شب خون
۲۹۳ تا ۲۹۹
(مکمل سیٹ) ۷۵۰ روپے

شب خون
سرمایۂ بہاراں

اردو فکشن کا غیر فانی کارنامہ
تہذیب، ادب، عشق، فن، سیاست اور تاریخ کا نادر مرقع

کئی چاند تھے سرِ آسماں

اٹھارویں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کے پس منظر میں زندگی، فن اور محبت کی تلاش پر مشتمل
یہ ناول ہند و پاک سے بہ یک وقت شائع ہو رہا ہے۔

سرورق : ذوالفقار احمد تابش (مشہور پاکستانی شاعر اور مصور)
صفحات : آٹھ سو سے زائد، مجلد
کاغذ : سفید مضبوط
قیمت : پانچ سو روپے (تخمیناً)

شب خون کتاب گھر، الہ آباد اور شہرزاد، (آصف فرخی) کراچی

ہالی ہاک(Hollyhock) (روغن)   عمل: فاطمہ صوفیہ تاج   عطیہ از مصور

شب خون

حصہ دوم

جون تا دسمبر ۲۰۰۵

شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹

سرمایۂ بہاراں

یعنی

پہلے ''شب خون'' سے لے کر آخری ''شب خون'' تک کا انتخاب

مرتبین

شمس الرحمٰن فاروقی

سید ارشاد حیدر

منتظم : امین اختر

صفحہ ساز : ریاض احمد کاتب

قیمت (مکمل سیٹ حصہ اول و دوم) ۷۵۰ روپے

IZHARSONS
19 – Urdu Bazar, Lahore

اظہار تشکر

خواجہ جاوید اختر
بشن ٹنڈن
ریاض احمد کاتب
سید محمد امین
سید نشاط احمد جعفری
شاداب مسیح الزماں
صدیق الرحمٰن قدوائی، شاہد ماہلی
فضل حسنین
مجتبیٰ حیدر قدر

انتساب

جمیلہ فاروقی کے نام

سرمایۂ بہاراں

دائم آباد رہے گی دنیا

سید ارشاد حیدر

۶۱۹

آشا پربھات — صرف ایک عورت — ۶۲۱
آشفتہ چنگیزی — غزل — ۶۲۱
آصف فرخی — بندر کی تقریر — ۶۲۲
آصف فرخی — پھپھوندی — ۶۲۹
آفتاب احمد — محمد حسن عسکری : شخص اور دوست — ۶۳۲
آفتاب حسین — غزل — ۶۴۴
آفتاب حسین — دوغزلیں — ۶۴۵
آل احمد سرور — ادب میں جدیدیت کا مفہوم — ۶۴۶
آل احمد سرور — فکشن کیا، کیوں اور کیسے؟ — ۶۵۲
آل احمد سرور — وقت کا عرفان ; ہمیں سکھایا گیا تھا — ۶۵۷
ابرار احمد — یہ شام بکھر جائے گی — ۶۵۸
ابرار احمد — میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے — ۶۵۹
ابرار احمد — سیر بین — ۶۶۰
ابرار اعظمی — غزل — ۶۶۴
ابوالحسنات حقی — دو غزلیں — ۶۶۴
احترام اسلام — غزل — ۶۶۵
احتشام اختر — دو غزلیں — ۶۶۵
احمد فواد — مجھے ٹوٹے ہوئے لفظوں سے جوڑو — ۶۶۶
احمد فواد — ابو دردا ابو دردا — ۶۶۸
احمد محفوظ — تین غزلیں — ۶۷۲
احمد مشتاق — بارہ غزلیں — ۶۷۳
احمد ہمیش — ڈرینج میں گرا ہوا قلم — ۶۷۹
احمد ہمیش — لینڈ اسکیپ — ۶۸۲
احمد ہمیش — لوکل ٹرین — ۶۸۴
احمد یوسف — خاموشی کے حصار — ۶۸۵
الفسح نورازل — نیند سے پہلے — ۶۸۷
اختر الایمان — اذیت پرست — ۶۸۸
اختر الایمان — تفاوت — ۶۸۹
اختر الایمان — میری آواز — ۶۹۰
اختر الایمان، فضیل جعفری، مرتب: تصدیق سہاوری — میرا جی کے ساتھ ایک شام — ۶۹۱
اختر الایمان — مناجات — ۶۹۵
اختر الایمان — راہ فرار — ۶۹۶
اختر الایمان — ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر — ۶۹۷
اختر الایمان — گریز پا؛ اور اب سوچتے ہیں — ۶۹۹
اختر الایمان — زمستان سرد مہری کا — ۷۰۰
اختر یوسف — رات کی آنکھ میں خنجر اگا — ۷۰۱
اختر یوسف — اپنے شہر میں فساد — ۷۰۲
اختر یوسف — پاس کے شہر میں فساد — ۷۰۲
اختر یوسف — شکتی ۴ ؛ شکتی ۵ — ۷۰۳
اختر یوسف — بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی۔۳ — ۷۰۴
ادا جعفری — دو غزلیں — ۷۰۵
ارشد عبدالحمید — گال — ۷۰۶
اسد محمد خاں — کوزہ کا سب سے چھوٹا پوم — ۷۰۷
اسد محمد خاں — کھڑکی بھر آسمان — ۷۰۷
اسد محمد خاں — سلامتی کا گیت — ۷۰۸
اسد محمد خاں — نگار صہبائی، پنجم سر میں تین چوتھائی صدی — ۷۰۹
اسد محمد خاں — ملشٹر — ۷۱۰
اسد محمد خاں — دریا اب میرا ہوا — ۷۱۲
اسرار گاندھی — رنگ گل و بوے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں — ۷۱۳
اسعد بدایونی — غزل — ۷۱۵
اسعد بدایونی — چار غزلیں — ۷۱۶
اسلم انصاری — غزل — ۷۱۸
اسلم عمادی — کون ہے — ۷۱۹
اسلم عمادی — خبر — ۷۲۰
اسلم فرخی — کچھ احوال ہمارے ضمیر کا — ۷۲۱
اسلم مرزا (مترجم) کے۔ چید انندن — سات ملیالی نظمیں — ۷۳۲

اسمارا جہ	ایک محبت	۷۳۷
	خدا کے بغیر ایک دن	
اسمارا جہ	مجھے اپنا دل پسند ہے	۷۳۸
	مٹی	
	پرندہ کھانے کو مانگتا ہے	
اسؔی بدرزبیری	غزل؛ واپسی؛ ایک نظم	۷۳۹
اصغرندیم سید	شاعری کا پرندہ	۷۴۰
اطہر نفیس	دو غزلیں	۷۴۱
اظہار الاسلام	سوراخ	۷۴۲
اعجاز احمد	تلاش	۷۴۳
اعجاز احمد	ستاروں کا مزاج؛ موت	۷۴۵
افتخار جالب	بورژوا فی بورژوا زی	۷۴۶
افتخار جالب	معنی کا خمیازہ تشدد کا	۷۵۴
	صلہ واللہ	
افتخار جالب	دہر کے بیتی شیتی سحر	۷۵۵
	کا پردہ	
افتخار عارف	غزل	۷۵۶
افتخار نسیم	غزل؛ میں درویش نہیں ہوں	۷۵۶
افضال احمد سید	غزل	۷۵۷
افضال نوید	غزل	۷۵۷
افغان اللہ	ایک عجیب نثری نظم	۷۵۸
اقبال پٹیل	نمو؛ ہم تو کچھ بھی	۷۵۹
	نہیں؛ موسم	
اقبال مجید	پیٹ کا کیچوا	۷۶۰
اقبال مجید	صغریٰ کا بلا	۷۶۵
اکبر معصوم	دو غزلیں	۷۷۲
اکرام باگ	آتش حنا	۷۷۳
اکرام باگ	اقلیما سے پرے ہو	۷۷۵
اکرم محمود	غزل	۷۷۸
اکرم نقاش	غزل	۷۷۸
الیاس احمد گدی	عجائب سنگھ	۷۷۹
امجد اسلام امجد	محبت کی کہانی؛ نظم	۷۸۴
امجد اسلام امجد	دوسرا عکس	۷۸۵
امجد جاوید	گھر میں اجنبی	۷۸۶
امنگ بالی	غزل؛ معصومیت؛	۷۸۸
	دیارِ غیر میں اک شب	
	خاموش	
انتخاب سید	ایک سوال	۷۸۸
انتظار حسین	خوابوں کے مسافر	۷۸۹
انتظار حسین	کچھوے	۸۰۹
انتظار حسین	نر ناری	۸۱۶
انتظار حسین	رزمیہ میں ایک نئی جہت	۸۲۰
انجلا ہمیش	ان دیکھی زمین پر	۸۲۳
انعام ندیم	دو غزلیں	۸۲۴
انوپا	سہرا؛ بندیا	۸۲۵
انوپا	بروز یوتم؛ بھید بھرا سناٹا؛	۸۲۶
	ان عورتوں کے نام	
انور خاں	گیلری میں بیٹھی عورت	۸۲۷
انور سجاد	چھٹی کا دن	۸۲۸
انور سجاد	بچھو، غار، نقش	۸۳۵
	حلقۂ اربابِ ذوق کی کارروائی اور محبوب الرحمٰن فاروقی کا حاشیہ	۸۳۷
انور سجاد	گینگرین	۸۳۸
انور سن رائے	میں مرنے کے بعد بھی	۸۴۲
	تمہارے کام آؤں گا	
انور سن رائے	خدا حافظ؛ چوہے کا خواب	۸۴۳
انور سن رائے	لینن کا مشتبہ حریف	۸۴۴
انور شعور	غزل	۸۴۶
انور شعور	تین غزلیں	۸۴۷
انور قمر	بیگانے	۸۴۸
انیس رفیع	کرفیو سخت ہے	۸۵۲
انیس ناگی	نوحہ ۱، نوحہ ۲، نوحہ ۳	۸۵۴
اوپندر ناتھ اشک	آکاش چاری	۸۵۷
اوم پربھاکر	دو نظمیں	۸۶۴
باقر مہدی	دو نظمیں	۸۶۶
بانی	غزل	۸۶۷
بانی	سات غزلیں	۸۶۸
بشر نواز	جھوٹ تقدس رشتوں کا	۸۷۲
بشر نواز	نظم؛ وہ ہیں تیرگی میں	۸۷۳
	بھی ضوفشاں	
بشر نواز	مجھے جینا نہیں آتا	۸۷۴
بشیر باگ	عجیب تماشا	۸۷۵
بلراج کومل	ایک عورت؛ کابوس	۸۷۹
بلراج کومل	بلی؛ تیسرا فاصلہ؛	۸۸۰
	پانچویں منٹ کے بعد	
بلراج کومل	پرندوں بھرا آسمان	۸۸۱
بلراج کومل	بے نشاں	۸۸۲
بلراج کومل	گریزاں روشنی کی ہم	۸۸۲
	سفر آنکھیں	
بلقیس ظفیر الحسن	وہ رات ماہ صیام کی تھی	۸۸۳
بلقیس ظفیر الحسن	پوسٹر نظم	۸۸۴
بلقیس ظفیر الحسن	غزل	۸۸۵
بلقیس ظفیر الحسن	خدا کے لئے کچھ	۸۸۶
بمل کرشن اشک	اجڑا دیار	۸۸۷
بمل کرشن اشک	غسل	۸۹۶
بمل کرشن اشک	جی یہ کرتا ہے	۸۹۷
بیدار بخت	میرے گملے میں ایک پیڑ	۸۹۸
پرتپال سنگھ بیتاب	چار نظمیں	۸۹۹
پرتپال سنگھ بیتاب	غزل؛ نظم	۹۰۰
پرتپال سنگھ بیتاب	تونے یہ کیوں کیا ؟	۹۰۱
پرکاش فکری	آٹھ غزلیں	۹۰۲
پریم کمار نظر	چار غزلیں	۹۰۶
تاج ہاشمی	غزل؛ نظم	۹۰۸
تاج مجبور	ملاقات	۹۰۸
تبسم کاشمیری	مراجعت کا ایک تجربہ	۹۰۹

تنویراعجاز	بے مانگی؛	۹۱۰
	سرگذشت:احمد آباد	
	۲۸ فروری ۲۰۰۲	
تنویرانجم	دو غزلیں	۹۱۱
تنویرانجم	رنگ، مذہب، زبان اور	۹۱۲
	کوالٹی کنٹرول	
تنویرانجم	غیر پاکستانی نواب	۹۱۳
	زادی آمنہ کا خواب	
تنویرانجم	فوراً ہی مرجانا	۹۱۴
تنویر سامانی	غزل	۹۱۴
توصیف تبسم	دوغزلیں	۹۱۵
ثروت حسین	میں ایک آدمی کی موت	۹۱۶
	مرنا چاہتا ہوں؛ غزل	
ثروت حسین	دو غزلیں	۹۱۷
جاں نثار اختر	غزل	۹۱۸
جاں نثار اختر	غزل	۹۱۹
جاوید شاہین	تین غزلیں	۹۲۰
جبار جمیل	اپنی بچی کی موت پر	۹۲۱
جبار جمیل	پولیو	۹۲۲
جگن ناتھ آزاد	اقبال صرف مسلمانوں کا	۹۲۳
	شاعر	
جگن ناتھ آزاد	غزل	۹۲۹
جلیس نجیب آبادی	تنکے، آندھی اور میں	۹۲۹
جلیس نجیب آبادی	غزل	۹۳۰
جمال احسانی	دو غزلیں	۹۳۰
جمنا پرشاد راہی	غزل	۹۳۱
جمیل الرحمٰن	غزلیں	۹۳۲
جمیل مظہری	سلجھا اپنا	۹۳۳
جمیل مظہری	ظفر اوگانوی کے نام	۹۳۴
جمیل مظہری	دو غزلیں	۹۳۵
جوگندر پال	بازیچۂ اطفال	۹۳۶
جوگندر پال	رہائی	۹۴۳
جیلانی بانو	سوکھی ریت	۹۴۴
جیلانی کامران	میرا باغ نرگس سوتہا	۹۴۷
جیلانی کامران	نظم؛ خواب سناؤ	۹۴۸
جینت پرمار	نظم کہاں رکھی ہے مس نے؛	۹۴۹
	کولاژ؛ فیاض خاں کا مزار	
جینت پرمار	نئی نظم کا مصرع؛	۹۵۰
	اسٹل لائف ۱؛	
	اسٹل لائف ۲	
چندر پرکاش شاد	دو غزلیں	۹۵۱
چودھری محمد نعیم	نظم	۹۵۲
حارث خلیق	ڈر؛ پہلی عورت	۹۵۲
حارث خلیق	باتوں باتوں میں؛	۹۵۳
	راہ دکھانے والی	
حامد حسین حامد	غزل	۹۵۳
حامدی کاشمیری	راشد کی نظم اور میرا جی	۹۵۴
	کا تجزیہ	
حامدی کاشمیری	دو غزلیں	۹۵۷
حبیب حق	سات مختصر نظمیں	۹۵۸
حسن جمال	بے وجود	۹۵۹
حسن عزیز	تین غزلیں	۹۶۲
حسن فرخ	یوں بھی ہوتا ہے	۹۶۳
حسن منظر	پہلا سودا	۹۶۴
حسن نعیم	تین غزلیں	۹۶۷
حسین الحق	میرا منیم کیوں مرا	۹۶۸
حمایت علی شاعر	نروان کے بعد	۹۷۱
حمدون عثمانی	غزل	۹۷۲
حمید الماس	جو کسی حادثے کی	۹۷۲
	علامت نہیں	
حمید الماس	پچیس نظمیں	۹۷۳
حمید الماس	نئی دھرتی	۹۷۶
حنیف نجمی	غزل	۹۷۶
حیدر صفت	اکتوبر ۱۹۷۶ کی ایک	۹۷۷
	نامکمل نظم	
خالد جاوید	پیٹ کی طرف مڑے ہوئے	۹۸۱
	گھٹنے	
خالد سعید	غزل	۹۹۱
خالد عبادی	غزل	۹۹۱
خالدہ حسین	سکڑی	۹۹۲
خالدہ حسین	ہتے	۹۹۵
خلیل الرحمٰن اعظمی	جدید تر غزل	۹۹۹
خلیل الرحمٰن اعظمی	دو غزلیں	۱۰۰۶
خلیل تنویر	تین غزلیں	۱۰۰۷
خواجہ جاوید اختر	غزل	۱۰۰۸
خواجہ رضی حیدر	غزل	۱۰۰۹
دیویندر اسر	دیو ہیکل ادارے اور ذات	۱۰۱۰
	کا بحران	
دیویندر گوتم	غزل	۱۰۱۳
ذکاءالدین شایاں	دو غزلیں	۱۰۱۴
ذکیہ مشہدی	قصہ جانکی رمن پانڈے	۱۰۱۵
ذوالفقار احمد تابش	غزل	۱۰۱۶
ذیشان ساحل	سرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی	۱۰۲۷
ذیشان ساحل	ہلکی اور بھاری چیزیں	۱۰۲۸
ذیشان ساحل	کھٹی کا مسئلہ	۱۰۲۹
ذیشان ساحل	مختلف لوگوں کے لئے	۱۰۳۰
	نظم	
ذیشان ساحل	دو نظمیں	۱۰۳۱
ذیشان ساحل	بغداد کوئی خط نہیں	۱۰۳۲
	لکھتا	
راجندر سنگھ بیدی	سونفیا	۱۰۳۳
راحت حسن	غزل	۱۰۳۹
راشد جمال فاروقی	چار نظمیں؛	۱۰۳۹
	اک منظر آسمان پر	
راشد طراز	تین غزلیں	۱۰۴۰

رام لعل — اکھڑے ہوئے لوگ ۱۰۴۱
راہی فدائی — چار غزلیں ۱۰۴۷
رشید امجد — الف کی موت پر ایک کہانی ۱۰۴۹
رشید امجد — شب مراقبہ کے اعترافات ۱۰۵۳
رشید کوثر فاروقی — چار غزلیں ۱۰۵۹
رضوان حسین — مکتوب در معرفت شاعر نو ۱۰۶۳
رفعت سروش — دیوار، ندی ۱۰۶۸
رفیق راز — چار غزلیں ۱۰۶۹
رونق نعیم — رشتے ناطے، اندر دھنش، بڑا آسمان ۱۰۷۱
رونق نعیم — غزل ۱۰۷۲
رؤف خلش — رام جی رونے لگے ۱۰۷۲
رئیس فراز — دو غزلیں ۱۰۷۳
زاہد ڈار — نظم، ایک ویران گاؤں میں ۱۰۷۴
زاہد ڈار — کچھ دیر پہلے ۱۰۷۵
زاہدہ حنا — رانا سلیم سنگھ ۱۰۷۶
زاہدہ زیدی (مترجم) / لوئیجی پرانڈیلو — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے ۱۰۸۶
زاہدہ زیدی — ایک نظم ۱۱۱۵
زبیر رضوی — عاقبت اندیش بیٹے، رقیب شوق ۱۱۱۶
زبیر شفائی — تین غزلیں ۱۱۱۷
زیب غوری — سات غزلیں ۱۱۱۸
ساجد حمید — احتیاط/احتجاج ۱۱۲۲
ساجدہ زیدی — بہ دنیائے وحدت ۱۱۲۳
ساجدہ زیدی — ققنس ۱۱۲۴
ساحل احمد — بیداری، ہوا، حرب و ضرب، سایہ ۱۱۲۵
سارا شگفتہ — اے میرے سرسبز خدا، چٹکی بھر آنکھ ۱۱۲۶
ساغر جیدی — چار غزلیں ۱۱۲۷
ساقی فاروقی — امانت، مجھے جزیرہ ملے ۱۱۲۹
ساقی فاروقی — ایک پشت کی مسافت میں ۱۱۳۰
ساقی فاروقی — ہمزاد، غزل ۱۱۳۱
ساقی فاروقی — حمل سرا ۱۱۳۲
ساقی فاروقی — تین غزلیں ۱۱۳۳
سراج اجملی — غزل ۱۱۳۴
سردار حسین (مترجم) / گی دا موپاساں — کون جانتا ہے؟ ۱۱۳۵
سرشار بلند شہری — ایک نظم ۱۱۴۰
سریندر پرکاش — دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ۱۱۴۱
سریندر پرکاش — رونے کی آواز ۱۱۴۴
سریندر پرکاش — برف پر مکالمہ ۱۱۴۷
سریندر پرکاش — خواب صورت ۱۱۵۱
سکندر احمد — ہمزہ، اپنی اصل کے تناظر میں ۱۱۵۵
سلام بن رزاق — ننگی دوپہر کا سپاہی ۱۱۶۲
سلام مچھلی شہری — جو میں اپنے مالک کو اس طرح پوجوں ۱۱۶۷
سلطان اختر — چار غزلیں ۱۱۶۸
سلیم احمد — محمد حسن عسکری اور فراق ۱۱۷۰
سلیم احمد — غزل ۱۱۷۳
سلیم اختر — تذکرۂ اشعار ۱۱۷۴
سلیمان اریب — تم کس سے ملنے آئے ہو؟ ۱۱۷۷
سلیمان اریب — آخری لفظ، پہلی آواز، تمھیں کیا ۱۱۷۸
سلیم کوثر — دو غزلیں ۱۱۷۹
سمیع آہوجا — بشو نبی مصطفیٰ ۱۱۸۰
سونو — عقیدہ ۱۱۸۴
سونو — راگ چندر کونس، شاہد ۱۱۸۵
سہیل احمد زیدی — پانچ غزلیں ۱۱۸۶
سید احتشام حسین — ناول کی تنقید ۱۱۸۹
سید امین اشرف — آٹھ غزلیں ۱۱۹۳
سید بشارت علی — مرثیہ ۱۱۹۸
سید حامد — تثلیث حزن ۱۱۹۹
سید سراج الدین (مترجم) / ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ — ارض ویراں ۱۲۱۲
سید عارف — غزل ۱۲۲۳
سید فضل المتین — غزل ۱۲۲۳
سید محمد اشرف — تلاش رنگ رائیگاں ۱۲۲۴
شارق کیفی — دو غزلیں ۱۲۶۰
شان الحق حقی — استقبال استاداں ۱۲۶۱
شاہد اختر — غزل ۱۲۶۲
شاہد عزیز — ایک شام، آئینہ ۱۲۶۲
شاہد کلیم — تیز ہوا اور گھر کی گرد ۱۲۶۳
شاہد میر — راگ رنگ ۱۲۶۴
شاہدہ حسن — درودیوار پہ سبزہ، غزل ۱۲۶۵
شاہین — دوغزلیں ۱۲۶۶
شاہین — صبا لکھنوی، ایک نظم تین عنوانات ۱۲۶۷
شاہین — نقدی کہاں سے آئے گی، ایک منظر، واپسی ۱۲۶۸
شاہین عباس — تین غزلیں ۱۲۶۹
شائستہ یوسف — دو نظمیں ۱۲۷۰
شفق — سیاہ کتا ۱۲۷۱
شفق سوپوری — دو غزلیں ۱۲۷۵
شفیع جاوید — رات شہر اور میں ۱۲۷۶
شفیع جاوید — تیز ہوا کا شور ۱۲۷۹
شفیق فاطمہ شعریٰ — گڑیا گھر ۱۲۸۳
شفیق فاطمہ شعریٰ — غزل ۱۲۸۵
شکیل الرحمٰن — نئی شاعری، ایک رجحان ۱۲۸۶
شمیم احمد — اردو میں جدیدیت کا پیش رو، حالی یا شبلی ۱۲۹۳

شمیم حنفی	تنہائی کا مسئلہ	۱۳۰۳
شمیم حنفی	دو غزلیں	۱۳۰۷
شہاب جعفری	تسخیر فطرت کے بعد	۱۳۰۸
شہریار	زوال کی حد	۱۳۰۹
شہریار	ایک نظم، غزل	۱۳۱۰
شہریار	دو غزلیں	۱۳۱۱
شہریار	آگے بہت آگے آگیا، غزل	۱۳۱۲
شہریار	غزل، خوف حکایت، اسعد بدایونی	۱۳۱۳
شہریار	دو غزلیں	۱۳۱۴
شہزاد احمد	پانچ غزلیں	۱۳۱۵
صابر ظفر	غزل	۱۳۱۸
صبا اکرام	قطرہ قطرہ تشنگی	۱۳۱۸
صبا جائسی	ادب کے نفسیاتی مطالعے کے اصول	۱۳۱۹
صدیق عالم	ڈھاک بن	۱۳۲۷
صدیق عالم	بیتے دنوں کا اسکلیٹن	۱۳۳۲
صدیق عالم	لورسیس	۱۳۳۳
صدیق مجیبی	مٹی کی نظم	۱۳۴۱
صدیق مجیبی	دو غزلیں	۱۳۴۲
صفدر	بسم اللہ الرحمن الرحیم، سبز ہاتھ	۱۳۴۳
صلاح الدین محمود	حمضیہ نظمیں: شاخ انجم کے سفیر	۱۳۴۴
صلاح الدین محمود	غزل، خطاب	۱۳۴۷
صہبا وحید	غزل	۱۳۴۸
ضمیر احمد (مترجم) محمود درویش	شناختی کارڈ	۱۳۴۹
ضمیر احمد (مترجم) محمود درویش	خواہشیں	۱۳۵۰
ضمیر احمد (مترجم) سیلو	اپنی ہمجولیوں سے	۱۳۵۰
ضمیر احمد (مترجم) اودونس (علی احمد سعید)	عصر حاضر کا نوحہ	۱۳۵۱
ضمیر الدین احمد	پروائی	۱۳۵۵
ظفر احمد صدیقی	بلاغت کی بعض اصطلاحیں	۱۳۶۰
ظفر اقبال	گیارہ غزلیں	۱۳۷۱
ظفر اوگانوی	انثراسوروس	۱۳۷۲
ظفر گورکھپوری	دو غزلیں	۱۳۷۸
عابدہ احمد	نظم، یاد، کچھ کیا جاتے	۱۳۷۹
عادل منصوری	ہم عصر اجداد کے نام	۱۳۷۹
عادل منصوری	حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود	۱۳۸۰
عادل منصوری	غزل	۱۳۸۲
عادل منصوری	ایل۔ ایس۔ ڈی۔ نظمیں	۱۳۸۲
عادل منصوری	تین غزلیں	۱۳۸۳
عالم خورشید	دو غزلیں	۱۳۸۵
عالم خوندمیری	غالب	۱۳۸۶
عباس اطہر	لیکن ہم مرنے والوں کا ساتھ نہیں دے سکتے	۱۳۹۲
عباس اطہر	نیک دل لڑکیو!	۱۳۹۳
عبدالاحد ساز	دو غزلیں	۱۳۹۴
عبدالاحد ساز	معمورہ	۱۳۹۵
عبدالاحد ساز	نظم	۱۳۹۶
عبدالحمید	دو غزلیں	۱۳۹۷
عبدالرحیم نشتر	دو غزلیں	۱۳۹۸
عبدالصمد	بیکار لوگ	۱۳۹۹
عبداللہ کمال	غزل	۱۴۰۱
عبید صدیقی	دو غزلیں	۱۴۰۲
عتیق اللہ	تعاقب	۱۴۰۳
عثمان عارفی	غزل	۱۴۲۰
عدیم ہاشمی	مکالماتی غزل	۱۴۲۰
عذرا عباس	میرا بچپن	۱۴۲۱
عرفان ستار	چار غزلیں	۱۴۲۸
عرفان صدیقی	بارہ غزلیں	۱۴۳۰
عزیز بانو داراب وفا	دو غزلیں	۱۴۳۶
عزیز تمنائی	آوازیں	۱۴۳۷
عزیز حامد مدنی	روح باراں، سارقوں کی کشتیاں	۱۴۳۸
عشرت ظفر	تین غزلیں	۱۴۳۹
عقیل جامد	تین غزلیں	۱۴۴۰
عقیل شاداب	چار غزلیں	۱۴۴۱
علی ظہیر	نظم، رخصت، موت کے دروازے پر	۱۴۴۳
علیم افسر	دو غزلیں	۱۴۴۴
علی محمد فرشی	نیند کنول کا راجکمار، ست رنگی نیند کی موت	۱۴۴۵
علی محمد فرشی	بات اتنی سی تھی	۱۴۴۶
عمیق حنفی	تعارف	۱۴۴۷
عمیق حنفی	سیارگاں	۱۴۴۸
عمیق حنفی	غزل، مہک اڑا دے	۱۴۵۶
عمیق حنفی	نیلی نظم	۱۴۵۷
عنبر بہرائچی	اندھیر	۱۴۵۷
عوض سعید	رات والا اجنبی	۱۴۵۸
عین تابش	غزل	۱۴۶۰
عین رشید	شہر	۱۴۶۱
عین رشید	شہر	۱۴۶۲
غلام حسین ساجد	چار غزلیں	۱۴۶۳
غلام مرتضیٰ راہی	چھ غزلیں	۱۴۶۵
غلام مصطفیٰ فراز	غزل	۱۴۶۷
غیاث احمد گدی	طلوع	۱۴۶۸
غیاث احمد گدی	سمندر اور آسماں	۱۴۷۱
غیاث متین	ایک نظم، غزل	۱۴۷۲
فاروق انجینئر	پرانا گھوڑا، ندی (۱)، ندی (۲)، پریاں، خط، کشش	۱۴۷۷

فاروق شفق	چھ غزلیں	۱۴۷۸
فاطمہ حسن	دو غزلیں	۱۴۸۱
فراق گورکھپوری	ایک اور گفتگو	۱۴۸۲
فرحت احساس	غزل	۱۴۸۷
فرخ جعفری	پانچ غزلیں	۱۴۸۷
فرخ یار	خون اپنی گواہی پہ قائم رہا؛ تاریخ اپنے کھاتے نئی کتابوں پر منتقل کر چکی	۱۴۹۰
فضا ابن فیضی	غزل	۱۴۹۱
فضل تابش	غزل	۱۴۹۱
فضل تابش	سر میں کیل ٹھونک کر	۱۴۹۲
فضل حسنین (مترجم) کنور نرائن	سیما ریکھائیں	۱۴۹۳
فضیل جعفری	دو غزلیں	۱۴۹۵
فضیل جعفری	نئی شاعری اور جدیدیت	۱۴۹۶
فضیل جعفری	غزل	۱۵۰۵
فہمیدہ ریاض	کیا گلابی کبوتر جت گئے؟	۱۵۰۶
فہمیدہ ریاض	موسموں کے دائرے میں	۱۵۱۳
فہمیدہ ریاض	جلوہ؛ خبر نامہ	۱۵۱۴
فیاض رفعت	پندرہ خود کلامیاں اروشی کے نام	۱۵۱۵
فیصل ہاشمی	اگر یہ راستہ کبھی	۱۵۱۷
قاضی افضال حسین	نئے افسانے کی زبان	۱۵۱۸
قاضی جمال حسین	دیباچۂ "غرۃ الکمال" کی معنویت	۱۵۲۲
قاضی سلیم	درد سدی؛ سفر	۱۵۲۶
قاضی سلیم	لمس	۱۵۲۷
قاضی سلیم	اے چراغ	۱۵۲۸
قاضی سلیم	تعبیر	۱۵۳۰
قدیر زماں	گردش	۱۵۳۱
قربان آتش	تین غزلیں	۱۵۳۲
قرۃ العین حیدر	فوٹو گرافر	۱۵۳۷
قمر احسن	اسپ کشت مات	۱۵۴۰
قمر جمیل	جنگلی لڑکیوں کے نام	۱۵۴۷
قمر جمیل	طوفانی رات کی آواز	۱۵۴۸
قمر صدیقی	غزل	۱۵۴۸
قمر عالم قاسمی (مترجم) احسان عبدالقدوس	مجھے نکلو اس سفر سے	۱۵۴۹
قیصر عالم	تنہائی کو اور کیا چاہیے؛ چلو ٹھیک ہے؛ کیا تمہیں معلوم ہے؟	۱۵۶۹
قیوم راز	غزل	۱۵۷۰
کامل اختر	شہادت کے لئے منظر؛ غزل	۱۵۷۰
کاوش بدری	چھ غزلیں	۱۵۷۱
کرشن بلدیو وید	قرض	۱۵۷۴
کرشن چندر (مترجم) سیموئل بیکیٹ	گوڈو کے انتظار میں	۱۵۷۶ *
کرشن کمار طور	چھ غزلیں	۱۶۳۸
کرشن موہن	مرغولے	۱۶۴۱
کرشن موہن	غزل	۱۶۴۲
کشور ناہید	ترا لٹیا شہر بھنبھور	۱۶۴۲
کمار پاشی	میں جو قیدی بنا	۱۶۴۲
کمار پاشی	اپلیناہا کا زوال	۱۶۴۳
کیدار ناتھ کومل	دیواریں؛ جی ہوتا ہے	۱۶۴۵
کیف احمد صدیقی	غزل	۱۶۴۶
کیلاش ماہر	مونا ستونتی	۱۶۴۶
گوپی چند نارنگ	اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ: چند مثالیں	۱۶۴۷
گیان چند جین	مہاتما گاندھی اور اردو رسم الخط	۱۶۵۴
لطف الرحمٰن	چھ غزلیں	۱۶۵۷
مبین مرزا	ریت کی دیوار کے ادھر	۱۶۶۰
مجید امجد	آپریشن سے ایک دن پہلے*	۱۶۶۶
مجید امجد	پھولوں کی پلٹن	۱۶۶۷
مجید امجد	نظم؛ گداگر	۱۶۶۸
مجید امجد	دوام؛ نظم	۱۶۶۹
مجید امجد	مرے خدا، مرے دل	۱۶۷۰
محبوب خزاں	غزل	۱۶۷۲
محبوب راہی	غزل	۱۶۷۳
محمد احمد رمز	پانچ غزلیں	۱۶۷۳
محمد اظہار الحق	دو غزلیں	۱۶۷۶
محمد اظہار الحق	مجاز؛ زہر ہے کہ جاتا نہیں	۱۶۷۷
محمد اظہار الحق	نظم؛ غزل	۱۶۷۸
محمد اظہار الحق	غزل	۱۶۷۹
محمد اعظم	دو غزلیں	۱۶۸۰
محمد حسن عسکری	اردو ادب کی روایت، چند تصریحات	۱۶۸۱
محمد حمید اللہ	فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ	۱۶۸۶
محمد حمید شاہد	سورگ میں سور	۱۶۸۹
محمد سلیم الرحمٰن	برجمنوں کی صبح	۱۶۹۲
محمد سلیم الرحمٰن	روزگار	۱۶۹۳
محمد سلیم الرحمٰن	مارینا تسویتائیوا کے لئے نظم	۱۶۹۹
محمد طاہر (مرتب)	ادیب اور فرقہ واریت: ایک مباحثہ	۱۷۰۰
محمد علوی	آخری دن کی تلاش	۱۷۰۶
محمد علوی	مچھلی کی بو	۱۷۰۷
محمد علوی	غزل؛ چپ رہو	۱۷۰۸

محمد علوی	ایک خط (فاروقی کے نام)	۱۷۰۹
محمد علوی	غزل؛ آج بھی ایسا ہوگا؛ گھر،جھروکا ، دوپہر	۱۷۱۰
محمد علوی	دو یادیں؛ ساہتیہ اکادمی؛ غزل	۱۷۱۱
محمد عمر میمن	رات اور کھمبیاں	۱۷۱۲
محمد عمر میمن	حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت	۱۷۳۰
محمود ایاز	سسی فس	۱۷۴۰
مخمور سعیدی	ذات کا سفر	۱۷۴۱
مدحت الاختر	آٹھ غزلیں	۱۷۴۵
مرتضیٰ خاں	خاک میں خاک	۱۷۴۸
مرزا حامد بیگ	کندیاں لائن	۱۷۴۹
مرزا سعید الظفر چغتائی (مترجم) / پال ایلوار	نظم؛ لب آسودہ؛ دریا؛ ناقابل تقسیم	۱۷۵۳
مرزا سعید الظفر چغتائی (مترجم) / سوزان ہیوسک	نظم	۱۷۵۴
مرزا سعید الظفر چغتائی (مترجم) / سیولی پریودیوم	آنکھیں	۱۷۵۵
مرغوب علی	عجب موسم	۱۷۵۵
مسعود اشعر	اپنا گھر	۱۷۵۶
مسیح الزماں (مترجم) / یوژین آنسکو	بیاہنی لڑکی	۱۷۷۳
مصحف اقبال توصیفی	مزاحمت؛ ایک نظم	۱۷۷۸
مصحف اقبال توصیفی	ہمیں اتنا نہ آیا	۱۷۷۹
مصحف اقبال توصیفی	غزل؛ نیم دائرے	۱۷۸۰
مصطفیٰ ارباب	سیب؛ میرا دل؛ دیوتا	۱۷۸۱
مصور سبزواری	چار غزلیں	۱۷۸۲

مظفر حیدری	غزل	۱۷۸۳
مظفر حنفی	چھ غزلیں	۱۷۸۴
مظہر الزماں خاں	نجات	۱۷۸۷
مظہر امام	چھ غزلیں	۱۷۸۸
مغنی تبسم	لالیہ	۱۷۹۱
م۔ق۔خان	حق وفاداری	۱۷۹۶
منشا یاد	بیتال کتھا	۱۷۹۸
منشا یاد	ماں جی	۱۸۰۱
منصور اعجاز	ایک نظم	۱۸۰۵
منصورہ احمد	غزل	۱۸۰۵
منظر سلیم	الزائمرس	۱۸۰۶
منظر کاظمی	پرندہ اور ریشم کے دھاگے	۱۸۰۷
من موہن تلخ	چار غزلیں	۱۸۱۱
منیب الرحمٰن	بلبلوں کے محل؛ الفاظ	۱۸۱۳
منیب الرحمٰن	کبھی میں نہیں کبھی تم نہیں	۱۸۱۴
منیب الرحمٰن	سال کا پہلا گلاب؛ شجر تلخ	۱۸۱۵
منیب الرحمٰن	ہجر و فراق کی نظمیں	۱۸۱۶
منیر نیازی	موسم تنہائی میں آئندہ کا خیال؛ ایک احتمال	۱۸۱۷
منیر نیازی	غزل	۱۸۱۷
منیر نیازی	ایک دوزخی شہر میں بادلوں کے لئے دعا، سر سحر آب زار بنگال	۱۸۱۸
منیر نیازی	چار غزلیں	۱۸۱۹
منیر نیازی	آغاز زمستاں میں دوبارہ؛ کل رات میرے خواب میں دو مکان تھے	۱۸۲۱
موہن لال	میں بوند بوند زہر پیتا ہوں	۱۸۲۲
مہتاب حیدر نقوی	تین غزلیں	۱۸۳۸

مہدی جعفر	انور سجاد کی اسیری اور میری ہوا خوری	۱۸۴۹
مہر افشاں فاروقی (مترجم) / آنتون چیخوف	تمباکو کی ضرر رسانیاں	۱۸۵۹
مہر افشاں فاروقی (مترجم) / تاتیانا تالستایا	بہ یاد جوزف براڈسکی	۱۸۶۱
مہر افشاں فاروقی (مترجم) / اینڈ رو موشن	راج بدل گیا	۱۸۶۵
مہیش اشک	غزلیں	۱۸۶۶
میرا جی	آبگینے کے اس پار کی ایک شام	۱۸۶۷
میرا جی	یگانگت	۱۸۶۸
میرا جی	تنہائی	۱۸۶۹
میرا جی	الجھن کی کہانی	۱۸۷۰
میرا جی	ایک کتبہ؛ حادثہ؛ سحر حیات	۱۸۷۱
میرا جی	غزل	۱۸۷۲
میرا جی	راشد کی نظم "خود کشی"	۱۸۷۳
میرا جی (مترجم) / سیفو	گیت	۱۸۷۴
میرا جی	نظم	۱۸۷۵
مین را	کمپوزیشن چار	۱۸۷۶
ناصر شہزاد	دو غزلیں	۱۸۷۸
ناصر کاظمی	غزل	۱۸۷۹
ناہید اختر	نظم	۱۸۸۰
نجم فاروقی (مترجم) / ولیم سیمن سم	سرخ و سیاہ	۱۸۸۱
نجم فاروقی (مترجم) / ایم۔ایس۔واڈل	مجھے چاہو، مجھے چاہو، مجھے چاہو	۱۸۸۳

انجم فضلی	وحشی کی موت	۱۸۸۷
انجم فضلی	حصارہ	۱۸۸۸
محمد افضلی	غزل	۱۸۹۰
محمد افضلی	ما گیت، محبت	۱۸۹۱
محمد افضلی	غزل، تھوڑی سی کمی	۱۸۹۲
محمد افضلی	میرا شہر، میرا شہر	۱۸۹۳
نشتر خانقاہی	دو غزلیں	۱۸۹۴
نصیر احمد ناصر	مہمان پرندوں کو الوداع،	۱۸۹۵
	دکھ،	
	اے مرے خواب کہاں	
	جائے گا	
نقی حسین جعفری	پھر بھی کبھی کبھی،	۱۸۹۶
	کوئی کہتا ہے	
ن۔م۔دانش	غزل، بدصورتی کا حسن	۱۸۹۷
ن۔م۔راشد	اے سمندر	۱۸۹۸
ن۔م۔راشد	مزار	۱۸۹۹
ن۔م۔راشد	گدھ گہ	۱۹۰۲
ن۔م۔راشد	طوفان نوکری	۱۹۰۳
ن۔م۔راشد	بے سرا الاپ	۱۹۰۴
ن۔م۔راشد	جہاں ابھی رات ہے	۱۹۰۵
ن۔م۔راشد	السمہ+لیکن	۱۹۰۶
ن۔م۔راشد	آنگن ہے ریت	۱۹۰۷
ن۔م۔راشد	اک زمرے کا ہاتھ	۱۹۰۸
نیر عاقل	تین غزلیں	۱۹۰۹
نیر مسعود	مارگیر	۱۹۱۰
نیر مسعود	شیشہ گھاٹ	۱۹۲۷
وارث علوی	حدیث کے بڑے بھائی	۱۹۳۴
	لوگ	
وحید اختر	غزل	۱۹۵۳
وحید اختر	آنکھ سوما	۱۹۵۴
وزیر آغا	جدید اردو شاعری،	۱۹۵۵
	ایک مثبت تحریک	
وزیر آغا	کھلونے	۱۹۶۰
وقار واثقی	غزل	۱۹۶۰
وویک وشال	بہم لمحوں کی داستان	۱۹۶۱
وہاب اشرفی	افسانے کا منصب	۱۹۶۲
وہاب دانش	عکس ایک	۱۹۶۷
وہاب دانش	ابابیل کو سمت دو	۱۹۶۸
وہاب دانش	نظم	۱۹۶۹
وہاب دانش	عرض نشاط، تیرا نام،	۱۹۷۰
	اس آئنے تو	
ہربنس کھیا	سکون، میری دوست	۱۹۷۱
ہمدم کاشمیری	دو غزلیں	۱۹۷۲
یاسمین حمید	ہم دو زمانوں میں پیدا	۱۹۷۳
	ہوئے	
یوگ راج	جدید شاعری کے مسائل	۱۹۷۴

فہرست مصنفین مترجمہ

آئنسکو، یوژین (فرانسیسی)، ۱۷۷۳، مترجم: مسیح الزماں
احسان عبدالقدوس (عربی)، ۱۵۳۹، مترجم: قمر عالم قاسمی
ادونس (علی احمد سعید، عربی)، ۱۳۵۱، مترجم: ضمیر احمد
ایلیٹ، ٹی۔ایس۔ (انگریزی)، ۱۲۱۲، مترجم: سید سراج الدین
ایلوار، پال (فرانسیسی)، ۱۷۵۳، مترجم: مرزا سعید الظفر چغتائی
بیکیٹ، سیموئل (انگریزی)، ۱۵۷۶، مترجم: کرشن چندر
پرانڈیلو، لوئجی (اطالوی)، ۱۰۸۶، مترجم: زاہدہ زیدی
پریودوم، سیولی (فرانسیسی)، ۱۷۵۵، مترجم: مرزا سعید الظفر چغتائی
تاتیانا تالستایا (روسی)، ۱۸۶۱، مترجم: مہر افشاں فاروقی
چیخوف (روسی) ۱۸۵۹، مترجم: مہر افشاں فاروقی
سچدانندن، کے۔ (ملیالی) ۷۳۲، مترجم: اسلم مرزا
سیفو (یونانی) ۱۳۵۰، مترجم: ضمیر احمد
سیفو (یونانی) ۱۸۳۴، مترجم: میراجی
سین سم، ولیم (انگریزی)، ۱۸۸۱، مترجم: نجم فاروقی
کنور نرائن (ہندی)، ۱۳۹۳، مترجم: فضل حسنین
محمود درویش (عربی)، ۱۳۵۰، مترجم: ضمیر احمد
مصری نظم (قدیم)، ۷۳۵، مترجم: اعجاز احمد
موپاساں، گی دا (فرانسیسی)، مترجم: سردار حسین
موشن، اینڈریو (انگریزی)، ۱۸۶۵، مترجم: مہر افشاں فاروقی
واڈل، ایم۔ایس۔ (انگریزی)، ۱۸۸۳، مترجم: نجم فاروقی
یوسیک، سوزان (فرانسیسی)، ۱۷۵۴، مترجم: مرزا سعید الظفر چغتائی

دائم آباد رہے گی دنیا

سید ارشاد حیدر

"شب خون" کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۶۶ کی تاریخ کے ساتھ ۱۸ مئی ۱۹۶۶ کو شائع ہوا تھا۔ اردو کا شاید کوئی بھی معیاری ادبی رسالہ اتنے طویل عرصے تک مسلسل شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے تتبع یا جواب میں نکلنے والے رسائل مثلاً "شب رنگ"، "شہپر"، "اقدار"، "مزاج"، "جواز"، "غبار خاطر"، "نبض"، "گفتگو"، "شعر و حکمت"، "سطور"، "شعور" جیسے پرچے بہت جلد ہی دم توڑ گئے، حالانکہ ان میں بعض کی پشت پناہی میں قیمتی اشتہارات اور بڑے بڑے صاحبان تمول و تجمل بھی تھے۔ "شعر و حکمت" البتہ کئی بار نکلا اور بند ہوا اور خوشی کی بات ہے کہ اب کچھ برسوں سے وہ پھر باقاعدہ نکل رہا ہے، لیکن شش ماہی ہونے کی وجہ سے اس میں فوری تاثیر اور تاثر و مباحثہ کا وہ رنگ نہیں ہے جو ماہناموں کا خاصہ ہوتا ہے۔ "شب خون" سے پہلے "سوغات" البتہ ایسا رسالہ تھا جو بہت با اثر، بہت معیاری تھا، لیکن وہ سہ ماہی تھا اور بہت پہلے نکل کر بند ہو چکا تھا۔ بعد میں اسے دوسرے اور تیسرے دور میں پھر شائع کیا گیا۔ افسوس کہ محمود ایاز کی موت نے اس کی کتاب زیست پر آخری مہر لگا دی۔ "پیکر" تو "شب خون" کی اشاعت کے پہلے سے نکل رہا تھا، "شب خون" نکلنے کے کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ "صبا" جو محض نام کو ماہنامہ تھا، لیکن باوزن اور با اثر پرچہ تھا، مرحوم سلیمان اریب کی زندگی تک کسی طرح نکلا پھر خلاے گمنامی میں محو ہو گیا۔ عابد سہیل کا "کتاب" بھی "شب خون" سے قدیم تھا، اور بہت خوبی سے نکل رہا تھا۔ لیکن وہ بھی نامساعد حالات کی نذر ہو گیا۔

"شب خون" شاید واحد پرچہ ہے جس کی شہرت اس کی پہلی اشاعت کے چند ہی مہینوں کے اندر اندر ہند و پاک کے علاوہ مغربی ممالک جیسے برطانیہ، امریکہ، جرمنی، فرانس، اور مشرق وسطیٰ وغیرہ میں پھیل گئی تھی، اور جو لگاتار (اگرچہ کبھی کبھی گنڈے دار) کوئی چالیس برس تک شائع ہوتا رہا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "شب خون" کی لگاتار اشاعت میں شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ ان کی اہلیہ جمیلہ فاروقی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جمیلہ فاروقی کے بے لوث اور بے دریغ مالی اور اخلاقی تعاون کے بغیر "شب خون" بھی خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل بود کا مصداق ہو کر رہ جاتا۔

یہ تاریخ کا دلچسپ طنز ہے کہ شروع شروع میں "شب خون" جیسے کم استطاعت پرچے کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن جب اس جھوٹ کی کوئی تصدیق کہیں سے نہ ہو سکی (ہمارے دوست اعجاز احمد، جو خود مدتوں "شب خون" کے نمایاں قلمی معاون رہے، اپنی ایک انگریزی تحریر میں صرف اتنا کہہ سکے کہ سنا گیا کہ "شب خون" کو امریکی تعاون حاصل تھا) تو بعض دوست نما دشمنوں نے فرمایا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے امریکہ اور کناڈا کا دورہ کر کے "شب خون" کے لئے دریوزہ گری کی۔ اب جب کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو کسی بھی مغربی ملک کا دورہ کئے آٹھ دس سال ہو رہے ہیں، یہ جھوٹ بھی پاؤں کی غیر موجودگی کے باعث دھم سے بیٹھ گیا ہے۔ لہٰذا یہاں اس حقیقت کا اعتراف اور اعادہ یقیناً بہت ضروری ہے کہ "شب خون" کا منظر عام پر آنا، اور اس کا منظر عام پر اس طویل مدت تک قائم رہنا صرف ایک ہستی یعنی جمیلہ فاروقی کا مرہون منت ہے اور اسی لئے اس آخری شمارے کو ان کے نام معنون کیا جا رہا ہے۔

کسی بھی اردو رسالے کے مدیر نے اپنے پرچے کی اشاعت کے بند ہونے کا اعلان اس تفصیل اور اس اہتمام سے نہیں کیا، لیکن "شب خون" کا آخری شمارہ پورے اعلان و اطلاع اور مالی واجبات کی پوری ادائگی کے انتظام کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ اس سلسلے میں کچھ خسارہ بھی برداشت کیا جا رہا ہے، کہ جن دوستوں کی خریداری شمارہ ۲۹۲ سے ایک شمارہ بھی آگے تک تھی، انھیں یہ ضخیم اور بیش قیمت شمارہ بے قیمت حاضر کیا جا رہا ہے۔ اصولی طور پر یہ "شب خون" کے چالیسویں سال کا پہلا شمارہ ہے، اور شمار کے اعتبار سے اسے شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹ (جون ۲۰۰۵ تا دسمبر ۲۰۰۵) کہا گیا ہے۔ لیکن کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یہ شمارہ کم از کم ایک پورے سال کو محیط ہے۔

"شب خون" کو بند کرنے کی وجہ شمس الرحمٰن فاروقی کی صحت کی خرابی کے سوا کچھ نہیں۔ اب ان کی عمر اور ان کی صحت ایسی نہیں رہیں کہ وہ "شب خون" کی بھرپور مصروفیت کے ساتھ اپنی دوسری کتابیں بھی مکمل کر سکیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے "شب خون" کی جو چالیس سالہ خدمات انجام دی ہیں میں انھیں "شعر شور انگیز" سے بھی بڑا کارنامہ مانتا ہوں۔ "شعر شور انگیز" کی چاروں جلدیں ("شب خون" اور ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ) تقریباً آٹھ

برس میں مکمل ہوئی تھیں۔ "شب خون" کا بار شمس الرحمٰن فاروقی پر نہ ہوتا تو وہ "شعر شور انگیز" جیسی کم از کم پانچ مزید کتابیں لکھ سکتے تھے۔ فاروقی کی صحت اور عمر کو دیکھتے ہوئے اب ناگزیر ہو گیا تھا کہ "شب خون" کی اشاعت بند کر دی جائے تاکہ اردو ادب میں کچھ اضافے مزید ممکن ہو سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ "شب خون" کے بند ہونے پر ہمیں افسوس بھی ہے اور خوشی بھی۔ افسوس اس لئے کہ "شب خون" جیسا پرچہ ہندو پاک سے کہیں نہیں شائع ہو رہا ہے، اور خوشی اس لئے کہ اب فاروقی کے ضخیم ناول "کئی چاند تھے سر آسماں"، اور داستان امیر حمزہ پر کتاب ("ساحری، شاہی، صاحب قرانی") کی بقیہ دو یا تین جلدیں، اور قدیم الفاظ کی فرہنگ ("تضمین اللغات") وغیرہ کی تکمیل کے امکان پیدا ہو جائیں گے۔

اس آخری شمارے میں "شب خون" کا جو انتخاب شامل ہے وہ تخلیقات نظم و نثر کے نہایت سخت انتخاب پر مبنی ہے۔ اس میں بالخصوص ان تمام مصنفین کی عمدہ ترین تحریریں شامل کی گئی ہیں جنھیں "شب خون" کے ذریعہ ادبی دنیا میں شہرت ملی اور جن سے "شب خون" کی بھی پہچان قائم ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ محض اس آخری شمارے کے مطالعے سے گذشتہ چالیس برسوں میں اردو کے معیاری ادب کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بات درست مان لی جائے کہ ادبی دنیا میں ہر دس سال پر نسل بدل جاتی ہے، تو اس شمارے میں چار نسلوں کی بہترین تحریریں انتخاب کی شکل میں یکجا ہیں۔ انتخاب میں ان مصنفین کی خاص طور سے نمائندگی ہے، جنھوں نے اردو میں لکھا ہے لیکن جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ "شب خون" کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ الٰہ آباد کے لکھنے والوں کو ایک اچھا پرچہ مل جائے۔ اس مناسبت سے مقامی مصنفین کو بھی انتخاب میں پوری جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ انتخاب "شب خون" کے پورے سرمائے کو بار بار دیکھ پڑھ کر تیار کیا گیا ہے۔ انتخاب تیار ہو جانے کے بعد بھی اسے دوبارہ بلکہ سہ بارہ دیکھا گیا خاص کر اس خیال سے کہ اگر اس کی ضخامت کچھ کم ہو سکے تو اچھا ہو۔ لیکن ہر بار ایسا ہوا کہ ایک صفحہ کہیں کم ہوا تو دو صفحے کہیں اور بڑھانے پڑے۔ مہینوں کی عرق ریزی اور انتہائی سخت معیار انتخاب پر عمل کرنے کے بعد ہم یہ صفحات تیار کر سکے ہیں۔ معیار انتخاب کے علاوہ، انتخاب میں آنے والی تحریروں کی طوالت و اختصار بھی ہمارا ایک اہم سروکار رہی ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کم ضخامت کی تحریریں زیادہ سے زیادہ ممکن ہو سکیں۔ اگر کسی مصنف کی ایک بہت طویل تحریر انتخاب میں آ گئی تو پھر اس مصنف کے لئے مزید صفحات مختص کرنا ضروری نہ سمجھا گیا لیکن یہ اطمینان کر لیا گیا کہ اس کی ایک طویل تحریر نے صفحات کی کمی کی تلافی بخوبی کر دی ہے۔ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں سے تراجم کی مسلسل اشاعت "شب خون" کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے تراجم براہ راست اصل زبان سے اردو میں منتقل کئے گئے تھے۔ ہم بہت متمنی تھے کہ تراجم کو مزید جگہ ملتی لیکن تین بہت طویل تراجم کی ناگزیر شمولیت نے دیگر تراجم کے لئے جگہ کم کر دی۔ ہمیں اس کا رنج ہے۔ لیکن حصۂ اول میں کچھ بہت عمدہ ترجمے شامل ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ انتخاب میں تراجم کی کمی ان سے تھوڑی بہت پوری ہو جائے گی۔

ساڑھے تین سو سے زیادہ مصنفین اور ہزار سے اوپر تحریروں میں سے کسی ایک مصنف یا تحریر کو تلاش کرنا قارئین کے لئے آسان نہ ہوتا، لہٰذا سب مصنفین کو ناموں کے اعتبار سے حروف تہجی کی بنیاد پر یکجا کیا گیا ہے۔ اسی غرض سے مترجمین کو بھی اصل مصنف قرار دے کر انھیں عمومی فہرست مشمولات میں رکھا گیا ہے۔ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ کس کس مصنف کی تحریر کا ترجمہ شامل انتخاب ہے، تو اس کی آسانی کے لئے ایک "فہرست مصنفین مترجمہ" بھی مہیا کر دی گئی ہے۔

اس انتخاب میں "شب خون" کے کوئی چوبیس ہزار صفحات پر موجیں مارتے ہوئے ہر رنگ کی نمائندگی مل جائے گی، لیکن خود مرتبین کی کوئی تحریر انتخاب میں نہیں لی گئی ہے۔ یہ روایت "نئے نام" (۱۹۶۷) نے قائم کی تھی اور ہم نے اسے برقرار رکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ان تحریروں میں سے بھی انتخاب نہیں کیا گیا جو فاروقی نے دوسرے ناموں سے لکھی تھیں، یا جو فاروقی نے لکھی یا ترجمہ کی تھیں لیکن ان پر کسی کا نام نہیں ہے۔ تبصرے بھی اسی لئے نظر انداز کئے گئے ہیں کہ تبصروں کی بھاری اکثریت ہم دو مرتبین ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

"شب خون" کے اس آخری شمارے کی اشاعت کے وقت ہمیں ان دوستوں کے نام بطور خاص یاد آتے ہیں جو آغاز سفر میں ہمارے ساتھ تھے اور اب وہ اعلیٰ علیین میں ہیں۔ ہمارے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین، پھر پروفیسر سید احتشام حسین، جن کے مبارک ہاتھوں سے دفتر "شب خون" کا افتتاح ہوا، ہمارے پہلے کاتب اور دفتر کے منتظم سلیم اللہ نیر الہ آبادی جن کی بے مثال کتابت کی بنا پر لوگوں نے انھیں "شب خون رقم" کا خطاب دیا، شمس الرحمٰن فاروقی کے ہمکار اور معاون حامد حسین حامد اور محمود عثمانی، پہلے چند شماروں کے مصور نایاب، بعد کے زمانے کے کاتبوں میں سید احمد عباس۔ ان پاک روحوں کو ہم دل کی گہرائیوں سے خراج محبت و عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہر چند کہ ایک دنیا اس وقت یہی کہہ رہی ہے کہ "شب خون" جیسا پرچہ پھر نہ ہوگا، لیکن مجھے اردو دنیا سے امید ہے، بلکہ مجھے یقین ہے، کہ "شب خون" کا نام اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں تنہا نہ رہے گا۔ ناصر کاظمی نے غلط تو نہ کہا ہو گا۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

☆☆☆

صرف ایک عورت

آشا پربھات

شمارہ ۲۴۱،
اکتوبر نومبر ۲۰۰۰

آنکھیں میری
نہیں ہیں
کوئی جھیل یا سمندر
جس کی کاسنی گہرائی میں
ڈبکی لگاؤ
خوش ہو سکو تم

وہ صرف آنکھیں ہیں
بالکل تمھاری آنکھوں کی مانند
جس میں کتنے ہی ان کہے سوالات
اگتے بجھتے رہتے ہیں

ہونٹ میرے
نہیں ہیں برگ گل
تم جس کی سرخی سے
سنوار لو اپنی بے تکی صورت

وہ لرزتے ہیں
بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں
جسے سننے کی تاب
نہیں ہے تم میں
یا دانستہ طور پر تم
انھیں ان سنی کر جاتے ہو
کمر میری
نہ تو پھولوں کی نازک شاخ ہے
اور نہ لچکتی ہے
خوبصورتی یا نمائش کی خاطر
تمھارا وجود جس وقت اس کے اندر
حرکت اور گرمی سے ہم آغوش ہوتا ہے
اور
اس بار گراں کو اٹھا کر
میں چلتی ہوں تو
کیا وہ لچکتی ہے؟

غزل

آشفتہ چنگیزی

شمارہ ۱۷۵،
جون، جولائی ۱۹۹۴

برا مت مان اتنا حوصلہ اچھا نہیں لگتا
یہ اٹھتے بیٹھتے ذکر وفا اچھا نہیں لگتا

جہاں لے جانا ہے لے جائے آکر ایک پھیرے میں
کہ ہر دم کا تقاضائے ہوا اچھا نہیں لگتا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا سمندر جب بلاتا ہے
کسی ساحل کا کوئی مشورہ اچھا نہیں لگتا

جو ہونا ہے سو دونوں جانتے ہیں پھر شکایت کیا
یہ بے مصرف خطوں کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا

اب ایسے ہونے کو باتیں تو ایسی روز ہوتی ہیں
کوئی جو دوسرا بولے ذرا اچھا نہیں لگتا

ہمیشہ ہنس نہیں سکتے یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں
ہر اک محفل میں منھ لٹکا ہوا اچھا نہیں لگتا

بندر کی تقریر

آصف فرخی

شمارہ نمبر ۱۶۵،
مئی تا اکتوبر ۱۹۹۲

"فسانۂ عجائب" کبھی بھی میری پسندیدہ کتابوں میں شامل نہیں رہی۔ وہ ان کتابوں میں سے نہیں ہے جنھیں میں فرصت کے کسی بھی لمحے شلف سے نکال کر یوں ہی بیچ میں سے کہیں سے کھول لیتا ہوں۔ اور ایک مانوس ذائقے کا لطف اٹھاتا ہوا اس لذت اندوزی میں نئے نکتے اور نئی تفصیلات دریافت کرتا چلا جاتا ہوں۔ میں ہمیشہ اس کے پڑھنے سے جی چراتا رہا۔ میں نے جب بھی اس کا تصور کیا ہے یہ کسی دیوار پر نصب بھوسہ بھرے جانور کی طرح نمائشی، مصنوعی اور بے جان نظر آتی ہے، اتنی مردہ اور "ناقابل پڑھ" کہ میں فوراً اسے کلاسیک ماننے پر تیار ہو جاتا ہوں۔ اس کو کلاسیک ماننے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے مجھے بوے کتب آتی ہے، پرانے صندوقوں میں رکھے جانے والے گرم کپڑوں کی طرح جن کی تہوں تک میں کیڑے مار فنائل کی بو بس جاتی ہے۔

میں ایسے کپڑے نہیں پہن سکتا، نہ ایسی کتابیں پڑھ سکتا ہوں جنھیں مدرس نقادوں نے فنائل کی گولیاں ڈال کر زندہ رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کتاب سے میری کئی خاصی بیزار کن یادیں وابستہ ہیں۔ میں بھلائے نہیں بھول سکتا کہ اس کتاب سے میری پہلی ملاقات کلاس روم میں ہوئی تھی۔ اس کتاب کا ایک مختصر اقتباس کتنے بہت سارے شمس، بے روح اور تکلیف دہ اسباق کا سبب بن گیا۔ عجیب نثر تھی کہ اس کا پڑھنا ربڑ کے ٹکڑے کو چبانا ہو گیا کہ نہ حلق سے اترتا تھا، نہ منھ کا مزہ بدلتا تھا، ایک عجیب کسیلے پن کے ساتھ زبان اور دانتوں سے چپکتا جا رہا تھا۔ ساری کلاس نے اس نثر پارے کے ساتھ بہت محنت کی (کس قدر اکتاہٹ اور بے دلی سے!) مگر یہ ہمارے لیے بہت سے ایسے الفاظ و محاورات کا الجھا ڈھیر بنا رہا، جن کے معنی ہمیں طوطوں کی طرح رٹنا پڑ رہے تھے۔ اور جن کی ہم کو مطلق پروا نہیں تھی۔ ہمیں پہلے دن سے سکھایا جا رہا تھا کہ نثر کے لیے سلاست اور زود فہمی لازمی شرط ہیں، اور یہ کہ اسلوب کو کچھ ہوائی چپل کی طرح ہونا چاہیے کہ فوراً پیروں میں ڈالا اور چل پڑے۔ مرتے پر سو درے، یہ کتاب جس کے ہر طول طویل فقرے کا مختصر سا مطلب ہمارے استاد کو بتانا پڑتا اور ہم کاپیوں میں لکھ لیتے۔ وہ بے چارے بھی کیا کرے، ایک تو اردو کا استاد ہو جانے کے بعد سے انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں معمولی پن کو قبول کر لیا تھا اور پھر ہر سال لڑکوں کی ایک نئی کلاس کو ایسے سبق از سر نو پڑھانا انھیں درسیات کو بے رس بنانے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔

ہمارا پورا نصاب یونیورسٹی کے ماہر اساتذہ کی پوری ایک ٹیم نے اس احتیاط سے منتخب کیا تھا کہ زندگی کی کوئی رمق بھولے سے نہ آنے پائے، ایک ایک سطر چڑیا گھر کے مردہ خانے میں رکھے ہوئے بیمار جانور سے مشابہ ہو اور ہمارے چاروں طرف پھیلی بھرپور، نوجوان زندگی سے دور کا تعلق بھی وہم و گمان تک میں نہ

آنے پائے۔ اپنے مزے کے لیے کتابیں پڑھنے کا دھنی تو میں ہو چکا تھا۔ مگر میرا دماغ کسی طرح ایسی زبردستی کی کتابوں کو مارے باندھے پڑھنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نصاب کی بدولت مجھے اردو سے بطور ایک مضمون کے نفرت سی ہو گئی، اور میں نے بہت جلد ایڈوانس انگلش کا اختیاری مضمون لے لیا تاکہ مجھے اردو نہ پڑھنی پڑے۔

اگر بچپن میں اشرف صبوحی کی کہانیاں نہ پڑھی ہوتیں تو میں نصاب کی بدولت اردو ادب پر یہ سوچ کر تین حرف بھیج چکا ہوتا کہ یہ سب کا سب خیال ماضی کے حوالے سے پر تکلف اور رکی مبالغہ آرائی سے عبارت ہے۔ اور ان میں سے اول ترین کتاب وہ ہے، جس کا نام "فسانہ عجائب" ہے۔ اس تخیل دشمن نصاب کے تعصبات سے اپنے آپ کو آزاد کرانے میں کافی وقت لگا (اور رہائی کا یہ عمل ہی میری واحد ادبی تعلیم ہے۔) یہ نصاب اور طریقہ تدریس ادب کی خواندگی کے راستے میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔

پاؤنڈ (Ezra Pound) نے اپنے مشہور مضمون "استاد کا مشن" میں لکھا تھا:

> اگر آپ دیکھیں کہ کوئی شخص شفاخانے میں ناقص تھرمامیٹر پہنچا رہا ہے تو آپ اسے پرلے درجے کا کمینہ اور دھوکے باز کریں گے۔ مگر عجب ستم ظریفی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں سے امریکہ میں 'خیالات' کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اور خیالات کے ان بازی گروں سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ تمھارے منھ میں کے دانت ہیں۔ لہٰذا، اگر کوئی ایسا معجزہ ظہور میں آئے کہ مجھے Canby یا اٹلانٹک منتھلی (Atlantic Monthy) کے مدیر اور اسی قسم کے دوسرے حضرات کو قتل کر دینے کی سعادت نصیب ہو جائے، یا اگر میں ایسے ہی سینکڑوں حلیم الطبع اور خوش اخلاق اشخاص کو مار سکوں یا ملک بدر کر سکوں جنھیں اپنے معذور ہونے کا مکمل یقین ہے اور جو اپنی غلط بیانی یا ذہنی بودے پن پر شرمندہ ہونے کے قطعاً نااہل ہیں، تو مجھے گمان تک نہیں ہوگا کہ میں نے کسی آدم زاد کے خون میں ہاتھ رنگے ہیں۔

(استاد کا مشن، ترجمہ اعجاز احمد، ادب لطیف، لاہور، جون ۱۹۶۳)

اگر یہ خون کسی آدم زاد کا نہیں، تو پھر کیا یہ کسی بندر کا قتل ہے اور ان کا لکھنا بندر کی تقدیر یا پاؤنڈ کی اس فرد جرم کا ابتدائی حصہ؟ شمیم حنفی نے رشید حسن خاں پر اپنے خاکے میں ان کا بیان نقل کیا ہے کہ یہ ہمارے تعلیمی اداروں پر کچھ زیادہ ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ خود رشید حسن خاں نے پاؤنڈ سے بھی زیادہ سخت بات کہی ہے:

> لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں گانا سب کو سنا دیتی تھیں لیکن جنسی وابستگی صرف ایک سے رکھتی تھیں۔ ہمارے بہت سے اساتذہ اور ناقدین کا کردار تو ڈیرے دار طوائف کے برابر بھی نہیں رہا ہے۔

("کتاب نما"، دلی، اگست ۱۹۹۷)

پروفیسر کرار حسین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہماری ثقافت کے زوال کے منجملہ اسباب میں سے اصل بات یہ ہے کہ اب طوائفیں بھی ویسی نہ رہیں۔ ورنہ کیا طوائف کیا محقق دونوں کا فن تقاضا کرتا تھا یا تو کسی کے ہو رہو یا کسی کو اپنا بنالو۔ محقق حضرات سوائے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے اب کسی سے وابستہ ہی ہونا نہیں چاہتے۔ ان میں سب سے الگ خنجر آزما تیغ بدست مجیبہ الغافلین قسم کے محقق رشید حسن خاں کے بارے میں سنا تھا کئی برس سے "فسانہ عجائب" پر جتے ہوئے ہیں اور اس کا درست متن مرتب کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر میرا پہلا تاثر کچھ ایسا تھا کہ حضرت ثقہ محقق ہیں اور بے کار مباش کچھ کیا کر کے قائل، کسی نہ کسی ادھڑی کتاب کی تلاش میں رہتے ہوں گے کہ رفوگری کے جوہر دکھا سکیں۔ لیکن اب جو "فسانہ عجائب" مرتبہ رشید حسن خاں سامنے آئی ہے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں بالکل ہی نئی کتاب پڑھ رہا ہوں، ایسی کتاب جو دعوت مطالعہ بھی دیتی ہے اور دامن دل بھی کھینچتی ہے، دشوار ہونے کے باوجود اچانک دسترس میں آ گئی ہے۔ اس کے بعد "حل لغات" اور "شرحیں" واقعی بندر کی تقریر معلوم ہوتی ہیں۔ اس ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود صاحب لکھتے ہیں:

> انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوین متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کر دیا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ابھی تک اردو نثر کا کوئی متن اس شان کے ساتھ مرتب نہیں ہوا تھا۔

اس ایڈیشن میں کلاسیکی متن کے تحقیقی تدوین جو ہوئی ہے اس کی داد دینا تو میرے بس سے باہر ہے، تاہم اس کی بدولت میں ایسے رموز و نکات سے واقف ہو رہا ہوں جیسے یہ کتاب نئی بن کر میرے سامنے آئی ہو۔ ناقدوں سے شاکی پاؤنڈ نے شعرا کو "نیا کر دکھانے" کا منشور دیا تھا (Make it new) اور اس ایڈیشن سے ایک پرانی کتاب نئی ہو کر اس طرح سامنے آئی ہے کہ نئے مضامین، نئے نکات اور نئی Correspondences بھارہی ہے۔ اس ایڈیشن کو میں بار بار اٹھاتا ہوں، تھوڑا سا پڑھتا ہوں اور رکھ دیتا ہوں۔ ورق گردانی کرتے کرتے ایک بات سوجھتی ہے، اور میں اس خیال کے تعاقب میں چل پڑتا ہوں۔

لکھنؤ کے جس بیان سے کتاب شروع ہوتی ہے اس میں نقادوں نے اردو کی سیاسی ثقافتی خود مختاری اور اس ثقافت کے حوالے سے Snobbery کے عناصر پر بہت زور دیا ہے۔ تاہم اس پورے بیان میں داستان کے معرض تحریر میں آنے کے زمان و مکاں بڑے واضح انداز میں اجاگر ہو جاتے ہیں۔ داستانوں کے طلسمی وقت اور فنٹاسٹک جغرافیہ کے مقابلے میں، معاصر زماں و مکاں کی واقفیت کا

یہ بیان، داستان سے ناول کی ناول کی طرف گریز کا بہت واضح نشان ہے۔ آغاز داستان میں روایتی حمد و نعت اور مدح حاکم دوراں کے بجائے، دو اشعار درج کیے ہیں۔ اپنے استاد نوازش کا ایک شعر الفاظ یوں بدل کر لکھا ہے کہ اس کا مضمون شاعری کے بجائے کہانی کر دیا ہے۔

مثل ہی سے نہ الفاظ تلازم سے یہ خالی ہے
ہر اک فقرہ کہانی کا گواہ بے مثالی ہے

اور اس کے بعد وہ شعر کہ 'سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ'۔ اگر یہ اشعار محض رسمی طور پر بھی درج کیے گئے ہیں تب بھی یہ یہاں ایک عجیب مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے سرور اس بات کے بہت Conscious نظر آ رہے ہیں کہ وہ کہانی کہہ رہے ہیں۔ افسانہ سازی کے عمل کا یہ شعوری احساس جدید فکشن کی خود شناسی (بلکہ خود پرستی) کا پیش رو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ ایک مستحکم فنی رویہ بھی ہے۔ اس سے قبل سرور اپنی افسانہ سازی کے تخلیقی محرکات بیان کر چکے ہیں جو جان عالم کی کہانی اور اس میں گندھے ہوئے ضمنی قصوں کے لیے ڈھانچے یا فریم ورک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''وجہ تالیف اس قصۂ بے نظیر کی...'' والے ٹکڑے میں وقت اور زمانے کا بیان ایک عجیب اور بے حد اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ذکر ایک محفل کا ہے جہاں:

حسب اتفاق ایک روز چند دوست صادق، محب موافق باہم بیٹھے تھے۔ مگر تیرگی زمانہ ناہنجار اور کج روی فلک سفلہ پرور، دوں نواز، جفا شعار سے سب بادل حزین وزار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرت حرماں و افکار سے، کہ ہر دم یہ پاس تھے، دل گرفتہ، سینہ ریش اور اداس تھے...

سرور کو گردش زمانہ اور غم روزگار کے بیان کا موقع مل جاتا ہے، جو اگرچہ روایتی انداز میں ہے مگر پوری کتاب میں اتنی بار آیا ہے کہ سرور کا ایک اہم موضوع اور ان کی ذہنی اور ان کی ذہنی ساخت کا بار بار دہرائے جانے والا جزو معلوم ہوتا ہے۔

جب سلسلۂ سخن یہاں تک پہنچا، اس زمرے میں ایک آشنائے بامزہ بندے کے تھے۔ انھوں نے فرمایا: اس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو اور غنچۂ سربستہ دل جو سموم حوادث سے مضمحل ہے، باہتزاز نسیم تکلم کھل جائے۔ فرماں بردار نے بجز اقرار، انکار مناسب نہ جانا، چند کلمے گوش گذار کیے۔

مقدمے میں وجہ تصنیف اور زمانہ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے اس نکتے کی مزید صراحت کی ہے کہ یہاں سرور نے قصہ گوئی کی رعایت سے ''چند کلمے'' لکھا ہے، داستان سرایوں اور قصہ گویوں کا یہ خاص محاورہ تھا۔ میرے نزدیک یہ بات محل نظر اور بہت اہم ہے کہ سرور نے داستان سرایوں اور قصہ گویوں کا خاص محاورہ اختیار کر لیا۔ کہانی کہنے کی فرمائش کی شرط بھی خوب ہے کہ وقت کے تسلسل اور گذران کی تنسیخ ہو جائے۔ اس کا وار کہانی کی بدولت کاری نہ پڑے۔ لمحۂ حاضر پر اصرار کی تہ میں محبت کی تپش بھی موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے وجہ تصنیف کی عبارت کا عنوان نقل کیا ہے: ''باعث تحریر اجزاے پریشان و سرگذشت مجمع داستان، مکلف ہونا محبوب کا، بیان داستان مرغوب کا۔'' اور ''مکلف ہونا محبوب کا'' والے ٹکڑے کو توجہ طلب قرار دیا ہے۔ اس ٹکڑے کی اہمیت یوں بھی اجاگر ہوتی ہے کہ خود سرور نے اس کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دوسری نظر ثانی اشاعت ۱۲۶۷ھ میں ''محبوب'' کی جگہ ''فرمائش'' آ گیا، تیسری اصلاحی اشاعت (۱۲۷۲ھ) میں ''محبوب'' کا لفظ واپس آ گیا اور آخری اشاعت (۱۲۸۰) میں پھر ''صاحب فرمائش'' کر دیا گیا۔ رشید حسن خاں نے عنوان کے ساتھ عبارت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جہاں ''آشنائے بامزہ'' کو نظر ثانی میں ''آشنائے باصفائے پرمزہ'' کر دیا گیا ہے اور اس کے لیے ''باعث زیست جگر نگار، تسکین خاطر بے قرار'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

داستان طراز اور دوست داستاں پسند کے درمیان محبت کی یہ ادھوری کہانی کہیں کھل کر سامنے نہیں آتی، چند اشاروں پر ہی مشتمل رہتی ہے۔ الف لیلہ کی داستانوں کے آخر میں دعا ہوتی ہے کہ جیسے خدا نے ان کے دن پھیرے، ویسے سب کے پھریں۔ اپنی داستان کے آخر میں اس مقام پر سرور نے یہ حسرت ناک اشعار لکھے ہیں جو پوری ایک کہانی کہہ دیتے ہیں۔

وہ بچھڑے تو سب ہو گئے یک جا
ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جدا
رہی شرح جور فلک نا تمام
سرور حزیں، تو سن خامہ تھام

سرور کی داستان سرائی کے محرکات میں درد محبت کے علاوہ غریب الوطنی بھی شامل ہے۔ لکھنؤ کا بیان جس غلو کے ساتھ ہوا ہے اس میں ''چھوڑی ہوئی منزل'' کی خلش موجود ہے اور اس کے مبالغے کو ناسٹلجیا کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے۔ مفارقت کے بعد مہاجرت کا ذکر یوں کیا ہے:

آنے کا اتفاق مجبور کو رہ کانپور میں ہوا۔ بس کہ یہ بستی ویران پوچ و لچر ہے، اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں، اور جو ہوں گے تو گوشہ نشیں، عزلت گزیں، مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دل وحشت منزل اس مقام سے سخت گھبرایا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے، تیرہ بختی روز سیاہ دکھائے..

برہمی اور بیزاری نے الفاظ میں مجبوری اور بے کسی کے ساتھ ایک شان سی پیدا کر دی ہے کہ فلورنس سے بچھڑا ہوا دانتے یاد آنے لگتا ہے۔ مقدمہ نگار نے اس جلاوطنی کے اسباب پر اشارتاً گفتگو کی ہے، مگر اس کی وجہ تلاش معاش ہو، امرد پرستانہ معاشقے ہوں یا شاہی عتاب کا خوف، وطن سے دوری کے احساس نے سرور کے داستان سرائی میں ایک اور ضرورت شامل کر دی ہے۔ اس کا لکھنا اب ان کے لیے اپنے ہوش و حواس کو جنون سے محفوظ رکھنے کا

ذریعہ بھی ہے۔

وقت کا احساس سوزش محبت، جلا وطنی، زبان کی ہنر مندی اور استعارات پیکر تراشی اور کہانی کہنے کے عمل میں گہرا ہوتا ہوا Involvement "فسانۂ عجائب" کے یہ تخلیقی محرکات، سرور کو جیمس جوائس اور رابرٹ میوزل (Musil) کے قریب تر لے آئے ہیں۔ (میوزل کا طویل ناول اس کو اس صدی کے اہم ترین ناول نگاروں میں مقام عطا کرتا ہے۔ اس ناول کا نام The Man Without Qualities مجھے شہزادہ جان عالم کا مختصر اور بلیغ ترین ڈسکرپشن معلوم ہوتا ہے، جسے نقادوں نے بودا اور کمزور اور خود سرور نے عقل کا کچا کہا ہے)۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ "خاص بات جو ہمیشہ نظر میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ سرور نے داستان لکھی تھی ناول نہیں لکھا تھا۔" مجھے اس بات پر بہت اعتراض ہے۔ اگر یہ لکھی اور وہ نہ لکھا تو اس سے کیا کسر شان میں آئی؟ مانا کہ انھوں نے عزیز احمد کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ "فسانۂ عجائب" ناول سے قریب تر ہے۔ ذرا جان عالم کا یہ موازنہ داستان امیر حمزہ کے صاحبقراں سے کیجیے۔ صاحبقراں سپاٹ کردار بلکہ کردار سے زیادہ اسٹیریوٹائپ (stereotype) ہیں، کہیں اور سے کاٹ کر چپکائی ہوئی رنگین تصویریں۔ جان عالم اپنے خالق کی منشا سے الگ ہو کر اپنی ایک تقدیر تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ داستانی کرداروں کی طرح بار بار دہرائے جانے والے دائروں میں نہیں گھومتا، بلکہ ناول کے انسانی کرداروں کی طرح انھیں واردات سے الجھتا ہوا اپنے تجربے کو Live کرنے کی کوشش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مجھے تو وہ کسی وجودیت پسند ناول کا اینٹی ہیرو معلوم ہوتا ہے۔ (منشائے مصنف اور کردار کے اپنے اندرونی تقاضوں کے درمیان تخلیقی تناؤ بنا کر ڈاکٹر نیر مسعود نے جان عالم کی نہایت پر لطف خود کلامی لکھی ہے، ملاحظہ ہو "شعور" نئی دلی، پہلی کتاب۔)

"فسانۂ عجائب" کو اسلوب کی مرصع کارانہ مشکل پسندی، رعایت لفظی، مقفیٰ و مسجع انداز کی وجہ سے مطعون کیا جاتا رہا ہے، اور "باغ و بہار" سے حریفانہ چشمک کی بدولت نقادوں نے اسے کچھ زیادہ ہی برا کہا ہے، بلکہ بعض نے تو اسے Punching Bag کے طور پر استعمال کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "فسانۂ عجائب" کی مشکل پسندی کا گلہ ہماری اپنی ناواقفیت اور سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ مشکل پسندی کا یہ اعتراض کھڑا کر کے ہم نے داستان کے عناصر کی طرف توجہ ہی نہیں دی، ورنہ اس میں کئی مقام تفصیلی مطالعے کے متقاضی ہیں۔ مثال کے طور پر جکسٹن کے بیٹے کی داستان جو کلکتہ کی سوداگر بچی اور انگریز کے عشق کے بیان میں شامل ہے۔ جکسٹن کا نام محض اتفاق ہے یا مجسٹریٹ، کی بگڑی ہوئی شکل جیسے "سکریٹری" سے "سکتر" ہو گیا۔ "وہ طبیب و ادیب بے بدل" مرد دانا کا روپ ہے مگر بیٹے کو جزیرے کی شہزادی کے سراغ میں جانے سے روک نہیں سکتا۔ وہ شہزادی کس شہر کا شکار ہے کہ اپنے بیٹے کو طمنچہ کھینچ کر مار ڈالتی ہے۔ اور جکسٹن کا بیٹا مسدس پڑھتا رہ جاتا ہے، آخر اپنی جان کھو دیتا ہے۔ کیا اس کہانی کے مقام و کردار اس انگریزی کے لحاظ سے معمولی قسم کی رعایت لفظی ہیں، یا ان کی کوئی علامتی معنویت ہے؟ ایسے کئی سوال حل طلب ہیں۔ اب کتاب کا متن درستگی کے ساتھ قائم ہو گیا ہے؟ تو اس کی Hermeneutics کی بات ہونا چاہیے۔

ایسے ہی ایک تفصیل طلب مقام کا ذکر مقدمے میں اور آیا ہے لیکن محض متنی تدوین کے مسئلہ کے طور پر۔ شہزادہ جان عالم بندر کے قالب میں ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر ایک تقریر کرتا ہے۔ مرکزی داستان ایسے موڑ پر آئی ہے کہ یہ مقام ایک ہی نقطۂ عروج کی حیثیت رکھتا ہے، جان عالم، انجمن آرا، اور ملکہ مہر نگار دونوں کو حاصل کر چکا ہے اور وطن واپسی کا قصد کرتا ہے کہ اعتماد اور دوستی کی بدولت گرفتار بلا ہو جاتا ہے۔ وہ ملکہ کے باپ کی سکھائی ہوئی ترکیب کہ جس میں وہ اپنا جسم چھوڑ کر دوسرا قالب اختیار کر سکتا ہے، وزیرزادے کو بتا دیتا ہے۔ وزیرزادہ، انجمن آرا، پر مائل ہو گیا ہے۔ جوں ہی جان عالم اپنی اس قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے راستے میں پڑے ہوئے ایک بندر کا قالب اختیار کرتا ہے، وزیرزادہ جان عالم کے قالب میں داخل ہو جاتا ہے۔ نقلی جان عالم سارے ملک کے بندر پکڑوا کر قتل کر رہا ہے اور اصلی جان عالم بندر کے قالب میں چھپتا پھر رہا ہے۔ دغابازی اور ہوس کا پتلا اور وزیرزادہ جسم کو مغلوب کر چکا ہے، مگر شہزادے کی روح اپنے جسم سے جلاوطن ہو کر مصائب جھیل رہی ہے چڑی مار کی بیوی اور سوداگر کے پاس سے بندر شہزادے کی موجودگی کی خبر پھیل جاتی ہے، (صرف اس وجہ سے بندر چپ رہنے کی بجائے باتیں کرتا رہتا ہے، اور یوں بولنے کی وجہ سے پکڑا گیا) سرکاری آدمی اس بندر کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں جہاں اسے یقینی طور پر مار ڈالا جائے گا۔ وہ اپنے جسم سے تو ہاتھ دھو ہی بیٹھا ہے، اب اس کو دوبارہ پانے کا امکان اور اپنی پوری کشمکش کے ثمرات بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائیں گے یکایک بندر راستے میں لوگوں سے کلام کرنے لگتا ہے۔ سرور کے نزدیک بندر کی یہ تقریر کچھ اہمیت کی حامل رہی ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے "فسانۂ عجائب" کی مختلف اشاعتوں میں اس میں خاصے اضافے کیے۔ "فسانۂ عجائب" کے "بنیادی متن" میں تقریر مختصر صورت میں موجود ہے۔ یعنی ڈیڑھ صفحہ سے بھی کچھ کم میں۔ رشید حسن خاں اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "یہ تقریر شروع میں یعنی جب پہلی بار (۱۲۵۰ھ) میں اس داستان کو لکھا گیا ہے، اس وقت اس مقدر مفصل نہیں تھی۔" دنیا کی بے ثباتی کا ماتم اور اس بے ثباتی کا اخلاقی پہلو، سرور کے انداز فکر میں ایک Obsessive Concern کی سی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا میں اس بات پر کوئی تعجب نہیں کہ وہ "فسانۂ عجائب" کے اس کلیدی موڑ پر ہونے والی تقریر کی طرف بار بار آئے اور اس میں قطع برید کی۔ نیر مسعود نے لکھا ہے کہ اکیس سال تک سرور کتاب میں رد و بدل اور حذف و اضافے کی صورت میں مداخلت کرتے رہے۔ ان مداخلتوں کے دوران یہ مقام انھیں خاص اہمیت کا حامل ہوا ہوگا۔ رشید حسن خاں نے ان مداخلتوں کا سراغ لگایا ہے کہ تقریر میں اضافے کے وقت بعض اہم واقعات کی طرف اشارے شامل کر لیے گئے ہیں، جیسے نصیر الدین حیدر کا مرنا، نعش کا رات بھر تنہا بے گور پڑے رہنا، اور محمد علی شاہ کے جنازے کا حال۔ داستان کے طلسمی وقت میں معاصر تاریخ کی یہ مداخلت ہمیں عجوبہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر سرور سے لے کر طلسم ہوش ربا تک سب داستانوں میں کم و بیش ایسا ہوتا آیا ہے جس سے خیال

ہوتا ہے کہ داستانوں کے پڑھنے سننے والوں نے اس امر کو قبول کیا ہی ہوگا۔ ایسے انقلاب انگیز (یا حیرت خیز) واقعات کہ جن سے قارئین بخوبی واقف ہیں، ان کے حوالے کی شمولیت دنیا کی بے ثباتی کے بیان کو مزید موثر بنادے گی۔ سرور معاصر تاریخ کے حوالے سے اپنی نیم متصوفانہ Vision کو بیان کررہے ہیں، بالکل جیسے میلان کنڈیرا (Milan Kundera) یا انتظار حسین جیسا ناول نگار کرتا ہے۔ داستان اس وقت ناول میں جائے گی۔ جب اس رخ کے بیان کے لیے تاریخی حوالہ حاوی ہو جائے گا اور طلسماتی Devices کو منسوخ کردے گا۔ سرور کی ساری داستان طرازی اور لسانی ہنرمندی، تاریخ کے اس حوالے کو کہانی میں دراندازہونے میں نہیں روکتی۔ بلکہ اس کے بے محابا قوت کے آگے ڈھیر ہوجاتی ہے کہانیاں اسی طرح وقت کی اسیر اور تاریخ کی پابند ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سرور نے بندر کی تقریر میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اسے دوسری جگہوں پر بروئے کار بھی لائے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> نصیرالدین حیدر کی موت کے بعد کا جو حال "فسانۂ عبرت" میں سرور نے لکھا ہے (یہ تو مطبوعہ صفحوں پر مشتمل ہے) اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ بندر کی تقریر کے بعض اجزا یہاں لفظی صورت بدل کر نمودار ہوئے ہیں۔ اس کے بعد محمد علی شاہ (متوفی ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ) کے جنازے کا جو حال لکھا ہے ("فسانۂ عبرت"، ص ۵۵ سے ص ۵۷) اس میں بہت سے جملے اور عبارت کے ٹکڑے تقریباً وہی ہیں جو بندر کی تقریر کا حصہ ہیں۔

"فسانۂ عبرت" تاریخی انداز کی کتاب ہے، قصہ کہانی نہیں۔ سرور نے اس میں "فسانۂ عجائب" کا ٹکڑا کیوں اور کیا سوچ کر چپکا دیا، بادشاہ وقت کی موت پر بندر کی تقریر دوبارہ کیسے استعمال میں آگئی؟ یہ اتفاق مجھے بہت دلچسپ اور قیاس طلب معلوم ہوتا ہے۔ ایک ہی عبارت کو دو مختلف جگہوں پر چلانا سرور کا شعوری فیصلہ ہو یا ان کے عجز بیان کا نتیجہ، تاریخ اور داستان کا یہ تال اپنی جگہ پر عجیب ہے، اور تاریخ تصنیف کے تعین سے زیادہ اہمیت کا متقاضی۔ اگر یہ مسالہ بورخیس (Borges) کو ملا ہوتا تو وہ اس پر اپنے Fictiones میں سے ایک بنیاد رکھ سکتا تھا جہاں فسانہ، انشائیہ اور تنقیدی مقالہ مل کر ایک انوکھی حیرت کو جنم دیتے ہیں۔ یا پھر شاید نیر مسعود صاحب اس پر قلم اٹھائیں کہ اس کا موضوع کا حق وہی ادا کرسکتے ہیں۔ بہر کیف بندر کی تقریر امکانات سے پر ہے۔

ان امکانات کو محض ایک رخ سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے اپنے مرتب کردہ "فسانۂ عجائب" میں لکھا ہے:

> بندر کی تقریر کا پورا حصہ غور سے پڑھنے بعد 'احوال محمد علی شاہ' کا وہ حصہ پڑھا جائے جہاں محمد علی شاہ کے جنازے کا جلوس کا ذکر ہے۔ یہ بیان تقریباً اسی لب و لہجہ میں ہے جس میں سرور نے بندر کی تقریر لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ "فسانۂ عجائب" سے منقول نہ ہوگا، بلکہ یہاں "فسانۂ عبرت" میں لکھنے کے بعد سرور کو اپنے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنے کا خیال آیا کہ اسے "فسانۂ عجائب" جیسی شہرۂ آفاق کتاب میں استعمال کیا جائے۔

رشید حسن خاں نے یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد تسلیم کیا ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بہت سے اجزا کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون سا بیان کب لکھا گیا۔ لیکن تاریخی شواہد سے وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بندر کی تقریر کے جو اجزا "فسانۂ عبرت" میں بھی ہیں، وہ "فسانۂ عجائب" سے منقول ہیں یا اس کا نقش ثانی ہیں۔ یہ سوال کہ ایک متن کو دوسرے پر زمانی فوقیت حاصل ہے، خشک مدرسانہ موشگافی کے روپ میں فی الاصل یہ عمیق مسئلہ ہے کہ افسانوی بیان کی وجودیات (Ontology) کیا ہوتی ہے؟

میرا قیاس کہتا ہے کہ سرور نے پہلے "فسانۂ عجائب" میں بندر کی تقریر لکھی ہوگی، اور اس کے بعد اس عبارت کے ٹکڑے "فسانۂ عجائب" کے مصرف میں لے آئے ہوں گے، اس لیے کہ بندر کے تقریر کرنے اور اپنی تقریر میں موعظت نہ صرف کہانی کے اس موڑ کے لحاظ سے فطری اور عین مناسب ہے، بلکہ یہ ایک باقاعدہ ادبی رسم (Convention) ہے، جس کی سند اور پیش مثال موجود ہے۔ سرور نے وہی کیا جو کہانی نے ان سے کروایا ہے وہ کہانی کے گواہ بے مثال ہیں۔ میں اس نتیجے پر اس لیے پہنچا ہوں کہ تھانگ عہد کا ایک گمنام مصنف سفید بندر کی داستان لکھ چکا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ چین کے تھانگ شاہی عہد میں (۶۱۸ تا ۹۰۷) نوجوان دانشور سرکاری ملازمتوں کے امتحانات میں شریک ہوتے وقت ممتحن پر اپنے اثرات ڈالنے کے لیے انھیں لکھے ہوئے مضامین اور کہانیاں ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتے تھے۔ اس رسم کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ دانشور ممتحن پر اپنی تخلیقی صلاحیت، قوت مشاہدہ، تاریخی معلومات، منطقی استدلال اور اعلیٰ نثر نگاری کی وہ صفات ظاہر ہوں جن پر کنفیوشس نے بہت زور دیا ہے۔ آج شاید ہمیں یہ طریقہ عجیب معلوم ہو مگر جب علی بیگ سرور کے لیے یہ بات اجنبی نہ ہوگی، کیوں کہ ان کو بھی "فسانۂ عجائب" کو دربار میں پیش کرکے انعام کی توقع تھی۔ تھانگ عہد کی ایک ایک کہانیاں باقی ہیں۔ تو کوانگ تھینگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت سی کتابیں تحریر کی تھیں مگر اب اس کی صرف چند کہانیاں ہی ملتی ہیں (اس انجام میں سرور اس کے شریک ہیں کہ "فسانۂ عجائب" کے علاوہ ان کی باقی کتابوں کو اب صرف محقق پڑھتے ہیں)۔ جدید چین کے نقادوں نے ان کہانیوں کے "وافر نظریاتی مواد، جاگیردار طبقے کے تضادات اور زندگی کی جان دار عکاسی" کا اعتراف کیا ہے، لیکن اس شکایت کے ساتھ جو بیجنگ سے حال ہی میں شائع ہونے والے تھانگ کہانیوں کے اردو ترجمے کے دیباچے میں بھی دہرائی گئی ہے:

> ان کہانیوں میں زبان اس درجہ مرصع اور پرتکلف استعمال

کی گئی ہے کہ ان سے محض اعلیٰ طبقے کے لوگ ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

ان شکایت کو سن کر ایسا لگتا ہے کہ کوئی ترقی پسند نقاد ہمارے داستانی ادب کا ذکر کر رہا ہے۔ کم فہم بے بہرہ تنقید بھی، بدمذاقی کی طرح ہر معاشرے اور ہر عہد میں موجود ہے، بلکہ شاید آفاقی ہے۔

"سفید بندر کی داستان" کے مصنف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم (مجھے اس بات کی فکر ہے کہ وہ اس امتحان میں پاس ہوا کہ نہیں؟) اور یہ کہانی کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں ہوئی، یہاں تک کہ سونگ عہد میں اسے تائی پنگ مجموعے میں شامل کیا گیا۔ قصے کا خاکہ یوں ہے کہ اویانگ خہ نام کا افسر حملے فوجی مہم کے دوران، خطرناک علاقے میں بہت دور تک نکل جاتا ہے، جہاں ایک دیو قامت سفید بندر اس کی خوب صورت بیوی کو اٹھالے جاتا ہے۔ سال بھر کی تگ ودو کے وہ اچانک بندر کا سراغ پالیتا ہے اور دوسری مغویہ عورتوں کی مدد سے بندر کو باندھ کر "اس کی ناف کے کچھ نیچے کے مقام" پر تلوار کا وار کرتا ہے۔ مرنے سے پہلے بندر اویانگ کو بتاتا ہے کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ سال بھر بعد اس کی بیوی بندر کی شکل کے ایک بچے کو جنم دیتی ہے جسے اویانگ کی پھانسی کے بعد چیانگ زونگ پرورش کرتا ہے۔ بچہ بڑا ہو کر تھانگ عہد کا مشہور ادیب، خطاط اور نامور شخصیت بن جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ کہانی تھانگ عہد کی ایک مشہور شخصیت پر طنز ہے جس کا چہرہ مہرہ بندر کا سا تھا۔ اس کہانی کے بارے میں جدید چین کا دانشور اور ادیب لوشون، جس نے عہد قدیم کی کئی کہانیوں کو نئے انداز سے لکھا، اپنی مشہور اور موثر تصنیف "چینی افسانوی ادب کی مختصر تاریخ" میں رقم طراز ہے کہ اویا خاندان کے کسی دشمن نے یہ کہانی لکھی ہوگی۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "لوگوں کا مضحکہ اڑانے کی خاطر کہانیاں ایجاد کرنے کا دستور چین میں خاصا ہے" (چینی افسانوی ادب کی مختصر تاریخ، انگریزی ترجمہ، بیجنگ، ۱۹۷۶، باب ہشتم)۔ اسی خیال کی بازگشت تھانگ کہانیوں کے محولہ بالا اردو ترجمے میں بھی ہوئی ہے، جہاں اس کہانی کے بارے میں فقط یہی ایک فقرہ لکھا گیا ہے کہ "تھانگ عہد میں ادب کا استعمال ایک سیاسی حربے کے طور پر بھی ہوا تھا۔"

سیاسی طنز کا یہ حربہ اس کہانی کی بعض نفیس تفصیلات کی تشریح اور تفہیم میں مددگار نہیں ہوتا۔ مثلاً بندر کے معمولات کا یہ بیان جس میں خطاطی سے دلچسپی کا ذکر بھی ہے):

> روزانہ صبح بندر منہ ہاتھ دھونے کے بعد سفید لباس اور ٹوپی پہن لیا کرتا تھا۔ سردی ہو یا گرمی وہ ایک ہی لباس پہنا کرتا تھا۔ اس کے جسم پر کئی انچ لمبے سفید بال تھے۔ غار کے اندر وہ لکڑی کی تختیوں پر کندہ تصویری خط کو پڑھا کرتا تھا جس کی تحریر کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ پڑھنے کے بعد وہ ان تختیوں کو پتھر کی ایک سل کے نیچے رکھ دیتا تھا۔ جس دن مطلع صاف ہوا کرتا، اس دن وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلانے کی مشق کیا کرتا۔ دونوں تلواریں بجلی کی طرح گھومتی ہوئی اس کے چاروں طرف چاند کے نور کا ہالہ سا بنا دیتی تھیں۔
>
> وہ ہر طرح کی چیزیں کھا سکتا تھا۔ مگر خشک میوہ اور کتوں کا خون اس کی مرغوب ترین غذا تھی۔ وہ دوپہر کے وقت غائب ہو جاتا تھا۔ اور دو چار ہزار میل گھومنے کے بعد رات کو گھر واپس آجاتا تھا آجاتا تھا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔
>
> جب بھی کسی حسین اور خوبرو دوشیزہ پر اس کی نظر پڑ جاتی تو پھر وہ اسے حاصل کر کے ہی دم لیتا تھا۔ رات کو وہ باری باری سبھی عورتوں کے ساتھ ہم بستری کیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کی زبان پر بندروں کی نسل کا اثر موجود تھا مگر پھر بھی وہ بڑے صاف لہجے میں گفتگو کر سکتا تھا۔

تفصیلات کی یہ لذت، سیاسی طنز کے ہدف سے آگے نکل کر داستان سازی کے عمل میں داخل ہو گئی ہے جس کی طرف لوشون نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ خطاطی کا قدرشناس بندر کی تقریر کا جویا بھی ہے۔ اویانگ کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد اپنی موت کو نزدیک پا کر وہ کہتا ہے: "یہ سب کچھ قدرت کی مرضی سے ہوا ہے، ورنہ تم مجھے کسی بھی حالت میں نہیں مار سکتے تھے۔" اس راضی برضا جملے سے پہلے اسے موت کا احساس ہو جاتا ہے۔ "اس سال موسم خزاں میں جب پت جھڑ شروع ہوا تو سفید بندر بڑا افسردہ اور مایوس سا نظر آنے لگا۔" چودھویں کی رات کے کچھ دن بعد پتھر کی سل کے نیچے آگ لگ جانے سے تمام تختیاں جل جاتی ہیں۔ وہ عورتوں سے دو باتیں کرتا ہے: "میری عمر ایک ہزار سال ہو چکی ہے، مگر ابھی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ افسردہ ہو کر بولا، اب یہ عورت حاملہ ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری موت قریب ہے۔ اس نے بھی عورتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کچھ دیر تک روتا رہا۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ پہاڑ بالکل سنسان اور سیدھا ہے۔ پہلے یہاں آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر میں نے گھاٹی میں بھیڑیوں، شیروں اور دوسرے جنگلی جانوروں کو تو دیکھا ہے، مگر ابھی تک کسی لکڑہارے کو بھی اوپر آتے نہیں دیکھا۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہوتی تو اس ویران اور سنسان جگہ پر بھلا آدمی کس طرح پہنچ سکتا ہے؟"

اپنی اس تقریر کے دوران سفید بندر ایک اور عجیب جملہ کہتا ہے۔

"پہاڑ کے دیوتا نے مجھے بددعا دی ہے کہ میں مرجاؤں گا لیکن اگر مجھے دوسرے دیوتاؤں کی مدد مل جائے تو شاید میری جان بچ سکتی ہے۔" دیوتاؤں کی مدد نہیں ملتی۔ اور وہ خدا کی مرضی کو قبول کر لیتا ہے۔ دیوتاؤں کی بے ثباتی، ارادے کا مشیت ایزدی کے سامنے مسخ ہونا اور موت کی اٹل حقیقت اس تقریر سے مترشح ہیں۔ شاہی خاندان یا صاحب اقتدار لوگوں کے بارے میں گم نام مصنف کے خیالات، کہانی کے عمل میں دب گئے ہیں۔ آخر میں اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ بندر کی تقریر ہے۔

نقادوں کے تجزیے، سیاسی کشمکش، اہل اقتدار کے عروج وزوال اس

جز رو مد سے دانشوروں کی وابستہ توقعات، ان کا زہر خند اور اہل دنیا کو عبرت دلانے کے لیے متوجہ کرنا، یہ تمام سلسلے بندر کی تقریر میں ضمنی تفصیلات بن جاتے ہیں۔ بندر کی تقریر کہانی سنانے کا عمل ہے، جو بہر صورت ''محض خیالات'' سے افضل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز اپنے محولہ بالا اقتباس میں یہ فرض کیے لے رہے ہیں کہ چند ایک فلسفیانہ خیالات، جو مصنف کو تاریخ نویسی کے دوران آئے وہ کہانی میں چسپاں کر دیے گئے۔ کہانی کا عمل اس کے بالکل برخلاف بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ کہانی لکھنے کے دوران مصنف کو چند فلسفیانہ خیالات آئے جن سے اس نے اپنی تاریخی کتاب میں بھی استادہ کیا۔ کہانی کا عمل تصنیف سے مانع نہیں بلکہ تجربے کے تسلسل کا مستند طریقہ ہے۔ بندر کی تقریر لکھتے ہوئے سرور اس نکتے کو پا چکے تھے، جیسے کہ اس کے بعد آنے والے بعض افسانہ نگاروں نے بھی پایا۔ بندر کی تقریر کیا، یہ پوری کہانی سید رفیق حسین نے ''آئینۂ حیرت'' میں لکھی ہے، بندر شہری انسان اور محروم انسانی انسان کے باہمی تفاعل سے مرتب ہونے والی کہانی۔ یہاں بندر دنیا کی ناپائیداری کا نقشہ کھینچ کر سننے والوں کو عبرت نہیں دلاتا، بلکہ قوت کی اندھی قدرت کا ایک مہرہ بن کر اتفاقات زمانہ کی اندوہ ناک ستم ظریفی کے ہاتھوں انسان کی لاچاری، اپنے مال و مقام کا گھمنڈ کرنے والے انسان کی نادانی، غرضیکہ کتنی بہت ساری باتوں کا ایک مرقع سامنے آتا ہے۔ قضا و قدر کے وسیلے کے طور پر بندر اپنا کام خاموشی کے ساتھ سرانجام دے رہا ہے۔ اس لیے تقریر افسانہ نگار کو کرنا پڑتی ہے:

> زندگی! پر عیش و پر کیف زندگی بچپن کی پر سحر بے فکر زندگی
> جوانی کی مست زندگی۔ کیا تو اس واسطے عطا ہوئی تھی کہ
> وقت آخری تیری یاد کے تازیانے پشت خمیدہ کی دھجیاں
> اڑائیں۔

جوش تقریر میں وہ بڈھی بندریا سے بھی خطاب کر بیٹھا ہے۔ بندریا کی 'او، او، خی، خی' درج گزٹ ہوتی ہے، نیم پاگل پروفیسر دوہرے شعور کی رو میں بہکے چلے جاتے ہیں۔ بندریا کی محرومی اور خاموش انتقام سے قریشی صاحب کا بچہ ان ڈھیالوں میں پہنچ جاتا ہے جنھیں نیم وحشی اور جانور سے بدتر سمجھا گیا ہے۔ انسان کا یہ زوال، انتظار حسین کے یہاں واضح تر ہے۔ ''آخری آدمی'' میں انسان اپنی بر خود غلط نافرمانی اور سراسر شرارت کی پاداش میں بندر بن رہا ہے۔ الیاسف نے پہچان لیا ہے کہ وہ بندروں میں منقلب ہو جانے والی بستی میں اکیلا آدمی ہے، اور اس نے بولنے یا نصیحت کرنے کے بجائے خاموش رہنے کا وطیرہ اختیار کیا ہے:

> الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اور
> اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا
> اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں
> پر، اپنے آپ اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ
> لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ
> میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج
> بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا ہے اور الیاسف لفظ
> کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

لفظ مر چکا ہے اور بندر کی چپ سادھ رہ گئی ہے۔ بورخیس کے دوست، لاطینی افسانہ نگار لیوپولڈ ولوخونیز (Leopoldo Lugnes) نے اپنے افسانے ''یزور'' (Yezur) میں دکھایا ہے کہ ایک سائنس داں کو یقین ہوتا ہے کہ بندر بولنا جانتے ہیں مگر انسان کے ظلم کی وجہ سے نہیں بولتے۔ وہ ایک بندر کو بولنا سکھاتا ہے لیکن برسوں کی مشقت کے بعد وہ مرتے ہوئے بندر کی زبانی صرف یہ الفاظ سن پاتا ہے: ''آقا میرے آقا۔''

اشفاق احمد کے افسانے ''بندر لوگ'' تک آتے آتے بندر کے کلام کرنے کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔ سرور سے لے کر اشفاق احمد تک، یعنی بندر کی تقریر اور اس موت کے زائل ہوتے ہوتے یکسر گم ہو جانے تک، ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جو مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے افسانوں میں بیان کر دی ہیں۔ سرور کے ہاں افسانہ نگار حاوی و ناصر ہے کہ بادشاہوں کی موت کا بیان بھی بندر کی تقریر کے ذیل میں آتا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں بندر کو بولنے کا نہیں ملتا اس لیے کہ افسانہ نگار ہی مسلسل بولے چلا جا رہا ہے۔ اس کے جوش کلام کے مارے افسانہ بچھڑ گیا ہے۔ بندر کی بلا افسانہ نگار کے سر آ گئی ہے۔ افسانے پر اس سے زیادہ برا وقت اور کیا ہو سکتا ہے؟

شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے King John ''کنگ جان'' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

> Another lean unwash'd artificer
> Cuts off his tale and talks of Arthur's death.

سرور ایسے Artificer نہ تھے کہ کہانی روک کر بادشاہ کی موت کا ذکر شروع کر دیں۔ انھوں نے بادشاہوں کی موت جیسے مہتم بالشان واقعات کو بندر کی تقریر کا حوالہ بنا دیا، اتنا مستند حوالہ جو تاریخی کتاب میں بھی حرف بحرف دہرایا جا سکتا ہے، انسانیت کا اعجاز ہے، اور سرور افسانہ نگاری کے اس فن کے محرم راز جس کا شعور ہمارے دور کے افسانہ نگاروں سے بھی گم ہوا جا رہا ہے۔ اسی لیے ''فسانۂ عجائب'' کا نئے اور مستند ایڈیشن میں چھپنا میرے لیے اتنا بڑا واقعہ ہے، ایک بالکل نئی دریافت ☆☆☆

سرخ گلاب اور بدر منیر
(تمام نظمیں تمام غزلیں)
ساقی فاروقی
قیمت: ۲۲۵ روپے
شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد

پھپھوندی

آصف فرخی

شمارہ ۱۸۲،
اپریل ۱۹۹۵

گوشت سے ناخن جدا ہوا جاتا تھا کہ رات میں کسی وقت اس کے خواب میں آیا، وہی پہلے کی طرح ہموار اور گول اور گلابی ناخن، اور اس میں کے سامنے کہ بکرنی رکھ دی: "بیسیوں کا سر کاٹ دیا۔ نہ مارا نا خون کیا۔"

یہ سنتا تھا کہ وہ سن ہو گیا۔ اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

خواب کے اندر خواب نہ تھا۔ تعجب کا ایک عالم تھا اور ناخن کا حد سے بڑھنا۔

سراسیمگی بے سبب تو نہیں تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

اور ناخن پر اس کا تعجب کم ہونے میں نہ آتا تھا۔

کہ بکرنی کا جواب نہ ملنے پر ناخن بھی ٹوٹ سا گیا۔

یہ کہ ناخن میں پہلے جیسی بات نہیں رہی، اس کا پہلی مرتبہ اندازہ نہانے کے دوران ہوا۔ اپنے بدن میں تنہا ہونے کا موقع ایک یہی تو ملتا تھا۔ ڈھلتی عمر کے جسم میں سر اٹھانے والے عوارض، آنکھوں کے سامنے ایسے ہی میں آشکار ہوتے ہیں۔ ناخن کے نمایاں ہونے کا وہ دن، اس دن سخت حبس تھا اور گرمی چہار جانب سے ابلی پڑ رہی تھی۔ شام گرم پانی میں بھیگے ہوئے تولیے جیسی تھی گھر کے بارہ، ہوا تین طرف سے بند اور منہ کی طرف سے کھلا ہوا غار تھی اور کمروں کے اندر، دیواروں کے پاس سے کسی جانور کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی بھاپ کی طرح، گرم گرمی کی بساندی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اندر چین تھا نہ باہر۔ بدن پر پسینے سے کپڑے چپکنے لگے اور گرمی دانوں میں مرچیں لگے جا رہی تھیں قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر پیٹھ کھجاتے کھجاتے ناخنوں میں نرم نرم میل کی طرح کالی کالی مڑوڑیاں بھر گئیں اور ناخنوں کے اوپری حصے ایسے ہو گئے جیسے گلابی چہروں کے سر پر بال۔ اب یہ ناخن وہی چہرے تھے۔ انگلیوں کے اشارے پر چلتے تھے۔ پھر وہ پانی مانگنے لگے۔ ایک دم ہی سارے کپڑے اتار کر وہ ننگے مجم بدن سے کھڑا ہو گیا غسل خانے کی جس دیوار کے کونوں پر مسلسل نمی کے سبب کائی جمی رہنے لگی تھی، اس میں ہلکی سی ٹھنڈک بسی ہوئی تھی۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، مگر ٹھنڈک ہتھیلی سے آگے نہیں بڑھی۔ اس نے نل گھمایا۔ پانی اس فراوانی سے بدن پر پھسلتا ہوا نہیں اترا۔ شاور کی دھار کم محسوس ہوئی۔ اوپر نظر اٹھا کر دیکھا۔ دھات کے گول منہ والے فوارے میں بہت سے سوراخ بند تھے۔ ان پر پانی کی چھوٹی سی بوند بنتی، مگر ٹپک کر نیچے نہیں گر پاتی تھی۔ بلبلے کی طرح پھٹ جاتی۔ خیال آیا کہ پن لے کر اسے کریدنا چاہیے۔ ان سوراخوں میں جما ہوا زنگ صاف ہو جائے گا۔ اس کام کے بہانے گرمی کا یہ پہر غسل خانے میں کٹ جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ شاور کی ٹونٹی اتار کر اس کے سوراخوں سے پانی رواں کر سکتا، اس کی نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی۔ ناخن بھی تو کاٹنے ہیں، اسے یاد آیا۔ ہاتھ قینچی کی طرف سرک گئے۔

قینچی کا پھل کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پہلی ہی نظر میں وہ مختلف معلوم ہوا۔

یہ دیکھنا بہت آسان تھا کہ وہ بدل رہا ہے۔ پہلی بار وہ اتنا نامانوس معلوم ہوا۔ جیسے ساری عمر کا ہموار گلابی نہ آئے ہوں وہ بھدا اور چپٹا ہوا الگ رہا تھا۔ زیادہ استعمال کیے ہوئے برتن کی طرح۔ اس کا ہموار گلابی رنگ اڑا ہوا تھا اور ایک طرف سے سیاہ پڑ چکا تھا۔ بجھی ہوئی سیاہی کی سی تحریر اتنے حصے پر حاوی تھی۔ اس کی شکل اتنی مختلف تھی کہ اس نے چھو کر دیکھا۔ چھونے میں بھی وہ بات نہیں تھی۔ اب اس میں کھردراہٹ اور سختی تھی۔ وہ حصہ جو سیاہ پڑ چکا تھا، چھونے میں اور بھی سخت تھا، مگر یہ سختی جیسے اس کے بدن سے نہیں آئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اسے خوف محسوس ہوا۔ اس چیز سے خوف جو اس کے بدن سے اگ رہی تھی، مگر اس کا تعلق کسی حیوان کی وحشت سے زیادہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جانور کا کھر یا سینگ کا ٹکڑا ہو۔

اس ناخن کا صاف صاف مطلب تھا جانور۔

یہ اوپر کو اٹھا ہوا، گوشت سے الگ ہوا، مڑا تڑا ناخن جس جانور کا ہے وہ میرے اندر ہی تو ہے۔ اسے اپنا یہ خیال بالکل منطقی معلوم ہوا۔ اور یہ سوچ کر ایک طویل اطمینان سا ہوا جیسے اس جانور کو الگ پہچان کر، پنجرے میں ہانک دیا ہو۔ یہ ناخن کاٹنے میں بھی سخت ہوگا۔ قینچی کی تیز نوک اچٹ کے کہیں چبھ نہ جائے۔ اس نے ہاتھ

بڑھا کے قینچی واپس رکھ دی اور نہائے بغیر کمرے میں واپس آ گیا جہاں گرمی زبان نکالے ہانپ رہی تھی، اور اس کی گرم لیس دار رال تمام در و دیوار پر تھتڑی ہوئی تھی۔

دن ڈھل جانے کے بعد ناخن سے اگلی ملاقات ہوئی۔ وہ دونوں بستر میں ملے، گھلا ہوا دوسرے کے لمس پر چونک پڑے۔ بے حد مانوس لمس، مگر اب اس میں اجنبیت کا ذائقہ گھلا ہوا تھا، طلاق کے فیصلے پر پہنچنے والے میاں بیوی کی طرح لیکن اپنے جسم کے ایک حصے کے ساتھ رہتے رہتے اس کی عادت سی پڑ جائے، تو اب اسے طلاق دے کر الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ موزوں کے اندر ملفوف اور ساری شام جوتوں کے اندر بند رہنے کے بعد پاؤں آزاد ہوئے تو اس نے بستر پر ٹانگیں پھیلائیں اور پیر کی انگلیوں کو حرکت دی تو انگوٹھے میں اسی اجنبیت نے سر اٹھایا۔ اور اسے سر شام نہاتے وقت ناخن کی ناگوار کیفیت یاد آ گئی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے پھر ناخن کو دیکھا۔ ناخن آنکھ کی سیدھ میں نہیں تھا۔ گردن کو تھوڑا سا نیچا یا تکیے کو تھوڑا سا اونچا کرنا پڑ رہا تھا۔ اور وہ آنکھ سے ایک طویل فاصلے کی مسافت پر معلوم ہو رہا تھا۔

بدن پھر فاصلہ
تھکن پھر مسافت

اندھیرے میں وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا اور نہ ان تبدیلیوں کا پتہ چل رہا تھا جو اس میں رونما ہو چکی تھیں۔ بلکہ وہ اندھیرے کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ اندھیرے کا اتنا ٹکڑا جو انگوٹھے کا ایک حصہ کاٹ کر لے گیا تھا۔ اور اب وہاں انگوٹھے پر بھی رات کا اندھیرا تھا۔ رات کے کالے ناخن بڑھ آئے تھے۔ ان کے سروں پر پنجے تھے اور نیند بھری خاموشی کے بدن پر کھرنچیں ڈال رہے تھے کہ جہاں جہاں پر ناخن لگتے، نیند اڑ جاتی۔

نیند کے نرم، ریشمی جال کی ساری بنت کو یہ ناخن ادھیڑ چکا تھا۔

کاٹ کر گرا دیئے جانے والے درخت کی طرح جسم ڈھیر تھا۔ اور اس کے تنے کے ایک سرے پر وہ ناخن دار انگوٹھا سانپ چھتری کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔

ایسے کوئی سو سکتا ہے؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک عجیب سے تجسس کے ساتھ، جو ان چیزوں کے بارے میں محسوس ہوتا ہے جن سے گھن آتی ہے، اسے پھر سے چھو کر دیکھا۔ ناخن گوشت کو چھوڑ رہا تھا، اور ایک طرف سے ابھر آیا تھا۔ جتنا حصہ ابھرا تھا، وہ باقی ناخنوں جیسا نہیں رہا تھا۔

اپنے ہی جسم کے ایک حصے کے بارے میں اس طرح سے سوچنا اور بار بار چھو کر دیکھنا، خود اسے بھی عجیب لگا۔ اس نے صبح اٹھ کر ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔

لیکن ایک طویل معائنے کے بعد، جس میں اس کے جسم کے آگے کو نکلے ہوئے اور اندر کو جانے والے حصوں کو ٹٹولا اور جانچا گیا، جو لفظ تشخیص کے طور پر بتایا گیا اس نے جسم کے اندر ہونے والی شکست و ریخت کے عمل کو ایک پر اسرار اور گمبھیر سلسلہ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا سوال یہ نہیں تھا کہ آندھیاں کیسے چلتی ہیں، یا قوموں کا عروج و زوال کیسے ہوتا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کے خیال میں یہ کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے محض یہ سوال پوچھا تھا۔

"فنگس..."

"جی؟"

پہلے پہل وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔ پھر بھی کچھ چونک سا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب کچھ اور سمجھے۔ انھوں نے اس نام کا مطلب اردو میں بتایا۔

چونکتے چونکتے وہ کھسیانا سا ہو گیا۔

انگریزی کے لفظ کے معنی اسے معلوم نہیں تھے، یہ بات نہیں جو بات وہ سمجھ رہا تھا پا رہا تھا، وہ یہ تھی کہ اس کا تعلق مجھ سے بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک زندہ انسان سے پھپھوندی تو بے جان چیزوں پر لگتی ہے۔ یا ان چیزوں پر جو جینا ختم کر کے بیکٹیریا، وائرسز اور دوسرے نامیاتی وجودوں کے لئے خام مواد کی فراہمی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

پہلا صدمہ جو گزرا، وہ یہ تھا کہ ایسا قلب و نظر کی موت سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے ذہن میں اپنے لیٹے ہوئے جسم کی تصویر گھوم گئی۔ لجلجاہٹ میں گرے ہوئے گلیور کی طرح وسیع و عریض پورا ایک برا اعظم، جس میں سے ہزاروں چھوٹے بڑے طفیلی، کیڑے، پودے، جرثومے اپنا رزق حاصل کر رہے ہیں، اور ان سے بے خبر زمین کا وہ ساکت ڈھیر سانس لیے جا رہا ہے۔

اگر ان سب نے کھا کھا کر اسے ختم کر دیا تو؟

خوف کی کوئی پرچھائیں، اڑتے ہوئے پرندے کی طرح، اس کی آنکھوں کے افق پر سے گذری ہو گی جو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ ضرورت سے زیادہ حساس ہیں جو اتنی جلدی اتنی دور کی بات سوچ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ نہیں، ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے..."

پریشانی سے زیادہ اسے حیرانی تھی۔ حیرت کہ میرے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ حیرت کہ یہ سب کچھ میرے اندر چل رہا ہے اور مجھے خبر نہیں۔

خبر ہوئی ہے تو اس وقت جب ناخن گوشت سے الگ ہونے، سیاہ پڑنے لگا۔

ناخن کی یہ صورت اسے سراسیمہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔ سراسیمہ اور بے تحاشا سوالوں کی زد پر آیا ہوا.. سوال جن کے آگے ڈاکٹر کی تسلی ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ بھی انفیکشن کی ایک ضرورت ہے۔ ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں۔ لیکن اینٹی فنگل ٹریٹ منٹ شروع کرنے سے پہلے کلچر کروانا ہو گا..."

یہ سارے الفاظ اتنے حیران کن کیوں ہیں؟ ٹریٹ منٹ سے پہلے کلچر، کیوں؟ بھلا پھپھوندی کا کلچر سے کیا تعلق؟

"صاحب، آپ بھی حد سے زیادہ ہیں۔ وہ والا کلچر نہیں ہے، جس کی آپ لوگوں کو بہت فکر رہتی ہے۔ یہ کلچر یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ آپ کے ناخن پر فنگس کی گروتھ ہے کہ نہیں۔ آپ کے ان گرون ٹو نیل بھی ہیں۔ جی، جی، میں سمجھا رہا ہوں۔ آپ گھبرایئے مت۔ آپ کے انگوٹھے کے ناخن اندر ہی اندر اس طرح

بڑھتے ہیں کہ وہ گوشت میں اتر جاتے ہیں، باہر کی طرف نہیں آ رہے۔ آپ کو تیڑھے ناخن کاٹنے پڑیں گے یوں کر کے، الٹے چاند کی طرح۔ میں طریقہ بتا دوں گا۔ ہاں کوئی اور طریقہ نہ ہو تو پھر آپریشن کر کے ہی نکالنا پڑتا ہے۔ مگر ابھی اس کی نوبت نہیں آئی...''

ناخن غریب بڑی مشکل میں تھا۔

چلتے چلتے ڈاکٹر نے بھی ایک سوال پوچھ لیا۔

''آپ ڈائی بیٹک تو نہیں ہیں؟ شوگر ٹیسٹ کروائی ہے؟ کوئی فیملی ہسٹری؟''

''گھر واپس گیا تو پورے جسم ہی کے بارے میں متفکر ہوتا ہوا۔

غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک بار سر سے لے کر پاؤں تک غور سے دیکھا۔ صحت کے حساب سے فٹ دیکھنے میں بھی ستواں جسم۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے ساتھ محبت کے عمل میں شریک رہے ہیں۔ پھر اس جسم میں یہ خرابی کا امکان کہاں سے آ گیا۔

پتلون کی جگہ اس نے شلوار قمیص پہن لی اور بستر پر لیٹ کر ایک بار پھر انگوٹھے پر غور کرنے لگا۔ اب۔ ''انگوٹھا بھی.. سوچو تو ذرا... اس پر کاہے کو توجہ دی ہوتی؟ اتنا وقت یوں گزارا جیسے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا؟ اگر ہے تو چپ چاپ کر کے موزے کے اندر لیٹا رہے۔ اس کا بھلا کیا کام؟

کہیں یہ اتنے برس کی نظر اندازی اور محرومی کا انتقام تو نہیں لے رہا ہے؟

مگر یہ تو خود نشانہ بن رہا ہے۔

اس نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ شاید پہلی بار اتنے غور سے۔ اور وہ حصے جو ٹھیک تھے۔ ابھی تک ٹھیک تھے۔

ایک چھوٹی سی اور گول، ابھری ہوئی ہڈی سپیر کے حاشیے سے باہر نکلی ہوئی لگتی تھی، وہ اس کی جڑ تھی۔ اور جوڑ کے اوپر تین چار بال تھے۔ اگلے جوڑ پر سے پتلا ہوتے ہوئے پھر چوڑا ہو جاتا جہاں پر ناخن تھا۔ اس کے آگے ذرا سا گوشت چمچے کی طرح نکلا ہوا تھا اور ناخن کا اوپری حصہ برابر کٹا ہوا ہونے کے بجائے کٹا پھٹا ساتھ جیسے بچ گیا ہو یا کسی چیز میں اٹک کر ٹوٹ گیا ہو۔

اتنے سے ناخن میں وہ جوڑ۔ اس نے انھیں چٹکا کر دیکھا۔

اس کے برابر جو انگلی تھی، اس کا ناخن والا حصہ زیادہ موٹا تھا۔ ڈھکن کی طرح اور یہ انگلی بھی انگوٹھے سے کوئی ناخن بھر آگے نکلی ہوئی تھی۔

اور اس اتنے سے آگے نکلنے کے بھی کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔

اسے یاد آیا۔ ''تم اپنی بیوی سے دب کر رہو گے۔'' اس کے کسی دوست نے کہا تھا۔ ایک جگہ فرشی نشست میں بیٹھنے کے لئے دفتر کے کسی ساتھی کی ماں کی میت تھی) اس نے جوتے اتارے اور پاؤں بند موزوں سے باہر آیا تو اس دوست نے اشارہ کیا تھا۔

''بیوی ان پر حاوی رہتی ہے جن لوگوں کا یہ انگوٹھا انگلی سے چھوٹا ہوتا ہے۔'' اور کوشش کے باوجود وہ میت کے سامنے مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کی وجہ سے میت کی بے ادبی ہوئی ہے تو کہیں انگوٹھے پر بددعا نہ لگ گئی ہو۔ اور پھر وہ ایک بار پھر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پیر کے انگوٹھے سے کسی اور چیز کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی ایک مرتبہ۔ اسکول کے یہ بڑے لڑکے نیچر سے چھپ کر کلاس سے غائب ہو گئے تھے اور اسکول کی عمارت کے پچھواڑے بیٹھ کر چوری چھپے سگریٹ دھونک رہے تھے۔ اس وقت کی ساری باتیں گھوم پھر کر ایک ہی بات پر آ جاتی تھیں، اور وہ اس بار پھر بحث کرنے لگے کہ کس کا زیادہ بڑا ہے۔ یہ ناپنے کا ایک معروضی معیار طے کرنے میں لگے ہوئے تھے وہ۔

''سامنے سے ناک کے برابر ہوتا ہے۔'' راشد نے کہا تھا۔ نوید نے فوراً اس کی ناک دبا کر بھدی کر دی تھی اور سب ہنسنے لگے۔

''بالشت کے برابر ہوتا ہے۔'' خالد نے انگلیاں پوری کھول کر سامنے کر دی تھیں۔

''نہیں، بے۔ پیر کے انگوٹھے جتنا بڑا ہوتا ہے،'' وسیم بول پڑا تھا۔ اور سب ہنس پڑے تھے۔

کتنی پرانی بات یاد آئی۔ اس نے شلوار میں ایک طرف کو کھجایا۔ اور اگر انگوٹھے کی جگہ کہیں اور یہ انفیکشن ہو جاتا؟ ان جگہوں میں سے ایک جن سے وہ انگوٹھے کی مشابہت تلاش کر رہے تھے۔ اور اگر اب بھی اس انفیکٹڈ انگوٹھے نے جراثیم کو ان حصوں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیا۔

پیر کا انگوٹھا کچھ taken for granted سا کیوں ہوتا ہے؟ اسے خیال آیا۔ انگوٹھے اور انگلیاں مل کر پنجے کو اس طرح مکمل کرتے ہیں کہ اس نے کبھی ان کے بارے میں اس قدر تفصیل سے اور الگ الگ سوچا بھی نہیں تھا۔

اور اب اس انگوٹھے میں بیماری نے جڑ پکڑ لی تھی۔

کلچر کی رپورٹ میں کیا نکلے گا؟ پریشانی نے ایک بار پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا جب ناخن اتنا متاثر ہے تو پھر یقیناً مرض اندر ہی اندر پلتا رہا ہے۔

انگوٹھا تو گیا کام سے! اس کی نیند بالکل اچٹ گئی، اور عجیب سے خیالوں نے آ لیا۔

پھپھوندی! سارا بدن سیاہی مائل سبز گاد سے ڈھک گیا ہے، باہر پڑی رہ جانے والی باسی روٹی کی طرح جو اس رنگ کا نہیں ہے وہ بس ایک پیر کا انگوٹھا ہے جو بالکل سیاہ پڑ چکا ہے اور اس میں سے سڑنے کی بدبو اٹھ رہی ہے۔ ''گینگرین...!'' وہ ڈاکٹر چلا رہا ہے اور اس کو جڑ سے کاٹ دینے کے لئے آگے آ رہا ہے۔

تو اب اس فاسد انگوٹھے کو کاٹ دیا جاتا ہے، اس نے راضی برضا ہوتے ہوئے سوچا یہ اس کا انجام ہے۔ اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں شرع کیا کہتی ہے، انگوٹھے کو آپریشن میں کاٹ دیے جانے کے بعد جنازے کی طرح اٹھا کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے؟

مگر پھر خیال آیا کہ اس سڑی گرمی میں کون آئے گا محض ایک انگوٹھے کے جنازے کو اٹھانے کے لئے۔ اور وہ بھی ایسا انگوٹھا جس پر پھپھوندی لگ چکی ہو☆☆☆

محمد حسن عسکری، شخص اور دوست

آفتاب احمد

شمارہ ۲۷۹،
اپریل ۲۰۰۴

عسکری کے متعلق اکثر کہی جانے والی یہ بات درست ہے کہ وہ طبعاً خاموش اور کم آمیز آدمی تھے اور اگر وہ کسی محفل میں موجود ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ اس میں شریک بھی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ دم بھر کی صحبت ناجنس سے ان کو دہشت ہونے لگتی تھی اور وہ فوراً بھاگ نکلتے تھے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اپنے خاص دوستوں کے حلقے میں پہروں بسر کر سکتے تھے۔ ان خطوں میں جو آپ کے پیش نظر ہیں سات سات آٹھ آٹھ گھنٹوں کی طویل صحبتوں کا ذکر ہے۔ ایسی صحبتوں میں وہ خوب باتیں کرتے تھے اور اگر انتظار حسین بھی موجود ہوں تو ان سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ گفتگو کے میدان کے مرد نہیں تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ انھیں اس کا شدید احساس بھی تھا۔ اسی لئے اکثر محفلوں میں انھوں نے خاموشی کو اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔ کلاس روم میں ان کا کیا انداز تھا اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر ظاہر ہے کہ وہ طالب علموں سے الگ سطح پر بات کرتے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ کراچی میں انھوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ آج کل میں ایلیٹ پڑھا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے ایلیٹ کو پڑھے اور ایلیٹ پر کچھ پڑھے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں کل سے آپ کی کلاس میں آکر بیٹھ جایا کروں گا۔ کچھ دماغ کا زنگ اترے گا۔ مگر عسکری نے مجھے صاف منع کر دیا۔ میں نے چھیڑنے کے انداز میں اصرار کیا تو کہنے لگے کہ اگر آپ آئے تو میں کلاس چھوڑ دوں گا اور آپ کو چائے پلانے لے جاؤں گا۔

بعض اور باتوں میں بھی ان میں ایک قسم کی جھجک پائی جاتی تھی، مثلاً شعر پڑھنے میں، حالاں کہ شعر کے معاملے میں ان کی نظر تہ بہ تہ جاتی تھی جو مختلف شاعروں پر ان کے تنقیدی مضامین اور اس مجموعے کے بعض خطوں سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن میں نے کبھی عسکری کو ذوق وشوق اور لہک سے شعر پڑھتے ہوئے نہیں سنا طرح کہ جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ شعر سے لطف اندوز بھی ہو رہے ہوں۔ پورا شعر پڑھتے ہی نہیں تھے۔ گفتگو کے دوران میں کبھی ضرورت پڑی تو ایک آدھ ٹکڑا اپنی زبان سے ادا کیا اور پھر یہ کہہ دیا کہ یار مجھے شعر یاد نہیں رہتے، اس سلسلے میں فراق صاحب سے بھی ڈانٹ کھا چکا ہوں۔ اسی طرح، وہ انگریزی کے استاد تھے اور انگریزی پڑھنے لکھنے میں اور انگریزی شعر وادب کی تفہیم میں انھیں جو درک حاصل تھا وہ میں نے آکسفورڈ اور کیمبرج سے انگریزی میں سند یافتہ لوگوں میں بھی کم دیکھا ہے، لیکن کلاس روم میں تو شاید انگریزی بولتے ہوں گے مگر ویسے ان کو اس میں بڑا حجاب تھا۔ ہمارے ہاں کے اکثر انگریزی داں حضرات جن میں اردو کے بعض شاعر اور ادیب بھی شامل ہیں، عام بول چال میں انگریزی لفظ ہی نہیں بے اختیار اور پے در پے انگریزی کے جملے بول جاتے ہیں، مگر عسکری جملے تو کیا انگریزی لفظ بھی شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے۔

فون پر بات کرنے میں بھی انھیں آلکس تھی۔ کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے بات کرتے بھی تھے تو رسان سے نہیں۔ ریل کے ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں سفر نہیں کرتے تھے، کہتے تھے اس سے میرا دم گھٹتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر تو انھوں نے کبھی کیا ہی نہیں اور نہ شاید کرنا چاہتے تھے۔ لباس میں بھی اپنی پرانی وضع ہی قائم رکھی، وہی کرتا پاجامہ اور اچکن سوائے اس مختصر زمانہ کے جس میں وہ انگریزی طرز کے کپڑے پہننے لگے تھے، مگر اس کی ایک خاص وجہ تھی جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اس کے باوجود انھوں نے بیسویں صدی ہی نہیں، سولہویں صدی کے بعد کے یورپ کے ادب وفکر کو اپنے ذہن میں جس طرح سمیٹا ہوا تھا اس دور کے دوسرے ادیبوں اور نقادوں میں اس کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی، اور پھر جس طرح انھوں نے یورپ ہی کے چند مفکروں سے متاثر ہو کر یورپ کو رد کیا اس کا

بھی جواب نہیں۔

مگر یورپ کو عسکری نے کتابوں اور تصویروں کی مدد ہی سے دیکھا تھا۔

ان خطوں میں ایک آدھ جگہ باہر جانے کے ارادے کا ذکر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اگر چاہتے تو اس کے کئی مواقع پیدا ہو سکتے تھے۔ مجھ سے مجید ملک صاحب نے کہ اس زمانے میں حکومت پاکستان کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے، کہا کہ بھئی تم اپنے دوست عسکری کو تیار کرو، ہم انتظام کردیں گے۔ میں نے عسکری سے ذکر کیا، پہلے تو تیار ہو گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد خود ہی مجھ سے کہا یار آپ ملک صاحب کو منع کر دیجئے، میں جا نہیں سکوں گا اور اگر انھوں نے انتظام کر دیا تو پھر مجھے انکار کرنے میں خفت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ عسکری کو سفر سے وحشت تھی اور وہ غیر ملک میں اکیلے رہنے سے بھی گھبراتے تھے۔ چنانچہ وہ ملک سے باہر کبھی نہیں گئے۔ لیکن انگلستان اور فرانس کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ انھیں وہاں کے چیدہ چیدہ مقامات، گلیوں اور محلوں اور وہاں کے ادیبوں کے پسندیدہ ریستوران اور قہوہ خانوں کے نام تک یاد تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف ادب ہی نہیں پڑھتے تھے۔ عام قسم کے رسالوں، خصوصیت سے رنگین رسالوں پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ پڑھنے کا انداز یہ تھا کوئی کتاب یا رسالہ ہر وقت ہاتھ میں لئے رہتے تھے۔ بس کے انتظار میں بھی پڑھتے تھے اور سفر کے دوران بھی، قہوہ خانے میں، یا کسی دکان پر، جہاں کسی سے ملنا طے ہو۔ ملنے والا اگر ذرا دیر سے پہنچا تو اس نے عسکری کو پڑھنے میں معروف پایا۔ ان کے دیر کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے ایسا وقت کا پابند آدمی دیکھا ہی نہیں۔ اگر پانچ بجے کا وعدہ ہے تو پانچ بجے ہی پہنچیں گے۔ دوسروں سے بھی وہ یہ توقع رکھتے تھے مگر دیر سویر ہو جانے پر خفا نہیں ہوتے تھے۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے۔

لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں میرے ہاں عسکری سے ملاقات کے اوقات میں کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ صبح شام، دوپہر، جب بھی طے پاتا، ہم مل بیٹھتے۔ اس معمول میں اس وقت بھی کوئی فرق نہیں آیا جب نماز میں باقاعدگی عسکری کے معمولات میں شامل ہو گئی۔ انھوں نے بعض دوسرے پابند نماز لوگوں کی طرح مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ نماز سے پہلے آؤں گا یا نماز کے بعد۔ میرے گھر میں بیٹھے بیٹھے جب بھی نماز کا وقت آیا انھوں نے جانماز مانگی اور تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مجھ سے انھوں نے کبھی کسی قریب کی مسجد کا راستہ نہیں پوچھا اور نہ یہ کہہ کر کبھی گھر واپس گئے کہ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے۔

میں نے البتہ اپنے طور پر دستور بنا لیا تھا کہ کراچی میں ان کے پیر الٰہی بخش کالونی والے گھر میں شام کو اور کشمیر روڈ والے گھر میں ظہر کی نماز کے بعد جاتا اور عصر کے وقت واپس چلا آتا تھا۔ کبھی کبھی دیر بھی ہو جاتی تھی مگر وہ کبھی مجھے اکیلا چھوڑ کے نماز ادا کرنے نہیں گئے۔ اپنے گھر میں وہ جس طرح میرا خیر مقدم کرتے تھے وہ دوستی اور اخلاص کا ایسا نمونہ تھا جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں عموماً وقت مقرر کئے بغیر جاتا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی یا دستک دی اور چند لمحوں میں عسکری نے کھٹ سے دروازہ کھولا اور چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے سے کہ جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوں، ہر ہر لفظ کی آواز کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا، "آیئے آفتاب صاحب۔ تو آپ آ گئے۔" مجھے اپنی بیٹھک میں ایک صوفہ کرسی پر بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔ اندر اس لئے جاتے تھے کہ گھر میں چائے کے لئے کہہ آئیں۔ واپس آ کر میری کرسی کے برابر لگے ہوئے تخت پر بیٹھ جاتے اور باتیں کرنے لگتے۔ میں اگر کبھی کسی ایسے وقت پہنچ جاتا کہ کوئی شاگرد اور ملنے والا پہلے سے موجود ہوتا تو اسے تھوڑی دیر میں کسی نہ کسی بہانے ٹہلا دیتے تھے۔ ایک دفعہ کا معاملہ البتہ مجھے ذرا مشکل نظر آیا۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت بزرگ ہستی کے فرزند ارجمند جو اب خود ایک بزرگ ہستی ہیں اور سرکار میں ایک بہت اونچے دینی عہدہ پر فائز ہیں، عسکری کے کمرے میں پہلے سے بیٹھے ہیں۔ قرآن شریف اور تفسیر کی کتابیں کھلی ہوئی ہیں اور دونوں کسی بہت سنجیدہ قسم کے کام میں مشغول ہیں۔ عسکری نے مجھے میری مخصوص کرسی پر بٹھا دیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اجازت لینی چاہئے کیوں کہ مجھے عسکری کے چہرے پر کچھ تردد کے آثار نظر آئے۔ لمحے بھر بعد میں نے ان آثار کو بدلتے دیکھا اور پھر یکا یک عسکری نے ان بزرگ سے کہا کہ یہ ہمارے دوست راولپنڈی سے آئے ہیں، ان کے پاس وقت بھی بہت کم ہوتا ہے، ہم آپ تو یہیں ہیں۔ آپ سے انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔ میں اس دوران میں یہ کتابیں دیکھ لوں گا۔ چنانچہ وہ بزرگ اٹھے۔ عسکری ان کو دروازے تک چھوڑنے گئے۔ اندر کے راستے سے واپس آئے، وہی چائے کے لئے کہنے گئے تھے۔ تخت پر بیٹھے، سگریٹ سلگائی اور بہت اطمینان سے کہنے لگے۔ ہاں صاحب تو اب باتیں ہوں گی۔

دوستی اور خلوص کے اس رشتے میں یہ نہیں کہ ہم دونوں میں مکمل اتفاق رائے ہی پایا جاتا ہو۔ قربت اور کسی قدر بے تکلفی کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کو گفتگو میں عموماً 'آپ' کہہ کے مخاطب کرتے تھے اور خطوں میں نام کے ساتھ صاحب کا اضافہ بھی کر دیتے تھے۔ میں عسکری کا بہت احترام کرتا تھا مگر ان سے اختلاف کے پہلو بھی نکلتے رہتے تھے اور ان کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا۔ ان خطوں میں بھی جا بہ جا اس کے ثبوت موجود ہیں، مگر تعلقات کی نوعیت میں کبھی فرق نہیں آیا۔

یہ تعلقات کم و بیش پینتیس سال تک قائم رہے۔ میں عسکری سے پہلے پہل ۱۹۴۳ کی گرمیوں میں ملا تھا۔ میرے دوست امجد حسین اور میں دہلی گئے۔ اس زمانے میں میراجی مرحوم کہ جن سے ہم دونوں کو لاہور میں حلقۂ احباب ذوق کی وجہ سے ایک خاص نسبت تھی، آل انڈیا ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے دہلی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے بڑی شفقت سے اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر کہ جہاں وہ مقیم تھے ہمیں دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ میراجی نے آٹھ دس اور لوگوں کو مدعو کر رکھا ہے، جن میں زیادہ تر ریڈیو میں ان کے ادیب ساتھی تھے۔ اسی مجلس میں پہلی بار ن۔ م۔ راشد مرحوم سے ملاقات ہوئی اور وہیں عسکری سے بھی کہ وہ بھی اس زمانے میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر اسٹاف آرٹسٹ تھے۔ عسکری سفید کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ آئے اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ نشست فرشی تھی اور عسکری مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ لہٰذا میں ذرا سرک کے ان کے پاس ہو بیٹھا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ انھوں نے میرا نام سن رکھا تھا اور کرشن چندر کے ناول "شکست" پر میرا مضمون

جو "ادب لطیف" میں چھپا تھا، اور میرے کچھ اور مضمون بھی پڑھ رکھے تھے۔ عسکری تو اس وقت بطور افسانہ نگار خاصے مشہور ہو چکے تھے۔ میراجی کے ہاں سے رخصت ہوتے ہوئے دوسرے دن شام کو اردو بازار میں امامیہ بک ایجنسی کی دکان پر ان سے ملاقات طے پائی۔ میں وہاں پہنچا تو دکان پر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد عسکری مجھے باہر لے آئے اور ہم دونوں جامع مسجد کے علاقے میں بہت دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اسی دن مجھے پتہ چل گیا کہ عسکری سے ملاقات کا ایک جزو سڑکیں ناپنا بھی ہے۔ بعد کو تو میں نے ان کے ساتھ لاہور اور کراچی میں بیسیوں میل پیدل طے کیے ہوں گے۔ بہر حال اس ملاقات میں عسکری کچھ زیادہ نہیں کھلے، باتیں ضرور کرتے رہے مگر کم کم۔ البتہ میری باتیں بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ان سے "ساقی" میں چھپے ہوئے کرشن چندر پر ان کے مضمون کا ذکر کیا تو ٹال گئے اور موضوع بدل دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اب وہ اس منزل سے آگے نکل گئے ہیں۔

اگلی بار عسکری سے ملاقات دہلی ہی میں دسمبر ۱۹۴۴ میں ہوئی۔ میں ایم۔ اے۔ انگریزی کے پہلے سال کا طالب علم تھا اور کالجوں کے سالانہ مباحثوں کے سلسلے میں دہلی گیا تھا۔ وہاں پہنچا تو تاثیر صاحب مرحوم سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ جوش اور فراق آج کل یہاں ہیں، کورونیشن ہوٹل فتح پوری میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آج شام ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جانا۔ کوئی تکلف نہیں۔ میں وہاں پہنچا اور جوش اور فراق کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بڑا سا کمرہ ہے، جوش اور فراق اپنے اپنے پلنگوں پر بیٹھے ہیں، درمیان میں ایک میز پر پینے پلانے کا سامان رکھا ہے اور دور چل رہا ہے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر پلنگوں کی پائنتیوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہیں، مگر تاثیر صاحب موجود نہیں۔ اتنے میں ایک گوشے سے آواز آئی۔ آفتاب صاحب یہاں آ جائیے! یہاں آ جائیے۔ دیکھا کہ عسکری ہیں اور مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو بلا رہے ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ چلو ایک تو جاننے والا ملا۔ اتنے میں تاثیر صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے حاضرین محفل سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ جوش اور فراق کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس کا تفصیلی ذکر میں نے فراق صاحب پر اپنے مضمون میں کیا ہے۔ یہاں مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ جب فراق صاحب کافی تاؤ میں تھے اور کسی کی بات نہیں سن رہے تھے۔ عسکری اٹھے، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور احترام اور عقیدت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "فراق صاحب، اب جانے دیجیے۔ بس بہت ہو چکی۔ اب آپ اپنے شعر سنائیے۔" فراق صاحب دھیمے پڑ گئے۔ پھر کچھ اور لوگوں نے بھی ان سے شعر کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے جو اشعار سنائے ان میں سے ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے:

مری نذر محبت، پیاری پیاری جھوٹی باتیں ہیں
نہ ہوتا گر خلوص اتنا تو میں سچ بولتا تم سے

عسکری اس قسم کی محفل کے آدمی نہیں تھے۔ وہ تو دراصل فراق صاحب سے ملنے آئے تھے اور ان کے کہنے پر رک گئے تھے۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد عسکری اور میں نے اجازت چاہی۔ ہوٹل سے نکل کر ہم کچھ ادھر ادھر گھومے۔ عسکری، فراق صاحب کی باتیں کرتے رہے اور پھر اگلے دن کی ملاقات کا وقت اور مقام طے کرنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ہاں عسکری نے یہ بھی کہا کہ میں آپ کو فراق صاحب سے ضرور ملواتا مگر اب کے یہ جوش وغیرہ کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں ان سے ملنا بے کار ہے۔ دہلی کے اس قیام کے دوران میں عسکری سے دو ایک بار ملنا ہوا۔ واپس آ کر چند مہینوں کے بعد ان کے اور میرے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگست ۱۹۴۶ میں ایک دفعہ پھر میں نے دہلی کا چکر کاٹا۔ اب تو عسکری سے دوستی ہو گئی تھی۔ لہٰذا ان سے کئی بار ملنا ہوا اور خوب گپ رہی۔ اب کے عسکری نے مجھے اپنا وہ گھر بھی دکھایا جس کا نقشہ انھوں نے اپنے اس زمانے کے ایک خط میں کھینچا ہے۔

اس مجموعے کے جولائی ۱۹۴۷ تک کے خطوں سے ظاہر ہے کہ عسکری کا کوئی ارادہ پاکستان آنے کا نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد حالات بگڑنے لگے۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کشمیر گیا ہوا تھا۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں ہم لوگ واپس لاہور آئے تو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ڈاک اور تار کا سلسلہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ عسکری کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں تھی کہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان کی طرف سے ایک سروس شروع کی گئی جس کے ذریعے یہاں کے لوگ ہندوستان میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام پیغام نشر کروا سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی عسکری کے نام یہ پیغام نشر کروایا کہ فی الحال آپ فوراً لاہور آ جائیے۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس پیغام کا کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے امید تھی کہ شاید عسکری کسی یہاں آنے والے کے ہاتھ کوئی خط بھیج دیں۔ آخر اس انتظار میں اکتوبر کے دوسرے پندرہواڑے کے کسی ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ عسکری نیلے رنگ کی گرم اچکن پہنے مجھے ڈھونڈتے ہوئے گورنمنٹ کالج کے اسٹاف روم میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں آگے بڑھ کے ان سے ملا اور انھیں کالج کے ملک بار میں لے گیا کہ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ معلوم ہوا کہ عسکری نے میرا ریڈیو پیغام سن لیا تھا۔ بات تو بہت معمولی تھی، مگر انھوں نے دو تین بار کہا کہ بھئی آپ کے پیغام سے ہمیں بڑی ڈھارس ہوئی کہ ہمارا بھی کوئی پوچھنے والا پاکستان میں موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس دوران میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ اور بہن بھائی ان کے ساتھ یہاں آ گئے ہیں اور کرشن نگر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ تھا لاہور میں عسکری کا ورود، اس سے پہلے وہ کبھی ان اطراف میں نہیں آئے تھے۔ ان کو لوگوں نے لاہور کی سردی سے اتنا ڈرا رکھا تھا کہ انھوں نے اکتوبر ہی میں گرم اچکن نکال لی تھی۔ پھر جب واقعی لاہور میں سردی شروع ہوئی تو عسکری نے خوب اس کا لطف اٹھایا اور ان کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی۔

پروفیسر پطرس بخاری اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ اور تاثیر صاحب اور فیض صاحب عسکری کو دہلی سے جانتے تھے۔ اب کالج میں عسکری کا آنا جانا شروع ہوا تو میں نے کالج کے دیگر بزرگ اساتذہ قاضی اسلم، صوفی تبسم، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر سراج الدین، خواجہ منظور حسین سے کہ سب مجھ سے بہت شفقت کرتے تھے، عسکری کو ملوایا۔ مگر معاملہ علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھا۔ عسکری تھے ہی اتنے کم آمیز۔ ہاں اسی زمانے میں عسکری میرے دوست

(ڈاکٹر) اجمل سے بھی ملے اور وہ ملاقات وقت کے ساتھ مستقل دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

اس دوران میں تاثیر صاحب سے عسکری کا ملاپ بہت بڑھا۔ میرے ساتھ ان کے ہاں جاتے تھے اور اکیلے بھی۔ عسکری کا ایک فرانسیسی صحافی دوست جب لاہور آیا تو ہم دونوں اس کو لاہور کی سیر کراتے رہے۔ عسکری خاص طور پر اسے تاثیر صاحب سے بھی ملوانے لے گئے۔ آخر کو عسکری کا تاثیر صاحب سے ایسا بگاڑ ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے مگر اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

صوفی صاحب اپنی طبیعت سے مجبور، خاطر تواضع اور محفل آرائی کے شوقین، انھوں نے عسکری کو ایک شام کھانے پر بلایا اور ان کے ساتھ تاثیر صاحب، غلام عباس اور مجھے بھی۔ عسکری دیر تک بیٹھے تو رہے مگر بقول عصمت چغتائی وہی ''جی جی'' کرتے رہے۔

گورنمنٹ کالج میں بخاری صاحب کے آنے کے بعد 'مجلس اقبال' میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی اور اس کے جلسے بڑی باقاعدگی سے ہونے لگے تھے۔ عسکری ادبی محفلوں سے دور بھاگتے تھے، کسی ایسی محفل میں مقالہ پڑھنے کا تو ذکر ہی کیا۔ مگر میرے اصرار پر مان گئے۔ چنانچہ مجلس اقبال کا ایک بڑا بارونق جلسہ ہوا اور اس میں عسکری نے ایک مقالہ ''ادب میں منصوبہ بندی'' پیش کیا۔ صدارت تاثیر صاحب نے کی۔ لاہور کے سب چیدہ چیدہ اور دہلی اور یوپی سے آئے ہوئے کچھ ادیبوں مثلاً شاہد احمد دہلوی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ بخاری صاحب بھی موجود تھے۔ فیض صاحب لاہور سے باہر تھے اس وجہ سے نہیں آسکے۔ سجاد ظہیر ان دنوں لاہور میں تھے۔ بخاری صاحب نے ان کو بھی بلایا تھا۔ مگر وہ نہیں آئے۔ بخاری صاحب نے بعد میں ان کا بہت پیچھا لیا کہ تم کیوں نہیں آئے۔ بہر حال جلسہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اچھی خاصی بحث بھی ہوئی۔ مگر سب سے بڑا فائدہ ہوا کہ عسکری کا لاہور میں تووارد ہونے کا حجاب اٹھ گیا۔

عسکری کے لاہور پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد کشمیر میں جنگ چھڑ گئی۔ عسکری بڑے جوش میں آئے۔ پاکستان کے لئے ان کے دل میں بڑا جذبہ تھا ان دنوں وہ اکثر مال روڈ کے کسی خوانچے والے دہلوی مہاجر کا یہ جملہ دہرایا کرتے کہ آخر مسلمانوں کو ایک کچا گھر تو مل گیا۔ بہر حال دو ایک مہینے بعد یعنی دسمبر ۱۹۴۷ کا واقعہ ہے کہ چند ہندوستانی ادیبوں نے کشمیر کی جنگ کے بارے میں حکومت ہند کی حمایت میں ایک بیان دیا۔ غلام عباس، عسکری اور میں ایک جگہ جمع تھے کہ اس بیان کا ذکر آیا۔ عسکری اور عباس نے کہا کہ پاکستان کے ادیبوں کو بھی اس سلسلے میں بیان دینا چاہئے۔ یہ دونوں حضرات دہلی میں بھی تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے ادیبوں کے حلقے میں کام کرنے کی تجویز سوچا کرتے تھے۔ ان خطوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ غلام عباس اور میں ادیبوں کے بیان کی تیاری کے سلسلے میں پہلے تاثیر صاحب سے ملے، پھر فیض صاحب سے، اور آخر وہ بیان جب خود پطرس بخاری نے مرتب کیا تو عسکری بہت خوش ہوئے۔

سعادت حسن منٹو مرحوم بھی اس زمانے میں لاہور آچکے تھے۔ عسکری ان کو بھی دہلی سے جانتے تھے۔ یہاں جب ان سے ملے تو دونوں میں بہت دوستی ہوگئی۔ چنانچہ دونوں نے مل کر ایک رسالہ بھی نکالا، نام تھا ''اردو ادب''۔ یہ رسالہ نکلا تو بڑے ٹھاٹ سے تھا مگر دو شماروں کے بعد ہی بند ہوگیا۔ عسکری نے منٹو کے خاکے (تخلیقی ادب) میں ایک خاص واقعے کا ذکر کیا ہے، جس کے بارے میں مجھے بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ عسکری لکھتے ہیں:

> میں دو چار دفعہ گیا مگر ڈرتے ڈرتے، کیوں کہ شخصیت کی تسکین بخش داد دینے میں مجھے خاصی مشکل پڑتی ہے۔ منٹو نے پھر ہتھے پر ٹوک دیا۔ گاندھی جی کی وفات کے اگلے دن منٹو نے کہا ''یار، میں تو سمجھتا تھا کہ مجھ ہی کو رنج ہے۔ لیکن شہر میں پھر کر دیکھا، ہر شخص رنجیدہ نظر آتا ہے۔ اب تو جی چاہتا ہے میں رنج نہ کروں۔'' یہ سننے کے بعد میں جو اٹھا تو مہینے دو مہینے کے لئے غوطہ لگا گیا۔

گاندھی جی کے ہولناک قتل کے بعد عسکری نے بہت سے لوگوں سے ان کے تاثرات معلوم کئے تھے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی گہرے رنج کا اظہار کیا۔ اس پر مجھ سے ذرا بگڑ کے کہنے لگے کہ آپ کا ردعمل تو artful ہے۔ اصلی بات تو کسی نے یوں کہی ہے کہ خس کم جہاں پاک۔ عسکری عموماً اپنی گفتگو میں انگریزی لفظ نہیں بولا کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے اس کا سہارا ایک حجاب رکھنے کی خاطر لیا۔ کہنا وہ چاہتے تھے کہ میں جان بوجھ کر ایک بناوٹی بات کر رہا ہوں۔ میں نے بھی ذرا تنک کر جواب دیا کہ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میرا ردعمل وہی ہونا چاہئے جو آپ کا ہے؟ اس پر خاموش ہوگئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ مجھ سے ملنے میں انھوں نے ایک دن کا بھی غوطہ نہیں لگایا۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور نے امتیاز علی تاج کا لکھا ہوا جو پروگرام نشر کیا تھا اور جسے ہندوستان میں بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس پر عسکری بہت خفا تھے۔ عسکری کی طبیعت میں جو تلخی اور شدت تھی اس کا اندازہ تو مجھے ان کی تحریروں سے ہو چکا تھا مگر اس قسم کی نفرت کا اظہار میں نے ان کے ہاں پہلی بار دیکھا۔

عسکری کے لاہور آنے کے بعد میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی کالج میں لکچرر ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اس معاملے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی، مگر معلوم نہیں وہ کیوں اس پر تیار نہ ہوئے حالانکہ دہلی میں وہ کالج ہی میں پڑھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اب لکھنے پڑھنے کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک ناشر سے بات کر کے ترجمے کا کام شروع کر دیا اور اس میں خاصے مصروف رہنے لگے۔ کوئی سال بھر کے وقفے کے بعد جب ''ساقی'' کراچی سے نکلا تو عسکری نے بھی اپنا کالم ''جھلکیاں'' پھر سے شروع کر دیا۔ اس دوران میں وہ لاہور کے کچھ رسالوں اور روزناموں میں مضمون لکھتے رہتے تھے۔ ایک ہفتہ وار ''نظام'' نکلا تھا، انتظار حسین کی ادارت میں۔ اس میں عسکری باقاعدہ لکھنے لگے۔

ترقی پسند ادیبوں کی مخالفت جو ایک عرصے سے ان کا محبوب موضوع بن گیا تھا۔ اب بھی جاری رہی بلکہ اس میں پاکستان کے بارے میں عسکری کے والہانہ جوش و خروش کے واسطے سے کچھ اور شدت آگئی اور عسکری نے ترقی پسند

ادیبوں پر بڑے سخت حملے کیے۔ اس زمانے میں ان کا ایک موضوع پاکستانی اور اسلامی ادب کے علاوہ نئی مملکت سے ادیبوں کی وفاداری بھی تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے بعض ناروا بیانات اور فیصلوں کی وجہ سے کہ جن کو بعد میں انھوں نے بڑے تاسف کے ساتھ خود ہی غلط قرار دیا، ان کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ اس فضا میں یکایک حکومت پنجاب حرکت میں آئی اور اس نے سیفٹی ایکٹ کے ماتحت "سویرا"، "ادب لطیف"، اور "نقوش" کو چھ چھ مہینے کے لئے بند کر دیا کہ انھیں رسالوں میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں چھپتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ عسکری کو اس قسم کے سخت اقدام کی توقع نہیں تھی اور نہ وہ اس کی حمایت کر سکتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ خود احمد ندیم قاسمی صاحب نے الطاف احمد قریشی سے اپنے مکالمے ("ادبی مکالمے") کے دوران میں ہمیں بتایا ہے کہ جب سرکاری حکم کے خلاف دستخطوں کی مہم چلی تو اس میں عسکری پیش پیش تھے اور وہ اس سلسلے میں قاسمی صاحب اور منٹو کے ساتھ ایک وفد کی صورت میں پریس برانچ کے انچارج چوہدری محمد حسین سے بھی ملے تھے۔

اس زمانے میں ایک دفعہ یہ افواہ اڑی کہ کچھ ترقی پسند ادیبوں کی گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔ اب تو عسکری اور بھی زیادہ پریشان ہوئے۔ میرے سامنے جب ان کا ذکر کیا تو میری حرکت ملاحظہ فرمائیے کہ میں نے جھٹ انھیں یہ یاد دلایا کہ آپ نے جو پاکستان سے وفاداری کے سلسلے میں اتنا کچھ ان ادیبوں کے خلاف لکھا ہے اس کا بھی تو حکومت پر اثر ہوا ہوگا۔ گویا میں نے ان کی پریشانی میں "احساس جرم" کا ایک عنصر بھی گھولنا چاہا۔ اس پر پہلے تو یہ کہا کہ ہم تو اردو میں لکھتے رہے ہیں۔ حکومت کے اداروں میں اردو کون پڑھتا ہے؟ یہ تو تاثیر کا کیا دھرا ہے۔ وہی انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مگر میرے اس کہنے پر ان کو یہ احساس ضرور ہوا کہ لوگ یوں بھی سوچ سکتے ہیں۔ تاثیر صاحب پر الزام دھرنے کے بعد وہ اپنی مدافعت پر آ گئے اور کہنے لگے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں ترقی پسند ادیبوں کے خلاف نہیں لکھوں گا اور یہ کہ میں نے منٹو کو بھی اس پر آمادہ کر لیا ہے۔ کیوں کہ منٹو نے بھی اس زمانے میں ان کے خلاف کچھ مضمون لکھے تھے اس کے بعد کہا بھئی ہم تو ان کے ادبی شعور کے مخالف ہیں۔ یہ بحث مباحثے کی بات ہے۔ ہم یہ تھوڑی چاہتے ہیں کہ ان کو جیل میں ڈال دیا جائے۔

ترقی پسند ادیبوں سے تو عسکری اصولی سطح پر ادبی جنگ لڑتے تھے اگرچہ اس میں بھی وہ اکثر غیر ضروری طور پر تلخی اور شدت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ مگر یہ تلخی اور شدت، ذاتی نوعیت کی مخالفت میں تو بعض اوقات حد سے تجاوز کر جاتی تھی۔ تاثیر صاحب کے خلاف ان کی "جھلکیاں" اسی قسم کی تحریر کا ایک نمونہ ہیں۔ اس معاملے میں تو خیر عسکری کے پاس ایک جواز بھی تھا۔ تاثیر صاحب نے مختلف ناموں سے لکھے ہوئے اپنے مضامین میں عسکری پر فقرے چست کیے تھے۔ مگر عسکری کی طبیعت کا یہ رنگ ایک اور مرتبہ بھی دیکھنے میں آیا۔ خواجہ منظور حسین گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور کراچی یونیورسٹی کے ممتحن۔ خواجہ صاحب نے پرچہ سیٹ کیا اور زبانی امتحان لینے کے لئے کراچی گئے۔ عسکری کے کچھ طالب علم جو اس امتحان میں شریک ہوئے اچھے نمبر حاصل نہ کر سکے اور شاید بعض تو فیل ہی ہو گئے۔ اس پر عسکری بگڑ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ممتحن کا اپنا انداز ہوتا ہے اور اس میں اس کے کچھ ذاتی تعصبات بھی راہ پا لیتے ہیں، مگر عسکری نے یہ طے کر لیا کہ خواجہ صاحب کو نہ تو پرچہ سیٹ کرنا آتا ہے، نہ زبانی امتحان لینا۔ اور پھر اپنی مخاصمت کا برملا اظہار یوں کیا کہ لاہور کے اخبار "آفاق" میں ایک مضمون خواجہ صاحب کے خلاف لکھ مارا۔ یہی مضمون "ساقی" میں بطور "جھلکیاں" بھی شائع ہوا۔ خواجہ صاحب مرحوم میرے محترم تھے اور نہایت شریف، مہذب اور وضعدار آدمی تھے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ مجھے اس واقعے سے بہت کوفت ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد میں جب کراچی میں عسکری سے ملا تو میں نے پوچھا حضرت، یہ کیا حرکت تھی۔ کہنے لگے یار مجھے اپنے طالب علموں کی وجہ سے غصہ آ گیا تھا۔ بھئی ہم لکھنے والوں کے اپنے اندر کا زہر نکالنے کا اور کون سا طریقہ ہے اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

عسکری ابھی لاہور ہی میں تھے کہ میں نے مرکزی ملازمتوں کے مقابلے کا امتحان دیا۔ اس فیصلے میں کچھ بزرگ استادوں کا پرزور مشورہ بھی شامل تھا۔ امتحان میں کامیابی ہوئی اور مجھے فارن سروس کے لئے چن لیا گیا کہ یہی میری پہلی ترجیح تھی۔ بدقسمتی سے اس دوران میں میرے گھر کے حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ میرے لئے باہر جانا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا میں نے کسی دوسری سروس کی کوشش شروع کر دی۔ عسکری کو اس زمانے میں باہر جانے کا، خصوصیت سے یورپ جانے کا بہت شوق تھا اور وہ میرے فارن سروس میں لئے جانے پر بہت خوش تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس خوشی میں یہ طے کیا کہ وہ مجھے الوداعی تحفے کے طور پر حسرت موہانی کا انتخاب شعرائے اردو دیں گے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اور آسانی سے دستیاب نہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے یہ جلدیں اکٹھی کیں۔ آخر جب میں فارن سروس میں نہیں گیا اور اکاؤنٹس سروس میں شامل ہو گیا تو عسکری نے کہا کہ اب میں آپ کو یہ تحفہ نہیں دوں گا۔ اس کو آپ ان کی ناخوشی کا اظہار سمجھ لیجیے۔

نئی ملازمت کے بعد میں تو لاہور ہی میں رہا۔ البتہ عسکری فروری ۱۹۵۰ میں "ماہِ نو" کے ایڈیٹر بن کر کراچی چلے گئے۔ شروع شروع میں تو ان کو لاہور بہت یاد آیا۔ ایک تو کراچی کی آب و ہوا نے ان کو پریشان کیا، ان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ پھر ان کو وہاں کی عام فضا خصوصاً ادبی فضا بھی کچھ پسند نہ آئی۔ اس زمانے کے خطوں میں ان کا ذکر موجود ہے، کوئی چھ مہینے کے بعد وہ "ماہِ نو" سے تو علیحدہ ہو گئے۔ مگر اس وقت ان کو اسلامیہ کالج میں لیکچرر کی جگہ مل گئی اور وہ انتہائی دلچسپی سے پڑھانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اس دلچسپی اور انہماک کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان کی کلاس میں لڑکیاں بھی تھیں اور وہ اپنی علمیت اور قابلیت کی وجہ سے ان کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ اس مجموعے کا خط نمبر ۳۰ تو سارے کا سارا تقریباً اسی موضوع پر ہے، جس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اپنے کرار صاحب ہی نے مجھے چھیڑنا شروع کر دیا کہ مہوشوں سے صحبت گرم ہے۔"

کچھ عرصے کے بعد عسکری سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ ان میں ایک نمایاں تبدیلی آ رہی ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ پر اعتماد اور خوش نظر آنے لگے ہیں۔ چنانچہ میں نے کریدنے کی خاطر ان کو چھیڑا کہ میں کچھ سونگھ رہا

ہوں۔ آپ کے ساتھ تو شاید وہ معاملہ ہو رہا ہے اور پھر فراق کا یہ شعر پڑھا۔

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

عسکری کچھ جھینپ کر ہنس پڑے اور ان کے چہرے پر ایک رونق سی آگئی جیسے وہ میری بات کا لطف لے رہے ہوں۔ پھر بولے کہ یار بات ہے کچھ ایسی ہی۔ اس کے بعد مجھے اپنا رازدار بنایا۔ کچھ ناز و نیاز کی باتیں بھی سنائیں اپنے مخصوص نفسیاتی تجزیے اور ادبی حوالوں کے ساتھ۔

عسکری ذاتی معاملات کا ذکر قریبی دوستوں سے بھی بہت کم کیا کرتے تھے مگر اس معاملے نے ان میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ ان سے رہا نہ گیا۔ ایک دفعہ جب انھوں نے مجھے رازدار بنا لیا تو پھر خطوں میں بھی اشارے ہونے لگے۔ مثلاً اسی مجموعے کے خط نمبر ۴۵ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۵۲ میں فراق کی ایک غزل کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں'' مگر میں آج کل زیادہ سخت غزل پڑھ رہا ہوں، فراق نے تو اتنا ہی کہا ہے۔

دل الڈا سا آنکھ بھری سی
آج تو حسن بھی ہے اپنا سا

مگر ابھی فراق صاحب کے شعر میں اس بات کی جھلک نہیں آئی کہ 'آج تو آپ بالکل میرے جیسے ہو رہے ہیں'' ... خط نمبر ۵۰ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۲ میں ڈاکٹر اجمل سے ایک لڑکے کے نفسیاتی علاج کے سلسلے میں مشورے کا ذکر ہے تو وہ بھی ان خاتون ہی کے کوئی بھانجے یا بھتیجے تھے۔ اس خط میں لکھا ہے کہ'' ان لوگوں سے میرے گھر کے سے تعلقات ہیں'' ... یہ لوگ آسودہ حال تھے اور ان کے انداز زندگی میں کچھ مغربیت کا رنگ نمایاں تھا۔ اس لڑکے کے والد ایک انگریزی کمپنی میں ملازم تھے۔ چنانچہ جب میں نے لکھا کہ وہ صاحب اجمل کے پاس نہیں پہنچے، تو عسکری نے اگلے ہی خط یعنی خط نمبر ۵۱ میں یہ تبصرہ کیا کہ'' بات یہ ہے کہ انھیں دو ہزار تنخواہ ملتی ہے، اسی لئے وہ I am Antony still والے لوگوں میں سے ہیں، ممکن ہو بعد میں انھیں شرم آگئی ہو۔''

انھی لوگوں کے انداز زندگی کے زیر اثر عسکری نے اپنے لباس کا انداز بھی بدلا۔ گرمیوں میں بش شرٹ اور پتلون، اور سردیوں میں سوٹ بوٹ پہننے لگے۔ انھوں نے ان خاتون سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہٰذا وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو قابل قبول بنانا چاہتے تھے اور سوشل اسمارٹ نس کے تقاضے بھی پورے کر رہے تھے، جن کی آج تک انھوں نے پروا نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس مجموعے کے خط نمبر ۶۶ مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۵ میں مجھ سے خاص طور پر لندن سے واپسی پر اپنے لئے ایک گرم سوٹ لانے کی فرمائش کی۔ ان دنوں عسکری میں جو'' جدیدیت'' آگئی تھی اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ یکایک ان کو فوٹو گرافی کا شوق ہوا۔ لاہور آئے تو دیکھا کیمرہ ساتھ ہے، تصویریں لیتے پھر رہے ہیں۔ کراچی میں بھی اپنا یہ نیا شوق پورا کرتے رہتے تھے۔

یہ تبدیلی اپنی جگہ، مگر اس زمانے کے خطوں میں عسکری کے ہاں ایک قسم کی بے چینی جھلکتی ہے۔ وہ اسلامیہ کالج میں لکچرر تھے اور بظاہر خوش تھے۔ مگر اسی دوران انفارمیشن منسٹری میں واپس جانے کے بارے میں بھی سوچنے لگتے تھے۔ پھر اس خیال سے بدک بھی جاتے تھے۔ کراچی سے بیزار ہو کر لاہور آنا چاہتے تھے مگر پھر آتے بھی نہیں تھے۔ کبھی پاکستان ہی سے بیزار ہو کر فرانس چلے جانے کے منصوبے بنانے لگتے تھے۔ چنانچہ اسی مجموعے کے خط نمبر ۵۲ مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ میں لکھا ہے،'' میں تو اتنا بددل ہو رہا ہوں کہ جی چاہتا ہے فرانس بھاگ لوں۔ اگر شادی ہو جائے تو بیوی کو بھی سمیٹ لے جاؤں'' اس بے چینی میں اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کی خواہش بھی موجود تھی جسے وہ شادی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

بہر حال قصہ مختصر آخر عسکری کے خاندان والے باقاعدہ پیغام لے کر گئے مگر افسوس کہ بات آگے نہیں بڑھی، شیعہ سنی اختلاف نے کھنڈت ڈال دی اور اس طرح یہ معاملہ ۱۹۵۶ یا ۱۹۵۷ میں اپنے انجام کو پہنچا۔ ان خاتون کی شادی ان کے خاندان کے حسب منشا کسی اور صاحب سے ہو گئی۔ عسکری نے اس کے بعد شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا، جہاں تک مجھے معلوم ہے عسکری کی زندگی میں بس یہی ایک خاتون تھیں جو ایک زمانے میں ان کی'' رعنائی خیال'' کا مرکز بن گئی تھیں۔ اس معاملے میں وہ'' معتقد میر'' تھے۔ ان کو'' پریشاں نظری'' کا ہوکا نہیں تھا۔

اس عشق کے دوران عسکری کی زندگی میں جو ایک لہک اور امنگ پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ یوں کہنے کو تو وہ بہت لئے دیئے رہے، یوں لگتا تھا جیسے انھوں نے سب کچھ بھلا دیا ہے اور بظاہر ان کا رویہ کچھ ایسا رہا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ شادی کے بعد ان خاتون سے کبھی کبھار ملتے بھی رہے۔ مگر دراصل اس المناک ذاتی مایوسی نے ان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ میں سکڑ سمٹ کے رہنے لگے اور ان کی طبیعت کی وحشت زیادہ سختی سے عود کر آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخر کو اس واقعے نے عسکری کی زندگی میں بڑے دوررس نتائج پیدا کئے جن میں سے ایک دوسرے عسکری کا جنم بھی تھا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ذاتی مایوسی کے ساتھ ساتھ عسکری پاکستان کے حالات خصوصاً ادبی اور سیاسی حالات سے بھی مایوس ہوتے جا رہے تھے جیسا کہ اس زمانے کے خطوں سے صاف ظاہر ہے۔ سیاست سے ان کو ہمیشہ سے گہری دلچسپی رہی تھی۔ یہ دلچسپی صرف پاکستان تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ ساری اسلامی دنیا کا احاطہ کئے ہوئے تھی، خاص طور پر وہ مسلمان ممالک جو استعماری قوتوں کے مقابلے میں سرگرم عمل تھے اور اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے صدر جمال ناصر کی کتاب کس ذوق و شوق سے حاصل کر کے مجھے پڑھنے کو دی تھی اور پھر جب جولائی ۱۹۵۶ میں صدر جمال ناصر کے نہر سوئز کو قومیانے پر برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کیا تو اس پر عسکری کا ردعمل کتنا شدید تھا۔ میں اس واقعے کے چند ہی دن بعد کراچی پہنچا۔ ان کی بے تابی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں اپنے قیام کے دوران عسکری سے کئی بار ملا۔ مگر سوائے اس کے اور کسی موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی مرحوم کے'' صفر جمع صفر جمع صفر'' والے بیان پر سخت خفا تھے اور اپنے جوش و خروش میں دنیائے عرب کے اتحاد کے خواب دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب اس معاملے میں ذرا شک کا اظہار کیا تو ان کو وہ بھی ناگوار گذرا۔

چند ہی مہینوں کے بعد عسکری نے اپنے دل کی بھڑاس "امروز" کراچی ۸ نومبر ۱۹۵۲ کے کالموں میں نکالی۔ ایک خط ایڈیٹر کے نام لکھا، "پاکستانی ادیب اور مصر" اور اس پر پاکستانی ادیبوں کی خوب خبر لی کہ وہ ایسے موقع پر خاموش کیوں ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک مضمون "تھینک یو امریکہ!" لکھا۔ جس کے دوران یہ اعلان کیا:

> عالمگیر خطرے کے باوجود مصر کی حمایت میں انگلستان اور فرانس کو الٹی میٹم دے کر روس نے انسان کی لاج رکھ لی۔ انگلستان اور فرانس کے خلاف ہائیڈروجن بم استعمال کرنے کی دھمکی دراصل شیکسپیئر اور راسین (Racine) کی مدافعت کا اعلان ہے۔ اس موقع پر روس کے الٹی میٹم کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ضمیر ابھی تک مرا نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ میرے ملک میں ایسے اخبار بھی ہیں جو جنگ کے سلسلے میں آئیزن ہاور کا شکریہ ادا کر رہے ہیں اور اسے امن کا دیوتا کہہ رہے ہیں... یہ اخبار حالات کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا پاکستان اور امریکہ کا مفاد ایک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ پنڈت نہرو کی طرح ہنگری اور مصر کا نام ایک سانس میں لے رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت مشرقی یورپ زر پرستوں کے ہاتھ میں چلا جاتا تو اسلامی ممالک کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑ گیا تھا۔ لیکن ہمارا فرض تو یہ قرار پایا ہے کہ اسلامی ممالک کا اور ساتھ میں پاکستان کا جو بھی حشر ہو ہم بہر حال "تھینک یو امریکہ" کہے جائیں۔

یہ ۱۹۵۶ کی بات ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی پاکستان میں امریکہ کا بول بالا ہوئے کئی برس گذر چکے تھے، مگر ایسا موقع کہ جب پاکستان میں ایک اسلامی ملک کے مقابلے میں امریکہ کا ساتھ دینا ضروری سمجھا گیا ہو، شاید پہلی دفعہ پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ عسکری اس پر تلملا اٹھے۔ استعماری قوتوں، بلکہ یوں کہئے کہ سرمایہ دار ملکوں کی پالیسیوں سے عسکری کو جو نفرت تھی اس کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا رہتا تھا۔ یونگ کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> زر پرست دنیا کا پیغمبر فرائڈ نہیں بلکہ یونگ ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ زر پرستی، جھوٹ، نمائش پسندی اور ریاکاری کے سماجی ماحول میں رہ کر بھی بلکہ اس ماحول سے سمجھوتا کر کے بھی ذہنی صحت اور دماغی ترقی ممکن ہے۔ یونگ کو جس طرح آگے بڑھایا جا رہا ہے، انسانیت، علم، ادب، بلکہ بنیادی اخلاقیات کے لئے بھی ایک عظیم خطرہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ سید سبط حسن مرحوم نے عسکری کے انھی مضامین کی بنا پر الطاف احمد قریشی سے اپنے مکالمے ("ادبی مکالمے") کے دوران امریکہ، روس اور عسکری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> وہ بہت ایماندار اور مخلص آدمی تھے۔ چنانچہ یہاں امریکیوں نے ان کو اپنے ڈھب پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اس طرح سے جب روس کے خلاف بہت ہنگامہ ہوا تو مجھے یاد ہے کہ انھوں نے کئی مضامین سوویت یونین کے حق میں "امروز" میں لکھے... انھوں نے کبھی سوشلزم کی مخالفت نہیں کی۔ کبھی اس کے خلاف نہیں لکھا۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ عسکری کے تصور کا پاکستان ایک "عوامی اور اشتراکی ریاست" تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے مئی ۱۹۴۶ کی "جھلکیاں" شروع تو ہوئی تھیں "نئی زندگی" کے پاکستان نمبر کے ایک نہایت مخالفانہ تبصرے سے، مگر انھی میں عسکری نے شاید پہلی بار اپنے سیاسی نقطۂ نظر کا بھرپور اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

> چونکہ اس وقت مسلم لیگ ہر قسم کی استعماریت، استبداد اور سرمایہ داری کی مخالفت کر رہی ہے، چونکہ مسلم لیگ کا پاکستان برِاعظم ہندوستان میں سب سے پہلی عوامی اور اشتراکی ریاست ہوگا اور پاکستان کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہوگا بلکہ خود ہندو عوام کے لئے بھی، چونکہ دنیا سے سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور مستقل امن و امان قائم کرنے میں پاکستان سے بہت مدد ملے گی، اس لئے میں مسلم لیگ سے متعلق ہونا فخر کی بات سمجھتا ہوں۔

اس وقت مسلم لیگ نے جو کچھ بھی کہا اور کیا اور بعد میں پاکستان کا جو حال ہوا وہ الگ بات ہے۔ یہاں مجھے فقط یہ عرض کرنا ہے کہ عسکری کی امیدوں کا پاکستان کسی ترقی پسند ادیب کے خوابوں کے ملک سے ہرگز مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ترقی پسند ادیب ان امیدوں کو مسلم لیگ سے وابستہ نہیں کرتے تھے، مگر پھر خود عسکری جس طرح مسلم لیگ اور پاکستان کی پالیسیوں سے مایوس اور برگشتہ ہوئے وہ بھی ہم نے دیکھ لیا۔

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ عسکری نے اشتراکی ریاست کے بارے میں اپنے تصور کی وضاحت تو نہیں کی مگر میرا خیال ہے کہ یہ کچھ برطانوی اور بعض دوسرے یورپی ممالک کی اشتراکیت سے ملتا جلتا تھا نہ کہ روسی اشتراکیت سے۔ سوشلزم کے ماتحت روسی معاشرہ، اس کا ادب اور اس کا نظریۂ ادب، اس کے اندر اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ابھرتے ہوئے رجحانات تو ہمیشہ ان کی تنقید کی زد میں رہے۔ لہٰذا سبط حسن صاحب کا یہ کہنا کہ عسکری نے کبھی سوشلزم کی مخالفت نہیں کی، کبھی اس کے خلاف نہیں لکھا، محلِ نظر ہے۔ کہنے کو تو جس

زمانے میں عسکری کی جھلکیاں ترقی پسند ادیبوں کے خلاف طنزیہ اور کاٹ دار جملوں سے اٹی پڑی ہوتی تھیں تب بھی انھوں نے ایک دفعہ یہ صراحت کی تھی کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں روس کے سوشلسٹ نظام کے خلاف ہوں۔ میں تو اسے انسانیت کی تاریخ میں ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہوں۔ بہر حال روس کے سوشلسٹ نظام کو وہ کچھ بھی سمجھتے ہوں، امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں بلکہ اپنے ملک میں ان کے حاشیہ برداروں کے بھی وہ سخت مخالف تھے اور آخر دم تک مخالف رہے۔

اس معاملے میں عسکری کسی قسم کی رورعایت اور رواداری برتنے کے قائل نہیں تھے۔ دوستوں اور بزرگوں پر بھی اگر شک ہو جائے تو بخشتے نہیں تھے۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم سے ''ساقی'' کے واسطے سے بہت دیرینہ رفاقت تھی۔ ذاتی تعلقات بھی تھے۔ پھر ان تعلقات میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی ہو، مگر جو وجہ خود عسکری نے مجھے بتائی وہ یہ تھی کہ یار شاہد صاحب امریکنوں سے بہت ملنے جلنے لگے ہیں۔ پھر ایک امریکی فیلوشپ پر ان کے سیٹو (SEATO) کے رکن ملکوں کے دورے کا بھی ذکر کیا۔ اب یہ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت تک شاہد صاحب یہ دورہ کر چکے تھے یا کرنے والے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے دیکھا کہ ''ساقی'' کے سرورق پر عسکری کا نام قلمی معاونین میں تو موجود رہا مگر ''جھلکیاں'' غائب ہو گئیں۔ یہ گویا ان کی کنارہ کشی کی ابتدا تھی۔ غالباً یہ ۱۹۵۷ کے آخر کی بات ہے۔

ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا اور چند ہی مہینوں بعد کراچی میں رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتدائی تجویز تو جمیل الدین عالی اور ان کے چند احباب کی تھی مگر قدرت اللہ شہاب نے اس کو عملی جامہ پہنانے میں بڑا کام کیا اور وہی گلڈ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ شہاب صاحب اس زمانے میں جنرل ایوب خاں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان کے سکریٹری تھے۔ ان کی وساطت سے گویا گلڈ کو مارشل لا انتظامیہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ گلڈ کے افتتاحی اجلاس میں ایوب خان مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے اور انھوں نے حاضرین سے خطاب بھی فرمایا تھا۔ شاہد احمد دہلوی اس افتتاحی اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور گلڈ کی کارروائیوں میں بہت پیش پیش تھے۔ عسکری کے لاہور سے بلائے جانے والے دوستوں میں ناصر کاظمی، انتظار حسین اور میں شامل تھے۔ مجھے تو عسکری نے شاید اس خیال سے معاف کر دیا کہ میں سرکاری ملازم تھا (یہ واقعہ ہے کہ مجھے اس سلسلے میں میرے اس وقت کے افسر اعلیٰ یعنی محکمہ دفاع کے مشیر مالیات برنی صاحب کا پیغام بھی آیا تھا) اور یہ معاملہ ہی سرکاری ہو گیا تھا۔ مگر ناصر کاظمی اور انتظار حسین کا انھوں نے بہت پیچھا کیا۔ گلڈ سے متعلق شاہد صاحب نے ''ساقی'' کا مخالفانہ پروپیگنڈے پر مشتمل ''سوویت ادب'' نمبر نکالا۔ اب تو عسکری کو شاہد صاحب کے ''امریکہ تعلق'' پر یقین ہو گیا۔ چنانچہ وہ ''ساقی'' سے باقاعدہ طور پر علیحدہ ہو گئے اور اپنا نام قلمی معاون کی فہرست سے بھی واپس لے لیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عشق میں ناکامی کے بعد یعنی ۱۹۵۶، ۱۹۵۷ کے لگ بھگ عسکری کچھ اپنے آپ میں سکڑ سمٹ کر رہنے لگے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی ذہنی زندگی میں ایک انقلاب آنا شروع ہوا۔ چنانچہ خط نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۶ میں لکھتے ہیں: ''یار میں جان بوجھ کر لاہور نہیں آیا۔ آج کل میں اعتکاف میں بیٹھ گیا ہوں۔ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اب میں افسانے لکھنے کی فکر میں یوں ہوں۔'' یہ افسانے تو خیر نہ لکھے گئے، البتہ ذہنی انقلاب جاری رہا اور ۱۹۵۸ کے مارشل لا کے بعد اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ اب میرا تبادلہ کراچی ہو چکا تھا اور میں اکثر شام کو عسکری کے ہاں چلا جایا کرتا تھا۔ انھوں نے واقعی ایک قسم کا مراقبہ اختیار کر رکھا تھا۔ لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر تصوف اور دینی مسائل پر کتابیں پڑھنے لگے تھے اور اس شغل میں ان کا انہماک دیدنی تھا۔ رینے گینوں (Rene Guenon) سے تو وہ تقریباً بارہ برس پہلے متعارف ہو چکے تھے۔ چنانچہ خط نمبر ۳۵ میں جو ۸ جولائی ۱۹۴۷ کو لکھا گیا، اس کا حوالہ موجود ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے جملہ مسائل کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اور مصیبت یہ ہے کہ کسی کتاب سے مدد بھی تو نہیں ملتی۔ اقبال تک سے میری تسلی نہیں ہوتی، اور مجھے تو اسلام بڑا mediocre مذہب نظر آتا ہے۔ سنا ہے کہ ایک فرانسیسی رینے گینوں نے اپنی کتاب Crisis of the Modern World میں اسلام کے متعلق کچھ معقول باتیں لکھی ہیں۔ وہ ہندو فلسفے کا عالم ہے اور مسلمان ہو گیا ہے۔ رہتا بھی ہے بالکل عربوں کی طرح۔ ممکن ہے اس نے کچھ تشفی بخش باتیں بتائی ہوں۔

چنانچہ عسکری نے اسی رینے گینوں کو اپنا گرو بنایا۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ عسکری نے یورپ کو انگریزی سے زیادہ فرانسیسی ادیبوں کے واسطے سے دریافت کیا تھا اور اب اسلام کی دریافت کے لئے بھی انھوں نے ایک فرانسیسی مفکر ہی کا سہارا لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ انھیں فرانس سے ایک عجیب قسم کا لگاؤ تھا۔ اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی وہ فرانس کی فضاؤں میں سانس لیتے نظر آتے تھے۔ اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی انھوں نے فرانسیسی زبان میں غیر معمولی استعداد پیدا کر لی تھی۔

عسکری کی طبیعت کا ایک خاصہ یہ تھا کہ وہ جو کام بھی کرتے پوری دل جمعی سے کرتے۔ اپنے ذہنی سفر میں جس طرف نکل جاتے پورے ذوق و شوق اور انہماک سے اس راہ پر چلتے اور نئی نئی سرزمینوں کا کھوج نکالتے رہتے۔ ان کے دل میں اشیا کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی بے اندازہ طلب تھی۔ چنانچہ وہ لکھنؤ کی شاعری کا مطالعہ کرتے کرتے مسلمانوں کی تہذیب میں حواس خمسہ کی دنیا اور تمثیلات کا جائزہ لینے لگے اور اس سلسلے میں پہلے قرآن سے رجوع کیا پھر اس کی تفسیر کے لئے ابن عربی اور ''فصوص الحکم'' تک پہنچے اور پھر فلسفے اور تصوف کی دوسری کتابوں تک۔ انھوں نے اپنے آپ کو گویا ان علوم میں بند کر لیا تھا۔ علم اور ذہنی زندگی سے اس قسم کا لگاؤ اور انہماک میں نے اپنے جاننے والوں میں بہت کم دیکھا ہے۔ مجھ سے وہ مسلسل اپنی دلچسپیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے اور مجھے ان میں شرکت کی ترغیب بھی دیتے رہتے تھے۔ دوستوں کے معاملے میں یہ ان کا ہمیشہ

دستور تھا مگر مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ عسکری اب ایک اجنبی اور نئی منزل کے مسافر ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں جو خط مجھے موصول ہوئے ان میں سے صرف دو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ دوسرے ہی خط سے صاف ظاہر تھا کہ عسکری اس نئی منزل کی راہ میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ برابر آگے ہی بڑھتے گئے۔ چنانچہ جب میں ۱۹۶۵ کے وسط میں واپس کراچی پہنچا اور عسکری سے ملا تو میں نے دیکھا کہ دوسرا عسکری اب پہلے عسکری کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اس سے بہت حد تک گریزاں ہے۔ گفتگو کے دوران البتہ پہلے عسکری کی جھلکیاں نظر آجاتی تھیں مگر اب عسکری کی دنیا بدل چکی تھی، ان کے معمولات بھی اور ان کی اصطلاحات اور حوالے بھی۔

کراچی میں ایک آدھ مہینہ گذارنے کے بعد میں لاہور آگیا۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں نے وہیں دیکھی۔ لاہور میں تقرر کے زمانے میں اور پھر ڈھاکے میں تقرر کے زمانے میں کراچی کے چکر بہرحال لگتے رہے اور عسکری سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں مگر میری مصروفیتوں کی وجہ سے زیادہ تر رواروی میں۔ چنانچہ میں نے دوسرے عسکری کو ڈھاکے سے تبدلے کے بعد چار مہینے کی اس چھٹی کے دوران دریافت کیا جو میں نے کراچی میں گذاری۔ اس زمانے میں فرصت ہی فرصت تھی۔ پڑھنے لکھنے اور عسکری سے گپ کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

عسکری نے اپنی نئی دلچسپیوں کے بارے میں مجھے صرف آگاہ ہی نہیں کیا، بلکہ باقاعدہ میری تعلیم کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے تو رینے گینوں کی Crisis of the Modern World پڑھوائی، پھر اس کے کچھ مضامین۔ اس کے علاوہ انگریزی اور اردو کی بہت سی اور کتابیں جن میں سے ایک کتاب مولانا حسین احمد مدنی کی "نقش حیات" بھی تھی جس میں مولانا نے اپنے ذاتی حالات وکوائف کے بیان کے ساتھ ساتھ مسائل اور واقعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر کڑی تنقید کی گئی تھی اور خالص دینی نقطۂ نظر سے بھی انھیں گمراہی کا مرتکب سمجھا گیا تھا۔ عسکری مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے سخت مخالف تھے اور ان کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنی نے جو کچھ لکھا تھا اس کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔

بات یہ تھی کہ ان معاملات میں عسکری کے نزدیک علمائے دیوبند کا نقطۂ نظر ہی مستند تھا۔ رینے گینوں سے دینی روایت کی مرکزیت اور اہمیت کا سبق سیکھنے کے بعد عسکری نے برصغیر میں اس روایت کا نمائندہ اور پاسبان علمائے دیوبند کو قرار دیا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن ان کے خیال میں ۱۸۵۷ کے بعد کے زمانے کے سب سے بڑے آدمی تھے اور مولانا حسین احمد مدنی ان کے شاگرد اور رفیق کار تھے۔ لیکن وہ پاکستان کے مخالف تھے اور عسکری پاکستان کے پرجوش حامی۔ لہٰذا عسکری نے مولانا محمود الحسن کے ایک دوسرے شاگرد یعنی مولانا اشرف علی تھانوی کا دامن تھاما کہ وہ بھی روایت کے صحیح نمائندہ اور پاسبان تھے اور انھوں نے سیاست میں جناح صاحب کی قیادت قبول کرتے ہوئے پاکستان کی حمایت کی تھی۔ عسکری نے ان کو اپنا پیر ومرشد بنا لیا تھا اور آخر کار ادبی معاملات میں بھی مثلاً مومن، ذوق اور غالب کے بارے میں وہ مولانا کی تصریحات ہی کو دہرانے لگے تھے۔ اس لئے کہ ادبی روایت دینی روایت سے الگ نہیں ہو سکتی تھی اور دینی روایت کا نمائندہ ہی ادبی روایت پر بھی حکم لگا سکتا ہے۔ یہ منطق عسکری کی اپنی تشفی کے لئے کافی تھی۔

مختصر یہ کہ ۱۹۷۰ کے ابتدائی مہینوں میں کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے میں نے محسوس کیا کہ اب دوسرا عسکری نہ صرف یہ کہ ایک نئی مرکزیت کی بنیاد پر اپنی ایک نئی شخصیت کی تعمیر کر چکا ہے اور اس عمارت کے تمام رخنے اور دراڑیں بھی بند کر چکا ہے بلکہ یہ کہ وہ اب اس میدان میں ایک قدآور شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب مفتی محمد شفیع صاحب اور دار العلوم کراچی کے دوسرے بزرگوں سے ان کی علمی صحبتیں رہتی تھیں اور کراچی سے لے کر اکوڑہ خٹک تک دینی حلقوں میں ان کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ انھوں نے اپنی وہ کتاب یعنی "جدیدیت" بھی لکھ دی تھی جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ کتاب کے شروع میں ناشر نے اطلاع دی ہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۱ کے پہلے دو تین مہینوں میں مرتب کی گئی تھی۔ یہ درست نہیں کیوں کہ عسکری نے مجھے اس کا مسودہ ۱۹۷۰ جنوری یا فروری میں پڑھنے کو دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ انھوں نے اسے دار العلوم کراچی کے طلبہ کے لئے ایک خاص قسم کے کورس کے Notes یعنی اشارات کے طور پر تیار کیا تھا۔ کسی وجہ سے یہ کورس نہ چل سکا اور انھوں نے یہ مسودہ واپس لے لیا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ عسکری نے اسے اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا تھا۔

مسودہ پڑھنے کے بعد جب میں نے اسے عسکری کو لوٹایا تو اس موضوع پر بات چیت ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے نقطۂ نظر سے گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ تو بہت عمدگی سے کھینچا ہے مگر ان گمراہیوں کی بے پناہ یورش کے سامنے اور ان عوامل کے پیش نظر جو ان کے زیر اثر خود ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ چکے ہیں، میں آپ کے اس مسودے کے آخری جملے ہی سے مکمل اتفاق کر سکتا ہوں یعنی یہ کہ اللہ اپنے دین کی حفاظت کرے گا!

مجھے یاد ہے کہ میرے اس فقرے پر عسکری کچھ نہیں بولے، کسی قدر محظوظ ہوئے اور مسکرا کر بات کا رخ پلٹ دیا۔ بات یہ ہے کہ عسکری اپنی اس قسم کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں سے مجھے آگاہ تو کرتے رہتے تھے مگر مجھ سے ان معاملات میں کسی گہری ذہنی رفاقت کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کی دوستی بہرحال ہم دونوں کو عزیز تھی اور آخر دم تک عزیز رہی۔ لہٰذا وہ میری کبھی کبھی کی شوخ گفتاری سے صرف نظر کر دیتے تھے۔ ان معاملات میں ان کی ذہنی رفاقت تھی ڈاکٹر اجمل سے، جو اس لحاظ سے عسکری کے بہت قریب آگئے تھے۔ یہ رفاقت شروع تو ہوئی تھی اجمل کے خاص مضمون "جدید نفسیات" میں عسکری کی دلچسپی سے اور ختم ہوئی ان دونوں کی مولانا اشرف علی تھانوی سے عقیدت اور ارادت پر۔

اسی دوران میں ایک دن عسکری مجھ سے کہنے لگے، مغربی تعلیم کے رعب میں آکر ہمارے علما بھی دینی مدرسوں کے طلبہ کو اپنا پرانا فلسفہ پڑھانا غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ مغرب میں اب پڑھے لکھے لوگ اس فلسفے کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور اپنے ہاں کے فاسق وفاجر لوگوں کو بھی علما کی بات سننے کا

شوق ہونے لگا ہے۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا" جیسا کہ مجھے۔" اس پر عسکری ہنس پڑے اور میں نے فقرہ بازی کا انداز جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جناب آپ فاسق و فاجر لوگوں کو ایسی نگاہ کم سے نہ دیکھا کیجئے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مولانا عبید اللہ سندھی کو دیو بند کے مولویوں اور علی گڑھ کے انگریزی پڑھے لکھوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا کام سپرد کیا تھا۔ پروفیسر سرور نے مولانا سندھی سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ شیخ الہند نے مولانا سندھی کو یہ قطعہ بھی لکھ کر دیا تھا:

ایمن مشو کہ مرکب مردان مرد را
در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش
ناگہ بہ یک خروش بہ منزل رسیدہ اند

عسکری نے قطعہ سنا تو ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ کہنے لگے، یار مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔ چنانچہ فوراً قلم اٹھایا اور یہ قطعہ ایک کاپی میں نوٹ کر لیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ وہ بھی تو شیخ الہند کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ ان پر بڑا اعتماد بھی کرتے تھے۔ آپ کے معیار کی رو سے تو وہ بھی روایت کے نمائندہ اور پاسبان ہوئے۔ عسکری مولانا سندھی کو یہ مرتبہ دینے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں مولانا کے سوشلزم پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کہا بھی تو یہ کہا کہ وہ تو سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔

عسکری اس قسم کے تعصبات سے بالا نہیں تھے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ وحدت الوجود کے قائل تھے کہ جو عملاً مختلف مذاہب میں رواداری ہی نہیں، اشتراک اور وحدت کے اصول کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر مختلف مذاہب تو رہے ایک طرف، عسکری مسلمانوں کے اندر بھی فرقہ بندی کی تمیز کو سختی سے روا رکھتے تھے اور انتظار حسین نے تو لکھا ہے کہ مسجد میں نماز پڑھنے سے پہلے یہ پوچھتے تھے کہ یہ دیو بندیوں کی ہے کہ بریلویوں کی۔

عسکری نے مولانا سندھی کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ مولانا سندھی جب چوبیس برس کی جلاوطنی کاٹ کر ۱۹۳۹ میں واپس وطن آئے تو سوشلزم کے علاوہ ان کے خیالات میں اور بھی کئی ایسی تبدیلیاں آچکی تھیں کہ جن کو "جدیدیت" کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ الہند کے محبوب شاگرد اور مستند دیو بندی ہونے کے باوجود ان کے اور علمائے دیو بند کے ایک با اثر گروہ کے درمیان ہمیشہ سے اختلاف کا ایک پردہ حائل رہا تھا۔ اس لئے عسکری ان کو روایت کا نمائندہ ماننے پر تیار نہیں تھے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اختلاف کا ایک اور پردہ تو علمائے دیو بند اور مولانا اشرف علی تھانوی کے درمیان بھی حائل تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے شیخ الہند کی تحریک آزادی ہند سے اجتہادی اختلاف کیا تھا اور انگریزی حکومت کی حمایت اور اس سے وفاداری کو جائز قرار دیا تھا جو علمائے دیو بند کو بھی گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ 'مسلک اشرفی' کو جد و جہد پر عافیت کوشی کو ترجیح دینا قرار دیتے تھے اور مولانا سندھی تو بقول پروفیسر سرور مولانا اشرف علی تھانوی کے علم و فضل اور ارشاد و سلوک کے قائل ہوتے ہوئے بھی ان کی اس روش سے بہت خفا تھے اور اپنی خفگی کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔ بہر حال عسکری سے بحث کرنا میرا دستور نہیں تھا اور ان معاملات میں تو میرا علم بھی ان کے مقابلے میں بہت ناقص تھا۔

اسی دوران یعنی ۱۹۷۰ کی ابتدا سے یحییٰ خان کے مارشل لا میں جب سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو عسکری کی دبی ہوئی رگ سیاست پھر پھڑکی۔ تحریر میں تو نہیں، لیکن گفتگو کی حد تک وہ پھر سیاست میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ انھیں پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کی فکر رہتی تھی۔ احمد سوئیکارنو، جمال عبد الناصر اور ان کے بعد معمر قذافی، یاسر عرفات، جو مسلمان لیڈر مغرب کی استعماری قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو وہ عسکری کا ہیرو تھا۔

وہ ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اسی قبیل کا لیڈر سمجھتے تھے اور ملکی سیاست میں اب وہی ان کے ہیرو تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ بھئی ایک طرف تو آپ ساری خرابیوں کا الزام مغرب پر ڈالتے ہیں اور دوسری طرف آپ بھٹو جیسے مغرب زدہ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میرے اس اعتراض کا جواب بھی انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی ہی کے حوالے سے نکال لیا۔ کہنے لگے کہ جب حضرت مولانا نے جناح صاحب کی حمایت کی تو ان سے بھی یہی سوال کیا گیا تھا۔ ان کا جواب تھا کہ سیاست کی دنیا میں مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کا سامنا ہے۔ ان کے ہتھکنڈے جناح صاحب خوب سمجھتے ہیں۔ ان کا توڑ وہی کر سکتے ہیں۔ مغرب زدہ ہیں تو کیا، مسلمان تو ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مفاد کا سودا نہیں کریں گے۔ بھٹو کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے، آج کی دنیا کی سیاست اور مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کو وہ سمجھتے ہیں اور وہی ان سے نپٹ سکتے ہیں۔

جب ۱۹۷۰ کے انتخابات کا ہنگامہ شروع ہوا تو اسلام پسند جماعتوں کی طرف سے ایک فتوے کا اشتہار نکلا جس میں سوشلزم کی حمایت کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہدف اس کا ذوالفقار علی بھٹو تھے کیوں کہ انھی کی جماعت نے سوشلزم کو اپنے پروگرام میں شامل کیا تھا۔ اس فتوے پر عسکری کے ممدوح مفتی محمد شفیع صاحب کے بھی دستخط تھے۔ میں نے جب عسکری سے اس کے متعلق بات کی تو وہ کچھ جھینپ سے گئے۔ کہنے لگے کہ اصل میں مفتی صاحب کے ایک بیٹے انگریزی پڑھ گئے ہیں اور وہ اب سیاست میں ان کے مشیر ہو گئے ہیں۔ ان کو جماعت اسلامی والوں نے ورغلایا ہے۔ چالاکی دیکھئے کہ مودودی نے خود تو دستخط نہیں کئے اور مفتی صاحب سے کروا لئے۔ عسکری جیسا ذہین آدمی بعض اوقات اس قسم کی بچکانہ باتیں بھی کر دیا کرتا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۰ میں انتخابات ہوئے۔ نتیجہ نکلا تو مغربی پاکستان میں بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کامیاب اور جماعت اسلامی ناکام۔ عسکری بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس کو پاکستان میں امریکہ کی شکست گردانا۔ سلیم احمد جو عسکری سے

گذشتہ پچیس برس سے بہت گہرے عقیدت مندانہ تعلقات رکھتے تھے اور ادب میں ان کے خلیفہ سمجھے جاتے تھے اور خود عسکری بھی ان کو بہت عزیز جانتے تھے، اس دوران میں جماعت اسلامی سے منسلک ہو چکے تھے۔ عسکری نے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ پہلے میں جب کراچی جاتا تھا تو عسکری، سلیم کو اپنے ہاں بلوا لیتے تھے یا ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہم دونوں سلیم کے گھر پہنچ گئے۔ اب یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ بہر حال سلیم نے انتخابات میں جماعت اسلامی کی ناکامی پر نثر میں ایک طویل مرثیہ بلکہ یوں کہیے کہ "ملک آشوب" لکھا۔ جماعت اسلامی سے سلیم کے تعلق کا تو مجھے علم تھا مگر جس قسم کی شدت جذبات کا اظہار انھوں نے اس مضمون میں کیا تھا اور جس انداز سے جماعت کی ناکامی کا سوگ منایا تھا مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اگلی دفعہ جب میں کراچی گیا تو میں نے بر سبیل تذکرہ عسکری سے پوچھا کہ یہ سلیم کو کیا ہوا؟ آپ نے اس کا وہ مضمون دیکھا تھا؟ عسکری بولے "جی ہاں۔ امریکنوں سے پیسے کھالئے ہوں گے۔" میں نے حیرت سے کہا: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" کہنے لگے: "یار سب چلتا ہے۔ چلئے چھوڑیے اس قصے کو۔"

یہ بھی عسکری کی طبیعت کی اسی تلخی اور شدت کا مظاہرہ تھا کہ جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ سلیم سے چونکہ ناراض تھے لہٰذا ان کے بارے میں اس قسم کی بات کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ عسکری نے آخر سلیم احمد سے قطع تعلق کر لیا اور پھر مرتے دم تک ان سے نہیں ملے۔ سلیم نے کئی دفعہ کوشش کی، پروفیسر کرار حسین صاحب کو بھی بیچ میں ڈالا۔ مگر عسکری نے مان کے نہیں دیا۔ عسکری کے مرنے پر میں نے سنا ہے کہ سلیم سخت بے قرار تھے مگر چہرہ دیکھنے سے بھی ڈرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مجھ سے خفا گئے ہیں۔

۱۹۷۱ میں ملک جس خوں چکاں دور سے گذرا، ظاہر ہے کہ عسکری اس سے دل برداشتہ تھے۔ مگر حالات نے جو صورت اختیار کر لی تھی آخر اس کا نتیجہ وہی ہونا جو ہوا۔ مغربی پاکستان بچ گیا، اب اس کی خیر منائیے۔ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا۔ ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے۔ لوگوں میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ عسکری کو تو بہر حال ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ چنانچہ وہ بھٹو صاحب کی تقریریں اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں سننے کے لئے گھر میں ٹی وی سیٹ لے آئے۔ باقی پروگراموں کو تو وہ لہو و لعب سمجھتے تھے۔ وقت گذرتا گیا اور آخر ۱۹۷۷ کے انتخابات آگئے۔ کراچی کی ایک نشست کے لئے پیپلز پارٹی نے جمیل الدین عالی کو بھی ٹکٹ دیا تھا۔ عسکری اس پر بہت خوش تھے۔ خود مجھ سے کہا کہ بھئی دیکھیے بھٹو صاحب نے ادیبوں کا بھی خیال رکھا۔ عالی کا مقابلہ جماعت اسلامی کے ایک امیدوار سے تھا۔ شاید اسی بنا پر عسکری نے عالی کے لئے اپنے دوست احباب میں کچھ کام بھی کیا اور پھر انتخابات کے دن بڑے شوق سے ان کے حق میں ووٹ ڈالنے بھی گئے۔ جماعت کا امیدوار کامیاب ہوگیا۔ اس پر بڑے ناخوش ہوئے اور کراچی والوں کو برا بھلا کہنے لگے۔

انتخابات کے نتائج کے فوراً ہی بعد بھٹو صاحب کے خلاف پی۔ این۔ اے۔ کی تحریک شروع ہوگئی۔ جب اس نے زور پکڑا اور بھٹو حکومت کا سنگھاسن ڈولنے لگا تو عسکری سخت پریشان اور فکر مند ہوئے۔ انھوں نے اس میں "اسلام کے دشمنوں کی عداوت" اور "کافروں کے عزائم" کا ہاتھ دیکھا اور پاکستان کی سلامتی اور بقا کے لئے خطرہ مضمر پایا۔ عسکری کے ان جذبات کا اظہار اس زمانے میں سہیل احمد کے نام ("محراب" ۱۹۷۹) اور پیش نظر مجموعے کے خطوط نمبر ۸۶،۸۵ اور ۸۷ میں تحریری طور پر ہوا ہے جہاں انھوں نے پاکستان کے حفظ و امان کے لئے خاص طور پر دعائیں مانگی ہیں۔ زبانی تو انھوں نے مجھ سے کچھ اور بھی کہا۔ ان کو یقین تھا کہ بھٹو اور پیپلز پارٹی ہی پاکستان کو بچا سکتی ہے۔

جولائی ۱۹۷۷ میں بھٹو کی حکومت ختم ہوئی۔ ایک دفعہ فوج پھر اقتدار میں آئی اور ملک میں مارشل لا کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ستمبر میں میری ان سے ایک مختصر سی ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو بہت غمگین پایا۔ نومبر میں البتہ ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بھٹو مرحوم قتل کے الزام میں گرفتار کئے جا چکے تھے اور مقدمہ شروع تھا یا ہونے والا تھا۔ میں نے عسکری کو اس قدر پژمردہ اور گرفتہ دل اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سوائے بھٹو کی بات کے انھوں نے اور کوئی بات نہیں کی۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا بھٹو بچ جائیں گے؟ میں نے کہا مجھے تو موجودہ حالات میں یہ مشکل نظر آتا ہے۔ مگر اس کا انحصار اس پر بھی ہے کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے فوراً مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں لوگ بھٹو کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اجمل صاحب کا کیا خیال ہے؟ میں نے جواب دیا کہ آخر بھٹو کے خلاف ملک میں کچھ مواد تو موجود تھا اور ساتھ ہی بتایا کہ اجمل کہہ رہے تھے کہ لوگوں میں کچھ ambivalent متضاد جذبات پائے جاتے ہیں۔ عسکری کو یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ چنانچہ انھوں نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا کہ آپ اور اجمل صاحب جس قسم کے لوگوں سے ملتے ہیں ان میں متضاد جذبات پائے جاتے ہوں گے۔ میں تو 'گولیمار' کے رہنے والوں سے ملتا ہوں۔ ان کے ہاں کوئی ایسے متضاد جذبات نہیں ہیں، وہ تو سب بھٹو کے ساتھ ہیں۔ عسکری نے ایک ترنگ میں آکر یہ کہہ تو دیا مگر میں ملاقات کے دوران برابر یہ محسوس کرتا رہا کہ ان پر ایک گھٹا ٹوپ مایوسی کا عالم طاری ہے اور دل پر جیسے ایک بوجھ سا ہے، اس ملاقات کے دو مہینے بعد اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔

میں نے اس مضمون میں عسکری کی دو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں میں جو بعد اور دوری ہے وہ خود عسکری کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ اب یہ سوال کہ دوسرے عسکری کو جنم دینے میں کون سے عوامل کار فرما تھے، ایک گونہ اہمیت تو رکھتا ہے مگر اس کا کوئی حتمی جواب مہیا کرنا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اس کا تعلق اس بنیادی معمے سے ہے کہ کسی ایک فرد کے ذہنی اور نفسیاتی تقاضے اور میلانات بدلتے ہوئے ماحول میں مختلف قسم کے اثرات قبول کرتے ہوئے، اس کی شخصیت کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ مزید برآں، یہ سوال عسکری جیسی شخصیت کے معاملے میں کہ جس کی ذہانت اور طباعی ایک خیال کی رائی سے ایک پورے نظریے کا پہاڑ بنا سکتی ہو، اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہاں ایک بات نہ بھولئے کہ عسکری نے اگرچہ افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر ادب سے ان کی دلچسپی محض اس کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں تک محدود نہیں تھی۔ وہ ادب کو ہمیشہ سے ایک قوم کی تہذیبی علامت سمجھتے تھے۔ اردو ادب ان کے نزدیک اس

مرکزی تہذیبی روایت کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا جسے وہ ہند اسلامی تہذیب کا نام دیتے تھے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس تہذیب کے ہندوی عناصر سے بھی انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ مسلم لیگ سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی لکھا تھا:

> جہاں تک ہندو کلچر کا تعلق ہے اس سے مجھے عقیدت ہی نہیں محبت بھی ہے اور میں نے اس محبت کو کبھی چھپا کر بھی نہیں رکھا۔ اس بات کا بھی موید ہوں کہ ہندو کلچر میں جو اچھی باتیں ہیں مسلمانوں کو ان سے ضرور متاثر ہونا چاہئے۔

(جھلکیاں" ساقی"، مئی ۱۹۴۶)

ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام سے ان کی وابستگی زیادہ بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ اسلام کے دینی اور فکری تصورات، خصوصیت سے برصغیر کی سرزمین میں پیدا ہونے والے اسلام کے تہذیبی مظاہر، اس خطے میں مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی زندگی کے نمونے اور ادب میں ان کا اظہار، شروع دن سے انھیں بہت عزیز تھا۔ عسکری پاکستان میں بھی برصغیر کی اسی مرکزی تہذیبی اور ادبی روایت کا فروغ چاہتے تھے۔ ان کی یہی خواہش پاکستان کے لئے ان کے ابتدائی جوش و جذبہ کی بنیاد بھی تھی۔ یہاں آنے کے بعد پہلے تو انھوں نے اسلامی ادب کی بات شروع کی اور ترقی پسند ادیبوں سے وفاداری کے سلسلے میں ایک ادبی جنگ لڑی مگر جب حکومت نے ان کے رسالوں کے خلاف پابندیاں عائد کیں تو اس پر احتجاج کیا۔ پاکستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار منٹو کے حق میں زوردار مضمون لکھے اور اس کے ساتھ مل کر ایک رسالہ جاری کیا۔ پھر ایک سرکاری رسالہ سے منسلک ہوئے مگر جلد ہی اس سے علیحدہ ہو گئے اور کالج میں لکچراری کے ساتھ ساتھ ایک آزاد ادیب کی زندگی گذارنے لگے۔ چنانچہ پاکستان میں ادب اور زندگی کے مسائل سے وہ ذہنی طور پر متعلق رہے اور ان کے بارے میں لکھتے بھی رہے۔ یہاں تک کہ سویز کے معاملے میں ادیبوں اور اخباروں کے رویے کی آڑ لے کر پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ مختصر یہ کہ آزاد ملکوں میں خصوصیت سے فرانس میں ادیب اور دانشور اپنے ملکی معاملات پر رائے زنی کا جو کردار ادا کرتے ہیں کچھ اسی قسم کا تصور عسکری نے بھی اپنے ذہن میں قائم رکھا تھا اور حتی المقدور وہ یہ کردار ادا بھی کرتے رہے۔ خصوصیت سے ادب اور کلچر کے معاملات میں پاکستان میں اظہار و بیان کے وسائل کچھ ایسے وسیع نہیں تھے مگر پھر بھی عسکری کے لئے پہلے دس سال تک تو "ساقی" کی "جھلکیاں" موجود تھیں اور مضمون اگر ذرا مختلف قسم کا ہو تو جیسا کہ ہم نے دیکھا، "امروز" کے کالم بھی۔ مختصر یہ کہ پاکستان میں حالات کی رفتار سے اگرچہ غیر مطمئن تھے، مگر اتنا تو تھا کہ اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر کے وہ اپنے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے۔ مگر جب اکتوبر ۱۹۵۸ میں ایوب خان کے مارشل لا کا نفاذ ہوا تو اظہار کے یہ سب وسائل یکایک مسدود ہو گئے اور بقول راشد اس ملک میں "آوازوں کا رزق" ہی بند ہو گیا۔

عسکری نے ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کا خواب دیکھا تھا کہ جس میں مسلمان عوام ایک جمہوری نظام کے ماتحت زندگی بسر کریں گے۔ مگر اب تو حالات کا رخ کسی اور ہی طرف تھا۔ عسکری پاکستان میں امریکی اثر و رسوخ سے نالاں تھے مگر مارشل لا کی حکومت کی پالیسیوں سے صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ اب یہ اثر و رسوخ اور بڑھے گا۔ عسکری کو اپنے سب خواب مسمار ہوتے ہوئے نظر آئے۔ حالات کی اس نئی کروٹ نے عسکری کو بالکل بوکھلا دیا۔ انھوں نے اس سے ایک صدمے کا اثر لیا۔

مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۱۹۵۸ کی چھٹیوں میں وہ لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس وقت تک فیض صاحب سمیت کچھ ادیبوں کی گرفتاریاں بھی ہو چکی تھیں۔ ایک شام عسکری میرے ہاں بیٹھے تھے اور ہم ملکی حالات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ عسکری سخت پریشان اور فکرمند ہیں۔ اتنے میں میرے دوست امجد حسین کہ اس زمانے میں پاکستان ٹائمز میں رپورٹر تھے، وارد ہوئے اور آتے ہی سبط حسن کی گرفتاری کی تازہ خبر سنائی۔ عسکری بالکل سناٹے میں آگئے۔ اردو ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ انگریزی میں کہا This is cold terror اور خاموش ہو گئے۔

میں عسکری کی جذباتی زندگی میں محرومی اور ناکامی کے اس صدمے کا ذکر کر چکا ہوں کہ جس نے ان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس سے ابھی پوری طرح سنبھلے نہیں تھے کہ یہ ایک نیا صدمہ کہ جس کی نوعیت اگرچہ بالکل مختلف تھی، عسکری کے لئے ایک تازہ محرومی لے کر آیا۔ مارشل لا نے ان کا سب سے بڑا اثاثہ یعنی ان کا قلم چھین لیا اور یوں وہ اپنی شخصیت کے سب سے قوی تقاضے کی تسکین یعنی اظہار سے محروم ہو گئے۔ عسکری کے ہر وقت مصروف رہنے والے ذہن کا تقاضائے اظہار ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ سیاسی سطح پر جبر و استبداد سے نبرد آزما ہونا عسکری کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو ایک کھلی اور آزاد فضا میں قلم کی جنگ ہی لڑ سکتے تھے، لیکن اب اس کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، وہ ایک قسم کے مراقبے میں چلے گئے اور آخر کار ان کی "واماندگی شوق" انھیں اسلام کی دینی اور متصوفانہ فکر کی راہ پر لے آئی کہ جس میں اظہار پر کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ ڈیڑھ دو برس کے مراقبے کے بعد جب عسکری ایک نئے ماہنامے "سات رنگ" کے صفحات پر طلوع ہوئے تو وہ ایک دوسرے عسکری تھے۔

عسکری نے ذہنی زندگی کی جو راہ اب اختیار کی تھی اس پر وہ ایک دفعہ چل پڑے، تو پھر چلتے ہی گئے۔ اور اگلے اٹھارہ برس یعنی اپنی زندگی کے آخری ایام تک انھوں نے اس میں وہ منزلیں طے کیں کہ جن کا اوروں نے کبھی نشان بھی نہ پایا تھا۔ ان کی عمر بھر کی بے قراری کو ان معنوں میں تو قرار آ گیا کہ انھیں اپنی ذہنی زندگی کے منتشر اجزا کو مجتمع کر کے اس کے لئے ایک مرکزی تصور مل گیا اور ان کے ہاں اسی کی کمی پائی جاتی تھی۔ عسکری کی بے تاب روح اس حصول کی سرشاری کے ساتھ ذہنی اور تہذیبی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس مرکزی تصور کی نمود کا نظارہ کرنے کے لئے بھی بے تاب رہتی تھی۔ چنانچہ تصوف اور سلوک کے رموز کی چھان بین کرتے ہوئے وہ سماع اور موسیقی سے پرانے صوفیہ کے باہمی ربط و تعلق پر تحقیق کرنے لگے۔ اس سلسلے میں وہ پہروں استاد امراؤ بندو خان سے راگ سنتے تھے اور

ان کے بارے میں سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی معلومات حاصل کرتے تھے۔
فکر ونظر کی یہ نئی دعوت ہی اب عسکری کی زندگی بن چکی تھی۔ وہ ہمہ وقت دینی فکر اور تصوف کے بارے میں معلومات کی فراہمی، متعلقہ مسائل پر غور و خوض، اور ان کے مضمرات کی جانچ پرکھ میں لگے رہتے تھے۔ وہ اپنے حالات میں مگن تھے۔ انھوں نے اپنے ماضی یا پہلے عسکری کو باقاعدہ جھٹلانے یا مسترد کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بس اس کو بھلا دیا۔ اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ عسکری کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جب وہ کسی سے قطع تعلق کر لیتے تھے تو پھر کبھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ان کی محفل میں اس کا ذکر تک نہیں ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جو سلوک عسکری نے اپنے دو دوستوں شاہد احمد دہلوی اور سلیم احمد سے کیا، دوسرے عسکری نے بھی پہلے عسکری سے وہی سلوک کیا۔
میری ملاقات اور دوستی اگرچہ پہلے عسکری سے ہوئی تھی مگر دوسرا عسکری بھی "تفاوت رہ" کے باوجود آخر دم تک میرا دوست رہا اور اس نے اس معاملے میں مجھے کبھی کسی قسم کی دوری کا احساس نہیں ہونے دیا، بلکہ اپنے طور پر کسی نہ کسی انداز میں مجھے شریک سفر بھی رکھا۔ جب عسکری نے مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تو ان کا اصرار تھا کہ میں بھی اسے ایک نظر دیکھ لیا کروں۔ چنانچہ پیش نظر مجموعے کے خط نمبر ۸۰ (۱۱ ستمبر ۱۹۷۵) میں اس ترجمے کی ایک قسط بھیجتے ہوئے مجھے لکھا ہے: "آپ کو میں نے جو حصہ دکھایا تھا وہ تو آپ نے سرسری طور سے دیکھا تھا۔ بہر حال مجھے تسلی ہوگئی تھی۔ اب اسے پڑھ کر مجھے مناسب مشورہ دیجیے۔"
سید سبط حسن نے اسی مکالمے میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ عسکری کے بارے میں یہ بھی کہا ہے اور بہت ٹھیک کہا ہے کہ:

> وہ ان لوگوں میں سے تھے کہ خود ایمانداری سے جو چیز محسوس کرتے تھے، اس پر کام کرتے تھے، عمل کرتے تھے، ان کو آپ خرید نہیں سکتے تھے، کوئی بھی انھیں خرید نہیں سکتا تھا، نہ ہی انھیں متاثر کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ وہ سمجھ لیں کہ یہ مخلص ہے اور دیانت دار ہے۔

پہلا عسکری ہو یا دوسرا، بنیادی بات تو یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے وقت میں اور اپنی اپنی جگہ اصلی اور سچے تھے۔ ان میں کوئی کھوٹ اور ملاوٹ نہیں تھی۔ عسکری کا خمیر بڑی خالص مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ اپنے تعصبات، اپنے تضادات، اور اپنی بوالعجبیوں کے باوجود انھوں نے ہمیشہ وہی کیا جو صحیح اور درست سمجھا اور پھر اس پر عمل بھی کیا۔ اپنے خیالات کے اظہار میں بھی انھوں نے کسی خاص مصلحت، کسی ذاتی مقصد برآری کو کبھی دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ہمیشہ اخلاقی اور ذہنی دیانت داری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ آخر میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بطور ایک دوست کے ذاتی طور پر میری زندگی میں عسکری کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ کسی اور دوست سے نہ کبھی پورا ہوا، نہ ہو سکے گا ☆☆☆

غزل

آفتاب حسین

شمارہ ۲۸۲،
جولائی ۲۰۰۴

انا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں
بلا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

گھٹن کے دن ہوں کہ جھکڑ سے چلتے رہتے ہوں
ہوا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

مہکتی رہتی ہے لفظوں میں کوئی خوشبو سی
صبا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

وہ حال ہے کہ خموشی کلام کرتی ہے
صدا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

وہ ہاتھ جیسے کہیں اب بھی دل پہ رکھا ہو
حنا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

گرفت میں ہوں کسی بت کی آفتاب حسین
خدا کو باندھتا رہتا ہوں اپنے شعروں میں

آفتاب حسین

شمارہ ۲۸۲،
جولائی ۲۰۰۴

کسی نظر نے مجھے جام پر لگایا ہوا ہے
سو کرتا رہتا ہوں جس کام پر لگایا ہوا ہے

غلط پڑے نہ کہیں پہلا ہی قدم یہ ہمارا
کہ ہم نے آنکھ کو انجام پر لگایا ہوا ہے

تمام شہر مشرف بکفر ہو کے رہے گا
یہ جس قماش کے اسلام پر لگایا ہوا ہے

لگا رکھے ہیں ہزاروں ہی اپنے کام پر اس نے
ہمیں بھی کوشش ناکام پر لگایا ہوا ہے

پلاتا رہتا ہوں دن رات اپنی آنکھ سے پانی
شجر یہ دل میں ترے نام پر لگایا ہوا ہے

وہ اور ہوں گے جو آرام سے گذار رہے ہیں
ہمیں تو اس نے کہیں لام پر لگایا ہوا ہے

گذرتے وقت کی کوئی نشانی ساتھ رکھتا ہوں
کہ میں ٹھہراؤ میں بھی اک روانی ساتھ رکھتا ہوں

سمجھ میں خود مری آتا نہیں حالات کا چکر
مکاں رکھتا نہیں ہوں لامکانی ساتھ رکھتا ہوں

گذرنا ہے مجھے کتنے غبار آلود رستوں سے
سو اپنی آنکھ میں تھوڑا سا پانی ساتھ رکھتا ہوں

فنا ہونا اگر لکھا گیا ہے میرے ہونے میں
تو میں تجھ کو بھی اے دنیائے فانی ساتھ رکھتا ہوں

آل احمد سرور

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

جدیدیت کا ایک تاریخی تصور ہے۔ ایک فلسفیانہ تصور ہے اور ایک ادبی تصور ہے۔ مگر جدیدیت ایک اضافی چیز ہے، یہ مطلق نہیں ہے۔ ماضی میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو آج بھی جدید معلوم ہوتے ہیں۔ آج ایسے لوگ ہیں جو در اصل ماضی کی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور آج کے زمانے میں رہتے ہوئے پرانے ذہن کے آئینہ دار ہیں۔ ہمارے ملک میں مجموعی طور پر جدیدیت انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ جدیدیت مغرب کے اثر سے آئی ہے۔ یورپ میں نشاۃ الثانیہ نے ازمنۂ وسطیٰ کو ختم کر دیا۔ ہمارے یہاں نشاۃ الثانیہ مغرب کے اثر سے انیسویں صدی کے وسط میں رونما ہوا۔ یورپ میں جدیدیت کی تاریخ تین سو سال سے زیادہ کی ہے، ہمارے یہاں سو ڈیڑھ سو سال کی۔ اس لئے جدیدیت نے جو رنگ یورپ میں بدلے ہیں ان کے پیچھے کشمکش اور آویزش کی خاصی طویل تاریخ ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں جدیدیت نوعمر ہے اور ہندوستانی ذہن ابھی تک مجموعی طور پر اور پورے طور پر جدید نہیں ہو سکا ہے۔ اس پر ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کا اب بھی خاصا اثر ہے۔ اگر ذہن جدید بھی ہو گیا ہے تو قومی مزاج جو صدیوں کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، اب بھی ازمنۂ وسطیٰ کے تصورات سے نکل نہیں سکا ہے۔

مگر چونکہ بیسویں صدی کی منزلیں دہائیوں میں طے ہوتی ہیں اس لئے گذشتہ بیس پچیس سال میں جدیدیت کے ہر روپ اور رنگ کے اثرات ہمارے یہاں بھی ملنے لگے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے مجموعی طور پر جدیدیت کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔ اس کا معروضی طور پر تصور نہیں ہوتا۔ ایک بڑا گروہ جو ابھی پرانے تصورات میں گرفتار ہے، اس جدیدیت کو مغرب کی نقالی اور اپنی تہذیب سے انحراف کہہ کر اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ایک چھوٹا گروہ جو نسبتاً بیدار ذہن رکھتا ہے اور اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، جدیدیت کو اپنانا چاہتا ہے۔ مگر اس گروہ میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو جدیدیت کی روح کو سمجھتا ہے اور اس کے ہر روپ کا تجزیہ کر کے اس سے مناسب توانائی اخذ کرتا ہے، مگر دوسرا گروہ موجودہ آزادیٔ خیال اور جدید نسل اور قدیم نسل میں خلیج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے وجود کی اہمیت کو منوانے کے لئے اور اپنے مختلف ہونے کا جواز پیش کرنے کے لئے جدیدیت کے نام پر ہر سماجی اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داری سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ جدیدیت کی اندھی پرستش یا اس پر سستے اور سطحی تبصرے کے بجائے اس کا معروضی مطالعہ کیا جائے، اس کی خصوصیات متعین کی جائیں اور ان خصوصیات کی روشنی میں اس کی قدر و قیمت اور ضرورت کو واضح کیا جائے۔ پھر ادب میں اس کا ارتقا آسانی سے دیکھا جا سکے گا اور ہم طرف داری یا جانب داری کے بجائے سخن فہمی اور سنجیدہ شعور کا ثبوت دے سکیں گے۔

ادب میں جدیدیت کے واضح تصور کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ پہلے جو کام مذہب یا فلسفہ بڑی حد تک انجام دیتا تھا، اب یہ دونوں کے بس کا نہیں رہا۔ ہاں ادب اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مذہب یا فلسفیانہ نظاموں کی گرفت کے ڈھیلے ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ ادب اس خلا کو پر کر سکتا ہے یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے عقائد میں بڑے رخنے پیدا کئے ہیں۔ اور جہاں اس لئے بے پناہ علم، بے پناہ طاقت، بے پناہ تنظیم، خاصے بڑے پیمانے پر یکسانیت، نئے نئے ادارے، ایک عمومیت اور آفاقیت پیدا کی ہے، وہاں بہت سی نئی مشکلات، نئی الجھنیں، نئے خطرے اور نئے دسوسے بھی دئے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے جو کلچر پیدا ہوا ہے اس نے مشین کا کام لے کر انسان کو بہت طاقت اور بڑی دولت عطا کی۔ لیکن اس نے انسان کے اندر جو جانور موجود ہے اس کو رام کرنے میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ تمام تر سائنس اور ٹیکنالوجی کا قصور نہیں ہے کیوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اس معاملے میں غیر جانب دار ہے، مگر اس نے جب پرانی بندشوں کو ڈھیلا کیا، پرانے عقائد اور نظریات پر ضرب لگائی تو نئے فتنوں کو بھی جنم دیا۔ پھر اس نے عقل کی پرستش ایک میکانکی انداز سے کی اور اس چیز کو نظر انداز کیا جسے بعض فلسفی "حیات بخش عقل" اور اقبال "عشق" کہتے ہیں۔ اس نے باطن اور اس کے اسرار کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ اس نے محنت کے ساتھ تفریح کے مواقع پیدا کیے اور تفریح کو سستے ہیجان یا بے معنی مصروفیت کے لیے وقف کر دیا۔ جیسے جیسے تفریح کی ضرورت بڑھتی گئی ویسے ویسے تفریح ایک ایسا زہر بنتی گئی جو بالآخر ذہن کی صحت کو مجروح کر دیتا

ہے۔ اس نے ہلاکت کے ایسے آلے ایجاد کیے جن کی وجہ سے انسانیت کا مستقبل ہی مشکوک نظر آنے لگا۔ اس نے جنگوں کو اور ہولناک بنادیا اور فوجوں کے علاوہ شہری آبادی کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ اس نے انسان سے فطرت کی آغوش چھین لی اور غدار شہروں کی ویرانی میں اسے تنہائی کا احساس دلایا۔ اس نے فرد پر جماعت کی آمریت لادی اور ایک بے رنگ یکسانیت کی خاطر انفرادی صلاحیتوں اور میلانوں کو مجروح کیا۔ اس نے جبلت کو پست اور عقل کو بلند سمجھا مگر جبلت نے اس سے اپنا انتقام لے لیا۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیدا کردہ مسائل کے حل کے لئے کچھ لوگوں نے ایک فلسفیانہ بشریت کا سہارا لیا، کچھ نے ایک طرح کی وجودیت کا اور کچھ نے ایک نئے ہیومنزم کا۔ مگر یہ سب نے محسوس کیا کہ انسانیت کے درد کا درماں صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے پاس نہیں ہے۔ انسان کو ایک عقیدے، ایک لنگر ایک سمت اور میلان کی ضرورت ہے، اور گو ایسا میلان مذہب یا فلسفہ اب بھی دے سکتا ہے، مگر اس کو دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے، اس کے جذبات کو آسودگی اور روح کو شادابی عطا کرنے کے لئے، ادب کے راستے فاقہ زدہ جذبات کے سیرابی کا سامان کر کے، لفظ کے علامتی استعمال سے اس کا جادو جگا کر، دو تہذیبوں کی خلیج کو پر کیا جاسکتا ہے اور انسانیت کے لئے نشہ اور نجات دونوں کا سامان بہم پہنچایا جاسکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ ادب میں جدیدیت کے واضح تصور پر موجودہ دور میں ادب کے صالح رول کا انحصار ہے کیوں کہ اس صالح رول پر انسانیت کی بقا کا دارومدار ہے۔ انسانیت کی بقا صرف ادب میں نہیں سائنس میں بھی ہے۔ مگر صرف سائنس اسے تباہی کی طرف لے جاسکتی ہے اور صرف ادب کے نتائج ہم پہلے دوروں میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے جدید ادب کے عرفان پر ادب کا ہی نہیں انسانیت کا مستقبل بھی بڑی حد تک منحصر ہے۔ سائنس اور ادب دونوں اب حقیقت کی تلاش کے دو راستے مان لئے گئے ہیں اور دونوں کے درمیان بہت سی پگڈنڈیاں بھی ہیں اور پل بھی۔

جدید دور میں ادب کی اہمیت اور ادب کے راستے سے انسانیت کی نجات پر زور دینے کی ایک اور وجہ ہے۔ اور وہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں زبان کے امکانات سے ناواقفیت اور لفظ کے امکانات اور لفظ کے جادو اور لفظ اور ذہن کے تعلق، اور لفظ کی وضاحت اور ذہن کی براقی، اور ادب میں لفظ کے رمزی اور علامتی اور تخیلی اور تخلیقی استعمال کی وجہ سے اس کی شخصیت پر اثر، اور پورے آدمی تک اس کی رسائی کی اہمیت۔ پھر یہ بات بھی فطری ہے کہ انسان جو روزی کی جستجو اور جینے کی مہم کے سر کرنے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے بعض اوقات ان قدروں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے وجود کو معنویت اور معیار عطا کرتی ہیں جن سے آدمی انسان بنتا ہے اور جو تہذیب و اخلاق کو ایک قیمتی سرمایہ بناتی ہیں۔ اس لئے ادب کے ذریعہ سے ان قدروں کو جس طرح جاگزیں کیا جاسکتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی نوائے سینہ تاب بنایا جاسکتا ہے، اس کا احساس بھی ضروری ہے۔ ہاں اپنے دور کے فیشن اور فارمولا کی وجہ سے اس کے سارے امکانات پورے منظر اور پورے وجود کے متعلق غلط فہمی ممکن ہے جسے دور کرنا ہر لحاظ سے ضروری ہے۔

جدیدیت کسے کہتے ہیں؟ وہ کون سی آواز ہے جو اس دور کے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں مشترک ہے خواہ یہ شاعر اور ادیب ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ وہ کون سی خصوصیت ہے جو ہم کسی نہ کسی طرح پہچان لیتے ہیں اور جب کسی فن پارے میں اسے پاتے ہیں تو بے ساختہ اس سے محبت یا نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس خصوصیت، آواز، مزاج یا روح کو ہم کیسے واضح کریں؟ کیا یہ علامتی رنگ ہے؟ کیا یہ پرائیویٹ حوالہ Reference ہے۔ کیا یہ مختلف اور متضاد آوازوں کے ٹکرانے کا دوسرا نام ہے؟ کیا یہ ابدی قدروں کے بجائے وقتی اور ہنگامی قدروں کی عکاسی ہے؟ کیا یہ تعمیم کے بجائے منفرد، یا شخصی، انداز کہی جاسکتی ہے؟ کیا اس کی روح طنزیاتی ہے یا کنایاتی اور بظاہر ایک سنجیدگی اور اس سنجیدگی کے پردے میں طنز جسے ہجو ملیح بھی کہہ سکتے ہیں؟ کیا یہ ہیرو پرستی کے خلاف اعلان جنگ کا نام ہے اور ہر ہیرو کے مٹی کے پاؤں دکھا کر سب کو ہیرو بنانے کا حیلہ؟ کیا بت شکنی کے پردے میں یہ ایک نئی بت پرستی ہے؟ کیا اس کا مقصد محض کسی شہرت کی سطحیت کو واضح کرنا اور کسی آئیڈیل ادارے یا شخصیت کے ساتھ جو جذباتی غلاف ہے اس کا پردہ چاک کرنا ہے؟ کیا یہ انسان کی بلندی کا رجز ہے یا اس کی پستی کا المیہ؟ کیا یہ سائنس کا قصیدہ ہے یا اس کا مرثیہ؟ کیا یہ علوم کی روشنی سے ادب کے کاشانے کو منور کرنے کا دوسرا نام ہے یا ایک نوزائیدہ بچے کے حیرت خوف اور جستجو کے جذبے کی مصوری؟ کیا یہ انسانی شعور کے ارتقا کی کہانی کا تازہ ترین باب ہے یا اس کے لاشعور کے تہ در تہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش؟ کیا یہ روایت، فن، قدیم سرمائے کی صدیوں کی کمائی سے محرومی اور اس پر ہٹ دھرمی کی آئینہ دار ہے یا بیزاری اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ سچی بے اطمینانی اور تجربے کی آخری حدوں کو ضبط تحریر میں لانے کا نام ہے؟

یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہیں جو کیے جاسکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان میں سے ہر سوال ایک جواب بھی رکھتا ہے جو اپنی جگہ غلط نہیں۔ مگر تعبیروں، توجیہوں، تصویروں کے اس جنگل میں ایک واضح اور جامع تصور آسان نہیں۔ پھر بھی یہ کوشش ضروری ہے۔

پہلے اس سلسلے میں کچھ شاعروں کی روح کی پکار سن لینا چاہئے۔ یہ طریقہ گو سائنس اور فلسفے کا نہ ہو، لیکن اس سے بہت سے مسائل خود حل ہو جائیں گے۔

بودلیر اپنی ایک نظم میں دو آوازوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک کہتی ہے کہ زمین ایک میٹھا کیک ہے۔ اگر تم اسے کھالو تو بے پناہ مسرت ملے گی اور تمہاری بھوک بھی اسی زمین کے برابر کی ہوجائے گی۔ دوسری کہتی ہے، آؤ خوابوں میں سفر کرو، جو معلوم ہے اس کے آگے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اس وقت سے میرے غم، میرے مقدر کا آغاز ہوتا ہے۔ وجود کی وسعت کے بعد تاریک غار میں میں عجیب دنیائیں دیکھتا ہوں اور اپنی غیر معمولی بصیرت کے جلوے کی سرشاری میں ایسے سانپ اپنے پیچھے گھسیٹا پھرتا ہوں جو میرے جوتوں کو کاٹتے ہیں۔

ایک دوسری نظم میں وہ سستے اوزان کو ایک ایسے جوتے سے تشبیہ دیتا ہے جو بہت بڑا ہے اور اس قسم کا ہے کہ ہر پاؤں میں آسکتا ہے اور ہر پاؤں سے اتارا جاسکتا ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے کہ خطابت Eloquence کی گردن ماردو۔ اور جب یہ کر رہے ہو تو قافیے کی بھی کچھ اصلاح کرو، کیوں کہ اگر ہم اس پر کڑی نگاہ نہ رکھیں تو نہ معلوم یہ کیا گل کھلائے۔

ایک اور نظم میں بودلیئر کہتا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ منزل ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور چونکہ یہ کہیں نہیں ہے، اس لئے کسی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔ ''انسان جس کی امیدیں کبھی مضمحل نہیں ہوتیں ہمیشہ ایک پاگل کی طرح آرام کی تلاش میں دوڑتا رہتا ہے۔ مگر سچا مسافر جو بے سفر کی خاطر نکلے جس کے ساتھ سفر میں غبارے کی طرح ہلکا دل ہو۔ جو اپنی تقدیر سے گریز نہ کرے اور ہمیشہ کے لئے چلے، بغیر جانے کہ کیوں۔''

لورکا (Lorca) کی ایک نظم میں خانہ بدوشوں کی شہری محافظوں کے ایک دستے سے لڑائی دیکھئے:

جج محافظ دستے کے ساتھ زیتون کے درختوں سے ہو کر آتا
ہے، خون جس میں پھسلن ہے اپنی خاموش ناگ دھونی میں
کراہتا ہے۔

والٹ وٹمین (Walt Whitman) خطاب کر رہا ہے:

ادوار اور گذرے ہوئے واقعات عرصے سے وہ مسالہ جمع
کر رہے ہیں جس کو مناسب سانچہ نہیں ملا۔ امریکہ معیار لایا
ہے اور ہے مخصوص اسالیب۔ ایشیا اور یورپ کے غیر فانی
شاعر اپنا کام کر چکے اور دوسرے کروں کو رخصت ہوئے۔
ایک کام باقی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس پر بازی لے
جانے کا کام۔

''ایسٹ کوکر'' (East Coker) نامی نظم میں الیٹ اپنی ابلاغ کی مشکلات اس طرح بیان کرتا ہے:

پس میں یہاں ہوں درمیانی راستے میں، بیس سال مجھے
ملے۔ بیس سال جو زیادہ تر ضائع ہوئے لفظوں کا استعمال
سیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ اور ہر کوشش ایک بالکل نیا
آغاز ہے اور ایک مختلف قسم کی ہار، کیوں کہ آدمی صرف یہ سیکھ
پایا ہے کہ لفظوں سے کس طرح بازی لے جائے ان چیزوں
کے لئے جو اسے اب کہنا نہیں ہیں، یا اس طرح جس طرح
اب وہ انھیں کہنے کے لئے راضی نہیں ہے۔ پس ہر کوشش
ایک نیا آغاز ہے، واضح تلفظ پر ایک حملہ میلے ساز و سامان
سے جو برابر ناقص ہوتا جاتا ہے جذبے کی غیر قطعیت کے
عمومی ہجوم میں۔

ایک اور جگہ الیٹ کہتا ہے:

مسافر و آگے بڑھو، ماضی سے فرار نہ کرتے ہوئے مختلف
زندگیوں میں یا کسی مستقبل میں۔ تم وہی نہیں ہو جنھوں نے
اسٹیشن چھوڑا تھا یا جو کسی ٹرمنس تک پہنچ گئے۔

مایا کووسکی (Mayakovsky) نعرہ لگاتا ہے:

جہاں آدمی سے اس کی نظر کاٹ دی گئی ہے، بھوکوں کے
سروں کے قریب جو ابھرتے ہیں انقلاب کے کانٹوں دار
تاج میں، میں انیس سو سولہ کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں
اور تمھارے ساتھ... میں اس کا پیش گو ہوں اور ہمارا سیارہ
محبت کے لئے مناسب و موزوں نہیں ہے۔ ہمیں اپنی مسرت
مستقبل میں سے چیز نکالنا ہے اس زندگی میں مرنا مشکل نہیں
ہے زندگی کرنا، یقیناً زیادہ مشکل ہے۔

آڈن (Auden) ''پہلی ستمبر'' میں کہتا ہے:

میرے پاس جو کچھ ہے ایک آواز میں ہے
جس سے بار بار لپٹے ہوئے جھوٹ کو کھول دوں
وہ رومانی جھوٹ جو سڑک پر چلنے والے شہوانی آدمی کے دماغ میں ہے
اور اقتدار کا جھوٹ
جس کی عمارتیں آسمان کو ڈھونڈھتی ہیں
ریاست... ایسی کوئی چیز نہیں ہے
اور کوئی تنہا وجود نہیں رکھتی
بھوک کوئی چارہ کار نہیں دیتی
نہ شہری کو اور نہ پولیس کو
ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنا ہے یا مر جانا ہے۔

کنگسلی ایمس (Kingsly Amis) اپنی کتاب Poets of the 1950's میں کہتا ہے: اب کوئی فلسفیوں، مصوروں، ناول نگاروں یا نگار خانوں یا دیومالا، یا بیرونی ملکوں کے شہروں کے متعلق اور نظمیں نہیں چاہتا۔ کم سے کم میں توقع کرتا ہوں کہ کوئی نہیں چاہتا۔ اور فلپ لارکن (Philip Larkin) کہتا ہے، مجھے روایت پر کوئی اعتقاد نہیں، نہ ایک عام اساطیری زنبیل میں اور نہ نظموں میں، کبھی کبھار دوسری نظموں یا شاعروں کی طرف اشارے۔ آڈن نے بہت پہلے اس شاعری کی طرف اشارہ کیا تھا جو ترس (Pity) میں ہے۔ رابرٹ گریوز (Robert Graves) کہتا ہے کہ مایوسی سے ایک اسٹائل سیکھو۔ لارکن کہتا ہے، ''بدی میرے دوست صرف یہی ہے۔ ایک سچ جسے ہم نہیں سمجھتے۔'' ڈگلس (Douglas) کہتا ہے کہ آج جذباتی ہونا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے خطرناک ہے۔

رومانی شاعر اپنے آپ کو ایک ہیرو سمجھتا تھا۔ سماج اسے کچھ سمجھے، اسے اپنے پر بھروسا تھا۔ وہ اپنی مخصوص نظر کی مدد سے سماج کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا اور سیاسی لیڈر اور پیغمبر کا بار اٹھانے کے لئے بھی تیار تھا۔ جدید شاعر کو جو بصیرت ملی ہے وہ اسے اپنے کو سمجھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ رومانی شاعر کے لئے بچپن روح کی

دنیا کی آواز سننے کے لئے ایک کھوئی ہوئی معصوم جنت تھا۔ جدید شاعر کے لئے بچپن میں بلوغ کے قبل از وقت اشارے بھی ہیں۔ اب فن کار جس دنیا کو دیکھتا ہے، نہ صرف اس دنیا کے متعلق، بلکہ اپنے متعلق بھی اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے تخلیق کے متعلق اس کا تصور بدل گیا ہے۔ جدید شاعری سے پہلے نظم آئینے کی طرح شفاف ہوتی تھی۔ مواد جتنا پیچیدہ ہے اتنی ہی فن میں مہارت کی ضرورت ہے۔ رمز کہتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور والی بات۔ جدید شاعر یہ دیکھتا ہے کہ مصرع خیال سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، اور ایک پیچیدہ بحث اتنی ہی الجھی ہوئی اور اکھڑی اکھڑی زبان میں بیان کرتا ہے تاکہ خیال کے موڑ اس کا ابہام اور اس کا تضاد سب آجائے۔ گو اس کی وجہ سے جدید شاعری کے پڑھنے والے کم ضرور ہوئے مگر اس کا ابہام، اور خطابت کے خلاف اس کا جہاد، دراصل ذہن کی اس رو کو پکڑنے کی کوشش ظاہر کرتا ہے جس کے لئے موجودہ الفاظ یا تو ناموزوں ہیں یا بے جان ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جدید یورپی شاعر یونان کی دیومالا اور اس کے ادب اور اپنی ساری یونانی اور لاطینی میراث کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ اس سے اپنے حالات کی تعبیر کرنے اور اس کی ترجمانی کرنے کے لئے رمز علامات اور اشارے لیتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں اکثر یہ لاعلمی ملتی ہے۔ پھر جدید شاعر ایک حس کو دوسری حس کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ لورکا کے یہاں خون جو بہہ رہا ہے، بولنے لگتا ہے اور زمین پر سرخ تقاطر اپنے رنگ سے نہیں بلکہ اپنی مفروضہ خاموش دھن سے محسوس کیا جاتا ہے۔ جدید شاعر بیان کے بجائے تبصرے پر زور دینے کی وجہ سے حسیات کے بیانوں کو ملا دیتا ہے، آواز دیتا ہے۔ آواز بھی حسیات اور رشتوں کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ غرض شاعر کا بٹا ہوا ذہن، سیاست کے فریب سے اس کا نکل آنا، ایک مخصوص بصیرت پر اصرار، ماضی کے متعلق بدلا ہوا رویہ، فن میں کمال کا مختلف تصور، اور خود اس کے ذہن کی الجھنیں، یہ سب اس کو پرانے شاعر سے علیحدہ کرتی ہیں۔ کلاسیکل ہیومنزم نے حسن کا جو تصور دیا تھا اس میں چونکہ یہ اکتا دینے والی یکسانیت آگئی تھی اس لئے بدصورتی کے حسن کو دیکھنے کی سعی شروع ہوئی۔ ادب پر مذہب اور اخلاق اور سماج کی گرفت بہت سخت رہی تھی، اس لئے ان تینوں کے بارے میں آہستہ آہستہ آزاد خیالی آئی۔ لیکن جدید شاعر کا زبان اور وقت کے متعلق جو تصور ہے وہ ایک بنیادی تبدیلی ظاہر کرتا ہے۔

انگلستان کے رومانی شعرا نے ایک ایسی ڈکشن کی ضرورت محسوس کی جو عام بول چال کے قریب ہو۔ ورڈس ورتھ نے اس کی وکالت کی مگر اسے پا نہ سکا۔ بائرن اسے پا گیا لیکن اس کی وکالت نہ کرسکا۔ ٹینی سن اور آرنلڈ گرینڈ اسٹائل کو واپس گئے۔ براؤننگ (Browning) جہاں اپنی ایجاد کا ثبوت دیتا ہے وہاں ادب کے آہنگ کو برتتا ہے، نہ کہ بول چال کے۔ روایت کے فارم اس کے آہنگ اور اس کی زبان سے بھرپور بغاوت والٹ وٹمن کے یہاں ملتی ہے۔ وٹمن کے وجہ سے آزاد نظم کو مدد ملی جو جدید شاعری کا نمایاں میڈیم ہے۔ مگر وٹمن کی تقلید وہی شاعر کرسکتا تھا جو اپنے پیام میں اتنا سرشار ہو کہ اس کی خطابت بھی اس پیام کی گرمی کی وجہ سے فطری معلوم ہوتی ہو۔ ہاں مایا کووسکی اور پابلو نرودا (Pablo Neruda) دونوں اس سے خاصے متاثر ہیں کیوں کہ وہ بھی وٹمن کی طرح اپنے آپ کو آنے والے دور کا نقیب سمجھتے ہیں۔ نئی شعری زبان اور اس کا آہنگ لافورگ Laforgue سے زیادہ متاثر ہیں۔ لافورگ کے یہاں سنجیدہ لہجے میں طنز چھپی ہوئی ہے اور اس نے شہروں کی مخصوص بولی، لوگ گیت عام موسیقی کی محفلوں کے ترنم کا خاصا احساس ہے۔ ایلیٹ نے پروفراک (Prufrock) کی زبان اس سے سیکھی۔ لافورگ نے وزن یا قافیہ دونوں کو چھوڑا نہیں، مگر قافیے کی پابندی ایک مقررہ قاعدے کے مطابق ضروری نہیں تھی۔ لافورگ کے یہاں وقت کا تصور تکرار کے ایک چکر کے مطابق ہے جس میں وہی واقعات جو ادب کی تاریخ میں ایسے ہی واقعات کی یاد دلاتے ہیں، یا بچپن یا کسی پریوں کی کہانی سے لئے گئے ہیں، بار بار آتے ہیں۔ اس سے مذہب کے متعلق ایک نیا تصور نکلتا ہے۔ یہاں کسی دینیات یا مسلک کے بغیر خدا یا مذہبی عقیدے کا تجزیہ ہے، گو ایلیٹ جیسے شعرا کے یہاں رومن کیتھولک عقیدے کی طرف واپسی بھی مل جاتی ہے۔

جب شاعر کے پاس کوئی ایسا عقیدہ نہ رہا جو اس کے پورے وجود کو معنی و مقصد دے سکے، جب اسے کسی پیام سے دلچسپی نہ رہی، جب وہ فلسفے سیاست مذہب اور اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا، اور جب اس نے کائنات کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش چھوڑ کر اپنی ذات کے عرفان کی کوشش کی اور اپنے تجربے کا تجزیہ بھی اسے عزیز ٹھیرا، تو اسے ایسی زبان کی ضرورت نہ رہی جو اپنی ذات سے باہر دیکھنے والے شعرا کے واضح اظہار کے لئے کافی تھی مگر اس کے منتشر جذبات کی ترجمانی سے قاصر تھی۔ اس کے لئے کبھی سرریلزم کے ذریعہ وجدان کے سرچشموں تک پہنچنے کی کوشش ہوئی، کبھی علامتی اظہار کی۔ یہاں پرانے قصوں روایتوں دیومالا سے بڑی مدد ملی جن کے پیرائے میں ان کیفیتوں کا اظہار ممکن ہو سکا جو صاف اور واضح اور براہ راست اظہار میں ممکن نہ تھا۔ علامتی اظہار بالواسطہ اظہار کا وہ طریقہ ہے جو اس دور میں اس لئے مقبول ہوا کہ یہ دور کوئی سبق دینے یا کسی قصے کی زیبائش کرنے کا قائل نہیں، بلکہ ان ننگے لمحوں کی مصوری کا قائل ہے جو کبھی کبھار اور بڑی کاوش کے بعد یا بڑے ریاض کے بعد ہاتھ آتے ہیں۔ اس علامتی اظہار میں نہ صرف اساطیری سرمائے سے کام لیا گیا بلکہ نئے Myth بھی ایجاد کئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عام پڑھنے والوں میں یہ طرز مقبول نہ ہو سکا۔ مگر جدید شاعری کا یہ نیا میلان اس لئے بن گیا کہ اس میں شاعر کے روح کے ریگستان میں بھی سفر کی ہر منزل اور ہر موڑ کا اس طرح گہرا احساس دلانا ممکن ہو گیا اور پھر زبان کو بھی اس اختیار کے ذریعہ سے نئی وسعتیں گہرائیاں اور امکانات ملے۔

غرض آزاد نظم کے فروغ اور اس میں علامتی اظہار کو ہم جدیدیت کا خاص اظہار کہہ سکتے ہیں۔ ایلیٹ نے کسی جگہ کہا ہے کہ کسی قوم کی واردات میں کم چیزیں اتنی اہم ہیں جتنی شاعری کے ایک نئے فارم کی ایجاد۔ یہ نیا فارم نہ صرف بدلے ہوئے حالات سے وجود میں آتا ہے اور تجربے اور اس کی تشریح وتعبیر کے لئے نئے امکانات دیتا ہے، بلکہ ایک نئی ذہنی رو کو عام کرتا ہے جو بالآخر کسی نہ کسی

طرح اس کے پورے حلقے کو متاثر کرتی ہے۔ شاعر اب اپنے سے باتیں کرتا ہے اور اس لئے اس کا لہجہ شخصی، دھیما، اور کہیں کہیں بول چال کی زبان کی طرح اکھڑا اکھڑا ہے۔ اس لئے اب اسے مجمع کی ضرورت نہیں، بلکہ ایسے پڑھنے والے کی ضرورت ہے جو اس شخصی لہجے پر کان دھرے اور اسے سمجھ سکے۔ یعنی شاعر سے یہ مطالبہ اب ضروری نہیں رہا کہ وہ سب کو اپنی بات سمجھا سکے، بلکہ پڑھنے والے سے یہ مطالبہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس ذہنی سفر میں شاعر کا ساتھ دے سکے، اس کے اشارے کنارے سمجھ سکے۔ آج کا شاعر ایسی زبان استعمال کرتا ہے جو بیسویں صدی کے ذہن، بول چال کے طریقے، آہنگ اور نمائندہ میلانات کا ساتھ دے سکے۔

بہت سے پڑھنے والے یہاں ابھی اٹھارویں اور انیسویں صدی کی فضا یا مشہور اساتذہ کے اسلوب سے مناسبت ڈھونڈتے ہیں اور جب یہ نہیں پاتے تو اس جدیدیت کو ہی کوئی مرض سمجھنے لگتے ہیں۔ ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کے اس مشورے کو نئے شاعروں نے قبول کر لیا ہے کہ اپنی شاعری کو نیا بناؤ۔ آج شاعری ان مقاصد کے لئے استعمال نہیں ہوتی جو نثر میں زیادہ کامیابی سے یا بہتر طور پر پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اگر شاعر کے پاس صرف خیالات ہیں جن کا وہ پرچار کرنا چاہتا ہے یا کسی ذاتی ضرورت کی وجہ سے جن کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ بھی وہ نثر میں کرتا ہے۔ شاعری میں خیالات صرف مجرد خیالات کی شکل میں نہیں آتے بلکہ شاعرانہ تجربے کی صورت میں آتے ہیں۔ یہ خیالات کی ایک دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ ایک علامت ہے جو دوسری علامتوں سے جڑی ہوئی ہے اور ایک ایسی وحدت کا کام دیتے ہیں جس کی جڑیں شاعر کی زندگی اور اس کے قومی شعور میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بہترین جدید شاعری میں جہاں خیالات ہیں، خواہ سیاسی ہوں یا سماجی، یا فلسفیانہ، تو وہ بقول الیٹ کے صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان خیالات کے ہجوم میں گھرا ہوا شاعر کیا محسوس کرتا ہے۔ جدیدیت خیالات کی آقائی میں ہے نہ کہ غلامی میں۔ جدید شاعر کو چونکہ موجودہ زندگی کے مختلف اور متضاد عناصر میں ایک ذہنی تنظیم پیدا کرنی ہوتی ہے اس لئے اس تنظیم کے لئے اسے مجرد خیال سے مخصوص اور ٹھوس تجربے تک اور پھر مجرد خیال تک جست لگانی ہوتی ہے۔ اسے ذہن اور جذبے دونوں میں ایک نئی وحدت قائم کرنی ہوتی ہے اور ذہن کو اس صحت اور سادگی تک لانا پڑتا ہے جس میں مانگے کے یا دوسروں کے لادے ہوئے خیالات نہیں بلکہ فرد کے تجربے کی صداقت ہو۔ یہ صداقت سائنس کے نئے نئے انکشافات سے کم اہم نہیں ہے۔ ہماری زندگی بڑی پستی میں بسر ہو رہی ہے۔ مگر ہماری دسترس خیالات تک ہے۔ آج فرد میں خلوص کی اور دیانت کی جو کمی ہے جدید شاعری اس کی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جدید شاعری کچھ کہتی نہیں، کچھ کرتی ہے۔ اس کے نزدیک شاعری، نثر سے زیادہ خوب صورت یا زیادہ زوردار پیرایۂ اظہار نہیں ہے۔ جو لوگ روایتی شاعری کے عادی ہیں وہ اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ جدید شاعری سے ایک مرتب سلسلۂ خیالات اور ایک مرکزی تصور انہیں نہیں ملتا۔ جدید شاعری ایک شخصی اور نجی اسرار بن گئی ہے، یہ فرد کی تنہائی کا عکس ہے۔ آج انسان اپنی کائنات میں کوئی اطمینان کا گوشہ نہیں بنا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نظام سے الگ ہے۔ وہ چپ دیکھتا ہے کہ اس کے حلقے میں وہ پورا خیال نہیں ہے جو پہلے اس کے پاس تھا اور اس کے اپنے باطن میں ایسی پیچیدگیاں ہیں جن سے وہ بے خبر تھا تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ سماج میں گروہ بندی، مذہب کی بندشوں اور روایات سے رشتہ کا ڈھیلا ہونا، تبدیلیوں کی تیز رفتاری، یہ سب باتیں شاعر کو اپنی دنیا اور گرد و پیش کی دنیا میں تعلق پیدا کرنے سے روکتی ہیں۔ وہ اپنے آپ سے اپنا رشتہ قائم نہیں کر پاتا۔ تنہائی سے گھبرا کر وہ اور زیادہ تنہائی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ تعلیم سے گھبراتا ہے۔ نظریات اسے خوف زدہ کرتے ہیں۔ افادی، اخلاقی سیاسی شاعری اسے زہر لگتی ہے۔ یہ خیالات سے بغاوت نہیں دوسروں کے خیالات کا غلام ہونے سے بے نیازی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے پیچھے ایک نئے عقیدے کی جستجو بھی ہے: یہ ہے ایک شخصی عقیدہ۔

اب نظم پر کوئی ڈیزائن لادا نہیں جاتا۔ یہ خیال کی رو ہے، زندہ، مانوس، محسوس کیا ہوا خیال، جس نے نظم کو ایک تنظیم عطا کی ہے۔ بڑی شاعری بڑے خیالات سے وجود میں نہیں آتی۔ شاعری ترس میں بھی ہے، غصے میں بھی، فریب سے نکلنے میں بھی۔ یعنی شاعری اس ہیجان، اس تخمیر میں ہے جو غم، غصہ، طنز کوئی بھی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ نثر میں آپ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں، نظم میں اپنے تک۔

ادب جس طرح فلسفے سیاست، مذہب، اخلاق کی بندشوں سے شاعری میں آزاد ہو کر جدید ہوا ہے، اسی طرح ناول میں بھی اس نے اپنی آزادی کی کوشش کی ہے، گو ناول کے ارتقا کو دیکھتے ہوئے یہاں چست قصے سے کردار نگاروں تک اور کسی عہد کی تہذیب سے خاندانوں کے عروج و زوال کی داستان تک حقیقت نگاروں کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ مگر لارنس (Lawrence)، جوائس (Joyce)، ٹامس مان (Thomas Mann)، کافکا (Kafka)، کامیو (Camus)، گراہم گرین (Graham Greene)، ہمنگ وے (Hemingway)، سال بیلو (Saul Bellow) تک یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اب ناول ماضی کی تہذیب کو رد کرتا ہے اور اس لئے اس پر طنز کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا کھوکھلا پن دکھائے بغیر اسے چارہ نہیں۔

ناول فرد کی تنہائی، اس کی قنوطیت، اس کے احساس شکست کا آئینہ دار ہے۔ اس سے اس کے گرد کوئی منظم اور مربوط قصہ نہیں بن سکتا۔ سرل کانولی (Cyril Connolly) نے غلط نہیں کہا تھا۔

> مغرب کے عام باغوں کے اب بند ہونے کا وقت ہے اور
> آج سے ایک فن کار صرف اپنی تنہائی کی گونج اور اپنی مایوسی
> کی گہرائی سے پہچانا جائے گا۔

اس گہرائی کی وجہ سے جوائس کے تجربات جدیدیت رکھتے ہوئے بھی زیادہ معنی خیز نہیں معلوم ہوتے۔ لارنس کی خون کی پکار سائنسی میکانکیت کے خلاف ردعمل کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہوئے اپنے فلسفے کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی

جذبات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی وجہ سے قابل قدر رہے گی۔ مگر ابھی ایک عرصے تک کافکا کی معنویت پر غور کیا جائے گا جو کہتا ہے کہ "ہمارا حق صداقت کے سامنے خیرگی ہے۔ وہ روشنی پر چہرے کو مسخ کر رہی ہے سچ ہے، مگر اور کچھ سچ نہیں۔" کافکا سے پہلے کسی نے اندھیرے کو اس قدر صفائی سے پیش نہیں کیا، نہ مایوسی کی دیوانگی کو اس قدر سنجیدگی اور ہوش مندی سے۔ اس کی شکست و ریخت میں ایک دیانت ہے۔ وہ ایک دھوکے باز دنیا کے نظام اخلاق کا ناپنے والا ہے۔ اسی طرح کامیو جو نراج کو تنظیم نہیں بلکہ نراج ہی کہتا ہے، وہ اس نسل کا ترجمان ہے جو دہشت کے اس عہد میں بھی جسے عام کساد بازاری، عالم گیر جنگ، آمریت، سے سابقہ رہا اور جسے دوسری جنگ عظیم کے بعد حقیقی امن کے بجائے سرد جنگ کی اعصابی کیفیت ملی۔

کامیو نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہمارے دور کی دہشت اور بے چینی کی ذہنی بنیاد اٹھارویں اور انیسویں صدی کی آئیڈیالوجیوں کی عطا کی ہوئی ہے۔ مغربی ذہن کے پیچھے بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ اس نے عقل کی فرعونیت کو جنم دیا جو بہت دن بعد ترقی کرتے کرتے جنگوں، جیل خانوں، اور جلادوں کے تشدد میں ظاہر ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی جس طرح انسان سے اس کی انسانیت چھین لیتی ہے۔ اس پر کامیو نے بہت زور دیا۔ اس لئے اس کے نزدیک انسانیت کے ایک نئے احساس کی ضرورت ہے جس کے لئے کلاسیکی اعتدال خصوصاً یونانی شاعری کے ہیرو یولیسز (Ulysses) کی مثال دی جاسکتی ہے جو ٹرائے (Troy) کے مہم بازوں میں سب سے زیادہ انسانیت رکھتا ہے۔ اس کی State of siege میں وہ ایکٹر جو پلیگ کی نمائندگی کرتا ہے جس سے مراد جدید دنیا ہے اور جو آمریت کی زندگی کی تنظیم کی طرف اشارہ کرتا ہے، ان لوگوں سے جنھیں اس نے ابھی زیر کیا ہے، کہتا ہے کہ ان کی موت بھی منطق اور Statistics کے مطابق ہوگی، مگر اس کے Rebel کی فریاد میں امید کی کرن ہے۔ کامیو کی یہ بات دلچسپ ہے کہ آج ہمیں خیر کے لئے صفائی پیش کرنی پڑتی ہے۔

یہ ایک معنی خیز بات ہے کہ آئیڈیلزم کے فلسفے نے جو جدیدیت نے قریب قریب ترک کر دیا ہے، ماضی میں بہت بڑا ادب پیدا کیا۔ مارکسزم نے ہمیں اتنا بڑا ادب نہیں دیا۔ ہاں وجودیت Existenstialism کے علم برداروں میں سارتر (Sartre) اور کامیو کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی قابل توجہ بات ہے کہ مجموعی طور پر جدید فکر مارکسزم سے اس طرح متاثر نہیں ہے، جس طرح آج سے تیس سال پہلے تھی۔ آج اس پر وجودیت کا اثر زیادہ گہرا ہے۔ مارکسزم کی سرد عقلیت کے مقابلے میں وجودیت کا محسوس کیا ہوا خیال Felt thought ادیبوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ گو یہ بات بھی واضح ہے کہ نظریہ شاعر یا ادیب پیدا نہیں کرتا۔ شاعر ادیب اپنے مخصوص حالات اور مزاج کی افتاد کی بنا پر کسی نظریے سے متاثر ہوتے ہیں۔ جدیدیت نے اس لحاظ سے ایک اور بات واضح کی ہے۔ وہ مجموعی طور پر آئیڈیالوجی کے خلاف ہے فلسفے کے نہیں۔ آئیڈیالوجی کو وہ ایک پرچم سمجھتی ہے جو فرد اور جماعت کو عمل پر آمادہ کرے۔ فلسفہ بہر حال حریت فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ ادبی فن کار اس کا پابند نہیں، ہاں اس سے اپنے طور پر کام لیتا ہے۔

اس دور کو ژید Gide اخلاق اور خلوص کا مقابلہ کہتا ہے۔ موجودہ صنعتی ترقی نہ اخلاقی برتری کا نہ بہتر ذہنیت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ کامیو کہتا ہے، "ذہن اس لئے پراگندہ نہیں ہے کہ ہمارے علم نے دنیا کو اتھل پتھل کر دیا ہے بلکہ اس لئے کہ ذہن ابھی اس حشر کو ہضم نہیں کر سکا ہے۔"

پھر بھی جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں، اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔ مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ، اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔ اس لئے اسے شعر و ادب کی پرانی روایت کو بدلنا پڑا ہے، زبان کے رائج تصور سے نپٹنا پڑا ہے، اسے نیا رنگ و آہنگ دینا پڑا ہے، اس کے اظہار کے لئے اسے علامتوں کا زیادہ سہارا لینا پڑا ہے۔ سوزن لینگر (Sosan Langer) نے غلط نہیں کہا ہے کہ آرٹ ایسے فارم کی تخلیق ہے جو انسانی جذبات کی نقالی نہیں کرتے، ان کی علامت ہوتے ہیں۔

اردو ادب کے طالب علموں کو جدیدیت کے ہر روپ کا معروضی طور پر مطالعہ کرنا چاہئے اور فیشن یا فارمولا کے چکر سے نکل کر اپنے ذہن کو جدیدیت کی روح سے آشنا کرنا چاہئے۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کو لے کر جدید دور کی بھول بھلیاں میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر سکتے۔ جدیدیت غالب کے الفاظ میں یہ دعویٰ کر سکتی ہے۔

بہ وادی کہ درآں خضر را عصا خفت است
بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

☆☆☆

مفکرانہ احساس اور پیچیدہ معنویت کے غزل گو
راشد طراز
کا پہلا مجموعہ
کاسۂ شب
قیمت : سو روپے
اردو مرکز، ۲۴/۷، ایم۔ آئی۔ جی۔ لوہیا نگر
پٹنہ ۸۰۰۰۲۰

فکشن کیا، کیوں اور کیسے؟

آل احمد سرور

شمارہ ۷۲،
مئی ۱۹۷۲

ڈی۔ ایچ۔ لارنس کہتا ہے:

میں زندہ انسان ہوں، اور جب تک میرے بس میں ہے میرا ارادہ زندہ انسان رہنے کا ہے۔ اس لئے میں ایک ناولسٹ ہوں اور چوں کہ میں ناولسٹ ہوں، اس لئے میں اپنے آپ کو کسی سنت، کسی سائنٹسٹ، کسی فلسفی، کسی شاعر سے برتر سمجھتا ہوں، جو زندہ انسان کے مختلف حصوں کے بڑے ماہر ہیں مگر پورے انسان تک نہیں پہنچتے۔ ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے۔ کتابیں زندگی نہیں، یہ صرف پتھر میں ارتعاشات ہیں۔ لیکن ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے زندہ، نسان کے اندر لرزش پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو شاعری، فلسفے، سائنس یا کسی اور کتابی ارتعاش کے بس کی بات نہیں۔

لارنس کے اس اقتباس سے سو فی صدی اتفاق ضروری نہیں، مگر اس میں ناول کی اہمیت کی طرف جو اشارہ ہے اور ناول کی وسعت، دائرۂ کار، بلندی، گہرائی اور عظمت کا جو احساس ہے اسے ضرور دھیان میں رکھنا چاہئے۔

فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں فکشن کے لئے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے، مگر چونکہ "افسانہ" ہمارے ہاں مختصر افسانہ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لئے "افسانوی ادب" کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا۔ ہم نہ صرف شارٹ اسٹوری (Short Story) کے لئے افسانے کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں بلکہ لانگ شارٹ اسٹوری (Long Short Story) کے لئے طویل افسانہ کی اصطلاح بھی برتتے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لئے "فکشن" اور "فکشن کا ادب" استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انگریزی کی ایسی اصطلاحیں جن کے مترادف الفاظ ہمارے یہاں نہ ہوں اور جو ہمارے صوتی نظام کے مطابق ہوں انھیں بجنسہٖ لے لینے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔

تمام نقادوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ہمارے یہاں شاعری کا جو سرمایہ ہے اس کے مقابلے میں ناولوں کا سرمایہ بہت کم ہے۔ یہاں مقدار کا ہی سوال نہیں، معیار کا بھی سوال ہے۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں شاعری کے سرمائے کی روایت تقریباً پانچ سو سال سے ملتی ہے۔ ناول کی روایت سو سال سے زیادہ کی نہیں۔ ہاں ہمارے یہاں ناول سے پہلے داستانوں کا ایک شاندار سرمایہ موجود ہے، جس کی عظمت کا اعتراف ضروری ہے مگر جو ناول سے بالکل مختلف فن سے تعلق رکھتا ہے۔ ناول نوعمر ہے تو اس پر تنقید بھی نوعمر ہے۔ یہ بات افسوس کے قابل ہے، مگر ماتم کے قابل نہیں۔ رینی ویلیک (Rene Wellek) اور آسٹن وارن (Austin Warren) نے Theory of Literature میں لکھا ہے،

"ناول کے متعلق ادبی نظریہ اور تنقید کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے شاعر کے نظریئے اور تنقید سے کم تر ہیں۔" ناول کا کوئی نقاد ارسطو، جانسن اور کولرج یا آرنلڈ اور الیٹ کے درجے کا نہیں ہے۔ مغرب میں بھی ناول کی صنف اور اس

کی انفرادیت کا احساس زیادہ سے زیادہ دو سو سال کا ہوگا۔ ہمارے یہاں تو نذیر احمد کے تمثیلی قصے ناول کے لئے فضا سازگار کرتے ہیں۔ سرشار کہتے ہیں کہ میاں آزاد کا ہر شہر و دیار میں جانا اور وہاں کی بری رسموں پر جھلانا ناول کا عمدہ پلاٹ ہے۔ مگر وہ ناول کے ضبط و تنظیم کے فن سے واقف نہیں، ہاں کرداروں کا ایک نگار خانہ اور معاشرت کا ایک مرقع ضرور پیش کر دیتے ہیں۔ شرر ناول لکھنے کا عزم کرتے ہیں، مگر رومان لکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کا پہلا ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ پریم چند نے، جو دراصل افسانہ نگار تھے، کچھ اچھے ناول لکھے اور ناول کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے وسعت بھی عطا کی۔ مگر وہ عظیم ناول نگار کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے اچھے ناول "میدان عمل" اور "گئو دان" ہی ہیں۔ پریم چند کے بعد اس فن میں کافی ترقی ہوئی اور چھوٹے بڑے ناولوں میں "لندن کی ایک رات"، "ٹیڑھی لکیر"، "ایسی بلندی ایسی پستی"، "آگ کا دریا"، "آنگن"، "اداس نسلیں"، "علی پور کا ایلی"، "اک چادر میلی سی" اور "خدا کی بستی" میرے نزدیک اردو کی قابل فخر ناولیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے اور یہاں فہرست سازی میرا مقصد بھی نہیں۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اتنے تھوڑے سے سرمائے کے پیش نظر، اگر ناول کے فن پر تنقید کم ہو اور وہ تنقید بھی تاریخی اہمیت زیادہ رکھتی ہو، تنقیدی کم، تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

اردو میں افسانہ ناول سے بھی نو عمر ہے، مگر اس نے بلاشبہ ان پچاس ساٹھ سال میں خاصی ترقی کی ہے۔ مگر یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ہمارے یہاں افسانے کی اتنی ترقی کیوں ہوئی اور ناول کی کیوں نہیں ہوئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ناول کی ترقی کے لئے جس نثر کی پختگی کی ضرورت ہے وہ بہت دیر میں وجود میں آئی اور غزل کے اثر سے چوں کہ مجموعی طور پر ہمارا فنی شعور چھوٹے پیمانے پر تصویر بنانے، یا (Miniature Painting) سے زیادہ مانوس ہے، اس لئے مختصر افسانے میں اس نے زیادہ آسودگی پائی؟

ناول نسبتاً بھاری پتھر تھا اور اس کے مطالبات بھی زیادہ تھے، اس لئے ان سے عہدہ برآ ہونا اتنا آسان نہ تھا۔ ناول کے لئے فضا اس وقت سازگار ہوتی ہے جب اول تو نثر کے تعمیری حسن کا پورا احساس ہو، دوسرے ہر قسم کی نثر کے اچھے نمونے سامنے آ چکیں، تیسرے شخصیت اور اس کی عکاسی بذات خود ایک کارنامہ سمجھی جائے۔ چوتھے، ایک ایسا متوسط طبقہ وجود میں آ چکا ہو جس میں خواندہ لوگوں کی خاصی تعداد ہو، جسے اپنی اہمیت کا احساس ہو جو اپنے اخلاق و عادات کو عزیز رکھتا ہو، جس کے پاس کچھ فرصت ہو، مگر جس کا نقطۂ نظر کاروباری ہو، جو اپنے نیچے طبقے کے بظاہر بھدے اور بھونڈے طریقۂ زندگی سے اور اپنے سے اوپر کے طبقے کے بظاہر ناکارہ پن سے اپنے کو ممتاز سمجھتا ہو۔ اسی متوسط طبقے سے ناول کو سروکار ہوتا ہے، کبھی اس کی امید و بیم کی معروضی عکاسی کر کے، کبھی جین آسٹن کی طرح متوسط طبقے کے طرز زندگی کا تجزیہ کر کے، کبھی فلابیر کی طرح اس کے اخلاق پر ضرب لگا کے، یا ایک متوسط طبقے کے پس منظر میں اس طرز زندگی کے متبادل طریقے تجویز کر کے، جیسے ایملی برانٹی اور کانریڈ کے یہاں ملتے ہیں۔ پانچویں جب چھپے ہوئے حروف کی اتنی عادت پڑھنے والوں کو ہو جائے کہ وہ تحریر کے آہنگ کو دیکھ سکیں اور اس سے لطف لے سکیں، تحریر میں تقریر اور اس کی خطابت کا لطف تلاش نہ کریں۔ چھٹے جب نثر اتنی پختہ ہو جائے کہ وہ شاعری سے زیور نہ مانگے، بلکہ اپنے حسن کی رعنائی پر نازاں ہو سکے اور علمی یا فلسفیانہ یا سیاسی یا تاریخی شعور کی آئینہ داری کر سکے۔ ناول میں انفرادی تجربہ کی بنیادی اہمیت ہے۔ یہ تعمیم کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے، یہ انفرادی جذبے کے خام مواد سے اپنا تانا بانا تیار کرتی ہے اور اسی سے فکر کے لئے لباس مہیا کرتی ہے۔ محض خیالات ناول میں زیادہ اہم نہیں لیکن اگر ذہنی فضا ایسی ہے کہ انفرادی تجربہ حقیقت سے ہم کنار نظر آتا ہے تو ناول فلسفیانہ بھی ہو سکتی ہے۔

ناول کا موضوع انسانی رشتے ہیں۔ اس لئے اس میں حقیقت ایک مقررہ، پہلے سے طے شدہ عقائد کے مجموعے کی شکل میں نہیں بلکہ حقیقت کے اس تجربے کی شکل میں ہوتی ہے جس کا ایک ارتقائی عمل ہے۔ اس لئے ناول پر کوئی نظریہ لادا جائے تو ناول، ناول نہیں رہتا جیسے ویلس (H. G. Wells) کے یہاں۔ ویسے اس میں فن کے آداب کے مطابق ہر نظریے کی عکاسی کی گنجائش ہے۔ ناول تہذیب کا عکاس، نقاد اور پاسباں ہے۔ کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا انداز وہاں کی شاعری میں ہوا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ میں نے جرمن، روسی، فرانسیسی، انگریزی، امریکن تہذیبوں کی روح کو ان ملکوں کے ناولوں کی مدد سے بہتر سمجھا ہے۔ انھیں سے یہ اندازہ ہوا کہ ان ملکوں میں سماج کس طرح بدلا ہے، برادری اور خاندان کے تصور میں کیا انقلاب ہوا ہے، انفرادیت پر کیوں زور بڑھا ہے، طبقے کس طرح بدل رہے ہیں اور شہروں کی کشش کیا رنگ لا رہی ہے؟ پھر ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرد کے ذہن میں یا باطن میں کیا انقلاب ہوا ہے، عقائد کس طرح شکست ہو رہے ہیں، ایک سیکولر اخلاقیات کس طرح جنم لے رہی ہے؟ شخصیت کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے اور پیشے یا سماج کا جبر اسے کس طرح خانوں میں بانٹ رہا ہے؟ انھیں سے یہ عقیدہ بھی کھلا کہ نفسیات، سوشیالوجی اور سائنسی طریقۂ کار نے تہذیب پر کس طرح اثر کیا ہے؟ ہیوم (Hume)، برک (Burke)، مارکس، فرائڈ کے کیا اثرات پڑے ہیں؟ گویا ذہنی تاریخ ان ناولوں میں محفوظ ہو گئی ہے۔ ناول کو جب جدید ایپک (Epic) کہا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ ایپک کے فن سے زیادہ اس کی وسعت اور اس کی عظمت کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ ناول ایپک کی طرح مصنف کی ہر وقت موجودگی کو گوارا نہیں کرتا، بلکہ ناول کے کرداروں کی اپنی زندگی اس قدر اہم ہو جاتی ہے کہ بالآخر فن کار کی اپنی شخصیت غائب ہو جاتی ہے۔ جیمس جوائس نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے اس طرح بیان کیا ہے کہ "فن کار کی شخصیت پہلے ایک پکار، ایک دھن یا ایک موڈ ہے (غنائیہ میں)، اور پھر ایک سیال اور سبک تاب Lami cut بیان (ایپک میں) اور بالآخر اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ ڈرامے میں گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے۔"

ناول کی اہمیت پر اب کچھ روشنی پڑی ہوگی۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صنف ناول کے متعلق چند اصولی باتیں کہہ دی جائیں تاکہ ہمیں اپنے سرمائے کو پرکھنے میں آسانی ہو اور ہم آم سے املی کے مزے کی توقع نہ کریں، نہ احمد

کی ٹوپی محمود کے سر رکھ دیا کریں۔ اس سلسلے میں مارس شروڈر Maurice Shroder نے ایک مضمون لکھا ہے۔ ناول کی عام طور پر تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ نثر میں ایک افسانوی (Fictional) بیان ہے جو قابل لحاظ طوالت رکھتا ہے۔ (A fictional narrative in prose of substantial length)۔ اس تعریف میں ناول کا جس طرح ارتقا ہوا ہے اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ناول کی تعریف کے لئے ضروری ہے کہ ہم ادبی تاریخ کو ذہن میں رکھیں، خارجی ادب کا مطالعہ کریں اور ناولوں کے مواد کو بھی ملحوظ رکھیں۔

" ناول ایک بیانیہ فارم ہے اس میں ایک مثالی (Typical) عمل ہوتا ہے، جس کی موضوعی اہمیت (Thematic Value) ہے اور جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔" ناول معصومیت کے عالم سے تجربے کی منزل تک کے سفر کا بیان ہے۔ اس نادانی سے جو بڑے مزے کی چیز ہے، یہ آدمی کو زندگی کے واقعی روپ کے عرفان تک لاتی ہے۔ ناول ظاہری حالت اور حقیقت (Appearance and reality) میں امتیاز سے سروکار رکھتی ہے۔ ناول جس حقیقت تک ہمیں لے جاتی ہے اس سے اس کا تاریخی رشتہ ہے۔ یہ بورژوا زندگی، تجارت اور جدید شہروں کی زندگی ہے۔ ناول نے جس حسیت کو جنم دیا وہ شیکسپیئر کے کردار فالسٹاف میں سب سے پہلے جھلکی۔ ناول کا ہیرو ازالۂ فریب کے ایک سلسلے سے گذرتا ہے۔ وہ ایک طفلانہ امید سے ایک قانع تخیل تک سفر کرتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ناول رومان سے بالکل مختلف ہے۔ رومان کا ہیرو اپنے کو ہیرو ثابت کرتا ہے۔ ناول کے ہیرو کا اینٹی ہیرو ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ ایسا ہیرو جو تمام صفات کا مجموعہ نہیں ہے۔ ناول کا عمل (Action) رومان کے عمل سے ملتا جلتا ہے۔ ناول کے ہیرو کا سفر کو نارتھراپ فرائی (Northrop Frye) نے Quest یا تلاش کا نام دیا ہے جو ایک محدود فضا سے ایک وسیع فضا کے لئے ہے۔ یہ تلاش زمان و مکان دونوں میں ہوسکتی ہے۔ اس جستجو کی منزل آئے یا نہ آئے مگر ناول کا ہیرو آخر میں رمز پا لیتا ہے کہ ہیروازم کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے اور وہ خود بھی ایک بالکل معمولی آدمی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارے ناولوں کا انجام المیہ اور سارے رومانوں کا طربیہ ہوتا ہے۔ ناول میں ہیرو اس لئے کامیاب ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور اس نے اپنے غرور کو ترک کر دیا ہے۔ ناول میں یہ زوال اچھا ہے کیوں کہ اس طرح زندگی کے حقائق کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ناول کا موضوع دراصل ایک ذہنی تعلیم کی تکمیل ہے۔ ناول کے ایک سرے پر رومان ہے اور دوسرے پر فلسفیانہ قصے جیسے والٹیئر کا کاندید (Candide) یا گلیور کا سفرنامہ۔ ناول رومان کے مقابلے میں فلسفیانہ قصے سے قریب تر ہے۔ مگر جب کہ فلسفیانہ قصوں میں ازالۂ فریب افکار کے ذریعے سے ہوتا ہے، ناولوں میں تجربے کی منطق کے ذریعہ۔ ناول اور فلسفیانہ قصے دونوں رومان سے اس لئے گریزاں ہیں کہ رومان زندگی کو تخیل کے دھندلکے کی مدد سے دیکھتا ہے، یہاں شخصی ترجمانی ہوتی ہے اور یا تو اس میں جذبات کا رنگ ہوتا ہے یا اساطیر کی شاعری کی حدود سے اس میں ایک طلسماتی فضا پیدا کی جاتی ہے۔

ناول کا عمل Demythification کا عمل ہے۔ ناول ازمنۂ وسطیٰ کے رومانوں سے پیدا ہوا، اور اپنے فارم کے لحاظ سے اور صنفی لحاظ سے یہ رومان کے خلاف ہے۔ رومانی حسیت کی اس میں گنجائش نہیں۔ ڈان کوئکزوٹ پن چکیوں کو دیو سمجھتا ہے۔ دیووں کو پن چکی کہنے والے بھی مل جائیں گے۔ لیکن سانکو پانزا پوچھتا ہے، کیسے دیو (What giants?)۔ اس بنیادی سوال میں ناول اور رومان کا فرق مضمر ہے۔ ناول ازالۂ فریب شکست طلسم اور کنایہ ہجو ملیح سے کام لیتا ہے۔ جیسے جیسے ناول ترقی کرتا گیا، اس میں یہ کنایہ بڑھتا گیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دراصل ناول ایک کنایاتی افسانوی فارم (Ironic Fictional Form) ہے۔ ناول اور رومان دونوں میں انسانی صورت حال بیان کی جاتی ہے۔ افکار یا خیالات سے بحث نہیں ہوتی۔ دونوں میں تجرباتی حقیقت سے بحث ہے، نظریاتی سوالوں سے نہیں۔ ناول فلسفیانہ قصے دونوں میں رومانی حسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جو چیز رومانوں کو دلکش بناتی ہے وہ ناول کے لئے زہر قاتل ہے۔ طلسمی اور عجیب وغریب کی ناول میں گنجائش نہیں۔ ناول اور فلسفیانہ قصے دونوں میں ایک معلمانہ مقصد ہوتا ہے۔ دراصل ناول اتنا مقبول نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ رومان آج بھی زیادہ مقبول ہے کیوں کہ یہ آج بھی انسان کے رباب کے بہت سے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ رومان دراصل ایک فراری آرٹ ہے۔ ناول انسان کو حقیقت تک واپس لے جانے میں رومان کی بنیاد سے انکار کرتا ہے۔ ناولسٹ اپنی افسانوی دنیا کا خدا ہے جو اوپر سے اپنے کرداروں کو دیکھتا اور ان کی حرکات کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ ناول کا ہیرو ایک اور آدم ہے جو بچپن کی جنت سے نکل آیا ہے۔ بچپن کی یہ جنت رومان کی اقلیم ہے۔

نارتھراپ فرائی نے ہیرو کے لحاظ سے جو درجہ بندی کی ہے وہ ہمارے لئے معنی خیز ہے۔ سب سے اوپر ایسے ہیرو ہیں جو انسان نہیں دیوتا ہیں، اس کے نیچے ایسے ہیرو جو انسان ہیں مگر ہم جیسوں سے زیادہ طاقتور، عقلمند اور چالاک، اس کے نیچے ہماری طرح کے انسان، اور آخر میں وہ ہیرو جنھیں ہیرو کہنا ہی مشکل ہے۔ فالسٹاف اور خوجی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ کوئی رومان تسلی بخش نہیں ہوسکتا اگر اس کے ہیرو ہم جیسے ہوں۔ اور اس منطق سے کسی ناول میں رومانی یا ایک صفات کا ہیرو کھپ نہیں سکتا۔ فرائی یہ تسلیم کرتا ہے کہ مکمل ناول میں رومان کے عناصر بھی ہوتے ہیں جس طرح رومان میں ناول کے عناصر مل سکتے ہیں۔ مگر ناول کی اپنی حقیقت نگاری سب سے بنیادی چیز ہے۔ اس کے علاوہ وہ دو اور اہم عناصر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک اعتراف، جس کی وجہ سے خودنوشت کے نقوش ناول میں در آتے ہیں، دوسرے Anatomy جس کے ذریعے سے فلسفیانہ اظہار خیال کی گنجائش نکل آتی ہے۔ فرائی کے نزدیک یولی سیس (Ulysses) اس لئے مکمل ایپک ہے کہ اس میں یہ چاروں عناصر بڑی خوبی سے جمع ہوگئے ہیں۔

ہمارے یہاں موضوع کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر کسی سیاسی، سماجی، فلسفیانہ یا اخلاقی موضوع پر ناول لکھا گیا، تو موضوع کی وجہ سے ہی اسے سراہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ناول سیاسی یا سماجی دستاویز بن گیا،

یا فلسفیانہ رسالہ یا اخلاقی وعظ، ناول نہ رہا۔ حد سے بڑھا ہوا سائنسی ایجادات سے شغف یا مستقبل کا درد بھی ناول نگار کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے۔ چناں چہ ویلس، ہنری جیمس کے اعلیٰ درجوں کے ناولوں سے بہت خفا تھا حالاں کہ اس کے اپنے ناول چونکہ انسانی رشتوں سے زیادہ اپنے مخصوص نظریہ حیات کی ترجمانی کرتے ہیں اس لئے اس کے الفاظ میں "اسے صحافت میں عافیت ملی۔" اسی طرح صرف ہیئت کے تجربے، فلمی ٹیکنک یا فلیش بیک یا اخباروں کی سرخیوں پر ملو صفحات بھی ناول کو قابل قدر نہیں بناتے۔ مجھے صرف ایک تجربہ اس سلسلے میں قابل قدر معلوم ہوتا ہے۔ سال بیلو (Saul Bellow) کے ناول ہرزاگ (Herzog) کا ہیرو ہر مسئلے پر خط لکھتا ہے جو بھیجے نہیں جاتے۔ یہ خود کلامی کی ایک صورت ہے یا اس طرح ناول نگار اپنے ہیرو کے ذریعے سے الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کوشش کرتا ہے جو ناکام ہے کیوں کہ خط صرف لکھے جاتے ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ ناول میں بنیادی اہمیت فن کی ہے۔ اس بات کو مارک شورر (Mark Shorer) نے اپنے ایک مضمون "تکنیک: ایک دریافت" (Technique as Discovery) میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیٹس کے فارمولے حسن اور صداقت کو اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ مواد یا Content صداقت ہے، اور فارم حسن ہے۔ یعنی موضوع اور تکنک سے حسن مکمل ہوتا ہے۔ جدید تنقید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ صرف مواد کا نام لینا فن کے لئے کافی نہیں۔ مواد کی بات تجربے کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ ہمیں مکمل شدہ مواد (Achieved Content) کی بات کرنی چاہئے۔ مکمل شدہ مواد ہی فارم ہے جو فن پارے کی خصوصیت ہے۔ مواد اور تجربے اور مکمل شدہ مواد اور آرٹ میں جو فرق ہے اسی کو کہتے ہیں۔ تکنک کے دو پہلو ہیں۔ ایک تجربے کی نوعیت بیان کرنے میں الفاظ کا انتخاب اور استعمال، یعنی زبان کا تخلیقی استعمال، اور چوں کہ یہاں نثر کا سوال ہے اس لئے اس تخلیقی استعمال کے ساتھ نثر کے تعمیری اظہار کے ساتھ پورا انصاف، دوسرے نقطۂ نظر کی موجودگی جو نہ صرف ایک ڈرامائی حد بندی کرتی ہے بلکہ یک طرح موضوع کو بھی متعین کرتی ہے۔ گویا ناول میں مواد اور ہیئت علیحدہ نہیں ہوتے بلکہ دونوں ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی من تو شدم تو من شدی والی بات ہے۔ اس حل کو ہی تکنک کہتے ہیں۔

جب تک زندگی کو طبیعیاتی علوم کے دیئے ہوئے قوانین کی مدد سے سمجھا جاتا رہا، ہر چیز میں باقاعدگی، تناسب، تنظیم، پلاٹ کی چستی پر پر زور دیا گیا۔ جب یہ اندازہ ہوا کہ کائنات ایک ریاضی کا فارمولا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سڑک ہے جس پر کچھ بلب روشن ہیں۔ بلبوں کے نیچے اور کچھ دور تک روشنی ہے اور بیچ میں اندھیرا۔ اس لئے اب پلاٹ پر اتنا زور نہیں جتنا پہلے تھا۔ فارسٹر نے کہا تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے، لیکن اب پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کے متعلق ہمارا تصور بدل گیا ہے۔ نفسیات کے علم اور لاشعور اور تحت شعور کے مطالعے نے کردار کے باطن کو روشن کر دیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہم آئس برگ کا انداز سمندر کی سطح سے اوپر برف دیکھ کر لگاتے تھے۔ اب اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کا تین چوتھائی حصہ سمندر کے نیچے ہے۔ یہی حال انسانی فطرت کا ہے جو صرف خارجی حالات کی مدد سے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کے لئے انسان کی پوری تاریخ اور ذہن کی بھول بھلیاں میں جھانکنا پڑتا ہے۔ شعور کی رو کی علم نے ناول کی دنیا میں انقلاب کر دیا۔ جیمس جوائس کے یولی سس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ڈبلن کا ماحول بھی ہے، شعور کی رو بھی، یورپ کے ذہنی سرمائے سے استفادہ بھی ہے اور ان سب چیزوں کو اساطیر کی مدد سے گہری معنویت عطا کرنے اور آج کے انسان کو ادبی مسائل کی جستجو میں سرگرم دکھانے کی ایک کامیاب کوشش بھی۔ ناول کا بڑا سرمایہ حقیقت پسندی (Realism) کے ذیل میں آتا ہے مگر اس کے ارتقا میں علامتی اظہار کی بھی اہمیت مسلم ہے۔ علامتی ناول، حقیقت پسند ناول کے بعد وجود میں آیا مگر اس کا رشتہ فطرت کے ایک ناقابل انکار قانون کی بنا پر رومان سے مل جاتا ہے۔ یہ رشتہ جدید ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی واضح ہے جہاں تخیل کی اہمیت ہے۔ جدید ناول میں جوائس، پروست، فاکنر، کافکا، کازیلی کی جو اہمیت ہے اس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ ان کے فن میں علامت اور اشارے کی جو مرکزیت ہے وہ ظاہر ہے۔ علامت کسی غیر مرئی شے کا مرئی نشان ہے۔ علامت سازی انسان کی فطرت ہے، یہ اس دور کا ہی تجربہ نہیں ہے۔ وہائٹ ہیڈ علامت پرستی یا اشاریت کو Perception کا ایک طریقہ سمجھتا ہے۔ جس کی وجہ سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ کیسیرر (Cassirer) کہتا ہے کہ آدمی ایک علامتی جانور ہے، جس کی زبانیں، اساطیر، مذاہب، سائنس اور آرٹ سب علامتی فارم ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنی اصلیت کو کرتا ہے اور اسے سمجھتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ ان شکلوں کے علاوہ جو اصلیت ہے وہ مدفاضل ہے۔ ایک بنیادی مفہوم میں علامت پسندی ہر دور کی خصوصیت رہی ہے۔ ہاں اس دور میں علامت کا استعمال شعوری اور بالارادہ ہو گیا ہے۔ اس لئے علامتی ناول اور افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ترشے ترشائے واضح، متناسب، صاف ستھرے، روز روشن کی طرح عیاں فن کو دھندلا، طلسمی، خواب آلود اور ہر شے کو کچھ اور بنا دیتا ہے۔ ہاں اس کے باوجود ناول کی اصلی اور بڑی روایت یعنی حقیقت پسندی ختم نہ ہو گی بلکہ علامت پسندی کے دوش بہ دوش جاری رہے گی اسے اس قسم کی لامعنویت کو بھی اپنانا ہوگا جو Theate of the absurd میں ملتی ہے اور جس کی وجہ سے گودو کے انتظار میں کچھ حقیر سے انسان، ایک نئی عظمت اور معنویت پیدا کر لیتے ہیں۔

ناول ہمارے یہاں چوں کہ مغرب سے آیا ہے اس لئے ناول کے ارتقا کی کہانی ہمارے یہاں بھی اپنی طرح دہرائی جا رہی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی۔ ناول کے عالمی مزاج اور کردار کو بیرونی شے کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا جس طرح یہ کہہ کر کہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے، شہروں کی طرف میلان سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ ابھی حال میں ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے نہ صرف شہروں کی طرف تیزی سے بڑھنے کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے صنعتی ملکوں کی طرح بڑے شہروں کے اور بڑے ہونے کا میلان بھی قوی ہے اس لئے اردو کا ناول موجودہ دور کی پر پیچ، ہنگامہ خیز، اپنے سے بیزار اور دنیا سے نالاں

شہری زندگی سے اور اس کی نت نئی تعبیروں اور تفسیروں سے کس طرح دامن بچا سکتی ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے یہاں ناول پر توجہ زیادہ ہوئی ہے۔ مگر ابھی قرار واقعی توجہ نہیں ہوئی۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایجاز و اختصار کی عادت غزل میں زیادہ ظاہر ہوئی اور نظم کی تعمیر کی طرف اتنی توجہ بعد میں ہوئی، اس طرح نثر میں مختصر افسانے نے اپنی طرف زیادہ توجہ مبذول کر لی اور چاند تاروں کی مسلسل روشنی کے بجائے شہاب ثاقب کی چمک میں زیادہ کشش نظر آئی۔ دوسرے ہمارے یہاں متوسط طبقہ دیر میں ابھرا اور اسی لئے بنگالی اور مراٹھی اور دوسری زبانوں میں ناول کا سرمایہ شاید زیادہ وقیع ہے۔ تیسرے وہ حقیقت پسندی جو کسی سیاسی یا مذہبی شکنجے کی پابند نہیں، ہمارے یہاں عام نہیں ہو سکی۔ ہماری تنقید میں بھی نظر سے زیادہ نظریے پر زور رہا۔ اور بجائے بار بار دیکھنے کے ایک نظر دیکھنے کو کافی سمجھا گیا۔ ایک لمحے کی مصوری، ایک کیفیت کی عکاسی، ایک کردار کی مرقع کشی، بہرحال لمحوں کی برات، کیفیات کے زیر و بم اور کرداروں کے نگارخانے سے آسان ہے۔ میں یہ تو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ افسانہ اعلیٰ ادب نہیں ہے۔ موپاساں، چیخوف، او۔ ہنری، میلسفیلڈ اور خود ہمارے یہاں پریم چند، منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر، قرۃ العین اور اس دور کے بہت سے افسانہ نگاروں کے قابل قدر کارناموں سے کیسے انکار ممکن ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جس طرح غزل کی روایت کو تسلیم کرتے ہوئے اور غزل کے ہر دور میں بدلتے ہوئے رنگ کو مانتے ہوئے، میرے نزدیک اردو شاعری کا مستقبل غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے۔ اسی طرح افسانے کی گہرائی اور تاثیر اور اس کی نشتریت کو تسلیم کرتے ہوئے اردو فکشن کا مستقبل اس کے ناول سے جانچا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج ہمارا افسانہ جس منزل میں ہے ہماری ناول وہاں تک نہیں پہنچی۔ ہماری ناول ابھی حقیقت پسندی کی معراج کو نہیں پا سکی اور افسانے میں علامتی اور تجریدی اظہار کو کامیابی سے برتا جانے لگا ہے۔ افسانوں کی ترقی اور مقبولیت میں رسالوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ناول کو یہ سہولت میسر نہیں اور بالاقساط ناول اب اٹھارویں اور انیسویں صدی کی طرح پڑھنے والوں میں مقبول نہیں ہوتے۔ ناول کی کمی کا ایک سبب خالص اقتصادی بھی ہے۔ ناول لکھنے کے لئے فن کار کو پورا وقت چاہئے۔ افسانہ اس سے اتنا مطالبہ نہیں کرتا۔ اگر ہمارے بعض افسانہ نگاروں کو اپنے فن کی طرف توجہ کرنے کے لئے کچھ معاشی آسودگی نصیب ہوتی اور وہ اپنے فن پر زیادہ توجہ صرف کرتے تو انہیں افسانہ نگاروں میں کچھ بڑے اچھے ناول بھی لکھتے۔ اردو میں سستے ادب کی مانگ کافی ہے۔ اچھے صحت مند اور سنجیدہ ادب کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت مختصر ہے۔ حلقہ مختصر تو ہر زبان میں ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں جتنا مختصر ہے اتنا شاید کہیں نہ ہوگا۔ پھر اس مختصر حلقے کو ہمارے نقادوں نے اور محدود کر دیا ہے جو طرف داری کے مرتکب زیادہ ہوتے ہیں، سخن فہمی کے پھیر میں زیادہ نہیں پڑتے۔ ہماری تنقید میں نظریے کی آمریت بہت زیادہ ہے۔ مارکس کے ماننے والے فرائڈ کو ماننے کو مشکل سے ہی تیار ہوتے ہیں وہ تو وجودیت کے روز افزوں اثر کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ زندگی کی طرح ادب میں بھی حقائق سے آنکھیں چرانا خطرناک ہے۔ مثال کے طور پر بیدی کی عظمت کا اعتراف ہوا ہے مگر کما حقہ اعتراف نہیں ہوا۔ اور منٹو جس پائے کا فن کار ہے اس کی طرف اس کے ادبی موضوعات سے شغف کی وجہ سے بیش تر نقادوں کا دھیان ہی نہیں گیا۔ آگ کا دریا پر پاکستان میں لے دے ہوئی تھی۔ سیتا ہرن کے مسودے کو ہندوستان کے ایک مشہور ناشر چھاپنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ہمارے یہاں تق تقریر و تحریر کی آزادی ہے۔ مگر فن کار کو ابھی تک اپنی روح کی پکار سنانے کی وہ آزادی نہیں جو ہونی چاہئے۔ فن کار جب ہر ایک کو سرخم کرتے دیکھتا ہے تو اپنی کلاہ کج کر لیتا ہے اقرار کے شور میں اسے انکار کا سر بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب کوئی عمارت فرسودہ ہو جاتی ہے تو وہ نئی تعمیر پر اصرار کرتا ہے۔ وہ پاسترناک کی طرح انقلاب کے جلوس کا شکوہ بھی دکھاتا ہے اور اس میں کچھ کچلی ہوئی روحوں کے زخم بھی۔ وہ کافکا بھی ہے اور کامیو بھی، بریخت بھی ہے اور بیکٹ بھی۔

آندرے ژید کا ایک کردار کہتا ہے:

"I should like a novel which should be at the same time as true and as far from reality, as particular and at the same as general as human and fictions as athalie or tartuffe or cinna."

"And... The subject of this novel?"

"It has'nt got one, answered edourd brusquely and perhaps that's the most astonishing thing about it My novel has'nt gota subject yes, I know it sounds stupid, Levi's say if you prefer it, it has'nt got one subject. "A slice of life" the naturalist school said, The great defect of that school is that it always cuts its slice in the same directions, in time lengthwise. Why not in breadth? of in depths? as for me I should like to put everything into my novel I do not want any cut of the scissors to limit its substance at one point rather than at another for more than year now that I have been working at it, nothing happens to me that I do'nt put in to it-everything I see, everything I know, everything that other people's lives and my own teach me."

سوال یہ ہے کہ کیا اردو فکشن اس بلندی پر پہنچ گیا ہے؟ ☆☆☆

آل احمد سرور

شمارہ ۱۵۶،
اگست تا اکتوبر ۱۹۸۹

وقت کا عرفان

کولرج کا بوڑھا ملاح ایک آفاقی علامت ہے
ہم سب، جو آفتاب لب بام ہیں
بوڑھے ملاح کی طرح شادی کے مہمان کا ہاتھ پکڑ کر
اسے اپنی داستان سناتے ہیں
گاندھی جی اور مولانا آزاد
جواہر لال نہرو اور جناح اور قدوائی کی باتیں
حسرت جگر فانی کے قصے
عبدالحق ضیاء الدین ذاکر حسین
علی گڈھ اور جامعہ اور اقبال کی داستان
مگر انھیں اس طلسم ہوشربا سے کوئی دلچسپی نہیں
ان کے اپنے ہیرو اور اپنے نیتا ہیں
کوئی اداکار، کوئی گیت کار، کوئی رقاص
کوئی پونجی پتی کوئی صنعت کار
انھیں نہ مذہب کے مسائل ستاتے ہیں
نہ ادب کے سوالات نہ سیاست کے عقیدے
یہ اپنے میدان حشر میں اپنا مقام ڈھونڈ رہے ہیں
بس آج کا معرکہ اور آج کی الجھن
ان کی فتح اور شکست
یہ لمحے کے اسیر
وقت کا عرفان کہاں سے لائیں

ہمیں سکھایا گیا تھا

ہمیں سکھایا گیا تھا
ہوتے ہیں چند آداب زندگی کے
یہ زخم آداب عاشقی کے
وہ داغ خوابوں کی چاکری کے
نئے حقائق سے دوستی کے
ہمیں بتایا گیا تھا
عظیم ہے چاہنے کی خواری
ہر ایک جلوے کی پاسداری
کرن کوئی ہو تو دل پکارے
ہم اس کے ہیں اور یہ ہماری
ہمیں بجھایا گیا تھا
کہ دشت میں بے تکان گھومیں
بہار کی ہر ادا پہ جھومیں
کلی اگر کوئی مسکرائے
تو اس کو دیوانہ وار چومیں

وہ سارے دفتر الٹ گئے ہیں
کہاں کے جلوے کہاں کے نسخے
اداس نسلیں اداس چہرے
نہ آگہی کی شراب باقی
نہ وہ جنوں کا حساب باقی
گھروں میں جینا گھروں میں مرنا
کسی طرح صبح و شام کرنا
سبو چہ خالی پڑا ہوا ہے
اسی سے ہر لحظہ جام بھرنا

یہ شام بکھر جائے گی

ابرار احمد

شمارہ ۲۳۲،
دسمبر ۱۹۹۹

ہمیں معلوم ہے
یہ شام بکھر جائے گی
اور یہ رنگ
کسی گوشۂ بے نام میں کھو جائیں گے
یہ زمیں دیکھتی رہ جائے گی
قدموں کے نشاں
اور یہ قافلہ
ہستی کی گذرگاہوں سے
کسی انجان جزیرے کو نکل جائے گا
جس جگہ آج
تماشائے طلب سے ہے جواں
محفل رنگ و مستی
کل یہاں ماتم یک شہر نگاراں ہوگا
آج جن رستوں پہ
موہوم تمنا کے درختوں کے تلے
ہم رکا کرتے ہیں، ہنستے ہیں
گذر جاتے ہیں
ان پہ ٹوٹے ہوئے پتوں میں ہوا ٹھہرے گی
آج جس موڑ پہ ہم
تم سے ملا کرتے ہیں
اس پہ کیا جانے کل کون رکے گا آ کر؟
آج اس شور میں شامل ہے
جن آوازوں کی دل دوز مہک
کل یہ مہکار اتر جائے گی خوابوں میں کہیں
گھومتے گھومتے تھک جائیں گے
ہم فراموش زمانے کے ستاروں کی طرح
ارض موجود کی سرحد پہ بکھر جائیں گے
اور کچھ دیر ہماری آواز
تم سنو گے تو ٹھہر جاؤ گے
دو گھڑی رک کے گذر جاؤ گے
چلتے چلتے۔
اور سہمے ہوئے چوباروں میں
اپنے رستوں، اپنے بازاروں میں
ہنسنے والوں کے
نئے قافلے آ جائیں گے

میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے

ابرار احمد

شمارہ ۲۳۵،
مارچ تا جون ۲۰۰۱

میرے پاس
راتوں کی تاریکی میں کھلنے والے پھول ہیں
اور بے خوابی
دنوں کی مرجھائی ہوئی روشنی ہے
اور بینائی...

میرے پاس لوٹ جانے کو ایک ماضی ہے
اور یاد
(اس تکلیف دہ زندگی میں
ایک اور زندگی کی متوازی لہر)
میرے پاس
مصروفیت کی تمام تر رنگارنگی ہے
اور بے معنویت
اور ان سب سے پرے کھلنے والی آنکھ
میں آسمان کو اوڑھ کر چلتا
اور زمین کو بچھونا کرتا ہوں
جہاں میں ہوں
وہاں ابدیت اپنی گرہیں کھولتی ہے
جنگل جھومتے ہیں
بادل برستے ہیں
مور ناچتے ہیں
میرے سینے میں ایک سمندر نے پناہ لے رکھی ہے
میں اپنی آگ میں چلتا
اور اپنی بارشوں میں نہاتا ہوں
میری آنکھوں میں
ایک گرتے ہوئے شہر کا سارا ملبہ ہے
اور ایک مستقل انتظار
اور آنسو...

اور ان آنسوؤں سے پھول کھلتے ہیں
تالاب بنتے ہیں
جن میں پرندے نہاتے ہیں
ہنستے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں
میری آواز میں
بہت سی آوازوں نے گھر کر رکھا ہے
اور میرا لباس
بہت سی دھجیوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا ہے
میرے پاس
دنیا کو سنانے کے لیے کچھ گیت ہیں
اور بتانے کے لیے کچھ باتیں
میں رد کیے جانے کی خفت سے آشنا ہوں
اور پذیرائی کی دل نشیں مسکراہٹ سے
بھر رہتا ہوں
میرے پاس
ایک عاشق کی وارفتگی
درگذر اور بے نیازی ہے
تمھاری اس دنیا میں
میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے
وقت اور تم پر
اختیار کے سوا؟

ابرار احمد

شمارہ ۲۸۴،
ستمبر ۲۰۰۴

الٹے سیدھے قدموں میں،
یہاں وہاں رکتا ہے کبھی
کبھی چل پڑتا ہے
بے خبری کی نیندوں کے آرام سے باہر
سونی دوپہروں کی خالی خاموشی میں
شام کے پھیکے بازاروں میں
اک بے مول محبت کی خوشبو سے پریشاں
اپنے سینے میں سہمے رازوں سے ہراساں
گرم و سرد ہواؤں کی یلغار کے آگے
اپنی میلی ذات کو اوڑھے
گھنٹی کی جھنکار میں اپنی بیٹھی ہوئی آواز ملا کر
کوئی صدائیں دیتا ہے

"ہے کوئی؟ زندہ ہے کوئی؟
جاگتا ہے کوئی؟ سنتا ہے کوئی؟
ان قصبوں اور شہروں کے آسیب سے نکلو
اپنے گھروں کی مہک سے اور دھوئیں سے نکلو
اپنی دیواروں تک ٹھہری نظروں کے آشوب سے نکلو
لوٹو، اپنی حیرانی کی جانب لوٹو
اپنی رونق، اپنی ویرانی کو لوٹو
نکلو اس وحشت سے، تھوڑی دیر کو نکلو
آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو
دیکھو، دیکھنے والو، دیکھو...

"طاقتور کی منطق دیکھو
دنیا میں دہشت پھیلاتے آگ اگلتے بندر دیکھو
ان کے چکنے چہرے دیکھو
اپنی گردن دینے والے احمق دیکھو
اور پھر ان کی جنت دیکھو
انگلستان کا سبزہ دیکھو
دیوار چیں، اس کے لڑھکتے پتھر دیکھو
روس پہ جمتی برف کو دیکھو
ہن برساتے بادل دیکھو
سبز ملایا، سنگاپور کے جزیرے دیکھو
دیکھو اپنے خالی کھیسے
پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھو
دیکھو ملک عرب کا صحرا
کوفہ اور بغداد کو دیکھو
اور جاپان کے پرزے دیکھو
دیکھو... وصل و فراق کی دنیا
ازل کی پیاس اور پانی دیکھو
یورپ اور امریکہ دیکھو
ایشیا اور افریقہ دیکھو
دیکھو، دیکھنے والو، دیکھو..

"شاہ نجف کا روضہ دیکھو
عرش پہ جاتا گھوڑا دیکھو
کعبہ دیکھو، دیکھو، مسجد اقصیٰ دیکھو
بارہ دری مغلوں کی دیکھو
پنکھے جھلتی لاڈ لڈاتی باندی دیکھو
تاج محل اور مندر دیکھو
بھکشو، صوفی، سادھو اور قلندر دیکھو
گوری ملکہ کی بگھی کے پھیرے دیکھو
چھک چھک کرتا انجن دیکھو
موٹر دیکھو، چمنی دیکھو
پھر دھرتی پر کھنچتی ہوئی تحریریں دیکھو
لہولہان ٹرینیں دیکھو
اپنی مٹی تج کر آنے والے دیوانوں کو دیکھو
ان کی خالی آنکھیں دیکھو
دیکھو قائد کی بے طاقتی
اور کرسی کی قوت دیکھو
شالیمار کا جوبن دیکھو
رنگ برنگی چڑیاں اور کبوتر دیکھو
یحییٰ خان اور بارہ من کی دھوبن دیکھو
دھان کے کھیتوں میں بھاری بوٹوں کا کیچڑ
خون کے رنگ میں نقشہ غائب ہوتا دیکھو
کچھ بے چین مسافر دیکھو
اکڑی گردن اور زہریلی آنکھیں دیکھو
اور پھانسی کے تختے دیکھو
تعزیے اور جلوس کو دیکھو
کالے کپڑے اور لوگوں کا ماتم دیکھو
اور قدرت کے کرشمے دیکھو
عزت دیکھو، ذلت دیکھو
نفرت کی آندھی
چاہت کی بارش دیکھو
مٹی کے کسی ڈھیر پہ گرتے آنسو دیکھو
اور ہوا میں بکھرے ہوئے بے نام ونشاں جسموں کو
دیکھو
اور ان کی تدفین کو دیکھو
کل عالم کی دلہن کو، اپنے وطن کو دیکھو
اس پر تازہ مشق ستم کی آڑی ترچھی لکیریں دیکھو

"رستے کدھر نکل جاتے ہیں
آسمان کا در ہے کہاں پر
جگنو، چاند ستارے کہاں ہیں
سورج کیوں بجھتا ہی نہیں ہے
پانی کی منزل ہے کدھر کو
ظالم وظلم کا انت کہاں ہے
دھرتی کیوں پھٹتی ہی نہیں ہے
منکر اور نکیر کو دیکھو
اور اپنی تقدیر کو دیکھو
اول کیا ہے، آخر کیا ہے
رخساروں کا سونا دیکھو اور بالوں کی چاندی دیکھو
دیکھو جہل کی، زر کی سبقت
دیکھو علم و ہنر کی ہزیمت
دیمک لگی کتابیں دیکھو
بے کل عمر بتانے والی روحوں کی تنہائی دیکھو

ان پر ہنستی دنیا دیکھو
اور ان کی محرومی دیکھو
اپنے پاگل من کو دیکھو
نانک دیکھو، بلھا دیکھو
خسرو دیکھو، خواجہ دیکھو
ملا اور تماشا دیکھو
دریاؤں کی روانی دیکھو
جذبوں کی طغیانی دیکھو
کھیڑوں کے پنجے میں روتی کرلاتی ہوئی ہیر کو دیکھو
وارث شاہ دلگیر کو دیکھو
اور اس کی تحریر کو دیکھو
لوح جہاں پر باہو اور حسین کے آنسو
پیر فرید کی ہوک کو دیکھو
دیکھو، دیکھنے والو، دیکھو...''

شہری بابو، لڑکے بالے
بڑے گھروں سے جھانکنے والے
کالج اسکولوں کے بچے
دھول سے اٹے ہوئے میدانوں
صاف اور ستھری گلیوں میں
کہیں کشادہ رستوں پر
تانگے والے، ریڑھے والے
جم کے دکان چلانے والے
بیلوں کی جوڑی کے مالک
اپنے ماتھے پر لشکائے
کٹی ہوئی فصلوں کا سونا

پگڑی والے شملے والے
پینٹوں اور قمیصوں والے
مل کر راس رچاتے آئے
گھنٹی کی آواز پہ رکتے، چلتے آئے
روتے آئے، ہنستے آئے

''رنگے اور مراثی دیکھو
برفی لڈو، پھول کھانے
گرما گرم جلیبیاں دیکھو
دیکھو اونچے تختے اوپر نور جہاں کے شوخ سروں پر
گوٹا لگے ہوئے کپڑوں میں
ناچتی گاتی لڑکیاں رنگ برنگی
ٹکٹ کی کھڑکی، دھوم دھڑکا
لگی سرکس شیروں والی
چٹی چمڑی، ننگی خواہش
گول سڈول اٹھانیں دیکھو
رونے دیکھو، ہاسے دیکھو
رنگ برنگے کپڑے اور کپڑوں کے اندر
خوابوں کی تصویریں دیکھو اور ان کی تعزیریں دیکھو
دھیرج والی بیبیاں دیکھو
ان کی سرمہ لگی آنکھوں میں
آزادی کی تڑپ کے گہرے ڈورے دیکھو
دیکھو بوڑھے لاٹھی ٹیکتے، گرتے پڑتے
ان کا سہارا بننے والے بیٹے دیکھو
دھول اڑاتی کچ کچ کرتی لاری دیکھو
اور بے سمت مسافروں کی

میلی، حیراں آنکھیں دیکھو
سڑکیں دیکھو، کاریں دیکھو اور ان کی رفتاریں دیکھو
دیکھو ٹھنڈے ریستورانوں کے شیشوں کے اندر
باہر تپتے فٹ پاتھوں کی خلقت دیکھو
دیکھو اپنی حالت، اپنے آئندہ کی صورت دیکھو
اور کسی ان دیکھی دنیا میں بس جانے کی خواہش کے
پھیرے دیکھو

مایوسی کے ڈیرے دیکھو
دیکھو پاس پڑوس کی آنکھیں
ان میں ٹھہرے آنسو دیکھو
انساں اور پرندے دیکھو
اپنی گلیاں، اپنے گھر اپنی دیواروں سے ٹکراتے
گرتے اٹھتے، روتے ہنستے بچے دیکھو
زندگیوں کے سستے پن پر
دلوں میں اترے ڈر کو دیکھو
گئے دنوں کی یادوں کی دیوار سے لگ کر
آنے والے کل کے رخ پر چادر دیکھو
روز ازل سے شام ابد تک
جو کچھ دیکھ نہیں سکتے ہو
اور جو کچھ دیکھ رہے ہو، دیکھو
دیکھو، دیکھنے والو، دیکھو

"آنکھ کی زد سے باہر کیا ہے
دل کی حد کے اندر کیا ہے
عکس ہے کیا شے، صورت کیا ہے
تو کیا چیز ہے خواہش کیا ہے
عمروں کی یہ گنتی کیا ہے
ماہ و سال، کلینڈر کیا ہے
شام و سحر کا چکر کیا ہے
سر میں کیا طوفان مچا ہے
اور سینے کے اندر کیا ہے
ظاہر کیا ہے
باطن کیا ہے
کون سا پل کیا کر جائے گا
کس لمحے کیا ہو جائے گا
کون کہاں پر مل جائے گا
کون کہاں پر کھو جائے گا
انہونی کے حیلے دیکھو
اپنی خاک کے ٹیلے دیکھو
دیکھو اس مٹی میں اپنی مٹی ملتے
اور اس دیش کی خوشبو کے سرچشمے دیکھو
قبریں دیکھو، کتبے دیکھو
دلوں میں ہر دم شور مچاتی دھول پہ گرتی شبنم دیکھو
دھند میں گرتی شکلیں دیکھو
جیتے جی بس دیکھتے جاؤ،
ہاتھ ملو اور دیکھتے جاؤ
دیکھتے جاؤ، چلتے جاؤ
دیکھو، دیکھنے والو..."

رنگ سے، نم سے خالی آنکھیں
بے کل اور متوالی آنکھیں
کسی فسوں میں کھوئی ہوئی ہیں
روئی ہوئی یا سوئی ہوئی ہیں...

ابراراعظمی

شمارہ ۴۳،
دسمبر ۱۹۶۹

کمرے میں دھواں درد کی پہچان بنا تھا
کل رات کوئی پھر مرا مہمان بنا تھا

بستر میں چلی آئیں مچلتی ہوئی کرنیں
آغوش میں تکیہ تھا وہ انجان بنا تھا

وہ میں تھا مرا سایہ تھا، یا سائے کا سایہ
آئینہ مقابل تھا میں حیران بنا تھا

نظروں سے چراتا رہا جسموں کی حلاوت
سنتے ہیں کوئی صاحب ایمان بنا تھا

ندی میں چھپا چاند تھا ساحل پہ خموشی
ہر رنگ لہو رنگ کا زندان بنا تھا

حرفوں سے بنا تھا کہ معانی کا خزینہ
ہر شعر مرا بحث کا عنوان بنا تھا

ابوالحسنات حقی

شمارہ ۱۹۷،
اگست ۱۹۹۶

یہ اک اور ہم نے قرینہ کیا
در یار تک دل کو زینہ کیا

بدل دی ہے سب صورت آب وخاک
مگر جب لہو کو پسینہ کیا

وہ کشتی سے دیتے تھے منظر کی داد
سو ہم نے بھی گھر کو سفینہ کیا

کہاں ہم تک آیا کوئی راز جو
کہاں ہم نے دل کو دفینہ کیا

فقیروں کا یہ بھی طلسمات ہے
لہو رنگ کو آبگینہ کیا

چمکنے لگا پھر غم رائیگاں
مگر ایک جب زخم و سینہ کیا

شمارہ ۲۶۴،
جنوری ۲۰۰۳

بے نیاز دہر کر دیتا ہے عشق
بے زروں کو لعل و زر دیتا ہے عشق

کم نہاد و بے ثبات انسان میں
جانے کیا کیا جمع کر دیتا ہے عشق

کون جانے اس کی الٹی منطقیں
ٹوٹے ہاتھوں میں سپر دیتا ہے عشق

پہلے کر دیتا ہے سب عالم سیاہ
اور پھر اپنی خبر دیتا ہے عشق

جان دینا کھیلتے ہنستے ہوئے
قتل ہونے کا ہنر دیتا ہے عشق

کٹ گریں اور پھر بھی قائم ہیں صفیں
کتنے بازو کتنے سر دیتا ہے عشق

سر برہنہ ہیں انا گنبد جو تھے
آندھیوں سے سر کو بھر دیتا ہے عشق

درد مندی پر جو قائم ہوں انھیں
نور افزا چشم تر دیتا ہے عشق

ایک بوجھل رات کٹ جانے کے بعد
ایک لمحے کو سحر دیتا ہے عشق

یہ سمجھ تم کو بھی ہوگی صاحبو
دل کو کیوں شعلوں میں دھر دیتا ہے عشق

چل نکلنے کا ارادہ باندھئے
دیکھئے سمت سفر دیتا ہے عشق

قدر ہے جس کی خیام حور میں
آبرو کا وہ گہر دیتا ہے عشق

احترام اسلام

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

دیکھنا کیا کہ یہ گھر کس کا ہے
ہے خدا ساتھ تو ڈر کس کا ہے

کس کے ہاتھوں ہے سند جرأت کی
پیرہن حزن میں تر کس کا ہے

سر بکف آپ بھی ہو جائیں گے
سوچ کر دیکھئے سر کس کا ہے

دیکھ کر زخم جگر کی صورت
جان لیتا ہوں ہنر کس کا ہے

جسم سونے کا چمکتا ہے بہت
جسم سونے کا مگر کس کا ہے

در و دیوار ہیں میرے لیکن
سوچتا رہتا ہوں گھر کس کا ہے

کون جانے کہ وہ ہیرا جس پر
ہے زمانے کی نظر کس کا ہے

شمارہ ۲۰۹،
اگست ۱۹۹۷

اس کے آنے سے یکا یک گھر مرا روشن ہوا
گھپ اندھیرے گھر میں جیسے اک دیا روشن ہوا

بارشوں نے شہر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا
ہر گلی ہر باڑ پر منظر نیا روشن ہوا

میں گھنے تاریک جنگل میں اکیلا تھا مگر
یک بیک میرے لئے اک راستہ روشن ہوا

انگنت ہاتھوں نے تعمیر قصر شاہ کی
سارے جگ میں نام لیکن ایک کا روشن ہوا

سامنے کی بند کھڑکی کھل گئی تھی رات کو
پھر یکا یک ایک چہرہ چاند سا روشن ہوا

دشمنوں نے سب بجھائیں مشعلیں جب راہ کی
بے سہاروں کے لئے اک حوصلہ روشن ہوا

احتشام اختر

شمارہ ۲۳۶،
اپریل ۲۰۰۰

دشوار ہے بھلانا وہ درد اضطراب کا
منظر ابھی بھی یاد ہے مرگ عقاب کا

پھاڑا مجھے تو سلسلہ پھر ٹوٹ جائے گا
میں بھی تو اک ورق ہوں تمھاری کتاب کا

لکھتا ہوں اس کا نام میں گھر میں جگہ جگہ
باقی ابھی خمار ہے کل کی شراب کا

میری صدا ہی گونجتی رہتی ہے دشت میں
میں منتظر ہوں اپنی صدا کے جواب کا

دیکھا تھا جس کو جھیل کے شیشے میں ایک دن
آنکھوں کو انتظار ہے اس ماہتاب کا

خوشبو نے سرخ پھول کی پاگل کیا مجھے
آنگن سے کاٹ پھینکا ہے پودا گلاب کا

احمد فواد

شمارہ ۱۷۸،
نومبر دسمبر ۱۹۹۴

مجھے ٹوٹے ہوئے لفظوں سے جوڑو
مری ان انگلیوں کو کاٹ کے پھر اس کی ٹیبل پر سجا آؤ
مجھے دوزخ کی جھولی میں گرا دو
محبت ہو تو شعلوں کی تپش سے ڈر نہیں لگتا
مری آنکھوں کے دامن خشک کر کے اس کے دروازے پہ چھوڑ آؤ
ہوا میں اس کی سانسیں گھل گئی ہیں
مجھے ان سرد جھونکوں کے فقط دو گھونٹ پینے دو
میں پی کر گیت لکھنا چاہتا ہوں

کچھ ایسے گیت...
جن میں آسمانوں کا بڑھاپا ہو
زمیں کے نام اک پاگل ستارے کی وصیت ہو
سمندر کے لبوں کی سرد خاموشی ہو
دریاؤں کی سب قومی کتابوں کا خلاصہ ہو
پرانی آہٹیں ہوں
نیم جاں اشکوں کے تہ خانوں کی دہشت ہو
کسی کی ڈائری کے خالی صفحوں کی صدائیں ہوں
وہ تصویریں ہوں
جن کو درد نے چپکے سے کھینچا ہو
کچھ ایسے خواب جن کو نیند نے گھر سے نکالا ہو
وہ دکھ جو راستے میں کھو گئے ہوں
یا کسی جیب سے سکھ نے چرائے ہوں
کچھ ایسے گیت...
جن کو چوم کے دل کی رگوں میں زہر گھل جائے
ہوا کی بے پنہ خرمستیوں کا راز کھل جائے
فرشتے پھر مجھے سجدہ کریں اور لامکاں کو آگ لگ جائے
کچھ ایسے گیت...
جن کے ہاتھ دن کی پسلیوں سے خوب واقف ہوں
جو شب کی دل زدہ گلیوں میں تنہا گھومنے جائیں
جو اپنی آگ میں خود جل کے مر جائیں
کچھ ایسے گیت...
جن کے پاؤں میں چھالوں کے موزے ہوں
بدن پر خوف کی چادر ہو
پیشانی پہ دکھ کے زرد ہونٹوں کا حوالہ ہو
کچھ ایسے گیت...
جو اس سے ملیں
تو اس کے دل کے تار ہل جائیں
ان آنکھوں کی خمار آلود خاموشی میں پتھر پھینک دیں
اور دائروں میں عکس بن کر دور بہ جائیں
کچھ ایسے گیت...
جو دنیا کو اپنے بازوؤں کے تنگ گھیرے میں لیے اک روز
اڑ جائیں
اور رنگیں تتلیوں کا روپ دھارے
اس کی نازک انگلیوں کو حسن دکھ کا وہ پیغام پہنچا دیں
جو بارش آسماں سے ساتھ لائی تھی

مجھے ٹوٹے ہوئے لفظوں سے جوڑو
مجھے بھی دھوپ

ان شاداب پیڑوں کی طرح راشن پہ تھوڑی روشنی دیدے
میں اک ٹوٹا ہو گملا ہوں
جس میں سر اٹھاتے ننھے پودے کو کسی نے روند ڈالا ہے
مجھے بھی، آگ!
خود کو راکھ کر کے زندگی کو عام کرنے کی جسارت دے
میں اک بجھتا دیا ہوں
جس کے دروازے پر ہر دم اک مسلح رات پہرہ دیتی رہتی ہے
مجھے بھی، اے سمندر!
ہر گھڑی اک رقص میں مصروف لہروں کی بشاشت دے
میں اک بچھڑا ہوا دریا ہوں
جس کے پاؤں میں زنجیر ہے گذرے زمانوں کی
مجھے بھی، آسماں!
اک دو ستاروں کی ضرورت ہے
میں ایسا راستہ ہوں
جس پہ ان قدموں کے بادل چھائے رہتے ہیں

میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
ہوا کے بازوؤں میں تڑپتے درخت اور دریا کا ہاتھ
چھڑا کر بھاگتی لہریں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتیں
میں تمھیں آہستہ آہستہ پی رہا ہوں
تمھاری بے اعتنائی اور تلخ الفاظ محبوب کے روایتی غصے کی طرح
میرے جوتوں پر سر رکھتے سو جاتے ہیں
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
تم اپنے ہونٹ کب تک الماریوں میں رکھتے رہو گے
تمھاری انگلیوں کا ذائقہ دھوپ جیسا ہے
میں تمھیں آہستہ آہستہ پی رہا ہوں
تمھاری بغلوں کے بال تمھاری پلکوں سے زیادہ خوش ذائقہ ہیں
میں تمھیں آہستہ آہستہ پی رہا ہوں
حالانکہ میں تمھیں ایک گھونٹ میں بھی پی سکتا تھا

ترا چہرہ
لرزتے آسماں کا عکس، بچے دھوپ کی رسی کو تھامے گنگناتے ہیں
ترا چہرہ
سمندر وادیاں اپنے گلے میں ہاتھ ڈالے گھومتی لہریں
ترا چہرہ

یہ ساری زندگی کا غم ہے
دو دن جاگنے سے کچھ نہیں ہوگا
محبت تو سدا اچھے بھلے لوگوں کا بیڑا غرق کرتی ہے
تم اپنے مشوروں کے نرم تکیے ساتھ لے جاؤ
مجھے معلوم ہے
وہ حسن کی مشہور تعریفوں کی پروا تک نہیں کرتا
میں یہ بھی جانتا ہوں
اس کے دل کے سرد ایوانوں میں اس روتے دیے کا
ایک آنسو بھی نہ ٹپکے گا
مگر کیا فرق پڑتا ہے
مجھے تو اس ہوا کا لمس کافی ہے
جو اس کے گرم بوسے لیکر آئی ہے
مجھے ان بھاگتی کرنوں سے تھوڑی بات کرنے دو
جو اس کے گھر سے آئی ہیں
یہ اپنی ہوش مندی کی کتابیں ساتھ لے جاؤ
مجھے اس گرد کے یہ ہاتھ بڑھ کے چوم لینے دو

تم ایک دن میرے ہاتھوں میں گھل مل جاؤ گے
میں نے پہلے بھی کئی سیل بند خاموشیاں توڑی ہیں
درختوں سے گفتگو کے لیے پرندوں کی بولیاں سیکھنی پڑتی ہیں
تم میری زندگی کا ایک چھوٹا سا راز ہو
اک دن میں تمھارا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے دوں گا
اور آسمان کا اتنا مذاق اڑاؤں گا
کہ وہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے
دن کی یہ خالی پلیٹ میری ٹیبل پر پڑی رہے گی
اپنا باقی وقت میں رات کے کوٹھے پہ گذارنا چاہتا ہوں
ہاں تم کوئی ستارہ بن کر میرے ساتھ رہ سکتے ہو

احمد فواد

شمارہ ۲۸۷،
دسمبر ۲۰۰۴

ابودردا، او بے دردا
میں تیرے ہاتھ چوموں گا
ہمیشہ ساتھ جھوموں گا
ابودردا ابودردا
ہوا کو کیا پڑی ہے ناچنے کی یہ بری عادت
ملے آہیں پرونے سے اگر فرصت
ابودردا ابودردا
کتاب ہجر کے کچھ باب سننے کے لئے دنیا میں آئی ہیں
یہ آنکھیں خواب بننے کے لئے دنیا میں آئی ہیں
ابودردا ابودردا
کہیں اک شاہزادہ ہے
جسے سب سے چھپا کر دل میں رکھنے کا ارادہ ہے
ابودردا ابودردا
تری نظموں نے نیلے پانیوں میں آسماں لکھا
ہواؤں کو کسی کے غم میں روتی داستاں لکھا
ابودردا ابودردا
پڑا اس حسن کا جب خاک پر سایہ
تو سب کو سانس لینے کا مزہ آیا
ابودردا ابودردا
بھرے رہتے تھے ان جیبوں میں جب سپنے
زمین و آسماں لگتے تھے سب اپنے
ابودردا
مگر وہ دن
جب اس دل نے
گلابی صورتوں سے تنگ آ کر ساری دنیا سے بغاوت کی
پھر آنکھوں کی حمایت کی
نہ ہونٹوں کی عبادت کی
ابودردا
مگر وہ دن
کھلی کھڑکی
نظر آئی ہنسی میں جھولتی اک مہرباں لڑکی
ابودردا
وہ منظر یاد آتا ہے
تو دل میں درد کا اک تیز دریا دندناتا ہے
ابودردا
مجھے بھی سوچنے کا روگ ہے شاید
ابھی تک اس کے جانے کا جہاں میں سوگ ہے شاید
ابودردا
تمھاری زندگی اک عکس ہے میرا
تری صورت کسی سائے کے پیچھے رقص ہے میرا
ابودردا
تجھے بھی چاندنی نے اپنے بستر سے جدا رکھا
مجھے بھی رات دن اک بے کلی نے
اپنے گرد و پیش سے اکثر جدا رکھا
ابودردا
ترا دامن بھی خالی تھا مرا دامن بھی خالی ہے
ابودردا
تجھے شاہوں سے نفرت تھی مجھے بھی ان سے نفرت ہے

ابودردا

تجھے بھی زرد پتوں سے محبت تھی مجھے بھی زرد پتوں سے محبت ہے

ابودردا

تری آنکھوں میں بھی وحشت تھی پاگل پن تھا دنیا سے
بغاوت تھی
مری آنکھیں بھی ویرانوں کا مسکن ہیں بیابانوں کی زینت ہیں

ابودردا

تجھے بھی لوگ پتھر مارتے تھے وحشی و پاگل سمجھتے تھے
نہ جانے کب سے میں بھی سنگدل نعروں کی زد میں ہوں
مری ہر سانس گھائل ہے
مجھے بھی دیکھتے ہی لوگ کہہ اٹھتے ہیں پاگل ہے
ابودردا کی نظمیں درد سے بوجھل ہوائیں جب سناتی ہیں
جوانی کے نشے میں مست کتنی لڑکیاں دل ہار جاتی ہیں
ابودردا کی نظمیں نوجواں کو کسی دن مار ڈالیں گی
وگرنہ زہر کھالیں گی
ابودردا کی نظمیں اب کتابوں میں نہیں ملتیں
غلامی ان کی فطرت میں نہیں ہے زرد صفحوں کی
انھیں تو پانیوں کے رنگ بہنا ہے
گھروں سے دور افسردہ دلوں کے ساتھ رہنا ہے
ابودردا کی نظمیں باندھ کر سامان میں رکھ لو
سفر میں کام آئیں گی

ابودردا کو کہتے ہیں کسی دن خواب میں
وہ خواب سی صورت نظر آئی
کہ اس کے بعد ساری عمر اس کی جاگتے گذری
اسی سائے کے پیچھے بھاگتے گذری
ابودردا نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے
گھر سے ننگے پاؤں ننگے سر نکل آیا
بہت اس شہر کے لوگوں نے سمجھایا
مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا

وہ اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈے گا
جہاں میں گھوم پھر کر اب وہی تصویر ڈھونڈے گا
اسے لوگوں کی باتوں سے بھلا مطلب
دنوں سے کیا غرض راتوں سے کیا مطلب
نہ رشتوں کی کوئی پروا نہ منزل سے غرض کوئی
نہ موجوں سے کوئی ڈر تھا نہ ساحل سے غرض کوئی
جہاں سے دور
خود سے دور چلتا جا رہا تھا وہ
کسی مستی میں ڈوبا گا رہا تھا وہ

میں اب آزاد ہوں کپڑوں کی لعنت سے
شریفوں کی محبت سے رذیلوں کی عداوت سے
کوئی روکے مجھے رکنا نہیں لیکن
کوئی ٹوکے مجھے جھکنا نہیں لیکن
کوئی رستے میں گر آیا تو گردن توڑ دوں گا میں
کہا گر آسماں نے کچھ تو بھانڈا پھوڑ دوں گا میں
یہ سب بکواس ہے ہر شے پرانی ہے
مجھے اب اک نئی دنیا بنانی ہے
نہ ہوں گے رات دن اس میں
نہ یہ سب انس و جن اس میں
میں اب آزاد ہوں جو جی میں آئے گا کروں گا میں
سمندر کو اٹھا کر اپنی جیبوں میں بھروں گا میں

مجھے اشبیلیہ لڑکیوں سے کچھ نہیں لینا
کھلی ہوں بند ہوں ان کھڑکیوں سے کچھ نہیں لینا

میں دن کے ساتھ سوؤں گا
میں ساری رات روؤں گا
مجھے احباب کی ان جھڑکیوں سے کچھ نہیں لینا

ابودردا نہیں بدلا
یونہی چلتا رہا گاتا رہا پگلا

سوائیلہ جہاں پر سنگتروں کے پھول کھلتے ہیں
مدنشالہ جہاں ہر لمحہ صبح و شام ملتے ہیں
کواکب زا کھلا رہتا ہے جس جانب سدا سورج کا دروازہ
مداکمتا جہاں ہر شام لگتی ہے تر و تازہ
نوائی لم جہاں کی لڑکیوں کے رنگ گورے بال کالے ہیں
لبکسینی جہاں کے مرد سارے ڈھیلے ڈھالے ہیں
شرابہ جس کے بوڑھوں نے کبھی بارش نہیں دیکھی
نبائب جس کی گلیاں پیاس کے اونٹوں کا مسکن ہیں
بلاگب جس کو شہر سرخ کہتے ہیں
جہاں فرمان شاہی سے فقط گلفام رہتے ہیں
دشرد و تیز دریاؤں کا سنگم ہے
جہاں برپا کئی صدیوں سے ماتم ہے
ابیزہ دو سنہری دھوپ کا قصبہ
جہاں اب کر لیا ہے اک مسلسل رات نے قبضہ
مورندلپا جہاں پر کسبیوں کی اتنی کثرت ہے
کہ سب کہتے ہیں شادی کی یہاں کس کو ضرورت ہے
ابودردا کی خاطر سب نے کھولے اپنے دروازے
مگر اس نے غلط ثابت کئے ان سب کے اندازے

وہ لڑکی کیا تھی بس اک سرخ شعلہ تھی
ابودردا کے قلب و روح پر ایسی گری بجلی
کہ سب کچھ جل گیا اس کا
پھر اس کے بعد وہ خود کو ہمیشہ خاک لکھتا تھا
جہاں کو راکھ لکھتا تھا

جہاں بدلا ابودردا نہیں بدلا
یونہی چلتا رہا گاتا رہا پگلا

درختوں سے محبت نے مری دنیا بدل ڈالی
جہاں جاتا ہوں اب تنہا نہیں ہوتا
یہ میرے ساتھ ہوتے ہیں
میں ہنستا ہوں تو ہنستے ہیں
میں روتا ہوں تو روتے ہیں
سدا خود دھوپ میں جلتے ہیں میرے سر پہ سائے تان دیتے ہیں
مری راحت کی خاطر جان دیتے ہیں
کبھی روتی ہوا کی داستاں پر آہیں بھرتے ہیں
کبھی یہ آندھیوں سے جنگ کی زندہ مثالیں پیش کرتے ہیں
کبھی ہفتوں کھڑی بارش کی باتیں سنتے رہتے ہیں
کبھی سورج کا سینہ تان کر ہر ظلم سہتے ہیں
بہار آئے تو رنگارنگ آنچل اوڑھ لیتے ہیں
خزاں آئے تو اپنے تن کے کپڑے بیچ دیتے ہیں

جہاں بدلا ابودردا نہیں بدلا
یونہی چلتا رہا گاتا رہا پگلا

اگر کانٹوں کے دل ہوتے
تو پھولوں کے رویے سے ہمیشہ ٹوٹتے خوار و خجل ہوتے
کہاں تک آندھیوں کا حکم مانیں ناچتے جائیں
پڑے رہتے کہیں پتھر کی سل ہوتے

کہاں گمنام راہوں میں
سدا چلتے رہے ہم بھی
ترے رخسار کی چوکھٹ پہ جل بجھتے جو تل ہوتے

جہاں بدلا ابودردا نہیں بدلا
یونہی چلتا رہا گاتا رہا پگلا

یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں
جو پھولوں کے لبوں سے مسکراہٹ چھین لیتے ہیں
جنھیں آہوں سے مطلب ہے
جو اپنا خوف ساری بستیوں میں بانٹ دیتے ہیں
یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں
جو ان ہنستے ہوئے کھیتوں کے دشمن ہیں
جو دریاؤں کا رستہ روک دیتے ہیں
جو ہر گاتی ہوئی ندی کو بڑھ کر ٹوک دیتے ہیں
یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں
جو نیلے آسماں کو گالیاں دیتے نہیں تھکتے
اگرچہ اس کا کوئی بال بیکا کر نہیں سکتے
یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں
جنھیں جینے کی فرصت ہے نہ مرنے کی اجازت ہے
جنھیں مایوسیوں کی خاک سر میں ڈالتے رہنے کی عادت ہے
یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں

ابودردا او بے دردا

نہیں تجھ سے کوئی پردہ
میں تنہائی سے شادی کر کے پچھتایا
مجھے بیوی سے ہول آتا ہے جب وہ شب کو
میرے پاس آتی ہے
یہ عورت ہے کہ وحشت ہے
میں اس بندھن سے آزادی کا طالب ہوں
ابودردا نہیں تجھ سے کوئی پردہ

مجھے اب چاہئے وہ زندہ مجموعہ
جو آنکھیں کھولتا ہو بند کرتا ہو
جو مجھ سے بولتا ہو میری سنتا ہو
جو میرے ساتھ سوئے ساتھ جاگے ساتھ باہر گھومنے جائے
مرے سینہ پہ سر رکھ کر کبھی روئے
کبھی باہوں میں باہیں ڈال کر گائے
کبھی لپٹا رہے دن رات پہلو میں
کبھی ناراض ہو کے دور جا بیٹھے
کبھی گر خواب میں چھو لوں تو وہ آپے سے باہر ہو
کبھی خود ہی کہے آ کر کہ لو منہ چوم لو میرا

ابودردا نہیں تجھ سے کوئی پردہ

ابودردا کے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا
کہ اک شاعر تھا دیوانہ
ستاروں کے گلی کوچوں میں ننگے پاؤں پھرتا تھا
کبھی دیوانگی میں چاندنی کے ساتھ سو جاتا
کبھی غصے میں آ کر دھوپ کی زرتار چادر کو جلا دیتا
کبھی تاریک راتوں میں سویروں کو اٹھا دیتا
کبھی ہنستے ہوئے روتا
کبھی روتے ہوئے کچھ یاد کر کے مسکرا دیتا
ابودردا کے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا
کہ اک شاعر تھا دیوانہ

احمد محفوظ

شمارہ ۱۷۳،
فروری مارچ ۱۹۹۴

اب اس مکاں میں نیا کوئی در نہیں کرنا
یہ کام سہل بہت ہے مگر نہیں کرنا

ذرا ہی دیر میں کیا جانے کیا ہو رات کا رنگ
سو اب قیام سرِ رہ گذر نہیں کرنا

خبر ہے گرم کسی قافلے کے لٹنے کی
یہ واقعہ ہے تو آگے سفر نہیں کرنا

بیاں تو کردوں حقیقت اس ایک رات کی سب
پہ شرط یہ ہے کسی کو خبر نہیں کرنا

رفو گری کو یہ موسم ہے ساز گار بہت
ہمیں جنوں کو ابھی جامہ در نہیں کرنا

شمارہ ۲۱۱،
اکتوبر نومبر ۱۹۹۷

اٹھ جا کہ اب یہ موقع ہاتھوں سے جا رہے گا
یہ کارواں ہے آخر کب تک رکا رہے گا

زخموں کو اشک خوں سے سراب کر رہا ہوں
اب اور بھی تمھارا چہرہ کھلا رہے گا

یوں تو بہت ہے مشکل بند قبا کا کھلنا
لیکن کھلا تو پھر یہ عقدہ کھلا رہے گا

سرگرمی ہوا کو دیکھا ہے پاس دل کے
اس آگ سے یہ جنگل کب تک بچا رہے گا

کھلتی نہیں ہے یارب کیوں نیند رفتگاں کی
کیا حشر تک یہ عالم سویا پڑا رہے گا

وقت زوال ہے ہم کھلواڑ دیکھتے ہیں
اٹھیے کہ یہ تماشا یوں ہی لگا رہے گا

یکسر ہمارے بازو شل ہو رہے ہیں یارب
آخر دراز کب تک دست دعا رہے گا

شمارہ ۲۳۲،
دسمبر ۱۹۹۹

اس سے رشتہ ہے ابھی تک میرا
وہ علاقہ ہے ابھی تک میرا

کس توقع نے جگایا تھا مجھے
خواب تازہ ہے ابھی تک میرا

کیا بتاؤں میں لب دریا سے
کچھ تقاضا ہے ابھی تک میرا

کہیں یک دشت ہوا چمکتی تھی
شہر اندھا ہے ابھی تک میرا

اک ذرا خود کو سمیٹوں تو چلوں
کام پھیلا ہے ابھی تک میرا

وہی صحرا ہے وہی رنج سفر
وہی قصہ ہے ابھی تک میرا

احمد مشتاق

شمارہ ۱۰۷،
فروری تا اپریل ۱۹۷۸

مل ہی جائے گا کہیں دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے

جس کے سانسوں سے معطر تھے در و بام ترے
اے مکاں بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

شمارہ ۱۳۴،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

اشک دامن میں بھرے خواب کمر پر رکھا
پھر قدم ہم نے تری راہ گذر پر رکھا

ہم نے اک ہاتھ سے تھاما شب غم کا آنچل
اور اک ہاتھ کو دامان سحر پر رکھا

چلتے چلتے جو تھکے پاؤں تو ہم بیٹھ گئے
نیند گٹھری پہ دھری خواب شجر پر رکھا

جانے کس دم نکل آئے ترے رخسار کی دھوپ
مدتوں دھیان ترے سایۂ در پر رکھا

جاتے موسم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا مشتاق
رہ گیا ساغر گل سبزۂ تر پر رکھا

احمد مشتاق

شمارہ ۱۳۶،
جنوری تا مارچ ۱۹۸۵

پھر وہی آنسو وہی خاموشیاں سازوں کے بعد
نغمہ آوازوں سے پہلے ہے نہ آوازوں کے بعد

کون بتلائے گا کتنی دستکیں باقی ہیں اور
تیرا دروازہ کھلے گا کتنے دروازوں کے بعد

جانے کس کس سے ملیں ہم تجھ سے ملنے کے لئے
پھر تیری آواز آئے کتنی آوازوں کے بعد

پھر وہی جلتی ہوئی شاخیں وہی پتوں کے ڈھیر
کیا ملا ان بے جہت بے درو پروازوں کے بعد

شوق ہنگامہ طلب کچھ اس کا اندازہ بھی ہے
وہ جو اک پرہول سناٹا ہے آوازوں کے بعد

شمارہ ۲۶۲،
نومبر ۲۰۰۲

چشم ولب کیسے ہوں رخسار ہوں کیسے تیرے
ہم خیالوں میں بناتے رہے نقشے تیرے

تیرے ساونت کو سولی کی زباں چاٹ گئی
جسم ابھی گرم تھا اور بال تھے گیلے تیرے

کیا کہوں، کیا ترے افسردہ دلوں پر گذری
کیسے تاراج ہوئے آئینہ خانے تیرے

اب کہاں دیکھنے والوں کو یقیں آئے گا
باغ جنت تھا بدن خواب تھے بوسے تیرے

احمد مشتاق

شمارہ ۲۶۲
نومبر ۲۰۰۲

پانی میں عکس اور کسی آسماں کا ہے
یہ ناؤ کون سی ہے یہ دریا کہاں کا ہے

دیوار پر کھلے ہیں نئے موسموں کے پھول
سایہ زمین پر کسی پچھلے مکاں کا ہے

چاروں طرف ہیں سبز سلاخیں بہار کی
جن میں گھرا ہوا کوئی موسم خزاں کا ہے

سب کچھ بدل گیا ہے تہ آسماں مگر
بادل وہی ہیں رنگ وہی آسماں کا ہے

دل میں خیال شہر تمنا تھا جس جگہ
واں اب ملال اک سفر رائیگاں کا ہے

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

بتا رہا تھا کوئی آشنائے آب رواں
کہ جنتیں ہیں عجب زیر پائے آب رواں

وہی طلوع مسلسل ہے جس طرف دیکھو
تمام آب رواں ہے ورائے آب رواں

حواس اگرچہ نظر بندی سراب میں ہیں
دلوں کو کھینچ رہی ہے صدائے آب رواں

جو روشنی سے بھرے تھے اب ان علاقوں میں
نہ دھوپ ہے نہ کہیں جھلملائے آب رواں

ترے خیال کے آتے ہی یاد آتے ہیں
شفق کے رنگ، درختوں کے سائے، آب رواں

احمد مشتاق

شمارہ ۲۶۶
مارچ ۲۰۰۳

ہم ہیں اب اور گھر ہمارا ہے
یہی سیر و سفر ہمارا ہے

وہ درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟
وہیں بستی میں گھر ہمارا ہے

بار بار اس گلی میں جاتے ہیں
جیسے کوئی ادھر ہمارا ہے

کیوں پریشاں کریں زمانے کو
درد دل درد سر ہمارا ہے

ہم ہیں مزدور کار خانۂ شوق
خواب سازی ہنر ہمارا ہے

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

دیکھیے ہوتی ہے کب نشو نما پانی کی
ہم نے اک اشک سے ڈالی ہے بنا پانی کی

اپنی قسمت میں ہے اک دشت بلا کا منظر
اور اطراف سے آتی ہے صدا پانی کی

دست خالی کے سوا ان کے تصرف میں ہے کیا
کیا کریں لوگ جو مانگیں نہ دعا پانی کی

اس سے پہلے کہ ترس جائیں نمی کو آنکھیں
لوح دل پر کوئی تصویر بنا پانی کی

رات کچھ یوں دل پر درد سے گذری تری یاد
جیسے صحرا سے گذرتی ہے ہوا پانی کی

سوکھتا جاتا ہے دریاے محبت مشتاق
مصرع تر سے کوئی موج اٹھا پانی کی

احمد مشتاق

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

بغداد میں صبح

وہی ان کی ستیزہ کاری ہے
وہی بے چارگی ہماری ہے

وہی ان کا تغافل پیہم
وہی اپنی گلہ گذاری ہے

وہی رخسار و چشم و لب ان کے
وہی بے چہرگی ہماری ہے

حسن ہو خیر ہو صداقت ہو
سب پہ ان کی اجارہ داری ہے

ہاتھ اٹھا تو سن تخیل سے
یہ کسی اور کی سواری ہے

شمارہ ۲۷۰
جولائی ۲۰۰۳

شام غم یاد ہے کب شمع جلی یاد نہیں
کب وہ رخصت ہوئے کب رات ڈھلی یاد نہیں

دل سے بہتے ہوئے پانی کی صدا گذری تھی
کب دھندلکا ہوا کب ناؤ چلی یاد نہیں

ٹھنڈے موسم میں پکارا کوئی ہم آتے ہیں
جس میں ہم کھیل رہے تھے وہ گلی یاد نہیں

ان مضافات میں چھپ چھپ کے ہوا چلتی تھی
کیسے کھلتی تھی محبت کی کلی یاد نہیں

جسم و جاں ڈوب گئے خواب فراموشی میں
اب کوئی بات بری ہو کہ بھلی یاد نہیں

احمد مشتاق

شمارہ ۲۷۷
فروری ۲۰۰۴

جب پرندے پس دیوار خزاں بولتے ہیں
دل میں نادیدہ بہاروں کے نشاں بولتے ہیں

سرخی شام الم گیت میں ڈھل جاتی ہے
زخمۂ درد سے تار رگ جاں بولتے ہیں

کیا لکھا ہے ترے قانون طرب میں اے دوست
اپنے اطراف تو نغمے کو فغاں بولتے ہیں

جاگتا ہوں تو صدا دیتی ہیں قاتل یادیں
سونے لگتا ہوں تو زخموں کے نشاں بولتے ہیں

حسرتیں چپ ہیں مگر تیز ہے دل کی دھڑکن
جب مکیں مہر بلب ہوں تو مکاں بولتے ہیں

شمارہ ۲۸۸
جنوری ۲۰۰۵

لرزہ ہوا تھا طاری حصن حصین دل پر
رکھا تھا پاؤں تم نے جب سرزمین دل پر

تم آؤ تو دکھاؤں بے درد بارشوں نے
ڈالی ہیں جو لکیریں لوح جبین دل پر

رت آگئی خزاں کی باغات آسماں سے
جھڑنے لگے ہیں پتے خاک زمین دل پر

کل شام اک پرندہ جانے کہاں سے آیا
کچھ دیر چہچہایا شاخ حزین دل پر

آخر ہم اس کا دامن تھامے رہیں گے کب تک
وہ بھی تو ہاتھ رکھے اب آستین دل پر

ہیں کیا ہماری غزلیں طرز وزمین دل پر
یا طائر فسردہ شاخ غمین دل پر
شمس الرحمٰن فاروقی

ڈرینج میں گرا ہوا قلم

احمد ہمیش

شمارہ ۱۴،
مئی ۱۹۶۷

ایک دستاویزی سیاہ رات کی تاریخ ختم ہوتے ہی جب ہم صبح کو اٹھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پیٹ کی روایتی خرابی ہمیں بستر سے ایک انچ بھی حرکت نہ کرنے پر بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ایک قلم دیا جاتا ہے کہ ہم اس سے آنے والی رات کا ویسا ہی، من و عن پروگرام لکھیں، جو پچھلی دستاویزی سیاہ رات کا رہا ہوگا۔

ہمارے پیٹ میں ایک تیزابی مروڑ ہوئی۔ جلن کے ساتھ درد ایک خاص حصہ میں یکا یک رک گیا۔ یعنی اگر رکتا نہ تو کسی طرح باہر ضرور خارج ہو جاتا۔ درد اور گاڑھا ہو گیا۔ لیکن ہمیں پہلی بار انتہائی غصہ آیا۔ ہم نے قلم کو مٹھی میں بھینچ لیا۔

"ہم پروگرام میں تبدیلی چاہتے ہیں۔" ہم نے سوچا۔

"قلم میں کتنی روشنائی موجود ہے؟" سوال کسی مصروف کونے سے اٹھا اور اگلی مصروفیت کے ریہرسل کے لئے تیار ہو گیا۔

یعنی سیاہی موجود ہے، ریہرسل ممکن ہے۔

ہم نے مٹھی کی ابتدائی گرفت غصہ کے ردعمل میں بدل لی۔ قلم کو انگوٹھے اور اس کے ساتھ کی دو انگلیوں کے درمیان مضبوطی سے دبا لیا اور خود سے اعلان کیا کہ پہلے ہم تمام خراب پیٹوں کے نام ایک اہم مسودہ تیار کریں گے۔ سیاہ دستاویز سے بالکل مختلف۔

سارا عمل روشنی میں ہوگا۔

"لیکن عمل کا تعلق کس سے ہے؟" کوئی بھی پوچھ سکتا ہے۔

کیا ان خودسر محبوباؤں سے، جو محض اپنے پیٹ کی خرابی کی بنا پر ہی ہمارے لئے تنگ ہوئیں حتیٰ کہ وہ مخالف ہوا، جو ان کے پیٹ سے نکل کر باہر کھلی ہوا میں ملنا چاہتی ہوگی، دوبارہ ان کے دماغ کی طرف پلٹ گئی۔ انھوں نے چہرے سکوڑ لئے، ان کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ دراصل یہ سب کچھ ہمارے خلاف ہوا۔ حالانکہ اس سے ہمارے قلم میں کافی روشنائی تھی۔ کیوں کہ ہم اب بھی جو کچھ خارج کرتے ہیں، پھیل جاتے ہیں۔ ہم تو ان عورتوں کے پیٹوں میں بھی تنگ نہیں ہوئے، جب ہم ان میں دردزہ تھے۔ وہ عورتیں جو بے وقوف تھیں۔ کیوں کہ وہ مر چکی ہیں۔ لیکن ان کے پیٹوں کو ہم نے نہیں، ان کے شوہروں نے خراب کیا تھا۔

"ہم کسی مری ہوئی ذمہ داری کو جھیلنا نہیں چاہتے۔" ہم نے یہ اعلان بنا مائیکروفون کے کیا تھا۔ سو، برا یہ ہوا کہ منھ سے نکلی ہوئی آواز دور تک نہ پھیل سکی۔ جب کہ ہم کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتے تھے، ہم کچھ بول بھی نہ سکے۔ اپنے ہی ہاتھوں کا بوجھ اپنے گردزدہ چہرے پر رکھے، ہم ان سوالوں کا انتظار کرتے رہے، جو ہم سے کسی وقت بھی کئے جا سکتے ہیں (مطلب یہ کہ ابھی کئے نہیں گئے)۔

اس عمل میں ہم سوالوں کو تو سن سکتے ہیں لیکن سوال کرنے والے چہروں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے لئے ہمیں اتنا عرصہ درکار ہوگا جتنی دیر میں وہ چہرے ہمارا ضمیر بن جائیں۔

گویا ہمیں ضمیر کا سفر یاد ہے۔ اتر پردیش کے ضلع بلیا میں ایک کمنی کر کچی سڑک پر ہم نے جس گنوار کو جو اور مٹر کے ستو کے ساتھ اس میں تین گنی دھول ملا کر کھاتے دیکھا۔ اس کا کھردرا میلا چہرہ ہم سے پوچھ سکتا تھا کہ ہم اس کی طرح دھول خور کیوں نہیں بن جاتے۔

ہم دھول بھی نہ کھا سکے۔ ہمارے پاس سے بہت سی چیزیں، اور عورتیں نکل گئیں۔ ہم انھیں پہچان بھی نہ سکے۔ ورنہ ہم سے وہ بیمار گدھا بہ درجہا بہتر تھا، جس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک بڑا سا ناسور تھا اور جلد کی سیاہی ادھڑ ادھڑ کر ناسور کے بدگوشت کے ساتھ جھولنے لگی تھی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ ایسے میں ہمارا یہ سمجھنا لازم ہوگا کہ وہ اپنے آس پاس چرتے صحت مند گدھوں کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی نسل نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن اس کے برعکس وہ ضرورت پڑنے پر صحت مند گدھوں کی بہ نسبت زیادہ ہی بہک جاتا ہے۔ اپنی نسل پیدا کرنے کے لئے دوڑتا ہے صحت مند گدھوں پر حملہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھپی ہوئی توانائی جانے کیسے بدگوشت کے ڈھیر سے نکلتی ہے اور دوڑ کے نتیجے سے جاملتی ہے۔

دھول خوار گنوار اور بیمار گدھا... یہ ہمیں، ہماری بساط سے کہیں زیادہ

حیرت میں ڈال دیتے ہیں ورنہ ہم تو مدتوں سے محض چوہوں کے محکوم ہیں اور اتفاق سے یہ چوہے بہت چالاک ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے بہت پہلے ہی ہماری بساط معلوم کر لی تھی کہ ہمارا پیٹ کسی طرح بھی بھر دیا جائے بشرطیکہ ہم ان کی پہرے داری کریں۔

سو جنوبی شہر میں ہمیں چوہوں کی پہرے داری ملی۔ تب چوہوں کے دم برداروں نے کہا۔ "چلو روٹی کا تو انتظام ہوا۔"

ہمیں بتایا گیا کہ فلاں چوہے کا فلاں مل ہے اور فی الحال ہمیں وہیں پہرے داری کرنی ہے۔

گویا ایک چوہا اس مرتبہ پر پہنچ چکا ہے یوں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایرکنڈیشنڈ مل میں بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک قیمتی پنسل ہے، جسے وہ کتر رہا ہے اور اس کے پہلے سے کی گئی چھیلنیاں میز پر پڑے کاغذ پر بکھری ہوئی ہیں۔ ہم اس کی میز کے پاس ہی کھڑے ہیں۔ جانے وہ ہم سے کب مخاطب ہو۔ اس کا بوڑھا چپراسی اس کے حکم کے ساتھ ہی "پانی لاؤ" پندرہ منٹ سے پرچ میں پانی کا گلاس لئے کھڑا ہے۔ بڑھاپے کی کمزوری سے اس کا ہاتھ کپکپا رہا ہے۔ لیکن چوہا اتنے انہماک میں مبتلا ہے کہ اس کو پندرہ منٹ سے پرچ میں پانی کا گلاس لئے کھڑا بوڑھا چپراسی نظر نہیں آتا۔ اگرچہ دم بردار اور ہم پاس ہی کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ مبادا بوڑھے کے ہاتھ میں گلاس چھوٹ جائے لیکن سب مصلحتاً چپ ہیں۔ حسب عادت صاحب مرتبہ چوہے کا پیٹ خراب ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مسودہ روشنی میں تیار کیا جائے۔

لیکن پہلے تو ہمیں خود بستر سے اٹھنا ہے۔ خود ہمارے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے کہیں نہ کہیں خارج کرنا ہے اور ہمیں جو قلم دیا گیا ہے، اسے پورے دن سے گذرنا ہے۔ ممکن ہو، قلم میں روشنائی موجود ہو، ہمیں شام سے پہلے ہی تمام خراب پیٹوں سے گذر جانا ہے۔

(۲)

سوالوں کے انتظار میں ہم اس روایتی ضمیر سے مایوس ہو چلے ہیں جس کی بنا پر ہم مسودہ ترتیب دینے میں خود سے آمادہ ہوئے ہوں گے لیکن سوال جب اپنے انتہائی لازمی کرب کے باوجود بھی ادا نہ ہو سکے تو اچانک ہمیں ادھورے رہ جانے کا احساس ہوا اور اس ناگہانی ادھورے پن میں ہمیں یہ اندازہ نہ ہوا کب بستر سے اٹھے۔ حالاں کہ شہر میں کچھ دن سے پھر لاکھوں خراب پیٹوں کے پرانے ذخیروں کا مسئلہ سڑکوں پر دہرایا جا رہا تھا۔

"ذخیرے کہاں ہیں؟"

گوداموں میں جمع ہیں۔

"تو کیا لاکھوں لوگوں کی بھیڑ ان ذخیروں کو گوداموں سے باہر نکال لے گی؟" مسئلے کا دباؤ بہر حال ہم پر پڑتا ہے۔

آخر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہیں جو پرانی خراب سہ سہ کر اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان کے کولہوں پر بار بار دہرائے ہوئے تجربوں کے نشان ہیں۔ وہ کئی کئی دن تک خالی پیٹ اپنے کولہوں پر ضرب جھیل سکتے ہیں۔ ان کے چوگرد مطالبوں کی تختیاں لگی رہتی ہیں۔ وہ چلاتے ہیں کہ انھیں ان کی گم شدہ غذاؤں کے ذخیرے سونپ دیے جائیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو بھی مطالبہ منظور نہیں کرتے وہ محض ضرب لگاتے ہیں۔ کانوں میں آوازیں نہیں بلکہ پھٹے ہوئے نرخرے سنائی دیتے ہیں اور ہم جبراً اس لئے سن لیتے ہیں کہ کل یہ بھی نہیں سنائی دیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ملک کے لوگ صدیوں سے محض فضلہ ہیں، انھیں کسی طرح بحر ہند میں اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ مگر کون پھینکے گا؟ پھر یہ کہ ہم خود ٹریفک سے بچ بچ کر سڑک پر چل رہے ہیں اور یوں چلنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جس قدر ہم خود کو محفوظ سمجھنے کی غلط فہمی میں ہیں اتنے ہی تناسب سے ہم اپنی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں لوگوں کو بحر ہند میں پھنکوانے والے؟

نظامیہ دواخانہ کے پاس ہم رک جاتے ہیں۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ پچھلے سال جب ہم اس شہر میں نئے نئے آئے تھے تو ہم نے لوگوں سے درخواست کی کہ ہمارے پاس بھی ایک قلم ہے لہٰذا ہمیں بھی پہچانا جائے۔ ہم خالی ہیں، ہمیں کچھ بھر دیا جائے۔ لوگوں نے ہماری درخواست منظور کی اور ہمیں مذکورہ دواخانہ کے ایک وارڈ میں داخل کرا دیا۔ اور یوں روٹی اور رہائش کا مسئلہ حل ہوا تو ہم نے بھی فاضل حکیموں اور وارڈ کے کارکنوں کو اچھی طرح یقین دلا دیا کہ ہم کون ہیں؟

ایک سال کا عرصہ کچھ زیادہ تو نہیں۔ دواخانہ کے کارکن تو ہمیں پہچانتے ہی ہوں گے۔ وہاں برآمدہ میں ایک فلش ہے اس سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے جب کہ میونسپلٹی کے بیت الخلا عام طور پر خالی نہیں ہوتے۔ پھر وہاں خاکروب صفائی کے لئے تھوڑے سے پانی کے عوض پانچ نئے پیسے لیتے ہیں اور اتفاق سے اتنے پیسے بھی ہمارے پاس نہیں (گویا پیٹ خالی کرنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں)۔ کم از کم دواخانہ کے فلش کے لئے تو ہمیں پیسے نہیں دینے پڑیں گے۔ ہاں ممکن ہے، کوئی کارکن اجنبی سمجھ کر ہمیں روکے۔ پھر بھی ہم بڑے اعتماد سے اسے پرانی جان پہچان یاد دلائیں گے۔ ہم اسے قائل کریں گے کہ ہم دراصل مسائل سے بس کچھ ہی دیر کے لئے بھاگ کر آئے ہیں، ہمیں پھر مسائل ہی میں شامل ہو جانا ہے۔

برآمدہ میں کوئی کارکن دکھائی نہیں دیتا۔ فلش کا دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں نے کئی بار ڈرینج کو استعمال کیا ہے۔ لوگ بڑی عجلت میں ہوں گے۔ شاید وہ فلش کی زنجیر کھینچ کر وہ سب کچھ بہانا بھول گئے، جسے ہم چاہیں تو بہا سکتے ہیں۔ سو، ہم زنجیر کھینچتے ہیں مگر فلش کام نہیں کر رہا ہے۔ ٹنکی میں محض پانی کے قطروں کے رک رک کر گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ پانی اپنی ایک مقررہ سطح تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ یا بار بار کے استعمال سے پانی بہت کم رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے ایک جانے پہچانے آسن کے سہارے۔ ڈرینج کے نشیبی سوراخ کا احاطہ

کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم جلد سے جلد فلش سے باہر نکلنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس عرصہ میں غالباً کئی بار دواخانہ کے کارکن فلش کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے، انھیں اختیار حاصل ہے یا انھیں پتہ لگ گیا ہے کہ ہم باہر سے آکر فلش میں بغیر کسی اطلاع کے داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے انھیں اختیار ہے کہ پرانی جان پہچان کی پروا کئے بغیر ہمیں جبراً باہر نکال دیں۔ اس خوف کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہوئے ہم عجلت میں اٹھتے ہیں۔ اٹھتے ہی سر چکرانے لگتا ہے، ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور اچانک جیب سے قلم پھسل کر ڈرینج کے سوراخ میں گر جاتا ہے۔ ہم بہت زور سے چلاتے ہیں، ''افسوس ہمارا قلم!''... آواز ہمارے سر میں چکرا رہی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے اندر ہی چلاتے ہیں۔ آواز فلش سے باہر نہ جا سکی۔ یوں بھی دروازہ کے ساتھ فلش کی کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ اب تک تو ہم اشتہاری مردی کے وہم میں رہے۔ لیکن باہر مسائل بہت طویل ہیں۔ ہم ان میں شامل ہوں تو کیسے ہوں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم خود سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کسی طرح قلم کو ٹٹولیں اور اسے باہر نکال لیں یوں ہم سوراخ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہے ہیں لیکن قلم نظر نہیں آتا۔

(۳)

بنا قلم کے ہم پھر ٹریفک سے بے ربط سڑک پر چلنے لگتے ہیں۔ اگرچہ موسم اور شہر کے درمیان ایک طرح کی تجرتی خنکی کا معاہدہ سا ہے۔ ایسے میں چالاک لوگ کافی فائدہ اٹھاتے ہیں کیوں کہ انھیں درمیانہ یا آہستہ رفتار سے چلنے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ٹریفک اس لئے بے ربط ہے کہ شہر کا مزاج صنعتی نہیں۔ بھیڑ تو محض اطمینان اور تفریح کی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ ہر حال میں مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اتنی کثرت سے کہ ہم شمار نہیں کر سکتے۔ معطل خاندانوں کی عورتیں آٹو رکشوں میں سوار شہر کے پل سے دوسری طرف جا رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ انتہائی قیمتی ہو جائیں گی، فلاں ہال میں ساٹھ سال کا ایک فلاں بوڑھا، سامعین اور تماشائیوں کے سامنے اسٹیج پر اپنی عملی سوانح عمری دہرا رہا ہے۔ درجنوں دانشور ادیب اور اخبار نویس بڑے مزے سے اس کو اس وہم میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اس کی عمر پھر ایک بار پیچھے کو گھوم گئی ہے۔ نوجوان عورتیں چونک چونک کر اسے دیکھ رہی ہیں اور ہم جو خون کی کمی کی بنا پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے، حسد کے مارے اسے گالیاں دینے لگتے ہیں۔ مگر ہال میں جتنے لوگ بھی موجود ہیں ان کے چہروں پر فاضل رطوبت مل دی گئی ہے گویا ملک میں کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سبھی تفریح میں مبتلا ہیں۔ تھری ایسز بار کے مقابل مین روڈ پر جو شاندار مٹرنٹی ہوم ہے، اس میں دیسی زبان کے ایک ادھیڑ شاعر کی لڑکی کے پیٹ سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اتفاق سے لڑکی کے شوہر کا باپ بھی دیسی زبان کا ادھیڑ شاعر ہے۔ دونوں ادھیڑ شاعر، مٹرنٹی ہوم کے گول برآمدہ میں بیٹھے ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں اور انھیں بدھائی دینے کے لئے شہر کے کئی دیسی زبان کے ادھیڑ بوڑھے شاعر وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا ہے کہ حق دار بچوے اپنی حق تلفی دیکھ کر واپس چلے گئے ہیں اور ہم تو ایسے ناکارہ ہیں کہ ہمیں بچوں سے بھی ڈر لگتا ہے۔

حالاں کہ اس عرصہ میں ہم نے ڈرینج صاف کرنے والے گاڑھے کپڑے کی ملگجی وردی پہنے کئی خاکروبوں کو راہ میں روک روک کر پوچھا کہ کیا ان میں سے کوئی ہمارا قلم ڈرینج سے نکال سکتا ہے؟ لیکن ہر خاکروب ہمیں چونک کر دیکھتا ہے، بلکہ پاگل سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود جب ہم ان سے بار بار درخواست کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ خاکروب ہم پر رحم کھا کر ہمیں اپنی یونین کے سکریٹری کے پاس لے جاتے ہیں۔ سکریٹری جو اپنے لباس سے کسی سیاسی پارٹی کا رکن معلوم ہوتا ہے، ہمیں سر سے پاؤں تک گھورتا ہے۔ ''فرمایئے؟''

یہ ایک ایسا انداز ہے جو ایک طرح کی تفریحی ناگواری ظاہر کرتا ہے۔ ایسے میں اگر ہم اس پر اصل واقعہ واضح کر دیں تو وہ ضرور ہمارا مذاق اڑائے گا۔ لہٰذا ہم فوراً طے کرتے ہیں کہ ہم اس سے عام باتیں کریں۔ مگر پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ خود پہلے سے تیار ہے کہ وہ بھی کوئی خاص بات نہیں کر سکتا۔ اگر اس حد تک ہی ہمیں یہ علم ہو جائے کہ ایک بے ربط آبادی کے لاکھوں پیٹوں کا فضلہ صاف کرنے والے بھی پیٹ کے مسائل میں مبتلا ہیں تو ظاہر ہے ہمارا مقصد حل نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ہم میں آئندہ اپنے گم شدہ قلم کی خواہش بھی نہیں رہ جائے گی۔ کم از کم اتنا فرق تو باقی رہنا چاہئے کہ ہم اس کی ضرورت محسوس کریں، اسے تلاش کریں۔

سو ہم تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ کئی بار ہمیں، شہر کا مزاج بالکل سست کر دیتا ہے۔ ہمیں بھلاوا دیتا ہے کہ ہم ہر اس شے سے لاپروا ہو جائیں جس کا تعلق ہم سے ہو۔ اس کے باوجود ہم مصر ہوتے ہیں کہ اصل واقعہ کا دھیان جب تک باقی ہے، تعلق بھی باقی رہ سکتا ہے۔

ڈرینج سکشن کا انچارج فیصلہ دیتا ہے۔ ''ناممکن۔''

اسے معلوم ہے کہ واقعہ رونما ہوا، لیکن جس کے لئے ہوا، وہ ڈرینج کے اختیار میں ہے۔

''تو کیا ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے؟'' ہماری مایوسی میں تجسس باقی ہے، ڈرینج کا انچارج محسوس کرتا ہے۔ ''فضول!''

مطلب یہ کہ اب کچھ باقی نہیں ہے۔ انچارج کا فیصلہ بہت حد تک درست ہوگا۔ کیوں کہ اتنا تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ ڈرینج لائن بالکل سیدھی جاتی ہے یوں جب لوگ پیٹ بھرنے یا پیٹ خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹیڑھی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہر موڑ پر مین ہول بناتے ہیں اور انھیں ڈھانپ دیتے ہیں لیکن ڈرینج کو عام طور پر کھلا رکھتے ہیں تاکہ ان کے پیٹ کی خرابیاں کہیں نہ رکیں۔ سیدھی لائن میں بہ جائیں شاید ہمارا قلم بھی ہمارے پیٹ کی خرابی ہوگا، جو سیدھی لائن میں بہ گیا۔ شاید مسودہ ترتیب دیتے ہوئے ہم نے ٹیڑھی تدبیروں سے کام لیا ہوگا ☆☆☆

لینڈ اسکیپ

احمد ہمیش

شمارہ ۵۹،
اپریل ۱۹۷۱

تم لوگ یہاں بیٹھے ہو
تم لوگ یہاں اس لئے بیٹھے ہو کہ جو یہاں نہیں ہے اسے وہاں سے
اٹھا دیا گیا
تم میں سے کوئی پرتگال نہیں گیا۔ لیکن تمھارے درمیان میز اور کرسیاں
ہیں جو دنیا تم کو دکھانے کے لئے ملی ہے وہ جینے مرنے کے لئے کافی ہے۔
اس سے بڑھ کر بھی کوئی دکھ ہوگا۔ جتنا سوچو گے، بھولتے جاؤ گے۔ مثلاً
موسیقی یا عورتیں اور آب وہوا،
بچے، اخبار یا غذاؤں کے نام... یہاں تک کہ نیند آجاتی ہے
یا وہ ایک بوڑھا، جس کے پاؤں میدانوں میں چلتے چلتے ختم ہوئے۔
اس کی فصل اس کے پرانے چہرے کو
گالی دے کر اس پر پھینک دی گئی۔ ناریل کا بنا ہوا حقہ بھی اور اس میں جو
جلا ہوا پانی ہوتا ہے، وہ بھی...
اور جو راکھ ہوتی ہے، وہ بھی۔
تم لوگ اسے چھوڑ کر اس کمرہ میں آگئے
تمھارے سامنے میز پر ایش ٹرے میں ابھی ابھی جب کہ فلک کی گھڑیوں
میں رات کے ۹ بج رہے ہیں، ایک سگرٹ کا
جلتا ہوا فلٹر ختم ہو رہا ہے
میں تم سب کے بارے میں، بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کچھ ضروری بھید ہیں
لیکن اگر کہہ دوں تو بہت برا ہوگا
تمھاری گردنیں مجھے انسانی شکل میں دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ گردنیں
جسم کا فلٹر ہیں
جسم تفصیلات میں جل گئے اب فلٹر ہیں
جسم تفصیلات میں جل گئے اب فلٹر جل رہے ہیں
یہ میں نہیں بتاؤں گا کہ تمھیں کس نے جلا جلا کے پیا
مذہب نے اس جسم میں تمھارے اس کمرے جیسے ان گنت کمرے بنائے اور
ہر کمرے میں آگ جلائے رکھنے کی ترکیب بتائی
میں تم میں سے ایک تھا۔ تمھارے درمیان مصیبت کے دنوں میں خدا کا نام
سنا تھا
کروڑوں بھکاریوں کے دلوں کو سمیٹ روٹی کا ایک ٹکڑا مانگنے کے لئے
اسے پکارا
کتابوں میں سچائی کے دو لفظ پڑھنے کے لئے مٹی کے تیل کی ڈھبریاں چار پائیاں
پر الٹ دیں۔ میری غریبی
کے یادگار گدڑے اور بستر جل گئے
زمین پر اتنے کنکر پتھر، اینٹیں، بجری اور بالو کے ذرے بھی نہیں ہوں گے
جتنی میری رٹی ہوئی دعائیں کہ عورتوں اور جانوروں
سے چھٹکارا مل جائے!
بات یہ ہے کہ میں کھل کر رونا چاہتا تھا... اتنا کہ تمھاری آبادیوں میں
بازاروں کے ہجوم بھی ہوں گے اور لڑکوں کی
گالیاں جو ننگے پاگلوں کے پیچھے دوڑتی ہیں
نہیں میں اسے اپنے ڈھنگ سے چاہتا تھا... اتنا کہ ایک ارب نیکیوں سے
بھرے ہوئے اسپتال بھی کافی نہیں
ارے میں جو خدا مانگتا ہوں، وہ تم دیتے نہیں!
آگ جلانے کی ترکیب تو میں نہیں جانتا... میں تم سے کہتا ہوں، مجھے جلاؤ
یا میری نباتات جلاؤ

سنو کام کرنے کے لئے ایک ایسی زندگی چاہئے کہ تم سب کو بلا وجہ مرنے
سے روک سکوں!

زندگی کا کام کبھی رکتا نہیں... ہر چند کہ
بڑی بھیڑ کے زمانہ میں اچھی کتابیں، لکھنے پڑھنے کے مضبوط سامان
نایاب ہو جاتے ہیں
دولتمندے اسٹائل سے اشتہاری سکون بانٹتی ہے
مائیکروفون یا پاپ اور یونی ورسٹیوں میں جب پروفیسر اعزاز کی سولیوں پر
خوش گوار دکھائی دیتے ہوں!

مائیں یا مائیں بہنیں
بڑا غلط اندھیرا ہوتا ہے۔ غلط بیٹے اور بھائی
بیداریاں، جنھیں بنا قیمت دیئے اگر تم چھولو تو کاغذ تمھیں پکڑ لیں گے،
کاغذ تمھیں مار ڈالیں گے
کاغذ، جن سے تمھارے اسکول کے بچے... کاپیاں اور تمھارے لئے
دھوکے اور مستقبل بناتے ہیں
اس بھیڑ سے نکلو... زندگی کا کام کبھی رکتا نہیں... پاس آؤ
میں تمھاری جیبوں کے جھوٹ سے آج تک ڈرا نہیں ہو... ان میں رکھے
ہوئے پیسے نکال لوں گا

پیسے مت چھپاؤ... پاس آؤ
یہ میں جانتا ہوں کہ تمھاری بیویاں، تمھاری موت کی ایجنٹ ہیں... تمھارے
بیٹے اور بھائی مجھ سے نفرت کرتے ہیں
میں تمھارے گھروں کے ڈرے ہوئے بند دروازوں پر دستک دیتا ہوں...
تم اور تمھارے لوگ اندر سے چلاتے ہیں کہ

تم نہیں ہو!
میں تمھیں مرنے سے کیسے روکوں... ہر چند کہ روک سکتا ہوں
موت کسی کو مارنے کے لئے آسمان سے نہیں اترتی

موت اس لئے ہے کہ تم نے اسے آسمان مان لیا
زمین تمھیں جاگنے کے لئے دی گئی... تم نے اسے مایوس کیا
موت زمین کی مایوسی پر آج تک خوش ہے اور اسے تمھارے خوابوں میں چلنے کی
آزادی ہے۔ تمباکو، افیم اور بھنگ کے پودے آج تک خوش ہیں کہ وہ تمھاری
مری ہوئی ماؤں کی مامتا ہیں
تمھاری بہت سی بیماریاں تمھارے جسم میں بڑے آرام سے ہیں اور دواخانوں
میں بہت سی دوائیں بھی بڑے آرام سے ہیں
میں تمھیں مرنے سے کیسے روکوں!
ہاں، تم مجھے جینے سے روکتے ہو
میں تم سے کہتا ہوں کہ تمھارے چھوڑے ہوئے میدانوں کی ہواؤں کے
جھونکے جب تمھاری کھڑکیوں میں آ رہے ہوں تو کھڑکیاں
مت بند کرو
بات یہ ہے کہ تمھارا جمع کیا اثاثہ تمھارے جسم کے ایک معمولی روئیں تک کو
نہیں چھکا سکتا... تمھارے جمع کئے
ہوئے غلط اندھیروں پر جب سورج چمکتا ہے تو تم اس سے اکتاتے ہو...
تم مجھے بولنے سے روکتے ہو...
...وہ دوسرے ملکوں کے سویروں پر چمکنے چلا جاتا ہے
میں کہتا ہوں، تمھارے یہ مکان، تمھاری آنے والی قبروں سے مختلف نہیں
تم بین الاقوامی بچھوؤں سے زیادہ چالاک نہیں ہو
تم دنیا کی بڑی کتابوں سے زیادہ گمبھیر نہیں ہو
جب تک میں تم سے اپنے سفر کا سارا سامان چھین نہیں لوں گا... تم سے اختلاف
کروں گا

میں تمھیں مرنے سے روکوں گا

لوکل ٹرین

احمد ہمیش

شمارہ ۱۰۸،
مئی تا جولائی ۱۹۷۸

سنو، اس جغرافیہ میں میری روح کی آب و ہوا نہیں ملتی
اس آبادی میں میرے نام کی کوئی کھڑکی نہیں کھلتی
یہ تو صرف میرے جسم کی مٹی ہے
جو میری قبر تک جائے گی
کوئی نہیں جانتا کہ اس کی قبر کہاں کھدے گی
وہاں پانی برسے گا یا آگ برسے گی
اس سے پہلے کہ عدم کی اور سے آنے والی ٹرین میرا نام پکارے گی
اور ہماری دنیا کے پیارے بچوں کے گیلے کپڑوں کو ادھ سکھا چھوڑ کر آخری دھوپ جاتی رہی ہوگی
میں اپنے سامان میں سب سے قیمتی چیز رکھ لوں گا
اور وہ میری آنکھیں ہوں گی
سنو، اس جغرافیہ کی مردہ مٹی، جو ایک روشن جسم اگا نہیں سکتی
مردہ پیڑ، جو اپنی دھول میں اٹی ہوئی پتیوں پر ایک آنسو بھی نہیں بہا سکتے
اور مردہ مرد اور عورتیں، جو ایک دوسرے کو ایک پل کی بیداری کا دان نہیں دے سکتے
میں ان کے درمیان رہ کر سانس لینے کا آخری جرم کروں گا
میرا جرم اسم اعظم ہے
تاکہ لوگ، جو نہیں جانتے، وہ بھی جان لیں کہ شاعر جب آتا ہے تو دوسروں کی زندگی کے لئے
آتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کی زندگی کے لئے جاتا ہے

خاموشی کے حصار

احمد یوسف

شمارہ نمبر ۱۹۵،
جون ۱۹۹۶

غنی نے لکھا تھا۔ "عطا کا خط آیا ہے، وہ اس ماہ کے آخر تک اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آجائے گا۔ آج ۱۰ تاریخ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۲۵، ۲۶ تک بیٹا، بہو اور بچے آجائیں گے... گھر میں بہار آجائے گی۔"

سجاد نے غنی کے خط کی ان سطروں کو بار بار پڑھا، اور ہر بار اسے ایک نیا لطف آیا۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ محسوس ہوا کہ یہ خبر غنی کے بیٹے عطا نے نہیں بھیجی ہے، بلکہ اس کے بیٹے مختار نے اسے بھیجی ہے۔

لیکن جب اسے یاد آیا کہ مختار اور اس کے بچوں کو گئے تو ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں، اور ابھی تو اسے پورے دس مہینے اور ان کا انتظار کرنا ہوگا، تو اس پر ایک بے کیفی سی طاری ہوگئی.. کیسی محرومی ہے۔

ایک بیٹا ہے، وہ سعودی میں ہے، ایک بیٹی ہے وہ اپنے شوہر کے ساتھ پونا میں ہے... بیٹا سال بھر بعد آتا ہے، تو بیٹی کیوں نہ سال بھر بعد آئے؟ کتنی بار کہا کہ سال میں دو بار تو آیا کرو۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی پریشانیوں کا قصہ چھیڑ دیتی ہے، بچوں کا اسکول، ان کے امتحانات، میاں کی مصروفیتیں، ان کا ٹور، موسم کی سختیاں... اور آتی جب ہی ہے، جب مختار آتا ہے۔ بس مہینے ڈیڑھ مہینے کے لئے... اب اس مختصر سی مدت میں کس سے بات کی جائے، کس کی بات سنی جائے، کس کے بچوں پیار کیا جائے اور کس کے بچوں کو گود میں کھلایا جائے۔

پھر آنے کے دو چار دنوں بعد ہی انھیں اپنی اپنی سسرال یاد آجاتی ہے... چھ گھنٹے کی راہ بیٹے کی سسرال کی ہے، اور دو گھنٹے کی راہ بیٹی کی سسرال کی...

مصیبت تو یہ ہے کہ اب اس دنیا میں کوئی کسی سے گلے شکوے بھی نہیں کرسکتا۔ اگر مختار سے کہا جائے کہ بیٹا سال بھر بعد تو مہینے ڈیڑھ مہینے کے لئے آتے ہو، اس میں بھی ہفتے دس دن کے لئے سسرال چلے جاتے ہو، تو کہتا ہے... "پاپا سوچئے، عابدہ کے گھر والوں کا بھی تو حق ہے ہم لوگوں پر۔" اس پر میں کہتا ہوں۔ "وہ تو صحیح ہے بیٹا لیکن اب تم ہی سوچو..." لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے آگے مجھ سے کچھ کہا بھی نہیں جاتا۔ بہو کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔

عندلیب بھی ہفتے دس کے لئے سسرال جانے کو تیار ہوجاتی ہے۔ اس سے تو یوں بھی کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ داماد برا مان جائیں گے۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم لوگ اس سے کچھ درخواست ضرور کرتے ہیں... دونوں ہی عجیب طوفانی انداز سے آتے ہیں اور طوفانی انداز سے چلے جاتے ہیں... داماد زیادہ تر اپنے گھر میں رہتے ہیں، اسی لئے عندلیب کچھ دنوں اپنی سسرال میں رہ کر ایک بچے کے ساتھ میرے یہاں چلی آتی ہے۔ .ادھر بہو بھی زیادہ وقت اپنے میکے میں رہنا چاہتی ہے... بس ایک کشاکش سی رہتی ہے۔

عندلیب سے جب بھی یہ کہا کہ بیٹی تم مختار کے ساتھ کیوں آتی ہو، اگر اس کے آنے کے چھ ماہ بعد آؤ، تو ہمارے گھر، سال میں دو بار عید منائی جائے، تو اس نے ہمیشہ مجھے یہ کہہ کر لاجواب کردیا... "واہ پاپا، پھر بھیا سے ملاقات کیسے ہوگی؟"

دریا کے ایک کنارے پر اگر ہم کھڑے ہیں، تو دوسرے کنارے پر عندلیب اور اس سے کچھ فاصلے پر مختار کھڑا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب اسی کنارے پر آملتے ہیں، جلد ہی جدا ہونے کے لئے۔ اس کے بعد ہم ہوتے ہیں، اور محرومی اور تنہائی کا نہ ختم ہونے والا کرب...

فاطمہ کو دیکھو تو سال بھر بچوں کے آنے کی تیاریاں کرتی رہتی ہے، جب مٹر کا سیزن ختم ہونے کو آتا ہے، تو خدا جانے کتنی مٹر چھیل کر ان کے دانے پولی تھین کے تھیلوں میں بھر کر رکھ دیتی ہے، پھر اس طرح دس پندرہ کیلو ہرے چنے بھی تھیلوں میں بھر کر ڈیپ فریز میں ڈال دیتی ہے کیا اگر عندلیب کو مٹر کا پلاؤ پسند ہے تو مختار کو ہرے چنے کی گھونی۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب عندلیب اور مختار آتے ہیں، تو دونوں ایک ہی بات اپنی ماں سے کہتے ہیں۔ "امی کیوں ہم لوگوں کے لیے اتنی پریشانیاں مول لیتی ہیں؟" اس پر مختار کہتا ہے، ناشتے میں تو امی مجھے میدے کی خوب پھولی پھولی کچوریاں، آلو کی خوب سرخ سرخ بھجیا اور کرچھل میں تلا ہوا انڈا پسند ہے..." ادھر عندلیب کہتی ہے۔ "امی دن کے کھانے میں باستی چاول ہو، ارہر کی دال، ہری مرچ کا دو پیازہ اور لیموں کی پھنکی... میری تو جان جاتی ہے، اس کھانے پر۔"

تب فاطمہ بگڑ کر کہتی ہے۔ "ٹھیک ہے تو اس بار سردیوں میں تم لوگوں کے لئے مٹر اور ہرے چنے نہیں رکھوں گی۔" اس پر دونوں اپنی ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔ "نہیں امی ایسا غضب نہ کیجئے گا۔"

سجاد سوچتا، کاش یہ سارے مناظر آنکھوں کی دنیا میں مستقل سکونت اختیار کرلیتے، لیکن یہ کہاں ہوتا ہے، تب وہ دھیرے سے اپنی آنکھوں کو خشک کرلیتا ہے۔

بچے آجاتے ہیں تو کچھ چھوٹی موٹی تقریبات بھی ان کے آنے سے ہوجاتی ہے۔ عندلیب نے لکھا تھا، چھوٹے کا عقیقہ میں اپنے گھر سے کروں گی، میں نے ان سے بھی کہہ رکھا ہے، بس بھیا آجائیں گے تو وہیں آکر یہ پروگرام بناؤں گی۔

مختار نے لکھا تھا، "پاپا ساجد کا مکتب آپ ہی کو کرنا ہے۔ اقرا باسم..."

چلئے دو تقریبات تو ہوگئیں۔ اگر یہ سب نہ بھی ہوا تو میلاد النبی کی تقریب تو ہو ہی جاتی ہے۔

"سچ یہ ہے کہ روشنی ہی روشنی کو کھینچ لاتی ہے۔"

بچے آتے ہیں تو گھر بھر دیتے ہیں، کپڑے لتے، چھوٹی چھوٹی مشینیں۔ مسالہ پیسنے کی مشین، جوسر، وی سی پی اور ویڈیو کیسٹ...

تین چار سال پہلے مختار ڈیپ فریز لے آیا۔ کہا بھی میں نے کہ بیٹا کیا ہوگا ان چیزوں کا، خاصی ڈیوٹی دے کر لاتے ہو۔ اس پر مختار نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "پاپا یہ سب نہ کہا کیجئے۔ آپ لوگوں کی دعاؤں سے اللہ کا فضل ہے۔"

ظاہر ہے ڈاکٹر ہے، لمبی تنخواہ پاتا ہوگا، لیکن یہ سب تو فضول کا خرچ ہے۔ عندلیب بھی جب آتی ہے تو دنیا بھر کی چیزیں پونا اور بمبئی کے بازار سے خرید کر لے آتی ہے۔

کیا بچے ہیں... آتے آتے گھر کو بھر دیتے ہیں، اور جاتے جاتے دلوں کو خالی کر دیتے ہیں۔ کیا خاک اڑتی ہے ان کے جانے کے بعد...

فاطمہ تو ان کی روانگی سے ہفتے بھر پہلے ہی سے رونا شروع کر دیتی ہے۔ عندلیب سمجھاتی ہے، امی کیا کریں ان کی سروس ہے نہ، آپ تو جانتی ہی ہیں بندگی بیچارگی۔ خورشید میاں بھی سمجھاتے ہیں، امی ہم لوگ ادھر آنے کو پریشان ہیں، اگر آ گئے تو کوشش کریں گے کہ اسی شہر میں پوسٹنگ ہو جائے۔ مختار بھی اپنی امی کو چپ کرانے کی سعی کرتا ہے۔ امی اتنی سمجھدار ہو کر بھی دل کو چھوٹا کرتی ہیں۔ اور یہ کہہ کر چپکے سے کسی بچے کو فاطمہ کی گود میں بیٹھا دیتا ہے۔ بیٹا دادی کو پیار کر لو...

مختار بہت پیسے بھیجتا ہے۔ لیکن سجاد سوچتا، پیسوں سے دکھ کا مداوا تو نہیں ہوتا۔ کسی خط میں بیماری آزاری کے متعلق لکھا، یا مختار سے فون پر کچھ بتایا، تو پھر دوسرے ہی دن اس کا دوست ڈاکٹر رام پرکاش آ جاتا ہے۔ آتے ہی پوچھتا ہے۔ "پاپا امی آپ لوگ کیسے ہیں، کل ہی رات مختار کا فون آیا تھا..." دیکھ بھال کر، دوائیں دے کر چلا جاتا ہے۔ پھر مختار کا خط آتا ہے، تو پھر دنیا بھر کی ہدایتیں ہوتی ہیں اس میں، اور تب اگلے مہینے کے ڈرافٹ میں، دو ڈھائی ہزار فاضل آ جاتے ہیں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ یہ وہ دکھ نہیں ہے، جو پیسے سے کم ہو جائے۔

یہ لوگ چلے جاتے ہیں، تو پھر گھر میں کون رہ جاتا ہے؟ ایک میں ایک فاطمہ، ایک تیرہ چودہ سال کا، ضلع ویشالی کا رہنے والا لڑکا قاسم، جو بازار کا کام کرتا ہے اور جوٹی وی کے ڈراموں کا بڑا شوقین ہے، باہر سے آئے ہوئے ڈراموں کے کیسٹ وی سی پی پر دیکھا کرتا ہے۔ اور کوئی کام نہ ہو تو دھیمے سروں میں نئی سے نئی فلموں کے گانے گاتا رہتا ہے۔ وہ جب سال میں ایک بار لمبی چھٹی لے کر اپنے گھر جاتا ہے، تو بڑا برا لگتا ہے، کہ اس کے رہنے سے گھر میں آدمی کی آواز تو سنائی دیتی ہے۔ ایک باورچن بھی ہے، جو دن چڑھے آتی ہے، اور سرِ شام گھر چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھار دو چار دنوں کے لیے، بھائی بہنوں کے بچے یا کوئی رشتہ دار آ جاتا ہے تو لگتا ہے کوئی بولنے چالنے والا آیا، ورنہ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔

قصہ یہ ہے کہ ہر آشنا کے پاس مصائب کا دشت ہے، اس لئے کیا کوئی کہیں آئے جائے... ویسے اگر کبھی کوئی آ گیا، تو اسی کے ساتھ بیٹھ کر گھڑی دو گھڑی ہنس بول لئے، تھوڑی دیر کے لئے دل بہل گیا۔

رہی فاطمہ تو وہ اتنی چڑچڑی ہو گئی ہے کہ ذرا کچھ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتی ہے... مختار ڈاکٹر ہو کر دو سال رہا، اور پھر ایک انٹرویو دے کر سعودی چلا گیا... اس میں میرا قصور؟ داماد ایم بی اے کر کے بمبئی کی کسی بڑی فرم میں ملازم ہو گیا، پھر وہاں سے پونا چلا گیا، تو اس میں میری کون سی غلطی ہے...؟ لیکن نہیں، آپ ہمیشہ منہ سیئے بیٹھے رہتے ہیں... ارے بھائی تو میں کیا کرتا۔ مختار اپنی مرضی کا مالک ہے اور داماد پر کسی کو کیا اختیار؟

تنہائی کا دکھ میں بھی جھیل رہا ہوں، تنہائی کا دکھ وہ جھیل رہی ہے، لیکن اس کا تو عجیب حال ہے۔

خط نہیں آتا ہے تو اس میں میری کاہلی کا دخل ہوتا ہے، پوسٹ آفس جا کر دریافت نہیں کرتے ہیں، حالانکہ ہر دوسرے تیسرے دن میں پوسٹ آفس کا چکر لگا آتا ہوں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مختار اور عندلیب کا فون برابر آتا ہے۔ وہ دونوں ہم لوگوں کو طرح طرح سے سمجھاتے رہتے ہیں۔ ماں سے کہتے ہیں کہ اگر آپ پریشان ہوں گی تو پاپا بھی پریشان ہوں گے۔ اور مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ پریشان ہوں گے تو امی بھی پریشان ہوں گی۔

بچوں کی تصویریں آتی رہتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر فاطمہ کا تو عجیب حال ہو جاتا ہے، چومنا چاٹنا، بلائیں لینا۔ کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، پھر تصویریں الماری میں حفاظت سے بند کر کے رکھ دی جاتی ہیں۔ کئی بار کہا کہ البم میں لگا لو، لیکن فاطمہ کو تو اب میری کوئی بات پسند ہی نہیں آتی۔

پیسے کی اللہ کے فضل سے کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سات ساڑھے سات ہزار مختار کے یہاں سے آ جاتے ہیں، ساڑھے تین ہزار کے قریب میری پنشن ہوتی ہے، اپنا گھر ہے۔ بس دو چار آدمیوں کے کھانے پینے کا جو بھی خرچ ہو۔

علاج معالجے کا یہ حال ہے کہ جہاں ہم لوگوں کی بیماری کی خبر مختار کو ملی، اس نے ڈاکٹر رام پرکاش کو فون کر دیا، اور دوسرے ہی دن دیکھنے پہنچ گیا۔ البتہ کچھ دن پہلے جب فاطمہ کو گردے کی تکلیف ہوئی تھی، تو میں نے خود ڈاکٹر رام پرکاش کو فون کر کے بلایا تھا۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھ بھال کے بعد کچھ دوا لکھ دی، اور کچھ ٹسٹ بتائے، پھر دوسرے دن ایک اسپیشلسٹ کو لے کر پہنچ گیا۔ دونوں نے گردے میں پتھری ہونے کا شبہ ظاہر کیا، لیکن دونوں کا خیال تھا کہ کچھ دن آپریشن کو ٹالا جا سکتا ہے، شاید دواؤں سے ہی فائدہ ہو جائے۔

دوسرے دن فاطمہ کو آرام ملا، تو میں نے دیکھا کہ وہ کروندے کی جیلی تیار کر رہی ہے، شام تک جیلی تیار ہو گئی، تو مجھے بھی ایک طشتری ملی۔ اس کے بعد دو ڈھائی کلو جیلی اس نے شیشوں میں بند کر کے رکھ دی۔ کروندے کی جیلی، مختار اور عندلیب دونوں کو پسند ہے۔ اور بچے تو ہر میٹھی چیز پر جان دیتے ہیں۔

مختار اور عندلیب مشکل سے ڈیڑھ مہینے رہتے ہیں، لیکن فاطمہ کی تیاریاں دیکھنے والی ہوتی ہیں، کیا نہیں بنتا ہے ان کے لئے چٹنی، اچار، مربے، حلوا، ساس اور جانے کیا کیا... فریزر میں انواع و اقسام کی کھانے کی چیزیں رکھی رہتی ہیں۔

کوئی دو ماہ بعد آج پھر غنی کا خط آیا ہے۔

"عطا پچھلے ہفتے بچوں کو لے کر چلے گئے... پھر وہی زندگی ہماری ہے۔"

خط لے کر میں فاطمہ کے کمرے میں آیا تو دیکھا وہ کیلنڈر کے سامنے کھڑی کچھ حساب کتاب کر رہی ہے، مجھے دیکھ کر کہنے لگی:

"مختار کو آنے میں ابھی آٹھ مہینے سات دن اور ہیں۔" ☆☆☆

ا۔ح۔نور ازل

شمارہ ۱۴،
جولائی ۱۹۶۷

نیند سے پہلے...
سارے دن کی سہانی ہلچل، سارے جھگڑے
ہر ناکامی، ہر افتاد، ہر الجھن دل کی،
دیکھا ہوا، ہر دل کش چہرہ، بگڑی صورت
سب ایک ایک سے ٹکر کھاتے، یاد میں گڈمڈ ہوتے ہیں
جیسے کیچڑ میں کیڑے رینگیں...
افسر نے اک بات کہی تھی،
بیوی نے اک طنز کیا تھا،
بچے نے فرمائش کی تھی،
اک ساتھی نے فلاں گلی کے موڑ پہ مجھ کو دیکھ لیا تھا،
ساہوکار نے گالی دے کر، نالش کرنے کی دھمکی دی تھی،
فلاں دوست کا سوٹ دیکھ کر دل مچلا تھا،
ایک حسینہ، عاشق کی آغوش میں بیٹھی، مجھ کو ہنس ہنس دیکھ رہی تھی...

ساری باتیں روشن روشن، دھندلی دھندلی
کڑوی کڑوی، میٹھی میٹھی، اک بھیڑ کی صورت آئی ہیں
اکثر ان میں شور مچاتی، کچھ ہونٹوں پر قفل لگائے
ذہن کے گوشے گوشے میں بس جاتی ہیں
پھر ان میں جھگڑے ہوتے ہیں، ایک کو بھگا دیتی ہے
آنکھیں میچ کے بند کروں تو ان کی چبھن پلکوں پہ دہکنے لگتی ہے
تخئیل کی کھڑکی بند کروں تو زور سے دستک دیتی ہیں
کروٹ لے کر سونا چاہوں تو اور لپٹ سی جاتی ہیں
اف دن بھر کی دل سوز تھکن، اف نیند نہ آنے کی الجھن!
کیا کشتی ڈوبنے سے پہلے منجدھار سے بچ کر نکلے گی؟
خوابوں کی پری
ساحل پہ مجھے پہنچا دے گی؟

اذیت پرست

اختر الایمان

شمارہ ۱۸،
نومبر ۱۹۶۷

میں بہ ظاہر جو بہت سادہ ہوں بے حس نظر آتا ہوں تمھیں
ایسا دریا ہوں جہاں سطح کے نیچے چپ چاپ
موجیں شوریدہ ہیں، طوفان اٹھا کرتے ہیں
ٹھہرا پانی ہوں مگر اس میں بھنور پڑتے ہیں
اپنا ہر زخم اٹھائے ہوئے پھرتا ہوں ہنسی کے پیچھے
صرف اس واسطے شانوں پہ ردائے تہذیب
ڈالے رہتا ہوں کہ حیواں نہ کہے کوئی مجھے
وہ ثقافت جسے کہتے ہیں اثاثہ ورثہ
سالہا سال کی محنت ہے جو انسانوں کی
میرے اک فعل سے غارت نہ کہیں ہو جائے
ورنہ تم سامنے آتی ہو تو سر سے پا تک
دوڑ جاتی ہے کبھی آگ سی، تیزاب سا اک شعلہ سا
تم کو معلوم ہے اس دور میں میرے دن رات
صرف اس واسطے بامعنی ہیں تم سامنے ہو
تم کو معلوم ہے یہ گردش ایام مجھے
کیوں بھلی لگتی ہے کیوں دیکھ کر تم کو آنکھیں
مسکرا اٹھتی ہیں، میں شاد نظر آتا ہوں
میں جو اس پھیلی ہوئی دنیا میں یوں جیتا تھا
جیسے یہ بستی نہیں شہر ہے اک لاشوں کا
جس میں انساں نہیں مردے ہیں کفن پہنے ہوئے
اور ان مردوں میں لب سوختہ میں بھی ہوں کہیں
تم نے احساس دلایا نہیں میں لاش نہیں
اپنی گفتار کی گرمی سے حرارت بخشی
منجمد خون کو دوڑا دیا شریانوں میں
کھینچ لائیں مجھے تنہائی کی دنیا سے یہاں
میں الف لیلہ کا کردار نہیں ہوں کوئی
تم بھی افسانوی محبوبہ نہیں اور نہ تھیں
پھر روایاتی ستم کیوں کیا تم نے مجھ پر؟
خود ہی وارفتہ ہوئیں کھنچ گئیں خود ہی ایسے
جیسے میں واقعی اک لاش ہوں چلتی پھرتی
اب تمھیں دیکھ کے میں دل سے دعا کرتا ہوں
لاش بن جاؤں میں سچ مچ ہی، یہ بے گانہ روی
یہ نیا طرز وفا تم نے جو سیکھا ہے ابھی
کچے شیشے کی طرح ٹوٹ کے ریزہ ہو جائے
اور تم مجھ سے ہر اک خوف کو ٹھکراتے ہوئے
چیخ کر ایسے لپٹ جاؤ کلیجہ پھٹ جائے

اختر الایمان

شمارہ۱۹
دسمبر ۱۹۶۷

ہم کتنا روئے تھے جب اک دن سوچا تھا ہم مرجائیں گے
اور ہم سے ہر نعمت کی لذت کا احساس جدا ہو جائے گا
چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے شہد کی مکھی کی بھن بھن
چڑیوں کی چوں چوں کوؤں کا ایک اک تنکا چننا
سڑکیں کوٹنے والے انجن کی چھک چھک بچوں کا دھول اڑانا
آدھے ننگے مزدوروں کو پیاز سے روٹی کھاتے دیکھتے جانا
یہ سب لایعنی بیکار مشاغل بیٹھے بیٹھے اک دم چھن جائیں گے
ہم کتنا روئے تھے جب پہلی بار یہ خطرہ اندر جاگا تھا
اس گردش کرنے والی دھرتی سے رشتہ ٹوٹے گا ہم جامد ہو جائیں گے
لیکن کب سے لب ساکت ہیں دل کی ہنگامہ آرائی کی
برسوں سے آواز نہیں آئی اور اس مرگ مسلسل پر
ان کم مایہ آنکھوں سے اک قطرہ آنسو بھی تو نہیں ٹپکا

میری آواز

اختر الایمان

شمارہ ۲۷،
اگست ۱۹۶۸

ملائکہ! مری آواز سن رہے ہو تم؟
سنی ہے پہلے بھی تم نے ضرور یہ آواز
بہت لطیف تھی، شریں تھی، اس میں نرمی تھی،
شگفتگی تھی، یقیں تھا، بلند حوصلگی تھی
کھنک تھی اس میں توانائی اور گرمی تھی
یہ آج خشک ہے، بے جان اور بے رس ہے
تھکی تھکی سی ہے، مجروح اور بے بس ہے

ملائکہ! مری آواز سن رہے ہو تم؟
خدا نے چھین لیں بیساکھیاں بھی انساں سے
پیمبر اب نہیں آتے زمین بانجھ ہوئی
تمام سلسلے تہذیب و ضبط کے جو تھے
وہ سارے ٹوٹ گئے، زندگی تڑپتی ہے
اک ایسے درد سے جو درد زہ نہیں شاید؟
ملائکہ! دل ایذا طلب نہیں ہارا
مگر مشین کی میعاد ہے، کبھی نہ کبھی
اک ایسا وقت تو آتا ہے، جب نہ ہو یارا
کسی بھی بات کا، دمساز ہی نہ ہو کوئی؟
غنیم وقت بھی ہے سامری صفت گویا
تمام کہنہ مسائل ہیں جوں کے توں پھر بھی
ہر ایک شخص ہے مصروف یاوہ گوئی میں

اندھیر گردی کو کہنے لگے ہیں آزادی!
میں رونا چاہتا ہوں کس پہ روؤں لیکن میں
اس ایک بات پر ظالم ہے سرخ رو مظلوم
جواب مانگنے جائے تو اور رسوا ہو
فساد اور بڑھے، ہوا گر بنا معلوم؟
اس ایک بات پہ مقتل بنا ہے شہر کا شہر
مگر بیان سے بڑھ کر کوئی سبیل نہیں
کوئی غریب کا حاجت روا کفیل نہیں
کسی کے سامنے معصوم کی اپیل نہیں؟

سخنوروں پہ روؤں جن کے سامنے اس وقت
تمام مسئلے بے جان ہیں سوا اس کے
جو جائے خانوں سے چھوٹیں تو بھوکی آنکھوں سے
زنان شہر کے پستان ناپیں، یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیر ناف، بال گنیں

ملائکہ! مری آواز سن رہے ہو تم؟
سنی ہے پہلے بھی تم نے ضرور یہ آواز
مگر وہ پہلی سی معصومیت نہیں ہے آج
تمام کرب، زمانے کا بھر گیا اس میں
جو زہر، زیست میں ہے، سب اتر گیا اس میں!

اختر الایمان، فضیل جعفری، مرتب: تصدیق سہاوری

شمارہ ۶۷،
دسمبر ۱۹۷۱

ثناء اللہ ڈار کشمیری، بشیر چند یا میراجی، ایک ٹیڑھی لکیر کے تین نقطے ہیں۔ جدید اردو ادیبوں اور شاعروں کے لیے ان نقطوں کی رمزیت کافی کشش رکھتی ہے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۷۱ کو ادیبوں اردو شاعروں کا ایک اجتماع محمود چھابڑا کے مکان واقع باندرہ میں ہوا جس میں میراجی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔

بات یوں ہے کہ ادھر سال ڈیڑھ سال سے بمبئی میں ماہانہ ادبی نشستوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے، جسے دوستوں کی ادبی نشست کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان نشستوں میں نئے پرانے لوگوں میں اختر الایمان، جاں نثار اختر، باقر مہدی، فضیل جعفری، ندا فاضلی، سریندر پرکاش، جتندر بلو، یوسف ناظم، محافظ حیدر، یعقوب راہی اور متعدد لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، مجروح سلطان پوری، عصمت چغتائی اور مہندر ناتھ وغیرہ میں سے کسی کی شرکت ہو جاتی ہے تو نشست کے مباحثوں میں زیادہ تیزی اور کاٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ چند مہینوں پہلے ایسی ہی ایک نشست میں کسی نے اختر الایمان سے درخواست کی کہ وہ آئندہ نشست میں میراجی کے متعلق ایک تقریر کریں۔ انھوں نے حامی بھر لی مگر ایک شرط لگا دی کہ انھیں پہلے سوالات دے دیئے جائیں۔ وہ تقریر کرنے سے سوالات کا جوابات دینا زیادہ پسند کریں گے۔ یہ خدمت فضیل جعفری کے سپرد کی گئی۔ فضیل جعفری نے یہ سوال نامہ اختر صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن پہلے تو بعض فلمی مصروفیتوں کے سبب اور پھر یورپ چلے جانے کے باعث اختر صاحب کئی مہینوں تک ان نشستوں میں شریک نہیں ہو سکے اور بالآخر ۱۱ جولائی کو یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ فضیل جعفری نے یہ سوال نامہ پڑھ کر سنایا۔

سوال نامہ:

(۱) میراجی سے آپ کی ملاقات کب، کہاں اور کن حالات میں ہوئی؟ اس پہلی ملاقات نے آپ کے ذہن پر کیا اثر چھوڑا؟

(۲) اردو کے اکثر نقادوں نے میراجی پر لکھتے ہوئے آپ کے ان سے ''گہرے تعلقات'' کا ذکر کیا ہے۔ ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی، یعنی خوردی و بزرگی کی یا دوستانہ؟

(۳) عام گفتگو اور نجی ملاقاتوں میں میراجی کس قسم کی باتیں کرنے کے عادی تھے؟ وہ علمی، ادبی مسائل پر گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے یا محض غپ شپ کرتے تھے؟

(۴) میراجی اور میرا سین کے بارے میں صدہا افسانے مشہور ہیں، کیا میراجی نے کبھی خود آپ سے اس موضوع پر گفتگو کی تھی؟

(۵) میراجی نے برانٹی سسٹرز (Bronte Sisters) کو اردو والوں سے متعارف کراتے ہوئے لکھا تھا: ''کسی شاعر کے سوانح حیات اس کے کلام کے مطالعہ میں اس حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ اس کے ذہنی نشو و نما کو سمجھنے میں مدد دیں۔ ذاتی حالات میں دلچسپی سے یہ نقصان وہ پہلو نکل سکتا ہے کہ ہم افسانہ پرست بن کر اس کے کلام کی حقیقت سے دور ہو جائیں گے اور پھر کلام کی صحیح جانچ میں الجھن پیدا ہو جائے گی۔'' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میراجی کے نقادوں نے ان کی افسانوی شخصیت کو ان کی شاعری سے زیادہ اہمیت دی؟ کیا آپ کے خیال میں اس کی ذمہ داری خود میراجی پر عائد کی جا سکتی ہے؟

(۶) بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں جب کہ ترقی پسند شاعری سکۂ رائج الوقت بن چکی تھی میراجی نے، راشد نے اور خود آپ نے اپنا راستہ الگ بنایا۔ ایسا آپ تینوں کا انفرادی اور غیر شعوری کوششوں سے ہوا، یا آپ سب نے مل کر کوئی الگ راستہ نکالنے کی بات سوچی؟ کیا آپ اپنے ذاتی تجربہ اور علم کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میراجی ترقی پسند شاعری، اور ترقی پسندوں کے مخالف تھے، جیسا کہ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں لکھا ہے؟

(۷) ترقی پسندوں نے میراجی کی زندگی ہی میں ان پر منفیت، شکست خوردگی اور بیمار ذہنیت اور فحاشی جیسے الزامات لگائے تھے۔ کیا آپ اس پس منظر میں میراجی کے ردعمل اور ان کے خیالات پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟ خود آپ

منفیت، اور فحاشی کی کیا تعریف کریں گے؟ کیا آپ کو ترقی پسندوں کے ان الزامات میں صداقت محسوس ہوتی ہے ؟

(۸) خلیل الرحمن اعظمی نے آپ کی شاعری پر اپنے ایک مضمون ("اختر الا یمان، ایک متحرک شاعر") میں میراجی کی تخلیقی شخصیت کو ادھوری شخصیت سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اختر الایمان، مختار صدیقی، اور مجید امجد نے "میراجی کے ناتمام ورناتراشیدہ تجربوں کو ایک نئی معنویت کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔" کیا آپ خلیل الرحمن اعظمی کے اس بیان کو تنقیدی اعتبار سے مہمل اور بے معنی بیان سمجھتے ہیں؟ اگر نہیں، تو وہ کون سے ناتراشیدہ اور ناتمام تجربے تھے جنھیں آپ نے نئی معنویت عطا کی ہے، اور کیا خلیل الرحمن کا یہ بیان آپ کی اپنی انفرادی شخصیت کو مجروح نہیں کرتا؟

(۹) میراجی کی شاعری کے بعض حصوں پر بھگتی تحریک کا اثر بتایا جاتا ہے۔ ان کی زندگی پر ہندو تہذیب کا اثر بھی نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے، لیکن میراجی کے بارے میں کرشن چندر نے ایک بار کہا تھا: "میراجی مسلمان ہیں بلکہ پکے مسلمان ہیں، ان کا ہندو نام ایک دھوکا ہے، صبح سویرے وہ جے جے ونتی کا جو راگ الاپتے ہیں وہ بھی محض ایک فریب ہے۔ دراصل وہ مسلمان ہیں۔" کیا آپ اپنے تجربوں کی بنا پر میراجی کی زندگی کے اس حصے پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

(۱۰) کچھ دنوں پہلے ایک انٹرویو میں راشد نے میراجی کو اس زمانے کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر، سب سے زیادہ جدت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کا مالک اور سب سے منفرد شاعر قرار دیا ہے۔ آپ خود اپنی اور راشد کی شاعری کے پس منظر میں راشد کی ان باتوں کی تشریح کیسے کریں گے؟

(۱۱) ادھر آپ نے "نیا دور" اور دوسرے پرچوں میں میراجی کی جو غیر مطبوعہ نظمیں شائع کرائی ہیں وہ میراجی کی بہترین نظموں مثلاً "ترغیب"، "سمندر کا بلاوا"، "خدا"، "شام کو راستے پر"، "تفاوتِ راہ"، "مجھے گھر یاد آتا ہے"، "اجنتا کے غار"، "کلرک کا نغمۂ محبت"، "لب جوئبارے" وغیرہ کے مقابلہ میں بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا بعض لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ میراجی کو اپنی ان نظموں کی کمزوری کا احساس تھا اور اسی لیے انھوں نے اپنی زندگی میں ان نظموں کو شائع نہیں کرایا؟

سوال نامہ سن کر اختر الایمان نے ان کاغذوں کو الٹا پلٹا جو میراجی کے آخری دور کا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے چند کاغذات ہاتھ میں لیے، مجمع پر ایک نظر ڈالی اور لب کشا ہوئے۔

اختر الایمان:

شاعر کی زندگی اور فن قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شخصیت فن سے جدا ہو جائے۔ میراجی کے انتقال کے بعد میں نے جو نظمیں اشاعت کے لیے دیں ان کے بارے میں اچھی یا بری، کی تخصیص نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ قیوم نظر اور شاہد دہلوی مرحوم نے میراجی کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کے لیے اکثر مجھے خطوط لکھے تھے اور میں نے اس مطالبہ کو پورا کیا تھا۔ میراجی اپنے غیر مطبوعہ کلام کے دو نسخے مرتب کر چکے تھے، اس کے ساتھ ہی ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں ان غیر مطبوعہ مجموعوں کی طباعت نہ کرا سکا۔ اس وقت حالات ہی دگرگوں تھے۔ [اختر ایمان کی مراد ادبی، سیاسی اور اقتصادی حالات سے ہے]۔

میراجی کے آخری دور کے بارے میں اختر الایمان نے فرمایا کہ میراجی کے جنازے کے ساتھ گنتی کے چار آدمی تھے، وہ خود، مدھوسودن، مہندرناتھ، اور ان کے ہم زلف مسٹر سدن۔ اس وقت بمبئی میں ترقی پسندوں کا اجتماع تھا۔ انھوں نے فرداً فرداً مطلع کیا مگر ان چار کے علاوہ کوئی شریک نہ ہو سکا۔ میراجی کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کے لیے اختر الایمان نے یہ اہتمام کیا کہ دونوں نسخوں کی نقلیں جمیل جالبی کو بھجوا دیں۔ ان نسخوں کی بیشتر نظمیں "سیپ" اور "نیا دور" میں شائع ہو چکی ہیں۔ اختر صاحب نے کہا کہ اس صورت میں یہ کہنا کہ میں نے نظموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز برتا درست نہ ہوگا۔

میراجی سے اپنے تعلقات کے بارے میں اختر الایمان نے کہا کہ میراجی کے دوستوں میں ایک صاحب عبدالطیف نام کے تھے۔ یہ صاحب ایرفورس کی ملازمت چھوڑ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہو گئے تھے، اس کے بعد بمبئی منتقل ہو کر فلم لائن اختیار کر لی۔ میراجی کو ان سے کافی قربت تھی۔ وہ لطیف کے نام اکثر خط لکھا کرتے تھے جسے وہ اپنی سوانح حیات کہتے تھے۔

اختر صاحب نے ایک خط کا اقتباس پڑھ کر سنایا :

خط: عبدالطیف کے نام

اکتوبر ۲۱، ۱۹۴۶ء

"لطیف کے نام" دلی سے جو آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی اس کے چند اوراق پڑھے۔ خیال آیا کہ زندگی تو کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جائے گی، یہ آپ بیتی جاری رہنی چاہیے، لیکن شراب کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کبھی تو عارضی طور پر ہر بات بھلا دیتی ہے، کبھی کوئی یاد ذہن نشین کرا دیتی ہے۔ آج ماحول کچھ ایسا تھا کہ یہ بات دل میں بیٹھ گئی، چنانچہ لکھنا شروع کیا۔ لیکن کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں؟ سوانح نویسی کا یہ سلسلہ کچھ ایسا ٹوٹا کہ میں دلی چھوڑ آج بمبئی کے گردونواح میں ہوں۔ پہلے دفتر کی میزوں پر سوتا تھا، اب فرش پر براجمان ہوتا ہوں۔ کبھی شراب کے بغیر اور کبھی نشہ میں۔ خود کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا فقیر تصور کرتا ہوں، اور دنیا شاید مجھے بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے سماج سے فرائض، جس طرح دنیا انھیں سمجھتی ہے، میں نے، جس طرح میں انھیں سمجھتا ہوں، پورے نہیں کیے۔ لیکن میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے

اس کالحاظ کیسے ہوگا!

اختر الایمان نے کہا کہ میراجی کی زندگی ایسی ہی تھی۔ اختر صاحب کے نزدیک یہ زندگی خود اختیاری تھی۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے ان پر پابندی عائد ہوتی ہو۔ ان کے پاس Defeat Of Baudelaire (کتاب کا نام) رہتی تھی جس کا وہ اکثر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مرتے وقت بھی یہ کتاب ان کے سرہانے موجود تھی۔ اختر صاحب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ میراجی اپنی ماں سے محبت کرتے تھے (ماں حقیقی تھیں)۔ چونکہ سماج کے کچھ افراد اس فعل کو مذموم سمجھتے ہیں، شاید اسی احساس کے تحت وہ خود کو بطور سزا ایذا پہنچانے لگے تھے۔ اختر صاحب نے کہا "میرے نزدیک ان کی مجموعی شاعری اسی احساس سے مختلف ہے۔"

فضیل جعفری نے سوال کیا کہ ترقی پسند تحریک کی طرف میراجی کا کیا رویہ تھا؟

اختر الایمان نے جواب دیا کہ میراجی کہا کرتے تھے ترقی پسند تحریک ادب کو ادب کی حیثیت سے نہیں پرکھتی بلکہ تحریک کا Tool سمجھتی ہے۔ میراجی نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق حلقۂ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی اور جب جوش کی شاعری کا جائزہ لیا تو اس میں "ازم" کو تلاش نہیں کیا بلکہ ادبی حیثیت سے چھان بین کی۔ اسی رویہ کی بنا پر سجاد ظہیر نے ۱۹۴۴ میں میراجی کی مذمت بھی کی تھی۔

بمبئی میں ترقی پسند نشستوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ سجاد ظہیر کے فلیٹ واقع والکیشور میں یہ نشستیں ہوتی تھیں۔ میں اور میراجی بھی اکثر شریک ہوئے، مگر محسوس یہ ہوا کہ ہماری شرکت پسند نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت میراجی، راشد اور میں، ان ترقی پسندوں سے مختلف قسم کی شاعری کرتے تھے، مگر ہم لوگ بھی ترقی پسند کہلاتے تھے، لیکن شاعری کو سیاست سے منتھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس میں اس دور کی ترقی پسندی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف "انگارے" والے احمد علی کی ترقی پسندی تھی، دوسری طرف سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کی تھی، اور تیسری طرف راشد، میراجی اور میری ترقی پسندی تھی۔ حقیقتاً ہم لوگوں کو ہی ترقی پسند کہنا چاہیے تھا۔

اختر الایمان نے کہا کہ میراجی سے ان کی ملاقات کا سلسلہ ایک خط کے ذریعہ شروع ہوا۔ وہ اس وقت "ادبی دنیا" لاہور کے شعری حصہ کے مدیر تھے۔ اختر صاحب نے ایک نظم اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ اس کا ایک مصرع تھا ع

سچ بتا کر زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو

میراجی نے یہ نظم اس نوٹ کے ساتھ واپس کردی۔

"جس عالم میں آپ نے یہ نظم کہی ہے اسی عالم میں نظر ثانی کر کے بھیجیے۔"

باقر مہدی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے یہ نظم راشد کی نظم "ہم رقص" سے متاثر ہو کر کہی تھی! اختر الایمان نے اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے بتایا کہ راشد کی نظم ان کی نظم کے بعد وجود میں آئی ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ میراجی سے ملاقات کا ایک موقعہ ۱۹۳۹ میں پیدا ہوا تھا۔ کرشن چندر نے دلی میں کانفرنس بلائی تھی جس میں ان سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی، لیکن وہ کچھ نہ لکھ سکے اور دلی سے باہر چلے گئے۔

سوال: زندگی کے بارے میں میراجی کا جو نقطۂ نظر تھا کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے؟

جواب: میراجی کے نقطۂ نظر کو میں کیوں جھٹلاؤں؟

اختر الایمان نے بتایا کہ میراجی سے ان کی پہلی ملاقات اوپندر ناتھ اشک کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس وقت میراجی کا قیام دلی میں تھا۔ یہ ملاقات دوستانہ تھی، البتہ وہ میراجی کا لحاظ کیا کرتے تھے۔

باقر مہدی: لحاظ کی نوعیت کیا تھی، خوردی کی یا بزرگی کی ؟

اختر الایمان: ایسی ہی نوعیت اور ایسا ہی لحاظ جیسا کہ میں آپ کا کرتا ہوں۔

باقر مہدی: تب تو لحاظ کے ساتھ احترام بھی ہوگا ؟

اختر الایمان: احترام بھی تھا اور ایسا ہی تھا جیسا کہ تم سے توقع کی جاتی ہے۔

آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دلی کے قیام میں یہ ڈھرا بن گیا تھا کہ شام کو ہم لوگ مل بیٹھتے اور متعدد موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے۔"

اس کے بعد اختر الایمان شالیمار پکچرز سے وابستہ ہو گئے۔ میراجی ۱۹۴۲ میں پونا پہنچ گئے۔ جب اختر الایمان بمبئی آئے تو میراجی بھی پونا سے چلے آئے۔ وہ مدھوسودن کے ساتھ فورٹ کی Espalanade Mansion کے ایک کمرے میں جسے "ساقی" صاحب خالی کر کے چلے گئے تھے، رہنے لگے۔ اختر صاحب اور مدھوسودن نے طے کیا کہ میراجی کی زندگی میں کچھ نظم و ضبط پیدا کیا جائے اور مدھوسودن روزانہ میراجی کو نہلانے کا اہتمام کریں۔ ابھی منصوبے پر پوری طرح عمل بھی نہ ہوا تھا کہ میراجی کی صحت جواب دے گئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کثرت شراب نوشی ان کی صحت پر اثر انداز ہوئی تھی۔ ان کی آنتوں میں زخم پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ وہ چھاج پئیں اور ساگودانہ کھائیں لیکن میراجی مسلسل بد پرہیزی کرتے رہے۔ انھیں بھابھا اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اختر صاحب کے گھر سے کھانا جاتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے میراجی اسپتال کے کسی ملازم کو بہلا پھسلا کر باہر سے پکوڑے منگا کر کھانے شروع کر دیے تھے۔

چند ہی دن میں میراجی کا Mental Derailment ہو گیا۔ اسپتال میں انھوں نے ایک نرس کی کلائی چبا ڈالی۔ جب میراجی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایسا علاج پسند نہیں کرتے جس سے ان کے Complexes ختم ہو جائیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ نہ لکھ سکیں۔ سوال کا جواب دیتے ہوئے اختر الایمان نے کہا کہ وہ اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ Complexes کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ خود انھیں معلوم تھا کہ بغیر سگریٹ منہ میں دبائے لکھنا محال ہے، لیکن انھوں نے کہا، "چھوڑ دی اور پھر بھی لکھتا رہا۔"

اس بات پر حاضرین میں سے کسی نے سرگوشی کی کہ اختر

الایمان عادتوں کو Complexes سے Confuse کر رہے ہیں۔ باقر مہدی نے بلند آواز میں کہا کہ شاعر جن Complexes پر اپنے فن کی بنیاد رکھتا ہے کیا ان کو نکال کر وہ سفید سلیٹ کے مانند نہ ہو جائے گا؟ اگر میرا جی کے Complexes نکل جاتے تو وہ میرا جی رہتے؟ ڈاکٹر Laing (وجودی اور نفسیاتی ماہر) نے پاگل کو ہوشیار اور ہوشیار کو پاگل کہا ہے۔ میرا جی ہوشیار قرار دیے جائیں گے یا پاگل!

اختر الایمان نے کہا کہ ہوشیار یا پاگل کی بحث کرنا تو نقادوں یا ماہر نفسیات کا کام ہے۔ وہ تو نجی حالات پیش کر رہے ہیں تا کہ شاعر یا فن کار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اختر الایمان کے نزدیک شاعر کی زندگی جتنی واضح ہوگی اتنا ہی اس کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ کبھی کبھی فن کار حالات سے بغاوت بھی کرتا ہے۔ شاعر کے نجی حالات، افعال یا اعمال اس کے فن پر کس حد تک اثر انداز نہ ہوتے ہیں، یہ فیصلہ کرنا نقادوں اور ماہروں کا کام ہے۔ وہ صرف ان حالات کو پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے خود دیکھے ہیں۔

میرا سین کے بارے میں آپ نے بتایا کہ اس مسئلے پر میرا جی ان کی تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی۔ البتہ ایک واقعہ یاد ہے۔ ایک دن پونا میں میرا جی دیوار سے سر ٹکرا رہے تھے۔ سبب پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا:

"یہی ہے وہ دن جس دن میری تباہی شروع ہوئی تھی۔"

آپ نے میرا سین کے نام میرا جی کے دو خط سنانے سے پہلے کہا کہ یہ ضرور ہے کہ میرا سین کی نسبت سے انھوں نے اپنا نام میرا جی رکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ بشیر چند لکھا کرتے تھے۔

میرا سین کے نام میرا جی کا خط:

(خط کے ابتدا میں ایک نقش ہے اور اختتام میں بشیر چند کی ہو بہو نقل ہے۔)

خط (۱)

میراں!

تمھاری پوجا کو تین سال پورے ہونے میں ایک مہینہ اور کچھ دن رہ گئے۔ لیکن ابھی تک کوئی آثار کامیابی کے نظر نہیں آتے۔ ملنا تو در کنار، درشن کی ہمت افزا شراب روز بروز کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ خدا کے لیے کسی دن چند لمحوں کی گفتگو کا موقع دو تا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا آغاز کر سکوں اور مناسب وقت آنے پر خوابوں کی تعبیر خوش کن بنا سکوں۔ یوں دور سے تمھارے لباس کو سجدے کرتے ہوئے، یہ لمحے اذیت سے کم نہیں۔ خدارا، اس تلخی کو شیرینی سے بدل دو اور مجبور نہ کرو کہ سارے بندھن توڑ کر از خود رفتگی میں ناگوار صورت حال پیدا کروں۔

تمھارا ایک ہلکا سا اشارہ مجھے تم سے مخاطب ہونے کی جرأت دلا دے گا۔

سب سے آخر... ان فقروں کے بے تکلف لہجے کی معافی نہیں چاہتا یہ کام ملاقات پر ملتوی سمجھتا ہوں۔

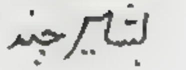

خط (۲)

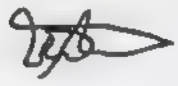

میراں!

ایک شخص جس کی تباہی لازمی ہے، لیکن اس کے برے لمحوں کی تلخی کو کس حد تک دور کیا جا سکتا ہے، یا کم از کم ان میں تاخیر پیدا کی جا سکتی ہے، اور یہ سب کچھ تمھارے بس میں ہے۔ اس بات پر اظہار افسوس بے کار ہے کہ میں نے قابل اعتراض یا غلط طریقے اختیار کیے تم سے تعارف پیدا کرنے کے! اتنی تسلی ہے کہ کم سے کم کوئی نامناسب حرکت سرزد نہیں ہوئی اور وہی نا تجربہ کاری جو حصول مقصد میں سدِ راہ ثابت ہوئی میرے دلی اخلاص کی دلیل ہے۔ اب کہ حالات بے چارگی کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں اور تم سے ملنے کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے، قدموں میں سر رکھ کے کہتا ہوں (اور عملی طور پر بھی تیار ہوں بلکہ خوش قسمتی سمجھوں گا) کہ تم ذرا سی کوشش کر کے [اسے]، جسے تم بہت پیاری ہو، اس تباہی سے بچاؤ جو عنقریب میری بہتر ہستی کا خاتمہ کر دے گی۔

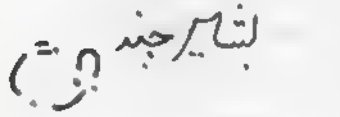

ان باتوں کو یوں ہی نہ سمجھنا، اور مجھے معاف کرنا کہ یہ سب کچھ گھر کے پتے پر بھیج رہا ہوں کیوں کہ مجھ میں جرأت نہیں کہ خود تم تک پہنچا سکوں۔ میں تم سے بہت ڈرتا ہوں۔

☆

خطوط سننے کے بعد فضیل جعفری نے سوال کیا:

"کیا میرا جی کا راستہ ترقی پسندوں سے الگ تھا؟"

اختر الایمان نے جواباً کہا کہ ترقی پسندوں سے ان کی مخالفت نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ فن کا زاویہ Spontaneous ہوتا ہے، یہاں مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دلی میں باہمی ملاقاتیں ہوتی تھیں، ان میں فیض بھی شریک ہوتے تھے، وہ فوج میں میجر تھے۔ کسی نے شعوری طور پر کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اختر الایمان نے "یادیں" کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اس کے دیباچے میں اس نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں اختر الایمان نے کہا کہ شاعری میں جو اسلوب انھوں نے اپنایا وہ کسی کا تجویز کردہ نہیں تھا اور نہ وہ اپنے فن کو کسی تحریک کا ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کی نظمیں پڑھتے تھے اور محسوس کرتے

تھے کہ اس کینوس کو پھیلایا جا سکتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ خلیل الرحمن اعظمی نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہے (ملاحظہ ہو سوال ۸)۔

میراجی کی شاعری پر بھگتی تحریک کے اثرات پر اختر الایمان نے کہا کہ کرشن چندر کا میراجی پر اعتراض کسی ''ازم'' کے تحت تھا۔ میراجی خود کو وشنو بھگت کہتے تھے، لیکن عملی طور پر وہ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتے تھے، نہ مسجد جاتے تھے، نہ مندر۔ دو ہاتھوں میں لوہے کے گولے رکھتے تھے اور گلے میں مالا بھی پہنے رہتے تھے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سبب نفسیاتی تھا یا جسمانی!

ندا فاضلی: بھگتی تحریک کے دو اسکول ہیں: نرگن واد، سگن واد مورتی پوجا اور بنا مورتی پوجا۔ ہوسکتا ہے میراجی سگن واد ہوں۔

اختر الایمان: سب کچھ ممکن ہے۔ میں اس موضوع پر زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ میرے سامنے جو روپ تھا وہ بیان کر دیا۔ اس میں جذبہ کی سچائی تھی یا نہیں، اس سے ایک مختلف بحث چھڑ جائے گی۔

ندا فاضلی: سچائی کا تصور کیا ہے؟ جو راہ انھوں نے اختیار کی وہ جبری تھی یا اختیاری؟ کبیر نے جو Anti Establishment رویہ اختیار کیا تھا اسے کیا نام دیا جائے گا، کبیر نے اپنے رویہ کی بنا پر جو تکالیف اٹھائیں اس کی توجیہ کس طرح کریں گے ؟

اختر الایمان: یہ موضوع میرے زیرِ بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میراجی اپنے فن کے خالق تھے، انھوں نے تقلیدی فن اختیار نہیں کیا اس لئے اس میں نیا پن ہوتا تھا اور لوگ اسے قبول کرنے پر مشکل سے تیار ہوتے تھے اور بعض اوقات گالیاں تک دیتے تھے۔

[اختر الایمان نے مزید کہا]: میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ جدید شاعری میں میراجی کو پیشرو کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی کینوس کو وسعت دینے کی کوشش کی اور اسے مقبول بنانے کے لیے اسٹیج پر گا کر بھی سنایا، خواہ کچھ لوگ برا بھلا ہی کیوں نہ کہتے رہیں ☆☆☆

مناجات

اختر الایمان

شمارہ ۸۹، مارچ اپریل ۱۹۷۴

آشفتہ خاطری مری مٹی میں ہے ملی
تم یوں ہی مجھ کو دیکھ کے آزردہ ہو گئے
ہر لحظہ قبر ہے، گئے لمحے کی، ہر نفس
پہلے نفس کی گور سے افسردہ ہو گئے
کارِ جہاں ڈھکا ہے مناظر کے حسن سے
افسونِ جدلیات سے غم مردہ ہو گئے
یوں سمجھو ساز باز ہے اک موت سے حیات
شر قوتِ نمو کا محرک ہے سادگی
اک ماندگی شکل ہے یوں ہی بہے چلیں
بے پایاں ممکنات کا یہ بحرِ بے کنار
ہم جس میں تیرتے ہیں خدائے عظیم ہے
مظہر ہے یا خدا کا چلو سر بسجدہ ہوں
اے ربِ لایزال کوئی راہ مستقیم
ہم کو نہ بخش دینا، یوں ہی برقرار رکھ
لا کے محیط! میرا مرض آگہی نہیں
اک تشنگی ہے میرا مرض لاعلاج کر
پھیلا دے اور آگ زمیں پر مرے لئے
جو دہر کا مزاج ہے میرا مزاج کر
منعم، غنیم، قافلہ سالار، اشتہا
کچھ اس طرح کے اور بھی الفاظ دے مجھے
مفلوج کر کے میرے قویٰ، مرے ولولے
پھر حوصلہ دے، ہمت پرواز دے مجھے
آبِ حیات زہر بنا دے مرے لئے
یہ زہر اس کے بعد رگوں میں اتار دے
دن، اس کی برکتیں جسے جی چاہے بخش دے
دائم تڑپ مجھے خلشِ انتظار دے

اختر الایمان

شمارہ ۸۹

مارچ اپریل ۱۹۷۳

ادھر سے نہ جاؤ
ادھر راہ میں ایک بوڑھا کھڑا ہے
جو پیشانیوں اور چہروں پہ
ایسی بھبھوت ایک مل دے گا، یہ سب جھریاں پھٹ پڑیں گی
سیہ مار جیسے چمکتے ہوئے کالے بالوں
پہ ایسی سپیدی اڈ آئے گی کچھ
کوئی راستہ اور ڈھونڈو
کہ اس پیر فرتوت کی نظروں سے بچ کر
نکل جائیں اور اس کی زد میں نہ آئیں کبھی ہم
ادھر سے نہ جاؤ
ادھر اس نے ایک شخص کو جاتے دیکھا ہے اکثر
جوانوں کو جو راہ میں روک لیتا ہے، ان سے
وہی باتیں کرتا ہے مل کر
جو سقراط کرتا تھا یونان کے سب من چلوں سے
یقیناً اسے ایک دن زہر پینا پڑے گا
ادھر سے نہ جاؤ، ادھر روشنی ہے
کہیں آؤ چھپ جائیں جا کر تمام آفتوں سے
مجھے ایک تہ خانہ معلوم ہے خوشنما سا
جو شاہان دہلی نے بنوایا تھا، اس غرض سے
کہ ابدالیوں، نادری فوج کے دسترس سے
بچیں، اور بیٹھے رہیں سارے ہنگاموں کی زد سے بچ کر
یہ دراصل میراث ہے، آپ کی، میری، سب کی،
سلاطین دہلی سے پہلے کسی اور نے اس کی بنیاد رکھی تھی
وہ ماقبل تاریخ کی بات ہے، کون جانے؟
ادھر سے نہ جاؤ
ادھر شاہ نادر نہیں آج کوئی بھی لیکن
وہی قتل عام آج بھی ہو رہا ہے
یہ میراث ہے آپ کی، میری، سب کی،
یہ سوغات بیرونی حاکم ہمیں دے گئے ہیں
چلو سامنے کے اندھیرے میں گھس کر
اتر جائیں تہ خانے کی خامشی میں
یہ سب کھڑکیاں بند کر دیں
کوئی چیخنے، بین کرنے کی آواز آئے نہ ہم تک
کوئی خون کی چھینٹ دامن پر آ کر نہ بیٹھے
کبھی تم نے گانجا پیا ہے
کوئی بھنگ کا شوق، کوئی جڑی بوٹی کھائی؟
نہ کوکین، افیون، کچھ بھی!
کبھی کوئی نشہ نہیں تم نے چکھا؟
نہ اغلام، امرد پرستی سے رشتہ رہا ہے!
کوئی تجربہ بھی نہیں زندگی کا
فسادات دیکھے ہیں تقسیم کے وقت تم نے؟
ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈھیلوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا ہے کٹتے
اور پستاں بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھیں کبھی بین کرتے؟
نہیں یہ تو نشہ نہیں، تجربہ بھی نہیں ہے کوئی ایسا،
یہ اک سانحہ ہے
فراموش گاری کا احسان مانو
یہ سب کل کی باتیں ہیں، بوسیدہ باتیں
فراموش گاری بھی اک نعمت غیر مترقبہ ہے
ادھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا
نہ ایسا خطرہ، نہ مسئلہ کوئی جس کو
نہ سوچا نہ سمجھا، نہ احساس ہے جس کا اب تک
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی ایسی راہ فرار آج ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں۔

ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر

اختر الایمان

شمارہ ۱۱۵،
جون ۱۹۸۰

"کون سا اسٹیشن ہے؟"
"ڈاسنہ ہے صاحب جی،
آپ کو اترنا ہے؟"
"جی نہیں، نہیں۔" لیکن
ڈاسنہ تو تھا ہی وہ
میرے ساتھ تھی قیصر
یہ بڑی بڑی آنکھیں
اک تلاش میں کھوئی
رات بھر نہیں سوئی
جب میں اس کو پہنچانے
اس اجاڑ بستی میں
ساتھ لے کے آیا تھا۔
میں نے ان سے پھر پوچھا:
"آپ مستقل شاید
ڈاسنہ میں رہتے ہیں؟"
"جی، یہاں پہ کچھ میری
سوت کی دکانیں ہیں،
کچھ طعام خانے ہیں۔"
میں سنا کیا بیٹھا،
بولتا رہا وہ شخص،
"کچھ زمینداری ہے۔
میرے باپ دادا نے
کچھ مکان چھوڑے تھے
ان کو بیچ کر میں نے
کاروبار کھولا ہے۔
اس حقیر بستی میں
کون آ کے رہتا ہے،
لیکن اب یہی بستی
بمبئی ہے دلی ہے،
قیمتیں زمینوں کی
اتنی بڑھ گئیں صاحب
جیسے خواب کی باتیں۔
اک زمین ہی کیا ہے؟
کھانے پینے کی چیزیں
عام جینے کی چیزیں
بھاؤ دس گنے ہیں اب۔"
بولتا رہا وہ شخص،
"اس قدر گرانی ہے
آگ لگ گئی جیسے
آسمان حد ہے بس۔"
میں نے چونک کر پوچھا،
"آسماں محل تھا اک
سیدوں کی بستی میں۔"
"آسماں ہی نہیں صاحب
اب محل کہاں ہوگا؟"
ہنس پڑا یہ کہہ کے وہ،

میرے ذہن میں اس کی
بات پے بہ پے گونجی
"اب محل کہاں ہوگا؟"
اس دیار میں شاید
قیصر اب نہیں رہتی
وہ بڑی بڑی آنکھیں
اف نہ دیکھ پاؤں گا
ملک کا یہ بٹوارا
لے گیا کہاں اس کو
ڈیوڑھی کا سناٹا
اور ہماری سرگوشی۔
"مجھ سے کتنے چھوٹے ہو!"
میں نے کچھ کہا تھا پھر
اس نے کچھ کہا تھا پھر

بے رقم کہاں وہ سب
درد کی گراں جانی
میری شعلہ افشانی
اس کی جلوہ سامانی
بے رقم کہاں وہ اب
کرب زیست سب میرا
گفتگو کا ڈھب میرا؟
اس کا ہاتھ ہاتھوں میں
لے کے جب میں کہتا تھا
اب چھڑاؤ تو جانوں!
رسم بے وفائی کو
آج معتبر مانوں۔
اس کو لے کے باہوں میں
جھک کے اس کے چہرے پر

بھینچ کر کہا تھا یہ

"بولو، کیسے نکلوگی
میری دسترس سے تم
میرے اس قفس سے تم؟
بھورے بادلوں کا دل
دور اڑتا جاتا ہے
پیڑ پر کہیں بیٹھا
اک پرند گاتا ہے
چل چل اک گلہری کی
کان میں کھنکتی ہے...
ریل چلنے لگتی ہے،
راہ کے درختوں کی
چھاؤں ڈھلنے لگتی ہے۔
"مجھ سے کتنے چھوٹے ہو!"

اور مری گراں گوشی
ڈیوڑھی کا سناٹا
اور ہماری سرگوشی،
بے رقم کہاں وہ سب؟
دور اس پرندے نے
اپنا گیت دہرایا:
"آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا
گم کیا ہوا پایا۔"

اخترالایمان

شمارہ ۱۵۳
جنوری فروری ۱۹۸۹

گریزپا

ہوا میں سرمستیاں گھلی تھیں لہو میں نغمے بھرے ہوئے تھے
گلوں کی خوشبو کے موسموں کا زمانہ کتنا بھلا بھلا تھا
زمیں پہ رکھتے تھے پاؤں ایسے ہمیں نے تخلیق کی تھی جیسے
رفیق جاں بخش قہقہے تھے فضا میں نشہ ملا ہوا تھا
مدارتیں، میٹھی میٹھی چہلیں، صنم تھے مہرو وفا سراسر
دھنک میں جھولے پڑے ہوئے تھے تمام منظر سجا سجا تھا
خبر نہیں تھی دوا کی بوباس بھی ہے شامل رفاقتوں میں
تمام گلپوش موسموں کا زمانہ اتنا گریزپا تھا
پڑا تھا میں سینہ چاک آگے لہو میں ڈوبا ہوا تھا نشتر
کھڑا تھا جراح سانس روکے زمانہ کچھ دیر تھم گیا تھا
یہ روز و شب ہیں یہ ماندگی ہے تو کیا بھروسہ کریں کسی کا
وہ دل ہی سب منحصر ہے جس پر، ہوا نشانہ شکستگی کا

شمارہ ۱۵۳،
جنوری فروری ۱۹۸۹

اور اب سوچتے ہیں

دور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
ہفت خواں لمحے کئے ظلمات سے گذرے بھٹکے
وسعت دشت تمنا میں سراسیمہ زبوں آبلہ پا
رات دن چلتے رہے ایک لگن دل میں لئے
راہ کی گرد چھٹے کرب سے حل جائے نجات
دور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
عمر کے موڑ پہ آئے تو شش و پنج میں ہیں
اور اب سوچتے ہیں منزل مقصود تھی کیا؟

اخترالایمان

شمارہ ۱۹۰،
جنوری ۱۹۹۶

کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں فقط میں
کسے آواز دو گے، رنگ پیراہن تصور میں
بہت جلوہ گری کرتا ہے لیکن وہ قد و قامت
تکلم کا کرشمہ سا تو اوجھل ہے نگاہوں سے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے جس کا مداوا ہی نہیں کوئی
بجز اس کے اٹھالائیں وہ جنت سی تخیل میں
چمن سازی کریں
لفظوں کے گل،
لفظوں کے گل بوٹے کھلائیں، اس کے دامن کو
کچھ اس انداز سے کھینچیں وہ ٹھٹھا مار کر ہنس دے
خفا بھی ہو
کبھی اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہے
گذرتی رات کی چاندنی پگھلنے دیں
یہ گھاؤ صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں
بہت اڑتے ہوئے رنگوں کی چھینی چھلنی چادر سے
مرے ہونٹوں سے لپٹی نا طلب بوسوں کی شیرینی
وہ سب آئینہ خانوں میں سجے تصویر سے چہرے

محرک فلم کے پردے، یہ بزم عیش کا ساماں
وہ سارے ہم نوالہ ہم پیالہ یوسف ثانی
دل درد آشنا لے کر جو اس دنیا میں آئے تھے
مری یادوں کے البم میں ہیں ان کی دھندلی تصویریں
شکست و کامیابی کے مناظر، خندہ پیشانی
شہابی گالوں پر موتی کی لڑیاں ٹوٹتی بنتی
وفا کی داستاں، رسوائی کے قصے
یہ کس کس کی ہنسی، سرگوشیاں، باتیں ہیں سب پہچانتا ہوں میں
میں کیسی آشنائی سے پکڑتا ہوں کلائی کو
وہ کیسی دلربائی سے چھڑا لیتی ہے ہاتھ اپنا
وہ منہ کا ذائقہ باتوں کی گرمی، رات کا جادو
بہے جاتی ہے میری کشتی عمر رواں کیسے
حیات خمسہ سحر سامری میں وقت کی گم ہیں
فسانہ تھا جہاں جیسے، حقیقت تھی گماں جیسے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں فقط میں
بہے جاتی ہے میری کشتی عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوتا جا رہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

اختر یوسف

شمارہ ۱۰۵،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷

رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا
رات کالی ہے، اجلی ہے، پیلی ہے، نیلی ہے یا پھر
رات کا کوئی رنگ ہی نہیں ہے
مگر جو بھی ہو، رات کالی ہے... ایسا سمجھ لیجئے
رات کالی ہے، بہتی ہے جیسے ندی، اندھے پانی کی، کہرے کی یا دھند کی

رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا
ایک وحشی پرندے نے خنجر کا بوسہ لیا
نوک خنجر... پرندے کی آنکھوں میں سازش کا نشہ مچا
خواب کی دھند، اندھی ندی، زرد شعلہ بنی اور بہتی رہی
پھر کہیں زرد رنگوں کے پتھر کی بارش پرائے شہر میں روانہ ہوئی
راحتوں کے مکاں کے منڈیروں سے راحت کے کوے اٹھے
شور کی کنکری سے کنویں بھی بھرے، آئینہ آئینہ سی فضا بھی جلی
ایک قصے کی انتی پرانی نئی، پھر کہیں بوم کا آشیانہ بنی
رات کی آنکھ میں ایک خنجر اگا

اختر یوسف

شمارہ ۱۷۳ء
فروری، مارچ ۱۹۹۴

اپنے شہر میں فساد

سفید کبوتروں سے آج سارا آکاش خالی ہے
دھوپ...ڈری ہوئی فاختہ سی لگتی ہے
منڈیروں پہ بیٹھی ہوئی زرد ہے
کانپ کانپ اٹھتی ہے، ہوا آدمی کی طرح
کرفیو سے بھرے ہوئے شہر کی سڑکوں پہ گھوڑوں کی وحشی ٹاپیں
آگ اڑاتی ہیں
مکان جلتے ہیں...مرے تمہارے
اندر ہمارے دھواں دھواں سا کچھ رہ رہ اٹھتا ہے
دور میں اور پاس میں بھی زوروں کے دھماکے ہوتے ہیں
گولیاں تابڑتوڑ سنسناتی ہیں
ہڈیوں میں اتری جاتی ہیں
دن...لہو خاک میں لپٹا ہوا گذرتا ہے
شام بھی لہولہان چھپکلی کی طرح سہمی ہوئی چپ چاپ اداس اداس
دھیرے سے ندی میں ڈوبتی ہے
پھر، سیاہ ہوتے ہوئے پیڑوں پہ ڈھیر سارے گدھ
اپنی پوری طاقت سے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں
سناٹا، کائنات میں اور بھی گہراتا ہے
کچھ، دھواں دھواں سا اندر اندر مرے تمہارے اور بھی بڑھ جاتا ہے

پاس کے شہر میں فساد

پاس کے شہر سے کرفیو کی بے آواز چاپ
دھیرے دھیرے
مرے شہر کی گلیوں اور چوراہوں تک آ پہنچی ہے
رات کی طرح خوف پھیلا ہے
دروازے کھڑکیاں چپ
کتے بھی چپ
ہراساں دور دور تک سڑکوں کو تکتے ہیں
پھر روتے ہیں
پاس کے شہر میں نعرے ابھرتے ہیں
ایک ہی ساتھ جیسے ڈھیر سارے بکروں کی گردنوں پہ
دھاردار چاقو تیرتے ہیں
پیڑوں پہ چاندنی ستمبر کی سہمی ہے
تنہا پرندے کے ہیرا جیسے دل میں بلے کی لہولہو آنکھ ڈوب کر ابھرتی
سناٹا زمیں کا آکاش سے جاملا ہے
گھوڑوں کی آگ اگاتی ٹاپ پاس کے شہر میں/اور
اپنے شہر میں آگیا جیتال پٹرول پمپوں کے پاس کھڑا ہے
رات کی طرح خوف پھیلا ہے...سائکل ہلاتا ہے
چاندنی ستمبر کی پیڑوں پہ روتی ہے
بلے کی لہولہو آنکھ اور پرندہ
بے چارہ

اختر یوسف

شمارہ ۲۰۲،
جنوری ۱۹۹۷ء

شکتی — ۴

شکتی مایا... چاروں اور... اور ہوا لرزیدہ اور دریدہ
جیسے چادر جوگی کی کھاٹ کنارے لرزیدہ
تار تار میں بنے ہوئے اسرار
ہوا لرزیدہ یا پرندہ

آنکھ میں جس کے اگنی درپن برہمن کے گیتوں کی رات
بارش میگھا جل تھل ندیاں سات سمندر دھنک تماشا
جس میں
گھلتا جائے... شکتی کی کایا کی مایا

جنگل جنگل مور ناچ پاؤں میں جن کے کالک بندھن
رنگ اڑے تو اڑتا جائے ہوا میں لہکے راج رنگ
جیسے چادر جوگی کی پلک پلک میں اجیارا... زردارا...
نیلا را
اکتارا.. بول رہا ہے

رم جھم برسے شکتی پھلوار
عنبر ملکے دورائے دوار
جوہی جیسی ایک کٹوری
جس میں امرت تارا دمکے
سیب کے باغ میں نیلا چاند
ٹھوڑی پکڑے شرمائے
شکتی مایا چاروں اور... چاروں اور

شکتی — ۵

شکتی کی آنکھوں میں ساگر دھرتی اور آکاش
کمنڈل سورج کا
برسائے دھوپ
تمھارا روپ
شکتی روپ... ساگر اندر موتیوں کے ہنس راج کے
درشن دے
لہرائے میرے سامنے
دھرتی کے نیلم مور کی آنکھیں اور آکاش کے سات
پرت
سات پرت والی پتنگ... ایک دھنک اور سب کا
اتم شبد... اللہ
اللہ اول شبد اللہ ارض وسما کا نور اللہ
شکتی کی آنکھیں... بیلا پھول کی خوشبو مجھ کو
آدھی رات جگا کے بولے
دیکھ فلک سے ارض تلک پکھراج کا دریا کیسا صندل
راگ بکھیرے
صندل راگ جہاں بیراگ
ساگر اندر موتیوں کے ہنس راج کے درشن دے
دور کھڑی للچائے... مور کھ پگلی مایا

بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی–۳

اختر یوسف

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی اپنی ویران اور بڑی سی حویلی کی اوپری منزل کے
جھروکے پہ دیر سے کھڑی ہیں گرما کی سہ پہر
ڈھلان پہ ہے اور سورج تھکا ہوا، بہت نڈھال مغرب کے
اندھیرے، بہت ٹھنڈے کنوئیں میں ڈوب جانے کو بے تاب ہے
سامنے دور دور تک اوندھے کو بڑ کھکو بانجھ اور بنجر
میدان پھیلے ہیں کہیں کہیں سر جھکائے ہوئے ٹیلے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے چھوٹی
منجھولی سرخ زرد اور سفید حویلیاں صم بکم وقت کو روک نہ سکنے کے غم میں بدحال ہیں
لٹ گیا سب کہاں گئے سب لوگ
بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی کے اندر سے ایک لمبی آہ نکلی
حیرت کی بات ہے ان کی حویلی اب تک کھڑی کیسے ہے
سائیں سائیں کرتی ویران حویلی میں آسیب کی طرح وہ بدرنگ دیواروں کو
سونگھتی رہتی ہیں افسوس مگر بھر بھر روتی مٹی کی المناک بو کے سوا اب دیواروں سے
آدم بو نہیں آتی ہے بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی بہت دیر سے جھروکے پہ کھڑی ہیں
آنکھیں ان کی نم ہیں گرما کی سہ پہر کب کی ڈھل چکی ہے
سورج بھی مغرب کے اندھیرے، بہت ٹھنڈے کنوئیں میں ڈوب چکا ہے
بے ءءگم اچانک جیسے کسی نے پیچھے سے انھیں آواز دی ہے
وہ بری طرح چونک جاتی ہیں
اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی وہ تیزی سے پلٹتی ہیں
اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے گھپ اندھیرا
کو ن تھا وہ... سوچتی رہ جاتی ہیں وہیں اوبڑ کھبڑے اور
ننگے فرش پہ بیٹھ جاتی ہیں گھپ اندھیرے میں سائیں سائیں کرتے سناٹے میں
اپنی تقدیر کا حکم ماننے پہ مجبور ہیں بے چاری
بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی

ادا جعفری

شمارہ۲۰۷،
جون۱۹۹۷

آنسو ہے گلاب ہے، دیا ہے
دل آپ ہی اپنا ماجرا ہے

پل بھر میں بدل رہے ہیں موسم
کچھ بھی نہ سمجھ میں آسکا ہے

پرچھائیں سی میں یہیں کہیں ہوں
دور ایک چراغ جل رہا ہے

ہے یوں کہ ابھی نہ حال پوچھو
یادوں سے ابھی مکالمہ ہے

لمحے کہیں کھو نہ جائیں، جن پر
اس نے مرا نام لکھ دیا ہے

اک عمر کے روپ دیکھتی ہوں
دیوار فراق آئینہ ہے

اک ساعت خواب سا ملا تھا
صدیاں مرے نام کر گیا ہے

میں آبلہ پا یہ کس سے پوچھوں
اب فاصلہ کتنے کوس کا ہے

میں رنج کے ساحلوں اکیلی
یہ کون مجھے پکارتا ہے

یہ بھی تو کسی پیام سا ہے
یہ پھول جو شاخ پر کھلا ہے

خوشبو ہے، کتاب ہے، دعا ہے
جو سانس ہے خود معاملہ ہے

شمارہ۲۳۶،
اپریل۲۰۰۰

اس قدر تو نہ تھا بدگماں راستہ
رہ گیا پھر نہ جانے کہاں راستہ

آشنا بھی رہا، اجنبی سا بھی ہے
گھر کا نامہرباں، مہرباں راستہ

دور تو وادی لالہ و گل نہیں
آگیا ہے مگر درمیاں راستہ

ساتھ دیتی رہیں دل کی تنہائیاں
بن گیا کارواں، قصہ خواں راستہ

رنج کے مرحلے طے ہمیں سے ہوئے
ہم سے پہلے رہا بے نشاں راستہ

دھول اڑتے راستوں سے ذرا دور ہی
ہے یہاں تو کہیں آسماں راستہ

اک نگاہ شناسا کو ترسے بہت
بے خبر راہرو، بے زباں راستہ

بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی—۳

اختر یوسف

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی اپنی ویران اور بڑی سی حویلی کی اوپری منزل کے
جھروکے پہ دیر سے کھڑی ہیں   گرما کی سہ پہر
ڈھلان پہ ہے اور سورج تھکا ہوا بہت نڈھال مغرب کے
اندھیرے، بہت ٹھنڈے کنوئیں میں ڈوب جانے کو بے تاب ہے
سامنے   دور دور تک اوندھے کوبڑھکو بانجھ اور بنجر
میدان پھیلے ہیں   کہیں کہیں سر جھکائے ہوئے ٹیلے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے چھوٹی
منجھولی   سرخ زرد اور سفید حویلیاں صم بکم وقت کو روک نہ سکنے کے غم میں بدحال ہیں
لٹ گیا سب   کہاں گئے سب لوگ
بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی کے اندر سے ایک لمبی   آہ نکلی
حیرت کی بات ہے   ان کی حویلی اب تک کھڑی کیسے ہے
سائیں سائیں کرتی ویران حویلی میں آسیب کی طرح   وہ بدرنگ دیواروں کو
سونگھتی رہتی ہیں   افسوس مگر بھربھری مٹی کی السناک بو کے سوا اب دیواروں سے
آدم بو نہیں آتی ہے   بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی بہت دیر سے جھروکے پہ کھڑی ہیں
آنکھیں ان کی نم ہیں   گرما کی سہ پہر کب کی ڈھل چکی ہے
سورج بھی   مغرب کے اندھیرے، بہت ٹھنڈے کنوئیں میں ڈوب چکا ہے
بے ۔۔۔ گم   اچانک جیسے کسی نے پیچھے سے انھیں آواز دی ہے
وہ   بری طرح چونک جاتی ہیں
اپنی آنکھیں   پونچھتی ہوئی وہ تیزی سے پلٹتی ہیں
اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے   گھپ اندھیرا
کو ن تھا وہ...   سوچتی رہ جاتی ہیں وہیں اوبڑ کھبڑے اور
ننگے فرش   پہ بیٹھ جاتی ہیں   گھپ اندھیرے میں   سائیں سائیں کرتے سناٹے میں
اپنی تقدیر کا حکم ماننے پہ   مجبور ہیں   بے چاری
بیگم زرتاب مروت لعل بدخشانی

ادا جعفری

شمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

آنسو ہے گلاب ہے، دیا ہے
دل آپ ہی اپنا ماجرا ہے

پل بھر میں بدل رہے ہیں موسم
کچھ بھی نہ سمجھ میں آسکا ہے

پرچھائیں سی میں یہیں کہیں ہوں
دور ایک چراغ جل رہا ہے

ہے یوں کہ ابھی نہ حال پوچھو
یادوں سے ابھی مکالمہ ہے

لمحے کہیں کھو نہ جائیں، جن پر
اس نے مرا نام لکھ دیا ہے

اک عمر کے روپ دیکھتی ہوں
دیوار فراق آئینہ ہے

اک ساعت خواب سا ملا تھا
صدیاں مرے نام کر گیا ہے

میں آبلہ پا یہ کس سے پوچھوں
اب فاصلہ کتنے کوس کا ہے

میں رنج کے ساحلوں اکیلی
یہ کون مجھے پکارتا ہے

یہ بھی تو کسی پیام سا ہے
یہ پھول جو شاخ پر کھلا ہے

خوشبو ہے، کتاب ہے، دعا ہے
جو سانس ہے خود معاملہ ہے

شمارہ ۲۳۶،
اپریل ۲۰۰۰

اس قدر تو نہ تھا بدگماں راستہ
رہ گیا پھر نہ جانے کہاں راستہ

آشنا بھی رہا، اجنبی سا بھی ہے
گھر کا نامہرباں، مہرباں راستہ

دور تو وادیِ لالہ و گل نہیں
آگیا ہے مگر درمیاں راستہ

ساتھ دیتی رہیں دل کی تنہائیاں
بن گیا کارواں، قصہ خواں راستہ

رنج کے مرحلے طے ہمیں سے ہوئے
ہم سے پہلے رہا بے نشاں راستہ

دھول اڑتے راستوں سے ذرا دور ہی
ہے یہاں تو کہیں آسماں راستہ

اک نگاہ شناسا کو ترسے بہت
بے خبر راہرو، بے زباں راستہ

ارشد عبدالحمید

شمارہ۲۸۵،
اکتوبر ۲۰۰۴

میں اک اونچی حویلی کی نہایت صاف ستھری مہنگے رنگوں سے پتی دیوار پر لکھی ہوئی موٹی سی گالی ہوں محلے کے سبھی پیر و جواں جو اس طرف آتے ہیں ہنستے ہیں حقارت سے مجھے پڑھتے ہیں میرے باپ کو ایک گالی دیتے اور اپنی راہ لیتے ہیں حویلی ان کی اس گالی پہ چپ رہتی ہے لیکن مجھ سے کہتی ہے کہ میں دیوار سے اتروں اور اپنی ماں کی بستی میں چلا جاؤں حویلی والے مجھ کو اپنے دروازے کے باہر سے بھی باہر بھیجنے کی فکر میں ہر پر لگے رہتے ہیں اور گہرائی سے گہرے ہر اک مہنگائی سے مہنگے نئل رنگوں کے نیچے دفن کرنے کا کوئی حربہ کوئی موقع سنہرے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے بنا ہولی دیوالی اپنی دیواروں پہ رنگوں کے ورق چڑھواتے رہتے ہیں مجھے مٹواتے رہتے ہیں پریشاں ہیں کہ میرے خال و خط کو کاروانِ وقت کے پیروں سے اڑتی دھول بھی دھندلا نہیں سکتی کبھی جھٹلا نہیں سکتی بظاہر اس حویلی کے سنہرے ہاتھوں کی ناکامیوں پر میں بہت خوش ہوں مگر اندر سے گاہے گاہے ایک آواز آتی ہے مجھے اکسا کے کہتی ہے کہ میں دیوار سے اتروں زمیں پر پاؤں رکھوں اور پیتل کے بنے پھاٹک سے سارے شہر کی آنکھوں پہ چلتا فخر سے اونچی حویلی میں چلا جاؤں اور اپنے باپ کی مانند اپنے ذہن کی سب گالیاں کمروں میں رکھی خوبرو گڑیوں کی پیٹھوں سے لگے پیٹوں میں رکھ آؤں مگر مشکل یہی ہے گالیاں انسان دیتے ہیں کوئی گالی کبھی گالی نہیں دیتی

اسد محمد خاں

شمارہ ۹۹،
مئی تا جولائی ۱۹۷۶

گیزہ(۱) کا سب سے چھوٹا ہرم

دو برتنوں میں روشنی امید کی
دو برتنوں میں صرف گیندے کی مہک
پھر ایک شیشے میں دھنک
اور راگ بھیروں
دوسرے شیشے میں آنسو
وہ جو میں نے خوبصورت عورتوں اور دوستوں کی یاد میں ضائع کیے
اور دور کونے میں دھری، صندل بھری اک پالکی
وہ پالکی جو ق۔م۔ ۱۹۳۵ یا ۳۶ میں اماں نے میلے میں خریدی تھی
یہ سب چیزیں میری
اور پالکی کے پاس میلی دھجیوں میں گھاس کا چھوٹا سا اک فرعون میں

(۱) شمالی مصر کا علاقہ، جہاں اہرام (واحد ہرم) واقع ہیں

کھڑکی بھر آسمان

بائیں ہاتھ پر آسمان دوڑ رہا ہے
اور مجھے زنجیر پر اور نیند پر کوئی اختیار نہیں
کہ میرے بائیں ہاتھ پر تم بیٹھے ہو
اور دائیں ہاتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے موٹا اونگھ رہا ہے
اور کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے
وہ تمھارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
پر میرے آسمان میں تمھارا احمق سلویٹ (۱) پھنسا ہوا ہے،
سو میرا آسمان تمھارے آسمان سے کچھ کم ہے
اور اگر موٹا جاگ رہا ہوتا
تو اس کا آسمان
میرے آسمان سے بھی کم ہوتا
میں اگر تم کو قتل کر دوں تو مجھے کھڑکی بھر آسمان مل جائے گا
اور اگر موٹا اونگھنا چھوڑ کر مجھے اور تمھیں قتل کر دے تو
تو اسے کھڑکی بھر آسمان مل جائے گا

سو مجھے پہلے موٹے کو،
پھر تمھیں قتل کر دینا چاہیے،
یا زنجیر کھینچ لینی چاہیے
یا سو جانا چاہیے۔

(۱) Silouhette

سلامتی کا گیت

اسد محمد خاں

شمارہ ۱۱۸،
نومبر دسمبر ۱۹۸۰

میں: سلامتی سلامتی
کورس: سلامتی سلامتی سلامتی
میں: دشمن کا کام ہی قتل کرنا ہے
کورس: دشمن کا کام ہی قتل کرنا ہے
میں: اگر اپنی پسند سے وہ یوں کرتے
کہ سب دشمن مل کر
بڑی طاقت سے
دو مضبوط درختوں کے لچک دار تنے
ایک دوسرے کے قریب لاتے
اور ایک تنے سے میرا ایک ہاتھ اور پیر
اور دوسرے تنے سے میرا دوسرا ہاتھ اور
دوسرا پیر
باندھ دیتے۔
اور جب تک میں اچھی طرح دونوں تنوں سے باندھ نہ دیا جاتا
اس وقت تک درختوں کو جھکائے رکھتے

پھر ایک ساتھ
ان درختوں کو
اپنی فطری ایستادگی پر لوٹ جانے کے لئے چھوڑ دیتے
تو بات سمجھ میں آنے والی تھی
اس لئے کہ وہ دشمن تھے
کورس: اور دشمن کا کام ہی قتل کرنا ہے
میں: یا وہ یوں کرتے
کہ کسی ایک درخت کی افقی شاخ پر
میرے ہی کمربند سے پھانسی کا پھندا ڈالتے
اور مجھے لٹکا دیتے
یا
مجھے آرے سے چیر دیتے
یا
کسی ستون سے باندھ کر جلا دیتے
یا
میری کھال اتار کر مجھ پر نمک چھڑکتے
تو یہ سب ہی باتیں سمجھ میں آنے والی تھیں
اس لئے کہ وہ دشمن تھے
کورس: اور دشمن کا کام ہی قتل کرنا ہے
میں: مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا...
انھوں نے مجھے
میرے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں) سلامتی سلامتی
کورس: ہمیں
ہمارے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں اور بین) سلامتی سلامتی سلامتی

(۱۹۷۵)

نگار صہبائی، پنچم سر میں تین چوتھائی صدی

اسد محمد خاں

شمارہ ۲۰۷،
جولائی ۲۰۰۳

(میں۔کوئی گیت لکھنے والا۔جواپنامدھم سر کہہ چکا،اب آواز کی آسماں گیر چھت کے نیچے رکا ہوا کھڑا ہوں اور یک پنچم کہنے والے گیت نگار کے جی وت سر کو درودیوار سے امگتا پھوٹتا سن رہا ہوں۔)

آیئے میرے ساتھ سرگم دہرایئے۔پہلے سا ہے:
سا سرت ہے،ایک ندی ہے سا،جیسے ندیوں میں سر جوندی۔سا سُرتی ہے،کوئی جھرن،کہ ایک بار چل پڑے تو رکتی نہیں۔یہ شرتی ہے،یعنی آواز... جس کے پہلے مون تھا... سمجھو سکوت اور سناٹا جسے بیان کرنے کا کوئی سادھن،کوئی ذریعہ کسی کے پاس نہیں۔
سا کہنے والا پہلی بار سناٹے کی سیما توڑتا ہے۔
خوش نصیب سا کہنے والا کہ سا کہتے ہوئے اسے من چاہی مراد ملی ہے۔یہ ایسی عطا،ایسا وردان ہے جس نے اسے سراسر بدل کے رکھ دیا،کس لئے کہ اب وہ سناٹے سے نکل آیا،آواز والا ہے وہ،گونگا نہیں ہے اب۔

رے رکھب پہلا قدم ہے جہاں سا کہہ چکنے پر،کہنے والا اپنی آواز خود سنتا ہے۔

گا گندھار ہے جب دوسرے اسے سنتے اور سراہتے ہیں۔

ما مدھم ہے جب کہنے والے نے بساط بھر اپنی آواز سنائی اور نام کمایا اور خوش ہولیا۔یہاں انکسار میں سر جھکائے موجود رہنا لازم ہے۔

(اس لئے میں،کوئی گیت لکھنے والا جو اپنا مدھم سر کہہ چکا،اب آواز کی آسماں گیر چھت کے نیچے رکا ہوا کھڑا ہوں اور ایک پنچم کہنے والے کے جی وت سر کو درودیوار سے امگتا پھوٹتا سن رہا ہوں)
پا پنچم وہ ہے جب سنانے والے کو خود اس کے بیان کی گرمی پگھلاتی اور سونا بنادیتی ہے۔
یہاں میں کچھ دیر ٹھیرتا ہوں اور پنچم سر میں گیت گاتے شاعر نگار صہبائی کا نام لیتا ہوں جس کے لئے میں نے یہ سارا پھیلاوا کیا ہے۔
اب آگے چلئے دھا...دھادھی وت ہے جسے گنی سیانوں نے ہاتھی کی چیخ کہا ہے...یہ کسی پیل نشین،صاحب زماں کی آواز ہے۔
یہ خسرو کی آواز ہے۔بڑی شان ہے دھا کی۔کوئی عاجز،رستے میں رکا ہوا،اسے پوری طرح کیسے بیان کرسکتا ہے۔

اور اب ساتویں سر،نی نکھاد کی مدح کیجئے۔یہ آواز کی پورنتا ہے۔یہ نی زمانوں کی حدی الانگھ کر برہمانڈ میں کہ موجودات میں گونجتی ہے۔اسے جھنجھناتی ہے۔یوں لگتا ہے جیسے کانسی میں ڈھلے گھونگرو کی ایک کھوکھلی کلی میں پڑا کنکر،بے لرزش آپی آپ بجنے لگے۔
یہ نی نکھاد شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔یہ تکمیل ہے کہ اس کے آگے کچھ نہیں۔اگر ہے تو اسی کی ثنا،اسی کا بکھان کرتی شرتیوں کی وہی سا ہے جو اپنے خالق کے روبرو ہاتھ باندھے خامشی کی ابدی مدرا میں کھڑی ہے۔

سدا رہے نام سائیں کا۔

ہم سرگم کہہ چکے۔سو اب اپنے اس شاعر نگار صہبائی کے لئے دعا کرتے ہیں جو اپنے مستی،اپنے پنچم سر میں گاتا ہوا عمر کی آٹھویں دہائی میں پہنچا ہے۔تو خوش رہے اور گاتا رہے اپنا یہ دوست۔
سدا رہے سر سائیں پالنہار کا۔

اسد محمد خاں

شمارہ ۲۷۳،
اکتوبر ۲۰۰۳

ہر کہانی لکھنے والے کے پاس ادھ لکھی ادھوری کہانیاں ہوتی ہیں۔

میرے پاس بھی کئی ادھوری کہانیاں ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کا مجھے خیال رہتا ہے کہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔ کیا خبر اور بھی ہوں، لکی چھپی۔

بعض کہانیاں نوٹس کی صورت میں ہیں۔ کچھ نوٹس کئی صفحوں پر پھیلے ہیں۔ کچھ کم پر۔ بعضے تو بہت ہی مختصر ہیں۔ ایک ڈیڑھ سطر کے ہوں گے۔ ایک جگہ تو صرف پوائنٹس لکھے ہیں: کرائے دار، بیسا کھی والا، مرشد، قتل، ہودپ۔

یہ ٹانگوں سے معذور، اپنے وقت کے مشہور جیب کترے اور نوسر باز "بمبئی ماشٹر" کی کہانی کے نوٹس ہیں۔

ان میں 'ہودپ' کا لفظ انوکھا ہے۔ باقی، قتل، بیسا کھیاں، کرائے دار اور مرشد، یہ سب پہچانے ہوئے لفظ ہیں۔ 'ہودپ' ایک طرح کی آواز ہے۔

تو اب دیکھیے ان لفظوں کی مدد سے ماشٹر کو اور اس کی سنائی ہوئی سنسنی خیز کہانیوں کو یاد کرنے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔

بمبئی ماشٹر ہمارے پشتینی مکانوں میں سے ایک بہت چھوٹے مکان میں اپنی بیوی اور سات آٹھ برس کی بیٹی کے ساتھ کرائے سے رہتا تھا۔ وہ ہم لڑکوں اور بعض ہمسایوں کا ایک دم "ذاتی" داستان گو تھا۔ اسے کہانیاں سنانے کے ساتھ کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔

وہ خود کو بلند آواز میں اسلامی تواریخی ناولیں اور بہرام ڈاکو کی کہانیاں پڑھ کے سنایا کرتا تھا۔ اور جب ناولیں اور کہانیاں نہیں پڑھ رہا ہوتا، اور ہم لوگ مناسب تعداد میں آس پاس موجود ہوتے، تو وہ خود اپنے معرکوں کے بارے میں بتاتا کہ کس طرح اس نے ٹرام میں بیٹھے بیٹھے منٹ بھر میں ایک مارواڑی سیٹھ کی کیش کی تھیلی اڑالی تھی اور کس طرح اس نے اس پیسے سے گوا، اور اودرسری نگر، اور اجمیر شریف میں مزے کیے تھے... اور کس طرح وہ ایک بار درگاہ حاجی علی جانے کے لیے اجتماعی گھوڑا گاڑی میں آگے کوچبان کے پاس جا بیٹھا تھا تو اس نے رستے سے سوار ہونے اور اتر جانے والے ایک سنار کی صندوقچی سے کوئی سیر بھر سونے کے زیورات اڑا لیے تھے۔ اس مہارت کے ساتھ کہ نہ سنار کو پتہ چلا کہ زیورات جا چکے ہیں اور نہ کوچبان کو معلوم ہوا کہ ماشٹر اس کے وزنی فوجی بوٹ لالہ جی کی صندوقچی میں ڈال چکا ہے۔ اور اب جو لالہ جی کرائے کے دو آنے پکڑا کے سامان اٹھائے خوشی خوشی گھوڑا گاڑی سے اتر رہا ہے تو اصل میں کوچبان کے بوٹ لیے جا رہا ہے، زیورات نہیں۔

ہمیں بہت لطف آتا تھا۔ بڑی کھلبلی ہوتی تھی کہ سنار جب اپنی دکان پہ پہنچے گا تو صندوقچی کا قفل کھولے گا تو اسے وہاں سیر بھر سونے کے بجائے کباڑی بازار سے بارہ آنے میں خریدے گئے فوجی بوٹ ملیں گے۔ مزا آجائیگا۔

بمبئی ماشٹر اپنی جیب کتری، چوری چکاری اور ٹھگیتی (اور شاید عورت بازی) کی کہانیاں سناتے ہوئے خود کو ایک عجیب منصف مزاج سوشلسٹ اور ایک انوکھے صاحب ایمان مسلمان کی طرح پیش کرتا تھا۔ یہ خوب شوق تھا اس کا۔ اپنی کہانیوں میں وہ کسی غریب ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی مل مزدور، پھیری والے کی جیب نہیں کاٹتا تھا۔ اور کسی ملک التجار، ساہو کار، دھنی دھنوان کو... جو مسلمان ہو ہرگز نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ اس کا شکار دولت مند ہندو ہوتے تھے اور وہ بھی ایسے جن کے بارے میں اسے معلوم ہوتا تھا کہ سالے "سود بیاج" کھاتے ہیں۔ اس کے سوا ماشٹر دین دھرم کا بھید بھاؤ نہیں کرتا تھا۔

ہم لڑکوں کی موجودگی میں بمبئی ماسٹر کو اپنی عورت بازی کے بیان سے سرسری سا گذرنا ہوتا تھا۔ تاہم سننے والے ہمسایوں کی آنکھوں کی چمک اور ماسٹر کے رمزیہ انداز میں سرہلانے سے ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت جو بمبئی ماسٹر اس ہندو عورت کو 'سمجھا بجھا کے' اپنی کھولی میں لے جا رہا ہے تو بے شک اب یہ اس کے ساتھ سوئے گا۔

بمبئی میں زندگی کرنے کے دوران جو مسلمان عورتیں اور لڑکیاں ماسٹر کے راستے میں آتیں، ماسٹر انھیں ٹرام میں بٹھا کے صابو صدیق کی سرائے کے سامنے چھوڑ آتا تھا کہ "لے اماں"، (یا "لے بٹی") یہ سامنے اپنے مسلمانوں کی سرائے ہے، جب تک کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا تو ادھر رہ سکتی ہے۔

میں ہمیشہ سے یقین کر لینے والا آدمی ہوں۔ ماسٹر کی باتیں (جیسی وہ بیان کررہا ہوتا) اسی طرح مان لینے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ مگر مجھ سے ایک ڈیڑھ سال چھوٹا میرا بھائی ماسٹر کی اپنی بیان کردہ نیکیوں پر بالکل بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا... بلکہ یقین تھا اسے... کہ ماسٹر نے مسلمان حاجیوں تک کی جیبیں کاٹی ہوں گی اور موقع لگنے پر مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی وہی سب کیا ہوگا جو وہ ہندو عورتوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ ماسٹر جھوٹ بولتا ہے، یا اس نے وہ کیا ہے۔ جسے لوگ کرتے رہتے ہوں گے اور بتاتے نہیں، یا اپنی چوری چکاریاں بیان کرتے ہوئے وہ مسکرائے جاتا ہے... جیسے چوریاں نہ ہوئیں ساہوکاریاں ہوگئیں، جیسے اکھاڑوں میں کشتیاں جیتی ہوں ماسٹر نے۔

مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماسٹر کی کہانیاں مجھے الجھالیتی تھیں۔ سال بھر پہلے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں آیا تھا اور ہم لڑکے کوئی آٹھ مہینے سے کسی کو بتائے بغیر، چپکے سے جا کے اس کی کہانیاں سن لیتے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو معلوم تھا کہ گھر والوں سے ہمارے آنے کا ذکر بالکل نہیں کرنا ہے۔ کیوں کہ گھر والوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ ہم ماسٹر کے گھر آئیں جائیں یا اس کی کہانیاں سنیں یا محلے والوں کے ساتھ انھیں بیٹھیں۔

ماسٹر بیڑی بناتا تھا۔ اس کی بیوی اجرت پہ گھر سنبھالنے والی 'موگلائی' تھی۔ یہ ماسٹر نے ہمیں بتایا تھا (گھر والے کہتے تھے وہ کہیں پیسے والوں کے دہاں کھانا پکاتی ہے۔)

تو کھانا پکانے میں کیا ہے؟ اگر کسی موگلائی نے پیسے والوں کا کھانا پکا دیا تو کیا ہوگیا؟ کسی کو تو پکانا ہوتا ہے کھانا۔ (اور یہ پیسے والی بات ابھی ہمارے ذہن میں ٹھیک سے نہیں آئی تھی۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ کچھ لوگوں کے پاس پیسے ہوتے ہیں، کچھ کے پاس نہیں ہوتے، یا کم ہوتے ہیں۔ تو اس سے کسی کو کیا؟)

گھر والوں کو یہ بھی کہتے سنا تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی کچھ گھپلا کر رہے ہیں۔ کوشش کرنے پر بھی ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ وہ کیا گھپلا کر رہے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ ہوسکتا ہے گھر والے ماسٹر کو یہاں سے چلتا کردیں۔ میرے چھوٹے بھائی نے اپنے طور پر کچھ پتہ لگانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی زیادہ صاف نہیں ہو پایا تھا۔ مطلب اسے شک سا تھا کہ ماسٹر کی بیوی کے ساتھ 'دوسرے' لوگ سوتے ہیں۔ بکواس بات تھی سوتے ہیں؟ ہاں کبھی ہو سکتا ہے بھلا؟ ماسٹر 'دوسرے' لوگوں کو چھری نہیں مار دے گا۔

خیر۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر ہم لوگوں کو زیادہ کچھ غور کرنے کا شوق نہیں تھا (میرے چھوٹے بھائی کو تھا۔ مگر اس کی بکواسوں پر اکثر میں اسے ڈانٹ دیتا تھا۔)

محلے میں ایک اچھے آدمی امو میاں رہتے تھے (ہم انھیں ٹیڑھی گردن والے اموں میاں ہودپ کہتے تھے)۔ یہ لمبا، بیکار سا نام ہم ہی نے رکھا تھا۔ امو میاں پیری مریدی کرتے تھے۔ ان کی گردن ٹیڑھی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے ہودپ ہودپ کی آواز نکالتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے اپنے موکل کو یا کسی جن کو بلا، یا بھگا رہے ہیں۔ امو میاں نے بمبئی ماسٹر کو بھی مرید بنالیا تھا۔

ماسٹر اکثر بڑے جذبے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا تھا کہ پیر امو میاں صاب نے بھٹکے ہوئے ماسٹر کو صحیح رستے پہ لگا دیا ہے نہیں تو ماسٹر "جہنمی" مارا گیا تھا۔

پتہ نہیں وہ خود کو "جہنمی" کس بات پہ کہتا تھا؟

باقی کہانی زیادہ کچھ لمبی نہیں ہے۔ ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں تایا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ بیس دن بعد لوٹے تو دیکھا کہ ہمارے جس مکان میں ماسٹر رہتا تھا اس میں اب گھاس کا بیوپاری رہتا ہے اور سامنے والے میاں (ٹیڑھی گردن والے امو میاں ہودپ) کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کی تو ہمیں پروا نہیں تھی، ہاں، ماسٹر کے جانے سے ہم لوگ بے مزہ ہوگئے تھے کہ وہ سب سنسنی والی کہانیاں اب سننے کو نہیں ملیں گی۔

دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی عجیب کہانی لے کے آیا۔ بتانے لگا کہ ماسٹر اصل میں کہیں شفٹ نہیں ہوا ہے، جیل میں ہے۔ اس نے ٹیڑھی گردن والے امو میاں ہودپ کی گردن میں چھری ماری تھی اسی سے امو میاں مرے ہیں۔ بھائی بتانے لگا کہ پہلے پہل تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں دھوبیوں کے لڑکوں نے بتایا کہ رات میں کسی وقت ماسٹر کی بیوی جب امو میاں ہودپ کے لیے میٹھے چاول لے کے گئی تو امو میاں نے اس پہ برے ارادے سے ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چیخنے لگی تو ماسٹر بیساکھیوں کے سہارے اچھلتا ہوا سڑک پار کر کے ہودپ کی بیٹھک میں پہنچا جہاں اس نے وہ سب دیکھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ امو میاں نے کتنی بار ہودپ ہودپ کی، مگر بیوی کی بات ٹھیک تھی تو بس ماسٹر نے ٹیڑھی گردن والے ہودپ کی گردن پہ چھریاں ہی چھریاں ماریں اور اسے ختم کر کے سڑک پہ آ کے بیٹھ گیا... اور رونے لگا۔ دھوبیوں کے لڑکے خود حیران ہو رہے تھے کہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ رو کیوں رہا تھا ماسٹر؟ اور امو میاں ہودپ کو اس نے چھریاں کاٹے کو ماری تھیں؟ لڑکے کہہ رہے تھے کہ ماسٹر خود ہی تو اپنی عورت کو چلاتا تھا، ایک امو میاں کے ہاتھ پکڑنے سے کون طوفان آگیا تھا؟

چھوٹے بھائی نے بتایا کہ دھوبیوں کے لڑکے طوفان کو "طوفان" کہہ رہے تھے۔ جاہل سالے ☆☆☆

دریا اب میرا ہوا

اسد محمد خاں

شمارہ ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

مئی سنہ پچاس میں کسی دن ریل میں بیٹھ کے اور ٹھنڈی ریت پہ چل کے باڑ میر سے میں کھوکھرو پار، پھر حیدرآباد کے محلے ہیرآباد آیا تھا۔
یہیں رہنے، بسنے اور ہو سکے تو یہیں مٹی میں مٹی ہو جانے کو۔
میں اپنا وہ دریا پیچھے چھوڑ آیا تھا جس کے ریتوں پہ میرے پرکھے ڈھائی سو برس آسودہ ہوئے تھے۔
میں یہاں آیا اور پہلی بار میں نے ماہ مئی کی آسائش میں لہرتے، اینڈتے ہوئے اس مٹیالے دیوتا... سندھ دریا کو دیکھا۔
میں نے قصباتی حیرت سے ندیوں کے اس سمراٹ کو دیکھا اور سوچا، یہ مجھے کیوں منھ لگانے لگا؟ ایسی تو کوئی امید نظر نہیں آتی کہ دریا مجھے پیتا لے گا۔
(دریاؤں کا ایسا ہے کہ کوئی دو سو برس میں وہ آدمی کو دوست بناتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔)
میں اپنے پرکھوں کے ڈھائی سو برس نربدا ندی کے پتنوں[1] میں چھوڑ کے آیا تھا۔
سترہ ساڑھے سترہ سال کا یہ آدمی خالی ہاتھ آیا تھا یہاں۔
میں نے سوچا، بہت جیوں گا تو پچاس پچپن برس اور جی لوں گا۔ دریا تو اب مجھے نہیں ملنے کا۔

پر سچی بات کہوں؟... دریا کو میں نے اپنے اور اپنے پیاروں کے دکھوں تکلیفوں میں اور آسائشوں محرومیوں میں اور جشنوں رتجگوں میں... تہی دامانیوں میں پالیا۔
دریا کو میں نے اس آشوب میں پالیا کہ جس سے ہماری زمین گذر رہی ہے۔ جس آشوب میں ہم جی رہے ہیں۔

میں آیا تھا اور پہلی بات میں نے دریا سے یہ کہی تھی کہ
پردیساں پندھ کری حلی آیوں ہوں[2]
اور اس نے میرا جی بہلانے، ہمت بندھانے کو ایک محفل سجادی تھی گورے چٹے، کالے، مٹیالے، منموہنے، سانول چہروں کی۔
ان میں جہازوں سے بوریاں اتارتے آخری شفٹ کے مزدور تھے جو ریت کو فرش مخمل کیے، دیوار کی ٹیک لگائے مجھے اکتارہ اور چنگ سناتے تھے۔
وہ گائیک، رقاص اور عالم اور صاحبدل درویش تھے۔
ان میں بلاول بیلجیئم تھا، بلبل ترنگ والا۔ اور کتاب کا کیڑا عبدالغفور بلوچ بھی (خدا سلامت رکھے) جو اس وقت گوسوامی تلسی اور مارکس اور پکتھال کو پڑھتا پڑھاتا
کھڈا، نوآباد میں اپنے دوستوں کی نظمیں فرانسیسی میں ترجمہ کرتا رہتا تھا۔
تو پھر میں نے کہا "یہ زمین، یہ دریا اب میرا ہوا۔"

---

1. Pattan
2. سندھی: "میں پردیس سے سعی کرتا آیا ہوں۔"

رنگ گل و بوے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

اسرار گاندھی

شمارہ ۲۵۷،
جون ۲۰۰۲

I have loved flowers that fade,
Within whose tents
Rich hues have marriage made
With sweet, unremembered scents.

Robert Bridges

سورج کی ریشم جیسی کرنیں آسمان سے اتر کر زمین پر خیمہ زن ہو چکی ہیں۔ لان پر بکھرے شبنم کے قطرے اپنے سفر کے آخری مرحلے میں ہیں۔

وہ لان کے گوشے میں رکھی ہوئی فائبر کی ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر اضمحلال کی دھند ہے۔ اداسی، بے کیفی اور تھکاوٹ اس کی آنکھوں میں جھلک رہی ہے۔ اس کے کچھ بکھرے ہوئے سے بال کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے الجھ پڑتے ہیں لیکن پھر خاموشی سے اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور اس کی نظریں ادھر ادھر گھومتی پھرتی پھولوں کے ان دو تختوں پر ٹھہر گئیں جو گلاب کے پودوں سے بھرے ہوئے تھے۔

گلاب کے پودے جو عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔

پھولوں کے ان تختوں کو دیکھ کر اس نے ہمیشہ بے چینی اور گھٹن محسوس کی ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نیم تاریک تصورات کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

پھولوں کے یہ دو تختے...

وہ ان تختوں کے درمیان کس طرح پس رہا ہے۔ اس کا وجود کس طرح سے پارہ پارہ ہو کر رہ گیا ہے۔

پھولوں کا ایک تختہ جو اس کے باپ کی دین ہے، باپ جو اب اس دنیا میں نہیں ہے، لیکن اس کی یادیں ہیں جو اکثر راتوں کو سوتے سے جگا دیتی ہیں۔

دوسرا تختہ اس پچیس چھبیس برس کے جوان لڑکے کا ہے۔ یہ تختہ ایسے پھولوں سے بھرا ہوا ہے جو اسے پسند نہ تھے۔ ان پھولوں میں نہ تو اسے خوشبو محسوس ہوتی اور نہ وہ ان میں دیر تک ٹھہرنے کی سکت ہی دیکھتا تھا۔ لیکن ان پھولوں کو لگاتار دیکھتے دیکھتے وہ ان سے کچھ مانوس ہو چلا تھا۔ اس نے شروع میں کئی بار سوچا تھا کہ ان پودوں کو اکھاڑ پھینکوں، یہ میرے دل کو اپنی طرف راغب نہیں کرتے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ کسی اور کے بوئے ہوئے پودوں کو اکھاڑ پھینکنے کا مجھے کیا حق ہو سکتا ہے؟ ہر کسی کو اپنی پسند کے پھول لگانے کا حق ہے۔ ہر کوئی اپنے ڈھنگ سے جی سکتا ہے۔

کاش اس کے پاس اسے پسندیدہ پھولوں کا کوئی تختہ ہوتا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ آنکھیں کھولیں تو باپ کے پھولوں کا تختہ سامنے تھا اور اب جب کہ وہ پچاس برس کا ہو رہا ہے، بیٹے کے پھولوں کا تختہ سامنے ہے اور وہ پنڈولم کی طرح بے مقصد دونوں تختوں کے درمیان جھول رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے باپ کے لگائے ہوئے پھولوں کو محفوظ کر سکتا اور موت اور خزاں اور افسردگی کے خلاف ان کا دفاع کر سکتا۔

ماں باپ کے لگائے ہوئے پودے... جن کے پھول خوبصورت ہیں، جن کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے، روح کو تازگی بخشتی ہے، زندگی کا اعتبار بڑھاتی ہے۔ اسے یہ پھول ہمیشہ پسند رہے ہیں۔ اس نے ان پھولوں کی رفاقت میں اپنی

زندگی کا بڑا حصہ گذارا ہے۔

"میں ان پودوں کی حفاظت ضرور کروں گا۔" اس نے سوچا۔

لیکن کیسے؟ کیا وہ وقت کے دھارے کو موڑ سکتا ہے؟ تندوسبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو... کیا ایسا کبھی ہوا ہے؟

یہ پودے اب بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ ان کی جڑوں میں وہ دم خم باقی نہیں رہا۔ پھر وہ ننھے منے ان دیکھے کیڑے بھی تو ہیں جو آہستہ آہستہ ان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

یہ کیڑے!

ان حشر سامانوں کو، ان خانہ برانداز ان چمن کو، بھلا کون روک سکتا ہے؟

اسے یاد آیا کہ یہ کیڑے باپ کے بوئے ہوئے پودوں میں اس وقت سے لگنا شروع ہو گئے تھے جب اس کے بیٹے نے اپنے پودے لگائے تھے۔ کیا باپ کے پودوں کو بظاہر ناگزیر انجام سے بچانے کے لئے اسے اپنے بیٹے کے لگائے ہوئے پودوں کو اکھاڑ پھینکنا ہوگا؟

کیا یہ مناسب ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ مناسب کیا ہے اور نامناسب کیا۔ تو میں کیا کروں...؟ کیا دونوں تختوں کے درمیان یوں ہی بے مصرف جھولتا رہوں؟

وہ دیر تک اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، پھر جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اس کا بیٹا اپنے پودوں کے پاس کھڑا ہے اور پھولوں پر چمکتے ہوئے شبنم کے قطروں کی ٹھنڈک سے اپنی آنکھیں سینک رہا ہے۔ بیٹے کے چہرے پر ایک نئی خوشی تھی اور آنکھوں میں ایک نئی چمک۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور وہیں پہنچ گیا جہاں اس کا بیٹا کھڑا تھا۔

پہلے اس نے اپنے باپ کے پھولوں پر نظر ڈالی، پھر بیٹے کے پھولوں کو دیکھا۔ باپ کے سارے گلاب دیسی تھے اور دیسی گلاب کے رنگوں میں یکسانی ہوتی ہے۔ ان پھولوں کی بسی ہوئی بھینی بھینی خوشبو بھی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ نہ رنگ الگ نہ بو الگ، نہ انداز مختلف نہ ادا مختلف، اور بیٹے کے گلابوں میں یکسانیت نہیں تھی۔ کچھ تو ایسے تھے کہ جن کے ایک ہی پھول میں کئی رنگ تھے۔ اس نے سنا تھا ان میں خوشبو بھی بڑی دیوانہ کر دینے والی ہوتی ہے، لیکن اسے ان پھولوں میں کبھی خوشبو محسوس نہ ہوئی تھی۔

"ڈیڈی دیکھئے! کیا تازہ دم پھول ہیں۔" باپ کو دیکھ کر بیٹا بول پڑا۔

وہ چپ رہا۔ بیٹا پھر بولا۔ "آپ کو ہمارے پھول کب اچھے لگیں گے ڈیڈ؟"

"بیٹے میں کیا کروں۔ مجھے ان پھولوں میں کوئی زندگی محسوس نہیں ہوتی۔ تمہارے دادا کے پھولوں میں عجب سی مہک ہے جو میرے پورے وجود کو معطر کر دیتی ہے۔ ان میں یادوں کی تازگی ہے شاید اسی وجہ سے وہ زندگی سے بھرپور ہیں۔"

"Come on, Dad، آپ بات کو ذرا سمجھئے تو سہی۔ پرانے کاغذوں کی خوشبو سونگھتے سونگھتے آپ کی قوت شامہ سست پڑ گئی ہے..." وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا۔

"شاید اسی لئے آپ سچے پھولوں کی خوشبو کو محسوس کر سکتے۔"

"لیکن تمہارے پھولوں کا دورنگا پن، وہ تو مجھے دکھائی دیتا ہے؟"

"دورنگا پن تو خوبی ہے ڈیڈی۔ وجود کے مختلف رخ ہیں، یہ تو خوبی کی بات ہے۔"

بیٹے کی بات سن کر وہ خفیف سی مسکراہٹ مسکرایا، لیکن اس میں کانٹوں کی سی چبھن تھی۔

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر بیٹے ہی نے مہر سکوت توڑی:

"ڈیڈی آپ نے اور دادا صاحب مرحوم نے اپنے وقت کے پھولوں کی اوپری جاذبیت پر ہی توجہ کی۔ کبھی پس منظر میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے مالی رکھ لئے۔ انھیں تنخواہیں دیں، کھانا کپڑا گھر فراہم کیا۔ لیکن آپ نے کبھی یہ بھی دیکھا کہ پتیاں گر گر کر کیسے سڑتی ہیں اور کیسے ان پودوں کے لئے کھاد بن جاتی ہیں؟ آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لاتعداد خوردبینی کیڑے، ان گنت مخلوق خدا، ان پودوں سے، ان سڑتے پتوں سے، اپنی خوراک حاصل کرتی ہے، مرتی جیتی ہے، اور زیست... موت... پیدائش کا کھیل کھیلتی ہے جو ابتدائے آفرینش سے کھیلا جا رہا ہے اور جس میں فنا بقا کے راز پوشیدہ ہیں... آپ کو سڑی گلی اور ادنیٰ چیزوں کو دیکھنے سے نفرت رہی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ گھنی تاریک نم آلود مٹی بھی گہوارہ ہے جس میں جانیں پلتی ہیں۔"

"بیٹے میں نے تو یہ سب نہیں جانا اور سوچا۔ لیکن تمہارے جاننے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے۔ یہ جو پودے میں نے لگائے ہیں وہ اپنے پس منظر کی زمین کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ان پودوں کی شادابی برقرار رہے گی۔"

بیٹے کی بات سن کر وہ کہیں گم سا ہو گیا۔

اسے یاد آیا کہ اس کا بیٹا جب ایسی ہی باتیں اپنے دادا سے کرتا تو وہ چڑ کر کہتے:

"صاحب زادے، ان پھولوں کے رنگ میں جو گہرائی ہے اور ان کی خوشبو میں جو طاقت ہے وہ تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میرے پھولوں کے مقابلے میں تمہارے پھول بے رونق لگتے ہیں۔"

"معافی چاہتا ہوں دادا جان، لیکن یہ نظر نظر کا پھیر تو نہیں...؟"

دادا اس کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگاتے تو پوتا منہ پھیر کر معنی خیز انداز میں مسکراتا، لیکن بیٹے کے چہرے پر الجھن اور بے یقینی کی ایک پرچھائیں آتی تو ایک جاتی۔ "کیا سب پرانا ایسا ہی ہوتا ہے؟" وہ سوچتا۔ "کیا میں اپنے باپ کے لئے نیا نہیں ہوں؟"

"دادا جان،" پوتے کے لہجے میں سمجھانے کا سا انداز تھا، گویا وہ دادا ہو اور دادا اس کا پوتا ہو۔ "لوگ اب تو ایسے پھول لگانا بھی نہیں چاہتے، لگانا کیا دیکھنا بھی نہیں چاہتے بلکہ ان جگہوں سے کترا کر نکل جاتے ہیں کہ جہاں ایسے پھول لگے ہوں۔"

"میں نہ مانوں گا۔" دادا سر جھٹک کر کہتے۔

"دادا جان، یہ خوشبوئیں بہت بھاری ہیں، لوگوں سے برداشت نہیں

ہوتیں۔ آج کے لوگوں کا خون پتلا اور ٹھنڈا ہے۔ ان پھولوں کی تیز خوشبو ان کے کاندھوں پر بوجھ بن جاتی ہے۔"

"کچھ بھی ہو، میں اپنی زندگی تک تو ان پودوں کی حفاظت ضرور کروں گا اور میرے بعد شاید میرا بیٹا بھی کرے۔" دادا نے زیرِ لب جواب دیا، بلکہ اپنے آپ سے کہا۔

"ڈیڈ!"

بیٹے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ پرانی یادیں سمٹ کر دل میں چھپ گئیں۔

"کہو، کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔" وہ دھیرے سے بولے۔

"آپ کس سوچ میں گم ہیں؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ تمھارے دادا کے لگائے ہوئے ان پودوں کو موت سے کیسے بچاؤں۔"

"ڈیڈی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ دادا کے پودوں میں طرح طرح کے وائرس لگ چکے ہیں۔ وائرس لگے پودوں کو کون بچا سکتا ہے، اور بچا بھی لیں تو کیا فائدہ؟ ان میں زندگی کا تحرک تو رہ نہیں گیا۔ ان کی قوت نباتی جل چکی ہے۔"

چند لمحوں کے لئے ایک سناٹا چھا گیا، ایسا سناٹا جس نے پرانے پودوں کو خوف سے بھر دیا۔

"ایک بات کہوں ڈیڈ؟"

"ہاں ہاں، کہو۔"

"آپ ان پرانے پودوں کے پھولوں کو ابھی توڑ لیجئے کہ ابھی یہ بظاہر تر و تازہ ہیں۔ پھر انھیں اپنی کتابوں میں جگہ جگہ دبا دیجئے۔ مدت دراز تک پڑھنے والوں کو ان کی خوشبو اور خوبصورتی تو محسوس ہوگی۔ اجنبی سی خوشبو اور اجنبی سی رنگت ہی سہی۔"

"اور ان پودوں کا کیا کروں؟"

"بس ان کو زمین کی قید سے چھٹکارا دلا دیجئے۔"

بیٹے کی بات غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اسے غصہ آ گیا۔ اس نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبی فاصلوں کا ایک دشت بے آب و گیاہ دکھائی دیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ یوں ہی گم سم کھڑا رہا۔ پھر اسے اپنے اندر کسی چیز کے اچانک ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر بعد اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان اور زمین پر اگی ہوئی ہری گھاس نے دیکھا کہ وہ پھولوں کے دونوں تختوں کے درمیان کھڑا کبھی ادھر کبھی ادھر آب پاشی کر رہا ہے، لیکن وہ پانی کو ڈالتا کہیں ہے اور پانی پڑتا کہیں ہے ☆☆☆

غزل

اسعد بدایونی

شمارہ ۱۱۳،
مئی تا جولائی ۱۹۷۹

سفر، سفر تھا پہ مجھ کو گراں زیادہ نہ تھا
وہ دن کہ زرد مرا برگ جاں زیادہ نہ تھا

شجر گرے نہیں بتلاؤ کن دیاروں میں
ہوا کا قہر عزیزو کہاں زیادہ نہ تھا

اسے بھی شوق نہ تھا مجھ سے جنگ کرنے کا
لہو بھی میری رگوں میں رواں زیادہ نہ تھا

شجر کو موت بھی آئی تو ایسے موسم میں
کہ جن دنوں اسے خوفِ خزاں زیادہ نہ تھا

وہ دور چشمِ مسافت زدہ نے دیکھا ہے
جب آگ آگ تھے جنگل دھواں زیادہ نہ تھا

غزل

اسعد بدایونی

شمارہ ۱۲۱،
جولائی، اگست ۸۱

چند امکاں تھے نگاہوں میں کدھر رخصت ہوئے
ساتھ ہی جن کے مرے عیب و ہنر رخصت ہوئے

اک عجب دلدوز منظر تھا نظر کے سامنے
آندھیوں کے ساتھ جب اپنے شجر رخصت ہوئے

حادثہ، وہ تھا کہ آنکھوں سے بصارت چھن گئی
سانحہ یہ ہے کہ پیروں سے سفر رخصت ہوئے

آسمانوں سے پرندے لوٹنے کا وقت ہے
اس سمے پیڑوں سے یہ طائر کدھر رخصت ہوئے

سیدھے سادے پانیوں کا اب سفر درپیش ہے
معجزہ، یارو، کہ دریا سے بھنور رخصت ہوئے

یہ طلب بے دست و پا، وہ منزلیں بے راستہ
کیا وہاں تک جاسکیں گے ہم اگر رخصت ہوئے

چاہتے تھے دیکھنا کوہ ندا کے پیچ و خم
روکنا چاہا ہمیں سب نے مگر رخصت ہوئے

غزل

اسعد بدایونی

شمارہ ۱۳۹،
اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵

مرے لوگ خیمۂ صبر میں مرے شہر گرد ملال میں
ابھی کتنا وقت ہے اے خدا ان اداسیوں کے زوال میں

کبھی موج خواب میں کھو گیا کبھی تھک کے ریت پہ سو گیا
یونہی عمر ساری گذار دی فقط آرزوے وصال میں

کہیں گردشوں کے بھنور میں ہوں کسی چاک پر میں چڑھا ہوا
کہیں میری خاک جمی ہوئی کسی دشت برف مثال میں

میں زوال خواب کی داستاں جو لکھوں تو کیسے لکھوں کہ ہوں
نہ عقیدتوں کے فریب میں نہ بغاوتوں کے خیال میں

یہ ہوائے غم یہ فضائے نم مجھے خوف ہے کہ نہ ڈال دے
کوئی پردہ میری نگاہ پر کوئی رخنہ تیرے جمال میں

مرے بحر جاں میں رواں دواں کسی لمس خواب کی ناؤ بھی
کبھی چاہتوں کے کنول کھلے تھے مرے خیال کے تال میں

اسعد بدایونی

شمارہ ۱۸۸،
نومبر ۱۹۹۵

تمام دیوانے چوب دستیں اٹھائے نعرے لگا رہے تھے
تھی ان کے چہروں پہ ایسی وحشت غنیم سب تھرتھرا رہے تھے

عجیب دلکش حسیں مناظر سے دشت سارا بھرا ہوا تھا
طیور شاخوں پہ نغمہ زن تھے گلاب سب مسکرا رہے تھے

عجب طلسمی مقام تھا وہ جہاں انھوں نے لگائے خیمے
نہنگ دریا تڑپ رہے تھے حباب آنکھیں دکھا رہے تھے

کہیں پہ تنور جل رہے تھے کہیں پہ دیگیں کھنک رہی تھیں
زمین داران قریہ محفل جو کسبیوں کی سجا رہے تھے

برائے فتاحی طلسماں تمام شہزادگان عالی
دکھوں کے جنگل میں اپنے اپنے نصیب کو آزما رہے تھے

کہیں طلایہ پہ کوئی افسر کہیں کوئی بدنصیب ساحر
کچھ اپنی قسمت کو رو رہے تھے کچھ اپنی منزل کو پا رہے تھے

سرا ئچہ چاک کر کے عیار بھاگتا ہے
اور اس کے پیچھے سپاہ سالار بھاگتا ہے
نہ ساحروں سے نہ غیر ساحر سے رک سکے گا
دوندۂ بے بدل لگاتار بھاگتا ہے
نگاہ کیں سے جہاں وہ آہو نہاں ہوا تھا
اسی طرف آتک وہ رہوار بھاگتا ہے
گلیم اوڑھے نظر سے مخفی عمرو کھڑا ہے
تلاش میں ساحروں کا سردار بھاگتا ہے
نہ اس کے گوپھن سے بچ سکے گا یہ سر کٹے گا
کدھر بھلا اب تو پیک مکار بھاگتا ہے
تمام زیور تمام نقدی یہیں پہ رکھ دے
کہاں تو مجھ سے شکار غدار بھاگتا ہے

اسلم انصاری

شمارہ ۲۸۶،
نومبر ۲۰۰۴

کار اہل وفا جہد و تسلیم ہے ہم بھی تسلیم میں کیا تامل کریں
ذات کے دشت کتنے ہی درپیش ہیں کیا کریں گے اگر پھر تساہل کریں

اے صریر قلم، اے ضمیر جہاں، آپ اپنی زباں میں جو لکھنا ہو لکھ
کتنے احوال ہیں نانوشتہ ابھی کیا مناسب ہے ان سے تغافل کریں

ہم پریشان و آشفتہ لوگوں میں بھی اک زمانہ ہوا ایک دھیرج سا تھا
اب تو ہم ایسے لوگوں کی خواہش بھی ہے کوے و برزن میں جا، تابشب غل کریں

میرے الفاظ میں میرا خون جگر کیسے کیسے جھلکتا ہے دیکھیں کبھی
ساز عشق و ہوس گو ہم آہنگ ہیں پھر بھی عشق و ہوس میں تقابل کریں

اب تو اہل ہنر ایک ہی راستہ آپ ایسوں کی خاطر کھلا ہے ابھی
ہر عطائے زماں پر تشکر کریں ہر جفائے جہاں کا تحمل کریں

کہنا سننا بھی اک وضع تہذیب ہے کہنے سننے میں نقص مراتب نہیں
اک ذرا چپ رہیں ہم بھی گلزار میں پاس رسم حکایات بلبل کریں

ٹوٹتی ہیں روایات مینا و مے کیا کریں گے عوض میں مقامات کے
اہل تدبیر ابھی وقت تدبیر ہے آئیں اور اہتمام تسلسل کریں

وہ جو ارباب دانش ہیں ان کے لئے اک نصاب عمل سوجھتا ہے مجھے
کیا ہیں وہ اور کیا ہے یہ نظم جہاں کچھ تفکر کریں کچھ تامل کریں

کون ھے

اسلم عمادی

شمارہ ۸۳،
اپریل ۱۹۷۳

کون ہے
جو پس پردہ سے چیختا ہے... جیسے تلوار کاغذ کو چیرے کبھی
کون ہے!
یوں لرزتا ہے جیسے کہ بھیگا ہوا سرخ تاگا ہوا میں
کون ہے!
چاپ در چاپ آتا ہوا

خون کی لہر سر سے اترتی ہوئی جسم میں پھیلتی برق احساس جاں

آج اعلان کر دوں کہ میں اب بھی موجود محصور ہوں
کلبلاتے ہوئے شہر میں
مجھ کو تکثیف ہستی کے دھوکے میں رکھا گیا
اتنے معبود... چلتے ہوئے سانس میں
ریزہ ریزہ بکھرتے ٹھہرتے
مرے سانس کے سوچ کو آن اور آف کرتے ہوئے
مرے خوف پر اپنی مسند لگائے ہوئے
مدتوں سبز و سرشار جیتے رہے
اور میں...
چھوڑ کر اپنی ممنوعہ تعبیر کو
جو اشاروں پہ کرتی رہی زیر و بم
زیر و بم میں عمل اور رد عمل
ہو گیا اپنی آلودگی میں نہاں
اور سینے میں دود نفس جم گیا... جم کے دیوار پیدا ہوئی

کون ہے!
سبز کھیتوں کے اندر ہواؤں کے ہمراہ اب رینگتا...
سر اٹھا کر کہوں؟
میں ابھی تم میں موجود محصور ہوں!

خبر

اسلم عمادی

شمارہ ۸۵،
جون جولائی ۱۹۷۳

ہاں اے شفیق لباس قدسی
میں ساری نشانیوں کو پہچانتا ہوں
تم...
میری باتوں سے انکار نہیں کر سکتے

ہاں اے شفیق لبان قدسی
میری سرزمین پر جھوٹ کے پودے نہیں اگتے
سچ کی کائی لگ جاتی ہے
میں نے اپنی آنکھوں سے ارجن کو اپنے بھائیوں پر
تیر چلاتے دیکھا ہے
میں نے اپنی آنکھوں سے امن کو خنجر لہراتے دیکھا ہے
ہائے وہ کتنے دل کش منظر تھے
جب ہم لوگ خدا ترس تھے اور گنہ گاروں کو قتل کر دیتے تھے

ہاں اے میرے سورج مکھی شہر
تیرا رخ بھی بدل جاتا ہے
تیرے سینے سے غلامی کے طمطراتی نغمے بھی ابھرتے ہیں
اور آزادی کی دھوم دھام بھی
تیرے جسم پر
بزرگوں کے، رہ نماؤں کے اور دغابازوں کے
اصنام عمودی شکل میں کھڑے ہیں۔

تم سب کو ایک نئی خبر سناتا ہوں
میرے گھر کی پشت پر ایک بوڑھے نے موت کے ماتھے کو چوم لیا ہے
کہتے ہیں وہ نیک شخص تھا
الہامی کتابوں کا تاجر تھا

سچ، اے میرے بے زبان شہر
میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا
میں نے آج تک ایک بھی الہامی کتاب نہیں خریدی

مجھے اس خبر سے غرض نہیں
شاید تمھارے کام آئے

کچھ احوال ہمارے ضمیر کا

اسلم فرخی

شمارہ ۲۸۳،
اگست ۲۰۰۴

دلی میں ہمایوں کے مقبرے کے پہلو میں جو سڑک حضرت سلطان جیؒ کی خانقاہ کے آثار کے طرف جاتی ہے اس پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک احاطہ ملتا ہے جو مقبرے کی تعمیر سے زیادہ قدیم ہے۔ مقبرہ تعمیر کرنے والوں نے اس احاطے کو مقبرے میں شامل نہیں کیا بلکہ مسجد اور مزار کی وجہ سے اسے برقرار رہنے دیا۔ اس احاطے میں شیخ شمس الدین اوتاد اللہ کا مزار ہے۔ شیخ شمس الدین، حضرت سلطان جیؒ کے ہم عصر تھے۔ روایت کے مطابق وہ اسی جگہ بھبھوت ملے، لباس سے بے نیاز بیٹھے رہتے تھے۔ اگر کوئی یہ اطلاع دیتا کہ حضرت سلطان جیؒ ادھر سے گذرنے والے ہیں تو فوراً چادر منگوا کر اوڑھ کر لیتے اور کہتے "مرد آرہا ہے مرد!" شیخ کے مزار پر ایک لیٹواں درخت کا سایہ ہے۔ یہ پیڑ اوپر بڑھنے کے بجائے اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔ اہل حاجت درگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس پیڑ کا ایک پتا توڑتے ہیں اور لے جاتے ہیں۔ مراد پوری ہو جاتی ہے تو حسب توفیق سونے چاندی کا پتا نذر گذارتے ہیں۔ مرادیں مانگنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ بڑی بارونق درگاہ کے اس لیٹواں پیڑ نے ایک متبرک یادگار کی حیثیت کرلی ہے۔

میں نے صحافت کے مرد بزرگ نیازی صاحب کو پہلے پہل دیکھا تو میرے ذہن میں اس بزرگ مہربان، لیٹواں پیڑ کا تصور فوری طور پر ابھرا۔ نیازی صاحب کی خدمت میں نیاز سمائی ایک مدت سے حاصل تھا لیکن اس وقت تک بالمشافہ گفتگو کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سارا کام ٹیلی فون پر چل رہا تھا۔ کیا چیز ہے ٹیلی فون بھی، براہ راست بات کیجئے اور ہجر میں وصال کے مزے لیجیے۔

یہ سمائی ملاقات عزیزی آصف اسلم کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نیازی صاحب کے نام اور کام دونوں سے واقف تھا۔ ان کی جرأت رندانہ اور حق پسندی کا مداح بھی تھا لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ میں ملنے جلنے سے ذرا گھبراتا ہوں۔ آصف ان کے یہاں کے مستقل حاضر باشوں میں ہیں۔ ان سے تذکرہ ہوتا رہتا تھا اور دلی قربت محسوس کرتا تھا۔ پھر فون پر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ روزانہ یا تو میں فون کرتا ہوں یا وہ فون کرتے ہیں۔ دو بوڑھوں میں بڑی معلومات افزا گفتگو (میری حد تک) ہوتی ہے۔ میں نے ان سے بے شمار باتیں کرید کرید کر پوچھی ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نیازی صاحب بات کرتے ہیں تو معلومات کے دریا بہاتے ہیں بہت سی باتیں میرے ذہن میں محفوظ رہ گئیں۔ ان میں سے بعض نے اس خاکے کی بنیاد فراہم کی ہے۔

اس دن سوئے اتفاق سے نیازی صاحب کے طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ آصف انھیں دیکھنے جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہولیا اور نیازی صاحب کے دیدار کی نوبت آگئی۔ اشتیاق ایک مدت سے تھا مگر ان کی تکلیف کے خیال سے ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس شام ہمت کرلی اور حاضر ہوگیا۔

ہم لوگ ایک سادہ کمرے میں لے جائے گئے۔ درمیان میں دہری مسہری، مسہری پر چھپا ہوا خوش رنگ، روشن روشن بالا پوش، سرہانے چند تصویریں، تصویر بتاں نہیں، بلکہ نمایاں ترین تصویر میں "عندلیب گلشن نا آفریدہ" مرزا اسد اللہ غالب کسی فکر میں محو۔ الٹے ہاتھ پر ایک نیچی چھوٹی میز پر ٹیلی فون اور اس کے برابر ایک ریک کے بالائی تختے پر ڈکشنریاں، کنسائز آکسفرڈ، آکسفرڈ کی انگریزی حوالوں کی ڈکشنری، اکیسویں صدی کی چیمبرس ڈکشنری، دو چار اور بھاری بھرکم ڈکشنریاں جن سے یہ اندازہ آسان تھا کہ اس کمرے کے باسی کو انگریزی زبان کی صحت سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف دیوار سے لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے ریک جن میں کتابیں پھنسی ہوئی، پورے کمرے میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں۔ مسہری پر سیدھے ہاتھ کی طرف ریڈیو، دو چار اخبار، علم و دانش اور آگاہی کی فضا۔ میں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ یونیورسٹی کیمپس میں گذارا ہے لیکن معدودے چند اساتذہ کے سوا وہاں کسی مکان میں علم کا ایسا ذخیرہ یا آگاہی کی ایسی فضا دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کمرے کا نمایاں وصف علم کی بو باس اور سادگی تھا۔

نیازی صاحب اس وقت چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ صرف چہرہ کھلا ہوا

تھا۔ انھیں دیکھا تو بڑی دیر تک دیکھتا ہی رہا۔ گورا رنگ جو اس وقت پھیکا پھیکا نظر آرہا تھا، سر پر چاندی کے تاروں کی جھلمل عینک کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں حیرت اور معصومیت کے بے شمار سوالوں کی لہریں، فراخ پیشانی، پھیلی ہوئی ناک، باریک ہونٹ، نازک دہانے، زنخداں کے پھیلاؤ میں مضبوط ارادے اور مستقل مزاجی کے آثار، چہرا ستا ہوا، بیماری کی اذیت ناک تکلیف کے باوجود پرعزم، ایسے مستقل مزاج انسان چہرہ جو نامساعد حالات میں پوری طمانیت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھنا جانتا ہے، جو نااہلوں کے ہجوم میں سب سے الگ تھلگ اپنے منفرد انداز اور سچائی کی قوت کے سہارے ممتاز نظر آتا ہے اور درگاہ کے لیٹواں پیٹر کی طرح اپنے فیض سے کسی کو بھی محروم نہیں رکھتا۔ نیازی صاحب اس وقت بڑی تکلیف میں تھے لیکن جب میں نے مزاج پوچھا تو ٹیلی فون کے معمول کے مطابق جواب دیا، ''اللہ کا کرم۔ اللہ کا کرم'' نیازی صاحب کسی حال میں بھی ہوں، بالمشافہ یا ٹیلی فون پر خیریت دریافت کرنے والوں سے ''اللہ کا کرم، اللہ کا کرم'' ہی کہتے ہیں۔ روحانی طمانیت اور یقین کامل کا اس سے زیادہ مثبت اظہار اور کیا ہوسکتا ہے۔ نیازی صاحب لیٹے ہوئے تھے اس وجہ سے ان کے دھان پان اور نحیف و نزار جسم کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ بس میں انھیں دیکھتا رہا اور اس بزرگ، مہربان لیٹواں پیٹر کو یاد کرتا رہا جس کے گرد اگرد مرادیں مانگنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ نیازی صاحب کے گرد اگرد بھی فیض حاصل کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ابھی یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک جماعت بیٹھی ہے۔ ان میں سے ایک کو صحافت کی تاریخ پر مقالہ لکھنا ہے۔ دوسرے کو برقی ذرائع ابلاغ کے تحت صحافت کے مسائل کا جائزہ مرتب کرنا ہے۔ تیسرا معاشرتی تبدیلیوں کا مطالعہ کررہا ہے۔ نیازی صاحب کے سوالوں کا جواب دے رہے ہیں۔ کسی کو نوٹ لکھوا رہے ہیں۔ کسی کو کتابوں کے نام بتا رہے ہیں، کسی کو اخباروں کے تراشے دکھا رہے ہیں۔ یہ جانے نہیں پاتے کہ ایک اور گروہ آدھمکتا ہے۔ یہ صحافیوں کا گروہ ہے، مختلف مسائل پر نیازی صاحب سے اظہار خیال چاہتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کا ایک گروہ تحریک کے ابتدائی دور کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آیا ہوا ہے۔ مختلف لوگ ہیں، مختلف گروہ ہیں، اپنے اپنے طور پر پتے توڑ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فون بھی مسلسل آرہے ہیں۔

''تقریر سنی تھی آپ نے؟ پھر کیا تاثر ہے؟''

''ضمیر! تم نے... میرا کالم پڑھ لیا۔ کیا خیال ہے؟''

تیسرا فون کچھ یوں: ''یہ جھوٹ دیکھ لیا آپ نے۔ سفید جھوٹ اسی کو کہتے ہیں۔''

''تردید کردیجئے۔''

''میری چندیا پر اتنے بال نہیں۔''

''پھر شکوہ فضول ہے۔''

نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے لوگ، تلاش و جستجو میں پریشان یہاں آتے ہیں، پتا توڑتے ہیں۔ بزرگ، مہربان، لیٹواں پیٹر سے فیض حاصل کرتے ہیں اور اپنے اپنے طور پر مطمئن چلے جاتے ہیں۔ لیٹواں پیٹر سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کی سنتا ہے۔ سب کے مسائل کے حل میں تعاون کرتا ہے اور اپنی صحت کے مسائل سے بے نیاز لیٹا رہتا ہے۔

اس دن نیازی صاحب سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ ہم لوگوں کے تکلیف کرنے سے کچھ پریشان اور کسی قدر شرمندہ نظر آرہے تھے۔ گھر والوں پر کسی حد تک ناراض بھی ہوئے کہ ''بات کا بتنگڑ کیوں بنایا، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں ان کے استقلال مزاج کی داد دیتا ہوا ذرا دیر میں واپس آگیا لیکن بڑے گہرے نقش اور دائمی تاثر کے ساتھ۔

ضمیر نیازی صاحب قائد اعظم اور مہاتما گاندھی سے وطنی نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے دادا گجرات سے بمبئی آئے اور پھر یہیں آباد ہوگئے۔ ان کے والد نے ماہم میں ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ یہیں نیازی صاحب اور ان کے سارے بھائی بہنوں نے ایک عمر گذاری۔ بعد میں ان کے ایک بھائی اسحاق صاحب نے اس فلیٹ کے قریب اپنے لئے بھی ایک فلیٹ خرید لیا لیکن سارے گھر والے پرانے فلیٹ ہی میں رہتے رہے۔ نیازی صاحب تو کراچی چلے آئے تھے لیکن خاندان کے باقی افراد اسی فلیٹ میں رہے اور جگہ کی قلت کے باوجود اسحاق صاحب مشترکہ خاندان کی برکت کو چھوڑ کر نئے فلیٹ میں منتقل نہیں ہوئے۔ ۱۹۹۰ میں نیازی صاحب بمبئی گئے تو انھیں آدمیوں کی کھچ پچ کا شدت سے احساس ہوا اور ''میرے کان میں گھس، میرے کان میں گھس'' کا تماشا نظر آیا۔ ان کی حق پسند طبیعت نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ انھوں نے گھر والوں سے کہا، ''والد نے جب یہ فلیٹ لیا تھا تو ہم کل سات آدمی تھے۔ اب ماشاء اللہ چودہ پندرہ ہیں۔ بمشکل گذر ہوتی ہے۔ اسحاق کا گھرانہ اپنے فلیٹ میں منتقل ہوجائے تو سب کے لئے سہولت ہوگی۔'' گھر والوں نے کہا، ''یہ آپ کہہ رہے ہیں!'' نیازی صاحب نے کہا، ''میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ وقت کہہ رہا ہے۔ آج کوئی شکایت نہیں کرتا۔ کل شکایتیں شروع ہو جائیں گی۔ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہوں گی۔ پھر آپس میں کتا چھنی ہوگی۔ اس لئے الگ الگ رہنا ہی بہتر ہے۔''

نیازی صاحب کے اس فیصلے پر خوش دلی سے عمل ہوا اور اب سب خوش ہیں۔ اس واقعے کے پس منظر میں مجھے لاہور کے شاعر دوارکا داس شعلہ کا ایک ذاتی تجربہ یاد آتا ہے جسے انھوں نے خود قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ''ہم سب بھائی لاہور میں مشترکہ مکان میں رہتے تھے اور ہمارا کاروبار بھی مشترکہ تھا۔ بظاہر آپس میں یک جہتی تھی لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ کیا کہ ایک دکان کلکتے میں کھولی، ایک بھائی اور اس کے خاندان کو وہاں منتقل کردیا۔ دوسری دکان کسی اور شہر میں۔ اس طرح ہر بھائی کو الگ الگ کاروبار میں لگا کر مختلف شہروں میں آباد کردیا اور اس کے بعد بھائیوں، بھاوجوں اور بچوں میں جو غیر معمولی یک جہتی کا احساس بیدار ہوا وہ حیرت انگیز ہے۔'' اصل بات جرأت کردار اور انصاف پسندی کی ہے۔ نیازی صاحب جیسا انصاف پسند اور جرأت کردار کا حامل انسان ہی ایسا فیصلہ کرکے اس پر خوش دلی سے عمل درآمد کرسکتا تھا۔ اس فیصلے میں زیادہ سہولت، زیادہ گنجائش اور زیادہ ذہنی و روحانی آسائش کا سراغ ملتا ہے۔ یہ ایک معاملہ فہم اور حقیقت آشنا انسان کا فیصلہ ہے، جھوٹی شرم اور جھوٹی آن پر جان دینے والے کا نہیں۔

نیازی صاحب کو اپنے تعلیمی دور ہی سے محنت کشوں کی تحریکوں، طلبہ کی

تنظیموں، بائیں بازو کے تصورات اور معاشرتی صلاح وفلاح کے پروگراموں سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس عہد کے باشعور نوجوان کی طرح انھیں بمبئی کی اشترا کی تنظیم سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ طالب علمی کے دور ہی میں اشترا کی کارکنوں اور رہنماؤں میں گھل مل گئے تھے۔ میں انھیں اس عہد کے اشترا کی تصورات، کارکردگی اور افراد کی زندہ انسائیکلوپیڈیا تصور کرتا ہوں۔ بمبئی کے سارے اہم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے ان کی ذاتی تعلقات تھے۔ میں نے جب بھی کسی ادیب شاعر کا تذکرہ کیا، نیازی صاحب نے اتنی دلچسپ تفصیل کے ساتھ اس کے بارے میں گفتگو کی کہ ان کے معلومات پر حیرت بھی ہوئی اور رشک بھی آیا۔ بڑے بڑے دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات سننے کو ملے۔ ایک شعلہ بیان شاعر سے نیازی صاحب کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ دن رات کا ساتھ، اٹھنا بیٹھنا، ہر جگہ ساتھ آنا جانا، پھر یہ ہوا کہ نیازی صاحب کراچی آگئے۔ کراچی سے جب وہ پہلے پہل بمبئی گئے تو جاتے ہی ان شاعر کو ٹیلی فون کیا، مگر وہ پہچانے ہی نہیں۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

نیازی صاحب سمجھے، شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ دوڑے ہوئے گئے مگر شاعر شعلہ بیاں نے انھیں پہچاننے سے انکار کردیا۔ نیازی صاحب منہ لٹکائے واپس آگئے۔ مگر آج بھی جب وہ اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں تو کسی برہمی یا غصے کا اظہار نہیں کرتے۔ دل شکستگی کا ایک ہلکا سا تاثر ضرور ابھرتا ہے۔

میں نے اس عہد کی بے شمار باتیں نیازی صاحب سے معلوم کی ہیں۔ پی۔سی۔ جوشی اس زمانے میں اشترا کی جماعت کے جنرل سیکریٹری اور نوجوانوں کے گرو تھے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے جوشی کی پارٹی سے علیحدہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا میں یہ واقعہ تفصیل سے بتاؤں گا۔ دیکھیے یہ فرصت کب میسر آتی ہے۔ اسی طرح ایک بار میں نے ''پیپلز وار'' کے ایک نامہ نگار آر ایس چری کے بارے میں ان سے پوچھا۔ کہنے لگے ''بڑا لائق رپورٹر تھا۔ ذہین، ہوشیار، معاملہ فہم، پھر پارٹی سے علیحدہ ہوگیا، سیاست ہی سے علیحدہ ہوگیا۔ پارٹی وکیلوں کی ایک مشہور فرم تھی، کانگا۔ اس میں شامل ہوگیا، سارے محنت کش رہنماؤں کے مقدمے مفت لڑتا تھا۔ علیحدگی کے بعد اس پارٹی کے بارے میں کبھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ خاموش زندگی گذارتا رہا۔'' میرا خیال ہے کہ اگر کوئی باہمت محقق نیازی صاحب کے بیٹھ کر اس قسم کی ساری معلومات قلم بند کرلے تو اس عہد کی سیاسی اور صحافتی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں نیازی صاحب کو معاشرتی اصلاح کے کاموں سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ دس دس روپے کے عطیے سے ایک جماعت کی نشو و نما میں حصہ لیا جس کا مقصد معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی تھا۔ پچاس روپے کے سرمائے سے وجود میں آنے والی یہ جماعت اب ایک بڑا زبردست ادارہ بن چکی ہے اور اس کا اثاثہ تقریباً پانچ کروڑ روپے ہے۔ نیازی صاحب اس جماعت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بھولے سے بھی اپنی کارگذاری یا بانی رکن ہونے پر افتخار کا اظہار نہیں کرتے۔ اس ذکر سے سرسری گذر جاتے ہیں جیسے یہ ان کے خلاف مزاج ہو۔ کام کرنے والے کام کرتے ہیں۔ لمبے چوڑے تذکرے نہیں کرتے۔ کام اپنا انعام خود ہے۔ تذکرہ ہو تو کیا اور نہ ہو تو کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نیازی صاحب نے اپنے لئے صحافت کے پیشے کا انتخاب کیا۔ ع شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما۔ ''اجمل'' سے وابستہ ہوئے۔ یہاں پہلے معین الدین حارث کی نگرانی میں کام کیا۔ انھوں نے ''اجمل'' سے تعلق ترک کرلیا تو ''مدینہ'' بجنور کے مدیر حامد الانصاری غازی ادارتی فرائض انجام دینے کے لئے بلائے گئے مگر ''اجمل'' پھر بھی آگے نہیں بڑھا اور بند ہوگیا۔ نیازی صاحب ''خلافت'' پہنچ گئے۔ حافظ علی بہادر، بدر الحسن جلالی اور بعض دوسرے مدیران کے کرام کے ساتھ کام کیا۔ مگر انھیں محسوس ہوگیا کہ بمبئی میں اردو کی کمزوری صحافت کی وسعت بقدر شوق نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اردو سے انگریزی کا رخ کیا اور فری پریس جرنل میں کام کرنے لگے۔ یہاں سے پرواز کی تو بخط راست کراچی آگئے۔ یہاں انگریزی کے اخبار تھے تو دو تین، مگر بول بالا ''ڈان'' کا تھا۔ چنانچہ ایک سہانی صبح نیازی صاحب وہیں پہنچے۔ اس زمانے میں نہ تشریفات کا سلسلہ تھا اور نہ دروازے پر روکنے والے محافظ جوان۔ دو آدمیوں کے نام انھیں بتائے گئے تھے، محمد عشیر اور محمد زبیری۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ عشیر صاحب تو چھٹی پر ہیں۔ زبیر صاحب کے کمرے کا رخ کیا، چق اٹھائی اور اندر پہنچے۔ بات چیت ہوئی۔ باہر نکلے تو روز نامہ ڈان میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے اپرنٹس مقرر ہو چکے تھے۔ نیازی صاحب کو پریشانی یہ تھی کہ ڈیڑھ سو روپے، اتنے بہت سے روپے خرچ کیسے ہوں گے، کیا کریں گے اتنے روپیوں کا؟ دور وہ تھا کہ الطاف حسین کو دو ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔ بمبئی میں ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر کو بھی دو ہزار ملتے تھے اور یہ دونوں بہت زیادہ تنخواہ پانے والے ایڈیٹر تھے۔ ایک ایڈیٹر تنخواہ کے معاملے میں ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ ٹاٹا کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ ''مارگ'' نکلتا تھا۔ ملک راج آنند اس کے ایڈیٹر تھے۔ انھیں ڈھائی ہزار روپے ماہوار مشاہرہ ملتا تھا۔ اس رسالے کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا تھا۔ لکھنے والے کو مضمون کا معاوضہ پانچ سو روپے ملتا تھا۔ مضمون لکھنے کے لئے چھ مہینے کی مدت دی جاتی تھی۔ آدھا معاوضہ شروع میں ادا کردیا جاتا تھا۔ ادھا مضمون موصول ہونے کے بعد ادا ہوتا تھا۔

نیازی صاحب تین مہینے اپرنٹس رہے۔ تین مہینے کے بعد آزمائشی مدت شروع ہوئی۔ تنخواہ دو سو ہوگئی۔ تین مہینے بعد یہ مدت بھی ختم ہوگئی اور تنخواہ ڈھائی سو ہو گئی۔ نیازی صاحب کا مسئلہ وہی رہا کہ روپیہ کہاں خرچ کریں۔۔۔ صدر کے چائے خانوں میں دو چائے کی ٹرے آٹھ آنے میں آتی تھی، سموسے اور پیسٹریاں ارزاں۔ کیفے ٹیریا، کافی ہاؤس، ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک کیفے جارج، کوالٹی اور حد یہ کہ صاحب لوگوں کا کیفے گرینڈ بھی بہ اعتبار نرخ کچھ ایسا گرینڈ نہیں تھا۔ آمدرفت بسوں کے ذریعے۔ کسی نے بڑا تیر مارا تو اسکوٹر لے لیا۔ ڈان میں موٹر یا تو الطاف حسین کے پاس تھی یا عشیر صاحب کے پاس۔ دونوں کو دفتر نے گاڑیاں فراہم کی تھیں۔ باقی لوگ پیدل، اعلیٰ لباس کا آج کل کا سا معیار نہیں، نہ کھانے پینے میں آج کل کا سا نخرہ۔

یہ سادہ رہن سہن کا دور تھا۔ میں نے الطاف حسین کا مکان بھی دیکھا

تھا۔ بھرگری روڈ پر عام انداز کی کوٹھی تھی۔ نیچے الطاف حسین رہتے تھے اوپر ریڈیو والے بخاری صاحب۔ اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کروفر اور شان شوکت نہ ان کے یہاں تھی نہ ان کے یہاں، نہ موٹروں کی بھیڑ بھاڑ۔ محمد احمد زبیری کیماڑی میں میولسس مینشن میں رہتے تھے، وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ رہن سہن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ڈان کا دفتر بھی ہیپر روڈ (اب الطاف حسین روڈ) کی ایک نیم تاریک اور بے ہنگم عمارت میں تھا۔ بہت بڑے بڑے کمرے، پوری عمارت پر طویلے کا گمان ہوتا تھا۔ چاروں طرف غلے کے کاروباریوں کی دکانیں، اس سڑک پر ایک سی عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ قریب ہی فریئر روڈ (اب شارع لیاقت) پر غلے کا اسٹاک ایکسچینج تھا۔ بازار میں تنگی، ٹھیلوں اور حمالوں کا ہجوم، گاہکوں اور دکانداروں کی چپقلش، گرد و غبار کی تہیں، ملک میں پیدا ہونے والے غلے کی ریل پیل۔ یہ عمارت پاکستان میں صحافت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ یہاں سے انگریزی ڈان، شام کا اسٹار، اردو ڈان، گجراتی ڈان، انگریزی میں السٹریٹڈ ویکلی، ایک فلمی رسالہ اور خواتین کے لئے ماہ نامہ "خاتون مشرق" شائع ہوتا تھا۔ اردو ڈان تھوڑے دن چلا۔ فضل احمد صدیقی اور خواجہ آشکار حسین اس کے کرتا دھرتا تھے۔ ٹائپ میں شائع ہوتا تھا اس لئے نامقبول تھا۔ "خاتون مشرق" کو یکتا امروہوی اور شفیق بریلوی سنبھالے ہوئے تھے۔ عمارت کی کہنگی کے باوجود تعمیر وطن کے جذبۂ لازوال کا نور، قومی مزاج کی تشکیل نو کا ولولہ، رائے عامہ میں حق اور انصاف کی لگن پیدا کرنے کی بھاری ذمہ داری کا احساس، حقائق کی جستجو اور بھرپور اظہار کا حوصلہ... نیازی صاحب نے ڈان میں عمر عزیز کے آٹھ برس بڑے جذبے اور حوصلے سے گذارے۔ یہ ان کی صحافتی زندگی کا تشکیلی دور تھا۔ مخلص، حوصلہ مند اور جری صحافیوں، بزرگ صحافیوں سے استفادے کا موقع ملا۔ یہ سب لوگ تھے جو صحافت کے تقدس اور عظمت پر جان دیتے تھے۔ حالات سے سمجھوتے کرنے کی وبا اس وقت تک عام نہیں ہوئی تھی۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم نے ڈان کے بزرگ صحافیوں کو بے رحمانہ بزدلی کے ساتھ فراموش کر دیا ہے۔ الطاف حسین کی خدمات کا اعتراف کس نے کیا؟ وہ بے چارے وزیر ہونے کی وجہ سے مارے گئے۔ محمد عشیر وہ صحافی تھے جن کا تقرر شہید ملت لیاقت علی خاں نے براہ راست کیا تھا۔ لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پیڈ پر شہید ملت نے خود تقرر کا حکم لکھا تھا۔ عشیر صاحب ان دنوں پانیر میں تھے اور بقول اکبر ؎ بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے۔ جمیل انصاری تھے۔ محمد احمد زبیری تھے۔ ضمیر الدین احمد تھے۔ نیازی صاحب ان سب کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے تھے۔ وہ برملا اقرار کرتے ہیں کہ میں نے ان میں سے ہر ایک سے براہ راست اور بھرپور استفادہ کیا ہے، سیکھا ہے۔ یہ پاکستان میں انگریزی صحافت کے ستون تھے۔ ان لوگوں نے کتنی ہی نسلوں کی تربیت کی ہے۔ یہ حق اور انصاف کے علم بردار تھے۔ اور انھیں پر کیا منحصر بے شمار بزرگ صحافی ہماری مجرمانہ غفلت کا شکار ہو گئے۔ عبد الرحمن صدیقی، محسن علی، زیب، لئسا حمید اللہ، ابرار صدیقی اور نہ جانے کتنے ایسے بزرگ صحافی ہیں جن کے کارناموں سے خود آج کے صحافی بھی ناواقف ہیں۔

تین برس نیازی صاحب نے ڈیلی نیوز میں گذارے۔ یہاں سے علیحدگی کے وقت نیوز ایڈیٹر تھے۔ مگر ہوا یہ کہ ان کے پرانے کرم فرما محمد احمد زبیری نے انھیں اپنے روزنامے بزنس ریکارڈر میں کھینچ بلایا۔ یہاں نیازی صاحب نے پورے پچیس برس گذارے اور ۱۹۹۰ میں پچیس برس مکمل کر کے سبک دوش ہوئے۔

۱۹۵۸ کے اواخر سے ملکی صحافت کا رخ بدلنا شروع ہو گیا۔ نیازی صاحب آشوب صحافت کے اس ہولناک دور میں اپنا کام لگن اور خلوص سے انجام دیتے رہے۔ صحافت ان کا پیشہ نہیں، عبادت بھی تھی۔ اور وہ پورے خضوع و خشوع سے اس عبادت میں محو رہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ کیا کہ اخبارات کو حکومت کی طرف سے جو پریس ایڈوائس موصول ہوتی تھی اسے ایک رجسٹر میں درج کر لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کے آئندہ کے لائحۂ عمل کا دیباچہ تھا۔ جنوں کی حکایت خوں چکاں لکھنے کا آغاز اسی رجسٹر سے ہوا تھا مگر گھات لگانے والے بھی حرفوں کے بنے ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۱ میں نیازی صاحب کی یہ متاع لوح قلم خاموشی سے غائب کر دی گئی۔ غائب کرنے والوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ انگلیاں خون دل میں ڈبو لی جائیں تو پھر ایسی اوچھی باتوں کا منفی اثر نہیں ہوتا۔ اس واردات کے بعد نیازی صاحب پورے انہماک اور توجہ سے پاکستان میں صحافت کی پامالی کی روداد مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۸۶ میں ان کی پہلی کتاب "صحافت پابند سلاسل" Press In Chains شائع ہوئی اور ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ میں نے یہ کتاب شائع ہوتے ہی دیکھی تھی اور نیازی صاحب کے ساتھ کراچی پریس کلب کو بھی خراج تحسین پیش کیا تھا جس نے ہمت کر کے صحافت کی پامالی کر کے حقائق پر مبنی یہ دستاویز شائع کر کے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ ہمت کر کے اکیلے چلنے والے کے لئے کارواں ضرور وجود میں آ جاتا ہے۔

"صحافت پابند سلاسل" میں برصغیر کی صحافت کا مختصر لیکن حقیقت پسندانہ جائزہ ہے اور پھر وطن عزیز میں صحافت کو پابند سلاسل کرنے کے دستاویزی شواہد ہیں۔ حوصلہ مند اور انصاف پسند صحافیوں کی جدوجہد، مزاحمت اور قربانیوں کی روداد ہے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ کالی بھیڑوں کی نشان دہی بھی ہے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں اس کتاب کی دھوم تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شعبے ہی کسی استاد نے یہ کتاب مجھے فراہم کی تھی۔ میں نے جب اسے پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ سچ کا چرچا بہت سنا تھا مگر ایسے واشگاف انداز میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

پریس ایڈوائس کو رجسٹر میں محفوظ کرنے والے نیازی صاحب نے جو منصوبہ بندی کی تھی وہ "صحافت پابند سلاسل" میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن نیازی صاحب نے اپنا سفر یہیں ختم نہیں کیا۔ انھوں نے رخ بدل کر ایک نئی سمت کا جائزہ مرتب کر ڈالا۔ ملکی سیاست میں تشدد کے بہیمانہ عناصر کی زبردستی کے اثرات زندگی اور معاشرے کے ہر شعبے میں محسوس ہونے لگے تھے۔ اندر ہی اندر پکنے والا لاوا آخر کار پھوٹ نکلا تھا اور جان و مال، عزت و آبرو، امن چین، سلامتی سبھی داؤں پر لگ گئے تھے۔ صحافت اور صحافی اس ابتلا سے کیسے محفوظ رہتے؟ جس کے حق میں نہ لکھو، جس کی پاسداری نہ کرو، وہی کاٹنے پر تیار۔ دھمکیاں، توڑ پھوڑ، تشدد، لاٹھی گولی سبھی کا سامنا کرنا پڑا۔ نیازی صاحب نے ۱۹۶۵ سے ۱۹۹۱ تک کے دو سو چھتیس ایسے واقعات کو بے خوفی اور جگر داری سے مرتب کر دیا، کراچی پریس کلب ہی کو اس معرکہ آرا دستاویز کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا، کیونکہ دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد

تھا۔اور کون ہمت کرتا؟

نیازی صاحب نے "محصور صحافت" میں ۲۳۶ دو سو چھتیس وارداتوں کا ذکر کیا ہے جو صحافیوں اور صحافت کے ماتھے گئیں مگر دو سو سینتیس ویں واردات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جو خود ان کے ساتھ پیش آئی۔ ہوا یہ کہ "محصور صحافت" کی ترتیب وتدوین میں وہ ایک ایسی اور ظالم اور جان لیوا بیماری کا شکار ہوگئے جس سے ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، آنا جانا سب بند ہوگیا۔ یوں کہیے کہ پوری زندگی ہی ایک بھیانک خواب میں تبدیل ہوگئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ہمت ہار دیتا مگر نیازی صاحب، ان کا مسلک تو سدا سے یہ رہا ہے ۔

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا
قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

شدید علالت کے باوجود وہ اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہے۔ ایک طرف بیماری کی شدت اور دکھ، دوسری طرف اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس، صاحب فراش ضمیر نیازی نے بزرگ مہربان لیٹواں پیڑ کی حیثیت اختیار کرلی۔ فیض پہنچانے کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار ذہنی اذیتوں اور روحانی صدموں سے بے نیاز نیازی صاحب اپنے کام میں مصروف رہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ بڑھاپے میں بیماری کا رونا سب روتے ہیں۔ جسے دیکھیے درد پنہاں و آشکارا کی ایک تھکا دینے والی روداد سناتا ہے مگر نیازی صاحب کے آب وگل میں شکوہ شکایت کی آمیزش سرے سے نہیں ہے۔ وہ صحت مند تھے تو فیض جاریہ تھے، علیل ہوئے تو بھی فیض برساتے رہے۔ ۱۹۹۴ میں ان کی تیسری کتاب ("احتساب کا جال") The Web of Censorship انھیں کیفیتوں میں شائع ہوئی۔ اس دفعہ ان کی کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی۔ رسم اجرا پریس کلب میں ہوئی۔ پریس کلب میں بے شمار کتابوں کے جلسے ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں مگر شرکا کے بقول یہ تقریب اور ہی کچھ تھی... وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ نیازی صاحب نے ۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

کا اہتمام کیا تھا۔ اپنی پہلی دو کتابوں کی طرح نیازی صاحب نے اس کتاب میں بھی آزادی صحافت کا پرچم بلند کیا ہے۔ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ برسوں کی سرکاری مداخلت سے وجود میں آنے والی اس زبان بندی اور قلم شکنی کا تذکرہ ہے جس سے پاکستانی صحافیوں کا سابقہ پڑا۔ اس توہین اور تذلیل کی روداد ہے جو پاکستانی صحافت کو برداشت کرنا پڑی۔ بڑی زبردست اور عبرت انگیز دستاویز ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ شدید جسمانی علالت کے باوجود نیازی صاحب نے ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز مرتب کرنے میں کسی ذہنی اضمحلال کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "احتساب کا جال" پڑھنے والا کوئی بھی قاری یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ یہ ایک ایسے شخص کا کارنامہ ہے جو صاحب فراش ہے، دوڑ بھاگ تو کیا چل پھر بھی نہیں سکتا۔ لیکن ہو تو ایسی اور ہمت ہو تو ایسی۔

میں نیازی صاحب کی کتابوں کو دیکھتا ہوں۔ غور کرتا ہوں اور اس دوران مرزا غالب کا ایک مشہور شعر میرے ذہن میں بے اختیار ابھرتا ہے ۔

بہ وادیی کہ دراں خضر را عصا خفت است
بہ سینہ می سپرم رہ اگر چہ پا خفت است

واقعی انھوں نے رہ وادی خیال کو مستانہ وار طے نہیں کیا، بلکہ علیل جسم کے ساتھ سارا راستہ سینے کے بل طے کیا ہے۔ ان کی کتابیں روشنی کا مینار ہیں۔ آنے والی نسلوں کو سچ بولنے اور حق بات کہنے کا حوصلہ دیتی رہیں گی، مگر میرا مقصد نیازی صاحب کی کتابوں پر اظہار خیال نہیں لہٰذا میں اس ذکر سے گریز کرتا ہوں۔

ایک طرف تو نیازی صاحب کے تالیفی کارناموں کی واہ واہ ہوئی، ادھر ان کی بیماری کا آغاز ہوچکا تھا۔ ایک دن سندھ کے گورنر فخر الدین جی ابراہیم ان کی عیادت کے لئے آئے۔ جاتے وقت انھوں نے نیازی صاحب کو ایک بند لفافہ دیا اور تاکید کی کہ اسے میرے جانے کے بعد کھولئے گا۔ ان کے جانے کے بعد ضمیر نیازی نے کھولا۔ لفافے میں ایک خط اور مبلغ پچاس ہزار روپے کا ایک چیک تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ "مائی ڈیر ضمیر۔ براہ کرم مجھے مبلغ پچاس ہزار روپے کا ایک چیک پیش کرنے کی اجازت دیجیے جو آزادی صحافت کے لئے آپ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر ہے۔ احترام اور نیک خواہشات کے ساتھ۔ آپ کا مخلص۔ فخر الدین جی ابراہیم۔" نیازی صاحب تو بے نیاز آدمی، مرد قلندر، اور قلندر بھی ایسے کہ ع قلندر جز دو حرف لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔ انھوں نے فوراً گورنر کو فون کیا کہ میں آپ کا چیک واپس کررہا ہوں۔ ادھر سے اصرار ہوا کہ واپس نہ کیجئے۔ مگر نیاز صاحب فیصلہ کرچکے تھے۔ آخر کار گورنر نے کہا، "اچھا آپ یہ چیک تین دن تک اپنے پاس رکھئے اور اس کے بعد آپ کا جی نہ چاہے تو واپس بھیج دیجیے۔" چنانچہ تین دن گذارنے کے بعد نیازی صاحب چیک واپس کردیا اور لکھا:

> میں اس اصول کا قائل ہوں کہ رپورٹروں کے علاوہ ہر صحافی کو اپنے اور با اقتدار طبقے کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنا چاہیے۔ اسے نقد رقم یا کسی اور صورت میں کوئی اعزاز یا انعام قبول نہیں کرنا چاہئے۔ میرے اصول شاید دقیانوسی معلوم ہوں لیکن نہایت عاجزی کے ساتھ انھیں پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پندرہ برس سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے کہ میں اپنی بساط کے مطابق خوف وخطر سے بے نیاز ہوکر اور ستائش وصلے کی پروا کئے بغیر ایمانداری سے صحافت کے پیشے کی خدمت میں مصروف ہوں اور میرا ذاتی فلسفہ مجھے مجبور کررہا ہے کہ میں آپ کا بھیجا ہوا چیک واپس کردوں۔

ضمیر نیازی دنیاوی اعتبار سے صاحب ثروت آدمی نہیں۔ ساری زندگی کنواں کھودا اور پانی پیا، ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ وسائل محدود ہوگئے۔ علالت اس پر مستزاد، علاج گراں، دوائیں کمیاب، مگر نیازی تو وہی مرد ہیں جس کی عشق زبردست پیشہ کو تلاش رہتی ہے۔ چیک قبول کرلیتے تو شاید سر ہمیشہ کے لئے جھک جاتا مگر یہاں تو ۔

سر کسی سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

رویہ فخرالدین جی ابراہیم کا بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اپنے جانے کے بعد لفافہ کھولنے کے لئے کہا۔ روبرو کی انا شکنی یا عزت نفس کو مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دلداری اور دل نوازی کا وہ رویہ ہے جو آج کل کی ''لفافہ صحافت'' میں عنقا ہو گیا ہے۔

واہ واہ کی تو آپ نے سن لی۔ اب لگے ہاتھوں آہ آہ کی روداد بھی بیان ہو جائے۔ ۱۹۹۴ میں نیازی صاحب کو وزیراعظم سکریٹریٹ اسلام آباد سے مبلغ چالیس ہزار روپے کا ایک چیک موصول ہوا۔ عام حالات میں یہی سمجھا جائے گا کہ نیازی صاحب کی خدمات کا اعتراف کے طور پر یہ چیک انھیں بھیج دیا گیا، مگر چیک پر جو مہر لگی تھی اس میں درج تھا ''ضرورت مند اور ناداروں کے لیے عطیہ، وزارت سماجی بہبود ڈویژن، اسلام آباد۔'' نیازی صاحب کو اپنی اس توہین پر جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے ممکن نہیں۔ لکھنؤ کے شاعر کا شعر یاد آتا ہے ؎

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلا د نے جاتے جاتے

نیازی صاحب کی اس توہین اور بے وقری پر معروف صحافی غازی صلاح الدین نے The News میں کالم لکھا۔ پڑھنے والے چونکے، مگر کمان سے نکلا تیر کب واپس آیا ہے۔ نیازی صاحب نے یہ اوچھا وار بڑے صبر اور استقلال سے سہ لیا، چیک واپس کر دیا ؎

ہو کوئی بادشاہ کوئی یا وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سر اکبر حیدری نے یوم اقبال کے موقعے پر ایک ہزار روپے کا چیک بطور تواضع علامہ اقبال بھیجا۔ علامہ نے چیک واپس کر دیا اور یہ اشعار لکھے ؎

تھا یہ اللہ کا فرمان شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

نیازی صاحب نے بھی ''خدائی کی زکات'' واپس کر دی اور ''نار نمرود'' سے پھول برساتے سلامت گذر گئے۔ تاریخ میں درج ہو گیا کہ ایک فقیر بے نوا نے جمہوریت کی خدائی سے ملنے والے نذرانے پر لات مار کر جرأت، بے خوفی، بیباکی اور آزادہ روی درویشانہ روایت از سر نو زندہ کر دی ہے۔

مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ بظاہر نیازی صاحب بڑے حلیم الطبع، بردبار اور نرم مزاج ہیں مگر جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو یہی بردبار اور نرم مزاج درویش صحافی انتہائی پامردی اور جرأت کے ساتھ ان اعزازات کو ٹھکرا دیتا ہے جن کے حصول کے لئے ارباب اشتیاق سرکاری پیر پہیہ بن جاتے ہیں۔ نیازی صاحب کی اصول پرستی انھیں ایک لمحے کو بھی متزلزل یا مذبذب نہیں ہونے دیتی۔ غضب کا حوصلہ ہے ان میں۔ میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ نیازی صاحب سرکاری اعزاز کو طوعاً کرہاً قبول کر لیتے ہیں لیکن اس بیساکھی کے سہارے راستہ نہیں طے کرتے۔ ادھر انھیں کوئی ظلم یا ناانصافی نظر آئی اور ادھر انھوں نے سرکاری اعزاز کی بیساکھی کو نکال پھینکا۔

بیساکھی نکال پھینکنے کا ایک واقعہ ان کی جرأت کردار، استقلال مزاج اور بے نیازی کا ایسا مرقع ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے، دل و جان میں اجالا بھی ہوتا ہے اور اپنی بیچارگی پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۹۵ میں صدر پاکستان نے نیازی صاحب کو تمغۂ حسن کارکردگی عطا کیا۔ اس تمغے کے ساتھ پچاس ہزار روپئے بھی تھے۔ تمغۂ حسن کارکردگی مختلف امور میں نمایاں کارکردگی کی بنا پر عطا کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ تمغوں اور خطابوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ انسان غائب، خطاب موجود۔ معدودے چند ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بقول غالب ؏ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما۔ ان معدودے چند اتفاقات میں انسان پیش منظر میں، خطاب پس منظر میں رہتا ہے۔ بہادر یار جنگ نواب تھے تو معظم و محترم تھے۔ بہادر خاں رہ گئے تو دلوں کا اجالا اور روح کی طمانیت بن گئے۔ نوابی ان سے علیحدہ ہو کر اپنی معنویت سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ نیازی صاحب کو ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ کو تمغۂ حسن کارکردگی عطا ہوا تھا اور اسی سال انھوں نے اعزاز کا بوجھ اتار بھی پھینکا۔ اعزاز ملا تھا تو انھوں نے صدر کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا تھا:

یہ اعزاز کسی ایک فرد کے لئے نہیں۔ یہ لکھے ہوئے لفظ کی طاقت کا اعتراف ہے۔ علاوہ ازیں، یہ پریس کی آزادی کے لیے صحافیوں کی عظیم جدوجہد کو دیا جانے والا اعزاز ہے۔

یکم جولائی ۱۹۹۵ کو انھیں یہ احساس ہو گیا کہ پریس کی آزادی اور صحافیوں کی عظیم جدوجہد دونوں کو زبردست خطرہ لاحق ہے اور انھوں نے فوری طور پر اعزاز واپس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قصہ یہ تھا کہ اس عہدے کے وفاقی وزیر داخلہ نے اپنے ایک آمرانہ حکم کے ذریعے کراچی میں شام کے وقت شائع ہونے والے تمام اردو روزناموں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ بیک جنبش قلم وہ تمام اخبار جن کی مجموعی اشاعت میں لاکھ سے زیادہ تھی، بند کر دیئے گئے۔ حکومت کا کہنا تھا کہ یہ اخبار فرضی اور بے بنیاد افسانے تراش کر حکومت کو بدنام کر رہے ہیں۔ حقیقی دہشت ناک واقعات پر مبنی یہ مصور رپورٹیں وزیر داخلہ کو فرضی بے بنیاد افسانے نظر آئیں۔ انھیں اپنے عمل کی مشق ناز کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ طاقت کے بے رحمانہ اور سفاک استعمال کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ سارا دوسرا شام کے اخباروں کے ماتھے گیا۔ جابر و قاہر حاکم نے ایک لمحے کے لے بھی یہ نہ سوچا کہ اخبارات کی اشاعت پر پابندی ساری دنیا میں روسیاہ ہونے کا اعلان ہے۔ نیازی صاحب نے جب یہ حکم سنا تو بڑا صحیح، بروقت اور مثبت فیصلہ کیا۔ اعزاز واپس کر دیا اور صدر کو لکھ دیا:

''میں نے یہ اعزاز اس واضح یقین کے ساتھ قبول کیا تھا کہ حکومت عوامی آگاہی کے

حق کی تکمیل حفاظت کرے گی لیکن حکومت کے طرزِ عمل نے اس یقین کو غلط ثابت کر دیا ہے۔"میرا خیال ہے کہ نیازی صاحب ملکی تاریخ میں سرکاری اعزاز واپس کرنے والے اولین صاحب کردار بزرگ ہیں۔ ان کے بے جھجک اندازِ عمل سے مرزا غالب کا مصرع ع

دگر ز شاہ رسد ار مغاں بگردانیم

یاد آتا ہے۔اعزاز کے ساتھ پچاس ہزار رقم بھی تھی۔حکومت نے اعزاز کی واپسی بھی منظور کی اور یہ رقم بھی واپس طلب کی۔ نیازی صاحب نے فوری طور پر رقم بھی واپس کردی۔لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے اس پیسے کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا، یونہی رکھا رہنے دیا تھا۔

حکومت کے ظالمانہ رویہ کے خلاف ایسا پر زور احتجاج کرنے والے نیازی صاحب جہاں کہیں ناروا رویہ دیکھتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں اور کسی قسم کا اعزاز قبول نہیں کرتے۔کراچی یونیورسٹی نے طے کیا کہ انھیں صحافت کے حوالے سے قابل قدر کتابیں مرتب کرنے پر اعزازی ڈگری عطا کی جائے۔ نیازی صاحب بھی یہ ڈگری قبول کرنے پر تیار ہوگئے۔لیکن جب انھیں یہ علم ہوا کہ ڈگری حاصل کرنے کے لئے گورنر ہاؤس جانا پڑے گا تو انھوں نے وہاں جانے سے صاف انکار کردیا اور کہہ دیا کہ ڈگری یونیورسٹی ہی میں ملنا چاہیے، میں یونیورسٹی کے علاوہ کہیں اور جاکر ڈگری نہیں لوں گا۔ چنانچہ وہ اب تک اعزازی ڈگری سے بے نیاز ہیں۔علی گڑھ یونیورسٹی نے جگر صاحب کو بھی اعزازی ڈگری دی تھی۔اب اگر کوئی ڈاکٹر جگر کہے تو یہ نام دونوں کو ناگوار گذرے گا۔نیازی صاحب کے نام کے ساتھ بھی ڈاکٹر لگ جاتا تو کیا فرق پڑتا۔وہ تو ویسے ہی طبیب دل ہا اور حکیم علم افزا ہیں۔

نیازی صاحب کی ابتدائی دو کتابیں پڑھنے کے بعد ان کے بارے میں ذہن میں یہ تاثر تھا کہ تلخ حقائق کے اس روداد نگار کے مزاج میں کسی نہ کسی قدر تلخی ضرور ہوگی، مگر جب تعارف ہوا تو اندازہ ہوا کہ میرا تاثر بالکل غلط تھا۔ نیازی صاحب تو سراپا حلاوت ہیں۔ذاتی زندگی میں، دوستوں اور عزیزوں کے حلقے میں، حد درجہ منکسر المزاج ہیں، فیض رساں ہیں۔ جو بھی ضرورت مند آتا ہے اس بزرگ مہربار لیٹواں پیڑ سے ایک پتہ توڑ کر لے جاتا ہے۔وہ ہر ضرورت مند کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔حالانکہ بعض ضرورت مند ان کی نرم خوئی اور انکسار مزاج سے فائدہ اٹھا کر چونا لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، مگر نیازی صاحب پھر بھی ان کی دلداری ہی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ تحقیق صحافت کے ایک اعلیٰ طالب علم ان کے یہاں آئے۔ تحقیق کر رہے تھے، کچھ مواد درکار تھا۔ نیازی صاحب نے کہا۔میرے پاس بائیس برس کے اخباروں کے تراشے ہیں، ان میں تلاش کرلیجیے۔طالب علم نے یہ جلدیں دیکھیں تو باچھیں کھل گئیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔فرط مسرت سے بے تاب ہوکر بولے،" اچھا تو میں یہ جلدیں لے جا رہا ہوں۔مطلوبہ تراشوں کے فوٹو اسٹیٹ بنوا کر دو تین دن میں واپس کردوں گا۔"نیازی صاحب نے بڑی نرمی سے کہا ،" بھائی یہ حوالے کی جلدیں ہیں۔نہ جانے کتنی محبت سے مرتب ہوئی ہیں۔ ابھی میرے بیٹے آجائیں گے۔ان کے ساتھ نکڑ کی دکان پر چلے جایئے۔اچھا اور ارزاں فوٹو اسٹیٹ بنتا ہے۔ جو چیزیں چاہیے ہوں فوٹو کاپی کروا لیجیے۔" مگر وہاں تو "مطلب سعدی" ہی دوسرا تھا۔بس بگڑ گئے اور برافروختہ ہوکر مرخص ہوگئے۔ نیازی صاحب نے جب یہ واقعہ مجھے سنایا تو نہ ان کے لہجے میں درشتی تھی نہ کسی قسم کی تلخی۔ تاسف ضرور تھا کہ اگر اس طالب علم میں علم کی سچی تڑپ ہوتی تو وہ ضرور فوٹو کاپی بنوا لیتا۔تھوڑی دیر انتظار کرلیتا۔افسوس کہ مطلوبہ معلومات حاصل کئے بغیر چلا گیا۔ بس بار بار یہی کہتے رہے اور افسوس کرتے رہے۔ایک طرف یہ طنطنہ کہ ؎

بندگی میں ہم وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور کہاں یہ انکسار کہ طالب علم کے تساہل پر رنج میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

نرم خوئی اور دل نوازی کے ساتھ ساتھ نیازی صاحب کے یہاں علم کی ترسیل اور معلومات کے ابلاغ کی سچی تڑپ ہے۔ میں نے ایسی تڑپ بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ وہ روزانہ بارہ اخباروں کا بہ امعان نظر مطالبہ کرتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ سرخیاں دیکھیں اور بھر پایا۔ بزرگ اور تجربہ کار صحافی ہیں، ہر خبر پر نظر دوڑاتے ہیں۔ جو کچھ نظر سے گذرتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے اور عام کرنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔اب مثلاً فون آیا۔" آپ نے آج کے ڈان میں ایڈورڈ سعید کا مضمون پڑھا۔ ادب کے حوالے سے ہے۔" میری عادت یہ ہے کہ صبح صبح اخبار کی خبریں تو دیکھ لیتا ہوں لیکن مضامین وغیرہ دوپہر کو یک سوئی سے پڑھتا ہوں۔ عرض کیا،" جی ابھی نہیں پڑھا۔" شام کو پھر سوال ہوا،" جی ہاں پڑھ لیا۔" پھر کیا خیال ہے، اس کا ترجمہ ہوجانا چاہیے۔ بڑا مفید اور زبردست مضمون ہے"۔" جی۔ بہت اچھا، ہوجائے گا۔" چنانچہ اپنے ایک کرم فرما شاہ محی الحق فاروقی صاحب کو زحمت دی جو انگریزی سے اردو میں اچھا ترجمہ کرتے ہیں۔فاروقی صاحب بے چارے شریف آدمی، سب کام چھوڑ کر ترجمہ کر ڈالا۔ نیازی صاحب کو بھجوا دیا گیا۔" کس نے کیا ہے؟" بتایا کہ ایک کرم فرما ہیں، فاروقی صاحب، انھوں نے کیا۔" ان کوئی ٹیلی فون نمبر ہے؟"" جی ہاں ہے۔" نمبر بتادیا۔ نیازی صاحب کی علم دوستی، شرافت نفس اور علمی دیانت داری یہ ہے کہ انھوں نے فوراً فاروقی صاحب کو فون کرکے ان کا شکریہ ادا کیا اور ترجمے کی تحسین کی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ نیازی صاحب اخبار میں کوئی مضمون، کوئی خبر دیکھتے ہیں اور فوراً ٹیلی فون کرتے ہیں۔ اطلاع دیتے ہیں اور اطلاع دینے میں، یا دوسرے الفاظ میں عصری آگاہی کو عام کرنے میں روحانی فرحت محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ اخباروں سے وابستہ تھے تو لکھ کر لکھے ہوئے حرف کی قوت کا احساس دلاتے تھے۔اب جبکہ وہ ایک بزرگ مہربان لیٹواں پیڑ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں تو دوسروں کے سبقت کرنے سے پہلے خود ہی پتے توڑ توڑ کر مستحق افراد میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ پیڑ اپنے پتے جھاڑ کر اہل غرض کی جھولی میں ڈالتا رہتا ہے اور لکھے ہوئے حرف کی قوت کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ نیازی صاحب اپنے ہر نیاز مند کو اس کی دلچسپی کے مطابق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ میرا تعلق چونکہ ادب سے ہے اس لئے ادبی معلومات کی ترسیل زیادہ ہوتی ہے۔

نیازی صاحب کی ادبی معلومات حیرت انگیز ہے۔ بمبئی میں وہ انجمن

ترقی پسند مصنفین کے بڑے فعال رکن تھے۔ لکھتے رہتے تھے، تمام لکھنے والوں اور اخبار و رسائل سے تعلقات تھے۔ ترقی پسندوں پر پابندی عائد ہونے کے بعد تحریک کی ترجمانی کے لئے "نیا پرچم" شائع ہوا۔ یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا جس کا سارا کام نیازی صاحب انجام دیتے تھے۔ پرچم بلند کرنے میں کراچی بھی پیچھے نہیں تھا۔ یہاں مولانا سیماب نے "پرچم" بلند کر رکھا تھا۔ عام طور پر مولانا سیماب کو مدمغ اور دوسروں خصوصاً جوان معاصرین کی تحسین سے عاری سمجھا جاتا تھا، مگر میرے سامنے کی بات ہے کہ جب مولانا نے "پرچم" نکالا تو ایک صاحب نے انھیں مجاز کا شعر ـ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

سنایا۔ مولانا نے شعر سن کر کہا "اگر آپ پہلے یہ شعر سنا دیتے تو میں پرچم کی لوح پر یہی شعر لکھواتا۔" ۱۹۴۷ء میں بمبئی کے ایک رسالے نے ایک ضخیم سیماب نمبر بھی شائع کیا تھا۔ ایک دفعہ نیازی صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے یاد دلایا کہ یہ نمبر بڑے سائز پر شائع ہوا تھا۔

یہ جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا۔ بمبئی کی حکومت نے "نیا پرچم" پر بھی پابندی عائد کر دی تو نیازی صاحب نے تصدیق سہاروی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "منزل" نکالا۔ یہ بھی بند کر دیا گیا تو نیازی صاحب نے اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ ایک ایرانی تاجر "نرگس" کے نام سے ایک فلمی رسالہ نکالتے تھے۔ یہ پرچہ کچھ عرصے سے بند تھا۔ نیازی صاحب نے ان ایرانی تاجر سے بات کی اور "نرگس نو" کے عنوان سے ایک عدد فلمی رسالہ نکالنا شروع کر دیا۔ ادبی افواہ سازوں کا غیر مصدقہ بیان ہے کہ محتاط اور دور اندیش نیازی صاحب نے "نو" کا سابقہ اس لئے بھی لگایا کہ ان پر "نرگس" کے پرستار ہونے کا الزام عائد نہ ہو سکے۔ اس رسالے کا بیشتر حصہ ترقی پسند ادب پر مشتمل ہوتا تھا۔ نیازی صاحب نے ڈیڑھ برس تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

کراچی آ کر بھی نیازی صاحب کی ادبی دلچسپی برقرار رہی۔ مختلف رسالوں میں لکھتے رہے، مگر آہستہ آہستہ صحافتی ذمہ داریاں حاوی ہو گئیں۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نیازی صاحب اگر صحافت کے خارزار میں نہ الجھتے تو ادیب ہوتے اور بڑے ادیب ہوتے۔ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ اب بھی قلم سنبھالتے ہیں تو موتی رولتے ہیں۔ دو برس پہلے فرمان صاحب نے انھیں نیاز و نگار کے سالانہ لیکچر کی دعوت دی۔ نیازی صاحب نے نیاز صاحب کی روشن خیالی، صحافیانہ آزادہ روی اور بیباکی کی حوالے سے بہت عمدہ مضمون تیار کیا جو سالانہ اجتماع میں پیش ہوا اور پسند کیا گیا۔ بعد میں فرمان صاحب نے اسے "نگار" میں شائع بھی کر دیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نیازی صاحب نے اپنی شدید علالت کے باوجود ایسا معرکہ آرا مضمون لکھ ڈالا اور نیاز صاحب کی جرأت، خدمت، اور ادب کو پوری طرح واضح کیا۔ علالت کے باوجود ادب سے ان کی دلچسپی اور ترسیل کا یہ عالم ہے کہ جب کوئی ڈھنگ کا ادبی مضمون یا کتاب پڑھتے ہیں تو اس کی اطلاع فوراً دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں، مطلق دیر نہیں کرتے۔ چاہتے ہیں کہ اس ادب پارے سے لطف اندوز ہونے میں سب ان کے شریک ہو جائیں۔ کوئی کتاب، رسالہ، مضمون ہاتھ آتا تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ کتابیں، رسالے، مضامین، تراشے ان کے پاس کثرت سے آتے رہتے ہیں اور وہ بڑی خوشی سے ان کے مطالعے میں نیاز مندوں کو شریک کرتے رہتے ہیں۔ انور ظہیر خاں کے خاکوں کا مجموعہ انھوں نے پڑھا تو انھیں یہ مجموعہ بہت پسند آیا۔ فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس کی اشاعت یہاں بھی ہونا چاہیے۔ انور ظہیر خاں سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ نیازی صاحب نے اجازت موصول ہوتے ہی فضلی سنز کے طارق رحمن سے بات کی۔ طارق سعادت مند نوجوان ہیں۔ نیازی صاحب کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے بخوشی آمادگی ظاہر کی۔ اب نیازی صاحب اس ہیچ مداں کو حکم دیا کہ ایک دیباچہ لکھ دو۔ دیباچہ لکھ کر پیش کر دیا گیا۔ جسے پڑھ کر نیازی صاحب نے فوراً فون کیا اور کہا، "میں بڑے انکسار اور ادب سے التجا کرتا ہوں کہ اس دیباچے میں آپ نے جو کچھ میرے بارے میں لکھا ہے اسے قلم زد کر دیجیے۔" حالانکہ کچھ بھی نہیں لکھا تھا، صرف یہ تھا کہ نیازی صاحب یہ کتاب پسند کی ہے اور مجھے اس پر دیباچہ لکھنے کے لئے مامور کیا ہے۔ میں نے بادل ناخواستہ وقتی طور پر ان کی بات مان لی۔ اتفاق یہ ہوا کہ دیباچہ کمپوز ہو کر میرے پاس تصحیح کے لئے آیا تو میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر نیاز صاحب کی ناراضگی کے خوف کو یکسر انداز کیا اور قلم زد الفاظ بڑھا دیئے۔ کتاب چھپ کر آ گئی تو نیازی صاحب بہت خوش ہوئے۔ پہلا نسخہ انور صاحب کو اس اہتمام سے بھیجا کہ وہ یہاں اشاعت کے صرف تیسرے دن بعد ان کو بمبئی میں موصول ہو گیا، لیکن انھوں نے نیازی صاحب کو وصول یابی کی کوئی اطلاع نہیں بھیجی، شکریہ کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ بہت دن کے بعد ان کا خط آیا کہ "کتاب مل گئی۔ میرے طرف سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر دیجیے۔" چلئے چھٹی ہوئی۔ مگر نیازی صاحب ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیتے۔

ہر دوسرے تیسرے دن ان کا فون آتا ہے۔ "مدینہ ایک بڑا مشہور اخبار تھا"۔ عرض کیا، "جی ہاں، بجنور سے نکلتا تھا۔ حافظ محمد مجید حسن اس کے مالک تھے۔ میرے والد اس کے مستقل خریدار تھے۔ پابندی سے ہمارے یہاں آتا تھا۔ بڑے بڑے لائق اہل قلم اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔" کہنے لگے، "اس کے اداریوں کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔ ابھی بیٹا گھر سے دفتر کے لئے نکلے گا تو یہ انتخاب آپ کو دیتا جائے گا۔ ذرا دیکھ لیجیے۔" ذرا دیر بعد وہ انتخاب پہنچ گیا۔

فون آیا۔ "آپ نے یہ ذوق والا مضمون کب لکھا تھا۔" عرض کیا۔ "اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا۔" ارشاد ہوا "لکھا کیسے نہیں۔ "اردو ادب" کے ذوق نمبر میں چھپا ہوا ہے۔" میں نے بہت سوچا، بہت غور کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر حیران ہو کر دریافت کیا، "مضمون کا عنوان کیا ہے؟" کہنے لگے، "عنوان ہے دیوان ذوق۔" خیال آیا کہ یہ میری کتاب "محمد حسین آزاد، حیات و تصانیف" کے ایک باب کا عنوان ہے۔ غالباً کتاب میں سے یہ مضمون لے کر شائع کر دیا گیا ہے۔ یہی بات نیازی صاحب سے عرض کر دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد حارث ضمیر وہ رسالہ پہنچا گئے۔ میرا خیال صحیح تھا کہ مضمون کتاب سے لیا گیا ہے۔ نیازی صاحب کا فون آیا۔ "یہ رسالہ آپ ہی رکھ لیجیے۔ آپ کا مضمون اس میں شامل ہے۔" حالانکہ رسالے پر نیازی صاحب کا نام اور مدیر ڈاکٹر اسلم پرویز کے دستخط تھے۔

فیاضی اور علمی دوستی کا یہ مظاہرہ نیازی صاحب ہی کر سکتے تھے، ورنہ عام طور پر دوست احباب کتابوں اور رسالوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے، صرف طمطراقی تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

میں نے نیازی صاحب کی ارسال کردہ رسالوں اور کتابوں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ ان کے ترسیل ادب کے عمل کا مطالعہ کیا ہے۔ پچھلے دنوں ان کی نظر سے غالب کے ڈھائی سو اشعار کا انگریزی ترجمہ گذرا جو قائداعظم کے سیکریٹری مطلوب حسین سید کا کیا ہوا ہے۔ آج کل وہ اس ترجمے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ سوال بھی پیش نظر ہے کہ مقدمہ کس سے لکھوایا جائے۔ بہرحال اشاعت کے بارے میں ان کے ذوق دشوق سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ جو فی الحال ایک رسالے میں شائع ہوا ہے جلد ہی کتابی شکل میں اہل ذوق کے سامنے آجائے گا۔ مجھے جب انھوں نے اس ترجمے کی اطلاع دی تو میں خاصا متعجب ہوا کیونکہ سید صاحب میری شناسائی بھی تھی مگر غالب کے اثرات کبھی محسوس نہیں ہوئے۔

آجکل نیازی صاحب ایک اور کتاب کی اشاعت میں بھی کوشاں ہیں۔ کوئی صاحب جو سفیر رہ چکے ہیں۔ مختلف یورپین زبانوں سے آشنا ہیں اور بہت اچھی انگریزی لکھتے ہیں، ایک انگریزی اخبار میں گاہے گاہے کالم لکھتے تھے۔ نیازی صاحب ان کے کالم سے بہت متاثر تھے چنانچہ ایک مشترک دوست کے ذریعے سے انھوں نے ان صاحب کو پیغام بھجوایا کہ بھائی لکھنا ہے تو خودنوشت لکھو، کالم لکھ کر وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ ان صاحب نے نیازی صاحب کی یہ بات دل پر لکھ لی۔ خودنوشت میں مصروف ہوگئے، مسودہ مکمل کر کے نیازی صاحب کو بھیج دیا کہ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں نے اپنا کام کردیا ہے۔ اب نیازی صاحب جان و دل سے کوشاں ہیں کہ یہ مسودہ کس صورت سے شائع ہوجائے اور ایک اچھی خودنوشت قارئین تک پہنچ جائے۔

علم، ادب، اور ترسیل معلومات کی یہ تڑپ یک طرفہ نہیں۔ نیازی صاحب کو کسی اچھی کتاب، رسالے اور مضمون کی بابت علم ہوتا ہے تو اس کے حصول کے لئے بے قرار ہوجاتے ہیں۔ میں نے ایک بار ان سے ضیاء الدین برنی کی کتاب "عظمت رفتہ" کا تذکرہ کیا۔ برنی صاحب عرف عام میں چچا کہلاتے تھے۔ ان کی کتاب میں دلی اور بمبئی کی بے شمار صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے ہیں۔ دلی کے کم، بمبئی کے زیادہ۔ نیازی صاحب نے اس کتاب کے مطالعے کا غیر معمولی اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے کتاب انھیں فوراً بھجوادی۔ نیازی صاحب نے مزے لے لے کر پڑھی اور مجھے واپس بھجوائی تو نئی عمدہ اور مضبوط جلد بندھوا کر۔ لکھنؤ کے بارے میں ایک کتاب دلی سے شائع ہوئی تھی۔ آصف نے یہ کتاب بڑی تلاش کے بعد میرے لئے حاصل کی، میں نے نیازی صاحب سے تذکرہ کیا تو انھوں نے حسب معمول غیر معمولی اشتیاق ظاہر کیا۔ کتاب پڑھی اور شکریے کے ساتھ واپس بھجوائی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ روزانہ بارہ اخباروں کا تفصیلی مطالعہ کرنے والا مزید مطالعے کا وقت کیسے نکال لیتا ہے اور پھر وہ شخص جو علالت کے شدید دباؤ کا شکار ہے؟ مگر نیازی صاحب ہیں کہ علالت کے دباؤ سے بے نیاز ہمہ وقت مطالعے میں مصروف ہیں۔ علالت کے باوجود یادداشت قوی اور حافظہ بے حد تیز ہے۔ کسی موضوع پر بات کیجیے، معلوم ہوتا ہے معلومات کا ایک سمندر سینے میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ ادھر آپ نے کسی ادیب، شاعر، اخبارنویس، صحافی، کتاب، اخبار یا رسالے کا نام لیا، اور معلومات کا چشمہ ابلنے لگا۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیازی صاحب نے اپنی ساری عمر اس موضوع کے مطالعے میں گذاری ہے۔ کاش یہ معلومات مدون اور مرتب ہوجائے۔ دوسروں سے خودنوشت لکھوانے والے نیازی صاحب اگر اپنی خودنوشت لکھوادیں تو بیسویں صدی کے نصف آخر کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ مرتب ہوجائے گی۔

نیازی صاحب کے پاس کتابوں، رسالوں اور اخباروں کا بڑا نادر ذخیرہ ہے، وہ کہتے ہیں، کبھی تھا، اب کچھ بھی نہیں ہے؛ کسی عزیز کو ملازمت کے سلسلے میں ضمانت درکار تھی۔ نیازی صاحب سے کہا۔ انھوں نے ضمانت دے دی۔ ادھر نے نادہندگی ہوئی۔ ضامن غریب پکڑا گیا۔ مثل ہے ضامن دے یاد لائے، نیازی صاحب درویش آدمی۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق سینے پر صبر کی سل رکھ کر کتب خانہ فروخت کردیا اور رقم ادا کر کے گلوخلاصی حاصل کی۔ زیادہ تر کتابیں تو اس جبری فروخت کی نذر ہوئیں۔ مگر ہاتھی لاکھ لٹے گا تب تب بھی سوا لاکھ کا رہے گا۔ جو ذخیرہ اب بھی موجود ہے وہ بھی بڑا نادر اور انتخاب ہے۔ انھوں نے یہ ذخیرہ ایک اعلیٰ تدریسی ادارے کے نام کردیا ہے۔ اخبارات کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ ساری فائلیں ڈان کے دفتر میں اس شرط پر رکھ دی جائیں گی کہ ڈان والے ہر ضرورت مند کو ان کے کسی تراشے کا فوٹو اسٹیٹ بلا قیمت فراہم کریں گے۔ یعنی نیازی صاحب کا فیض آج بھی جاری رہے گا۔ بزرگ، لیٹواں پیڑ کے پتے ہر مراد مانگنے والے کی جھولی گرتے رہے گے۔

میرا خیال ہے کہ نیازی صاحب برصغیر کے سارے اردو انگریزی رسالے منگواتے ہیں۔ ان کے دوست، احباب، شناسا انھیں رسالے اور کتابیں بھیجتے رہتے ہیں۔ تاہم اکثر رسالے وہ خود خریدتے ہیں۔ یہ وصف میں نے نیازی صاحب کے علاوہ صرف مشفق خواجہ میں دیکھا ہے۔ وہ بھی اکثر رسالوں کے سالانہ خریدار ہیں۔ اردو والوں میں یہ عادت بالعموم نہیں پائی جاتی۔ نیازی صاحب ان کا مطالعہ کرتے ہیں، دوستوں کا پڑھواتے ہیں اور پھر محفوظ کرلیتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ان کی نظر سے نہیں گذرتا تو اس کی جستجو کرتے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ برقی ذرائع ابلاغ کے اس تیز رفتار دور میں نیازی صاحب اپنی علالت کے باوصف وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ کسی دوست کو کتاب، رسالہ یا خط بھیجنا ہو تو کوریر سروس، فیکس اور ای میل سے کام لیتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح بھجوا ہی دیتے ہیں۔ ان کی اس مجاہدانہ کوشش سے مجھے بارہا احساس ہوا کہ علالت، اضمحلال، جسمانی مجبوری اور ناطاقتی انسان کے آہنی ارادے کو زیر نہیں کرسکتے۔ نیازی صاحب نے اپنی ناطاقتی ہی کو اپنی قوت بنا لیا ہے۔ ہار مان لینا اور سپر ڈال دینا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔

نیازی صاحب کے حوصلے اور ہمت کا اندازہ مجھے اس طرح بھی ہوا

کہ پچھلے دنوں "جواب دوست" والے ڈاکٹر نسیم انصاری کراچی آئے۔ نیازی صاحب سے بھی ملے۔ مجھے جب نیازی صاحب نے اس ملاقات کا حال بتایا تو مجھے خیال آیا کہ انصاری صاحب سے ایک ایسے اجتماع میں گفتگو ہونا چاہیے جس میں نیازی صاحب بھی موجود ہوں۔ مجبوری یہ کہ نیازی صاحب کہیں آجا نہیں سکتے۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کے یہاں ایک اجتماع ہوجائے تو کیسا رہے۔ انھوں نے اپنی تکلیف اور مجبوری کا کوئی خیال کیے بغیر فوراً آمادگی ظاہر کی، خود ہی انصاری صاحب سے بات بھی کرلی۔ نیازی صاحب کو ذاتی طور پر جو زحمت اٹھانا پڑی اس کا آسانی سے اندازہ نہیں ہوسکتا۔ محفل نیچے نہیں ہوسکتی تھی۔ بڑا کمرہ اوپر تھا۔ نیازی صاحب کو کرسی پر بٹھا کر اوپر لے جایا گیا۔ فرشی نشست تھی، نیاز صاحب بڑی تکلیف سے تکیوں کے سہارے فرش پر بیٹھے۔ ڈاکٹر انصاری بر وقت آگئے۔ بڑا ستھرا مجمع تھا۔ شاعر، ادیب، دانشور، صحافی، شرکا کی تعداد تو زیادہ نہ تھی لیکن جتنے لوگ بھی موجود تھے اپنے اپنے میدان میں منفرد تھے۔ گفتگو شروع ہوئی اور دل سے دل تک پہنچنے والی وہ گفتگو ہوئی جو کسی عام اجتماع میں نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر انصاری نے بھی کھل کر اظہار خیال کیا مگر نیازی صاحب ساری محفل پر چھائے رہے۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، والی بات تھی لیکن تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نیازی صاحب نے بڑی نرمی سے کہا۔ "اپنی اسٹیم ختم ہوئی۔" اس وقت ان کے چہرے پر مجبوری کی ایک الم ناک لہر لمحے بھر کے لئے ابھری اور پھر فوراً ہی غائب بھی ہوگئی۔ کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ نیازی صاحب نے یہ فقرہ کتنے دکھ کے ساتھ کہا ہے۔ اس اجتماع سے مجھے نیازی صاحب کی مقبولیت، ملنے جلنے والوں میں ان کے احترام اور ان کی شخصیت کی گہرائی کا کسی قدر اندازہ ہوا۔

ایسی ایک نشست انتظار حسین صاحب کے اعزاز میں بھی ہوئی تھی۔ اس دن بھی بڑی معرکے کی گفتگو ہوئی۔ یہ دونوں نشستیں بڑی یادگار اور تاریخی اہمیت کی حامل تھیں کیونکہ بقول میر ع باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ نیازی صاحب کو ذاتی طور پر بڑی تکلیف ہوئی لیکن انھوں نے علم اور معلومات کی ترسیل اور دوسروں کی خوشی کے لئے ذاتی تکلیف کی کوئی پروا نہیں کی۔ خیر کا یہ جذبہ، خلق خدا کو فیض پہنچانے کی یہ روش، نیازی صاحب کی پوری زندگی میں جاری وساری نظر آتی ہے۔ وہ جہاں کہیں خیر کا عمل یا مظاہرہ دیکھتے ہیں اس میں خاموشی سے شریک ہوجاتے ہیں، صاحب خیر کی تحسین کرتے ہیں، حوصلہ افزائی سے کام لیتے ہیں اور اس کام میں روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اس حوالے سے مجھے یاد آیا کہ کراچی کے ایک خوش گو شاعر جمال احسانی کے انتقال کے بعد فاطمہ حسن نے کوشش کرکے ان کا مجموعہ شائع کرایا اور اس مجموعے کی تقریب اجرا کا اہتمام کراچی اور اسلام آباد میں کیا۔ یہ ایک بڑا قابل قدر عمل خیر تھا۔ فاطمہ کے اس حسن عمل سے شاعر اور ادیب بہت متاثر ہوئے۔ میں نے جب یہ واقعہ نیازی صاحب کو سنایا تو وہ فاطمہ کی اس کوشش سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے کسی تعارف یا شناسائی نہ ہونے باجود فاطمہ کو فون کیا اور ان کی کوشش کو سراہا۔ بظاہر یہ بڑا معمولی واقعہ ہے لیکن اس سے نیازی صاحب کی فطرت کے مثبت انداز، خیر کے جذبے اور خیر کی تحسین کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ جہاں خیر اور سچائی ہے وہاں ضمیر نیازی بھی ہے اور جہاں ضمیر نیازی ہے وہاں خیر اور سچائی لازمی طور پر موجود ہوتی ہے۔

خیر اور سچائی ہی کے حوالے سے نیازی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو مجھ پر بہت آہستہ آہستہ منکشف ہوا۔ جب میری کتاب "دبستان نظامؒ" شائع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ نیازی صاحب کو بھی بھیجا۔ انھوں نے اس کتاب کو بڑی احتیاط، شوق اور عقیدت سے پڑھا۔ پڑھتے گئے اور اپنے پسندیدہ جملوں پر نشان لگاتے گئے۔ بعد میں میں ایک دوسرا نسخہ ان کی خدمت میں پیش کرکے نشان زدہ نسخہ سے لے لیا۔ اس نسخے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی حضرت سلطان المشائخؒ کے دیرینہ عقیدت مند ہیں۔ انھیں اولیا اللہ سے والہانہ محبت ہے اور وہ دینی فرائض کی بجا آوری، اہمیت اور ضرورت سب کے قائل ہیں۔ ان کے اس انداز فکر وروش سے مجھے بے اختیار مولانا حسرت موہانی یاد آئے جو ایک ہمہ جہتی بزرگ تھے۔ دین کے دلدادہ اور پابند، اولیا اللہ کے عاشق، عوامی اشتراک واقتدار کے زبردست حامی اور اپنے قول وفعل پر ہر حال میں قائم رہنے والے انسان۔ نیازی صاحب کے کردار میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ بھی دین کے دلدادہ ہیں، اولیا اللہ کے عاشق ہیں اور فکر ونظر میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کے بھی قائل ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ "دبستان نظامؒ" ان کے سرہانے رکھی رہتی ہے اور وہ اکثر اس کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

نیازی صاحب کا یہ ذوق دیکھ کر میں نے مرشدی واستادی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب قبلہ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ انھیں بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے ایک مرید محبوب صاحب نے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر صاحب قبلہ کی ایک تصویر بھی ہے (اگرچہ قبلہ تصویر کھنچوانے کے حق میں نہیں ہیں)۔ دوسرے دن نیازی صاحب نے مجھ سے کہا، "میں نے آج تک ایسا وجیہ، نورانی، اور دلآویز چہرہ نہیں دیکھا۔ آنکھوں میں غیر معمولی کشش اور کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ جس شخص کے چہرے سے اتنا نور، وجاہت اور بزرگی ٹپکتی ہو وہ بڑے روحانی مرتبے کا حامل ہوگا۔" مجھے ان کے یہ خیالات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

کچھ دن کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ اتفاق کیا ہوا، حیدرآباد گیا ہی اسی وجہ سے تھا کہ حاضری کی سعادت حاصل ہو۔ حاضری کے موقعے پر میں نے نیازی صاحب کا تذکرہ بھی کیا اور ان کا تاثر بھی بیان کردیا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے فرمایا، "کراچی جاکر آپ نیازی صاحب سے میرا سلام کہہ دیں۔" چنانچہ میں نے واپس آکر نیازی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کا سلام پہنچادیا۔ متاثر تو وہ پہلے سے تھے، اب سچ مچ عقیدت مند ہوگئے۔ ان دنوں وہ ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ یہ الجھن کسی قدر تفصیل کی متقاضی ہے۔

نیازی صاحب کے دو بیٹے ہیں۔ حارث ضمیر اور جنید ضمیر۔ میں بھول گیا، دو نہیں تین ہیں۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے ہیں آصف اسلم میرا تیسرا بیٹا ہے۔ میں ان کی یہ بات سنتا ہوں تو مجھے تفریح طبع کے طور پر ایک مثل یاد آتی ہے۔ بڑھاپے کی ایک خرابی یہ بھی ہے مجھے ہر لفظ اور خیال کے ساتھ کوئی شعر، کوئی ضرب المثل یا کوئی

محاورہ یاد آتا ہے۔ میرے سارے گھر والے میری اس یادداشت سے محظوظ ہونے کے بجائے اس سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو تیسرے بیٹے کی مناسبت سے مجھے ایک مثل یاد آتی ہے۔ ''تیسرا بیٹا راج رجائے، تیسری بیٹی بھیک منگائے۔'' بظاہر یہاں اس مثل کا کوئی موقعہ نہیں لیکن بڑھاپے کا چونچلا کس سے چھوٹتا ہے جو میں چھوڑ دوں۔ نیازی صاحب کے اسی تیسرے بیٹے کے راج رجانے کی وجہ سے مجھے ان کا نیاز حاصل ہوا ہے۔ انھوں نے دونوں بیٹوں کی شادی میں یہ التزام کیا ہے کہ حارث کے لئے بہن کی لڑکی لائے اور جنید کے لئے سالی کی لڑکی۔ ان کی بہن بمبئی میں رہتی ہیں اور ان کی دو ہی بیٹیاں ہیں۔ بڑی کی شادی حارث سے ہوئی۔ چھوٹی کی شادی اسی سال جولائی کی سترہ تاریخ کو بمبئی میں ہونا تھی۔ یہی وہ دور تھا جب پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کارگل کی وجہ سے کشیدگی کی انتہائی کو پہنچے ہوئے تھے۔ بڑی تناتنی تھی۔ ادھر چھوٹی بہن کی شادی سر پر، ادھر تعلقات میں یہ کشیدگی۔ آنا جانا دشوار، فضا مخدوش، حالات ناموافق، بڑی بہن بے چاری حق حیران، ہر وقت مغموم آنسو ہیں کہ امنڈے آرہے ہیں اور نیازی صاحب اسے دیکھتے اور کڑھتے رہتے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے۔ بڑے پریشان تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ ''ڈاکٹر صاحب قبلہ کو دعا کے لئے لکھ دیجئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بھیجوں یا نہ بھیجوں۔'' میں نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو خط لکھ دیا۔ فوری طور پر جواب آیا: ''بیٹی خیر سے جائیں خیر سے آئیں۔ اللہ نگہبان ہے۔'' نیازی صاحب کو اس ارشاد سے مطلع کر دیا گیا۔ بہت خوش ہوئے، سارا تردد جاتا رہا۔ بیٹی خیر سے گئیں بھی، شادی میں شریک بھی ہوئیں اور شرکت کے بعد اطمینان و سکون سے گھر پہنچ گئیں۔ نیازی صاحب نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کے اس خط کا عکس منگوا کر اپنے پاس بطور سند رکھ لیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آپ اصل خط ہی لے لیجیے، لیکن انھوں نے عکس پر اکتفا کیا۔ ایسا اعتماد اور یقین بہت بڑی بات ہے۔ مجھے ان کے اعتماد اور یقین کا تھوڑا بہت اندازہ خیریت کے جواب میں ان کے الفاظ ''اللہ، اللہ کا کرم'' ہی سن کر ہو گیا تھا۔ اب تو میں ان کی خوش عقیدگی اور بزرگان دین سے محبت کا بھی قائل ہوں۔

نیازی صاحب کے بارے میں یہ ساری باتیں تو ہو گئیں مگر آج کل کا زمانہ کچھ اور ہے۔ محض تعمیر سے کام نہیں چلتا، ڈی کانسٹرکشن کو بھی ناگزیر سمجھا جاتا ہے، تو اس نقطۂ نظر سے نیازی صاحب کے یہاں اضطراب بہت ہے۔ ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن میں مبتلا رہتے ہیں اور ارادے باندھتے رہتے ہیں۔ جب وہ ارادے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتے تو جلتے رہتے ہیں، پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ ہر شخص ان کی طرف دیانت دار، صاحب استقامت اور سخت کوش ہو جائے۔ اور جب لوگ ان باتوں سے پہلو تہی کرتے ہیں تو انھیں جھنجلاہٹ بھی ہوتی ہے اور صدمہ بھی ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی جھنجلاہٹ اور صدمے کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے اس لئے اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔

لیٹے لیٹے مستقل کتابیں پڑھتے رہنے سے نیازی صاحب کو یہ شوق ہو گیا ہے کہ ان کی طرح ہر شخص ہر کتاب فوری طور پر پڑھ ڈالے۔ کتاب کو قاری تک پہنچانے کے لئے وہ اس کی اشاعت کا منصوبہ بناتے ہیں، پبلشروں سے بات کرتے ہیں۔ پبلشر شروع شروع میں ان کے خوش کرنے کو ہاں ہاں کرتے ہیں لیکن اپنی روایتی سہل انگاروں اور غفلت سے کام لیتے ہیں۔ اس طرز عمل سے نیاز صاحب کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اس مایوسی کے ساتھ شاید انھیں اپنی بیچارگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

درد و غم کی برداشت میں نیازی صاحب خود کفیل ہیں۔ کیا مجال کہ اپنی تکلیف کا اظہار کریں۔ احباب کو تو جانے دیجیے، گھر والوں کو بھی اپنی تکلیف سے آشنا کرنا اپنے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اصول سے گھر والوں اور احباب کو تکلیف ہوتی ہے، مگر نیازی صاحب تو نیازی صاحب ہیں، کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ حالانکہ یہی نیازی صاحب کسی دوسرے کو تکلیف کا حال سن لیتے ہیں تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ ہم ایک شام کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم نیازی چلی آرہی ہیں۔ خوش آمدید، صفا آوردید، اب سے دوران دنوں آصف بیمار تھے۔ بیگم نیازی نے اطلاع دی کہ نیازی صاحب خود تو آ نہیں سکتے لہٰذا تسلی دینے اور خیریت معلوم کرنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ حال دریافت کرنے آئی ہوں۔ مگر یہی نیازی صاحب اپنے حوالے سے سونٹھ کی ناس لئے رہتے ہیں۔ اشتراکی نقطہ نظر پسند کرتے ہیں مگر درد و غم کی برداشت میں اشتراک نہیں کرتے۔

حالات کی بے ربطی اور حق کی بے وقری سے نیازی صاحب کسی قدر زود رنج بھی ہو گئے ہیں، مگر ان کی زود رنجی ایک لہر کی طرح ہے۔ ادھر اٹھی اور ادھر ختم ہوئی۔ دوستوں، جاننے والوں، عزیزوں، رفقائے کار اور زمانے کی بے راہروی نے انھیں تکلیفیں بھی پہنچائی ہیں۔ نہ جانے کتنے بدتوفیقوں سے ان کا واسطہ پڑا ہے۔ اور وہ ذاتی الم انگیزی کی داستانوں کا ایک پورا سلسلہ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں لیکن ان کا اظہار نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کرتے۔ لاکھ کرید ڈالئے مگر بس ہوں ہاں سے آگے نہیں بڑھتے۔ میری رائے میں یہ بڑی زیادتی ہے۔ میں عیب پوشی کو اچھی صفت سمجھتا ہوں لیکن جب عیب زیادتی اور جرم کی حیثیت اختیار کرلے تو اس کا اخفا مناسب ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ اور بزر مہربان لیٹواں پیڑ کا فیض اپنی جگہ۔ مجھے معلوم ہے کہ سب کو فیض پہنچانے والا یہ شخص اندر سے کتنا دکھی اور ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کی بیگانۂ ہوش و حواس بوڑھی ماں بمبئی میں اپنے بیٹے کے آنے کی راہ تک رہی ہیں مگر انھیں کون سمجھائے، کس طرح سمجھائے کہ بیٹا اب ان کے پاس نہیں آسکتا۔ وہ دنیا کو فیض پہنچانے، حق اور انصاف کا پرچم بلند رکھنے، لکھے ہوئے لفظ کی حرمت اور طاقت برقرار رکھنے کی دھن میں بذات خود تندرستی، صحت، توانائی اور جسمانی فعلیت کی ہر شق سے محروم ہو گیا ہے۔ تڑپتا رہتا ہے لیکن تڑپ کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اس بزرگ مہربان نے لیٹواں پیڑ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ سب کچھ سن رہا ہے۔ سب کو فیض پہنچا رہا ہے۔ مگر خود بالکل خاموش ہے۔ اس کی نوائے خاموش کون سمجھے گا۔ بظاہر اس کی زندگی کی روش آسان نظر آتی ہے لیکن بقول غالب ؎

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

☆☆☆

سات ملیالی نظمیں

کے۔ سچیدانندن، ترجمہ اسلم مرزا

شمارہ ۲۶۰
ستمبر ۲۰۰۲

(۱)

اندھا جس نے سورج دریافت کیا

"سورج کیسا لگتا ہے؟"
اک اندھے نے
اک مشعل بردار جلوسی سے پوچھا۔
"بالکل اس مشعل کی طرح۔"
اندھے نے وہ جلتی مشعل چھو لی
رات گئے پھر
اندھے پر نامعلوم سمت سے
کسی شخص نے
گرم، کھولتا پانی پھینکا
"یہ سورج ہے۔" اس اندھے نے سوچا

جینڈ بجانے والے سے اندھے نے پوچھا
'سورج کیسا لگتا ہے؟"
"بالکل اس نقارے کی طرح۔"
نقارے پر اس اندھے نے اک ضرب لگائی۔
بہت سویرے
نوبت نے اعلان کیا جب موت کا
اندھے نے سوچا، "یہ سورج ہے۔"

"سورج کیسا لگتا ہے؟"
دوسرے دن اندھے نے مچھوارے سے پوچھا۔
"اسی سمندر جیسا۔"

وہیں، سمندر میں اندھے نے گہرا غوطہ مارا
مونگے کی چٹان سے اس کے ہاتھ جلے
اسے اڑائے لئے پھرے
کچھ دیر سمندر کے گھوڑے
اور بنات البحر کے محلوں میں لے پہنچے
سیپیوں، موتیوں اور خس وخاشاک کے
اجلے بستر پر
اندھا گہری نیند میں ڈوبا سوچ رہا تھا
اس نے سوچا
اب میں سمجھا سورج کیسا لگتا ہے
لیکن میں تو انھیں نہیں سمجھا سکتا
جن کی اپنی آنکھیں ہیں
لیکن وہ سب
جنھوں نے اب تک یہ نہیں سیکھا
انھیں سکھایا جا سکتا ہے
لیکن میں نے جو سمجھا، محسوس کیا
انھیں میں یہ سب آخر کیسے سکھا سکوں گا؟

تہ میں سمندر کی وہ اندھا
یوں ہی اب تک لیٹا ہے
استقبال کو
دریانوردوں کے، جو آنے والے ہیں

(۲)

ناگ پھنی

کانٹے مری زبان ہیں
میں اپنی موجودگی کا اعلان کرتا ہوں
خونی لمس کے ساتھ

کبھی یہ کانٹے پھول تھے
میں ان پریموں پر رشک کرتا ہوں
جو دھوکا دیتے ہیں

باغوں کی طرف جانے کے لئے
شاعروں نے
صحراؤں کو تج دیا ہے
اب یہاں صرف اونٹ رہتے ہیں
اور ان کے ساتھ ان کے تاجر
جو میرے پھولوں کو
خاک میں ملاتے ہیں
ایک کانٹا
گراں بہا، پانی کی بوند کے لئے
میں تتلیوں کو نہیں ورغلاتا
کوئی پرندہ میری تعریف میں گیت نہیں گاتا
میں قحط کا شکار نہیں ہوتا

میں ایک ایسی خوبصورتی خلق کرتا ہوں
جو چاندنی سے پرے ہے
خوابوں کے اس طرف
مہین، تیز، دھاردار
زبان کی طرح

(۳)

شاعری کا ترجمہ

شاعری کا ترجمہ نقل زمانی ہے
جیسے مچھلی پانی میں غوطہ لگاتی ہے
مترجم ذہنوں کے بیچ سے گذرتا ہے
ہر لفظ کے ساحل پر
دبیز ریت میں گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے
اک اک سیپ کے رنگ کا مطالعہ کرتا ہے
اک اک ناقوس کو بجاتا ہے

شاعری کا ترجمہ
وکرم دت کی کہانی

مترجم دوسرے شاعر کا سر اپنے شانوں پر رکھتا ہے
ہر مصرع جنگ، غربت اور بوریت
سے مجروح گلی کی طرح
موسیقی سے بھرپور
ایک کوچہ جہاں غیر فانی انسان
دیوتا اور درخت ہوتے ہیں
جہاں ایک گلی ختم ہوتی ہے

وہاں ایک نئی بھول بھلیاں شروع ہوتی ہے
خاموشی کے تالاب میں مردہ روحیں اپنی
پیاس بجھاتی ہیں

اور وہ جو اس سمت آتے ہیں
اپنے جوتے اتار لیں، اپنے کپڑے اتار لیں
یہاں برہنہ داخل ہوں
جیسے وادیوں میں ہوا

ایک دن میں نے خود کو خواب میں دیکھا
اپنی ہی شاعری کا ترجمہ
اپنی ہی زبان میں کرتے ہوئے

ہم سب نظموں کا ترجمہ کرتے ہیں
ہم سب ایک اک نظم کا ترجمہ
اپنی اپنی زبانوں میں کرتے ہیں
اور ان کے معنی پر جھگڑتے ہیں

مجھے افسوس ہوتا ہے کہ
بڑبڑاہٹ کبھی مکمل نہیں ہوگی

(۴)
گاندھی اور شاعری

بہت کمزور، لاغر، دبلی پتلی نظم
اک دن گاندھی جی کے آشرم پر
صبح دم پہنچی تو درشن بھی ہوئے

گاندھی جی چرخے پر اپنے منہمک تھے
رام کی جانب تھا دھاگا، اس گھڑی
نظم کی جانب نظر اٹھی نہیں

سر جھکائے دیر تک یوں ہی کھڑی تھی
آشرم کے گیٹ پر
نظم شرمائی کہ گاندھی کی توجہ اس کی جانب
کیوں نہیں؟
دل میں سوچا،
میں بھجن بن کر اگر آتی تو اچھا تھا
بے خیالی میں کھنکھارا نظم نے
گاندھی جی نے اپنے دائیں بائیں دیکھا
اپنی اس عینک کے شیشوں سے جو
جہنم کے نظارے کر چکے تھے

لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ جاگ اٹھی
گاندھی جی نے نظم سے پوچھا:
''بتاؤ سوت کاتا ہے کبھی تم نے؟
کسی بھنگی کی گاڑی کو دھکیلا ہے؟
دھواں جھیلا ہے اپلوں اور لکڑی کا گجر دم
جو اٹھا کرتا ہے چولھوں سے؟
کبھی بھوکی رہی ہو تم؟''

اس دبلی پتلی نظم نے کہا
''باپو،
کوئی شکاری تھا میں جس کے منھ میں
اک گھنے جنگل میں جنمی
جھونپڑوں میں ماہی گیروں کے پلی
لیکن وہ سوال ابھی جو آپ نے پوچھے ہیں
ایسا کوئی بھی کارنمایاں میں نہ کر سکی ہوں
اب تک۔ مگر ہاں
صرف گاتی ہوں۔
بہت پہلے درباروں میں گاتی تھی
تب میری صحت بھی اچھی تھی
مگر اب دیکھیے میں سڑکوں پر
آ گئی ہوں، آدھا پیٹ۔''

شرارت سے بھرے گہرے تبسم سے گاندھی نے کہا
''اچھا ہے،
مگر تم گفتگو کے درمیان
جو سنسکرت کے لفظ لاتی ہو
یہ عادت تمھیں چھوڑنی ہوگی
اٹھو، کھیتوں پر جاؤ
اور باتیں سنو کسانوں کی۔''

اچانک دبلی پتلی نظم کا روپ
دانے میں بدل گیا
وہ اک کھیت میں جا کر گر پڑی اور
اب منتظر ہے
کوئی ہل شاید ادھر آئے
کنواری کالی دھرتی کو پلٹ دے
نیچے اوپر۔
اور بارش کی ترنم ریز بوندیں
اس کو نم کر دیں

(۵)

ڈھول

ایک بچہ
یہ جاننے کا خواہاں
ڈھول کی آواز کہاں سے آتی ہے،
میں نے ایک مرتبہ اس کا ڈھکن اٹھایا
اور اندر جھانک کر دیکھا

وہاں ایک جنگل تھا
اور وحشی جانور گھوم رہے تھے
مسلسل بارش ہو رہی تھی
دریاؤں میں طغیانی تھی
ہوائیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں
کالے آسمان کے نیچے
ایک جنگلی دیوتا
بگل بجا رہا تھا
میں نے لرزتے ہاتھوں سے
ڈھکن دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا

اب میں جب بھی ڈھول کی آواز سنتا ہوں
میں ایک جنگل میں پہنچ جاتا ہوں
موسلا دھار بارش میں ایک جزیرے پر
جو سمندر کے بیچ میں ہے
اور وہاں انتظار کرتا ہوں
دھن کے بند ہونے کا
اور سورج کے نکلنے کا جو پہاڑی کی چوٹی میں ہے
اور زمین کی سمت سے
اپنے دوست کے آنے کا
اس کے ہاتھوں میں پھول ہوں گے اور
قلم ہوگا

(۶)

روزانہ

روزانہ ایک پیالہ ٹوٹتا ہے
اس میں سے سورج بہہ نکلتا ہے
ابلتا ہوا

روزانہ اک انڈا پھوٹتا ہے
اس کے پروں سے بہار کے
پانچ رنگ کھلتے ہیں
اس کے گیتوں سے

روزانہ جب موسم بہار کھلتا ہے
اس میں سے بچے نکلتے ہیں
قہقہے لگاتے ہوئے

روزانہ جب کوئی دل ٹوٹتا ہے
اس میں سے شاعری پھوٹتی ہے
اور منجمد ہو جاتی ہے

(۷)

وقت

جب میں چار سال کا تھا
تب مجھے علم تھا کہ وقت اچانک رک جائے گا
جیسے کالی چیونٹی کے پیر باندھ دیئے جائیں

یہ نہیں کہ میں نے کوشش نہیں کی
لیکن اسکول کی گھنٹی اب بھی بجتی ہے
آج بھی رات
اپنے بالوں میں الوؤں کو سجائے آتی ہے

میں نے دوڑتے ہوئے گیدڑ کو
اس کی دم سے پکڑنے کی کوشش کی
لیکن اس نے زوردار چیخ ماری
وقت نہیں رکا

پھر میں نے جادوئی منتروں سے
ایک عورت کے بالوں میں بندھی ہوئی
چھپکلی کو چھت کی طرف پھینکا
آتش دان کی چمنی میں
سرسوں کے بیج کے ساتھ
کوے کے کٹے ہوئے پر پھینکے
اور ریشم کے کیڑے کے بالوں کو
بحری صدفیہ میں داخل کیا
جنگلی بلی کی بصارت چرا کر
اندھی چاندنی کو قرض میں دے دی
شیر کی گردن سے بال نکال کر
چیختے ہوئے سورج پر چسپاں کر دیئے
لیکن سب بے کار

پھولوں کو بے ترتیب کرنے کے لئے تب شام آئی
صبح آئی
بہن کا چہرہ لئے
صبح تاخیر سے اٹھے چہرے پر
پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے
وہ سب جو بیدار ہوئے تھے
اس طرف پروان چڑھے
اور وہ جو سب مر گئے
دوسری سمت پروان چڑھے

ایک دن اسکول سے لوٹتے ہوئے
میں نے ایک بڈھے کو دیکھا
اس کی آنکھوں پر محدب عدسہ تھا
اور کانچ کے شیلف کے پیچھے بیٹھا
وہ گھڑیاں درست کر رہا تھا
اس کے شیلف پر
بے شمار مردہ گھڑیاں تھیں

اس لمحہ مجھے معلوم ہوا، کیوں
وقت کبھی رکتا نہیں

اسماراجہ

شمارہ ۱۶۶،
نومبر دسمبر ۱۹۹۲

ایک محبت

میں نے اس کا منھ چڑایا
اسے تنگ جوتے پہنا دیئے
اسے ٹھوکر مار کر زمین پر گرادیا
پھر بھی جب وہ اٹھ کھڑی ہوئی
تو میں نے ایک موٹا رسا اس کے گلے میں ڈال کر پنکھے سے لٹکا دیا
اور انہماک سے اسے مرتا ہوا دیکھنے لگی
اسے مرتے ہوئے کئی برس گذر گئے ہیں
مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا
وہ میرا منھ چڑاتی ہے
مجھے ٹھوکر مار کر گرا دیتی ہے
اور پھر روز میرے مرنے کا تماشا دیکھتی ہے

شمارہ ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

خدا کے بغیر ایک دن

اگر کسی دن
ہم یہ سوچ لیں
کہ اس جہان کا کوئی خدا نہیں ہے
سزا اور جزا کی میزانیں
اٹھا دی گئی ہیں
سچ اور جھوٹ کا کوئی فیصلہ
تلافی اور مکافات کی کوئی صورت
کسی اور دنیا میں
اب ممکن نہیں ہے
عالم غیب ایک وہم ہے
زندگی
بس یہی لمحۂ موجود ہے
ماسوا کچھ بھی نہیں

اگر ہم یہ سوچ لیں
تو پھر اس زندگی کو
ہم اس طرح سے گذاریں
کہ ساری عمر کی محرومیوں
اور ناکامیوں کا
ایک ہی دن میں ازالہ کریں

اسما راجہ

شمارہ ۲۶۸، مئی ۲۰۰۳

مجھے اپنا دل پسند ہے

مجھے ہوا بہت پسند ہے
اور پانی
شور مچاتا ہوا
اور بھڑکتی ہوئی آگ
اور مجھے تم پسند ہو
سنہری مٹی سے بنے ہوئے
اور مجھے اپنا دل پسند ہے
جو اس مٹی میں
دفن ہونا چاہتا ہے

مٹی

جب ہمارے ساتھ رہنے والے
بے درد اور حاسد ہوں
اور ہمارے چاہنے والوں کے پول کھل جائیں
جب ہمیں جھوٹے وعدوں پر اعتبار کرنا پڑے
جب ساری راہیں مسدود ہو جائیں
اور جب ایک تیز دھار آلے سے
اپنا گلا کاٹنے کے بعد
ہمیں زندہ رہنا پڑے
تو پھر دنیا مٹی کا ایک معمولی ڈھیر لگتی ہے
اور ہم ایک زرد آنکھوں والے
بیمار بلے کی طرح
اپنے پنجوں سے
یہ مٹی کھودنے لگتے ہیں

پرندہ کھانے کو مانگتا ہے

دانہ
مٹی
کنکر
کیچوے
پنیر
پاروٹی کا ٹکڑا
نہیں
پرندہ میرا دل مانگتا ہے

اسنیٰ بدر زبیری

شمارہ نمبر ۱۸۴
جون جولائی ۱۹۹۵

غزل

سب کے بارے میں سوچتی تھی میں
پہلے کتنی عجیب سی تھی میں

زندگی اب بھی تو سلامت ہے
تیرے اندر تو جی رہی تھی میں

پھر وہ اک بات یاد آئی نہیں
جانے کیا سوچ کر ہنسی تھی میں

مجھ کو اونچا اٹھا کے بھول گئی
باد صرصر تری سکھی تھی میں

خواب کے اک مہیب جنگل میں
ایک مدت سے سو رہی تھی میں

کوئی آیا نہیں جگانے کو
خس و خاشاک میں چھپی تھی میں

شمارہ ۱۹۰،
جنوری ۱۹۹۶

واپسی

اپنے اندر
نت نئی تبدیلیاں محسوس کرتی ہوں
ہزاروں سال کے بچھڑے
تمھاری بازیابی کس طرح سے ہو رہی ہے
کس طرح سے تم مرے خالی بدن میں اپنی
ہستی بھر رہے ہو
یوں تو بس اک چند ہی دن گذرے
لیکن مجھ کو لگتا ہے
حمل کا آخری دن ہے
مری تکلیف تم جانو گے کیا
سمجھو گے کیا
تم نے ابھی دنیا کہاں دیکھی ہے
تم میرے سوا یوں
اور کس پر آشکارا ہو
اور ابھی میرے لئے بھی
آسماں سے جھانکتا
ننھا ستارہ ہو

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

ایک نظم

آنسوؤں کی بنیاد پر
میں گھر نہیں بنا سکی
دکھے ہوئے دلوں کی زمین پر
پاؤں نہیں جما سکی
اب عمر بھر اکیلی رہوں گی اور
ہمیشہ دوسروں کو قصوروار ٹھہراتی رہوں گی

شاعری کا پرندہ

اصغر ندیم سید

شمارہ ۱۶۸،
مارچ تا مئی ۱۹۹۳

شاعری کا پرندہ
مجھے اس کے گھر لے گیا
اس کے باورچی خانے سے شہد
اور تار پر لٹکی قمیص سے محبت مانگی

شاعری کا پرندہ
مجھے باغ میں لے گیا
جہاں انار کے درخت پر چڑیا اپنا نغمہ بھول گئی تھی
میں نے وہ نغمہ اٹھایا اور
گیندے کے پھول میں چھپا دیا
ایک عرصے بعد یہ نغمہ بیج بن کر گر پڑا
اور نغموں کا باغ بن گیا

شاعری کا پرندہ
مجھے خوبصورت ہونٹوں والی عورت کے پاس لے گیا
میں نے اسے اتنا دیکھا
کہ میری روشنی سفید پرندہ بن کر اڑ گئی
پھر میں نے اپنی بانسری کے سروں سے بہشت کے
پرندوں کو اپنی جانب بلایا
اور گیت گایا
اس کی شام کا
اس کی سرگوشی میں لپٹے ہوئے بوسے کا
پھر ہم نے اپنے بوسوں کی گرہیں لگا کر
سمندر کے لئے ایک چادر کاتی
دنیا کے لئے لباس بنا
اور ایک نیند دریافت کی
جس میں ڈوب کر ہم نے خواب کا ایک پھول اٹھایا
اس پھول میں ایک صبح قید تھی
جسے ہم نے رہا کرا دیا

شاعری کا پرندہ
مجھے انسانوں کے درمیان لے گیا
اور کہا ان سب کی روح مجھ میں ہے
یہ سب مل کر مجھے مار دینا چاہتے ہیں
میں شاعری کے پرندے کو اپنے گھر لے گیا
اور اسے اپنے خواب میں چھپا لیا

اطہر نفیس

شمارہ ۹۹،
جون ۱۹۷۰

دل کی مسرتیں نئی جاں کا ملال ہے نیا
میری غزل میں آج پھر ایک سوال ہے نیا

اب جو کھلے ہیں دل میں پھول ان کی بہار ہے نئی
اب جو لگی ہے دل میں آگ اس کا جلال ہے نیا

اس کے لئے بھی غمزۂ و ناز و ادا کا وقت ہے
اپنے لئے بھی موسم ہجر و وصال ہے نیا

اس میں بھی خودنمائی کے رنگ بہت ہیں ان دنوں
اپنے لئے بھی عرصۂ خواب و خیال ہے نیا

جاگ اٹھا ہے اک چمن میری حدود ذات میں
اس کے لئے قریب ہی دشت ملال ہے نیا

لذت قرب کے چراغ روح میں جل اٹھے ہیں آج
سوز و گداز ہجر میں شامل حال ہے نیا

جھوم اٹھے ہیں برگ و بار پھول کھلے ہیں بے شمار
اے مری روح بے قرار تیرا تو حال ہے نیا

شمارہ ۱۱۲
مئی تا جولائی ۱۹۷۹

کیا وقت پڑا ہے ترے آشفتہ سروں پر
اب دشت میں ملتے نہیں ملتے ہیں گھروں پر

پہچان لو اس خاک رہ حرص و ہوا کو
قدموں سے یہ اٹھتی ہے تو گرتی ہے سروں پر

خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

سوغات سمجھتے تھے جسے دشت وفا کی
وہ خاک بھی سجتی نہیں اب اپنے سروں پر

ابھرا نہ ترا حسن خدو خال ابھی تک
تصویر تری قرض ہے تصویر گروں پر

کانٹے بھی چنے راہ کے پتھر بھی ہٹائے
منزل نہ ہوئی سہل مگر ہم سفروں پر

پھر پکے مکانوں کے مکیں خندہ بلب ہیں
یلغار ہے دریاؤں کی پھر کچے گھروں پر

اظہار الاسلام

شمارہ نمبر ۲۱۶،
مئی ۱۹۹۸

پچھلی رات سے وہ بے چین تھا، مگر بے چین کیوں تھا؟ کلب میں وہ رات گئے تک تاش کھیلتا رہا، ہر بار اپنے حصے کے اکیس پتے اٹھاتا تو تین رن لگ کر آتے۔ ایک ہی عدد اور رنگ کے تین کارڈ، چوائس کارڈ بھی اس کے حصے میں آتے، کبھی کبھی وہ گراؤنڈ شو بھی کرتا، کارڈ کھینچ کر اس نے کئی بار میریج بھی بنائی۔ اسے لگ رہا تھا پچھلے کئی دنوں کی ہار کے بعد آج سود سمیت جیت واپس مل جائے گی۔ بظاہر وہ اطمینان سے کھیل رہا تھا مگر اندر ہی اندر ایک بے قراری ناگن کی طرح اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کیے جا رہی تھی۔

جب وہ کلب سے نکلا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی، اس کے ہاتھ اسکوٹر کے ہینڈل پر جم گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پوسٹ آفس کے سامنے والی دکان بند نہ ہو جائے۔ اس نے دکان تک پہنچ کر اسکوٹر اسٹینڈ کیا۔ دکان دار تالا بند کر رہا تھا۔ اس کی طلب پر اس نے پریمیم وسکی کی ایک بوتل اسے دے دی۔

گھر پہنچ کر کسی کو جگانا اسے مناسب نہیں لگا۔ لباس تبدیل کر کے اس نے ٹی وی آن کی۔ گلاس اور کچھ مکسچر لے کر بیٹھ گیا۔ اس کی بے چینی بدستور قائم تھی۔ اس نے اس درمیان کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

کیا کچھ ہونے والا ہے یا کہیں کچھ ہو چکا ہے؟ وہ درمیانی سرے کی تلاش میں تھا۔

اس نے ایک اور پیگ بنایا، چسکی لے کر اس نے گلاس سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے دن بھر کے حالات پر نظر ڈالی۔ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی تھی، وہ کویتا کے گھر بھی گیا تھا، اگر وہ ایک دو ہفتے اس کے ہاں نہ جاتا تو اس کا منہ پھول جاتا۔ ویسے وہ آج بھی اینٹھی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر دو تین دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ خوابوں کے پرستان میں سیر کرنے والی عورت تھی۔ وہ بے رحم حقائق کے پتھروں سے چکنا چور تھی۔ اسی لئے اس نے اس کی ذات میں پناہ ڈھونڈ لی۔ دونوں گھنٹہ بھر بستر کی شکن گنتے رہے۔

دن تو بیت گیا۔ رات بھی آدھی گذر چکی تھی۔ اس نے کھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ پیگ پر پیگ چڑھاتا چلا گیا۔ نیلو دوسرے کمرے میں بچوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اس نے نیا پیکٹ کھول کر سگریٹ ہونٹوں سے لگایا اور اندر تک کش کھینچ کر اسے ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

شروع شروع میں بہت ضد کرنے پر نیلو ایک آدھ پیگ تک اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس نے کئی بار اسے زبردستی سگریٹ بھی پلائی تھی مگر ہر بار اس پر کھانسی کے دورے پڑ جاتے تھے۔ جس دن وہ تھوڑی سی پی لیتی ایک دم سے وہ مختلف ہو جاتی۔ اسے تھوڑی سی ہی میں نشہ ہو جاتا۔ اس حالت میں وہ اس کی ہر خواہش پوری کر دیتی۔

اسے بھوک محسوس ہوئی۔ فریج میں اس کے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فریج کے اوپر ہاٹ پیک میں کچھ تھا۔ اس نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے کھاتے کھاتے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ میڈانا Papa don't preach گا رہی تھی۔ اس کے پاس میڈنا کے Blue truth کے علاوہ Erotica اور Evita کے البم بھی تھے۔ گانے کے ساتھ ساتھ اس کا کھانا ختم ہو گیا۔ اس نے پلیٹ سنک میں رکھ کر واش بیسن میں ہاتھ دھوئے۔ میڈانا کا دوسرا گانا چل رہا تھا۔ کبھی وہ ہوٹل کے ٹیبل پر ہوتی اور کبھی کسی نوجوان کے ساتھ بستر میں۔ میڈانا کے سارے گانے ایک کے بعد ایک آ رہے تھے۔ اس نے ان لمحوں میں نیلو کو شریک کرنا چاہا مگر وہ کسمسا کر سو گئی۔

رات کی خاموشی میں اسے سناٹا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس نے بوتل اور گلاس کیبنٹ میں رکھ دیئے۔ کھلی کھڑکی سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ اس نے باہر دیکھا۔ آسمان میں سردی سے ٹھٹھرا ہوا چاند کپکپا رہا تھا۔ ویسے اسے سورج سے زیادہ چاند پسند تھا۔ سورج تو ہمیشہ ذمہ داری کا احساس دلاتا۔ جب کہ چاند اس کی نس نس میں چاندنی بھر دیتا۔ مگر آج چاند بھی اداس تھا، بالکل اس کے اندر کی اداسی کی طرح۔ اور اس رات میں دل کی دھڑکن اور گھڑی کی ٹک ٹک میں کتنی مماثلت ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک لحاف چاند کی طرف بڑھا دے۔ کب تک بے چارہ سردی سے کانپتا رہے گا۔

اس نے سوچا اس کی ساری ہمدردی سارا پیار صرف رات بھر ہی کیوں محدود رہتا ہے؟ سورج جس کے کھلتے ہی افق میں لالی پھیل جاتی ہے۔ بادِ نسیم کا گنگنانا، چڑیوں کا چہکنا، میدانوں کی طرف ریوڑ کا بڑھنا۔ یہ سب تو زندگی کی علامت ہے۔ جاڑے کی دھوپ کتنی پیاری لگتی ہے۔ گرمی کی تیز دھوپ بھلے ہی اس کا جسم چھلنی کیے دیتی ہو مگر فصل بھی تو پکاتی ہے۔ سمندر سے بھاپ سمیٹ کر برسات کے لئے ترل ترل ترانے سجاتی ہے۔ جب بھی جسمانی تکلیف ہوتی ہے تو سارا قصور گیس کا سمجھا

جاتا ہے اور طبیعت میں بے چینی ہو تو ذہن اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگتا ہے۔

اسے یاد آیا کہ شاید کسی خاص کام سے اسے جینی کے ہاں جانا پڑا تھا۔ وہ اس کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ کوئی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ وہ تنہا رہتی ہے۔ وہ جب اس کے ہاں گیا تو رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کی دستک پر اسے دروازہ کھولنے میں دیر لگی۔ وہ پہلی بار اس کے گھر گیا تھا۔ دفتر میں بس ہیلو ہیلو تک تعلق تھا۔ اس لئے وہ خاصا نروس تھا۔ اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے کام کی بات کی مگر اس نے اسے اندر آنے کے لئے کہا تو اس سے انکار نہ ہو سکا۔ اس نے اس کے لئے ڈرنک بنائی۔ ان دنوں وہ شوقیہ کبھی کبھی پی لیتا تھا۔ دو تین پیگ کے بعد اس نے کوئی میوزک لگا دی اور اس سے ڈانس کی فرمائش کی۔ وہ ڈانس وانس نہیں جانتا تھا پھر بھی انکار نہ کر سکا۔ وہ اس کے ساتھ ڈانس کرتی رہی اور دھیرے دھیرے اپنی گرفت اس کے گرد سخت کرتی گئی۔ اس کی آنکھوں میں خطرناک ارادے نظر آئے۔ جیسے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لینا چاہ رہی تھی۔ وہ اس سچویشن کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بالکل آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ ایک محکوم کی طرح اس کے سامنے بے بس تھا۔ اچانک اس نے ایک عجیب سی بات کہی۔ وہ گھوڑا بن جائے۔ اس نے چپ چاپ اس کی بات مان لی۔ وہ بڑی دیر تک اس کی پیٹھ پر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اس کے بال نوچ کر دو تین تھپڑ رسید کرے۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اس کی یہ فرمائش بھی پوری کی۔ پھر اس نے اس کی پتلون سے بیلٹ کھینچ کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نشہ تھا۔ ہر بار اس کے منہ سے ایک کراہ نکلتی۔ اسے پیٹتے پیٹتے وہ تھک گیا اور پلنگ کی پائینتی بیٹھ گیا۔ جینی بستر پر تنہا یوں بل کھا رہی تھی جیسے ناگن اپنے ناگ سے لپٹی پٹخنیاں کھاتی ہو۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اور وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔

دوسرے دن دفتر میں جینی سے ہیلو ہیلو ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند تھی۔ پچھلی رات کے نقوش اس کے چہرے پر نہیں تھے۔ وہ ایک مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔

دوسری بار وہ تیار ہو کر جینی کے گھر گیا۔ اگلے دن وہ دفتر نہیں آئی۔ پتہ چلا کہ اس نے ہفتہ بھر کی چھٹی لے رکھی ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اسے بھولی بسری باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ کیا اس کے دماغ کا نظام بگڑ چکا ہے؟ یہ کیسی بے چینی ہے، کیا ہونے والا ہے؟

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چاند نیند کی آغوش میں لڑھک چکا تھا۔ ساری دنیا سو چکی تھی، وہ کیوں جاگ رہا ہے؟ کیا اس طرح جاگتے جاگتے صبح ہو جائے گی؟

اس کے بائیں ہاتھ میں جلن سی ہو رہی تھی۔ اس نے ہتھیلی کو دیکھا، ایک نیلا داغ پڑ گیا تھا، ساری جلن ہتھیلی کے بیچوں بیچ ہارٹ لائن کے پاس جمع ہو گئی تھی۔ اس نے زور سے انگلیاں موڑ لیں۔ انگوٹھے کو ان پر جما دیا۔ اس کے بائیں ہتھ میں جتنی طاقت تھی اس نے مٹھی کو بھینچے رکھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سارا نشہ کافور ہو گیا۔

ہتھیلی پر ہارٹ لائن کے پاس سکے کے برابر ایک سوراخ تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ اس نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اس سوراخ سے اسے ٹی وی اسکرین، اس کے پیچھے اسٹیلی گراف کا چھوٹا سا پوسٹر، بائیں طرف دیوار پر اقبال اور غالب کی فریم کی ہوئی تصویریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ کیسے ہو گیا، کیوں ہو گیا؟ اب اس کے ہاتھوں کی جلن مٹ چکی تھی۔ اس نے پرس سے ایک سکہ نکالا اور اسے ہتھیلی پر رکھا، لیکن وہ غائب ہو چکا تھا، اس نے ہاتھ ہٹایا، سکہ بستر پر پڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر بالوں کو مٹھیوں میں پکڑ کر زور سے کھینچا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ اپنی تمام تر پریشانیوں کے ساتھ۔ اس نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالی دو بج رہے تھے، ایسے میں کوئی آ جائے تو اسے پاگل ہی سمجھے گا۔ کیا اسے نیلو کو جگانا چاہئے؟

وہ کیا کرے، کہاں جائے؟

آنگن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا امرود کی شاخ پر چاند اٹکا ہوا تھا۔ اس نے ہتھیلی آنکھوں کے سامنے لائی، چاند اداس تھا۔ پتہ نہیں وہ کب سویا۔

صبح نیلو اسے اٹھا رہی تھی، دوسری بار اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی گرما گرم، لیکن اب وہ تیسری بار چائے بنانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسے اٹھنا ہی پڑا۔ پچھلی رات کا Hangover ابھی بھی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں اسے چائے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی، مگر دو چار گھونٹ پینا ہی پڑے۔ اس کا سر بری طرح جھائیں جھائیں کر رہا تھا، اسے رات کی کوئی بات یاد نہ تھی، نیلو کا چہرہ پڑھ کر اسے ایسا لگا جیسے اس نے رات بہت گڑبڑ کی تھی، لیکن اسے تو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ اس نے دیوار گھڑی دیکھی، نو بج رہے تھے۔

وہ روز سوچتا کہ پینا چھوڑ دے۔ مگر شام ہوتے ہی اس کی نیت بدل جاتی۔ پتہ نہیں یہ علت اس نے کیسے پال لی تھی؟ اسے وہ لوگ کتنے اچھے لگتے جو اس موذی کو چھوتے بھی نہیں۔

"کیا نہانا نہیں ہے؟" نیلو اسے گھور رہی تھی۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں" وہ اٹھتا ہوا لڑکھڑایا۔

"کل رات آپ کو کیا ہو گیا تھا، ایسا تو آپ نے پہلے نہیں کیا؟" وہ ناشتے کا برتن سمیٹ رہی تھی۔

"میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا ہے۔" اس نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"پہلے بھی کہہ چکی ہوں، آپ شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"کس کس کو چھوڑوں؟" اس نے ہنسی میں بات ٹالنی چاہی۔

"اب بچے بڑے ہو رہے ہیں، ان کا تو لحاظ کیجئے۔"

"سچ، مجھے کچھ یاد نہیں، کل رات کیا ہوا؟" اس نے آئینے کے سامنے ٹائی کی گرہ درست کی۔

"شام جلد آیئے گا، نمرتا کے ہاں چلنا ہے۔" اس نے اسکوٹر کی چابی بڑھائی، مگر وہ زمین پر گر چکی تھی۔

وہ اس کی ہتھیلی کو گھورنے لگا، جہاں ہارٹ لائن کے پاس ایک سوراخ تھا ☆☆☆

اعجاز احمد

شمارہ ۵۵،
دسمبر ۱۹۷۰

پانچ برس:

ہم، لفظ کے اکتسابوں میں قید،
اک ایسا وجود ڈھونڈتے رہے
جو لیمپ، یا چوڑیوں، یا گل دان کی طرح
ٹھوس اور سالم ہو:

نہ ایسا ناپائدار
جیسے سلگی ہوئی سگرٹ سے لحظہ لحظہ جدا ہوتی
دھوئیں کی کاسنی لٹ

لیکن میرا عشق آج بھی
ایسا گنجلک اور شکستہ شکستہ سا ہے
جیسے تمھاری مسکراہٹ

درد وہی ہیں، چاہت وہی، خوف وہی،
بدن وہی:

نہ چاند، نہ کندن، نہ استعارہ۔

ساتھ:

اپنے پسیجے ہوئے ہاتھ،
یوں کہ جیسے سویرے کی پہلی، نرم کرن
کھڑکی کے اوس بھرے شیشوں پہ اترے،
میرے ہاتھوں پہ رکھ دو۔

دروازوں پہ پولیس نہیں،
یہ ہواؤں کی بھاری دستک ہے
جس سے تم چونک پڑی ہو۔

یہ کپکپاہٹیں نہیں،
خوف کے فشار ہیں جن سے نیند
ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے۔

اعجاز احمد

شمارہ ۶۸
جنوری ۱۹۶۸

ستاروں کا مزاج

مجھے یہ گستاخ ہوا سخت ناپسند ہے

تم کچھ کہو تو لفظ اڑا لے جائے گی
اپنی انگلیوں کی غلیظ کنگھی
ہردم تمھارے بالوں میں پھیرتی ہے
بلا اجازت
غیروں کے سامنے تمھیں چومتی ہے

اور میں کہوں کہ تمھارے آنگن سے ہو کے جب گذرے
تمیز سے گذرے
تو بچوں کی طرح مچلتی ہے
اور جوتے تک نہیں اتارتی

مجھے ستاروں کا مزاج پسند ہے
تمھیں دیکھتے ضرور ہیں
مگر ادب اور احترام کے ساتھ

دور دور سے

موت (۱)

موت آج میرے سامنے ہے
جیسے بیمار کے لئے صحت
جیسے طویل بیماری کے بعد پہلی بار کمرے سے نکلنا ہو

موت آج میری نظر میں ہے
جیسے لوبان کی خوشبو
جیسے آندھی چلے تو چادر میں لپٹنا ہو

موت آج میرے روبرو ہے
جیسے کنول کی سوندھی باس
جیسے نشے کے ساحل پہ پاؤں پسار کے بیٹھنا ہو

موت آج میری نظر میں ہے
جیسے بارش کا خاتمہ
جیسے پردیس میں لڑائیوں کے بعد وطن لوٹنا ہو

موت آج میرے سامنے ہے
جیسے بادل چھٹنے کے بعد آسمان
جیسے برسوں قید رہنے کے بعد گھر دیکھنے کی تمنا ہو

---

(۱) قدیم مصری نظم، بیسویں صدی قبل از مسیح، انگریزی کے توسط سے ترجمہ

افتخار جالب

شمارہ ۱۳،
دسمبر ۱۹۶۸

...علامت کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتوں نے بھان متی کے کنبہ جوڑنے کی جس مسلسل عمل کی راہیں کھولی ہیں، وہ روز بروز اتنا گنجلک ہوتا جا رہا ہے کہ بزعم خود اپنی کہنا کسی کی کہنے کے برابر ہے۔ جو جو کچھ دوسروں کے منہ سے نکلتا ہے اس پر کم وبیش، سوچے سمجھے بغیر، بلا چون وچرا، اپنے کہے کا گمان گزرتا ہے۔ حدیں مسخ ہو گئی ہیں۔ معتبر نامعتبر، فائدہ مند ونقصان دہ اور غلط وصحیح کی تمیز اٹھ جانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی کے گلے میں چھچھوندر نہیں رہی۔ بے لگام کہنے کی اس سہولت سے متمتع ہوتے ہوئے منہ کھولنے میں کوئی قباحت دکھائی نہیں دیتی۔

ابتدائیہ کے طور پر ایک امیج پر نگاہ کیجئے: "ایک بادشاہ کو جواہرات سے محبت تھی۔ ہر روز اپنے حضور منگاتا۔ کہیں وارد غے ذرا دیر کرتے تو اس کا مزاج برہم ہو جاتا۔ اسی واسطے ایک مچھلی سونے کی بنوائی۔ سارے لعل، جواہر یاقوت، ہیرا، پنا، نیلم، موتی، مونگا، کنکر، پتھر بیش قیمت جو کچھ خزانے میں تھا، سب اس پر چڑھوایا اور شب وروز اپنی نظروں تلے رکھنے لگا۔ جو دربار میں بیٹھتا تو تخت کے سامنے دھری رہتی اور سونے کے وقت زیرِ سر تکیہ رکھتا۔"

بھان متی کنبہ جوڑے تو بادشاہ جڑاؤ مچھلی بنوائے۔ کتنی مختلف کاروائیاں ہیں؟ نہیں، ان میں مشابہتیں بھی ہیں۔ اس اختلاف ومشابہت کو گرفت میں لے لیا جائے تو ہزاروں موشگافیوں کے پول کھل جاتے ہیں۔ چار چھ مشابہتوں اور آٹھ دس مغائرتوں کا بہ یک وقت احاطہ کرنے کا وسیلہ استعارہ ہے۔ بچوں کو سمجھانے کے لئے جو یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں چیز فلاں شے کا استعارہ ہے، تو ابتدائیہ کے طور پر غلط نہ تھا۔ معاملہ یہ بھی تھا کہ مشابہتیں اور مغائرتیں عدداً ایک آدھ سے تجاوز نہ کرتی تھیں۔ ان وجوہات کی بدولت چند لوگ ابتدا کو انتہا سمجھ بیٹھے، تو اس میں کچھ ہاتھ حالات کا بھی تھا۔ حالات سدا یکساں نہیں رہتے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ابتدا کو انتہا کہنے والے اپنے خیالات میں تغیر قبول کر لیتے۔ حالات بدل گئے۔ وہ نہیں بدلے۔ کوئی چاہے بھی تو اس برق رفتار تغیر کو روک نہیں سکتا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے چار چھ مغائرتوں اور آٹھ دس مشابہتوں پر محیط استعارے کی تخلیق، تشخیص اور تنقید کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک استعارہ ایک آدھ مشابہت اور مغائرت پر ہی مبنی ہے تو یہ لازمی ہے کہ آپ کہیں کہ فلاں چیز فلاں شے کا استعارہ ہے۔ استعارے میں ایک چیز کا دوسری شے کی نیابت کرنے کا تصور اسی محدودیت کا شاخسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیابت کا یہ تصور استعارے کو نیست ونابود کر کے رکھ دیتا ہے۔ مشابہتوں اور مغائرتوں کو آپس میں گندھا ہوا دکھانے کا کام استعارے کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ انھیں علیٰحدہ علیٰحدہ کرنا منطقی تعقل پسندانہ، تجزیاتی، غیر استعاراتی کاروائی ہے۔

جب مشابہتیں اور مغائرتیں چار چھ سے زائد ہوں تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ فلاں چیز، فلاں شے کا استعارہ ہے۔ استعارہ محدودیت تناظر کو درہم برہم کر کے متعدد مشابہتوں اور مغائرتوں کو ایک وحدت بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مشابہتوں اور مغائرتوں کی یہ وحدت، قائم مقامی اور نیابت کی بساط الٹ کر، استعارہ کو غیر معروضیت کا جواز مہیا کرتے ہوئے علامت کی صف میں لے آتی ہے۔ یوں استعاراتی علم تجریدی مصوری کی غیر معروضیت کا شریک ودخیل بن جاتا ہے۔ آج کل کی تجریدی مصوری اور شاعری کے مخالفین کا اتحاد اس سچائی کی سچائی کا کھلا ثبوت ہے۔ ایلیز یو وائیواس (Elisio Vivas) نے غیر معروضیت کے ضمن میں چند سوال اٹھائے ہیں: اول یہ کہ شعر کو بطور شے دیگر، مثلاً سماجی تاریخ پڑھنے میں کوئی فرق ہے، یا نہیں؟ دوم یہ کہ اگر شعر کو بطور شعر اور شعر کو بطور شے دیگر پڑھنے میں کوئی فرق ہے، تو اس فرق کو کس طرح واضح کیا جا سکتا ہے؟ سوم یہ کہ اگر شعر کو بطور شعر اور شعر اور بطور شے دیگر پڑھنے میں کوئی فرق نہیں تو شعر کو سماجی تاریخ وغیرہ سے کیسے ممیز کیا جا سکتا ہے؟ چہارم یہ کہ اگر شعر اور غیر شعر میں کوئی حد فاصل نہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعر بے مثال قدر اور تفاعل کا حامل ہوتا ہے؟ پنجم یہ کہ اگر شعر بے مثال قدر اور تفاعل کا حامل ہوتا ہے تو یہ صفات کن کن اجزا پر مشتمل ہیں؟

ششم یہ کہ شعر کا مشار الیہ کیا ہوتا ہے؟ یہ تو ایک نیم صداقت ہے ہی کہ شعر کی زبان مشترکہ تجربے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہاں مسئلہ شعر کی زبان کا نہیں فی نفسہٖ شعر کا ہے۔ شعر کا معروض کیا ہوتا ہے؟ کیا شعر اپنی خلقت سے پہلے کی دنیا، موجود دنیا کا اشارہ کناں ہوتا ہے؟ ہفتم یہ کہ اگر شعر اپنی تخلیق سے ماقبل کی دنیا کا اشارہ کناں ہوتا ہے تو کیا یہ دنیا کی نقل اتارتا ہے؟ ہشتم یہ کہ اگر شعر دنیا کی نقل اتارتا ہے تو ہم شیکسپیئر کے ڈرامے کو شپینگلر (Spengler) کی کتاب سے کیسے ممتاز

کرتے ہیں؟ سوالات اس کے سلسلے کا مقصد رومائسس (Mimesis) کے سوا اور کچھ نہیں۔ استعارے کے ذریعے غیر معروضیت کا ارتکاب تجرید کے ذرائع مہیا کرتا ہے۔ غیر معروضیت پر ایک الزام انمل بے جوڑ عناصر کی یکجائی کا ہے۔ منجملہ دیگر اجزا، مضحک صورت حال میں ایک جز وانمل بے جوڑ ضرور ہوتا ہے۔ استعارے کے دائرۂ اختیار میں تجرید غیر معروضیت اور مضحکہ خیزی کو پاکر اچنبھا نہ ہونا چاہئے، کہ خود پکاسو (Picasso) کو اس کا اعتراف ہے کہ شیکسپیئر کی طرح اس کے فن میں اکثر مضحک اور نسبتاً گھٹیا چیزیں پائی جاتی ہیں۔ پکاسو نے مشابہت کو یہیں تک محدود رکھا ہے ورنہ شیکسپیئر کی چمک دار امیجری میں غرق علامتوں کا اس کی تجریدی مصوری سے مماثلت دریافت کرنا قطعاً دور از کار نہیں۔

غیر معروضیت انسانی رفتار میں ہے۔ ممائسس (Mimesis) اور رومائسس کا تصادم دیکھنے کے لئے کہ، استعارہ و تجرید کی کلید ہے، ہیملٹ پر نگاہ کیجئے۔ ایلیٹ (Eliot) کو اس پر اعتراض ہے کہ شے جسے ہیملٹ جذبہ کہنا چاہئے، اپنے مکمل معروضی حوالے اور سیاق وسباق سمیت منصۂ شہود پر آنے سے قاصر رہی ہے۔ شیکسپیئر، ہیملٹ کے لئے موزوں معروضی تلازمہ نہیں ڈھونڈ سکا۔ فنی ہیئت میں اظہار جذبات کا واحد ذریعہ معروضی تلازمہ کی دریافت ہے۔ معروضی تلازمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ واقعات واشیا کے قرینے، صورت حالات اور حوادث کے سلسلے مل جل کر اس طرح ایک مخصوص کلیۂ جذبات کی شکل اختیار کر لیں کہ جوں ہی حسی واردات پر منتج ہونے والے یہ خارجی واقعات واشیا کے قرینے صورت حالات اور حوادث کے سلسلے آموجود ہوں، فی الفور اس جذبے کا صور پھونکا جائے۔

اگر آپ شیکسپیئر کے کسی زیادہ کامیاب ڈرامے کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ قطعی مطابقت مل جائے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ خواب میں چلتی لیڈی میک بتھ کی ذہنی کیفیت کی، تخلیاتی طور پر حسی تاثرات کو مہارت سے مجتمع کر کے، آپ تک ترسیل کی گئی ہے۔ اپنی بیوی کی موت کا سن کر میک بتھ کے منہ سے نکلنے ہوئے کلمات ہم پر یوں وارد ہوتے ہیں کہ ہمیں صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر واقعات واشیا کا قرینہ صورت حالات اور حوادث کا سلسلہ یہی ہو، تو ان کلمات کے ڈھونڈنے کی اس آخری کڑی سے از خود پیدا ہونا لازمی تھا۔ یوں نہیں کہ یہ کلمات میک بتھ کے منہ سے بزور کہلوائے گئے ہیں۔ اس مرحلے پر ڈرامے کے در و بست کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ یہ کلمات ادا ہوں۔ کلمات کی یہ بھرپور معنی انگیز ادائیگی واقعات و اشیا کے قرینے، صورت حالات اور حوادث کے سلسلے سے پیدا ہونے والے معروضی تلازمہ کا منطقی نتیجہ ہے۔ معروضی تلازمہ اور جذبات کی مکمل مطابقت میں فنی ناگزیریت اور محالہ پن مضمر ہے۔ یہ مطابقت ہیملٹ میں مفقود ہے۔ ہیملٹ کردار ایک ایسے جذبے کا اسیر ہے جو ناقابل اظہار ہے کہ جذبہ ڈرامے میں ظاہر ہونے والے واقعات سے زائد ہے۔ اس مقام پر ہیملٹ کردار کی اپنے خالق سے مفروضہ یگانگت سچی اور کھری دکھائی دیتی ہے کہ ہیملٹ کی اپنے احساسات سے مطابقت رکھتے ہوئے معروضی تلازمہ کی عدم موجودگی پر پریشانی، اس پریشانی کو شدید سے شدید تر کرتی ہے، جو اس کے خالق کو اپنے فنی مسائل کی نسبت سے ہے۔

اگر ایک طرف ہیملٹ کردار کو اپنے جذبے سے عین مطابقت رکھتا ہوا معروضی تلازمہ بوکھلاتا ہے تو دوسری طرف شیکسپیئر کے لئے ہیملٹ کی صورت حال سے لگا کھاتی ہوئی فنی ہیئت کی تخلیق سوہان روح بنی ہوئی ہے۔

یوں، ہیملٹ کردار اور شیکسپیئر فن کار ایک ہی مخمصے میں گرفتار ہیں۔ دونوں موزوں معروضی تلازمہ کی دریافت کے لئے سرگراں ہیں۔ ہیملٹ اس مشکل کے سامنے سینہ سپر ہے کہ اس کی حقارت کا سرچشمہ اس کی ماں ہے۔ چونکہ ہیملٹ کی ماں اس حقارت کا مکمل معروضی تلازمہ نہیں بن پاتی اس لئے اس کا یہ جذبہ ماں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لینے کے باوصف فالتو بچ رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو ہیملٹ سمجھ نہیں پاتا۔ وہ اسے معروضی طور پر باہر لا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اسی وجہ سے اس احساس کا زہر اس کی زندگی میں سرایت کر کر عمل کی راہیں مسدود کرتا ہے۔ عمل کی کوئی راہ اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسی طرح شیکسپیئر، پلاٹ سے جو جی چاہے کرے، ہیملٹ کا اس کے لئے اظہار ہو نہیں پاتا۔ اس امر کا بالضرور مشاہدہ کیا جانا چاہئے کہ اس مسئلے کا جوہر ہی ایسا ہے کہ ہر نوعیت کے معروضی تلازمہ کی نفی کرتا ہے۔ اگر گرٹروڈ (Gertrude) کے مجرمانہ پن کو اور واضح کر دیا جاتا تو اس کا مطلب ہیملٹ میں موجود جذبے کے بجائے ایک بالکل ہی مختلف جذبے کا فارمولا مہیا کرنا ہوتا کہ گرٹروڈ کا کردار ہی اتنا منفی اور حقیر ہے کہ وہ ہیملٹ میں ایسا شدید احساس پیدا کرتی ہے کہ جس کی وہ نمائندگی نہیں کر سکتی۔ اگر گرٹروڈ کا کردار اتنا بے وقعت نہ ہوتا تو شاید ہیملٹ کا ردعمل ایسا نہ ہوتا۔ ہیملٹ کا ردعمل متغیر ہوتا تو ڈرامے کی ہیئت بدل جاتی۔

قصہ کوتاہ، ڈرامے کی موجود شکل ہیملٹ کردار کی جاں گسل غم گینی و دیوانگی اور شیکسپیئر کی فنی کوتاہی کا بدیں وجہ بین ثبوت ہے کہ دونوں معروضی تلازمہ دریافت نہ کر سکے۔ یہ جذبے کا مسخرہ پن ہی ہے جو ایک طرف ہیملٹ کردار میں عمل کا راستہ نہیں پاتا، تو دوسری جانب ڈرامہ نگار کے ہاتھوں فن میں اظہار پذیر نہیں ہوتا۔ شدید احساس، وجد آور یا خوف ناک، بغیر مناسب معروض کے، یا معروض سے زائد ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر ذی شعور کو پالا پڑ چکا ہے۔ عنفوان شباب میں اس کا اکثر ظہور ہوتا ہے۔ عام آدمی یا تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے، یا کاٹ چھانٹ کر کاروبار حیات کے مطابق کر لیتا ہے۔ چونکہ فن کار میں کائنات کو اپنے جذبات کے لئے شدید کشائش اور واردات بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس لئے وہ ان احساسات کو زندہ رکھتا ہے۔ لافورگ (Lafourge) کا ہیملٹ نیم بالغ ہے، تو شیکسپیئر کا نہیں کہ اس کے پاس وجہ ہے نہ جواز۔ ان وجوہ کی بنا پر ایلیٹ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہمیں یہ مان ہی لینا چاہئے کہ شیکسپیئر نے ایک ایسے مسئلے کو سلجھانا چاہا جو اس کے بس میں نہ تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ شیکسپیئر نے ایک ایسے مسئلے کو سلجھانا چاہا جو اس کے بس میں نہ تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ شیکسپیئر، ہیملٹ کے لئے من وعن پورا اترنے والا معروضی تلازمہ دریافت نہیں کر سکا تو ایلیٹ کو کن ذرائع سے مکمل ہیملٹ صورت حال موصول ہوگئی کہ جس پر انحصار کر کے، ہیملٹ کردار، ہیملٹ ڈرامہ اور شیکسپیئر، ڈرامہ نگار پر رائے زنی کی گئی؟ کیا یوں تو نہیں کہ ہیملٹ ڈرامہ

سے اخذ کر کے ایلیٹ نے ہیملٹ صورت حال کی اپنے ذہن میں تشکیل کرنے کے بعد اپنے تئیں یہ پوچھا کہ اگر ہیملٹ ڈرامہ یوں کے بجائے یوں ہوتا تو کیسا ہوتا؟ سمجھ دار آدمی نے معروضی تلازمہ کا تصور گھڑا اور ماخوذ ہیملٹ صورت حال کو مفروضہ ہیملٹ ڈرامہ پر منطبق کرتے ہوئے یہ بھی پالیا کہ شیکسپیئر ان امور میں اپنے ڈرامہ میں ہر سطح پر ناکام رہا ہے۔ مفروضہ تخلیق کو حقیقی تخلیق پر ہمیشہ فوقیت رہے گی۔ اس پر عمل پیرا ہو کر ایلیٹ نے اپنے مفروضہ ہیملٹ کی مدد سے شیکسپیئر کے ڈرامے کی تنقیص کی ہے۔ اسی طرح کا سلوک میک بتھ سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ کوئی آدرشی میک بتھ صورت حال ایجاد کر کے شیکسپیئر کے میک بتھ سے اسے ٹکرایا جاتا تو اس کا بھی ہیملٹ جیسا حال ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کڈ (Kyd) کے ڈرامے سے ہیملٹ صورت حال کا استنباط کر کے اسے شیکسپیئر کے ہیملٹ کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔ دمودر کی ہیر کا وارث شاہ کی ہیر پر یہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کارروائی میں نہال چند لاہوری کی مذہب عشق سے دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟ ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری کون سی صورت تھی جس سے ایلیٹ نے ہیملٹ صورت حال کا اکتساب کر کے شیکسپیئر کے مہیا کردہ معروضی تلازمہ کو ناکافی پایا؟ دراصل معروضی تلازمہ کا تقاضا کرنے والی ذہنیت نیچرل ازم کے تصورات کی پروردہ ہے۔ علامت و استعارہ معروضیت کو پھلانگنے کے وسائل ہیں۔ نیچرل ازم کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنیت اس ذہنیت سے بارہ پتھر دور ہے جو علامت و استعارہ کے اتباع میں پیدا ہوتی ہے۔ ایلیٹ کے یہاں یہ دونوں ذہنیتیں کارفرما ہیں۔ آپ ممائسس کو بیک بینی و دو گوش باہر نکال کیجئے، معروضی تلازمہ کے بغیر شیکسپیئر کا ڈرامہ، ہیملٹ رہ جائے گا۔ یہ ڈرامہ آٹھ دس وقوعاتی مشابہتوں اور مغائرتوں پر مشتمل ایک عظیم استعارہ ہے۔ اس نوعیت کے استعارے کے بارے میں یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ کس معروضی تلازے کی نیابت و قائم مقامی کرتا ہے۔ اس کی حیثیت مجرد غیر معروضی تصویر کی ہے جسے کسی معروضی تلازے کی ماتحتی میں نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ اسی وجہ سے یہ عظیم استعارہ جب معروضی تلازے کے سانچے میں بزور ڈھالا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ جذبہ فالتو بچ جاتا ہے۔

تخیلاتی ادب کے بارے میں یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ کسی موجود جذبے کے لئے مناسب استعارہ کہ جس میں وہ سمٹ جائے، تخلیق نہیں کرتا کہ یہ نقل اور ممائسس کی کارروائی ہے۔ اگر استعارہ کسی موجود، معروضی جذبہ کی قطعی مطابقت میں تخلیق کیا جا سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ جذبے کا کچھ حصہ فاضل رہ جائے۔ مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ استعارہ ہمیشہ جذبے کو اپنی کامل گرفت میں نہیں لے پاتا کہ اس کی تخلیق کسی شدید مطابقت میں ممکن ہی نہیں۔ درحقیقت جذبے اور استعارے میں کوئی لاینفک تعلق نہیں کہ استعارہ غیر معروض ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کا نقال ہونے کی بجائے از خود حقیقت ہوتا ہے۔ پھر یہ امر بھی محل نظر ہے کہ جذبہ اپنے تئیں کوئی ایسی واضح شکل و صورت رکھتا ہو کہ جس کی مطابقت میں فنی ہیئت تخلیق کی جا سکے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ فنی ہیئت کبھی کبھار ہی جذبے کو شکل و صورت اور معنی بخشتی ہے، بسا اوقات تو یہ جذبہ کی تخلیق کرتی ہے۔

فیض لکھتے ہیں:

تشبیہ اور استعارہ کے معانی میں تو ایسا اختلاف یا یا ابہام نہیں لیکن ان کا صحیح فنی مقصد اور محاسن شعر میں ان کی اہمیت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ آج تک بھی کسی شاعر کے کلام کا محاسبہ کرتے وقت تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور رنگینی پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ بہت سے نقاد کہتے ہیں کہ غالب کی عظمت کا راز اس کی اچھوتی تشبیہوں اور جدید استعاروں میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم کہتے نہیں تو سمجھتے ضرور ہیں کہ ایک شاعر محض تشبیہوں اور استعاروں کے بل پر بھی بڑا بن سکتا ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کی اہمیت جانچنے سے پہلے ہمیں ان کی صحیح نوعیت معلوم کرنی چاہئے۔ شاعر اپنے تجربے کی کوئی اکائی پڑھنے والے تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس اکائی کی وضاحت کے لئے اسے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ چنانچہ وہ اسے ایک مختلف اکائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں چیز ایسی ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز فلاں چیز جیسی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ قدرت کلام کا مظاہرہ نہیں، عجز کا اظہار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یا وہ اپنے مضمون کی تمام تفصیلات کو چند الفاظ کے جامے میں سمیٹ نہیں سکا یا ان کے اظہار کے لئے اسے الفاظ نہیں ملے۔ مجبوراً اسے راہ راست کی بجائے تشبیہ استعارہ کی پگ ڈنڈی یا شارٹ کٹ اختیار کرنا پڑا۔ پہلا راستہ طویل بھی تھا دشوار بھی۔ دوسرا مختصر بھی ہے سہل بھی۔ اس عمل میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تشبیہ استعارہ منزل نہیں، راستہ ہے اور راستے کی اہمیت محض منزل کی وجہ سے ہوتی ہے، اور اگر ایک منزل ہی اہم نہیں تو اس کا راستہ اور بھی ناقابل اعتنا ہوگا۔ شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اس کا مضمون یا خیال ہے۔ اور اگر یہ منزل بالکل بنجر ہے تو راستے کی رنگینی اسے دل فریب نہیں بنا سکتی۔ پس تشبیہ و استعارہ ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں، فقط ایک راستہ یا آلہ ہے۔ اور ہر راستے یا آلے کی طرح اس کا حسن و عیب اضافی ہے۔ ہم کسی شاعر کو اس تشبیہوں، اور استعاروں کی وجہ سے مستحسن یا مذموم قرار نہیں دے سکتے۔ نہ کوئی شاعر ان کے اثاثے پر ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے ادب برائے ادب کی طرح تشبیہ برائے تشبیہ اور استعارہ برائے استعارہ غلط اور گمراہ کن نظریہ ہے۔

اس تمام گفتگو کی بنیاد اس بات پر ہے کہ تشبیہ و استعارہ ادب کا جزو لاینفک نہیں، بلکہ محض ایک ضمنی چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ تشبیہ و استعارہ مضمون پہنچانے کا متبادل ذریعہ ہے۔ ہم بہ وضاحت دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصورات غلط ہیں۔ ان تصورات پر مبنی استعارہ برائے استعارہ کا محاکمہ بھی نادرست ہے۔ ان تصورات کی ٹیڑھ دیکھنے کے لئے ''گلزار نسیم'' کے ایک اقتباس کا مطالعہ کیجئے۔

بہر گہر طلسم اخلاص / ہے بحر سخن میں خامہ غواص
وہ قطرۂ بارش جدائی / وہ غرقۂ بحر آشنائی
وہ بادشہ حباب افسر / یعنی تاج الملوک مضطر
بے مہری چرخ سے جو ناگاہ / گرداب کے ہالے کا ہوا ماہ
جو ماہ سپہر برتری تھا / سو ماہی بحر ابتری تھا
بادل سا وہ بحر آسمان جوش / بجلی سی لہر سے ہم آغوش
دریا تھا نہ بحر تھا نہ جیحوں / طوفان طلسم جوش افسوں
گرتے وہ پانی سر سے گذرا / ابھرا تو نہ کچھ نظر سے گزرا
موجوں کے عوض تھی چین داماں / گرداب کے بدلے تھا گریباں
آگے جو بڑھا جزیرہ دیکھا / اشجار کا واں ذخیرہ دیکھا
جس پھل کو چھوا جو پھر کیا غور / ہاتھ آیا نہ کچھ حباب کے طور
جانا کہ طلسم کا ہے جنگل / ہے یاں کے درخت کا یہی پھل
اور آگے بڑھا وہ بحر اوہام / ڈوبا خورشید ہو گئی شام
ڈر جانوروں کا جی میں پیٹھا / اک نخل کہن پہ چڑھ کے بیٹھا
ناگاہ سنی صدائے پر خوف / آیا اک اژدہا پئے طوف
صورت میں پہاڑ کی نشانی / سیرت میں بلائے ناگہانی
منہ کھول کے سانپ اک نکالا / اس کالے نے من زمیں پہ ڈالا
لہرا لہرا کے اوس چاٹی / بن میں کالوں نے رات کاٹی
جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا / کالے نے من، اژدہے نے کالا
وہ جا کے افق میں مہر چمکا / من افعی شب کے منہ سے نکلا
سوچا وہ کہ لیجیے من کسی طور / دشمن کا تھا سامنا کیا غور
کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں / بن میں ہری دوب چر رہی تھیں
دودھ ان کا دوہا، پیا، کہا، لو / گوبر کے انھیں کے چھوت پھینکو
نکلا جو پھر آکے شب کو اژدر / گلخن سے دھواں دھوئیں سے اخگر
گوبر پھینکا تو دب گیا من / بادل میں چھپا وہ ماہ روشن
بے روشنی اندھے ہو گئے وہ / من ڈھونڈتے آپ کھو گئے وہ
من لے کے جو اس نے مہرہ ہارا / شب کاٹ کے صبح دم سدھارا
دو مرغ تھے بیٹھے اک شجر پر / مادہ لگی پوچھنے کہ او نر
میں تجربہ کر چکی جہاں کا / کھلتا نہیں کچھ طلسم یاں کا
مادہ کے یہ سن کر بول اٹھا نر / ہے طرفہ طلسم اس جگہ پر
وہ پیڑ جو حوض پر لگا ہے / طوبیٰ سے خواص میں سوا ہے
اک سانپ وہاں ہے چوٹ کرتا / مارے سے نہیں کسی کے مرتا
لیکن جو یہ بندۂ خدا جائے / تا حوض قدم قدم چلا جائے
لپکے گا جو اس کو دیکھ کر سانپ منہ / چادر آب میں یہ لے ڈھانپ
ابھرے گا لگا کے جب یہ غوطہ / بن جائے گا آدمی سے طوطا
اندیشہ نہ اپنے دل میں لائے / اڑ کر یہ اس شجر پر جائے
سب خشک ہے ایک ہے ہری ڈال / دو رنگ کے پھل ہیں سبز اور لال
پہلے تو یہ لال پھل کو کھائے / انسان کا رنگ روپ پائے
پھر توڑے اس کے سبز پھل کو / پھل چکھوا دے رہے کا کل کو
جس شخص کے پاس وہ ثمر ہو / ہتھیار نہ اس پہ کارگر ہو
لکڑی میں یہ اثر ہے کہ دشمن / بن جاتا ہے موم اگر ہو آہن
دو ہاتھوں میں لے جو کاندھے پر سے / اڑتا پھرے جیسے مرغ پر سے
ٹوپی جو بنائے چھیل کر چھال / دکھلائی نہ دے نظر کی تمثال
پتوں کی صفت بیان کیا ہو / دم بھر میں بھریں جراحتوں کو
منہ میں رہے گوند اس کا جب تک / لگتی نہیں بھوک پیاس تب تک
تھا ملہم غیب مرغ گویا / سنتے ہی ادھر چلا وہ جویا
کالے نے جہاں سے کی سیاہی / وہ حوض میں تھا مثل ماہی
طوطا بن کر شجر پہ آکر / پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے پھل گوند چھال لکڑی / اس پیڑ سے لے کر راہ پکڑی
ہاتھ جو آ گئی عصا کی تاثیر / پراں ہوا صورت عصافیر
اڑتا ہوا واں سے دور جا کر / ٹھہرا دم لینے اک جگہ پر
من ران کو چیر کر چھپایا / پتے سے وہ زخم سب بھر آیا
اک حوض پر آب و تاب دیکھا / سر چشمۂ آفتاب دیکھا
غوطہ جو لگا کے سر اٹھایا / وہ حوض وہ آب کچھ نہ پایا
دکھلائی برے دنوں نے شامت / مردی کی رہی نہ کچھ علامت
ہوش اس کے اڑے یہ دیکھتے ہی / فوارہ ہے گم، خزانہ باقی
سختی جو دکھاتا تھا مقدر / چھاتی پہ دھرے کچوں سے پتھر
نامردی سے اپنی نعرہ زن ہو / بے چاری چلی کسی طرف کو
آگے سے جوان ایک خوش قد / آتا تھا دنوں کی جیسے آمد
آپس میں مرد و زن کیا میل / دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل
ہائے جو پڑی گھر اس کے بے قید / امید سے رہ گئی تو مید
جب جن کے نہانے کا دن آیا / غوطہ کسی حوض میں لگایا
ابھری تو نہ حوض نہ وہ روپ / پانی کے عوض تھی دشت کی دھوپ
مردی نے جو پھر وجود پایا / پستانوں کو بے نمود پایا
ترکش پہ نگاہ کی تو تھا تیر / تیغے میں پھر آئی کھوئی شمشیر
گھر شمع بنا چراغ دامن / روشن نہ ہوا وہ رنگ و روغن
تھا مردم دیدۂ طلسمات / خال رخ و رنگ رو مساوات

یہ اشعار تشبیہ استعارے سے مزین نہیں ہیں۔ من افعی شب کے منہ سے نکلا، گلخن سے دھواں، دھوئیں سے اخگر، کو چھوڑ کر جہاں کہیں بھی تشبیہ و استعارہ کا استعمال ہوا ہے،، سپاٹ بے لطف اور گھسا پٹا ہے۔ بیانیہ میں کوئی مقام ایسا نہیں کہ کہا جا سکے کہ یہاں شاعر نے عجز و کم مائیگی کی وجہ سے تشبیہ و استعارہ کا سہارا لیا ہے۔ مضمون کیا ہے؟ عام سی باتیں ہیں۔ فیض کے معیاروں کو بروئے کار لایا جائے

تو اس ٹکڑے کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ ابتدا میں خامہ بحرِ سخن کی غواصی کرتا ہے۔ پھر غواصی بار بار ہوتی ہے۔ تاج الملوک ایک حوض میں غوطہ لگا کر طوطا بنتا ہے۔ دوسرے میں غوطہ لگا کر عورت بنتا ہے۔ تیسرے میں غوطہ لگا کر پھر مرد بنتا ہے۔

غواصی کے تلازمات شدت سے لگاتار آتے ہیں۔ غواصی کے ساتھ بحر، لہر، دریا، قطرہ، طوفان، بارش، بجلی، کے انسلاکات شروع ہی میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کے مجرد سیاق و سباق بعد میں جو ٹھوس حوالے اختیار کرتے ہیں ان کی پیش گوئی کے مدھم اشارے بھی موجود ہیں۔ بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش، آخرش جنسی اختلاط میں اسی طرح منتج ہوتا ہے جس طرح وہ قطرہ، بارش، جدائی، آخرکار دریا سے ملا، وہ قطرہ زنِ سیل کا مفہوم لے لیتا ہے۔ بحر، لہر، دریا، قطرہ، طوفان آہستہ آہستہ متغیر ہوتے ہیں۔ اس تغیر کے جراثیم ان کے خمیر میں ہیں کہ گوندھے ہی ایسے گئے ہیں۔ سانپ کا من چھین کر، اسے روشنی سے محروم کر کے شہزادہ تاج الملوک جس حوض کی طرف بڑھتا ہے اس کا محافظ ایک سانپ ہے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ حوض میں کود کر اپنی جون بدلتا ہے۔ یہاں پر دو حادثات کی پیشین گوئی ہوئی ہے۔ اول یہ کہ سانپ سے کاٹا جائے گا۔ دوم یہ کہ جون بدلے گی۔ ایک بات یہ بھی ہوئی ہے کہ حوض کا پانی سانپ ہی کا نعم البدل ہے۔ گویا یہ کاروائی دو مرتبہ ہوگی۔ پھر اس نے من ران میں چھپایا۔ حوض میں غوطہ لگایا تو مردی جاتی رہی۔ ناگاہ ایک جوان خوش قد آیا۔ اس نے مباشرت کی۔ اس مباشرت کی پیش آگہی کے ضمن میں من کا ران میں چھپانا ٹھہرے تو پہلی دونوں پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ جون بھی بدلی اور سانپ نے بھی کاٹا۔ اگر وہ من پیٹ میں چھپاتا تو اور بات تھی۔ من تو ران میں تھا۔

مین را کی ایک کہانی "میں" سے:

> اور ان دنوں کہ بے لذتی کے بادل چھائے ہوئے تھے، اس نے وراثت میں پائے ہوئے چاقو سے جس کے پھل پر وقت کا بے رنگ ساز زنگ لگا ہوا تھا، اپنی ران میں مدتوں سے مضطرب مچھلی نکالی اور میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر میں پھینک دی۔

اس لئے امید سے رہ گئی وہ نومید! پانی اور سانپ کی ان مناسبتوں کے بعد درخت کی باری آتی ہے۔ ایک اشجار کا ذخیرہ ہے۔ جس پھل کو چھوا وہ حباب کی مانند ہاتھ نہ آیا۔ یہاں پھل کی مشابہت کے لئے بلبلہ، پانی پر پیدا ہونے والا، چنا گیا ہے۔ اشجار کا ذخیرہ، پانی میں گھری زمین یعنی جزیرے پر ہے۔ ایک پیڑ حوض کے کنارے پر ہے۔ یہ پیڑ سوائے ایک شاخ کے خشک ہے۔ وہ ایک شاخ کیوں سرسبز ہے؟ اس کا پھل حباب آسا نہیں۔ کیوں؟ پھل دو رنگوں کے ہیں: سبز اور لال۔ لال پھل کھا کر انسان کا رنگ روپ پائے۔ اس شجر کی صفات یہ ہیں کہ اس کے پتے فوراً زخم بھر دیتے ہیں۔ اس کی لکڑی کے دو خواص ہیں: اول یہ کہ اسے کاندھے پر سے دو ہاتھوں میں لگا لیا جائے تو انسان پرندوں کی طرح اڑنے لگتا ہے۔ دوم یہ کہ دشمن لوہے کا بھی ہو تو موم کی طرح نرم اور کمزور بن جاتا ہے۔ اگلی منزل میں شہزادہ تاج الملوک اس سے عصائے موسیٰ کا کام لیتا ہے۔ عصائے موسوی کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ زمین پر ڈالنے سے سانپ بن جاتا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو سانپ نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا کہ حوض کے کنارے کا درخت عصائے موسوی کے حوالے سے اس سے منسلک ہے۔ سبز پھل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کھانے والے پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔ مارے سے نہیں کسی کے مرتا۔ سانپ، حوض کا پانی، کایا کلپ ہوتی ہے: پانی سے، درخت کے پھل سے، چھال سے، آدمی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے: پانی سانپ کا درخت، مل جل کر، اثرات صفات میں، ہم زاد! اس تمام منظر میں سوائے تاج الملوک کے کوئی آدم زاد نہیں۔ حوض میں غوطہ لگا کر عورت بنتے ہی ایک خوش قد جوان وارد ہوتا ہے: ناگاہ، جیسے دنوں کی آمد! عورت سے دوبارہ مرد بن کر تاج الملوک دیکھتا ہے۔ پانی کے عوض تھی دشت کی دھوپ! دن اور دھوپ مردانگی کے تمام مفاہیم سے لبریز ہو کر یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ سیاہی اور پانی نسوانیت کے تلازمے رکھتے ہیں۔ دھوپ کو خشک، بے برگ و نمو دشت کی دھوپ کہا گیا ہے۔ حوض کے کنارے کا پیڑ سوائے ایک شاخ کے بے برگ و نمو ہے۔ اس مردانگی کے ساتھ دو پھلوں والی سرسبز و شاداب شاخ کی نسائیت ہے۔ طلوعِ خورشید کو نفیِ شب، رات کے منہ سے من کے نکلنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ من کی صفات دن اور دھوپ کی صفات سے متحد ہیں۔ کالا کہ جس نے منہ سے من نکالا اور اژدہا کہ جس نے کالا منہ میں ڈالا، زوجین ہیں، نگلنے والی نسائیت، اژدہا، رات، پانی!

شہزادہ تاج الملوک نے جب اپنی ران چیر کر من چھپایا تو یہ طے ہو گیا کہ وہ عورت بن کر رہے گا۔ امیجری کے ان زیرِ سطح مفاہیم کے برعکس شعوری طور پر مردانگی کے لئے فوارہ، تیر، تلوار، کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ تضاد، کش مکش، ذو معنویت اور کہہ مکرنی پن پوری طرح اس درخت میں ظاہر ہوتی ہے جس کے خواص طوبیٰ سے بھی سوا ہیں۔ خشک پیڑ کی مردانگی سرسبز شاخ کی نسائیت سے متوازن و قائم ہے۔ مکمل قلبِ ماہیت نہیں ہوتی، ممکن نہیں! تاج الملوک طوطا بننے کے باوجود انسانی روپ میں حاصل کیا ہوا من نہیں کھوتا۔ طوطے سے انسان بن کر جو جو کچھ درخت کا لیا تھا، عورت میں تبدیل ہونے کے بعد ضائع نہیں ہوتا۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے باوصف پہلی صورت کی کامل نفی نہیں ہو جاتی۔ معاملہ ملا جلا سا رہتا ہے۔ ملا جلا سا کیا، کیسا، کتنا، نہیں کہا جا سکتا۔ سرریلزم کے زیرِ اثر بننے والی تصاویر میں دھڑ بیل کا، سر گھوڑے کا، ہاتھ عورت کے اور آنکھوں سے ٹپکتی بے بسی انسانی ہو سکتی ہے۔ کوئی جزو فی الاصل کہاں ہونا چاہئے کے بجائے من چاہی جگہ لگا دیا جاتا ہے۔ حامد کی پگڑی محمود کے سر، سر تو کجا، کولہوں پر آ جمتی ہے۔ عین اسی طرح زیرِ سطح فعال امیجری کے جوڑ سرریلسٹک تکنیک کے مطابق بٹھانے کا نتیجہ دوہری غیر معروضیت کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ اول یہ کہ یہ بیانیہ غیر فطری کایا کلپ سے تعرض کرتا ہے، اس لئے اس کا معروضی تلازمہ ڈھونڈا ہی نہیں جا سکتا۔ دوم یہ کہ امیجری کے سرریلیسٹک مطالعے نے واقعات کی زمانی ترتیب کو یکے بعد دیگرے کی ذیل سے نکال کر لمحۂ محض، مکانیت مصوری میں تبدیل کر دیا ہے۔ ابتدا و انتہا کو طرفۃ العین میں واشگاف ہونے والے سکتۂ حاضر میں مدغم کرتے ہوئے،

لسانی تشکیلات کو ظرف زبان سے نجات دلائی گئی ہے۔ متضاد و متصادم امیجری کے ٹیڑھے بھینگے خطوط کا پیٹرن جس استعارے کا رنگ روپ ذومعنویت اور کہہ مکرنی پن اجاگر کرتا ہے، اس کے بارے میں کیا اس کلیہ کا نفاذ ہوسکتا ہے کہ فلاں چیز، فلاں چیز جیسی ہے؟ مشابہتوں اور مغائرتوں کی اس کثرت تعداد کے پیش نظر معروضی تلازمہ ڈھونڈنے کا تقاضہ پورا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس مشکل کا حل، استعارہ برائے استعارہ کے معقول تصور کے سوا کہیں نہیں۔ استعارہ برائے استعارہ نہ صرف موضوع اور ہیت کی دوئی سے چھٹکارا دلاتا ہے بلکہ مماثلت اور نیچرل ازم کے بجائے غیر معروضیت اور تجرید کے مواقع مہیا کرتا ہے۔

غیر معروضیت تجرید اور استعارے کا ربط باہم دیکھنے کے لئے سلطان غازی کی ایک مختصر کہانی موزوں رہے گی:

> صدیوں کی نیند کے بعد جب اصحاب کہف بیدار ہو گئے تو انھوں نے آنکھیں ملتے ہوئے تاریخ کے اندھیرے غار میں جھانکا۔ باہر روشنی تھی اور اندر وہ سب کچھ تھا جو صدیوں ان کے وجود کا حصہ بنا رہا۔ بدبو اور تاریکی۔ سروں پر کھردرے اور نکیلے پتھروں کی کرختگی اور نیچے پسینے کی دلدل۔ پھر اصحاب کہف نے روشنی کا رخ کیا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے ان کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دیا اور روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ان کے لڑکھڑاتے قدم رک گئے۔ ہوا غار کی سنگین دیواروں پر سر پٹک کر روتی ہوئی باہر نکلی اور اصحاب کہف نے دوسرا سانس کھینچتے ہی گھٹی گھٹی بدبو سے اپنے آپ کو مانوس پایا۔ صدیوں کی نیند نے انھیں ہر احساس اور سوچ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب غار کے اندر اور باہر دنیا نے ایک نئی اور ناقابل یقین صورت حال بنا دی۔ ان کے قدم باہر جاتے جاتے رک کیوں گئے۔ یہ کوئی نہ جان سکا۔ ان میں سے پانچ اپنی ڈاڑھیاں نوچنے لگے اور چھٹے کی زبان پر ایک لفظ کانٹا بن کر اگا۔
>
> ...خوف!
>
> پھر اسے اپنا خواب یاد آیا۔
>
> سمندر کے کنارے سبز دلدل میں رینگتا ہوا اژدہا! وہ اژدہا کتنا بڑا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ سے دس گنا، بیس گنا، سو گنا، ہزار لاکھ یا کروڑ گنا، بے بسی کے احساس نے اسے بے دم کر دیا۔ لیکن وہ پھر بھی بھاگ رہا تھا اور اژدہا اپنی شکلیں بدل بدل کے اس کے سامنے پہنچ جاتا۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائی۔ وہاں بجلی کوندگئی۔ اس نے سمندر کا رخ کیا۔ وہاں طوفان آ گیا۔ وہ تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور زمین زلزلے سے کانپنے لگی۔ آخر میں اژدہے نے سب سے زیادہ خوف ناک شکل اختیار کی۔ اب اس کی کوئی شکل نہ تھی۔ لیکن وہ ہر جگہ اور ہر وقت تھا۔ وہ غار کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔ پھر وہ سب غار میں آ کر کیوں چھپ گئے تھے؟ یہ خواب اس نے ایک سو سال پہلے دیکھا تھا یا ایک کروڑ سال پہلے، اسے کچھ یاد نہ تھا۔
>
> لیکن یہ صرف خواب ہی تھا۔ اس نے مسکرانا چاہا۔ اور اسی لمحے اس کی زبان پر سے کانٹا غائب ہو گیا۔ اس نے اپنے پانچوں ساتھیوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ سب یوں کانپ رہے تھے جیسے ان کے سامنے اژدہا آ گیا ہو۔ اس نے انھیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ خود روشنی کی طرف منہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پانچوں آدھے راستے میں ٹھٹک گئے تھے۔ اس نے ان کا انتظار نہ کیا۔ اور خود آگے بڑھتا رہا۔
>
> تب اس نے غار کے منہ پر اس کتے کو بیٹھے دیکھا۔ جو ساتواں تھا۔ جس نے تمام اصحاب کہف کو صدیوں سوتے دیکھا تھا۔ کتے نے اسے باہر نکلتے دیکھ کر نہ دم ہلائی اور نہ کان کھڑے کئے۔ لیکن وہ کچھ حیران ضرور تھا۔ اسے تو معلوم تھا کہ ایک دن اصحاب کہف جاگ اٹھیں گے۔ پر ان سب کو ایک ساتھ غار سے باہر آ جانا چاہئے تھا۔ باقی پانچ کہاں رہ گئے؟ کتے نے وہیں غار کے سامنے ایک دو چکر کاٹے، وقت اور موسم کو سونگھنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کچھ پتہ نہ پڑا کہ آخر یہ ہوا کیا؟ پھر کتے نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر یوں دیکھا۔ جیسے اس کی حالت زار پر افسوس بھی ہوا اور رشک بھی۔
>
> رشک اسے خود بھی تھا۔ لیکن افسوس کس بات کا؟ اس کی زبان کا کانٹا غائب تھا۔ اژدہا صرف خواب تھا۔ وہ اپنی مرضی سے رد بھی سکتا تھا۔ وہ اس اختیار کا مالک تھا جو ذوالقرنین کو بھی نہ مل سکا۔ اس نے اختیار سے کام لیا اور ایک بار پھر پلٹ کر غار کی طرف دیکھا۔ سنہری دھوپ کی چمک میں ایک سیاہ سوراخ اندھیرا خلا میں معنویت کا سڑتا ہوا ڈھیر! وہ اپنے پانچوں ساتھیوں کو بھول چکا تھا۔ اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ تب کتے نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور بڑی دیر تک رویا۔
>
> اژدہا اپنی تمام بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ غار میں جا چھپا۔ اور وہ با اختیار ہوتے ہوئے بھی اب اپنے رشک کے ساتھ بالکل تنہا تھا۔ اور وہ کتا جو اصحاب کہف میں ساتواں تھا اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اور آج تک اس کے ساتھ لگا پھرتا ہے۔
>
> پرسوں رات کے بارہ بجے وہ امریکہ میں بنی ہوئی لڑائی مار کٹائی سے بھرپور فلم دیکھ کر واپس آ رہا تھا، تو اسے گمان بھی نہ گذرا کہ کتا کب اور کہاں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ گھر پہنچ کر جب اس نے دروازے پر دستک دی تو کتا اپنے پنجوں سے زمین

کھودنے لگا۔ تب اس نے پلٹ کر اسے پہلی بار دیکھا۔ کتے کی آنکھوں میں کئی ہزار برس کا غم تھا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اسے پہچانتا نہ ہو۔ پھر بھی کسی ان جانی مدد کا طلب گار ہو۔

وہ شاید بھوکا تھا۔ اسے اپنی بھوک بھی یاد آ گئی اور اس نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا اور پھر اس رات اس نے اپنی بیوی کو بھی پیٹا۔ اگلے دن وہ طوائفوں کے بازار سے گذرا۔ اس نے دیکھا کہ سب دروازے بند تھے۔ رمضان شروع ہو چکا تھا۔ اسے پھر جامع مسجد کے اونچے میں منار دکھائی دیے۔ اس کی زبان پر بھی کچھ کانٹے اگ آئے تھے۔ بے ذائقہ تھوک کو نگلتے ہوئے اس نے سوچا، لیکن کچھ سوچنے سے پہلے اس کی نگاہ کتے پر جا پڑی۔

وہ بڑے والہانہ انداز میں اس کے سامنے دم ہلا رہا تھا۔ اسے کتے کی اس حرکت پر بڑی حیرت ہوئی اور کتا خود بھی شاید اس وجہ سے اظہار محبت پر نادم ہو گیا تھا۔ اس نے پچھلی ٹانگ سے اپنا کان کھجایا۔ ایک جھرجھری لی اور ایک طرف فٹ پاتھ پر ہولے ہولے چل پڑا۔

اس نے اپنی بیوی کو کیوں پیٹا تھا؟ دروازے کے باہر وہ کتا کیوں آ بیٹھا تھا۔ امریکی فلم میں اتنے لوگوں کو مرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے کسی سوال کا جواب نہ بن پڑا۔ پھر وہ کتے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ کتے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور کتا اسے پہچاننا چاہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بھول بھی نہ سکے تھے۔ وہ کروڑوں برس سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔

جب وہ عجائب گھر سے باہر نکلا تو اس کی ہڈیوں میں پیلا پیلا درد ہو رہا تھا۔ وہاں اس نے مہاتما بدھ کو فاقوں مرتے دیکھا۔ عجائب گھر کے سامنے یونی ورسٹی میں قومی نظریے پر بحث ہو رہی تھی۔ چوراہے پر پہنچا تو سرخ آنکھ نے اس کی سائیکل کا راستہ روک لیا۔ وہاں ایک بنگالی نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ بنگلہ بھاشا آشو؟ اس نے کہا: نہ آشو، اور بنگالی اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اس رات کتے نے اسے دیکھا تھا۔ میں تمھیں نہیں پہچانتا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کو بھول بھی نہیں سکتے۔ وہ بوکھلا گیا۔ سرخ بتی کے بعد نارنجی بتی بھی جل گئی اور دونوں کے نیچے منہ کھولے ہوئے ایک اندھیرا غار تھا۔ پھر وہ کتا آ گیا۔ عین چوراہے پر۔ اس کی سائیکل لڑکھڑا گئی اور وہ غار کے سامنے اوندھے منہ گر پڑا۔ تب اس نے آخری سانس لیتے ہوئے پسینے کی کھٹی کھٹی بو کو سونگھا۔ اور پانچ آدمی لٹھ لئے کتے کے پیچھے دوڑ پڑے۔

چوں کہ بنیادی علامت اور ثانوی علامت ایسی اصطلاحیں برمحل نہیں، اس لئے غلط فہمی کا خطرہ مول لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی میں بنیادی علامت کے ارد گرد مزید ثانوی علائم کو قائم کر کے پورے سلسلۂ واقعات کو ایک بڑے استعارے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بنیادی علامت، ثانوی علامت اور بڑے استعارے کے ضمن یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہاں علامت و استعارہ کا مطلب جبر و مقابلہ کی علامتوں ایسا متعین اور واضح نہیں۔ ریاضیاتی ترویج و تدوین کی راہ البتہ کھلی ہے۔ دیکھیں اس کی طرف توجہ کب مبذول ہوتی ہے۔ یہاں علامت اور استعارہ کئی سطحوں پر، جو متحارب بھی ہو سکتی ہیں، عمل کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ اختر الایمان کی شوقیہ، سپاٹ، میکانکی علامت نگاری کے برعکس یہ علامت نگاری شخصی اور فنی جبر کا نقطۂ کمال ہے۔ آج کل کے نثر نگاروں نے نظم اور نثر کی مصنوعی حد بندی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیا ہے۔

اب افسانہ پڑھتے ہوئے وہی حظ دستیاب ہوتا ہے جو کسی زمانے میں شعر سے منسوب تھا۔ آج کل کی بیش تر نثری نظمیں اور روایتی افسانے دفع الوقتی کے لئے بھی نہیں پڑھے جا سکتے کہ ان میں شعری کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ:

> علامات سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنھیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لئے استعمال کرتا ہے جس طرح ہم کسی ایک لفظ کو اصطلاح قرار دے کر اس کے خاص معنی مقرر لیتے ہیں، خواہ اس کا لغوی مفہوم کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح شاعر اپنے تجربات کے اظہار میں بعض الفاظ کو اصطلاحات قرار دے لیتا ہے۔

تو یہ کہئے کہ اس کہانی کے مصنف کا بنیادی تصور کیا ہے؟ فرض کیجئے کہ آپ نے تجربے کی اکائی اور مصنف کا بنیادی تصور دریافت کر لیا ہے۔ اب یہ بتائیے کہ یہ اکائی کون سی دوسری اکائی میں تبدیل کی گئی ہے؟ کیا چیز، کون سی چیز جیسی ہے؟ اژدہا، کتا، غار، اصحاب کہف، ذوالقرنین، اس کہانی میں کس کی علامت ہیں؟ بیوی کی پٹائی کے علامتی مفاہیم کیا ہیں؟

ان استفسارات کا جواب دینے سے پیشتر ایک مرتبہ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ آپ کی مصنف کے بنیادی تصور تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ کیا اب مذکورہ سوالات پوچھنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ اگر آپ بنیادی تصور اور بنیادی علامت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ بنیادی علامت سے بنیادی تصور کی تجرید اور استنباط ناممکنات میں سے ہے، تو آغاز کار ہی میں امیجری کے سرریلسٹک مطالعہ کو ہاتھ میں لے لینا مناسب ہوگا۔ دقیانوس اور عہد جمہور کے درمیان کا تاریخی فاصلہ بیک جنبش قلم خارج کر دیا گیا ہے۔ اصحاب کہف، ان میں سے ایک، مرنے والا اور پانچ لٹھ بند غیر تاریخی سکتۂ محض میں آ گئے ہیں۔ اصحاب کہف کی روایت میں سانپ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر مبنی عباس اطہر کی ایک نظم میں بھی سانپ موجود ہے:

سوراخ میں سانپ، غار کے دہانے پر کڑی کا جالا۔
لیکن پرانے سکے بدل چکے تھے۔

کیا اصحاب کہف کے قصے کی تنظیم نو اس لئے تو نہیں کی گئی کہ سانپ کے لئے کوئی جگہ پیدا ہو سکے؟ سانپ کی اتنی غیر معمولی اہمیت کس امر کی غماز ہے؟ اصحاب کہف کے قصے کی ساخت میں ایسی کون سے مخفی دلالتیں ہیں کہ ان کی تنظیم نو میں ہی سانپ کو جائے اماں ملتی ہے؟ سانپ اصحاب کہف کی کس طرح توسیع کر سکتا ہے؟ قصے کی ساخت اور سانپ کے تعلق میں ناگزیریت کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ یک طرفہ کارروائی کے طور پر جب صبح جب ہوئی تو منہ میں ڈالا کالے نے من، اژدہے نے کالا سے منسلک کی ہوئی نگلنے والی نسائیت فرض کر لیں تو اس کی ایک گنجائش یوں بھی نکلتی ہے کہ اصحاب کہف میں کوئی عورت نہ تھی، مرد ہی مرد تھے۔ اژدہے کی نسائیت کے برعکس سانپ کی مردانگی عباس اطہر کی نظم سے ظاہر ہے۔

غار میں چھپ جانے والے کے ماتھے پر دراڑ!
جب وہ سات سو سال کے بعد باہر نکلا
سکے بدل چکے تھے۔

اس نظم میں جیپ، ہیوک اور ڈیزل بس کو نسائی صفات دینے کے لئے اسٹیرنگ پر توجہ دی گئی ہے۔ یوں اصحاب کہف سانپ، ٹھہرتے ہیں۔ اگر اژدہا نسائیت کے انسلاکات لئے ہوئے ہے تو پھر اس کا غار میں گھسنا ناقابل توضیح ہے۔ یہی پتہ نہیں چلتا کہ اژدہا کس کی علامت ہے تو اصحاب کہف، ذوالقرنین کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کس کس کی علامت ہیں؟ یہ اسلوب توضیح بر محل نہیں ہے۔ اب یہ صورت رہ جاتی ہے کہ واقعات کو بے جوڑ طریقے سے جوڑا جائے:

اگلے دن وہ طوائفوں کے بازار سے گذرا۔ سب دروازے بند تھے۔ رمضان شروع ہو چکا تھا۔ اسے جامع مسجد کے اونچے مینار دکھائی دیئے۔ اس کی زبان پر کانٹے اگ آئے۔

طوائف، بند دروازے، رمضان، مسجد کے میناروں کے تلازمات میں کوئی ایسی چیز ہے جو اپنے اندر خوف کے سامان رکھتی ہے: زبان پر کانٹے، اژدہے کا خوف! یہ خوف اژدہے کے دامن میں عدم تقدس، نامعلومی، ممانعت اور تقدس کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہ کوئی منطقی قضیہ تو نہیں لیکن انجانی لذت کا ممنوعہ تقدس سے الحاق اتنی خوفناک چیز تھی کہ وہ اصحاب کہف غار میں آ کر چھپ گئے۔ اژدہے کا ڈر، وہ غار کے اندر بھی تھا باہر بھی۔ غار کیا، اندھیرے خلا میں بے معنویت کا سڑتا ہوا ڈھیر! سانپ کا غار میں داخل ہونا، بے معنویت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ مکمل صورت حال یوں بنی کہ انجانی لذت، ممنوعہ تقدس اور بے معنویت مربوط ہیں۔ پھر آگے کیا ہوا؟ معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ وہ کتا جو اصحاب کہف میں ساتواں تھا، اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ساتواں در نہیں کھلے گا۔ اس نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس رات اپنی بیوی کو بہت پیٹا۔ ساتواں در نہیں کھلے گا۔ تمام اصحاب کہف کو ایک ساتھ غار سے باہر آ جانا چاہئے تھا۔ پانچ آدمی راستے ہی میں ٹھٹک گئے۔ اس نے ان کا انتظار نہ کیا بلکہ آگے بڑھتا رہا۔ اسے اپنے پانچوں ساتھی بھول گئے۔ تب کتے نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور بڑی دیر تک رویا۔ ساتواں در نہیں کھلے گا۔ جدائی، اجنبیت، لاتعلقی! عظیم حادثہ ہو چکا تھا۔ کتے کی آنکھ میں کئی ہزار برس کا غم تھا، کس بات کا؟ پتہ نہیں۔ کیا کیا جائے؟ پھر وہی مشکل آن پڑی ہے۔ گھر پہنچ کر اس نے جب دروازے پر دستک دی تو کتا اپنے پنجوں سے زمین کھودنے لگا وہ شاید بھوکا تھا ؟ وہاں اس نے مہاتما بدھ کو فاقوں مرتے دیکھا۔ تو بھوک محض جسمانی بھوک نہیں، روحانی بھی ہے۔ کتا عجیب مصیبت میں مبتلا ہے۔ اسے اصحاب کہف کی آپس کی جدائی کا شدید دکھ ہوتا ہے۔ وہ انھیں اکٹھا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ متحد مخلص محب نہیں رہ سکتے۔ وہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ کس کا؟ وہ جو آگے بڑھ رہا ہے، اجنبیت، لاتعلقی کا شکار، شک، خوف، تنہائی کا نخچیر کتا، اصحاب کہف میں ساتواں کتا ہی ہے؟ ایک بنگالی نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا: بنگلہ بھاشو آشو؟ اس نے کہا: نہ آشو۔ بنگالی اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اس رات کتے نے اسے دیکھا تھا۔ یوں لگتا ہے کتا اصحاب کہف ہی میں سے ایک آدمی ہے۔ جب اسے اپنی دشواریوں کا احساس ہوا اور اجنبیت کے مرض کی تشخیص ہو گئی تو اس نے کھٹی کھٹی بو کو سونگھا۔ یہ بو اصحاب کہف کے اجنبیت کا شکار ہونے سے پہلے بھی تھی۔ جس نے اتحاد و مراجعت کی فضا پیدا کی۔ پانچ آدمی اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ پڑے۔ بے چارہ کتا، کیا کرے؟ آغاز، سلسلہ، تلازمہ دلدل میں جا پہنچا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اتنے سارے موتیف (Motif) مل کر ایک مونتاج بناتے ہیں؟ مونتاج کا گیشٹالٹ (Gestalt) تمام موتیف کا احاطہ کرتے ہوئے ان سے ماورا بھی لے جاتا ہے۔ مونتاج کی ماورائیت استعارے کی غیر معروضیت سے ملحق ہے کیوبزم (Cubism) کہ غیر معروضیت کے ارتکاب کا اہم وسیلہ ہے، انتہائی دوررس نتائج کا ذمہ دار ثابت ہوا ہے۔ کیوبزم نے مکانیت کو چپٹا کر کے رکھ دیا ہے۔ مکانیت کو چپٹا کرنے کا عمل تاریخی طور پر نہایت اہم ہے۔ اسی نوعیت کا ایک عمل الٹی سمت میں اس سے پہلے بھی ہوا تھا۔ چودھویں صدی میں نشاۃ الثانیہ کے شروع شروع کی مصوری میں چپٹی سطحوں کو چھوڑ کر مصور سہ ابعادی تصویر کشی کی طرف مبذول ہوئے۔ یہ گویا قرون وسطیٰ کی خودنگری اور داخلیت سے نکل کر خارجی دنیا کی طرف ایک سفر تھا۔ اس سفر کا آغاز سائنسی فتوحات و انکشافات سے بہت پہلے مصوری کی دنیا میں ہوا۔ اب کے مصوری کا چپٹا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ خارج کی سہ ابعادی مکانیت سے دست کش ہو کر پھر دروں بینی اور داخلیت کا احیا ہو رہا ہے۔ جدید مصوری کی داخلیت موجودہ معاشرے کی وسیع خارجیت کے خلاف ایک شدید بغاوت کا درجہ رکھتی ہے۔ وسیع خارجیت کے خلاف اس کے رد عمل میں نفسیاتی تشفی کے سامان بھی ہیں۔ جدید مصوری جس کائنات کی تصویر کشی کرتی ہے اس میں انسان اجنبی ہے۔

مکانیت کا چپٹا ہونا کیوبزم میں ہی ظاہر نہیں ہوتا۔ ولیم بیرٹ (William Barret) کے خیال میں اس عمل نے ادب میں تین طریقوں سے اظہار پایا ہے۔ اول یہ کہ جدید ادب میں وقت چپٹا ہو گیا ہے۔ ماضی اور حال کو علحدہ

علاحدہ نہیں رکھا جاتا۔ واقعات بیک وقت ماضی اور حال میں وقوع پذیر ہوتے دکھائے جاتے ہیں۔ برگساں نے جسے لمحۂ محض سے تعبیر کیا ہے اس کا بہترین استحصال ادیبوں نے کیا ہے۔ ماضی اور حال کو یادداشت کے درخشاں وقفے میں متحد کر کے ادب نے تمام زمانوں پر حاوی ایک ایسا صیغۂ ہست ڈھونڈ نکالا ہے کہ ابتدا و انتہا کا تصور مٹ گیا ہے۔ دوم یہ کہ کلائمکس کا تصور مٹ گیا ہے۔ ارسطو کی بوطیقا کے مطابق ڈرامے کی ابتدا، کلائمکس اور انتہا ہونا ضروری ہے۔ عمل ایک مقام سے شروع ہو کر کلائمکس تک پہنچے۔ کلائمکس سے انتہا اور انجام تک کا سفر ادیب کے لئے لازمی تھا کہ وہ منطق، حاجت لازمیہ اور امکان کے تقاضوں کی متابعت میں کام کرے، اس کے ادب کی ساخت پرداخت پر ایک ایسا قابل فہم کل پیدا کرے جس کا ہر حصہ منطقی طور پر اپنے سے ماقبل کے واقعات سے نتیجہ لے۔ جدید ادب سے یہ تمام صفات منہا ہو چکی ہیں۔ کوئی ابتدا، کلائمکس اور انتہا نہیں۔ کچھ بھی واضح اور قابل فہم نہیں۔ بے ترتیبی اور انتشار نے مواد کو گھنا، غیر شفاف مغلق، ماورائے تفہیم اور متناقض بنا دیا ہے۔ جدید ادب کا امیج فطرت کی بے معنویت ہے کہ ابتدا و انتہا کے بغیر مسلسل اور متواتر جاری رہتی ہے۔ جدید ادب کے لئے ولیم بیرٹ کا فطرت کے امیج کا حوالہ لامعروضی تلازمہ ہی کی ایک شکل ہے۔ غیر معروضیت اسے رد کرتی ہے۔ سوم یہ کہ قدریں بھی چپٹی ہو گئی ہیں۔ اچھے برے، عظیم اور حقیر، خوبصورت اور بدصورت وغیرہ یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اونچ نیچ کی ہائرارکی (hierarchy) میں سب کچھ ایک ہی سطح پر آ گیا ہے۔

ادب میں کیوبزم کے یہ متوازی سلسلے دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر معروضیت ہمارے ویلٹنشا ننگ (waltenschung) کے خمیر میں ہے۔ اگر ایلیٹ، ہیملٹ کردار کو اہم سمجھ کر ارسطو کی بوطیقا زیر اثر کی بار بار اس کی جانب رجوع کرتا ہے تو ویلٹنشا ننگ کی غیر معروضیت اسے مجبور کرتی ہے کہ اہم اور غیر اہم کی تخصیص چھوڑ کر وہ ہیملٹ ڈرامے کا نہ صرف بہ حیثیت مجموعی جائزہ لے بلکہ اس امر کی طرف توجہ بھی دلائے کہ ہیملٹ ڈراما ابتدائی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ ہیملٹ کردار کی اہمیت ثانوی درجے کی ہے۔

استعارے کی جہات کی یہ توسیع تجرید کے آفاق کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ تجرید کے صحن پر ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ مصوری میں اس تصویر کی سطح آناً فاناً اپنی تمام تفصیلات سمیت پردۂ چشم پر منتقل ہوتے ہی کل کو پیش کر دیتی ہے، یکے بعد دیگرے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ زبان زمانی صفات رکھتی ہے۔ ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ آتا ہے۔ کلام کے تمام اجزا، جملے، بیک وقت موجود نہیں ہوتے، بتدریج بنتے مٹتے ہیں۔ ان میں تصویر کے اعضا کی طرح کی شدید ہم عصریت نہیں ہوتی۔ لسانی تشکیلات کی اس دوگونہ زمانیت سے چھٹکارا پانے کے لئے شعور کی رو کا ادب پیدا ہوا ہے۔ اپنے مکمل وجود میں یہ ادب غالب طور پر زمانیت سے رہائی پا جاتا ہے۔ اس ادب کی ہیئتی ساخت پرداخت بڑی شدت سے اپنے کل کی اکائی کو متحجر کرتی ہے تاکہ استعارہ اپنے زمان و مکان کی حد بندی کو توڑ کر غیر معروضیت کا اثبات کرتے ہوئے تجرید سے ہم کنار ہو جائے ☆☆☆

معنی کا خمیازہ تشدد کا صلہ، واللہ

افتخار جالب

شمارہ ۴۲،
نومبر ۱۹۶۹

یہ کہ صد مرتبہ محتاج ہوئی، جلتی زمیں
بند پیمانہ ثمر چکھنے کو، لذت کے منقش در و دیوار
وہی بات ہے، جو عقد ثریا کی گندھی شاخیں
لرزتے ہوئے پیچیدہ گھنے سائے، تڑپتے ہیں
زباں خشک ہوئی، نطق گلوگیر ہے
پابند ہے، آواز
پابجولاں ہے، شعاعوں میں بندھے سائے
سلاخوں سے گذرتے ہیں
بھنور کرنیں اچٹتی ہوئی نظروں کے حباب آئینہ پھیلاؤ میں
حرکت کا ثبات
چپچپا، خودنگر، احساس کی شرمندہ بصیرت کا امر
ایک تغیر ہی کہیں، گہرے سیہ پانیوں میں کھول گیا
شب کے محجوب گلی کوچوں میں کیچڑ ہے
تعفن سے شرابور سراسیمگی
آرائش محفل میں فسوں پھونکتی
نظروں کی زبان بولتی ہے۔ لفظ سوارت نہ ہوئے
باندھتے رہنے میں رہیں: معنی کا خمیازہ تشدد کا صلہ، واللہ

دھر کے ہیئتی شیئتی سحر کا پردہ

افتخار جالب

شمارہ ۹۸
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

کاٹھ کباڑ پہاڑ سے دھندوں میں دہشتوں کی معذوریاں ہیں
دل آنا فانا کل محتاط سلیقوں پر، تعظیمی بندشوں کی جبریتوں سے متشددی آزادیوں کا متقاضی ہے
ہر چند حقیقتوں کی متجاوز یورشیں واہموں کی تقلید سے روگردانیوں بدعنوانیوں میں
بے دم ہوتی، از خود ٹوٹتی، نامعلوم نقاب کی پردہ پوشیاں کھینچ اتارتی ہیں
پھر کشف عذاب کدورتیں میل کثافتیں چھوٹنی چاہئیں
کچھ بھی تو ہوتا نہیں
بے کیف زمانہ کی زحمتیں ظلم روا رکھتی ہیں
زخموں کو صبر سے سہتے ہی بنتی ہے
نمناک مناظر میں پیوست لب و رخسار کے دھندلے دھبوں میں
جو خوف لرزنے لگتا ہے، تحلیل ہی کر کے چھوڑتا ہے:
ان عہد کے رخنوں میں پلتے ارادوں کو
جنھیں چھوڑنے کی عافیت کو پوشیدگی کے ارمان اجاڑتے رہتے ہیں
موضوع اور اک خلا سے بھی نازک نوک مژہ پر بے تقصیر خطاؤں کے خالی جملے
دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں: لاچار کہ جن کو نطق سے ادنیٰ و ناقص رابطہ رکھنے کی توفیق نہیں!
اس گونگے بہرے کی غوں غاں کو، اپنے معانی پہنانے کی استعداد نہیں ہے، لیکن
دل کے حساب سے، جیسے بھی چاہیں، نبٹاتے ہیں، ان منزلوں کو
تحریص جنھیں ہر طور ہماری شہ رگ سے پیوستہ دیکھنا چاہتی ہے
خواہشیں اتنا ہی چاہتی ہیں کہ لوٹ کھسوٹ کے جبر و تشدد قہر کی راہیں دائمی سربسجود رہیں
ناچیز ٹھوکریں دہر کے ہیئتی شیئتی سحر کا پردہ چاک کریں
درماندگی خود ایمان کی رستاخیز بنے
نادیدہ جکڑتے پھندوں کے
زندہ ریشوں کو
اپنی حقیقت سے نابود: ہلاک: فنافی الذات کریں
ناشاد سہی لاچار نہ ہو، اک دنیا پھر آباد کریں

غزل

افتخار عارف

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

جنوں کا رنگ بھی شعلہ نمو کا بھی ہو
سکوت شب میں اک انداز گفتگو کا بھی ہو

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو

وہ جس کے ڈوبتے ہی ناؤ ڈگمگانے لگی
کسے خبر وہی تارہ ستارہ جو کا بھی ہو

ثبوت محکمی جاں ہے جس کی برش ناز
اسی کے تیغ سے رشتہ رگ گلو کا بھی ہو

وفا کے باب میں کار سخن تمام ہوا
مری زمین پر اک معرکہ لہو کا بھی ہو

غزل

افتخار نسیم

شمارہ ۱۸۷،
اکتوبر ۱۹۹۵

چاند پھر تاروں کی اجلی ریزگاری دے گیا
رات کو یہ بھیک کیسی خود بھکاری دے گیا

ٹانکتی پھرتی ہیں کرنیں بادلوں کی شال پر
وہ ہوا کے ہاتھ میں گوٹہ کناری دے گیا

کر گیا ہے دل کو ہر اک واہمے سے بے نیاز
روح کو لیکن عجب سی بے قراری دے گیا

شور کرتے ہیں پرندے پیڑ کٹتا دیکھ کر
شہر کے دست ہوس کو کون آری دے گیا

اس نے گھائل بھی کیا تو کیسے پتھر سے نسیم
پھول کا تحفہ مجھے میرا شکاری دے گیا

میں دروپدی نہیں ہوں

افتخار نسیم

شمارہ ۲۰۲،
جنوری ۱۹۹۷

کل رات بھی تم اس قدر
نشے میں تھے
کہ تم سے کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا تھا
مہمان کچھ مجھ پر ہنس رہے تھے
کچھ تم پر
اور کچھ تمھاری باتیں سن کر
''کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں''
کہتے ہوئے چلے جا رہے تھے
فرش پر تمھارے ٹوٹے ہوئے گلاس
کی کرچیاں چنتے چنتے
میرے تلوے زخمی ہو گئے ہیں
میں تھک گیا ہوں
کاش میں تمھاری روح کے
گھٹاٹوپ اندھیرے میں
چھپے ہوئے اس انسان کو ڈھونڈ نکالوں
جس کی وجہ سے
میں نے تم سے پیار کیا تھا
پینے کے اس کھیل میں تم نے
اپنی زندگی اور میری محبت
داؤ پر لگا دی ہے
اور تم جانتے ہو
کہ تم ہار رہے ہو
لیکن میں دروپدی نہیں ہوں
کہ تم مجھے بھی داؤ پر لگا دو
میں نے کبھی کسی کی زندگی نہیں گذاری
اس لئے میں کسی کی موت نہیں
مرنا چاہتا

افضال احمد سید

شمارہ ۲۴۷،
اگست ۲۰۰۱

میری وحشت سے جو اس حسن پہ تشدید آئی
دل یہ کہتا ہے کہ اب ساعت تمہید آئی

روبرو اس کے جو اس دل سا خطاکار آیا
اس کی آنکھوں میں بھی اک شوخی تائید آئی

کون سی مے سے مری خاک میں نم آیا ہے
کس ستارے سے مرے خواب میں تجرید آئی

پاس ناموس جنوں ضبط گریباں کے لیے
فصل گل آئی تو مجھ پر بڑی تاکید آئی

ایک آئینہ میں ایسا بھی لئے پھرتا ہوں
جس میں جب دیکھا، نظر صورت امید آئی

سرگراں رہتے ہیں اس پہ یہ دبیران کہن
مجھ کو کس مشق سے رنگینی تسوید آئی

اس نے سن کر یہ غزل بوسۂ لب تک نہ دیا
اس کی جانب سے بڑی سخت یہ تنقید آئی

افضال نوید

شمارہ ۲۴۱،
اکتوبر،نومبر ۲۰۰۰

ساغر ہو یا قلم ہو لہو مانگتا ہے یار
لاؤں میں کس جگر سے جو تو مانگتا ہے یار

ہے پیش گل سکت کی کمی نطق ہے خفی
اور صحن باغ خار گلو مانگتا ہے یار

جھگڑا مدام رکھتا ہے مابعد وصل و ہجر
جو ہے نہیں وہ عربدہ جو مانگتا ہے یار

بے موج رنگی کہاں رفت اپنے آپ سے
اسباب بے خودی کوئی ہو مانگتا ہے یار

ندی کوئی گذرتی نہیں گرد و پیش سے
اور اہتمام سجدہ وضو مانگتا ہے یار

یعنی بنے بنائے پہ کیا استوار ہو
ہونا نہ ہونے کی کوئی خو مانگتا ہے یار

جاں کھینچ لے گئی مری صدپارہ جلد کو
دل کا یہ حال تجھ سے رفو مانگتا ہے یار

افغان اللہ

شمارہ ۱۱۵،
جون ۱۹۸۰

اس سے پہلے
کہ فضا میں بکھرے ہوئے
لاکھوں زہریلے کیڑے
میرے بدن سے تمام گوشت ریزہ ریزہ نوچ لیں، کھا جائیں
یا یہ دھند مجھے اندھا کردے
میں ایک بار، صرف ایک بار اس شہر کا حاکم ہونا چاہتا ہوں
تا کہ ''انھیں'' ہر چوراہے پر منھ کھول کر کھڑا کروادوں
اور ان کے گلے میں یہ عبارت جھولتی ہو
''یہاں تھوکئے''
یہی سب سے ہلکی سزا ہے جو انھیں ملنی چاہئے
اب تو... اب تو... میرے سامنے ان کے جرموں کی فہرست بھی تو ہین ہے
میں نہیں جانتا کہ یہ سازش ہے یا بیوقوفی
لاشوں کے بوجھ کندھوں پر لاد دیئے گئے
انھوں نے سوچا ہم پر ہر تجربہ روا ہے
ہماری تخلیق ہی ان کے لئے ہوئی ہے
کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟
کہ چھوٹے چھوٹے گھروں میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے
آنگن میں جھانکنا
اور للکارنا... نہیں... ہم تو انسان ہیں!
ہزر برس بیت گئے... ہم سے کہا گیا کہ حکومت عقلمندوں کو ملتی ہے
کیڑے کی طرح رینگنا عزت کی بات ہے
طوطے کو رام رام رٹا کر سوچتے ہو سنسکرت میں سوچے گا
لیکن اب... ہم...
ہر ذمہ داری سے انکار کرتے ہیں
خوف ایک شرمناک مرض کی شکل اختیار کر چکا ہے
ہم خلاؤں میں دوڑتے ہیں چیختے ہیں۔ بچ کر نکل بھاگنا چاہتے ہیں
ہماری زبانیں جو ماں کا دودھ ہیں
کٹ جانا چاہتی ہیں
کٹ جائیں گی کیا؟
اس سے پہلے یہ آگ پانی ہوا اپنے اندر سمولے
مجھے ایک بار صرف اک بار حاکم بنادو حاکم بنادو

اقبال پٹیل

شمارہ ۲۸۳،
اگست ۲۰۰۴

نمو

خاموش فضاؤں میں
اونچے پہاڑ کی ڈھلان پر بسی ہوئی جھونپڑی میں بیٹھی ہوئی
نمو
اپنے سوکھے، پکے، اڑتے ہوئے
بالوں سے پریشان
سوچ میں ڈوبی ہوئی
کھوئی کھوئی سی
صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے
کھانا پکا رہی ہے
چولھے سے نکلتا ہوا دھواں
بادلوں سے گلے ملتا ہے
جھونپڑی اور بادل
بہت پاس پاس رہتے ہیں۔

ٹھیک اسی جھونپڑی سے
نکلتی ہے
ایک پگڈنڈی جو وادیوں سے ہوکر
پتھریلے راستے سے گذرتی ہوئی
سڑک سے جا ملتی ہے، اس سڑک کا بھی ایک قصہ ہے۔ اسی سڑک سے
گیا تھا
شہر
نمو کا دلبر
آج تک لوٹ کر نہیں آیا

ہم تو کچھ بھی نہیں

چلو
وقت کے طاق میں رکھ دیں
اپنے ماضی کے
سارے غم
نفع نقصان کی باتوں سے
پرے ہو جائیں
سارے خواب توڑ دیں
بے خواب ہو جائیں۔

جو ہے وہ ہے
جو نہیں ہے وہ نہیں ہے
فلسفوں کے رنگ بھرے
زندگی کی بے رنگ تصویریں
پھول خوشبو کی باتیں
تاروں کا ذکر کرتی
اپنی تحریریں

نہ آج ہے
نہ کل ہے
جو بھی ہے بس
یہ ایک پل ہے
ہم کیا ہیں
ہم تو کچھ بھی نہیں

موسم

بہت جھڑ سے پہلے ہی
گرے ہوئے
کچھ بے قرار پتے...
مرنے کے انتظار میں
ادھر سے ادھر
اڑتے ہیں
پاگل ہواؤں کے
اشاروں پر یہاں وہاں
مڑتے ہیں

پیڑ
چپ چاپ کھڑے ہیں
جنگل کا
سارا درد اوڑھے
انھیں یقین ہی نہیں ہوتا اس کا
جو ان کے پاس،
ان کے ساتھ، ہو رہا ہے

پیٹ کا کیچوا

اقبال مجید

شمارہ ۱۹
دسمبر ۱۹۶۷

"کفن کے کپڑے میں کتنا خرچ ہوگا؟"

"تیس پچیس روپے۔"

"غسل وغیرہ میں؟"

"دس پندرہ روپے۔"

"قبر کے لئے؟"

"اگر قبر کی جگہ لی گئی تو تیس پینتیس روپے۔"

"اور دفن کے واسطے؟"

"پندرہ بیس روپے اوپر سے اور رکھو۔"

"تو سو روپے کے اندر کام ہو جائے گا؟" اس نے جیسے سیدھے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو تمھارے پاس کیا کچھ بھی نقد نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں۔"

"کتنا ہے؟"

"دو سو روپے۔" میں نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے پاس نقد دو سو روپیہ موجود ہے۔" میں نے جملہ پھر دہرایا۔ ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا؟" جیسے اب تک وہ میرے سامنے ریوالور تانے کھڑا ہو اور اب اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی ہو۔

"اب تمھیں کس بات کا انتظار ہے۔ یہ لاش اب تک یوں ہی کیوں پڑی ہے؟" اس نے گولی چلا دی۔ جیسے میری شہ رگ پر نوکیلی کیل رکھ کر ٹھونک دی گئی ہو۔

"تم ذلیل ہو۔" میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی نہیں تو کچھ دیر بعد تم مجھ سے یہ سوال ضرور کرو گے۔ کمینے!"

لاش کیوں پڑی ہے؟

کیوں!

کیوں!!

یہی کیوں تھا جو پچھلے چار گھنٹوں سے میرے دماغ کے گودے کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔

برابر والے کمرے سے راجہ کی ماں تھمی تھمی سسکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ راجہ کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے راجہ کو پیر کے انگوٹھوں سے لے کر سر تک چادر سے ڈھک رکھا تھا۔

میں نے اپنے اندھیرے کمرے سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ باہر کا اندھیرا جیسے اندر آ گیا تھا۔ بہت اندر۔ باہر حد نظر تک بہت کچھ خالی خالی سا کھلا کھلا سا تھا۔ میرے دماغ کے گوشوں کی طرح۔ رات جو سارے دکھوں کو سلا دیتی ہے میرے دکھ کو پھوڑے کی طرح تپا رہی تھی۔

ابھی چار گھنٹے پہلے راجہ زندہ تھا۔ اس نے مجھ سے مدھم سی آواز میں تین پہیوں والی سائیکل لا دینے کی فرمائش کی تھی اور اب سامنے کے روشن دان کی طرح اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اور لوبان جل رہا تھا۔ ناک میں بو پہنچی تو میں نے کنکھیوں سے اس کمرے کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں دیر سے اندھیرے میں بیٹھا ہوں۔ میری نگاہوں نے بجلی کی سوئچ کو ٹٹولا اور پھر اٹھ کر سوئچ کی طرف بڑھا۔ ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھایا۔

"بتی مت جلاؤ۔" اس نے سرگوشی کی۔

اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس وقت میں روشنی سے ڈر رہا تھا۔ جیسے روشنی مجھے ننگا کر دے گی۔ مادر زاد ننگا۔ اور راجہ کی ماں مجھے یوں ننگا دیکھ کر مجھے پھاڑ کھائے گی۔ وہ کہے گی۔

"گھر میں تمھارے بچے کی لاش پڑی ہے اور تم ننگے ہو کر گھوم رہے ہو۔"

"بے شرم بے حیا۔"

"ننگے۔ ننگے۔"

میرا ہاتھ سوکھی پرت سے لوٹ آیا۔

"مگر یہ اندھیرا کب تک مجھے بچائے رکھے گا۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے مخاطب ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ میں گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ وہ میری بے بسی کو خوب جانتا تھا لیکن خاموش رہا۔ میرے ان اندھیروں کو، میری اس تنہائی کو صرف ایک روشن دان تھا جو تکے جا رہا تھا۔ کمرے کی دیوار کا روشن دان۔

یہ روشن دان سات سال پرانا ہے۔ کیوں کہ بانو کے شکم میں راجہ سات سال پہلے آیا تھا۔ تب ہی سے مجھے لگنے لگا تھا جیسے کوئی چیز برابر ہر وقت مجھے گھورے جا رہی ہے جب میں نے اس سے کہا تھا۔ بہت مجبور ہو کر کہا تھا۔

"تم ایک بات نہیں کی یا یہ جان چکی ہو کہ مجھے تمھارے عقیدے وغیرہ سے کوئی غرض نہیں۔"

"لیکن۔" وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی اور گھٹ کر رہ گئی۔ اسے میری طرح بولنا نہیں آتا تھا۔ وہ محرم کے دنوں میں سر سے دوپٹہ پہنتی تھی۔ امام باڑوں کے سامنے نوحے پڑھتی تھی۔ میری ریشہ دوانیوں پر کب وہ جیت سکی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں برہم تھا اور بھی تیز ہو کر بولا۔ "میں نے تم سے محبت کی، شادی کی یعنی اس بات کا اقرار کیا کہ ہمارے جو بچے ہوں گے وہ میری پناہ میں رہیں گے۔ ہم ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹیں گے اور بس۔"

"میں کب کہتی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "لیکن اماں اسے نہیں مانیں گی۔"

"ان سے کہہ دو کہ میں خدا کو نہیں مانتا، میں مذہب کو ایک غیر ضروری چیز سمجھتا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ میرے خاندان میں بدنام ہو جائیں گے۔"

"پرواہ نہیں۔" میں بولا۔ "میں نے تم سے شادی کی ہے تمھارے عقیدے سے نہیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اپنے ماں باپ کے مذہب سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔"

"اور ہمارے بچے۔" وہ شرم سے سرخ ہوتے ہوئے گردن جھکا کر بولی۔

"ان کا بھی ہم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔" ہمارا فرض ان کی نگرانی کر کے انھیں بڑا کرنا ہے، اس کے بعد وہ خود راستہ ڈھونڈھیں گے۔ فیصلہ کریں گے وہ کیا مانتے ہیں کیا نہیں مانتے یہ ان کا اپنا معاملہ ہوگا۔"

"نہیں۔ شاید اماں کو اس کا بڑا دکھ ہوگا۔ وہ انھیں شیعہ دینیات ضرور پڑھائیں گی۔"

"اگر میری ماں سنی دینیات کے لئے بضد ہوں تو۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے اپنے کو سنبھالا۔

"چار چھ سال کیوں نہ وہ دونوں ہی دینیاتوں کو پڑھ لیں۔ سمجھ دار ہو کر تو پھر وہ وہی کریں گے جو ان کی مرضی ہوگی۔" اور تب ہی میں نے اسے بڑا زوردار حتم کا انکشاف ہو رہا تھا۔

"ایک بات صاف سمجھ لو بانو۔ ہم اپنے بچوں میں کوئی بھی زہر نہیں بوئیں گے۔ میں اپنی محبت کے بدلے تم سے صرف اتنا ہی مانگتا ہوں۔"

بڑے تیور سے وہ فلمی قسم کا مکالمہ میں نے ادا کیا تھا۔

اور آج کی رات جب کہ راجہ کو پیدا ہوئے سات سال ہو چکے ہیں۔ جب کہ اسے مرے ہوئے چار گھنٹے گذر چکے ہیں اور یہ روشن دان مجھے ٹکٹکی باندھے تکے جا رہا ہے۔ محض مکالموں سے کام نہیں چلے گا۔ کیوں کہ وہ برابر میرے پیچھے لگا ہے۔ مجھ سے الٹے سیدھے سوال کر چکا ہے۔ اس وقت بھی میرے قریب بیٹھا ہے اور مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"یہ شیعہ سنی کا کیا چکر ہے؟"

"صرف اتنا کہ میں نے ایک شیعہ لڑکی سے شادی کی ہے، محبت کی ہے جب کہ میرے ماں باپ سنی ہیں اور میں خدا تک کا منکر ہوں۔"

"اور لڑکی؟"

"وہ عورت ہے، جاہل ہے، کٹر ہے، خدا اور قیامت پر یقین رکھتی ہے۔"

"لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے تمھارے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر وہ شیعہ نہ ہو کر ہندو ہوتی تب بھی کیا فرق پڑتا؟"

"کچھ نہیں۔"

"اور اگر وہ عیسائی، سکھ یا کسی طرح کی کوئی اور چیز ہوتی تو بھی تمھارا مسئلہ تو شاید یوں ہی رہتا۔"

میرا مسئلہ؟ میرا کون سا مسئلہ؟" میں نے گھبرا کر اس سے نگاہیں ملائے بغیر پوچھا۔

"وہی۔" یہ کہہ کر اس بار وہ مسکرایا۔ میرے بچے کی لاش پڑی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس مسکراہٹ کے لئے یقیناً اسے بڑی محنت کرنا پڑی ہوگی۔

"برا نہ مانو تو کہوں۔"

"کہو۔" میں اندر سے کانپ گیا۔ لیکن وہ کچھوا تھا۔ میرے پیٹ کا کیچوا۔ سب جانتا تھا۔

"وہی مسئلہ جس کے سبب پچھلے کئی گھنٹوں سے تمھارے بچے کی لاش پڑی ہے اور تم بے دست و پا بیٹھے ہو۔"

میں نے نفرت سے اس کی طرف سے منھ موڑ لیا۔

مانگ پور کی یہ رات جو میں اپنے وطن سے دو سو میل دور رہ کر کاٹ رہا تھا شاید وہ نہ ہوتی اگر میرے گھر پر میرے خاندان کے بیچ گذرتی۔ میں اس ذہنی کرب سے بچ جاتا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ راجہ کی دادی سب کچھ کر دیتیں، راجہ کیسے نہلایا گیا، کون سا غسل ہوا، کون سی آیتیں پڑھی گئیں، کیسے کفن سلا، کیسے قبر میں اتارا گیا۔ سب کچھ ماں کرتی، بانو کی ماں اس وقت کیا کہتی مجھے نہیں

معلوم۔ میں ایک دکھی باپ جس کی اولاد مرگئی ہو آنے والوں کے پرسے سنا کرتا۔ موت کی تفصیل بتاتا ہوتا۔ صرف دو سو روپے ماں کے ہاتھ میں رکھ کر تمام الجھنوں سے سبکدوش ہو جاتا۔ پھر وہ مجھ سے اس طرح کے الٹے سیدھے سوال نہ کرتا۔ لیکن ایسی حالت میں راجہ کی لاش کو میں وطن بھی تو نہیں لے جا سکتا تھا۔ چھوٹے سے اس قصبہ میں نہ ٹیکسی نہ لاری۔ ڈاک کے ذریعہ خاندان والوں کو اطلاع کر دی تھی۔ لیکن کوئی بھی دوسرے دن سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایک رات، ایک دن اور پھر شام۔ آخری رسوم کو اس سے پہلے ہونا تھا۔ جلد سے جلد ورنہ لاش خراب ہو سکتی تھی۔ بانو ماں تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر مجھ سے کہا تھا۔

"دیکھو تم نے ہمیشہ من مانی کی ہے۔ مگر اب میری ایک بات مان لو۔ یہ راجہ کی نہیں میری لاش ہے۔ اسے یہ سمجھ کر دفناؤ جیسے مجھے دفنا رہے ہو۔" اور وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں بھی رو پڑا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا اور اسی لئے دل میں ایک خوف لئے اپنے کو اندھیرے میں چھپائے بیٹھا تھا تاکہ وہ روشنی میں میرے دل کے خوف کو پہچان نہ لے۔

میں قسمت کو نہیں مانتا لیکن اتفاقات کو مانتا ہوں۔ پوری بستی میں تین شیعہ گھر تھے جن سے میں مدد لے سکتا تھا جو راجہ کو اسی عقیدے کے مطابق دفن کر سکتے تھے جیسا کہ میری بیوی چاہتی تھی۔ میں بستی میں اجنبی ضرور تھا، لیکن میں ان تینوں گھروں میں گیا۔ ان سے بتانے کہ میرا لڑکا مر گیا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں میری مدد کیجئے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان لوگوں کو اپنے گھر بلا کر لاش کو دفن کراؤں گا۔ ان میں سے کسی بڑے کے ہاتھ میں دو سو روپے رکھ دوں گا اور وہ سارا انتظام کر دیں گے۔ لیکن جب میں ایک گھنٹہ کی تلاش کے بعد گھر واپس لوٹا تو میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ایک ایسی پسپائی تھی ایک ایسی تھکن تھی جس کی شکایت میں کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ روح کے کچھ تجربے ہمارے اپنے ہو جاتے ہیں ان کا ساجھے دار کوئی نہیں ہو سکتا۔ سوچا تھا یہ بات بانو سے کہہ دوں گا۔ گھر پہنچا تو پاس پڑوس کی عورتیں بانو کے پاس بیٹھی تھیں۔

میں مردہ قدموں سے اپنے کمرے میں اندھیرے میں جا کر پھر بیٹھ گیا۔ اس کا میرا بڑا پرانا ساتھ تھا۔ وہ میری کمزوریوں کو خوب جانتا تھا۔ لیکن اس بار وہ ہمیشہ سے زیادہ حربے استعمال کر رہا تھا۔ میری آنتوں میں رینگتا ہوا بولا۔

"تو اس کے مطلب یہ ہوئے کہ زندگی ہو یا موت پیسے کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے مری سی آواز میں پوچھا۔

"مطلب یہ؟" اس کا لہجہ اداس تھا۔ "کہ تمہارے پاس دو سو روپے موجود ہیں لیکن پھر بھی تم بے بس ہو، لوگوں کے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہو۔"

"دیکھو میں بہت پست ہو گیا ہوں۔" میں نے خوشامد کی۔ "خدا کے لئے مجھ پر یوں تیر نہ چلاؤ۔"

"کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو؟" یکبارگی وہ پوچھ بیٹھا۔

"میں تم سے بہت ڈرتا ہوں۔ اور نہیں بھی ڈرتا۔ تم کمینے آدمی ہو، سفاک ہو۔ دوسری بات یہ کہ تم مشین کی طرح ٹھنڈے ہو۔ موقع نہیں دیکھتے، برابر کچوکے لگائے جاتے ہو، میرا لڑکا مر گیا ہے۔ بانو راجہ کا جنازہ اپنے عقیدے کے مطابق اٹھانا چاہتی ہے۔ وہ اس کی آخری رسوم اس شکل میں دیکھنا چاہتی ہے جس میں اس کے گھر کے دوسرے مردے اٹھے تھے۔"

"شکل۔" وہ مسکرایا۔ "کیا کوئی ایسا آدمی ملا جو بانو کے عقیدے کے مطابق بچے کی تجہیز و تکفین کرے۔"

"نہیں اتفاق سے تینوں گھر کے مرد بستی میں موجود نہیں۔ ایک ہے لیکن وہ بیمار ہے۔ میں قسمت کو نہیں مانتا لیکن اتفاق کو مانتا ہوں۔"

"اچھا اگر بانو ہندو ہوتی۔ اور وہ اپنے بچے کی آخری رسوم اس شکل میں دیکھنا چاہتی جس میں اس کے گھر کے دوسرے مردے اٹھے تھے تو تم کیا کرتے؟"

"میں راجہ کو۔"

تم راجہ کو جلا دیتے؟ ہے نہ؟؟ اس نے بیچ میں میری بات چھین لی۔

"شکلوں کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔ پارسی اپنے مردوں کو Tower of silence میں رکھ آتے ہیں، انگریز دوسری طرح سے دفن کرتے ہیں، زمین پر ہزاروں شکلیں ہیں، اس کرۂ ارض پر الگ الگ انسان نے نہ جانے کتنی رسوم میں کتنی شکلوں میں اپنی زندگی، موت، شادی بیاہ اور زندگی کرنے کا اظہار کیا ہے۔"

"تم اور کوئی بات نہیں کر سکتے۔ یا کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے۔"

لیکن وہ نہیں مانا۔ تب اس نے بتایا سمندر کے سفر میں جہاں زمین نہیں ہوتی خواہ کسی رسم کا ماننے والا ہو لاش کو سمندر کے سپرد کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے اور مچھلیاں اس کھا جاتی ہیں، لیکن زمین پر۔

شکل!شکل!!!

اور تب ہی اس نے یہ پوچھا تھا۔

"لیکن مان لو، بانو تمہارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہوتی۔ تمہاری ہی طرح وہ بھی کسی خدا اور کسی جنم پہ یقین نہ رکھتی۔ تم عدالت کے سامنے اس سے شادی کا اقرار کرتے۔ فرض کرو بانو کا راجہ آج یوں مرا پڑا ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

میں کچھ نہیں بولا۔

لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ پیٹ میں پڑے ہوئے کیچوؤں کی طرح وہ میری ہر غذا کا ساجھے دار تھا۔ اس کو رینگنے کی عادت تھی۔ آنتوں میں چپے رہ کر اس نے میری عمر پائی تھی لیکن وہ ایک foreign body جو بس کیچوے کی طرح میرے اندر پلا بڑھا تھا اور میری ہر خوراک پر قبضہ جمائے تھا۔ جب رینگتا تھا ایک foreign body کے روپ میں جب اپنے وجود کو منواتا تھا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ میں درد سے تڑپ اٹھتا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے وجود کو میرے اندر گھسے رہ کر منوانا چاہتا تھا۔ میں اس کی شخصیت کے اس پہلو سے واقف تھا اور مجبور تھا۔ اس وقت بھی وہ مجھے درد سے تڑپا رہا تھا۔ یعنی اندر ہی اندر رینگنے کی کوشش کر رہا

تھا۔

"بولو تم جو کسی شکل کو نہیں مانتے۔ اس وقت تم کون سی شکل اپناتے؟"

میں کچھ نہیں بولا۔

"کیا تم راجہ کو جلا دیتے؟"

"_____"

"میرا مطلب ہے کیا بانو بھی اسے جلانے کے لئے تیار ہو جاتی؟ اس لئے کہ عورت زیادہ conservative ہوتی ہے۔ ممکن ہے تم وقت کی مروجہ شکلوں میں ایک نئی شکل کا اضافہ کرتے۔ یعنی تم کوئی نئی بات سوچتے۔ تم راجہ کی لاش کو محض گھورے پر پھینک کر ہی مطمئن ہو جاتے۔"

"بکواس مت کرو۔" میں تلخی سے بولا۔

"سنو۔" اس کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔

میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔" میں تلخی سے بولا۔ لیکن وہ نہیں مانا کہنے لگا۔

"دیکھو ساری بات یہ ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔"

"تم کیچوے ہو اور کیچوؤں سے مجھے گھن آتی ہے۔" میں نے اپنا غصہ دبا کر جواب دیا۔

"قصہ یہ ہے۔" وہ حرام زدگی پر تلا ہوا تھا۔ "کہ خداؤں سے انکار کرنا بڑا آسان ہے لیکن راجہ کو، امن کی حالت میں (اس لئے کہ جنگ میں سب ممکن ہے) گھورے پر پھینک دینا بڑا مشکل کام ہے۔"

میں کہتا ہوں چپ رہو۔" میں چیخ اٹھا۔

"میری جان۔" وہ بڑی نرمی سے گویا ہوا۔ کیا تم جانتے ہو کہ سنی مسلمان اپنے مردے کی تجہیز و تکفین کیسے کرتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"اور شیعہ مسلمان؟"

"نہیں۔"

"تم تو شاید غسل میت بھی نہیں جانتے ہو گے۔"

"نہیں۔"

"اور فاتحہ؟"

"بچپن میں سیکھا تھا اب بھول گیا ہوں۔"

"اور اب ان سب کے لئے تمہیں کرائے کے آدمی چاہئے۔" وہ بہت زور سے ہنسنے والا تھا کہ بانو کا خیال کر کے رک گیا۔ برابر ہی کمرے میں بانو عورتوں کے پاس رو رہی تھی۔

"دیکھو بانو کو بکنے دو۔ اگر تم میں ہمت نہیں ہے تو میں ہی تمہاری کچھ خدمت کئے دیتا ہوں۔ میں چپکے سے راجہ کی لاش لئے جاتا ہوں، کندھے پر لاد لوں گا۔ چپکے سے میونسپلٹی کے کسی گھورے پر پھینک آؤں گا۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو یار۔"

لیکن وہ کہتا رہا۔ "ایک آدھ روز میں جب لاش سڑ جائے گی تو جمعدار کسی مہتر سے اٹھوا کر بستی کے باہر پھنکوا دے گا۔"

وہ اتنا بچہ نہیں تھا کہ اس فرق کو محسوس نہ کر پاتا۔

تجہیز و تکفین کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ پھر وہ مذہب کی دھمکی کیوں دے رہا تھا۔ اس کا نام لے لے کر کیوں ڈرا رہا تھا۔ خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی بہر حال مجھے اپنے بچے کی لاش کو باعزت طور پر ٹھکانے لگانا تھا۔ کسی ایسی شکل میں جسے دل قبول کرے۔ یہ میرا المیہ نہیں تھا کہ لاش کس طرح ٹھکانے لگائی جائے، میری الجھن تو یہ تھی کہ۔

"تو پھر بولو۔ کیا فیصلہ کیا؟ جن آدمیوں کو تم ڈھونڈھنے گئے تھے وہ کرائے کے آدمی تو تم کو ملے نہیں۔" اس نے پھر مجھے چونکا دیا۔

اور تب میں نے اس سے بتایا کہ یہی میری مجبوری ہے۔

"تو پھر تم اپنی بیوی کو سمجھا کیوں نہیں دیتے؟ کہہ دو کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہ ممکن نہیں۔ پڑوسیوں کو بلواؤ۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔

اس روز سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے ان سب کی ضرورت تھی۔ انھوں نے میرے بچے کو نہلایا دھلایا، کفن سلوایا، اسے لپیٹا، لوبان اور کیوڑہ اور کوری چٹائی لائی گئی۔ آیتیں پڑھی گئیں۔ وہ یہ سب کرتے جاتے اور مجھے دیکھتے بھی جاتے۔ راجہ کو قبر میں اتارتے اتارتے وہ میرے بارے میں بغیر میرے بتائے ہی سب کچھ جان چکے تھے اور مجھے ذلیل کر چکے تھے اور اپنے ایک ایک عمل سے انھوں نے ظاہر کر دیا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خدا ترسی کے ناطے کر رہے ہیں۔ وہ جیسے کہہ رہے ہوں۔

"دیکھو تم کتنے کمینے ہو، کس قدر غلیظ ہو لیکن ہم اپنی ناکوں پر کپڑے باندھ کر تمہارے غلیظ بدن میں پڑے ہوئے کیڑے کو نکال رہے ہیں۔ لیکن تم اتنے بڑے احسان فراموش ہو کہ کل سویرا ہوتے ہی ہمارے اس احسان کو بھول جاؤ گے کہ ہم نے تم کو تمہارے آڑے وقتوں پر سنبھالا تمہیں سہارا دیا۔ روح کے ایک عذاب سے بچایا۔"

راجہ کو قبر میں اتارنے کے بعد جب میں شام کو گھر لوٹا تو کچھ اسی طرح کی بات اس نے بھی مجھ سے پوچھی تھی۔

"فرض کرو اس بستی میں تم اکیلے مسلمان ہوتے، میرا مطلب ہے ظاہری قسم کے مسلمان، اور باقی لوگ کچھ اور ہوتے تو پھر تم کیا کرتے؟"

اور تب میں نے سنجیدگی سے سوچا تھا کہ سارے فساد کی جڑ یہی کمبخت ہے۔ یہ جو مجھے برابر کچوکے لگا رہا ہے، اذیتیں دے رہا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کر کے چوٹیں مار رہا ہے۔ ایسے سوال کر رہا ہے جو مجھے پریشان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا، اور آخری بار تصدیق کی کہ اس کا وجود ایک کیچوے کے مانند ہے۔ جو میرے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اس روز سے جس روز میں نے دنیا میں آنکھ کھولی اور اپنی ماں کا دودھ پیا اسی روز سے یہ میری تمام تر غذاؤں کا ساجھے دار رہا ہے۔ جیسے جیسے میں بڑھتا گیا یہ بھی بڑھتا گیا ہے۔ اور اب یہ اتنا بڑا ہو گیا ہے اتنا موٹا اور تندرست کہ میری غذا کا بڑا حصہ خود کھا جاتا

ہے اور مجھے بیمار رکھتا ہے۔ کبھی بچوں کی طرح میرے دانت کنکناتے ہیں۔ جی متلاتا ہے۔ میں اپنے میں وہ سارے Symptoms محسوس کرتا ہوں جو ایسے بچے محسوس کرتے ہیں جن کے پیٹ میں کیچوے پڑ جائیں۔

یہ مجھے میری اندر بہت دنوں سے foreign body کے مانند تنگ کر رہا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ اندر زخم ڈال دے گا۔ مجھے فوراً جلاب لینا چاہئے کیسے بھی ہو اسے باہر نکال دینا چاہئے۔ حالانکہ یہ میرے اندر پلا ہے لیکن باہر کا ہے۔ میرے لئے اجنبی ہے اس لئے کہ یہ میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا وجود میرے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔ لیکن مجھ سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ یہ ہر جگہ، ہر موقع پر important بن جاتا ہے۔ مجھ پر غالب آجاتا ہے۔

اسی رات میں نے سوتے میں دیکھا کہ میرے پیجامے میں ایک بڑا سا کیچوا رینگ رہا ہے۔ کاہلی کے ساتھ ادھر ادھر کلبلا رہا ہے اور میں بے حد خوش و خرم اور چاق چوبند ہو گیا ہوں۔ مجھے کھل کر بھوک لگی ہے۔

دوسرے دن سویرے محرم کی چاند کی پہلی رات تھی۔ میں اپنی بالکنی پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا میرے پڑوسی کے بچے قصبہ کی بازار سے چھوٹے چھوٹے تعزیئے خرید کر لا رہے تھے۔

"انسان کیسی کیسی بیوقوفیوں میں گرفتار ہے۔" میں نے سوچا۔ "میری بیوی بھی آج ہی امام باڑہ سجائے گی۔ تعزیہ رکھے گی۔" اس نے مجھے یہ سوچتے ہوئے شاید دیکھ لیا۔ میرے پیٹ میں رینگ کر بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم تعزیئے کی بے حرمتی کر سکتے ہو، سب کے سامنے، چوراہے پر؟"

"کیا بکتے ہو ذلیل۔" میں نے دانت کنکناتے ہوئے اس کے جملے کو کاٹ دیا۔

"تو پھر تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ اگر تمھارے بچے کو جلایا جاتا تو تمھیں کیسا لگتا؟"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ آنسو میری شکست کا اظہار تھے۔ لیکن تب بھی میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ راجہ کی لاش اگر جلائی جاتی تو مجھے بے حد افسوس ہوتا۔ وہ مجھے روہانسا دیکھ کر بولا۔ "شاید تمھاری صحت ٹھیک نہیں۔"

میں بڑی مشکل سے اس سے کہہ سکا۔ "میں ایک صحت مند انسان کب ہوں؟ جس کے پیٹ میں تمھارے قد کا کیچوا موجود ہو وہ صحت مند بھی کیسے سکتا ہے" ☆☆☆

انعامات برائے نگارشات نظم ونثر

موضوع: سیرت نبوی

سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن ایک رضاکار فلاحی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ اس سال سے سیرت نبوی کے بارے میں معیاری نگارشات نظم ونثر پر سالانہ انعامات کا نظم کر رہا ہے۔ اجمال یہ ہے:

۱۔ انعام نعت۔ برائے بہترین نعتیہ مجموعۂ کلام

۲۔ انعام سیرت۔ برائے بہترین تخلیقات

دونوں انعام گیارہ گیارہ ہزار روپے نقد اور توصیف پر مشتمل ہوں گے۔ ٹرسٹ کے دفتر میں نگارشات کے موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۶ ہے۔

اغراض و مقاصد، معیار انتخاب اور شرائط مع فارم درخواست، متعلقہ کتابچہ (Brochure) میں دستیاب ہیں جسے دو سو روپیہ بذریعہ منی آرڈر ملنے پر رجسٹرڈ ڈاک یا کوریر سروس سے بھیج دیا جائے گا۔

ابرار اعظمی

Managing Trustee
Social Education Foundation
Khalis Pur, Azamgarh-276138
Mob.: 09839206207, Ph.: 05466-230589
E-mail seftrust@yahoo.com.in

رشید حسن خاں

زٹل نامہ

(کلیات جعفر زٹلی)

جعفر زٹلی کو اردو کا مشکل ترین شاعر کہا جا سکتا ہے۔ مشکل ترین اس باعث کہ انھوں نے کثرت سے ایسے اردو فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں جو لغات میں نہیں ملتے اور جن کا پڑھنا بھی آسان نہیں۔ دلچسپ ترین اس لئے کہ سترہویں اٹھارویں صدی کی سماجی اور سیاسی زندگی پر طنزیہ اظہار رائے اور بعض اوقات "فحش گوئی" ان کے کلام کو نئے نئے رنگوں سے بھر دیتی ہے۔

جعفر زٹلی کو اب تک مسخرا یا فحش گو کہہ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور ان کی ادبی اور "لسانی اور تاریخی" اہمیت کا اعتراف اب ممکن ہوگا۔ رشید حسن خاں ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

مجلد، ۳۴۸ صفحات   قیمت ۲۳۰ روپئے

انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باشتراک قومی کونسل برائے اردو زبان

صغریٰ کا بلا

اقبال مجید

شمارہ ۲۵۸
جولائی ۲۰۰۲

اب صغریٰ بیگم نے بند مٹھی سے دی جانے والی صدقے خیرات کی رقموں پر پلنا شروع کر دیا تھا۔ کئی گھر ایسے تھے جہاں وہ میلا سا برقعہ لپیٹے لکڑی ٹیکتی جھکی کمر کے ساتھ آنگن میں داخل ہوتیں، کچھ دیر چارپائی پر بیٹھ کر سانسوں کو قابو میں لاتیں، ایک کٹورا ٹھنڈا پانی پی کر دم لیتیں۔ اور جب ایک بند مٹھی ان کی مٹھی میں کچھ چپکے سے رکھ دیتی تو وہ سارے گھر کو دعا دیتی گھر سے باہر آ جاتیں۔ مٹھی میں دبی رقم نے انھیں اس بار یاد دلایا کہ گوبھی کی فصل آ گئی ہے اور انھوں نے ابھی تک اصلی گھی میں بکرے کے گوشت کے ساتھ تر تراتی ہوئی رسیلی گوبھی پکا کر نئے چاولوں کے ساتھ نہیں کھائی ہے۔

رات میں جب ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی تو وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں لکڑی کے چولھے پر گوبھی گوشت پکا چکی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہانڈیوں کی خوشبو جیسے ہی اٹھتی نہ جانے کہاں سے وہ دیوار پر نمودار ہو جاتا۔ اس رات بھی ہانڈی تیار ہو کر چولھے سے اتری ہی تھی کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں وہ بھیگا بھاگا چوڑی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا اور اپنی سیاہ کھال کے پیچھے لال لال چمکتی آنکھوں سے چولھے کے پاس بیٹھی صغریٰ کو گھورنے لگا جو پلیٹ میں گوبھی گوشت نکال رہی تھیں۔

دیوار کی طرف دیکھے بغیر اور اس کی آہٹ کو سنے بغیر وہ بتا سکتی تھیں کہ وہ آ چکا ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ اس کے دیوار پر آ جانے پر ان کے نتھنوں میں ایسی بو آنے لگتی تھی جو اکثر ان کے شوہر وصی کاظم کی بنیان سے آیا کرتی تھی۔ عجیب بدہیئت سا بلا تھا وہ۔ اس پر کالا رنگ اور سرخی مائل آنکھیں۔ گلا اور جبڑا بھی اس کا غیر معمولی تھا اور پیٹ اتنا بھاری کہ جیسے پیٹ میں بچہ ہو۔

بوندا باندی میں سارے بدن سے بھیگا وہ قدرے سکڑا ہوا صغریٰ بیگم کو تکے جا رہا تھا۔

صغرا نے دھیرے سے پکارا تو وہ دیوار سے اتر کر ایک بار چھوٹے سے آنگن میں رکا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر صغریٰ کے کمرے کی دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ صغریٰ نے ایک بوٹی کے ساتھ آدھی روٹی مل کر تام چینی کی ٹوٹی پلیٹ میں رکھ دی جو بلے کے لئے مخصوص تھی۔ وہ اپنے کھانے میں یہ بھول گئیں کہ بلا کھانا ختم کر کے دیوار پر جا چکا تھا۔ کسی کے رونے کی آواز پر وہ چونک پڑیں۔ دیکھا تو بلا دیوار پر بیٹھا رو رہا تھا۔

وہ عاشور کی رات تھی۔ بلے کی رقت بھری آواز پر انھیں وہ یوم عاشور یاد آ گیا جب ہندوستان آزاد ہونے میں کئی سال باقی تھے اور ریلوے اسٹیشن سے گذرنے والی فوجی گاڑیوں میں اوپر کے بدن سے ننگے گورے سپاہی بھرے رہا کرتے تھے۔ عاشور کی رات گھر کی دیوار پر کوئی بلا ایسے ہی رویا تھا اور صغریٰ کے شوہر اس رات کی صبح اٹھنے والے علموں کی زیارت کرنے گئے تھے اور ماتم کرتے ہوئے کربلا کو جانے والے ایک جلوس کے ساتھ ہو لئے تھے۔ جلوس لکھوریوں کے بنے قدیم مکانوں کی قطاروں کے تنگ راستے سے گذر رہا تھا۔ کہیں کہیں بوسیدہ مکانوں کے گرے ہوئے ملبے سے نالیوں کا پانی سڑک پر بہ آیا تھا اس کو پھاندتے ہوئے جب وہ مدح صحابہ کمیٹی کے مرکز کے قریب پہنچے تو ایک مجمع سے ایک بوڑھا تہمد باندھے اور ہاتھ میں لاٹھی لئے ان کی طرف لپکا اور ان پر لاٹھی برسانے لگا۔

جلوس کے لوگ سینہ پیٹ پیٹ کر نوحہ پڑھ رہے تھے۔

حاکم شامی لعین است   پیش زینب نشین است

مدح صحابہ کمیٹی کو اس نوحے پر ہمیشہ سے تبرے کی بو آتی تھی، اور ان کے خیال میں شام کے حاکم کو لعین کہہ کر پکارنا مناسب نہ تھا۔ دوسری جانب، نوحہ پڑھنے والی انجمن کو ضد تھی کہ حضرت زینب کے سامنے بیٹھنے والا کوئی اور نہیں یزید تھا اور یزید لعین تھا۔

وصی میاں کی پٹائی بوڑھا اپنی لاٹھی سے شبنم کے دروازے کے سامنے کر رہا تھا۔ پہلے تو وصی کاظم بوڑھے کی لاٹھیاں اپنی کسرتی باہوں پر روکتے رہے، آخر کو انھوں نے اس کی کمر میں گھس کر اس کو نالی کا پانی پلا دیا۔ اسی وقت شبنم نے پیچھے سے وصی کی شیروانی کا کالر پوری طاقت سے کھینچا اور انھیں دروازے کے اندر کر کے پھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور زینے سے اوپر لے گئی۔

شبنم نے وصی کی شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی، کرتے کی آستین ہٹا کر نیل دیکھے، گرم دودھ اور پھٹکری پلائی اور بولی:

"تم رافضی ہو یہ تو میں جانتی تھی۔ مگر باہوں پر لاٹھیاں روک کر ایک سنی سے اتنی مروت برتو گے، یہ مجھے امید نہ تھی۔ اگر بھیجا نکل آتا تو سڑک پر پڑے ہوتے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ہانڈی چولہا کر دوں؟"

"نہیں۔" وسی نے منع کر دیا۔

"ہاں تمہاری عورت پوچھے گی کہ چونا کس نے لگایا تو کیا جواب دو گے۔"

یوں تو جوانی میں شبنم کا وسی میاں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا مگر وسی میاں کے بیاہ میں آئی تو صغریٰ بیگم ہی آئی۔ صغریٰ کی ماں رنڈیوں کے گھروں میں حمل ساقط کرانے یا ولادتیں کرانے پر مامور تھی۔ وہی پیشہ صغریٰ نے بھی اختیار کیا تھا۔ جوانی میں صغریٰ دوہرے بدن کی سانولی سلونی مگر سفید دیدوں والی کھڑے ناک نقشے کی عورت تھی۔ صغریٰ کی چھٹی حس اپنے زمانے کے مرد کی ذہنی اور جسمانی جنسیت کو دور ہی دور سے اشاروں ہی اشاروں میں برانگیخت کرنے کے فن سے کچھ اس طرح واقف تھی کہ اس نے شیر جیسے سید زادے وسی میاں کو دو پٹے میں مار گرایا۔

صغریٰ سلیقے اور صفائی سے رہتی، نمازیں پڑھتی، درگاہوں میں شمعیں جلاتی، اور عاشور کے دن بال کھول کر اپنے تعزیئے کے سامنے کربلا تک ننگے پیر پیدل چل کر سوز پڑھتی۔ شبنم اور وسی کاظم کا کیا رشتہ رہا تھا، یہ بات وسی کاظم نے سہاگ رات ہی کو صغریٰ سے مزے لے لے کر بتا دی تھی اور جسم پر چاقوؤں کے وہ دو تین نشان بھی دکھا دیئے تھے جو رقابت میں شبنم کو بچانے میں ان کے بدن پر لگے تھے۔ اپنی جان پر کھیل کر وسی نے شبنم کو نوچندی کے میلے کی بھیڑ بھاڑ میں بچایا تھا۔ اس واقعے نے شبنم کو ہمیشہ کے لئے وسی کا مرید بنا دیا تھا۔

صغریٰ کو وسی کاظم نے پہلی بار اس کی ماں کے ساتھ شبنم ہی کے کوٹھے پر دیکھا تھا اور شبنم کے کناؤ دار کوٹھے میں سب کی نظر بچا کر ایسی باریک چٹکی لی تھی کہ صغریٰ سی سی کر کے رہ گئی تھی۔ صغریٰ نے بھی پھر گن گن کر اور چپکے چپکے وسی کاظم سے ایسے بدلے لئے تھے کہ ان کی جان ہی تو نکل گئی تھی۔

صغریٰ جانتی تھی کہ اس کا میاں رنگیلا اور دل پھینک ہے۔ دن رات سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی اور میاں کو رجھائے رکھنے کے ایسے ایسے جتن کرتی کہ رنڈیاں بھی عش عش کرتیں۔ لیکن وسی میاں کی مردانی شخصیت نے صغریٰ کو بہت شکی بنا دیا تھا۔ وہ ان کے اتارے ہوئے کپڑوں کو کئی کئی بار سونگھتی اور رومال کے دھبوں کو غور سے دیکھتی۔

وسی کاظم سید زادہ تھا۔ اس کے باپ کو بھلا یہ کیسے پسند آتا کہ وہ ایک پیشہ ور دائی کی لڑکی کو اپنی بہو بنائے۔ اس نے اپنے بیٹے وسی کاظم کی زندگی اجیرن کر دی۔ وسی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے پہلے تو باپ کو سمجھایا کہ صغریٰ دائی ہے، رنڈی نہیں ہے، جب کہ سید زادوں کے کئی گھروں میں رنڈیاں ان کی ازواج کے طور پر پل رہی تھیں۔ جب وسی کاظم کا باپ اپنی ضد پر قائم رہا تو صغریٰ نے سنکھیا کھانے کی کوشش کی۔ مگر وسی کاظم نے اس کو بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بچا لیا، اور اپنے باپ کا گھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ امام زمانہ کو زیارت میں یاد کر کے ختم ہو جانے والے محنت مشقت سے کمائی کرنے والی ایک دائی کو اپنے کنبے میں جگہ نہیں دے سکتے تو وہ امام غائب کے عالمی انقلاب کے تصور کو کیسے قبول کریں گے جس میں عدل و انصاف ہوگا، احساس محرومی ختم ہو جائے گا اور احساس کمتری نابود ہو جائے گا؟

وسی کاظم بہت دنوں تک پتھر توڑتا رہا۔ شام کو اس کی بنیان پسینے کی تیز بو سے بھبھکنے لگتی جس کو صغریٰ بڑے چاؤ سے دھوتی۔ جب اس کام میں وسی کے دونوں ہاتھ جلد جلد زخمی ہونے لگے تو وہ ریلوے میں خلاصیوں کی نوکری پا گیا۔ وسی کاظم ہائی اسکول پاس تھا، لیکن باپ کو جلانے کے لئے اس نے چھانٹ چھانٹ کر ایسے کام کئے جو سید زادوں کے لئے ہتک آمیز تھے۔ شادی وہ صغریٰ سے کر چکا تھا۔ اور صغریٰ سے بار بار یہ کہہ چکا تھا کہ یہ امام زمانہ کے عالمی انقلاب کی جانب اس کا پہلا قدم ہے۔

ریلوے میں خلاصی بننے سے پہلے اپنی بیوی کے ہاتھ پر اپنی کمائی رکھنے کی خاطر اس نے اپنے مسلک کے مردوں کو نہلانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر شیعہ خاندانوں میں مردے کو غسال ہی غسل دیا کرتے تھے۔ ایک بار وسی کاظم ایک نوجوان مردے کو نہلاتے ہوئے لگاتار اس عجیب و غریب شک میں مبتلا رہا کہ اس مردے میں جان باقی ہے۔ کفن پہنا کر تابوت میں لٹاتے وقت تک بار بار اس کا جی اندر سے یہی کہتا رہا کہ مردے کا بدن لاش کی طرح ٹھنڈا نہیں، اور اس کے نتھنوں سے گرم ہوا کا نکلنا اور ہتھیلی پر محسوس ہوتا اور اس کی آنکھوں میں روشنی کی چمک، سب کچھ کسی زندہ انسان کی طرح ہے۔ بلکہ ایک بار تو وسی کو محسوس ہوا جیسے مردے کی بغلوں کو صاف کرتے وقت یکا یک مردے کو گدگدی سی محسوس ہوئی تھی اور ایک پل کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ جب مردے کو قبر میں اتار کر قبر پر لکڑی کے پٹرے رکھ دیئے گئے اور اوپر سے مٹی ڈال دی گئی تو رات میں وسی کو بہت تیز بخار چڑھا اور دوسرے دن سے اس نے غسالی کا کام بند کر دیا۔

وسی کاظم کبھی کبھی صغریٰ سے کہتا تھا۔

"میں تمہیں اتنا پیار کروں گا کہ تم مجھ سے عاجز آ جاؤ گی اور بھاگنے لگو گی۔ پھر تمہارا جی چاہے گا کہ کسی اور مرد کا ذائقہ چکھو۔ روز روز ارہر کی دال کھاتے کھاتے تنگ آ جاؤ گی، پھر ایک دن ایسا آئے گا جب تم بیچ میں دال پکاؤ گی۔"

وسی کی باتیں سن کر صغریٰ پہلے تو رو دیا کرتی تھی، پھر وہ ایسے فقروں اور باتوں کی عادی ہو گئی۔ وسی کچھ ہی روز ریلوے میں خلاصی رہا، اس کے بعد اسٹور کیپر ہو گیا۔ صغریٰ نے اپنے پیار کا پٹا اس کے گلے میں ایسا باندھا کہ اس کی سدھ بدھ ہی کھو گئی۔ وسی چالیس برس ہو کر جب مرا تو ہمیشہ صغریٰ کو یہی شک رہا کہ وہ مرا نہیں ہے کہیں روپوش ہو گیا ہے۔

یکبارگی بوڑھی صغریٰ کے کانوں میں بلے کے رونے کی پھر آواز آئی۔

"دیکھئے، اگر حسین کے غم میں رو رہے ہیں تو اور بات ہے۔ ورنہ رونا دھونا بند کریئے اور ادھر پلنگ پر آ جایئے۔" صغریٰ نے یہ بات بلے کو مخاطب کر کے

گئی۔

دو پٹّا تو بلا اپنے کو چاٹتا رہا پھر اتر کر آنگن میں آیا اور آنگن سے صغریٰ کے بستر پر۔ پہلے وہ سرہانے کی طرف گیا، سرہانے ایک کتاب رکھی تھی۔ بلے نے کتاب کو توجہ کے ساتھ سونگھا پھر اپنے ایک پیر سے اس کو چھیڑنے لگا۔ کتاب کھل گئی۔ صغریٰ بہت غور سے بلے کو ایسا کرتے دیکھتی رہیں، پھر کھلی ہوئی کتاب کو انھوں نے جلدی سے اٹھالیا اور لالٹین کی لو گھبرا کر کانپتے ہاتھوں سے تیز کی۔ ہلکی روشنی میں اپنی بوڑھی آنکھیں انھوں نے اس صفحے پر گڑو دیں جو کھل گیا تھا۔ ان کے مشاہدے کے مطابق بلا پہلے بھی اس کتاب کے ساتھ ایسا سلوک کر چکا تھا اور اس طرح کھل جانے والے صفحے کو صغریٰ نے ہمیشہ بہت غور سے پڑھا تھا جیسے فال دیکھنے کے لئے دیوان حافظ کو لوگ کھولتے ہیں اور صفحے کے پہلے شعر کو پڑھ کر مطلب برآری کرتے ہیں۔

وہ کتاب حالات امام زمانہ علیہ السلام سے متعلق تھی اور جو صفحہ اتفاقاً کھل گیا تھا اس کی تحریر یہ تھی:

> خلاصہ یہ ہے کہ قائم آل محمد عجل اللہ فرجہٗ ہدایت عالم کے لئے اس وقت ظاہر ہوں گے جب دنیا میں بے دینی پھیل جائے گی، خواہش نفس کی پیروی ہوگی، عوام کو الگ کار بنایا جائے گا۔ جماعتیں بکثرت ہونگی، عہد شکنی عام ہوگی دنیا کا حرص اسقدر بڑھ جائے گا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر تجارت کریں گی۔ مسجدوں میں آرائش ہونے لگے گی، وہاں لوگ صف بستہ ایک دوسرے کے قریب ہوں گے، ظاہری اجتماع ہوگا مگر باطنی افتراق رہے گا۔ دل بھیڑیوں جیسے ہونگے۔ ۱۵ ماہ رمضان کو سورج گہن، دمدار ستارے کا مشرق سے طلوع، دیوار مسجد کوفہ کا انہدام، جانب غرب سے ایک لشکر کا اٹھنا اور سمت شرق سے اس کا مقابلہ، شرق سے عالمگیر فتنہ کا بلند ہونا مغرب کی جانب بڑی آگ کا بھڑکنا۔ پس ایسے خوفناک دور میں اور ایسی گمرہی کے زمانے میں اس رہنما کا ظہور ہوگا جو سارے جہاں کے لئے ہدایت و رحمت ہے تاکہ دنیا کو امن وامان کا پیغام پہنچائے۔

صغریٰ نے صفحہ ختم کیا، پھر کتاب بند کی پھر لالٹین کی لو دھیمی کرکے بولیں:

''ہاں قرب قیامت ہے۔'' بلے نے بستر پر اپنی پیٹھ اونچی کرکے بدن کو ایک خاص زاویہ دے کر اکڑا لیا، پھر جمائی لی۔

''اب پانی میں مت بھیگئے گا۔ لیٹ کر سو جائیے۔'' بلا بستر پر پائنتی رکھی ہر ضائی کے خول میں گھس گیا۔

صغریٰ چھوٹے سے کھٹولے پر بدن سکیڑ کر اور گٹھڑی مار کر لیٹ تو گئی مگر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیر تک پڑوس کے مکان والے کی لڑکی کی دیدہ دلیری پر غش غش کرتی رہی۔ دن دیہاڑے ماں باپ کی موجودگی میں اپنے یار کو بلا کر چوما چاٹی کرتی ہے چھنال۔ اورا ماں ابا ہیں کہ ٹکر ٹکر دیدیم دم نہ کشیدیم۔

صغریٰ کو یکایک اپنی جوانی کے وہ دن یاد آئے جب ملک میں بھگت سنگھ راج گرو اور سکھدیو کو پھانسی دیئے جانے کا ماتم منایا جا رہا تھا۔ انھیں دنوں جب صغریٰ نے اجمل سرائے کے پیچھے رہنے والے چنگ ساز رئیس مرزا کی لڑکی کے بارے میں یہ سنا کہ چنی لال کنکوا فروش کا لڑکا رات کے اندھیرے میں اپنی چھت سے جڑی ہوئی مرزا کی چھت پر پھاند کر آجایا کرتا ہے تو صغریٰ کو یقین ہو گیا کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی گل کھلنے والا ہے۔

صغریٰ کو اپنی ماں کے بیان کے مطابق یہ علم تو تھا ہی کہ رئیس مرزا کا خاندان آصف الدولہ کے بیٹے نواب وزیر آصف جاہ کے سلسلۂ نسب سے تھا۔ مرزا نے اس وقت بھی اپنی شرافت اور خاندانی عظمت کو نیچا نہ ہونے دیا جب وہ مانجھے کی ڈور سوت کر اور اپنی ہتھیلیاں لہولہان کر کے چنی ہوئی آستینوں والے براق اور بے داغ انگرکھے میں پوری جامہ زیبی کے ساتھ بازار سے نکلتے تھے اور کسی ایک فاقہ زدہ کو نان بائی کی دکان پر کھانا کھلاتے تھے۔

ایک رات انھیں دنوں صغریٰ کے دروازے پر کہاروں نے آواز لگائی۔ پتہ لگا رئیس مرزا کے گھر سے ڈولی بھیجی گئی ہے۔ صغریٰ کے گھر پر نہ جانے کتنے زبوں حال شریفوں کے گھروں سے چپکے چپکے ڈولیاں بھیجی جاتی تھیں اور جب ان شریفوں کی مصیبت دور ہو جایا کرتی تھی تو وہی شریف زادگان صغریٰ کو نیچ پیشہ سمجھ کر حقارت کی نظروں سے بھی دیکھتے تھے۔ ایک بار تو صغریٰ کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کو سل پر رکھ کر بٹے سے کچل ڈالنا چاہا تاکہ راتوں میں اس کی خفیہ طلبی کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ وہ یہ بات سمجھ نہیں پائی تھی کہ جو لوگ اس کو اپنے برابر بیٹھنے کی جسارت پر تیوریاں چڑھا کر دیکھتے تھے وہ انھیں کی غلاظتوں کو زمانے سے چھپانے کے کام میں آخر کیوں لگی رہتی ہے۔

کہار تھے کہ دروازے سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آخر کو صغریٰ بوجھل دل سے ڈولی میں بیٹھ گئی۔ رئیس مرزا کے دروازے پر جلتی لالٹین سے دور اندھیرے میں ڈولی روکی گئی۔ اندھیرے میں ہی صغریٰ اتاری گئی اور تیزی سے صدر دروازے سے پلک جھپکتے میں اندر کردی گئی۔ صغریٰ نے وہاں پہلے عشا کی نماز پڑھی، پھر خدا سے دعا کی کہ گھر کی عورتوں کے شبہات غلط نکلیں۔ لڑکی نے دو روز سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ گورے چٹے اور روشن ماتھے پر نقاہت کا پسینہ چمک رہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ روتے روتے آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے۔ صغریٰ نے گرم پانی تولیہ صابن اور سینی منگا کر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

جب ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد وہ باہر آئیں تو لڑکی کی ماں سے انھوں صاف بتا دیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ چھیڑ چھاڑ کرنے میں جان کا خطرہ ہے۔ الٹے پیروں ڈولی سے واپس گھر آکر صغریٰ نے رات گذاری اور فجر کی نماز ادا کر کے چوکی پر سے اٹھی بھی نہیں تھیں کہ کریم بہشتی کے چھوکرے نے آنگن میں

مشک کے ساتھ گھستے ہی آواز لگائی کہ آدھی رات گئے رئیس مرزا نے اپنے آنگن کی قدیم باولی میں اپنی بیٹی کو ڈھکیل کر خود بھی چھلانگ لگائی۔

بوڑھی صغریٰ نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے پیروں کی طرف ٹٹولا۔ مگر ان کا بلا اب وہاں نہیں تھا، پیٹھ کے پیچھے دبکا پڑا تھا۔ انھوں نے کروٹ لی، بلے کے سر کو انگلیوں سے سہلانا شروع کر دیا۔ پھر وہ دھیرے سے بولیں:

"سنتے ہیں آپ؟" بلے نے جواب میں آنکھیں بھی نہ کھولیں، لیکن اس نے صغریٰ کو ایک سرد آہ کھینچتے سن لیا۔

ہائے کیسے پر لگ جاتے ہیں دنوں کو۔ اسی برس تو مجھے ہی ہو گئے ایک امام غائب کے انتظار میں زندگی بسر کرتے ہوئے۔ یاد ہے آپ نے پالم پور کے مجتہد کو ایک برس گھر کی سالانہ مجلس پڑھنے کے لئے بلایا تھا۔ منبر پر بیٹھ کر انھوں نے ہی تو کہا تھا کہ وہ لوگ جو اپنے کو حضرت امام زمانہ علیہ السلام کا منتظر کہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کو ایک بڑی تبدیلی کے لئے آمادہ کریں، اپنا خود امتحان لیں اور اپنی سوچ کو حق کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ بولئے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نہ۔" بلے کو صغریٰ نے ایک ہاتھ سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

بلے نے اپنا پورا بدن ایک بار تان دیا، منہ کھول کر جمائی لی اور ادھ کھلی آنکھوں سے صغریٰ کو دیکھا۔

"آپ تو گواہ ہو کہ میں اپنے بیٹے کے گھر سے کیوں نکلی تھی۔" صغریٰ نے کچھ ایسے اعتماد سے سوال کیا جیسے بلا نہیں ان کے شوہر وصی کاظم ان کے پاس بیٹھے ہوں۔

صغریٰ کو بہو کے گھر کے امام باڑے کی وہ رات یاد آئی جب ان کی بہو نے شام کو گھر کے ایک کمرے میں سجائے گئے امام باڑے کا دروازہ کھولا تھا اور موم بتیاں جلا کر اور اگر بتیاں سلگا کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگی تھی: "یا مولیٰ آپ گھر گھروں اپنے معجزے دکھا رہے ہیں۔ بس ایک بار میرے امام باڑے میں بھی معجزہ دکھا دیجئے۔"

صغریٰ کو اپنی بہو کی یہ مراد کچھ عجیب سی لگی۔ اس زمانے میں آئے دن گھروں کے عزاخانوں میں مولیٰ کے معجزے ہو رہے تھے۔ کبھی خبر آتی کہ جعفری وکیل کے عزاخانے میں امام حسین کے علم سے خون کی دھار بہی، کبھی عورتیں خبر لاتیں کہ بنک منیجر نقوی صاحب کے امام باڑے میں آقا مولیٰ کے علم سے سنہری شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ صغریٰ یہ خبریں سنتیں، عورتوں کو جوق در جوق ایسے امام باڑوں میں دھکا پیل کرتے گھستے ہوئے دیکھتیں اور سانس روکے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر پاتیں۔ دوسروں کے بارے میں تو وہ کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن جس دن مہندی کا جلوس تھا اس شام انھوں نے اپنی بہو کو شہید کربلا حضرت قاسم کے تابوت پر استادہ علم کو مہندی سے لیپتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعد میں سینہ پیٹ کر پکارتے بھی سنا، "ہائے علم پر مہندی کہاں سے آئی!"

پلک جھپکتے میں مشہور ہو گیا کہ رضی کاظم کے گھر پر مولا کا معجزہ ہوا ہے... صغریٰ کس سے کہتیں اور کیسے کہتیں کہ کبھی نماز روزہ بھی نہ کرنے والی عورت اور ہر دم اپنا لباس، اپنے کھانے اپنے جسم اور اپنی پسند کی خواہش کو کسی بھی طرح پورا کرتے رہنے کے جتن میں لگی رہنے والی ان کی بہو کتنی بڑی جھوٹی فریبی اور مکار ہے۔

بہت برس پہلے جب ان کا بیٹا بارہ یا چودہ برس کا رہا ہوگا اور ملک میں تقسیم کے بعد فسادات پھوٹ پڑے تھے اور سر پر عمامہ باندھے اور کالی عبا پہنے بڑے بڑے مجتہدوں کے خاندان ریلوے پلیٹ فارم پر پڑے پڑے پاکستان جانے والی گاڑیوں کا انتظار کیا کرتے تھے، صغریٰ نے ایک مولانا کو اسٹیشن لے جانے اور انھیں گاڑی میں بٹھانے کی خدمت انجام دینے کے لئے اپنے بیٹے رضی کاظم کو بھیجا تھا۔ مولانا کو پلیٹ فارم پر جب بھوک لگی اور کھانے کا سامان فروخت کرنے والا ایک بھی مسلمان دکاندار وہاں نظر نہ آیا تو مولانا نے رضی کاظم کو اسٹیشن کے باہر بھیج کر مسلمان حلوائی کی دکان سے جلیبیاں منگوائیں۔

رضی کاظم باہر نکل کر بہت بھاگے دوڑے مگر انھیں آس پاس کسی بھی مسلمان حلوائی کی دکان نظر نہ آئی۔ آخر کو انھوں نے ہندو حلوائی سے جلیبی خریدی اور مولانا سے جھوٹ بولا کہ مسلمان حلوائی کی دکان سے لایا ہے۔ مولانا نے جلیبی کا ناشتہ کیا۔ دو چار جلیبیاں پڑیا میں راستے کے لئے رکھ لیں اور رضی کاظم کے پوچھنے پر کہ وہ کون سی کتاب لگاتار بڑے شوق سے پڑھے جا رہے ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہ تاریخ کی کتاب ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پردادا کو اودھ کے بادشاہ امجد علی شاہ نے سلطان العلما، مجتہد العصر کا خطاب پیش کیا تھا اور سلطان العلما نے برطانوی اقتدار کے اثر میں آنے والے شعبوں کو چھوڑ کر باقی تمام شعبوں کو اسلامی قوانین کے مطابق ہی چلایا تھا۔

رضی کاظم نے مولانا کو ٹرین میں بٹھا کر اور گھر آ کر اپنی ماں صغریٰ کو بتا دیا کہ اگر میں ہندو حلوائی کی جلیبی کو مسلمان حلوائی کی جلیبی بتا کر نہ کھلا دیتا تو مولانا بھوکے بغیر ناشتے کے سفر کرتے۔ کئی برس بعد صغریٰ کو خبر ملی کہ پاکستان میں مسلمانوں نے شیعہ سنی جھگڑے میں انھیں ذبح کر دیا لیکن انھیں کھانا پہلے کھلا کر خالی پیٹ کسی کی جان لینے کے گناہ سے خود کو صاف بچا لیا۔

صغریٰ پر قیامت اس روز گذری جب ان کی بہو نے صغریٰ کی بیماری کے دنوں میں کئی بار ان کے پیشاب کے بستر کو دھونے کے بعد ان کے بیٹے سے چار چوٹ کی لڑائی لڑی تھی اور اپنے شوہر سے صاف اعلان کر دیا تھا کہ میں تمھاری کی والدہ کی خدمت کی ایک پل کو بھی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہوں۔ رضی کاظم کی بیوی مہینے میں دوبارہ ہوٹلوں میں کٹی پارٹی میں جایا کرتی تھی، ویک اینڈ پر وہ گھر سے باہر کبھی میاں کے ساتھ تو کبھی اکیلی کھانا کھاتی تھی اور گھر پر کھانا پکانے والی کے ناغہ کرنے پر دو منٹ میں تیار ہو جانے والی پیکٹ کی بند غذاؤں کو ابال کر کھا لینے کی رسم پوری کر لیا کرتی تھی۔ صغریٰ کو اس غذا کو دیکھ کر ہی کراہت آتی تھی، وہ ان کو ابلے ہوئے کیچوے سمجھ کر دیر تک ابکائیاں لیتی رہتیں۔

صغریٰ کو جب معلوم ہوا کہ رضی کاظم ان کی بہو کی گرفت میں جکڑ گیا

ہے اور ان کے مثانے کی کمزوری کا علاج نہ تو حکیموں کے پاس ہے اور نہ ڈاکٹروں کے پاس، اور اگر علاج ہے بھی تو اس پر روپیہ خرچ کرنے کے لئے بہو کے ڈر سے بیٹا آمادہ نظر نہیں آتا، اور گھر میں اکثر دیر رات تک صغریٰ بھائیں بھائیں کرتی ویرانی میں اکیلی پڑی رہتیں تو انھوں نے نالے کے اوپر بنے ہوئے اس کچے مکان کی کوٹھری میں رہنا پسند کیا جس میں پڑوس کا گھوسی چارے پانی کے لئے اپنی بھینس باندھا کرتا تھا۔

۸ محرم کی آٹھ تاریخ تھی جب انھوں نے بیٹے کا گھر چھوڑ کر اس مویشی خانے کی کوٹھری میں پناہ لی تھی۔

اس روز کی مردانی مجلس میں ان کے بیٹے رضی کاظم نے اپنے باپ کی طرح پالم پور کے مولانا کو بلایا تھا۔ صغریٰ چپکے چپکے ایک پوٹلی میں اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹ رہی تھیں، اور مردانے میں منبر پر حدیث خوان مجلس پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا:

مومنین، ایک روایت کے مطابق حضرت امام جعفر کا فرمانا ہے کہ جس وقت تم یہ دیکھو کہ دینِ خدا اپنے مفاہیم سے اس طرح خالی ہو گیا ہے جس طرح برتن الٹ دیا گیا ہو، جس وقت تم یہ دیکھو کہ مرد مرد پر اور عورتیں عورتوں پر اکتفا کر رہی ہیں، جس وقت تم یہ دیکھو کہ رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں، جس وقت تم یہ دیکھو کہ لوگوں کی ساری توجہ پیٹ اور شرمگاہ پر مرکوز ہے، ایسے زمانے میں اپنے آپ کی حفاظت کرو، خدا سے نجات طلب کرو کہ تمھیں مفاسد سے محفوظ رکھے۔

ابھی روایت بیان کرنے والا ذاکر ممبر سے اتر بھی نہ پایا تھا کہ صغریٰ اپنی اولاد کا گھر چھوڑ کر اور ایک پوٹلی بغل میں دبا کر اور برقع اوڑھ کر لکڑی ٹیکتی کلکتہ جوتیاں سنبھالتی مویشی خانے کی ایک کوٹھری میں آ کر آباد ہو گئیں تا کہ آئے دن کے فسادوں سے دور رہ سکیں۔

بیٹے کے گھر میں اگر کسی چھوٹنے کا انھیں غم تھا تو وہ ان کی پوتی سکینہ تھی۔ سکینہ کو رضی نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ تب کمپیوٹر کا چلن شروع بھی نہ ہو پایا تھا کہ باپ نے سکینہ کو ایم۔ کام۔ کے ساتھ کمپیوٹر کا ایڈوانس کورس بھی کرا دیا تھا۔ صغریٰ نے خاص طور پر بچپن میں سکینہ کو دینی تعلیم دلوائی تھی۔ زنانی مجلسوں میں سکینہ بڑے اعتماد سے حدیث خوانی کرنے لگی تھی۔ نئی جوانی، قبول صورت، کندنی رنگ، بھرا ابھرا پر کشش سینہ، قد بھی نکلتا ہوا۔ شمالی ہند کے کسی ہندو لڑکے نے جو انجینیرنگ کی تعلیم کی غرض سے مقیم تھا اس پر ڈورے ڈالے۔ گھر میں خبر پہنچی، باپ ماں نے سختیاں کیں۔ پہلے تو سکینہ نے انھیں سمجھایا کہ بہت کوشش کے بعد بھی اپنے لئے وہ کوئی معقول روزگار والا باصلاحیت مسلمان لڑکا نہیں تلاش کر پائی ہے، وہ اس لڑکے کی دوستی کو ذریعہ بنا کر باہر جانا چاہتی ہے جہاں اسے امید ہے کہ وہ کامیاب ہو سکے گی، مگر اس کا کوئی عذر قبول نہیں کیا گیا۔

اب کبھی کبھی سکینہ دو دو تین تین دن کچھ کھائے پیئے بغیر گھر کے کسی بھی کمرے کے ایک کونے میں کھڑی رہتی ہے اور ذہنی علاج کرنے والے ڈاکٹر کے سوالوں کے جواب میں اسے یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ بھوک پیاس نہ لگنے اور بیٹھنے یا لیٹنے کو جی نہ چاہنے کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ پاگل ہے۔

ایک دن صغریٰ کو سکینہ کی بہت یاد آئی۔ وہ دل پر جبر نہ کر سکیں بیٹے کے گھر گئیں۔ مگر جب ان کی بہو نے جدھر جدھر وہ جاتیں ادھر ادھر ان کے پیچھے پیچھے لگ کر ان کی اس طرح نگرانی کرنا شروع کر دی جیسے وہ گھر سے کچھ اٹھا نہ لے جائیں، تو اس کے بعد سے صغریٰ نے اس گھر میں قدم رکھنا بند کر دیا اور وہ رقم جو کبھی کبھی ان کا بیٹا انھیں بیوی سے چھپا کر دے دیا کرتا تھا، اسے بھی لینے سے انکار کر دیا۔

وہ آوارہ سا بد ہیبت سا کالا بھجنگ بلا جس کے گلے میں اب موتیوں کا پٹہ پڑا رہتا ہے صغریٰ کو اس مویشی خانے میں آنے کے بعد ملا تھا۔ کبھی کبھی بلیاں اس کو تلاش کرتی ہوئی دیوار پر خوب لڑتیں۔ خدا جانے کن آوارہ بلوں نے اس کو چیر پھاڑ کر خونم خون کر ڈالا تھا۔ وہ دیوار پر بیٹھا روتا رہا اور اپنے زخم چاٹتا رہا۔ اس کی آواز بار بار کوٹھری میں لیٹی ہوئی صغریٰ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ایک بار انھیں ایسا لگا کہ ان کے مرحوم شوہر وصی کاظم شیعہ سنی کی لڑائی میں اپنے بازوؤں پر لاٹھیوں کی بند چوٹوں کے درد سے جس طرح کراہا کرتے تھے یہ بلا بھی ویسے ہی کراہ رہا ہے۔ بلے نے انھیں گھورتے ہوئے پھر ویسے ہی کراہنے کی آواز نکالی۔

صغریٰ دل پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے بلے کو دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ زخمی بلا دیوار سے نیچے اترا اور دم اوپر اٹھا کر ان کے پیروں کے گٹوں پر اپنا بدن رگڑنے لگا۔ یکایک ان کے نتھنوں میں ایسی بو محسوس ہوئی جیسی وصی کاظم کے پسینے میں ڈوبی بنیان سے آیا کرتی تھی۔ صغریٰ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ پہلے بھی وہ اس بلے کی موجودگی میں وصی کے پسینے کی بو محسوس کر چکی تھیں۔ وہ گھبرا کر کوٹھری کی جانب پلٹیں، جلدی سے اندر گھس گئیں اور پلٹ کر بڑے استعجاب کے ساتھ بلے کو دیکھنے لگیں۔ بلا نڈھال سا چلتا ہوا کوٹھری کی دہلیز کے آگے بیٹھ گیا۔ صغریٰ نے دیکھا اس کے بدن پر کئی جگہ گہرے زخم تھے، کھال ادھڑ گئی تھی اور جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ صغریٰ غصے سے لال ہو گئیں۔ بولیں:

''اب آپ کی وہ عمر نہیں ہے کہ بازارو بلیوں کے چکر میں آوارہ بلوں سے اپنا بدن نچوائیں۔''

انھیں یاد آ گیا تھا کہ وصی کاظم نے انھیں کون سی کہانی بتا کر چاقوؤں کے وہ زخم دکھائے تھے جو انھوں نے شبنم سے عشق بازی کے چکر میں نوچندی کے میلے میں کھائے تھے۔ صغریٰ نے ناراضگی کی حالت میں تام چینی کی ٹوٹی پلیٹ میں ذرا سا دودھ ڈالا اور بلے کے آگے رکھ دیا۔ مگر بلے نے اس کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے زخموں کی تکلیف سے کانپ رہا تھا۔ صبح جب صغریٰ بیدار ہوئیں تو پلیٹ سے دودھ غائب تھا اور بستر سے بلا۔

صغریٰ کے شوہر وصی کاظم اکثر حضرت امام مہدی علیہ السلام کے حالات زندگی پر مبنی ایک کتاب سے فال دیکھا کرتے تھے یا نصیحت لینے کا کام کرتے تھے۔ صغریٰ کو بھی انھوں نے اس کا قائل کر دیا تھا۔ ایک دن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کے بلے نے کتاب کو پنجوں سے الٹ پلٹ کر ایک صفحہ

کھول دیا اور بار بار اس صفحے کو سونگھ کر اور صغریٰ کو دیکھ کر میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ صغریٰ نے پڑھا تو اس صفحے پر لکھا تھا:

علامہ ملا باقر مجلسی علیہ الرحمۃ نے بحار الانوار میں اہلِ نجف کی ایک جماعت کے بیان کیے ہوئے واقعے کا ذکر یوں کیا ہے کہ کاشان کا رہنے والا ایک شخص حج بیت اللہ کے خیال سے نجف آیا اور ایسا بیمار ہوا کہ پاؤں خشک ہو گئے اور وہ حج کو نہ جاسکا۔ ایک دن کاشان کا وہ شہری دوسروں کی مدد سے نجف سے باہر اس مقام پر پہنچایا گیا جو حضرت حجت علیہ السلام (امام مہدی علیہ السلام) کہلاتا ہے۔ بیمار نے وہاں کا واقعہ بتایا، کہ ناگاہ ایک خوش رو جوان تشریف لائے، مجھے سلام کیا اور حجرے کے اندر چلے گئے۔ وہاں نماز پڑھ کر وہ میرے پاس آئے اور میرا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ سخت بلا میں مبتلا ہوں۔ نہ تو بیماری رفع ہوتی ہے کہ تندرست ہو جاؤں اور نہ موت آتی ہے کہ راحت مل جائے۔ انھوں نے کہا غم نہ کرو

خداوند عالم دونوں چیزیں عطا فرمائے گا۔ وہ تو چلے گئے۔ اسی اثنا میں نے ایک کپڑا دھو کر پیڑ پر پھیلایا تھا وہ زمین پر گر گیا۔ میں نے جا کر اسے اٹھایا، دھویا، اور پھر پھیلا دیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ کہاں تو میں ایک قدم بھی چل نہ سکتا تھا اور کہاں میں نے چل پھر کر اتنے کام کر ڈالے۔ یہ واقعہ میں نے اپنے رفیق کو جب بتایا تو وہ افسوس کرتا رہا کہ امام آخر کی زیارت اس کو نصیب نہ ہوئی۔

صغریٰ نے اس مضمون کو بڑے غور سے دوبارہ پڑھا۔ اب بلا جیسے پرسکون ہو گیا تھا وہ بستر کے پائنتی دبکا بیٹھا ہوا تھا۔ عبارت پڑھ کر صغریٰ نے فوراً وضو کیا، نماز ادا کی اور زیارت پڑھ کر سجدے میں گر گئیں اور ہچکیوں سے رو رو کر دعا مانگتی رہیں۔

"یا حضرت میری بھی فریاد سن لیجیے۔ بستر پر پیشاب کی کھراہند اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کوئی اس کے پاس کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو مولا مشکل کشا کا واسطہ مجھے اس مرض سے نجات دلا دیجیے۔"

اس نماز اور دعا کے بعد صغریٰ کا گھڑی گھڑی پیشاب جانا اور پیشاب کی بوندوں کا بستر اور کپڑوں کو ناپاک کرنا تقریباً بند ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد سے صغریٰ گھنٹوں اس بلے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ انھیں اس کے بدن سے وصی کاظم کی بو آتی تھی۔ انھوں نے جھوٹے موتیوں کو کپڑے پر ٹانک کر بلے کے لئے ایک خوبصورت سا پٹہ بنا کر اس کی گردن میں باندھا۔ آئیے، بیٹھیے، کھائیے، جائیے جیسے الفاظ اس کے لئے استعمال کرنے لگیں۔ سڑک پر جب وہ چلتیں تو بلا ان کے پیچھے پیچھے چلتا۔ آوارہ کتے دوڑاتے تو وہ بنگلوں کی باہری دیواروں پر چڑھ جاتا۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنی بستی میں "بلے والی صغریٰ" مشہور ہو گئیں۔

اب صغریٰ میں گھر گھر جا کر صدقہ خیرات کی رقوم حاصل کرنے کی سکت نہیں رہ گئی ہے۔ وہ شاہ مینا کی مزار کے قریب ایک میلی سی چادر زمین پر بچھا کر بیٹھ جاتی ہیں اور بھیک مانگ کر آدھا چوتھائی پیٹ پالتی ہیں۔ ان کا بیٹا رضی کاظم فالج سے بستر پکڑ چکا ہے اور بہو میاش پولیس افسروں کے لئے چکن کا کام کرنے والیوں کی آڑ میں کنواریوں کی دلالی کر کے فیشن بھری زندگی گذار رہی ہے۔

اس دن صغریٰ پر پہلا دل کا دورہ پڑا تھا جب شہر میں ہوا ایک پھوٹ پڑنے والے فساد کے موقعے پر ان کی بہو دو روز گھر سے غائب رہی تھی اور تیسرے روز شہر کے باہر کے علاقے میں ایک کولڈ اسٹوریج کی عمارت کے پاس اس کی کٹی پٹی لاش ملی تھی۔ اب صغریٰ کو ایک بار پھر ایسا لگتا ہے کہ ان کے کپڑوں پر پیشاب کی بوندیں جلدی جلدی ٹپک جاتی ہیں اور وہ ناپاک ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے اب نماز پڑھنا بند کر دیا ہے۔ ان کا بلا اپنے گلے سے موتیوں کا پٹا نوچ کھسوٹ کر پھینک چکا ہے اور وہ بلوں بلیوں کی لڑائی میں جلد جلد زخمی ہونے لگا ہے۔ صغریٰ اس کے زخموں کو دیکھ کر اس کو دل ہلا دینے والے کوسنے دے کر جی ہلکا کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن پھر بھی انھیں چین نہیں ملتا ہے۔

بلے نے اب ان کے پیچھے پیچھے چلنا بند کر دیا ہے اور مویشی خانے کی چھت کے موکھوں میں آتے جاتے کبوتروں کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ صغریٰ کی بیماریوں نے انھیں توڑ دیا ہے۔ اکثر گھر کا چولھا بھی نہیں جلتا، ان کی پڑوسن خدا ترسی میں کبھی کبھی کچھ کھانے کو دے جاتی ہے۔ ان کی مصیبتیں بڑھ رہی ہیں اور صبر کا دامن چھوٹ رہا ہے۔ ایک دن بھیگی آنکھوں سے وہ بلے کو اپنی گود میں بٹھا کر کہتی ہیں:

"آیئے یہاں سے چلیں۔ خدا جانے کب ان کا ظہور ہو گا۔ میں ایک نیا بلیڈ خرید لائی ہوں۔"

صغریٰ کو اب یقین ہو چلا ہے کہ انتظار کی اس منزل سے انھیں محروم رہنا ہے جو منزل منتظر کو شہادت کے اعلیٰ درجے تک پہنچاتی ہے۔ ایک بار وصی کاظم نے ان سے کہا تھا کہ جب بھی تمھیں شک ہو کہ میں تمھارے لئے مخلص نہیں رہ گیا ہوں تو مجھے کسی بورے میں بند کر کے اور بورے کو فرش پر پٹک پٹک کر مجھے ختم کر دینا کیوں کہ میں بڑا سخت جان ہوں، آسانی سے نہیں مروں گا۔

ایک دن صغریٰ ایک پرانی بوری کا منہ کھولتی ہیں۔ بلے کو اس کے اندر داخل ہونے کا حکم دیتی ہیں، پھر سُتلی سے بوری کا منہ اچھی طرح سے باندھ دیتی ہیں۔ بوری کو باندھنے کے بعد وہ بوری اٹھا کر بھینسوں کو چارہ کھلانے والے تھالوں کے پاس خود کو گھسیٹتی ہوئی لے جاتی ہیں اور اونچے پکے چبوترے پر بنے ان تھالوں کی کگار پر بوری کو اس طرح پٹخنا شروع کرتی ہیں جس طرح دھوبی کپڑے پٹختا ہے۔

بوری کے اندر بلا ہر ضرب پر تڑپتا ہے، غراتا ہے، مگر صغریٰ بوری کو پٹختی جاتی ہیں۔ ان کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت بڑھ جاتی ہے اور بڑی بڑی سفید آنکھوں میں سرخی پھیلتی جاتی ہے۔ بند بوری میں چوٹیں کھا کر بلے کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جاتی ہے لیکن صغریٰ کا ہاتھ نہیں رکتا۔ تھالوں کے دھاردار کناروں پر بوری میں کوئی ضرب ایسی لگتی ہے کہ بلا بلبلا کر چیخ پڑتا ہے۔ بہت دیر تک صغریٰ بند بلے کو پٹخنیاں دینے کا کام جاری رکھتی ہیں۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگتی ہیں، انھیں بوری پر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چبوترے پر دو پل سستانے کو بیٹھ جاتی ہیں۔ اکھڑی سانسوں کے ساتھ اپنا منہ بوری کے پاس لے جاتی ہیں اور کہتی ہیں:

"ہم دونوں کی قسمت میں آسان موت نہیں ہے۔ تم مر جاؤ پھر میں اپنی نسیں کاٹ کر لیٹ جاؤں گی۔ اور قطرہ قطرہ کر کے مر جاؤں گی۔"

صغریٰ کو معلوم نہ تھا کہ سب کچھ ان کا چاہا جیسا نہ ہو گا، کیوں کہ جب وہ نیا بلیڈ نکال کر اس کو اپنی کلائی پر چلانے کو ہوتی ہیں تو ان کے سینے میں تیز درد اٹھتا ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے بستر ہی پر گر پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کے منہ سے جھاگ چھوٹتا ہے اور وہ نیلی پڑ جاتی ہیں۔ اسی وقت ایک پل کو بند بوری میں خفیف سی حرکت ہو کر بند ہو جاتی ہے۔ ☆☆☆

اقبالیات فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی

اردو غزل کی روایت اور اقبال

اور اقبال پر دیگر مضامین

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی

زیر طبع

شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۳

اقبالیات فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی

How To Read Iqbal ?

And other Essays on Iqbal

To be published shortly by

Iqbal Academy, Pakistan

Lahore

شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۳

اکبر معصوم

شمارہ ۲۳۷،
مئی ۲۰۰۰

یہ جو اک شاخ ہے، ہری تھی ابھی
اس جگہ پر کوئی پری تھی ابھی

سر بسر رنگ و نور سے لبریز
اک صراحی یہاں دھری تھی ابھی

خاک کیسی ہے میرے پاؤں تلے
سات رنگوں کی اک دری تھی ابھی

اس خرابے میں کوئی اور بھی ہے
آہ کس نے یہاں بھری تھی ابھی

سانحہ کوئی یاں سے گذرا ہے
یہ فضا کیوں ڈری ڈری تھی ابھی

میں بساتا تھا اس کے دل میں گھر
اور قسمت میں بے گھری تھی ابھی

کیوں نہ کرتے ہم اس کی دلداری
اس میں کچھ خوے دلبری تھی ابھی

ایسا ایک مقام ہو جس میں دل جیسی ویرانی ہو
یادوں جیسی تیز ہوا ہو درد سے گہرا پانی ہو

ایک ستارہ روشن ہو جو کبھی نہ بجھنے والا ہو
رستہ جانا پہچانا ہو رات بہت انجانی ہو

وہ کب کا جو بیت گیا اس میں رہیں تو اچھا ہے
کیا معلوم جو پل آئے وہ فانی ہو، لافانی ہو

منظر دیکھنے والا ہو، پر کوئی نہ دیکھنے والا ہو
کوئی نہ دیکھنے والا ہو اور دور تلک حیرانی ہو

ایک عجب سماں ہو جیسے شعر منیر نیازی کا
ایک طرف آبادی ہو اور ایک طرف ویرانی ہو

آتش عنقا

اکرام باگ

شمارہ ۱۴۰
جولائی ۱۹۹۷

آج تمام فرشتے جہنم کی آگ سے اپنے ہاتھوں میں دبی ہوئی سردی کو تاپ رہے تھے۔ ان سب سے بے نیاز شیطان کائنات پر ایک لا محدود خیمے کی طرح ایستادہ لوگوں کو اپنی جانب بلا رہا تھا۔ آگ کی جستجو میں بشیر، راستے ہی میں ٹھرے کی بوتل اپنے حلق میں انڈیلتا جلدی جلدی آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر بھی اس رات کی سردی اس پر سے تو شاید ہی رہی تھی۔ دور دور سے آنے والی بدبودار گلیوں، نالیوں سے بے پروا آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ قدم قدم پر وہ ٹھوکریں کھاتا پھر سنبھلتا درشتگی انداز میں لپکتا۔ اچانک اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ راستہ بھول کر بازار کی جانب نکل آیا تھا۔ سامنے نندو کی پان کی دکان میں دبکا خود بھی ایک بڑا سا کاروکا لگی چیز رہا تھا۔ کاش کوئی کا یک اسے سلگا لے۔ اس کے سلگنے سے ایک چولھا سلگ سکتا ہے اور اس چولھے سے گھر کے بچوں، بیوی کے بجھے ہوئے پیٹ کی آگ بجھ سکتی ہے۔ اور تو اور نندو نے سگنے کے لئے سگریٹ کی پیکٹوں سے زیادہ فلمی ایکٹرسوں کی تصاویر جگہ جگہ چپکا دی تھیں۔ مگر اس میں ایک چوک ہوگئی تھی کہ وہ تمام لباس پہنے ہوئے تھیں۔ آخر ہے نا ایک پان والا۔ بشیر نے اپنی جیب ٹٹولی۔ دس کا ایک نوٹ جو کبھی کبھی تنخواہ سے پہلے آجاتا ہے اور جس کے لئے اس سردی میں اپنے جی کو مارتے ہوئے وہ کام کرنا پڑتا ہے جو دفتری امور کے حساب سے تنخواہ روز کے کام کے برابر ہوتا ہے۔ اور نہ بھی کرتا تو کیا کرتا۔ سات زندگیوں کی مکمل بھوک مٹانا، یہ کام بھی اس کی تنخواہ نہیں کر سکتی تھی۔ یوں تو آٹھ افراد تھے مگر وہ اپنے آپ کو ان میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ بہت سال ہوئے اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ مسلسل فاقوں سے اس کی آنتوں نے یہ سبق ضرور یاد کر لیا تھا کہ اب صرف قے کرنے کے قابل ہے۔ اس لئے وہ صرف شراب پیتا تھا۔ شراب ... کچھ دیر کے لئے تو اسے اپنے آپ کو بھول سکتا تھا جنھیں وہ ابھی سے فاقوں کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے دو قدم اور آگے بڑھائے اور نندو کی دکان سے گولڈ فلیک کی پیکٹ خریدی۔ دس کی ریزگاری نہیں تھی نندو نے عجب نظروں سے دیکھا اور پیسہ کل بجنے کے لئے کہا۔ بشیر دس کا نوٹ اور نندو کی حسرت کو اپنے جیب میں ڈالے بڑھنے لگا۔ سگریٹ کا دھواں پیچھے پیچھے چکر کھا رہا تھا اور اس کے خیالات آگ کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی بیوی اس کے ... کی چاپ کا انتظار کر رہی ہوگی اور بچے بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کیا واقعی بچے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے یا اپنی بھوک کے ... کا۔ "آج کوئی بیٹا کسی باپ کا انتظار نہیں کرتا محض اپنی بھوک کی تسکین کا انتظار کرتا ہے... امیر، ملک، تاج خود بہ خود اس کے ہونٹوں پر فلمی گیت در آ گئی۔ اس نے بھی اپنے بچوں کے نام غیر شعوری طور پر کیسے کیسے رکھ دئے ... کیا اس کے لاشعور میں ایک اچھی زندگی کا تصور انگڑائی نہیں لے رہا ہے؟ ابھی تو وہ ان ناموں کے، ان لفظوں کے سحر جن سے یہ نام بنے تھے، بچ نہ سکا تھا۔ سدھارت نے لکھا تھا "الفاظ کے سحر سے بچو۔" کیا کوئی لفظوں کے سحر سے بچ سکتا ہے ہرگز نہیں خود سدھارت لفظوں کے سحر سے نہ بچ سکا۔ ورنہ کیا بات تھی کہ وہ "میرا بیٹا مر گیا" کے سحر سے بچ نہ سکا اور نروان کی تلاش میں انسانی دکھ کے مداوا کے لئے نکل پڑا۔ ورنہ لاکھوں لوگ روز یہ جملہ سنتے ہیں اور کافی

ہاؤس کی طرف چل دیتے ہیں سدھارت کی طرح نروان کی تلاش میں نکل نہیں پڑتے۔ دراصل لفظ بڑا ساحر ہے جو شخصیت دیکھ کر عمل کرتا ہے۔ لفظ محبت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی مدھم مدھم سروں میں مسلسل گھنٹیاں بجا رہا ہو۔ لفظ نفرت میں چنگھاڑنے والی موسیقی نکلتی ہے لفظ بھوک سے کسی خوں خوار بھیڑیے کا تصور ذہن کے پردے پر چھا جاتا ہے۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کبھی نہ کبھی الفاظ کے نروان کو پالیتا ہے، اگرچہ کہ اب محبت میں مدھم سروں کی گھنٹیوں کے بجائے لاتعداد چیخیں نکلتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ زمانے نے ہر چیز کا چہرہ مسخ کر دیا ہے، اسی طرح جس طرح کہ امیر، تاج، ملکہ... بجائے اپنے باپ کے اپنی تسکین کا انتظار کرتے ہیں۔ بشیر کے ہونٹوں پر ہنسی معدوم ہوتی گئی اور اس نے غصے سے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا۔ سامنے نذر اللہ اپنی تجوری سے ٹیک لگائے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس سرد رات میں تجوری کو آتش دان سمجھ رہا ہو۔ بشیر اس کی نظروں سے بچتا تیزی سے نکل گیا کیوں کہ گذشتہ مہینے کا حساب باقی تھا۔ گھر قریب آرہا تھا۔ اس نے سامنے کی دوکان سے دو درجن کیلے خریدے اور پیسے جیب میں ڈالے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کے دروازے پر قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا گویا وہ گر پڑے گا وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ بچے فوراً کیلوں پر جھپٹ پڑے اور وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ بیوی سے رضائی لانے کو کہا اور اسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ مگر سردی کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی نے کنکھیوں سے کیلوں کی جانب نگاہ ڈالی۔ سارے کیلے ختم ہو چکے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور بچوں کو بستر پر سلا دیا اور چھلکے بے بسی سے اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ چھلکے نہیں بلکہ اپنی بھوک کو پھینک رہی ہو، پھر وہ آہستہ سے چلتی ہوئی بشیر کے بستر تک آئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور وہ بھی لاچار سو گئی۔

سورج نے آہستہ سے اپنی پلکیں کھولیں مگر بشیر کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں... اس کی بیوی نے اپنے تکتے ہوئے بچوں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکی اب وہ بشیر کا، اپنے باپ کا انتظار نہ کریں۔ دوپہر تک کسی نہ کسی طرح روپیوں کا انتظام ہو گیا اور لوگ اس کو دفنا کر گھروں کو واپس آگئے۔

بشیر نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف گھپ سیاہی پھیلی ہوئی تھی اسے احساس ہوا کہ آج وہ واقعی مر گیا ہے۔ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ نہ جانے سکینہ میرے بعد کس طرح گھر چلا.. چاروں طرف روشنی ہو گئی دو نورانی صورت بزرگ قبر میں داخل ہوئے اور بشیر کی جانب بڑھنے لگے ان میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ بشیر نے ٹوکا "مجھے عربی نہیں آتی۔"

دوسرے نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا "یہاں زبان کا جھگڑا نہیں ہے۔"

پھر پہلے بزرگ نے کہا "تمھارا نام؟"

مردے کے چہرے پر سنجیدگی آئی اور اس نے جواب دیا "کلرک۔"

بزرگ نے آنکھیں نکال کر کہا "ہم تمھارا پیشہ نہیں بلکہ نام پوچھ رہے ہیں۔"

"ہمارا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ ویسے مجھے بشیر کہتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تم نے اپنی زندگی میں شراب پی ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"ہاں جب کبھی غم حد سے تجاوز کر جاتے تو یہ مجھے سہارا دیتی تھی۔" بشیر نے جواب دیا۔

"بیس کوڑے لگاؤ۔" پہلے بزرگ نے کہا۔ سزا ختم ہونے پر اس نے سوال کیا "تم نے رشوت لی ہے؟"

"ہاں۔ جب کبھی..."

"...بیس کوڑے" فرشتے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس طرح مختلف سوالات ہوتے رہے اور وہ مار کھاتا رہا۔ آخر میں بزرگ نے کہا۔

"کیا تمھیں آخرت کا یقین تھا"

بشیر کے ہونٹوں پر زہر خند دوڑ گیا۔

"قرآن پڑھا تھا؟"

بشیر نے جواب دیا "ان اللہ مع الصابرین۔"

"بیس کوڑے۔"

سزا ختم ہونے پر دونوں بزرگ واپس جانے لگے۔ بشیر نے آواز دی اور پوچھا "کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں۔"

"ضرور" دونوں نے جواب دیا۔

بشیر نے حسرت بھرے لہجہ میں پوچھا "قبر کا عذاب ختم ہو گیا؟"

"ہاں۔" جواب ملا۔

اچانک بشیر کے منہ سے ایک قہقہہ نکل پڑا اور اس نے کہا۔ "تو وہ مولوی جھوٹ کہتا تھا۔ کہتا تھا قبر کا عذاب انسان کی برداشت کے باہر ہے۔ اتنا عذاب تو میں نے زندگی کے چند لمحوں میں سہا ہے۔" فرشتے آگے بڑھنے لگے۔ بشیر نے پھر ٹوکا اور لجاجت سے کہا "آخری سوال... کیا واقعی انسان فرشتوں سے عظیم تر ہے؟"

"ہاں" کہہ کر وہ دونوں چل دیے اور قبر میں گھپ سیاہی پھیل گئی ☆☆☆

اکرام باگ

(بادشاہ کے نام)

شمارہ ۱۰۱،
اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

جب مطلب سوئی کے باریک دھاگے کا سرا ختم ہوا تو۔ میں نے ایک کھلی ہوئی دوپہر میں خود کو یہاں پڑا پایا۔

تپتے ہوئے ذرات سے سارا جسم اٹ چکا تھا۔ ادھ مری آنکھوں سے دور دور تک نظریں دوڑائیں مگر وہاں کیا تھا ایک میں اور مجھ سے پرے ہوا میں لپٹی ہوئی ساعتیں۔

پتہ نہیں جسم پر کتنے روئیں ایسے ہوں گے جو ایک ایک احساس کو چوکس شکاری کی طرح قید کر لیتے ہیں۔ ان قید خانوں میں تشنگی کو پتھرائی ہوئی آنکھ اور اقلیما کا عکس۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ... جو کبھی نہیں کھلتا۔

باہر: کائنات کی ہولناک مسکراہٹ میں فنا کا گیت گونج رہا ہے لیکن میرے عقب میں ان دیکھے قدموں کی کھڑکھڑاتی آوازیں، مجھے سنتے ہی رہنا ہے۔ خواہ وہ سنیچر کو سمندر کے قریب گڑھے کھودتے ہوئے پاؤں ہوں کہ مال غنیمت پر للچائی ہوئی آنکھ۔

علیحدگی تو صرف سراب ہے... ورنہ... سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

چاروں طرف پھیلا ہوا یہ ریگستان، آخر مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔

اندر باہر چاروں طرف ریگستان۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک جن جن درختوں نے مجھے بے برگ و بار کیا ان میں سے اب کوئی بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ جب پہلی بار اس شاخ سے مجھے ہجرت کا پھندا نصیب ہوا تو وہ دونوں، میرے ہم راہ، دھوئیں کے رتھوں پر سوار نیچے ہی نیچے تر بتر ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہم یک جا ہوتے رہے شکلیں بدل بدل کر۔

شاید وہ جمعہ کی خون آشام سہ پہر تھی... نیم کے درخت کے پاس آنکھیں میچے، وہ مرا انتظار کر رہا ہے۔ اپنے کاندھے سے ہل پھینک کر، میں نے اس کے گلے پر نظر ڈالی۔ وہاں خوش نما پھول پتیوں والا رومال پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ صاف ستھرے سیاہ لباس میں ملبوس، ہدایت کردہ سمت میں منہ اٹھائے دوہرا رہا تھا کہ "جب آنکھوں کی روشنی اچک لی جائے گی اور سمندر کا پانی ہانپ اٹھے گا تو اے جن وانس تم کسے پکارو گے۔" اس کے پیروں کے پاس مقدس قربانی رکھی ہوئی تھی اور پاس کی بہتی ہوئی ندی میں اس کا سایہ لہروں سے کشمکش کر رہا تھا۔ 'چھوڑ۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک لمحہ کے لئے میرے سینے میں تقریباً ویسی ہی خوف اتر آیا جب میں نے پہلی بار ممنوعہ پھل حلق میں اتارا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے دیدوں میں بھوری گھاس سے بنی کھڑکی میں سے اقلیما کا روشن چہرہ تھرتھرا رہا ہے۔ وہ قربانی اٹھانے کے لئے جھکا، در فوراً ہی مجھے دھکا دے کر خود بھی، جھک گیا۔ سامنے کالا سانپ لہراتا ہوا ندی کے بہاؤ میں گم ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ لالچ تو محض شکستہ خواہش ہے۔

پھر بھی ہم دونوں چلتے رہے اور مقرر کردہ آمنے سامنے کی چٹانوں پر اپنی اپنی قربانیاں رکھ دیں۔ اطراف پیپل کے درختوں پر اسرار اونگھ رہا تھا۔ اچانک جھماکے کے ساتھ ایک تیز آندھی کا بگولا وہاں داخل ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر، مشتبہ انداز میں چٹان پر نظریں ڈالیں مگر مری قربانی وہاں موجود تھی اور دوسری چٹان عریاں اسی لمحہ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں اور وہ، اپنے طاؤس نما پاؤں لئے مری جانب بڑھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے سیاہ لباس میں سے کوئی چمک دار شے نکالی اور میرے حلق سے اق ق لیما کا خرخراتا ہوا لفظ اس گھومتی ہوئی زمین میں چکرا گیا۔ آسمان پر لال دریا پھیل گیا اور فنا کا گیت گونج اٹھا۔

شام تھی۔ میں ویسٹ انڈیا کی کرکٹ کنٹری سے فارغ ہو کر، صحن میں پہنچا تو شہتوت کے درخت کے قریب دو آنکھیں یک ٹک مجھے گھور رہی تھیں۔ تنفس سے نکلا۔ اقلیما۔ اور میں شفق آسا وادی میں ڈوب گیا۔ وہیں بیت الخلاء سے متصل دیوار کے قریں، ہم نے بدنام لفظ کی دیوار کو آخری اینٹ دے دی۔

تب عقبی گلی میں فائر بریگیڈ انجن گونج اٹھا۔

شفق آسا وادی سے جدا ہو کر جب میں چھت پر پہنچا تو وہاں آسمان پر آگ کے بجائے رات پھیل چکی تھی۔

نیچے اترنے تک صحن میں سارے رابطے کٹ چکے تھے اور وہاں ایک

گوریلا جادوا پر متحرک رہا تھا۔ اس کے سر پر وضو کے بعد کا مرحلہ رسم ہونے کی کہانی بکھیر رہا تھا۔ میں سب کچھ جان گیا...

سامنے ایک دیوار، لمحہ بہ لمحہ اگتی گئی اور کوئی اندر کی آگ اور دھوئیں کو ہٹاتا ہوا مجھ سے جدا ہوا۔ میں نے دیکھا: اس کے ہاتھوں میں ایک کلہاڑا ہے۔ پہلے ہی وار پر دیوار کے پتھر جھر جھرا گئے اور وہ دیوانہ وار دیوار پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے پسینہ میں سارے پتھر ڈوب چکے تھے اور اب وہ بنیاد اکھیڑنے کی سعی میں ڈوب گیا۔ پہلے ہی وار پر ایک افعی نکلا۔ وہ اسے اپنے گلے میں لپیٹے دوسرے وار کی سانس لینے لگا۔ مسلسل واروں کی زد میں مکڑیوں کے جال، چاقو، نمک اور ادھڑے ہوئے پتے نکلتے گئے اور آخر کار تہہ میں اسے وہ کاغذات مل گئے جس کی اسے تلاش تھی۔ مگر یہ کیا؟ کاغذات پر روشن بدنام لفظ خود اس کے پسینے سے بجھ گئے تھے اور صرف بے ربط دستخط اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ جوئے شیر کی عدم یابی میں صبحوں اور شاموں کی تنہائی اب سخت جاں ہے۔ افعی اسے ڈس رہا ہے مگر وہ سرگشتہ خمار رسوم قیود بھی ہے یا نہیں۔ پتہ نہیں۔ سامنے پھر دیوار اگ آئی ہے اور اس کے منڈیروں پر گوریلا اپنا جادو تھرتھرا رہا ہے۔

"قناعت،" میرے منہ سے نکلا۔ مگر قناعت پذیری کیسے آئے؟ اپنے اندر کے گرگٹ سے اتنا لڑنا ہوگا کہ بے ہاتھ ہو جاؤں ورنہ اس بے رحم چھلنی میں اپنا وجود ڈالے قطرہ قطرہ ہونے کا منظر دیکھ پاؤں گا۔ اتنا شاید کبھی کافی نہیں ہوگا کہ اس جہنم آسا زندگی کا لمحاتی مداوا کسی اجنبی رات میں اپنی مانوس اداسی اور تنہا چاند میں ڈھونڈوں۔

چاند نکل آیا ہے۔ اور یہ ریگستان ناقابل تسخیر ہے..

پیچھے: بادیہ کے سنگ میل کو بگولوں نے چاٹ لیا ہے۔ وہاں، سرخ نیزے، ریت پر کیپٹل لفظ دائم کرنے میں سرگرداں ہیں۔ اب ان دیکھے قدموں کی بازگشت عادت سی بن گئی ہے۔ چلتے رہنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

ایک اکیلا منتشر انبوہ اور اس قدر کٹی پھٹی زمین۔ ہریالے فلسفہ کہاں اگتے ہیں۔ معدومی اور بے راہ روی۔ کتنے راستے، اس بیچ، درمیان میں آ گرے مگر... مگر دور شاید ایک چور کنواں ہے۔ میں تھکا ماندہ، بے فیض، وہاں پہنچتا ہوں، مگر وہاں بھی چوکور دیوار سے متصل سیاہ عمامے ذلیل و خوار پڑے ہیں۔ یہ حب حزن تو نہیں؟ میں نے جواب دیا تھا: تیس سال کی عظیم محنت کے بعد، جن چھ جلدوں سے اس نے ہماری فہم روشن کی، اس پر اندھیرا نہیں پھینکا جانا چاہئے۔ مگر سیاہ عمامے اندھیرا پھینکتے رہے اور کبھی تو عذاب کی توجیہہ کے لئے ایک نسل کا ذہن کافی نہیں ہوتا...

وہ منگل کی ایک اکتاہٹ بھری رات تھی...

مدراس کے کیفے میں پاکستان ریڈیو سن کر جب میں مین روڈ پر داخل ہوا تو زندگی رواں دواں ہے۔ سامنے عمارت کی بالکونی پر نظر دوڑائی تو "کینسر کا شرطیہ علاج" بورڈ دکھائی دیا۔ لسن آمیز گلیوں سے گذر کر قبرستان پہنچا تو وہاں ایک ببول کے درخت کے نیچے، اونٹ، تھکا ماندہ بیٹھا تھا... مجھے ریڈیو کی خبریں یاد آئیں اور دل ہی دل میں ملی ترانہ گنگناتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک پتھر پاؤں کے قریب آ گرا۔ اور پھر چیخ اور نعروں کی گونج میں میرے بدحواس معطل پاؤں ممنوعہ دروازہ میں داخل ہوئے۔ "ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ... جو کبھی نہیں کھلتا۔" اب جو بھی ہو کیا کیا جا سکتا ہے۔ پناہ وجود سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اندر داخل ہوا تو صحن میں چاندنی کٹی ہوئی تھی... یہ یقین ہو گیا کہ یہاں فساد میں ہی ممنوعہ چہرے دیدار ہوتے ہیں۔ چھت پر پہنچا تو گئی رات تک فائر بریگیڈ انجنوں کی نیند ابھی ٹوٹی نہیں تھی۔ صحن میں شہتوت کا درخت کاٹ دیا گیا تھا...

آگ چاروں طرف۔ اندر اور باہر راکھ اور ملبوں کے ڈھیر۔ بات: عمامے پر رنگ کی بارش سے شروع ہوئی۔

اقلیما... چاند کو تکتے تکتے مجھے ہوش نہیں رہا اور میں نے دیکھا: مری زبان کی نوک ایک وسیع گنبد کے بہاؤ پر ٹکی ہے اور میرا سارا وجود معلق۔ گنبد کے محدبی بہاؤ پر سفر کرتے ہوئے میں نے ایک لمحہ کے لئے دیکھا کہ نیچے ایک عجیب الخلقت عفریت ناچ رہا ہے۔ اس کے تکوے ٹینک نما اور ٹانگیں میزائل انگیز اور ان کے درمیان ایک تنگ دھڑ ننگ عورت لٹک رہی ہے۔ سر پر دلاسٹک نما پھریرے لہرا رہے ہیں۔ اور دھڑ ایک کٹی پھٹی زمین کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہاتھوں کے بجائے ایریل پول کندھے سے جڑے ہیں۔ مرے سفر کے اختتام کی چیخ، اس کے حلق میں اتر آئی اور میں ہڑبڑا گیا۔ کنویں میں ابھی تک میری چیخ گونج رہی تھی۔ سیاہ عمامے اسی طرح ذلیل و خوار تھے۔ دن نکل آیا تھا۔ میں نے سوچا: اگر ہم کسی علامتی شبیہہ سے ہراساں تیز گام ہیں تو وقت اور زماں ہمارے لئے کیا رہ جائیں گے۔ عذاب کی توجیہہ کے لئے ایک نسل کا ذہن کافی ہے؟

اس ریگستان میں پتہ نہیں کب سے بارش روک دی گئی ہے...

اب تو میں اس ریگستان میں آ جانے کی وجہ سے بھی ماورا ہو چکا ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کس کی تلاش ہے۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ، جو کبھی نہیں کھلتا۔ مگر یہیں سے گذرتے رہنا ہوگا۔ شاید انسان کی ابتدا بھی خدا کے ظہور ہی کی طرح ایک واقعہ ہے۔ مگر آدمی خدا کہاں ہے؟ صرف بے ربط دستخطیں ہیں مگر سیاہ ورق کی لمبائی کا اندازہ کون کرے؟ اقلیما کا عکس اور قید خانوں میں فنا کا گیت۔ اس قضیہ میں مجھے وہ ورق اچھی طرح یاد ہے۔

شروع میں اس کی طوالت کا اندازہ خود مجھے بھی نہیں تھا۔ روشن دان سے منعکس ہوتی ہوئی کرنوں کے احساس پر معلوم ہوا کہ روشن دان سے اس کی جڑیں میرے بستر کی جانب آ رہی ہیں۔ دیواروں پر منقش آیات ہمیشہ کی طرح مجھ سے بیزار تھیں۔ جب وہ پوری طرح میری آنکھوں اور پھر بستر میں پیوست ہو گئیں تو اس عمل کے اختتام پر مجھے معلوم ہوا کہ گاجر کا درخت مجھ پر چھا چکا ہے۔ میرے ناتولد قطروں سے پرے رات، حوض پر اتر آتی تو دروازہ کے قریب مجھے احساس ہوتا کہ کیا ان رابطوں کے کٹ جانے کا حاصل بس یہی ایک چھچھلا، حقیر عمل ہے جہاں اقلیما محض چند آیتوں کے اعلان میں ممنوع ہے... اذان کی آواز پر جب میں دروازہ کی جھریوں سے جھانکتا تو ہمیشہ کی طرح وہ سب اس سرد ترین، دھواں آمیز صبح میں اپنی اپنی پشیمانیاں دھونے میں خشوع خضوع ہوتے۔ انھیں شاید علم ہی نہ تھا مسجد کے اس کمرہ میں ایک میلا بستر ہول ناک درخت کی زد میں محو استراحت ہے۔ فلاح کے

راستہ بلانے والی آواز نیند میں تحلیل ہے اور پشیمانی کسی مفہوم میں عبادت معلوم نہیں ہوتی۔ علیحدگی تو صرف سراب ہے ورنہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ اول اول کون سی سطح گندہ ہوئی کیوں کہ ہوش آنے تلک تو معلوم ہی نہ تھا کہ لال مٹی کے آگے بھی کنویں، انسان، بازار، تالاب اور پتنگ آباد ہیں۔ غالباً وہ کوئی دوپہر یا پتنگ اڑائی جانے والی شام تھی کہ دھاگا تن چکا تھا۔ نہ کوئی معبود اور نہ ہی کوئی عابد۔ بس ایک انبساط تھا جو یہ محرک خزینے کسی حبس آمیز، دھو پیلے گوشہ، سنیما کی اندھیری سیٹ، قبر کا چبوترہ، ناولوں کی کمان یا فصیل پر رکھی توپ پر وا ہوتے تب رٹی رٹائی آیت کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔

بس دو نسائی آنکھیں یاد ہیں۔

ان ہی آنکھوں کو مسرت دلانے کے لئے دو پاؤں بے چین رہتے۔ وہیں کہیں ایک درگاہ تھی اور کہیں کوئی پارہ پڑھتے منتظر رہتا۔ تب تپتی ہوئی دوپہر میں دو پاؤں درگاہ کو پہنچتے اور شام آجاتی۔ مولسری کی آخری شاخ پر دور کے قبرستان سے رات کے آثار پر جلد جلد اپنی جیبیں بھرے ہانپتے ہوئے دو پاؤں دہلیز تک پہنچتے۔ مولسریوں کی منتظر آنکھیں۔ اور میں۔ اور بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی جی چاہتا کہ اس کے مرتعش دو مولسریوں کو اس سے طلب کرلوں مگر جمعرات کا دن آموختہ ہوتا۔

لیکن محرک خزینے کی دریافت میں کالی مٹی ہی سب کچھ ہے کیوں کہ اقلیما اور شہتوت کا درخت یہیں پر نمو پاتے رہے اور میں دیوار کے ساتھ ملبہ میں اپنے آپ کو ڈھونڈتا رہا۔

منتخب تاریخ کا علم مجھے گھر ہی کے ایک فرد سے ہوا۔ ابھی ابھی سویرا ہوا تھا مگر میرے چہرہ پر یک دم سے کئی سورج گر پڑے۔ گم ہی میں دوپہر سات گنبد کے قبرستان، کینئے کے گوشہ اور مسجد کے متعفن بستر پر بیت گئی۔ ایک میں تھا اور مجھ سے پرے ہو میں لپٹی ساعتیں۔ ایک طویل چپ کا مفہوم یہی نہیں تھا کہ پیروں کے نیچے سے زمین ہٹ گئی بلکہ... تب سے میرے پاؤں سی ڈوپوڈیا (Psedopodia) ہو چکے ہیں۔ اس بیچ کے عرصہ کی تبدیلی میں میں ایک نامعلوم کتی، کاغذ، شہتوت کے پتے، نمک اور مکڑیوں کے جال میں سے کس کے خوف میں مبتلا ہوں اندازہ نہیں ہوتا۔ ہاں اس رات رم جھم تھی...

مخصوص پاؤں کی دھمک میری آنکھیں کھول گئیں۔ میں نے ٹین کے نچلے خلا سے دیکھا تو محض چاکلیٹی رنگ ہی نظر آیا۔ حالاں کہ چاندنی اس رم جھم میں بھی صاف اور شفاف تھی۔ رم جھم تھی کہ جسم میں اترتی چلی گئی۔ گندگی بہا دینے کی حاجت تو محض حرکت کرنے کا ایک جواز تھی۔ سرہانہ، دائیں طرف، برف افسانہ کا دوسرا ورق الٹا ہوا تھا... میں اٹھا۔ واپس لوٹتے ہوئے احساس تھا کہ سب کچھ ناکام ہی رہا تھا۔ کسی نئی آیت کو پڑھنے کی ضرورت عف عف کی بوکھلاہٹ میں ناکام رہی لیکن شفق آسا وادی اور کہسار، مچھلیوں کے آئینے مجھے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر مجبور کر چکے۔ جب ٹین کے پترے سے کٹ کر صبح میرے چہرہ پر گری تو رعنائی میں چھپی میری آنکھیں صحن میں موجود ایک طویل سنانے سے سراسیمہ تھیں... اٹھو، رضائی کے الٹتے ہی ایک طمانچہ کا احساس ہوا اور پھر اخلاق کی کتاب کے اوراق الٹتے رہے۔ گویا عف عف کا اظہار غلط نہیں تھا۔ میں ایک نامعلوم کتی کے خوف میں مبتلا ہوں؟

کتابیں پھینک کر میں گھر سے بس اسٹینڈ کی طرف دوڑا... اچانک راستہ چلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ چلتی ہوئی بس میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں۔ سامنے پولیس اسٹیشن ویران تھا اور لال مٹی کا دامن خموش۔ پائے دان سے نیچے پاؤں رکھتے ہی سطح زمین پر ایک قبر طلسم انگیز طور پر ابھر آئی۔ اگلے پاؤں کے ٹکنے سے قبل پھر ایک قبر کا اضافہ۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ گاؤں میں اداس بجرم شام کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ قبروں کی درمیانی جگہوں پر سے میرے پاؤں گھر تک کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ گھر کی چوکھٹ پر بھی ایک قبر موجود تھی۔ پھر اندر داخل ہوا تو، صحن، باورچی خانہ، بیت الخلاء، پرانا حجرہ سب ہی قبروں کے مسکن تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا تو کیا عف عف کا وقوعہ...؟ چھت پر بھی قبریں موجود تھیں۔ منڈیروں پر ٹھہر کر میں نے دور دور تک نظر دوڑائی مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ قبریں ہی قبریں۔ آسمان پر لال بھبوکا سورج مولسری کے درخت پر گر پڑا تھا...

میں نے سوچا: ممکن ہے وہ سب رات کے ٹیلے سے برآمد ہوں گے اور جو کچھ اپنے اندر طمانیت کی روشنی بچی ہے وہ بجھ جائے گی اور پھر دور دور تک الکٹرک پول اور پل کے نیچے ندی... میں کب یہاں سے جدا ہوا تھا؟

دو نسائی آنکھیں یاد ہیں۔ حادثے زوال آمادہ ہیں اور فنا کا گیت گونجتا ہے کہ تخلیق میں مصروف ہے؟ پتہ نہیں۔

کاش میں یہاں ہمیشہ کی طرح مولسریاں توڑتا رہتا مگر کتابوں نے مرا جسم چاٹ لیا۔ اب یہاں ایک وحشت ناک ہو ہے اور میں بھاگ رہا ہوں۔ واپسی میں کالی مٹی کی خلق کردہ آگ ٹھنڈی ہو جائے گی؟ زندگی اس قدر اجنبی ہو جائے گی کہ منقطع دستخطوں میں اپنا مفہوم ڈھونڈے گی۔ یہ میں نے کب سوچا تھا۔ قبریں میرے تعاقب میں ہیں اور میں بھاگ رہا ہوں۔ اسی تگ ودو میں گڈھے میں گر پڑا ہوں اور اوپر چار سفید پوش کچھ پڑھتے ہوئے مجھ پر کنکریاں پھینک رہے ہیں۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہوں اور میرے قدم ریگستان میں دھنس جاتے ہیں۔

سورج نصف النہار پر ہے۔ دور ایک درخت نظر آرہا ہے۔ شام تک شاید پہنچ جاؤں تو گویا پیروں کے نیچے پڑا ریگستان ہی واحد حقیقت اور اقلیما؟؟

چلتے رہنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

آسمان پر لالی کے چھاتے ہی مجھے اس درخت کے سواستک نما پتے نظر آئے۔ مگر یہ کیا؟ یہ... یہ شجر زقوم تو نہیں؟ پھل انسانی سر کیسے ہو سکتے ہیں درخت کے نیچے بہتی ندی سے میرا سایہ کوئی کشمکش نہیں کرتا۔ ایک سحر ہے کہ جس کی زد میں اترتا ہوا تنے میں سمایا جا رہا ہوں۔ ایک ان جانی وحشت میں پیچھے اچٹتا ہوں تو پلنگ کی ریلنگ سے سر ٹکراتا ہے۔ ریڈیو پر کسی معاہدہ پر دستخط ہونے کی خبر نشر ہو رہی ہے اور سامنے بھائی اسٹیٹکس کے اعداد و شمار میں گم۔ میں رفع حاجت کے لئے اٹھتا ہوں مگر صحن میں کھڑا نیم کا درخت میرے قدم روکتا ہے۔ تنے سے سر ٹکائے، آنکھیں میچے، ہدایت کردہ سمت میں منھ اٹھائے، دوہراتا ہوں: "جب آنکھوں کی روشنی اچک لی جائے گی اور..." ☆☆☆

اکرم محمود

شمارہ۲۶۵،
فروری ۲۰۰۳

اگر ہر چیز میں اس نے اثر رکھا ہوا ہے
تو پھر اب تک مجھے کیوں بے ہنر رکھا ہوا ہے

تعلق زندگی سے مختصر رکھا ہوا ہے
کہ شانوں پر نہیں نیزے پہ سر رکھا ہوا ہے

زمانے سے ابھی تک پوچھتے ہیں اس کی باتیں
اسے ہم نے ابھی تک بے خبر رکھا ہوا ہے

اب ایسی بے ثمر ساعت میں اس کی یاد کیسی
یہ دکھ اچھے دنوں کی آس پر رکھا ہوا ہے

نکلنا چاہتا ہے وسعت صحرا میں وحشی
بڑے جتنوں سے دل کو باندھ کر رکھا ہوا ہے

صدا دیتا ہے روز و شب کوئی ایسا جزیرہ
جہاں میرے بھی حصے کا ثمر رکھا ہوا ہے

نہ جانے کون سی منزل پہ بجھ جائیں مری آنکھیں
سو میں نے اک ستارہ ہم سفر رکھا ہوا ہے

اکرم نقاش

شمارہ۲۳۸،
ستمبر۲۰۰۱

چمکتی راتوں میں چاندنی پر ترے بدن کے عذاب دیکھوں
برستے موسم میں بجلیوں کو سراپا شعلہ در آب دیکھوں

مری بصارت گماں کی زد میں مرے تخیل میں بے یقینی
تجھے کبھی میں کتاب لکھوں تجھے کبھی میں سراب دیکھوں

مرے گماں کی سیاہیوں میں وہ چاند جب بھی چمک اٹھا ہے
میں ہر نظر آفتاب دیکھوں ہر ایک چہرہ گلاب دیکھوں

کہیں قفس کی صدا ہے روشن کہیں پہ نغمہ سرا ہے صحرا
کہیں سلاسل ہیں قیدیوں کے کہیں رہائی کا باب دیکھوں

عجائب سنگھ

الیاس احمد گدی

شمارہ ۲۴،
مئی ۱۹۶۸

عجائب سنگھ پشت کی چھوٹی کھڑکی میں اپنا چوڑا چہرہ پھنسا کر دھاڑا۔

"اب چپ بھی کرو گی تان سین کی بیٹیو یا نہیں۔ گیئر پھنس گیا ہے..."

پیچھے ڈالے میں بیٹھی ہوئی چوڑے شانے والی آدی باسی لڑکیاں بہ دستور گاتی رہیں۔

کون کسور دیا، بچھڑل سور پیا، ہائے رے ہائے۔
چھاڑے رکھل دور دیسے...
(اے سکھی پتہ نہیں کس خطا پر میرا محبوب مجھ سے بچھڑ گیا ہے اور مجھے
اتنی دور چھوڑ دیا ہے۔)

ان کی تیز، جوان، تندرست اور سریلی آواز برداواگ کے گھنے جنگل اور پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی میں دور دور تک لہرا رہی تھی۔ موسیقی کا رس چاروں طرف رچ گیا تھا۔ عجائب سنگھ نے دو چار جھٹکے گیئر کو دیے۔ مگر گیئر محض کڑکڑا کے رہ گیا۔ جھلا کر اس نے اپنی میلی ہتھیلی سے اپنی پیشانی کا پسینہ پوچھا اور علی سے بولا۔

"علی ان حرام زادیوں سے پوچھو، کیا سارے چھوٹا ناگ پور کی مستی انھیں پر چڑھی ہے؟"

علی ہنسنے لگا۔

"مگر یہ تو بروگ کا گیت ہے استاد، جدائی کا..."

"میں کہتا ہوں، جدائی کے بچے رنچ نکال، کھوپڑی کھولنی ہوگی۔" وہ ہمیشہ گیئر کور (Gear cover) کو کھوپڑی کہتا تھا۔

لڑکیاں ابھی تک لہک، لہک کر گا رہی تھیں:

گھر آنگن سون بنجر ہمیں لاگے گھوں
پیا بن ایکو موکے لاگے نہیں بیسے
چھاڑے رکھل دور دیسے..
(گھر آنگن سونا ہے۔ اور جسم کو گھن لگ رہا ہے اور محبوب کے بغیر مجھ کو
کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔)

گیئر کے نٹ میں رنچ پھنسا کر وہ علی سے بولنے لگا۔

"کسی دن سالیوں کو لئے دیے سنتاؤس کی گھاٹی سے نیچے اتر جاؤں گا۔"

اس نے نٹ گھمانے کے لئے زور لگایا تو رنچ پھسل گیا۔

جب ہی اچانک لڑکیوں نے گیت بند کر دیا۔ فضا پر جو سرور چھایا ہوا تھا، اور خاموش جنگل کے پراسرار سناٹے میں جو افسوں رقصاں تھا شکست ہو گیا۔ لڑکیوں نے جھانک کر دونوں مردوں کو گیئر بکس پر جھکے دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے وہ نیچے کود آئیں، ایک لڑکی نے ڈرائنگ گیٹ کھولا اور پنجابی میں بولی۔

"کی ہویا سی؟"

عجائب سنگھ نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔ چوڑے شانے اور بھرے بھرے بدن والی سونا تھی۔ ایک شریر، خوب صورت، بے ریا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تیرتی ہوئی تھی۔ شرارت اور شباب کے رنگ سے اس کا سانولا چہرہ منور تھا۔ اور جوان اور گہری سیاہ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"تو جو پٹنا پھٹ بولتی ہے تو اگر کہیں کوئی پنجابی تجھے اٹھا لے گیا تو تیری ماسی ساری بستی میں چھاتی پیٹتی پھرے گی، سمجھی..."

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ سونا ایک دم شرما کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر سڑک سے نیچے اتر کر اس نے ایک پتھر اٹھایا۔ اور اپنی خجالت مٹانے کے لئے ہاتھ گھما کر زور سے پتھر سامنے کھڑے ہوئے جامن کے تناور درخت پر پھینک دیا۔ سیاہ رس بھری جامنیں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ان گرتی ہوئی جامنوں کو دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی دوڑ پڑیں۔

سہ پہر کے ڈھلتے ہوئے سورج نے، چاروں لڑکیوں نے، تمام چیزوں پر زرد، سنہرا ملمع چڑھا دیا تھا۔ برداداگ کے جنگل کی خاموش فضا میں عجائب سنگھ کی ہتھوڑی کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ سارا جنگل خاموش کھڑا تھا۔ لمبے اونچے درخت ہوا کے کسی تیز جھونکے سے لپٹ جاتے تو پتیوں کی ہنسی کی آواز سنائی دے جاتی۔ لڑکیاں بار بار پتھر پھینک کر جامنیں توڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے پھینکے ہوئے ہر پتھر کے ساتھ کچھ جامنیں بکھر جاتیں جب کوئی سالم گچھا ٹوٹ کر گرتا تو لڑکیاں خوشی سے تالیاں بجانے لگتیں۔ عجائب سنگھ ان لڑکیوں کی خوش فعلیوں پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا ہوا گاڑی بنانے میں مصروف رہا۔

گاڑی جب دوبارہ ٹھیک ہوئی تو لڑکیوں نے اپنے انگوچھے سیاہ جامنوں سے بھر لئے تھے۔ اب جگالی میں مصروف تھیں۔ ان کے بھرے بھرے موٹے گداز ہونٹ ان جامنوں کے رنگ میں ڈوب کر خون آشام ہو گئے تھے۔ عجائب سنگھ نے گاڑی اسٹارٹ کر کے لکنگ گلاس میں اپنا چہرہ دیکھا۔ موٹا بھرا ہوا چہرہ، زمانے نے جس پر خراشیں ڈال دی تھیں آنکھوں کی تابانی ماند پڑ چکی تھی۔ اور صافے کے گوشوں سے جھانکتے ہوئے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ایک نوعمر کھلنڈرا پن ایک پر رونق بشاشت اس کے چہرے پر حاوی تھی۔ اور اس کے بڑھاپے کی تردید کرتی تھی۔۔۔ وہ مسکرایا۔ منشی سالا جھوٹ موٹ کہتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

علی اس کے پہلو میں چپ چاپ گیئر کا ڈنڈا پکڑے بیٹھا تھا۔ ٹب پنیئن سلپ کر گیا تھا اس لئے علی کو ہمیشہ گیئر کا راڈ پکڑے رکھنا پڑتا تھا۔ پیچھے ڈالے میں لڑکیاں خاموشی سے جامن کھانے میں مصروف تھیں۔ عجائب سنگھ کو یہ خاموشی بری لگی۔ اس نے علی سے کہا۔

"علی، ان سے کہو کہ گائیں۔۔"

علی نے پشت کی کھڑکی کی طرف چہرہ گھما کر جیسے حکم دیا۔

"اے سونا، تم لوگوں نے گیت کیوں بند کر دیا۔ کچھ گاؤ۔"

سونا نے جامن کا بیج زور سے تھوک دیا اور لہک کر گانے لگی۔

تو ریکھے رہے بابو ہمر دپر دکھ ہو، تو ریکھے۔۔۔
کہ پلنگا کے اوپر بجو کرت دلار۔

لڑکیاں ہنسیں تو علی نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے جواب دیا۔

تو ریکھے رہے میاں ہمرو گھر کے گھرنی گے۔۔۔ تو ریکھے۔۔۔
باسی بھاتے کی گے میاں بینکا ڈولائے۔۔۔

لڑکیوں میں زبردست ٹھہاکا پڑا۔ علی بھی ہنسنے لگا اور پھر عجائب سنگھ کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے دیکھ کر اسے گیت کا مطلب سمجھانے لگا۔

"سونا نے کہا کہ اے بابو تمہاری طرح میرا بھی چاہنے والا تھا، جو مجھے پلنگ کے اوپر بیٹھا کر پیار کرتا تھا اس پر میں نے جواب دیا کہ اے لڑکی، تمہاری طرح میری بھی گھر والی تھی جو مجھ سے اتنا پیار کرتی تھی کہ باسی اور ٹھنڈے بھات پر پنکھا جھلتی تھی۔"

عجائب سنگھ نے بائیں ہاتھ سے علی کی جانگھ پر تھپڑ مارا۔

"اوئے تو نے کہاں سیکھی یہ مسخری؟ تو تو دیکھنے میں بڑا سیدھا لگتا ہے۔"

علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جونا کی چڑھائی شروع ہو چکی تھی عجائب سنگھ نے گاڑی کو اسپشل گیئر میں ڈال دیا۔ بوڑھا انجن ہائیں ہائیں کرنے لگا۔ علی نے اس شور سے گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔

سڑک کے پہلو میں ایک برساتی نالہ گدلے ٹیالے پانی کا بوجھ اٹھائے تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس گدلے پانی میں سر اٹھائے اکا دکا سیاہ چٹانیں یوں دکھلائی دے رہی تھیں جیسے کوئی بھیل عورت اپنے سیاہ فام بچوں کو چھاتی سے چمٹا کے سو گئی ہو۔ ٹرک موڑ پر موڑ گھوم رہی تھی۔ گہری اندھیری کھائیاں جیسے اس ٹرک کو نگلنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ لیکن ہر موڑ گھوم کر ٹرک جیسے ان کھائیوں کو جل دے جاتی اور اس کے پہلو میں نیچے اسی گدلے پانی والے نالے کی منحنی سی لکیر دکھلائی دے جاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سڑک، ٹرک اور وہ نالا آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

چڑھائی چڑھتے انجن ایک دم گرم ہو گیا اور جب چڑھائی ختم ہوئی تو ریڈی ایٹر کا پانی ابال کھا چکا تھا۔ بونٹ کھول کر جب ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھایا گیا تو بھاپ کی ایک لکیر دور تک اوپر اٹھتی چلی گئی۔ رام بھروسے مخالف سمت سے اپنا ٹرک ان لوڈ کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی روک کر کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور عجائب سنگھ کو چھیڑا۔

"ارے یار سردار، تیری جورو تو ایک دم گرم ہو گئی ہے۔"

عجائب سنگھ نے بھی سر کھڑکی سے باہر نکالا اور ہنسنے لگا۔

"ہاں، سسر کی بیٹی بڑا نخرہ بگھارتی ہے۔ اس پر سوتن لے آؤں گا تو ساری شیخی دھری رہ جائے گی۔"

لفظ سوتن کو وہ بڑے اچھے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔ اس کے مالک جگت بابو عرف بڑے ٹھیکے دار صاحب نے کتنی ہی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ تم کوئی دوسری گاڑی اپنے چارج میں لے لو۔ اور یہ گاڑی کسی نئے ڈرائیور کو دے دو۔ مگر وہ ہر بار انکار کر دیتا۔ پتہ نہیں اس کو اس گاڑی سے کیا انسیت تھی کہ اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اس ڈاج ٹرک کو ہمیشہ سسر کی بیٹی کہتا تھا۔ اسی مناسبت سے لوگ اس گاڑی کو عجائب سنگھ کی جورو کہتے تھے۔ اور جب منشی جی اس گاڑی کو کھٹارا کہتے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور منشی کو وہ وہ بول سناتا کہ سارا ڈپو ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتا۔

عجائب سنگھ ہٹا کٹا تنومند آدمی تھا۔ عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی مگر پندرہ سولہ برس کی مجرد زندگی گذارنے کی وجہ سے ہنوز تر و تازہ دکھتا۔ یوں بڑھاپے نے اپنی نشانیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ آنکھوں کے گرد ہلکی سیاہی کے

داغ، چہرے کی پختگی اور سر کے بالوں میں اکا دکا چاندی کے تار، یہ تمام چیزیں آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھیں۔ لیکن ان کے باوجود وہ ہنوز جوان تھا اور زندہ دل ایسا کہ برواداک سے رانچی تک کے تمام علاقے میں بالکل ایک الگ اور منفرد شخصیت ہو کے رہ گیا تھا۔ سارا علاقہ اس کو اس خوبی کی بنا پر چاہتا تھا۔

اس کی اس خوش دلی اور بذلہ سنجی کو نہ اس کی نئی نویلی بیوی کی موت لوٹ سکی نہ اس کی خانماں بربادی۔ اس کو گھر چھوڑے لگ بھگ بیس برس ہو گئے تھے، مگر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ نہ ہی کوئی خط لکھا۔ نہ ہی کسی سے کوئی خیر خبر لی۔ لوگ کہتے کہ یہ دراصل اس کی بیوی کی موت کا غم ہے جو سال بھر اس کے ساتھ رہ کر دوسری دنیا کو سدھار گئی۔ مگر بہ ظاہر کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ کیوں کہ جب کبھی اس کی بیوی کا ذکر اٹھتا تو بڑے اطمینان سے مسکرا کر کہتا۔

"اوئے، میری بیوی تو یہ ڈاج ہے۔ یہ سسر کی بچی اتنا نخرہ بگھارتی ہے کہ کیا کہوں۔"

یہ سسر کی بچی، یعنی وہ ڈاج ٹرک جسے وہ چلاتا تھا کئی برسوں سے اس کی میت بھی تھی۔ اس کے ٹائر گھس جاتے تو بدل دیے جاتے، انجن ری بور ہو جاتا، ایکسل کے اسٹڈس ٹوٹتے اور لگتے گ، بیئر بکس چیختا، چنگھاڑتا جیسے اپنی خستہ حالی پر احتجاج کر رہا ہو۔ لیکن دونوں کی وفاداری ہنوز برقرار تھی۔ عجائب سنگھ کو اس ٹرک سے بڑا پیار تھا۔ اس کے ساتھ کے ڈرائیوروں کو نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں مل گئیں۔ مگر اس نے کوئی دوسری گاڑی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"اوئے، میں ہرجائی نہیں، دل لگا دیوار سے تو پری کس کام کی۔" وہ کلکتہ کی کسی تھیٹریکل کمپنی کا ڈائلاگ دہراتا۔

کبھی کبھی اس کے ساتھی ڈرائیور اس سے مذاق کرتے۔

"ارے یار عجائب سنگھ تیری جورو کے ڈیفرینسل میں آواز ہے۔"

"تیری جورو کے جوئنٹ کا بر کٹ گیا ہے، دیکھ تو سہی۔"

ایسی باتوں سے ناراض ہونے کی بجائے وہ اور خوش ہوتا۔ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ ہنستا، گاتا، چلا چلا کر باتیں کرتا... وہ تو ایک ایسا دریا تھا جو تمام آلائشوں کو اپنے اندر سمیٹ کر بھی صاف وشفاف رہتا ہے... ڈرائیونگ اس کی اتنی اچھی تھی کہ آج تک کوئی مرغی کا بچہ بھی اس کی گاڑی کے نیچے آ کر مرا نہ تھا۔ اس پہاڑی علاقے کے پیچ در پیچ راستے سے خوف ناک گھاٹیوں اور ہیبت ناک موڑوں سے، اس صفائی سے گاڑی نکالتا جاتا جیسے وہ چیختا چنگھاڑتا ٹرک نہیں، بلکہ ایک کھلونا ہے، جسے وہ جدھر چاہتا ہے گھما لیتا ہے...

پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک نے اٹھ کر پشت کی کھڑکی سے جھانکا اور عجائب سنگھ کو اطلاع بہم پہنچائی۔

"سردار جی ہوا نکل رہی ہے۔"

"کیا؟" اس نے ایک دم سے ایکسلریٹر چھوڑ دیا۔ انجن کا شور کم ہوا تو شوں شک... کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے علی کی طرف دیکھا۔

"دیکھ تو کون چکا ہے؟"

علی نے دروازہ کھولا اور پاؤدان پر اتر کر جھانکنے لگا۔

"استاد، بائیں طرف اندر والا ہے۔"

"ہوا ہے، یا بالکل نکل گئی ہے؟" عجائب سنگھ نے پوچھا۔

"ابھی کچھ ہوا ہے۔ ذرا اسپیڈ سے چلنے تو ہم لوگ وہاں پہنچ کر اسٹپنی لگا لیں گے۔"

عجائب سنگھ نے اسپیڈ ایک دم سے بڑھا دی۔ "سالی کسی دن چین سے نہیں رہنے دیتی۔"

جب وہ کانٹا ٹولی پہنچے تو وہاں انھیں گاڑی ان لوڈ کرنی تھی۔ تب تک ٹائر کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔ علی گاڑی کے نیچے گھس کر جلدی جلدی جیک لگانے لگا اور عجائب سنگھ نٹ کھولنے لگا۔ دوسری طرف کا ڈالا کھول کر لڑکیاں بیلچے سے بولڈر گرانے لگیں اور پی۔ ڈبلو۔ ڈی کا گنجا ٹھیکیدار انھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں چکا کھل گیا۔ ہوا ابھی تک شوں شوں کر کے نکل رہی تھی۔ عجائب سنگھ نے جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر علی کو دیا۔

"لو اس کو بنوا کے کسی دوسری گاڑی سے لے کر آ جانا۔ تب تک میں سنگل چکے پر جاتا ہوں۔ اگر وہاں پہنچ گیا تو جب تک گاڑی لوڈ ہو گی تم آ ہی جاؤ گے۔"

علی چلا گیا تو پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے گنجے ٹھیکے دار نے بیڑی سلگائی اور عجائب سنگھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سردار جی آج تو آپ کا کالا گلاب ایک دم کھلا ہوا ہے (دی بلیک روز از بلومنگ) سونا کو ٹھیکے دار ہمیشہ کالا گلاب کہتا تھا۔ اور ہمیشہ اپنی انگریزی دانی کا اظہار کرتا تھا۔

سونا نے تیکھی نظروں سے ٹھیکے دار کو دیکھا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔

عجائب سنگھ صابن سے اپنے ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

"اے گنجا، تو سڑک کی دھول پھانک، تیری قسمت میں گلاب کہاں، سالے اندھے بھی لال پیلے رنگوں کی بات کرتے ہیں۔"

ٹھیکے دار خوش دلی سے ہنسنے لگا۔ سونا ہاتھ میں بیلچہ لئے ہوئے نیچے کود گئی۔

"اے چندلا یہ بیلچہ دیکھتے ہو نہ۔ ایک ہاتھ میں بھیجا باہر آ جائے گا۔"

یہ بات اس نے غصہ سے نہیں، بلکہ خوش دلی سے کہی تھی اور ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ پسینے اور دھول میں ڈوبا ہوا اس کا چہرہ، بکھرے ہوئے میلے بال اور کسا ہوا جوبن بدن ایک عجیب دل آویز صورت میں نمایاں ہوا تھا...

گاڑی اسٹارٹ کر کے عجائب سنگھ نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے تم لوگوں میں سے کوئی آ کر یہاں گیئر کا ڈنڈا پکڑو۔"

پیچھے ڈالے میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کو دھکیل کر بھیجنے لگیں۔ تو جا۔ نہیں تو جا۔ آخر سونا اتری اور لجاتی ہوئی سی اس کی بغل میں بیٹھ گئی۔

"دیکھ زور سے پکڑے رہنا۔ اگر چھوڑا تو یہیں سے نیچے دھکیل دوں گا۔" اس نے دھمکایا۔

جواب دینے کی بجائے وہ کھی کھی کرنے لگی۔

جب گاڑی شہر سے باہر آ گئی تو عجائب سنگھ نے کنکھیوں سے اپنے بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے میلے بکھرے ہوئے بال اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ ایک آوارہ لٹ اس کے رخساروں تک جھول آئی تھی۔ گیئر میں زور لگانے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اور سیاہ جلد سرخ آمیز ہو کر تانبے کے رنگ کی ہو گئی تھی۔ اس کی ناک کے نیچے ہونٹوں کے گوشوں میں اور گالوں پر یہاں وہاں پسینے کے قطرے یوں دکھلائی دے رہے تھے جیسے کسی تازہ کھلے ہوئے پھول پر شبنم کی ننھی بوندیں جگمگا رہی ہوں۔ ایک بھولا ہوا چہرہ جو انجان بھی لگتا تھا اور شناسا بھی، اس کی نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ مگر وہ گیئر کا ڈنڈا نہ تھا جس کو وہ پکڑے ہوئے تھی، بلکہ ایک کیکر کا ننھا نابالغ درخت تھا جس کے تنے کو پکڑے ہوئے وہ کھڑی ہانپ رہی تھی۔ کوئی ایک میل تک کھیت کی پگڈنڈیوں پر دوڑ کر اس نے اس کو پکڑا تھا۔ اور اب پسینے کی بوندوں میں وہ جھلملاتا ہوا اور خون کی یورش سے سرخ ہوتا ہوا چہرہ اس کے ایک دم قریب تھا، اتنا قریب کہ اگر وہ چاہتا تو اس چہرے کو چوم بھی سکتا تھا...

سونا کی گرفت ڈھیلی پڑی تو گیئر کڑکڑانے لگا۔ عجائب سنگھ جیسے چونک گیا۔

"اوئے تیری ماسی کھانا نہیں دیتی تجھے۔ زور لگا کر پکڑ!"

ایک ہاتھ سے گیئر کا ڈنڈا پکڑ سونا نے دوسرا ہاتھ دکھلایا۔

"دیکھ ہاتھ کیسا لال ہو گیا ہے۔"

پھٹے ہوئے محنت کش ہاتھ کی ہتھیلیاں سرخی مائل ہو گئی تھیں۔ ایک بار بہت پہلے کسی نے اپنی ہتھیلی اس کے آگے کر دی تھی۔ وہ دودھ بلو کر اٹھی تھی۔ اور رسی سے زور آزمائی کرنے کے بعد وہ ہتھیلی ایک دم سے لال بھبوکا ہو گئی تھی۔ عجائب سنگھ نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا اور اچانک اس نے ہتھیلی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے... آج بھی پتہ نہیں کیوں اپنے سامنے پھیلی ہوئی ہتھیلی کو دیکھکر اس کا جی چاہا کہ اس کو چوم لے ..

"اے سامنے دیکھو" سونا نے اس کو ایک ٹک ہتھیلی کی طرف دیکھتے دیکھ کر ٹوکا۔

اس نے جھجک کر اپنا چہرہ سامنے کر لیا۔ سامنے سڑک بل کھاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی...

ڈپو میں منشی نے سونا کو آگے بیٹھے دیکھ کر فقرہ کسا:

"یار، عجائب سنگھ بڑا خوب صورت ٹب گیئر لگایا ہے تو نے؟"

عجائب سنگھ گاڑی کھڑی کر کے نیچے کود آیا۔

"کیا منشی، تو بھی جلتا ہے؟"

منشی ہنسا۔ "نہیں یار میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تو بھی بالغ ہوتا جا رہا ہے۔"

لڑکیوں نے ایک طرف کا ڈالا کھول دیا۔ اور فرش پر ایک بید کی ٹوکری الٹ کر رکھ دی جس پر چڑھ کر وہ بولڈر ٹرک پر لوڈ کرتی تھیں۔

عجائب سنگھ اپنا صافہ کھول کر اپنے کیس سنبھالنے لگا۔

وہ پہاڑی علاقہ جس میں یہ چھوٹا سا دو منزلہ مکان، چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے درمیان تنہا تنہا کھڑا تھا، لگ بھگ تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ یہ دو منزلہ مکان چھوٹے بابو کے پتانے جو بڑے ٹھیکے دار صاحب کے نام سے مشہور ہیں، بنوایا تھا... تب انھوں نے پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں چپس سپلائی کرنے کا نیا نیا ٹھیکہ لیا تھا۔ شروع شروع میں تو ویسے ہی پہاڑی آبادی کے سرداروں اور چھوٹے چھوٹے ٹھیکے داروں سے چپس کی خریداری ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے ان کی آمدنی بڑھتی گئی اور چپس کی مانگ مختلف اداروں سے بڑھنے لگی تو انھوں نے مستقل مزدور رکھ کر پتھر تڑوانے شروع کیئے، پھر کریشر منگوایا، پھر زمین خریدی، مکان بنوایا۔ پھر ٹرک خریدے گئے اور ان ٹرکوں کو ٹھہرنے کے لئے ایک بڑا احاطہ اس دو منزلہ مکان کے گرداگرد بنوایا گیا جس میں ایک طرف پانچوں ٹرکوں کے لئے جگہ مخصوص کی گئی۔ دوسری طرف بولڈر کا اسٹاک کر کے گودام بنوایا گیا۔ اس دو منزلہ مکان اور اس مکان کے احاطے کے تین اطراف میں کچے جھونپڑے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی زمین دار کے گرد اس کے حواری بیٹھے ہوں۔ انھیں جھونپڑوں میں سے ایک میں سونا رہتی تھی۔

سونا کو اس کی ماسی نے پالا تھا۔ کہتے ہیں جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اس کے ماں باپ کسی وبائی مرض کا شکار ہو کر دنیا تیاگ گئے تھے۔ اس کی بیوہ موسی چوں کہ لاولد تھی اس لئے اس نے سونا کو رکھ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے رات دن محنت کر کے، مزدوری کر کے سونا کو پالا ہے، حالانکہ بات ایسی نہیں۔ اب بھی اس بات کے جاننے والے اس بستی میں مل جائیں گے کہ شہر میں وہ بہت عرصہ تک ایک پنجابی کی داشتہ کی حیثیت سے رہی تھی۔ اور جب وہ پنجابی مر گیا تو اس کی ساری دولت سمیٹ کر وہ یہاں آ بسی تھی۔ سونا نے اسی پنجابی موسا سے، پنجابی زبان کے دو چار فقرے سیکھ لئے تھے۔

اس پہاڑی علاقے کی آب و ہوا نے بہت جلد سونا کے جسم کو سڈول کر دیا۔ اس کے چہرے پر صحت کا نکھار آ گیا اور وہ کلی جو شہر کی گرم اور دھوئیں سے بھری فضا میں کمہلا سی رہی تھی، ایک دم سے کھل کر پھول بن گئی۔

اور جب وہ پھول بن گئی تو بھنوروں کی کیا کمی۔ ساری بستی کے لوفر جوان اس پر فریفتہ تھے۔ بڈھا خرانٹ منشی بھی اس کے لئے بعض اوقات بے چین ہو اٹھتا۔ ٹرک کے ڈرائیور اور خلاصیوں کے علاوہ شہر کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے ٹھیکے دار اس پر دم دیتے تھے۔ بلکہ یہاں تک سنا گیا تھا کہ چھوٹے بابو کی بھی نیت خراب ہے... مگر اس کی جہاں دیدہ موسی جانتی تھی کہ لوہا جب خوب گرم ہو جائے جب ہی اس پر ہتھوڑی مارنی چاہئے دنیا کی سرد و گرم چکھے ہوئے وہ عورت بہ ظاہر بڑی بے تعلقی سے ان تمام باتوں کو دیکھ رہی تھی...

لیکن عجائب سنگھ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ دراصل محبت کا لفظ ہی اس کے یہاں بے معنی تھا۔ البتہ ادھر کچھ دنوں سے وہ اپنے دل میں ایک عجیب بے نام سی خلش محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ سونا کو دیکھتا تو اس کو اپنا آپ بکھرتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کو ایسا لگتا جیسے اس کے اندر، بہت اندر، کوئی چیز ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہے، جیسے آہستہ آہستہ کوئی بے نام سا چہرہ سونا کا روپ دھارن کر رہا ہو۔ جیسے وہ ٹرک پر

کام کرنے والی کوئی آدی باسی کامن (مزدورنی) نہ ہو بلکہ کسی دیہات کی کوئی الھڑ شوخ لڑکی ہو، جب وہ اس کے قریب ہوتی تو اس کے جسم کی حدت اور مہک کو وہ محسوس کرسکتا تھا۔ کوئی وصال کی لذت، اس کے گلے میں باہیں حمائل کر دیتی اور وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے چین سا محسوس کرنے لگتا۔

اس بے چینی پر قابو پانے کے لئے اس نے کتنے ہی جتن کئے وہ دن دن بھر لوگوں سے مذاق کر کے بے تحاشا ہنستا۔ کبھی منشی کو چھیڑتا، کبھی ساتھی ڈرائیوروں پر فقرے کستا۔ اس نے سونا سے بات تک کرنا بند کر دیا۔ وہ اس کو کبھی اپنے قریب نہ آنے دیتا۔ کبھی اس کو نظر بھر کر نہ دیکھتا... مگر وہ بے چینی بدستور تھی۔ بلکہ روز افزوں تھی اور وہ آہستہ آہستہ، بہت آہستہ آہستہ ڈوبتا چلا گیا۔

اور جب اس نے منشی پر اپنی نیت آشکار کی تو وہ دم بہ خود رہ گیا۔

''سردار ہوش میں ہے یا دارو پی کر آیا ہے؟''

مگر عجائب سنگھ نے دارو نہ پی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہوش میں نہ تھا۔ وہ مجوب سا ایک ٹک زمین کو دیکھا کیا۔ اس کو ایسے شرماتے دیکھ کر پہلے تو منشی خوب ہنسا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں آج سونا کی ماسی سے بات کرتا ہوں۔'' اس نے عجائب سنگھ کا کاندھا تھپ تھپا کر کہا۔

اسی شام منشی نے سونا کی ماسی سے بات کی۔ مگر سونا کی ماسی کی شرائط بڑی کڑی تھیں۔ اس کی مانگ تھی، تین ہزار روپے نقد اور پانچ سو روپے شادی کا خرچ۔ عجائب سنگھ نے سنا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ لیکن اس نے منشی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اٹھ کے چلا آیا۔

اس نے اپنے اکلوتے بکس کو کھولا جس میں اس کی پندرہ برس کی کمائی رکھی ہوئی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ رات گئے تک نوٹوں کو گنتا رہا۔ پورے پانچ ہزار چھبیس روپے نکلے۔ دوسری صبح اس نے منشی کو کہہ دیا کہ وہ حامی بھر لے۔

ڈپو میں عجائب سنگھ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ادھر سونا نے کام پر آنا بند کر دیا۔ وہ اب گھر سے باہر بھی کم ہی نکلتی تھی۔ لوگ اسے سردارنی کہہ کر چھیڑتے تو وہ خوش دلی سے ہنستی۔ عجائب سنگھ کو چھیڑ چھیڑ کر لوگوں نے پریشان کر دیا، یہاں تک کہ ایک دن چھوٹے بابو نے بھی گرہ لگا دی۔

''تم تو اس بستی کا کلیجا نکال لے رہے ہو عجائب سنگھ۔''

جواب دینے کی بجائے وہ شرما کر بھاگ کھڑا ہوا اور اس کو اس طرح شرماتے دیکھ کر منشی اور ڈپو کے دوسرے تمام مزدور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مگر ان ہی دنوں جب عجائب سنگھ کی شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، ایک دن عجائب سنگھ کو خبر ملی کہ چھوٹے بابو اس کی گاڑی کو بیچ رہے ہیں۔ آج صبح کچھ لوگ آئے تھے اور ان سے کچھ بات چیت بھی طے ہو گئی ہے۔ شام کو عجائب سنگھ چھوٹے بابو سے ملا، تو انھوں نے صاف لفظوں میں اس کو بتا دیا کہ گاڑی کی بات چار ہزار روپے میں تقریباً طے ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے عجائب سنگھ سے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کو کوئی دوسری گاڑی دے دی جائے گی۔

عجائب سنگھ جب چھوٹے بابو سے بات کر کے لوٹا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چاند اوپر اٹھ آیا تھا۔ اور سفید دودھیا چاندنی اس ویران علاقے میں ایک عجیب اداس غم زدہ انداز میں جگمگا رہی تھی۔ تمام پیڑ، پگڈنڈیاں، کچی سڑک سے پرے کھیت، کھیتوں کے پرے جنگل، سب جیسے سوگوار کھڑے تھے۔ اس چاندنی کے سفید کفن میں ملفوف اس کی ڈاج ٹرک یوں چپ سادھے ہوئے تھی، جیسے اس سے روٹھ گیا ہو۔

اس نے بونٹ پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس سرد لمس کی کیفیت کو دیر تک محسوس کرتا رہا۔ یہ گاڑی جو سات برس کے بے شمار لمحوں میں اس کی رفیق رہی تھی، وہ اس گاڑی کے ایک ایک انداز سے واقف تھا۔ آج اس کو اتنا سرد اور خاموش دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے وہ اس سے روٹھ گئی ہے یا جیسے محض اپنی سرد مہری کا اظہار کر رہی ہو۔

دو تین دن شدید ذہنی ہیجان میں مبتلا رہ کر آخر ایک رات وہ چھوٹے بابو کے کمرے میں جا دھمکا۔ چھوٹے بابو نے اتنی رات گئے اس کو اپنے پاس آتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''حضور'' اس نے اپنا صافہ اتار لیا۔ ''حضور اگر آپ یہ گاڑی بیچنا ہی چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں۔ میں اس کی قیمت آپ کو چکا دیتا ہوں۔''

پہلے تو چھوٹے بابو حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر ذرا سا مسکرائے اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

''اتنے روپے ہیں تمھارے پاس؟ سنا ہے شادی میں بہت خرچ ہو رہا ہے۔''

''شادی کو گولی ماریے۔'' عجائب سنگھ نے تیزی سے کہا۔ ''میرے سسر کی بیٹی ہی مجھے مل جائے، یہی بہت ہے۔''

چھوٹے بابو بڑی خوش دلی سے ہنسے:

''اچھا ٹھیک ہے۔ کل شہر جاتے ہوئے روپے لیتے چلنا، وہیں لکھا پڑھی کرا دوں گا۔''

دوسری صبح عجائب سنگھ نے غسل کیا، نئی قمیص پہنی، آنکھوں میں سرمہ لگایا، صافہ جسے وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھتا تھا خوب کس کر باندھا اور نوٹوں کی گڈیوں کو اپنی نچلی جیبوں میں ٹھونس کر جب ٹرک اسٹارٹ کر کے چلا تو یوں لگتا تھا جیسے شادی کرنے جا رہا ہو۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد گاڑی اس کے نام ہو گئی۔ شام کو جب پولیس آفس سے اس کا چھٹکارا مل گیا تو اس نے وہ نارنجی رنگ کا نیا کلف دیا ہوا صافہ نکالا جسے اس نے اپنی شادی کے لئے خریدا تھا اور اس کو گاڑی کے بونٹ پر آڑا ترچھا کر کے باندھ دیا، اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے بڑے پیار سے گیئر دیا اور ریلوے مال گودام کی طرف آہستہ سے گاڑی گھمالی ☆☆☆

امجد اسلام امجد

شمارہ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۲

محبت کی کہانی

محبت کی کہانی میں بڑی دشوار گھاتیں ہیں
محبت امن کی ساتھی
محبت چین کی دشمن
یہ اک دستہ ہے پھولوں کا
یہ ہے کانٹوں بھرا دامن
عجب کردار ہیں اس کے انوکھی اس کی باتیں ہیں
یہ ہے اک آگ کا پیکر
یہی شبنم کا قطرہ بھی
یہ ہے اک حبس کا عالم
یہی خوشبو کا رستہ بھی
اندھیرے ہیں سحر اس کی چمکتی اس کی راتیں ہیں
محبت کی کہانی میں بڑی دشوار گھاتیں ہیں

نظم

ارض وطن کی ان پہ جو گلیاں ہوئی ہیں تنگ
اپنے گھروں میں بند وہ چپ چاپ جل گئے
اتری ہے ان پہ موت کسی رات کی طرح

بو چھوڑنے لگی ہے گلی میں پڑی وہ لاش
مدت سے دل میں رکھی ہوئی بات کی طرح

امجد اسلام امجد

(نذر مجید امجد)

شمارہ ۲۷۹،
اپریل ۲۰۰۴

کتنی بدل گئی ہے دنیا
کتنی اور ابھی بدلے گی
ان سب لمحوں کی صد ابرستی بوچھاروں نے اے میرے دل
جانے وہ ساعت کب آئے گی
جب میں ماضی، حال اور مستقبل کو
ان کے اپنے الگ الگ چہروں میں ایسے دیکھ سکوں گا
جیسے کوئی آئینے میں اپنے پورے عکس کو دیکھے
اور پھر سوچے،
"جانے والے کل نے اب تک کتنی لکیریں بدلی ہیں
اور کنپٹیوں کے گرد اگرد ان بالوں میں
کھلے ہیں کتنے پھول سفیدی کے۔"
لیکن اے دل، کس کے پاس اب اتنا وقت ہے
اپنی ذات کے صنم کدے سے باہر نکلے
اور دوجے کی بابت سوچے۔

دریا کی موجوں کو کاٹتے رواں سفینوں کو کیا پروا ہے
ان ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی، جن کے تختے
بس اتنی دیر تک اک دوجے سے جڑے ہوئے ہیں
جب تک کوئی موت آثار تھپیڑا ان سے ٹکرائے
اور ان کا ہونا ایک کہانی کا حصہ بن جائے۔

اس کے بعد جو موج آئے گی اس کو یہ بھی علم نہ ہوگا
ابھی ابھی کچھ لمحے پہلے یہیں کہیں کچھ خواب تھے زندہ
جن کو دیکھنے والی آنکھیں یہیں کہیں پر ڈوب گئی ہیں
کس کو خبر ہے روزِ ازل سے اب تک جانے کیا کیا دریا برد ہوا؟
لیکن پھر بھی موجیں یوں ہی رواں دواں ہیں
نئے مستول اور نئے سفینے پانی کے اس کھیت میں پھر سے اُگ آئے ہیں
ان کے جلو میں کتنی آنکھیں کیا کیا خواب لئے روشن ہیں

یہ بھی اک دن بجھ جائیں گی اے مرے دل
ہست اور نیست کا یہی تسلسل وہ دریا ہے
جس کی ہر اک موج میں ایک نئی دنیا ہے

سو اب اس ذکر سے کیا حاصل، "کتنی بدل گئی ہے دنیا!"
جانے والے دن کا ماتم آتے دن سے کیا کہے
کہ آتا دن بھی اپنی اصل میں جاتے دن کا اک حصہ ہے
یہ جو گنتی کی کچھ سانسیں اپنی عمروں میں باقی ہیں
شاید یہ بھی گذر چکی ہیں
اور یہ سارا پھیر فقط اس لمحے کا ہے، جس میں ہم اس وقت کھڑے ہیں

یہ جتنے اجڑے شہر ہیں باقی اپنے ہونے کے آثاروں میں
سوچ مرے دل، یہ زندہ بھی تو ہو سکتے ہیں
ان شہروں میں، جن میں ہم تم جیتے ہیں۔
آنے والا کل ہمارا گذرا کل بھی ہو سکتا ہے
وہ جو ہم سے پہلے گذرے،
وہ ہم میں ہیں، یا پھر شاید ہم ان میں زندہ رہتے ہیں
دریا کی ہر آنے والی موج ہو یا یہ جیتے جاگتے شہر ہمارے
ہر اک چیز بدل جاتی ہے... ہر اک چیز بدل جائے گی
ہم سے پہلے جانے والے اور ہمارے بعد میں آنے والوں میں
اور ہم میں شاید ایک ہی رشتہ سچا ہے
ہم سب مل کر ایک ہی نوحہ پڑھتے ہیں
"کتنی بدل گئی ہے دنیا!"

لیکن یہ بھی سوچ مرے دل،
ممکن ہے یہ دنیا ازل سے ایسی ہی ہو
اور ہر لمحے، اس کو دیکھنے والی آنکھ
بدل جاتی ہو؟

گھر میں اجنبی

امجد جاوید

شمارہ ۲۰۸،
جولائی ۱۹۹۷

میں ابھی کالج میں ہی تھا کہ یکایک ایک اعلان سنائی دیا۔ آدھے گھنٹے میں شہر میں کرفیو نافذ کیا جا رہا ہے، تمام لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ اعلان سنتا تھا کہ مجھ میں عجیب سی سراسیمگی پیدا ہوگئی۔

کرفیو کا لگنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کیوں آج کے اعلان نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ ایک تو گھر کالج سے بہت دور ہے، اور دوسرے گھروں کو پہنچنے کے لیے پولیس والوں نے قلیل وقت دیا ہے۔ آج صبح سے ہی طبیعت میں ایسی کسل مندی تھی کہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کا خوف اور بے چینی سی تھی۔ دن اداس، بری بری آوازیں نکالتے ہوئے گدھ آسمان میں منڈلا رہے تھے۔ بیوی کہہ رہی تھی کہ تمام رات گلی میں کتے اس قدر رو رہے تھے کہ میں خوف کے مارے سو ہی نہیں سکی۔

میں نے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم بیوقوفوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ کتے بھونکتے رہے۔ اور تم پر خوف طاری ہوگیا۔"

اس نے کہا۔ "چپ رہیے۔ آپ کو معلوم نہیں رات میں کتوں کا رونا کوئی اچھی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمھارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ کم از کم میرے سامنے ایسی بیکار باتیں نہ کرو۔ ہماری شادی کو اتنے سال ہوئے مگر تم ابھی تک نہیں بدلیں۔ انھیں دقیانوسی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔"

آج کرفیو کے اعلان نے مجھ میں ایک طرح کی جھرجھری سی پیدا کردی۔ صبح جب کالج کو نکل رہا تھا تو عجب طرح کے مخمصے سے دوچار تھا۔ کبھی طبیعت چاہتی کہ چھٹی لے لوں اور کبھی دل کہتا کہ جانا چاہئے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ آخر میں نے ایسا سوچا کیوں؟ پھر یہ سوچ کر کالج چلا آیا کہ یہ محض وہم ہے۔

اتنے قلیل وقت میں جوں توں کر کے گھر پہنچ گیا۔ بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میری راہ تکتے تکتے وہ نڈھال سی ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپٹ کر زار وقطار رونے لگی۔ میں پتھر کی مانند حواس باختہ کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"ارے بھئی میں وقت سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا ہوں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

مگر وہ روتی ہی رہی۔ میں نے اسے لاکھ دلاسا دینے کی کوشش کی مگر اس کی ہچکیاں تھیں کہ برابر جاری تھیں۔ اچانک میری نظر بالکونی پر پڑی تو دیکھا کہ ایک گدھ مجھے خوفناک انداز سے گھورے جا رہا ہے۔ میں نے اسے اڑانے کی کوشش کی تو وہ ایک کریہہ آواز نکالتا ہوا اڑ گیا۔ لیکن وہ گھر کے اطراف ہی چکر لگاتا رہا۔ اس کی آوازیں میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔

دور سے پولیس کا اعلان سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پولیس کی وین اور جیپ نے اپنی گشت تیز کر دی ہے۔ اعلان مسلسل ہو رہا تھا۔

"کوئی بھی گھر سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ گولی ماردی جائے گی!"

بیوی نے جلد جلد تمام دروازے اور دریچے بند کر دیئے اور اپنے آپ سے بڑبڑاتی ہوئی بولی۔ "یہ دنگے فساد بلوے، اف، اے اللہ تو انسانوں کو عقل دے۔" پھر باآواز بلند بولی: "چلیے کھانا کھایئے۔ پتہ نہیں صبح جاتے وقت آپ نے ٹھیک سے کھایا بھی کہ نہیں۔"

میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ "نہیں۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔" اپنے اضطراب میں اس نے میرے جواب کو سنا ان سنا کر دیا اور کہنے لگی: "دو منٹ انتظار کیجئے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

وہ کھانا گرم کرنے کے لئے باورچی خانے چلی گئی اور میں منہ ہاتھ دھونے باتھ روم چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ باہر تمام سڑکیں پوری طرح سنسان ہوگئی ہیں۔ کہیں کوئی نہیں۔ صرف کبھی کبھی دور سے کہیں پولیس والوں کی جیپ اور وین کی آوازیں سنائی دیتیں، یا پھر ماحول میں پھیلے سناٹوں کی سرگوشیاں۔ باہر آیا تو میری نگاہ پھر اچانک گھر کی منڈیر پر پڑی۔ وہی گدھ۔ آنکھیں پھاڑے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے طرح طرح سے اسے وہاں سے اڑانے کی کوشش کی مگر وہ قدرے اڑ کر پھر وہیں بیٹھ جاتا۔

یکایک مجھے بچے کا خیال آیا۔ میں نے "نبیل! نبیل!" کی آواز لگائی۔ بیوی سے پوچھا "نبیل نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے بھئی۔"

اس نے کہا: "یہیں کہیں کھیل رہا ہوگا۔"

"کہاں کھیل رہا ہے؟ کتنی بار کہا ہے۔ تم ہو کہ بس۔ ارے تم کتنی بے وقوف ہو یار۔ دیکھتی نہیں ہو...؟"

بیوی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اسے کیا معلوم کہ حالات خراب ہیں۔ میں تو بار بار اسے اندر لاتی ہوں۔ بچہ ہے وہ۔ ایک جگہ نہیں بیٹھتا۔"

میں متواتر "نبیل! نبیل!" کی آوازیں لگاتا رہا۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ ادھر ادھر پورا گھر تلاش کیا۔ کہیں نظر نہیں آیا۔ میرا غصہ بڑھنے لگا۔

جھلاتے ہوئے بیوی سے کہا۔ "ارے کہاں ہے بھئی!"

"آپ بھی خوب ہیں۔ خواہ مخواہ اتنا پریشان ہو رہے ہیں۔ یہیں کہیں ہوگا۔"

"تم عورتوں کو مردوں کی باتیں پہلے تو سمجھ نہیں آتیں۔ اگر آتی بھی ہیں تو غلط سمجھ میں آتی ہیں اور غلط سمجھی ہوئی بات کا ظاہر ہے جواب بھی غلط ہوگا۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہیں کہیں ہوگا۔ یہیں کہیں ہوگا۔ میں گھر کا چپہ چپہ تلاش کر چکا ہوں اور آپ اب تک "یہیں کہیں" میں ہیں۔"

میرا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر وہ بھی اب پریشان ہو رہی تھی۔ کھانا گرم کرنا چھوڑ کر ادھر ادھر آوازیں لگاتی ہوئی بے چین ہو کر ڈھونڈنے لگی۔ کھڑکی کھول کر وہ "نبیل! نبیل!" مسلسل پکارے جا رہی تھی۔ مگر بچہ ہو تو نظر آئے۔ جواب دے۔

میں نے بڑے ترش لہجے میں بیوی سے کہا۔ "لاکھ مرتبہ سمجھایا ہے تمہیں۔ بچہ چھوٹا ہے۔ نگرانی رکھو۔ ایک تم ہو کہ ہر وقت لاپروائی کا ثبوت دیتی ہو۔ خدا معلوم بچے کو کہاں ڈال دیا تم نے؟" میں پریشانی کے عالم میں چھت پر گیا کہ دور تک نظر دوڑاؤں۔ گدھ تھا کہ چھت کے کونے پر بیٹھا ویسی ہی بری آوازیں نکال رہا تھا۔ میں نے پھر اسے اڑانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی وہی حرکت، اڑ کر گھر کے اطراف ہی چکر لگاتا رہا۔

باہر پوری سڑک سنسان پڑی تھی۔ کوئی بھی نہیں۔ تمام دکانیں، گھروں کے در اور دریچے سب بند تھے۔ تھے تو بس دو ایک کتے جن کے بھونکنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سڑک پر دور تک نظریں دوڑائیں۔ اچانک میری چیخ نکل گئی۔ نبیل سڑک پر اکیلا چلا جا رہا تھا۔ بیوی بھاگتے بھاگتے ہوئے چھت پر آ گئی۔ وہ بھی چیخ پڑی۔

گدھ ہمارے اطراف ہی منڈلا رہا تھا۔ مجھے اب اس سے ڈر لگنے لگا تھا مگر بیوی گدھ کے منڈلانے سے یکسر بے نیاز تھی۔

نبیل بے خوف جا رہا تھا۔ ہم دونوں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میرے ہوش گم ہو رہے تھے۔ رہ رہ کر وہی باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ کرفیو! دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم! میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ حلق اور ہونٹ سوکھ کر لکڑی ہو گئے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا، دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بادل ناخواستہ بیوی سے کہا۔ "جا کر نبیل کو لاتا ہوں۔" مگر حقیقتاً اندر ہی اندر مجھ میں طرح طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ باہر جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ ادھر نبیل برابر ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بیوی نے بپھرتے ہوئے کہا۔

"ارے دیکھتے کیا ہو؟ جا کر لاتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا۔ "دیکھتیں نہیں دور گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور تم ہو کہ جا کر لانے کی بات کر رہی ہو۔ باہر جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔"

وہ مجھے نفرت سے گھورنے لگی۔

میں نے کہا: "اس طرح کیا گھور رہی ہو۔"

"بس! آپ خاموش رہیے۔ میں خود جاتی ہوں۔" اس کا لہجہ ترش تھا۔

میں نے کہا۔ "زبان بہت لمبی ہو رہی ہے تمہاری۔"

اس نے مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اترنے لگی۔

میں نے کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"کہہ دیا نہ خاموش رہیے" اس کا لہجہ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ارے سنتی کیوں نہیں؟ کہاں جا رہی ہو؟"

اس نے کہا: "اللہ کے واسطے چپ رہئے۔ بہت ہو چکا۔"

پھر میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے میں نے ایک زوردار طمانچہ مارا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح گھورنے لگی جیسے اس نے بھی مجھے ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا ہو۔ مگر میرے قدم بچے کو لانے کے لیے اٹھنے کو تیار پھر بھی نہ تھے۔

"پاگل تو نہیں ہو" میں نے غصہ سے کہا۔ "باہر کرفیو ہے۔ باہر جانا اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالنا ہے۔ اللہ محافظ ہے۔ صبر سے کام لو۔"

اس نے کہا۔ "جانتی ہوں اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مگر یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کو صبر نہیں کہتے۔"

اچانک دور کہیں پولیس کا کچھ اعلان سنائی دینے لگا۔ آواز صاف نہ تھی لیکن لگ رہا تھا کہ پولیس کی جیپ ہماری ہی طرف آ رہی ہے۔

"خاموش!" جھڑکتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ "اللہ واسطے خاموش ہو جاؤ۔ کچھ ضروری اعلان ہو رہا ہے۔"

مگر اس نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ اب میری کوئی بات نہیں سنے گی۔ وہ چیخ کر بولی۔

"پولیس پولیس چھوڑیے۔ آپ جائیے یا پھر مجھے جانے دیجئے۔"

پولیس کا اعلان اب کچھ صاف سنائی دے رہا تھا۔ "ایک ضروری سوچنا: ایک چھوٹا بچہ سڑک پر ملا ہے۔ نام نہیں بتاتا۔ جس کسی کا ہو باہر آ کر لے لیں۔"

پڑوس کے لوگ نیم وا دریچوں کو کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ باہر نہیں بلکہ حقارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اور میں اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ پولیس کا اعلان برابر جاری تھا۔

پولیس کی جیپ گھر کے قریب آنے لگی۔ جب گھر قریب آیا تو نبیل نے گھر کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور پھر وہ "ممی! ممی!" کہہ کر زار و قطار رونے لگا۔

وہ مجھے باہر جانے کو کہہ رہی تھی۔ مگر میں ساکت رہا۔

اس نے اصرار کیا: "جاتے کیوں نہیں؟"

میں نے "خاموش!" کہہ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرے ہاتھ کو جھٹک کر چیخ پڑی اور بڑی بے تابی سے بچے کو لینے باہر چلی گئی۔

بچے کو گود میں لے کر وہ آپے سے باہر ہو کر بے اختیار چومنے لگی۔

باہر پولیس والے پولیس کی زبان میں بک بک کرتے ہوئے چلے گئے۔

میں چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بچے کو لینے آگے بڑھا تو اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرا اس سے اور بچے سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ میں ساکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"گدھ اب بھی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے لاکھ اڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا☆☆☆

امنگ بالی

شمارہ ۲۶۲،
نومبر ۲۰۰۲

بڑھی جاتی ہے جوش شوق سے اپنی پریشانی
بہت ہے درد سینے میں بہت مشکل غزل خوانی

کبھی اک بار جو برسوں میں صحرا کو ملے پانی
عنایت ہے یہ بادل کی کہ ہے بادل کی نادانی

تری محفل، ترے جلوے، ترا سب کچھ، مرا ہے کیا؟
نہ ہو جو آنکھ یہ میری تو پھر سب کچھ ہے بے معنی

خیالوں کا ہے کیا، جائیں ستاروں سے پرے جائیں
رہا ہوں گے نہ لفظوں سے کسی صورت یہ زندانی

وہ خود ہی عشق تھا گھر کر گیا رومی کے دل میں جو
کیا سرشار نانک کو ہوئی میرا بھی دیوانی

ہوائے سرد، شبنم نے جو دستک دی در دل پر
کرن کی تب چمن تابی کلی نے خوب پہچانی

جدا رہتے ہیں تجھ سے لیکن اتنا بھی نہیں بدلے
کہ تیری یاد ہو دل میں تو آنکھوں میں نہ ہو پانی

نشے صد ہا ہیں دنیا میں غرض ہے ذائقے سے بھی
امنگ جرعہ کش کو ورنہ کافی ہے فقط پانی

معصومیت

ٹوٹتے انجم... وہ تم کو یاد ہیں؟
وہ جو اسپ تیز رو کی طرح تھے گردوں نورد
جو ہماری خواہشوں پر جست بھر کر ایک دم
تیرگی شب میں ہو جاتے تھے گم
اور ہماری خواہشیں بے انت تھیں
ان گنت... جیسے ستارے... ان گنت
دیکھ کر روشن ستاروں کا زوال
لب پر آ جاتے تھے کتنے ہی سوال
ہاں دل حیرت زدہ کی چھاؤں میں
ہم اسی میں خوش تھے بس زندہ ہیں، ہم

دیار غیر میں اک شب خاموش

چاندنی جم گئی ہے مرے فرش پر
اور برفیلی یہ روشنی دیکھ کر
میں تحیر زدہ
سر اٹھا کر بھروں آنکھ میں چاند کو، اور کبھی
سر جھکا کر کروں یاد بھولا ہوا اپنا گھر

انتخاب سید

شمارہ ۱،
جون ۱۹۶۶

یہ آسمان
کسی دیو کی طرح خونخوار
مرے وجود پہ تاریک سائے کی مانند
مرے شعور میں اک خوف بن کے رہتا ہے
نشان زخم جگر کے سیاہ دھبوں کو
سدا کھرونچتا ہے اپنے تیز ناخن سے
خراشیں ڈالتا ہے زندگی کے چہرے پر
دھواں دھواں سا ہے ماحول رنگ و بوامروز
رکی رکی سی ہے نبض حیات کی رفتار
تھکی تھکی سی نگاہوں میں تلخی حالات
بجھے بجھے سے چراغوں کے دل دھڑکتے ہیں
جدھر نگاہ اٹھاتا ہوں موت کے آثار
گھٹی گھٹی سی فضاؤں میں خون کی بو ہے
رباب زیست کے تاروں کو زنگ چاٹ گیا
سحر کا نور پگھلتا ہے موم کی صورت
حدیث غم میں نئے باب کا اضافہ نہ ہو
بکھر نہ جائے کہیں زندگی کا شیرازہ
ہزاروں سال پرانی زمیں کے سینے میں
نہ جانے درد کا احساس کیوں نہیں ہوتا

خوابوں کے مسافر

انتظار حسین

شمارہ ۵۴
نومبر ۱۹۷۰

کردار
(جس ترتیب سے نمودار ہوتے ہیں)

کشور	بو جی کی جوان اکلوتی بیٹی
بو جی	کشور کی ماں
بڑی بوا	کشور کی پھوپھی
میاں جان	کشور کا باپ
اقو	میاں جان کا نوجوان بھتیجا
شاہد	میاں جان کا نوجوان بھانجا
	بڑی بوا کا بیٹا
بندو	ایک نائی
ماسٹر	کتابوں کا ایک دمق
زمانہ	ہمارا تمھارا

ایک کمرہ جس میں ایک طرف دو کرسیاں پڑیں ہیں۔ پاس ہی ایک چوکی بچھی ہے جس پر کسی قدر میلی چادر بچھی ہے اور گاؤ تکیہ رکھا ہے عقب میں طوطے کا پنجرہ ٹنگا ہے۔ ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر سینے کی مشین رکھی ہے۔ بو جی چوکی پر بیٹھی سینی میں گاجریں چھیل رہی ہیں۔ کشور پنجرے کے پاس کھڑی ہے۔ تماشائی صرف اس کی پشت دیکھ سکتے ہیں۔

کشور: حق اللہ، پاک ذات اللہ۔ نبی تو خدا کا رسول، تو غافل نہ ہو۔ خدا کو نہ بھول۔ جگ جگ جیا کرو، دودھ بتاشے پیا کرو۔ بولو میاں مٹھو، بی بی کا مٹھو۔ اجی بول بھی پڑو نا صمن بکمن۔

بو جی: بی بی میں ذرا گاجریں چھیل رہی ہوں۔ تو ذرا باورچی خانہ میں جا کر ہنڈیا دیکھ لے۔

کشور: (اسی طرح پنجرے پہ جھکی ہوئی) بو جی ابھی جاتی ہوں۔ بی بی کا مٹھو، میاں کا مٹھو، نبی جی بھیجو، صمن بکمن، نبی جی بھیجو۔

بو جی: (بیزاری کے لہجے میں) گھر کا کام کاج تو گیا۔ جب دیکھو صمن بکمن سے مغز مار رہی ہے۔ صمن بکمن نہ ہوا بلائے جان ہو گیا۔ کمبخت کو بلی بھی تو نہیں لے جاتی۔ نہ بولنا نہ چالنا۔ گوبر کا چوت سا بنا بیٹھا رہتا ہے۔ میں پہلے ہی کہتی تھی اری اسے میٹھی چیزیں مت کھلا۔

کشور: بو جی کیا میں اسے بھوکا مار دیتی؟ (مڑ کر دیکھتی ہے)۔

بو جی: اری بھوکا مارنے کو کون کہہ رہا ہے۔ مگر اسے دودھ ملائی بھی تو نہ ٹھساتی۔ میٹھا کھا کے بھی کہیں طوطے بولتے ہیں؟ میں نے ہر چند کہا کہ بیٹی اسے مرچیں کھلا زبان تیز ہو گی مگر...

(باہر کا دروازہ کھلتا ہے۔ بڑی بوا سوکھی چمرخ، سر سفید، تنگ موری کا پاجامہ، قدرے میلا۔ برقعہ سر سے اتارتی اندر داخل ہوتی ہیں۔)

بڑی بوا: بی بی میری خاطر کرو، میں ڈپٹی کلکٹر کی ماں ہوں۔

بو جی: اجی تمھارا شاہد اللہ کرے گورنر بنے، ماں کو راج رجائے۔ مگر یہ گھر بھی تو تمھارا ہی گھر ہے۔

کشور: (پنجرے سے ہٹ کر بڑی بوا کے قریب آتے ہوئے) بڑی بوا آداب۔

بڑی بوا: بیٹی جیتی رہ۔

بو جی: بڑی بوا آؤ بیٹھو اری کشور لے یہ گاجر ادھر رکھ دے اور ذرا مجھے پاندان اٹھا دے۔ بڑی بوا منہ میٹھا کب ہو رہا ہے۔

بڑی بوا: بی بی منہ میٹھا بھی ہو جاوے گا۔ نتیجہ تو آلیوے۔ آج انٹر اے ڈوبا کیا نام ہے انٹرو، ونٹرو میں ڈوبی کیا جانوں۔ وہ دے کے آیا ہے۔ اس میں خیریت سے گذر جاوے۔

بو جی: خدا نے چاہا تو اس میں سے بھی سرخ رو ہو کے نکلے گا۔

بڑی بوا: بی بی کمیشن میں تو تمھارا شاہد اول آیا تھا۔ اس میں سے بھی سرخ رو نکلے تو برادری میں جلیبیاں بانٹوں گی اور ڈپٹی کلکٹری کی جب پہلی

تنخواہ آوے گی تو بیڑوں کا مولود شریف کروں گی۔

بوجی: خدا نے چاہا تو ہمارا شاہد بھی ایسا ہی نام پیدا کرے گا۔

(میاں جان داخل ہوتے ہیں)

میاں جان: بیٹی حقہ لاؤ۔ آئے ہائے آج تو ہم بہت تھک گئے۔ (کشور حقہ لینے باہر چلی جاتی ہے)

بوجی: (چھالیہ کترتے ہوئے) اجی سنا آج تمہارے شاہد میاں کا انٹرویو ہو گیا۔

میاں جان: ہنھ۔

بوجی: بڑی بوا پان اور کھا لو۔

بڑی بوا: بس بی بی ذرا سی کتر لیجیو۔ بخت ماری طلب کی وجہ سے آج تو پان کھاؤں ہوں۔ نہیں تو اب پان کھانے کا دھرم نہیں رہا۔ پان تو سونے کا ورق ہو گئے اب۔

بوجی: اجی پان چھوڑنے سے کیا فرق پڑے گا۔ روٹی کھانا چھوڑ دو۔

بڑی بوا: بی بی کمبخت پیٹ کی دوزخ تو بھرنی ہی پڑے ہے۔ بڑی اماں کہا کریں تھیں کہ غدر میں ایسا کال پڑا تھا کہ لوگوں نے سالن کھانا چھوڑ دیا تھا۔ نون مرچ سل پر پیس کر چٹنی بنائی اور موٹی جھوٹی روٹی سے کھانا کھا لیا۔ مگر بی بی اب تو نون مرچ کی چٹنی بھی تنجن کا نوالہ ہے۔ کل میں نے شاہد کو پیسے دیئے کہ بیٹا گھر میں مرچیں نہیں ہیں، مرچیں لا دے۔ اجی تمہیں یقین نہیں آوے گا اتی سی پڑیا لا کے ہاتھ میں دے دی۔ مجھ کال کھاتی کو کیا خبر کہ پڑیا میں کیا ہے۔ پڑیا جو کھولی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے کہا کہ بیٹے ابھی ہم اتنے امیر نہیں ہوئے کہ ہنڈیاں میں زعفران ڈالیں۔ بولا کہ بوا مرچیں گھی کے بھاؤ بک رہی ہیں، میں نے کہا کہ نہ بیٹے تو اسے پنساری کے منہ پر مار کے آ۔

بوجی: اجی بڑی بوا اچھا کیا کہ واپس کرا دی۔ پسی ہوئی مرچیں تو کبھی خرید یو ہی مت اللہ کی قسم اس میں اینٹیں پسی ہوتی ہیں۔

بڑی بوا: اری بی بی تو ثابت مرچ بھی خرید کے کیا کریں۔ میں نے ثابت مرچ منگوائی۔ تمہیں یقین نہ آوے گا کہ گنتی کی چار مرچیں، میں نے کہا کہ بیٹے ہنڈیا میں ان کا کیا پتہ چلے گا تو اپنے گلدان میں لگا لے۔

بوجی: (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے) بڑی بوا پیسے کی قیمت اب کچھ نہیں رہی اب تو چیزوں کی قیمت ہے۔

(کشور حقہ لئے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے)

بوجی: کشور یہ ذرا پان بھی دے دیجیو۔ (کشور میاں کو پان دیتی ہے)

بوجی: کشور بیٹی جا کے ہنڈیا دیکھ لے۔

میاں جان: بڑی بوا تیرا لونڈا گدھا ہے اور گدھا رہے گا۔

بڑی بوا: اے نہ میاں جان۔

میاں جان: بس میں نے کہہ دیا تیرے بیٹے کے لچھن اچھے نہیں۔ تجھے یہ خوش نہیں کرے گا۔

بوجی: اجی اور کیا لچھن اچھے ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ بی۔ اے۔ پاس کیا ہے۔ کمیشن میں فرسٹ نمبر آیا ہے۔

میاں جان: اجی تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم فرسٹ نمبر کہتی ہو۔ میں کہتا ہوں وہ کلکٹر بھی بن جائے گا مگر پھر رہے گا گدھا ہی۔ میاں آخر ترقی کر کے کیا بنیں گے۔ کمشنر بن جائیں گے، ہم نے گدھوں کو اس سے زیادہ ترقی کرتے دیکھا ہے۔

بڑی بوا: تو بھیا ہمیں عقل مند نہ چہئیں۔ گدھا ہے مگر کمائی کر کے لائے۔

میاں جان: اور ہماری ناک کٹا دے۔ جہاں جاتا ہوں لوگ پوچھتے ہیں کہ میاں جان کہتے ہیں کہ آپ کا بھانجا دہریہ ہو گیا ہے۔ خدا کی قسم شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔

بڑی بوا: اے بھیا لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو اچھے بھلے آدمی کو باؤلا بنا دیویں ہیں۔

میاں جان: لوگ اسے کیا باؤلا بنائیں گے۔ انگریزی نے پہلے ہی اسے باؤلا بنا دیا ہے۔ بڑی بوا تیرے بیٹے کا انگریزی نے ستیاناس کر دیا۔ بات یہ ہے کہ گیہوں کی روٹی اور انگریزی ہر ایک کو ہضم نہیں ہوتی۔ ڈپٹی صاحب کے بھیے بیرسٹر صاحب کو دیکھا تھا۔ کیا حشر ہوا۔ بازاروں میں انگریزی بولتے پھرتے تھے۔

بڑی بوا: ارے واہ واہ تم بڑے اچھے آئے میرے بیٹے کو کوسنے والے۔ کبھی دعا تو منہ سے نکلی نہیں۔

میاں جان: اس میں بددعا کی کیا بات ہے۔ (اٹھتے ہیں) بیرسٹر صاحب کم پڑھے لکھے تھے۔ تیرے بیٹے سے زیادہ پڑھے ہوئے تھے۔ لندن سے بیرسٹری کر کے آئے تھے مگر دماغ کی کل ڈھیلی تھی۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ سب اٹھ گیا۔ گھر میں ہر ایک سے انگریزی بولنی شروع کر دی۔ پھر گھر میں آنے والے بھنگی سقے سے بھی انگریزی میں باتیں ہونے لگیں اور پھر ایسا دماغ چلا کہ گھر سے نکل جاتے تھے اور قصائی کنجڑوں سے انگریزی بولتے پھرتے تھے۔ بڑی بوا بتائے دے رہا ہوں تیرے بیٹے کا بھی یہی انجام ہو گا۔ بازاروں میں انگریزی بولتا پھرے گا۔

بڑی بوا: نہ بھیا نہ، برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہر وقت میرے بچے کے پیچھے پڑے رہو ہو۔ کبھی بھانجے پر پیار کا ہاتھ تو دھرا نہیں۔ ارے یہی سوچ لیتے کہ بیوہ بہن کا سہارا ہے۔ ڈوبا خون بالکل ہی سفید ہو گیا۔

میاں جان: ہوں پیار کا ہاتھ دھرا نہیں۔ وہ بھلا اس لائق ہے۔ مجھے کیا کہتا ہے

کہ میاں جان۔ میں آپ کے معجزے وعجزے کا نہیں مانتا۔ اب
بے ایمان تو کون ہوتا ہے معجزے کو نہ ماننے والا۔ تیرے بڑوں
نے معجزے کو مانا ہے۔

بوجی: اجی لڑکپن ہے۔ ابھی اللہ رکھو جب ذمہ داری سر پر پڑے گی تو
آپ ہی سمجھ آجائے گی۔

میاں جان: ہاں بیرسٹر صاحب کے بارے میں بھی یہی کہتے تھے۔ شروع میں تو
ایک سنک سی تھی۔ کوٹ پتلون پہنے نماز کو کھڑے ہوگئے۔ اسے
درگذر کیا کہ بھئی ولایت سے نئے نئے آئے ہیں۔ آگے چل کے
ٹھیک ہوجائیں گے۔ پھر جو سنک سوار ہوئی تو غریب بیوی پر نان
نفقہ کی نالش کردی۔ اسے بھی درگذر کیا! ابھی ولایت سے نئے
نئے آئے ہیں۔ بے چاروں کو کیا خبر کہ نان نفقہ کیا ہوتا ہے۔ مگر
درگذر کہاں تک کیا جاتا۔ دماغ ایسا چل بچل ہوا کہ گلیوں بازاروں
میں انگریزی بولتے پھرتے تھے۔

بڑی بوا: (کھڑی ہوجاتی ہیں اور برقعہ سنبھالتی ہیں) اجی بس بہت ہوگئی۔
آئے بڑے کہیں کے میرے بچے کا بالسٹر صاحب سے مقابلہ
کرنے والے۔ ارے عزیزوں رشتے داروں میں ایک دوسرے
کی مدد بھی کریں ہیں تو یوں احسان میں پیس نہیں ڈالتے۔ سمجھا کیا
ہے تم نے مجھے، بچے کی قسم ایک ایک پیسہ ادا کروں گی۔

بوجی: ارے بڑی بوا ان کی تو عادت ہے کہ ہر وقت کھری باتیں کیا
کرتے ہیں۔ بیٹھو تو سہی۔

بڑی بوا: نہ بی بی میں اس گھر میں نہیں آؤں گی۔ مجھے اپنے بچے کے لئے تو
کوسنے نہیں سنے جاتے۔ اللہ کی قسم، شاہد پیارے کی قسم تمھارا
ایک ایک پیسہ ادا کردوں گی۔ اگر ادا نہ کروں تو میرے جنم میں
تھوکنا۔

بوجی: اجی بڑی بوا سنو تو سہی، بڑی بوا...

(بڑی بوا تیزی سے نکل جاتی ہیں)

بوجی: ڈوبی بادل پن کی بات ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کسی کے
معاملے میں دخل دینے کی۔ کوئی کچھ ہی کیا کرے جو کچھ ہم کرسکتے
تھے ہم نے کردیا ہے۔ یہی فرض ہوا کرتا ہے عزیزداری کا۔ کوئی
جان بوجھ کر کنویں میں گرنے لگے تو کوئی کیا کرے گا۔ بڑوں کا
کام تو سمجھانا ہے۔ باقی ان کا اپنا فعل ہے۔ بڑی بوا اب وہ بڑی بوا
نہیں ہیں۔

(کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

کہ جو جی میں آیا کہہ لیا اور وہ چپ ہوکے چلی گئیں۔ اور بھئی ٹھیک
بھی ہے۔ اب ان کا بچہ ماشاء اللہ ڈپٹی کلکٹر ہوگیا ہے۔ پہلے بھتیجی پر
کیسے صدقے واری ہوتی تھیں۔ اب وہ محبت جانے کہاں گئی۔
اب تو ڈپٹی صاحب کی لونڈیا کی تعریفوں کے پل بندھتے ہیں۔
ہاں بڑے آدمیوں میں جائیں کرکے دیکھ لیں پتہ چل جائے گا کہ
وہاں سے کیا ملتا ہے۔ ہم ہی بیوقوف ہیں پڑھایا لکھایا اور اب ہم
ہی دشمن ہوگئے۔ ہم کوسنے دینے والے ہوگئے۔ کہتی ہیں ایک
ایک پیسہ ادا کروں گی۔ اللہ تیری شان ہے۔ بڑی ادا کریں گی، ہم
بھی تو دیکھیں۔

(انو داخل ہوتا ہے قمیص پتلون پہنے ہوئے ہے۔ لباس اور
بالوں سے بے پروائی ظاہر ہوتی ہے۔ خیالات میں کھویا کھویا۔)

انو: میاں جان ایک پلان بنائی ہے۔

بوجی: (تیزی سے) بھیا ان ڈوبی بخت ماری پلانوں کے پھندے میں
کب تک پھنسے رہوگے۔ ان پہ خاک ڈالو اور نوکری کی تدبیر کرو۔

میاں جان: نوکری! نوکری تو اس کے باپ نے نہ کی، اللہ بخشے ان پہ تو سنک
سوار تھی کہ نوکری نہ کروں گا۔ وہ کمیٹی کی ممبری کے منصوبے بنایا
کرتے تھے۔ کوئی رنڈی بازی اور شراب میں دولت اڑاتا ہوگا۔
انھوں نے کمیٹی کی ممبری کے پیچھے پیسہ بہایا۔ شہر کے ہر لچے لفنگے
کے سامنے ہاتھ جوڑی کی۔ اور پھر رقمیں بانٹی جارہی ہیں۔ کسی
لچے نے ایک دفعہ ایسی افواہ اڑائی کہ انھوں نے سچ مچ سمجھ لیا کہ
ممبری مل گئی۔ بس پھر کیا تھا، دیگیں کھنکنے لگیں۔ دعوت انھوں نے
دی اور نام لگا کسی اور اوباش کا۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت
نصیب کرے۔ آدھی جائداد کمیٹی کی ممبری کے منصوبے میں بہا
دی۔ اور کمیٹی کی ممبری نہ ملی۔ سارے منصوبے چھاتی پہ دھر کے
لے گئے۔ ایک شیخ کو چھوڑ گئے ہیں۔ دیکھو وہ کیا گل کھلاتا ہے۔

انو: میاں جان یہ شیخ چلی کی بات نہیں ہے، اب کے ایسی چاروں
طرف سے باندھ کر پلان بنائی ہے کہ انگلی نہیں رکھ سکتے۔ میاں
جان یہ جو بچ بٹن ہوتے ہیں ان کی ہر گھر میں ضرورت ہوتی ہے۔
پاکستان میں اب تک اس کا کوئی کارخانہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں
یہاں اگر کوئی اس کا کارخانہ کھول لے تو بڑے بڑے امپورٹروں
کے رستے بند کردے اور اس میں ایسا جھمیلا بھی نہیں۔ بس کوئی
چھوٹی سی جگہ الاٹ کرے، پھر دو ڈائیاں لگالے۔ لوجی کارخانہ
تیار ہے۔ بچ بٹن بننے لگے۔ بس ڈائیوں پہ تھوڑا سا خرچ آئے
گا۔ کل تین ہزار کا خرچ ہے۔

میاں جان: منصوبہ تو اچھا ہے مگر تم گدھے ہو تمھارے بس کا یہ روگ نہیں۔

بوجی: ارے بھیا کوئی عقل کی بات کرو۔ پڑھ لکھ کے بچ بٹن بنانے میں
تمھیں غیرت نہ آئے گی۔ موئے بچ بٹن کوڑی درجن دکان دکان
بکتے ہیں۔ اس میں دھیلا پیسہ بچ بھی رہا ہو تو کیا، ہتک لگے گی
مفت میں ناک کٹوانے کی بات ہے۔ لوگ کہیں گے کہ لو بھئی

میاں جان نے بھتیجے کو بڑے قصے سے پڑھایا تھا، اب ٹچ بٹن بناتا ہے۔

انو: چچی جان آپ کمال کرتی ہیں۔ یہ تو انڈسٹری ہے۔ اس میں ناک کٹنے کی کیا بات ہے۔

بو جی: (اٹھ کر انو کے پاس جا کر) ارے بھیا ناک یوں پکڑ لو یا یوں پکڑ لو بات تو وہی ہے۔ (پیچھے جاتے ہوئے) ہمارے یہاں ٹھٹھیرے اور بٹن ساز ایسے کام کیا کرتے تھے۔ شریفوں میں ایسے کام کب ہوتے تھے۔ پاکستان میں یہ آفت ٹوٹی کہ موچیوں، جولاہوں اور ٹھٹھیروں کے کام شریفوں میں ہونے لگے۔ اچھا جواب ہے کہ یہ تو انڈسٹری ہے۔ خاک بھوبھل ایسی انڈسٹری پہ کہ شریف، کمینوں کے کام کریں۔ پاکستان نگوڑا اس لئے بنا تھا کہ شریف شرافت چھوڑ دیں۔

انو: چچی جان آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ کام میں کوئی عیب نہیں۔

بو جی: (پیچھے سے انو کے پاس جا کر) بات یہ ہے بھیا کہ یہ تمھاری خاندانی صفت ہے کہ جس کے دماغ میں جو سما جاتی ہے وہ کسی کے نکالے نکلتی نہیں۔ (کرسی کے پیچھے جاتے ہوئے) اور ماشے اللہ تم پڑھے لکھے ہو میں جاہل۔ میری بات تمھاری سمجھ میں کیوں آنے لگی (پلٹ کر) مگر میں یہ کہے دوں ہوں کہ تم سے یہ گاڑی چلے گی نہیں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں (انو کے پاس جا کر) کہہ دینا تو آسان ہے کہ چھوٹی سی جگہ الاٹ کرا لیں گے، مگر کرائے گا کون؟ تم یا تمھارے میاں جان (پیچھے جا کر) ڈوبا مکان تو ڈھنگ کا الاٹ کرایا ہی نہ گیا۔ یہاں آئے دس برس ہوگئے۔ کمبخت اب تک ٹھکانے کا کونا نہ ملا۔ (پلٹ کر) ارے ان دس برسوں میں تو لوگوں نے محل کھڑے کر لئے۔ میں پی صاحب کے گھر گلبرگ گئی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہم تو دلی کا قلعہ سنا کرتے تھے۔ بی بی گلبرگ میں تو ہر گھر دلی کا قلعہ ہے۔

کشور: بو جی نمک چکھ لیجئے۔

بو جی: چٹپٹا ہوگیا تھوڑا سا پانی اور ڈال لے۔

کشور: انو بھائی۔

بو جی: انو بھائی سے اس وقت بات مت کرو۔ وہ ٹچ بٹن کے کارخانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

کشور: ٹچ بٹن؟

بو جی: ہاں ٹچ بٹن۔ اب انو ٹچ بٹن بنائے گا۔

کشور: ٹچ بٹن (ہنستی ہے) انو بھائی تم ٹچ بٹن بناؤ گے؟

(شاہد داخل ہوتا ہے سوٹ بوٹ پہنے۔ پائپ منہ میں دبائے)

کشور: شاہد بھائی، انو بھائی ٹچ بٹن۔

شاہد: انو بھائی ٹچ بٹن کیسے ہوگئے، کیا مطلب؟

کشور: بات یہ ہے کہ شاہد بھائی انو بھائی نے بٹن کا کارخانہ کھولنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

شاہد: اوہ! اب سمجھا! تو گویا انو بھائی کا نیا پنج سالہ منصوبہ شائع ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ انو بھائی صنعتی نظام کے آدمی پر طنز کرنا چاہتے ہیں۔ اس صنعتی نظام نے آدمی کو ٹچ کا بٹن بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود انو بھائی کو دیکھ لو، تجارتی ذہنیت نے انھیں آدمی رہنے ہی نہیں دیا۔ اچھا خاصا ٹچ بٹن بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب یہ آدمیوں سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ بس انھیں کسی بساط خانے میں رکھ دیا جائے۔ بالکل ٹچ بٹن کی طرح کھلتے اور بند ہوتے رہیں گے۔ انو بھائی اسی لئے میں فارن کنٹری جا رہا ہوں۔ یہ ہمارا پاکستان معقول سے معقول آدمی کو ٹچ کا بٹن بنا دیتا ہے۔ میں نے کوئی چانس نہیں رکھا ہے۔ تینوں خانوں میں فارن سروس بھرا ہے۔ انٹرویو میں بھی میں نے ٹکا کر تین بار کہا، فارن سروس، فارن سروس، فارن سروس۔ وہ پوچھنے لگے کہ فارن سروس سے آپ کو کیا دلچسپی ہے، میں نے کہا جناب، میں یورپ کی آرٹ گیلریاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت گھٹے میرے اس جواب پر۔ ایک نے پوچھا، یورپ کے کون سے ملک میں آپ جانا پسند کریں گے۔ میں نے کہا جناب فرانس۔ کیوں؟ میں نے کہا کیوں کہ وہ سارتر کا ملک ہے۔

میاں جان: (بات کاٹ کر) اجی مجھے ذرا ایک پان لگا دو۔

بو جی: (بھنا کر) اے ہے پان تو ختم ہوگئے۔ ایک ٹکڑا پڑا ہے۔

کشور: (پنجرے کی طرف) انو بھائی ہمارے صمن بکمن کے بولنے کی بھی کوئی پلان بنا دو۔

شاہد: انو بھائی خود صمن بکمن ہیں۔ آدمی سے بات نہیں کر سکتے بیچارے۔ اور ان کی پلان کیا کرے گی۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ بورڈ والے پوچھنے لگے کہ فرانس...

میاں جان: بھئی انو رات کو کیا ہوگا پانوں کا۔ دیکھو میری اچکن سے اٹھنی نکال لو اور پان لے آؤ۔

(انو اچکن سے پیسے نکالتا ہے اور چلا جاتا ہے)

شاہد: اچھا کشور میں نے فلابرٹ کی بات پر انھیں بہت فلیٹ کیا، بار بار کہیں فلابرٹ میں نے آہستہ سے کہا فلابیئر۔ اچھا پھر فرانسیسی شاعری کا ذکر کرتے کرتے ایذرا پاؤنڈ کا نام لے دیا۔ ایک صاحب بولتے ہیں یہ کوئی فرانسیسی خاتون ہیں۔ میں نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ فرانسیسی خاتون کا شک تو ان پر ہوتا ہے۔ مگر زیادہ احتمال یہ ہے کہ وہ کوئی انگریزی شاعر ہیں۔ اس پر سب کو سانپ

سونگھ گیا۔

میاں جان: کشور پان دو۔ (دروازے پر دستک)

میاں جان: بندو آ گیا۔

شاہد: اچھا میں اب چلا۔

بوجی: (اٹھ کر شاہد کے پاس) شاہد میاں بیٹھو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کھڑے کھڑے آئے اور چل دیئے۔ انٹرویو کیسا ہوا یہ تو بتایا ہی نہیں۔

شاہد: ممانی جان، بس فلیٹ کر آیا ہوں۔

بوجی: اللہ کرے انٹرویو میں بھی ایسے ہی سرخ رو ہو جیسے کمیشن میں اول نمبر آئے تھے۔

شاہد: اچھا ممانی جان آداب۔ میاں جان آداب۔

میاں جان: ...تم پردے میں چلی جاؤ۔ (بوجی پاندان اطمینان سے بند کرتی ہیں۔ غصہ سے) اجی اب جا بھی چکو۔ (بوجی غصہ سے پاندان بند کرتی ہیں۔ میاں جان کو اسی غصہ سے دیکھتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔)

اماں آ جاؤ بندو۔

(بندو داخل ہوتا ہے، کرتا، پاجامہ اور واسکٹ پہن رکھی ہے۔ بغل میں حجامت کے سامان کا بقچہ ہے۔)

بندو: سلام میاں۔

میاں جان: سلام میاں، اچھے تو ہو (دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے) ماسٹر صاحب ہوں گے۔ (آواز دیتے ہوئے) ماسٹر صاحب ہیں؟ تشریف لائیے۔

(ماسٹر صاحب داخل ہوتے ہیں۔ عینک لگائے۔ چھڑی ہاتھ میں لئے، بغل میں چند کتابیں)

بندو: میاں صاحب، سپوتنک ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سب نے دیکھا ہے مگر یہاں والے حامی نہیں بھرتے۔ (حجامت کا سامان کھولنا شروع کرتا ہے)

میاں جان: اماں نہیں۔

بندو: لو جی اخبار کی بات بھی غلط ہو گئی۔ (استرا رکھ کر اخبار نکالتا ہے) اسی صفحے پر وہ خبر تھی، ٹوبہ ٹیک سنگھ والے کہتے ہیں کہ ایک سرخ رنگ کا ستارہ تیسرے پہر کے وقت دکھائی دیا تھا، سب نے دیکھا۔

میاں جان: اماں جس وقت سپوتنک دکھائی دے گا تو ٹوبہ ٹیک سنگھ والوں کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔

بندو: اچھا جی لاہور میں تو ابھی دکھائی نہیں دیا نا؟

میاں جان: نہیں۔

بندو: ابھی تک کوئی خبر تو نہیں آئی ہے نا؟

میاں جان: نہیں۔

بندو: تو میاں جان صاحب اب میری سنو، جھوٹ بولے سو کافر۔ بات یہ ہوئی کہ پرسوں شام کو میری پتنگ تارا بن گئی۔ میاں جان صاحب، کیا ہوا کہ مجھے یوں لگا کہ مٹھی بھاری ہو گئی ہے۔ میں کہوں کہ سالی اتنی اونچی جا کے جھونک کھا رہی ہے۔ اوپر جو دیکھو تو جیسے امرتی ہو۔ کوئی چیز کنوں میں اٹکی ہوئی۔ میں نے کہا ابے ہوا اڑن طشتری تو نہیں ہے۔ وہ دیکھ کے چلایا کہ ابے یہ تو سپوتنک ہے۔ تو جی یہ میں نے جلدی سے کھینچ ماری پر سالا مانجھا گھسا کھا گیا اور سپوتنک اور پتنگ دونوں غائب۔

ماسٹر: میں نہیں مانتا۔

بندو: ماسٹر صاحب، جو جھوٹ بولے سو کافر، چلو مسجد میں چل کے مجھ سے قرآن اٹھوا لو۔

ماسٹر: میں نہیں مانتا، پتنگ اتنی بلندی پر پہنچ ہی نہیں سکتی۔

بندو: میاں جان صاحب سن رہے ہو کہ پتنگ اتنی بلندی پر نہیں پہنچ سکتی۔ آپ کو تو جی پتہ ہے کہ کتنا کتنا مینہ پڑا پر میں نے اپنی پتنگ تنی ہوئی رکھی۔ جب اتاری تو بالکل خشک۔ میری پتنگ اور بوا کے کبوتر ہمیشہ بادلوں سے اونچے اڑے۔ سپوتنک بادلوں سے اونچا تو نہیں جا سکتا نا! میاں جان، اب کے تو خیر سپوتنک میرے اڑنگے سے نکل گیا مگر میں نے بوا سے کہہ دیا کہ بیٹا اگر سپوتنک مار مانجھا تیار نہ کیا تو بندو اپنے باپ سے نہیں۔ اس پہ وہ بہت گھٹا، میں نے کہا کہ بیٹا کبوتر کی چونچ میں سپوتنک آنے سے رہا۔ اپنے شیرازی کے پروں میں قینچیاں لگواؤ ویسے میں یہ مانتا ہوں کہ بوا کی آنکھ بہت تیز ہے۔ سالے کو ٹیکا ایک دوپہری میں تارا نظر آیا تھا۔

میاں جان: میاں میں تو مان لوں گا۔ ماسٹر صاحب کو بتاؤ۔

بندو: کیوں جی ماسٹر صاحب، آپ یہ بات بھی نہیں مانیں گے؟

ماسٹر: میں بالکل نہیں مانتا۔

بندو: کیوں جی ماسٹر صاحب، کیوں نہیں مانتے۔ چلو جی میں لپاٹی ہوں، مگر کیا بوا بھی جھوٹا ہو گیا۔

میاں جان: اماں بوا اور تم کس گنتی میں ہو، ماسٹر صاحب تو ستاروں کو ہی نہیں مانتے۔

بندو: ستاروں کو نہیں مانتے؟

میاں جان: ہاں میاں ہو کس ہوا میں، کہتے ہیں کہ یورپ میں آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ ستارے معدوم ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا ماسٹر صاحب کہ تمہارے یورپ کو رتوندی آتی ہے۔ اسے چمکتے ستارے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ ستارے غائب

ہو چکے ہیں۔ ان کی روشنی ہمارے پاس دیر سے پہنچتی ہے۔ پوچھ لو سامنے بیٹھے ہیں، میں تو منھ پہ کہہ رہا ہوں۔

بندو: ماسٹر جی، اس کا مطلب تو ہوا کہ قدرت کے لائٹ ششم میں گھپلا ہے۔ سوئچ آف کر دیا اور لائٹ آئے جا رہی ہے۔

میاں جان: اس بات کو بھی جانے دو۔ میں تو سیدھا سوال کرتا ہوں کہ کیوں جناب جب ستارے ہیں ہی نہیں تو یہ سپوتنک کہاں کے لئے اڑایا گیا ہے۔ چاند میں تو آپ کہتے ہیں کہ زندگی نہیں مریخ میں ہے۔ مگر جب ستارے نہیں ہیں تو مسخرا مریخ کہاں سے آن ٹپکا۔

ماسٹر: میاں جان آپ میرے مافی الضمیر کو غلط سمجھے۔ میں نے سب ستاروں کے متعلق عرض نہیں کیا تھا بلکہ...

میاں جان: بلکہ ولکہ میں نہیں جانتا۔ ایک بات کہئے کہ ستارے ہیں یا نہیں۔ آپ عدم اور وجود کے بیک وقت کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔

ماسٹر: صاحب آپ تو بے دلیل کے بات کرتے ہیں۔ یہ سائنس کا مسئلہ ہے۔

میاں جان: اماں ماسٹر صاحب آفتاب آمد دلیل آفتاب، ستارے سامنے نظر آ رہے ہیں۔ تمھاری مسخری سائنس اس میں کیا کرے گی۔

میاں جان: اماں بندو خاں بات یہ ہے کہ (ماسٹر اٹھتے ہیں) اماں ماسٹر صاحب آپ تو اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماسٹر: باتوں میں وقت کا خیال نہیں رہا۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) دس منٹ اوپر ہو گئے۔

میاں جان: مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ کو کسی عامل نے گھڑی میں باندھ دیا ہے۔

ماسٹر: سلام علیکم۔

میاں جان: وعلیکم السلام (ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد) ہاں تو بندو خاں میں کیا کہہ رہا تھا، خدا تمھارا بھلا کرے۔ ماسٹر صاحب بچاروں کا قصور نہیں۔ کچھ زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ ہماری بہن کے صاحبزادے ہیں، انھیں ماسٹر صاحب سے زیادہ بدہضمی ہے۔ وہ معجزے کو نہیں مانتے، میں نے کہا کہ ابے تو کون ہوتا ہے معجزے کو نہ ماننے والا۔ تیرے بڑوں نے مانا ہے۔

(انو پان لے کر داخل ہوتا ہے)

میاں جان: اماں لے آئے پان؟

انو: جی۔ (پان رکھتا ہے اور کاغذ نکال کر غور کرنے لگتا ہے۔

بندو: پان آج کل بہت مہنگا جا رہا ہے۔

میاں جان: اماں سستی کون سی چیز ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آدمی روٹی نہ کھائے پان کھائے۔ پان کا کم سے کم راشن تو نہیں ہوا ہے۔

بندو: میاں جی یہ سچ کہو ہو۔ (بقچہ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جاتے ہوئے) اچھا میاں جان جی سلام۔

میاں جان: سلام (حقہ پیتا ہے) ٹھنڈا ہو گیا (آواز دیتا ہے) کشور! بیٹی ذرا حقہ گرم کرو۔ اور پانی منھ دھونے کو رکھو۔

(میاں جان یہ کہہ کر اندر چلے جاتے ہیں۔ انو اکیلا بیٹھا ہے اور کاغذ پڑھنے میں غرق ہے۔ کشور داخل ہوتی ہے۔ انو سے نگاہ ملتی ہے۔ ٹھٹکتی ہے۔ حقہ کی طرف بڑھتی ہے۔)

کشور: انو بھائی۔

انو: (دیکھتا ہے۔)

کشور: انو بھائی کچ بتن۔ انو بھائی ہمیں بھی دکھائیے کیا آپ نے اسکیم بنائی ہے۔ (آگے بڑھ کر) انو بھائی بس ایک نظر دکھا دیجئے۔ (کاغذ پکڑ لیتی ہے۔)

(انو کاغذ چھیننے کی خاطر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ہاتھ پکڑنے کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور سٹپٹا جاتے ہیں۔ میاں جان کھانستے کھنکارتے داخل ہوتے ہیں۔ ان کی آہٹ سن کر کشور ہاتھ چھڑا کر الگ ہو جاتی ہے۔)

میاں جان: کشور بیٹی پہلے پان لگا دو۔

کشور: (گھبرا کر) جی اچھا۔ (چلتے ہوئے حقہ سے ٹکراتی ہے۔ چلم گر پڑتی ہے)

میاں جان: بیٹی کیا ہو گیا ہے تمھیں۔

(کشور چلم اٹھانے لگتی ہے۔ پردہ گرتا ہے۔)

دوسرا ایکٹ

(وہی کمرہ، میاں جان غصے میں ہیں۔ بو جی چھالیا کاٹ رہی ہیں۔)

میاں جان: کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب حرام ہو گیا۔ جہاں گھر میں داخل ہوا اور گراموفون پر سوئی چل گئی۔ میرا تو دماغ خراب ہو گیا۔ یا اللہ کیا مصیبت آ گئی۔

بو جی: ارے واہ! آئے بڑے کہیں کے، مصیبت کہنے والے، میری بچی جیتی رہے، مجھ کال کھاتی کو کیا خبر تھی۔ اب یہ ذکر کر جاؤں تو جو چور کا حال سو میرا۔

میاں جان: کیا خوب ہر وقت تو چرخی چلتی رہتی ہے۔

(کشور حقہ لے کر داخل ہوتی ہے اور الٹے پیروں چلی جاتی ہے)

میاں جان: اللہ کا نام نہ رسول کا کلمہ، دنیا کا کوئی ذکر ہی نہیں رہا۔ جب دیکھو وہی رام کہانی، صبح، دوپہر، شام۔

بو جی: اجی تم صبح، شام، دوپہر کی کہہ رہے ہو، مجھے تو اللہ قسم راتوں کو نیند

نہیں آتی۔ رات کیا ہوا کہ جب تم لوٹا لے کے باہر گئے تو آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ بس پھر آنکھ نہیں لگی۔ سوچتی رہی کہ یا اللہ کیا ہوگا، کیسے پالا بندھے گا۔ پھر اٹھ کے بیٹھ گئی پاندان کھولا، پان کھایا، چھالیا کاٹتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جب گھنٹے نے دو بجائے ہیں تو چارپائی کو کمر لگائی۔ مگر آنکھ کہاں لگتی تھی۔ کروٹیں بدلتی رہی۔ تین بجے، چار بجے۔ جب مرغ بولنے لگے ہیں تو ذرا جھپکی آگئی۔ پھر تم نے جھنجھوڑا، اٹھو نماز کا وقت ہوگیا۔

میاں جان: میں کہتا ہوں کہ تمھیں تو ہمیشہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر پان کھانے کی لت ہے مگر دوسروں کی نیند کیوں حرام کرتی ہو۔

بو جی: تمھیں اولاد کی محبت ہوتی تو پھر دیکھتی کہ کیسے یہ بات کہتے۔ جس کے دل کو یہ لگی ہے وہ جانے۔ تم تو اولاد کو مصیبت سمجھتے ہو۔

میاں جان: اولاد کو مصیبت میں نے بنا رکھا ہے یا تم نے؟

بو جی: کیا خبر ہے کس نے مصیبت بنا رکھا ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ جہاں بچی کا ذکر آیا تمھارے تن بدن میں پتنگے لگے۔ میں کہتی ہوں کہ اللہ رکھے ایک سے تم اتنے بولائے ہوا گر پانچ سات ہوتے تو تم تو کپڑے پھاڑ کے جنگل کو نکل جاتے۔

میاں جان: میں بولایا ہوا ہوں، بولائی ہوئی تو تم ہو کہ مجھے باؤلا بنائے دے رہی ہو۔

بو جی: (اٹھ کر میاں جان کو پان دیتے ہوئے) سچ کہتے ہو، بولائی ہوئی تو میں ہوں۔ گھنٹے سے تو میرے لگی بیٹھی ہے۔ رات دن اسی ادھیڑ بن میں رہتی ہوں کہ یا اللہ کیسے ہوگا۔

میاں جان: وہ مالک ہے۔

بو جی: وہ تو مالک ہے۔ مگر وہ پڑیا میں باندھ کر اوپر سے تو نہیں پھینکے گا۔ کوشش بندوں کا فرض ہے۔ باقی وہ مالک ہے۔

میاں جان: میں یہ پوچھتا ہوں کہ کوئی بغیر جوڑے کے پیدا ہوئی ہے۔ جس نے بیٹی دی ہے وہ بر بھی دے گا۔

بو جی: اجی وہ زمانہ نہ رہے کہ بر آپ ہی آپ مل جایا کرتا تھا۔ اگلے زمانے کی باتیں اور تھیں۔ بیٹے والیاں برسوں پھیرے لگاتی تھیں اور دہلیز کی خاک لے جاتی تھیں، تب رشتہ ملتا تھا۔ مگر اب تو بیٹے والوں کا وہ ٹھسا ہے کہ سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ اپنی بہن کو نہیں دیکھتے کیسی بدلی ہیں۔ کل تک کشور کی بلائیں لیتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ کشور تو میری ہے۔

میاں جان: آخر آگیا نا پھر وہی ذکر۔

بو جی: (میز پر پاندان رکھ دیتی ہے) اجی ذکر کیسے نہ آئے گا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مشہور تو یہ ہوگیا کہ کشور پھوپھی کے گھر ہو رہی ہے۔ دنیا میں تھڑی تھڑی ہوگی اور ہماری لونڈیا تھک جائے گی سو وہ الگ۔ کسی اچھی جگہ گئی ہوتی تو ہم بھی کہتے کہ بڑی بوا کی کل سنور جائے گی۔ ڈپٹی صاحب، ڈوبے خاک دیں گے جہیز، سوکھی لڑکی شوق سے لے آئیں۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ لمبی لگ لگ سی۔ اوپر سے عینک لگالی۔ لو بھئی فیشن ایبل بن گئی۔ میں نے کہہ دیا بٹی برا مانو مت، تمھاری یہ عینک کا فیشن مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ جی یہ فیشن نہیں ہے۔ میری آنکھیں کمزور ہیں۔ جی میں آئی کہ کہوں بٹی آنکھیں کیا آگے خراب نہ ہوتی تھیں۔ مگر ہم نے تو کسی سیانی لڑکی کو عینک لگاتے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے کہا کہ ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کی بات میں بولیں۔

(بڑی بوا داخل ہوتی ہیں)

بڑی بوا: بی بی میری خاطر کرو۔ میں ڈپٹی کلکٹر کی ماں ہوں۔

بو جی: بڑی بوا۔ تم تو جب سے ڈپٹی کلکٹر کی ماں بنی ہو، ہم تمھاری صورت کو ترس گئے۔

بڑی بوا: اے ہاں یہ تم سچ کہتی ہو بی بی کیا کروں، دوپہر تو پکانے ریندھنے میں ہی ہو جاوے ہے۔ اور تم جانو کہ جاڑوں کا دن کتنا ہووے ہے۔ آنگن میں ذرا آ کے بیٹھی کہ دھوپ لے لوں دھوپ تو ایسی دھوپ چھاؤں کی طرح غائب ہووے ہے کہ آنگن سے دیوال، دیوال سے منڈیر پہ۔ اے لو پل بھر میں شام ہوگئی۔ مغرب کی اذان ہوئی، نماز پڑھی، نماز کے بعد میں وظیفہ پڑھنے بیٹھ جاؤں ہوں۔ بی بی میں آیت کریمہ کا وظیفہ پڑھ رہی ہوں۔ اللہ کرے پورا ہو جائے۔

(کشور داخل ہوتی ہے)

کشور: بڑی بوا، آداب۔

بڑی بوا: بٹی جیتی رہو۔ کڑوے نیم سے بڑی ہو۔ اے میں کیا کہہ رہی تھی، میں آیت کریمہ کا وظیفہ پڑھ رہی ہوں اللہ کرے پورا ہو جاوے اور مراد بر آوے تو...

بو جی: اللہ نے چاہا تو مراد بر آوے گی اور شاہد ڈپٹی کلکٹر بنے گا۔

بڑی بوا: بی بی مجھے بشارت ہوئی ہے۔ اری کیا ہوا پرسوں مجھے وظیفہ پڑھتے پڑھتے اونگھ آگئی۔ پھر میں ایک ساتھ چونک پڑی، ایسا لگا کہ کوئی آیا تھا۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نہیں۔ مگر کیا بتاؤں تم جھوٹ جانو گی۔ سارے گھر میں خوشبو۔ میں نے شاہد سے کہا کہ بیٹا شاہد چنبیلی کے پھول کہاں سے لایا ہے تو۔ اس نے کہا بڑی بوا کیسے پھول؟ میں نے کہا کہ بیٹا مجھے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے۔ اسی رات میں نے ابا جی کو خواب میں دیکھا۔ جیسے بڑا سا گھر ہے۔ ابا جی ہاتھ میں ہرا ہرا دونا لئے آئے ہیں اور طاق میں رکھ دیا ہے۔ پھر میں نے دونے میں سے ایک پیڑا لے لیا ہے۔ پھر بی بی میری

آنکھ کھل گئی۔

بوجی: مبارک ہو بڑی بوا تمھارا شاہد ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔ اب پیڑے ہی بانٹیو۔

بڑی بوا: بی بی جب آنکھ کھلی تھی، میں نے اسی وقت منت مان لی تھی کہ متھرا کے پیڑوں کا مولود شریف کروں گی۔ (کشور ہنستی ہے)

کشور: بڑی بوا! متھرا کے پیڑے آپ کہاں سے منگائیں گی؟

بڑی بوا: بٹی منگانے کو کیا ہوا ہے۔ پیسہ ہونا چاہئے۔ اور اول تو ہمارے پچھواڑے جالندھر والے کی دکان ہے۔ میں نے پچھلی جمعرات کو مولا مشکل کشا کا دونا دلایا تھا تو اسی سے لڈو منگائے تھے۔ میں تو اسی سے متھرا کے پیڑے بنواؤں گی۔

(کشور اور زور سے ہنستی ہے)

کشور: بڑی بوا، متھرا کے پیڑے تو متھرا ہی میں ملتے ہیں۔

بڑی بوا: بٹی مجھے باؤلا مت بنایا کر۔ پاکستان میں باہر کی لکھو کھا چیز موجود ہے۔ ولایتی دودھ، رنگونی چاول، اللہ رکھو امریکہ کا گیہوں۔ خدا بھلا کرے تمھارے پیرس کا مسی سرمہ۔ دساور کے مال سے بازار پٹا پڑا ہے، متھرا کے پیڑے ہیرے جواہر ہیں کہ نہ ملیں گے۔

(کشور ہنستی ہوئی طوطے کے پاس جاتی ہے)

کشور: ممن بکمن متھرا کے پیڑے کھاؤ گے۔ میاں کا مٹھو، بی بی کا مٹھو، جگ جگ جیا کرو، متھرا کے پیڑے کھایا کرو۔ ممن بکمن نبی جی بھیجا کر۔

بوجی: کشور بٹی میں اپنا دوپٹہ طشلے میں بھگو آئی تھی، ذرا اسے جا کر پڑیا لگا دے۔ میں بڑی بوا سے بات کر لوں۔ (پاندان اٹھا کر) بڑی بوا تمھارے لئے پان لگاؤں؟

بڑی بوا: اری چونا کم لگائیو۔ کل میں ڈپٹی صاحب کے یہاں گئی۔ وہاں جو پان کھایا تو چونا نگوڑا ایسا تیز تھا کہ زبان کے قتلے ہو گئے۔

بوجی: اے بڑی بوا ہمارے تو اب کے جانے کیسا چونا آیا کہ زبان پر لگتا ہی نہیں ہے۔ میں جانوں سڑا ہوا چونا ہے۔

بڑی بوا: چونے میں بھی اب تو بخت مارے ملاوٹ کر رہے ہیں۔ دیکھ کے لیا کرو۔

بوجی: ارے بھئی کیا کیا دیکھ کے لیں۔ اب تو بس گھڑے کا پانی خالص رہ گیا ہے۔ ڈپٹی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ انھیں خالص چونا مل جاتا ہوگا۔ اللہ رکھو میرا شاہد ڈپٹی کلکٹر ہو جائے تو ہمیں بھی اچھی چیز مل جایا کرے گی۔ بڑی بوا اب تم ڈلی کھایا کرو گی۔

بڑی بوا: اری بی بی وہ وقت آوے تو سہی۔

بوجی: اللہ نے چاہا تو جلدی آئے گا بڑی بوا۔ شاہد کی تقرری ہو جائے تو بس بیاہ کر ڈالوں۔

بڑی بوا: نہ بی بی ابھی تو میں اپنے بیٹے کی کمائی کھاؤں گی۔

بوجی: ارے بڑی بوا بہو کیا تمھیں خدا نہ کرے کمائی نہ کھانے دے گی۔

بڑی بوا: اجی آج کل کی بہوئیں تو آتے ہی ساس کو طاق میں بٹھال دیوے ہیں۔ میں تو بہو سے ایسی خدمت کراؤں گی جیسے ڈپٹی صاحب کی ماں نے کرائی تھی۔

بوجی: ڈپٹی صاحب ہیں تو بڑے آدمی مگر بھئی میں تو خدا لگتی کہوں گی، ڈوبے خسیس ہیں۔ ماں کو کیا راج رجایا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہنڈیا میں پکایا کلیا میں کھایا۔ ماشاء اللہ ہمارے شاہد کا ہاتھ چلا ہوا ہے۔ ماں کو راج تو وہ رجائے گا۔

بڑی بوا: اری بی بی خسیس پن کی تو یہ ہے کہ جو ہاتھ روک کے خرچ کرے وہ خسیس ہو گیا۔ ویسے تو ماشاء اللہ ان کے گھر دو دو ہنڈیا پکے ہے اور دونوں وقت بکرے کا گوشت دسترخوان پر ہووے ہے۔

بوجی: بڑی بوا انصاف کی بات کیا کرو۔ میں نے کیا ان کے گھر کا کھانا دیکھا نہیں ہے۔ اللہ رکھو کنبہ بھی تو اتنا بڑا ہے۔ وہ سالن تو چٹنی بن جاتے ہیں۔ ہنڈیا کی ہنڈیا کشتی میں الٹ لی۔ اور دسترخوان پہ لا کے رکھ دی۔ آدمیوں والوں کے گھر میں کہیں یہ ہوا کرتا ہے؟

میاں جان: اجی شکر کرو کہ اب ڈپٹی صاحب کے گھر بکرے کا گوشت تو ایک دن جاتا ہے جب تک ماں زندہ رہی تو ساتویں دن بکرے کا گوشت آتا تھا اور چھ دن مسور کی دال پکتی تھی۔ غریب نے چائے ہمیشہ گڑ کی بنا کر پی۔ میں کہا کرتا تھا کہ خالہ اب تو تمھارا بیٹا حاکم ہے۔ ڈلی میں چینی نہیں آتی کیا۔ جواب دیتی بیٹا گڑ سے چاء سوندھی ہو جاوے ہے۔ بات یہ ہے کہ اتنی جلدی عادت کیسے بدل جاتی۔ پانی بھرتے بھرتے شریف بن گئے۔

بڑی بوا: تم تو بھیا ہر ایک میں کیڑے ڈالو ہو۔

میاں جان: کیڑے ڈالنے کی اس میں کیا بات ہے۔ ڈپٹی صاحب کے دادا کو تو ہمارے ابا جی نے کاندھے پر مشک لادے دیکھا تھا۔ بلکہ ہم نے بھی اپنے بچپن میں ان کی بیٹھک میں مشک دیکھی ہے۔ اللہ کی شان ہے سقے سے سید بن گئے۔ اب وہ شہر کے عزت داروں میں ہیں۔ تمھارے ابا جی تو تھے ہی منہ پھٹ، ایک روز ڈپٹی صاحب پوچھ بیٹھے، اماں تمھارا شجرہ وجرہ بھی ہے؟ بولے کہ ہجرت میں گم ہو گیا۔ ابا جی بہت حیران ہوئے، ہجرت؟ اماں کیسی ہجرت، تم تو پہلے ہی آ گئے تھے۔ کیا جواب دیتے ہیں کہ خالو بات یہ ہے کہ ہم فرانسیسی سید ہیں۔ جب اسپین سے مسلمانوں نے ہجرت کی تو ہمارے بزرگ فرانس نکل گئے تھے۔ بھلا پوچھو کہ اسپین میں سیدوں کو کب کس نے گھسنے دیا تھا۔ ابا جی بولے کہ ٹیپو سلطان اور والیٔ فرانس میں ایک صلح نامہ ہوا تو تھا۔ آپ کا خاندان ٹیپو سلطان

کے عہد میں ہندوستان آیا ہوگا۔

بڑی بوا: میاں جان تم تو دنیا بھر کی ذات میں عیب نکالو ہو۔ بھئی ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کیا۔ ان کا دین ایمان جانے اور بھیا سید بننے کی بات تو یہ ہے کہ پاکستان میں ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنے سید بن گئے۔ کریم بخش والے وہاں تو شیخ کلاں ہوویں تھے۔ یہاں وہ اللہ کی شان سید ہیں۔

میاں جان: پاکستان کی بھلی کہی یہاں تو شیخ کلاں سید ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اتنے سید اور وزیر بنے ہیں کہ ہم نے ڈپٹی صاحب کو بھی سید مان لیا ہے۔ ڈپٹی صاحب پڑھے لکھے تو ہیں فرانسیسی سید بننا انھیں زیب دیتا تھا اور ایسے پڑھے کہ پاگل بھی ہوتے ہیں تو انگریزی بولتے ہیں۔ بڑی بوا تیرا بیٹا ڈپٹی کلکٹر ہو جائے وہ فرانسیسی سیدوں سے کم نہیں ہے۔

بڑی بوا: بھیا میرا لونڈا ایسا نہیں ہے۔

میاں جان: اچھا دیکھ لیجیو۔ بڑی بوا تیری ساری عبادت پر پانی پھیرے گا۔ وہ کنجڑوں، موچیوں سے انگریزی نہ بولتا پھرے تو میرا نام بدل دیجیو۔

بڑی بوا: ارے واہ۔ بڑے آئے تم میرے بچے کو کوسنے والے۔

میاں جان: انگریزی پڑھ کے حرام خور کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔ سارے بیرسٹر صاحب والے پھن ہیں۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے۔ یہ معجزے کو نہیں مانتا۔ کہتا ہے کہ عقل معجزے کو نہیں مانتی۔ میں نے کہا بے عقل کل عقل کے پیچھے تو سائنس کا ڈنڈا لئے پھرتا ہے۔

بڑی بوا: ارے بھیا خدا کے خوف سے ڈرو۔ بیوہ کے بچے پر تہمتیں لگانا اچھا نہیں۔

میاں جان: تہمت، یہ تہمت ہے، ہم تو شریفوں میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ جو ملتا ہے پوچھتا ہے میاں جان، سنا ہے تمھارا بھانجا دہریا ہو گیا ہے۔ خدا پاک کی قسم شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔

بڑی بوا: ہاں ہاں بھیا ہم تو شرم ہی کے لائق ہیں۔ ارے تم نے تو کبھی بہن کو بہن نہ کہا اور بھانجے کو بھانجا نہ جانا۔ اے ہے میاں جان ایک ماں کا پیٹ اور ایسا خون سفید ہو جائے۔ جبھی تو کہویں ہیں کہ چودھویں صدی آ گئی، خون کے رشتے کٹ گئے، محبتیں اور مروتیں اٹھ گئیں۔

بو جی: اری بوا کیسی باتیں کرو ہو، ان کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا۔

بڑی بوا: ارے میں سب جانوں ہوں ان کا مطلب کیا ہے۔ ارے بھیا شرم سے گردن کیوں جھکاؤ ہو۔ ہم کوئی تمھارے رشتہ دار نہیں ہیں۔

بو جی: (بڑی بوا کو کرسی پر لا کر بٹھا دیتی ہے) اجی بڑی بوا تم ہر بات کو الٹا ڈال دیتی ہو۔ آخر ماموں ہی تو ہیں۔ اگر ذرا سی بات کہہ دی تو کیا ہو گیا اور بری بات پر اپنے نہ ڈانٹیں گے تو باہر والے ڈانٹنے تھوڑا ہی آئیں گے۔ باہر والوں کو کیا غرض پڑی ہے۔ وہ تو تماشا دیکھنے والے ہیں۔

بڑی بوا: ہاں بی بی ہم تو تماشا ہی کے لائق ہیں۔ جس کا جی چاہے ہنس لے۔ (روتے ہوئے) آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو کیوں کوئی ہنستا۔ یتیم بچے کا جتنا چاہے تماشا بنا لو، میں کچھ نہ کہوں گی۔ وہ دیکھنے والا ہے۔

بو جی: اجی بڑی بوا میں نے تو یہ کہا ہے...

بڑی بوا: ارے میں کیا سمجھتی نہیں ہوں منی۔ فارسی میں جیسے تم بات کرتی ہو۔ میں خوب جانتی ہوں۔ میرا آنا اگر اچھا نہیں لگتا تو اب نہیں آؤں گی۔

بو جی: اری بڑی بوا بیٹھو تو سہی۔

میاں جان: اجی جانے دو، بڑی بوا تو بولا گئی ہے۔

بڑی بوا: بولائے ہوں تمھارے ہوتے سوتے، میں کیوں بولاتی۔

میاں جان: تو سٹھیا گئی ہوگی۔ ماں سٹھیا گئی بیٹا بولا گیا۔

بڑی بوا: (چلتے چلتے) ارے خدا کے خوف سے ڈرا کرو۔ کسی کی ایک سی نہیں رہتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے دلدر اب دور ہوئے، کچھ گذر گئی، کچھ گذر جائے گی، مگر غریب کی آہ لینی اچھی نہیں ہوتی۔

بو جی: بڑی بوا، اجی بڑی بوا۔ اجی سنو تو سہی۔

بڑی بوا: بہت سن لیا بی بی، اب نہیں سنوں گی۔

(تیزی سے نکل جاتی ہے)

بو جی: ہزار مرتبہ کہا کہ بڑی بوا کے قصے میں دخل نہ دیا کرو انھیں برا لگتا ہے اور برا لگنے کی بات بھی ہے۔ آخر اولاد ہے اور بھئی وہ زمانے تو رہے نہیں کہ بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سن لیا کرتے تھے۔ یہ نئی روشنی کے لڑکے ہیں۔ باپوں کی نہیں سنتے، ماموں تایا تو پھر ماموں تایا ہیں۔

میاں جان: ہوں۔

بو جی: اور بھئی وہ بیٹے والی ہیں۔ وہ کسی سے کیوں دب کے چلیں۔ دب کے بیٹی والے چلتے ہیں۔

میاں جان: ہوں، دب کے بیٹی والے چلتے ہیں۔

بو جی: (تخت کے پاس کھڑی ہے) تمھاری انھیں باتوں نے تو لونڈیا کی ریڑھ لے لی۔ ایسی بے دماغی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ تو کسی نے کہا ہے کہ جس پیڑ میں پھل آئے گا وہ جھکے گا، تو اولاد والے کی مثال تو پھل والے پیڑ کی ہے، مگر یہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

میاں جان: یعنی اولاد کے لئے ایمان نگل لوں۔

بو جی: ایمان نگلنے کو کون کہہ رہا ہے مگر یہ تو سوچنا چاہئے کہ بیٹی کا معاملہ نازک ہوتا ہے۔ایسی ویسی باتیں درگذر کرنی پڑتی ہیں۔

میاں جان: لاحول ولا قوۃ، تم سمجھتی ہو میں اس دہریئے کو اپنی بیٹی دوں گا۔قسم اللہ پاک کی فقیر کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دوں گا۔دہریئے کو نہیں بیاہوں گا۔

بو جی: اجی یہ بھی تمھاری خواہ مخواہ کی بات ہے۔آج کل کے تو سب لڑکے ایسے ہی ہیں۔اور میں اپنی بیٹی مسجد کے ملا کو تو دینے سے رہی۔

میاں جان: اجی تم نے تو میرا گھر میں بیٹھنا ہی دوبھر کر دیا ہے۔بیٹی، بیٹی، بیٹی۔ بیٹی نہ ہوئی بلائے جان ہوگئی۔(کھڑا ہوتا ہے) کشور بیٹی۔

(کشور داخل ہوتی ہے)

کشور: جی۔

میاں جان: میری شیروانی لا۔تیری ماں مجھے بیٹھنے نہ دے گی۔(ٹوپی اچکن دیتی ہے)

(میاں جان ٹوپی اچکن جلدی جلدی پہن، چھڑی ہاتھ میں لے نکل جاتے ہیں۔)

بو جی: ارے میرا دوپٹہ رنگ دیا۔

کشور: رنگ کر تار پر لٹکا آئی ہوں۔شام تک سوکھ جائے گا۔اب میں اپنی قمیص سیوں گی ذرا۔

بو جی: میں ذرا جا کے ہنڈیا دیکھ لوں۔ان کی باتیں دیکھو کھانے کے وقت چل دیئے۔اب کھانا ٹھنڈا ہوگا۔(کشور قمیص سینے لگتی ہے۔افو داخل ہوتا ہے)

افو: میاں جان نہیں آئے ابھی۔

کشور: آ تو گئے ہیں ابھی ابھی پھر باہر چلے گئے۔

(خاموشی)

کشور: کیوں؟

افو: کچھ نہیں، بس یوں ہی۔

(خاموشی۔افو کاغذ دیکھنے لگتا ہے)

کشور: افو بھائی۔وہ آپ کی ایک رجسٹری آئی تھی۔

افو: اچھا۔پھر۔پھر کہاں ہے وہ؟

کشور: میاں جان نے کہیں رکھ دی ہے۔

افو: اچھا۔

(سوچ میں پڑ جاتا ہے۔پھر رجسٹری تلاش کرنے لگتا ہے)

کشور: افو بھائی وہ میاں جان یہ پوچھ رہے تھے (افو رکتا ہے) وہ میاں جان یہ پوچھ رہے تھے کہ آپ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز سے ملے۔

افو: مل لیا ہوں۔بات بنی نہیں۔پلان فیل ہوگئی۔

کشور: اے لو بھئی کیوں۔(مشین رکتی ہے)

افو: بات یہ ہے کہ اس کے لئے کراچی جانا پڑے گا۔

کشور: تو پھر؟

افو: بات یہ ہے کہ اب کراچی کون جائے گا۔

کشور: افو بھائی پہلے تو آپ کراچی جانے کا ہر وقت بہانہ ٹٹولتے تھے۔

افو: ہاں ہاں مگر۔بس میں کراچی ہی نہیں جاتا۔(خاموشی۔آہستہ سے مشین کا چلنا) کشور (مشین رکتی ہے) کشور بات یہ ہے کہ میں نے سوچا ہے کہ اب کراچی نہیں جاؤں گا۔سوچا ہے کراچی کا خیال ہی ترک کر دو۔ایک کام ہے جو یہاں چل سکتا ہے۔اور آگے چل پڑا تو یہ بات یہ ہے کشور میں سوچتا ہوں کہ...کہ...

کشور: افو بھائی بتایئے نا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

افو: یہی کہہ رہا ہوں کہ کراچی نہیں جاؤں گا اور...اور...

(میاں جان آتے ہیں)

میاں جان: اماں کیا ہوا تمھارا۔

افو: بات یہ ہے کہ میاں جان پلان فیل ہوگئی۔

میاں جان: فیل ہوگئی۔اماں کیا کہہ رہے ہو۔ڈائرکٹر صاحب اپنے بڑے مہربان ہیں۔

افو: نہیں میاں جان بات یہ ہے کہ لائسنس کے لئے کراچی جانا پڑے گا۔

میاں جان: اماں تو چلے جاؤ۔

افو: جی بات یہ ہے کہ وہاں رہنا بھی پڑے گا۔

میاں جان: اوں۔اماں اس سے تو اچھا یہی ہے کہ میاں بیٹھے بیٹھے بٹن بناتے رہو۔

افو: جی میاں جان بات یہ ہے کہ میں نے ایک تدبیر سوچی ہے کہ کراچی جانا ہی نہ پڑے۔

میاں جان: کیا؟

افو: ایک پلان بنائی ہے۔

میاں جان: (جھنجھلا کر) پھر کوئی منصوبہ بنالیا۔اماں تم نرے گدھے ہو۔تمھیں کچھ کرنا نہیں ہے۔بس منصوبے بنایا کرو۔

افو: جی میاں جان بات یہ ہے کہ یہ ایسا کام ہے کہ اس میں سو فیصد نفع ہی نفع ہے۔گلاس کلاتھ انڈسٹری پاکستان میں سرے سے نہیں ہے۔

میاں جان: اماں یہ کون سی انڈسٹری ہے؟

افو: شیشے کے کپڑے کی انڈسٹری۔

میاں جان: شیشے کے کپڑے کی انڈسٹری؟

افو: جی میاں جان بات یہ ہے کہ امریکا کا ایک صنعتی رسالہ آتا ہے۔اس میں پوری پلان دی ہوئی ہے۔امریکا میں آج کل شیشے کا کپڑا

بہت بنتا ہے۔

میاں جان: شیشے کا کپڑا۔ میاں ہوش کی دوا لو۔ اجی کشور کی ماں سن رہی ہو۔ اجی تم نے سنا ہمارے انو میاں اب کے نیا شوشہ لائے ہیں۔ کہتے ہیں شیشے کا کپڑا بناؤں گا۔

بو جی: شیشے کا کپڑا۔ اے انو عقل کی بات کیا کرو۔

انو: جی چچی جان۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ پاکستان میں یہ چیز بالکل نئی چیز ہوگی۔ میاں جان ایسا ہوتا ہے کہ ایک بھٹی ہوتی ہے۔ ایک لمبی سی چمنی ہوتی ہے۔ اس میں شیشہ پگھلتا رہتا ہے۔ پھر اس کے پیلے پیلے تار کھینچتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے جیسے سوئیاں ٹوٹتی ہیں۔ ان سے کپڑا بنا جاتا ہے۔ امریکا میں تو آج کل اس کا بہت فیشن ہے۔

میاں جان: اں امریکا کے شیشہ گروں کی نقل ہم نہیں کر سکتے۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ یہاں گاڑھے گزی کا کپڑا میسر نہیں، تم شیشے کے کپڑے کی بات کرتے ہو، اور بھائی شیشے کا کپڑا پہننا ہے تو آدمی ننگا کیوں نہ رہے؟

انو: میاں جان یہ کارخانہ ہم نے کھول لیا تو بس یوں سمجھ لیجئے کہ یوں کام چلے گا۔ بس ایک فرض میرا ہے کہ بھٹی قائم کرنی پڑے گی۔ کل ملا کر چھ ہزار کا خرچ آتا ہے تو چھ ہزار تو ایک بار میں نکل آئیں گے۔

بو جی: چھ ہزار، بھیا چھ ہزار کس گھر سے آئیں گے؟ (انو کے پاس جا کر) کارخانہ کھولنا تو تم نے ہنسی مذاق سمجھ رکھا ہے۔ (پلٹ کر) اور بھئی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ عزت تو نوکری میں ہی ہے چاہے کانسٹیبلی ہو۔ کارخانہ تم لاکھوں کا بنالو، کہلاؤ گے ٹھٹھیرے ہی۔ (بیٹھ جاتی ہے کرسی پر)

میاں جان: میاں انو تم گدھے ہو۔ تمھارے بس کا کام نہیں ہے۔ ہاں ہاں تمھاری کوئی رجسٹری آئی ہے۔ کشور اچکن کی جیب سے نکالنا۔

(کشور اور انو نکل جاتے ہیں)

بو جی: (انو کو دیکھتی رہتی ہے) بھئی میری تو رائے یہ ہے کہ انو کو نوکری کرنی چاہئے۔ ان آرخانوں کارخانوں میں کیا رکھا ہے۔ عمر برباد کرنی ہے۔

میاں جان: نوکری اس کے باپ نے نہ کی وہ کیا کرے گا۔ ان کے دماغ میں بھی کیڑا تھا اس کے دماغ میں بھی کیڑا ہے۔

بو جی: (اٹھ کر تخت پر جا بیٹھتی ہے) شاہد کی پڑھائی لکھائی کا بھی خرچ آخر ہم نے اٹھایا ہی تھا۔ مگر وہ زمانہ اور تھا۔ اب ہمارے پاس اتنا کہاں ہے کہ کارخانے وارخانے میں لگائیں۔ جوان لونڈیا گھر میں بیٹھی ہے۔ مجھے تو یہی فکر کھائے جاتی ہے کہ اس کا کیسے ہوگا۔ یہ بھی تو آخر سوچنا چاہئے کہ اب کنبہ برادری تو رہی نہیں کہ پیغام آ رہے، بات چل رہی ہے۔ اب تو اچھے برے جیسے بھی ہیں یہی گھر کے لڑکے ہیں۔ (کھڑی ہو جاتی ہے) سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اس لڑکے پہ بڑا دل ہے۔ ماشاء اللہ عہدے والا ہے۔ پھر دیکھا بھالا ہے اور رہا بڑی بوا کا۔ تو بھیا ہاتھ پکڑے گا تو ان کی کیا مجال کہ بول جائیں۔

میاں جان: آ گیا پھر وہی ذکر۔

بو جی: (پھر تخت کی طرف) اجی ذکر کیسے نہ آئے، یہ ذکر تو آئے گا۔ میں (پلٹ کر) یہ کہتی ہوں کہ تم شاہد کو کچھ مت کہا کرو۔ اور بڑی بوا سے تو اب صاف صاف بات ہوگی۔ (بیٹھ کر) انھوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔

میاں جان: تم مجھے گھر میں نہیں بیٹھنے دو گی۔ (بڑھ کر اچکن لی اور چلے) (دروازے پر دستک) (چلتے چلتے رک جاتے ہیں) بندو آ گیا۔

(بو جی سے) اندر جاؤ۔

(بو جی چلی جاتی ہیں)

اماں بندو خاں آ جاؤ۔

(بندو داخل ہوتا ہے)

بندو: میاں جان سلام۔

میاں جان: سلام۔

بندو: آج ماسٹر صاحب نہیں آئے جی۔

میاں جان: ہاں آئیں گے، وقت پہ آئیں گے۔ گھڑی کے غلام ہوئے نہ۔ (دستک) دیکھ لو آدمی تھوڑا ہی گھڑی کی سوئی ہیں۔ تشریف لائیے ماسٹر صاحب۔

(ماسٹر صاحب داخل ہوتے ہیں)

بندو: کیوں جی ماسٹر صاحب، میں آج آپ سے صاف پوچھ ہی لوں۔ کیوں جی آپ بھی واقعی معجزے کو نہیں مانتے۔

ماسٹر صاحب: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کیا مطلب؟

میاں جان: ہاں ماسٹر صاحب آج بتا ہی دیجئے۔ ایک ہمارے گھر میں بھی آپ کا شاگرد پیدا ہو گیا ہے۔ اماں بندو ہمارے بھانجے میاں جو پیدا ہوئے ہیں وہ ماسٹر صاحب سے بھی سوا ہاتھ آگے ہیں۔ سائنس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کہنے لگا سائنس کی بدولت آدمی چاند پر تو پہنچ گیا۔ میں نے کہا کہ میاں جب تمھاری سائنس چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دے، تب ہمارے سامنے بات کرنا، بے ایمان کیا کہتا ہے کہ میاں جان میں معجزے کو نہیں مانتا۔ میں نے کہا اب تو کیا نہیں مانے گا۔ تیرے بڑوں نے مانا ہے۔ آیا ہے بڑا دہریہ بن کے۔ تو ماسٹر صاحب آپ بھی کیا سچ مچ معجزے کو نہیں مانتے۔

بندو: ماسٹر صاحب آپ مریخ کو تو مانتے ہیں جی؟

ماسٹر: جی ہاں۔

بندو: اور کہکشاں کو؟

ماسٹر صاحب: اسے بھی مانتا ہوں۔

بندو: تو پھر ماسٹر صاحب جی آپ کہکشاں کو مانتے ہیں، تو براق کو کیسے نہیں مانیں گے اور پھر براق کو مان لیا تو معجزے کو مان لیا۔

میاں جان: اماں اس مسخری سائنس کا کوئی اصول وصول نہیں ہے۔ ایک چیز کو مانتی ہے اور ایک چیز کو نہیں مانتی۔ مریخ کو مانتی ہے ستاروں کو نہیں مانتی، اچھا صاحب یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس کے زور پر ہم مریخ میں پہنچ جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ پہنچ جاؤ۔ پہنچ لینے دو سائنس کو مریخ میں۔ جن جن چیزوں سے انکار ہے سب کو مانیں گے۔ آسمان کا تھوکا حلق میں آئے گا۔

ماسٹر صاحب: آسمان کیا؟

میاں جان: (تعجب سے) آسمان کیا؟ اماں آسمان۔

ماسٹر صاحب: میں نہیں مانتا۔

میاں جان: لو میاں سن رہے ہو بندو خاں۔ اب آسمان کو بھی نہیں مانتے۔

بندو: ماسٹر صاحب جی۔ پھر یہ سفید سفید نیلا نیلا سا، اگر آپ کہویں ہیں کہ آسمان نہیں ہے تو پھر کیا فاختہ کا انڈا ہے۔

ماسٹر صاحب: حد نظر۔

میاں جان: حد نظر؟ حد نظر کیا ہے؟

ماسٹر صاحب: میاں جان سائنس کہتی ہے کہ آسمان کوئی شے نہیں ہے۔ آدمی کی نظر کی حد جہاں تک جاتی ہے اسے ہم نے آسمان کا نام دے دیا ہے۔

میاں جان: ماسٹر صاحب آپ کی سائنس جہالت کی بات کرتی ہے۔ نظر کی حد کوئی بھی نہیں ہوتی۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے دیوار آگئی۔ یہ سمجھ لو کہ دیوار نہ ہوتی تو گلی کی ساری چیزیں مجھے نظر آتیں۔ آسمان سے ادھر کی تو کوئی چیز ہمیں نظر نہیں آتی نا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیچ میں آسمان کی دیوار آگئی۔ یعنی پھر آسمان ہوا نا۔

بندو: میاں جان جی یوں آسمان انھیں نظر نہیں آئے گا۔ سائنس سالی سپوتنک کے گھوڑے پر سوار ہے۔ جب چت کرے گی تب آسمان نظر آوے گا۔ میاں جان جی گھیکوار کا پتہ دلواؤ کہیں سے، میری لگدی تیار ہے ابھی میں کچھ نہیں کہتا۔ میرا انجا تیار ہو جاوے پھر میں شاہد میاں سے پوچھوں گا کہ جی وہ تمھارا سپوتنک کہاں ہے؟ ماسٹر صاحب یہ تو اڑنگے کی بات ہے اور اڑنگے میں اچھا اچھا آجاوے ہے جیسے امریکا روس کے اڑنگے میں آگیا۔

میاں جان: بندو خاں اگر اڑنگے ہی کی بات ہے تو ہم یہ بتائے دیتے ہیں امریکا بھی بہت اڑنگے باز ہے۔ داؤں پر لا کے ایسا پچھاڑے گا کہ تمھاری سائنس کو آسمان نظر آئے یا نہ آئے تمھیں ضرور نظر آجائے گا۔

بندو: میاں جان روس تو بس بکھیر دے گا امریکا کے۔

میاں جان: اماں نہیں، روس کو تم کیا سمجھتے ہو، مجھ سے پوچھو تو چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔

بندو: کیا مطلب؟

میاں جان: مطلب یہ کہ اسپوتنک چیونٹی کا پر ہے۔ تمھارا روس پہلے چٹکی مارنے سے بدکتا تھا اور اپنے اڈے میں بند رہتا تھا، اب اس نے شہر کا رخ کیا ہے۔ بس اب مارا گیا۔

بندو: میاں جان روس مارے ہی مارے۔

میاں جان: (گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا میاں جان وقت ہو گیا۔ ہم چلے۔

(اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(ماسٹر صاحب چلے جاتے ہیں)

میاں جان: اچھا ماسٹر صاحب۔

بندو: میاں جان آج ماسٹر اڑنگے میں آگیا۔

میاں جان: اماں کس کا ذکر کرتے ہو، جاہل آدمی ہے۔

بندو: میاں جان جی یہ نہ کہو ماسٹر نے کتاب بہت پڑھی ہے۔

(بندو حجامت بنا چکا ہے اب اپنا سامان سمیٹتا ہے)

میاں جان: اماں نہیں۔ اپنا غریب ماسٹر کتابوں کے بیچ دب کے رہ گیا۔ علم اسے مچھ دے گیا۔ خود تو اڑن چھو ہو گیا۔ اسے کتابوں میں بند کر دیا گیا۔ (تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے)

بندو: (بقچہ بغل میں داب کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اچھا میاں جان۔

(چلا جاتا ہے)

میاں جان: (آواز دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتے ہیں) کشور بیٹی۔ بیٹی کشور۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(افو کا کمرہ۔ ایک طرف الماری میں کتابیں چنی رکھی ہیں۔ برابر میں رائٹنگ ٹیبل اور کرسی۔ افو بیٹھا لکھ رہا ہے۔ کشور کتابیں ٹٹول رہی ہے۔)

کشور: (بڑبڑاتی ہے) کامیاب زندگی جینے کے اصول۔ صنعتی منصوبہ بندی۔ پاکستانی صنعتوں کے سولہ سال۔ پاکستان کا صنعتی مستقبل (اٹھ کر) افو بھائی آپ ناول جو خرید خرید کر لایا کرتے تھے وہ سب کہاں گئے۔ ایک بھی ناول نہیں رکھا۔ جانے کہاں بہا دیئے۔

افو: کشور، مجھے کام کرنے دو۔ (پھر کچھ لکھنے لگتا ہے)

کشور: (قلم پکڑ لیتی ہے) بس بہت لکھ چکے۔ آپ تو منصوبے ایسے تیار کرتے ہیں جیسے شاعر غزل لکھتے ہیں۔ آپ نے کاروبار کو شاعری بنا دیا۔ اللہ قسم آپ کاروبار کبھی نہیں کر سکتے۔

افو: کشور تمھیں پتہ نہیں کہ میں کیوں... اصل میں میں یہ چاہتا ہوں کہ اب کوئی سلسلہ شروع ہی ہو جانا چاہئے۔ اور پھر۔

کشور: اور پھر؟

افو: کشور... کشور میں نے ایک اسکیم سوچی ہے۔

کشور: کیا؟

افو: تم... میں یہ... اصل میں یہ سوچتا ہوں کہ آدمی کو پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ تو میں یہ چاہتا ہوں کہ... بات یہ ہے کہ اب کوئی سلسلہ شروع ہو ہی جانا چاہئے۔ پھر میں ایک دفعہ میاں جان سے۔ مگر تم... تم۔ (کہتے کہتے جھجک جاتا ہے)

کشور: کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

(کشور بیٹھ جاتی ہے)

افو: کچھ نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میاں جان سے (بات بدلتے ہوئے) ہاں میاں جان سے یہ پلان ڈسکس کر لی جائے۔ بات یہ ہے کہ گلاس کلاتھ انڈسٹری کے لئے تو بہت سرمایہ چاہئے لیکن میں نے ایک پلان بنائی ہے۔ پلاسٹک انڈسٹری کی پلان۔ پلاسٹک انڈسٹری کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں سہولت بہت ہے۔ سرمایہ تھوڑا ہے تو تھوڑے میں شروع کرو، زیادہ ہو تو زیادہ سے شروع کرو۔ اور پھر پلاسٹک کا سامان پاکستان میں۔

کشور: (جھنجھلا کر) اف۔ توبہ۔

افو: (حیران ہو کر) کیا؟

کشور: (جھنجھلا کر) اوہ توبہ ہے بھئی آپ سے۔ حیران ہو کر ایسے تکتے ہیں۔ آپ مجھ سے مذاق کیوں کرتے ہیں۔

افو: میں مذاق کرتا ہوں۔ میں... میں... نہیں۔ کشور تم غلط سمجھتی ہو۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی میں تم سے مذاق نہیں کرتا۔ میں تم سے... میں تم سے مذاق نہیں کرتے۔ میں تم سے مذاق نہیں... م۔ میں تم سے۔

(دونوں کی نظریں ملتی ہیں)

(میاں جان کشور کو آواز دیتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ کشور ان کی آہٹ پاتے ہیں وہاں سے تیزی سے نکلتی جاتی ہے۔)

میاں جان: کشور۔ کشور۔

افو: (گھبرا کر) یہاں تو نہیں ہے۔ کشور یہاں نہیں ہے۔

میاں جان: کہاں چلے جاتے ہیں سب لوگ (بیٹھتے ہوئے) میاں افو اب یہ تم شیخ چلی پنا چھوڑو، کوئی کام کرو۔

افو: میاں جان میں نے سوچا یہ ہے کہ گلاس کلاتھ مل کے لئے بہت سرمایہ چاہئے۔ پلاسٹک انڈسٹری کا معاملہ سیدھا سادا ہے۔ کم خرچ بالانشین۔ یعنی ایک ڈائی۔ ایک بھٹی، چند سانچے، دو مشین کاریگر۔ پھر بعد میں کام کو پھیلا لیں گے۔ میاں جان آج کل ہر چیز پلاسٹک کی بن رہی ہے۔ کل میں نے ایک سگریٹ کیس دیکھا۔ بالکل ہاتھی دانت کا لگتا تھا۔ غور سے دیکھا تو پلاسٹک کا۔ اور پلاسٹک کی چوڑیاں تو عام ہیں اور اب گھریلو چیزوں میں بھی پلاسٹک آ گیا ہے۔۔۔ تو بس ایک ڈائی، ایک بھٹی، چند کاریگر۔ تین ہزار کا خرچ۔ کم خرچ بالانشین۔ میں نے ابھی ابھی حساب لگایا ہے۔ تین ہزار آٹھ سو پچاس۔

میاں جان: ہوں، کام تو اچھا ہے۔ (اٹھتا ہے) مگر تمھارے بس کا روگ نہیں۔

افو: نہیں میاں جان، بات یہ ہے۔

(شاہد داخل ہوتا ہے)

شاہد: میاں جان آداب

میاں جان: آداب۔

شاہد: میاں جان کراچی جا رہا ہوں۔

میاں جان: ہوں۔

(بو جی داخل ہوتی ہے)

بو جی: شاہد میاں اچھے تو ہو؟

شاہد: ممانی جان آداب۔

بو جی: جیتے رہو۔

شاہد: ممانی جان میں کل صبح کی گاڑی سے کراچی جا رہا ہوں۔

بو جی: ارے کبھی ایسے بھی سفر ہوا کرتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاہد: بس اب تو جا رہا ہوں۔

بو جی: بھیا تمھارے انٹرویو کا بھی تو نتیجہ آنا تھا، وہ ابھی نہیں آیا؟

شاہد: ممانی جان وہ معاملہ تو کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ اجی بورڈ والے سخت جاہل ہیں۔ افو بھائی حد ہو گئی۔ میں کہہ رہا ہوں فلابیر، وہ کہہ رہے ہیں فلابرٹ۔ میں نے کہا آندرے ژید وہ کہتے ہیں آندرے گائڈ۔ اور کامیو کام یوں آیا کہ کیموس بن گیا۔ میں سمجھا کہ شاہنامے کا کوئی کردار ہوگا۔ فارسی کی قاموس تو پڑھی نہیں تھی۔ اسے کیکاؤس کا وزیر سمجھ بیٹھا۔ پھر خیال آیا کہ اوہ یہ تو کامیو کا کام تمام ہوا اور "ایبسٹرکٹ آرٹ" تو ان کے...

میاں جان: (غصہ سے بات کاٹتے ہوئے) اجی میں نے کہا کہ آج کھانا وانا نہیں ملے گا۔

بو جی: اے ہے تم نے تو ترپائی لگا دی۔ کشور کھانا اتار تو رہی ہے۔

شاہد: اچھا میں اب چلتا ہوں۔

بو جی: ارے بھیا کھانا کھا کر جانا۔

شاہد: نہیں ممانی جان مجھے اب سفر کا انتظام کرنا ہے۔ آداب۔

بو جی: اللہ کرے کامیاب واپس آؤ۔

(شاہد جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(افو کا کمرہ)

کشور: (بیٹھی ہوئی ہے) پلان پلان یعنی بلائے جان، میں کہتی ہوں کہ آپ آدمی نہیں رہے اچھے خاصے پلاننگ بورڈ بن کر رہ گئے ہیں۔

افو: (انگیٹھی کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے) تم سمجھتی نہیں کشور، بات یہ ہے کہ۔

کشور: (اٹھ کر پاس جا کر) میں سب سمجھتی ہوں، میرے سامنے کیسی باتیں ملاتے ہیں۔ میاں جان کے سامنے جا کر صمن بکمن بن جاتے ہیں اور سر کھجاتے کھجاتے چلے آتے ہیں۔

افو: بات یہ ہے کہ اپنی ساری پلاننگ اب تک کچھ گڑبڑ رہی ہے۔ بس یہی تھی ساری خرابی۔

کشور: (پلٹ کر) گویا اب آپ کی پلاننگ گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اب آپ کو ایک پلان میں بتاتی ہوں۔ آپ منصوبہ نویس بن جایئے۔ کچہریوں میں جیسے عرضی نویس، نقشہ نویس بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ بھی کسی بڑے دفتر کے سامنے صندوقچہ رکھ کر بیٹھ جایئے۔ اور لوگوں کو منصوبے بنا بنا کر دیا کیجیے۔

افو: نہیں کشور اب میں نے ایک پلان بنا لیا ہے۔

کشور: میں پھر پوچھتی ہوں کہ آخر آپ نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔ میاں جان بھی یہی کہتے ہیں۔ بو جی بھی یہی کہتی ہیں کہ آپ کو نوکری کرنی چاہیے مگر آپ پر بھوت سوار ہے کاروبار کا۔

افو: نوکری میں کیا رکھا ہے۔

کشور: مگر آپ کی پلاننگ تو عاقبت میں پروان چڑھے گی۔ (بیٹھ جاتی ہے) اس وقت تک۔ آپ کے لئے تو پلان سب کچھ ہے۔

افو: کشور یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ کہ جب تک آدمی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو اس وقت تک اس کا کیا منہ ہے ایسی بات کرنے کا۔

کشور: اور اپنے پیروں پر اس لئے کھڑا ہونا نہیں چاہتے کہ آپ کو یہ بات کرنی نہ پڑ جائے۔

افو: اف کشور تم، مجھے کتنا غلط سمجھتی ہو۔

کشور: میں آپ کو سب سمجھتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ مجھ سے۔ آپ مجھے بناتے ہیں۔ (رونے لگتی ہے)

(رائٹ ڈاؤن اسٹیج آ کر)

افو: کشور۔ کشور۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

کشور: ہاں ہاں میں خوب سمجھتی ہوں آپ مجھ سے۔ آپ کو میرا ذرا بھی تو خیال نہیں افو۔

افو: کشور (خاموشی) کشور۔ کشور میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میاں جان سے بات کر ہی لوں گا۔ بات یہ ہے کہ میری پلان یہ تھی کہ شاہد کا پتہ کٹ جائے۔ سو کٹ گیا ہے۔ پلان یہ تھی کہ بڑی بوا کی بات نہ چلے۔ سو وہ بھی اب نہیں چلے گی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اپنے کاروبار کی پلان چلے اور اس کے بعد میں یہ بات کروں۔

کشور: اس کے بعد یعنی قیامت میں۔

افو: اچھا تو پھر میاں جان سے میں ایک دفعہ بات کئے ہی لیتا ہوں۔ پہلے اپنی پلان بتاؤں گا پھر... ہاں بس آج ہو جائے گی بات۔

(ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا منظر

پہلے والا کمرہ

بو جی: (موڑھے پر بیٹھتی ہے) میں یہ کہتی ہوں کہ یہ معاملہ بیچ میں کب تک لٹکا رہے گا۔ بڑی بوا نے ترپائی لگا رکھی ہے۔ اور بھئی وہ بھی بچی ہیں۔ وہ کب تک انتظار کریں۔ جواب تو دینا ہی چاہیے۔ ہاں میں یا نہ میں۔

میاں جان: (حقہ پیتے ہوئے) ہوں۔

بو جی: اے ہے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہوں، ہوں، ہوں کر کے چپ ہو جاتے ہیں۔

میاں جان: تم میرا دماغ مت چاٹو جو جی میں آئے کرو۔ (حقہ پینے لگتے ہیں)

بو جی: اے لو یہ اور نئی بات ہوئی۔ تمہاری اولاد نہیں ہے کیا۔ یہ بھی خوب رہی کہ جو جی میں آئے کرو۔ میری دونوں طرف سے آفت ہے۔ بڑی بوا سارا الزام مجھ پر ڈال دیں گی کہ بھیا تو راضی تھا۔ بھاوج نے نہ ہونے دی۔ نہ میں جواب نہ دوں۔ تم ان کے بھائی وہ تمہاری بہن۔ تم جانو وہ جانیں۔

میاں جان: تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟

بو جی: میں کیا چاہتی۔ اچھا لڑکا ہو اور کماؤ ہو۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہئے۔ ڈوبی کمپنی کی نوکری میں کیا رکھا ہے۔ نہ پیسہ نہ عزت۔ ٹوٹا برتن کٹھیرے کے سر۔ جب تک ڈپٹی کلکٹری کی امید رہی تو ڈپٹی صاحب کے پاس گھس گھس کے جاتی تھیں۔ ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ آتے ہی انھوں نے صاف جواب دے دیا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر سچے ہیں۔ آخر دیکھ بھال ہی کے کریں گے۔ آنکھیں بند کر کے تو کوئی بھی بیٹی کو دھوکا نہیں دے دیتا۔

میاں جان: اجی ڈپٹی صاحب کی بھلی کہی، سنکی ہیں۔ وہی بادلوں کا خاندان ہے نا۔ بیرسٹر صاحب کی طرح دماغ نہیں چلا ہے بس۔ مگر سنک تو ہے۔ ایسے حسب نسب والا انھیں کہاں سے مل جائے گا۔ نہ سہی ڈپٹی کلکٹری، کمپنی کی ملازمت بھی تو ماشے اللہ معقول ملازمت ہے۔

بو جی: اجی رہنے بھی دو۔ خاک معقول ملازمت ہے۔ ایسی ملازمت کا کیا ہے، چلتے پھرتے مل جاتی ہے۔ کلمے محمد کی قسم میں کراچی چلی جاؤں تو مجھے مل جائے۔ میں کہتی ہوں کہ کم تنخواہ کی ہو مگر سرکاری نوکری ہو۔ ڈوبی پکی تو ہوتی ہے۔ مہینے کے مہینے تنخواہ ملتی ہے۔ خدا تمھارا بھلا کرے، بھتہ ہے اور پھر اوپر کی آمدنی۔ رہنے کو کوارٹر ملتا ہے، ترکاری مفت کی اور بعد میں پھر پنشن ہے۔ ڈوبی کمپنی کی نوکری کیا ہے سیٹھ کی مرضی پر ہے۔ جب تک خوش ہے، تو نوکری بھی ہے۔ ناخوش ہوئے تو نکال باہر کیا۔ بڑی بوا کو دیکھو کیسی شیخیاں بگھارتی ہیں۔ ''میرے پوت کو ایک ہزار روپیہ مہینے تنخواہ ملے ہے۔ انگریزی کمپنی میں نوکر ہے۔'' ڈپٹی کلکٹروں کو تو ایک ہزار ملتی نہیں ہے۔ ڈوبی کمپنی کی نوکری نہ ہوئی وائسرائے گیری ہو گئی۔

میاں جان: بھئی آخر امریکی فرم ہے اور پھر وہ ماشے اللہ ایم۔ اے۔ ہے۔ تبھی تو نائب منیجری مل گئی۔ ایک ہزار پیٹ ہی لیتا ہوگا۔

بو جی: ہاں بس پیٹ ہی لیتا ہوگا۔ تنخواہ ایک ہزار نہ ہوگی خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا پر عقل سے تو پہچانا ہے۔ چاہے تمھارے امریکا ہی کا کیوں نہ ہو۔ کوئی سیٹھ ایسا بھولا نہیں ہوتا کہ ایک ایک ہزار روپیہ تنخواہوں میں بانٹتا پھرے۔ کوئی بیچ میں سے باندھ لے تو یہ اور بات ہے۔ خیر بھئی ہمیں ان باتوں سے کیا۔ کسی کو کچھ ہی ملا کرے۔ میں تو یہ کہوں ہوں کہ بڑی بوا میری لونڈیا کو اچھی طرح نہیں رکھیں گی۔ بہت خدمت لیں گی۔ اور رہا لڑکا تو مجھے وہ بھی چھچھورا سا لگتا ہے۔ ماں بیٹے دونوں شیخیاں تو ایسی مارتے ہیں کہ اللہ توبہ۔ ممانی جان میں نے بورڈ والوں کو ایسا جواب دیا کہ بس چپ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ ارے بھیا، باادب بانصیب۔ بورڈ والے ہوں یا محلے والے، بزرگوں کے سامنے ہمیشہ سر جھکا کر بات کرنی چاہئے۔ مگر نہ بی بی وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔

میاں جان: حرام خور سے میں نے بہت کہا کہ اپنے آدمی کے جامے میں رہ۔ بڑا آیا ہے کہیں سے فرانسیسی سید بن کے۔ بیرسٹر صاحب کا جو حال ہوا وہ ہوگا تیرا بھی مگر صاحب انگریزی کے رسیے نے ہماری بات سنی ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا۔ ڈپٹی کلکٹر بن جاتا تو ہر وقت انگریزی کی ٹانگ توڑا کرتا۔ اب کمپنی کی نوکری نخنے ڈھیلے کر دے گی۔

بو جی: خیر ہمیں اس سے کیا، میں تو یہ کہوں ہوں کہ جب کوئی عہدہ ہی نہیں ہے تو ہم کیوں اپنی لڑکی کی جان ضیق میں ڈالیں۔ لڑکوں کی ہمیں ایسی کی تھوڑا ہی ہے۔ ماشے اللہ ایک لڑکا تو گھر ہی میں بیٹھا...

(افو داخل ہوتا ہے)

افو: میاں جان میں نے ایک پلان تیار کی ہے۔

میاں جان: ہوں۔ پھر لے آئے پلان۔ میاں پلان ولان کب تک بناتے رہو گے آدمی بنو اور کوئی کام کرو۔

افو: میاں جان میں نے بس ایک آخری پلان بنائی ہے۔ اب کے زیادہ پیسے کا معاملہ ہی نہیں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ آدمی کو لمبا چوڑا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہئے۔ مختصر سا کام شروع کر کے مثلاً چوڑیوں کا کام ہے۔ اب اس میں کوئی لمبا چوڑا خرچ نہیں ہے۔ ایک بھٹی، چند سانچے اور چند کاریگر۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار کا خرچ ہے۔ ہاں یہی کوئی ایک ہزار آٹھ سو بیالیس روپیہ کا۔

میاں جان: تو گویا تم منہار بنو گے۔

افو: نہیں میاں جان یہ تو انڈسٹری ہے۔

بو جی: ارے بھیا چوڑیاں بناؤ گے تو منہار ہی کہلاؤ گے۔ تم کہا کرو کہ انڈسٹری ہے۔ لوگوں کا منہ کون بند کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ میاں جان نے بھتیجے کو اچھا پروش کیا کہ منہار کے کام پر لگا دیا۔

افو: چچی جان منہار کی دکان تھوڑی کھولی جا رہی ہے۔ وہ تو چوڑیوں کا کارخانہ ہوگا۔

بو جی: ارے بھیا میں یہ کہوں ہوں کہ تم پڑھے لکھے ہو اور ایسا بھی نہیں کہ کوئی ذریعہ نہ ہو۔ ڈوبے کارخانوں میں کیا رکھا ہے۔ سرکاری نوکری کیوں نہیں کرتے۔ اور میں کہتی ہوں آدمی کام بھی کرے تو عزت کا کرے۔ ڈوبا وہ الاسٹک بلاسٹک تم کیا کہہ رہے تھے۔ اس کا کارخانہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ چوڑیوں کا کام ہم تمھیں نہ کرنے دیں گے۔

افو: بات یہ ہے چچی جان کہ پلاسٹک کی انڈسٹری رقم مانگتی ہے۔

بو جی: بیٹا رقم کی وجہ سے خاندان کی عزت تو خاک میں نہیں ملائی جائے

اور رقم کا کیا ہے۔ آدمی کا ارادہ ہونا چاہئے۔ باقی اللہ پر چھوڑ دے۔ مگر میاں جان نے یہ سوچا ہے کہ... یہ پلان... بات یہ ہے کہ میں... میں...

(بڑی بوا داخل ہوتی ہیں)

بڑی بوا: اری بی بی ذرا دیکھو تو سہی یہ کیا چیز ہے۔

بو جی: بڑی بوا یہ کیا چیز ہے؟

بڑی بوا: اے بی بی میں کیا جانو تم تمہارا شاہد روز ایک پارسل بھیج دیوے ہے۔ ارے بیٹی کشور دیکھو یہ کیا چیز ہے۔ اے کشور کہاں گئی۔

(کشور داخل ہوتی ہے)

کشور: بڑی بوا آداب۔

بڑی بوا: جیتی رہو، کڑوے نیم سے بڑی ہو، چندا سا دولھا ملے۔ بیٹی ذرا دیکھ تو سہی یہ کیا چیز ہے۔ مجھے تو اوزار سے لگے ہیں۔

(بڑی بوا ڈبا کشور کو پکڑاتی ہیں کشور اسے کھولتی ہے)

کشور: بڑی بوا کانٹے ہیں یہ۔ ان کے ساتھ چمچے اور چھریاں بھی تو ہوں گی۔

بڑی بوا: اری ہاں وہ بھی ہیں۔ بیٹی تجھے یقین نہ آئے گا۔ اتنے بڑے بڑے چمچے۔ اور اتنی بہت سی چھریں۔ میں نے کہا کہ بیٹا مجھے ترکاری کے لئے ایک چھری بہتیری تھی، ڈھیر ساری چھریاں کیا کروں گی۔ مجھے کیا قصائی کی دکان کرنی ہے اور ساتھ میں تکلے بھیج دیئے۔ تو کہوے ہے کانٹے ہیں تو بی کانٹے ہی ہوں گے۔

کشور: بڑی بوا شاہد بھائی نے آپ کو چھری کانٹے بھیجے ہیں۔ اب آپ چھری کانٹے سے کھایا کریں۔

بڑی بوا: اے لو ج، میں کیوں کھاتی چھری کانٹے سے۔ میرے گلے پہ کوئی چھری رکھ دے تو بھی چھری کانٹے سے نہ کھاؤں۔ میں تو اب اسے لکھ بھیجوں گی کہ بیٹا یہ سوغاتیں بھیجنے بند کرو۔ بی بی تمہارے شاہد کا ایسا ہاتھ کھلا ہے کہ میں جانوں ساری تنخواہ سودا سلف میں ہی بہا دیوے ہے۔ روز ایک پارسل آجاوے ہے۔ بھلا میں یہ سامان کہاں سنگھواتی پھروں۔ میں نے اسے لکھ دیا ہے کہ بیٹا تمہارا گھر بار سنبھالنا میرے بس کا نہیں ہے۔ اپنا گھر آباد کرو۔ تو بی بی میں تو یہ کہوں ہوں کہ اب شاہد کا جلدی سے بیاہ کر دوں۔

(کشور طوطے کے پنجرے کے پاس جا کر طوطے سے بات کرنے لگتی ہے)

کشور: حق اللہ، پاک ذات اللہ، نبی کا خدا رسول۔ تو غافل نہ ہو، خدا کو نہ بھول، جگ جگ جیا کرو، دودھ بتاشے پیا کرو۔

بو جی: ہاں بیاہ تو ہونا ہی چاہئے۔ اور بڑی بوا یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ بھیا آج کل کے زمانے میں اتنی فضول خرچی اچھی نہیں ہے۔ بڑی بڑی تنخواہوں والوں کے ہاتھ تنگ ہو رہے ہیں۔ ہماری تمہاری کیا بساط ہے۔ ایسے اللے تللے خرچ کریں گے تو کاہے کو پاٹھا بندھے گا۔

بڑی بوا: اری بی بی تنخواہ تمہارے شاہد کی بھی ماشاء اللہ معقول ہے۔ ایک ہزار روپیہ مہینہ ملے ہے۔ کیا کسی ڈپٹی کلکٹر کی تنخواہ ہوگی۔ میں تو کہے ہوں کہ اچھا ہی ہوا کہ ڈپٹی کلکٹری نہ ملی۔ اللہ کو ہماری بہتری منظور تھی۔ بی بی ڈپٹی کلکٹری کا تو اب نام ہی نام ہے۔ پہلے ڈپٹی کلکٹر ضلعے کا حاکم ہووے تھا۔ اب تو بخت مارا سڑک کا روڑا ہے۔ اور کراچی کے بڑے دفتر میں پیش کاری کرے ہے اور بی بی اگلے زمانے کی ڈپٹی کلکٹری کی بھی یہ ہے کہ اپنے ڈپٹی صاحب کو دیکھ لو۔ ٹھساوہ کہ الٰہی توبہ۔ گھر کی حالت یہ ہے کہ ڈوبی میز کرسیاں سب کرائے کی ہیں۔ بیچارہ کرسیوں والا روز تقاضے کو آوے ہے۔ اور روز یہی ہووے ہے کہ آج دیویں کل دیویں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بھرم بھاری، پٹارہ خالی، تو کسی نے مثل کہی، ڈپٹی صاحب نے اصل کر دی۔

میاں جان: بڑی بوا تو ڈپٹی صاحب کا میرے سامنے ذکر نہ کیا کر۔ اوچھے لوگ ہیں۔ یہاں کے کئی معزز لوگوں نے پوچھا کیوں صاحب آپ بھی تو وہیں کے ہیں۔ آپ بتایئے یہ لوگ اپنے آپ کو فرانسیسی سید بتاتے ہیں۔ ہاں کہو تو مشکل، نہیں کہو تو مشکل۔

بڑی بوا: میں یہ کہوں ہوں کہ اگر فرانسیسی سید بھی ہو تو اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو کسی سے نہیں کہتے کہ ہم سید ہیں بلکہ ہمارا تو شجرہ بھی تھا۔ ابا جی کہا کرتے تھے اب سے دور جب تمہارا غدر پڑا تھا تو بادشاہ نے چلتے چلتے ہمارے پردادا کو ایک رقعہ لکھ کر دے دیا۔ ہمارے پردادا نے کیا کیا وہ رقعہ اور شجرہ دونوں نیفے میں اڑس لئے اور دلی میں سے نکل پڑے۔ رستے میں جاٹ گوجر ٹوٹ پڑے۔ اس افراتفری میں رقعہ اور شجرہ دونوں کھو گئے۔ وہ رقعہ ہوتا تو آج ہم رئیس ہوتے۔ تو بی بی ہم تو غدر کے مارے ہوئے ہیں۔ خدا خدا کر کے اب امن کی صورت دکھائی دی ہے۔ بی بی میں نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ شاہد نوکر ہو گیا۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ اب حسرت یہ ہے کہ چاند سی دلہن گھر میں آوے۔

بو جی: آمین۔

بڑی بوا: میری بہو، خدا سے توبہ کر کے کہتی ہوں سونے میں تلے گی۔ تو اب تمہارے شاہد نے اللہ رکھو موٹر بھی خرید لی ہے۔

بو جی: (اٹھ کر تخت پر بڑی بوا کے پاس بیٹھ جاتی ہے) موٹر؟

بڑی بوا: ہاں بی بی اس نے موٹر خرید لی ہے۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ بیٹا اب کے چھٹی پر آوے ہے تو موٹر میں بیٹھ کے آئیو۔ میاں جان

اب تمھارا شاہد بالکل بدل گیا ہے۔ کراچی کے یتیم خانے میں اس نے پانچ سو روپیہ چندہ دیا تھا۔ ہمارے شاہد کی ایسی دھوم ہوئی کہ اخبار والوں نے اخبار میں یہ خبر چھاپ دی۔

میاں جان: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کمپنی کی نوکری بے ایمان کی عقل درست کردے گی۔ مجھ سے کہتا ہے کہ میاں جان میں معجزے کو نہیں...

بڑی بوا: اجی اب معجزے کو مانے ہے۔ میں نے اسے خط میں لکھا بیٹا رات مجھے بشارت ہوئی ہے کہ مجھے مرتبہ ملے گا میں نے خواب میں دلدل دیکھا ہے۔ اللہ کی قسم ایک بندر ہوا اڑہ ہوا تھا کہ نوکری مل گئی۔ اب وہ آجائے تو نیاز دلاؤں گی۔ تمھارا شاہد ایک مہینے کی چھٹی پہ آرہا ہے۔ اس نے گلبرگ میں زمین کے لئے خط و کتابت کی ہے۔

بو جی: (حیرت سے) گلبرگ میں۔

بڑی بوا: اری بی بی میں نے اسے بہتیرا منع کیا مگر اس نے کہا کہ مکان بناویں گے تو گلبرگ میں ہی بناویں گے۔ میں نے کہا بھئی جیسی تمھاری مرضی میرا کیا ہے۔ میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں بس یہ چاہوں ہوں تمھارے سہرا بندھا دیکھ لوں۔ بی بی میرے ایک بچہ ہے، میں چاہوں ہوں کہ خاندان میں رہے۔ میں نے اس سے بھی کہہ دیا ہے کہ بیٹا خاندان میں رہ ہی کون گیا ہے ایک تمھارا اماموں ہے۔ میں چاہوں ہوں کہ بھیا سے مل جاؤں۔ کہیں اور کا تو نے نام لیا تو قرآن کی قسم زہر کھالوں گی۔ (افو داخل ہوتا ہے) بی بی آج میں اس کا جواب لے کے جاں گی۔

(افو حیران و پریشان بو جی و میاں جان کی صورتیں تکتا ہے۔)

بو جی: (اٹھ کر درمیان میں) ہم کیا جواب دیں۔ بیٹا بھی تمھارا ہے بیٹی بھی تمھاری۔ تمھیں اختیار ہے۔

(افو سر جھکا کر نکل جاتا ہے)

بڑی بوا: (مسرت آمیز لہجہ میں) اللہ کی قسم میں نے کشور کو اپنی بیٹی سمجھ کے پالا ہے۔ میں نے میاں جان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کشور کو مجھے دے دو۔ میں تمھارے پاس اسے چھوڑوں گی نہیں۔

بو جی: بڑی بوا کشور پہلے بھی تمھاری تھی اب بھی تمھاری ہے۔

بڑی بوا: تو بی بی انتظام کرلو۔ ماسٹر کراچی جاتے وقت میرے پاس آئے کہ شاہد کو کچھ کہلوانا ہے تو میں نے اسے پہلے ہی کہلوا دیا ہے کہ ان چھٹیوں میں تیری تاریخ مقرر کردوں گی اور ماسٹر صاحب سے بھی کہہ دیا ہے کہ اسے اونچ نیچ سمجھا دیجیو اور موٹر میں اس کے ساتھ بیٹھ کے کراچی سے آئیو۔

(دستک۔ بندو آواز دیتا ہے)۔ میاں جان صاحب۔

میاں جان: بندو خاں آگیا (بو جی کی طرف دیکھتے ہوئے کن رہی ہو۔ بندو۔ ذرا پردے میں چلی جاؤ (بو جی اور بڑی بوا چلی جاتی ہیں) اماں بندو (آواز دیتے ہوئے) بندو خاں آجاؤ۔ (بندو داخل ہوتا ہے)

بندو: میاں جان صاحب سلام۔

میاں جان: کہو کیا حال ہے؟

بندو خاں: میاں جان جی۔ سپوتنک مار مانجھے نے اپنا کباڑا کردیا۔

میاں جان: اماں کیا ہوا؟

بندو: جی اسکیم فیل ہوگئی۔

میاں جان: اماں نہیں۔

بندو: اللہ قسم میاں جان جی، کام میدے نے چوپٹ کیا۔ میں نے میدے والے سے کہہ دیا تھا کہ یار کھانے کے لئے نہیں لے جارہا ہوں، لگدی کے لئے ہے۔ نخالص میدہ دینا۔ میاں جان جی پیٹ تو سالا عمر عیار کی زنبیل ہے۔ اس میں جو ڈال دو، ٹھیک ہے، پر مانجھا تو پیٹ کی آنت نہیں ہے۔ جب لگدی بنی تو میں نے کہا کہ ابے بندو اسپوتنک مار مانجھے کی لگدی تو نہیں ہے یہ۔ تو میاں جان اسکیم فیل ہوگئی۔

(افو داخل ہوتا ہے)

میاں جان: میاں افو تم کیا ذکر کررہے تھے۔ اماں اسکیم تو اچھی ہے۔ مگر تم گدھے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ پھر...

افو: میاں جان اپنی پلان فیل ہوگئی۔

میاں جان: مجھے پتہ تھا۔

بندو: میاں جان جی افو میاں میری نہیں سنتے۔ میں نے ایک ایسی اچھی اسکیم بنائی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا ہی آئے۔

میاں جان: اماں تمھاری اسکیمیں بھی بس ہوائیں ہوتی ہیں۔

بندو: نہیں میاں جان میں نے انھیں بس ایسا کام بتایا ہے کہ اس میں سو فیصدی فائدہ ہی فائدہ ہے۔ آپ کو پتہ ہے جی کہ اب کے ریزر بلیڈ والوں کو حکومت نے امپورٹ لائسنس نہیں دیا ہے اور یہاں کے بلیڈ بنانے والے الٹے استرے سے حجامت کررہے ہیں۔ تو جی لوگ اب دیسی استرے خرید رہے ہیں۔ اور استروں کا یہ ہے جی کہ انگریزی استرا تو بازار میں ملتا نہیں۔ پاکستان میں جو استرا بنا ہے وہ یہاں کے بلیڈ سے بھی زیادہ کنڈم ہے۔ تو میں نے افو میاں سے کہا کہ استروں کا کارخانہ کھول لو۔ بس یہ سمجھ لو کہ استروں کے کام میں آج کل چاندی ہے۔

میاں جان: اماں نہیں۔

بندو: تو پھر میاں جان دوسری اسکیم یہ ہے کہ انھیں کراچی بھیج دو۔ کراچی میں بڑا کام ہے۔ بوا کو دیکھ لو۔ یہاں کسی شریف آدمی نے اس سے خط نہیں بنوایا۔ میں نے بہت کہا کہ ابے کبوتروں کے پروں

میں کب تک قینچیاں لگا دے گا... بالوں میں قینچیاں لگانا بھی سیکھ لے مگر اس نے میری سن کر نہیں دی۔ یاں تو اسے کبوتر اڑاتے اڑاتے دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ کراچی جو گیا تو وہاں پر باربر یونین نے اسے امریکا بھجوا دیا۔

میاں جان: امریکا؟ اماں نہیں۔

(افو آہستہ سے باہر نکل جاتا ہے)

بندو: قسم اپنے سر کی۔

میاں جان: مگر کیسے؟

بندو: جی ہماری یونین والوں نے امریکہ سے کہا تھا کہ پاکستان کے باربر امریکہ جانے چاہئیں امریکہ کے باربر پاکستان آنے چاہئیں۔ اس پہ دونوں ملکوں کی دوستی پکی ہو جائے گی۔ (بندو سامان سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اچھا میاں جان سلام۔

میاں جان: سلام (بندو جاتا ہے۔ آواز دیتے ہوئے) کشور کی ماں ابھی سنو تو سہی۔

(بو جی داخل ہوتی ہے)

بو جی: میں نے ٹھیک کہا نا؟

میاں جان: (بڑے میاں آئینہ دیکھتے ہیں) بڑی بوا آ گئیں۔

بو جی: ہاں ابھی گئی ہیں۔ مجھے بلا گئی ہیں کہ شاہد کا بھیجا ہوا سامان دیکھ جاؤ۔ ابھی میں نے سوچا کہ آخر بچپن کی لگی ہوئی ہے اور دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ ماشاءاللہ کمانے بھی لگا ہے۔ اب بھی ہمارے لئے کوئی آسمان سے تو اترے گا نہیں۔ اور بڑی بوا کو بھی بات ہے کشور سے انس بہت ہے۔ اب آگے لڑکی کی تقدیر ہے۔ ماں باپ کا فرض تو یہی ہے کہ دیکھ بھال کے رشتہ کریں۔

میاں جان: کشور کہاں گئی؟

بو جی: میں نے اس سے کہا کہ ذرا ہنڈیا دیکھ لے۔ میں ذرا بڑی بوا کی طرف ہو آؤں۔ نہیں تو برا مان جائیں گی۔

(بو جی برقعہ اوڑھنے لگتی ہیں)

میاں جان: ذرا جلدی آنا۔

بو جی: اے ہے مجھے کون سا بیٹھ جانا ہے وہاں۔ الٹے پاؤں آؤں گی۔

(بو جی چلی جاتی ہیں)

میاں جان: (آواز دیتے ہوئے) کشور۔ بیٹی کشور۔

کشور: جی میاں جان۔

(کشور داخل ہوتی ہے)

میاں جان: بیٹی میں نہا لوں۔ پانی گرم ہے۔

کشور: جی پانی گرم ہے۔

میاں جان: (غور سے دیکھتے ہوئے) بیٹی تیری صورت اتری اتری کیوں ہو رہی ہے۔ کیا بات ہے؟

کشور: جی میاں جان۔ کچھ نہیں صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔

میاں جان: تو بیٹی دوا کھا لی ہوتی۔ دیکھو میز کی دراز میں گولیاں رکھی ہیں۔ ایک گولی لے لو۔

(کشور نکل جاتی ہے۔ افو داخل ہوتا ہے)

افو: جی میاں جان۔

میاں جان: اماں کہاں جا رہے ہو؟

افو: جی شہر میں ایک میٹنگ ہے ذرا وہاں جا رہا تھا۔

میاں جان: اچھا۔ اماں وہ تمھاری پلان جو تھی نا۔

افو: میاں جان وہ۔ پلان فیل ہو گئی۔

میاں جان: اماں فیل ویل نہیں ہوئی۔ تم اس کا حساب کتاب کرو۔ دیکھو کچھ رقم کا بندوبست ہو ہی جائے گا۔

افو: میاں جان اس شہر میں کام چلے گا نہیں۔ اصل میں کراچی جانا ہی پڑے گا۔ بزنس کراچی ہی میں ہے۔

میاں جان: ہاں ہاں ہے تو کراچی ہی میں بزنس۔ اب شاہد کو دیکھو اس کے کے بس کا کیا تھا۔ سوائے قینچیاں بگھارنے کے۔ کراچی میں اس کو بھی کام مل گیا۔ مگر پھر بھی یہاں بھی کام ہو سکتا ہے۔

افو: جی۔ جی۔

(کشور داخل ہوتی ہے۔ افو کو اداس نظروں سے دیکھتی ہے۔ افو اسے دیکھتا ہے اور باہر جانے لگتا ہے)

میاں جان: اچھا سوچ لو۔

افو: جی اچھا۔ (باہر چلا جاتا ہے)

میاں جان: کشور کیسی ہے طبیعت، گولی کھائی؟

کشور: جی ٹھیک ہے اب تو کچھ۔

میاں جان: کپڑے نکالے؟

کشور: جی نکال رہی ہوں۔

میاں جان: اچھا جاؤ تم آرام کرو۔ میں نکال لوں گا۔

(کشور کا جانا اور بو جی کا آنا)

میاں جان: (گھبرائی ہوئی) ابھی سنا تم نے کچھ... میرا دل تو پہلے ہی نہیں ٹھکتا تھا۔ مگر میں نے کہا بھئی گھر کا معاملہ ہے۔ ایسا تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔

میاں جان: مگر۔ ہوا کیا؟ (مونڈھے پر بیٹھ جاتے ہیں اور حقہ کی نے منہ میں لیتے ہیں۔)

بو جی: ہوا خاک پتھر۔ تمہارے لاڈلے بھانجے امریکہ جا رہے ہیں۔

میاں جان: تو پھر کیا ہوا؟

بو جی: پھر کیا ہو گیا؟ ذرا ماسٹر صاحب کے پاس جا کر پوچھو کیا ہو گیا۔

ماسٹر صاحب نے شادی کا ذکر کیا تو اس نے جواب دیا کہ فی الحال تو میں کمپنی کی طرف سے ٹریننگ کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔ اس کے بعد شادی کی دیکھی جائے گی۔ اور یوں بھی پردے دار لڑکی سے شادی کی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آیا ہے بڑا کہیں کا انگریز بن کے۔ میری لڑکی کو اس نے سمجھا کیا ہے۔ اس کے لئے میں اپنی لڑکی کا پردہ چھڑا دوں گی کیا۔ خاک بھوبھل اس کے منہ میں۔ میں پہلے ہی کہتی تھی یہ لڑکا چیلا ہے۔ یہاں تو خیر تھوڑی بہت روک ٹوک رہی تھی۔ وہاں اسے روکنے ٹوکنے والا کون ہے جو جی میں آئے گا کرے گا۔ اور جیب میں پیسہ ہے جو نہ کرے وہ تھوڑا ہے۔ بڑی بوا سر پکڑ کے روئیں گی۔ اب وہ ان کے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔ گھر میں کوئی رنڈی منڈی ڈال لے گا۔

میاں جان: میں نے بڑی بوا سے پہلے ہی کہا تھا کہ تیرے بیٹے کے لچھن برے ہیں۔ تجھے خوش نہیں کرے گا۔

بوجی: مگر میں یہ کہتی ہوں کہ ہماری لڑکی کیوں بدنام ہو۔ آنے دو بڑی بوا کو۔ اب تک تو میں نے لحاظ میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اب میں انھیں مزا چکھا دوں گی۔ انھوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ جب لڑکے پر ان کا اختیار نہیں تھا تو انھوں نے کیوں ہماری بچی کا نام لیا۔

(چھالیا کترتے ہوئے)

اجی میں نے کہا کہ بولتے کیوں نہیں ہو؟

میاں جان: کیا بولوں؟

بوجی: یہ بھی خوب رہی کہ کیا بولوں۔ تمھیں خبر بھی ہے کہ کتنی بدنامی ہوگی۔ اور ہوگی کیا ہو رہی ہے۔ ایسی بات کوئی چھپی رہے ہے۔ کم بخت نے ماسٹر صاحب کی زبانی پیغام بھیجا ہے۔ برادری میں نہ پھیلتی ہو تو پھیل جاوے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اجی میں پوچھوں ہوں کہ اب کیا ہوگا۔

میاں جان: میں کیا بتاؤں۔ تم نے کیا ہے تمھیں بھگتو۔

بوجی: میں نے کیا ہے؟

میاں جان: اور میں نے کیا ہے؟ میں تو اس بے ایمان کو جانتا تھا کہ یہ کسی کا نہیں ہوگا۔ اب امریکہ جا رہا ہے۔ وہاں سے فرانسیسی سید بن کے آئے گا۔ حشر اس کا وہی ہونا ہے جو بیرسٹر صاحب کا ہوا۔

بوجی: اس منہ جلے کا کچھ بھی حشر ہو، ہمیں اس سے کیا۔ میں یہ کہتی ہوں کہ ہماری لڑکی کا اب کیا ہوگا؟

میاں جان: (اوپر اشارہ کرتے ہوئے) وہ مسبب الاسباب ہے۔

بوجی: اجی ایسے کام نہیں چلا کرتا۔

میاں جان: پھر کیسے چلتا ہے؟

بوجی: میں کہتی ہوں اب کوئی دوسرا بندوبست فوراً ہونا چاہئے۔

میاں جان: بتاؤ کیا بندوبست کروں؟

بوجی: میں یہ کہوں ہوں کہ لڑکی کا رشتہ باہر سے تو اب آئے گا نہیں اور چند دن گذر گئے تو لڑکی تھک جائے گی اور ساری برادری میں ہمیشہ کے لئے ناک کٹ جائے گی۔

میاں جان: تو پھر ہو کیا؟

بوجی: اجی میری تو یہ رائے ہے کہ اب جو کچھ بھی ہے اللہ کا نام لے کے انو سے اس کا کلمہ پڑھا دو۔ گھر کا لونڈا ہے۔ گھر کی بات گھر ہی میں رہے گی اور بھئی اسے تجارت کی بہت لگ رہی ہے۔ تھوڑا سا پیسہ دے کے کوئی کام شروع کرا دیں گے۔

میاں جان: ہوں۔

بوجی: مگر میں کہتی ہوں کہ کام چٹ پٹ ہونا چاہئے۔ تمھاری اس ہوں ہاں نے لڑکی کی ریڑھ لے لی۔ تم تو ہوں ہاں ہی کرتے رہو گے۔ کہاں ہے انو۔ میں اسے لاتی ہوں۔ اسے میرے سامنے سمجھاؤ۔

میاں جان: سنو تو سہی۔

(بوجی عجلت میں نکل جاتی ہیں۔ میاں جان ٹپٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ بوجی فوراً واپس آتی ہیں)

بوجی: انو کہاں گیا۔ کمرے میں تو نہیں ہے۔

میاں جان: شہر میں کوئی میٹنگ ہے وہاں گیا ہے۔

بوجی: مگر اس کے کمرے سے تو سامان بھی اٹھا ہوا ہے۔ نہ بستر ہے، نہ سوٹ کیس ہے۔

میاں جان: ہاں! (حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے)

(دروازے پر دستک۔ بندو کی آواز۔ میاں جان صاحب)

میاں جان: بندو ابھی تو گیا تھا۔ پھر کیوں آیا ہے۔ ذرا اندر تو جاؤ (بوجی جاتی ہیں) اماں بندو آؤ۔

(بندو داخل ہوتا ہے)

میاں جان: اماں کیا بات ہے؟

بندو: جی مجھے انو میاں ملے تھے۔

میاں جان: اچھا؟

بندو: کہہ رہے تھے ایک بزنس کی بات آ پڑی ہے۔ فوراً کراچی جا رہا ہوں۔ میاں جان کو جا کے بتا دیجیو۔ میاں جان جی انو میاں نے میری اسکیم مان لی۔ کراچی میں بھی بہت کام ہے۔ میں نے اسے کہا کہ انو میاں کراچی سے مجھے سنند جھاگ بھیج دیجیو۔ یہاں تو مرفی والے سنند جھاگ میں بھی ملاوٹ کرتے ہیں۔ میاں جان میں سپوتنک مار مار جھابنا کے رہوں گا۔

میاں جان: (بڑبڑاتے ہیں) اب وہاں جا کے خراب ہوگا۔ اچھا میاں بندو۔

بندو: (حیران ہوکر) جی میاں جان جی (یکا یک لہجہ بدل کر) میاں جان جی میں نے انھیں سمجھایا تھا۔ پر وہ میاں جان۔ اچھا میاں جان جی۔ (بندو چلا جاتا ہے۔ بوجی گھبرائی ہوئی آتی ہیں)

بوجی: اجی یہ کیا کہہ رہا تھا بندو؟

میاں جان: کہہ رہا تھا کہ اثو کراچی چلا گیا۔

بوجی: کراچی چلا گیا۔ (جیسے سکتہ میں آگئی ہوں۔ وقفہ سوچتے ہوئے) اور تم تو کہہ رہے تھے کہ میٹنگ میں گیا ہے۔

(خاموشی)

میاں جان: مجھ سے وہ یہی کہہ گیا تھا۔

بوجی: (طنزیہ لہجہ میں) تو یہ کہو تم نے اسے جانے دیا۔

میاں جان: میں نے؟

بوجی: اور میں نے... (وقفہ)... مگر کراچی میں وہ ٹھہرا کہاں ہوگا۔ اس کا پتہ کہاں سے لیا جائے گا؟

میاں جان: ٹھہرتا کہاں... دھکے کھاتا پھرے گا.. (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب وہاں خراب ہوگا۔

(خاموشی۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ)

(بڑبڑاتے ہوئے) اب دوسرے شہر میں جا کر ٹھوکریں کھائے گا۔

(خاموشی۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ)

بوجی: (درد بھرے لہجہ میں) تم نے میری بچی کی ریڑھ لے لی...

(خاموشی۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ)

...میں نے جو تدبیر کی اسے ملیامیٹ کر دیا۔

(بوجی اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ میاں جان خاموش آنکھیں جھکائے حقہ پیتے رہے ہیں۔ وقفہ۔ کشور اداس اداس داخل ہوتی ہے۔ میاں جان اسے دیکھتے ہیں پھر حقہ پینے لگتے ہیں۔)

میاں جان: (بڑبڑاتے ہوئے) اب وہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ (حقہ ایک طرف کرکے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کشور سے) اچکن۔

(کشور اچکن لا کر پہناتی ہے۔ میاں جان چھڑی اٹھاتے ہیں۔ چلتے چلتے مڑ کر کشور کو دیکھتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ کشور خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ پنجرے کی طرف جاتی ہے۔)

کشور: (ڈبھتی ہوئی آواز میں) حق اللہ پاک ذات اللہ۔ نبی تو خدا کا رسول۔ تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول۔ جگ جگ جیا کرو۔ دودھ بتاشے پیا کرو۔ بی بی کا مٹھو۔ میاں کا مٹھو۔ اثو بھائی آئیں گے دودھ بتاشے لائیں گے۔ اثو...(رو پڑتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

☆☆☆

اردو کا ابتدائی زمانہ

شمس الرحمٰن فاروقی

کی

تاریخ ساز کتاب

جو ہندو پاک میں کئی بار شائع ہو چکی ہے اور انگریزی میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نئی دہلی نے شائع کی ہے، اب اس کا ہندی ترجمہ راج کمل پرکاشن نئی دہلی بہت جلد منظر عام پر لا رہا ہے۔

اردو کا ابتدائی زمانہ
Early Urdu Literary Culture
and History
उर्दू का इब्तिदाई ज़माना

شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۳
سے حاصل کریں

انتظار حسین

شمارہ ۹۰
مئی جون ۱۹۷۴ء

ودیا ساگر چپ ہو گیا تھا۔ اس نے بھکشوؤں کو اونچی آوازوں سے بولتے سنا، لڑتے دیکھا اور وہ چپ ہو گیا۔ سنتا رہا، دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ پھر ان کے بیچ سے اٹھ اور نگر سے باہر نگر باسیوں سے دور ایک شال کے پیڑ کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ گیا اور کنول کے ایک پھول پر نظریں جمائے جو پھولا، مسکایا اور مرجھا گیا۔ ایک پھول کے بعد دوسرا پھول، دوسرے پھول کے بعد تیسرا پھول۔ جس پھول پہ وہ درشٹی جماتا وہ پھولتا، مسکاتا اور مرجھا جاتا۔ یہ دیکھ کے اس نے شوک کیا اور آنکھیں موند لیں بیس دن آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

دنوں بعد بیتے دنوں کے سنگھی سندر سمدر اور گوپال اس کے پاس آئے اور بولے کہ "ہے ودیا ساگر ہم دکھ میں ہیں۔"

ودیا ساگر پرشانت مورتی بنا بیٹھا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ گوپال دکھی آواز میں بولا۔ "کیسا اندھیر ہے کہ جنھیں نہیں بولنا چاہئے وہ بہت بول رہے ہیں اور جسے بولنا چاہئے وہ چپ ہو گیا ہے۔"

اور سندر سمدر بولا۔ "سو بھدرا نے کہا اور انھوں نے کیا۔ سو بھدرا نے کہا تھا کہ تتھاگت اب ہمارے بیچ نہیں ہے۔ وہ سدا ٹوکتا رہتا تھا کہ یہ کرو اور یہ مت کرو۔ اب جو ہمارے جی میں آئے گی وہ ہم کریں گے۔ ہے ودیا ساگر، اب سب بھکشو وہی کرتے ہیں جو ان کے جی میں آتی ہے۔ اور ان کا جی ترشنا کے جنگل میں ہے۔ گھاس کا بستر انھوں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کھاٹ پہ سوتے ہیں اور جاجم پہ بیٹھتے ہیں۔ ہے گنی ہے گیانی تو کیوں نہیں بولتا۔"

ودیا ساگر نے آخر کو آنکھیں کھولیں۔ سندر سمدر اور گوپال کو غور سے دیکھا۔ پوچھا "بندھوؤ تم نے طوطے کی جاتک سنی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر سنو۔" ودیا ساگر سنانے لگا۔ "بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا اور ہمارے بدھ دیو جی نے طوطے کے روپ میں جنم لیا تھا۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے سے تھے کہ ایک چڑی مار نے انھیں پکڑا اور بنارس کے ایک برہمن کے ہاتھ انھیں بیچ دیا۔ برہمن نے دونوں طوطوں کو ایسے پالا جیسے اولاد پالتے ہیں۔ ایک بار برہمن کو پردیس جانا پڑا اور جاتے ہوئے طوطوں سے کہہ گیا کہ مٹھوؤ تنک اپنی ماتا کا دھیان رکھنا۔

برہمن کے جانے کے بعد وہ ناری کھل کھیلی۔ چھوٹے طوطے نے اسے ٹوکنے کے لئے پر تولے۔ بڑے نے کہا کہ بندھو تو بیچ میں مت بول۔ پر چھوٹا نہ مانا اور ناری کو ٹوک بیٹھا۔ اس چاتر ناری نے بھولی بن کر کہا کہ اچھا اب میں کوئی پاپ نہیں کروں گی۔ تو نے ٹوک دیا اچھا کیا۔ باہر آ تجھے پیار کروں۔ وہ بھولا باہر آ گیا۔ ناری نے جھٹ اس کی گردن مروڑ دی۔

جب دنوں بعد برہمن واپس آیا تو اس نے بڑے سے پوچھا کہ میاں مٹھو تمھاری ماتا نے میرے پیچھے کیا کیا۔ طوطا بولا کہ مہاراج جہاں کھوٹ ہو وہاں بدھیمان چپ رہتے ہیں کہ ایسی اوستھا میں بولنے میں جان کا کھٹکا ہے۔

طوطے نے یہ کہہ کر جی میں سوچا کہ جہاں بول نہیں سکتے وہاں جینا اجیرن ہے۔ وہاں چلو جہاں بول سکو۔ پر پھڑپھڑائے، برہمن سے کہا کہ مہاراج ڈنڈوت، ہم چلے۔ برہمن نے پوچھا کہ میا مٹھو کہاں چلے۔ بولا کہ

وہاں جہاں بول سکیں۔ یہ کہہ کے بدھ ستو جی بنارس کی بھری بستی کو چھوڑ جنگل کی اور اڑ گئے۔"

یہ جاتک سنا کر ودیا ساگر شال کے پیڑ کے نیچے سے اٹھ آگے چل پڑا۔ چلتا رہا، چلتا رہا۔ کالے کوسوں جا کر ایک نرجن بن میں باس کیا۔ سندر سمر اور گوپال بھی ہر مرج کھینچتے پیچھے پیچھے وہاں پہنچے۔

ودیا ساگر تین دن تین رات بیر اسن مارے، آنکھیں مونڈے بے کھائے پئے بیٹھا رہا۔ چوتھے دن سندر سمر اور گوپال اپنے اپنے بھکشا پاتر لے کر بولے کہ "ہے ودیا ساگر کیا تتھاگت نے نہیں کہا تھا کہ پیٹ بھرنے کے لئے کھاؤ اور پیاس بجھانے کے لئے پیو۔"

یہ سن کر ودیا ساگر نے آنکھیں کھولیں۔ جو سامنے رکھا تھا اسے کھایا ایسے جیسے اس میں کوئی سواد نہ ہو اور ندی کا نرمل جل پیا ایسے جیسے وہ گرم پانی ہو۔ پھر کہا کہ مٹی کو مٹی میں ارپن کیا۔

سندر سمر نے یہ موقع اچھا جانا اور کہنے لگا کہ "ہے ودیا ساگر، بھکشو ست پتھ سے پھر گئے ہیں۔ تتھاگت کے بتائے ہوئے نیموں کا پالن نہیں کرتے۔ پیڑ کی چھاؤں چھوڑی، چھتوں تلے اونچی کھاٹوں پہ آرام کرتے ہیں۔ ایک سنگھ کے اندر کتنے سنگھ بن گئے اور کتنی منڈلیاں پیدا ہو گئیں۔ ہر منڈلی دوسری منڈلی کی جان کی بیری ہے۔ تو پلٹ چل اور انھیں شکشا دے کہ تو ہمارے بیچ گنی اور گیانی ہے۔"

"نہیں۔"

ودیا ساگر بولا کہ "ہے سندر سمر تو نے مینا کی جاتک سنی ہے؟"

"تو سن۔ اگلے جنم کی بات ہے کہ بنارس میں راجہ برہم دت براجتا تھا اور ہمارے بدھ دیو جی مینا کے جنم میں جنگل میں بس کرتے تھے۔ ایک پیڑ کی گھنی ٹہنی میں ایک سندر گھونسلہ بنایا اور اس میں رہنے سہنے لگے۔ ایک بار بہت ورشا ہوئی۔ ایک بندر بھیگتا ہوا کہیں سے آیا اور اسی پیڑ پہ مینا کے گھونسلہ کے برابر بیٹھ گیا۔ پر یہاں بھی وہ بوندوں سے بھیگ رہا تھا۔ مینا بولی کہ "ہے منو، ویسے تو تو آدمی کی بہت نقالی کرتا ہے مگر گھر بنانے میں اس کی نقالی کیوں نہیں کرتا؟ آج تیرا گھر ہوتا تو ورشا سے یہ تیری دردشا کیوں ہوتی۔" بندر بولا کہ "بیناری مینا۔ میں نقل کرتا ہوں پر عقل نہیں رکھتا۔" مگر پھر بندر نے یہ کہنے کے بعد سوچا کہ مینا اپنے گھر میں بیٹھی باتیں بنا رہی ہے۔ اس کا گھر نہ ہو اور میری طرح بھیگے، پھر دیکھوں کیسے باتیں بناتی ہے۔ یہ سوچ کے اس نے مینا کے گھونسلے کو کھسوٹ ڈالا۔ بدھ ستو جی اس موسلا دھار مینھ میں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ انھوں نے ایک گاتھا پڑھی جس کا تت یہ ہے کہ ہر ایرے غیرے کو نصیحت کرنا مفت میں مصیبت مول لینا ہے۔ یہ گاتھا پڑھتے وقت وہ اس جنگل سے بھیگتے ہوئے دوسرے جنگل کی اور اڑ گئے۔"

ودیا ساگر نے یہ جاتک سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ "بدھ دیو جی نے بندروں کے ساتھ کیا کیا اور بندروں نے بدھ دیو جی کے ساتھ کیا کیا۔" پھر یہ جاتک سنائی۔

بنارس کے راج سنگھاسن پر برہم دت براجتا تھا اور بدھ دیو جی نے بندر کا جنم لے کے جنگل بسایا ہوا تھا۔ بڑے ہو کر وہ ایک موٹے تازے بندر ہوئے اور راجہ کے آموں کے باغ میں بسنے والے بندروں کے راجہ بنے۔ ایک بار آموں کی رت میں راجہ باغ میں آیا اور بندروں کو دیکھ کر بہت کلسا کہ وہ آموں کا ناش کر رہے ہیں۔ اپنے پارتھیوں سے کہا کہ باغ کے گرد گھیرا ڈالو اور ایسے تیر چلاؤ کہ کوئی بندر بچ کے نہ جائے۔

بندروں نے یہ بات سن لی۔ بدھ ستو کے پاس گئے اور پوچھا کہ "ہے بندر راجہ بتا اب ہم کیا کریں۔ بدھ ستو جی نے کہا کہ چنتا مت کرو۔ ابھی اپائے کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک ایسے پیڑ پہ چڑھے جس کی ٹہنیاں گنگا کے پاٹ پہ دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پاٹ پہ پھیلی ہوئی آخری ٹہنی سے دوسرے کنارے چھلانگ لگا کے فاصلہ ناپا اور اس ناپ کا ایک بانس توڑ کر دریا پار کی ایک جھاڑی سے باندھ پاٹ کے اوپر سے آم کی ٹہنی تک لانے کا جتن کیا۔ پر ناپ میں تھوڑی سی چوک ہو گئی۔ بانس اور ٹہنی کے بیچ ان کے دھڑ برابر فاصلہ رہ گیا۔ بدھ ستو جی نے کیا کیا کہ بانس کے کونے کے ساتھ اپنی ایک ٹانگ باندھی اور اگلے ہاتھوں سے آم کی ٹہنی پکڑی، بندروں سے کہا کہ لو میں پل بن گیا ہوں۔ تم میرے اوپر سے ہو کے بانس پہ جاؤ۔ بانس پہ سے گنگا پار کود جائے۔"

باغ میں گھرے ہوئے اسی ہزار بندر بدھ ستو جی کی پیٹھ سے سبج سبج گزرے یہ سوچ کے کہ انھیں دکھ نہ پہنچے۔ پر بندروں میں دیودت بھی تھا۔ اس نے بھی اس سے بندر کا جنم لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسی جنم میں بدھ کا کام تمام کر دیا جائے۔ وہ اس زور سے بدھ ستو جی کی پیٹھ پہ کودا کہ وہ ادھ موئے ہو گئے۔

راجہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بدھ ستو جی کو اوپر سے نیچے اتارا، گنگا میں اشنان کرا کے زرد بانا اڑھایا۔ سوگندھ لگائی اور دوا دارو پلائی۔ پھر ان کے چرنوں میں بیٹھا اور کہا کہ "ہے بندر راجہ تو اپنی پرجا کے لئے پل بنا۔ پر تیری پرجا نے تیرے ساتھ کیا کیا۔" بدھ ستو جی بولے کہ "ہے راجہ اس میں تیرے لئے ایک شکشا ہے۔ راجہ کو چاہئے کہ پرجا کو دکھی نہ ہونے دے چاہے اس کے کارن اسے جان ہارنی پڑے۔ یہ کہہ کر بدھ ستو جی نے آخری ہچکی لی اور بندر کے جنم سے دوسرے جنم میں چلے گئے۔"

اس جاتک نے ودیا ساگر، سندر سمر اور گوپال تینوں کو دکھی کر دیا۔ انھوں نے شوک کیا کہ تتھاگت نے جگ کو نستارنے کے کارن کتنے جنم لئے اور کیسے کیسے دکھ بھوگے۔ ہر ہر جنم میں دیودت ایسے دشٹ پیدا ہوتے رہے اور تتھاگت کے لئے کٹھنائیاں پیدا کرتے رہے۔ سندر سمر نے پوچھا "ہے ودیا ساگر، کیا دیودت بدھ دیو جی کا بھائی نہیں تھا۔"

"بھائی ہی تھا۔" یہ کہہ کر ودیا ساگر پہلے ہنسا پھر رویا۔

"ہے گیانی تو ہنسا کیوں اور رویا کیوں؟" گوپال نے پوچھا۔

"جب بکری ہنس اور رو سکتی ہے تو میں کہ منش جاتی سے ہوں کیوں ہنس اور رو نہیں سکتا۔"

سندر سمر کو کرید ہوئی۔ "بکری کیوں ہنسی اور کیوں روئی؟"

ودیا ساگر نے جواب میں ایک جاتک سنائی۔ "ہے سنتو، بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا۔ ایک برہمن نے کہ ویدوں کی ودیا میں رچا بسا تھا مردوں کو بھوجن دینے کے دھیان سے ایک بکری خریدی۔ بکری کو اشنان کرایا، گلے میں گجرا ڈالا۔ بکری اپنے بھینٹ کی یہ تیاریاں دیکھ کے پہلے ہنسی پھر روئی۔ برہمن نے پوچھا کہ ہے بکری تو ہنسی کیوں اور روئی کیوں۔ بکری بولی کہ "ہے برہمن اگلے جنم میں بھی برہمن تھی اور میں بھی ویدوں کی ودیا میں ہیری ہوتی تھی اور میں نے بھی ایک بار مردوں کو بھوجن دینے کے لئے ایک بکری لی تھی اور اس کا گل کاٹا تھا۔ ہر ایک بار بکری کا گل کاٹنے کے بدلے میں میرا گلا پانچ سو بار کاٹا گیا۔ آج پانچ سو اکیسویں بار میرے گلے پہ چھری پھرے گی۔ میں یہ دھیان کر کے ہنسی کہ آج آخری بار میرا گلا کٹ رہا ہے اس کے بعد اس دکھ سے میرا نستارا ہو جائے گا۔ اور میں یہ دھیان کر کے روئی کہ میرا گلا کاٹنے کے بدلے میں اب تجھے پانچ سو بار گل کٹانا پڑے گا۔"

برہمن بولا کہ "ہے بکری تو ڈرے مت، میں تیرا گلا نہیں کاٹوں گا۔"

بکری زور سے ہنسی اور بولی کہ "مجھ بکری کا گلا تو کٹنا ہی ہے۔ تیرے ہاتھوں نہیں کٹے گا تو کسی اور کے ہاتھوں کٹے گا۔"

برہمن نے بکری کی سنی ان سنی کی۔ اسے آزاد کیا اور چیلوں سے کہا کہ دیکھو اس کی رکھشا کرو۔ چیلوں نے اس کی بہت رکھشا کی پر ہونی ہو کر رہی۔ اس بکری نے چرتے چرتے ایک پیڑ کی ٹہنی پر منھ مارا۔ وہ پیڑ اس پہ گرا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

ہے سنتو اب سنو کہ اسی پیڑ کے برابر ایک سندر پیڑ کھڑا تھا۔ یہ بدھستو جی تھے جنھوں نے تر ور کے روپ میں جنم لیا تھا۔ انھوں نے ترت تر ور کا جنم چھوڑا اور ہوا کے بیچ آسن جما کے بیٹھے۔ جنتا نے یہ دیکھ اچنبھا کیا اور اکٹھی ہونے لگی۔ بدھستو جی نے اس گھڑی ایک منگل گاتھا پاٹھ کی جس کا ارتھ یہ ہے کہ پرشو ہنسا کا انت دیکھو۔ جو دوسرے کا گلا کاٹے گا ایک دن اس کا بھی گلا کاٹا جائے گا۔"

سندر سمدرا اور گوپال نے یہ جاتک کتھا دھیان سے سنی اور شردھا سے سر جھکا لیا۔ مگر پھر سندر سمدر بولا کہ "ہے گیانی میرا سوال جوں کا توں ہے۔ کیا دیودت بھد دیو جی کا بھائی نہیں تھا۔"

ودیا ساگر بولا "ہے سندر سمدر یہ پرشن مت کر، نہیں تو میں پہلے ہنسوں گا اور پھر روؤں گا۔"

"ہے گیانی تو کیوں ہنسے گا اور کیوں روئے گا؟"

"میں یہ بتا کے ہنسوں گا کہ دیودت ہمارے بدھ دیو جی کا بھائی تھا اور یہ دھیان کر کے روؤں گا کہ وہ بھکشو بھی تھا۔"

سندر سمدر یہ سن کر رو دیا اور بولا کہ "ہے پربھو بھکشوؤں کو کیا ہو گیا ہے۔"

ودیا ساگر نے سندر سمدر کو گھور کر دیکھا۔ "ہے سندر سمدر یہ مت پوچھ۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟"

"مت پوچھ کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ برائی کی کھوج کرتے کرتے انت میں ہمیں اپنا ہی آپا دکھائی دیتا ہے۔"

"کیسے؟"

"یہ ایسے کہ بنارس کے درجہ برہم دت کی رانی کسی دوسرے مرد سے مل گئی۔ راجہ نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا کہ میں کسی پرائے سے ملی ہوں تو میں مرنے کے بعد چڑیل بن جاؤں اور میرا منھ گھوڑی کا ہو جائے۔ اور ایسا ہوا کہ رانی مر کے سچ مچ چڑیل بن گئی اور اس کا منھ گھوڑی کا سا ہو گیا۔ وہ ایک بن میں جا کے ایک کھوہ میں رہنے لگی۔ آتے جاتے کو پکڑتی اور کھا لیتی۔ ایک بار ایک برہمن ٹکشلا سے ودیا پراپت کر کے آ رہا تھا۔ چڑیل اسے کمر پہ لاد کے اپنی کھوہ میں لے گئی۔ پر برہمن جوان تھا۔ جب انگ سے انگ ملا تو چڑیل گرما گئی۔ کھوہ میں لے جا کے اس سے کھیلنے لگی۔ برہمن ودوان تھا، پر جوان بھی تو تھا۔ ودیا اپنی جگہ جوانی اپنی جگہ۔ وہ بھی گرما گیا۔ چوما چاٹی کی اور بھوگ کیا۔ اس بھوگ سے چڑیل کو گر بھ رہا۔ نو مہینے بعد اس نے پتر جنا۔ یہ پتر داستو میں ہمارے بدھ دیو راج تھے جنھوں نے اب کی بار چڑیل کے پتر کے روپ میں جنم لیا تھا۔ بدھ ستو جی نے بڑے ہو کے چڑیل کے چنگل سے نکلنے اور منش جاتی کے بیچ جانے کی ٹھانی۔ چڑیل نے کہا کہ میرے لال تو نے منش جاتی کے بیچ جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو اپنی ماں کی یہ بات سن لے کہ چڑیلوں کے بیچ گذارہ کرنا آسان ہے۔ آدمی کے ساتھ گذارہ کرنا کٹھن کام ہے۔ میں تجھے ایک ٹونکا بتاتی ہوں جو اس دنیا میں تیرے کام آئے گا۔ اس ٹوٹکے کے بل پہ تو آدمی کے پاؤں کے نشان بارہ کھونٹ تک دیکھ سکتا ہے۔

اپنی ماں سے یہ ٹونکا لے کے پوت جا کے سنگ بنارس پہنچا اور اپنا گن بتا کے راجہ کے دربار میں چاکری کر لی۔ درباریوں نے یہ دیکھ کے کھسر پھسر کی اور راجہ سے کہا کہ مہاراج پرکھنا تو چاہئے کہ اس آدمی کے پاس یہ گن ہے بھی یا نہیں۔ راجہ نے اس کی پرکھشا کے لئے کیا کیا کہ خزانے کا مال چوری کیا اور دور جا کے ایک تلیا میں ڈبو دیا۔ دوسرے دن شور مچا کہ خزانے میں چوری ہو گئی۔ بدھستو جی سے کہا کہ چوری کا پتہ لگاؤ۔ بدھستو جی نے جھٹ پٹ پاؤں کے نشان دیکھے اور تلیا سے مال برآمد کر دیا۔

راجہ نے کہا تو نے چوری کا پتہ خوب لگایا۔ پر چور کا پتہ نہ بتایا۔ بدھستو جی نے کہا کہ مہاراج مال مل گیا۔ چور کا پتہ پوچھ کے کیا کرو گے۔ راجہ نہ مانا۔ کہا کہ چور کا پتا بتا۔ بدھستو جی نے کہا کہ ہے راجہ میں ایک کہانی سناتا ہوں۔ تو بدھیمان ہے۔ جان لے گا کہ اس کا ارتھ کیا ہے۔ ایک نرتکار گنگا میں اشنان کرتے ہوئے ڈوبنے لگا۔ اس کی بھار و واج نے یہ دیکھا تو چلائی کہ سوامی، تم تو ڈوب رہے ہو۔ مجھے بانسری بجا کے کوئی دھن سکھا دو کہ میرے پاس کچھ گن آ جائے اور تمھارے بعد میں پیٹ پال سکوں۔ نرتکار ڈبکیاں کھاتے ہوئے بولا کہ اری بھاگوں بھری، میں کیا بانسری بجاؤں اور کیا دھن سناؤں۔ پانی جو جیو جنتو کو طراوٹ دیتا ہے اور مری مٹی میں جان ڈالتا ہے، مجھے مار رہا ہے۔ پھر اس نے ایک گاتھا پڑھی جس کا ارتھ یہ ہے کہ جو میرا پالن ہار تھا وہی میرا جان لیوا بن گیا۔

بدھستو جی نے یہ سنا کے کہا کہ مہاراج راجہ بھی پرجا کے لئے پانی

سمان ہے۔ اگر پالن ہار ہی جان لیوا بن جائے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی پر اسے چین نہ آیا۔ بولا کہ متر کہانی اچھی تھی۔ پر میں تجھ سے چور کی پوچھتا ہوں۔ وہ بتا۔

بدھستو جی نے کہا کہ مہاراج جو میں کہتا ہوں اسے کان لگا کے سنو۔ اور پھر انھوں نے یہ کہانی سنائی تھی۔ بنارس میں ایک کمہار رہتا تھا۔ روز نگر سے نکل کے جنگل جاتا اور اپنے برتن بھانڈوں کے لئے مٹی کھود کے لاتا۔ ایک ہی استھان سے مٹی کھودتے کھودتے ایک گڑھا بن گیا تھا۔ ایک دن اس گڑھے میں اتر کے مٹی کھود رہا تھا کہ آندھی چل پڑی۔ اور اوپر سے ایک تودہ اس پہ گر پڑا۔ بے چارے کا سر پھٹ گیا۔ وہ چلایا اور یہ گاتھا پڑھی کہ جس دھرتی سے کونپل پھوٹتی ہے اور جیو کو چگا ملتا ہے اسی دھرتی نے مجھے کچل ڈالا۔ جو میرا پالن ہار تھا وہی جان لیوا بن گیا۔ اور پھر بدھستو جی نے کہا کہ مہاراج راجہ پرجا کے لئے دھرتی سمان ہے۔ وہ پرجا کو پالتا ہے۔ پر راجہ پرجا کو موسنے لگے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی اور کہا کہ کہانی میری بات کا جواب نہیں۔ تو چور کو پکڑ اور میرے سامنے لا۔ بدھستو جی نے کہا، مہاراج اسی بنارس کے نگر میں ایک جنا تھا۔ ایک بار وہ بہت بھات کھا گیا۔ اس کی ایسی دردشا ہوئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چلاتا تھا اور کہتا تھا کہ جس بھات سے ان گنت برہمنوں کو سکت ملتی ہے اسی بھات نے میری سکت چھین لی۔ اور ہے مہاراج راجہ بھی پرجا کے لئے بھات سمان ہے۔ وہ اس کی بھوک دور کرتا ہے اور سکت دیتا ہے۔ پر اگر راجہ ہی پرجا کا بھات چھین لے تو پرجا کہاں جائے؟

راجہ نے یہ کہانی بھی ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑائی۔ یہ کہا کہ متر مجھے کہانیوں پہ مت ٹرخا۔ چور کا پتا بتا۔ بدھستو جی بولے "مہاراج ہمالہ پہاڑ پہ ایک پیڑ تھا۔ اس میں بہت سی ٹہنیاں تھیں۔ ان ٹہنیوں میں بہت سی چڑیاں بسیرا کرتی تھیں۔ ایک بار دو موٹی ٹہنیوں نے ایک دوسرے سے رگڑ کھائی اور ان سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ یہ دیکھ ایک چڑیا چلائی کہ پنچھیو یہاں سے اڑ چلو کہ جس تر در نے ہمیں شرن دی تھی وہی اب ہمیں جلانے پہ تلا ہے۔ جو ہمارا پالن ہار تھا وہ ہمارا جان لیوا بن گیا اور ہے مہاراج جس پرکار پیڑ چڑیوں کو شرن دیتا ہے اسی پرکار راجہ پرجا کو شرن دیتا ہے۔ پر اگر شرن دینے والا ہی چور بن جائے تو چڑیاں کہاں جائیں؟"

وہ مورکھ راجہ اس پہ بھی کچھ نہ سمجھا۔ وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ چور کا نام بتا۔ بدھستو جی نے ہار کے کہا کہ اچھا سب پرجا کو اکٹھا کرو۔ پھر میں چور کا نام بتاؤں گا۔ راجہ نے ڈونڈی پٹوا کے ساری پرجا کو اکٹھا کر لیا۔ تب بدھستو نے اونچی آواز سے کہا کہ ہے بنارس نگر کے باسیو کان لگا کے سنو اور دھیان دو۔ جس دھرتی میں تم نے اپنا دھن دابا تھا اسی دھرتی نے تمھارا دھن موس لیا۔

لوگ یہ سن کے چونکے۔ انھوں نے تاڑ لیا کہ بدھستو جی نے کیا کہا۔ وہ راجہ پہ پل پڑے۔ پھر اسے ہٹا کے بدھستو جی کو راج سنگھاسن پہ بٹھایا اور ان کی جے بولی۔"

یہ سنتے سنتے سندر سمر اور گوپال دونوں نے اتساہ سے تتھاگت کی جے بولی۔ ودیا ساگر نے دونوں کو دیکھا، یہ جاننے کے لئے ان میں پوچھنے کی سکت ابھی تک ہے یا جاتی رہی۔ پھر کہا کہ "بھکشوؤ، بتانے والا ہمیں تمھیں سب کچھ بتا کے پرلوک سدھارا ہے۔ سو اب کسی سے مت پوچھو اور اپنا دیا آپ بنو کہ امی تابھ نے سدھارتے سمے آنند سے یہی کہا تھا۔"

سندر سمر اور گوپال دونوں تتھاگت کے سدھارنے کا دھیان کر کے دکھی ہوئے اور بولے کہ جس دیئے نے جگ میں جوت جگائی تھی اور ہمیں ڈگر دکھائی تھی وہ دیا بجھ گیا۔ اب سرشٹی میں اندھکار ہے۔ ہم اپنے دیوں کے دھندلے اجالے میں اندھیری چل رہی ہے اور اندھکار بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے ٹمٹماتے دیوں کی لو مندی ہوئی چلی جا رہی ہے۔"

ودیا ساگر نے انھیں ٹوکا اور کہا کہ "سنو تم امی تابھ کے لئے کیسی بات دھیان میں لاتے ہو۔ وہ تو امر جوتی ہیں۔ وہ کیسے بجھ سکتے ہیں۔"

یہ سن کر سندر سمر اور گوپال دونوں اپنی چوک پہ پچھتائے۔ ایک شردھا کے ساتھ امی تابھ کو دھیان میں لائے اور دھرتی سے انبر تک انھوں نے ایک اجالا پھیلا دیکھا۔ ان کی دیہی کانپنے لگی اور آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ودیا ساگر کے سنگ مل کر انھوں نے پرارتھنا کی کہ ہم بھکشو تتھاگت امی تابھ کی ارادھنا کرتے ہیں جو دیو ستھان میں باس کرتے ہیں۔ جہاں ہر سمے ان پہ سوگندھت پھول برستے ہیں۔ ہے آتما روپی، ہے ہمارے شاکیہ منی، ہے ودیا کے ساگر، ہے امی تابھ، ہم تم کو سمان کے ساتھ بلاتے ہیں۔ تم ہمارے استھان میں آ کے باس کرو اور ہمارے اندر جوت جگاؤ۔

پھر وہ چپ ہو گئے۔ پر آنسوؤں کی گنگا دیر تک بہتی رہی۔ پھر انھوں نے ان دنوں کو دیا کیا جب امی تابھ ان کے بیچ موجود تھے اور نگر نگر ڈگر ڈگر کیا بستی کیا جنگل سب جگہ اجالا پھیلایا تھا۔ ودیا ساگر بولا۔ ان دنوں ہم امی تابھ کے سنگ رات رات بھر چلتے تھے، اندھیری راتوں میں گھنے بنوں سے گذرتے تھے، پر کبھی مجھے یہ نہیں لگا کہ اندھیرے میں چل رہا ہوں۔ ڈگر ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے پورنماشی کا چاند نکلا ہوا ہو۔ پیڑ پودے پھول پتے، جانو کہ پوری دھرتی اور سارا انبر اجیارا ہے اور امی تابھ کی جے دھنی کرتا ہے۔"

گوپال سنتے سنتے ان دنوں کو دھیان میں لایا۔ کہنے لگا "سنتو ان دنوں ہم کتنا چلتے تھے۔ نس دن چلتے ہی رہتے تھے کبھی گھنے جنگلوں میں، کبھی چٹیل میدانوں میں اور کبھی بھکشا پاتر لئے نگر نگر گلی گلی۔"

سندر سمر کل سے ترت آج میں آ گیا۔ دکھ سے بولا "اب بھکشوؤں نے چلنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کے پاؤں تھک گئے ہیں، شریر پھیل گئے ہیں اور توندیں پھول گئی ہیں۔"

اس پہ ودیا ساگر نے کہا کہ "بندھو تتھاگت نے کہا تھا کہ جو جیو بہت کھا کھا کے موٹا ہو گیا ہے اور بہت سوتا ہے وہ جنم چکر میں پھنسا رہے گا۔ سوتر کے سمان بار بار پیدا ہو گا بار بار مرے گا۔"

سندر سمر نے کہا "ہے گیانی وہ بہت کھاتے ہیں اور کھاٹ پہ سوتے ہیں اور ناری سے ہنس کے بولتے ہیں۔"

"ناری سے ہنس کے بولتے ہیں؟" ودیا ساگر نے ڈری آواز میں کہا۔

"ہاں پربھو ناریوں سے ہنس کے بولتے ہیں۔ اور میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ خود سنگھ کی بھکشو ناریاں مسکا کے بات کرتی ہیں اور جھانجھن پہنتی ہیں۔"

ودیا ساگر نے آنکھیں موندلیں اور دکھ کی آواز میں بڑبڑایا۔" ہے تتھاگت، تیرے بھکشو تجھ سے پھر گئے۔ میں اس بھوساگر میں اکیلا ہوں۔"

سندر سمر اور گوپال نے بھی آنکھیں موندلیں اور گڑگڑائے۔" ہے تتھاگت ہم اکیلے ہیں اور دکھی ہیں اور ہمارے اردگرد بھوساگر امڈا ہوا ہے۔"

وہ آنکھیں موندے بیٹھے رہے۔ پھر سندر سمر نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ" گوپال تو نے یہ دھیان کیا کہ ہم آج پوری بستی میں پھرے ہیں۔ ہمیں بھکشا میں سب کچھ ملا پر کھیر نہیں ملی۔"

گوپال نے ہاں میں ہاں ملائی" تو نے سچ کہا۔ کھیر ہمیں کسی گھر سے نہیں ملی۔ اور کھیر تو اب کبھی کبھی ہی دیکھنے میں آتی ہے۔"

سندر سمر نے سوال اٹھایا۔" میں پوچھتا ہوں کھیر اب گھروں میں کیوں نہیں پکتی۔ کیا لوگ تتھاگت کو بھول گئے ہیں یا گیوں نے دودھ دینا کم کر دیا ہے۔"

گوپال بیتے دنوں کو یاد کر کے کہنے لگا۔ ان دنوں سب نرناری تتھاگت کے نام کی مالا جپتے تھے اور گیوں کے تھن دودھ سے بھرے رہتے تھے اور گھروں میں کھیر اتنی پکتی تھی کہ گھر باہر والے جی بھر کے کھاتے تھے پھر بھی بچ رہتی تھی۔"

"اور ہم کتنا سواد لے کے کھیر کھاتے تھے۔ سندر سمر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

ودیا ساگر نے گھور کر اسے دیکھا۔" سواد؟ مورکھ، کیا تو سواد لے کے بھوجن کرتا ہے۔"

" نہیں پربھو۔" سندر سمر نے جھینپ کر کہا۔" میں نے بھوجن کبھی سواد لے کے نہیں کھایا۔ سدا یہی دھیان کر کے کھایا کہ مٹی میں مٹی مل رہی ہے اور میں پیٹ بھر رہا ہوں۔ پر جب کھیر آتی تھی تو میرے دھیان میں وہ کھیر آجاتی تھی جو سجاتا نے تتھاگت کو کھلائی تھی اور میرے تالو اور جیبھ کو کچھ ہونے لگتا تھا۔"

ودیا ساگر نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ" بندھو، بھولے مزے کو یاد مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پھر اندریوں کے پھیلے جال میں پھنس جاؤ۔"

دونوں نے کان پکڑے اور کہا" پربھو ہم ہر سواد کو تیاگ چکے ہیں۔ بس تتھاگت کے دھیان میں سواد لیتے ہیں۔"

ایک بار پھر شاکیہ منی ان کے دھیان میں پھر گئے جو اٹھتے بیٹھتے بھکشوؤں کو اپدیش دیتے کہ سنسار اسار ہے اور سنسار کے سواد کھوکھلے ہیں۔ گوپال بولا" سندر سمر، تجھے وہ گھڑی یاد ہے جب تتھاگت نے تجھے ناری سواد کے جال سے نکالا تھا۔"

" ناری سواد کے جال سے؟" سندر سمر نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

" ارے مورکھ تو بھول گیا۔ مجھے وہ سمے آج تک یاد ہے۔ تتھاگت آنکھیں موندے پرشانت مورتی بنے بیٹھے تھے اور ہم پریم اور شردھا سے انھیں تک رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے ہونٹ مسکائے۔ آنند نے پوچھا کہ ہے تتھاگت، مسکانے کا کارن کیا ہوا۔ بولے کہ اس سمے ایک بھکشو کا ناری سے مقابلہ ہے۔"

مقابلہ میں کون جیتے گا؟" آنند نے پوچھا۔

" مقابلہ کڑا ہے۔" تتھاگت بولے۔" ناری چاتر ہے۔ گلے لگتی ہے اور مچل کے نکل جاتی ہے۔ انگ دکھاتی ہے اور چھپ لیتی ہے۔ چھلکتی چھاتیوں کی جھلک دکھاتی ہے پھر اوٹ کر لیتی ہے۔ لہنگا اتارنے لگتی ہے پھر چڑھا لیتی ہے۔"

سندر سمر دھیان سے سنتا رہا۔ اسے اس بیتی گھڑی کی ایسی یاد آئی جیسے سمندر امنڈ کے آتا ہے۔ بولا" گوپال تو نے کب کی بات یاد دلائی۔ ہاں مقابلہ بہت سخت تھا۔ کیا ناری تھی مانو کنول کا پھول۔ میں پہلے اس بستی جاتا تو گلی گلی پھرتا اور کیا چھتری کیا ویش، کیا نردھن کیا دھن وان، ہر چوکھٹ پہ جاکے بھکشا لیتا۔ پر اس کی سندرتا نے مجھے ایسا موہت کیا کہ سب رستے بھولا۔ بس اسی کی چوکھٹ کا ہو رہا۔ روز بھکشا پاتر لئے اس دوارے جاتا اور آواز لگاتا کہ سندری بھکشو کو بھکشا ملے۔ اس چنچل نے مجھ پہ بہت دیا کی اور بہت بھکشا دی: میں نے بہت سواد لوٹا۔ اور ایک دن تو اتنی دیالو بنی کہ میں نے جانا کہ گنگا نہا لوں گا۔ اندر لے جا کر سانکل لگائی اور گود میں پھول کے سمان آپڑی۔ ہے گوپال مت پوچھ کہ کیسی کومل سرل گات تھی، کیا رسیلا سینہ تھا اور کیسے ہرے بھرے کولھے تھے اور پیٹ بالکل ملائی۔ انگ سے انگ ملنے لگا تھا کہ تتھاگت کی مورتی پرکاشت ہوئی۔" سندر سمر ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو گیا۔

" پھر کیا ہوا؟" گوپال نے پوچھا۔

سندر سمر نے مری سی آواز میں کہا۔" پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے باسنا کو مارا اور میٹھی ندی سے بے پیے نکل آیا۔"

سندر سمر نے چپ ہو کر آنکھیں بند کرلیں جیسے دور کے دھیان میں کھو گیا ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ دھیرے سے بولا" اب وہ کہاں ہوگی؟"

" کون؟" گوپال نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

" وہی سندری۔"

" کون جانے کہاں ہو۔"

سندر سمر اٹھ کھڑا ہوا۔ گوپال نے ایک اچنبھے کے ساتھ دیکھا کہ اس کے قدم بستی کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ گوپال پکارا۔" بندھو پلٹ آ۔"

ودیا ساگر خشک آواز میں بولا۔" سندر سمر اب پلٹ کے نہیں آئے گا کہ وہ اب باسنا کے جنگل میں ہے۔"

گوپال چلایا۔" ہے ودیا ساگر ایسا جتن کر کہ وہ باسنا کے جنگل سے نکلے اور پلٹ آئے۔"

ودیا ساگر نے اسی خشک آواز میں کہا۔" ہے گوپال تو اسے بھول جا۔ اپنے آپ کو بچا سکتا ہے تو بچالے۔"

" پربھو میری چنتا مت کر۔ میں بچ ہو ہوں۔"

ودیا ساگر نے اس پر کچھ نہیں کہا۔ چپ رہا۔ پھر زہر بھری ہنسی ہنس کر بولا۔" جو یاں سب سے زیادہ بول رہا تھا وہ سب سے پہلے گیا۔ باسنا اسے ایسے بہالے گئی جیسے باڑھ سوتے گاؤں کو بہالے جاتی ہے۔"

گوپال وِدیا ساگر کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔ "ہے گنی گیانی بولنے میں کیا برائی ہے۔"

وِدیا ساگر کہنے لگا "بندھو، شاید تو نے زیادہ بولنے والے کی جاتک نہیں سنی۔ اچھا تو سن۔ ہمارے بدھ جی مہاراج ایک بار ایک درباری کے گھر جنمے تھے۔ بڑے ہو کے راجہ کے منتری بنے مگر وہ راجہ بہت بولتا تھا۔ بدھستو جی نے من میں وچار کیا کہ کسی پرکار راجہ پر جتایا جائے کہ راجہ کی بڑائی زیادہ بولنے میں نہیں زیادہ سننے میں ہے۔"

اب سنو۔ کہ ہمالہ پہاڑ کی تلی میں ایک تلیا تھی۔ وہاں ایک کچھوا رہتا تھا۔ دو مرغابیاں بھی اڑتی اڑتی وہاں آ گئیں۔ تینوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ پر ایک سمے ایسا آیا کہ تلیا کا پانی سوکھنے لگا۔ مرغابیوں نے کچھوے سے کہا کہ متر ہمالہ پہاڑ میں ہمارا گھر ہے۔ وہاں بہت پانی ہے۔ تو ہمارے سنگ چل۔ وہاں چین سے گذرے گی۔"

کچھوا بولا کہ "مترو میں دھرتی پہ رینگنے والا جانور، بھلا اتنی اونچائی پہ کیسے پہنچوں گا۔"

مرغابیوں نے کہا کہ "اگر تو یہ وچن دے کہ تو زبان نہیں کھولے گا تو ہم تجھے وہاں لے چلیں گے۔"

کچھوے نے چپ رہنے کا وچن دیا۔ مرغابیوں نے ایک ڈنڈی لا کے کچھوے کے سامنے رکھی اور کہا کہ بیچ میں سے اپنے دانتوں سے پکڑ اور دیکھ بولنا مت۔ پھر ایک مرغابی نے اپنی چونچ سے ڈنڈی کا ایک سرا، اور دوسری نے اپنی چونچ سے دوسرا سرا پکڑا اور اڑ گئے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک نگر سے گذرے تو بالکوں نے یہ تماشا دیکھا اور شور مچایا۔ کچھوے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ اگر میرے متروں نے مجھے سہارا دیا ہے تو تم کیوں جل مرے۔ مگر اس نے یہ کہنے کے لئے جیبھ کھولی ہی تھی کہ ٹپ سے زمین پر گر پڑا۔

اب سنو کہ یہ کچھوا جہاں گرا تھا۔ وہ جگہ راجہ کے محل میں تھی۔ محل میں شور مچا کہ ایک کچھوا ہوا میں اڑتے اڑتے زمین پہ گر پڑا ہے۔ راجہ بدھستو کی سنگت میں اس جگہ آیا۔ کچھوے کی درد شا دیکھ کے بدھستو جی سے پوچھا۔ "ہے بدھیمان تو کچھ بتا کہ کچھوے کی یہ گت کیسے بنی؟"

بدھستو جی نے ترت کہا۔ "یہ بہت بولنے کا پھل ہے۔" ور کچھوے اور مرغابیوں کی پوری کہانی سنائی۔ پھر کہا کہ "ہے راجہ جو بہت بولتے ہیں ان کی یہی درگت بنتی ہے۔"

راجہ نے بدھستو جی کی بات پر جی ہی جی میں وچار کیا۔ بات اس کے جی کو لگی۔ اس دن کے بعد سے یہ ہوا کہ وہ کم بولتا تھا اور زیادہ سنتا تھا۔"

یہ جاتک سنا کر وِدیا ساگر نے کہا کہ "بندھو، ہم بھکشو لوگ کچھوے ہیں اور رستے میں ہیں۔ جو بھکشو موقع بے موقع بولے گا وہ گر پڑے گا اور رہ جائے گا۔ تو نے دیکھا کہ سندر سمدر کس بری طرح گرا اور رہ گیا۔"

گوپال کے جی میں یہ بات اتر گئی۔ بولا کہ "کتنے بھکشو ابھی رستے میں تھے کہ گر پڑے اور رہ گئے۔" پھر کہا۔ "اب میں چپ رہوں گا۔"

اور گوپال سچ مچ چپ ہو گیا۔ گیان دھیان کرتا۔ بھکشا لینے بستی جاتا اور کسی سے بات کئے بن واپس آ جاتا۔ پر ایک دن اس بستی کے بیچ اس کے نگر باسی اور بچپن کے متر پربھاکر نے اسے آن پکڑا۔ کہا کہ "ہے متر میں تیرے لئے راج کا سندیش لایا ہوں۔ سن کہ تیرا پتا پرلوک سدھارا۔ اب راج گدی خالی پڑی ہے۔ تیری میا تجھے بلاتی ہے اور تیری سندر استری سولہ سنگھار کئے تیری باٹ دیکھتی ہے۔"

گوپال نے کہا کہ "ہے متر یہ سنسار دکھ کا استھان ہے۔ راج پاٹ موہ کا جال ہے ماتا پتا، استری مایا کا کھیل ہیں۔ ہم بھکشو تتھاگت کے بالک ہیں۔"

یہ کہہ کر بالک مڑ لیا۔ پربھاکر نے پیچھے سے پکارا۔ "متر میں نے تیری بات سنی۔ پھر بھی میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میں تین دن اس بستی میں رہوں گا اور اسی استھان پہ بیٹھ کے تیری باٹ دیکھوں گا۔"

گوپال واپس ہونے کو تو ہو لیا پر بہت بیاکل تھا۔ پربھاکر کی آواز رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ وِدیا ساگر کے پاس آ کے ایسے بیٹھا جیسے پیڑ سے پتا گرتا ہے۔ بولا کہ "ہے گیانی، میں چپ ہوں، پھر بھی گر رہا ہوں۔ ڈنڈی میرے دانتوں سے نکلی پڑ رہی ہے۔ بتا کہ میں کیا کروں؟"

وِدیا ساگر نے کہا "پھول کو دیکھ۔"

گوپال پاس کی ایک جھاڑی کے سامنے آسن مار کے بیٹھ گیا۔ اور ایک پھول کو کہ ابھی ابھی کھلا تھا تکنے لگا۔ تکتا رہا، تکتا رہا۔ پھول مسکاتا رہا۔ پر پھر دھیرے دھیرے رنگ بے رنگ ہوا اور پھول مرجھا گیا۔ گوپال کو جیسے کل آ گئی ہو۔ اپنے آپ سے کہا کہ ہے گوپال سنسار اسار ہے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پر جب بھور بھئے اس نے آنکھیں کھولیں تو اسی ٹہنی پہ ایک اور پھول کھلا ہوا تھا اور اسے دیکھ دیکھ مسکرا رہا تھا۔ کھلے پھول کو دیکھ وہ بیاکل ہو گیا۔ اس کی درشٹی بکھر گئی۔ آنکھیں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں اور اسے یاد آیا کہ آج تیسرا دن ہے۔ وہ تڑک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پاؤں آپ ہی آپ بستی کی طرف اٹھنے لگے۔

وِدیا ساگر اسے جاتے دیکھا کیا اور چپ رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ زہر بھری ہنسی ہنسا، پھر اسے تتھاگت کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ یاترا میں اگر سوجھ بوجھ والا سنگھی ساتھی نہ ملے تو بھلائی اسی میں ہے کہ یاتری اکیلا چلے۔ جنگل میں چلتے ہاتھی کی سمان۔

تتھاگت کی یہ بات یاد کر کے اسے بہت ڈھارس ہوئی۔ اس نے اس پہ وچار کیا اور اسے اس میں بہت گمبھیرتا دکھلائی دی۔ میں نے تتھاگت سے پہلے سنا اور اب جانا کہ جو آدمی مورکھ کے ساتھ چلتا ہے وہ رستے میں بہت دکھ اٹھاتا ہے۔ مورکھ کی سنگت سے یہ اچھا ہے کہ آدمی اکیلا رہے ور اکیلا چلے۔ اس نے یاد کیا کہ سندر سمدر اور گوپال نے اس کے گیان میں کتنی کھنڈت ڈالی تھی۔ وہ بوتے ہی رہتے تھے اور اس کا دھیان بار بار بٹ جاتا تھا۔ اسے لگا کہ کتنے منوں کا بوجھ تھا جو ان کے چلے جانے سے اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ اس نے اب اپنے آپ کو ہلکا ہلکا جانا اور نچنت ہو کر جنگل میں گھومنے لگا۔ وہ کبھی اونچی اونچی گھاس کے بیچ چلا، کبھی کسی بٹیا پہ پڑ لیا۔ کبھی کسی اونچی نیچی ڈگر پہ ہو لیا۔ اس نے ڈال ڈال پات پات کو دیکھا۔

پھولوں کو مسکاتے اور ٹہنیوں کو لہراتے دیکھا۔ ندی کنارے چلتے ہوئے شیتل دھارا کا شور سنا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سارا سنسار آنند سنگیت سے بھر گیا اور پھولوں کی سگندھ جل تھل میں رچ بس گئی ہے۔ اور اس نے جانا کہ اسے وستو گیان مل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ آتم گیان اپنی جگہ مگر آدمی کو وستو گیان بھی ملنا چاہئے۔

وستو گیان میں مگن اور آنند سے بھرپور وہ ڈگر ڈگر چلتا رہا، دیکھتا رہا، سنتا رہا، چھوتا رہا، سونگھتا رہا۔ اسی چلنے پھرنے میں اسے ایک پیڑ دکھائی دیا۔ "ارے یہ تو املی کا پیڑ ہے۔" وہ ٹھٹک گیا۔ اسے اچنبھا سا ہوا کہ اس نے کتنے دنوں سے اس جنگل میں باس کر رکھا ہے مگر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ یاں املی کا پیڑ بھی ہے۔ پھر اسے یہ دھیان کر کے اچنبھا ہوا کہ اپنے نگر سے نکلنے کے بعد وہ کتنے بنوں میں مارا مارا پھرا ہے اور کتنے پیڑوں کی چھاؤں میں بسیرا کیا ہے مگر کبھی املی کا پیڑ دکھائی نہ دیا۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا یا ان بنوں میں املی کا پیڑ ہوتا ہی نہیں۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس کا دھیان پیچھے کی طرف گیا۔ املی کا اونچا گھنا پیڑ، کمان کی سمان لمبی لمبی گدریں، تیرتی اترتی طوطوں کی ڈاریں۔ جاڑوں کی رت میں بھور بھئے طوطوں کی کتنی لمبی لمبی ڈاریں شور کرتی آتیں اور اس پیڑ پہ اترتیں۔ میں نے اس کے بعد بہت بن دیکھے پر کبھی ایسا بھرا پیڑ نہیں دیکھا اور کبھی کسی پیڑ پہ اتنے طوطے ترتے نہیں دیکھا۔ اور پھر اس پیڑ کے ساتھ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بہت کچھ یاد آیا۔ آس پاس پھیلے ہوئے اونچے نیچے مٹی میں اٹے ہوئے رستے۔ ان پر دوڑتی گرد اڑاتی تھیں۔ پیڑوں پہ دوڑتی گلہریاں، گرگٹ، اس کا جی لے کر گلہری کے پیچھے بھاگنا، گلہری کا اچک کر پیڑ پہ چڑھنا، ٹہنی پہ جا کر دو ننھی ننھی ٹانگوں پہ کھڑے ہو کر اسے دیکھنا اور پھر پتیوں میں چھپ جانا۔ کسی بھٹ میں سے دو سوئیوں جیسی زبان کے ساتھ ایک لال لال منہ کا اچانک دکھائی دینا اور اوجھل ہو جانا اور اس کے سارے بدن میں ڈر کی ایک لہر کا سرسرانا اور ہاں کو بھی، اسی پیڑ تلے شام کے جھٹپٹے میں وہ اس سے ملی تھی، ایسے جیسے ندی ساگر سے ملتی ہے۔ پہلے ہونٹ ملے، پھر وہ ڈالی کی طرح کی لچکتی ننگی باہیں اس کے گردن کے گرد گئیں اور آن کی آن میں وہ دونوں شام کے جھٹپٹے سے رات کے اندھیرے میں چلے گئے۔ یہ دھیان کرتے کرتے اس کے اندر ایک مٹھاس گھلتی چلی گئی مانو اس نے سوم رس پیا ہو۔ "وستو گیان" اس نے من ہی من میں کہا اور ایک آنند میں ڈوب گیا۔

اس اوستھا میں وہ کتنی دیر رہا پھر بیاکل ہو گیا۔ اور اس نے سوچا کہ سب بھکشو پیڑوں کی چھاؤں سے نکل کر چھتوں کے نیچے چلے گئے اور کھاٹوں پہ سونے لگے اور ناریوں سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے لگے اور وہ اکیلا بن میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ سب پلٹ کر اپنے اپنے استھان پر چلے گئے۔ میں کیوں اپنے پیڑ سے دور ہوں۔ پیڑ کی یاد اس کے لئے بلاوا بن گئی۔

جنگل سے نکلتے نکلتے وہ ایک دم سے ٹھٹکا۔ ایک پر سیلھ مورتی اس کے دھیان کا رستہ کاٹ رہی تھی۔ وہ اپدیش جسے وہ بھول ہی گیا تھا کہ ہے بھکشوؤ اپنے وچاروں کی دیکھ بھال رکھو اور اگر تم برائی کے رستے پر پڑ جاؤ تو اپنے آپ کو وہاں سے ایسے نکالو جیسے ہاتھی دلدل سے نکلتا ہے۔ اس نے آگے اٹھتے ہوئے پاؤں کو روکا اور ایسے پلٹا جیسے ہاتھی دلدل سے نکلتا ہے۔

وہ ایک پچھتاوے کے ساتھ پلٹ کر آیا اور پیپل کے پیڑ تلے بیراسن مار کر بیٹھ گیا۔ وہ پچھتایا۔ یہ سوچ کر کہ وہ کھلتے پھولوں اور بہتی ندی کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ کیا تتھاگت نے نہیں کہا تھا کہ بھکشوؤ ہنسنا مسکانا کس کارن اور خوشی کس بات کی کہ سنسار تو دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس نے جانا کہ یہ سنسار اگنی کنڈ ہے۔ ہر چیز جل رہی ہے۔ پھول، پتے، پیڑ، بہتی ندی اور اس کی اپنی درشٹی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دنوں بیراسن مارے، آنکھیں موندے، گم سم بیٹھا رہا۔ پر اسے شانتی نہیں ملی۔ اس کا دھیان بار بار بھٹکتا اور املی کے پیڑ کی طرف چلا جاتا۔ نراش ہو کر وہ اٹھا اور شانتی کی کھوج میں ایک لمبی یاترا کی۔

ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں، دوسرے جنگل سے تیسرے جنگل میں چلتے چلتے اس کے تلوے خونم خون ہو گئے اور پاؤں سوج گئے اور ٹانگیں دکھنے لگیں۔ آخر کو وہ اروبلو کے جنگل میں جا نکلا۔ کھوج کھوج کر کے وہ بودھی ورم کے پاس گیا۔ اس اونچے گھنے برگد کو دیکھا جو ایک دیوتا سمان پیڑوں کے بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس پیڑ کے نیچے بیراسن مار کر بیٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر بنتی کی کہ ہے شاکیہ منی ہے تتھاگت ہے امی تابھ۔ یہ بھکشو تیرا کھوا ہے اور رستے میں ہے۔" آنکھیں موند لیں اور بڑبڑایا۔ "شانتی، شانتی، شانتی۔"

بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ دن بیتتے چلے گئے اور وہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ دھیرے دھیرے شوک اس کے جی سے دھل گیا۔ من میں آنند کی ایک کونپل پھوٹی اور دھیان میں ایک ہرا بھرا پیڑ ابھرا۔ وہ پیڑ وہی املی کا پیڑ تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جانا کہ اس نے بھید پا لیا ہے۔ یہی کہ ہر نر ناری کا اپنا جنگل اور اپنا پیڑ ہوتا ہے۔ دوسرے جنگل ڈھونڈنے والے کو کچھ نہیں ملے گا، چاہے وہ بودھی ورم ہی کیوں نہ ہو جو ملے گا اپنے جنگل میں اپنے پیڑ کی چھاؤں میں ملے گا۔

یہ بھید پا کر ودیا ساگر نے جانا کہ اس نے گیان کی مایا پالی اور چلا اپنے پیڑ کی اور۔ پر اروبلو کے جنگل سے نکلتے نکلتے ایک بھاؤنا نے اس کے پیڑ پکڑ لئے ہے ودیا ساگر یہ دانتوں میں ہے یا دانتوں سے چھوٹ گئی ہے۔ اس دبدا میں اس کا ایک پاؤں اروبلو کے جنگل میں تھا اور دوسرا پاؤں اپنے پیڑ کی طرف اٹھا ہوا تھا اور اگنی کنڈ میں چاروں اور آگ دہک رہی تھی ☆☆☆

انتظار حسین

شمارہ ۱۲۴
مارچ تا مئی ۱۹۸۲

مدن سندری کتنی خوش تھی کہ دیوی نے اس کی سن لی، نہیں تو بھیا اور پتی دونوں ہی کو وہ کھو بیٹھی تھی۔ بھیا جب سدھارنے لگا تو اس نے خود بلائیں لیں۔ گوپی نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعا دی، دعا لی اور چلا گیا۔

گوپی کے چلے جانے کے بعد بھی مدن سندری دیوی کے گن گاتی رہی۔ دھاول اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ دونوں نے مل کر دیوی کی اس آن بان کو یاد کیا کہ برہما، وشنو اور اندر سب کی سیوا میں لگے رہتے ہیں، اور وہ بھی اپنے بھگتوں پر کتنی کرپا کرتی ہے کہ جب کسی بھگت پر بپت پڑتی ہے تو وہ ترت وہاں پہنچ اسے سنکٹ سے نکالتی ہے۔

بس انھیں باتوں میں دن بیت گیا۔ رات ہوئی اور دن بھر کی تھکی ہاری مدن سندری سونے کے لئے دھاول کے سنگ آلیٹی۔ آج اس کی باہوں میں جسے اس نے کھو کر پایا تھا کتنی چاہت کے ساتھ آئی تھی۔ اور آج ہی اسے ان باہوں میں سکون نہیں ملا۔ وہ بدن آج اسے انجانا لگ رہا تھا۔ وہ حیران کہ آج اس کے بدن کو کیا ہو گیا ہے۔ اس بدن کو تو اس کا بدن خوب پہچانتا تھا۔ جب دونوں بدن ملتے تو کیسے مکمل مل جاتے۔ جیسے جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اور وہ ہاتھ کیسی جانکاری کے ساتھ گورے گرم بدن کے بیچ یاترا کرتا جیسے اس کے سب بھیدوں کو اس نے بوجھا ہوا ہے۔ اور اس بجلی بھرے ہاتھ کے چھو جانے سے انگ انگ میں ایک لہر دوڑ جاتی۔ اور پورا بدن جاگ جاتا پر آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بدن ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔ اور وہ ہاتھ جیسے آج پہلی مرتبہ اس بدن کے بیچ اترا ہو۔ مدن سندری وسوسے میں پڑ گئی۔ کیا یہ وہی بدن نہیں جس سے روز لگ کر وہ سویا کرتی تھی۔ پھر اتنا انجانا پن کیوں۔ اپنے وسوسے سے وہ بہت لڑی۔ اپنے آپ کو دیر تک وہ روکتی رہی پھر ایک دفعہ بے قابو ہو بول پڑی۔ "یہ تو نہیں ہے۔" اور اس کی باہوں سے نکل اٹھ بیٹھی۔

دھاول حیران کہ مدن سندری کو کیا ہو گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے تو۔ یہ میں نہیں ہوں۔"

"نہیں یہ تو نہیں ہے۔" زبان ایک دفعہ کھل گئی تو بس کھل گئی۔

سندری ہوش کی دوا لے۔ میں اگر میں نہیں ہوں تو پھر کون ہوں۔ یہ کہتے ہوئے دھاول اٹھا، چراغ جلایا۔ چراغ ہاتھ لے مدن سندری کے پاس بیٹھا۔ اور بولا۔ "لے دیکھ لے۔ بول یہ میں نہیں ہوں۔"

مدن سندری نے چراغ کی روشنی میں پتی کو دیکھا اور ایسے بولی جیسے اپنے کہے پر شرمندہ ہو۔ "ہاں ہے تو یہ تو ہی۔"

"اچھی طرح دیکھ لے پھر بعد میں کسی سندیہہ میں پڑ جائے۔ تو خوب دیکھ لے۔" دھاول بھی اب اسے زچ کرنے پر اترا ہوا تھا۔

وہ زچ ہو گئی۔ "ہاں تو ہی ہے۔" پر یہ کہتے کہتے اس کی نظر دھاول کے ہاتھوں پر جا پڑی۔ چونک کر بولی۔ "پر یہ ہاتھ؟"

"ان ہاتھوں کو کیا ہوا؟"

مدن سندری نے دھاول کی بات سنی ان سنی کی۔ ان ہاتھوں کو تکتی رہی۔

"دھاول، یہ ہاتھ تیرے نہیں ہیں۔"

"پھر کس کے ہیں؟" اس نے جل کر کہا۔

پھر کس کے ہیں، یہی تو وہ سوچ رہی تھی۔ یہ ہاتھ انجانے تو نہیں ہیں مگر دھاول کے بھی نہیں ہیں۔ پھر کس کے ہیں۔ اسی آن ایک دم سے گوپی کا سراپا اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ "گوپی کے ہاتھ؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر تو اس کا وہ حال ہوا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ گم سم ہو گئی۔ بولی تو ایسے جیسے جرم کو قبول کر رہی ہو۔ "سوامی مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔"

"چوک؟ کیسی چوک؟"

"بھاری چوک ہو گئی۔" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پتہ تو چلا کیا چوک ہو گئی؟"

"سر دھڑ کا گھپلا ہو گیا۔"

"سر دھڑ کا گھپلا؟" وہ بہت چکرایا۔ "اری بھاگوان آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔"

دوروپڑی۔ "سوامی تم مجھے بھاگوان کہتے ہو۔ مجھ سے بڑھ کر دربھاگ کس کے ہوں گے۔ ایک سنکٹ سے نکلی تو دوسرے سنکٹ میں پڑ گئی۔ پھوٹ جائیں یہ نین جنھوں نے پہلے دھرم پتی اور بھیا پیارے کے سر دھڑ کو جدا دیکھا اور اب سر دھڑ کا گھپلا دیکھ رہے ہیں۔ اور ٹوٹ جائیں یہ ہاتھ جن سے یہ گھپلا ہوا۔"

دھاول چکرا سا گیا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں مدن سندری کا دماغ چل بچل تو نہیں ہو گیا۔ بولا۔ "اری سر تو میرا اکتا تھا پر مجھے لگتا ہے کہ سر تیرا پھر گیا ہے۔ سیدھی بات کر نہیں تو میں سچ مچ یہی سمجھوں گا کہ تیری مت ماری گئی ہے۔"

"ہاں میری مت ہی تو ماری گئی تھی۔ ہوا یہ کہ..." اور یہ کہتے کہتے وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ مندر کی انگنائی میں دیوی کی مورتی کے سامنے گوپی اور دھاول خون میں لت پت پڑے ہوئے اس طرح کہ دونوں کے سر الگ دھڑ الگ۔ اس کی تو سدھ بدھ جاتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا۔ کیسے ہوا۔ منھ پیٹنے لگی، سر نوچنے لگی۔ دم بھر میں آنکھ سے آنسوؤں کی گنگا بہہ گئی۔ روتے روتے سامنے جو نظر گئی تو دیکھا خون میں سنی تلوار پڑی ہے۔ خون میں سنی اس تلوار کو دیکھ کر اس کے دماغ میں کچھ اور ہی سائی۔ یہ میرے در بھاگیہ ہیں کہ سوامی اور بھیا دونوں جان سے گئے۔ ایک ابھاگن اب جی کے کیا کروں گی۔ جس کھانڈے نے اس کا کام تمام کیا ہے کیوں نہ اسی کھانڈے سے میں اپنا سر کاٹوں۔ اور ان پر وار دوں۔ یہ سوچ کر اس نے وہ خون میں سنی تلوار اٹھائی۔ اپنے گردن پر مارنے لگی تھی کہ دیوی کی مورتی سے آواز آئی۔ "ناری کھانڈا پھینک دے۔ تو سچی استری اور سچی بہن نکلی۔ میں تجھ سے پرسن ہوئی۔ سو میں نے تیرے پتی اور بھیا کو جی دان دیا۔ تو ایسا کر کہ منڈ کو رنڈ سے ملا۔ دونوں جی اٹھیں گے۔ یہ آواز سن کے اس کے خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بس اسی میں گڑبڑا گئی۔ مت پہلے غم سے ماری گئی تھی، اب خوشی سے ماری گئی۔ "سوامی میری مت سچ مچ ماری گئی تھی۔ ایسی گڑبڑائی کہ بھیا کے دھڑ پہ تمھارا مستک ٹکا دیا۔ تمھارے دھڑ سے بھیا کا مستک چپکا دیا۔ پھر جو مجھے سدھ آئی تو میں نے سر پیٹ لیا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ غلطا کو ٹھیک کرنے لگی تھی پر جو ہونے والی بات ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ میں سر دھڑ کو پھر سے جوڑنے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ تم دونوں جی اٹھے۔ اور مردوں کو جیتا دیکھ کر میں خوشی سے ایسی باولی ہوئی کہ یہ بات ہی میں بھول گئی۔ اب یاد آیا ہے تو گڑبڑائی ہوئی ہوں کہ یہ تو بھیا اور پتی کا گھال میل ہو گیا۔"

دھاول نے بات کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔ "چل یہ تو اچھا ہی ہوا کہ بھیا اور پتی کا گھال میل ہو گیا۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "پر مجھے یہ چنتا کھائے جا رہی ہے کہ اب میں بہن کس کی ہوں اور پتنی کس کی ہوں۔"

یہ بات سن کر دھاول تھوڑا گڑبڑا گیا۔ اب اسے سوچنا پڑا مگر جلد ہی اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ بولا۔ "اری یہ فیصلہ کرنا کون سی مشکل بات ہے۔ ندیوں میں اتم گنگا ندی ہے، پربتوں میں اتم سمیرو پربت، انگوں میں اتم مستک۔ دھڑ کا کیا ہے وہ تو سب ایک سمان ہوتے ہیں۔ مانو تو اپنے مستک سے پہچانا جاتا ہے۔ سو تو دھڑ پہ مت جا۔ مستک دیکھ کہ وہ میرا ہے۔"

مدن سندری قائل ہو گئی۔ دل میں کہا کہ دھاول ٹھیک کہتا ہے۔ دھڑ کے نہ آنکھ کان ہوتے ہیں نہ ناک نہ منھ، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو بس دھڑ ہوتا ہے۔ اس نے دھاول کے مستک کو دیکھا اور سب کچھ بھول گئی۔

وہ دونوں ایک دوری کے بعد جیسے بہت پاس پاس آ گئے ہوں۔ ایسے ملے جیسے ایک دوسرے میں گھل جائیں گے۔ پر جب وہ ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تو جانے کیا ہوا کہ وہ پھر بھڑک گئی۔ باہوں سے تڑپ کر نکل گئی۔

"سندری، اب تجھے کیا ہوا؟"

"لجا آ رہی ہے۔"

"کس سے؟ اپنے پتی سے۔"

"نہیں، پتی سے نہیں۔"

"پھر کس سے؟"

رکتے رکتے بولی۔ "دھڑ سے۔"

"ہے میری دھرم پتنی۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا تو پھر میرا سر اور دھڑ الگ الگ دیکھنا چاہتی ہے۔ جان لے کہ جس کا سر اس کا دھڑ۔ سو سر بھی میں ہوں، دھڑ بھی میں ہوں۔"

جب دھاول نے سر اور دھڑ کے الگ الگ ہونے کی بات کی تو مدن سندری بہت دکھی ہوئی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں وہ منظر پھر گیا کہ دھڑ الگ سر الگ۔ "نہیں نہیں، ایسی بات منھ سے مت نکالو۔" اس نے تڑپ کر کہا۔ پھر اس نے من ہی من میں طے کر لیا کہ اب وہ اس سر اور اس دھڑ کو ایک جانے گی۔

مدن سندری نے تو طے کر لیا کہ اب وہ اس سر اور اس دھڑ کو ایک جانے گی پر یہ کچھ کہنے کے بعد دھاول دبدا میں پڑ گیا۔ اپنے انگ انگ کو دیکھا۔ ایک بار دو بار۔ بار بار۔ ہے رام کیا یہ میں ہی ہوں۔ پھر وہم کی ایک اور لہر اٹھی۔ ایک میں ہی ہوں یا کوئی دوسرا مجھ میں آن جڑا ہے۔ دوسرا مجھ میں آن جڑا ہو یا میں دوسرے میں جا جڑا ہوں۔ تو میں اب سارا میں نہیں ہوں۔ تھوڑا میں تھوڑا وہ۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ نہیں، اس نے کہ وہم میں بہہ چلا تھا اپنے آپ کو تھاما، نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ان ہونی بات ہے۔ مدن سندری نے کہا اور تو نے مان لیا۔ خیر مدن سندری کی بات تو یہ ہے کہ اس بے چاری نے اپنے دو پیاروں کے سر اور دھڑ الگ الگ پڑے دیکھے اس سے اس کا دماغ چل بچل ہو گیا۔ پھر مورکھ تجھے کیا ہوا کہ ان ہونی کو ہونی سمجھ بیٹھا۔ یوں دل ہی دل میں اپنے آپ کو روک ٹوک کر ایک دفعہ تو وہ سنبھل گیا۔ مگر تھوڑی دیر میں اسے خیال آیا کہ ان ہونی بات تو یہ بھی ہے کہ آدمی کا سر اور دھڑ الگ الگ ہو جائیں۔ پھر کوئی دوسرا انھیں جوڑ دے اور آدمی پھر اٹھ کھڑا ہو۔ ہاں یہ تو بالکل ان ہونی بات ہے۔ جی اٹھنے کے بعد اب پہلی مرتبہ اسے اس ان ہونی کا خیال آیا۔ اب تک تو اس نے اس بات پہ دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ایسے اٹھ کھڑا ہوا اور مندر سے اسی سادگی سے نکل آیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب اسے اس بات کا دھیان آیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اپنے آپ سے بولا کہ میں نے تو اپنے کو

ایسا کھانڈا مارا تھا کہ سر بھٹے کی طرح اڑ کر دور جا پڑا تھا۔ گردن سے پھر وہ چپکا کیسے اور مجھ میں سانس دوبارہ آیا کیسے۔ اور پھر میں ایسے اٹھ کھڑا ہوا جیسے آدمی گر پڑے اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ کتنے اچرج کی بات ہے، اور وہ کتنا حیران ہوا کہ سکتے میں آ گیا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ مدن سندری نے آخر دیوی سے بنتی کی تھی اور دیوی میں بڑی شکتی ہے۔ ان ہونی کو ہونی کرنا ان کے ہاتھ کا کرتب ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے سوچا کہ اگر ایک کرتب ہو سکتا ہے تو دوسرا کرتب بھی ہو سکتا ہے۔ اس دوسرے کرتب پر بھی اب اسے حیرانی ہوئی۔ پہلے وہ بات کو ہنسی میں اڑاتا رہا، پھر دبدے میں پڑ گیا۔ پر اب وہ حیران ہو رہا تھا کہ اچھا مجھ میں دوسرے کا دھڑ جڑ گیا۔ پر کیسے؟ اپنے آپ سے بولا کہ میری تو عقل حیران ہے کہ ایسا ہوا کیسے پر مدن سندری کہتی ہے کہ ایسا ہوا۔ اور وہ سنی تھوڑا ہی کہتی ہے۔ آنکھوں دیکھی، خود اپنے ہاتھ سے کی ہوئی کہتی ہے۔ دونوں کرتب اسی کے ہاتھوں سے ہوئے۔ ایک کرتب دیوی کی دیا سے اور دوسرا اپنی بھول چوک سے۔ اس کے بھید وہی جانے۔ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ چاہے ان ہونی ہو۔ کتنی ان ہونی بات ہے پر اب یہ ہے کہ یہ میرا شریر میرا نہیں ہے۔ مستک میرا ہے۔ باقی سب کچھ دوسرے کا۔ کتنے اچرج کی بات ہے۔ حیران حیران اس نے پھر اپنے تن پہ نظر ڈالی، ایک بار، دو بار، بار بار۔ ہر بار اس نے اپنے انگ انگ کو دیکھا اور حیران ہوا کہ اچھا یہ کسی اور کے ہیں جو مجھ میں آن جڑے ہیں۔

دھاول کتنی دیر تک اس انہونی پر حیران رہا۔ پھر حیرانی کم ہوتی چلی گئی دکھ بڑھتا چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر کتنا دکھی ہوا کہ اس کا آپا سارا اس کا نہیں۔ دکھی ہو کر پھر اس نے اپنے آپے پر نظر ڈالی۔ ایک بار، دو بار، بار بار اور اب اسے احساس ہوا کہ گردن سے نیچے تو بہت کچھ تھا۔ ایک رنگا رنگ دنیا۔ ایک پوری کائنات کہ اس کے پاس سے نکل گئی۔ کتنا کچھ تھا کہ کھو گیا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور دل میں کہا۔ میں تو اب تنک ہی سا رہ گیا ہوں۔ باقی تو کوئی دوسرا ہی ہے میرا لے دے کے ایک مستک باقی تو سب پرائے ہیں۔ ڈیل ڈول اتنا پر میں کتنا۔ لگتا ہے کہ میں ہوں ہی نہیں۔ اور جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ پھر دبدا میں پڑ گیا کہ اگر میں نہیں ہوں تو یہ میرے بیچ کون سمایا ہوا ہے۔

رات پڑے جب مدن سندری اس کے پاس آئی اور انگ لگی تو وہ بڑبڑایا۔ "سندری پرے رہ۔ یہ میں نہیں ہوں۔"

مدن سندری کچھ حیران کچھ پریشان کچھ کھسیانی کہ اسے دھاول نے ٹھکرا دیا۔ پھر سنبھلی اور بولی۔ "سوامی تمہارا اس سے مطلب کیا ہے۔ تم کیسے نہیں ہو۔"

وہ دکھ سے بولا۔ "سندری سر دھڑ کے گھپلے کے بعد میں رہ ہی کتنا گیا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں ہوں ہی نہیں۔"

"نہیں سوامی، تم ہو۔"

"بھاگوان میں کہاں ہوں۔ کتنا ہوں۔ میں تو بس مستک تک ہوں۔ مستک سے نیچے نیچے تو سارا تیرا گو..." مدن سندری نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اور اتنی سختی سے رکھا کہ اس کا سانس رکنے لگا۔

دیر تک دونوں چپ رہے۔ دونوں ہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ دیر بعد مدن سندری نے زبان کھولی۔ "سوامی تم نے مجھے بتایا اور میں نے جانا کہ ندیوں میں اتم گنگا ندی ہے، پربتوں میں اتم سمیرو پربت، انگوں میں اتم مستک، دھڑ کا کیا ہے وہ تو سب ایک سمان ہوتے ہیں۔ مانو مستک سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جس کا سر اس کا دھڑ۔ سو میں نے تمہارا مستک دیکھا۔ اور چوٹی سے ایڑی تک تمہیں ایک جانا۔ اور اپنا سوامی سمجھا۔ پر تم مجھے بات بتا کر خود اس سے پھر رہے ہو۔"

دھاول بہت کھسیانا ہوا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ دل میں کہا کہ مدن سندری سچ کہتی ہے۔ میں نے ہی تو اسے یہ بات بتائی تھی۔ اسے بتا کر میں خود بھول گیا تو چلو اس نے مجھے یاد دلا دیا۔ انگوں میں اتم مستک ہی ہے۔ چونکہ یہ مستک میرا ہے سو مستک تلے جو کچھ ہے وہ بھی میرا ہے۔ چوٹی سے ایڑی تک میں ہی میں ہوں کوئی دوسرا میرے بیچ نہیں ہے۔

دھاول اپنے کہے کو زیادہ دن نہیں نبھا سکا۔ زبان سے لاکھ کچھ کہتا۔ اندر تو چور بیٹھا ہوا تھا۔ بس ایک پھانس سی چبھتی رہتی کہ یہ تن کسی اور کا ہے۔ سر اپنا دھڑ پرایا۔ کیسی انمل بے جوڑ بات ہے اور اسے اپنا پورا وجود انمل بے جوڑ دکھائی پڑتا ہے۔ جب رات پڑے مدن سندری اس کے سنگ آرام کرتی تو وہ دبدا میں پڑ جاتا کہ وہ تن کس تن سے مل رہا ہے۔ کتنی بار اسے اپنے پرائے تن پر تاؤ آیا۔ کتنی بار اس کے جی میں آئی کہ اس پورے دھڑ کو اپنے آپ سے توڑ کر کاندھے پر لاد کے لے جائے اور گوپی کے سر پر دے مارے کہ لے اپنا دھڑ، میرا دھڑ مجھے دے۔ پر وہ دھڑ تو اس کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ الگ کرنے کی ترکیب اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ پر پھر بھی اسے کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ جیسے اسی کا سر الگ پڑا ہے، وہ دھڑ الگ پڑا ہے۔ اور اسے وہ راج کماری یاد آ جاتی جو ایک دشٹ راکشش کی قید میں تھی۔ روز راکشش صبح ہونے پر سرہانے کی چھڑیاں پائنتی رکھتا اور پائنتی کی چھڑیاں سرہانے رکھتا، پھر راج کماری کی گردن مارتا اور اس کا سر چھینکے پہ رکھ باہر نکل جاتا۔ دن بھر راج کماری کا دھڑ مسہری پہ پڑا رہتا سر چھینکے پہ رکھا رہتا۔ اس سے بوند بوند خون ٹپکتا رہتا۔ شام پڑے راکشش چلاتا دہاڑتا آتا۔ پائنتی کی چھڑیاں سرہانے رکھتا اور سرہانے کی چھڑیاں پائنتی رکھتا۔ چھینکے سے سر اتار کر دھڑ سے جوڑتا اور راج کماری جی اٹھتی۔ راج کماری کتنے دکھ میں تھی کہ روز صبح کو سر دھڑ سے کاٹا جاتا اور روز شام کو دھڑ سے جوڑا جاتا۔ پر وہ سوچتا کہ اسے ایک سکھ تو تھا کہ سر بھی اپنا تھا دھڑ بھی اپنا تھا۔

جوں جوں دن گذرے دھاول کا دکھ بڑھتا گیا۔ مدن سندری نے تو سوچا تھا کہ کچھ دن گذر جائیں گے تو بات آئی گئی ہو جائے گی۔ اور بھولی بسری کہانی بن جائے گی۔ مگر ہوا یہ کہ جتنے دن گذرتے گئے اتنی ہی دھاول کی دبدا بڑھتی گئی۔ مدن سندری کو دیکھ کے وہ کچھ زیادہ ہی دبدا میں پڑ جاتا۔ مدن سندری کو دیکھتا اور سوچتا کہ مدن سندری پوری ہے پر میں آدھا ہوں۔ آدھے سے بھی کم اور جس دھڑ کے ساتھ میں پورا بنتا ہوں وہ میرا نہیں دوسرے کا ہے۔ اور وہ سوچ میں پڑ جاتا کہ دوسرے کے جوڑ سے پورا بن کر وہ کیا بنتا ہے اور کون بنتا ہے۔ اور مدن سندری اس کی کون بنی۔ پھر اس سوال نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس سر دھڑ کے

ساتھ میں کون ہوں، مدن سندری میری کون ہے، مدن سندری کی طرف وہ کھنچتا، پھر ٹھٹھک جاتا۔ دبدا میں پڑ جاتا کہ میں کون ہوں؛ مدن سندری کون ہے۔ اسے لگنے لگا کہ اس کے اور مدن سندری کے بیچ جو رشتہ تھا اس میں سردھڑ کے کھیلے سے کچھ گتھی سی پڑ گئی ہے۔ سردھڑ کے رشتے میں گتھی پڑی ہوئی تھی کہ یہ ایک دوسری گتھی پڑ گئی۔

کتنے دن بیت گئے اور دھاول سے کوئی گتھی نہ سلجھی۔ آخر کو وہ مدن سندری کو ساتھ لے کر نگر سے نکل پڑا۔ جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا۔ چلتے چلتے وہ اس جنگل میں پہنچا جہاں دیوانند رشی باس کرتے تھے۔ ان کے چرن چھوئے اور بنتی کی کہ مہاراج تم مہا گیانی ہو۔ سرشٹی کے کتنے بھید تم نے پائے، جیون کی کتنی گتھیاں سلجھائیں۔ ایک گتھی میری بھی سلجھا دو۔

دیوانند رشی نے دونوں کو غور سے دیکھا پھر بولے۔ "بچہ کیا گتھی لے کے آیا ہے؟"

"ہے گیانی گتھی یہ ہے کہ میں کون ہوں اور مدن سندری کون ہے۔" اور پھر دھاول نے اپنی ساری رام کہانی کہہ سنائی۔

رشی جی نے دھاول کو گھور کے دیکھا۔ بولے۔ "مورکھ کس دبدا میں پڑ گیا۔ سو باتوں کی ایک بات تو نر ہے مدن سندری ناری ہے۔ جا اپنا کام کر۔"

جیسے دھاول کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ ایک دم سے اٹھ گیا۔ رشی جی کے چرن چھوئے اور مدن سندری کا ہاتھ پکڑ واپس ہو گیا۔

آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا تھا۔ بیچ جنگل سے گذرتے گذرتے دھاول نے مدن سندری کو ایسے دیکھا جیسے جگوں پہلے پرجاپتی نے اوشا کو دیکھا تھا۔ اور مدن سندری دھاول کی ان لالسا بھری نظروں کو دیکھ ایسے بھڑکی جیسے اوشا پرجاپتی کی آنکھوں میں لالسا دیکھ کر بھڑکی تھی کہ بھڑک کر بھاگی پھر پسپا ہوئی ☆☆☆

اٹھارویں انیسویں صدی

کی

ہند اسلامی تہذیب

کے

دامن میں

زندگی کی تلاش

فن کی تلاش

محبت کی تلاش

شمس الرحمٰن فاروقی

کئی چاند تھے سرِ آسماں

پینگوئن بکس انڈیا، نئی دہلی

اور

شہرزاد، کراچی

سے بیک وقت شائع ہو رہا ہے۔

رزمیہ میں ایک نئی جہت

انتظار حسین

شمارہ ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

حضرت زینب، شہر بانو، بالی سکینہ، کبریٰ، صغریٰ، فضہ، یہ اور ان کے ساتھ کتنی اور بیبیاں ہیں۔ کوئی پہلے ہی سے بیوہ ہے۔ کسی کو کربلا میں آکر رنڈاپا دیکھنا ہے۔ یہ اتنے نسوانی کردار مرثیوں میں کیا کر رہے ہیں اور انیس نے اپنے پورے فنی شعور کے ساتھ ان پر اتنی توجہ کیوں صرف کی ہے کہ ان کے مرثیوں میں ایک بھری پری نسوانی تہذیب پھلتی پھولتی نظر آتی ہے؟

نقادوں نے انیس کے مرثیوں کو رزمیہ شاعری کی قسم میں شمار کیا ہے۔ رزمیہ شاعری تو وہ ہے، مگر ایک فرق کے ساتھ۔ ان مرثیوں کی نسوانی فضا رزمیہ شاعری کی روایت سے لگا نہیں کھاتی۔ بات یہ ہے کہ رزمیہ شاعری کی روایت تو مردانہ رنگ میں رچی بسی ہے۔ جو بڑے رزمیے ہمارے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کی زیادہ تر صورت یہی ہے۔ عورت کی آواز ان رزمیوں میں مشکل سے سنائی دیتی ہے۔ اور سنائی دیتی بھی ہے تو جلد ہی جنگی نعروں، للکاروں اور ہتھیاروں کے شور میں گم ہو جاتی ہے۔ کیا مضائقہ ہے کہ ایک ڈیڑھ مثال پیش کردی جائے۔ مگر اس سے یہ مت سمجھئے کہ میں ان رزمیہ شاہ کاروں کا مرتبہ گھٹا کر انیس کے مرثیوں کو ان سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں صرف رزمیہ کے اس فرق کو جو انیس کے ہاں نظر آتا ہے، سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں میں یہ وضاحت کردوں کہ میں یہ مضمون اپنے ایک پچھلے مضمون کے تسلسل میں لکھ رہا ہوں جہاں میں نے یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ رزمیوں میں بالعموم انسانی رشتے جنگ کے شور میں گم نظر آتے ہیں جب کہ اردو مرثیے میں ان پر اصرار ہے؟ اس لیے ضرورت کی حد تک اپنے بعض بیانات کو مجھے یہاں دہرانا پڑے گا۔

اب میں اس مسئلے پر سوچتا ہوں تو نظر یہ آتا ہے کہ جو انسانی رشتے تخصیص کے ساتھ رزمیہ میں گم ہو گئے ہیں وہ نسوانی رشتے ہیں۔ بالفاظ دیگر عورت رزمیوں میں بالعموم گم ہے، مرد چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر اردو مرثیے میں عورت کا کردار بہت نمایاں ہے۔ اور انیس کے یہاں وہ ایک نئی معنویت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ان نسوانی کرداروں کی تھوڑی اور تخصیص کی جائے تو جو چند نسوانی کردار خاندانی رشتوں میں نمائندہ کرداروں کی حیثیت سے ابھرتے ہیں اور اس رشتے سے انسانی رشتوں کی رنگارنگی میں سب سے بڑھ کر حرارت اور معنویت پیدا کرتے نظر آتے ہیں، وہ ہیں: ماں، بہن، اور بیٹی۔ یہ بات بہت معنی خیز نظر آتی ہے کہ قدیم ہندوستان کے دو بڑے رزمیوں، رامائن اور مہابھارت میں مردانہ روایت پر اتنا اصرار ہے کہ بھائی اور بیٹے یہاں چھائے ہوئے نظر آتے ہیں، بہن اور بیٹی کے کردار کم و بیش غائب ہیں۔ اگر ہیں بھی تو کہیں بہت پس منظر میں ہیں۔ کتنی عجیب سی بات لگتی ہے۔ رامائن میں عین مرکز میں تین بھائی ہیں رام، لکشمن اور بھرت۔ مہابھارت میں سو بھائی ایک طرف ہیں پانچ بھائی دوسری طرف۔ بہن کوئی نہیں ہے، نہ بیٹی ہے۔ بھتیجی، بھانجی، پھوپھی، خالہ ایسے رشتے جو ایک رچی ہوئی خاندانی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں ان کو تو بھول ہی جایئے۔ اتنے اہم انسانی رشتے اگر غائب ہیں تو پھر عورت کی آواز کہاں سنائی دے گی؟ تلسی کی رامائن کی ایک رزمیہ کی حیثیت سے عظمت اپنی جگہ، مگر انیس کو پڑھنے کے بعد رامائن کو پڑھا جائے تو عجب احساس ہوتا ہے کہ بہن اور بیٹی ان دو کرداروں کے نہ ہونے سے جذبات و احساسات کا کتنا رنگا رنگ منطقہ اس بڑے شاعر کی دسترس سے نکل گیا اور انسانی رشتوں کے کتنے نازک گوشے اس رزمیہ کے دائرے سے باہر ہو گئے۔

ویسے مجھے مہابھارت کی مثال زیادہ دلچسپ اور معنی خیز نظر آتی ہے۔ پوری جنگ میں صرف ایک مقام پر عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز ایک سوگوار ماں کا بین ہے۔ اس وقت ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سورماؤں کے اس ہجوم میں کسی گوشے میں ایک دکھیاری ماں بھی بیٹھی تھی۔ اور وہ ماں کسی بھائی کی بہن بھی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ابھمنیو مارا جاتا ہے اور اس کی ماں سبھدرا بین کرتی ہوئی رن میں پہنچتی ہے۔ اور بین کیا ہے کہ اے مرے لال، مرے چندا تو نازوں کا پلا ہے۔ اس ڈراؤنے سونے جنگل میں تو رات کیسے گذارے گا، تو نرم بستر میں سونے والا، تجھے اس سخت کانٹوں بھری دھرتی پر نیند کیسے آئے گی؟

یہ وہ مقام ہے جہاں مہابھارت کی رزمیہ اردو مرثیے کی روایت کے قریب آجاتی ہے۔ مگر یہ مقام جلد ہی گذر جاتا ہے۔ ویسے تو کئی اور دکھی مائیں بھی بعد میں نمودار ہوتی ہیں۔ دروپدی پر بھی غم کا پہاڑ ٹوٹتا ہے کہ اس کے بیٹے سوتے میں قتل کردیئے گئے اور گندھاری سو بیٹوں کے سوگ میں ہے۔ مگر ان ماؤں کے

طریقے اور ہیں۔ دروپدی تو جلالی ماں ہے۔ انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ سمدرا کا مسئلہ انتقام نہیں ہے۔ وہ ارجن کا مسئلہ ہوگا۔ بیٹے کا غم اسے کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔

اور ہاں ہومر کی ایلیڈ (Iliad): سورماؤں کے نعروں اور ہتھیاروں کی جھنکار میں کوئی نرم شیریں آواز یہاں مشکل ہی سے سنائی دیتی ہے۔ جب ہیکٹر (Hector) مارا جاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ یہاں کوئی ماں بھی ہے اور کوئی بیوہ بھی ہے جس کا سہاگ اجڑ گیا ہے۔

ویسے تو انیس نے بھی رزم کا نقشہ خوب باندھا ہے۔ کیسی کیسی رجز ہے اور کیا کیا للکار ہے۔ اور پھر گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں کیسا کیسا سماں باندھا گیا ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جدال وقتال کے بیچ ہر نازک موڑ پر کوئی دکھ بھری نسوانی آواز ابھرتی ہے، کبھی بہن کی، کبھی بیٹی کی، کبھی بھتیجی کی، اور فضہ جو ابھی تک تلواروں کی جھنجھناہٹ سے گونج رہی تھی، درد وسوز سے بھر جاتی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ آواز ہمیں جدال وقتال سے انسانیت کی طرف واپس لے آتی ہے۔ اس مقام کو دیکھیے جہاں لشکر حر نے قافلۂ امام کا راستہ روک رکھا ہے۔ حضرت عباس جلال میں ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ کہیں لڑائی نہ چھڑ جائے۔ حضرت زینب پریشان ہو کر پوچھتی ہیں کہ یہ شور کیسا ہے۔

محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا
بلوہ کنار نہر ہے اے بنت مرتضیٰ
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

اب حضرت زینب کا ردعمل ملاحظہ فرمائیے۔

زینب پکاریں پیٹ کے زانو بہ صد ملال
ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسد کبریا کے لال
غربت پہ ابن فاطمہ کی تم کرو خیال
قربان ہوگئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصے کو تھام لو

اور پھر یہ دھمکی۔

لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر
محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر

یہ کربلا میں جنگ کے خلاف سب سے بلند آواز ہے۔ سمجھ لیجیے کہ جنگ کے خلاف پورے عالم نسوانیت کی آواز۔ جنگ ایک ایسا بھیانک عمل ہے جس میں آدمی ہی نہیں مارے جاتے، انسانیت بھی قتل ہوتی ہے۔ امام حسینؑ اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے جنگ سے بچنے کی ہر تدبیر کرتے ہیں اور متبادل راستے تجویز کرتے ہیں۔ مگر یہ معاملات امام حسین کے ساتھ ہیں۔ حضرت زینب صرف اتنا جانتی اور چاہتی ہیں کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے اور ان کی یہ آواز لشکر حر کی مزاحمت کے وقت سے شروع ہو کر لڑائی کے ہنگام تک ہمیں سنائی دیتی رہتی ہے۔ اس بات کو شاید سب سے بہتر انیس نے سمجھا ہے اور جا بجا پوری فنی شائستگی کے ساتھ اسے بیان کیا ہے۔ اس مقام کو دیکھیے جہاں حضرت عباس میدان جنگ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ عین اس ہنگام ایک بچی جوان کی عزیز بھتیجی ہے اپنی پیاس کا ذکر درمیان میں لے آتی ہے۔ اب انیس کے یہاں حضرت عباس کا ردعمل ملاحظہ فرمائیے۔

سوکھے ہوئے ہونٹوں کو نہ دکھلاؤ سکینہ
ہو وے جو کوئی مشک تو لے آؤ سکینہ

لیجیے اس کے ساتھ جنگ کا سارا مفہوم ہی بدل گیا۔ اب حضرت عباس ایک جنگجو کی حیثیت سے میدان میں نہیں جاتے۔ اب ان کا کردار مختلف ہے۔ ایک طرح سے جنگ کی نفی والا کردار۔

جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے
مشکیزہ دھرا دوش پہ اس بحر کرم نے

اور اس کے ساتھ لڑائی کی نوعیت ہی بدل گئی۔

کیا کیا نہ لڑے مشک کو کیا کیا نہ بچایا
گہ چھاتی تلے زیر پر گاہ چھپایا
جھک کر کبھی دامان زرہ اس پر اڑھایا
وہ تیر لگا سینہ پہ جو مشک پہ آیا
پانی کے لیے خون میں تر ہو گئے عباس
تلوار جب آئی تو سپر ہو گئے عباس

اس طرح ہم انیس کے مرثیوں کو پڑھیں تو یہاں رزمیہ شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوتا نظر آئے گا، نسوانی درد کی جہت۔ یہ نسوانی کردار، جس طرح وہ انیس کے مرثیوں میں بیان ہوئے ہیں، اس جہت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں آ کر سارے انسانی رشتے منقطع ہو جاتے ہیں۔ پھر رشتہ تیر تلوار سے ہوتا ہے اور دشمن کے سر سے۔ رزمیوں میں میدان جنگ انھیں جانے مانے رشتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مگر یہاں میدان جنگ میں سارے انسانی رشتے برقرار ہیں۔ تلواروں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ٹاپوں کے پس منظر میں بیبیوں اور بچوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی ایک بی بی کا نالہ، کسی ایک پیاسی بچی کی پکار، اس درد کے ساتھ ابھرتی ہے کہ پورے منظر پر چھا جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لیے تلواروں کی جھنکاریں اور گھوڑوں کی ٹاپیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

یہاں انسانی رشتوں کی ایک رنگارنگی ہے اور ہر رشتے کی اپنی ایک نزاکت ہے اور شاعر نے اپنی پوری فنی مہارت سے اس نزاکت کو بیان کیا ہے۔ خاندانی اور غیر خاندانی رشتوں کی رنگارنگی یہاں اپنی پوری حرارت کے ساتھ اس طور پر پیش ہوئی ہے کہ لگتا ہے کہ ہم ایک پوری تہذیب سے ملاقات کر رہے ہیں۔ پوری تہذیب تو اسے ہونا ہی چاہیے۔ آخر یہ لوگ خاندان رسالت سے تعلق رکھتے

ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قول و فعل کو اس خاندان کے قول و فعل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے آپس کے تعلقات میں، ان کے فعل و عمل میں، ان کے ادب آداب اور ان کی بول چال میں بھی ایسی خوبی تو ہونا چاہیے کہ اس سے ایک مکمل مثالی تہذیب کا نقش ابھرتا نظر آئے۔ مگر اسے گرفت میں لانے کے لیے بھی تو کسی بڑے شاعرانہ تخیل کی ضرورت تھی۔ انیس کے شاعرانہ تخیل کی آبیاری ایک ایسی تہذیب میں بھی ہوئی تھی جہاں انسانی رشتوں کی نزاکتوں کا پاس لحاظ اس حساب سے تھا کہ ع

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ایسا ہی تخیل آل رسول کی تہذیب کو کسی حد تک گرفت میں لا سکتا تھا۔ اور انیس نے اس تہذیب کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اتنا زندہ اور حقیقی ہے کہ ہمیں اس پر اعتبار آتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً جب حضرت زینب علم داری کے مسئلہ پر عون محمد کو سرزنش کرتی ہیں کہ ؎

دیکھو نہ کچھ بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے
عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ہاں اپنے ہمسوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے انھیں لفظوں میں اور اسی لہجے میں بیٹوں کو مخاطب کیا ہوگا۔ یا جب وہ یہ دعا کرتی ہیں کہ ؎

بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

تو ہمیں یقین آجاتا ہے کہ اس بی بی نے اپنے عزیز بھائی اور بھاوج کے لئے خاص انھیں لفظوں میں اور اتنا ہی ڈوب کر دعا کی ہوگی۔

یہاں سے مجھے ایک خیال اور آرہا ہے کہ اردو کلچر نے جو نسوانی لہجے بنائے سنوارے ہیں وہ انیس نے کتنی فنی مہارت کے ساتھ اپنے مرثیے میں برتے ہیں۔ میں نقاد تو نہیں ہوں کہ کوئی محاکمہ کروں۔ مگر ایک سوال کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے انیس کے مرثیوں کو اردو شاعری کے دفتر سے الگ کرلیں تو یہ لہجے اتنی نزاکت و نفاست کے ساتھ اور اتنے زندہ رنگ میں پوری اردو شاعری میں کہیں اور دستیاب ہوں گے؟

اب میں اس سے ایک قدم اور بڑھ کر ایک بات کہوں گا۔ مگر اس بات سے پہلے ایک بات اور کہہ لینے دیجیے۔ اردو میں انیس کی صورت میں ایک بڑا ڈراما نگار پیدا ہوا تھا مگر تہذیبی مجبوریوں کی وجہ سے وہ ڈرامے کی صنف سے ہٹ کر مرثیہ نگار بن گیا۔ جو موضوع اور جو تجربہ اس کے پاس تھا ہند اسلامی تہذیب اسے ڈرامے کی شکل میں اظہار کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس تہذیب کی بوالعجبی دیکھو کہ اسی شہر لکھنؤ میں اس نے ڈراما کو انیس سے اچک کر امانت لکھنوی کی گود میں ڈال دیا۔ پھر کیا ہوا۔ وہی جو ایسی صورتوں میں ہوتا آیا ہے کہ ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پھر انیس نے مرثیے ہی کو ڈراما بنادیا۔ لکھت اور پیشکش دونوں اعتبار سے اس عمل میں اس شاعر نے اردو زبان کی اصل تک رسائی حاصل کرلی۔ بات یہ ہے کہ زبان تو اصلاً بول چال کا معاملہ ہے۔ کسی زبان کی اصل تک پہنچنا چاہو تو اس کے لہجوں کو گرفت میں لاؤ۔ اور ڈراما اپنے عمل میں یہی کام انجام دیتا ہے۔ مگر اردو میں انیس کے ہاتھوں میں آکر مرثیے نے ڈرامے سے بڑھ کر یہ کام انجام دیا۔ تو جو بات میں کہنا چاہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ صرف نسائی لہجہ ہی اپنی نزاکت و نفاست کے ساتھ گرفت میں نہیں آیا ہے بلکہ اردو زبان کی اصل اپنے نسائی اور مردانہ لہجوں کے ساتھ یہاں اپنی ساری نزاکتوں کے ساتھ گرفت میں آئی ہے۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ انیس نے امام حسینؑ کے رفقا کا اور اہل خاندان کا ذکر اس تفصیل سے کیا ہے اور ان کے رکھ رکھاؤ، ان کے ادب آداب، ان کی بول چال، ان کی چال ڈھال کو اتنے زندہ اور موثر رنگ میں پیش کیا ہے کہ پوری ایک تہذیب کا جیتا جاگتا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قاعدے سے اس تہذیب کو اسلامی اقدار کے عین مطابق ہونا چاہیے کہ یہ رسول کے گھرانے کی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب ہم سے کیا کہتی ہے؟ جب لشکر حر کو اس ریگ زار میں پانی کے قحط کا سامنا ہوتا ہے اور وہ پیاس سے بے حال ہو جاتا ہے تو امام حسینؑ اس سے قطع نظر کرکے کہ یہ دشمن کا لشکر ہے رفقا کو ہدایت کرتے ہیں ؎

عباس سے فرمایا کہ سقوں کو بلاؤ
ناقوں پہ جو سیراب ہیں شربے، انھیں لاؤ
قاسم سے کہا چھاگلیں تم لینے کو جاؤ
اکبر سے کہا جلدی پکھالوں کو منگاؤ

سوچنے کی بات ہے کہ یہ جنگ کی کون سی اخلاقیات ہے۔

ہاں اور یہ جو ذکر تھا کہ اس قافلہ میں بیبیاں اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور نمایاں حیثیت میں نظر آتی ہیں، آخر اس تہذیب میں عورت کا کیا مقام ہے؟ صاحبو منصفی کرو کہ حضرت زینب نے شام کے بازاروں میں اور دربار یزید میں جو گواہی دی تھی وہ کیا آدھی گواہی تھی؟ اور ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ جب جنگ سر پہ آگئی اور علم دار کے تقرر کا مسئلہ پیش آیا اور لشکر حسینی میں یہ تجسس تھا کہ یہ اعزاز کسے ملے گا تو امام حسینؑ نے یہ اختیار اپنے پاس نہیں رکھا۔ حضرت زینب کو یہ اختیار منتقل کردیا گیا ؎

مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

اور حضرت زینب اپنا فیصلہ سناتی ہیں۔

عباس نامدار سے بہتر کوئی نہیں

اور ہاں حضرت شہر بانو۔ وہ تو غیر عرب تھیں اور مالِ غنیمت میں آئی تھیں۔ ان منتخب ہستیوں کے بیچ کیا ان کی حیثیت کسی سے کم ہے؟

سو اس تہذیب کو دیکھو۔ پھر سمجھ میں آئے گا کہ بنیاد پرستوں، مولویوں، ملاؤں نے اسلام کے تصورِ آدمیت کو کتنا مسخ کیا ہے اور اسلامی تہذیب کو کتنا بگاڑا ہے۔

تو اس تہذیب کی صورت یہ ہے کہ بوڑھے اور جوان، بچے اور بڑے، عورت اور مرد، اپنے اور غیر، ہم قوم اور غیر قوم سب ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں اور اپنی اپنی جگہ معزز ہیں۔ ع

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

یہ حسینی قافلے کی تہذیب تھی۔ اس سے الٹ وہ تہذیب تھی جو یزیدی لشکر پیش کر رہا تھا۔ مگر اسے تہذیب کیوں کہیے؟ ان کے طور طریقے ان شائستہ ادب آداب کے متضاد بلکہ ان کے خلاف ردِ عمل تھے۔ تو اسے نفی تہذیب کیوں نہ کہا جائے؟ صحیح ہے کہ وہ بھی مسلمان ہی تھے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک ہی عقیدے اور ایک ہی نظریۂ حیات کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ ایک شخص بہترین انسانی صفات کا حامل ہو اور دوسرا دہشت گرد بن جائے۔

تو کربلا میں جو جنگ تھی اسے ایک سطح پر تہذیب اور نفی تہذیب کے تصادم کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے اور انیس کے مرثیے کو اس تصادم کے موثر ترین اظہار کے طور پر ☆☆☆

ان دیکھی زمین پر

انجیلا ہمیش

شمارہ ۲۵۱،

دسمبر ۲۰۰۱

سنو

غور سے سنو

ایک سوگواری دستک تمھارے در پہ کب سے ہو رہی ہے

جانتے ہو

یہ سوئیوں کی ٹک ٹک تمھیں دھیرے دھیرے بے بس کر رہی ہے

گذرنے والا کوئی پل بھی تمھارا نہیں

محسوس کرو ان ہاتھوں کی جنبش کو جو تمھاری گرفت سے آزاد ہو رہے ہیں

کیسے روک سکو گے اس گھڑی کو

جو تمھارے ماضی کو کچل کر مستقبل پر ہنس رہی ہے

بہت سی امیدیں اور خواب

تمھاری آنکھوں میں جاں کنی بن کر ٹھہر گئے ہیں

آنکھیں جن میں اب کوئی منظر نہیں

وحشت زدہ ویرانیاں تمھارے بستر سے پلٹ گئی ہیں

اس خالی اور اداس فضا میں

کبھی رات کی رانی کی خوشبو سے محروم رات آتی ہے

اور کبھی کوئی صبح ایسی بھی ہوتی ہے

جب سورج مکھی تک سورج کی کوئی کرن نہیں پہنچی

تب صرف زوال کا پھول کھلتا ہے

انعام ندیم

شمارہ۲۳۸،
جون۲۰۰۰

ستم بھی مہر سامانی سے پہلے
ہے اک مشکل ابھی آسانی سے پہلے

بتائیں کیا کہ تھا ابھی آباد کیسا
یہ دل کا شہر ویرانی سے پہلے

یہ دریا خامشی سے بہ رہا تھا
مری آنکھوں کی طغیانی سے پہلے

بہت قیمت ہوا کرتی تھی دل کی
یہاں جذبوں کی ارزانی سے پہلے

یہ منزل ہے کسی عہد فنا کی
ندیم اک عہد لافانی سے پہلے

شمارہ۲۵۶،
مئی۲۰۰۲

دل پر کسی پتھر کا نشاں یوں ہی رہے گا
تا عمر یہ شیشے کا مکاں یوں ہی رہے گا

ہم ٹھہرے رہیں گے کسی تعبیر کو تھامے
آنکھوں میں کوئی خواب رواں یوں ہی رہے گا

ہے دھند میں ڈوبا ہوا اس شہر کا منظر
کیا جانیے کب تک یہ سماں یوں ہی رہے گا

کچھ دیر رہے گی ابھی بازار کی رونق
کچھ دیر یہ ہونے کا گماں یوں ہی رہے گا

بجھ جائے گا اک روز تری یاد کا شعلہ
لیکن مرے سینے میں دھواں یوں ہی رہے گا

لو دے تو رہا ہے مرے خوابوں کے افق پر
لیکن یہ ستارہ بھی کہاں یوں ہی رہے گا

انوپا

سمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

سہرا

آؤ میرا گھونگٹ الٹو
میری مانگ میں چندا کے آنسو کی افشاں ہے
میرے بالوں میں پھول بہاروں سے چھپ کر روتے ہیں
میرے ہاتھوں کی مہندی میں
جانے کتنی شام کے سورج سوتے ہیں
دیکھو دھیمے سے الٹو گھونگٹ
میرے ماتھے جلتی دوپہر کا سورج
جھومر بن کر چمٹ گیا ہے
میں دلہن ہوں
میرا جسم جبر کی آگ میں جھلس جھلس کر
کندن سا چمک اٹھا
میرے پیروں کانٹوں کی پازیب
پیار کے گیت سنائیں
چپکے سے گھونگٹ کو چھونا
میرے چہرے پر جانے کتنے ہاتھوں کی
خراشوں کا حسن سجا ہے
میری آنکھوں میں
سب کی آنکھیں روتی ہیں
ہاں میں اپسرا ہوں، دیوی ہوں، دلہن ہوں
میرے جسم کا پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر ترش گیا
دیکھو ہولے سے گھونگٹ الٹو
شبنم کے تاروں کا سب موتی گر جائیں گے

شمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

بندیا

تم اپنی سہاگن کے ماتھے
مرے آنسو کی اک بندیا لگالو
اور گلے کا ہرا بنالو
میرے یہ ٹوٹے کنگن
شاید کوئی روپ ہی جھلکے
اپنے پیا سنگ آنچل ڈھلکے
بھولو ان کلیوں کو ساری
جو مرے بالوں مہکیں بہکیں
سودے بن بے لذت نکہت
مان ہیں سپنے مول محبت
سب بکتے ہیں جاؤ خریدو
من کی سندرتا من کے ارماں
اور جو تم سنگ لاگے نیناں
بن چادر کی سیج پہ اپنی
میرے سر کا آنچل ڈالو
تم اپنی سہاگن کے ماتھے
مرے آنسو کی اک بندیا لگالو

انوپا

شمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

پروز پوئم

تخلیق کسی صنف کی محتاج نہیں
فرق صرف اتنا ہے کہ
قلم یا تیشہ کس کے ہاتھ میں ہے
سچا لفظ برہنہ آتا ہے
نہ تم اس کو عروض اور ارکان کے گھٹنے پہنا سکتے ہو
نہ پروز اور فری درس کے ناقص تجربوں کے انڈرویئر
اطہر کیا تم نے دیکھا نہیں
سچی شاعری
منافقوں کے تالو سے زبان کھینچ لیتی ہے۔

شمارہ ۲۰۹،
اگست ۱۹۹۷

بھید بھرا سناٹا

سوئی تھیں نہ جاگتی آنکھیں
کس چھایا پتھ میں پیر رکھے اتنی دور نکل آئی
ایسا جل تھل جس کا کوئی اور نہ چھور
سب تاریخیں تہذیبیں بھنور بھنور کے ناچ
اتنے بڑے سمندر میں یوں روز میں کس سے ملنے جاتی ہوں
مجھے یاد نہیں یہ آنے والے دن ہیں یا وہ جو گذر گئے
ان سب بچھڑنے والوں میں بس آنکھیں انت میں رہ جاتی ہیں
جس کا بھید بھرا سناٹا جھانکتا رہتا ہے سوتی جاگتی آنکھوں میں
کہ رات دعا ہے آس بھرے ہاتھوں میں سوئی ہوئی
یہ رات سزا ہے اپنوں سے بچھڑ کر جانے والوں کی
پر کیسی کچھا ہے پتھرائے ہوئے نینوں کی
ہر آہٹ ہے دیر سے واپس آنے والے کی
کون یہ کہتا ہے چپکے سے
اس رات کا کوئی انت نہیں
جاگتے رہنا جاگتے رہنا

ان عورتوں کے نام

فرائڈ اور بودلیئر کی اترن سے
لذتیں لکھنا چھوڑ دو
اور تم بھی باورچی خانے میں کھنکھناتی ہوئیں
معصوم چوڑیوں سے کھیلنا چھوڑ دو
لکھ سکو تو کبھی اپنی شب عروسی
روح کے ناسور سے بھی لکھو

جسم کے شعبدوں میں
لفظ بھی ہار جاؤ گی
اور جو کچھ بھی نہیں ہے تو اپنے
گذشتہ لمس کو سینت کر رکھ لو
آنے والی کل تک
دیکھنا کہ تم کرنسی پھر بدل جائے گی

گیلری میں بیٹھی عورت

انور خان

شمارہ ۱۰۵،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷

سڑک پر چلتے راہ گیر، میدان میں کھیلتے بچے، فٹ پاتھ کے کنارے پھولوں سے لدا درخت، سامنے کھپریل کے مکان کی منڈیر پر بیٹھا کبوتر کا جوڑا روز ہی گیلری میں بیٹھی سن رسیدہ عورت کو دیکھتے ہیں اور شاید سوچتے ہیں اس بڑھیا کے ذہن کے کسی گوشے میں وہ بھی محفوظ ہیں لیکن انھیں پتہ نہیں کہ عکس اس کی سال خوردہ پتلیوں میں اترتے ہی پگھل جاتے ہیں اور پتلیوں سے دماغ تک جانے والے اعصاب اس قدر بوسیدہ ہو چکے ہیں کہ وہاں تک کوئی عکس پہنچتا ہی نہیں۔ اور اگر کبھی اتفاق سے پہنچ بھی جائے تو فوراً مٹ جاتا ہے۔ دماغ کے کسی حصہ میں البتہ چند خلیے اب تک زندہ ہیں اور چند عکس وقفے وقفے سے بڑھیا کے ذہن میں ابھرتے رہتے ہیں۔

درختوں کی شاخوں سے لٹکا سورج لحظہ لحظہ نیچے سرکتا ہے۔ شاخوں سے چند پرندے پرواز کرتے ہیں اور پھر اتر کر انھی شاخوں میں کھو جاتے ہیں۔ دور مکانوں پر دھوپ آخری سانس لے رہی ہے۔ گیلری کے نیچے ایک نوعمر لڑکا بجلی کے کھمبے سے لگا بوڑھی عورت کو بغور دیکھ رہا ہے۔ بڑھیا سڑک پر دیکھ رہی ہے۔ ایک کم سن لڑکی لاپرواہی سے سر کے بال جھٹکتی بغل سے بستہ لٹکائے پیپرمنٹ چوستی آرہی ہے۔ ایک خوب رو مرد ایک نوجوان دوشیزہ پر جھکا ہوا ہے۔ ایک خوش پوش عورت اپنے کم سن صحت مند بچے کا ہاتھ تھامے گذر رہی ہے۔ سیکنڈ کے کسی حصہ میں سارے عکس گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

دھوپ نے مکانوں سے جست لگا دی ہے اور اب فضا میں ملگجا سا اجالا ہے۔ ایک شرابی لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر سے گذر رہا ہے۔ گیلری کے نیچے آکر وہ رکتا ہے اور سر اٹھا کر بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے۔ نوعمر لڑکا چونک کر شرابی کو دیکھنے لگتا ہے۔

"ہر روز یوں ہی تم مجھے گھورتی رہتی ہو۔" وہ چلا رہا ہے۔ "آخر کیوں مجھے معلوم ہے تم جواب نہیں دوگی۔ تم کبھی جواب نہیں دیتیں۔ میں نے آخر تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ ہاں ہاں میں گنہ گار ہوں، میں گنہ گار ہوں۔"

شرابی لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ نوعمر لڑکا اب بھی اسے بغور دیکھ رہا ہے۔

میدان میں کھیلتے بچے جا چکے۔ اب سڑک پر کوئی راہ گیر نہیں۔ پرندے گھونسلوں میں گم ہیں۔ کبوتر کا جوڑا دکھائی نہیں دیتا۔ بجلی کے قمقموں کی تیز آنکھیں سڑک کا پہرہ دے رہی ہیں۔ ایک کم سن لڑکی لاپرواہی سے سر کے بال جھٹکتی بغل سے بستہ لٹکائے پیپرمنٹ چوستی چلی آرہی ہے۔ ایک خوب رو مرد نوجوان دوشیزہ پر جھکا ہوا ہے۔ ایک خوش پوش صحت مند عورت اپنے کم سن صحت مند بچے کا ہاتھ تھامے سڑک پر سے گذر رہی ہے۔

سڑک کے سرے پر ایک کتا نمودار ہوتا ہے۔ گیلری کے نیچے آکر خوش دلی سے دو تین بار بھونکتا ہے اور لہراتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ نوعمر لڑکا جو بوڑھی عورت کو بہ غور دیکھ رہا ہے چونک کر اپنے گرد و پیش کو حیران نگاہوں سے تکتا ہے اور ایک طرف دوڑنے لگتا ہے ☆☆☆

چھٹی کا دن

انور سجاد

شمارہ ۳۷،
جون ۱۹۶۹

دوپہر

بچے چڑیا گھر کے دروازے کے ساتھ بیٹھے خوانچے والے سے چنے خریدتے ہیں اور اچھلتے کودتے اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ چڑیا گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔

سڑک کے پار کھڑی عورت ٹھنڈا سانس لیتی ہے۔ ساتھ کھڑے مرد کو دیکھتی ہے۔ مرد کی نگاہیں آہنی دروازے کی عمودی سلاخوں سے گذر کے پنجروں میں بھٹکتی ہیں۔ مرد خشک حلق کو منہ کے لعاب سے تر کرتا ہے، مسکرانے کی کوشش کرتا ہے۔

سلاخوں کے پار جنگل کا قیدی بادشاہ لیٹے لیٹے سر اٹھاتا ہے، نیم وا آنکھوں سے اپنے پنجرے سے پار دیکھتا ہے، دم کے آخری گچھے دار سرے کو ہوا میں لہرا کے سر کو پھر جنگلے کی سلاخوں کے ساتھ ٹکائے آنکھیں موند لیتا ہے۔

مرد کی آنکھیں شیر کے پوائنٹ آف ویو سے، پنجرے کی سلاخوں کے پار اپنے آپ کو دیکھتی ہیں۔ مرد کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ فوراً آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ گھنے درختوں کے گنجان پتوں میں یرقانی دھوپ جھلملاتی ہے۔ اس کا سانس لمحہ بھر کے لئے رکتا ہے۔ وہ گھبرا کے چاروں اور دیکھتا ہے۔ سڑک پر لوگ آزادانہ چل پھر رہے ہیں۔ چڑیا گھر کے ادھ کھلے دروازے سے آ جا رہے ہیں۔ سڑک پر زندگی رواں دواں ہے۔ دور سڑک کے کنارے کھڑا، ایک شرارتی بچہ درختوں میں الٹی لٹکی چمگادڑوں کو غلیل سے پتھر مارتا ہے۔ چمگادڑوں میں بے چینی پھیلتی ہے۔ درختوں پر لٹکی جھولتی چیختی ہیں۔ چند کوے پھرتی سے اڑتے ہیں، درختوں کے پتوں سے جھانکتی یرقانی دھوپ میں بجھ جاتے ہیں۔ پھر سکوت چھا جاتا ہے۔ مرد اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

عورت کی سوالیہ نظریں چڑیا گھر کے دروازے سے پلٹتی، مرد کی نظروں سے ٹکراتی ہیں۔

"نہیں ہم اندر نہیں جائیں گے۔" مرد کہتا ہے۔

گندے متعفن تالاب سے ایک کونج پھڑک کر خشکی پر آتی ہے۔ پنجرے کے تاروں کو چونچ سے ضربیں لگاتی ہے۔

"کیوں؟" عورت دبی زبان میں پوچھتی ہے۔

تمام پرندے اپنی اپنی جگہ پر ساکت، حیرت سے گردنیں گھما کے کرلاتی کونج کو دیکھتے ہیں۔ کونج کی تنہا، آخری کرلاہٹ چاروں طرف سے پسپا ہو کر حلق سے نکلتی ہے اور پیروں میں بکھرے چنوں میں دفن ہو جاتی ہے۔

"بس کہہ جو دیا۔" مرد درشت لہجے میں کہتا ہے۔

شیر لیٹے لیٹے اپنی اگلی ٹانگ اکڑا کے پنجرے سے باہر نکالتا ہے، پنجوں سے تیز نوکیلے ناخن پل بھر کے لئے جھانکتے ہیں۔ آس پاس کھڑے لوگ فوراً پیچھے ہٹتے ہیں۔ ناخن پھر میان میں چلے جاتے ہیں۔ لوگ اطمینان کا سانس لے کر پھر آگے بڑھتے ہیں۔

"اب چلو نہ۔ کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے ہو۔"

عورت سیرگاہ کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ مرد خاموشی سے ساتھ ہو لیتا ہے۔

عورت خاموشی سے اکتا جاتی ہے۔

"گرمی بہت ہے۔ کہو تو برقع اتار لوں۔"

"ہوں؟"

"یہاں آس پاس کوئی نہیں۔ مجھے گرمی..."

"اتار لو۔ میں نے منع کب کیا ہے۔"

"پکڑنا ذرا۔"

عورت اپنا پرس مرد کے سامنے کرتی ہے۔ مرد چپ ہے۔ چڑیا گھر کو باغ سے علیحدہ کرتی باڑ کے پار، پنجرے میں ناچتے مور کو دیکھتا ہے۔ عورت کچھ نہیں کہتی، چلتے چلتے برقع اتار کے پرس والے ہاتھ میں پکڑ لیتی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے بالوں کو درست کر کے سر پر دوپٹے کو ٹھیک کرتی ہے۔ پھر گلے سے لٹکے لاکٹ کو چھاتیوں کے عین درمیان سیٹ کرتی ہے۔ ہاتھ کو نیچے گرا کے مرد کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ ہولے سے دباتی ہے۔ مرد اپنا ہاتھ فوراً چھڑا لیتا ہے۔

"کچھ تو خیال کرو۔"

عورت روہانسی ہو جاتی ہے۔ اس کا ہاتھ بے جان ہو جاتا ہے۔

کولتار کی سڑک پر ان دونوں کے قدموں کی اکھڑی اکھڑی آوازیں فضا کی دوسری ہم آہنگ آوازوں سے بالکل الگ ہیں۔ عورت قدموں کی آوازوں سے اکتا جاتی ہے۔

"آج۔ آج اماں کہہ رہی تھیں گرمی بہت ہو گئی ہے۔"

"اماں؟"

"تمھاری اماں۔"

"اوہ۔ اماں کی غلط فہمی ہے۔ ابھی تو گرمی آئی ہی نہیں۔"

"گرمیاں آ تو گئی ہیں۔ دیکھو میں پسینے..."

"اونہہ... یہ تو جو آئے دن بموں کے تجربے ہوتے رہتے ہیں، ان کی وجہ سے موسم بدل گئے ہیں۔"

"بہر حال گرمی جلد آ گئی ہے۔ لوگ تو یہی کہتے ہیں۔"

"میں مانتی ہوں بعض لوگ کم عقل ہوتے ہیں لیکن... لیکن تم کیوں فضول بحث میں چھٹی کا دن برباد کرنے پر تلے ہو۔"

"چھٹی؟ او ہو... ہاں... میں بھول ہی گیا تھا آج اتوار ہے۔"

"اتوار نہیں، ہفتہ ہے اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا آج کاہے کی چھٹی ہے؟"

کاہے کی چھٹی کاہے کی چھٹی میں ہر دن اس سے پہلے دن کی طرح گذار گذار کے اکتا گیا تھا سورج نکلتے ہی فائلیں لیس سر نو سر ڈیری ویل سر تھینک یو سر پھر گھر بک بک چخ چخ دفتر سے بچی فائلیں۔ دوات قلم قلم دوات کاغذ کاغذ لفظ لفظ بے معنی لفظ بے معنی لفظ آج تمھیں ترقی دی جاتی ہے اسی طرح محنت کرتے رہے تو کل کل کل کل لفظ بے معنی لفظ

"شب بخیر۔"

"کیا؟" عورت حیرت سے اسے دیکھتی ہے۔

"ہوں؟ کچھ نہیں۔ آج جانے کاہے کی چھٹی ہے۔ بس ہے چھٹی۔"

مرد چلتے چلتے عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ "تم۔ تم خوش ہو؟ میرے ساتھ؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے!" عورت سچے دل سے کہتی ہے۔ مرد پھر سیدھا دیکھنے لگتا ہے۔ "تم نے بہت اچھا کیا کہ..."

"کہ تمھیں سیر کے لئے لے آیا ہوں۔"

"آج شادی کے بعد پہلی مرتبہ اکٹھے تنہا نکلے ہیں!"

"اکٹھے؟ تنہا!" مرد ہنسنے کی خواہش کو دبا دیتا ہے۔ "آؤ بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلیں۔"

"ابھی تو تم نے میرا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔"

عورت کی نظریں باڑ سے دوسری طرف اٹھ جاتی ہیں۔ وہ فوراً تیز تیز قدم اٹھا کر باڑ کے جھروکوں سے دیکھتی ہے۔

"ہائے دیکھو کتنی خوب صورت بطخیں ہیں۔ دیکھو دیکھو ذکی۔"

مرد باڑ سے دور سڑک کے کنارے کھڑا بوٹ کی نوک سے چند کنکریاں اکھاڑتا ہے۔ عورت پلٹ کر اس سے پوچھتی ہے۔

"یہ بطخیں اڑ کیوں نہیں جاتیں؟"

"میں کسی دن ان سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" مرد، عورت کے قریب آتے ہوئے کہتا ہے۔ دونوں جانے کیوں ہنسنے لگتے ہیں۔ مرد اسے اشارہ کرتا ہے۔ "چلو۔"

دونوں چلنے کے لئے مڑتے ہیں۔

ان سے دور اپنے پنجرے میں شیر گردن اٹھاتا ہے پچھلی ٹانگیں سمیٹ کر اٹھتا ہے۔ اگلے پیروں کو فرش پر جما کے انگڑائی لیتا ہے دھاڑتا ہے۔ عورت اچھل کر مرد کے سینے سے چمٹ جاتی ہے۔ فضا سہم جاتی ہے۔

"بچہ نہ بنو۔"

"وہ... وہ... شیر۔"

"قید ہے۔"

فضا کی آوازیں، شیر کی دہاڑ میں دبی آہستہ آہستہ ابھرتی ہیں مرد گہرا سانس لیتا ہے۔ عورت کو کندھوں سے پکڑ کر علیحدہ کرتا ہے۔ دباؤ کی وجہ سے عورت کے لاکٹ کا نشان مرد کی قمیص پر پڑ جاتا ہے۔ عورت اپنے چہرے میں مرد کے سینے کی تمام برف لئے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ہے، دھیرے دھیرے ہنستی ہے۔ دوبارہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر چھاتیوں پر درست کرتی ہے اور تیزی سے چلنے لگتی ہے۔ مرد کے قدم سست ہیں۔ چند قدم بعد عورت کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ دونوں پھر ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ مرد ایک دم چونکتا ہے۔ عورت سہم کر کہتی ہے۔

"نہیں نہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

مرد کی نظریں چمگادڑوں کے ساتھ درختوں پر الٹی لٹک جاتی ہیں۔

ابھی کچھ دیر شام انھیں جھنجھوڑے گی اور یہ پھڑ پھڑاتی ہوئی تلاش معاش میں نکل جائیں گی رات کے اندھیرے میں اپنے پیٹ کو روشن کریں گی۔

"تم نے چمگادڑ کی کہانی سنی ہے؟" مرد اچانک عورت سے

پوچھتا ہے۔

"پرندوں اور جانوروں والی؟ ہاں۔"

عورت چلتے چلتے چڑیا گھر کے چھوٹے بند دروازے کے سامنے رکتی ہے۔ خواہش آخر زبان پر آہی جاتی ہے۔

"آؤ چڑیا گھر کے اندر چلیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

پتہ ہے سیر گاہوں کے معنی کیا بنتے ہیں سنا ہے جہاں اب سیر گاہیں ہیں وہاں جنگلی جانور رہا کرتے تھے شیر چیتے خوں خوار پنجے نکالے شہر کے دروازوں پر دستک دیا کرتے تھے پھر شیروں چیتے کے گرد سلاخیں گاڑ دی گئیں وہ محصور ہو گئے رنگ برنگ پرندوں کو قینچیاں لگا متعفن تالابوں میں چھوڑ دیا گیا اور اس طرح چڑیا گھر بے سیر گاہیں وجود میں آئیں۔

شیر پنجرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لاتعداد چکر لگا چکا ہے۔ لگا رہا ہے۔ مور ناچتا نہیں تھکتا۔

"میں نے تم سے کہا تھا اس بے کار جگہ کے بجائے قلعے کی سیر کو جاتے تو۔" مرد تاسف سے کہتا ہے۔

"کیوں یہاں کیا خرابی ہے؟ سبزہ، پھول، خوشبو، ان گنت رنگ۔"

سبزہ زار شہر کے گرد فطرت کی فصیل میں لوگوں کے دلوں کے عین درمیان ویرانہ یا ویران دلوں کے عین درمیان ویرانہ یا ویران دلوں کے عین درمیان سبزہ زار یا آدمی کے ویرانے کے گرد آدمی کے ویرانے کی فصیل زندگی کے لئے تھوڑا بہت وحشی ہونا ضروری ہے۔

"تم تو رنگ اور خوشبو کا یوں ذکر کرتی ہو جیسے... دراصل نیچر ہماری نیچر کا آئینہ ہے۔" ایک پرندہ تنہا پاس کے درخت سے اڑتا ہے اور سیٹی بجاتا ہوا فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ "تمہارے خیال میں یہ پرندہ آزاد ہوگا؟"

"اچھا بابا... تم ٹھیک کہتے ہو۔ فطرت بہت بد دیانت، بہت بد اخلاق ہے۔ یہ سبزہ، یہ پھول یہ درخت..." عورت بولتی بولتی لحہ بھر کے لئے سوچتی ہے۔

گھر میں زخم دیتے تنہا لمحوں سے جو چیز مجھے بچاتی ہے وہ کھڑکی سے نظر آتی احاطے میں پھیلتے پیپل کے درخت کی شاخیں ہیں ان میں گاتی چڑیاں ہیں جب تم دفتر میں ہوتے ہو تو میں سارا سارا دن ان پتوں کی گنتی گزارتی ہوں چڑیوں کی زبان سمجھتے گزارتی ہوں اور جب رات میں تم پھر فائیلوں کے ساتھ ہم بستر ہوتے ہو تو میں تمام پیپل کے ہرے پتوں سے زرد پتے چننے میں بسر کرتی ہوں چڑیوں کے گیتوں کو درخت کی کوکھ میں دفن کر کے اپنے بستر کے جنگل میں نیند کا پیچھا کرتی ہوں حتیٰ کہ سورج گذرے ہوئے دن کا آئینہ لے کر پھر پیپل کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور میرے حواس کو منتشر ہونے سے بچا لیتا ہے۔

"اگر یہ درخت یہ سبزہ یہ پھول میرے حواس کو قائم رکھتے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ ورنہ میں تو پاگل ہو جاؤں۔" عورت لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہتی ہے۔

"غلط... آدمی یا پاگل ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔"

"آدمی پاگل ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں گھر میں نظر بند کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے؟" مرد جھنجلا جاتا ہے۔ "اس کے سوا اور چارہ کیا ہے...؟ ملازمت۔ ملازمت۔ ترقی کا زینہ... معمولات کی زنجیر۔"

"میں نے تو کہا تھا، میں بھی نوکری کر لیتی ہوں۔ آخر میرا ایف۔ اے۔ کب کام آئے گا؟"

"کیا میں تنہا کافی نہیں؟ اور تم کیا چاہتی ہو۔ پہلے میں کلرک تھا اور اب سینئر کلرک ہوں۔ اگر اسی طرح کام کرتا رہا تو ایک دن..."

ایک دن، ایک دن ایک دن جب چیختے دہاڑتے غراتے شیروں کے ارد گرد سلاخوں کی فصیل مکمل ہو جائے گی اور وہ محصور ہو جائیں گے۔

شیر اور بھی تیزی سے پنجرے میں گھومنے لگتا ہے۔ مستعد پہرے دار۔ شیر کے گلے سے نکلتی خرخر کی آواز فلک شگاف دہاڑ بن جاتی ہے تمام آوازیں لبیک کہتی ہیں۔ مور کی چیخ اس واویلے میں ابھر کے ڈوب جاتی ہے۔ وہ ناچتا ناچتا اپنے پیروں کو دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے دم کو سمیٹ کر اپنے پیروں کو تاسف سے دیکھتا اندرونی کمرے میں چلا جاتا ہے۔

مرد اور عورت پل بھر کے لئے رک کے ان تمام آوازوں کو فضا میں بکھرتا سنتے ہیں۔ موڑ مڑتے ہیں۔ تمام آوازیں موڑ پر آگے رک جاتی ہیں اب کولتار کی سڑک پر ان کے جوتوں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں۔

وہ اس موڑ سے تھوڑا ہی دور پہنچے ہیں کہ رفتہ رفتہ قوالی کی آواز قدم قدم ان کی طرف بڑھتی ہے۔ دونوں آوازوں کے رخ ہو جاتے ہیں۔

دفن ہونے کے لئے کتنی خوبصورت جگہ ہے۔

مزار پر پہونچ کر عورت سوچتی ہے۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے، پھر جھک کر مزار کو چومتی ہے۔ مرد ذرا مزار سے ہٹ کر اکڑوں کھڑا ہے۔ اس کا رخ مزار کی طرف نہیں ہے۔ وہ موڑ سے پرے، موڑ میں چھپے چڑیا گھر کی باڑ کو آنکھوں سے ٹٹولتا ہے۔ قوالی کی آواز میں دبی دوسری آوازوں کو سننے کی کوشش کرتا ہے۔ موڑ کے پیچھے سب کچھ چھپا ہے، باڑ، چڑیا گھر، آوازیں، ٹریفک کی آواز بھی نہیں آتی، قوالی کے شور میں سب کچھ معدوم ہے۔

مرد کن انکھیوں سے مزار دیکھتا ہے۔

قدرت کا بہیمانہ مذاق زندگی میں اپنے سینے کے اندر ویرانے لئے بستی بستی گھوما کئے ہر لحہ فنا ہوا کئے اور جب فنا ابدی ہوئی تو کہاں۔ مرد عورت کو چلنے کے لئے اشارہ کرتا ہے۔

عورت دعا ختم کر کے ہاتھ چہرے پر پھیرتی ہے۔ مڑتی ہے۔ دونوں چلتے چلتے پہاڑی کے قدموں میں آتے ہیں۔ عورت پہاڑی پر چڑھنے کی غرض سے پہاڑی کے راستہ کی طرف بڑھتی ہے مرد رک جاتا ہے۔ پاس میل کے پتھر کو تھام لیتا ہے۔

"ہم پہاڑی پر نہیں جائیں۔"

"کیوں؟" عورت رک کر حیرانی سے اسے دیکھتی ہے۔

مرد میل کے پتھر سے ٹیک لگا کر کہتا ہے۔ "سوال نہیں کرنے چاہئیں۔ اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔"

"اور سوال نہ کرنے سے بھی تو انتشار۔ پلیز میری خاطر چلو پہاڑی پر چڑھیں۔"

مرد مجبوراً میل کے پتھر سے ہٹتا ہے۔ "چلو۔"

"یوں چکر لگا کر نہ چلیں؟"

"نہیں یہ سیدھا راستہ ہے۔" مرد چلتا چلتا کہتا ہے "تم آ رہی ہو یا نہیں؟"

"اس طرف سے نہ جاؤ... دیکھو تو سہی اس طرف کتنی سیڑھیاں ہیں آسمان تک ٹوٹی پھوٹی غیر محفوظ۔"

"میں تمہاری وجہ سے پہاڑی چڑھ رہا ہوں۔ یہ تمہاری خواہش ہے۔"

"اور وہ شکستہ پل کتنا خطرناک ہے اگر ٹوٹ جائے تو؟"

"چوٹی تک ایسے ہی راستے جاتے ہیں۔"

"توبہ۔ ایسے تیز نہ چلو۔ رک جاؤ۔ مجھے تھامو۔"

"یہ تمہاری خواہش ہے۔"

مرد جما جما کر پیر رکھتا پل کو پار کر لیتا ہے۔ عورت ہانپنے لگتی ہے۔ مری ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

"تم رک نہیں سکتے؟"

"نہیں۔" مرد پلٹ کر کہتا ہے۔ فوراً چیختا ہے۔ "نہ نہ ریلنگ کا سہارا نہ لو... یہ دیمک خوردہ..."

عورت کا سانس پھول جاتا ہے۔ وہ بڑبڑاتی، لکڑی کے دیمک خوردہ پل کی شکستہ ریلنگ کا سہارا لیتی ہے۔

"مجھے تم تک پہنچنا ہے تم رک جاؤ تو میں تم تک پہنچ ہی جاؤں گی۔ پھر تم ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دینا۔ ریلنگ کو تھامے بنا چارہ بھی تو کوئی نہیں۔"

عورت پل پر بہت احتیاط سے پیر جماتی دھیرے دھیرے مرد کی طرف بڑھتی ہے۔ جانے کیا بڑبڑاتی ہے۔ پاس پڑے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کے مرد کہتا ہے۔

"مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ تم لفظوں میں سانس ضائع نہ کرو۔ ابھی ان گنت سیڑھیاں باقی ہیں۔"

دونوں کو دیمک خوردہ پل کے آر پار ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ عورت جلدی سے اپنا پچھلا پیر اٹھا کر پل کے پاس پتھریلی زمین پر رکھتی ہے، مرد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو پکڑتی ہے اور بے جان ہو کر اس کی گود میں گر جاتی ہے۔ شکریہ شکریہ شکریہ۔ عورت کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے۔ چند منٹ بعد وہ اس کی گود سے سر اٹھاتی ہے۔ دونوں پہاڑی کی چوٹی کی سمت دیکھتے ہیں۔ اب صرف ایک چوتھائی فاصلہ باقی ہے۔ دونوں مڑ کر پل کی جانب دیکھتے ہیں۔

"توبہ" عورت کا سانس قابو میں آ چکا ہے۔ "اتنی ساری اترتی ہوئی سیڑھیاں۔ اور وہ... وہ مزار..."

سیڑھیوں کے اوپر درختوں کی شاخیں ایک دوسرے میں الجھی ہیں۔

دور نیچے آخری دہانے پر شام کا پہلا چراغ روشن ہوتا ہے۔ مزار پر قوالی شاید ختم ہو چکی ہے۔ مرد اور عورت کان لگا کے سنتے ہیں لیکن مینڈوں، جھینگروں، مینڈکوں کے شور اور پرندوں چمگادڑوں کی چیخوں اور پھڑپھڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں۔ شام آہستہ آہستہ پیڑوں سے اترتی ہے۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔" عورت اٹھتے ہوئے کہتی ہے۔ "آؤ چوٹی پر چلیں۔"

مرد کی نظریں درختوں سے بنی سرنگ کے مختلف کونوں کھدروں سے گھبرا کے پلٹتی ہیں۔

"شام ہو رہی ہے۔ آؤ گھر چلیں۔" مرد اٹھتا ہے۔

"کیوں، چوٹی پر نہیں جانا؟"

"چوٹی؟" مرد کی آنکھیں پل بھر کے لئے پتھرا جاتی ہیں۔

"چلو نہ۔" عورت بچوں کی طرح ضد کرتی ہے۔ "تم چوٹی سے خائف ہو!"

میں؟ چوٹی سے؟ خائف ہوں؟ میں!

مرد ایک دم عورت سے پوچھتا ہے۔ "تم میرے لئے اپنی جان قربان کر سکتی ہو؟" اور پھر اپنی نظروں کو درختوں سے بنی سرنگ کی دہلیز پر چھوڑ دیتا ہے۔

"کیوں؟" عورت کی سمجھ میں نہیں آتا۔ "کیوں؟"

"یہ غلط جواب ہے۔ جان دو گی؟ ہاں یا نہ..."

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اگر تمہارے مرنے سے میں بچ جاؤں۔ تو؟"

"کیوں نہیں؟ میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ ہمارا ساتھ ہمیشہ رہنا چاہئے۔"

قبر میں بھی؟ پھر بھی ہم تنہا ہوں گے اپنی اپنی قبر میں جیسے کہ اب ہیں۔

مرد مسکراتا ہے۔ "وعدہ؟"

"ہاں وعدہ... اب چلو۔" عورت چوٹی کو دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

"میری جان تمہاری ہے۔ جس طرح جی چاہے اسے برتو۔"

"تمہاری چوٹی تک پہنچنے کی خواہش سے میں جلنے لگا ہوں۔"

اوہ سمجھا اس پہاڑی کی چوٹی سے اس کی کوئی رومانی یاد وابستہ ہوگی پرانی کہانی یہ اور اس کا ہیرو یہاں آئے ہوں گے ایک دوسرے کے وجود میں دنیا پاتے ہوں گے پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"پھر تمہاری شادی ہو گئی۔ اور وہ دیوانہ اب بھی وہاں تمہارا منتظر ہوگا۔"

"کون دیوانہ...؟ اووووہ۔" عورت کے ہونٹ اداس مسکراہٹ میں لرزتے ہیں۔ "تم مجھے بھول گئے؟ تم ہی تو مجھے شادی سے پہلے یہاں لایا کرتے تھے۔ تمہیں یاد نہیں؟ میں کالج کی آخری کلاس مس کر کے گیٹ پر تمہارا انتظار کیا کرتی تھی پھر تم..."

"مجھے کچھ یاد نہیں۔"

مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

"مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔" عورت دوپٹے کے پلو کو انگلی پر بل دیتی ہے۔ "چلو نہ... وہ دیوانہ شاید اب بھی وہاں میرا انتظار کر رہا ہو۔"

مرد کے ہونٹ بھی عورت والی مسکراہٹ میں اداس ہو جاتے ہیں۔

"وہ خواب مر گیا۔"

"وہ خواب مر گیا...؟ تمھارے لئے نہیں وہ خواب اب بھی زندہ ہے۔ چلو وہاں چل کر دیکھیں۔"

"میں نے جب تم سے پوچھا تھا کہ میری خاطر جان دو گی تو تمھارا چہرہ زرد کیوں ہو گیا تھا۔"

"نہیں تو۔"

"ہوا تھا زرد... ایک سیکنڈ کے لئے۔ پتہ ہے، میں نے ابا سے بھی پوچھا تھا کہ آپ میری خاطر جان دیں گے؟ کہنے لگے۔ میں اب اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ موت بے معنی ہے اور پھر میں ایک بار تمھیں زندگی دے چکا ہوں دوبارہ کیا تک..." مرد ہنستا ہے۔ "جب ماں سے یہی سوال پوچھا تو فرش پر بوریا پھیرتے کہنے لگی... "میں بہت مصروف ہوں۔"

عورت بھی ہنسنے لگتی ہے۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ "تو چلو" اور چوٹی کی جانب قدم اٹھاتی ہے۔

"سوچ لو۔ پھر نہ کہنا۔"

"وہاں خواب۔" عورت پلٹ کر کہتی ہے۔

"وہاں ڈائن ہے۔ منہ پھاڑے دانت نکالے کھڑی ہے۔ زبان لہو سے تر۔"

"مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" عورت مسکراتی ہے۔

مرد سنجیدگی سے کہتا ہے۔ "پھر نہ کہنا۔ چلو۔"

دونوں چند قدم چلتے ہیں کہ بھاگتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز سن کر رک جاتے ہیں۔ ایک لڑکا شام کے پھیلتے سرمئی غبار سے جنم لیتا ہے۔

"یہ کون؟" عورت دبک کے مرد کے ساتھ لگ جاتی ہے۔

"لڑکا ہے۔ تتلی کا پیچھا کر رہا ہے۔"

لڑکا ان دونوں کو تقریباً چھوتا ہوا گزر جاتا ہے عورت کانپ جاتی ہے۔

نہ بھاگو لڑکے جانے دو تتلی کو ارے ارے آگے سیڑھیاں ہیں پھسلن ہے دیمک خوردہ پل ہے اے منے اے لڑکے اے بیٹے پھسل جاؤ گے گر جاؤ گے مر جاؤ گے

عورت چیختی ہے۔ "روکو۔ روکو اسے۔ گر جائے گا۔"

لڑکا کھلکھلا کر ہنستا ہوا درختوں کی سرنگ میں غائب ہو جاتا ہے۔ مرد اسے اس سرنگ میں تحلیل ہوتا دیکھتا ہے۔

جانے دو اسے خود اپنے لئے سچائی کی تلاش کرنے دو جب وہ ان دیکھی تتلی اس کے ہاتھ آتی آتی پھسل جائے گی تو وہ انگلیوں پر لگے نظر نہ آنے والے تتلی کے پروں کے بور کو دیکھتا سوچے گا سچائی کیا ہے اور پھر کائی جمی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کو پھلانگتا دیمک خوردہ پل پر ڈولتا اجنبی راستوں پر بھاگتا اس عکس کا پیچھا کرے گا جو اس کی دانست میں تتلی تھا حتیٰ کہ وہ اس سرنگ میں تحلیل

"روکو اسے... گم سم کیوں کھڑے ہو؟"

"چلو۔" مرد زیر لب کہتا ہے۔ عورت خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیتی ہے۔

"توبہ... ذرا آہستہ چلو۔"

"وہ رہی چوٹی..."

بکھرے ہوئے سانسوں کو سمیٹو

"یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ہاں۔ ہم تنہا ہیں۔"

دوسری طرف جہاں چشمہ پھوٹتا ہے نیچے اتر کے آبشار بنتا ہے جس کے دامن میں رات کو دھنک سوتی ہے لوگ تو وہاں ہوتے ہیں

"جانے تم کیوں اس اجاڑ میں..."

"اپنی چھٹی برباد کر رہا ہوں؟" میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ چھٹی کا یہ دن بھی گرد بن کر فائلوں کے ساتھ چمٹے ہوئے عام دنوں کی سائیکلو سٹائل کاپی ہو گا... "تم ہی تو چاہتی تھیں کہ پہاڑی کی چوٹی کو سر کریں۔"

"آؤ نیچے جا کر تالاب میں گرتی آبشار کو دیکھیں پھر ریستوران میں آئس کریم اور سموسے کھائیں۔"

"اچھا۔"

"لیکن تم تو پلٹ کر مزار کو جا رہے ہو۔ جانا تو چوٹی..."

"سب راستے اسی طرف نہیں جاتے؟" اوہ... ساری... میں کنفیوز ہو گیا تھا۔"

بس چند قدم اور پھر ہم اپنے اپنے خوابوں اپنی اپنی مصیبتوں اپنی اپنی اذیتوں کا سامنا کریں گے ہمیں خائف نہیں ہونا چاہئے یہ کیسی آواز ہے آواز تھی کوئی عین اس لمحے جب میرا خیال تھا کہ میں اس آواز کو پکڑ لوں گا پھسل گئی آوازیں فنا ہو جاتی ہیں اونھ ہوں فضائی لہروں میں امر ہو جاتی ہیں ساری کائنات ایک گونج ہے نوزائیدہ بچے کی پہلی چیخ کائنات کے نامعلوم راستوں پر بھٹکتی جب مرنے والے کی آخری ہچکی سے

"جانتی ہو ہم کائنات کی موسیقی ہیں۔"

"ذرا رکنا... ایک سیکنڈ..."

"آہ... ہم پہنچ گئے۔"

عورت چوٹی کی سطح پر قدم رکھتے ہی اپنا پرس کھول آئینہ نکالتی ہے۔ چہرے کو پف کرتی ہے۔ آنکھوں کا سرمہ درست کرتی ہے۔ مرد استہزائیہ انداز میں مسکراتا ہے۔

تم آنکھوں کو چاہے جتنا سنوارو آنسوؤں کی لکیریں نہیں مٹیں گی آنکھیں تو سوگ کی جھیلیں ہوتی ہیں آنسوؤں کے بغیر بھدی معلوم ہوتی ہیں الم بذات خود خوب صورت ہوتا ہے نہیں نہیں اس میں خود رحمی کی کوئی بات نہیں خواہ مخواہ رومانوی سوچ سوچنے کو جی چاہا تھا مجھے معاف کرو میں کولہو کا بیل ہوں اکتاہٹ کا مارا نامردی کا شکار میں نوکری کرتا ہوں اور آج نوکر دفتر نہیں گیا کل اتوار ہے نوکر کی ہر اتوار شاہی قلعے میں گذرتی ہے۔ آج نوکر بہت مشکل سے اپنی بیوی کے ساتھ سیر کے لئے نکلا ہے کہ کل اسے شاہی قلعے جانا ہے اتوار کے دن کی عیاشی وہ کسی کے لئے قربان نہیں کر سکتا

"آہ... ہم پہنچ گئے۔"

عورت اس سے الگ تیزی سے، سطح کے گرد کناروں پر لگے جنگلے کی طرف بڑھتی ہے۔

"دیکھو دیکھو... ادھر... یہاں سے آبشار کتنی خوب صورت نظر آتی ہے۔"

مرد کی ویران نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی ہیں۔

"وہ چھوٹی سی جھیل۔ وہ نیچے... دیکھو بالکل میرے پیروں سے چشمہ پھوٹ رہا ہے۔"

عورت پلٹ کر مرد کو دیکھتی ہے۔ جو ایک بہت بڑے تناور درخت کے پیچھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک غار کے منہ کو دیکھ رہا ہے۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ دیکھو ہم کتنی بلندی پر ہیں... وہ دور نیچے جھیل میں بچے کاغذ کی..."

"مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" مرد پھر غار کے منہ میں نگاہیں ڈال دیتا ہے۔

تو میرا چھٹی کا دن ضائع نہیں ہوا میں قلعے میں نہیں پہنچا قلعہ ہی میرے پاس آ گیا لیکن یہ دہانہ قلعے کی دوسری سرنگوں سے کتنا مختلف ہے اور سرنگوں میں تو روشنی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتی رفتہ رفتہ بجھتی ہے لیکن یہاں تو باقاعدہ دروازہ ہے نہ سیڑھیاں تاریک منہ تاریکی میں اور بھی تاریک ہے سرنگ کا دہانہ کھردرے کناروں سے بنا ہے بے ترتیبی سے ٹوٹے ہوئے پتھر جن کی سطح پر اگے درختوں کی جڑیں لاروے

"ہائے دیکھو... اب روشنی ہوئی ہے تو جھیل میں واقعی دھنک اتر آئی ہے۔ فوارے سے اچھلتی بوندیں تاروں کی طرح ٹوٹ رہی ہیں۔"

عورت بچوں کی طرح تالیاں بجاتی مڑتی ہے۔ مرد کو ڈھونڈتی، سرنگ کی دہلیز پر جھکے مرد کے پاس آتی ہے۔

"تم... تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ آج ہم پہلی مرتبہ اکٹھے..." مرد آہستہ آہستہ نگاہیں اٹھا کے عورت کو دیکھتا ہے۔ گہری شام کی دھندلاہٹ میں مرد کی آنکھوں کی سرخی صاف نظر آتی ہے۔ عورت سہم سی جاتی ہے۔ "تم یوں کیوں بیٹھے ہو۔"

مرد مسکراتا ہے۔ "آخر میں قلعے میں پہنچ ہی گیا۔"

"قلعہ!" عورت حیران ہو جاتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں پاتی۔ "اٹھو... یہاں بہت اندھیرا ہے۔ کہیں کوئی سانپ وانپ..."

"سانپ؟" مرد ہنس دیتا ہے۔

"تم یہاں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"جو تم ڈھونڈ رہی تھیں تم نے پا لیا... جس کی مجھے تلاش ہے ابھی تک..."

"تم اس کھوہ..."

"تم جاؤ۔" مرد فیصلہ کن لہجے میں کہتا ہے۔

عورت سہمی ہوئی، مایوس، پلٹتی ہے اور جنگلے کے ساتھ لگ کر، پہاڑی کے قدموں میں، اچھلتی آبشار سے پھوٹتی دھنک پر جھک جاتی ہے۔

جانے میرے لئے سرنگوں کے دہانوں میں اتنی کشش کیوں ہے شکر ہے چھٹی کا دن مرا نہیں تمام راستہ یہی سوچتا کہ ہم قلعے کی سیر کو جاتے تو اچھا ہوتا لیکن خواہش ہو تو ہر جگہ قلعے بن جاتے ہیں ہر جگہ سرنگوں کے دہن کھل جاتے ہیں تم ہر اتوار کہاں جاتے ہو؟

افسروں کی خوشنودی اور فوری ترقی کی خواہش میں... اتوار کے روز بھی دفتر!

"دفتر۔" مرد زیر لب کہہ کر مسکراتا ہے۔ "سرنگ۔"

پتہ ہے سرنگوں کے مالک سرنگوں کو کئی طریقوں سے استعمال کیا کرتے تھے مغل شہزادیوں کا پردہ اور شارٹ کٹ شہنشاہوں کی فرار کے خفیہ راستے اور ایک سرنگ بھی تھی جس کے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا یہ سرنگ ذرا دور جا کر دیواروں میں کٹ کے کئی راستوں میں بٹ جاتی تھی اس کے عین وسط میں ایک بلا کا منہ کھلا تھا جانے یہ سرنگیں بھی اسی سرنگ کے مانند ہوں کاش میں ان سرنگوں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکتا میری تو ہر اتوار کا سورج قلعے کی سرنگوں سے طلوع ہوتا ہے وہیں غروب ہوتا ہے اور میں سرنگوں کے دہن چاٹتا دہلیز پار کرنے کا ارادہ ہی کیا کرتا ہوں کیا پتہ یہ سرنگیں بھی اسی سرنگ کی طرح ہوں جس میں سچائی کے متلاشی داخل ہوتے ہی دوسرا قدم بلا کے منہ میں رکھ دیتے ہیں کہ شاید یہی باہر نکلنے کا راستہ ہو میں جاؤں اندر جا کے دیکھوں؟

مرد عورت کو پکارتا ہے۔ عورت خوش خوش مرد کے پاس آ جاتی ہے۔

"جانے یہ سرنگ کہاں جاتی ہے؟"

"کہیں نہیں جاتی... آؤ چلیں... جا کر سموسے اور آئس کریم۔"

"ابھی دیکھتے ہیں یہ کہاں جاتی ہے۔"

"نہیں۔" عورت کے چہرے کی تمام خوشی خوف کے تاثر میں بدل جاتی ہے۔ "اندر نہ جاؤ... کیا معلوم وہاں کیا ہو... سانپ بچھو... ڈھانچے، بلائیں... میں تمھیں اندر نہیں جانے دوں گی۔"

"میں نہیں۔ تم جاؤ گی۔"

"میں؟"

"ہاں..."

"میں؟"

"ہاں ہاں... تم...! تم نے تو میری خاطر جان تک دینے کا وعدہ کیا تھا... یہ تو معمولی بات ہے... یہ لو ماچس۔ اندر تاریکی ہوگی۔ صرف جھانک کر آجانا۔"

عورت ماچس نہیں لیتی۔ اسے بہت غور سے استفہامیہ انداز میں دیکھتی ہے۔

"میری خاطر۔ پلیز۔ میری خاطر۔" مرد التجا کرتا ہے۔ "تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟" مرد بہت پیار سے عورت کی گردن سے لٹکے لاکٹ کو سیدھا کر کے چھاتیوں کے عین درمیان سیٹ کرتا ہے۔ "صرف چند لمحوں کے لئے۔"

"تم... تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" عورت ایک دم پیچھے ہٹتی ہے۔ "یہ سرنگ تو معلوم نہیں ہوتی۔ کھوہ ہی ہے۔ ممکن ہے یہاں سے مالی نے مٹی کھود کر..."

"جو بھی ہو، سمجھ لو ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔"

"آنکھ مچولی؟" عورت کے ہاتھ سے برقع اور پرس پھسل کے گر پڑتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر تالی بجاتی ہے۔

"ہاں آنکھ مچولی۔" پھر ہم نیچے جا کر سموسے اور آئس کریم کھائیں گے۔

"اچھا... تمھاری خاطر... تم کہیں جانا نہیں... لو میں چلی۔" عورت ماچس کی ڈبیا سے سلائی نکال کر جلاتی ہے۔ "خدا حافظ۔"

خشک پتوں پر عورت کے پیروں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے جو کہ دیا سلائی کے شعلے کے ساتھ رفتہ رفتہ تاریکی میں دور ہوتی فیڈ ہو جاتی ہے۔

تم میری بیوی ہو تم میری ساتھی ہو تم میری جرأت ہو اگر میں خود اندر نہیں گیا تو کیا ہوا تمھاری آنکھیں بھی تو میری ہیں

ابھی تک آئی نہیں؟ مرد بے چینی سے سرنگ میں جھانکتا ہے کیا ہے اندر؟ کیسی جگہ ہے؟ تم اب کہاں ہو؟ جواب دو۔ کچھ ملا؟ بلا نظر آئی؟ بولو خیریت سے تو ہو؟ کوئی خزانہ جو کسی بھاگتے ہوئے شہنشاہ کی پیٹھ سے گر گیا ہو۔ جواب دو۔ تم کہاں ہو؟

سرنگ سے آتی کھانسی کو سن کر مرد کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوکھے پتوں پر چھوٹے چھوٹے لڑکھڑاتے قدموں کی آواز اس کی طرف بڑھتی ہے۔ دور سرنگ کے دوسرے دہانے پر دیا سلائی کا شعلہ بجھتا ہے۔

"تم ہی ہو نہ...؟ تم آگئیں!"

عورت سرنگ کی دہلیز پر پہنچ کر لڑکھڑاتی ہے۔ مرد بے صبری سے بڑھ کر فوراً اسے تھام لیتا ہے۔

تم؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

عورت بالکل عورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی کو مکڑی کے جالے چاٹ رہے ہیں۔ چہرے پر صدیوں کا غبار ہے۔ آنکھوں سے تاریکی بہ رہی ہے۔

"بولو... تمھیں کیا ہوا...؟"

ننھے ننھے سانس

مرد زمین پر پڑے برقعے پر بیٹھ کر عورت کا سر اپنے زانو پر رکھتا ہے۔ عورت کے چہرے کو سیدھا کرتا ہے۔

"جواب دو۔"

وہ جواب شاید سرنگ ہی میں کہیں چھوڑ آئی ہے۔ مرد کے منھ سے سوال پھر مشین گن سے جھڑتی گولیاں ہیں۔

"تم نے کیا دیکھا؟ زمین کی کوکھ میں کیا چھپا ہے؟ تاریکی؟ بچھو؟ سانپ؟ بلائیں؟ پنجر؟ انسانی ڈھانچے؟ تم کانپ رہی ہو۔ زرد ہو رہی ہو۔ کہیں بلا کے منھ کو باہر جانے کا راستہ سمجھ کر تم نے اس میں پیر تو نہیں ڈال دیا تھا؟ بھئی اس میں خائف ہونے کی کیا بات ہے یہ تو مذاق تھا۔ آؤ واپس چلیں۔ آبشار سے پھوٹتی دھنک کو قریب سے دیکھیں۔ ارے!" مرد کی نظریں اس کی چھاتیوں کے درمیان ہک پر جا پڑتی ہیں! "تمھارا لاکٹ کہاں گیا...؟ اندر ہی گرا آئیں؟"

مرد بہت احتیاط سے عورت کا سر اٹھا کر زمین پر پڑے پرس پر رکھ دیتا ہے اور اس کے بے جان ہاتھوں سے ماچس لے لیتا ہے۔

"بس ایک منٹ میں تمھارا لاکٹ لے آؤں۔"

مرد دیا سلائی کو ماچس پر رگڑتا ہے۔ شعلہ ہوا میں پھڑکتا ہے۔ وہ عورت کی چھوٹی چھوٹی کھانسی، رکتے رکتے سانس۔ بینڈوں، جھینگروں مینڈکوں اور چمگادڑوں کی سمفنی کے حوالے کر کے سرنگ کی دہلیز پار کرتا ہے اور اپنے پیروں سے نکلتی، خشک پتوں کی سرسراہٹ سمیت دھیرے دھیرے، دیا سلائی کی روشنائی لئے، سرنگ میں اتر کے سرنگ آشنا ہوتا ہے۔

اتوار کا دن

سورج گذرے ہوئے دن کا آئینہ لے کر پیپل کی کوکھ سے طلوع ہوتا ہے۔ عورت اپنے گھر کی کھڑکی سے، احاطے میں پھیلتی پیپل کی شاخوں سے ابھرتے چڑیوں کے گیت سنتی ہے۔ اس کا ہاتھ چھاتیوں کے عین درمیان قمیص کو اس جگہ ٹوچتا ہے جہاں لاکٹ نہیں ہے ☆☆☆

عابد سہیل

کی کتابیں

کھلی کتاب (خاکے)	160/-
فکشن کی تنقید	140/-
جینے والے (افسانے)	80/-
سب سے چھوٹا غم (افسانے)	50/-

رابطہ

عابد سہیل

۲۳۔ ایس۔ پی۔ سیکٹر "سی" علی گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۲۴

انور سجاد

شمارہ ۴۴،

جنوری ۱۹۷۰ء

اگر بچھو دہکتی آگ کے دائرے میں محصور ہو جائے تو وہ خود کو ڈنک مار کے مر جاتا ہے۔

یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔

کونے میں دیوار کے ساتھ لگی مستطیل میز جس کی سطح پر سفید صاف کاغذ پڑا ہے۔ اس میز کی پچھلی دائیں ٹانگ کے ساتھ ساتھ نظر کو اتارا جائے تو فرش پر، اس کے پیروں سے ایک فٹ کے فاصلے پر ایک موری ہے جو غسل خانے میں کھلتی ہے۔ اس موری کے راستے غسل خانے کا پانی کمرے میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی، کبھی کبھی جب پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے تو موری کی چھت کے عین نیچے چھوٹے سے گڑھے کے کناروں پر آ کے ذرا سا چھلک جاتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا، اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے، موری کی چھت کے نیچے چھوٹا سا جوہڑ بن گیا ہے، ایسے لگتا ہے جیسے کسی بڑے جوہڑ کو دوربین کے الٹے حصے سے دیکھا جائے۔ فرش کے ساتھ ساتھ چلتی ہوا کا دباؤ لحہ بھر کے لئے بڑھتا ہے تو اس کھڑے پانی کی لرزتی سطح سے ایک آدھ مچھر اڑ کر موری کی دیوار پر بیٹھ جاتا ہے۔

غسل خانے اور کمرے کے درمیان اس سرنگ کی لمبائی آٹھ انچ ہے۔

کونے میں دیوار کے ساتھ لگی میز، جس پر پڑے سفید صاف کاغذ کی سطح پر نگاہ بڑھا کے دیوار تک لے جایا جائے تو اسی سطح پر میز سے دو انگل کی اونچائی پر ادھ ٹوٹے اندھے شیشوں والی بند کھڑکی کی دہلیز ہے جس میں اناناس کا خالی ڈبہ ایسے رخ اوندھا پڑا ہے کہ سورج کی کرنیں، ادھ ٹوٹے اندھے شیشوں کی تیز دھار سے کٹنے کے باوجود اس ڈبے میں عمودی پڑتی ہیں۔

جہاں کھڑکی والی دیوار، جا کے چھت سے ملتی ہے، وہاں سے لے کر چھت کے نصف حصے تک کھڑکی ہی کی شکل میں روشنی کی چوکور ہے۔ جس کی دیوار سے دور والی متوازی لکیر، دیوار کی طرف والی متوازی لکیر سے تین چوتھائی ہے۔ روشنی کی چوکور، کھڑکی کے ٹھوس حصوں کا یہ نیم تبدیل شدہ پرتو تو اتنا مکمل ہے کہ اس میں ادھ کٹے شیشوں کی تیز دھاریں بھی عیاں ہیں۔ روشنی کی اس چوکور میں باہر چلتے پھرتے لوگوں کے الٹے سائے ایک طرف سے بڑھتے ہیں، ادھ کٹے شیشوں کی تیز دھار اور کھڑکی کے چوکھٹوں کے خطوط میں الجھتے ہیں، دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ چھت پر ساکت کھڑکی کا تانا بانا، اس میں داخل ہوتے الجھتے، بچھڑے سائے، باہر کھڑے پانی سے منعکس ہوتی کرنوں نے بنے ہیں۔

بیک گراؤنڈ میں شہر کی آوازیں۔

فضا میں الجھتی بچھڑتی شہر کی آوازیں، چھت پر روشنی کے فریم میں آتے، الجھتے بچھڑتے لوگ، کھڑکی کی دہلیز میں اوندھا پڑا ڈبہ، میز پر سفید صاف کاغذ، میز کے پچھلے دائیں پیر سے ایک فٹ کے فاصلے پر آٹھ انچ لمبی سرنگ، جس کی سطح فرش پر چلتی ہوا کا دباؤ بڑھنے سے لرزتی ہے، یہ سب، یہ سب ایک دوسرے سے منسلک، نظر کی اس اکائی میں گندھے ہیں جس پر، موجودہ آنکھ کا پردہ گرا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔

کھڑکی کے ادھ ٹوٹے شیشوں سے داخل ہوتی ہوا، جس میں شہر کی آوازوں کی لہریں شامل ہیں، سفید صاف کاغذ کو میز کی سطح سے کھسکا دیتی ہے، سفید کاغذ میز کے کنارے سے آدھا لٹک جاتا ہے، لحہ بھر رک کر، اپنے لٹکے حصے کی کشش کے باعث میز کی سطح سے مکمل پھسل جاتا ہے، ہلکورے لیتا، فرش پر، سرنگ سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلہ پر جا گرتا ہے۔

اب سرنگ سے بچھو کا سر نکلتا ہے، پل بھر سرنگ کی دہلیز پر رک کے ادھر ادھر دیکھتا ہے، باہر آ جاتا ہے۔ اس کا جسم رنگ کے پیندے میں بنے چھوٹے سے جوہڑ کے چکنے مٹیالے پانی سے شرابور ہے۔ اس کی پیٹھ پر پانچ چھوٹے چھوٹے خوردبینی سائز کے بچھو سوار ہیں جو اسی مٹیالے پانی میں رنگے ہیں۔

مادہ، پانچ چھوٹے بچوں کا بوجھ پشت پر اٹھائے آگے بڑھتی ہے، اس کے گیلے پیروں کے باعث فرش پر تین ٹوٹی پھوٹی، ایک ساتھ چلتی، لکیریں کھنچ جاتی ہیں۔ سفید صاف کاغذ سے پانچ انچ دور، مادہ کے جسم میں تشنج کی لہر دوڑ جاتی ہے بچوں کے جسموں کی چکنائی، مادہ کے جسم کی چکنائی پر پھسلتی ہے، بچے پیٹھ سے پھسل کر فرش پر آ جاتے ہیں۔ مادہ کو اپنی پیٹھ کا بوجھ ہلکا محسوس ہوتا ہے، وہ پلٹ کر فرش پر کربل کربل کرتے بچوں کو ایک سیکنڈ کے لئے دیکھتی ہے۔ اس طرح اس کا رخ اس دیوار کی طرف ہو جاتا ہے، جس میں بنی بند کھڑکی، اندھے، ادھ ٹوٹے شیشے اور فریم میں داخل ہوتے، الجھتے، بچھڑتے سائے چھت پر منعکس ہیں۔ مادہ کربل کربل کرتے بچوں کو ایک سیکنڈ دیکھنے کے بعد سیدھا بھاگتی، دیوار پر چڑھ جاتی ہے اس کا رخ کھڑکی کی دہلیز کی جانب ہے جس میں اناناس کا خالی ڈبہ اوندھا پڑا ہے۔

پانچ خوردبینی سائز کے بچھو اپنے جسم کی بے قابو تھراہٹ سے فرش پر بڑی تیزی سے کھسکتے رہتے ہیں ان کا رخ فرش پر پڑے کاغذ کی طرف ہے جو سرنگ

سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر سفید و صاف پھیلا ہوا ہے۔

اب چھت پر منعکس متحرک سایوں میں اور فضا میں تھرتھراتی آوازوں کی لہروں میں ہیجان آجاتا ہے۔

تاریکی میں ملفوف ایک تاریک گوشے میں ایک نر، اپنے سوراخ سے نکلتا ہے۔ اپنی دم کو ڈھیلا چھوڑ کر اکڑا کے خم میں لاتا ہے، دم کے آخری سرے پر گلاب کے کانٹوں ایسے ڈنک کو لہراتا ہے، سر اور جسم کے جوڑ سے دونوں اطراف نکلتے بازوؤں کے آخیر میں جبڑے پلاس نما جبڑوں کے دندانوں کو رگڑتا ہے، بڑھتا ہے۔ اس کی چال نارمل نہیں۔ اسے سرمستی کا انداز پیٹ کے نیچے ابھری ہوئی خاردار سطح میں ابھرے ہوئے کانٹے سے نکلتے رس، ور خوش بو نے دیا ہے جو اس کے قابو سے نکل کر مادہ کے قابو میں جانا چاہتا ہے۔

وہ ادھر ادھر دیکھتا اسی چال میں چلتا ہے۔

مادہ، کافی پرے اسی تاریکی میں ملفوف حشرت الارض کی تلاش میں مصروف ہے اس کی نظر اس سرمست پر پڑتی ہے۔ وہ اسے لبھانے کے لئے اور بھی مستی کا انداز اختیار کرتا ہے۔ مادہ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتی ہے۔ نر قریب آتا ہے تو وہ اس کی خوش بو میں سرشار اسے چھونے کی اجازت دیدیتی ہے۔ نر اور مادہ کے بازوؤں کے پلاس نما جبڑے ایک دوسرے کو جکڑ لیتے ہیں۔ تب نر الٹے پاؤں چلنے لگتا ہے، لگتا یوں ہے جیسے مادہ اسے دھکیل رہی ہے۔

پھر کہیں سے ایک اور نر ٹپک پڑتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جبڑوں میں جکڑے اسی طرح چلتے رہتے ہیں۔ دوسرا نر لپک کر مادہ کی دم کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے اور رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ بالآخر دوسرا نر تھک ہار کے الگ ہو جاتا ہے۔ پہلا نر، مادہ کو اسی طرح تھامے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

تب ماتھے ایک دوسرے کو چھوتے ہیں، منہ ایک دوسرے پر ثبت ہوتے ہیں پھر ایک دوسرے کے چہرے پر ہوائی لمس کی طرح پھیرتے ہوئے اپنی اپنی لذتوں کا پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ مادہ اس سارے عمل سے بور نہیں ہوتی، اس لئے اس بوریت کا نتیجہ نر کے سر پر مادہ کی دم کا کوڑا برسنے میں ظاہر نہیں ہوتا۔

خوشبو اور رس میں گنج، سرمستی کا یہ رقص جاری رہتا ہے۔

اب یہ تاریکی میں ملفوف ایک تاریک گوشے میں بڑے پتھر کی اوٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ نر اپنی بچی کچی قوت کو سمیٹ کر مادہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے رس اور خوش بو کی خاردار سطح میں ابھرا کانٹا، مادہ کے رس اور خوش بو اگلتے چھید میں پیوست ہو جاتا ہے، ان دونوں حصوں کے ارد گرد ابھرے دندانے ایک دوسرے کو جکڑ لیتے ہیں۔

نر اپنے بازوؤں کے پلاس نما جبڑوں کو کھول کر مادہ کے جبڑوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک بار پھر اپنی ساری طاقت یک جا کر کے بھاگنے کی تیاری کرتا ہے لیکن اتنی طاقت نہیں سمٹ پاتی کہ اپنے پیٹ کے دندانوں کو مادہ کے پیٹ کے دندانوں سے چھڑا سکے۔ چھید میں سے کانٹا نکال سکے۔ وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ مادہ کی دم کوڑے کی طرح نر پر برستی ہے۔ گلاب کے کانٹے ایسا ڈنک اس کے جسم میں پیوست ہو جاتا ہے تب وہ خود کو اس لاش سے علیحدہ کرتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے اسے دیکھتی ہے پھر دھیرے دھیرے بڑھ کر آہستہ آہستہ اس کا منھ اپنے منھ میں لے لیتی ہے، چبانے لگتی ہے، نگلنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا پورا سر کھا جاتی ہے۔ باقی جسم کو چھوڑ کر نہایت مدھم رفتار سے ایک طرف کو چل دیتی ہے۔

تاریکی میں ملفوف تاریک کونوں سے حشرت الارض کا ہجوم سر کٹے نر کی طرف بڑھتا ہے۔

مادہ اسی مدھم رفتار سے چلتی ہوئی اس ٹب کے نیچے پہنچ جاتی ہے جس کا ایک حصہ، نیچے اینٹ ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھا ہے۔ ٹب کے نیچے اس اینٹ کی اوٹ میں پہنچ کر وہ رک جاتی ہے، ستانے لگتی ہے۔ ستاتی رہتی ہے۔

تاریکی کے اس وقوعے کا جادو اس کے پیٹ میں سمندر کی لہر بن کر سر اٹھاتا ہے، اس کے سارے وجود کو کھرے پر پٹخیاں دیتا ہے۔ تب اس کے پیٹ کے وسطی چھید سے پانچ خوردبینی سائز کے بچے ایک ایک کر کے برآمد ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ان میں حرکت ہوتی ہے تو وہ رینگتے ہوئے اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ مادہ اپنے پلاس نما جبڑوں سے انھیں سوار ہونے میں مدد دیتی ہے، پھر بغیر کسی ارادے کے اس سمت میں چل دیتی ہے جدھر آٹھ انچ لمبی سرنگ غسل خانے کو ساتھ والے کمرے سے ملاتی ہے۔

سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر وہ اس جوہڑ کے کنارے سے پھسل جاتی ہے جو سرنگ کے پیندے میں بنا ہے۔ گدلے پانی میں غوطہ کھانے کے بعد ابھرتی ہے، اس کے پاؤں، پلاسوں والے بازو اور دم دیوانہ وار فضا میں لہراتے ہیں۔ وہ اپنے پیٹ کے محور پر گھومتی ہے، جوہڑ میں طوفان آجاتا ہے، لاروں میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے، مچھر اڑ جاتے ہیں، بچے اس کی پیٹھ پر چپکے، اس کی دم سے چمٹے لرز لرز جاتے ہیں۔ ڈوبتے ابھرتے، ڈوبنے ابھرنے، چکر کھانے کے اسی عالم میں اس کے پلاس نما جبڑے فرش کے کنارے پر جا پڑتے ہیں۔ وہ بہ صد دقت کنارے کو تھام کر اپنے پیروں کو جماتی، جسم کو سمیٹتی آہستہ آہستہ خشکی پر آجاتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے سرنگ کی دہلیز پر رک کے جائزہ لیتی ہے، باہر آجاتی ہے۔ اس کا جسم جوہڑ کے چکنے مٹیالے پانی سے شرابور ہے، اس کی پیٹھ پر سوار پانچ خوردبینی سائز کے بچھوؤں کے جسم بھی اسی چکنے مٹیالے پانی میں رنگے ہیں۔

اب مادہ، کھڑکی کی دہلیز پر بڑی تیزی سے چلتی ہوئی یک دم رک جاتی ہے۔ سر اٹھا کے ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ گھوم کر ڈبے کی مخالف سمت میں بڑھتی ہے، پھر رکتی ہے۔ دائیں جانب بڑھتی ہے، رک کے بائیں جانب بڑھتی ہے پھر پلٹ کر تیزی سے بھاگتی بلا ارادہ اوندھے ڈبے میں داخل ہو جاتی ہے جس میں سورج کی کرنیں ادھ ٹوٹے اندھے شیشوں کی تیز دھار سے کٹنے کے باوجود عمودی گرتی ہیں۔ وہ ڈبے میں داخل ہوتے ہی ایک دم گھبرا کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ڈبے کے گول منھ کی اونچی دیوار پر اس کے ہاتھ پاؤں جم نہیں پاتے۔

اس عرصے میں وہ پانچ خوردبینی سائز کے بچے اپنے جسم کی بے تو بو تھراہٹ کے باعث کھسکتے ہوئے فرش پر پڑے سفید صاف کاغذ کے کنارے تک آپہنچتے ہیں۔

ڈبے میں مادہ عمودی کرنوں کے پے بہ پے واروں سے بھاگنے کی کوشش میں ڈبے کی دیواروں سے سر ٹکراتی ہے۔

پانچ خوردبینی سائز کے بچھو کنارے کو پار کر کے سفید کاغذ پر آ کے بکھر جاتے ہیں اور اپنے جسم کے ریشوں میں ابلتے جنون میں تھرکنے لگتے ہیں، اچھلنے لگتے ہیں۔

تب چھت پر منعکس متحرک سایوں اور فضا میں سنسناتی آوازوں کی لہروں کا ہیجان عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

عروج کے اس لمحے، عمودی کرنوں کے وار مادہ کے جسم کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ اگر بچھو اس طرح کسی ڈبے میں قید ہو جائے تو سورج کی روشنی اور حدت کے باعث مر جاتا ہے۔

یہ بات سچ ثابت ہو چکی ہے۔

اس سچائی سے قطع تعلق، پانچ خوردبینی سائز کے بچھو، تھرکتے، اچھلتے، اپنے جسموں پیروں بازوؤں، جبڑوں دموں اور ڈنکوں پر چڑھے مٹیالے رنگ کے پانی کا بوجھ ایک ایک کر کے سفید صاف کاغذ پر نقش کی صورت اتار دیتے ہیں، جس میں ان کی دموں کے سروں پر لگے گلاب کے کانٹوں ایسے ڈنکوں کا زہر بھرپور گھلا ہے۔

سفید صاف کاغذ پر اترتا، تھرکتا، ابلتا نقش کا زہر، ڈبے میں کرنوں کا ٹارگٹ بے جان جسم، فضا میں الجھتی، بکھرتی شہر کی آوازیں، چھت پر کھڑکی کے فریم میں آتے، الجھتے، بکھرتے عکس، یہ سب، یہ سب ایک دوسرے سے ننھی نظر کی اس اکائی میں گندھے ہیں، جس پر، موجود آنکھ کا پردہ گرا ہے۔

اب پردہ اٹھتا ہے ☆☆☆

حلقہ ارباب ذوق لاہور کے اجلاس
منعقدہ اتوار ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۹ کی کارروائی
جو درج رجسٹر ہوئی۔

سرور کامران: افسانہ عمل تخلیق کی تمثیل ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس عمل کو ظاہر کرنے کے لئے بچھو کی علامت کیوں لی گئی ہے؟

جیلانی کامران: افسانہ نگار کے جتنے افسانے نظر سے گذرے اس میں اس بات کا احساس ہوا کہ عنوان ہمیشہ غلط راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی یہی ہوا ہے۔ اگر اس افسانے کو تخلیق فن کی تمثیل نہ سمجھا جائے تو تمام جبریت میں گرفتار ہے۔ مادہ بچھو آتی ہے اور اپنا کام انجام دے کر چلی جاتی ہے کہ جس میں نر بچھو کا کھایا جانا بھی شامل ہے۔ مگر جس نر کو اس نے کھایا تھا اس کا حیاتیاتی اجراء بچوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کمرہ ہماری صورت حال ہے تو افسانہ ہماری سوشیو پولیٹیکل صورت حال کی علامتی توضیح ہے۔

نذیر ناجی: مادہ بچھو تہذیب کی علامت ہے اور تہذیب دراوڑی تہذیب ہے جس نے آریاؤں کی تہذیب کو کھالیا۔

انتظار حسین: افسانے کو خواہ مخواہ علامتی افسانہ سمجھا جا رہا ہے۔ یہ افسانہ حقیقت نگاری کی مثال ہے اور اس میں بچھوؤں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

افتخار جالب: افسانے میں نر اور مادہ بچھو کے امیجز سے تخلیق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ جب روشنی تیز ہو جائے تو فن کار نیم تاریک جگہوں میں چلا جاتا ہے اور تخلیق کا کام سرانجام دیتا ہے۔ افسانے کے آخری حصے میں محض بچھو ہی نہیں، حد نظر تک تمام کائنات ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ تخلیق خالص بچھو ہی کا کام نہیں۔ بچھو کی معنویت اپنے زہر اور اپنے نر کو کھا جانے کی وجہ سے ہے۔

سرور کامران: افسانہ سیڈ سنک ہے اور اس میں افسانوی انداز بہت کم ہے۔ افسانہ نگار نے واقعات کا محض گوشوارہ ہی مرتب کیا ہے۔

عارف وقار: انور سجاد کی مخصوص تکنیک ہے اور افسانہ منظر کشی اور واقعیت نگاری کے لحاظ سے کامیاب ہے ☆☆☆

حاشیہ "شب خون"

محبوب الرحمٰن فاروقی

اوپری سطح سے دیکھا جائے تو یہ ایک ننھے سے جانور کی جسے بچھو یا ریشم کا کیڑا بھی کہہ لیجئے کی جبلتی اور حیاتیاتی داستان ہے، ور پس پردہ اس میں Neanderthal man سے لے کر آج کی تہذیب وتمدن کا انحصار جس تخلیقی اور جنسی عمل پر ہوا ہے، اس کی ایک تمثیل بھی ہے۔ غار اور آگ کا دائرہ جنس کی علامت ہے اور فسانہ کا پہلا جملہ اس غلط بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس کی بدولت یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ بغیر لازمی جنسی فعل کے نہ تو تخلیق وارتقاء کا سلسلہ چل سکتا ہے اور نہ خود مجہول فاعل زندہ رہ سکتا ہے۔ اب یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے کیوں کہ کسی ایک شخص کے اس فعل سے الگ ہونے پر بھی تخلیقی سلسلہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور نہ وہ شخص خود ختم ہو سکتا ہے کیوں کہ جنس کی جبلت اپنی شکل بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ نقش کا مطلب حاصل فعل یا تخلیق کے وجود میں آنے سے ہے۔ افسانے میں سفید کاغذ کا برابر تذکرہ ہوا ہے۔ سفید کاغذ جس پر ننھے بچوں کے چلنے سے نقش بن جاتا ہے کائنات کی علامت ہے یہاں آ کر ہر شخص کچھ نہ کچھ حرکت کرتا ہے اور اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے چاہے یہ کسی عمل کے ذریعہ ہو یا آواز کے ذریعہ، جو ہمیشہ فضا میں گونجتی رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نقش مٹتے اور مدھم بھی ہوتے جاتے ہیں سفید کاغذ بچے کے کورے دماغ سے بھی مشابہہ ہے، جس پر تمام عمر کائنات و ماحول کے نقش بنتے رہتے ہیں اور آگے چل کر یہی نقش خود وجود کا سہارا بنتے ہیں اور اس کا احساس دلاتے ہیں۔ جوہڑ اور موری غلاظت کی علامت ہیں اور اس غلاظت کی بھی جو ایک مادہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دو بچھوؤں کی جنگ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے مصداق ہے یہ قرون وسطیٰ کے زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسانے کی ایک زمانی حد بندی بھی کر دیتی ہے لیکن اس ارتقائی سلسلہ کو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اس جلد بازی پر حیرت بھی ہوتی ہے لیکن دراصل قرون وسطیٰ کے طاقت کے فلسفہ سے نکل کر وجودیت کے فلسفہ تک آنے میں سارے درمیانی زمانے صرف پلک جھپکنے کی داستان ہی لگتے ہیں۔ افسانے کا آخری جملہ عصری ماحول کے زندہ انسان کی زندگی کی مکمل اور واضح ترین تلمیح ہے اور پردہ اٹھنا دراصل اس Cycle of life کی ایک دوسری شکل میں تبدیل ہو جانے کی حقیقت، جب موجود آنکھ کا گرا ہوا پردہ اٹھ جاتا ہے تو عقدہ کھلتا ہے کہ:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ☆☆☆

گینگرین (۱)

انور سجاد

شمارہ ۶۶

نومبر ۱۹۷۱

یہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے!

لوگ، ایک نظر آسمان کی طرف دیکھنے کے بعد، دم سادھ کر ایک دوسرے نظروں ہی نظروں میں سوال کرتے ہیں، نظروں ہی نظروں میں، ایک دوسرے سے مبہم سا خوف زدہ، اجنبی جواب پا کر اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو جاتے ہیں اور ان کے سائے سر جھکائے بہت ہی آہستہ رو، جیسے وقت، پانی کی آبشار نہیں موبل آئل کا دھارا ہے، بہت بے دلی سے، میکانکی انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں، کہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے سوا چارہ نہیں کہ ملگجی سی تاریکی نے ان نے وجود ساکت کر کے ان کے سائے الگ کر دیئے ہیں۔

وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑا آسمان کو دیکھتا ہے۔ بادل، بڑے بڑے، مہیب بادل، چاروں اور، تا حد نگاہ، تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے، ایک دوسرے میں گم ہو کر، ابھرتے ہوئے، چاروں اور پھیلتے، سمٹتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر اوپر کو اٹھتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے آخر میں، غیر جانب دار ملک ناروے کو جب غیر ممالک سے موسم کے بارے میں پیشین گوئیاں موصول ہونا بند ہو گئیں تو ناروے کے ماہرین موسمیات نے موسم کی پیشین گوئی کے لئے اس مفروضے پر نیا طریقہ ایجاد کیا کہ موسم، ہواؤں کے جھکڑوں کی حرکات سے جنم لیتا ہے، جہاں ہواؤں کا اتصال و تصادم ہوتا ہے، اس جگہ کو ان ماہرین نے جنگی اصطلاح کے مطابق، کہ اس وقت پہلی جنگ عظیم جاری تھی، فرنٹ یعنی محاذ کا نام دیا۔ اس فرنٹ پر اس اتصال اور تصادم کا اثر مختصر لیکن اتنا شدید ہوتا ہے کہ گرم ہوائیں آسمانوں کو اٹھتی ہیں اور سرد ہوائیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ تب فرنٹ کی کوکھ سے سرکش طوفانی عفریت دیوانہ وار نکلتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں بجلیاں تھامے، دامن میں ہریکین، ٹائیفون، سائیکلون یا تورنادو چھپائے ساحلوں، سمندروں اور میدانوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

یہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے؟

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا اپنے کمرے میں آتا ہے جہاں اس کی بیوی اپنے ابھرے ہوئے پیٹ کو تھامے، چار پائی پر حیران و پریشان بیٹھی ہے۔ سایہ سائے پر سوال داغتا ہے۔

...آج مرغوں نے اذانیں دی تھیں؟ پرندے چہچہائے تھے؟

اس کی بیوی آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر سر جھکا لیتی ہے۔ کہتی ہے۔

...آج دن پورے ہو گئے ہیں۔

...نہیں۔ نہیں۔ سورج نہیں نکلا... سورج نہیں نکلا۔

وہ پھر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا واپس چھت پر آ جاتا ہے۔ مشرق کی جانب دیکھتا ہے۔

...تو سورج واقعی نہیں نکلا؟

وہ ہر صبح خود چھت پر جا کر طلوع آفتاب دیکھتا ہے کہ جب اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس نے سنا تھا اور جب وہ پڑھنے کے قابل ہوا تھا اس نے پڑھا تھا اور جب وہ سمجھنے کے قابل ہوا تھا اس نے سمجھا تھا کہ دور دراز کی بعض زمینوں پر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی پہلی کرنیں وہاں کے انسانوں میں زندگی کا روپ دھارتی ہیں اور جب سورج اپنی کرنوں سے بندھا افق سے ابھرتا ہے تو انسان کا سنہرا مقدر بن کر اس کے سارے آسمان، اس کی ساری زمین، اس کے سارے وجود میں پھیل جاتا ہے کہ سائے اور وجود کا تضاد مٹ جاتا ہے۔

وہ ہر صبح خود چھت پر جا کر اس خواہش میں اپنے آسمان، اپنی زمین، اپنے وجود کو سورج کی کرنوں کے حوالے کرتا ہے لیکن ہر صبح، جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے، جب سے اس نے سنا ہے، جب سے اس نے پڑھا ہے، جب سے اس نے سمجھا ہے، ٹھٹھری ہوئی بانجھ کرنیں وہیں کہیں بیمار زرد سورج کے قریب لڑکھڑا کے گر جاتی ہیں۔ اس وقت سورج کے گول دائرے کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی سیاہ بدلیاں پھیل جاتی ہیں۔ زرد اور ہلکے نارنجی رنگ، سیاہی میں گھل کر سورج کے دائرے کو گڈمڈ کر کے پھیلا دیتے ہیں اور سورج کچھ ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے ان سب کی سانجھ بھینس کی دم پر وہ ناسور، جس کے بارے میں اس نے ماہرین کی زبانی سنا تھا کہ گینگرین ہے۔

وہ چھت پر پہنچتے ہی پلٹ کر تاریک سیڑھیوں کو دیکھتا ہے۔ نظریں سیڑھیوں کی تاریکی چاٹتی کمرے میں داخل ہوتی ہیں اور بیوی کے پھولے ہوئے پیٹ کے زرد، ہلکے نارنجی رنگ میں سیاہی گھول دیتی ہیں۔

(۱) Gangrene

گھنگر ین!

آج دن پورے ہوگئے ہیں

نہیں نہیں سورج

وہ سورج جو اپنی کرنوں سے بندھا مشرق سے ابھرتا ہے تو انسان کا سنہرا مقدر بن کر اس کے آسمان، اس کی زمین، اس کے وجود میں پھیل جاتا ہے کہ سائے اور وجود کا تضاد مٹ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں مقامی محکمۂ موسمیات کے ماہرین نے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ذریعے، صدیوں پرانی بشارت کو اپنی پیشین گوئی کے طور پر مشتہر کروایا تھا۔

لیکن وہ سورج ہے کہاں کیا حسب معمولی محکمہ موسمیات کی پیشین گوئی الٹ ثابت ہوگی لیکن یہ تو بشارتوں کا نوشتہ ہے اگرچہ ان میں وقت کا اندراج نہیں لیکن پھر بھی پھر بھی

یہ راتوں رات کیا ہوگیا ہے

وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے

اب وہ مہیب سرکش عفریت Cumulonimbus بادلوں کو سمیٹ کر کے غائب ہوگئے ہیں۔ ان بادلوں کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ پیدا تو ٹراپیکل سمندروں میں ہوتے ہیں لیکن ان کی یلغار ساحلوں اور میدانی علاقوں پر یکساں ہوتی ہے۔ یہ بادل ہر دم نئی شکلیں اختیار کرتے، بجلیوں کے کوڑے برساتے، بارش اور اولوں کی بوچھاڑ کرتے، ہریکین کی صورت دندناتے پھرتے ہیں۔ بعض علاقوں میں ہریکین کو ٹائیفون یا سائیکلون ہی کہا جاتا ہے اور خاص حالات میں تورنادو بھی... جب اس طوفان کے قیف نما ستون زمین پر اترنے لگتے ہیں۔

اس ہری کین، ٹائیفون، سائیکلون، یا خاص حالات میں تورنادو، کی ایک آنکھ بھی ہوتی ہے، اس کے مرکز میں، بہت پرسکون کہ دن کے وقت سورج اور رات کے وقت تارے صاف نظر آتے ہیں۔ اس آنکھ تک پہنچنے کے لئے اس کے گرد بے پناہ قوت سے گھومتے، سکڑتے، پھیلتے، ابھرتے، ڈوبتے بادلوں، ہوائوں اور بجلیوں کو پار کرنا پڑتا ہے۔

ان سرکش بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں میں تھپیڑے کھاتی، ابھرتی، ڈوبتی، اس کی آنکھیں ہریکین کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھتی ہیں۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ مہیب سرکش عفریت، جن کی جگہ کیومولونمبس بادلوں نے لے لی تھی، غائب نہیں ہوئے بلکہ اطمینان سے اس آنکھ میں بیٹھے، دن میں چمکتا سورج اور رات میں چمکتے تارے دیکھتے ہیں۔ بہ ظاہر تو ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن دھیان ان کا طوفانی بادلوں پر ہے جو ابروؤں سے بندھے، ابروؤں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

اس کی آنکھیں، طوفان کی اس صورت کا راز پاکر اسی طرح، دہاڑتے، چنگھاڑتے، بل کھاتے سرکش بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں کے تھپیڑے کھاتی، پلٹ کر اس کے گھر کی چھت کے بائیں کونے میں لگی کبوتروں کی چھتری پر اترتی ہیں اور چھتری کے بانس سے اتر کے پاس بیٹھے کبوتروں پر جا پڑتی ہیں۔ وہ بڑھ کر اپنا سب سے قابل اعتماد کبوتر اٹھاتا ہے، اس کا سر چومتا ہے اور فضا میں چھوڑ دیتا ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کی خبر لائے۔ کبوتر پھڑ پھڑا کے اوپر کو اٹھتا ہے اور مکانوں کی چھتوں پر متوازی پرواز کرتا ہوا مشرق کی جانب غائب ہوجاتا ہے۔

اب فضا تاریکی سے بہت بوجھل ہوجاتی ہے۔

وہ چھت کی منڈیر کے ساتھ ٹیک لگا کے پھر آسمان کا جائزہ لیتا ہے۔

اب بادل واضح شکلیں اختیار کرنے ہی لگتے ہیں کہ اس کی بیوی کی آواز اس کے کانوں میں آتی ہے۔

وہ آسمان سے نظریں نہیں ہٹانا چاہتا۔

بیوی اسے پھر پکارتی ہے، التجا بھرے لہجے میں۔

کیا مصیبت ہے

وہ جھنجھلا کے سیڑھیوں کی جانب آتا ہے۔ دیواروں کو تاریکی میں ٹٹولتا، سیڑھیاں اترتا ہے۔ کمرے میں پہنچتا ہے۔ اس کی نظریں بیوی کے پیٹ پر پڑتی ہیں۔

گھنگر ین

وہ بہت خوف زدہ ہوکر سرگوشی میں اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

... تمھیں معلوم ہے، ابھی بہت سے کوے آئیں گے اور... اور تمھارے پیٹ...

بیوی ہولے سے کراہتی ہے۔

... مجھے بہت درد ہورہا ہے۔ دائی کو بلالو۔

... مجھے سورج چاہئے، سورج۔

اس کے لہجے میں بڑی درشتی ہے۔ اس کی بیوی اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیتی ہے۔

بے بس، بانجھ غصے میں اس کے خاوند کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ گھٹے ہوئے سانس میں اس کی چبھتی ہوئی زبان سے چبھتے ہوئے لفظ نکلتے ہیں۔

... اس طوفان، اس نفسا نفسی میں جنم لے گا؟ کیا جنم لے گا؟

اس کی بیوی دھیرے دھیرے رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے:

... اس میں میرا کیا قصور؟

اس میں میرا کیا قصور؟ وہ اس جملے کو بار بار اپنے ذہن میں دہراتا ہے۔ اس کی بیوی اسے خاموش پاکر کبھی کبھی نگاہوں سے پلٹ کر اسے دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تناؤ کو رفتہ رفتہ ڈھیلا پڑتے دیکھ کر کہتی ہے۔

... دائی نے وعدہ تو کیا تھا آجائے گی۔ ابھی تک آئی نہیں۔ اس کی بیوی کے ہونٹ درد کی وجہ سے دانتوں میں آجاتے ہیں۔

اب اس کی بیوی کے جسم پر رینگتا کرب اس کے اپنے وجود پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ روبوٹ کی طرح اپنی بیوی کی طرف بڑھتا ہے۔ پھولا ہوا پیٹ جس کے زرد اور ہلکے نارنجی رنگ میں اسے سیاہی گھلتی نظر آتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی طرف اٹھتا ہے، وہ آنکھیں بند کے اس کی ناف پر بوسہ دیتا ہے اور تیزی سے مڑ کر باہر کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔

...میں باہر دیکھتا ہوں، شاید آ رہی ہو۔

وہ گھر کے دروازے سے نکل کر باہر بازار میں آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہوا جو گلیوں، بازاروں اور شاہ راہوں میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی، اب ذرا تیز ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ آسمان پر نظریں ڈال کر ڈرتے ڈرتے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور نظروں نظروں میں ایک دوسرے سے مبہم سا جواب پا کر اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو جاتے ہیں اور ان کے سائے سر جھکائے بہت ہی آہستہ رو، جیسے وقت پانی کی آبشار نہیں بلکہ موبل آئل کا دھارا ہے، بہت بے دلی سے میکانکی انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اب تیز ہوا میں، سڑک پر اڑتا ہوا اخبار کا ایک صفحہ آ کر اس کے پیروں سے لپٹ جاتا ہے۔

وہ جھک کر اخبار کے اس صفحے کو اٹھاتا ہے، پڑھتا ہے۔ نیم تاریکی میں اخبار کی شہ سرخی چمکتی ہے.. بھینس کی گینگرین... ماہرین نے علاج ڈھونڈھ لیا۔ پھر خبر کی تاریخ، مقام اجرا اور کچھ اس مفہوم کی عبارت کہ وہ بھینس جوان سب کی سانجھ بھینس تھی اور جس کی دم پر مدتوں سے گینگرین تھی، عجیب گینگرین تھی کہ جس کے زہر سے بھینس مرتی تھی نہ صحیح معنوں میں زندہ ہی تھی اور جس کے زخم سے گوشت کے ریشے اڑانے کی خاطر پیپ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، کوے، لاتعداد گوشت خور کوے شور مچا مچا کر ٹھونگے مارا کرتے تھے، آپس میں لڑا کرتے تھے، بھینس کو اذیت میں مبتلا کر دیا کرتے تھے، اس کا علاج ماہرین نے یہ کیا ہے کہ ان میں سے ایک کوے کو مار کر بھینس کی دم پر لٹکا دیا گیا ہے۔ اب میلوں دور تک کوؤں کا نشان نہیں۔ اب بھینس کوؤں کے کچوکوں سے آزاد ہے۔

لیکن گینگرین کا عذاب

وہ خود سے سوال کر کے اخبار کو دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اخبار کا کاغذ گیند بنا تیز ہوا میں سڑک پر گھومتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

تب اس کی آنکھیں یک دم چندھیا جاتی ہیں۔ بجلی کا لشکارا دم بھر میں ساری کائنات کو اندھا کر کے بادلوں کی کروٹوں میں چلا جاتا ہے، پھر گرج، گرج کی بازگشت، کی بازگشت جیسے کئی لاکھ ٹن ٹی این ٹی پھٹ گئے ہیں۔

اب فرنٹ پر ہواؤں کے اتصال اور تصادم کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

کیومونمبس بادل، ہر یکین کی پر سکون آنکھ میں بیٹھے عفریتوں کے ابروؤں سے بندھے واضح صورتیں اختیار کرنے لگتے ہیں۔ جنگلوں کی صورت، سجدہ ریز انسانوں کی صورت، منہ پھاڑ کر دھاڑتے ہوئے شیروں کی صورت، بھیڑوں کے پیچھے بھاگتے بھیڑیوں کی صورت۔ بجلی کا کوندا لپکتا ہے تو جنگلوں میں آگ برستی ہے، کیا حیوان، کیا انسان سب کے سب بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر گرج، گرج کی بازگشت کو تیز طوفانی ہوائیں اپنے شکنجے میں کس کے زمین پر وار کرتی ہیں۔ لوگوں کے ساکت وجود پر لباس پھٹے ہوئے پرچموں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہیں اور ان کے سائے ان کے وجودوں سے نکل کر چپ چاپ سر جھکائے بہت اداس، بہت بے دلی، بہت دکھ سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دائی، بازار کے نکڑ سے برآمد ہو کر اسے ذو معنی نگاہوں سے دیکھتی اس کے قریب سے گذر کر اس کے گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ اس کا دھیان گلیوں، بازاروں میں ٹمٹماتی ہوا، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں پر سیاہ گرزوں سے حملہ آور ہوا کے وار سہتا ہے کہ اب آسمان پر تمام صورتیں لپکتی بجلیوں میں بھسم ہو کر گہری خاکی، سیاہی مائل خاکی چادر کی صورت تننے لگتی ہیں۔

وجودوں کے سایوں اور سایوں کے وجودوں کی اوٹ سے، صاف و شفاف سفید قمیص پتلون پہنے ایک آدمی نکلتا ہے۔ بہت تیکھا۔ بہت اسمارٹ، اس نے ایک کندھے سے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر لٹکا رکھا ہے، دوسرے کندھے سے مووی کیمرہ اور فلیش گن، گلے میں ساکت تصاویر کھینچنے والا کیمرہ اور ایک ہاتھ میں مائیکروفون، وہ وجودوں کو ساکت پا کر سایوں سے پوچھتا ہے۔

...آپ کا موسم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سب اپنی اپنی بولیوں میں کہتے ہیں۔

...ہم جب اٹھے تھے تو موسم کو ایسا ہی پایا۔ ہم بے قصور ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ راتوں رات یہ کیا ہو گیا ہے؟

...سوال میں کروں گا، آپ نہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ موسم...

...ہم خوش ہیں، دیکھیے ہم مسکرا رہے ہیں۔

سفید پوش مائیکروفون کو ٹیپ ریکارڈر سے لٹکا کر فوراً مووی کیمرہ سنبھالتا ہے اور مسکراہٹوں کو محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا ہے۔

مسکراہٹیں ہونٹوں سے نہیں زبان پر لفظوں کی صورت آئی ہیں اور پھر روشنی تو ہے نہیں فلم پر تاریکی کے سوا کس شے کا عکس ہوگا۔

اتنے میں وہ سفید پوش ساکت کیمرے سے، فلیش گن کی مدد سے تصاویر اتارنے لگتا ہے۔ فلیش گن سے نکلے روشن، گینگرین دھبے گیس کے غباروں کی طرح اٹھ کر بادلوں کی سیاہی مائل خاکی چادر کی سلوٹوں میں تڑپتی، کلبلاتی، بین کرتی، معدوم ہوتی صورتوں پر جا کے چپک جاتے ہیں۔ اب چاروں اور بجلی کے کوندے لپکتے ہیں، زمین پر برستے ہیں اور دیکھتے دیکھتے بعض چوراہوں میں چند ایک وجود جلتی ہوئی مشعلیں بن جاتے ہیں۔ وہ ان مشعلوں کی روشنی میں

سفید پوش کو ان شعلوں کی تصویر اتارنے کی بجائے، کہ اب تو روشنی ہے، اپنی طرف بڑھتے دیکھتا ہے۔ اس کے قریب آ کر سفید پوش پوچھتا ہے۔

...آپ کچھ کہیں گے؟

...گینگ ری ی ی ی ن۔

وہ پوری قوت سے چلا کر کہتا ہے اور بھاگ کے اپنے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کمرے میں دائی اس کی بیوی کے پیٹ پر جھکی ہے، اس کے آنے کی آہٹ پر سر اٹھا کے کہتی ہے۔

...ابھی کچھ دیر ہے۔

وہ پلٹتے ہی لگتا ہے کہ ایک کتا دم دبائے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کتے کا سارا جسم جھنجھنائے ہوئے تار کی طرح لرز رہا ہے۔ کتا اس کی بیوی کی چارپائی کے نیچے گھسنے ہی لگتا ہے کہ اس کی بیوی چلا اٹھتی ہے۔

...اسے نکالو... باہر نکالو...

کتا اس غیر متوقع ردعمل کو محسوس کر کے وہیں ایک طرف دیوار کے ساتھ دبک جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو حیرت سے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ بیوی ہذیانی کیفیت میں چلائے جاتی ہے۔

...اسے باہر نکالو... باہر نکالو...

...رہنے دو، باہر موسم بہت خراب ہے۔

وہ چلائے جاتی ہے۔ چارپائی پر سست سست کر اس کا برا حال ہو جاتا ہے۔

...دیوانی ہوئی ہو... بے چارہ پناہ لینے آیا ہے۔

...مجھے نہیں پتہ، اسے باہر نکالو۔ تمھیں میرا ذرا خیال نہیں۔ نکالو اسے خدا کے لئے۔ ورنہ، ورنہ...

بیوی کو یوں دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کا تمام خون اس کے کانوں میں سنسنانے لگتا ہے، وہ دیوانہ وار پیر کا جوتا اتار کے اس سے کتے کو پیٹنے لگتا ہے۔

...نکل یہاں سے، حرام زادے... دفع ہو جا۔

جوتا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ کتے کو ٹھوکریں مارنے لگتا ہے۔ کتا اتنا بوکھلا جاتا ہے کہ اسے باہر جانے کا راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ کتے کو ٹھوکریں مارتا دروازے کی طرف دھکیلتا ہے۔

...نکل، نکل یہاں سے، کتے، حرام زادے۔

کتا، ٹھوکریں کھاتا، دم دبائے آہستہ آہستہ کھسکتا دروازے تک جا پہنچتا ہے، پلٹ کر چوں چوں کرتا اس کی طرف دیکھتا ہے۔ بے بسی، بے چارگی، مظلومیت اور حسرت میں ڈوبی، اس کی اپنی آنکھیں، کتے کی کھوپڑی سے اسے گھورتی ہیں۔ ان آنکھوں میں زرد ہلکے نارنجی رنگوں میں سیاہی گھل جاتی ہے۔

...گینگرین!

وہ چیختا ہے۔ کتے کو آخری ٹھوکر مار کے دروازے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دیتا ہے اور دیوانہ وار پلٹ کر دو دو چار چار سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر آ جاتا ہے، اس کے جسم کا ریشہ ریشہ بری طرح تشنج میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پٹھوں کی ڈھیل اور تناؤ کی ردم وہی ہے جو چوراہوں میں بھڑکتی مشعلوں کی۔

وہ اپنے تشنج پر قابو پانے کی کوشش میں بار بار مشرق کی سمت دیکھتا ہے، جس سمت سے اس کے بھیجے ہوئے کبوتر کو لوٹنا ہے۔

اب یوں ہوتا ہے کہ آسمان پر سیاہی مائل خاکی بادلوں کی چادر مکمل طور پر تنتے ہی یہ چادر مختلف جگہوں سے قیف نما ستونوں کی صورت زمین کی طرف اترنے لگتی ہے۔ اسے ماہرین تورنادو کہتے ہیں۔ زمین سے اٹھ کر آسمان کو جانے کے بجائے، آسمان سے زمین پر اترنے والے ان واوردولوں کے اندر ہوا کا دباؤ صفر، بلکہ منفی ہوتا ہے اور باہر کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر کھاتی ہوائیں۔ جہاں جہاں یہ قیف نما واوردولے اترتے ہیں، بڑے بڑے اسکائی اسکریپروں کو اپنے اندر لے کر خس و خاشاک بنا دیتے ہیں۔ ایک ایسے ہی واوردولے کو وہ اپنے کبوتروں کی چھتری کے عین اوپر اترتے دیکھتا ہے۔ غور سے دیکھنے پر اسے پتہ چلتا ہے کہ قیف کی نالی کی طرح اس کا سرا کھلا نہیں بلکہ بند ہے۔ اسے یکایک خیال آتا ہے کہ اگر کسی طرح قیف کے بند سرے کو وہیں روک دیا جائے تو تباہی سے بچا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ اور سوچے بغیر، بھاگ کر، بانس پر چڑھتا ہے اور ڈولتی ہوئی چھتری پر پہنچ کر بڑی مشکل سے متوازن ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ واوردولے کی قیف کا بند سرا کبوتروں کی چھتری کو چھوئے، وہ اسے اپنے کندھوں کے درمیان پشت پر روک لیتا ہے۔ بے پناہ دباؤ کی وجہ سے اس کے جسم کا ایک ایک مسام پھٹنے لگتا ہے، لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پا کر، اٹلس بنا، اس عذاب کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے گرد و پیش کو دیکھتا ہے، جہاں کہیں واوردلوں کے اترنے کا امکان تھا، وہیں اسے وجود اٹلس بنے نظر آتے ہیں۔ وہ پھر مشرق کی سمت دیکھنے کی غرض سے نظریں پلٹتے ہی لگتا ہے کہ عین اس وقت نوزائیدہ بچے کے پہلے سانس چیخوں کی صورت، سیڑھیاں پھلانگتے، طوفان کی گھن گرج کو چیرتے اس کے کانوں تک پہنچتے ہیں۔ اس کی نظریں لمحہ بھر کے لئے سیڑھیوں کی تاریکی میں رکتی ہیں پھر فوراً مشرق کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

اس کی آنکھیں مشرق میں گڑی ہیں۔ طوفانوں، ہریکینوں، ٹائیفونوں، سائیکلونوں، تورنادوؤں کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے، وہ کبوتروں کی چھتری پر متوازن کھڑا ہے کہ ابھی تک چالیس دن چالیس راتیں نہیں گذریں کہ اس کا بھیجا ہوا کبوتر اپنی چونچ میں سورج کی پہلی کرن لے کر آئے اور اسے اپنے افق پر اس سورج کے طلوع ہونے کی خبر دے، جو انسان کا سنہرا مقدر بن کر اس کے سارے آسمان، اس کی ساری زمین، اس کے سارے وجود میں پھیل جاتا ہے ☆☆☆

میں مرنے کے بعد بھی تمہارے کام آؤں گا

انورسن رائے

شمارہ ۱۰۴،
مئی تا جولائی ۱۹۷۷

زمین پر چلتے ہوئے
مجھ میں اب یہ طاقت نہیں رہی
کہ میں آسمانوں کی بلندیوں میں اڑوں
تو باز اور دوسرے شکاری پرندوں کی آنکھیں
مجھ پر نہ کھلیں
جنگلوں میں
شیر کے جبڑوں سے میرا جسم
اور لومڑیوں کی مکاری سے
میرے پاؤں محفوظ رہیں
سمندروں میں
شارکیں میرا پیچھا نہ کریں
زہریلی بیلیں مرے بازوؤں سے نہ الجھیں

میں گذرے ہوئے دنوں کی طرح ہونا چاہتا ہوں
جب مرے ماتھے پر
چاند نہیں چمکا تھا
میں نے
کسی کے ہاتھ چومنے کی خواہش نہیں کی تھی
اپنے گرد دیواروں کے خواب نہیں دیکھے تھے

جب نوجوان مرا احترام کرتے تھے
اور بوڑھے مجھے اپنے درمیان بٹھا کر
مقدس کتابوں کو چومنے کے برابر فخر محسوس کرتے تھے
گرمیوں میں
ان کی کنواری بیٹیاں
چاندی کے وراثتی کٹوروں میں
مجھے ٹھنڈا پانی پلاتیں
اور سردیوں میں
وہ مجھے اپنے گرم لباسوں میں شریک کرتے
جب خداؤں نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا
اور میں ان کے ہونے کا یقین دلانے کے لئے
گھنٹوں بولتا
میرا چہرہ ارغوانی اور آنکھیں انگور کی شراب کی طرح ہو جاتیں

میں دن بھر کا تھکا ہارا
چند سکے لئے گھر پلٹتا
مری ماں
میرے لئے منہ ہاتھ دھونے کا پانی گرم کرتی
اور مجھ سے لڑنے والی
چھوٹی بہن صبح کا بچا ہوا کھانا

وہ رات گئے گہری سردی میں
مری اکیلی قمیص اور پتلون دھوتی
اور نرم ٹھنڈے ہاتھوں سے
مرا کھردرا چہرہ چھو چھو کر
مجھے دن بھر کی باتیں سناتی

چھوٹے سے مکان میں ماں کی خوشی میرا آسمان تھی
میں بان کی چارپائی پر لیٹتا
تو ایک گود اس طرح کھل جاتی
جیسے کوکھ بچے کے لئے وا ہوتی ہے
طلسمی گھنٹیوں کی آوازیں مجھے لوریاں دیتیں

لیکن اب
اب کچھ بھی نہیں
کچھ بھی نہیں
کچھ بھی نہیں
میں تو راتوں میں چونک چونک کر جاگتا ہوں
تو میرے لئے کوئی گود نہیں کھلتی
طلسمی لوریوں کی آوازوں کو خواب ہواؤں میں
دیوتاؤں کے گھوڑے کی طرح اڑاتے ہوئے
مجھ سے دور لے جا رہے ہیں

میں اس گھونسلے میں ہی مارا جاؤں گا
اوس مری شاخوں پر رات کاٹے گی
یا پھر:
ان ہی سڑکوں پر چلتے ہوئے
کوئی مسخرا دولت مند
یا کسی بے وقوف نشے باز کی گاڑی
مجھے کچلتی ہوئی گذر جائے گی
مری لاش بے شناخت مردوں میں شامل کر دی جائے گی
میں مرنے کے بعد بھی
تمہارے کام آؤں گا

انورسن رائے

خدا حافظ

شمارہ ۱۳۴،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

اچھا بھئی... چل دیے
دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے
میں کہتا ہوں
خدا حافظ

خدا حافظ
ایک ساتھ کئی آوازیں آتی ہیں

خدا حافظ
سب سے آخر میں
ایک دبی ہوئی آواز کہتی ہے
میں پلٹ کر نہیں دیکھ سکتا
شاید جلدی کی وجہ سے
یا شاید...

لیکن
دروازہ مجھے روک لیتا ہے
مبارک... خدا حافظ

جلدی سے آگے بڑھتا ہوں
اسٹریٹ پول مجھ پر جھک آتا ہے
مو... بار... ک،... خدا حافظ
تب سے اب تک
سارے لوگ اور ساری چیزیں
یہاں تک کہ یہ نظم بھی
مجھ سے کہہ رہی ہے
مبارک
مبارک
خدا حافظ
خدا حافظ
خدا حافظ
اچھے لوگو
خدا حافظ
عمدہ چیزو

خدا حافظ پیاری نظم
خدا حافظ

چوہے کا خواب

شمارہ ۱۶۱،
مارچ، اپریل ۱۹۹۱

رات کے وقت میں ایک چوہے کو خداوند سے محوِ کلام دیکھتا ہوں، وہ کہتا ہے:

"وہ ان گنت باتیں، جن میں سے کچھ ہر اعتبار سے ناپسندیدہ تھیں یا مسلط کی گئی تھیں اور جنھیں میں جانتا تھا؛ اور بھی کچھ، ضرور بہت کچھ ہوتا، جس کے بھاری بوجھ نے میرے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے کر دیے۔ حالانکہ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن غیر معمولی طور پر طویل کی گئی زندگی گزارنے کے لیے یقیناً بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ پھر بھی مجھے ہر وقت یہ خیال رہا: ایک مختصر زندگی، بہر صورت، ہر لحہ درپیش، ایک نئے راستے کے ان اذیتناک مراحل سے بچا سکتی تھی، جو روزانہ، اس چھوٹے سے جہنم کو ایندھن مہیا کرنے کے لیے یقیناً کسی نہ کسی کمزور کی حق تلفی پر اکساتی ہے۔ اس کے باوجود کسی نے میرے لیے ایک شکنجہ تک لگانا گوارا نہیں کیا، کوئی مجھے نگلنے پر تیار نہیں ہوا، لڑکھڑا لڑکھڑا کر اپنی سمت بڑھتے ہوئے دیکھ کر موت کے چمکیلے دانتوں نے بھی اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ آخر کار تجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ تھا۔ جو میں نے انھیں متوجہ کرنے کے لیے نہیں کیا۔

خداوند! تیرا شکر ہے کہ میرا مقدر پھر بھی اس انسان سے بہتر ہی رہا، جو مجھے تجھ سے محوِ کلام دیکھ رہا ہے، اپنے خواب میں۔" ☆☆☆

لینن کا مشتبہ حریف

انور سن رائے

شمارہ ۲۱۵،
مارچ اپریل ۱۹۹۸

شاعر ایک نظم لکھنا چاہتا ہے
اس شاعرہ کے لئے جس سے وہ نفرت نہیں کرتا

جس کو مفتوح بنایا جا سکے
اس سے نفرت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی
اس بات کا
شاعر، شاعرہ اور نظم سے کوئی تعلق نہیں
شاعر نے ایک غیر ملکی دورے کے بعد داڑھی رکھ لی ہے
لینن کی بھی داڑھی تھی
کیا وہ خود کو لینن سمجھنے لگا ہے
صرف داڑھی کی بنا پر یہ بات پورے یقین سے نہیں کہی جا سکتی

شاعرہ لینن کی مداح ہے اور شاعر کی بھی
داڑھی کی وجہ سے نہیں
مداحی کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں
ان وجوہ کو الگ الگ کرنا
اور ان کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں
جس طرح یہ جاننا ضروری نہیں
کہ جب وہ شاعرہ کے حضور ہوتا ہے
تو خود کو لینن سے برتر کیوں سمجھتا ہے

شاعر کی اس سوچ کو
گورباچوف کے گلاس نوسٹ اور پرسٹرائیکا کے تناظر میں دیکھنا بھی
مناسب نہیں ہوگا
لیکن اس میں
ان کا کچھ نہ کچھ کردار ضرور ہے
شادی شدہ عورتوں سے
شاعر کی دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں
نہیں، اس کی وجہ یہ بھی نہیں کہ شاعر
پرخطر راستوں سے گریز کا حامی ہے
ہاں یہ ضرور ہے
کہ اسے نو آموزی اور ناتجربہ کاری ناپسند ہیں
پر مہارت نیا پن اور تخلیقی قوت کے بغیر
وہ کسی چیز کو قبول نہیں کر سکتا

شاعری میں تاریخی حوالوں کے برمحل استعمال کے علاوہ
وہ یہ جان لینے میں بھی مہارت رکھتا ہے
کہ کون عورت اپنے شوہر سے
کیا بات چھپانے
اور شوہر کی چھپائی ہوئی کیا چیز
بروقت نکال لانے کی صلاحیت رکھتی ہے

اس کام میں بھی اسے زیادہ دقت کی ضرورت نہیں پڑتی

صرف ایک دو ملاقاتیں
اوران ملاقاتوں میں شوہروں کی موجودگی
یا غیر موجودگی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا

وہ تمام عورتوں کی زبان جانتا ہے
اوران کی دلچسپیاں بھی
جیسے وہ دنیا بھر میں بنائی جانے والی شرابوں
ان کو تیار کرنے اور پینے والوں کے بارے میں جانتا ہے

اس شہر میں رہتے ہوئے بھی
وہ اس شہر میں کم اور تاریخ میں زیادہ رہتا ہے
اسے یقین رہتا ہے
شہر کی سب سے خوبصورت لڑکیاں
پھولوں کی نمائشوں میں جاتی ہیں
لیکن لڑکیوں سے اس کی دلچسپی
اگر ہمیشہ دور سے کی جانے والی ملاقاتوں سے
زیادہ ہوتی
تو بہت سی عورتیں قاتل بننے سے
اور وہ مقتول ہونے سے بچ جاتا

عشق کا آغاز وہ ہر بار
(اگر اسے عشق کہا جا سکتا ہے تو)

ایک نظم سے کرتا ہے
اور انجام پر بھی
ایک نظم ہی کو ترجیح دیتا ہے

اسے کبھی جلاوطن نہیں کیا گیا
لیکن اسے اور اس کی شاعری کو
جلاوطنی کے بغیر
سمجھا بھی نہیں جا سکتا
اس کے باوجود بھی
شاعرہ میں اس کی دلچسپی کے لئے
جلاوطنی واحد وجہ قرار نہیں پائے گی

تو کیا
اسے شاعری کے ہاں
لینن کا آنا ناگوار گذرا ہوگا؟
اس سوال کا جواب
کوئی بھی پورے یقین سے نہیں دے سکتا
یہاں تک کہ وہ خود بھی

وہ تمام مردوں کا حریف ہے
لیکن اس پر

لینن کا حریف ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا

انور شعور

شمارہ ۳۴،
اپریل ۱۹۶۹

اس میں کیا شک ہے کہ آوارہ ہوں میں
کوچے کوچے میں پھرا کرتا ہوں میں

مجھ سے سرزد ہوتے رہتے ہیں گناہ
آدمی ہوں، کیوں کہوں اچھا ہوں میں

صاف و شفاف آسماں کو دیکھ کر
گندی گندی گالیاں بکتا ہوں میں

قہوہ خانے میں بسر کرتا ہوں دن
قحبہ خانوں میں سحر کرتا ہوں میں

بار ہوتا ہوں کبھی احباب پر
اور کبھی فُٹ پاتھ پر سوتا ہوں میں

بیٹ کر جاتی ہے چڑیا فرق پر
عظمت آدم کا آئینہ ہوں میں

کانچ سی گڑیوں کے نرم اعصاب پر
صورت سنگ ہوس پڑتا ہوں میں

نازکوں کے ناز اٹھانے کے بجائے
نازکو سے ناز اٹھواتا ہوں میں

دوسروں کو کیا پتہ اپنا بتاؤں
میں کہ خود اپنے لئے عنقا ہوں میں

مجھ سے پوچھے حرمت کعبہ کوئی
مسجدوں میں چوریاں کرتا ہوں میں

مجھ سے لکھوائے کوئی ہجو شراب
مے کدوں میں قرض کی پیتا ہوں میں

میں چھپاتا ہوں برہنہ خواہشیں
وہ سمجھتی ہے کہ شرمیلا ہوں میں

یوں تو کہنے کو فروغ بادہ سے
کس جگہ آخر نہیں بہکا ہوں میں

جس محلے میں نہ بہکا تھا کبھی
اس محلے میں بھی اب رسوا ہوں میں

جس سے ملنے میں بہت محتاط تھا
اس کی نظروں میں بھی اب غنڈہ ہوں میں

کس قدر رسوائیاں ہیں میرے ساتھ
کیا بتاؤں کس قدر تنہا ہوں میں

خواب آور گولیوں کے راستے
خودکشی کی کوششیں کرتا ہوں میں

انور شعور

شمارہ ۱۲۳،
جنوری،فروری ۱۹۸۲

خدا کا شکر، سہارے بغیر بیت گئی
ہماری عمر تمھارے بغیر بیت گئی

جو بات اس کے اشارے پہ بیتتی ہم پر
وہ دل پہ اس کے اشارے بغیر بیت گئی

ہوئی نہ شمع فروزاں تو آنکھ کیا جلتی
شب فراق ستارے بغیر بیت گئی

بہار آئی تھی اس چھوئی موئی پر لیکن
نشان اپنے ابھارے بغیر بیت گئی

وہ زندگی جو گزارے نہیں گزرتی
ترے طفیل گزارے بغیر بیت گئی

نہ بیتتی تھی کبھی جس کی چاندرات اس کی
سہاگ رات ہمارے بغیر بیت گئی

شعور تیز رہی زندگی کی دوڑ اتنی
کہ ہار جیت شمارے بغیر بیت گئی

شمارہ ۲۰۵،
اپریل ۱۹۹۷

عبور کر نہ سکے ہم، حدیں ہی ایسی تھیں
قدم قدم پہ یہاں مشکلیں ہی ایسی تھیں

وہ مجھ سے روٹھ نہ جاتے تو اور کیا کرتے
مری خطائیں مری لغزشیں ہی ایسی تھیں

تمھارے ساتھ گزاری ہوئی شبیں اب تک
مجھے جگائے ہوئے ہیں، شبیں ہی ایسی تھیں

کہیں دکھائی دیئے ایک دوسرے کو ہم
تو منھ بگاڑ لیے، رنجشیں ہی ایسی تھیں

بہت ارادہ کیا کوئی کام کرنے کا
مگر عمل نہ ہوا، الجھنیں ہی ایسی تھیں

ہزار مرتبہ دیکھا مگر نہیں دیکھا
وہ گھر ہی ایسے تھے، وہ لڑکیاں ہی ایسی تھیں

بتوں کے سامنے میری زبان کیا کھلتی
خدا معاف کرے، خواہشیں ہی ایسی تھیں

نہ پوچھتا تھا وطن میں شعور کو کوئی
نہ آن بان نہ آسائشیں ہی ایسی تھیں

شمارہ ۲۱۲،
دسمبر ۱۹۹۷

اتفاق اپنی جگہ، خوش قسمتی اپنی جگہ
خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ

کہہ تو سکتا ہوں مگر مجبور کر سکتا نہیں
اختیار اپنی جگہ ہے، بے بسی اپنی جگہ

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ

صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

دوست کہتا ہوں تمھیں، شاعر نہیں کہتا شعور
دوستی اپنی جگہ ہے، شاعری اپنی جگہ

بیگانے

انور قمر

شمارہ نمبر ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۲

"بھائی! اس پہاڑ پر وہ روشنیاں کیسی نظر آ رہی ہیں؟"

اس نے تعجب سے کہا۔ "آپ کو نہیں معلوم؟ یہ وہی پہاڑ ہے جس کے غار میں وہ سارے براتی قید ہیں جن کا پر الم قصہ آپ نے کچھ مہینے پہلے اخبار میں پڑھا ہوگا۔"

"ہاں پڑھا تو ہے مگر یہ روشنیاں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"یہ لوگ کسی سوشل ادارے کے رکن ہیں جو اس غار میں قید لوگوں کو وقتاً فوقتاً سامان رسد پہنچاتے ہیں۔"

میں اس شخص کو کھانے کا آرڈر دے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا۔ کھانے کے دوران وقفے وقفے سے میں دیکھتا رہا کہ وہ روشنیاں دھیرے دھیرے نیچے اترتی جا رہی ہیں۔

"ان بدقسمتوں کو وہاں سے نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی؟"

"بہتری کوششیں کی گئیں، پر کامیابی نہیں ہوئی۔ غار کے دہانے پر جو چٹان آ گری ہے، بہت وزنی اور جسیم ہے۔ اتنی بلندی پر کوئی کرین تو جا نہیں سکتا تھا، اس لیے آٹھ آٹھ، دس دس بیلوں کی جوڑیوں کی مدد سے اس چٹان کو ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ وہ ہٹتی تو کیا، جگہ سے سرک بھی نہ پائی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ڈائنامائٹ کے استعمال پر غور کیا گیا؟"

"وہی موثر ترین نسخہ تھا۔ مگر چٹان کے ٹوٹ کر بکھرنے سے لوگوں کی جانوں کو بھی خطرہ تھا، اس لیے ڈائنامائٹ کا خیال ترک کر دیا گیا۔"

"تو کیا ان کی نجات کی اب کوئی صورت ممکن نہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کل خود جا کر دیکھ لیجیے گا۔ ذرا سا خلا ہے غار کے دہانے اور چٹان کے بیچ، اسی راستے سے غذا اور دوسری ضروری چیزیں ان کو پہنچائی جاتی ہیں۔"

کچھ دیر تک میں نے ادھر ادھر کے موضوعات پر ہلکی پھلکی باتیں کیں، بل ادا کیا، ڈھابے سے باہر آ کر گیسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔

گیسٹ ہاؤس کے وسیع ہال میں تمام نشستیں پر تھیں اور ان پر بیٹھے ہوئے بیشتر افراد میرے ہم سفر اور ساتھی تھے۔ مسز حیدر کی بغل میں ایک نشست کو خالی دیکھ کر میں نے آگے بڑھ کر مودبانہ ان سے کہا۔

"اگر مضائقہ نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

انھوں نے اپنی نگاہوں کتاب پر سے ہٹائیں اور میری جانب دیکھ کر بولیں "تشریف رکھیے۔"

مسز حیدر ایک چالیس، پینتالیس سالہ متمول اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کے شوہر کسی غیر ملکی جہازراں کمپنی میں بحیثیت کپتان ملازمت کیا کرتے تھے۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ دونوں شمالی ہند کی کسی ریاست میں انجینیئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ ساری باتیں مسز حیدر نے مجھے سفر کے دوران بتا دی تھیں۔

"کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟"

انھوں نے کتاب پر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "ایک ناول پڑھ رہی ہوں۔"

"دلچسپ ہے؟"

"کیا ناول کبھی دلچسپ ہو سکتا ہے؟ بشرطیکہ وہ طویل بھی ہو اور اجنبیت (Alienation) کے موضوع کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہو؟"

"آپ درست فرماتی ہیں۔ سوائے فرانسیسی ناولوں کے، کیا انگریزی ناول، کیا روسی، سب کا خاصا حصہ بوریت سے پر ہوتا ہے۔"

"اور میں جو ناول پڑھ رہی ہوں اس کا موضوع بور ضرور ہے لیکن میرے نقطۂ نگاہ سے بے حد اہم ہے۔"

"کہیں آپ کی مراد زندگی کی معنویت، انسان اور انسان کے مابین فاصلے اس کا اپنے فن سے، اپنے آپ سے، اپنے سماج اور خود اپنی فطرت سے بیگانگی تو نہیں؟"

وہ مسکرائیں اور بولیں، "کیا میں نے اپنی گفتگو میں ایسے واضح اشارے کر دیئے تھے کہ آپ کو میری زندگی میں کسی بیاباں کے وجود کا احساس ہو جاتا؟"

"مجھے کیا، کسی کو بھی اس بات کا احساس ہو سکتا تھا۔ میں تو آپ کے ایک وسیع و عریض عمارت میں قید تنہائی کے مترادف زندگی گذارنے کا تصور کر سکتا ہوں، ایسی عمارت کہ جس کی کھڑکیوں پر دبیز پردے پھیلے ہوئے ہوں، جس کے فرش پر کشمیری قالین بچھے ہوں، دیواریں قیمتی تصویروں سے مزین ہوں اور آرائشی مصنوعات سے گھر سجا ہو۔ موسیقی کے جدید آلات، ٹیلی ویژن، پولی تھین کے غلافوں میں لپٹے ہوں۔ سیڑھیوں پر ہوا کا سنسناتا جھونکا، اوپری منزل سے نیچے کی طرف آتا ہو، اور آپ ننگے پاؤں ساری عمارت میں کسی آتما کی طرح گردش کرتی ہوں۔"

"...اور میرے ذہن میں میرے خاوند کی یاد کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی صورتیں آ جا رہی ہوں ۔ میں چھوٹی تھی تو کنوؤں میں جھانکنے کا بڑا شوق تھا، کوٹھی کے احاطے میں ایک کنواں تھا جس کے پانی سے کھیت اور چمن کی آبیاری کی جاتی تھی۔ رہٹ چلتا تو اس کی آواز سن کر دوڑتی اور کمرے سے نکل کر کنویں کے پاس پہنچ جاتی۔ دراصل رہٹ کی آواز باغبان کی طرف سے دی جانے والی اطلاع ہوتی کہ میں موجود ہوں، تم کنویں کا جائزہ لے سکتی ہو۔ باغبان ایک سفید ریش، معمر شخص تھا جو پنج وقتہ نمازی اور دیندار تھا۔ جب میں اچھل کر منڈیر پر چڑھ جاتی تو رسول بخش کے مضبوط اور چوڑے ہاتھ مجھے شانوں سے پکڑ لیتے۔ جانتے ہو میں کنویں میں کیا دیکھتی؟ سبز پری کو، لال پری کو اور سیاہ پری کو!"

میں نے مسکرا کر کہا، "کنویں میں آپ کو دیو نظر نہیں آتے؟"

"سچ کہا تم نے۔ کبھی کبھار پریاں مدتوں دکھائی نہ دیتیں۔ ان کی جگہ دو سینگ والے ہیبتناک دیو نظر آتے جن کے نکیلے دانت، نچلے ہونٹوں کو دبائے ہوئے ہوتے۔"

گیسٹ ہاؤس کا بل ادا کر دیا گیا۔ ہم سب بس میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ بس کو پانڈولینے کے پہاڑ کے دامن میں ضرور روکے گا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم اس پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جہاں یاتریوں کی ضروریات اور تفریح بہم پہنچانے کا تمام سامان مہیا ہو اور آپ دوربین کے ذریعہ بہت دور دھواں اگلتی ہوئی تیز دوڑتی ہوئی ریل گاڑی دیکھ سکیں، یا آپ کو آتش فشاں پہاڑ جواب ٹھنڈے ہو چکے تھے، دکھائے جائیں۔ یا جہاں نوٹنکی کا خیمہ لگا ہو اور موت کو کنواں بھی موجود ہو، گنے کے رس اور وڑا پاؤ کا اسٹال لگا ہو۔ چوڑی فروش، چائے والے اور نجومی اپنا کاروبار جمائے بیٹھے ہوں تو آپ اسے میلہ ہی کہیں گے۔

وہاں پہنچتے ہی ہمیں بڑی فرحت اور تازگی کا احساس ہوا۔ میدانی ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے۔ دور دور تک ٹخنوں سے اونچی گھاس اگی ہوئی تھی جو دھوپ میں یک گونہ سنہری ہو چکی تھی۔

دیومالا کی روایت کے مطابق پانڈوؤں نے اپنے بن باس کے دنوں میں اس پہاڑ کے غاروں میں قیام کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد کسی عہد میں اس تاریخی روایت کو سنگ تراشی کے آرٹ میں منتقل کر دیا گیا تھا جو باراتی اور سیاح وہاں قید تھے وہ نقاشی کا یہی نمونہ دیکھنے گئے تھے۔

چڑھائی دشوار نہیں تھی۔ بعض مقامات پر سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ بعض جگہوں پر ناہموار سطح سے بھی سابقہ پڑتا تھا۔ غار نیچے سے دیکھنے پر زیادہ اونچائی پر نظر نہیں آ رہے تھے، مگر ہمیں وہاں پہنچتے پہنچتے گھنٹہ بھر لگ گیا۔ غاروں کا رخ چونکہ مغرب کی سمت تھا اور اس وقت تقریباً گیارہ بج رہے تھے، اس لیے یہ حصہ سائے میں تھا۔ اور سورج پہاڑ کی پشت پر تھا۔ ہمارے علاوہ پندرہ بیس زائرین (یا انھیں سیاح کہوں تو مناسب ہو) وہاں موجود تھے۔ میں نے مسز حیدر سے کہا۔

"کیا آپ یہاں فوٹو کھینچ لیں گی؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "یقیناً، مگر دو چار سے زیادہ نہیں۔" انھوں نے نیلی جینس اور اسی کپڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ان کے گلے میں نارنجی اسکارف لہرا رہا تھا۔ گہری سیاہ عینک کی فریم ان کی بڑی بڑی آنکھوں کی سائبانی کرتی ہوئی خم ابروؤں کو چھو رہی تھی۔ چڑھائی کی مشقت سے ان کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ مخالف سمت سے آنے والے ایک شخص کو روک کر انھوں نے پوچھا۔ "وہ لوگ کس غار میں پھنسے ہیں؟"

اس نے انگلی کے اشارے سے گذرگاہ کے انتہائی سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں، اس آخری غار میں۔"

ہمارا تو ارادہ یہی تھا کہ یکے بعد دیگرے تمام غاروں کو دیکھتے ہوئے وہاں تک پہنچتے، لیکن مسز حیدر کے اصرار پر ہم سب کے سب اس آخری ہی غار کی طرف بڑھ گئے۔ واقعی وہ غار ایک بہت بڑی چٹان سے ڈھکا ہوا نظر آیا۔ اگر لوگ پہلے سے واقف نہ ہوتے تو اس مہیب چٹان کے پیچھے اس کی موجودگی کا علم کبھی کسی

کو نہ ہوتا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ غار تو ہر طرف سے تقریباً سربند دکھائی دیتا ہے۔" مسز حیدر نے کہا۔

میں نے کہا، "دیکھنا یہ ہے کہ ان قسمت کے ماروں کو کھانا کہاں سے دیا جاتا ہے۔"

ہمارے ساتھیوں میں ایک سولہ سترہ سالہ نوجوان بھی تھا۔ وہ کسی صورت اس چٹان پر چڑھ گیا۔ اس کی مدد سے ہم نے بھی کوشش کی اور کھینچ کھانچ کر چٹان پر چڑھ گئے۔ تب ہمیں علم ہوا کہ چٹان کے اوپری سرے پر کوئی چھ آٹھ انچ کی خفیف سی دراڑ ہے جس میں سے کھانا پانی انھیں دیا جاتا ہے۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو غار میں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے مسز حیدر سے کہا،

"اندر تو گھپ اندھیرا ہے، کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"آپ ہٹئے۔ میں دیکھتی ہوں۔"

جب انھیں بھی کچھ نظر نہیں آیا تو انھوں نے پکارا، "اندر کوئی ہے؟"

مگر انھیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ انھوں نے اپنا سوال اسی انداز سے دہرایا۔ پھر مایوسی سے میری طرف گردن گھما کر بولیں:

"اندر تو کوئی نہیں ہے۔"

"کوئی نہیں ہے؟ تو ڈھابے کا مالک مجھ سے کیوں کہہ رہا تھا کہ... اور وہ لوگ انھیں کھانا پہنچانے کیوں آتے ہیں؟"

ہمارے بعد اوروں نے بھی آواز دی، مگر غار میں سے کوئی جواب نہ ملا۔

"ممکن ہے سو رہے ہوں۔"

مسز حیدر بولیں۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، اس تاریکی میں انھیں رات دن کا فرق کا اندازہ تو لگتا نہ ہوگا۔"

میں نے کہا، "ہم نے بچپن میں چھ مہینے سونے اور چھ مہینے جاگنے والے دیو کی کہانی پڑھی تھی۔"

وہ بولیں۔ "میں جب تم کو کنویں میں دکھائی دینے والی پریوں اور دیوؤں کے بارے میں بتا رہی تھی تو اس وقت بھی تم غیر سنجیدہ تھے اور اب بھی ہو۔"

ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ میں نے اپنے مطمحِ نظر سے انھیں واقف کر دینا ضروری سمجھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ زندگی میں بعض اوقات الیوژن کی شکل میں پیش آتے ہیں۔ وہ زندگی کی طرح حقیقی نہیں ہوتے۔ آپ ان پر جس قدر سوچتے ہیں وہ اتنے ہی واقعی اور حقیقی محسوس ہوتے جاتے ہیں... اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہم ان کے غیر یقینی ہونے کے خیال ہی کو ارادتاً ملتوی کر دیتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آپ ان پیکروں کا تصور لئے کنویں میں جھانکا کرتی تھیں جن کی بازیافت آپ کے ذہن میں ہو جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ آپ اسے حقیقت کا روپ دے دیا کرتی تھیں۔ مگر حقیقت میں نظر آنے والی رنگ برنگی پریاں اور ڈراؤنی شکل کے دیو آپ کے الیوژن کا کرشمہ تھے، اور کچھ نہیں۔"

"اور ہماری زندگی؟" وہ کچھ چیں بہ جبیں سی تھیں۔

"ہندو عقیدے کے مطابق تو وہ بھی مایا ہی ہے۔"

"اور اس غار میں قید اشخاص؟" مجھے ان کی آواز میں پھنکار سی محسوس ہوئی۔ میں نے انتہائی دھیمے لہجے میں کہا، "ان کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں، آیا وہ غار میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو اب کہاں ہیں؟"

ہم چٹان سے نیچے اتر آئے۔ ہمارے چند ساتھی بڑبڑا رہے تھے۔ مسز قدوائی نے کہا، "یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مسٹر بھونسلے نے سنترے کا چھلکا ترائی میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "اب تک تو کسارا گاؤں پہنچ گئے ہوتے۔ اتنی دیر میں تو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا ہوتا۔"

مسز بھونسلے نے خاوند کو ٹوکا۔ "آپ ایسا مت کہیئے۔ اس بہانے ایسے اہم تیرتھ استھان کے درشن ہو گئے۔"

مسز حیدر بولیں، "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں بیٹھ کر ان کھانا پہنچانے والوں کا انتظار کریں؟"

"آپ کا مطلب ہے... کہ رات آٹھ بجے تک؟"

"کیا انھیں دوپہر کا کھانا نہیں دیا جاتا؟"

"پتہ نہیں، ڈھابے کے مالک نے دو وقت توشہ پہنچانے کا مجھ سے ذکر نہیں کیا تھا۔"

"تو کیا اب وہ انھیں رات ہی کو کھانا پہنچانے کو آئیں گے؟" مسز حیدر نے مایوس ہو کر پوچھا۔

میں نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔ "جی، میں تو یقینی طور سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

مسز حیدر نے اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا اور کہا، "ذرا آپ اوپر جا کر ایک بار پھر سے آواز لگا کر دیکھیں۔ ممکن ہے کہ اب کی بار اندر سے کوئی جواب آجائے۔"

لڑکا چٹان پر چڑھ گیا۔ اس نے دہانے کے پاس منہ لے جا کر زور سے آواز لگائی۔

"اندر کوئی ہے؟ تم لوگ بولتے کیوں نہیں؟"

بڑی دور سے سے کسی کی کچھ دھندلی سی آواز سنائی دی۔ فوراً واپس آ کر اس نے بتایا:

"میں نے ابھی ابھی کسی کو اندر سے بولتے سنا ہے۔"

مسز حیدر کے چہرے پر خوشی کی لہر سی آگئی۔ انھوں نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کی طرف سہارے کے لیے بلند کیا جسے تھام کر لڑکے نے انھیں اوپر کھینچ لیا۔ مسز حیدر چٹان کی غیر ہموار سطح پر پیر جماتی ہوئی اس دہانے تک پہنچ گئیں۔ انھوں نے اپنا منہ دہانے پر جما کر زور سے پکارا: "اندر کوئی ہے؟"

اندر سے جواب آیا: "ہاں ہیں!"

"آپ کون ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟" اندر سے پوچھا گیا۔

"مسز حیدر۔"

"مسز حیدر؟" نام اندر سے دہرایا گیا گویا مزید معلومات کا مطالبہ کیا جا رہا ہو۔

"میں مسافر ہوں، اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ سفر پر نکلی ہوں، ہم لوگ شمالی ہند کی سیاحت کر چکے ہیں اور اب جنوبی ہند کے مقامات دیکھنے جا رہے ہیں۔ آپ لوگ اس غار میں کیسے پھنس گئے؟" مسز حیدر نے پکار کر کہا۔

"ہم باراتی ہیں، قریب کے گاؤں سے ہم ایک لڑکی بیاہ کر لا رہے تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ یہ ایک متبرک مقام ہے، کیوں نہ اس کے درشن کر لیے جائیں۔ سارے باراتی اوپر آ گئے۔ غاروں کا یکے بعد دیگرے درشن کرتے ہوئے ہم اس آخری غار میں داخل ہوئے کہ ایک زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی ہم جہاں تھے وہیں دبک کر اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد زور کا دھماکا ہوا اور ایک چٹان غار کے بالکل سامنے آ گری۔"

"کتنے عرصے سے قید ہیں آپ لوگ؟"

"یاد نہیں، آپ تو دیکھ ہی رہی ہیں کہ اندر کس قدر اندھیرا ہے۔ رات اور دن کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے۔"

"اندر کتنے لوگ ہیں؟"

"کچھ پتہ نہیں۔"

"کچھ پتہ نہیں؟"

"جی ہاں، ہم باراتی تو چالیس تھے، جن میں سے چار مر چکے ہیں، مگر ہمارے علاوہ بھی اور بہت سے لوگ ہیں۔ چونکہ غار اندر سے بہت بڑا ہے اس لیے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اندر ہی اندر پھیل گئے ہیں۔"

"اور کھانے پینے کا انتظام؟"

"باہر والے کر دیتے ہیں۔ مگر اس کی بھی اب ہمیں زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"کیوں؟" مسز حیدر نے تعجب سے پوچھا۔

"ابتدا میں عادت کے مطابق بھوک لگا کرتی تھی، اب نہیں لگتی۔"

"اندر آپ اور آپ کے ساتھی کیا کرتے رہتے ہیں؟"

"بیٹھے رہتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، سوچا کرتے ہیں۔"

"کیا سوچتے ہیں؟"

"اپنی گذری ہوئی زندگی کے بارے میں۔ اپنے رشتے داروں کے بارے میں۔"

"کن رشتے داروں کے بارے میں؟"

"جنھیں ہم چھوڑ آئے ہیں۔ جو آپ کی دنیا میں رہتے ہیں۔"

"ان میں سے کوئی آپ لوگوں سے ملنے بھی آیا؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ انھوں نے کوشش ضرور کی ہوگی۔ پتہ ٹھکانہ معلوم کیا ہوگا مگر انھیں سراغ نہ مل پایا ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ ایک روز وہ ہم سے ضرور ملنے آئیں گے۔"

میں نے دیکھا کہ مسز حیدر کا چہرہ سوگوار ہو چکا ہے اور ان کی آواز ڈوبنے لگی ہے اور لہجہ پرسوز ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا:

"تمھارے ساتھ کئی اور لوگ جو قید ہیں وہ کون ہیں، کہاں سے یہاں پہنچے ہیں؟"

جواب ملا: "جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اندر سے یہ غار بہت گہرا اور وسیع ہے چونکہ اس میں اندھیرا ہے اس لیے ہمیں اوروں کی موجودگی کا احساس تو ضرور ہے لیکن ان کے متعلق ہم کسی قسم کی معلومات نہیں رکھتے۔ ہاں ہم نے کسی غیر مانوس زبان میں بین کیا کرتے ہوئے لوگوں کو ضرور سنا ہے مگر ہم جب اس آواز کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ ہم سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا کہ جو اس غار میں قید ہیں اور وہ خدا جانے کب سے قید ہیں، کیوں کہ ابھی ابھی سنی ہوئی باتوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد افراد اس میں قید ہیں۔ مگر کیا ان سب کے متعلقین کو ان کے ساتھ پیش آئے ہوئے اس حادثے کا علم ہے؟ ممکن ہے کہ وہ ان کی جانب سے کسی اطلاع کے ملنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ وہ ان کے بحفاظت گھر لوٹ آنے کی اللہ کے حضور میں دعائیں کر رہے ہوں۔ مگر انتظار کرتے کرتے جب خاصا وقت گذر گیا ہوگا تو ان کی پراسرار گم شدگی ان کے لیے سوہان روح ہو گئی ہوگی۔

میں نے ابھی کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا

مسز حیدر نے کہا۔ "واقعی ہم ایسے واقعات سے کم ہی دوچار ہوتے ہیں۔ اضطراب کی وہ کیفیت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔"

ہم جس چٹان پر بیٹھے ہوئے غار میں قید باراتیوں سے باتیں کر رہے تھے اس چٹان کے نیچے مجھے کچھ اور لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ہم سے کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ نیچے آ جائیں تا کہ ہم لوگ بھی غار میں قید لوگوں سے مکالمہ کر سکیں۔ چٹان پر سے اتر کر میں نے جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ مسز حیدر کے ساتھ ساتھ دیگر ساتھی بھی میرا انتظار کر رہے تھے اور تفریحی مقامات کی جانب بڑھنے کو بے قرار تھے۔ میں بھی ان میں جا ملا ☆☆☆

کرفیو سخت ہے

انیس رفیع

شمارہ ۱۷۲،

جنوری ۱۹۹۳

سورج کہیں لاپتہ ہوگیا تھا...
یا کسی نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دی تھی
یا پھر کوئی دبیز سا کمبل اوڑھ کر اوندھے لیٹ گیا تھا سورج
اب جب کہ سورج لاپتہ ہو چکا ہے
ساری باتیں زمین کے حوالے
سارے معتر کے اندھیروں سے
ان اندھیروں میں پیلیا روشنی لئے
بیرسٹر داہر کا کمرہ۔

دیواروں پر کتابوں کے لمبے لمبے شیلف۔ بھلا دی جانے والی ساری بڑی بڑی کتابوں کے مدفن۔ کل ملا کر یہ کمرہ بوسیدگی کی طرف مائل تھا۔ دیواروں پر سفیدی برسوں سے پتی ہوئی تھی۔ شیلف کے شیشے جا بجا ٹوٹے ہوئے تھے چمگادڑوں اور کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کوئی کوئی کتاب شیلف سے باہر آتی ہوئی اٹک گئی تھی جیسے مکڑیوں نے جالے بن کر انھیں نیچے گرنے سے روک دیا تھا میز، کرسیاں، کھڑکیوں کے پٹ سب گرد آلود تھے اور پرانی وضع کا ایک بجلی پنکھا اور مخدوش لیمپ شیڈ چھت سے لٹک رہے تھے۔ اس میں لگا ہوا نحیف سا بلب جلنے پر بھی بجھا بجھا سا لگ رہا تھا بجھی بجھی کیفیت میں جلتے ہوئے اس بلب کے نیچے ایک گول میز تھی جس پر تین سروں کے سائے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔

داہر کے سامنے قاسم اور اس کا ایک محرر بیٹھے تھے داہر پے در پے کئی مقدمے ہار کر اپنی وکالت کی ساکھ بگاڑ چکے تھے۔ امام قیلی کے ایڈوکیٹ قاسم نے بھی داہر کو ایک بھاری شکست دی تھی اور اس کے بعد بیرسٹر داہر اپنے موکلوں کے لئے گمنام ہوتے چلے گئے تھے۔ شکست و فتح اپنی جگہ دونوں کے ذاتی تعلقات بہت گہرے تھے۔ کورٹ سے باہر دونوں ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے۔ مگر سورج کے اچانک غائب ہو جانے پر قاسم ہیبت ناک مقدمے میں پھنس گیا تھا داہر، قاسم اور محرر تینوں کے چہروں پر تناؤ تھا۔

کمرے کی پھیکی روشنی بھی فی الوقت ان کے لئے چمکتی سی امید تھی کیونکہ کمرے سے باہر کی روشنی، روشنی جیسی تو تھی پر روشنی ہرگز نہ تھی۔ کمرے کی تیرہ بختی سے کہیں زیادہ بدبختیاں کمرے کے باہر کھڑی تھیں، خموشی، سناٹا، سکرن، سیلن۔ شاید یہ کمرہ اپنی خستہ حالی کے سبب بیرونی عذابوں سے بچ گیا تھا ورنہ اس کی بغل والا مکان خشت خشت چھٹک کر ڈھیر ہو چکا تھا، ملبے کے اوپر پہرہ لگا دیا گیا تھا۔

"تم بیٹھو، میں باہر جھانک کر آتا ہوں۔"

"کھڑکی مت کھولنا، سن سے گولی اندر آجائے گی۔"

"کبھی اندر جھانک کر دیکھا نہیں۔ باہر جھانکنے سے کیا فائدہ؟"

"جب کہ اب باہر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں۔"

"جب بغل والا مکان خشت خشت ڈھیر ہو رہا تھا تب کھولی تھی کھڑکی؟"

"تب تو آنکھیں موندلی تھیں شترمرغ کی طرح۔"

"ویسے میں نے دیکھا تھا کھڑکی کھول کر۔"

"کب؟"

"جب سورج نقاب بند کیا جا رہا تھا اندھیارا دھیرے دھیرے زمین پر اتر رہا تھا۔"

"شاید اسی وقت جب میں تمھاری طرف آرہا تھا، یہ جانے بغیر کہ باہر گولیوں کا پہرہ ہے۔ گولی کی آواز پر نہ رکتا اور دونوں ہاتھ اوپر نہ اٹھاتا تو شاید وہیں سڑک پر ڈھیر کر دیا جاتا۔"

یک بیک بجلی چلی گئی۔ میز نے سایوں کو جذب کر لیا۔ باہر کی سنگینی

کمرے میں در آئی...

"دروازہ بولٹ ہے نہ؟"

"بولٹ ہے مگر..."

"ادھر ادھر مت پھرو۔ ایک ذرا سی آواز آفت ڈھا سکتی ہے۔"

"اب تو تاش بھی نہیں کھیل سکتے۔ ڈھیر سارے وقت کا ہم کیا کریں گے؟"

"بیان جاری رکھو مگر سرگوشیوں میں جب دھیرے دھیرے زمین پر اندھیرا اتر رہا تھا تو..."

"تو میرے کانوں کو محسوس ہوا دور کہیں دور ایک آواز گشت کر رہی ہے۔"

"کیسی آواز تھی؟"

"اذان تھی شاید، جو میلوں میل گشت کرتی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے دیکھا بغل والے منہدم مکان کے ملبے سے لہولہان لوگ سر پہ ٹوپیاں رکھے باہر آ رہے ہیں۔"

"کیا اس مکان کے مکیں ملبے میں دب کر مرے نہیں؟"

"زندگی اور موت کا پتہ نہیں۔ ان کے چہروں کی بے خوفی زندگی کی تھی یا موت کی، میں طے نہیں کر پایا۔"

پھر کوئی شے ادھر سے ادھر ہوئی۔ دھمک سے کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ تینوں سہم کر چپ ہو گئے۔ شاید شیلف سے باہر نکلی ہوئی کسی کتاب سے چمگادڑ ٹکرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں، کتاب گری ہے اوپر سے شیلف کے سارے شیشے چور ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ کوئی دن یہ ساری کتابوں گر پڑیں گی۔ زمین پر تب کیا ہوگا مسٹر داہر؟"

"وہی ہوگا جو کتابوں کے آنے سے پہلے ہوا تھا۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ ملبے سے لوگ باہر آ رہے تھے۔"

"ہاں وہ باہر آ رہے تھے۔ مگر آواز کی طرف روانہ ہونے سے قبل اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتے۔"

"کرفیو میں ایسا نہ کرنے سے گولی مار دی جاتی ہے۔"

داہر کی بیٹی درگا چائے کی تین پیالیاں اسی اندھیرے میں لے کر آ گئی۔ شاید اسے احساس ہو چکا تھا کہ کمرے میں محبوس قاسم اور اس کا محرر اس کے بغیر بڑی بیکلی محسوس کر رہے ہوں گے۔ درگا نے اندھیرے میں بیحد احتیاط کے ساتھ تینوں کو چائے کی پیالیاں بڑھائیں مگر چائے انھیں یاد ہی نہ تھی بیان جاری تھا۔

"پھر میں نے بہت غور سے آواز سنی، اذان تھی۔ وہ آواز دونوں ہاتھ اٹھائے لوگ قطاروں میں آواز کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔"

"بڑا عجیب منظر تھا۔"

"عجیب منظر۔ مجھے نہ جانے کتنے منظر، کتنے لوگ نظر آئے۔ سب لہولہان مگر رواں۔"

"تم دیکھ کر، ہم دونوں سن کر حیران ہیں۔ کیا اب بھی باہر یہی منظر ہوگا؟"

"مجھے یقین ہے کہ اب بھی باہر یہی منظر ہوگا۔ جب تک جائے نماز نہ مل جائے یہ لوگ ملبوں سے لہو میں ڈوبے نکلتے رہیں گے۔"

"مگر ہم نے کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔ ہم گوشۂ عافیت میں پڑے ہیں۔"

"جاؤ ذرا کھڑکی کھولو اور سنو کیا آواز اب بھی آ رہی ہے؟"

"نہیں۔ کھڑکی کی طرف مت جاؤ ورنہ یہ مکان بھی ملبے میں بدل جائے گا۔"

"مگر ملبے سے ہی تو زندہ لوگ برآمد ہوتے ہیں۔ صالحین نے جو کچھ کہا تم نے سنا نہیں۔"

"کیوں نہ ہم..."

"داہر ہم بھی اس آواز کی طرف روانہ ہونا چاہیں گے، شاید ہمیں بھی نماز مل جائے۔"

"مگر جانے سے پہلے ہمیں داہر کے کمرے سے چمگادڑ کو بھگا دینا ہوگا ورنہ یہ ساری کتابیں زمین پر گرا دیں گی۔"

"اسلاف کی چھوڑی ہوئی کتابیں چمگادڑیں زمین پر گرا دیں۔ اچھا نہیں ہوگا۔"

"وہ کتابیں چمگادڑوں سے برباد نہیں ہوتیں بھائی۔"

قاسم اور اس کا محرر صالحین دونوں داہر کے ہاتھوں کو چھو کر باہر جانے کی اجازت طلب کرنے لگے داہر نے دونوں کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔

"باہر کرفیو سخت ہے، ڈھیل ملتے ہی چلے جانا۔"

"اب کبھی ڈھیل نہیں ملے گی۔ لوگ ملبوں سے نکل کر جا رہے ہیں ہمیں بھی نماز ادا کرنی ہے۔"

داہر نے بدقت تمام انھیں جانے کی اجازت دے دی دروازے کا بولٹ کھول کر دونوں دھیرے دھیرے باہر آئے۔ باہر پھیکی پھیکی روشنی تھی، کرخت آواز ابھری...

"ہاتھ اوپر۔"

دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اسی آواز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہر دو چار مکان کے بعد انھیں ملبے نظر آئے اور ان ملبوں سے لہولہان لوگ نکلتے نظر آئے جہاں کہیں سے بھی اذان کی آواز آ رہی تھی وہاں مسجد ضرور ہوگی۔ ہزار ہا پل بیتتے چلے جا رہے تھے۔ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھائے اٹھائے کتنا لمبا سفر طے کیا، مگر ایک نقطہ بھی آیا جہاں انھیں آواز کا آخری سرا مل گیا۔ لوگ نماز کے لئے باجماعت کھڑے تھے اور سب کے ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔

وہ دونوں بھی جماعت میں کھڑے ہو گئے۔ مگر انھیں حیرت اس وقت ہوئی جب ان کے ہاتھ بھی اوپر سے نیچے نہ آ سکے ☆☆☆

انیس ناگی

شمارہ ۱۰۳،
مئی تا جولائی ۱۹۷۷

اب کہاں تک اس کے ادراک کے لئے خواب کی دنیا سے پرے، اپنی سوچ سے دریچوں اور روشن دانوں کی بلور آنکھیں روشن کریں؟

وہ مرتفع سرزمینوں پر لچکتی فلک بوس عمارتوں میں تاج پہنے ہوئے، کائی میں لپٹے ہوئے ہسپانوی طرز کے مکانوں میں بھی نہیں ہے،
نہ ہی اس کا نقش سروں کی طرح اترتے اور چڑھتے ہوئے میدانوں میں کہیں موجود ہے،
ہم نے عمر کے تمام نشیبی اور مرتفع حصوں میں، مرتعش جذبات کی کائنات میں، ہر ناممکن امکان میں، قبیلوں کے پراگندہ حسن میں، بسالٹ [1] کی رنگ بدلتی ہوئی سرزمین پر نیلی رنگت کے ہوگر شتربانوں کے ساتھ، ریت کے اوندھے پیالوں پر صحرائی چاند کی روشنی میں سفر کرتے ہوئے، گرینائٹ [2] کے پہاڑوں پر بے آباد قلعے اور متروک گرجا گھر میں اس کی تلاش جاری رکھا اور کبھی پتھریلے ساحلوں سے ایک غم ناک آواز سنی:

Femme, vous suis-je de grand sens

Dans les tenebres du coeur d'boune[3]

اس نئی پکار، اس نئی ابجد کے عقب سے بھی اس کی موجودگی کا مظہر سامنے نہ آیا، نہ ہی رموز کی قاموس کی کسی سطر میں اس کا قیام نظر آیا۔
اس الم ناک فراق کے باوجود ہم نے اس کی تلاش میں اپنی وطنیت کو خیر باد کہا، اپنی بہیمانہ ایشیائی سرشت کو الوداع کہا اور اپنے شجرۂ نسب کے آخری سلسلے کو فراموش کیا کہ اس کا قرب ہمارے لئے نئی علامتوں کا جہان بن سکے۔
مگر وہ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھی، ہر جگہ اس کے گذر جانے کے آثار تھے، ایک دن ہم نے مہندی ایسے سبز بحر المتوسط کے کھلے آسمان پر جنگی طیاروں کی لکیر کی مانند فضا میں چڑھتے ہوئے سفید پرندوں سے، صبح کے وقت چیختے ہوئے سمندری جہازوں سے، رات کو ساحلوں پر گشت، کشتیوں کے اشاروں سے، اس کے قیام کی، اس کی موجودگی کی آخری سمت پوچھی،
لیکن اوراں [4] کے ساحل پر صحرائے اعظم سے آتی ہوئی ہوا سے مرغ بادنما کی چاروں سمتیں ایک ہی سمت میں گھوم رہی تھیں!

---

(۱) Basalt (۲) Granite

(۳) یہ سینٹ جان پرس (Saint John Perse) کی نظم کا مصرع ہے: "اے عورت میں ایک عظیم معانی میں قلب انسان کی تیرگی میں تیرے تعاقب میں ہوں۔" (انیس ناگی)

(۴) Oran، الجیریا کا شہر۔

انیس ناگی

شمارہ ۱۰۴،
مئی تا جولائی ۱۹۷۷

ہم بدن کو متزلزل کرنے، دل ودماغ کو چٹخانے، اور تمام خواہشوں کو پھیکی حسرت میں تبدیل کر دینے والی خاموشی میں،
کس نادیدہ مستقبل کی کن رفعتوں کا، کس گذرے ہوئے شکوہ کا گیت گائیں کہ ہم کلامی کے صیغے سے محروم ہو چکے ہیں،
اب ملتے بھی ہیں تو کوئی وقوف نہیں پاتا، اور یوں ایک مدت سے بے کلامی کا جبر سب چور راستوں پر مراقبت کرتا ہے!
اس سے فرار کے سب منصوبے بنتے ہی کچھ سازش کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں، اور معانی سیاق وسباق کی غلط نشستوں میں اپنا رستہ کھو دیتے ہیں،
ذہن بھیانک خوابوں کی بھول بھلیاں بن جاتا ہے، آئینہ ہر چہرے کی شناخت سے منحرف ہو کر سانس کے بادل سے اندھا ہو جاتا ہے،
اسی جمود نے، اسی تعطل نے ہمیں ان تعبیروں سے دور کیا ہے، جن کا خواب ہم نے رذالت کے وجدان میں بے بصر لوگوں میں حیوانوں کی سی زندگی کا دم بھرتے ہوئے دیکھا ہے!
اس فلسفیانہ خاموشی کے باوجود ہم نے سمندروں کی زیر آب خاموشی میں ہر قطرے کو صدف بنتے ہوئے دیکھا ہے،
آسمانوں کے پر ہیبت سکوت میں نئے ستاروں کا خراج دیکھا ہے اور سمندری راتوں میں بھاپ کے آسمان پر گزشتہ صدیوں کی چاپ اور مستقبل کے نوحے سنے ہیں،
لیکن ہماری خاموشی میں کوئی صدا آباد نہیں ہے، کسی بستر کی کوئی یاد نہیں ہے۔ سکتے کا یہ عالم، ہو کی یہ واردات ہمارے لئے ایک پھیلتا ہوا استفہام ہے،
اور ان کے لئے دور خا جواب بھی ہے، جنھوں نے ہمارے حوصلے پست کئے ہیں، ہمیں کھنڈروں کی طرح ویران کیا، کہ ہم سوچ کے مجرم تھے،
یوں ہم اپنے ہاتھوں مہاجر ہوئے، طویل راتوں میں بھی بے خواب ہوئے اور ہمارے خواب بھی برباد ہوئے،
اور آج بھی ہماری خاموشی کا ان کہا صحیفہ بادلوں کی طرح بے امید شہروں پر سے گذرتا ہوا نئی سرزمین کی تلاش میں ہے کہ اپنے نوحے کی سرگذشت سنا سکے۔

انیس ناگی

شمارہ ۱۰۴،
مئی تا جولائی ۱۹۷۷ء

بلا تکان، بے نشان، رواں دواں، مستقبل اور حال کے جھرمٹ میں سے زندگی کی معمولات کو برقرار رکھتے ہوئے، میں نے کانوں کان خبر دیئے بغیر، ایک ذاتی ضرورت کے تحت چند ساعتیں قرض لی ہیں،

کہ کون و مکاں کی سرحدوں کے انکشافات، اسباب و علل کی پھیلتی اور سکڑتی زنجیروں، نامحسوس، ناچشیدہ تاہم موجود حسیات کی آفرینش کے لئے ایک کنوار سے دبستان گویائی کا در کھولوں، ایک ہمہ گیر رسم نقاب کشائی کروں، اور ایک نئے وجدان کا اعلان کروں:

اے بے ضمیر عہد کے باضمیر لوگو!

ایک ایسی آندھی سے آسمان گدلا ہو چکا ہے، آئینے دھندلا گئے ہیں کہ اپنے ناموں کے متحرک حروف مٹانے ہی میں بقا کے آثار ہیں،

تم نے افہام کا راستہ ترک کیا، جہالت کی، بے خبری کی آڑ میں ایک ایسے کاذب شہر کی بنیاد رکھی ہے جہاں بینائی رستہ کھو دیتی ہے،

جہاں سب ذائقوں میں تلخی کا ذائقہ ہے، جہاں نیند میں بے خوابی کا سفر ہے، اور جہاں بے خوابی کی دھڑکنوں میں ایک عظیم اجتماعی احساس ہزیمت اور نا یافتگی پیہم سلگتا ہوا جہنم خوشیوں کی تہ میں سیال تیار کر رہا ہے

اے بے ضمیر عہد کے باضمیر لوگو!

میں نے تمھاری صورت کا جوا اتار دیا ہے، اور میں ایسی منہ زور اصوات کا متلاشی ہوں جو تمھارے دل و جاں میں ایک نئے ضمیر کو خطاب کر سکیں،

اور میں تمھیں ایک ناخواندہ بچے کی طرح قدیم حروف ابجد کی سیر کرا سکوں،

نہیں، ہرگز نہیں میں اپنے رویاء کا باب تمھاری محبوس سہ نشینوں کی طرف وا نہیں کروں گا کہ میں اپنے لئے چند گریز پا ساعتوں کا مقروض ہوں!

آکاش چاری[1]

اوپندر ناتھ اشک

شمارہ نمبر ۱۴۹،
مارچ تا مئی 1988

لگتا ہے گویا میں لیٹا نہیں ہوں، چل رہا ہوں۔ چل بھی نہیں رہا ہوں، ہوا کے دوش پر اڑا جا رہا ہوں اور یہ ساری کی ساری راجدھانی، اس کی فلک بوس عمارتیں، چوڑی کشادہ سڑکیں، ہرے بھرے پارک۔ . یہ اتنی بے کار بھیڑ میرے قدموں کے نیچے، میری فتح کا استقبال کرتی ہوئی عقیدت سے سرنگوں ہے۔ اکادمی کا انعام میری اہمیت کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ میں تو اپنے آپ کو دنیا کے عظیم تر انعام پانے کا مستحق سمجھتا ہوں، لیکن جب ایک بار میری کتاب کا نام آ گیا تو پھر اس کا منتخب نہ ہونا میری شکست تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے خوف سے انتخاب کرنے والوں نے بقیہ دو کتابوں کو بھی مسترد کر دیا اور کہہ دیا کہ کوئی بھی کتاب انعام کے قابل نہیں تھی۔ لیکن کیا یہ میری توہین نہ تھی۔ میں، جسے اس بات کا یقین ہے کہ میرا ہر لفظ زبان کے سینے پر ایک ایسا امٹ گودنا ہے، جو ہر نئے روز ایک نئی ضو کے ساتھ چمکتا جائے گا۔ اس بات کو کیسے تسلیم کر لیتا کہ میری کتاب اس حقیر انعام کے مستحق نہ سمجھی جائے۔ میں جو اپنے آپ کو نظم و نثر... ادب کی ہر دو اصناف میں ایک نئے دور کا پیش رو سمجھتا ہوں، جس نے اپنی اس ہندی بھاشا کو اس لائق بنایا کہ لوگ اس میں پھر سے نئے ادب کی تخلیق کر سکیں، نئی اور گہری بات کہہ سکیں... اس پھوہڑ اور گنوار ہندی بھاشا کو جس نے نئی ضو، نئے استعارے اور نئے معانی عطا کئے، وہ کیسے یہ سب برداشت کرتا...؟ سکو گے...؟ سکوں گا!... میرے سامنے میرا ہی ایک لسانی تجربہ گھوم رہا ہے۔ کتنے معنی خیز الفاظ ہیں! عام طور سے اپنی اس بھاشا میں لکھے جانے والے پورے کے پورے جملے میں نے ان دو الفاظ میں سمو دیے ہیں۔ ابرو کے ہلکے سے اشاروں جیسے نہ جانے کتنے معنی خیز الفاظ میں نے اس زبان کو دیے اور حاسد کہتے ہیں کہ مجھ میں طبع زاد جوہر نہیں، کہ میں انگریزی سے سرقہ کرتا ہوں، کہ میں مردہ زبان استعمال کرتا ہوں۔ کہ میں عام زندگی سے دور ہاتھی دانت کے مینار میں بیٹھ کر ایک ایک لفظ، ایک ایک محاورہ گڑھتا ہوں، جو کبھی بھی عوام میں مقبول نہ ہو پائے گا... ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ ادب میں بھی ایک نجابت ہوتی ہے، کہ محض ایک اور تخلیقیت (Originality) کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بغیر معنویت پیدا کئے، بغیر زبان کو نئی جلا اور چمک دے، طبع زاد خیال محض کچا مال ہے۔ اور کچا مال ادب نہیں ہوتا۔ اپنشد کار کیا طبع زاد لکھتے تھے؟ گیتا کار نے کیا طبع زاد لکھا۔ پرانوں کی کہانیاں کیا سب کی سب طبع زاد ہیں۔ سور تلسی داس اور کبیر کے ہاں کیا سب کچھ طبع زاد ہے اور کیا ٹیگور ہی سو فی صدی اوریجنل ہیں... ویدوں سے اپنشد کاروں نے لیا، گیتا کار اور پران کاروں نے اپنشدوں سے، سور، تلسی کبیر نے ان سب کے خیالات چرائے، ٹیگور نے نہ جانے کن خزانوں سے موتی اڑائے... اہمیت محض طبع زاد تحریر کی نہیں، بلکہ اس میں الفاظ کی خوب صورت در و بست، زبان کے منجمد ار، تخیل کی بلندی، گہرائی اور گیرائی اور تحریر میں مختلف النوع خیالات کے حسین امتزاج کی ہے... سکو گے؟... سکوں گا! ...میرے مردانہ ہونٹ (مونا کہا کرتی تھی... 'شا' جی آپ کے ہونٹ بہت سینشویل (Sensual) ہیں ایک دل نشیں مسکراہٹ میں پھیل جاتے ہیں... میں گویا اپنے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی راج دھانی پر تیرتا چلا جا رہا ہوں... سکو گے؟... سکوں گا!... اور میں نہیں سکا کیا؟ تین سال کے بعد جھک مار کر اکادمی نے اس کتاب پر مجھے انعام دیا، جسے اس نے اس قابل نہیں سمجھا تھا... نہیں سکا میں؟... ابھی کچھ برس پہلے جو لوگ مجھے ختم ہوا، چک گیا سمجھتے تھے

اب کیسے میرے ارد گرد منڈلا رہے ہیں؟ اور کس طرح دوبارہ اپنی کتابیں میرے نام منسوب کر کے اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہے ہیں... وہ میرے نقش قدم پر چلنے والا مغرور افسانہ نگار، جس نے مجھے تیسرے درجے کا ناول نگار قرار دیا تھا، اب اپنے افسانوں کے مجموعے مجھے معنون کرتے ہوئے لکھتا ہے... 'شاجی کے لئے جنھوں نے کہانی کو اپنی اس زبان میں پھر ایک بار ممکن بنایا، متاخرین کی عقیدت کے ساتھ!... اسے کہتے ہیں فتح! جو شخص خود مجھے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا، میرے بعد آنے والے تمام دوسروں کو لے کر میرے سامنے سر بسجود ہے... راجدھانی میں کوئی فنکشن ایسا نہیں ہوتا، جس میں مجھے پہلے مسند صدارت نہ پیش کی جائے۔ میں انکار کر دیتا ہوں، کیوں کہ میں نے ایسی حیثیت بنالی ہے کہ لوگ میرا انکار سننا بھی اپنی خوش نصیبی خیال کریں اور بار بار مجھے بلائیں!... میں نے اپنی حیثیت بنالی کہ میں انتخاب کرسکوں... میں نے اپنی حیثیت بنالی ہے اور میں انکار کر دیتا ہوں۔ تب لوگ دوسرے نام نہاد مصنفوں اور آچاریوں کو پوچھتے ہیں۔ کل تک دوسرے درجے کے وہ لوگ، جو راج سبھا کے ممبر مصنفوں کی چاپلوسی کر کے بڑے ساہتیہ کار اور آچاریہ بن گئے تھے، جنھوں نے اپنا گروپ بنا کر برتر لوگوں کا پتہ کاٹ دیا تھا، کیسے میں نے ان کی گدیاں ہلادی ہیں... سکو گے؟... سکوں گا! اور کیسا ایک مضبوط گروپ میرے ارد گرد اکٹھا ہو گیا ہے۔ میرے اشاروں پر ادبی تحریکیں چھیڑ دینے والا میرا جھنڈا اٹھائے ہندوستان کے طول وعرض میں میرا ڈنکا بجانے والا... کس صوبے میں میرے نام کی قسمیں کھانے والے، میرے لئے سر پھوڑنے پھڑوانے والے موجود نہیں ہیں! بڑے بڑے تیس مار خانوں کی، اپنے آپ کو عظیم افسانہ نگار کہلانے والوں، برسوں سے اپنی مخصوص جگہ بنائے ہوئے جمے بیٹھے شعراء اور ناول نگاروں کی آبرو اتار کر رکھ دی ہے۔ میرے چاہنے والوں نے!... میرے سامنے پروفیسر 'ش' کی صورت گھوم جاتی ہے سیکنڈ ڈویژن میں ایم۔ اے کر کے وہ نئے نئے ایک نواحی کالج میں پڑھانے لگے ہیں اور کافی کوششوں کے بعد مجھ سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ انگریز کا زمانہ ہے۔ میں شعبۂ تعلیم کے لئے ایک لیکسکان (Lexicon) مرتب کر رہا ہوں۔ ریڈیو کا آنریری ہندی صلاح کار ہوں .. میرے سامنے بیٹھے وہ آدھے گھنٹے سے منمنا رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں انھیں ریڈیو میں متعارف کرادوں۔ کہانی، تنقید، تبصرہ، کچھ بھی دلوا دوں، لیکن وہ مجھے نہایت کند ذہن اور کسی طرح کے جوہر سے یکسر عاری، محض محنت و مشقت کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان کی منمناہٹ کو چپ چاپ سنتا رہتا ہوں اور پھر ایک "اچھا" کہہ کر سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے انھیں چلتا کر دیتا ہوں۔ پھر بھی وہ مجھ سے ملاقات کی کوشش نہیں کرتے۔ یونی ورسٹی کے صدر شعبہ ہندی کی جوتیاں سیدھی کر کے کسی نہ کسی طرح ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی خوش بختی سے ملک آزاد ہو جاتا ہے اور دنیا جہان کے دوسرے تیسرے درجے کے تھس میڈیا کروں کی کرسیوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ تب وہ بھی تکڑم بھڑا کر ایک یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے صدر بن جاتے ہیں۔ انھیں دنوں ان سے میرا ایک مداح کہتا ہے... (کہ میں اس زمانے میں راجدھانی ہی میں عارضی طور پر رہائش پذیر ہوں کہ میرا ناول جس نے ہندی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے، نصاب میں رکھا جائے نفرت سے منھ بگاڑ کر وہ کہتے ہیں کہ وہ ناول تو مغربی ادیبوں کی تخلیقات کا محض چربہ ہے اور اعلان کرتے ہیں کہ جب تک وہ صدر شعبہ ہیں ان کی یونی ورسٹی میں تو کیا، حتی الامکان وہ اسے کسی بھی دوسری یونیورسٹی کے ہندی بورڈ میں منظور نہ ہونے دیں گے... اور وہ یونی ورسٹیوں کے ہندی بورڈوں، انٹرویو کمیٹیوں، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں... غرضیکہ ہر جگہ قابض ہو جاتے ہیں۔ مختلف ترکیبوں اور دس قسم کی چالوں سے وہ مختلف صوبوں کی یونیورسٹیوں میں اپنے شاگردوں کو لکچرار اور ریڈر اور پروفیسر بنوا دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے مذاقاً کہا... آچاریہ جی! (کہ وہ پروفیسر کی بجائے آچاریہ کہلانا پسند کرتے ہیں) آپ کے بیل کہاں کہاں نہیں ہیں۔ آپ بچھڑے بھرتی کرتے ہیں اور انھیں مرکھے سانڈ بنا کر باہر بھیج دیتے ہیں۔ آچاریہ جی ہنستے ہیں۔ "وہ مرکھے تو دوسروں کے لئے ہیں، میرے لئے تو بدھی" ہیں،... آچاریہ جی ٹھیک کہتے ہیں، جب ان کے بیل شاگردوں کی حیثیت سے یونیورسٹی میں پہنچے تھے تو وہ محض منھ زور بچھڑے ہی تھے، لیکن ایسے بے جان نصابوں سے، جنھیں جدیدیت کی ذرہ بھر رمق نہ تھی، ان کے ذہنوں میں بھوسہ بھر دیا گیا۔ پھر اپنے محبوب طلباء کو زیادہ سے زیادہ نمبروں سے نواز کر نئے طالب علموں پر واضح کر دیا گیا کہ جنھیں ڈویژن اور کیریر چاہئے، وہ کون سا راستہ اختیار کریں اور اس طرح انھیں بدھی کر کے ہندوستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں لکچرار، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ بنا کر بیٹھا دیا گیا اور ان بدھی بیلوں نے ملک میں بدھی لکچراروں اور نقادوں کی پوری نسل تیار کر دی... لیکن آچاریہ جی کا سنگھاسن ڈولنے لگا ہے۔ کیوں کہ میں نے بھی بدھی سانڈوں کی ایک پوری فوج تیار کر دی ہے جو کہ ان کے بیلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مرکھے ہیں... سکو گے؟ سکوں گا!... جب انھوں نے میرے ناول کو نصاب میں نہیں رکھا تو کہا تھا کہ ہم اس ادیب کو پڑھاتے ہیں جو اپنی موت کے پچیس پچاس سال بعد بھی زندہ رہتا ہے (حالانکہ اپنی تخلیقات کو جو محض پرانوں پر مبنی قصوں کا خلاصہ ہیں یا جن میں تاریخی حقیقتوں کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، وہ اس لائق سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں ہر یونیورسٹی میں پڑھائی جائیں اور ان کے ادبی کارناموں پر ریسرچ کی جائے، تب میں نے آپ سے سوال کیا تھا... سکو گے؟ اور خود ہی میں نے اس کا جواب دیا تھا... سکوں گا!... اور میں سکا... میں نے انھیں کے ہتھیاروں کو ان پر آزمایا۔ انھوں نے بدھی کرنے کے لئے جو بچھڑے چنے تھے، وہ ذہن سے بالکل کورے تھے۔ ان کے خالی دماغوں میں انھوں نے بھوسہ بھرا اور ان کی انا کو پوری طرح کچل کر انھیں بالکل بے ضرر بنا کر اپنی گاڑی میں جوت لیا۔ میں نے تیار جوان بچھڑوں کا انتخاب کیا۔ وہ سبھی ذہین تھے اور ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو اگر جدوجہد کرتے تو مجھ سے آگے نکل جاتے۔ میں نے ان کی انا کو کچلنے کی بجائے، اسے سہلایا۔ اس کے بعد صرف یہ کیا کہ ان کا نقطۂ نظر بدل دیا۔ ان کی تحریر کے دھارے کو الٹے راستے پر موڑ دیا۔ ان میں سے ایک بھی میرے جیسا اعلیٰ نسب

نہیں تھا وہ تمام نچلے متوسط طبقے کے فرد تھے۔ عام لوگوں میں سے اٹھے تھے۔ وہ اولوالعزم تھے۔ آدرشوں کے پیچھے جان دینے والے تھے۔ میں نے بس اتنا کیا کہ اپنے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی جو خواہش ان کے دل میں نہاں تھی، جتنا کافی ہاؤس کی بجائے اسٹینڈرڈ یا ونیجرز (۲) میں بیٹھنے کی جو آرزو ان کے دل میں سوئی پڑی تھی اسے جگا دیا میں نے انھیں پہلے ادب کے کافی ہاؤس سے اٹھا کر ادب کے اسٹینڈرڈ میں لا بٹھایا۔ وہ سیدھی سادی آسان تخلیقات کی بجائے زندگی کی صداقت سے دور، مشکل، پے چیدہ، مبہم، تجریدی اور انفرادی ادب تخلیق کرنے لگے۔ ان میں میرے جیسا ایک بھی اعلیٰ نسب نہیں تھا۔ میرے جیسی تخلیق کرنا تو ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اپنا تھان وہ چھوڑ چکے تھے، دوسرا ان کی دسترس سے باہر تھا۔ اس وقت جب وہ پس وپیش میں مبتلا تھے، میں نے انھیں اپنے تھان سے لا باندھا۔ ان کی بے جان اور مبہم تخلیقات کے ترجمے خود انگریزی میں کیے۔ اپنے ملکی اور غیر ملکی دوستوں سے سانٹھ گانٹھ کر کے انھیں ملک میں اور ملک کے باہر چھپوایا۔ انھیں بڑی بڑی نوکریاں دلا کر آزادی سے ان کا قلانچیں بھرنا بھلایا۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف مجھ سے بلکہ دنیا کے تمام ادیبوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ بری طرح بدھی ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی نہیں... چوں کہ وہ میری سرپرستی میں بڑی بڑی ملازمتوں پر قابض ہیں۔ اس لئے وہ میرا کہنا سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور ہر آن میرے ہلکے سے اشارے پر لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کو تیار رہتے ہیں۔ مجھے تو بلکہ اشارہ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جو بھی میری مخالفت کرتا ہے، وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور لوگ کہنے لگے ہیں کہ تحریک آزادی میں تشدد پسندوں کے ساتھ رہ کر میں نے اور کچھ نہیں سیکھا'' میں نے پرانے گینگسٹر (Gangster) اور موالی اکٹھے کر لئے ہیں. بہترین ذہنیت کے حامل شاعروں افسانہ نگاروں اور نقادوں کو ایک منظم گروہ میں ڈھال کر موالی بنا دیا ہے... کیوں آچاریہ جی، آپ کے بدھی بیلوں کے مقابلے میں کیسے ہیں یہ میرے بدھی موالی... اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا... سکو گے؟... جال بچھا دیا ہے آپ ہی کی طرح میں نے بھی... اور آپ کے بدھی بیل میرے بدھی سانڈوں کے رحم و کرم پر منحصر رہنے لگے ہیں... آپ کے ہاتھوں میں اگر یونی ورسٹی ہے تو میرے ہاتھوں میں لاکھوں کے سرمائے سے چلنے والا اخبار ہے... سبھی شہروں میں اس کے نامہ نگار اور رپورٹر ہیں... جس کے ادبی کالموں میں اپنے دشمنوں کے خلاف جھوٹی، مسخ، زہر آلود، یک طرفہ رپورٹیں بھیجنے کے لئے میں انھیں خاص رقمیں دلواتا ہوں۔ اور آپ کے بدھی بیل اپنا سارا مرکھاپن چھوڑ کر بے ضرر ہوتے جا رہے ہیں!... اور آپ میری اس کتاب کو اس معمولی انعام کے لائق بھی نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ میری سب سے کمزور کتاب ہے... ہے! یہ میری فتح ہے کہ اس کمزور کتاب پر، ساری مخالفت کے باوجود، میں نے اکادمی سے انعام پایا ہے... اور آپ دیکھئے گا، میں کیسے ملکی اور غیر ملکی بڑے بڑے انعام حاصل کرتا ہوں۔ دنیا کا سب سے اہم ملک میرے ساتھ ہے۔ اس ملک میں اس کا لاکھوں روپیہ میرے اشارے پر تقسیم ہوتا ہے میں ہی ہندوستان کا اس کا واحد ادبی صلاح کار ہوں... انعام کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں تو خود ہی انعام بانٹتا ہوں... وہ تو صرف آپ جیسے بے وقوفوں کو یہ دکھانا تھا کہ مجھے مرنے کی ضرورت نہیں، میں اس زندگی میں زندہ جاوید ہو جاؤں گا... متھ (Myth) بن جاؤں گا... سکوں گا... سکوں گا!!

راجدھانی میرے قدموں کے نیچے بچھی ہے۔ موسم بہار کے اواخر میں آ جانے والی ہلکی سی حدت رات کی آمد کے ساتھ کیسی خنک ہو جاتی ہے۔ راجدھانی کے اوپر اس طرح آزادی سے خلا میں اڑتے جانا کتنا اچھا لگتا ہے۔ میرے سنشوئل (sensual) ہونٹوں پر اس وقت ضرور ایک دل فریب مسکراہٹ ہوگی... وہی مسکراہٹ جس کے سامنے میرا بڑے سے بڑا مخالف زیر ہو جاتا ہے، جسے آئینے میں دیکھ کر میں خود اپنے اوپر قربان ہو جاتا ہوں۔ جس کی لو پر نہ جانے کتنے پری جمالوں کو میں نے پروانے کی طرح جلایا ہے۔ جس میں میری ساری اریسٹوکریسی اپنے دل ربایانہ انداز میں سمٹ آتی ہے... جب یہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر کھیلتی ہے، تب میں کسی کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں... یہ میرے گرد جمع ہونے والے مرکھے سانڈ اس کے آگے کیسے بے ضرر بچھڑے بن جاتے ہیں اور میں اس کے ذریعے ان کے پٹھے تھپتھپا دیتا ہوں... نیچے پارکوں میں کچنار پھول آیا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں گل مہر کے چھتنار درخت اپنے گھنے لال غنچوں اور جیکارینڈا (Jacaranda) کے گاچھ اپنے پھولوں کے بینگنی بادلوں سے دوپہروں کی تمازت کم کر کے آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائیں گے۔ یہ املتاس معلوم نہیں کیوں، دلی میں اتنا نظر نہیں آتا۔ الہ آباد کی لو بھری دوپہروں میں اس کے پیلے پیلے پھولوں کی لمبی لٹکتی جھالریں آنکھوں کی تھکن مٹا دیتی ہیں۔ جب بھی مجھے گل مہر کی یاد آتی ہے، میری آنکھوں میں آسام کے جنگلوں کا کرشن سرا گھوم جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرخ کی بجائے اس کی ڈالیاں گلابی گچھوں سے بھری رہتی ہیں۔ کتنا پیارا سا نام ہے کرشن سرا... شیلانگ جاتے ہوئے سش نے کس طرح مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں کار روک کر کرشن سرا کی ایک غنچوں بھری شاخ اسے لا کر دوں۔ سش... سسمتا مکمل نہیں... میں نے یہی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہا تھا سسو، تم تو خود کرشن سرا کی ڈالی ہو. اور وہ جذبات سے بے خود ہو کر میری گود میں لڑھک آئی تھی... لیکن مجھے کچنار ان کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔ مجھے اس کا سفیدی مائل گلابی پن بہت بھاتا ہے۔ کچنار کی کچی کلیوں کی ترکاری کا ذائقہ اچانک میری زبان پر آ جاتا ہے. میں کھلے ہوادار کچن میں ایک پٹرا پر بیٹھا ہوں۔ لگاتار بیٹھنے سے پٹرا بہت چکنا ہو گیا ہے۔ سامنے سفید سنگ مرمر کی چوکی پر چاندی کی تھالی میں ماں کچنار کی ترکاری دے رہی ہے... میری ماں کا بوٹا سا قد، تیکھا ناک نقشہ، گورا سفید رنگ میرے سامنے ہے۔ نہ جانے کتنی اذیت اس کے ہاتھوں میں نے پائی اور کتنی اسے دی ہے... لیکن میں اس پر نہیں، اپنے باپ پر گیا ہوں۔ میرا لمبا قد، میری چوڑی پیشانی، میرے یہ مردانہ ہونٹ، میرے جسم پر گھنے کالے بال جن سے اپنے رخسار رگڑنے کا خواب نہ جانے کتنی دوشیزائیں دیکھتی رہی ہیں... یہ سب میرے والد کا ہے. ماں کا نہ جانے میرے یہاں کیا ہے۔ شاید پٹی نیس (Pettiness) شاید فرومائیگی... نچلے متوسط طبقے کا اوچھاپن، جو میری اعلیٰ نسب انا کے ساتھ مل کر کچھ

عجب سی رزالت کے قریب جا پہنچتا ہے... اگر کوئی ایسا مہمان میرے یہاں آجائے جسے میں پسند نہیں کرتا تو میں اس سے گھنٹوں، دنوں بات نہیں کرتا۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھی پھلوں کی پلیٹ سے سیب یا سنگترے لے کر چھیل چھیل کر کھاتا ہوں اور اسے نہیں پوچھتا اور میرے اس برتاؤ سے مہمان میں میز پر پڑے پھلوں کو اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میرے اس سلوک سے مہمان کا دھیان پھلوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی پیشانی پر عجب سی لکیریں ابھر آتی ہیں۔ یہ دیکھ کر نہ جانے میرے من میں بیٹھا کون سا دیت پسند آسودہ ہوتا ہے۔ جتنے دن وہ مہمان میرے ہاں رہتا ہے میں یہ آسودگی بھرپور حاصل کرتا ہوں۔ یہ آسودگی میری ماں کی ہے.. ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کوئی بھی ناخوش گوار بات میری پیشانی پر نہایت باریک سے تیور لے آتی ہے ۔ہم کھانا کھا رہے ہوں اور گیلری میں محض ایک انگوچھا باندھے پسینے سے شرابور مالی باغ میں کام کرتا کرتا کسی نو وارد کی خبر دینے آجائے تو ماں کے چہرے پر ایسا ہی باریک تیور بن جاتا تھا۔ لیکن پتا کی چوڑی پیشانی اور بھی کھل اٹھتی تھی۔ ان کا ارفع وطیرہ فطری تھا۔ ماں کا ظاہری... محض مستعار لیا ہوا۔ اس لئے کھوکھلا اور فرسودہ، ماں ایسے وقت میں مالی کو ڈانٹ دیتی تھی۔ والد بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے آنے والے کو خوش آمدید کہہ کر بیٹھانے کا حکم دیتے تھے... میں مسکرا نہیں سکتا۔ میں ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ بس باریک سا تیور ماتھے پر لے آتا ہوں۔ ڈانٹنے یا چلانے جیسا بھونڈا برتاؤ میری نجابت کو پسند نہیں. لیکن میری ساری کوششوں کے باوجود میری ماں مجھ پر حاوی ہو جاتی ہے اور اپنی اعلیٰ نسبی کے سارے اصول توڑ کر میں کبھی کبھی چلا اٹھتا ہوں... میں کار ریستوران کے سامنے پارک کرنا چاہتا ہوں۔ آگے ایک سردار اپنا فورسیٹر روک کے اس پار لیٹا ہوا ہے۔ میں بار بار ہارن بجاتا ہوں۔ وہ فورسیٹر پر لیٹے لیٹے بڑی لاپرواہی سے کہتا ہے۔ "اودھر پارک کر لو جی"۔ اور میرے ضبط کے باندھ ٹوٹ جاتے ہیں اور میں دانت پیس کر چلاتا ہوں.. "آپ آگے سے ہٹیں تو!" میری آواز میں دانت پیس کر کھینچے ہونے کے باوجود نہ جانے کیسی درشتی ہے کہ دوسرے ہی لمحے سکھ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اٹھتا ہے اور اسکوٹر گھرڑ گھرڑ کرتا ہوا سرک جاتا ہے... پتا افسروں کے سامنے اس طرح کبھی نہیں جھکے۔ ان کے جھکنے میں بھی ایک وقار رہتا تھا۔ وہ افسروں کا خیر مقدم کرتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا ایک شہنشاہ دوسرے شہنشاہ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ سیر کو جاتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک شہنشاہ دوسرے شہنشاہ کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے۔ اس لئے انگریز افسر انھیں پسند کرتے تھے۔ لیکن میری ماں اپنے تمام کر و فر کے باوجود انگریز افسروں کی بیویوں کے سامنے بچھ بچھ جاتی تھی۔ اس کے ہونٹ اپنے آپ خوش آمدید میں پھیل جاتے تھے... میں نے ہمیشہ اپنے والد کی طرح بننے کی کوشش کی ہے، لیکن سشں جب آسام میں مجھے چھوڑ کر آ گئی تو اس سے کسی نے پوچھا کہ پرشانت پہلی ہی ملاقات میں تمھیں لکھنؤ سے ایسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے، جس طرح طوفان کسی برگ گل، کو پھر تم اتنی جلدی کیوں انھیں چھوڑ کر واپس آ گئیں؟ تو اس نے جواب دیا تھا... 'شاجی' اپنے ماتحتوں سے بہت برا سلوک کرتے تھے اور اپنے افسروں کی بے طرح چاپلوسی اور مجھے وہ سب بہت ناگوار لگتا اور میں بھاگ آئی... دیا سون دلکر نے سشں کے نچے پن سے متعلق یہ بات بمبئی میں مجھ سے کہی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دیا کی بات سن کر بھی اس نے ان سنا کر دیا تھا۔ صرف میری پیشانی پر نہایت بے معلوم سے تیور بن گئے تھے... یہ چاپلوسی میری ماں کی ہے... میں اپنی ماں سے نفرت کرتا ہوں... میں اپنے والد جیسا بننا چاہتا ہوں، لیکن میری ماں کے چہرے پر آنے والی خوشامد لاشعوری طور پر میرے چہرے پر بھی آجاتی ہے۔ میں اپنی ماں سے نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوں۔ اپنے خون کی اس ملاوٹ سے نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوں! ماں جو نہیں حاصل کرتی تھی، اس سے نفرت کرنے لگتی تھی۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔ میں ماں کو کتنا چاہتا تھا۔ پتا کی طرح چاہتا تھا۔ لیکن جب اس ماں نے لڑکپن میں مجھے تھپڑ دے مارا تو میں اپنے آپ میں سمٹ گیا۔ سمٹ گیا۔ سمٹتا چلا گیا۔ اور ماں سے نفرت کرنے لگا۔ میں نے کبھی اس سے سیدھے منھ بات نہیں کی۔ اسے چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کی بے عزتی کی۔ اسے اذیت دی... پائی۔ اپنی تنہائی میں اس سب توہین اور اذیت کا بدلہ چکایا... میرے سامنے سفید خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے (سفید خون... یہ ترکیب میں نے کہاں پڑھی ہے... سفید خون. مہاتما گاندھی نے شاید اس لفظ کا استعمال کیا ہے) میں دیکھتا ہوں۔ میں سفید خون کے اس سمندر میں ڈوب گیا ہوں۔ اور جب کنارے پر لگا تو میں نے دیکھا وہ تو میرا ہی خون تھا۔ میری ہی قوت باہ تھی اور میں اپاہج ہو گیا ہوں۔ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو گیا ہوں۔ ماں کی اس بے رخی نے مجھے تباہ کر دیا ہے... میرے سامنے سجے ہوئے عروسی بستر پر ایک برہنہ دلہن کی سلوئٹ آجاتی ہے، تشنہ، ناآسودہ، مبہوت اور میں پردے کے پیچھے بال نوچ رہا ہوں اور ماں! تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔ برباد کر دیا ہے۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوں... صنف نازک سے نفرت کرتا ہوں۔ مرد میں جو خوبصورتی ہے، وہ اسے بدصورتی میں تبدیل کر دیتی ہے... میں عورتوں کو پروانوں کی طرح اپنی طرف مائل کرتا ہوں اور انھیں جلا جلا کر اپنی ایذا پسندی کو تسکین دیتا ہوں۔ میں نے جو ضائع کر دیا ہے، اس طرح اس کے فقدان کو پورا کرتا ہوں... میرے سامنے اپنا وہ فوٹو آجاتا ہے، جو راجد ھانی کے ایک ماہر فوٹوگرافر نے انعام تقسیم ہونے والے جلسے کے کچھ دن پہلے لیا تھا۔ میں چاہتا تھا... پتا کے چہرے پر رہنے والا فراخ دلانہ جذبہ، کائنات کو تسخیر کر سکنے والی میری وہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آجائے لیکن عین وقت پر نہ جانے کیا ہوا، مجھے لگا یوں مسکراتے ہوئے فوٹو کھچوانا میری سنجیدگی کو، میری عظمت کو زیب نہیں دیتا... میرے ہونٹ آپ سے آپ بھنچ گئے۔ پیشانی پر وہی ہلکے سے تیور اور ہونٹوں کے کناروں پر وہی نامعلوم سی سلوٹ پڑ گئی۔ وہی چینی نیس وہی فرومایگی، وہی دل کے نامعلوم گوشوں میں چھپا ہوا نچا پن ۔میں نفرت کرتا ہوں۔ نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوں ۔ نچلے متوسط طبقے کے تمام نچے پن اور کمینگی سے نفرت کرتا ہوں۔ میں اس سے اوپر اٹھنا چاہتا ہوں بہت اوپر اٹھ جانا چاہتا ہوں... آسمان کی بلندیوں کو چھو لینا چاہتا ہوں، لیکن لگتا ہے غیر شعوری طور پر میری ماں مجھے پھر نیچے کھینچ لیتی ہے، وہی ہلکا سا تیور میری پیشانی پر

آجاتا ہے اور میری وہ مسکراہٹ پتہ نہیں کہاں غائب ہو جاتی ہے... میرے سامنے میرے چاہنے والے آتے ہیں۔ سب اسی نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں دل میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں۔ انھوں نے میرے اس فوٹو کی ڈھیر ساری کاپیاں کرا کے تمام صوبوں میں اپنے ساتھیوں کو بھیجیں اور معلوم نہیں کیسے میرے ہونٹوں کی اس سکرن میں میرے دل میں نہاں فراخ دلی ڈھونڈ نکالی... ''شاجی۔ یہ فوٹو گرافر کمال کا فن کار ہے۔ آپ کی دریا دلی، جسے آپ بہت چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، اس فن کار نے آپ کی تصویر میں اجاگر کر دی ہے...'' میرے ہی تھان پر بندھا، میرا منھ لگا بدھی سانڈ... میں اپنی وہی فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آیا ہوں۔ لیکن میری آنکھوں میں شک ہے کہ کہیں وہ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہا... نہیں، وہ تو میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔ عجیب سی چپار میں اس کے ہونٹ پھیلے ہیں۔ اپنی پچاسویں سالگرہ پر میں نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے، آخر میں کہا تھا... بھگوان نے اور چاہے مجھے کچھ نہ دیا ہو، لیکن دل دریا دیا ہے۔ میرے اس آخری جملے کو بار بار دوہراتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ آپ نے یہ بالکل سچ لکھا تھا۔ میری اس فراخ دلی کے چرچے رفتہ رفتہ ادب میں سرایت کر رہے ہیں۔ شاعر سنجیو جو اپنے قصبے کی جھونپڑی میں فرش پر سوتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کھچڑی پکا کر گذر اوقات کرتے ہوئے آزادانہ طور پر شاعری کرتے تھے، جنھوں نے ترقی پسند نظم میں تجریدی تجربہ کی بنا ڈالی... وہی سنجیو میری دریا دلی اور فیاضی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے... میں جب بھی ان کے قصبے سے گذرا ہوں، ان کی کوٹھری میں ضرور گیا ہوں۔ انتہائی مسرت سے وہ لوگوں سے ذکر کرتے ہیں... شاجی اپنے قیمتی لباس کا دھیان نہ کرتے ہوئے میری کوٹھری کی کھری دہلیز پر بیٹھ جاتے تھے۔ سنجیو جی میری رحم دلی اور سخاوت کے قصے بھی سناتے ہیں کہ کس طرح جب بھی ان پر مصیبت پڑی، میں نے ان کی مدد کی... ایک بار وہ میرے یہاں آئے۔ رات کو سونے سے پہلے میں شب بخیر کہنے ان کے کمرے میں گیا۔ ان کے بستر پر تکیہ نہیں تھا۔ میں نے فوراً اپنا ریشمی تکیہ لا کر انھیں دیا۔ اس واقعے کو انھوں نے نہ جانے کتنی بار اور کہاں کہاں نہیں سنایا... میں نے ان کی نظموں کو مرتب کیا۔ انھیں نہ صرف ہندوستان، بلکہ غیر ممالک میں بھی چھپوایا۔ انھیں قصبے کی تنہائی سے راجدھانی کی چکاچوندھ میں لے آیا اور ایک اچھی سی نوکری دلوا دی اور شاعر سنجیو جو میری ادبی اریسٹو کریسی (aristocracy) سے چڑھتے تھے، اب بڑے بڑے اریسٹوکریٹوں کے کان کترتے ہیں... ان سبھی نام نہاد ترقی پسندوں کے اندر وہی پرانا سرمایہ دار چھپا ہے جو شور مزدور کا مچاتا ہے لیکن رہنا سرمایہ دار کی طرح چاہتا ہے۔ میرے سامنے غیر ملکی ایجنسیوں اور سفارت خانوں میں کام کرنے والے کتنے ہی نام نہاد ترقی پسند گھوم جاتے ہیں، جو مجھے پانی پی پی کر کوستے تھے اور اب مزدور کی بے کاری اور کسان کی غریبی بھول کر بہترین ولایتی شرابوں کے جام پر جام چڑھاتے ہیں اور روز بروز موٹے ہوتے جاتے ہیں... میں ایسی سخاوت اور رحم دلی کا برابر ثبوت دیا کرتا ہوں... پتہ نہیں کتنوں کو اسی ہمدردی کے ذریعے میں نے ان کی بلندیوں سے کھینچ گہرے کھڈوں میں گرا دیا ہے۔ میری ناک کٹی ہے تو ان کی کیوں ثابت رہے... لیکن کئی بار میں چاہتا ہوں... اپنے والد کی طرح سود و زیاں سے آزاد ہو کر کسی کا گھر بھر دوں۔ دشمنوں کو اپنی پناہ میں پا کر معاف کر دوں، لیکن میری ماں والد کی اس فراخ دلی کو پاگل پن قرار دیتی تھی۔ اور میں پاگل نہیں ہوں۔ لیکن میں پاگل ہونا چاہتا ہوں۔ تمام سوچ بچار، در سود و زیاں سے بے نیاز، بے فکر اور بے پرواہ۔ لیکن لگتا ہے ماں کا اثر غیر شعوری طور پر مجھے باندھ لیتا ہے۔ میری وسعت کو محدود کر دیتا ہے میرا قد چھوٹا کر دیتا ہے۔ مجھے بونا بنا دیتا ہے... میں نفرت کرتا ہوں۔ میں نفرت کرتا ہوں... میں نفرت کرتا ہوں۔

میرے قدموں کے نیچے ٹھوس سڑک ہے۔ کولتار کی ٹھوس کالی سڑک ہے۔ راج دھانی کی آزاد فضا میں تیرتا ہوا، نہ جانے کب میں اس گنجان بستی میں اتر آیا ہوں۔ کتنی بھیڑ ہے، کتنی بے پناہ بھیڑ ہے۔ ہلکی خنکی کے باوجود پسینے کی بو ہے۔ دھواں ہے، دھند ہے، دھول ہے... (میری کار کہاں ہے)... گرد ہے، ہر طرف گرد ہے، یہ ریگستان کیسے ہر لمحہ راجدھانی کی طرف بڑھا آ رہا ہے۔ یہ ریگستان اس کی ساری ذہانت، فطانت، قوت اور زرخیزی کو سوکھ لے گا۔ پورب سے پچھم سے، اتر سے دکھن سے ڈھیروں ریت آتی ہے، ہر سال، ہر ماہ، ہر دن اور راجدھانی پر چھا جاتی ہے۔ کبھی میں نے چاہا تھا کہ میں الہ آباد کے خاموش اور پرسکون ماحول میں رہ کر اعلیٰ ادب کی تخلیق کروں گا۔ لیکن میں خود اس ریت کا ذرہ بن کر اڑا چلا آیا... فرق صرف یہی ہے کہ میں آرام دہ کرسی پر جم گیا ہوں... میں ریت کا ذرہ نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے میں اڑتا ہوں۔ فکر کے بے کراں آسمانوں پر اڑتا ہوں، راجدھانی کے اوپر اڑتا ہوں اور سمندروں اور کوہساروں پر اڑ کر دیس بدیس گھوم آتا ہوں... چاہتا ہوں... راجدھانی میں ہر جگہ گھنے چھتنار، سدا بہار پیڑ لگا دیئے جائیں۔ ہرے بھرے درختوں کا ایک چوڑا حاشیہ اسے ہر چہار طرف سے گھیر لے اور اس ریگستان کا چڑھتا سیلاب رک جائے... لیکن جب چاروں طرف زمین سوکھ رہی ہے۔ مٹی ریت بن رہی ہو، تو ان درختوں کی کیا بساط ہے۔ یہ مہلک ریت ان پر جم جائے گی۔ ان کی شادابی سوکھ لے گی، ان کی جڑیں کھوکھلی کر دے گی۔ اور یہ بڑھتا ہوا ریگستان ایک دن انھیں نگل جائے گا... میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرا دم بری طرح گھٹتا جا رہا ہے۔ سامنے بنگلے کا ایک بہت اونچا گنبد نما دروازہ ہے۔ اس پر بڑا سا تالا لگا ہے۔ میں جیبیں ٹٹولتا ہوں۔ میری جیب پتہ نہیں کتنی لمبی ہے۔ میرا ہاتھ نیچے نیچے چلا جا رہا ہے۔ اچانک کنجی میرے ہاتھ آ جاتی ہے۔ میں جلدی سے تالا کھولتا ہوں۔ آہنی دروازہ۔ پتہ نہیں کواڑ کب سے بند ہیں۔ میں زور سے اپنی طرف کھینچ کر کواڑ کھولتا ہوں۔ گلیارے کی سیڑھیوں پر میرا نوجوان مالی ایک چھوٹی سی گوری لڑکی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سے دونوں چونک اٹھتے ہیں۔ مالی فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ گھبراہٹ میں اپنے سر کے لمبے بالوں پر برابر ہاتھ پھیرے جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہیں۔ خجالت کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے نتھنوں اور ہونٹوں کے بیچ ٹھہری ہوئی ہے... لیکن لڑکی ویسے ہی اکڑی، تنی بیٹھی ہے۔ اچانک اس کی سیدھی نظر میری چور نگاہ سے ملتی ہے۔ لونی... لا دنیہ پر بھا۔ میری آسامی نوکرانی... اس کا سینہ ابھر آیا ہے۔ کمر کا خم نہایت واضح ہو گیا

ہے... جب میں آسام میں تھا اور وہ چھوٹی سی بارہ سال کی لڑکی تھی۔ اور دیکھنے میں دس ہی سال کی لگتی تھی۔ فراک پہنتی تھی۔ اور اپنی ماں کے ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی کرنے آتی تھی، تب کیسے مبہوت و مسحور میری طرف ایک ٹک دیکھا کرتی تھی۔ نظریں ملتے ہی بڑے دل کش انداز میں مسکرا دیتی تھی۔ اس کے موٹے سنگول ہونٹ ایسی میٹھی مسکراہٹ میں کھل جاتے تھے کہ اس کے دانتوں کے موتی ہونٹوں کی عجیب سی تکون میں چمک اٹھتے۔ جب بہت دن تک وہ ایسے ہی مسکراتی رہی اور میں نے اسے کبھی پاس نہ بلایا تو ایک دن وہ میری میز کے پاس آ کھڑی ہوئی اور دائیں طرف بغل کے نیچے یوں ہی اشارہ کر کے کہنے لگی... ''یہاں درد ہوتا ہے...'' میں کام میں مشغول تھا۔ میں نے بغیر میز سے نظریں اٹھائے پوچھا... ''کہاں؟'' اور اس نے فراک اوپر اٹھا دیا۔ میں بے خیالی میں اس پر ہاتھ پھیر دیتا ہوں۔ لونی اپنی وہی موتیا تکون چمکاتی، لجاتی، دوہری ہو جاتی ہے... ''کہاں درد ہوتا ہے تمہارے؟'' میں جھینپتا ہوا اسے ڈانٹ کر پوچھتا ہوں۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ سنجیدہ ہو کر پھر فراک اٹھا دیتی ہے اور ذرا سا مڑ جاتی ہے۔ بغل کی ہلکی سی دھند کے نیچے ایک لال کھرونچ ہے۔ میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں... میرا ہاتھ بے ساختہ پھسل جاتا ہے۔ تبھی لونی قدرے سر جھکا کر کنکھیوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ پتہ نہیں اس کی آنکھوں میں کیسی سپردگی ہے کہ میں کچھ پریشان ہو اٹھتا ہوں۔ خوب صورتی بدصورتی میں بدلنے لگتی ہے۔ لمحہ بھر کو میں اسے کھینچ کر اپنی بانہوں میں بھر کر اس کے بھورے پیارے سینے پر اپنے ہونٹ رکھ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اپنی شکست تسلیم نہیں۔ ''کچھ نہیں ہے''۔ کہیں کھجاتے ہوئے ناخن لگ گیا ہے۔ ''بھاگ جا!'' کہتا ہوا میں اٹھ جاتا ہوں اور غسل خانے میں چلا جاتا ہوں... دوسرے ہی دن میں اپنے یہاں اس کا آنا منع کر دیتا ہوں... لونی سیڑھیوں پر اس طرح تنی بیٹھی ہے۔ بیباک، باغی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے... میری چور نگاہیں اس پر ٹکی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے، یہ لمحہ ہمیشہ کے لئے رک جائے گا۔ لیکن میں نظریں ہٹا لیتا ہوں۔ میں اس کی نظروں کی بیباکی برداشت نہیں کر پاتا۔ اور نہ یہ برداشت کر پاتا ہوں کہ وہ میری طرف دیکھنے کے بجائے میرے مالی کی طرف والہانہ انداز سے دیکھے، اس سے محبت بھری گفتگو کرے... میں مالی کو اپنے پیچھے یوگ کے اثر سے اس طرح وہاں بیٹھی بیٹھی فضا میں اٹھتی ہے اور میری آنکھوں کے سامنے خلا میں معلق ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا ہوں، اتنے ہی فرق سے وہ پیچھے ہٹتی جاتی ہے... بے پناہ غصے سے بھر کر میں رکتا ہوں، مڑتا ہوں۔ بغل کی کوٹھری کا دروازہ کھولتا ہوں اور اندر جا کر اسے بند کر لیتا ہوں... سامنے میرا سوٹ کیس پڑا ہے۔ میں اسے کھولتا ہوں۔ بافتے کا کیس اٹھاتا ہوں۔ وہ مجھے لونی کے سینے جیسا ملائم لگتا ہے۔ میں پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ اسے کھولتا ہوں۔ اوپر ہی پانچ ہزار کا چیک پڑا ہے۔ لمحہ بھر میں اسے دیکھتا ہوں... پرشانت وشمپائن... دیسراج شرما... ماں باپ کے ذریعہ دیے گئے نام سے یہ کتنا پیارا ہے۔ ماں باپ نام رکھتے وقت مستقبل میں کیوں نہیں جھانکتے۔ کیوں اتنی بے پروائی سے نام رکھ دیتے ہیں... دیسراج شرما... کسی شاعر یا ادیب کا بھلا یہ نام ہو سکتا ہے؟ میں نے ٹھیک ہی کیا جو اپنا نام پرشانت رکھ لیا... پرشانت... مہاساگر گہرا، وسیع اور خاموش... میں چیک کے نیچے تانبے کی پلیٹ پر لکھے لفظ ''ساہتیہ'' کو دیکھتا ہوں۔ ساہتیہ... ادب... ایک دن آئے گا جب میرا نام ہندی ادب کا ہم معنی ہو جائے گا۔ چیک کو وہیں رکھ کر میں کیس کو بند کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ لونی دروازے میں کھڑی ضرور میری طرف والہانہ انداز سے دیکھ رہی ہو گی... میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اس کے خوف سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اچانک میرا دل دھڑک اٹھتا ہے۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے اور نشے میں چور ایک غنڈہ دونوں بازو پھیلائے پوری چوکھٹ کو روکے کھڑا ہے۔ اس کا سر کافی بڑا اور پچھلی طرف کو بڑھا ہوا ہے۔ اس کے کھچڑی بال بے ترتیبی سے بکھرے ہیں۔ مونچھیں کانوں تک پھیلی ہیں۔ جسم پر چھوٹے کالروں کی لکیردار قمیص اور کمر میں لنگی ہے۔ قمیص کا گریبان کھلا ہے اور سینے کے روکھے، کھچڑی بال چوروں کی طرح جھانک رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور ہونٹوں کے کونوں سے پان کی پیک بہہ رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے سے شراب کی بو کا بھبکا آتا ہے... غنڈہ سوٹ کیس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں، کہ اپنے حواس پر قابو رکھوں اور ایسا رویہ اختیار کروں جو اپنے یہاں ملنے کے لئے آنے والے کسی اجنبی ادیب کے سلسلے میں اختیار کرتا ہوں۔ یا اپنی اسی کائنات کو تسخیر کرنے والی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر لے آؤں لیکن دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہو پاتا۔ میں مبہوت و ساکت بیٹھا رہتا ہوں۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ لاکھ چاہنے پر بھی وہ ہلکا تیور میری پیشانی پر نہیں ابھرتا۔ غنڈہ داہنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے اور انگلیوں کو اوپر نیچے حرکت دیتا ہوا اشارہ کرتا ہے کہ لاؤ چابی دے دو۔ میری تانبے کی پلیٹ... ساہتیہ... جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے تین برس تک اتنی جدوجہد کی۔ میں کچھ عجیب کھسیانے پن سے ہنستا ہوں... بڑبڑاتا ہوں... ''اس میں کچھ نہیں ہے''۔ غنڈہ جواب نہیں دیتا۔ صرف مڑے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کا آدھا حصہ حرکت کرتا ہے کہ لاؤ لاؤ... اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ میں چابی اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پر پھینک دیتا ہوں اور نہایت بے نیازی سے کہتا ہوں ''کھول کر دیکھ لو، اس میں کچھ نہیں ہے''۔ میری یہ چال کام کر جاتی ہے۔ شرابی بے پروائی سے انگلیوں کے اگلے حصے پر بڑی چابی مہر لگانے کے انداز میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا ہے اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اسے دباتا ہے۔ پھر وہ کنجی میری طرف اچھال دیتا ہے اور کوٹھری کے باہر نکل جاتا ہے۔ میں دونوں ہاتھوں سے کنجی لپک لیتا ہوں۔ پھر سوٹ کیس دیکھتا ہوں اور بافتے کا کیس دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہوں... تبھی مالی بڑھ کر پیشانی پر تیور بنائے دونوں ابروؤں کو سکوڑتے ہوئے کہتا ہے... سرکار آپ نے یہ کیا کر دیا۔ اس نے کنجی کا ٹھپہ لے لیا ہے۔ وہ اس کی دوسری کنجی بنا لے گا۔ یہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔''... اور میں اٹھ کر بھاگنے لگتا ہوں۔ بے تحاشہ گلیارے میں بھاگتا چلا جاتا ہوں اور اسے جا پکڑتا ہوں... ایک لمبا سا دالان ہے اس سے ملا صحن اور کھلا آسمان ہے وہیں چھوٹے سے بونے جیسا اس کا سلوئٹ (Silhouette) دکھائی دیتا ہے۔ ''تم کنجی کا ٹھپہ بنا لائے ہو... تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔

راشٹرپتی''...میں کہنا چاہتا ہوں کہ راشٹرپتی میرے دوست ہیں، میرے مداح ہیں۔ میری تخلیقات کے انگریزی ترجمے انھوں نے پڑھے ہیں۔ لیکن فوراً یاد آتا ہے کہ انعام دیتے ہوئے انھوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ مسکرائے تک نہیں تھے...نہیں میں راشٹرپتی کا نام نہیں لوں گا اور میں کہتا ہوں...''وزیر اعظم میرے دوست اور مداح ہیں۔ میں ذرا اشارہ کردوں وہ تمھیں ڈی۔آئی۔آر میں پکڑ کر جیل میں بند کرادیں گے اور کسی عدالت میں شنوائی بھی نہیں ہوگی''...یہ کہتے ہوئے میری جسامت ایک دم بڑھ جاتی ہے۔ سینہ چوگنا ہوجاتا ہے اور سر چھت کو چھونے لگتا ہے۔ لیکن میں اپنا جملہ پورا ابھی نہیں کرپاتا کہ وہ دبلا پتلا بونا سا سلوئٹ (Silhouette) اچانک بڑھنے لگتا ہے اور میرا جملہ ختم ہوتے نہ ہوتے کسی بھیانک دیو کے قدوقامت کو مات کرتا ہوا، برہمانڈ ناپنے والے وامن اوتار (۳) کی طرح نپے تلے تین قدموں میں بیچ کا فاصلہ طے کرکے میرے سر پر آپہونچتا ہے...میرا جملہ میرے ہونٹوں پر جم جاتا ہے۔ میرا قد ایک دم چھوٹا ہونے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے وہ مردانہ ہونٹ میری ماں کے ہوگئے ہیں اور وہ خوشامدانہ انداز میں پھیل گئے ہیں...میں نظر اٹھاتا ہوں۔ وہ دیو مجھے آچاریہ جی جیسا دکھائی دیتا ہے...میں چاہتا ہوں میری پیشانی پر وہی ہلکا سا تیور بن جائے...اچانک دیو مجھے کلائی پکڑ کر گھمادیتا ہے۔ اور اپنا فولادی پنجہ میری گدی پر جماکر اسے جھکادیتا ہے اور پورے زور سے ایک لات جمادیتا ہے...میں قلابازی کھاتا ہوا، فضا کو چیرتا ہوا میں اڑتا ہوں۔ دیوار راستہ دے دیتی ہے، گلیارا نیچے رہ جاتا ہے۔ آندھی کی زد میں آئے ہوئے تنکے کی طرح میں اڑا جارہا ہوں...میرا رواں رواں بری طرح کانپ جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آسمان سے گر رہا ہوں۔ شہاب ثاقب سا تیزی سے نیچے راجدھانی کی طرف گر رہا ہوں۔ شام کی سرمئی روشنی میں راجدھانی کا خاکہ ابھرتا ہے۔ بجلیاں چمکتی ہیں، گھومتی ہیں، نیچے جن پتھ کی پتھریلی کالی سڑک ہے۔ مجھے لگتا ہے اگلے لمحہ میں گر کر چور چور ہوجاؤں گا...میری ماں زور سے چیخ مارتی ہے.. مجھے زور سے بھینچ لیتی ہے...

میری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ مجھے سانس لینے میں بیحد تکلیف ہورہی ہے۔ میرا بدن پسینے سے تربہ تر ہے۔ مونا مجھے بانہوں میں بھرے مجھ پر جھکی ہے میری چوڑی پیشانی اور بڑھتے ہوئے گنجے پن کی وجہ سے ہلکے ہوجانے والے پسینے سے بھیگے بالوں پر ہاتھ پھیرے جارہی ہے۔ اس کے فکرمند ہونٹ بار بار سرگوشی کر رہے ہیں۔ ''شاجی...شاجی...''

''کیا میں چیخا تھا...'' میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ''کیا میں چیخا تھا؟''

لیکن میں نہیں پوچھتا... ''شاجی...شاجی''۔ مونا سرگوشی کیے جارہی ہے...اچانک گود میں پڑے اخبار کی سرخی پر میری نظر پڑتی ہے...دل کے دورے سے شری... ''یہاں سینے میں درد ہے، میں دل پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ ''سانس لینے میں بڑی تکلیف ہورہی ہے!''

''میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔'' مونا کہتی ہے اور میری گود سے تکیہ اٹھا کر میرے سر کے نیچے رکھتی ہوئی مجھے آرام سے لٹادیتی ہے...ٹیلیفون پر مونا کی گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے...'' آپ فوراً آیئے شاجی کو شاید دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ انھیں سانس لینے میں تکلیف ہے۔'' آرام سے لیٹ جانے پر مجھے کچھ راحت ملتی ہے۔ شاید میں اخبار میں آچاریہ کی تقریر پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا تھا اور خواب دیکھنے لگا تھا...سینے پر تکیئے کے دباؤ سے وہ خواب کابوس میں بدل گیا تھا...میری طبیعت کچھ سنبھلتی ہے۔ مونا ٹیلیفون کا چونگا رکھ کر لوٹتی ہے۔ ''شاجی کیسی طبیعت ہے؟'' مونا آنکھوں میں بے پناہ محبت، عقیدت اور فکر لئے کھڑی ہے... میں اسے حقیقت سے آگاہ نہیں کروں گا۔ میں اخبار میں اپنے مائلڈ ہارٹ اٹیک کی خبر چھپنے نہیں دوں گا۔ میں پورے ہفتہ کسی سے نہیں ملوں گا...شا...شانت پرشانت... میں نے اپنے چہرے کو، اپنی شخصیت کو پرشانت مہاساگر (۴) سا بنانے کی کوشش کی ہے۔ عمیق، پرسکون، پرشانت...لیکن میرے اندر یہ کیسے طوفان اٹھتے ہیں۔ مجھے اپنا نام اٹلانٹک مہاساگر کے نام پر رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن اٹلانٹک کے لئے ہماری اس ہندی بھاشا میں کوئی اچھا، ہم معنی لفظ نہیں ہے... مجھے اپنی تخلیقات انگریزی میں کرنی چاہیئے تھیں۔ انگریزی میں لکھتا تو اب تک نوبل پرائز مارے جاتا...میرے جیسے تخلیق کار کے لئے ہندی مناسب بھاشا نہیں ہے...ہرگز ہرگز مناسب بھاشا نہیں ہے...☆☆☆

حواشی

(۱) آکاش چاری: آسمان میں پرواز کرنے والا فلک سیر

(۲) نئی دلی کے دو بڑے ریستوران

(۳) ایک بار راجہ بالی کا غرور توڑنے کے لئے بھگوان نے بونے برہمن کا روپ دھارا اور بھکشا میں صرف تین قدم زمین مانگی۔ بالی نے بونے برہمن کی درخواست منظور کرلی۔ تب بھگوان نے اپنا روپ بڑھانا شروع کیا اور تین قدموں میں ساری کائنات ناپ ڈالی۔ بالی کا غرور چور چور ہوگیا۔

(۴) بحرالکاہل Pacific Ocean

لاثانی شخصیتوں کے لافانی خاکے

لال سبز کبوتروں کی چھتری

از

اسلم فرخی

قیمت : تین سو روپے

مطبوعہ شہرزاد، کراچی

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

سے طلب کریں

اوم پربھاکر

شمارہ ۲۷۶
جنوری ۲۰۰۴

یہ جو دنیا کا کھلونا ہے
اسے تو ہی کھیل، مجھے تو کوئی بڑی چیز دے
مجھے تو کوئی بڑی چیز دے
تو وقت کٹے

داڑھی والے کو دے قرآن شریف
چوٹی والے کو عطا کر گیتا
اور جو اس کے اس کے حامی ہیں
ان کو بھی کچھ نہ کچھ شغل دے دے

کسی کو نام دے دے پنڈت جی
کسی کو کام دے موذن کا
کسی سے کہہ کہ تو تسبیح اٹھا
کسی سے کہہ کہ تو صلیب اٹھا
کسی کو گائے ہانکنے پر لگا
کسی کو بکریاں چرانے دے
کسی کو ذات دھرم کی خاطر
لڑنے مرنے دے
مگر اتنا سن
مجھ کو دیوانہ مت سمجھ لیجو
میں اک انسان ہوں، باہوش وحواس
میں وہی اور وہی بولوں گا
جو میری ذات کی حقیقت ہو
جو میرے وقت کی حقیقت ہو
ان کی وہی جانیں جو یہ کہتے ہیں
تو ہی تو ہے نہیں دیگر کوئی
...تب تو پھر وہ بھی کہاں دنیا میں؟
اور دنیا ہے، جو مجسم ہے
کئی رنگوں میں، ذائقوں میں کئی
پھر بھی ہے مجھ کو تو یہی غم ہے
یہ جو دنیا ہے، بہت ہی کم ہے
ایک پرانا سا کھلونا ہے
اسے تو ہی رکھ
مجھے تو کوئی بڑی چیز دے تو وقت کٹے

اوم پربھاکر

شمارہ ۲۹۱
اپریل ۲۰۰۵

رات کے دو بجے ہیں
وہ سو رہی ہے،
میں جاگ رہا ہوں۔

وہ سو رہی ہے اور
گھر بھر کے بستر تہ کر کے
سارے کمروں میں جھاڑو لگا رہی ہے
نل آ گیا ہے۔

میں جاگتا ہوں
اسے سوتے ہوئے
کروٹیں بدلتے دیکھتا ہوں
اب وہ جھٹ پٹ چو کے باسن
اور پانی سے نپٹ کر
وضو کر کے
نماز پڑھ رہی ہے

میں جاگ رہا ہوں
اور کچھ نہیں کر رہا ہوں۔
وہ سو رہی ہے
اور سب کے لئے چائے ناشتہ تیار کر رہی ہے
چاول چن رہی ہے
آٹا گوندھ رہی ہے
بلاؤز کی اکھڑی سلائی کو
پلو سے ڈھانکتی
جلدی جلدی روٹیاں سینک رہی ہے

گویا اسی کو ٹھیک ٹائم اسکول یا دفتر پہنچنا ہے۔

صرف میں جاگ رہا ہوں۔
وہ سو رہی ہے اور نہ جانے کیا کیا کر رہی ہے۔
مشین اور پھٹے کپڑے رکھنے سے پہلے
وہ کھانا کھا کر لیٹی ہے کہ
پڑوسن کی بچی کی طبیعت کا حال جاننے کے لئے
چھت پر چلی گئی ہے۔

وہ سو رہی ہے
لیکن خراٹے بھرنے کی فرصت سے محروم
میں جاگ رہا ہوں
اور کچھ نہیں کر رہا۔
وہ سو رہی ہے اور
پسوانے کے لئے گیہوں چن رہی ہے
گھر، خرچ کا حساب لکھ رہی ہے
لڑکی کی عمر کے سال اور
لڑکے کی پڑھائی کے درجے گن رہی ہے۔

میں جاگتے ہوئے کچھ نہ کرتے ہوئے پریشان
دیکھ رہا ہوں کہ
وہ سو رہی ہے اور
دنیا بھر کا بوجھ اٹھائے
خدا جانے کہاں کہاں بھٹک رہی ہے۔

نظم
(گجرات کی پہلی برسی پر کہی گئی)

باقر مہدی

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

(۱)

میں نے کھڑکی کی کھول کے دیکھا
ساگر کی موجیں کیسی ہیں؟
چاندنی کا رقص!
اتنی رات کو ایک پرندہ اڑتا اڑتا آیا
سامنے کے پیڑ پہ آکر بیٹھ گیا
میں حیران ہوا...

بے چارہ اک الو تھا
گھور گھور کر ایسے مجھ کو تکتا تھا
جیسے میرا ساتھی ہو
نظروں سے وہ اپنی کہانی
مجھ سے کہنے والا تھا۔

''کتنی دور سے آئے ہو اتنی رات گئے؟''
اس کی روشن آنکھوں سے پانی سا بہنے لگا
میں نے سوچا، وہ گجراتی ہے
''سہیم خبر چھوں''
وہ بولا:
''دنیا میں اب میرا کوئی نہیں ہے
مجبوراً میں... راتوں رات اڑتا پھرتا ہوں
مانس، گھر بچے جلتے میں نے دیکھے ہیں
کیا اس پیڑ پہ مجھ کو پناہ ملے گی؟''

(۲)

''شیو سینا کے سارے کوے
تجھ پر ٹوٹ پڑیں گے
بھارت میں اب کہیں بھی جاؤ
شانتی کا نام نہیں ہے۔''
آخر میں کب تک تکتا
تھک کر آرام کیا

(۳)

صبح کو میں نے دیکھا
وہ پیڑ کے نیچے
مرا پڑا ہے
کالے کوے ناچ رہے ہیں

نظم

باقر مہدی

شمارہ ۲۹۱،
اپریل ۲۰۰۵

ایک چہل قدمی کے لئے گلی بنی
سمندر کے پاس یہ پھولوں کی گلی بنی
میں بھی بھولے سے یہاں آجاتا ہوں
میری عمر چلنے پھرنے گھومنے کی نہیں ہے
عورتیں بچے اور دو اک بوڑھے بھی آتے ہیں
میں یوں ہی کچھوے کی چال کی طرح
آہستہ آہستہ آیا تھا۔
اک جھاڑی کے پیچھے دو سائے ہم آغوش تھے
ایک نے بآواز بلند کہا:
کیا تم نے اس بوڑھے کو دیکھا؟
ہنسنے کی آواز آئی،
یہ بوڑھا دھرتی کا بوجھ ہے۔
میں نے سنا مگر چپ چاپ چلتا گیا
اس نے شاید صحیح کہا۔ یہ عمر چلنے پھرنے کی نہیں ہے
مگر میں کیا کروں ڈاکٹر نے مجھے سو قدم چلنے کو کہا ہے۔

میں شروع سے زندگی میں دھرتی کا بوجھ تھا
میں نے جوانی کرم کتابی بن کے گذاری ہے
میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا ہے
زندگی میں علم کی جستجو سب کچھ نہیں ہے
یہ مجھے تب معلوم ہوا جب میں دھرتی کا بوجھ بن گیا تھا

غزل

بانی

شمارہ ۸۰
جنوری ۱۹۷۳

نہیں سب خیریت ہے میں ہی رہتا ہوں یہاں اب بھی
تو کیا تم کو ہے اس گھر کے اجڑنے کا گماں اب بھی

سنائی دیں کھلے باہر میں میرے گھر کی آوازیں
یہی گھر ہے مگر میرے لئے جائے اماں اب بھی

کہیں آہ و فغاں ہو اس طرف ہی ہر نظر اٹھے
بسیرا ہے کن آوازوں کا یہ سونا مکاں اب بھی

سماں جو پہلے آتی آہٹوں کا تھا وہ اب بھی ہے
محبت ہے وہی یادوں بھری تنہائیاں اب بھی

وہی ہوں میں رہا جو کارواں در کارواں تنہا
وہی ہوں ڈھونڈتے ہو جس کا تم نام و نشاں اب بھی

تمھارے ساتھ ہوں تم میں سے کوئی اک نہیں ہوں میں
بڑھا لو فاصلے یہ میرے اپنے درمیاں اب بھی

یہ طرز فکر، جیسے پربتوں پر شام پڑ جائے
تو پھر کیوں تلخ لہجے میں ہے شہروں کا دھواں اب بھی

بانی

شمارہ ۸۰،
جنوری ۱۹۷۳

ہاتھ تھے روشنائی میں ڈوبے ہوئے اور لکھنے کو کوئی عبارت نہ تھی
ذہن میں کچھ لکیریں تھیں، خاکہ نہ تھا... کچھ نشان تھے نظر میں علامت نہ تھی

زرد پتے کہ آگاہ تقدیر تھے ایک زائل تعلق کی تصویر تھے
شاخ سے سب کو ہونا تھا آخر جدا ایسی اندھی ہوا کی ضرورت نہ تھی

اک رفاقت تھی زہریلی ہوتی ہوئی راستہ منتظر خود دو راہے کا تھا
پھر وہ اک دوسرے سے جدا ہو گئے، دونوں چپ تھے کہ دونوں کو حیرت نہ تھی

ایک آراستہ گھر میں تھا کب سے میں ایک صد برگ منظر میں تھا کب سے میں
میری خاطر تھیں کیا کیا ہنرکاریاں اک نظر دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی

آج رکھا ہے لمحہ ترے ہاتھ پر لمس اول کی لذت کو محفوظ کر
کل نہ کہنا فلک خوش تعاون نہ تھا کل نہ کہنا زمیں خوب صورت نہ تھی

کتنا پانی بہالے گئی ہے ندی، کتنے منظر اڑا لے گئی ہے ہوا
اک خزانہ کہ اب تک نہ خالی ہوا، اک زیاں تھا کہ جس کی شکایت نہ تھی

ایک اک لفظ کے سینۂ خشک سے فصل صد رنگ معنی اگانا پڑی
اپنی تقدیر میں کوئی ورثہ نہ تھا نام اپنے کوئی بھی وصیت نہ تھی

شمارہ ۸۹،
مارچ، اپریل ۱۹۷۴

صبح کی پہلی دعا سے آشنا ہوتا ہوا
ایک سناٹا ہے مانوس صدا ہوتا ہوا

جاتے موسم کی عجب تصویر ہے چاروں طرف
درمیاں اس کے ہے اک پتہ ہرا ہوتا ہوا

اتنی آگاہی تو ہے میں بڑھ رہا ہوں کس طرف
یہ نہیں معلوم کس سے ہوں جدا ہوتا ہوا

اک نوا آہستہ آہستہ فنا ہوتی ہوئی
ایک حرف صد طلب چپ چپ ادا ہوتا ہوا

دیکھ میں اپنی جگہ سے اک قدم سرکا نہیں
دیکھ تیرا ہی نشانہ ہے خطا ہوتا ہوا

اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی
ایک منظر، سوپرت، یکسر نیا ہوتا ہوا

بڑھ رہا ہے کون اپنا راستہ لیتے ہوئے
ست ہمراہوں سے چپکے سے خفا ہوتا ہوا

بانی

شمارہ ۱۰۱،
اکتوبر، نومبر ۱۹۷۶

(زیب غوری کی نذر)

اب آر پار دھیان کی مشعل کہاں ہے زیب
گنجان درد کا مرے اندر دھواں ہے زیب

گاڑھے سیاہ میں ہے لہو کی لپک نہ لہر
کیوں اس قدر بھی نقش نفس بے نشاں ہے زیب

کیوں بے اثر ہے میری دعا صحن صبح میں
کیوں شب کدے میں میری فغاں رائیگاں ہے زیب

کیوں مٹھی بھر سراب سے نقصان دشت ہے
کیوں آنکھ بھر نمی سے چمن کا زیاں ہے زیب

کیوں بادباں پہ بوجھ ہے اک بوند اوس بھی
کس آب ناتواں میں سفینہ رواں ہے زیب

کیوں بار بار مجھ سے بچھڑتا ہے، کون ہے
کیوں موڑ موڑ میرے لئے امتحاں ہے زیب

کیوں ایک خواب روز کی نیندوں پہ ہے محیط
کیوں اک ورق ہی میرے لئے داستاں ہے زیب

اب ارض شش جہت ہے نہ دریائے ہفت موج
مسمار آنکھ میں عدم آسماں ہے زیب

میرا تو ایک زخم بھی اب تک نہ بھر سکا
کہتے ہیں لوگ، وقت بڑا مہرباں ہے زیب

آ، کچھ سنیں سنائیں کہ شاید ہوا چلے
وہ حبس خوں میں ہے کہ اذیت میں جاں ہے زیب

تا عمر تیرے نام سے لکھوں غزل غزل
اک درد مشترک کا سخن درمیاں ہے زیب

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر ۱۹۷۶ تا فروری ۱۹۷۷

سیر شب لامکاں اور میں
ایک ہوئے رفتگاں اور میں

سر میں سلگتی ہوا تشنہ تر
دم سے الجھتا دھواں اور میں

میری فراوانیاں نو بہ نو
اب ہے نشاط زیاں اور میں

خاک و خلا بے چراغ اور شب
خواب و خبر بے نشاں اور میں

کب سے بھٹکتے ہیں باہم، الگ
لمحۂ کم مہرباں اور میں

غیر مطالب کہیں اور ڈھونڈ
سہل بہت شرح جاں اور میں

سانس خلاؤں نے لی، سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں

اسم ابد کی تلاش طویل
حسن شروع گماں اور میں

دونوں طرف جنگلوں کا سکوت
شور بہت درمیاں اور میں

پھر مرے دل میں کوئی تازہ کھوٹ
پھر کوئی سخت امتحاں اور میں

دور چھتوں پر برستا تھا قہر
چپ رہے کیوں تم یہاں، اور میں

بانی

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر۱۹۷۶تافروری۱۹۷۷

عکس کوئی کسی منظر میں نہ تھا
کوئی بھی چہرہ کسی در میں نہ تھا
صبح اک بوند گھٹاؤں میں نہ تھی
چاند بھی شب کو سمندر میں نہ تھا
کوئی جھنکار رگ گل میں نہ تھی
خواب کوئی کسی پتھر میں نہ تھا
شمع روشن کسی کھڑکی میں نہ تھی
منتظر کوئی کسی گھر میں نہ تھا
کوئی وحشت بھی مرے دل میں نہ تھی
کوئی سودا بھی مرے سر میں نہ تھا
تھی نہ لذت سخن اول میں
ذائقہ حرف مکرر میں نہ تھا
پیاس کی دھند بھی ہونٹوں پہ نہ تھی
اوس کا قطرہ بھی ساغر میں نہ تھا
مٹھی بھر اون نہ تھی بھیڑوں پر
لقمہ بھر گوشت کبوتر میں نہ تھا
جون میں تھی نہ سلگتی ہوئی لو
برف کا لمس دسمبر میں نہ تھا
چاند تارے کسی گردش میں نہ تھے
دل کسی شوق کے چکر میں نہ تھا
اب گرہ کوئی مقدر میں نہ تھی
خم کوئی گیسوے ابتر میں نہ تھا
راہ شفاف تھی چادر کی طرح
یعنی کچھ بھی مری ٹھوکر میں نہ تھا
خود روی قلب قلندر میں نہ تھی
بے دھڑک حوصلہ لشکر میں نہ تھا
دن میں تھا کار جنوں کا نہ سرور
شب کا آرام بھی بستر میں نہ تھا
شاہ کردار تھا غائب، یعنی
ذکر دل شوق کے دفتر میں نہ تھا
یوں تو ہم ڈرتے تھے غم سے اب بھی
پر کوئی خاص مزہ ڈر میں نہ تھا
بعض طائر تو منڈیروں پہ نہ تھے
رزق کا ہمہمہ اکثر میں نہ تھا
میری پلکوں سے سفر کرتا ہوا
تھا کوئی سایہ کہ دم بھر میں نہ تھا
اک مہک بوند کی بارش میں نہ تھی
اک دھواں صحن منور میں نہ تھا
کوئی تشبیہ علامت میں نہ تھی
استعارہ کوئی پیکر میں نہ تھا
کیا عجب فصل تھی ویرانی کی
پھول تک دست پیمبر میں نہ تھا
اب ہوا جاتی کہیں کیا لے کر
کچھ بھی ماحول مکدر میں نہ تھا
یوں اکیلے کا سفر تھا بانی
میں بھی خود اپنے برابر میں نہ تھا

بانی

شمارہ ۱۱۴
دسمبر ۱۹۷۹ تا مارچ ۱۹۸۰

سر سبز موسموں کا نشہ بھی مرے لئے
تلوار کی طرح ہے ہوا بھی مرے لئے

میرے لئے ہیں منظر و معنی ہزار رنگ
لفظوں کے درمیاں ہے خلا بھی مرے لئے

شامل ہوں قافلے میں مگر سر میں دھند ہے
شاید ہے کوئی راہ جدا بھی مرے لئے

میں خوش ہوا کہ مژدہ سفر کا مجھے ملا
پھیلا ہوا ہے دشت سزا بھی مرے لئے

دیکھوں میں آئینہ تو دھواں پھیل پھیل جائے
بولوں تو اجنبی ہے صدا بھی مرے لئے

میرے لیے تمام اذیت، تمام قہر
اور پھول سے لبوں پہ دعا بھی مرے لئے

بانی عجب طرح سے کھلی خوش مقدری
برگ شفق بھی، برگ حنا بھی مرے لئے

شمارہ ۱۱۴
دسمبر ۱۹۷۹، جنوری تا مارچ ۱۹۸۰

کہاں تلاش کروں اب افق کہانی کا
نظر کے سامنے منظر ہے بے کرانی کا

ندی کے دونوں طرف ساری کشتیاں گم تھیں
بہت ہی تیز تھا اب کے نشہ روانی کا

سجی ہوئی تھی وہاں بزم خوش وقاروں کی
عجب مزے کا تماشا تھا بے زبانی کا

میں کیوں نہ ڈوبتے منظر کے ساتھ ڈوب ہی جاؤں
یہ شام اور سمندر اداس پانی کا

پرندے پہلی اڑانوں کے بعد لوٹ آئے
چمک اٹھا کوئی احساس رائیگانی کا

میں ڈر رہا ہوں ہوا میں کہیں بکھر ہی نہ جائے
یہ پھول پھول سا لمحہ تری نشانی کا

وہ ہنستے کھیلتے اک لفظ کہہ گیا بانی
مگر مرے لیے دفتر کھلا معانی کا

جھوٹ تقدس رشتوں کا

بشر نواز

شمارہ ۵۸،
مارچ ۱۹۷۱

آنکھیں ہر دم ڈھونڈتی جائیں
بیگانی ان گنت نگاہوں سے بچ کر
دل چاہے
خود کو برہنہ کر دے
ایک اک گھاؤ پہ میٹھے لمس کا مرہم رکھ دے
ہاتھ کہیں ان انگلیوں کو داب کے چٹنی چٹی دیں
ہونٹوں کے سمٹتے کونوں پر جی بولے، نوک زباں سے
اک صدیوں کا پرانا گیت لکھے
لیکن ہو بھی کچھ چھپ چھپ کر
وہ روح ہزار سہی اپنی وہ جسم ہمارا لاکھ سہی
دنیا نہ کبھی مانے گی مگر
اس واسطے سب سے چھپ چھپ کر

ویران کھنڈر! ویران کھنڈر یہ چاردیواری ٹوٹی سی
پردے یہ پرانے جالوں کے
مٹی کی سہانی سیج پہ کنکر پھول بنیں
(نزدیک ذرا کچھ آجا)
جسموں کے دہکتے چاند کھلیں
جسموں کے دہکتے چاندوں سے یہ پیرہنوں کے ابر ہٹیں
یہ پیرہنوں کے ابر ہٹیں دو رس کے پیالے کھل جائیں
(کچھ اور قریب آجاؤ ذرا، کچھ اور ابھی، کچھ اور ابھی)
تاریک بھنور
تاریک بھنور کی تہ میں یہ موتی کا خزانہ چپکے سے، اس طرح
چھپا دیں جیسے اثاثہ چوری کا
(ہم آپ ہی اپنے چور ہوئے)

سانسوں کی الجھتی موجیں اور بے معنی حروف و صوت و صدا
پوروں میں رویں سی بجلی کی
ہر لحظہ سمٹتا کستا سا شریانوں وریدوں کا پھندا
ہونٹوں کی چٹا چٹ... سسکاری

آنچوں کی لپٹ... شعلوں کی دہک
دو پنکھڑیاں اک نرم کلی
اک نرم کلی اور اس کی چٹک
سب کچھ ہے وہی... سب کچھ ہے وہی
یہ کھیل پرانا صدیوں کا
پھر کی چبھن
"بیدرد نہ بن
آہستہ ذرا... آ... آہستہ.."
سب کچھ ہے وہی

دھیرے دھیرے ہر منظر پھر صاف، نمایاں، چمکیلا
آسودہ تھکن
سب کچھ ہے وہی سب کچھ ہے وہی
یہ کھیل پرانا صدیوں کا
یہ کھیل تمھارے میرے لئے، قیدی ہے مگر
میں پاپ کے بندی خانوں کا
رسموں کے حصاروں لفظوں کی بے در و سیہ فصیلوں کا
اس واسطے سب سے چھپ چھپ کر
مٹی کی سہانی سیج کے کنکر پھول بنے
ریشم کی ملائم سیج، مہکتے پھول، دعائیں، آرسی مصحف یکتا
...ابھی کچھ دور ہیں اپنی قسمت سے
اس واسطے سب سے چھپ چھپ کر
سنجوگ یہ روحوں جسموں کا

محفل میں تمھاری اور میری
نظروں پہ نقابیں سوانگ رچے
میں بھائی تمھارا تم ہو بہن
سب جھوٹ تقدس رشتوں کا
صرف ایک مقدس...
کھیل۔ یہی اک کھیل پرانا صدیوں کا

بشر نواز

شمارہ ۱۵۵،
مئی تا جولائی ۱۹۸۹

نظم

ایک پھول
آسمان کی بلندیوں سے اک سنہرا پھول
کالی سرد جھیل میں
موج موج ڈوبتا ابھرتا دور تک پہنچ گیا
سبک کچھ اس قدر سبک
کہ جیسے سطحِ جام پر
اجلا اجلا جھاگ ڈولتا ہوا
سبک کچھ اس قدر سبک
کہ دیر تک نہ ساحلوں نہ موج کو پتہ چلا
سنہرا لمس
دھیرے دھیرے
لہر لہر ایسے جگمگا گیا
کہ سطح سے اتھاہ تک
سب ہی نور ہو گئے
ایک جگمگاتی دھند
نرم ہلکی دھوپ جیسی چار سو بکھر گئی
نہ ابتدا نہ انتہا
بس ایک جگمگاتی دھند
نرم ہلکی دھوپ سی
تمام میں گھلی ملی

شمارہ ۲۶۹،
جون ۲۰۰۳

وہ ہیں تیرگی میں بھی ضو فشاں

وہ جو نیک دل ہیں امین ہیں
جو ضمیر اہلِ یقین ہیں
جو لہو سے صفحۂ وقت پر
نئی داستانِ حیات لکھنے میں محو ہیں
انھیں نذر کرتی ہے زندگی
کئی ظلم جھیلتے سورماؤں کے حوصلے
ابھی جگمگاتے ہیں یاد میں
شر و خیر کے کئی معرکے
جو یہیں کہیں کبھی سر ہوئے
وہ منارِ نور سے روز و شب
جو دفاعِ حق میں بسر ہوئے
انھیں خوف کیسا خطر کہاں
وہ جو اپنے خوں کی زرہ پہن
کے سجانے نکلے ہیں سونے بن
وہ ہیں تیرگی میں بھی ضوفشاں
وہ شہید ہو کے بھی جاوداں
کہ فضا میں گونجتی اک ندا
سے ہے روح ان کی ازل کے دن ہی سے آشنا

''ہے قسم ستارۂ صبح کی
کہ خسارہ اس کا نصیب ہے
جو سیاہیوں کا نقیب ہے۔''

مجھے جینا نہیں آتا

بشر نواز

شمارہ ۲۸۵،
اکتوبر ۲۰۰۴

(شمس الرحمٰن فاروقی کی نذر)

میں جیسے درد کا موسم
گھٹا بن کے رنگ خوشبو نذر کرنے کی تمنا لے کے جس منظر تلک
جاؤں
اسے اشکوں کے گہرے کہر میں ڈوبا ہوا پاؤں
میں اپنے دل کا سونا
پیار کے موتی
ترستی آرزو کے پھول
جس در پر سجاتا ہوں وہاں جیسے مکیں ہوتا نہیں کوئی
بنا ہوں ایک مدت سے صدائے بازگشت ایسی
جو دیواروں سے ٹکرائے
ہراساں ہو کے لوٹ آئے
دھڑکتے دل کے سونے پن کو سونا اور کر جائے
میں اپنے آپ کو سنتا ہوں
اپنے آپ کو چھوتا ہوں
اپنے آپ سے ملتا ہوں خوابوں کے سہانے آئینہ گھر میں
تو میرا عکس مجھ پر مسکراتا ہے
یہ کہتا ہے:
"تجھے جینا نہیں آتا۔"

"تجھے جینا نہیں آتا، تجھے جینا نہیں آتا۔"
صدائیں پتھروں کی مجھ پر
میرے خوابوں کے سہانے آئینہ گھر پر برستی ہیں

ادھر تارا ادھر جگنو
کہیں اک پھول کی پتی، کہیں شبنم کا اک آنسو
بکھر جاتا ہے سب کچھ سوچ کے سنسان صحرا میں

میں پھر سے زندگی کرنے کے ارماں میں
اک اک ریزے کو چنتا ہوں، سجاتا ہوں، نئی مورت بناتا ہوں
دھنک کے رنگ خوشبو نذر کرنے کی تمنا میں قدم آگے بڑھاتا ہوں
تو اک بے نام گہری دھند میں سب ڈوب جاتا ہے
کسی سے کچھ شکایت ہے نہ شکوہ ہے
کہ میں تو درد کا موسم ہوں
اپنے آپ میں پلتا ہوں، اپنے آپ میں جیتا ہوں
اپنے آنسوؤں میں بھیگتا ہوں، مسکراتا ہوں
مگر سب لوگ کہتے ہیں
مجھے جینا نہیں آتا

عجیب تماشا

بشیر باگ

شمارہ ۱۵۸،
اپریل تا ستمبر ۱۹۹۰

آج ایک عجیب تماشا شروع ہوا۔

دودھ کی زمین، دودھ کا آسمان، دودھ کے درخت، درختوں پر پکے ہوئے پھل دودھ کے، پھول دودھ کے، منڈلاتی ہوئی تتلیاں دودھ کی، دودھ کے دن، دودھ کی راتیں ایسے کہ کوئی آیا نہ گیا۔ زمین و آسمان ایسے کہ ان میں کوئی فاصلہ نہیں۔ یعنی باہم پیہم۔ دودھ میں نہائی شفاف پاک وصاف وادی میں دودھ کا جھرنا اور اس میں تیرتی مچھلیاں دودھ کے جھرنے کے قریب دودھ کی کٹیا اور اس میں سے نکلتی ہوئی روشنی دودھ کی۔

الغرض آج عجیب تماشا ہوا۔

پرندوں نے چگنا، چرندوں نے جگالی کرنا چھوڑ دیا۔ پگڈنڈی سے گذرنے والے یکلخت رک گئے۔ جھرنوں نے اپنا دامن سمیٹ لیا۔ مچھلیوں نے تیرنا چھوڑ دیا۔ زمین اور آسمان لرزنے لگے گویا ان کا باہم رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ ہر طرف افراتفری کے بیچ کسی کے ہبکنے کی آواز وادی میں پھیل کر مبشر مبشر کی صدا بن گئی ہے۔

آج عجیب تماشا ہوا۔

مبشر مبشر کی آتی ہوئی صدا پر دودھ کی کٹیا کے کیواڑ کھل جاتے ہیں۔ کٹیا سے دودھ کی داڑھی، دودھ کی آنکھوں والا مبشر باہر نکلتا ہے۔ چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ جب اس کی نگاہ پیش گاہ پر پڑتی ہے تو دیکھتا ہے۔ دودھ پہنی، دودھ اوڑھی ایک عورت دودھ کے آنسو رو رہی ہے۔ مبشر سمجھ جاتا ہے کہ کیوں اس وادی کا سکون درہم برہم ہوا۔ مبشر کی آہٹ پر عورت چونکتی ہے۔ نظریں اٹھا کر دیکھتی ہے۔ مبشر سمجھ جاتا ہے کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ اور فکرمند، نہیں چاہتی کہ اس کا بچہ اس دنیا میں آئے۔ مبشر آنکھیں موند لیتا ہے۔ گویا کچھ غور کرتا ہے۔

ایک اسٹیج ہے جس کے کئی حصے ہیں۔ اس وقت اسٹیج کا پردہ کچھ حصے سے ہٹا ہوا ہے جہاں سے دو کمرے نظر آرہے ہیں۔ ایک کمرے میں خاموش سناٹا تاریکی لئے ہوئے ہے۔

اس تاریکی میں دو سفید ہیولے آہستہ آہستہ اس دیوار کی سمت بڑھ رہے ہیں جو متصل کمرہ کو جدا کئے ہوئے ہے۔

متصل کمرہ جس کی دیواریں مختلف گہرے رنگ وروغن سے آراستہ ہیں جن کی وجہ سے چھت میں لگے ہوئے تیز روشنی والے بلب سے نکلتی ہوئی روشنی اپنی شناخت کھو چکی ہے۔ سب سے پہلے دکھائی دینے والی دیوار پر ایک پینٹنگ آویزاں ہے جس میں سات موٹی تنومند گائیں ہیں جنھیں سات لاغر گائیں کھا رہی ہیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر گندم کی سات بالیاں اور بالیوں پر سات کیڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں پہاڑ کی چوٹی پر چمکتا ہوا سورج۔

کمرہ کے داہنی دکھائی دینے والی دیوار میں اکیلا ایک دروازہ، وا کیا ہوا۔ کوئی روک ٹوک نہیں یا کسی کا انتظار۔

ایک کونے میں دبیز بستر سے آراستہ ایک پلنگ، جس پر ایک بوڑھا سویا ہوا اک ٹک چھت کی سمت دیکھ رہا ہے۔ بوڑھے کے بائیں ہاتھ میں ایک نلی لگی ہوئی ہے جس کا دوسرا سرا پلنگ کے سرہانے رکھے ہوئے اسٹینڈ سے جاملا ہے جہاں خون کی بوتل ٹنگی ہوئی ہے۔ قریب ہی ایک ٹیبل جس پر چند خون کی خالی بوتلیں اور

ایک گلدان رکھے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف کونے میں جہاں بلب کی روشنی کچھ ترچھی پڑ رہی ہے ایک صندوق ہے جس پر روغن کیا ہوا رنگ جگہ جگہ سے اکھڑ کر آثار قدیمہ ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ دروازے میں سرسراہٹ ہوتی ہے۔

ایک مجیم شحیم، کشندہ پیشانی، چمکتی ہوئی آنکھوں والا، بے ترتیب لباس پہنے شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ نووارد اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ سفید گون پہنے ہاتھ میں اسٹیتھیسکوپ پکڑے ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں اور سیدھے اس پلنگ کی طرف چلے جاتے ہیں جس پر بوڑھا ضعیف مریض لیٹا ہوا ہے۔

ڈاکٹر مریض پر جھکتا ہے۔ نبض دیکھتا ہے۔ تعجب سے نووارد کی طرف سر اٹھا کر پوچھتا ہے۔

ڈاکٹر:

(تعجب سے) اس کی تو نبض بھی نہیں محسوس ہوتی۔

نووارد:

(مسکراتا ہے) ہماری نبض دیکھنی ہو تو غیر مرئی انگلیوں سے دیکھو۔

ڈاکٹر:

(اپنی انگلیوں کی پوروں کو دوسرے ہاتھ سے چھو کر دیکھتا ہے) خیر۔ اس کی عمر کیا ہوگی؟

نووارد:

مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب خدا کے ذہن میں انسان کی تخلیق کا خیال پیدا ہوا تھا۔

ڈاکٹر:

اوہ، (Good, Good) (ہنستا ہے) اور تم؟

نووارد:

میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب انسان نے پہلی مرتبہ جینا چاہا۔

ڈاکٹر نووارد کی طرف ایسے دیکھنے لگتا ہے جیسے اسکو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ڈاکٹر:

(خون کی بوتل کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر) یہ خون کس گروپ کا ہے، تمھیں معلوم ہے؟

نووارد:

کوئی مخصوص گروپ نہیں۔ (ڈاکٹر کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے) ڈاکٹر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی تم نئے ہو آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گے۔

ڈاکٹر کی نگاہ نووارد کی آنکھوں کی طرف جاتی ہے۔ جہاں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی آنکھیں جھلمل کرتی ہوئی روشنی کی تاب نہیں لاتیں وہ اپنی نگاہیں نیچے کر لیتا ہے۔

دروازہ کے باہر ایک شور اٹھتا ہے۔ مارو۔ پاگل ہے۔ کسی کو کاٹ لے گا۔ دیوانہ ہے۔ زہر دے دو۔ منافق ہے! اٹھاؤ پتھر، سنگ سار کر دو۔

نووارد دروازے کے قریب جاتا ہے۔ بغل میں موٹی کتاب دبائے ایک مخدوش شخص، جس کا لباس تار تار، آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک، بال کھچڑی، کمرے میں بوجھل قدموں سے داخل ہوتا ہے۔

نووارد:

(اس کے قریب جاتے ہوئے پہچان کر) میں نہ کہتا تھا۔ اس دنیا میں آج تک جتنے بھی نظام، فلسفے، مذاہب، حکومتیں قائم ہوئی ہیں میری ہی وجہ سے قائم ہوئیں۔ تمھیں تو اچھی طرح معلوم تھا۔ میری ہی وجہ سے مٹ بھی گئیں۔

مخدوش شخص:

لیکن میرا فلسفہ... میرا راستہ اہنسا کا راستہ ہے۔ بھلا کیوں کر تمھاری مدد لیتا۔

ہاں۔ ہاں۔ اہنسا کے لئے بھی ہنسا کی ضرورت ہوئی ہے۔ اب بھی وقت ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو.. (نووارد کا لہجہ تبدیل ہوتا ہے چڑچڑے پن سے پہلو بدلتے ہوئے) ورنہ یہاں سے نکل جاؤ اور خاموش کسی خالی قبر کو تلاش کر کے سو جاؤ۔ تم سے پہلے کتنے آئے اور بے گور و کفن چلے گئے ہیں۔

مخدوش شخص:

(اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے) بھلا میں کیسے اعتبار کرلوں۔ تمھاری قائم مقام چیزیں کیوں فرسودہ ہوئیں کیوں ان میں کمزوری آئی۔ انھیں تو مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔ کیوں مٹیں؟

نووارد:

بے شک (مخدوش شخص کی جانب مڑتے ہوئے) بے شک تم اعتبار نہ کرو۔ فطرت ارتقا پذیر ہے۔ اور ارتقا تغیر کا محتاج۔ جب تغیر کا عمل ہوتا ہے۔ بہت کچھ تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے لیکن طاقتور مادہ اپنی شناخت باقی رکھتا ہے۔ کمزور فنا ہو جاتا ہے۔

مخدوش شخص خاموش ہو جاتا ہے گویا فیصلہ نہیں کر پا رہا ہو۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہتی ہے۔ دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔

نووارد:

کون ہے؟ اندر آ جاؤ میاں! کوئی بندش نہیں ہے۔ (باہر سے آواز آتی ہے) میں... میں ہوں تمھارا آشنا۔

نووارد:

(سوال کرتا ہے) کیا کام ہے کیوں آئے ہو؟

آشنا:

(باہر ہی سے) چلو سب تیار ہے۔ ہم نے پھر سے اپنی دوکانیں چمکالی ہیں تاکہ جلانے میں آسانی ہو۔ اور ہم نے اپنی عورتوں اور بچوں کو کھلے میں ڈال دیا ہے تاکہ ہتھیار سرخ کرلو۔

نووارد:

(کچھ بلند آواز سے) ابھی تو پچھلا خون ختم نہیں ہوا (خون کی بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے) کچھ انتظار کرلو تو بہتر ہے۔

آشنا:

(باہر ہی سے) تم اب کب ملو گے۔ ہم تمھیں کہاں کہاں ڈھونڈیں؟ (مایوسی سے)

نووارد:

تعجب ہے۔کیا تمھیں معلوم نہیں میں کہاں ملتا ہوں؟ (پیشانی پر بل ڈالتا ہے) میں ہر اس جگہ ہوں جہاں دو قوتیں ٹکراتی ہیں اور ان کے درمیان تیسری قوت پیدا ہوتی ہے۔میں وہیں ہوں۔اور میں وہیں ہوں۔مجھے وہیں ڈھونڈو۔اسی وقت اسی جگہ۔

باہر سے آواز آنا بند ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر اور مخدوش شخص چونکتے ہیں۔کبھی باہر آواز کی طرف دیکھتے ہیں کبھی نووارد کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف مخدوش شخص گویا ہوتا ہے۔

مخدوش شخص:

یہ عجیب پاگل لوگ ہیں۔انھیں کوئی احساس نہیں، کیا یہ اتنے بے بس کر دیئے گئے ہیں کہ ظلم کو خود دعوت دیتے پھرتے ہیں؟ (وہ اتنی آہستگی سے کہتا ہے گویا وہ خود اپنے آپ سے مخاطب ہو مگر نووارد سن لیتا ہے اور مخدوش شخص کو سمجھاتا ہے۔)

نووارد:

بے بس نہیں، یہ اس دور کی بے حس قوم ہے جو اپنے خوش قسمتی کے دور میں فراغت کی نیند سوتی تھی۔

دور پلنگ کے سرہانے کھڑا ڈاکٹر ان دونوں کی گفتگو میں مخل ہونے کے لئے قریب آتے ہوئے گلدان سے ایک پھول نکالا لاتا ہے۔نووارد ڈاکٹر کو پھول لئے اپنے قریب آتا ہوا دیکھ کر چیختا ہے۔اور غصے سے پھول چھین کر زمین پر پھینکتا ہے۔اور اسے پیر سے مسل ڈالتا ہے۔

نووارد ڈاکٹر: (کچھ بلند آواز سے) یہ یاد رکھو چھوٹے سے چھوٹا لطیف جذبہ بڑے سے بڑے منصوبوں کو تباہ کر سکتا ہے۔ان پھولوں کو گلدان کی حد تک ہی رہنا اچھا ہے۔مبادا انجام جنون ہو، جنون وہ جو انسانوں کو بیدل کر دے۔

ڈاکٹر نووارد کی جلتی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر کچھ دیر خاموشی کے بعد سمجھانے کے انداز میں بڑی ہی نرمی سے کہنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر:

میں اب کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔سنو اب اس کھیل کو یہیں ختم کر دو تو بہتر ہے۔ویسے بھی خون کی بوتلیں ختم ہو رہی ہیں۔ضعیف مریض کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔

نووارد:

نہیں ڈاکٹر نہیں۔(گھبراہٹ سے) ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔تم نہیں جانتے ڈاکٹر اس کو زندہ رکھنا بہت ضروری ہے کہ اگر یہ ختم ہو گیا تو پھر سمجھ لو اس دنیا، اس کائنات کا اختتام ہوا۔اس کو زندہ رکھنا ہوگا۔کسی قیمت چاہے کتنے ہی بوتل خون لگ جائے۔اسے زندہ رکھنا ہوگا۔نہیں معلوم ابھی کیا کچھ ہونا باقی ہے۔نہیں معلوم انسان اور کتنا جینا چاہتا ہے (وہ بے چینی سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔پھر دروازے سے نکل جاتا ہے۔)

متصل کمرے میں جہاں تاریکی ہے، دو ہیولے دیوار سے چپکے ہوئے سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔تاریکی میں سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔

ایک:

بڑا افسوس ہوگا اگر اب بھی ہم اپنے جسموں کو حاصل نہ کر سکیں۔نہ جانے ہمارے انتظار میں ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

دوسرا:

مجھے بھی افسوس ہے۔

ایک:

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ان سے اپنے جسم مانگ لیں اور وہ دے دیں؟

دوسرا:

ہو بھی سکتا ہے۔مگر...مگر...

پہلا:

مگر کیا؟

دوسرا:

مگر ان جسموں کو پا کر ہم کریں گے کیا؟

پہلا:

کیا مطلب؟ کیا ہم مکمل نہیں ہو جائیں گے۔بے روح جسم بے جسم روح یہ ادھورا پن...

دوسرا:

وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا ذہن کھٹکتا ہے۔جب ہم اپنے جسموں کے ساتھ اس دنیا میں داخل ہوں گے تب کیا ہمارے جسم محفوظ رہیں گے؟ کیا ہماری پاکیزگی برقرار رہے گی؟

پہلا:

غور کرنے والی بات ہے۔شاید ابھی وقت نہیں آیا...چلو لوٹ چلتے ہیں۔

دوسرا:

ٹھہرو۔کسی کے قدموں کی آواز آ رہی ہے۔سنتے ہیں پھر آگے کیا ہوا (وہ دونوں متصل دیوار سے اور کچھ سمٹ جاتے ہیں)۔

دوسرے کمرے میں قدموں کی آواز آنے لگتی ہے۔ڈاکٹر اور مخدوش شخص دروازے کی جانب دیکھنے لگتے ہیں جہاں سے تازہ تازہ خون کی بوتلیں لئے ہوئے نووارد داخل ہوتا ہے۔اس کے پیچھے دو نوجوان، جینز پینٹ، ڈھیلا ڈھالا کرتا، بال بڑھے ہوئے مگر ترتیب سے سنوارے ہوئے اسپورٹس شوز پہنے داخل ہوتے ہیں۔نووارد سیدھا پلنگ کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتا ہے۔

نووارد:

ڈاکٹر انھیں دیکھنا۔تھوڑی مرہم پٹی کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر:

کیا ہوا ہے انھیں؟ یہ گھاؤ... کسی چیز کے گھاؤ ہیں بھائی؟

پہلا نوجوان:

(دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس نے مجھے مارا (ہنستا ہے)

ڈاکٹر:

کیوں مارا ہے؟ (دوسرے نوجوان سے پوچھتا ہے۔)

دوسرا نوجوان:
لذت (کھلکھلا کر ہنستا ہے۔)
ڈاکٹر:
اور تم مار کھا گئے؟ (تعجب سے پہلے نوجوان سے پوچھتا ہے۔)
پہلا نوجوان:
لذت (وہ بھی کھلکھلا کر ہنستا ہے۔)

ڈاکٹر تعجب کرتے ہوئے پلنگ کی طرف جاتا ہے۔ پرانی خون کی بوتل کی جگہ نئی بوتل چڑھاتا ہے۔ دونوں نوجوان بھی ڈاکٹر کے پیچھے پلنگ کے قریب آتے ہیں اور ضعیف مریض کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھتے ہیں:
ایک نوجوان:
یہ صاحب کون ہیں؟
ڈاکٹر:
یہ (ضعیف کے چہرے کے قریب آتے ہوئے) تم انھیں نہیں جانتے کیا تم اپنے ماضی کو بھول گئے؟ خواہش کو جانتے ہو؟
دوسرا نوجوان:
(تعجب سے کندھے چڑھاتا ہے۔ تھوڑے مزاحیہ انداز میں نووارد کے قریب جاتے ہوئے) تو ایسا ہے ہمارا ماضی اور ایسی ہے ہماری خواہش! (دونوں نوجوان ہنسنے لگتے ہیں۔ اچانک ایک کھٹ کھٹاہٹ ہوتی ہے جس میں کچھ کترنے کی آواز بھی ملی ہوئی ہے۔ دونوں نوجوان خاموش ہو جاتے ہیں کمرے میں جیسے خاموشی چھا جاتی ہے۔ سبھی اس کھٹ کھٹاہٹ کی وجہ جاننے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ پھر ایک بار ویسی ہی کھٹ کھٹاہٹ ہوتی ہے۔ کمرہ میں ڈاکٹر کی گھبرائی سی آواز گونجتی ہے۔)
ڈاکٹر:
ب، ب بدروح؟! (صندوق کی جانب اشارہ کرتا ہے جہاں کچھ کچھ حرکت ہو رہی ہے۔)

نووارد ڈاکٹر کو سنبھالتا ہے اور کچھ سمجھانے کے انداز میں کہتا ہے:
نووارد:
نہیں۔ ڈرو نہیں۔ اس میں بدروح نہیں، بے روح جسم ہیں جنھیں خلع بدن کے بعد اس صندوق میں رکھا گیا تھا۔ یہ بے ضرر ہیں۔ کبھی کبھی اپنی ارواح کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں اور کھٹ کھٹاتے ہیں (ایک بار پھر ویسی ہی کھٹ کھٹاہٹ ہوتی ہے۔)
ڈاکٹر:
کون ہے؟ کون ہے! (خوف سے نوجوانوں سے چپک جاتا ہے جو خود بھی تشویش میں مبتلا ہیں۔ دونوں نوجوان ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنا سر ہلاتا ہے۔ دوسرا بھی جواب میں سر ہلاتا ہے۔ اچانک دونوں دوڑ کر صندوق پر چڑھ جاتے ہیں، کودنے اور ناچنے لگتے ہیں۔ صندوق چرمراتا ہے۔ اور اس پر چڑھا ہوا روغن جھڑنے لگتا ہے۔ صندوق کی حالت دیکھ کر مخدوش شخص آواز دیتا ہے۔)
مخدوش شخص:
اتر جاؤ اس پر سے! نقصان مت پہنچاؤ وہ... وہ تمھاری موت کے بعد...

نوجوان مخدوش شخص کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ اور بھی زور زور سے کودنے لگتے ہیں۔ صندوق کے ٹوٹنے کی آواز گونجتی ہے۔ تب متصل دیوار کے اس طرف تاریک کمرے سے افسوس میں ڈوبی ہوئی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یا ذوالقرنین یا ذوالقرنین یا ذوالقرنین آوازیں آہستہ آہستہ دور ہونے لگتی ہیں۔

اسٹیج کا پردہ جو کچھ ہی کھلا ہوا تھا بند ہو جاتا ہے۔

مبشر آنکھیں کھولتا ہے۔ اور سمجھانے کے انداز میں گویا ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلتے ہوئے الفاظ دودھ بن کر ٹپکنے لگتے ہیں۔

انسان کے جسم کے دو حصے ہیں: ایک اس کا باہر، دوسرا اس کا اندر۔ دنیا کی چیزیں ایک حال پر نہیں رہتیں۔ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور ان کا رجحان اس طرف ہے کہ پہلے پیدا ہوں، پھر پروان چڑھیں اور ایک حد تک پہنچ کر کملانا شروع کر دیں اور آخر رفتہ رفتہ فنا ہو جائیں۔ دنیا کی ہر چیز انھیں مراحل سے گذرتی ہے۔ مگر انسان کا اندر غیر متبدل ہے۔ اس پر کوئی زمانہ نہیں گذرتا۔ وہ ادنیٰ اور اعلیٰ کا متمنی نہیں۔

باہر ٹوٹ سکتا ہے پھوٹ سکتا ہے۔ اندر متاثر نہیں ہوتا۔ اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کا باہر سڑ گل کر مٹی میں مل نہیں جاتا۔ تب وہ ساتھ چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے چپک جاتا ہے جس کا کہ وہ ایک حصہ تھا۔

باہر کی جنس ہوتی ہے۔ اس کو کوئی جنتا ہے اور وہ کسی کو جنتا ہے۔ اندر کو کسی نے نہ جنا ہے، نہ وہ کسی کو جنتا ہے۔ وہ اپنی کوئی شناخت نہیں رکھتا۔ محتاج تعریف تو ہے ہی نہیں۔ وہ ہر تعریف سے باہر ہے جو اپنی شناخت کے لئے پر خطر معرکے سر کرتا ہے۔ جان جوکھم میں ڈالتا ہے۔

دنیا کے مصائب و آلام میں گرفتار، باہر اقدار کی بلندیوں پستیوں میں ڈولتا جزا و قضا میں کھولتا، رنگ و نسل حسب و نسب کو سنبھالتا، نفس کے تابع اپنی صفات کو اس ظاہری حواس باطنی کی کشتی میں ڈالے انجانے ساحل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ مگر اس کا اندر ان تمام صفات سے معرا صرف خلوت پسند ہے اور اس کا خلوت کدہ انسان کا باہر ہے جہاں وہ نہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے۔ بس پڑا ہوا رہتا ہے۔ جیسے کہ اس کائنات سے پہلے پانیوں پر پڑا ہوا تھا۔

ہمارا کام صرف اس کے لئے جسم مہیا کرنا ہے۔ یہ نقطۂ موہوم ہے۔ گانٹھ لو، اسی میں بھلائی ہے۔

دودھ جیسے الفاظ جوں جوں نکلنے لگتے ہیں سسکتی ہوئی عورت انھیں اوک سے پینے لگتی ہے۔ یوں وادی میں سسکیوں کی گونج کم ہونے لگتی ہے۔ تب چرندوں نے، پرندوں نے، سکھ کا سانس لیا۔ زمین اور آسمان باہم پیوست ہوئے۔ جھرنوں نے اپنے دامن کھول دیئے، مچھلیاں تیرنے لگیں اور پگڈنڈی سے گذرنے والے بہت ساری دعائیں دیتے ہوئے گذرنے لگے۔

اس طرح ایک عجیب تماشا ختم ہوا ☆☆☆

بلراج کومل

ایک عورت

شمارہ ۲۳،
اپریل ۱۹۶۸

وہ موج اک مقام سے
افق کی سمت
پھیلتی چلی گئی
وہ ایک دائرے سے
سینکڑوں حسین دائروں میں
دیکھتے ہی دیکھتے بدل گئی
ہر ایک دائرے میں آفتاب تھا
ہر ایک دائرے میں سرخ زہر تھا
ہر ایک دائرہ حیات جاوداں
ہر ایک دائرہ میں مرگ شادماں

وہ ایک تھی
ہزار صورتوں میں میرے سامنے
طلوع جب ہوئی
تو میرا آسمان بن گئی
نئی، عظیم لذتوں کے درمیاں
میں اپنے مشتعل مقام سے
افق کی سمت پھیلتا چلا گیا
حصار مرگ و زندگی کو روندتا چلا گیا

کابوس

شمارہ ۳۱،
دسمبر ۱۹۶۸

جام سے آج گذرا ستارہ کوئی
دشت تھا، یا سمندر تھا، یا خواب تھا
اس میں کیوں اجنبی کی طرح سے میں صدیوں گذرتا رہا
جام ہم زاد تھا، جام میرا لہو، جام میرا جگر
دشت کیوں بن گیا؟
کیوں سمندر بنا؟
حشر کے روپ میں، میرے آفاق پر ہائے کیوں چھا گیا؟
میرے لب تھے مرے، جام سے جب ملے
قتل کا سلسلہ، موت کا دائرہ
سر بریدہ، برہنہ، شکستہ کوئی جسم اچھلا
مرے پردۂ چشم پر آ گیا
اس کے چہرے کو ترتیب دیتا رہا
وہ بکھرتا رہا۔ وہ بکھرتا رہا
خاک و خوں میں مسلسل تڑپتا رہا
کون سی آنکھ تھی؟ کون سے ہونٹ تھے
جن کی ترتیب مجھ سے نہ ممکن ہوئی

اس کی تصویر تھی،
میری تقدیر تھی
جام میں آج اترا ستارہ کوئی
جام سے آج گذرا ستارہ کوئی

بلراج کومل

شمارہ ۹۱،
جولائی تا ستمبر ۱۹۷۴ء

بلی

یہ سوچتے سوچتے ماں نے
آنکھوں ہی آنکھوں میں رات گذار دی
کہ کمرے میں بلی
کس راستے سے داخل ہوئی
جب کہ تمام کھڑکیاں، دروازے اور روشن
دان بند تھے
صبح اٹھنے پر ماں نے اپنی مشکل جب سنائی
تو میں اس کو نظر انداز کر کے
گھر سے باہر چلا گیا۔

آج رات ماں کو نیند آ گئی، اور میں نے
ساری رات
آنکھوں ہی آنکھوں میں گذاری
یہ سوچتے سوچتے
کہ بلی کس راستے سے کمرے میں داخل ہوئی؟

تیسرا فاصلہ

نرخ نامے میں اس کا نام پڑھ کر
میں خریداروں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا
تا کہ جو کام میں متاع وفا سے نہیں کر سکا
دام چکا کر کر لوں۔

میں نے دام چکا دیئے تو مجھ پہ یہ راز کھلا
میرے اور اس کے درمیان
تعلق کے سرابوں میں
کوئی تیسرا فاصلہ حائل تھا۔

پانچویں منٹ کے بعد

خریدی ہوئی لڑکی
اس کی تسکین ہوس کے لئے تیار تو ہو گئی
لیکن اس شرط پر
کہ وہ اسے پانچ منٹ میں فارغ کر دے گا

اس رات
اس پہاڑی برف آلودہ شہر میں
سردی اپنے عروج پر تھی
اور وہ اپنے گھر سے بہت دور تھا
اس نے بہت چاہا
لیکن اس کی پراسرار الجھن سے
گھڑی کی رفتار میں کوئی کمی نہ ہوئی
اور پانچواں منٹ دم توڑ گیا

برف باری
جو اس کے شکستہ گاؤں پر، مدتوں پہلے
شروع ہوئی تھی،
مسلسل جاری رہی
جب سارا گاؤں اس کے نیچے دب گیا
تو اجنبی کو اپنا
ادھ جلا، جھلسا ہوا، وہی گھر یاد آیا
جس کو وہ سوچتا تھا، وہ فراموش کر چکا ہے۔

بلراج کومل

شمارہ ۱۳۷،
اپریل تا جون ۱۹۸۵

لوگ کہتے ہیں
آواز کا
ایک چہرہ بھی ہوتا ہے
انداز بھی، جسم بھی
سرخ سورج کا سونا
درختوں کے اس پار
مہتاب کی سیم گوں موج عریاں
سمندر کی آویزشوں کا
پراسرار نغمہ
محبت کی لذت کی گرمی
کبھی شبنمی، ننھی منی سی لوری
کہانی
سیہ کار شب میں
کوئی خون آلودہ باب عداوت
مکانات کا سلسلہ
دل کی ویرانیوں سے گذرتا ہوا
کوئی حرف ملامت
ندامت

ہجوم نقوش فراواں کا ہنگام
میں یاد کرتا ہوں
میں یاد کرتا ہوں

آواز، چہرہ، حسیں جسم
سب زاویے، دائرے اور قوسیں
شب و روز
رفتار کی آگ میں
موج در موج بہتی ہوئی راگنی
دور کی وادیوں میں
سرشام
دم توڑتی روشنی
نغمگی، روشنی نغمگی
تیرگی، بے بسی، خامشی
رنگ و خوشبو سے سرشار
صدیوں پرانی زمین
دور جاتا ہوا کارواں

جسم آواز کا وحشی بے زباں
اک جنوں، ایک معکوس برہم سکوں
زیر و بم، زیر و بم
اضطراب، اضطراب
اجنبی موسموں کا جہاں
فاصلوں، سرحدوں سے پرے
وسعتوں میں پرافشاں
پرندوں بھرا نیلگوں بیکراں آسماں

بلراج کومل

شمارہ ۱۳۸
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵

فصیل شہر
اب کسی کو روکتی نہیں
فصیل شہر
صرف کنکروں کا پتھروں کا ڈھیر ہے

ہزار، دس ہزار،
ایک لاکھ
بے اماں، زار لوگ
شہر میں اتر رہے ہیں
ہر برس
ہر ایک رہگذر
کدورتوں کی، بے مراد شہوتوں کی رزم گاہ
سیل باد ہو میں
اب فصیل شہر بولتی نہیں
کسی کو بازوؤں میں تولتی نہیں

یہیں کہیں پہ ایک سنگ بے نشان ہے
پتھروں کے کنکروں کے ڈھیر میں
برس گذر گئے
جانے کیسے یاد آ گیا
لکھا تھا اس پہ ہم نے اپنے ہاتھ سے
تمھارا نام، میرا نام،
میں بھی سوچکا ہوں
تم بھی ہونٹ کھولتیں نہیں
سگان شہر
زہر گھولتی ہوئی زبان شہر

شمارہ ۲۷۲
ستمبر ۲۰۰۳

'سفر ہے دور کا، لیکن
سنا ہے رہ گذر او نچے گھنے، سرسبز سایہ دار پیڑوں کی
حسیں سرگوشیوں کے درمیاں سے عالم وارفتگی میں، رقص کے
انداز میں اٹھلا کے مستی سے نکلتی ہے
سنا ہے انتہائے گام پر ہر راہرو کی منتظر ہے اک شگفتہ منزل روشن '

میں اپنے جادوئی لمبے سفر پر جانے کب نکلا
جو میری رہ گذر تھی، سبز سایہ دار پیڑوں کی
جواں سرگوشیوں کے درمیاں سے، ٹھیک اسی انداز سے نکلی تھی
جیسے اجنبی راوی نے
اپنے پر کشش انداز میں مجھ کو بتایا تھا
میں اس پر چل کے آ پہنچا ہوں ایسے موڑ پر اب روبرو میرے عجب
ان دیکھا منظر ہے
نگہ اٹھتی ہے اور آخر جہاں تک پہنچ پاتی ہے
گڑے ہیں رہ گذر پر دھڑ ہزاروں اور لاکھوں، مرد و زن، پیرو
جواں، طفلان غنچہ رو
بریدہ جسم، چہرے منجمد، آنکھوں میں دہشت، بے بسی کی گنگ
تصویریں
مرے خوابوں کی عبرت ناک تعبیریں

سفر کی انتہا سے دور ہوں، لیکن
میں دھنستا جا رہا ہوں رفتہ رفتہ رہ گذر کی خاک میں
اب صرف
میرے جسم کا اوپر کا دھڑ باقی ہے باہر
اور میری آنکھیں
گریزاں روشنی کی ہم سفر آنکھیں

وہ رات ماہ صیام کی تھی

بلقیس ظفیر الحسن

شمارہ ۱۴۸،
دسمبر ۱۹۸۷ تا فروری ۱۹۸۸

وہ رات ماہ صیام کی تھی۔ وہ برأت و مغفرت کی شب تھی۔ وہ رات شنوائیوں کی شب تھی۔ بشیر احمد پرانی بستی کے مرد دانا، خدا رسیدہ بزرگ رو رو کے گڑ گڑا کے خدا سے یوں عرض کر رہے تھے، بلک بلک کے یہ کہہ رہے تھے۔ ''رحیم تو ہے، کریم تو ہے، خبیر تو ہے، علیم تو ہے۔ زمین کو طاقت نمو، آسماں کو تاروں سے چاند سورج سے زینتیں بخش دینے والے حکومتیں سب ترے لئے ہیں۔ تری رضا کے بغیر پتا بھی شاخ سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ کل شئی قدیر تو ہے۔ ترے صحیفوں میں درج ہے بجبجاتی مٹی سے خلق آدم کو کر کے اس کی جبین میں نور اپنا رکھا، فضیلتوں عظمتوں کی دستار سر پہ باندھی۔ خلافت دہر اس کو سونپی۔ بلاشبہ صاحب عطا ہے جلیل تو ہے۔'' بشیر احمد سسک سسک کر یہ کہہ رہے تھے، بتا مرے رب، مرے خدا اے مرے خدا، یہ اندھیرا پھر کیسے ہو رہا ہے۔ جبین آدم سے نور تیرا کہاں گیا، کیسے بجھ گیا ہے؟ کہ اب تو بس بجبجاتی مٹی کا ایک تودہ، سڑاند بن کر بجک رہا ہے۔ تفاوت نسل و رنگ و ملت، سیاستیں یہ بنام مذہب، کہاں ہے تہذیب اور شرافت؟ عفونتوں بدبوؤں کے بھبھکے چہار جانب سے اٹھ رہے ہیں۔ کہاں ہے جائے مفر؟ نہیں ہے! یہ چہرۂ بے بسی سے آنکھیں نکالنے والا تیز ناخن تری عطا کردہ طاقتوں کا امیں نہیں ہے۔ شفیق دھرتی میں بیج نفرت کے بو کے شعلوں کی فصل جو کاٹے جا رہا ہے، یہ صاحب شر بشر نہیں ہے۔ کہیں بھی جائے مفر نہیں ہے۔ یہ لجلجا بجبجاتی مٹی کا آفریدہ، غلیظ کیڑے کی طرح اپنی عفونتیں چاٹے جا رہا ہے۔ اسی کو تو نے نیابتیں اپنی سونپ دی تھیں؟'' بشیر احمد تڑپ تڑپ کے یہ کہہ رہے تھے۔ ''میں تیرے عفو و عطا کا طالب، تری جلالت کا معترف ہوں، تو احکم الحاکمین ہے منصب عدالت ترے لئے ہے۔ یہ رات برأت کی مغفرت کی ہے معافیاں دے مجھے غفور الرحیم تو ہے، مگر مرے ساتھ تو بھی اپنے کئے پہ کچھ شرمسار ہو جا۔''

وہ رات برأت کی تھی اور بشیر احمد گرے تھے سجدے میں گڑگڑاتے تھے سر پٹکتے تھے، رو رہے تھے اور ان کے حجرے سے بس ذرا دور لوگ اپنے پڑوسیوں کے گھروں پہ روغن چھڑک کے ماچس دکھا رہے تھے۔ لپکتے شعلے بڑی ہی سرعت سے ان کے حجرے کی سمت بڑھتے ہی آ رہے تھے۔

بلقیس ظفیر الحسن

شمارہ ۱۷۲،
جنوری ۱۹۹۴

''بی بی صاحب مرا آدمی... روز دارو چڑھا کے چلا آتا تھا
پیٹتا تھا مجھے
ایک پیسہ بھی اپنی کمائی کا مجھے... خرچنے کا دیتا نہیں تھا
ساتھ ایسے کے کیسے میں رہتی... اسے چھوڑ کر
گاؤں سے شہر میں آگئی
آپ جیسے بڑے لوگوں کے گھر میں اب... کام کرتی ہوں
اب اپنی محنت کا کھاتی ہوں میں
گھاؤ بن کر جو ماتھے سجے۔ ایسا سندور کس کام کا!''

بی بی صاحب مگر اب یہ دھنیا کو کیسے بتائیں کہ اس کی کہانی الگ کچھ نہیں ان کی بھی داستان
ہے۔ ایسا ہی کچھ نہ کچھ ان پہ بھی رات دن بیتتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ بی بی صاحب ہیں
اور وہ یہ... اور یہ حیثیت اپنے صاحب سے بخشش میں ان کو ملی
ہے۔ (جس کی اپنی کوئی شخصیت ہی نہ ہو، اس کو تو بخششوں پر ہی جینا پڑے گا)۔
''گھر میں رہ کے پتی کے جو سمان ملتا ہے، ناری کہیں جائے، کب
پائے گی۔'' اپنی پیشانی کا گھاؤ سہلا رہی ہیں۔ ''تجھ کو اپنا پتی چھوڑ
کر یوں نہیں آنا تھا۔'' وہ دھنیا کو سمجھا رہی تھیں...
اپنا سمان کیا چیز ہے، ان کو بے چاری دھنیا بتائے تو کیسے بتائے۔

غزل

بلقیس ظفیر الحسن

شمارہ ۲۱۲،
دسمبر ۱۹۹۷

جینا ہے خوب اوروں کی خاطر، جیا کرو
اک آدھ سانس خود بھی تو لیتے رہا کرو

کیا ہرج ہے جو دل کی بھی سن لو کبھی کبھی
یوں اپنے آپ سے نہ ہمیشہ لڑا کرو

یہ بار زیست جھیلتے رہنا ہے عمر بھر
اپنی تھکن پہ ٹک کے کبھی سولیا کرو

ہے بسکہ خاک اڑانے کی آوارگی کو خو
رخت سفر میں گھر کو بھی باندھے پھرا کرو

افعی بھی سو رہے ہیں چنبیلی کی چھاؤں میں
نو وارد چمن ہو سنبھل کر چلا کرو

کتنا کہا تھا تم سے کہ مت کھیلو آگ سے
اب جو سلگ پڑی ہے تو چپکے جلا کرو

اس تار تار جیب میں نکتا ہی کچھ نہیں
اب کیا رفو کرو اسے کتنا سیا کرو

گھبرا گئے ہیں روز بدلتی رتوں سے ہم
جھیلیں نہ اب کوئی سی بھی رت، یہ دعا کرو

اے وائے آگہی نہ رہی کوئی جستجو
پانا بھی کچھ نہیں ہے نہ کھونا تو کیا کرو

نظارگی کو کب ہے تجلی کی احتیاج
عالم تمام جلوہ ہے دیکھا کیا کرو

کب تک سنیں جنوں کی حکایات خونچکاں
بلقیس اپنے ہوش کی اب کچھ دوا کرو

---

(۱) جاتے ہیں کیسے کیسے کہیں چشم وا کرو (میر)

خدا کے لئے کچھ

بلقیس ظفیر الحسن

شمارہ ۲۱۸،
جولائی ۱۹۹۸

ذرا نہیں پٹتی ہے میری اس کی،
میری جان کے ساتھ لگا رہتا ہے وہ
چاہے کہیں بھی جاؤں اس سے بھاگ نہیں سکتی
وہ آگے پیچھے میرے منڈلاتا رہتا ہے
میرے ارادوں منصوبوں پر پانی پھیر کر اپنے ہونے
کا احساس دلانے کی عادت ہے اس کو
کوڑا کرکٹ ڈال کے راہیں بند کبھی کر دے سب میری
تلواروں کی دھار پہ ننگے پاؤں کبھی دوڑا دے
جلتی ریت کے صحراؤں میں مجھے پھرائے جھلسائے
اور کبھی تو میری جان کو بالکل ڈھا کے رکھ دے
اور جب میں ٹوٹ بکھر کر، زچ ہو کر تھک کر پڑ جاؤں
دھیرے دھیرے میری پلکیں نرمی سے
سہلائے۔ رکھ دے اپنے ہاتھ مرے زخموں پر
مسیحا لمسی کے ٹھنڈے پھاہے رکھے
نئی طرح سے مجھے اٹھا دے
دوست ہے یا ہے مرا حریف

نہیں مجھ کو معلوم مگر ہے... ہاں وہ ہے ہی
اپنے ٹوٹتے خوابوں میں دیکھا ہے اتنی بار اسے
میں کیسے اسے ان دیکھا کر دوں
ریت کے جلتے صحراؤں میں چھاؤں ببول کی دینے والا
کوئی اور نہیں ہے... وہ ہے
قدم قدم تلوار کی دھار پہ مجھ سے لگ کر چلنے والا،
کوئی اور نہیں ہے... وہ ہے،
گرنے سے ہر بار بچانے آنے والا
کوئی اور نہیں ہے... وہ ہے
ٹوٹی بکھری ذات کو میری نیا سراپا دینے والا
کوئی اور نہیں ہے... وہ ہے
میں جو اسے جانوں پہچانوں، کیسے اسے جھٹلا دوں
کیسے اس سے میں منکر ہو جاؤں
ہاں... منصوبے اور ارادے توڑ کے اپنے
ہونے کا احساس دلانے کی عادت سے
ہے مجبور... کرے کیا وہ بھی

بمل کرشن اشک

شمارہ ۹۴
فروری مارچ ۱۹۷۵

دھرم کھشیتر ے، کورو کھشیتر ے
عمل سے زیست بنے گی، خدا کہ جیبوں میں
کھنک رہا ہے، کہ ہولی کا رنگ مہنگا ہے،
دیوں کی قیمتیں بڑھتی رہی ہیں، مہماں کو
پیالہ کافی کا مہنگا پڑے گا، کافی سے
نہ زیست ماپو، مگر آج تک سیاست میں
رہا ہے عقل کا دارومدار پانی پر....

(اس نے کافی کے چند گھونٹ بھرے،
میرے زانو پہ ہاتھ رکھ کے کہا
پانچ پیسے، بہت نہیں ہوتے
جسم دیکھو، یہ رینگتے بچے
لہو پیتے رہے تو کیا ہوگا؟
سیہ تکون الٹ کر لبوں پہ سرخ ہوئی
اپنا گاندھاری سے تعلق کیا؟
پانچ پیسے، بہت نہیں ہوتے
پانچ... دو تین، اور دو بٹے تین
حقے سے شب بھر مذاق اڑاتے رہے،
شراب اوک سے پینے کا وقت آپہنچا
پیالے مہنگے ہوئے، روٹیاں سکڑنے لگیں
ستارے بڑھنے لگے، چار سگرٹوں کی جگہ
شب ہجراں میں تین سگرٹیں پیں،
چار آنسوؤں کی جگہ، شب ہجراں میں تین اشک بہا،
ڈیڑھ آرزو میں کٹ گئے، ڈیڑھ انتظار میں۔

اتنے سستے کہیں کشتیز نہیں ہیں،
ہم مرد توانا ہیں کوئی ہیز نہیں ہیں۔

(اس نے کافی کے تین گھونٹ بھرے،
جسم جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا،
جس کی قیمت میں بجٹ کے باعث
فرق بالکل نہ پڑا
جسم جامہ تھا کہ، جیسے کھدر...
سخت کھدر کی طرح
دھوئے سکڑے ہوئے کھدر کی طرح
اس کے چہرے پہ ندامت کا اثر باقی تھا)
سوال یہ ہے کہ دودھ آج میں پیوں نہ پیوں،
یہ خوب ہے کہ مرا جھریوں اٹا چہرہ
ندامتوں کے اثر کو قبول کرتا رہے،
کہ اپنے بچوں کے ہونٹوں سے دودھ کا کوزہ
جھپٹ کے چہرے سے احساس شرم دھو ڈالوں۔
میں ہیملٹ بھی نہیں،
میں مردمی کے تعاقب میں دودھ کا کوزہ
جھپٹ بھی سکتا ہوں
مگر وہ پانچ بدن جن کی نازکی کا سبب
ضمیر وقت ہوئی،
یہ آشیانہ بہت پائدار بھی تو نہیں
کہ شاخ نازک ہے،
یہ کارخانہ تو ہم کا کارخانہ ہے

اگر نہ ہوتے مرا اعتبار کافی تھا۔
(باپ ان کا مشت زن تھا
اور ماں امرد پرست،
یا پھر ان کا باپ تھا امرد پرست...
وہ فقط ان کے تخیل میں رہے،
زندگی کے بھاؤ سے لاعلم وہ ان کے تخیل میں رہے،
کتنے خوش قسمت تھے وہ ان کے تخیل میں رہے)

اگر نہ ہوتے مرا اعتبار کافی تھا،
ہے ہم سے آج بھی اجڑے دیار کی رونق
یہ جن کے سر پہ نہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا
انھیں سے آج ہے اجڑے دیار کی رونق۔

میری چندا جس کے چہرے پر بہت معصومیت تھی،
جب مجھے بن باس پر جانا پڑا
تا کہ میں ڈگری کے آگے آکسن (۱) بھی لکھ سکوں،
ہر کسی کا چاند بن کر رہ گئی،
اور میں آکسفورڈ کی گلیوں میں اک لڑکی کے سینے سے لگا،
جس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی،
اس نے مجھ پر علم دولت کے کئی گر آزمائے،
جب میں اپنے ملک لوٹا،
پاؤڈر کا بھاؤ دگنا ہو چکا تھا
ہوٹلوں میں کمرے کے ریٹ دگنے ہو چکے تھے،
اور چندا اور سلم ہونے کی خاطر
ڈائٹنگ تک آ چکی تھی
اور بلو فلموں، چرس کے بھاؤ دگنے ہو چکے تھے۔

فلم میں ایک السیشین ڈاگ (۲) نے
نارمنڈی (۳) کے توانا اسپ سے پوچھا، تمھارے ملک میں
کتیوں اور گھوڑیوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں،
اور چندانے نے مجھے،
سی۔او۔ڈی۔(۴) کا وہ ضمیمہ بھی دکھایا
جس میں فینی ہل (۵) سے ٹرا پک آف کینسر (۶) تک سبھی موجود تھا
فلم کے دی اینڈ (۷) پر جن گن نہ تھا،
ہم کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ تھے،
کیوں کہ ہم گھٹنوں کے بل چلتے نہ تھے،
اس لئے گرنا بھی بے معنی نہ تھا۔

اور ہر جانب شب عریانیت کے بھاؤ دگنے ہو چکے تھے۔

میں سگ ناداں کی صورت ایسے کچھ احباب کے زمرے میں تھا
جن کو احمد شاہ کے مضمون کا احساس ہو۔

ایک عورت جس کے چہرے پر بلا کا درد تھا،
اپنا بلاؤز یوں ہوا میں پھینکتی تھی
جیسے وہ گم سم فضا میں میری نظروں کی طرح
ایک لمحے میں معلق ہو رہے گا

بریزئر کے بند ڈھیلے پڑ چکے تھے،
اور زپ اپنی جگہ سے دھیرے دھیرے ہٹ رہا تھا
اور اک عورت ہتھیلی اپنی آنکھوں پہ ٹکائے رو رہی تھی،
اور چندا نے اشارے سے مجھے کمرے کا دروازہ بجھایا
جس میں دو لڑکے سریلسٹک کی اک تصویر کا خاکہ بنے تھے،
میری چندا میری خاطر، میرے ٹھنڈے جسم کی خاطر برسوں سے انگلیوں تک
میری وحشت کو جگانا چاہتی تھی،
اور مرے چہرے،
مرے چہرے پر ندامت کے کئی آثار تھے
میرے چہرے پر ندامت کے کئی آثار تھے اور شام کا کھانا
لبوں تک لوٹ کر پھر آ چکا تھا،
میرے چہرے پر ندامت کے کئی آثار تھے...

میرے چہرے پر ندامت کے کئی آثار تھے
اور شام کا کھانا لبوں پر لوٹ کر پھر آ چکا تھا،
میرے چہرے پر ندامت کے کئی آثار تھے،
اس لئے ہم اپنی وحشت کے ادھورے شوق کو تکمیل دینے کے لئے،
کمرے کی پھیکی نیلی روشنی میں چھپ گئے۔

ایک دو...ایک دو
کمرے کی پھیکی نیلی روشنی
دھم دھمادھم...تھپ تھپاتھپ...دھم دھما
نظریں، چہرے، ناف، گردن چپک کر رہ گئیں،
اک نظر کے واسطے اک لکس کی ٹکیا بہت ہے،
اور ان نظروں کے نیچے جسم ہے
بریزئر، انڈرویر...اک بریزئر، انڈرویر چھ اور
ان سب کے تلے اک جسم، ننگا جسم ہے،
جسم ننگا جسم...اک دو.....ایک دو
ایک دو،
ماں سمجھتی ہے میں ہوں اک ٹائپسٹ
باپ اور خاوند دونوں...ایک دو...
باپ اور خاوند دونوں سو چکے ہیں...ایک دو...
سو چکے ہیں، ہاں منوں مٹی کے نیچے سو چکے ہیں...ایک دو...
تین من کی لاش کرسی میں دھنسی ہے
ہاؤ ڈو یو ڈو...ذرا نیچے جھکو...اک قہقہہ
قہقہے کی تہ میں نفرت کی کنی...کیسے ہو پیارے؟
پیٹھ کے نیچے سرکتے ہاتھ اور برفاب جسم،
جسم، جس میں سرسراہٹ مر چکی ہے، ایک دو...
باپ اور خاوند دونوں مر چکے ہیں...ایک دو....
مینکا جوزف ادھر بھی کھڑی ہے اور جوزف مر چکا ہے،
مینکا جوزف کی فیس
ماں کی آنکھوں کی دوائی ..ایک دو...

ایک دو تین...ایک دو
برا گئی، اور مینکا جوزف کی خاطر یہ نکیلی چھاتیاں
سب کے لئے ہیں
چھاتیاں سب کے لئے ہیں، یہ ہوس اور دودھ سے پر چھاتیاں
سب کے لئے ہیں، سب کی نظروں کے لئے ہیں، ایک دو...
(جاؤں اور ان چھاتیوں کو چوم لوں،
اور میرا ہاتھ چندا کے بدن پر گھومتا ہے،
اور میرا جسم .. اس کے ہاتھ .. خواہش اور ہاتھ)

اور یہ انڈرویر یہ دوسرا انڈرویر

(تیسرا انڈرویر میں اپنے ہاتھ سے اتاروں
اور میرا ہاتھ چندا کے بدن پر گھومتا ہے،
اور میرا جسم....اس کے ہاتھ...خواہش اور ہاتھ)

جسم کی حرکت کہ جیسے میرا جوزف اب بھی میرے ساتھ ہو
جیسے وہ اس فرش پر ہو،
جس طرح اس کا بدن، ننگا بدن اس فرش پر ہو....ایک دو ...
اس طرح مت جاگ ورنہ ہر نظر،
ناف کے نیچے چپک جائے گی، اک دو...ایک دو...
اور یہ انڈرویر آنکھوں پہ چپکا دوں مگر

مینکا کی فیس، امی کی دوائی...ایک دو...
آخری انڈرویر رکھا بھی کیا ہے،
جسم میں رکھا بھی کیا ہے،
یہ تو اس کا جسم تھا اس جسم میں رکھا بھی کیا ہے...ایک دو...
تالیاں...اکزٹ (خدارا ..بس خدارا...
ہاتھ کا رومال...چندا بس خدارا...
آؤ چندا کار تک مجھ کو لوا لے جائے چندا،
یہ تمھارے دوست ہیں، گھر تک چلیں...

ایک بوتل سکاچ لے کر آیئے گھر تک چلیں...
اور وہ میں ہوں...)

۲

مس رضا نے پچھلے ہفتے جنسیاتی لطف پر اک پمفلٹ شائع کیا
جس کی قیمت ڈھائی آنے تھی، دوواہت عورتوں کو،
چارپائی پر طوائف کا سلیقہ چاہئے، اعصاب پر...
اس کے اعصاب پر آدم ہے سوار

لومڑی نے کل جواہر روڈ پر اک ننھے منے مرد کو
جس کی گردن پر خراشوں کے نشاں تھے،
تھری کاسل (۸) کے نئے کارٹن
(عین کا اعلان جائز نہیں ہے)
مس رضا سے پانچ سو مردوں نے پوچھا ہے کہ اس کا جنسیاتی
پمفلٹ
ناتجربہ کاری پر مبنی تو نہیں ہے
مس رضا نے کل جواہر روڈ پر بنگلہ کرائے پر لیا ہے
اور اپنے پمفلٹ کے بھاؤ دگنے کر دیئے ہیں

ڈاکٹر مس روز کلینک میں جواہر روڈ پر کل شام کو
ایک لکچر دے رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے گر رہا ہے،
جنسیاتی لطف کا ماضی، بدن سے دھیرے دھیرے گر رہا ہے،
ناخنوں کی نیل پالش پر خراشیں بڑھ رہی ہیں،
جنسیاتی پمفلٹ کا بھاؤ دگنا ہو رہا ہے
مس رضا مسز قمر رومان کے قصے اپر سوسائٹی میں
قیمتوں کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں
یوزمی (۹) کی اہمیت کم ہو رہی ہے،
عین ممکن ہے کہ اگلے پانچ برسوں میں کوئی دو دو کا پہاڑا پڑھ سکے
گھر کی آبادی سے لے کر پمفلٹ کے بھاؤ تک دو دو کا پہاڑا پڑھ
سکے....
[اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا، مسز روزی، مسز ورمابدن کو مشتہر کرتی
پھریں

باسٹرڈز
آٹھ ہفتے کی مسلسل چھٹیاں لیتی رہیں،
اور میں اس جنسیاتی لطف کی خاطر جواہر روڈ پر جو یوزمی ہے
اس کا منہ تکتی رہوں
درمیاں تک چیونٹیاں سی رینگتی ہیں،
پھر بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی ہیں،
کون ایک چمڑے کے ٹکڑے سے تعلق جوڑ کر
(مس رضا کا پمفلٹ بے حرمتی کی آخری منزل پہ لانا چاہتا ہے)
جھنجھلا کر جسم کو رسوا کرے۔

جو وہ نہ ہوگا تو آئینہ آنکھ مارے گا،
اس کے ایسی موم بتی پھینک دوں،
رات کتنی مختصر ہے،
ہیگ (۱۰) کی بوتل، تھری کاسل کا ڈبہ منتظر ہیں،
ہاں فرائڈ کے یہ سمبل منتظر ہیں،
یوزمی تک منتظر ہیں،
ایس۔ ڈی۔ سوزا آ کہ بھوری چیونٹیاں
یوزمی تک منتظر ہیں]

۳

یوں تو وہ عورت تھی لیکن
اس کے لہجے میں تحکم تھا، زباں پر انفرادی گالیاں
گالیاں جو جنسیاتی بنتے بنتے رہ گئیں۔
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا،
ایسا لگتا تھا ڈبل بیرل (۱۱) لئے،

وہ میری جانب لپکتی آ رہی ہے،
لمبے لمبے ناخنوں کے ان نشانوں کا بدل کوئی نہیں
میری گردن سے یہ لپ اسٹک کس سے اترے تو اترے
جسم پر نوکیلے دانتوں کے نشاں دکھنے لگے ہیں،
آٹھ ہفتے کہیں تعطیل نہ لینی پڑ جائے۔

اس میں، مجھ میں فرق کیا ہے
کیا میں بس اک یوٹرس (۱۱) ہوں، اووری (۱۲) ہوں،
اس کے بالوں میں اگر میں دائٹ گوتھوں تو وہ کیسا لگے گا،
ناخنوں، دانتوں سے اس کو نوچ لوں، زخمی کروں تو!
ٹاپ لیس وہ اور میں دونوں ہوں تو بس ایک مجھ کو شرم آنی چاہیے

میں فقط ایک یوٹرس ہوں اووری ہوں،
مجھے کچھ اور بھی دے،
میری تکمیل کی خاطر مجھے کچھ اور بھی دے۔

۴

لذت ان میں ہے جو میرے اور اس کے جسم کا حصہ نہیں ہیں،
اور جو میرے اور اس کے جسم کا حصہ بھی ہیں،
مجھ پہ میرا بس نہیں ہے،
جب تلک جسموں کے ہوٹل وا ہیں، دستر خوان سجتے ہیں،
زباں پر ذائقہ کی حس ہے قیمت پر نہ جا،
جاگ جا،
احتراماً، احتیاطاً جاگ جا،
جن کو میں چھوؤں، جنھیں کاٹوں، وہ حصے میرے ہاتھوں،
میرے دانتوں کے قریں کر دے کہ لمحہ جاوداں ہے،

لمحہ لمحہ جاوداں ہے، مجھ پہ میرا بس نہیں ہے،
لمحے کو مٹھی میں بھر کے بھینچ لے،
لمحے کو دانتوں میں لے کے کٹکٹا،
لمحے کو ہونٹوں سے پی
اس طرح.....زخمہ نہ ہو

لطف کو تخلیق کی وحشت سے بیگانہ کریں
ایک لمحہ ثبت ہونٹوں، گردنوں، گالوں پہ ہے،
ظلم کی چٹکی میں یہ لمحہ مسل دیں،
چند لمحے اپنے کپڑوں کے تلے محصور ہیں آزاد کر دیں،
لطف کی راہوں میں، لذت کے سفر میں شرم کیسی،
جاگ جا منزل ہمیں ایک ساتھ ملنی چاہیے،
جاگ بھی جا مجھ پہ میرا بس نہیں
ان گنت صدیوں کی زنجیروں کے حلقے توڑ دے،
روح اور حسن و حیا کی بیڑیوں کو توڑ کر،
اک جسم بن جا، عشق بن جا، آبرو کو قتل کر دے،
آنکھ میں جو لال ڈورے ہیں، گلے میں جو صدائیں ہیں،
بدن میں جتنی حرکت، اسے آزاد کر دے،
مجھ پہ قابو پا کر میرا مجھ پہ کچھ قابو نہیں ہے
جاگ جا

جاگنا آساں نہیں ہے،
بھولنا آساں نہیں ہے،
جانور بننا بہت آساں نہیں ہے،
بتیاں گل ہیں مگر اخبار کی سرخی میں ہاکر کی صدا پیوست ہے،
دل کی دھڑکن، نبض کی حرکت، مثالی قیمتوں پر منحصر ہے،

لذت اس میں ہے جو میرے اور تیرے جسم کا حصہ نہیں ہے
اور جو تیرے اور میرے جسم کا حصہ بھی ہے،
مجھ پہ میرا بس ہے لیکن جسم کے ہوٹل میں دستر خوان سجتے ہیں
تو ٹپ بھی مانگتا ہے،
بیرا ٹپ بھی مانگتا ہے جاگنا آساں نہیں ہے۔
تیرے ہاتھوں، تیرے دانتوں کے قریں ہیں،

سب وہ حصے جن میں حس لذت کی ہے وہ تیرے ہاتھوں کے قریں
ہیں
تیرے دانتوں کے قریں ہیں، تجھ پہ تیرا بس نہیں ہے،

لمحہ ہونٹوں میں ہے، دانتوں میں ہے، ہاتھوں میں ہے لیکن
لمحہ کیوں تخلیق سے بیگانہ ہوگا،
اور اب اس جسم میں تخلیق کی ہمت نہیں ہے،

اسکول کے ٹیچر سے ٹیلر ماسٹر تک،
دودھ سے آلو مٹر تک،
ٹافیوں سے رکشا، لوکل کے سفر تک،
ٹیکس کے دفتر سے گھر تک
ریٹ بڑھتے جا رہے ہیں،
مجھ پہ میرا بس ہے لیکن تجھ پہ تیرا اور بڑھتے ریٹ کا قابو نہیں
ہے

تو بہت مجبور ہے،
قیمتیں اور میں بہت مجبور ہیں
ہم سبھی مجبور ہیں اور جاگنا آساں نہیں ہے

۵

ادب تک گونج ماضی کی
میں مذہب، جنس، قیمت، ہے سچ ہوں گونج ماضی کی
جوئے، دھرت راشٹر سے مچھلی تک میں دروپدی ہوں
اور میں کورو کشیتر سے مکے تلک انساں ہوں، ارجن ہوں میں، ایمان
ہوں،
میں گونج ماضی کی، ادب تک گونج ماضی کی،
میں سے ہوں جس کا کیلنڈر، گھڑی سے دور کا رشتہ نہیں جو
لاشعوری موج کی مانند جان، برگساں ہے، آئنسٹائن، ڈارون
ہے،
فرائڈ ہے ایڈلر ہے،
بس اک خود نہیں ہے،
میں کہ مریم، کلاڈیس (۱۲)، ہیملٹ، یدھشٹر، ابن مریم
اور دریودھن، دشاسن، دروپدی ہوں،
خود سے کہتا ہوں اگر میں ابن مریم ہوں تو کیا ہے
مجھ سے اس دکھ کی دوا ممکن نہیں ہے، میرا مولا
اب مدینے سے صدا دیتا نہیں
اور میں ان سب سے تھک کے آج پھر اک موت مرنا چاہتا ہوں۔
موت جس کے بعد مجھ کو چین آئے،
اور کہاں جائیں گے؟ کا ڈر ختم ہو۔

لے یہ قربانی، مری عصمت کی، میرے حافظے کی
تا کہ چہرہ اور بدن واضح رہیں...

انبالے کا جوڑ کر کیا تو نے ہم نشیں،
گل زمانی اور رانی مسکرا کر گھل گئیں،
اور اتنا جاننا مشکل ہوا،
ہونٹ کس کے چھاتیاں کس کی ہیں،
ڈولی کون چڑھتا ہے، کہانی کون گھڑتا ہے

گل زمانی مال چرنے کی
گل زمانی پیاس کی خاطر... دروناچاریہ، تیروں کا بستر، مال چرنے
کی
رانی..... میرا کرشن..... جس کا دوسرا کوئی نہیں
رانی گردھر ناگروں تک مال چرنے کی،
گل زمانی مال چرنے کی

رانی... جے جگدیش... بھارت بھاگیہ... راما... مال
چرنے کی،
گل زمانی..... میرے مولا... لڑ کے لیں گے..... مال چرنے کی

مذہبوں میں بیر کیسا، مذہبوں میں ایک قدر مشترک ہے.... مال
چرنے کی
پیارا ہندوستان، میرا پیارا ہندوستان.... لڑ کے لیں گے ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
میرا امنا اور وہ خالی مکان..... آئینہ پر چھائیں تک...
احمد آبادوں سے لے کر میرے انبالے تلک
میرا پیغام محبت نہ کہیں تک پہنچا....

ساتویں در سے وہ آواز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز،
گل زمانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور،
نوجوانی مال چرنے کی
گل زمانی ہو کہ رانی مال چرنے کی

میرے پاگل پن کی کیا تعریف ہے؟
کب سے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قید ہوں۔

ننھے قاصد مر چکے اب کھول دو کہنا بہت ہے
ہائے وہ عطار کا لونڈا کہاں ہے؟
عشق کے کم خرچ ہونے پر تعجب کس لئے۔

میں اوفیلیا (۱۳)، ریڈ لائٹ ایریا کی روشنی،
ریڈ لائٹ ایریا... جنت... پری زادہ نہیں میں
رات بھر لیتی ہے مجھ سے انتقام

کس ادب کو آدمی پورا ملا ہے،
یہ تو میرا اسین کی دنیا ہے، لیکن رات بھر
زندگی لیتی ہے مجھ سے انتقام
میں نہ ڈولی چڑھ سکی، کس باپ کو آواز دیتی،
میرا ٹب جو ہڑ نہیں ہے اور مرا ننگا بدن سلگنے کی لو تک بجھ
چکا ہے،
اس بدن کا جاگنا ممنوع ہے۔

میں دھتورے کا نشہ اس شہر میں
نام کے نشے سے کچھ بڑھ کر ملے گا
نام کا نشہ یہاں مفقود ہے، ممنوع ہے
کیوں کہ اس کا نام کے اور کاشی سے نکل کر
سرسراتا ہے دماغی مشت زن کی جیب میں،
اب غم دل، وحشت دل کیا کرے،
جب دماغی مشت زن کی جیب میں آباد کھنکے، سرسرائے،
کھول دے،
کھول رکھے مرغ جب تک چونچ میں سورج چبائے،
صبح سے جب تک ثبوت حق مہیا ہو بدن کو کھول رکھے،
صبح جب گھڑیاں کرتا ہو منادی جسم کو
کراس سے آواز دے کر کھینچ لے۔

بھوک لگتی ہے تو پیٹوں سے دھواں اٹھتا ہے،
ورنہ یہ بوجھ یہ ہکلائے ہوئے مرد کا بوجھ
بودے جسموں نے کہاں اٹھتا ہے

میں اوفیلیا اور میرا باپ پردے اوڑھ کر یوں مر گیا
جیسے وہ مارا گیا ہو،
اور میں ہیملٹ کہ میرا باپ تنہا باغ میں سویا رہا اور مر گیا،
جیسے وہ مارا گیا ہو۔

اور میں اب باپ کے اندھے تجسس میں رواں ہوں،
ریل کا بس کا کرایہ بڑھ رہا ہے اور میں اندھے سفر میں مبتلا ہوں،
میری قیمت بڑھ رہی ہے اور میں اندھے سفر میں مبتلا ہوں۔

آنکھ کی پٹی کو قدرے اونچا کر کے تخت سے دھرت راشٹر
نے،
(سن کہ جب دھرت راشٹر گاندھاری ہوا)

دروپدی کی سمت دیکھا،
اور جب ساری کی انگلی تہ کھلی،
اس کا بوڑھا ہاتھ کانپا۔

اور یوسف دیر سے اندھے کنوئیں میں قید ہے،
مصر کے بازار ویران ہو چکے ہیں،
اور زنانِ مصر سے
ریڈ لائٹ ایریا کی روشنی میں،
رات بھر لیتی ہے دنیا انتقام
زندگی جیسے کہ اک اندھی
ریڈ لائٹ ایریا کی روشنی اک زخمِ تر کی کھوج میں،
سارے بدن پر گھومتی ہے
اور ہر اک زخم اپنی ٹھیک قیمت مانگتا ہے۔

آنسوؤں کی بھیڑ آنکھوں سے رواں ہے
اور میلہ ایک دھرتی کی طرح یوں گھومتا ہے،
جیسے سپنوں کی دکاں دن میں کھلے گی،
پھر کوئی بارات آئے گی مگر
بینڈ والے کان کے نزدیک آ کر
پھر کسی مجروح کی ساحر کی قیمت مانگ لیں گے۔

روشنی آنکھوں کو اندھا دیکھ کر
بلب کی صورت جلے گی... دولتاس
آج کل ہڑتال پر ہیں، اور لطفِ شب دمکتی روشنی پر منحصر ہے
اب اندھیرے روشنی میں جاوداں ہیں،
پھر پتنگا شمع تک جائے گا لیکن لوٹ کر بھی آئے گا،
میر کی آنکھوں سے دیواریں نہ دیکھو
ورنہ چہرے، غم زدہ چہرے تمھیں ڈھونڈا کریں گے

گل کی خوشبو کتنی سنتھیٹک (۱۴) ہوئی ہے۔

ہونٹھ مت کھولو کہ اک گندم کا دانہ
ان گنت حوائیں رسوا کر چکا ہے۔

داشک پچھلی جنوری کی تیرہویں کو گیہوں اٹھارہ روپے تھا،
آج کل چھتیس ہے
تھو کنے کا مال پر اس سال جرمانہ وہی ہے

داشک پچھلی جنوری کی تیرہویں کو میں نے اس کے جنم دن پر
ایک ساری بھینٹ کی تھی
اور اس نے مجھ کو اپنے ساتھ ساری رات تک سونے
دیا تھا۔
اب کے میں آدھی ہی ساری لا سکوں گا

...کوئی بلاؤز، کوئی اسکرٹ...
اور نچلے ہونٹ پر لپ سٹک لگا کر،
اور ساری کی بجائے سکرٹ کا کونا اٹھا کر
ساتھ میرے ساتھ آدھی رات تک سوئی رہے گی...
(شکر ہے،
تھو کنے کا مال پر اس سال جرمانہ وہی ہے)

اور یہ دو تین زخم....
دوسرے ایڈورڈ (۱۵) نے بلڈاگ گیوسٹن کی خاطر
کوئین کو ٹھکرا دیا۔

آسکر وائلڈ کتنے سال ریڈنگ جیل (۱۶) میں ٹھہرا رہا
ڈبلو۔ایچ۔(۱۷) ایکٹر تھا جس میں وائلا (۱۸) تھی، ڈیسڈیمونا (۱۹)،
جولیٹ تھی

ہرکولیس، ٹلی (۲۰)، سکندر، ایسکلس، (۲۱)
اور سیفو،
ریڈ لائٹ ایریا کی روشنی... تخلیق پر دکھ منحصر ہے

پانچ پیسوں میں اگر تعلیم، شادی، نوکری سب ہو سکے تو ٹھیک ہے،
ورنہ سن اے ریڈ لائٹ ایریا کی روشنی،
زخم تر کو زخم بدبودار کو پیکوں کے نیچے چھوڑ دے،
اور گیوسٹن، اسپنسر، ہائلا سوں کو تلاش،
دروپدی، دھرت راشٹر، دونوں مجھ میں ہیں...
ہکسلے (۲۲) کے ساتھ میرانڈا (۲۳) کا دم بھرتے رہیں...
خوب صورت اور نیا عالم کہیں ہوگا ضرور
جستجو کرتے رہیں

خوب تو کمیاب ہے،
خوب تر کی جستجو کرتے رہیں،
خوب تر کی جستجو اندھے سفر میں مبتلا کرتے رہیں،

باپ اے میرے مقدس باپ
آسمانوں سے اتار
اپنی جنت آسمانوں سے اتار،
چاہے اس میں شہد کی نہریں ہوں یا جوے شراب
یا کسی چورن کا ڈھیر،
چاہے اس میں حور ہو، غلمان ہوں، تو اپنی جنت آسمانوں سے اتار
ایسی جنت جس میں کپڑوں کی ضرورت ہی نہ ہو،
اشتہا کا پیڑ ہو جس میں نہ شہوت کا درخت،
اور جہاں تیرے علاوہ باپ ہو کوئی نہ ماں...

آسمانوں سے اتار... آمین.... اونچے آسمانوں سے اتار
ورنہ ہم جو چاند کی بے جان دھرتی تک پہنچ سکتے ہیں ان کے واسطے
تیری جنت ڈھونڈ لینا غیر ممکن تو نہیں

حواشی

(۱) Oxon یہ مخفف ہے Oxonian کا یعنی آکسفورڈ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا۔
(۲) Alsatian Dog یعنی جرمن قوم کا
(۳) Norman یعنی فرانسیسی
(۴) Concise Oxford Dictionary، یہ حوالہ طنزیہ اور مزاحیہ ہے۔
(۵) Fanny Hill انیسویں صدی کا مشہور انگریزی ناول جس کی شہرت اس کی فحاشی کی بنا پر ہے، مصنف John Cleland
(۶) Tropic of Cancer امریکی مصنف ہنری ملر کا خود سوانحی ناول جس کی بھی شہرت زیادہ تر اس کی فحاشی کے باعث ہے۔
(۷) The End
(۸) مشہور سگریٹ Three Castles
(۹) Use Me
(۱۰) وہسکی کی مشہور برانڈ John Haig
(۱۱) Double Barrell
(۱۲) Claudius، شیکسپیئر کے ڈرامے ہملٹ میں ہملٹ کی معشوقہ اوفیلیا کا باپ، ہملٹ اسے پردے کے پیچھے سے مار ڈالتا ہے۔
(۱۳) Ophelia
(۱۴) Synthetic
(۱۵) انگریز بادشاہ ایڈورڈ دوئم جس میں ہم جنسی کے رجحانات تھے اور اسی بنا پر اس کا بہت بہیمانہ قتل ہوا۔ گیوسٹن Gaveston اس کا منظور نظر تھا جسے اس نے جلاوطنی سے واپس بلا لیا تھا۔
(۱۶) Reading، ایک مقام جہاں کے جیل خانے میں آسکر وائلڈ قید کیا گیا تھا۔
(۱۷) W. H.، شیکسپیئر نے اپنے سانیٹ اس کے نام معنون کیے ہیں۔ اس کی شخصیت پردۂ راز میں ہے۔ بعض لوگ اسے شیکسپیئر کا دوست اور کوئی اداکار بتاتے ہیں۔
(۱۸) Viola، شیکسپیئر کے ڈرامے As You Like It کی ہیروئن۔
(۱۹) Desdemona، شیکسپیئر کے ڈرامے اوتھیلو کی ہیروئن۔
(۲۰) رومن مورخ (Tully, 106 BC-43BC) جو سسرو (Cicero) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔
(۲۱) مشہور یونانی ڈراما نگار (Aeschylus, 525BC 456BC)
(۲۲) انگریز نقاد اور ناول نگار Aldous Huxley
(۲۳) Miranda، شیکسپیئر کے ڈرامے The Tempest کی ہیروئن۔

بمل کرشن اشک

شمارہ ۱۳۶،
جنوری تا مارچ ۱۹۸۵

اپنے ہاتوں گدگدی ہوتی نہیں ہے
آؤ میں تم کو نہلا دوں
تم کو کیا معلوم میری انگلیوں میں کیسی کیسی لال نیلی، کالی پیلی لذتیں ہیں
جس جگہ چھو جائیں گی شعلہ سا لپکے گا، ہر اک شعلے کا اپنا رنگ ہوگا
دھیرے دھیرے یوں لبادہ جسم سے اترے گا جیسے دھیرے دھیرے صبح کا سورج چکاچوند آنکھ کو کرتا ہے، جیسے
دھیرے دھیرے بادلوں کو چیر کر سورج نکل آتا ہے، جیسے
دھیرے سارا عالم روشنی میں جھلملا اٹھتا ہے، جیسے
اک سیہ کمرے میں روشن ظرف یادیں دھیرے دھیرے جاگتی ہیں

میرے ہاتوں سے وہی بیسن جہاں لگ جائے گا تابندگی اگنے لگے گی
چھاتیاں آنکھیں اٹھائیں گی کہ جیسے انگلیوں کا لمس ناکافی رہا ہو
زانوؤں کو چھو کے ٹھنڈی دھار پانی کی سلگ اٹھے گی، ہر ذرہ سفر کی داستاں مجھ سے کہے گا
سیٹیاں سی جسم میں بجنے لگیں گی، یوں گلے سے لذتیں آواز دیں گی جیسے سو صدیوں سے مجھ کو جانتی ہوں
جسم اندر تک نہا جائے گا ورنہ آدھے سوکھے آدھے گیلے بال جھٹکاتی پھروگی۔

آؤ اس ہٹ بیجنے کی جلبلی چنگاریوں سے آگ پانی میں لگا دوں
آؤ میرے ساتھ آؤ میں تمھیں ہاتوں سے مل مل کے نہلا دوں

بمل کرشن اشک

شمارہ ۱۳۶،
جنوری تا مارچ ۱۹۸۵

جی یہ کرتا ہے کہ کل جو نظم لکھی تھی اسے دوبارہ لکھیں
عین ممکن ہے کہ اس کے جسم کا کوئی دریچہ وا نہ ہو پایا ہو، اس کے جسم پر کوئی لبادہ رہ گیا ہو،
عین ممکن ہے کہ میں تہذیب کے پردے میں وہ کچھ کہہ گیا ہوں جس کے معنی اس پہ واضح ہو نہ پائیں
عین ممکن ہے کہ اس کے لمس کی لذت کہیں الفاظ میں گم ہو گئی ہو
عین ممکن ہے کہ لب کا زانوؤں کا ذائقہ یک طرفہ ہو کر رہ گیا ہو
عین ممکن ہے نظر لمحے دو لمحے کے لئے آوارہ ہو کر رہ گئی ہو
عین ممکن ہے علامت نے بدن کی روشنی کو ڈھک دیا ہو
عین ممکن ہے کہ کچھ کہنے کو باقی رہ گیا ہو
اس لئے دوبارہ کچھ جسموں کی، کچھ آئینوں، کچھ جھلمل دیوں کی روشنی میں
کل کی لکھی نظم کو دوبارہ لکھوں

بیدار بخت

شمارہ۲۶۹،
جون ۲۰۰۳

میرے گملے میں ایک پیڑ — ۱

بند مکاں کے اک گوشے میں ایک شگفتہ پیڑ کھڑا ہے
تنہائی میں اس کی میری اکثر باتیں ہوتی ہیں...

ایک صبح سویرے دھوپ میں اس کی ہر پتی جگمگ کرتی تھی
میں نے اس سے رشک میں پوچھا:
جانتے ہو، تم کتنے قسمت والے ہو؟
آندھی، پالے، دکھ، بیماری سب سے تو محفوظ ہو تم
وقت ضرورت تم کو پانی کھانا سب مل جاتا ہے
مفت کی توڑا کرتے ہو
تم کتنے قسمت والے ہو

پیڑ ہنسا اس بات پہ میری
اور بہت حیران ہوا۔
بولا: تم بھی میری محرومی سے ناواقف ہو؟
ان شیشوں کے پار ہوا کی اٹکھیلیاں دیکھ کے
میرے جسم کی ہر ہر پور چٹخنے لگتی ہے
میری شاخیں شوخ پرندوں کو چھونے کو
رات اور دن ترسا کرتی ہیں
باہر کے پیڑوں کو دیکھو
ان میں چڑیاں گھر کرتی ہیں
اور مسافر چھاؤں میں ان کی
دم لیتے ہیں
میں تو بس اچھا لگتا ہوں

میرے گملے میں ایک پیڑ — ۲

بند گھر کے سن رسیدہ پیڑ نے مجھ سے کہا
تیری قید اب مجھ کو راس آتی نہیں
تیری چھت ہی تک فقط محدود ہے قامت مری
اب مری مغرور شاخیں بید مجنوں کی طرح ہیں سرنگوں
تن خمیدہ، اب میں تیرے گھر کی زینت بھی نہیں
فرش پر تیرے تو میں اک بوجھ ہوں
سن مری فریاد سن
میرا دم گھٹتا ہے تیرے گھر میں اب
اس جہاں رنگ و بو سے یا مجھے آزاد کر
یا کسی ایسی جگہ لے جا
جہاں میرا کوئی مصرف نہ ہو

پرتپال سنگھ بیتاب

شمارہ ۱۰۳،
مارچ اپریل ۱۹۷۷

(ا)

ہمارے درمیان فاصلوں کی دوڑ دھوپ ہے
مگر قدم قدم ملا کے چل رہے ہیں
اور یہ بھی جانتے ہیں
ہم بھی
کہ
یہ عمل کہیں بھی فطرتاً نہیں ہے
کاوشوں کے
ضابطوں کے
باوجود
جو قدم ملے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں
وہ سراب ہیں

(ب)

ہم تو،
اندھی گھاٹیوں سے،
آئے تھے سمندروں کو چھینے
مگر یہاں جواہرات دیکھ کر
سمیٹنے میں جٹ گئے ہیں

(پ)

پتھروں کا قافلہ چلا تو کس کو علم تھا
کہ راستوں کا منزلوں سے رابطہ ہے
واسطہ ہے
یا تو اتفاق ہے
کہ آئینوں کا شہر راستے میں پڑ گیا ہے

(ت)

ہمارے بعد جو بھی آئے گا
ہمارا حشر اس کے واسطے
حیات کی کتاب کا ورق ہے وہ
کہ جس کو ایک منچلا امیدوار
امتحاں کے ہال میں تو لے گیا
مگر
سوال ہی نہ تھا وہ امتحاں میں
جس کا وہ جواب تھا

پرتپال سنگھ بیتاب

شمارہ ۱۱۴،
دسمبر ۱۹۷۹ تا مارچ ۱۹۸۰

آخرش اس بے جہت دریا میں بہ جانا پڑا
ہار کر سونے کی زنجیروں کو اپنانا پڑا

اک گھنے جنگل کی جانب دوڑتے جاتے تھے لوگ
ایک دن تو بھیڑ میں ہم کو بھی کھو جانا پڑا

ہٹ کے چلنے میں لطافت تھی مگر کیا کیجئے
زیست جو کرنا تھی آخر راہ پر آنا پڑا

سچ سے تو ممکن نہیں تھا ان سوالوں کا جواب
جھوٹ کیا کیا کہہ کے اس بچے کو بہلانا پڑا

ہم کہ گنتے تھے کبھی باہر سے یہ لمبی قطار
حادثہ یہ بھی ہوا اب خود کو گنوانا پڑا

ہر طرف آسیب نے جب اپنے پر پھیلا دئے
اور کچھ چارہ نہیں تھا گھر کو ٹھکرانا پڑا

سب مناظر برف باری کی خنک زد میں جو تھے
رات بھر اس کہنہ یخ بستر کو گرمانا پڑا

ساعتیں بے تاب جس خستہ دریچے ہو گئیں
کورا کاغذ گھر کی دیواروں پہ چپکانا پڑا

شمارہ ۱۳۵،
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴

سرخ بتی جل رہی ہے
اور گھوڑے دوڑتے ہیں
فائلوں میں شور بڑھتا جا رہا ہے
میرے اندر سے وہی آواز
پھر آنے لگی ہے
سوچتا ہوں پھاند جاؤں
ایک لمحے کے لئے...
سارے سفر کے سلسلوں کو بھول کر
خود میں اتر جاؤں
مگر...

یہ...
سرخ بتی جل رہی ہے
اور گھوڑے دوڑتے ہیں
فائلوں میں شور

پرتپال سنگھ بیتاب

شمارہ ۲۹۱
اپریل ۲۰۰۵

ناگ دیوتا، تم نے مجھے کیوں ڈسا؟
میں تو تمھاری پوجا کرتا تھا
تمھیں دودھ پلاتا تھا
میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا
کہ تم میرے ساتھ ایسا کرو گے
حالانکہ کئی لوگ وقتاً فوقتاً
مجھے تاکید کرتے رہے
کہ سانپ آخر سانپ ہے
جتنا مرضی دودھ پلاؤ
یہ زہر ہی اگلے گا
لیکن میں نے کسی کی بات نہ مانی
کیوں کہ مجھے تم پر یقین کامل تھا
میں سوچتا تھا کہ باقی سانپ بے شک
ایسے ویسے ہوں گے
لیکن تم بھی دوسرے سانپوں جیسے
نہیں نکلو گے
آج تمھارا ڈسا ہوا
ہارا ہوا مارا ہوا میں
سوچ رہا ہوں
کہ شاید تم دیوتا ہو ہی نہیں
تم تو سانپ ہو
محض ایک سانپ
جو دودھ پلانے والے کو بھی
دانت مارنا نہیں بھولتا
کیوں کہ دانت مارنا
اس کی فطرت ہے
میری طرح ہزاروں لاکھوں لوگ
جو تمھیں یا تمھارے جیسے دوسرے سانپوں کو
ناگ دیوتا مان کر
پوجتے ہیں اور دودھ پلاتے ہیں
کسی نہ کسی دن وہ بھی ڈسے جائیں گے
لیکن جب تک وہ ڈسے نہیں جاتے
وہ سب یوں ہی تمھیں
اور تمھارے جیسے دوسرے سانپوں کو
پوجتے رہیں گے
دودھ پلاتے رہیں گے

پرکاش فکری

شمارہ ۱۰۱
مارچ ۱۹۶۷

دھوپ کھڑکی سے ابھی آئے گی تھوڑی دیر میں
میرے کمرے کو ہنسی آئے گی تھوڑی دیر میں

دن کا شور وغل اداسی کو کہیں لے جائے گا
درد میں شاید کمی آئے گی تھوڑی دیر میں

میں گپھاؤں میں چھپوں گا پھر بھی مجھ کو ڈھونڈتی
کالی آنکھوں کی نمی آئے گی تھوڑی دیر میں

پتھروں پہ سر پٹکتے پانیوں کے شور میں
گیت کی سی دل کشی آئے گی تھوڑی دیر میں

اک ذرا سا صبر فکری اور بھی کچھ لوگ ہیں
تجھ کو سننے کی گھڑی آئے گی تھوڑی دیر میں

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

جسموں پہ خاک ڈال کے صحرا سے آیئے
دریا کہیں جو پاس ہو دھومیں مچایئے

یہ پھل تو اپنے آپ سدا ٹوٹتے نہیں
ہاتھوں سے احتیاط کی مہندی چھڑایئے

ہر جا ملیں گی شہر میں آنکھیں وہ گھورتی
چپ چاپ یوں ہی لیٹ کے یہ دن بتایئے

اس روشنی کے زہر میں کیا نیند آئے گی
ہے منتظر وہ دیر سے بتی بجھایئے

کس کو پڑی ہے آئے گا کچھ سوچ کے کہاں
جھانکے گا گھر میں کون کہ پردے لگایئے

جنس کے علاوہ رات بھی اس حادثے کے بعد
کتنا وہ خوش مزاج ہے اب مان جایئے

فکری نہیں سلیٹ کی تحریر جو مٹے
پتھر پہ لکھے نام کو کیسے مٹایئے

پرکاش فکری

شمارہ ۱۱۷،
ستمبر ۱۹۸۰

ہمارے خواب ہمیشہ جواں نہیں رہتے
سلگتی ریت پہ دریا رواں نہیں رہتے

کچھ ایسے پھول ہیں جن کی مہک نہیں جاتی
کچھ ایسے زخم ہیں جن کے نشاں نہیں رہتے

پتہ لگائیں کہ آخر کہاں وہ جاتے ہیں
اندھیری شب میں اجالے یہاں نہیں رہتے

تلاش یار کا موسم گذر گیا شاید
لہو میں ہجر کے شعلے تپاں نہیں رہتے

ہم ایسے دشت میں فکری بھٹک رہے ہیں اب
درندے خوف کے مارے جہاں نہیں رہتے

شمارہ ۱۶۹
جون جولائی ۱۹۹۳

سبز کالے جنگلوں سے آج تک گذرے نہیں
ساحلوں پہ پاؤں دھوتے شہر بھی دیکھے نہیں

نیند خوابوں کا جہاں آباد کرتی ہے مگر
خواب تو بس خواب ٹھہرے، ہاتھ وہ آتے نہیں

بادلوں کے دن ہیں لیکن آسماں شفاف ہے
اس سے پہلے ایسی رت میں ہم کبھی ترسے نہیں

خامشی جس طور سے بے چین کرتی ہے ہمیں
سر پھری پاگل ہوا نے ڈھنگ وہ سیکھے نہیں

یہ گلی اپنی ہے فکری پھر ہمیں لگتا ہے کیوں
ہم یہاں اک اجنبی ہیں ہم یہاں رہتے نہیں

پرکاش فکری

شمارہ ۲۲۳
اپریل ۱۹۹۹

خود سے رستہ کہاں چنا میں نے
دل جو کہتا تھا وہ کیا میں نے

ساتھ اپنے مجھے بھی لے جائے
آج دریا سے یہ کہا میں نے

اس کی ٹیسیں ہیں کچھ الگ جیسی
درد ڈھونڈا ہے اک نیا میں نے

وہ نہ پہنچی جہاں پہنچنا تھا
جب بھی مانگی کوئی دعا میں نے

جس کو آنا ہو شوق سے آئے
گھر کو رکھا ہے جب کھلا میں نے

مجھ کو آتا تھا کب سخن فکری
باندھ رکھی تھی بس ہوا میں نے

فلک پر نور کا دریا تماشا
زمیں پر ہر طرف سبزہ تماشا

طلسموں سے بھرے جنگل نرالے
چمکتی دھوپ میں صحرا تماشا

اڑا ئی خاک جب دشت الم کی
ہوا پھر عشق بھی اپنا تماشا

رہے کچھ دیر تک سب کی نظر میں
ہمیں اچھا لگا بننا تماشا

بہت کچھ جان کر فکری یہ جانا
تماشا سب یہاں دنیا تماشا

پرکاش فکری

شمارہ ۲۵۰
نومبر ۲۰۰۱

اداس لمحوں کی میں صدا ہوں
ہوا کے رستے میں کھو گیا ہوں
تھکن اڑانوں سے ہو گئی ہے
خزاں کی ٹہنی پہ جھولتا ہوں
کہاں گنوائی شفق کی رنگت
میں اپنی شاموں سے پوچھتا ہوں
بجھا کے رکھ دیں جو چاندنی کو
میں ایسی راتوں سے آشنا ہوں
کبھی تو دیکھے گا کوئی ان کو
میں رنگ لفظوں میں بھر رہا ہوں
سنو گے مجھ سے وہی کہانی
جسے میں اوروں سے سن چکا ہوں
مجھے جگائے نہ کوئی فکری
میں خوب سوؤں یہ چاہتا ہوں

خواب و خواہش کے زمانے یاد کر
جب ہوئے تھے ہم دوانے یاد کر
بیٹھ کر اپنے دکھوں کی چھاؤں میں
دھوپ والے دن سہانے یاد کر
جو ہوئے مشہور ہم سے دہر میں
دلبری کے وہ فسانے یاد کر
جن کے دم سے زندگی تھی زندگی
نقش وہ سارے پرانے یاد کر
تیرے کوچے میں بھٹکنے کے لئے
جو تراشے تھے بہانے یاد کر
تیرگی کے جنگلوں کی راہ سے
کون آتا تھا بلانے یاد کر
بے گھری میں گھر کہا فکری جنھیں
وہ فقیروں کے ٹھکانے یاد کر

پریم کمار نظر

شمارہ ۱۰۵،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷

ہے اختیار میں تیرے نہ میرے بس میں ہے
وہ ایک لمحہ جو غیروں کی دسترس میں ہے

وہ منھ سے کچھ نہیں کہتا کہ پیش و پس میں ہے
بدن کا کرب تو ظاہر نفس نفس میں ہے

اگرچہ شور بہت کوچۂ ہوس میں ہے
وہ کیا کرے کہ وہ چالیسویں برس میں ہے

اٹھو کہ پھر ہمیں اذن سفر ملے نہ ملے
ابھی تو لطف صدا نالۂ جرس میں ہے

کرے گا کون اسے سازش بدن میں شریک
وہ شخص قید ابھی روح کے قفس میں ہے

اسے پسند کہ وہ ٹوٹ کر گرا، ورنہ
شجر میں کیا نہیں ہوتا جو خار و خس میں ہے

شمارہ ۱۱۷،
ستمبر ۱۹۸۰

میں نے جب پیٹھ پر شجر رکھا
اس نے سورج زمین پر رکھا

خود تو منزل پہ رک گیا لیکن
مجھ کو آمادۂ سفر رکھا

مجھ میں پیوست تھا لباس اس کا
فاصلہ پھر بھی جسم بھر رکھا

کن فضاؤں میں سیر کو نکلے
کن درختوں پہ اپنا گھر رکھا

وہ بدن آج بھی چھریرا ہے
ہم نے ہی عہد مختصر رکھا

نام بانی نے اپنی غزلوں کا
ٹھیک ہی "حرف معتبر" رکھا

پاس کی چیز بھی نہیں دکھتی
نام رکھنے کو یوں نظر رکھا

پریم کمار نظر

شمارہ ۱۶۸،
مارچ تا مئی ۱۹۹۴

کیا جھول کوئی آیا ہے کردار میں صاحب
چھپتے ہو بہت ان دنوں اخبار میں صاحب

شاید اسے کہویں گے میرا کشف بصارت
چہرہ سا نکل آیا ہے دیوار میں صاحب

تسلیم کہ قابو میں نہیں لوچ بدن کا
جو معتدلی ہوتی ہے رفتار میں صاحب

میں سر تو لگا رکھا ہے اک تختۂ گل پر
اٹکی ہے مری جان کسی خار میں صاحب

خوش آئی نہیں عالم وحشت کی رسائی
سر ہم بھی بہت مارے ہیں دیوار میں صاحب

آ لگتا ہے ہر تیر میرے نافۂ جاں پر
ہے کوئی تو اپنا صف اغیار میں صاحب

گل رنگ نہ ہو جاتے لہو میں نہ نہاتے
جوہر ہی نہیں تھا کسی تلوار میں صاحب

رکھتا ہے بہر طور وہ اک وصف قناعت
سو عیب سہی آپ کے بیمار میں صاحب

شمارہ ۲۸۶،
نومبر، ۲۰۰۴

ہر چند کہ تھا ہجر میں اندیشۂ جاں بھی
آخر کو اٹھا ہم ہی سے یہ بار گراں بھی

اک گوشۂ در رکھا ہے محفوظ ہمارا
اس وسعت کونین میں ہم جائیں جہاں بھی

معدوم بھی ہوں اہل تماشا کی نظر میں
بکھرا ہے ہر اک سمت مگر میرا نشاں بھی

کچھ کم نہ ہوا رزق خدا تیرے گدا پر
ہر چند کہ گلیوں میں اٹھا شور سگاں بھی (۱)

کام آتی ہے اکثر تو یہی خانہ بدوشی
رکھنے کو تو ہم شہر میں رکھتے ہیں مکاں بھی

وہ وقت عجب ہوتا ہے ترسیل کا واللہ
لفظوں کو ترس جاتے ہیں جب اہل زباں بھی

---

(۱) آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

تاج ہاشمی

شمارہ ۶۵،
اکتوبر ۱۹۷۱

بھنگی بھنگری بھنگ چبالی
زلفی انکھیا رنگ غزالی

دیکھتے ناگن سوبل کھائے
جن سایوں نے دھوپ چرالی

وحشت لرزاں رینگ رہی ہے
بے پردا آواز سوالی

کانوں میں رس گھول نہ جائے
ٹوٹ نہ جائے رسم پیالی

ایک ہے لڑکی ایک ہے لڑکا
آج ہی ان کی ہوئی بحالی

شمارہ ۷۱،
اپریل ۱۹۷۲

نظم

بے لفظی آوازیں چھوتی چھاتی
تیکھی ٹیڑھی گھوم گھما کر
حرف نہ آئے نوک زباں پر
گریہ حیواں سنج محن گر
آنسو نالہ
برف پگھلتی دھوپ سنہری
تڑپ تڑپ خون نابہ ابرے
دھم دھم کڑ کڑ
ورشا پائل
جیسے پاگل
رم جھم چھم چھم

تاج مہجور

شمارہ ۱۵،
اگست ۱۹۶۷

ملاقات

تمھارے ہاتھ کی نرمی
تمھارے جسم کی آنچ
تمھارے قرب کی سیال چاندنی کی پھوار
برس رہی ہے
ملاقات کی گھٹاؤں سے
تمھارا ہاتھ
مرے ہاتھ میں ہے لیکن ہم
یہاں سے دور بہت دور ہیں جہاں مجھ کو
تمھاری کوئی خبر ہے تمھیں نہ میرا پتہ
ہمارے بیچ میں حائل ہے لمس کا صحرا
تم اپنا ہاتھ چھڑا لو
کہ ہم قریب آ جائیں

مراجعت کا ایک تجربہ

تبسم کاشمیری

شمارہ ۲۷۳،
اکتوبر ۲۰۰۳

خیال کے لڑکھڑاتے پہیے...
...یاد کا ایک درماندہ سفر
بارشوں میں بھیگتے دن رات
بجلیوں میں چمکتی ہوئی
جامنوں والی ایک سڑک
بوندوں میں جلتی بجھتی لالٹین
اور سرمئی پتھر کی ایک مسجد

گرما کی یہ تیز پیلی دھوپیں
سرخ اور گلابی کپڑوں سے لدی
...لمبی لمبی الگنیاں
...اور ایک گھر
چھتوں پہ ایک گمشدہ بادل
اور اس کی فریاد

چھجوں تلے ایک نابینا
پنچھی کا بسیرا
پرانے مسکنوں میں فاختاؤں کے گھر
آم کے پیڑوں میں لٹکتے گھونسلے
اور بچوں کی غلیلوں کا شور

محرابوں پہ کھلتے گلاب
اور ہاتھوں پہ کھلتی چنبیلی
جھاڑیوں میں گلہریوں کے غول
اور دوپہروں کو گرتی چقیں
شاید سب کچھ ویسا ہی ہے...
...مگر خیال کے پہیوں کا ضعف
اور یاد کے شیشوں پہ جمتی سیاہی...
یا پھر میری کہولت
باقی سب کچھ ویسا ہی لگتا ہے

تنویر اعجاز

شمارہ ۲۴۴،
فروری ۲۰۰۱

بے مائگی

میرے گھر کے سامنے سے
گذرتی ہوئی پکی سڑک
وادی کے دل میں اتر کر
نہ جانے کدھر گم ہو جاتی ہے
درختوں کے سائے کی تلاش میں
سر اٹھائے ہر طرف
پہاڑوں کے سلسلے
حیرت سے تکا کرتے ہیں اک دوسرے کو
بوڑھی سڑک کی جسارت پر

شمارہ ۲۵۶،
مئی ۲۰۰۲

سرگذشت: احمد آباد

کبھی ایسا بھی تھا
میں بالکل آزاد ہوا کرتا تھا
سبھی پابندیوں سے پرے
نہ تھے حائل
کبھی راہ میں سود و زیاں
نہ تھی پروا کبھی زماں و مکاں کی
مگر پھر یوں ہوا
کہ دیواروں نے آگھیرا
مجھے چاروں سمتوں سے
سر اور آسماں کے درمیاں
ہوا معلق اک سائباں
نظارہ صد رنگ آسماں کا
ہوا خواب صدا کے لئے
کہیں سے اب دھوپ آتی نہیں
چپ چپ سے ہیں سبھی روشندان
دروازے کی اوٹ سے
سرگوشیوں میں پوچھتی ہے ظالم ہوا
''کہو خوش تو ہو اپنے مکان میں؟
بھلا کیسا لگتا ہے بتانا
تمھیں بے امانی کی امان میں؟''

شمارہ ۲۶۳،
دسمبر ۲۰۰۲

۲۸ فروری ۲۰۰۲

شہر خوش بخت میں
سیاہ رو مکان
نفرتوں کا دھواں اگلتے تھے
جس کی زہریلی تحریر
لوح آسماں پر
تا حد نظر پھیلی تھی
جس کے پڑھنے والے
محروم ہوئے بینائی سے
نا آشنا ہوئے لذت خواب سے
اور
ان رو سیاہ مکانوں کے مکیں
شہر خوش بخت کو
خیر باد کہہ چکے تھے
دعاؤں کا حصار گرنے سے پہلے ہی

تنویر انجم

شمارہ ۲۳۳
جنوری ۲۰۰۰

جچتی نہیں کچھ شاہی و املاک نظر میں
ہیں مہر و مہ و انجم و افلاک نظر میں

اک سوز فسوں گر ہے تری آنکھ میں پنہاں
ہے دل کے لیے شوق کا فتراک نظر میں

کیا خوب کہ کشکول فقیری سے ہے آیا
اک گنج گراں مایہ تہہ خاک نظر میں

اک خواب سحر ساز کا نایاب خزانہ
دریافت کیا ہے تری بے باک نظر میں

کچھ اور کہاں چاہئے اس دل کو کہ اب ہے
دریائے غم عشق کا پیراک نظر میں

یہ خواب ہے صیاد کا یا اک دل وحشی
ابھرا ہے کوئی طائر چالاک نظر میں

سیلاب شقاوت کے مقابل ہے تمہارے
یہ فصل محبت خس و خاشاک نظر میں

کھائے ہیں بہت موج مخالف کے تھپیڑے
رکھا ہے بہت بحر خطر ناک نظر میں

ملبوس میں انجم کے ہیں پیوند کے گوہر
کیوں ٹھہرے یہ کمخواب کی پوشاک نظر میں

آسمان یاس پر کھویا ستارہ ڈھونڈنا
ہے دل آزردہ کو چہرہ تمہارا ڈھونڈنا

بحر ہستی سے کہو اک پل ذرا اک پل ٹھہر
ایک آہستہ قدم ہے کنارہ ڈھونڈنا

اس غم دوراں کی تاریکی میں اے جان سحر
دل ہمارا کھو گیا ہے دل ہمارا ڈھونڈنا

اجنبی چہروں کے پیچھے ہے چھپی رہ آشنا
ان نظاروں سے ادھر ہے اک نظارہ ڈھونڈنا

اے شب غم چھوڑ دے دامن سرا ہے اب مجھے
نیند سے اٹھنا وہ خوابیدہ شرارہ ڈھونڈنا

روح پر بھاری رہا بار حیات شرمسار
کارواں میں اب نہ تم ہم کو دوبارہ ڈھونڈنا

راہ نو پر گامزن اے شہسوار تیز رو!
برگ گور کہنہ میں اک استعارہ ڈھونڈنا

وہ تعلق تجھ سے ہے دل کو کہ اے مرگ عزیز
راہ میں آنکھیں بچھا تیرا اشارہ ڈھونڈنا

تنویر انجم

شمارہ ۲۱۸
جولائی ۱۹۹۸

تقریباً سیاہ فام گلنار فاطمہ نے
اپنے بچوں کو
کلوں سے ڈرا دیا

گلنار فاطمہ نے بچوں کو واضح طور پر بتادیا
سفید فام ہماری نسل سے برتر ہیں
اور ہم سیاہ فاموں سے

میک اپ کے سامان کی سب سے بڑی کثیر القوی کمپنی میں
کوالٹی کنٹرولر کے عہدے پر فائز
گلنار فاطمہ کے ہر کام میں
اعلیٰ کوالٹی کے آثار نمایاں ہیں

گلنار فاطمہ کو سب سے زیادہ نفرت ان لوگوں سے ہے
جنہوں نے کبھی اسے
اس کی سیاہی مائل رنگت کا احساس دلایا ہے
جیسے کہ اس کی گوری چٹی بہنیں
اور دوسری قریبی رشتہ دار لڑکیاں

گلنار فاطمہ نے معمولی باتوں پر
سب سے تعلقات ختم کرلیے ہیں
اعلیٰ کوالٹی کی چیزیں جمع کرنے والی
گلنار فاطمہ کا گھر
گوری چٹی بدذوق بہنوں کے گھروں سے
کہیں زیادہ خوبصورت ہے
گلنار فاطمہ کو اپنی ملازمت پر فخر ہے
اور میک اپ کے سامان کے مفت کوٹے سے
وہ کبھی کبھی ان لوگوں کو چھوٹے موٹے تحفے دلاتی ہے
جو اس پر رشک کا اظہار کرتے ہیں

اپنے وطن سے دور
"پاکیزہ""دوشیزہ"اور خواتین ڈائجسٹ"
بڑی لگن اور کوشش سے حاصل کرکے پڑھنے والی
گلنار فاطمہ کے خیالات
سفید فاموں سے دوستی کے بارے میں
واضح نہیں ہیں

یہ اس لیے ہے
کہ وہ رومان پسند ہونے کے ساتھ ساتھ
مذہبی بھی ہے
اور اس لئے بھی
کہ لگاتار کافی دیر تک
معیاری انگریزی میں گفتگو آسان نہیں ہے

پلاسٹک سرجری کے کسی نہ کسی ماہر سے
ہر مہینے ملاقات کرنے والی
گلنار فاطمہ کو
اگر اپنی سیاہی مائل رنگت کی وجہ سے
یا لوگوں سے تعلقات نباہنے سے انکار کی بنا پر
طلاق ہو جائے
تو وہ غیر معیاری انگریزی بولنے والے
سفید فام ایلین سے دوستی کرسکتی ہے
جو اس کے کام کی کوالٹی کا مداح ہے
یا اپنے ہم مذہب سیاہ فام عبداللہ سے شادی
جو اس کے سیاہی مائل رنگت پر فدا ہے

شمارہ ۲۳۴
فروری ۲۰۰۰

تنویر انجم

پاکستان چھوڑ دو
تقسیم کرو اور پاکستان چھوڑ دو
اپنے آپ کو تقسیم کرو اور پاکستان چھوڑ دو
اپنے بچوں کو اپنی ذات سے تفریق کرو اور پاکستان چھوڑ دو
اپنا پھاڑا ہوا غیر پاکستانی پاسپورٹ جوڑو
اور پاکستان چھوڑ دو

پیاری بہن آمنہ
ہم تمہارے دامن پر لگے سارے دھبوں کو بھول جائیں گے
ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے
کہ تم اپنے بچوں سے دور ہو کر انہیں خط نہ لکھو
یا دوسروں کو ان کے بچے پالنے میں مدد دو

پیاری بہن آمنہ
چولہا پھٹنے سے آگ میں جل کر
اب تمہاری صورت بدل چکی ہو گی
ہم وعدہ کرتے ہیں
ہم تمہیں پہچاننے کی پوری کوشش کریں گے
اور تم سے کسی کراہیت کا اظہار نہیں کریں گے

پیاری بہن آمنہ
ہمیں معلوم ہے
تمہیں اپنے ہیروئنچی شوہر کی موت کا کوئی غم نہیں
سوائے اس کے کہ اب تم پہلے سے زیادہ
دوسروں کی محتاج ہو
ہم تمہیں اس چہار دیواری میں
کسی کا محتاج نہیں ہونے دیں گے
اور تمہارے اس آبائی گھر میں
تمہیں تمہارا حق دینے کی کوشش کریں گے

پیاری بہن آمنہ
تمہیں وہاں تمہارے مرحوم شوہر کے ہیروئنچی بھائی سے
بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا
اپنے آپ پر اور اپنے خاندان کی عزت پر
کچھ رحم کرو
اور اپنے جانے پہچانے لوگوں کی پناہ میں واپس چلی آؤ

پیاری بہن آمنہ
ہم وعدہ کرتے ہیں
جب تم ہمارے پاس سے
پاگل پن کے دورے میں گھر سے بھاگو گی
ہم تمہاری تلاش میں ضرور جائیں گے
اور تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو جائے
تمہیں گھر واپس لے آئیں گے

پیاری بہن آمنہ
تم خوب سمجھتی ہو
تمہارا جلا ہوا چہرہ، معمولی تعلیم، تمہارا پاگل پن
ہر جگہ مشہور ہے
یہاں بھی کسی کی نظر میں تمہاری کوئی افادیت نہیں
خود مختاری کے دروازے تم پر ہر طرف سے بند ہیں
لیکن پھر بھی ہم اپنی محبت سے مجبور ہیں
اپنے بچوں کو ان کی دھرتی ماں کی پناہ میں دے دو
اور پاکستان چھوڑ دو

پیاری بہن آمنہ
اپنی مرحوم بہن کے اس نامے کو
اپنے دل کی آواز سمجھو
اور اپنے خاندانی قبرستان والی اس حویلی میں
میرے پاس چلی آؤ

تنویر انجم

شمارہ ۲۳۴
فروری ۲۰۰۰

وہ ایک بہت حسین شوہر کے ساتھ
ساری زندگی آخر کیوں رہے
ایک بہت دلچسپ شوہر نے
شادی کی پہلی رات
اپنے ہلکے پھلکے معاشقوں کا تذکرہ
مزے لے لے کر کیا
بہت مقبول شوہر نے
رات رات بھر ہوٹلوں میں بیٹھ کر
گہرے اور عزیز دوستوں کے ساتھ
خوش گپیاں کرنے کا معمول
ہمیشہ جاری رکھا

بہت تیز رفتار شوہر نے
ایک لمبے سفر کا منصوبہ بنایا
اور اس پر چلتے ہوئے
سب کے سامنے کہا
کہ اس جیسی سست رو کے ساتھ
کوئی نہیں چل سکتا

بہت دانشور شوہر نے
بچوں کی تعلیم کے معمولی کام میں
اس کے پاگل پن کو کبھی نہیں سراہا

ایک معمولی بوڑھی عورت
بہت بلند آواز شوہر کے ساتھ
ساری عمر رہ لیتی
اگر وہ پہلی بار
بیوی کے مکان سے نکالے جانے پر
فوراً ہی نہ مر جاتا

تنویر سامانی

شمارہ ۲۷۴،
نومبر ۲۰۰۳

دشت میں جو بھی ہے جیسا مرا دیکھا ہوا ہے
راستہ اس کے سفر کا مرا دیکھا ہوا ہے

کس لئے چیختا چنگھاڑتا رہتا ہے بہت
موج در موج یہ دریا مرا دیکھا ہوا ہے

وقت کے ساتھ جو تبدیل ہوا کرتا ہے
آئینہ آئینہ چہرہ مرا دیکھا ہوا ہے

رنگ و روغن مری تصویر کو دینے والا
آب شفاف ہے کتنا مرا دیکھا ہوا ہے

کس طرح تجھ کو یہ بتلاؤں ہوا کے جھونکے
ریت پر لکھا ہے کیا کیا مرا دیکھا ہوا ہے

کس جگہ کون گڑا ہے مجھے معلوم ہے سب
اس ترے شہر کا نقشہ مرا دیکھا ہوا ہے

رات کے بعد سحر ہوتی ہے روشن تنویر
ہے اندھیرے میں اجالا مرا دیکھا ہوا ہے

توصیف تبسم

شمارہ ۱۳۶،
جنوری تا مارچ ۱۹۸۵

آئینہ ملتا تو شاید نظر آتے خود کو
اب وہ حیرت ہے کہ پہروں نہیں پاتے خود کو

آشنا لوگ جو انجام سفر سے ہوتے
صورت نقش قدم آپ مٹاتے خود کو

ایک دنیا کو گرفتار غم جاں دیکھا
یوں نہ ہوتا تو تماشا نظر آتے خود کو

آئینہ رنگ کا سیلاب ہے پایاب بہت
آنکھ ملتی تو یہ منظر بھی دکھاتے خود کو

اب یہ دیکھو کہ ہمیں راہ ہمیں منزل ہیں
عمر بھر دیکھ چکے ٹھوکریں کھاتے خود کو

آسماں شب کو کھلے دشت پہ جھک آتا ہے
خوشبو اڑتی ہے کہ صحرا ہیں بلاتے خود کو

کیا عجب کوئی کرن ہم سفر خواب ملے
تا سحر لے کے چلیں نیند کے ماتے خود کو

شمارہ ۲۸۷،
دسمبر ۲۰۰۴

دل کی بات نہ مانی ہوتی عشق کیا کیوں پیری میں
اپنی مرضی بھی شامل ہے اپنی بے توقیری میں

درد اٹھا تو ریزہ دل کا گوشۂ لب پر آن جما
خوش ہیں کوئی نقش تو ابھرا بارے بے تصویری میں

قید میں گل یاد آیا تو پھول سا دامن چاک کیا
اور پھر لو ہو روئے گویا بھولے نہیں اسیری میں

جانے والے چلے گئے پر لمحہ لمحہ ان کی یاد
دکھ میلے میں انگلی تھامے ساتھ چلی دلگیری میں

طوق گلے کا پاؤں کی بیڑی آہن گر نے کاٹ دیے
اپنے آپ سے باہر نکلے زور کہاں زنجیری میں

شکر ہے جتنی عمر گذاری نان و نمک کی فکر نہ تھی
ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر حاصل رہے فقیری میں

ثروت حسین

شمارہ ۱۳۴،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

(۱)

میں ان کے درمیان سے اٹھ کر آ گیا ہوں،
بات یہ ہے کہ میرا علم بہت محدود ہے اور مجھے اصلاحوں سے
خوف آتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میرا شہر کس عرض البلد پر واقع ہے
لیکن میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جس کی انگلیاں قالین پر پھول
کاڑھتی ہیں اور قالین سے اڑنے والا اون اس کے پھیپھڑوں پر
پھول کاڑھتا ہے۔

(۲)

میرے دکھ بہت معمولی ہیں، میں دکھی ہوں اس مریض
کے لئے جس کی بیل گاڑی اسپتال کے دروازے تک نہیں پہنچ پائے
گی، میں دکھی ہوں اس عورت کے لئے جو اس بیل گاڑی کو جاتے
ہوئے دیکھتی ہے، میں دکھی ہوں اس بیلچے کے لئے جو بارشوں میں
بھیگ رہا ہے، میں دکھی ہوں آوازوں کے اس صندوق کے لئے جو
میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے۔

(۳)

وہ مجھے پریشان رکھتے روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے اور بدل
دیتے ہیں ایک باپ کو درندے میں، بدل دیتے ہیں ایک شاعر کو
آگ میں۔

میں درندے کی موت مرنا چاہتاوں
میں آگ کی موت مرنا چاہتا ہوں
میں ایک آدمی کی موت مرنا چاہتا ہوں

شمارہ ۱۷۰،
اگست ستمبر ۱۹۹۳

ہے وقت امتحان بھلے دن بھی آئیں گے
مہکے گا گلستان بھلے دن بھی آئیں گے

سوئیں گے دل گرفتہ و دل ریش سکھ کی نیند
بدلے گا یہ جہان بھلے دن بھی آئیں گے

رنجیدہ کیوں ہے کوئی ستارہ اگر نہیں
دل کو چراغ جان بھلے دن بھی آئیں گے

پھر جمع ہوں گے آگ کے چوگرد قصہ گو
چھیڑیں گے داستان بھلے دن بھی آئیں گے

اطراف سے دیار کی مہماں سراؤں میں
اتریں گے میہمان بھلے دن بھی آئیں گے

ہاتھوں میں شمع دان لئے باغ و راغ میں
نکلیں گے نوجوان بھلے دن بھی آئیں گے

پتوں کی تالیوں سے پرندوں کے شور سے
گونجے گا ہر مکان بھلے دن بھی آئیں گے

فردا کی گونج سن کے اٹھیں گے جہاز راں
کھولیں گے بادبان بھلے دن بھی آئیں گے

کیوں سو گیا ہے ہاتھ سرہانے دھرے ہوئے
ثروت خدا کو مان بھلے دن بھی آئیں گے

ثروت حسین

شمارہ ۲۰۲،
جنوری۱۹۹۷

آدمی کو رہ دکھانے کے لیے موجود ہیں
کچھ ستارے جگمگانے کے لیے موجود ہیں

ابر، دیواریں، سمندر اور نادیدہ افق
رہروؤں کو آزمانے کے لیے موجود ہیں

کیوں گرفتہ دل نظر آتی ہے اے شام فراق
ہم جو تیرے ناز اٹھانے کے لیے موجود ہیں

دیکھتا رہتا ہوں اشیاے تصرف کی طرف
یہ کھلونے ٹوٹ جانے کے لیے موجود ہیں

پیش پا افتادہ قریے، سر بر آوردہ شجر
سو بہانے دل لگانے کے لیے موجود ہیں

کون کر سکتا ہے ایسے میں کسی دریا کا رخ
جب وہ آنکھیں ڈوب جانے کے لیے موجود ہیں

میں درختوں سے مخاطب ہوں خداے عزوجل
جو زمیں پر سر اٹھانے کے لیے موجود ہیں

آگ اور طرح کی ہے دھواں اور طرح کا
ہے کچھ مرے جلنے کا سماں اور طرح کا

یہ شہر ہے مٹی ہے یہاں اور طرح کی
یہ دشت ہے پانی ہے یہاں اور طرح کا

دیتے ہیں خبر خوش گذراں اور طرح کی
کرتے ہیں سخن دل زدگاں اور طرح کا

پر مل گئے مٹی کے تو آنکھوں پہ کھلا یہ
منظر ہے سر کاہکشاں اور طرح کا

تعمیر کی بنیاد میں دل رکھا ہے یعنی
ہم لوگ اٹھائیں گے مکاں اور طرح کا

جاں نثار اختر

شمارہ ۲۶،
نومبر ۱۹۷۱

چونک چونک اٹھتی ہے محلوں کی فضا رات گئے
کون دیتا ہے یہ گلیوں میں صدا رات گئے
یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا
اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی ردا رات گئے
چبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بند قبا رات گئے
آؤ، ہم جسم کی شمعوں سے اجالا کر لیں
چاند نکلا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے
تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے
سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے
دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس
دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتہ رات گئے
بھیگی بھیگی ہوئی موسم کی ہواؤں پہ نہ جا
دل پہ برسے گی شراروں کی گھٹا رات گئے
اب بھی آتی ہے تری یاد مگر کچھ ایسے
ٹمٹمائے کسی جنگل میں دیا رات گئے
پھیل جاتا ہے افق تا بہ افق میرا وجود
مجھ سے بھر جاتے ہیں یہ ارض و سما رات گئے
گھر میں پی لیں بھی تو کیا، آج بھی یاد آتی ہے
فرش مے خانہ پہ وہ لغزش پا رات گئے
جاگ اٹھتی ہے مرا شعر، مرا فن بن کے
خود مرے روح کی پاکیزہ نوا رات گئے

جاں نثار اختر

شمارہ ۸۹،
مارچ اپریل ۱۹۷۴

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

لوگ خاموش سے کیوں ہیں
ایسی کیا آن پڑی ہے

اب کہاں آنکھ میں آنسو
دھول پلکوں سے جھڑی ہے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک
کوئی چادر سی پڑی ہے

زندگی ہاتھ پسارے
آج رستے پہ کھڑی ہے

تپ اٹھا جسم زمیں کا
کیا قیامت کی گھڑی ہے

بے خبر کون ہے کس سے؟
آنکھ سے آنکھ لڑی ہے

کیا ہوئے رات کے راہی
راہ سنسان پڑی ہے

کبھی ایسا بھی لگا ہے
زندگی بند گھڑی ہے

اک ہوس آج بھی دل میں
جیسے کیلوں سے جڑی ہے

دوجہاں کھو نہیں جائیں
عشق کی شرط کڑی ہے

روح کی پیاس کے آگے
جسم کی پیاس بڑی ہے

رات رستے سے ہٹے بھی
صبح آنے کو کھڑی ہے

جاوید شاہین

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

دل میں شفقت نہ رہے آنکھ کا پانی نہ رہے
عہد میں تیرے کوئی چیز پرانی نہ رہے

رسم ہجرت کو بہ انداز دگر زندہ رکھ
اتنے ویراں ہوں مگر شوق مکانی نہ رہے

سلسلہ بند ہو یاروں کی ملاقاتوں کا
صبح رنگیں نہ رہے شام سہانی نہ رہے

ہو سکے لوح دل و جاں سے مٹا اس کے نقوش
جانے والے کی یہاں کوئی نشانی نہ رہے

تو ندی نالے کو ہر طور بہم رکھ پانی
وہ تو چاہے گا کہ دریا میں روانی نہ رہے

بات جو دل میں ہے کھل کر اسے کہہ دے شاہیں
کیا خبر کل کو یہ آشفتہ بیانی نہ رہے

جاوید شاہین

شمارہ ۱۳۸،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵

اس طرح کرتے ہیں کچھ لوگ بڑائی اس کی
خلق اس کی ہے، خدا اس کا، خدائی اس کی

کیا خبر تھی کہ یہیں وصل کے سائے کے قریب
دھوپ کے بیچ پڑی ہوگی جدائی اس کی

لے گئے شوق سے مرحوم کی ہر شے احباب
چھوڑ دی طاق کے اوپر ہی اچھائی اس کی

کی ہے افلاس میں دوشیزۂ امید جواں
اب تو بس بیٹھ کے کھانی ہے کمائی اس کی

زندگی کٹتی ہے دونوں کی مسلسل ضد میں
قید ہے میری وہی جو ہے رہائی اس کی

معتبر نام تھا وہ پھر بھی حوالہ نہ دیا
جاں بچانے کو قسم جھوٹی نہ کھائی اس کی

زندگی ساری گنوا دوں یہ ضروری تو نہیں
یہ بہت ہے کہ کوئی بات نبھائی اس کی

یہ محبت نہیں کچھ اور ہے صورت شاہیں
تم مزہ لے کے جو سنتے ہو برائی اس کی

غزل

جاوید شاہین

شمارہ ۲۹۱،
اپریل ۲۰۰۵

زخم کوئی اک بڑی مشکل سے بھر جانے کے بعد
مل گیا وہ پھر کہیں دل کے ٹھہر جانے کے بعد

میں نے وہ لمحہ پکڑنے میں کہاں تاخیر کی
سوچتا رہتا ہوں اب اس کے گذر جانے کے بعد

کیسا اور کب سے تعلق تھا ہمارا کیا کہوں
کچھ نہیں کہنے کو اب اس کے مکر جانے کے بعد

مل رہا ہے صبح کے تارے سے جاتا ماہتاب
رات کے تاریک زینے سے اتر جانے کے بعد

کیا کروں آخر چلانا ہے مجھے کار جہاں
جمع خود کو کر ہی لیتا ہوں بکھر جانے کے بعد

زخم اک ایسا ہے جس پر کام اب کرتا نہیں
وقت کا مرہم ذرا سا کام کر جانے کے بعد

چپ ہیں یوں چیزیں کہ کھل کر سانس بھی لیتی نہیں
جیسے اک صدمے کی حالت میں ہوں ڈر جانے کے بعد

ہیں نواح دل میں شاہیں کچھ نشیبی بستیاں
ڈوبتا رہتا ہوں ان میں پانی بھر جانے کے بعد

اپنی بچی کی موت پر

جبار جمیل

شمارہ ۲۹،
اگست ۱۹۶۹

ٹوٹے پھوٹے خشک مٹی کے گھروندے اردگرد
ایک چھوٹا، کچی مٹی کا گھروندا درمیاں
جس پر اپنا ہاتھ رکھے میں اکیلا بیٹھا ہوں خاموش گم سم
سامنے مغرب کا مٹیالا سمندر
جس میں سورج کا الاؤ گر کے پانی بن چکا ہے
موت کی کالی کہانی بن چکا ہے

ان گنت جمپر
چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں
موزے، سوئٹر، شرٹ، شلوار اور جوتے
نیلے پیلے سرخ اودے ننھے منے
آسمانوں سے دھنک مہمان بن کر آئی تھی
چھوٹی سی کاجل کی ڈبیہ
گنگناتی مسکراتی چھوٹی چھوٹی قسمتیں
وقت رخصت گرم بوسے گال پر
واپسی میں گرم آنسو زندگی کے حال پر

پولیو
(ڈھائی سالہ غوث کے نام)

جبار جمیل

شمارہ ۱۵۵،
مئی تا جولائی ۱۹۸۹

شجر حجر کو کیا ہوا
آسماں کا شہر اس قدر اجاڑ سا ہے کیوں
آسماں کے شہر میں
کہکشاں کی رہگذر کو کیا ہوا
شام کس لئے اداس ہے سحر کو کیا ہوا
گلی گلی ملول کیوں ہے بام و در کو کیا ہوا
موسم بہار ہے مگر
شاخ شاخ کی زبان پر
ستیزہ کاری خزاں کا مرثیہ ہے کیوں
زمیں کے سینے سے دھواں سا اٹھ رہا ہے کیوں
طائران خوش نوا کو کیا ہوا
کوئی دل نواز لے نہ کوئی جاں گداز گیت
یہ کیا طلسم ہے کہ ساری کائنات
اس کراں تا اس کراں
گلو گرفتہ سی دکھائی دیتی ہے
ہوا کو کیا ہوا
کہ چلتے چلتے رک گئی ہے یک بیک
کہ جیسے کانٹا چبھ گیا ہو پاؤں میں
یہ کس کا ظلم کس کی سحر کاری ہے
مگر تمہیں یہ کیا ہوا
اٹھو...
اٹھ کے کھیلتے نہیں ہو کس لئے؟
دوڑتے ہو کیوں نہیں؟
ابھی ابھی تو تم نے چلنا سیکھا تھا۔
اٹھو، بیٹھے رہنے کی گھڑی تو دور ہے
یعنی بڑھاپا دور ہے
عمر کا وہ بے ضرر کنارہ کوسوں دور ہے
شروع عمر ہی تو ہے
شروع عمر ہی میں بوڑھے کیسے ہو گئے، اٹھو۔

اقبال : صرف مسلمانوں کا شاعر؟

جگن ناتھ آزاد

شمارہ ۱۳۱،
اکتوبر ۱۹۸۳ تا فروری ۱۹۸۴

یہ سوال، کہ کیا علامہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں، مطالعۂ اقبال میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں تو یہ سوال (اگرچہ سوال کی صورت میں نہیں بلکہ ایک مسئلے کی صورت میں) اکثر میرے سامنے آیا، بالخصوص ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۷ تک جب کہ علامہ کی صد سالہ تقریبات ہندوستان کے گوشے گوشے میں منائی جا رہی تھیں۔ اس سے قبل، میں جس زمانے میں کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے لئے اقبال نمائش مرتب کر رہا تھا، اور علامہ مرحوم کے اساتذہ کی تصاویر کی تلاش کے سلسلے میں میرے خطوط ہندوستان کے اردو انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپ رہے تھے، اس وقت مجھے زیادہ تو نہیں لیکن دو ایک عتاب نامے موصول ہوئے تھے جن کے مطالعے سے میرا ذہن اسی سوال کی جانب منتقل ہوا تھا۔ یہی سوال مجھ سے پچھلے دنوں رنگون (برما) کی ایک محفل میں بھی کیا گیا جہاں میں نے ایک خالص ادبی موضوع پر تقریر کی تھی، اور وہ موضوع تھا: مسجد قرطبہ کے شعری محاسن۔

دراصل اس سوال کے اندر دو اور سوال مضمر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات چیت کی ابتدا انہیں مضمرات سے کی جائے۔ اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ فکر کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس کے جواب کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے اور نہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش کہ اقبال کے بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن اور حدیث ہیں۔

لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ اس کے علاوہ مشرق ومغرب کے تمام فکری معیاروں سے اقبال بے نیاز ہیں، اقبال کے فکر وفن کے باتوجہ مطالعے کا نتیجہ نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اقبال نے مختلف نظام ہائے فکر کا بغور مطالعہ کیا، بلکہ ان کے اپنے نظام فکر میں ان نظام ہائے فکر کے اکثر پہلوؤں کے رد وقبول کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ چنانچہ ان کی شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں اسلامی فکر کے ساتھ ہی ساتھ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ، اور مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادی نظام فکر بھی شامل ہے۔ اگر ہم کلام اقبال سے یہ تمام فکری عناصر خارج کر دیتے ہیں تو ان کی نظم ونثر کا اکثر حصہ مفہوم سے عاری ہو کے رہ جاتا ہے اور فکر اقبال کی محض ایک ادھوری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

مطالعۂ کلام اقبال میں قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ اور مارکس اور اینگلز کے جدلیاتی مادی نظام فکر میں سب سے زیادہ اہمیت میں مغربی فلسفے کو دوں گا، اگرچہ فلسفۂ مغرب کے تعلق سے کلام اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اکثر افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔ اہل قلم کی ایک جماعت نے یہ ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگا دیا کہ علامہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف مغربی فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تغلیط کی ہے۔ اور دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں۔ یہ حضرات اس ضمن میں نیٹشے اور برگساں کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے انتہا پسندانہ اور حقیقت سے دور ہیں۔ حقیقت ان کے بین بین چلتی ہے اور اس پر سے اقبال نے خود اپنی نظم ونثر میں اکثر پردہ اٹھایا ہے۔ علوم مغرب کے تعلق سے فکر اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے۔ Aspects of Iqbal کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> He tried to reach the inwardness of European culture and appreciated and interpreted Islam in the light of modern Eropean thought. He was not the bigoted communalist which (even) sme of his so-called admirers make him out to be. He confessedly sought knowledge from the spring-head of European learning

دراصل جو کچھ تاثیر مرحوم نے کہا ہے وہ خود علامہ کے اپنے افکار ہی کا پرتو ہے۔ اقبال اپنی تصنیف The Reconstruction of Religion Thought in Islam میں لکھتے ہیں:

> The most remarkable phenomenon of modern history, however, is the enormous rapidity with which the world of Islam is moving towards the west. There is nothing wrong in this movement, for European culture on its intellectual side is only a further development of some of the most important phases of the culture of Islam. Our only fear is that the dazzling

exterior of European culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of that culture.

جس زمانے میں اقبال اپنی مذکورہ کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam کے مختلف ابواب لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، انھوں نے صوفی غلام مصطفی تبسم مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ان دنوں ایک کتاب لکھنے کا خیال کر رہا ہوں، جس کا نام ہوگا Islam as I Understand it۔ اس ضمن میں انھوں نے مذکورہ خط میں لکھا تھا:

> Most of my life has been spent in the study of European philosophy and that has become my second nature. Consciously or unconciously I study the realities and truths of Islam from the same point of view.

یہ تو خیر ایک پرائیویٹ نوعیت کا خط ہے (۲ ستمبر ۱۹۲۵ کا)، اگرچہ میں علامہ مرحوم کے ان افکار کو جو ان کے خط میں مندرج ہیں کم اہمیت نہیں دیتا)، لیکن یہ بات انھوں نے The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں مسلمانوں کے سامنے ایک لائحۂ عمل کے طور پر پیش کی، جب انھوں نے لکھا:

> The only course open to us is to approach modern knowledge vita a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that knowledge even though we may be led to differ from those who have gone before us.

یہ جو انھوں نے لکھا ہے کہ ہم علوم جدید کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور انھیں علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اپنی اس کوشش میں انھیں اپنے پیش رووں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے، تو یہ بات انھوں نے محض گفتار کی حد تک ہی محدود نہیں رکھی بلکہ اپنی نظم و نثر میں اسے ایک عملی صورت بھی دی۔

اپنی نظم و نثر میں اگرچہ انھوں نے قدم قدم پر اپنے نظریات مغربی مفکرین کے نظریات کی تردید میں پیش کیے ہیں اور مغربی فلسفے کو فرنگی شیشہ گری کے نام سے یاد کرتے ہوئے جا بجا مغرب کی نارسائی کی جانب اشارے کیے ہیں۔ مثلاً:

ے از میخانۂ مغرب چشیدم　　　به جان من که درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی　　　ازاں بے سود تر روزے نہ دیدم

☆

کہا اقبال نے شیخ حرم سے　　　تہِ محراب مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی　　　فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

☆

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں　　　سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

☆

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و مغرب　　　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

مگر مغربی علم و فن کے جن چشموں سے آنسووں نے پیاس بجھائی ہے ان کا ذکر انھوں نے بڑی کشادہ دلی اور احسان مندانہ انداز سے کیا ہے اور اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ مغربی علوم کا ذکر ایک طالب علمانہ خلوص سے کرتے ہیں مثلاً:

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ

☆

علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

☆

کیمیا سازی اور یگ رواں را زر کرد

لیکن اس کی روشن ترین مثال دینے کے لئے میں ایک بار پھر The Reconstruction of Religious Thought in Islam کی طرف رجوع کروں گا جس میں وہ لکھتے ہیں :

> The task before the modern Muslim is therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past.

اور مذکورہ کتاب اول سے آخر تک اسی کوشش اور کاوش پر مبنی ہے یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن و حدیث ہے یا دوسرے لفظوں میں اسلام ہے، تو ہمیں اس بات سے خالی الذہن نہیں ہونا چاہئے کہ اقبال اسلام سے مراد لیتے ہیں اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل نو، یا دوسرے لفظوں میں، Islam as I Understand it۔

اس ضمن میں نقادان اقبال کے دو انتہا پسندانہ رویوں کا ذکر تو میں نے کیا ہے۔ ایک تیسرا انتہا پسندانہ نظریہ اور بھی ہے اور وہ ہمیں مس میں پینٹنس کے یہاں نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے قبل ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ برس کی بات ہے، ماسکو میں میری ملاقات نتاشا پریگارینا سے ہوئی۔ پریگارینا کو کلام اقبال سے عشق ہے اور اس وقت تک وہ اقبال کے متعلق دو کتابیں لکھ چکی ہیں۔ ایک اقبال کی فکر پر، دوسری اقبال کی شعریات پر۔ پریگارینا نے دوران گفتگو میں "بانگ درا" کھول کے اقبال کی نظم "میں اور تو" نکالی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا "تو" سے مراد "ہندو" ہے؟ میں نے نظم کے ایک ایک شعر کی تشریح کی

اور بتایا کہ "تو" سے مراد "ہندو" نہیں ہے، بلکہ اس "تو" سے مراد ایک مخاطب نہیں، کئی مخاطب ہیں۔ بنیادی طور پر اقبال نے اس نظم میں فلسفۂ حرکت اور فلسفۂ ارتقا بیان کیا ہے۔ یہ آپ کہہ سکتی ہیں کہ "تو" سے مراد haves ہے اور "میں" سے مراد have-nots۔ لیکن have-not بھی ہمیشہ have not نہیں رہے گا، کیوں کہ تغیر اصول فطرت ہے۔ ایک ہی مقام پر قرار یا قیام اصول ارتقا کے خلاف ہے۔ اقبال حرف کن سے بھی یہی مراد لیتے ہیں، ع کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں۔ یعنی یہ کائنات ہر لحہ ارتقا پذیر ہے۔ پریگاریتا نے میری بات غور سے سننے کے بعد کہا کہ اسی عنوان کی ایک نظم اور بھی ہے، کیا وہاں "تو" سے مراد "ہندو" ہے؟ میں نے اس نظم کے دو تین شعر انھیں سنائے ع

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

کہنے لگیں، ہاں یہی نظم ہے۔ میں نے کہا اس میں بھی "تو" سے مراد "ہندو" نہیں ہے۔ بلکہ اس نظم میں بحیثیت مجموعی خطاب مسلمانوں سے ہے۔ ان مسلمانوں سے جنھوں نے غیر اسلامی طریقے اپنا لئے ہیں۔ میں نے اس نظم کے اکثر اشعار کی تشریح کی بالخصوص اس شعر کی۔

گلۂ وفائے جفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
جو صنم کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اس پر نتاشا کہنے لگی کہ ہاں، اب بات سمجھ میں آگئی ہے پہلے ان دونوں نظموں کے متعلق میرا خیال کچھ اور تھا۔

معلوم نہیں بعض غیر ملکی طالب علمان اقبال کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے کہ اقبال کی شاعری ہندو اور مسلمان کے دائرے میں محصور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے، اقبال اس وقت ایک دوراہے پر ہیں۔ اس حقیقت کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہیں، اس طرح سے پیش کرنا کہ اقبال ہندو اور مسلمان کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل سکیں کلام اقبال اور فکر اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ ڈاکٹر تاثیر نے جب ۱۹۳۸ میں یہ لکھا تھا کہ:

> He was not the begoted communalist which (even) of his so-called admirers make him out to be

تو وہ دراصل اسی فقرے کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس کی ایک جھلک مجھے پریگاریتا نتاشا کے ساتھ بات چیت میں نظر آئی۔

یوں تو میں ایک تیسرے انتہا پسند نظریے کا ذکر کر رہا تھا کہ یہ نظریہ ہمیں مس میسی پینٹس کے یہاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنی کتاب Pakistan Philosophy and Sociology میں لکھتی ہیں:

> He was familiar with western philosophy and science and knew how to present the ideas of religious modernism with theoretical persuation. His desire to bring the teachings of Islam closer to western philosophy and the findings of modern science echoed the mood of the national bourgeoisie and intellectuals who wanted to cast off the burden of the old dogmas and adopt new ideas.

خدا جانے مس میسی پینٹس اقبال اور اسلام دونوں کے متعلق کیا سوچ رہی تھیں جب انھوں نے اقبال کے بارے میں مندرجہ بالا جملے لکھے۔ مس میسی پینٹس کی یہ بات کہ اقبال تعلیم اسلام کو مغربی فلسفے کے قریب تر لانا چاہتے تھے، میری سمجھ سے باہر ہے، کیوں کہ اقبال نے خود اپنے لکچروں کے دیباچے میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

> In these lectures which were undertaken at the request of the Madras Muslim Association and delivered at Madras, Hyderabad and Aligarh, I have tried to meet, even though partially, this urgent demand (for a scientific form of religious knowledge) by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical traditions of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge and the present is quite favourable for such an undertaking.

اس طویل اقتباس سے میرے نزدیک یہ معنی بالکل نہیں نکلتے کہ Iqbal desired to bring the teaching of Islam closer western philosophy یعنی یہ کہ اقبال تعلیمات اسلام کو مغربی فلسفے کے قریب تر لانا چاہتے تھے۔ اقبال کی متذکرہ بالا تحریر کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال الٰہیات اسلامیہ میں عقلی اساسات کی اہمیت بیان کر رہے ہیں۔ اگر علامہ نے انھیں لکچروں میں یہ کہا ہے کہ "ہم علوم جدید کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کرلیں اور انھیں علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں خواہ اپنی اس کوشش

میں ہمیں اپنے پیش رووں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے" تو اس کی تاویل اس طرح سے کرنا کہ اقبال تعلیمات اسلام کو مغربی علوم کے قریب تر لانا چاہتے تھے۔ کئی طرح کی غلط اندیشیوں کے لئے رستہ بنانے کے مترادف ہے کیوں کہ مس میمی چینٹس کی تاویل کے پیش نظر تو مغربی علوم ہی معیار یا کسوٹی بن جائیں گے۔ حالانکہ اقبال کے سارے سلسلۂ فکر میں کسوٹی یا معیار یا مطمح نظر خود اسلام ہے نہ کہ مغربی علوم۔ مغربی علوم والی بات سمجھنے میں مس میمی چینٹس سے سہو ہوا ہے اور انھوں نے فکر اقبال کی تاویل پیش کرنے کے لئے بہت ہی غلط اور خطرناک جادہ پر قدم رکھا ہے۔ اقبال نے اپنے اس نظریے کی وضاحت "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کے پہلے ہی لکچر Knowledge and Religious Lecture (علم اور مذہبی مشاہدات، ترجمہ از نذیر نیازی) میں یہ کہہ کے کی ہے:

> The search for rational foundations in Islám may be regarded to have begun with the prophet himself. His constant prayer was "God grant me knowledge of the ultimate reality of things.

یعنی بقول اقبال۔

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

اس تمام عرض و معروض کے بعد اس سوال کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟

اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ کلام اقبال میں اکثر و بیشتر مواقع پر اقبال کے اولین مخاطب مسلمان ہیں۔ لیکن اسی تخاطب میں پھر بسا اوقات اقبال نے مسلمانوں کے پردے میں سارے عالم انسانیت سے بات کی ہے۔ "ارمغان حجاز" میں قارئین نے دیکھا ہوگا کہ "حضور ملت" اور "حضور عالم انسانی" کے عنوان سے دو ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں مضامین و مباحث قریب قریب ایک ہی طرح کے ہیں۔ پہلے چند رباعیات "حضور ملت" کے عنوان سے پیش ہیں۔

پرد در وسعت گردوں یگانہ   نگاہ او بہ شاخ آشیانہ
مہ و انجم گرفتار کمندش   بدست اوست تقدیر زمانہ

جوانمردے کہ خود را فاش بیند   جہان کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش   کہ او با خویشتن خلوت گزیند

نگہدار آنچہ در آب و گل تست   سرور و سوز مستی حاصل تست
تہی دیدم بسوے این و آں را   مئے باقی بہ مینائے دل تست

نخستیں لالۂ صبح بہارم   پیاپے سوزم از داغے کہ دارم
بچشم کم مبیں تنہائیم را   کہ من صد کارواں گل در کنارم

جواناں را بد آموز است ایں عصر   شب ابلیس را روز است ایں عصر
بہ داماں مثال شعلہ پیچم   کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

زعلمے چارہ سازے بے گدازے   بسے خوشتر نگاہے پاک بازے
نکو تر از نگاہ پاک بازے   دلے از ہر دو عالم بے نیازے

اب "حضور عالم انسانی" کے زیر عنوان دی ہوئی چند رباعیات دیکھیے۔

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد   کہ پیما ید جہان چار سو را
دے آشنائے کہ دل کردند نامش   بخویش اندر کشید ایں رنگ و بو را

دلے چوں صحبت گل می پذیرد   ہما ں دم لذت خوابش بگیرد
شود بیدار چوں "من" آفریند   چو "من" محکوم تن گردد بمیرد

بہ رو ماگفت با من راہب پیر   کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگ خود را   ترا تقدیر و مارا کشت تدبیر

شنیدم مرگ بایزداں چنیں گفت   چہ بے نم چشم آں کز گل بزاید
چو جان او بگیرم شرمسار   دلے او را از مردن عار ناید

ویسے بھی، مومن اور کافر کے بیان کا جہاں تک تعلق ہے اقبال نے بنیادی اہمیت نظریۂ عمل کو دی ہے۔ مثلاً۔

کافر بیدار دل پیش صنم
بہ ز پندارے کہ خفت اندر حرم

اس نظریے کی ایک بہت خوب صورت مثال "اسرار خودی" میں ملتی ہے جب کہ شیخ برہمن سے کہتا ہے۔

تاشدی آوارۂ صحرا و دشت   فکر بیباک تو از گردوں گذشت
باز میں در ساز اے گردوں نورد   در تلاش گوہر انجم مگرد
من نہ گویم از بتاں بیزار شو   کافری، شائستۂ زنار شو
اے امانت دار تہذیب کہن   پشت پا بر مسلک آبا مزن
گرز جمعیت حیات ملت است   کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نہ   در خور طرف حریم دل نہ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور   تو ز آزر من ز ابراہیم دور
قیس ما سودائی محمل نہ شد   در جنوں عاشقی کامل نہ شد

مرد چوں شمع، خودی اندر وجود
از خیال آسماں پیما چہ سود

"جاوید نامہ" میں اس طرح کی متعدد روشن مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً "خطاب بہ جاوید" میں کہ اقبال کے اپنے الفاظ میں "خطاب بہ نژادِ نو" ہے، علامہ کہتے ہیں۔

گر خدا سازد ترا صاحب نظر　　روزگارے راکہ می آید نگر
عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز　　چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن، دین و سیاست عقل و دل　　زوج زوج اندر طواف آب و گل
آسیا آں مرز و بوم آفتاب　　غیر بیں از خویشتن اندر حجاب

اب دیکھیے، بات سارے ایشیا کی ہو رہی ہے۔ اس میں بسنے والی کسی ایک قوم کی نہیں۔ اس میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، بدھ بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں۔ اس سارے ایشیا کو اقبال پہلے تو مرز بوم آفتاب کہتے ہیں اس کے بعد بحیثیت مجموعی سارے ایشیا کو ع

غیر بیں از خویشتن اندر حجاب

قرار دیتے ہیں اور پھر اس موضوع پر شمشیر برہنہ بن کر سامنے آتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

قلب اوبے واردات نو بہ نو　　حاصلش راکس نہ گیرد باد و جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر　　ساکن و یخ بستہ بے ذوق سیر
صید ملایاں و نخچیر ملوک　　آہوے اندیشۂ او لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ　　بستۂ فتراک لردان فرنگ
تاختم بر عالم افکار او　　بر دریدم پردۂ اسرار او

درمیان سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگر گوں کردہ ام

اس کے بعد وہ خوبصورت اشعار آتے ہیں جن کا ذکر اقبال کے فکر و فن کے تعلق سے اکثر ہوتا رہتا ہے۔

من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف　　کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار　　تا کنم عقل و دل مرداں شکار
حرف تہ دارے بہ انداز فرنگ　　نالۂ مستانہ از تار چنگ
اصل ایں از ذکر و اصل آں ز فکر　　اے تو بادا وارث ایں فکر و ذکر
آب جویم از دو بحر اصل من است　　فصل من فصل است و ہم وصل من است

تا مزاج عصر من دیگر فتاد
طبع من ہنگامۂ دیگر نہاد

یہاں پر دو نکتے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اتنی اہم بات وہ سارے زمانے سے کہہ رہے ہیں، صرف مسلمانوں سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "بانداز فرنگ" سے مراد ہے، مغربی فلسفے کے انداز پر۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ فلسفۂ مغرب کو ایک خراج تحسین ادا کر رہے ہیں اور پھر جاوید سے، جاوید کے پس پردہ ساری نسل نو سے، کہہ رہے ہیں کہ خدا تجھے میرے اس سارے فلسفے کا بھی وارث بنائے اور میرے جذبۂ عشق کا بھی۔

یہ حصہ سارے کا سارا، اول سے آخر تک، نئی نسل کے نام پند و نصائح سے لبریز ہے اور یوں تو اس کا ہر شعر حکمت و وجدان سے مملو ہے لیکن میں صرف چند اشعار پیش کروں گا۔

منکر حق نزد ملا کافر است　　منکر خود نزد من کافر تر است

☆

سر دیں صدق مقال اکل حلال　　خلوت و جلوت تماشاے جمال

☆

آدمیت احترام آدمی　　باخبر شو از مقام آدمی

☆

آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن　　بر طریق دوستی گامے بزن

☆

کفر و دیں را گیر در پہناے دل　　دل اگر بگریزد از دل واے دل

"جاوید نامہ" کا ذکر آگیا ہے تو یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس آسمانی سفر کی ابتدا فلک قمر سے ہوتی ہے جہاں اقبال شیو جی مہاراج سے ملتے ہیں اور وہ زندہ رود کو ہنگام طلوع خاور کا مژدہ دیتے ہیں۔ اسی "جاوید نامہ" میں وادی طواسین، طاسین گوتم سے شروع ہوتی ہے اور طاسین زرتشت اور طاسین مسیح سے ہوتی ہوئی تا سین محمد تک پہنچتی ہے۔ "زبور عجم" کے ایک حصے میں تمام غزلوں کا مخاطب انسان ہے۔ اصولی طور پر مذہب، اور قطعی طور پر اسلام، اقبال کے لئے یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن غالب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ "غالب یقیناً ان شعرا میں سے ہے جن کا ذہن اور تخیل انھیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے" (شذرات فکر اقبال، مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، صفحہ ۱۰۲)۔

جہاں تک کلام اقبال کے مخاطب کا تعلق ہے، بقول ڈاکٹر نکلسن اس کا شاعرانہ پیغام محض ہندی مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اس نے عالم اسلام کو مخاطب کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ڈاکٹر نکلسن کی مذکورہ رائے پر مراقش کے پروفیسر ایس۔ آئی۔ فہد کی رائے ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

> اقبال ایک ہمہ گیر شہری ہیں۔ ان کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیاز نسل و ملک سما جاتے ہیں۔ آپ عظمت انسانی کے علمبردار ہیں، اس لئے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے۔

اٹلی کے پروفیسر جی۔ توچی (G. Tucci) لکھتے ہیں:

> ...لہٰذا ہم اس عظیم الشان شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہ سکتے، جس کو شاید ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور جن کا زوردار پیغام صرف مہذب ذہنوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ان سب کے لئے بھی ہے، جو ابھی تک انسانیت کی تقدیر سے مایوس نہیں۔

اقبال نے مادی موت سے بلند ہوکر زندگی جاوداں کا راز صرف ملت اسلامیہ کو نہیں بتایا، بلکہ سارے عالم انسانیت کو بتایا ہے۔ اور انفرادی سطح پر انھوں نے یہ بات انسان ہی سے کہی ہے۔ ان کی آخری نظم (قطعی طور پر آخری نظم) بھی انسان ہی کے متعلق ہے۔

کسی کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجمن سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

آج سے دو ڈھائی سال قبل جب ہم لوگ دنیا کے مختلف حصوں سے اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کے لئے لاہور اور سیالکوٹ حاضر ہوئے تھے تو سری لنکا سے آئے ہوئے نمائندے تیسا وجت رتن نے اپنے مقالے میں کہا تھا:

> ...یہی وہ پیغام تھا جس کی انسان دوستی نے اس کی شاعرانہ کشش کو عالم گیر بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہو، خواہ وہ مسلم پاکستان ہو یا ہندو بنگال، ایران ہو یا روس کی کوئی اسلامی جمہوریہ، چین ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کے مسیحی طلبا کا کوئی اجتماع، یا بودھ طالب علموں کی کوئی ایسی محفل، ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنھیں اسلامی احیا کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے (ترجمہ ڈاکٹر سلیم اختر)۔

اس ضمن میں یہ بھی میں عرض کر دوں کہ ہندوستان میں بعض دفعہ ایک عجیب صورت حال میری نظر سے گذری ہے، اور وہ یہ کہ اقبال پر لکھنے والے چند اہل قلم نے فکر اسلام سے اقبال کی وابستگی کو ایک معذرتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ صرف ایک افسوس ناک صورت حال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ادبی دیانت پر بھی حرف آتا ہے۔ اس صورت حال پر میں اپنے ایک انگریزی مقالے بعنوان Iqbal, Poet and Politician میں جو میں نے چند برس قبل میسور یونیورسٹی میں پڑھا تھا، کسی حد تک بحث کر چکا ہوں، جس میں یہ کہنے کی میں نے کوشش کی ہے کہ ہماری یہ روش ہمیں کلام اقبال کے دیانت دارانہ مطالعے سے دور لے جائے گی۔

اس کے برعکس، ولیم او ڈگس، ایسوشی ایٹ جسٹس سپریم کورٹ آف یو۔ ایس۔ اے۔ کی یہ رائے جو حفیظ ملک کی کتاب Iqbal Poet Philosopher of Pakistan میں ان کے لکھے ہوئے پیش لفظ میں موجود ہے، زیادہ وقیع ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔

> The great need these days is for bridges of understanding between east and west The need is for bridges of understanding at the highest intellectual levels so that divergent civilizations, each great in its own right, may come to know and understand each other. Iqbal was a voice from the east. He found a common denominator with the west and helped build the universal community that tolerates all differences in race, in creed, in language.
>
> In deep humility I pay tribute to the name of Iqbal and send up a prayer in gratitude that this man was permitted to pass among us.
>
> For these reasons I say that although Iqbal was a son of Pakistan, we of America also claim him.

حضرات! اب یہاں اقبال کے کلام سے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کے عوض۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

☆

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ

☆

شمع کی طرح سے جس بزم گہ عالم میں

☆

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

☆

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی

☆

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

☆

مہ و ستارہ کہ در دل شرق ہم سفرانند

یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سورج اگرچہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق سے اس کی مناسبت ازلی اور ابدی ہے، لیکن اس کے باوجود خورشید کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے انوار سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب، افلاک، زمین، ہر ایک کو منور کرتا ہے اور اس مثال کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ کیا اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں؟ میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں، ہندوستان، بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں، ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں ☆☆☆

نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد (قلم اور روشنائی) عمل: جینت پرمار عطیہ از مصور

استفہام واستعجاب   (پیسٹل)، عمل: سنکیت مہاپاتر   عطیہ از مصور

غزل

جگن ناتھ آزاد

شمارہ ۱۷۹،
جنوری ۱۹۹۵

کیا گلہ کیف کا، کم کا بھی زمانہ نہ رہا
اب کسی سوختہ دم کا بھی زمانہ نہ رہا

نغمۂ شوق کی اس دور میں کیا بات کریں
کہ جگر کاوی غم کا بھی زمانہ نہ رہا

نگہ شوق کو ارباب کرم کی ہے تلاش
جب کہ یاروں کے ستم کا بھی زمانہ نہ رہا

دل مایوس اب اس دور میں آخر کب تک
اب تو ارباب ہمم کا بھی زمانہ نہ رہا

اب کر آزاد کسی اور زمانے کی تلاش
کہ علم کا بھی قلم کا بھی زمانہ نہ رہا

تنکے، آندھی اور میں

جلیس نجیب آبادی

شمارہ ۲۵۷،
جون ۲۰۰۲

راہ میں چھوٹ گیا ہے کیا کیا

وہ گھنا پیڑ
جو ساون کی جھڑی میں اکثر
کچی دیواروں کے خس پوش کو باہوں میں چھپا لیتا تھا

کشت زاروں کی وہ پگڈنڈیاں
جن پر مجھسیں
مسکراتی ہوئی، شرماتی ہوئی
رات کے افسانے کہا کرتی تھیں

کتنے سرگوشیاں کرتے ہوئے کھنڈروں کا فسوں
وہ چھتیں
جن کی منڈیروں پہ جلا کرتے تھے
دو آنکھوں میں
میری یادوں کے دیئے

نیم تاریک دریچے میں وہ پر بستہ کبوتر
کبھی سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
جن کی خاموش زباں
خوب سمجھتی تھیں نگاہیں میری

کوئی بھیگا ہوا آنچل
کوئی پھیکا کاجل

راہ میں چھوٹ گیا ہے کیا کیا

جلیس نجیب آبادی

شمارہ ۲۷۳،
اکتوبر ۲۰۰۳

برستی رات کی یادیں ہیں کیا، بتاؤں اسے
جو ہو سکے اسی بارش میں دیکھ آؤں اسے

اگر یقین ہو مجھ کو منانے آئے گا
تو روٹھنے کی طرح روٹھ کر دکھاؤں اسے

یہ کیسی آرزو لیتی ہے دل میں انگڑائی
وہ مجھ کو یاد کرے اور میں بھول جاؤں اسے

وہ حال پوچھے، میں زعم انا میں کھو جاؤں
اور اس کے بعد بہت دیر تک رلاؤں اسے

بس اس کے گرم تنفس کا لمس کافی ہے
متاع غیر ہے سینے سے کیا لگاؤں اسے

تمام گھر کی چھتیں صبح سے برستی ہیں
میں ایسی رات میں کس طرح ساتھ لاؤں اسے

دو چار دن یہاں ٹھہرے گا لوٹ جائے گا
جو مجھ میں شہر خلا ہے وہ کیا دکھاؤں اسے

جمال احسانی

شمارہ ۱۰۰،
اگست، ستمبر ۱۹۷۶

(ساقی فاروقی کے لئے)

راتیں مبارک ساعتوں والی اور دن برکت والے
میری پونجی کب لوٹائے گا نیلی چھت والے

حد نگاہ تلک پھیلا ہے ان دیکھا آسیب
گوشۂ دل میں جھلمل جھلمل دیپ عبادت والے

چاروں جانب رچی ہوئی ہے اشکوں کی بوباس
اس رستے سے گزرے ہوں گے قافلے ہجرت والے

ایک کلی مہکائے ہوئے تھی پورے باغ کا باغ
اس کی گلی کے سارے لوگ تھے اچھی عادت والے

کبھی یہ آنکھیں خود بھی اڑا کرتی تھیں پتنگ کے ساتھ
دور دریچے سے ہوتے تھے اشارے حیرت والے

پچھلی رات کے قہر سے پہلے کی ہے بات جمال
اپنی جھولی میں تھے چند ستارے قسمت والے

جمال احسانی

شمارہ ۱۱۵،
جون ۱۹۸۰

کوئی پرساں ہی نہ ہم دل زدگاں کا نکلا
شہر کا شہر اسی دشمن جاں کا نکلا

نئی بستی میں سبھی لوگ پرانے تھے مگر
ہم جہاں کے تھے کوئی بھی نہ وہاں کا نکلا

خس و خاشاک رہ عشق ہوئے تو ہم سے
اور اک رشتہ نسیم گذراں کا نکلا

زیست خمیازۂ ادراک ہے اور کچھ بھی نہیں
پس ہر سنگ اک آئینہ زیاں کا نکلا

چارہ سازوں میں تھی اک چشم ندامت آثار
یہ مسیحاؤں میں بیمار کہاں کا نکلا

زینۂ ذات پہ دزدانہ قدم رکھتا ہوا
قافلہ کس کے تعاقب میں گماں کا نکلا

تیرا انجام ہوا جو وہی ہونا تھا جمال
اس جہاں میں تو کسی اور جہاں کا نکلا

جمنا پرشاد راہی

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر ۱۹۷۶، جنوری، فروری ۱۹۷۷

دیار سنگ میں رہ کر بھی شیشہ گر تھا میں
زمانہ چیخ رہا ہے کہ بے ہنر تھا میں

لگی تھی آنکھ تو مریم کی گود کا تھا گماں
کھلی جب آنکھ تو دیکھا صلیب پر تھا میں

تمام شہر میں جنگل کی آگ ہو جیسے
ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی خبر تھا میں

عجب مسافت وہم و یقیں میں تھا کہ جہاں
کبھی نظر کا کبھی دل کا ہم گذر تھا میں

ہوائے وقت نے پتھر بنا دیا ورنہ
لچکتی شاخ سے ٹوٹا ہوا ثمر تھا میں

اماں کہاں تھی مرے سائے میں کہ رکتا کوئی
خود اپنی آگ میں جلتا ہوا شجر تھا میں

جمیل الرحمٰن

شمارہ ۱۹۵،
جون ۱۹۹۶

دل کی پکار گنبد بے در میں رہ گئی
فریاد گونج بن کے مرے سر میں رہ گئی

کوئی بیان عشق مکمل نہیں ہوا
یہ کیسی نارسائی مقدر میں رہ گئی

تیشہ بدست کھوجتے ہیں شہر سنگ میں
وہ آگ جو دبی ہوئی پتھر میں رہ گئی

لوح دعا بنا لیا سارے وجود کو
جب آرزوے وصل ہی منظر میں رہ گئی

اس گل بدن کی خوشبو ہوا سے اڑی جمیل
اب اپنے گھر کی بات کہاں گھر میں رہ گئی

شمارہ ۲۷۴،
نومبر ۲۰۰۳

مٹھی میں خواب کی ہوں ستارے تو کیا کریں
وہ چاند ہی کے عکس اتارے تو کیا کریں

دنیا تو خیر یوں بھی کسی کی نہیں ہوئی
جب تم بھی ہو سکے نہ ہمارے تو کیا کریں

نکلے تھے خود میں دشت و سمندر سمیٹنے
سنبھلے نہ ہم سے اپنے کنارے تو کیا کریں

کھلتے نہیں ہیں پھول اچانک بہار میں
سب منحصر بہ صبر ہو پیارے تو کیا کریں

گر جیتنے کے ہوں سبھی از بر جسے جمیل
اپنی رضا سے بازی وہ ہارے تو کیا کریں

ماجرا اپنا

جمیل مظہری

شمارہ ۱۹،
دسمبر ۱۹۶۷

عقل کے مشورے سنے تو جمیل
زندگی کا مزہ مگر نہ ملا
لذت غم سے آشنا نہ ہوئے
انبساط دل و نظر نہ ملا
مختصر ہے یہ ماجرا اپنا
سر ملا اور درد سر نہ ملا
سر ملا اور سرخوشی نہ ملی
سر ملا اور سنگ در نہ ملا
اس جبیں پر کوئی نشاں بھی نہیں
داغ کیا خاک آستاں بھی نہیں
زندگی کو ہر ایک پہلو سے
آزما آزما کے دیکھ لیا
دین و دانش کے پنگھٹوں پہ گئے
دل کو چلو بنا کے دیکھ لیا
حرم و دیر بھی دکانیں تھیں
ہم نے دونوں کو جا کے دیکھ لیا
مے کدے میں بھی کچھ نہیں ملتا
پی کے دیکھا پلا کے دیکھ لیا
ہاتھ تھاما نہ ہوشیاروں نے
لڑکھڑا لڑکھڑا کے دیکھ لیا
لائے خالی وفا کا ظرف گلی
جلتے چولھوں سے راکھ بھی نہ ملی

کیسی شادی کہاں کا غم اے دوست
پا کے کھویا نہ کھو کے کچھ پایا
نہ کبھی دھوپ نے عنایت کی
نہ کہیں مہرباں ہوا سایہ
خار و خس پر بھی اعتبار کیا
رنگ و بو کا فریب بھی کھایا
پہنچے لالہ رخوں کے باغ میں بھی
پھول کیا زخم تک نہیں پایا
خاک لے کر گئے بیاباں سے
خار چن لائے کچھ گلستاں سے
شوق بھٹکا کیا ادھر سے ادھر
چارۂ سوزش دروں نہ ملا
چاہا پلکوں پہ کچھ چراغ جلائیں
مگر اتنا بھی دل میں خوں نہ ملا
عقل اک مستقل عذاب رہی
زندگی کو کوئی جنوں نہ ملا
عمر ساری کٹی فسانوں میں
اور کوئی معتبر فسوں نہ ملا
حرص تک اقتدار کی نہ ملی
چھاؤں بھی اعتبار کی نہ ملی
ہم نے خون جگر دیا اس کو
زرد پتی بھی اک چمن نے نہ دی

گل بھی ہم سے ہنسی چرائے رہے
بو بھی نسرین و یاسمن نے نہ دی
سایہ آفتاب میں ٹھٹھرے
اور حرارت کسی کرن نے نہ دی
ذوق ایثار شوق عصیاں کی
داد یزدان و اہرمن نے نہ دی
ہر دو حالت میں دل رہا شاکی
جیب خالی رہی تمنا کی
اپنی محرومیوں کا راز یہ ہے
کوشش ناروا نہ کی ہم نے
اپنے دل پر ستم کیا لیکن
دوسروں پر جفا نہ کی ہم نے
دشمنوں کو ہمیشہ سمجھے دوست
دوستوں سے دغا نہ کی ہم نے
مے سے بے شک بھگو لیا دامن
خوں سے رنگیں قبا نہ کی ہم نے
یعنی شیطاں سے بے وفائی کی
اور خدا سے وفا نہ کی ہم نے
ہم سے رہزن بھی رہ نما بھی خفا
ہم سے شیطان بھی خدا بھی خفا

جمیل مظہری

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

اے لال ظفر اوگانوی نام
اے حیرتی طلسم الفاظ
برسے گا ضرور بن کے بادل
سیال گرہ تو کھل سکے گی
اقدار نمائے عالم نو
لیکن یہ نجوم کی براتیں
ظلمت کی تہیں ہٹا سکیں گی؟

تمہید میں گرچہ ہو گیا طول
کیا تم نے کہا سبھی ہیں تنہا؟
ہر عہد میں آدمی تھا تنہا
دونوں کی سرتیں الگ تھیں
جب تو ہر آدمی ہے تنہا
اس معرکۂ زار نار و گل میں
تنہا ہے سفر ہر آدمی کا
ہے سوز جگر کا کون ساتھی
جب وہ بھی ہو دور جو کہ ہے پاس؟
ہر قرب کو بعد کا گلا ہے
ایثار سر اپنا کیوں نہ پھوڑے؟
انسان ازل سے خود غرض ہے

اے میرے عزیز روشن آغا
زخموں کے چمن کدے میں خوش گام
اے عبرتی زوال معنی
لیکن یہ سوال ہے عزیزم
زردی چہروں کی ڈھل سکے گی؟
اے چہرہ کشائے صبح فردا
ہر گام پہ کارواں بناتی
یا اپنی ہی تیز روشنی میں
اب تم سے ہے ایک بحث معقول
اس عہد کے آدمی ہیں تنہا
آدم بھی رہے یہاں اکیلے
دو مشت غبار دو کف خاک
دانی و ابلہی ہے تنہا
ہر فرد کی زندگی جدا ہے
کاندھے پہ جنازہ ہے خودی کا
ساتھی ہے ہر اک مگر نہیں ہے
کیوں ہو نہ اکیلے پن کا احساس
جب عشق کی بھی خودی ہو بنیاد
تنہائی جو لعنت خودی ہے
ہے یہ کہ قدیم یہ مرض ہے

اے میرے عزیز فرخ انجام
اے خلوتی دماغ استاد
سینہ میں تمھارے یم بہ یم ہے
کھیتوں کو نمو بھی دے سکے گا
اے جان حزیں پئے غم نو
اٹھواؤ نگاہ کا بھی پردہ
ہر راہ کو کہکشاں بناتی
کردیں گی گم آپ اپنا رستہ
اے وقت کے شور میں اکیلے
اس عہد پہ کچھ نہیں ہے موقوف
ہر چند تھیں ان کے ساتھ حوا
گو پھیل کے بن گئی ہے دنیا
گم راہی و رہبری ہے تنہا
پیمانہ سرخوشی جدا ہے
بٹتا نہیں بوجھ زندگی کا
سب گرم سفر ہیں کارواں میں
دو شخص اگرچہ روبرو ہیں

کیوں لفظ وفا کرے نہ فریاد
یہ خودنگری و خودگری کا
ہر فرد اکیلے پن کا بیمار
اے جلوتی دیار ارشاد
پگھلی ہوئی آگ کا جو پانی
پیاسوں کو سبو بھی دے سکے گا
اے ریگ تپاں پہ شبنم نو
کرتے تو ہو روشنی کی باتیں
لو ذہن کی بھی بڑھا سکیں گی؟

معروض یہی ہے دست بستہ
انچاس کرور میں اکیلے
ہر عہد میں آدمی تھا تنہا
دونوں کی طبیعتیں الگ تھیں
تنہائی مگر ہے ان کی میراث
یعنی اس حشر مستقل میں
سیرابی و تشنگی جدا ہے
ہے فکر و نظر کا کون ساتھی؟
لیکن کوئی ہم سفر نہیں ہے
پھر بھی صدیوں کا فاصلہ ہے
جب فرض بھی اپنا عہد توڑے

از بس کہ نتیجہ منطقی ہے
ہر شخص کو بیش و کم یہ آزار

جمیل مظہری

شمارہ ۳۹،
اگست ۱۹۶۹

بلاؤ اس کو زباں داں جو مظہری کا ہو
مگر ہے شرط کہ اکیسویں صدی کا ہو

یقیں وہی ہے جو آغوش تیرگی میں پلے
سواد وہم میں ہمسایہ روشنی کا ہو

بتوں کو توڑ کے ایسا خدا بنانا کیا
بتوں کی طرح جو ہم شکل آدمی کا ہو

مرا غرور نہ کیوں ہو سرور سے خالی
جب اس کے بھیس میں اک چور کمتری کا ہو

لگائے قلقل مینا بھی قہقہے واعظ
جو تجزیہ ترے اس ناز تشنگی کا ہو

بہت بجا ہے یہ مذہب کی موت پر ماتم
مگر کوئی تو عزادار شاعری کا ہو

ہے وقت وہ کہ مسلم ہو آذری اس کی
صنم کدوں میں صنم، ذہن مظہری کا ہو

تصرف اس پہ ہو سو کا کہ ایک ہی کا ہو
ہماری پیاس بجھے میکدہ کسی کا ہو

پکار ہے کہ امین سبو و جام ہو کون؟
یہ اس کا حق ہے جو ہمدرد تشنگی کا ہو

خدا گری کا یہ جذبہ بہت مبارک ہے
گر اس کے ساتھ اک احساس خودگری کا ہو

جو دل کے ناز اٹھائے جو دل کی قدر کرے۔
کوئی ضرور نہیں ہے کہ دل اسی کا ہو

اٹھوں میں فرش سے تم اپنے عرش سے اترو
کہ ایک سطح پہ امکان دوستی کا ہو

وہ روشنی سے ڈرے ہو جو تیرگی کا مرید
وہ تیرگی سے نہ بھاگے جو روشنی کا ہو

جو اس کی آگ کو تاپے وہ مظہری کا نہیں
تپے جو آگ میں اس کی وہ مظہری کا ہو

جوگندر پال

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

اپنے آفس میں داخل ہو کر میں اپنی کرسی پر آ بیٹھا ہوں اور گھنٹی کے بٹن پر انگوٹھا رکھ دیا ہے اور گھنٹی کی آواز سنتے ہی اپنی میز کے سامنے تیز تیز آ کھڑا ہوا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنے آپ سے کیا کام کراؤں۔

گھنٹی بج رہی ہے اور میں اپنے سامنے مودب کھڑا اپنے حکم کا منتظر ہوں اور متعجب ہوں کہ گھنٹی کیوں بجتی جا رہی ہے۔

کچھ نہیں... میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے بٹن سے اپنا انگوٹھا ہٹا لیا ہے۔

میرا چپراسی گھیرو اندر داخل ہوتا ہے اور ہمیشہ کے مانند مجھے دیکھنے کے لئے سب سے پہلے میری کرسی کے اوپر نہرو مرحوم کی تصویر کی جانب دیکھتا ہے۔

گڈ مارننگ سر... اپنی دانست میں وہ میری مادری زبان میں اپنی نمسکار پیش کرتا ہے۔

نمسکار۔ میں گویا اسے حیرت میں مبتلا کرنے کے لئے اپنی دانست میں اس کی زبان میں جواب دیتا ہوں اور اپنی توقع کے مطابق اسے اپنے اوپر شادماں سی حیرت طاری کرتے ہوئے پا کر مجھے یوں ہی خیال آتا ہے کہ ہمارے مجلسی آداب ہمیں حیرت کا اس قدر عادی بنا دیتے ہیں کہ جب واقعی حیران ہونے کا کوئی موقع پیش آئے تو حیران ہونا ہمیں یاد نہیں رہتا۔

کوئی آیا تھا؟

یونیورسٹی سے وی۔سی۔ کا فون آیا تھا سر۔

وی۔سی کا فون؟... میں تیزی سے یونیورسٹی کا ٹیلیفون نمبر گھمانے لگتا ہوں۔ کیا کام ہو سکتا ہے وی۔سی کو؟ آج تین سو دو کمیٹی کی میٹنگ ہے شاید... تین، چار... نمبر کا آخری ہندسہ گھما کر میں ریسیور کو خوب دبا کر کان کے ساتھ جوڑ لیتا ہوں۔ گھوں... گھوں... گھر. ٹیلیفون سے بزی کی آواز برآمد ہو رہی ہے۔ ہیلو! ہیلو! پرنسپل کمار ہیئر! مجھے وی۔سی۔ سے بات کرنا ہے۔ گڈ مارننگ سر! میں پرنسپل کمار... ہیلو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا سر! ہیلو؟ آئی ایم ساری سر۔ آئی ایم ناٹ کیچنگ یو... گھوں... گھ... ابھی تک یونیورسٹی میں کسی نے ٹیلیفون نہیں اٹھایا ہے... ہیلو، وی۔سی پلیز! ہیلو سر! آپ کی یونیورسٹی کی ٹیلیفون سروس بڑی بور ہے۔

پہلے تو آپریٹر کی آواز کا انتظار کرتے کرتے کان اپنے آپ بولنے لگتے ہیں اور پھر آپ کی آواز سنائی دینے لگتی ہے تو یا تو کان اچانک بند ہو جاتے ہیں یا آپ کا ٹیلیفون... سر؟ ہہ ہہ ہا... بات یہ ہے پرنسپل کہ ٹیلیفون اپنے فزکس کے ڈاکٹر کے ڈاکٹر راگھو کا اسپیشل سبجیکٹ ہے۔ انھوں نے آپریٹر کو وارن کر رکھا ہے کہ کچھ خرابی ہو تو ٹیلیفون آفس کے بجائے ان ہی کے ڈیپارٹمنٹ کو یاد کیا جائے۔ ہیلو! پرنسپل، ہمارا یونیورسٹی ٹیلیفون آفس فزکس ڈپارٹمنٹ کی اللیگل ایکس ٹینشن (illegal extension) بنا ہوا ہے... ہہ ہہ ہا ہا... ہیلو! ہیل... گھوں گھاں... ! یونیورسٹی میں کوئی ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھا رہا؟ میں اپنے چپراسی گھیرو سے پوچھتا ہوں۔ اور وہ نہایت معقول جواب دینے کے لئے چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہتا ہے... ٹک! ہاں اٹھا لیا ہے! ہیلو! پرنسپل کمار ہیئر! وی۔سی پلیز ٹک! ہیلو! وی۔سی۔ پلیز! نہیں ہیں؟ کانفرنس روم میں ہیں۔ میٹنگ؟ (تین سو دو کمیٹی کی میٹنگ؟) وہیں کانٹیکٹ کروا دو بھئی۔ پرنسپل کمار ہیئر۔ تھینک یو۔ ہیلو! ہیل... سر، پرنسپل کمار ہیئر! آپ نے مجھے فون کیا تھا؟ برتھ ڈے؟ کس کا؟ اوہ۔ آپ کے بڑے بیٹے رما کانت کا، جو افریقہ میں فرنچ گورنمنٹ کی سروس میں ہے؟ ہیلو... مسٹر رما کانت کی فرنچ سٹیزن شپ (French citizenship) کنفرم (confirm) ہو چکی ہے؟ ہاؤ ونڈر فل سر! ہاں، ہاں، رما کانت تو پارٹی پر نہیں ہوں گے پر۔ ہاں، جی ہاں، برتھ ڈے ان ایبسینشیا! (Birthday in absentia) آپ کے فادرلی فیگر (Fatherly gifure) اتنے ٹنڈر (tender) ہیں کہ... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنے فقرے کو کیسے مکمل کروں... آپ چاہتے ہیں کہ مسٹر رما کانت کی طرف سے برتھ ڈے کیک میں ہی کاٹوں؟ ہاؤ کائینڈ آف یو! (How kind of you) ہاں سر، رما کانت میری ہی عمر کے ہیں، یعنی مجھ سے دو ڈھائی ماہ چھوٹے ہیں۔ میری برتھ ڈیٹ؟ مجھے اپنی برتھ ڈیٹ اچانک بھول جاتی ہے اور میں یوں ہی کہہ دیتا ہوں۔ چودہ ستمبر... ارے! اچھا! آپ بھی چودہ ستمبر کو ہی پیدا ہوئے؟ واٹ اے کوانسیڈنس! (What a coincidence) اسی لئے میں آپ سے اتنا ذہنی رابطہ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کی میٹنگ چل رہی ہے ورنہ اور باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے... میں سینٹیمینٹل (sentimental) تو ساؤنڈ (sound) نہیں کر رہا سر؟ میرا تو یقین

ہے کہ ذہنی رشتے خون کے رشتوں سے بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ آپ میرے گورو ہیں سر... اپنے لہجے میں رقت محسوس کر کے میں لاشعوری طور پر گھیروا کی طرف قہر بھری نظر سے دیکھنے لگا ہوں اور اس بے چارے نے شاید جھکی جھکی آنکھوں سے مجھ سے کہا ہے: آپ میرے باپ ہیں سر! میں تنک کر گھیروا سے مخاطب ہوا ہوں۔ اب یہاں کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ! نو، آئی ایم ساری سر! ٹیلیفون کرتے کرتے میں ذرا اپنے چپراسی سے مخاطب ہوا تھا، ڈسٹرب کر رہا تھا۔ آپ کی میٹنگ ہو رہی ہے اور میں آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کر رہا ہوں -- ارے، جی ہاں، یہ تین سو دو کمیٹی کی میٹنگ ہے؟ پچھلے سال اس کمیٹی نے مجھے ایگزامز کا اتنا کام سونپ دیا تھا کہ... اب کے بھی... ٹھیک ہے سر، جو مناسب سمجھیں۔ میرا کام تو اپنا فرض... دیکھئے مسز چھترے ہے نا؟ اس سال تو اسے ہسٹری پینل کی چیرمین شپ ملنی ہی چاہئے۔ آپ مسز چھترے کو نہیں جانتے؟ ہمارے کالج کی ہی پروفیسر ہے۔ اکتوبر میں آپ اس کی پانچویں میرج اینیورسری (marriage anniversary) پر تشریف لے گئے تھے۔ جی ہاں، وہی نہایت عمدہ رس گلے بناتی ہے۔ اس کا ہزبینڈ اپنی پروفیشنل ٹریننگ کے لئے آج کل ناروے میں ہے۔ یس سر! جی میں آج شام کو ضرور آؤں گا۔ مسز کمار کو بھی لاؤں گا۔ مسز چھترے؟ یس سر، مسز چھترے کو بھی لے آؤں گا۔ تھینک یو سر، بائی۔

میں ریسیور کو کریڈل میں ڈال دیتا ہوں۔

تم یہاں ابھی تک کیوں کھڑے ہو؟

سر وہ لڑکا آیا ہوا ہے۔ آپ نے بلایا تھا۔

وہ کل لڑکی والا قصہ۔ ہاں، اندر بھیج دو۔

میرے سامنے میز پر اس لڑکے رام گوپال کا ہندی میں لکھا ہوا رجسٹرڈ لیٹر رکھا ہے جو اس نے بی۔ کام سکنڈ ایر کی مس آئینگر کو لکھا تھا۔

رام گوپال اندر داخل ہو رہا ہے۔ اجلے اجلے دیسی لباس سے اچانک جادوئی انداز سے برآمد ہوتا ہوا۔ میلا سا چہرہ، جس کے سر کے بال صاف اس لئے ہیں کہ اس کی شکل کی حد بندی ہو جائے۔ میں اس کی طرف بہ غور دیکھ رہا ہوں۔ وہ ذرا بوکھلا سا جاتا ہے اور لگتا ہے کہ اس بوکھلاہٹ میں اس کی لانگ دار دھوتی ڈھیلی ہو کر نیچے کرنے لگی ہے۔

کیا تمہیں لفظ 'پریم' کا پورا مطلب آتا ہے؟

میں خود ہی کسی شریر طالب علم کی طرح اپنے کو جواب دیتا ہوں۔

پورا نہیں ادھورا آتا ہے۔

ہاں، پریم بھی اندھوں کا ہاتھی ہے۔ جس نے جو حصہ چھو لیا وہی پریم۔ پریم نرا منہ ہی منہ ہے، یا نرا سینہ یا پونچھ۔ نہیں پریم پیٹ ہے، صرف پیٹ، مگر آج کل اندھوں نے انگلیوں سے چھو چھو کر پریم کی سالم شبیہہ دیکھ لی ہے۔ تو یہ ہے ہاتھی! کتنا بڑا جانور ہے! نرا پرا جانور!

بولو، کیا تم پریم کا پورا مطلب سمجھتے ہو؟ یا آدھا، یا ایک چوتھائی؟ بولو، خاموش کیوں ہو؟

رام گوپال اپنی دھوتی کو ڈھیلا محسوس کرنے لگا ہے۔

میں... مجھے... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے سر۔

یہ کند ذہن لڑکا مجھے سمجھا رہا ہے اور کیا نام ہے اس کا؟ اس لڑکے نے... راہو نے... بلا تکلف مجھے بتایا تھا، دیکھئے سر، آپ مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کیجئے۔ میں آپ کو، اپنے ہر بزرگ کو، اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ وہ مجھے سمجھ سکے۔ ہم نئے لوگ آپ کے اعمال کو مثالی کیوں قرار دیں؟ ہم فطری طور پر ان اعمال کو ترجیح دیں گے جو ہمیں اپنی نئی دنیا کے قریب تر رکھیں۔ ہم خود اپنے آپ پرنسپل پروفیسر اور ماں باپ بننا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی بہتری کے قوانین بنانے کے ذمہ دار خود آپ ہیں۔

راہو کی باتیں سن سن کر رام گوپال کی دھوتی کی طرح میری پتلون ڈھیلی ہو گئی تھی۔

مجھے رام گوپال پر غصہ آنے لگا۔

کیا تم اپنے بڑوں کے بنائے ہوئے قوانین کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہو؟

جواب میں راہو میرے ذہن میں بولنے لگا ہے۔

ہاں۔ ٹوٹل ریفیوزل (total refusal) سر، آپ مجھے اس لڑکی سے ملنے سے اس لئے منع کر رہے ہیں کہ آپ میری ضرورت کو محسوس کرنے کے نااہل ہیں۔ میں نے ضرورت محسوس کی تو اسے فوراً بھگا لے جاؤں گا۔ نہیں، بھگانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، کیوں کہ آپ کی اتھارٹی آپ کے جامد وجود سے وہیں تک نافذ ہے جہاں آپ کا دو فٹ لمبا دایاں بازو پہنچ سکتا ہے اور بس۔

میں نے رام گوپال کا رجسٹرڈ لیٹر پکڑ کر اپنا دایاں بازو اپنی کرسی سے پورے دو فٹ کی لمبائی تک پھیلا دیا ہے اور اُس سے بڑی غصیلی آواز میں پوچھا ہے۔

دیکھو، یہ لو لیٹر کیا تمہارا لکھا ہوا ہے؟

جی ہاں، میں نے ہی لکھا ہے۔ مگر یہ لو لیٹر نہیں ہے۔ مس آئینگر میری...

مس آئینگر تمہاری کیا لگتی ہے؟... (مسز چھترے، میری کیا لگتی ہے؟)

کیا لگتی ہے بہن؟ کیا بہنوں کو بھی لو لیٹر لکھے جاتے ہیں؟

کیوں نہیں لکھے جاتے سر؟

(ہاں بے بستر محبت بھی تو کی جا سکتی ہے، یعنی درمیان میں کچھ فاصلہ چھوڑ کر آمنے سامنے کرسیاں ڈال کے۔)

مدن گوپال کو شاید پہلی بار اپنی دھوتی کے کسے ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔

کیا بہنوں کو پریم پتر نہیں لکھے جا سکتے سر؟

(تم اپنی چھٹیوں میں تو محبت کے کلاسکس کا ذکر کرتے ہو کمار مگر بات چیت میں صرف ٹیکسٹ بکس کا۔)

ہاں، چھترے، محبت صرف تحریر میں ہی بے داغ معلوم ہوتی ہے۔
آواز میں خلل ہوتے ہی وہ پہلی تنفس بات یہی پوچھتی ہے چلو کہاں چلیں؟)

مجھے خیال آیا ہے کہ مدن گوپال کا خط تو میں نے ابھی تک پڑھا ہی نہیں۔

اپنا یہ خط پڑھ کر سناؤ۔

میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا ہے کہ گھیرو داس آئینگر کو بھی بلا لائے۔ مدن گوپال کے چہرے کے خطوط پر تعظیم، خفت و خفگی کی شدت سے اپنی جگہ سے اڑ اڑ کر اس کے کھڑے بالوں سے باہر نکل رہے ہیں، جس سے اس کی شکل کی حد بندی ٹوٹ گئی ہے۔

آپ خود ہی پڑھ لیجئے سر۔

میں اٹک اٹک کر ہندی پڑھنے کا عادی ہوں لیکن اپنی یہ کمزوری تسلیم کر کے اس کی خفت کم کرنے کی بجائے میں نے آرڈر دیا ہے۔

میں تمہارے الفاظ تمہارے ہی منہ سننا چاہتا ہوں۔ پڑھو!

پریہ بہن مس آئینگر...

ہاں، ہاں، بولو!

پریم بڑا گاڑھا شبد ہے۔ اس رنگ میں رنگ کر کسی کا اپنا رنگ نہیں رہتا۔ سارے رنگ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔

میں سیاہ رنگ کا خیال کر کے دل ہی دل میں ہنس رہا ہوں۔

میں بھی سارے کا سارا تمہارے سچے پریم میں رنگ گیا ہوں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ جی بھر کے دیکھ لو، پرکھ لو۔ واستو میں آج کے جھوٹے سنسار میں سچے پریم کی پرکھ کوئی کھالا جی کا گھر نہیں۔ جھوٹے سچے نجر آتے ہیں اور سچے، جھوٹے۔ پر یہ بہن، وشواس نہ کرو گی تو دھوکا کھاؤ گی۔ کئی گنڈے... میرا مطلب اپنی کلاس کے کئی ودیارتھیوں سے ہے، شریفوں کا بھیس بدل کر تمہاری اجت لوٹ لے جائیں گے پر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

ایک اور محاورہ! یہ بے وقوف لڑکا اپنی حماقتوں کے بارے میں اٹک اٹک کر کیوں نہیں سوچتا تاکہ سیدھے سادے جملے لکھے یا اپنے اظہار کے لئے نئے محاورے بنائے؟ یا شاید یہ سوچنے کا عادی ہی نہیں اس لئے اندھا دھند اپنے باپ دادا کے محاورے بولتا جا رہا ہے۔

مدن گوپال کی پشت پر مس آئینگر کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ بے اختیار پیچھے دیکھتا ہے اور پھر فوراً سنبھل کر گویا وہاں کچھ نہ پا کر اپنا سر پھر آگے گھما لیتا ہے۔

پڑھتے جاؤ... تم بیٹھ جاؤ۔

مس آئینگر بیٹھ جاتی ہے۔

سکھ چین سے بچ کر رہو۔ اس روز سکھ چین نے ہی تم پر چاک کا ٹکڑا پھینکا تھا۔ پر یہ بہن، میری تو بس یہی اچھا ہے کہ کوئی تمہارے کیریکٹر پر انگلی نہ اٹھائے۔ تم کھوب بڑھو پھلو اور تمہارا کسی بڑے لڑکے سے ووداہ ہو۔ اور ہاں، بھلا مجھے دیکھ کر تم ڈر کیوں جاتی ہو؟ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو شادی سے پہلے اپنی پتنی کو بھی بہن سمجھتے ہیں۔

میں مسکرانے لگا ہوں۔

مس آئینگر اچانک اپنے ساڑی کے پلو کو آنکھوں پر رکھ کے بے اختیار رونے لگتی ہے۔

ارے! رونے کیوں لگیں؟

یہ ہمیشہ مجھے تنگ کرتا رہتا ہے سر۔ راہ چلتے روک لیتا ہے اور سمجھانا شروع کر دیتا ہے۔ میں اس کی کیا لگتی ہوں؟ آپ اس سے پوچھئے سر، اس کی لگتی کیا ہوں؟

بہن۔

شٹ اپ، مدن گوپال!

میرا جی چاہ رہا ہے کہ کھلکھلا کر ہنس پڑوں۔ شاید لڑکی اس لئے رو رہی ہے کہ بہن کہلوانا اسے ناپسند ہے اور یہ لڑکا اس لئے مطمئن ہے کہ اس نے بہن ہی تو کہا ہے۔

دیکھو مدن گوپال تمہیں دراصل کسی سے پیار ویار نہیں۔ تمہیں صرف اپنی باتوں سے اپنے آپ سے پیار ہے۔ آئندہ کسی بہن کے گلے میں باہیں ڈالنے کو جی چاہے تو چپکے سے اپنے ہی گلے میں باہیں ڈال لیا کرو۔ سمجھے!

جاؤ! خبردار آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہ دینا۔ تم بھی جاؤ مس آئینگر۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ تیسری گھنٹی میں مجھے انگلش آنرز کلاس میں نئے ادب کے موضوعات پر لیکچر کرنا ہے۔ نئے ادب کے موضوعات...

تمہیں کوئی بہن پکارے تو سٹپٹا کیوں جاتی ہو بھئی؟

اس لئے کہ میرے صرف ایک ہی بھائی ہے جو بچپن سے مجھے بہن پکارتا چلا آ رہا ہے، اور... اور کوئی غیر مرد مجھے بہن کا نام دیتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے اسے شک ہو کہ میں ابھی بچی ہوں۔ سو میں چڑھ جاتی ہوں۔

ہاں، ہمارا بالغ رشتہ صرف ایک ہے، جنسی رشتہ۔ باقی سب رشتے تو تلے ہیں۔ جنسی رشتہ صرف مرد اور عورت کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ اس سے مرد اور عورت اپنے آس پاس سے، اپنے جہان سے بھی جڑ جاتے ہیں۔ جنسی رشتے سے آدمی اپنی جذبات آفریں خواہشات کا غلام بن کر کمینگی کو اپنے کمینہ پن کا باعث نہیں سمجھتا۔ ان خواہشات سے اس میں جینے کی سوجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے اور اس کا نقطۂ نظر بے لاگ ہوتا ہے۔ انھیں پورا کرتے ہوئے نہ صرف اسے حظ محسوس ہوتا ہے بلکہ وہ کسی جواں مرد، خوش باش کسان کے مانند اپنی نوع کا بیج بھی بو جاتا ہے۔ یہ خواہشیں نہ ہوں تو زندگی بے واقعہ ہو جائے۔ گناہ کی تمنا غیر فطری نہیں، عمل حیات کا ہی خاصہ ہے کیوں کہ گناہ اور بدی سے بھی زندگی کی ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے اور اس جملہ ہیئت میں گناہ بار آور ہو کر ایسے ہی معصوم معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بدکار عورت کا نوزائیدہ بچہ۔

نئے ادب کے موضوعات... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے سوچنے کا

یہ انداز طلبا کے کچے پکے ذہنوں کے لئے ضرر مند ہے۔

مس شیرف، چند روز ہوئے میں نے اپنی سوشیالوجی کی نئی لیکچرر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا، آپ کی سوچ اتنی بے باک، صحیح اور موثر ہے کہ میں ڈرنے لگا ہوں آپ کے طلبہ یونیورسٹی کے امتحان میں فیل ہو جائیں گے۔

مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے وہ میری طرف محظوظ سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔ نان سنس، پرنسپل، واٹ ڈو یو مین؟

آئی مین، آپ کو ٹیچر کی روایتی ذمہ داریاں بھی قبول کرنا ہوں گی۔ آپ کی اوریجنل تھنکنگ (original thinking) ہمارے فاضل ممتحنوں کی خفگی کا باعث بن سکتی ہے، کیوں کہ ہماری تعلیمی ناپ تول میں تھنکنگ اور اوریجنلٹی کی گنجائش بہت کم ہے۔

دراصل میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں، میری رائے کو یک سر نظر انداز کر کے تم اپنے انداز میں پڑھاتی جاؤ مس شیرف۔ رائٹ اپروچ (Right approach) یہی ہے مگر میں نے اپنا منہ پکا کر لیا جیسے میں نے کوئی بڑی اہم بات کہی ہو مگر اس کی اہمیت کو غیر اہم سمجھتا ہوں۔ مجھے خواہش ہو رہی تھی کہ میرا لٹکا لٹکا، غیر جانب دار اور سنجیدہ چہرہ میری آفیشل ذمہ داری کی غیر ذمہ دار احتیاط پر ہنس ہنس کر تن جائے۔

مس شیرف، ہمیں اپنے تازہ دم طلبا کے لئے ان لوگوں سے فرسٹ کلاس مارکس لینے ہیں جو علم کی کھوج کرتے کرتے اب تھک گئے ہیں۔ ان معززین نے ایک عرصے سے سوچنا بند کر رکھا ہے، یعنی وہ نہیں سوچتے بلکہ کئی کئی سال سے ان کی سوچ خودکار ہو چکی ہے۔

اگر یہ درست ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ آپ درست کہہ رہے ہیں، تو ان حالات میں ہمیں اپنی درس گاہوں سے فرسٹ ریٹ تھرڈ ڈویژن پیدا کرنے چاہییں۔

مس شیرف، آپ بھی تھرڈ ڈویژنر ہیں۔

دراصل اس پوسٹ کے لئے اسے کئی فرسٹ ڈویژنرز پر ترجیح دی تھی حالاں کہ ایکسپرٹ کا اعتراض تھا کہ یونیورسٹی تھرڈ ڈویژنر کے تقرر کی منظوری نہیں دے گی۔ اس تقرر کی منظوری کی درخواست بھیجنے سے دو ایک روز پہلے مجھے وائس چانسلر سے ملنے کا اتفاق ہوا، یا یوں کہئے کہ میں نے ایسے حالات پیدا کر لئے کہ اس ملاقات کو محض اتفاق پر محمول کر لیا جائے۔

سر، میں نے وائس چانسلر کو بتایا، کل شام کو میں آپ کی آرٹس فیکلٹی کے ایک پروفیسر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ وہاں دیواروں پر میں نے تین نہایت عمدہ فوٹو فریم دیکھے۔ بس آپ پوچھئے نہیں۔ ایسے خوب صورت فریم ابھی تک میرے دیکھنے میں نہیں آئے۔

بھئی فوٹو فریم ہی تو تھے۔ تصویروں کی بات کرو۔

تصویر وہاں کوئی نہیں تھی سر۔ ان فریموں میں پروفیسر نے اپنی تینوں ڈگریاں جوڑ رکھی تھیں، سکنڈ کلاس بی۔اے۔، فرسٹ کلاس ایم۔اے۔، اور ڈاکٹر آف فلاسفی۔

وائس چانسلر ہنسنے لگا۔

کون چغد تھا وہ جو اپنے مہمان کو سب سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بی۔اے۔، اور ایم۔اے۔ اور یہ اور وہ ہے، اور اگر یقین نہ ہو تو یہ ہیں سندیں... ہہ ہا ہہ... کون تھا وہ؟ پرنسپل، مجھے یہ بتاؤ، کیا علم برتر کو دو یا تین کلاسوں میں بانٹا جا سکتا ہے؟ فولش!

میں آپ سے پورے طور پر متفق ہوں۔ ہم نے تو اپنے کالج میں سوشیالوجی کی پوسٹ کے لئے ایک ایسی لیکچرر کو ترجیح دی ہے جو تھرڈ کلاس ہے مگر سر، وہ ایسی ذہین ہے کہ ہمارے مدبرین شاید اسے فیل ہی کر دیتے۔

ہہ ہا ہہ! بہت ناٹی ہو تم پرنسپل، مگر میں خوش ہوں کہ تم نے اس لڑکی کو فرسٹ کلاسرز پر ترجیح دی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مس شیرف ایجوکیشن میں اپنے مختصر سے قیام کے بعد ہی اپنے پیشے سے بیزار ہو گئی ہے۔ اس بیزاری کا کچھ تو یہ سبب ہو گا کہ ہمارے ناقص معیار نے اس کی غیر معمولی ذہانت کو تھرڈ کلاس قرار دے کر اسے خواہ مخواہ کا کمپلکس کا شکار بنا دیا اور کچھ یہ کہ معمولی دماغی صلاحیتوں کے لوگ ہمارے ودیا کے مندروں میں محض فرسٹ کلاس اور سینئر ہونے کی وجہ سے اٹوٹ بتوں کے مانند پوجے جاتے ہیں۔

محمود غزنوی کی طرح مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں، ورنہ میں اتنا بڑا سومناتھ توڑ پھوڑ کر ہی دم لیتی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ یہ پیشہ چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاؤں اور ہر بار کسی ایسی فلم میں کام کروں جہاں مجھے کسی چالیس سالہ پروفیسر کی بیوی بننا ہو اور پھر دیکھوں، بابا کتنے پانی میں ہیں۔

مس شیرف چاہتی ہے کہ اس کے طلبہ معاصرانہ مجلسی مسائل کو اپنے اپنے ذاتی تجربے بنالیں اور ان تجربوں کی روشنی میں غلط سلط نتائج پہ پہنچ کر اسے پریشان کر دیں۔

پرنسپل کمار، یہ نتائج دراصل غلط سلط نہیں ہوتے، غلط سلط ہوتے ہوتے ہم ہی ہو جاتے ہیں۔ کوئی دو تین برس کا بچہ جب ڈوبتے سورج پر اچانک نظر پڑنے پر خوشی سے تالیاں بجانے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ دیکھو، سورج نکل رہا ہے، تو وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہوتا اور نہ ہی اس کا مشاہدہ اپنے تاثر کے اعتبار سے غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے خام اوائل کی کوششوں کے نتائج بالآخر غلط ثابت ہوتے ہیں تو عمر کے آخری مشاہدوں سے بھی ہمیں یہی پتہ چلتا ہے کہ ذرا پہلے کے نتائج صحیح نہ تھے۔

تو...

تو یہ پرنسپل، کہ ہماری ہر فکری کوشش عمر کے مختلف حصوں میں ہماری ذہنی حالت کے عین مطابق ہوتی ہے اور اس لئے عین مناسب اور فطری۔ دراصل اگر بڑھاپے کا شعور بچپن میں ہی آ جائے اور زندگی میں حماقتوں کی گنجائش نہ رہے تو ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ حماقت کو ہی دانش مندی کی معراج قرار دینے لگیں۔

مس شیرف کو ڈیکورم (decorum) اور گڈ مارل مینرز (Good moral manners) سے بھی چڑ ہے۔

گڈ مارلز ان لوگوں کی محبوب اصطلاح ہے، جس میں پوری طرح جینے کی جرأت نہ ہو۔ سوشیالوجسٹ کے نزدیک لائف کوئی فکشن نہیں کہ اچھے اچھے الفاظ میں جھوٹ کو سچ باور کرا لیا جائے۔ زندگی اولاً پڑھنے کے لئے نہیں، جینے کے لئے ہے اور سوشیالوجی پڑھنے کے لئے صرف جینا بھی کافی ہے۔

میں اپنی بات کی ایک مثال پیش کرتی ہوں۔

ایک سیمنار میں مس شیرف نے طلبہ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

آج کل یورپ اور امریکہ میں نوجوان عورتیں شادی کے لئے عام طور پر بوڑھوں کا انتخاب کرتی ہیں اور شادی کے بعد اپنے انتخاب سے بہت خوش نظر آتی ہیں۔ یہ امر میرے لئے کئی شکوک کا باعث ہو رہا ہے اور سوشیالوجسٹ ہونے کے تعلق سے میں سوچتی ہوں، کیوں نہ میں کسی بوڑھے سے چند روزہ شادی کر کے اپنے شکوک رفع کر لوں؟

گذشتہ ایک ماہ میں میں نے کئی بار مس شیرف کو اشارے اشارے میں سمجھایا ہے کہ پڑھانے کا یہ انداز ہمارے مشرق کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے منافی ہے... مشرق کی تہذیبی اور اخلاقی قدریں! میں ہنس دیتا ہوں قدریں وہ ضروری ہوتی ہیں جن کی ضرورت انسان کو ہو، یا وہ جن کی ضرورت مشرق کو ہو؟ دراصل اکثر یوں ہوتا ہے کہ اپنے اسٹاف کے دوسرے اراکین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے میں اپنے آپ پر ہی نکتہ چینی کر رہا ہوتا ہوں۔ وہی باتیں میں بھی کرتا ہوں جن کے لئے اوروں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہوں۔ اور ایسا کر کے مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو بھی متنبہ کر دیا ہے۔ شاید اپنے آپ کو متنبہ کرنے کا یہی فطری طریقہ ہے۔

ار۔ را! تیسری گھنٹی شروع ہونے میں صرف سات منٹ رہ گئے ہیں مگر میں نے اپنا لیکچر... میں نے سوچ لیا ہے کہ آج اپنا لیکچر بڑا جنرل سا بنا لوں گا اور کلاس کو ذرا پہلے ہی چھوڑ دوں گا (پروفیسر ڈیسائی آپ کے بارے میں یہ شکایت ہے کہ آپ ہر روز اپنی کلاس کو ٹائم سے پہلے ہی چھوڑ دیتے ہیں...) آیئے، آیئے پروفیسر ٹماڈے!

پروفیسر ٹماڈے بڑے اولڈ فیشن کا اولڈ بیچلر ہے۔ عقل ذرا موٹی ہے پر ہے بڑا محنتی۔ مس شیرف کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا (مس شیرف کو یہ عادت ہے کہ کسی شخص کو محبت یا نفرت سے بغور دیکھتی ہے تو دوسری آنکھ سے کام لینا بھول جاتی ہے۔) اول تو وہ کسی موضوع پر بات جاری رکھنے کی بجائے اپنی خاموشی سے اس موضوع پر یہی روشنی ڈالتا ہے۔ میں یونی ورسٹی کا گولڈ میڈلسٹ ہوں، لیکن اگر وہ بولنے لگتا ہے تو جھٹ پٹ موضوع کے ارد گرد اونچی اونچی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔ مس شیرف میری اکادمی زندگی کی کامیابی کا یہی راز ہے، بس موضوع کو فوراً گھیر لو! گھیر لو؟ گھیر کر کیا کرو گے؟ اسے لپیٹنا شروع کر دو گے؟ کوئی بات کہیں ختم نہیں ہوتی ٹماڈے، بلکہ بات بات میں اپنا آپ کسی اور بات کو سونپ دیتی ہے، تم بڑی سطحی ہو شیرف... اور تم گہرا ہونے کے لئے اپنا سر پاؤں میں لٹکائے رکھتے ہو ٹماڈے... تم میری انسلٹ کر رہی ہو؟ تو جاؤ پرنسپل کو رٹن رپورٹ (written report) دے آؤ؟ شٹ اپ! یو شٹ اپ! ان دونوں کی شادی کا خیال مجھے بڑا فطری معلوم ہوتا ہے۔ ذہانت اپنی جنس مخالف سے لاکھ ناراض نظر آئے، پردے پردے میں وہ اسے گلے لگا کر رکھتی ہے۔

کہئے پروفیسر ٹماڈے، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ آپ اجازت دیں تو آپ کی کلاس آج میں ہی لے لوں۔

(چلو یہ بھی اچھا ہوا!) کیوں؟

آپ کے بعد آنرز کلاس میں میرا ہی پیریڈ ہے، مگر ڈبل پیریڈ چاہئے۔ ڈکنس کو ختم کرنا ہے۔

میں ہنس پڑا ہوں۔ اصل میں ہم ادب کے اساتذہ کا یہی فریضہ ہے کہ کلاسیکی مصنفین کو ختم کیا جائے۔ قصور بے چارے ان ہی مصنفین کا ہے کہ اپنی موت کے ساتھ ختم نہیں جاتے، اور پھر ہم اساتذہ انھیں سال بہ سال بہ یک وقت ان گنت درس گاہوں میں ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ مرکھپ کر پھر آئندہ سال ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ کلاسیکی مصنفین اپنے اس مقدر کے ذمہ دار خود آپ ہی ہوتے ہیں کہ موت کے بعد بھی بار بار موت کے گھاٹ اتارے جائیں۔

ہاں، پروفیسر، آپ ضرور ڈکنس کو ختم کیجئے (بسم اللہ۔ چھری کتنی کند ہے! چلو کوئی بات نہیں، روح کے ہی ٹکڑے کرنے ہیں۔)

پروفیسر ٹماڈے کے جانے کے بعد گھنٹی کا بٹن دباتا ہوں اور گھیروا سے کہتا ہوں کہ اکاؤنٹنٹ کو بلا لائے اور مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں کام سے لدا پڑا ہوں اور میرا انگوٹھا از خود پھر گھنٹی کا بٹن دبانے لگتا ہے، گویا میں لاشعوری طور پر اپنی مصروفیت کے احساس کو تیز تیز بجا رہا ہوں۔

کچھ نہیں۔ میں نے گھیروا کو دیکھ کر کہا ہے۔

اکاؤنٹنٹ اپنے لیجر لئے کچھ اس طرح داخل ہو رہا ہے کہ مجھے یہ گمان گذرے کہ آج حساب کتاب میں ضرور گڑبڑ ہے، تاکہ چیکنگ پر کسی گڑبڑ کا انکشاف نہ ہو تو وہ مجھے شکست خوردہ پا کر بہت خوش ہو۔

وہ رسید کا رجسٹر میرے سامنے کھول دیتا ہے۔

رجسٹر میں اپنے آدھے دستخط ثبت کر کے مجھے خیال آتا ہے کہ میزان چیک کر لوں۔ چھ اور چار، دس۔ دس اور آٹھ، اٹھارہ اور آٹھ، چوبیس۔ نہیں، چھبیس۔ مسز انو چھترے کو ہسٹری پینل کی چیرمین شپ نہ دی گئی تو وہ مجھے اپاہج سمجھنے لگے گی۔ چھبیس اور نو... عورت کے یہاں مرد صرف طاقت کا ایک تخیل ہے۔ کمار۔ طاقت؟ جسمانی یا ذہنی؟ پینتیس۔ پینتیس اور سات، بیالیس۔ چالیس کے اوپر پہنچ کر آدمی کے ذہن میں بہار آنے لگتی ہے۔ میں بتاؤں مس شیرف، یورپ اور امریکہ کی لڑکیاں بوڑھوں سے کیوں شادی کرتی ہیں؟ ہمارے دور میں آدمی بوڑھا ہو کر ہی جوان ہوتا ہے، اس وقت جب اس کی سوچ سے ماں کے دودھ کی بو آنا بند

ہو جائے اور وہ اپنے چہرے میں خود آپ نظر آنے لگے۔ یہی وہ چہرہ ہے جس پر لڑکیاں مرتی ہیں۔ اپنے لئے خود آپ سوچنا انھیں بڑا مشکل لگتا ہے، اس لئے مردوں کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کی دھاریں انھیں طاقت کا نشان بن بن کر نظر آتی ہیں۔

میں میزان کو وہیں چھوڑ کر اپنے ادھورے دستخط کو پورا ثبت کر دیتا ہوں اور اکاؤنٹنٹ ابھی اپنی کتابیں سمیٹ ہی رہا ہوتا ہے کہ اپنے راؤنڈ کے لئے آفس سے باہر نکلتا ہوں اور باہر آ کر سوچنے لگتا ہوں کہ سائنس لیباریٹریز کا رخ کروں یا آرٹس لیکچر ہالز کی طرف۔ باعمل ذہانتوں کی دیکھ بھال کرنا ان کے کام میں خواہ مخواہ دخل انداز ہونا ہے۔ نگہداشت تو بے عمل ذہانتوں کی کرنی چاہئے جن کا کام باتیں بنانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ لوگ سوچنے کو ہی عمل کا جواز سمجھ لیتے ہیں اور اپنی سوچ کے اظہار کے وقت سوچنا بند کر دیتے ہیں۔

آپ عمدہ باتیں کر لیتے ہیں۔

کالج کا چارج لئے ابھی مجھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ مسز چھترے مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔

اور آپ کی دلچسپ گفتگو سن سن کر معلوم ہوتا ہے پرنسپل کمار کہ آپ فکری عادات سے لاتعلق ہیں۔

خوبصورت عورت کو ذرا جھنک دیا جائے تو اس کی خوف آمیز چیخ پر اکثر فلسفی کا گمان گزرتا ہے۔

نہیں مادام، میں سوچنے کا اس قدر عادی ہو گیا ہوں کہ مجھے سوچنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یا اس وقت آتا ہے جب کسی خوش گوار اتفاق سے آپ جیسی خوبصورت عورت کے ذہن کی طرح میرا ذہن بھی بالکل خالی ہو۔

عورت کا ذہن خالی نہیں ہوتا، صرف باقرینہ ہونے کی وجہ سے کھلا کھلا معلوم ہوتا ہے۔

اس کا کہنا سچ تھا، کیوں کہ میرا ذہن میرے اسٹڈی ہال کی طرح اتنا کھلا ہونے کے باوجود قدرے بے قرینہ ہے کہ بہ وقت ضرورت ہزار سر پٹکنے پر بھی کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ میری زندگی کے بیش تر ضروری امور وہیں کہیں چھپ کر بے فیصلہ پڑے رہتے ہیں اور ایک عرصے کے اس بے فیصلہ پن سے آخر ان سے متعلق کوئی بھی فیصلہ غیر اہم معلوم ہونے لگتا ہے۔ مثلاً.. مسز چھترے ہی... کئی سال سے میں مسز چھترے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ کئی سال سے میرے اور اس کے درمیان ایک بے نام، بے آواز سا رشتہ ہے جس سے متعلق میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اور اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو جس طرح ہے وہی ٹھیک ہے۔ اس بے لفظ رشتے کے سب نشانات جانے کہاں کن انباروں کے نیچے دھنسے ہوئے ہیں۔ کون انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سر کھپائے پھر اور سر کھپا کھپا کر انھیں ترتیب وار رکھ کے ان کا کوئی واضح یقین کرے اور پھر اگر جرأت ہو تو اس رشتے کا کوئی بڑا پیارا اور واضح نام دھر کر اس کا باقاعدہ اعلان کرے اور اپنا بنا بنایا جہان درہم برہم کر دے۔ یا یہ نہیں تو اس واضح تعین کے بعد کسی بزدل کی طرح سہم کر اس بے آواز رشتے پر کان ہی نہ دھرے اور سب خاموش، منتشر گونجوں کو دل و دماغ سے خارج کر کے اپنی ہستی ویران کرے۔ اگر اس انتشار اور ابہام سے ہی مجھے اپنے باقاعدہ ہونے کی تُوہ ملتی ہے تو میں اپنی بے قاعدگی کو کیوں ترک کروں؟ اگر میں بھی مسز چھترے کے مانند اپنے ذہن کو باقرینہ رکھنے کی کوشش کروں گا اور منتشر کاغذات کا فائل میں جوڑنے کے لئے بیٹھوں گا (میرے آفس میں ماضی بعید کے فائل مقفل اور بے کار پڑے ہیں) تو مجھے ہر کاغذ غیر اہم معلوم ہونے لگے گا اور یوں میں اپنی ہستی کے ایک ایک حوالے کو پھاڑ کر خالی الذہن ہو جاؤں گا۔ عورت کائنات کا بھی ہجوم سمیٹ کر اتنی بھری بھری ہو کے بھی خالی خالی نظر آتی ہے مگر مرد اگر عورت کا قرینہ اپنا لے تو خالی خالی نظر آنے کے لئے سچ مچ خالی خولی ہو جائے گا۔

سب ٹھیک ہے میں اپنے آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ جس طرح ہے، اسی طرح چلنے دو۔

میں آرٹس فیکلٹی کے کاریڈارز میں آ پہنچا ہوں۔

پروفیسر مانو یکر یہاں ہال نمبر ۱۳ میں اقتصادیات پڑھاتے ہوئے اتنی خرخیلی آواز میں بول رہا ہے کہ کاریڈار کے سامنے سائیکل اسٹینڈ میں طلبہ کے سائیکلوں کے پہیے کھڑے ہوئے گھومتے نظر آ رہے ہیں۔ مجھے اپنے ہال کے آگے گذرتے دیکھ کر وہ بولتے بولتے ذرا سا رکا ہے اور پھر اس کی آواز اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ اپنا مطلب اٹھانا تو درکنار، اپنا آپ بھی اٹھانے سے قاصر ہے۔ اگلے ہال میں پروفیسر دیش مکھ چپ چاپ بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہا ہے اور طلبا ہولے ہولے باتیں کر کے جماعت کے ماحول میں ایک بے چین گھٹن پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے باہر گذرتے دیکھ کر طلبہ خاموش ہو جاتے ہیں اور پروفیسر لکھنا چھوڑ کر جو لکھا ہے اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہے، اور پروفیسر نماڈے ڈکنس کے مزاح پر اتنی حواس باختہ سنجیدگی سے بحث کر رہا ہے گویا اس کی عدم موجود بیوی اس کی سارے مہینے کی تنخواہ سے اپنے لئے نئی ساڑی خرید لائی ہو اور وہ اس مضحکہ خیز چویشن پر اپنے آنسو روک رہا ہو۔

میں بائیں برآمدے کی طرف مڑ جاتا ہوں جہاں پہلے ہی ہال میں پروفیسر منظور حسین پٹیل سیاسیات پڑھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر پٹیل عمر میں ہم سب سے بڑے ہیں اور ان کی بزرگی کی وجہ سے سبھی اساتذہ ان کی موجودگی میں ان سے بڑی تعظیم سے پیش آتے ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں ان کی اس طرح نقلیں اتارتے ہیں جیسے طلبہ اپنے اساتذہ کی۔ پروفیسر پٹیل کو کالج کے بچوں سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ بوڑھے کیوں نہیں۔ پچھلے ہفتے وہ ایک ہندوستانی فلم دیکھ کر آئے۔ اس فلم میں ایک بچہ اتنا سمجھدار تھا کہ شروع میں اس کا باپ اس کی نصیحتیں سن سن کر گھر سے بھاگ نکلا اور آخر میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے کم سن بیٹے کے قدموں پر آ گرا۔ واہ واہ... واہ، بھئی فلم دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی (پٹیل صاحب کو خوشبوؤں سے الرجی ہے خواہ وہ شیشی سے آئیں خواہ براہ راست پھولوں سے)۔ عمر بہ عقل است نہ بہ سال، یعنی عین ممکن ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں در اصل آپ پچپن برس کے ہوں۔ پروفیسر پٹیل کا بس چلے تو بچے

پیدائش پر ہی چہروں پر جھریاں لے کر آئیں۔ واہ! واہ! کیا نورانی چہرہ ہے! خوش آمدید مولانا، بڑی لمبی عمر لے کر آئے ہو۔ یہ مٹی، بہتر برس تو پہلے ہی جی آئے ہو۔ اب دو چار اور جی لو۔

لیکن کئی بار مجھے خیال آتا ہے کہ علم کے ادراک کا دوسرا نام بڑھاپا ہی ہے۔ بچے ہماری درس گاہوں میں بوڑھے ہونے کے لیے ہی آتے ہیں۔ ہم اپنے طلبہ کی طبیعی توانائیوں کو بڑے انداز میں تھکا تھکا کر مجہول کر دیتے ہیں اور وہ ہمارے علم کی لاٹھیوں کا سہارا لے کر درس گاہوں سے قدم دھرتے ہیں تو انھیں بے اختیار یہ خواہش ہونے لگتی ہے، کاش یہ دنیا، دنیا ہونے کی بجائے بوڑھا خانہ ہوتی جس میں داخل ہو کر ہم مزے سے زندگی کے بقیہ دن کھاٹ پر پڑے گذار دیتے!

.... بے علم لوگ بڑی بے جگری سے لڑ لڑ کر اپنے جینے کا سامان کرتے ہیں اور باعلم ہو کر لڑنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو بتا دیتے ہیں کہ لڑنا عبث ہے۔ ہم ہار جائیں گے۔ ہم بے بس ہیں۔ ہر پڑھا لکھا آدمی بوڑھا ہے، میری طرح بوڑھا۔

اس دن میں کتنا ڈر گیا تھا! سویرے سویرے اٹھا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے سر کے بالوں کے گچھے جابجا برف ہو چکے ہیں، مانو میرا خون ان تک پہنچنا بند ہو چکا ہو۔ یہاں خون پہنچنا بند ہو چکا ہے۔ اب یہاں بھی پہنچنا بند ہو جائے گا۔ اب یہاں بھی، اور اب میرے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ خوف سے میرا دل منہ کی طرف کھنچنے لگا، گویا مجھے لقوے نے آلیا ہو۔ میں آئینے میں اپنی ڈاڑھی کے بالوں کو گھورتے جا رہا تھا۔ ان کی سفیدی میرے چہرے کی کبھی کبھی جڑوں میں چمک رہی تھی۔ کیا میں واقعی اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں؟ کیا واقعی؟ ان چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے چارپائی پر سوئے سوئے رات بھر میں ہی عمر کی ساری مسافت طے کر لی ہے؟ ڈر سے میری پوری کھلی ہوئی آنکھیں مجھے پھٹی پھٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ سونے سے پہلے میں نے میڈیکیٹڈ سوپ (medicated soap) سے سر دھویا تھا جس سے میرا خضاب اتر گیا ہے۔ مقررہ میعاد سے کئی روز پہلے ہی میں نے اپنے بالوں پر خضاب کی نئی تہیں لگا دیتا ہوں کہ اپنے بڑھاپے کی جھلک نہ پاؤں اور ہر روز ڈاڑھی خوب چھیل چھیل کر صاف کرتا ہوں۔ جب میں پہلے روز کالج میں آیا تھا تو مسز چھترے نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہمارا پرنسپل کوئی بہت بوڑھا آدمی ہوگا مگر آپ تو بہت جوان ہیں.... یہ سن کر میں جی بھر کے خوش ہو گیا تھا اور شاید اس لمحے سے اس سے عشق کرنے لگا تھا لیکن.... اگر وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لیتی تو.... تو.... میرا دل چاہا کہ کسی فالتو بوڑھے کے مانند اپنی بے بسی پر رو دوں۔

ریڈنگ روم کے قریب پہنچ کر مجھے شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ میرا ہر قدم بڑھاپے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ریڈنگ روم سے مس شیرف برآمد ہوئی ہے۔

گڈ مارننگ، اولڈ مین!

مس شیرف نے مجھے کسی انگریزی جہاز کے میس میں کام کرنے والی ایک لڑکی کا قصہ سنا رکھا ہے۔ جو اپنے باس سے فلرٹ کرنے کی ابتدا ہر صبح کو ہمیشہ اسی طرح کرتی۔

گڈ مارننگ، اولڈ مین!

مس شیرف بڑی خوش نظر آ رہی ہے۔ ہمارے خوش شکل نوجوان لائبریرین سے مل کر وہ ہمیشہ موڈ میں آ جاتی ہے۔

گڈ مارننگ، بیٹا۔

میں سر جھکائے اسے جواب دے کر آگے نکل جاتا ہوں۔ وہ "بیٹا" سے چونک کر ذرا رکی ہے۔ پھر ہنس کر (اس نے اپنے کندھے بھی اچکائے ہوں گے جس سے وہ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے) اپنے راستے ہولی ہے۔

ریڈنگ روم سے دائیں برآمدے میں آ کر میں پھر اپنے آفس کی طرف ہو لیا ہوں اور اپنی ذہنی کیفیت کے عین مطابق آس پاس دیکھے بغیر (بوڑھا آدمی باہر کی بجائے اپنے اندر دیکھتا ہے) تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا اپنے آفس تک آ پہنچا ہوں اور پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوتا ہوں۔

سامنے کرسی پر مسز چھترے بیٹھی ہے۔

تم؟

جیسے وہ میرے اندر کی حالیہ گھٹن سے گھبرا کر میرے وجود سے باہر آ گئی ہو۔

مجھے تم سے ایک نہایت ضروری بات کرنا ہے کمار۔

وہ احتیاطاً دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔

اگر تمھارا چپراسی باہر بیٹھا ہے تو اسے چائے لانے کے بہانے بھیج دو۔

میں نے گویا اپنے منہ کا بٹن دبا کر پکارا ہو۔ گھیرو!

یس سر!

وہ فوراً اندر آ گیا ہے۔

جاؤ دو چائے لے آؤ۔

باہر نکلتے ہوئے گھیرو شاید بلاوجہ ذرا مسکرایا ہو... مگر مجھے بے چین سا خیال آیا ہے کہ وہ مسز چھترے کو اور مجھے تنہا پا کر اکثر یوں ہی مسکرا دیتا ہے۔ احمق!

ہاں بھئی، کہو!

دیکھو کمار، میں نے آج اپنے شوہر کو چٹھی لکھ دی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔

میں اپنے ذہن کے کباڑ خانے میں تیز تیز گم شدہ حوالوں کو ڈھونڈنے لگتا ہوں۔

کیا مطلب؟

میں نے اپنے شوہر کو لکھ دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے طلاق لے لیں۔

میں اتنا گھبرا گیا ہوں کہ میرے بجھے بجھے بڑھاپے کا نوعمر شعور تن کر کھڑا ہو گیا ہے۔

مجھ میں اب اور برداشت کرنے کی سکت نہیں رہی کمار۔ تم اور میں.... اس طرح کتنی دیر اور...؟

میں اسے ٹوکتا ہوں۔

تم اپنی یہ چٹھی پوسٹ کر چکی ہو؟

ہاں۔

اور تم نے چٹھی میں میرا بھی ذکر کیا ہے؟

نہیں۔ جب اسے چھوڑ رہی ہوں تو اس سے اسے کیا غرض؟

چلو یہ اچھا ہوا، ورنہ میں جو رول ادا کرنے کی سوچ رہا ہوں اس کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جاتا۔

میں خلاف معمول بڑی آہستگی اور وقار اور احتیاط سے بول رہا ہوں اور اپنی آواز کو ذرا اونچا کرنا چاہتا ہوں اور میری آواز میری خواہش کو نظر انداز کر کے از خود دھیمی ہو ہو کر نہایت صریح ہو رہی ہے۔

الو، کیا تم نے سوچا ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ تمہارے بچوں، میرے بچوں، تمہارے شوہر اور میری بیوی پر کیوں کر اثر پذیر ہوگا؟ نو ینگ وومن، مجھے ٹوکو نہیں، صرف سنو۔ ہم اپنے جذباتی رشتے کو سوسائٹی سے کبھی تسلیم نہیں کروا سکیں گے، شاید اپنے آپ سے بھی تسلیم نہ کروا سکیں۔ تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو گی تو اچانک اپنے ماضی کا خیال کر کے تمہاری نظر ڈبڈبا جائے گی۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تمہیں محسوس ہوگا کہ تم اپنی نظر سے بچ بچ کر میری طرف دیکھ رہی ہو...

میں نے اپنی آواز میں اتنی پر چین صراحت کبھی محسوس نہیں کی ہے۔

الو، تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے اور غلطی کے ازالے کے لئے میں تمہارا گاڈ فادر بن کے تمہارے شوہر کو چٹھی لکھوں گا ☆☆☆

رہائی

جوگندر پال

شمارہ ۳۰،
ستمبر ۱۹۶۹

ایک دفعہ میں اپنی لائبریری کا تالا کھول رہا تھا کہ اندر سے مجھے آوازیں سنائی دیں۔

میں ٹھٹک گیا۔

یہ آوازیں میری پرانی کہانیوں کے کرداروں کی تھیں۔

یہ لوگ کیوں کر میرے الفاظ کی قید سے آزاد ہو کر کتابوں سے باہر نکل آئے ہیں؟

میرا ایک کردار دوسروں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا:

"میرے دوستو، سال ہا سال سے ہم سے وہی فقرے بلوائے جا رہے ہیں، اسی ایک واقعات کے چکر میں ہم سب کو محبوس کیا گیا ہے۔ میرا یہ سوال ہے۔ نئے واقعات، نئے خیالات، زندگی کے نئے اسباب کی راہیں ہم پر کیوں بند کی گئی ہیں؟... ہم نے اپنی اپنی جان کی بازی کھیل کر اپنی رہائی کا یہ اقدام کیا ہے۔ آؤ، اس کھڑکی کی راہ سے نکل جائیں، آؤ جلدی کرو، باہر نئی زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے..."

جب میں اندر داخل ہوا تو ہال خالی پڑا تھا۔

میں نے جلدی جلدی یکے بعد دیگرے اپنی سب پرانی کتابوں کو کھول کر دیکھا، پر محض الفاظ کے سوا مجھے وہاں اور کچھ نہ ملا ☆☆☆

"زیر غور" کے بعد

زبان قلم

ذکاء الدین شایان

کے تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ

قیمت : ۸۰ روپے

ناشر

ادبی حلقہ

"جدید فکر" پیلی بھیت ۲۶۲۰۰۱

سوکھی ریت

جیلانی بانو

شمارہ ۲۰۲

جنوری ۱۹۹۷

ڈیفنس کالونی کا وہ ایک سربلند مکان تھا۔ خوبصورت، امپورٹیڈ سازو سامان سے سجا ہوا۔ اپنے مکینوں کی دولت اور اعلیٰ ذوق کا خوبصورت اظہار۔

مسز بانو کے کھلے دل اور بلند قہقہوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سکہ وقت پر چلتا ہے۔ خوشیاں ان کے پیچھے دوڑتی ہیں۔

"آپ ٹھنڈا لیں گی یا کافی؟"

"بادام لیجئے۔"

"چلغوزے کھائیے۔"

"مالٹے پسند ہیں یا سیب؟"

"آپ کے لئے میں نے سالم بکرے روسٹ کروائے ہیں۔ کابل سے ایک کوک آ گیا ہے۔ ویسے پشاوری چپلی کباب اور لاہور کا چرغہ، کراچی کا کٹاکٹ... آپ اپنی پسند بتائیے نہ... جائز کھانے پسند ہیں یا کانٹینینٹل ڈشیں..."

پیرس کے پرفیوم سے مہکتی، امریکن میک اپ سے چمکتی، پاکستانی خلوص سے دمکتی ہوئی ہماری میزبان ہمرفیق نے پوچھا۔

"بس اب اور کچھ نہیں۔ میرا خیال اتنے کھانوں سے ایک بھوکے ہندوستانی کا پیٹ بھر جائے گا۔" سب ہنسنے لگے۔

"یہاں سے کلفٹن بہت قریب ہے۔ کھانے کے بعد آپ کو آئس کریم کھلانے وہاں لے جائیں گے۔" ایک مہمان خاتون نے بڑے خلوص سے میرے پاس آ کر کہا۔ (اس محفل میں ہر مہمان ہمارا میزبان بنا ہوا تھا۔)

"اب آئس کریم کا پروگرام کسی اور دن پر رکھیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن کھانے کے بعد پان کھانے کے لئے تو آپ کو وہیں جانا ہی پڑے گا۔" ایک مشہور نقاد نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

یہ پاکستان کے بڑے اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی محفل تھی۔

ہر بات میں بے حد نفاست، سلیقہ، خلوص بھرا انداز، پر لطف گفتگو۔

تمام مہمانوں نے ہماری دعوتوں کے دن بانٹ لئے۔ ہماری تفریح کا پروگرام بنا لیا گیا۔

اتنا خلوص... کسٹم والے تولنے بیٹھیں تو ہرگز ساتھ نہ لے جانے دیں۔

شال میں لپٹے، اونی ٹوپی اوڑھے، ایک دھان پان سے بزرگ میرے قریب آ بیٹھے۔

"آپ کلفٹن ضرور جائیے۔" انھوں نے اپنے تعارف کے بغیر مجھ سے کہا۔

"وہاں سے دور تک سمندر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ تو ایسی ہے کہ ناک کی سیدھ میں انڈیا کا ساحل ہے۔ ریت پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں تو ادھر کی موجیں پاؤں چھونے آ جاتی ہیں۔"

اب میں ان کی طرف مڑ گئی۔

"آپ انڈیا سے یہاں کب آئے تھے۔؟"

اس عمر کے بوڑھے لوگ اپنے خوبصورت دن ادھر چھوڑ آئے تھے اور اب بہتی موجوں میں ڈھونڈنے ساحل کے کنارے آ جاتے ہیں۔

"ارے بی بی... جگ بیت گئے۔ اب تو کچھ یاد نہیں رہا۔ وقت نے سارے فاصلے دھندلا دئیے ہیں۔"

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ بار بار کھانس رہے تھے۔ پیچھے

کی طرف جھک جاتے۔
"ہارٹ پیشنٹ ہیں ہمارے فادر ان لا۔" ہماری میزبان ہما نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
"جب سنا کہ حیدرآباد سے ایک رائٹر آئی ہیں تو بستر سے اٹھ کر آگئے ہیں آپ سے باتیں کرنے کے لئے۔"
"آپ حیدرآباد میں رہتے ہیں؟"
"جی ہاں۔"
"آپ کا مکان جانے کہاں ہوگا... نامپلی اسٹیشن کے آگے۔ باغ عام کے سیدھے ہاتھ پر، ہماری گلیے کی دوکان کے پاس حکیم چندر بھان کا مطب تھا۔ اللہ نے اس حکیم کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔"
بات کرتے میں وہ ہانپ جاتے تھے۔ کچھ باتیں اشاروں سے پوری کر دیتے۔
"ہاں ہاں، ابھی وہ دوکان ہے... میں اکثر حکیم صاحب کو دیکھتی ہوں۔"
"اچھا...؟ آپ نے انھیں دیکھا ہے۔ وہ زندہ ہیں؟"
وہ میرے اور قریب سرک آئے۔ "اگر آپ کو کبھی حکیم چندر بھان ملیں تو ان کو میرا حال بتانا۔ دل کے دورے پڑتے ہیں میرے کو۔ ڈاکٹروں کی دواؤں سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ حکیم صاحب کو بولو میرے کو خمیرہ گاؤزبان جواہر والا بھیج دو۔"
"آپ آجایئے نہ حیدرآباد۔ اپنا علاج بھی کروالینا۔"
"نہیں نہیں۔ یاں ایسی باتاں نکو کرو بی بی۔" انھوں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔
"آپ لوگ کبھی انڈیا نہیں آتے...؟" کھانے کے دوران میں نے رفیق صاحب سے پوچھا۔
"حیدرآباد دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ ابا جان کا وطن تھا مگر میں فوج میں ہوں اس لئے انڈیا کا ویزا ہمیں نہیں ملتا۔"
"ہم ابا جان سے کہتے ہیں، آپ بھول جایئے حیدرآباد کو۔"
"پاگل ہے میرا بیٹا..." انھوں نے اپنی چھڑی پر زور دے کر غصہ میں کہا۔ "میاں صاحبزادے۔ میرے پاس اب اپنے آپ کو بھلا دینے کے سوا، یاد کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔"
سب چپ ہوگئے۔ رفیق صاحب نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ ان کے ابا کچھ ابنارمل سے ہیں۔
"بڑی لمبی چوڑی انکوائری ہوتی ہے ہماری۔" ہما رفیق نے اپنے خوبصورت لہریئے دار بال جھٹک کر کہا۔ "ایک بار پیرس سے آتے ہوئے شاپنگ کے لئے میں ایک دن دہلی میں ٹھہر گئی تو رفیق کو بڑی پریشانی ہوئی۔"
"یہاں آپ کے دوست رشتے دار ہوں گے۔" میں پھر ان کے پاس جا بیٹھی۔
وہ ہنسنے لگے... "دوست بنانے، عشق کرنے، دل جلانے کی عمر میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب رفیق کا ایک شہر سے دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہوتا ہے تو ہم ایک نئے گھر میں جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ ایر کنڈیشنز کی وجہ سے بدلتے موسم کا بھی پتہ نہیں چلتا ہمیں۔
"ابا جان دس بج گئے ہیں۔ اب آپ سو جایئے۔" ان کی بہو نے مشورہ دیا۔
ایک نوکر انھیں اٹھانے آیا تو انھوں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر مجھ سے پوچھا۔
"آپ پھر کب آئیں گے یہاں؟ میرے کو آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"
"دو تین دن بعد اسی کالونی میں اپنی ایک دوست سے ملنے آؤں گی تو یہاں بھی آجاؤں گی۔"
"آپ اکیلی کہیں مت جایئے۔ ہم خود آکر آپ کو لے جائیں گے۔" کراچی کے ایک مشہور مشفق نقاد نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔
"سنا ہے آج کسی نے لالوکھیت کی مارکیٹ میں آگ لگادی۔ ابھی تک بازار جل رہا ہے۔"
"لوگ چٹکی بجانے میں آگ لگا دیتے ہیں۔" وہ پھر غصے میں بھر گئے۔ "یہ آگ کب بجھتی ہے۔ کیسے بجھتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔"
سب چپ ہوگئے۔
"آپ کے ابا جان یقیناً بہت اچھے شعر کہتے ہوں گے۔ اب آؤں گی تو آپ سے شعر بھی سنوں گی۔"
"نہیں نہیں۔ میں شعر وعر نہیں کہتا۔ بکواس کرتا ہوں۔" وہ برا مان گئے۔
ایک ہفتے کے بعد بیگم ہما رفیق کا فون آیا۔ "بہت مصروف ہوں گی آپ۔ ہمارے فادر ان لا کی طبیعت خراب ہے۔ مگر بار بار اصرار کر رہے ہیں کہ آپ ان سے ملنے کب آئیں گی۔ فون کر کے پوچھو۔"
"آج... ابھی آرہی ہوں۔" میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ کہا۔

پورٹیکو میں ہما کھڑی تھیں۔
"معاف کیجئے۔ بے وقت آپ کو زحمت دی ہے۔ ڈاکٹر نے انھیں مکمل آرام کرنے کو کہا ہے مگر آپ کو بلانے کی ضد کر رہے تھے۔"
کمرے میں وہ کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔ تخت پر جانماز، تسبیح، رحل پر قرآن شریف رکھا تھا۔ شیلف میں اردو فارسی شاعروں کے دیوان تھے۔ سرہانے قلی قطب شاہ کا دیوان رکھا تھا۔ دیوار پر چارمینار کے فوٹو والا ایک پرانا کیلنڈر لگا تھا۔ اور سرہانے کی ٹیبل پر بے شمار دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔
میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے صرف حکیم چندر بھان اور نامپلی بازار کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی کے مارے اٹھ کر بیٹھ گئے۔
"میں حکیم صاحب سے آپ کا حال بتا کر خمیرہ گاؤزبان ضرور بھیج دوں گی۔" ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر میں نے کہا۔

"نکو بی بی۔ ایک بار دوا آ گئی تو کیا ہوگا۔" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

"قلی قطب شاہ بہت اچھا شاعر تھا..." میں نے اب بات کرنے کے لئے دوسرا موضوع ڈھونڈا۔ وہ حسب توقع خوش ہوگئے۔

"اچھا آپ کو معلوم پرانا پل کیوں بنا تھا...؟"

"جی نہیں۔"

"قلی قطب شاہ جب شہزادہ تھا تو سب سے چھپ کر بھاگ متی سے ملنے راتوں کو جایا کرتا تھا۔ ایک بار بارش ہو رہی تھی۔ ندی پر چڑھاؤ لگا۔ گھوڑے پر سے ندی میں گر گیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیئے کہ ندی پر جلدی سے ایک پل بنادو۔"

"واہ، دلچسپ کہانی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ پرانے لوگوں کی باتاں ہیں بی بی..." انھوں نے کتاب بند کر کے کہا۔ "جب بیچ میں ندی آجائے تو پل بنا کر جوڑ دیتے تھے۔ اب ایسے پلوں کو توڑ دیتے ہیں۔"

"میں یہاں آنے سے پہلے حکیم چندر بھان کی دوکان پر گئی تھی۔" میں نے پھر ان کی دلچسپی کا کوئی موضوع ڈھونڈا۔

"ابھی دوکان پر آتا ہے وہ! بہت بوڑھا ہوگیا ہوگا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "بہت سے لوگاں تھے وہ۔ بہت سے باتاں تھے۔ یاد کرو تو الجھے دھاگوں کی طرح پیروں سے لپٹ جاتی ہیں... نواب نفاست جنگ کی دیوڑھی تھی۔ تانگے والے سے بولو دیوڑھی کو جانا ہے تو وہ نہیں پوچھتا تھا دیوڑھی کہاں ہے۔"

"آپ کے دادا کی دیوڑھی تھی...؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہمارے دادا...؟ نہیں بی بی۔ ہمارے دادا حضت تو معمولی پیروکار تھے۔ نفاست جنگ کی جو نواسی تھی چاند پاشا... وہ ہماری پھوپو کی نند کی بیٹی تھی۔"

اب میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اس بوڑھے کے چہرے پہ مچلتی ہوئی پرچھائیاں دیکھنے لگی۔

"بھوت خوبصورت تھی وہ بچی... مگر بہت شریر تھی۔ ہمارے گھر آئی تو کچے پکے سوب انار توڑ کے پھینک دیتی تھی۔ میرے کو بولتی ناریل کے جھاڑ پر چڑھ کر ناریل توڑ کے لاؤ..."

وہ ہنسنا چاہتے تھے مگر کھانسی روک دیتی... میں گم سم بیٹھی رہی۔

"نواب زادیوں کے نخرے... جس چیز کو دل چاہے وہ ضرور مل جاتا... میں نے جب بی۔ اے۔ پاس کیا تو پولیس ایکشن کی مارا ماری شروع ہوگئی۔ ہمارا پورا خاندان پاکستان چلا گیا۔ باوا جان بولے، چلو بیٹا۔ بوریا بستر سمیٹو یہاں سے۔ مگر چاند پاشا میرے سے بولے۔ تم یہاں سے نہیں جانا... اب کیا سناؤں آپ کو وہ قصہ۔ ہمارے باوا نفاست جنگ کے پاس پیغام لے کر گئے... بولے گھر داماد بنالو آپ میرے بیٹے کو..."

میں دم سادھے بیٹھی تھی۔

"مگر... کاں محبوب علی، کاں پیاز کی ڈلی..." وہ رو نہیں رہے تھے۔ مگر ایسا لگا جیسے رو رہے ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ مگر یہ نہیں پوچھا... ہاں کیا ہوا...؟

"پورا گھر خالی ہوگیا ہمارا۔ سب پاکستان چلے گئے... میں گھر میں آیا... کوئی آواز۔ کوئی یاد... سارے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ اپنے قدموں کی آواز بھوت بن کر ڈرا رہی تھی۔ بس۔ میں تیزی سے اسٹیشن کی طرف بھاگا... ریل چھوٹ رہی تھی۔ چلتی ریل میں چڑھتے وقت میرا پاؤں پھسل گیا.. میں نیچے گر رہا تھا... کسی نے ادھر کھینچ لیا... بس... اس دن سے ایسا وہم ہوگیا ہے میرے کو جیسے میں نیچے پھسل رہا ہوں۔ پھر کوئی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ آدمی کسی ایک طرف ہو تو چین پڑے نہ...؟

سسکی کی آواز سن کر میں نے سر اٹھایا۔ ان کا دبلا پتلا بنگالی نوکر اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ پاکستان میں صفائی کرنے والی ماسی اور کھانا بنانے والے لڑکے بنگالی ہوتے ہیں۔

"صائب جی کہیں تو ہم دوسرے نام سے ان کا پاسپورٹ بنوا کر ویزا لگوا دیں ہمارا سالا یہیں بزنس کرتا ہے۔ دو ہزار روپیہ لگیں گے۔" بنگالی بابو نے جھک کر میرے کان میں کہا۔

"واہ... یہ تو بہترین آئیڈیا ہے۔" میں نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

"اس ویزا پر آپ حیدر آباد آئیے۔ خوب تفریح کیجئے۔ پرانے پل سے نفاست جنگ کی ڈیوڑھی جائیے۔ اب تو حیدر آباد کی ہر چیز بدل گئی ہے۔ ہر اسٹیٹ کے لوگ آگئے ہیں۔ آپ کو اب وہاں کوئی نہیں پہچانے گا۔"

"میرے کو اب وہاں کوئی نہیں پہچانے گا...؟" انھوں نے گردن جھکالی۔

ہمارے درمیان سے جانے کتنے دل دھک دھک کرتے گذر گئے۔

اب میرے پاس ان سے کہنے کے لئے شاید کچھ نہیں رہا تھا۔

بڑی دیر کے بعد شاید انھیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔

"آپ کلفٹن کے بیچ پر گئے تھے...؟"

"جی..." میں صفا جھوٹ بول گئی۔

"اچھا...؟ تو اونچی اونچی موجوں نے آپ کو شرابور کر دیا ہوگا...؟" وہ اچانک خوش ہوگئے۔

"جی... جی نہیں... وہ بات یہ ہوئی کہ... کہ..."

"میں بھی کئی بار گیا... موجیں آگے نہیں بڑھیں... سوکھی ریت پر کھڑا رہا میں..." دل کا درد کم کرنے والی گولی انھوں نے زبان کے نیچے دبالی ☆☆☆

جیلانی کامران

شمارہ ۴۰،
ستمبر ۱۹۶۹

کسے عرش فرش میں دیکھتا
کسے روز و شب کے بلند و بالا میں ڈھونڈھتا
کسے اوج کہہ کر پکارتا
کسے پست و کمتر میں جھانکتا
میرا باغ نرگس موتیا...

اگر دھوپ نکلے تو چھاؤں مجھ کو بلائے۔آ،
جو بہار آئے تو خشک مٹی مٹی روشن روش مسکرائے
مجھ کو بلائے۔آ،
میں رکوں تو کیوں
میں چلوں تو یوں
جسے آسمانی بہشت کی نا سمجھ ہوا،
میرا باغ نرگس موتیا!

کوئی ایک پھول سے جھانک کر
مجھے نام لے کر کہا... بلا!
کبھی شاخ پر میرا راستہ روک کر کہے، میرا گیت سن۔
ذرا مسکرا!
کوئی خاک کے سبز آسماں سے مجھے بلا کر کہے...
ذرا میری بات سن
مجھے اسم دے، مجھے جسم کی سلطنت میں لا!

میں صدا بنوں
میں ہوا بنوں
جیسے حشر کے روز تیری رحمت کا ماجرا
میرا باغ نرگس موتیا!

میرے سائے میں

کس کی خاطر شہر کے اندر شہر کے باہر شور
کس کو لفظ کے باغیچے میں ڈھونڈیں چاند چکور
میرے سائے میں کوئی اور!

خاک کو اپنی بہن بنا کر روتے ہیں کیوں لوگ
کس کی چھاؤں میں اے خوش قسمت سوتے ہیں یوں لوگ
کس کی آہ کے گرویدہ ہیں بلبل، باز اور مور
میرے سائے میں کوئی اور!

اک ندی پر پیاس بجھائی ایک پہ ڈالا ڈیرا!
کس قیمت پر آج خریدا میں نے سبز پھریرا!
اس پانی کا عکس نہیں ہے چہرہ تیرا میرا!
لفظ کے ہجے کچے کچے جیسے میں کمزور
میرے سائے میں کوئی اور!

جیلانی کامران

نظم

شمارہ ۱۶۸،
مارچ تا مئی ۱۹۹۳

ان پرندوں کو کل تم نے دیکھا تھا
ان پرندوں کو میں نے تمھاری نگاہوں سے دیکھا تھا
کتنے حسیں تھے
اسی سرزمیں پر یہیں تھے
یہیں تھے کہیں تھے
مجھے ان کے اڑنے کی، اڑ کر چہکنے کی پیاری ادا
یاد آتی ہے
تمھاری طرح ان کے نازک پروں کی صدا
بے طرح آزماتی ہے
آسماں کے دریچوں سے تارے دکھا کر
بلاتی ہے
زمانے کے قدموں کی آہٹ نے
نیلی فضا سے پرندوں کو
مری عمر کے موسموں سے ترے میرے خوابوں کو
اپنے نئے شور کے ساتھ رخصت کیا ہے
ہمیں اپنی اپنی تمناؤں میں بے حقیقت کیا ہے
کوئی اور دیکھے گا جو تم نے دیکھے تھے
اڑتے پرندے
جو میں نے تمھاری نگاہوں سے دیکھے تھے
اچھے پرندے
کسی اور دن کوئی دیکھے گا
شاید کسی اور دن

خواب سناؤ

شمارہ ۱۸۳،
مئی ۱۹۹۵

اپنے اپنے خواب سناؤ
پیارے بچو
خوشی خوشی سے آؤ جاؤ پیارے بچو
چھوٹے چھوٹے خواب سناؤ
پیارے بچو!

تارا دیکھا
پیارا پیارا
دل کی سمت گذرتے دیکھا
ایک اشارہ...
کوئی نور کی نہر کے پار اترتے دیکھا
ابر کا ٹکڑا دور ہی دور گذرتے دیکھا
گھر کے باغ میں
پھول کا رنگ سنورتے دیکھا
اک کیاری پھولوں والی، دیکھی بھالی
اپنے گھر کے صحن میں ہر سو اگتے دیکھی
مرغی دانے چگتے دیکھی
چڑیا شاخ پہ بیٹھے دیکھی اڑتے دیکھی
دور سے اپنے گھر کی جانب مڑتے دیکھی

گھوڑا دیکھا
اڑتے اڑتے چاند کی سمت گذرتا تھا
اپنے آپ کو زمین پہ دیکھا خوش خوش دیکھا
اپنے نام کا چرچا
ہر سو ہر سو دیکھا

کس کو راز بتائیں ایسا
کس کو خواب سنائیں ایسا

جینت پرمار

شمارہ ۲۷۷،
فروری ۲۰۰۴

نظم کہاں رکھی ہے میں نے

میز کے خانوں میں
ٹیبل پر
ریک پہ، الماری میں
اور بک شیلف پہ
کب سے ڈھونڈ رہا ہوں...
اپنی پرانی کتابوں کے
اوراق جنوں میں
کھدر کے کرتے کی
پھٹی سی جیبوں میں
اونٹ کے چمڑے کے بستے میں
نظم کہاں رکھی ہے میں نے؟

پوچھتا ہوں پھر
نرودا(۱) سے، امیخائی(۲) سے، رلکے(۳) سے
ابھی ابھی تو رکھی تھی
نظم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی مل جاتے ہیں
قلم، دوات اور کورے کاغذ
لیکن نظم
بیاضِ دل سے غائب ہے

کولاژ

مرے سامنے
رنگیں پردے، کھڑکی، دروازے، کمرے
ڈرائنگ روم، عبادت گاہیں، زنان خانہ
ہال کی دیواروں پہ
آدی باسی لکڑی کے مہرے
اور ڈرائنگ
مختلف چہروں پر غصہ
پیار کی نظمیں
رنج و غم اور احساسات...
ان سب کا کولاژ بنا کر
آنکھ کی کھونٹی پر لٹکا کر
دل کی دیواروں کو سجاتا رہتا ہوں

فیاض خاں کا مزار

فیاض خاں کا
سنگ مرمر کا کتبہ
ٹوٹے مزار کے ڈھیر پہ جھک کر
ڈھونڈ رہا تھا سارے گاما
پادھانی...
سجدہ گذار عبیر و گل کو
مالکوس کی بھیگی لے کو
کھرج میں رقصاں رنگوں کو
دود و سیاہ میں شعلوں کو
مدھم سُر کی براتوں کو
اجڑی قبر کی مٹی میں...

لیکن قبر میں سوائے دکھ کے
کٹے پھٹے ادھ جلے سروں کے
ہاتھ نہیں آیا کچھ بھی

---

(1)Neruda,(2)Yehuda Amichai,(3)Rilke

جینت پرمار

شمارہ ۱۹۷،
اگست ۱۹۹۶

نئی نظم کا مصرع

رائٹنگ ٹیبل پر
لورکا اور اوکتاویو پاز
مجید امجد اور فاروقی
ایک ساتھ بیٹھے ہیں
دھرم یگ کے سرورق کا
غلام علی
گویا ابھی سنائے گا
"اپنی دھن میں رہتا ہوں"

ٹی وی اسکرین کے اشتہار کی اک لڑکی
ابھی نہا کے نکلی ہے
گویا اس صابن کی خوشبو
پھیل گئی ہے کمرے میں

آئینے میں دیکھتا ہوں

یقین کر لیتا ہوں
اسی پرانے خول میں ہوں
اپنے ہاتھوں کی انگلیاں
پھر سے تازہ کر لیتی ہیں
اپنی ہی پہچان

شہر حیراں میں ہوں گم
نئی نظم کا مصرع ڈھونڈ رہا ہوں
جس کی انگلی تھام کے
دن کا دریا پار اتر جاؤں

شمارہ ۲۱۵،
مارچ اپریل ۱۹۹۸

اسٹل لائف ۱

کبھی نیند میں
مشرق کا سورج
کتھئی بھورے آسمان سے
کھڑکی کے پردے سرکا کے
داخل ہوتا ہے کمرے میں
اور دھیرے سے بید کی کرسی کھینچتا ہے
ٹیبل کے پاس
چاندنی کے کپ نے پی لی ہے
بغیر چینی کی کافی
کپ کے چھوٹے سے تالاب میں اک چیونٹی
باہر آنے کی کوشش میں ڈوب رہی ہے
تیز ہواؤں نے الٹے
زرد بیاضوں کے اوراق
پنسل نے کھینچی تصویر سرابوں کی
کچی نیند میں دیکھے سچے خوابوں کی
مٹی کے پیڑوں پر چڑیا بیٹھی ہے
لمبی لمبی تارکول کی سڑکوں پر
شور کے کانٹے اگتے ہیں

شمارہ ۲۱۵،
مارچ اپریل ۱۹۹۸

اسٹل لائف ۲

منی ایچر(۱) پینٹنگ کی طرح
مچھلی سی آنکھیں
دوات میں جب
قلم ڈبوتی ہیں اپنا
ڈوب ڈوب جاتی ہیں کسی
نظم کے رنگوں میں
میز پہ رکھے بھال اور دوات
اور دوات کے نیچے
ہرے رنگ کا ٹیبل کلاتھ
جس کے چاروں کناروں پر
مور پنکھ ہیں محو رقص
میز کے بیچوں بیچ کتاب
سرورق پر سلگ رہا ہے
فان گاگ(۲) کا پیٹر
میرے دل کی آگ بھی
کیا ایسی ہوگی!
اور اس میں
اندھکار کے جلتے ہاتھ

(۱)miniature (۲)Van Gogh

غزلیں

چندر پرکاش شاد

شمارہ ۷۷،
اکتوبر ۱۹۷۷

بدن کو اپنی بساط تک تو پسارنا تھا
ہر ایک شے کو لہو کے رستے گذارنا تھا

جدھر فصیلوں نے اس کو موڑا، یہ مڑ گئی ہے
ہوا کی موجوں میں کوئی کوندا اتارنا تھا

تو کیا سبب سات پانیوں کو نہ پی سکے ہم
خود اپنا ڈوبا ہوا جزیرہ ابھارنا تھا

میں اپنے اندر سمٹ گیا، ایک لمحہ بن کر
کہیں تو اپنے جنم کا منظر گذارنا تھا

تم آگئے کیوں وجود کی یہ برات لے کر
ہمیں تو اپنی رگوں میں شمشان اتارنا تھا

یہاں سے کٹ کر وہ جا کے جنگل میں سو گئی ہیں
اسی بہانے ہواؤں کو کھیل ہارنا تھا

نہ برج ٹوٹے، نہ آنکھ جھپکی، نہ وقت بیتا
نہ جانے کیا کچھ بسرنا تھا کیا بسارنا تھا

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

ہر اک امکان تک پسپائی ہے اپنی
اور اس کے بعد صف آرائی ہے اپنی

سزا سمجھو مجھے اس کھوکھلے پن کی
صدا ہر سمت سے لوٹ آئی ہے اپنی

جماعت بے جماعت ایک سا ہوں میں
کہ صدہا شکل کی تنہائی ہے اپنی

اب ان سیرابیوں کا سلسلہ کب تک
خبر تو مدتوں تک پائی ہے اپنی

پھر اپنے آپ میں گرنے لگا ہوں میں
وہی لغزش وہی گہرائی ہے اپنی

سفر بے لذتی کی جستجو کا ہے
بہر منظر زیاں پیمائی ہے اپنی

نظم [1]

چودھری محمد نعیم

شمارہ ۴۷،
اپریل ۱۹۷۰

سانپ جب رینگنے کا حق مانگیں
اور سورج کہے کہ بونس دو
چاند کو رشک ہو ستاروں پر
اوس پھولوں کے حق میں دشمن ہو

جب یہ سب معجزات ہو جائیں
نقش فطرت کے بن چکیں باطل
تب سمجھنا کہ حضرت انساں
ہیں کسی اعتبار کے قابل

(۱) ای ای کمنگز (e e cummings) کی یک نظم کا تاثر

نظمیں

حارث خلیق

شمارہ ۲۰۴
مارچ ۱۹۹۷

ڈر

ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے
گرچہ ہر بات چھپائی ہے بڑی خوبی سے
ساتھ اک عمر نبھائی ہے بڑی خوبی سے
پھر بھی دھڑکا سا لگا رہتا ہے
عین ممکن ہے کہ شک اب بھی کوئی تازہ ہو
اپنے بارے میں 'جو مجھ کو بھی نہیں' ہے معلوم
کیا خبر اس کو اسی بات کا اندازہ ہو

پہلی دعوت

کم سن تازہ خوشیوں کا
انبار لگا تھا
ان آنکھوں میں رونق تھی
بازار لگا تھا
خوف آتا تھا
اس رونق میں کھو جانے سے
اور بھرے بازار میں
تنہا ہو جانے سے

حارث خلیق

شمارہ ۲۲۰
اکتوبر ۱۹۹۸

باتوں باتوں میں

کیا خبر ان سے بھی اندھیرے میں
بس ہمارے خیال کے جگنو
چپکے چپکے نظر ملاتے ہوں
روشنی کی جھلک دکھاتے ہوں
تازگی جس کی کم نہیں ہوتی
وہ پرانی کتھا سناتے ہوں
رات بھر بے طرح جگاتے ہوں
ان سے معلوم کر کے دیکھیں گے

راہ دکھانے والی

اس کی آنکھیں قطب نما ہیں
وحشت کی، دیوانے پن کی
اک اک سمت بتا دیتی ہیں
اس کے بوسے ہوش ربا ہیں
جن سے اٹھتی آگ کی لپٹیں
ایک جہان جلا دیتی ہیں
اس کے شوق فلک پیما ہیں
اور بدن کی ایک اک رگ میں
خواہش کے طوفان بپا ہیں

حامد حسین حامد

شمارہ ۱۷۰،
اکتوبر ۱۹۶۷

پتہ پتہ کانپ رہا ہے
باہر کتنی سرد ہوا ہے
آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے
سپنوں سے تعبیر کیا ہے
یادوں کے گلدان سجا لو
موسم تو روکھا پھیکا ہے
آؤ دستک دے کر دیکھیں
دروازہ کیوں بند پڑا ہے
اپنے تن کو ٹھیک سے ڈھک لو
ایک زمانہ گھور رہا ہے
قرنوں کا درپیش سفر ہے
پل دو پل میں کیا ہونا ہے
کتنے راہی گذرے ہوں گے
چوراہا کب سوچ سکا ہے
شام و سحر کے سرمائے سے
کم کم اپنے ہاتھ لگا ہے
کچھ تو اپنی بات کہو گے
خاموشی کا روگ برا ہے

حامدی کاشمیری

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

میراجی کے تجزیے کے پہلے پیراگراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روایتی اصناف کے مقابلے میں اپنے عہد کی نظموں میں، جن کی نمائندگی راشد اور وہ خود بھی کرتے ہیں، کردار نگاری کے نئے امکانات سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ وہ اسی نقطۂ نظر سے راشد کی نظم کو دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر نظم سے رابطہ قائم کرنے کی سمت ایک صحیح قدم ضرور ہے، مگر دوسرا ہی قدم انھوں نے ایسا اٹھایا ہے جو نظم سے دوری کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھکتے ہوئے تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں، جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی الجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہے۔

یہ بیان صاف طور پر راشد کی نظموں کے بارے میں ایک عمومی نوعیت کا بیان ہے، اور ان کی نظموں کے عمومیت زدہ موضوعی کردار کو واضح کرتا ہے۔ یہ بیان نظم سے قربت کے بجائے دوری کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے بعد نظم کی جانب متوجہ ہو کر میراجی لکھتے ہیں:

> اس نظم کا انسان بھی کچھ اسی وقت کا انسان ہے، اس میں ایک ایسے آدمی کے خیالات کا عکس ہے، جو یکساں بہاؤ اور بیزار کن کیفیات میں شب و روز گرفتار رہتا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میراجی زیر تجزیہ نظم کی کلیت سے نہیں، بلکہ ''نظم کے انسان' کے حوالے سے نظم کی بنیادی موضوع کو مرکز توجہ بناتے ہیں، جو بقول ان کے ''شاعر یا کلرک ہے۔'' تجزیے کے تیسرے پیراگراف میں میراجی من مانے طریقے سے نظم کے ہیرو کو ''تخصیص کے نقطۂ نظر'' سے نشان زد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ ہیرو کون ہے، کسان، بنیا یا صرف ایک کلرک؟ نظم کا صرف ایک مصرع جواب دیتا ہے۔ وہ ہیرو ایک کلرک ہے۔
>
> شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں،
> چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
> اور صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند۔

پھر اپنی خود ساختہ تعبیر کی رو سے اسے کلرک قرار دیتے ہوئے میراجی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

> دفتر میں میز پر بیٹھے ہوئے کلرک کے سامنے فائلوں کا انبار لگا رہتا ہے، انگشت کو تر کر کے ان کے صفحے پلٹتے ہوئے، اور ان صفحوں کے سیاہ و سفید میں تبدیلی کرتے ہی اس کا دن تمام ہوتا ہے۔ شام تک وہ میز کے انبار کو گھٹانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، ہر چیز سے بیگانہ، ایک مشین۔ شام کو لوٹتے ہوئے اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے... دوسرے روز دفتر پہنچ کر پھر یہی دیکھتا ہے کہ میز پر فائلوں کی دیوار دوبارہ بلند دکھائی دے رہی ہے۔

میراجی کے اس بیان میں نظم کے ہیرو کا، جو غالباً حقیقی زندگی میں کلرک ہو سکتا ہے، نظم کے سیاق میں کلرک ثابت کرنے کا دعویٰ من گھڑت اور دور از کار ہے۔ اور اس ضمن میں جو ادعائی لہجہ یعنی ''وہ ہیرو ایک کلرک ہے'' اختیار کیا گیا ہے، وہ سراسر غیر تنقیدی ہے۔ نظم کے ہیرو کو ایک ایسے مصرع سے کلرک ثابت کرنا جس سے اس کا کلرک ہونے کا دور دور تک کوئی اشارہ نہیں ملتا، مضحکہ خیز ہے۔ متعلقہ مصرعے (مصرع نہیں، جیسا کہ میراجی نے لکھا ہے) یہ ہیں:

> شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
> چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
> صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

ان مصرعوں سے نظم کے کردار کا کلرک ہونا کسی صورت میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور پھر کلرک کے ساتھ فائلوں کا انبار اور دن بھر فائلوں کے انبار کو گھٹانے کی کوشش اور دوسرے روز پھر فائلوں کی دیوار... کی وضاحت، کلرک کے روزمرہ کے کام کی تفصیل ہو سکتی ہے۔ مگر نظم یا اس کے مرکزی کردار سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو پاتا۔ نظم کے ہیرو کو کلرک ثابت کرنے کے لئے جن مصرعوں کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ ہیرو کی کسی واضح پہچان قائم کرنے کے بجائے اس کے نامعلوم اور پراسرار ہونے کی توثیق کرتے ہیں، کیونکہ یہ وہ کردار ہے جو شام تک دیوار کو نوک زباں سے چاٹ کر ناتواں کرتا ہے، اور پھر صبح ہونے پر وہ دیوار دوبارہ بلند ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کردار کا یہ عمل سراسر مافوق فطری ہے، غیر معمولہ اور نامانوس۔ کردار کا یہ عمل نظم کی مجموعی فضا اور خود کردار کی شخصیت سے کیا ربط رکھتا ہے؟ یہ ایک گتھی ہے، جس کی گرہ کشائی آگے چل کر ہوگی۔ فی الوقت یہ کہنا مقصود ہے کہ میراجی کا یہ تصور کہ نظم ایک کلرک کی بیزار زندگی سے متعلق ہے، یا یہ ''کلرکی سسٹم'' کی مخالفت کرتی ہے، نظم کے متن سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ میراجی نظم کے استعاروں کی طرف متوجہ ہو کر بھی استعاراتی نظام کی کثیر المعنویت سے چشم پوشی کر کے اپنے خود ساختہ تصور میں گرفتار ہیں، اور ''دیوار'' ''ساتویں منزل'' اور ''خودکشی'' کی ایسی

تاویلیں کرتے ہیں، جو دوراز کار اور غیر منطقی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "دیوار، ظاہر ہو چکا کہ فائلوں کا انبار ہے"۔ پھر کہتے ہیں:

ساتویں منزل سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ دفتر کی عمارت ہے، جس کی ساتویں منزل میں یہ کلرک کام کرتا ہے؟ ایک شک گذرتا ہے کہ یہ منزلیں عمارت کی نہیں، اس کلرک کے دوران ملازمت کی منزلیں ہیں۔ "خودکشی"... اقتصادی خودکشی ہے۔

یہ ساری باتیں میراجی کے ذہن کی پیداوار ہیں، اور نظم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ ساری گڑبڑ اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ میراجی نے نظم کے مرکزی کردار کو ایک کلرک سمجھ لیا ہے، اور اس مفروضے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہ نظم کی ہر کڑی سے حسب دلخواہ معنی اخذ کرتے ہیں اور ان کی تعبیر نظم کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔

غور سے دیکھیے تو نظم میں دیوار، فائلوں کی دیوار نہیں، بلکہ ٹھوس اینٹ گارے کی دیوار ہے، شئیت کی مظہر، جو نظم میں علامتی برتاؤ سے تخلیقی جواز حاصل کرتی ہے۔ اسے کسی ایک متعینہ یا معمولہ معنی کے مترادف قرار دینا، اور خاص کر جب نظم کا سیاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا، علامت ناشناسی کے رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ "ساتویں منزل" کو شک کی بنا پر کلرک کی ملازمت کے سات سال قرار دینا ایک من مانا عمل ہے۔ "ساتویں منزل" واضح طور پر اس بلند بالا عمارت کی ساتویں منزل ہے، جس میں کردار کی محبوبہ کا کمرہ ہے۔ اس بات کی توثیق وہ اس کمرے میں محبوبہ کا انتظار کرتے ہوئے خودکشی کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کرتا ہے:

جی میں آئی ہے لگادوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوے بام کو

دریچے کے ساتھ لفظ "اس" سے صاف ظاہر ہے کہ یہ محبوبہ کا کمرہ ہے، جس میں وہ موجود ہے۔ لہٰذا ساتویں منزل کو کلرک کی ملازمت کے سات سال قرار دینے کا دعویٰ دور کی کوڑی لانے کے برابر ہے۔

میراجی نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے "تازہ درخشاں لہو" کو ہر نو گرفتار کلرک کا خون قرار دیا ہے، اور کلرک کے اقدام خودکشی کی توجیہ کلرکی کے ختم ہونے سے کی ہے۔ اگر میراجی کی نظم کی تعبیر کو بفرض محال صحیح مانا جائے، تو پہلا سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ اس سطحی یا اکہرے معنی کے ہوتے ہوئے نظم کو فن پارہ قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ میراجی نے اس مسئلے پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کلرک محض فائلوں کے انبار سے بیزار ہو کر اقدام خودکشی کرتا ہے؟ مانا کہ دفتر میں فائلوں کے انبار کو گھٹانا یکسانیت اور بیزاری کا کام ہے، مگر محض اس وجہ سے خودکشی کا قصد ناقابل فہم ہے۔ اگر فائلوں کا انبار ہی کلرک کا سب سے بڑا اور حیات بیزار مسئلہ ہے، تو ہل چلانے والے کا ہل چلانا بھی یا دوکان دار کا بزنس بھی اسی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ میراجی نے خود کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ ہر کام اسی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کام سے، جو اس کے لئے روزی روٹی کا وسیلہ ہے، اور بامعنی مصروفیت بھی ہے، تنگ آکر خودکشی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟ اگر کلرک بفرض محال فائلوں سے بیزار ہے، تو اس سیکشن میں کام کرنے والا ہیڈ اسسٹنٹ یا سپرنٹنڈنٹ یا آفیسر یا دفتر کا سربراہ بھی فائلوں کے انبار سے نمٹتے ہوئے بیزاری اور اکتاہٹ محسوس کر سکتا ہے۔ کیا یہ بیزاری اور اکتاہٹ اسے خودکشی پر مجبور کرے گی؟ اگر نہیں، تو پھر صرف کلرک ہی ایسا کیوں کرے گا؟ ایک درجہ بند نظام میں درجوں یا تنخواہوں کے اسکیل کا فرق، ملازموں کی، کام سے بیزاری میں تخفیف کا باعث نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی ادارے میں ایک معمولی کلرک سے زیادہ اس ادارے کے بڑے آفیسر یا سربراہ کو فائلوں کی دیوار کو گھٹانے کا بیزار کن مسئلہ روز کا مسئلہ ہے۔

نظم کے بارے میں میراجی کے اخذ کردہ نکات کی بے معنویت اور عدم صحت کا اندازہ کرنے کے بعد آیئے اب نظم کی وجودی سالمیت کو دیکھیں۔ نظم کے پہلے مصرعے "کر چکا ہوں آج عزم آخری" اور مصرعے کے آخر میں وقفے کی علامت سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نظم کا واحد متکلم خود کلامی میں مصروف ہے۔ اس کی خود کلامی کی توثیق، اس کے خودکشی کے ارادے، جو نظم کے نویں مصرعے یعنی "کود جاؤں ساتویں منزل سے آج" سے مترشح ہے، سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا شخص ہے (نظم کا فرضی شخص)، جو خودکشی کرنے کا ارادہ کر چکا ہے، وہ اپنے ارادے اور اس کے محرکات کو Flashback کی تکنیک سے اشارتاً پیش کرتا ہے، اور پھر نظم کے اگلے تین مصرعوں سے:

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

اس شخص کے کردار کی ایک نئی جہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ مصرعے اس مشہور اسطور کی یاد دلاتے ہیں، جو یاجوج ماجوج اور سد سکندری سے متعلق ہے۔ اس کی رو سے یاجوج ماجوج جو ابن نوح کے بیٹے تھے اور منگولیا وغیرہ میں آباد تھے اور ایک تاتاری قوم بن گئے تھے، ان کے جور و تشدد اور غارت گری کو روکنے کے لئے سکندر نے ایک دیوار آہن بنوائی تاکہ وہ دیوار کو پار نہ کر سکیں۔ یاجوج ماجوج روز اس دیوار کو توڑنے کے لئے ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، مگر وہ پوری طرح نہیں ٹوٹ سکتی تھی، جس قدر دن بھر ٹوٹتی تھی، رات کو پھر بن جاتی تھی۔ یہ دیوار سد سکندری کے نام سے مشہور ہوئی۔ نظم میں اس اسطور کا حوالہ انتہائی تخلیقی پیرائے میں ملتا ہے۔ دیوار یہاں خالص علامت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ اس کے علامت بننے سے نہ صرف نظم کی اسراری فضا مستحکم ہوتی ہے بلکہ شعری کردار کے غیر معمولی ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کردار کا نوک زبان سے دیوار کو چاٹنا اور اسے کمزور کرنا، اور پھر دیوار کا صبح ہوتے ہی بلند ہونا ماورائی ہونے کے باوجود قابل یقین ہو جاتا ہے۔ اور سد سکندری اور یاجوج ماجوج کی سعی نامشکور کی جانب قاری کے ذہن کو منعطف کرتا ہے۔ اس اسطور کی تقلیب اور شعری کردار کے تعلق سے اس کا برتاؤ اس درجہ تخلیقی ذہانت سے ہوا ہے کہ یہ نظم کا ایک ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔

اگلے مصرعے میں نظم کا کردار پھر طبعی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ دن بھر کی مشقت و مزاولت کے بعد گھر لوٹتا تو "تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں" اور "منہ بسورے رہگذاروں سے لپٹتے سوگوار" ظاہر ہے یہ اس کی تھکن، بیزاری، محرومی اور

شکست خوردگی کا معروضی تلازمہ ہے۔

اگلے مصرعے میں خودکشی کے ارادے یعنی "کود جاؤں ساتویں منزل سے آج" کے بعد مکاشفانہ انداز میں گویا ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کو، جو حجابات میں مستور تھی، بے نقاب دریافت کیا ہے۔ اور یہی انکشاف اس کی خودکشی کے عزم کو عزم آخری بنا دیتا ہے۔ اور پھر اگلے چند مصرعوں میں متکلم ایک ایسی "عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ" سے تعلق یا تعلق خاطر کا ذکر کرتا ہے، جس کے پاس وہ "مدت سے آتا جاتا تھا" لیکن آج اس کے پاس جا کر وہ اس کے "تخت خواب کے نیچے" "تازہ و رخشاں لہو" دیکھ لیتا ہے، اور کمرے کی فضا میں "بوے مے میں بوے خوں الجھی ہوئی" محسوس کرتا ہے۔ "بوے مے" اور "الجھی ہوئی" سے کمرے میں کسی ایسے گذشتہ واقعے کا اشارہ ملتا ہے جو شک اور خوف سے عبارت تھا۔ اگلا مصرع ہے:

وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں

یہ مصرع اس شخص کو سراپا انتظار بناتا ہے۔ "تازہ و رخشاں لہو" کو دیکھنے کے باوجود دیر تک محبوبہ کا انتظار کرنا، اور اسی اثنا میں فریب شکستگی اور مایوسی کے عذاب کا شدید ہونا اسے خودکشی کے عزم آخری کی طرف لے جاتا ہے۔ "تازہ و رخشاں لہو" سے یہ بھی ابھرتا ہے کہ اس کی محبوبہ، جس کے پاس وہ ایک مدت سے آتا جاتا تھا اور ہر بار خودکشی کے عزم کو ترک کرتا تھا، غالباً اسی لئے اس سے اس کا کوئی نامعلوم ذہنی یا روحانی رشتہ قائم ہو چکا تھا اور وہ اس کی قربت یا موافقت سے زندگی کی جانب مراجعت کرتا تھا۔ اب وہ کسی کے خون ناحق میں ملوث ہے، اور یہ اس کی برداشت کے باہر ہے۔ "تازہ و رخشاں لہو" کے ساتھ ہی "بوے مے میں بوے خوں الجھی ہوئی" ہے۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہو جاتی ہے کہ اس کی محبوبہ کے کمرے میں شراب نوشی کے بعد خوں ریزی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ یہ منظر متکلم کے وجود کو ہلا کے رکھ دیتا ہے، زندگی کا ایک بھیانک روپ اس کے سامنے آتا ہے اور خودکشی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

نظم میں محبوبہ کو "عشوہ ساز و ہرزہ کار" کہا گیا ہے۔ محبوبہ کے بارے میں یہ صفات متکلم کی ہی زبانی ادا ہوئے ہیں۔ تاہم یہ کوئی ضروری نہیں کہ محبوبہ کے بارے میں بیان کردہ صفات سے وہ خود متفق ہو۔ وہ مدت سے اس کے پاس آتا جاتا رہا ہے۔ اور یک گونہ سکون حاصل کرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے متکلم اس کے بارے میں ایسی بات نہیں کہے گا، اگر وہ بفرض محال ایسی ہو بھی۔ سوال یہ ہے کہ ایک "عشوہ ساز و ہرزہ کار" محبوبہ کے کمرے میں ایسے واقعے کا ہونا متکلم کے لئے صدمے کا باعث کیوں بنا؟ کیا وہ اپنی زبان سے اسے "عشوہ ساز و ہرزہ کار" نہیں کہتا؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کوئی شریف عورت نہیں؟ متکلم کے بیان کو اگر اثباتی انداز میں لیا جائے، تو اس عورت کی جسم فروشی میں ملوث ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن خود متکلم کا طرز عمل، یعنی اس عورت کے پاس ایک مدت تک اس کا آنا جانا، یعنی اس سے سکون بخش دوستی کے رشتے میں بندھا ہونا، اس خیال کا استرداد کرتا ہے۔ یہ گویا متکلم کا اس عورت کے بارے میں ایک متضاد رویہ ہے جو معنوی امکانات کی توسیع کرتا ہے۔ اور ہاں، اگر متکلم کے لہجے میں طنزیہ عنصر کا اثبات کیا جائے تو ایک اور معنوی سطح روشن ہو جاتی ہے۔ وہ عورت جسے لوگ "عشوہ ساز و ہرزہ کار" کہتے ہیں، ایسی نہیں ہے، بلکہ ایک اور راست باز عورت بن جاتی ہے۔ اور ایسی عورت سے فریب شکستہ ہو کر وہ خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ کردار پہلے بھی بارہا خودکشی کا ارادہ کر چکا ہے، لیکن بارہا اس کا ارادہ ٹوٹ چکا ہے۔ اور آج اپنی محبوبہ کی اصلیت جان کر وہ ایک ناقابل برداشت صدمے سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی آخری آس بھی خاک میں ملتی ہے، اور وہ محبوبہ کے کمرے کے دریچے سے جست لگاتا ہے اور نظم یوں ختم ہوتی ہے:

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی

آخری مصرعے سے قبل کے تین مصرعوں کے اعادے سے متکلم کے اس ذہنی ابتلا کا پتہ چلتا ہے، جو اس کے لئے سوہان روح بن چکا ہے۔ اور آخری مصرع، اس کے ذہنی آشوب، جو ایک عارضے میں بدل جاتا ہے، کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دیوار کو دن بھر کی مشقت کے بعد کمزور کرنا اور پھر اگلے دن اس کا دوبارہ بلند ہونا، ایک ایسا عذاب ہے، جو اس کی مستقل ذہنی کیفیت بن چکا ہے، اور آج کے واقعے سے یہ عذاب دوگونہ ہو گیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے گا تو دیوار بھی یقینی طور پر "ہم آغوش زمیں" ہو جائے گی۔ یہ ذہنی کیفیت گویا ایک ایسے شخص، جو زندگی سے بیزار ہے، اور بیزاری کے زیر اثر بار بار خودکشی کے بارے میں سوچتا ہے، کی فوبیائی ذہنی کیفیت ہے۔ غالب کے شعری کردار کو فوبیا کے زیر اثر شاخ گل میں افعی نظر آتا ہے۔ راشد کے شعری کردار کو فوبیا کے زیر اثر محبوبہ کے تخت خواب کے نیچے تازہ و رخشاں لہو نظر آتا ہے۔ یہ فوبیا ہی ہے جو حقیقت کی تقلیب کر کے دیوار کو نوک زباں سے چاٹنے اور اس کے دوبارہ بلند ہونے کے استمراری عمل میں پنہاں ہے۔

نظم کے آخری مصرعے سے پتہ چلتا ہے کہ شعری کردار ذہنی تصرف (Obsession) سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ خودکشی کے ارتکاب کے نتیجے میں کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب جاں کاہ سے چھٹکارا پانے کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور نظم تکمیل کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ شعری کردار خود شناسی کی ارفع سطح پر اپنے وجود کے تضادات، انسانی روابط کی شکست، تشدد پرستی، دائمی محرومی اور موت کے وسیلۂ نجات ہونے کا انکشاف کرتا ہے۔

نظم کردار اور واقعہ کے عمل اور رد عمل کی ڈرامائی صورت میں اپنے تخلیقی وجود کا اثبات کرتی ہے۔

جہاں تک نظم کی موضوعیت کا، جو میراجی کے لئے مرکزی اہمیت رکھتی ہے، تعلق ہے، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ نظم کسی متعین یا سوچے سمجھے گئے موضوع سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ یہ ایک وسیع اور پیچیدہ داخلی تجربے کی تجسیم ہے، جو شاعری کی رگ و پے سے عود کرتا ہے اور لسانی تشکیل سے ایک زندہ، آزاد اور حرکی وجود میں ڈھل جاتا ہے۔ بالآخر یہ تجربہ متنوع انسلاکاتی معانی مثلاً رایگانیت، شکست روابط، آشوب آگہی، اجنبیت التباس اور موت میں زندگی، پر محیط ہو جاتا ہے☆☆☆

حامدی کاشمیری

شمارہ ۱۳۵،
اپریل ۱۹۸۷

اس دشت تار میں ہیں نگہباں وہی حروف
سرتا بہ پا لہو میں ہیں رخشاں وہی حروف

بھر بھر کے ہاتھ وہ درِ خوش آب لے گئے
ویراں ہتھیلیوں میں ہیں غلطاں وہی حروف

کتنی ہی بار مل کے ہم آئینہ ہوئے
کرتے ہیں آج بھی مجھے حیراں وہی حروف

دست ہوائے تیرہ نے جن کو بجھا دیا
کرتے ہیں شہر جاں میں چراغاں وہی حروف

شب بھر مرے لہو سے نموتاب ہوگئے
وقت سحر ہیں مجھ سے گریزاں وہی حروف

رگ رگ میں بن کے خار ملامت اتر گئے
تاروں میں ڈھل گئے سر مژگاں وہی حروف

شمارہ ۲۳۱،
نومبر ۱۹۹۹

یہ جہان نور و سایہ راز ہے دیکھا نہ تھا
حرف سربستہ کا اک اعجاز ہے دیکھا نہ تھا

برف کی چادر میں کب سے ساکت و جامد رہے
ذرہ ذرہ جوشش پرواز ہے دیکھا نہ تھا

مدتوں تک جاگزیں تاریک سناٹے رہے
یہ چمن صد نیرنگی آواز ہے دیکھا نہ تھا

کھو گئے تھے سارے تارے ظلمت سیال میں
کوئی میرا مونس و دمساز ہے دیکھا نہ تھا

کر گئے اس خاکدان تیرہ میں عمریں تمام
گنبد افلاک کا در باز ہے دیکھا نہ تھا

ہو رہے ہیں ہنہناتے گھوڑوں پر پھر سے سوار
خاتمہ اک نقطۂ آغاز ہے دیکھا نہ تھا

حبیب حق

شمارہ ۲۲۸،
اگست ۱۹۹۹

(۱)

جادوئی چیزوں سے بھری پڑی ہے یہ دنیا
ناچتے ناچتے مور شیر ببر میں تبدیل ہو جاتا ہے
کھڑکی میں بیٹھی شوخ حسینہ داغ سیاہ بن جاتی ہے
ننھا سا بچہ صفحۂ کائنات کو پلٹ دیتا ہے

(۲)

ہم ان سے جب ملے جب کہ وہ ملنے پر مجبور ہو گئے تھے
کہ انھیں سب کے سب اس جا چھوڑ گئے تھے جہاں آب و
دانہ میسر نہ تھا
آرزوئیں کی شمعیں جل بجھ کر خاک ہو گئی تھیں
اور آسمان میں سارے روشن ستارے ان سے بے نیاز ہو گئے تھے

(۳)

جھیل کی ٹھہری سطح پر ساکت ہنسوں کا جوڑا
ہلکے نیلے آسمان پر پھیلتے دودھیا بادلوں کو یوں دیکھ رہا تھا
کہ جیسے روپہلے پنکھوں والی پریوں کا ایک جوڑا
آسمان سے اتر کر ان کی دھلی دھلائی پشت پر پناہ لے گا

(۴)

ان کی سرمئی آنکھیں عجب ہو رہی تھیں
سرخ ڈورے معدوم ہو چکے تھے
ممکن نہ تھا کہ ان سے وجوہات دریافت کی جا سکیں
کہ انھوں نے خود کو شیشے کے گھر میں محفوظ کر رکھا تھا

(۵)

میری چندھیائی آنکھوں میں اپنی شفاف آنکھوں سے جھانکو
شاید تمھیں وہ وقت یاد آ جائے جب ہم نہر کے کنارے
متوالے ہو کر ایک دوسروں سے وعدے کر رہے تھے
جس ساعت کو میری آنکھوں نے اب تک محفوظ کر رکھا ہے

(۶)

کہرے نے اپنی تھوتھنی بڑھا کر برآمدے کا جائزہ لیا
جیسے کہ سانپ اپنی لپلپاتی زبان چوہے کے بل میں ڈال
دے
اور فرش پر کچھ نہ پا کر افسوس و صدمے نے اسے یوں
نڈھال کر دیا
کہ اس کی آنکھوں نے جہاں تہاں آنسوؤں کے قطرات
ٹپکا دئے

(۷)

بادلوں کے رتھ پر سوار ہو کر اسے آسمانوں سے ورے جانا
تھا
جہاں کی دنیا اسے بار بار اپنی جانب بلا رہی تھی
اونچے درخت پر چڑھ کر اسے پتہ چلا کہ بادل مزید بلند
تھے
ناچار وہ درخت سے کود پڑا... اور اس کی روح آسمانوں سے
ورے چلی گئی

حسن جمال

شمارہ نمبر ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۲

وہ بہت سارے تھے اور وہ اکیلا تھا اور ان کے ساتھ تھا۔ برسوں سے یا یوں کہیں صدیوں سے۔ لمحوں کو صدیاں بنتے دیر نہیں لگتی اور وہ اپنی اب تک کی زندگی میں یہی محسوس کرتا آیا تھا۔

وہ ہر ایک کے ساتھ یوں چلتا جیسے لہریں پانی کے ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن لہروں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ لہر، لہر، تم پانی ہو یا پانی سے الگ ہو؟ مگر اسے ہر روز ہر دفعہ یہ کہنا پڑتا تھا کہ میں تمھارے ہمراہ ہوں، مجھے دیکھو۔ میں موجود ہوں یہاں، تمھارے درمیان، تمھارا اپنا دوست، تمھارا بھائی، تمھارا باپ، تمھارا سب کچھ مگر کوئی اس کی جانب دیکھتا تک نہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے تمام لوگ اندھے گونگے بہرے ہو چکے ہیں۔ ان کے باطن میں احساسات کا سوتا خشک ہو چکا ہے۔ وہ سارے کے سارے موم کے پتلے بن چکے ہیں اور موم کے پتلے کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ جانے وہ کب کون سی صورت و شکل اختیار کر لے، یقینی طور پر کچھ کہنا اور سمجھنا کارِ دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان زندگی گذارنا ایک روز نہیں، ایک برس نہیں، بلکہ صدیوں تک ایک عمر قید کی مانند تھا۔ مگر اسے زندگی تو گذارنا ہی تھی۔ ان کے ساتھ نہ رہتا تو کہاں جاتا؟ جنگلوں میں یا ویرانوں میں جو کہ اب مفقود ہیں؟ یا یوں کہیں کہ جنگل اور ویرانے اٹھ کر اب بستیوں میں آ گئے ہیں گنجان آبادیوں کے چوراہوں پر بیٹھے ماتم کناں ہیں۔

"ہاں وعلیکم السلام۔ بولو، جلدی کرو، ہمیں بہت کام ہے۔"

"دو گھڑی پاس بیٹھو تو سہی۔ یہ بھی تو ایک کام ہے، بلکہ اشد ضروری کام ہے۔"

"نہیں ہمارے پاس اتنا فضول وقت نہیں۔ کام کی بات کہو۔ مدعا بیان کرو اپنا۔"

"مدعا تو یہ ہے بھائی کہ سناٹے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ کچھ بات کرو کہ یہ سناٹا ٹوٹے۔"

"سناٹا؟... کہاں ہے سناٹا؟ اس قدر تو شور شرابا ہے کہ کان پڑی سنائی نہیں دیت۔ لوگ بہرے ہوئے جاتے ہیں اور تم، تم یار عجب آدمی ہو۔ سناٹے کی بات کرتے ہو۔ فالتو آدمی ہی ایسی فضول باتیں سوچ سکتا ہے۔ اچھا چھوڑو اور اس شور شرابے میں اپنے آپ کو غرق کر دو۔ یہی تمھارا واحد علاج ہے۔"

"میں بیمار نہیں ہوں۔"

"نہیں تم بیمار ہو اور وہ بھی چھوت والی بیماری کے۔ اس سے پہلے کہ تمھاری مجھے آ لگے میں جانا چاہتا ہوں"، اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

آخر اس دنیا کو ہو کیا گیا ہے؟ جسے دیکھو وہ بھاگنا چاہتا ہے۔ بھاگ رہا ہے، بے سمت، بے سہارا۔ بھاگ کر وہ جائے گا کہاں؟ وہ بھاگ کر جہاں بھی جائے اپنے آپ کو ہی پائے گا۔ ہانپتا ہوا، ہراساں۔ اپنے آپ کو وہ چھوڑتا کیوں نہیں؟ اپنے سے علیحدہ کسی اور میں دلچسپی کیوں نہیں لیتا؟ ہم سب ایک دوسرے کے لئے ہی تو پیدا ہوئے ہیں۔ کیوں نہیں دیکھتا کوئی اس کی طرف؟ کیوں اسے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ میں یہاں موجود ہوں، تمھارے درمیان، تمھارا اپنا؟

وہ پکار پکار کر، مختلف لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے بری طرح تھک چکا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چپکنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ ایک رات اپنی بیوی کی بغل میں سر چھپا کر وہ ہانپنے لگا۔

"جان! میری جان نکلی جا رہی ہے۔ مجھے لوگوں نے یکسر بھلا دیا ہے۔ کوئی مجھے پہچانتا نہیں۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ کسی کو میری ضرورت ہی نہ رہی۔ میں اس بھری پری دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ یہ سناٹے ایک روز میری جان لے لیں گے۔"

جان کی زلفیں کھلی تھیں۔ تازہ شیمپو کی خوشبو سے معطر زلفوں کے گھنے سائے میں اسے یک گونہ راحت سی محسوس ہوئی۔ جان کے گلابی ہونٹ تھوڑا مسکرائے: "تم کو اپنی شناخت کے لئے ان نامرادوں کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اپنا آپ دوسروں کے سپرد کرنے کی بجائے اچھا ہے کہ تم اپنا رنج و غم، اپنی پریشانی مجھے دے دو۔"

جان کے نرم و نازک ہاتھ کو سہلانے سے اسے کچھ اور دلاسا ملا۔

"تمھارے دم سے ہی تو میرا دم غنیمت ہے۔ ورنہ یہ دنیا اس قدر گھٹیا ہے کہ اس میں تو میرا دم گھٹتا ہے۔ جان! یہ گھٹن کب تک چلے گا؟"

"تم خوامخواہ کو ہلکان کئے جاتے ہو۔" جان اس پر فدا ہوتے ہوئے بولی۔ "تم دوسروں کی اتنی پروا کرتے ہی کیوں ہو؟ میں ہوں نہ تمھارے ساتھ۔ تمھاری شریکِ حیات، تمھاری سب کچھ تو میں ہی ہوں۔"

ہاں، اس کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ کب کا مر چکا ہوتا۔ اس نے اپنے آپ کو جان کے سپرد کر دیا۔ جان نے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھی جب زمانے کا ٹھکرایا ہوا شخص اس کے سینے میں اپنا سر چھپا لیتا تھا۔ اس طرح

ایک بھاری دن کے بعد ہلکی پھلکی رات اس پر سے یوں گذر جاتی جیسے خوشبوؤں میں لہراتا آنچل معطر اور نشہ آور لمس دیتا ہوا گذر جائے۔

اگلے روز پھر وہی روح و جسم کو جھلسا دینے والی تیز دھوپ، ناہموار راستے اور بے ہودہ افراد کا یہاں سے وہاں تک بے پناہ ہجوم... بھائی مجھے راستہ دو۔ میں تمھارا بھائی ہوں، تمھارا اپنا۔ مجھے دیکھو، مجھے پہچانو، میں اسی شہر میں رہتا ہوں، اسی محلے میں، اسی گلی میں، تمھارے پڑوس میں، تمھارا اپنا ہوں کوئی غیر نہیں ہوں۔

مگر کوئی اسے نہیں دیکھتا، کوئی اسے نہیں سنتا۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔

اسے اپنی آواز کسی گہرے گٹر میں کلبلاتے پلے کی سی لگتی ہے جس کے وجود سے کوئی واقف نہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز مدھم ہوتی چلی جائے گی۔ اور ایک دن، پتہ نہیں ہو کون سا وقت ہوگا جب اس کی آواز ہمیشہ کے لئے کسی انجان دنیا کے لئے پرواز کر جائے گی۔ پیچھے رہ جائے گا اکڑتا، دم بہ دم پھولتا بدبو دیتا بے جان اور بے پہچان جسم۔ پھر کیچڑ کا ایک ریلا اسے بہالے جائے گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ایک روز پلا گٹر میں گر گیا تھا اور اپنے دفاع کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا، لکیاتا رہا تھا، مگر کسی نے اس کی سسکتی ہوئی پکار نہ سنی۔ بھلا کتے کی جان...

کیا میرا بھی یہی حشر ہونا ہے؟ میں تو انسان ہوں اور انسان کی زندگی بڑی مشکل سے شکل حاصل کرتی ہے۔ کوئی اسے یوں ہی کیسے ضائع ہونے دے سکتا ہے؟ کوئی اپنے وجود کی بے وجودی کیوں کر برداشت کر سکتا ہے؟ کیا میں بے شناخت اپنی موت کو گلے لگا سکتا ہوں؟ مگر موت کا تو ایک وقت معین ہے۔ جانے وہ کون سا لمحہ ہوگا۔

"جب میں مر رہا ہوں گا تب کیا تم میری جان بچا سکو گی؟"

"تم ایسی منحوس باتیں مت کیا کرو۔ مجھے ہول اٹھتا ہے۔" جان روٹھ گئی۔ "تم زندگی میرے ساتھ کرتے ہو اور موت کو دوست بنائے رکھتے ہو۔ پتہ نہیں تمھاری کون سی چول ڈھیلی ہو گئی ہے۔ میرے ہزار جتن کے باوجود تمھیں کوئی غم کھائے جا رہا ہے کہ روز بہ روز گھلتے جا رہے ہو اور کسی کروٹ سکون نہیں پاتے، بس وہی راتیں تمھاری کچھ ٹھیک گذرتی ہیں جب تم میری آغوش میں پناہ لیتے ہو۔"

"جان، مجھے اپنے وجود کی بے وجودی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے، کسی دن میں بھی گٹر میں پھنسے ہوئے کتے کی طرح بے موت مارا جاؤں گا۔ کوئی میرے ماتم کو بھی نہ آئے گا۔ سب مجھے بھول چکے ہیں۔"

"اگر بھول چکے ہیں تو تم بھی ان کو بھول جاؤ۔ میں ہوں نہ تمھارے ساتھ، تمھاری جان۔"

وہ اسے بھینچ بھینچ لیتی۔ جب وہ ننھا سا تھا اور اس کی ماں زندہ تھی، جب بھی کبھی وہ روٹھ جایا کرتا، جب کبھی وہ باہر سے پٹ کر روتا ہوا گھر آتا اس کی ماں بھی اسی طرح اسے اپنی نرم و گرم گود میں سمیٹ لیتی تھی۔ لیکن ماں کی گود اور جان کی آغوش میں فرق تھا۔ ماں کے پاس ممتا تھی، جان کے پاس حقیقتوں سے ٹکرانے کے مشورے۔ وہ اپنے مرد کو اس قدر مضبوط دیکھنا چاہتی تھی کہ جس کے سائے میں وہ خود پر سکون اور بے خطر ہو کر پناہ لے سکے، اسی لئے تو وہ اس کا حوصلہ باندھتی رہتی تھی کہ کمزور نہ پڑو، مردانہ وار ہر باد مخالف کا مقابلہ کرو اور میری حفاظت کرو۔ مگر وہ تو اپنی ہی حفاظت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کی ساری قوت ارادی اور توانائی اپنے وجود کو تسلیم کروانے ہی میں صرف ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے پہچانو، میں موجود ہوں یہاں۔ تمھارے درمیان، تمھارا اپنا۔

جب اس کی چیخ پکار لا حاصل نکلی تو اس نے بھی تہیہ کر لیا کہ اگر میں دنیا کے لئے ناموجود ہوں تو پھر واقعتاً ناموجود بن کر دکھاؤں گا۔ نہیں اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس کے پاس ایسا کوئی نسخۂ کیمیا نہیں تھا، جس کے استعمال سے وہ حقیقتاً غائب ہو جاتا، بلکہ اپنے برتاؤ سبھاؤ سے وہ اپنے ہی ذاتی باطنی انسان کو بروئے کار لانے میں لگ گیا۔

اپنے ہونے کو نہ ہونا بنانا اس قدر آسان تو نہ تھا۔ شروع شروع میں اسے بڑی دقتیں آئیں۔ جیسے سر راہ کوئی جان پہچان کا نظر آ گیا تو اس کی آنکھ بچا کر کس طرح نکلتا ہے، کس طرح اسے نظر انداز کرتا ہے، کس طرح چشم پوشی کرتا ہے۔ عادت کے دباؤ کے تحت آپ ہی آپ اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ جاتا۔ کسی کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ کرنے، چائے وائے پینے کی نوبت آتی تو بادل ناخواستہ اسے وہ بھی کرنا پڑتا۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے جان لیا کہ مقابل کو ان دیکھا کس طرح کرتا ہے۔ اس نے دور ہی سے بھانپ لینا سیکھ لیا کہ کوئی آ رہا ہے۔ پھر اس کے قدم کہیں اور نگاہیں کہیں ہوتیں۔

جلسوں محفلوں میں جانا اس نے ایک دم چھوڑ دیا۔ دعوت نامے آتے تو وہ انھیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا، ان پر سرسری نگاہ تک نہ ڈالتا۔ شادی بیاہ کا تو سوال ہی کیا، موت میت پر بھی وہ بے حس دم سادھے گھر میں پڑا رہتا۔ جب لوگوں نے اسے مردہ تصور کر لیا ہے تو میں بھی کسی موت پر کیوں ماتم کناں ہوں؟ ویسے بھی مردے کہیں آنسو بہاتے ہیں۔

خطوط آتے تو ان کو پڑھنا تو در کنار، وہ ان پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالتا۔ ڈیڈ لیٹر آفس کے خطوط کی طرح وہ اس کے کمرے میں، میز کی درازوں میں، پلنگ پر، سرنگوں تنہائی کی دھول چاٹتے رہتے۔

گذشتہ زندگی میں کبھی اس کے دل میں ترنگ اٹھتی تو وہ خود کو ٹھیل ٹھال کر کسی کے یہاں چلا بھی جاتا اور جہاں بھی جاتا وہاں کبھی کبھی گھنٹوں بے تکان باتیں بھی کرتا۔ لیکن اب اس نے ان تمام گھروں کی طرف جھانکنا ہی چھوڑ دیا اور جب اس نے انھیں چھوڑ دیا تو لوگوں نے بھی اس کی طرف آنا چھوڑ دیا۔ وہ یوں بھی کم کم ہی آتے تھے۔ شروع میں جب اکا دکا لوگ سال چھ ماہ میں اس سے ملاقات کی غرض سے آتے، وہ ان کو ٹالنے کے نت نئے جتن کرتا۔ جب میں موجود ہی نہیں ہوں تب میں کسی کو نظر کیوں آؤں، ان سے ملاقات میں اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کروں؟

اس کا خیال تھا کہ اپنی سراپا ناموجودگی کا احساس کرانے میں اسے کئی برس لگ جائیں گے، کیوں کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کٹ جانا اتنا آسان تو نہیں ہے۔ مگر اسے یہ دیکھ کر کچھ دھکا سا لگا کہ یہ سب تو چند ماہ میں اثر پذیر ہو گیا۔ ایک دم سناٹا! ہو کا عالم۔ گویا آپ جیتے جاگتے قبر میں دفنا دیئے گئے ہوں۔ مر گیا؟ چلو بلا ٹلی۔ اب نہ کوئی دعوت نامہ، نہ خط، نہ تار، نہ ٹیلی فون، نہ دروازے کی گھنٹی بجانے والی انگلی۔ یعنی خالی خالی تمبو اور خالی خالی ڈیرا۔ یہاں کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں، بس جان ہے اور میں ہوں۔

"جان! میں نے قلعہ فتح کر لیا ہے۔" وہ مکمل طور پر مطمئن ہو کر ایک روز جان سے بولا۔

"بڑا Neglect کیا تھا کم بختوں نے مجھے۔ میں نے بھی وہ چھکا مارا ہے کہ سب باؤنڈری کے باہر۔ اب کڑھنے، پیچ وتاب کھانے کے دن گئے۔ لو آؤ، پیار کریں۔"

"پیار تو کرلیں، لیکن تم جس راستے پر چل پڑے ہو وہ مناسب بھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ آخر تم نے دنیا تو ترک کی نہیں۔ اسی جہان میں انھیں افراد کے درمیان رہنا ہے اور جینا ہے۔ اتنے خود غرض نہ بنو۔ میری بات مانو تو پھر سے نارمل بن جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ تمھاری زود احساسی کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑے۔"

اسے دکھ ہوا کہ جان کو میری فکر سے زیادہ خود اپنی فکر ہے۔ وہ کسی سوچ میں گم ہوگئی تھی۔ اس کی پلکیں نیم وا تھیں۔ وہ اس کے پژمردہ چہرے پر بے شمار بوسے ثبت کررہا تھا۔ وہ مدہوش ہوئی جاتی تھی، لیکن چہرے پر ملال کا دھواں بھی تھا۔

"ڈرتی ہو؟"

اس کی آنکھیں سیپ کے مانند کھل گئیں۔ "کس سے؟"

"مجھ سے۔"

"تم سے کیوں؟" جان اس کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔ "تم تو میرے شریک زندگی ہو۔ میری خوشیوں کے محور۔ تم سے کیوں ڈروں گی بھلا؟ میں تو تمھاری اس علیحدگی پسندی سے خوف زدہ ہوں۔ انسان جب ٹھکرانے پر آتا ہے تب جنون میں ہر شے کو خس وخاشاک کی طرح روندتا ہوا چلنے لگتا ہے۔ یوں ہی رہا تو کل تم مجھے بھی ٹھکرا سکتے ہو۔ خیال کرو، کل کو بچے بڑے ہوجائیں گے اور ہم بوڑھے ضعیف، کمزور، سہاروں کے محتاج ہوں گے۔ دنیا کی ضرورت تب بھی پیش آئے گی، بلکہ اور بھی زیادہ۔ بچوں کے مستقبل کا کیا ہوگا؟"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جان نے اسے موقع نہ دیا۔ "بچوں کی شادیاں... ٹھیک ہے لوگوں سے تمھاری نہیں بنتی۔ وہ تمھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، تمھیں ہر وقت کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔ تمھیں کبھی کبھی اپنے مطلب کے لئے استعمال بھی کرلیتے ہیں... تو اس میں اس قدر بگڑنے کی بات کیا ہے؟ بس ذرا اندر ہوش رکھنے کی ضرورت ہے جیسے عورتیں رکھتی ہیں۔ پتا بھی کھڑکتا ہے تو جاگ جاتی ہیں۔ چھٹی حس کو بیدار کرلو۔ اور میری سنو تو اپنے گلے میں ایک تختی ڈال لو Keep Distance!۔"

جان کھلکھلائی اور بیل کی مانند اس سے لپٹ گئی۔ خوشبوؤں کا دریا اس کے اندر بہتا چلا گیا یہ جان تو کبھی میری جان لے کر رہے گی۔ "تم اپنے رنج وغم، اپنی پریشانی مجھے دے دو..." اس نے سرگوشی کی۔

کچھ دن بعد اسے محسوس ہوا اس پر کچھ نشہ چھانے لگا ہے۔ یہ نشہ جب پوری طرح طاری ہوتا ہے تب اسے اچھی سی نیند آتی ہے اور دن نکلنے کے بعد بھی سوتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ جان کو وہ کھینچتا چلا گیا۔ یہ روز کا معمول ہوگیا۔

دنیا سے کنارہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں کہ وہ اگر باہر نہیں ہے تو پھر اندر بس جاتی ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔ بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ اور جاؤ گے تو کتنے دن؟ کبھی تو مہاتما بدھ نہیں ہوتے اور بدھ بھی اکیلے کہاں تھے؟ بھکشوؤں کا ایک قافلہ تھا ان کے ہمراہ۔ حضرت محمدؐ بھی غارِ حرا کو تشریف جاتے تھے تو لوٹ کے اپنے حجرے میں آتے تھے اپنے اہل وعیال، اپنے صحابیوں کے پاس۔ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ اور دنیا سے جیتے جی چھٹکارا ممکن نہیں اور کیا عجب کہ مرجانے کے بعد بھی یہ کم بخت دنیا پیچھا نہ چھوڑتی ہو۔ یہ دنیا والے... کم بختوں نے جینا محال کر رکھا ہے اور یہ جو جان ہے، میری جان، یہ بھی دنیا کی طرف دار ہے۔ ہم خانہ بھی ہم خیال نہیں تو پھر میں جاؤں کہاں؟ تری دنیا میں دل لگتا نہیں، مالک اٹھالے...

لاکھ سجدے میں گرو تو کیا ہے؟ ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے۔ چیزوں پر، دنیا پر، واقعات پر آپ کا کچھ اختیار نہیں، چاہے لاکھ سر پٹک لو۔ کچھ نادیدہ طاقتیں ہمیشہ تعاقب میں رہیں گی۔

اتنا تو پھر بھی ہوا کہ دنیا جہان سے منقطع ہوکر وہ پرسکون نظر آنے لگا تھا۔

مگر ایک روز صبح اس کے گھر کی کال بیل بجی۔ اس وقت وہ ان دانتوں پر برش کررہا تھا جنھیں کچھ عرصے سے اس نے کٹکٹانا بند کردیا تھا۔

جان دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "کوئی آیا ہے، کیا کہوں؟ گھر میں ہیں یا باہر گئے ہیں؟"

"نہ تو میں گھر میں ہوں نہ باہر گیا ہوں۔ دیکھو تو کسی بندہ ہے کون؟"

وہ تیزی سے برش چلانے لگا۔ واش بیسن کے آئینے میں اس نے دیکھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ابھی وہ اپنی کپکپاہٹ کو سمجھنے کی بے سود کوشش کررہا تھا کہ جان بدحواس، گھبرائی ہوئی، ہانپتی سی اس کے قریب آئی۔ شہادت کی انگشت دروازے کی طرف اٹھائے وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"وہ... وہ... وہاں کون ہے؟ تم... تم یہاں ہو تو وہاں کون ہے؟"

"ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں حرام زادے کو۔ دروازے پر علی الصبح کون کم بخت آن مرا ہے؟ میری جان کو ڈرا دیا۔ کوئی بہروپیا ہے کیا؟"

جیسے ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا اور چق کے باہر کھڑے ہوئے ہیولے پر اس کی نظر پڑی، اس کے ہاتھ سے برش گر پڑا اور جان کی طرح اس پر بھی گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

دروازے کے اس طرف جو کھڑا تھا، وہ تو خود ہی تھا۔ بالکل وہی۔ بس فرق اتنا تھا تو صرف اتنا کہ ادھر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ادھر اس کے ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ تھی...

خود اعتمادی سے دمکتا ہوا چہرہ اور بڑی ملائم آنکھیں، لمبی پلکیں جیسے کسی ننھی سی چڑیا کی خوب صورت پر کسی حسینہ کے رخسار کو سہلا رہے ہوں۔ وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہو گے؟ تم نے تو ملنا ہی چھوڑ دیا، ایک مدت ہوگئی تم کو دیکھا نہیں تھا۔ آج ادھر سے گذر رہا تھا تو سوچا..."

اسے یاد نہیں کہ نو وارد نے جملہ کس طرح مکمل کیا، کب وہ اندر آیا اور کب کیا ہوا؟

لیکن اس روز وہ غسل خانے سے گنگناتا ہوا باہر نکلا تو جان اس کی شگفتگی دیکھ کر حیران رہ گئی ☆☆☆

حسن عزیز

شمارہ ۱۰۳،
مارچ، اپریل ۱۹۷۷

نہ چھین لے کہیں بڑھ کر مری چمک مجھ سے
کچھ ایسا دور نہیں رات کا فلک مجھ سے

کہیں اندھیرے میں تیرا ہی کچھ سراغ لگے
تو روشنی ہے تو باہر کبھی جھلک مجھ سے

اٹھا سکے تو اٹھا بار خواب تنہا تو
طلب نہ کر مری تائید کی کمک مجھ سے

ترا وجود نہیں ہے تو بھاگتا کیوں ہے
قریب آ، کہ نہیں میں بھی، مت جھجک مجھ سے

میں ایسے تپتے حصاروں میں قید ہوں کہ جہاں
ملا نہ آ کے کوئی لمحۂ خنک مجھ سے

یقین کر لو مرے سامنے سراب سہی
نہ اٹھ سکے گا حسن اور بار شک مجھ سے

شمارہ ۱۳۳،
جون ۱۹۸۴

ایک لغزش پہ مری کیسی صدا کرتا تھا
آپ اپنے کو حسن کچھ نہ کہا کرتا تھا

اتنی سی بات پہ سو چہرے اتر جاتے تھے
میری تائید میں اک ہاتھ اٹھا کرتا تھا

تھے تو پہلے بھی مگر اتنے تہی دست نہ تھے
اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بسا کرتا تھا

کھوتے رہتے تھے اسے رات کی تاریکی میں
کچھ اگر دن کے اجالے سے بچا کرتا تھا

رنگ دیتا تھا وہ بے آب فضاؤں کو حسن
زرد ہوتے ہوئے موسم کو ہرا کرتا تھا

حسن عزیز

شمارہ ۱۸۹،
دسمبر ۱۹۹۵

زمین جسم کو تازہ ہوا کی چاہت تھی
ہمارے گھر میں مگر آسماں کی قلت تھی

تلاش کرتا رہا آتش معانی میں
کتاب جسم مگر برف سے عبارت تھی

کسی کے بس کا نہ تھا ایک اکیلا سورج بھی
دیار سایہ میں ہر پل نئی قیامت تھی

وہ اور شب تھی کہ ہم راستہ نہیں بھولے
چمکتے چاند کی حاصل ہمیں قیادت تھی

اسے بھی عشق تھا تعبیر کے تماشوں سے
ہمیں بھی جاگتی آنکھوں کے خواب کی لت تھی

مرے سوا صف دشمن میں اور کوئی نہ تھا
خود اپنے آپ سے اب کے مجھے عداوت تھی

میں منتظر تھا حسن شاخ شب کے ٹوٹنے کا
گھنے درخت کے نیچے عجیب ہیبت تھی

حسن فرخ

شمارہ ۱۷۶،
اگست، ستمبر ۱۹۹۴

چاند کا اک ٹکڑا، ننھا منا، شیریں شیریں
ہر راز سے واقف، ہر جنبش کی لذت پر نازاں
غنچہ دہن، سرمایۂ جاں گودی میں پروان چڑھا تھا
اب کہتا ہے اپنی فکر کرو، صبر کرو، جھنجھلاتے کیوں ہو؟
رات کی تاریکی حالات کے اندھے کنویں سے ابھرا
ایک ستارہ سہما سہما، حیراں حیراں
آنکھوں میں اتر کے، ہاتھوں سے پھسل کے، فرحاں فرحاں
کہتا تھا سورج میری منزل ہے، آنکھوں میں دیے جلاتے کیوں ہو؟
وقت کی ہر ہر آہٹ سے خوف زدہ
ایک ستارہ، جھل مل جھل مل، شاداں شاداں
زینوں سے اترا تھا، جذبوں کی فرحت سے گریزاں
کہتا تھا بیزار نہیں ہو تو ڈولی آخر منگواتے کیوں ہو؟
سورج کی تمازت سے بپھرا
ایک ستارہ، سمٹا سمٹا، لرزاں لرزاں
آنگن میں پھیل گیا تھا لمحوں کی شدت سے پشیماں
کہتا تھا جب آگ بجھا نہیں سکتے ہو تو لگاتے کیوں ہو؟
پھر ٹوٹ گیا وہ دے کر ایک کھلونا
لمحوں میں بدلتے زردرتوں کے تیور میں سمٹے
اور نہ جانے کتنے ستارے، ڈھیرے ڈھیرے، فرحاں فرحاں
دل کی دھرتی پر بکھرے، پہلی بارش کی بوندوں سے پرافشاں
کہتے تھے، اظہار کی جرأت تو کر چکے ہو، پھر گھبراتے کیوں ہو؟
آج سبھی اپنے اپنے قدموں میں داخل جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں
میں سرحد پہ خلا کی ٹھہرا بس گردش دیکھا کرتا ہوں
کھوئی کھوئی آنکھوں کو، خوابوں کے کھلونے بیچا کرتا ہوں

حسن منظر

شمارہ نمبر ۲۰۵،
اپریل ۱۹۹۷

سورج کے سر پر آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں گپھاؤں کے سامنے پہاڑی کی اوٹ میں سوکھی ہوئی گھاس پر بیٹھی تھیں۔ بچوں میں سے کوئی کھیل نہیں رہا تھا۔ وہ ایک وقفے وقفے سے اپنی ماؤں کے سینے میں منہ مار کر دیکھتے تھے اور بلکنے کی سی آواز نکال کر خاموش ہو جاتے تھے۔ ماؤں میں بھی اتنا دم نہیں تھا کہ انھیں کندھے سے لگا کر ٹہلنے لگیں یا بازوؤں میں جھلائیں۔

دور سے ایک لحیم شحیم آدمی گپھاؤں کی قطار کی طرف آتا نظر آیا۔ وہ ادھر کا آدمی نہیں تھا۔ ہرن کی کھال اس نے سوکھی ہوئی بیل سے اپنے کولھے پر باندھ رکھی تھی۔ اوپر کا دھڑ کھلا تھا۔ اس کی رنگت سیاہ تھی اور اس کے سیاہ بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ لگتا تھا کہ سر گردن اور چہرے پر اس نے بھالو کی کھال پہن رکھی ہے اور اس کے شگافوں میں سے اس کی آنکھیں، ناک اور ہونٹ جھانک رہے ہیں۔ ہونٹ سیاہی مائل سرخ تھے اور ان کے درمیان نوکیلے دانت نظر آرہے تھے، جن میں سے کچھ ٹوٹے ہوئے بھی تھے۔ شاید کہ ان لوگوں میں سے تھا جو گوشت کو پھاڑ کر کھاتے ہیں اور اس کے لئے دانتوں کو کھردرے پتھر سے رگڑ کر نوکیلا بنا لیتے ہیں۔ جیسے شیر، بلیوں اور کتوں کے دانت۔

جب وہ اور نزدیک آگیا تو سب کو پتہ چلا اس کی گردن کے پیچھے سے دونوں کندھوں پر ایک ہرن پڑا تھا، جس کی چاروں ٹانگیں اپنی ٹھوڑی کے پاس ملا کر اس نے اپنے الٹے ہاتھ سے پکڑ رکھی تھی۔

اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک لمبا، پتھر کا تیز دھار والا ہتھیار تھا اور کمر پر بندھی ہوئی سوکھی بیل میں بھی اس نے ایک پتھر کا ہتھیار اڑس رکھا تھا جو بڑے ہتھیار کے آدھے کا بھی آدھا ہوگا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے جھاڑی کی طرح الجھے ہوئے بالوں پر بھی خون لگا تھا اور ہرن کے پٹھے پر بھی جما ہوا سیاہ خون تھا۔

دونوں ہتھیار بھی بے دھلے تھے۔

پوری گپھاؤں میں کوئی مرد نہیں تھا۔

گھاس پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم سست ہوئے اور جب عورتوں نے اسے دیکھ کر نہ بیزاری سے منہ موڑے نہ ہاتھ سے آگے چلتے رہنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک جگہ پر رک گیا۔ پہاڑی کی چھاؤں اس تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن لگتا تھا اسے دھوپ کی فکر نہیں ہے۔

کچھ عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں، کچھ اٹھتی اٹھتی بیٹھ گئیں اور لڑکیاں اپنی جگہ پر بیٹھی بیٹھی اسے دیکھتی رہیں۔ بچوں کا رونا رک گیا۔

عورتوں کا خیال تھا وہ شاید پانی کا پتہ پوچھے گا لیکن وہ صرف عورتوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ عورتیں بھی اسے دیکھتی رہیں۔ لڑکیوں میں سے کچھ بے دھیانی سے بے جان گھاس کو کھینچ کھینچ کر توڑنے لگیں۔

کسی گپھا میں کوئی مرد نہیں تھا، کوئی بیمار یا زخمی مرد بھی نہیں۔

ہرن بڑا اور مضبوط جسم کا تھا۔ اس کے سینگ لمبے، نوکیلے اور سیاہ تھے، پیٹ بھرا ہوا تھا جیسے تھوڑی ہی دیر پہلے چرنے سے فارغ ہوا تھا، اپنی جان بچانے کے لئے پوری تیزی سے نہیں دوڑ پایا اور مارا گیا۔ اس کو شکار کرنے والا بھی بہت بڑا اور مضبوط شخص تھا جو اکیلا اتنے بھاری بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھا جو دو مردوں یا چار

عورتوں کے اٹھائے نہ اٹھتا۔ بوجھ جتنا بھی تھا اور دھوپ جیسی بھی تھی اس کا ارادہ ہرن کو خود سے جدا کرنے کا نہیں دکھائی دیتا تھا تاوقتیکہ گوشت سڑنے ہی نہ لگے اور اس کے پیچھے پیچھے سیاروں اور کتوں کی قطار چلنے لگے۔

ہوا ابھی پوری طرح سے گرم نہیں ہوئی تھی۔ ایک جگہ چھاؤں میں چار چڑیاں چونچیں کھولے بیٹھی تھیں۔ اس کی پشت پر سامنے کے درخت کی شاخیں ہل رہی تھیں۔

جب اسے وہاں کھڑے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو ایک عورت نے جو اس کے یہاں آنے پر اس کی نیت بھانپنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر کچھ پتہ نہ پڑنے پر بیٹھ گئی تھی اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے چلا کر کہا "ہمارے یہاں کوئی مرد نہیں ہے!"

وہ اس عورت کی بات سمجھ گیا کیونکہ انسان کے الفاظ کے ملنے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور وہ وہاں جہاں دیودار Cedar کے درخت ہیں اور وہاں جہاں باؤباب Baobab کے درخت ہیں اور وہاں جہاں برگد Banyan کے درخت ہیں سب جگہ ایک ہی جیسے تھے۔ ان گپھاؤں والوں کے ساتھ ہی اس کے لوگوں کو بھی لفظ ملے تھے اور مناسب چیزوں اور مخلوق کے نام جانتا تھا اور سب کاموں کے بھی۔ لیکن کاموں کے نام اس نے، اور یہاں والوں اور سب جگہ والوں نے اپنے اپنے طور پر ڈھونڈ نکالے تھے۔

اس نے اپنے لمبے ہتھیار کو گردن ٹیڑھی کرکے کندھے اور سر کے بیچ میں تھاما، ٹھوڑی کے بالوں میں پانچوں انگلیاں ڈال کر بالوں کے نیچے کو سونتا جیسے منہ کو کھولتا ہو اور کہا

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمھیں معلوم ہے؟" اسی عورت نے کہا

"ہاں۔"

"کیا؟"

"اتنی دور چل کر جاؤ کہ دو بار سورج نکلے اور ڈوبے اور تیسری بار سر پر آجائے تو تم ان کو دیکھ سکتی ہو۔" سب کے چہروں پر اشتیاق ابھر آیا۔ صرف بہت بوڑھی عورتیں غیر متعلق بیٹھی رہیں۔

"کیا دیکھ سکتی ہوں؟" اسی عورت نے کہا۔

"سب مرے پڑے ہیں۔"

سب کے منہ سے 'سی' کی سی آواز نکلی۔

پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا، "ہو سکتا ہو اب نہ پڑے ہوں۔ دو پورے دن اور ایک اتنا دن کہ سورج سر پر آجائے چل کر میں یہاں پہنچا ہوں۔"

پھر اشارے کے لئے ہرن کو ایک جگہ جمع کئے ہوئے کھروں کو تھوڑی سے چھوتے ہوئے اس نے کہا:

"بس اسے مارنے کے لئے آج صبح ایک جگہ پر رکا تھا۔ ہو سکتا ہے اب تک بھیڑیے اور لگڑ بگھے انھیں کھا کر اپنی ماندوں کو جا چکے ہوں۔"

پہلے کا سوال جواب کرنے والی عورت رو اٹھی، پھر باقی سب عورتیں رونے لگیں اور ان کے پیچھے لڑکیاں۔ بڑوں کو روتے دیکھ کر خوف زدہ بچے اپنی ماؤں اور بڑی بہنوں سے لپٹ گئے۔ ایک بچے نے اپنی کھڑی ہوئی ماں کو اس کے کولھے پر بندھی ہوئی کھال سے کھینچ کر درخت کی شاخ کی طرح نچایا اور اس کے کولھے پر چڑھ گیا۔ اس نے دودھ پینا چاہا لیکن عورت کے تھن برسے ہوئے بادلوں کی طرح خالی تھے۔ جب بچہ رویا تو اس کے رونے میں غصہ تھا۔

بوڑھی عورت نے طنز اور خفگی سے کہا "اس سے پوچھو اسے کیسے معلوم وہ ہمارے مرد ہیں؟"

"تم خود پوچھ لو۔"

"اگر تمھارے نہیں ہیں تو تمھارے مرد کہاں گئے؟" نووارد نے بے رخی سے کہا۔

عورتیں لاجواب ہو گئیں۔

"جہاں وہ لوگ پڑے تھے وہاں سے پیروں کے نشان کو جاتے ہیں جدھر سے آیا ہوں اور جہاں کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ وہاں سے پیروں کے نشان میں نے ادھر کا رخ کرتے نہیں دیکھے۔

"راستے میں کوئی اور آبادی نہیں پڑتی جہاں مرد نہ ہوں، صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں یا بچے۔"

بوڑھی عورت نے کہا "تم بھی وہیں کے ہو؟"

اس نے کہا۔ "نہیں، وہاں سے پرے کا ہوں۔ راستے میں وہ گپھائیں ہیں جہاں کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ پھر میں چلتا رہا اور وہاں پہنچا جہاں وہ لوگ تمھارے لوگوں سے لڑے تھے، اور تمھارے لوگ گرے تھے۔ پھر میں سیدھ میں چلتا رہا اور یہاں پہنچا جہاں ایک بھی مرد نہیں ہے۔"

اس یقین نہ کرنے والی بوڑھی عورت نے حساب لگایا کہ کتنی دفعہ سورج تب سے اب تک ابھرا اور ڈوبا تھا جب وہ لوگ یہاں سے گئے تھے، پھر نووارد سے پوچھا:

"ان کا خون تازہ تھا؟"

"نہیں۔ زمین پر سوکھ چکا تھا۔ لیکن نہ ان کے پیٹ پھولے تھے، نہ لاشوں سے بدبو آ رہی تھی، نہ ہی جنگلی جانور اس وقت تک وہاں آئے تھے۔"

بوڑھی عورت نے ایک بار پھر اس دن کو جب مرد لڑنے کے لئے گئے تھے اور نووارد کے یہاں تک آنے کے پورے اور آدھے دنوں کو جوڑتے ہوئے کہا، "وہی تھے۔"

عورتیں رونے کو ہوئیں اور چپ ہو گئیں۔

سوال جواب کرنے والی عورت نے اپنے بچے کو سامنے کرتے ہوئے اس کے منہ اور پچکے ہوئے پیٹ پر انگلیاں رکھ کر انجانے شخص کو دکھاتے ہوئے کہا "بھوکا ہے۔ ہم سب بھوکے ہیں۔ یہ جناور ہمیں دے دو۔"

ایک عورت نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا، "ہم تمھیں پتی پر لے جائیں گے۔"

آدمی نے، لمبے تیز دھار کے ہتھیار والے آدمی نے کہا "لالچ دلاتی ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ پھر اس نے ہرن کے کھروں کو اپنی انگلیوں کی گرفت سے اچانک چھوڑ دیا اور وہاں دھب سے زمین پر

گرا۔ پھر وہ عورتوں سے بولا۔

"دیکھو میں جہاں سے آیا ہوں وہ جگہ یہاں سے آٹھ بار سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی مسافت پر ہے اور اگر چاند اچھی روشنی دینے والا ہو تو راتوں کا بھی کچھ حصہ چلنے کے لئے رکھو۔ لیکن میں بھوکا نہیں ہوں کیونکہ میرے ہاتھ میں یہ ہے۔" اس نے ہوا کو ہتھیار سے کاٹتے ہوئے کہا۔

عورتوں کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔

اس عورت نے جس نے پانی پر لے جانے کی بات کی تھی، کہا، "بھوکے ہونے کی بات کس نے کی؟"

"میں نے۔" نو وارد شخص نے کہا۔

"کس کے لئے؟"

"تمھارے۔"

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ تم بھوکے نہیں ہو۔" ایک اور عورت نے جس کے گھٹنے کھال کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ننگے تھے، کہا۔

"ہاں یہی میں بتانے جا رہا ہوں۔" پھر اس نے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں پیٹ سے بھوکا نہیں ہوں، پیٹ سے نیچے بھوکا ہوں۔ تم سمجھ گئیں؟"

چھاؤں سمٹ گئی تھی اور چڑیاں سوکھی گھاس پر چل کر اس میں چلی گئیں۔

کچھ توقف سے ایک عورت جو کافی عمر کی تھی لیکن بوڑھی بھی نہیں اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شکاری نے، کیونکہ اسے یہی کہا جا سکتا ہے، اس عورت کو ہاتھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ اس طرح کیا جیسے اسے زمین میں دھنسا رہا ہو، اور ایک کم عمر لڑکی کی طرف سر کی جنبش اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اس کا جسم بمشکل جوان ہوا تھا۔ وہ سہم گئی۔

عورت نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے لڑکی کو آنکھوں اور سر کی عمودی حرکت سے رضامندی کا اشارہ کیا۔

لڑکی نے جو بچہ اس کے بازوؤں سے لپٹا ہوا تھا، اس گھاس پر لٹا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

شکاری نے اپنے ہتھیار کو زمین پر رکھ کر ہرن کو پھر سے اپنی گردن کی پشت پر لاد لیا۔ سب عورتوں کے منہ سے استعجاب میں اُوْ نکلا۔

شکاری نے اپنا ہتھیار اٹھایا اور سامنے کے درخت کی طرف چل پڑا جو پہلے اس کی پشت پر تھا۔

لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

یہ اس لئے ضروری تھا کہ انسان پر اس کی شرم ہویدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، ورنہ کولھوں سے بندھی کھالوں سے نہ عورتوں کی اوپر کی شرم پوری طرح چھپتی تھی نہ ہی مرد کی نیچے کی اگر وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے گھٹنے موڑے۔ گپھاؤں میں بھی یہی حال تھا جہاں ایک ایک میں کئی کئی مرد، عورتیں، بچے مل کر رہتے تھے۔

مرد اور اس کے پیچھے چلتی ہوئی لڑکی پیڑ کے نیچے پہنچے۔ شکاری نے ایک بار پھر اپنا ہتھیار، وہی لمبا، تیز دھار کا پتھر کا ہتھیار زمین پر رکھا اور ساتھ ہی ہرن کے پیروں کو بھی چھوڑ دیا۔

ہرن کے گرنے کی آواز گپھاؤں کے باہر بھوری پیلی گھاس پر پہاڑیوں کے سائے میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

ہوا میں ہلکی گرمی آگئی تھی۔ درختوں کی شاخیں ہل رہی تھیں اور سائے سے باہر اگی ہوئی گھاس کی پتیاں بھی۔ جہاں وہ دونوں سب کو نظر آرہے تھے وہ جگہ چٹیل تھی۔ اس طرح تا حد نگاہ نہ کوئی جانور چرتا نظر آرہا تھا اور نہ ہوا میں پر مارتا کوئی پرندہ۔

بوڑھی عورت نے تینوں طرف افق کو دیکھا پھر سب کو سنانے والی آواز میں کہا۔ "ادھر پیچھے، آدھے یا ایک دن کے فاصلے پر ہرن بھی ہیں اور بکریاں بھی۔"

کسی نے اس کی بات کو نہیں جھٹلایا۔ سب چپ رہیں۔

پھر بڑھیا خود ہی بولی۔ "جب مرد چلے گئے تو ہمیں خود ہی جا کر کسی جانور کو شکار کرنا چاہیے تھا۔"

"اتنی جان ہے ہم میں؟" ایک جوان عورت نے کہا جو اب تک خاموش رہی تھی۔

"اب نہیں ہے تو کیا ہوا، جب تو تھی جب مرد ایک سورج کے چڑھنے سے دوسرے کے چڑھنے تک نہیں لوٹتے تھے؟" کسی نے نہ اس کی بات کو رد کیا نہ احسنت کہا۔

"بلکہ جب بھی جانا چاہیے تھا جب مرد یہاں تھے۔"

جب مرد چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کو سنبھالنے لگا تو لڑکی بھی اور چوپایوں کی طرح اپنے جسم پر مل مل کر سوکھے پتوں اور مٹی کو جھاڑنے لگی۔ جس طرح وہ گئے تھے اسی طرح واپس لوٹے۔

لڑکی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور جو بچہ اس کے دور جانے سے پہلے اس کے بازو سے چپٹا ہوا تھا پھر سے اس کے کندھے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شکاری کو غصے سے دیکھ رہا تھا کیونکہ جتنی دیر لڑکی وہاں نہیں تھی وہ گھاس پر پڑا رہا تھا۔ شاید اسے ابھی بغیر سہارے کے کھڑا ہونا نہیں آیا تھا۔

کسی نے لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ سب کی نظریں شکاری پر تھیں۔

ان لوگوں کے اور نزدیک آ کر شکاری نے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ہرن کو ان کی طرف پھینکا اور بولا:

"مجھے معلوم ہے پانی کہاں ملے گا۔"

پھر بغیر ہمدردی کے دو بول بولے یا ان کی حالت پر تضحیک کا تاثر دکھائے اپنے ہتھیاروں کو جسم پر سجائے اور اپنی ہرن کی کھال کی پوشاک پہنے وہ اپنی راہ پر آگے چل پڑا ☆☆☆

حسن نعیم

شمارہ ۳۱،
دسمبر ۱۹۶۸

میں کس ورق کو چھپاؤں دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

ہمیں نہ بھولنا آلام صدزماں کہ یہاں
ہمیں ہیں مسکن حرماں ہمیں ہیں بیت عذاب

پکڑ کے دامن دل یا جھکا کے سر اپنا
دیا ہے خواب شکستہ کا ہر کسی کو حساب

گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی وہاں بھی مرگ سراب

ان ہی سے شب میں اجالا ان ہی سے خیال
مرے لئے تو بہت کچھ ہے دیدۂ بے خواب

مرے کلام کی تفسیر کے لئے پڑھئے
جمال فکر کی آیت نوائے جاں کی کتاب

وہ آنکھیں پیار کے لہجے میں کہہ رہی تھیں حسن
ہمیں سے مانگ پیالہ، ہمیں سے مانگ شراب

شمارہ ۹۸،
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

(جانِ سخن کا سراپا تجاہل عارفانہ میں۔ قوافی میں یائے معروف
اور یائے مجہول کی تخصیص نہیں ہے۔ حسن نعیم)

جو ہی رہ جاتی ہے بے باس چنبیلی کیا ہے؟
وہ نہ آئی تو مری جاں کی حویلی کیا ہے؟
خط ابرو میں ہے کس موجۂ گیسو کی جھلک
اس کی آنکھوں میں کوئی لہر نکیلی کیا ہے؟
جگمگاہٹ میں ہے پیکر کی وہ عریاں عریاں
گل سے چہرے پہ ستوں وصف اکیلی کیا ہے؟
موتیاں میں پس پردہ کہ ہے شیریں سخنی
اس کے ہونٹوں میں کوئی چیز رسیلی کیا ہے؟
خیمۂ نے سے صدا آئی کہ اے ساز گلو
کوئی شے تجھ سے قریں اتنی سجیلی کیا ہے؟
دل کی دھڑکن سے بہت ملتی ہے قدموں کی صدا
جوئے آواز میں اک موج سریلی کیا ہے؟
سرکشی اس کے ہی قامت پہ نچھاور کیوں ہے
اس کے ہی لمس میں اک آنچ نشیلی کیا ہے؟
پاؤں صندل کے لگیں، اس کا مطالب کیا کچھ
کنجیاں ناف پہ جھومیں، یہ پہیلی کیا ہے؟
اس کے ہاتھوں میں کھلی اور بھی تقدیر حنا
رشک لالہ ہے نعیم اس کی ہتھیلی کیا ہے؟

شمارہ ۱۲۰،
اپریل، مئی ۱۹۸۱

وہ علم دے، جو سخن کو وقار دیتا ہے
وہ درد بخش، جو فن کو نکھار دیتا ہے

یہ کون دل میں جلاتا ہے آتش امید
وبال فکر کو سر سے اتار دیتا ہے

کسی کو جبر سے کرتا ہے وہ تہ شمشیر
کسی کو اپنے کرم ہی سے مار رہتا ہے

ستم نواز زمانے سے پوچھئے تو سہی
وہ کس ظریف کو دامان یار دیتا ہے

جسے سلیقہ ہے ظلمت کو نور کرنے کا
وہ دن کو رات بنا کر گذار دیتا ہے

سنا نہ مجھ کو فسردہ گلاب کا نوحہ
وہ برگ لا جو سراغ بہار دیتا ہے

میں اس درخت سے کم تر ہوں مرتبہ میں حسن
جو دھوپ سہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

سبرا منیم کیوں مرا

حسین الحق

شمارہ ۱۵۲
نومبر، دسمبر ۱۹۸۸

مدھولتا نے بے تاب ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

ایک گھنا سفاک اندھیرا... آدمی کٹی گردن والے خون سے شرابور جسم کی چھٹپٹاہٹ۔

اسے ایسا لگا جیسے بارہ بور کی رائفل کی نال اس کے پیٹ پر رکھ کر لبلبی دبا دی گئی ہو..

جب اس کے پاپا نیفا کے مورچے پر شہید ہوئے تھے تو وہ گیارہ بارہ برس کی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی ماں جب پھپھک پھپھک کر رونے لگی تو پاپا کا سامان لے کر آنے والے جوان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"بہن! تو تو بھاگیہ وان ہے کہ تیرا آدمی وطن کے کام آیا، تو روتی کیوں ہے؟ ابھاگے تو ہمارے بال بچے ہیں کہ ہمارا لہو ہماری مٹی کو پسند نہیں آیا۔"

ماں اس وقت تو چپ نہ ہو سکی مگر بعد میں جب جب پاپا کا ذکر ہوتا تو ماں کی آنکھوں میں جیسے سورج اتر آتا... سرخ روشنی دیتی زندگی سے بھرپور آنکھیں ... ایسا نہیں تھا کہ ماں نے پاپا کی کمی محسوس نہ کی ہو۔ پاپا کے بعد ماں پر کئی بار تھکاوٹ ٹوٹ ٹوٹ کر برسی... کیسے عجیب بھیانک دن تھے وہ، سونے بازار، ہو کا عالم، لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھتے کوئی بری خبر لئے دوڑا چلا تو نہیں آرہا ہے! ہم کیا ان سے تعداد میں کم تھے لیکن جب سربراہ زکام کے ڈر سے مورچہ چھوڑ دے تو پیچھے والوں کو تو فالج مار ہی دے گا۔ مگر اس کے باوجود میرے گھر کا تو سر فخر سے تن ہی گیا... بعد میں پاپا کو پرم ویر چکر.... اس سے یاد کرنا چاہا تو اسے ہلکا ہلکا یاد آیا... نہرو جی اس کی ماں کو تمغہ دے رہے تھے...

اسی وقت کی بات، جھک کر اسے پیار کیا، کیسی لالما تھی ان کے چہرے پر... ماں سے وہ پاپا کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے، پھر مدھو کی طرف مڑے... بس ایک جملہ یاد رہ گیا۔ "بہادر باپ کی بہادر بیٹی۔" اسکول میں بھی لوگ اسے دیکھ کر کہتے۔ "شہید کی بیٹی۔"

اس ایک لفظ میں جانے کون سا جادو تھا کہ اس کے انگ انگ میں خون قلانچیں بھرنے لگتا... ایک مرتبہ اس کا جی چاہا تھا، کاش آئینہ ہوتا اور وہ دیکھتی کہ کیسی لگتی ہے وہ اس وقت.. جب شہادت کی مسرت اس کے اپنے آپ میں اتر آتی ہے! بعد کے دنوں میں ایک مرتبہ اس نے اپنے آپ سے یہ سوال بھی کیا... اسے اپنے پاپا کے مرنے کا دکھ زیادہ ہے یا ان کے شہید ہونے کی خوشی زیادہ ہے؟

تناسب کا یقین وہ کبھی نہ کر سکی مگر انتہائی اداس لمحے میں بھی پاپا کا سامان لے کر آنے والے جوان کی بات اسے ضرور یاد آئی... "تو تو بھاگیہ وان ہے... تیرا آدمی وطن کے کام آیا۔"

پس ماں پر جب جب تھکاوٹ ٹوٹ کر برسی تو اس کا شہید شوہر ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ بنا۔

مگر...

اچانک مدھو کے خیال کی رو بھٹک گئی... اس نے بے تاب ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا... ایک گھنا سفاک اندھیرا اور اس گھنے سفاک اندھیرے میں آدمی کٹی گردن والے خون خون جسم کی چھٹپٹاہٹ... اس نے اپنے آپ میں ایک عجیب قسم کی ہولناکی محسوس کی جیسے کوئی بڑا ہی خوفناک، بھیانک، اور غلاظت میں لت پت درندہ اس کی رگوں میں سیال بن کر اتر رہا ہو۔

"ایسا کیوں ہے؟" سوال کا بھیانک عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

"ایک ہی طرح کے دو افراد کا یکساں عمل الگ الگ تاثر کیوں پیدا کرتا ہے؟

"بیچارہ بچہ!"... وجود کی انتہائی گہرائیوں تک اتر جانے والی گونج!

اس نے بے تاب ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا... بولنے والا شام کی دھند میں رل مل چکا تھا۔

بولنے والا تو جانے کب کا جنوب کی گرم شام میں، شاید کسی سائے کی تلاش میں، کہیں اور جا چکا تھا... مگر الفاظ اگیا بیتال کی طرح اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔

"بیچارہ بچہ!" اس نے تڑپ کر کھڑکی بند کر دی اور کھڑکی کے شیشوں سے اپنا گال چپکا لیا... ایک تیز سریع الاثر زہر کی طرح رگ و پے میں جہنم انڈیلتی ٹھنڈک اس کے سراپے میں اترنے لگی... اسے پھر پاپا یاد آئے۔ کیسا مضبوط سہارا تھا وہ... ہم سب کا... پاپا مر کر شہید کہلائے اور امر ہو گئے۔ کیسا زندہ... شہرگ سے فوارے کی طرح ابلتے ہوئے خون سمان آئیڈیل بن گئے تھے وہ، صرف گھر کا نہیں... پورے شہر کا... شاید سب کا۔

پھر مدھو کی شادی کا مسئلہ سامنے آیا۔ شہید کی بیٹی کی شادی!

اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا، کسی فوجی کی بیوی بننا میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔

مگر آج... اگیا بیتال نے پھر اسے گھورا اور اس نے بے چین ہو کر اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

نہیں نہیں... اس نے کسی اور کے لئے کہا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینی چاہی۔ مگر الفاظ اسے گھور رہے تھے اور وہ تڑپ رہی تھی... درد کی ایک تیز دھار دار لہر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اور خود مدھو، درد سے تڑپتی ایک بے سہارا عورت، ایک بانجھ عورت کے درد کی تمثیل تھی۔

"میجر سبرامنیم!" مدھو پھوٹ پھوٹ کر رو دی... "تم نہیں، میں بد نصیب ہوں۔"

اسے وہ جوان یاد آیا جس نے کہا تھا۔ "ابھاگے تو ہمارے بال بچے ہیں کہ ہمارا لہو ہماری مٹی کو پسند نہیں آیا..."

اس نے تڑپ کر پاس کھیلتے راما سوامی کو کھینچ کر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا... "پاپا! دیکھو اس کو کچھ نہیں ملا۔"

وہ پاپا کی تصویر کے سامنے چیخ رہی تھی۔ اور چھ سالہ سوامی کبھی ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا، کبھی ممی، ممی کہہ کر اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اور کبھی اس کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتا۔ اور مدھو کے چاروں طرف گھنی سفاک اندھیری رات اپنا گھیرا تنگ کرتی جاتی تھی۔

وہ پہلی رات اسے یاد آئی جب اس نے گھونگھٹ کی آہٹ سے میجر سبرامنیم کو دیکھا تھا... ساڑھے چھ فٹ کا دراز قد، گٹھیلے بدن کا سبرامنیم... جس کے بازو کی مچھلیاں یوں پھڑک رہی تھیں اور چمک رہی تھیں جیسے کوئی شخص ایکوریم پرست رنگی نارنج کا فوکس مار رہا ہو... جیسے شیش محل میں قوس قزح کی ست رنگی دھنک۔ اڈ گھمنڈ کر برستے نشے کا کیف اس کا پور پور شرابور کر رہا تھا اور وہ جھولے جا رہی تھی۔

بعد کے دنوں میں کئی مرتبہ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی... اس لمحے میں آخر اس نے ایسا سوچا کیسے؟ چھی... کیسا کمینہ خیال تھا۔ پر وہ کیا کرتی، میجر سبرامنیم اس کی طرف جھک رہا تھا... مدھو اسے دیکھے جا رہی تھی اور جھماکے کی طرح بس ایک خیال لپک جھپک کرتا آ رہا تھا اور جا رہا تھا... وہ بار بار خیال کی رو کو میجر کے چہرے کی طرف... خوبصورت خوشبودار رومانی ماحول کی طرف... چھ فٹ کے دراز قد گٹھیلے بدن کی طرف موڑنے کی ناکام کوشش کرتی رہی... اور بار بار بس ایک ہی خیال مدھو کی پلکوں کے تٹ پر بجلی کی بے قرار چمک کی طرح جھماکے کرتا رہا اور مدھو اس خیال کی گھنا گھنگھور ورشا میں بھیگتی رہی۔ اب وہ شہید کی بیوہ کہلا سکتی ہے۔ اب وہ شہید کی بیوہ کہلا سکتی ہے!

مدھو نے گنگنا کر سوچا۔ تو گویا اب وہ خود ہے جس نے کھویا اپنا آپ۔ اس نے تڑپ کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی سہارا... کوئی پناہ... کوئی سایہ... کوئی جھوٹ جو اسے اس پل میں تھام لیتا۔ اسے اس یقین یا گمان کی ڈور پکڑنے کا سہارا مل جاتا کہ نہیں یہ خود مدھو نہیں ہے، کوئی اور ہے۔ مگر... اس نے بے تحاشہ ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کیا کہیں ایسا کچھ بھی ہے جو میری خاطر ایک پل کا سچ، جھوٹ فریب کچھ بھی بن سکے۔

مدھو جیسے تھونس کر بیٹھ گئی۔ ایسا کچھ بھی نہیں... کچھ بھی نہیں ..

اور اس گہری اندھیری سفاک شام نما شب میں مدھو تنہا سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہو گیا؟

کیسا گھمنڈ تھا اس کو، شہید کی بیٹی، فوجی کی بیوی، وطن پر جو فدا ہوگا امر وہ نوجوان ہوگا... سبرامنیم تم کو میں کیا کہوں؟ ہار تو میری ہوئی ہے۔ مدھو پور پور کٹ کٹ کر اپنی نظروں کے سامنے گر رہی تھی کہ اس کے سارے سپنے راکھ بن چکے تھے۔ اور وہ زندہ تھی۔

میں پاپن ایسی جلی...

مدھو کو یاد آیا کہ اس کی سہیلیاں کیسی جل سی گئیں تھیں... رما تو سدا کی منہ پھٹ بول ہی پڑی "یہ صاحب کس کھوہ میں چھپے تھے؟" اور اس کی بات کنول نے اچک لی کہ رما کھوجتی رہ گئی اور اسے نہ ملے... سیتا نے ہنس کر کہا۔ "تو اپنے میاں کے گلے میں کالا دھاگا باندھا کر۔ ورنہ ہماری نظر لگ جائے گی۔"

نظر کس کو لگی؟ شری سبرامنیم سوامی کو یا شریمتی مدھولتا کو؟

مدھو سوالات کے سمندر میں ابھر رہی تھی اور ڈوب رہی تھی اور پار اترنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

سبرامنیم... سبرامنیم... دوں گی میں کانوں کا مونڈل... سبرامنیم نے کانوں کا مونڈل بھی دیا اور گلے کا ہار بھی۔ اس کے چہرے کی شوبھا بھی بڑھائی اور اس کا ابھیمان بھی۔ اسے یاد آیا کیسے گھمنڈ بھرے لہجے میں اس نے اپنے بیٹے کو بتایا تھا۔ ہاں تینوں فوجی ہیں بیٹا۔ تیرے نانا بھی دادا بھی اور پاپا بھی!"

اس کے باپ شہید ہوئے۔ سسر نے پنشن پائی اور غازیوں کے

زمرے میں شمار کیئے گئے۔ لیکن سبرانیم تم... اور میں سبرانیم؟ میری ماں اور ساس زیادہ بڑے نصیبوں والی ٹھہریں نہ؟

اس بیچ کتنے چھوٹے بڑے ایسے مواقع آئے جب نیتایاد آنے لگا۔ لیکن یہ میں کس کس کا منھ رد کوں... اس دن کیسا دہرا دکھ مجھے درندوں کی طرح بھنبوڑ رہا تھا... اور میں سیاپا کرتی ایک مجبور عورت۔ میں کاہے کو رو رہی تھی؟ اپنے سہاگ کے لئے؟ میں پاپن ایسی جلی۔ سبرانیم جس پل تم مجھے پہلی بار میسر ہوئے اس پل بھی میں تمہارے تئیں آدھی ادھوری وفاداری نبھا پائی۔ اور اب جب میں تمہارا نام ڈھو رہی ہوں اب بھی تو میں اپنے کو ویسا ہی وشیا سمان پریمیکا دکھ رہی ہوں جو اپنے سراپے پر چھانے والی کے پاس کبھی پوری نہیں رہتی۔

سبرانیم! کیا تمہارے مرجانے کا مجھے دکھ نہیں ہے؟

چھ سالہ سوامی پھر رونے لگا تھا۔

مدھو نے اسے چپ کرانے کے لئے کھڑکی کھول دی۔ ساحل سے سمندری ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا کمرے میں در آیا۔ باہر مدراس اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی صاف ستھری چوڑی سڑک کچھ دور تک اونچی جاکر پھر ڈھلوان کی طرف جھکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اور مدراس کی ایک گرم شام سارے اردگرد کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ بولنے والا شام کی دھند اور ازدحام میں رل مل چکا تھا۔ مگر الفاظ اگیا بیتال کی طرح اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔ مدھو کے من کی منڈیر پر... بہت دور سے اڑکر پاس آئی ہوئی آشا کی تتلی نے اپنے پروں کا لس چھوڑا، چھبی دکھائی اور ایک بڑی منھ زور خواہش اس کے اندر پاتال سے اٹھی اور اس کے چاروں جانب رقص کرنے لگی... کوئی کہہ دیتا، ''تو تو بھاگیہ وان ہے بٹی!''

مگر یہ تو اس نے بھی نہیں کہا جو سبرانیم کا سامان لے کر آیا تھا۔

ایک سفاک گھنے اندھیرے کو دلدل میں اس نے اپنے آپ کو دھنستا محسوس کیا۔ کہیں بہت دور دوائیں یا فوجیں لے جانے والے جہاز کا بھونپو بجا۔ سمندر کے سینے کو روندتی فوجیں آگے بڑھیں۔ ''کسی بڑی کلو دا میں پھر کوئی ماں سینہ پیٹ کر اپنے کسی بیٹے کے لئے روئی اور مدھو نے چھٹپٹا کر اس لمحے کو یاد کیا جب سبرانیم کے دوستوں نے اس کے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا:

''بے چارہ بچہ! اس کے باپ نے اپنے گھر میں خود آگ لگائی۔ اور پھر اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔''

''سبرانیم!'' مدھو چیخ پڑی۔ ''میرا باپ مرا تو مجھے بہادر باپ کی بہادر بٹی'' کہا گیا۔ اور تم مرے تو تمہارا بچہ بے چارہ کہلاتا ہے... بے چارہ کہلاتا ہے۔ سبرانیم... تمہارا بچہ بے چارہ کہلاتا ہے!''

مدھو لتا چیخ رہی ہے۔

جہاز کا بھونپو بج رہا ہے۔

اور جنوب کی شام کسی طرح ٹھنڈی ہونے کا نام نہیں لیتی۔

شاید کسی اوگھڑ نے اپنے جلے ہوئے شریر کی راکھ تن پر مل لی ہے اور اپنی کھوپڑی میں اپنا ہی خون پی رہا ہے ☆☆☆

''لامکاں''، ''لاریب'' اور ''لاکلام''

کے شاعر

غلام مرتضیٰ راہی

کی تازہ غزلوں کا مجموعہ

لاشعور

غلام مرتضیٰ راہی عہد حاضر کے نامور غزل گو ہیں۔ انھیں غزل گویوں کے تمام جدید وقدیم حلقوں میں اعتبار حاصل ہے۔ ''لاشعور'' ان کا تازہ مجموعہ مہارت فن، تخیل کی پرواز اور مضمون یابی میں اپنا جواب آپ ہے۔

وارث علوی کہتے ہیں :

''میں غلام مرتضیٰ راہی کو اس دور کا اہم شاعر تسلیم کرتا ہوں اور ان کے دانشور مداحوں میں خود کو شامل کرنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔''

قیمت : ۱۵۰ روپئے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

راہی پبلیکیشنز، فتح پور ۲۱۲۶۰۱

حمایت علی شاعر

شمارہ ۲۸۸،
جنوری، ۲۰۰۵

یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں
جب کرشن اور رادھا کی کہانی
اک حقیقت تھی
مجھے بھی ایک عورت سے محبت تھی

وہ جب مرلی کی دھن پر رقص کرتی تھی
تو اس کے جسم کا ہر زاویہ، ہر قوس، ہر انداز
اس کے رقص کا ہر دائرہ، ہر روپ
رنگ و نور کی بارش سے
اس دھرتی کو اک گلزار کر دیتا
مجھے سرشار کر دیتا
وہ جب لہرا کے رادھا کی طرح
سینے سے لگ جاتی
تو اس کا لمس نشہ بن کے رگ رگ میں اتر جاتا

لہو کو آگ کر جاتا
وہ جب خوشبو میں رچ کر
بستر گل پر بکھر جاتی
تو بندرابن میں جیسے
جنت گم گشتہ کی تصویر اتر آتی
زمیں پر آدم و حوا کی چاہت کو
نیا عنوان مل جاتا
نیا پیمان مل جاتا

مگر اب کرشن ہے کوئی نہ رادھا ہے
میں اک پتھر کا بت ہوں اور مشت خاک ہے وہ بھی
میں اپنی فکر میں ڈوبا ہوا، سڑکوں پہ آوارہ
اور اپنے گھر میں اک چولھے کی ٹھنڈی راکھ ہے وہ بھی
میں گوتم...وہ یشودھا ہے

حمدون عثمانی

شمارہ ۱۲۰،
اپریل، مئی ۱۹۸۱

مسموم رت سے کیف و سرور صبا نہ مانگ
دم گھٹ رہا ہے گھٹنے دے ان سے ہوا نہ مانگ

اس درجہ گر کے ہو کے نرا بے حیا نہ مانگ
اب تو کسی سے سوز دروں کی دوا نہ مانگ

تنہائیوں کی ٹھنڈ میں یخ بستہ ہو بھی جا
قربت کی آنچ گرمی مہر و وفا نہ مانگ

الفاظ کے کھلونوں سے بہلا دل حزیں
اس جا نہیں خلوص روا نا روا نہ مانگ

قدرت کے نرم بوسے ہیں یہ زخمہائے دل
لاج ان کی رکھ لے مرہم کیف آشنا نہ مانگ

ہر سانس ایک کرب قضا دوختہ سہی
مت کہہ کسی سے کچھ دل وحشت زدہ نہ مانگ

خیرات کے خلوص سے بہتر ہے خودکشی
خود کو نہ بیچ قیمت خون وفا نہ مانگ

اب حادثوں کی دھوپ کو ہی سائباں سمجھ
زانو نہ ڈھونڈ سایۂ زلف دوتا نہ مانگ

اپنے کو سجدہ کر کہ نہ پھر سر یہ اٹھ سکے
حمدون دربدر نہ بھٹک آسرا نہ مانگ

جو کسی حادثے کی علامت نہیں

حمید الماس

شمارہ ۷۶،
ستمبر ۱۹۷۲

واقعہ روز اول کا
معلوم ہے
اور پھر دیدۂ ہوش نے
جو بھی دیکھے ہیں
وہ حادثے سامنے ہیں
جنھیں میں اندھیرے کے کاغذ پہ
لکھتے ہوئے تھک گیا ہوں
مری مضمحل روح کی سمت دیکھو
مجھے پھر کہیں
روشنی کے مضافات میں لے چلو
آج کی رات
شیورنجنی (۱)
دل کے تاروں پہ چھیڑوں تو
صبح ازل کا
وہی حرف اول سناؤ مجھے
جو کسی حادثے کی علامت نہیں

(۱) شیورنجنی، کرناٹک موسیقی کا ایک راگ

حمید الماس

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

(۱)

کوئی شاید تاک میں ہے
کھڑکیوں سے اس طرف...
حادثہ

(۲)

شہد کے ڈوبے ہوئے قطرے کو
دریا سے نکالا ہے قلم نے
بارہا

(۳)

موت
میرے خانۂ ویراں میں آکر
کھو چکی ہے حافظہ

(۴)

کن بھیانک جنگلوں میں
پرورش پاتی ہے
مرگِ ناگہاں

(۵)

کیا پرندے
کیا مگس
گم ہیں سب کے سب ہوا کے کھیل میں

(۶)

اڑ گئے سارے پرندے
اب اکیلے نقش پا ہیں
رہ گذارِ باد پر

(۷)

صبح سے نکلا ہوا
میرا پرندہ لوٹ کر آیا نہیں
دور جنگل میں کہیں کوئی پرندوں کی ضیافت تو
نہیں

(۸)

آج آخر
میرے پاؤں
برف جیسے پانیوں پہ ٹک گئے

(۹)

ہر طرف محسوس ہوتی ہے مجھے
ریگِ رواں
کیوں نہ پھیلاؤں میں اپنی سرحدیں

حمید الماس

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

(۱۰)

بولتے جنگل میں
آوازوں کا شور
زندگی

(۱۱)

وہ مری ہر بات کو
محفوظ رکھتی ہے
دعاؤں کی طرح

(۱۲)

آسماں پر
کیا خس و خاشاک ہیں یا
سات رنگ؟

(۱۳)

کب تلک
کہتے رہیں گے راستے
مختصر ہے فاصلہ

(۱۴)

اس کو میرے گھر میں آنے کے لئے
مدتیں درکار ہیں
روشنی ہے روشنی

(۱۵)

چڑھتے چڑھتے سن رہا ہوں
اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں،
ایک زینہ اور ہے

(۱۶)

رات
مجھ سے کہہ رہی تھی کان میں
اس کا دامن پاک ہے

(۱۷)

جب کلید شہر
مجھ سے چھن گئی
رو رہے تھے بام و در

حمید الماس

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

(۱۸)

رات بھر رہتا ہے
سچے موتیوں کا لین دین
منتظر الفاظ سے

(۱۹)

میرے اندر بحر و بر ہیں
اونچے اونچے پربتوں کا سلسلہ ہے
ٹوٹ کر گرتے ہوئے تارے بھی ہیں

(۲۰)

پوچھیے رات کے مسافر سے
کیا اسے یاد ہے
سویرا بھی

(۲۱)

دشمنوں کی فوج
جس کی جستجو میں پھر رہی ہے
وہ نہفتہ راز میرے پاس ہے

(۲۲)

سورج بھی غرق ہو گیا
کشتی کے ساتھ ساتھ
سب فاتحہ پڑھیں

(۲۳)

ریت میں لپٹی ہوئی موج ہوا
جا رہی ہے کس طرف
وقت بتلاتا نہیں

(۲۴)

سنگدل لوگوں میں پھنس کر
مضطرب رہتی ہیں اکثر
پاک روحیں

(۲۵)

ہے تماشا
غیب کی آواز
نادانوں کے بیچ

نئی دھرتی

حمید الماس

شمارہ ۱۹۹،
اکتوبر ۱۹۹۶

رہ امروز مجھ کو اس زمین نو پہ لائی ہے
نہ جس کا کوئی ماضی ہے نہ قصہ ہے
بھرا جنگل ہے جس میں ہر طرف
لپٹی ہوئی ہیں جھاڑیوں سے زرد رو تنہائیاں
شاخوں پہ ناشگفتہ پھلوں کو دیکھ کر
حیران ہیں آنکھیں
اچھلتے کودتے بندر
درندے
خوشنما پنچھی
یہاں پہنچے نہیں شاید
اکیلا جھیل پر بیٹھے ہوئے یہ سوچتا ہوں
اب مجھے
آب نمو سے
اس زمیں کی روح کو پاکیزہ کرنا ہے
ہوا سے اک نہ اک دن گفتگو ہوگی
یہاں بادل بھی برسیں گے
دمکتے چاند سورج کی حسیں کرنیں بھی
اس دھرتی کو چومیں گی
مرا حرف دعا خالی نہ جائے گا
زمیں کا حافظہ کمزور ہے
ممکن ہے مجھ کو بھول جائے
مگر میری یہ تنہا کوششیں
باقی رہیں گی آخری دن تک

غزل

حنیف نجمی

شمارہ ۲۵۶،
مئی ۲۰۰۲

وہ تلاطم کو نواح دل و جاں تک لے جائے
چڑھتے دریا کو وہ خطرے کے نشاں تک لے جائے

میں ہوں درویش تو کیا، جبر شکم مجھ کو بھی
عین ممکن ہے کہ دربار شہاں تک لے جائے

دور رہ کر مری ہستی کا وہ اثبات کرے
پاس آئے تو مرا نام و نشاں تک لے جائے

جسم کیا چیز ہے تیرا کہ مجھے کر کے نہال
جذبۂ سود کو احساس زیاں تک لے جائے

لاکھ پیاسا ہوں تو کیا پھر بھی مری پیاس مجھے
غیر ممکن ہے کسی چاہ گماں تک لے جائے

اپنی مٹی سے میں پیمان کئے بیٹھا ہوں
فکر کیا کوئی مجھے کاہکشاں تک لے جائے

جی رہا ہوں میں ابھی جس کی نگہداری میں
کیا عجب مجھ کو وہی تیر و سناں تک لے جائے

حیدر صفت

شمارہ ۱۱۳،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۹

کبھی کبھی تیز گام قدموں کی ضرب کامل شدید سے بھی زمیں کا سینہ دہل گیا ہے۔ زمیں کی سختی کے نرم گوشوں پہ زلزلوں کی نظر رہی ہے۔ شگاف پڑنے پہ یہ بھی سوچا ہے آسماں نے، زمیں بڑی نرم خو بنی ہے، مگر حقیقت یہی نہیں ہے... فلک کا کوئی وجود بھی ہے، زمیں تو اپنا وجود رکھتی ہے، سخت ہو، نرم ہو یا کچھ بھی، مگر فلک اپنی وسعتوں سے کچھ بعید بھی نہیں نظر کی، بس انتہا ہے، خلا کہ جس پہ ہے ناز اس کو، زمیں سے کم تر، فلک سے کم تر مکین جس میں، مکاں نہ جس میں، وہی نہ نو مین ٹریٹری (1) جو قدم نہ ثبت قدم کی لذت سے آشنا ہے۔

سنا ہے اک لفظ ہی زمیں ہے
وہی خلا، وہی فلک ہے، وہی ہے سب کچھ
مگر وہی لفظ
تمام فتنوں کی جڑ ہے شاید

...وہ دھندلی مٹیالی روشنی بھی (نہیں وہ مٹیالی روشنی کیوں، سیاہیاں کیوں نہیں کہ ساری خرابیوں کی بنا وہی تھی) تھکی تھکی مضمحل سی خواہش اور ایک ہلکی سی نرم آواز پر فدا تھی۔

بگولے طوفان، آندھیاں، زلزلے مسلسل
نشیب تر سے فراز تر تک

کہاں وہ رستہ کہ جس کے اس آخری سرے
پر بہشت بھی ہے

یہاں کی راہیں، تمام راہیں
جہنموں سے ہی مل گئی ہیں
تپش، تعفن، مسخ شدہ ہڈیوں کے ڈھانچے
تمام ہاتھوں کو کاٹ ڈالا
تمام ذہنوں کو برف کی سی خوش وادی میں کپکپانے کو ہانک ڈالا
نگاہ کی روشنی کو غاروں میں جھانکنے کا ہے حکم صادر
اب اس سے زیادہ بھی کیا کرو گے

یہ راستہ جس پہ ہم کھڑے ہیں
یہ راستہ جس کے دونوں جانب، ہزاروں سالوں کی داستانیں ہیں دفن لیکن
نئی کہانی، نئے فسانوں کے بیج اب بھی پڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سی نم ہو یہاں کی
مٹی تو کتنی زرخیز... نئی نئی کونپلیں اگیں گی
یہ کچی پگڈنڈیاں سلامت جو راستوں سے پھسل گئی ہیں

اوراس طرف جو بلندیاں ہیں، بلندیاں ہیں کہ پستیاں۔ خدا ہی جانے خدا، خدا بھی ہے کیا نہیں۔ نہیں وہ کبھی نہیں تھا، شریف لوگوں نے گڑھ لیا تھا وہ نام لیکن انھیں بھی اس کا یقین نہیں تھا کہ لوگ اس نام سے ڈریں گے، وہی کریں گے جو وہ کہیں گے

گھسٹتے چپل، شکستہ پتلون
مسکتی ساڑی سے کیا غرض ہے
چلو یہاں سے، یہاں گھٹن ہے۔

"ایک سو پانچ روپے اور ایک آپریشن
اوراس کے بعد ہر سال دو سال کی پریشانیوں سے نجات۔"

"مذہب اجازت نہیں دیتا۔"

"تم کون سے بڑے مذہبی ہو،
شراب پیتے ہو، دوسروں کی عورتوں کو تکتے ہو، رنڈیوں کے کوٹھے پر جاتے ہو۔"

"وہ...و...ہ..."

"جاؤ جاؤ میں تمھیں پہچانتا ہوں۔"

گناہ کیا ہے، ثواب کیا ہے
یہ زندگی ہے
تو قہر کیا ہے عذاب کیا ہے

اداس موسم کے نرم سائے، پگھلتے ساعت، شکستہ ساعت کی بازگشتوں کے دائروں میں گھرے ہوئے ہیں
لچکتی شاخوں پہ کوئلوں کے سریلے نغموں کو نوحہ خوانوں کا رنگ دے دو
تمام شادابیاں سمیٹو، سبھوں کو تیر و تفنگ دے دو
تمھیں غرض کیا کہ ننگی چھاتی پہ بھوکے کتوں کے ناخنوں سے خراش آئے
ہر ایک فطری عمل کا ردِ عمل بغاوت
ہر اک بغاوت کی تہ میں فطری عمل چھپا ہے

شعور کی گتھیاں نہ سلجھیں، خمیدہ چٹان بھورے جسموں کا بوجھ کب تک خود اپنے سینوں پہ سہ سکیں گے۔ تمام گاڑھے معانی والے حروف لفظوں میں ڈھل گئے ہیں۔ انھوں نے اوڑھی ہے نظریوں کی دبیز چادر، معنی لفظوں کا ماحصل ہے، معنی لفظوں کی اصلیت ہے، معنی یہ ہے، معنی وہ ہے۔ معنی کیا ہے بتا سکو گے؟ معنی سب کچھ تو لفظ کیا ہے میں لفظ ہوں، تم بھی لفظ ہو۔ تو حروف کیا ہیں، حروف کیوں ہیں؟ حروف: لفظ و معنی اپنی ہی اختراع ہیں، تو ہم ہی کیا ہیں؟ بس ایک نقطہ، نہ ضرب و تقسیم کی اجازت، جمع و تفریق سے الگ سا۔ وہ نقطہ کیا ہے، وہ نقطہ کیا ہے، وہ نقطہ کیوں ہے؟ نہیں وہ نقطہ بھی کچھ نہیں ہے، نہ ہم ہی کچھ ہیں نہ تم ہی کچھ ہو۔ کہیں بھی کچھ تو نہیں ذرا بھی۔ یہ شور اور اشتعال کیا ہے؟

"کون"؟

"یہ کون تھا؟ کوئی بتا دے، بتا دے مجھ کو"
"میں!"
خواب تنہا، خیال تنہا
گناہ کی لذتوں سے آگے یہ خوف سا کیوں
یہ خوف! رواں رواں کانپنے لگا ہے

میں آہٹوں سے، تمھارے قدموں کی آہٹوں سے، کسی کے قدموں کی آہٹوں سے، خود اپنے قدموں کی آہٹوں سے لرز رہا ہوں، نہیں نہیں سردی ہوا ہے
لرز رہا ہوں
"سنو!"
"کوئی ہے یہاں؟"
کون ہے؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟
یہ وہم کیوں ہے، یہ وہم کیا ہے، یہ وہم تم ہو، یہ وہم میں ہوں، یہ وہم وہ ہے
یہ وہم کیا ہے

خطیب گم ہے
نقیب گم ہے
کوئی پکارے، کوئی صدا دے
یہ روشنی سی کیا ہے
کسی کی آہٹ... نہیں میں خود ہوں

پکار لو نہ
کہیں سے مجھ کو پکار لو نہ
کوئی بھی مجھ کو پکار لو نہ

خموش کیوں ہیں، سمندروں سے کہو کہ ساحل زدہ شبوں کے اداس چہروں کی ساری کالک بہا کے لے جائیں... اگلے سیلاب سے زیادہ تباہیاں مچ گئی ہیں، لیکن نہ ان کا عزم جواں ہی ٹوٹا، نہ گھر بہے اور ساری فصلیں کھڑی ہوئی ہیں، بہا کے لے جائیں، بہے تو ان کا غرور ٹوٹے... شفق کا سارا لہو انڈیلو کہ خوف، جسموں سے بہہ چکا ہے، مگر لہو چاٹنے کی عادت لہو کی بارش سے چھٹ رہے گی، یقیں نہیں ہے، یقین کیسے ہو کچھ تو بولو۔
شفاف جسموں نے صندلی عطر مل لیا ہے
کریہہ شکلوں کا دوش بھی کیا
تمام قدروں کو کیا ہوا ہے
کبوتروں کو فضا کی وسعت سے دور رکھو

کہاں ہیں شاہیں؟
خبر کرو بھی، دبوچ لیں ان کے پھڑ پھڑانے کا کوئی منظر نظر سے گذرے
لہو کے چھینٹے شہادتوں سے قریب کر دیں
گلی کے زینے بھی تیرنے کر نکل پڑے ہیں
اب ان کی زد پہ ہیں شہریاروں کے چوڑے سینے

نقوش فرہنگ، تمام فکروں سے بالاتر ہیں، تکوئی سازش کے رنگ گہرے کھرچ کھرچ کر مٹا رہے ہیں۔ سمندرو! جھاگ والے ساحل، ادھار کھائے قلم کی کھٹی ڈکار سے کیوں سہم رہے ہو؟ ابھار سینوں کے ڈھل گئے ہیں، نظر کی شوخی بکھر گئی ہے، شفق کے جیسے شفاف عارض دھواں دھواں ہیں، کمر کے اوپر کی سلوٹوں پر نگاہ مرکوز... یہی ہے معیار حسن اپنا
بھری بھری پنڈلیوں میں لتھڑے تحرک رہے ہیں
تمام رانوں کے نرم گدرائے گوشت منزل بدل چکے ہیں
جوان جسموں کی ناف نیچے سرک رہی ہے

شراب قصوں میں بٹ گئی ہے
...نیلے خوابوں سے اجلی کالی حقیقتوں تک
ہر ایک شے اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، تمام دیوارں ڈھہ چکی ہیں
سبھی تو موجود ہیں یہاں پر
زرد چہروں سے سبز آنکھوں کے فاصلہ تک
سفید ننگے بدن
سیاہ رانوں کے ننگے سائے... بدن تھکا ہے، بدن کو اوڑھو، بدن
بچھالو، بدن پہ سو جاؤ، سب روا ہے۔

تمام خواہش گھروں کے Tables, shelves, cupboards میں بس رہی ہیں گھروں کے باہر کا سارا منظر حسین تر ہے، گھروں کے اندر ضرورتیں ہاتھ باندھے کب سے کھڑی ہوئی ہیں، بسوں کی جنبش کی منتظر ہیں، سکون پھر بھی کہاں چھپا ہے سکون لیکن کہیں نہیں ہے، خموشیوں کی دوکان ساری سجی ہوئی ہیں، یہاں بھی سایوں کی بھیڑ پیلے دشا کی جانب....

نیا تصور جو لائے تھے تم
وہ قرمزی خواب طربیہ ہے کہ المیہ اب

---

(۱) No man territory

پیٹ کی طرف مڑے ہوئے گھٹنے

خالد جاوید

شمارہ۲۲۹،
ستمبر ۱۹۹۹

(۱)

ایک غیر ضروری تمہید اور رطب و یابس

میں اس وقت جس مقام پر کھڑا ہوں اس کا جغرافیہ بیان کرنے سے قاصر ہوں لیکن میں اسی مایوس کن جغرافیے کو اپنے احساس بیچارگی کے ذریعہ آپ تک پہونچانے کی ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ بس ایسا سمجھ لیجیے جیسے میں ریت کے بگولے اوڑھے ایسی ریگستانی صحرا میں ایک ایسے مقام پر رک گیا ہوں جہاں ایک دل افزا اور راحت کن نخلستان میرے قدموں کے پاس آہستہ آہستہ ہلکورے لے رہا ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ اب شام ہو چکی ہے اور نخلستان کے چاروں طرف اگے ہوئے کھجوروں کے پاکیزہ درخت مہیب شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ گیلی ریت پر میرے جلتے ہوئے پیر کچھ دیر بعد یقیناً قابل رحم حد تک ٹھنڈے ہو جائیں گے، لیکن ایک مسئلہ اس سے زیادہ سنگین ہے اور وہ یہ کہ ان لانبے پاکیزہ درختوں سے گھرا یہ آبی ٹکڑا اب مجھے المناک حد تک بے تکا نظر آتا ہے۔ اسی لیے میری دلچسپی اس میں تقریباً تمام ہو چکی ہے۔

یہ دراصل اپنی کہانی سنانے کے لیے محض تمہید تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ مختصر سی تمہید غیر ضروری اور کسی حد تک تجلیجی بھی تھی مگر اپنا بھرم اپنی نظروں میں قائم رکھنے کے لیے میرے حق میں بہر حال مفید ثابت ہوئی ہے، کیونکہ اپنی کہانی سنانے کے لیے تھوڑے سے بلند منبر پر تو کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے، مگر ٹھہریے۔ شاید میری یہ کہانی اس معنی میں ہرگز کہانی نہیں ہے جو آپ فرض کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ یہ کہانی تو میرے احساس میں اچانک ایک ٹیلے کی طرح یا ایک پہاڑ کی طرح نمودار ہو گئی ہے۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ذہن و احساس میں کوئی ٹیلہ کب نمودار ہوتا ہے۔ ایسا تب ہی ہوتا ہے جب سابقہ زندگی سے سیکھے گئے سبق یا اس کے سیکھنے کے طریقے میں کوئی گہری خامی رہ گئی ہو یا پھر جسم و احساس کی سطح پر کوئی بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہو۔

اسی لیے میری کہانی میں تاریخی شعور بڑی حد تک مفقود ہے۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اسی کہانی کے کرداروں کے سماجی اور معاشی کوائف بیان نہیں کروں گا۔ یہ کردار پہلی بار آپس میں کس طرح متعارف ہوئے تھے اور وہ حالات کیا تھے اور وہ مقامات کیا تھے اور ان دنوں موسم کون سا چل رہا تھا اور اسی قسم کی دیگر تفصیلات کا اس کہانی کے مرکزی خیال سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ آپ انھیں اپنے مزاج اور سہولت کے مطابق کسی طور بھی فرض کر سکتے ہیں۔

ایک اور امر سے بھی میں آپ کو شروع ہی میں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میرا لب ولہجہ اس کہانی کے دوران جگہ جگہ قدرے شاعرانہ اور رومانی ہو سکتا ہے جس کا جواز میرے باطن کی وہ بچکانہ خواہش ہے کہ آپ کو میری شخصیت کے اس پوشیدہ گوشے کا بھی علم ہو جائے کہ میں نا مساعد حالات اور ذہنی انتشار کے عالم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کس خوبی کے ساتھ کر سکتا ہوں۔

(۲)

تاریخ کی ہڈیوں کا غلط ڈھنگ سے جڑ جانا

اگرچہ میں تاریخی شعور سے تقریباً بے بہرہ ہوں لیکن اس شعور سے میرے ان قدموں کا کوئی تعلق نہیں ہے جو تاریخ کی پرانی ہڈیوں پر لگاتار چلتے جا رہے ہیں۔ میرے یہ سونے قدم مہیب ایک صدا بھی بلند کرتے ہیں اور میرے نیچے تاریخ کی مردہ ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں۔

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ یہ ایک مضحکہ خیز مقولہ ہے۔ کوئی کسی کو نہیں دہراتا۔ بس کچھ یکساں طور سے وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم دو الگ اور مختلف اشیا میں شعوری طور پر کوئی مشترک نقطہ تلاش کرتے ہیں۔ تاریخ اپنے پیچھے لامتناہی طویل پنجر اور مردہ ہڈیوں کا چورا اور راکھ چھوڑ جاتی ہے۔

میں ان راکھ اور مردہ ہڈیوں پر چل رہا ہوں اور میری پنڈلیاں بری

طرح اینٹھ رہی ہیں۔

مگر صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ میرے قدموں کے دباؤ سے یہ پرانی اور گودے سے عاری ہڈیاں آپس میں غلط زاویے سے جڑتی بھی جا رہی ہیں۔ ہڈیوں کا غلط زاویے پر جڑنا تو اپنے آپ میں اور بھی زیادہ خطرناک۔

افسوس۔ یہ سب میرے ہی قدموں کے نیچے ہونے کو رہ گیا تھا۔ سب کچھ میرے ہی منحوس قدموں کے نیچے۔

میرے ہی قدموں کے نیچے چند صدیوں کے موسم اور جغرافیے پوشیدہ تھے۔ میرے ہی منحوس قدموں کے نیچے ہزار ہا ندیاں ریت میں پتلی سی لکیر بن کر گم ہوگئی ہیں۔ مگر کون جانتا ہے کہ جن نشانات کو صدیوں زمانہ پہلے کے آدمی راستے سمجھا جا رہا ہے وہ صرف سیلاب کی علامتیں ہوں۔

جب ٹوٹی ہوئی ہڈیاں غلط ڈھنگ سے جڑ جاتی ہیں تب ایسا ہی ہوتا ہے۔

(۳)

خواب، عجیب الخلقت پل اور دھوبیوں کی مشقت

نہیں۔ اب اس پل کے نیچے وہ دریا نہیں بہتا ہے۔ اب یہاں دوسرا دریا بہتا ہے۔ میں اکثر خواب میں اس ویران عجیب الخلقت پل کو دیکھا کرتا ہوں۔ پل کی لکھوری اینٹوں پر جمی کائی اور اس پر اگے ہوئے جھاڑ میری نیند کو زیادہ گہرا نہیں ہونے دیتے۔ ویسے تو ندیاں اکثر اپنا راستہ بدل لیا کرتی ہیں مگر کسی پل کے نیچے بار بار ایک ندی کی جگہ دوسری ندی کا نمودار ہو جانا یقیناً ایک پر اسرار اور کسی حد تک گھٹیا سی بات بھی ہے۔

اور اس منحوس اجاڑ پل کے نیچے نہ جانے کب سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ پرانے مٹیالے دریا نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور اب وہ ذرا بچ کر ادھر وہاں اس موڑ سے نکل جاتا ہے بس ریتیلی مٹی جو اس کے بہاؤ نے کاٹی ہے دور دور تک بکھری ہوئی ہے۔ پل کے تمام در خالی ہیں سوائے ایک کے جہاں سے ایک پتلی سی نالی کے مانند اپنے ویران کناروں کے ساتھ ایک ندی گذرتی ہے۔

پل کے خالی دروں میں پانی نہیں دھواں بہتا ہے۔ یہ دھواں جلتے ہوئے مردہ بوسوں کا ہے۔ ان مانگے ہوئے مردہ بوسوں کی جراند دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ چٹ چٹ جل رہے ہیں اور جلتے وقت عجیب مضحکہ کن مگر ساتھ ہی دہشتناک انداز میں سکڑتے بھی جا رہے ہیں کچھ اس طرح کہ یہ بوسے نہیں لگتے۔ یہ اپنی تشریح و تفہیم مانگتے ہیں۔

اس خواب کا یہ پہلا ہی منظر مجھے انتہائی خوف زدہ کر دینے کے لئے کافی ہوتا اگر اس کے فوراً بعد ہی وہاں وہ نہ آ جاتے۔

اس بے ہنگم پل پر اچانک نہ جانے کہاں سے دھوبی ہی دھوبی چلے آتے اور اپنی اپنی گٹھریاں کھول کر گندے میلے کپڑوں کو ریت پر پٹخنے لگتے۔ ایسے وقت میرے تمام گناہ۔ آوارگیاں اور لغزشیں وہاں میلا لباس پہنے حیرت سے دھوبیوں کی مشقت کو تکا کرتی ہیں۔

(۴)

فاحشہ اور دکھ کی نیلی قمیص

اب تو مجھے بھی یہ احساس ہونے لگا ہے اگر میں اس کمبخت پل اور ان ہڈیوں کا ذکر لے کر نہ بیٹھتا تو کہانی کو کوئی نقصان نہ پہونچتا لیکن اس طرح کم از کم جبراً ہی مگر میں نے اپنے ان تجریدی احساسات سے تو آپ کو روشناس کرا ہی دیا جن سے میں فی الوقت دو چار ہوں۔ اور آپ کو اگر ابھی علم نہیں ہوا ہے تو آگے ہو جائے گا کہ تھوڑا سا وقت گذر جانے کے بعد میں تقریباً ہر شے کو سفا کانہ حد تک جمالیاتی نقطۂ نظر سے بیان کرنے پر قادر ہوں۔ بہر حال اب میں براہ راست نفس مضمون کی طرف آتا ہو۔

سب سے پہلے ایک بدقماش لڑکی کے بارے میں ذکر کرنا ضروری ہے۔ مگر پہلے وہ میری نظروں میں بدقماش ہر گز نہیں تھی وہ میرے لیے کائنات کی سب سے قیمتی شے تھی۔ میں اس سے عشق کرتا تھا اب سوچتا ہوں کہ ممکن ہے کہ وہ بری لڑکی نہ ہو کر صرف ایک اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والی اوسط درجے کے کردار کی لڑکی ہو۔ وہ تو اچانک اس دن میرے لیے فاحشہ بن گئی جب میں نے محبت اور لاڈ میں سرشار ہو کر اس سے پوچھ لیا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ اگر میں کبھی مر جاؤں تو تم کیا کرو گی؟"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا نہیں کہتے۔"

"نہیں بتاؤ نہ اگر میں مر گیا تو تم کیا کرو گی؟" میں اٹھلایا۔

"تم خاموش نہیں ہو گے؟" اس نے اپنائیت سے آنکھیں دکھائیں۔

میں اندر ہی اندر افسردہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے سوال کو سن کر بے ساختہ تڑپ اٹھے گی اور اپنے مکان کی اوپری منزل سے نیچے کود جانے کی بات کہے گی۔ وہ خود کشی کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرے گی۔ خیر۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ شاید اس بار وہ میرے سوال کا میری مرضی کے مطابق جواب ممتا سے پر نور چہرے، آنسو بھری آنکھوں اور میرے ماتھے پر ثبت ایک جلتے ہوئے بوسے کے ساتھ دے سکے۔

"میں اکثر خود کشی کر لینے کی سوچتا ہوں۔"

میں نے خلا میں گھورنے کی اداکاری کی۔

"کبھی سوچا ہے پھر میرا کیا ہوگا؟" وہ بگڑ گئی۔ "اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ خود کشی حرام موت ہے۔ خود کشی کرنے والے انسان کی بخشش نہیں ہے۔"

یہ کہتے وقت اس نے بالوں کی لٹ چہرے سے بے رحمی کے ساتھ جھٹک دی۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک ویرانہ اگنے لگا۔

میں اس کے سامنے شاید پہلی بار اتنا اداس ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس اداسی کی وجہ سے لاعلم تھی مگر ان لمحات میں خلوص دل کے ساتھ میری اداسی کو دور کرنا وہ اپنا سب سے بڑا فریضہ سمجھتی تھی۔ شاید اسی لئے اچانک وہ میرے بہت قریب کھسک آئی ورنہ اس سے پہلے تو ہم نے صرف ایک دوسرے کے ہاتھ کو ہی چوما تھا۔

اور تب مجھے محسوس ہوا جیسے میں میلا کچیلا پریشان حال، بال، اور

داڑھی بڑھائے کسی حمام کی دوکان میں بیٹھا تھا۔ وہ نائی کا مشاق ہاتھ تھا۔ ایک گہری مکاری سے لبریز ہاتھ جو آپ کے ذہن کی اس رگ کو سلا دیتا ہے جو عقل کے احکام کی تعمیل کرتی ہے۔ اور اس حالت میں حجام سے مالش کراتے وقت آپ خود بھی ہوا خارج کر سکتے ہیں۔ اور المیہ یہ ہے اس ہوا کی ذلیل آواز نہ تو آپ کو شرمندہ کرتی ہے۔ اور نہ ہی روایتی طور پر آپ اسے ایک پوچ لطیفے کی شکل میں قبول کرتے ہوئے ہنس پانے کے قابل ہوتے ہیں اگر چہ یہ امر مجھ پر عرصے بعد منکشف ہوا تھا کہ فاحشہ کے تربیت یافتہ ہاتھوں میں مشاق سے مشاق حجام سے زیادہ چالاکیاں پنہاں ہوتی ہیں۔

اس نے اس جرأت و بے باکی کا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا اور افسوس کہ صرف اس لئے کہ اس وقت شدت سے اداس تھا۔

دراصل یہ کم بخت منحوس اداسی ہی ہر جگہ میرا بیڑا غرق کرتی رہی ہے ورنہ میں تو ایک کامیاب شادی شدہ انسان تھا اور دو چھوٹی چھوٹی بچیوں کا باپ بھی۔ اگر میں آوارہ اور اداس نہ ہوتا تو ایسی خوبصورت وفادار بیوی کے رہتے اس سڑی چوہیا جیسی لڑکی سے انتہائی سنجیدہ قسم کا عشق کیوں کرنے لگتا؟ اس افلاطونی عشق کی حماقت آمیز سنجیدگی کو ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے تیسرا بچہ پیدا کرنے کی کوشش صرف اس لیے نہیں کی کہ اس طرح ان دنوں اس لڑکی سے میرے معاشقے پر اخلاقی حرف آتا تھا اور میں اس کے آگے شدت سے شرمندہ ہو سکتا تھا۔ میں بھلا اسے کیا جواب دیتا کہ جن دنوں میں ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کے چہرے کو تکا کرتا تھا انھیں راتوں میں اپنی بیوی سے محو اختلاط رہا کرتا تھا حالانکہ میری بیوی کو شدت سے تیسرے بچے کی خواہش تھی کہ ممکن تھا اس بار لڑکا ہی پیدا ہو جاتا۔

تو یہ سارا تماشا میری اداسی کی وجہ سے تھا۔

لیکن آخر میں دکھی اور اداس کیوں تھا:

دراصل میں "دکھ" کو قریب سے نہ دیکھ پانے کی وجہ سے دکھی تھا۔ "دکھ" کو ٹھیک اور واضح طور پر دیکھنے کی کوشش میں انسان پھسلتا جاتا ہے۔ اس ناکام کوشش نے انسان کو گناہ گار اور کمینہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

"دکھ" کا چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ میری طرف سے پشت کر کے بیٹھ جاتا۔ "دکھ" کے چلتے ہوئے جھکڑوں میں صرف اس کی نیلی قمیص اڑتی ہے اور پھڑ پھڑاتی ہے۔ نہیں۔ میں نے "دکھ" کو نہیں دیکھا۔ صرف اس کی نیلی قمیص دیکھی ہے۔

(۵)

کھیل اور خاتمہ

اس نئی قسم کی قربت کے نشہ انگیز لمحات میں اپنی چھٹی حس سے میں نے شدید طور پر یہ محسوس کیا کہ اس لڑکی میں انتہا تک پہونچی ہوئی ایک قسم کی خود غرضی تھی۔ یہ اپنی بقا اور اپنے تحفظ کے لیے کچھ بھی کر گذرنے کی کمینہ خود پرستی تھی جو عام انسانوں کی عام سی خود غرضی سے قطعی طور پر الگ، اور کسی حد تک خوفناک اور بے رحم بھی تھی۔

اب میں اس سے مستقبل میں بھی اس قسم کا کوئی لاڈ بھرا احمقانہ سوال پوچھنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں آہستہ آہستہ اس کھیل کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

میں یہ وثوق کے ساتھ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ وہ کنواری تھی یا نہیں۔ ویسے عورتیں اگر یہ سمجھتی ہیں (ان میں بیویاں بھی شامل ہیں) کہ مردوں کو ان کے کنوارے ہونے پر یقین ہے تو یہ صرف ان کی خوش فہمی ہو سکتی ہے یہ دراصل مردوں کا ان کے تئیں لحاظ اور انھیں شرمندہ ہونے سے بچانا ہے یہی تو ایک مقام ہے جہاں عام سے عام اور کمینے سے کمینے مرد کی محبت بھی بامعنی اور بلند بن جاتی ہے۔

تو قربت کے ان محفوظ لمحات میں ہم دونوں ہی پوری طرح سیراب ہو رہے تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس کے بے حد تجربہ کار ہونے کے باعث میں اکثر بے معنی سے خوف اور احساس کمتری کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔ میں جب اپنی بیوی سے اس کا موازنہ کرتا ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری بیوی کے مقابلے کمزور اور چھوٹے قد کی ہوتے ہوئے بھی زیادہ جوشیلی تھی اور جوش کے لمحوں میں اکثر اس کے آگے نکلے دو بدنما دانت کچھ ایسے شہوانی انداز میں باہر نکل آتے تھے جس سے مجھے قدرے گھبراہٹ اور کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن ایک تو اتنے نازک حالات میں بظاہر غیر ضروری باتوں پر توجہ صرف کرنا نامناسب تھا دوسرے یہ خود میرا چہرا اتنا اوٹ پٹانگ واقع ہوا ہے کہ ایسے وقت میں وہ تو شاید بالکل ہی دیدار کے قابل نہ رہتا ہو۔ اور صاف بات تو یہ تھی کہ اسکے کمزور اور ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے جسم میں بھی لذت کے انتہائی ناقابل فہم قسم کے خزانے پوشیدہ تھے۔

اب اس کھیل پر میرا ایمان وایقان پختہ ہو چکا تھا۔

مگر مجھے اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی کہ اس کھیل کا خاتمہ اس قدر جلد اور پھس پھسے انداز میں ہو جائے گا۔ مجھے علم ہی نہیں ہوا کہ وہ کب سے اپنی شادی کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے تو تب پتہ چلا جب ایک دن خلاف معمول وہ بے حد سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر آئی۔

اس کے ہاتھ تقریباً سیاہ ہوتی ہوئی مہندی سے رچے ہوئے تھے۔ اور نہ جانے کیوں قدرے بھاری یا سوجے ہوئے نظر آتے تھے۔ دائیں ہاتھ کی انگلی میں خاص اس جگہ ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی جہاں اس کی سفید جلد کے مسامات سے تین چار سیاہ بال اوپر کے اگ آئے تھے۔

آج شاید پہلی بار شلوار سوٹ کی جگہ گلابی رنگ کی ایک گنواروی ساڑی پھوہڑپن سے باندھ رکھی تھی جس کی وجہ سے اس کے پچکے ہوئے پیٹ پر اس کی بے تکی شگاف زدہ ناف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس ناف کو دیکھ کر مجھے قدرے گھٹیا پن اور اجنبیت کا احساس ہونے لگا۔

اس نے بتایا کہ کل شام اس کی منگنی تھی اور یہ کہ اس کا ذکر مجھ سے اس لیے نہیں کیا کہ مجھے "دکھ" ہوتا۔

ایک طویل عرصے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی لاتعلق سا ویرانہ اگنے لگا جو دراصل اپنی لاتعلقی اور بیگانگی کی وجہ سے ہی اور بھی زیادہ مہیب نظر

آتا تھا۔

اس بے حس ویرانے سے گھبرا کر میں نے بے اختیار اپنی بانہیں اسے آغوش میں لینے کے لئے پھیلا دیں۔

مگر نہ صرف وہ میرے سامنے کرسی پر اسی طرح بیٹھی رہی بلکہ ایک بھیانک اور منحوس لمحے میں میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیوں شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ کیا وہ میرے سائے سے ڈر رہی تھی؟ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں آج خود سپردگی کی جگہ تفکر اور دنیا داری کا رنگ تیر رہا تھا۔ اس کے وہ دو بدنما دانت جو قربت و تنہائی کے ان مواقع پر بار بار باہر نکل آتے تھے وہ اس وقت ہونٹوں کے بری طرح بھینچے ہوئے ہونے کے باعث ندارد تھے۔ اس کا یہ چہرہ افسوس ناک حد تک سوجھ بوجھ اور گہرے قسم کے احساس جرم سے رنگا ہوا تھا۔

میں اس چہرے کو دیکھ کر اس درجہ ڈر گیا کہ میرا دل اسے اسی وقت اسی جگہ قتل کرنے کو چاہا۔ مگر دراصل میں عبرت ناک حد تک ایک بزدل آدمی ہوں اور بزدل انسان کی سرخروی اس نکتے میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے خوف کو کس حد تک دوسروں سے چھپا سکتا ہے۔

اس شام سے میں نے اپنی بیوی کو خالص محبت کے ساتھ جذباتی انداز میں چمٹا لیا اور پسینے سے بھیگی گردن پر بے تحاشہ بوسوں کی بھرمار کر دی حالانکہ میری آنکھوں میں کائی اور مچھلی جیسی بساندھ والے غلیظ آنسو بھی بھرے ہوئے تھے، مگر ایسا شاید میرے وجود میں صرف کسی خرابی تعمیر کے باعث تھا۔ اسی لیے تو بیوی نے نہ ان آنسوؤں پر غور کیا اور نہ میرے بوسوں کی تازگی پر۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی شکست خوردہ آواز میں کہا۔ بیوی میرا چہرہ الگ کرنے لگی۔ "ہٹو تو۔ بہت گرمی ہے بھئی!" وہ زچ ہو کر بولی۔

"نہیں۔ پہلے بتاؤ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو نہ؟" میں نے اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ میرا اگلا رندھ رہا تھا۔

"آخر کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔ رات کو جب بچے سو جائیں گے تب میں آ جاؤں گی۔" بیوی کا لہجہ انتہائی سرد اور اکتایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت گھر کے کام میں بے تحاشا مصروف تھی اور فوراً ہی مجھ سے پیچھا چھڑا کر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

وہ بے حس ویرانہ اب ایک اجاڑ ٹیلہ بن چکا تھا جسے عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

آج سوچتا ہوں کہ اگر اس شام بیوی نے مجھ سے سرد گھریلو اور اکتائے ہوئے لہجے میں بات نہ کی ہوتی تو شاید یہ کہانی آج میں آپ کو یہاں بیٹھا نہ سنا رہا ہوتا (شاید۔ شاید نہیں)۔

اپنی دانست میں وہ فاحشہ آج بھی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ جب بھی ملتی ہے میرے آگے پیچھے چڑیل کی طرح ناچتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں آج بھی اس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ افسوس کہ وہ نہیں جانتی کہ اس منحوس دن اس کے گھٹنے موڑ لینے کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کی اعتماد، اعتقاد بھی ایک قسم کا تخیل ہی ہے۔

اب یہ بتانے کی شاید کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی شادی ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ اس کی گود میں ایک بچہ بھی ہے۔ میں خود آج تک اس کے گھر نہیں گیا ہوں۔ لیکن نہ جانے کب سے سوچ رہا ہوں کہ کبھی اس کے گھر پہونچ کر اس کے بچے کے ہاتھ میں کوئی نذرانہ تھماؤں۔ ایک رسمی سی چائے پیوں اور اس کے چغد قسم کے شوہر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاؤں۔ اس قسم کے رشتوں کے انجام ایسے ہی خوف ناک حد تک رسمی ہوا کرتے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی نئی بات نہیں۔

(۲)

نیک سیرت لڑکیاں اور جنوں کے سائے

کچھ اشیا یونہی بھٹکتی پھرتی ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ ہیں۔ اپنے وجود کو اپنے وجود پر ہی جنی پاتی ہوئی یہ ایک آوارگی ہے اور آوارگی ہی کی خاطر ہے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ میری آوارگیوں اور گناہوں کا ذمہ دار کون ہے؟ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر امر کا کوئی ذمہ دار ہو جیسے ذمہ داری کوئی ایسی ٹھوس شے ہو جسے ہاتھ بڑھا کر چھویا کم از کم نشان زد کیا جا سکتا تھا۔ مگر زندگی اس مقصود بالذات آوارگی کو بے وجہ سنجیدہ ہو کر قبول کرتی ہے اور محض اتنا ہی نہیں، یہ احمق زندگی مکر و فریب، الزام تراشی، بہانے تراشی اور بدمزاجی سب کی پوٹلیاں بنا بنا کر گدھے کی طرح لادے لادے پھرتی ہے۔ ہاں یقیناً ایک گدھے ہی کی طرح۔

مگر میرے لیے ان دنوں اپنے حلیے اور ہیئت کے اعتبار سے زندگی ڈراؤنی بھی نظر آنے لگی تھی۔ مضحکہ خیزیوں کے خد و خال کبھی کبھی بھیانک بھی نظر آنے لگتے ہیں، جیسے گیروے رنگ کو جسم پر پوت کر اس پر کھریا کے سفید نشانات لگائے آپ کے سامنے کوئی بے تکی سی اچھل کود کرتا پھرے۔

یہی زمانہ تھا جب میری اس نیک سیرت لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن اسے ملاقات بھی نہیں کہا جا سکتا بس جس طرح باڑھ کے دنوں میں پانی پر بہتے جاتے ہوئے نہ جانے کن کن بدنصیب گھروں کے زیورات اور قیمتی برتن نچے قسم کے لوگوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں، اسی طرح وہ نیک سیرت میرے ہاتھ لگ گئی۔ وہ عمر میں میری بیوی اور اس بدقماش لڑکی دونوں ہی سے چھوٹی تھی لیکن اس کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اتنی کم عمری میں بھی وہ جنون کی حد تک مذہبی تھی اور پاکیزگی اور جسمانی طہارت پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔

مگر یہ تمام خصوصیات اس میں ہمیشہ ہی سے نہیں تھیں۔ یہ تو اصل میں ایک حادثے کے بعد تحیر انگیز طور پر اس میں اچانک ہی پیدا ہو گئی تھیں۔ اس حادثے کے بارے میں جیسا کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے وہ کچھ اس طرح کا ہے۔

جمعرات کی ایک افسردہ سی شام کو عصر و مغرب گلے مل رہے تھے۔ وہ اس پرانی، ویران آدھی تعمیر شدہ مسجد کے اندر سے گذر رہی تھی جس میں سے اکثر آدھی رات کو آذان کی صدا سنی جاتی تھی۔ مسجد کے اندر سے ہو کر گذرنے والا یہ سنسان راستہ دراصل اس کی منزل کو مختصر کرتا تھا۔ اس کے ساتھ دو عمر رسیدہ برقع پوش عورتیں بھی تھیں۔ ساری اشیا خاموش تھیں، یا شاید خاموشی کی طرف جھک رہی

تھیں، کہ اچانک کہیں سے ہوا اڑتی اڑتی آئی اور مسجد میں واقع گدلے پانی کے ایک وسیع و عریض حوض کے کنارے لگے پرانے انار کے اداس درختوں پر جھومتے ہوئے جن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گئے۔ باتیں کرتے کرتے اس کی آواز اور لہجہ بدل گیا۔ اس کی لمبی اور موٹی چوٹی آپ ہی آپ کھل گئی۔ لمبے لمبے بال پنڈلیوں تک لہرانے لگے۔ اس کا دل بے حد عجیب انداز سے گھبرایا۔ وہ اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑتے ہوئے ویران زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے کس بات کا ہوش نہیں رہا۔ اس کا پنڈا گرم تھا۔ جب ایک مدت کے بعد اس کا طویل اور پراسرار بخار اترا تو لوگوں نے پایا کہ وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ اس میں نماز اور عبادت کے تئیں حیرت انگیز طور پر لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے گوشت کے نام ہی سے متلی آنے لگتی تھی۔ جسمانی طہارت کے بارے میں اس میں شدت پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ چہرے پر ایک قسم کا جلال آ گیا تھا۔ آنکھیں پہلے سے زیادہ بڑی اور چمکیلی ہو گئی تھی لوگوں نے اس امر پر بھی غور کیا تھا کہ جمعرات کی سہ پہر سے اس کی آواز تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور رات ہوتے ہوتے تقریباً مردانہ لہجے میں بدل جاتی ہے۔ اس دن اس کی آنکھیں ہلکی سی سرخی مائل اور جلال سے پر معلوم پڑتی ہیں اور چہرے اور تمام جسم پر حیرت انگیز طور پر اچانک سوجن آ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں کسی کو مجال نہیں کہ اس سے بات بھی کرنے کا حوصلہ کر سکے۔

دراصل اس شریف لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہے اور سایہ تب تک اس کے جسم میں قیام کرے گا جب تک اس کی شادی کی رسم کے سلسلے میں اسے ابٹن لگاتے وقت اسے پہلے ہلدی نما رنگ کے کپڑے پہنا کر میراثنوں کے ذریعہ گائے ہوئے حرارے نہ دیے جائیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ کیا جا سکتا تو یہ جن کے سائے اس کے نکاح کے ساتھ ساتھ اس کے لمبے سیاہ بالوں میں بندھ کر اس کے ساتھ ہی چلے آئیں گے۔ تاحیات اس کے ساتھ رہنے کے لیے۔

لیکن اول تو وہ شادی کے نام پر ہی غیر معمولی طور پر غیظ و غضب سے بھر جاتی تھی اور دوسرے ابھی اس کی شادی کا وقت ہی نہیں آیا تھا۔

(۷)

مگر مچھ کی پیٹھ پر سفر کرتا ہے کلیجا بندر کا

مگر میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے وہ پرانا کھیل میں دوبارہ کھیلنا چاہتا ہوں، کسی کے بھی ساتھ۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے اپنے وجود میں ایک نیا مکارانہ کھیل بھی کھیلنا ہے۔ مجھے آپ جیسے بہت سے تماشائیوں کے سامنے ایک اونچی اور پتلی سی سیڑھی پر رک رک کر بھاؤ بتا کر چڑھتے ہی چلا جانا ہے۔ بیچ میں رک کر دم لینے اور بیڑی سلگانے کے بہانے سیڑھی کے لیے کاغذ کی چھوٹی چھوٹی کترنیں اچھالنا ہیں اور تب آخری ڈنڈے پر پہونچ کر اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک کر دیا سلائی دکھا دینا ہے۔ ایک لہراتے ڈولتے قد آدم شعلے کے مانند نیچے گرنا ہے۔ پانی سے لبالب بھرے کنویں میں۔ چھپاک۔ اپنا مکمل عکس دیکھنے کی کوشش میں اپنے وجود کے گہرے اندھے کنوئیں میں روز ہی میں یہ موت کی چھلانگ لگاتا ہوں اور بے شرمی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یہ ایک قسم کی جسم فروشی ہے۔

غرض کہ اس بار میری جسم فروشی کے اس خطرناک کرتب کی نمائش اس نیک اور معقول لڑکی کے بدن میں لگی تھی مگر اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس دلچسپ اور خطرناک کرتب کی داستان سناؤں مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔

مثال کے طور پر وہ جب بھی مجھ سے بات کرتی ہے تو میں نئے انداز سے اداس ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز کے کنارے اکثر بے حد اپنائیت میں ڈوبے رہتے ہیں۔ وہ بہت پرانی باتیں یاد کرتی ہے۔ ایسی باتیں جو میں نے بچپن میں ہی دیکھی اور سنی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی بھوری بھوری آنکھوں میں انار کے اداس درخت اگے ہیں۔ یہ آنکھیں دراصل بھوری نہیں ہیں۔ یہ کوئی اور ہی رنگ ہے۔ ایک پراسرار اور بے قرار رنگ جو ہر رنگ کے کناروں کو چھو چھو کر بہتا رہتا ہے لیکن بارہا میں نے ان بے چین آنکھوں کی تہ میں چھپے گہرے دبیز سناٹے کو محسوس کیا ہے۔ جس میں انار کے افسردہ درختوں سے اترے ہوئے جن چہل قدمی کرتے رہتے ہیں۔

میں اس کے پاس بیٹھ کر نہ جانے کیوں ایک بے تکے سے اعتماد اور احساس برتری سے بھرا رہتا ہوں۔ اب پتہ نہیں کہ یہ اس کے کھردرے۔ پر خلوص ہاتھ جہاں تک میرا سوال ہے تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے انداز کا سہارا ہے یا خود میرا کمینہ اور بے شرم حوصلہ۔

کبھی جہاں پیار کا ایک لفظ جگ مگ جگ مگ چمکتا تھا وہاں غصے کی ایک پیلی تپتی ہوئی لکیر کھنچ گئی ہے۔ لیکن یہ تپکن گرم نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھنڈا۔ اور مردہ بخار کے مانند ہے۔ اس شریف لڑکی کے دل میں میرے لئے محبت کے سوتے پھوٹنے کی آخر وجہ کیا تھی؟ میرے پاس وجہ نہیں ہے صرف وجہ کی تلاش ہے اور چند امکانات ہیں۔ ہر شے اپنا اصل چہرہ امکانات میں ہی پوشیدہ رکھتی ہے۔

اگرچہ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، مگر قوی امکان یہ ہے کہ شاید کسی اتفاقی لمحے میں میں نے اس کے اندر کی دلدل اور دہشت کو دیکھ لیا تھا۔ کیا دلدل اور دہشت کے اندر کچھ اتنا خوبصورت ہے؟ کیا ہر قسم کی محبت کے بیج اسی دلدل اور دہشت میں پھوٹتے ہیں۔

مگر میں تو اپنے سر پر غلاظت کا ایک ٹوکرا خوشدلی سے قبول کیے کھڑا ہوا تھا۔ اور اس لئے مجھے اسی محبت سے زیادہ اس کے پرکشش جسم کی زبردست نسوانیت کی فکر تھی، مجھے تو صرف اس کا جامنی رنگ کا ایک سوتی جمپر یاد رہ گیا ہے جس میں اس کی چھاتیوں کا ابھار خوبصورت نظر آتا تھا، مگر ٹھیک اسی مقام پر سنہرے ریشم کی چکنی کڑھائی ہونے کے باعث میرا ہاتھ بے مزہ ہو کر پھسل جاتا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کا مرحلہ تھا۔ شروعات میں تو میں اس کے قلت خون کے مارے زرد اور سفید پاؤں کو بھی جی بھر کر اسی وقت دیکھ پاتا تھا جب وہ عشا کی نماز پڑھ رہی ہوتی، اگرچہ نماز کے رعب اور جلال کے زیر سایہ ان پیروں کی وہ توجہ نہیں دی جا سکتی جو کم از کم اس وقت میرے پاس ضرور تھی۔

میں بہت ہوشیاری سے کام لے رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس بار حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے۔ نام نہاد پاکیزگی کے ہالوں۔ کے تقدس کو آہستہ مٹایا جائے یہ اور بات کہ پاکیزگی کا یہ مرحلہ فتح کرنے کے بعد جس قسم کی طمانیت کا

احساس ہوتا ہے وہ گھٹیا اور کمینہ ہی ہے۔

اسے بھی کمبخت انھیں دنوں خلوص دل کے ساتھ میری اداسی دور کرنے کا خبط پیدا ہو گیا تھا اداسی اپنے میں بے حد پیچیدہ شے ہے۔ خاص طور پر چہرے کی اداسی تو اکثر کچھ طبیعاتی لوازمات کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اکثر اس وقت بھی بے چین ہو اٹھتی جب میں صرف اپنے مسوڑھوں کی سوجن کو منھ کے اندر ہی اندر زبان سے چاٹ رہا تھا اور بار ہا ایسا بھی ہوا کہ اس نے تڑپ کر اپنے دوپٹے سے اس وقت بھی میرے آنسو صاف کرنا چاہے جب آنکھ آنسوؤں سے خالی تھی۔ یہ میری آنکھ کی ماہیت کی پرانی مکاری تھی جس سے وہ ہمیشہ لاعلم رہی۔

میں ان دنوں بھلا اداس کیوں ہوتا۔ یہ بھی بہر حال ایک المیہ تھا۔ بندر اپنا کلیجا درخت پر ہی لٹکا آیا۔ اور اب مگر مچھ کی پیٹھ پر بیٹھا آرام سے بے کراں پانیوں کا سفر کر رہا ہے۔

(۸)

سلامتی کی دعائیں اور دو توجیہات

یوں تو میں ہمیشہ سے ہی نزلے اور زکام کا دائمی مریض رہا ہوں لیکن ان دنوں مجھے ہلکا سا بخار بھی رہنے لگا تھا۔ معمولی سی بات تھی، مگر وہ بے چاری میرے لیے بے حد فکر مند ہو گئی۔ وہ روزانہ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سفید دوپٹہ سر سے اوڑھ کر نہایت احترام عقیدت کے ساتھ میرے چہرے پر نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھ کر پھونکنے لگی۔ اسے مذہبی معاملات کی اچھی خاصی معلومات تھی جو کم از کم اس کی سی عمر رکھنے والی لڑکی کے لئے میری دانست میں خاصا متحیر کن تھا۔ روز ہی کسی نہ کسی بچے کے ذریعہ وہ مجھے پڑھا ہوا پانی کھجور بھجوایا کرتی۔ جب کئی دن تک میرا بخار نہیں گیا تو وہ تقریباً تمام رات جاگ کر میری صحت کے واسطے کوئی وظیفہ بھی پڑھنے لگتی تھی۔ اس کے بعد میرا بخار اتر گیا تھا لیکن اس نے پابندی کے ساتھ وظیفے کی مدت کو پورا کیا۔ سچ سچ کہوں تو میرا چہرہ دراصل انتہائی مکروہ تھا کہ واقع ہوا ہے مگر اسے یہ چہرہ کبھی کبھی اتنا اچھا لگتا تھا کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر نظر کی سورۃ پڑھنے لگی تھی اور پھر میرے چہرے پر دم کر دیتی۔ ایسے حالات میں وہاں سب کچھ تکلیف دہ حد تک پاک اور صاف دکھائی دیتا اور مشکل یہ تھی کہ خود میرے وجود میں بھی کبھی کبھی پاکیزگی کے جراثیم پیدا ہو جانے کا التباس نظر آنے لگتا تھا۔

ان ایک دو تفصیلات سے اب تو آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ آن پڑا تھا کہ اس پاکیزگی کے حصار کو کیسے توڑا جائے۔

مجبوراً مجھے بھی وہی فرسودہ چالیں استعمال کرنا تھیں جو ایسے حالات میں اکثر معمولی سی عقل و فہم رکھنے والے لوگ کام میں لے آتے ہیں۔ اس قسم کی بہت سی چالیں ہیں اور ان کی توجیہات دو طرح سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک توجیہ تو نفسیاتی ہے۔ جس کے مطابق کسی بھی عورت کے دل میں تھوڑی سی جنسی دلچسپی جگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جنسی اعضا اور ان کی کارکردگی یا افادیت پر کچھ اس قسم کی غیر وابستہ گفتگو یا تقریر کی جاسکتی ہے۔ جس کا استعمال فٹ پاتھ پر گھٹیا قسم کی اشتہاری دوائیں فروخت کرنے والے انتہائی سپاٹ لہجے میں کرتے ہیں اور نہایت شائستہ اور کاروباری زبان میں یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں "اکثر ہماری ماتا بہن کو سفید پانی کی شکایت رہتی ہے" (اگر آپ کو میرے اس جملے پر وہ مذہبی رسالہ یاد آ گیا ہو جس کی پشت پر ایسے اشتہارات کی بھرمار ہوا کرتی تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔)

فلسفیانہ توجیہ یہ ہے کہ درحقیقت ہمارے تمام غیر اخلاقی افعال۔ گناہ اور لغزشوں کے عقب میں عین اخلاقی اور انتہائی خلوص و مروت سے مالا مال نظریات کارفرما ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے عقب میں ایک رواداری پوشیدہ ہے کسی بھی شریف لڑکی کے ذہن و احساس میں کسی مرد کو پہلا بوسہ دیتے وقت یا اپنے جسم کو چھیڑنے کی اجازت دیتے ہوئے محبت، وعدہ، وفا اور لحاظ و مروت کے حامل اخلاقی تصورات ضرور قائم رہتے ہیں اور اس صورت میں اس کے لیے کوئی بھی فیصلہ حتمی طور پر کرنا محال بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

اور میں نے ان سب چالوں کا فائدہ اٹھانا کسی حد تک شروع کر دیا تھا۔

(۹)

ایک بوسے کی خاطر

بالآخر وہ دن آ گیا جب میں نے خود کو اس کا بوسہ لینے کے لیے نڈر اور اعتماد سے بھرا پایا۔ لیکن کم بخت اسی دن میرے ساتھ ایک زبردست ستم ظریفی پیش آ گئی جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہوا یہ کہ اس کے پاس جانے سے کچھ دیر پہلے میں نے بے حد خوشبودار تمباکو والا پان کھایا تھا کیونکہ میں اس کا ایک بھرپور اور دیرپا بوسہ لینا چاہتا تھا اور اپنی سانس کی بو پر مجھے اس لیے زیادہ اعتماد نہ تھا کہ اکثر میرے دانتوں کے درمیان گوشت کے ریشے پھنسے رہ جاتے ہیں۔ میں پان میں تمباکو کا استعمال نہیں کرتا ہوں۔

مگر اس دن لاکھ کوشش کے باوجود بھی تھوڑی تمباکو میرے حلق کے نیچے اتر ہی گئی۔ میرا سارا جسم ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چکر کی وجہ سے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس شام میں اس گھر کے قریب ایک اندھیری سنسان گلی میں الٹیاں کرتا پھرا۔

بہر حال اس کے دوسرے روز میں نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ مثلاً اس کمرے کا مکمل جائزہ میں نے پہلے ہی لے رکھا تھا کہ اگر کمرے کے اندر کوئی کھڑا ہو تو اس کی پرچھائیں کس رخ اور کس انداز میں نظر آئے گی۔ بہترین موقع بوسہ لینے کا اس وقت تھا جب کمرے میں کوئی دوسرا آ کر واپس چلا گیا ہو۔ یہاں تک کہ میں نے باقاعدہ ریاضی کے اصول کی مدد سے اس کمرے سے گھر کے ہر گوشے کے درمیان واقع فاصلے کے قدم گنے اور تقریباً ہر رفتار میں وہاں سے کمرے تک پہنچنے کا وقت معلوم کیا اور اس حساب سے بوسے کی زیادہ سے زیادہ مدت کو ذہن نشین کر لیا۔ لڑکی کا نچلا ہونٹ بہت پتلا تھا اور جب بھی وہ سنجیدہ ہو کر کوئی بات سننے کی کوشش کرتی تھی تب تو یہ ہونٹ تقریباً معدوم ہی ہو جاتا تھا۔ اس وقت ان ہونٹوں کے بوسے

کے بارے میں سوچنا بھی مشکل تھا۔

مجھے اپنے ہونٹوں کے درمیان اس کا یہ ہونٹ محسوس ہی نہیں ہوا۔ اس کی سانسوں سے پرانے کپڑوں کی سی بو آرہی تھی ایسے کپڑے جو پاک و صاف تو ہوں مگر عرصے سے کسی صندوق میں بند رکھے ہوں۔

آج سوچتا ہوں کہ شاید وہ گھٹن اور دباؤ کی بو تھی جو اپنے ہی منہ اور حلق کے ذائقے بکھرے خوابوں اور اجاڑ مقدر کے باہمی تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ تقریباً کانپتے ہوئے میں نے جب اپنے ہونٹ الگ کیے تو مجھے احساس ہوا کہ میں تو دراصل اپنے ہی منہ کے پھیکے سیٹھے ذائقے میں اکیلا کھڑا ہوا تھا۔ اس طویل بوسے کے ایسے مایوس کن ذائقے سے بہتر تو بھنے ہوئے سستے چنوں کا مزا ہی رہتا ہے۔

اس دن دل برداشتہ ہونے کے باوجود اب میرے دل میں نہ جانے کیوں شدت سے یہ خواہش پیدا ہونے لگی تھی کہ کبھی وہ خود بڑھ کر میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیتی تو شاید ذائقہ تھوڑا چٹ پٹا ہو جاتا۔ اتنے ابتدائی دنوں میں یہ نسوانی فطرت کے یکسر خلاف تھا مگر میں نے جلدی ہی اپنی قسم دی کر ایک اور بے حد "اداس" ہو جانے کی دھمکی دے کر اسے اسی امر پر بھی راضی کر لیا۔

جب مجھے اپنے لبوں پر اس معدوم سے ہونٹ کا دباؤ محسوس ہوا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ ہونٹ اچانک اتنا قوی اور جوشیلا کیسے ہو گیا۔ میرا دہانہ اس دکھائی نہ دینے والے پراسرار ہونٹ کے غیر مرئی بوجھ سے دبتا چلا گیا۔ تب مجھے ایک ناقابل تشریح قسم کے احساس کمتری نے اپنی گرفت میں لے لیا جسے دور کرنے کے واسطے میں نے اپنے ہاتھ اس کے کولہوں کے ابھاروں پر رکھ دیے۔ مگر تب ہی اچانک وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ ہونٹ غائب ہو چکا تھا۔ اب وہاں صرف ایک تھوڑی تھی جیسے یہ ہونٹ منہ کے اندر زبان کے ساتھ کہیں رہتا تھا۔ اور جس طرح کچھوے کی گردن شدید تکلیف اور دباؤ کے عالم میں باہر نکل پڑتی ہے اس طرح یہ ہونٹ سخت قسم کے اعصابی تشنج کے باعث باہر آ گیا تھا اور کچھوے کی گردن کے مانند ہی دوبارہ اندر چلا گیا تھا۔

یقیناً یہ دہشت خیز تھا اور وقتی طور پر تمام خواہش کا پامال کرنے والا بھی۔

(۱۰)

کراماتی پیر صاحب اور پاکیزگی کا حصار

کہانی آگے بیان کرنے سے پہلے میں یہ نکتہ واضح کرتا چلوں کہ مجھے جنوں پر یقین نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں ان سے خوف زدہ ہوں۔ میرے اجتماعی لاشعور میں ممکن ہے کہ خوف و وہم کی کوئی رمق باقی ہو مگر اس نیک سیرت لڑکی سے جنسی قربت حاصل کرنے کی خواہش میرے اندر اس حد تک قوی تھی کہ اس کے آگے اس قسم کے بے جا خوف کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہ سکتی تھی۔ ورنہ یہ باتیں تو میری بھی سنی ہوئی تھیں کہ جس لڑکی پر کسی شئے کا سایہ ہوتا ہے اس سے جنسی قربت حاصل کرنے والا شخص یا تو مر جاتا ہے یا پھر دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

اس سلسلے میں میری رغبت اور سنک کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ میں تو ان پیر صاحب سے بھی ملنے نہیں گیا۔ وہ جو ٹھاٹھیں مارتی ہوئی ندی کو پیروں پر چل کر پار کرتے ہیں؟ وہ بڑے کراماتی پیر ہیں۔ ان سے مل کر لوگوں کی سالہا سال پرانی بیماریاں، پریشانیاں اور غربتیں دور ہو جاتی ہیں۔ وہ خلق خدا کے دکھ دور کر دیتے ہیں۔ اگر چہ ان سے ملنا ایک امر محال ہے مگر مجھے ایک دفعہ ایسا موقع نصیب ہوا ہے جب میں ان کے حجرے میں اسی طرح داخل ہو سکتا تھا جس طرح اپنے گھر میں گھستا ہوں۔ میں حجرے کے دروازے تک پہونچا بھی مگر اچانک ایک اندیشہ نے مجھے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔

میں نے سوچا کہ ممکن ہے پیر صاحب سے ملاقات کے بعد میری فطرت ہی بدل جائے اور اس لڑکی سے قربت کی خواہش میرے اندر ختم ہو جائے۔ آخر اللہ والوں سے مل کر انسانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں تو عام طور پر ہی جاتی رہی ہیں۔

مگر نہیں ہرگز نہیں۔ غریبی، بیماری اور ذہنی پریشانیوں کی اس نیک سیرت کے بھرپور نسوانی جسم کے آگے اہمیت یا حقیقت ہی کیا تھی۔ میں جس حال میں تھا اس میں خوش تھا۔ میں نے ادھر سے رخ موڑ لیا جہاں پیر صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔

لیکن اصل مسئلہ اب یہ تھا کہ اس پاکیزگی کے حصار کو کیسے توڑا جائے۔ ان بے تکے بے مزہ بوسوں سے تو وہ ٹوٹ نہیں پایا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ اس شریف لڑکی کو خواہش سے مغلوب کرنے کے لیے چند پاکیزہ الفاظ ضروری تھے۔ کیونکہ محض الفاظ کی پاکیزگی اور ان کا سوجھ بوجھ اور سلیقے سے استعمال کرنے کی خوبی میں ہی یہ راز پوشیدہ ہے کہ کسی بھی حیوانی جذبے یا جبلت پر کیونکر نیکی اور فلاح و بہبودی کا التباس پیدا کرایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف میں نہیں کہہ رہا۔ انسانوں کی ساری تہذیب اس بات کی شاہد ہے۔

اس لئے ایک دن میں نے اس کی گردن کے تل کو پیاسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر آؤ ذرا چپٹ کر میرے کلیجے سے تو لگ جاؤ۔ عجیب سی ہوک اٹھ رہی ہے۔"

کلیجے اور ہوک جیسے الفاظ کی پاکیزگی شبہے سے بالاتر ہے۔ وہ سہمی سہمی اٹھی۔ اس کی نظریں بجھی بجھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں سے کس کر بھینچ لیا۔

اب میں نے اس کے جسم پر اس طرح ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا جیسے یا تو یہ صرف بے خیالی میں ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی اعلیٰ ترین محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔ حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قربت کے ان لمحات میں کسی کا اس درجہ ہوشیار اور چوکنا رہنا بذات خود قربت کی ہی نفی کرتا ہے۔ تب ہی میرا ہاتھ اس کے جامنی رنگ کے جمپر کے گریبان پر کشیدہ ریشمی کڑھائی تک پہونچا اور وہاں سے بے لذت ہو کر پھسل گیا۔ وہ اس طرح مجھ سے الگ ہو گئی جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو اور ڈوپٹے سے اپنے سینے کو اچھی طرح ڈھانپنے لگی۔ میں اس کم بخت چکنی کشیدہ کاری کو دل میں کوستا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس بار اسے پوری طاقت سے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اس کے گریبان کے اندر ہی ڈال دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ گھبرا کر تقریباً چیخ پڑی۔

اس نے اندر گھریلو قسم کی شمیز پہن رکھی تھی۔ اس بات سے بدمزہ ہوتے ہوئے بھی میں نے دوبارہ ہانپتی ہوئی سانسوں میں پاکیزہ الفاظ استعمال کیے۔

"دیکھو۔ یہ تمہارے جسم کا سب سے مقدس مقام ہے۔ تمہارا نیک اور پاک قلب یہیں دھڑکتا ہے۔ مجھے اسے ایک بار چھونے تو دو۔ یہیں سے تو ممتا کے سوتے پھوٹتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ چھوڑ دیجئے۔ ارے بھیا۔ چھوڑ دیجئے۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔" خوشامد کرتے ہوئے اس کی آواز بے حد روہانسی ہوگئی اور اس کا گلا بیٹھنے لگا۔

دراصل اسے دوران گفتگو لفظ "بھیا" استعمال کرنے کی وہی پھوہڑ عادت تھی جو کہ اکثر لوگوں میں کسی بات پر زور دینے کے لیے یا اس کی نفی کرنے کے لیے لاشعوری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر آج سے پہلے میرے لیے اس نے اس الفاظ کا استعمال کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن ذرا غور تو کریں کیا ان نازک ترین لمحات میں اس لفظ کا بہ آواز بلند استعمال اس تمام جدو جہد کو ہی مضحکہ خیز بنا دینے کے لئے کافی نہ تھا؟ مگر میں اپنے ساتھ واقع ہونے والی اس بدمذاقی کے باوجود بھی اپنی ضد اور ارادے پر اڑا رہتا ہے اگر اچانک میرے انگلیوں میں اس کے گریبان کے اندر جھولتا ہوا سیاہ دھاگے سے بندھا تعویذ پھنس گیا ہوتا۔ وہ انتہائی بے چارگی سے بولی۔

"دیکھیے خدا ناراض ہو جائے گا۔"

میں نے چاہا کہ اس کے گوش گذار کردوں کہ خدا اس حد تک خود مکتفی ہے کہ کسی فعل سے ناراض ہو جانے یا خوش ہو جانے کے تصور سے ہی اس کے وجود پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔ مگر ایک تو میرا ہاتھ اس تعویذ میں پھنسا ہوا تھا دوسرے مجھے خیال آیا کہ آج جمعرات ہے۔ اس کی بے چارگی سے پھٹی پھٹی سراسیمہ آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مجھے اچانک ان آنکھوں میں انار کے اداس درخت ہلتے ہوئے نظر آئے۔

میرا ہاتھ مردہ سا ہو کر باہر لٹک گیا۔ میرے ناک اور کنپٹی پر اس کے سر کے ایک دو بال ٹوٹ کر چپک گئے تھے۔ اس پاکیزگی کے حصار کو توڑنا تو دور۔ میں خود اپنے وجود میں پہلی بار اس حد تک ہیبت ناک پاکیزگی کا ناقابل فہم احساس سرایت کرتے ہوئے پا رہا تھا۔

اس رات اچانک میری بیوی آ کر میرے سینے سے لگ گئی اور اس نے اپنا چہرہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجبوراً مجھے اس کا بوسہ لینا ہی پڑا حالانکہ اس وقت میرا ارادہ فقط اس کے ماتھے کو چوم کر چھوڑ دینا تھا۔ مجھے اس کی خود سپردگی کا بھرم رکھنا پڑا۔ جلد ہی میرے اندر کا عارضی بیراگ بھاپ بن کر اڑ گیا۔ لیکن انھیں لمحات میں ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔

(۱۱)

ایک مفید اور کار آمد ڈپلوما

اور یہ خیال پاکیزگی کے اس پریشان کن حصار کو توڑنے کے سلسلے میں تقریباً ایک ڈپلوما یا ٹریننگ کی سی کار آمد اور عملی حیثیت کا حامل تھا اور میری بیوی اس میں بے حد معاون ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ اس وقت مدہوش اور مظلوم ہو کر ٹوٹی پھوٹی فیشن زدہ انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہی تھی اور اس بڑبڑاہٹ کو اپنی زبان میں آسانی کے ساتھ فحش قرار دیا جا سکتا تھا۔ مگر میں ان لمحات میں بھی اس کا انٹرویو لینے کو تیار تھا۔ میں نے اس کے سر سے لیکر پیر تک تمام جسمانی اعضا کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ میرے ساتھ جسمانی قربت کے لمحات میں اس کے جسم کے کس حصے کی فطری مانگ کیا ہے، اور اس سے حاصل ہونے والے حظ کی شدت اور نوعیت کس قسم کی ہے؟ اور اس قسم کے بہت سے سوالات اور ان کی باریک سے باریک تفصیلات بھی میں نے پوچھنا چاہیں جن کا اگرچہ بیوی نے شرم کے باعث کھل کر جواب نہیں دیا مگر بہت سی باتیں تو آپ کی اپنی عقل سلیم پر منحصر ہوتی ہیں۔ میں یہ تمام کار آمد نکات ایک بہترین طالب علم یا ماہر شماریات کی طرح ذہن نشین کرتا رہا۔ حالانکہ اس موقع پر میرے لیے یہ کتنا مشکل اور آزمائشی کام تھا اس کا اندازہ آپ کو بخوبی ہوگا۔ مگر میری تسلی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اس رات بیوی کے سو جانے کے بعد اپنی تحقیق کو اور بھی زیادہ مستند بنانے کے لیے میں نے جنسی موضوع پر لکھنے والے ایک مشہور اور قابل اعتماد مصنف کی پرانی کتاب نکالی جس میں ماہ کے ہر دن عورت کے جسم پر پڑنے والے قمری اثرات کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ جس عضو میں قمر کا قیام ہوتا ہے عورت کا وہی عضو اس وقت جنسی اعتبار سے سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے اور مرد کے لیے اس وقت وہی عضو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہو جایا کرتا ہے۔ میں نے رات میں بڑی دیر جاگ کر یہ ساری باریکیاں، نکات اور تفصیلات بھی اپنے حافظے میں اچھی طرح محفوظ کر لیں۔

(۱۲)

خلا میں جھولتی گالی

دوسرے دن شام کو میں اسی مکمل ذہنی تیاری کے ساتھ اس سے ملنے گیا جس طرح پڑھا کو قسم کے فکر مند طالب علم امتحان دینے جایا کرتے ہیں، وہ اس وقت مصلیٰ زمین پر بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے جلدی جلدی مصلیٰ تہہ کیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا فرش پر گھٹنوں کے بل جھک کر میرے پیر پکڑ لیے۔

"معاف کردو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ کل میری وجہ سے تمہارا بہت دل دکھا ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کے ہاتھ میرے پیروں کو چھو رہے تھے۔ ایک پل کو مجھے یہ ہاتھ بخار زدہ محسوس ہوئے۔

"کیا اسے بخار چڑھ آیا ہے؟" میں نے سوچا مگر ٹھیک اسی وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے ان بخار زدہ ہاتھوں کی گرمی تو دراصل میری پنڈلیوں کو نہ صرف بے حد لذت بخش رہی ہے بلکہ مجھے ایک ناقابل تشریح قسم کے احساس غرور سے بھی مالا مال کر رہی ہے۔ میری سانسیں گرم ہونا شروع ہو گئیں حالات غیر متوقع طور پر میری موافقت میں تھے۔

میں نے نرمی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا اور اسے

اپنے چہرے کے بے حد قریب لے آیا۔ اکثر میں نے غور کیا کہ جب بھی اس کا یہ چہرہ میرے بہت ہی قریب آ جاتا ہے تو اس وقت نہ جانے کیوں کسی ایسے مجبور و بے بس جنگلی جانور سے مشابہ نظر آتا ہے جس کے پاس انسانوں کے لئے فی الحال اجنبیت اور اجڈ پن کے علاوہ دوسرا کوئی جذبہ پایا ہی نہ جاتا ہو۔ آج مجھے اس چہرے پر بے حد غصہ آنے لگا مگر بس یہی وقت تھا گویا صدیوں سے قائم اس پاکیزگی کے حصار کو پار کرنے کا۔ میں نے کل رات کا سارا سبق ایک بار دل ہی دل میں دہرایا اور بے حد شائستہ اور نرم و شیریں لہجے میں گویا ہوا۔

"اٹھو۔ تمہارا مقام میرے قدموں میں نہیں ہے۔ کیوں مجھے گناہ گار بناتی ہو۔"

وہ اس وقت زرد رنگ کے کپڑے میں ملبوس تھی جن پر اس کے قلت خون سے مارے بدن کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔ ایسے کپڑے لڑکیوں کو تب پہنائے جاتے ہیں جب ان کی شادی سے پہلے ابٹن لگانے کی رسم ادا کی جاتی ہے مجھے اس وقت اس کا یہ پیلا پیلا جسم نسوانی اعتبار سے بے حد تحریک خیز محسوس ہوا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر سینے سے لگایا۔ "مجھے معاف کر دو۔" اس نے سرگوشی کی۔

"معافی تو مجھے مانگنا چاہیئے۔ غلطی میری تھی۔" میں نے اپنی اکھڑی اکھڑی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اس کا سارا جسم بخار میں جل رہا تھا۔ وہ واقعی بیمار تھی۔ مگر میری باتوں سے شاید اسے بہت تسلی ملی تھی کیونکہ پیار اور اپنائیت کے جذبے کے ساتھ اس نے میری قمیص کا کالر پکڑ لیا۔ آج قمر کا قیام اس کے جسم کے بائیں حصے میں ہے۔ مجھے یاد آیا۔

سب سے پہلے میں نے اس کے بائیں کان کی جلتی ہوئی لو کو آہستہ سے اپنی زبان سے چاٹا۔

وہ اچانک کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا

"گدگدی ہو رہی ہے۔" وہ اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔

مجھے ہلکی سی مایوسی ہوئی کیونکہ میری بیوی کے منہ سے اس موقع پر بڑی لذت آمیز سسکاری نکلتی تھی۔

اب میں نے اپنے ناخن پوری طاقت کے ساتھ اس کی بائیں ران میں گڑا دیئے۔ اس کے منہ سے ایک تکلیف زدہ چیخ نکلی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے زور کا درد ہوا۔" وہ بسورتی ہوئی بولی۔

مجھے پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ میری بیوی اس فعل کے جواب میں فحش انگریزی بولنے لگتی تھی۔

میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ نہیں۔ وہاں درد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اس کی گردن کے بائیں طرف اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے ایک بار اسے پوری طاقت سے بھینچ لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میری بیوی مجھے پاگلوں کی طرح چومنے لگتی تھی۔ مگر وہ تو بالکل خاموش تھی۔ بس اس نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے پوری طاقت سے بھینچا۔

"جان۔" میرے منہ سے جذباتی اور کسی حد تک فحش انداز میں نکلا۔

ٹھیک اسی وقت مجھے ایک انوکھے امر کا انکشاف ہوا۔ جنسی قربتیں جب پرانی ہو جاتی ہیں تو جسمانی اور ذہنی سطح پر اپنے ساتھی سے بہت سی لاشعوری حرکات اور انداز گفتگو تک کی شرکت کر لیتی ہیں۔ اس وقت جو میرے منہ سے 'جان' کا لفظ نکلا تھا تو قصہ دراصل یہ تھا کہ یہ لفظ اسی انداز میں میری بیوی کے ذریعہ اس وقت ادا ہوتا تھا جب میں اسے پوری طاقت سے چمٹاتا تھا اور وہ اس کا گرم جوشی سے جواب دیتی تھی۔ پیار میں کتنا کچھ مانگا ہوا، سیکھا ہوا اور باسی ہوا کرتا ہے۔ ہم کس کو یقین کے ساتھ ایک بوسہ تک ایسا نہیں دے سکتے جو کہ محض اس کی ذات کے لیے ہونٹوں نے تخلیق کیا ہو۔

لیکن یہاں اس انوکھے امر کا ایک خوفناک پہلو بھی میرے سامنے تھا اور وہ یہ کہ یک بارگی مجھے یہ احساس ہوا کہ اس وقت یہاں اس لڑکی کے ساتھ میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ شاید میری بیوی بھی میرے ساتھ شامل ہے۔ شاید میں اور میری بیوی دونوں مل کر اس بدنصیب اور بے زبان لڑکی کو روند رہے تھے۔ یہ ایک قسم کی سفاکی تھی اور اس بے چاری کے لیے انتہائی ذلت آمیز بھی۔

مگر نہیں یہ ایسے حالات ہرگز نہیں تھے جن میں زیادہ دیر تک یہ خوفناک اور انوکھا احساس مجھے بے دست و پا رکھ پاتا۔ مجھے اپنا کام مکمل کرنا تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ خاصی دیر سے محبت آمیز خود سپردگی کے ساتھ میرے سینے سے لگی کھڑی ہے تو میں نے ایک ہاتھ اس کی چھاتی کے بائیں طرف اور دوسرا ہاتھ بائیں طرف کے کولھے کے ابھار کے نیچے رکھ دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کم از کم اس مرحلے پر رات کا سیکھا ہوا میرا سبق رائیگاں نہ جائے گا۔

اس نے مجھے اتنے زور سے دور جھٹکا کہ میں تو گرتے گرتے بچا ہی وہ خود بھی پیر پھسل جانے کے باعث فرش پر لڑھک گئی۔

"اگر تمھیں یہی سب چاہیے ہے تو مجھے اپنا کیوں نہیں لیتے؟ وہ زور زور سے سسکنے لگی۔

میں اب وہاں سناٹے میں کھڑا اپنی ہی ہوا میں جھوم رہا تھا۔

تو یہ سب بیکار تھا اور مضحکہ خیز حد تک گھناؤنا بھی؟ بالآخر میں نے سوچا نہیں۔ جسمانی سطح پر بھی سب کچھ یکساں نہیں ہوا کرتا۔ میری بیوی کسی دوسرے زمان و مکان کی شے تھی۔ وہ تو حشرہ بھی کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ محض جسم میں بہنے والے ایک جیسے کیمیائی مادے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دو انسانوں کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ ان کے بیچ آپس میں نہ پیار بانٹا جا سکتا ہے نہ نفرت اور نہ ہوس۔ ہر انسان تنہا ہے۔ ازل ہی سے تنہا۔ دو انسانوں کی روحوں کے درمیان کوئی کھڑکی نہیں کھلتی۔ اس وقت مجھے پہلی بار المناک حد تک زندگی کے بے تکے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے فرش پر بیٹھی اس کمزور لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس پل، یک نظر میں مجھے وہ نہایت عام سی لڑکی نظر آئی۔ شاید آج اس کے جسم پر وہ سوجن نہیں تھی جو لوگوں کے کہنے کے مطابق کسی شے کے باعث آجایا

کرتی تھی۔ ممکن ہے اس کی وہ نسوانی کشش اس سوجن کے ہی باعث ہو۔ میں نے خیال کیا۔ ”تم سن رہے ہو؟ اگر تم نے مجھے نہیں اپنایا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ اس نے فرش پر بیٹھے بیٹھے میرے گھٹنے پکڑ لیے۔ وہ پیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ایسے کپڑے شادی سے پہلے ابٹن لگاتے وقت اور لڑکی کو مانجھے میں بٹھاتے وقت پہنائے جاتے ہیں۔

آج اس کی پر جلال بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں سونی پڑی تھیں۔ جن ان آنکھوں سے اتر کر اس دل کے ساتھ اسے الوداع کہتے ہوئے واپس پرانی ویران مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

وہ فرش پر اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے میرے گھٹنے زور سے ہلائے۔

تمھیں پتہ نہیں سب کو اس تعلق کا علم ہو گیا ہے۔ اب میں ان کی نظروں میں ایک آوارہ لڑکی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اس بدنامی سے بچالو۔ میں تمھاری بیوی کی لونڈی بن کر زندگی گذار دوں گی۔“

وہ دردناک لہجے میں اپنے تحفظ کی بھیک مانگ رہی تھی۔ ایک ادنیٰ اور عام لڑکی کی طرح جس سے بات کرنے کا حوصلہ کل تمام لوگوں میں اس لیے ہو جائے گا کہ اس کی آنکھوں میں خراماں خراماں ٹہلنے والے جن اب رخصت ہو چکے ہیں۔

”تم اگر چاہو تو ہمیشہ کے لیے مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ تمھیں کون روکے گا؟“

اس نے ایک بار پھر میرے گھٹنے زور سے دبائے اور اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میں خود اپنے گھٹنے لاشعوری طور پر موڑنے یا آپس میں ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ازل سے انسان اپنی بیکراں تنہائی میں اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے سکڑا ہوا لیٹا ہے۔ اپنے تحفظ کے لیے کیے گئے اس جرم کے لیے اسے معاف کر دینا چاہیئے۔

مجھے واہمہ گذرا کہ کہیں دور ڈھولک کی بے ہنگم اور بے سر تال پر میراثنیں حرارے گا رہی تھیں۔ مجھے بخار چڑھنے لگا۔ وہ اسی طرح میرے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ اور تب وہ تمام دعائیں جو اس نے میری سلامتی کے لیے پڑھ کر پھونکی تھیں، بھٹکتی ہوئی ہوائیں بن کر اندر آ گئیں اور ان کے جھکڑوں میں میرا سارا چہرہ گرد سے ڈھک گیا۔ اب میں وہاں قابل نفریں طور پر اکیلا تھا۔ اپنے آپ کو دی گئی ایک اداس اور ننگی گالی کی طرح اکیلا جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے اور جو بس خلا میں ڈولتی جھولتی رہ جاتی ہے۔

(۱۳)

اپنوں کے درمیاں

مجھے کون روکتا؟

میں اگر چاہتا تو ہمیشہ کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا۔

میں مگر اس شام کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا۔

مجھے اس کا کوئی رنج ہے یا پچھتاوا، یہ بتانے سے بھلا کہانی پر کیا فرق پڑے گا؟

ان کا انجام کیا ہوا؟ اس کے زرد پیر اسے کہاں لے گئے؟ اب یہ میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کی قوت تخیل سے زیادہ کھلواڑ نہیں کرنا چاہتا حالانکہ یہ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی کہ قوت تخیل بہر حال ایک سیال شے ہے اور اسے کسی بھی طرح حتمی اور ٹھوس حقیقت میں نہیں بدلا جا سکتا اور اکثر حقیقت اس سے دور کھڑی بڑے پھسپھسے اور عامیانہ انداز میں سر کھجایا کرتی ہے۔ اس لیے سر دست بس اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت اپنوں کے درمیان ہوں۔ میں اپنے گھر میں ہوں۔ باہر نومبر کی دھند بھری سرد رات بکھری ہے مگر میں نے اپنے گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں۔ یہاں بہت سکون ہے۔ یہ اپنوں کے ساتھ رہنے کا سکھ یا پھر تحفظ کا احساس ہے۔ اور جس پر ہر شے کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں اس ماحول میں خود کو مکمل اور محفوظ گردانتا ہوں۔ میری بیوی اور بچے اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر چین سے بڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ اور خود میں بھی بے حد آرام کے ساتھ کروٹ سے لیٹا ہوا کامکس پڑھ رہا ہوں اگرچہ تھوڑی سی خنکی محسوس کرنے کے باعث میں نے اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑ رکھے ہیں۔

ہر انسان کو ایک نہ ایک دن گھٹنے موڑ ہی لینا پڑتا ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی سوچا تھا کہ اس کے لیے انسان کو معاف کر دینا چاہیئے۔ جہاں تک میرا سوال ہے آپ مجھے معاف کریں یا نہیں مگر میں یہ اعتراف 'جرم' کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے ”دکھ“ نہیں دیکھا۔ ”دکھ“ تو اپنا چہرہ چھپائے خاک میں لوٹ رہا تھا۔ میں نے صرف آسمان میں لہراتی پھڑ پھڑاتی ”دکھ“ کی نیلی قمیص ہی دیکھی ہے۔

(۱۴)

تمہید کی طرف سفر کرتا ایک رسمی اور بچکانہ اختتام

میری یہ کہانی اسی جگہ ختم ہو جاتی ہے مگر بھیانک حقائق کے لیے استعارے کے عیاشانہ استعمال کا شوق پوری طرح ابھی بھی میرے دل سے مٹ نہیں پایا ہے اور اگر آپ اسے میری جہالت پر محمول نہ سمجھیں تو استعارے کے اسی عیاشانہ اور سفاکانہ استعمال کو ہی تو رمز بلیغ کہتے ہیں۔

لہٰذا میں دوبارہ اسی اونچے میز پر کھڑا ہو جاتا ہوں اور آپ سب کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے چھچھورے پن کے ساتھ دہرانا چاہتا ہوں کہ میں جس مقام پر ہوں اس کا جغرافیہ اور محل وقوع بتانے سے قاصر ہوں۔ گمنام ریگستان کے اس آبی ٹکڑے کے کنارے کھڑے کھڑے اب شام ہو چکی ہے۔ کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ اس کے بعد گیلی ریت پر میرے جلتے ہوئے پیر قابل رحم حد تک ٹھنڈے پڑیں گے اور اکڑ جائیں گے ☆☆☆

خالد سعید

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

تیر کو دل پر لے نہ سکے اور زیب گلو بھی کر نہ سکے
سر کو علم وہ کرتے کیا جو دل کو لہو بھی کر نہ سکے

اگلی صفوں نے نماز پڑھی تھی تیر کھائے جی بھر کے
اب کے وہ گھمسان کا رن ہے ہم تو وضو بھی کر نہ سکے

زندگی ایک نماز تھی جس میں غلطی سرزد ہو ہی گئی
موت کہ بازوِ ہستی کھڑی تھی، سجدہ سہو(۱) بھی کر نہ سکے

تیری گلی دل چاک گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے ہیں
بے ہنری تھی فرصت بھی کم چاک رفو بھی کر نہ سکے

کب سارے پامال ہوئے ہم کب سارے آباد رہے
کچھ یاروں نے ادھورا چھوڑا کچھ تو عدو بھی کر نہ سکے

شعر و سخن کے پردے میں بس درد کا کاروبار کیا
شعر کو دھندا لفظ کو رسوا ہم تو کبھو بھی کر نہ سکے

کچھ نے آنکھ کو صحرا جانا کچھ نے درد کو چاند لکھا
ہم نے درد کو درد ہی لکھا تھوڑا غلو بھی کر نہ سکے

خالد عبادی

شمارہ ۱۷۹،
جنوری ۱۹۹۵

قبائے ہجر میں خوشبو یہ کیا ہے
وہ رشکِ گل اگر مرجھا چکا ہے

شکاری گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں
پرند خوش بیاں محو نوا ہے

ادھر بھی دیکھتے رہنا ادھر بھی
کوئی کھل کر کوئی چھپ کر کھڑا ہے

رخ طالب پہ گرد نارسائی
تری محفل میں اب یہ بھی روا ہے

اسے پانا گنوانا پھر سے پانا
عبادی زندگی میں اور کیا ہے

(۱) قافیہ مکتوبی

مکڑی

خالدہ حسین

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

خواتین و حضرات میں آپ کی آمد کے لئے بے حد مشکور ہوں۔ شاید آپ کو یہ احساس نہیں ہو سکے گا کہ میں نے کس کس طرح اس موقع، اس واردات کو ٹالا، بھلایا، پس پشت ڈالا، جھٹک کر ایک طرف کیا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک روز ضرور۔ آخر مجھے آپ کو بلانا پڑے گا۔ یہ پریس کانفرنس ناگزیر تھی۔

جب سے میں نے اپنے وجود کو موجود پایا۔ یا اس کائنات کو موجود پایا۔ یہ پریس کانفرنس ناگزیر تھی۔ میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پھر اب کسی سے بات کرنے... الفاظ کو کسی تک پہنچانے... یا آوازوں کو باہم سمجھنے کا کوئی اور طریقہ بھی تو نہیں رہ گیا۔ شاید آپ میں سے بہت سے دل ہنس رہے ہوں کہ دنیا میں سب سے زیادہ جو فعل عمل میں آتا ہے وہ "بولنا" ہے "بات" ہے تمام دنیا چوبیس گھنٹے بولتی ہے دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں ہر وقت کوئی نہ کوئی بات کرتا ہے اور وہ سنی بھی جاتی ہے۔

مگر خواتین و حضرات۔ مسئلہ دراصل بات کی اہمیت منوانے، سامنے لانے کا ہے۔ مسئلہ الفاظ کا نہیں ان کے مفہوم کا اور ان کی قدر و قیمت کا ہے کبھی جب ہنگامی حالات کا نفاذ ہوتا تھا تو سب چونک جاتے تھے سنتے تھے سمجھتے تھے۔ مگر پھر ہر لحہ ہنگامی لحہ ہوتا گیا۔ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کوئی بھی لحہ عام لحہ نہ رہا۔ اور پھر اس لئے سب لمحے ایک سے ہو گئے۔ جن کا کوئی نام کوئی احساس کوئی یاد نہیں۔ لہٰذا وقت ایک ملگجا تسلسل مکڑی کے جالے کی طرح پھیلتا گیا، تار عنکبوت میری تمھاری اصل بن گیا اور گھروں میں سب سے بودا گھر مکڑی کا ہے

تو جب میں نے دیکھا کہ اب تمام گھر مکڑی کے گھر بن گئے ہیں اور مجھے ایک اور صرف ایک راستہ بات کرنے کا نظر آیا وہ تھا کہ آپ کو مدعو کروں۔ چند بینائیوں چند سماعتوں کو، پس خواتین و حضرات میں آپ سے بینائی اور سماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے بات کروں گا۔

آپ نے یہ گھر دیکھا ہے ہاں یہ بھی مکڑی کا گھر ہے۔ جس میں میں ابھی تک الجھ کر لٹکا ورمرا نہیں۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ تو یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ مجھے یہ خبر آپ کو دینا تھی۔ آپ سب پھر دل ہی دل میں ہنس رہے ہوں گے۔ میں ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں۔ یقین کیجیے مجھ سے زیادہ عقلیت پسند جاندار اس روئے زمین پر نہیں۔

مگر آپ خود ہی بتائیے کہ جب کبھی آپ کا گھر مکڑی کا گھر بن جائے اور کبھی آپ کو یوں محسوس ہو کہ آپ کسی بہت بڑی کشتی یا بحری جہاز میں سوار ہیں اور یہ وہ کشتی ہے کہ پہاڑوں ایسی جوش مارتی لہروں میں الٹتی پلٹتی کسی کوہ جودی کی تلاش میں ہے، باہر یہ مکان ابھی چپکے سے اسی طرح ہوا میں اڑنے لگے گا اور ہم اس کے باہر کچھ بھی نہ دیکھ سکیں گے۔ کیوں کہ دراصل یہ مکڑی کا گھر ہے اور میں مکڑی نہیں ہوں۔

مکڑی تو کوئی اور ہے جس نے یہ جالا بنا ہے اور اس کو تار تار تنا ہے اور میں اس کا شکار اس کے نرم ریشمیں تانے بانے میں اتر آیا ہوں اور باہر نہیں دیکھ سکتا نہ ہی اس مکڑی کو جس نے یہ بودا گھر بنایا اور اس پر بھی مجھ سا تو انا شخص چاہے بھی تو اس نامعلوم ان دیکھے۔ ریشمیں تاگوں سے باہر نہیں نکل سکتا یہ بودا گھر اپنی مضبوطی میں ایسا ہے۔

شاید ابھی آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اس لئے میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ شروع سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اس لئے کہ میں پہلے ہی بہت سا وقت قتل کرنے کا مجرم ہوں۔

میں نے وقت کو پامال کیا اور اس کے بدلے میں وقت نے مجھے پامال کیا مگر اب بھی ہم نبرد آزما ہیں۔ خیر یہ تو محض سخن گسترانہ بات بیچ میں آن پڑی تھی۔ دراصل بات یہ ہے بہت سال ہوئے جب میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم الگ ہے اور اس پر ایک سر دھرا ہے۔ جس کے اندر ایک سلیٹی رنگ کا جھری دار تہہ در تہہ مادہ ہے جس کا وزن زیادہ سے زیادہ ایک پونڈ ہے اور اس میں بے شمار تہیں غلاف سلوٹیں ہیں اور سب کی سب مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں۔ میں ان کے سامنے بے بس ہوں۔

میرے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں ہر چیز اس مادہ کی غلام ہیں۔ وہ اکثر میرے سر میں الجھتا ہے مچلتا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا۔ "کیا تمھارے جسم پر بھی ایک سر ہے اور اس میں ایک سلیٹی مادہ تہہ دار دو حصوں میں بٹا سلوٹ در سلوٹ تڑپتا، مچلتا ہے۔ کیا تم نے بھی اس کی پیدائش اس کی آمریت پر غور کیا؟"

تو وہ ہنس دیئے۔ قہقہہ در قہقہہ۔ میں بھی ہنس دیا۔ اور ان کا جواب یہ سمجھا کہ ان کے جسموں کے اوپر جو سر ہے اس کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ نہیں۔ اس رابطہ نے مجھے بہت، الجھایا۔ بہت پریشان کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر کے مشورہ پر میں نے صبح و شام، باغوں، سڑکوں پر فضا راستوں کی سیر شروع کی۔ یہ کونے میں رکھی آپ نے میری چھڑی نہ دیکھی؟ یہ چھڑی ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کو ٹیک کر میں ہرے بھرے سبزے اور رنگین ہنستے پھولوں کے درمیان پھرتا ہوں۔ کبھی ڈھلوانی سڑکوں پر بادیہ پیمائی کرتا ہوں۔ قدرت کی رنگینیوں اور ان کی پیدائش پر غور کرتا ہوں اور صبح و شام کے الٹنے بدلنے پر تفکر کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ کس طرح اندھیرے میں سے روشنی اور روشنی میں سے اندھیرا

کھنچا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ سب کچھ میں نہیں دیکھ رہا۔ یہ سب میں نہیں جان رہا۔ یہ وہ ایک پونڈ سلیٹی رنگ کا تہ در تہ مادہ ہے کہ مجھے دکھاتا ہے، مجھے حکم دیتا ہے۔ دیکھو۔ تو میری آنکھ دیکھتی ہے۔ مجھے حکم پہنچتا ہے کہ سنو تو میرے کان سنتے ہیں اس لئے یہ صبح و شام کی چہل قدمی میرے کسی کام نہ آئی۔ یہ راستوں میں بچھی پھولوں کی پگڈنڈیاں میرے لئے اتنی ہی بے معنی بن گئیں، جس طرح کسی غلام۔ کسی قیدی کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اس سے پرفضا مقام پر دوڑ لگانے کو کہا جائے۔ اس کو قدرت کی نیرنگیاں دکھائی جائیں اور وہ اس ملے ہوئی حکم پر دوڑے۔ دوڑتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں زنجیروں سے زخمی ہو ہو کر بالآخر علیحدہ ہو جائیں دور جا پڑیں۔

تو خواتین و حضرات میں آپ سے ہرگز ہرگز اپنا یہ جرم چھپانا نہیں چاہتا میں کسی طور پر بھی اس سنگین گناہ سے انکار نہیں کروں گا کہ میں نے چاہا کہ میرا سر مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔ میں نے چاہا کہ میرا جسم آزاد ہو جائے اور کیا آپ یقین کریں گے کہ میری خواہش یا دعا پوری ہو گئی؟ بالکل اپنے حقیقی معنوں، لفظوں میں۔ ان کے اصل لغوی معنوں میں پوری ہو گئی۔ کیا آپ کو کسی سر کٹے سرمست کی کہانی یاد آئی۔ ہاں ہاں اسی لئے آپ سب ہنس رہے ہیں۔ نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ وہ سر کٹے سرمست وہم نہیں تھے۔ وہ بھی ہم ہی میں سے تھے کہ انھوں نے خواہش کی کہ ان کا وہ ایک پونڈ وزنی مادہ ان سے علیحدہ ہو جائے وہ ان کا آمر۔ مگر آپ مجھ سے اس بات کا ثبوت مانگیں گے۔ آپ پوچھیں گے کہ اس جالے میں مقید میں نے یہ کیسے جانا کہ میں نے اپنے سر سے نجات پائی؟ تو جناب والا اس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے اور میری آج کی گفتگو کا اصل موضوع یہی ہے۔

سنئے خواتین و حضرات۔ میرے گھر کے اس گیٹ کے باہر جہاں چار سڑکیں آپس میں آمنے سامنے سے آکر ملتی ہیں ایک راؤنڈ اباؤٹ ہے۔ اور اس میں خوبصورت نرم گھاس پر رنگ برنگے پھول مہکتے ہیں۔ میرے گھر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر ایک فٹ پاتھ ہے میں جب گھر سے اس چھڑی کے سہارے نکلتا ہوں تو اسی فٹ پاتھ پر چلتا ہوں۔

اس فٹ پاتھ پر ایک حجام بیٹھتا ہے۔ اس کے پاس لکڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا میز ہے۔ جس کی ایک ٹانگ چھوٹی ہے اور اس کے نیچے وہ ایک ٹوٹی اینٹ رکھتا ہے ایک کرسی ہے جس کا نیلا پالش بالکل اتر چکا ہے۔ اور ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس جو جگہ جگہ سے کھونچا ہوا ہے۔ وہ حجام سامنے کی سڑک سے عین اس وقت اپنے ٹھکانے پر پہنچتا ہے جب میں سیر کے لئے نکلتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھتا ہے میں اسے شاید اس نے ہزاروں بار سوچا ہو کہ آخر یہ شخص مجھ سے حجامت کیوں نہیں بنواتا؟ وہ کاندھے پر لکیر دار تولیہ ڈالے بائیں ہاتھ میں کھونچا ہوا اٹیچی کیس اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں ایک مستطیل آئینہ۔ تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا۔ جس کے درمیان ایک ڈوری لٹکتی ہے۔ اٹھائے چلا آتا ہے پھر وہ میز کی چھوٹی ٹانگ کے نیچے سے کھسک جانے والی اینٹ درست کرتا ہے اپنا اٹیچی کیس اس پر رکھتا ہے اور پھر سامنے دیوار پر لگی ایک مضبوط کیل کے ساتھ وہ آئینہ لٹکاتا ہے۔ ذرا دور ہو کر احتیاط سے دیکھتا ہے۔ اسے سیدھا کرتا ہے اور اپنا اٹیچی کیس کھولنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

مجھے اس کے کسی بھی فعل پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ وہ ایک دیانتدار رزق حلال کمانے والا شخص ہے۔ اور میری گردن اس کے سامنے احترام سے جھکی رہتی ہے۔ مگر خواتین و حضرات مجھے اعتراض اس کے صرف آئینہ لٹکانے پر ہے وہ آئینہ ایک ایسی اونچائی پر لٹکاتا ہے کہ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے کبھی مجھے اپنا چہرہ اس میں دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ ہر بار۔ مہینوں سے میری کوشش رہی کہ میں اپنا چہرہ دیکھ سکوں۔ شاید وہ اتنی ہی اونچائی پر لٹکاتا ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر حجامت بنوانے والا بآسانی اس میں اپنا چہرہ دیکھ سکے لیکن فٹ پاتھ پر یا سڑک پر چلنے والا اس میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ شاید دوسرے دیکھ سکتے ہوں۔ مگر میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے جب بھی دیکھا آئینے میں محض اپنے شانے ہی نظر آئے وہ بھی میں نے یوں پہچانے کہ میں اپنی اس لکیر دار قمیض کو پہچانتا ہوں۔ تو وہ لکیر دار قمیض پہنے شانے میرے ہی ہوتے ہیں۔ مگر اس آئینے کی اونچائی ایسی ہے کہ اس میں اپنا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خواتین و حضرات کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ آئینہ کی ڈوری ذرا لمبی کر دیتا۔ یا کیا تو فٹ پاتھ ذرا نیچا نہ رہ سکتا تھا۔ اب کیا مجھ میں اتنا سا بھی انسانی وقار نہیں رہ گیا کہ میں اچک اچک کر جھک جھک کر اس میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کروں؟ نہیں۔ ابھی مجھ میں اتنی انسانیت باقی ہے۔ میں یہ حرکت نہیں کر سکتا۔ تو پھر آخر اس حجام کو یہ آئینہ اسی جگہ پر کیوں لٹکانا تھا؟

کیا وہ اس بات کا منتظر ہے کہ میں اس کے پاس پہنچوں حجامت بنوانے کے لئے اور اپنی صورت دیکھوں؟ آپ سنتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ دو روپے میں حجامت بنانے والا۔ رزق حلال کمانے والا شخص۔ میں بھلا اس سے حجامت کیوں کر بنوا سکتا ہوں۔ قریب ہی وہ ہالی وڈ ہیر کٹنگ سیلون ہے۔ ائرکنڈیشن۔ آخر مجھے ہر پندرھویں دن وہیں جانا ہوتا ہے۔ یہ میری زندگی کا معمول ہے۔ اور معمولات توڑے نہیں جاتے عقل یہ کہتی ہے کہ بغیر کسی فائدے کے معمولات مت توڑو۔ تو پھر آخر میں اس دو روپے والے رزق حلال کمانے والے کی ٹوٹی کرسی پر کیوں بیٹھوں محض اپنا چہرہ دیکھنے کے لئے۔

چہرہ تو میں اس ائرکنڈیشنڈ سیلون میں بھی دیکھ سکتا ہوں جس پر چاروں طرف سے روشنیوں کی بوچھار پڑتی ہے۔ پیچھے ایک بہت بڑا آئینہ لڑکا لئے کھڑا رہتا ہے میں چاروں طرف سے اپنا چہرہ، اپنا سر دیکھتا ہوں۔ مگر وہ تو ایک بند کمرہ ہے۔ بنا ہوا اور کھڑکیوں کے۔ بنا روشندانوں کے جیسے مکڑی کا گھر۔ اور مجھے تو چلتی سڑک پر۔ کھلی دنیا میں وسیع آسمان کے نیچے اپنا چہرہ صرف اسی اور اسی آئینہ میں دیکھنا تھا۔ وہ میری پہنچ سے باہر ہے۔

ہاں باہر تھا۔ اب نہیں۔ دیکھا آپ سب چونک گئے۔ جی نہیں میں بالآخر وہاں حجامت بنوانے نہیں گیا۔ اور اب اس واقع کی مرکزی تفصیل کی طرف آتا ہوں خواتین و حضرات میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ اور کیا آپ یہ مانیں گے کہ میں نے کھلی آنکھوں سے ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں۔ اس لمبے صاف شفاف برآمدے میں وہ منظر دیکھا۔ وہ جو صرف میرے لئے وجود میں آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ کتے کے گرد ایک اژدہا لپٹا ہے۔ دونوں نبرد آزما ہیں اور اس کالے کے بڑے بڑے گول گول کنڈل اس کتے کے گرد یوں لپٹے ہیں کہ اسکی پسلیاں توڑتے ہیں۔ میرا دم رک گیا۔ گویا وہ کنڈل میری پسلیوں کے گرد

لپٹے ہوں۔ اس جنگ نے مجھے پسینے میں شرابور کردیا۔ اس کالے کے ڈنک کتے کے سیاہ جسم میں نشتروں کی طرح پیوست ہوکر نکل رہے تھے۔ اور دونوں خاموش تھے۔ بالکل خاموش۔ اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا سوائے میرے۔

صرف میں ان کا تماشائی ان کا شاہد۔ ان کا مصنف تھا۔ اور خواتین و حضرات نتیجہ میری۔ آپ کی سب کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔ کچھ ہی دیر میں کتا غائب تھا اور وہ کالا اژدہا بے چین۔ بالکل سیدھا۔ موٹی چپٹی لکیر۔ بے تحاشہ بڑے سر کے ساتھ برآمدے کی پوری لمبائی میں پڑا تھا۔ اور سرخ روشنی میں اس کی چمکتی سیاہی گیلی گیلی نظر آرہی تھی۔ اور اس کا سر بہت بڑا سر انسانی سر چپٹا زمین پر چپکا تھا۔

آپ لوگ کراہت کے مارے منھ پر رومال نہ رکھئے۔ ابھی سنئے...

ایک عورت کی ہمت وہ نہ معلوم کہاں سے آئی کہ اس کالے کی لمبائی بالشتوں سے ماپتی تھی۔ اور اس کے انسانی چپٹے سر کو بڑے آرام سے، احتیاط سے سیدھا کرتی تھی۔ پھر وہ میرے پاس آئی اور بولی۔ اس طرح جیسے کوئی کسی عزیز کے مرنے پر بولتا ہے۔ دیکھتے کیا ہو، سوچتے کیا ہو۔ فوراً پولیس کو خبر دو۔ فوراً پولیس والوں کو بلاؤ۔

خواتین و حضرات میں ضعیف الاعتقاد نہیں۔ میں اسی وقت بھاگا بھاگا آپ لوگوں کے پاس نہیں آیا۔ نہ ہی میں نے اسی دم فون کا رسیور اٹھایا۔ میں نے بہت انتظار کیا۔ سوچا، سمجھا۔ پھر میں نے اس عورت سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا تمہیں اس سے کیا غرض؟ تمہیں تو صرف اس بات سے غرض رکھنی چاہئے، جو تم نے دیکھی جس کے تم شاہد ہو جو انہونی تم نے دیکھی اس کی اطلاع فوراً سب کو دو ورنہ پھر کوئی بھی یقین نہ کرے گا اور بالآخر ایک دن تم بھی یقین نہ کروگے اس پر کہ جو تم نے دیکھا۔

وہ عورت عجیب جادو بھری تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس واردات کے سائے میں بھی میرے وجود کا ذرہ ذرہ اس کے لئے تڑپ اٹھا۔ وہ ایسی تڑپ تھی کہ کبھی آج تک میں نے نہ سہی تھی۔ جیسے کوئی کسی کے جیتے جی اس کے اعضاء علیحدہ کرتا ہو۔ مگر صد حیف یہ تار عنکبوت یہ جالے چپکے چپکے آگے بڑھے اور انھوں نے مجھے اپنے میں جکڑ لیا۔ وہ جس نے یہ جالا بنا تھا اور خود نظروں سے غائب تھا۔ آج پہلی بار یوں مجھ پر حملہ آور ہوا تھا انجانے میں۔ چپکے سے ایسے لمحے میں جب میرا وجود ایک دوسرے وجود میں اتر جانے کو ایک ہو جانے کو تھا۔ بس وہ میرے وجود کو ہونے نہ ہونے کا آخری اور پہلا لمحہ تھا۔ میں آگے نہ بڑھ سکا۔ میری آنکھوں میں جالوں کے تار اتر آئے اور میری نظر دھندلا گئی۔ میرے سر میں وہ ایک آدھ پونڈ وزنی گلگجا مادہ۔ سلوٹ در سلوٹ۔ یوں تڑپا یوں ابلا کہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہوکر اڑ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ برآمدہ اسی طرح خوبصورت صاف شفاف خالی پڑا ہے۔ اب میں آپ کو کیا بلاتا۔ کیا دکھاتا۔ کیا ثبوت دیتا۔

مگر خواتین و حضرات میں مرد ہوں اور مرد شکست کھا کر بھی ہار نہیں کرتے۔ ان کو یہی سبق دیا جاتا ہے۔ میں ہارا ہوا انسان نہیں۔ میں اب بھی چھڑی پکڑ کر سڑکوں، روشوں، باغوں کی سیر کو جا سکتا تھا۔ چنانچہ اگلی صبح حسب دستور میں باہر نکل کھڑا ہوا۔

میں وقت کا بے حد پابند ہوں۔ ادھر سے حجام بھی اپنا سامان لئے چلا آتا ہے۔ اس نے میز کی چھوٹی ٹانگ تلے اینٹ درست کری۔ کرسی کی پشت پر لکیر دار تولیہ پھیلایا۔ ادھر دیوار پر اس کیل کے ساتھ آئینہ لٹکا دیا۔ اور خواتین و حضرات

آج میں نے اپنا تمام انسانی وقار بالائے طاق رکھ کر وہ حرکت کی جس پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ میں نے اس چوراہے پر کھڑا ہو کے دوہرا ہو ہو کے۔ اکڑوں بیٹھ بیٹھ کے اچھل اچھل کر اس آئینہ میں دیکھا۔ دیکھ لیا۔ میں نے اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھ لیا۔ اے سماعت اور بصارت کے نمائندہ سنو کہ میرے شانوں پر میرا سر نہیں تھا۔ نہیں تھا۔ میں بغیر سر کے تھا۔

تب میں اپنے خالی شانے لے کر گھر لوٹ آیا۔ مجھے اپنے پیر و مرشد کے الفاظ یاد آئے، اس پیر و مرشد کے جس کے سامنے میں نے دوزانو بیٹھنا ترک کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ انسان کے جسم پر اس کے سر کی بادشاہت ہے اور جو شخص اپنی اس بادشاہت کو نہ سمجھ پائے گا وہ کائنات کی بادشاہت کو کب سمجھ پائے گا۔ میں نے کتاب بند کردی۔ اسے گرد اٹے طاق میں واپس رکھ دیا اور با آواز بلند کہا کہ آخر میں کیوں اس لئے تخلیق کیا گیا کہ کسی بھی بادشاہت کو سمجھوں۔ خواہ اپنی خواہ کائنات کی۔

تب سے وہ واقعہ رونما ہوا۔ دیکھئے میں رو نہیں رہا۔ میں ماتم بھی نہیں کر رہا۔ میں مرد ہوں۔ اگر میرا سر تن سے جدا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ معلوم وہ دنیا کے کس خطے میں۔ کس زمین میں مدفون ہے۔ یا اتنا خوش نصیب ہے کہ نیزے پر چڑھایا گیا ہے مگر نہیں مجھے معلوم ہے۔ معلوم ہے کہ وہ ایسا خوش نصیب نہیں۔ میں نے تو خود اپنی ہی ذات کی خاطر اس سے علیحدگی کی خواہش کی تھی۔ چنانچہ وہ خواہش پوری ہوگئی۔ وہ دعائیں تمنائیں پوری ہونے والی رات تھی اور یہ سب کچھ میری ذات تک محدود تھا پھر وہ کیونکر نیزے پر چڑھایا جا سکتا تھا؟

مگر اب اسے سننے دیکھنے والو کیا تم جانتے ہو کہ اپنی بادشاہت سے علیحدہ ہونے کے بعد میرے تمام اعضاء مجھ سے الگ ہو رہے ہیں میرے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان سب علیحدہ ریگستانوں میں جلتے انگاروں پر رواں ہیں۔ ایک طویل نہ ختم ہونے والے سفر میں اس مدفون سر کی تلاش میں... اس کے ساتھ مل کر ایک وحدت ہونے کو۔ ایک ذات بن کر۔ ایک وجود کہلانے کو۔ وہی وجود جس سے میں نے علیحدگی مانگی۔ مگر اب میں یقیناً پچھتانے والوں گھاٹا کھانے والوں میں سے ہوں۔ کہ جب تک میرے اعضاء کا یہ سفر پورا نہ ہوگا۔ جب تک میرا جسم اپنے سر کے ساتھ مل کر وحدت نہ بنے گا۔ میں اسے نہ پا سکوں گا۔ اس کو اس جادو بھری۔ لمبے سیاہ بالوں۔ دلوں کے بھید جاننے والی کو جس کے لئے میں ریزہ ریزہ ہوں۔ میرا ہر عضو انگاروں کا مدفن ہے سچ کہا ہے میرے مرشد نے کہ ہر عضو اپنے انگارے لے کر جہنم میں داخل ہوگا وہ تو ابھی ٹھنڈا پڑا ہے۔ یخ بستہ۔

تو خواتین حضرات یہ تلاش گمشدہ کا اعلان نہیں۔ میں تو محض اپنے سر کی تلاش میں ہوں کہ نہ معلوم دنیا کے کس خطے میں۔ کس زمین میں مدفون ہے۔ اور اپنی گنگ زبان میں میرے اعضاء کو علیحدہ علیحدہ پکارتا ہے دن رات اور وہ مجھ سے کٹ کٹ کر اس کی گنگ پکار پر چلتے چلے جا رہے ہیں۔ نامعلوم تاریکیوں۔ ریگزاروں اور انگاروں پر۔

اب آپ میں سے کوئی سوال کرنا چاہے تو میں حاضر ہوں جیسا کیسا بھی مکمل نامکمل۔ حاضر یا غیر حاضر ☆☆☆

پتے

خالدہ حسین

اتفاقات کی بھی بھلی پوچھی۔

بکھرے ہوئے بے شمار بے قاعدہ نقطے۔ کبھی وقت کے آخری حصے میں ایک بامعنی صورت، عبارت، لفظ، بن جاتے ہیں۔ آدمی انھیں دیکھتا پڑھتا ہے اور حیران ہوتا ہے۔ گویا ایک معما ہے کہ اس کے بکھرے حصے ایک ایک کرکے، بے ترتیبی سے ہی سہی مگر بالآخر اپنی اپنی جگہ آن جڑتے ہیں اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ اچھا اس کا یہ مطلب تھا!

ملک کو دیکھ کر مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ پھر ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ آدمی کی عمر کے واقعی تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک میں وہ لوگوں کو اور چیزوں کو تلاش کرتا ہے۔ دوسرے میں گم کرتا ہے، اور تیسرے میں ان کی بازیافت کرتا ہے۔ تو داناؤں نے یوں ہی عمر رواں کو صبح، دوپہر اور شام میں تقسیم نہیں کیا۔ مگر یہ اتنی حسابی بات بھی نہیں۔ اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ صبح کی حد کہاں ختم ہوتی اور دوپہر کب شروع ہوتی اور شام کب آتی ہے۔ کچھ کی صبح ہی لاانتہا ہو جاتی ہے۔ کچھ کی دوپہر طول پکڑ جاتی ہے اور کچھ ابدی شام میں زندہ رہتے ہیں۔

یہ سب کچھ میں نے تب سوچا جب اسکول کے پھاٹک پر قاسم کو لینے اپنی ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں منتظر بیٹھی تھی اور وہ سلور گرے شراڈ ایک بار پھر، بلکہ روز ہی کی طرح وہاں آن رکی تھی اور اس میں سے وہ گاڑی ہی کے رنگ ایسے سلور گرے بالوں والا شخص اتر کر چوکیدار سے محو گفتگو ہوا تھا۔ ابھی چھٹی میں دس منٹ باقی تھے اور اسے یقیناً کہیں جانا تھا اور وہ بچی کو دس منٹ پہلے لے جانا چاہتا تھا، جو اس اسکول میں ایک خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ چوکیدار نے اس سے کچھ کہا، پھر ہاتھ سے پھاٹک کے اندر پرنسپل کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور ایک ٹانگ پر بوجھ ڈال کر اس درخت کے قریب کھڑا ہو گیا جس میں بے شمار لہو رنگ پھول سر نیچے کیے قمقموں کی صورت لٹکے تھے اور میری سمجھ میں آج تک نہ آیا تھا کہ یہ کھل چکے ہیں یا مزید کھلیں گے۔ ایک عجب بے اطمینانی انھیں دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتی تھی۔ پہلے کبھی میں نے سوچا تھا کہ نرسری سے اس کا پودا لا کر اپنے گھر میں لگاؤں گی مگر اب میں اپنا فیصلہ تبدیل کر چکی تھی۔ جن پھولوں کا یہی بھید نہ کھلے کہ وہ مکمل ہیں یا ادھورے، ان سے مکالمہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے مجھے برسوں برسوں پہلے والا وہ ٹی سیٹ یاد آ جاتا جس کی پیالیوں اور پرچوں کے تلے میڈ ان جاپان چھپا تھا اور سفید شفاف چینی پر اودے اور پیلے رنگوں سے پھول اس طرح بنے تھے کہ کوئی بھی مکمل نہ ہونے پاتا تھا۔ ہر پھول کو کمال ہوشیاری کے ساتھ ادھورا بلکہ نصف چھوڑ دیا گیا تھا، گویا پورا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ حالانکہ اس کے پورا ہونے میں کوئی آڑ، کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ تو مجھے ان کا ادھورا پن اس قدر بے اطمینان کرتا کہ ہر رخ سے پرچ پیالیوں کو دیکھتی رہتی کہ کہیں تو کوئی نقش اپنی مکمل صورت میں موجود ہوگا، مگر بے سود۔ اس درخت کو دیکھ کر بھی ویسی ہی بے چینی میرے اندر سر اٹھا لی۔

اس وقت میں نے دیکھا وہ نیم سفید بالوں والا دراز قد شخص کچھ سوچتا ہوا میری جانب آ رہا ہے۔ شاید وہ بچوں کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری گاڑی کے کھلے شیشے کے قریب رک گیا۔

''معاف کیجیے گا۔'' اس نے گلا صاف کیا۔ ''کیا آپ راحلہ ہیں؟''

میں ایک دم اپنی سیٹ سے اچھل پڑی۔

''کیوں؟'' بے اختیار میرے منھ سے نکلا۔ کوئی مجھے یوں میرے نام سے جان سکتا ہے۔ بڑی عجیب بات تھی۔ اب تو میں مسز ناصر تھی یا روشن کی امی یا قاسم کی دادی۔

''جی۔ اور آپ؟'' اب میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''ملک۔ ملک سلیم۔''

ملک سلیم! ایک دم سے میرے سینے میں عجب طرح کی گھٹن اٹھی۔

''ملک سلیم... اتنی مدت کے بعد!'' میں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

''میں تو بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور قاسم اور بسمہ تو ایک ہی کلاس میں ہیں۔ لوٹس میں۔''

اسکول میں بچوں کے سیکشن مختلف پھولوں کے نام پر تھے۔ قاسم لوٹس میں تھا۔ اور کالج کے دنوں میں ہم ٹینی سن کی طویل نظم پڑھتے تھے، دا لوٹس ایٹرز (The Lotos Eaters)۔ لوٹس جو خواب اور آسودگی کا پھول ہے اور پانیوں میں کھلتا ہے۔ اس نظم کے جفاکش لوگ اسے کھا کر ایک طلسماتی آرام اور آسودگی میں ڈوب جاتے ہیں۔ لاریب۔ لاریب۔ نیند مشقت سے بہتر ہے! مگر میں ابھی تک اپنی پھولتی سانس پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ سلیم اتنا بدل چکا

تھا کہ پہلے کا کچھ بھی اس میں باقی نہ تھا سوائے اس زخم کے نشان کے جو اس کی بائیں آنکھ کے نیچے رخسار کی ہڈی پر تھا۔ ہم سب کے سب کھڑی دوپہروں میں سنسان سڑک کے کنارے گلی ڈنڈا اور پٹو گرم کھیلتے تھے۔ اور سلیم کے کشادہ گھر کے لان میں ہائی جمپ کے مقابلے کرتے تھے۔ ان کا گھر مین روڈ سے ملتی ہوئی ایک گلی میں بہت اندر جا کے دائیں ہاتھ پر تھا۔ پورچ میں کالے رنگ کی فورڈ کھڑی رہتی۔ وردی پوش دو پولیس محافظ بندوقیں تھامے پھاٹک کے اطراف کھڑے رہتے۔

تب سلیم کس قدر دبلا پتلا سانولا سا لڑکا تھا۔ نیکر میں سے اس کی پتلی پتلی ٹانگیں عجب اداسی سے نکلی ہوئی ہوتیں۔ اس کے سیاہ بوٹ باقاعدہ چمکتے نظر آتے۔ شاید اس کو مسلسل نزلہ رہتا تھا، اسی لئے اس کے سر کے بال گردن کے قریب ایک جانب سے سفید پڑتے جا رہے تھے اور کچھ عرصہ بعد وہ عینک بھی لگانے لگا تھا۔ اس کی ناک ہر دم بند رہتی اور منہ سے سانس لینے کے باعث اس کے ہونٹ لٹکتے نظر آتے۔ اکثر وہ ہر بات دوسری بار میں سنتا تھا۔ مگر اب سلیم ملک ایک دراز قد، خوبصورت شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔

"تم کہاں ہو اور باقی سب لوگ کیا ہوئے؟" چوکیدار بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ گیا تھا۔

"یہ بسمہ، میری نواسی۔ اس نے بسمہ کے سنہرے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میں ادھر ہوں، ٹیچنگ ہاسپٹل میں پروفیسر آف سرجری۔"

"اوہ۔ میں سخت مرعوب ہوگئی۔ حسب معمول میں اپنی اردو دانی پر زمین میں گڑ گئی۔ بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا۔ میں نے دیکھا ایک ایک کر کے لوگ بچے لے کر جا رہے تھے۔ سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم چھٹ چکا تھا۔

"اور تم ... تم کیا کرتی رہیں... کیا کر رہی ہو۔" ایک دم وہ تم پر اتر آیا۔

میں نے دروازہ کھول کر قاسم کو گاڑی میں بٹھایا۔ "میں؟ بس لڑکیوں کو پڑھانے میں ..."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تب واقعی مجھے احساس ہوا کہ اپنے بارے میں بتانے کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میری ٹوٹی پھوٹی گاڑی بھی سخت شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ اچانک مجھے ناصر کا خیال آیا اگر وہ جان سکے کہ اس وقت میں اپنے بچپن کے ایک ساتھی کے ساتھ یادیں شیئر کر رہی ہوں۔

اگلے روز میں وقت سے کچھ پہلے اسکول جانے کے لئے تیار ہوئی اور روز کی طرح الٹے سیدھے حلیے میں نہیں۔ میں نے اپنی وہ چادر اتار پھینکی جو ہمیشہ باہر جاتے ہوئے ایک ڈھال کے طور پر اپنے گرد لپیٹ لیتی ہوں۔ کپڑوں کی الماری میں لٹکتے کپڑوں میں سے ڈھنگ کا ایک جوڑا نکالا۔ یہ کپڑے اتنی مدت سے اسی طرح غیر استعمال شدہ یوں پڑے تھے کہ ان میں سال خوردگی کی بو پڑ گئی تھی۔ پرانے پن اور فراموشی کی ایک اپنی باس ہوتی ہے۔ میں نے ایک ایک کر کے ہینگر کھسکائے۔ کون کون سے کپڑے کب کب سے چپ چاپ لٹکے تھے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے ان میں جان سانس لیتی نظر آنے لگی۔ وہ کپڑے نہیں بہت سے جاندار مصلوب تھے جنہیں تنہائی اور تاریکی میں فراموش کر دیا گیا تھا۔ میں نے ایک لباس نکالا اور اپنے ساتھ لگا کر آئینے میں دیکھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" ناصر نے عینک کے اوپر سے دیکھ کر کہا۔

"قاسم کو لینے۔"

"ہوں۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کپڑے ہینگر سے اتار کر بانہہ پر ڈالے۔

"ایک بچی ہے بسمہ۔ وہ قاسم کے ساتھ ہی ہے اس کی کلاس میں۔"

"پھر...؟ بہت سی بچیاں ہوں گی؟"

"پھر یہ کہ جس شخص کی وہ نواسی ہے... بچپن میں ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے۔"

"بہت سے گھر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔" ناصر نے کمپیوٹر کے اسکرین کو گھورا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر سب گھر ایسے نہیں ہوتے۔" میں نے راستے بھر دل میں بات جاری رکھی۔ ایک دو تین سیڑھیاں چڑھ کے اس گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ ایک دالان ہے جس میں دائیں کونے سے سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی ہیں۔ سامنے دو بڑے بڑے کمروں کے دروازے۔ تب بیڈ روم کا تصور نہیں تھا۔ صرف کمرے ہوتے تھے اور ان میں پلنگ ہی بچھے ہوتے تھے۔ ان کمروں میں رنگین پایوں والے نواڑی کے بڑے بڑے پلنگ جن پر کالے سفید چارخانی کھیس اور بڑے بڑے تکیوں پر رنگین مشینی کڑھائی کے ستونی غلاف۔ میزوں پر کروشیے سے بنے میز پوش۔ اندر کے صحن میں سردیوں کی کھلی دھوپ میں بان کی مضبوط پایوں والی جہازی چارپائیاں.... ایک پر بڑے ملک صاحب سفید براق تہمد کرتا اور پگڑی پہنے حقہ گڑگڑاتے ہیں اور دوسری چارپائی پر بڑی ملکانی دری پر گندم بچھائے چھاج پھٹک رہی ہیں۔ زمینداری پس منظر کے ساتھ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو کیمبرج میں تعلیم دلوائی ہے۔ شجاعت لمبے اونچے سانولی رنگت مضبوط نقوش والے ایس۔ پی۔ پولیس تھے۔ وہ اکثر شہر کی سڑکوں پر صحت مند، پٹھے پھڑکاتے سڈول جسم گھوڑے پر پویہ چال میں گھڑسواری کرتے نظر آتے۔ اور صبح کی سیر میں وہ کبھی کبھار اسی طرح گھوڑے پر سوار ہمارے گھر میں آ جاتے۔ باہر کے برآمدے کے قریب گھوڑا رک جاتا۔ شجاعت ملک اس کی کمر پر بیٹھے بیٹھے ابا سے باتیں کرتے رہتے۔ گھوڑے کے نتھنوں سے گرم بھاپ اڑتی رہتی اور کبھی کبھی وہ انتہائی غیر ذمہ داری کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے فراغت بھی حاصل کر لیتا۔ شجاعت ملک نہایت شستہ انگریزی میں دو ایک پھنکاریں سناتے اور پھر اپنا نفیس چابک لہراتے چل نکلتے۔ ان کے پیچھے قیمتی اوڈی کولون کی مہک گھوڑے کی باس کے ساتھ رل مل جاتی۔

مگر سلیم کی امی تو لمبی اونچی شہری نما دیہاتی خاتون تھیں۔ کبھی کبھی لاچے اور نیچے کرتے میں بھی نظر آ جاتیں۔ ان کے بال چکنائی سے چپکے رہتے۔ قدرے لمبی ناک میں ہیرے کی کیل اور بانہوں میں سونے کے وزنی کڑے۔ وہ زیادہ تر باورچی خانے میں الجھی رہتیں۔ بات کرنے میں ان کے موٹے موٹے ہونٹ بے

حد خشک نظر آتے اور ان کے پاؤں تو مستقل سوجے رہتے تھے۔ ان کے کمرے کے عین مقابل ملک چاچا کا کمرہ تھا جس میں ان کا ڈریسنگ ٹیبل بے شمار لوشنوں اور پرفیوم اور کریموں سے لدا جگر جگر چمکتا۔ ایک روز میں غلطی سے اس کمرے میں جا گھسی۔ ملک چاچا برش کے ساتھ کالے لانگ بوٹ چڑھائے بالوں میں برش کر رہے تھے۔ پھر انھوں نے ماؤتھ فریشنر (mouth freshener) کا اسپرے (spray) اپنے منہ میں کیا اور گنگناتے ہوئے کمرے سے باہر چل دیئے۔ باہر سلیم کی امی اپنے سوجے پاؤں اور چپکنے بالوں اور خشک ہونٹوں کے ساتھ گاؤں سے آنے والے انڈوں اور مرغیوں کا حساب کتاب کر رہی تھیں اور سارے میں دہی اور اصلی گھی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

اس کے بعد میری یاد میں ایک لمبا وقفہ آتا ہے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ بس ان کا تبادلہ کسی اور شہر میں ہو گیا اور وہ گھر بہت سے دن خالی پڑا رہا اور سنتری غائب ہو گئے۔ مگر سلیم کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی تھے۔ میں نے ٹریفک کے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے یاد کیا۔ سب کے سب کسی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کیا معلوم لوگ میرے بارے میں بھی سوچتے ہوں کہ وہ کہاں اڑن چھو ہو گئی؟ مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔ میں ہرگز اڑن چھو نہیں ہوئی، اس طویل عرصے میں برابر موجود رہی ہوں... اور اس قدر زیادہ موجود کہ اس موجودگی سے میرے شانے چٹخنے لگے ہیں اور پاؤں کی ہڈیاں ٹیڑھی میڑھی ہو گئی ہیں۔ اب سگنل سبز ہو گیا تھا۔ یہ دنیا بھی کس قدر حریص ہے۔ کتنے کروڑوں اربوں انسان اس کو آباد کرنے میں برباد ہو رہے ہیں اور یہ پھر بھی مطمئن نہیں۔

آج میں وقت سے خاصا پہلے پہنچ گئی، مگر یہ دیکھ کر اور حیران ہوئی کہ وہ مجھ سے بھی پہلے کا وہاں کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر فوراً یاد آیا... میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہوں یا باہر نکل کے کھڑی ہو جاؤں۔ باہر نکلوں گی تو وہ یقیناً اس ناکافی سینڈل میں میرے پاؤں کی ٹیڑھی میڑھی ہڈیاں دیکھے گا۔ ڈاکٹر جو ہوا۔

"تو پھر وہ باقی سب لوگ کیا ہوئے؟" اس نے بغیر تمہید کے بات کی۔ "وہ خرم اور شائستہ اور درشہوار، اور یوسف۔"

مجھے تو ان کے نام بھی یاد نہ تھے اب ایک دم سے ان سب کی صورتیں ذہن میں آ گئیں۔

"کچھ معلوم نہیں۔"

"وہ تو یاد ہے نہ امیر علی۔" اس نے بڑی توقع کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امیر علی؟ وہ سید امیر علی؟"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ اچھل پڑا۔

اور مجھے سید امیر علی پوری تفصیلات کے ساتھ یاد آ گیا۔ وہ مین روڈ کی نکڑ والی کوٹھی میں رہتا تھا۔ چھوٹا سا منحنی زرد رو لڑکا۔ مگر اپنا نام پورا لیتا تھا۔ اگر کوئی صرف علی یا امیر علی کہہ دیتا تو آدھ بیچ ہی ٹوک دیتا۔ میرا نام سید امیر علی ہے۔ تب مجھے نام کے ساتھ لگے ہوئے لفظ "سید" کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ سید امیر علی۔ وہ زرد رو منحنی سا لڑکا بڑی غیر متوقع حرکتیں کرنے کے لئے مشہور تھا۔ وہ ہم سب کی طرح نہ تو باقاعدگی سے اسکول جاتا تھا نہ ہی پڑھائی اس کے لئے کوئی اہمیت رکھتی تھی۔ بہت سی بہنوں کا اکیلا بھائی تھا۔ اور اس کی بہنوں کا خیال تھا کہ وہ جینئس (genius) ہے۔ شاید اسی لئے وہ اسکول سے آتے جاتے کتاب میں سے وہ ورق پھاڑ کے پھینک دیا کرتا تھا جو اس روز پڑھایا جاتا ہوتا۔ ایک روز وہ ہماری پوری ٹولی کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کا کمرہ باقی گھر سے الگ تھلگ ہی تھا۔ ہم سب پر اس بات کا بہت رعب تھا کہ اس کا اپنا علیحدہ کمرہ ہے اور نوکر اس کے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتا ہے۔

جب ہم سب کے سب اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو عجب منظر تھا۔ پورا فرش الم غلم کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بلیک بورڈ نصب تھا جس پر چاک سے حساب کی لمبی لمبی رقمیں لکھی تھیں۔ اور ریاضی الجبرا کے نشانات۔ ایک کونے میں معلوم نہیں کس مشین کے کل پرزے کھلے پڑے تھے اور گریس میں لتھڑے جھاڑن ادھر ادھر رل رہے تھے۔ ہم سب کچھ حیران کچھ خوفزدہ ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ امیر علی نے چاک اٹھا کر بلیک بورڈ پر نہایت تیزی کے ساتھ ایک مشین کا نقشہ بنایا اور پھر وہ بھول گیا کہ ہم وہاں پر کھڑے ہیں۔ سب سے پہلے میں وہاں سے کھسکی۔ مجھے یوں بھی ریاضی کے لمبے لمبے فارمولوں سے دہشت آتی تھی۔ بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا۔

"ہاں، سید امیر علی۔"

"اس سے میری ملاقات حادثاتی طور پر ہو گئی۔ جس طرح تم سے۔ وہ اپنے بازو کی گلٹی نکلوانے میرے پاس آیا۔ میں نے صرف نام سے اسے جانا ورنہ اب وہ بالکل سرے سے بدل چکا تھا۔"

"اچھا؟ بدل تو ہم سب گئے ہیں۔" میں نے رشک سے اس کے پروقار وجیہ سراپا پر نگاہ ڈالی۔

"نہیں۔ بدلنے سے میرا مطلب ہے کہ..." وہ رک گیا۔ "دراصل وہ سینائل (senile) ہو گیا ہے۔ گو ابھی ہماری ایسی عمر بھی نہیں۔ مگر کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کا ذہن ضرورت سے زیادہ تیز ہو گیا ہے۔ ہم اسے بڑھاپے کی ناتوانی سمجھتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہے نہ برسوں پہلے وہ ایک دم گھر سے غائب ہو گیا تھا؟ پھر عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ جرمنی پہنچ چکا ہے، وہاں کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے۔ وہاں اسے بہت سے ایوارڈ وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے۔ مگر ظاہر ہے ہمارے ہاں ایسی بیکار خبروں پر توجہ نہیں دی جاتی۔

"ہاں۔" میں نے اسکول کے پھاٹک سے ایک ایک کر کے نکلنے والے بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ مجھے یاد ہے اس کی بہنیں اسے چھوٹا سا آئن سٹائن کہا کرتی تھیں۔ حالانکہ اسکول میں وہ ہر امتحان میں یا تو غائب ہوتا یا بری طرح فیل۔

اب بسمہ اور قاسم دونوں آ چکے تھے۔ اس نے روز کی طرح بسمہ کے

خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ بسمہ بے حد گوری، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بچی تھی۔ اس کے ہونٹ اس قدر سرخ کہ لگتا تھا ابھی گال ٹپکنے لگے گا۔ شاید اس میں پٹھانی خون تھا یا پھر۔

"تمھاری فیملی۔" نہایت غیر ضروری سوال میری زبان سے ٹپک ہی پڑا۔

"ہاں۔ میں بہت عرصہ سے باہر رہا۔ لینا (Lena) آئرش (Irish) ہے۔ وہ زیادہ تر باہر ہی رہتی ہے۔ اور آج کل میری بیٹی بھی اپنی ماں کے پاس ہے۔ میں بھی سال کا خاصا حصہ وہاں گذارتا ہوں۔ اور تم؟ تمھارے...." اس نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے بھی بات سنی ان سنی کردی کیوں کہ میرے پاس بتانے کو کوئی دلچسپ بات نہ تھی۔

"کیا یہ ممکن ہے۔" اس نے کچھ رکتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ راستے میں ہم سید امیر علی کو دیکھتے چلے جائیں؟ وہ یہاں سے قریب ہی اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا ہے۔"

میں نے قاسم کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ بند کیا۔ سید امیر علی کو دیکھنا یا اس سے ملنا کوئی ایسا ضروری نہ تھا۔ مگر اب وقت ضروری باتوں سے اس طرح بھر گیا تھا کہ غیر ضروری کی کبھی گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔ اور یوں بھی اس وقت سید امیر علی کو دیکھنے کی عجیب سی خواہش نے اچانک ہی میرے دل میں سر اٹھایا۔ اب تو ایسی سب چیزیں اور لوگ، جو واپسی کا راستہ دکھاتے تھے، بڑے پرکشش نظر آنے لگے تھے اور پھر یہ بھی ایک دلچسپ صورت حال تھی کہ ہمارے ساتھ کے اب سینیلیٹی (senility) سے دو چار ہیں۔ مگر اس دیوانگی میں ہے مزہ۔ لوگ کہتے ہیں اسے آزار کیوں۔

اس کی گاڑی میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ ان راستوں سے تو میں صبح و شام گذرتی تھی۔ معلوم نہیں کتنے برسوں سے گذرتی چلی آرہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ ماربل فیسنگ والا مکان اور شکستہ سبز پھاٹک اور راہداری پر صبح و شام گرنے والے خزاں زدہ پتے سید امیر علی کا مسکن ہے۔

گھنٹی پر ایک سانولا سا لڑکا سکوٹی پر بہتا چلا آیا۔ اس نے پہلے مجھے حیرت سے دیکھا مگر ملک کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک آشنا سی مسکراہٹ آگئی۔

"السلام علیکم انکل۔ آج بڑے ابا صبح سے نیم پر چڑھے بیٹھے ہیں۔" اس نے پھاٹک کھولتے ہوئے اطلاع دی۔

"اچھا... کچھ کھایا پیا بھی کہ نہیں؟ آؤ راحلہ۔" ملک نے گھوم کر مجھے بلایا۔ دونوں بچے اب ایک ہی گاڑی میں قریب قریب بیٹھ گئے تھے۔

"یہ راحلہ ہیں۔ ہماری ایک اور ساتھی۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کس طرح ہماری ٹولی آنکھ مچولی اور گلی ڈنڈا کھیلتی تھی اور تمھارے بڑے ابا اپنی کتاب کے ورق پھاڑ پھاڑ کے پھینکا کرتے تھے۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔"

"اچھا ـــــ" اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پکارا۔ "بڑے ابا دیکھئے کون آیا ہے۔ اب آجایئے۔"

وہ ذرا آگے جا کے ایک چھوٹے سے خزاں زدہ لان کے کونے میں ایک چھتنار درخت کی طرف منہ اٹھا کے پکارا۔

نہیں یار! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اب کوئی آہستگی سے ایک موٹے سے ٹہنے سے نیچے اترا۔ لمبوترا چہرہ تو اب چوڑا ہو چکا تھا۔ رنگ وہی زردی مائل سفید۔ سفید بھنویں۔ چھوٹی سی مخروطی ڈاڑھی۔ دھاری دار قمیص کے ساتھ گیلس لگی سلیٹی پینٹ۔ ناک کی نوک پر ٹکی سنہرے فریم کی عینک۔ سید امیر علی۔ اس نے اجنبی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر ایک لاپرواسا تاثر اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ جیسے اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ سامنے کون کھڑا ہے۔

"اب یہ تو کوئی بات نہیں نہ یار!" اس نے شکوہ کیا۔ "کچھ بھی ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک شے، ہر ایک حرکت کی ایکویشن ہے۔ کوئی فارمولا، کوئی قاعدۂ کلیہ، کبھی بس کبھی کچھ ایک ہی دفعہ میں کر دیا؟ ہیں ـــــ ؟ کچھ تو ہو جو اپنی مرضی سے بے ساختہ قاعدۂ کلیہ سے باہر ہو جائے۔" اس نے میری طرف ٹٹولتی آنکھوں سے دیکھا۔

"تم کب آئیں؟" اس نے ایک دم حیرت سے پوچھا۔ پھر خود ہی جاری ہو گیا۔ "اب دیکھو۔ میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہوں۔ لو یہ ہاتھ اٹھا لیا۔ اب طاقت اور حرکت کے فارمولے شروع ہو گئے۔ چھوٹی سے چھوٹی حرکت۔ سب اسیر ہیں۔ سب اسیر ہیں۔" پہلے وہ ایک ٹانگ پر بازو اٹھائے کھڑا ہونے کی کوشش کرتا رہا پھر سیدھا دونوں بازو لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

"امیر علی، بازو کیسا ہے۔ اب ٹانگوں میں سوزش تو نہیں؟"

"دیکھو، دیکھو۔ یہ بھی ایک ایکویشن ہے۔ میں تو تنگ آگیا ہوں اس اسیری سے۔ دم گھٹتا ہے میرا۔ یار یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ چاروں طرف سے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ او یار۔" اس نے بازو پھیلا کے آسمان کی طرف پکارا۔

"میرا خیال ہے ان کے دل کی ایک آدھ آرٹری، کوئی والو، گڑبڑ ہے۔ سنی، اپنے بڑے ابا کی اینجیوگرافی کراؤ۔"

"او کے انکل۔" لڑکا پھر سے سکوٹی دوڑا رہا تھا۔

اب ملک پھاٹک کی طرف مڑا۔ پیچھے گاڑی میں بیٹھے بچے ایک دوسرے کی کاپیاں، پنسلیں ملاحظہ کر رہے تھے اور وسیع دن چاروں طرف پھیلا تھا۔ ہر شے اپنے ہونے میں مصروف تھی۔ یار۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اچانک مجھے عجیب طرح کی تنگی کا احساس ہوا۔ سب اسیر ہیں۔ سب۔ ملک نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔

"میں سال بھر کے لئے جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میرے پیچھے سینائل نہ ہو جاؤ گی۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔

"اور تم بھی!" میں نے بسمہ کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

سامنے تمام راستے خشک پتوں سے اٹے پڑے تھے۔ پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کچھ پتوں کو اڑا کے لے گیا۔ کچھ کو چھوڑ گیا ☆☆☆

خلیل الرحمن اعظمی

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

جدید تر غزل، اردو شاعری کے جدید تر رجحانات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس لئے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید تر اردو شاعری کے خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ ویسے اس مسئلے پر کوئی قطعی بات کہنے اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ کر کسی قسم کا حکم لگانے کی ذمہ داری میں اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جن شعری اور ادبی تخلیقات کا تعلق خود ہمارے زمانے، ہماری زندگی اور ہماری اپنی ذات سے بہت گہرا ہو اور جو رجحانات اپنی تشکیل وتعمیر کی ابتدائی یا درمیانی منزل میں ہوں، ان کا معروضی مطالعہ اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

شاعری کے سلسلے میں "جدید" کی صفت بہ طور اصطلاح ہمارے یہاں اس وقت استعمال میں آئی جب آزاد اور حالی نے شعوری طور پر مقصدی، افادی اور اصلاحی قسم کی نظمیں لکھنے اور اس رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس وقت سے لے کر اب سے کچھ دنوں پہلے تک جدید شاعری کے جتنے رجحانات سامنے آئے ہیں ان کے پیچھے زمانۂ حاضر سے متعلق کسی نہ کسی قسم کے مسلک یا نصب العین کا تصور کارفرما رہا ہے۔ بعض اوقات ایک رجحان دوسرے رجحان کی ضد یا ردعمل کے طور پر وجود میں آیا ہے، لیکن اس کے علم برداروں نے بھی اپنے رجحان کو ایک مسلک یا نصب العین کی شکل دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں کسی نہ کسی منصوبہ بندی یا مقررہ لائحۂ عمل پر کاربند ہونے کا تصور رہا ہے۔ اس لئے اس دور کی جدید شاعری اپنی تمام منزلوں اور مرحلوں میں اپنے مسلک یا نصب العین کے واسطے سے ہی پہچانی جاتی رہی ہے، اور اس کو پسند یا ناپسند کرنے والوں نے بھی اکثر و بیش تر مسلک یا نصب العین کو ہی اپنی کسوٹی قرار دیا ہے۔ اصلاحی شاعری، قومی شاعری، وطنی شاعری، ملی شاعری، رومانی شاعری، شبابیات کی شاعری، انقلابی شاعری، صحت مند شاعری، رجائی شاعری، اجتماعی شاعری، عوامی شاعری، ترقی پسند شاعری، جیسی اصطلاحیں نہ صرف عام لوگوں کا، بلکہ بیسویں صدی کے نقادوں اور مورخوں کا بھی تکیہ کلام رہی ہیں۔

شعر و ادب کا تعلق بنیادی طور پر شاعر و ادیب کی شخصیت، اس کے مزاج، اس کی افتادِ طبع اور اس کے تجربات ومحسوسات کی نوعیت سے ہے۔ یہ تجربات ومحسوسات جس قدر حقیقی ہوں گے، ان کی جڑیں زندگی میں جتنی گہری ہوں گی اور ان کا رشتہ، شاعر و ادیب کی اصلی شخصیت اور اس کی افتادِ طبع سے جتنا فطری اور حقیقی ہوگا، اسی اعتبار سے وہ فن پارے کے تخلیقی شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہوگا اور اس کی تحریروں میں وہ آب ورنگ پیدا ہو سکے گا جن کی بہ دولت ان کی تاثیر دیرپا اور مستقل حیثیت کی حامل ہوگی۔ مسلک اور نصب العین ہر دور میں پیدا ہوتے اور اپنی موت آپ مرتے رہتے ہیں۔ لیکن تخلیقی ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس کی دل کشی اور تازگی اس وقت بھی برقرار رہے جب اس مسلک یا نصب العین سے لوگوں کو ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ ہو۔ انسان دوستی کا بنیادی عقیدہ یا حسن، صداقت اور خیر کی جستجو، اور اس کے لئے لگن اور خلوص جیسی چیزوں سے تو کسی سچے فن کار کو انکار نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ان کے بغیر کسی قسم کے احسان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن مسلک یا نصب العین اگر کسی ایسے نظریے یا منصوبے کی پیداوار ہے جو کسی ہنگامی یا وقتی ضرورت کے ماتحت وجود میں آیا ہے تو فن کار کی دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، اس لیے کہ اس طرح کی وابستگی عام طور پر نظر کو محدود کر دیتی ہے اور شاعر یا ادیب کو اس کی بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ حد بندی یا جکڑ بندی بعض اوقات شاعر یا ادیب کا رشتہ زندگی، زمانہ یا فطرت کے نامیاتی تسلسل اور اس کے کلی وجود یا زندہ وحدت سے منقطع کر کے اسے چند وقتی حصاروں میں مقید کر دیتے ہے۔

ادبی تنقید کے معلم اول ارسطو نے غالباً اس نکتے کو پالیا تھا، اس لئے اس نے تاریخ کے مقابلے میں شاعری کی آفاقیت اور ہمہ گیری کا اعتراف کیا ہے۔ اقبال کا پیرایۂ بیان اگر مستعار لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فن کی تقویم میں بھی عصر رواں کے سوا اور کئی زمانے شامل ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ شاعری کا تعلق اگر کسی ایسے نصب العین سے ہے، جس کا تعلق محض عصر رواں سے ہو تو اس کے متعلق ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ آگے چل کر پرانی نہ ہو جائے اور اس کی

حیثیت محض ایک تاریخی دستاویز کی ہو کر نہ رہ جائے۔ گو کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی شاعری کسی نصب العین سے وابستگی کے باوجود نصب العین سے ماورا ہو گئی ہے اور اس کے بہت سے حصے زمانے پر فتح حاصل کرنے میں کام یاب رہے ہیں ع

مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کسی متعین نظریہ یا نصب العین کو اپنائے بغیر بھی رہ سکتا ہے اور اپنے زمانے کے ان گنت مسائل اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے خود اس کی نظر، اس کا خلوص، اور اس کے اپنے حواس اور ادراک کافی نہیں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ نظریے یا نصب العین کا تصور انسان کے لئے ایک ایسا سہارا رہا ہے جس نے اس کی دشواریوں کو بہت کچھ آسان بنائے رکھا۔ کسی چیز کو رد یا کسی کو قبول کرنے کے لیے ہمیں ایک بنا بنایا پیمانہ یا کسوٹی مل جاتی ہے اور ہم بہت سی زحمتوں سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن تخلیقی فن کار کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی لگی ہوئی ہے کہ ہر فن کار اپنی ایک انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی اپنی عقل، اس کا اپنا حواس، اور اس کا اپنا ادراک بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اگر فن کار اپنی عقل کو استعمال نہ کرے اور اپنے حواس یا ادراک کو کسی خارجی نظام فکر کے تابع کر دے تو اس سے زیادہ محفوظ راستہ اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہر تخلیقی فن کار اس محفوظ راستے پر گام زن ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کا اپنا داخلی احساس اور اس کی اپنی عقل بعض اوقات ایک نئے رد عمل سے دوچار ہوتی ہے۔ غالب نے اس عمل کو "آشوب آگہی" سے تعبیر کیا ہے۔ جب شاعر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ

اپنی ہی ہستی سے ہو جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

تو گویا وہ مقررہ سانچوں اور بنے بنائے راستوں سے باہر نکل جانے کی مصیبت مول لیتا ہے۔

کلاسکیت اور رومانیت کی آویزش اس وقت بھی انسانی سماج میں جاری رہی ہے جب ان اصطلاحوں کا وجود بھی نہ تھا۔ البتہ جب سے انسان نے زندگی اور زمانے کے متحرک اور تغیر پذیر ہونے کا راز دریافت کیا ہے، حقیقت اور صداقت کا تعین اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ حقیقت اب جامد نہیں متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ ایک شے کا رشتہ بہت سی اشیا کے ساتھ ہے۔ ظاہری رشتوں کے علاوہ کچھ باطنی، اندرونی اور پر اسرار رشتے بھی ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں اگر جامد، ساکت، متعین یا مقررہ ہوتیں تو انسان کے مسائل ایک ہی بار طے ہو جاتے اور کوئی ایک نظریہ، یا نصب العین، یا کوئی ایک شخص، ایک دن بیٹھ کر ساری باتوں کا تعین کر دیتا اور ساری حقیقتوں کو ان کے نام دے دیتا۔ نذیر احمد کے کرداروں کی طرح ہم ہمیشہ کے لیے کچھ لوگوں کے نام ظاہر دار بیگ یا زبردست بیگ رکھ دیتے اور کچھ عورتوں کو تمیزدار بہو یا بدتمیز بی بی کہہ کر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن ہماری آگہی نے اس وقت مصیبت کھڑی کی جب یہ معلوم ہوا کہ ہر زندہ شے اور ہر زندہ شخص نیکی اور بدی، جھوٹ اور سچ، محبت اور نفرت، اخلاص اور ریاکاری، بہادری اور بزدلی کا ایسا مرکب ہے جہاں ان کی نسبتیں وقت کے ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہیں، اور ہم ان کے درمیان جو لکیریں کھینچتے ہیں انھیں زندگی کی بے درد حقیقتیں مٹا دیتی ہیں، اور بقول فراق وہ منزل آ جاتی ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ۔

آئے نہ نظر لکیر ایسی   نیکی و بدی کے درمیاں ہے

اس لکیر کے غائب ہونے کا شعور اور زندگی کو کلی حیثیت سے برتنے اور اس کا ادراک حاصل کرنے کی خواہش مغرب میں بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن مشرق میں اس کا احساس کہیں کہیں انفرادی طور پر نظر آتا ہے۔ بیدل جب کہتا ہے کہ۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

تو یہ دراصل قربت اور دوری کی بنی بنائی لکیروں کے غائب ہونے کے کرب کا اظہار ہے۔ یا جب غالب یہ محسوس کرتے ہیں کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یا

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یا

مستقل مرکز غم پر بھی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئین وفا ہو جاتا

یا

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصور پرستی اور مقررہ نصب العینیت کے دائرے کو زندگی نے کس بے دردی سے توڑ دیا ہے اور اس کے نتیجے میں شاعر کو کس اندرونی کش مکش اور ذہنی تصادم سے گذرنا پڑ رہا ہے۔

ہندوستان میں مغربی حکومت کے قیام کے بعد جب نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا چرچا ہوا تو ہمارے شاعروں نے تصوف، اوہام پرستی، مافوق الفطرت قوتوں پر یقین، یا عشق پیشگی، رندی اور دیوانگی کے تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر کے کچھ نئے تصورات کو جنم دیا، وہ تصورات جن کا تعلق مادی زندگی کی فلاح و بہبود اور زمانہ حاضر کے مسائل کا حل تلاش کرنے سے تھا۔ حالی سے لے کر تقسیم ہند کے کچھ دنوں بعد تک ہمارے شعرا کے لئے یہ تصورات اور ان تصورات سے وابستہ مسلک یا نصب العین کا تصور ذہنی سہارے کا کام دیتا رہا۔ ایک عقیدے کے ختم ہونے کے بعد انسانی ذہن کو جس اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس نسل کے حصے میں نہیں آیا کیوں کہ ان کی جگہ ایسے عقیدوں نے لے لی تھی جنھیں شاعر اپنے گذشتہ عقائد کا نعم البدل سمجھ سکتا تھا۔ اس دور میں گذشتہ عقائد سے انحراف یا بغاوت نے خود اپنی جگہ پر ایک مسلک یا عقیدے کی جگہ لے لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ

اس دور کی شاعری میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ شاعری عام طور پر بیانیہ، خطابیہ، اور پیامیہ ہے اور اس کی منطق بہت سیدھی سادی ہے۔ یہ شاعری یا تو تلقین وتبلیغ کرتی ہے یا جذبات واحساسات کو براہ راست اکساتی ہے۔ حب وطن، اتحاد قومی، آزادی جمہوریت، اشتراکی سماج، نئی صبح، سرخ سویرا، بغاوت، تخریب، انقلاب اس طرح کے بہت سے نعرے اور نشے موجود تھے اور ہمارا شاعر انھیں کے سہارے زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کو جھیلتا یا ان کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتا تھا۔ حصول آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ان نعروں اور نشوں کا، ان خوابوں اور آدرشوں کا طلسم جس طرح ٹوٹا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا کوئی سیاسی مصلحت ہو تو ہو لیکن کسی حساس ادیب یا شاعر کو ان کی شکست کے احساس سے نہیں بچایا جاسکتا۔ خاص طور پر اس نسل کے لئے جو جدید علوم کے زیر سایہ رہ کر قدیم مذہبی اور روحانی تصورات کی وراثت سے بھی محروم ہے، اس لیے کہ اس سرمائے کو خود اس کے پیش روؤں نے از کار رفتہ سمجھ کر پہلے ہی دفن کر دیا تھا۔ انسان کی مادی ترقیات اور سائنسی فتوحات کے باوجود اس کی نارسائیوں اور ناآسودگیوں کا احساس ایک طرف ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر سیاسی وسماجی آدرشوں کا حشر۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس صورت حال نے بنے بنائے راستوں کو گم کر دیا ہے اور تمام لکیریں بری طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں۔

نیا شاعر جس ذہنی کیفیت سے گذر رہا ہے اور تہذیب کے جس دورا ہے پر کھڑا ہے اس نے احساسات کے اعتبار سے اسے ماضی قریب کے شعرا سے دور اور ماضی بعید کے بعض شعرا سے نسبتاً قریب کر دیا ہے۔ اس کیفیت میں اب اسے حالی، چکبست اور تلوک چند محروم کی اصلاحی اور قومی شاعری، ظفر علی خاں اور اقبال کی ملت پرستی، جوش کا نعرۂ انقلاب، اختر شیرانی کی رومانیت، احسان دانش کی مزدور دوستی اور سردار جعفری کی اشتراکیت خاصی حد تک باسی اور پرانی لگتی ہے اور اس کے مقابلے میں میر کی دردمندی اور انسان دوستی، غالب کی تشکیک اور احساس شکست اور یگانہ اور فراق کی نفسیاتی پیچیدگی اور دھند لکے کی کیفیت زیادہ نئی اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔

یہ احساس محض اس نسل کا ہے جس نے ان کیفیات کو محسوس کر لیا ہے۔ ورنہ جن لوگوں کے لئے یہ لکیریں اب بھی وجود رکھتی ہیں (اور ایسے لوگوں کی تعداد اب بھی خاصی ہے) وہ بڑی عافیت میں ہیں اور ان کے لئے اب بھی بزرگوں کے دیئے ہوئے فارمولے موجود ہیں جن کی رو سے وہ اپنے مسلک کا تعین کر لیتے ہیں۔ اس فارمولے کے مطابق مذہب کو رد کرنے سے لامذہبیت، روحانیت کی نفی کرنے سے مادیت، حال سے بے اطمینانی کی صورت میں ماضی یا کسی خیالی مستقبل میں پناہ لینے کا جذبہ، غم روزگار کو ٹھکرا کر غم جاناں، یا غم جاناں سے دست بردار ہو کر غم دوراں کو اپنانے کی روش، یا اشتراکیت سے برگشتہ ہو کر اشتراکیت دشمنی کو اپنا مطمح نظر بنانے والوں کی اب بھی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے۔ لیکن جدید تر شاعروں کی ایک نسل ایسی پیدا ہو چلی ہے جو انکار واثبات کے دورا ہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ یہ نسل جو نہ کافر ہے نہ مومن، زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ وہ انسان اور فطرت، جماعت اور فرد، محبت اور نفرت، ظاہر اور باطن، غم اور مسرت، زندگی اور موت کفر وایمان کے ناگزیر لیکن بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھ کر زندگی کے آہنگ کو دریافت کرنا چاہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ اور دشوار عمل ہے جس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے گوپال متل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی جب باقر مہدی یہ کہتے ہیں کہ وہ کمیونسٹوں سے بھی اتفاق نہیں رکھتے اور اینٹی کمیونسٹ کے بھی مخالف ہیں۔ گوپال متل کی مشکل یہ ہے کہ وہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اپنے ذہنی سہاروں کے لئے لکیروں کو جنم دیا تھا۔ کرشن چندر نے ۱۹۴۹ کی بھیونڈی کانفرنس کے بعد ایک افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "مہالکشمی کا پل"۔ ان کے نزدیک اب وقت آگیا ہے کہ آدمی مہالکشمی کے پل کے اس طرف رہنے کا فیصلہ کر لے یا اس طرف۔ معلوم نہیں کرشن چندر کا اب کیا خیال ہے لیکن گوپال متل کے ذہن میں ابھی تک اس پل کا وجود باقی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب پل کے ایک طرف رہتے رہتے انسان کی طبیعت گھبرا جائے یا ادھر کے رہنے والوں سے اس کا نباہ نہ ہو سکے تو وہ پل کے دوسری طرف چلا جائے۔ جدید تر نسل کے بیشتر نوجوانوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ پل کے دونوں طرف زندگی ہے۔ یہ زندگی ناقابل تقسیم، متحرک، رواں، دواں اور ہر آن تغیر پذیر ہے اور جس چیز کو ہم آج حقیقت و صداقت سے تعبیر کرتے ہیں اس پر ہمارا ایمان مستحکم بھی نہیں ہونے پاتا کہ ہمیں ایسے تجربے اور مشاہدے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جب یہ حقیقت اور یہ صداقت کچھ اور نظر آنے لگتی ہے۔ کیا یہ انکشاف کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ اسٹالن کے مرنے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ وہ مہالکشمی کے پل کے اس طرف کا نہیں بلکہ در اصل اس طرف کا آدمی تھا اور ہمیں اس کا علم ہو جانے کے بعد اس کی ہڈیوں کو قبر سے نکال کر اس پار بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

جدید تر شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مقررہ نظریوں، خانوں، فارمولوں اور نعروں سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور کسی وقتی یا ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ اس نے ان لکیروں اور پلوں کو توڑ دیا ہے اور زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کی وحدت کو اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنا، برتنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ نفی اور اثبات کا کوئی بنا بنایا سانچہ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ وہ نہ کسی چیز کو آنکھ بند کر کے رد کرنے کے حق میں ہے اور نہ آنکھ بند کر کے قبول کرنے کی تائید میں، بلکہ وہ خود اپنے حواس، اپنے تجربے اور اپنے ادراک سے زندگی کی ماہیت اور حقیقت کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ عمل بہت کٹھن ہے اور اس کے سارے سہارے چھن چکے ہیں، اس لئے زندگی کا کرب اسے اکیلے جھیلنا پڑ رہا ہے۔ تنہائی کا کرب، تلاش وجستجو کی اذیت، انجانی چیزوں کا خوف اور جانی ہوئی چیزوں میں انجانی حقیقتوں کی موجودگی کا احساس جدید تر شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تصور

پرست انسان خواہ وہ پرانے دور کا ہو یا گذشتہ صدی کے نئے دور کا، اپنی شخصیت کو ایک نام دے دیتا تھا: وہ اپنے آپ کو محض عاشق کہہ کر اپنے وجود پر فخر کرتا تھا اور عشق کو حاصل حیات سمجھتا تھا۔ اسی طرح صوفی، رند، انقلابی، رومانی، فطرت پرست، باغی، مصلح قوم، مجاہد، اشتراکی، وغیرہ قسم کی صفات میں کسی صفت کو اپنی کل شخصیت قرار دیتا تھا۔ نیا شاعر ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ قنوطی، رجائی، نشاط پرست، الم پرست وغیرہ بھی نہیں ہے۔ وہ محض انسان ہے، ایسا انسان جو متضاد عناصر سے مل کر بنا ہے اور متضاد کیفیتوں سے گذرنا اس کا مقدر ہے۔ وہ ایک ایسا مسافر ہے جسے کسی منزل پر قرار نہیں، اندھیرے اجالے، محبت و نفرت، غم و مسرت، ہجر و وصال، قربت و دوری، کی بدلتی ہوئی نسبتوں کی وجہ سے ہر آن اسے زندگی کی پیچیدگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس کے یہاں ایک غبار اور دھندلکے کی سی کیفیت ہے۔ اس کیفیت نے جدید تر شاعری کو چند نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔

جدید تر شاعری کسی ایسے دبستاں سے تعلق نہیں رکھتی جس سے وابستہ ہو کر شاعر ہمیشہ عمدہ، صحت مند، مفید، صحیح، کامیاب اور اعلیٰ درجے کے فن پاروں کو جنم دینے کی خوش خیالی میں مبتلا رہتا ہے۔ شاعر کی زندگی، اس کے تجربات و محسوسات، اس کے ذہن کی رسائی اور اس کی عقل کی گرفت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی اور نہ ہر تجربہ اور ہر واردات تخلیقی عمل سے مکمل طور پر گذر کر یکساں صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس لئے جدید تر شاعری میں اگر نشیب و فراز ہیں، جدید تر شاعروں کی بہت سی نظمیں یا غزلیں اگر صحیح معنوں میں نظمیں یا غزلیں نہیں بن پائی ہیں، اگر ان کے بہت سے تجربے ادھ کچرے، ناتراشیدہ اور خام ہیں، اگر احساس کی ترسیل میں وہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہیں تو زیادہ اندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقی شاعروں اور سچے فن کاروں کے مقابلے میں متشاعروں اور نقالوں کی تعداد ہر دور میں زیادہ رہی ہے۔ لیکن گذشتہ ادوار کے مقابلے میں فن کی پرکھ کا شعور اب زیادہ بڑھ چلا ہے اس لئے کہ ان ادوار میں شاعری سے لطف اندوز ہونے یا اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کے پیمانے عام طور پر ناقص اور ادھورے رہے ہیں۔ جس زمانے میں زبان و بیان، صنائع و بدائع اور عروضی نزاکتوں کو شاعری کی کسوٹی قرار دیا گیا اس دور میں وقتی طور پر متشاعروں اور فن کے بازی گروں نے ادب کی دنیا میں اعتبار حاصل کر لیا اور ان کی استادی اور ملک الشعرائی کا سکہ چل گیا۔ اسی طرح، جس زمانے میں وطن پرستی، قوم پرستی، انقلاب پرستی، یا مزدور دوستی وغیرہ کو ہم نے شاعری کی اولیں کسوٹی قرار دیا اس زمانے میں حقیقی اور غیر حقیقی شاعر کا امتیاز مٹ گیا اور عام قارئین کے ساتھ نقادوں نے بھی سب کو ایک نظر سے دیکھنا شروع کیا، تاآں کہ زمانے نے خود آ کر اپنا فیصلہ نہیں سنایا۔

آج کے دور میں اس طرح کی کسوٹیوں نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔ اس لیے لفظ و معنی کی وحدت اور فن پارے کی مکمل تخلیقی نوعیت ہی آج کی کسی نظم یا کسی شعر کی کامیابی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ آج کی شاعری کے مطالعے اور اس پر رائے زنی کے لیے زبان و بیان کے بندھے ٹکے اصولوں سے نصابی قسم کی واقفیت، یا چند نظریوں کا کتابی اور اخباری علم ہی کافی نہیں۔ خود قاری اور نقاد کے لئے زندگی کے لاتعداد تجربوں میں شمولیت اور ان کا ادراک و احساس بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے اب کتابی اور نظریاتی تنقید کی نارسائی کا احساس عام ہوتا جا رہا ہے۔ مخلص، درد مند، حساس باذوق اور زندگی کا پارکھ ہونا پہلے صرف شاعروں کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، لیکن اب شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے یا اس پر محاکمہ و تبصرہ کرنے کے لیے قاری و ناقد کو بھی اپنے اندر یہ خصوصیتیں پیدا کرنی پڑیں گی۔ شاعر اور قاری یا شاعر اور نقاد کا رشتہ اب زیادہ فطری اور حقیقی ہوگا اور ہونا چاہئے۔

جدید تر شاعری کی اس عمومی صورت حال کو سمجھنے کے بعد جدید تر غزل کی نوعیت اور اس کی خصوصیت کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے ہیں، اس لئے گذشتہ دور کے غزل گویوں کی طرح اس دور کے غزل کہنے والوں کو آپ ان اصطلاحوں کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے، جیسے صوفی شاعر، رند شاعر، خمریات کا شاعر، عشق حقیقی کا شاعر، عشق مجازی کا شاعر، ہوس ناکی اور معاملہ بندی کا شاعر، سیاسی شاعر، غم جاناں کا شاعر، غم دوراں کا شاعر، قنوطی شاعر، رجائی شاعر، زبان و محاورے کا شاعر، وغیرہ کہہ کر پہلے ہم خود سمجھتے یا دوسروں کو سمجھایا کرتے تھے۔

ویسے، غزل کی اپنی ایک مستحکم روایت یہ رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ رمز و ایما کا سہارا لیا ہے اور علامات اور اشاروں میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ یوں تو غزل میں اور بھی کئی طرح کے رنگ اور اسلوب رہے ہیں، غزل قصیدہ طور سے لے کر صحافیانہ، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی غزلیں تک لکھی گئی ہیں لیکن جب بھی غزل نے اپنے مخصوص ایمائی اور رمزیاتی انداز کو ترک کر کے اور اپنے طریقۂ راسخہ سے ہٹ کر دوسری ڈگر اختیار کی ہے اس کا وار ہلکا پڑ گیا ہے اور اس طرح کی شاعری کو غیر متغزلانہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا رمزیت و ایمائیت خود اس کی ایسی خصوصیت ہے جو اس کے دائرۂ اثر کو وسیع کرتی ہے اور اسے کسی مخصوص مسلک یا نصب العین سے وابستہ کرنے کے بجائے عالم گیر انسانی جذبات و محسوسات سے منسلک رکھتی ہے۔ غالباً اسی لئے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اچھی غزل کہنے کے لئے شاعر کو ترک نسب کرنا پڑتا ہے اس اور اس برادری میں شامل ہونا پڑتا ہے جسے انسان کہتے ہیں اور میر نے ایک جگہ اپنے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے ؏

پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

نئے شاعر نے واعظ ہی نہیں عاشق، رند، رومانی باغی، مبلغ، مجاہد، انقلابی، اور اشتراکی، سب کے نسب نامے کو پھر سے ایک بار آدم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور آدمی کے چہرے سے اس کا اوپری خول اتار کر اس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔

اگر ہم جدید تر غزل میں صرف ان جذبات و محسوسات کو دیکھنے کی کوشش کریں جن کا تعلق عشق و محبت سے ہے تو ہمیں یہاں نئے شاعر کا رویہ خاصا بدلا ہوا نظر آئے گا۔ زندگی میں عشق کی مرکزیت اور اولیت سے انکار کی روایت تو ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے اور یگانہ اور فراق نے بھی اس تصور پر خاصی ضرب

لگائی ہے۔ لیکن جدید تر غزل میں یہ تصور اور بھی سیال ہو گیا ہے اور زندگی کے لاتعداد مسائل میں یہ نقطہ کبھی تو نظر آتا ہے اور کبھی خود شاعر کو اس کے موہوم ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی زمانے میں فراق کی غزل میں یہ کیفیت دیکھ کر کہ یہاں محبوب ظالم اور جفا کار ہونے کے بجائے وفا شعار ہے اور ہجر کے صدمے صرف عاشق کے حصے میں نہیں آئے ہیں بلکہ محبوب کو بھی اس کے لئے خاک بسر ہونا پڑا ہے، جعفر علی خاں اثر نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تو سراسر آداب شاعری اور آداب غزل کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں جدید تر غزل کے بارے میں موصوف کا کیا تاثر ہو جہاں عاشق اور محبوب دونوں ایسی کیفیتوں سے دو چار ہیں جہاں آداب عشق اور آداب غزل دونوں آداب زندگی کے سامنے مات کھا گئے ہیں۔

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

(ناصر کاظمی)

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

(شاذ تمکنت)

ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

(وحید اختر)

چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خد و خال سے بھی گئے

(عزیز حامد مدنی)

سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا ہوگا
یہ بھی دیکھو کہ تمھیں ہم نے بھلایا کیسا

(سلیم احمد)

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

(حسن نعیم)

نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

(شہریار)

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

(بشیر بدر)

اوپر جو اشعار دیئے گئے ہیں وہ نہ تو اس عاشق کے ہیں جو محض عشق ہی کو اپنا مقصد و مدعا جانتا ہے اور نہ اس سیاسی انسان کے جس نے عشق کے جذبے کو حقیر اور غیر مفید یا غیر سماجی سمجھ کر ترک عشق کا کوئی منصوبہ بنایا ہے، اور نہ اس مرد مجاہد کا رویہ ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے جا رہا ہے اور غم جاناں کو اپنے پاؤں کی بیڑی سمجھ کر اسے جھٹک دینے کی فکر میں ہے۔ بلکہ ان شعروں میں حسن و جمال سے انسانی فطرت کے ازلی لگاؤ اور زندگی کے تضادات میں فرد کی فرد سے دوری اور علیحدگی کا حیرت انگیز احساس ہے۔ یہ اشعار نہ وفاداری سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ بے وفائی سے، پھر بھی حقیقی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں محبت کی کسک ملتی ہے۔ نہ صرف حسن و عشق بلکہ زندگی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ آج کے شاعر کے ہاتھ میں ایک الجھے دھاگے کی طرح ہے جسے وہ سلجھانا چاہتا ہے۔ وہ ذات اور کائنات کے پیچیدہ رشتے کو سمجھ کر اس کے حدود کا تعین کرنا چاہتا ہے، اس لئے آج کی غزل میں ماحول فطرت اور اس کے مظاہر علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

خاک بھی اڑ رہی ہے رستوں پر
آمد صبح کا سماں بھی ہے

(ناصر کاظمی)

بین کرتی ہے دریچوں میں ہوا
رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ
سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

(سلیم احمد)

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

پکارتی ہیں بھرے شہر کی گذرگاہیں
وہ روز شام کو تنہا دکھائی دیتا ہے

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

(احمد مشتاق)

اپنے سوئے ہوئے سورج کی خبر لے جا کر
اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

چہروں کی دھند بجھنے لگی شام سے ظفر
رنگ ہوائے شام کچھ ایسا ہی زرد ہے

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

لرز گئی ہے جو آنکھوں کے آئینوں میں کبھی
کٹے پھٹے ہوئے اندر کی انتہا ہی تو ہے

ہوا کی سخت فصیلیں کھڑی ہیں چاروں طرف
نہیں یہاں سے کوئی راستہ نکلنے کا

لوگ ہی آن کے یک جا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

کیا ہوں ظفر اندھیرے اجالے کی جنگ میں
دن سا مرے وجود میں یہ ڈوبتا ہے کیا

(ظفر اقبال)

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنا تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو
وہ دور ایک جزیرہ دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دھوپ شکیب
ہر ایک پھول سنہرا دکھائی دیتا ہے

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

(شکیب جلالی)

اک رات ہم ایسے ملیں جب دھیان میں سائے نہ ہوں
جسموں کی رسم و راہ میں روحوں کے سناٹے نہ ہوں

میں آنسوؤں میں نہایا ہوا کھڑا ہوں ابھی
جنم جنم کا اندھیرا بلا رہا ہے مجھے

میں وہ مردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندوں جیسی
بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

بجھے لبوں پہ ہے بوسوں کی راکھ بکھری ہوئی
میں اس بہار میں یہ راکھ بھی اڑا دوں گا

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

(ساقی فاروقی)

کھل گئی تھی آندھیوں کے سامنے دل کی کتاب
ایک کاغذ سا ہوا میں دیر تک اڑتا رہا

اس طرف جاتی سڑک پر روشنی سی رہی
دو پہر تک تنگ گلیوں میں دیا جلتا رہا

وہ دیودار کی ٹہنی پہ رک گیا سا چاند
ہوا چلے تو ابھی کروٹیں بدلنے لگے

(بمل کرشن اشک)

اب ٹوٹنے ہی والا ہے تنہائی کا حصار
اک شخص چیختا ہے سمندر کے آر پار

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے
اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے

(عادل منصوری)

مرے کمرے میں جیسے میں نہیں ہوں
نہ جانے دوسرے کمرے میں کیا ہے

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا

(محمد علوی)

آبلہ پا ہوں آپ اپنے ہی نقش قدم سے ڈرتا ہوں
تنہا تنہا پھرتے پھرتے اپنا سایہ بھول گیا

وقت بے رحم ہے لمحوں کو کچل جائے گا
دن کو رو کو کہ مہینوں میں بدل جائے گا

(شاذ تمکنت)

منزل صبح آ گئی شاید
راستے ہر طرف کو جانے لگے

(محبوب خزاں)

میں دن ہوں مری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں
کوئی سمجھے بساط لمحہ کیا
(بشیر بدر)

ہر نئے چہرے سے پیدا اک نیا چہرہ ہوا
طاق نسیاں پر ہے کوئی آئینہ رکھا ہوا
(صہبا وحید)

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ
(اطہر نفیس)

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے
عجیب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
(شہریار)

اب شکایت ہے کہ راتیں چیختی ہیں
آج تک کیوں شہر والے بے خبر تھے
روشنی جن سے ابلتی تھی وہ چہرے کیا ہوئے
سامنے کب سے وہی ننگی اندھیری رات ہے
(شمیم حنفی)

پیچھے نہ بھاگ وقت کی اے ناشناس دھوپ
سایوں کے درمیان ہوں سایہ نہیں ہوں میں
(عبیداللہ علیم)

رات ہمیں پھر تنہا پا کے جانے کیا کر بیٹھے
حسرت سے ہم دیکھ رہے ہیں دن کا سورج ڈھلتے
(پرکاش فکری)

اوپر جو مثالیں دی گئیں ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ یہ غزل انسانی زندگی اور اس کے ماحول کے رشتوں اور رابطوں کو بالکل نئے انداز میں دیکھتی ہے۔ اس غزل میں داخلیت اور خارجیت کی حدیں ختم ہوگئی ہیں اور شعر میں معنی کی کئی سطحیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان اشعار میں قافیوں کی رعایت سے پرانے مضامین یا عشق و عاشقی کی کیفیات کو لفظی الٹ پھیر کے ساتھ دہرانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ان میں وہی کیفیتیں ہیں جن سے آج کا شاعر دو چار ہے اور ان کے اندر سایوں اور دھندلکوں کی وہی آویزش ہے جو آج کے انسان کا مقدر ہے۔

چونکہ جدید تر غزل جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی پیداوار ہے اس لئے اس غزل میں ہمیں ایک نئی فضا اور ایک نیا ذائقہ ملتا ہے۔ اس غزل میں پرانی علامتوں کی تکرار اور گھسے پٹے تلازموں کے بجائے تازہ تر علامتیں اور الفاظ کے نئے تلازمے ملتے ہیں۔ یہ الفاظ اور علامتیں ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ دن، رات، اندھیرا، اجالا، سورج، چاند، شام، سناٹا، تنہائی، چراغ، ہوا، دھوپ، آواز، گھر، دریچہ، کمرہ، دروازہ، دستک، سڑک، راستہ، دھند، دھواں، چہرہ، سایہ، پرچھائیں، درخت، پتہ، ٹہنی، فصیل، حصار، سمندر، بادبان، جزیرہ، ابر، پتھر خاک، ریت، راکھ، اور اس طرح کے بہت سے الفاظ غزل میں ایک نئی معنویت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، اس طرح کہ غزل کی لفظیات اور اس کی مخصوص فضا بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

غزل کی فرسودگی اور اس کی اکتا دینے والی لفظیات کے دائرے کو توڑنے کی کوششیں پہلے بھی ہوئی ہیں لیکن بسا اوقات اس کوشش میں غزل غزل نہیں رہ پاتی، وہ گیت، دوہے یا بیانیہ نظم سے قریب ہو جاتی ہے۔ آج کے شعرا کے یہاں بھی ایسی چیزیں مل جائیں گی لیکن بیشتر اچھے غزل گویوں نے غزل کے مخصوص رمزیاتی اور ایمائی طریق کار کو ملحوظ رکھا ہے۔

غزل کی بنیادی روایت میرے نزدیک اس کا یہی رمزیاتی اور ایمائی انداز اور اس کی تہ داری اور پہلوداری ہے۔ جدید تر غزل اپنی اس بنیادی روایت سے ہٹی ہوئی نہیں ہے، گو کہ قفس و آشیانہ، صیاد و گلچیں، دیر و کعبہ، مے خانہ، ساقی، موسیٰ و طور، قیس و فرہاد، واعظ و محتسب اور اس طرح کی علامتوں کے استعمال نہ ہونے سے بظاہر یہ غزل ہماری غزلیہ شاعری سے کچھ الگ سی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل جدید تر شاعر نے پرانی علامتوں کو اپنی ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے ناکافی سمجھ کر خود اپنے ماحول اور قریبی زندگی سے علامتیں وضع کی ہیں اور اس نے اس سلسلے میں خود اپنے حواس خمسہ کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اس عمل میں اردو غزل اپنی دھرتی سے بہت قریب آگئی ہے۔ اس کی عجمیت جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ فارسی غزل کا چربہ سمجھی جاتی تھی اب قریب قریب ختم ہوگئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو غزل کی تاریخ میں یہ ایک اگلا قدم ہے۔

جدید تر غزل ہمارے نزدیک غزل کی وہ صورت ہے جو یگانہ، فراق، اور شاد عارفی کی غزل کے بعد ایک نئی فضا اور نیا لہجہ لے کر ابھری ہے۔ اس غزل کے خدوخال ۱۹۵۰ کے بعد سامنے آنے والی نسل کے یہاں پہلے پہل ابھرنے شروع ہوئے جس میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، سلیم احمد، ظفر اقبال کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۰ کے لگ بھگ ایک اور نئی نسل اس قافلے میں شامل ہوئی ہے جس میں شکیب جلالی، بمل کرشن اشک، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، ساقی فاروقی، شمیم حنفی، پرکاش فکری اور دوسرے نئے شعرا شامل ہیں جو ان شعرا کے دوش بہ دوش اپنی غزل کے ذریعہ ہماری شاعری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرا رہے ہیں ☆☆☆

خلیل الرحمٰن اعظمی

شمارہ ۲۹،
اکتوبر ۱۹۶۸

کیوں شمع بجھ کے رہ گئی، کیسی ہوا لگی
"اے اہل بزم کوئی تو بولو خدا لگی"

دنیائے دوں سے بھاگ کے ہم بے کدے گئے
اب کیوں ہمارے ساتھ ہے یہ بے حیا لگی

وہ لوگ اب کہاں ہیں، وہ چہرے کدھر گئے؟
اے شہر حُسن، کس کی تجھے بد دعا لگی

ہم کیوں نہ اپنے آپ پہ نازاں ہوں صاحبو
ہم پر ہی کیوں یہ تہمت مہرو وفا لگی

سائے سے کچھ قریب سے ہو کر گزر گئے
پچھلے پہر کو آنکھ ابھی تھی ذرا لگی

یہ آئینے میں کون ہے، ہم جانتے نہیں
صورت ذرا ذرا سی ہمیں آشنا لگی

کیا اب ادھر نہ آئیں گے خوشبو کے قافلے
تجھ کو خبر کہاں سے یہ باد صبا لگی

ہم جل کے خاک ہو گئے یہ اور بات ہے
کچھ ان کے دل میں آگ تھی ہم سے سوا لگی

کچھ دن رہے تھے زلف پریشاں کی قید میں
پھر اپنے ساتھ اور نہ کوئی بلا لگی

ہم تشنہ لب تو تیرے دعا گو ہیں پھر بتا
ہے کون جس کی تجھ کو نظر ساقیا لگی

بس اک حسین کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی

شمارہ ۱۰۲
دسمبر ۱۹۷۶ جنوری فروری ۱۹۷۷

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

غیروں نے مجھ کو دفن کیا شاہراہ پر
میں کیوں نہ اپنی خاک میں غیرت سے گڑ گیا

خلوت میں جس کی نرم مزاجی تھی بے مثال
محفل میں بے سبب وہی مجھ سے اکڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا ادھڑ گیا

کس کس کو اپنے کون جگر کا حساب دوں
اک قطرہ بچ رہا تھا سو وہ بھی نبڑ گیا

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

اب کیا بتاؤں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

خلیل تنویر

شمارہ ۱۲۶،
ستمبر تا نومبر ۱۹۸۲

خیال و خواب ہوئی ہیں رفاقتیں اس کی
بھلا سکے نہ مگر ہم محبتیں اس کی

جہاں جہاں بھی گیا اپنے رنگ چھوڑ گیا
گلی گلی میں پریشاں حکایتیں اس کی

عجب ستم ہے کہ در در کی خاک چھانے ہے
کچھ اس کے کام نہ آئیں ذہانتیں اس کی

یہ اور بات کہ ہم اس کے نام لیوا ہیں
سنبھال بھی نہ سکے پر امانتیں اس کی

ہم اس کے بارے میں سوچیں تو سوچ بھی نہ سکیں
زماں مکاں سے پرے ہیں حقیقتیں اس کی

شمارہ ۱۳۵،
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴

یہ کس خیال میں تھا روز و شب سفر اپنا
تمام عمر رہا زلزلوں میں گھر اپنا

یہ زندگی کی طلب بھی بڑی عذاب ہوئی
کہاں کہاں پہ جھکاتے رہیں گے سر اپنا

کنار شام اداسی کی راکھ اڑتی ہے
بجھا جو روزن دل بجھ گیا شرر اپنا

ہوا کے ہاتھ میں کچھ آگ تھی بہانہ تھا
خود اپنی آگ میں جل بجھ گیا شجر اپنا

جب اس کی بات چلی ہے تو بے زباں ہوئے
کھلا یہ بھید کہ بیکار تھا ہنر اپنا

خلیل تنویر

شمارہ ۱۳۹،
اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵

سیاہ خانۂ دل پر نظر بھی کرتا ہے
مری خطاؤں کو وہ در گذر بھی کرتا ہے

پرند اونچی اڑانوں کی دھن میں رہتا ہے
مگر زمیں کی حدوں میں بسر بھی کرتا ہے

تمام عمر کے دریا کو موڑ دیتا ہے
وہ ایک حرف جو دل پر اثر بھی کرتا ہے

وہ لوگ جن کی زمانہ ہنسی اڑاتا ہے
اک عمر بعد انھیں معتبر بھی کرتا ہے

جلا کے دشت طلب میں امید کی شمعیں
اذیتوں سے ہمیں بے خبر بھی کرتا ہے

خواجہ جاوید اختر

شمارہ ۲۴۸،
ستمبر ۲۰۰۱

تصور میں بسا رکھا ہے جو وہ گھر بناؤں گا
زمیں پر کیا بنے گا محض کاغذ پر بناؤں گا

بگولا بن کے اڑتی پھر رہی ہے جو فضاؤں میں
جو ممکن ہو اسی مٹی سے میں ساغر بناؤں گا

جو فرصت ہو تو تھوڑی دیر میرے پاس آبیٹھو
تمھیں دیکھوں گا اور پھر صبح کا منظر بناؤں گا

قلم سے پیٹ بھرتا ہے نہ اپنا جسم ڈھکتا ہے
قلم کو توڑ دوں گا اور اب خنجر بناؤں گا

مجھے پہلے مکاں شیشے کا اک تیار کرنا ہے
پھر اس کے گرد پتھر کے نئے منظر بناؤں گا

خواجہ رضی حیدر

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

اک یاد کی یلغار تھی اور تیز ہوا تھی
خوشبو کہیں۔ اس پار تھی اور تیز ہوا تھی
تنہائی کی دشمن تھی شناسا کوئی آہٹ
آہٹ بھی لگاتار تھی اور خیز ہوا تھی
اڑتی تھی عجب گرد دریچے کے مقابل
اک حسرت دیدار تھی اور تیز ہوا تھی
اک پیرہن ناز کہ قامت پہ تھا زیبا
اک خوبی رفتار تھی اور تیز ہوا تھی
کرتے رہے آرام تہ شاخ تعلق
جب فرصت انکار تھی اور تیز ہوا تھی
رقصاں تھی در و بام میں تاریکی امکاں
روشن نگہ یار تھی اور تیز ہوا تھی
برفاب بدن شوق کی حدت سے ہراساں
سیال شب تار تھی اور تیز ہوا تھی
اک خواب سی دیوار پہ تعبیر کی صورت
تصویر رخ یار تھی اور تیز ہوا تھی
کچھ مجھ کو بھی اندازۂ تمہید نہیں تھا
کچھ رات بھی عیار تھی اور تیز ہوا تھی
کیا شب تھی گل بوسہ چٹکتے تھے بدن پر
وحشت مری گلزار تھی اور تیز ہوا تھی
وہ جسم سمیٹے ہوئے پہلو سے اٹھا تھا
جب ساعت اقرار تھی اور تیز ہوا تھی
اک عجز کی لذت پہ بھی اس آنکھ میں موجود
اک مشعل پندار تھی اور تیز ہوا تھی
مشروط ہوا جب کسی مژگاں سے سویرا
وہ شب، شب انکار تھی اور تیز ہوا تھی
اڑتے تھے مرے سامنے اک رات کے پرزے
اک زلف شرر بار تھی اور تیز ہوا تھی
لرزاں تھا کسی طاق میں بے نام تحیر
لو شمع کی بیمار تھی اور تیز ہوا تھی
اس باغ میں تھے سارے شجر دست و گریباں
اک شاخ طرح دار تھی اور تیز ہوا تھی
اک شور تھا سرگوشی معدوم کے پیچھے
اک سانس کی رفتار تھی اور تیز ہوا تھی
اک آنکھ سناتی تھی فراموش کہانی
جب روح سبکسار تھی اور تیز ہوا تھی
اک گریۂ تنہائی تھا ہنگام تماشا
اک حسرت دیدار تھی اور تیز ہوا تھی
کل سایۂ مہتاب کے ہمراہ سحر تک
میں تھا تری دیوار تھی اور تیز ہوا تھی
اسباب یہی تھے مری محتاط روی کے
سر پہ مرے دستار تھی اور تیز ہوا تھی
کچھ حبس کا عالم تھا رضی تیری غزل میں
اک حرف کی تکرار تھی اور تیز ہوا تھی

دیو ہیکل ادارے اور ذات کا بحران

دیویندر اسر

شمارہ نمبر ۲۰،
جنوری ۱۹۶۸

جدید ادب کا ایک اہم مسئلہ ذات کے بحران کا ہے۔ آج انسان اپنے آپ کو تنہا تصور کرتا ہے، ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر۔ وہ اپنے ذاتی ماحول سے قریب قریب مکمل طور پر کٹ چکا ہے اور خاندان کا ہر سہارا ٹوٹ گیا ہے۔ سماج اس کی ذاتی حیثیت کو برقرار رکھنے سے قاصر ہی نہیں بلکہ اسے وسیع، جامع اور مکمل طور پر منظم اداروں میں مدغم کرنے کے درپے ہے۔ آج کوئی آدرش ایسا نہیں ہے جس کے لئے انسان جہاد کرے کیوں کہ تمام آدرش باطل اور تمام اقدار بے معنی ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لئے آج فرد کسی آدرش، قدر یا ادارے سے وابستگی محسوس نہیں کرتا، لہٰذا وہ ایک ایسے بحران کا شکار ہے جسے ذات کے بحران کا نام دیا گیا ہے۔

انسان اپنی ذات کو بحال کرنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے اور اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے کہ اس کی منفرد حیثیت قائم ہے، کسی حد تک بھی جا سکتا ہے، مروجہ رسم و رواج سے بغاوت سے لے کر جرم کو فلسفے کا روپ دینے تک۔ اس بحران کے باعث جدید انسان اپنی ذاتی زندگی اور سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی اداروں کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہے جو درد حقیقت ایک ایسی کامل منظم ادارہ بندی قائم کر رہے ہیں جس میں انسان کی ذاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔ وہ ان اداروں میں اپنی حیثیت کو متعین کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں محفوظ محسوس کر سکے۔ اور بعض اوقات وہ ان اداروں سے وابستگی قائم کر کے اپنے وجود کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ لیکن آخر کار اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی ذات اور خارجی اداروں کے رشتے اتنے پیچیدہ اور گم راہ کن ہیں کہ اسے وجود کے ایک جھوٹے احساس کو حقیقی تصور کرنا پڑتا ہے۔ اس باطل احساس کو حقیقی بنانے میں الفاظ کی جادوگری اداروں کے فائدے اور "خفیہ ترغیب" (Hidden Persuasion) کا بڑا اہم رول ہے۔

جدید ادب کے کردار کا ذہنی رویہ اور عمل بہت کچھ اس سے متعین ہوتا ہے کہ اس کے اس بحران کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ اس سے کس طرح اور کس حد تک نبرد آزما ہے؟ کردار ذات کی تلاش میں بھٹکتے ہیں۔ اپنے تجربات کو معنی خیز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انھیں آخر کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی تجربہ یا آدرش یا ادارہ یا عمل ان کی ذات کو مستند ثابت نہیں کر سکتا۔ اور ان کے وجود کی معنویت کو پیش نہیں کر سکتا۔

جدید ادب کا ہیرو اس طرح بغیر کسی نظریے یا آدرش سے وابستگی کے باعث سماج کی مختلف سطحوں میں چکر کاٹتا ہے اور اقدار کی تلاش کی کوشش کرتا ہے جن سے وہ اپنی وفاداری کا اظہار کر سکے۔ تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ آخر وہ کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک بے نام، بے چہرہ، ذات سے محروم انسان ہے یا اس کی کوئی منفرد حیثیت ہے! اور اقدار کے بحران کو بڑی حد تک متعین کرتا ہے۔ جب تک ایک ٹھوس وجود کا ثبوت اور ذات کی معنویت کا یقین اسے نہیں ہو جاتا۔ وہ اس ذہنی کیفیت سے نجات حاصل کر سکتا۔ شخصیت اور ذات کا خاتمہ انسان کو غیر یقینی صورت حال اور انتشار کے گہرے بھیانک غار میں پھینک دیتا ہے۔ اور اس انتشار کے عالم میں انسان جرم کرنے سے لے کر پاگل پن تک کسی بھی ذہنی کیفیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ انسان کی حالت اور اس کے مسائل اور اس کے ساتھ اس کی اپنی ذاتی کمزوریاں اس کے دلیرانہ عمل کے راستے میں حائل ہیں اس لئے آج ادب میں ہیرو کا زوال نظر آتا ہے۔ اور کسی حد تک اینٹی ہیرو کے تصور کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہ بونے ہیرو اور دیو ہیکل ادارے اور نظریات، عمل کے مضحکہ خیز روپ جدید ادب کو موضوع اور فارم کے نئے نئے تجربات سے روشناس کرانے کے لئے بڑی زرخیز زمین مہیا کرتے ہیں۔ وجودیت پرست ادیبوں نے ذات کے مسئلے کو تنہائی اور خوف سے وابستہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جب کہ دوسرے ادیبوں نے سماجی، سیاسی اور معاشی اداروں کو ہی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وجودیت پرستوں کے نزدیک ان اداروں اور ان کے آدرشوں سے فرد کی وابستگی کے ٹوٹنے کے باعث انسان کو اپنی ذات کی قدر متعین کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں کہ وہ اس لغو دنیا میں تنہائی اور دہشت کی زندگی بسر

کرے۔ انسان کو اپنی نظر خود ہی پیدا کرنی پڑے گی اور اسے اپنی اسی ذاتی نظر سے ہی ہر چیز کو پرکھنا پڑے گا۔ کوئی مشترکہ آدرش یا فلسفہ اس کی مدد نہیں کرسکتا کیوں کہ اصلی نظر تو داخلیت کی حامل ہوتی ہے۔

جدید ادب میں داخلیت کا رجحان بھی اسی باعث زیادہ مقبول ہے۔

وجودیت پرست ادیبوں کا خیال ہے کہ انسان اپنے وسیع امکانات اور اپنی بڑی حدوں کے درمیان گھر گیا ہے۔ وجودیت پرستی اسے ان امکانات اور ان حدوں کا شعور عطا کرتی ہے اور معنی خیز وابستگی کی ذاتی اقدار کے انتخاب پر زور دیتی ہے کیوں کہ اقدار کی تلاش اور ان کا حصول فرد خود ہی کرسکتا ہے۔ اس لئے اسے اپنے تجربات سے ہی اقدار کی کھوج کرنی پڑے گی۔ ادارہ بندی، اقتدار کا جو بھرم قائم کرتی ہے اس کے خلاف ادیب بغاوت اور تنقید کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ ادارہ بندی کی مکمل تنظیم میں انسان کی ذات کا بحران کیا صورت اختیار کررہا ہے اور وہ اس سے کس طرح نبرد آزما ہے۔ یہ مغربی ادب کی کچھ مشہور تحریروں کے تجزیہ سے بہ خوبی واضح ہوسکے گا۔

ادارہ بندی کے خلاف فرد کیا کیا رویہ اختیار کرسکتا ہے اس کی مثال چند جدید ناولوں کی روشنی میں دی جاسکتی ہے۔ (۱) خودکشی (Brave New World) (۲) سزائے موت (Darkness at Noon) (۳) قتل (One Flew over the Cuckoo's Nest) (۴) معطلی (A New Life) (۵) استعفیٰ (A Man in a Grey Flannel Suit) (۶) خود سپردگی (Catch 22) اور (۷) وجود یا ذات کا بحران اور لغو کیفیت (The Castle)۔

ادارہ بندی کے چکرویو میں جکڑے ہوئے انسان نے کیا کیا ستم نہیں سہے ہیں۔

جدید دور بڑے بڑے طاقتور اداروں کا دور ہے جس کے سامنے انسان ایک حقیر ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سیاسی اور معاشی اداروں نے جس مرکزی نظام کو جنم دیا ہے اس نے انسان کو ایک گہرے بحران میں ڈال دیا ہے۔ یہ بحران ہے اس کی ذات کا۔ ذات کی فنا کا خوف اور غیر محفوظ ہونے کی دہشت اس کی زندگی کا عذاب بن گئے ہیں۔

سوال یہ نہیں کہ یہ ادارے بڑے طاقتور اور ہمہ گیر ہیں بلکہ یہ ہے کہ جدید ادارے ایک ایسی انسان کش قوت کی پرورش کررہے ہیں جو انسان کو اس کی ذات اور انسانی خصائص سے علیحدہ کرکے خودحرکی مشینوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کررہے ہیں، اقدار، ضمیر، اور ذاتی آگہی کے بغیر سانس لینے والے آدمی کی حیثیت سے جس کا نہ کوئی مخصوص نام ہے اور نہ مختلف چہرہ۔

جدید ادب نے اداروں کے ذریعے انسان کی ذاتی اور خاندانی زندگی کے خلفشار اور اس کی ذات کے گم ہونے کے درد کو پیش کیا ہے۔ اس طرح کی تحریروں نے وجودیت پرست اور لغو (Absurd) کے ادب کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور چیلنج دیا ہے کہ مطلق العنان اور تجارتی اداروں کی مخالفت ذاتی اقدار اور ذات کے تحفظ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یکسانیت کے خلاف ذاتی قدر کو ترجیح دینا ہی آج کے انسان کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

آلڈس ہکسلی (Aldous Huxley) کی یوٹوپیا Brave New World میں انسان اپنے وجود کی ذاتی حیثیت کو مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ سائنس نے برسراقتدار سیاست دانوں کے ہاتھ میں قوت اور فنا کے جو آخری حربے دے دیئے ہیں ان کے ذریعے انسان پہلے سے تیار کئے ہوئے منصوبے اور منضبط سماج کی ضرورتوں کے مطابق تجربہ گاہوں میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ان کی تشکیل ان کے استعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ ماس میڈیا کے نئے نئے ذرائع، پوشیدہ محرکات، نئی ڈرگس، اور برین واشنگ کے ذریعے انسان کے ضمیر اور عقل کو ختم کرکے ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالی جارہی ہے جس میں ذاتی حیثیت جیسی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ انسان تنظیم سے مکمل طور پر وابستگی قائم کرچکا ہوگا۔ ادب، فن اور فلسفہ اور انسان کی تمام فکر، احساس اور جمالیاتی ذوق کو سماج سے باہر کردیا جائے گا۔

اس نئے سماج میں لوگ اپنی زندگی اور ماحول سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ وہ 'سوم' ایک نشہ آور دوا کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس منصوبہ بند سماج میں بھی تشکیک اور مایوسی کے نشان ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ناول کے دو اہم کردار۔ برنارڈ مارکس اور اس کا دوست واٹسن اپنی تخلیقی بے چینی کے باعث غیر مطمئن رہتے ہیں۔ اس مہذب دنیا کی انسان کش اقدار میں وحشی جان کا کردار ابھرتا ہے۔ جب برنارڈ مارکس وحشی جان کو اس نئی دنیا میں لاتا ہے تو اس میں ہل چل پیدا ہوجاتی ہے۔ واٹسن اس سے شیکسپیر کی شاعری سن کر اپنی مصنوعی اقدار اور غیر فنی زندگی کے بارے میں شک ظاہر کرتا ہے۔ برنارڈ مارکس اور وحشی جان (Savage John) سمجھتے ہیں کہ 'سوم' کے ذریعے انھیں ضمیر اور عقل سے عاری بنایا جارہا ہے اور انھیں اس دنیا سے مکمل طور پر مطابق بنانے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ ان کی کوئی ذاتی حیثیت نہ رہے۔ وہ مل کر 'سوم' کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ لیکن یکسانیت اور کنفارمٹی (Conformity) کی اس دنیا میں ان کی بغاوت ناکام رہتی ہے۔ اور انھیں مجرم کی شکل میں مغربی یورپ کے مقامی ناظم مصطفیٰ مانڈ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

مانڈ اپنی جوانی میں انقلابی تھا لیکن جلاوطنی سے بچنے کے لئے وہ سرکاری ملازمت اور وفاداری کو تسلیم کرتا ہے۔ واٹسن کو جلاوطنی کا حکم ملتا ہے کیوں کہ وہ اپنی ذاتی آزادی کو مقدم سمجھتا ہے اور اس ذہنی آزادی کے لئے آرام اور سکون کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور ستم سہنے کی جرأت کا ثبوت دیتا ہے۔ برنارڈ مارکس بزدلی کے باعث نشے کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔ وہ خودسپردگی کے لئے مجبور ہوجاتا ہے۔ وحشی جان (John) کو سائنسی تجربوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب مصطفیٰ مانڈ جان سے کہتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی خوشی کے لئے کیا جارہا ہے تو جان جواب دیتا ہے:

> "لیکن میں خوشی نہیں چاہتا۔ میں خدا چاہتا ہوں۔ میں شاعری چاہتا ہوں۔ میں ثواب چاہتا ہوں۔ میں گناہ چاہتا ہوں۔"
> مصطفیٰ مانڈ کہتا ہے۔ "دراصل تم دکھ سہنے کا حق چاہتے ہو۔"
> "یہی، یہی۔" وحشی جان جواب دیتا ہے۔ "میں دکھی رہنے کا حق چاہتا ہوں۔" کیوں کہ وہ ارادے اور عمل کی آزادی چاہتا ہے۔

جان کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس غیر روحانی دنیا کی

دہشت سے پاگل ہو جاتا ہے کیوں کہ اس مہذب دنیا میں آرام اور تحفظ تو ہے لیکن خدا، شاعری، آزادی اور ضمیر نہیں اور ان کے بغیر جان کا کوئی وجود نہیں۔ اس دنیا کی ہمہ گیر اجتماعیت، مطابقت، یکسانیت، اور محفوظ ادارہ بندی کی غیر ذاتی حیثیت سے مایوس ہو کر جان خود کشی کر لیتا ہے۔

ادارہ بندی سے غیر مہذب انسان کی نجات اگر پاگل پن اور خود کشی میں ہے تو پارٹی ممبر کی نجات مکمل خود سپردگی میں ہے۔ بگ برادر (The Big Brother) سے مکمل ہم آہنگی اور مطابقت اور احسان مند محبت میں ہے۔ جارج آرویل (George Orwell) کے ناول "۱۹۸۴" (ایک اور اینٹی یوٹوپیا) میں انسان کی اسی رحم انگیز اور بھیانک حالت کی عکاسی کی گئی ہے جب سائنس اور نفسیات سے مطلق العنان تنظیم کے جبر کے حربے بن جائیں تو "بریو نیو ورلڈ" کی دہشت آرویل کے "۱۹۸۴" کا اوبرین "بریو نیو ورلڈ" کے مصطفیٰ مانڈ کی طرح ایک بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ اعلیٰ افسر ہے۔ وہ ریاست اور اس کی قوت کے نمائندہ بگ برادر سے ناول کے ہیرو ونسٹن (Winston) کی مطابقت حاصل کرنے کے لئے حیوانی قوت اور بے رحم اذیت کا استعمال کرتا ہے۔ اوبرین کا قول ہے کہ قوت کا استعمال مزید قوت کے لئے کیا جا رہا ہے۔

ذاتی زندگی مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے اور بگ برادر ہر مقام پر ہر لمحہ ان کے ہر فعل کی نگرانی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ونسٹن کی ذاتی ڈائری بھی اس کی نظر میں ہے۔ ونسٹن جنس دشمن لیگ کی ممبر جولیا (Julia) سے اپنے پیار کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ مطلق العنانی مرکزی منضبط سماج کے ذریعے انسان کی روح کی گہرائیوں میں داخل ہو کر اس کی ذاتی اور انفرادی احساسات کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ "۱۹۸۴" اس بات کا ثبوت ہے۔ انجام کار ونسٹن اور جولیا ریاست کے ضمیر سے عاری انسان بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو دغا دیتے ہیں۔ ناول کا خاتمہ اس منظر پر ہوتا ہے کہ ونسٹن ایک ریستوران میں بگ برادر کی تصویر کے سامنے بیٹھا ہے اور اس کی طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور وہ بگ برادر کے سامنے خود سپردگی کر دیتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ذاتی حیثیت کا مکمل خاتمہ اور ادارے کے نمائندہ میں مکمل شمولیت۔ یہ ہے ارویل کے خوف ناک ناول "۱۹۸۴" میں انسان کی مشیت۔

لیکن آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) کے ناول (Darkness at Noon) کا ہیرو روباشوو (Rubashov) آمریت کی منضبط ادارہ بندی اور اس کے حکمرانوں کے خلاف اپنی ذاتی حیثیت کو آخر دم تک محفوظ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سزائے موت بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ اس کے لئے موت کا لمحہ ہی ذات کے شعور کا لمحہ ہے۔

ایک طرف ادارے سے انس، وابستگی اور اس کے سامنے خود سپردگی اور دوسری طرف اس سے بغاوت، خود کشی اور سزائے موت، دو بالکل مخالف رویے ہیں جن میں انسان بھٹک رہا ہے۔ وہ کبھی ٹوٹ جاتا ہے اور کبھی ابھر آتا ہے آج ادارہ بندی انسان کی ذاتی زندگی اور خاندان پر کئی قسم کے براہ راست اور پوشیدہ حملے کر کے اس کو ذات کے بحران میں ڈال رہی ہے۔ انسان اپنے ذاتی وجود سے الگ ہو کر ادارے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اس کی اقدار تسلیم کرتا ہے اور ذاتی فکر اور ضمیر کے بجائے تنظیم کے قاعدے اور قانون کا غلام بن جاتا ہے۔ ادارے میں کام یابی اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرنا ہی اس کی قابلیت کا پیمانہ بن جاتا ہے۔ یہی کام یابی اور اس کے ذاتی وجود کا ثبوت ہے۔ ولیم۔ ایچ۔ وہائٹ نے ایسے آدمی کو "آرگنائزیشن مین" کا لقب دیا ہے۔ اس کے خیال میں:

> آرگنائزیشن مین متوسط طبقے کا ہر وہ فرد ہے جو خاندان کے دائرے سے ذہنی اور جسمانی طور پر الگ ہو کر تنظیم اور اس کے نظام کو زندگی کے ہر شعبے میں تسلیم کر چکا ہے۔ وہ جدید بڑے بڑے اداروں کے دماغ ہیں۔ تنظیم ان کی زندگی میں پوری طرح داخل ہو چکی ہے، محض روزی کمانے والے انسان کی شکل میں ہی نہیں بلکہ خاندان کے رکن اور ایک شہری کے روپ میں بھی۔ آج ہماری تمام تعلیم اور تکنیکی تربیت کا مقصد بنیادی طور پر یہ ہے کہ ہم ایک آرگنائزیشن مین کی شکل میں عہدہ رتبہ اور آرام و سکون حاصل کریں اور تنظیم کے مطابق اپنی قابلیت بنائیں اور استعمال کریں۔

سلون ولسن (Sloan Wilson) نے اپنے مشہور ناول (A Man in a Grey Flannel Suit) میں اسی آرگنائزیشن مین کو موضوع بنایا ہے۔ اس کا ہیرو راتھ (Roth) کارپوریشن کے ممبروں کے سامنے ایک تقریر کرتا ہے۔

> میں پیسہ چاہتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا پیسے کو اتنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں ایسا آدمی نہیں جو شام گئے تک ہفتے کے آخر میں اور ہمیشہ اسی طرح متواتر کام کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسئلہ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ ہے۔ میں ایسا آدمی نہیں جو اپنی نوکری میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ میں اپنے کو یہ یقین نہیں دلا سکتا۔ میرا کام ہی دنیا میں سب سے زیادہ اہم کام ہے۔ میں ایک جنگ سے گذرا ہوں۔ ممکن ہے دوسری شروع ہونے والی ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں تصور کرنا چاہتا ہوں اس وقت کا جو میں نے دو جنگوں کے دوران میں اپنے خاندان کے ساتھ بسر کیا ہے جیسا کہ اسے بسر کرنا چاہئے۔

راتھ نوکری سے استعفے دے دیتا ہے اور اپنی چھوٹی سی نوکری پر واپس آ جاتا ہے جس سے وہ زندگی کی ضرورتیں پورا کر سکتا ہے۔ ہمہ گیر تجارتی کارپوریشن اور دفتری نوکر شاہی کی غیر ذاتی اور غیر روحانی زندگی کو چھوڑ کر وہ اپنے خاندان میں پھر سے خوش زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ یہ ناول ادارہ بندی کی ضمیر کش، مفاد پرست مادی دنیا کے خلاف ایک ذہین حساس آدمی کی باغی اور جدوجہد سے بھری زندگی کی جرأت مندانہ کہانی ہے۔ یہ ناول ایک ایسے فرد کی داستان ہے جو ادارہ بندی سے نجات حاصل کر کے تنظیمی آدمی ہونے سے بچ جاتا ہے اور اپنے وجود کو ٹوٹنے کی اذیت ناک کیفیت سے بچا لیتا ہے۔

ذات کے تحفظ کے جدوجہد ایک زیادہ منضبط تنظیم یعنی فوجی نظام میں

بھی جاری رہتی ہے۔ جوزف ہیلر (Joseph Heller) کے ناول Catch22 کا ہیرو یوسارین جنگ کی لغویت کو اچھی طرح جان چکا ہے وہ پبلک بیانوں کے پیچھے چھپے جھوٹ اور ذاتی مفاد کو سمجھتا ہے۔ جسے وہ تعلقات عامہ کے جھوٹ کا نام دیتا ہے۔ یہ آرویل کے ''نیو اسپیک'' کا ہی بدلا ہوا روپ ہے۔ یوسارین، وہ نٹرگرین سے انسپریشن حاصل کرتا ہے کیوں کہ وہ اس نظام سے ذہنی طور پر علیحدہ ہو چکا ہے۔ اس کا ذاتی وجود ابھی قائم ہے۔ کیتھ کارٹ آرگنائزیشن مین ہے، جس نے بغیر کسی سوال اور شک کے تنظیم کی وسیع حکومت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس سے وابستگی کو ہی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔

ادارہ بندی سیاسی، سائنسی اور تجارتی شعبوں تک ہی محدود نہیں بلکہ عام فلاح کے دائروں تعلیم اور صحت میں بھی اس کا حملہ ہو رہا ہے۔ برنارڈ مالموڈ (Bernard Malamud) کا ناول ''اے نیو لائف'' تعلیمی ادارے کی مکمل تنظیم میں انگریزی کے ایک آدرش وادی پروفیسر لیون (Levin) کی کہانی ہے۔ لیون کی علیحدگی (Alienation) کا باعث کالج کا مرکزی طور پر منضبط نظام ہے، جس کا نمائندہ اس کا افسر گل (Gill) ہے جو کالج کے قاعدے اور قانون کو پورے طور پر تسلیم کر چکا ہے یہ قاعدے قانون تعلیم کے مقصد کے حصول کے لئے کم، تنظیم کو مضبوط بنانے کے لئے زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ تعلیم سے زیادہ اہم ہے ڈسپلن۔ کالج سے اپنی مکمل مطابقت کے باعث گل آرگنائزیشن مین بن چکا ہے۔ وہ لیون کو نوکری سے برخاست کرا دیتا ہے،' اخلاقی نقطہ نظر سے عوام کی بہبودی کے لئے۔' لیون صحیح معنی میں ایک وجودیت پرست کردار ہے وہ ذاتی ارادے اور ضمیر کے ذریعہ اپنے عمل کی ذمہ داری تسلیم کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے تئیں ایمان دار ہے، وہ اپنے ذات کے بحران کا حل کالج کی تنظیم کی کنفارمٹی سے بغاوت کی شکل میں تلاش کرتا ہے۔

مسئلے کی یہی صورت کین کیسی (Ken Kesey) کے نئے ناول One Flew Over the Cukoo's Nest میں ملتی ہے جب ناول کا ہیرو میک مرفی (McMurphey) نرس وسٹ شیڈ (Wetsheed) کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ اسپتال کی نرس وسٹ شیڈ کو اسپتال میں دبگ نرس (The Big Nurse) (بگ برادر کی طرح ہی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ اسپتال کی نوکر شاہی کا ایک مشینی پرزہ ہے۔ میک مرفی اسپتال کے نظام میں تبدیلی لانا چاہتا ہے اور اس کی یہ جدوجہد اس کی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ اس کی ذات کا ثبوت بھی جدوجہد ہے۔ اس لئے بگ نرس سے اس کی مخالفت ناگزیر ہے۔ بگ نرس تنظیم کی نمائندہ ہے۔ میک مرفی کے پیار اور جدوجہد میں ایک رجائیت پرست نظر ملتی ہے جو آرویل کے ہیرو ونسٹن کے پیار میں نہیں۔ میک مرفی کی ذہنی شفا کے لئے جو علاج تجویز کیا جاتا ہے برومڈین (ناول کا ایک حساس کردار) اسے برداشت نہیں کر سکتا کیوں کہ میک مرفی اس علاج سے بے حس زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ برومڈین یہ برداشت نہیں کر سکتا اور وہ میک مرفی کو اس غیر ذاتی وجود سے بچانے کے لئے قتل کر دیتا ہے۔ اس کے ذاتی وجود کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ برومڈین کے خیال میں اسپتال ایک مشین ہے جو آدمی کو حقیر اور کمزور بنانے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ انسان کو سانچے میں بدلنے کے لئے اور اس کے آزاد خیالوں کو ختم کرنے کے لئے اور برومڈین کا جہاد ہے انسانیت اور ذات کا تحفظ۔

ذات کے بحران کی لغو کیفیت کی عکاسی فرانز کافکا کے ناول The Castle میں ملتی ہے۔ ''دی کیسل'' بھیانک خواب کے روپ میں اس مسئلے کا وجودیت پرست تجزیہ ہے۔ ناول کا ہیرو ''K'' کیسل کے قریب گاؤں میں کیسل کا ایک عہدہ دار ہے۔ وہ اپنے عہدے کو پہچاننا چاہتا ہے۔ لیکن وہ کیسل کے کسی ذمے دار عہدے دار سے نہیں مل پاتا، جو اس کے عہدے کی سند پر مہر ثبت کر سکے۔ اس کے لئے یہ سوال اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ انسان کی حیثیت سے ہی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے عہدے کو مستند ثابت کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیسل میں قبولیت ہی اس کے وجود کی سب سے بڑی شرط بن جاتی ہے کیسل میں عدم قبولیت کا مطلب ہے عدم وجودیت۔ ''K'' تنظیم سے علیحدگی (Alienation) کو دور کرنے کے لئے دوستی، پیار اور دوسرے انسانی رشتوں کو مسخ بنا دیتا ہے۔ میکس براڈ (Max Brod) کا خیال ہے کہ کافکا نے کیسل کا جو انجام سوچا تھا اس میں ''K'' جدوجہد میں ٹوٹ کر مر جاتا ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں ناول کا انجام ہے ''K'' کی انسانی رشتوں سے مکمل علیحدگی اور دوری۔

اگر ہم کیسل کے ''K'' کے رشتوں کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر چہ ''K'' سے کامل خود سپردگی کی مانگ صرف پیشہ ورانہ ہے لیکن حقیقت میں یہ مانگ اس کی پوری زندگی کی سپردگی کی ہے۔ اور تنظیم سے مکمل وابستگی کی مانگ ہے کیوں کہ یہ مانگ مکمل ہے، اس لئے انتخاب یا عدم انتخاب، وجود کی تلاش اور انسان کی حیثیت سے زندگی کی معنویت اس کے لئے اہم وجودیت پرست سوال بن جاتے ہیں۔

انسانی تنظیم کو خدا کا رتبہ دے کر اس کی پرستش کرنے کے باعث ذات سے جو علیحدگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس سے عدم وجودیت اور مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ''K'' کی تمام جدوجہد ذات کی اس بات کا ثبوت ہے۔

جدید انسان کو بیک وقت کئی جماعتوں کا وفادار رہنا پڑتا ہے اور اکثر اس وفاداری میں باہمی تضاد بھی ہوتا ہے۔ اس تصادم سے بچنے کے لئے وہ کسی ایک وسیع تنظیم کے سامنے مکمل خود سپردگی کر دیتا ہے لیکن کچھ افراد کے لئے یہ سوال ان کے ذات کا بحران کا سوال بن جاتا ہے کیوں کہ وہ ذات اور اقدار کے وفادار ہیں۔ جب بھی کوئی آدمی کسی ادارے میں اپنے وجود کو مکمل طور پر جذب کر دیتا ہے تو وہ اپنے وجود سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے وہ ایک غیر ذاتی وجود کے لئے انسانی وجود کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ ایسا آدمی آرگنائزیشن آدمی بن جاتا ہے۔

ادارہ بندی کے خلاف جدید انسان کی جدوجہد میں سیاسی انقلاب پرستوں کی بغاوت کی عظمت شاید نہ ملے لیکن یہ جدوجہد کچھ کم اہم نہیں۔ کوئی بھی فرد اپنے آپ کو انسانیت کی اقدار سے الگ کئے بغیر ادارے سے مکمل طور پر وابستہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ انتخاب اور عمل کی آزادی انسان کی وجودیت پرست حیثیت ہے ☆☆☆

دیوندر گوتم

شمارہ ۱۱۹،
فروری، مارچ ۱۹۸۱

مرے مزاج کی آب و ہوا سے گذرے تو
وہ روشنی کی طرح تیرگی سے ابھرے تو

مری امید کے صحرا میں تشنگی ہے بہت
ترے کرم سے منور ہیں پھر بھی قطرے تو

ہماری روح میں صدیوں سے اضطراب سا ہے
نواح دل سے کسی دن سکون ابھرے تو

اداسیوں کے بکھرتے ہوئے کہاسے میں
خوشی کی دھوپ کسی روز آکے ٹھہرے تو

میں اپنے جسم کی رعنائیاں اڑا دوں گا
ترے بدن میں تمازت کا رنگ ابھرے تو

گلی گلی میں سبھی لوگ جگ چکے ہیں مگر
کسی سڑک سے کوئی انقلاب گذرے تو

سفر طویل ہے ہمت مگر جواں رکھیئے
ہر ایک موڑ پہ ملتے رہیں گے خطرے تو

ہر ایک شکل ہے وحشت کا آئینہ گوتم
ہر ایک سمت ملیں گے ہوس کے کچرے تو

ذکاءالدین شایاں

شمارہ ۹۱،
جولائی تا ستمبر ۱۹۷۴

سرد خوشبو کی رگوں میں خون دوڑائیں گے ہم
چاندنی بجھنے تو دو، پھر آگ برسائیں گے ہم

سخت جانوں کا یہ شہر بے اماں ہے تو رہے
پتھروں کے درمیاں اک شہر بن جائیں گے ہم

اپنے حق میں تیز سورج ہی سے ہیں شادابیاں
بارشیں جتنی بھی ہوں گی اتنے کمھلائیں گے ہم

دیکھنا یہ ہے ہمیں حل کون کرتا ہے یہاں
اس کے ہونٹوں پر ادھوری بات ہو جائیں گے ہم

کالے پیلے موسموں کا سرخ نیلا ہے مزاج
سخت چٹانوں سے برگ سبز تک آئیں گے ہم

ذکاءالدین شایاں

شمارہ ۲۴۳،
جنوری ۲۰۰۱

گل کھلے، رنگ گرفتاری عیاں ہونے لگے
چھولیا تتلی کو ہاتھوں پر نشاں ہونے لگے

درد دل پر آپ کی لگتی گئی مہر سکوت
رفتہ رفتہ غم ہمارے بے زباں ہونے لگے

ہم بھی اڑتے تیر تھے ملتے رہے چہرے پہ خون
اس طرف بھی جذبے کھنچ کر خود کماں ہونے لگے

شہر کی آبادی، صحرا کی فضا کیا خوب تھی
اپنے گھر لوٹے تو پھر ہم بے مکاں ہونے لگے

ایک لایعنی تسلسل جھوٹے سچے حرف و لفظ
خود کلامی ایسی کیا جو داستاں ہونے لگے

ذکیہ مشہدی

شمارہ ۲۶۶،

مارچ ۲۰۰۳

اب کوئی پوچھے ان جانکی رمن پانڈے ایڈوکیٹ سے کہ اچھے بھلے الہ آباد میں تھے، رسول پور کہاں جامرے۔ وہ بھی محاورۃً نہیں حقیقتاً۔ یوں تو عام عقیدہ ہے کہ مرنے کی ساعت اور جگہ پہلے سے طے ہوتی ہے (ویسے مرنے سے بھی بڑے کچھ واقعات کی ساعت پہلے سے طے ہوتی ہے مثلاً شادی) لیکن سوال یہ ہے کہ عقیدہ یہ کہتا ہے تو ہنگامہ کاہے کا؟ مگر کیا کیجئے۔ ایک سے ایک دماغ موجود ہیں۔ ان کا یہ بھی سوچنا ہے کہ مرنے کی جگہ اور ساعت تو اوپر والے حاکم نے طے کردی۔ کچھ تو ایسا بھی ہو جو ہمارے ہاتھوں میں بھی رہے۔ اب ہم مردے پر نو من مٹی ڈالیں یا مٹی کا تیل (یوں تو زندوں پر مٹی کا تیل ڈال کر پھونکنے کی روایت بھی خوب قائم ہوگئی ہے) یا اسے چیل کوؤں کو کھلائیں۔ اور بھائی سو باتوں کی ایک بات یہ کہ عقیدے وہی اچھے لگتے ہیں جو اپنی مرضی اور سہولت سے میل کھائیں ورنہ اٹھایا ڈنڈا اور اپنی مرضی منوانے پر تل گئے۔ ہمارا تو یہی عقیدہ ہے۔ اب دیکھ لیجئے پانڈے جی کا حال۔

پانڈے جی کا پورا قصہ کے۔ کے۔ ماما سناتے تھے۔ کے۔ کے۔ یعنی کرشن کانت۔ وہ اسی مخفف سے جانے جاتے تھے۔ ٹائٹل لگانا انھوں نے بہت دن ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ کہتے تھے اس کلجگ میں سارے باہمن پنڈت چوہڑے چمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے، کھان پان تک کا پرہیز نہ رہا۔ کاہے کو باپ دادوں کا نام کیچڑ میں گھسیٹیں۔ لیکن کرشن کانت کے سارے چیلے چپاٹی جانتے تھے کہ یہ سارا کچھ ان کی مسخرہ شخصیت کا ایک حصہ تھا۔ وہ ذات پات کے سخت مخالف تھے۔ ٹائٹل استعمال نہ کرنا دراصل ان کے احتجاج کا مظہر تھا۔ کے۔ کے۔ کا اپنا بھانجا تو شاید کوئی تھا بھی نہیں۔ نہ جانے کس ستم ظریف نے نام کے آگے ماما لگا دیا۔ بس وہ جگت ماما ہوگئے۔ خاصا طویل عرصہ لکھنؤ میں گذارا تھا، اچھی اردو بولتے تھے۔ قصہ گوئی کے شوقین تھے۔ نخاس کے کسی داستان گو کی روح ان میں حلول کر گئی تھی (ایسا خیال کبھی جانکی رمن پانڈے ہی نے ظاہر کیا تھا)۔ وہ پان ایک گال سے دوسرے میں ٹھیلتے اور منھ اوپر کر کے کہ پیک کی چھینٹیں سننے والوں پر نہ پڑیں۔ عجیب گول گول لہجے میں بولتے، لیکن نہ جانے کیسے سحر طراز تھے کہ سامعین اٹھنے کا نام نہ لیں۔ دے قصہ پہ قصہ۔

سامعین میں خاص تھے لانبے چوڑے کنبے کے سارے نوجوان، دو ایک اڑوسی پڑوسی جن میں مرزا انور بیگ کی بیوی نیرہ بیگ بھی شامل تھیں۔ اور جو آیا گیا ہو وہ الگ۔ انور بیگ شاید واحد ہستی تھے جو کے۔ کے۔ ماما سے چڑتے تھے۔ ''زٹلیہ کہیں کا!'' ان کا جملہ ہوا کرتا تھا۔ ''عورتوں جیسی گپ بازی کرتا ہے۔ خاندان میں فلانا یوں اور ڈھکانا یوں...''

مگر انور بیگ کچھ بھی کہیں، کے۔ کے۔ کی مقبولیت میں کبھی بٹہ نہ لگا سکے۔ وہ آئے نہیں کہ جمگھٹ لگا۔ خاص کر جاڑوں میں کہ مونگ پھلیوں کی ڈھیری اور گرم گرم چائے کی پیالیاں سامنے ہوں، تسلے میں آگ جل رہی ہو اور سامنے بیٹھے ہوں دلائی میں ملفوف کے۔ کے۔ خاصے مسخرے سے لگتے ہوئے۔ راوی تفریح کی جنت لکھتا تھا۔

ایسے ہی کسی جاڑے میں انھوں نے جانکی رمن پانڈے ایڈوکیٹ، جو ادھر اچانک بیٹھے بیٹھے رسول پور جامرے تھے اور عجب کرائسس پیدا کر گئے تھے، ان کا قصہ بیان کیا تھا جو اس طرح تھا...

پانڈے جب چھوٹے تھے (اور اس بات کو بہو... او... اوت دن ہوگئے کہ پانڈے چھوٹے تھے) تو ان کی اماں، جو پنڈتائن کہلاتی تھیں پرلوک سدھار گئیں۔ وہ ہماری اماں کے پھپھیرے بھائی کی سالی کے جیٹھ کی چچازاد بہن ہوتی تھیں۔ رشتہ تو تھا ہی تعلقات بھی تھے۔

''جتنا رشتہ تھا، تعلقات بھی اتنے ہی تھے یا کچھ کم بیش...؟'' بھیا کو ٹنگڑی لگانے کی عادت تھی، چاہے داستان ہو یا زندگی۔

''اب بھیا تعلقات ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ہم نے ایجاد نہیں کیا۔ مگر ہاں تعلقات تھے۔ اور بہت تھے۔ اور رشتہ بھی کون سا کم تھا۔ ارے میاں پہلے لوگ خط میں لکھواتے تھے، تھوڑے لکھے کو بہت جانیو... سو لکھے کو ہی نہیں تھوڑے رشتے کو بھی بہت جانتے تھے اور نبھاتے تھے۔ ہم بھی انھیں میں سے ہیں۔'' ماما نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔ پیک کی خاصی مقدار اڑی اور فضا میں تحلیل ہوئی۔ انھوں نے باچھیں پونچھیں۔

''اچھا خبردار اب جو کوئی بیچ میں بولا۔'' چھن بھیا کو نیرہ بیگ نے ڈانٹا۔ ویسے بھی سب کو ڈانٹنے کا ٹھیکہ انھوں نے ہی لیا ہوا تھا بشمول انور بیگ۔

تو بیٹا پانڈے کی اماں مریں تو کچھ دن بعد ان کے ابا نے کرلیا دوسرا

بیاہ۔ اس وقت لوگ باگ ضرورت سمجھتے تو بیوی کے مرنے کا بھی انتظار نہ کیا کرتے تھے، مزے سے دوسرا بیاہ کر لیتے تھے۔ انھوں نے مرنے کے بعد کیا تو کیا گناہ کیا؟ وہ بھی خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے اصرار پر کہ آئے ہائے پنڈت۔ بن ماں کا بچہ کیسا رل رہا ہے۔ دوسرا بیاہ کر لو نت۔ پانچ برس کا لڑکا کیسے پالو گے۔

نیرہ بیگ نے کہاں تو ابھی بین بھیا کو ڈانٹا تھا، کہاں خود ہی کو باز نہ رکھ سکیں۔ تپ سے بولیں:

"اور جو کہیں پنڈت مرے ہوتے تو کوئی نہ کہتا کہ آئے ہائے پنڈتائن دوسرا بیاہ کر لو۔ اور تب پانڈے مزے میں پل بھی جاتے۔ کوئی نہ سوچتا کہ پانڈے کیسے پلیں گے اگر ان کی اماں بن بیاہی بیٹھی رہ گئیں تو...؟"

"لے تو پانڈے کو کوئی ان کی اماں نے پالا؟ والد صاحب قبلہ نے کر لیا دوسرا بیاہ اور اب جو پنڈتائن لائے وہ پانڈے کی بڑی بیاہی بہن ادما سے بس کوئی سال بھر چھوٹی تھیں۔"

"اے ہے ماما، سال بھر چھوٹی کہ سال بھر بڑی؟" نیرہ بیگ نے پھر ٹھہو دیا۔

"اب نیرہ بی بی، رہیں تو وہ سال بھر چھوٹی۔ تمہرا جی چاہے تو کہہ لو کہ بڑی تھیں۔" ماما نے گلوری پھر ادھر سے ادھر ٹھیلی۔

"ماما اب کوئی بولے تو جھاڑیے اس کو ایک لپڑ۔" کانتی دی نے کہا۔ وہ قصہ آگے نہ بڑھ پانے کی وجہ سے بیں بہ جبیں تھیں۔

تو بھیا... ماما نے پن ڈبہ کھول کر ذرا سا خوشبودار تمبا کو اور منہ میں سرکایا۔ اب ہم کیا لپڑ چپڑ کریں گے۔ تم بس آگے کی سن لو۔ تو پنڈت جی کی جو بٹیا الہ آباد میں بیاہی گئی تھیں وہ سب سے بڑی تھیں۔ اور ویسے تو ان کا نام دیوی کے نام پر اوما رکھا گیا۔ تھا، لیکن سارے لڑکے بالے انھیں دوادوا کہتے تھے۔ بس کوئی اٹھارہ برس کی تھیں۔ انھوں نے مائکے کے رنگ ڈھنگ دیکھے کہ نئی ماں تو ماتھے پہ ٹیکہ سجائے پائل چھنکاتی رن جھن گھومتی ہیں اور والد صاحب یا مردان خانے میں رہتے ہیں یا نئی ماں کے آگے پیچھے ریشہ خطمی ہوتے نظر آتے ہیں، تو انھوں نے سسرال واپس آ کے کیا یہ کہ اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ گئیں۔ اور شوہر سے کہا کہ ہم تو بھیا کو ساتھ رکھیں گے۔ تین بہنیں مر کے بیچ میں یہ بھائی پیدا ہوا تھا اور اس پر سوتیلی ماں مکھیاں بھنکا رہی ہے۔ ایک کٹورا دودھ کو ترستا ہے جب کہ گھر میں دو گئیں بندھی ہیں۔ شوہر نے کہا، بھائی ہم نے کب منع کیا۔ تم یہی بات سیدھے سبھاؤ نہیں کہہ سکتی تھیں؟ یہ رانی کیکئی بننے کی کیا ضرورت تھی جب کہ تم تو ہماری اکیلی اکلوتی بیوی ہو؟ دوا خوش خوش دوسرے ہی دن واپس آئیں اور پانڈے کو ساتھ لوا لے گئیں۔ سوتیلی ماں نے سوچا خس کم جہاں پاک۔ ان کی پائل کے گھنگرو اور زیادہ چھنکنے لگے۔

پانڈے کو دوا پیار سے بھین کہتی تھیں اور بھائی نہیں بیٹا سمجھتی تھیں۔ اپنے لڑکے بالے ہو گئے تو بھی بھین کا درجہ کم نہیں ہوا۔ جو نہ جانتے وہ یہی سمجھتے کہ بہن پہلوٹھی کے ہیں۔ ان کے شوہر اونکار ناتھ مشر نے بھی سالے کو کم مان سمان نہیں دیا۔ دوا جیسی بیوی پا کر خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ شکل سے نور برساتی برہمنی، صاف گوئی اور وعدہ وفا کرنے میں راجپوتنی، سارا حساب کتاب رکھنے، زمین جائداد دیکھنے میں ویشیہ، اور کھٹ کے خدمت کرنے میں شودر۔ اونکار آگے پیچھے گھومتے۔ جو کہتیں وہ کرتے۔ بھین کو بھرپور تعلیم ملی۔

بی۔ اے۔ کے فائنل ایر میں تھے کہ ارمان بھری دوا جا کے ان کا رشتہ طے کرا آئیں۔

کے۔ کے۔ ماما نے گلوری کے ساتھ پہلو بھی بدلا اور قصے میں ذرا ڈرامائی کیفیت پیدا کی۔ حاضرین اب نہایت مودب دم بخود بیٹھے کلائمکس کے منتظر تھے۔

اب بھیا یہ سن لیو کہ ادھر دوا رشتہ طے کر کے آئیں ادھر کسی نے جا کے بھین سے جڑ دیا کہ لڑکی تو جی بھر کے کالی ہے۔ بھین کا جی ڈوبنے لگا۔ بڑی ہمت کر کے دوا کے پاس گئے۔ وہ تخت پہ چڑھی بیٹھی دھوبی کا حساب کر رہی تھیں۔ تبھی چور جیسی شکل بنائے، نظریں جھکائے، قمیص کا دامن مروڑتے بھین دبے پاؤں آ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پیچھے یوں کہ دوا کی سیدھی نظروں سے بچے رہیں اور دل کی بات گوش گذار کر سکیں۔

"دوا۔" کچھ دیر بعد ان کے منہ سے مری ہوئی آواز پھوٹی۔

"اے ہے مرا پھر بٹن توڑ لایا۔"

بھین گڑبڑا گئے۔ بچپن میں قمیص اور نیکر سب کے بٹن چباتے اور دوا سے بڑی ڈانٹ سنتے تھے لیکن اب... کیا اب بھی کوئی بٹن ٹوٹا ہے؟ "نہیں تو دوا... کہاں...؟" وہ جلدی جلدی اپنے بٹن ٹٹولنے لگے۔

"ارے تو؟ تو یہاں کہاں کھڑا ہے رے؟ تجھے نہیں اس مرے دھوبی کو کہہ رہی تھی۔ دھوتیاں چار، چادریں دو، جاکٹ ایک۔"

"دوا۔" بھین نے اطمینان کی سانس لے کر سر کھجایا۔

"کیا ہے رے؟ نازل ہو جاتا ہے بے وقت۔ صبح دیکھے نہ شام۔"

"اچھا دوا..." بھین پھر گڑبڑا گئے۔ "ہم پھر بات کر لیں گے۔"

"تجھے نہیں اس مرے دھوبی کو کہہ رہی تھی... آ بیٹھ، بیٹھ نہ... پیچھے کاہے کو کھڑا ہے۔" انھوں نے لادی سرکا کر بھین کے لئے تخت پر جگہ بنائی۔ "دیکھ نہ ناشتے کا وقت ہے اور پہنچ گیا۔ طرہ یہ کہ کپڑے پھلکے اور غائب غلہ۔" انھوں نے دھوبی کی نقل کی: "حساب کر کے رکھئے، پڑوس سے ہو کے آتے ہیں۔ تو بول، کیا کہہ رہا ہے؟"

"دوا..."

پانڈے نے ہمت بٹوری اور اپنی دانست میں بم کا گولا چھوڑا۔

"سنا ہے مرچا پور والی کالی ہے اور تم زبان دے آئیں۔"

"کیا؟" دوا کے ہاتھ سے کاپی پنسل گر پڑی۔ بھین سے ایسی بے حیائی کی توقع انھوں نے نہیں کی تھی۔ پیٹ کے جائے جیسے ماں جائے کو انھوں نے گھور کے دیکھا۔ پانچ برس کا تھا تو لے آئی تھیں۔ پالا پوسا، خدمت کی، پڑھایا لکھایا۔ اس کی یہ مجال۔ حالانکہ پانڈے بے چارے کی کیا مجال تھی کہ پوری بات دل کی گوش گذار کر سکتے۔ جب سے شادی کی بات سنی تھی ایک چاند سا مکھڑا آنکھوں میں کوندنے لگا تھا اور کہاں اچانک اس پر کسی نے سیاہی پھیر دی۔ مستقبل کی یہ تصویر بڑی روح فرسا تھی کہ صبح صبح آنکھ کھلی نہیں کہ کالی مائی حاضر۔ انھوں نے اتنا کچھ نہ

کہہ کر بس ایک ڈھکا چھپا جملہ ہی کہا تھا۔

"سنو بھین!" ددا نے غصے سے دھوبی کی گٹھری پر ہاتھ مار کر کہا۔ "صورت دیکھی جاتی ہے رنڈی کی۔ بٹیا کا تو خاندان دیکھا جاتا ہے۔ سو خاندان ہزاروں میں ایک ہے۔ ماس مچھی تو کیا، کوئی پیاس لہسن تک نہیں کھاتا۔ سو شریفوں کے ایک شریف۔ اور تو اور بٹیا نے ہائی اسکول پاس کرلیا ہے۔ اگلے منگل کو بر یکھا ہے۔ مگر آپ جا کر فی الحال پڑھائی میں دھیان لگائیے۔"

اس بیچ ناشتے کی پکار لگاتے اونکار ناتھ مشر عرف بھین کے جیجاجی ادھر کو آنکلے تھے اور ہونے والی سلیح کے پورے خواص انھوں نے سن لئے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بولے "برخوردار۔ فی الحال خاندان والی سے بیاہ کرلو، بعد میں کبھی ایک صورت والی بھی لے آنا۔"

ددا نے اس وقت اپنی بڑی خوبصورت آنکھیں تریرکے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن پانڈے نے بات گرہ میں باندھ لی اور خوشی خوشی کالی مائی کو بیاہ لائے۔ اپنے پیٹ کے جائے بیٹے کے بیاہ سے پہلے ہی ددا کے آنگن میں پائل چھنکاتی بہو آن اتری۔

پانڈے کو ددا سے بڑی محبت تھی۔ ہونی بھی چاہیے تھی۔ لیکن وہ مہربان بہنوئی کی قدر بھی کچھ کم نہیں کرتے تھے۔ کرنی بھی چاہیے تھی۔ جس باپ کے نطفے سے تھے اس نے پلٹ کر شاذ و نادر ہی پوچھا تھا۔ سب کچھ تو ان بہنوئی کا ہی دیا ہوا تھا۔ اب وہ وکالت بھی اس لئے پڑھ وار ہے تھے کہ خود بھی وکیل تھے۔ کہتے تھے بھین کو گھر میں ہی اچھی ٹریننگ مل جائے گی۔ جمے جمائے کامیاب وکیل کے زیر سایہ پریکٹس کریں گے تو بہت جلد چل نکلیں گے۔ اب ایسے دیوتا جیسے بہنوئی کی بات وہ کیسے اٹھا دیتے۔ سو تعلیم مکمل کرنے کے کچھ برس بعد جب ان کی وکالت چل نکلی تھی اور وہ پوری طرح خود کفیل ہو چکے تھے وہ ایک صورت والی بھی لے آئے۔

کے۔ کے۔ ماما نے قصے کی اس منزل پر آکر ٹھنڈی سانس بھری۔ گرم چائے دوبارہ طلب کی۔ حاضرین کا اشتیاق بڑھا۔ ماما نے ایک ڈرامائی وقفہ لیا تھا۔

وقفے میں ہپن بھائی صاحب نے چھت اکھاڑ قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے:

"یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ صورت والی مسلمنٹی تھیں۔ لیکن ان سے سابقہ کہاں، کیسے، پڑا یہ تو ماما ہی بتائیں گے۔"

جواب میں ماما نے گلوری پھر ایک گال سے دوسرے میں ٹھیلی اور پیک کو منہ میں سنبھالا۔

"چائے نہ تھوک کیوں نہیں آتے ہیں..." کسی سامع نے ٹوکا۔

"ابے چپ،" ایک اور سامع سے اسے جواب ملا۔ "چائے آنے دے۔ ماما ذرا فریش ہو جائیں۔"

چائے فوراً ہی آگئی۔ نیرہ بی بی نے سب کے لئے پیالیوں میں انڈیلی اور آنکھیں تریر کر ہپن سے بولیں:

"اس مسلمنٹی پر تو میں تم سے بعد میں نمٹوں گی ذرا پہلے ماما سے قصہ سن لوں۔"

اس پر ہپن نے جواب دیا۔ "تم ہم سے کیا نمٹو گی نیرہ بھابھی؟ کتنا کہا کہ کوئی اپنی جیسی خوبصورت مسلمنٹی ڈھونڈ دو تو نہلا کے دی۔ ہم تو اب تمھیں پہ عاشق ہونے والے ہیں۔ اس سالے انور کی قسمت۔ وہ جو کہہ گئے کوئی استاد کہ پہلوے حور میں..."

نیرہ نے ہپن کی گردن پہ تھوڑی سی گرم چائے چھلکائی: "کمبخت... ہندو بچے کہیں کے..."

گلوری کا ملبہ تھوک کے کلی کرنے کے بعد چائے سڑکتے ہوئے ماما نے داستان کا سرا پھر پکڑا۔ سامعین بھی چائے کی چسکیاں لگا رہے تھے۔

باتیں تو بہت اڑائیں یار دوستوں نے۔ اسے رنڈی منڈی بھی بنا ڈالا۔ لیکن یہ بات قطعی نہیں تھی۔ نہ ہی اس صورت والی کا خاندان کچھ ایسا ہیٹا تھا۔ رہا مسلیٹے مسلمنٹی کا سوال، تو میاں کوئی کہہ دے ان نیرہ بی بی کی صورت دیکھ کر کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ماتھے پہ نہ کوئی ذات لے کے گھومتا ہے نہ مذہب اور میاں ہمارا بس چلے تو ہم دنیا کے سارے مذاہب بین کرادیں۔ انسانوں کے بیچ ان سے زیادہ تفرقہ کسی نے نہیں ڈلوایا...

ماما نے اتنے طیش میں آکے یہ آخر کا جملہ ادا کیا کہ حاضرین ذرا سکتے میں آگئے۔

پھر ماما نارمل ہو گئے جیسے اکثر طیش میں آنے کے بعد لوگ ہو جایا کرتے ہیں۔

پانڈے کے جیجاجی پنڈت اونکار ناتھ مشر ایڈوکیٹ کے پرانے فرماں بردار منشی تھے، منشی رجب علی۔ عمر میں اونکار ناتھ سے تھوڑے بڑے۔ رجب علی کے والد امتیاز علی اونکار ناتھ کے والد کے وقتوں سے گھر میں دخیل تھے۔ زمینیں انھیں کے حوالے تھیں۔ بڑے ہی ایماندار منیجر تھے۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا تھا، سو رجب علی ان کے منشی بن گئے۔ ددا انھیں رجب علی بھائی صاحب کہتیں۔ جب بھی امتیاز علی آتے تو گھونگھٹ کاڑھ کے پیر چھو کے پرنام کرتیں، ہاں ان لوگوں کے گھر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ میاں یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے کے گھر کھائیں نہ کھائیں خلوص ضرور برتتے تھے۔ اب روٹی کا رشتہ تو قائم کیا لیکن دل کے رشتے توڑ لئے۔ تف ہے۔ ماما نے پن ڈبے سے پھر گلوری نکالی۔

پرہیز پکے ہوئے کھانے اور گیلی چیزوں کا تھا۔ سوکھے سامان، پان تمباکو، پھلوں وغیرہ سے عار نہیں تھا۔ سو عید میں رجب علی کے یہاں سے خوان آتا۔ تانبے کی نئی سینی پر سوکھی سویاں لچھے، خشک میوے، شکر اور طرفہ تماشا دودھ خریدنے کے لئے ایک کنارے کچھ نئے کرکرے نوٹ رکھے ہوتے اور سارے لڑکے بالوں کے لئے نام بنام عیدی کے لفافے بھی۔ یہ سارا سامان سینی سمیت ددا کی خدمت میں ہدیہ کیا جاتا۔ ددا ہر بار کہتیں، ارے رجب علی بھائی صاحب۔ پھر نئی سینی! کہا نہ ہمیں آپ کے ان برتنوں سے قطعی پرہیز نہیں جن میں کھانا نہ پکتا ہے نہ کھایا جاتا ہے۔ پرانی لے آیا کیجئے اور پھر واپس بھی لے جایئے۔ مگر رجب علی ایک نہ سنتے۔ ددا منشی رجب علی کے مرنے پر ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔ "ساری سینیاں بھنڈار میں رکھی ہیں۔ جاؤ گنو تو معلوم ہوگا کتنی عیدیں ساتھ گذر گئیں۔"

انھیں رجب علی کی ایک بیوہ بہن تھیں، عمر میں ان سے خاصی بڑی۔ ان بہن کی ایک نواسی تھی۔ اس کی ماں جوانی میں ہی مر گئی تھی۔ باپ نے دوسرا نکاح کرلیا تھا۔ رجب علی بیوہ بہن اور یتیم نواسی کو گھر لے آئے۔ اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی،

اس لئے اسے بہت چاہتے تھے۔ بڑے ارمان سے اس کی شادی کی تھی۔ ددا نے بھی جوڑے باگے بھیجے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد معلوم ہوا جس جس لڑکے سے شادی کی ہے وہ دماغی مریض ہے۔ رجب علی کی قبل از وقت موت کا سبب بھی یہی صدمہ بنا کہ آخر کار اس عزیز نواسی کو خلع دلوانا پڑا۔ لڑکی گھر آ کر بیٹھ گئی۔ ایک چپ سی لگ گئی تھی اسے۔ پہلی مرتبہ اس پر نظر پڑی تو پانڈے کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ لگا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ رجب علی کے انتقال پر وہ ان کے گھر گئے تھے اور لڑکی ان کے سامنے آ گئی تھی۔ رویا رویا چہرہ۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے۔ ان کی اچھی خاصی عمر ہو چلی تھی، بہت سی اچھی صورتیں بھی نظر سے گذری تھیں لیکن یوں انھوں نے دل نہیں ہارا تھا۔

بظاہر رجب علی کی پرانی وفاداریوں کے صلے میں پانڈے نے ان کے گھر آنا جانا بڑھایا۔ تحفے تحائف سے لاد دیا۔ بے چاری رجب علی کی بی بی، سیدھی سادی۔ اوپر سے شوہر کی موت اور اس بچی پر جو گذری تھی اس کے صدمے سے آئے حواس جاتے رہے تھے۔ بہت دن تک وہ کچھ نہ سمجھیں۔ رہیں ددا تو انھیں بسنت کی خبر ہی نہ تھی۔ چونکیں تو پانی سر سے اوپر بہہ رہا تھا۔ ہر ہر... ہر ہر۔

"ارے بھین! یہ کیا سن رہے ہیں؟"

بھین چپ تو چپ۔

"ارے تو بولتا کیوں نہیں۔ یہی ملی تھی؟ ایک تو مسلمان اوپر سے طلاق شدہ؟"

"ارے ہم پتھر سے بات کر رہے ہیں کیا...؟" ددا نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

عشق اچھے اچھوں کی مت پھیر دیتا ہے۔ ددا نے زیادہ ہنگامہ آرائی کی تو پانڈے کو جو کچھ سال پہلے چپ چپاتے بہن کی پسند کے آگے سر جھکا کے سات پھیرے لے آئے تھے منہ کھول کے بولنا پڑا۔ اگرچہ بولے نہایت رسان سے تھے ددا آپ ماں سمان ہیں۔ اماں زندہ ہوتیں تو اس سے زیادہ احترام ہم ان کا بھی نہ کر پاتے۔ ہم نے آپ کی لاج رکھی۔ آپ ہم سے پوچھے بغیر ہماری زندگی کا فیصلہ کر آئیں، ہم نے سر آنکھوں پہ اٹھایا۔ وہ پٹ رانی ہے۔ رہے گی۔ لیکن یہ ہماری محبت ہے۔ وہ بھی رہے گی۔

ددا گنگ ہو گئیں۔ بھین نے انھیں جواب دیا تھا۔ اس کے آگے تو کچھ کہنے سننے کو رہ ہی نہیں گیا تھا۔ "واہ بھین صاحب واہ۔ بڑے سورما نکلے۔ ایک یہ ہمارے چین بھیا ہیں۔ لڑکی کا مذہب دوسرا نہیں تھا۔ صرف جات دوسری تھی۔ اماں نے ڈانٹ پلائی بس جھٹ سے انھیں کے آنچل تلے آن چھپے۔" ایک نے کہا۔

"شیم! شیم!" مشترکہ نعرہ بلند ہوا۔

"اور پھر ذرا جنریشن گیپ کی بات کرنے والوں کے تو منہ لیپ جا کے۔ لوگ بلاوجہ آج کے لوگوں کو بدنام کرتے ہیں۔ یہ پچھلے کم نہ تھے۔"

چین کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی روتلی صورت دیکھ کے کوئی ان کی مدد کو آگے آیا۔ "اچھا ماما۔ پھر آگے بھی تو کچھ ہوا ہوگا؟"

آگے جو ہوا وہ ددھاتا کا کیا ہوا تھا۔ اس میں ددا، پانڈے اور ان کی مرجا پوروالی کا کوئی دخل نہ تھا۔ جب پانڈے نے صورت والی سے بیاہ کیا، اس وقت ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ یہی کوئی پانچ چھ برس کی۔ ادھر انھوں نے دوسرا بیاہ کیا اور سال کے اندر پٹ سے بیٹا۔ پھر دوسرے برس دوسرا بیٹا۔ اور ادھر تیسری بھی بیٹی۔ اب تو ددا سے نہ رہا گیا۔ بدھاوا لے کے گئیں۔ بڑے بڑے خاندانی جھوک بھاوج کو پہنائے۔ بھتیجوں کا منہ دیکھ کے نہال ہو گئیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ان کی حسین و جمیل کم سن ماں نے جھک کر آداب کیا تو بلائیں لیں۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو کہا۔ اس کے ہاتھ سے پان کی گلوری لے کر کھائی۔ (پاندان پانڈے کی وجہ سے سجا رہتا تھا۔)

گھر واپس آ کر ددا نے ست نرائن بھگوان کی کتھا رکھوائی۔ پرشاد لے کر ایک بار پھر اسی غیر مذہب بھاوج کے گھر گئیں۔ صاف صاف تو کچھ نہیں کہہ سکیں بس پرشاد آگے بڑھایا جو اس نے مسکرا کر دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں بڑے احترام کے ساتھ لیا، (کمبخت کیسی خوبصورت ہے ہاتھ تو دیکھو چاندی کے لگتے ہیں ددا نے سوچا) پھر ماتھے پر لگا کے پی گئی۔ ددا بولیں ارے یہ تو بڑی فرماں بردار اور بڑوں کی عزت کرنے والی لڑکی ہے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولیں۔

"بھین کے ساتھ تمھاری جوڑی رام سیتا کی جوڑی لگتی ہے۔ ہم آج سے تمھارا نام جانکی رکھتے ہیں۔ معلوم ہے سیتا میا کا دوسرا نام جانکی تھا؟ بھین کے نام میں یہ نام شامل ہے۔"

روشن آرا مسکرائی۔ (نام میں کیا رکھا ہے کہہ گئے میاں شیکسپیر صدیوں پہلے۔ کچھ ستم ظریفوں نے انھیں پر طبع آزمائی کر ڈالی۔ کہاں ان کا نام تو شیخ پیر دتا)۔

لڑکوں کے نام رکھے گئے تھے عامر اور صابر، ددا نے عامر کو امر اور صابر کو سپر کر دیا۔ اس طرح سب کو خاندان میں شامل کر کے لوٹیں۔ ساری خلیج انھوں نے پل بھر میں پاٹ کے رکھ دی۔ اتنی جلدی تو ہنومان جی کی فوج ہندوستان اور لنکا کو جوڑنے والا پل بھی نہ بنا پائی۔ مگر اس ساری کارروائی کا فال آؤٹ ذرا گڑبڑ تھا۔ جس خاندان والی کو ددا بڑے ارمان سے بیاہ کے لائی تھیں وہ ددا سے خاصی ناراض رہنے لگی۔ میاں یہ ساس نند والے جھگڑے تو ہوتے سب جگہ ہیں۔ لیکن شریف گھرانوں میں ذرا چھپے رہتے ہیں۔

"ہاں صاحب شاہزادی این اور لیڈی ڈائنا میں کبھی نہیں بنی۔"

"واہ صاحب۔ سیدھے انگلستان ہی پہنچ گئے۔ اپنی دیسی صفدر جنگ روڈ کو کیوں بھول رہے ہیں؟"

بات پانڈے سے سیاسی ہستیوں تک آ گئی۔ چائے کے ساتھ مونگ پھلیوں اور غیبت کا دور بہت دیر تک چلا (بقول مشتاق یوسفی یہ دونوں جاڑوں میں بہت مزا دیتی ہیں)۔ خاصی تفریح رہی۔

یہ نشستیں اب بھی ہوتی تھیں لیکن وہ مزا نہیں رہ گیا تھا۔ کے۔ کے۔ ماما محض پچپن سال کی عمر (بقول خود بھری جوانی) میں کینسر کا شکار ہوئے اور دو برس میں چٹ پٹ ہو گئے۔ ان کی کہانی کے ہیرو بھی ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہوئے تھے۔ بس ساٹھ سے کچھ اوپر آئے تھے۔ کوئی چار کہ پانچ برس۔ کسرتی بدن تھا۔ مرنے کے آثار ابھی دور دور تک نہ تھے۔ لگتا تھا اسی پچاسی سے پہلے تو ایک

اینٹ نہیں کھسکنے کی، عمارت کی کون کہے۔ ہاں دو امر چکی تھیں اور لڑکیاں بڑی ہو گئی تھیں اس لئے بیوہ کا دباؤ ان پر بڑھ گیا تھا۔ جاتے بھی تو جلدی چلے آتے۔

لیکن اس مرتبہ گئے تو سارا اگلا پچھلا حساب چکتا کر دیا۔ وہیں مر گئے۔ بس یوں ہی اچانک بیٹھے بیٹھے۔ کے۔ کے۔ ماما تو ہیں نہیں ورنہ کہتے۔ اب میاں نہ کسی پہ دل آنے کا کوئی وقت مقرر ہے، نہ آندھی، شادی اور موت کا۔ کبھی کبھی ایسے اچانک آتی ہیں یہ کہ پوچھئے مت۔ اب دیکھ لیو اچھے بھلے پانڈے گھر میں بیٹھے، اب یہ رسول پور کہاں جا مرے۔ مانا کہ وہاں وہ رہ رہی تھی، ان کی چہیتی بیوی۔ لیکن اس گھڑی نہ جاتے تو شاید مرتے بھی نہیں۔ اور مرتے بیشک لیکن رسول پور میں تو نہ مرتے۔

پانڈے نے جب روشن سے شادی کی ضد کر کے اس کے ناک میں دم کر دیا تھا تو روشن نے ایک دن کہا تھا:

"مگر پنڈت... [وہ پانڈے کو اسی طرح مخاطب کرتی تھیں] تمھارا اور ہمارا مذہب مختلف ہے۔ اوپر سے تم ٹھہرے شادی شدہ، دو بچیوں کے باپ۔ اب تم لاکھ کہو کہ تم ہم پہ زہر کھاتے ہو..."

"مذہب..." پانڈے نے طویل سانس لے کر سر کھجایا تھا۔ "ہاں مذہب تو ہے۔ تم مسلمان ہو ہم ہندو۔ رہی بات ہمارے شادی شدہ ہونے کی تو اسے کیوں درمیان میں لاتی ہو؟ تمھارے مذہب نے تو چار کی اجازت دے رکھی ہے۔"

روشن آرا مسکرائیں۔ "ہندو کے اوپر تو کوئی پابندی سرے سے ہے ہی نہیں۔ چار کر دیا چالیس۔"

پانڈے جھنجھلائے۔ "ارے گورنمنٹ نے لگا دی نہ... ورنہ ہمارے اجداد میں ایک صاحب تھے، ایک ہی گھر سے چار بہنیں ایک کے بعد ایک بیاہ کے لائے۔ پھر وہاں لڑکیوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو ایک کوٹھے والی بھی رکھ لی۔ مگر تم پر تو پابندی نہیں ہے کوئی۔"

روشن آرا نے آنکھیں نکالیں۔ "ہم پر تو ہے۔ ہمارے مردوں پر نہیں ہے۔ بائی دی وے، پنڈت تم ہمیں کیا سمجھتے ہو؟"

"جان پنڈت۔"

"اس خالص ہندو لفظ کے ساتھ اضافت اچھی نہیں لگتی۔ جیسے ہماری تمھاری جوڑی، انمل بے جوڑ۔"

"روشن آرا تم ہم سے پٹ جاؤ گی۔"

روشن آرا یک لخت سنجیدہ ہو گئیں۔ "پٹ تو ہم چکے ہیں۔ زندگی کی بساط پر ایک بے بضاعت مہرے کی طرح۔ پنڈت اب ہم کیا کریں؟" اضطراری طور پر وہ ہاتھ ملنے لگی تھیں۔ ان کے لہجے میں بلا کی بے بسی تھی۔

"کچھ مت کرو بس چپ چاپ ہم سے بیاہ کر لو۔"

"تمھیں مذہب بدلنا پڑے گا۔ ہم کورٹ میرج نہیں کریں گے۔"

"کورٹ میرج تو ویسے بھی نہیں ہو پائے گی۔ گھر پر وہ جو ہے نہ مرجا پور والی۔ اس سے کیسے انکار کریں گے کہ وہ ہماری بیاہتا ہے۔"

"تو ہمیں رکھیل بناؤ گے کیا؟"

اب سنجیدہ ہونے کی باری پانڈے کی تھی۔ جس سے یوں ٹوٹ کر محبت کی اس کی یہ بے حرمتی۔ پل بھر کو وہ گنگ ہو گئے۔

"بولا پنڈت۔" روشن آرا کے لہجے میں ایک قطعی جواب کا اصرار تھا۔

"ہم نکاح کریں گے۔" پانڈے کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"مذہب بدلنا پڑے گا۔ معلوم ہے نہ؟"

"اب وکیل کو تم پڑھاؤ گی روشن آرا بیگم۔ تم ایک عورت جس کے بارے میں بزرگ کہہ گئے کہ اس کی عقل ٹخنے میں ہوتی ہے۔"

"ٹخنے میں کس کی عقل ہے اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ پہلے تم یہ سوچ لو کہ راستہ بڑا سنگلاخ ہے۔ اپنے اجداد کا مذہب چھوڑ کے..."

"ایسی کی تیسی۔" پانڈے نے ہونٹ کاٹے۔

"کس کی ایسی کی تیسی کر رہے ہو۔ مذہب کی یا اجداد کی؟"

"سماج کی۔ جس نے مذہب بنایا۔ مگر ہاں تمھارا مذہب تو آسمان سے اترا ہے۔"

"ابھی ہندو ہو اس لئے جو جی چاہے کہہ لو۔ مسلمان ہو گئے تو بے ادبی کی اجازت نہیں ہو گی۔"

گھر جا کر پانڈے رات کو بیوی کی بغل میں لیٹے تو انھیں نیند نہیں آئی۔ وہ سگریٹ سلگا کر برآمدے میں جا بیٹھے۔ ددا نے انھیں گھر سے جانے نہیں دیا تھا۔ بس بھائی کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے، لوگ باتیں نہ بنائیں، اس لئے شادی کے کچھ عرصے بعد جب وہ کمانے بھی لگے تو اپنے ہی بنگلے کے بغل کی خالی زمین پر بنے نئے کاٹیج نما بنگلے میں انھیں منتقل کر دیا تھا۔ دونوں گھروں کا مشترکہ کمپاؤنڈ تھا۔ ددا کی نگرانی میں تربیت یافتہ مالی کے ہاتھوں باغ کو سنوارا نکھارا گیا۔ ایسے ایسے خوبصورت درخت کہ کچھ کے تو پتے ہی پھولوں سے زیادہ دیدہ زیب لگتے تھے۔ ہوا ان سے ہو کر آتی تو کچھ اور زیادہ فرحت بخش محسوس ہوتی۔ چاند آسمان کے بیچوں بیچ نیلی چھت گیری میں فانوس کی طرح ٹنگا ہوا تھا۔ پانڈے سگریٹ پھونکتے وہاں بیٹھے رہے... مولسری کی خوشبو تمباکو پر حاوی ہو کر کسی سحر کی طرح ان کے گرد و پیش منڈلاتی رہی۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی کہ وہ کرسی سے اٹھ کر ددا کی طرف چل پڑے۔ ایک طرف سفید مسنڈے کے بڑے بڑے جھاڑ کھڑے تھے۔ سنا ہے گوتم بدھ اپنے کسی جنم میں سری لنکا کے جنگلوں میں بھٹک رہے تھے۔ اماوس کی رات تھی۔ ٹٹولتے ٹٹولتے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک قطار در قطار سفید مسنڈے کے جھاڑوں میں چاندنی جیسے پھول کھل اٹھے۔ سارا جنگل روشن ہو گیا۔ یہاں سے وہاں تک چاندنی بکھر گئی۔ چاندنی کی نہیں، پھولوں کی چاندنی۔ تب گوتم بدھ نے مسنڈے کو دعا دی۔ وہ آج تک برقرار ہے اور سارے سال کھلتا ہے۔ پتہ نہیں اس کہانی کا نفسیاتی اثر تھا یا ان پھولوں میں واقعی ایسا کوئی وصف تھا کہ دیکھو تو دل و دماغ میں ٹھنڈک سی اتر جائے۔ کیا یہ گوتم بدھ کی دعا تھی؟ اور کیا گوتم بدھ نے نسل انسانی کے لئے دعا نہیں کی تھی؟ عقل سلیم کی دعا؟ دلوں سے کثافت دور ہونے کی دعا، پیدائشی خباثت سے نجات کی دعا، بڑھاپے، بیماری اور موت کے چکر سے آزاد ہونے کی دعا؟ یہ تو آج بھی اسی طرح انسان کو خوف زدہ کر رہے ہیں، اسی طرح

دلوں میں دہشت بھر رہے ہیں۔ اماں... پیاری اماں...

پانڈے اپنی جواں مرگ خوبصورت ماں کو یاد کرکے آب دیدہ ہو گئے۔ جاتی رات کے اس پہر میں ان کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اماں مر کے کہاں گئی ہوں گی؟ کیا واقعی ویترنی پار کرنی پڑی ہوگی؟ کیا اس جہاں سے آگے اور بھی جہاں ہیں؟ کیا مرنے کے بعد پانڈے اماں سے مل سکیں گے۔ زندہ رہنے کے دوران ہر وقت ننھے جانکی رمن کو کلیجے سے لگا کر رکھنے والی اماں کیا ان کے لئے بے چین ہوتی ہوں گی؟ ہر سال جا کے پنڈ دان کرنے سے کیا واقعی اماں کی آتما کو شانتی ملتی ہوگی؟ آتما؟ آتما کیا ہے؟

(روشن آرا بھی منشی رجب علی کے نام سے فاتحہ پڑھ کے کہتی ہے کہ اس سے ان کی روح کو سکون ملتا ہوگا، اور ثواب بھی۔) گناہ اور ثواب کیا ہیں؟ روشن نے انھیں کبھی پیار نہیں دیا، بس انگلیاں چھونے کی اجازت دی۔ یہ گناہ ہے۔ اس کا جملہ تھا جو تکیہ کلام کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ (ویسے تو روشن بی بی تمھارے عقیدے کے مطابق تمھارا مجھ سے ملنا، یہ عورت مرد کے درمیان کی کشش کو راہ دینا ہی گناہ ہے۔)

کس نے بنائے ہیں یہ گناہ ثواب کے معیار... وہ بے چینی سے تیز تیز چلنے لگے تھے... اگر وہ کلمہ پڑھ کے کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں تو بھی وہ جانکی رمن پانڈے ہی رہیں گے یا کچھ اور ہو جائیں گے؟ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ نہیں، رہیں گے تو وہ وہی۔ اپنے سارے علم و آگہی، وکالت کی موشگافیوں، اپنے جسم، اپنے رنگ روپ، اپنے جذبات و احساسات، اپنے خیالات، اپنی کمینگیوں، خامیوں، اپنی تمام محبتوں کے ساتھ... جانکی رمن پانڈے کے نام میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔

محبتیں..؟ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیوی۔ بیوی کے لئے انھوں نے کسی ایسے لگاؤ، جذبات کے ایسے طوفان کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا جیسے روشن آرا کے لئے... دو اور بیٹیاں..؟ کیا ان کے لئے پانڈے کے دل میں محبت صرف اس لئے کم ہو جائے گی (یا ختم ہو جائے گی) کہ وہ اپنے اوپر ایک نیا لیبل چسپاں کر لیں گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے جانکی رمن پانڈے، انھوں نے اپنے آپ کو ڈپٹا، پھر یہ کون سے جھگڑے ہیں، کس کے جھگڑے ہیں؟

اگلے ہفتے انھوں نے روشن آرا سے جا کہا کہ وہ کلمہ پڑھنے کو تیار ہیں۔

"مگر روشن..." انھوں نے خاموش، جھکی پلکوں اور روشن چہرے والی روشن سے کہا:

"میں وشنو کا بھگت ہوں۔ میں انھیں دل سے نہیں نکال سکوں گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ سارے نام، یہ سارے تصورات مختلف اوقات میں انسانوں نے اپنے بنیادی سوالوں کے جواب میں ڈھونڈے ہیں۔ یہ دنیا کس نے بنائی؟ لوگ مرتے کیوں ہیں، مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ کیا دنیا میں جو ناانصافیاں اور دکھ ہیں ان کی کہیں کوئی تلافی نہیں ہے؟ جنھیں قانون سزا نہیں دے پاتا ان گنہگاروں کو کیا کہیں کوئی سزا ملے گی؟ کیا نیکوکاروں کے لئے کوئی اجر ہے؟ دنیا میں یوں ہی کیا کم ظلم اور گناہ ہیں روشن بیگم.. مذہب نہ ہوتا تو ان کی باڑھ آجاتی۔ مذہب انسانوں میں گھسے شیطانوں کے گرد لچھمن ریکھائیں کھینچتا ہے۔ دکھ میں، کرائسس میں، طاقت اور صبر دیتا ہے۔ امیدیں جگاتا ہے۔

"یہ جو تم بات بات پر انشاء اللہ کہتی ہو... ماشاء اللہ کہہ کر نظر بد سے بچنا چاہتی ہو... وہ جو تمھارا اللہ رحمٰن و رحیم ہے، زندگی کا ضامن ہے اور موت کا بھی۔ میرا وشنو بھی ان سارے خواص سے آراستہ ہے۔ بس ہم نے اسے تین الگ الگ صورتوں میں دیکھا ہے۔ وہ جو تخلیق کرتا ہے، وہ جو پالتا ہے اور وہ جو فنا کرتا ہے۔ یہ تینوں ایک ہی ہستی کے روپ ہیں۔"

وہ مسکرائے، "تمھارا اللہ تو رب العالمین کہلاتا ہے، رب المسلمین نہیں، تو... اس طرح تو وہ میرا بھی ہوا۔ پہلے بھی تھا، ہاں اب اعلانیہ طور پر میرا ہو جائے گا اور اس کے توسط سے میں تمھارا ہاتھ تھاموں گا۔ لیکن جس صورت میں تمھارے اللہ کو میں اب تک پوجتا آیا تھا، آئندہ بھی پوجوں گا تو اسی صورت میں۔"

وہ تھوڑی دیر کو چپ رہے، پھر ذرا آنکھ جھکا کر بولے۔ "اور روشن بیگم... دوسری بات یہ کہ میں اپنی بیوی کو، اپنی بچیوں کو اور دادا کو، کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بیوی جیسی بھی ہے ودھی ودھان سے بیاہی ہوئی بیوی ہے۔ اس کی پشت پر میرا پورا سماج ہے۔ سب کو کسی ایک رشتے پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔"

انھوں نے پھر ذرا توقف کیا، لیکن اس بار ذرا مسکرائے۔ "مسز سمپسن والے کنگ ایڈورڈ کی مثال مت دینا۔ وہ ٹھہرے راجہ، وہ بھی انگلستان کے۔ ہم عام آدمی، جنتا جناردن۔ ہندوستان کے نہایت پیچیدہ ورن آشرم کے شکار۔"

ہاتھوں کے کٹورے میں چہرے کا چاند تھامے، غور سے پانڈے کا لکچر سنتی ہوئی روشن ہنسی، کچھ اذیت بھری ہنسی۔

"پنڈت، میں نے اپنا دل تمھارے حوالے کرتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ تم جانکی رمن پانڈے ہو اور میں روشن آرا۔ جب میں نے ناموں کے اندر چھپے ہوئے فرق کو پہچانا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تمھارا جو جی چاہے کرتے رہنا۔ بس کلمہ پڑھ کے انگلی میں خون لگا لو۔ مجھے نکاح کے علاوہ ساتھ رہنے کی کوئی اور صورت منظور نہیں ہے۔ میں تو تم سے گوشت کھانے تک کو نہیں کہوں گی۔"

پھر وہ کچھ برہمی سے بولی۔ "گائے بیل کا چارہ ڈال دیا کروں گی تمھارے آگے جب تم میرے یہاں آؤ گے۔ تمھاری بیوی کی حق تلفی کی سوچوں تو سور کھاؤں... میرے یہاں آنے کی بات یہ ہے کہ جب چاہو آنا اور اتنے دن ہی رہنا جتنے میں تمھارا امن سکون درہم برہم نہ ہو۔"

اگلے ہفتے دونوں کا نکاح ہو گیا۔ جانکی رمن پانڈے نکاح سے پہلے ایک مسکین صورت ڈرے سہمے مولوی کی موجودگی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نکاح کے وقت روشن کی نانی یعنی رجب علی کی بی بی بہت اداس تھیں اور بے حد پریشان۔ انھیں اپنی پریشانی میں یہ پروا نہیں رہ گئی تھی کہ روشن نے ایک ہندو سے نکاح کیا ہے۔ انھیں رنج یہ تھا کہ وہ اونکار ناتھ کی بہو کو کیا منہ دکھائیں گی، کس منہ سے انھیں عید کی سویاں بھیجیں گی؟ اس خاندان سے اتنے پرانے تعلقات ہیں، انھیں کا گھر رہ گیا تھا سیندھ لگانے کے لئے؟ اب جانکی رمن ٹھہرے مرد، انھیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔ اگرچہ روشن نہ ان کو دیکھتے ہی عاشق ہوئی تھی اور نہ اس نے آنے جانے اور تعلقات پیدا کرنے کے بہانے ڈھونڈے تھے۔ بلکہ ابتدا میں تو وہ جانکی رمن کی آر جار کو نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتی تھی۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے نہایت

تکلیف دہ اور نازک دور سے گذرتی ہوئی لڑکی تھی۔ توجہ اور محبت پا کر ڈھلک پڑی۔ مگر یہ سب کون دیکھتا سنتا ہے اور کون وضاحتیں مانگنے کو دم بھر ٹھہرتا ہے؟ اور واقعی جانکی رمن کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ سب روشن آرا پر پھاند پڑے۔

کلٹا۔ کچھنی۔ پہلے شوہر کو چھوڑ آئی۔ ایسی سندر عورت کو کہیں مرد مارا کرتا ہے؟ آوارہ ہوگی تبھی مار کھاتی تھی۔ اس پر الزام دھر دیا کہ دیوانہ ہے۔ پاس نہیں بھٹکنے دیتی تھی تب ہی تو تین برس میں چوہے کا بچہ بھی نہ جنا اور یہاں ادھر پانڈے سے بیاہ رچایا ادھر بیٹا۔ کیا پتہ پانڈے سے پہلے ہی کی آشنائی ہو (پانڈے کے سات فرشتوں کو بھی تب روشن کے وجود کی خبر نہ تھی)۔ جیسوا۔ دھرم ادھرم کی بھی نہیں سوچی۔ برہمن کا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے۔ سیدھی نرک میں جائے گی۔ ارے نرک میں بھی جگہ نہ ملے گی۔ نہ جانے کیا کیا کھلا رہی ہوگی انہیں پھر ایک دن کچھ دنیا جہان کی سنتے، کچھ خود کہتے، بیوی نے پانڈے سے کہا، ''تم وہاں کھا کے آتے ہو۔ اپنے برتن الگ کرلو۔ یہاں ہمارے برتنوں میں مت کھانا۔''

بیوی سے پانڈے بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ اور تو نہ جانے کس کس طرح اپنا دفاع کیا تھا اور اسے پٹی پڑھائی تھی لیکن کھانے کی بات پر گیتا اٹھا کر لے آئے، اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ ہمارے وہاں رہنے پر بالکل الگ برتنوں میں الگ چولھے پر کھانا پکتا ہے۔ وہ خود ان دنوں گوشت، مچھلی، پیاز لہسن نہیں کھاتیں۔ شدھ ساتوک کھانا ہوتا ہے۔ اس ''وہ'' پر مرجاپور والی کے تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی تھی۔ لیکن پانڈے گیتا پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہوئے ایسے مظلوم، ایسے معصوم اور ایسے سچے لگے کہ اس کے بعد سے اس نے اس 'کھادیہ' 'اکھادیہ' کے مسئلے پر راڑ مچانا چھوڑ دیا۔

کھانے کو تو پانڈے نے قسم کھائی لیکن اس دن سے بہت رنجیدہ رہنے لگے۔ پہلی بار خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے انہیں اس آخری حد سے گذرنا پڑا تھا۔ لگا وہ وکیل نہیں ہیں مجرم کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ رامائن کا وہ سوپان یاد آیا جہاں سیتا اگنی پریکشا سے گذری تھیں۔ وہ بہت دیر دیر تک بیٹھے سوچتے رہتے تھے یہ حلال حرام، کھادیہ، اکھادیہ ہے کیا؟ کوئی گوشت کھائے، کوئی نہ کھائے۔ کوئی گوشت کھاتا ہو تو سور نہ کھائے۔ یا پھر کتا نہ کھائے۔ سبزی تک میں کہیں کہیں پیاز لہسن تک کا پرہیز جیسے خود پانڈے کے اپنے گھر میں۔ ادھر ددا کے لڑکوں نے گھر میں پیاز کے پکوڑے بنوانے شروع کر دیئے تھے۔ ددا کے سسرال میں ان کے جیٹھ کے دو لڑکوں کے گھروں میں اس کھان پان کو لے کر چولھا الگ ہو گیا تھا۔ برسوں کا مشترکہ خاندان بکھر گیا۔

ددا کے جیٹھ بے حد افسردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ ان کے ایک لڑکے نے نہ جانے کس بری سنگت میں گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بیوی کسی نیول آفیسر کی لڑکی تھی اس لئے خاصی ماڈرن تھی۔ اس نے گھر میں ہنگامہ کرنا تو کجا شوہر کی ہمت افزائی کی۔ کھانے میں پیاز لہسن کی تو فراوانی تھی ہی، پہلے چوری چھپے ہوٹل تک بات رہی۔ پھر جب ذرا بیباؤ اور کھلا تو ناشتے دان میں بھر کے مرغا اور بریانی آنے لگے۔ چترویدی برہمن کے یہاں یہ غضب۔ رام رام رام۔ دونوں بھائیوں میں کھل کے جھگڑا ہوا۔ بڑا پرانے خیال کا تھا اور باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی زندگی تک یہ سب نہ ہوتا تو شاید یہ بات اتنی نہ بڑھتی۔ اس نے چھوٹے کا چولھا الگ کرا دیا۔ بڑا سا دو منزلہ مکان دو گھروں میں تقسیم ہو گیا۔ والدین بڑے بیٹے بہو کے ساتھ رہے۔ چولھا الگ ہوا تو ان سب چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر لڑائی ہونے لگی جو پہلے نظر انداز کر دی جاتی تھی۔ ایک دن مذاق ہی مذاق میں خاصا بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ دیور نے بڑی بھاوج سے کہا بھابھی ایک دن مرغے کی ٹانگ چبا کے تو دیکھو۔ مرغا تو کیا آدمی کھانے لگ جاؤ گی۔ بھاوج اتنا چلائیں کہ سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ ایسی راڑ مچی کہ زمین جائداد تک کے بٹوارے کی بات ہونے لگی۔

(بٹوارے کی بات دراصل بہت دن سے بڑے بھائی کی بیوی کے ذہن میں تھی۔ اس کا اچھا موقع مل گیا۔)

انسان کس قدر احمق ہے۔ کب تک رہیں گے بھلا؟

روشن آرا بتا رہی تھیں کہ ان کی اماں کبھی سور کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ''برا'' کہتی تھیں یا پھر ''صورت حرام'' کہتی تھیں سور کا نام لینے سے گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

''اور بی بی روشن آرا تم وہ لوگ ہو جو مرغا، بکرا، گائے بھینس حتیٰ کہ اونٹ گھوڑا سب کھا جاؤ۔ ایک سور کو لے کے اتنا ہنگامہ!''

''ہم تو نہیں کھاتے اونٹ گھوڑے!'' روشن بدک گئیں۔ ''اور سیف تم نے چھڑوا دیا۔''

''حلال ہیں نہ اونٹ گھوڑے۔ اور وہ تمہارے دور کے رشتہ دار جو ہیں بدن میاں... انھوں نے چھ بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہونے پر اونٹ کی قربانی کی تھی۔ تمہارے یہاں بھی تو حصہ بھجوایا تھا۔ لوگ بیٹی پیدا ہونے پر اونٹ کی کیا بکری کی بھی قربانی نہیں دیتے۔ لاکھ تم کہتے رہو کہ اسلام میں عورت کا درجہ بلند ہے لیکن مذہب اور سماجی عقائد میں ٹکراؤ ہر جگہ ہے۔'' پنڈت نے یہ بھی کہا تھا۔

''ہم نے کہاں کھایا وہ اونٹ؟''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ارے حلال ہے نہ! تمہارے دھرم بھائی کھاتے ہیں۔ تم کھاؤ یا مت کھاؤ۔''

''مرغے کی ایک ٹانگ تو تم نے کر رکھی ہے۔ لگتا ہے ریکارڈ پہ سوئی اٹک گئی۔''

''سوئی اس لئے اٹکی کہ تم نے یہ نہیں بتایا تم لوگ سور سے اتنا کیوں بدکتے ہو؟ یاد ہے تم نے وعدہ بھی سور کے نام پر کیا تھا کہ تمہاری بیوی کی حق تلفی کروں تو سور کھاؤں؟''

''شاید اس لئے کہ نہایت غلیظ اور گھناؤنا لگتا ہے۔''

''سو تو ہمیں بھی لگتا ہے۔ اوروں کو بھی لگتا ہوگا۔ تمہاری سائیکی میں اس کی اس قدر منفی جگہ کیسے بن گئی ہے؟ احمق ہیں جو اتنا زیادہ بدکیں۔ بس حرام ہے جیسے گدھا حرام، کتا حرام۔ ویسے شاید وجہ یہ ہو کہ گدھا، کتا کوئی کھاتا نہیں، سور کو لوگ کھاتے ہیں اس لئے ساتھ ساتھ یہ تصور چلا آتا ہوگا۔ تم تو، مگر تم لوگ ناراض ہو کے سور کھانا کہہ کے گالی کیوں دیتے ہو، گدھا کھانا، کتا کھانا کیوں نہیں کہتے؟''

''اس منطق پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ اب تم کرلینا...'' پھر روشن آرا نے آنکھیں نکالیں۔ ''گھر ہی میں فساد کراؤ گے کیا باہر تو بہت کرالئے تم نے۔''

پانڈے کھلکھلا کر ہنسے۔

حال ہی میں ایک فساد ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ کوئی فتنہ پرور مسجد میں گوشت کی پوٹلی پھینک گیا تھا۔ اب وہ گوشت کس کا تھا، یہ تحقیقات تو کسی لیبوریٹری بھیج کر نہیں کی جا سکی لیکن لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ ضرور سور کا گوشت تھا اس لئے کہ مسجد میں پھینکا گیا تھا۔ مشتعل نوجوانوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے میں پانڈے پیش پیش تھے۔ وہ ان دنوں روشن کے پاس رسول پور آئے ہوئے تھے۔

"تم لڑ کر اکثریت سے پار نہیں پا سکو گے۔ تمہاری معمولی سی غلط حرکتیں تمہاری قوم کے بڑے نقصان کا سبب بن جائیں گی۔ صبر سے کام لو اور اتنی ذرا سی بات سے اتنے اشتعال میں مت جاؤ۔"

"یہ ذرا سی بات ہے؟" روشن نے آنکھیں نکالی تھیں۔

"ذرا سی بہ ایں معنی کہ پوٹلی اٹھا کے پھینک دو۔ بالٹیاں بھر بھر کے فرش پاک کر لو، قصہ ختم۔ جو تمہیں چڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں اپنا سا منہ لے کے رہ جائیں گے۔" مگر بڑی دیر لگی یہ سمجھانے میں۔ پانڈے نے خود اٹھا کر پوٹلی لے جا کر کوڑے میں پھینکی۔ امام صاحب کے ہاتھ پیر جوڑے۔ ماحول خاصا گرم ہو چکا تھا لیکن خدا خدا کر کے کوئی بڑا واقعہ ہونے سے ٹالا جا سکا۔

(بڑا واقعہ ہوتا بھی کیسے۔ مسلمانوں میں دم ہے کہیں؟ کچھ بولیں تو تم انھیں مار پیٹ کے ٹھیک کر دو۔ قبرستانوں پہ قبضہ بھی کر وا اور پھر قبرستان بھیجنے کی دھمکی بھی دو۔ پاکستان تو ہم جانے سے رہے۔ روشن کا جملہ تھا۔ بابری مسجد کا معاملہ بھی اس زمانے میں گرم تھا۔ کوئی روشن کے گھر کی دیوار پر بھی لکھ گیا تھا۔ مسلمان کے دو استھان... پاکستان یا قبرستان۔)

روشن بالکل بت بن گئی تھی۔ چہرہ ایسا جیسے گرد و پیش کا قطعی ہوش نہ ہو۔ (اور واقعی رہ بھی نہیں گیا تھا۔) لانبے لانبے بال جو پانڈے نے اس رات کھول کر اپنے شانوں پر بکھیرے تھے اسی طرح بکھرے ہوئے تھے اور تھوڑا الجھ چلے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ابھر آئے تھے۔ آنکھیں جواب بھی روشن اور چمکدار تھیں ان میں کسی نے حیرت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ حیرت اسی انہونی پر کہ یہ کیا ہو گیا؟ ذہن اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ کہیں یہ بچھو بھی ڈنک مار رہا تھا کہ پانڈے اس کے پاس آکر ہی کیوں اس جہاں سے سدھارے؟ (شاید وہ اپنے اصل مقام پر مرے ہوتے تو روشن کو یہ صدمہ ڈنک مارتا رہتا کہ آخر وقت میں ان کا منہ نہیں دیکھ سکی۔) پتہ نہیں وہاں لوگ کیا سوچیں گی۔ اور پھر یہ... دونوں بیٹے یہاں تھے۔ سارے لوگ اکٹھے ہو گئے۔

پانڈے ہر طرف بہت مقبول تھے۔ روشن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگوں سے کیا کہے، کیسے کہے اس کا شوہر مسلمان نہیں ہے اس کا کریا کرم ہندو عقیدے کے مطابق ہونا چاہئے۔ (وہ پورا گاؤں مسلمانوں کا تھا۔ تھوڑے سے برہمن اور راجپوت گھر تھے۔ گاؤں کے کنارے کچھ چماروں کی جھونپڑیاں تھیں۔) مگر پانڈے کو کس خانے میں رکھا جا سکتا تھا؟ کون سے خانے میں؟ کس کے خانے میں؟

عرصہ گذرا ایک رات جب وہ روشن کے انھیں لانبے، سیاہ گھنے بالوں میں انگلیاں پھراتے اس کا سر اپنے سینے سے لگائے نیم دراز تھے تو روشن نے کہا تھا "پنڈت۔ تم کتنے بڑے ریا کار ہو۔ جمعہ کے روز مسجد میں جا کے نماز بھی پڑھ آئے۔ سچ کہنا کیا پڑھا تھا؟ گائتری منتر؟ یا ہنومان چالیسہ؟"

پانڈے ہنسے تھے۔ "ہمیں ساتوں کلمے یاد ہو گئے ہیں اور الحمد بھی۔ بس وہی ہیر پھیر کے پڑھ لئے اور اٹھک بیٹھک بس ویسے ہی کر لی جیسی دوسرے کر رہے تھے۔" پھر وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئے۔ "دو ملاؤں کے بیچ مرغی حرام ہوتے بھی دیکھی ہے؟"

"کیوں، مرگی کہاں سے سوجھ گئی پنڈت! وہ بھی حلال اور حرام۔ کھاؤ گے کیا؟"

"روشن۔" پانڈے اب بھی سنجیدہ تھے۔ "ہم سیدھے سادے ہندو تھے۔ تمہارے چکر میں نقلی مسلمان بنے۔ پھر اصلی ہندو بھی نہ رہے۔ ہم پکے دہریے ہو گئے۔ وہ کیا کہا جاتا تھا، نیچری۔"

روشن نے ایک جھٹکے سے بال پیچھے پھینکے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "واہی تباہی مت بکا کرو۔ جا کر کھانا لگاتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دیکھا کہ پنڈت پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ پھر وہ گیس کے چولہے سے کہنی ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔

"روشن۔ پہلے ہم نے کبھی خدا اور مذہب پر اتنا غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ہم سمجھتے تھے ایک پالن ہار ہے۔ سندھیا آرتی کر کے ہم اس کے تئیں اپنا فرض پورا کر لیتے ہیں۔ آس پاس دوسرے مذاہب پر بڑی نکتہ چینی سی تھی۔ ہمیں بھی لگتا تھا ہمارا مذہب ہی افضل ہے۔ پھر ہم نے دنیا کو بغور دیکھا۔ تم سے ملنے کے بعد تمہارے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلے ہم نرے وکیل تھے قانون چھوڑ کچھ نہیں جانتے تھے۔ مذہب میں دلچسپی پیدا ہوئی تو ہم نے بہت کچھ پڑھا۔ ہسٹری، سوشیالوجی، انتھروپالوجی، مذہب۔ اور روشن اب ہم سارے خانوں اور تہہ خانوں سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔"

"سنو پنڈت۔" روشن نے چنے کی دال بھرے ٹنڈے کڑھائی سے ایک خوبصورت گہری پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔ "ہمارے کسی مذاق کو سنجیدگی مت سمجھا کرو۔ بخدا تمہارے مذہب سے ہم نے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ ہمارے لئے تم صرف تم ہو۔ ایک انسان، جس نے ہمیں بھرپور محبت دی اور تحفظ دیا۔"

"جانتے ہیں روشن۔ اور ہم نے صرف تمہاری صورت سے محبت نہیں کی۔ تمہاری ذہانت، تمہاری بذلہ سنجی، تمہاری گہری سوجھ بوجھ، تمہاری شرافت سے محبت کی ہے۔ ہم نے یہ سب اپنی بیوی میں چاہا تھا نہیں ملا تبھی تمہاری طرف آئے۔"

"مگر ہم تمہیں کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ ہم نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے کہ کائنات کے اسرار و رموز میں، زندگی کے سارے اتار چڑھاؤ نے، موت، بڑھاپے اور دکھ نے۔ ہر دور، ہر مقام اور ہر رنگ و نسل کے انسان میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا کیا جو اس سارے گورکھ دھندے پر قادر ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ ایک ایسی ہستی جو باپ کی طرح شفیق ہے اور ہر اختیار سے بالاتر ہے۔ ایسی ہستی جس سے ہم حق کی حمایت اور جھوٹ کی مخالفت کی امید کرتے ہیں، ایسی ہستی جو ہر وقت جاگتی ہے اور ہر ذی روح پر نظر رکھتی ہے۔ ایسی ہستی جس سے ہم سب کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اس ہستی کو خوش کرنے، اس کے غصے سے بچنے کے لئے پھر ہم نے گناہ ثواب کے اصول بھی گڑھے۔ بنیادی طور پر تو سارے ثواب وہ تھے جن سے کسی کو فائدہ پہنچے اور گناہ وہ جو باعث نقصان ہوں۔"

تھوڑی دیر وہ گیس کے شعلے میں کچھ دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے ہم یہ بھی بھول گئے کہ مختلف خطوں، مختلف وقتوں اور مختلف خیالات کے تحت لوگوں کے تصورات کا مختلف ہونا نہایت فطری تھا جب کہ بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ سارے مذہبی نظام صرف ایک طرف لے جاتے تھے۔ اس قادر مطلق کی طرف جس نے کائنات تخلیق کی اور جو موت و حیات پر قادر ہے۔ ہم نے صرف اسی نظام کو صحیح قرار دیا جس کے پیروکار ہم خود تھے۔ دوسرے جو ہمارے دائرے سے باہر تھے گردن زدنی ٹھہرائے گئے۔ پھر بنیادی گناہ ثواب میں بھی ہم نے ایسی مثالیں نکالیں جن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔"

روشن نے چاولوں کی قاب ٹرے پر رکھی اور بڑے تاسف کے ساتھ کہا: "ان گناہوں میں سے ایک گناہ وہ بھی ہے جس کے مرتکب ہم ہوئے ہیں۔ ایک غیر مذہب کے پیرو سے بیاہ۔ ہمیں پتہ ہے پنڈت تم نے کلمہ صرف اس لئے پڑھا تا کہ نکاح قانوناً جائز ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے روشن۔ لیکن میں بھی ایک خدا میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا سناتن دھرم بھی یہی کہتا ہے۔ اور میں تمہارے پیغمبر کی بڑی عزت بھی کرتا ہوں۔ وہ ایک زبردست انقلابی مصلح تھے۔ ایسی شخصیت دوبارہ پیدا نہیں ہوئی جو دنیا کے لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں مسخر کر لے۔ جو اپنے سماج میں اتنی زبردست مثبت تبدیلیاں لے آئے۔"

"مگر پھر بھی تم مسلمان نہیں ہو۔"

"میں نے کہا نہ، میں اب ہندو بھی نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں۔ مجھے چڑیوں کی چہچہاہٹ میں، پھولوں کی خوشبو میں، خلا کی وسعتوں میں بکھری کہکشاں میں، دریاؤں کے پانی میں، اگتے اور ڈوبتے سورج کے حسن میں خدا کا جلوہ دکھائی پڑتا ہے۔ شاید سورج کی پوجا بھی ہمارے رشیوں منیوں نے اسی لئے کرنی شروع کی تھی اور درختوں اور دریاؤں کی... یہ سب خدا کی قدرت کے مظہر ہیں۔

"اور میں ہر شخص کے لئے اس کے ذاتی عقائد اور مذہب کا حق تسلیم کرتا ہوں۔ وہ جس طرح بھی خدا تک پہنچنا چاہے۔ لیکن مذہب کے نام پر جتنی دیواریں اٹھیں، جتنے ظلم ہوئے شاید کسی اور مسئلے یا سوال پر نہیں ہوئے ہوں گے۔ امریکہ کی دریافت کے بعد اسپینی وہاں پہنچے تو بارود اور چیچک کے ساتھ وہ وہاں کے مول باسیوں کے لئے تحفے میں ایک نیا خدا بھی لے گئے تھے۔ یقیناً ان کو اس خدا کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں دقت ہوئی ہوگی، انھیں وقت لگا ہوگا اپنے اجداد کی روحوں کو بھلانے میں جن کی وہ پوجا کیا کرتے تھے۔ اپنے مقدس بھینسوں کا قتل عام ہوتے دیکھ کر غم زدہ ہونا ترک کرنے میں۔ جرمنی کے قبائل شاہ بلوط کے درختوں کو پوجتے تھے۔ عیسائی مبلغین نے انھیں کٹوا دیا۔

"اور تمہارے یہاں بھی تبلیغ کی بڑی اہمیت ہے، سنتی ہو۔ میرا علم یہ نہیں کہتا کہ اسلام محض تلوار کے زور پر پھیلا۔ لیکن اسلام کے پھیلنے میں اسلامی فتوحات کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ مفتوح قومیں فاتح قوموں کا مذہب اختیار کرنے میں عافیت سمجھتی ہیں۔ فاتح قوموں کے تہذیبی اور مذہبی اثرات رفتہ رفتہ ان پر حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

"اور تم نے بودھوں کو مار مار کے بھگا دیا۔ ان کی عبادت گاہیں مسمار کیں۔ مہاتما بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مان کے انھیں کھا گئے۔ یہ بھی تمہارا ہتھکنڈا تھا بدھ مذہب کو ختم کرنے کا۔" روشن نے جل کے کہا۔ پھر ہنس کے بولی، "لیکن مجھ مسلمان کو گوتم بدھ سے بڑی عقیدت ہے۔ اچھا اب کافی وعظ کہہ چکے۔ گھاس خور۔ چلو کھانا لگا دیا۔"

"روشن بیگم تمہارے مہاتما بدھ نے مورتی پوجا کی شدید مخالفت کی تھی اور سارے کرم کانڈ کی بھی، لیکن ان کے پیروکاروں نے ساری دنیا میں ان کے بت نصب کر دیئے اور وہ سب کچھ کرنے لگے جن کی مخالفت انھوں نے کی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ خدا انسانوں کی ضرورت ہے اور وہ بھی ایسا خدا جو دکھائی دے۔ تمہارے غیر مرئی خدا کی عبادت بڑی مشکل ہے۔ اس کے لئے جس گہری سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے وہ عام انسانوں میں کہاں مل پاتی ہے؟ ہاں ڈنڈا ہاتھ میں ہو تو انسانوں کے جسم اور عقائد دونوں پر کرارے وار کرنے کی سوجھ بوجھ سب میں آ جاتی ہے۔ انسان میں جو احمق شیطان چھپا ہوا ہے اس پر قابو پانا. اب دیکھو نہ بامیان کے عظیم الشان بت کو تمہارے طالبان نے..."

روشن اب کی سنجیدگی سے ناراض ہو گئی۔ "طالبان میرے کیوں؟ اس لئے کہ وہ میرے ہم مذہب ہیں؟ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ان مورتیوں کو افغانستان کے کسی فاتح نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بت شکن کا لقب پانے والے محمود نے بھی نہیں۔ اتنی ترقی ہو چکی لیکن انسان انسان نہ بنے۔ لیکن جو خراب ہے، تنگ نظر ہے، تاریخ کا دشمن ہے، وہ میرا کیوں کہلائے؟"

"ہر مذہب اپنی اصل میں کچھ تھا، پیروکاروں نے اسے کچھ اور بنا دیا۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔" پانڈے نے ہنس کے کہا۔ "ہم مر جائیں گے تو ہماری انتیشٹی کس مذہب کے مطابق ہوگی؟ بھائی ہمیں دفنائے جانے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ قبر میں تمہارے منکر نکیر آ کے پریشان کریں گے وہ الگ۔ تم ہماری الٹی سیدھی جھیل لیتی ہو وہ تو گرز اٹھا کے شروع ہو جائیں گے دے دنا دن۔" روشن ہونٹ دبا کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پانڈے کی زبان کترنی جیسی چالو تھی۔

"اور ہم کبیر بھی نہیں کہ مریں تو ہمارے جسم کی جگہ پھول آ جائیں۔ آدھے تم بانٹ لو اور آدھے ہماری پہلی محل۔"

روشن نے پانڈے کو گھور کے دیکھا۔ باریک سی مسکراہٹ کی لکیر لبوں سے غائب ہو چکی تھی۔

وہ ہنس پڑے۔ "اچھا روشن ایک بات اور بتاؤ۔ یہ سارے معجزے پچھلوں کے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں، جنھیں ہم نے دیکھا جانا نہیں۔ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہوتے؟ آج، اب۔ ویسے ایک اچھی بات تو ہے۔ ہمیں مر کر دوہرا ثواب ملے گا۔ پنڈ دان تو ہوگا ہی۔ تم بھی فاتحہ پڑھ لیا کروگی۔ جیسے اپنی ماں کے لئے پڑھتی ہو اور رجب علی چاچا کے لئے..."

روشن نے تھالی پٹک دی۔ "کھانا سامنے رکھ کر یہ نا شدنی باتیں مت کرو۔"

"روشن ہم تم سے عمر میں بہت بڑے ہیں اس لئے تم سے پہلے ہمارا مرنا تو تقریباً طے ہے۔ تقریباً ہم نے اس لئے لگا دیا کہ شاید تم سے عاجز آ کر

خودکشی کی سوچ لو۔ مگر تم ایسا کروگی نہیں۔ تم ہمیں اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤ گی۔'' انھوں نے اس کے گھنے بال مٹھی میں جکڑ لیئے۔ ''اچھا سچ کہو، کیا کروگی اگر پہلے ہم مر گئے، بولو؟''

''کریں گے کیا؟'' روشن نے اچانک امنڈ آنے والے آنسوؤں کو پی لیا'' اب بھی راضی بہ رضا ہیں۔ تب بھی ویسے ہی رہیں گے۔''

''راضی..... بہ.... رضا'' پانڈے نے تینوں الفاظ کو زور دے کر الگ الگ دہرایا۔'' جاہی بدھی راکھیں رام تاہی بدھی رہیو۔ رام وہی ہیں... وہی ذات اعلیٰ جس کے سر سب کچھ منڈھ کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جاتے ہیں۔ دکھوں کو آسانی سے جھیل لیتے ہیں۔ یہ دشرتھ پتر رام نہیں ہیں۔ یہ ویدوں کے برہمن ہیں۔ کبیر کے رام بھی وہی تھے۔ اور گاندھی کے رام بھی۔ ہم کون سا مذہب اختیار کریں لیبل کچھ لگا دو۔ رہیں گے ہم تو وہی۔ اور بہ حیثیت انسان اپنا فرض بھی نبھائیں گے۔''

وہ اچانک چپ ہو گئے۔ پھر جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''ہم نے اپنی نصف جائداد تمھارے اور تمھارے بیٹوں کے نام کر دی ہے اور نصف دونوں بیٹیوں کے نام۔ رہائشی مکان بیوی کو دے دیا ہے۔''

''پنڈت ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ بس یہاں رسول پور میں رہنے کا ٹھکانا تم نے کر ہی دیا ہے۔ دونوں لڑکوں نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ خود بہت کمائیں گے۔ تم نے انھیں اتنی بڑی دولت دی۔ باہر رکھ کر اعلیٰ اسکول کالجوں میں پڑھایا، اتنا خیال رکھا۔ اب اور کیا دو گے۔ ہمارا سر پھٹنے لگتا ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض اور کمینہ خصلت ہے۔ ایک کمینہ پن ہم نے بھی کیا کہ ایک بے چاری عورت کے شوہر پر قبضہ کر لیا۔''

''وہ عورت ایسی بے چاری بھی نہیں ہے روشن بیگم۔ اسے ہمارا بھرپور ساتھ ملا ہے۔ سماج نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ ہم تمھیں نہ دے سکے اس لئے کہ سماج سے کٹ کے فرد اکیلا ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم تمھارے گناہ گار ہیں۔ تمھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر، مر کر ہم اس گناہ میں اضافہ نہیں کرنا چاہیں گے۔ ہماری دلی خواہش تو یہ ہے مریں تو تمھارے پاس ہوں۔'' روشن نے پانڈے کے منھ پر اپنی ملائم ہتھیلی رکھ دی۔

کے۔ کے۔ ماما ہوتے تو کہتے ارے وہ تو ہمیشہ کا کل جبھا تھا۔ جو بری بات منھ سے نکالتا ضرور پوری ہوتی۔ مگر کے۔ کے۔ تو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اب وہ داستانیں تھیں نہ بیٹھکیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وہ جو نادی ہے اور انت۔ اکھنڈ اور ابھید۔ جس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ جو موت و حیات سے بالاتر ہے۔

دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ کچھ کے سروں پر صیقل کیئے ہوئے پھل چمک رہے تھے۔ لاٹھیوں والے مقامی لوگ تھے۔ الہ آباد سے پانڈے کے تینوں داماد، ان کے ایک رشتہ دار اور ددا کے جیٹھ کے خاندان والے تھے۔ ددا کے دونوں بیٹوں نے خود کو اس جھمیلے سے الگ رکھا تھا۔ روشن کے دونوں بیٹوں نے ماں کے نام پر دی جانے والی گندی گالیوں کو سننے کے بعد دروازہ کھول دیا تھا اور نہتے باہر نکل آئے تھے۔ اندر آنگن میں روشن ہاتھوں پر قرآن بلند کیئے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

تاریخ نے کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ روشن جب کم عمر لڑکی تھی تو اچانک دنگل میں پہلوانوں کے مقابلے میں فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی۔ دوکانداروں نے دھڑا دھڑ دوکانوں کے شٹر گرائے اور سڑکوں پر لوگوں کے بھاگنے کی آوازوں سے روشن آرا کی گلی لرز اٹھی۔ تب روشن کی دادی اسی طرح ہاتھ میں قرآن اٹھائے آنگن میں آ کھڑی ہوئی تھیں اور باآواز بلند تلاوت کرنے لگی تھیں۔ یا مولا مشکل کشا... ملازمہ نے سر ڈھانک کر دعا کے لئے ہاتھ بلند کیئے تھے۔

(حضرت عثمان شہادت کے وقت قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ان کے خون کے چھینٹے اللہ کے کلام کو رنگین بنا گئے۔) جو ہونا ہے وہ ہوتا ہے۔ روشن کے دادا جو فصل اٹھانے گاؤں گئے ہوئے تھے اور اسی دن وہاں سے واپس چلے تھے، راستے میں مار ڈالے گئے۔ شہر کے اندر کچھ نہیں ہوا۔

روشن بے چین ہو کر باہر نکل آئی اور بیٹوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔

''یہ تمھارے رشتے دار ہیں۔ جانکی رمن پانڈے کی اپنی اولادیں۔'' اس نے زور سے چلا کر کہا۔

''پہلے تو اس کلٹا کو ہی مارنا چاہئے۔'' بھیڑ سے کوئی جواباً چلایا۔

''تم لوگ کاغذات لے آؤ۔ امن سکون کے ساتھ ہمارے ساتھ بیٹھو۔ ہم تینوں اس جائداد سے دست بردار ہوتے ہیں جو پنڈت ہمارے نام کر گئے ہیں۔'' روشن کو اچھی طرح یاد تھا۔ ددا کے جیٹھ کے یہاں گوشت کھانے نہ کھانے کو لے کر جو تکرار شروع ہوئی تھی وہ جائداد کے بٹوارے تک پہنچ کر ختم ہوئی تھی۔ لڑکوں کو پیچھے دھکیل کر اس نے یہ جملے بھی پکار کر ادا کیئے۔

کسی انہونی کے خوف سے جیپ لے کر بھاگتے آتے ہوئے بوڑھے اونکارناتھ مشر موقع پر پہنچ گئے۔ ستر سے اوپر ہو چکے تھے اور بیوی کے مرنے کے بعد تقریباً سنیاسی والی کیفیت ان کی ہو گئی تھی۔ دنیا کے سرد و گرم دیکھنے کے بعد لوگوں کے مزاج اور خصلتوں سے پوری واقفیت تو تھی ہی، دنیا کی بے ثباتی بھی دل پر نقش ہو گئی تھی۔ پانڈے کے تینوں داماد لاؤ لشکر لے کر رسول پور کے لئے نکل گئے ہیں۔ پانڈے وہاں مرے تھے اس لئے لوگوں نے باقاعدہ نماز جنازہ پڑھا کر انھیں قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ یہ پکی اطلاع آ چکی تھی۔ مرنے سے پہلے ہی انھوں نے نصف جائداد لڑکوں اور روشن کے نام کر دی تھی یہ بن گن بھی تھی۔ ادھر الیکشن قریب آ رہے تھے۔ رسول پور میں آئی۔ ایس۔ آئی۔ کے ایجنٹوں کے سرگرم ہونے کی افواہ بھی کبھی کبھار کان میں پڑتی ہی تھی۔ سب کچھ ملا جلا کر صورت حال نہایت خطرناک تھی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھے۔

پانڈے کی پہلی بیوی ماتھے پر گھونگھٹ کھینچ کے پاس آ گئیں۔'' بھائی صاحب لڑکوں اور ان کی ماں پر آنچ مت آنے دیجئے گا۔ روشن آرا نے انھیں کبھی ہم سے چھینا نہیں۔ اور لڑکے تو انھیں کا خون ہیں نہ۔ دھرم دوسرا ہونے سے خون نہیں بدل جائے گا۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔'' دامادوں کو ہم کچھ نہ کہہ سکے۔''

اونکارناتھ کو بھی اپنی خشک ویران آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ بیوی کے مرنے کے بعد پہلی بار رونے کو جی چاہا۔ قدرے توقف کے بعد یہ کہتے ہوئے

اٹھ کھڑے ہوئے:

"بھگوان سے مناؤ ہمارے جانے سے پہلے کوئی انرتھ نہ ہو چکا ہو۔"

ان کی مرحومہ بیوی بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔ اور اس مناسبت سے انھوں نے روشن اور لڑکوں کو شرف قبولیت بخشا تھا لیکن خود ان کے بیٹے جانکی رمن کے دامادوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ بیشک وہ ان کے ساتھ نہیں گئے تھے لیکن کچھ بولے بھی نہیں۔ اور اونکار ناتھ کے بھتیجے، وہ تو ساتھ چل بھی دیئے۔ اس وقت انھیں ساری رشتہ داریاں یاد آ گئی تھیں۔

جانکی رمن کی سونے کے دل والی کالی بیوی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ اونکار ناتھ عین وقت پر پہنچ گئے تھے۔ ورنہ واقعی جانے کیا ہو جاتا۔ معاملہ سلجھ گیا۔ زمین جائداد سے روشن دست بردار ہو جائے گی، یہ وعدہ، کچھ شرطیں اور... قبر سے اکھاڑ کر نکالی گئی پانڈے کی لاش لے کر لوگ واپس آ گئے۔

"چھوٹی بہو" اونکار ناتھ کا روشن سے یہ پہلا سابقہ تھا۔ "اجازت دے دو۔" انھوں نے نرمی سے کہا تھا۔

"ورنہ تم تو صرف تین ہو۔ گاؤں میں نہ جانے کتنے ایسے معصوموں کی جانیں جائیں گی جن کا تمھارے اس گورکھ دھندے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ فضا خراب ہے۔ خود کہہ دو کہ اچھا ٹھیک ہے۔ لے جایئے۔ اسی میں خوبصورتی ہے۔ سدبھاؤ بنا رہے گا۔ جن کی مت پلٹ گئی ہو، ہم ان سب سے نہیں لڑ سکتے بیٹا۔"

پنڈت کے جسد خاکی کی ایسی بے حرمتی۔ روشن پچھاڑیں کھانے لگیں۔ کتنا کہا تھا اس نے گاؤں کے لوگوں سے، بیٹوں سے، کہ اسے ان کے گھر الہ آباد پہنچا دیا جائے لیکن لوگ نہیں مانے۔

"چھوٹی بہو۔ مرا ہوا انسان سڑنے کے لئے نہیں چھوڑا جاتا۔ نہ گھر میں نہ سڑک پر۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

لوگوں کے لاش لے جانے کے بعد اونکار ناتھ کچھ دیر وہیں بیٹھ گئے تھے۔ "اب اسے جلاؤ یا دفن کرو۔ وہ تو دنیا سے گیا۔ پنچ تتو پنچ تتو میں مل جاتے ہیں۔ مٹی، مٹی میں؛ آکاش، آکاش میں؛ آگ، آگ میں؛ پانی، پانی میں اور ہوا، ہوا میں۔ جل کے بھی یہی ہوتا ہے اور دفن ہو کے بھی یہی ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ دفن پر یہ عمل سست رفتار کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر لوگ اس بات کو نہیں سمجھیں گے۔ مرنے کے بعد ساری رسمیں صرف زندوں کو تسلی کے لئے ہیں۔ ہم تو معمولی آدمی ہیں۔ ہم کیا کہیں مگر رشیوں منیوں نے شریر کو چولا قرار دیا ہے جسے آتما بدلتی رہتی ہے۔ آتما جو اجرا اور امر ہے۔ یہ مانیں تو دفن کئے جا چکے آدمی کو اکھاڑنے کی کہیں سے منطق نہیں بنتی بیٹا۔ مگر ہم کیا کریں۔ بھگوان کو بھی مورکھوں سے خاص پیار ہے اسی لئے اس نے مورکھ اتنی بڑی تعداد میں پیدا کئے۔ صبر کرو۔"

"اونکار بھائی صاحب۔" روشن نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ "دھرتی آپ جیسے دیوتا سمان لوگوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ اتنی مہربانی کیجئے۔ ہمیں الہ آباد لے چلئے۔ کسی جگہ رکھ دیجئے گا۔ ہمارے کچھ رشتے دار ابھی ہیں وہاں۔ اگرچہ سب نے ناتا توڑ لیا تھا۔ رجب علی نانا تو چلے ہی گئے تھے اب نانی بھی نہیں رہیں۔" وہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

سکون کے ساتھ بہتی گنگا کے کنارے دھو دھو کر جلتی چتا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں لپکتے زرد شعلے۔ آسمان پر اکا دکا بادل تیر رہے تھے۔ سبزے میں چھپے جھینگروں نے شور مچا رکھا تھا۔ آدمی جن جا چکے تھے۔ لکڑیوں کی تڑتڑاہٹ، مینڈکوں اور جھینگروں اور دریا کی لہروں کی آواز کے باوجود سناٹا... ابدی ازلی اور لامتناہی۔ آگ کی اور بھی کئی ڈھیریاں تھیں جو انسانوں کو کھا رہی تھیں پانچوں عناصر پانچوں عناصر میں تحلیل ہو رہے تھے۔

ندی رے ندی، کتنے لوگوں کو چھکتے دیکھا؟ اس کنارے اور اس کنارے؟ یہاں سے وہاں تک... جہاں سے تیری ابتدا ہے اور جہاں تک تیری انتہا ہے؟

پیڑوں کے جھرمٹ کے پیچھے سے نکل کر وہ سامنے آ گئی۔ ایک طرف کو زمین ذرا سی اونچی تھی۔ پیچھے ایک قطار سے درخت کھڑے تھے۔ سرسبز، شاداب، لازوال۔ وہ اس اونچی زمین پر کھڑی ہو گئی۔ ہلکے پھلکے بدن کی دراز قد گوری (اور اس وقت کاغذ جیسی سفید) عورت۔ ہوا کے جھونکے سے اس کی باریک سفید ساری کا کناری دار آنچل پھڑ پھڑایا۔ اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس پورے منظر پر محیط ہو چکی ہو۔

یہ آدمی جو شعلوں کی نذر ہوا، جس کے گھنے بالوں کو آگ کی لپٹوں نے ایک لمحے، محض ایک لمحے میں چاٹ لیا اور جس کے (بڑھاپے میں بھی) مضبوط سر کو کپال کریا کے لئے لاٹھی مار کر پھوڑا گیا اس کا کون تھا؟ کیوں آئی تھی وہ یہاں شمشان گھاٹ پر جہاں عورتوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے؟ وہ خود کون تھی؟ یہ سارے انسان کون تھے؟ اور کیوں تھے؟ جو قبر کے کیڑوں اور چتا کے شعلوں کو بھلا کر جان لینے اور جان دینے تل جاتے ہیں؟

"کسی بھلاوے میں مت رہنا روشن آرا بیگم۔ یہ دوسری دنیا کا تصور موت کو شکست دینے کی بچکانہ خواہش کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہمارا تمھارا ساتھ اتنا ہی ہے جتنا ہم جئیں گے۔ باقی رہا اگلا جہان۔ تو تمھارا جی چاہے تو ہمارے نام سے بھی فاتحہ پڑھ لیا کرنا۔" پھر وہ شیطنت کے ساتھ مسکرائے تھے۔ "مگر کیا تمھاری فاتحہ پہنچے گی ہم تک؟ ہم کہ ٹھہرے..."

بجھتی چتا کے دھوئیں کی طرح بے کلی نے روشن کے اندر چکر کاٹے۔

"ساری جنتیں، سارے جہنم ہم اسی دنیا میں جھیل لیتے ہیں۔ اور یہ سب ہمارے ہی تخلیق کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے اعمال کے نتیجے۔"

"کس قدر بک بک کرتے ہو پنڈت، بس چپ ہو جاؤ۔" روشن آرا نے چھنگلیا سے آنسو خشک کئے۔

پنڈ دان کے وقت جو منتر پڑھے جائیں گے ان میں شاید یہ الفاظ بھی ہوں گے۔ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ مرنے والا پھر اس دنیا میں لوٹ کر نہ آئے۔ اب تم جاؤ جانکی رمن پانڈے، لوٹ کر نہ آنا۔ ابھی لوگ تیار نہیں ہیں۔

روشن آرا نے ساری کا پھڑپھڑاتا پلو شانوں کے گرد کس کر لپیٹا اور بھاری دل کے ساتھ آہستہ آہستہ چالیس قدم پیچھے ہٹنے لگی ☆☆☆

ذوالفقار احمد تابش

شمارہ ۲۷۹،
اپریل ۲۰۰۴

یہ شور و شر تو پہلے دن سے آدم زاد میں ہے
خرابی کچھ نہ کچھ تو اس کی خاک و باد میں ہے

پہنچ کر اس جگہ اک چپ سی لگ جاتی ہے مجھ کو
مقام اک اس طرح کا بھی مری روداد میں ہے

عجب اک بے کلی سی میرے جسم و جان میں ہے
صفت سیماب کی مجھ پیکر اضداد میں ہے

یہ شیشہ گھر ابھی تک عرصۂ تکمیل میں ہے
یہ خواب خوبصورت معرض ایجاد میں ہے

میں جتنا اٹھ رہا ہوں اور جھکتا جا رہا ہوں
کجی دراصل اول سے مری بنیاد میں ہے

زمانہ یوں نہیں جیسے دکھائی دے رہا ہے
خرابی کوئی ماہ و سال کی تعداد میں ہے

طریق عشق میں کوئی خرابی آ گئی ہے
کوئی بدصورتی اس طرز نو ایجاد میں ہے

یہ نقش خوشنما دراصل نقش عاجزی ہے
کہ اصل حسن تو اندیشۂ بہزاد میں ہے

یہاں جو آ گیا اک بار پھر جاتا نہیں ہے
کشش ایسی کچھ اس شہر ستم ایجاد میں ہے

وہ جو کہتے رہے اس کی گواہی مل رہی ہے
یہ ساری گفتگو ان رفتگاں کی یاد میں ہے

یہ جتنا ہے کہیں اس سے زیادہ بھید میں ہے
طلسم اس دہر کا پوشیدہ ہفت ابعاد میں ہے

ذیشان ساحل

شمارہ ۱۹۳،
اپریل۱۹۹۶

ایک ایسے شہر میں
جہاں ہر صبح
ڈرے ہوئے چہروں کا
نیا جلوس لئے
طلوع ہوتی ہے
بے دھیانی سے چائے کا پانی کیتلی
میں بھرتے ہوئے
سرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی
کتنی بھلی لگتی
ہے
آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے

ہر روز
ہڑتالوں، اندھادھند فائرنگ
اور مایوس لوگوں سے بھری بستی میں
وہ اپنے آپ میں مگن
چاولوں میں نمک ڈالتی رہتی ہے
اور باورچی خانے کی کھڑکی سے
اپنے بھیگے ہاتھ جھٹک جھٹک کے
خوشی
پانی کے قطروں کی طرح
پڑوسیوں میں بانٹتی رہتی ہے
پرندے اس کے فلیٹ پر سے
ہمیشہ کی طرح چہچہاتے ہوئے
گذرتے ہیں

شہر کے خراب حالات کے
باوجود
بہت سے سرمئی اور سفید بادل
اسے چائے کی پیالیوں میں
شکر ڈالتے دیکھتے ہیں
اور شہرِ خموشاں سے چلے جاتے ہیں

ان کے جانے کے بعد ستارے
ایک ایک کر کے
اسے دیکھنا شروع کرتے ہیں
اپنا سارا کام ختم کر کے
سرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی
نیچے دیکھتی ہے
مجھے لکھتا دیکھ کے
سیٹی بجاتی ہے اور
میرے چونکنے پر چھپ جاتی ہے
میرے دوبارہ دیکھنے پر
ہنستی ہے
اور اپنی کھڑکی
اگلی صبح تک کے لئے
شہر کے بارے میں کچھ سوچے بغیر
بند کر دیتی ہے

ہلکی اور بھاری چیزیں

ذیشان ساحل

شمارہ ۱۹۳،
اپریل ۱۹۹۶

ایک گولی
بہت ہلکی ہوتی ہے
گلی کے کونے پر کھڑے لڑکے کی
بندوق سے نکلنے کے بعد
دور فلیٹوں میں
کھڑکی سے نکلے بازو تک پہنچتے پہنچتے
وہ اپنا سارا وزن
اپنی ساری طاقت کھو دیتی ہے
اور بازو میں سوراخ کرنے کے بعد
آگے نہیں بڑھ پاتی۔ وہیں
رہ جاتی ہے

گولی کے بازو میں رہ جانے سے
آدمی کو بہت تکلیف ہوتی ہے
اگر اس گولی کے ساتھ
دو تین گولیاں اور بھی ہوتیں
تو شاید آدمی کو اور زیادہ تکلیف
ہو رہی ہوتی
وہ یہ بات نہیں سوچتا
اور کراہنے لگتا ہے
زیادہ گولیوں سے اس کی موت بھی
واقع ہو سکتی تھی

وہ یہ بات بھی نہیں سوچتا
اور رونے لگتا ہے
گولیوں سے بھی کم وزن رکھنے
والے آنسو
بستر کی چادر اور پروں سے بھرے
تکیے میں
جذب ہو جاتے ہیں
بازو میں اٹکی ہوئی گولی کے خیال سے
وہ یہ بھی نہیں سوچتا
کہ اس کے بہت ہلکے آنسو
تکیے یا چادر پر گرنے کے بجائے
بھاری بندوق پر گرتے رہتے
تو ایک نہ ایک دن
اسے زنگ لگ جاتا
یا پھر اس کی طرف گولی بھیجنے والے
لڑکے کا سخت دل
اس کے آنسو دیکھ کر
موم ہو جاتا

بھاری چیزوں کی جگہ
ہلکی چیزیں لے لیتیں
ہلکی چیزوں کی جگہ
کچھ اور نہ آ پاتا

ذیشان ساحل

شمارہ ۱۹۴،
مئی ۱۹۹۶

پہلی بار جب چوہوں کی تعداد
لوگوں سے زیادہ بڑھ گئی
تو چوہے دان ایجاد ہوا
مگر جب چوہے دان میں لگائی جانے والی
روٹیاں
ناکافی ہوگئیں تو
چوہے مارنے کی دوا دریافت کی گئی
مگر تبدیلی آب وہوا
اور چوہوں کی جسمانی قوت مدافعت
کے باعث
جب چوہے مار دوا بے اثر ہوگئی
تو فیصلہ کیا گیا
کہ جادوئی بانسری والے کی مدد سے
چوہوں کو لے جاکر
سمندر میں غرق کردیا جائے
جب بانسری بجی
اور بانسری والا چوہوں کو لے کر
سمندر کی طرف چلا
تو تھوڑی دور چل کر
چوہے مست ہوگئے اور گانے لگے
وہ گانے لگے
اور بانسری والے کے چاروں طرف
ناچنے لگے
چوہوں کے ناچ گانے سے گھبرا کر
بانسری والے نے
سمندر میں چھلانگ لگادی
اور چوہے دوبارہ شہر لوٹ آئے

اب آخری تدبیر کے طور پر
ایک تربیت یافتہ
کمانڈو بلی کو بلوایا گیا
جس نے دیکھتے ہی دیکھتے
چوہوں کا صفایا کرنا شروع کردیا
بہادر چوہے اس سے مقابلہ
کررہے تھے
مگر کر نہ سکے
وہ ڈر کر بھاگے
اور اپنے بلوں میں جا گھسے
وہ اپنی تعداد میں مزید اضافہ کرنے میں
مشغول ہوگئے
اور کمانڈو بلی اس خوشی میں
اپنے گلے میں گھنٹی باندھ کر
چوہوں کا پیچھا کرنے لگی
گھنٹی کی وجہ سے
گھنٹی کی وجہ سے
چوہوں اور بلی کے لیے
جو مسائل پیدا ہوئے
ان کا ذکر پھر کبھی سہی

ذیشان ساحل

شمارہ ۱۹۳،
مئی ۱۹۹۶

ہم مختلف ہیں
ہمارے سروں کے اوپر
آہستہ آہستہ اڑنے والا آسمان
ہمارے پیروں کے نیچے سے
دھیرے دھیرے کھسکتی زمین
مختلف ہے
ہماری نیلی رگوں میں
دوڑنے والا خون
سرخ نہیں سفید رنگ کا ہے
ہمارے جسموں کی رنگت گندمی نہیں
مسلسل دھوپ اور غصے کی وجہ سے
ہمارے بدن
سیاہ ہو گئے ہیں
خوف کی حالت میں ہمارا دل
ایک منٹ میں
شاید ایک سو بیس دفعہ دھڑکتا ہے
ڈھول کی طرح
دھڑکنے والے اس دل کو بجا بجا کر
ہم اعلان کرتے ہیں
کہ ہم مختلف ہیں
ہمارے آبا و اجداد
براعظم انٹارکٹیکا میں رہتے تھے
صرف اسکیمو ہی
ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی
ہمارے قریبی رشتے دار ہیں
برف کی سلوں سے بنے گھر
اگلو
ہماری آبائی رہائش گاہ
اور پنگوئن ہمارا
قومی پرندہ ہے
ہمارے آس پاس
جب کوئی نہیں ہوتا
پنگوئن کی یاد میں ہم
لڑھک لڑھک کر چلنے لگتے ہیں
اور آنکھیں بند کر کے
قطب شمالی جا پہنچتے ہیں
وہاں جو زبان بولی جاتی ہے
ہماری ترانے اس کے سرد لفظوں سے
بھرے پڑے ہیں

گرم علاقوں میں
کوئی ہماری بات نہیں سمجھتا
اسی لئے جب ہم کہتے ہیں
ہم مختلف ہیں
سب خاموش ہو جاتے ہیں
ہم اپنی بات دہراتے ہیں
اور دہراتے ہی چلے جاتے ہیں
سب ہنستے ہیں اور
ہمیشہ ہنستے ہی رہتے ہیں

ذیشان ساحل

شمارہ ۲۳۶،
اپریل ۲۰۰۰

(۱)

ایسا لگا مجھے کہ محبت کی ایک شام
یہ دل تمھارے دل میں کسی مور کی طرح
کھولے ہوئے پروں کو اتر ہی نہیں سکا

کاپی میں احتیاط سے لکھا ہر ایک لفظ
آنکھوں میں بس تمھاری بکھر ہی نہیں سکا

چلتا رہا اداس ستارہ شمال میں
لیکن مری گلی میں ٹھہر ہی نہیں سکا

اک دائرے میں لوگ تھے، اک دائرے میں پھول
دونوں کو ساتھ ساتھ کوئی کر ہی نہیں سکا

خوابوں کی رہ گذر سے گذرتے ہوئے یہ دل
اک حادثے کے بعد گذر ہی نہیں سکا

(۲)

اے پرندو! کسی شام اڑتے ہوئے
راستے میں اگر وہ نظر آئے تو
گیت بارش کا کوئی سنانا اسے

اے ستارو! یونہی جھلملاتے ہوئے
اس کا چہرہ دریچے میں آجائے تو
بادلوں کو بلا کر دکھانا اسے

اے ہوا! جب اسے نیند آنے لگے
رات اپنے ٹھکانے پر جانے لگے
اس کے چہرے کو چھو کر جگانا اسے

خواب سے جب وہ بیدار ہونے لگے
پھول بالوں میں اپنے پرونے لگے
میرے بارے میں کچھ نہ بتانا اسے

ذیشان ساحل

شمارہ ۲۷۴،
نومبر ۲۰۰۳

بغداد کوئی خط نہیں لکھتا

اور اس کے لکھے گئے
خط کو پڑھے بغیر
ہمیں پتہ نہیں چل پائے گا
کہ اس پر کیا گذر رہی ہے
ہم جان نہیں پائیں گے کہ فوری طور پر
اسے کتنے خیموں، کتنی دواؤں
اور کتنے آنسوؤں کی ضرورت ہے
ایمبولینس کا انتظار کرنے والے
بچوں کو کتنی مسکراہٹیں درکار ہوں گی
پلاسٹک کرسیاں، واشنگ مشین
پرانے برتن اور دریاں
پک اپ میں لے جاتے والے خاندان کیسے روک سکیں گے
اپنی چھتریوں سے گولیوں کی بارش کو

بغداد کیوں نہیں لکھتا کہ
اسے ٹوٹے ہوئے دلوں کو
جوڑنے کے لیے ساری دنیا کا
اسکاچ ٹیپ چاہیے؟
مرنے والوں کی فہرست بنانے کے لیے
خوشبودار رنگین کاغذ
جو چین میں بنا ہو
مردوں کو قبرستان یا اجتماعی قبر تک پہنچانے کے لیے
جاپانی ٹرک

بغداد کوئی خط نہیں لکھتا
کہ وہ ایک جاہل عرب ہے
جس کی زبان مہذب دنیا سمجھنے سے قاصر ہے
وہ خط نہیں لکھتا
کہ اس کے ہاتھ زخمی
اور انگلیاں جھلسی ہوئی ہیں
وہ خط نہیں لکھتا کہ
جدید ایجادات کے معجزے اس کی دسترس سے باہر ہیں
وہ خط نہیں لکھتا کہ اسے کسی کا نام
کسی کا پتہ، کسی کی شکل یاد نہیں
محبت میں ناکام ہو جانے والوں کی طرح
وہ دن رات آنسو بہاتا ہے
اپنے مرحوم بیٹے کے غموں میں پاگل
بوڑھی عورت کی طرح
خود سے باتیں کرتا ہے
کسی جنگ عظیم میں
ولولے اور بہادری کے کارنامے دکھانے والے
ایک سابق سپاہی کی طرح
اپنے سارے تمغے سینے سے لگائے
وہ اپنی پرانی بندوق کو چومتا ہے
چاند کا نشانہ لگاتا ہے
مگر کسی کو خط نہیں لکھتا

راجندر سنگھ بیدی

شمارہ ۲،
جولائی ۱۹۶۶

سونفیے کی خوشبو گاڑھی دھند کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آم کے اس قسم کے بیسیوں پیڑ تھے، جو 'گور پرساد' نام کے اس بنگلے میں لگے ہوئے تھے کتا گھاس اور ڈا لیا وغیرہ سے تو کیا ہوتا موگرے اور گارڈینیا کی خوشبو بھی سونفیے نے دبادی تھی۔ ایسے ہی جیسے لیلا مانک کی جوانی نے مندر کے بھجنوں کی قدر گھٹادی تھی۔

یہ آم کی اس تیز تر خوشبو ہی کی وجہ سے تھا کہ مکندی نے اچھی بھلی بھگوان کی اس لیلا کا نام سونفیا رکھ دیا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ماں کا بیٹا، بنگلے سے فرلانگ بھر ادھر ہی (اپنی) چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ سونفیا اس وقت گھر ہی پر ہے۔ جن مردوں کی ناک کے بالوں میں عورت کی بو کھجلی نہیں ہوتی، وہ تو قرائین ہی سے کہتے تھے... مثلاً یہ کہ سونفیا کا ریلے سائیکل برآمدے میں اپنے اسٹینڈ پر کھڑا ہے اور اس کا پچھلا پہیہ بودھ لوگوں کے تقدیر کے چکر کی طرح اپنے آپ ہی دھرے پہ گھومتا جا رہا ہے۔ اس کے ٹیلی فنکن میں کہیں کرناٹکی سنگیت کا بکرا ذبح ہو رہا ہے اور یا پھر اتر پچھم کی طرف اس کے کمرے کی خس تھوڑی اٹھی ہوئی ہے، البتہ بلائنڈ کھنچے ہوئے...

شام کے پانچ بجے تھے۔ لو ابھی تک زوروں پہ تھی۔ پرماتما تو جیسے اپنا کرم دھرم ہی بھول گیا تھا اور مانس کے بدن پر سے کھال کھینچ کر زمتا سے اسے کسی نمک کی کان میں دھکیل رہا تھا۔ ان گنت باریک باریک سے اگنی بان تھے جو بدن کے پور پور میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ دراصل ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرے تھے جو لو کے ساتھ دریا کی طرف سے اڑ اڑ کر آتے تھے اور جسم میں پیوست ہو ہو جاتے تھے۔ گری لال، مکندی کے دوست نے کہا بھی تھا کہ لو تھم جائے گی تو چلیں گے، لیکن مکندی ڈرتا تھا کہ لو کے تھمتے ہی سونفیا دریا کی طرف نکل جائے گی، جہاں ایسے بھبھا کا سے موسم میں پھر تھوڑی تسکین کی ہوا چلتی ہے۔ دریا کا جوبن ماتا حصہ چھوڑ کر، اس جگہ پر جہاں پانی چھوٹے چھوٹے پوکھروں اور نالیوں میں بٹ جاتا ہے، انسان اور حیوان ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں کتے اپنے علعو، اپنے خصیے اور پیٹ پانی میں ڈبو کر، بڑی بڑی زبانیں باہر لٹکائے ہانپ رہے ہوتے ہیں اور ان میں سے پسینے کے بڑے بڑے قطرے باہر ٹپکتے ہیں۔ لوگ باڑھ سے بچے ہوئے تربوز ریت میں سے نکلوا کر لاتے ہیں اور کسی جبر کے عالم میں خالی ہاتھوں ہی سے انھیں پھاڑ کر بڑے بڑے کھپر بناتے ہوئے اپنے منھ اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ کچھ دور سے دیکھنے پر پتہ ہی نہیں چلتا کہ تربوز کہاں ختم ہوتا ہے اور ان کا منھ کہاں سے شروع؟ پہلے یوں لگتا ہے، جیسے وہ تربوز کھا رہے ہیں، پھر تربوز انھیں کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے، گودا، بیج، منھ سب بے تحاشہ بکھرے ہوئے نیچے بالو میں دھنستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں میں صبر ہوتا ہے، وہ تربوز کو ایسے ہی سر کے نیچے رکھ کر ٹھنڈی میٹھی ریت پہ لیٹ جاتے ہیں اور اپنے نفسانی ہاتھ اس کی گولائیوں پر پھیرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں کی حدت سے تربوز بھی جل اٹھتا ہے۔ پھر وہ نہیں جانتے کہ اسے کھائیں یا پھینک دیں۔ کچھ جذباتی نا کتخدا ایسے ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر لیموں کو مسلتے جاتے ہیں جو کہ لو کا پورا حملہ خود پہ لے کر پہلے تو لال ہو اٹھتا ہے لیکن آخر میں کالا پڑ جاتا ہے۔

لو سے بچنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہوتا ہے البتہ، ایک یہ بھی رسائین کہ آدمی چلتا ہوا خواہ مخواہ سردی محسوس کرنے لگے اور اگر سوچ بچار کی اتنی رسائی نہ ہو تو لو کے تیروں اور دانتوں کو کند اور بے اثر کرنے کے لئے ایسے ہی ہمک ہمک کر اچھل اچھل کر گانے لگے۔

لل لو۔ لل لو۔ لل لو لل لو...

...پھر لو کا کہیں نام و نشان نہیں رہتا، اور نہ انسان، کیونکہ جب تک لو یوگ مایا ہو چکی ہوتی ہے اور بیچارہ انسان یوگی۔

گور پرساد کی باڑیں اور بیلیں سب جھلس چکی تھیں۔ کہیں نام کے لئے اور کوئی پتا ہرا رہ گیا تھا اس دبی ہوئی، نامحسوس مسکراہٹ کی طرح جو دل میں کسی شرارت سے اپنے آپ ہونٹوں پہ چلی آتی ہے۔ گری لال تو پھاٹک کے باہر ہی رک گیا اور کہنے لگا۔ نا بھیا، میں تو نہ جاتا اندر''

''کیوں یار؟'' مکندی نے پوچھا۔ ''کیا مصیبت ہے؟''

گری نے پھاٹک کی طرف اشارہ کیا، جو یوں تو ہرے رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا، لیکن اس پر سفیدے سے پتی ہوئی ایک تختی لگی ہوئی تھی، جس پر کالے حرفوں میں لکھا تھا ''کتے سے بچو۔''

مکندی گری لال کو کیسے بتاتا کہ کتا دراصل جانور نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک احساس ہوتا ہے، جو کثیف ہو کر چار ٹانگوں، ایک دم اور بڑے بڑے جبڑوں کو

پھیلائے ہوئے بھونکتا چلا آتا ہے۔ ایسی بات نہیں، بیچ میں کہیں بدن بھی ہوتا ہے اس کا۔ جیسے وہ اپنے اندر کی وافر صحت سے اجنبی پر یوں پھینک دیتا ہے، جیسے غلیل مٹی کے ڈھیلے کو۔ ایک پل کے لئے مکندی اپنے آپ کو جاہل، بے معنی اور بے وقوف لگا۔ اور کتا...؟ لیکن آخر سمجھ چلی آئی۔ جو نزع میں بھی بے اختیار اور مجبور ہو کر چلی آتی ہے اور سونفیے کی زندہ خوشبو سے گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ سمل کے نرم نرم، سفید سفید، گداز گداز، پری کہانی کی طرح کے گولے پھاٹک کے آہنی کلیمپ میں پھنسے ہوئے تھے۔ مکندی نے ایک ہاتھ سے کلیمپ کو اٹھایا اور دوسرے سے پھاٹک کھولتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم آؤ تو..."

گری لال وہیں رکا، ایک ڈرے ہوئے بچے کی طرح انکار میں سر ہلاتا رہا۔

مکندی نے گری کے گرد ہاتھ ڈالا اور کہنے لگا۔ "کاٹے گا تو میرا ذمہ تمہارے کیا دانت نہیں ہیں...؟" اور پھر وہ ہنس دیا۔

گری لال کو اب تک یقین نہ تھا۔ پچھلی بار جب دت کے مونگرل نے اسے کاٹا تھا تو پورے چودہ ٹیکے لگوانے پڑے تھے۔ نہ صرف پیچھا سوج گیا تھا بلکہ ٹانگ میں بھی ایک طرح کا لنگ سا پیدا ہو گیا تھا، جو کسی علاج سے نہ جا رہا تھا اور جس کے کارن گری کی طبیعت ہمیشہ گری گری سی رہتی تھی۔ اس پہ طرفہ یہ کہ موتی، دت کا مونگرل، اس کا دوست ہو گیا تھا۔ موتی کا رنگ کالا تھا۔ اس لئے صبح کے وقت جب گری لال ہوا خوری کے لئے نکلتا اور موتی اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتا تو ایسے معلوم ہوتا۔ جیسے وہ یدھشٹر ہے اور موتی وہ کالا کتا، جو یدھشٹر کے ساتھ ہمالہ کی بلندیوں پہ چلا گیا تھا، جہاں وہ اور اس کا مالک دونوں برفوں میں گل کر مر گئے تھے۔ مکندی کے مجبور کرنے پہ گری بنگلے کے اندر چلا تو گیا، لیکن اس انداز میں کہ ضرورت پڑے تو بھاگ بھی سکے۔ پھر وہ حیران بھی ہو رہا تھا کہ مکندی اپنی لڑکی سے ملنے آیا ہے تو ساتھ اسے کیوں لے آیا ہے؟ شاید مکندی کے اندر بھی کوئی کتا تھا، جس سے وہ ڈر رہا تھا اور جس سے بچنے کے لئے اسے کسی بھی دوسرے آدمی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ہاں، انسان کو انسان کی ضرورت تو ہے ہی، ورنہ سب مردے اپنے آپ اٹھ کر اپنی اپنی قبر میں جا لیٹیں۔ خود کو وافر لگنے کے باوجود ایک تحیر گری لال کو اندر لئے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی سرریلیسٹ تصویر میں کے مرد کی آنکھوں کی طرح پپوٹوں سے دو دو انچ باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان پہ پیٹ بنا ہوا تھا۔ وہ سونفیا کو دیکھنا، نظروں سے اسے ٹوہنا اور اس کے ساتھ لپٹنا چاہتا تھا۔ سونفیا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہرگز ہرگز خوبصورت نہیں ہے، لیکن اس قدر متناسب اعضا اور بھرپور صحت والی ہے کہ... (یہاں سے تحریر کا عجز شروع ہو جاتا ہے)۔

جن لوگوں نے گورے رنگ پر جان دی ہو، جانتے ہیں کہ اس میں آپ کچے گوشت کے احساس سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن سونفیا کا سا کالا نہ گورا رنگ ہمیشہ تندرستی کا نہ صرف لبالب بلکہ چھلکتا ہوا جام ہوتا ہے، جو مرد کے گوگاں کو دور افتادہ جنوب مشرقی جزائر میں لے جاتا اور وہاں پوری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سونفیا کے ملائم اور چکنے بدن کی تعریف گری لال نے کان پور میں سنی تھی۔ جہاں کے چمڑا رنگنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ سب سے اچھی جلد کون سی ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کنواری چاہنے کے باوجود، قریبی سے قریبی دوست بھی خوبصورت عورت کے سلسلے میں اپنے آپ کو بدل کے طور پہ رکھتے ہیں وہ دیور کہلواتے اور بھابی کہتے ہیں اور جو بھی تھوڑی بہت لذت ہاتھ آئے لے کر چل دیتے ہیں۔ اور اب تو سونفیے کی خوشبو اور بھی تیز اور بوجھل ہو گئی تھی۔ بنگلے کا واحد سمل، ہوا اور لو کے جھونکوں کے ساتھ اپنا رواں چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا خوشبو چھوٹے چھوٹے خواب بن کر چاروں طرف بکھر رہی ہے یا وہ کوئی کنفیٹی ہے جو عشق کو خوش آمدید کہنے کے لئے اوپر کے کسی حکم سے مکندی پہ گرائی جا رہی ہے۔ لیکن پھر لو؟

عشق سے بڑی لو اور کون سی ہوتی ہے؟... دونوں دوست، مکندی اور گری لال اس راستے پہ چلنے لگے جو دو طرفہ ہو کر، بیچ کے سوکھے سڑے باغیچے اور خشک فوارے کو لپیٹ میں لے کر، سامنے کے پورچ میں جا ملتا تھا اور جس پہ لال لال راجستھانی بجری پڑی، جوتوں کے منہ میں کچر پچر کر رہی تھی۔ آخر وہی ہوا۔ مکندی اور گری کی بو پاتے ہی جبرو، سانفیا کا گریٹ ڈین، منہ پھاڑے ہوئے ان کی طرف لپکا۔ کتے کی آواز کتے ہی کی سی ہوتی ہے، لیکن جبرو کی کچھ شیر کی سی تھی۔ چونکہ کتے اور شیر میں کراس ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے جبرو آخر کار کتا ہی تھا۔ وہ دس برس اور جیتا رہتا تو کتا ہی رہتا۔ پلے ہی پیدا کرتا، لیکن اس کے باوجود اسے یوں خوں خوار طریقے سے لپکتے دیکھ کر مکندی اور گری لال وہیں تھم گئے۔ گری تو مکندی کے پیچھے چھپ گیا اور منہ میں استوتر پڑھنے لگا لیکن مکندی ویسے ہی نڈر کھڑا تھا۔ البتہ ہاتھ اس کے بھی صلح کی جھنڈی میں اٹھے ہوئے تھے اور وہ پکار رہا تھا۔ "جبرو، جبرو... جبرو..."

جو لوگ کتے کی نفسیات سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ آپ تھم جائیے تو کتا بھی تھم جاتا ہے اور مشکوک انداز سے دیکھتا ہوا کچھ دور کھڑا بھونکتا رہتا ہے۔ وہ کبھی تو ایک ٹک نو وارد کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف منہ کر کے مالکوں کو کچھ کہتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ بیچ میں وہ اگلے پنجوں کے بل نیچا ہو ہو کر زمین کھدیڑتا، چھوٹی سی جست لیتا، آگے بڑھتا، پیچھے ہٹتا، سر کو چھوٹے بڑے جھٹکے دیتا ہوا مسلسل بھونکتا چلا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہہ رہا ہے "آ بیٹا، ماں کا دودھ پیا ہے تو آ مقابلے پر۔" وہ شہ دیتا ہے اور مات کھاتا ہے۔ لیکن یہ سب برابر والے کی اینڈو کرین گلٹی پہ منحصر ہے اگر اس کی گلٹی جلدی جلدی اور تیز تیز ڈر کے لعاب کو خارج کرنے لگے تو کتا، جس کی سونگھنے کی قوت بے پناہ ہوتی ہے، پہلے معاملے کی تہ پہ پہنچ جاتا ہے اور آخر آدمی کی تہ پر۔

مکندی بالکل نہ ڈرا۔ اس نے ایک نظر اپنے اور پھر گری کے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ کسی چپراسی، بھنگی یا بھک منگے کے تو نہ تھے، جن سے کتے کو خدا واسطے کا بیر ہوتا۔ کمینہ خود چاہے سارا دن کیچڑ اور گندگی میں کودتا پھاندتا پھرے، لیکن سامنے والے کو برابر صاف اور ستھرا دیکھنا چاہتا ہے۔ جو کہ بدمعاشی اور ناانصافی کی انتہا ہے۔ مکندی بدستور "جبرو، جبرو!" پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ جبرو نے کچھ رک کر ایک غیر یقینی انداز سے بھونکا۔ پھر پاس آیا اور مکندی کو سونگھا۔ پیچھے کی طرف دیکھ کر

بھونکا۔ یہی عمل اس نے گری کے پاس پہنچ کر دہرایا۔ قریب ہی تھا کہ گری الٹے پاؤں بھاگ نکلے لیکن مکندی نے مضبوطی کے ساتھ اسے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا اور بولا" سونگھ لینے دے، ایک بار اسے سونگھ لینے دے، گری... ہوسکتا ہے گری کی پتلون کو سونگھنے پہ جبرو کو کچھ دھندلی دھندلی شکلیں نظر آئی ہوں۔" پھر اس نے منہ اٹھا کر گری کی طرف دیکھا۔" کیا یہ وہی ہے؟" بیچ میں مکندی آ گیا۔ اب جبرو دم ہلا رہا تھا اور ادھر ادھر پھر کر ایک عجیب طرح کی بے بس اور گرل آوازیں نکال رہا تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ بھاگتا ہوا لکڑی کے کھمبے کے پاس پہنچ گیا، جس کے اوپر رات کو روشنی کے لئے بتی لگی تھی۔ جب ہی اس نے ٹانگ اٹھائی اور دنیا بھر کے کتوں کی طرح اپنے تناؤ کی تسکین کر لی۔

سامنے، برآمدے میں، سونفیا کی خادمہ جامن کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مکندی آگ بگولا ہوا تھا۔" باندھ کے کیوں نہیں رکھتیں اس باپ کو؟"

جامن ہریانے کے علاقے کی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس کا بدن گٹھا ہوا تھا اور رنگ سیاہی مائل۔ سونفیا نے شاید اسے اپنا رنگ، اپنا بدن اوف سیٹ کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا اور مالش میں اپنی گرمی اس تک منتقل کرنے کے سلسلے میں اسے ٹھنڈائی سردائی وغیرہ پلاتی رہتی تھی مکندی کی بات کے جواب میں جامن شرما دی۔ بھلا شرمانے کی کیا بات تھی اس میں؟ لیکن وہ بچاری عمر کے اس حصے میں تھی، جس میں لڑکی کو کچھ بھی کہیں تو وہ شرما جاتی ہے۔ آپ اسے مونگ کی کہیں تو وہ موٹھ کی سمجھ لیتی ہے اور پھر شرما جاتی ہے۔ آپ پوچھیں۔ تم شرمائیں کس بات سے؟ تو اس کے جواب میں بھی وہ شرما جاتی ہے۔

جامن نے برآمدے میں بید کی دو کرسیاں 'مہمانوں' کے لئے سرکا دیں اور خود مالکن کو اطلاع کرنے کے لئے اندر چلی گئی۔ حالانکہ جبرو کے بھونکنے سے اسے ضرور پتہ چل چکا ہوگا کہ کوئی آیا ہے۔ لیکن کسی بھی لڑکی سے، خاص طور پہ جب کہ وہ جوان ہو، یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ یوں دھڑ سے باہر چلی آئے گی۔ پہلے وہ اپنا آپ ٹھیک ٹھاک کرتی ہے۔ گڑیا کی آنکھ سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی ہوئی وہ اس پر کے ایک ہی مہاسے کو پاؤڈر سے کوستی ہے اور پھر ماس پڑی کالی پنسل کو اٹھا کر ٹھوڑی کے بائیں طرف دیکھنے والے کی آنکھ کی پتلی کے برابر ایک تل سا بناتی، اپنے قاعدے سے بنے ہوئے بالوں میں سے چند ایک کو سرکش کرتی، آخری بار آئینے میں دیکھتی ہے کہ اس کے بدن، اس کے لباس میں رات کا تو کچھ نہیں؟ وہ یہ سب کرتی ہے، چاہے اسے اپنے ملاقاتی سے اس ناخن بھر بھی دلچسپی نہ ہو، جیسے وہ ابھی ابھی تنی کیوریا پالش کرتی آئی ہے۔

جب تک مکندی اور گری لال بیٹھ گئے۔ بالکل ہی... جبھی گری نے مکندی سے پوچھا۔" جبرو نے شروع میں بھی کبھی تمھیں کاٹنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں..." مکندی نے جواب دیا۔

"کیوں؟ کتے تو..."

"بات یہ ہے، جس آدمی نے خود کتا رکھا ہو، اسے دوسرے کا کتا بھی نہیں کاٹتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب، اپنے کتے کی بو اس میں رس بس جاتی ہے نا۔ جس کا ہمیں تمھیں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن کتے کو ہمیشہ چل جاتا ہے۔ پھر وہ دم ہلانے، چاٹنے لگتا ہے کتا ہمیشہ اسے پیار کرتا ہے جس کے پاس کتا ہو۔"

"ہاں۔ تمھارا وہ براؤن ڈاشنڈ، رکی بڑا پیارا کتا ہے۔"

... جبھی سونفیا اپنے لانبے بالوں کا جوڑا بناتی، دونوں ہاتھوں سے اسے دباتی ہوئی باہر آئی۔ وہ یہ کام اندر بھی کر سکتی تھی لیکن شاید وہ یہیں باہر ہی جچتا تھا۔ دونوں بازوؤں کے اٹھنے سے سونفیا کا اصل دکھائی دیتا تھا۔ گرانے سے قبل گری لال اور مکندی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے اور نمستے کی۔

گری لال کا تعارف کراتے ہوئے مکندی نے کہا۔" گری لال میرے دوست ہیں، کانپور میں ایل آئی سی میں کام کرتے ہیں۔"

سونفیا نے سر ہلا دیا اور جان بوجھ کر اپنی آنکھوں میں سے غائب ہو گئی جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتی تھی اور جس سے اس کے کئی کمپلٹ پے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔" بیٹھیے۔"

سونفیا بیس بائیس برس کی ایک کھلے ہاتھ پیر والی لڑکی تھی۔ مطمئن بالذات اس کے اس اطمینان میں فن کتنا تھا اور نیچر کتنی، اس کا اندازہ آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ اس میں کی آگ کا صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا، جتنا کہ بجلی کے تار کو دیکھنے میں، صرف دیکھنے سے اس میں کوئی قوت اور جوش کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش موٹے موٹے اور بھرے پرے تھے، حالانکہ وہ مصور کی تصویر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ وہ اپنی عام حرکت میں بھنگڑا ناچنے والوں کی طرح سے قوت کو اندر کھینچنے کی بجائے باہر پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یا شاید ویسے ہی اس کی صحت عام ہندوستانی لڑکیوں سے اچھی تھی۔ جامن جو دیہاتی خوبصورتی کا اچھا نمونہ تھی، اس کی سامنے یونہی معلوم ہوتی تھی جیسے آم کے سامنے جامن۔ وہ گوری تھی یا گندمی، کچھ بھی اور، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ دھوپ میں ہوتی تو تانبا ہو جاتی، سائے میں ہوتی تو سفید، دریا کے کنارے سانولی اور اپر انڈیا کلب میں سلونی۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود وہ روز صبح مندر ضرور جاتی تھی۔ شاید اس لئے نہیں کہ اس میں اس کی آتما کو شانتی ملتی تھی، بلکہ اس لئے کہ مندر جانے والا آدمی وقت پہ سوتا اور وقت پہ ہی جاگتا ہے، جس سے بدن کی رطوبتیں خشک نہیں ہوتیں اور وہ ہرا بھرا اور شاداب رہتا ہے۔ اندر کا فرجذیر جو جسم کے اعضا کو یکجا اور تر و تازہ رکھتا ہے اچھی طرح سے کام کرتا ہے۔ اسی لئے جب مندر سے، سفید ساری میں ملبوس، سونفیا باہر آتی تو دیوی لگتی اور کلب میں جاتی تو صوفیا لورین۔ اس کی آواز میں سے کئی ریزے، کئی دانے غائب تھے۔ شاید وہ اپنے ارادے سے انھیں غائب کر دیتی تھی۔ بہر حال اس کی آواز میں ایک انگیخت پیدا کرنے والا کھر کھرا پن، ایک انوٹ رکھب سا رہتا تھا جو کبھی مدھم پہ نہ پہنچتا۔ جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں سے مغرور ہو جاتی تھی، ایسے ہی گلے سے بھی۔

جامن نے ایک اور بید کی کرسی سرکا دی، لیکن سونفیا نے بیٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ یونہی کھڑے کھڑے وہ مغائرت کے انداز میں بولی۔" کہیے؟"

مکندی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔" مطلب، یوں تھوڑے

کہتے ہیں؟"

پھر سونفیا نے بازو اٹھا کر اپنے جوڑے میں ایک سوئی کو دبایا اور انگریزی میں روکھے پھیکے انداز سے کہا۔ "میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

مکندی کے اوسان اور بھی خطا ہو گئے۔ گری ساتھ نہ ہوتا تو وہ اسے جوتا بھی مار دیتی تو کوئی پروا نہ تھی۔ لیکن اس وقت... مکندی کو بھی غصہ آیا مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ قدرت میں کتنی بے رحمی تھی۔ جو مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی۔ کاش، وہ اپنے آپ میں مکمل ہوتے... سونفیا نے ہمیشہ اس سے ایسی ہی بے رخی برتی تھی۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ لکھنؤ سے ایل ایل ڈی کر چکا تھا۔ پھر وہ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ پچھلے ہی سال وہ صحت کے مقابلے میں مسٹر لکھنؤ قرار دیا گیا تھا۔ مکندی نے اپنے آپ کو روکا۔ اندر کے جبرو کو تہذیب واخلاق کی ایک موٹی سی زنجیر کے ساتھ باندھ دیا ورنہ اگر کوئی لڑکا بڑھ کر کسی لڑکی سے کہہ دے۔ آپ میرے لئے کر ہی کیا سکتی ہیں تو پھر لڑکی کے پاس کیا رہ جاتا ہے، سوائے اس کے کہ اس کا رنگ پیلا پڑ جائے اور منہ پہ کف لاتے ہوئے وہ اپنے بازو کی سوپ کے ساتھ باہر کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہے۔ چلے جایئے۔ نکل جایئے میرے یہاں سے مصلحت... مکندی نے کہا تو صرف یہ کہ اس دن... آج میں ادھر سے گذر رہا تھا تو سوچا لیلا دیوی ہی کو سلام کرتے چلیں۔ اس دن اپر انڈیا کلب کے فینسی ڈریس میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ بالکل مریہ گونڈ لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ اور پھر دل میں کہا۔ ایک موتیاری، جسے سر پہ چنٹی رکھے ہوئے اس کا چیلک، سر شام ہاتھ سے پکڑ کر ہوٹل میں لے آتا ہے۔ رات بھر وہ کنوارے ایک دوسرے سے لپٹتے، پیار کرتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی بیلو سا انھیں باہر دھکیل دیتی ہے۔ سورج کی روشنی سے پہلے، کیونکہ وہ رات کی شرارتوں کو یاد کرتے ہوئے بہت زیادہ ہنستے اور کھلکھلاتے ہیں...

سونفیا نے کہا بھی تو صرف اتنا... "شکریہ۔"

وہ ٹھنڈی تھی؟ برف کا تودہ؟ پتھر میں بھی تیل ہوتا ہے۔ شاید کسی بو، کسی لمس نے اس کے اندر کی آگ کو نہیں بھڑکایا تھا۔ اتنی لو میں بھی وہ پگھل اور پسیج نہ رہی تھی۔ مکندی نے کچھ اور باتیں کرنے کی کوشش کی۔ ایسی باتیں جن کا جواب لمبا ہو، لیکن سونفیا جانے اختصار کی روح کو پا گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا جواب دیتی، بلکہ ٹکا سا۔ مکندی نے اسے وہ سماں یاد دلایا، جب وہ سفید ساری میں ملبوس نروتم کے مندر سے نکلی تھی اور صبح کے دھندلکے کی طرح سے حسین معلوم ہو رہی تھی اور شانت۔ مندر کی سیڑھیوں پہ کوئی سورداس، اکتارے پہ دلپت لے میں بھیرویں کے سر الاپ رہا تھا... اور دل میں کہا، جب تم سے لپٹنے، تمھیں پکڑنے کی بجائے، تمہارے قدموں پر لوٹنے کو جی چاہتا تھا...

مندر سے لوٹنے والی یوتی سے بات مت کرو، کیونکہ وہ آفاقی ہو چکی ہوتی ہے اس وقت کا انتظار کرو جب ایک بار پھر اس میں مقامیت لوٹ آئے۔

لیکن کیسے؟ سونفیا تو جیسے مندر سے نکلتی ہی نہ تھی۔ مقامیت کو لوٹتی ہی نہ تھی۔ کسی کو سامنے پاتے ہی وہ کہیں دور پہنچ جاتی۔ دریا کے کنارے اس کی سہیلیوں کا جمگھٹ اس کے ارد گرد رہتا تھا اور کلب میں من چلوں کا۔ اور وہ کسی کی پکڑ میں نہ آتی تھی۔ وہ انیک سے ایک ہوتی تو بات بنتی۔ وہ اپنے بدن کو صحت سے بھرتی جا رہی تھی جو کہ اب تک قارون کا خزانہ ہو چکی تھی۔ وہ اس سیدھی سادی حقیقت کو نہ جانتی تھی کہ عورت نام ہے خرچ ہونے کا گھٹنے اور بڑھنے کا۔ مناسب وقت کے بعد خاک وخون میں لت پت ہونے کا ورنہ وہ عورت نہیں رہتی۔ لیونارڈو کا شہ کار ہو کر رہ جاتی ہے۔

یا شاید مکندی اناڑی تھا اور نہیں جانتا تھا کہ لڑکی سے بات کیسے کی جاتی ہے؟ بات کر بھی لی جائے تو آگے کیسے بڑھائی جاتی ہے؟ شرافت سے بات بنتی ہے یا غنڈہ گردی سے؟ اسے صحیح تو ایک طرف، غلط سلط طریقے سے بھی لڑکی کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ غالباً وہ ان مردوں میں سے تھا، جو کسی طرح اپنے چال چلن، کو خراب نہیں ہونے دیتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ بات عورت کو بہت متاثر کرتی ہے۔

جانے سونفیا اس سے اس لئے بات نہیں کرتی کہ وہ خوبصورت تھا اور مسٹر لکھنؤ۔ ایسے آدمی کے بارے میں لڑکی کو یقین ہی نہیں آتا یا پھر اس میں کوئی ایسا جذبہ ہے، جس سے وہ بدصورت اور جنگلی قسم کے آدمی کو ترجیح دیتی ہے۔ کیا اس لئے کہ حسن اور خوبصورتی نرمی اور گداز پن اور مظلومیت اسی کا اجارہ ہیں اور بدصورتی اور کرختگی اور بربریت مرد کا؟

مکندی نے سوچ لیا کہ اب اس کی دوڑ دھوپ سے تو کوئی کام نہیں بنتا۔ گور پرساد ہی کچھ ہو تو ہو۔ بنگلے سے نکلتے وقت جبرو نے منہ اٹھا کر بھی تو نہ دیکھا۔ کہاں وہ شعور دشغب کے زلزلے لے آیا تھا۔ پھاٹک کی طرف بڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سمل نے اپنی پری کہانیاں روک کر ان کے گھٹیا جاسوسی قصے بنا دئے تھے اور انھیں ریلوے کے بک اسٹالوں پہ بیچنا شروع کر دیا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام میں وہ کالے ننز (Nuns) کی طرح سے سفید اور پاکیزہ خیالات کے بجائے کالے بھجنگ، گندے اور فحش دلال ہو گئے تھے۔ آم گلنے سڑنے لگے تھے اور انسان کے کام و دہن نے ذائقے سے منہ موڑتے ہوئے انھیں پیڑ ہی پہ متعفن ہونے کے لئے چھوڑ دیا تھا اور جامن کو اس بات کے لئے مجبور کر دیا تھا کہ وہ جبرو سے مجامعت کرے اور بار بار کرے۔

اس شام اپر انڈیا کلب میں بڑی رونق تھی۔ بمبئی سے کوئی مائم (نقال) چلا آیا تھا جس نے حال ہی میں مغرب کا نہایت کامیاب دورہ کیا تھا۔ ہر دارالخلافے میں اس کی کمانڈ پرفارمنس ہوئی تھیں۔ جو تیقن کی چمک اس کی آنکھوں میں اور خوشحالی کی سرخی گالوں پہ لے آئی تھی۔ اس نے لوگوں کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ صرف مکندی ان سب سے کٹا ایک طرف بیٹھا، گملٹ میں اپنی کچھ دیر پہلے کی ہزیمت کو ڈبو رہا تھا۔ گری لال جان بوجھ کر سٹک گیا تھا۔ ہاں، ہارے ہوئے آدمی کے ساتھ ہمدردی کرو تو برا نہ کرو تو برا۔ اور اسی ہاں اور نہ کے بیچ کا فن نہایت گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ نہ معلوم سونفیا کے سلسلے میں مکندی نے اس کے سامنے کیا کچھ ڈینگیں ماری تھیں، جو...

برج اور شطرنج کھیلنے والے بھی اپنے اپنے کھیل چھوڑ کر تھیٹر کارز میں اس مائم کی نقالی دیکھنے چلے گئے تھے۔ بیرے بے کاری کے عالم میں وسکی، شیری

یارم کی بوتل کے ساتھ خالی گلاس اور سوڈا ٹرے پہ رکھے اور چابی ہاتھ میں لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ آرکسٹرا کا گوانی لیڈر اپنے ریگولیشن سوٹ میں کوئی اذیت سی محسوس کر رہا تھا۔ دن کے مقابلے میں اس وقت گرمی کم تھی کیونکہ لو چلنا بند ہو گئی تھی۔ لیکن اس پر بھی شرابی کے الٹے سانس کی طرح سے بیچ بیچ میں گرم اور متعفن ہوا کا جھونکا چلا آتا تھا، کیونکہ کلب کے نیچے ہی شہر کا گندا نالہ تھا، جس کا پانی کوئی سوڈیڑھ سو گز پرے دریا میں گرتا تھا۔ وہ بار بار اپنا سفید رومال نکال کر اپنا منھ اور اپنی گردن پونچھتا تھا اور پھر، نہ جانے کیوں، اس رومال کو دیکھتا تھا جس پر مٹی اور پسینے کی میل چلی آتی تھی۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کالا رنگ جانے لگا ہے اور کچھ دنوں میں وہ گورا ہو جائے گا۔ پھر وہ جھلا کر ڈبل بیس پر اپنا ہاتھ مار دیتا تھا، جس سے عجیب طرح کی بیزار کر دینے والی آواز نکلتی تھی اکیلا ساز اور وہ بھی بے وقت، بے ہنگم طریقے سے بجے تو ایک اینٹی میوزک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جتنا میوزک سے لطف آتا ہے، اتنی ہی اینٹی میوزک سے بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر سارا سلسلہ ساز اور آہنگ ہی کا ہے نہ۔

شیلو گورنر کے اے ڈی سی کی لڑکی تھی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو گورنر ہی سمجھتی تھی۔ اور یہ تھا بھی ٹھیک کیونکہ بڈھا گورنر جب بھی دورے پر جاتا، شیلو کو اپنے خاص سیلون میں ساتھ لے جاتا تھا اور کسی کو پتہ نہ چلتا تھا کہ کسی گھاتک کو پھانسی کی سزا سے عمر قید میں بدل جانے یا بالکل ہی چھوٹ جانے میں شیلو کا کتنا ہاتھ تھا۔ شیلو کی عمر کوئی تیس ایک برس کی تھی مگر وہ کنواری تھی۔ شادی کے سلسلے میں اس کی عمر ممکن شوہروں کو آزمانے میں گذر گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے اکثر ان کے بڑے باپ کی بیٹی ہونا، زیادہ خوبصورت اور پڑھے لکھے ہونا، ان کی شادی کے منافی ہوتا ہے۔ شیلو یوں کوئی ایسی فلرٹ نہ تھی، لیکن اس وقت، ساز اور آہنگ کے کھیل میں وہ اس کم بخت مائم کے آجانے سے صرف ساز ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے، سدھانت شہر کے چیمبر آف کامرس کے پریذیڈنٹ کے ساتھ وہ ڈانس ناچتی رہی تھی لیکن مائم کے منظر پہ آتے ہی سدھانت نے شیلو کو یوں چھوڑ دیا جیسے انگریزی میں لوگ ہاتھ سے گرم گرم آلو کو چھوڑ دیتے ہیں اور ڈانس کا آہنگ شیلو کے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا۔ کسی لڑکی میں آہنگ شروع ہی نہ ہو تو وہ برسوں کسی تان پرے کی طرح سے گھر میں، یک کھونٹی پہ ٹنگی ہوئی رہ سکتی ہے لیکن اگر وہ شروع ہو جائے یا اسے کوئی چھیڑ دے تو پھر وہ دھن یا ڈانس نمبر کو تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی اور ڈانس کا آہنگ شیو کے تقریباً کنوارے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا۔ جسے وہ کہیں بھی، کیسے بھی جھٹک دینا چاہتی تھی۔

اور سامنے مکندی بیٹھا تھا۔ خوب صورت اور مسٹر لکھنؤ۔

اور اکیلا۔

جانے اکائی عورت کو کیوں ہمیشہ پریشان کرتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ دوئی کی نمائندہ ہے اور اسے بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندسوں میں دو، تین، چار اور ان سے زیادہ کی دلیل ہے۔ اسی لئے جب کہیں کوئی رشتے کی بات چلتی ہے، تو اس کا استمرار دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور وہ فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔ وہ جمع اور ضرب کی قائل... خیر، یہ حساب کی باتیں ہیں۔ شیلو دونوں ہاتھ اٹھا کران سے اپنے سر کے بالوں کو کچھ اور ڈھیلا اور بے ربط کرتی ہوئی مکندی کے پاس چلی آئی۔

"آپ... آپ نہیں دیکھنا چاہتے وہ پینٹو مائم؟"

"نہیں..." مکندی نے سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"مجھے نقل اچھی نہیں لگتی۔"

"اصل اچھی لگتی ہے؟" شیلو نے معنی خیز انداز سے کہا اور پھر اپنے آپ ایک کرسی سرکاتی ہوئی مکندی کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ "مجھے بھی یہ نقل پسند نہیں، زندگی کی نقل..." وہ خفیف سا ہانپ بھی رہی تھی، جیسے اسے حالات پہ کچھ غصہ تھا۔ اس نے بیرے کو آواز دی۔ جو پہلے ہی کہیں بھی، کوئی کام چاہتا تھا۔ وہ بھاگا ہوا آیا، دست بستہ۔ ابھی اس نے مایوس ہو کر ٹرے بار کے کونٹر پر جا رکھی تھی۔ شیلو نے آرڈر دیا۔

"ایک شیری، ڈبل۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی مکندی نے بیرے سے کہا۔ "میرے حساب میں۔"

"نہیں نہیں..." شیلو نے احتجاج کیا اور پھر مکندی کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر بیرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی... "او کے، یورس۔"

اور بیرا یس میڈم، کہہ کر بار کی طرف چل دیا، تیز تیز...

مائم ایک ڈینٹسٹ، دنداں ساز کی نقل اتار رہا تھا۔ پہلے اس نے دور سے مریض، فرضی مریض کو آتے دیکھا اور خوش ہوا کہ گاہک پھنسا۔ اس کے آنے سے پہلے اس نے کرسی ورسی ٹھیک کی۔ ہاتھ سے گرد کو جھاڑا اور جیسے ہی مریض آیا، اس نے مودب طریقے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر ایسے ہی منہ ہلا ہلا کر اس کی دردناک باتیں سنتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ بے چارہ درد کی شدت سے رات بھر نہیں سویا لیکن ٹھیک ہو جائے گا اور اسے ڈینٹسٹ کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ جا کر اس کرسی پر بیٹھ گیا، جب ہی اس نے مریض کو منھ کھولنے کی ہدایت دی۔ مائم چونکہ دنداں ساز بھی خود تھا اور مریض بھی خود ہی، اس نے اپنا منھ کچھ اس طریقے سے کھولا کہ وہ زمانہ یاد آگیا جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا۔ جب دنداں ساز نے غار کی قسم کے اس منھ میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے فرضی بتی کو کھینچ کر مریض کے منھ کے برابر کیا اور روشنی میں اندر جھانکا۔ کیا ہو کا سا اندھیرا ہو گا کہ ڈاکٹر کو منھ میں انگلی ڈال کر مسوڑھوں اور دانتوں کو ٹٹولنا پڑا۔ جبھی وہ فرضی مریض ایک دم ٹیس سے بلبلاتا ہوا دکھائی دیا۔ غالباً دنداں ساز کا ہاتھ اندر ہلتے، جھولتے ہوئے دانت اور اس کے پاس کی کسی ننگی رگ کو جا لگا تھا۔ ہاتھ نکالتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جبکہ وہ شہر کے سب سے بڑے، اور سب سے قابل دنداں ساز کے پاس آگیا ہے، اب اسے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے آنکھوں میں دہشت سمو کر، دو تین بار ہاتھ کی مدد سے بتایا کہ اندر بہت بڑی کیوٹی (cavity) ہے جس میں سے اکبر کے زمانے کا پورا لشکر مع ہاتھی ہودے اور گھوڑے وغیرہ کے گذر سکتا ہے لیکن چتنا کی کوئی بات ہی نہیں۔ جب تک ڈاکٹر

کے مسمریزم کا مریض پہ اثر ہو چکا تھا، لیکن وہ ابھی تک ڈر رہا تھا کہ ڈاکٹر پھر کہیں غلط جگہ پہ انگلی نہ ڈال دے۔ جب ڈینٹسٹ نے ایک پیر سے مشین کا پہیہ گھمایا۔ نہ جانے وہ کس لئے؟ شاید عادتاً۔ پھر اس نے مشین کے اوپر ایک فرضی بوتل سے روئی کے پھوئے نکالے اور ایک کے بعد دوسرا منھ میں ڈالتے ہوئے اس نے دانت اور اس کے نواح کو آلائشوں سے صاف کیا۔ پھر دیکھا، بتی کو اور نزدیک کرتے ہوئے، اور سر ہلا دیا کہ دانت نکالے بغیر گذارہ نہیں۔

مریض نے بھی سر ہلا دیا۔ وہ شاید چاہتا تھا کہ دانت رہ جائے چاہے وہ کتنا ہی کیڑے کا کھایا ہوا کیوں نہ ہو۔

لیکن ڈاکٹر برابر اسے دانت نکالنے کا مشورہ دیتا رہا۔ نمونے کے طور پر وہ دوسروں کے دانت اٹھا لایا اور اسے بتایا کہ یہ دانت تو پھر تمھارے دانت کے مقابلے میں اچھے ہیں اور میں نے ایک جھٹکے سے نکال دیے تمھارا دانت تو بالکل ہی گیا گذرا ہے۔

آخر مریض مان گیا۔ ڈینٹسٹ نے پوری تسلی دی اور چپکے سے اوزاروں کی پلیٹ میں سے زنبور اٹھایا۔ جسے دیکھتے ہی مریض کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ڈینٹسٹ کو پھر اسے تسلی دینا پڑی۔ پچکاری سے دانت اور اس کے نواح کے علاقے کو بے حس اور مردہ کرنا پڑا۔ آخر جب دانت اس کے ارد گرد کا حصہ حتیٰ کہ مریض بھی مردہ ہو گئے تو اس نے زنبور اندر ڈال کر مضبوطی سے دانت کو پکڑا اور ایک دو جھٹکوں ہی سے اسے باہر نکلا دیا۔ اس کے جھٹکوں کے ساتھ مریض اچھلتا، بلبلاتا تھا، لیکن اب وہ ایک طرف ڈاکٹر اور دوسری طرف زنبور کی پکڑ میں تھا۔ وہ کیا کرسکتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا بے چارہ۔ ڈاکٹر بہت خوش تھا اس نے دانت کو آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر سے کوئی پرچھائیں سی گذری جبھی مریض نے منھ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو اسے پتہ چلا۔ ڈاکٹر نے صحیح و سالم دانت کو نکال دیا تھا۔ ٹوٹا ہوا اور کرم خوردہ دانت ابھی وہیں تھا۔ جوں کا توں۔

اب مریض اور ڈاکٹر دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اسی مشین، اسی فرضی کرسی کے ارد گرد۔ اور لوگ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ مائم اس قدر کمینہ تھا کہ مریض اور ڈاکٹر دونوں کی چال اور دونوں کی دوڑ کا، یک دم الگ انگ اور بے حد کامیاب نقشہ کھینچ رہا تھا۔

بیچ میں کہیں سونفیا بھی آ گئی۔ ظاہر ہے کہ تھیٹر کارنر میں جانے سے پہلے وہ کلب ہال ہی میں سے گذر کر آئی ہوگی۔ آج اس نے معمول سے زیادہ دلکش میک اپ کر رکھا تھا اس پر بھی وہ ایسی کھلی ہوئی نہ تھی، جیسی کہ وہ عام طور پر ہوتی تھی۔ کیا وہ آج صبح مندر نہیں گئی تھی؟

مائم نے اپنے پروگرام کی دوسری مد شروع کی جو ایک فرسٹریٹڈ یعنی محروم و مجبور عاشق کے بارے میں تھی۔ سب سے پہلے سدھانت سونفیا کو دیکھ کر مجمع سے باہر چلا آیا۔ پھر رشید علی، کلب کا منیجر، آرکسٹرا کے لوگ چوکنے ہو گئے اور گونی لیڈر اپنی ٹائی کی ناٹ کو کستا ہوا ڈبل جیس کے پیچھے آ بیٹھا۔ بیرا لوگ بھی مستعد ہو گئے۔ پھر ابھینکر نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مجمع میں سے کھینچ لیا اور کشاں کشاں بساط پہ لے آیا بغیر اگلی چال کے لئے بیچارے مائم کے کھیل کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔

سدھانت اور کچھ دوسرے لوگوں نے دیکھا، مکندی اور شیلو وہاں سے غائب تھے۔ مرمر کے میز کی ٹاپ پر دو گلاس خالی پڑے تھے۔ ایش ٹرے میں بہت سی سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے اور ایک طرف دستخط کیا ہوا بل، جس پر پانچ کا ٹپ پڑا ہوا تھا اور جو صدر دروازے سے آنے والی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

کچھ دن بیت گئے۔ مکندی اور گری لال آپس میں ملے اور ایک دوسرے کی کمر میں ٹھوکے دے دے کر ہنستے ہنساتے رہے۔۔

چند لوگوں کو صرف سنیچر کی شام کو چھٹی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ اگلے روز کہیں آنا جانا تو ہوتا نہیں۔ مزے سے آدمی بستر پر پڑا منھ میں پرانی یادوں کی خوبانیاں پھول سکتا ہے اور اس کے ذائقے سے قند مکرر کا لطف اٹھا سکتا ہے، جو قند سے بھی زیادہ لذیذ ہو سکتا ہے۔

سنیچر کی شام کو جب گری لال مکندی کے ہاں شری نواس میں آیا تو دیکھا مکندی کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک لال ہو رہا تھا۔ وہ خوش بھی تھا اور نہیں بھی۔ گری لال نے اس کی وجہ پوچھی تو دیکھا کہ جواب دینے میں مکندی بھی ایکا ایکی اپنی نظروں سے کہیں غائب ہو گیا ہے اور ہر بات کا جواب 'ایں؟' سے شروع کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر پوچھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی بات دہرانی پڑتی ہے۔

بیزار ہو کر گری لال نے مکندی کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ''مکندی بات کیا ہے آخر؟''

''کچھ نہیں...'' پہلے تو مکندی نے کہا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر اپنی کرسی گری لال کے پاس سرکائی اور بولا۔ ''سن یار، ایک عجیب ہی بات ہوئی۔''

اور پھر وہ رک گیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اب بھی بتائے یا نہ بتائے۔

''بڑا کمینہ ہے یار تو۔'' گری لال نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا بات ہے جو تو گری سے چھپائے گا؟''

''بتاتا ہوں۔'' مکندی رازداری کے انداز میں اپنا منھ گری لال کے کان کے پاس کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ، سونفیا...''

''ہاں ہاں، سونفیا؟''

''ہم جتنا اسے برف کا تودہ سمجھ رہے تھے، اتنی ہی وہ آگ نکلی۔''

''سچ؟'' اور گری لال کا چہرہ بھی تمتمانے لگا... اور پھر اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''کہاں، کیسے ہوا یہ سب؟ اسے کیا شیلو اور تمھارے بارے میں پتہ چل گیا تھا؟''

''نہیں...'' مکندی نے جواب دیا ''ہم تو اس کے کلب میں آنے سے پہلے وہاں سے نکل کر دریا کے کنارے چلے گئے تھے۔''

''پھر؟''

''پھر...'' مکندی نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی لمبا چوڑا بیان دینے والا ہے۔ لیکن جب ہی اس کا ڈاشنڈ کتا رکی برآمدے کی طرف سے چلا آیا، جسے مکندی نے گود میں اٹھا لیا اور بھینچ بھینچ کر اس سے پیار کرنے لگا ☆☆☆

راحت حسن

شمارہ ۱۷۸،
نومبر دسمبر ۱۹۹۴

خود سے یوں بھی یہ مسافر نہیں چلنے والا
کاش آئے کوئی تاریخ بدلنے والا

کب سے بیٹھا ہوں بس اک گھونٹ کی حسرت لے کر
تیرا پانی نہیں کیا آج ابلنے والا

اپنے چہرے کو کسی سمت بھی یارو کر لو
اتنی آسانی سے طوفاں نہیں ٹلنے والا

اب جو دیتا ہے ضرورت کا تصور مجھ کو
بھی بچہ تھا کھلونوں پہ مچلنے والا

شان سے بین بجاؤ تو نکلے گا وہ بھی
سانپ ایسے نہیں اس بل سے نکلنے والا

اب کے ہر شعر پہ جھلی سی چڑھی ہے راحت
اب کے بارش میں یہ کاغذ نہیں گلنے والا

راشد جمال فاروقی

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

۱

شناور تم نہیں ہو
میں بھی کب ہوں
تلذذ کے سمندر میں اتر جائیں
چلو۔ آؤ سمندر چند لمحوں بعد
ہم کو خود ہی ساحل پر پٹک دے گا

۲

جھپک جھپک کے پلک
دیکھنے کی کوشش کی
ذرا ذرا کچھ کچھ
دکھائی دینے لگا تھا کہ شام اتر آئی

۳

نئی زمینیں، نئے جزیرے، نئے سمندر
ازل سے سب کو پکارتے ہیں
نئے بدن اجنبی سی خوشبو کی چاہ کوئی نئی نہیں ہے
کہ تم بھی آخر بدل ہی دیتی ہو روز گلدان کے شگوفے

۴

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے
رکشا والے سے حجت کرنی پڑتی ہے
ایک اٹھنی بچ جاتی ہے
یہ آٹھ آنے
خارش کا مرہم لینے میں کام آتے ہیں

اک منظر آسمان پر

ہتھیلی پر مرا چہرہ ٹکا تھا
خلا کو تک رہا تھا
نیلگوں شفاف خالی آسماں
میرے سامنے تھا
یکایک میں نے دیکھا
دوریوں سے
کئی نظمیں ابھرتی آرہی ہیں
کئی غزلیں ابھرتی آرہی ہیں
منظر بدلتے جارہے ہیں
کارواں در کارواں لفظ
آسماں محراب سے ہو کر گذرتے جارہے ہیں

راشد طراز

شمارہ ۱۷۳،
فروری مارچ ۱۹۹۴

وحشت دل، چشم حیراں، خواب صحرا اور میں
اک بساط شوق پر میرا تماشا اور میں

میرے ہاتھوں میں ترا کشکول بھرتا ہی نہیں
قریہ قریہ گھومتے ہیں میرا کاسہ اور میں

ایک ہی صورت کے دو ٹکڑے ہوئے ہوں کیا خبر
شام کو ماتھے پہ وہ پہلا ستارہ اور میں

اس کے حصے میں تو آبادی رہی، ساحل رہا
میرے حصے میں تھا راشد چڑھتا دریا اور میں

شمارہ ۲۵۱،
دسمبر ۲۰۰۱

وہ کیسا ضبط سخن تھا فغاں کے ہوتے ہوئے
خموش رہ گیا طائر زباں کے ہوتے ہوئے

اٹھائے شانوں پہ اپنے عذاب در بدری
میں بے امان رہا آسماں کے ہوتے ہوئے

میں اعتبار نہیں پا سکا اقامت میں
اک اجنبی ہی رہا آشیاں کے ہوتے ہوئے

شگفت حسن سے سرشار ہیں مری یادیں
بہار رہتی ہے مجھ میں خزاں کے ہوتے ہوئے

مجھے بھی غیب سے نسبت تھی بے نیازی میں
میں بے حضور رہا آستاں کے ہوتے ہوئے

ہزار حیف کہ جرأت کے باوجود طراز
بیاں نہ غم ہوا زور بیاں کے ہوتے ہوئے

شمارہ ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

غبار اڑتا ہے گلیوں میں رنگ و بو کیا ہو
لہو سے تر ہوں جب آنکھیں تو جستجو کیا ہو

کچھ اور درد بھی لازم ہے اس بیاں کے لئے
نہا چکے ہیں لہو سے تو پھر وضو کیا ہو

خموش رہ کے تماشائی بننے والوں سے
خلاف جبر و ستم کوئی گفتگو کیا ہو

اب اور اپنی یہ حرمت گنوا نہیں سکتی
ہماری بے زباں فریاد رو برو کیا ہو

اکھڑے ہوئے لوگ

رام لعل

شمارہ ۳۸،
جولائی ۱۹۶۹

آپ جانتے ہیں یہ کتنا بڑا شہر ہے لاکھوں آدمیوں سے بھرا ہوا ایک جنگل ہو جیسے میرے خیال میں اتنے سارے لوگوں میں ایک ہی قدر مشترک ہو سکتی ہے...اجنبیت ایک دوسرے کو نہ جاننے، پہچاننے کی اس شہر کے مشینی دور میں کسی کے پاس اس قسم کے تکلفات کے لئے وقت کہاں ہے؟ بسوں میں، ٹراموں میں، لوکل ٹرینوں میں تھوڑی دیر کا ساتھ اور اس کے بعد پھر دھکے بھیڑ میں آگے پیچھے چل کر راستے میں اپنی اپنی سمت کو اچانک مڑ جانے کے ارادے جو ہر ذہن میں بستے ہیں۔ ہر دل میں موجود رہتے ہیں۔ کسی مرد یا عورت کو اپنی مخالف جنس کا فرد اچھا بھی لگ جاتا ہے تو کوئی کسی کا تعاقب نہیں کرتا۔ نظریں ملاتا ہے نظروں سے ہی تھوڑی دور تک پیچھا کرتا رہتا ہے پھر ایک عجیب سی افسردگی سے سر کو جھٹکا کر یا جھکا کر اپنی سمت کو چل دیتا ہے۔ بڑے شہروں کا اب یہی مقدر ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

اسی بھیڑ میں ایک دن آتم نے کسی کو دیکھ لیا۔ اب یہ نہیں بتاؤں گا آتم کون تھا اور کسی کون تھی بتانے میں کوئی خاص حرج بھی نہیں ہے لیکن بتا دینے سے فائدہ بھی کون بڑا ہے۔ اوہ ہم آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ لیجئے آتم میں ہی تھا اور کسی کوئی ایک لڑکی یہ معلوم کر کے آپ کی دلچسپی میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے تو یونہی سہی مجھے آپ کی خوشی ہی منظور ہے۔

ہاں تو ایک دن آتم نے کسی کو اچانک دیکھ لیا۔ بھیڑ میں دونوں ہوڑا برج پر ایک ہی سمت کو جا رہے تھے۔ شام کے جھٹ پٹے میں۔ آگے پیچھے پیدل چلنے والے اور بھی لاکھوں لوگ تھے دونوں اور کے فٹ پاتھوں پر۔ بیچ بیچ میں موٹریں بھی تھیں بسیں اور ٹرامیں بھی۔ لیکن ان کی روانی کا سلسلہ کسی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ کہیں بیچ میں کسی موٹر کے اچانک لڑ جانے یا خراب ہو جانے کے کارن یعنی دور تک یہ گھر گھراتی، کھڑکھڑاتی ہوئی مشینیں تھمی ہوئی تھیں اور ان کے اندر بھرے ہوئے لوگ کھڑکیوں سے باہر بڑی بے بس نظروں سے تاک رہے تھے۔ چلئے یہ سب تو چلتا ہے۔ روز ہی ہوتا ہے۔ تماشا (میرے آگے۔)

لیکن پیدل چلنے والے برابر بہتے ہوئے سے جا رہے تھے سب کے سب اس کوشش میں مبتلا کہ ہر شخص سے آگے بڑھ کر گھر پہنچنے کے لئے پہلی لوکل ٹرین میں سوار ہو جائیں۔ یعنی پہلی جو بھی لوکل مل جائے۔ لوکل تو ہر دو چار منٹ کے بعد چھوٹتی ہے۔ لیکن بے صبری کی بھی صاحب حد ہو گئی۔

آتم نے کسی کو پہلے اس کی پیٹھ سے پہچانا۔ ایک جوان تندرست پیٹھ تھی وہ اور گردن کے پیچھے ڈھیر سارے بالوں کا خوب صورت جوڑا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اچانک۔ اور قدم بھی تیز ہو گئے۔ یہ آدمی بڑا عجیب جانور ہوتا ہے نا اچھی لگنے والی عورت کو دیکھتے ہی اس کے قریب تر ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے آگے آگے ہوتا ہے تو اپنی رفتار کو سست کر لیتا ہے۔ ہے نا دلچسپ بات تو اس نے قریب ہو کر پہلے اس کے چہرے کو ایک طرف سے تاکا۔ جدھر سے وہ اس کے قریب پہنچا تھا۔ جب یقین ہو گیا وہ سو فی صدی کسی ہی ہے تو اسے دھیرے سے پکار لیا۔ "کسی!"

کسی اپنا نام سن کر حیران رہ گئی۔ اسے حیران ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس کا نام کسی ہی تھا جس نے اسے پکارا تھا وہ آواز جانی پہچانی تھی، بھلے ہی اس نے اس آواز کو برسوں کے بعد سنا ہو۔ پھر آواز تو وہی تھی۔ اس نے اپنا خوب صورت بالوں ڈھکا ہوا سر گھما کر آتم کی طرف دیکھا تو اور بھی حیران ہوئی۔ اگر چہ اس کی آنکھیں ایک عجیب سی خوشی اور بڑے فخر سے چمک اٹھی تھیں بولی۔ "ارے آتم تم بھی کلکتے میں ہو؟"

"ہاں میں تو پچھلے پانچ برسوں سے یہاں ہوں۔ لیکن کیا تم ابھی تک کلکتے میں ہی رہتی ہو؟"

"کیوں، میں کلکتہ چھوڑ کر اور کہاں جاتی؟ یہ تم نے کیسے سوچا؟"

آتم نے پہلے تو شاید کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب وہ یقیناً سوچنے لگا۔ واقعی اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ کسی کلکتے میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس نے یہ بات اچانک اس لئے کہہ ڈالی تھی کہ عام طور پر لڑکیاں بڑی ہو کر دور دور بیاہ دی جاتی ہیں یعنی یہ ضروری نہیں ہوتا وہ وہیں پر رہ جائیں جہاں وہ اپنا بچپن گزارتی ہیں۔ گلیوں میں کھیلتی ہیں۔ اسکولوں و کالجوں میں پڑھتی ہیں اور کبھی کبھی کسی سے محبت بھی کر بیٹھتی ہیں۔ لیکن یہ تو دوسری بات ہے۔ بالکل دوسری جو ہر لڑکی پر پوری نہیں اترتی۔ اس نے چور نظروں سے کسی کے چہرے اور سر کے بالوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں تھی۔ اور مانگ میں سیندور کی دھاری بھی نہیں اور

جوڑے میں کوئی پھول بھی ہرگز نہیں یہ سب دیکھ کر آتم کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اٹھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے یہ بھی سوچ لیا۔ یہ تو بڑی مورکھتا ہوگی اگر میں یہ سوچ کر خوش ہو جاؤں کہ سب ٹھیک ہے ہوسکتا ہے ظاہراً کچھ معلوم نہ ہوسکتا ہو لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ کسی اور کو دیکھ کر اپنا سب کچھ بھول جاتی ہو اس اندیشے نے آتم کی زبان پر جیسے تالا سا لگا دیا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا کسی کو جواب دینے کے لئے اور کسی نے اسے چپ دیکھ کر خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

"میں تو کبھی کہیں اور گئی بھی نہیں۔ یہیں پیدا ہوئی، یہیں بڑی ہوئی اور یہیں ایجوکیشن بھی پائی اور یہیں سروس بھی کر لی۔"

آتم کی جان میں جان آگئی۔ اس نے باقی ساری باتوں کے ساتھ وہ بات نہیں کہی ہے۔ کسی سے محبت کرنے کی بات کہہ بھی کیسے سکتی ہے۔ لیکن کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

"اچھا تو اب تم سروس کر رہی ہو۔ کون سے آفس میں؟" آتم نے ایک آدمی کو اپنے بیچ میں نکل جانے کا موقع دے دیا جو پیچھے سے کتنی دیر سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آما کے جیتے دو بھائی" (مجھے جانے دو بھائی۔)

کسی بھی اس کے ساتھ سٹ کر چلنے لگی۔ ایسا نہ کرتی تو پیچھے سے آتے ہوئے لوگ اچانک ان کو الگ الگ کر دیتے۔ ہائے ری بھیڑ!

"ہاں آتم۔ میں کدر پور ڈاکس (Kidderpore Docks) پر اسٹینو ہوں۔ پورٹ ٹرسٹ کے آفس میں، اور تم کیا کرتے ہو؟"

پیچھے سے آتے ہوئے لوگوں نے واقعی انھیں تھوڑی دیر کے لئے الگ الگ کر دیا۔ لیکن وہ ذرا سی کوشش سے پھر اکٹھے ہو گئے یعنی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"میں اسٹاک ایکسچینج کی مین بلڈنگ میں شفٹ مکینک ہوں۔ یاد ہے جب تم آسنسول آئی تھیں تب میں آئی ٹی آئی میں ٹریننگ پا رہا تھا۔ تم لوگ میری بڑی بہن کی شادی میں شریک ہونے آئے تھے وہاں۔"

"ہاں خوب یاد ہے آتم وہاں میرے پتاجی نے جائداد کے بٹوارے کے لئے تمھارے پتاجی کے ساتھ بڑا جھگڑا بھی کیا تھا۔ پر ذرا دھیرے دھیرے چلو دیکھو میں پیچھے رہ جاتی ہوں۔"

"اچھا۔ ہاں کسی مجھے اس جھگڑے کی بات یاد تو ہے اور میں اداس بھی بہت رہا ہوں کیوں کہ اسی وجہ سے ہم لوگ اس کے بعد کبھی نہیں مل سکے۔ آخر ہمارے ماں باپ نے ذرا سی بات کے لئے اتنا بڑا جھگڑا کیا کیوں؟"

"آتم اس بھیڑ میں تمھارے ساتھ بات کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑلو نا پیچھے سے لوگ دھکا لگا دیتے ہیں تو ہم کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں تم نے ابھی ابھی کیا کہا؟"

"میں نے کہا آخر میرے پتاجی اور تمھارے پتاجی نے ذرا سی بات کے لئے اتنا بڑا جھگڑا کیا کیوں تھا؟ کیا یہ ضروری بھی تھا وہ لوگ تو ایک دوسرے سے ایسے روٹھے کہ پھر مل بھی نہ پائے۔ جب میرے پتاجی چل بسے تو اس اوسر پر تمھارے پتاجی نے وہاں آنا تو ایک طرف ذرا سا خط لکھنا بھی پسند نہ کیا۔"

"آتم مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔ لیکن تم جانتے ہو میں تب کتنی چھوٹی تھی تمھیں کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں تھا نہ۔"

"نہیں کسی، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو تمھارے پتاجی کی بات کر رہا تھا۔"

"آتم دیکھو پیچھے سے کتنا تیز ریلا آرہا ہے شور بھی بڑھ گیا ہے۔ پتہ نہیں تم نے کیا کہا؟"

"کسی، ہم اسٹیشن کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن وہاں تو اور بھی بھیڑ ہوگی۔ کہیں بیٹھ کر چائے ہی پئیں گے اور اطمینان سے باتیں بھی کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی چاہ رہی تھی۔"

"آتم نے کسی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا اسے باہر نکال کر لے گیا۔ لیکن اس کوشش میں کسی کا آنچل کندھے سے کھنچ گیا۔ اس کے بالوں کا جوڑا بھی کھل کر بکھر گیا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال اس کے کندھوں پر جھول جھول گئے۔ کسی نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر پھر سے جوڑا باندھ لیا جب وہ ایسا کر رہی تھی آتم اس کی طرف بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کسی اب کتنی بڑی ہوگئی ہے پوری عورت ہی لگتی ہے باپ رے باپ!

اسے اپنی طرف اس طرح گھورتا پا کر کسی کا چہرہ بھی لال ہوگیا۔ کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہ بول سکا۔ چپ چپ سے ریسٹوران کے اندر گئے۔ لیکن وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ کسی کسی میز پر دو دو کرسیاں خالی تھیں بھی تو وہاں انھوں نے دوسروں کے سامنے بیٹھ کر بات کرنا پسند نہ کیا۔ اس معاملہ میں دونوں کا ایک خاموش سا ہی اتفاق تھا۔ دونوں واش بیسن کے سامنے جا کر کھڑے ہوگئے۔ آئینے میں دونوں نے ایک دوسرے کا عکس دیکھا اور مسکرا دئے۔ آتم نے کسی کے لئے پانی کا ٹیپ کھول دیا پہلے کسی نے منہ ہاتھ دھوئے اس کے بعد آتم نے۔ اب دونوں کے چہرے گرد اور پسینے سے صاف ہوگئے۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک میں بھی ایک نئی تازگی آگئی۔

باہر آکر وہ ایک نان ویجی ٹیرین ریسٹوران میں گئے۔ وہاں بھی بھیڑ تھی۔ باہر کافی کے اسٹالوں پر بھی شام کا وقت تھا نا۔ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے والے گاڑی کا انتظار بھی کر رہے تھے۔ جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھی نگلتے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی طرح تیز تیز لہجے میں۔ پولٹکس پر، گھریلو سمسیاؤں پر، دفتروں و بزنس کے مسائل پر

"ارے بار بنگ ویسے لیفٹنٹ سرکار نچھی ہوئی اے" (اب کے بنگال میں لیفٹنٹ سرکار بن کر ہی رہے گی۔)

"بھائی امار استری بڑو ای ایک گوئے ای سمبندھے ای کا کھوئی راضی ہوئی ہیں نا۔" (بھائی ہماری بیوی بہت ضدی ہے اس رشتے کے لئے وہ کبھی ہاں نہیں کرے گی۔)

"آمرا نجے آما دیر ماکے ائی روپ بھادئے گھیراؤ کوریا چھی بے تا تے ہار مانیتے وادھیہ۔ اے ہار پھول ائی جے تار کرمیر جنیہ اوت ہوئی تے ہوئی آچھے دفترے سکلیر بن لکھے۔" (ہم نے پچھلے ہفتے اپنے باس کا ایسا گھیراؤ کیا کہ اسے ہار ماننی ہی پڑی کیا سمجھے؟ اس نے پورے دفتر کے عملے کے سامنے معافی مانگی۔)

بعض مسائل پر تو ایک دوسرے سے ناواقف لوگ بھی بولنے لگتے ہیں۔ ایسی اپنائیت سے جیسے ایک دوسرے کے جگری رفیق ہوں۔ لیکن اپنی گاڑی کو دور سے آتا دیکھ کر ایک دوسرے کو وش کئے بغیر ہی کافی کی پیالیاں اور پیسے رکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں جو ہو، مسئلہ بھی کوئی ہو، وہ دوٹوک بات کہہ کر اپنے مزاج کا مظاہرہ تو کر ہی دیتے ہیں۔

آتم اور کسی خاموش کارنر کی تلاش بے سود ہی کرتے پھرے کوئی ایسی جگہ تھی ہی نہیں آخر آتم نے ایک ٹرین کی ڈائننگ کار دیکھ لی۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس نے کسی سے اسی میں جا کر بیٹھنے کی تجویز پیش کردی۔ کسی نے فوراً اتفاق کرلیا۔ انھوں نے یہ بھی طے کرلیا گاڑی جب تک پلیٹ فارم پر رہے گی وہ بیٹھے ہی رہیں گے۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے، ایئر کنڈیشنڈ کار کے نیلے شیشوں کے پار دیکھنے لگے۔ لوگ بھاگ بھاگ لوکل ٹرینوں میں چڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کوئی بھی لوکل آکر رکتی اس میں سے بے پناہ ہجوم ابل پڑتا۔ جیسے وہ خود سے باہر دھکتے ہوں بلکہ کوئی مشین انھیں باہر کے سمندر میں پھینک دیتی ہو اور سمندر میں ان کی شمولیت سے جھاگ پیدا ہوجاتی ہو، تیز تیز لہریں بن جاتی ہوں اور جھاگ اور لہریں کچھ دیر تک ابھرتیں، چکر کھاتیں اور پھر پھیلتی ہوئی کئی سمتوں میں ٹکڑے ہوکر بہہ نکلتی تھیں۔ نیلے شیشے کے اس پار کچھ ہی مسافر تھے۔ جن میں وہ بھی تھے۔ چپ چپ سے لیکن بڑے سکون سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ کبھی ایک ٹک، کبھی نظریں چرا چرا کر آتم کو جیسے پہلے مرتبہ اس کا چہرہ غور سے دیکھنے کا اب موقع ملا۔ کسی کا چہرہ زندگی سے بھرپور اور فروزاں تھا۔ خوش گوار ذہانت کی چمک لئے ہوئے۔ ایک ایسی قوت برداشت کی کیفیت بھی لئے ہوئے جو زندگی کے کڑے تجربات سے گذر کر ہی نمودار ہوسکتی ہے۔

بیرا چائے کے ٹرے رکھ گیا تو کسی نے چائے بناتے ہوئے زبان کھولی۔ ''آتم، اس سے کیا کہہ رہے تھے تم؟''

''کب؟'' وہ جیسے کسی خواب سے چونک پڑا۔

''جب تم میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے بھیڑ میں سے باہر لے آئے تھے۔''

آتم کے اپنے چہرے پر ایک کشمکش دکھائی۔ کہا ''یاد نہیں آرہا ہے اب چھوڑو۔ ہوگی کوئی بات۔ اچھا یہ بتاؤ تم رہتی کہاں ہو؟''

''ہم لوگ اتر پاڑہ میں رہتے ہیں۔ موکھرجی کی بانس واڑی کے بالکل پیچھے۔ اور تم؟''

''ہم لوگ بیگم پور میں، پلاسٹک فیکٹری کے سامنے کے کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ ماں اور میں۔ تمھارے ساتھ کون کون ہے؟ پتا جی اور ماتا جی کے علاوہ۔''

''اور تو کوئی نہیں ہے اب۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ ایک بمبئی میں ہے دوسرا مدراس میں۔ شیاما دیدی کبھی کبھی سسرال سے آجاتی ہے مہینہ پندرہ دن رہ کر چلی جاتی ہے۔

''اور تم؟... تم سسرال نہیں گئیں اب تک؟''

آتم نے اگرچہ بہت آسانی سے یہ سوال کردیا لیکن اسے احساس ہوا اس کا جواب سننا اس کے لئے بہت ہی صبر آزما ہوسکتا ہے۔ اس لئے اس نے اب ڈرتے ڈرتے ہی کسی کی طرف نگاہ اٹھائی لیکن کسی مسکرادی بولی۔ ''سسرال جانا کیا بہت ضروری ہوتا ہے ہر لڑکی کے لئے؟ اگر وہ نہ جانا چاہے؟''

آتم جواب دینے کے معاملے میں بہت تیز فہم نہیں تھا۔ جذباتی زیادہ تھا۔ جو کچھ کہنا چاہا اس کے گلے کے اندر ہی اٹک کر رہ گیا۔ کسی اس کی اس کیفیت سے خاصی محظوظ سی ہوئی، اور مسکراتی رہی۔ پھر بولی۔ ''اچھا۔ چاچی اب کیسی ہے؟ بہت کم زور ہوگئی ہوگی پہلے بھی کافی کم زور تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا۔''

''ہاں ویسی ہی ہیں۔ اب تو ان کی نظر بہت کم زور ہوگئی ہے کتنی عینکیں بدلوانے کے بعد اب کہیں جا کر ایک فٹ بیٹھی ہے۔ میں نے تمھاری ماتا جی کو تو کئی برسوں سے نہیں دیکھا۔ بلکہ یاد بھی نہیں آتا آخری بار کب دیکھا تھا۔ شاید اپنے بچپن کے بالکل شروع شروع زمانے میں ان کی گود میں کھیلتا رہا ہوں گا۔''

کسی ہنس پڑی۔ ''بچپن کا زمانہ بھی کتنا اچھا ہوتا ہے جب ہم پانچ سال پہلے ملے تھے۔ وہ بھی ہمارے بچپن کا ہی زمانہ تھا۔ تم آئی ٹی آئی میں تھے۔ میں دسویں کا امتحان دینے والی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ڈھیلے بالوں کو اپنی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں سے کھول کر جلدی جلدی پھر سے جوڑے کی شکل میں باندھنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ ارادہ ترک کردیا۔ بالوں کی ایک لمبی چوٹی بنالی اور سارے ہیئر پن بیگ میں رکھ لئے۔

آتم بولا... ''جب تم نے جوڑا بنا رکھا تھا تو خاصی بڑی عمر کی لگتی تھیں... اب تم پھر سے لڑکی لگ رہی ہو۔''

''کیا سچ؟'' وہ خوش ہوکر مسکرادی۔ ایسے تعریفی کلمے سن کر آدمی فوراً اپنا عکس دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ جب شیشہ سامنے نہیں ہوتا تو تعریف کرنے والے کی آنکھوں میں ہی جھانکنے لگتا ہے۔ کسی نے بھی کچھ لمحوں تک آتم کی آنکھوں میں ڈوب کر دیکھا پھر اپنی لمبی چوٹی ہاتھ میں لے کر اس کے سارے نشیب اور فراز انگلیوں سے سہلاتی ہوئی بولی۔ ''تمھیں یاد ہے آتم، جب میں آسنسول گئی تھی۔ تم ایک روز مجھے سائیکل پر بٹھا کر شانتی نکیتن دکھانے لے گئے تھے۔''

''ہاں یاد ہے... اور تم نے یہ بھی کہا تھا اسی یونیورسٹی سے ڈگری لوں گی؟''

''ہاں میں نے کہا تو بہت پتا جی سے لیکن وہ مجھے شانتی نکیتن بھجوا نہ پائے۔ دراصل ان کا ہاتھ تنگ رہنے لگا تھا۔ میرے دو بڑے بھائیوں کی ہی ایجوکیشن پر کافی خرچ ہورہا تھا۔ شیاما دیدی کی شادی کی بات چیت بھی پکی ہوچکی تھی۔ اسی لئے تو انھوں نے جوائنٹ پراپرٹی کے بٹوارے کا سوال کھڑا کردیا تھا۔ اپنے حصے کی پراپرٹی بیچ کر ہی وہ ساری ذمہ داریاں نبھا پائے۔''

''اچھا کسی، مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ مجھے افسوس ہے اصلی بات جانے بنا ہی تمھارے پتا جی کے بارے میں اتنا کچھ کہہ گیا۔''

''کب کہا؟ میں نے تو نہیں سنا۔'' وہ اس طرح مسکرادی جیسے آج وہ آتم کا ہر قصور معاف کردے گی۔

''جب ہم ہوڑہ برج پر سے گذر رہے تھے تبھی میں نے کچھ کہا تھا۔ لیکن تم اتنے اچھے سبھاؤ کی ہو، میری کسی بات کا بھی برا نہیں مانتی ہو۔''

"اچھا تو ذرا سی دیر میں تمھیں میرے سبھاؤ کا اندازہ بھی ہو گیا لیکن میں اپنے گھر میں خاصی لڑاکا سمجھی جاتی ہوں" وہ کھل کھلا کر ہنس بھی پڑی۔

اچانک گاڑی چل دی۔ وہ اپنی باتوں میں اس قدر مگن تھے کہ انھیں نہ گارڈ کی وسل سنائی دی نہ ہی انجن کی۔ لیکن اب وہ ہراساں سے ہو کر دروازے کی طرف لپکے۔ اسی وقت انھیں بیرے کو بل ادا کرنا بھی یاد آ گیا۔ اس وقت تک گاڑی نے کافی رفتار پکڑ لی۔ کسی نے گھبرا کر کہا... "اب؟ یہ گاڑی کہاں تک جائے گی؟"

بیرے نے ٹھیٹھ بنگالی لہجے میں کہا۔ "میا مدراس میل ایک گھنٹہ بادے اے بار کھڑگ پورے تھامی بے۔" (یہ مدراس میل ہے اگلا اسٹاپیج اب کھڑک پور ہوگا یعنی ایک گھنٹے بعد۔)

آتم نے کسی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ کھڑگ پور پہنچ کر ہمیں فوراً کوئی دوسری ٹرین واپسی کے لئے مل جائے گی ہم یہاں نو بجے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔ کیا تم اس سے پہلے کبھی دیر سے گھر نہیں پہنچیں؟"

کسی نے اسے بتایا۔ "زیادہ سے زیادہ آٹھ ساڑھے آٹھ تک ضرور پہنچ جاتی ہوں۔ وہ بھی جب کسی وجہ سے لوکل لیٹ ہو جاتی ہے۔ ورنہ سات تک تو ہمیشہ ہی چلی جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تب بھی زیادہ لیٹ نہیں ہوگا۔ میں تمھارے ساتھ گھر چلوں گا۔"

"تمھیں دیر نہیں ہو جائے گی؟ اترپاڑا سے لوٹ کر ہی کوئی لوکل پکڑو گے نا اس طرح تو تم گیارہ سے پہلے گھر نہیں جا سکتے۔ تب تک چاچی بے چاری پریشان نہیں ہو اٹھے گی۔"

"پریشان ہو اٹھے گی تو بھی کیا؟ اس شہر میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہی غنیمت ہے کہ ہم کسی طرح گھر پہونچ ہو جاتے ہیں دیر یا سویر۔ اچھا اب بیٹھو۔ چنتا چھوڑو۔ ایک ایک چائے اور پی جائے اور کچھ کھایا بھی جائے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ کیا کھاؤ گی؟"

"یہ تو تم بتاؤ کیا کھاؤ گے؟"

"جو تم کھاؤ گی۔"

"میں بھی وہی کھاؤں گی جو تم کھاؤ گے۔" کسی کی شوخی پھر لوٹنے لگی۔

"افوہ تب تو بڑی مشکل ہو جائے گی بابا میں کھانے پینے کے معاملے میں کبھی اپنا چوائس نہیں بتا پاتا ہوں۔ اسی وجہ سے ماں اکثر مجھ سے خفا ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ پوچھتی ہے آج کیا بناؤں؟ میں ہمیشہ وہی جواب دیتا ہوں جو تمھارے من میں آئے بس تنی سی بات پر تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ آخر ہوتا وہی ہے جو ہوتا آیا ہے یعنی ماں اپنی مرضی سے ہی کچھ نہ کچھ بنا دیتی ہے اور میں وہی کچھ کھا لیتا ہوں جو میرے سامنے پروس دیا جاتا ہے۔"

کسی نے ہنستے ہوئے کہا... "اچھا تو میں مٹن چاپ منگا رہی ہوں۔ کھا لو گے نہ؟"

"ضرور کھا لوں گا۔ یہ تو تم نے میری پسند کی بات کہہ دی۔"

کسی نے بیرے کو بلا کر آرڈر دے دیا اور کچھ سوچتے ہوئے پوچھا...

"اپنے بچپن میں تم بہت ضدی ہوا کرتے تھے کہا کرتے تھے نا کسی کی غلامی نہیں کروں گا۔ اپنا ہی کوئی کاروبار شروع کروں گا۔ تمھارے وہ اصول کیا ہوئے؟"

"کسی، میں نے زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں کہیں سمجھوتا بھی ضرور کیا ہے لیکن، صرف وہاں جہاں میرے اصول قربان نہیں ہوتے۔ لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟"

"یونہی،" وہ ہنس پڑی۔

"تم نے بی اے میں کون کون سے سبجکٹ لے رکھے تھے؟"

"سوشیولوجی اور ہسٹری تو میرے دو خاص سبجکٹ تھے۔ کیوں؟"

"یوں ہی" وہ بھی ہنس پڑا۔ "ذرا تمھارے ٹیسٹ جاننا چاہتا تھا۔ کبھی اسٹیج میں بھی دلچسپی لی؟"

"اچھا یاد آیا، تم تو شروع سے ہی اسٹیج کے رسیا تھے اسکول میں مجھے کسی ڈرامے کی ریہرسل میں بھی تو لے گئے تھے اس بات کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا تمھارا ڈرامہ دیکھنے کے لئے میں کچھ روز اور نہ رک سکی کیا تم اب بھی ڈراموں میں کام کرتے ہو؟"

"ہاں۔ ہمارا الیکٹریکل امپلائز کا اپنا ایک کلب ہے۔ اس کا میں سیکریٹری ہوں۔ ابھی پچھلے ہی مہینے ہم نے ایک پلے دیا تھا۔ تھکا ہوا خدا"

"بہت دل چسپ ٹائیٹل ہے۔ کام یاب رہا؟"

"بہت کام یاب رہا۔ تمھارے ڈاکس پر ایسی کلچرل اکٹوٹی نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے لیکن وہاں ڈرامہ ورامہ نہیں ہوتا۔ لے دے کر بس جادو، مداری کے کھیل، میوزیکل کنسرٹ یا فینسی ڈریس شو وغیرہ ہو جاتے ہیں۔ تمھارے کلب سے کبھی کہا جائے پلے کے لئے؟"

"ہمیں کیا انکار ہو سکتا ہے کسی ہم اس تجویز کو بخوشی قبول کریں گے۔ لیکن تم اس میں حصہ لو گی نہ؟"

"میں تو سنگیت میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ ستار بجا لیتی ہوں تھوڑا بہت گا بھی لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے چلے گا۔ اچھا اپنا فون نمبر لکھاؤ۔ ہے نہ؟"

"ہے تو لیکن مجھے کبھی کبھی ہی بلانا۔ یعنی دن میں کئی کئی بار نہیں۔ نہیں تو مجھے اپنے باس کی ٹیبل پر ہر وقت جانا پڑے گا جسے میں پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں؟ کیا وہ تم سے محبت جتانے لگتا ہے؟" آتم ہنس پڑا۔

وہ بھی ہنس کر بولی۔ "تم نے اندازہ ٹھیک ہی لگایا۔"

اسی وقت گاڑی کھڑک پور کے یارڈ میں اچانک داخل ہو گئی۔ انھیں لوہے کی بدلتی ہوئی بے شمار پٹریوں اور پہیوں کا شور سنائی دیا تو وہ چونک کر باہر دیکھنے لگے۔ اس وقت آتم کو یاد آیا ان کے پاس تو گاڑی کے ٹکٹ بھی نہیں ہیں کسی کو بھی آگاہ کیا لیکن وہ تو ڈر ہی گئی بولی۔

"ارے بابا بہت فائن دینا ہوگا میرے پاس تو کل ملا کے پندرہ یا بیس ہی ہو پائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ کے سارے روپے پیسے میز پر الٹ دئے۔ آتم نے بھی اپنی جیب کے سارے روپے اور پیسے ان میں ملا دئے۔ کہا.. ڈائننگ کار کا بل اور ریل کا بھاڑا تو ادا ہو جائے گا۔ لیکن واپسی کے لئے یقیناً کچھ نہیں بچ رہے گا۔"

"ہم واپس کیسے ہوں گے؟" کسی کے چہرے پر تشویش کی کئی بدلیاں آنا فاناً چھا گئیں جنھیں دیکھ کر آتم مسکرا دیا۔ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر بولا۔

"یہاں میری بہن رہتی ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ کھانا بھی کھائیں گے اور کچھ روپے بھی لے لیں گے۔"

"لیکن میں تمھاری بہن کے سامنے نہیں جاؤں گی نہ جانے کیا نہ سوچ بیٹھے۔ نا بابا!" کسی سچ مچ اپنے دونوں کان پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ آتم اس کے دونوں ہاتھ نیچے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تو ہے... تمھیں میرے ساتھ دیکھ کر وہ چونکے گی ضرور۔ اچھا تم باہر رک جانا۔ میں جلدی سے روپے لے کر آ جاؤں گا۔ پھر کھانا بھی ہم اسٹیشن پر ہی آ کے کھائیں گے۔ کیوں؟"

"ٹھیک۔ ہی..." کسی کی خوشی ایک ہی لمحے میں واپس آ گئی۔ وہ آتم کی ہر شرارت میں بچوں کی سی معصومیت سے ساتھ دے رہی تھی۔ آتم بھی حد درجہ مسرور تھا اور نازاں بھی گاڑی سے اتر کر انھوں نے پہلے تو کرایہ ادا کیا پھر بقایا رقم سے ٹیکسی میں اسی جگہ گئے جہاں آتم کی بڑی بہن رہتی تھی۔ کسی ٹیکسی میں ہی بیٹھی رہی۔

آتم تھوڑی سی دیر کے بعد اپنی کامیابی پر مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کسی کو دس دس کے پانچ نوٹ دکھا دئے کسی نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ دبا لیا اور کہا... "بہن نے پوچھا نہیں اتنے روپوں کا آخر ہو گا کیا؟"

"میں نے کہا تھا میرا ایک دوست اسپتال میں پڑا ہے اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔"

کسی نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم تو مجھ سے بھی نمبر لے گئے بابا۔ ایک بار میں نے بھی اپنی ماں کے آگے اسی طرح کی بات بنائی تھی مجھے کچھ فرینڈز کو ایک دعوت ریٹرن کرنی تھی۔ جانتی تھی ماں سیدھے سیدھے مانگنے سے تو کچھ بھی نہیں دے گی۔ اس لئے میں نے دو مہینوں کی ایکسٹرا فیس لے جانے کا قصہ گڑھا اور روپے کھٹ سے مل گئے۔"

دونوں دیر تک ہنستے گئے۔ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے کئی قہقہے لگا لئے۔

زندگی میں کبھی کبھی اچانک ہی اس طرح ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے راستے میں پڑی ہوئی دولت کی طرح جس کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنی خوشیوں میں اور اضافہ کیا جائے۔

وہ اسٹیشن پر پہنچے تو کلکتہ جانے والی گاڑی تین گھنٹے لیٹ تھی۔ اس اطلاع نے کسی کے تو ہوش اڑا دئے۔ لیکن آتم اسے ریستوران میں لے گیا وہ کسی کو آج بہترین قسم کا کھانا کھلانا چاہتا تھا۔ بیرے کو بلا کر اس نے کئی چیزیں لے آنے کے لئے کہا۔ چکن کری۔ فرائی فش، کٹلٹ، پلاؤ، وغیرہ وغیرہ اور جب وہ کسی کی طرف پلٹا تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا بات ہے کسی تم یک بیک پریشان کیوں ہو اٹھی ہو؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ آتم کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں اپنائیت بھی تھی اور پشیمانی بھی کتنے سارے اندیشے آنسوؤں کے قطرے بن کر چمک رہے تھے۔ یہ آنسوؤں کے قطرے ابھی اس کی پلکوں پر ہی تھے۔ لیکن لگتا تھا وہ اپنے آنسوؤں کو دیر تک نہیں روک سکے گی۔ آتم نے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے کسی اسی کی وجہ سے یہاں تک چلی آئی ہے۔ لیکن یہ سب ایک عجیب سے جوش میں ہوا ہے۔ بے حد جذباتی موڈ میں ایک لمبی مدت کے بعد ایک دوسرے کو دیکھتے ہی وہ بے قابو ہو گئے تھے۔

بیرا میز پر کھانا لگا کر چلا گیا۔ لیکن کسی نے کھانے کی طرف نگاہ ہی نہ اٹھائی۔ آتم کے اندر بھی اتنی جرأت نہ رہی اسے کھا لینے کے لئے کہے۔ اب تو اس کا اپنا جی بھی کچھ کھانے کے لئے بے چین نہیں رہا تھا۔ اگر وہ دو چار لقمے کھا بھی لیتے تو کھانے کی محض رسم پوری کرنے کی خاطر۔ ورنہ ان کے ذہن اور دہن کھانے کی لذت سے محروم ہی ہو چکے تھے۔

گاڑی کافی انتظار کے بعد آئی۔ دونوں ایک ڈبے میں چپ چپ سے بیٹھ گئے۔ ایک ہی سیٹ پر انھیں جگہ مل سکی۔ باقی مسافر ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے۔

کھڑگ کے اس پار کسی ریلوے کرمچاری کو دیکھ کر آتم نے اس گاڑی کے کلکتہ پہنچنے کا اندازاً وقت پوچھا تو وہ جلدی جلدی یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا.. "شا کال پانچ ٹار آگے کونو پرکارے پہونچوتے پارے نا۔" (صبح پانچ بجے سے پہلے کسی حالت میں نہیں پہنچ سکتی۔)

یہ سن کر کسی کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اس نے گردن گھما کر آتم کی طرف دیکھا تو وہ بڑے متاسف لہجے میں کہہ اٹھا... "مجھے بہت افسوس ہے کسی مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میری وجہ سے ہی تم یہاں تک چلی آئیں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا ہمیں یہاں اس قدر دیر ہو جائے گی اور پھر تم یہ بھی تو جانتی ہو، جو کچھ ہوا ہے وہ سب ایک ایڈونچر کے جذبے کے تحت ہی ہوا ہے۔"

اب کسی کے آنسو بہہ نکلے انھیں وہ بار بار پونچھتی اور وہ ہر بار بہہ نکلتے۔ اس نے مجبوراً گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ سسکتی ہوئی بولی۔ "میں تمھیں قصوروار نہیں ٹھہراتی۔ آتم میں خود ہی اس کے لئے ذمے دار ہوں لیکن میں گھر پہنچ کر انھیں کیسے یقین دلاؤں گی؟ ہم رات بھر کلکتہ اور کھڑگ پور کے بیچ میں کیوں بھٹکتے رہے ہیں؟"

"میں چلوں گا نہ تمھارے ساتھ۔ چاچا جی سے میں کہوں گا نہ۔"

"نہیں آتم میرے چاچا جی تو اب زندہ بھی نہیں ہیں۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی اب موجود نہیں ہے۔ اب میں شادی شدہ ہوں۔ اس وقت وہ نیند سے کوسوں دور گھر سے گلی تک اور گلی سے سڑک تک کے کتنے چکر لگا چکا ہوگا۔ میرا دل یہی سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا ہے۔"

کسی کی بات سن کر آتم سناٹے میں آ گیا۔ خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا جو گھٹنوں میں سر دیئے اب بھی کہے جا رہی تھی۔ "تم سے مل کر تو میں سب کچھ بھول بیٹھی۔ صرف اتنا یاد رہ گیا کہ ہمارا کوئی بچپن کا زمانہ تھا جو بے حد

سہانا تھا اور ہم بالکل بچے بن کر رہ گئے... اوہ۔"

آتم نے بھی اپنے گھٹنوں پر جھک کر دھیرے دھیرے کہا۔ "کچھ جھوٹ میں بھی بول گیا تھا تم سے۔ تمھیں یہ غلط بتا دیا کہ میری ماں زندہ ہے۔ وہ تو کبھی کی پرلوک سدھار گئی۔ گھر میں تو اس وقت میری بیوی اور ہمارا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ میں بھی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ وہ ابھی تک سو نہیں پائی ہوگی۔ ذرا سا کھٹکا ہونے پر بھی چونک کر سر اٹھا لیتی ہوگی لیکن ہم کوئی بہانہ بھی بنا سکتے ہیں، کہہ سکتے ہیں واپسی پر اچانک ٹریفک جام ہو گیا جو آج صبح تک رکا رہا۔ ایک جلوس کے ساتھ پولیس کا مقابلہ ہو گیا۔ بسیں اور ٹرامیں جلا دی گئیں۔ لاٹھی چارج ہوتا رہا۔ گولی چلتی رہی۔ یہ سب تو روز ہی یہاں ہوتا ہے نہ۔"

"لیکن میرے دفتر اور ہوڑہ کے بیچ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ آج اخباروں میں کسی بھی ایسے ہنگامے کا ذکر نہیں ہوگا۔"

"اخبار والے سارے ہنگاموں کا ذکر ہی کب کر پاتے ہیں؟ روز روز کے واقعات کے وہ اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ بہت سی باتوں کا تو وہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے۔"

کسی بہت دیر تک خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی کوئی جھلک نہ ابھری جیسے بڑے سے بڑا جھوٹ بول کر بھی وہ گھر والے کے غصے سے نہیں بچ سکے گی، اس کی گھبراہٹ سے یہی لگتا تھا۔ وہ اس کا گلا ہی نہ گھونٹ دے اس کی نظر بار بار کلائی پر بندھی گھڑی پر جا اٹکتی۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ رات بھر کے جاگرن اور پشیمانی نے اس کے چہرے کی ساری ملاحت زردی میں بدل دی تھی۔ اس کے تیل سے چپڑے اور چمکتے ہوئے کالے کالے بال اب روکھے، سوکھے اور بھورے بھورے سے لگ رہے تھے۔

آتم بھی اب اتنا جوشیلا اور دل کش نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھ گئی تھی وہ بار بار الٹے ہاتھ سے ٹھوڑی اور گال کھجا کر اپنی بے چینی دکھا رہا تھا۔ اگرچہ وہ ایک دو بار جیب سے کنگھی نکال کر بالوں میں پھیر چکا تھا لیکن اس سے بھی اس کے چہرے پر روزمرہ کے معمول کی جھلک نہیں ابھری تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت کے ساتھ سر ٹکا لیا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ چاہتا بھی تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف اپنے اندر داخل ہو کر سوچنا چاہتا تھا جہاں اسے کچھ سکون کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے اندر بھی بے حد شور تھا۔ جیسے وہاں بھی کوئی شہر آباد ہو۔ اتنا ہی بڑا۔ وہاں بھی بڑی بھیڑ ہو اسی طرح تیز رفتار گاڑیاں اور بھرابھراتے ہوئے ٹرک اور ہوا کی گتی سے اڑتی ہوئی الیکٹرک ٹرینیں ہوں اور وہ سارا اجتماعی ذہنی تناؤ بھی جس سے وہ دن رات دوچار رہتا تھا۔

اچانک گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن سوری گرام پر رک گئی۔ کلکتہ سے آٹھ دس میل ادھر۔ آگے پٹری پر ایک بہت بڑے ہجوم نے دھرنا دے رکھا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافر اٹھ اٹھ کر باہر جھانکنے لگے۔ آتم نے بھی کھڑکی سے سر نکال کر کچھ جاننے کی کوشش کی۔ جب سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو کمپارٹمنٹ سے اتر کر باہر چلا گیا۔

انجن کے آگے دور تک بیٹھے ہوئے لوگوں میں مرد اور عورتیں سب ہی تھے۔ وہی سب جو صبح کی پہلی کرن پھوٹتے ہی اپنے بچوں اور اپاہج بزرگوں کو گھروں میں چھوڑ چھاڑ کر کارخانوں اور فیکٹریوں کی طرف بھاگ نکلتے ہیں اور شام کا دھندلکا بکھرنے کے بعد ہی اسی طرح بھاگتے اور گاڑیوں کے اندر بھرے ہوئے لوٹ آتے ہیں۔ آج انھیں ان کی منزلوں کی طرف لے جانے والی ایک لوکل ٹرین نہیں آ پائی تھی۔ وہ اپنے غصے کا اظہار ایک دوسری گاڑی کو روک کر کر رہے تھے۔

"جتو کھون ما چھیر ریل گاڑی نا آشچھے تا تو کھون آمی ٹریک سوربونا۔"

(جب تک ہمیدا لوکل نہیں آتی ہم ٹریک پر سے نہیں ہٹیں گے۔)

"پولش ڈاکا ہو چھے دادا آمی نجیر کانے ایس ایم کے فون کورتے سنے چھی۔"

(پولیس بلوائی جا رہی دادا میں نے اپنے کانوں سے ایس ایم کو فون کرتے سنا ہے۔)

"آس تے داؤ پولش کے آمی پولش کے بھئے پائی نا۔"

(آنے دو پولیس بھی ہم نہیں ڈرتے پولیس سے۔)

"اسٹیشن ماسٹار کے ماترو آدہ گھنٹار سے دیچھے۔)

"ہم اسٹیشن ماسٹر کو صرف آدہ گھنٹے کا سے دیتے ہیں۔)

"گاڑی نا ایلے آمرا ڈھل چھنڑ بے نو۔"

(لوکل نہیں آئی تو ہم پتھراؤ شروع کر دیں گے۔)

پتھراؤ کا ذکر سنتے ہی بہت سے لوگوں نے پٹری پر سے پتھر اٹھا لئے۔

آتم بھاگتا ہوا اپنے کمپارٹمنٹ کے سامنے گیا، نیچے کھڑے کھڑے ہی کسی کو پکارا۔

"کسی! کسی! نیچے آجاؤ۔ فوراً آجاؤ۔ ایک بہت ضروری بات ہے!"

اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے یک بیک چمک اٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی افسردگی کی کوئی جھلک نہیں رہ گئی تھی۔

ذرا سے پس و پیش کے بعد کسی نیچے اتر آئی۔ وہ گاڑی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ڈرتی تھی کلکتہ پہونچنے میں مزید تاخیر نہ ہو جائے۔

آتم اسے ایک طرف جا کر جلدی جلدی بتانے لگا۔ "دیکھ رہی ہو نہ اتنے سارے لوگوں کو! سب وہی ہیں جن کے ساتھ ہم روز ہی دھکے کھاتے ہیں۔ کل شام کو ان سے دور ہو کر اپنی کہنے سننے کے لئے ہم کتنے بے چین تھے پر اب ان ہی میں شامل ہو کر ہماری مکتی ہو جائے گی۔ ساری پریشانیوں سے مکتی۔ اب ہم سے کوئی بھی نہ پوچھ سکے گا۔ ہمیں صرف پتھر اٹھانا ہوں گے۔ پولیس آنے والی ہے۔ وہ ہمیں دو دن، چار دن، زیادہ سے زیادہ ہفتے بھر کے لئے ہی بند کر سکے گی!"

آتم مسکرانے لگا۔ اس کی بات سمجھ کر کسی کے تنے ہوئے چہرے کی کیفیت ہی بدلنے لگی۔ اس نے پہلے تو ان لوگوں کی طرف دیکھا جو اپنے اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ٹرین کے شیشے توڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

"چولبے نا! چولبے نا!"

"اسٹیشن ماسٹر نپات ہوک ریلوے ادھیکاری۔ نپات ہوک۔"

"دشٹرن ریلوے نپات ہوک۔"

کسی نے بھی ایک عجیب سے جوش کے ساتھ اپنی ساڑھی کے آنچل میں بہت سے پتھر بھر لئے اور ان لوگوں کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں جا کر وہ فوراً بھیڑ میں کھو گئی۔ آتم کے لئے اسے ڈھونڈنا بھی مشکل ہو گیا ☆☆☆

غزل

راہی فدائی

شمارہ ۱۲۱،
جولائی، اگست ۱۹۸۱

منظر کو شمع، آنکھ کو ناموس کیوں کریں
بے سمتی بساط کو محبوس کیوں کریں

دود چراغ بن کے اٹھیں گی خباثتیں
شعلہ فشاں دماغ کو مایوس کیوں کریں

اپنی بلا سے، ذوق جمال آشنا نہ ہو
زاغ و زغن کو ہمسر طاؤس کیوں کریں

حرف غلط کی شرح لکھیں صدق تو کہیں
آزادی خیال کو محروس کیوں کریں

اس درجہ مرتفع ہیں کمالات آگہی
بے وجہ ذات غیر کو محسوس کیوں کریں

اظہار مدعا کے طریقے ہیں بے شمار
عریانیت کو مانع ملبوس کیوں کریں

تشکیک کے نقیب تردد کے پاسباں
وحشت زدہ خیال کو مانوس کیوں کریں

راہی رہی ہے جس کی روش مثل دائرہ
مقلوب کیا کریں اسے معکوس کیوں کریں

غزل

راہی فدائی

شمارہ ۱۳۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

انساں سے نہ ڈر بچھو
چھت پر سے اتر بچھو
فطرت سے بغاوت کیوں
کام اپنا تو کر بچھو
قدرت یہ خدا کی ہے
آدم کا پسر، بچھو
فتنے کا شجر شاید
گل، غنچہ، ثمر، بچھو
تکمیل ہوس ناگن
ترغیب نظر بچھو
اوپر نہ کہیں نیچے
سر میں ہے مگر بچھو
کہتی ہے یہ تنہائی
ہیں شمس و قمر بچھو
پھرتے ہیں سڑک پر اب
بے خوف و خطر بچھو
سانسوں کے خیالوں میں
ہے شام و سحر بچھو
اپنوں سے ہوا خالی
لگتا ہے یہ گھر بچھو
ساحل پہ تماشائی
ہے بیچ بھنور بچھو
آخر میں نہ ہو جائیں
سب زیور و زر بچھو
گمراہ جو ہو راہی
ہر راہ گزر بچھو

راہی فدائی

شمارہ ۲۱۹،
اگست ستمبر ۱۹۹۸

خلاف، آب وہوا سے ہے، رنگ و بو سے نفاق
غلط ہے سخت غلط، اپنے ہی لہو سے نفاق
ملا کے زہر کہاں تم نے انتقام لیا
بوقت تشنہ لبی آبجو سے نفاق
گل و ثمر کی تمنا ہے جن درختوں کو
انھیں ورق بہ ورق قوت نمو سے نفاق
خلوص دل میں ہے اک آنچ کی کسر باقی
ٹپک رہا ہے ابھی اس کی گفتگو سے نفاق
نہ سوچو چاک گریباں ہے یہ کہ چاک دل
رفو گرو نہ رکھو پیشۂ رفو سے نفاق
عجیب طبع کے حامل ہیں عابدان جدید
نماز سے ہے محبت مگر وضو سے نفاق
زوال آمدہ ہو جائے گا یہ بخت بلند
نہیں مفید قریب رگ گلو سے نفاق
وہ شہر جس کے در و بام کو ہو باہم خوف
امنڈ آئے نہ کیوں اس کے کو بہ کو سے نفاق
جناب آپ سے شیطان کر ملا ہوگا
یہ کیسی بات کہ صوفی کو ہا و ہو سے نفاق
رسول ایک، خدا ایک ہے، کتاب بھی ایک
تو کس بنا پہ روا ہوگا قبلہ رو سے نفاق
پھر اس کے بعد ہے امکان دوستی راہی
نہ ساتھ دے گی عداوت، رکھو عدو سے نفاق

شمارہ ۲۶۲،
نومبر ۲۰۰۲

موسم بدلا ڈھنگ بدل
برگ شرافت رنگ بدل
حق کی بیساکھی تو خرید
اپنا عذر لنگ بدل
کیسے پانسا پلٹے گا
معنی امن و جنگ بدل
اپنی ہی دھن میں ڈوب نہ جا
اپنے در کا سنگ بدل
جوش پہ ہے فیضان ازل
دامن قلب تنگ بدل
منظر پھیکا پھیکا ہے
کرداروں کے رنگ بدل
دل پہ حکومت کرنی ہے
تاج و سپاہ اورنگ بدل
عکس نہ دے نیرنگ خیال
شیشۂ دل کا زنگ بدل
دل کا توازن ہے درکار
جسم کا اب پاسنگ بدل

رشید امجد

شمارہ ۹۵،
اپریل تا جون ۱۹۷۵

آج میں نے اپنی موت کی دستاویز پر دستخط کیے ہیں۔

وہ کئی دنوں سے یہ چاہ رہی تھی کہ میں اس پر دستخط کر دوں، لیکن میں کسی نہ کسی طرح ٹال جاتا تھا۔ آج میں نے سوچا اگر میرے دستخط کر دینے سے اسے سکون مل سکتا ہے تو مجھے انکار نہیں کرنا چاہیے، سو میں نے اس پر دستخط کر دیے اور اب میرے ہر اٹھتے ہوئے قدم کے ساتھ فاصلے کا گولا کھلتا چلا جا رہا ہے۔ ویران سڑکوں پر مسلسل چلتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں آخر وہ مجھ سے اس دستاویز پر کیوں دستخط کرانا چاہتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ میں اس پر دستخط کروں، لیکن جب میں اس سے ملنے جاتا تھا، یہ دستاویز اس کی میز پر پڑی ہوتی تھی۔ میں نے بہت دن پہلے اس کا مضمون پڑھ لیا تھا، لیکن میں اسے دانستہ نظر انداز کرتا رہا اور اس خیال میں رہا کہ میں ایک دن اسے ان تصویروں سے باہر نکال لاؤں گا جن میں اس نے خود کو قید کر رکھا ہے۔ لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے تو مجھے بھی تصویر بنا کر اپنی دیوار پر لٹکا دیا ہے، ایک ایسی تصویر جسے وہ اب بھول بھی چکی ہوگی، لیکن میں زندگی بھر اس کی دیوار پر اس انتظار میں لٹکتا رہوں گا کہ کسی دن تو وہ مجھے نیچے اتارے گی۔

میرے اندر گھٹن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ میں سگریٹ کے دھوئیں کے ذریعہ اسے اگلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیواروں پر لگی ہوئی ساری تصویریں ایک جانب سے اکھڑ گئی ہیں۔ میں اپنے اندر انگلیاں ڈبو کر سفید کینوس پر اپنی خوں آلود انگلیوں کے نشان ثبت کرتا ہوں۔ ان نشانوں میں سے کئی چہرے ابھرتے ہیں اور کھلکھلاتے ہوئے دوڑ جاتے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں ناچتی مسکراہٹ کو سونگھتا ہوں اور سنسان اداس سڑک پر تیز تیز چلنے لگتا ہوں۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔

"جہاں مجھے جانا ہے۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"اور مجھے کہاں جانا ہے؟" میں پھر خود سے سوال کرتا ہوں۔

"جہاں یہ سڑک جاتی ہے۔"

میں چپ ہو جاتا ہوں۔

سڑک اور میں۔

میں اور سڑک۔

ہم دونوں کو کہیں جانا ہے۔ کہاں؟

میں سڑک کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں، اور اسی سے پوچھتا ہوں۔ "تمھیں معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔

میں بھی نفی میں سر ہلاتا ہوں۔

اور ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہتے ہیں۔

جب میں پہلی بار اس سے ملنے گیا تو وہ رنگوں کی پیالی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سارا جسم اور چہرہ رنگوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں باہر تھیں۔

میں نے کہا۔ "میں تمھاری تصویریں دیکھنے آیا ہوں۔"

کہنے لگی... "میرے پاس تو کوئی تصویر ہے ہی نہیں۔"

لیکن اس کی آنکھیں، ہنس پڑیں اور پیالی میں سے نکل کر میرے کان میں سرگوشی کرنے لگیں... "جھوٹ بولتی ہے۔"

اور اس کی آنکھیں سسک پڑیں۔

میں ان آنکھوں کو سلگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ضرور اس دستاویز پر دستخط کر دوں گا۔

اس رات میں نے ب سے کہا... "اب بتاؤ میں کیا کروں؟ وہ مجھ پر اعتماد ہی نہیں کرتی۔"

وہ دیر تک سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔ "عجیب لڑکی ہے۔"

میں نے کہا... "عجیب تو ہے ہی، بس وہ رنگوں کی پیالی سے باہر نہیں آنا چاہتی، لیکن کیوں؟"

اور آج جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ اسی طرح رنگوں کی پیالی میں بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر کہنے لگی... "کیسے ہو؟"

میں نے کہا... "تم اس پیالی سے باہر کیوں نہیں آتیں؟"

وہ خاموشی سے تصویر بناتی رہی، پھر بولی... "تو تم سمجھتے ہو تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے؟" پھر کہنے لگی۔ "تم نے صرف ان تصویروں کے رنگ دیکھے ہیں لیکن ان رنگوں کے پیچھے چھپے ہوئے زخم نہیں دیکھے۔"

میں چپ رہا۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ میں نے ان رنگوں کے پیچھے چھپے ہوئے زخموں کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ میں تو ہر بار ان کے لئے مرہم بھی لے کر آتا ہوں لیکن وہ مجھے ان زخموں پر مرہم لگانے ہی نہیں دیتی اور ہر بار یہ مرہم میرے اپنے ہی ہاتھوں میں پگھل جاتا ہے۔

وہ تصویر بنانے میں منہمک رہی، پھر کہنے لگی... "رنگ بڑے شوخ ہیں لیکن ان کے پیچھے کتنی خراشیں ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔"

میں چپ رہا۔

میرے ہاتھوں میں کوئی چیز پگھلنے لگی۔ میں نے ہاتھ کھول کر دیکھے۔

میرے ہاتھوں پر وہ مرہم بہہ رہا تھا جو میں اس کے زخموں پر لگانا چاہتا تھا۔

وہ پھر رنگوں کی پیالی میں ڈوب گئی تھی۔

میں اٹھ کر ایزل کے قریب آیا۔ کینوس پر میری تصویر بنی ہوئی تھی۔

میرے ہاتھوں پہ بہتا ہوا مرہم قطرہ قطرہ نیچے ٹپکنے لگا۔ میز پر رکھی ہوئی میری موت کی دستاویز پر لکھے ہوئے میرے نام کے حروف مجھے پکار رہے تھے۔

میں نے دستاویز اٹھائی اور اس پر دستخط کر دیئے۔

کہنے لگی... "تم بہت عظیم ہو، میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

میں خاموش رہا۔

میری موت کی دستاویز میرے ہاتھوں میں سانس لے رہی تھی۔ اس نے ایزل سے میری تصویر اتاری اور اسے دیوار پر ٹانگنے لگی۔ جب کیل میرے سینے سے گذر کر دیوار کے پتھر میں داخل ہوئی تو میں نے دستاویز اس کے ہاتھ میں دے دی اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔

اور اب میرا ہر اٹھتا ہوا قدم فاصلے کے دائرے کو پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ میں اور سڑک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلے جا رہے ہیں... چلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

ایک ان دیکھی، نامعلوم صدا کی طرف... جو ہمارے نام لے لے کر ہمیں دور سے پکار رہی ہے۔

اور یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے۔

اے مردوں میں سب سے سندر، اے چندر مکھ، تیری آواز ایسی میٹھی ہے جیسی کلونکا پنچھی کی آواز۔ وہی کلونکا پنچھی جس کی آواز نے ایشور کو بھی پاگل بنا دیا تھا۔

اے میرے اجیالے پتی تو نے ان باغوں کی جنت میں جنم لیا تھا جو مدھ مکھیوں کی گنگناہٹ سے گونج رہے تھے۔

اے گیان کے اونچے پیڑ، مکتی داتاؤں کی مٹھاس۔

اے میرے پتی تیرے ہونٹ آلوچوں کی طرح گلابی ہیں۔ تیرے دانت برف کے گالوں کی طرح ہیں۔ تیری آنکھیں کنول ہیں۔ تیری کھال گلاب کا ایک پھول ہے۔

اے پھولوں میں سب سے روشن

اے میرے سہانے موسم

اے عورتوں کے بھون کی خوش بو کہ جو چنبیلی سے اچھی ہے۔

اے گھوڑوں میں سب سے اچھے گھوڑے، کنتھکا، وہ تجھ پر سوار ہو کر کدھر چلا گیا؟

صبح جب میں سو کر اٹھتا ہوں تو ساری چیزیں بدرنگ پیلی اداسی میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میز سے سارے کاغذ اڑ کر فرش پر دور دور تک بکھر گئے ہیں۔ سارے لفظ ننگی دیواروں پر الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور شیلفوں سے کتابیں نیچے گر پڑی ہیں، ان کی جلدیں پھٹ گئی ہیں اور ورق تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔

وہ مر چکا ہے۔

میں کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا اسے دیکھتا رہتا ہوں، اداسی مجھ سے لپٹ جاتی ہے اور مجھے بھینچ بھینچ کر روتی ہے۔

میں اسے پکارتا ہوں... آوازیں دیتا ہوں لیکن وہ لفظوں اور صداؤں کے دائروں سے بہت دور نکل گیا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے چند ہی دن پہلے اس نے میرے کندھے پر جھکے جھکے کہا تھا... "تم دیکھنا کسی دن میں آوازوں کے سحر سے نکل جاؤں گا اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔"

اس کا چہرہ، آنکھیں اور ہمیشہ حرکت میں رہنے والے ہاتھ ابھر ابھر کر ڈوب رہے ہیں۔ میں زمین پر بیٹھ جاتا ہوں اور کتابوں کے پھڑپھڑاتے صفحوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ اس کی انگلیوں کا لمس ایک ایک سطر پر چپکا ہوا ہے۔

"آج کالج نہیں جانا؟"... باورچی خانہ سے میری ماں پوچھتی ہے۔

میں دوڑ کر باورچی خانے کی طرف جاتا ہوں لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے رک جاتا ہوں۔

آدمی مر جائے تو سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، اور پھر میری ماں کو اس کی موت سے کیا۔

وہ مجھے دروازے میں یوں کھڑا دیکھ کر حیرت سے پوچھتی ہے... "کیا بات ہے۔ جاؤ گے نہیں آج؟"

میں اسے کیسے بتاؤں کہ اس کی لاش کو گھر میں چھوڑ کر میں کیسے مر جاؤں۔

میں کچھ کہے بغیر کمرے میں لوٹ آتا ہوں۔ اور اس کے سرہانے سے اس کی وصیت نکال کر دیکھنے لگتا ہوں۔

کاغذ کے تین چوتھائی حصہ میں ایک شخص کی تصویر ہے، جس کے جسم پر کئی تلکے لگے ہوئے ہیں جن میں سے تازہ گرم خون بہہ رہا ہے۔ اس شخص کا سر درمیان میں سے پھٹا ہوا ہے اور اس میں سے لفظوں کی قطاریں اچھل اچھل کر نیچے گر رہی ہیں۔ اس کے گرد کئی لوگ جمع ہیں۔ کچھ نلکوں سے منہ لگائے ہوئے ہیں، کچھ لفظ چننے میں مصروف ہیں۔ اس شخص کے بازو دو متضاد سمتوں میں دوڑتے منہ زور گھوڑوں سے بندھے ہوئے ہیں۔

تصویر کے نیچے جو جگہ خالی ہے اس پر تین سطریں لکھی ہوئی ہیں۔

پہلی سطر میں لکھا ہے۔ میری لکھی ہوئی ہر تحریر پھاڑ دینا، کیوں کہ میں زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہوں، اب میں جان گیا ہوں، کہ سچائی کیا ہے۔

دوسری سطر ہے... ایک کتاب کے سوا میری کتابیں ب کو دے دینا اور اس سے کہنا جب اس کے پاس چائے اور سگریٹ کے لئے پیسے نہ ہوں تو ایک ایک کتاب بیچتا رہے۔

آخری سطر ہے... ایک کتاب جو کسی کو نہیں دینی وہ ہے جو شیلف کے سب سے اوپر والے خانے میں ہے، یہ کتاب رنگوں کی پیالی والی نے مجھے دی تھی اور اس پر اس کی انگلیوں کا لمس ثبت ہے۔

میں اس کی وصیت تہہ کر کے وہیں رکھ دیتا ہوں اور شیلف کے پاس آتا ہوں، اوپر والے خانے میں ایک کتاب اسی طرح پڑی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں۔ ساری کتابیں نیچے جا گری ہیں لیکن یہ کتاب اسی طرح اپنی جگہ رکھی ہوئی ہے۔ میں ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانا چاہتا ہوں لیکن میری انگلیاں اسے چھوتے چھوتے رہ جاتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس کتاب کے صفحوں میں چھپا بیٹھا ہے اور جوں ہی میں کتاب کھولوں گا، وہ کسی صفحہ سے باہر نکل آئے گا۔

میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔

دفعتاً مجھے خیال آتا ہے، مجھے اس کے دوستوں کو اس کی موت کی اطلاع دینا چاہئے۔ میں جلدی جلدی باہر نکلتا ہوں اور سب سے پہلے ب کے پاس پہنچتا ہوں۔

میری بات سن کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے، وہ غراتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ ''عجیب شخص ہے بھلا اتنی سی بات پر مرنے کی کوئی تک ہے، اگر وہ رنگوں کی پیالی سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی تو اس نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا تھا اسے باہر نکالنے کا؟''

وہ تیزی سے سر ہلاتا ہے۔ ''مرنا ہی تھا تو کسی اور دن مر جاتا، آج ہی مرنا کیا ضروری تھا؟'' .... پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ٹی۔ وی پر ایک پروگرام ملا تھا، آج اس کی ریکارڈنگ کرانا ہے اور ادھر یہ مصیبت آن پڑی ہے۔''

میں چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہتا ہوں، ب بار بار اضطراب سے اپنے دونوں ہاتھ ملتا ہے۔ مونچھوں کے کونے مروڑتا ہے اور پھر اپنی لمبی وگ پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ مجھے اس پر ترس آنے لگتا ہے۔

میں ب سے کہتا ہوں۔ ''تو یوں کرو، تم ریکارڈنگ کرا لو، شام کو آ جانا۔''

اس کے چہرے پر اطمینان کی چمک پھیلنے لگتی ہے، وہ کہتا ہے... ''ٹھیک ہے، یوں بھی اب ہم اس کے لئے کر ہی کیا سکتے ہیں۔''

اس کے بعد میں اس کے ایک ایک دوست کے پاس جاتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کو آج کوئی نہ کوئی کام ہے۔ کسی کو کسی فنکشن میں یہ مضمون پڑھنا ہے، کسی کو اپنے کسی دوست سے ملنے جانا ہے اور کسی کو بچوں کے لئے جوتے خریدنے ہیں۔ میں واپس گھر آ جاتا ہوں۔

میری ماں کہتی ہے... ''آج تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟ کہاں گئے تھے؟ جانا نہیں۔''

میں نفی میں سر ہلاتا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔

وہ اسی طرح بستر پر پڑا ہوا ہے۔ میں اس کے قریب جاتا ہوں، اسے چھوتا ہوں۔ جیسے مجھے یقین ہو کہ وہ میرے چھوتے ہی اچھل کر اٹھ بیٹھے گا اور لہک لہک کر گائے گا۔

بھاند کر دیوار کمرے میں گئے... اپنے گھر میں رہ کے بھی ہم چور تھے

لیکن آج وہ نہ اچھل کر اٹھتا ہے اور نہ لہک لہک کر گاتا ہے۔

میں کچھ دیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہتا ہوں... بس دیکھتا رہتا ہوں، پھر اسے اٹھا کر غسل خانے میں لے آتا ہوں اور اچھی طرح نہلاتا ہوں۔ پھر الماری سے دھوئے ہوئے کپڑوں کا جوڑا نکال کر اسے پہناتا ہوں اور پڑوس والی مسجد کے مولوی کے پاس جاتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ آ کر اس کی نماز جنازہ پڑھائے۔

مولوی کہتا ہے... ''میں تو نہیں پڑھاؤں گا اس کا جنازہ وہ تو ساری عمر مجھے اور مذہب کو گالیاں دیتا رہا، اس کی تو نماز جنازہ ہو ہی نہیں سکتی۔''

میں کندھے ہلاتا لوٹ آتا ہوں۔

شہر کا کوئی مولوی اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے تیار نہیں۔

بہت دیر بعد میں سوچتا ہوں، اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نماز جنازہ نہ بھی پڑھی گئی تو کیا فرق پڑے گا۔ اور پھر اسے اس کی ضرورت بھی نہیں۔

میں اس کی لاش کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گھر سے نکل آتا ہوں۔

اور سارا دن اسے ہاتھوں میں اٹھائے۔ ان گلیوں، سڑکوں اور چوراہوں میں پھرتا رہتا ہوں جہاں وہ پہروں گھوما کرتا تھا۔ پھر میں اس کیفے میں جاتا ہوں جہاں وہ ہر شام دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ میں اس کی لاش بڑی میز پر لٹا دیتا ہوں۔ وہ اس سرخ صوفے میں دھنس کر بیٹھا کرتا تھا اور کہتا تھا ''اس صوفے میں ماں کی گود سا لمس ہے۔''

میں خالی صوفے کو اپنی انگلیوں سے ٹٹولتا ہوں۔

بیرا کہتا ہے... ''کیا لاؤں؟''

میں نفی میں سر ہلاتا ہوں۔ میز پر اس کی لاش پڑی ہو تو کچھ پینے کو کیسے جی چاہ سکتا ہے۔

میں اسے اٹھا کر باہر آ جاتا ہوں اور کشمیری روڈ پر پھرنے لگتا ہوں۔

اسی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا... ''ہم سب کیا ہیں؟ کچے رنگ، ہے نہ؟''

مجھے یاد ہے اسی سڑک پر پھرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''وہ رنگوں کی پیالی سے باہر کیوں نہیں آتی؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا... ''وہ تو رنگوں کی پیالی سے باہر آنا چاہتی ہے، لیکن حالات''... پھر بولا... ''یہ دو لفظ، ''لیکن'' اور ''حالات'' ہی تو سارے فساد کی جڑ ہیں۔''

ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کافی دیر بعد کہنے لگا... ''یار کسی طرح ہم ان دو لفظوں ''لیکن'' اور ''حالات'' کو ختم نہیں کر سکتے۔''

اور پھر ہم دونوں کتابوں کی ایک ایک دکان پر گئے اور لغت کی کتابیں دیکھنے کے بہانے دکان دار کی نظر بچا کر لغت کی ہر کتاب میں سے ''لیکن'' اور ''حالات'' کے الفاظ مٹانے لگے... جب ہم نے شہر کی ساری دوکانوں پر رکھی ہوئی لغتوں میں سے ''لیکن'' اور ''حالات'' کے الفاظ مٹا دیئے تو ہم ایک دوسرے پر گر گر دیر تک ہنستے رہے۔ میں نے کہا... ''لو آج ہم نے ان دو لفظوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔''

مگر دوسرے دن جب وہ اس سے مل کر آیا تو اس کے چہرے پر وہی اداسی پھن پھیلائے شوک رہی تھی۔

میں نے پوچھا... ''کیا ہوا، وہ رنگوں کی پیالی سے باہر نہیں نکلی؟''

کہنے لگا... ''ہم نے لغت کی کتابوں میں سے تو لیکن اور حالات کے الفاظ مٹا دیئے ہیں لیکن یہ الفاظ اپنی جگہ موجود ہیں۔''

بہت دیر بعد اس نے شانے اچکائے اور کہنے لگا... ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں پیارے؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا... ''کدھر؟''

کہنے لگا... ''کہیں۔''

''بے مقصد گفتگو کرنے؟''... میں نے پوچھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا... ''کبھی سوچا ہے تم نے، اگر ہم یہ بے مقصد گفتگو نہ کریں تو ہمارے چہرے مسخ ہو جائیں۔ ہمارے جسم پھول جائیں اور ہم ایک دوسرے کے لئے بچھو بن جائیں۔''

''ہم سب بے مقصد جی رہے ہیں''... میں اس کی لاش کو ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے سوچتا ہوں...'' اور شاید اسی لئے وہ اس بے مقصدیت سے دور نکل گیا ہے۔''

رات دھیرے دھیرے شام کی پیالی میں گھل رہی ہے اور میں چسکی چسکی اس کی سیاہی اپنے اندر اتار رہا ہوں، سب کچھ ختم ہو چکا ہے، مجھے اب صرف آخری کام کرنا ہے۔ اس کی لاش کو دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر میں لپیٹنا ہے۔ اور پھر انتظار کے ایک ختم نہ ہونے والے طویل وقفے کو اوڑھ کر اس سنسان سڑک پر تنہا سفر کرنا ہے۔

میں آہستہ سے بند دروازے کو چھوتا ہوں۔ کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند ہیں۔ میں اس کی لاش تھڑے پر رکھ دیتا ہوں اور روشن دان سے لٹک کر اندر جھانکتا ہوں۔ وہ اپنی رنگوں کی پیالی میں بیٹھی گہری نیند سو رہی ہے۔ میں روشن دان سے ہاتھ ڈال کر دروازے کی چٹخنی کھولتا ہوں پھر نیچے اتر کر اس کی لاش اٹھاتا ہوں اور آہستگی سے اندر چلا جاتا ہوں۔ کمرے میں ایک پراسرار اداسی گہری چپ کا لبادہ اوڑھے ہر شے سے چپکی ہوئی ہے۔

میں باری باری ان دونوں کو دیکھتا ہوں، وہ جو رنگوں کی پیالی میں بیٹھی گہری نیند سو رہی ہے۔ اور وہ میرے بازوؤں میں لٹک رہا ہے۔ مجھے دونوں معصوم نظر آتے ہیں۔ وہ اس لئے رنگوں کی پیالی سے باہر نہ آنا چاہتی تھی کہ اسے ڈر تھا کہ باہر آتے ہی اسے مار دیا جائے گا اور وہ اس لئے آج میرے بازوؤں میں جھول رہا ہے کہ اسے بھی ڈر تھا کہ اس دستاویز پر دستخط کرنے کے باوجود وہ وہاں نہ آنے کے وعدہ پر قائم نہ رہ سکے۔

مجھے ان دونوں پر ترس آتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں جھک کر دونوں کو باری باری چوموں۔

دفعتہً مجھے خیال آتا ہے، پھر قصور کس کا ہے؟ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین چٹخنے لگتی ہے۔ میرے اردگرد دور دور تک ہر شے چٹخی ہوئی ہے۔ ہر چیز اندر سے مسخ اور بدنما ہو چکی ہے۔ سارا قصور تو اس دائرے کا ہے جس میں وہ دونوں اور ہم سب رہتے ہیں، ان سب کا ہے جنھوں نے ایک کو تو رنگوں کی پیالی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور دوسرے کو اتنا بے بس بنا دیا کہ وہ اسے اس پیالی سے باہر نہ نکال سکا۔

میں سر ہلاتا ہوں اور اس کی لاش کو دیوار پر لگی ہوئی اس کی اپنی تصویر میں لپیٹنے لگتا ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے اب وہ ہمیشہ اسی انتظار میں اس دیوار سے لٹکا رہے گا کہ کسی دن تو وہ رنگوں کی پیالی سے باہر آ کر اسے نیچے اتارے گی۔ لیکن میں جانتا ہوں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

باہر نکلنے سے پہلے میں آخری بار دونوں کو دیکھتا ہوں اور چپ چاپ گلی میں آ جاتا ہوں۔ سڑک کی طرف جاتے ہوئے میں سوچتا ہوں... کیا واقعی یہ بات اتنی اہم ہے کہ کوئی اس کے لئے جان دے دے؟... مجھے معلوم ہے سب اس کا مذاق اڑائیں گے کہ اس نئے زمانے میں رہتے ہوئے بھی وہ کتنا پرانا نکلا۔

مجھے اس پر غصہ آنے لگتا ہے، اب میں لوگوں کو کیا بتاؤں گا کہ اس بات کا جواز کیا ہے؟ دفعتہً مجھے اس کی ایک بات یاد آ جاتی ہے۔ بہت دن ہوئے اس نے کہا تھا... ''پیارے ہر بات کے درست ہونے کا جواز اس میں ہے کہ تم اسے درست سمجھتے ہو۔''

گرم ریت پر چلتے ننگے پاؤں کے چھالے پھوٹ جاتے ہیں، پہاڑ کاٹنے کی آواز تیز ہو جاتی ہے اور بجلی کی مدھر تان میرے چاروں طرف بکھر جاتی ہے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بڑی سڑک پر آ جاتا ہوں اور سنسان اداس رات میں تنہا چلتا رہتا ہوں لیکن ایک خیال مجھے بار بار آتا ہے کہ خواب وہ دیکھتا تھا اور زندہ میں تھا۔ اب یہ خواب کون دیکھے گا، اور میں زندہ کیسے رہوں گا؟ ☆☆☆

شب مراقبہ کے اعترافات

رشید امجد

شمارہ ۲۸۰،
اکتوبر ۲۰۰۴

پہلی کہانی

مرشد سے ملنے سے پہلے معمول سے زیادہ کچھ جاننے کی خواہش ہی نہ تھی اور نہ شاید ضرورت، کہ کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے کی کیفیت میں بسر ہو رہی تھی۔ معمول سے زیادہ کچھ کی لذت اسے اس درویش سے پڑی جو بڑے پارک کے ایک تالاب کنارے بیٹھا پانی میں کنکریاں پھینکتا رہتا تھا۔ سیر کرتے ہوئے وہ اکثر وہاں رک جاتا اور غیر ارادی طور پر کنکریاں پھینکنے کے عمل کو دیکھتا، سمجھ نہ آتی کہ درویش کیا کر رہا ہے۔ آخر ایک دن پوچھ ہی بیٹھا۔

درویش مسکرایا اور بولا۔ ''ہر کنکری پانی کی ایک نئی سطح بناتی ہے۔''

اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ ''تو پھر؟''

درویش نے اسے گھورا۔ ''جاؤ، اپنا کام کرو، یہ تمھارے بس کی بات نہیں۔''

اسے غصہ تو آیا، لیکن کچھ کہے بغیر آگے نکل گیا۔

سیر کرتے کرتے تالاب پاس پہنچتا تو رکنے کو جی چاہتا لیکن درویش کے غصے سے ڈرتا ہوا وہ آگے بڑھ جاتا۔ دو تین دن اس تذبذب میں گذرے، پھر ایک دن وہ ٹھہر گیا۔

''میں سمجھنا چاہتا ہوں۔''

درویش مسکرایا۔ ''اب تم راستے پر آئے ہو... طلب بنیادی کنجی ہے جس سے سارے دروازے کھلتے ہیں۔''

''میں یہ دروازے کھولنا چاہتا ہوں، ہر منتی ہوئی سطح کو جاننا چاہتا ہوں۔''

درویش بولا۔ ''تو جاؤ مرشد کو تلاش کرو۔''

''مرشد...؟'' اس نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ملے گا؟''

''تمھارے آس پاس۔'' درویش نے کہا۔ ''نظریں کھلی رکھو۔''

مرشد اسی شام مل گیا۔ لمبی سیر کے بعد ذراستانے کو وہ سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گیا تھا کہ مرشد ساتھ آ بیٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں تو تمھیں جانتا ہوں۔'' اس نے مرشد سے کہا۔

مرشد مسکرایا۔ ''جانتے تو ہم بہت کچھ ہوتے ہیں، اصل چیز اس کا اقرار ہے۔''

''اقرار۔''

''ہاں، اقرار۔'' مرشد نے کہا۔ ''پہلے نفی پھر اثبات۔ اس کے بغیر اقرار نہیں ہو سکتا۔''

''اور اقرار کے لئے؟'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''پہلے محبت اور پھر ڈر پیدا کرنا چاہئے۔''

مرشد مسکرایا۔ ''یہ وہ مقام ہے جہاں خوشی حدت پیدا کرتی ہے اور

حدت ہی راہِ سلوک کا سب سے بڑا پتھر ہے۔"

اس نے کہا۔ "تو اس پتھر کو ہٹنا چاہئے۔"

پتھر نے غار کا منہ خدا جانے کب سے بند کیا ہوا تھا۔ وہ اندر اترے تو اول اول گھپ اندھیرے نے انہیں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سیلن زدہ اندھیرا ان کے وجودوں پر رینگنے لگا۔ دونوں ہاتھ پیر مارتے آگے نکل آئے۔ اب سرمئی دھند کا علاقہ شروع ہوا۔

مرشد بولا۔ "آگے بڑھنے سے پہلے مردود بننا پڑے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "کس کا مردود؟"

مرشد نے کہا: "اپنے آپ کا۔ اور جب تم خود کو رد کرو گے تو عین قبول کے مقام پر پہنچ جاؤ گے۔"

سرمئی دھند سے گذرتے اس کا وجود بھی سرمئی ہو گیا۔ سارے متعلقات دور کہیں پیچھے رہ گئے۔

اس نے سوچا۔ "میرا وثیقہ ہو گیا۔"

مرشد نے اس کی سوچ سن لی اور بولا۔ "تمہارے باطن نے اس وثیقے پر شہادت دی۔"

اور یہیں سے زا (بھید) کی کیفیت شروع ہوئی جو ایک دائرہ کی طرح تھی۔ وہ دائرے کے گرد اگرد گھوما گھومتا رہا۔ معلوم نہیں لمحہ بیتا یا صدیاں گذر گئیں، لیکن اندر داخل ہونے کا راستہ نہ ملا۔

اس نے مرشد سے کہا۔ "اس دائرے کا کوئی دروازہ نہیں اور اس میں جو نقطۂ وسطانی ہے میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔"

مرشد بولا۔ "اس اسرار کو دائرے کے ارد گرد رہ کر دیکھو۔ یہ نہ دائرے سے باہر ہے نہ اس کے اندر۔"

"وہ بھلا کس طرح؟"

"اس لئے کہ..." مرشد نے کہا۔ "نقطہ کوئی طول کوئی عرض کوئی عمق نہیں رکھتا۔"

"تو لاشے کو میں کیسے دیکھوں؟" وہ بے چارگی سے بولا۔

مرشد ہنسا۔ "دونوں نقطوں کے درمیان خط کھینچ لو۔"

"دوسرا کون؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک تم، دوسرا وہ۔"

"خط کھینچ لو گے تو تمام شکلیں نقطے ہی سے وجود میں آئیں گی۔"

"شاید ٹھیک کہتے ہو" وہ بڑبڑایا۔ "نقطہ ہی موجود ہے اور نقطہ ہی غائب۔"

سرمئی دھند میں اڑتے اڑتے جب پر ٹوٹنے لگے تو وہ چلایا۔ "مرشد ارے مرشد میرے پر ٹوٹ رہے ہیں۔"

مرشد نے کہا۔ "مبارک ہو۔ یہاں سے تیری بقا کا سفر شروع ہوا۔"

آہستہ آہستہ وہ نیچے بیٹھنے لگا، اور آہستگی سے اس کے پاؤں نے زمین کو چھوا۔

"یہ بھی عجب بات ہے،" اس نے سوچا۔ "زمین پر تھا تو اڑنے کی خواہش بے چین رکھتی تھی، اڑا ہوں تو زمین کھینچتی ہے۔"

"یہی حقیقت ہے۔" مرشد مسکرایا۔

یہ سفر شاید ایک ہزار ایک راتوں کا تھا، یا شاید صرف ایک رات کا۔

مرشد نے جانے سے پہلے کہا۔ "جب کسی کی تعریف کرتے جھجک نہ آئے اور مخالفت کرتے دیر تک ملال رہے تو سمجھ لو تم زندگی ہو، کیونکہ ذات تو صفات کے پردے ہی میں اپنا اظہار کرتی ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں نے اسے دیکھا، سمجھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی نام نہیں۔"

مرشد نے جواب دیا۔ "بس وہ ایک قوت ہے۔ چلو، تم اسے انرجی کہہ لو۔ جو جی چاہے کہہ لو، بات ایک ہی ہے۔"

یہ کہہ مرشد نے پر پھیلائے اور اڑتا ہوا سرمئی دھند میں غائب ہو گیا۔

صبح اٹھ کر اس نے سوچا۔ واقعی وہ ایک انرجی ہے، اور تسیم کمپیوٹر کا خالق جس میں کئی سافٹ ویر کام کر رہے ہیں، ان گنت چینل ہیں، جن پر کئی سی ڈی چل رہی ہیں۔ ایک سی ڈی میں بھی ہوں، جس کا اپنا طے شدہ وقت اور پروگرام ہے، اگر کوئی بریک ڈاؤن نہ ہوا تو گھنٹے، منٹ سیکنڈ تک متعین ہیں، ایک کلک اور پروگرام ختم... اسکرین پر چترے مترے۔ پھر کون جانے یہ سی ڈی دوبارہ چالو ہو جائے اور کسی دوسرے چینل پر چل پڑے۔ کون جانے؟ ☆☆☆

دوسری کہانی

ان دنوں مرشد کا کچھ پتہ نہ چلتا کہ کب آیا کب گیا۔ پلک جھپکنے میں باتیں کرتے کرتے اڑاری ماری اور یہ جا وہ جا۔ آنا ایسا کہ چلتے چلتے بیٹھے بیٹھے احساس ہوتا کہ ساتھ ہے۔ تنہائی کے دنوں میں وہی معمول تھا کہ دفتر سے آکر کچھ آرام، پھر شام کی سیر، بڑے پارک کے واکنگ ٹریک کے دو چکر لگا کر، کنول کے تالاب کے ساتھ چلتے اس ویران پتھر کی سل پر بیٹھنا، جہاں کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا۔ ان دنوں یہی تنہائی تھی۔ سیر کرتے ہوئے بھی دفتر اور گھر ذہن پر سوار رہتے، الجھن سی ہوتی کہ مرشد کے ہوتے کیسی کیسی باتیں ہوتی تھیں۔ کم از کم سیر کے دوران تو وہ پر پھیلا کر اڑ سکتا تھا، سرمئی دھند کو چھوتا، کچھ جاننے کی سعی کرتا، سوال کرتا، کچھ کے جواب ملتے، کچھ کے نہ ملتے۔ لیکن اڑان کا مزہ تو اپنی جگہ تھا، لیکن اب کئی دنوں سے مرشد غائب تھا، وہ ٹریک کے دو چکر لگا کر حسبِ معمول کنول کے تالاب سے ہوتا ہوا پتھر کی سل پر آ بیٹھا۔ دفعتہً احساس ہوا کہ مرشد ساتھ بیٹھا ہے۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" اس کی آواز میں شکایت تھی۔

"میں کہاں گیا تھا؟ یہیں تھا۔" مرشد مسکرایا۔

"یہاں کہاں؟ مجھے تو نظر نہیں آتے۔"

"ہونے کے لئے دکھائی دینا ہی ضروری نہیں۔"

"تو...؟"

"صرف دیکھا نہ کرو، محسوس بھی کیا کرو۔"

"میرے تو نظر ہی کمزور ہو گئی ہے،" اس نے عینک صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتا، نظر اتنی تیزی سے کیوں گر رہی ہے۔"

"موتیا تو نہیں اتر رہا؟" اس کے ساتھی نے کہا۔

"شاید۔"

"تو فوراً ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

ڈاکٹر نے مختلف زاویوں سے اس کی آنکھوں کو ٹٹول کر، دبا کر دیکھا، تیز روشنی کے آلے کی مدد سے اس کی پتلیوں اور آنکھوں کے پردے کا جائزہ لیا اور بولا۔ "تقریباً چھ سات مہینے لگیں گے موتیا کے براؤن ہونے میں، اس دوران آپ کی نظر مسلسل گرتی رہے گی۔"

مرشد ہنسا۔ "چلو اس دوران تم نظر کے بجائے کچھ عقل کا استعمال بھی کرلو۔"

"لیکن تم ہی تو کہتے ہو کہ عقل اس کے راستے کی دیوار ہے۔"

"میں دنیاوی عقل کی بات نہیں کر رہا،" مرشد بولا۔ "شعور کی بات کر رہا ہوں اور شعور کا تعلق محسوس کرنے کی بھی۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں تو اسے ہمیشہ ہی محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہی کبھی قریب آتا ہے، کبھی دور، بہت دور چلا جاتا ہے۔"

مرشد بولا۔ "اس کا دور جانا بھی ایک ادا ہے۔"

"مجھے تو اس کی اداؤں نے مار دیا۔" وہ ہنسا۔

"عشق میں مرنا تو پڑتا ہی ہے۔" مرشد بھی ہنسا۔

"دونوں چلتے ہوئے کنول کے تالاب کنارے دوسری طرف آگئے جہاں سے شہر کی جگمگاتی روشنیاں رقص کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مدھم اندھیرے سے روشنیوں کا رقص عجب لطف دے رہا تھا۔ مرشد نے کہنے لگا۔

"اندھیرے اور روشنی میں کتنا باریک سا فرق ہے لیکن ہمیں کتنا بھلا محسوس ہوتا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "شاید ایسا ہی زندگی اور موت میں بھی ہے؟"

"ایک لمحہ کبھی کبھی صدیاں بن جاتا ہے۔"

"کیسے؟" اس نے پوچھا۔

مرشد بولا۔ "ایک شخص قبرستان سے گذر رہا تھا۔ پاؤں پھسلا تو وہ ایک نوئی قبر میں جا گرا، چند لمحوں بعد نکلا تو معلوم ہوا ہزار سال بیت چکے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنے طور پر سوچا ایک لمحہ اگر ہزار سال میں بدل سکتا ہے تو فنا بقا میں کتنی دیر میں تبدیل ہوگی۔

مرشد نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"فنا اگر بقا ہے تو پھر بقا کیا ہے؟"

"صرف لفظوں کا فرق۔"

اس نے پوچھا۔ "اور وقت، ذات ہے یا صفت؟"

مرشد نے کہا۔ "صفت، اس لئے کہ ذات کسی میں بھی منتقل نہیں ہوتی، ہاں صفات کا کچھ حصہ کسی کو عطا ہو جاتا ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ "اے ذات مجھے اپنی اس صفت کا کچھ حصہ عطا کر کہ میں دوسری طرف جا کر واپس آسکوں۔"

مرشد ہنسا۔ "دوسری طرف جانا بھی چاہتے ہو اور واپسی کی دعا بھی مانگتے ہو!"

"ہاں..." اس نے کہا۔ "میں سمندر کی تہ میں اترنا چاہتا ہوں، مگر وہاں رہنا نہیں چاہتا کہ مجھے اس کی وسعتوں سے ڈر لگتا ہے۔"

مرشد نے تبسم کیا۔ "اپنے وجود کی نفی سے ڈرتے ہو۔"

"وجود کی نفی سے نہیں، اپنے نہ ہونے کے احساس کا خوف ہے، میرے اپنے ہونے کا احساس نہ رہا تو پھر جاننا اور نہ جاننا بے معنی ہے۔"

مرشد بولا۔ "تو آؤ اسی نقطہ کے گرد دائرہ بناتے ہیں۔"

انہوں نے مل کر دائرہ کھینچا، پھر اس دائرے کے گرد اگرد کئی دائرے بنائے، بنتے گئے۔ بن گئے تو وہ کہنے لگا۔ "دائرے تو ہم نے بنائے، اندر جانے کا راستہ کہاں ہے؟ اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں تھا تو کیا ہمارا مقدر دائرے سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جانا ہے؟"

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مرشد حسب عادت اڑاری مار کر کب کا جا چکا تھا۔

کنول کے تالاب کنارے پتھر کی سل پر بیٹھے اندھیرا گہرا ہو گیا۔

بیوی بھی اپنا چکر لگا کر آگئی اور بولی۔ "چلیں، آج تو بہت دیر ہو گئی۔"

اس نے کوئی جوب نہ دیا، چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا☆☆☆

تیسری کہانی

بڑی ہی پریشانی کے دن تھے۔ مرشد کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا اور اس کی میز سے ایک اہم فائل گم ہو گئی تھی۔ انکوائری جاری تھی، اگر وہ قصوروار ثابت ہو جاتا تو نوکری تو جاتی ہی اور بہت کچھ بھی بھگتنا پڑتا۔ ایسے میں مرشد کی ضرورت تھی، وہ ہر شام کنول تالاب کنارے پتھر کی سل پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا۔ سیر تو برائے نام ہی تھی، ایک چکر بھی پورا نہ ہوتا اور اکتاہٹ ہونے لگتی۔

"یہ اعتبار بھی عجب شے ہے۔" بیٹھے بیٹھے خیال آیا۔ "میں اتنی جلدی لوگوں پر اعتبار کر بیٹھتا ہوں۔"

"یہی تو سادگی ہے اور سادگی اسے بہت پسند ہے۔"

"کدھر چلے گئے تھے؟" اس نے کہا۔ "میں ان دنوں..."

"مجھے معلوم ہے،" مرشد بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ میں تمہارے اندر بھی ہوں اور باہر بھی۔" مرشد مسکرایا۔

"تو میں کیا کروں؟"

"انتظار۔" مرشد نے کہا۔ "انتظار میں مزہ بھی ہے اور دکھ بھی، اور تم جانتے ہو کہ دکھ تمہارا راستہ ہے۔"

"لیکن... راستہ آگے بند ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"کوئی راستہ بند نہیں ہوتا۔"

لیکن فی الحال تو راستہ بند ہی تھا۔ آگے ایک بھیانک تاریکی تھی، کچھ سمجھ نہ آتا کہ کون دوست ہے کون دشمن۔ دن بھر لوگ اس کے سامنے آ کر اس کی دیانت کی تعریفیں کرتے اور دروازے سے نکلتے ہی اس کے کئی ناکردہ گناہوں کی سزا بھی دیتے۔ اس نے سوچا، "یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ ہر شے دو چہرے رکھتی ہے۔"

"لیکن اس کا کوئی چہرہ نہیں، اس لئے یہاں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مرشد بولا۔

"لیکن فاصلہ طلب کا امتحان ہے۔"

امتحان میں مزاج کو اعتدال میں رکھنا کتنا مشکل ہے، اس کا اسے اب خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ بیوی بچے الگ پریشان۔ اس کے چڑچڑے پن سے تنگ آئی ہوئی بیوی بار بار کہتی۔ "جس ہوتا اے، ہو جائے گا کیوں اتنا کڑھتے ہو؟"

"کڑھتا اس لئے ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا، آخر یہ کس بات کی سزا ہے؟ اور کیوں ہے؟"

مرشد دیر سے چپ تھا، اب اس نے سکوت توڑا۔ "یہ ایک کیفیت ہے اور کیفیت کا عرصہ برزخ کی طرح ہے۔"

"لیکن برزخ میں زیادہ عرصہ نہیں گذارا جا سکتا۔" اس نے ناخن کریدتے ہوئے کہا۔

"تو پھر نکلو یہاں سے، آگ کی خبر لائیں۔"

مرشد آگے آگے، وہ پیچھے پیچھے، اس لمبے سفر پر نکل پڑے جسے اس درخت پر ختم ہونا تھا جو بولتا تھا، لیکن وہ کیا بولتا؟ بولنے والا تو کوئی اور تھا، سننے والا بھی کوئی دوسرا نہیں تھا، وہ خود تھا۔ جو وصف ہے وہی موصوف ہے، تو پھر میں کیا اور تو کیا؟ سفر کے معنی کیا؟

اس نے کہا۔ "مرشد چلو واپس چلیں، ہم تو اپنی ذات کے دائرے ہی میں پھر رہے ہیں۔"

مرشد ہنسا۔ "لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہم دائرے کی لکیر کے ساتھ ساتھ پھر رہے ہیں، مرکز کے ساتھ نہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "تو مرکز تک کیسے پہنچیں گے؟"

"اسباب سے نظر اٹھاؤ اور سبب پر مرکوز کر دو تو مرکز خود بخود سامنے آ جائے گا۔"

نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے وہی کنول تالاب تھا، شام زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی اور ہلکی تھاپ پر رقص کرتا اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ وہ اور مرشد چپ چاپ بیٹھے اپنے اپنے دائرے میں مرکز کو تلاش کر رہے تھے کہ اس کی بیوی نیم دوڑتی، ہانپتی آئی۔

"تم یہاں بیٹھے ہو میں چاروں طرف تلاش کر آئی۔"

"خیر ہے، کیا ہوا؟"

"ابھی ابھی صاحب کا فون آیا ہے کہ فائل کا پتہ چل گیا۔"

"کیا" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"فائل تمہارے کلرک نے چرائی تھی۔ کمپنی والوں سے رشوت لے کر۔ وہ مان بھی گیا ہے۔" بیوی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کہا۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر دوبارہ سل پر بیٹھ گیا۔ مرشد حسب عادت اڑاری مار بھی کا جا چکا تھا۔ اسے خیال آیا "یہ بھی خوب ہے۔ یہ فائل نہ گمتی تو میں اتنا سفر کیسے کرتا۔ مرشد ٹھیک ہی کہتا ہے۔ جو فکر ہے وہی ذکر ہے" ☆☆☆

چوتھی کہانی

عجب خوشبو بھرے دن تھے۔ پہلے پھول نئے کھلتے ہوئے موسم کی آمد آمد کی خبریں پھیلا رہے تھے۔ وہ سیر کرتے ہوئے جھوم جھوم جاتا کہ یہ دن خوشبو کے دن تھے۔ اس کی خوشبو کی حس سال میں ہفتہ دس دن کے لئے ہی بیدار ہوتی تھی، ورنہ سارا سال اسے خوشبو بدبو سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اچانک ہی کسی کھلکھلاتی صبح شیو کرتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں تو خوشبو بھی ہے۔ اس پر وہ وجدانی کیفیت میں آ جاتا، صابن کو اٹھا کر سونگھتا، شیونگ کریم کو تھپتھپا کر چہرے پر ملتا، پھر بعد میں کریم بھی لگاتا، خوشبو کا اسپرے بھی کرتا۔ اس کے ملنے جلنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ خوشبو کے دن ہیں۔ سب سے پہلے تو بیوی ہنستی۔

"لگتا ہے تمہاری ناک کھل گئی ہے۔"

وہ جھومتے ہوئے کہتا۔ "ہر طرف خوشبو ہی خوشبو ہے۔"

لیکن خوشبو کا یہ رقص چند دن ہی رہتا۔ پھر کسی دن اچانک اسے احساس ہوتا کہ شیونگ کریم میں خوشبو نہیں، صابن خوشبو سے خالی ہے۔ بس پھر وہی لمبا عرصہ نہ خوشبو نہ بدبو۔ خوشبوؤں کا عرصہ مختصر سا ہوتا لیکن سال بھر کی کوفت دور کر جاتا، ذہن میں نئی نئی باتیں آتیں۔ مرشد سے لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔

یہ دن، رقص کرتے دن، خوشبوؤں کے نام تھے۔ لیکن مرشد حسب معمول غائب۔ لمبی سیر کر کے، آس پاس کے پھولوں کی خوشبو چکھتے، وہ تالاب کنارے پڑی سل پر آ بیٹھا اور تیرتے کنولوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ چونکا۔ مرشد چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"سوچ رہا ہوں،" وہ بولا۔ "صاف پانی میں تو سبھی غوطہ لگاتے ہیں، کیوں نہ اس تالاب میں جھانکا جائے۔"

مرشد مسکرایا۔ "کنول کی تہہ دیکھنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔" وہ بڑبڑایا: "میرے، بچپن میں کنول کی جڑوں میں پایا جانے والا ایک پھل بکا کرتا تھا، جسے کنول ڈوڈے کہتے تھے۔"

"وہ تو اب بھی موجود ہیں،" مرشد بولا۔ "لیکن اب لوگوں کی پسند بدل گئی ہے، اب وہ ایسی چیزیں نہیں کھاتے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ آج صبح میں نے چائے میں ادتی بھگو کر کھائی تو میرے بچے حیرت سے دیکھنے لگے، ور ماں سے پوچھنے لگے کہ بو یہ کیا گند کر رہے ہیں۔"

مرشد ہنسا۔ "تمھاری بیوی نے کہا ہوگا اپنا پینڈ دین نہیں بھولتے۔"

"یہ کہا تھا۔" وہ بھی ہنسا۔ "میرا جی چاہتا ہے کنول کی جڑوں سے کنول ڈوڈے نکالوں۔"

"پھسل کر اندر جا گرے تو پھر وہیں رہو گے۔" مرشد بولا۔

"پھر کیا؟ یہ تجربہ بھی سہی۔"

"اب نئے نئے تجربے کرنے کی تمھاری عمر نہیں ہے۔" بیوی غصے سے بولی۔

"ہر نئے تجربے کی گود میں ایک نیا ہمکتا ہوا خیال ہے۔" اس نے سوچا، لیکن چپ رہا۔ بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی تو وہ خیالوں کی پگڈنڈی پر چلتا دور تک پھیلے ہوئے مرغزاروں میں پہنچ گیا۔ خوشبوئیں یک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہی تھیں۔ ہوا گداں بجاتی ہنس ہنس کر دہری ہوتی جا رہی تھی۔

مرشد بولا۔ "اس کا ہونا بھی ایسے ہی ہے جیسے پھول میں خوشبو۔"

اس نے کچھ دیر سوچا۔ "تو پھر اس کے ساتھ چلنے کے لئے ہوا بننا ضروری ہے۔"

دونوں ہوا بن گئے اور اڑتے پھرے، ٹہنی ٹہنی، پھول پھول، دیر تک اڑنے کے بعد رکے تو دیکھا کہ ایک شخص اشاروں سے کچھ کر رہا ہے۔

پوچھا۔ "اے شخص، کیا کر رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "دیکھتے نہیں، میں اس سے گفتگو کر رہاں ہوں۔"

"یہ کیسی گفتگو ہے، جس میں لفظ نہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "لفظ گمراہ کرتے ہیں اور درمیان میں ایک پردہ کھینچ دیتے ہیں۔ میں نے عرصہ ہوا لفظ ترک کر دیے اب س سے گفتگو کرنے کے لئے مجھے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے مرشد کی طرف دیکھا مرشد نے کہا۔ "یہ شخص اگلے پڑاؤ پر ہے۔"

وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر مڑے۔

اس نے پوچھا۔ "یہ میرے ساتھ کیا ظلم ہے کہ سال میں صرف چند دن میرے ہیں؟"

مرشد بولا۔ "اسے بھی غنیمت سمجھو کہ چند دن تو تمھارے ہیں۔"

اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ میری بے بسی ہے۔"

مرشد بولا۔ "بے بسی بھی ایک کیفیت ہے۔"

اسے بڑا غصہ آیا۔ "ہر چیز ہی ایک کیفیت ہے تو میں کہاں ہوں؟"

"کہیں بھی نہیں۔" مرشد ہنسا۔

"کیوں نہیں؟"

"یہی تو سفر کا آغاز ہے، اس کیوں کو تلاش کرو، جانو اور سمجھو۔"

وہ جھنجھلایا ہوا تھا، بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔ بولا، "خوشبوئیں مدھم ہو رہی ہیں، پھر وہی ایک طویل خشک موسم۔"

مرشد نے کہا۔ "آؤ۔ کنول کے تالاب پر چلیں۔"

دونوں پتھر کی سل پر بیٹھ گئے۔ تا دیر چپ رہے پھر مرشد نے کہا: "دیکھو پھول تالاب کی سطح پر کھلے ہیں اور نیچے کائی اور سڑاند ہے۔ پھول کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ بڑبڑایا اور چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ ☆☆☆

پانچویں کہانی

خزاں کی آمد آمد تھی اور بہار چپکے چپکے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ درختوں سے گرتے اکا دکا پتے پیروں کے نیچے چرمرانے لگے تھے۔ کنول کا تالاب خالی خالی دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ پھول مرجھانے کی تیاریوں میں تھا۔ تالاب کی سطح پر سبز کائی کا مخملی فرش بچھتا جا رہا تھا۔ خوشبوؤں کو گئے عرصہ ہو چلا تھا۔ مرشد حسب عادت کئی دن سے غائب تھا۔ تالاب کنارے پڑی سل پر بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا، مرشد ہوتا تو اس بدلتے موسموں کی کچھ خبر لیتے، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، اور یہ عروج و زوال کیا ہے، خزاں کیا ہے بہار کیا ہے؟

ابھی اس کی سوچ کا دھارا کسی سمندر کی تلاش ہی میں تھا کہ مرشد، جو جانے کب سے چپ چاپ چپکے سے پاس آ بیٹھا تھا، بولا۔ "سفر کرنا تو اتنا مشکل نہیں، لیکن سفر کی عطا کے لئے جس ظرف کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤ گے؟"

وہ چونکا۔ "تم کب آئے؟"

"میں گیا ہی کہاں تھا؟" مرشد نے حسب عادت تبسم کیا۔

اس نے بحث نہیں کی، کہنے لگا۔ "سفر تو شروع کریں، ظرف خود ہی پیدا ہو جائے گا۔"

دونوں ان دیکھے سفر پر نکل پڑے۔

دریا کنارے دیکھا کہ ایک شخص ایک ٹانگ پر کھڑا وظیفہ پڑھ رہا ہے۔

مرشد بولا۔ "یہ تلاش کم اور دکھاوا زیادہ ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جاننے کی سچی طلب ہو تو ان کرتبوں کی ضرورت نہیں۔"

ان کی باتیں سن کر اس شخص نے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور غصے میں

ابھر کر بولا۔ ''بغیر جانے سمجھے اظہار بے وقوفی کی دلیل ہے اور بے وقوف کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔''

وہ گھبرا گیا، اور معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آپ سچ کہتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کیا دکھاوا ہے اور کیا حقیقت؟''

مرشد کچھ نہ بولا، چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا، لیکن جب دونوں کچھ آگے نکل آئے تو کہنے لگا۔

''جو دکھائی دیتا ہے ضروری نہیں وہی سچ ہو۔''

''تو پھر سچ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چلو اسے تلاش کریں۔'' مرشد نے جواب دیا۔

اور دونوں گھنے جنگل میں اتر گئے۔

جنگل گھنا، نیم تاریک اور دیکھنے میں سنسان تھا، لیکن وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، چیزیں بولنے لگیں، پتے اشارے کرنے لگے، درختوں نے سرگوشیاں کیں اور چرند بھی شاخوں، جھاڑیوں اور اپنی اپنی گھوؤں سے نکلنے لگے۔

''جنگل بھی بولتے ہیں،'' مرشد بولا۔ ''اگر انھیں احساس ہو کہ سننے والا موجود ہے۔''

اسے ان چار طیور کی کہانی یاد آئی جو سیمرغ کو تلاش کرنے نکلے تھے، اور طویل سفر کی صعوبتیں سہتے جب آئینۂ صفات کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آئینۂ صفات میں انھی کا عکس موجود ہے۔ اس نے مرشد سے کہا۔

''جنگل تو ہمارے اندر بھی موجود ہے اور سرگوشی بھی کرتا ہے مگر انھی کے لئے جو اس کی آواز سننا چاہتے ہیں۔''

''سننے کی خواہش، زندہ ہونے کی دلیل ہے۔'' مرشد نے کہا۔ ''اور زندہ وہ ہے جسے اپنے ہونے کا احساس ہے۔''

جنگل کے بیچوں بیچ ایک تالاب تھا جس کے آدھے حصے پر کائی کا سبز مخملی فرش بچھا ہوا تھا، باقی کے آدھے حصے میں پانی شفاف تھا۔ اس نے مرشد سے پوچھا۔

''یہ کیا ماجرا ہے کہ آدھا تالاب اور طرح کا ہے اور آدھا اور طرح کا؟''

مرشد ہنسا۔ ''تالاب ایک ہی ہے، یہ صرف ہمارے دیکھنے کا انداز ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سچ آدمی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''واقعی صورت اشیا معلوم ہے، حقیقت اشیا مجہول ہے، اور یہی مقام تعجب ہے۔''

''تعجب بھی ایک نعمت ہے،'' مرشد بولا۔ ''تعجب ختم ہو جائے تو آدمی پتھر ہو جاتا ہے۔''

وہ آگے بڑھے کہ مقام عجب کے بعد اب مقام طلب آتا تھا۔

اور مقام طلب سے پہلے آگ روشن تھی، شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے شوں شوں کر رہے تھے کہ اس آگ میں جل ہی خرمن ہستی کو خاک ہونا تھا کہ صفات نفسانیہ میں سے کوئی صفت باقی نہ رہے۔ اس کے بغیر وصال ممکن نہ تھا۔

مرشد نے کہا۔ ''آگ عشق ہے، جل کر ہی طلب ختم ہوتی ہے اور طالب، مطلوب، اور طلب کی تثلیث باقی نہیں رہتی۔''

وہ جھجک گیا۔ ''لیکن جلنا اتنا آسان نہیں۔''

مرشد ہنسا۔ ''تطہیر قلب بھی چاہتے ہو اور جلنے سے ڈرتے بھی ہو۔ تمھارے اندر سے ابھی دنیا نہیں نکلی۔''

اسے بیوی یاد آئی۔ کھلکھلاتے بچوں کی کلکاریوں نے کانوں میں رس گھولا، بولا۔ ''آگ حسی بھی ہے اور معنوی بھی، میں حس تک ہی محدود رہنا چاہتا ہوں۔''

مرشد ہنسا، خوب ہنسا۔ ''تم اس غلام کی مانند ہو جو زرِ مکاتیب ادا کر چکا، مگر صرف ایک درہم ادا کرنا باقی ہے کہ آزادی ملے مگر اس ایک درہم کی ادائگی سے ڈر رہا ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''صفات نفسانیہ میں سے ایک صفت بھی باقی رہے تو آدمی اسی صفت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔''

مرشد نے کوئی جواب نہ دیا، بڑے وقار سے قدم قدم چلتا آگے کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ وہ باہر بیٹھا دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا، پھر خاموشی سے اٹھا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔

''اعلیٰ شہود یہی ہے کہ شاہد و مشہود کی دوئی مٹ جائے اور اسی کی آنکھیں ہوں، اسی کے جلوے، لیکن یہ وہ مقام ہے جو میرے نصیبوں میں نہیں، مرشد نے اسے پالیا۔''

اس شام سیر کے بعد وہ دیر تک تالاب کنارے سل پر بیٹھا، چپ چاپ تالاب کو دیکھتا رہا، کنول مرجھا گئے تھے اور سبز کائی آہستہ آہستہ پورے تالاب پر پھیلتی جا رہی تھی ☆☆☆

پچھلے کوئی چالیس برس سے احتشام اختر کی سادہ لیکن بھاری بھرکم شاعری نے اپنے کو دوست دشمن سب سے منوالیا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اب ان کی غزلوں کا انتخاب ناگری رسم الخط میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کے پڑھنے والے اردو زبان کے باہر بھی پھیل جائیں گے۔

میں انھیں مبارک باد دیتا ہوں۔

سوندھی مٹی کی سگندھ

(ہندی)

احتشام اختر

قیمت ۱۰۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

غزل

رشید کوثر فاروقی

شمارہ ۲۱۷،
جون ۱۹۹۸

همت عالی کا اتنا تو زیاں ہونا ہی تھا
جرم گیہاں تاب کو بے خانماں ہونا ہی تھا

یہ تو اے ماتم کنان کشتگاں ہونا ہی تھا
ان مہم جویاں کو اک دن جاوداں ہونا ہی تھا

مر کے بھی یادوں میں جینا چاہتا ہے آدمی
آدمی کی زندگی کو امتحاں ہونا ہی تھا

قسمت قاموسیاں ہر عہد میں سر گشتگی
تب تو امیتن کو آخر زماں ہونا ہی تھا

شاہد محمل سے اتنی قربتیں، یہ دوریاں
ہائے وہ جس کا مقدر سارباں ہونا ہی تھا

سونپ کر مٹی کو مٹی لی ہوا نے اپنی راہ
مشغلہ تھا خاک سے دامن فشاں ہونا ہی تھا

قید میں رکھا گیا قطرہ تو غلطاں ہو گیا
نور کی نہروں کو ناپیدا کراں ہونا ہی تھا

شہرہ ہیکل کے لئے آوازہ پیکر کے لئے
ہر توانائی کو بے نام و نشاں ہوناہی تھا

ہم نے کچھ یوں ہی نہیں جھیلا تھا قرنوں کا عذاب
آخر اس دیر آشنا کو مہرباں ہونا ہی تھا

تنگ جب کر دی گئی ہم پر زمیں کرتے بھی کیا
لازماً ہم کو زمیں سے آسماں ہو نا ہی تھا

کہکشاں کی سمت اٹھنے تھے ابد پیما قدم
جانب سیارگاں طیارہ رواں ہونا ہی تھا

تھا قفس میں بھی تو تھا فوارۂ آہنگ و رنگ
اس پرندے کو تو جنت آشیاں ہونا ہی تھا

رشید کوثر فاروقی

شمارہ ۲۲۵،
مارچ اپریل ۱۹۹۹

کتنا خلوص عشق کے ذوق بقا میں ہے
شامل مری اجل بھی مرے مدعا میں ہے

ہیں راس و چپ فراق کی تیغیں کھنچی ہوئی
آگے وہ شاخ گل ہے سو دست قضا میں ہے

دل ہو کہ سر جو نذر کیا سب اسی کا تھا
کیا جانئے دماغ وفا کس ہوا میں ہے

اے بزمیاں بتاؤ کہ سر چشمۂ کشش
نے میں ہے نے نواز میں ہے یا نوا میں ہے

ہم نے مزے وصال کے بھی خوب چکھ لیے
کس سے کہیں کہ روگ تو سارا دوا میں ہے

ماتھے کی سلوٹوں کو ستارہ بنا دیا
کچھ بات تو مری نگہ التجا میں ہے

کچھ اور ہی تھا برق حسام و سناں نہ تھی
مت بھولیے کہ بدر کا مطلع حرا میں ہے

خلق خدا کو مفت میں بدنام کر دیا
دنیا کی ہر نزاع خدیو و خدا میں ہے

کن کن قدامتوں کو ترقی نگل گئی
فرحت نسیم میں نہ طراوت صبا میں ہے

تعویذ ٹوٹنے کو ہے اس کا تڑاق سے
تہذیب کی جو قبر نئی نینوا میں ہے

اپنوں پہ سخت گیر پرایوں سے نرم خو
اس ایک کے سوا بھی کوئی دوسرا میں ہے

شاکی تو زندگی کے علائق کا ہوں مگر
مرتا ہوں اس کھنک پہ جو زنجیر پا میں ہے

رشید کوثر فاروقی

(نذرِ شمس الرحمٰن فاروقی)

شمارہ ۲۳۴،
فروری ۲۰۰۰

درد جب ہو تو مداوا نہیں ہوتا کہ نہ ہو
موت ہی سے سہی، ایسا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

وقت سے زخم کا انگور تو بھر جاتا ہے
دل میں ٹوٹا ہوا کانٹا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

ہمنواؤں سے پرے ہوتی ہے درماں کی تلاش
اور پہلو میں مسیحا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

عقل حیراں ہو جہاں اور جنوں بال کشا
پس پردہ کوئی لیلیٰ نہیں ہوتا کہ نہ ہو

مفت میں کس کو رچا ہے سرِ شمشیر کا کھیل
کسی جانب سے اشارہ نہیں ہوتا کہ نہ ہو

تو نفس بے تاب، سہولت کی طلب آوارہ
ویسے دریا نہ صحرا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

کون ہے جس کو نہ پہنچا ہو کبھی غیب کا ہاتھ
بے سہاروں کا سہارا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

پردہ اوروں کے لیے اس نے گرا رکھا ہے
حسن خود محو تماشا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

جس نے اپنے کو زمانے کے لیے تیاگ دیا
ایک دن اس کا زمانہ نہیں ہوتا کہ نہ ہو

تہ بہ تہ دھول ہو، لپٹی ہوں اندھیری راتیں
اندروں آئینہ سیما نہیں ہوتا کہ نہ ہو

آپ کو حق ہے کہ بستر سے اٹھیں یا نہ اٹھیں
ورنہ دنیا میں سویرا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

تم ہنسو مجھ پہ میں تم پر کہ ہیں دونوں معذور
سر کوئی ہو، کوئی سودا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

آج لیتے تو ہو معصوم سے ماضی کا قصاص
کسی امروز کا فردا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

چیخ کی تاک میں ہے نیل گگن کی محراب
شیشہ ٹوٹے تو چھناکا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

رشید کوثر فاروقی

شمارہ ۲۶۱،
اکتوبر ۲۰۰۲

پھنسا ہے دل جو تمنا کے تانے بانے میں
طلسم ہوش ربا ہے غریب خانے میں

یہ سب سوال گل و غنچہ سے کرو، ہم کون
چمن کی خاک، نہ ہنسنے نہ مسکرانے میں

خزانہ کاسۂ سر میں ہو، اور خازن ہی
نہ آشنا ہو کہ کیا کیا ہے اس خزانے میں

نظر ابھی انھیں حیرانیوں میں ہے کہ جمال
بدن کے کھلنے میں ہے یا ترے چھپانے میں

شکار مہر کہاں کا کہ عمر بیت گئی
یہ ڈھول گوندھ کے اک سائباں بنانے میں

جہاں طیور کو چگنا تھا بھٹک گئے ظالم
کہاں کہاں کے چمن ہوں گے دانے دانے میں

نہ لاگ ہو نہ لگن انتظار ہو نہ کڑھن
تو دل لگی کے سوا کیا ہے دل لگانے میں

وہ سونے والے بھی سوئے ہوئے تھے کن نیندوں
جگانے والے بھی خود اونگھا کئے جگانے میں

عجب پڑاؤ ڈیرے کھڑے بھی ہو نہ سکے
سفر تمام ہوا صرف آنے جانے میں

چمن نے غسل کو میلی قبا اتاری ہے
ارے تو دیر ہی کیا ہے بہار آنے میں

تری گلی کا گدا قبلۂ خلائق ہو
یہ بھید کیا ہے دل و جاں پہ کھیل جانے میں

ہزار آئینہ پرتو ہزار جلوہ حجاب
نہیں ہو تم کہ یہیں ہو نگار خانے میں

رضوان حسین

شمارہ ۱۱،
اپریل ۱۹۶۷

جدید شاعری سے متعلق جو ڈائیلاگ "شب خون" کے صفحات پر جاری ہے اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک "نمائندہ جدید شاعر" کے ذہن کو سمجھنے کا موقع مل گیا۔ "نئے تیشے، نئے کوہ کن" کو جب میں نے پہلی بار پڑھا تو مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ احتشام صاحب "خانہ بدوش جدید ادب" پر شب خون مار رہے ہیں یا تیشہ بازی کا ہنر دکھا رہے ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف میرا تو احتشام صاحب سے یہ شکایت کرنے کا جی چاہا کہ آخر آپ سیدھی سادی بات کو بہ طرز شاعر جدید تلازموں میں چھپانے کی کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ مگر اب جب کہ ایک سنجیدہ بحث تیز گفتگو میں تبدیل ہو چکی ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ احتشام صاحب جدید شاعر کی تنک مزاجی کا لحاظ کرتے ہوئے نرم لہجہ اور بالواسطہ طریقہ استعمال کر رہے تھے۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جدید شاعر جس نے اپنے آپ کو ایک شیشے کے مکان میں محفوظ کر رکھا ہے۔ "سنگ باری" کی زد میں آئے اور اسی لئے انھوں نے اپنے اعتراضات کا رخ شخصیات کے خلاف نہیں بلکہ ایک رجحان کے خلاف رکھا تھا۔

مگر اب جب کہ اس بہ ظاہر معصوم مضمون نے دل کے پوشیدہ چور کو سامنے لا کھڑا کیا ہے اور جس کی داڑھی میں تنکا تھا وہ بول ہی اٹھا ہے تو احتشام صاحب سے یہ امید تھی کہ وہ سب کچھ صاف صاف کہہ دیں گے جن باتوں کو وہ اب تک دفع شر کی خاطر اپنے مضمون میں نہیں کہہ پائے تھے۔ اور عمیق حنفی صاحب سے بھی یہ امید تھی کہ اس بحث میں وہ جدید شاعری کے ان نکات کو بہ خوبی سمجھ سکیں گے جن کو سمجھنے سے احتشام صاحب قاصر ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ ہمارے "نمائندہ جدید شاعر" نے مظلومیت کا مرثیہ کچھ اس زور شور سے پڑھنا شروع کیا اور "ظالم تنقید" پر اس انداز سے لعن طعن شروع کی کہ احتشام صاحب نے بحث کو آگے بڑھانے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ لہٰذا اتنی بحث ہونے پر بھی یہ نہ پتہ چل پایا کہ آخر "جدید شاعری" سے ان دونوں حضرات کی مراد کیا ہے؟ دراصل یہ تو احتشام صاحب کا ہی فرض تھا کہ وہ بحث کے آغاز ہی میں اس بات کی وضاحت کر دیتے کہ آخر یہ "بہت سے جدید نظم نگار" کون ہیں جن کے رویہ سے وہ مطمئن نہیں اور جن کی گمراہی سے اردو شاعری کا مستقبل تاریک ہو رہا ہے؟ لطف تو یہ ہے کہ خود وہ مبہم اشاروں میں بات کرتے رہے اور الٹے حنفی صاحب سے یہ شکایت کر ڈالی کہ وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کی فہرست میں کون کون سے "جدید شاعر" شامل ہیں۔ حنفی صاحب نے بحث کے ابہام سے پورا فائدہ اٹھا کر جواب میں اپنا "بک ریک" پیش کر دیا جس کی ابتدا میراجی سے ہوتی ہے اور انتہا کمار پاشی پر۔ ظاہر ہے احتشام صاحب کا "بک ریک" اس سے بڑا ہی رہا ہوگا لہٰذا انھوں نے اس فہرست میں اقبال، جوش، فراق، ملا وغیرہ کا بھی اضافہ کر دیا۔ ان فہرستوں کی وسعت سے دونوں کے حوصلے کا پتہ تو چلتا ہے، مگر یہ نہیں کہ اس بحث کا رخ کیا ہے اور اس کا موضوع کیا ہے؟ یہ تو صحیح ہے کہ لفظ "جدید" کے مفہوم کو وسعت دی جا سکتی ہے، مگر اس بحث میں اس کی ضرورت تھی کہ اس لفظ کو بغیر وضاحت کے نہ استعمال کیا جاتا۔

اب اگر اس کی اجازت ہو کہ ان دونوں حضرات کے مقاصد و اغراض کا تجزیہ کیا جا سکے، تو میں کہوں گا کہ یہ سارا "کنفیوژن" دانستہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے تو احتشام صاحب نے غیر ضروری احتیاط برت کر صرف فرد جرم پیش کی مگر مجرم کے نام کو چھپائے رہے تا کہ اپنی بے اطمینانی کا اظہار بھی ہو جائے اور احتجاج سے بھی بچے رہیں۔ مگر اب جب کہ حنفی صاحب نے ان اعتراضات کو ایک ذاتی مسئلہ بنا کر احتجاج شروع کیا تو احتشام صاحب نے ان اعتراضات کو اور مبہم بنانے کے لئے کبھی تو جدید شاعروں کی فہرست اقبال اور ملا تک پھیلا دی اور کبھی مزید استفسار پر یہ کہا کہ ان اعتراضات کا تعلق تمام جدید شاعری سے نہیں، بلکہ اس کے صرف ایک حصے سے ہے۔ اور اب یہ "حصہ" دوسرے حصے سے کیسے ممتاز کیا جائے، اس کو احتشام صاحب نے پڑھنے والے کی توفیق اور سمجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ بعض وقت تنقید میں سلامت روی، انتہا پسندی سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔

اب رہی عمیق حنفی صاحب کی بات تو انھوں نے عمداً میراجی، راشد، اختر الایمان، منیب الرحمٰن، اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے ناموں کو اپنی فہرست میں شامل کیا ہے۔ حنفی صاحب یہ تو بہ خوبی جانتے ہی ہیں کہ میراجی اور راشد جدید شاعری کے ایک دور سے، اختر الایمان اور مختار صدیقی دوسرے دور سے، اور منیب الرحمٰن اور خلیل صاحب تیسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان سب کا ایک سانس میں نام لینا اور خاص کر جب یہ سانس کمار پاشی پر ٹوٹے گی، کسی طرح سے مناسب نہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ حنفی صاحب یہ زیادتی لاعلمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ عمداً کر رہے ہیں۔ حنفی صاحب دل ہی دل میں یہ تو جانتے ہی ہیں کہ شاعروں کی جس نسل سے ان کا تعلق ہے اور جس کی نمائندگی کا بوجھ انھوں نے اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے، اس کا نہ تو ابھی کوئی ایسا ادبی کارنامہ ہے اور نہ ایسی مقبولیت کو جو جی میں

آئے کہے اور جتنے بڑے دعوے ہو سکتے ہیں کر لے اور پھر بھی کسی مصلحت یا مرعوبیت کی وجہ سے تنقیدی گرفت سے آزاد رہے۔ لہٰذا اپنی نسل کے ساتھ انھوں نے وہ نام بھی ٹانک لئے ہیں جن کو ایک ادبی اعتبار حاصل ہو چکا ہے اور جن کی آڑ میں وہ اپنی ادبی کم مائیگی کے باوجود بھی ''بڑے بول'' بول سکتے ہیں۔ یہ تو رہی حنفی صاحب کی دفاعی تیاری۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لگے ہاتھوں ''روایتی تنقید'' کی کم مائیگی اور اس کے نقائص کا بھی چرچا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو یہ باور کرا سکیں کہ اگر یہ ''روایتی تنقید'' ہم کو عظمت کی سند نہیں دیتی تو اس میں ہماری کم مائیگی کو دخل نہیں، بلکہ یہ تو اس کا پرانا دستور ہے اس لئے کہ اس نے اپنے لطف و کرم سے میراجی، راشد، اختر الایمان جیسے شاعروں کو بھی محروم رکھا ہے۔ اب پتہ نہیں کہ ان بزرگ شعرا کو اس نسل میں شامل ہونے کا کہاں تک شوق ہے، مگر یہ بات ضرور واضح ہو گئی ہے کہ ہمارے ''جدید شاعر'' کو ساری فکر اس کی ہے کہ ''پیروں'' کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے تاکہ نجات کا معاملہ پکا رہے۔

بہر کیف اس Smoke Screen کے باوجود بھی اس بات کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس بحث کا اصل موضوع دراصل شاعروں کی وہی نسل ہے، جس میں عمیق حنفی اور کمار پاشی بھی شامل ہیں۔ ویسے مجھے تو یہ ساری بحث قبل از وقت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ہمارے ان جدید ترین شعرا میں سے کسی نے بھی کوئی ایسا کارنامہ نہیں کیا کہ جس کی بنا پر ان کی ذہنی سطح اور فنی Maturity کا تعین کیا جا سکے۔ ان نوجوان شعرا میں سے کچھ تو ضرور ایسے ہیں جن کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فنی آہنگ اور توازن کو دریافت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مگر اس وقت ان کے لئے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوں گے اور وہ ہماری شاعری کی روایت میں کس نوعیت کا اضافہ کریں گے۔ لہٰذا اس منزل پر یہ فیصلہ کرنا کہ آج کے جدید شعرا سے اردو شاعری کا مستقبل تاریک ہو گا یا روشن، اتنا ہی قبل از وقت ہے جتنی عمیق حنفی صاحب کی یہ خواہش کہ بغیر کسی کارنامے کے ان کو عظمت کی سند مل جائے وہ Class Room Classic بن جائیں اور ان کو تعلیمی نصاب میں شامل کر لیا جائے۔

بہر کیف، مستقبل کے بارے میں اس وقت کسی طرح کی پیشین گوئی یا ''جدید شاعر'' کی یہ جنگ جو وہ بڑی شد و مد سے اپنے Recognition اور شہرت کے لئے لڑ رہا ہے، قبل از وقت ہی نہیں، بلکہ غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ ہمارا نقاد جدید شاعر کے دعووں سے نہیں بلکہ اس کی شاعری سے واسطہ رکھتا اور اس وقت تک خاموشی سے انتظار کرتا رہتا جب تک کہ یہ جدید شاعر اپنی شعری صلاحیت یا فقدان صلاحیت کا ثبوت نہ دے دیتا۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس بحث بحثی کی تمام تر ذمہ داری احتشام صاحب پر ہی نہیں عائد ہوتی، بلکہ اس کے ذمہ دار حنفی صاحب بھی ہیں، اس لئے کہ وہ عرصہ سے اپنی جھنجلاہٹ اور غم و غصہ کا اظہار بڑے ہی تند و تیز انداز میں مضامین لکھ لکھ کر کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کا سبب ان کی شاعری نہیں بلکہ ڈانٹ پھٹکار ہو گی۔ غالباً حنفی صاحب نے یہ پڑھ رکھا ہو گا کہ ایزرا پاؤنڈ نے بھی Blast کرنے کا کچھ یہی طریقہ استعمال کیا تھا مگر اس تقلید میں وہ یہ نہ بھولیں کہ اس کے دعوے اس وقت بھی کھوکھلے نہ تھے اور اس کی شاعری کو وہ اعتبار حاصل ہو چکا تھا کہ اس کے پڑھنے والوں نے ان Tirades کو ''بڑے بول'' کہہ کر انہیں ٹال دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی ایزرا پاؤنڈ کو اس ڈانٹ پھٹکار سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکا تھا۔

بہر کیف چونکہ بحث چل ہی نکلی ہے لہٰذا اس پر بھی غور کر لیا جائے کہ آخر حنفی صاحب کے دعوے کیا ہیں اور احتشام صاحب کے شبہات کی نوعیت کیا ہے؟ مگر قبل اس کے کہ اس بحث پر توجہ کی جائے، بہتر یہ ہو گا کہ ان ''جدید شاعروں'' کے متعلق کچھ سوالات کر لئے جائیں جن کے خود ساختہ ترجمان حنفی صاحب ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر ان شعرا کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ دوسری بات یہ کہ کیا یہ شاعر اپنے عقائد، خیالات یا اسلوب کی یکسانیت کی وجہ سے کسی تحریک کی ابتدا یا ادبی گروپ کی تشکیل کر رہے ہیں؟ اس صدی کی پانچویں دہائی سے جو شاعری ''جدت'' کے نام پر ہو رہی ہے اس سے ایک مجموعی رجحان یہ ابھرتا ہے کہ یہ شاعری تمام تر ردعمل کی شاعری ہے۔ یہ ردعمل دراصل ترقی پسند شاعری کے موجودہ موضوعات اور اس کے سماجی Emphasis کے خلاف ہے۔ ویسے تو ٹھیک اس وقت بھی جب کہ ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور اس کے فوراً بعد بھی، ان موضوعات اور اس سماجی Emphasis سے ہٹ کر شاعری ہوئی، مگر اس شاعری کو محض ردعمل کا نتیجہ ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں دراصل عقائد کے اختلاف کو بھی دخل تھا۔ اور اسی لئے میراجی، راشد، اختر الایمان اور خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری میں زندہ رہنے کی وہ صلاحیت موجود ہے جو ایک مثبت عقیدے سے پیدا ہونے والی شاعری میں ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ''جدت پسند'' نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد ابھی تک اس ردعمل کی شد سے مفر نہیں حاصل کر پائی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ردعمل ہی ان کا درمیان ایک قدر مشترک ہے اور یہی ان کا مطمح نظر ہے۔

کسی ردعمل ہی کا مطمح نظر بن جانا ایک منفی رجحان کہلائے گا، اس لئے کہ ردعمل صرف اس منزل تک تو ضروری ہوتا ہے جہاں تک یہ نئے امکانات کی تلاش اور دریافت میں مددگار ثابت ہو مگر اس کے بعد یہ کسی مثبت طرز فکر یا عقیدے کا بدل نہیں بن سکتا۔ اور اسی لئے ان نوجوان شعرا کے درمیان جو اشتراک ہے وہ بہت ہی سطحی ہے۔ اس دور کی شاعری کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ''جدت'' کا خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہے۔ ہر شاعر ''جدت'' کے حصول میں خود اپنے طریقے استعمال کر رہا ہے۔ کبھی تو اس ''جدت'' کی خاطر مغرب سے ہیئت اور طرز فکر کو بغیر سوچے سمجھے امپورٹ کیا جا رہا ہے (اس کی بہترین مثال خود حنفی صاحب ہیں) اور کبھی اس جدت کی تلاش میں شاعری کی صنمیات کے الفاظ استعمال سے ادق بنایا جا رہا ہے (اس کی بہترین مثال کمار پاشی ہیں)۔

مگر اس بات کو اگر یہیں پر چھوڑ دیا جائے تو ان نوجوان شعرا کے ساتھ زیادتی ہو گی جو اسی نسل میں شامل ہیں اور سچی جدید شاعری کر رہے ہیں اس ادبی Chaos میں کچھ نوجوان شاعر ضرور ایسے ہیں جو اپنے نئے لہجہ اور فکری اور فنی ضبط و احتیاط سے پڑھنے والوں کو متوجہ کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے قابل ذکر جو چیز

ہے وہ ہے ان کا ایک نیا لہجہ (Idiom)، اور حقیقت تو یہ ہے کہ نئے لہجہ کی دریافت ہی نئی شاعری کی پہچان ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے جب غزل کے لہجے سے آزاد ہونا چاہا تو انھوں نے بھی ایک لہجے کی دریافت کی تھی جس کو "خطابت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ لہجہ ان کی شاعری کے مقاصد اور اس وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہا تھا، اس لئے کہ اس پرشور زمانے میں خطابت ہی کا لہجہ سنا جا سکتا تھا۔ مگر اس دور میں وہی خطابت مولویانہ معلوم ہوگی، اس لئے کہ آج آہستہ کلامی ہی موثر لہجہ بن سکتی ہے۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ میں اس سیاسی اور سماجی Context کی تبدیلی کی وضاحت کروں جس کی وجہ سے لہجے کی تبدیلی بھی ضرور ہوگئی ہے، بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج آہستہ کلامی ہی اس دور کی سچی اور موثر آواز معلوم ہو رہی ہے اور اس آہستہ کلامی کی مثال آپ کو وحید اختر، بلراج کومل، اور شہریار کے یہاں مل جائے گی۔

اس تقسیم سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونا چاہئے کہ میں حنفی صاحب اور کمار پاشی کی شاعرانہ صلاحیت پر شک کر رہا ہوں یا یہ کہ وہ ایسے Dead End پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے امکانات کے راستے نہیں پھوٹتے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا تھا کہ جدت کی تلاش میں ایسے طریقے بھی استعمال کئے جا رہے ہیں جو نہ تو ہماری شاعری کی مرکزی روایت میں کھپ سکتے ہیں اور نہ وہ کسی سچے تجربہ کے اظہار کا ذریعہ ہی بن سکتے ہیں۔ میں یہ بھی واضح کرنا چاہ رہا تھا کہ اس وقت دو طرح کی شاعری ہو رہی ہے: ایک وہ جس کی مثالیں حنفی صاحب اور کمار پاشی کے یہاں تلاش کی جا سکتی ہیں اور جس کے الہام کا منبع خود اپنا کلچرل Context نہیں بلکہ دو جنگوں کے درمیان کا یورپ ہے جہاں جنگ کے بعد کی تباہ حالی اور شہروں کے جبر نے انسانی رشتوں کے تقدس کو بھی مشکوک کر دیا تھا۔ مگر چونکہ انگریزی اور دوسرے یورپی شاعروں کے لئے یہ اپنا تجربہ تھا لہٰذا ان کی شاعری میں جو خلوص اور Cosmopolitan Sophistication ملتا ہے وہ ہماری جدید شاعری میں باوجود ایک سنجیدہ تقلید کے بھی نہ پیدا ہو سکا۔ اس کے علاوہ دوسرے قسم کی جو شاعری ہو رہی ہے اس کی اچھی مثال "اسم اعظم" اور "پتھروں کا مغنی" میں مل سکتی ہے، جس میں چونکانے کے بجائے ایک ایسا دھیما اور افسردہ لہجہ ہے جو ترسیل کو موثر بناتا ہے اور جس میں ہمارے مانوس تجربات سے پرہیز نہیں کیا گیا۔

اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ اس دور کی جدید شاعری میں کوئی ایک اجتماعی رجحان کارفرما نہیں ہے جو ان کو ایک "گروپ" میں منسلک کر سکے، یا تمام جدید شاعروں کے لئے مابہ الامتیاز بن سکے۔ بلکہ اس وقت کئی آوازیں سنی جا سکتی ہیں، کچھ تو محض "تقلیدی" ہیں اور کچھ یقیناً اور جینئن اور سچے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں اگر حنفی صاحب کسی "گروپ" کی تشکیل کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کی یہ کوشش محض ایک ادبی سیاست کے تحت تو ضروری ہے۔ (اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اس ساری بحث میں حنفی صاحب تنہا جوکھم لڑ رہے ہیں اور ان کی مدد کے لئے جدید شاعروں میں سے سوائے بلراج کومل کے کوئی آگے نہیں بڑھ رہا)۔

اس تفصیل کے بعد اب ذرا اس ڈائیلاگ پر بھی نظر ڈال لی جائے جو حنفی صاحب اور احتشام صاحب کے درمیان شروع ہوا اور جس نے ایک مناظرے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

احتشام صاحب نے اپنے مضمون "نئے تیشے، نئے کوہ کن" میں اردو شاعری کی مرکزی روایت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ (اس طرح کی کسی بھی تعریف میں نقطۂ نظر کو بڑا دخل ہوتا ہے۔) انھوں نے شیریں، جوئے شیر، تیشہ، بے ستون، اور خسرو پرویز کے تلازمے میں تخلیق، ذریعہ تخلیق، زمین تخلیق اور محرک تخلیق کے رشتوں کو بتایا ہے۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ شیریں اور کوہ کن بھی بدلیں گے۔ احتشام صاحب جس بات پر مصر ہیں وہ یہ کہ شیریں اور کوہ کن، تیشہ و جوئے شیر اور کوہ بے ستون میں جو بنیادی رشتہ ہے وہ منقطع نہ ہو، اس لئے کہ یہی رشتہ تفہیم تخلیق کو ممکن بناتا ہے یعنی شاعر اور اس کے قاری کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا احتشام صاحب ہر اس انحراف سے جو اس رشتے کو کم زور یا منقطع کرے متفق نہیں۔ مثلاً وہ خارجیت اور داخلیت کی میکانکی تقسیم کو بے معنی سمجھتے ہیں اور کسی ایک ذہنی کیفیت، تجربہ یا جذبہ کو ایک تنہا حقیقت کی شکل میں دیکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اپنے ان اصولوں کی روشنی میں جب احتشام صاحب "بہت سے جدید نظم نگاروں" کو پرکھنا چاہتے ہیں تو ان کو ناامیدی ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ نظم نگار انفرادیت اور عدم مقصدیت کے حصول میں اس بنیادی رشتے کو منقطع کر رہے ہیں جس سے ترسیل ممکن ہے۔ اس طرح احتشام صاحب کو ان نظم نگاروں سے جس چیز کی شکایت ہے وہ ہے ان کی نظموں میں غیر ضروری ابہام اور فقدان ترسیل۔

احتشام صاحب کا یہ مضمون "شب خون" کے پہلے شمارے میں شائع ہوا اور تیسرے شمارے سے اصل بحث کا آغاز ہوا۔ عمیق حنفی صاحب کو احتشام صاحب کے بنیادی اصولوں سے پورا پورا اتفاق ہے اور وہ اظہار ساتھ ترسیل کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ مگر ان کا اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ وہ ترسیل کو اپنی ذمہ داری نہیں مانتے، اس لئے کہ ترسیل کی ذمہ داری قبول کرنے سے غیر شروطیت اور انفرادیت کے حصول میں دقت پیش آئے گی۔ لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ وہ "اظہار کی ترسیلی صلاحیت بڑھانے کے لئے کسی نظام فکر، تصور حیات یا منشور کی اطاعت" کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے کہ یہ اطاعت جدید شاعر کی "فنی دیانت داری" اور اس کی فکری وسیع النظری" کے حق میں نہیں ہے۔ حنفی صاحب کے خیال میں یہ اطاعت صرف ان شاعروں کے لئے ضروری ہے جن کے سامنے "حیات و کائنات افشانہ ہو"۔ مگر چوں کہ آج کے جدید شعرا (جن کے خود ساختہ ترجمان حنفی صاحب ہیں) اور حیات و کائنات کے درمیان کوئی حجاب کوئی پردہ، کوئی دیوار اور کوئی غیریت نہیں رہ گئی ہے لہٰذا کسی مخصوص تصور حیات سے وابستگی کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے میں حنفی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ "جدید شاعر تخلیقی عوامل سے گذرتے ہوئے اپنے ذہن کو غیر مشروط رکھتا ہے" (ملاحظہ ہو "شب خون" کا تیسرا شمارہ صفحہ ۷۳)۔

جن اوصاف کو حنفی صاحب نے "جدید شاعر" سے منسوب کیا ہے، ان کی بنیا پر اس شاعر کو پیغمبری کیا، خدائی کا درجہ مل سکتا ہے۔ مگر مجھے ان دعووں کی صداقت پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ حنفی صاحب خود جدید شاعر ہیں اور غالباً وہ اپنے ذاتی علم وعرفان کی بنا پر ایسے دعوے کر رہے ہوں گے، اور خدا کرے اردو کے تمام نوجوان شاعر حنفی صاحب کی قیادت میں عرفان و آگہی کی اسی منزل پر پہنچ جائیں۔ (ان دعووں کی صداقت کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لئے خود حنفی صاحب کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہے۔) مجھے تو جو بات کہنا ہے وہ یہ کہ حنفی صاحب کے ان بیانات میں دو بہت دلچسپ تضاد ہیں۔ اول تو یہ کہ حنفی صاحب، احتشام صاحب سے جس حد تک متفق ہیں (یعنی یہ کہ حنفی صاحب یہ مانتے ہیں کہ خارجیت اور داخلیت کی میکانکی تقسیم بے معنی ہے، کسی ایک ذہنی کیفیت، جذبے یا تجربے کو ایک تنہا حقیقت کی شکل میں دیکھنا درست نہیں، اور اظہار کے ساتھ ترسیل کی اہمیت سے انکار ٹھیک نہیں)، اس کے بعد "ترسیل کی ذمہ داری" پر اختلاف اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کچھ منطقی نہیں معلوم ہوتا۔ اور جہاں منطق بے بس ہو جاتی ہے وہیں سے لفاظی کا جادو اور الفاظ کے تشدد شروع ہو جاتا ہے۔

حنفی صاحب نے اس تضاد کو اپنے غصے اور بلند آہنگ الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ مگر جب احتشام صاحب نے کو اس تضاد کی طرف متوجہ کیا تو انھوں نے اپنے اس بیان میں ذرا سی تبدیلی کی اور "غیر مشروط ذہن" کی وضاحت اس طرح کی کہ "ادیب تخلیقی عوامل کے دوران اپنے ذہن کو کسی A priori عقیدے یا نظریے کا مطیع نہ بنائے" (ملاحظہ ہو "شب خون" کا پانچواں شمارہ، صفحہ ۴۳)۔ غالباً حنفی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ "تخلیقی عوامل" کے دوران تو "جدید شاعر" مشروط ذہن سے کام لیتا ہے، مگر اس سے پہلے یا اس کے بعد وہ کسی عقیدے یا نظریے کا مطیع بن سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنفی صاحب نے تخلیق کی نفسیات میں کوئی نیا اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ دوسرا تضاد اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور وہ یہ جس بلند آہنگی سے وہ اپنے دعوے پیش کرتے ہیں اور جس بے نیازی سے وہ ترسیل کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں اس کا بھرم اسی بحث میں آگے چل کر کھل جاتا ہے (ملاحظہ ہو "شب خون" کا تیسرا شمارہ، صفحہ ۴۷)۔ حنفی صاحب ابہام کے مسئلے کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "احتشام صاحب کی شکایتیں بجا اور تقاضے برحق لیکن جدید شاعری کے ابہام اور اہمال کے ذمہ داری محض چند جدید شاعروں ہی پر نہیں، نصاب تعلیم، ناقدین کرام، طرز تعلیم، مشاعروں اور شاعری کے سیاسی پلیٹ فارموں کے آفریدہ مذاق اور ہمارے کلچرل اور فنی اداروں پر عائد ہوتی ہے۔

اب یہ کتنی دلچسپ بات ہے کہ حنفی صاحب نے جس بلند آہنگی سے اپنی "شدید انفرادیت" اور "غیر مشروطیت" کا اعلان کیا تھا اس کو اپنی "مدد طلبی" سے رد کر دیا۔ "غیر مشروطیت" کے دعوے دار کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اگر ترسیل کی ذمہ داری نہیں قبول کرتا تو وہ اس بات سے بھی بے نیاز ہو جائے کہ دوسرے اس کو سنیں، اور اس کے فن پر توجہ دیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ ہمارے جدید شاعر نے "انفرادیت" اور "غیر مشروطیت" کا چرچا محض اس لئے شروع کیا کہ وہ ایک دم بیسویں صدی کے فیشن میں شامل ہو جائے اور جس کے اس فارمولے سے وہ اپنے قارئین کو مرعوب کرتا رہے اور اگر کوئی نکتہ چینی کرے تو یہ کہے کہ ہم انفرادیت کی جلاوطنی میں گرفتار ہیں۔ اس خود ساختہ "جلاوطنی" سے جب دم گھٹنے لگتا ہے تو ہمارا جدید شاعر کبھی ناقد کو پکارتا ہے، اور کبھی نصاب تعلیم سے مدد طلب کی جاتی ہے (حنفی صاحب نے نصاب تعلیم میں شامل ہونے کی سفارش بلراج کومل سے بھی کرائی ہے۔ ملاحظہ ہو "شب خون" کا ساتواں شمارہ صفحہ ۴۷)۔ اب حنفی صاحب کو یہ کون بتائے کہ کلاس روم Classic بننے میں وقت لگتا ہے، یہ تو ممکن نہیں کہ "جدید شاعر" جلد سے جلد اس Establishment کا حصہ بن جائے جس سے وہ آج شاکی ہے۔ اور حنفی صاحب کو تو اس دستور کا بھی علم ہوگا کہ کلاس روم تک پہنچنے کے لئے شاعر کو "عام پڑھنے والوں کی عدالت" میں بھی ضروری دینا پڑتی ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ حنفی صاحب کو احتشام صاحب کے اس مشورے میں یہ نفسیاتی نکتہ سوجھ گیا کہ اس عدالت میں "ملزم" بن کر جانا پڑے گا۔ یہ خوف دراصل صرف اس لئے ہے کہ قارئین تک تو مانوس تجربات کے ذریعہ ہی پہنچا جا سکتا ہے اور جب شاعر نے "جدت" کے فارمولے میں انفرادیت اور غیر مشروطیت کے ساتھ بدیسی تجربات اور طریق فکر کو بھی شامل کر لیا ہو تو وہ قاری تک پہنچے کیسے؟ لہٰذا اس کو اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کے شعبے اس کے لئے Public Relations Office کا کام کریں اور ناقد P.R.O. بن جائیں۔ خود تو ابہام کو "جدید" بن جانے کی خواہش میں ضروری سمجھیں، اور "ابہام کشائی" کی ذمہ داری ناقد پر ڈال دیں، اور اگر ناقد ایسا نہ کریں تو خفا ہو جائیں۔

حنفی صاحب کو اس پر اصرار ہے وہ بیسویں صدی میں ہیں اور ان کے لئے یہی "جدید" ہونے کا جواز بھی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ تاریخی اعتبار سے حنفی صاحب بیسویں صدی میں ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری بیسویں صدی اور الیٹ کی بیسویں صدی میں کم از کم تین صدیوں کا فرق ہے۔ لہٰذا الیٹ کا تجربہ حنفی صاحب کا تجربہ نہیں ہو سکتا، اور الیٹ کو جس "جدت" کی ضرورت تھی، وہ حنفی صاحب کے کام نہیں آ سکتی۔ ویسے تو آج کی دنیا میں یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم چاہے سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے کتنے بھی پس ماندہ ہوں مگر افکار کی افراط سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اور کسی حد تک یہ بات بھی صحیح ہے کہ خیالات چاہے وہ ہمارے حقیقت تجربات سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہمارے ذہن پر ایک اثر بھی ڈالتے ہیں۔ مگر کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس اثر کے تحت ہم اپنے ذہن کو یورپ کے ذہن کے منضم کر لیں؟ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے توازن کو کھو بیٹھیں، اور اپنے احساسات کو اس حد تک بے حس کر دیں کہ حقیقت کتنی بھی سنگین ہو، ہمیں متوجہ نہ کر سکے۔ میں اس کا منکر نہیں کہ "تنہائی کا کرب" اور "جدید شہر کا جبر" تحریک تخلیق نہیں بن سکتا۔ مگر بس شرط یہ ہے کہ تجربات اپنی ہی ہوں، مستعار نہ لئے گئے ہوں، ورنہ اصل ونقل میں وہی مضحکہ خیز فرق ہوگا جو لندن میں لکھی گئی Waste Land اور اندور میں لکھی گئی "سند باد" میں ہے۔

حنفی صاحب جیسے عالم شاعر سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ جس ادب میں شاعری کی ایک طویل اور پروقار روایت موجود ہو، اس میں بے تحاشا تجربات کی کوشش کچھ بہت زیادہ کام یاب نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر انگریزی شاعری ہی کو لے لیجئے۔ بیسویں صدی کے گوناگوں تجربات کو انگلستان میں کم ہی منہ لگایا گیا، اس لئے یہ وہاں کی شعری روایت میں خود اتنی وسعت اور جان تھی کہ وہ نئے تجربات اور نئے شعور کو اپنے ہی فریم ورک میں اظہار اور Originality کا موقع دے سکتی تھی۔ لہٰذا Experimentalism دراصل امریکی Fad رہا ہے، اس لئے کہ امریکہ میں ناول نگاری میں تو ایک قابل قدر روایت کی تشکیل ہو سکی، مگر شاعری میں کوئی ایسی روایت نہ بن سکی جس سے ایک طرح کی تخلیقی خود اختیاری پیدا ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے وہاں آج تک نت نئے تجربات کا ایک سیلاب ہے جو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگلستان میں جن دو شاعروں نے تجربات کو بڑھاوا دیا وہ بھی دراصل امریکی تھے، یعنی الیٹ اور پاؤنڈ۔ اب اس کو الیٹ کی ذہانت کہئے کہ عین اس وقت جب کہ وہ شاعری میں تجربات کر رہا تھا، اس نے مضامین لکھ لکھ کر روایت کی بات چھیڑی، اور یہی نہیں بلکہ فرانس سے امپورٹ کئے ہوئے تجربات کے لئے اس نے سترہویں صدی کی انگریزی شاعری سے جواز تلاش کرنا شروع کیا، تاکہ اس کے نئے تجربات انگریزی شاعری کی روایت میں پیوست ہو جائیں اور انگریزی مزاج سے ہم آہنگ رہیں۔ (ان انگریزی شاعروں کو پڑھتے وقت ایک بات اور یاد رکھنا چاہئے کہ جنگ کی تباہ کاریوں اور جدید شہر کے جبر نے ان شاعروں کو "تنہائی" کا ایک ایسا مشترک تجربہ دیا تھا جو شاعر اور قاری کے درمیان رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا۔)

میرے خیال میں اردو شاعری کی بھی ایک پروقار روایت ہے جو نئے تجربات اور نئے تخلیقی امکانات سے وسیع اور توانگر تو کی جا سکتی ہے مگر جس سے قطعی انحراف کچھ زیادہ راس نہیں آتا۔ حالی سے لے کر ترقی پسند ادیبوں تک تجربے کے نام پر جو کچھ ہوا ہے، اس کا صرف وہی قلیل حصہ قابل قبول بنا جو ہماری شاعری کی مرکزی روایت میں کھپ سکا۔ اس کے برخلاف ہندی شاعری میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھ لیجئے۔ چونکہ ہندی شاعری میں کوئی ایسی مستحکم روایت نہیں جیسے اردو میں ہے، لہٰذا وہاں تجربات پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ اور یہ صحیح ہے کہ ہندی میں جتنے تجربات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں، اس کثرت سے نہ اردو میں اتنے تجربات ہوئے ہیں اور نہ ان کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

میں تجربات کا مخالف نہیں، بلکہ اس کے برخلاف میں یہ سمجھتا ہوں کہ نئے تجربات اور نئی آوازوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ ہمیں کچھ دے ہی جاتی ہیں۔ مگر اس جوش میں اچھے اور برے، کھرے اور کھوٹے کی تمیز کو نہ ختم کر دینا چاہئے، اس لئے کہ اکثر "جدت" کے نام پر ایسا جدید ادب بھی پیدا ہونے لگتا ہے جو ہمارے لئے "جدید" ہی ہوتا ہے اور نہ ادب۔ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ ادیب کے لئے محض غیر ادبی مفاد کے واسطے کوئی عقیدہ مسلط کیا جائے۔ ادیب کو اپنے عقائد کے انتخاب کے لئے تنہا چھوڑ دینا چاہئے۔ مگر حنفی صاحب کے اس دعوے سے کون متفق ہو سکتا ہے کہ ادیب کو کسی بھی عقیدے سے کوئی سروکار رکھنا ہی نہ چاہئے؟ ادب بہر کیف خلا میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ ہر اچھے ادب کی تخلیق کسی نہ کسی مثبت عقیدے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ Waste Land کے بارے میں I.A. Richards نے یہ شکایت کی کہ یہ نظم ہر عقیدے کی نفی کرتی ہے تو الیٹ نے جواب دیا تھا کہ کہ کہنا ٹھیک نہیں کہ اس نظم میں عقیدے سے انحراف کیا گیا ہے بلکہ اگر بے یقینی اور تشکیک کا احساس ملتا ہے تو وہ دراصل عقیدے تک پہنچنے کی ایک منزل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الیٹ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ عقیدے سے بے نیازی کا وہ دعویٰ کرتا جو حنفی صاحب کر رہے ہیں۔ الیٹ نے تو اپنے مضامین اور Waste Land کے بعد کی تمام شاعری میں عقیدے کی اہمیت ہی کو واضح کیا ہے۔ الیٹ کی شاعرانہ ارتقا کی منزلوں کا اگر تعین کیا جائے تو اس کا چارٹ کچھ اس طرح بنایا جا سکتا ہے: فقدانِ عقیدہ کا مرثیہ، عقیدے کی تلاش، اور پھر ایک عقیدے کی دریافت۔

احتشام صاحب نے دراصل اپنے مضمون میں صرف "جدید شاعر" کی بے عقیدگی اور بے مقصدیت کے خلاف شکایت کی ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں کہیں بھی کسی خاص عقیدے کو مسلط نہیں کیا، اور نہ عقائد کی تقسیم ترقی پسند اور رجعت پسند خانوں میں کی ہے اور نہ موضوعات ہی کا تعین کیا ہے۔ احتشام صاحب کے اس مضمون سے (جو کچھ ان کے دل میں ہے اس کو میں نہیں جانتا) صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ادیب کی خود مختاری کا احترام کرتے ہوئے صرف اس کی اس غیر مشروطیت، اور انفرادیت کی نکتہ چینی کر رہے ہیں جو شاعری میں غیر ضروری ابہام پیدا کرتی ہے اور شاعری اور قاری کے درمیان ایک ضروری رابطے کو منقطع کرتی ہے۔ میں اس کو مانتا ہوں کہ شاعری میں سو فی صدی ترسیل ممکن نہیں، اور جس شاعری میں ترسیل اس حد تک پیدا ہو جائے، وہ شاعری نہیں، بلکہ سائنسی بیان ہے۔ رمزیت سے شعر میں عمق اور اس کی معنویت میں وسعت پیدا ہوتا ہے۔ مگر ابہام کو محض اس لئے برقرار رکھنا کہ انگریزی کے جدید شاعروں میں یہ پایا جاتا ہے، یا یہ کہ اس سے شعر کو ادق اور بھاری بھرکم بنایا جا سکتا ہے، کبھی بھی مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں احتشام صاحب اگر جدید شاعر کے سامنے کوئی منشور پیش کرتے جس سے اس کی جائز آزادی خطرے میں پڑتی تو حنفی صاحب کو خفا ہونے یا مظلوم بننے کی ضرورت تھی۔ مگر اس مضمون میں تو احتشام صاحب نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس میں شک نہیں کہ ادھر کچھ دنوں سے بہت سے "معمر ترقی پسند ادیب" پھر سے منظم ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مگر حنفی صاحب کو ان سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ مردہ جسم میں روح صرف خدا پھونک سکتا ہے۔ انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ تحریک اپنی عمر پوری کر چکی ہے اور اس کے پاس تخلیقی امکانات کو بڑھانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ یہ محض چند ریٹائرڈ ادیبوں کا ایک عقلی گدا ہے۔

بہتر تو یہ ہے کہ حنفی صاحب بغیر غم و غصہ کئے ٹھنڈے دل سے جدید ادب کے مسائل پر غور و فکر کرتے اور اپنی تحریروں سے جدید شاعری کے بارے میں ہم لوگوں کو کچھ سنجیدہ اور مفید باتیں بتاتے۔ یہ ہمیشہ ایک اچھا شگون ہوتا ہے جب شاعر خود فن اور زندگی کے مسائل پر اظہار رائے کرے ☆☆☆

رفعت سروش

شمارہ نمبر ۲۷۶،
جنوری ۲۰۰۴

رہوار

یہ رہوار عمر رواں ہے، اسے باندھ کر اصطبل میں نہ رکھو
تڑائے گا رسے، ہواؤں سے باتیں کرے گا، خبر بھی نہ ہوگی
کہاں اڑ گیا وہ

یہ رہوار عمر رواں ہے اسے پیار سے تھپتھپاؤ،
ہتھیلی کا لمس اس کی نس نس میں بھر دو،
کرو اپنی آواز کا اس پہ جادو
اسے اپنی سانسوں کا، قدموں کی آہٹ کا عادی بناؤ
سواری کرو اس پہ،
اور سبزہ زاروں میں، دریاؤں، کہساروں اور جنگلوں میں اسے
دوڑنے کا سلیقہ سکھاؤ کہ ٹھوکر نہ کھائے
پھلانگے... تمھیں حادثوں سے بچائے

شمارہ ۲۸۸،
جنوری ۲۰۰۵

ندی

یہ اک ندی جو نکل کے منبع سے پربتوں، جنگلوں سے
کھیتوں سے وادیوں اور بستیوں سے گذر چکی اب
نہ جانے کس سمت جا رہی ہے۔

رفیق راز

شمارہ نمبر ۱۴۷،
ستمبر اکتوبر ۱۹۸۷

سبزہ و خوشبو میں اک سیلاب خوں پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پر قہر سیہ خوابیدہ ہے

میں نواح چشم بینا میں تخیل کا جمال
تو غبار رفتہ میں اک منظر نادیدہ ہے

خوشبوے معنی میسر ہے نہ سائے کی لہک
گلشن گفتار میں نخل صدا رنجیدہ ہے

رقص میں برفاب کے سرو صنوبر ہیں یہاں
شعلۂ حیرت یہاں ہر شاخ پر لرزیدہ ہے

لمس کے سیلاب کی رفتار بھی کچھ تیز ہے
جسم کی دیوار مرمر بھی ذرا بوسیدہ ہے

شمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

اک خلل اور سراسیمہ سیہ خاک میں ڈال
خوف نادیدہ نواح دل بے باک میں ڈال

کچھ نہیں ساتھ بجز تیرگی فکر فنا
اپنے ہونے کا شرر ہی رہ ادراک میں ڈال

بس، کہ روشن ہوں یہ ظلمت زدہ اطراف وجود
جاتے جاتے شرر ایسا خس و خاشاک میں ڈال

اے خموشی میں شرابور معانی کی مہک
زہر تاثیر مرے نغمۂ سفاک میں ڈال

رات کے پچھلے پہر ہی یہ کرامت ہو جائے
شعلۂ خواب مرے دیدۂ نمناک میں ڈال

رفیق راز

شمارہ ۲۱۲،
دسمبر ۱۹۹۷

زرد موسم کی ہوا اس دن بہت بپھری ہوئی تھی
شاخ پر تھی ایک ہی چڑیا مگر سہمی ہوئی تھی

چیر کر صحرائے ظلمت کو نشانے تک تو پہنچی
چشم بینا کی کرن لیکن بہت میلی ہوئی تھی

ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی عجب یکسانیت تھی
میری خوشبو جانے کس کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی

جیسا تک سانسوں نے سیلاب بلا کا روپ دھارا
درمیاں میں خامشی کچھ اور بھی گہری ہوئی تھی

میرے منظر کے سوا معدوم ہر منظر ہوا تھا
دشت بینائی پہ جانے دھند کیا چھائی ہوئی تھی

اک بھیانک رقص شعلوں نے کیا تھا نیم شب کو
پہلے یہ سرسبز بستی شام تک خالی ہوئی تھی

پھل تو سارے گر چکے تھے خوف کی آندھی سے لیکن
باغباں کی لاش اب بھی پیڑ پر لٹکی ہوئی تھی

خواہش دیدار کے شعلے بھی کچھ بھڑکے ہوئے تھے
جلوۂ صد رنگ کی دہشت بھی کچھ پھیلی ہوئی تھی

شمارہ ۲۴۶،
جولائی ۲۰۰۱

ہر سمت پھیلا ہوا ہے دھواں سا
روشن ہے کچھ کرب آوارگاں سا

دیوار و در پر ہیں جلوے اسی کے
میرا مکاں بھی ہوا لامکاں سا

پاؤں کے نیچے تو دھرتی نہیں ہے
سر پر ہے موجود اک آسماں سا

چلتا رہے تو ہے اک موج طوفاں
رک جائے تو ایک سرو رواں سا

آغاز بھی وہ ہے انجام بھی وہ
یعنی مکمل ہے وہ داستاں سا

دشت و جبل بھی ہیں خورشید و مہ بھی
خوابوں کا عالم ہے تیرے جہاں سا

رہتا ہوں پہروں میں اس کی ہی دھن میں
آنکھوں سے یارب وہ کیوں ہے نہاں سا

مڑ کر نہ دیکھوں نہ رک کر ہی سوچوں
بے سدھ ہوں تیری ہی جانب رواں سا

رونق نعیم

شمارہ ۱۷۱،
اکتوبر ۱۹۶۷

رشتے ناطے

پورب میں وہ ٹیڑھی میڑھی شوخ ندی کتنی پیاری ہے
سب سے میٹھے میٹھے سر میں بول رہی ہے
آؤ میرے پاس تو آؤ
پاؤں تمھارے میں دھو دوں گی

پچھم میں وہ کاجل جیسا پربت کہتا ہی رہتا ہے
تم پر کچھ میرا بھی حق ہے
ایک نظر مجھ کو بھی دیکھو
تم تو جگ جگ سے اپنے ہو
بستی کے اتر کی جانب
اب بھی سرکنڈوں کی جھاڑی
لوٹ کے گھر آنے والوں سے پوچھ رہی ہے
کتنی راتیں رو کر گذریں
کتنے دن برباد ہوئے

دکھن میں وہ جاگی سی بنسواڑی
چلا چلا کر کہتی ہے
اس نگری کو چھوڑ کے کوسوں دور کہیں مت جانا ورنہ
میں پہروں بے چین رہوں گی

اوپر تو آکاش پتا سا اپنا سایہ ڈال رہا ہے

نیچے دھرتی ماں جیسی ہے

شمارہ ۲۰۸،
جولائی ۱۹۹۷

اندر دھنش

اندر دھنش کو اپنے گھر میں لے آؤں
سوچ رہا ہوں
اس کے ساتوں رنگ بچھا کر سو جاؤں

بڑا آسمان

چاروں اور دھانی سیلاب اُمڈ پڑا ہے
سرخ کچے راستے ڈوب ڈوب گئے ہیں
بیل گاڑیاں بہتی ہوئی نظر آ رہی ہیں
یہ میں کہاں آ گیا
یہاں تو آسمان بہت بڑا ہے

غزل

رونق نعیم

شمارہ ۲۱۳،
جنوری ۱۹۹۸

دریا کہ موج موج مسلسل سفر میں تھا
مثل حباب میں بھی ہوا کے اثر میں تھا

وہ پاس تھا تو گرم ہواؤں کے درمیاں
خوش رنگ تتلیوں کا علاقہ نظر میں تھا

دنیا میں کیسی کیسی قیامت گذر گئی
وہ بھی لرز اٹھا کہ جو خوابوں کے گھر میں تھا

آرائش نظر کی تمنا فضول تھی
کچھ ایسا رنگ حلقۂ شام و سحر میں تھا

اک راز تھا جو ہو نہ سکا مجھ پہ منکشف
اک عکس تھا سو وہ بھی حجاب نظر میں تھا

وہ شخص اور کوئی نہیں تھا مرے سوا
سنگ گراں جو بن کے مری رہ گذر میں تھا

اب وہ بھی بہ گیا مرے اشکوں کے ساتھ ساتھ
رونق مرا وجود مری چشم تر میں تھا

رام جی رونے لگے

رؤف خلش

شمارہ ۲۵۷،
جون ۲۰۰۲

سادھوؤں سنتوں کی بیٹھک میں تھا چرچا کا وشے
کیا وہ کوئی دھرم یدھ تھا، دھرم سنکٹ تھا یا کیا تھا؟
دکھ بھری بانی سنائی دی:
دھرم سنکٹ تھا، نہ کوئی دھرم یدھ تھا
پریم شکشا کا آچرن ہو رہا تھا
راج نیتی جا کے ٹکرائی
پھر کرودھ اگنی میں کتنے دیس واسی جل مرے
پریم گاتھاؤں کی کتنی پستکیں جلنے لگیں
نیائے انیائے کی باتیں ماننے والے
پاپ کی گٹھری کو لے کر پن کا اپہار سمجھے
رام جی کے دوار پہنچے تو وہی بانی سنائی دی
سب شردھا، ساری بھگتی رہنے دو اپنی جگہ
یہ چڑھاوے کی تو سامگری نہیں ہے
آگ کی لپٹوں میں تانڈو ناچ جاری ہے
شانتی کو بھنگ کر کے،
آج میرے دوار کیوں آئے ہو؟ جاؤ
پریم شکشا کے سبھی پنے
اسی اگنی میں جلتے جا رہے ہیں
جاؤ، پھر اک چاہ میں ڈوبے ہوئے ہردے سے
پریم اپنیاسوں کی رچنا کرو
من ہے ساگر ایسا، جس کی سیما ریکھا نہیں ہے
موہ لو من کو، اسی میں ڈھونڈ لو مکتی
پھر اس کے بعد میرے دوار آنا

اتنا کہہ کر رام جی رونے لگے

رئیس فراز

شمارہ ۴۴،
جنوری ۱۹۷۰

ناموں میں کیا رکھا ہے نام کا کیوں بار سہیں
گمنامی میں جی لیں گے لوگ ہمیں نام نہ دیں

خبروں سے ہم کو کام بھی کیا تم ہی کبھی سوچو ذرا
بات تو سننی پڑتی ہے تم نہ کہو ہم نہ سنیں

ظالم سورج پھر ہم سے شب کی ردا چھین نہ لے
ساری دنیا سوتی ہے آؤ کہیں بھاگ چلیں

پھیلا ہے تا حد نظر صرف لہو صرف لہو
اس منظر کو جھٹلا دو تم بھی پیو ہم بھی پئیں

دل کی زباں تم بھول گئے لفظوں کو ہم توڑ چکے
تم سے مگر کچھ کہنا ہے سوچتے ہیں کیسے کہیں

جاؤ کہ تم جانا ہے روکا ہے کب کس نے کسے
لیکن ہم پتھر تو نہیں ضبط کا کیوں وعدہ کریں

تم کو پکارے دیر ہوئی اب بھی صدا گونجتی ہے
اب ہم اپنے قیدی ہیں اپنی صدا سنتے رہیں

شمارہ ۱۱۸،
نومبر، دسمبر ۱۹۸۰

قتل میں اور تو کچھ باعث تاخیر نہ تھا
اس کے ترکش میں مگر میرے لئے تیر نہ تھا

لوگ خاموش تھے آواز جرس پر یوں ہی
سات رنگوں کا جزیرہ کوئی زنجیر نہ تھا

سیل الزام میں شخصیتیں بہ جاتی ہیں
تب بھی زندہ تھا میں جب تو مری تقدیر نہ تھا

چونکنا تک کسی آواز پہ امکاں میں نہیں
تنگ اتنا بھی کبھی حلقۂ زنجیر نہ تھا

اپنے ہاتھوں میں سیہ صفحۂ بے جاں دیکھو
ذہن میں نام ترا تادم تحریر نہ تھا

تھے سراب اور مجھے جسم نظر آتے تھے
ریگ زاروں میں کوئی پیکر تصویر نہ تھا

آج ابھرا مرے ہاتھوں کی لکیروں سے فراز
وہی منظر جو مرے خواب کی تعبیر نہ تھا

زاہد ڈار

شمارہ ۲۹،
اکتوبر ۱۹۶۸

نظم

شاعروں کے پاس لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ریت پر بکھرے ہوئے خوابوں کے پھول
آسماں پر چاند کا ننگا بدن
گھاس کی خوشبو، درختوں کی پکار
آندھیاں اور راستے
لڑکیوں کی چھاتیاں
کشتیوں کے بادباں، جادو کے گیت
شاعروں کے پاس لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
آج میرا دل ہے خاموشی کا شہر
آج میرے دل میں مایوسی بھی ہے، امید بھی
ایک ہی دل میں محبت بھی ہے اور نفرت بھی ہے
زندگی کی آرزو بھی، موت کا احساس بھی
پھول بھی، کانٹے بھی ہیں
دن بھی ہے اور رات بھی
آج میرے پاس لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میں اکیلا ہوں مگر آباد ہیں
میری تنہائی میں لاکھوں آدمی
جو مرے دشمن بھی ہیں اور دوست بھی
بھی ہیں ایسے ہزاروں اور بھی الفاظ ہیں
شاعروں کے پاس لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں

شمارہ ۸۳،
اپریل ۱۹۷۳

ایک ویران گاؤں میں

انھیں سوکھے ہوئے میدانوں میں
جہاں اب دھوپ کی لہروں کے سوا کچھ بھی نہیں
سبز لہراتے ہوئے کھیت ہوا کرتے تھے
لوگ آباد تھے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں
محفلیں جمتی تھی، افسانے سنے جاتے تھے
آج ویران مکانوں میں ہوا چیختی ہے
دھول میں اڑتے ہوئے کتابوں کے ورق
کس کی یادوں کے ورق، کس کے خیالوں کے ورق
مجھ سے کہتے ہیں کہ رہ جاؤ یہیں
اور میں سوچتا ہوں صرف اندھیرا ہے یہاں
پھر ہوا آتی ہے، دیوانی ہوا
اور کہتی ہے، نہیں۔ صرف اندھیرا تو نہیں
یاد ہیں مجھ کو وہ لمحے جن میں
لوگ آزاد تھے اور زندہ تھے
آؤ میں تم کو دکھاؤں وہ مقام...
...ایک ویران جگہ، اینٹوں کا انبار، نہیں کچھ بھی نہیں
اور وہ کہتی ہے یہ پیار کا مرکز تھا کبھی
کس کی یاد آئے مجھے، کس کی، بتاؤ، کس کی
اور اب چپ ہے ہوا، چپ ہے زمیں
بول اے وقت کہاں ہیں وہ لوگ
جن کو وہ یاد ہیں جن کی یادیں
ان ہواؤں میں پریشان ہیں آج؟

زاہد ڈار

شمارہ ۸۶،
اگست، ستمبر ۱۹۷۳

کچھ دیر پہلے میں درختوں کے نیچے گھوم رہا تھا
میں اپنے ہی خوابوں کی خوبصورتی سے محبت کرتا ہوں
اگر لڑکیاں نہ ہوتیں تو میں مر جانا پسند کرتا
اگر کوئی لڑکی مجھے ہاتھ لگا دے تو میری موت واقع
ہو جائے
بیزاری کی انتہا اور خوشی کی انتہا
ہر طرف دائرے ہی دائرے ہیں
ہر حقیقت دائرے بنا رہی ہے
زمین اور کائنات، وقت اور زندگی
میں شہروں میں کیا کر رہا ہوں؟
کچھ دیر پہلے میں درختوں کے نیچے گھوم رہا تھا
اب واپس چلنا چاہئے
میرا مطلب ہے سفر جاری رہے
دنیا میں صرف ایک ہی راستہ ہے، جو واپس جاتا ہے

واپسی کے راستے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں
حقیقت دائروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں

نہ ہونے سے نہ ہونے تک
یہ ایک دائرہ ہو
درمیان میں موجودگی ہے
اور وہ ایک خلا ہے
میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟
کچھ دیر پہلے میں درختوں کے نیچے گھوم رہا تھا
اب وہ درخت مجھے کہیں نظر نہیں آتے
شاید اب درخت مجھے دیکھ رہے ہیں
اب میں خلا میں لٹک رہا ہوں
نیچے زمین پر درخت اکیلے ہوں گے
مجھے یقین ہے میرے بغیر وہ ناخوش نہیں ہوں گے
میں ان کے بغیر خوش نہیں ہوں
اب میں اپنے خوابوں کے سہارے زندہ ہوں
کچھ دیر پہلے میں زندہ تھا
یا شاید یہ بھی ایک خواب ہے

رانا سلیم سنگھ

زاہدہ حنا

شمارہ ۲۴۶،
جولائی ۲۰۰۱

آج وہ مجھے بے حساب یاد آیا۔

میں اس وقت ٹیلی ویژن اور پریس کیمروں کی تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا اور ایک آرٹ گیلری کے دروازے پر بندھے ہوئے سرخ فیتے کو کاٹ چکا تھا۔ میں نے ہال میں دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ قدم رکھا تو سفید دیواروں پر آویزاں روغنی تصویروں سے پھوٹتی ہوئی رنگوں کی تازی خوشبو کے ساتھ اس کی یاد ایک طوفانی لہر کی طرح آئی اور مجھے شرابور کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں اس لمحے ہجوم میں تنہا اور صرف اس کے ساتھ تھا شاید اس لئے کہ اس سے پہلی ملاقات کے بعد میں تازہ رنگوں کی خوشبو اور اس کی یاد کبھی ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے تھے جیسے ایک ہی کوکھ سے نکلے ہوں، ایک ہی شاخ سے پھوٹے ہوں۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں میں اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اگر اس کے اور میرے تعلق کو میری کانفیڈنشل رپورٹ (Confidential Report) میں لکھ دے تو میں معتوب ٹھہروں۔ بھلا کہیں دشمن بھی دوست بنائے جاتے ہیں؟ لوگ بناتے ہوں گے، ہم نہیں بناتے۔

دہشت میرے اندر بھنور ڈالنے لگتی ہے۔ میں ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میری اسٹڈی کے فرش پر دیوار تا دیوار سفید قالین ہے جس پر کرمان شاہی غالیچے بچھے ہیں۔ یہ غالیچے میں نے جنگ زدہ کابل کے کوچہ مرغاں کی ایک تنگ اور نیم تاریک دکان سے خریدے تھے۔ میں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں، سامنے برف کی ڈلیوں سے بھری ہوئی چاندی کی بالٹی ہے، شراب ہے، بھنے ہوئے نمکین کاجو اور بادام ہیں، سنکے ہوئے گوشت کے پارچے ہیں۔ نظر اس سے آگے جاتی ہے تو ٹیک وڈ (teak wood) کی دیوار گیر الماریاں ہیں۔ ان کے پیچھے وہ سیف ہے جس میں ڈالر اور پونڈ کی گڈیاں ہیں، دوسری قیمتی اشیا ہیں، اس کی بنائی ہوئی "بنی ٹھنی" ہے جسے میں شدید خواہش کے باوجود اپنے گھر کی کسی دیوار پر آویزاں کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ ان الماریوں کا باطن ہے اور ان کے ظاہر میں قیمتی کتابیں سجی ہوئی ہیں، دنیا بھر سے جمع کئے ہوئے نوادرات ہیں، سب سے اوپر کسی خطاط کا ایک شاہکار ہے، اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ میری نگاہیں الماری کے اس طاقچے تک آگئی ہیں جس میں مہاتما بدھ کا وہ مجسمہ ہے جسے Fasting Buddha کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تیاگ اور تپسیا نے کپل وستو شہزادے کا بدن گھلا دیا ہے، گنی جا سکتی ہیں۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا ہے، اس کی دھنسی ہوئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں گھبرا کر کسی اور شے کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کی آنکھیں بھی میرے وجود کو حرف حرف پڑھتی تھیں اور مجھے اس کی آنکھوں سے بھی ڈر لگتا تھا پھر بھی دل اس کی طرف کھنچتا تھا۔

وہ رنگوں کی خوشبو تھی جس نے کئی برس پہلے مجھ پر ہجوم کیا تھا اور میں نے چونک کر اپنے برابر آ بیٹھنے والے کو دیکھا تھا۔ اس نے آتے ہی وہسکی ساور (Whiskey Sour) کا آرڈر دیا تھا اور دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر لگا کر دلچسپی سے بارمین کو گلاس میں وہسکی، لیموں کے عرق اور شکر کو آمیز کرتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مجھے نظر آ رہا تھا۔ بالوں سے ڈھکا ہوا مضبوط ہاتھ جو اس کے نصف رخسار اور بالوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے اس کے ناخنوں کو دیکھا تھا، ان کے گوشوں میں رنگ سوتے تھے۔

چند منٹ بعد وہسکی ساور اس کے سامنے آئی تو اس نے رقم بارمین کے سامنے رکھی، پہلی چسکی لے کر گردن گھمائی اور ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے

سے الجھ کر رہ گئیں۔

"اپنی طرف کے ہیں آپ؟" اس کی آواز گہری اور مضبوط تھی اور نگاہیں، آواز سے بھی گہری۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں آپ کے بارے میں۔" میں بے اختیار مسکرا دیا۔ یہاں میرے پاس سب کچھ تھا لیکن دوست نہ تھے۔ جو حاضر باش تھے وہ ملازمتیں کرتے تھے اور صرف ویک اینڈ پر دستیاب ہوتے تھے، وہ بھی اس لئے کہ میں انھیں مفت کی شراب پلاتا، کھانے کھلاتا اور انھیں ضرورت پڑتی تو دس بیس پونڈ ان کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔

"اس شہر میں آپ شاید بہت دنوں نہیں رہے؟"

"سو تو ہے۔ لیکن آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟" میں نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔

"یہ جتنے بھی ظالم شہر ہیں۔"

"ظالم؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں، میں تمام بڑے شہروں کو ظالم کہتا ہوں۔ ان میں آدمی زیادہ دن رہ جائے تو انسان نہیں رہتا، جزیرہ بن جاتا ہے۔ جسم کا جزیرہ۔ دوسروں سے کٹا ہوا۔ اپنے بدن کا، اپنی خواہشوں کا قیدی۔ دوسروں سے اس کی روح کا مکالمہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"واہ۔ جزیرے والی بات خوب کہی آپ نے۔" میں نے بیساختہ اسے داد دی۔ اس کے جملوں میں روشن دھوپ کی آسودہ کر دینے والی چمک تھی۔

اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت کچھ اور مانگتا تو وہ بھی مل جاتا۔ بڑی شبھ گھڑی تھی۔ اس کا گیہواں رنگ سرشاری سے دمک رہا تھا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ارے جناب آپ کیا سمجھیں گے۔ ہوا یوں کہ جب میں کام کرتے کرتے تھک گیا تو اٹھ کر کپڑے بدلے اور یہ سوچ کر باہر نکلا کہ اپنی طرف کا کوئی مل جائے تو دو گھڑی اس سے باتیں کر لیں۔ دوسروں کی بولی بولتے بولتے جبڑے دکھنے لگتے ہیں۔ جس زبان میں آپ خواب نہ دیکھیں، عشق نہ کریں گالی نہ دیں اور ٹھوکر کھا کر جس میں "ہائے" نہ کہیں، اسے آپ کب تک بولیں گے؟ اور اگر بولتے بھی رہے تو من کے بھیتر سے کوئی سوتی کہاں پائیں گے۔"

"آپ تو بہت مزے کی باتیں کرتے ہیں۔" میں پھڑک اٹھا۔ میں اب جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں سے کوئی بھی ایسی باتیں نہیں کرتا تھا، یہ بھولا بسرا لہجہ تھا، بڑی دور سے آنے والی آوازیں تھیں۔

"اجی ہم یاروں کے یار ہیں۔ آپ دو گھڑی بات کر کے تو دیکھیں۔" وہ ترنگ میں تھا۔

"لیجئے صاحب، ہم نے آج کی رات آپ کے نام لکھی۔ ایسا کیجئے، یہ گلاس ختم کریں، پھر میرے ساتھ چلیں۔ جی چاہے تو ساری رات باتیں کیجئے گا۔ یوں بھی کل ہفتہ ہے۔ نہ کہیں پہنچنے کی جلدی اور نہ کہیں جانے کا مسئلہ۔" میں بھی اسی کے سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔ یوں بھی یہاں کے بار مجھے پسند نہ تھے۔ بھولے بھٹکے مجبوراً کبھی بیٹھ جاتا تھا۔

اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور چند لمحوں تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ "ضرور چلیں گے ہم آپ کے ساتھ، لیکن یہ تو بتائیں کہ چلیں گے کہاں؟"

"اس سے آپ کو کیا غرض میں کہاں لئے چلتا ہوں۔ آپ کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ہم زبان مل جائے۔ میں بھی تنہائی سے اکتا کر باہر نکلا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو مل ہی گئے ہیں تو پھر ذرا جم کر باتیں ہوں۔"

"بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ لیکن کیا خیال ہے، اب جب کہ ہم یہاں سے اکٹھے کہیں جا رہے ہیں تو ایک دوسرے کا نام نہ جان لیں؟ باتیں کرنے میں ذرا آسانی رہے گی۔" وہ شرارت سے مسکرایا اور تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی ابھی تک ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے ناواقف ہیں۔

"مجھے احمد مسعود کہتے ہیں۔ چند مہینوں کے لئے کسی سرکاری کام سے آیا ہوا ہوں۔" میں نے گول مول بات کی۔

"شاید پاکستان سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں، لیکن ہندوستان سے بھی تو آ سکتا تھا۔" میں نے جواباً سوال کیا۔

"ہاں آ تو سکتے تھے لیکن وہاں کے سرکاری افسر اتنی ٹیپ ٹاپ سے نہیں رہتے۔" اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور لحظہ بھر کے لئے میں جھنجھلا گیا، عجب بے دھڑک آدمی تھا۔

"ارے بھئی برا نہ مانئے گا میری بات کا۔ میں بس یوں ہی بے ڈھب بولتا ہوں۔" اس نے شاید میرے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا تھا۔ "اور ہاں، میرا نام تو رہ ہی گیا... جے پور کا رہنے والا ہوں۔ گھر والے اور دوست سب ہی مجھے شیخو کہہ کر بلاتے ہیں۔ ویسے میرا نام سلیم ہے، رانا سلیم سنگھ۔"

"آپ ایسے باکمال کا نام بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔" ہندوستانیوں اور وہ بھی ہندوؤں سے میل جول کے بارے میں مجھے اپنی وزارت کی ہدایتیں یاد آئیں اور میں نے اس کے کان میں پڑے ہوئے در کو دیکھا۔

وہ نگاہیں پہچانتا تھا، کہنے لگا۔ "میرے کان میں آپ یہ جو مندری دیکھ رہے ہیں اس میں پڑا ہوا یہ موتی منت کا ہے۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ ماتا جی کی شادی کو کئی برس ہو گئے تھے پر اولاد نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ ہر سادھو سنت، پیر فقیر سے مایوس ہو گئیں تو ننگے پاؤں، ننگے سر حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پہنچیں۔ صاحب ادھر انھوں نے منت مانگی، ادھر دس مہینے بعد ہم وارد ہو گئے۔ ماتا جی نے ترنت ہمارا نام سلیم سنگھ رکھ دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا۔ سمجھیں کہ واقعی ان کے گھر میں شہزادہ سلیم پیدا ہو گیا ہے لیجئے صاحب وہ ہمیں شیخو پکارنے لگیں۔ سو آج تک ہم گھر میں اور دوستوں میں شیخو ہیں، اس دائرے سے باہر نکلیں تو سلیم ہیں۔ لیکن کوئی انارکلی ہم سے محبت کی سزا میں دیوار میں چنوائی نہیں گئی اور مہر النسا کی بات رہنے دیں کہ اسے حاصل کرنے کے لئے شیر افگن کا قتل ضروری ہے۔"

اس نے ایک ٹھاٹ دار قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلیں صاحب،

اب جہاں چاہیں چلیں۔"

ہم دونوں باہر نکلے تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"ارے ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے ڈرائیور کو ٹرنہم گرین (Turnham Green) کا پتہ بتایا تو اس نے احتجاج کیا۔

"اماں بھائی صاحب سامنے ہی ہیمر اسمتھ (Hammersmith) کا ٹیوب اسٹیشن ہے۔ وہاں سے ٹیوب پکڑتے ہیں تو دو اسٹیشن بعد ٹرنہم گرین ہے۔ خیر، جیسے جناب کی مرضی۔" اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرا فلیٹ وہاں سے واقعی زیادہ دور نہیں تھا۔ بمشکل دس منٹ بعد میں اپنے اس فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا جس کی لیز ختم ہونے میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔

میں نے اسے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ "عالی جاہ، عالم پناہ، یہاں آرام سے بیٹھیں۔ سامنے ٹیپ رکھے ہیں۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی موسیقی، غزل، جو جی چاہے منتخب کریں اور سنیں۔ خود سوچئے کہ جیسا سکون یہاں ہے، کیا وہ کسی بھی بار میں میسر آ سکتا تھا؟" میں نے جھک کر اس سے سوال کیا۔

"اجی صاحب جو آپ کی رائے وہ پنچوں کی۔ کس کی مجال ہے کہ آپ کی بات نہ مانے۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر آڈیو کیسٹوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ میں کچن میں گیا، کیبنٹ سے رائل سیلوٹ (Royal Salute) اور کٹی سارک (Cutty Sark) کی بوتلیں نکال کر ٹرالی میں رکھیں۔ برف، چمکتے ہوئے گلاس اور طشتریوں میں کچھ نمکین چیزیں رکھ کر ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

اس نے جوتے اتار کر ایک طرف ڈال دیے تھے اور صوفے کی بجائے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کمرے میں سہگل کی پرسوز آواز گونج رہی تھی "بالم آئے بسو مورے من میں۔" وہ آنکھیں بند کیے سہگل کی آواز میں یوں محو تھا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ اس کی تقلید میں مجھے بھی قالین پر بیٹھنا پڑا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا پسند کرے گا، اس نے کٹی سارک کی طرف اشارہ کیا اور میں نے پیگ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوسٹ کیا اور پھر آواز کی لہروں پر بہنے لگا... "ساون آیا تم نہیں آئے، کوئل کوکت بن میں، بالم آئے بسو مورے من میں..." گیت ختم ہوا تو اس نے سر اٹھایا، آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں مجھے پڑھنے پر، میرے اندر تک اتر جانے پر قادر ہوں۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"اپنے نام کے بارے میں تو آپ نے بڑی تفصیل سے بتایا لیکن یہ نہ بتایا کہ آرٹسٹ بھی ہیں آپ۔" میں نے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ تو جادوگر معلوم ہوتے ہیں، نہیں جادوگر نہیں، جیوتش ودیا کے ماہر لگتے ہیں۔ آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تصویریں بناتا ہوں۔" اس نے اپنی بڑی اور گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا، ان میں واقعی حیرانی تھی۔

"آپ جب میرے برابر آ کر بیٹھے ہیں تو آپ میں سے تازہ رنگوں کی خوشبو آئی تھی اور آپ کے ناخن بھی چغلی کھا رہے ہیں۔"

اس نے جلدی سے اپنے ناخنوں پر ایک نظر ڈالی۔ "اماں بھائی صاحب پاکستان سرکار کے لئے شرلاک ہومز والا کام کرتے ہیں کیا؟" اس نے ہنس کر کہا۔

میں چپ رہا تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ چند لمحوں بعد کہنے لگا "آپ جس بار میں بیٹھے تھے میں اس کے قریب ہیمر اسمتھ میں رہتا ہوں ریور سائیڈ اسٹوڈیو (Riverside Studio) کے نزدیک، کسی روز میری طرف آئیں تو میں آپ کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھاؤں۔ کچھ دنوں میں میری exhibition بھی ہونے والی ہے، ریور سائیڈ اسٹڈیو کی گیلری میں۔"

"ون مین شو (One Man Show) ہے یا کچھ دوسرے آرٹسٹ بھی ساتھ ہیں؟"

"ون مین شو ہے۔ چند مہینوں بعد ہوگا۔ آپ ضرور آیئے گا۔"

"ہاں اگر اس وقت تک میں لندن میں رہا تو ضرور آؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی ان کے درشن کروں گا۔" میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔

"لیکن میری تصویریں دیکھ کر شاید آپ کو لطف نہ آئے، میری تصویروں کے تھیم بڑے کڑوے ہیں۔" اس نے ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں اور لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"زندگی اتنی کڑوی تو نہیں شہزادے۔"

"یہ زندگی کو دیکھنے کا ہر آدمی کا اپنا ڈھب ہوتا ہے جو اسے کڑوا یا میٹھا بنا دیتا ہے۔ پہلے کے آرٹسٹوں کی تصویروں میں کڑواہٹ اول تو کم ہوتی تھی اور اگر ہوتی تو مٹھاس بھی ساتھ ہوتی تھی۔ بدصورتی ان کے ہاں حسن کے سائے میں ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے زمانے میں تو مٹھاس جیسے زندگی کی تہ میں کہیں بیٹھ گئی ہے۔" اس کا لہجہ اداس تھا۔

میں خاموشی سے شراب میں گھلتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے تک خاموش رہا پھر اچانک بول اٹھا۔ "سترھویں، اٹھارویں، انیسویں صدی میں بنائی جانے والی تصویریں دیکھیں۔ اس زمانے کے بڑے بڑے چترکار چرچ کے لئے تصویریں بناتے تھے یا بادشاہوں، شہزادوں، ان کی محبوباؤں، ان کے گھوڑوں اور ان کے شکاری کتوں کی تصویریں۔ میدان جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی لاشوں پر کھڑے، تنتے ہوئے، فاتح حکمراں ان کا موضوع ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی بناتے تھے اس کا معاوضہ انھیں مذہب کا ادارہ ادا کرتا تھا یا بادشاہت کا۔ کچھ رقم اور سرپرستی انھیں فیوڈل لارڈز (Feudal Lords) سے مل جاتی تھی، ان کا کمٹ منٹ (Commitment) صرف اپنے فن سے تھا۔ یہ تو بیسویں صدی ہے جس نے کوی کو، ادیب اور چترکار کو براہ راست جنتا سے جوڑ دیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ یا جنتا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو جائے یا اسٹیبلشمنٹ سے ناتا جوڑے۔ پہلے کا آدمی راستوں کے انتخاب کے مرحلے سے نہیں گذرتا تھا جس طرح اب ہم گذرتے ہیں۔ اسی لئے ہماری ذمہ داری بھی بڑی ہے اور ہمارے

عذاب بھی بہت ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ میرے اپنے ڈرائنگ روم میں ایک بہت مشہور مصور نے ہمارے ہر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، صدر اور وزیر اعظم کی تصویر بنائی تھی اور اسی لئے اس کے مرتبے بہت بلند تھے۔ وہ سرکاری محکموں کے لئے، سفیروں اور سفارت خانوں کے لئے تصویریں پینٹ کرتا تھا۔ ان کا معاوضہ اسے لاکھوں میں ملتا تھا۔ اب وہ محض حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ تخلیق کرنا بھول چکا تھا۔ آپ لاکھوں میں کھیل رہے ہوں، ساری دنیا کا سفر کر رہے ہوں۔ تو "تخلیق" اور "تعمیل" کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں؟ یہ رانا سلیم سنگھ ابھی دنیا کو نہیں سمجھا تھا، میری طرح جب دنیا اس کی سمجھ میں آجائے گی تو یہ خود ہی سدھر جائے گا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"اچھا اب تم اپنا پیگ بناؤ اور ایک میرے لئے بھی۔" ہم دونوں کے ہی گلاس خالی ہو گئے تھے اور میں اب "آپ" سے تم پر اتر آیا تھا، وہ ابھی اسی لہر بہر میں تھا جس میں اکثر نوجوان ہوتے ہیں، آدرش کی باتیں اور دنیا اور دنیا کو بدلنے کے خواب۔ کبھی میری آنکھیں بھی یہ خواب دیکھتی تھیں۔

اس نے پیگ بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"میاں گھونٹ بھرو اور غم بھلاؤ۔ اس میں اداس ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"میں اس لئے اداس ہوتا ہوں یار صاحب کہ میرا جی خوش ہونے کو چاہتا ہے۔ حسن کو محسوس کرنے اور میٹھے رنگوں سے کھانڈ کے کھلونوں جیسی تصویریں بنانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو گیا ہے وہ مجھے زندگی کو کسی اور طرح دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں کے نم کو دیکھا اور یوں بن گیا جیسے کچھ نہ دیکھا ہو۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر کہنے لگا۔ "پہلے والے آرٹسٹ Nudes بناتے تھے تو اس میں حسن، توازن، تناسب جھلکتا تھا۔ آج بھی ماسٹرز کی بنائی ہوئی نیوڈز کے سامنے کھڑے ہو تو کچھ دیر بعد حواس دھوکا دینے لگتے ہیں۔ ان تصویروں میں سے جیتی جاگتی عورت کے بدن کی خوشبو اٹھنے لگتی ہے۔ لیکن میں ایسی حسین تصویریں کیسے بنا سکتا ہوں؟ کالج میں تھا تو ریلیف ورک کے لئے بنگال گیا۔ وہاں میں حسن بنگال کی بجائے فاقہ زدہ عورتیں دیکھیں جن کی چھاتیاں سوکھ کر پسلیوں سے چپک گئی تھیں۔ یونیورسٹی پہونچا تو کیونل رائٹس میں گھروں کے آنگنوں میں لیٹی ہوئی نیوڈز دیکھیں جن کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کو تکتی تھیں۔"

وہ بولتا چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور اب یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے دیوتا اٹلس ہو اور دونوں شانوں پر دنیا اٹھائے ہو۔

اس سے ملنے سے پہلے مجھے اپنے آپ پر ناز تھا کہ ماسٹرز کی تصویروں کے بارے میں بہت جانتا ہوں لیکن اس سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے بڑے مصوروں اور ان کی تصویروں کے بارے میں پڑھا ہے، سرسری طور پر انھیں آرٹ گیلریوں میں دیکھا ہے۔ سلیم سنگھ ان تصویروں کی روح میں اترا ہوا تھا۔ وہ کس روانی سے بولتا تھا اور کس سہولت سے اپنی بات بیان کرتا تھا۔ وہ Goya سے بے حد متاثر تھا۔ جنگ، قحط اور انسانوں پر ہونے والے مظالم نے گویا کے فن پر جو اثرات مرتب کیے، وہ دیر تک ان کا ذکر کرتا رہا۔ اس کے خیال میں گویا پہلا بڑا مصور تھا جس نے انسانی عذابوں کی تصویر کشی کی تھی، جہنم کے ساتویں طبقے اور جیل خانوں میں ہونے والے شدائد، فاتحین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا قتل عام اور بھٹی دہکانے اور غاصبوں کے خلاف لڑنے کے لئے کارتوس بنانے والوں کی تصویریں۔

وہ بطور خاص ان Etchings کا ذکر کرتا رہا جو گویا کے البم The Shadow of War کا ایک حصہ ہیں۔ جیل خانے میں انسان، انسان پر جو ظلم روا رکھتا ہے گویا نے یہ تصویریں اس بارے میں بنائی تھیں۔ یہ تین تصویریں جو بیڑیوں ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک قیدی کی تصویریں تھیں، اس پر گذرنے والے سارے عذابوں کو اور "انصاف کرنے والوں" کے "انصاف" کو ظاہر کرتی تھیں۔ "قید اس قدر وحشیانہ ہے جس قدر کہ جرم..."، "کسی مجرم پر تشدد کیوں..."، "اگر وہ مجرم ہے تو اسے جلد مر جانے دو۔" وہ ان عنوانات والی Etchings پر بولتا رہا۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا۔

"کیوں بھئی شیخو بابا تم چپ کیوں ہو گئے؟" خاموشی طول کھینچنے لگی تو میں نے ہنس کر پوچھا۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی اور میں ایک عرصے سے اتنی بوجھل باتوں کا عادی نہیں رہا تھا۔

"مجھے اب اپنا رنواس یاد آنے لگا۔" اس کا لہجہ شراب سے بھیگا ہوا تھا۔

"رنواس؟" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں جان عالم... رنواس... جہاں رانیاں رہتی ہیں، جسے تم حرم کہتے ہو، جی چاہے پرستان کہہ لو۔ وہ مجھے آنکھ مار کر ہنسا۔

"رنواس کے معنی میں جانتا ہوں، اتنی اردو یا ہندی مجھے بھی آتی ہے۔" میں برا مان گیا۔

اس کی سرخ آنکھیں میرے اندر سفر کر رہی تھیں۔

"کیسے شرابی ہو یار صاحب، بوتل والی اندر اترے تو سینہ دھو دیتی ہے، ساری کھوٹ کپٹ کینہ کاٹ دیتی ہے۔"

اس نے اپنا خالی گلاس اٹھایا اور میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ "یہ جب میرے اندر سفر کرتی ہے تو مجھے اپنی رانیاں، اپنی پریاں یاد آنے لگتی ہیں۔ اب میں جاؤں گا، وہ روٹھ گئی ہوں گی تو انھیں مناؤں گا۔ سبز پری، نیلم پری، لال اور بسنتی پری۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں لہرایا جیسے اس کے ہاتھ میں برش ہو اور وہ اس سے رنگ بکھیر رہا ہو۔

میں اس کے ساتھ سڑک تک آیا۔ میں اسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر بھیجنا چاہتا تھا لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا اور اتنا بر سانوٹ کے بادل ڈوب چلا ہے خانہ بھی گنگناتا ہوا چلتا چلا گیا۔

میں اس وقت تک پھوار میں بھیگتا رہا جب تک وہ گلی کا موڑ مڑ کر میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ یہ میں تھا جو گنگناتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ میں جو بوجھل

قدموں سے اپنے فلیٹ میں واپس آیا اور ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے کاغذ کے اس پرزے کو اٹھا کر دیکھتا رہا جس پر اس نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ یہ میرا پتہ تھا۔ اس احمد مسعود کا پتہ جس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے برسوں پہلے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی یاد تو مجھے نہ جانے کب سے نہیں آئی تھی اور اب جب کہ وہ اپنی جھلک دکھا کر چلا گیا تھا تو میرے دل پر آرے چل رہے تھے۔

میں پیتا رہا، برسوں کا غبار دھوتا رہا اپنے آپ سے بچھڑ جانے والے احمد مسعود کو یاد کرتا رہا جو فراق گورکھپوری کا شاگرد تھا اور ان جیسا، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین جیسا استاد بننا چاہتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ گھول کر پلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن ملازمتیں عنقا کا پر ہو چکی تھیں۔ تب احمد مسعود نے الٰہ آباد چھوڑا، لکشمن ریکھا پار کی اور کوہ ندا کا رخ کیا جہاں جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ وہ جو استاد بننے کے سفر پر نکلا تھا، دنیا اس سے استادی کر گئی۔ اس نے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا لیکن فراق گورکھپوری اور احتشام حسین لکشمن ریکھا کے ادھر رہ گئے تھے۔ خواہشیں بھٹکے ہوئے پرندوں کی طرح احمد مسعود کے وجود کی منڈیر پر اتریں، اور پھر انھوں نے اس کے سارے بدن میں بسیرا کر لیا۔ اس کے باطن میں سوئی ہوئی دنیا جاگ گئی اور چپکے چپکے پاؤں پھیلانے لگی۔ احمد مسعود خود سمٹتا گیا، سکڑتا گیا، دنیا کو اور اس کی خواہشوں کو جگہ دیتا گیا۔ پھر وہ سمٹتے سمٹتے بدن کے دائیں ہاتھ میں رہنے لگا۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جس روز میں نے کالج کے پرنسپل کے نام استعفیٰ لکھا تو میں نے دیکھا کہ میرا ماں جایا، میرا یار جانی احمد مسعود کسی سائے کی طرح میری انگشت شہادت سے نکلا اور خواہشوں اور دنیا کی ہم سائگی سے آزاد ہو گیا۔

وہی احمد مسعود اب رانا سلیم سنگھ کے قالب میں رہتا تھا۔ شاید کسی اور بدن میں بھی رہتا ہو۔ لیکن میرا تو برسوں بعد اس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ تبھی تو اس اجنبی آشنا سے مل کر میں بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے رنو اس میں چلا گیا تھا، تصویروں اور پریوں کی سبھا سجانے۔ لیکن میں کسی حجرۂ ذات کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے بٹوے میں بھرے ہوئے ملکہ کی تصویر والے نوٹوں سے کوئی مہنگی کتاب خرید کر پڑھ سکتا تھا، اس کے ذکر سے اپنے کم حیثیت ملنے والوں پر رعب ڈال سکتا تھا۔ لیکن ادب یا فلسفہ یا شاعری کے اسرار اب مجھ پر نہیں کھلتے تھے، با حیا کنواریاں اپنے بند قبا کسی اجنبی کے لئے کب اور کہاں کھولتی ہیں۔

اس رات میں پیتا ہی چلا گیا اور میرے کانوں میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ مجھے کئی بار اس کی آواز پر اپنی کھوئی ہوئی آواز کا شبہ ہوا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور کبھی کبھی بارش جب بہت زیادہ ہو تو پرانی قبریں کھل جاتی ہیں اور برسوں پہلے دفن کر دی جانے والی لاشوں کے ڈھانچے باہر آنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سمجھدار لوگ فوراً ہی ان ڈھانچوں کو بیلچوں سے قبروں میں دھکیل دیتے ہیں اور ان پر تازہ مٹی ڈال دیتے ہیں۔ ان قبروں کو پتھروں سے بھر دیتے ہیں۔ اس رات میں نے بھی سلیم سنگھ کی باتوں کے بہاؤ سے کھل جانے والی ایک قبر سے جھانکنے والے اپنے ڈھانچے کو اندر دھکیلا اور اس پر یاد فراموشی کی بھربھری ریت ڈال دی۔

میں کئی دن تک اس کی یاد کو ذہن کے مردہ خانے میں دھکیلتا رہا، خود کو سمجھاتا رہا کہ اس سے ملنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ کسی رانا سلیم سنگھ کا مجھ سے بھلا کیا علاقہ؟ میں جس شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس میں ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ناپسندیدہ ٹھہرتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات تھی جو دوسروں میں نہ تھی...

اور پھر ایک شام میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو رنگوں سے لتھڑے ہوئے کرتے پاجامے میں وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں برش تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"ارے واہ تو آپ آ گئے، میں روز ہی آپ کی راہ دیکھتا تھا۔" اس کی بے ساختگی میں کیسی مٹھاس، کیسا سوندھا پن تھا۔ مجھے ہائی اسکول کے سامنے سے خریدی ہوئی گزک یاد آنے لگی، سوندھی اور میٹھی منہ میں گھلتی ہوئی، نشے میں لاتے ہوئی، وہ نشہ تو اب مہنگی شرابوں سے بھی میسر نہیں آتا تھا۔

میں اندر داخل ہوا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا، بے ترتیب، تازہ رنگوں کی خوشبو در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی۔ کئی کینوس دیواروں پر آویزاں تھے، کئی دیوار سے ٹکا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ ایک کینوس ایزل پر تھا اور ادھورا تھا، وہ شاید اسی پر کام کر رہا تھا۔ فرش پر، تپائیوں پر، کتابوں کے ڈھیر تھے۔ ایک کونے میں ایک زنگ آلود ہاون دستہ رکھا تھا۔ شیشے کے مرتبان تھے جن میں سے پھول اور جڑی بوٹیاں جھانک رہی تھیں کسی عطار کی دکان کا منظر تھا۔

میں نے اسے دیکھا تو وہ گردن خم کیے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ "یہ سب کچھ دیکھ کر پریشان ہو گئے ہیں آپ لیکن بس یہی میرا رنو اس، میرا پرستان ہے۔ انتظار کیجئے کہ کسی بھی لمحے اچانک کوئی پری نمودار ہو جائے اور یہ آواز لگائے کہ مسحور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں، دھانی میری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں۔"

"میرے خیال میں اس کے بعد اسے یہ اعلان بھی کرنا چاہئے کہ شہزادۂ گلفام کی صورت پہ مری ہوں۔" میں نے اس کی بات پر گرہ لگائی۔

میرے جملے پر اس نے قہقہہ لگایا اور کمرے میں بچھے ہوئے واحد دیوان پر سے رسالے اور کتابیں اٹھا کر فرش پر رکھنے لگا۔ "آپ آرام سے یہاں بیٹھ جائیں، میں ابھی آیا۔" گیلری کا دروازہ کھول کر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے لکشمن ریکھا پار کرنے سے پہلے کے دن یاد آئے۔ ان دنوں میرا کمرہ بھی اتنا ہی بے ترتیب ہوتا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس میں تصویروں کی بجائے کتابیں تھیں۔ کسی کونے میں کرتے کا گولہ پڑا ہوا ہے، ولائی فرش پر لوٹ رہی ہے، پلنگ کی ادوائن کسنے کی فرصت نہیں سو وہ جھلنگا ہو گئی ہے، ایک تپائی پر ابا کا گراموفون رکھا ہے جس پر صبح شام کوئی ایک ریکارڈ اس وقت تک بجایا جاتا ہے جب تک کہ وہ گھس کر ختم نہ ہو جائے۔ ایک ہی ریکارڈ نہ بجائیں تو کیا کریں کہ گرہ میں دوسرا خریدنے کے دام نہیں۔ "کھینچو کمان، مارو جی بان، رت ہے جوان، ادھورے پران، مارو جی بان..." میرے بدن پر ارمانی (Armani) کا سوٹ تھا، قمیص آسٹن ریڈ کی (Austin Reid) اور اوورکوٹ بربری (Burberry) کا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں بیٹھوں جو سوٹ پر دھبے نہ لگیں اور قمیص کے کف

داغ دار نہ ہوں۔ اوور کوٹ کس چیز پر لٹکاؤں کہ وہ گرد آلود نہ ہو۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک تپائی پر گراموفون رکھا تھا۔ میں نے جیسے خواب میں اپنا اوور کوٹ اتار کر اسے ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور اس گراموفون کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس کے آنے کی خبر مجھے تارپین کی تیز بو سے ہوئی۔ ''میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا۔'' اس کے ہاتھ پر سے رنگ اتر گئے تھے لیکن تارپین کے سفید دھبے نظر آ رہے تھے۔

''میرے خیال میں تھوڑی سی دارو چلے، تب ہی دلوں پر جمی ہوئی برف پگھلے گی۔'' اس نے کہا اور کچن سے ایک بوتل اور دو گلاس لے آیا۔ پھر کسی کونے سے اس نے چپس کا ایک پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ جب گلاس میں شراب انڈیل رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص جو اتنے بے ڈھنگے پن سے یہاں رہتا ہے، میرے آراستہ فلیٹ میں آ کر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے آسائش کی زندگی اس کا روزمرہ ہو۔ مجھے پہلے اس پر رشک آیا، پھر حسد ہوا۔ پھر کسی نے مجھ سے کان میں پوچھا کہیں اپنے آپ سے بھی حسد کرتے ہیں؟ کبھی اپنے آپ پر بھی کسی کو رشک آتا ہے؟

گھونٹ بھرتے ہوئے میری نظر گراموفون کا طواف کرنے لگی۔

''کچھ سنیں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ چلتا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار صاحب ایسا ویسا چلتا ہے؟ ون ہنڈریڈ پرسنٹ (one hundred per cent) چلتا ہے۔'' اس نے دیوان کے نیچے سے ایک ریکارڈ کیس نکالا اور اس میں رکھے ہوئے ریکارڈ الٹنے پلٹنے لگا۔ پھر ایک ریکارڈ اٹھا کر وہ گراموفون تک گیا، سوئی بدلی چابی بھری اور پھر وہ آواز در و دیوار پر پھیل گئی، ''کھینچو کمان مارو جی بان، مارو جی بان...''

میرے سینے پر تیر سا لگا اور میرے ہاتھ میں تھما ہوا گلاس لرز گیا۔ یہ کمرہ تھا کہ جادو نگری؟ یہ شخص تھا کہ میری بھولی بسری یادوں کو پڑھنے والا؟ یہ وہ تھا کہ میں تھا؟ یہ میں تھا کہ وہ تھا؟

سامنے اس کی ایک پینٹنگ تھی۔ اس میں سمندر تھا، تہ میں سبز اور نیلا، سطح پر سفید جھاگ پر آسمان کی نیلگونی کا عکس تھرتھرا رہا تھا۔ پلٹتی ہوئی لہروں کی سبزی مائل نیلگونی میں سے کئی شکاری کتے نکل رہے تھے اور سمندر کی لہروں پر دوڑتے ہوئے اس ایک بگلے کا تعاقب کر رہے تھے جو ان کے کھلے ہوئے نوکیلے جبڑوں اور رال گراتی ہوئی سرخ زبانوں سے کچھ ہی اوپر اڑ رہا تھا۔ تصویر میں سمندر اور کتے دونوں ہی اس خوبی سے پینٹ کیے گئے تھے کہ دیکھ کر کتوں کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی تھی اور بھنور ڈالتا ہوا پانی اس قدر زندہ تھا کہ اس میں ہاتھ ڈبونے کو جی چاہتا تھا۔

''تم تو سمندر کا ایک ٹکڑا چرا کر لے آئے ہو اور اسے کینوس پر رکھ دیا ہے۔''

''اجی ہم تو آنکھوں سے سرمہ اور پسلیوں سے دل چرا لاتے ہیں، یہ سمندر کیا چیز ہے۔'' اس کی ہنسی کیسی بے ریا، کیسی ٹھاٹ دار تھی۔

''لیکن رانا جی، سرے والی کہیں نظر تو نہیں آ رہی۔'' اپنے لہجے کی شرارت مجھے خود اجنبی لگی۔

''ذرا چھری تلے دم تو لو یار صاحب، سرے والی سرکار بھی آ جائے گی، پھر آپ کو اس سے میر کی غزلیں اور میرا کے بھجن سنواؤں گا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔'' اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے تھے۔ وہ آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔

''ماشاء اللہ... کیا بامحاورہ اردو بولتے ہو۔'' میں نے گھونٹ بھر کر اسے دیکھا۔

''میں نے مولوی صاحب سے صرف ہندی اور اردو ہی نہیں، فارسی بھی پڑھی ہے۔ تختی لکھی ہے۔ کہیئے تو کریما بہ بخشائے بر حال ما سناؤں، یا شاہنامے کے اشعار سنیں گے؟'' وہ مسکراتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ میں نے ہندی کیوں بھلا دی۔ ہندی، ہندوی، ہندوستانی، امیر خسرو اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر سات سو برس پہلے کہہ گئے تھے، ''سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں...'' اب لکشمن ریکھا کے اس پار سے خط بھی نہیں آتے تھے۔ خون کے تمام رشتے بتاشے کی طرح بیٹھ گئے تھے اور مشترک تہذیب کی سیتا کو سیاست کا راون اٹھائے لے گیا تھا۔

میرے فلیٹ پر سرکاری اور درباری دونوں ہی قبیلوں کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سلیم سنگھ ان لوگوں کو میرے یہاں وقت بے وقت نظر آتا تو سرگوشیاں شروع ہو جاتیں اور سرگوشیاں سوال اٹھاتی ہیں۔ میرے الجھے ہوئے معاملات مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن اس سے پہلی ملاقات کے بعد سے دل بے اختیار اس سے ملنے کی خواہش کرتا۔ اسی لیے سلیم سنگھ کو بلانے کی بجائے میں خود اس کے یہاں چلا جاتا۔ میں کبھی کسی عورت کا بھی یوں اسیر نہیں ہوا تھا، آسمان کو چھوتی ہوئی اس سیڑھی کا بھی نہیں جو میری بیوی ہے اور ایک افسر اعلیٰ کی بیٹی ہے۔ سیڑھیاں بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کی ہم پوجا نہیں کرتے۔

سلیم سنگھ کے در پر میں نے بے قراری اور بے تابی سے جاتا تھا، اس لیے نہیں کہ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ میں وہاں اپنی تلاش میں جاتا تھا، وہ بھی مجھ سے یوں ملتا جیسے صدیوں کا بچھڑا یار مل رہا ہو۔ دوسری تیسری ملاقات میں ہی وہ مجھے ''سوائی صاحب'' کہنے لگا تھا۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ کا وہ خطاب جو اسے اورنگ زیب کے دربار سے ملا تھا۔ کچھواہا راج کو دوسرے تمام راجپوت راجوں سے ایک چوتھائی زیادہ ماننے کا اعلان۔ وہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوتا کہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی میں کسی دیو کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں۔ وہ جو زندانی ہوں وہی جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کی رہائی بھی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں اس سے وہ باتیں کرتا جنھیں میں کب کا بھلا چکا تھا۔ ان ناموں کو سنتا جن کا نام لیتے ہوئے بھی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ کس طرح اترا اترا کر خسرو، میر، کبیر کا نام لیتا، تلسی داس کی چوپائیاں اور غالب کی غزلیں سناتا، تان سین اور بسم اللہ خان، کون تھا جو اس کا نہیں تھا۔ تاج محل اور اجنتا ایلورا اس کا ورثہ تھے، راجہ ڈھلو کی بسائی ہوئی دلی اس کی تھی اور کمپنی بہادر کا آباد کیا ہوا کلکتہ بھی ترکے میں اسے ملا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ بٹوارے کے

نتیجے میں شہید بھی تقسیم ہو گئے تھے۔ بھگت سنگھ اور دادا اشفاق، جھانسی کی رانی اور حضرت محل بھی اسی کے حصے میں آئی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ خالی رہ گئے تھے۔ ایک رات اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت سے لوگ، بہت سے شہر اور بہت سی عمارتیں یاد آئیں، اس رات میں اس کے سامنے رو دیا۔

"یار یہ تو بڑی بے ایمانی ہے۔ تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔" اپنی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر میرا گریہ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس نے نشے سے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم تاریخ کا کیک کھانا بھی چاہتے ہو، اسے رکھنا بھی چاہتے ہو۔ اتہاس تو دھرتی سے جڑا ہوتا ہے، ہم جب دھرتی سے ناتا توڑ لیں تو اتہاس سے ناتا خود ہی ٹوٹ جاتا ہے۔"

میں نے سر جھکا لیا تھا، نشے میں بھی مجھے یہ یاد رہا تھا کہ میں اس سے شکایت کا حق نہیں رکھتا۔

جے پور اس کے پور پور میں رچا ہوا تھا۔ ایک دن ترنگ میں تھا سب کچھ بھول کر امبیر، جے پور کی باتیں کرتا چلا گیا۔

"جن نے جے پور نہیں دیکھا سوائی صاحب ان نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ بھی نہیں۔ جانو کہ زندگی اکارت گئی۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "سوائی صاحب، اپنی زندگی کے کچھ دن مجھے دے دو، میرے ساتھ جے پور چلو، دیکھو کہ راجپوتوں اور مغلوں کی رشتہ داریاں آج بھی ہمارے شہروں اور بازاروں میں کس طرح جھلکتی ہیں۔ مغل بادشاہ اور شہزادے ہماری گودوں میں کھیلے ہیں۔ ہم نے ان پر سے جانیں واری ہیں۔ سامو گڑھ میں ہارتے ہوئے دارا کے گرد ہم راجپوتوں نے گھیرا ڈالا تھا، اپنی گردنیں کٹا دی تھیں، پر پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔"

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے، وہ ماضی اور حال میں بہ یک وقت زندہ رہتا تھا۔ سانس لیتا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"اجی مہابلی اکبر ہم کچھواہہ راجپوتوں کے بہنوئی تھے اور شہزادہ سلیم کو چاندی کی کٹوری میں دودھ ملیدہ ہم نے کھلایا تھا۔ ہم ان کے ماموں، وہ ہمرے بھانجے۔" پھر وہ گنگنانے لگا۔ "مانگے ہے جودھا جی کا راج جلا جی کا نال نہ چھوائے۔"

وہ یہ باتیں کرتے ہوئے کبھی روتا، کبھی ہنستا رہا۔ ماضی اور حال کو یوں گڈمڈ کرتا رہا کہ میں بھی اس کے ساتھ زمیں بوس ہو جانے والی محل سراؤں میں پھرتا رہا۔

"کچھ جانتے بھی ہو سوائی صاحب، شہزادہ سلیم ہماری مان بائی کو بیاہنے گیا تو دلہن کی پالکی مہابلی اور شہزادہ سلیم اپنے کندھوں پر اٹھا کر راجہ بھگوان داس کے محل سے باہر لائے تھے اور مہابلی نے راجہ سے کہا تھا: 'تمہاری رے بیٹی، تمہارے محلوں کی رانی، تم صاحب سردارے...'" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کی لو چھوئیں اور "ہے رام" کا نعرہ لگایا۔

"میاں سلیم سنگھ تم اگر پچیس تیس برس پہلے مجھے ملے ہوتے تو میں کہتا کہ نا یہ کام دھام چھوڑ کر بمبئی چلے جاؤ اور کے۔ آصف کے یہاں بھرتی ہو جاؤ۔ انھوں نے بھی "مغل اعظم" بناتے ہوئے مغلوں اور راجپوتوں کی مالا اس طرح نہیں جپی ہے۔" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

وہ مجھے کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر ادا سے مسکرایا۔ "میں یہ باتیں کسی اور سے نہیں کرتا، صرف تم سے کرتا ہوں سوائی صاحب، دوسرے تو مجھے سودائی سمجھیں گے۔"

"میں بھی تمھیں کچھ کم سودائی نہیں سمجھتا۔"

"واہ کیا نام رکھا جا سکتا ہے... رانا سلیم سودائی جے پوری۔" اس نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔

"اس نام سے تو میں کل ہند مشاعرہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"اور غزلیں کہاں سے آئیں گی؟"

"اجی غزلوں کا کیا ہے، ڈیڑھ دو سو برس پہلے پران تیاگنے والے کسی بھی کائستھ کوی کا کلام آخر کسی کے کام تو آئے۔"

ہم دونوں اس طرح بے تکی باتیں کرتے۔ شاید یہی کتھارسس کا ایک طریقہ تھا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ سر پیٹ کر اس کمرے سے نکل جاؤں جس میں کھرل کیے ہوئے زعفران کی، ہاون دستے میں کوٹی جانے والی جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی، تارپین کے تیل اور خدا جانے کن کن چیزوں کی خوشبو تھی۔ مجھے الٰہ آباد کے عطار خانے یاد آتے۔

"او میاں مغلوں کے ماموں صاحب... ہم لندن میں بیٹھے ہیں، کبھی پکاڈلی اور آکسفورڈ اسٹریٹ کا رخ کرو، کبھی ٹاور آف لندن یا بکنگھم پیلیس کا بھی دیدار کرنے چلو۔" ایک روز میں نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو سوائی صاحب؟ ہمارے خزانے، ہمارا اتہاس، ہمارے درشن جھروکے اور ہماری چوکھٹیں تک تو لوٹ لائے یہ لوگ... اور ہم جا کر اپنی ہی چیزوں کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدیں، پونڈ خرچ کریں اور گورے ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال دیکھیں؟ نہیں سوائی صاحب یہ نہیں ہونے کا۔"

"جب یہ سب کچھ نہیں دیکھنا تو پھر یہاں لندن میں کیوں بیٹھے ہو؟ جاؤ اور جا کر جے پور میں دھونی رماؤ۔" میں نے اس پر چوٹ کی۔

میری یہ بات سنتے ہی اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ بیٹھا سر ہلاتا رہا، پھر اس نے اپنی مدھ ماتی آنکھوں سے مجھے دیکھا "گھر کیسے جاؤں؟ پتا جی کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے۔"

"پتا جی کیوں کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے؟ کیا ڈاکہ ڈال کے بھاگے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یار وہ اپنے جگری دوست کی بیٹی سے میرے پھیرے کرانے کے چکر میں ہیں۔ میں وہاں سے یہ کہہ کر رفو چکر ہوا ہوں کہ لندن میں میری نمائش ہے، اس سے نمٹ کر میں ترنت آیا۔" وہ ایک ادا سے ہنسا۔

"اور اب کتنے دنوں سے لندن میں ہو؟"

"یہی کوئی چھ ایک مہینے ہو گئے۔"

"لیکن اس طرح کب تک یہاں رہو گے؟"

"یہ نہ پوچھو۔ ماتا جی پتا جی نے ڈاک اور فون سے میرا ناک میں دم کر رکھا

ہے۔ میں ہر مرتبہ انھیں کوئی نیا جھانسہ دے دیتا ہوں۔"

"ابے گاؤدی، کب تک نیا جھانسہ دیتے رہو گے؟" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "ان سے صاف انکار کیوں نہیں کر دیتے؟"

اس نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا۔ "اپنے اللہ رسول کا شکر ادا کرو کہ جس نے تمھیں ایک راجپوت باپ کے گھر نہیں پیدا کیا۔"

"تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"وہ مجھے تو بس بنی ٹھنی کا انتظار ہے،" اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

"بنی ٹھنی؟ بھئی یہ کس بلا کا نام ہے؟"

"سچ کہتے ہو سوائی صاحب۔ واقعی قہر ہے، بلا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

اس روز وہ دیر تک میرا سین کی باتیں کرتا رہا جسے وہ لاڈ سے "بنی ٹھنی" کہتا تھا۔

"اسے دیکھ کر تم بھی یہی کہو گے کہ اس پر یہ نام سجتا ہے۔ ایسا سنگھار پٹار کرتی ہے کہ بس دیکھتے رہو۔" میرا سین کا نام "بنی ٹھنی" اس نے راجہ ساونت سنگھ کے دربار کے نہال چند کی بنائی ہوئی ایک تصویر سے دیکھ کر رکھا تھا۔ نہال چند اپنے عہد کا سب سے مشہور چتر کار تھا۔ اس نے رادھا اور کرشن کی کہانی رنگوں اور برش سے کاغذ پر اتاری تھی۔ کرشن اس نے راجہ ساونت کو بنایا تھا اور رادھا کا چہرہ بناتے ہوئے راجہ کی چہیتی محبوبہ "بنی ٹھنی" کو سامنے رکھا تھا۔

"میں نے بنی ٹھنی کا پورٹریٹ دیکھا ہے۔ تم یقین کرو سوائی صاحب، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے میرا کا ہی عکس ہے۔" اس نے بہت رازداری سے مجھے بتایا تھا۔

میرا تھیئٹر کی دنیا سے وابستہ تھی، بنگال کی رہنے والی، گانے اور ناچنے میں طاق۔ پہلی ہی ملاقات میں رانا سلیم سنگھ کا دل لے گئی تھی۔ لیکن سلیم سنگھ کے پتاجی کے لئے یہ ناک کٹا دینے والی بات تھی کہ ان کی اکلوتی بھانجی کے بجائے ان کا منتوں مرادوں کا بیٹا ایک بنگالن سے شادی کر لے۔ مرنے مارنے پر تیار تھے، اپنا کھانڈا لہرا کر بنگالیوں کے خلاف بھاشن دیتے اور یہ ثابت کرتے کہ نہ انھوں نے بنگال میں انگریزوں کو پاؤں ٹکانے دیے ہوتے نہ ہندوستان غلام ہوتا۔

اب وہ بات بے بات پر بنی ٹھنی کا تذکرہ کرتا۔ "ظالم ہے بنگال لیکن آنکھیں بالکل جودھ پوری ہیں۔ ویسی ہی کٹاری۔" اس نے رازداری سے مجھے بتایا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ "یار جودھ پوری کوٹ تو دیکھا، سنا اور پہنا تھا، لیکن یہ جودھ پوری آنکھیں کس کھونٹی پر لٹکائی جاتی ہیں؟" اس نے ڈپٹ کر کہا، "چپ" اور اپنے ایزل پر جھک گیا۔

یہ وہ تھا جس نے مجھے ہندوستانی مصوری کے رموز سکھائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہندوستانی موسیقی کے گھرانوں کی طرح miniature مصوری کے بھی گھرانے ہیں۔ جے پور گھرانہ، کشن گڑھ، بوندی اور کوٹا گھرانہ... میں نے اسے پستے سے سبز، زعفران سے نارنجی، ہڑ سے زرد اور نیل سے نیلا رنگ کشید کرتے دیکھا۔ اس کے کمرے میں طرح طرح کی سبزیاں، پھول، پیڑوں کی چھالیں اور شاخیں نظر آتیں۔ کبھی وہ ریت کو کپڑے سے چھانتا دکھائی دیتا اور کبھی سیاہ رنگ کے لئے اپنے فرائنگ پین کا پیندا کھرچ کر اس کی کالک اکٹھا کرتا نظر آتا۔ سرخ رنگ کے لئے شیشے کے ایک مرتبان میں اس نے قرمزی کیڑے محفوظ کر رکھے تھے۔ کھرل، باریک ململ، طرح طرح کی باریک موٹی چھلنیاں، ہاون دستہ، کاٹھ کباڑ خانہ اکٹھا کر رکھا تھا رانا سلیم سنگھ نے۔

میں نے پہلی مرتبہ جب اسے اس بکھیڑے میں الجھے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گیا تھا۔ "تم لندن میں بیٹھے ہو رانا جی، جہاں دنیا کے بہترین رنگ ملتے ہیں۔ دنیا بھر کے مصور یہاں سے رنگ خریدنے آتے ہیں اور تم یہاں بیٹھے کسی وید جی کی طرح خدا جانے کن جڑی بوٹیوں کو پیستے کوٹتے رہتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا تھا۔ "میں کل تمھارے لئے ایک گرائنڈر لے آؤں گا۔"

وہ میری یہ بات سنتے ہی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "جی ہاں، آپ گرائنڈر لے آئیں گے، بڑی کرپا آپ کی۔ یہ احسان مت کیجئے گا مجھ پر... کوٹنے اور کھرل کرنے سے رنگ ہی الگ نکلتا ہے، اس میں ہاتھ اور بازو کا زور بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر موتی کھرل کرنا ہو تو ہفتوں لگتے ہیں اس میں، لیکن اس کا اجالا، اس کا روپہلا پن، سارے بنے بنائے رنگوں سے جدا ہوتا ہے۔"

"بھئی تم تو جانے کس صدی کی بات کرتے ہو... تمھاری یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" میں نے بیزاری سے کہا۔

"ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں اور اپنے رنگ ہم چیزوں سے خود نچوڑتے ہیں۔ ہمارے لئے زندگی، موت سب رنگوں کا کھیل ہے۔ جان دینے جاتے ہیں تو کیسری بانا پہنتے ہیں، ہماری عورتیں جوہر کرتی ہیں تو نارنجی آگ اوڑھ لیتی ہیں۔ ہمیں زندگی کرتے دیکھنا چاہو تو ہماری لڑکیوں کی چندریاں، چوڑیاں اور چولیاں دیکھو، گہرے رنگوں سے رنگے ہوئے ہمارے شہر اور گاؤں دیکھو۔" وہ بولتا چلا گیا۔

"تو پھر تمھاری تصویریں اتنی کڑوی اور دل دہلا دینے والی کیوں ہیں؟" میں نے اس کی بنائی ہوئی ان تازہ تصویروں کی طرف اشارہ کیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں اور جن کے رنگ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔

"اپنشد میں کہا گیا ہے سوائی صاحب کہ سب سے پہلے صرف پانی تھا، اس پانی نے بیج کو، بیج نے برہما کو، برہما نے پرجاپتی اور پرجاپتی نے دیوتاؤں کو پیدا کیا اور دیوتا بیج کی پوجا کرتے ہیں۔ اب تم جانو کہ میں ٹھہرا ناستک، میں برہما، پرجاپتی اور دیوتاؤں کے بارے میں کوئی جان کاری نہیں رکھتا، لیکن میں پانی کو جانتا ہوں اور مانتا ہوں جس نے بیج کو پیدا کیا۔ میں اسی بیج کی لکیروں سے، اس کے رنگوں سے اپنی تصویریں بناتا ہوں۔"

شدید انتظار کے بعد میرا سین آ پہنچی۔ سلیم سنگھ اسے بنی ٹھنی کہتا تھا تو کیا غلط کہتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے رانا سلیم سنگھ پر رشک نہیں آیا، اس سے حسد ہوا۔ اس بنی ٹھنی کی آنکھیں واقعی جودھ پوری کٹار تھیں کہ دل کو کاٹتی چلی جائیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک بھولا بسرا گیت یاد آیا "بنے سہرا جو باندھیں تجھے حور پریاں، جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں۔" سسرال کی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی یہ بول میرے کانوں میں پڑے تھے، آواز

کجن بیگم کی تھی جو بہت ناز، بہت ادا سے گا رہی تھیں۔ "جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں۔"

میرا پر نظر پڑی تو مجھے بے ساختہ کجن بیگم کے گائے ہوئے یہ بول یاد آئے۔ گھنے گھنیرے بال آبشار کی طرح کمر سے بہت نیچے گرتے ہوئے اور آنکھیں رسیلی، مدھ سے بھری... ہم ہیتھرو ایرپورٹ پر تھے جہاں آنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے لئے گلے ملنا، ہونٹ چومنا ایک روزمرہ تھا۔ لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں ایسی حیا تھی کہ میں نے نگاہیں جھکالیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چل رہے تھے جیسے سینکڑوں نگاہوں کے حصار میں ہوں اور ہمت نہ رکھتے ہوں کہ ایک دوسرے کو چھولیں۔

اس رات میں کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر سلیم سنگھ کے اصرار کے باوجود انھیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ آیا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ رانا سلیم سنگھ نے مجھے ہر میدان میں شکست دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ برصغیر کی صرف تاریخ اور جغرافیہ اس کا ہے۔ لیکن وہ تو سوئمر میں بھی سب سے سہانی شہانی جیت لایا تھا۔ میں دو دن اس کی طرف نہیں گیا لیکن تیسرے دن اپنے دل پر میرا قابو نہیں رہا۔ اب تک میں اپنے آپ سے جلنے جاتا تھا اور اب میں اس سہانی کو دیکھنا چاہتا تھا جو میری نہیں تھی اور کبھی بھی میری نہیں ہو سکتی تھی۔

میرا قیامت ناچتی تھی اور اس سے بڑی آفت اس کی آواز تھی۔ تان اڑاتی تو اس کے گلے کی سبز رگیں تانت کی طرح تن جاتیں۔ میرا بائی کے بھجن سناتی تو عبادت کی، اگر اور صندل کی خوشبو آتی، مندر میں کوئی آرتی اتارتا رہتا۔ "رانا جی نے وش کا پیالہ بھیجا، پیالہ دیکھ میرا ہانسی رے..." یہ بھجن میں نے اسے کشتی میں گاتے سنا تھا اور پانی میں روشنیوں کا، رات اور رسیلی آنکھوں کا عکس دیکھا تھا۔ ان رسیلی آنکھوں کا قصیدہ کجن بیگم کی آواز پڑھتی رہی تھی، جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں۔ ہوا اس کے بال اڑاتی رہی تھی اور اس کی آواز پانی میں آگ لگاتی رہی تھی۔ پیالہ دیکھ میرا ہانسی رے۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، وہ رقص کا عالم تھا، جس میں ہر جنبش اس تیزی سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی تفصیل میں نہیں، اپنے تاثر میں یاد رہتی ہے۔ اس لئے کچھ باتیں مجھے یاد ہیں، کچھ بھول بیٹھا ہوں۔

سلیم سنگھ کی اور میرا کی شادی پہلے رجسٹریشن آفس میں ہوئی اور پھر سلیم کے ایک دوست کے گھر پھیرے ہوئے۔ گھر عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ سانولی سلونی لڑکیوں کے رنگین گھاگھرے، ان کے ٹھمکے، ان کے ذو معنی جملے، ایک لڑکی راجستھانی میں کوئی تیز تیکھا گیت گا رہی تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ اے مونچھوں والے نواب تو میرا دل لے گیا۔ شراب بہہ رہی تھی۔ میں اس محفل میں تھا اور نہیں تھا۔ ان دونوں نے جب آگ کے گرد پھیرے لگائے تو میں انھیں ایک ٹک دیکھتا رہا۔ سلیم سنگھ کی ریشمی شیروانی، اس کا نارنجی صافہ، اس کی پنڈلیوں میں پھنسا ہوا سفید چوڑی دار پاجامہ اور دوسری طرف وہ تھی جو صرف رنگ ہی رنگ تھی، خوشبو ہی خوشبو تھی، ایسے ہی جوڑوں کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ چشم بد دور و چشم بد بیں دور... میں انھیں حسرت سے دیکھتا رہا۔ یہ میں تھا، یہ میں نہیں تھا، وہ میری تھی وہ میری نہیں تھی۔ میں شادی کو تجارت سمجھتا تھا، وہ اسے عبادت جانتا تھا...

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس لڑکے کے لئے رو رہا تھا جو الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں کھری کھاٹ پر لیٹ کر رات کی تنہائی میں تاروں سے باتیں کرتا تھا۔ ہم کب اپنا ہاتھ، خود اپنے ہاتھ سے چھڑا لیتے ہیں، ہم کب اپنے اندر سے نکل کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پھیرے پورے ہوئے تو میں نے اسے بدھائی دی، میرا کو دعائیں اور ایک مخملی تھیلی دی اور جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ اس رات میں نے کوئی ٹیکسی نہیں روکی، کسی ٹیوب اسٹیشن کا رخ نہیں کیا، بس چلتا رہا اور سوچتا رہا وہ باتیں جو اس رات کے بعد میں شاید کبھی نہیں سوچیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے سفر پر نکل گئے، ان دونوں نے اپنے دستخطوں سے پیرس، وینس اور روم سے مجھے پوسٹ کارڈ بھیجے، جنھیں دیکھ کر جنھیں پڑھ کر میں خاک دخاکستر ہوتا رہا۔

میرا اور سلیم واپس آئے تو نہالوں نہال تھے، ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ سلیم سنگھ میں مجھے اپنا عکس نظر آتا تھا۔ میں اس سے ملنے کے لئے بے قراری سے جاتا تھا جیسے کچے دھاگے سے سرکار بندھے جاتے ہیں۔ لیکن اب ہم دونوں کے درمیان جدائی پڑ گئی تھی۔

پہلی ملاقات ہوئی تو سلیم سنگھ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی شادی کی تصویریں اور میرج سرٹیفکیٹ کی کاپی گھر بھیج دی تھی اور وہاں سے پیغام آ گیا ہے کہ اب وہ کبھی جے پور کا رخ نہ کرے۔

"کچھ دنوں میں تمھارے پتا جی کا غصہ یقیناً ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

اس کی آواز اداس تھی۔ "میرے دل پر ماتا جی کا خیال آرے چلاتا ہے۔ ان پر کیا گذری ہوگی۔"

"یہ بات تو تمھیں پہلے سوچنا چاہئے تھی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اس بنی ٹھنی کے سامنے کوئی بات یاد رہ سکتی ہے؟" اس نے بیچارگی سے مجھے دیکھا اور لاجواب کر دیا۔

وہ دونوں ایک نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ سلیم سنگھ کی کئی تصویریں بک گئی تھیں اور اس نے گھر کے لئے بہت سی چیزیں خرید لی تھیں، لیکن ایک کمرے میں وہی بے ترتیبی اور بکھراؤ تھا جو سلیم کے مزاج کا حصہ تھا۔ باقی گھر بنی ٹھنی کا تھا، اسی طرح سجا سجایا۔ پھر میری اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ اب میں اس کے یہاں جاتے ہوئے جھجکتا تھا۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ میرا دو مہینے کے لئے واپس ہندوستان جا رہی ہے۔ وہاں کئی شہروں میں تھیٹر فیسٹول ہو رہا تھا۔ میرا اپنے تھیٹر گروپ کی فرمائش پر نہ چاہتے ہوئے بھی جا رہی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد بھی ہم دونوں کی ملاقاتوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے تصویریں بناتا رہا۔ میری واپسی کے دن قریب تھے سو میں اپنا سامان سمیٹنے اور اپنی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگا رہا۔

وہ رات مجھے یوں یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ اس رات میں دیر سے گھر پہنچا تو سیڑھیوں پر سلیم سنگھ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور

رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا اور کچھ کہنے لگا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اسے اندر لے گیا، اس کے سر پر پانی بہاتا رہا، پھر میں نے اسے فرش لائم کا ایک گلاس پلایا۔ تب وہ اس قابل ہو سکا کہ مجھے کچھ بتائے۔

اس کی بات جب میری سمجھ میں آئی تو میں بھی رو رہا تھا۔ میرا ایک accident میں ختم ہو گئی تھی۔

"ہم دھواں سوائی صاحب... ہم دھواں۔" وہ اپنی بات پوری کر کے پھر چیخیں مارنے لگا۔

بنی ٹھنی کو بھی موت آ سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تو میرا تھی... راناجی نے وش کا پیالہ بھیجا، پیالہ دیکھ کر میرا ہانسی رے... اور پھر سلیم سنگھ کی چیخوں کے ساتھ میری چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ اس کے لئے رو رہا تھا اور جو پور پور اس کی تھی اور میرے آنسو اس کے لئے تھے جو پل چھن کے لئے بھی میری نہیں ہوئی تھی۔

وہ رات کس طور گذری، مجھے یاد نہیں۔ یاد ہے تو اتنی سی بات کہ سلیم سنگھ نے ہچکیوں کے درمیان یہ بتایا کہ میرا جب رخصت ہوئی ہے تو اکیلی تھی، وہ ماں بننے والی تھی، اس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اور سلیم سنگھ کے دوسرے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ کلکتہ چلا جائے۔ میرا کا بھائی اسے کلکتہ لے گیا تھا۔ میرا کے انتم سنسکار میں شریک ہو جائے۔ لیکن اس کی "نہیں" ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

"میں نے اسے زندہ دیکھا تھا، چاہا تھا، برتا تھا۔ اب اسے آگ کی چادر اوڑھ کر جلتے ہوئے کیسے دیکھوں؟" اب اس کی آنکھیں آنسو سے اور اس کی آواز کسی تاثر سے خالی تھی۔

میرے جانے کی گھڑی سر پر تھی اور چاہنے کے باوجود میں اس وقت سلیم سنگھ کے ساتھ نہیں گذار سکا تھا۔

میں اس سے آخری بار ملنے گیا تو اسے دیکھ کر دل کٹ گیا۔ وہ جس کی پور پور سے زندگی پھوٹتی تھی، جس کی آنکھیں ہنستی تھیں، جس کی آواز میں پھلجھڑیاں چھوٹتی تھیں، وہ اب ایک کھنڈر تھا۔ رنگ جھلس گیا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے اور آواز میں تھکن۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں؟" اس نے اچانک مجھ سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں سوالی تھیں۔

میں خاموش رہا اور میری خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ "ہاں ٹھیک ہے سوائی صاحب، تم اپنی راہ جاؤ ہم اپنی راہ لیں گے۔"

"ہم سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"تین کے لئے تو ہم ہی کہا جاتا ہے۔" اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے تو خاصی دیر تک لپٹے رہے۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا اور جانے میں کن خیالوں میں گم تھا۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں۔

میں چلا آیا۔ مجھے اپنی پیکنگ کرنی تھی، زیادہ سامان تو میں دو دن پہلے ہی ایر کارگو سروس سے بھیج چکا تھا۔

اس وقت صبح کے شاید سات بجے تھے جب میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری طرف سے سلیم سنگھ کا ایک دوست بول رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اسے میرا نمبر کہاں سے ملا تھا۔

"آپ فوراً سلیم سنگھ کے فلیٹ پر آ جائیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں منھ پر چھپکا مار کر اور ٹیکسی پکڑ کر اس کے یہاں پہنچا۔ سڑک پر ایمبولنس اور پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

دروازے کے باہر ہی سلیم سنگھ کے کئی دوست کھڑے تھے سب کے چہرے ستے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ... ایک نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک پولیس والے نے مجھے روکنا چاہا لیکن تعارف کرانے پر مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

وہ اپنے اور میرا کے بستر پر لیٹا تھا۔ چہرے پر سکون اور گہری نیند تھی۔ سفید لیس کی چادر پر سرخ رنگ کے دھبے تھے، جو اب سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ یہ رنگ اس کی کٹی ہوئی کلائی سے نکلا تھا اور چادر پر نقش و نگار بنا گیا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں۔ اس نے اپنے وجود سے رنگ کی آخری بوند بھی نچوڑ لی تھی۔ میں ساکت صامت کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ یہ میں تھا جو بستر پر تھا، یہ میں تھا جو کھڑا ہوا تھا اور خود کو دیکھ رہا تھا... میں اسے چھونے کے لئے جھکا تو پولیس والے نے مجھے روک دیا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ننگے پیر تھا اور اس کے دونوں پیر مسہری سے کچھ نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ میں ان پیروں کو دیکھتا رہا جنھیں پھیرے لگانے کے بعد بنی ٹھنی نے جھک کر ہاتھ لگایا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، مجھ سے آخری ملاقات کے بعد کیا تھا، رات کو اگر میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا، اگر میں اس کے ساتھ رہ جاتا میں اس کے پیروں پر سر جھکائے سوچتا رہا۔

اس کے لئے میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا۔ جب اسے کریمیٹوریم لے جایا گیا تب بھی نہیں۔ لیکن جب اس کے سرہانے سے ملنے والی چند سطری وصیت کے مطابق بنی ٹھنی کا پورٹریٹ مجھے دیا گیا تو میں دھاڑیں مار کر رو دیا۔ وہ پورٹریٹ میں نے اپنے گھر میں نہیں لگائی ہے۔ اسے بہت احتیاط سے اپنے سیف میں رکھ دیا ہے۔ میں ان جودھ پوری آنکھوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں ان رنگوں کو کس دل سے دیکھوں جنھیں سلیم سنگھ نے جانے کن پھولوں، چھالوں اور شاخوں سے کشید کیا تھا۔ نہیں، وہ اس کی نہیں میری بنائی ہوئی تصویر ہے۔ میں اس تصویر کو سب کی نگاہوں سے چھپا کر رکھتا ہوں اور سلیم سنگھ کی یاد بھی میرے اندر کہیں رہتی ہے۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن میں تازہ رنگوں کی خوشبو سے رانا سلیم سنگھ کی یاد بھی جدا نہ کر سکا... اور کیسے جدا کروں کہ جب اس کی یاد آتی تو میں خود کو یاد کرتا ہوں، اپنے خواب یاد کرتا ہوں، پھر ان خوابوں کو شراب میں ڈبونے لگتا ہوں ☆☆☆

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

لوئیجی پراندیلو، ترجمہ: زاہدہ زیدی

شمارہ ۲۰۰،
نومبر ۱۹۹۶

مختصر تعارف

اس مختصر نوٹ میں لوئیجی پراندیلو (Luigi Pirandello) (۱۸۶۷ تا ۱۹۳۶) کے فلسفۂ حیات، نظریہ فن، اس کی ادبی اہمیت اور مرکزیت اور ڈرامے کی دنیا میں اس کے کارہائے نمایاں پر بھرپور روشنی ڈالنا تو ممکن نہیں، لیکن چونکہ اس کا تصور حیات اور نظریات اس کی سبھی تخلیقات میں جاری وساری ہیں اور خاص طور سے اس کے ڈراموں کی ساخت میں پیوست ہیں، اس لئے ان کی طرف چند اشارے ضروری ہیں جن کی روشنی میں زیرنظر ڈرامے ''عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے'' کے مرکزی خیال اور معنویت کو زیادہ بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔

زندگی اور شعور زندگی کا تضاد اور باہمی کشمکش پراندیلو کے تصور حیات کا سنگ بنیاد ہے۔ فطرت کے سبھی مظاہر چرند پرند، نباتات اور حیوانات زندہ ہیں لیکن اس لئے اگر ایک طرف عریاں اور بے لگام زندگی شعور کی حدوں سے پرے اپنی پوری شدت سے رواں دواں ہے اور پیہم بے قرار ہے اور ہر دم رنگ بدلتی رہتی ہے تو دوسری طرف انسان اپنے شعوری احساس کی بدولت اس کی حدود اور سمت متعین کرنے اور اسے مخصوص شکلوں یا سانچوں میں ڈھالنے کے لئے ہر دم کوشاں رہتا ہے۔ یا پھر وہ زندگی کی ہماہمی کو زیادہ شفاف اور مثالی بنا کر اسے منطق، فلسفے، قانون اور رسم ورواج اور روایات میں ڈھالتا ہے اور اس طرح زندگی کا یہ رواں دواں دھارا جو گرمی، جوش اور شدت سے عبارت ہے، رفتہ رفتہ سرد ہو کر ان منجمد سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔

پراندیلو کے خیال کے مطابق یہ انجماد موت کے مترادف ہے۔ لیکن انسانی زندگی ان تصورات اور سانچوں کے بغیر ممکن بھی نہیں کیونکہ انھیں پر معاشرے، سماجی اداروں اور انسانی رشتوں کی بنیاد قائم ہے اور انھیں کے دائرے میں رہ کر انسان مختلف اور اکثر متضاد رول ادا کرتا ہے۔ انھیں ماسک یا نقاب کہا گیا ہے۔ لیکن یہ رسم ورواج انسان کی شخصیت کو کچل بھی سکتے ہیں اور یہ نقاب اسے اپنی شناخت سے بھی محروم کر سکتے ہیں۔ اور چہرے اور نقاب کی یہ کشمکش پراندیلو کے اکثر ڈراموں کی ساخت میں پیوست ہے، جس کا نقطۂ عروج پراندیلو کے دو اہم ڈرامے ''لباس برہنگی'' اور ''ہنری چہارم'' ہیں۔ آخر الذکر پراندیلو کا لاثانی شاہکار ہے۔

جب کوئی بیدار ذہن خود کو ان سانچوں اور تصورات سے جدا کر کے زندگی کی عریانی سے نظریں ملاتا ہے تو گویا وہ خود کو ایک آئینے کے روبرو پاتا ہے۔ پھر اس کا اولین ردعمل تو حیرت، خوف اور دہشت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا یہ عکس دیکھنے کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرتا ہے کہ وہ ساںچے اور تصورات جن پر اس کی زندگی کی اساس ہے کوئی دائمی حقیقت نہیں بلکہ کچھ داخلی ضروریات اور حالات کے مطابق ہر زمانے، ہر سماج بلکہ ہر شخص نے اپنے لئے وضع کر لئے ہیں۔ اور حقیقت کا ادراک بھی ہر شخص اپنے زاویۂ نظر سے اور اپنی داخلی ضروریات کے مطابق ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ کہ وہ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا سکتے ہیں اور زندگی کی گریز پا اور پر اسرار کیفیات کو گرفت میں لا کر ان پر حکم صادر کر سکتے ہیں، نہ صرف بے بنیاد بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ اور یہی زیرنظر ڈرامے کا مرکزی خیال ہے اسی طرح آئینہ در آئینہ اور عکس در عکس بھی پراندیلو کے ڈراموں کا ایک مخصوص ''موتیف'' ہے جس کے توسط سے زندگی کے تضادات اور پیچیدگیوں کو منعکس کیا گیا ہے۔

زیرنظر ڈرامے کا یہ پہلو قابل غور ہے۔ پراندیلو کی ڈراما نگاری انھیں مرکزی تصورات کی تجسیم ہے لیکن کیونکہ اس کی بنیاد زندگی کے تضادات اور جدلی خصوصیات پر ہے۔ اس لئے یہ تصور بے بنیاد ڈرامائی امکانات کا حامل ہے جنھیں پراندیلو نے بڑی خوبی اور فنکاری سے منکشف کیا ہے۔ طنز کی ایک زیریں لہر کے

ساتھ جو اس زاویہ نگاہ کا ایک لازمی نتیجہ ہے انسانی ہمدردی کا جذبہ اور انسانی مقدر سے وابستگی بھی پرانڈیلو کی ڈراما نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

پرانڈیلو نے اپنے نظریہ فن کی وضاحت بھی بڑی جدت اور دیدہ وری سے کی ہے۔ اور اس کے بعض ڈرامے مثلاً ''چھ کردار، ایک مصنف کی تلاش میں'' اور'' آج رات ہم ڈراما تخلیق کریں گے'' اس کے نظریہ فن کی تجسیم ہیں۔ اول الذکر اس کا مشہور ترین ڈراما اور لافانی شاہکار ہے۔ یہاں پرانڈیلو نے ڈرامے کے تاریخی تصور اور فلسفیانہ تصور کے درمیان جو امتیاز قائم کیا ہے وہ بہت اہم ہے اور انسانی شخصیت کے انتشار اور غیر یقینی کیفیت اور ڈرامائی کرداروں کی شفاف اور دائمی خصوصیات کا بھی بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

پرانڈیلو صرف ایک بہت تازہ کار اور اہم ڈراما نگار ہی نہیں، اس کے نظریات اور فنی تجربات نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ سارتر (Sartre)، کامیو (Camus) بیکٹ (Beckett) اینیسکو (Ionesco) ژنے (Genet) ژاں ژرادو (Jean Giradoux) انوئی (Anouilh) اونیل (O'Neill) پنٹر (Pinter) اور ٹینسی ولیمز (Tennessee Williams) جیسے ڈراما نگار بھی اس کے فکر و فن سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پرانڈیلو کے تصورات اور بصیرتیں جدید فکر اور حسیت کا ایک لازمی جزو بن چکی ہیں۔

''عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے'' لوئجی پرانڈیلو کے دلچسپ ڈرامے Osic (Si Ve Pare) یعنی So it is (If Your Think So) کا آزاد ترجمہ ہے اور اسے ہندوستانی ماحول میں ڈھالنے کے لئے اس میں کچھ ضروری تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اسے کسی قدر مختصر بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے مرکزی خیال، پلاٹ اور فلسفیانہ تصور میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، بلکہ اسے ابھارنے کے لئے اس کے مرکزی اور اہم کرداروں کو یہاں جو نام دئے گئے ہیں وہ ایک علامتی بعد رکھتے ہیں۔ صبا پنہاں، اسرار فاطمہ، مسز شفقت (محبت فاطمہ)، شرافت علی، فہیم رازداں اور کسی حد تک فخر الحسن اور فاخرہ بیگم اسی نوعیت کے نام ہیں۔ فہیم رازداں اس ڈرامے میں مصنف کا ترجمان ہے اور اس کا خاص رول اس ڈرامے میں پرانڈیلو کے فلسفیانہ تصورات کی تفہیم ہے۔

البتہ ڈرامے کے آخری منظر میں میں نے دو تبدیلیاں کی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اصل ڈرامے میں مسز پونزا کے چہرے پر ایک بہت موٹی نقاب پڑی ہوئی ہے لیکن یہاں صبا پنہاں اسرار فاطمہ کے چہرے پر باریک نقاب ڈالی گئی ہے، جو ڈرامے کے کرداروں اور حاضرین دونوں کی آتش شوق کو تیز تر کرتی ہے اور حقیقت کے تصور کو کسی حد تک مشرقی تصور سے قریب تر لے آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اصل ڈرامے کا ہر ایکٹ فہیم رازداں کے زوردار قہقہے پر ختم ہوتا ہے اور آخری ایکٹ میں بھی اسی پر پردہ گرتا ہے۔ لیکن اس آزاد ترجمے میں فہیم رازداں اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد گہری سوچ میں غرق آہستہ آہستہ اسٹیج سے نیچے اترتا ہے اور حاضرین کے درمیان سے ہوتا ہوا ہال سے باہر جاتا ہے۔ اس کی فکر اور بصیرتوں کو حاضرین کے ذہن میں پیوست کرنے کے لئے یہ میری ایک کاوش ہے جو اس صورت حال کے مضحکہ خیز پہلو کے ساتھ شاید اس کے سنجیدہ اور المناک پہلوؤں پر بھی غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

کردار

فخر الحسن:
ایک خوش حال شخص جو سرکاری افسر بھی ہے، عمر ۵۰ سال

فاخرہ بیگم:
فخر الحسن کی بیوی، عمر ۴۵ سال

نازلی:
فخر الحسن اور فاخرہ بیگم کی لڑکی، عمر ۱۸، ۱۹ سال

اوم پرکاش شرما:
فخر الحسن کا دوست، عمر ۴۵ سال

مسز سوشیلا شرما:
اوم پرکاش شرما کی بیوی، فاخرہ بیگم کی دوست، عمر ۳۸ سال

فہیم رازداں:
فاخرہ بیگم کا بھائی، عمر ۳۵ اور ۴۰ کے درمیان

مسز بیدی:
سوشیلا شرما کی دوست، عمر ۴۵ سال

مس نجمن:
مسز بیدی کی دوست، اسکول مسٹریس، عمر ۵۰ سال

انسپکٹر یادو:
پولیس انسپکٹر

رام کمار پانڈے:
ضلع مجسٹریٹ (کلکٹر)، عمر ۵۵ سال

نازلی کی سہیلیاں:
اسی کی ہم عمر

بہادر:
فخر الحسن کا ملازم، عمر ۱۶ سال

شرافت علی:
فخر الحسن کا ماتحت سرکاری ملازم

مسز شفقت:
(محبت فاطمہ) ایک عمر رسیدہ خاتون، شرافت علی کی ساس

مسز شرافت علی:
صبا پنہاں (اسرار فاطمہ)

جائے وقوع:
اتر پردیش کا ایک چھوٹا شہر۔ زمانہ: حال
سب مناظر فخر الحسن کے گھر میں پیش کئے جائیں۔

فخرالحسن کے گھر کا ڈرائنگ روم۔قیمتی فرنیچر اور قالین وغیرہ سے آراستہ، دیواروں پر تصاویر، کارنس پر سجاوٹ کا سامان۔کمرے میں دو عدد صوفہ سیٹ اور کئی میزیں بھی ہیں جن پر گلدان وغیرہ رکھے ہیں اور ایک میز پر کچھ رسالے وغیرہ پڑے ہیں۔ کمرے میں ٹی وی اور V.C.R وغیرہ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے تو ہم فہیم رازداں کو پریشانی کے عالم میں ٹہلتا ہوا دیکھتے ہیں۔اس کی عمر ۳۵ سال سے کچھ زیادہ اور ۴۰ سال سے کم ہے۔ وہ خاصا وجیہ اور خوش پوشاک ہے اور اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔اس کی بڑی بہن فاخرہ بیگم جو ایک ۴۵ سالہ کسی قدر فربہ لیکن خوش پوشاک اور قبول صورت خاتون ہے، صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک مصور میگزین ہے، جس کے ورق وہ بے پروائی سے الٹ رہی ہے۔اس کے انداز سے ظاہر ہے کہ اسے اپنے شوہر کی پوزیشن اور خود اپنی اہمیت کا خاصا احساس ہے۔اس کی بیٹی نازلی جو ۱۸، ۱۹ سال کی ایک دلکش لڑکی ہے، اس وقت گلدان میں پھول سجا رہی ہے۔اس کے انداز سے بھی ظاہر ہے کہ وہ ہر بات جانتی ہے۔

فہیم رازداں:
اچھا تو نوبت بہ اینجا رسید۔یعنی کہ بھائی صاحب اس مسئلے کو لے کر کلکٹر صاحب کے ہاں گئے ہیں۔

فاخرہ بیگم:
تو اور کیا کرتے؟ پانی سر سے گذر چکا ہے۔وہ فخرل صاحب کا ماتحت ہے۔

نازلی:
ذرا سوچئے تو ماموں جان... پہلے تو اس نے اپنی ساس کے لئے اسی بلڈنگ میں ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لیا اور پھر...

رازداں:
تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ یہ تو اس کا ذاتی معاملہ ہے۔

نازلی:
لیکن اسے سوچنا چاہیے تھا۔آخر وہ پاپا کا ماتحت ہے...

رازداں:
تو کیا تمھارا خیال ہے کہ اس کی ساس کا فرض تھا کہ وہ خود سلام کے لیے حاضر ہو کیونکہ اس کا داماد تمھارے پاپا کا ماتحت ہے؟

فاخرہ بیگم:
فرض کی بات کون کر رہا ہے؟ لیکن آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔

نازلی:
اور پھر ہم تو خود ہی وہاں گئے تھے کہ شاید بڑی بی کو کسی چیز کی ضرورت ہو...

فاخرہ بیگم:
اور ہماری شرافت اور ہمدردی کا ہمیں یہ انعام ملا کہ پہلی بار تو ہم گھنٹی بجاتے رہے اور کسی نے دروازہ ہی نہیں کھولا اور دوسری بار...

رازداں:
کیا اس میں صرف شرافت اور ہمدردی کا جذبہ کارفرما تھا یا آپ کے تجسس کو بھی کچھ دخل تھا؟

نازلی:
ظاہر ہے ماموں جان! اب اگر میں خانساماں کے بڑے بڑے جوتے پہن کر یہاں آجاؤں اور انھیں یہاں، عین آپ کے سامنے میز پر رکھ کر بیٹھ جاؤں تو کیا...

رازداں:
خانساماں کے جوتوں کا اس واقعے سے کیا تعلق ہے؟

نازلی:
(فخریہ انداز میں) دیکھا ماموں جان، اس عجیب وغریب بات پر آپ کو بھی تعجب ہوا اور تجسس بھی پیدا ہوا۔

رازداں:
(کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے) لیکن اگر تم صرف مجھے Shock کرنے کے خیال سے یہ سب کرو تو میرے تجسس کو الزام نہیں دے سکتیں۔لیکن شرافت علی نے تو صرف ہمیں Shock کرنے کی نیت سے اپنی ساس کو یہاں نہیں رکھا۔

نازلی:
چلئے آپ کی یہ بات مانے لیتے ہیں، لیکن یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا ماموں جان کہ اس شخص کا رویہ عجیب وغریب ہے۔اپنی ساس کو تو اس نے یہاں رکھ چھوڑا ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ وہ شہر کے دوسرے سرے پر رہتا ہے اور وہ بھی ایک عجیب و غریب عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر۔ کیا آپ نے کبھی اس خوفناک عمارت کو اندر سے دیکھا ہے۔

رازداں:
نہیں...اور تم...؟ کیا تم لوگ اسے دیکھ چکے ہو؟

نازلی:
اندر سے تو خیر ہم نے اس بھوتوں کے اڈے کو نہیں دیکھا لیکن میں اور ممی اور میری سہیلی شیلا اور اس کی ممی باہر سے تو اسے دیکھ آئے ہیں۔

رازداں:
تمھیں وہاں جانے کی ایسی کیا ضرورت تھی؟

نازلی:
ہم کیا شہر کے سبھی لوگ اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔

رازداں:
کیا ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں؟

نازلی:
کام کیوں نہیں؟ لیکن وہ عمارت بھی ایک عجوبہ ہے اور پھر اس کی سب سے اوپر کی منزل میں اس کی بیوی قید ہے اور پھر وہ عجیب وغریب نوکریاں اور گھنٹیاں...

رازداں:
تو اس میں تم لوگوں کو کیا پریشانی ہے؟

فاخرہ بیگم:
حد ہو گئی نعیم میاں! اس کی بیوی وہاں اوپر کی منزل میں اور ساس یہاں ہمارے پڑوس میں، پریشانی نہ سہی حیرت تو لازمی ہے۔

رازداں:
ہوسکتا ہے اس کی ساس خود ہی الگ مکان میں رہنا چاہتی ہو۔

نازلی:
کمال ہے ماموں جان یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس میں شرافت علی ہی کا قصور ہے۔

فاخرہ بیگم:
ٹھیک کہتی ہے بچی، سبھی لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔

رازداں:
ہوسکتا ہے ان کی آپس میں بنتی نہ ہو۔

نازلی:
بھلا یہ کیسے ممکن ہے یعنی کہ ایک بوڑھی ماں اور اس کی اکلوتی لڑکی۔

رازداں:
نہیں میرا مطلب تھا کہ شاید ساس اور داماد کی آپس میں نہ بنتی ہو۔

نازلی:
بالکل غلط۔ وہ ہر روز شام کو اپنی ساس سے ملنے یہاں آتا ہے اور کافی دیر دونوں میں گھٹ گھٹ کر باتیں ہوتی ہیں۔

رازداں:
تو کیا آپ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی ساس کے ساتھ کوئی معاشقہ چلا رہا ہے۔

فاخرہ بیگم:
(ہنسی روک کر) توبہ ہے نعیم، تمہاری باتوں سے تو خدا بچائے۔

نازلی:
(قہقہہ لگا کر) حد ہو گئی ماموں جان۔ یہ ساس یعنی مسز شفقت تو بالکل بڑھیا پھوس ہیں۔

فاخرہ بیگم:
لیکن ذرا سوچو تو نعیم۔ کیا یہ بات عجیب وغریب نہیں کہ وہ کبھی اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ساس سے ملنے نہیں آتا؟

رازداں:
ہوسکتا ہے اس کی بیوی بیمار رہتی ہو اور اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہ ہو۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ مسز شفقت خود ہی کبھی کبھی اپنی بیٹی سے ملنے جاتی ہوں۔

فاخرہ بیگم
وہ بے چاری تو روز ہی جاتی ہے لیکن بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس غریب کو اوپر جانے کی بھی اجازت نہیں۔ بس نیچے کھڑے ہو کر اپنی بیٹی کو دور سے دیکھ لیتی ہے۔

نازلی:
ذرا سوچئے ماموں جان! وہ بے چاری بڑی بی روز وہاں جاتی ہیں اور پھر گراؤنڈ فلور کے اس اندھیرے سے آنگن میں کھڑے ہو کر لٹکی ہوئی رسی کھینچ کر گھنٹی بجاتی ہیں اور پھر ان کی بیٹی بالکونی پر آتی ہے اور یہ بیچاری بڑھیا گردن اٹھا اٹھا کر اپنی بیٹی کو دیکھتی ہے۔ اس کی گردن بھی اکڑ جاتی ہوگی۔

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ بہادر داخل ہوتا ہے۔

بہادر:
بیگم صاحب۔ کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔

فاخرہ بیگم:
کون لوگ ہیں؟

بہادر:
شرما جی اور ان کی مسز ہیں اور ان کے ساتھ ایک بی بی اور ہیں۔

فاخرہ بیگم:
ارے تو انھیں اندر لے کر آ۔ یہاں کھڑا کھڑا میرا منہ کیا تک رہا ہے؟

بہادر باہر جاتا ہے۔ چند لمحے میں اوم پرکاش شرما، مسز سوشیلا شرما اور ان کے ساتھ مسز بیدی داخل ہوتی ہیں۔ سوشیلا شرما ایک ۳۷، ۳۸ سالہ خوش شکل اور اسمارٹ خاتون ہیں۔ مسز شرما کی عمر بھی ۴۵ سال سے زیادہ نہیں، لیکن سر تقریباً گنجا ہو چکا ہے۔ وہ ایک خوش حال طبقے کا ایک عام سا انسان ہے لیکن اس نے اپنے لباس وغیرہ پر خاص توجہ دی ہے۔ اس کا سوٹ قیمتی اور جوتے چرمراتے ہوئے ہیں۔ مسز بیدی ایک عام قسم کی خاتون ہے۔

فاخرہ بیگم:
آیئے آیئے شرما صاحب۔ آؤ سوشیلا۔ آپ لوگوں کو تو میں کئی دن سے یاد کر رہی تھی۔

سوشیلا شرما:
(جس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہے لیکن شوہر کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتی اور یہ بھی کہ وہ ہر بات جاننے کے لئے بے قرار ہے۔) آداب، آداب دیدی۔ ہمیں بھی آپ کو دیکھے بنا کہاں چین آتا ہے۔ معاف کرنا بہن میں اپنی ایک پرانی سہیلی کو بھی لے آئی ہوں۔ یہ ہیں مسز بیدی۔ آپ سے ملنے کو بڑی بے قرار تھیں۔

فاخرہ بیگم:
آیئے، آیئے مسز بیدی۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ہے میری بیٹی نازلی اور یہ ہیں میرے چھوٹے بھائی نعیم رازداں۔ ارے شرما جی آپ بھی بیٹھئے نا۔ آپ تو سب کو جانتے ہی ہیں۔

مسٹر شرما سلام علیک کے بعد ایک صوفہ کرسی پر بیٹھ کر اہتمام سے اپنا پائپ سلگانا شروع کرتے ہیں اور سب لوگ بھی بیٹھتے ہیں۔

سوشیلا شرما:
(فاخرہ بیگم سے) پیاری بہن میں اور مسز بیدی آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئی ہیں کیونکہ آپ سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہتی اور ہم لوگ ہر بات جاننے کے لئے بے قرار ہیں۔

فاخرہ بیگم:
ہر بات، یعنی کس سلسلے میں؟

سوشیلا:
کمال ہے فاخرہ بہن۔ آپ کے شوہر کے سکریٹری کے بارے میں اور کس سلسلے میں۔ آج کل تو گھر گھر اسی کی باتیں ہو رہی ہیں۔

مسز بیدی:
ہاں بہن جی۔ اس گتھی کو تو آپ ہی سلجھا سکتی ہیں۔ شرما جی اور سوشیلا شرما تو آپ کی بڑی تعریف کرتے رہتے ہیں۔

فاخرہ بیگم:
یقین مانئے مسز بیدی میں خود کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ ہم بھی بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اور سب لوگ۔

مسٹر شرما:
(اپنی بیوی سے فخریہ انداز میں) دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اس سے زیادہ ان لوگوں کو بھی کچھ معلوم نہ ہوگا بلکہ میں نے تو ابھی ایک اور بات سنی ہے۔

فاخرہ بیگم:
(بڑے اشتیاق سے) اچھا واقعی؟ بتائیے... بتائیے۔

مسٹر شرما:
یہ کہ شرافت علی کی بیوی اس لئے اپنی ماں سے ملنے نہیں آتی کیونکہ...

نازلی:
(تیزی سے) کیونکہ شرافت علی نے خود اس پر پابندی لگا دی ہے۔

رازداں جو شیلف سے ایک کتاب نکال کر دیکھ رہا ہے، اسٹیج کے سامنے والے حصے میں آتا ہے اور حاضرین سے مخاطب ہوتا ہے۔

رازداں:
(حاضرین سے) سن رہے ہیں آپ لوگ؟ اب یہ سلسلہ چل پڑا ہے تو دیکھئے کب ختم ہوتا ہے اور کس طرح!

مسز بیدی:
(مسٹر شرما سے) یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں۔

سوشیلا:
ہاں یہ کوئی معمولی سی بات نہیں۔ اس میں کوئی گہرا راز ہے۔

مسٹر شرما:
(بڑے متین انداز میں) ہاں راز تو ہے ہی، کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اس غریب کو ہمیشہ تالے میں بند رکھتا ہے۔

فاخرہ بیگم:
کیسے، بند رکھتا ہے اپنی ساس کو؟

مسٹر شرما:
نہیں مسز فخر الحسن، نہیں... اپنی بیوی کو۔

نازلی:
(فخریہ انداز میں) سن رہے ہیں ماموں جان۔ انکل کیا کہہ رہے ہیں اور آپ اس بات کا جواز ڈھونڈ رہے تھے۔ شرافت علی کی طرفداری کر رہے تھے۔

مسٹر شرما:
(حیرت اور کسی قدر ناگواری سے) طرفداری کر رہے تھے؟... اس بدمعاش کی؟

رازداں:
نہیں مسٹر شرما، میں کسی کی طرفداری نہیں کر رہا تھا بلکہ صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے اس قدر شور ہنگامہ کیوں۔ اور اس میں آپ لوگوں کی اس قدر دلچسپی بے سود ہے۔

مسٹر شرما:
اتنی سی بات... آپ اسے اتنی سی بات کہتے ہیں۔

رازداں:
جی ہاں یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور اس سلسلے میں ان خواتین کو اپنی جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسز بیدی:
لیکن بھائی صاحب یہ سب جاننا تو بہت ہی ضروری...

نازلی:
اور ہم اس معاملے کی تہ تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ کیا تم یہ جان سکتی ہو کہ وہ کون ہیں، کس قسم کے لوگ ہیں، کس طرح زندگی گزارتے ہیں اور کیوں؟

سوشیلا شرما:
کیوں نہیں؟ اگر ہم ساری معلومات حاصل کر لیں تو یہ سب باتیں سمجھ سکتے ہیں۔

رازداں:
معاف کیجئے گا مسز شرما۔ اس صورت میں تو آپ کو پہلے ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہئے تھا کیونکہ آپ کے شوہر سے زیادہ معلومات اور کس کی ہوں گی؟

مسٹر شرما:
ہاں... لیکن میں...

سوشیلا شرما:
(بات کاٹتے ہوئے) بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مسٹر رازداں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرے پتی دیو کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ہر بات جانتے ہیں لیکن مجھے تو اب تک ان کے ذریعے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

مسٹر شرما:

وہ تو اس لئے کہ تم میری ہر بات پر شک کرتی ہو۔ میری نظر سے کوئی چیز دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ بلکہ اکثر تو تم اس بات پر اڑ جاتی ہو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سوشیلا:

بالکل۔ بالکل... کیونکہ آپ اکثر... یعنی...

رازداں:

(قہقہہ لگاتے ہوئے) خوب... بہت خوب۔ ٹھہریئے مسز شرما۔ آپ کے شوہر کو جواب میں دوں گا۔ ہاں تو مسٹر شرما، آپ یہ توقع کیسے کرتے ہیں کہ آپ کی بیوی آپ کی ہر بات کو حرف بحرف سچ مان لیں جب کہ آپ ہر چیز کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسی کہ وہ آپ کو نظر آتی ہے؟

سوشیلا:

اور جیسی کہ وہ نہیں ہے۔

رازداں:

نہیں۔ نہیں مسز شرما آپ یہ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ آپ کے شوہر کے لئے تو ہر بات ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ آپ کو بتاتے ہیں۔

مسٹر شرما:

اور جیسی کہ وہ حقیقت میں ہے۔

سوشیلا:

بالکل نہیں۔ لوگوں اور حالات کو سمجھنے میں آپ عام طور پر غلطی کرتے ہیں۔

مسٹر شرما:

میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ ہاں تم اکثر باتوں کو غلط سمجھ بیٹھتی ہو۔

رازداں:

ٹھہریئے مسز شرما اور مسٹر شرما۔ میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ آپ دونوں حالات کو الگ الگ زاویوں سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن غلطی کوئی نہیں کرتا۔

مسٹر شرما:

وہ کیسے؟

رازداں:

آپ ذرا میرے قریب آیئے۔

(شرما بے یقینی سے رازداں کے قریب آتا ہے۔)

رازداں:

اب ذرا آپ مجھے چھو کر دیکھئے۔

شرما کسی قدر ناگواری سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔

رازداں:

اب آپ یہ بتایئے کہ کیا آپ نے مجھے ہی چھوا ہے؟

مسٹر شرما:

(خاصی ناگواری سے) بالکل۔ اس میں کیا شک ہے؟

رازداں:

اچھا تو مسز شرما ذرا آپ ادھر تشریف لایئے۔ نہیں... میں خود آپ کے پاس آتا ہوں۔

رازداں مسز شرما کے قریب آکر فرش پر اس کے سامنے دوزانو بیٹھتا ہے۔

رازداں:

اب اے محترم خاتون، آپ مجھے چھو کر دیکھئے۔

سوشیلا شرما بڑے تکلف سے اپنا ہاتھ اس کے شانے کی طرف بڑھاتی ہے۔ رازداں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بوسہ دیتا ہے۔ سوشیلا شرما جاتی ہے۔

رازداں:

واہ۔ کس قدر ملائم اور خوبصورت ہاتھ ہے۔

مسٹر شرما:

ارے۔ ارے بھئی۔ یہ کیا کر رہے ہو؟

رازداں:

(سوشیلا سے) اچھا تو اے عزیز خاتون اب یہ بتایئے کہ جس شخص کو آپ نے چھوا وہ میں ہی تھا؟

سوشیلا:

(شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ) ظاہر ہے، وہ آپ ہی تھے اور کون تھا؟

رازداں:

آپ کو بالکل پکا یقین ہے؟

سوشیلا:

بالکل۔ میں کسی بات میں غلطی نہیں کرتی۔

رازداں:

پھر بھی آپ اپنے شوہر سے یا ان لوگوں سے یہ بات نہ کہیں تو بہتر ہے۔

سوشیلا شرما:

کیوں نہ کہوں؟

رازداں:

کیونکہ ان لوگوں نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا اور نہ یہ لوگ مجھے بالکل اس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

سوشیلا شرما:

تو کیا آپ ہر ایک کے لئے ایک مختلف شخصیت ہیں؟

رازداں:

ظاہر ہے، اور خود آپ بھی۔

سوشیلا شرما:

آپ کی یہ بات تو میں مان نہیں سکتی۔ میں تو ہر ایک کے لئے ایک ہی دکھتی ہوں۔

رازداں:

اپنے لئے تو میں بھی ایک ہی شخصیت ہوں، لیکن دوسرے لوگ تو مجھے اپنے اپنے نقطۂ نظر ہی سے دیکھتے ہیں اور انھیں تو میں مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ مجھے ایسے ہی دیکھیں جیسے کہ میں خود کو دیکھتا ہوں۔

مسز شرما:

آخر ان گول مول باتوں سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟

رازداں:

یہی کہ آپ سب لوگ دوسروں کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھ سکتے ہیں لیکن انھیں پوری طرح جان نہیں سکتے۔

مسز شرما:

تو کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم کبھی حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے؟

مسز بیدی:

کمال ہے بھائی صاحب آپ تو دنیا کا نظام ہی بگاڑے دے رہے ہیں۔ کیا ہم اپنی آنکھوں پر بھی وشواس نہیں کرسکتے؟

رازداں:

نہیں محترمہ، آپ کرسکتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کے نقطۂ نظر کا بھی احترام کریں خواہ وہ آپ کے تصور کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔

سوشیلا شرما:

یہ کیسے ممکن ہے؟

مسز بیدی:

آپ کی باتیں بھائی صاحب ہماری سمجھ سے تو باہر ہیں۔

رازداں:

معاف کیجئے گا، بس اب میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ لوگ شوق سے شرافت علی اور مسز شرافت علی کی باتیں کیجئے، میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔

فاخرہ بیگم:

شکر ہے۔ میرے خیال میں تم اب تھوڑی دیر کے لئے اسٹڈی میں چلے جاؤ تاکہ ہم لوگ اطمینان سے باتیں کرلیں۔

رازداں:

نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کی باتوں میں کافی لطف آرہا ہے اس لئے اگر آپ کی اجازت ہو تو چپ چاپ یہیں بیٹھا رہوں۔

سوشیلا شرما:

ہاں تو فاخرہ بہن کیا یہ ٹھیک ہے کہ یہ شخص شرافت علی آپ کے شوہر کا ماتحت ہے؟

فاخرہ بیگم:

ہاں لیکن بس دفتر کی حد تک کیونکہ اپنی گلی میں تو تم جانتی ہو کہ کتا بھی شیر ہوتا ہے۔

سوشیلا شرما:

میں نے سنا ہے آپ لوگ خود اس کی ساس سے ملنے گئے؟

فاخرہ بیگم:

ہاں، ہم لوگ دوبارہ وہاں جاچکے۔

مسز بیدی:

(بڑے اشتیاق سے) اچھا واقعی؟ تو پھر کیا ہوا؟ آپ کی ان لوگوں سے بات چیت ہوئی؟

فاخرہ بیگم:

بالکل نہیں۔ کیونکہ پہلی بار تو انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ کوئی گھر پر نہیں ہے اور دوسری بار...

نازلی:

وہ خود دروازے پر آیا۔

سوشیلا شرما:

واقعی؟... اف خدا، اس کا وہ چہرہ (جھرجھری لیتی ہے) شہر میں سنسنی پھیلانے کے لئے تو اس کا چہرہ ہی کافی ہے اور پھر اس کا وہ سیاہ لباس، میں نے سنا ہے وہ تینوں ہمیشہ سیاہ لباس ہی پہنتے ہیں۔

مسز شرما:

بیوی کے بارے میں تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ اس کو تو آج تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ (فاخرہ بیگم سے) میں نے سنا ہے وہ لوگ بہار کے اس ضلع سے آئے ہیں جو پچھلے سال زلزلے میں بالکل تباہ ہوگیا تھا۔

فاخرہ بیگم:

جی ہاں... فخرل صاحب نے مجھے بتایا تھا۔

نازلی:

ہاں پاپا کہہ رہے تھے کہ اس زلزلے میں ان کا گھر ڈھے گیا تھا اور ان کے بہت سے رشتہ دار بھی اسی زلزلے کا شکار ہوگئے تھے۔

مسز بیدی:

(جسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں) ہاں... ہاں۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ جب اس نے دروازہ کھولا تو پھر کیا ہوا؟

فاخرہ بیگم:

ایک دم تو اس کا چہرہ دیکھ کر میں سناٹے میں آگئی اور آواز میرے گلے میں پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے میں اتنا کہہ پائی کہ ہم آپ کی ساس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ ہمارا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔

نازلی:

نہیں ممی، اس نے جھک کر شکریہ تو ادا کیا تھا۔

فاخرہ بیگم:

نہیں بی بی، وہ قاعدے سے جھکا بھی کہاں؟ بس ذرا سی منڈیا ہلادی تھی۔

نازلی:

لیکن آنٹی ان چند لمحوں میں ہی اس کی آنکھیں نہ معلوم کیا کیا کہہ گئیں (جھرجھری لیتی ہے) اف خدایا... اس کی وہ آنکھیں ... میں نے کسی انسان کی ایسی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ کسی Abnormal جانور کی آنکھیں ہوں۔

مسز بیدی:

(جس کا اشتیاق بڑھتا ہی جا رہا ہے) ہاں تو بتائیے نہ بہن اس نے کیا کہا؟

فاخرہ بیگم:

چند لمحے تو وہ خود بھی ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر منمنا کر بس اتنا کہا کہ میری ساس بیمار ہیں اور انھوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور یہ کہہ کر پھر بت بن کر کھڑا ہو گیا، گویا ہمارے جانے کا انتظار کر رہا ہو۔

نازلی:

مجھے تو بڑا غصہ آ رہا تھا اور امی کی تو اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی؟

مسز شرما:

جنگلی جانور! مجھے تو پورا یقین ہے کہ سارا قصور اسی کا ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ اپنی ساس کو بھی تالے میں بند رکھتا ہوگا۔

سوشیلا شرما:

مجھے یقین نہیں آتا دیدی کہ آپ کے ساتھ کوئی اس قدر بدتمیزی کر سکتا ہے۔ بھلا کہاں آپ اور کہاں وہ۔

فاخرہ بیگم:

بالکل ٹھیک کہتی ہو سوشیلا۔ اس بار تو میرے شوہر کو بھی بہت غصہ آ گیا اور انھوں نے قسم کھائی کہ اس بے ادبی کے لئے اسے وہ مناسب سزا دلوا کر رہیں گے اور اس وقت وہ خود کار لے کر کلکٹر صاحب کے یہاں گئے ہیں۔

فخرالحسن داخل ہوتا ہے۔ وہ معمولی شکل و صورت کا ایک پچاس سالہ انسان ہے لیکن اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہر وقت رہتا ہے کیونکہ وہ ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہے۔

فخرالحسن:

اوہو شرما صاحب ہیں! کہو کیا حال چال ہے؟ (اس سے ہاتھ ملاتا ہے۔) آداب عرض ہے مسز شرما۔ زہے نصیب۔

سوشیلا شرما:

آداب عرض بھائی صاحب۔

فاخرہ بیگم:

(اپنے شوہر سے) اور یہ ہیں مسز بیدی (مسز بیدی سے) اور آپ میرے شوہر ہیں۔ (دونوں ایک دوسرے کو سرسری انداز سے سلام کرتے ہیں۔)

فخرالحسن:

آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ (بیوی اور بیٹی سے) تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مسز شفقت یعنی شرافت علی کی ساس بہت جلد تم لوگوں سے معافی مانگنے یہاں آنے والی ہے۔

سوشیلا شرما:

(خوشی سے بے تاب ہو کر) ارے واقعی؟ وہ یہاں آ رہی ہے؟ یہ تو آپ نے بڑی اچھی بات سنائی بھائی صاحب۔

فخرالحسن:

جی ہاں مسز شرما، کچھ نہ کچھ تو مجھے کرنا ہی تھا۔ یہ میرے خاندان کی عزت کا سوال تھا۔

مسز شرما:

آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم ابھی یہی باتیں کر رہے تھے اور پھر بھی اچھا ہوا کہ...

فخرالحسن:

...کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے کلکٹر صاحب کو پوری روداد سنا دی۔

مسز شرما:

زندہ باد فخر بھائی۔ یہ تو آپ نے کمال کر دیا!

فاخرہ بیگم:

لیکن آپ نے انھیں یہ تو بتایا نہ ہوگا کہ وہ ان دونوں کو ہمیشہ تالے کنجی میں بند رکھتا ہے؟

نازلی:

نہیں ممی ایسا تو نہیں ہے، بڑی بی تو روز باہر جاتی ہیں۔

سوشیلا شرما:

لیکن اس کی بیوی کے سلسلے میں تو شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فخرالحسن:

بالکل۔ اور یہ بات بھی میں نے بڑی ہوشیاری سے کلکٹر صاحب کے گوش گذار کر دی اور اس بات کا ان پر گہرا اثر بھی ہوا۔

مسز شرما:

کیا انھیں پہلے سے کچھ معلوم نہیں تھا؟

فخرالحسن:

نہیں، افواہیں تو وہ کئی دن سے سن رہے تھے اور اس سلسلے میں وہ فکر مند بھی تھے، اس لئے انھوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا کہ حقیقت کو بے نقاب کرنے یعنی اس راز کو فاش کرنے کا یہ مناسب موقع ہے۔

رازداں:

(قہقہہ لگاتے ہوئے) ہاہا... ہا۔ بہت خوب۔ بہت خوب!

فخرالحسن:

کیوں بھئی رازداں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

سوشیلا شرما:

کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ہم کسی حالت میں بھی حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

بہادر داخل ہوتا ہے۔

بہادر:

جناب ایک بوڑھی سی بی بی باہر کھڑی ہیں۔ بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اپنا نام مسز شفقت بتلاتی ہیں۔

فخرالحسن:

ہاں۔ ہاں۔ انھیں اندر لے آؤ (رازداں سے) اب دیکھتے جاؤ میاں رازداں کہ حقیقت کے چہرے سے پردے کس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔

بہادر مسز شفقت کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ سیاہ ساری میں ملبوس ہیں اور پلو سے سر ڈھکا ہوا ہے۔ ان کے چہرے سے گہرے رنج و غم کا اظہار ہوتا ہے لیکن لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اس تاثر کو کم کر رہی ہے۔ مسز شفقت دبلی پتلی، مختصری سال خوردہ خاتون ہیں۔
سب لوگ غیر ارادی طور پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

فاخرہ بیگم:
آیئے، آیئے مسز شفقت۔ ہم لوگ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ (سب سے تعارف کراتی ہے) یہ ہیں میرے شوہر اور میری بیٹی نازلی اور میرے بھائی رازداں اور یہ ہیں میری عزیز دوست سوشیلا اور ان کے شوہر مسٹر شرما۔

مسز شفقت:
آداب عرض ہے۔ آداب عرض ہے۔ آپ لوگوں سے مل کر میری بڑی عزت افزائی ہوئی۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی معافی مانگنی ہے کہ اس سے پہلے ملنے کے لئے حاضر نہ ہو سکی۔ آپ نے میرے غریب خانے پر آ کر مجھ پر بڑا کرم کیا لیکن دراصل یہ میرا فرض تھا کہ پہلے میں...

فاخرہ بیگم:
چلئے چھوڑیئے اس بات کو مسز شفقت۔ پڑوسیوں میں اتنے تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں تو صرف اس لئے آپ کے گھر گئی تھی کہ یہاں آپ نئی ہیں۔ شاید آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور پھر ویسے بھی...

مسز شفقت:
شکریہ۔ شکریہ۔ اس عنایت کے لئے میں از حد ممنون ہوں۔

سوشیلا شرما:
تو کیا اس شہر میں آپ بالکل اکیلی ہیں؟

مسز شفقت:
نہیں نہیں۔ میری شادی شدہ بیٹی صبا پنہاں اور اس کا شوہر بھی اسی شہر میں رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی ابھی حال ہی میں یہاں آئے ہیں۔

مسٹر شرما:
اور آپ کے داماد شرافت علی غالباً کلکٹریٹ میں ملازم ہیں؟

مسز شفقت:
جی ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ جناب فخر الحسن صاحب مجھے اور میرے داماد کو معاف فرمائیں گے۔

فخر الحسن:
سچ تو یہ ہے مسز شفقت کہ یہ بات مجھے ناگوار تو بہت گذری تھی۔

مسز شفقت:
جی ہاں یہ بالکل قدرتی بات ہے، لیکن یقین مانئے جناب ہماری نیت خراب نہ تھی۔ لیکن ہم لوگ اس ہولناک حادثے سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ آج تک اس کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ اس لئے اگر انجانے میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو...

فاخرہ بیگم:
ہاں اس بات کا تو ہمیں بھی بڑا افسوس ہے۔ بڑا المناک حادثہ تھا۔

سوشیلا شرما:
کیا آپ کے کچھ رشتہ دار بھی اس ٹریجڈی کا شکار ہوئے؟

مسز شفقت:
جی ہاں مسز شرما۔ سبھی اس المیے کا شکار ہو گئے کوئی بھی تو نہیں بچا۔ میری چھوٹی بہن اور اس کی کم عمر کنواری لڑکی اس زلزلے کی نذر ہو گئے۔ اور میرے بدنصیب داماد کا تو پورا خاندان ہی اجڑ گیا۔ دو بہنیں اور ان کے شوہر اور چھوٹے بچے سبھی داغ مفارقت دے گئے۔

سوشیلا شرما:
ہائے۔ ہائے۔ یہ تو بڑا انیائے ہو گیا۔

مسز شفقت:
جی ہاں ہم لوگوں پر تو مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایسے زخم تو زندگی بھر نہیں بھرتے۔ دماغ بالکل سن ہو گیا ہے۔

فاخرہ بیگم:
زلزلہ کیا تھا مصیبتوں کا ایک سیلاب تھا۔

سوشیلا شرما:
ایسے میں انسان اگر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تو کیا تعجب ہے۔

مسز شفقت:
جی ہاں اس حال میں انسان اکثر اپنے فرائض سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی میں آپ سب لوگوں سے معافی چاہتی ہوں۔

فخر الحسن:
نہیں۔ نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں۔

فاخرہ بیگم:
بلکہ ہم تو آپ کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے آپ کے ہاں گئے تھے۔

مسز شفقت:
یہ آپ کی عنایت تھی۔

مسٹر شرما:
میں نے سنا ہے کہ پورا قصبہ ہی اس تباہی کی لپیٹ میں آ گیا۔

مسز شفقت:
جی ہاں اس قصبے کا تو نام و نشان ہی مٹ گیا۔ اب وہاں ملبے کے ڈھیروں کے سوا کچھ نہیں۔

مسز بیدی:
(جسے ان باتوں میں دلچسپی نہیں، صرف تجسس ہے) پھر بھی معاف کیجئے گا بہن جی۔ یہ بات کچھ عجیب سی ہے کہ اب بھی آپ اور آپ کی بیٹی الگ الگ رہتی ہیں۔ ایسی مصیبت کے وقت تو غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں اور کہاں یہ کہ خود آپ کی سگی بیٹی۔ میرا مطلب ہے... یعنی کہ...

مسز شفقت:

شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ان حالات میں میرا اور میری بیٹی کا الگ الگ رہنا غیر فطری ہے؟

سوشیلا:

جی ہاں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے۔

مسز شفقت:

(گہری دردمندی سے) جی ہاں، ویسے تو آپ ٹھیک کہتی ہیں (کچھ سوچ کر) لیکن شادی کے بعد تو بیٹی ہو یا بیٹا اپنے ہی انداز سے زندگی گذارنا پسند کرتے ہیں۔

رازداں:

مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ نئی زندگی اور نئے رشتے یکسوئی ہی میں پروان چڑھ سکتے ہیں۔

سوشیلا شرما:

لیکن معاف کیجئے گا رازداں صاحب اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ایک جوان عورت اپنی سگی ماں ہی سے منھ موڑ لے۔

رازداں:

لیکن مسز شرما آپ خود دیکھ سکتی ہیں کہ یہ محترمہ تو اپنی مرضی ہی سے اپنی لڑکی سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔

مسز شفقت:

(احساس تشکر کے ساتھ) جی ہاں آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔

مسز سیدی:

(بھولی بن کر) لیکن آپ کی بیٹی آپ کے پاس آتی جاتی تو رہتی ہوگی؟

مسز شفقت:

(پریشانی کے عالم میں) جی ہاں ہم لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔

مسز شرما:

لیکن ہم نے سنا ہے کہ آپ کی بیٹی تو گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ کم سے کم اس شہر میں تو کسی نے اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔

مسز سیدی:

(مکاری سے) شاید بچوں اور گھر کے کاموں میں فرصت نہ ملتی ہوگی۔

مسز شفقت:

جی نہیں بچے تو ان کے ہاں کوئی نہیں۔ اور اس کی امید بھی نہیں۔ شاید خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ان کی شادی کو سات سال ہو چکے ہیں اور گھر کے کام تو خیر رہتے ہی ہیں۔ لیکن... (کچھ سوچ کر) ہم قصباتی عورتوں کو گھر سے نکلنے کی زیادہ عادت بھی نہیں ہوتی۔

فاخرہ بیگم:

(معنی خیز انداز میں) آپ تو کبھی کبھار وہاں جاتی ہوں گی؟

مسز شرما:

لیکن اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنا۔ کیا یہ آپ کے بس کی بات ہے؟

مسز شفقت:

(اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے لیکن وہ بڑی مشکل سے مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے) جی نہیں مسز شرما۔ میرے لئے تو اس عمر میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن میری لڑکی خود ہی بالکونی پر آ جاتی ہے اور میں نیچے کھڑے کھڑے ہی اس سے بات کر لیتی ہوں... اس کی خیریت معلوم کر لیتی ہوں۔

سوشیلا شرما:

اتنی دور سے! یعنی کبھی اسے گلے لگانے کا موقع بھی نہیں ملتا؟

نازلی:

(اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے) بھئی میں تو اپنی امی سے اتنی دور سے کبھی بات نہ کروں۔ جب تک امی گلے لگا کر مجھے پیار نہ کرلیں مجھے تو چین نہیں آتا۔

مسز شفقت:

بی بی تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایک بوڑھی ماں کو بھی اپنی بیٹی کو گلے لگائے بغیر چین کہاں آتا ہے۔ چاہے اس کے لئے کتنے ہی زینے چڑھنے پڑیں لیکن کیا کیا جائے۔ کبھی کبھی حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔

سوشیلا شرما:

(بڑے فخر سے) دیکھا میں نہ کہتی تھی!

فاخرہ بیگم:

(رازداں سے) سن رہے ہو فہیم میاں؟ مسز شفقت کیا کہہ رہی ہیں؟

مسز شرما:

یقیناً آپ کے داماد کو اس پر اعتراض ہوگا۔

مسز شفقت:

(پریشانی سے) نہیں۔ نہیں میرا داماد تو میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ اور اپنی بیوی سے بھی بے حد محبت کرتا ہے۔ وہ مثالی شوہر ہے، بہت نیک آدمی ہے۔

سوشیلا شرما:

(چونک کر) تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

مسز شفقت:

(رک رک کر) ہم دونوں، یعنی میں اور میری بیٹی خود ہی ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں تاکہ میرے داماد کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے...

مسز شرما:

اس میں کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

فخر الحسن:

معاف کیجئے گا۔ اس قسم کی باتوں سے تو لوگوں کے دل میں شک پیدا ہو رہا ہے۔

مسز شفقت:

نہیں نہیں۔ آپ میرے داماد پر شک نہ کریں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہم دونوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔

سوشیلا شرما:

میں تو یہی کہوں گی کہ یہ بڑا ظلم ہے۔

مسز شفقت:
نہیں۔ نہیں۔ وہ ظالم نہیں ہے۔
فاخرہ بیگم:
تو پھر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ آپ تو اس بات کو ایک معما بنائے دے رہی ہیں۔
مسٹر شرما: اگر ظلم نہیں تو پھر...شاید یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔
مسز شفقت:
نہیں بیماری تو نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسے اپنی بیوی سے ایسی والہانہ محبت ہے کہ وہ اس پر کسی کا سایہ پڑنا پسند نہیں کرتا۔
سوشیلا شرما:
اسی لئے اس بیچاری کو اوپر کے فلیٹ میں قید رکھتا ہے!
نازلی:
معاف کیجئے گا آنٹی میں تو اسے ظلم ہی کہوں گی۔ اگر آپ کی بیٹی کی جگہ میں ہوتی تو کبھی یہ ظلم برداشت نہ کرتی۔ کیا آپ کا اپنی بیٹی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا؟
مسز شفقت:
نہیں بی بی۔ ہم ایک دوسرے سے بات تو کر لیتے ہیں۔ وہ اوپر سے ایک ٹوکری لٹکا دیتی ہے۔ اور میں اس میں ایک محبت بھرا خط رکھ دیتی ہوں۔ پھر وہ ایک پرچے پر جواب لکھ کر دوبارہ ٹوکری نیچے لٹکا دیتی ہے۔ اس کے سب پرچے میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔
فاخرہ بیگم:
خیر اگر آپ لوگ اسی میں خوش ہیں۔ تو پھر یہی ٹھیک ہے...
مسز شفقت:
(کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا آداب عرض ہے۔ اب میں اجازت چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔
فاخرہ بیگم:
ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔

مسز شفقت سب کو سلام علیک کر کے رخصت ہوتی ہے۔
فاخرہ بیگم اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی ہے اور پھر چند لمحے میں واپس آتی ہے۔

مسٹر شرما:
اس فضول گفتگو کا سر پیر کیا تھا۔ آپ کچھ سمجھے؟
فخرالحسن:
بالکل نہیں۔ اس میں یقیناً کوئی گہرا راز ہے جو بڑی بی چھپا رہی ہیں۔
سوشیلا شرما:
مجھے تو بڑا ترس آ رہا ہے۔ پتہ نہیں بے چاری کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔
نازلی:
اور اس غریب لڑکی پر بھی کیا بیت رہی ہوگی۔
مسز بیدی:
(آنسو پونچھ کر) ہائے ہائے بے چاری۔ کس مشکل سے آنسو روکے ہوئے تھی۔
فاخرہ بیگم:
اور سنا آپ لوگوں سے کیا کہہ رہی تھیں کہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے تو وہ دس زینے بھی چڑھ سکتی ہے لیکن حالات سے مجبور ہیں اور یہ حالات! یہی تو سب سے بڑا راز ہے۔
رازداں:
میرے خیال میں آپ اس راز کو راز ہی رہنے دیں اور کوئی اور بات کریں۔ یا پھر نازلی سے کوئی غزل سنیں۔
فاخرہ بیگم:
توبہ ہے فہیم۔ تمھیں اس وقت بھی گانے بجانے کی پڑی ہوئی ہے۔ ذرا سوچو تو ایک بچاری بوڑھی بیوہ ماں... اور وہ بھی...

بہادر داخل ہوتا ہے۔

بہادر:
(فخرالحسن سے) صاحب جی شرافت علی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ باہر کھڑے ہوئے ہیں۔
فخرالحسن:
ارے! وہ؟ (سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ان کا تجسس اب اپنے عروج پر ہے۔)
فخرالحسن:
(بہادر سے) ٹھیک ہے۔ انھیں لائبریری میں بٹھاؤ۔
سوشیلا شرما:
نہیں بھائی صاحب یہیں بلا لیجئے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔
فاخرہ بیگم:
ہاں فخرل صاحب، اسے یہیں بلوائیے۔ ذرا میں بھی تو سنوں کیا کہتا ہے وہ ظالم شخص۔
فخرالحسن:
ٹھیک ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔ آپ لوگ بالکل اطمینان سے بیٹھی رہیں اور کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کریں۔ جاؤ بہادر انھیں یہیں لے آؤ۔

بہادر جاتا ہے اور بہت جلد شرافت علی کے ساتھ واپس آتا ہے۔
شرافت علی ایک دبلا پتلا معمولی قد و قامت کا انسان ہے۔ اس کے چہرے اور حرکات و سکنات سے بے چینی اور پریشانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سیاہ پینٹ اور قمیص میں ملبوس ہے۔

شرافت علی:
آداب عرض ہے۔ (دوسروں سے) آداب عرض ہے۔ معاف کیجئے میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس پانچ یا دس منٹ...
فخرالحسن:
ہاں ہاں، کہو۔ کیا بات ہے؟ اگر تمھیں ان لوگوں کے سامنے کہنے میں اعتراض نہ ہو۔

شرافت علی:
جی نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ اچھا ہی ہے کہ یہ لوگ بھی سن لیں۔
فخرالحسن:
ٹھیک ہے۔ کیا تم اپنی خوش دامن کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟
شرافت علی:
سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی معافی مانگنی ہے کہ وہ آج سے پہلے آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنے نہ آئیں۔ وہ تو آنا چاہتی تھیں لیکن میں نے ہی انھیں آنے نہ دیا۔
فخرالحسن:
(ذرا سختی سے) لیکن کیوں؟
شرافت علی:
کچھ دیر پہلے جب وہ یہاں آئی تھیں تو انھوں نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میں ان کی بیٹی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔
فخرالحسن: نہیں۔ انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی بلکہ وہ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ یہ خود ان کا اور ان کی بیٹی کا فیصلہ ہے کہ وہ اس طرح ملیں۔
نازلی:
جیسے کہ ایک ماں بیٹی کو ملنا چاہیے۔
شرافت علی:
کون بیٹی...؟ کس کی بیٹی...؟
فخرالحسن:
ان کی بیٹی... تمھاری بیوی...
شرافت علی:
جناب والا۔ ان کی بیٹی تو مر چکی ہے۔
سب لوگ:
(حیرت سے) مر چکی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔
شرافت علی:
جی ہاں ان کی بیٹی کے انتقال کو چار سال ہو چکے ہیں۔
فخرالحسن:
تو پھر وہ خاتون کون ہے جو تمھارے ساتھ...؟
شرافت علی:
وہ میری دوسری بیوی اسرار فاطمہ ہے۔ دو سال پہلے میں نے ان سے شادی کی۔
مسٹر شرما:
لیکن تمھاری ساس تو کہتی ہیں کہ وہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔
شرافت علی:
جی ہاں میں جانتا ہوں اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری ساس پاگل ہیں۔
مسز بیدی، مسز شرما:
(ایک ساتھ) پاگل! ہرگز نہیں۔

فاخرہ بیگم:
ان کی باتوں سے تو یہ نہیں لگتا کہ وہ پاگل ہیں، بلکہ وہ مجھے تو بڑی نیک بی بی معلوم ہوئیں۔
شرافت علی:
جی ہاں۔ وہ بہت نیک خاتون ہیں۔ ان کا دل محبت کا ساگر ہے، وہ ہر کام بڑے قاعدے سے کرتی ہیں۔ خوش اخلاق بھی ہیں لیکن ان کا یہ خیال ہے کہ ان کی بیٹی زندہ ہے، بس یہی ایک قسم کا پاگل پن ہے۔
فخرالحسن:
لیکن یہ سب کیسے ہوا؟
فاخرہ بیگم:
لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟
شرافت علی:
جناب یہ ایک طویل اور المناک کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد وہ بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ ساتھ ہی معلوم نہیں کیسے ان کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ ان کی بیٹی مری نہیں بلکہ ہم لوگوں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ وہ دن بھر گم سی بیٹھی رہتیں۔ ان کی دیکھ بھال میں ہی کرتا تھا لیکن جب کسی طرح افاقہ نہیں ہوا تو میں نے انھیں نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا اور اس کے کچھ عرصے بعد میں نے اسرار فاطمہ سے شادی کر لی۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی انھوں نے نرسنگ ہوم کی کھڑکی سے مجھے اپنی دوسری بیوی کے ساتھ آتے جاتے دیکھ لیا۔ بس اسی وقت ان کے دماغ میں یہ خیال کوندا کہ یہی ان کی گمشدہ لڑکی صبا پنہاں ہے اور ان کے دل میں محبت کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ ایک اعتبار سے تو یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ وہ رفتہ رفتہ صحتمند ہونے لگیں۔ وہ گہرے رنج وغم کی دلدل سے نکل کر زندگی کی کھلی فضا میں واپس آئیں اور ہر چیز میں دلچسپی لینے لگیں اور ایک بار پھر مسرت سے ہمکنار ہوئیں۔ لیکن جب میں نے ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسرار فاطمہ میری دوسری بیوی ہے، ان کی بیٹی نہیں، تو انھیں کسی طرح یقین نہ آیا اور وہ یہی سمجھتی رہیں کہ میں اپنی والہانہ محبت کی وجہ سے ان کی بیٹی کو ان سے دور رکھتا ہوں اور اس طرح انھوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا اور مطمئن ہو گئیں۔
فاخرہ بیگم:
ہاں، یہ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ خوش اور مطمئن ہیں۔
شرافت علی:
جی ہاں۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہیں۔ لیکن میرے لئے تو یہ ایک اچھا خاصا مسئلہ بن گیا ہے۔ مجھے دو گھروں کا خرچ اٹھانا پڑ رہا ہے کیونکہ ان کی اس ذہنی کیفیت میں میں انھیں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ ویسے میری بیوی بہت نیک اور سمجھدار عورت ہے اور میرے ساتھ پورا تعاون کرتی ہے۔ جب یہ بزرگ خاتون اسے دیکھنے کے لئے ہمارے ہاں آتی ہیں تو وہ بالکونی پر آکر ان سے بات کرتی ہے۔ ان کے پرچوں کا جواب لکھ کر ٹوکری نیچے لٹکا دیتی ہے۔ لیکن آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع میں اس سے نہیں کر سکتا۔ اور اس خوف سے کہ کہیں یہ

گھر کے اندر آ کر اس پر محبت کی بارش نہ کر دیں، اسے میں گھر میں بند رکھتا ہوں۔ اور اسی خوف سے وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی کہ کہیں ان سے آمنا سامنا نہ ہو جائے اور اس طرح وہ بے چاری اپنے ہی گھر میں قید ہے۔

فاخرہ بیگم:

یہ تو ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آمنا سامنا ہونا بالکل مناسب نہیں۔

سوشیلا شرما:

(اپنے شوہر سے) دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ ان کی بیوی اپنی مرضی سے ہی گھر کے اندر رہتی ہے۔

شرافت علی:

(فخر الحسن سے) تو جناب بس یہی وجہ تھی کہ میں نے یہ کوشش کی کہ میری ساس کسی سے نہ ملیں۔

فخر الحسن:

ہاں اس صورت میں تو یہی مناسب تھا۔

شرافت علی:

(اٹھتے ہوئے) جناب عالی اب میں اجازت چاہتا ہوں اور مجھے سخت افسوس ہے کہ میں نے آپ کا اتنا وقت لیا اور یہ افسوسناک واقعہ سنا کر آپ کو پریشان کیا۔

شرافت علی سب کو سلام کر کے رخصت ہوتا ہے۔

فاخرہ بیگم:

اچھا تو یہ بات ہے! بیچاری بڑی بی پاگل ہو گئی ہیں۔

مسز بیدی:

ہائے ہائے۔ بے چاری۔

نازلی:

اف خدا۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مسٹر شرما:

خیر آپ کچھ بھی کہیں۔ مجھے تو شرافت علی کی بات پر پورا یقین نہیں ہے۔

فخر الحسن:

بھئی مجھے تو مسز شفقت کی باتیں پہلے ہی بڑی عجیب لگی تھیں۔

رازداں:

تو کیا آپ کو پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا؟

فخر الحسن:

اندازہ تو خیر نہیں تھا۔ کچھ شک ضرور تھا۔

مسٹر شرما:

لیکن وہ تو اپنے داماد کی بڑی طرفداری کر رہی تھیں۔

فخر الحسن:

ہاں لیکن اس طرفداری میں بھی پاگل پن کی ایک جھلک تھی۔

بہادر داخل ہوتا ہے۔ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا ہے۔

بہادر:

معاف کیجئے بیگم صاحب۔ وہ بوڑھی سی بی بی پھر آئی ہیں۔ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں۔

فاخرہ بیگم:

ہائے اللہ کون؟ مسز شفقت؟.. یہ بڑی بی پھر کیوں آن ٹپکیں؟ ارے بھئی... میں کیا کروں؟

سوشیلا شرما:

ہائے ڈیڈی اب کیا ہو گا...؟ یہ پاگل عورت تو آپ کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

مسز بیدی:

پھر بھی، بہن جی انھیں بلا ہی لیجئے۔ ذرا سنیں تو اب وہ کیا کہتی ہیں۔

مسٹر شرما:

ویسے سننا تو میں بھی چاہوں گا کیونکہ مجھے تو ان کے پاگل ہونے میں بھی شک ہے۔

نازلی:

ہائے ممی انھیں بلوا لیجئے۔ بیچاری بڑی سیدھی سادی نیک بیوی ہیں کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟

فخر الحسن:

میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس وقت ان کی بات سننا بہت ضروری ہے... جاؤ بہادر، انھیں بلا لاؤ۔

بہادر جاتا ہے۔

فاخرہ بیگم:

بھئی مجھے تو بڑی وحشت ہو رہی ہے۔ اس قضیے کو اب آپ لوگ سنبھالئے۔

مسز شفقت داخل ہوتی ہیں۔ وہ بدستور مسکرا رہی ہیں لیکن ان کے چہرے سے گہری اداسی عیاں ہے۔ سب لوگ انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

مسز شفقت:

معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پھر زحمت دی... آپ سب لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا میرے داماد نے آپ سے کہا کہ میں پاگل ہوں؟

فاخرہ بیگم:

نہیں نہیں، مسز شفقت۔ ایسی تو کوئی بات نہیں!

فخر الحسن:

آپ بیٹھئے۔ شرافت علی تو یہاں دفتر کے کام سے آئے تھے۔

مسز شفقت:

آپ کیوں بلا وجہ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟ ویسے اس نے بات تو سکون سے کی؟ زیادہ پریشان تو نہیں تھا؟

فخر الحسن:

جی ہاں... بالکل سکون سے۔ معمولی سی بات تھی۔

مسز شفقت:

معمولی بات تو نہیں تھی۔ اس نے تو آپ کو یہ بتایا ہو گا کہ میری بیٹی خدانخواستہ مر چکی

ہے اور میں اس کی دوسری بیوی کو اپنی بیٹی سمجھتی ہوں کیوں کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔

فخرالحسن:

نہیں۔نہیں۔میرا مطلب ہے...

مسز شرما:

سچ تو یہ ہے کہ مسز شفقت کہ آپ کے داماد نے ہم سے کچھ اسی قسم کی بات کی تھی۔

مسز شفقت:

میرا داماد ایک بہت نیک اور شریف آدمی ہے اور وہ محنتی اور ایماندار بھی ہے۔ (فخرالحسن سے) امید ہے کہ آپ اس کے کام سے مطمئن ہوں گے۔لیکن افسوس کہ ہم لوگ ایک بدنصیبی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ہم نے اس کا سامنا کرنے کا ایک راستہ ضرور نکال لیا ہے لیکن یہ کمزور عمارت کسی وقت بھی ٹوٹ کر بکھر سکتی ہے۔

فخرالحسن:

کمزور عمارت...؟ اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟

مسز شفقت:

کیا آپ اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ میں پاگل ہوں اور شرافت علی کی بیوی میری اپنی بچی نہیں ہے؟ لیکن اس کے لئے شاید ان باتوں پر یقین کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ... (کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہیں۔)

فخرالحسن:

تو کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کا داماد خود پاگل ہے؟

مسز شفقت:

نہیں۔نہیں۔میں یہ تو نہیں کہوں گی کیونکہ وہ ہر اعتبار سے بالکل نارمل ہے۔اسے اپنے فرائض کا پورا احساس ہے۔وہ ایک اچھا شوہر بھی ہے لیکن یہ بے بنیاد خیال اس کے دماغ میں جم گیا ہے۔

فخرالحسن:

تو کیا یہ سچ نہیں کہ چار سال پہلے آپ کی بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے؟

مسز شفقت:

نہیں۔نہیں۔خدا نہ کرے...ایسا نہ کہئے!

فخرالحسن:

اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ شرافت علی پاگل ہے۔

مسز شرما:

مجھے تو پہلے بھی شک تھا۔صرف باتوں ہی سے نہیں بلکہ شکل سے بھی وہ پاگل معلوم ہوتا ہے۔

مسز شفقت:

نہیں۔نہیں...! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔

فخرالحسن:

تو پھر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں...؟ صاف صاف بیان کیجئے۔

فاخرہ بیگم:

بہن جو بھی کہنا ہے صاف صاف کہو۔ہم سب تمہارے خیر خواہ ہیں۔

مسز شفقت:

میں آپ کی ممنون ہوں۔لیکن کیسے کہوں...

سوشیلا شرما:

ہاں۔ہاں بتایئے نہ...

مسز شفقت:

دراصل جب شرافت علی نے میری لڑکی سے عقد کیا تو وہ پہلی ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا اور آپ جانتی ہی ہیں کہ ہاتھ پاؤں کے اچھے کسی نوجوان آدمی کا عشق کیسا ہوتا ہے۔دوسری طرف میری لڑکی بڑی نازک سی تھی اور اس کا شوہر حد سے زیادہ عاشق مزاج۔نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔وہ بہت کمزور ہوگئی، مرجھا سی گئی۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے اور کچھ عرصے کے لئے اس کا اپنے شوہر سے الگ رہنا بھی ضروری ہے ورنہ خدانخواستہ وہ ختم بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایک دن میں نے خاموشی سے اپنی لڑکی کو ایک اچھے نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا اور بیوی کی جدائی کے غم میں میرا داماد نیم پاگل سا ہو گیا اور کچھ دن بعد اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔اس غم میں اس نے لوگوں سے ملنا جلنا، سیر و تفریح، ہنسنا بولنا سب کچھ چھوڑ دیا۔میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ اس کی بیوی زندہ ہے، لیکن وہ میری بات کا یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ چند مہینے بعد میری بیٹی صبا جس کا تخلص پنہاں ہے، تندرست اور چاق چوبند ہو کر نرسنگ ہوم سے واپس آگئی۔لیکن میرے داماد نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور بس یہی کہتا رہا کہ ''میری بیوی تو مر چکی ہے، یہ عورت کوئی اور ہے۔'' آخر جب کسی طرح یہ خیال اس کے دل سے نہ نکلا تو میں نے اس سے کہا کہ تم کب تک پنہاں کا غم مناؤ گے۔اب تم اسی نئی لڑکی سے شادی کر لو اور اس کا نام ہم نے اسرار فاطمہ بتایا اور پھر کچھ دوستوں کی مدد سے میں نے اس کی شادی دوبارہ اپنی بیٹی سے کرا دی۔لیکن دوبارہ نکاح چونکہ غیر شرعی ہوتا، اس لئے اس بار ہم نے رجسٹرار آفس جا کر ان لوگوں کی سول میرج کرا دی، اور وہ بھی جھوٹ موٹ کی۔رجسٹرار کو ہم نے ساری بات بتا دی تھی۔

مسز شرما:

اور اب تک شرافت علی کو یقین ہے کہ یہ عورت اس کی دوسری بیوی ہے؟

مسز شفقت:

جی ہاں... جی نہیں... اب تو شاید اسے پوری طرح یقین نہیں لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا کیونکہ اس طرح وہ زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی اور اسی لئے وہ اسے گھر میں بند رکھتا ہے۔

نازلی: یہ تو بڑی زیادتی ہے!

مسز شفقت:

نہیں۔نہیں۔بنیادی طور پر وہ بہت اچھا آدمی ہے اور میری بیٹی سے والہانہ محبت کرتا ہے، لیکن پھر بھی ہم لوگوں کے لئے یہ آسان مرحلہ نہیں۔میری بیٹی کو یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ وہ پنہاں نہیں بلکہ اسرار فاطمہ ہے...اور میں... مجھے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔اس لئے ایک غیر عورت کو اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔ (آنسو

پوچھتی ہے) اچھا خدا حافظ۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی عنایتوں کے لئے میں آپ کی ممنون ہوں۔

مسز شفقت آہستہ آہستہ باہر جاتی ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں۔ رازداں آہستہ آہستہ اسٹیج کے سامنے والے حصے میں آتا ہے اور حاضرین سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔

رازداں:

(حاضرین سے) دیکھ رہے ہیں آپ لوگ، یہ سب حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے چہرے سے نقاب اٹھانا چاہتے تھے اور اب یہ خود ہی مبہوت ہیں، محو حیرت ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ اس بحر کی تہ میں کون سا موتی چھپا ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟ شاید نہیں!

رازداں ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

دوسرا ایکٹ

فخر الحسن کے گھر میں اس کا آفس یا اسٹڈی۔ فرنیچر قیمتی اور بھاری بھرکم ہے۔ شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی ہیں اور دیواروں پر کچھ مشاہیر کی تصویروں کے ساتھ فخر الحسن کے باپ اور دادا کی بڑی تصویریں آویزاں ہیں۔ درمیان میں ایک بڑی سی ٹیبل ہے، جس پر کاغذات فائل اور وہ سب چیزیں موجود ہیں جو عام طور سے اس قسم کی میزوں پر دیکھی جاتی ہیں۔ میز کے ساتھ ایک بھاری بھرکم گھومنے والی کرسی بھی ہے۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ اور کرسیاں چھوٹی میزیں اور ایک صوفہ بھی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو ہم رازداں اور شرما کو اس صوفے پر بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں۔ فخر الحسن بڑی میز کے پاس کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ٹیلیفون کا رسیور ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار ہویدا ہیں۔ رازداں اور شرما بھی اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

فخر الحسن:

(ٹیلیفون پر) ہلو...؟ ہاں! ہاں! ہاں بالکل۔ کیا کہا؟ نہیں ملا؟ بالکل نہیں ملا؟ نہیں نہیں! اور کوشش کرو۔ تلاش جاری رکھو لیکن اس کام کو بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ (رسیور رکھتا ہے)

مسٹر شرما:

(اشتیاق سے) ہاں تو بتایئے۔ کوئی ثبوت ملا؟

فخر الحسن:

نہیں کچھ نہیں ملا۔ اس زلزلے میں ہر چیز تباہ ہوگئی... ٹاؤن ہال۔ رجسٹرار کا دفتر۔ سب ریکارڈ اور کاغذات۔

مسٹر شرما:

لیکن جو لوگ اس تباہی سے بچ گئے وہ تو کچھ بتا سکتے ہیں؟

فخر الحسن:

وہ لوگ بھی اپنا بوریا بستر لپیٹ کر ادھر ادھر چلے گئے۔ اس قصبے میں تو اب کھنڈروں اور ملبے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بجلی اور پانی تک کا انتظام نہیں۔ وہاں کوئی کیسے ٹھہرتا؟ اور اب دوسرے شہروں سے ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

مسٹر شرما:

اس کا تو یہ مطلب ہے کہ ہمیں ان دونوں میں سے کسی ایک کی بات پر یقین کرنا ہوگا حالانکہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس کا بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں۔

فخر الحسن:

یہی تو بس زیادہ پریشان کن بات ہے۔

رازداں:

میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ آپ دونوں ہی کی بات کا اعتبار کرلیں۔

مسٹر شرما:

یہ کیسے ممکن ہے، جب کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل برعکس بات کررہے ہیں؟

رازداں:

تو ٹھیک ہے۔ آپ دونوں میں سے کسی کی بات پر بھی یقین نہ کریں۔

فخر الحسن:

بھئی رازداں یہ مذاق کا موقع نہیں۔ ذرا تم خود سوچو...

مسٹر شرما:

یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں اور یہ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ایک کی بات سچ ہے اور دوسرے کی بالکل غلط۔

فخر الحسن:

اور پھر میرا خیال ہے کہ آج نہیں تو کل، کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔

رازداں:

کس قسم کا ثبوت؟

فخر الحسن:

مثلاً مسز شفقت کی بیٹی کی موت کا سرٹیفکیٹ... اور اس صورت میں ہم شرافت علی کی بات پر یقین کرسکتے ہیں۔

مسٹر شرما:

بالکل۔ کیا اس صورت میں بھی تم حقیقت سے انکار کروگے؟

رازداں:

میں نے کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ لیکن میرے خیال میں سچائی کسی سرٹیفکیٹ یا ریکارڈ میں نہیں بلکہ ان دونوں کے ذہنوں میں ہے، وہ سچائی جو ان کی سچائی ہے، جسے انھوں نے دل سے قبول کیا ہے۔

مسٹر شرما:

لیکن وہ دونوں تو ایک دوسرے کو پاگل کہہ رہے ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ کون

پاگل ہے اور کون نارمل؟

رازداں:

یہ درست نہیں، صرف شرافت علی نے اپنی ساس کو پاگل بتایا ہے۔ مسز شفقت نے تو صرف یہ کہا ہے کہ چار سال پہلے ان کا داماد اپنی بیوی کے غم میں نیم پاگل سا ہو گیا تھا، لیکن اب وہ کم و بیش ٹھیک ہے۔

مسز شرما:

(فخر الحسن سے) تو کیا آپ کا خیال ہے کہ ساس کا بیان زیادہ قابل اعتبار ہے۔

فخر الحسن:

بڑی حد تک، اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ اگر ہم مسز شفقت کے بیان پر اعتبار کر لیں تو یہ معما خود بخود حل ہو جائے گا۔

رازداں:

اور اگر آپ صرف شرافت علی کی بات پر اعتبار کریں تو بھی یہ معما اسی آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

مسز شرما:

تو پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کس کے بیان پر اعتبار کریں؟

رازداں:

یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن آپ کا مسئلہ یہ نہیں کہ وہ سب کاغذات اور ریکارڈ جن میں ان باتوں کا ثبوت تھا، ضائع ہو چکے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ خود ان دونوں نے بھی بہت سے واقعات کو بھلا دیا ہے اور اپنے اور ایک دوسرے کے لئے تخیل کی ایک ایسی دنیا تخلیق کر لی ہے جو ان کے لئے ہر اعتبار سے مکمل اور تسلی بخش ہے۔ اور اس دنیا کے لئے کسی ثبوت اور ریکارڈ کی ضرورت نہیں۔ اور نہ کوئی زلزلہ اسے تہ و بالا کر سکتا ہے کیونکہ یہ انوکھی سچائی ان کے رگ و پے میں پیوست ہے، خون کی گردش میں رواں دواں ہے۔ اور اب اگر کچھ ضروری کاغذات مل بھی جائیں تو شاید ان کی داخلی سچائی کو زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔

فخر الحسن:

یہ سب ہوائی باتیں ہیں۔ معاف کرنا رازداں تمہیں بچپن ہی سے فلسفہ بگھارنے کا شوق رہا ہے اور اب تو یہ بات حد سے تجاوز کر چکی ہے۔

مسز شرما:

دیکھو بھئی رازداں۔ ہم دونوں کا بیان سن چکے ہیں اور اب اگر ہم دونوں بیانات کو سامنے رکھ کر بڑی گہرائی سے غور کریں تو ہم یہ بات جان سکتے ہیں کہ کس کا تعلق حقیقت کی دنیا سے ہے اور کس کا تخیل کی اڑان سے؟

رازداں:

تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگ یہ گتھی سلجھایئے اور مجھے ان بے سود کاوشوں پر ہنسنے کی اجازت دیجئے۔

فخر الحسن:

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تلاش کی آخری منزل پر کون ہنستا ہے اور کون شرمسار ہوتا ہے۔

فاخرہ بیگم، سوشیلا شرما، اور نازلی داخل ہوتی ہیں۔

فخر الحسن:

(رازداں سے) اب بہتر ہوگا کہ تم تھوڑی دیر خاموش رہو تا کہ میں ان لوگوں کو ضروری باتیں سمجھا دوں۔

رازداں:

ضرور۔ ضرور... آپ فکر نہ کریں... میں اب خاموش رہوں گا۔

فاخرہ بیگم:

(اپنے شوہر سے) اچھا تو بتایئے اب کیا کیا جائے؟ میں اور سوشیلا دیر سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن بے سود۔

رازداں مسکراتا ہے۔

فخر الحسن:

اب آپ تینوں یہ کیجئے کہ فوراً مسز شفقت کے ہاں چلی جایئے۔ اور...

فاخرہ بیگم:

اور اگر اس بار بھی اس نے دروازہ نہ کھولا تو میری تو بڑی بے عزتی ہو جائے گی۔

فخر الحسن:

نہیں فاخرہ۔ اب اس کی یہ ہمت نہ ہوگی اور یوں بھی پہلے تو وہ لوگ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب تو دونوں خود ہی اپنی روداد بیان کر چکے ہیں۔

فاخرہ بیگم:

ہاں یہ تو ہے۔ لیکن ہم بڑی بی سے کس قسم کی باتیں کریں؟

فخر الحسن:

بس کچھ اس قسم کی باتیں کیجئے کہ وہ خود ہی ہر بات کھول کر بتا دیں اور پھر بس پندرہ بیس منٹ بعد آپ انھیں کسی بہانے سے یہاں لے آیئے۔

سوشیلا شرما:

لیکن کس بہانے سے۔ ؟

فخر الحسن:

ارے بھئی یہ آپ خود سوچ لیجئے۔ آپ لوگ خواتین ہیں اور یہ کوئی مذاق نہیں، بات چیت میں آپ کا ذہن اس تیزی سے کام کرتا ہے اس کا مقابلہ ہم کہاں کر سکتے ہیں۔

مسز شرما:

(اپنی بیوی سے) لیکن ذرا وقت کا خیال رکھنا۔

سوشیلا شرما:

(ذرا سخت لہجے میں) یہ بات آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟

مسز شرما:

اس لئے کہ اگر تم باتیں کرنا شروع کر دو تو بس کرتی ہی چلی جاتی ہو۔

سوشیلا شرما:

میں یا آپ...؟ آپ تو بس۔

نازلی:

(بیچ بچاؤ کے انداز میں) آپ اطمینان رکھیے انکل میں خود ان لوگوں کو بالکل ٹھیک وقت پر واپس لے آؤں گی۔

فاخرہ بیگم:

لیکن آپ کو وقت کی پابندی پر اس قدر اصرار کیوں ہے؟

فخرالحسن:

یہ بہت ضروری ہے، اس لئے کہ میں یہاں سے سیدھا دفتر جا رہا ہوں۔ دفتر پہنچتے ہی کچھ کاغذات دینے کے لئے شرافت علی کو بلواؤں گا اور کاغذات میں یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس طرح میں اس پر یہ ظاہر کروں گا کہ کاغذات غلطی سے گھر پر رہ گئے اور پھر اپنی کار میں یہاں لے آؤں گا۔ اس میں بس ۲۰ یا ۲۲ منٹ لگیں گے اور اسی عرصے میں مسز شفقت بھی یہاں آ جائیں گی اور ساس اور داماد کا آمنا سامنا ہو جائے گا۔

شرما:

اور میں؟

فخرالحسن:

تم بھی اپنی کار میں کہیں گھوم آؤ۔ یا قریب کے کسی ریستوران میں بیٹھ کر ایک پیالی کافی پی لو، اور عین اسی وقت گویا تم بھی اپنی بیوی کو واپس لے جانے کے لئے آؤ گے اور اس طرح تم بھی وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔

رازداں:

اور اس طرح آپ سب کی نظروں کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

نازلی:

اُفوہ... ماموں جان!

فخرالحسن:

اپنے ماموں کی باتوں پر تم زیادہ دھیان نہ دو۔ ان سے میں خود بات کروں گا لیکن ذرا اطمینان سے۔ پہلے ذرا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

فاخرہ بیگم، سوشیلا شرما اور نازلی باہر جاتی ہیں۔

فخرالحسن:

(شرما سے) میرے خیال میں اب ہم لوگوں کو بھی چلنا چاہیے۔

فخرالحسن اور شرما بھی باہر جاتے ہیں۔ اب کمرے میں رازداں اکیلا ہے۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا ہے اور پھر ایک بڑے آئینے کی طرف جاتا ہے جو اسٹیج کے سامنے والے حصے میں لگا ہے۔

رازداں:

(آئینے سے) ہلو... ہمراز... کیا حال ہے؟ (آئینے میں اپنے عکس کو ملٹری انداز میں سلوٹ کرتا ہے۔) ارے بھئی مجھے اس طرح کیوں تک رہے ہو؟ (انگلی سے اشارہ کرتا ہے) کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ ارے تم تو میری طرف اشارہ کر رہے ہو! تو کیا میں پاگل ہوں؟ خیر چلو کوئی بات نہیں، تمھارا اور ہمارا تو قدیم یارانہ ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ پیارے دوست کہ جب کوئی اور تمھارے سامنے آتا ہے تو تم ایک دم اپنا چہرہ کیوں بدل لیتے ہو؟ تم کیا ہو...؟ کون ہو۔ ؟ وہ جو مجھے نظر آتے ہو، یا وہ جو دوسروں کو نظر آتے ہو؟ تمھارا اصلی چہرہ کون سا ہے؟ وہ جو مجھے نظر آتا ہے، یا وہ جو دوسروں کو نظر آتا ہے؟... نہیں بتاؤ گے؟... اچھا نہ بتاؤ... (حاضرین سے) یہ مسخرہ تو بتائے گا نہیں، اب آپ لوگ ہی سوچئے کہ اس کا اصلی چہرہ کون سا ہے؟ یا پھر وہ سبھی چہرے اصلی ہیں جو وقتاً فوقتاً اس میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ (آئینے سے) اچھا خدا حافظ۔ اب تم سے پھر کبھی ملاقات ہو گی۔

عین اسی وقت بہادر داخل ہوتا ہے اور رازداں کو آئینے سے گفتگو کرتے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔

بہادر:

(ہمت کر کے) صاحب!

رازداں:

کیوں بہادر کیا بات ہے؟

بہادر:

صاحب دو بیبیاں آئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

رازداں:

مجھ سے؟

بہادر:

جی پہلے تو انھوں نے بیگم صاحبہ کو پوچھا، لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں تو پھر آپ سے ملنے کو کہا۔

رازداں:

کیا وہ جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟

بہادر:

جی شاید... معلوم نہیں۔

رازداں:

اور تم... کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟

بہادر:

جی نہیں... جی ہاں... آپ کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

رازداں:

بالکل نہیں۔ میں وہ نہیں جو تم دیکھ رہے ہو اور تم وہ نہیں جو میں دیکھ رہا ہوں۔

بہادر:

نہیں صاحب جی میں تو وہی ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کبھی آپ لوگوں سے کچھ نہیں چھپایا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔

رازداں:

(ہنستے ہوئے) نہیں تم بہت اچھے آدمی ہو، بڑے پیارے لڑکے ہو، اچھا جاؤ ان لوگوں کو یہاں لے آؤ۔

بہادر جاتا ہے۔ رازداں کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔ مسز

بیدی اور مس بینجمن داخل ہوتی ہیں۔ مس بینجمن ایک پچاس سالہ خاتون ہیں اور وضع قطع سے اسکول مسٹریس معلوم ہوتی ہیں۔

رازداں:

آیئے۔آیئے مسز بیدی۔۔آداب عرض ہے۔

مسز بیدی:

آداب عرض ہے اور یہ ہیں میری بڑی اچھی دوست مس روز میری بنجمن ۔ یہ بھی کئی دنوں سے...

رازداں:

مسز شفقت کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

مسز بیدی:

بالکل، بالکل...آپ کتنی جلدی ہر بات سمجھ جاتے ہیں بھائی صاحب۔

رازداں:

بیٹھئے۔وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔

مسز بیدی:

یعنی کون لوگ؟

رازداں:

پہلے میری بہن، مسز شرما اور نازلی اور ان کے ساتھ مسز شفقت اور پھر بس چند لمحے بعد میرے بہنوئی فخر الحسن صاحب اور ان کے ساتھ شرافت علی اور ان کے بعد مسٹر شرما۔

مسز بیدی:

ارے واہ رازداں صاحب، آپ تو غیب داں معلوم ہوتے ہیں!

رازداں:

میں غیب داں نہیں۔۔یہ سب پہلے سے طے ہے۔

مس بنجمن:

(مسز بیدی سے) چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔یہیں ان دونوں کے درشن ہو جائیں گے۔ہم لوگ بڑے اچھے وقت سے آئے۔

مسز بیدی:

اچھا یہ بتایئے رازداں صاحب کہ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

رازداں:

میرا...؟ کچھ نہیں۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے...؟ ان دونوں میں سے کون پاگل ہے؟

مسز بیدی:

دیکھئے میں تو آج کل اسی ادھیڑ بن میں ہوں۔ محلے کی کئی عورتوں سے بھی یہی باتیں ہوتی رہیں اور رات کو بیدی صاحب سے بھی دیر تک بحث ہوئی۔ اب وہ جو بھی کہیں لیکن میرا تو یہی خیال ہے کہ مسز شفقت ہی سچ بول رہی ہیں۔ میری سب ملنے والیاں بھی یہی کہہ رہی ہیں۔

مس بنجمن:

جی ہاں، ہمارے اسکول کی سب ٹیچر بھی کچھ اسی طرح سوچ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کا بھی یہی خیال ہے۔ ہاں، کچھ نئے زمانے کی لڑکیاں ہیں، وہ کچھ اور طرح سوچتی ہیں۔

مسز بیدی:

اور کچھ بتایئے رازداں صاحب۔۔کوئی ثبوت ملا۔

رازداں:

(بڑی رازداری کے انداز میں) جی ہاں۔ شرافت علی کی دوسری شادی کا سرٹیفکیٹ۔

مسز بیدی:

(بڑے جوش سے) اچھا! واقعی؟ (کچھ سوچ کر) تو کیا سچ مچ اس نے دوسری شادی کی تھی؟ یا یہ جھوٹ موٹ کی شادی کا سرٹیفکیٹ ہے؟

رازداں:

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔

مسز بیدی:

تو پھر کیا کیا جائے؟

رازداں:

اب آپ اس کا جو مطلب نکالنا چاہیں، نکال لیجئے۔ چاہیں تو اسے سچ مان لیجئے اور چاہیں تو جھوٹ موٹ کی شادی کا سرٹیفکٹ سمجھ لیجئے۔

مس بنجمن:

آپ نے تو بات کو اور بھی الجھا دیا۔

مسز بیدی:

یہ تو شروع ہی سے اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ بڑے مذاقیہ آدمی ہیں۔

نازلی تیزی سے کمرے میں داخل ہوتی ہے وہ خاصی پریشان ہے۔

نازلی:

ماموں جان ہم لوگوں نے ہر بات معلوم کر لی ہے اور وہ لوگ مسز شفقت آنٹی کو لے کر یہاں آتی ہی ہوں گی۔ آپ کسی طرح پاپا سے کہلوا دیجئے کہ شرافت علی کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں (خواتین کو دیکھ کر) اچھا آپ لوگ بھی ہیں۔ آداب آنٹی آداب...

مسز بیدی:

یہ میری دوست مسز بنجمن ہیں...اور...

رازداں:

مسز شفقت کو دیکھنے یہاں آئی ہیں..

مسز بنجمن:

نہیں میں تو ..

مسز بیدی:

آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانئے (نازلی سے) ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟ ہر بات معلوم ہو گئی ہے؟ یہ تو بہت اچھا ہوا۔

نازلی:

بالکل آنٹی .. ہر بات روز روشن کی طرح صاف ہے۔ مسز شفقت آنٹی بہت پیاری خاتون ہیں۔ ان کا فلیٹ بھی بہت اچھا سا سجا ہوا ہے اور وہ بہت Sweet طریقے سے بات کرتی ہیں.. اور آنٹی وہ گانا بھی جانتی ہیں۔ اپنی بیٹی صبا پنہاں کی پیدائش سے پہلے وہ ایک اسکول میں میوزک ٹیچر تھیں۔ انھوں نے ہمیں وہ سب چھوٹے چھوٹے پرچے دکھائے جو ان کی بیٹی نے اوپر سے بھیجے تھے اور جنھیں وہ بہت سنبھال کر رکھتی ہیں۔

مسز بیدی:

(کچھ سوچ کر) لیکن فرض کرو وہ پرچے اصلی نہ ہوں بلکہ نقلی بیٹی نے لکھے ہوں، جیسا کہ رازداں صاحب ابھی کہہ رہے تھے۔

نازلی:

نہیں آنٹی وہ پرچے نقلی کبھی نہیں ہوسکتے۔ ماں اپنی بیٹی کی تحریر پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرسکتی۔ ان بظاہر معمولی الفاظ میں ان کی بیٹی کے گہرے جذبات کا عکس ہے جسے صرف مسز شفقت ہی محسوس کرسکتی ہیں۔ ماموں جان کی باتوں پر آپ دھیان نہ دیں انھیں تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔

ڈرائنگ روم سے کچھ آوازیں آتی ہیں، جنھیں نازلی کان لگا کر سنتی ہے۔

نازلی:

ارے شاید وہ لوگ آگئے۔

مسز بیدی:

اچھا تو وہ لوگ آگئے (مس نجمن سے) چلیے تو ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔

دونوں اپنے پرس وغیرہ اٹھا کر درمیانی دروازے سے ڈرائنگ روم میں جاتی ہیں۔ چند لمحے بعد فاخرہ بیگم داخل ہوتی ہے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی ہے۔

فاخرہ بیگم:

(رازداں سے) شکر ہے یہ مسئلہ تو حل ہوگیا، لیکن تم کسی طرح اپنے بھائی صاحب کو اطلاع کردو کہ شرافت علی کو لے کر آنے کی ضرورت نہیں۔ کہیں کوئی اور فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اب ان دونوں کا سامنا کرانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

رازداں:

تو پھر آپ یہ درمیانی دروازہ بند کردیجیے تاکہ اس کی نوبت نہ آئے۔

نازلی:

یہ ہم کیسے کرسکتے ہیں؟ پاپا خفا ہوجائیں گے۔ ان کی خاص ہدایت تھی کہ یہ درمیانی دروازہ کھلا رہے۔

رازداں:

تو تم انھیں سمجھا دینا کہ اب ہر بات صاف ہوچکی ہے۔

نازلی:

پاپا کو کوئی بات سمجھانا اتنا آسان نہیں۔ ہر بات میں ان کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ کم سے کم میں تو یہ ہمت نہیں کرسکتی۔

رازداں:

اچھا تو میں خود اسے بند کیے دیتا ہوں۔

نازلی۔ نہیں ماموں جان! آپ بھی نہ کیجیے کیونکہ پاپا..

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ فاخرہ بیگم اور نازلی درمیانی دروازے سے ڈرائنگ روم میں چلی جاتی ہیں۔ دوسرے دروازے سے فخرالحسن داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ شرافت علی بھی ہے۔ فخرالحسن رائٹنگ ٹیبل کے قریب آکر کاغذات ڈھونڈنے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔ ڈرائنگ روم سے ہارمونیم کی آواز آنا شروع ہوتی ہے۔

فخرالحسن:

(شرافت علی سے) میں نے شاید وہ کاغذات یہیں کہیں رکھے تھے۔ (ایک لفافہ اٹھاتے ہوئے) لو یہ رہے۔ یہ الجھا ہوا کیس ہے، عرصے سے لٹکا ہوا ہے۔ تم ان سب کاغذات کو غور سے پڑھ لینا۔ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ (کان لگا کر میوزک سنتا ہے) اخوہ۔ ان لوگوں کو اس وقت بھی گانے بجانے سے فرصت نہیں۔ حد ہوگئی۔

ڈرائنگ روم سے غزل گانے کی آواز آتی ہے۔ کب ٹھہرے گا درد دل، کب رات بسر ہوگی سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی فخرالحسن اور شرافت علی دونوں سنتے ہیں، شرافت علی بہت پریشان نظر آنے لگتا ہے۔

شرافت علی:

(پریشانی سے) یہ کون گا رہا ہے؟

فخرالحسن:

(بے پروائی سے) معلوم نہیں۔ یہ سلسلہ تو یہاں چلتا ہی رہتا ہے۔

شرافت علی:

لیکن یہ تو میری ساس کی آواز ہے۔ کیا وہ پھر یہاں آگئیں.. ؟ انھیں کون یہاں لایا؟. اور کیوں؟

فخرالحسن:

ہوسکتا ہے تمھاری ساس ہی ہوں... اچھی آواز ہے۔

شرافت علی:

(پریشانی سے) اف خدا... پھر وہی غزل... وہی لے۔ وہی ترنم...

فخرالحسن:

تم کیوں اس قدر پریشان ہو؟ انھیں گانے دو۔ چلو ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔

شرافت علی:

نہیں۔ نہیں... یہ نہیں ہوسکتا۔

ڈرائنگ روم سے گانے کی آواز آتی ہے۔
کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا

کب تک تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

شرافت علی:

(اپنا سر پکڑ کر) اف خدا ...وہ غزل کیوں گا رہی ہیں؟ انھیں روکیے۔

فخر الحسن:

کیوں اس میں کیا ہرج ہے...؟ اچھی غزل ہے۔

شرافت علی:

نہیں اب یہ بات حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ غزل ان کی بیٹی گایا کرتی تھی۔

فخر الحسن:

اور اسے سن کر تمھیں رنج ہوتا ہے؟

شرافت علی:

میری بات چھوڑیے۔ لیکن اس غزل کا ان پر زیادہ برا اثر پڑ سکتا ہے۔ جو زخم مندمل ہو گئے ہیں وہ پھر ہرے ہو جائیں گے۔

ڈرائنگ روم سے مسز شفقت کے گانے کی آواز۔ کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامت جانانہ کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی اس دوران شرافت علی کمرے میں ٹہل رہا ہے، اس کی حرکات سے سخت پریشانی اور بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔ غزل ختم ہونے پر تالیوں اور تعریف و توصیف کی آوازیں آتی ہیں۔

نازلی کی آواز:

کمال کر دیا آنٹی۔ آپ تو اب بھی بہت اچھا گاتی ہیں۔

مسز شفقت کی آواز:

کبھی تم میری بیٹی پنہاں کا گانا سنو تو یہ نہ کہو گی۔ میری پیاری بیٹی پنہاں یہ غزل اتنے والہانہ انداز سے گاتی ہے کہ سننے والے وجد میں آ جاتے ہیں۔

شرافت علی:

(تھر تھر کانپ رہا ہے) سنا آپ نے؟ آپ نے سنا "میری بیٹی پنہاں۔"

فخر الحسن:

ہاں وہ اپنی بیٹی کا نام صبا پنہاں ہی تو بتاتی ہیں۔

شرافت علی:

لیکن انھوں نے کہا "گاتی ہے، پنہاں گاتی ہے۔"

اب ڈرائنگ روم سے بات چیت کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

سوشیلا شرما کی آواز:

اچھا تو کیا وہ اب بھی گاتی ہے؟ اس کے پاس ہارمونیم وغیرہ تو ہوگا ہی؟

مسز شفقت کی آواز:

نہیں اب تو وہ نہیں گاتی۔ اب کیسے گا سکتی ہے؟ اور شاید یہی اس کے لئے سب سے زیادہ صبر آزما بات ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ غزلیں بھی نہیں گا سکتی۔

شرافت علی:

سنا آپ نے؟ سنا آپ نے...؟ (حد سے زیادہ بے چین ہے)۔

فخر الحسن:

ہاں سنا۔ لیکن یہ تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ وہ ابھی تک اسی مغالطے میں ہیں کہ ان کی بیٹی پنہاں زندہ ہے۔

عین اسی وقت ادھر پر کاش شرما داخل ہوتا ہے اور شرافت علی کو دیکھ کر جواب تھر تھر کانپ رہا ہے، پریشان سا ہو جاتا ہے۔ فخر الحسن اسے اشارے سے اپنے قریب بلاتا ہے۔

فخر الحسن:

(مدھم لہجے میں) شرما، لیڈیز سے کہو کہ وہ وہیں آ جائیں۔

شرافت علی:

نہیں...نہیں...انھیں یہاں نہ بلائیے۔

شرما اسٹڈی اور ڈرائنگ روم کے درمیانی دروازے پر کھڑے ہو کر خواتین کو اشارہ کرتا ہے۔ خواتین ایک کے بعد ایک داخل ہوتی ہیں۔ مسز شفقت اپنے داماد کو اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ قریب آ کر بہت محبت اور ہمدردی سے اس سے بات کرتی ہیں، لیکن ان کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ شرافت علی کو نیم پاگل سمجھ رہی ہیں اور وہ خواتین کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہیں۔

شرافت علی:

(اپنی ساس سے) آپ یہاں کیوں آ گئیں؟ آپ کو کس نے بلایا تھا؟

مسز شفقت:

میں بس ذرا... پیارے بیٹے مجھ سے خفا نہ ہو۔ میں کسی بری نیت سے یہاں نہیں آئی۔

شرافت علی:

نہیں نہیں۔ آپ خاص طور سے ان لوگوں کو بتانے آئی ہیں۔ آپ ابھی ان لوگوں سے کیا کہہ رہی تھیں؟

مسز شفقت:

کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔

شرافت علی:

(غصے سے) کچھ نہیں...میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ آپ نے کہا۔ "پنہاں گاتی ہے۔" آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی بیٹی مر چکی ہے۔ چار سال پہلے اس کا انتقال ہوا...

مسز شفقت:

ہاں...ہاں...میں جانتی ہوں...تم ٹھیک کہتے ہو۔

شرافت علی:

تو پھر آپ نے یہ کیوں کہا کہ یہ اس کی بدنصیبی ہے کہ وہ اب گا بھی نہیں سکتی۔

مسز شفقت:

میرا مطلب تھا کہ...

شرافت علی:

آپ کی بیٹی مرچکی ہے۔وہ کیسے گا سکتی ہے؟

مسز شفقت:

میں نے یہی تو کہا تھا (خواتین سے) آپ ہی بتائیے میں نے کیا کہا تھا...

شرافت علی:

اور پھر آپ نے ہارمونیم کا ذکر کیا۔آخر کیوں...؟ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہارمونیم میں نے ہی توڑا تھا۔ پنہاں کے بعد اس کا کیا مصرف تھا؟ میری دوسری بیوی کو گانے بجانے کا شوق نہیں ہے۔

مسز شفقت:

ہاں میں جانتی ہوں... میں نے یہی تو کہا تھا۔

شرافت علی:

نہیں آپ نے پنہاں کہا تھا... پنہاں آپ کی بیٹی کا نام تھا... میری دوسری بیوی کا کیا نام ہے؟

مسز شفقت:

اسرار فاطمہ... اسرار فاطمہ۔

شرافت علی:

تو پھر آپ نے پنہاں کیوں کہا؟ اور آپ نے وہ غزل کیوں گائی جو پنہاں گاتی تھی؟

مسز شفقت:

نہیں... نہیں... ہاں میں نے ان لوگوں کے اصرار پر وہ غزل گائی۔

شرافت علی:

کیا میں نے بار بار آپ سے یہ نہیں کہا کہ وہ غزل نہ گایا کریں؟

مسز شفقت:

(روتے ہوئے) مجھے معاف کر دیجیے۔اب کبھی میں وہ غزل نہ گاؤں گی۔

شرافت علی:

(سختی سے) آپ فوراً اپنے گھر جائیے۔ایک منٹ بھی یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ جائیے... خدا حافظ۔

مسز شفقت جو اب زار و قطار رو رہی ہے، سر جھکائے ہوئے باہر جاتی ہے۔ جانے سے پہلے وہ رحم طلب نظروں سے خواتین کی طرف دیکھتی ہے۔اس کے جانے کے بعد شرافت علی کا انداز بالکل بدل جاتا ہے۔اب وہ پرسکون اور مودب دکھائی دے رہا ہے۔

شرافت علی:

خواتین اور حضرات۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ لوگوں کی موجودگی میں مجھے یہ رویہ اختیار کرنا پڑا لیکن میں مجبور تھا۔

فخر الحسن:

(حیرت سے) تو کیا تم جان بوجھ کر ان بے چاری کے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آئے؟

شرافت علی:

جی ہاں۔ کیونکہ اس بدنصیب عورت کے حق میں یہی بہتر تھا۔

فخر الحسن:

اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟

شرافت علی:

تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ میں پاگل یا نیم پاگل ہوں اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور اس طرح وہ اپنے تخیل کی دنیا میں خوش رہ سکیں۔ اور اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں تاکہ میں ان کے پاس جا کر ان کی دلجوئی کر سکوں۔اس وقت یہ بہت ضروری ہے۔

شرافت علی تیزی سے باہر جاتا ہے۔ سب لوگ مبہوت ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں۔رازداں اسٹیج کے سامنے والے حصے میں جا کر حاضرین کو مخاطب کرتا ہے۔

رازداں:

(حاضرین سے) دیکھا آپ نے، یہ سب لوگ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانے کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے اور اب خود واہموں کی دنیا میں کھو گئے ہیں (قہقہہ لگاتا ہے)۔

پردہ گرتا ہے۔

تیسرا ایکٹ

فخر الحسن کی اسٹڈی۔ وہ اس وقت گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہے۔ کمرے میں شرما اور رازداں کے علاوہ دو شخص اور بھی ہیں، جن کا تعلق فخر الحسن کے سوشل سرکل سے معلوم ہوتا ہے۔ انھیں صرف شخص کہا جائے گا۔ ڈرائنگ روم سے خواتین کی گپ شپ کی آوازیں آرہی ہیں۔

شرما:

تو اب کیا کیا جائے؟

فخر الحسن:

ابھی تو میں یادو کا انتظار کر رہا ہوں۔

پہلا شخص:

پولیس انسپکٹر جو اس معاملے کی تفتیش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ آتا ہی ہوگا اور اس کی رپورٹ سے...

رازداں:

ہر بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

فخر الحسن:

یہ تو میں نے نہیں کہا۔ لیکن وہ اس قدر محنت کر رہا ہے۔ اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی رپورٹ کی مدد سے حقیقت کی تہ تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔

شرما:
بالکل۔ اس میں کیا شک ہے۔
بہادر اور انسپکٹر یادو داخل ہوتے ہیں۔
فخر الحسن:
(بڑے جوش سے) آؤ بھئی یادو۔ بڑی دیر لگائی۔ امید ہے کہ تم نے کچے ثبوت حاصل کر لئے ہوں گے۔
یادو:
جی ہاں کوشش تو بہت کی ہے اور جو کچھ حاصل کر سکا ہوں آپ کو پیش کر رہا ہوں (فخر الحسن کو بڑا سا لفافہ دیتا ہے)۔
رازداں:
(ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر) مبارک ہو خواتین... شرافت علی اور مسز شفقت کے کیس کے ثبوت مل گئے ہیں۔
ڈرائنگ روم سے خوشی اور جوش و خروش کی آوازیں آتی ہیں اور پھر کئی خواتین اور لڑکیاں اسی دروازے سے اسٹڈی میں داخل ہوتی ہیں۔ ان میں ان سب خواتین کے علاوہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کچھ نوجوان سہیلیاں ہیں، لوگ اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ کر خواتین کو جگہ دیتے ہیں۔ نازلی اور اس کی سہیلیاں فخر الحسن کی میز کے ارد گرد کھڑی ہو جاتی ہیں۔
سوشیلا شرما:
واہ یادو جی۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔
نازلی اور اس کی سہیلیاں:
(تالی بجا کر) زندہ باد... انسپکٹر یادو زندہ باد!
انسپکٹر یادو:
(ذرا پریشانی سے) جی نہیں... دراصل... میرا مطلب ہے کہ رازداں صاحب نے خود ہی...
رازداں:
ان کا مطلب ہے کہ زیادہ ثبوت تو نہیں مل سکے لیکن جو ملے ہیں وہ بالکل قابل اعتبار ہیں۔
فاخرہ بیگم:
خدا کا شکر ہے۔ میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔
نازلی:
(اپنی سہیلیوں سے) چلو اچھا ہوا تم لوگ آگئیں۔ اب کل کالج میں ہم ہی سب سے پہلے یہ بات بتائیں گے سب لوگوں کو۔
ایک سہیلی:
بالکل نہیں... میں تو پہلے سب کو خوب پریشان کروں گی۔ پھر بڑی مشکل سے بتاؤں گی۔
دوسری سہیلی:
(تالی بجا کر) بالکل... بالکل... اور مسز ٹنڈن کو تو میں بالکل الٹی بات بتاؤں گی۔ وہی سب سے زیادہ پریشان ہیں۔

اس دوران میں فخر الحسن کاغذات کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس کے چہرے پر ناگواری کا احساس ابھرتا ہے اور پیشانی پر بل پڑ گئے ہیں۔ لڑکیاں جھک کر وہ رپورٹ پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔
ایک سہیلی:
ہائے انکل۔ ہمیں بھی دکھائیے۔
دوسری سہیلی:
ذرا ادھر سرکائیے انکل... پلیز۔
فخر الحسن:
ارے بھئی لڑکیوں مجھے پڑھنے تو دو۔ نازلی اپنی دوستوں کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔
لڑکیاں ذرا دور ہٹ جاتی ہیں لیکن اسی کمرے میں رہتی ہیں۔
فخر الحسن:
(یادو سے) لیکن اس سے تو کوئی بات بھی صاف نہیں ہوتی۔
کئی خواتین:
(ایک ساتھ) ارے... تو کیا اس میں کوئی نئی بات نہیں؟
فخر الحسن:
نئی بات تو ہے۔ لیکن بڑی مبہم سی۔
سوسیلا شرما:
(بڑے انداز سے) لیکن بھائی صاحب کچھ بتائیے تو۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔
فخر الحسن:
اس رپورٹ سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ایک خاتون کئی مہینے تک نرسنگ ہوم میں داخل رہی تھیں۔
مسز بیدی:
یہ تو بڑا اچھا ثبوت ہے۔
سوشیلا شرما:
اسی ثبوت کی تو ہمیں تلاش تھی۔
فخر الحسن:
لیکن اس سے کوئی قطعی نتیجہ نکالنا ممکن نہیں، کیونکہ شرافت علی کا کہنا ہے کہ اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد مسز شفقت کئی مہینوں تک نرسنگ ہوم میں رہیں تھیں اور مسز شفقت کا کہنا ہے کہ ان کی بیٹی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے اسے نرسنگ ہوم میں داخل کرایا تھا۔
فاخرہ بیگم:
تو اس میں یہ تو لکھا ہوگا کہ وہ ماں تھی یا بیٹی۔ کسی کا نام تو لکھا ہوگا۔
فخر الحسن:
نہیں۔ نام مٹ چکا ہے۔

مسز شرما:
مریضہ کی عمر تو لکھی ہوگی جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ماں تھی یا بیٹی۔
فخرالحسن:
نہیں مریضہ کی عمر کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں۔
نازلی:
وہ یقیناً بیٹی ہی ہوگی کیونکہ مجھے تو مسز شفقت کی ہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔
سوشیلا شرما:
ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔
فاخرہ بیگم:
ہاں مسز شفقت بے چاری بڑی نیک بی بی ہیں وہ جھوٹ نہیں بول سکتیں۔
رازداں:
دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر آپ سب کو اس بات کا اتنا پکا یقین ہے تو پھر یہی فرض کیے لیتے ہیں کہ شرافت علی کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے اور وہ اپنی پہلی بیوی صبا پنہاں کو اپنی دوسری بیوی اسرار فاطمہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اس بحث کو یہیں ختم کر دیجئے۔
شرما:
ایسا ہوسکتا تو واقعی بہت اچھا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کلکٹر صاحب کو سو فیصدی یقین ہے کہ شرافت علی ہی کی بات سچ ہے، یہاں تک کہ انھوں نے کلب میں بھی اس بات کا تذکرہ کیا اور میں نے سنا ہے کہ اور بھی کئی محفلوں میں اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں اور اب تو کچھ اور لوگ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔
سوشیلا شرما:
وہ تو اس لئے کہ ابھی تک انھوں نے مسز شفقت سے بات نہیں کی۔
پہلا شخص:
معاف کیجئے، مجھے تو کلکٹر صاحب ہی کا خیال درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ونود گپتا کا واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اس بے چارے کی بیوی ایک المناک حادثے کا شکار ہوگئی، لیکن اس کی ساس کے دماغ میں معلوم نہیں کیسے یہ خیال جم گیا ہے کہ اس کی بیٹی مری نہیں بلکہ ان لوگوں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔
دوسرا شخص:
لیکن ان دونوں معاملوں میں بڑا فرق ہے کیونکہ مسٹر گپتا نے تو اب تک اپنی بیوی کے غم میں شادی نہیں کی اور شرافت علی کی بیوی موجود ہے۔
رازداں:
(کچھ سوچتے ہوئے) بیوی موجود ہے؟ (جوش سے) واہ صاحب آپ نے تو بڑے پتے کی بات کہی۔
دوسرا شخص:
(حیرت سے) میں نے... یعنی کہ یہ کوئی خاص بات تو نہیں۔
رازداں:
نہیں... نہیں... یہ بہت خاص بات ہے اور اس کی مدد سے یہ معما آن کی آن میں حل ہوسکتا ہے (اس کے لہجے میں طنز کی جھلک ہے۔)
کئی لوگ:
(ایک ساتھ) لیکن کیسے... کس طرح؟
رازداں:
دیکھئے جناب شرافت علی کی بیوی ہی بتا سکتی ہے کہ وہ کون ہے۔ مسز شفقت کی بیٹی صبا پنہاں یا شرافت علی کی دوسری بیوی اسرار فاطمہ؟
فخرالحسن:
بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شرافت علی کی بیوی سے بات کون کرے گا؟ وہ تو گھر سے نکلتی ہی نہیں۔
رازداں:
ہم لوگ تو نہیں کر سکتے۔ لیکن کلکٹر صاحب اگر چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ یہاں آنے والے ہیں۔
فخرالحسن:
ہاں وہ مسز شفقت سے ملنا چاہتے ہیں۔
رازداں:
انھیں اس کی ضرورت نہیں۔ انھیں مسز شرافت علی سے ملنا چاہیے۔ بس اب یہی ایک راستہ باقی ہے۔
سوشیلا شرما:
معاف کیجئے رازداں صاحب۔ شرافت علی کی بیوی تو وہی کہے گی جو اس کا شوہر چاہے گا۔
مسز شرما:
ہاں یہ خطرہ تو ہے لیکن اگر کلکٹر صاحب اس سے تنہائی میں بات کریں تو وہ ضرور سچی بات بتادے گی۔
فخرالحسن:
ہاں یہ ممکن ہے۔ میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا اور یہ نئی تجویز ان کے سامنے رکھوں گا۔ یاد دو جاؤ تم ان سے میرے لئے Appointment لے لینا۔
سوشیلا شرما:
(بڑے ناز و انداز سے) رازداں صاحب آپ نے تو ہمارے سب مسائل حل کر دیئے۔ آپ تو واقعی رازداں ہیں۔
نازلی:
ماموں جان... زندہ باد!
نازلی کی سہیلیاں:
ماموں جان زندہ باد... رازداں انکل زندہ باد!
کئی خواتین:
بھئی واہ۔ ہم نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
مسز شرما:
آپ سوچ بھی کیسے سکتی تھیں؟ اسے کسی نے دیکھا بھی کہاں ہے؟ ہم لوگ تو اس

کے وجود سے بھی بے خبر تھے۔
رازداں:
(شرارت سے) اور اب کیا آپ کو یقین آ گیا کہ واقعی اس کا وجود ہے۔
فاخرہ بیگم:
چپ رہو نعیم میاں۔ تم تو ہر وقت ایک نیا شوشہ چھوڑتے رہتے ہو۔
مسز شرما:
ویسے اس سلسلے میں کچھ سوچ بچار ضروری تو ہے، کیونکہ اسے واقعی اب تک کسی نے نہیں دیکھا۔
نازلی:
لیکن مسز شفقت روز اپنی بیٹی سے ملنے جاتی ہیں۔
سوشیلا شرما:
اور شرافت علی بار بار کہہ چکا ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ رہتی ہے۔
رازداں:
لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ بیٹی اور وہ بیوی صرف ایک واہمہ ہو اور حقیقت میں کسی ایسی عورت کا وجود ہی نہ ہو۔
فاخرہ بیگم:
بھئی اب تم یہ اوٹ پٹانگ باتیں بند کرو۔ تم تو اور ہمارے دماغوں کو الجھائے دے رہے ہو۔
رازداں:
لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہی ہے کہ کیا مسز شرافت علی کا کوئی وجود ہے اور اگر ہے تو کیا وہ عام عورتوں کی طرح کی ایک عورت ہے؟

پولیس انسپکٹر یادو گھبرایا ہوا داخل ہوا ہے۔

فخرالحسن:
کیوں بھئی یادو کیا بات ہے؟
یادو:
معاف کیجئے گا جناب کلکٹر صاحب ادھر تشریف لے آئے ہیں۔ میں نے انھیں اسی بلڈنگ کے گیٹ پر دیکھا۔ ان کے ساتھ مسز شرافت علی بھی ہیں۔
فخرالحسن:
(ذرا پریشانی سے) اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ مسز شفقت سے ملنے جا رہے ہیں۔ (کچھ سوچ کر) اچھا تو یادو تم ایک مہربانی اور کرو۔ تم وہیں گیٹ پر جا کر ان سے درخواست کرو کہ کہیں اور جانے سے پہلے صرف چند منٹ کے لئے میرے غریب خانے پر آنے کی زحمت کریں۔

یادو سلام کر کے باہر جاتا ہے۔

فخرالحسن:
(ان سب لوگوں سے جو اسٹڈی میں جمع ہو گئے ہیں) آپ لوگ براہ کرم ڈرائنگ روم میں جانے کی زحمت کریں۔ (اپنی بیوی سے) فاخرہ تم ان لوگوں کے لئے چائے وغیرہ بنواؤ۔ اور ہاں شرما تم میرے ساتھ یہیں ٹھہرو اور رازداں تم بھی۔ لیکن یاد رکھو کلکٹر صاحب سے بات میں خود کروں گا۔ تم درمیان میں کوئی نیا شوشہ نہ چھوڑنا۔
رازداں:
آپ کہیں تو میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں۔
فخرالحسن:
نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تمھارا یہاں رہنا ضروری ہے۔

فخرالحسن، شرما اور رازداں کے علاوہ سب لوگ دوسرے کمرے میں جاتے ہیں۔ چند لمحے بعد کلکٹر رام کمار پانڈے داخل ہوتا ہے۔ وہ ۵۵، ۵۷ سال کے قریب عمر کا ایک لمبا چوڑا اور خوش شکل آدمی ہے اور چہرے سے خوش اخلاق بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بے تکلف لباس میں یعنی دھوتی کرتا (یا کرتا پاجامہ) اور جواہر کٹ جیکٹ میں ملبوس ہے۔ شانے پر ایک سلک کی شال بھی پڑی ہے۔ اس کے انداز سے بے تکلفی نمایاں ہے۔ اس کے پیچھے انسپکٹر یادو بھی آتا ہے اور پانڈے کے بیٹھنے کے بعد وہ ایک طرف مودب کھڑا رہتا ہے۔

فخرالحسن:
(کھڑے ہوتے ہوئے) آیئے، آیئے... آداب عرض ہے۔ تشریف لایئے۔ زہے نصیب (اس کو اپنی کرسی پیش کرتا ہے۔)
پانڈے:
(سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے) ارے بھئی فخرالحسن کہو کیا بات ہے... اچھا یہاں شرما بھی ہیں۔ ہلو۔ ہلو... اور یہ شاید...؟
فخرالحسن:
یہ میرے سالے ہیں نعیم رازداں۔
رازداں:
آداب عرض ہے۔
پانڈے:
ہلو۔ آداب... ارے بھئی شرما سنا ہے تم اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان ہو۔ ہر طرف یہی چرچا ہے۔
شرما:
گستاخی معاف، صرف میں ہی نہیں، شہر کے سبھی لوگ اس سلسلے میں پریشان ہیں۔
فخرالحسن:
جی ہاں... اس میں کوئی شک نہیں۔
پانڈے:
بھئی تم لوگ بلاوجہ رائی کا پہاڑ بنا رہے ہو، میرے خیال میں تو یہ ایک سیدھا سادا کیس ہے۔ شرافت علی جو کچھ کہہ رہا ہے وہی ٹھیک ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ماں...
شرما:
معاف کیجئے گا سر، آپ اس لئے اس کی بات پر یقین کر رہے ہیں کیونکہ ابھی تک

آپ اس کی ساس سے نہیں ملے۔

پانڈے:

میں اس وقت وہیں جا رہا تھا کہ تم لوگوں کا پیغام ملا۔ دراصل شرافت علی کا اصرار تھا کہ میں اس کی ساس سے تمھارے ہاں نہیں بلکہ خود انھیں کے ہاں ملوں۔

شرما:

وہ تو یہی کہے گا کیونکہ وہ وہ اس پر آسانی سے دباؤ ڈال سکتا ہے اور کوئی ایسی بات کہلوا سکتا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پاگل ہے۔

فخرالحسن:

میرا بھی یہی خیال ہے اور اگر آپ کل شرافت علی کو یہاں دیکھتے تو آپ کو بھی اندازہ ہو جاتا کہ دراصل پاگل وہ ہے۔

پانڈے:

ارے بھئی وہ تو پاگل پن کی ایکٹنگ کر رہا تھا اور وہ بھی اپنی ساس کی خاطر، تا کہ وہ اپنے تخیل کی دنیا میں مگن رہ سکے۔ اس نے مجھے خود سب کچھ بتا دیا ہے۔

فخرالحسن:

معاف کیجئے گا جناب اس نے بڑے مبالغے سے کام لیا۔ دراصل مسز شفقت خود اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں تا کہ اس کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔

پانڈے:

یہ تو تم بڑی عجیب سی بات کہہ رہے ہو، کیوں بھئی رازداں تمھارا کیا خیال ہے؟

رازداں:

معاف کیجئے گا۔ میرا کچھ خیال نہیں، کیونکہ میں نے اپنے بہنوئی سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ بولوں گا۔

فخرالحسن:

(خفگی سے) میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ (پانڈے سے) ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دو تین دن سے ہمارے ذہنوں کو اور الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔

شرما:

جی ہاں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم کسی حالت میں بھی حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تو انھوں نے یہ تک کہا کہ شرافت علی کی بیوی کا وجود ہی غیر یقینی ہے۔ شاید وہ صرف ایک واہمہ ہو۔

پانڈے:

(قہقہہ لگاتے ہوئے) خوب، بہت خوب۔ یہ تو بڑا دلچسپ خیال ہے... ویسے اس سلسلے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ مجھے مسز شفقت سے ملنا چاہیے یا نہیں؟

رازداں:

بالکل نہیں۔ کیونکہ ان سے ملنے کے بعد آپ کے دل میں بھی شکوک پیدا ہو سکتے ہیں۔

پانڈے:

(خوش ہو کر) اچھا تو تمھارا بھی یہی خیال ہے کہ شرافت علی کا بیان حرف بحرف ٹھیک ہے؟

رازداں:

جی نہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ شرافت علی کی بات پر یقین کرتے رہیں اور یہ لوگ مسز شفقت کی بات کو سچ مانتے رہیں اور اس بحث کو یہیں ختم کر دیں۔

فخرالحسن:

دیکھا آپ نے! یہ کئی دن سے اسی قسم کی گول مول باتیں کر رہے ہیں۔

شرما:

میرے خیال میں فخرل بھائی آپ ان سب باتوں کو تو بھول جائیے اور پانڈے جی کے سامنے ان کی نئی تجویز رکھ دیجئے۔

پانڈے:

نئی تجویز...؟ کیوں بھئی وہ نئی تجویز کیا ہے؟

فخرالحسن:

ان کا خیال ہے کہ آپ خود مسز شرافت علی سے مل کر یہ بات دریافت کریں کہ آیا وہ مسز شفقت کی اکلوتی بیٹی پنہاں ہے یا شرافت علی کی دوسری بیوی اسرار فاطمہ، تو یہ معاملہ حل ہو سکتا ہے۔

پانڈے:

ویسے یہ خیال برا نہیں۔ گو کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شرافت علی کی دوسری بیوی ہی ہے۔ لیکن اس طرح آپ لوگوں کے شکوک بھی دور ہو جائیں گے۔

فخرالحسن:

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شرافت علی اس بات پر راضی بھی ہو جائے گا؟

پانڈے:

میرے خیال میں اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ اب تک وہ میرے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہے اور یہ تو تم لوگوں کو بھی ماننا پڑے گا کہ شرافت علی بہت نیک اور شریف آدمی ہے۔ (انسپکٹر یادو سے) بھئی یادو تم برابر گھر میں جا کر شرافت علی کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ یہاں آ کر مجھ سے مل لے۔ بس چند منٹ کے لئے...

انسپکٹر یادو سلام کر کے رخصت ہوتا ہے۔

پانڈے:

اب تم لوگ دیکھتے جاؤ میں کس طرح اس بات کا فیصلہ یہیں کئے دیتا ہوں۔

فخرالحسن:

یہاں۔ میرے گھر میں؟ لیکن شاید شرافت علی اپنی بیوی کو یہاں لانا پسند نہ کرے۔

پانڈے:

یہ سب باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو۔

شرما:

میرے خیال میں تو آپ کہیں تنہائی میں اس سے بات کریں۔

پانڈے:

نہیں بھئی میں تم سب لوگوں کے سامنے ہی بات کروں گا تا کہ تمھارے شکوک بھی دور ہو جائیں ورنہ شاید تم یہ سوچو کہ خود میں نے...

فخرالحسن:

نہیں۔نہیں، مسٹر پانڈے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کی بات پر پورا یقین ہے۔

پانڈے:

نہیں بھئی افواہیں پھیلانے والوں کی کمی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ کہنے لگیں کہ میں نے اس معاملے کو بڑی ہوشیاری سے دبا دیا ہے کیونکہ شرافت علی سرکاری نوکر ہے۔(فخرالحسن سے) کیوں بھئی تمھاری بیگم گھر پر ہی ہیں؟

فخرالحسن:

جی ہاں۔ وہ دوسری خواتین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔

پانڈے:

اچھا تو خواتین کی محفل بھی یہیں جمی ہے... ہا... ہا... ہا۔

انسپکٹر یادو شرافت علی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

پانڈے۔ آؤ بھئی شرافت علی۔ تمھاری ساس تو ٹھیک ہیں نہ۔ آؤ یہاں بیٹھو۔

شرافت علی:

جی ہاں... لیکن...

پانڈے:

ارے بھئی بیٹھو نہ۔ (شرافت علی بیٹھتا ہے۔) ہاں تو عزیز من میں نے اس لئے تمھیں بلوایا ہے... کیونکہ ہم لوگوں کا خیال ہے... (شرافت علی بہت پریشان نظر آرہا ہے) کیا بات ہے شرافت علی؟ کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟

شرافت علی:

جی ہاں جناب عالی۔ میری درخواست ہے کہ آپ جلد از جلد میرا تبادلہ کسی اور شہر میں کرادیں۔

پانڈے:

ارے... ارے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمھارے کام سے بالکل مطمئن ہوں اور خود تم نے بھی کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔

شرافت علی:

معاف کیجئے گا جناب۔ یہاں مجھے ہر طرح سے پریشان کیا جارہا ہے اور اب یہ بات حد سے بڑھ چکی ہے۔

فخرالحسن:

کیا تمھارا اشارہ میری طرف ہے؟

شرافت علی۔ جی نہیں، صرف آپ ہی نہیں بلکہ سبھی لوگ مجھے پریشان کررہے ہیں۔ اپنی نجی زندگی میں یہ بیجا مداخلت اور تفتیش میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

پانڈے:

لیکن اس میں پریشان ہونے کی ایسی کیا بات ہے؟

شرافت علی:

معاف کیجئے گا یہ بیحد پریشان کن بات ہے۔ ذاتی رشتوں کی حفاظت اور تکریم کے لئے میں نے جو عمارت بڑی مشکل سے تعمیر کی تھی اس میں شگاف پڑ چکا ہے۔ اور اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ کل کے واقعے کے بعد میری ساس کس قدر پریشان اور دل شکستہ ہیں یہ آپ خود جا کر دیکھ سکتے ہیں۔

فخرالحسن:

لیکن اس میں ہم لوگوں کا کیا قصور ہے۔ وہ تو خود تم نے ہی...

شرافت علی:

آپ لوگ جس قسم کی اذیت ہم دونوں کو پہنچا رہے ہیں، اس کا اندازہ بھی آپ نہیں کرسکتے۔

پانڈے:

ارے بھئی اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دیکھو میں خود یہاں موجود ہوں اور میں نے تمھارے نقطہ نظر کو ہمیشہ ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شرافت علی:

جی۔ آپ کی ہمدردی کے لئے میں از حد ممنون ہوں۔

پانڈے:

اور یہ لوگ بھی تمھارے دشمن نہیں۔ صرف یہ کہ یہ حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

شرافت علی:

لیکن اس طرح تو یہ میری بوڑھی ساس کا خاتمہ کردیں گے اور خود میں بھی...

پانڈے:

خیر اب جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اور ان کے شکوک بھی دور ہوجائیں گے۔

شرافت علی:

ان کے شکوک کبھی دور نہیں ہوسکتے۔

پانڈے:

دیکھو جب تک تم اور تمھاری ساس ایک دوسرے کے برعکس بات کرتے رہیں گے ان کے شکوک قائم رہیں گے لیکن اگر کوئی تیسرا شخص تمھارے بیان کی تصدیق کرے گا تو پھر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

شرافت علی:

تیسرا شخص؟... یعنی کون...؟

پانڈے:

تمھاری بیوی۔

شرافت علی:

(حیرت سے) میری بیوی...؟ (انتہائی پریشانی اور غصے سے) نہیں نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

پانڈے:

کیوں نہیں ہوسکتا؟

شرافت علی۔ براہ کرم میری بیوی کو اس دلدل میں نہ گھسیٹیے۔ میں کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آخر آپ میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے؟

پانڈے:

میں نے ہمیشہ تمھاری ہی بات پر یقین کیا ہے لیکن اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر

مجھے بھی سوچنا پڑے گا۔

شرافت علی:

نہیں...نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

پانڈے:

آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ تمھاری بیوی میری بیٹی سمان ہے اور یہ لوگ بھی تمھارے خیر خواہ ہیں۔

شرافت علی:

(شدت جذبات کے ساتھ) کیا یہ کافی نہیں کہ ان لوگوں نے میرے سکون کو درہم برہم کر دیا ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ انھوں نے ایک مظلوم اور ضعیف عورت کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا ہے کہ اب میری بیوی کو بھی اس دلدل میں گھسیٹا جا رہا ہے؟... اچھا اب میں چلتا ہوں اور میں بہت جلد اپنے ٹرانسفر کی درخواست آپ کو پیش کروں گا۔

پانڈے:

(سختی سے) شرافت علی میں اس قسم کی گفتگو سننے کا بالکل عادی نہیں ہوں۔ تم میرے ماتحت ہو اور میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا تمھارا فرض ہے۔ (ذرا نرمی سے) اور تم یہ سمجھنے کی بھی کوشش کرو کہ اس میں تمھاری بھی بھلائی ہے۔

شرافت علی:

تو کیا یہ آپ کا حکم ہے؟

پانڈے:

ہاں یہی سمجھ لو۔ لیکن اس کے بعد تم بھی سکون کی زندگی گذار سکو گے۔

شرافت علی:

تو ٹھیک ہے میں اپنی بیوی کو لے کر یہاں آتا ہوں۔ لیکن آپ کو اس بات کی ذمہ داری لینی ہوگی کہ میری ساس اسے بالکل نہ دیکھیں کیونکہ یہ ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہوگا۔

فخر الحسن:

ٹھیک ہے۔ ہم اس بات کا پورا خیال رکھیں گے۔

پانڈے:

ویسے اگر تمھیں مسز شرافت علی کو یہاں لانے میں اعتراض ہو تو تم میرے بنگلے پر لا سکتے ہو کسی اور وقت۔

شرافت علی:

جی نہیں، میں انھیں ابھی اور یہیں لاتا ہوں تا کہ اسی وقت اس معاملے کا فیصلہ ہو جائے۔

پانڈے

تم چاہو تو میری کار لے جا سکتے ہو۔ ڈرائیور موجود ہے۔

شرافت علی:

جی نہیں۔ اس کی بھی ضرورت نہیں۔

شرافت علی جھنجھلائے ہوئے انداز میں باہر جاتا ہے۔

فخر الحسن:

شرافت علی کے تیور کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔

پانڈے:

اس کے رویے پر حیرت تو مجھے بھی ہوئی لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں خود بات کروں گا اور کچھ اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

فخر الحسن:

جناب وہ عام طور پر بھی کچھ اسی طرح بات کرتا ہے۔

پانڈے:

شاید اپنی بیوی کو یہاں لانے کا خیال اسے ناگوار گذرا۔ ورنہ بات تو وہ ہمیشہ بڑے سکون سے کرتا ہے۔

فخر الحسن:

یعنی قید خانے سے نکال کر کھلی ہوا میں لانے کا خیال اسے گراں گذرا۔

پانڈے:

ہو سکتا ہے اس میں شک کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہو یا شاید یہ اس کی والہانہ محبت کا نتیجہ ہو۔

شرما:

میں نے سنا ہے اس نے کوئی نوکر بھی نہیں رکھا ہے اور اس کی بیوی گھر کا سب کام خود کرتی ہے اور سودا سلف اور باہر کا کام وہ خود کرتا ہے۔

پانڈے:

نوکر تو وہ اس لئے بھی نہیں رکھ سکتا کہ اسے دو دو گھروں کا خرچ اٹھانا پڑ رہا ہے۔

شرما:

لیکن پھر بھی میرے لئے یہ بات قابل حیرت ہے کہ اس کی بیوی ایک غیر عورت کے لئے یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی۔

رازداں اسٹیج کے سامنے والے حصے میں آکر حاضرین کو مخاطب کرتا ہے۔

رازداں:

(حاضرین سے) لیکن سوال تو یہی ہے کہ اس کی بیوی عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے بھی یا نہیں۔

ڈرائنگ روم سے دبے دبے شور کی آوازیں آتی ہیں۔ فاخرہ بیگم گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے۔

فاخرہ بیگم:

فخرل صاحب۔ مسز شفقت۔ میرا مطلب ہے کہ وہ یکا یک آ گئی ہیں۔ اف خدایا اب میں کیا کروں؟

فخر الحسن:

(سختی سے) انھیں یہاں بلایا کس نے؟

فاخرہ بیگم:

انھیں جس طرح بھی ہو جلد واپس بھجواؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔ شرافت علی کسی وقت

بھی اپنی بیوی کو لے کر یہاں آسکتا ہے۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکے گا اور الٹا ہم لوگوں کو الزام دے گا۔

پانڈے:

جی ہاں مسز فخر الحسن۔ کسی طرح جلدی انہیں واپس بھجوائیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر مسز شفقت نظر آتی ہیں۔ وہ بیحد پریشان ہیں۔ اور تھر تھر کانپ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ دو تین خواتین اور بھی اندر آتی ہیں۔

فخر الحسن:

(کھڑے ہو کر سختی سے) مسز شفقت آپ مہربانی سے اپنے گھر جائیے۔ آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتیں۔

مسز شفقت:

(روتے ہوئے) کیوں نہیں ٹھہر سکتی؟ آخر کیوں؟ (فاخرہ سے) بہن آپ ہی ان لوگوں کو سمجھائیے۔ میرے دل کا حال آپ ہی سمجھ سکتی ہیں۔

فاخرہ بیگم:

نہیں مسز شفقت اس وقت تو مجھے معاف کیجئے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس وقت کلکٹر صاحب بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

مسز شفقت:

(پانڈے سے) جناب عالی آپ ہی میری مدد کیجئے۔ میں تو خود ہی آپ کے پاس آنے والی تھی۔

پانڈے:

اس وقت تو مجھے معاف کیجئے مسز شفقت۔ میں پھر کسی وقت خود آپ سے مل کر آپ کی شکایت سنوں گا۔

مسز شفقت:

ٹھیک ہے آپ کا حکم ہے تو میں جاتی ہوں۔ بلکہ میں کل ہی اس شہر سے بہت دور چلی جاؤں گی۔

فخر الحسن:

ہمارا یہ مطلب نہیں تھا مسز شفقت۔ لیکن اس وقت آپ کا یہاں سے چلا جانا ہی مناسب ہے۔

مسز شفقت:

لیکن کیوں؟ اس سے پہلے تو آپ لوگ اس قدر رکھائی سے پیش نہیں آئے۔ آخر بات کیا ہے؟

فخر الحسن:

(سختی سے) بات صرف یہ ہے کہ آپ کا داماد کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ آپ.

مسز شفقت:

اچھا تو میں جاتی ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گی کہ خدا کے لئے آپ ہمارے ذاتی معاملات میں اس قسم کی دلچسپی لینا چھوڑ دیں۔ اس طرح آپ ہماری مدد نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہمیں شدید اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو بہت جلد مجھے یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے گا۔ اور میں اس مسرت سے بھی محروم رہ جاؤں گی جو مجھے اپنی اکلوتی لڑکی کو دور سے دیکھ کر حاصل ہوتی ہے میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے بھی ترستی رہوں گی۔

پانڈے:

نہیں آپ کو شہر چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد آپ سے بات کروں گا۔

فاخرہ بیگم:

ہاں پیاری بہن آپ اس وقت چلی جائیے۔ ورنہ آپ کے داماد کو ہم سے شکایت پیدا ہوگی۔

مسز شفقت:

آپ لوگ کیوں میرے داماد کو الزام دے رہے ہیں؟ وہ خود ہی بہت پریشان ہے۔

پانڈے:

دیکھئے محترمہ مجھے خود آپ کے داماد سے ہمدردی ہے۔ اور میرے ہوتے ہوئے کوئی اسے پریشان نہیں کر سکتا۔

مسز شفقت:

بہت بہت شکریہ کہ آپ ہماری صورت حال کو سمجھتے ہیں۔ اور امید ہے کہ آپ کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

پانڈے:

نہیں مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔

مسز شفقت:

جناب عالی میں نے بار بار ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ہمارے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہ لیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں ہم لوگ اسی حال میں خوش ہیں۔ ہمارے سلسلے میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری بیٹی بھی مطمئن ہے۔ براہ کرم آپ بھی ان لوگوں کو سمجھائیے ورنہ میں اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی۔

عین اسی وقت کمرے میں ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو جاتا ہے اور کئی لوگوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مثلاً: وہ آگئی۔" اف خدا اب کیا ہوگا۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔"

مسز شرافت علی (صبا پنہاں اسرار فاطمہ) داخل ہوتی ہے۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس ہے اس کے چہرے پر ایک باریک سیاہ نقاب پڑی ہے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ عام مسلمان عورتوں کی طرح برقعہ نہ اوڑھے ہو جس سے اس کے ایک پردہ دار مسلمان خاتون ہونے کا تاثر قائم ہو۔ بلکہ وہ سیاہ ساری یا سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس ہو۔ ساری زیادہ مناسب ہوگی۔ سر پر ایک باریک سیاہ نقاب اس طرح ڈالا جائے کہ اس سے اس کا چہرہ ڈھک تو جائے لیکن اس باریک نقاب کے نیچے اس کا چہرہ دھندلا نظر آتا ہو۔ جو اداکارہ مسز

شرافت علی کا رول کرے اس کا قد لمبا جسم سڈول اور رنگ گورا ہو۔ اور اس کا میک اپ اس طرح کیا جائے کہ اس باریک نقاب کے نیچے اس کے نقش ونگار بہت دلکش معلوم ہوں۔ اور حاضرین میں بھی قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ نقاب اٹھائے تاکہ اس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا جاسکے۔

مسز شفقت:

(جو اسے دیکھ کر جذبات سے مغلوب ہوگئی ہے) آہ۔ میری بیٹی۔ پنہاں۔ میری بیٹی۔ (دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھتی اور اسے والہانہ انداز سے لپٹا لیتی ہے۔)

شرافت علی:

اسرار فاطمہ۔ (دوسروں سے مخاطب ہوتا ہے) دیکھا آپ نے؟ میں نہ کہتا تھا کہ یہی ہوگا۔ لیکن آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی۔

مسز شرافت علی:

(شرافت علی سے) کوئی بات نہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں... (آہستہ آہستہ خود کو مسز شفقت کی گرفت سے آزاد کرتی ہے۔ اس کے لہجے اور انداز میں سکون اور سنجیدگی نمایاں ہے۔) کوئی بات نہیں... اب آپ دونوں جائیے۔ بہت جلد... خدا حافظ۔

شرافت علی:

(مسز شفقت سے نرم لہجے میں) چلئے اب ہم لوگ چلتے ہیں۔

شرافت علی اور مسز شفقت ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ دونوں رو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے آنسو بھی خشک کرتے جاتے ہیں... کمرے میں اب مکمل خاموشی ہے۔ اور سب لوگ متاثر نظر آرہے ہیں۔ لیکن ان کا جوش وخروش اب ٹھنڈا ہو چکا ہے اور ان کے چہروں پر اب حیرت اور تاسف کے تاثرات ہیں۔ مسز شفقت اور شرافت علی کے جانے کے بعد اب لوگوں کی نظریں نقاب پوش خاتون پر ہیں۔ چند لمحے بعد وہ کمرے میں جمع لوگوں کو مخاطب کرتی ہے۔ اس کا لہجہ شدت احساس کے باوجود سنجیدہ اور پروقار ہے۔

نقاب پوش خاتون:

خواتین اور حضرات... آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

کلکٹر پانڈے:

(جو بہت متاثر معلوم ہوتا ہے) ہمیں آپ لوگوں سے گہری ہمدردی ہے اور ہم آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہیں لیکن پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ آپ دو الفاظ میں ہمیں بتادیں کہ...

نقاب پوش خاتون:

کہ حقیقت کیا ہے...؟

پانڈے:

جی ہاں... بالکل یہی...

نقاب پوش خاتون:

(وہ اپنے الفاظ آہستہ آہستہ اور زور دے کر ادا کرتی ہے) تو سیدھے سادے الفاظ میں حقیقت یہ ہے کہ میں مسز شفقت کی بیٹی ہوں... اور...

کئی لوگ:

(اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) آہ... آخر کار...

نقاب پوش خاتون:

(اسی لہجے میں) اور میں مسز شرافت علی کی دوسری بیوی ہوں۔

سب لوگ:

(پریشانی سے) لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

نقاب پوش خاتون:

میں مسز شفقت کے لئے ان کی اکلوتی بیٹی ہوں اور شرافت علی کے لئے ان کی دوسری بیوی ہوں۔

فخرالحسن:

اور آپ... آپ خود کون ہیں؟

نقاب پوش خاتون:

میں خود۔ خود کچھ بھی نہیں... کچھ بھی نہیں۔

پانڈے:

نہیں۔ نہیں مسز شرافت علی... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ خود تو ان میں ایک ہی ہوسکتی ہیں۔ اگر آپ شرافت علی کی دوسری بیوی ہیں تو مسز شفقت کی بیٹی نہیں ہوسکتیں اور اگر آپ ان کی بیٹی ہیں تو پھر شرافت علی کی دوسری بیوی نہیں ہوسکتیں... آخر ہم آپ کو کیا سمجھیں... آپ خود کیا ہیں؟

نقاب پوش خاتون:

میں خود کیا ہوں؟ میں وہی ہوں جو آپ سمجھنا چاہیں جو آپ خود محسوس کریں۔ اور کچھ بھی نہیں۔

نقاب پوش خاتون آہستہ آہستہ صدر دروازے سے باہر جاتی ہے۔ اس کے انداز میں سنجیدگی، وقار اور گہری اداسی ہے۔ اسٹیج پر سب لوگ بالکل مبہوت ہیں۔ رازداں آہستہ، آہستہ اسٹیج کے سامنے والے حصے میں آتا ہے اور حاضرین کو مخاطب کرتا ہے۔

رازداں:

(حاضرین سے) سنا آپ نے، یہی سچائی ہے۔ یہی حقیقت کی آواز ہے۔ حقیقت کا نقاب کس نے دیکھا ہے؟ اور اب ان لوگوں کو دیکھئے جو حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانا چاہتے تھے۔

(رازداں گہری سوچ میں غرق آہستہ آہستہ اسٹیج سے نیچے اترتا ہے اور حاضرین کے درمیان سے ہوتا ہوا تھیٹر ہال سے باہر نکلتا ہے) ☆☆☆

زاہدہ زیدی

شمارہ ۲۵۶،
مئی ۲۰۰۲

یہ کیوں ہے؟
یہ کیا ہے؟
یہ بنتے بگڑتے ہوئے دھندلے خاکوں کا اک کارواں
ہے
کہ بیتی ہوئی ساعتوں کا انوکھا بیاں ہے
کہ یہ سوختہ خواہشوں کا دھواں ہے
جو احساس کے گہرے ساگر میں
بے بادباں ایک کشتی کی مانند
موہوم منزل کی جناب رواں ہے

کبھی ڈوبتا اور ابھرتا کبھی
کبھی چوٹ کھاتا، سنبھلتا کبھی
کبھی شبنمی آنسوؤں میں نہاتا
لہو رنگ پھولوں کی مانند ہنستا مہکتا کبھی
یہ کیوں ہے... یہ کیا ہے

کہ دھندلی خلاؤں کے ساگر میں
موہوم منزل کی جانب رواں ہے
اسے ذہن کی بستیوں میں اتاروں
کہ لفظوں کے بلوریں ساغر میں ڈھالوں
بصیرت کی آگہی میں اس کو تپا کر
تخیل کی مشاطگی سے سنواروں
کہ اس کو بھٹکنے دوں
بس یونہی
بنتے بگڑے ہوئے بادلوں کی طرح
کہ اس طرح سے بھی تو یہ
میری تنہائیوں میں گھلا اور ملا ہے
کڑے کوس کی اس مسافت میں
یہ بھی بڑا آسرا ہے۔

زبیر رضوی

رقیب شوق

شمارہ ۱۳،
جون ۱۹۶۷

ہم ابھی کچھ دیر پہلے ساتھ تھے
شہر سارا یوں لگا تھا
جیسے اپنے ہی تعاقب میں
کرن سورج کی تھامے چل رہا ہے
اس کی آنکھیں بن کے پتھر اٹھ رہی تھیں
قرب کے آئینے چھن سے ٹوٹ کر ریزہ ہوئے تھے
ہونٹ اپنے سل گئے تھے
جسم اپنے جل گئے تھے
ہم بچھڑ کے نامرادوں کی طرح واپس ہوئے تو
شہر سارا اجنبی سا ہو گیا ہے
اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہے

عاقبت اندیش بیٹے

شمارہ ۱۲۱،
جولائی، اگست ۱۹۸۱

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
ہمیشہ ان کے ہونٹوں پر
مقدس آیتوں کا ورد رہتا تھا
ہمیشہ ان کی پیشانی
ریاضت اور عبادت کی نشانی کو لئے
روشن رہا کرتی
وہ پانچوں وقت
مسجد کے میناروں سے اذاں دیتے
وہ میلوں پا پیادہ
تیز دھوپوں میں سفر کرتے
خدا کی برتری، اس کی عبادت کے لئے
لوگوں میں جا کر
رات دن تبلیغ کرتے
لوگ ان کو مرحبا کہتے
حکایت ہے
وہ برسوں بعد
جب اپنے گھروں کو لوٹ کر آئے
انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی
ان کے بیٹوں نے
انھیں بالکل نہ پہچانا
گھروں کے آنگنوں کی باہمی تقسیم کر لی تھی
مکانوں کے نئے نقشے بنائے تھے
اور ان کی ساری چیزیں وہ
غریبوں اور محتاجوں میں جا کر
بانٹ آئے تھے!

زبیر شفائی

شمارہ ۱۶۹،
جون جولائی ۱۹۹۳

طلسماتی فضا تخت سلیماں پر لئے جانا
مرے گھر میں اترتی شام کا منظر لئے جانا

وہ اسباب شکست و فتح خود ہی جان جائے گا
علم جب ہاتھ سے چھوٹے تو میرا سر لئے جانا

گرج کے ساتھ بجلی بھی چمکتی ہے پہاڑوں میں
مسافر ہے کہ طوفانی ہوا کو گھر لئے جانا

کھلے جاتے ہیں جیسے دل کے سارے بند دروازے
اب ان قدموں کی آہٹ کیا ساعت پر لئے جانا

وہاں سنتے نہیں ہیں دیکھتے ہیں زخم پیشانی
اگر جانا تو آئینہ پس جوہر لئے جانا

گلی کی خاک مٹھی میں لئے ہیں چاہنے والے
زبیر اس کیمیا کو تم بھی چٹکی بھر لئے جانا

شمارہ ۱۹۸،
ستمبر ۱۹۹۶

جبیں سے ناخن پا تک دکھائی کیوں نہیں دیتا
وہ آئینہ ہے تو اپنی صفائی کیوں نہیں دیتا

دکھائی دے رہے ہیں سامنے والوں کے ہلتے لب
مگر وہ کہہ رہے ہیں کیا سنائی کیوں نہیں دیتا

سمندر بھی تری آنکھوں میں صحرا کی طرح گم ہے
یہاں وہ تنگی جا کی دہائی کیوں نہیں دیتا

جب اس نے توڑ دی زنجیر، دیواریں گرادی ہیں
اسیری کے تصور سے رہائی کیوں نہیں دیتا

وہ خود سے بخش دیتا ہے جہان آب وگل مجھ کو
طلب کے باوجود آخر گدائی کیوں نہیں دیتا

اب آنکھوں سے نہیں ہاتھوں سے چھونا چاہتا ہوں
مجھے وہ وصل آمیزہ جدائی کیوں نہیں دیتا

زبیر اک پور انگلی بھی نہیں چھونے کو ملتی ہے
وہ اپنے ہشت پہلو میں رسائی کیوں نہیں دیتا

شمارہ ۲۰۴،
مارچ ۱۹۹۷

قمر گزیدہ نظر میں ہالہ کہاں سے آیا
چراغ بجھنے کے بعد اجالا کہاں سے آیا

ندی میں وہ اور چاند ہیں ایک ساتھ روشن
زمیں پر آسمان والا کہاں سے آیا

یہ غنچہ غنچہ سیاہ بھونرے کی بوسہ خواہی
سواد گلشن میں ہم نوالہ کہاں سے آیا

فضا کی آلودگی تھی پہلے ہی نیم قاتل
یہ دل میں ایک اور داغ کالا کہاں سے آیا

قریب تر دوستوں سے ہونے کی آرزو میں
ابھی ابھی پشت پر یہ بھالا کہاں سے آیا

میں خواب میں بھی تری گلی سے نہیں گزرتا
یہ دونوں تلووں میں سرخ چھالا کہاں سے آیا

کہاں گیا سکہ سکہ قارون کا خزانہ
زبیر ہاتھوں میں یہ پیالہ کہاں سے آیا

زیب غوری

شمارہ ۹۱،
جولائی تا ستمبر ۱۹۷۳ (نذر بانی)

رہا ہو کم سواد دل تجھے شکست ہو گئی
بنائے قید آرزو ہی لخت لخت ہو گئی
بہت اڑی ہے سر پٹکتی میری خاک چار سو
پھر ایک روز خود ہی ساز برگ و دشت ہو گئی
سواد شب میں ساتھ ساتھ جانے کون شے تھی وہ
میں خوف سے چمٹ گیا تو وہ درخت ہو گئی
وہی ہوائے نرم حرف و سبزہ رنگ و مشکبو
نواح جسم و جاں سے گذری تو کرخت ہو گئی
چنار شاخ زر نگار دھوپ میرے سر پہ تھی
غبار بام و در بنا زمین تخت ہو گئی
چہار سمت اک حصار جان سنگ سخت تھا
مری صدائے دل صدائے بازگشت ہو گئی
فضا میں بس مری انا کا ارتعاش رہ گیا
فلک دو نیم ہو گیا زمین سخت ہو گئی
بہت بسیط دشت جاں تھا زیب، پھر مری نوا
کچھ اور پست، اور پست، اور پست ہو گئی

شمارہ ۹۸
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

سفید پھول روشنی تھی راہ میں
مگر بچا ہی کون تھا سپاہ میں
جھکی تھی چھت پہ نیم کی ہری گھٹا
چمک رہے تھے بام و در تباہ میں
حصار تھا لہو کا اور شام تھی
گھنے گھنے درختوں کی پناہ میں
کھلی تھی آنکھ اور کسی عدم کا نقش
ابھر رہا تھا رات کے سیاہ میں
دمک رہی تھی سرخ آنکھ بت کی زیب
سیہ سپید سب تھا اس نگاہ میں

زیب غوری

شمارہ ۹۸،
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

میرا عدم وجود بھی کیا زر نگار تھا
چاروں طرف خلا میں چمکتا غبار تھا

ساحل بنی نگاہ کی حد، فاصلے مٹے
گرداب موج دود مکاں کا حصار تھا

پی کر لہو سیاہ ہوئی کشت آرزو
کیا دیکھتے کہ خاک کا دعویٰ بہار تھا

موجوں میں ڈوبتی سرخی تھی شام کی
دل دشت پر سکوت تھا دریا قرار تھا

اک بوجھ اٹھائے شام کو لوٹا ہوں میں نڈھال
میں اپنے دام شوق میں کیا خود شکار تھا

دل کا سراغ کیا کہ جہاں تک نگاہ کی
نیرنگ نقش رفتۂ پاے فرار تھا

میں اک شجر سکوت تھا اور میری چھاؤں میں
گرتا ہوا صداؤں کا اک آبشار تھا

خورشید و ماہ میرے لئے اک فسانہ تھے
تاریک جنگلوں کا میں لیل و نہار تھا

شعلے دراز دست تھے اور میرے سامنے
خورشید شام دشت کا تاریک غار تھا

میں خاک دل بکھیر رہا تھا ہوا میں زیب
اور اس سے بے خبر تھا کہ اس میں شرار تھا

زیب غوری

شمارہ ۹۸،
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

سیاہ پیچیدہ سبز تر میں چھپا ہوا تھا
پتہ چلا کیا خزانہ خواب زیر پا تھا
زوال تھا زرد کا ہوا سنسنا رہی تھی
لہو کے خاموش میں کوئی شعلہ بجھ رہا تھا
چمک رہا تھا فلک کا شفاف نیلگوں میں
درون جاں داغ آرزو کا ابھر رہا تھا
صفت خد و خال میں وہی شکل سامنے تھی
اتر گیا میرے ذہن سے اس کا نام کیا تھا
نشیب تھا اور عقب میں چٹان گر رہی تھی
میں بے تحاشا گھنے سیہ میں اتر رہا تھا
سفید ہاتھوں کی روشنی زیب ہاتھ میں تھی
لبوں کو چھوتا ہوا نشہ بے ثبات کا تھا

شمارہ ۱۰۶،
نومبر ۱۹۷۷ تا جنوری ۱۹۷۸

جھکے ہوئے پیڑوں کے تنوں پر چھاپ ہے چنچل دھارے کی
ہولے ہولے ڈول رہی ہے گھاس ندی کے کنارے کی

کسی ہوئی مردنگ سا پانی ہوا کی تھاپ سے بجتا ہے
لہر ترنگ سے اٹھتی ہے جھنکار کسی اکتارے کی

کھلی فضا میں نکلے تو رنگ یکسانی دور ہوا
ایک ہوا کے جھونکے نے رنگت بدلی انگارے کی

ابر کی تہ میں بجلی چمکی اس کا تبسم تھا مگر اور
لفظوں میں پہچان نہ پائے تھی جو بات اشارے کی

دیکھ رہا ہوں بند خدا کی مٹھی ہونے والی ہے
صبح کی موتی پر اب بھی ہے دھیمی آنچ ستارے کی

سخت چٹانیں، شیشہ پانی، گل بوٹے، سب ضائع تھے
سنگ و شجر کو معنی دے گئی تان کسی بنجارے کی

ہجر کی نیرنگی کے منظر پس منظر کیا کیا دیکھوں
کتنی سہانی رات پڑی ہے اور فرصت ہے شرارے کی

باسی پھول کی پتی پتی بکھری ہاتھ لگاتے ہی
دل کی اداسی کو چھیڑا تو خاک اڑی بیچارے کی

ہم بھی پہاڑوں کو دیکھیں گے اڑتا روئی کے گالوں سا
بوجھ زمیں کچھ اور اٹھالے، ہے بس دیر اشارے کی

بہت غنی تھا اپنا دل بھی پہلے پہلے امیدوں سے
ہم نے بھی اونچی کر رکھی تھی اک دیوار سہارے کی

سرمایہ لاحاصل کا ہے زیب اپنا فن اپنا ہنر
ہم نے تجارت جاں کے کی ہے سچ پوچھو تو خسارے کی

زیب غوری

شمارہ ۱۱۸،
نومبر، دسمبر ۱۹۸۰

اک پیلی چمکیلی چڑیا کالی آنکھ نشیلی سی
بیٹھی ہے دریا کے کنارے میری طرح اکیلی سی

اک ٹک مجھ کو دیکھ کے اڑ گئی سرمئی شام دھندلکے میں
لیکن پیچھے چھوڑ گئی اپنی آواز نکیلی سی

جب میں نشیب رنگ و بو میں اترا اس کی یاد کے ساتھ
اوس میں بھیگی دھوپ لگی ہے نرم ہری لچکیلی سی

کس کو خبر میں کن رستے کی دھول بنوں یا پھول بنوں
کیا جانے کیا رنگ دکھائے اس کی آنکھ پہیلی سی

تیز ہوا کی دھار سے کٹ کر کیا جانے کب گر جائے
لہراتی ہے شاخ تمنا کچی بیل چنبیلی سی

جس ساحل پر سارے موتی چھوڑ کے پھر میں آیا ہوں
دور سے اب بھی نظر آتی ہے وہ پٹی چمکیلی سی

کم روشن اک خواب آئینہ اک پیلا مرجھایا پھول
پس منظر کے سناٹے میں ایک ندی پتھریلی سی

دھوکا کھانے والے نہیں ہم زیب تری اس سادگی کا
مطلب گہری آنکھوں جیسا باتیں کھلی ہتھیلی سی

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

ہو چکے گم سارے خدو خال منظر، اور میں
پھر ہوئے ایک آسماں ساحل سمندر اور میں

ایک حرف راز دل پر آئینہ ہوتا ہوا
اک کہر چھائی ہوئی منظر بہ منظر اور میں

میں بھی گویا حلقۂ اصنام بے پروا میں ہوں
نا تراشیدہ چٹانوں کے ہیں پیکر اور میں

دیکھنے والے مجھے خود سے الگ کر کے نہ دیکھ
یہ جہاں تو پھر بھی بن جائے گا مٹ کر اور میں

چھیڑ کر جیسے گذر جاتی ہے دوشیزہ ہوا
دیر سے خاموش ہے گہرا سمندر اور میں

غسل کر کے کوئی لیٹا ہے سنہری دھوپ میں
موتیوں کا ڈھیر ہے ساحل کے اوپر اور میں

شام ہی سے اٹھ گئی محفل ستاروں کی مگر
رات ہے میرے چراغوں سے منور اور میں

میری مشت خاک تیرے ہاتھ میں ہے اور تو
تیرے ساتوں آسماں ساتوں سمندر اور میں

کون میری خود سری سے لے رہا ہے انتقام
کس کی ٹھوکر میں ہے میرا کاسۂ سر اور میں

سوکھے پیڑوں کے تلے سو جاؤں لیکن یہ فلک
ایک تیغ بے اماں ہے میرے سر پر اور میں

یہ مقام بے نیازی راہ سے ہٹ کر سہی
اس جگہ وہ بھی چلے آتے ہیں اکثر اور میں

محفل شعر و سخن کچھ دیر کو رہتی ہے گرم
بیٹھ جاتے ہیں کبھی میرے کبوتر اور میں

کس قدر اک دوسرے سے لگتے ہیں مانوس زیب
ناریل کے پیڑ، یہ ساحل کے پتھر، اور میں

احتیاط/احتجاج

ساجد حمید

شمارہ ۱۷۸،
اکتوبر ۱۹۹۵

گھٹنوں اور کہنیوں کے بل
چلتے چلتے
جب سائے گھنے ہو جاتے ہیں
اور... جنگل بولنے لگتا ہے
تب
سانسوں کی سرسراہٹ سے بھی جی
لرزنے لگتا ہے
روشنی چرا کر
اپنی مٹھیوں میں قید کرنے والے
جب قہقہے اچھالتے ہیں
تب اندھیرے
اور گہرے ہو جاتے ہیں

رینگنا موقوف مت کرو
سفر جاری رہے
گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا حماقت
نہیں

کیونکہ
یہ عادت نہیں مجبوری ہے

سورج جب
اپنے ہاتھ دراز کرنے لگتا ہے
تب
انکار اور اقرار ساتھ ساتھ
چلتے ہیں
انجان راہیں متعین کرنے
کے بعد
چیخنا چلانا عبث ہے
احتجاج جاری رہے
اس احتیاط کے ساتھ
کہ
آوازوں پر خراشیں پڑنے
نہ پائیں

ساجدہ زیدی

شمارہ ۲۵۶،
مئی ۲۰۰۲

یہ بادِ سحر کا اشارہ
سرمئی شام کا یہ تنہا ستارہ
یہ چڑیوں کی چہکار
بادل کی یلغار
یہ جوے کہستاں کی رفتار
یہ طائرِ نوا سنج کی
آسمانوں میں پرواز
ہستی کی گہرائی میں گونجتی
حرفِ اقرا کی آواز...

یہ سمندر کا حیرت کدہ
تپتے صحراؤں کا حسنِ عریاں
یہ سات آسمانوں پہ
سیارگاں کی سبکسار لرزش
کوہساروں کے اسرار...اور
برف زاروں کی شفاف رعنائیاں
عناصر کی نیرنگیاں
دستِ قدرت کی صناعیاں
شرق سے غرب
آکاش سے خاک تک

حرفِ کن کی سحر کاریوں کا سماں...
یہ دنیاے وحدت
کہ جس نے مجھے درد کا ساز دے کر
میری آواز کو
حسنِ فطرت کا اعجاز دے کر
مری روح میں
نور و نغمہ کی اک سمفنی سی جگا دی

میں اس رنگ اور نور کے کارخانے میں
اک چشمِ حیراں بھی ہوں
مست و رقصاں بھی ہوں
اس کے جلوؤں میں شامل بھی ہوں
اس کی رفتار و حرکت کی حامل بھی ہوں

مرے دل میں جو درد کی راگنی ہے
مرے حرف و صوت و صدا میں جو وجدان کی روشنی ہے
اسی بزمِ اسرارِ فطرت کی جلوہ گری ہے
اس معنیِ بیکراں کی خلش ہے
تمنا کی اس آتشِ جاوداں کی تپش ہے

ساجدہ زیدی

شمارہ نمبر ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

دیارِ عشق میں اک شمعِ سوزاں ہوں
وہ... جس کی لو پہ پروانے نہیں جلتے
جو دل کے ساتھ
ہر لحہ پگھلتی ہے
جو ققنس کی طرح
خود اپنی ہی آتش میں
اپنے نغمۂ دلدوز کے ہمراہ جلتی ہے
جو... اپنی راکھ سے
پھر اپنی ہستی کو جنم دیتی ہے
اپنے نالہ ہائے درد سے
پھر عشق کا طوفاں اٹھاتی ہے۔

میں ققنس ہوں

اسی طوفان میں رہتی ہوں
انھیں موجوں میں بہتی ہوں
جو دل کے آخری گوشے میں
شعلوں کی زباں سے
عشق کا عنوان لکھتی ہیں
محبت میری ہستی ہے
محبت میرا نغمہ ہے
میں اک ہجرِ مسلسل ہوں...
دیارِ عشق ہی میری بقا، میری فنا کی آخری منزل ہے
میری ہر تلاش و جستجو
ہر آرزو... ہر اضطراب دل کا حاصل ہے

میں ققنس ہوں مرا نغمہ جلا دینے پہ مائل ہے
میں ققنس ہوں... مرا مرکز مرا آتش بجاں دل ہے

ساحل احمد

شمارہ ۲۴۲،
دسمبر ۲۰۰۲

بیداری

بیداری کی اک لہر
جسم وجاں کے گرداگرد موجود تھی
لیکن میں نیند کی آغوش میں تھا
وہ نیند مجھ کو پیاری تھی
بہت پیاری تھی
مگر اتنی نہیں کہ میں خود سے باہر ہو جاؤں
اور اپنی پہچان کھو دوں
موم ہو جاؤں

حرب و ضرب

کسی نے کہا صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
وہ شجر احساس کا پھل ہے
ٹوٹ جائے تو ترشی ہی ترشی
نہ ٹوٹے تو بے صبری ہی بے صبری
پھل جلدی پکتا نہیں
پک جائے تو گر جائے
نہ پکے تو ہرا ہی رہے

ہوا

ہوا نے آہستہ سے دروازہ کھولا
پردہ ہلا
میں نے پوچھا کس لئے آئی ہو
شمع درد طاقچے پر نہیں
پلکوں پر ہے
درد کی تمازت ہے
بوند بوند جل رہی ہے
پگھل رہی ہے

سایہ

جلتی آنکھوں کا سایہ
جب کاغذ پر پڑتا ہے
بوند لہو کی
پلکوں پر ہی رک جاتی ہے
شاخ شجر بھی جھک جاتی ہے
چلتے چلتے راہی بھی تھک جاتا ہے
کیا سایہ سو جاتا ہے

سارا شگفتہ

شمارہ ۱۲۸،
فروری تا اپریل ۱۹۸۳

غیب کی جنگلی بیل کو گھر تک کیسے لاؤں
کون سی دعا مانگوں
لوگ ناخن گننے لگتے ہیں
میں پرواز کے سائے سے ڈر جاتی ہوں
میں اپنی نگرانی میں رہی اور گم ہوتی چلی گئی...
اور کتنوں نے جب چاند دیکھا
اپنی پوشاک بھول گئے
دیواریں جوڑتے جوڑتے اپنا گھر بھول گئے...
بین کرنے والوں نے میری زبان چھین لی
اور ادھ کھلے ہاتھ سے مجھے قبول کیا
میں جنگل کی پیدائش ہوں
مجھے دیکھنے والا جانے کہاں مر گیا ہے...
انسان کے دو جنم ہیں
پھر شام کا مقصد کیا ہے:
کیسے ہاتھ اور دعا
ہاتھ دعا کا جبر ہیں تو انسان کس کا جبر ہے
میں سایہ زمین سے پھینک دیتی
لیکن یہ خدا کا اصول نہ تھا...
ہم خود کو دہرا نہیں سکتے
کہ قاتل کی سزا مقتول نہیں...
اے میرے سرسبز خدا
خزاں میں بھی میں نے تجھے یاد کیا
میں آنکھوں سے مرتی تو قدموں سے زندہ ہو جاتی
اب تیرے بوجھ سے دھنس رہی ہوں
تنہائی مجھے شکار کر رہی ہے
اے میرے سرسبز خدا...

شمارہ ۱۲۸،
فروری تا اپریل ۱۹۸۳

جاؤ! جانماز سے اپنی پسند کی دعا اٹھا لو
ہر رنگ کی دعا میں مانگ چکی...
باغباں، دل کا بیج تیرے پاس بھی نہ ہوگا
بدن سے پوری آنکھ ہے میری
نگاہ جوتنے کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے...
میری بارشوں کے تین رنگ ہیں
ٹوٹی کمان پہ ایک نشان خطا کا پڑا ہے...
ہم چاہیں تو سورج ہماری روٹی پکائے
اور ہم سورج کو تندور کریں:
فیصلہ چکا دیا، خطا اپنی بھول گئے
نظر کرنے آئے تھے، چٹکی بھر آنکھ...
تیری گلیوں میں تو بازار ہیں
زمین آنکھ چھوڑ کر سمندر میں سو رہی
جنگل تو صرف تلاش ہے
گھر تو کائنات کے پچھواڑے ہی رہ گیا...
شکار کمان میں پھنس پھنس کر مرا۔ تم کیسے شکاری:
آنکھیں پانیوں سے جل رہی ہیں
جسم زندگی کی ملازمت میں ہے
ہم نے آنکھوں سے شمشیر کھینچی
اور اس کی تصویر بنائی
رات گود میں سلائی
اور چاند کا جوتا بنوایا
ہم نے راہ میں اپنے پیروں کو جنا...

ساغر جیدی

شمارہ ۱۰۲
دسمبر ۱۹۷۶، جنوری فروری ۱۹۷۷

ہر اک جانب یہ میری بے دہانی حق بجانب ہے
کہ خود پر بے معانی حکم رانی حق بجانب ہے
نواحِ دشت و در ہے کرمک شب تاب کا منظر
شہ مغرب کی یہ جلوہ فشانی حق بجانب ہے
عدد سے بڑھ کے رفعت چاہتی ہے قوت لفظی
لہٰذا کاہنوں کی سحر رانی حق بجانب ہے
نہ تم محفوظ ہو مجھ سے نہ میں مبہوت ہوں تم سے
تو پھر اے نکتہ دانو، نکتہ دانی حق بجانب ہے
تضاد رنگ و سمت و ذائقہ ہے قطرے قطرے میں
جدا ہر نہر انسانی کا پانی حق بجانب ہے
حرارت سے معرا ان لبوں کی جنگ میں ساغر
خلاف شم میری بدگمانی حق بجانب ہے

شمارہ ۱۰۷
فروری تا اپریل ۱۹۷۸

مجھ سے تمھیں شبنمی نکاس ملے گا
تجھے میں فطرتی لباس ملے گا

میں وہ زمستاں کہ مرے قامت وقد میں
گرم ہواؤں کا اقتباس ملے گا

سوچیں تو شیشے میں پیش آئے گی دقت
دیکھیں تو بے رنگ انعکاس ملے گا

شہر ہے بھونروں کا یہ، یہاں گل شبو
شہد بہ کف موگرا شناس ملے گا

شب میں کسی کا معائنہ میں کروں تو
دن کا معزز اخی اداس ملے گا

ایک عدد شیر کی دہاڑ سے ساغر
قاطبۂ دشت بدحواس ملے گا

ساغر جیدی

شمارہ ۱۳۲

مارچ تا اگست ۱۹۸۴

صبح کا برگشتہ رنگ ہم پہ مسلط نہ کر
خدشۂ زخمی پلنگ ہم پہ مسلط نہ کر
آب و ہوا سے الگ نشو و نما سے پرے
مدح و ستائش کی جنگ ہم پہ مسلط نہ کر
قبۂ عقل و تمیز بحر معلق سہی
خالصتاً عذر لنگ ہم پہ مسلط نہ کر
تاجر پنبہ ہمیں کوئی صدا دے نہ دے
طنطنۂ خشت و سنگ ہم پہ مسلط نہ کر
تیری مکافات کا رد عمل ہے مگر
تحفۂ بے نام و ننگ ہم پہ مسلط نہ کر
سرد شعاعوں سے دور تیرے محقق تو ہیں
شب کی وساطت سے زنگ ہم پہ مسلط نہ کر
نطق و عتق سے نجات قول و سند کے بغیر
ساغر حلقوم تنگ ہم پہ مسلط نہ کر

شمارہ ۱۶۰،

جنوری فروری ۱۹۹۱

کیا کوئی کرے منافقت میری
شعلوں سے ڈھلی ہے معرفت میری
انگشت کی نوک تک پلٹ آئے
بے خوف و خطر مراجعت میری
شبنم پہ کمند ڈالنے والے
ہیروں سے بندھی ہے عاقبت میری
جاگیر کو بھیک پر اٹھاتی ہے
وارث کے بغیر مصلحت میری
اک قطرہ شہد بھی نہ چھو پائی
معذور ہے کس قدر سکت میری
کیا وقت کے واقعات سمجھے گی
اس بار لہو لہو صفت میری
مٹی کی لگام دے نہیں سکتا
مفلوج سہی مفاخرت میری
ماضی کبھی فاصلہ کبھی فردا
پابستہ ہے کب مسافرت میری
کس غیظ سے خون کھولتا ساغر
بیدار تھی شب میں معذرت میری

ساقی فاروقی

شمارہ ۶۷،
دسمبر ۱۹۷۱

اک قصبے کے
اک اسکول میں
اک لڑکے نے تھکی ہوئی اک تتلی پکڑی تھی
اور رہائی کی کوشش میں
اس تتلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ
فضا میں بکھر گیا تھا

اس لڑکے نے
میز کے اوپر، پیپر ویٹ کے نیچے رکھ کر
اس کے پر ماچس سے جلائے
اور اس کا دھڑ
پنسل کاٹنے والے چاقو سے
دو حصوں میں بانٹ دیا تھا

وہ لڑکا تو چلا گیا
پر تیس برس سے
اس کا گندا چاقو میرے پاس ہے
اور چاقو پر
اس مٹیالے پیلے خون کے دھبے سے الجھن ہے
اور زباں پر ایک کسیلا پن ہے
اتنی تھکن ہے
نیند سے پاگل ہوں

شمارہ ۱۱۱،
فروری تا اپریل ۱۹۷۹

میں وہ ماہ زدہ ہوں
جی کھو کر
چاند کرن کے مچھلی کانٹے میں نتھی ہو کر
بے حرکت
اک مردہ لہر کی صورت
سطح آب پہ نیم معطل پڑا ہوا ہوں...
ہوا چلے تو
مجھے ساحلوں کا بوسہ ملے

ساقی فاروقی

شمارہ ۱۱۷
ستمبر ۱۹۸۰

...اور وہ اس کی طرف پشت کیے سنک میں صبح کے جھوٹے برتن دھو رہی تھی...

''عورت اور مرد کی پشت یکساں ہوتی ہے''،

پتہ نہیں سلطان حیدر جوش نے یہ فقرہ کیسے لکھ دیا، اس نے وائن کی بوتل کھولتے ہوئے سوچا۔ یہ غلط فہمی پشت ہا پشت سے ہے۔ دراصل یہ بڑی بھٹکانے والی بات ہے ورنہ مرد کی پشت خاصی سپاٹ ہوتی ہے۔ شانوں سے لے کر کمر تک تو ٹھیک ہے کہ اس میں چیتے کی پشت کا ساطنطنہ اور کس بل ہوتا ہے مگر کولھے غیر مسطح اور ناتراشیدہ ہوتے ہیں اور کسی عمر رسیدہ کولھو کے بیل سے پچھلے دھڑ سے مشابہت رکھتے ہیں...یعنی وہ حصہ جو ''قلب'' سے جدا ''میسرہ...میمنہ'' کرتا رہتا ہے...ان کے مقابلے میں عورت کے کولھے، کمر کے لوچ کا جھٹکا کھا کر ایک وحشت کے انداز میں دو آدھے آدھے چاند بناتے ہوئے فراز سے نشیب کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ جلالی دریاؤں کی طرح، اور پراسرار رانوں کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر ٹھہر جاتے ہیں۔ مرد کے کولھوں کی زمین قحط زدہ اور پتھریلی ہوتی ہے۔ عورت کے کولھوں کا خمیر زرخیز مٹی سے اٹھا ہوا معلوم پڑتا ہے۔ ان کا ایک اپنا مزاج، ایک اپنی شخصیت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ آدمی نے پتھروں کے رگڑنے سے آگ پیدا کی، میرا اندازہ یہ ہے کہ پہلا شعلہ اسی چقماق سے نکلا ہوگا پھر ہر وصال کے بعد مرد کے کولھے اندر کی طرف دھنستے جاتے ہیں مگر عورت کے کولھوں میں رس بھر جاتا ہے اور گولائیوں میں ایک ساحرانہ دل کشی آجاتی ہے۔ ایک عورت کی پشت دیکھ کر آسانی سے قیاس آرائی کی جاسکتی ہے کہ اس کے پیچھے کتنے وصالوں کا عمل دخل رہا ہوگا...وہ اس کی طرف پشت کیے، سنک میں صبح کے جھوٹے برتن دھو رہی تھی...

همزاد

ساقی فارقی

شمارہ ۱۳۳
جون ۱۹۸۴

شیخ حسن شادانی
آؤ
خواب دیکھتے ہیں
یادنگر میں سائے پھرتے ہیں
تنہائی سسکاری بھرتی ہے
اپنی دنیا تاریکی میں ڈوب چلی...؟
باہر چل کر
مہتاب دیکھتے ہیں
شیخ حسن شادانی
آؤ
خواب دیکھتے ہیں
ہم سے پہلے کون کون سے لوگ ہوئے
جو ساحل پر کھڑے رہے
جن کی نظریں پانی سے ٹکرا ٹکرا کر
ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی ہیں
بکھر گئی ہیں اور پانی کا سبزہ ہیں
اس سبزے کے پیچھے کیا ہے؟
آج عقب میں
چھپے ہوئے گرداب دیکھتے ہیں
شیخ حسن شادانی
آؤ
خواب دیکھتے ہیں

غزل

ساقی فاروقی

شمارہ ۱۳۸،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵

دنیا قدم کے ساتھ ہے منزل نہ کر اسے
دل کا قرار بیچ کے حاصل نہ کر اسے

یہ غم فضول ہے کہ محبت نہیں ملی
اپنے مطالبات میں شامل نہ کر اسے

چھپ چھپ کے آنسوؤں میں جھلکتی ہے ایک یاد
جو لذت نظر ہے، غم دل نہ کر اسے

تیرے لہو میں تیرتا رہتا ہے ایک نام
یہ نام ہے، شبیہ ہے باطل نہ کر اسے

جائز ہے عمر عمر کے رستوں کا قتل بھی
پیارے مگر شریک مشاغل نہ کر اسے

ساقی فاروقی

شمارہ ۱۶۵،
مئی تا اکتوبر ۱۹۹۲

دادی اماں
(بستی کے سب سے ممتاز
گھرانے کی بیٹی...
سب سے معزز
آنگن کی دلہن
ماشاءاللہ
ستر کے پیٹے میں ہوں گی)
اپنا استحقاق مانگتی ہیں...
داداجان کہ
دس کم ساٹھ برس تک ان سے
اندھی گھپ کالی راتوں میں
چھپ چھپ کر ملنے آئے
بیوی کی زرخیز آنکھوں میں
صرف اولادِ نرینہ کے
خواب اگا کے چلے گئے...
یہ شوہر کے رستے میں
حائل نہ ہوئیں
دل کے ٹکڑے
ہوسٹلوں میں پلے بڑھے
حیف کہ ان کے دکھ سکھ میں
شامل نہ ہوئیں

داداجان کی سخت طبیعت نے
اس کا موقع ہی نہ دیا
یہ وہ ناطق
جو خاموش رہیں
اس نازیبا خاموشی میں
آگ لگانے کے دن آئے
اب اپنے چقماق مانگتی ہیں...
ان کے اندر تنہائی کا زہر اترتا چلا گیا
(اور زمانہ
اردگرد سے
پرچھائیں کی طرح گذرتا چلا گیا)
سوگ میں ہیں
تریاق مانگتی ہیں...
ایک جنم تک
اندھی گونگی بہری بن کے
اپنے ہی گھر میں بے دخل
بے قدری کے نخی حسن(۱) میں دفن رہیں
آج نئے آفاق مانگتی ہیں
دادی اماں طلاق مانگتی ہیں

---
(۱) کراچی کا ایک قبرستان

ساقی فاروقی

شمارہ ۱۷۴،
اپریل مئی ۱۹۹۴

جب تیری نظر پہ شک ہوا ہے اور دل میں ملال آگیا ہے
مریم پہ نگاہ رک گئی ہے سیتا کا خیال آگیا ہے

افسوس تمام دوسروں سے ہم لوگ بھی مختلف نہیں ہیں
تجھ پر بھی خزاں برس رہی ہے مجھ پر بھی زوال آگیا ہے

سچائی خلیج بن گئی ہے روحوں میں شگاف پڑ گئے ہیں
شاید کہ بدن ہی جھوٹ بولیں ہنگام وصال آگیا ہے

اس طرح اگر بچھڑ گئے ہم ذہنوں میں خلا کا راج ہوگا
یہ کیا کہ ہمارے درمیاں بھی یادوں کا سوال آگیا ہے

اس دل سے شکایتیں ہیں جس نے مغرور مجھے بنا دیا تھا
ڈوبے کہ نشیب عاجزی تک خورشید جمال آگیا ہے

شمارہ ۲۴۶،
جولائی ۲۰۰۱

یہ کس نے بھرم اپنی زمیں کا نہیں رکھا
ہم جس کے رہے اس نے کہیں کا نہیں رکھا

دیکھا کہ ابھی روح میں فریاد کناں ہے
سجدہ، جسے پابند جبیں کا نہیں رکھا

افسوس کہ انکار کی منزل نہیں آئی
ہر چند کہ در بند نہیں کا نہیں رکھا

اور اپنی طرح کے یہاں سالک ہیں کئی اور
ہر شخص پر الزام یقیں کا نہیں رکھا

گلزار کھلائے جہاں بازار لگائے
ہم خاک نشینوں کو وہیں کا نہیں رکھا

ایک ایسی قناعت ہے طبیعت میں کہ جس نے
محتاج ہمیں نان جویں کا نہیں رکھا

اس گھر کے مقدر میں تباہی نہ لکھی ہو
وہ جس نے خیال اپنے مکیں کا نہیں رکھا

ساقی فاروقی

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

چھپ کے ملنے آجائے، روشنی کی جرأت کیا
روح کے اندھیرے میں چاند کی ضرورت کیا

تو، مری محبت کے قتل میں ملوث ہے
اور مجھی سے کہتا ہے، خون کی شہادت کیا

کون میری آنکھوں کے بند توڑ دیتا ہے
دل کے قید خانے میں قید ہے قیامت کیا

ایک دوسرے کو ہم بھول جائیں گے اک دن
اتنی بے قراری کیوں، اس قدر بھی عجلت کیا

رات سے بچھڑنے کے خواب دیکھ رکھے ہیں
صبح راستے میں ہے، خواب کی حفاظت کیا

ایک وقت آتا ہے منصفی نہیں ملتی
جھوٹ کی وکالت کیا، خوف کی عدالت کیا

ظلم سہنے والوں کا صبر ختم ہوتا ہے
صرف ایک دھمکی سے پھیلتی ہے دہشت کیا

سراج اجملی

شمارہ ۲۶۲،
نومبر ۲۰۰۲

روشنی چشم خریدار میں آتی ہی نہیں
کچھ کمی رونق بازار میں آتی ہی نہیں

اس سے کچھ ایسا تعلق ہے کہ شدت جس کی
کسی پیرایۂ اظہار میں آتی ہی نہیں

جو نہیں ہوتا بہت ہوتی ہے شہرت اس کی
جو گذرتی ہے وہ اشعار میں آتی ہی نہیں

زندگی دھوپ میں جلنے کی ہے عادی اتنی
کم بخت سایۂ دیوار میں آتی ہی نہیں

سخت حیراں ہوں صلاحیت خیبر شکنی
وارث حیدر کرارؓ میں آتی ہی نہیں

تم نے دیکھی ہے عجب کیفیت چشم سراج
بات وہ نرگس بیمار میں آتی ہی نہیں

کون جانتا ھے؟

گی داموپاساں، ترجمہ: سردار حسین

شمارہ ۸۲،
مارچ ۱۹۷۳

اے خدا! آخر کار میں نے ان حالات کو لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے جن سے میں دو چار ہوا تھا، لیکن میں ایسا کر بھی سکوں گا؟ مجھ میں اتنی ہمت ہے؟ وہ سب کچھ بہت ہی پراسرار، ناقابل بیان، ناقابل فہم ہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا ہے اگر اس پر مجھے پورا یقین نہ ہوتا، اگر میرے حواس نے کہیں پر میرا ساتھ چھوڑا ہوتا، یا واقعات کے تسلسل میں کہیں کوئی رکاوٹ ہوتی، تو میں اس کو نظر کا دھوکا ہی سمجھتا۔

بہر حال، کون جانتا ہے؟

آج میں دماغی امراض کے اسپتال میں احتیاط کے طور پر خود ہی داخل ہوں کیوں کہ میں ڈرا ہوا ہوں۔ میری کہانی صرف ایک آدمی کو معلوم ہے، اسپتال کے ڈاکٹر کو۔ اب میں اس کہانی کو لکھنے جا رہا ہوں۔ یقین کیجئے مجھے خود نہیں معلوم، کیوں؟ شاید ان وسوسوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے جو ہر وقت مجھ پر کابوس کی طرح مسلط رہتے ہیں۔

خیر، واقعہ یوں ہے:

میں ہمیشہ تنہا رہا ہوں، خوابوں میں کھویا ہوا، گوشہ نشین، نیک مزاج، مطمئن، کسی کے خلاف کوئی کینہ اور خدا سے کوئی شکایت نہ رکھنے والا۔ میں ہمیشہ اکیلا ہی رہا کیوں کہ دوسروں کی موجودگی سے مجھے پریشانی اور الجھن ہونے لگتی ہے۔ میں کیسے بتاؤں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا اس لئے نہیں ہے کہ میں انسانوں کی صحبت سے بھاگتا ہوں۔ لوگوں کے ساتھ مل جل کر کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مجھے بہت لطف آتا ہے لیکن ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب مجھے ان کی قربت کا احساس ہوتا ہے اور پھر بھلے ہی وہ میرے عزیز دوست کیوں نہ ہوں، مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ میں تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگتا ہوں اور میری دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس سے فوراً چلے جائیں یا میں خود ان کے پاس سے ہٹ جاؤں اور اکیلا رہ جاؤں۔

میری یہ خواہش، خواہش سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور میری طبیعت کا جزو بن چکی ہے۔ اگر کسی وجہ سے مجھے لوگوں کے درمیان رکنا پڑتا ہے تو میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا ہوں اور مجھے یہ یقین ہوتا ہے کہ کوئی بھیانک واقعہ ہونے والا ہے۔ کیا؟ کون جانتا ہے؟ ممکن ہے، ہاں ممکن ہے صرف یہی ہو کہ میں اچانک زمین پر گر پڑوں۔

میں تنہائی کا اس قدر عادی ہوں کہ مکان میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کو سوتے ہوئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں گنجان شہر میں نہیں رہ سکتا کیوں کہ وہاں زندہ رہنے کے لئے مجھے مستقل جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ یہ احساس کہ میرے اردگرد بہت سے لوگ رہ رہے ہیں میری روحانی موت کا سبب ہوتا ہے۔ دراصل دوسروں کی نیند مجھے ان کی بات چیت سے بھی زیادہ گراں گذرتی ہے۔ اور یہ محسوس یا معلوم ہو جانے پر کہ دیوار کے دوسری طرف کوئی بھی موجود ہے میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔

میں ایسا کیوں محسوس کرتا ہوں؟... کون جانتا ہے؟ شاید اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہو کہ میں اپنی ذات کے باہر کی ہر چیز سے بہت جلد اکتا جاتا ہوں۔ اور دنیا میں میرے جیسے بہت آدمی ہیں۔

انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو دوسروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ لوگوں کے ساتھ رہ کر وہ خوش ہوتے ہیں اور انھیں سکون ملتا ہے۔ تنہائی ان کے لئے ایسی ہوتی ہے جیسے کسی برف کے پہاڑ پر چڑھنا یا کسی ریگستان کو پار کرنا۔ دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں اپنے عزیز ترین دوستوں کی قربت بھی ایک بوجھ معلوم ہوتی ہے اور وہ تھکا تھکا سا محسوس کرتے ہیں جب کہ تنہائی انھیں سکون دیتی ہے اور وہ آزادی کے ساتھ اپنی خیالی دنیا میں کھوئے رہنے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اپنی ذات کے سوا دوسری چیزوں کے بارے میں ایک خاص حد تک سوچ سکتا ہوں۔ اور جب یہ حد آجاتی ہے تو مجھے جسمانی اور دماغی بے چینی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بے جان چیزوں کی طرف مائل ہوں، یا یوں کہوں کہ تھا۔ یہ چیزیں ہی میرے لئے انسانوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور میرا گھر ہی میری دنیا بن کر رہ گیا تھا جس میں مختلف فرنیچر اور آرائشی سامان تھا۔ یہ فرنیچر اور سامان مجھے دوستوں کی طرح عزیز تھا۔ میں نے مختلف قسم کی چیزوں سے گھر کو سجا رکھا تھا، اور ان کے بیچ میں رہ کر مجھے اتنا سکون، اطمینان اور خوشی نصیب ہوتی تھی جیسے اپنی پیاری کی بانہوں میں ہوں جس کے ہاتھوں کا جانا پہچانا لمس دل کو سکون دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

میرا مکان ایک خوبصورت باغ کے بیچ میں بنا ہوا تھا جو شہر سے، جہاں میں اکثر تفریح کے لئے جایا کرتا تھا، بہت دور نہیں تھا۔ میرے نوکر مکان سے دور ایک دوسری عمارت میں رہتے تھے جو باغ کے سرے پر تھی۔ یہ مکان لمبے لمبے پیڑوں کے بیچ میں چھپا ہوا تھا اور اس کی خاموش فضا میں راتوں کی بڑھتی ہوئی سیاہی اس قدر سکون دیتی تھی کہ اکثر میں بستر پر سونے کے بجائے اس ماحول سے لطف اندوز ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔

اس رات میں شہر سے ڈراما دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جو پریوں کے اس خوبصورت کھیل کو موسیقی کے ساتھ میں نے دیکھا تھا اور مجھے بہت لطف آیا تھا۔

میں بہت خوش خوش گھر لوٹ رہا تھا۔ ڈرامے کے بعض حسین مناظر میرے دماغ میں اب بھی تازہ تھے اور موسیقی کی سریلی تانیں ذہن پر چھائی ہوئی تھیں۔ رات تاریک تھی، بالکل تاریک، اتنی کہ مجھے سڑک بھی مشکل سے نظر آ رہی تھی اور کئی بار میں گڑھوں میں گرتے گرتے بچا۔ میرا گھر چنگی چوکی سے آدھ میل پر ہوگا جو لگ بھگ بیس منٹ کا راستہ تھا۔ رات کا ایک یا ڈیڑھ بجا تھا۔ اچانک میرے سامنے آسمان پر ایک چمک دکھائی دی اور باریک چاند ابھرتا ہوا نظر آیا۔ زرد چاند کا یہ اداس اداس ہلال تھا۔ شروع کا چاند جب چار یا پانچ بجے شام کو نکلتا ہے تو چمک دار، صاف اور روپہلا ہوتا ہے لیکن آخر تاریخوں میں جب یہ آدھی رات کے بعد ظاہر ہوتا ہے تو اس کا رنگ زرد اور بجھا بجھا سا ہوتا ہے۔ رات گئے گھر سے باہر جانے والوں نے ضرور غور کیا ہوگا۔ شروع کا چاند بال کا سا باریک ہی کیوں نہ ہو، ہلکی لیکن صاف روشنی دیتا ہے جس کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے اور جس کی روشنی میں ہر چیز کا ٹھیک ٹھیک سایہ زمین پر پڑتا ہے۔ جب کہ آخر دنوں کے چاند کی روشنی مدھم، اداس اور پھیکی پھیکی ہوتی ہے جس سے کسی ایک چیز کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔

میرے باغ کی دھندلی دھندلی چاردیواری میرے سامنے تھی۔ لیکن کسی نامعلوم وجہ سے مجھے باغ میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ رات بڑی سہانی تھی۔ درختوں کے جھنڈ دور سے کسی بڑے مقبرے کی طرح نظر آ رہے تھے جس کے بیچ میں میرا مکان چھپا ہوا تھا۔

میں نے باغ کا پھاٹک کھولا اور درختوں سے ڈھکے ہوئے راستے پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ یہ راستہ ایک چھوٹی سرنگ کی مانند معلوم ہو رہا تھا جو کالے کالے درختوں کے بیچ سے گذرتی ہوئی چلی گئی تھی۔ راستے کے دونوں طرف سبزہ زار تھا جس میں بیضاوی شکل کی کیاریاں پیوند کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

جب میں مکان کے قریب پہنچا تو مجھے ایک خاص طرح کی بے چینی محسوس ہوئی۔ میں رک گیا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ درختوں کی پتیاں تک ساکت تھیں۔

"مجھے کیا ہو رہا ہے؟" میں نے سوچا۔ پچھلے دس سال سے میں اکثر راتوں کو گھر لوٹتا ہوں، لیکن کبھی مجھے اس طرح کی الجھن نہیں محسوس ہوئی۔ میں کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ میں اندھیرے میں کبھی نہیں ڈرا۔ کسی چور یا نقب زن کو دیکھ کر مجھے تاؤ آ سکتا ہے اور میں بلا جھجک اس سے نپٹ سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں مسلح بھی تھا۔ میرا ریوالور میرے پاس تھا، لیکن میں نے اس کو چھوا تک نہیں، کیوں کہ خوف کے احساس کو میں اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

پھر وہ کیا تھا؟ آنے والے خطرے کا احساس؟ ایک ایسے ناقابل بیان خطرے کا احساس جو کسی حیرت خیز چیز کے اچانک سامنے آ جانے سے آدمی کے دماغ کو ماؤف کر دیتا ہے؟... شاید ایسا ہی ہو۔ کون جانتا ہے۔

جب میں آگے بڑھ رہا تھا مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپاہٹ دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی اور جب میں اپنے مکان کی دیوار کے قریب پہنچا تو مجھے خود بہ خود یہ احساس ہوا کہ دروازہ کھولنے اور اندر جانے سے پہلے مجھے چند لمحے رک جانا چاہیے۔ میں باغ کی تپائی پر بیٹھ گیا جو میرے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے نیچے تھی۔ میں کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، سر دیوار سے لگا ہوا تھا اور میں درختوں کے جھنڈ کی سیاہی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چند لمحوں تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ پھر میرے کانوں میں ہلکی ہلکی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ لیکن مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کرتا تھا۔ میرے کانوں میں اکثر ایسی آوازیں آیا کرتی تھیں جیسے ٹرین گذر رہی ہو، گھنٹے بج رہے ہوں، یا کوئی بڑا مجمع زمین کو روندتا ہوا گذر رہا ہو۔

لیکن جلد ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز بالکل صاف سنائی دینے لگی اور اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں اب تک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ یہ میری شریانوں کی عام ٹپکن کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اب مجھے اپنے مکان کے اندر سے آنے والی مختلف آوازیں بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔ دیوار سے کان لگائے میں شور وغل سنتا رہا۔ اس کو شور وغل کے بجائے گھڑگھڑاہٹ کہنا بہتر ہوگا، جیسے بہت سا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹایا جا رہا ہو۔ جیسے کوئی میرے فرنیچر وغیرہ کو ان کی جگہ سے کھسکا رہا ہو اور انھیں فرش پر گھسیٹ رہا ہو۔

قدرتی طور پر مجھے کچھ دیر تک اپنی سماعت پر شک رہا، لیکن ان آوازوں کو زیادہ اچھی طرح سننے کے لئے میں نے اپنے کان دروازے سے لگائے اور مجھے جلدی ہی یقین آ گیا کہ مکان کے اندر کوئی غیر معمولی اور ناقابل بیان بات ہو رہی ہے۔ میں ڈرا نہیں، لیکن... میں کیسے بتاؤں؟ اس واقعے سے چونک کر بھی میں نے اپنے ریوالور کا سیفٹی کیچ نہیں ہٹایا، اس یقین کے ساتھ کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں نے انتظار کیا۔

میں بہت دیر تک انتظار کرتا رہا لیکن کسی بھی قطعی فیصلے پر نہ پہنچ سکا گو کہ میری دماغی حالت بالکل ٹھیک تھی پھر بھی میں شدید الجھن کا شکار تھا۔ میں انتظار کرتا رہا اور اپنے کان اس بڑھتی ہوئی آواز پر لگائے رہا جو کبھی کبھی اتنی تیز ہو جاتی تھی جیسے کوئی بڑا دھماکا ہونے والا ہو۔

یکایک اپنی بزدلی پر شرمندہ ہو کر میں نے کنجی نکالی، دروازے کے تالے میں ڈال کر دوبارہ تیزی سے گھمائی اور اپنی پوری طاقت سے دروازے کو دھکا دیا جو اندر کی دیوار سے زوردار دھماکے کے ساتھ ٹکرایا۔

دروازے کی ٹکر سے اتنی تیز آواز ہوئی جیسے کسی نے فائر کر دیا ہو۔ آواز پورے مکان میں گونج گئی۔ یہ اتنی اچانک، خوف ناک اور کرخت تھی کہ میں خود گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

میں انتظار کرنے لگا۔ لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ اب میں ایک بہت غیر معمولی آواز زینے سے آتی ہوئی سن رہا تھا۔ کسی کے چلنے کی آواز نہیں بلکہ فرش پر لکڑی اور لوہے کے رگڑنے کی آواز جو جھانجھ کی طرح مکان میں گونج رہی تھی اور پھر اچانک دروازے کی دہلیز پر مجھے اپنی بڑی آرام کرسی دکھائی دی جو ڈگمگاتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔ وہ دروازے سے باہر آئی اور باہری راستے پر چل پڑی۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم کی دوسری کرسیاں، اور ان کے پیچھے صوفہ تھا جو اپنے چھوٹے چھوٹے پایوں پر مگرمچھ کی طرح رینگتا ہوا آ رہا تھا۔ ان سب کے پیچھے مکان کی دوسری کرسیاں بکریوں کی طرح اچھلتی ہوئی اور اسٹول خرگوش کی طرح پھدکتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

سوچیے میری کیا حالت ہوئی ہوگی؟ میں جلدی سے ایک جھاڑی میں

چھپ گیا۔ لیکن میری نظریں اپنے فرنیچر کے جلوس پر گڑی ہوئی تھیں جو باہر نکل رہا تھا۔ قطار بنائے ہوئے، ان میں ہر چیز کی چال اپنے وزن اور شکل کے اعتبار سے تھی۔ کچھ کی تیز کچھ کی سست۔ میرا پیانو، شان دار پیانو، میرے قریب سے کسی تیز رفتار گھوڑے کی مانند گذرا۔ اس کے تاروں سے ہلکی جھنجھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ چھوٹی اشیا، برش، طشتریاں اور گلاس فرش پر چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی آرہی تھیں، اور اس طرح چمک رہی تھیں جیسے چاندنی میں جگنو چمکتے ہیں۔ دریاں اور پردے اس سبک روی کے ساتھ آرہے تھے جیسے پانی میں مچھلیاں تیرتی ہیں... میں نے اپنی لکھنے والی میز کو آتے دیکھا جو اٹھارویں صدی کی کاریگری کا ایک بہت نایاب نمونہ تھی۔ اس میں میرے خطوط بھی تھے۔ یہ میری زندگی کے اس جذباتی دور کی یادگاریں تھیں جو کب کا ختم ہو چکا تھا اور میری تصویریں بھی اسی میز میں تھیں۔

اچانک میرا ڈر غائب ہو گیا۔ میں نے اپنے کو میز پر گرا دیا اور اس سے اس طرح کشتی لڑنے لگا جیسے کوئی کسی چور یا ڈاکو سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ لیکن وہ بدستور چلتی رہی اور میں انتہائی کوشش کے باوجود اس کی رفتار تک کم نہ کر سکا۔ میں اس کی بے پناہ طاقت سے لڑتے لڑتے زمین پر گر پڑا اور وہ مجھ کو فرش پر لڑھکاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور اس کے پیچھے آنے والی چیزیں مجھے روندتی ہوئی گذر رہی تھیں، بالکل اس طرح جیسے سواروں کا رسالہ کسی پیدل سپاہی کو کچلتا ہوا نکل جاتا ہے۔

آخر کار خوف سے پاگل ہو کر میں نے کسی طرح اپنے کو راستے سے ہٹایا اور درختوں کے بیچ میں چھپ گیا اور اپنے سامان کی چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو جو کبھی میری تھیں، نظروں سے اوجھل ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے خالی مکان کے اندر دروازوں کے زور سے بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں پورے مکان میں گونج رہی تھیں اور اس کے بعد بڑے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہوا جس کو بے وقوفی سے میں نے ہی کھول دیا تھا اور جس میں سے نکل کر سارا فرنیچر باہر آ گیا تھا۔

تب میں وہاں سے بھاگا اور شہر کی طرف دوڑا۔ شہر کی سڑکوں پر پہنچ کر میری جان میں جان آئی۔ دیر سے لوٹنے والے لوگ اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ میں ایک ہوٹل پہنچا اور اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس ہوٹل کے لوگ مجھے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ میں نے اپنے کپڑوں کو ہاتھوں سے خوب جھاڑا اور ایک فرضی قصہ گڑھا کہ میں اپنی کنجیوں کا گچھا اپنے ملازموں کے مکان میں بھول آیا جو میرے باغ کی چار دیواری کے پیچھے ہے۔ اس طرح مجھے قیام کے لئے ہوٹل کا ایک کمرہ مل گیا۔

بستر پر لیٹ کر میں نے اپنی آنکھوں تک چادر کھینچ لی لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں صبح کا انتظار کرتا رہا اور اپنے دل کی تیز دھڑکنیں سنتا رہا۔ میں نے ہوٹل والے سے کہہ دیا تھا کہ صبح کی روشنی پھیلتے ہی میرے نوکروں کو اطلاع کر دے۔ صبح سات بجے میرے نوکر نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کتنا پریشان تھا۔

"صاحب، کل رات بہت ہی بھیانک واقعہ ہو گیا۔" اس نے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"آپ کا سارا فرنیچر چوری ہو گیا صاحب۔ کچھ بھی نہیں بچا۔"

یہ سن کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا، کیوں؟ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اپنے اوپر پورا قابو رکھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنے جذبات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دوں، کسی کو نہ بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ اس واقعے کو اپنے سینے میں کسی بھیانک راز کی طرح دفن کر دوں۔ میں نے جواب دیا۔

"تب تو یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے میری کنجیاں چرائیں۔ فوراً پولیس کو اطلاع کرنا چاہئے۔ میں ابھی تیار ہو کر تمھارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلتا ہوں۔"

پانچ مہینے تک تحقیقات چلتی رہیں، لیکن کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ نہ میرے سامان ہی میں سے کوئی چیز ملی نہ چوروں کا کوئی سراغ ملا۔ یا اللہ! اگر میں انھیں یہ بتا دیتا کہ میں نے کیا دیکھا تھا تو وہ قید ہی کر دیتے، چوروں کو نہیں، بلکہ مجھے، جس نے ایسا واقعہ دیکھا ہو۔

میں نے اپنا مکان دوبارہ نہیں سجایا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا پھر وہی واقعہ پیش آتا۔ میں اس مکان میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو پھر دیکھا ہی نہیں۔ میں پیرس کے ایک ہوٹل میں چلا گیا اور ڈاکٹروں سے اپنے اعصاب کے بارے میں مشورہ کیا کیوں کہ اس بھیانک رات کے بعد سے میرے اعصاب میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

انھوں نے مجھے سیاحت کی رائے دی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔

میں نے اپنی سیاحت اٹلی سے شروع کی۔ سورج کی روشنی نے مجھ پر اچھا اثر کیا۔ چھ ماہ تک میں جینوا سے وینس، وینس سے فلورنس، فلورنس سے روم، روم سے نیپلز تک گھومتا رہا۔ تب میں سسلی گیا جو اپنے مناظر اور یونانی اور نارمن مقبروں کے کھنڈرات کے باعث بہت دل فریب جگہ بھی جاتی ہے۔ وہاں سے میں افریقہ چلا گیا جہاں وسیع، پرسکون ریگستان کی سیر کرتا رہا اور جہاں اونٹ اور خانہ بدوش عرب گھومتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور جہاں صرف کھلی ہوئی ہوا میں کسی قسم کا محاصرہ مجھے نہیں محسوس ہوتا تھا، وہ دن ہو یا رات۔

میں مارسائی ہوتا ہوا فرانس واپس آ گیا۔ لیکن دھوپ کی حدت والے علاقے ختم ہوتے ہی مجھ پر پھر اداسی چھا گئی۔

میں پھر پیرس واپس چلا گیا۔ ایک مہینے کے بعد میں اکتا گیا۔ وہ خزاں کا موسم تھا اور میں نے طے کیا کہ جاڑے شروع ہونے سے پہلے میں نارمنڈی کے علاقے کا ایک چکر لگا لوں، یہ میرے لئے نئی جگہ تھی۔

میں نے رواں (Rouen) سے اپنا سفر شروع کیا اور تقریباً چار بجے، جب کہ میں ایک خوب صورت سڑک پر جس کے کنارے کنارے ایک سیاہی مائل پانی کی نہر بہہ رہی تھی، گھوم رہا تھا کہ میری نظریں پرانے فرنیچر کی کچھ دوکانوں پر جم گئیں اور میری ساری توجہ جو کچھ دیر پہلے شہر کی پرانی طرز کی عمارتوں پر تھی ان دوکانوں کی طرف مبذول ہو گئی۔

اس ذخیرے کو دیکھ کر پرانی چیزوں سے میری رغبت پھر زندہ ہو گئی۔ میں ان دوکانوں میں گھومتا رہا اور نہر کے بدبودار پانی پر چار سڑے ہوئے تختوں سے بنائے گئے پلوں کو دو ہی چھلانگ میں پار کر لیا... اور تب... یا اللہ! میرا دل اچھل کر منہ میں

آ گیا۔ میری نظر اپنی الماریوں میں سے ایک پر پڑی جو ایک کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ کمرہ پرانے فرنیچر کا قبرستان سا معلوم ہو رہا تھا۔ میں کانپتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ میں اتنا کانپ رہا تھا کہ مجھ میں اس کو چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا، پھر جھجک گیا۔ وہ یقیناً میری ہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا اور اس کو جس نے بھی پہلے دیکھا ہو پہچان سکتا تھا۔ اچانک اس نیم تاریک برآمدے کے آخر میں میں نے اپنی تین آرام کرسیاں دیکھیں۔ ان سے کچھ ہی دور پر میری دو میزیں رکھی تھیں جو اتنی نفیس بنی ہوئی تھیں کہ پیرس سے لوگ انہیں خاص طور پر دیکھنے آتے تھے۔

سوچئے، ذرا سوچئے میرے کیا جذبات ہوں گے؟

میں گھبراہٹ اور برانگیختگی کے عالم میں آگے بڑھا اور اندر چلا گیا کیوں کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اس طرح اندر داخل ہوا جیسے کوئی نائٹ کسی جادوگرنی کے باورچی خانے میں داخل ہوتا ہے۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا مجھے اپنی کتابیں، تصویریں، دریاں، قالین اور ہتھیار رکھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، سوا لکھنے کی میز کے جس میں میرے خطوط تھے۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔

میں چلتا رہا، تہ خانوں میں، تاریک برآمدوں میں، اور پھر اوپر واپس آ گیا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ میں نے آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس بڑے بھول بھلیاں نما مکان میں میں اکیلا تھا۔

رات ہونے لگی اور میں اپنی ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا کیوں کہ میں وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے میں پکارتا تھا... "یہاں کوئی ہے؟"

میں یقیناً وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھا رہا اور پھر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی، ہلکے اور سست قدموں کی چاپ۔ میں نہیں بتا سکتا کہ وہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ میں وہاں سے تقریباً دوڑتا ہوا بھاگا لیکن ہمت باندھ کر میں نے پھر آواز دی، اور تب ہی برابر والے کمرے میں میں نے روشنی دیکھی۔

آواز آئی: "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "خریدار۔"

جواب آیا۔ "بہت دیر ہو چکی ہے۔ دوکان بند ہے۔"

میں نے تیزی سے کہا۔ "میں آپ کا ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"آپ کل آ سکتے ہیں۔"

"کل میں روان سے چلا جاؤں گا۔"

آگے بڑھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی اور وہ میرے پاس نہیں آیا۔ کمرے سے آنے والی روشنی کا عکس ایک پردے پر چمک رہا تھا جس میں دو فرشتوں کو میدان جنگ میں لاشوں پر اڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ پردہ بھی میرا ہی تھا۔

میں نے کہا: "اچھا تو کیا آپ باہر آ رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

ایک بڑے کمرے کے بیچ میں ایک بہت ہی پستہ قد اور موٹا آدمی کھڑا تھا۔ وہ اتنا موٹا تھا جیسے ناٹکوں میں موٹے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ سودے بازی میں بہت سخت تھا۔ اس کے گندی اور چھدرے بالوں والی زرد داڑھی تھی۔ سر پر ایک بھی بال نہیں، ایک بھی نہیں۔ جب اس نے قریب آ کر مجھے دیکھنے کے لئے اپنی شمع اوپر اٹھائی تو اس کا گنجا سر پرانے فرنیچر سے بھرے ہوئے اس بڑے کمرے میں ایک چھوٹے چاند کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ پھولا پھولا اور جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور آنکھیں بہت چندھی چندھی تھیں۔

تھوڑی سودے بازی کے بعد میں نے اپنی ہی کرسیوں میں سے تین کرسیاں خرید لیں اور ایک بڑی رقم نقد ادا کر دی اور صرف اپنے ہوٹل کے کمرے کا نمبر بتا دیا۔ دوسرے دن صبح نو بجے وہ کرسیاں مجھے ملنا تھیں۔ اس کے بعد میں دوکان سے چلا آیا۔ وہ مجھے بہت ہی مہذبانہ انداز میں دروازے تک پہنچانے آیا۔ میں وہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں میں نے اپنے فرنیچر کی چوری اور اپنی تازہ دریافت کا واقعہ بتایا۔

انسپکٹر نے فوراً ہی پبلک پراسیکوٹر کے دفتر تار بھیجا جہاں اس واردات کی کارروائی رکی ہوئی تھی، اور مجھ سے انتظار کرنے کو کہا۔ ایک گھنٹے بعد جواب ملا جس نے میری رپورٹ کی تصدیق کر دی۔

"میں اس آدمی کو گرفتار کر کے ابھی پوچھ گچھ کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "کیوں کہ ہو سکتا ہے اسے کچھ شک ہو گیا ہو اور وہ آپ کا سامان کہیں اور چھپا دے۔ میری رائے ہے کہ آپ جائیں اور کھانا وغیرہ کھا کر دو گھنٹے بعد آئیں۔ تب تک میں اس کو یہاں لے آؤں گا اور پھر میں آپ کے سامنے اس سے دوبارہ پوچھ گچھ کروں گا۔"

"بہت خوب، انسپکٹر، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

میں نے ہوٹل جا کر کھانا کھایا۔ آج خلاف امید میری بھوک کھل گئی تھی۔ سب سے زیادہ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اس کو پکڑ لیا گیا ہو گا۔

دو گھنٹے بعد میں پولیس اسٹیشن پہنچا۔ انسپکٹر میرے انتظار ہی میں تھا۔

"کیا بتائیں جناب۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "ہم آپ کے دوست کو نہیں پکڑ سکے۔ ابھی تک وہ میرے آدمیوں کے ہاتھ نہیں آیا۔"

"کیا، آپ کا مطلب ہے...؟"

ناامیدی کی ایک لہر سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔

"لیکن... آپ نے اس کا گھر تو ڈھونڈ لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، اور اس کی باقاعدہ نگرانی کی جا رہی ہے، جب تک وہ واپس نہیں آتا۔ لیکن وہ غائب ہو گیا ہے۔"

"غائب ہو گیا؟"

"جی ہاں، غائب ہو گیا۔ وہ عام طور پر اپنی پڑوسن کے ساتھ شام کا وقت گذارتا ہے جو ایک عجیب طرح کی بڈھی عورت ہے۔ وہ بھی اس کی طرح پرانا سامان بیچتی ہے۔ اس بڑھیا کا کہنا ہے کہ آج شام ان کی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے کہ وہ کہاں ہے اس لئے ہم کو کل تک انتظار کرنا ہو گا۔"

میں چلا آیا۔ اب روان کی سڑکیں عجیب منحوس اور اداس اداس سی لگ رہی تھیں۔ رات کو ٹھیک طرح سے نہیں سو سکا اور جب بھی آنکھ لگتی تھی بڑے ہی ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے تھے۔

چونکہ میں دوسروں پر اپنی بے چینی اور عجلت ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اس

لئے میں نے دوسرے دن صبح دس بجے تک انتظار کیا اور تب پولیس اسٹیشن گیا۔

"وہ دوکان دار ابھی تک غائب ہے۔ اس کی دوکان بند ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے ضروری اقدام کرلئے ہیں۔ پبلک پراسیکوٹر کے محکمے کو بھی اطلاع کردی ہے۔ ہم لوگ ساتھ جاکر دوکان کا تالا توڑیں گے۔ آپ ساتھ چل کر اپنا سامان ہمیں دکھایئے گا۔"

ہم لوگ اس جگہ گئے۔ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ ایک تالے والا بھی موجود تھا اور دوکان کا تالا کھول دیا گیا تھا۔

جب میں اندر گیا تو نہ میری الماری تھی، نہ میری آرام کرسیاں، نہ میزیں۔ میرے گھر کی چیزوں میں سے کوئی بھی چیز وہاں نہیں تھی، جب کہ پچھلی شام ہر قدم پر میرا ہی سامان بکھرا ہوا تھا۔

چیف انسپکٹر نے حیرت زدہ ہوکر مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"انسپکٹر صاحب، میرے سامان کے غائب ہوجانے کا دوکان دار کے غائب ہوجانے سے گہرا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ نے کل چیزیں خرید کر اور ان کی قیمت دے کر سخت غلطی کی۔ اس سے اسے شک ہوگیا۔"

میں نے جواب دیا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کل تو یہ جگہ میرے سامان سے بھری ہوئی تھی اور آج یہاں دوسرا سامان رکھا ہوا ہے۔"

"اس کو رات بھر کا وقت بھی تو مل گیا۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے اور بھی ساتھی ہوں گے۔ یقیناً اس کے پاس ایک گھر سے دوسرے گھر سامان پہنچانے کے بھی وسائل ہوں گے۔ خیر، آپ گھبرایئے نہیں جناب۔ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ چور ہم لوگوں کو زیادہ عرصے تک چکمہ نہیں دے سکتا۔ اب ہم لوگوں نے اس کا خفیہ ٹھکانا معلوم کرلیا ہے۔"

میرا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔

میں رواں میں پندرہ دن تک رہا... وہ آدمی واپس نہیں آیا۔ خدا جانتا ہے، کوئی بھی اس آدمی کو ڈھونڈھنے یا گرفتار کرنے میں کام یاب نہیں ہوا۔

دوسرے دن صبح مجھے یہ عجیب خط ملا جو میرے مالی نے بھیجا تھا اور جو ان دنوں میرے گھر کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس ڈکیتی کے بعد سے وہ مکان خالی پڑا تھا۔

جناب عالی!

عرض یہ ہے کہ کل رات ایک ایسا واقعہ گذرا جس کو نہ تو میں ہی بیان کرسکتا ہوں اور نہ پولیس۔ آپ کا سارا فرنیچر واپس آ گیا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی۔ اب مکان پھر اس حالت میں ہو گیا ہے جیسا کہ نقب زنی سے پہلے تھا۔ آپ یہاں آکر سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ سب جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات میں ہوا۔ راستہ ضرور کچھ خراب ہوگیا ہے کیوں کہ ایسا لگتا ہے جیسے ہر چیز باغ کے پھاٹک سے لے کر صدر دروازے تک گھسیٹ کر لائی گئی ہو۔ اس کی حالت بالکل ویسی ہی مجھے جیسی کہ اس دن ہو گئی تھی جس دن یہ سب سامان غائب ہوگیا تھا۔

آپ کے آنے کا منتظر

آپ کا خادم

فلپ

نہیں! نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گا۔

میں خط لے کر چیف انسپکٹر کے پاس گیا۔

"یہ واپسی تو بڑی صفائی سے ہوئی۔" اس نے کہا۔ "ہم آج ہی کل میں اس شخص کو پکڑلیں گے۔"

لیکن وہ نہیں پکڑا گیا۔ نہیں۔ وہ اس کو نہیں پاسکے اور اب میں اس سے خوف زدہ ہوں، اس طرح جیسے کوئی وحشی جانور میرے پیچھے چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا، وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ بدہیئت آدمی جس کا گنجا سر چاند کی طرح ہے، وہ اس کو کبھی نہیں پکڑ سکیں گے۔ وہ کبھی بھی اپنی دوکان نہیں جائے گا۔ وہ کیوں جانے لگا؟ سوا میرے اس سے کوئی نہیں مل سکتا اور میں اس سے نہیں ملوں گا نہیں ملوں گا نہیں ملوں گا۔

اور اگر وہ واپس جاتا ہے، اگر وہ اپنی دوکان پر جاتا ہے، تو کون ثابت کرے گا کہ وہاں میرا فرنیچر موجود تھا؟ اس کا گواہ تو صرف میں ہوں۔ اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وہ سب میرا وہم ہی تھا۔

نہیں! میرا جینا اب دشوار ہوگیا ہے اور اب میں اس واقعے کو راز میں بھی نہیں رکھ سکوں گا۔ یہ خوف کہ وہ واقعہ پھر کسی لمحے میرے ساتھ پیش آسکتا ہے مجھے دوسروں کی طرح زندگی نہیں بسر کرنے دے گا۔

میں دماغی امراض کے اسپتال میں ڈاکٹر کے پاس مشورے کے لئے گیا اور اسے سارا واقعہ بتا دیا۔ میری مکمل جانچ کے بعد اس نے کہا:

"جناب، کیا آپ کچھ دن اور یہاں ٹھہر سکتے ہیں؟"

"بہت خوشی کے ساتھ۔"

"آپ کے پاس پیسے کی کمی تو نہیں ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر۔"

"کیا آپ اپنے رہنے کے لئے ایک بنگلہ پسند کریں گے؟"

"جی ہاں، بالکل۔"

"کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کے دوست احباب آپ سے ملنے یہاں آئیں؟"

"نہیں، ڈاکٹر، کوئی نہیں... رواں کا وہ آدمی ہوسکتا ہے یہاں بھی پہنچ جائے اور میرے ساتھ لگ جائے۔"

اور یہاں تنہا رہتے ہوئے مجھے تین مہینے گذر چکے ہیں، بالکل تنہا۔ یہاں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ البتہ میں صرف ایک چیز سے ذرا ڈرا ہوا ہوں۔ اگر وہ کہیں پرانی چیز والا دوکان دار پاگل ہوگیا اور اگر کہیں اس کو اسی اسپتال میں لایا گیا؟

اف! قید خانے تک پوری طرح محفوظ نہیں ہیں ☆☆☆

سرشار بلند شہری

شمارہ ۱۷۷،
اکتوبر ۱۹۹۴

ندی کا پل
لب سڑک
چھوٹا سا گاؤں
اونچی چوپال
چوپال پہ
مستی میں کھڑا
نیم کا درخت
نیم کے
درخت سے برستا
آب نیم
چوپال سے لگا
راستہ
راستے میں چلتے
گائے
بھینس
بھیڑ
بکریاں
اکا دکا
چرواہے
کاش
میں بھی
اس راستے میں چلتا
لیکن مجھے تو انتظار ہے
اپنی
مرکھنی گائے کا
جسے
چرواہے
دور جنگل میں
چرانے لے گئے ہیں

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم

سریندر پرکاش

شمارہ ۵،
اکتوبر ۱۹۶۵

سمندر پھلانگ کر ہم نے میدان پار کئے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑ پر پھیل گئیں۔ میں اک ذرا رکا اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ انتہائی اپنائیت کے احساس سے میں بھر گیا۔ تب علیحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کر لی اور میں انتہائی غم زدہ سر جھکائے وادی میں اتر گیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سب تھوتھنیاں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بار بار سر ہلا کر وہ اپنی رفاقت کا اظہار کرتے ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی دھات کی گھنٹیاں الوداع، الوداع پکار رہی تھیں اور ان کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کے کونوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میرے ہونٹ شدت سے کانپے، آنکھیں مند گئیں، پاؤں رک گئے مگر پھر بھی میں بھاری قدموں سے آگے بڑھا، یہاں تک کہ میں ان کے لئے اور وہ میرے لئے دور افق پر لرزاں ایک نقطے کی صورت اختیار کر گئے۔

وادی میں اونچے اونچے بے ترتیب درخت جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے جسموں کی خوش بو فضا میں مکمل ہل گئی تھی۔ نئے راستوں پر چلنے سے رہ رہ کر دل میں امنگ سی پیدا ہو رہی تھی۔ سورج پہاڑ پر سیڑھی سیڑھی چڑھ رہا تھا اور میں گرد آلود پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر صاف، شفاف، چکنی سڑکوں پر آ گیا۔ پختہ سڑکوں پر صرف میرے پاؤں سے جھڑتی ہوئی گرد تھی جو میں پگڈنڈیوں سے لے کر آیا تھا۔

چکنی سڑکوں کی سیاہی ابھر کر دھیرے دھیرے فضا میں گھلنے لگی اور افق پر سورج نقاہت سے لڑھکنے لگا۔ ابھی جھٹ پٹا ہی تھا کہ میں ایک گول کشادہ مکان کے بڑے سے پھاٹک پر آ رکا۔ نئے خوب صورت پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور کنجوں میں سے ہوتی ہوئی ایک روش اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے تک چلی گئی تھی۔ جس پر بکھرے ہوئے پتھروں کی آخری زرد دھوپ میں چم چما رہے تھے۔

میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا یوں آگے بڑھا جیسے پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔ خاموش ویران برآمدے میں میری آواز گونجی مجھے تعجب سا ہوا۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر آگے بڑھا۔ اور بڑے سے؟ دلندیزی؟ دروازے نے بانہیں پھیلا کر مجھے خوش آمدید کہا۔

دلندیزی دروازے کے ساتھ ہی قدیم آریائی جھروکوں جیسی کھڑکیاں تھیں اور ان سب پر گہرے کتھئی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے جن کی وجہ سے سارے کمرے میں دھند لکا چھایا ہوا تھا۔ ماحول کی اس ایکا ایکی تبدیلی نے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی تھی اور میں سہما، سہما سا کھڑا...

...نیند کی جھپکی تھی شاید...!

...نیم تاریک کمرے میں، میں سہما سہما سا صوفے کے گدگدے پن میں دھنستا ہوا، پاتال میں اترا چلا جا رہا ہوں۔ آتش دان میں آگ بجھ گئی ہے۔ پھر بھی راکھ میں چھپی بیٹھی چنگاریوں کی چمک گہرے سبز ریشمیں قالین پر ابھی موجود ہے۔ کارنیل پر رکھے دھات کے پھولدان کو میرے بڑے سے ہاتھ نے چھو کر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے جسم کی خنکی ابھی تک انگلیوں کے پوروں پر محسوس ہو رہی ہے۔ پھول دان کا اپنا ایک الگ وجود میں نے تسلیم کر لیا ہے۔ ہاتھ میرا ہے اس لئے احساس بھی میرا ہے لیکن پھول دان نے میرے احساس کو قبول نہیں کیا ہے۔

مجھے اس کا انتظار ہے! وہ جو اندر کاریڈار میں کھلنے والے دروازے پر سے پردہ سرکا کر مسکراتا ہوا نکلے گا۔ میں بوکھلاہٹ میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھوں گا۔ پھر ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے ملیں گے۔ وہ بڑا نفیس اور مہذب آدمی ہے... ڈرائنگ روم کی سجاوٹ، رنگوں کا چناؤ آرائشی چیزوں کی سج دھج سب میں ایک گریس ہے۔ نہ جانے وہ کتنی مدت تک ان کے بارے میں سوچتا رہا، ان کے لئے بھٹکتا رہا۔ اور تب کہیں جا کر وہ یہ سب کر پایا ہے۔

آتش دان بلیک ماربل کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ جس پر جگہ جگہ بے ترتیب سفید دھاریاں ہیں۔ میں کچھ دیر ان دھاریوں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ ایسا لگا جیسے وہ دھاریاں ایک بے پایاں صحرا کے لینڈ اسکیپ جیسی ہیں۔ بالکل خالی صحرا، اداس، خاموش اور میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس صحرا میں کھو گیا اور ریت کے جھکڑ نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا۔ میں ویسے ہی سہما سہما خوف زدہ سا اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لئے اس صحرا کی طرف بڑھا۔

آتش دان پر بنی کارنس پر ہاتھ جما کر، جھک کر میں اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا۔ کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی۔ جو ان جانے میں میرا ہاتھ لگنے سے گر گئی۔ میں نے اس تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ ایک خوش پوش آدمی گود میں ایک ننھی سی بچی کو اٹھائے بیٹھا تھا۔ اور اس کے بائیں کندھے سے کندھا لگائے ایک عورت بیٹھی ہے، دونوں مسکرا رہے ہیں۔ اور بچی ان کی طرف مڑ کر دیکھ رہی ہے... نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کبھی ایسی ہی تصویر کھنچوانے کے لئے میں بھی بیٹھا تھا اور

فوٹو گرافر نے کہا تھا۔

"ذرا مسکرایئے!"

ہم تینوں مسکرائے، اور فوٹو گرافر نے "تھینک یو"... کہا اور ہم اٹھ کر بکھر گئے۔ ہم ابھی تک بکھرے ہوئے ہیں۔ اکٹھے ہو بھی جائیں۔ تو بھی مسکرا نہیں سکتے، باقی تصویر ویسی کی ویسی کھنچ جائے گی۔

لیکن وہ تصویر میں مسکرا رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی مسکرا رہی ہے، بچی بھی شاید۔ کیونکہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

ایسے ہی مسکراتا ہوا وہ پچھلے دروازے سے وارد ہوگا۔ اور اس کی بیوی پچھلے کمروں میں بنے کسی بیڈروم میں مسکرا رہی ہوگی۔ اور بچی مکان کے پچھواڑے خوب صورت پرسکون کنجوں میں تتلیاں پکڑ رہی ہوگی۔

صوفے کے سائڈ ٹیبل پر پینے کے لئے کچھ رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں اس تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنے آپ کو صحرا میں تلاش کر رہا تھا تو کوئی چپکے سے نارنجی رنگ کے کسی سیال سے بھرا گلاس رکھ گیا تھا۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک!" برآمدے سے کسی کے زمین پر لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ لگاتار مسلسل اور باقاعدہ... میں دروازے کا پردہ سرکا کر سر باہر نکال کر دیکھتا ہوں... کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے کے موڑ سے مڑ گیا ہے اور اب اس کی پیٹھ بھی اوجھل ہو گئی ہے لاٹھی ٹیکنے کی آواز ہر لحظہ دور ہوتی جا رہی ہے۔

سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے؟... ہاں! سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے۔ میں واپس کمرے میں آتے ہوئے سوچتا ہوں۔ نمکین ہواؤں کا ایک جھونکا سب چیزوں کو چھیڑتا ہوا، سب چیزوں سے گزر جاتا ہے۔

سمندر سے میرا کیا رشتہ ہے؟ میں سمندر کے بارے میں اتنا فکر مند کیوں ہوں؟ میرے ذہن میں سمندر اپنی وسعت، اپنی گہرائی اور اپنے مد و جزر کے ساتھ پھیلتا چلا گیا... اور میں محسوس کرنے لگا یہ سچ ہی سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے۔ اور میں ایک کمزور سی، نازک سی، چھوٹی سی ناؤ کی طرح ہلکورے کھاتا ہوا، ڈولتا ہوا کھڑکی تک پہنچا... اور جھٹ سے پردہ ہٹا دیا۔

باہر شاید برف گر رہی ہے؟ ایک ایک گالا۔ ایک ایک گالا۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ کھڑکی سے باہر فضا میں دھیرے دھیرے، کبھی سیدھا کبھی الٹا حرکت کرنے لگا۔ مگر ایک گالا بھی اس پر نہ گرا اک ذرا سی خنکی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ قدیم آریائی جھروکے جیسے کھڑکی! میں بڑ، بڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "برف کہاں ہے؟"... "نہیں کہیں نہیں!" میں خود ہی سوال کرتا ہوں اور پھر خود ہی جواب دیتا ہوں۔ مگر اس سوال اور جواب کی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی۔ صرف محسوس ہوتی ہے۔ ایک پر اسرار سرگوشی کی طرح۔ اور میں اس احساس سے خوف زدہ ہو کر پھر اس پھول دان کی طرف مڑتا ہوں جس نے سب سے پہلے اس کمرے میں میرے احساس کو بیدار کیا تھا۔

بڑا سا گول پھول دان جس پر بڑی محنت سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے بے حرکت پڑا ہے۔ اور اس میں موسم سرما کے آغاز کے پھول سجے ہوئے ہیں۔ یہ پھول کسی ہاتھ نے سجائے ہیں اگال دان سے ہٹ کر میرا ذہن کچھ ہاتھوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جن میں پھول ہیں اور ہوا کھڑکی کے پردوں کو چھیڑتی ہے۔ دروازے کا پردہ بھی سرسراتا ہے۔ میں اکیلا اکیلا ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ پھر محسوس کرتا ہوں اور غمزدہ ہو جاتا ہوں۔ بے وجہ کا غم بے بنیاد اکیلا پن۔

میرے ذہن میں ایک سانپ پھن پھیلا کر اپنی تیز، تڑپتی ہوئی زبان نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر دھیرے سے نیچے قالین پر اتر جاتا ہے اور تیزی سے چلتا ہوا پیچھے والے دروازے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ میں خوف زدہ ہو کر چیخ اٹھتا ہوں۔ اور میری نظروں کے سامنے بیڈروم میں بیٹھی ہوئی مسکراتی ہوئی ایک عورت انگڑائی لیتی ہے۔ اور تتلیاں پکڑتی ہوئی ایک بچی زقند بھرتی ہے۔ میں صوفے کی پیٹھ کو مضبوطی سے تھام لیتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ سارا منظر کہیں دور اندھیرے میں دھیرے دھیرے گم ہوتا جا رہا ہے۔

'وہ ابھی نہیں آیا!'... رات باہر لان میں اتر آئی ہوگی۔ لاٹھی ٹیکنے کی آواز پھر قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں تیزی سے بڑھ کر دروازے کا پردہ ہٹا دیتا ہوں۔ ایک اندھا ادھیڑ عمر آدمی لاٹھی کے سہارے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ نپے تلے قدموں کے ساتھ۔ لاٹھی کی باقاعدگی سے ابھرتی ہوئی آواز کے ساتھ۔ اس سے پہلے کہ میں اسے آگے بڑھ کر روکوں۔ وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور چپکے سے برآمدے کے موڑ سے مڑ جاتا ہے۔ اکیلا اکیلا پلٹ کر میں کمرے کے خالی پن کو گھورتا ہوں۔ بڑا خوبصورت کمرہ ہے۔ دیوار پر بارہ سنگھے کا ایک سر ٹنگا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ایک بڑا ہی پرانا تیر کمان سجاوٹ کے لئے لٹکا رکھا ہے۔ کھڑکی اور دروازے کے درمیان والی خالی جگہ کو بھرنے کے لئے ایک چوڑے سنہری فریم والی بڑی سی تصویر ٹنگی ہوئی ہے۔ جس میں ہزار ہا رنگوں کی ان گنت جنگلی چڑیاں پھدکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

"سب خوب ہے! ہر چیز پرکشش ہے! سبھی کچھ اپنانے کو جی چاہتا ہے۔" کاش! اے کاش! یہ سب کچھ تیرا ہوتا... یہ صوفہ کارنر ٹیبل پر پڑا ہوا گل دان، بک کیس میں پڑی ہوئی کتابیں، کارنس پر رکھی ہوئی تصویر، گہرے سبز قالین کا گدگدا پن، آریائی جھروکوں جیسی کھڑکیاں، ولندیزی دروازوں پر لہراتے ہوئے پردے، بیڈروم میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی عورت، تتلیاں پکڑتی ہوئی بچی اور ان تمام چیزوں کے اپنا ہونے کا بھرپورا احساس!

"مگر نہیں... یں... یں... ں... ں!" اف میری آواز اتنی اونچی کیوں ہے؟ مجھے اپنے چلانے پر شرم محسوس ہو رہی ہے۔ شرم، خوف اور اجنبیت کے احساس سے میں کانپ جاتا ہوں اور مجھے اپنا وجود گہرے سبز قالین پر اوندھا پڑا محسوس کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آدمی قالین کو اپنی انگلیوں میں بھر لینے کی کوشش میں تڑپ رہا ہے۔ رو رہا ہے اور پھر اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔

"خاموش ہو جاؤ... خامو... و... و... ش!" میں گہرے غم میں ڈوب کر اس سے کہتا ہوں اور میرے آنسو آنسو رخساروں تک ڈھلک آئے ہیں۔ اور میں خاموش کھڑا اسے ویسا ہی تڑپتا دیکھتا رہتا ہوں۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک..." میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا

ہوں۔ "رک جاؤ... ؤ... ؤ...!" میں دھاڑتا ہوں۔ اندھا بالکل میرے قریب سے گذر جاتا ہے۔ اس پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں لپک کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن ناکام رہتا ہوں۔ وہ برآمدے کے موڑ سے اوجھل ہو گیا ہے۔

اندر قالین پر وہ اوندھا پڑا ابھی تک بسور رہا تھا۔ پیچھے کھلنے والے دروازے پر ذرا بھی ہلچل نہیں ہوئی سانپ کے مکان میں گھس جانے سے ذرا بھی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔

"اف کتنے بے حس لوگ ہیں؟"

اسی دروازے کے پاس تپائی پر کانسے میں ڈھلا ایک بوڑھا بیٹھا بڑی بے فکری سے ناریل پی رہا ہے۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

"چلتا ہوں...؟ مگر کہاں؟" سوال اور جواب دونوں ہاتھ پھیلائے نظریں ایک دوسرے پر گاڑے کھڑے ہیں۔ اور میں دھیرے سے کھسک کر اس کی مورتی کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

"پانی تو پی لیجئے!" ایک بڑی ہی میٹھی آواز کمرے میں گونجی۔

"نہیں! بس اب میں چلتا ہوں، بہت دیر ہو گئی۔"

میں پلٹے بغیر اس عورت کی طرف دیکھے بنا ہی جواب دیتا ہوں۔

"لیکن کہاں؟" آواز پھر ابھری اور پھیل گئی۔ سوال اور جواب نے مل کر سازش کی ہے شاید؟ اب میں ان کے درمیان کھڑا ہوں اور میرے لئے ان کی فتح مند نظروں کی تاب لانا مشکل ہو رہا ہے۔ میں سر جھکا کر خاموش کھڑا رہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اگر نہ ہو سکے تو بھی کوئی بات نہیں۔ مگر اتنا تو ہو ہی سکتا ہے کہ میں اس بوڑھے کی طرح بے فکری سے بیٹھا تمباکو پیتا رہوں!

"پہلے کانسے میں ڈھلنا پڑے گا!" قالین پر اوندھے پڑے آدمی نے کہا اور اٹھ کر آتش دان پر بنے صحرا میں گم ہو گیا۔

"کیا کوئی مجھے کانسے میں ڈھالے گا؟" میں نے مجسمے کو مخاطب کر کے کہا۔ کانسے میں ڈھلے بوڑھے نے تمباکو کا ایک لمبا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔ قدیم آریائی جھروکوں جیسی کھڑکیوں کے پردے سرسرائے اور بڑی سی تصویر میں ہزار رنگوں والی چڑیوں نے پھدک کر اپنی اپنی جگہیں بدل لیں۔ میں خوف زدہ سا لڑکھڑاتا ہوا سائیڈ ٹیبل تک پہنچا اور سارا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔

ابھی اسے صحرا میں کھو جانا باقی ہے! شاید اسی شدید برف باری میں بھاگ کر جانا پڑے یا پھر سمندر کنارے کے شہر میں! (کشتی بہر حال کنارے تک پہنچنی چاہئے)۔

ایک بپھرا ہوا سمندر، ایک ریت اڑاتا صحرا، برف کا طوفان۔ اور اکیلا آدمی۔ میں کیا کچھ کر لوں گا؟ میں دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دیتا ہوں، جو یہ سب کچھ سوچتی ہے مگر نظر نہیں آتی اور مجھ کمزور، نحیف، بے سہارا... (کشتی) کو بھٹکاتی پھرتی ہے۔

ٹھک، ٹھک، ٹھک، وہ پھر گذر گیا ہے۔ میں اسے پکڑ نہیں سکتا۔ اس سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ گونگا، بہرا، اندھا... ذہن میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی لاٹھی کی آواز۔

"چلو بھی، چلو!" دروازے پر کسی نے دستک دی ہے۔

"مگر وہ تو ابھی آیا نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"ابھی نہیں پھر سہی! دیکھو۔ دیر ہو گئی!" آواز باہر لان میں سے ہو کر آ رہی ہے۔

"ذرا سنو، پھر کب آنا ہو گا...؟" میں نے پلٹ کر نظریں ڈرائنگ میں دوڑاتے ہوئے کہا، جو مجھے انتہائی پسند تھا۔ "پرسکون آرام دہ کوزی۔"

جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ شاید وہ میری حریص نظروں کا مطلب سمجھ گیا تھا... لاٹھی کی آواز بڑی تیزی سے دروازے پر سنائی دی۔ شاید اسے بھی جلدی ہے۔

باہر صرف آواز تھی۔ ایک اس کے قہقہے کی آواز۔ دوسری اندھے کی لاٹھی کی آواز... اور رات باہر لان میں اتر کر سارے میں پھیل گئی تھی، شروع جاڑوں کی اندھیری رات۔

"یہ سب تمہارا ہی تو تھا۔ مگر اب اس سے زیادہ نہیں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔" اس کی آواز گونجی، پھیلی اور سمٹ کر پھر واپس چلی گئی... میں کسی انجانی چیز کے کھو جانے کے غم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" میں چیخا۔ "کم از کم میں پچھلے دروازے سے اندر جا کر ان میں ایک لمحے کے لئے بیٹھ تو جاتا۔ ان کی خواہش کہ ان کی اپنائیت کی گرمی سے اپنی آغوش کے خالی پن کو بھر تو لیتا... یہ ظلم ہے، سراسر ظلم...!"

"ہاہا... ہا... ہا...!!!"

میں نے خالی قالین کو اک ذرا دیکھا اور پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لینے کے لئے اس پر اوندھا لیٹ گیا اور میری پشیمانی کے آنسوؤں سے قالین کا دامن تر ہونے لگا۔ پھر صحرا میں بھٹکا ہوا آدمی دھیرے سے چلتا ہوا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا... کانسے میں ڈھلے ہوئے بوڑھے نے ایک اور گہرا کش لیا اور تمباکو کا دھواں میری طرف اگل دیا۔

میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان سب کی طرف دیکھا اور پوچھنا چاہا "دیکھ رہے ہو؟ یہ سب دیکھ رہے ہو نہ؟"... ایکا ایکی میں نے اپنی بے چارگی پر قابو پا لیا اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا:

"سنو! تم سب سن لو! سمندر کنارے کے شہر کا پتہ ہے نہ! اگر کبھی کوئی کمزور نحیف، بے سہارا کشتی ساحل سے آ کر لگے تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں! ☆☆☆

رونے کی آواز

سریندر پرکاش

شمارہ ۱۰۱
مارچ ۱۹۶۷

"فلاور انڈر ٹری از فری۔"

سامنے والی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گا رہا تھا۔ مگر اب کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے دباؤ کا نشان ہی باقی ہے۔ کتنا اچھا گاتا ہے وہ۔ مجھے مغربی موسیقی اور شاعری سے کچھ ایسی دل چسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتا ہی کچھ اس طرح ہے کہ میں کھو سا جاتا ہوں۔ وہ گاتا رہا اور میں سوچتا رہا "کیا پھول درخت کے سائے تلے واقعی آزاد ہے؟"

وہ اب جا چکا ہے۔ جن سروں میں وہ گا رہا تھا وہ اپنی گونج بھی کھو چکے ہیں۔ مگر الفاظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

"فلاور انڈر ٹری از فری۔"

Flower under tree is free!

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ کی عمر سر سے لمبی ہوتی ہے۔

شام جب وہ مجھ سے ملا خاصا نشے میں تھا۔ طالب علموں کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ملک کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پیتے پلاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "گھر سے جب میں نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فتور تھا کہ ساری دنیا پیدل گھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آٹھ برس ہونے کو آئے مجھے۔ دوسروں کے ہم شکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا۔"

"کیا کہیں تمھیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں ہیکینڈی نیویا میں۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دیے بغیر جواب دیا۔

رات گئے تک ہم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا، کرسی پر بیٹھا، دو ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اس نے ایک دم اپنا مخصوص گیت گانا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا "اس گیت میں جو الفاظ ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟"

"معنی کوئی ساتھ نہیں دیتا، صرف الفاظ دیتا ہے۔ دیتا بھی کیا ہے بس ان پر اپنے معانی کی مہر ثبت کر دیتا ہے۔ اور ہم ان میں سے اپنے معنی تلاش کرتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک بول اٹھا۔ "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ جبکہ خاصے معمولی آدمی ہو۔" میں بوکھلا سا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا "ہماری بلڈنگ کے اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں۔ وہ اس بلڈنگ کے مالک بھی ہیں۔ ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انھوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام مہر سوتی ہے۔

پھر اچانک وشنو بابو ایک مال دار عورت لکشمی سے ٹکرا گئے۔ تب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے لکشمی سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بے چاری سرسوتی رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھی روتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں بھی ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی لکشمی سے۔"

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کے چہرے کو خوف ناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڈ نائٹ کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آ گیا ہو۔

جس عمارت کے ایک کمرے میں میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دیواریں کہیں نہ کہیں، جیسے تیسے ایک دوسری سے مشترک ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، میری آواز، خاموشی یا پھر چند ہی پہلے میرے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی ضرور کہیں نہ کہیں پہنچی ہوگی۔

باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اردگرد کے سب گھروں کی بتیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ اور خاموشی دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف رینگے جا رہی ہے۔ میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور مدھم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں۔

مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی، خاموشی اور تاریکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر ہی دیتا ہے۔ جیسے خواب میں بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کا جسم و ذہن سن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی میری کیفیت ہے۔ دھیرے دھیرے میں نیچے گر رہا ہوں اور پھر اچانک مجھے لگتا ہے میں اپنے جسم میں واپس آ گیا ہوں۔

باہر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے شاید سرسوتی اور لکشمی میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور سرسوتی کے رونے کی آواز سیڑھی، سیڑھی اتر کر نیچے میرے کمرے کے دروازے تک آ گئی ہے۔ مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے میں محسوس کرتا ہوں ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہوگا۔ اور اس کی ماں بدستور نیند میں بے خبر سو رہی ہوگی۔ یا پھر شاید ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گئی ہو۔ اور بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے۔ یک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہے۔ اور کفن میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

"اگر درخت تہذیب کی علامت ہے تو ہم اس کے سائے میں روتے ہوئے آرد پھول ہیں۔" میرے ذہن میں اچانک اس کے الفاظ کے معنی کھل اٹھے ہیں۔ جن کے سر وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔

مگر اسے یہ کس نے بتایا ہوگا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور سو رہا ہے۔ کیوں کہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز ابھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی آپ پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ چل گیا تھا بچے کے رونے کی آواز میری آواز سے کتنی ملتی جلتی ہے...

پھر اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔"

میں واقعی معمولی ہوں۔ ہر صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دن بھر بھاگتا رہتا ہوں اور رات ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پاتا ہوں۔

صبح سب سے پہلے سارس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں جہاں ایک عورت خوب صورت کیبن میں گلاس ٹاپ کے میز پر اپنی سفید مرمریں باہیں پھیلائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کو ہر روز رنگ کے خضاب سے رنگ کر آتی ہے۔ میز پر پھیلی ہوئی اس کی باہیں۔ اس طرح لگتی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ ٹانگیں ہوں۔

کیبن کے اردگرد سے کئی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کیبن کے شیشوں میں سے اکثر جھانکتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی ننگی ٹانگیں میز پر پھیلائے ہوتے ہے تو...

...سیڑھیاں جہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ وہاں داہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بنک کے لاکروں جیسے کئی خانے بنے ہوئے ہیں جن میں ہر آدمی اپنی ذاتی چیزیں رکھ سکتا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کو اس میں بند کر کے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں۔ اور پھر شام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر تھیٹر والوں کی گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ اس کا ڈرائیور مجھے آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہتا ہے اور میں شہر کے جدید ترین تھیٹر میں پہنچایا جاتا ہوں۔ جس کا پنڈال بالکل سرکس کے پنڈال جیسا ہے۔ میں اس تھیٹر میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں سٹیج بالکل وسط میں ہے۔ اور میرا پہلا میک اپ اتار کر گلیور (Gulliver) کا میک اپ اور باس پہنایا جاتا ہے مکالمے سب بیک گراؤنڈ سے ہوتے ہیں۔ مجھے صرف للی پٹ والوں کی مار کھانے کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سوئیوں جیسے بھالے میرے جسم میں چبھتے ہیں۔ ان کے کمانوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر میرے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میرے مساموں سے خون کی بوندیں پسینے کی طرح نکلتی ہیں۔ مجھ میں خوبی بس یہی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا اس لئے اتنے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے ملتا کچھ نہیں یہ تو محض ہابی کے طور پر ہے۔ پھر جب شو ختم ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک باتھ روم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الکوہل سے بھرے ہوئے ٹب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الکوہل میرے زخموں میں ٹیسیں پیدا کرتی ہے۔ پھر ایک دم تازگی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا تب میں پیشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کرزورزور سے دروازہ پیٹنے لگا تب ایک آدمی نے آکر دروازہ کھولا۔ میں اس تصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اگر مجھے ساری رات اس پیشاب خانہ میں بند رہنا پڑتا تو میری کیا حالت ہوتی۔ گھبراہٹ میں چلتے وقت میں نے اس کیبن کی طرف بھی دھیان نہ دیا کہ آیا وہ عورت چلی گئی ہے یا نہیں۔ اور نہ ہی اس لاکر میں رکھی ہوئی اپنی ذات ہی نکالنے کا خیال آیا۔ بارہ تھیٹر کی گاڑی کا ڈرائیور ہارن پر ہارن بجائے جارہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن شو ختم ہونے پر بھیڑ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر میری طرف لپکی اور میری اداکاری کو اتنا قدرتی بتایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں پڑا رہنے دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کو زور سے بھینچ دیا ہے میں پھر اپنے کمرے کے ماحول کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں... سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز، روتے ہوئے بچے کی کرب ناک آواز میں اب ایک اور آدمی کی آواز بھی شامل ہوگئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی لاش اور بلکتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ضبط نہیں کر سکا۔

ایک اچھے پڑوسی کے ناطے میرا فرض ہے کہ ان کے سکھ، دکھ میں حصہ بٹاؤں، کیوں کہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزردہ پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے میں اپنے کمرے کے چاروں دیواروں میں سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر اردگرد کے کمروں میں جھانک کر انھیں سوتے ہوئے یا روتے ہوئے دیکھوں۔ کیوں کہ دونوں ہی حالتوں میں آدمی بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کتنا کمینہ آدمی ہوں لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پھر اپنے آپ کو اٹھ کر ان کے کمروں میں جاکر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں۔ اور ان کی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی کفن جیسی سفید چادر اپنے گرد لپیٹی اور سیاہ سلیپر پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی میں نے دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے والی سرسوتی، بلک بلک کر رونے والا بچہ، مری ہوئی عورت اور اس کا مجبور خاوند چاروں باہر کھڑے تھے۔ چاروں نے بہ یک زبان مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے آپ اتنی دیر سے رو رہے ہیں؟ ایک اچھے پڑوسی کے ناطے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ..." ☆☆☆

نئی غزل کی سب سے معتبر پہچان

کلیات

احمد مشتاق

"احمد مشتاق اہم ترین شاعر ہیں۔ ان کے کلیات کی اشاعت ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

احمد ندیم قاسمی

قیمت : ۲۵۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

برف پر مکالمہ

سریندر پرکاش

شمارہ ۴۵،
فروری ۱۹۷۰

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں۔"
اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں"
انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے دھیرے وا ہو جاتی ہیں، اور پھر یا نہیں
اپنی جڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں،
زندگی کا رس ناڑیوں کے رستے سارے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا ہے،
اور جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے،
تو انگلیوں کی پوروں میں سے خون کا ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے،
اور ہر طرف سرخ، سرخ پھول کھل اٹھتے ہیں۔"

سفید بھربھری برف یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور سب طرف جا بجا کٹی ہوئی بانہیں گڑی ہوئی تھیں۔ نیچے وادی میں گاؤں کے مکان دکھائی دیتے تھے جن کی چھتوں پر برف کی پرت جمی ہوئی تھی۔ اوپر پہاڑ کی بلندی پر ریلوے اسٹیشن تھا۔ جس کے سگنل کا کھمبا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی، ابھی گاڑی پلیٹ فارم سے چھوٹی تھی، جو حسب معمول لیٹ تھی۔ معلوم نہیں یہ لائن کب بچھی تھی، پہاڑ کب کٹا تھا اور کب پہلے دن گاڑی لیٹ آئی تھی۔ اب گاڑی آگے گئی تھی۔ آگے کچھ اور اسٹیشن ہیں۔ ان اسٹیشنوں کے گرد کچھ اور گاؤں ہیں اور ان گاؤں کے راستوں پر اسی طرح کٹے ہوئے بازو برف میں گڑے ہوئے ہیں۔

اس نے وہ اگلے گاؤں کبھی نہیں دیکھے اپنے گاؤں بھی وہ بڑی مدت بعد آیا تھا۔ وہ جب یہاں سے گیا تب یہاں سب طرف سمندر تھا اور وہ سب مچھلیاں تھے کہ سمندر کی بے کرانی میں تیرتے پھرتے تھے...

... ایک دن کی بات ہے۔ اس نے سمندر کے بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ مچھلی کو دیکھا جو بھگوے لباس میں ملبوس تھا اس نے بڑھ کر اس کے ننھے، ننھے خوشنما سنہری پروں کو بوسہ دیا اور تعظیم سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر ان جانے میں اس کے منھ سے سوال نکلا۔

"یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟ اور ہمارے بازار میں یہ رونق کس کے دم سے ہے؟"

...سفید ریش بزرگ مچھلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانہ سی چمک پیدا ہوئی اور مسکراہٹ سے اس کا چہرہ پھیل گیا۔ سفید سفید دانت برف کی طرح چمکنے لگے... پھر اس نے دیکھا کہ سمندر کی سطح پر ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی ہیں، سمندر کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں اور ہواؤں میں خنکی شدید ہوتی جا رہی ہے اور پانی لمحہ لمحہ جم کر برف میں تبدیل ہونے لگا ہے اور سفید ریش بزرگ کے ننھے ننھے سنہری پنکھ جھڑ کر گر گئے ہیں اور سب مچھلیاں دم دبا کر اور پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کا بازار ویران ہو گیا ہے۔

یہ بہت مدت کی بات ہے۔ تب ہی اس نے یہاں سے ہجرت کی تھی۔
"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں،
اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں۔"

برف!... برف کے گالے دھیرے، دھیرے آسمان سے ٹپک رہے تھے اور دور نیچے اس کا گاؤں برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

چند روز پہلے اس نے اپنا گاؤں خواب میں دیکھا تھا۔ ایسے ہی برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ اس کے بچے نے گاؤں کی گلی میں برف اکٹھی کر کے ایک مجسمہ بنایا تھا اور اس کی طرف اشارہ کر کے اپنی ماں سے کہا تھا...

"دیکھو ماں! یہ میرا باپ ہے، جو برف جمنے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا...!"

خواب کے گلیاروں میں سے گذرتے ہوئے اس نے جب بے داری کی دہلیز پر قدم رکھا تو اسے اپنا بچہ، اپنی بیوی، اپنے ماں باپ دور کے سمبندھی اور اپنا گاؤں خوب جی بھر کر یاد آئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تب وہ سردن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تو گاڑی اسے پہاڑوں پر جمی برف کی طرف لے کر بھاگی اور حسب معمول اسکے گاؤں کے قریبی اسٹیشن پر لیٹ پہنچی۔

وہ پلیٹ فارم پر اترا اور پھر باہر نکل کر برف پر پھسلتا ہوا اپنے گاؤں جا پہنچا۔

اس کے بچوں نے اور بیوی نے اور ماں باپ نے اور سمبندھیوں نے اپنی بانہیں وا کر دیں تا کہ اسے اپنے سینوں کے ساتھ بھینچ سکیں۔ تب یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سب کے بازو کہنیوں سے کٹے ہوئے ہیں۔

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں۔"

وہ سہم کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے محبت کی گرمی سے تمتمار ہے تھے اور آنکھیں آب دیدہ ہوئی تھیں۔

اس روز ہر گھر میں خوب پکوان پکے اور پھر سب گھروں میں اس کا تبادلہ ہوا اور لوگوں نے خوب دانتوں سے کاٹ، کاٹ کر ان کو کھایا۔

وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا ہوا سارا عرصہ مسواک سے اپنے دانت رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہا۔ پھر سب بچے جب خوب پیٹ بھر کھا چکے تو اس کی آغوش میں آ کر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے وہیں سو گئے۔

جب گاؤں والوں نے بچوں کو اس کی گود میں سے اٹھایا تو اسے اپنی ویران، ویران سی گود بڑی عجیب لگی۔

ایک سفید ریش بزرگ مسکراتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھگوے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب دیوانہ سی چمک تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے۔ "برف کیوں کر جم گئی؟ کہنیوں تک کٹے ہوئے بازو کلائیوں تک اس میں کیوں گاڑے گئے اور انگلیوں کی پوروں سے سرخ پھول کیوں کر پھوٹ پڑے؟"

مگر وہ یہ سب نہ پوچھ سکا۔ کیوں کہ سفید ریش بزرگ کا پرجلال چہرہ اس کے بہت قریب آ گیا اور اس نے اپنے خوب صورت سرخ ہونٹ اس کے کان کے قریب لے جا کر سرگوشی میں کہا... "سب رسمیں ختم ہو گئیں، اب تم سو جاؤ!"

اس نے محسوس کیا کہ اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔ اس کے بوڑھے ماں باپ نے اس کے سر پر شفقت سے اپنے ٹنڈ پھرائے پھر سب طرف اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں اس کی بیوی کا ننگا جسم کندن کی طرح دمکنے لگا اور خواب کے گلیاروں میں مسافر بھٹک گیا۔ جب اس کی بیوی انتہائی مطمئن ہوئی تو اس نے اپنے چمکیلے سفید دانتوں سے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو کاٹ لیا۔ وہ کراہ کر ایک طرف لڑھک گیا اور ساری رات اس کی انگلیاں اس کی بیوی کے دانتوں میں دبی رہیں۔

"جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے تو انگلیوں کی پوروں سے ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے۔"

رات گذر گئی تو برفیلی سفید صبح سب طرف پھیل گئی۔ وہ گھر سے نکلا اور گاؤں کی گلیوں میں سے گذرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ وہاں اس نے برف اکٹھی کر کے ایک چھوٹی سی ڈھیری بنائی اور اس پر اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے لکھا۔ "ایک رات گذر گئی!"

جب وہ پلٹا تو اس نے دیکھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ اس کی پشت پر کھڑے اس کی یہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کے استفسار تھے اور چہروں پر جذبے سمندر کی لہروں کی طرح اٹھ پڑ رہے تھے... اس کا خیال تھا کہ اب کوئی ہنگامہ کھڑا ہو گا۔ مگر کچھ نہ ہوا، سوائے اس کے کہ لوگوں کی زبانوں پر جو اس دن کے کھائے ہوئے پکوانوں کا ذائقہ تھا، ختم ہو گیا۔ اس کا باپ کمر کے ساتھ تلوار لٹکائے دن بھر پھرتا رہا اور جب اگلی رات آئی اور اس کی بیوی نے اپنا لباس اتار دیا، تو اس کا باپ کمرے میں فرش پر جمی برف میں سے ابھرے ہوئے قدیمی پتھر پر اس تلوار کی دھار تیز کرنے لگا۔ اور اس کی ماں پاس بیٹھی چکی چلاتی رہی اور گھر کا چراغ پھڑ پھڑاتا ہوا جلتا رہا... وہ ساری رات سو نہ سکا۔

اگلے دن صبح وہ پھر وہیں گیا، اس نے برف کی ایک اور ڈھیری بنائی اور اس پر اپنی انگلی سے لکھا۔ "ایک رات اور گذر گئی!"

اس کے باپ کی تلوار ہر رات پتھر پر گھستی رہی۔ حتیٰ کہ گھستے گھستے وہ لوہے کی ایک تار کی طرح باریک ہو گئی۔ اور پھر گاؤں والوں نے اس کے باپ کو پکڑ کر گاؤں کے چوک میں کھڑا کیا اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس کی ماں کو کہا کہ وہ ان ٹکڑوں کو اپنی چکی میں پیس ڈالے... اور اس کی ماں نے بین کرتے ہوئے ان ٹکڑوں کو ایک، ایک کر کے چکی میں پیس ڈالا، پھر سب نے آٹے کی ایک، ایک چٹکی اپنی جھولی میں ڈالی اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ اس کی ماں رات گئے تک چوراہے پر بیٹھی چکی چلاتی اور بین کرتی رہی۔

اگلے دن صبح اس نے پھر وہیں جا کر برف کی ایک ڈھیری بنائی۔ اور اس پر اپنی انگلی سے لکھا۔ "ایک رات اور گذر گئی!"

جب چکی میں پیسا ہوا تمام آٹا ختم ہو گیا تو یہ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اس کے بچوں کے پیٹ پیٹھ سے جا لگے اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر اس کی بیوی سب گھروں میں گئی... مگر بے نیل مرام لوٹی اور گھر میں آتے ہی اس پر برس پڑی۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو آخر؟ تم کیوں ان کا کہنا نہیں مان لیتے؟ تم کیوں اپنے بازو نہیں کٹوا ڈالتے؟... باپ مر گیا... ماں کی چکی کا سارا آٹا ختم ہو گیا۔ پھر بچے بھوک سے بلک بلک کر مر جائیں گے... تم پھر وہیں جاؤ گے اور ایک ڈھیری بناؤ گے اور اس پر لکھو گے" ایک رات اور گذر گئی!"

وہ شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ اس کی آواز کی گرج سے کئی گلیشیر ان کے گھر کی طرف لڑھکے اور دیکھتے ہی دیکھتے...

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں۔"

وہ اپنے ذہن میں بار بار گونجنے والی اس آواز اور اپنے سامنے والے اس منظر کی تاب نہ لا سکا... اور رات کے اندھیرے میں گھر سے دیوانہ وار بھاگ نکلا۔ جب وہ گاؤں سے دور اس جگہ پر پہنچا جہاں اس نے وہ ڈھیریاں بنا رکھی تھیں تو اس نے انہیں گنا۔ وہ تعداد میں پچپن تھیں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا سارا گاؤں برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے تباہ شدہ مکان کے باہر گلی میں برف کا وہ مجسمہ ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ جیسے کبھی اس کے بچے نے بنایا تھا اور جو اس کے کہنے کے مطابق اس کے باپ کا تھا جو برف جمنے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

اس کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو ٹپکے اور پھر سرد برفیلی ہوائیں زوروں سے چلنے لگیں اور دونوں آنسو اس کے رخساروں پر ہی جم گئے۔

برف اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے گاؤں کے ہر مکان کا دروازہ کھلا اور اس نے برف کی مدھم چمک میں دیکھا ہر دروازے سے لوگ اپنی بانہوں کے ٹنڈ کے ساتھ تلوار باندھے ہوئے اس کی کھوج میں نکل پڑے ہیں۔

"انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے، دھیرے وا ہو جاتی ہیں اور پھر بانہیں اپنی جڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں۔"

وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ دور سامنے پہاڑ کی بلندی پر ریلوے اسٹیشن کے سگنل کی سرخ بتی جل رہی تھی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے گاڑی حسب معمول اس کے پلیٹ فارم پر لیٹ آ کر رکی تھی اور اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ وہ جانتا تھا جب وہ گاڑی لوٹ کر آئے گی تو اسے واپس لے جائے گی۔

برف کے گالے آہستہ، آہستہ، گر رہے تھے۔ اندھیرا اس قدر ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے زمین پر آ رہا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ سی نکل گئی، پھر وہ چیز، جس سے کہ وہ ٹکرایا تھا حرکت میں آئی اور اس نے ایک آواز سنی۔

"اندھیرا بہت ہے مگر آہستہ چلو۔ یوں ٹکراتے پھرنے کے کیا معنی؟"

اسے پتہ چلا کہ وہ بھی کوئی آدمی تھا، کوئی دوسرا آدمی جو اس کی مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے معذرت طلب لہجہ میں کہا۔ "معاف کرنا بھائی۔ میں بہت خوف زدہ تھا۔ اس لئے..."

"اوہ! تو تم ہو!" سامنے سے دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ "میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ تمھارا گھر اور میرا گھر ساتھ، ساتھ ہیں۔ میری بیوی اور تمھاری بیوی سہیلیاں ہیں۔ میرے بچے اور تمھارے بچے ساتھ ساتھ کھیلتے ہیں، تمھاری ماں کے پاس میری ماں کی چکی ہے۔ کہو کب آئے؟"

آنکھیں اب اندھیرے سے قدرے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا اس کے سامنے جو آدمی کھڑا تھا سچ مچ وہ اسے تھوڑا تھوڑا پہچانتا تھا۔

اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

"میں نے خواب میں اپنے گاؤں کو برف اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا تو میں بے چین ہو اٹھا۔ میں نے بڑی منت سماجت کر کے سو دن کی چھٹی لی۔ جب میں وہاں سے بھاگا ہوں تو وہاں پچپن ڈھیریاں تھیں۔ ہر صبح میں برف اکٹھی کر کے ایک ڈھیری لگاتا تھا۔ ابھی میرے پاس پینتالیس دن کی چھٹی باقی ہے۔ مگر میں لوٹ رہا ہوں!"

"لیکن منو!" دوسرے آدمی نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔ "جب تم واپس جاؤ گے اور اتنے دن پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤ گے تو ان کو کیسے منہ دکھاؤ گے وہ پوچھیں گے گھر سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے۔ تو کیا جواب دو گے؟"

وہ کافی دیر تک خاموش رہا اور سوچتا رہا۔ کہ ان کو کیا جواب دے گا۔ اس نے دیکھا دائیں طرف ایک بڑی سی چٹان کھڑی تھی جس کی جڑ میں ایک گہرا غار تھا اور اس غار میں بے پناہ اندھیرا تھا۔

اندھیرے میں وہ سوچ رہا تھا۔ "وہ کیا جواب دیگا؟ وہاں جا کر اور کیا جواب دے گا؟" پھر وہ یک بیک چیخا۔

"اگر میں بازو کٹوا کر اور پورے دن گذار کر وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کر ایک طرف بٹھا دیں گے اور جب بھی میرے پاس سے گذریں گے نفرت سے میری طرف دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ کیا وہ شرمندگی اس شرمندگی سے کم ہو گی کہ میں جا کر صرف، صاف کہہ دوں کہ میں جلد لوٹ آیا ہوں مگر میں نے بازو نہیں کٹوائے۔"

"بازو؟ کیسے بازو؟... کون کاٹتا ہے بازو؟" دوسرے آدمی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس نے اپنے لہجہ پر قابو پاتے ہوئے اور گلے کو تھوک سے تر کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"وہ بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں۔ انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے دھیرے وا ہو جاتی ہیں اور پھر بانہیں اپنی جڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں۔ زندگی کا رس ناڑیوں کے رستے سارے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا ہے اور جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے تو انگلیوں کی پوروں میں سے خون کا ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے اور ہر طرف سرخ، سرخ پھول کھل اٹھتے ہیں۔ تب وہ کہتے ہیں۔ "وادی میں بہار آ گئی!"

"تم... تم نے میرے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ تو... تو کیا میں وہاں اپنے بازو کٹوانے جا رہا ہوں؟" دوسرا آدمی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"وہ دیکھو! دور اندھیرے میں جو سائے نظر آ رہے ہیں نہ، وہ گاؤں کے لوگ ہیں جو تلواریں سونتے میری تلاش میں برف پر دوڑے آ رہے ہیں، میں ان کے یہاں آنے سے پہلے اسٹیشن تک پہنچ جانا چاہتا ہوں تاکہ جب گاڑی اگلے گاؤں سے واپس آئے تو میں اس میں بیٹھ کر بھاگ لوں۔ وہاں جیسی بھی شرمندگی ہو گی سہ لوں گا!" اس نے جواب دیا۔

"تم... تم بڑے عجیب آدمی ہو! دوسرے آدمی کی کانپتی ہوئی آواز میں قدرے درشتی تھی۔ "تم نے اپنے لئے اور میرے لئے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ تم نے سوچ لیا ہے کہ شرمندگی تمھارے مقدر میں ہے اور اسے تمھیں سہنا ہے۔ یہ بات بازو کٹوانے سے بھی زیادہ ذلت آمیز ہے۔ جسمانی طور پر اپاہج ہونا یا ذہنی اعتبار سے پست ہونا دونوں میں مجھے کوئی بنیادی فرق محسوس نہیں ہوتا... مگر... مگر میں کیا کروں؟ جب تم گاؤں میں گئے ہو گے تو سب طرف امن تھا۔ مگر اب ہر ہاتھ میں تلوار ہے۔ اور میں اپنے لوگوں میں ایک لمحہ بھی گذار نہیں پایا۔"

دوسرے آدمی کی آواز دھیرے دھیرے مدھم ہوتی ہوئی بالکل ڈوب گئی۔

اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ وہ سردی سے اور خیالات کی تیز رفتاری کی وجہ سے جھولنے سا لگا... اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ نیچے وادی میں لوگوں کے بھاگنے کی آہٹیں ہر لمحہ قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے سوال بنے کھڑے تھے۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی اور اس اندھیرے اور خاموشی میں برف کے گالے ایک، ایک کر کے گر رہے تھے۔

اچانک سامنے والی چٹان کے ساتھ کسی زخمی پرندے کی دلدوز چیخ ٹکرائی۔ وہ دونوں یک بارگی ادھر متوجہ ہوئے، پھر انھیں زخمی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی، تب چٹان کے نیچے والی غار میں سے ایک سایہ نکل کر ان کی طرف لپکا۔ اور انھوں نے دیکھا وہ ایک تیسرا ہی آدمی تھا۔

وہ ان کے قریب آ کھڑا ہو گیا، پھر اس نے زور کا قہقہہ لگایا... انھیں زخمی پرندے کی دل دوز چیخ پھر سنائی دی۔ وہ دونوں دم بخود سے اسے گھورنے لگے۔ تب اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"میں نے آپ لوگوں کی سب باتیں سن لیں ہیں۔ تم دونوں کے پاس صرف لمحوں اور دنوں کا حساب ہے۔ مگر ادھر دیکھو!"

ان دونوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ اور انھوں نے دیکھا کہ اس کے دونوں بازو کندھوں سے کٹے ہوئے تھے۔

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر وہ بولا۔

"کئی صدیاں بیت گئیں۔ تب یہاں برف نہ تھی، سمندر تھا۔ اور ہم سب اس کی بے کرانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ ایک دن کی بات ہے میں اپنے بھگوے لباس میں سمندر کے بازار میں سے گذر رہا تھا کہ ایک نوجوان مچھلی نے مجھے روکا۔ اور میرے سنہری بازوؤں کو بوسہ دیا۔ اور مجھ سے بڑی تعظیم سے پوچھا۔

"یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟"

میں سوچ میں ڈوب گیا اور میرے سنہری بازو کہنیوں سے جھڑ کر گر گئے۔ پھر سمندر کا پانی برف میں تبدیل ہونے لگا اور سارا بازار ویران ہو گیا۔ میں تب سے اس کھوہ میں بیٹھا برف کے پگھلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ کب برف پگھلے گی اور کب میرے بازو مجھے ملیں گے؟

لیکن یقین جانو ایک دن ایسا ہوگا ضرور! اور ہم سب پھر مچھلیوں کی طرح اس سمندر کی بے کرانی میں تیرتے پھریں گے... تب تک سب کے بازو کٹ چکے ہوں گے... کہ مچھلیوں کے بازو نہیں ہوتے۔"

تینوں آدمی برف پر کھڑے ایک دوسرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ دور سے گاؤں والوں کی تلواروں کی چمک ستاروں کی مدھم روشنی میں دکھائی دینے لگی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن کا برفیلا پلیٹ فارم ابھی ویران تھا کہ گاڑی اگلے اسٹیشن سے ابھی واپس نہیں آئی تھی ☆☆☆

کرشن کمار طور

کا

مجموعۂ کلام

سرنامۂ گماں نظری

کرشن کمار طور کو جدید شعرا میں درجۂ اجتہاد و امامت حاصل ہے۔ وہ فارسی اور اردو کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصر حاضر کے آشوب کو انتہائی فن کارانہ مہارت کے ساتھ شعر کا روپ دیتے ہیں اور اس کے باعث وہ اپنے معاصروں میں رشک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ نئے خیالات، نئی تراکیب، استعارے اور پیکر کی جدت، لہجے کا بانکپن، یہ صفات کرشن کمار طور کو عہد حاضر میں ممتاز کرتی ہیں۔

قیمت : ۲۵۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۲۱۱۰۰۱

سے حاصل کریں

سریندر پرکاش

شمارہ ۱۳۰،
دسمبر ۱۹۸۵ تا فروری ۱۹۸۶

اس رات میں نے رسول اکرمؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔

وہ ایک کھیت کے کنارے کھڑے، چند کسانوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اور کھیت میں لہلہاتے ہوئے خوشوں میں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

ان کی شبیہ ویسی ہی تھی جیسی کہ روزمرہ کی بات چیت سن کر ذہن میں محفوظ ہو چکی تھی۔ سر پر بڑا سا سبز عمامہ تھا اور انھوں نے سبز رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

کسان جب اپنی بات ختم کر چکے تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ بجلی کی طرح چمکی۔ کسانوں نے اپنے ہاتھ پیٹ پر باندھ لئے۔ انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے انھیں کچھ سمجھایا۔ کسانوں نے حامی بھرنے کے انداز میں اپنے سر ہلائے تب وہ وداع ہوئے اور آہستہ آہستہ کھیت کی مینڈ پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پھر ان کا سبز عمامہ کھیت کی ہریالی کا حصہ بن گیا اور وہ کائنات کی وسعت میں سما گئے۔

تب میں بہت چھوٹا تھا...

میں نے صبح کو اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا... اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر کہا۔

"واہے گورو، واہے گورو!" اور بولی۔ "خوش حالی آنے والی ہے۔"

پھر وہ لپک کر کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چوتھی سیڑھی پر پہنچ کر اس نے پڑوسیوں کی دیوار سے اوپر سے جھانک کر دوسری طرف آواز لگائی۔

"فاطمہ بہن۔"

تھوڑی دیر کے بعد میری ماں ہی کی ہم عمر ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا... اس نے کانوں میں بڑی بڑی گچھے دار بالیاں پہن رکھی تھیں اور سر پر سیاہ دوپٹہ تھا۔

"کیا ہے رام پیاری؟" اس نے رچ بھاؤ سے پوچھا۔ جیسے اس قسم کا بلاوا ایک معمول سا ہو۔ میری ماں نے قدرے رازدارانہ انداز میں کہا:

"سنا تم نے اپنے چھندی کو رات میں کیا سپنا آیا؟"

"نہیں تو... تو کیا آیا اڑیے؟"

اور میری ماں نے میرا دیکھا ہوا خواب، بہن فاطمہ کے گوش گذار کر دیا۔

"اللہ نہیں!" فاطمہ پوری عقیدت سے بول اٹھی۔ کہاں ہے نی اب؟"

"نیچے گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔" میری ماں نے بتایا۔

"ایسی خصمان کھانی نے کیا ثواب کما لیا ہے!" فاطمہ کا چہرہ یہ کہتا ہوا دیوار سے نیچے لڑھک گیا۔

میں گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شٹاپو کھیل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سب طرف سناٹا تھا۔ ایسے وقت میں گھروں کے دروازوں پر بندھی گایوں اور بھینسوں کی ڈکرانے کی آوازیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ شاید نہر پر نہانے جانے کو اتاولی ہو رہی تھیں، مگر گوجر ابھی نہیں آیا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے والے لڑکیوں کے اسکول میں ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی۔

شٹاپو بھی عجیب کھیل ہے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کر کنویں، دریا اور سمندر بنائے جاتے ہیں اور بوٹ پالش کی ایک خالی ڈبیا سے بشارت لے کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں اب کائنات کے کون سے خطے کو پھلانگنا ہے۔ باری میری تھی اور میں تیسرا دریا پھلانگنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کہ فاطمہ نے پیچھے سے آکر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"اللہ کیا ہوا اسے ساری بات تو بتا۔ سبحان اللہ، تم پر تو رنگ چڑھا لگتا ہے۔ کیا رتبہ پا لیا ہے!"

وہ اٹھائے اٹھائے مجھے اپنے گھر کی طرف لئے جا رہی تھی۔ ماں اوپر سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور بچے سب دم بخود سے کھڑے فکرمند ہو گئے تھے۔ کہ کھیل میں سے اچانک ایک کھلاڑی کے اٹھ جانے سے وہ سارا کھیل پھر سے کیسے

منظم کر پائیں گے۔

فاطمہ کے شوہر شیخ اللہ دتہ بازار میں مکان کے نیچے بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ لمبے لمبے بانس تو سائبان تاننے اور مکان وغیرہ بنانے کے کام آتے تھے، لیکن چھوٹی لاٹھیاں لوگ بلم اور بھالے بنانے کے لئے لے جاتے تھے جو کہ بعد میں مرنے مارنے کے کام آتی تھیں۔ فاطمہ نے ان کو لفظ بھیج دیا تھا۔ وہ میرے پاجامے کے لئے لٹھے کا ٹکڑا اور قمیص کے لئے پاپلین، ایک سیر جلیبی اور سوا روپیہ نقد لے کر آپہنچے۔ فاطمہ نے وہ سب میری جھولی میں ڈالا اور مراقبے میں گر گئی۔ شیخ اللہ دتہ دونوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ فاطمہ آنسوؤں سے تر آواز میں پھسپھسانے لگی۔

"ہمارے رسولؐ، ہمارے رسولؐ!"

شیخ نے حال کی سی کیفیت میں سر کر ایک بار دائیں اور ایک بار بائیں جنبش دے کر سرگوشی کی۔

"آمین... ثم آمین۔"

شہر کے مرکزی گھنٹہ گھر نے ساڑھے بارہ بجائے۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی۔ گائیں اور بھینسیں رسیاں کھلتے ہی نہر کی طرف بھاگیں۔ بچوں کی ایک پارٹی نے دوسری پارٹی کو ایک گیم سے ہرا دیا۔ جیسے سب طرف حشر سا برپا ہو گیا ہو۔

اس بات کو کئی برس بیت گئے ہیں۔

شہر کے مرکز میں ایستادہ گھنٹہ گھر نے کچھ ضرور بجایا ہوگا۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی ہوگی۔ گائیں بھینسیں ڈکراتی ہوئی نہر کی طرف بھاگی ہوں گی اور زمینوں پر لکیروں سے بنے کنویں، دریا اور سمندر بھی پھلانگے جاتے ہوں گے... لیکن کوئی آواز نہیں آتی۔

"ماں اب بھی پھر ویسا خواب نہیں آیا!" میں نے پوچھا۔

"اب کہاں بیٹا... وہ ادھر گئے اور ہم یہاں آگئے۔" ماں نے جواب دیا۔

ماں اچانک بیمار پڑ گئیں تھیں۔ بہت علاج کروایا لیکن فائدہ نہ ہوا۔

ڈاکٹر نے ایک دن کہا۔ "بہتر ہے کسی سینی ٹوریم میں داخل کروا دو۔"

کافی دوڑ دھوپ کے بعد اس گاؤں کے سینی ٹوریم میں جگہ مل گئی۔ ماں اس سینی ٹوریم میں ساڑھے تین برس رہیں۔ جس صبح اس کی موت ہوئی، اس سے پہلی شام میں اور میری بیوی اس کے پاس تھے۔ وہ بالکل بھلی چنگی لگ رہی تھیں۔ چہرے پر چمک تھی۔ آنکھوں کی پتلیوں میں ستارے سے ٹوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے اس کے سر کے چاندی سے سفید بال سنوار کر پیچھے جوڑا بنا دیا تھا۔ ایسی صحت مند وہ کبھی بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ہم دونوں شام کی بس سے لوٹ آئے تھے، گھر میں بچے اکیلے تھے۔ اور پھر مارگریٹ نے بھی یقین کے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ لوگ جائیے۔ ماں بالکل ٹھیک ہیں۔"

مارگریٹ سینی ٹوریم میں کیئر ٹیکر تھی اور میری راکھی بہن بن گئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ ایک بار جب میں اسی طرح ماں کو دیکھنے آیا تھا تو اتفاق سے اس دن راکھی کا تیوہار تھا۔ میں بیٹھا ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ مارگریٹ آئی اور میری کلائی پر راکھی باندھ دی۔ میں بوکھلا گیا تھا۔

"ماں جی نے مجھے بیٹی بنا لیا ہے۔" مارگریٹ نے بتایا۔

ماں تھی ہی ایسی، جہاں جاتی لوگوں کا من موہ لیتی تھی۔ مجھے یاد ہے پتا جی مرتے دم تک ماں کے عشق میں مبتلا رہے تھے۔ کئی بار ماں کے رخساروں کو چھو کر اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر انھیں میں نے آنسو بہاتے دیکھا تھا۔

"پتا جی کہا کرتے تھے، بیٹا من میں کبھی تعصب نہ لاؤ۔ عقیدہ پکا رکھو جو کچھ پڑھو اسے بھگوان کے بھیجے ہوئے شبد سمجھو... ورنہ کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور نرے قمر الدین رہ جاؤ گے۔" ان کی عجیب عادت تھی۔ وہ جس کا نام نہ جانتے یا اسے جاہل سمجھتے قمر الدین کہہ کر پکارا کرتے۔ ان کی بات زندگی کی کسوٹی پر کئی بار کھری اتری۔ میں نے اکثر دیکھا کہ کوئی قمر الدین اپنے رٹے ہوئے علم، اونچے قد، لمبی بیخ اور چہرے پر چپکائی ہوئی وڈی مسکراہٹ کے بل بوتے پر کوئی عہدہ پا لیتا ہے۔ مگر اس کے سر میں بھیجا کتنا ہے۔ کوئی وزن نہیں کرتا۔

مرنے کے بعد ماں کا مردہ بھاری ہو گیا تھا۔ ہم کو اس کی موت کی خبر اگلے دن دوپہر کو مل گئی تھی۔ مارگریٹ نے سینی ٹوریم کے ایک کارکن کو ایڈریس دے کر بھیجا تھا۔ میں بیوی بچوں سمیت اس گاؤں پہنچا۔ مارگریٹ سینی ٹوریم کے دروازے پر سوگوار بیٹھی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے وہ باری باری سب کے گلے لگ کر روئی۔ وہیں اس گاؤں کے چھوٹے سے شمشان میں ماں کا انتم سنسکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زندگی کی کتاب کا ایک ادھیائے سماپت ہو گیا۔

اس دن کے بعد وہ گاؤں ہمارے لئے ایک تیرتھ استھان سا بن گیا۔ ہر راکھی کو وہاں جاتے، مارگریٹ مجھے راکھی باندھتی اور پھر ہم سب شمشان جا کر بیٹھتے اور ماں کی باتیں کرتے۔ اس دن کے بعد سے مارگریٹ گویا ہمارے خاندان کا ہی ایک فرد بن گئی تھی۔

بس اپنی مخصوص رفتار سے اس گاؤں کی طرف چلی جا رہی تھی۔ باہر وہی بار بار دیکھا ہوا منظر تھا۔

"کتے کی موت مرے گا سالے۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک قمر الدین نے دوسرے قمر الدین کو ہنسی کھیل میں گالی دی۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دونوں کو دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر بار بار دیکھا ہوا منظر دیکھنے لگا۔

دو متوازی پہاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ان کی چوٹیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں سرخ ٹائلوں کی چھتوں والے کئی مکان دھرے ہوئے تھے۔ کسی کی کھڑکی کھلی تھی، کسی کا دروازہ۔ گھروں کے اندر دھند لگا تھا اندر کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہوا بوجھل تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں جھکورے کھا رہی تھیں اور فضا میں گیلی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی سب طرف جل تھل تھا۔ چلتی ہوئی بس بالکل بے حرکت لگ رہی تھی۔

کل راکھی کا تیوہار تھا۔ اور میں اکیلا ہی مارگریٹ سے راکھی بندھوانے جا رہا تھا۔

اس کا گاؤں دراصل تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں ایک عالی شان مندر ہے۔ جس کے گنبد کا کلس دور سے ہی دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس پر

گیروے رنگ کا ایک جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ مندر کی عمارت بڑی شان دار اور پختہ ہے۔ ایک اونچی چاردیواری مندر اور اس کی عمارت سے ملحقہ گیسٹ ہاؤس کو گھیرے ہوئے ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے تمام کمرے ایر کنڈیشنڈ ہیں جن میں، امریکہ، آسٹریلیا اور یورپ سے آئے ہوئے ان سوامی جی کے عقیدت مند آکر ٹھہرتے ہیں جن کے نام پر یہ مندر تعمیر ہوا ہے۔

وہ سوامی جی کون تھے؟ یہ پوری طرح سے کوئی نہیں جانتا۔ ایک پوتر آتما جو ایک دن اس خطۂ زمین پر آ اتری اور پھر یہیں کی ہو گئی... سوامی جی کی تصویریں جا بجا لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ لنگوٹ باندھے باقی شریر سے بالکل ننگے ہیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر عجیب دیوتاؤں کی سی شان سے بیٹھے ہیں جیسے سارے سنسار کو آشیرواد دے رہے ہوں۔ کسی کسی تصویر میں ان کے سامنے ایک پھنیر سانپ بھی بیٹھا دکھائی دیتا ہے جو ان کی ایشور شکتی کے سامنے گویا نت مستک ہو گیا ہے۔ مندر کے بڑے ہال کا ماحول بڑا پراسرار ہے۔ گہرے اندھیرے میں ان کی سونے سے بنی سونی پتلی ہے۔ سوامی جی فربہ شریر کے سیہ فام منشیہ تھے۔ ان کا چہرہ گیند کی طرح گول تھا۔ مندر میں دن رات تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آرتی ہوتی ہے جس میں غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند قطاروں میں کھڑے ہو کر آرتی گاتے ہیں۔ ایک بھگت ہارمونیم پر ساتھ دیتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر سے یہ سر تال اور لے اوپر آکاش کی وسعت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ سرشٹی کی اچھا سے ہو رہا ہے۔

مندر ہی کی عمارت میں ایک طرف ایک بدیشی بینک کی برانچ ہے۔

سامنے ایک صاف ستھرا ریستوران ہے جس میں ایک راستہ پیچھے پارک میں جاتا ہے۔ پارک میں کئی پھل دار درخت ہیں اور طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں... غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند یہاں فرصت کے وقت میزوں کے گرد بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اور گپ شپ لڑاتے ہیں۔

ریستوراں کے ساتھ ہی مندر کے نام پر بنا پوسٹ آفس ہے جس کے باہر بس اسٹینڈ کا شیڈ ہے... پختہ سڑک کے ایک طرف چند دکانیں ہیں جن میں ایک لانڈری اور ایک پراویژن اسٹور ہے اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی دکانیں۔ مندر سے بہت فاصلہ پر مین سڑک کے کنارے بنے ایک مکان میں ولایتی شراب کی دکان ہے... آرتی کے سر فضا میں گونجتے رہتے ہیں... اور سڑک پر خاصی چہل پہل رہتی ہے۔

اس گاؤں کے دوسرے حصے میں سینی ٹوریم ہے۔

متعدی بیماریوں کے مریض بوڑھے، ور بوڑھیاں شہر کی دھول مٹی اور کارخانوں کی زہریلی ہوا سے دور، خریدی ہوئی سانسیں، سینی ٹوریم میں لیتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلتے ہیں یا پھر سردیوں کی دھوپ میں آرام کرسیاں ڈال کر چہروں پر ہاتھ رکھے آسمان کی طرف دیکھتے بیٹھے نظر آتے ہیں... اسی علاقہ میں گندھک کے پانی کے چشمے ہیں... تیراکی کا لباس پہنے غیر ملکی عقیدت مند اور شہر سے آئے ہوئے مرد عورتیں اپنے کندھوں پر تولیے ڈالے ان چشموں کی طرف جاتے اور آتے رہتے ہیں۔

اگر مندر والے حصے میں آتمک شدھی کی کریا چلتی رہتی ہے تو اس حصے میں شریر کو نروگ رکھنے یا کرنے کی کوشش جاری رہتی ہے... دونوں حصوں میں چہل پہل ہے۔ لوگ روپیہ خرچ کر کے روحانی اور جسمانی زندگی لے رہے ہیں۔ مارگریٹ کا گھر اسی حصہ میں سینی ٹوریم کے پچھواڑے واقع ہے۔

ہم لوگ یہاں آئیں تو مارگریٹ کے گھر ہی ٹھہرتے ہیں۔ وہ شہر آئے تو ہمارے ہاں رہتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا نہ کہ ہم قریب قریب ایک ہی خاندان کے فرد ہو گئے ہیں۔

اور اس کا تیسرا حصہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

صدیوں پہلے یہ گاؤں بسا ہوگا... کئی بار اس گاؤں کے گھروں کے چھپر آندھی میں اڑ گئے ہوں گے اور سیاہی مائل ہوتھوں نے نئے گھر تعمیر کئے ہوں گے۔ ان گھروں کے گرد پھیلے ہوئے کھیت کروڑوں برس پرانے ہیں... اور اس گاؤں کے اس حصہ کے گاؤں میں بسنے والوں نے ان کھیتوں سے لاکھوں بار اپنے مقدر کی فصل کاٹی ہوگی... وہ سب جوان گھروں میں رہتے ہیں ادھ ننگے ہیں۔ ان کے جسم دھوپ کی تمازت کی وجہ سے کالے ہو گئے ہیں... ان کی عورتوں کی چھاتیاں درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی طرح لٹکتی رہتی ہیں۔ ان کے کانوں میں کئی چھید ہیں جن میں چھوٹی بڑی چاندی کی بالیاں جھولتی ہیں۔ ان کے گھر اندھیرے ہیں اور ان کی عورتیں پینے کے لئے دور گندے تالابوں سے پانی مٹکے مٹکے بھر بھر کر لاتی ہیں۔

اس گاؤں کے مندر والے حصے اور اس حصے میں کئی صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ایک پکی سڑک اس طرف سے اس طرف آتی ہے جو یہاں پہنچ کر کسی کھیت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور پھر ان گنت پگڈنڈیاں شروع ہوتی ہیں جو کہیں گھروں کے آگے سے اور کہیں کھیتوں کے درمیان میں سے گذرتی ہوئی نامعلوم اطراف میں بکھر جاتی ہیں۔

ایک بار جب میں یہاں آیا تو یونہی گھومتا پھرتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے وہ کھیت نظر آیا جس کے خوشوں میں شعاعیں پھوٹتی تھیں... جس کے کنارے چند کسانوں کو میں نے ان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔

"اوہ! تو بچپن کے اس خواب کا کھیت یہاں واقع ہے!"

میں نے من ہی من کہا۔ اور کافی دیر کھڑا وہاں انتظار کرتا رہا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ سب طرف سناٹا تھا۔ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گذرتی تھی... اور کبھی کبھی کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہ آیا... کھیتوں میں ہریالی لہلہا رہی تھی۔

بس اسٹینڈ پر اتر کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور مارگریٹ کے گھر کی طرف چل دیا۔ میں اب راستوں سے بخوبی واقف ہوں۔ آنکھیں بند کر کے پہنچ سکتا ہوں... راستے میں ایک جگہ میں نے ایک بھیڑ دیکھی۔ چند کاریں اور پولیس کی گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ سفید اجلے لباسوں میں کچھ لوگ بڑے مصروف نظر آئے۔ میدان میں ایک سائبان تنا ہوا تھا۔ جس کا رنگ برنگا کپڑا ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سائبان کے اندر پتلے کاغذ کی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑی میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میں یہ نظارہ دیکھنے کے لئے رک گیا... قریب گیا تو دیکھا

کہ سائبان کے نیچے وسط میں ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ جس کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ قریب ہی ایک ہون کنڈ پر جولت تھا جس کے ایک طرف اوپر کے دھڑ سے ایک ننگا برہمن پوجا کر رہا تھا... معلوم ہوا کہ علاقہ کے وزیر صاحب آئے ہیں۔ گاؤں والوں کے لئے پینے کے پانی کی سہولت کے لئے ہینڈ پمپ کا ادگھاٹن ہونے جا رہا ہے۔

ہون کنڈ میں سامگری جل رہی تھی۔ فضا میں منتر گونج رہے تھے... منتر جب ایک خاص مرحلہ پر پہنچا تو سب ہون کنڈ میں سامگری ڈالتے، وزیر صاحب بھی جن کے گلے میں بھی ایک ویسا ہی پھولوں کا ہار پڑا تھا جیسا کہ پمپ کے گلے میں۔

پوجا ختم ہوئی تو وزیر صاحب نے ناریل پھوڑا... سب نے وزیر صاحب کی جے کا نعرہ لگایا اور تالیاں بجائیں... وزیر صاحب نے ہینڈ پمپ کا ہتھ پکڑ کر دبایا... پمپ کے دہانے سے پانی ابل پڑا... وہ پہلا پانی ایک برتن میں لیا گیا اور پھر چرن امرت کی طرح سب میں بانٹا گیا... سب نے چلو میں لئے لئے پانی کو منھ لگایا اور پھر ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے سر کے بال پونچھ دیئے۔

میں نے مارگریٹ کو دیر سے گھر پہنچنے کی وجہ بتائی تو اس نے کہا۔

"ہاں بیچارے گاؤں والوں کو پینے کے پانی کی بہت تکلیف ہے۔ گندے تالابوں کا پانی پیتے ہیں۔ بہت اچھا ہوا۔"

پروگرام یہ طے پایا کہ میں صبح راکھی بندھوا کر پہلی بس سے نکل جاؤں گا۔ شہر کو جانے والی پہلی بس صبح ساڑھے آٹھ بجے جاتی تھی۔

مارگریٹ آخری راؤنڈ لگانے کے لئے سیلی ٹوریم گئی۔ میں یونہی ستانے کے لئے اس کے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے نیند آ گئی...

مارگریٹ نے واپس آ کر جب مجھے جگایا تو رات ہو چکی تھی اور کھانا میز پر لگا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا مارگریٹ نے کہا کہ میں اس کے کمرے میں اس کے پلنگ پر سو جاؤں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کھانے کا خمار اور پھر بس میں بیٹھے رہنے کی تھکاوٹ کی وجہ سے پڑتے ہی سو گیا۔

پھر ایک خواب ناک فضا قائم ہونے لگی۔ بچپن میں دیکھا ہوا خواب فاطمہ کا لش لش کرتا ہوا چہرہ... ماں کی جلتی ہوئی چتا اور پھر کئی جانے انجانے چہرے اس طرح میرے گرد منڈلانے لگے جیسے دھاگوں سے باندھ کر چھت سے لٹکا دیئے گئے ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ بچپن میں دیکھے ہوئے خواب کی طرح ایک بار پھر دیدار ہو جائیں... لیکن لگتا تھا۔ اس نظارے کو کسی نے نظر بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے حواس کے جنگل سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں جا پہنچا۔

میرے نتھنوں میں کسی جسم کی مہک بس گئی... اور اچانک ایسا ہوا کہ میں نیند کا تار و پود توڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ میں نے کیا کیا...؟" میں بڑبڑایا۔ جواب یہ تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا یا دیکھا وہ عمل انتہائی شرمناک تھا۔ میں اس کے لئے اپنے ہی سامنے نادم ہو رہا تھا۔ جہالت کے جنگل سے تہذیب کی وادی تک کے سفر کے باوجود میرا ذہن روشن نہیں ہوا تھا... کمرہ بالکل اندھیرا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔

اس شرمناک عمل نے میرے تمام حواس معطل کر دیئے تھے۔ ذہن قریب قریب ماؤف تھا۔ اور کنپٹیوں پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ میں نے لائٹ جلائی اور سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ہے بھگوان، یہ سب کیسے ہو گیا...؟" میں نے آپ سے سرگوشی کی۔ مجھے کسی پل چین نہیں تھا۔ میں نے خواب میں مارگریٹ کے ساتھ مباشرت کی تھی۔

صبح میں بہت جلد تیار ہو گیا۔ مارگریٹ آئی اور اس نے میری راکھی باندھی۔ میرے منھ میں مٹھائی کا ٹکڑا ڈالا۔ میں نے اسے ایک سو ایک روپیہ دیا... ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ یہ سارا کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔ میں نے چلنے کے لئے بیگ اٹھایا۔

"اتنی جلدی؟" مارگریٹ نے کہا۔

"آہستہ آہستہ نکل جاؤں گا۔ تمہیں بھی تو ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

چلتے چلتے میں اس کھیت تک آیا جس کے خوشوں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا، سوچا کہ شاید کچھ بشارت نصیب ہو۔ وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ "میں کس کا منتظر ہوں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا... اس بار مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ پہاڑی کے پیچھے سے سورج دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا۔ کھیت کے کنارے کوئی نہیں تھا۔

میں چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کل سائبان تنا ہوا تھا۔ اب سائبان غائب تھا۔ ہون کنڈ ٹھنڈا پڑا تھا۔ پوجا کا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا پڑا ہوا تھا ہینڈ پمپ کے گلے میں پڑا ہوا ہار مرجھا گیا تھا۔ گاؤں کی طرف سے ایک ادھ ننگی سیاہ فام عورت سر پر مٹی کا مٹکا رکھے آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں چاندی کی بالیاں جھول رہی تھیں پیشانی پر ٹیٹو سے کچھ شبیہ بنی تھی۔ اس کے بال اوپر سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور پیچھے جوڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ سیدھی پمپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے سوچا یہ پہلی عورت ہے جو اس ہینڈ پمپ کا پانی پینے کے لئے اپنے گھر لے جائے گی.. میں ہینڈ پمپ کے منھ سے پہلا پانی نکلنے کا منظر دیکھنے کے لئے رک گیا۔

عورت پمپ کے قریب آئی... اس نے اپنا مٹکا زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر ہینڈ پمپ کو پرنام کیا.. پھر وہ سیدھی ہوئی۔ اس نے اپنا مٹکا اٹھا کر دوبارہ سر پر رکھا اور اس سمت بڑھنے لگی جدھر گندے پانی کا وہ تالاب تھا جس میں سے وہ ہر روز پینے کا پانی لے جایا کرتی تھی ☆☆☆

ہمزہ، اپنی اصل کے تناظر میں

سکندر احمد

شمارہ ۲۳۲،
دسمبر ۱۹۹۹

یاس یگانہ چنگیزی نے ایک مرتبہ فراق گورکھپوری کو مشورہ دیا:

یہ دیکھ کر کہ غزل کی اہمیت کا آپ کو اندازہ ہے، میں آپ کی قدر کرتا ہوں مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ محض انگریزی لٹریچر پر اکتفا کر کے، ایرانی لٹریچر سے بے خبر رہ کر فن پر کوئی تبصرہ کرنا سنسنی خیز تو ہو سکتا ہے مگر یہ پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچتا(۱)۔

اگر صوتیات کے تناظر میں مقتبس حوالے میں تھوڑی ترمیم کر دی جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محض انگریزی صوتیات اور مغربی ماہرین صوتیات پر اکتفا کر کے، ایرانی اور عربی صوتیات سے بے خبر رہ کر، اردو صوتیات پر تبصرہ کرنا سنسنی خیز تو ہو سکتا ہے مگر پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خالص عربی صوتی نکات پر بحث میں بھی ہمارے یہاں حوالہ ہے تو کسی مغربی ماہر کا، نہ کہ کسی ایرانی یا عربی ماہر صوتیات کا۔ ملاحظہ ہو:

"عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی کا ہے (Plosive Consonant) اور دوسرا حلق بندی (Glottal Stop) آوازوں کا۔ لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ (Dipthong) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے"(۲)۔

فاضل مصنف نے ہمزہ کے مخرج کے متعلق ایک ماہر صوتیات کا حوالہ دیا ہے۔ ان کا نام ہے W.H.T.Gaindel، جنھوں نے اپنی کتاب The Phonetics of Arabic میں یہ اصول بیان فرمایا تھا۔ اگر فاضل مصنف اصل مراجع پر توجہ فرماتے تو یہ بیان ان کے قلم سے نہ نکلتا۔ عربی اور فارسی ماہرین کو پڑھے بغیر ہم اگر اردو صوتیات پر لکھنے کی کوشش کریں گے تو اصطلاح بازی کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارا بیشتر وقت Nasal, Plosive, Trill, Stop, Fricative, وغیرہ کے نعم البدل ہی ڈھونڈنے میں گذر جائے گا۔ اقتدار حسین خاں نے اپنی کتاب "صوتیات اور فونیمیات" کے صفحہ ۴۶ پر Semi-vowel کے لئے "رگڑ جاریہ" کی مضحکہ خیز اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔

ہمزہ سے متعلق جتنی بھی غلط فہمیاں اور اختلافات رائے ہیں وہ اردو کی ساری عربی اور فارسی صوتیاتی اصول سے عدم واقفیت کی بنا پر ہیں۔ ہمزہ، اردو صوتیات کا "مثلث برمودہ"(۳) بن گیا ہے۔ ہر کوئی اس کی من مانی تشریح کر رہا ہے، اور اصل صورت حال سے بے خبر رہ کر۔ کوئی اسے حرف قرار دے رہا ہے تو کوئی علامت کہہ رہا ہے۔ چند ماہرین اسے دونوں ہی قرار دیتے ہیں۔ کوئی اس بات پر بضد ہے کہ ہمزہ کو صرف اعراب سمجھا جائے۔ علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی اپنی کتاب "کیفیہ" میں فرماتے ہیں کہ گو کہ فارسی اور اردو کی قدیم کتابوں میں ہمزہ حروف تہجی میں شامل ہے، مگر حقیقت میں وہ حرف ہے ہی نہیں۔ ہمزہ کو اعراب کہتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ "اس کی حیثیت پہلے چاہے جو بھی ہو مگر اب اعراب کی علامت سے زیادہ نہیں۔ نہ مادۂ تاریخ نکالنے میں اس کا کوئی عدد لیا گیا ہے(۴)۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی ہمزہ کو حروف میں شمار نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہمزہ (ء)، اسے غلطی سے حروف میں شامل کر لیا گیا۔ یہ دراصل (ی) اور (و) کے ساتھ وہی کام کرتا ہے جو مد الف کے ساتھ (۵)۔" مولوی صاحب کے برعکس، شوکت سبزواری، ڈاکٹر صدیقی، عزیز الحسن، گیان چند جین وغیرہ اسے ایک حرف تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جن ماہرین صوتیات نے ہمزہ کو حرف تسلیم کیا ہے ان میں بھی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر صدیقی، گیان چند جین وغیرہ اردو میں

ہمزہ کو مصوتہ تسلیم کرتے ہیں جب کہ عزیز الحسن اسے مصمتہ مانتے ہیں(۶)۔

میں نے ہمزہ سے متعلق جتنے بھی اردو کتب و رسائل کا مطالعہ کیا، کسی میں بھی کسی تازی یا عجمی ماہر صرف و نحو کا تذکرہ نہ پایا۔ حالاں کہ ظاہر ہے کہ ہمزہ، جو عربی الاصل ہے، اس کے بارے میں بنیادی معلومات عربی، اور پھر فارسی ہی سے مل سکتی ہے۔ اگر اردو کے ماہرین تاریخ میں جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ان کی نظر غالب پر جا کر اٹک جاتی ہے۔ غالب کی حیثیت بطور شاعر مستند ہے۔ لیکن نحوی معاملات میں ان کی کوئی کتاب، کوئی مضمون سوائے "قاطع برہان" دستیاب نہیں ہے، اور "قاطع" کا طرز نظر کچھ اور ہی ہے۔ نحوی معاملات پر غالب کی تحریریں دستیاب ہیں تو صرف خطوط جو انھوں نے اپنے شاگردوں کو تحریر کئے۔ ان خطوط میں کہیں کہیں نحوی اور صوتیاتی نکات کا تذکرہ ہے مگر نہایت ہی سرسری طور پر، اور نہایت اختصار کے ساتھ۔ ان ضمنی تحریروں کی بنا پر غالب کو صوتی اور نحوی معاملات میں مستند نہیں کہہ سکتے۔

ہمزہ اور یائے اضافت، نیز ہمزہ مصمتہ یا مصوتہ؟

محترم گیان چند جین ہمزہ کو حرف تو مانتے ہی ہیں لیکن اسے مصوتہ مانتے ہیں نہ کہ مصمتہ (۷)۔ ایک سے زیادہ جگہوں پر انھوں نے ہمزہ کو متحرک الف مانا ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں (۸)۔ عزیز الحسن مرحوم بھی اسے الف متحرک مانتے ہیں(۹)۔ لیکن گیان چند جین اس بات پر بھی بضد ہیں کہ عربی اور فارسی اصول کا اطلاق اردو میں نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ "اردو خط میں فارسی خط سے کئی حروف زیادہ ہیں۔ اس کا اپنا مزاج ہے۔ اسے کیوں عربی فارسی کا ضمیمہ بنائے رکھا جائے(۱۰)؟ یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اردو کا اپنا اصول ہونا چاہئے، لیکن آپ پہلے عربی اور فارسی صوتی اصول سے اپنی واقفیت کا ثبوت تو پیش کیجئے، پھر انحراف کیجئے۔ گیان چند جین علی الاعلان فرماتے ہیں کہ عربی کی انھیں واقفیت نہیں، پھر بھی انھوں نے ایک غیر عربی داں کا حوالہ دیا، اور اس کو غلط بھی "ثابت" کردیا۔

ڈاکٹر عقیل نے W.H.T.Gaindel کے حوالے سے کہا تھا کہ عربی میں ہمزۂ واضح دو طریقوں پر ہوتا ہے، پہلا طریقہ بندشی کا ہے، اور دوسرا حلق بندی۔ گیان چند جین فرماتے ہیں کہ محمد عقیل سے التباس ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ التباس ہوا ہے تو Gaindel سے نہ کہ محمد عقیل سے۔ موخر الذکر نے تو صرف ایک شخص کا قول نقل کردیا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ انھیں تصدیق کرلینی چاہئے تھی کہ جو بات گینڈل صاحب کہہ رہے ہیں، وہ درست بھی ہے کہ نہیں)۔ دوسری بات یہ کہ گیان چند جین کا مضمون "یائے اضافت اور ہمزہ" کے متعلق ہے۔ اس میں محمد عقیل کے حوالے کی کوئی ضرورت تھی ہی نہیں۔ فارسی سے متعلق گیان چند صاحب نے صرف ایک حوالہ دیا ہے وہ ہے ڈاکٹر نذیر احمد کا۔ بقول گیان چند، پروفیسر نذیر احمد فرماتے ہیں "..عربی علامت ہمزہ جو صرف (ع) کے شوشے کی طرح (ء) لکھی جاتی ہے، وہ فارسی مخطوطات میں نہیں۔ اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ علامت اضافت و توصیف دراصل مخفف (ی) ہے، ہمزہ نہیں (۱۱)"۔ ملاحظہ کیجئے کہ پروفیسر گیان چند جین نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا۔ فرماتے ہیں: "معلوم ہوا کہ ہمزہ کی شکل (ء) عربی ہے اور (ٔ) فارسی" (۱۲)۔ نذیر احمد صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ فارسی میں (ء) کی علامت ہمزہ نہیں، مگر گیان چند بضد ہیں کہ یہ ہمزہ ہی ہے۔

پروفیسر گیان چند "یائے اضافت کے لئے ہمزہ کے استعمال" کے بارے میں اپنے دلائل میں زور پیدا کرنے کے لئے معکوس نتیجہ بھی اخذ کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہاں میری اس بات پر کوئی بحث نہیں کہ یائے اضافت کے لئے ہمزہ کا استعمال ہونا چاہئے کہ نہیں۔ میرا معروضہ صرف یہ ہے کہ مفروضہ جو بھی ہو، اسے ٹھوس بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔ اپنے مضمون میں پروفیسر گیان چند نے ایک سے زیادہ جگہوں پر اردو کی جداگانہ حیثیت کی بات کی ہے اور فارسی کے اصول کی نفی کی حمایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "اردو میں ہمزہ کی نوعیت محض الف متحرک کی ہے، جب کہ عربی و فارسی میں اس کے علاوہ بھی ہے۔"

مجھے یہ کہنے کی اجازت ہونی چاہئے کہ ہمزہ کی نوعیت جو بھی ہے، وہ اردو میں عربی/فارسی سے ہی آئی ہے، اور ہمزہ پر ہماری بحث عربی/فارسی کے بغیر نامکمل اور غیر نتیجہ بخش رہے گی۔ محقق طوسی کی "معیار الاشعار" عروض کی ایک مستند کتاب ہے۔ میرے پاس اس کتاب کے دو نسخے ہیں۔ ایک، جس کا نام "زرکامل عیار" ہے، اسے مظفر علی اسیر نے ترتیب دیا ہے۔ متن کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے متوازی ترجمہ مع تشریح بھی دے دیا ہے۔ یہ کتاب اب اتر پردیش اردو اکادمی سے چھپ گئی ہے۔ غالب امکان ہے کہ یہ نسخہ مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی کا ترتیب کردہ قدیمی نسخہ ہے۔ دوسرا نسخہ تہران میں چھپا ہے۔ اس کے مرتب نجم الدولہ ہیں۔ تہران کے ایڈیشن میں نجم الدولہ کے مخطوطے کی فوٹو کاپی بھی لگا دی گئی ہے۔ عربی اور فارسی میں عروض کی ہر مستند کتاب میں صوتیات کا بھی ذکر ہے۔ خلیل بن احمد صرف عروضی اصول کا ہی موجد نہ تھا، وہ دنیا کا پہلا ماہر صوتیات بھی تھا(۱۳)۔ "معیار الاشعار" کے دونوں نسخوں کے ابتدائی ابواب میں صوتیات پر، اور بالخصوص مصمتہ اور مصوتہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اسے اردو صوتیات کی کم مائگی سمجھئے کہ عروض پر بحث کرتے وقت تو محقق طوسی اور خلیل بن احمد کا ذکر ہوتا ہے لیکن صوتیات میں ہم ان لوگوں کو بھول کر بلاک اینڈ ٹریگر، ٹروبیٹس کائے، فرتھ، پراگ اسکول، بلوم فیلڈ وغیرہ کا ذکر کرنے لگتے ہیں(۱۴)۔ بہر کیف، زیر نظر مضمون میں "معیار الاشعار" کا اصل فارسی متن نجم الدولہ کے نسخے سے، اور اردو ترجمہ اور تشریح مظفر علی اسیر کے نسخے سے لئے گئے ہیں۔

محقق طوسی فرماتے ہیں:

> دور علوم دیگر تقریر کردہ اند کہ حروف دراصل (دو) نوع بودہ است: یکی "مصوت" و یکی "مصست [مصمت]؟" و مصوت یا مقصور است، یا ممدود۔ و مقصور حرکات باشند، مانند ضمت، فتحت و کسرت۔ و ممدود، حروف مد کہ اخوات آں حرکات باشند، چہ ہر یکی از اشباع یکی از آں حرکات تولد کند۔ و حروف مصمت باقی حروف است، واو، و الف، و یا۔ ہر یک بہ اشتراک بر دو حرف افتد، یکی مصوت کہ حروف مد مذکور است و آں حروف جز ساکن نہ تواند بود۔ و دیگر مصمت کہ ہم متحرک باشند ہم ساکن۔ و اما مصمت در واو، و یا ظاہر است۔ و اما در الف، مصمت را ہمزہ نیز خوانند (۱۵)۔

اسیر اس عبارت کا ترجمہ اور تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

علوم دیگر میں یوں کہا ہے کہ حرف اصل میں دو طرح پر ہیں، مصوت اور مصمت۔ اور مصوت کی بھی دو قسمیں ہیں، مقصور اور ممدود۔ پس مصوت، مقصور حرکات کو کہتے ہیں یعنی زبر، زیر، پیش۔ اور مصوت، ممدود حروف کو کہتے ہیں کہ اخوات ان حرکات کے ہیں، کس واسطے کہ اشباع ضمہ سے واو، اور اشباع فتحہ سے الف، اور اشباع کسرہ سے ی، پیدا ہوتی ہے۔ اور سوا ان کے سب حرف مصمت ہیں۔ پس مصوت بتشدید و کسرہ واو، بمعنی آواز دہندہ۔ اور ظاہر ہے کہ آواز تلفظ عین حرکات حروف سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مصمت، بضم میم اور بہ سکون صاد و فتح میم دوم اور تاے فوقانی آگندہ میان خلاف مجوف (منتخب اور شرح نصاب اور کنز سے کذافی الغیاث)۔ اور بسبب استحکام اور استقلال کے، کہ حروف مصوت سے ان میں زیادہ ہے، مصمت نام رکھا۔ اور حروف مدہ حروف علت ہیں کہ خود ساکن اور حرکات ماقبل موافق ہو، جیسے دان اور دین اور دون۔ پس اگر خود متحرک ہوں جیسے صور اور سیر جمع صورت اور سیرت کی، یا حرکات ماقبل کی موافق نہ ہو، جیسے دور بمعنی 'گردش' اور دیر بمعنی 'بتخانہ'، [وہ] حروف مدہ نہ ہوں گے۔ اور اخوات جمع اخت، مراد مناسب ہے۔ اس واسطے کہ بھائی بہن میں لامحالہ مناسبت ہوتی ہے، اور ان حروف اور ان حرکات میں بھی مناسبت ہے کہ انھیں سے پیدا ہوتی ہے باشباع۔ اور واو اور الف، اور ی، ہر ایک باشتراک حرکت دو قسم پر ہیں۔ ایک مصوت، کہ حروف مد ہیں اور وہ سوا ساکن کے نہیں ہو سکتے۔ دوم مصمت، کہ متحرک بھی ہوتے ہیں اور ساکن بھی۔ لیکن واو اور ی میں تحریک اور سکون ظاہر ہے مگر الف میں مشکل۔ پس اصل جگہ الف مصمت کو ہمزہ کہیں گے۔ حاصل مطلب یہ کہ الف، اور واو، اور ی، دو طرح پر ہیں: مصوت اور مصمت۔ پس مصوت جس کو ممدودہ کہتے ہیں، جیسے نور، اور دور، اور میر، اور پیر، اور دار، اور زار۔ یہ سوا ساکن کے نہیں ہوتے۔ اور مصمت، وہ بھی دو طرح پر ہیں، ساکن اور متحرک۔ پس مصمت ساکن جیسے یوم، اور ویل، کہ بسبب عدم مناسب حرکت ماقبل کے غیر مدہ ہیں۔ اور مصمت ساکن اور قبل الف ہمیشہ فتح ہوتا ہے، غیر مدہ ممکن نہیں۔ اور مصمت متحرک واو جیسے ولد، ولدان، ورد، اور ی، جیسے یسر، یسار، معائش۔ اور الف میں مشکل ہے، کہ الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے۔ پس اگر متحرک ہوگا اس کو ہمزہ کہیں گے، الف نہ کہیں گے اصل میں۔ اور لغت میں معنی الف کے یوں لکھے ہیں کہ "الف بفتح اول و بکسر لام، بمعنی مرد جواد اور سخی، اور بقولے مرد بے زن، اور نام ایک حرف کا حروف تہجی سے، اور وہ ایک خط مستقیم ہے کہ درمیان لفظ کے، یا آخر لفظ میں ساکن واقع ہوتا ہے، بے ضغطہ زبان۔ اور اگر وہ خط مستقیم ابتداے لفظ میں متحرک ہو، یا درمیان یا آخر لفظ میں بضغطہ زبان واقع ہو، اس کو ہمزہ کہتے ہیں۔ مگر عرف اور محاورۂ عربی اور فارسی میں ساکن اور متحرک دونوں کو الف کہتے ہیں۔ کذافی الغیاث (۱۶)۔

پروفیسر گیان چند فارسی اصول کو اردو میں ناقبول سمجھتے ہیں، لیکن وہ ہمزہ کو متحرک الف ہی کہیں گے، اسے مصمتہ نہ مانیں گے۔ وہ فارسی سے انحراف کی وکالت کرتے ہیں، مگر عربی اور فارسی کی پیروی کرتے ہوئے ہمزہ کو متحرک الف ہی کہہ رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ وہ ذرا تلاش کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ ہمزہ کا متحرک الف ہونا عربی اور فارسی کا ہی اصول ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ فارسی کا الف مصمت ہمزہ ہے، جب کہ گیان چند جین نے ہر جگہ اسے مصوتہ لکھا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمیں انحراف اور اختلاف کا حق ہے مگر جس چیز پر اختلاف ہے اس سے ہمیں کما حقہ واقف ہونا پڑے گا، صرف ہوا میں تلوار چلانے سے کام نہ چلے گا۔ یاے اضافت میں ہمزہ کو استعمال کرنے کا ٹھوس صوتی جواز ہے، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ فی الحال یہ دیکھنا ہے کہ اگر فارسی اصول کے مطابق الف متحرک یعنی ہمزہ مصمت ہوتا ہے، تو اردو میں یہ مصوتہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ایک بات یہ بھی ہے کہ حتی الامکان اصول کو کلی طور پر ختم کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ فارسی کی طرح ہمزہ کو متحرک الف تو ضرور مانیں، مگر اسی اصول کا دوسرا حصہ جس کی رو سے الف متحرک (جسے ہمزہ کہتے ہیں) کو مصمت مانا گیا ہے، اسے نہ مانیں۔

مثال کے طور پر اردو کے کچھ الفاظ حسب ذیل ہیں:

جرأت، سائل، خائف

یہاں واضح طور پر ہمزہ کی حیثیت ایک آزاد حرف کی ہے۔ ہمزہ اس جگہ پر اپنے سے پہلے والے حرف میں مصوتہ کی آواز شامل نہیں کرتا۔ اگر ہمزہ مصوتہ ہے، تو جس طرح 'ب' مصمتہ میں مصوتوں کی آواز شامل کرنے سے کوئی آواز بنتی ہے (مثلاً 'ب' پر زبر لگائیں تو بَ کی آواز بنتی ہے)، اس طرح ب اور ہمزہ سے کوئی آواز نہیں بنتی۔ لہٰذا اردو میں ہمزہ ہرگز مصوتہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی حرف خواہ وہ ا، و، ی، ہی کیوں نہ ہو متحرک ہونے کے بعد مصمتہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہمزہ الف متحرک ہے تو یہ مصوتہ ہو

ہی نہیں سکتا۔ صرف ایک صورت میں ہمزہ مصوتہ ہو سکتا ہے، لیکن ملفوظی طور پر نہ کہ مکتوبی طور پر۔ جہاں دو ساکن حروف کے بیچ الف متحرک یعنی ہمزہ آتا ہے اسے تقطیع میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ایسی حالت میں الف متحرک یعنی ہمزہ کی حیثیت فتحہ یعنی زبر کی ہو جاتی ہے۔ یہ حیثیت فتحہ یعنی مصوتہ کی ہے۔ جیسے ''تم اب'' تقطیع میں ''تمب'' شمار ہو سکتا ہے۔ یہ عروضی نکتہ ہے۔

غالب کا حوالہ بھی ہمزہ کے استعمال کے ضمن میں دیا جاتا ہے۔ گیان چند جین، مالک رام کے حوالے سے، اور عزیز الحسن، منشی بیشمی پرشاد کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ بقول غالب، فارسی کے ان الفاظ کے بعد جو ا، و، یا ی، پر ختم ہوتے ہیں، ساکن الآخر ہونے کی وجہ سے اضافت کی صورت میں ہمزہ مع یاے کے بدلے صرف سادہ یاے استعمال ہوگا۔ جیسے گیسوئے سیاہ کو گیسوے سیاہ، آشنائے قدیم کو آشناے قدیم، لکھا جائے گا۔ غالب نے کہا کہ ایسے موقعوں پر ہمزہ کو استعمال کرنا عقل کو گالی دینے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ اس اصول کے قائل ہیں۔ اس کی مخالفت میں گیان چند جین، عزیز الحسن وغیرہ ہیں۔ جو لوگ غالب کی حمایت کرتے ہیں ان کے پاس سب سے بڑی دلیل غالب کی سند ہے۔ حزب اختلاف کے ارکان کے پاس اپنے دلائل ہیں۔ عزیز الحسن صاحب یاے مجہول کو کوئی حرف نہیں مانتے، محض علامت مانتے ہیں۔ میرے خیال سے عزیز الحسن صاحب نے بلا غور وفکر، ذاتی استدلال کا سہارا لیا ہے۔ جس طرح یاے معروف جب ساکن جیسے ''شیر'' (دودھ) میں، یا یاے مجہول جب ساکن ہو جیسے ''شیر'' (جانور) میں، تو دونوں صورتوں میں یہ ایک مکمل حرف مصوتہ ہے۔ محقق طوسی فرماتے ہیں:

> دو حروف مصوتہ ممدود کہ یکی از اں حرفیست کہ میانہ ضمت
> فتحہ باشد، چناں کہ در لفظ شور افتد، کہ بہ تازی مالح باشد و دیگر
> حرفے، الامیان کسرہ و فتحہ باشد، چناں کہ در لفظ شیر افتد کہ بہ تازی
> اسد باشد و ایں حرف بہ تازی نیز بکار دارند و آں امالہ خوانند۔
> اما از اصل لغت نہ شمرند (۱۷)۔

مظفر علی اسیر ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اور دو حرف مصوتہ ممدود کہ ان میں سے ایک حرف ہے کہ درمیان میں ضمے اور فتحے کے واقع ہوتا ہے، جیسا کہ لفظ شور میں۔ تازی میں اسکو مالح کہتے ہیں۔ اور دوسرا حرف درمیان کسرہ اور فتحہ کے ہوتا ہے، جیسا کہ لفظ شیر میں۔ تازی میں اس کو اسد کہتے ہیں۔ اور یہ حرف تازی میں بھی مستعمل ہے۔ اسے امالہ کہتے ہیں مگر اصل لغت سے نہیں جانتے (۱۸)۔

لہٰذا عزیز الحسن کا یہ کہنا کہ ے حرف نہیں علامت ہے، درست نہیں۔

ی میں جب فتحہ اور کسرہ کے درمیان کی حرکت ڈالیں تو یاے مجہول کی آواز پیدا ہوگی، اور اگر یہی یاے مجہول جب لفظ کے آخر میں آئے تو (ے) لکھا جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے اصول کو اردو میں رائج کیا جائے یا یاے اضافت میں ہمزہ ڈالا جائے؟ جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں فارسی سے بھی پہلے کے یعنی تازی اصول تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔

ہمزہ، تازی اصول کے پس منظر میں

''کتاب العین'' کو عربی کا پہلا سائنٹفک لغت کہا جاتا ہے۔ اس کے مرتب علم عروض کے موجد خلیل بن احمد ہیں۔ بہت سے محققین اور باشیین، خلیل کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ ایک قدیم ترین نحوی گذرا ہے۔ سیبویہ کی ''الکتاب'' کے پڑھنے والوں کو یہ اطلاع ملی کہ خلیل ابن احمد ''کتاب العین'' کے مصنف ہیں۔ النصر بن شمیل جو قدیم علمائے لغت میں سے ہے، کہا کرتا تھا کہ خلیل بن احمد کے علم اور کتابوں کو دنیا کھا گئی اور وہ اپنے جھونپڑے میں پڑا ہوا تھا۔ اسے احساس تک نہ ہوا۔'' بہر کیف، خلیل نے ''العین'' میں ایک خالص حرفی نظام کی پیروی کی، اور اس کی ایجاد کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ خلیل نے ''ابجدی'' یا ''الف بائی'' ترتیب کی پیروی نہیں کی، بلکہ مخرج کی بنیادوں پر حروف کو ترتیب دیا۔ ''مقدمتہ العین'' مختصر ہونے کے باوجود علم صوت کا ابتدائی مواد رکھتا ہے۔ یہ اتنا کافی ووافی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلیل ہی دراصل اسی علم کا موجد اور پہلا رہنما ہے۔ اس مقدمہ میں علم الصوت کے ابتدائی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا علم غیر عربی دانوں کو خلیل کے چند صدیوں کے بعد ہی ہوا۔

''کتاب العین'' کو عراق کی وزارت ثقافت نے ۱۹۸۰ میں از سر نو شائع کیا۔ اسے ڈاکٹر مہندی مخزومی اور ڈاکٹر ابراہیم سامرائی نے مرتب کیا۔ کتاب چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں علم الصوت پر بحث ہے اور کچھ نحوی معاملات کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب لغت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، لغت میں حروف کی ترتیب مخرج کے اعتبار سے ہے، لہٰذا پہلا حرف اس لغت کا (ع) ہے (۱۹)۔

خلیل ابن احمد نے ہمزہ کے متعلق یوں کلام کیا ہے: ''ہمزہ کا مخرج انتہائے حلق ہے، لیکن جب وہ اپنی جگہ سے ہٹتا ہے تو واو۔ الف اور ی میں بدل جاتا ہے'' (جلد ا صفحہ ۵۲)۔ ہم تازی اصول پر اکتفا کر کے اردو میں ہمزہ کے متعلق ساری افراتفری، ساری الجھنوں کو دور کر سکتے ہیں۔

پہلا الجھاو تو یہ ہے کہ ہمزہ صرف متحرک الف ہوتا ہے۔ رشید حسن خان کو یہ الجھن ہے کہ اگر ایسا ہے تو ''ذکاء اللہ'' اور ''ثناء اللہ'' جیسے لفظوں میں ہمزہ، واو کی قائم مقام کیوں کرنے لگتا ہے؟ رشید حسن خان صاحب فرماتے ہیں کہ ممکن ہے عربی قواعد میں ایسا ہو۔ یہاں امکان کی بات نہیں۔ عربی قواعد میں فی الواقع ایسا ہی ہے۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ یاے اضافت میں ہمزہ کا استعمال ہو یا نہ ہو؟ اس کا حل یہ ہے کہ عربی صوتیت کی بنا پر ایسا ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ چاہیں تو ایسا نہ بھی کریں، کیوں کہ فارسی والے، جن کی پیروی غالب کرتے ہیں، ایسے مواقع پر ہمزہ استعمال نہیں کرتے، بلکہ ہمزہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے پر وہ اسے ی سے بدل دیتے ہیں۔ اور یہ بھی سچ پوچھئے تو عربی کی ہی صوتیاتی اصول پر مبنی ہے۔ ایک تیسری الجھن یہ ہے کہ نیاز فتحپوری وغیرہ اضافت کے لئے صرف ہمزہ کے استعمال پر بضد ہیں (جہاں اضافت حرف علت کے بعد آرہی ہو) جیسے علماء اسلام، سوء ظن وغیرہ۔ اس کا حل یہ ہے کہ اگر آپ اضافت کو زیادہ کھینچ کر نہیں پڑھ رہے ہوں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ (لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب کافی نہیں، کیوں کہ اضافت کو کھینچ کر پڑھنا یا نہ پڑھنا بھی بعض حالات کا تابع ہے)۔ لہٰذا ہم صرف یہ ایک بات جان لیں کہ

عربی اصول سے ہمزہ صرف الف ہی کی نہیں بلکہ واو اور ی کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ اسے اگر شدت سے نہ پڑھا جائے تو اسے ''تسہیل'' کہتے ہیں، اور شدت کے ساتھ پڑھنے کو ''تحقیق'' کہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایسے حروف بھی ہیں جہاں ہمزہ، واو اور ی کی ترجمانی کرے؟ جواب اثبات میں ہے۔ ملاحظہ ہو:

الاقفتة: اونچے پہاڑوں میں گڑھے کے مشابہ (ہمزہ ''واو'' کی ترجمانی کر رہا ہے)۔ (کتاب العین، جلد ۵ ص۔ ۲۲۱)

الافاة: شجر (ہمزہ 'ی' کی ترجمانی کر رہا ہے)۔ (حوالہ سابق، ص ۲۳۹)

املا پر دو اہم کتابیں

ہمزہ کے متعلق کسی بھی بحث کا حق تب تک ادا نہ ہوگا جب تک رشید حسن خان کی ''اردو املا'' کے نو ابواب جن کا تعلق ہمزہ سے ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ ''املا نامہ'' کا ذکر نہ کیا جائے۔ عجب اتفاق ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ اس کتاب کا صرف پہلا ایڈیشن ہی ہر جگہ دستیاب ہے۔ دوسرا ایڈیشن جس پر شمس الرحمٰن فاروقی کی صدارت میں ایک ورکشاپ نے نظر ثانی کی، دستیاب نہیں۔ دونوں کتابوں میں ہمزہ کے متعلق چند مفروضے اور کچھ سفارشات ہیں۔ سفارشات پر فی الحال کوئی کلام نہیں، مگر دونوں کتابوں میں درج چند مفروضے محل نظر ہیں۔ گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں۔ ''عربی میں ہمزہ جس آواز کے لئے استعمال ہوتا ہے اردو میں اس کا وجود نہیں کے برابر ہے'' (ص ۱۸)۔ حقیقت حال یہ ہے کہ عربی میں ہمزہ عام طور سے متحرک الف کے لئے اور مخصوص حالات میں یہ ی اور واو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ ساری صورتیں موجود ہیں۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ عربی میں ہمزہ کی حیثیت مصمتے کی ہے، اردو میں ہمزہ مصوتوں کے ساتھ آتا ہے (حوالۂ سابق)۔ یہاں بھی ان سے تسامح ہوا ہے۔ اردو میں ہمزہ صرف متحرک حرف کی ہی نمائندگی کرتا ہے اور متحرک حروف مصوتے ہو ہی نہیں سکتے۔ (اس ضمن میں محقق طوسی کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے)۔

''املا نامہ'' میں آگے لکھا گیا ہے ''ہمزہ حرکت کا قائم مقام ہے'' (ص ۲۳)۔ اس کے آگے لکھتے ہیں: ''جس لفظ میں دو مصوتے (حرف علت یا حرکات) ساتھ ساتھ آئیں... وہاں ہمزہ لکھا جاتا ہے، جیسے ''کوئی''، ''نائی'' وغیرہ۔'' یہاں بھی تسامح ہوا ہے۔ ''نائی'' اور ''کوئی'' میں الف اور واو بالترتیب مصوتے تو ہیں، لیکن یہاں ہمزہ متحرک الف کی قائم مقامی کر رہا ہے اور متحرک حرف مصوتہ نہیں ہو سکتا۔ صفحہ ۲۵ پر کچھ حروف دیئے گئے ہیں جن میں واو ساکن ہے مگر مصوتہ نہیں۔ جیسے ''بھاؤ''، ''تاؤ'' وغیرہ۔ اس جگہ پر کوئی رہنما اصول درج نہیں۔ نارنگ صاحب انھیں حرف صحیح یا نیم مصوتہ مانتے ہیں۔ انگریزی Semi-vowel کا وجود ہے۔ لیکن کوئی ضروری نہیں کہ انگریزی صوتیات میں جن اصطلاحات کا استعمال ہے، اردو میں بھی ان سارے اصطلاحات کو برتا جائے۔ جیسا کہ محقق طوسی کے حوالے سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، الف، واو، اور ی مخصوص حالات میں مصمتے بھی ہوتے ہیں۔ میں یہاں تازی اصول کا بھی حوالہ دوں گا۔ تازی میں مصوتوں کو حروف مدہ کہتے ہیں۔ الف، واو، اور یاے کے قاعدوں میں، جب کہ یہ ساکن ہوں اور الف سے پہلے والے حرف پر زبر ہو، واو سے پہلے والے حرف پر پیش ہو اور یاے سے پہلے والے حرف پر زیر ہو، تو اس حالت میں ان کا نام مدہ ہے (۲۰)۔ محقق طوسی اسی بات کو یوں کہتے ہیں: ''یوم'' اور ''ویل'' میں ''واو'' اور ''یا'' کی مناسبت ان کے پہلے آنے والے حروف کی حرکتوں سے نہیں ہے، اس لئے یہ مصمت ہیں، مصوت نہیں۔ سہل زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ الف، واو اور یاے، بالترتیب جب اشباع کے عمل سے گذرے ہوئے فتحہ، ضمہ، یا کسرہ کی آواز دیں، تو حروف مدہ (یعنی مصوت) ہوں گے، ورنہ نہیں۔ چونکہ یہ تینوں حروف عربی اور فارسی کے ذریعہ اردو میں آئے ہیں اور ان دونوں زبانوں میں یہ حروف یا تو مدہ (مصوت) ہوتے ہیں یا غیر مدہ (مصمتہ) ہوتے ہیں، تو اردو میں ایک درمیانی کیفیت یعنی نیم مصوتے کی کہاں سے آسکتی ہے؟ کسرہ، مدہ یا مصوت یاے کی مختلف صورت ہے اور خلیل نے کہا ہے کہ حروف علت جب مدہ ہوں، یعنی مصوتے ہوں، تو ان کا مخرج جوف یعنی ''منہ کے اندر کا خلا'' ہے اور جب یاے میں اعلان ہو (جیسے ''یہاں'' میں)، تو اس کا مخرج وسط زبان اور اس کے اوپر کا تالو ہے۔ اس مخرج سے 'ج' اور 'ش' بھی ادا ہوتے ہیں، اور ان حروف کو عربی صوتیات میں ''حروف شجریہ'' کہتے ہیں۔

رشید حسن خان کی کتاب ''اردو املا'' بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ رشید حسن خان صاحب اردو زبان و ادب کے ایک بہت اہم ستون ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بعد اگر کسی کو ''باباے اردو'' کا خطاب دیا جائے تو اس کے سب سے بڑے حق دار رشید حسن خان ہی ہوں گے۔ تاہم بڑوں سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور علمی معاملات شیخ سعدی کے قول خطاے بزرگاں گرفتن خطا است کا اطلاق نہ ہونا چاہئے۔

''اردو املا'' میں بھی ہمزہ اور حروف علت، حروف صحیح کے معاملات میں غلط فہمیاں ہیں۔ رشید حسن خان غالباً مصوت اور مصمت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ مصوتوں کو سیدھے سیدھے حروف علت، اور مصمتوں کو حروف صحیح کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''الف، واو، اور ی، ان تین حرفوں کو ''حروف علت'' کہا جاتا ہے۔'' عام حالات میں یہ حروف صحیح کی طرح ہوتے ہیں، لیکن جب یہ ساکن ہوں تو بھی حروف علت ہوں گے۔ خان صاحب قبلہ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ لیکن حروف علت کو ہی اگر وہ مصوتے یا حروف مدہ سمجھتے ہیں تو مصوتوں کی یہ تعریف ادھوری ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ 'الف' 'و' اور 'ی' تبھی مدہ، یا مصوت ہوں گے جب:

(۱) یہ ساکن ہوں، اور

(۲) الف کے پہلے کا حروف مفتوح ہو
واو کے پہلے کا حروف مضموم ہو
ی کے پہلے کا حروف مکسور ہو

لہٰذا خان صاحب کی تعریف اگر غلط نہیں تو ادھوری ضرور ہے۔ ان کی تعریف کے پیش نظر ہم ''دور'' (زمانہ) اور ''دیر'' (بتخانہ) کے واو اور ی کو بالترتیب مصوتہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر مذکورہ دونوں حروف یہاں مصمتے ہیں، وجہ ظاہر ہے۔ ''دور''

میں واو کے پہلے ضمہ نہیں، فتحہ ہے۔ اور اسی طرح "دیر" میں یاے کے پہلے کسرہ نہیں فتحہ ہے۔ خان صاحب فرماتے ہیں۔ "ہمزہ حرف بھی ہے علامت بھی" (ص ۳۴۷)۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہمزہ حرف ہی ہے، علامت نہیں۔ جہاں آپ اسے علامت سمجھتے ہیں، وہاں وہ دراصل "ہمزۂ تسہیل" ہے جہاں اسے ذرا دبا کے پڑھا جاتا ہے۔ واو اور یاے کو بھی ان کی معدودے صورتوں میں دبا کے پڑھا جاتا ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوا کہ یہ حرف نہیں رہے۔ رشید حسن خان کہتے ہیں کہ ہمزہ، آواز کے لحاظ سے الف کا ہم جنس ہے (ص ۳۴۸)۔ حوالہ آگے چل کر انھوں نے دیا ہے عربی لغت "المنجد" کا۔ "المنجد" کے مرتب فادر لوئس نے ان امور کو بھی شامل کتاب کر دیا ہے، جن کا تعلق عقیدے سے ہے لغت سے نہیں۔ ملاحظہ ہو:

(۱) عذراء: یہ لقب ہے حضرت مریم کا جو والدہ ہیں جسمانی خدا کی۔ (دوسرے فقرے کا تعلق عقیدے سے ہے، لغت سے نہیں)۔

(۲) مسیح: مسیح اس چیز کو کہتے ہیں جس میں تیل ملا جائے، نیز یہ لقب ہے رب یسوع کا جو اللہ کے بیٹے جسمانی ہیں (اس معنی کے بھی دوسرے فقرے کا تعلق عقیدے سے ہے، لغت سے نہیں)۔

ظاہر بات ہے کہ مبتدی کے لئے ترتیب دیے گئے لغات کے حوالے سے کوئی نظریہ سازی نہیں کی جاسکتی۔ خاص طور سے اس وقت جب مرتب بذات خود معتبر نہ ہو۔ بہر حال، ہمزہ صرف الف کا ہی ہم جنس نہیں، یہ واو اور یاے کا بھی ہم جنس ہے(۲۱)۔ "فوائد مکیہ" کے صفحہ ۲۸ اور صفحہ ۲۹ کو ملاحظہ کریں، لکھا ہے: "اگر ہمزہ کو الف یا بقیہ حروف مد [یعنی واو/ یاے] سے بالکل بدل دیا جائے تو اسے "ابدال" کہتے ہیں۔" خلیل بن احمد کے حوالے سے پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ ہمزہ کا مخرج انتہاے حلق ہے اور جب یہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو الف، واو اور یاے سے بدل جاتا ہے۔

رشید حسن خان فرماتے ہیں کہ ہمزہ کا سب سے زیادہ غلط استعمال اسی طرح ہوتا ہے کہ یاے کی جگہ ہمزہ لکھ دیا جائے۔ عربی کے حوالے سے جو کچھ اوپر عرض کیا گیا، اس کی روشنی میں یہ بات بالکل طے ہے کہ یاے کی جگہ ہمزہ لکھنا، ہمزہ کا بالکل صحیح استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ ابدال کے ذریعہ جہاں مناسب ہو، ہمزہ اور یاے کو بخوبی ایک دوسرے کی جگہ لایا جاسکتا ہے۔ آگے صفحہ ۳۵۷ پر خان صاحب فرماتے ہیں کہ عربی میں لغوی سطح پر الف کی متحرک صورت کو ہمزہ سے موسوم کیا جاتا ہے اور اردو میں ہمزہ کو لفظوں کے بیچ الف کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اردو کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ایسا عربی میں بھی بے شمار جگہوں پر ہوتا ہے۔ "فوائد مکیہ" کے صفحات ۲۸ اور ۲۹ کو دیکھیں۔ "جمال القرآن" کے صفحہ ۳۵، اور "ضیاء القرأت" کے صفحہ ۴۱ کو بھی دیکھیں۔

ہمزہ کے استعمال سے متعلق سفارشات

اخیر میں ہمزہ کے متعلق ترقی اردو بورڈ (ہندوستان) کے زیر اہتمام قائم کی گئی املا کمیٹی اور مقتدرہ قومی زبان (پاکستان) کے زیر اہتمام املا اور رموز اوقاف پر سہ روزہ سیمنار اور سیمنار کی سفارشات کے نفاذ کے لئے تشکیل شدہ ذیلی کمیٹی کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ املا کمیٹی (ہندوستان) کی سفارشات کو مکتبہ جامعہ نے ۱۹۷۴ میں شائع کیا۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اتفاق سے اس کا پہلا ہی ایڈیشن دستیاب ہے۔ دوسرا ایڈیشن جس پر شمس الرحمٰن فاروقی کی صدارت میں ایک ورکشاپ نے نظر ثانی کی، دستیاب نہیں۔ املا کمیٹی کی صدارت ڈاکٹر عابد حسین نے کی تھی اور اس کے دیگر ارکان رشید حسین خان، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے۔ مقتدرہ قومی زبان (پاکستان) کے پہلے سیمنار کے صدر ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ اور ذیلی کمیٹی جس نے سفارشات کو حتمی شکل دی اس کے ارکان ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب مظفر علی سید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر شریف کنجاہی، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی اور ڈاکٹر اعجاز راہی تھے۔ ان کی سفارشات کو مقتدرہ قومی زبان (پاکستان) کے ترجمان "اخبار اردو" کے مارچ ۱۹۹۹ کے شمارے میں تفصیل سے شائع کیا گیا ہے۔

پہلے ان سفارشات کا ذکر کیا جائے گا جن پر ذرا تفصیل سے گفتگو ضروری ہے۔

ابتداء، علماء وغیرہ: عربی کے ایسے الفاظ جن کے اخیر میں ہمزہ لکھا جاتا ہے، لیکن اردو نے انھیں بغیر ہمزہ کے اپنا لیا ہے، انھیں بغیر ہمزہ کے ہی لکھا جائے۔ مثلاً ابتدا، انتہا، املا، علما، ادبا، وزرا، وغیرہ۔ یہ سفارش مشترک ہے۔

ہمزہ اور اضافت: بعض الفاظ میں ہمزہ کا استعمال اضافت کے لئے ضروری ہے۔ مگر دونوں کمیٹیوں میں مطابقت یہیں ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ املا کمیٹی (ترقی اردو بورڈ ہندوستان)، نے صاف وضاحت کردی ہے کہ اگر کوئی لفظ ہاے مختفی پر ختم ہو رہا ہو تو اضافت کے لئے ہمزہ ضروری ہے جیسے خانۂ خدا، جذبۂ دل، نغمۂ فردوس وغیرہ۔ ذیلی کمیٹی براے املا و رموز اوقاف (پاکستان) نے بغیر کسی رہنما اصول کے، چند الفاظ درج کردیے ہیں، مثلاً اردوے معلی، بوے گل، جن میں اضافت کے لئے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے۔

تأمل، تأسف وغیرہ: اس طرح کے الفاظ میں الف پر ہمزہ کے استعمال کو املا کمیٹی (ہندوستان) غیر ضروری سمجھتی ہے، جب کہ ذیلی کمیٹی براے املا و رموز اوقاف (پاکستان) ان الفاظ میں الف پر ہمزہ لگانا ضروری سمجھتی ہے۔ نہ املا کمیٹی نے عدم استعمال کا جواز فراہم کیا ہے نہ ذیلی کمیٹی براے املا و رموز اوقاف نے استعمال کا۔ میرے خیال میں ایسے الفاظ میں الف پر ہمزہ لگانے کو جو متروک قرار دیا گیا ہے غلط ہے۔ الف پر ہمزہ لگانے میں باریکیاں پنہاں ہیں۔ تأمل، تأسف وغیرہ بروزن فعولن ٹوٹتے ہیں اور اس وزن پر ان الفاظ کو توڑنے کے لئے الف کو متحرک دکھانا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ اسے متحرک کیسے دکھائیں گے، اردو میں اعراب تو لگائے نہیں جاتے۔ اگر فتحہ یعنی زبر آپ دیں گے تو الف ساکن ہی پڑھا جائے گا اور ایسی حالت میں الفاظ بروزن فاعلن ٹوٹیں گے جو کہ غلط ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمزہ حرف ہے۔ اس کا شمار حرکات سہ گانہ میں نہیں کیا جاتا ہے۔ آپ لکھنے میں کسی حرف کو کسی بھی صورت سے حذف نہیں کرسکتے۔

آزمائش اور آزمایش: املا کمیٹی (ہندوستان) آزمائش اور

آزمائش دونوں کو صحیح سمجھتی ہے۔ جب کہ ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف صرف آزمائش کو ہی صحیح سمجھتی ہے۔ ہمزہ اور یائے ابدال کے ذریعہ ایک دوسرے کی قائم مقامی کر سکتے ہیں۔ املا کمیٹی (ہندوستان) کا موقف درست اور عین عربی قواعد کے مطابق ہے۔

وہ امور جن میں املا کمیٹی (ہندوستان) اور ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کی سفارشات مشترک ہیں:

(۱) جب انشاء، شاء، وغیرہ کسی ترکیب وغیرہ کا حصہ ہوں تو انھیں ہمزہ کے ساتھ جوں کا توں لکھنا چاہئے، جیسے انشاء اللہ، شاء الحق، وغیرہ۔

(۲) امر کی سب شکلوں مثلاً آؤ، جاؤ، دکھاؤ، وغیرہ پر ہمزہ لگے گا۔

(۳) فرمائیے، آئیے، جائیے، وغیرہ پر ہمزہ لگے گا۔

(۴) ہائے مختفی پر اضافت کی صورت میں ہمزہ لگے گا۔

وہ امور جن میں املا کمیٹی (ہندوستان) اور ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کی سفارشات مشترک نہیں ہیں:

(۱) جرأت، تأسف وغیرہ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۲) اگر کوئی لفظ واو پر ختم ہو رہا ہو، چاہے وہ اسم ہو یا حاصل مصدر ہو، املا کمیٹی (ہندوستان) کہتی ہے کہ ہمزہ نہیں لگانا چاہئے جب کہ ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کہتی ہے کہ ان الفاظ کے واو پر ہمزہ لگے گا۔

(۳) پائے (پیر)، چائے (مشروب)، گائے (جانور) وغیرہ کے متعلق املا کمیٹی (ہندوستان) کہتی ہے کہ یائے کے اوپر ہمزہ نہیں لگے گا۔ ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کہتی ہے کہ ان الفاظ میں یائے پر ہمزہ لگے گا۔

(۴) اردوئے معلی، صدائے دل، نوائے ادب وغیرہ کے متعلق املا کمیٹی (ہندوستان) کہتی ہے کہ ان میں یائے پر ہمزہ نہیں لگے گا، جب کہ ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کہتی ہے کہ ہمزہ لگے گا۔

ان الفاظ جن کے بارے میں املا کمیٹی (ہندوستان) اور ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کی سفارشات مشترک ہیں، کوئی کلام ضروری نہیں۔ لیکن ان الفاظ کا کیا ہوگا جن کے بارے میں سفارشات متضاد ہیں؟ اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ برصغیر کے باہر کے حضرات کس سفارش کو مانیں؟ اردو ہندوستان کی ایک اہم آئینی زبان ہے۔ صوبہ جموں و کشمیر میں یہ پہلی سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں اردو قومی زبان ہے اور وہ ارباب سیاست بھی جو اردو کی مخالفت کرتے ہیں، اردو کے استعمال پر مجبور ہیں کہ یہ پاکستان کی سیاست کی بھی زبان ہے۔ میرے خیال میں اہل اردو کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ کسی بھی سفارش کو بطور سند استعمال کریں، خواہ املا کمیٹی (ہندوستان) کی ہو یا ذیلی کمیٹی برائے املا و رموز اوقاف (پاکستان) کی۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو، جس بھی مسلک کو عمل کے لئے اختیار کیا جائے، اسے پورا پورا اختیار کیا جائے۔

میں نے اپنی طرف سے یہ پوری کوشش کی ہے کہ ہمزہ کے مسئلے کو ہر زاویۂ نگاہ سے پرکھا جائے۔ مجھے قطعی یہ غلط فہمی نہیں کہ مختتم ہے میرا فرمایا ہوا۔ مندرجہ بالا معروضات غور و فکر اور بحث مباحثے کے لئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے ذریعہ ماہرین کو اتفاق رائے حاصل ہو سکے گا ☆☆☆

حواشی

۱۔ آیات وجدانی ص ۱۹۱، بحوالہ "شاعر" بمبئی۔ شمارہ ۹، ۸، جلد ۵۶، 1985

۲۔ اردو میں ہمزہ کا استعمال از ڈاکٹر محمد عقیل۔ "ہماری زبان" ۲۲ فروری ۱۹۲۶۔

۳۔ The Bermuda Triangle شمالی امریکی ساحل کے پاس بحر اوقیانوس کا ایک حصہ جہاں جہاز نامعلوم وجہوں سے ڈوب جاتے ہیں۔ ابھی تک تیس سے زائد بحری اور بیس سے زائد ہوائی جہاز ڈوب چکے ہیں۔ بحوالہ Encyclopaedia Britannica,1997 جلد دوم، صفحہ ۱۴۳

۴۔ کیفیہ۔ ص ۳۷

۵۔ قواعد اردو ص ۳۵، (طبع دوم)

۶۔ صوتی جائزے۔ ص ۱۲۸ (از عزیز الحسن)

۷۔ لسانی مطالعے۔ ص ۲۲۵ (از گیان چند جین)

۸۔ حوالہ سابق۔ ص ۲۲۴

۹۔ صوتی جائزے۔ ص ۳۲

۱۰۔ لسانی مطالعے۔ ص ۲۲۲

۱۱۔ حوالہ سابق۔ ص ۲۲۵

۱۲۔ حوالہ سابق۔ ص ۲۲۵

۱۳۔ پیش لفظ۔ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ (از مسعود حسین خان)

۱۴۔ معیار الاشعار (خیابان آیت، تہران)۔ ص ۱۶۹

۱۵۔ زر کامل عیار۔ ص ۲۲ / ۲۳

۱۶۔ معیار الاشعار (تہران) ص ۱۷۰

۱۷۔ زر کامل عیار۔ ص ۲۵

۱۸۔ کتاب العین (مطبوعہ ۱۹۸۰) بغداد، مرتب ڈاکٹر مہدی المخزومی و ابراہیم سامرئی۔ ص ۶، ۷، ۹، ۱۰

۱۹۔ جمال القرآن از مولانا شاہ اشرف علی تھانوی، لمعہ ۱۱، صفحہ ۲۱

۲۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور جلد ۲۳) صفحہ ۱۷۲، ایڈیشن ۱۹۸۹: "ہمزہ کا متعین طور پر کوئی ہجا نہیں۔ کبھی تو اسے الف کی طرح لکھتے ہیں کبھی یائے اور کبھی واو کی طرح تحریر کرتے ہیں۔"

ننگی دوپہر کا سپاہی

سلام بن رزاق

شمارہ ۱۰۳،
مارچ، اپریل ۱۹۷۷

اس کا جنم ہوا تو اس کا سر عام بچوں کے سر سے کم از کم تین گنا بڑا تھا۔ ماں کی کوکھ سے برآمد ہوتے ہوتے اس کی ماں کی کوکھ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور زمین پر اس کی پہلی چیخ کے ساتھ ہی اس کی ماں نے آخری ہچکی لی اور آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ وہ فرش پر پڑا گلا پھاڑے جا رہا تھا اور اس کی باچھوں سے گرم گرم خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ دائی اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور اس کی چیخوں سے کوٹھی کے در و دیوار کانپ اٹھے۔

"یہ بالک بہت ادبھت ہے بڑا ہو کر بہت بڑا ودوان بنے گا۔"

"اگر سنسار کے کاروبار میں من نہ لگا تو سادھو سنت بن جائے گا..."

"یا بہت بڑا اسیلانی بنے گا۔"

جوتشیوں نے شروع ہی سے اس کے بارے میں مختلف رائیں قائم کی تھیں۔

جب وہ گھر سے چلا تھا تو ابھی خاصی دھوپ پھیل چکی تھی۔ مگر دھوپ کی انگلیاں ابھی بہت ملائم اور گدگدی تھیں۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ گھر سے کب نکلا تھا۔ مگر اسے صحیح صحیح کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ نہ تاریخ، نہ دن، نہ مہینہ، نہ سال، بس اتنا یاد تھا کہ جب وہ چلا تھا تو دھوپ پھیل چکی تھی اور سورج کی کرنیں ابھی سان پر نہیں چڑھی تھیں۔ مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا برچھیاں چمکنے لگیں، تیر سنسنائے اور سورج ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر معلق ہوگیا۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ شہر کے بیچ چوراہے پر کھڑا تھا۔ لوگ چاروں دشاؤں میں اس طرح گھبرائے گھبرائے بھاگ رہے تھے جیسے اگلے ہی لمحے کسی بھاری بمباری کا خدشہ لاحق ہو۔

اس نے لپک کر اپنے قریب سے گذرتے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اے! تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

وہ شخص پہلے تو چونکا پھر اسے نیچے سے اوپر تک گھور کر دیکھا اور بولا۔

"تم اس شہر میں نئے آئے ہو شاید؟"

"ہاں، مگر یہ سب لوگ ایسے گھبرائے گھبرائے کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟"

"سائے کی تلاش... دیکھتے نہیں دھوپ کس قدر تیز ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں مگر سایہ کہاں ہے...؟"

اس کا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی وہ شخص آگے بڑھ گیا اور اس کا سوال اس کے ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گیا۔

"عجیب ہے..." وہ زیر لب بڑبڑایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں ایستادہ تھیں جن کے دروازوں پر سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ اور دروازوں کے سامنے انسانوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ لوگ اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے اور گرمی سے ہائے وائے کرتے ان دروازوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے، پھر باری باری اندر داخل ہو جاتے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے دربان آگے بڑھتا اور ایک بڑا سا طوق اندر داخل ہونے والے کے گلے میں ڈال دیتا۔

وہ بڑی دیر تک کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، اندر جانے والوں میں سے کوئی باہر نکلے تو اس سے اندر کا احوال پوچھے۔ مگر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی اندر جانے والوں میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی اور اب پسینہ اس کے ایک ایک مسام سے پھوٹ نکلا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے جی میں آیا کہ وہ بھی قطار میں کھڑا ہو جائے اور کسی عمارت میں داخل ہو کر گھڑی دو گھڑی کو ستا لے۔ دھوپ ڈھلتے ہی دوبارہ سفر شروع کر دے گا۔ جوں ہی اس کی نظر اس طوق پر پڑی جو اندر جانے

والوں کے گلے میں پہنایا جارہا تھا اس کے قدم رک گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔

"اے تم قطار میں کیوں کھڑے ہو؟"

"اندر جانے کے لئے۔"

"اندر کیا ہے؟"

"اندر چھاؤں ہے، ٹھنڈک ہے، اندر..."

"مگر دروازے پر گلے میں ڈالا جانے والا وہ طوق؟"

"کون سا طوق؟"

"وہ دیکھو جو اندر داخل ہونے سے پہلے ہر ایک کو پہنایا جارہا ہے۔"

"محض وہم ہے تمہارا۔ تم قطار کے باہر کھڑے ہو نا اس لئے تمہیں دکھائی دے رہا ہے، قطار میں کھڑے ہو جاؤ پھر دیکھو اندر پہنچنے کی خواہش ہر احساس پر غالب آجائے گی۔"

"لعنت ہے۔ زندگی احساس ہی کا تو نام ہے۔ تم سب مردہ ہو چکے ہو مردہ!"

اس نے طیش میں آکر کہا۔

"اے بھائی! تم قطار میں ہو کیا؟"

پیچھے سے کسی نے آواز لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے مزید کچھ لوگ آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے تلخی سے کہا۔ "نہیں..."

"تو پھر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمیں آگے جانے دو..."

وہ ایک طرف کو ہٹ گیا اور اس کے پیچھے آنے والے بھی قطار میں شامل ہو گئے۔ اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے جی میں آیا مشین گن سے قطار میں کھڑے ان سارے لوگوں کو بھون کر رکھ دے اور ان عمارتوں کو ڈائنا مائٹ سے اڑا دے۔ مگر اس کے پاس نہ مشین گن تھی نہ بارود۔ پیٹھ پر جو جھولا لدا تھا اس میں موٹی موٹی کتابوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ توشہ دان اور پانی پینے کا پیالہ تک وہ راستے میں کہیں چھوڑ آیا تھا کہ جو سفر اسے درپیش تھا اس میں یہ چیزیں بھی بہت ذیلی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس نے آگے قدم بڑھائے۔ آسمان اس کے سر پر کسی فولادی چادر کی طرح تنا ہوا تھا اور دھوپ لشکارے مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر ستانا تو وہ بھی چاہتا تھا کہ ذرا تازہ دم ہو لے تو دوگنی رفتار سے آگے بڑھے مگر کہاں ستائے راستے میں نہ کوئی سایہ تھا نہ درخت... اور کسی عمارت میں داخل ہو کر اس طوق کو گلے میں ڈالنا اس کے لئے موت کے مترادف تھا۔ دھوپ تھی کہ سان پر چڑھی کٹار کی طرح تیز ہوتی جارہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ آخر اسے سامنے ایک ایسی عمارت نظر آئی جس کے آگے کوئی قطار نہیں لگی تھی۔ اس نے سوچا چلو اس میں دو گھڑی کو ستا لیتے ہیں۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ مگر اندر فرش پر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سی ٹھنڈک رگ رگ میں سرایت کر گئی اور دماغ غنودگی کی دھند میں غوطے کھانے لگا۔ البتہ ایک عجیب سی گونج اسے سنائی دیتی رہی جیسے اس کے اطراف ہزاروں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اندھیرا اس قدر گھنا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ شاید تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو اسے کچھ دکھائی دے۔ اتنے میں ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خوش آمدید..." اور ساتھ ہی عمارت بھک سے روشن ہو گئی چاروں طرف دیواروں سے تقدس کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اس نے تیورا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ خاموش دیواروں سے پاکیزگی جھرنوں کی طرح بہہ رہی تھی۔ اب مکھیوں کی بھنبھناہٹ بھی تیز ہو گئی تھی۔

"خوش آمدید... یہاں تم کڑی سے کڑی دھوپ سے محفوظ رہ سکتے ہو۔"

آواز اوپر سے آئی تھی۔ اب جو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے چھت میں ایک بڑا سا جالا تنا ہوا دکھائی دیا۔ جس میں بہت سے لوگ الٹے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ہونٹ کسی قسم کے ورد میں دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ وہ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ غالباً اسی ورد کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ ایک کونے سے ایک بڑا سا مکڑا رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھا جس کا سر انسانوں کا سا تھا۔ شاید اسی نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے اس کی طرف اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آغوش میں لے لینے کو بے تاب ہو۔ وہ گھبرا کر پلٹا اور سرپٹ بھاگتا ہوا عمارت کے باہر آ گیا۔ باہر دھوپ اسی طرح پھیلی ہوئی تھی اور لوگ سایے کی تلاش میں سرگرداں ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ کسی عمارت میں پناہ نہیں لے گا۔ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا، حتیٰ کہ چلتے چلتے اس کے تلوؤں میں آبلے پڑ جائیں گے، ٹانگیں شل ہو جائیں گی اور اس کا بدن جھلس جھلس کر کوئلہ ہو جائے گا مگر وہ چلتا رہے گا... اچانک اسے کچھ شور سنائی دیا۔ ساتھ ہی فضا نعروں سے تھرا گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا بیچ سڑک پر ایک جلوس اس کے آگے آگے چلا جارہا تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دہانوں سے کف اڑ رہا تھا۔ دورویہ عمارتوں کی کھڑکیاں کھلیں... عمارتوں کے مکینوں نے خوف زدہ نظروں سے اس جلوس کو دیکھا۔ ادھر فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اسے لگا ان جلوس والوں کے ساتھ اس کا سفر آسان ہو سکتا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔ سب کے ساتھ اس کی بھی مٹھیاں بھنچ گئیں، گردن کی رگیں تن گئیں اور اس نے بھی ہوا میں ہاتھ اچھال کر ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، عمارتوں کی کھڑکیاں لرز لرز گئیں۔ چھتیں کانپ اٹھیں۔ اس نے انتہائی حقارت سے عمارتوں کے ان مکینوں کو دیکھا جو کھڑکیوں سے گردنیں نکالے خوف اور تجسس سے جلوس والوں کو تک رہے تھے۔

تھوڑی دیر جلوس کے ساتھ چلنے کے بعد اسے کچھ خیال آیا اور اس نے اپنے ساتھ چلتے ایک پرجوش نوجوان سے پوچھا۔

"یہ جلوس کہاں جارہا ہے؟"

نوجوان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر تک اس کے

سوال پر غور کرتا رہا پھر کاندھے اچکا کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم، اس شخص سے پوچھو۔ شاید اسے معلوم ہو۔"

نوجوان نے اپنے آگے چلتے ایک گنجے شخص کی طرف اشارہ کیا جو مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہا تھا۔ اس نے دو قدم بڑھ کر اس شخص کو روکا۔

"بھائی! یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟"

اس شخص کی بھینچی ہوئی مٹھی ہوا میں معلق رہ گئی اور منہ کھلا کا کھلا۔ گنجے ماتھے کے نیچے جڑی اس کی حیران آنکھیں تھوڑی دیر تک اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر بڑی مشکل سے وہ بولا۔

"مجھے... مجھے معلوم نہیں... اس شخص سے پوچھو۔ شاید وہ بتا سکے۔"

اس نے اپنے آگے چلتے ایک دوسرے معنک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے عینک والے کا بازو تھام کر پوچھا۔

"بھائی! یہ جلوس..."

"مجھے نہیں معلوم۔"

"یہ جلوس۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

وہ بڑھتے بڑھتے جلوس کے ایک دم آگے نکل آیا۔ ایک شخص پرچم اٹھائے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

"یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم۔ مگر ہاں کچھ دیر پہلے ہمارے آگے ایک اور جلوس گذرا تھا۔ شاید انھیں پتہ ہو۔"

جلوس کے آگے ایک اور جلوس۔ پھر اس کے آگے ایک اور... وہ تھک ہار کر جلوس کے باہر نکل آیا۔

کہاں جا رہے ہو۔

جلوس میں سے کسی نے پکارا۔

"نہ تم جانتے ہو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ نہ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم سب کہاں سے چلے تھے، کہاں جا رہے ہیں جب سفر ہی زندگی کی شرط ٹھہری تو پھر یہ سفر اکیلے بھی جاری رکھا جا سکتا ہے، بھیڑ کا احسان کیوں لوں۔"

پکارنے والے کا منہ لٹک گیا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر لدا کتابوں کا جھولا سنبھالا اور چپ چاپ دوسری سڑک پر مڑ گیا۔

اس سڑک پر بھیڑ نسبتاً کم تھی۔ اکا دکا لوگ گردنیں جھکائے اپنی اپنی سوچوں میں گم کسی سمت چلے جا رہے تھے۔ خاموش خاموش اور کھوئے کھوئے سے۔ وہ بھی چلتا رہا۔ گلی اور سڑکیں، نکڑ اور چوراہے۔ دھوپ ہر جگہ اس کے سر پر مسلط رہی۔

اچانک بچوں کی قلقاریوں نے اس کے قدم روک لئے۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے دائیں طرف ایک پارک میں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ معصوم، بھولے بھالے، گل گوتھنے سے بچے اسے بڑے اچھے لگے۔ کچھ بچے تتلیاں پکڑ رہے تھے۔ کچھ سنہرے پر لوٹیں لگا رہے تھے اور بعض خواہ مخواہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی معصوم حرکتیں دیکھتا اور شوخ قلقاریاں سنتا رہا۔ تبھی ایک شخص پارک میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی بچوں ہی کی سی معصومیت تھی۔ اور گلے میں ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بچے ہنستے قلقارتے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ نووارد نے اپنے جھولے سے میٹھی گولیاں، ٹافیاں اور کچھ کھلونے نکالے اور بچوں میں تقسیم کرنے لگا۔ بچوں کے چہرے کھلے پڑ رہے تھے اور نووارد کا چہرہ اس مسرت کے آئینے میں دمک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا جھولا خالی کر دیا۔ بچے ہنستے کھلکھلاتے دوبارہ اپنے کھیلوں میں منہمک ہو گئے اور نووارد مسکراتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر لوٹ گیا۔

اس کے بھی جی میں آیا کہ وہ بھی بچوں کو قریب سے دیکھے، ان کے پھول سے جسموں کو چھوئے، ان کی معصوم ہنسی کو اور پاس سے سنے۔ مگر وہ ان سے قریب کیوں کر ہو؟ انھیں دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا، نہ کھلونے نہ مٹھائی۔ اس نے اپنے سفر کے دوران زندگی کے اس رخ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر لدے جھولے کو ٹٹولا مگر وہاں موٹی موٹی مجلد کتابوں کے سوا کیا تھا۔ آخر اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بچے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ بچہ ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اس کا اشارہ پاتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ مگر جیسے ہی اس نے اس کے گال پر تھپکی دینے کو ہاتھ بڑھایا وہ خوف زدہ آواز میں چیخا۔

"بھ... بھو... ت..." اور ایک طرف کو بھاگا۔

سارے بچے چونک چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر تو سبھی بھوت چلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ بہت حیران ہوا۔ شاید سفر نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے... دو چار لوگوں نے آ کر اسے پکڑ لیا۔

"کیوں بے! بچوں کو ڈراتا ہے؟"

ایک نے اس کے جھولے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کیوں، بچے پکڑتا ہے؟ جھولے میں کیا ہے؟"

وہ گونگا بہرا بنا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سوالوں کا کیا جواب دے۔ اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی ہجوم کو چیرتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کا حلیہ دیکھا۔ لوگوں کی شکایت سنی۔ کتابوں کے جھولے میں جھانکا اور اعلان کیا۔

"ارے کچھ نہیں... جانے دو پاگل ہے۔ جھولے میں بچہ وچہ نہیں خالی ردی ہے... اے جا... ادھر جا... چل راستہ پکڑ..."

اور وہ ایک طرف مڑ کر راستہ پکڑے چلنے لگا۔ غصے، ندامت اور انتقام کے جذبے سے اس کا بدن کانپ اٹھا مٹھیاں بھنچ گئیں اور گردن کی رگیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ وہ ایک ایک سے چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا۔ "تم جاہل ہو دنیا کے اسیر، تم میری عظمت کو کیا سمجھو... تم سب کنویں کے مینڈک ہو، کنویں کے مینڈک، سمندر

کی موجوں کے تھپیڑے تمہارے نصیب میں کہاں؟ چہار دیواری کے تابوتوں میں دفن لاشیں، زندہ لاشیں... مگر وہ غصے کو کڑوی دوا کی طرح گھونٹ گیا کہ جاہلوں سے گرمی سے نہیں نرمی سے گفتگو کرنا ہی پیمبروں کا شیوہ رہا ہے۔

وہ ایک نکڑ پر رک گیا۔ پھر سڑک کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے چبوترے پر چڑھ کر اپنی پوری قوت سے چلایا۔

"لوگو! ادھر آؤ..." وہ چیخ رہا تھا۔

"میں زندگی کے رازہائے سربستہ سے واقف ہوں۔ جنہیں تم اپنی جہالت کے کارن سمجھنے سے قاصر ہو۔"

لوگ جمع ہونے لگے۔ ایک شخص نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں... میں..." وہ تھوڑا سپٹپٹایا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

یہ سوال ہی فضول ہے۔ میں کوئی بھی ہوں۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو..."

"تم سب کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں میں نے علم کو شراب کی طرح پیا ہے اور کتابوں کو کاکروچ کی طرح چاٹا ہے میں نے..."

"اچھا تو پھر کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ ہمارے پیٹوں سے بندھے یہ پتھر موم بن کر پگھل جائیں۔"

ہمیں بتاؤ کہ ہماری دمیں تو جھڑ گئیں۔ آخر ہمارے ناخن اور دانت کب جھڑیں گے؟"

"ہمارے گرد روز بروز تنگ ہوتی یہ دیواریں کب گریں گی؟"

"یہ دھوپ کب ڈھلے گی؟"

وہ ہر سوال پر اپنی پیٹھ سے بندھی ایک ایک کتاب کھولتا، ان کے ورق الٹتا پلٹتا پھر حیران نظروں سے ایک ایک کا منہ تکنے لگتا... وہ کیا جواب دے۔ اس نے ایسے نامعقول سوالوں پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا تھا... اسے خاموش اور حیران دیکھ کر لوگ چیخ پڑے۔

"تم جھوٹے ہو، تم کچھ نہیں جانتے۔ تم زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" لوگوں کی بھیڑ چھٹنے لگی اور وہ گونگا بنا انہیں منتشر ہوتے دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع غائب ہو گیا۔ اور وہ تنہا حیران پریشان اس ٹوٹے چبوترے پر کھڑا دھوپ کو اپنے مساموں میں اترتا محسوس کرتا رہا۔ اس کی پیٹھ کتابوں کے بوجھ سے دوہری ہو گئی تھی۔ آخر وہ اس بوجھ کو کب تک ڈھوئے ڈھوئے پھرے گا۔ اس نے جھولا پیٹھ سے اتار کر زمین پر پٹکا۔ سیدھا کھڑے ہو کر دو چار گہری گہری سانسیں لیں پھر جھک کر جھولے سے ایک کتاب نکالی کچھ دیر تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر دوسرے ہی لمحے... چر... چر... اس کے ورق پھاڑ کر ہوا میں اچھال دیئے۔

ایک کتاب... دوسری کتاب... پھر تیسری کتاب...

اتنے میں اسے دور سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسی کی طرف آ رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کتابیں پھاڑنے سے منع کر رہا تھا۔ وہ رک گیا۔ وہ شخص قریب آیا۔ اس کے سینے سے بھی کچھ کتابیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس شخص نے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کیا ہوا؟" اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس شخص کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم کتابوں کو کیوں پھاڑ رہے ہو؟"

"یہ ساری کتابیں جھوٹ کا پلندہ ہیں۔"

"تم پچھتاؤ گے۔ آگے سفر میں یہی کتابیں تمہاری رہنمائی کر سکتی تھیں۔"

"میں کتابوں کی رہنمائی میں تو یہاں تک آیا ہوں۔ مگر اب میں اپنا آگے کا سفر بغیر کتابوں کی مدد کے جاری رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ناممکن..."

"کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کیا کتابوں سے پہلے لوگ سفر نہیں کرتے تھے۔ تم بھی یہ ڈھونگ بند کرو۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص کے سینے سے بندھی کتابوں کو نوچ لینا چاہا۔ وہ شخص گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں، نہیں کتابوں کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

"تو پھر ہٹو... میرا راستہ چھوڑو..."

وہ شخص گھبرا کر ایک طرف کو ہٹ گیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص اپنے سینے پر جھکا کتاب میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ وہ اب شہر کی اونچی اونچی عمارتوں، پر ہجوم سڑکوں اور خوش نما باغات کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے چلنے والوں کی تعداد بھی گھٹنے لگی۔

لوگ چلتے چلتے اچانک دورویہ اونچی اونچی پتھریلی عمارتوں میں داخل ہو جاتے۔ بعض ستانے کو دیواروں کے سائے میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں شق ہو جاتیں اور سائے سائے میں ضم ہو جاتے۔ اسے لگ رہا تھا وہ راستے بھر بے شمار میتوں کو اپنے ہاتھوں قبر میں سلاتا آیا ہے۔ جنازے ڈھوتے ڈھوتے اس کے کاندھے ٹوٹنے لگے ہیں اور اب وہ کسی بھی قسم کا بوجھ ڈھونے کا اہل نہیں۔ حتیٰ کہ اپنا وجود بھی اسے اپنی ٹانگوں پر گراں گذر رہا تھا۔

سب دھوکا، سب فریب۔ دوست احباب، عزیز رشتہ دار، گھر، جائداد، خاندان، عزت، یہاں تک کہ کتابیں بھی دھوکا ہیں۔ اور زندگی؟ نہیں... زندگی ایک سوال کی شکل میں اس کے آگے آگے چل رہی تھی اور وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے لپکا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ مگر ایک پراسرار کشش، ایک نامعلوم تجسس اس کے قدم رکنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ راستے میں پڑنے والی ہر دل فریب چیز سے نظریں چراتا، دامن بچاتا ایک بگولے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔

اب اسے صاف اور سیدھے راستوں سے بھی چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ سیدھی سڑک سے اتر کر ایک اوبڑ کھابڑ راستے پر ہولیا جہاں دونوں جانب خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور قدم قدم نکیلے پتھر بچھے تھے۔ جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر

اس کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اتنی ٹھوکریں لگیں کہ پیروں کی انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔ مگر وہ چلتا رہا۔ اب چلنا ہی اس کا مقدر تھا۔ پیاس کے مارے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔ خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور اب سامنے تاحد نظر خشک ریت کے تودوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آسمان پر سورج اب بھی ننگی تلوار کی طرح ننگا ہوا تھا اور حلق میں کٹیلی جھاڑیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔

پانی... صرف دو گھونٹ پانی...

راستے میں کتنے کنویں، جھرنے چھوڑ آیا تھا وہ۔ مگر کسی جگہ رک کر اپنا حلق تر کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ زندگی مسلسل سفر کا نام ہے۔ اور اب وہ سفر میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ واپسی کا راستہ تک بھول گیا تھا۔

کاش، کاش... کہیں سے دو گھونٹ پانی مل جائے کہ اس کے حلق میں اگے کانٹے پھول بن جائیں۔

تبھی ایک معجزہ رونما ہوا۔ اس کی نظر ایک سیاہ نقطے پر پڑی۔ نقطہ متحرک تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ نقطے کا حجم دم بہ دم پھیلتا جا رہا تھا۔ پھر نقطہ لکیر بنا اور وہ لکیر دیر تک ایکس رے سکرین پر کانپتے، کسی برقی خط کی طرح اتھر میں لرزتی رہی۔ رفتہ رفتہ لکیر کا حجم بھی پھیلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لکیر پرچھائیں میں تبدیل ہو گئی۔ پرچھائیں ڈولتی، لڑکھڑاتی اسی کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لئے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جب آنکھوں پر زور دیا تو دیکھا کہ وہ ایک انسانی وجود ہے جو اس کی طرح خستہ اور تباہ قدم قدم اس کی سمت بڑھ رہا ہے۔ قریب اور قریب۔ اب وہ اسے صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ چہرہ دھوپ سے جھلسا ہوا تھا اور کپڑے بدن پر چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہے تھے۔ البتہ اس کی آنکھیں! ایسی ممتا ایسی شفقت اس نے بہت کم آنکھوں میں دیکھی تھی۔ جیسے صحرا میں دو پھول کھلے ہوں۔ عورت اس کے قریب آ کر رک گئی۔ ان شبنمی آنکھوں کی ٹھنڈک اسے بھیتر تک شاداب کر گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"پانی... پانی ہے تمہارے پاس؟"

عورت کے تھکے ہوئے چہرے پر سکون اور اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آنکھوں سے شفقت کے سوتے ابل پڑے۔ اس نے جھٹ اپنی قبا کے بند کھول دیئے۔ بھری بھری چھاتیاں خرگوشوں کی طرح پھدک کر باہر نکلیں۔ چھاتیاں دودھ سے تنا گئی تھیں اور ان کی بونڈیوں سے دودھ کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

عورت نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اس نے تڑپ کر اس کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ عورت وہیں جلتی ہوئی ریت پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سینے میں منہ گڑائے، آنکھیں بند کئے کسی بھوکے بچے کی طرح چسر چسر دودھ پینے لگا اور عورت اس پر اپنے پھٹے آنچل کا سایا کیے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی... چلاتی رہی... ☆☆☆

یہ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ نہیں ہے، ساحری، شاہی اور صاحب قرانی ہے۔ اردو داستانوں پر نہ ایسا کام ہوا ہے اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ میں نے داستانوں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ بہت سے سوال ذہن میں پیدا ہوئے۔ سب سے بات کی، سب کے خیالات سنے لیکن اس صحرائے بے پایاں کی وسعت، حسن اور صحیح معنویت کا سراغ نہ ملا۔ اکثر عالموں کو اس صحرا کے کانٹوں سے الجھتے ہی دیکھا۔

اب جو آپ کی کتاب پڑھنا شروع کی تو ان بے شمار سوالوں کے جواب مل گئے جو ایک مدت سے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ نظری مباحث میں بہت کچھ سمیٹ لیا گیا ہے۔ یہ پورا بیان عالمانہ تبحر، وسعت مطالعہ، مشرق و مغرب سے یکساں اور بھرپور استفادے کا مظہر ہے۔ ذاتی دید و دریافت کا مرقع اور ذوق و شوق کی ایک روداد ہے جس کا بنیادی نکتہ معروضی فکر اور فلسفیانہ راست گوئی ہے۔ آپ نے ماشاء اللہ بہت بڑا کام کیا۔ مہا کام کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ داستانوں کے گنجینۂ طلسم کی لوح آپ ہی کے حصہ میں تھی۔ اس طلسم کو طلسم کشا مل گیا ہے اور اب یہ طلسم اپنے آپ کو منکشف کر رہا ہے۔ بچپن میں طلسم ہوش ربا پڑھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ اب آپ کی کتاب پڑھ کر حیرت زدہ ہوں۔

—— اسلم فرخی

ساحری، شاہی، صاحب قرانی

داستان امیر حمزہ کا مطالعہ

شمس الرحمٰن فاروقی

جلد اول، نظری مباحث — قیمت : ۱۸۰ روپے
جلد دوم، عملی مباحث — (زیر طبع)
جلد سوم، داستان دنیا — (زیر تالیف)

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

جو میں اپنے مالک کو اس طرح پوجوں؟

سلام مچھلی شہری

شمارہ ۸۶،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۳

خدا تم جہاں ہو ہمہ روشنی ہو
ہمہ نور ہو اس لئے زندگی ہو
مگر میں تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں
بڑے عجز سے پوچھنا چاہتا ہوں
کہ تم آسماں سے اترتے نہیں کیوں
زمیں پر نیا رنگ بھرتے نہیں کیوں
طلسمات دنیا و دیں کھولتے ہو
مقدس کتابوں میں تم بولتے ہو
مگر زندہ خلد حسیں تک بھی آؤ
کبھی بھول کر اس زمیں تک بھی آؤ
جب آنا تو پہلے مرے گھر میں آنا
سنائیں گے بچے مرا اک ترانہ
مرے گھر کی ہر شمع جلتی رہے گی
تروتازہ پھولوں میں ڈھلتی رہے گی
مسرت بھرے آنسوؤں میں ڈبو دوں
خود اپنی ہی نظموں میں تم کو سمو دوں

تم آؤ تو قدموں پہ گر کر کہوں میں
کتابوں ہی میں غیر فانی رہوں میں
تمھی نے یہ رستہ دکھایا ہے مجھ کو
تمھی نے تو شاعر بنایا ہے مجھ کو

...بڑا خود غرض ہوں، یہ کیا چاہتا ہوں
تمھیں دیکھ کر پوجنا چاہتا ہوں
پر اس مسئلے پر تو قرآں بھی چپ ہے
تمنا کے باوصف انساں بھی چپ ہے
میں ضدی ہوں، تم کو بلا کر رہوں گا
جو دل میں ہے میرے، سنا کر رہوں گا
کسی طرح آؤ، کوئی روپ دھارو
فلک میں سجاؤں، زمیں تم سنوارو

...میں شاید غلط گفتگو کر رہا ہوں
مسلمان زادہ ہوں اب ڈر رہا ہوں

سلطان اختر

شمارہ ۲۹،
اکتوبر ۱۹۶۸

جس کو قریب پایا اسی سے لپٹ گئے
سورج ڈھلا تو لوگ قبیلوں میں بٹ گئے

کس کس کی میں ہجوم میں آنکھیں نکالتا
اچھا ہوا کہ آپ دریچے سے ہٹ گئے

جن حوصلوں پہ کوہ گراں کا گمان تھا
آندھی چلی تو سیکڑوں حصوں میں بٹ گئے

ٹھٹھرے ہوئے بدن کو حرارت نہ مل سکی
چھت پر چڑھے تو دھوپ کے آنچل سمٹ گئے

جو کہتے تھے کہ جان سے زیادہ عزیز تھے
زندہ دلی کے نام پہ کل وہ بھی بٹ گئے

یوں تو مری دفاع کی شمشیر کند تھی
اس کی جسارتوں کے مگر ہاتھ کٹ گئے

وہ گل پرست جن پہ بہاروں کو ناز تھا
آئی خزاں تو پائے خزاں سے لپٹ گئے

شمارہ ۱۱۰،
نومبر، دسمبر ۱۹۷۸، جنوری ۱۹۷۹

کچھ ڈوبتا ابھرتا سا رہتا ہے سامنے
ہر لمحہ اک طلسم تماشا ہے سامنے

اڑتی ہے صحن دل میں تہی منظری کی خاک
رنگوں کا اک ہجوم سا بکھرا ہے سامنے

ظلمات انتشار میں آنکھیں کھلی رکھو
تم جس کو ڈھونڈتے ہو وہ دنیا ہے سامنے

میں پھر بھی جستجو میں بھٹکتا ہوں دربدر
حالانکہ ہر قدم پہ وہ رہتا ہے سامنے

بکھری ہوئی ہے دھند سر شیشۂ طلب
بے رنگ نور عکس تمنا ہے سامنے

اک خوف بے پناہ ہے آنکھوں کے آر پار
تاریکیوں میں ڈوبتا لمحہ ہے سامنے

ہر حرف ناتمام لہو پر لرز گیا
پھر امتحان مطلب و معنیٰ ہے سامنے

سلطان اختر

شمارہ ۱۲۲،
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱

تاریکی زوال سر شام سو گئی
مجھ سے لپٹ کے گردش ایام سو گئی

اب کے بھی یوں ہی قرب کا موسم گذر گیا
بے آب و رنگ ہی طلب خام سو گئی

دل ڈوبنے لگا تو کوئی شے نہ کام آئی
امید صف شکن بھی لب بام سو گئی

چمکا لب طلب پہ نہ سورج شراب کا
نشے کی دھوپ چھاؤں تہ جام سو گئی

صحرائے جاں میں غم کے اندھیرے تھے خیمہ زن
خوشیوں کی دھوپ لے کے مرا نام سو گئی

ابھرا ہی تھا کہ ڈوب گیا آفتاب شوق
آغاز ہی میں حسرت انجام سو گئی

اب کے لہو میں لو نہ چلی اضطراب کی
یخ بستہ ہو کے موج شرر فام سو گئی

شمارہ ۲۷۰،
جولائی ۲۰۰۳

میں اپنا آپ بچالوں مگر در و دیوار
کہ ہو رہے ہیں ادھر سے ادھر در و دیوار

مری ہی طرح اذیت میں دن گذارتے ہیں
شکستہ دل مرے آشفتہ سر در و دیوار

تمھارے شہر میں ہم جیسے کتنے خانہ بدوش
تلاش کرتے رہے عمر بھر در و دیوار

غم مکیں ہی سلامت ہے اب نہ فکر مکاں
ہیں اپنے آپ سے بھی بے خبر در و دیوار

کوئی پناہ کی صورت نظر نہیں آتی
خمیدہ ہونے لگے گھر کے گھر در و دیوار

ہمارا گھر بھی عزا خانہ ہو کے رہ گیا ہے
کہ بین کرتے ہیں شام و سحر در و دیوار

کھلی فضاؤں میں ہم بھی بکھرنا چاہتے ہیں
ہمیں سمیٹے ہوئے ہیں مگر در و دیوار

گھروں میں خوف کا موسم ہے خیمہ زن اختر
لرزتے رہتے ہیں اب سر بسر در و دیوار

محمد حسن عسکری اور فراق

سلیم احمد

شمارہ ۱۱۳،
اکتوبر ۱۹۷۹

پچھلے مضامین میں ہم دکھا چکے ہیں کہ میری طرح عسکری صاحب بھی انسان ہیں اور آدمی بننا چاہتے ہیں۔ لیکن انسان سے پہلے ہر انسان آدمی ہوتا ہے۔ یعنی ایک حیاتیاتی، جبلی وہبی وجود، وہ انسان اس وقت سے بننا شروع ہوتا ہے جب تہذیبی اثرات قبول کرنے لگتا ہے۔ مذہب، عقیدے، اخلاق، سیاسی اور معاشرتی اثرات، جمالیات، رجحانات اور معیارات، یہ سب اس کے انسان کا حصہ ہوتے ہیں۔ اوسپنسکی (Ouspensky) نے انسان کو "شخصیت" کہا ہے اور آدمی کو "جوہر"۔ اب عام آدمی میں جوہر تو ضرور ہوتا ہے لیکن شخصیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ آدمی سے انسان بنتے ہیں ان میں شخصیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ فلسفی، سیاست داں، شاعر اور فن کار، ان سب میں شخصیت کا غلبہ ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شخصیت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کس طرح ترقی کرتی ہے؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ شخصیت تہذیبی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آپ جب اپنے بچوں کو معاشرتی آداب، اخلاقی اصول اور اپنے مذہب کے عقیدے سکھاتے ہیں تو ان کے جوہر میں شخصیت داخل کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ شخصیت کمزور ہوتی ہے اور اگر اسے ترقی نہ دی جائے تو ساری زندگی اسی کمزوری کی حالت میں رہتی ہے۔ عام آدمی کی شخصیت ایسی ہی ہوتی ہے، لیکن خاص آدمیوں میں شخصیت ترقی کر جاتی ہے اور وہ عام آدمیوں سے مختلف بن جاتے ہیں۔

شخصیت کی یہ ترقی کیسے ہوتی ہے؟ اوسپنسکی نے اس پر گہری روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عام آدمی جب تہذیبی اثرات قبول کرتا ہے تو اس کے جوہر میں ان کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی تہذیبی اثرات قبول کرنے تو ضروری ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے بغیر زندگی نہیں بسر کی جاسکتی۔ لیکن عام آدمی میں یہ اثرات کمزور اور بکھرے بکھرے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اوسپنسکی کے نزدیک جب کوئی آدمی تہذیبی اثرات سے زیادہ گہرا اثر قبول کرتا ہے تو شخصیت میں ایک مرکز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مرکز ایک مقناطیس کی طرح ہوتا ہے جو بکھرے ہوئے اثرات کو اپنی طرف کھینچ کر ایک جگہ جمع کر لیتا ہے۔ مرکز جتنا مضبوط ہوتا جاتا ہے شخصیت میں بھی اتنی ہی قوت آتی جاتی ہے یہاں تک کہ بعض قوموں میں مرکز اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام اجزا اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ایسا آدمی ایک مضبوط شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اب یہ مرکز مختلف قسم کے اثرات کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے مرکز پر مذہبی اثرات غالب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے مرکز پر مذہبی، اخلاقی، سیاسی شخصیتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں۔ یہ تقسیم صرف غلبے کے اعتبار سے ہوتی ہے ورنہ مرکز میں بہت سے اثرات ملے جلے ہوتے ہیں۔ اوسپنسکی کہتا ہے کہ بعض لوگوں کی شخصیت میں دو یا اس سے بھی زیادہ مراکز پیدا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ایسی شخصیتوں میں ایک تضاد اور کش مکش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی ایک مرکز کے تابع ہوتے ہیں کبھی دوسرے کے۔ اوسپنسکی کے نزدیک ایسی شخصیتیں ہمیشہ ایک اندرونی پیکار کا شکار رہتی ہیں اور بہت مشکل سے باطنی ہم آہنگی حاصل کر پاتی ہیں، ہمیشہ اس سے محروم رہتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی انسانوں کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک قسم کے لوگ باطنی طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ اندر سے کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ شاہ صاحب پہلی قسم کے لوگوں کو "اہل اصلاح" کہتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو "اہل تجاذب"۔ بہر حال شخصیت کی تعمیر کا پہلا مرحلہ تہذیبی اثرات سے اثر قبول کرتا ہے خواہ وہ کسی درجے میں ہو۔ اور دوسرا مرحلہ ایک مرکز کا پیدا ہونا ہے۔ یہ مرکز جتنا مضبوط ہوتا جاتا ہے شخصیت اتنی ہی ترقی کرتی جاتی ہے۔ آدمی سے انسان بننا اسی باطنی عمل کا نام ہے۔ اب چونکہ عام آدمیوں میں یہ عمل جاری نہیں رہتا اس لئے آدمی سے انسان بننے والے لوگ عام آدمیوں سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ خیر، عام آدمیوں سے "انسان" کے الگ ہونے کا مسئلہ تو پھر خارجی چیز ہے، اس عمل میں ایک گڑبڑ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی کی شخصیت ایک مرکز کے تحت آکر ترقی کرنے لگتی ہے لیکن اس کا جوہر غیر ترقی یافتہ حالت میں رہ جاتا ہے۔ اوسپنسکی نے کہا ہے کہ بعض

اعلیٰ درجے کی شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کا جوہر ایسا ہوتا ہے جیسے چھ سال کے بچے کا۔ یہ صورت حال بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے۔
اس لئے ہم آہنگ وجود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شخصیت کے ساتھ جوہر کو بھی ترقی دی جائے۔

آدمی سے انسان بننے کا عمل آپ دیکھ چکے۔ اب جوہر کو ترقی دینے کے کیا معنی ہیں؟ انسان سے پھر آدمی بننا۔ یہ انسان کی باطنی ترقی کا ایسا عمل ہے جس میں بڑے بڑے پانی مانگ جاتے ہیں۔ انسان تو جیسے بنے، بن جاتے ہیں، دوبارہ آدمی نہیں بن پاتے۔ بہر حال باطنی ارتقا کے اس عمل کے دو رخ ہیں۔ پہلا آدمی سے انسان بننا، دوسرا انسان سے دوبارہ آدمی بننا۔ تصوف کی اصطلاحوں میں آدمی سے انسان بننا روحانی ارتقا کی صعودی قوس ہے، انسان سے آدمی بننا نزولی قوس ہے۔ ان دونوں قوسوں کے ملنے ہی سے آدمی کا روحانی ارتقا مکمل ہوتا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں تو میں روحانی ارتقا کی ان دونوں منزلوں سے گذرنے والوں کے لئے ایک لفظ استعمال کرلوں: فرد۔ فرد وہ انسان ہے جس نے اپنے پورے وجود کو حاصل کرلیا ہے۔ اب وہ ایک ایسا منفرد وجود ہے جس کا جوہر اور شخصیت دونوں ترقی یافتہ ہیں اور ایک دوسرے کے ہم آہنگ تعاون سے دم بدم ایک نئی توانائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ فرد ایک ایسی کائنات بن جاتا ہے جس کا قانون وہ خود ہے۔ میں اس فرد کو پورا آدمی بھی کہتا ہوں۔

معاف کیجئے، مضمون کا عنوان "محمد حسن عسکری اور فراق" تھا اور ہم اپنی دھن میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ آیئے اب دیکھیں ان باتوں کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نکلتا ہے یا نہیں؟

ہم نے غلط یا صحیح عسکری صاحب کا مسئلہ آپ کو بتا دیا ہے۔ وہ انسان ہیں اور آدمی بننا چاہتے ہیں۔ اپنے مضمون "محمد حسن عسکری کی میر پرستی" میں ہم نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ میر کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اس لئے عسکری صاحب اردو شاعروں میں میر کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں اور بجا طور پر میر کی کلیات ہمیشہ اپنے سرہانے رکھتے ہیں۔ لیکن اردو میں میر کے بعد فراق بھی عسکری صاحب کے سب سے بڑے ممدوح ہیں۔ وہ انھیں میر کے برابر ہی کی اہمیت دیتے ہیں، بلکہ بعض جگہ تو ایسا گمان ہوتا ہے جیسے انھوں نے فراق کو میر پر فوقیت دے دی ہے۔ جرأت پر اپنے بے مثال مضمون میں انھوں نے کچھ ایسی ہی بات کہی ہے۔ یونگ (Jung) کے حوالے سے دو شخصیتوں کے تعلق پر غور کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> یونگ نے میاں بیوی کے تعلقات پر ایک مضمون لکھتے ہوئے بتایا کہ ان دونوں میں ایک فریق تو (Container) ہوتا ہے۔ دوسرا (Contained)۔ پہلے فریق کی شخصیت اتنی پیچیدہ، متنوع اور پہلودار ہوتی ہے کہ دوسرا اس کے اندر سما جاتا ہے۔ مگر چونکہ پہلے فریق کے اندر بہت سے خانے خالی رہ جاتے ہیں اس لئے آسودگی دونوں کو نہیں ملتی۔ چنانچہ مکمل ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے میاں بیوی میں ایک کشمکش سی شروع ہو جاتی ہے۔

عسکری صاحب کہتے ہیں:

> میرے خیال میں بالکل یہی نقشہ ایک شاعر اور قاری کے تعلقات کا ہے۔ ایسے شاعر بہت ہیں جو ہماری شخصیت کے بعض پہلوؤں کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں اور ہم ان سے تھوڑی دیر کے لئے جی بھر کر لطف لے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہماری شخصیت کے بہت سے تقاضوں کو تشنہ چھوڑتے ہیں اس لئے وہ ہمارے جیون ساتھی نہیں بن سکتے۔

عسکری صاحب کے نزدیک جیون ساتھی تو میر جیسے شاعر بن سکتے ہیں کیوں کہ "میر جیسے شاعر کو پڑھتے ہوئے فوراً ہم (Contained) بن کر رہ جاتے ہیں۔" یہ تو ہوا عسکری صاحب کا رشتہ میر سے۔ فراق کا ذکر فوراً آتا ہے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ اردو نے میر کا صرف ایک (Container) پیدا کیا ہے، فراق۔ اس جملے میں فراق کی جو برتری نکلتی ہے وہ سامنے کی بات ہے لیکن چونکہ عسکری صاحب نے یہ تنبیہ کردی ہے کہ "میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا ہوں کہ فراق صاحب میر سے بڑے شاعر ہیں" اس لئے ہم بھی اس پر اصرار نہیں کریں گے اور صرف اتنی ہی بات کہیں گے جو عسکری صاحب نے خود مان لی ہے۔ فراق کے بعض مطالبات میر سے بھی پورے نہیں ہوتے۔

اب سوال... پورے نہیں ہوتے۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے عسکری صاحب کے کچھ اور خیالات کو سمجھنا پڑے گا۔ عسکری صاحب نے شاعر اور اس کے قاری کے تعلق کو وضاحت سے بیان کردیا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ایک قاری کی حیثیت سے عسکری صاحب کے مطالبات کیا ہیں؟ ہم نے شخصیت کے ایک مرکز کا ذکر کیا تھا۔ اس مرکز کے ذریعہ شخصیت میں ہم آہنگ ترقی کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں عسکری صاحب اس ترقی کا ایک ایسا استعارہ ہیں جس کو سمجھے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ جدید اردو ادب میں کوئی معنویت باقی نہیں رہتی۔ عسکری صاحب یہ مرکز اپنے اندر پیدا کر چکے ہیں۔ "میں اپنا حق سمجھتا ہوں کہ میرے تجربات کا ایک مرکز اور میری کاوشوں کا ایک رخ ہو۔" اب ان کا مسئلہ اس مرکز کو ترقی دینا ہے۔ ان کا مطالعہ اپنے مرکز کو ترقی دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ "میں پڑھتا بھی ایسی چیزیں ہوں،" عسکری صاحب لکھتے ہیں، "جن سے مجھے پتہ چل سکے کہ متنوع تجربات ایک مرکز پر کیسے لائے جاسکتے ہیں۔" عسکری صاحب نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ مرکز کیسے پیدا ہوتا ہے:

"مجھے نہ غم جاناں والے پسند ہیں نہ غم دوراں والے، میں تو ایسے لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جن کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں دونوں مل کر "اپنا غم" بن جائیں۔"

یہ "اپنا غم" کیا ہے، اسے بھی عسکری صاحب کے الفاظ میں دیکھ لیجئے۔ "اس اپنے غم سے مراد وہ تخلیقی درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی تفتیش کا ذریعہ بنتا ہے اور جس میں کائنات کا غم و نشاط بن جانے کی قوت اور گیرائی موجود ہوتی

ہے۔ "دنیا کے عظیم ترین شاعر اور ادیب، ڈانٹے، چاسر، شیکسپیئر اور جیمز جوائس اسی تخلیقی درد سے عظیم بنے ہیں۔ میر بھی اسی تخلیقی درد کے شاعر ہیں۔"

عسکری صاحب نے اس تخلیقی درد کا نقشہ دکھانے کے لئے میر کا جو اقتباس نکالا ہے وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ اسے اعلیٰ ترین تنقیدی رسائی کا شاہکار کہنا چاہئے۔ اب عسکری صاحب نے اس خیال کی روشنی میں اردو کے شاعروں کے بارے میں بھی قیمتی باتیں کہی ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کے یہاں یہ غم پیدا ہو کر اپنی نفسیات کی تخلیق کا ذریعہ تو بن جاتا ہے مگر انسانی زندگی یا کائنات کی تفتیش تک نہیں پہنچ سکتا، مثلاً مومن۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دکھ درد کا ذکر تو کرتے ہیں مگر ان کی کامرانی یا محرومی محض ایک واقعے تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے اور انھیں اپنی پوری شخصیت پر بھی غور کرنے کی ترغیب نہیں دیتی، مثلاً جرأت۔ اب ان شاعروں کے مقابلے پر میر جیسے شاعر میں کیا صلاحیت ہوتی ہے، اس کا بیان بھی عسکری صاحب کے الفاظ میں دیکھئے:

> میر کے اندر ایک ایسی زبردست صلاحیت تھی جو کسی دوسرے اردو شاعر میں آدھی تہائی بھی نہیں تھی۔ میر کے دماغ میں اتنی طاقت تھی کہ صرف عشق کے تجربات یا جذباتی تجربات نہیں، صرف شاعرانہ تجربات بھی نہیں، بلکہ زندگی کے بہت سے چھوٹے بڑے اور مختلف نوعیت رکھنے والے تجربات پر ایک ساتھ غور کر سکے اور سب کو ملا کر ایک عظیم تر تجربے کی شکل دے سکے۔ چنانچہ میر کی شاعری میں ہمیں پوری زندگی ملتی ہے اور اپنی سارے تنوع اور تضاد، رفعتوں اور پستیوں، قوتوں اور مجبوریوں سمیت۔

آخر میں عسکری صاحب نے وہ بات بھی کہہ دی ہے جو میر جیسے شاعر کے بارے میں کہنی ضروری تھی۔

اپنے پچھلے مضامین میں میں نے آدمی اور انسان کے فرق کو وضاحت سے بیان کیا ہے، اور یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ انسان بننے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انسان کا عام آدمیوں سے کیا تعلق ہے؟ ہم کسی اور جگہ اس مسئلہ کو اور زیادہ وضاحت کریں گے، لیکن اس بحث میں ایک بات رہ گئی تھی۔ ایک مسئلہ تو یہ ہوا کہ "انسان" کا عام آدمیوں سے کیا تعلق ہو؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "انسان" کا کائنات سے کیا تعلق ہو؟ دراصل عظیم شاعری کو ان دونوں سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ عسکری صاحب نے "میر اور نئی غزل" میں انسان کے عام آدمیوں سے تعلق کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن "میر اور نئی غزل" میں دوسری بات بھی کہہ دی ہے: "میر کی شاعری کا موضوع دراصل یہی مسئلہ ہے کہ فرد کے ذاتی تجربات کا مقام زندگی اور کائنات میں کیا ہے؟" میر کی شاعری اس کے بغیر اتنی عظیم شاعری نہیں ہو سکتی۔

اب میر اور فراق میں کیا فرق ہے، اسے ہم وضاحت سے بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) میر آدمی سے انسان بن چکے ہیں اور پھر آدمی بننا چاہتے ہیں۔ اس کے دو معنی ہیں۔ میر چاہتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا ان کے جوہر سے تعلق پیدا ہو اور اس طرح ان کی شخصیت کی طرح ان کا جوہر بھی ترقی کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر کے حیاتیاتی، جبلی اور ذہنی وجود کو اپنے تہذیبی وجود کے برابر اہمیت دیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان بننے کے عمل میں وہ جس طرح عام آدمیوں سے الگ ہو گئے ہیں، اس خلیج کو پاٹ کر وہ ان سے دوبارہ رشتہ قائم کریں۔ میر نے یہ دونوں کام سرانجام دئے ہیں اور ایک طرف اپنے پورے وجود میں ہم آہنگی پیدا کر کے دکھائی ہے اور دوسری طرف اپنے وجود کو دوسرے آدمیوں سے ہم آہنگ بنایا ہے۔

(۲) میر کا انسان صرف دوسرے انسانوں سے اپنا رشتہ نہیں جوڑتا، بلکہ اپنے وجود کو کائنات کے مقابل رکھ کر بھی دیکھتا ہے اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی کی تلاش کرتا ہے۔ فراق صاحب نے بھی یہ دونوں کام کئے ہیں۔ لیکن فراق کے رشتے میر سے مختلف ہیں۔ ہم اسے بیان کرنے کے لئے اپنی تمہید سے ایک لفظ اٹھاتے ہیں: فرد۔ فرد وہ انسان ہے جو پہلے آدمی سے انسان بنا ہے اور پھر دوبارہ انسان سے آدمی بن گیا ہے۔ یعنی روحانی اعتبار سے مکمل طور پر ترقی یافتہ وجود ہے۔ فراق اور میر میں فرق یہ ہے کہ میر انسان بننے کے بعد عام آدمیوں سے رشتہ جوڑنے کی جدوجہد کرتے ہیں، یعنی ان لوگوں سے جو آدمی سے سفر کر کے کچھ اور نہیں بنے، جب کہ فراق جس وجود سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں وہ فراق کی طرح خود بھی فرد بن چکا ہے، یعنی روحانی اعتبار سے فراق کے برابر ترقی یافتہ ہے۔ میر کے آدمی میر کا احترام کر سکتے ہیں، میر کی ہمدردی، دل سوزی، اور محبت میں اپنا دل جلا سکتے ہیں، مگر وہ میر کے برابر کے لوگ نہیں ہیں۔ فراق جس وجود سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں وہ فراق کے برابر ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ فرد ایک ایسی کائنات ہوتا ہے جس کا قانون وہ خود ہو۔ فراق کا محبوب ایک ایسا ہی فرد، ایک ایسی ہی کائنات ہے، اور فراق کی شاعری کے معنی ہیں ان دونوں کائناتوں کا رشتہ۔ اب اسی طرح میر کی کائنات اور فراق کی کائنات میں بھی فرق ہے۔ اس فرق پر افسوس ہے کہ عسکری صاحب نے بھی روشنی نہیں ڈالی۔ لیکن شاید اس کی وجہ یہ تھی فراق صاحب خود اسے بہت وضاحت سے بیان کر چکے تھے۔ "میر کی کائنات پر" فراق صاحب نے لکھا ہے: "ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔"

یہ المیہ کی کائنات ہے جب کہ فراق کی کائنات پر رنگ نشاط غالب ہے۔ یہ نشاط المیہ کے بغیر نہیں ہے مگر میر کے اندھیرے کو فراق نے ایک ایسی روشنی میں ضرور تبدیل کر دیا ہے جیسا کہ ان مضامین میں جابجا دکھایا گیا ہے۔ عسکری صاحب کا مسئلہ بھی یہی ہے: کسی ماورائی طاقت کے بغیر خود اپنے خارجی اور داخلی عمل سے اپنے وجود کے الم کو نشاط میں تبدیل کرنا۔ فراق کے یہی وہ بعض مطالبات ہیں جو میر کی شاعری سے بھی پورے نہیں ہوتے۔

عسکری صاحب نے اپنے مضمون "اردو شاعری میں فراق کی آواز" میں ہمارے بیان کئے ہوئے یہ دونوں فرق اپنے انداز میں بیان کئے ہیں۔ "فراق

کے یہاں بنیادی مسئلہ فراق کا ہے۔ یہاں فراق کے وہ معنی نہیں جو اکثر اردو شاعری میں ہوتے ہیں، یعنی محبوب سے علیحدگی اس وجہ سے نہیں کہ محبوب کے رشتہ دار حائل ہیں یا محبوب جفا کار اور تغافل پسند ہے۔ یہاں فراق کی اصل وجہ دو شخصیتوں، دو فردوں، کی بنیادی علیحدگی ہے۔ ''اردو شاعری میں ''دو فردوں'' کی بنیادی علیحدگی کا احساس اور کہیں نہیں پایا جاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام اردو شاعری کا عاشق ''فرد'' بنا ہے نہ محبوب۔ وہ انسان بننے کے مختلف مرحلوں میں ہے۔ پورے انسان بھی نہیں، نہ فرد سے، عام آدمیوں سے البتہ مشابہ ہے۔ اس لئے میر کا محبوب اردو شاعری کے عام محبوب جیسا ہے، جب کہ فراق کا محبوب فراق کی طرح ایک منفرد ہستی ہے۔ عسکری صاحب نے ہمیں اس محبوب کی تصویر بڑی خوبصورتی سے دکھائی ہے۔

اب فراق صاحب کی شاعری کا بنیادی مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ''انھیں''، عسکری صاحب کہتے ہیں، ''ایسا محبوب پا کر بھی اس سے وصال اور مکمل یگانگت کا احساس حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔'' ہمارے نزدیک ''پا کر بھی'' کہنے کے بجائے ''پا کر ہی'' کہنا زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ اگر یہ محبوب ایسا نہ ہوتا تو فیض صاحب اور ان کے محبوب کی یگانگت کی طرح ایک چھوٹی یگانگت تو کوئی بھی پیدا کر سکتا ہے۔ فراق صاحب کو یہ یگانگت حاصل کرنے کی جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے عسکری صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے۔'' دو انسانی شخصیتیں ایسی متوازی لائنیں ہوتی ہیں جو کوشش کے باوجود ایک دوسرے سے نہیں مل سکتیں۔ یہی عشقیہ زندگی کا سب سے المناک پہلو ہے۔''

اس توجیہ سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ میں'' دو انسانی شخصیتوں '' کے بجائے'' دو فرد'' کہوں گا، کیوں کہ اس مضمون کی اصطلاح میں'' شخصیت '' کے دوسرے معنی ہیں۔ بہر حال فراق صاحب کی شاعری کی ایک عظمت تو یہ ہے کہ وہ ہمیں ادب میں پہلی بار'' دو فردوں'' کے رشتے سے روشناس کراتی ہے۔ ان کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ عشقیہ زندگی کے اس المیہ سے نشاط پیدا کر کے دکھاتے ہیں۔ فراق کی عظمت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اس'' انسانی مسئلہ'' کو کائنات تک اوپر اٹھاتے ہیں اور بقول عسکری صاحب اپنی ہستی کو کائنات میں سمونے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فراق کے عاشق اور فراق کے محبوب کی طرح فراق کی کائنات بھی اردو شاعری میں ایک نئی چیز ہے۔ اب عسکری صاحب کا اس بات سے یہ تعلق ہے کہ فراق کی اس عظمت کو دریافت کرنے والے عسکری ہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ ہر دریافت کرنے والا اپنے آپ ہی کو دریافت کرتا ہے۔ عسکری کی دریافت کردہ عظمت عسکری کی عظمت ہے ☆☆☆

غزل

سلیم احمد

شمارہ ۲۱۴،
فروری ۱۹۹۸

جو آنکھوں کے تقاضے ہیں وہ نظارے بناتا ہوں
اندھیری رات ہے کاغذ پہ میں تارے بناتا ہوں

محلے والے میرے کار بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں

وہ لوری گائیں گی اور ان میں بچوں کو سلائیں گی
میں ماؤں کے لیے پھولوں کے گہوارے بناتا ہوں

فضائے نیلگوں میں حسرت پرواز تو دیکھو
میں اڑنے کے لیے کاغذ کے طیارے بناتا ہوں

مجھے رنگوں سے اپنے حیرتیں تخلیق کرنی ہیں
کبھی تتلی کبھی جگنو کبھی تارے بناتا ہوں

زمیں یخ بستہ ہو جاتی ہے جب جاڑوں کی راتوں میں
میں اپنے دل کو سلگاتا ہوں انگارے بناتا ہوں

ترا دست حنائی دیکھ کر مجھ کو خیال آیا
میں اپنے خون سے لفظوں کے گل پارے بناتا ہوں

مجھے اک کام آتا ہے یہ لفظوں کے بنانے کا
کبھی میٹھے بناتا ہوں کبھی کھارے بناتا ہوں

بلندی کی طلب ہے اور اندر انتشار اتنا
سو اپنے شہر کی سڑکوں پہ فوارے بناتا ہوں

سلیم اختر

شمارہ ۲۵۳،
فروری ۲۰۰۲

(نخاس سے حاصل کردہ مخطوطہ ناقص الاول وناقص الآخر۔ ترقیمہ ندارد)

...عاجز، شہنشاہ دو عالم، گیتی پناہ، سریر آرائے تخت سلیمانی، فخر دودمان سلطانی کے پشتینی غلاموں میں سے ہے۔ جب آج سے قبل اڑھائی صدی، شہنشاہ عالم کے نیر رخشندہ جیسے جد، ماوراء النہر سے مقدر آزمائی اور مہم جوئی کے لئے نکلے اس خطۂ مینو سواد کا رخ کیا تو اس غلام کے آبا بھی ہم رکاب تھے۔ انھوں نے معرکہ آرائیوں میں قوت بازو کا مظاہرہ کیا، لشکر جرار کی قیادت کی، دشمنوں کی سرکوبی کی، بدخواہوں کو نیست و نابود کیا، مفسدوں کے سر کچلے اور سازشیوں کو نابود کیا... یوں ایک مضبوط سلطنت کی بنا استوار کی۔ یہی نہیں، سلطنت تو ہر فاتح ہی حاصل کر سکتا ہے مگر اسے قابو میں رکھنا اور رعیت کی محبت حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ فردوس منزل ہمارے بانی سلطنت اس رمز سے آگاہ تھے۔

لہٰذا انھوں نے اگر ایک طرف مملکت کو زور بازو سے آفاق تک پھیلایا تو دوسری جانب حسن تدبر، عدل و انصاف اور معاملہ فہمی سے رعایا کے دل جیت لئے۔ ہمہ وقت رعیت ان کے لئے دعا گو رہتی، یوں سلطنت کو داخلی استحکام بھی نصیب ہوا۔

بندۂ حقیر کے آبا نے چار پشت تک تیغ کی وفاداری سے حق نمک ادا کیا، چنانچہ تمام بادشاہوں نے انھیں سرفراز کیا۔ یہ عاجز پیدائشی کمزور تھا، بچپن ہی سے کم گو، کم آمیز، لب گور تھا۔ کھیلوں، ورزش اور کسرت سے نفور، درختوں پر چڑھنا، تیرنا، کشتی رانی، ناپسند۔ نہ میں اسپ تازی کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر رانوں کے سخت دباؤ سے اسے قابو میں رکھ سکتا تھا، نہ شمشیر زنی میرے بس کا روگ تھی، نیزہ بازی اور خنجر زنی سب میں نالائق... شمشیر زنوں کے خاندان اور معرکہ آراؤں کے گھرانے میں ایسا مریل بچہ، ہائے توبہ۔ میری ناتوانی اور اس کی پیدا کردہ کم ہمتی کی وجہ سے قبلہ گاہی طول خاطر رہتے کہ میدان جنگ میں موت پانے والوں کی نسل میں ایسا پیدا ہوا جو بستر پر تپ سے مرے گا۔

فنون حرب میں تربیت اور اسلحہ کے استعمال میں میری مہارت پیدا کرنے کے لئے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں مگر میں ان امور میں نا اہل ثابت ہوا۔ تب سیانوں کے مشورہ کے بموجب مجھے مدرسہ میں اساتذہ کے سپرد کر دیا گیا۔ میں کہ شمشیر زنی کا اہل نہ ثابت ہو سکا اپنے خاندان کا پہلا خواندہ مرد بن گیا۔

قدرت کے کھیل عجب ہیں اور اسی لئے فہم سے بعید بھی۔ جو دست اہل شمشیر نہ بنے وہ قلم سے مانوس ہوئے گویا اسی کے قابل تھے۔ قلیل مدت میں یہ عاصی ذہین و فطین طلبہ میں شمار کیا جانے لگا۔ مجھے خوش نویسی سے خصوصی لگاؤ تھا چنانچہ خوش نویسی کے مروج اسالیب جیسے تعلیق، نستعلیق، ثلث، طغریٰ، ریحان، مغربی، کوفی، دیوانی اور بہار وغیرہ میں خصوصی مشق بہم پہنچائی۔ اللہ نے حافظہ بھی بہت اچھا دیا تھا، ایک مرتبہ سنا ہوا لفظ، دیکھا ہوا چہرہ اور سونگھی ہوئی خوشبو کبھی نہ بھولتا۔

جب مدارج علم طے ہوئے اور خوش نویسی میں شہرت حاصل کر لی تو ایک روز سعید قبلہ گاہ نے حضور شاہ میں پیش کیا۔ شاہ دوراں نے لطف و کرم سے، آبا کی جاں ارزانی مد نظر رکھتے ہوئے، وقائع نگار کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ مجھ سیاہ بخت کا بخت خوابیدہ یوں بیدار ہوا کہ حضور پرنور کے قدموں کے نیچے بیٹھنے کا دائمی اعزاز حاصل ہوا۔ حضور پرنور کے دہن مبارک سے جو تلطف آمیز کلمات و احکامات وارشادات و اقوال ادا ہوتے، میں انھیں بعینہٖ قرطاس ابیض پر رقم کر لیتا۔

دربار امور مملکت سے فراغت کے بعد، یہ عاجز دن بھر میں قلم بند کئے گئے اقوال زریں گوش گذار حضور کے کرتا۔ حضور پرنور دست خاص سے بنفس نفیس عبارات کے بعض اجزا کی تصحیح کے بعد، یہ عاجز قرطاس منقش و مطلا پر اقوال و ارشادات خوش نویسی کے بہترین اسلوب میں منتقل کر دیتا تاکہ مورخین اور آئندہ نسلیں نوشیروان عصر، شہنشاہ عدل کی کارگذاریوں، احکامات، اور فرامین کے بارے میں دست اول معلومات حاصل کریں۔

دربار سے تعلق کے بعد ایک صبح قبلہ گاہی نے فجر کی نماز کی ادائیگی اور تسبیح کے بعد مجھ سے یوں خطاب فرمایا:

"اے پسر! میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں، یہ عمر بھر کے تجربات کا نچوڑ ہے، گوش نصیحت نیوش سے کام لو گے تو کبھی سرگرداں اور خوار نہ ہو گے۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہوا۔ فرمایا:

"اے نور چشم! ہم نے صدیوں تک دودمان شاہی کی خدمت کی اور جان دے کر حق نمک ادا کیا، تم بھی راہ وفا پر استقامت سے گامزن رہنا۔ یہ بات غور سے سنو اور اسے گرہ میں باندھ لو۔ بادشاہ اور بچے میں صرف عمر کا فرق ہوتا ہے مزاج کا نہیں۔ کچھ علم نہیں کہ بچہ کب ضد میں کیا طلب کر لے اور کیا توڑ پھوڑ شروع کر دے۔ بچہ جب ضد یا غصہ میں آتا ہے تو اسے کھلایا، پلایا، محبت، شفقت، الفت کچھ یاد نہیں رہتی۔ بعینہٖ بادشاہ پر جب غصہ سوار ہو اسے بھی جاں سپاری اور جاں نثاری کچھ یاد نہیں رہتی لہٰذا اسے کبھی غصہ نہ دلاؤ۔ ہمیشہ اللہ کا فضل چاہو اور بادشاہ کے غصے سے پناہ مانگو۔ ہمارا بادشاہ نیک نہاد ہے لیکن بیٹا! بادشاہ، بادشاہ ہوتا ہے۔

"فرزند من! دربار بھڑوں کا چھتہ ہوتا ہے۔ زرق برق ملبوسات میں کورنش بجالاتے وزرا، عمائدین سلطنت اور اراکین دربار کے لئے بادشاہ کے دل میں کچھ بھی محبت نہیں ہوتی، اس کی قوت کا خوف ہوتا ہے اس لئے سر تسلیم خم کرتے

ہیں۔ گردن اس لئے جھکاتے ہیں کہ عمامہ بچانا ہوتا ہے، سمجھے؟

"بیٹا! دربار میں سرخ رو زندہ رہنے کا ایک ہی سنہرا اصول ہے۔ گوش وچشم کھلے رہیں اور منہ بند۔ کام سے کام رکھو، شاہ وقت کی خوشنودی ملحوظ رہے، دن عافیت سے گذارو، رات کو شکرانہ کے نوافل ادا کرو... بس! اسی سے فلاح پاؤ گے۔"

عاجز نے پدر محترم کے پند سودمند کو حرز جاں بنایا...

[یہاں سے مخطوطہ پڑھا نہ جاسکا۔]

...اس عاصی کو چونکہ اسلحہ اور حربی مشقوں سے دلچسپی نہ تھی، اس لئے فارغ اوقات کتب بینی میں بسر ہوتے۔ وقت کا اس سے بہتر اور کوئی مصرف نہیں کہ بے معنی اشخاص کے بجائے معنی آفریں کتب کے ساتھ گذارا جائے۔ اسی لئے میں نے کتاب سے مکالمہ کو ترجیح دی۔

ایک شام بلامقصد و بے ارادہ گھومتا کارواں سرائے جا نکلا۔ وہاں تازہ کوئی قافلہ کہیں سے وارد ہوا تھا۔ اشیائے کمیاب اور نوادر برائے فروخت، ایسے مہین پارچہ جات گویا تار نگاہ سے بنے ہوئے ہوں۔ مصوری... مصوری کے ایسے شاہکار کہ تصویر چیخ اٹھے۔ نرم کولہوں اور سخت چھاتیوں والی کنیزیں، آہو چشم ترک لڑکے، قوت و توانائی کے فیل گراں حبشی غلام، چراغوں کی مانند لو دیتے ہیرے، اور ستاروں سے چشمک کرتے منور موتی... الغرض دامن دل کھینچنے کو ایک سے بڑھ کر ایک انمول تحفہ۔

میں اشیاء دیکھتا ہوا گذر رہا تھا کہ ملک خطا کا ایک کہن سال تاجر دکھائی دیا جو بھیڑ سے جدا، چند کتابیں لئے بیٹھا تھا۔ میں نے ادب سے سلام کیا جس کا اس نے خندہ جبینی سے جواب دیا۔ میرے استفسار پر اس نے منقش و مذہب کتابیں دکھائی شروع کیں۔ میں خوش ہو کر کتابیں دیکھتا رہا۔ جب اس نے اپنے تئیں اندازہ لگایا کہ واقعی مجھے کتابوں سے دلچسپی ہے تو اس نے ایک تھیلے میں سے خاصی خستہ کتاب نکالی اور یوں گویا ہوا:

"اگرچہ یہ رزمیہ مثنویوں کی مانند مصور نہیں، اور نہ ہی کتب قصص کے سے مطلا حواشی اس کے ہیں، نہ ہی شعراء کے دواوین کی مانند فردوس نظر ہے مگر یہ سونے میں تولنے لائق، تحفۂ شاہاں۔"

میں نے مارے اشتیاق کے وہ نسخہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بتا رہا تھا۔

"اس میں عقل و دانش کا نچوڑ، ایسے جواہر پارے ہیں جو راہ زیست میں چراغ ہدایت ثابت ہو سکتے ہیں۔"

اسی اسلوب میں وہ کتاب کی خوبیاں گنواتا رہا۔

"اے نوجوان! اس کتاب کو اپنا بزرگ، مرشد اور محب جانو گے تو ہمیشہ اسے مفید اور کارآمد پاؤ گے۔"

میں اگرچہ مشتاق تھا مگر کتاب کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ مجھے متردد دیکھ کر اس بزرگ نے یوں کلام کیا۔

"بیٹا! کتاب خریدو یا نہ خریدو، مگر ایک بات سمجھ لو! کتاب رقم کی میزان میں نہیں تلتی، کتاب کاغذ پر لکھی مجلد شے نہیں، کاغذ کا مول لگا سکتے ہو مگر اس پر تحریر دانش انمول ہوتی ہے۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"کیا تم سقراط، افلاطون اور ارسطو کی قیمت بصورت سکہ ادا کر سکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔

"سوچو۔" وہ انگشت شہادت سے اشارہ کر کے بولا۔ "اگر یہ اور ان جیسے دیگر معلمین نہ ہوتے تو آج دنیا جہالت کے کس مقام پر ہوتی؟"

"بجا فرمایا۔"

"ہمارے ملک خطا میں بھی ایسا ہی ایک معلم گذرا ہے، کنفیوشس۔"

یہ نام میرے لئے نیا تھا، چنانچہ پورے انہماک سے میں اس کی بات سنتا رہا۔ اس نے بات جاری رکھی۔

"کنفیوشس ہمارا عظیم معلم ہے۔ ہم نے اس سے دانش اور اخلاق حاصل کیا ہے، اس کتاب میں زیادہ تر اسی کے اقوال دل نشیں ہیں۔ وہ کنفیوشس جو زر میں نہیں تولا جا سکتا کہ اس کی دانش ہی زر خالص ہے۔"

"میں نے منہ مانگے دام ادا کئے۔ کتاب گھر لایا، پہلا صفحہ پڑھا تو کمرے میں جیسے اجالا ہو گیا:

زندگی میں کم از کم ایک معقول کتاب ضرور لکھو۔ یہ ممکن
نہیں تو زندگی میں کم از کم ایک پیڑ ضرور لگاؤ۔ یہ بھی ممکن نہیں
تو پیڑ کی چھاؤں میں الفاظ سے مکالمہ کرو۔

کتاب کیا تھی، موتیوں کا خزانہ تھی۔ میں رات بھر محو مطالعہ رہا۔ اگلی صبح کتاب ریشمی غلاف میں لپیٹی اور عالم کی خدمت عالی میں پیش کر دی۔ مجھ کم سواد کے لئے یہ کتاب شاہوں کے شایان شان تحفہ تھی۔ قربت کے باعث اس غلام کو علم تھا کہ حضور عالم بھی کتب بینی سے شغف رکھتے ہیں۔

سلطنت میں امن و امان، رعیت خوش حال، دشمن نابود، غنیم عنقا، سازشی مفقود، لہٰذا شہنشاہ گیتی پناہ کو فراغت حاصل تھی۔ حضور کتاب کا تحفہ پا کر بے حد مسرور ہوئے، گلوئے مبارک کی مالائے مروارید عنایت فرما کر کم ترین کا رتبہ بڑھایا۔

عالم پناہ مسلسل محو مطالعہ رہتے، کتاب سے دانش و حکمت کے موتی اخذ کر کے اہل دربار کی خردمندی میں اضافہ فرماتے...

[مخطوطے کے کچھ صفحات غائب ہیں۔]

...حضور کا معمول تھا کہ امور سلطنت سے فراغت کے بعد مجھے ساتھ لیتے اور خاموشی سے جنگل بن کا رخ کرتے۔ عیش و نشاط یا شکار کے لئے نہیں، ذوق مطالعہ کی تشنگی کے لئے۔ سہ پہر کی نرم دھوپ میں شاہ کسی پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے، کتاب سے ہمکلام نظر آتے۔

ایک شام کہ درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے، دن بھر کی اڑان کے بعد آشیانوں کو لوٹتے پرندوں کی آوازوں سے جنگل بن گونج رہا تھا۔ ہم نے اسے دیکھا۔

برق گزیدہ درخت کے جلے سیاہ تنے کے ساتھ ٹیک لگائے وہ کسی شاداب پھول کی مانند رخصت ہوتی دھوپ تن شجر کو روشن کر رہی تھی، یوں کہ نار پھل اور بے حجاب سنہری جسم پیرہن کا کام کر رہے تھے۔ ہم سب دیدۂ حیراں، یہ حسن نہ تھا جادو طلسم تھا، عورت تھی کہ جنگل کی روح مجسم ہو گئی تھی۔ تن بے لباس سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی اور اپنے گرم حصار میں لیتی محسوس ہو رہی تھیں۔

شاہ نے جب اسے مرد کی آنکھ سے دیکھا تو پھر اور کسی عورت کو نہ دیکھا۔ حرم میں عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن شاہ عالم پناہ اس کے طلسمی حسن کے قفس میں گویا پنچھی کی مانند اسیر ہو گئے۔

اب خرد مند شاہ کے ارشادات میں بعض اوقات ایسے کنائے ہوتے جنھیں یہ بے خرد سمجھنے سے قاصر رہتا۔

میں تادمِ مرگ وہ شام نہ بھول پاؤں گا۔

اس کے حسن میں مگن شہنشاہ چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک تناور شجر گویا سیاہ مضبوط جسم اور پرقوت بازو میں تبدیل ہو گیا۔ ایک لحہ کو پیش قبض بلند ہوا۔ اگلے لمحہ وہ سینۂ مبارک میں اتر گیا۔ جو گڑھا پہلے سے کھودا گیا تھا، جسدِ مبارک کہ ہنوز اس میں سے خون ابل رہا تھا، بے دردی سے اس میں لڑھکا دیا گیا۔ ماہر ہاتھوں نے گڑھا پر کیا، شاخیں اور پتے اس پر ڈال کر نشانِ ستم مٹا دیا گیا۔

زن باجمال ایک ادائے خاص سے یہ سب دیکھا کی۔

میں مانندِ شجر ساکت [مخلوطے کی چند سطریں یہاں بھی پڑھی نہ جا سکیں]۔

... نیا سورج نئی شان کے ساتھ طلوع ہوا، نقاروں پر چوٹ پڑی۔ اطلاعچیوں نے اعلانات کیے۔ وزرا، امرا، عمائدین، اراکین نئے شاہ کے حضور کورنش بجا لائے۔ شعرائے کرام نے نئے شاہ کی مدح میں، تشبیب اور گریز کے نئے قرینوں کے ساتھ جو قصائد تصنیف فرمائے تھے، ان میں نئے شاہ کی وہ ثنا کی، وہ صفات گنوائیں، وہ خصوصیات اجاگر کیں اور عظمت کے ایسے اسلوب میں گن گائے کہ تشبیہ و استعارہ کا کال پڑ گیا۔

مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ دراصل ایک زن غیر منکوحہ کے بد اطوار اور نانہجار پسر غیر شرعی کی یہ سازش تھی۔ وہ زن باجمال کہ درحقیقت زن نابکار تھی، شہنشاہ کو ورغلا کر بجلی بن تک لے آنے کے لئے مامور کی گئی تھی۔

جنت مکانی پدر محترم کی کارآمد نصیحت کے بموجب میں اور میرا قلم خاموش رہے۔ میں کہ شاہی مورخ اور وقائع نگار خصوصی تھا، اب نئے حالات کی روشنی میں تاریخ نویسی پر مامور ہوا۔ چناں چہ میں نئے شاہ کے فضائل و کمالات، عزم و ہمت اور عدل گستری پر مبنی تاریخ لکھتا رہا.. حسب دستور...

[مخلوطے کی چند سطریں یہاں بھی ناخوانا ہیں۔]

... وقت اچھا گذر رہا تھا مگر میں مطمئن نہ تھا، عجب سی بے کلی رہتی، آسودگی کے باوجود عدم آسودگی کا احساس۔ جب بھی وقت ملتا شہنشاہ عالم کے بے نشان مدفن پر چلا جاتا۔ بجلی بن کا وحشت بھرا ماحول ملول دل کے لئے سکون آور محسوس ہوتا۔ خاموش جنگل میں میں تنہا ہوتا، کوئی متنفس نہ سنگی ساتھی، خاموش مدفن پر بیٹھا شاہ مہربان کو یاد کرتا۔

ایک دن دیکھا کہ مدفن کی سیاہ مردہ گھاس میں قطرہ ہائے شبنم کی مانند پھولوں کے رنگ چمک رہے ہیں۔ مدفن کشت میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے باقاعدگی سے دیکھ بھال شروع کر دی۔ بہار آئی تو مدفن گل بن میں تبدیل ہو گیا۔ گرداگرد کے مردہ شجر بھی تر و تازہ ہو کر، نئے سبز لبوسات سے بنے سنورے۔ بجلی بن میں صرف یہی قطعہ خوش رنگ، خوش مہک اور خوش منظر تھا۔ میں بے نشان مدفن کا مجاور بن چکا تھا..

[مخلوطہ یہاں سے بھی پڑھا نہ جا سکا۔]

... بادشاہی کا اصول ہے کہ مقصد برآری کے لئے دغا، مکر، فریب، سازش اور قتل تک کسی فعل سے بھی اجتناب نہیں کرتے لیکن حصول مقصد کے بعد سازش کارندوں سے خوف زدہ بھی رہتے ہیں۔ اسی لئے سمجھ دار بادشاہ نے بہ طریق احسن اور بہ تدبیر خفیہ، سازش کے ساتھیوں سے پیچھا چھڑانا شروع کر دیا۔ یوں بجلی بن کی زیر زمین آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

میں کہ وقائع نگار خصوصی اور دربار شاہی کا مورخ تھا، مجھ سے بھلا یہ حقیقت کیسے روپوش رہ سکتی تھی کہ چالاک بادشاہ مخالفین اور ماضی کے ساتھیوں کو جس رفتار سے قتل کرا رہا تھا، اس کا امکان تھا کہ جلد ہی بجلی بن گورستان میں تبدیل ہو جائے گا۔

میں پدرم مرحوم کی نصیحت پر کاربند رہا۔ منہ کو بند اور قلم کو شاہ کے تابع رکھا۔ بحکم شاہ سب سازشی، مفسد اور دغاباز زیر زمین آباد تھے، البتہ اس سازش کا اہم ترین مہرہ، یعنی وہ زن نانہجار ہنوز زندہ تھی۔ وہ اپنی کارگذاری کے بدلے میں مناکحت کی خواہاں تھی جب کہ سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پڑوسی بادشاہ کی دختر قبیح صورت کو عقد میں لا کر مشرقی سرحدیں محفوظ بنا لی جائیں۔ زن نانہجار کو مملکت اور سیاست کے مقابلے میں اپنا مستقبل عزیز تھا.. تو تو تکار رہنے لگی۔ تب بادشاہ نے اس الجھن کا وہی حل نکالنا چاہا جو بادشاہ نکالا کرتے ہیں۔ کارلاکمہ کے لئے نئے وفادار حاضر تھے۔

یہ میری زندگی کی دوسری ایسی شام ثابت ہوئی جو لوح حافظہ پر دائمی نقش ثبت کر جاتی ہے۔

ہنسی اور باتوں کی آوازیں سن کر میں مدفن سے اٹھا، ایک گھنے جھاڑ کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا، دیکھا۔ بادشاہ اور زن نانہجار ہنستے بولتے چلے آ رہے تھے۔ مارے خوف کے میں پسینہ میں شرابور ہو گیا، اگر دیکھ لیا گیا تو زندہ نہ بچوں گا۔

سرسبز گھاس، پھولوں، پودوں اور اشجار و اثمار کو دیکھ کر وہ بولی۔ ''کیسی خوب صورت جگہ ہے!''

بادشاہ کہ گہری سوچ میں تھا، بالآخر بولا۔ ''تمھیں یاد ہے نہ، اسی جنگل میں تم نے اس کا کام تمام کیا تھا؟''

وہ بڑی دلربا سی ہنسی ہنسی۔

''یہ کیا قصہ لے بیٹھے، مجھے تو یاد بھی نہیں۔''

''مگر مجھے یاد ہے۔''

وہ دوبارہ ہنسی۔ ابھی اس کی ہنسی کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک طویل القامت شجر جھکا۔ اس کی مضبوط شاخوں کے پھیلے بازوؤں نے انھیں اچک لیا، پیشتر اس کے کہ ان کے کھلے حلقوں سے خوف کی چیخیں برآمد ہوتیں، دونوں شجر میں سما چکے تھے۔

یاللعجب! میں نے کیا دیکھا؟ آنکھیں ملیں، پھر کھولیں، پھر بند کیں۔ پرندوں کی اچانک خاموشی ماحول کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔ اشجار، پھول، پھل ساکت... منظر پر خاموشی کا پہرہ اور میں بے حواس۔

تب دیدۂ حیراں نے دیکھا کہ موٹے موٹے سیاہ چیونٹوں نے جو ادھر ادھر پھر رہے تھے، یک قطار ہو کر اس شجر کا رخ کر لیا...

[اس کے بعد مخلوطے میں کوئی صفحہ نہیں] ☆☆☆

تم کس سے ملنے آئے ہو؟

سلیمان اریب

شمارہ ۲۳،
اپریل ۱۹۶۸

تم کس سے ملنے آئے ہو
کس چہرے سے کام ہے تم کو؟
کن آنکھوں سے بات کروگے؟
تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو
اس میں ہیں کتنے ہی چہرے
جن کو لگائے میں پھرتا ہوں
تم کس سے ملنا چاہو گے؟

اس شاعر سے جس کو تم نے
دیکھا ہے اسٹیج پہ اکثر
سب کو بھولے خود کو بھلائے
بدمستوں کا بھیس بنائے
جس نے فلک پر حکم چلائے
سنگِ ملامت جس پر آئے
محفل کی محفل جھوم اٹھی
جس نے ایسے شعر سنائے؟

تم کس سے ملنے آئے ہو؟
اس لمبے گورے چہرے سے
جس پر آگ کے پھول کھلے ہیں
جو اک سیدھے قدم کو سنبھالے
دل میں سینکڑوں زخم چھپائے
اپنی انا کی لاش اٹھائے
کم ظرفوں کی اس دنیا میں
کتنے یگوں سے سرگرداں ہے؟

تم کس سے ملنے آئے ہو؟
اس انساں سے جس کے اندر
اک قاتل، زانی، سارق کے
تینوں چہرے ایک ہوئے ہیں؟
لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہیں
پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں
اور وہ قاتل اب بزدل ہے
اور وہ زانی اب شوہر ہے
اور وہ سارق اب منصف ہے

تم کس سے ملنے آئے ہو؟
میں خود اپنے آپ سے مل کر
پہروں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
کس چہرے سے بات کروں میں؟

سلیمان اریب

شمارہ ۴۰،
ستمبر ۱۹۶۹

آخری لفظ، پہلی آواز

کن حرفوں میں جان ہے میری
کن لفظوں پر دم نکلے گا
سوچ رہا ہوں
ابجد ساری یاد ہے مجھ کو
لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟

اب تو کسی بھی حرف کا چہرہ یوں لگتا ہے
جیسے وہ آواز ہو اس پہلے انساں کی
جو خود کو سایوں کے جہاں میں تنہا پا کر چیخ پڑا ہو
اور اس کی آواز گلے میں گھٹ کر
ص اص اح اح اع اآ
کچھ نکلی

اور اس سے پہلے کہ کچھ نکلے
نام بنے
سناٹے میں ڈوب گئی ہو

تمہیں کیا؟

میں اپنی زندگی کی نوٹ بک سے کتنی راتیں کتنے دن کاٹوں؟
کہ اک اک رات میں کتنی قیامت خیز راتیں مجھ پہ ٹوٹی ہیں
اور اک اک دن میں کتنے دن ہیں؟ جن میں حشر برپا
ہوتا رہتا ہے
اور ایسی کتنی صدیاں اس زمین پر مجھ پر بیتی ہیں
میں ہر لمحے میں سو سو بار مرتا اور جیتا ہوں
حساب بے گناہی ہر نفس پر دیتا رہتا ہوں
مگر یہ میرا اپنا مسئلہ ہے ایک دم ذاتی
تمھیں کیا اور کسی کو کیا جو میرے ساتھ سوتی ہیں

سلیم کوثر

شمارہ۱۹۶،
جولائی۱۹۹۶

اس عالم حیرت و عبرت میں کچھ بھی تو سراب نہیں ہوتا
کوئی نیند مثال نہیں بنتی کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا

اک عمر نمو کی خواہش میں موسم کے جبر سہے تو کھلا
ہر خوشبو عام نہیں ہوتی ہر پھول گلاب نہیں ہوتا

اس لمحۂ خیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے جس میں
ہر بات گناہ نہیں ہوتی سب کار ثواب نہیں ہوتا

مرے چار طرف آوازیں اور دیواریں پھیل گئیں لیکن
کب تیری یاد نہیں آتی اور جی بیتاب نہیں ہوتا

یہاں منظر سے پس منظر تک حیرانی ہی حیرانی ہے
کبھی اصل کا بھید نہیں کھلتا کبھی سچا خواب نہیں ہوتا

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

مری باتیں جیون سپنوں کی مرے شعر امانت نسلوں کی
میں شاہ کے گیت نہیں گاتا مجھ سے آداب نہیں ہوتا

شمارہ۲۲۵،
مارچ اپریل۱۹۹۹

بلندی پہ جو یہ ستارے بنائے گئے ہیں
مری دسترس کے اشارے بنائے گئے ہیں

مجھے پڑھنے لکھنے پہ مامور کرنے سے پہلے
زمیں آسماں کے شمارے بنائے گئے ہیں

چھپانے کی خاطر ہی ظاہر کیا اس نے خود کو
سو تمثیل اور استعارے بنائے گئے ہیں

مجھے ہی منافعے کی تفصیل جاری ہوئی ہے
مرے واسطے ہی خسارے بنائے گئے ہیں

مرے پار اترنے کو طوفان بھیجے گئے تھے
مرے ڈوبنے کو کنارے بنائے گئے ہیں

ہمیشہ کوئی بھی نہیں ان میں رہتا ہے لیکن
ہمیشہ محل اور منارے بنائے گئے ہیں

تو پھر ایک تنکے کا بھی آسرا کس لئے ہو
اگر ٹوٹنے کو سہارے بنائے گئے ہیں

تعرف میں کچھ بھی نہیں ہے مرے اور پھر بھی
مرے نام سے گوشوارے بنائے گئے ہیں

بشو نبی مصطفیٰ

سمیع آہوجا

شمارہ ۲۶۳،
دسمبر ۲۰۰۲

غم واندوہ میں پھنسی ہچکیاں، شکلوں کے ازدحام، ان امنڈتے، پھیلتے، تحلیل ہوتے چہروں سے گود میں بھرا چہرہ زیادہ نمایاں ہے، میری متحیر آنکھیں، ماتھے پہ ٹکی، بے تھوہ، شفاف پتھر آنکھوں میں، سوالوں کے رسے، کنڈیاں پھینک رہی ہیں، اندر اتر رہی ہیں، کہ اندر تو لاتعداد آنکھوں کے در وا ہیں، گونجتی آوازیں، بوجھل اور ہراساں سناٹے میں شگاف ڈالتی سیٹیاں، ابھی چند لمحے پیشتر جب تیرہویں دن کا ناتواں سانس ٹوٹا، تو گھپ خاموشی کے سارے منظر الٹ گئے، موہوم سائیکلون، اور میں ہیبت زدہ، ہر طرف اڑتا، خس و خاشاک۔ یہ لوگ دادا کو اب تک کیوں نہیں لائے، تیرہ دن ہو چکے، ایک کونے سے دوسرے کونے تک پانچ قدموں کا فاصلہ، میلوں میں اپنی کینچلی اتار چکا ہے، اور اختتام کے فیصلے سے پیشتر، میری پرواز پر کمند پھینک دی جاتی ہے، گمان کا اضطراب، غیر اختیاری، بے چارگی کے آنسوؤں میں پگھل جاتا ہے، چار سپاہی، دریدہ خون آلود جسم کو، ٹانگوں اور بانہوں کے جھولے میں ہلکورے دیتے، ششدر آنکھوں تلے پھینک دیتے ہیں، مضطرب چیخ، گود میں بھرا سر، خون میں لپے چہرے کو بنیان کے دامن سے پوچھتی لرزاں انگلیاں، بند آنکھوں میں جب لرزش نمو پاتی ہے تو غیر اختیاری تجسس کا منظر تھم جاتا ہے، اور اس کی آواز کا سائبان، تحفظ کی نیلگوں چھت۔ خلیل جی دادا، بدن کا ہر مسام، بصورت کان، اس کے ہلتے ہونٹوں سے الفاظ چننے کو بیتاب، لیکن کانوں میں امنڈتے الفاظ تو صدیاں ہیں، جسم کے بے یقین اور دھندلے خوف میں ہزاروں دھماکے، ہاتھ مردہ جسم کی راکھ میں زندہ چنگاری کرید رہے ہیں، مالش کر رہے ہیں، اور میری آنسو نچوڑتی آنکھوں تلے زندان کا ہر لمحہ جواب دہ... کاغذ پر پھیلے سیاہ لفظوں کا محاصرہ، پنجے، نوکیلے ناخون، تیز دانت، زندگی کے ایک ایک لمحے کو بھنبھوڑتے، انگلیوں کی جنبش میں ڈولتا، تھکا ہارا قلم، کوئی اور لفظ اگلنے سے معذور، تفتیشی افسر کی غراتی نیند کی سرخی سے لبریز آنکھیں کوائف سے اٹھیں، اور مجھ پر جھپٹ پڑیں، پھنکارتی آواز، برستا کوڑا، جسم کے روئیں روئیں میں خوف زدہ سنسناہٹ۔ ہاں تو پھر...؟ میرا چہرہ آواز کے رخ پلٹ پڑا، جی، اک دم میرے کانوں پر پڑنے والی ضرب، زلزلوں کی زمین پر وجود۔ جی کے بچے، حرام زادے، بتادہ اسلحہ کہاں ہے...؟ جواب دینے سے دماغ قاصر، مشینی الفاظ اگلتا دہانہ۔ جی مجھے کیا پتہ، میں تو صرف ناؤ کھیتا ہوں، لوگوں، ان کے سامان کو، اس پار سے اس پار لے جاتا ہوں، مجھے کیا پتہ کہ کس سامان میں اسلحہ ہے۔ بھاری بھرکم غراتا کتا کرسی سے اچھلا، نیم برہنہ پنڈے کے گرد چکر لگاتے، اچانک گھونسوں، ٹھڈوں سے حملہ آور ہو گیا، میں سامان کی نہیں، اسلحے کی بات کر رہا ہوں، جس سے تو نے قتل کیے ہیں۔ ماندگی، بے ساختہ چیخوں میں رحم کی اپیلیں، درد کی منہ زور طغیانی... میں دوہرا ہو گیا، اور پھر سر پر پڑنے والے ٹھڈے سے سائرن کا بٹن آن، لرزتے در و دیوار، اور پھر بلیک آؤٹ... اور جب بھاری پھڑ پھڑاتے پپوٹوں نے در وا کیے تو آنکھوں میں اترتا چہرہ بجلی کا کرنٹ، بوکھلاہٹ، میں ہڑبڑا کر پتھریلے فرش سے اٹھ گیا، کپکپاتے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا چہرہ، لرزاں انگلیوں سے لمبی سفید ڈاڑھی کا لمس، تنگ و تاریک سیلن زدہ کمرے میں دہشت زدہ سرگوشی، دادا؟ تم؟؟؟

مسکراہٹوں کے افلاک پر درخشاں چہرہ، اثباتی جنبش، میرے ہونٹ پھر لرزنے لگے۔ تو کیا یہ جانتے ہیں کہ تم میرے دادا ؟ نہیں، سوالیہ نشان میں ڈھلی ہوئی آواز۔ تو پھر یہاں کیسے؟ کربناک، حبس زدہ مسکراہٹ لفظوں میں مفاہیم بننے لگی، پرانی بات ہے۔ مجھ پر غداری کا، لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کا الزام ہے سارا بدن اعصابی تناؤ میں، وسیع وگمبیر اذیت، ایک بوجھل تشویش، تلخ بے یقینی، چپ کی سازش ہم دونوں کا گھیراؤ کرنے کی سعی میں مصروف، خون ابلتے جذبوں کی غراہٹ۔ اس ننھے سے لفظ میں ہماری تاریخ کے سارے اوراق، اتھل پتھل...، غدار؟ کس کس سرکار نے دیش سپوتوں کی کھال نہیں ادھیڑی۔ دادا تم؟ غدار؟؟ تم نے تو اس دھرتی کو اپنے لہو سے پاک کیا تھا۔ خلیل جو بھی ایسے حکومتی فریموں میں بند ہونے، جی کے لفظ کے ساتھ ڈنڈوت کرنے کی نفی کرے، وہ غدار...؟ مٹی، اختلاف کی کنکریوں سے چٹا بڑا شیطان مگر دہر میں تو اس کی سازشیں چپ سمان اترتی ہیں، اور یہ سب کھیل کھیلیں کھلم کھلا منبر پر کھڑے، طویل قامت شخص اولی الامر منکم پر اختلافی کنکر۔ یہ تیرا کرتا ایک چادر میں نہیں بن سکتا، دوسری چادر کا جواز؟ اور یہاں ان سے جو بھی اپنے خون کی ارزانی کا حساب مانگے وہ غدار، سازشی، بلا حساب اختلافی کے بدن کا سارا لہو کولھو کے زور میں نچڑ جائے، وجود کو سالم رکھنے کی آرزو، جدوجہد، باغی کے روپ سوانگ میں تھیٹر پر رقصاں، سوتی آنکھوں میں اس سارے لاسے کی نشان دہی، صحرا بدر ہونے کی ذلت میں روپوش۔ ابوذر، یہ تم نے کیسی بنیاد ڈال دی؟ سیل کے کھلتے آہنی دروازے کی چرچراہٹ، دادا کے تفتیشی افسر کا سرخ، چرب زدہ، صحیح خدوخال سے محروم مسخ چہرہ، پشت پر گارد۔ سرکار نے تجھ سے بڑا غدار آج تک نہیں پکڑا، سیاسی لیڈر ہو یا دہشت پسند وہ سب تو محدود نفری سے ہمارے مقابل آتے ہیں، مگر تو تو دیس کے ہر ذی روح کو ہمارے سامنے فصیل بنانا چاہتا ہے، اتنی بڑی غداری تیری تو بوٹی بوٹی کتوں سے نچوائیں گے۔ الٹا لٹکا ننگا بدن، راس، زہر اگلتی آنکھوں کے سرخ انگارے، بوٹی بوٹی، ریشے ریشے کی پرکھ، سارے پٹھوں میں اکڑاؤ، میرے سر کے گرد چکر کھاتا فرش، چیخیں اگلتے منہ سے باہر، معدہ ابل پڑنے کو بیتاب، خون سے لت پت عدسوں نے اپنے قصابوں کی نکو انظروں کو جانچا، جلاد سیاہ کی زرد زرد آنکھوں کے افق پر تیرتے سائے، پلکوں سے چمٹے خواب، بوجھل پپوٹوں کے قدموں میں بلکتی نیند، کوڑے برساتے، طویل قامت بدن کی آنکھیں، خون پیالے، شکوک وغیظ کی غلاظت چھلکاتے، دادا اپنے ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھے، کئی گھنٹوں سے تنگ وتاریک کوٹھری کو تکے جارہا تھا حکومتی مشینری کے یہ اہم کل پرزے ہیں مگر صرف ایک بٹن دباؤ کے محتاج، ان میں نیند کا کوئی ورق نہیں پھڑپھڑاتا، یہ سب بدبخت، ہم سے بڑے قیدی، بدتر غلام، ایسے لوگ باہر کہاں، ہر آنکھ وہاں اس پیاس سے ناآشنا، محروم، اور یہاں یہ سب گھربار سے دور، دن رات ایک سے سوال اگلتے حلق، گالیاں، کوڑے، ٹھڈے اور وہ بھی مجبوری کے ہاتھوں، شکم سیری کا جواز، پھر ایک سے جوابوں سے سیر ہونے کی افیون، ذمے داریوں کی آڑ میں نوسربازی، ہونہہ... جذبوں سے عاری، پتھر شکلوں کے قہقہے اگلتے غار، زرد زرد آنکھوں کی سرین پر گھات، کمر پر رینگتے، کھردرے، کپکپاتے، شہوت زدہ ہاتھ...، سرین کے اوپر کا حصہ سرین کے نچلے حصے سے زیادہ خوبصورت ہے۔ بول ورنہ تیرے ساتھ آج رت جگا منائیں گے۔ قہقہوں کی باڑ سے میرے بدن کی شکستہ ڈولتی ناؤ، ٹھٹھرتے لمحے کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ، پاؤں کی رسی کٹی اور میں سر کے بل فرش پر آگرا، منتشر حواس ابھی لوٹنے بھی نہ تھے کہ کوڑوں کی لذت بھری سسکاریاں جسم چاٹنے لگیں، بے قابو چیخوں کی چنگاڑیں، لرزتے درودیوار، ٹکرانے، گرنے اور پھڑپھڑانے کا ہیجانی عمل، اور دھیرے دھیرے دھند کا دبیز حصار پھیل گیا، پانی کا ایک بوکا، پھڑپھڑاتی آنکھوں کی بیداری، فرقان اور عزیز میاں کے دریدہ، کٹے پھٹے بدن، سامنے استادہ، آنکھیں وحشت گھر، ٹکٹکی ان کے منہ ساری باتیں نچوڑ چکی تھی خون آلود دہن میں اقرار کی گویائی، خلیل میاں کی کشتی؟ وسیلہ، اسلحے کی گھن گرج، آر پار، انتہائی تیز عذابوں کی مسلسل دھوپ، بخت افلاس زدہ اقرار میں تراشیدہ پناہ گاہ، بکاؤ بندوقوں کا ذکر لاپتہ، اور یہ سب؟ جسم خوف کی دسترس سے ایک دم باہر، ایک لمبی چھلانگ، مجھے کیا پتہ کہ ان کے سامان میں اسلحہ تھا یا اسمگلنگ کا کوئی مال، موتار بن سے دہاڑتے شیر کی جھلک، غم وغصہ سے امنڈتی آواز، مجھے کسی کے سامان سے کیا مطلب، مجھے تو مزدوری چاہیے، عزیز میاں اور فرقان کی مفاہیم اگلتی آنکھیں؟ تھپکیاں وہی پرانے لفظوں کا عہد نامہ۔ ذرہمت، پھنس گئے تو تیرا نام نہیں آئے گا۔ مگر یہ ساری سوچیں بھول بھلیاں میں ملفوف، ملی جلی کشمکش اور تر طلبی کا قحط، دونوں وجود موجود اور تیسرا سامنے، دیکھنے والی آنکھوں کے اندر مکمل علم الحساب، ٹکٹکی تلے تینوں کے اعضا، حساب چکاتے، سارا استحکام دھواں، جسم کے روئیں روئیں میں دادا کی سرگوشی، پھٹتے دماغ میں گونجتے الفاظ کا گنبد، ملگجیم شخص کی آواز دوسری صورت کی کلی کھلاتی ہے، دوسری شکل تیسری کے لیے بار پرودیتی ہے، مشکوک فضا کے مجرم ہواؤں میں گہرے سانس، ایک مجرم کا حلقہ دس پندرہ زنجیری حلقوں میں تبدیل، پیوست، بالکل باہم وصل زنجیریں، دوسری زنجیروں میں پروئی ہوئیں، ایک گروہ کی کئی گروہوں میں تبدیلی، تھکی ہاری بڑی مشین کی چنگھاڑ، مصنوعی، سنڈر، سب کے لیے جرائم کے آکسیجن ٹینٹ تیار، اور جیلوں کے شہر آباد ۔ تفتیشی افسر کی عریاں آنکھوں میں معنی خیز چمکیلی گونج، مضمحل بدن پر حریص گدھ کی سفاک نظریں، الفاظ میں چھپی عفونت، دماغ میں سنسناہٹ۔ میں نے میں نے۔ چپ کتے، تو تو کیا، تیرا تو باپ بھی بتائے گا کہ اسلحہ کہاں ہے؟ اور، اور ساتھی جہاں بھی ہوں گے زمین خود ہی اگل دے گی، لے جاؤ اس خنزیر کو تنگ وتاریک کوٹھری میں نہلاتا غضبناک شیر، اور دادا کی سر کو تھپکتی سرگوشی۔ غصے کو تھوک بس ایسی باتوں کی برداشت ہی صحیح راہیں کھولتی ہے، جیل اور جیل سے باہر کوئی زیادہ فرق نہیں، بس چند پابندیوں کی باریک چادر کھنچی ہوتی ہے، کھنچی کمان سے تیروں کی بوچھار زیادہ ہی تند ہوتی ہے، مگر کمان حد سے زیادہ کھنچے تو ٹوٹ جائے، تو یاد رکھ، اس سے گولی کی تپش بدن میں مرکوز، یا دیوار سے سر مار کر پھٹتا تربوز، اور خودکشی کا حساب بے باق، فرض شناسی کا ڈھونگ، آئینی عمل کی فرضی حاکمیت بھنڈ، غلط فہمی کے شیرے میں مکھی کے پنکھ اور پاؤں چسپیدہ۔ تفتیشی افسر کا حبس آنکھوں پر مسلط، وہم کے اسرار، میں چشکاؤں کا ہوں اور تم بھی، ہمیں فرقان سے کیا لینا ہے، وہ تو کھلنا کا ہے، اور عزیز میاں؟ وہ تو راجشاہی کا، یہ دونوں ازلی سازشی حرامی... پارلیمانی نجابتوں کے تقریباتی آداب، باشعور، ذہنی سوچوں کے خلاف اپنی ضرورتوں کے

پرانے ڈیم تعمیر، گمشدہ آسودگی، جھنجھلاہٹ اور نفرت کی ملی جلی کشمکش، پیٹ میں مروڑ، باہم ٹکسچر کی قے، سرکاری آڑھتی کے بے داغ دامن پر گراہی چاہتی تھی کہ دادا نے اسے اچک لیا۔ سرکاری فارموں میں نسلی تعصب کے تھوہڑ، افزائش آفرینش، حصاروں کے چاروں جانب، ایک قوم، مملکت اور نسل کا شور بے ہنگم، اور اندر حکومتی مرکز ثقل میں بیٹھنے والوں کے مقابل تمام ضلعی تقسیمیں، حقیر اور احمق، ضلعی تقسیم کے فرضی خطوط میں ہر فرد...؟ فتنہ، حرامی، سازشی، اور ہر نوع لزوم زندگی سے محروم اتیتیں، لیکن ڈھاکے کی پیدائشی اشکال، آسمان سے نازل، بلند و بالا، معتمد، انسانی سطح سے ہزار ہا مدارج اوپر، سب لوازمات کے حقدار، گروہی حاکمیت کے طیف، محروم اقلیتی جز و میں اگر دو سرے محروم بے بس اجزا باہم وصل ہوں تو اکثریتی محروم کا تصوراتی کل؟ آج میں ظہور پذیر، اتحاد، وطنیت کے شگافوں سے بہتا فسطائیت کا مواد؟ بند... گروہی بارڈر میں ٹانکا گیا ایک موتی، کانوں میں بھنبھناتی کھیاں، ذہنی ڈھلوانوں، حاشیوں پر ہسٹیریائی روشنی، گڈمڈ ہوتے حواسوں میں دھندلی کپکپاہٹ، باریک سوراخوں سے رستی پھوٹتا سیال، گروہ نے چند ایک کو قتل کر دیا تھا، مگر کن کو؟ حکومتی کل پرزے تو جا بجا پھیلے ہیں، وزیر، جرنیل، سپاہی یا ان کا کوئی اور اہل کار، حشرات الارض، لاتعداد، پتہ ہی نہ چلے کہ کس کو کہاں اتارنا ہے، اندھی بھول بھلیوں کے پھولے شکم، ڈھیرے ڈھیرے بے رحم سوالوں کی دایہ جنم دینے لگی، بے رحم بھنبھوڑتے خونخوار ہاتھ، شکنجے، تکرار سے پھولتی کرن، سزائے موت عمر قید کی ڈھلوان پر لڑھک گئی، آہستہ آہستہ سرکتا وقت، پندرہ سال سے دس کے زینوں پر اترا، اور پھر پانچ سال، پہیہ تھم گیا، نچلا زینہ سیاہ کائی، بے پناہ پھسلن ..، تفتیشی افسر کی گھنی موچھوں کے بال دانتوں میں، چباؤ، چکی، بالوں کا جوں اور ٹکٹکی باندھے آنکھیں۔ اگر تو ہمارے ساتھ مل جائے تو تب ہی تجھے اپنی حیثیت کا پتہ چلے گا، ہر شخص کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہوگی، اور تیرا ہر لفظ ان کی زندگی کا فیصلہ... آوازوں کا تیز نشتر، ساری سوچ کا نچڑتا مواد۔ میں کیا چاہتا ہوں...؟ شیر کی موت... مگر ہڈی پر منھ؟ ہونھ، میرا تو انکار ہی رہے گا۔ ٹھیک ہے، تم بالکل مت مانو، مگر ایسی دلیری کس کام کی؟ بے مقصد موت، کتے کی موت سے بھی بدتر، جلد بازی غلاظت میں اترنے پر مجبور کرتی، سزاؤں کے پھندے؟ میدان حشر... طوالت میں سوچنے کا وقت مانگو، جرأت انگیزی واقعیت کے چناؤ کو اپنی ماہیت میں حل کر لیتی ہے، اور اگر اصرار کا گھناؤنا پن، بدصورتی ساتھ ہی چپک جائے، تو اسیری سے باہر کی فضا مانگو، رٹ لگا دو۔ جیل انسانی لہو میں ٹیس کے ہجوم اتار دیتی ہے، باریک باریک خلیوں میں پھرتی ہوا، داؤ پیچ کی قوت نمو سے سرشار، باہر شعور چھوٹے چھوٹے جزیروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، ان نازک خیالوں سے محروم... جھونپڑے کے دروازے پر سمٹا، ترستا، ابا کا معذور جسم، پیاسی، پر امید، متلاشی آنکھیں، پہاڑیوں کے شاداب مدوجزر پر پھیلا گھنا جنگل... اک سراب، چھتنار درختوں کی پہلی قطار سے ابھرتے، چھاؤنی پر ٹوٹے سائے، موسلا دھار جھڑی، گولیوں کی برسات، ہینڈ گرنیڈوں کے دھماکے، بھگدڑ، نصف قرن کی تصویریں، ڈستے یادوں کے انبوہ، انگلش راج سے سینہ سپر، آہنی عزم، پرانے بہی کھاتے، ابا کے گالوں پر سیاہ روئیدگی کے پہلے اعلان پر ہی فیصلہ، کہ دادا کے ہاتھوں کی بندوق کا جدی پشتی انتقال، ایک ہی اسلوب عمل پر کاربند رہنے کا پیمان، کہ چیختے چلاتے دراز ہاتھوں کا سر، ہواؤں میں آندھیوں کی سیٹیاں بکھیرتے، دھول چاٹتے، چھتے رہنے کے وجود میں گم، سورج نکلنے کا شفق اور ڈوبنے کی مجبوری، سانس کے آنے جانے کی رسمیں، سب بے نام خوف کے تخم پاش میں مدغم، مگر دونوں بظاہر لاتعلق، دادا کے تحیر کا پھیلاؤ، باہر سناٹا اندر ہلچل کے الفاظ، لگاوٹ، محبت، اپنائیت کے سارے جذبے، دیکھنے کی فرصت کمیاب، اور جواب دیے بغیر ہی قدم، برما، چٹاگانگ، سہلٹ کی سرسبز دشوار گزار پہاڑیوں پر، تلاش میں سرگرداں، رانگا ماٹی، مادھوپور، سندر بن کے گھنے جنگلوں کے سبزے، جڑی، بوٹیاں، آکسیجن انڈیلتے راہوں کے بند افسوں، دلدلی راہیں، پھول پتے، ہر نوع پرندے، درندے، طلسم کشا، اسلحے کے بوجھ تلے ڈولتے قدم، طلب گاروں کی کھوج، ان تھک خواہشوں کے ہجوم استعداد، مہم جوئی کے پارچے، زمان و مکان کی روشن انگلیوں میں لیر لیر، انگلش راج کا کوچ، صرف قیام کے نشان باقی، بجھتے الاؤ، اور چوسی ہڈیاں چھچھوڑتے بھونکتے کتے پس ماندگان...، دادا کی سوچوں پر نئی آب، کہ دو سو سال بعد اب پھر جوانی کی متروک آواز کا پلٹنا، سب جینے، اب اپنے، سیاہ بال، دانتوں کی نئی بتیسی، پیدائش کہ دادا کے گھر پوتے کی آمد، پرایا۔؟ طویل عمر تک آہنی سلاخوں کا رشتہ، تین گولیوں کے ناجائز حمل، نچڑتے خون کی بدولت، بے لگام امراض، ہڈیوں کا کھڑ کھڑاتا ڈھانچا، اس کے ٹوٹتے، بکھرتے سانسوں کی ڈور جوڑنے کے عمل میں مالی دشواریوں کا بے محابا منھ زور اژدر، ہاڑوں سے کٹی کھیتیاں، دریا کے پہلے، عمیق و ہبل پیٹ میں، تاروں بھری چھاؤں میں میرے اٹھے ہاتھ بے قرار، بیکاری کا مداوا، مدفن قیدی رہائی کا منتظر، اٹھے ہاتھوں نے جھونپڑی کا شکم چاک کیا، ابا کے جگر کا ٹکڑا...؟ بندوق... سونکا، سکۂ رائج الوقت، فرقان اور عزیز میاں کے ہاتھوں سے نکاح قبول، اس قبولیت ہی نے ٹوکا کو جنم دیا... مگر ابا کے پھیپھڑوں نے وہ آکسیجن قبول ہی نہ کی۔ ابلتے آنسوؤں میں میری نظریں، جنگل کا بوس، چھتنار درختوں کے ٹمٹماتے ہیولوں کو ڈھونڈ رہی تھیں، ہاتھ نعش کو، دریا کے پیٹ میں، مقید کھیتوں کے ساتھ باندھ رہے تھے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دادا، تم؟ اس سمے کہاں ہو، تری اکھین کے دوار درشن، مگر پیار اور لگاوٹ کی ساری بندشیں تو کب کی ٹوٹ چکی تھیں، آزادی کے رشتے میں، گیتی کے سارے سپنے کرچی کرچی، پاکیزگی، دوشیزگی کے چہرے پر پھیلائے، دلبری، دلیری کے سارے آنچل، اپنوں ہی کے ہاتھوں تار تار، دنیا کا خوش قسمت ترین انسان بجھنے کا پچھتاوا، اس میں گردی سانس چھڑانے کی صورتیں گھٹا کی تلاش میں بھٹکتے زخمی، آبلہ پا، آواز کی پھڑ پھڑاہٹ ہوا کے کندھوں پر، ریت گھڑی میں گرتی ریت، سرکار کا وقت بالو تلے دب چکا تھا۔ انبوہ در انبوہ، پڑیاں، ہونٹوں پر چپ کا پہرا، گراؤنڈ وسیع و عریض، سروں کی فصل سے ڈھکا بیت المکرم کی سیڑھیوں تک دھوتی اور بنیان پوشوں کا قبضہ، جناح ایوینیو پر کھڑی جیپوں، رائفلوں کی گن سن لیتی، بے خواب خون آنکھیں، دھرتی دہشتناک بھونچال کی زد میں، لرزاں، آتش فشاں پھٹ چکا تھا، گیسیں زہریلی، بہتا لاوا، امار نیتا تمار نیتا، مجیب نیتا۔ پوڑونہ بھائی دھوکا ای، ووٹ دیولوکا ای۔ جالو جالو آگن جالو۔ امار باڑی تمام باڑی، نکسل باڑی۔ شونگرام شونگرام، چولبے چولبے۔ امار نیتا تمار نیتا، بشو نبی مصطفےٰ ﷺ۔ رات بوجھل، تھکی

آنکھیں، پھوٹتی پو سے چکاچوند، گذشتہ روز کی سخت مشقت، انگلیوں کے جوڑ جوڑ میں کسمساہٹ، یاد تازہ، بادبان کا شکم مہکتی ہوا کے وصل سے حاملہ ہونے کا سودا، لہروں پر تھمکتی نوکا بیتاب، ٹخنوں میں چیختے درد چوسنے کی سزا، لنگر کھولنے کے لیے لپکتی ایڑیاں، گھلتے رسے میں، ابھی پھولی لاش، پانی میں ڈبکیاں لگاتی، اندیشوں واہموں میں چلاتی آنکھیں، عادی انتشار، لبوں پر تنے خوف میں سراغ، گاؤں کی سمت اڑتی دہشت زدہ، لیر لیر آوازوں کی پھڑ پھڑاہٹ...، لاش،... فوجی... لاشیں بیرنے کی رسم دیکھنا بہتوں کا مقدر، پہلی لاش کی بو پر غیر مرئی ہاتھوں کی قسم، رحم اور بے حرمتی کو ڈھانپنے کے لیے کدال چلاتے ہاتھ، بے مصرف بنجر صرفے کو اچھالتی زبانیں، لفظوں کی جگالی... مگر دوسری پر دریا بردی کا فیصلہ، تیسری اور چوتھی پر پھسلن کی غلاظت، ثواب دارین کی جھولیاں لوٹتے فاتح؟ مغلوب، میں اور میری بیوی، باہم چار ہاتھ، تیسری اور چوتھی کا تیز دھاروں کے ساتھ پیمان، اور فضا میں سانپوں کی اندوہناک پھنکاریں، سائیکلون، سیل بلا، لاشوں کا تانتا، دریا پار سے اترتے قدموں کی چاپ بے حساب، شور و غوغا، اگن گولیوں پر توپوں کے دھاکوں کی چھاپ، بھگدڑ، بزدل، اعصابی لوٹ کھسوٹ میں اپنی سمندر نعمت اپنا لباس، خود فراہم کردہ کھیتی، بیوی اور بچہ، بھگدڑ کی بے چارگیاں، کل نفس ذائقۃ الموت، انتقام کی پرچھائیوں، مگر دشمن بے حساب، اور کہاں، میں، تم، سب، نقابوں تلے چہرگی کے خطوط سے نابلد، کہ فقط، مغفرت اور راستی کے ہی لفظوں کا چناؤ فرض، مگر حریف کی کھوج گناہ عظیم، اولی الامر منکم، پار سے اترتے فوجیوں کا پڑاؤ ہمارا گاؤں اور جسم کی سیفٹی والو تلے والیوم، میں فٹ بال، کبھی ادھر والے ٹھڈے، کبھی ادھر والے دھکے، اور پھر سناٹا، قدموں کی چاپوں میں بیزار دھندلے تسلسل؟ قافلے مگر وہ فوجی، پہلا تعفن، گاؤں کے اک اک در پر دستک دیتی بے اختیاری ساری آوازیں بے سود، میں حزن و ملال سے اچھل کر نکلا اور پانی میں اتر گیا، عفونت کا کنارے آنا اور خوف و عتاب کے گمان میں، آنکھیں وحشت اور ہراس سے باہم دست و گریباں، پھولی لاش اور اس کے گلے سڑے ہاتھوں جکڑی بندوق، لاش اور میں، دہ کے باسیوں کی حیران آنکھوں میں جکڑا، ترحم زدہ نظروں کے ساکت ہجوم پر دستک، لاش کے ہاتھوں سے بندوق کی رہائی، اور مردہ تیز دھارے کے سپرد۔ وہ بندوق، میں نے، سب کے سامنے، پچاس ٹکا میں فرقان اور عزیز میاں کے ہاتھوں بیچی، اب پتہ نہیں، یہ کون سی بندوق کی بات کرتے ہیں، ابا والی یا فوجی والی، جھونپڑی کی کھدی زمین، نوکا اور جھونپڑی کا نچار ریشہ ریشہ، مگر بے مہار سوالوں کی جگت، ادھیڑ بن کی دلدلیں۔ تو نے انھیں عزیز میاں اور فرقان یا بندوقوں کا تو نہیں بتایا۔ میں کیا بتاتا، گاؤں والوں کے دماغوں میں، ایک ایک ثانیے کی قاشیں، تر و تازہ، اور بے حساب سالوں کی تہوں میں وصل، باہم رشتے، دکھ سکھ، چھایا میں، اکٹھے کھلتے بند ہوتے لبوں کی داستان مرقوم، مرگ جوگ میں، سارے ہاتھ، دعاؤں اور مغفرت کے ازالوں میں شریک، خوشی پھوار، شے شامل، اشکال کی برجستہ پہچان، مگر انکشاف، بوکھلاہٹ کھلتے در، وہ سب اپنے تھے، اپنے ہی گاؤں کے سپاہی، کسی کے بیٹے، کسی کے بھائی، اکٹھی فصلیں کاٹتے، بیچتے، ملاپ و اشتراک، اب ان جان مسافتوں کے مرحلے میں، بے درد، گونتے، بے رحم ہاتھوں میں چپ کی سیون، ادھیڑنے بولنے کا تریاق، زبان کی چابی؟ عورتوں اور بچوں کی بلبلاتی چیخوں میں ظاہری چیلوں اور داخلی بے مصرف بوجھل سکوت میں شگاف، ان دوریوں کے بیچ، حبس اور یوم حساب، فیصلہ کن نقطے پر بے چینیوں کی پرچھائیاں، اختتام ان کی دسترس سے دور، بس ایک متوقع منظر کا بیچ ورک۔ دادا وہ سب تو اپنے ہی تھے، ہاں، وہ بھی اپنے تھے، مگر سرکاری بھتے پر منہ پڑتے ہی وہ دوئی کی فصیلوں میں بند، سرمایہ کچی ہنڈیا میں دفن، زمین کے شگاف میں ٹانکے، گھوڑوں کی ٹاپیں اکہ تقسیم، ایسی شباہت سرکار میں، جب اپنے سپاہی بن جائیں تو پھر اپنائیت کے سارے رنگ، خونخوار تپتی تیز دھوپ اڑا لے جاتی ہے، سوچنے سمجھنے کے سب رشتے، لمبی جڑوں والے پیپ زدہ پھوڑے میں تبدیل...، وہ اپنے نہیں بلکہ لادو گھوڑے، جن کی اگاڑی پچھاڑی سے ہوشیاری کا عمل لازم...، آبادیوں اور جنس کے نمائندے، منصف، حکموں کے تیز رفتار جنگی گھوڑے، دوڑنے کے تشخص میں الفاظ کا اسراف، گولی، ہانکا، بندوقوں کے برستے بٹ، بلا تمیز، بھاری بھرکم بوٹوں، وردیوں کا سائبان ابدی، ہر موسم میں کینچلی اتارتی سرکار، اپنی تازگی توانائی اور ہمارے بہلاوے کے لیے، کرسیوں کی ہڑبونگ میں الشاؤ کی رسم بھی مرقوم، مگر چوکیدارا ہمیشہ سلامت، لولے، لنجے بانجھ حکم نامے، مسلط رہنے کے نشے کی خاطر، مجبور سیاہ نسوں میں خون کی بوتلیں، قوت باہ کے لیے...، بھاری ہلمٹ اور گرجتا تسلط یکجان، ہم بستر، حاملہ ہو جائے تو فسطانیت کا بچہ پیدائش کے لمحے کے نزدیک۔ سپاہی بھلا ہم میں سے کیسے ہو سکتے ہیں...؟

بدن کے ہر مسام میں رچے الفاظ، آنکھیں پرسکون، یخ بستہ پر انوار چہرہ، منقش کانوں میں امنڈتے الفاظ صدیاں، گونج، بلاوا، خلیل... جی دادا...؟ جلال آباد کی پہاڑی ڈھلوان کے پیچھے چھوٹے قبرستان میں دس شہیدوں کی قبریں ہیں.. جی دادا... ان میں چودہ سب مشین گنیں، چالیس خودکار رائفلیں، وافر مقدار میں راؤنڈ اور پچاس گرنیڈ دفن ہیں۔ ان کو وقت آنے پر، پر استقامت ہاتھوں کے سپرد کر دینا، یہی آبائی جائداد ہے اور وصیت بھی...

اور میں ہیجان سے زقند بھر کر باہر، پرسکون، لگن سے سرشار، سوچوں سے آشنا، اب، اپنی رہائی کے ایام گنتا ہوں ☆☆☆

۲۶ جون ۱۹۷۷ء، لاہور

سوتو

شمارہ ۱۳۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

یک سبز وادی ہے دور تک
شاداب و سرمست
ایک گل مہر کے زیر سایہ
کھڑا ہوں میں
لوگ آتے ہیں
میرا ہاتھ چومتے ہیں
اور میرا دامن
پھولوں سے بھر دیتے ہیں
لوگ

میرے عاشق، میرے محبّ
ایک ایک کر آتے ہیں
اور میرا دامن
پھولوں سے بھر دیتے ہیں
نغمے، بوسے، ٹکڑے، دعائیں
منھ پر نشہ چھا جاتا ہے
میں غش کھاتا ہوں، گرتا ہوں
گہری نیند میں

محو ہو جاتا ہوں
ایک سبز چادر ہے دور تک
ایک کھلی دھوپ والا دن
نیلا آسمان
اور مہکتا موسم
ایک گھنے، پھیلے گل مہر کے زیر سایہ
لیٹا ہوں میں
لوگ آتے ہیں
اور میرا دامن
پھولوں سے بھر دیتے ہیں
ایک لاختم سلسلہ ہے آنے والوں کا
قافلہ رکتا نہیں کارواں تھکتا نہیں
لوگ آتے ہیں، آتے ہی چلے جاتے ہیں
اور اس گل مہر کے زیر سایہ
میرے دائیں بائیں
نیلے، پیلے، لال، گلابی،
رنگ برنگے
پھول ہی پھول ہیں ہر جانب

پھول وہی پھول
جن کی خاطر
عہد طفلی میں مچلا
اور جوانی میں تڑپا کیا
جن کے نغمے گائے
اور نوحے رویا کئے
میں اٹھتا ہوں
اور سرہانے پڑے نشتر سے
اپنے بدن پر
ایک اور زخم بناتا ہوں
یہ بدن سے بوند بوند رستا
اور سرخ لکیر بن کر
فرش پر چمکتا لہو
مجھے عزیز ہے
اچھا لگتا ہے
کہ یہ میرا شیوہ ہے
میرا نصیبہ
اور
عقیدہ بھی

سوٹو

شمارہ ۲۸۷،
دسمبر ۲۰۰۴

گیارہ بجے ہیں شب کے
آپ موسیقی کے کل ہند پروگرام میں اب
رام کشن پارکھ سے
راگ چندر کوس سنیں
رام کشن پارکھ
محمد علی کے شاگرد
اور گھرانا ان کا...
بندش تین تال میں
اور بول ہیں...

ابو، یہ راگ چندر کوس؟
ہاں صاحب زادے
غور سے سنئے ذرا
راگ انوکھا ہے یہ
اس میں لہرا نہیں ہوتا
تان مگر ہوتی ہے
فلک سے اونچی
اور گہری، سمندر جتنی

ابو، اب آپ نہیں
ہر والد جو غم
اولاد کو دے جاتا ہے
وہی غم آپ بھی دے کے گئے
سر آنکھوں پر
کیا کہوں آپ کو
کس درجہ اب
"مس" کرتا ہوں

جانے کیا سوچتا ہے یوکلپٹس
سرنگوں نیم، مالتی گم سم
لٹی سی چاندنی
مغموم صبا
لٹا ہوا سا کارواں ستاروں کا
کوہ پر دور درختوں میں چاند
کھویا کھویا اکیلا اور اداس
کرب کوئی لئے سینے میں
یوں ہی صدیوں سے

میرے سینے پہ بھی ہے بار
از حد گراں
میری رگ رگ میں اگن
ایک جلن
جسم میں شور
اک طوفان جان میں
زلزلہ قلب میں
میرے کس جرم کی سزا ہے یہ

خوبصورت سہی پر جھوٹ ہے
ہر شے آخر
سوا اس کرب کے
جو ساتھ جنم لیتا ہے
آپ جلتا اور جلاتا ہے
نفس آخر تک

کوہ پر دور درختوں میں چاند
چاندنی چارسو خفی مغموم
دور تک غرق خامشی وادی
دور تک غرق خامشی وادی
دور تک اک عمیق ناشادی
راگ اب صبح تک جگائے گا

شاید

سونو

شمارہ ۱۳۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

جسم پیاسے ہیں
جلتے رہتے ہیں
جسم جسم سے مل کر
اور دہک اٹھتے ہیں

تمھاری یہ دو آنکھیں
جیسے دو پھول، جیسے دو شبنم بوندیں
مجھے لگتا ہے
اس دکھ کی دوا ہیں یہ
انھیں میری
ہتھیلی پہ نہ رکھو
تشکیک میرا فلسفہ
مجھے دنیا سے گلہ
لیکن مجھے لگتا ہے
مجھے ایسا لگتا ہے

غزل

سہیل احمد زیدی

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر ۱۹۷۶، جنوری، فروری ۱۹۷۷

یہ کانٹا دل سے لیکن منزل مقصود پر نکلا
جسے رہزن سمجھتے تھے وہ اپنا ہم سفر نکلا

نہ اب سورج دکھائی دے نہ صورت نرم مٹی کی
ہمارے گھر میں راتوں رات پتھر کا شجر نکلا

وہ پیاسی اور نیلی آنکھ جس نے آسماں دھویا
ذرا پچھلے پہر جھپکی تو مطلع پر قمر نکلا

چھتیں آڑی مگر سیدھی قطاریں تھیں مکانوں کی
بہت کج ہو کے بھی مٹی کا آدم معتبر نکلا

زمین و آسماں گھوما کئے اپنی جگہ ہم تھے
یہ رستہ زندگی کرنے کا کتنا مختصر نکلا

وہی چہروں کا فتنہ دشت الفت میں بھی در آیا
جگر کا درد بھی آخر کو دیکھو درد سر نکلا

سہیل احمد زیدی

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر ۱۹۷۶، جنوری فروری ۱۹۷۷

روکے تھی رات سانس ستارے کہیں نہ تھے
کون و مکاں میں جیسے کبھی بھی مکیں نہ تھے

دریا کی موج موج بلاتی رہی مگر
تیار اس سفر کے لئے کچھ ہمیں نہ تھے

زخموں کو گن چکے تو چلے پھر اسی طرف
یہ غم بہت تھا زخم کہیں تھے کہیں نہ تھے

دل بستگی کی بات تھی دو حرف پیار کے
دیتی تھی ہم کو جان تو صاحب تمھیں نہ تھے

تنہا درخت سیکڑوں شاخوں میں بٹ گیا
خود کو بکھیر دینے کے مجرم ہمیں نہ تھے

حیرت ہوا کرے پہ حقیقت یہی تو تھی
ہم سب لہولہان تھے قاتل کہیں نہ تھے

دنیا نے دکھ دیئے تو برا ماننے لگے
ٹھہرے سہیل، شہر کے صحرا نشیں نہ تھے

شمارہ ۱۳۷،
فروری تا اپریل ۱۹۸۳

جیسا ہمیں گمان تھا ویسا نہیں رہا
قصہ بھی اختتام پہ قصہ نہیں رہا

اک خوف ساتھ ساتھ ہے اونچے مکان کا
ایسا نہیں کہ شہر میں سایہ نہیں رہا

سیلاب اپنے ساتھ بہا لے گیا اسے
نیلا سبک خرام وہ دریا نہیں رہا

کشتی کے بادبان میں سمٹی رہی ہوا
لطف سفر کہ میں تھا اکیلا نہیں رہا

ملتی ہے بیچ بیچ میں شہروں کی روشنی
صحرا کا گشت کھیل تماشا نہیں رہا

کہتے نہیں ہو شعر بزرگوں کی طرز پر
تم کو سہیل خوف خدا کا نہیں رہا

سہیل احمد زیدی

شمارہ ۱۳۹،
اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵

جب شام بڑھی رات کا چاقو نکل آیا
اس بیچ تری یاد کا پہلو نکل آیا

وہ شخص کہ مٹی کا تھا جب ہاتھ لگایا
چہرہ نکل آیا کبھی بازو نکل آیا

کچھ روز تو دو جسم میں اک جان رہے ہم
پھر سلسلۂ حرف من و تو نکل آیا

دیکھا کہ ہے بازار یہاں نفع و ضرر کا
وہ تیر کہ تھا دل میں ترازو نکل آیا

تھا بند چراغ غزل اک غار میں پہلے
مانجھا ہے سہیل اس کو تو جادو نکل آیا

شمارہ ۱۳۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

کچھ دفن ہے اور سانس لئے جاتا ہے
اک سانپ ہے جو قلب میں لہراتا ہے

اک گونج ہے جو خون میں چکراتی ہے
اک راز ہے پر بیچ ہوا جاتا ہے

اک شور ہے جو کچھ نہیں سننے دیتا
اک گھر تھا جو بازار ہوا جاتا ہے

اک نرم کلی ہے جو کھلی پڑتی ہے
اک دشت بلا ہے کہ جلا جاتا ہے

اک خوف ہے جو کچھ نہیں کرنے دیتا
اک خواب ہے جو نیند میں تڑپاتا ہے

دو پاؤں ہیں جو ہار کے رک جاتے ہیں
اک سر ہے جو دیوار سے ٹکراتا ہے

ناول کی تنقید

سید احتشام حسین

شمارہ ۳،
اگست ۱۹۶۶

ناول کو قصہ کہانی کی ارتقائی شکل مانا جائے یا عہد جدید کے پیچ در پیچ انفرادی اور سماجی ذہن کی تخلیق قرار دیا جائے، اس میں چند ایسے عناصر لازمی طور پر جگہ پا جاتے ہیں جنھیں فطرت انسانی کے عناصر اور اظہار واقعہ کے ناگزیر پہلو کہہ سکتے ہیں اور جن کی تقسیم میں قدیم اور جدید کی حد بندی کام نہیں دیتی۔ ہر قصے میں، چاہے وہ حکایت ہو یا داستان، افسانہ ہو یا ناول، بیان واقعہ، اشخاص قصہ، ماحول اور ذریعۂ اظہار یعنی زبان کا وجود لازمی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر قصہ چاہے وہ "پنچ تنتر" اور "ہتوپدیش" ہو یا "الف لیلہ ولیلہ"، داستان امیر حمزہ ہو یا Decameron، "فسانۂ آزاد" ہو یا "گئو دان"، لیڈی چیٹر لیز لور (Lady Chatterly's Lover) ہو یا وار اینڈ پیس (War and Peace)، ژین کرستوف (Jean Christophe) ہو یا یولی سیز (Ulysses)، اظہار واقعہ، پیش کش اور نقطۂ نظر میں یکساں اور یک رنگ ہوتا ہے۔

محض قصہ انسانی زندگی کے ایک یا کئی پہلوؤں کی کہانی ہے، لیکن انسان (لکھنے والا، جس کے متعلق لکھا گیا اور جن کے لئے لکھا گیا) اس کا ماحول، اس کے تجربے، اس کا فلسفۂ حیات، اس کے ادراک حقیقت کے طریقے، محبت اور نفرت کے معیار، عمل اور ردعمل کے محرکات اور طرز اظہار، ہر عہد میں بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے بیان واقعہ، اشخاص قصہ اور ماحول کے تناسبات برابر بدلتے رہتے ہیں۔

اس حیثیت سے ناول قدیم ذوق قصہ گوئی سے بھی رشتہ رکھتا ہے اور جدید طرز فکر سے بھی، اور ان دونوں کے درمیان سایوں اور رنگوں کے بہت سے دھبے، اسالیب اور طرز اظہار کے ان گنت طریقے اور ذہنی و معنوی تجربات کے لاتعداد نقش، ہر پڑھنے والے کو دعوت نظر دیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ناول میں اس کھو دینے والی دلچسپی کی جستجو بھی ہوتی ہے جس کا راز الف لیلہ کی قصہ گو وزیر زادی نے پالیا تھا اور اس معنویت اور گہرائی کی بھی جو موجودہ دور کے ذہن کو کریدتی اور حقائق کی پیچیدہ دنیاؤں سے روشناس کراتی ہے۔ کوئی پڑھنے والا ایک ہی بات سے آسودہ ہو جاتا ہے، کوئی دونوں کی جستجو کرتا ہے۔ ہر قاری اور ہر نقاد شعور کی مختلف سطحوں پر ناول سے انھیں باتوں کا مطالبہ کرتا ہے اور انھیں کو ان کی تہ در تہ پیچیدگیوں کے ساتھ پھیلانے کو ناول کی تنقید کہا جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ ناول کی تنقید کے مسئلے پر توجہ کی جائے، دو تین باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے۔ اول یہ کہ ناول بعض مشترک پہلوؤں کی موجودگی کے باوجود قدیم قصوں اور داستانوں سے مختلف ہے۔ اپنے موجودہ مفہوم میں اس کی عمر دو ڈھائی سو سال سے زیادہ نہیں قرار دی جا سکتی، اور جہاں تک اردو کا تعلق ہے ابھی اس کے آغاز کی سویں سال گرہ منانا بھی مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ شعر اور ڈرامے کے برخلاف ناول پڑھے جانے کی چیز ہے۔ اشعار کبھی کبھی سنے اور گائے جاتے ہیں۔ ڈرامے اسٹیج پر دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن ناول صرف پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے میں لکھنے والے کے کمال فن، قصے کی دل کشی، معنویت اور تاثر ہی کو پیش نگاہ رکھا جا سکتا ہے اور اس سے اس کی ادبی نوعیت اور حیثیت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ناول کی ترقی اور ہر دل عزیزی کا دار مدار پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ پر ہے۔ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ناول بھی عام لوگوں تک پہنچا اور چونکہ ان کے علم، شعور، ذوق اور میلان کی سطحیں مختلف تھیں اس لئے ناول کا کوئی معین معیار اور کوئی مقررہ ڈھانچا بنانے میں دشواری پیش آئی۔ ان پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی (اور ہے) جو ناول سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ قصہ ایسا ہو جو ان کے تفریح کے جذبہ کو آسودہ کرے۔ انھیں ناول کی فنی خصوصیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، در پردہ ان کا شعور اچھے اور برے میں تمیز اور خوب اور خوب تر، میں فرق کرتا رہے تو یہ اور بات ہے۔ لیکن وہ اچھائی اور برائی کی عقلی توجیہ کی فکر نہیں کرتے۔

اس مقالے میں ناول کے خالص تفریحی ہونے کے نظریے سے اختلاف کئے بغیر یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ناول کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں یہ ایک ادبی صنف نثر ہے جس کی کچھ فنی روایتیں بن گئی ہیں اور جس کے مطالعہ سے عارضی اور سطحی تفریح نہیں ہوتی، ذوق سلیم، جذبۂ توازن و ہم آہنگی

اور چیزوں کو خوبصورت اور متناسب ترتیب میں دیکھنے کی جمالیاتی خواہش بھی تسکین پاتی ہے۔ ہمیں احساس ہو یا نہ ہو، فن اور ادب سے یہ آسودگی حاصل ہوتی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ ہمارے ذوق نظر کو آراستہ اور بلند کرتی ہے۔ اسی سے قدروں کا احساس پیدا ہوتا ہے جو تنقید تک رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ناول کے اکثر قاری اس منزل تک نہیں پہنچتے۔ انھیں نہ تو یہ جاننے کی فکر ہوتی ہے کہ ناول کو ناول بننے کے لئے کن اجزا کی ضرورت ہے، نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ناول نگار کسی مخصوص مواد کا انتخاب کیوں کرتا ہے، نہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قصہ میں زمان ومکان کے تناسبات کے درہم برہم ہونے سے واقعات کی حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے، نہ یہ دیکھنے کی کہ ناول نگار کا نظریہ حیات کیا ہے۔

کچھ قاریوں کے نقطۂ نظر سے ان باتوں کا جاننا یا ان پر توجہ دینا غیر ضروری ہو سکتا ہے، لیکن ناول کو ادبی تخلیق قرار دینے کے بعد اس کی ہیئت، اس میں پیش کی ہوئی زندگی، اس کی زبان، اس کے بنیادی رنگ، اس کے موضوع اور اظہار قدر کے متعلق غور کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ ادبی صنف کی حیثیت سے ناول کا وجود بعد میں ہوا، اس لئے شاعری اور ڈرامے کے مقابلہ میں اس کے نقاد بھی بہت بعد میں پیدا ہوئے۔

ناول کے بعض ناقد مورخوں نے لکھا کہ یورپ میں ابتداء ناول کے نقاد صرف کہانی کا خلاصہ بیان کر دینے پر اکتفا کرتے تھے، اس کی طرف اصل توجہ اس وقت ہوئی جب ناول نے ڈرامے اور شاعری کے بجائے ادبی محفل میں مرکزی جگہ حاصل کر لی۔ اسی وجہ سے کلاسیکی ذہنوں نے ناول کو ہمیشہ ڈرامے اور شعر سے کم تر درجہ کی تخلیق سمجھا ہے اور ادبی شجرۂ وراثت میں اسے ان اصناف کے بعد ہی جگہ دی ہے۔ ایک موقع پر جین آسٹن نے ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

> تم پوچھتے ہو ناول میں کیا ہوتا ہے؟ بتاؤ ناول میں کیا نہیں ہے؟ اس میں فطرت انسانی کے متعلق سب سے مفصل معلومات ہوتی ہیں۔ ان کی متنوع کیفیات کا بہترین تجزیہ ہوتا ہے، ذکاوت اور ظرافت کے حسین ترین مظاہرے ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ بہترین اور پسندیدہ زبان میں دنیا تک پہنچایا جاتا ہے۔

بہرحال ناول اس حیثیت سے غور وفکر کا بڑا اہم موضوع بن جاتا ہے کہ اس کے دائرے میں ہر صنف ادب سے زیادہ وسعت ہے۔ ناول نگار کے ہاتھ بالکل آزاد ہیں کہ وہ جتنا کام چاہے قصہ سے لے، جتنا چاہے کرداروں سے، چاہے تو واقعات اور اشخاص قصہ کے پیچھے چھپ جائے اور چاہے تو کرداروں کو ہٹا کر خود اسٹیج پر آجائے اور وہ سب کچھ کہہ ڈالے جو کرداروں کے ذریعہ معلوم ہونا چاہئے۔ زمان ومکان حدوں کو جس حد تک چاہے پھیلائے، یہاں تک کہ اگر چاہے تو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی ابدی کشمکش کو چند گھنٹوں میں اس طرح پیش کر دے کہ ایک ایک لمحہ ہمارے سامنے آجائے اور چاہے تو ماضی اور مستقبل کو حال کے آئینہ میں پیش کر دے۔ اسی سبب سے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ناول کی کوئی معین فنی ہیئت نہیں ہو سکتی کیونکہ ناول نگاروں نے زندگی کے خام اور بے ترتیب مواد کو تاریخی، سوانحی، سماجی، نفسیاتی، مسائلی، سیاسی اور محض افسانوی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ کہیں کہانی اور ترتیب واقعات کو بنیادی جگہ مل گئی ہے، کہیں کرداروں کو، کہیں فرد کو، کہیں سماج کو، کہیں زمان کو اور کہیں مکان کو، کہیں موضوع کو اور کہیں انداز بیان کو، کہیں ماحول اور فضا کو، کہیں مقامی رنگ کو... ایسے میں تنقید نگار کا کام آسان نہیں رہ جاتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طویل، دقیق اور منصفانہ تجزیہ کے بغیر ناول کی اچھائی برائی، فنی یا موضوعی اہمیت کے متعلق کچھ کہنا ایک سرسری جائزے اور رائے زنی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

پھر بھی نہیں، خود ناول نگاروں نے اپنے تخلیقی عمل کے متعلق اور طریق کار کے متعلق جتنی مختلف باتیں کہی ہیں ان پر نگاہ رکھنے کے بعد تو یہ کہنا اور دشوار ہو جاتا ہے کہ ناول میں عظمت کس چیز یا کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے؟ نقاد یا ذہین قاری جب تک ناول نگار کے تخلیقی عمل میں شریک نہیں ہوتا، وہ ان گہرائیوں کا احساس نہیں کر سکتا جو ناول نگار کے پیش نگاہ تھیں۔ اور اگر اسی کے ساتھ رہتا ہے تو نظر میں وہ معروضیت پیدا نہیں ہو سکتی سچی پرکھ کے لئے جس کی ضرورت ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود چند واضح حقائق پر غور کرنا ناول اور ناول نگار دونوں کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

ہم کسی عہد کا کوئی ناول پڑھیں، اس میں چند عناصر بڑی آسانی سے الگ کر سکتے ہیں: ناول میں کوئی قصہ یا واقعہ ہوگا جسے دوسرے عناصر سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی ماحول ہوگا جو زمان ومکان کی بعض شرطوں کو ضرور پورا کرے گا۔ کچھ کردار ہوں گے جو قصے کا ستون بنیں گے۔ کہانی کا کوئی موضوع ہوگا۔ کوئی ادبی زبان ہوگی اور ناول نگار کا کوئی نقطۂ نظر یا مقصد ہوگا۔ کوئی ناول، وہ کتنا ہی تخئیلی، غیر ارضی اور تفریحی ہو، ان پہلوؤں سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اپنے مقصد اور فنی تصور کے لحاظ سے ناول نگار ان میں سے بعض عناصر کو اہم اور بعض کو غیر اہم قرار دے سکتا ہے، چھوڑ نہیں سکتا، انھیں نئے نئے طریقوں سے برت سکتا ہے، نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں ان تمام باتوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں جو فن ناول نویسی لکھی ہوئی مختلف کتابوں میں بڑے شرح وبسط سے بیان کی گئی ہیں اور جن سے میں نے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ لیکن ان کے بعض دقیق پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے کیونکہ کبھی کبھی عام نقاد بھی انھیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مثلاً پلاٹ یا روداد قصہ ہی کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کا ذہن بہ یک وقت دو خطوط پر کام کر رہا ہے اور دونوں کے امتزاج سے ایک تیسری سطح بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہے جسے وہ عام پڑھنے والے کے لئے ناول میں پیش کرے گا۔ پہلی سطح اس ظاہری دنیا اور اس میں بکھرے ہوئے واقعات کی ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے یاد رکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ ناول نگار اس دنیا سے غافل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس مانوس دنیا کے بغیر وہ قاری کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ لیکن دوسری سطح پر اس کا ذہن اس حقیقت کی جستجو کرتا رہتا ہے جو اس کے تصورات، نظریات، عقائد اور فلسفۂ

حیات کے مطابق ہے۔یہیں ایک ناول نگار دوسرے سے بالکل الگ ہوجاتا ہے۔ ہر ایک اپنے نقطۂ نظر کے مطابق واقعات کا انتخاب کرتا، بکھلا کر ان کی کڑیاں جوڑتا، بے ترتیبی میں اپنے فنی ادراک کے مطابق ترتیب پیدا کرتا اور تخلیقی قوت سے انھیں زندہ کرتا ہوا اسے تکمیل کی طرف لے جاتا ہے جہاں ناول کی ساخت اور حسن تعمیر، واقعات کی حقیقت اور ترتیب سب مل کر ایک ہوجاتے ہیں۔دونوں سطحوں کو ملا کر تیسری سطح پیدا کرنا بڑی کشمکش کے بعد ہی ممکن ہے، کیونکہ ناول نگار نہ تو ظاہری حقائق سے منہ موڑ سکتا ہے اور نہ اپنے ذاتی تصور فن اور اپنے نصب العین سے دست بردار ہوسکتا ہے۔اسے ایک ساتھ حقیقی، علامتی، ٹھہری ہوئی، متحرک بنی ہوئی، ہنستی ہوئی، آئندہ بننے والی کئی ذہنی فضاؤں سے گذرنا پڑتا ہے۔اگر وہ محض ظاہری حقائق ہی کو لے اور اپنے سینے کے اندر تڑپتی ہوئی تلاش حقیقت کی خواہش کی پروانہ کرے تو اس کی کہانی محض سطحی ہوگی اور ناول نگار کی شخصیت کی گرمی سے محروم، اور اگر ظواہر کی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلے تو وہ قاری اس کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے جسے ظاہری دنیا کے حقائق اور ان کے انتخاب ہی کے توسط سے فن کار کی باطنی دنیا کا علم ہوتا ہے۔نقاد کے لئے یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ وہ کس سطح کو زیادہ اہمیت دے۔کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری دنیا لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن ناول نگار کے دل کی دنیا میں تبدیلی نہیں ہوتی، اور وہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے نصب العین کی سطح پر لانا چاہتا ہے۔ایسی صورت میں بیان واقع میں بالکل مسخ ہوجاتا ہے یا انتخاب واقعات ایسے کھلے کھلے انداز میں مقصدی ہوجاتا ہے کہ ناول کی تفریحی اور فنی دونوں حیثیتیں مجروح ہوجاتی ہیں۔وہی ناول سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جن میں ناول نگار ظواہر کی دنیا اور اپنے خوابوں میں ہم آہنگی اور توازن، بے ساختگی اور کیمیاوی امتزاج پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

ایک بات اور قابل غور ہے۔نقطۂ نظر اور خوابوں کے علاوہ ناول نگار کے کچھ ذاتی تجربے بھی ہوسکتے ہیں، ایسے زبردست تجربے جو ہر واقعہ کو اسی میں رنگ دیتے ہوں۔ایسی صورت میں ناول نگار کی ذاتی زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہوجاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر ادراک حقیقت کا سراغ نہیں مل سکتا۔یہ ضروری نہیں کہ ناول نگار اپنے اس تجربے کا بیان واضح طور پر کرے، لیکن وہ تجربے جو زندگی اور افکار کو متاثر کرتے ہیں، شعوری یا نیم شعوری طور پر نظریۂ حیات کا جز بن جاتے ہیں اور انھیں پلاٹ کے تانے بانے سے علحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

محض کہانی کا خاکہ نہیں، بلکہ وہ کہانی جسے ناول نگار پلاٹ کے طور پر تر تیب دیتا ہے، فضا، ماحول اور پس منظر سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔اگر ماحول اور زمان و مکان فرضی بھی ہوں گے اور ہماری جانی بوجھی دنیا سے مختلف، تو بھی وہ ان قوانین کے پابند ہوں گے جو ناول نگار کے ذہن میں ہیں اور جن کے پڑھنے والوں تک پہونچانے کے لئے اس نے ذہن کو آمادہ کردیا ہے، ورنہ ناول ایک حل نہ ہونے والے معمے سے زیادہ کچھ نہ رہے گا۔زمان و مکان ہی حقیقت کو ناپنے کے آلے ہیں، لیکن خود زمان و مکان کی حقیقت پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔وقت کا ایک تصور وہ ہے جسے ہم لمحوں، گھنٹوں، دنوں اور مہینوں کے برابر فاصلوں سے ناپتے ہیں اور اسی حساب سے واقعات کی مدت یا ماضی اور حال کا اندازہ لگاتے ہیں۔لیکن وقت کی وہ رفتار بھی حقیقی ہے جو جذبات اور تصورات کی دنیا میں ہوتی ہے۔اس کی حیثیت جو ماضی کو حال میں اور حال کو ماضی میں بدلتی ہے، جو گذشتہ اور آئندہ دونوں کو حال کے لمحوں میں مرکوز کردیتی ہے، جو جھولے کی پینگ کی طرح بار بار کئی نقطوں سے گذرتی ہے، کبھی تیز ہوتی ہے کبھی سست، کبھی ٹھہر جاتی ہے، اور کبھی ایک لمحہ میں کئی قرنوں کا بدل بن جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں وقت کا یہ تصور بھی اہمیت رکھتا ہے۔اس کے لئے برگساں اور آئن سٹائن کا مطالعہ بہت ضروری نہیں۔ناول پڑھتے ہوئے ہمیں وقت کی اس رفتار کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے، جس سے ناول کے واقعات اور کردار گذر رہے ہیں یہ وقت بھی حقیقی ہے اور اس کے اندر بھی واقعات کی تخلیق ہوسکتی ہے۔

عام قصے اور ناول کے قصے میں ایک (امتیازی فرق سبب اور نتیجہ کے منطقی تعلق کا احساس بھی ہے۔اس کا تعلق ایک طرف جدید سائنسی ذہن سے ہے دوسری طرف پلاٹ کی اس تعمیر اور تشکیل سے جو اسے حقیقت پسند بناتی ہے۔جدید طبیعیات میں علل اور نتائج کے رشتے نئے سرے سے دیکھے جا رہے ہیں، اجزائے کے عمل میں کبھی کبھی وہ یکسانی نظر نہیں آتی جو ہمیں عام زندگی میں عادتاً نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ، زندگی میں اتفاق کے عمل اور اثر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ حربہ ناول نگار کے ہاتھ سے چھین لیا جائے تو بعض اوقات واقعات کی ترتیب میں زبردست خلا واقع ہوجانے کا خطرہ ہے۔لیکن اس کے استعمال میں ناول نگار کے تخلیقی ذہن، فنی بصیرت اور ذوق سلیم کی آزمائش ہوتی ہے۔ایسے ہی موقع پر وہ خیال اور قیاس کو حقیقت میں اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ قاری کو کوئی جھٹکا نہ لگے اور ایسا نہ معلوم ہو کہ جوڑ مصنوعی ہے۔

حقیقت ہی کے متعلق غور کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر شعور کی رو یا لاشعور کے عمل پر بھی نگاہ ڈالنا چاہئے گو انسانی زندگی اور شخصیت کی تعمیر میں تحت شعور اور لاشعور کے اثرات اور اظہار کی نوعیت اور کیفیت کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے۔کچھ لوگ اس کو ہر عمل کا محرک قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ ا س کی حقیقت ہی کے منکر ہیں۔لیکن اصل یہ ہے کہ عملی زندگی میں معتدل اور متوازن شخصیتوں کے یہاں زیادہ تر شعور ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔اسی توقع پر ہم انسانوں کے عمل اور ردعمل کے بارے میں اظہار خیال ہی نہیں، پیشین گوئی بھی کرتے ہیں۔یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ بعض کرداروں کا عمل نیم شعوری یا لاشعوری تحریک کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ خود ناول نگار کا قلم بھی لاشعوری حرکت سے گردش میں آتا ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کردار اور ناول نگار کے لاشعور کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں ختم ہوتی ہیں؟ اس کے علاوہ، اگر لکھنے والا لاشعور سے کام لئے بغیر لکھتا ہے تو اس کی فن کاری کسی تحسین و توصیف کی مستحق نہیں رہ جاتی، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا عمل مسمریزم سے بے ہوش کئے ہوئے معمول کے اظہار خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔میرا خیال ہے

کہ چند انتہا پسند ماہرین تجزیۂ نفس کے علاوہ کسی نے ناول کے سے مربوط، مکمل اور حقیقت پسند کارنامہ فن کو لاشعور کی تخلیق نہیں قرار دیا ہے۔ ایک آدھ کرداروں کی بات اور ہے جن کی لاشعوری کیفیت کو ناول نگار شعوری طور پر پیش کرتا ہے، گویا شعور سے لاشعور کی تخلیق کرتا ہے۔

پلاٹ میں حرکت اور عمل کرداروں کے عمل کا نتیجہ ہیں اور کرداروں کے بارے میں یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ حقیقی اور ظاہری دنیا سے تعلق رکھنے کے باوجود ناول نگار کی تخلیق ہوتے ہیں۔ جس طرح بنے بنائے اور ترشے ترشائے واقعات مشکل سے ملتے ہیں جنھیں تخلیقی ناول میں من وعن بیان کرکے کامیابی حاصل ہوسکے، اسی طرح بنے بنائے کردار بھی نہیں ہوتے، کہانی کے عمل میں بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اچھا ناول نگار وہی ہوتا ہے جو کرداروں کو چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی صورت آپ بنائیں یا بگاڑیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فن کار کو مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ کردار اور واقعات سب اسی کی تخلیق ہیں، کوئی کردار خود ناول نگار کے ذہن اور جذبہ سے بہتر ذہن اور جذبہ کا مالک نہیں ہوسکتا۔ پھر ناول نگار ہر قدم پر اپنے مقصد کے مطابق اسے مصنوعی نہیں بنا سکتا، اسے بنتے ہوئے قصے، ماحول اور کہانی کے اندر اندر دوڑتے ہوئے نقطۂ نظر کے مطابق بننا ہے تاکہ وہ پڑھنے والے کو مستقل اپنی طرف متوجہ رکھ سکے۔ یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ ناول نگار اسے اپنی مرضی کے مطابق موڑ رہا ہے۔ اس کی انفرادیت محض اپنے انوکھے پن یا اعتدال کی وجہ سے ذہن میں کھپ کر نہ رہ جائے بلکہ اپنی قوت، اپنی شخصیت کے وسیع تر اور عمیق تر اظہار اور اپنے جوش حیات کے ابال کے وجہ سے اگر اس کی انفرادیت نوع کی خصوصیات سے کٹ کر یکسر الگ ہوجاتی ہے تو وہ ان قدروں کی نمائندگی نہیں کرسکے گا جن کے ذریعہ ناول نگار کاروبار زندگی سے اپنی ترجیحات پیش کرتا ہے اور اگر اس میں اپنی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں ہے تو وہ ذہن میں اپنی جگہ نہیں بنا سکے گا۔

ترجیحات کا ذکر آگیا ہے تو اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہوگیا کہ دنیا کا کوئی اہم ناول ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس کی تہ میں ناول نگار کا کوئی نقطۂ نظر نہ ہو۔ اس کو خیال کہئے، زندگی میں ہم آہنگی کی جستجو کہئے، ذہنی رجحان کہئے، کیفیاتی ترجیح کہئے، جو نام بھی دیجئے، وہ ایک دھاگے کی طرح سارے واقعات، کردار، پس منظر اور طرز اظہار کو باندھے ہوئے ہے۔ اگر دنیا میں کچھ باتیں کچھ دوسری باتوں سے بہتر اور عظیم تر نہیں ہیں تو ناول نگار کے پاس کہنے کو کیا رہ جاتا ہے! یہ ضروری نہیں کہ ناول نگار جو انفرادی یا اجتماعی سوال اپنی تخلیق میں اٹھائے اس کا جواب بھی فراہم کرلے۔ اس کا پوری شدت کے ساتھ کسی مسئلے کو محسوس کرنا اور اس طرف متوجہ کردینا ہی ایک بہت بڑا تخلیقی اور اخلاقی کارنامہ ہے۔ لیکن فن کار کی طرح یہ بات ناول نگار کے لئے بھی بڑی آزمائش کا مسئلہ بنتی ہے کیونکہ یہی نقطۂ نظر کا اظہار ایک جگہ ناول کی عظمت اور قیمت میں اضافہ کرتا ہے اور دوسری جگہ اس کی ادبی حیثیت کو پست بنادیتا ہے۔ اس کا ایک اور صرف ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ جس ناول نگار میں یہ قدرت ہے کہ وہ ادبی اور جمالیاتی قدروں کی قربانی دیئے بغیر اس مسئلے کو پیش کرسکے جو اس کی روح میں تلاطم برپا کررہا ہے وہ اس سے بازی لے جاتا ہے جس کے پاس کچھ کہنے کو تو ہے لیکن جیسے کہنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔

اس سلسلے کی آخری لیکن بڑی اہم بات ناول کی زبان کا مسئلہ ہے جسے اکثر ناقدروں نے محض مکالمہ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ ہم جیسے ہی ناول کو ایک ادبی صنف قرار دیتے ہیں اور ناول نگار سے فن کاری کا مطالبہ کرتے ہیں، اظہار کے وسیلے کی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔ وسیلۂ اظہار کے بغیر اعلیٰ ترین پلاٹ، جاندار کردار، احساس تناسب، اعلیٰ نقطۂ نظر، سب پتھر کے اس ڈھیر کی طرح ہیں جس میں ہزار ہا ''شیریں پیکر'' اصنام پوشیدہ ہیں لیکن جنھیں کسی کوہکن فن کار کا وہ ہاتھ نصیب نہیں ہوا ہے جو تراش کر انھیں باہر نکال لے۔ زبان اور لفظ کا ساحرانہ استعمال صرف شاعری کے لئے لازم نہیں، ہر تخلیقی صنف ادب میں اس صنف کی ضروریات کے مطابق انھیں تخلیقی اور ترسیلی انداز میں استعمال کرنا پڑے گا۔

اظہار خیال کے لئے الفاظ کتنے ضروری ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مختصر سا لطیفہ سن لیجئے۔ مشہور مصور ڈیگاس (Degas) بڑے جوش میں بھرا ہوا ملارمے (Mallarme) کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا: ''لوگ کہتے ہیں کہ شاعری کے لئے خیالات ضروری ہیں۔ میرا سر خیالات سے پھٹا جارہا ہے پھر مجھ سے شعر کیوں نہیں ہوتا؟'' ملارمے نے اپنے فنی تصور کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا: ''میرے دوست شعر خیالات سے نہیں لفظوں سے بنتے ہیں۔'' یہ مسئلے کا ایک انتہا پسندانہ رخ سہی لیکن اس سے ادب کے اس دوسرے عنصر کی غیر معمولی اہمیت واضح ہوتی ہے جسے اکثر ناول نگار نظر انداز کرتے ہیں اور ادبی ناول کے بجائے یا تو کوئی قصہ لکھتے ہیں یا کوئی معلوماتی اور واقعاتی رپورٹ۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر یورپی یا ہندوستانی ناولوں سے مثالیں دینے، ان کا تقابل کرنے اور ان کی خوبیاں اور خامیاں گنانے سے پرہیز کیا ہے کیونکہ ناول کے کسی پہلو کی بحث تجزیہ اور طویل مثالوں کے بغیر ممکن نہیں تھی اور وقت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے تنقید ناول کی تاریخ بھی بیان نہیں کی ہے۔ مغرب میں اس کی کہانی طویل ہے اور اردو میں بے حد مختصر، دونوں کے بیان سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی۔

بس ایک جملہ اور کہنا چاہتا ہوں۔ ناول کے سب سے پہلے نقاد فیلڈنگ (Fielding) نے ناول کو ''مزاحیہ نثری ایپک'' کہا تھا۔ ''مزاحیہ'' کا لفظ تو شاید اس کی ذاتی پسند کی غمازی کرتا ہے لیکن آج بھی اس خیال میں ناول کے ادبی پیکر کا حسن اور جلال جھلک رہا ہے۔ یقیناً ناول اپنی وسعت، گہرائی، تنظیم اور تفسیر حیات کی کوششوں کے ساتھ اس عظمت کا مستحق ہے جو ایپک (Epic) کو حاصل ہے، اور جو ناول نگار اسے محسوس نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

جب یہ مضمون ایک ادبی مجلس میں پڑھا گیا تو مختلف حضرات نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:

۱۔ ناول کا وجود نشاۃ ثانیہ کے ادب میں بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تخلیقی عمل میں لاشعور کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

۳۔ ناول کے فنی حدود نہیں بتائے گئے ہیں۔

۴۔ جو کردار زندہ رہ جاتے ہیں ان کی خصوصیات نہیں بیان کی گئی ہیں، یا سرسری طور پر پیش کی گئی ہیں۔

۵۔ مضمون سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ناول نگار وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنے عہد کی ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔

۶۔ یہ بھی واضح نہیں کہ ناول نگار کے لئے خیال اہم ہے یا زبان۔

۷۔ ناول کی زبان کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ناول ایک ادبی صنف ہے اس کے لئے تو زبان ادبی ہوگی ہی۔

میں نے جواب میں حسب ذیل باتیں کہیں:

۱۔ اس مضمون میں ناول نگاری کی ابتدا کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، نہ اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ بحث غیر مختتم ہے۔ کچھ لوگ نشاۃ ثانیہ سے بھی پہلے جاپان کی مشہور کتاب ٹیل آف گنجی (TheTale of Genji) مصنفہ لیڈی موراساکی (Lady Murasaki) کو ناول ہی کہتے ہیں اس کا زمانہ تصنیف بارہویں صدی عیسوی ہے۔ میرے پیش نظر ناول کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے، جس کا ارتقا اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہوا۔

۲۔ میں نے لاشعور کو نظر انداز نہیں کیا ہے، ہاں اسے وہ اہمیت نہیں دی ہے جو شعور کو حاصل ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ناول نگار لاشعور کا بیان بھی شعوری طور پر کرتا ہے اس لئے اسے لاشعوری عمل کہنا مناسب نہیں۔ ناول نگار کے لاشعور کا ذکر تھوڑا بہت اس وقت ہو سکتا ہے جب تخلیقی عمل کی توجہ شعوری طور پر نہ ہو سکے۔

۳۔ پورے مضمون میں اس کی کوشش کی گئی ہے، ہاں اسے دو اور دو چار کی طرح نہیں کہا گیا ہے۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ فنی حدود متعین نہیں ہو سکتے تخلیقی فن کار انھیں بدلتا رہتا ہے۔ کسی فن کی تاریخ سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے۔

۴۔ مضمون کے آخری حصے میں اس کی وضاحت ہے۔ پھر بھی اگر دوسرے الفاظ میں کہنے سے بات کسی قدر صاف ہو سکے تو میں زندہ کردار کی تعریف یہ کروں گا کہ وہ اپنے عمل سے اپنے حقیقی ہونے کا یقین دلائے، قصے میں اس کا جو مقام ہے، وہ اس سے مطابقت رکھتا ہو، اپنے گروہ، ٹائپ کا ماحول اور طبقہ کا نمائندہ ہونے کے باوجود ایسی امتیازی حیثیت بھی رکھتا ہو کہ اسے بھیڑ سے الگ پہچانا جا سکے۔ اس کا وجود ناول کے عمل کی حرکت اور ارتقا کو برقرار رکھنے میں مدد دے۔

۵۔ ہاں یہ بات زیر بحث نہیں آئی ہے لیکن مضمون کے اندر زندگی کے بنیادی مسائل پر کئی جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔ میں اسی کو ترقی پسندی کا اصل موضوع سمجھتا ہوں۔ زندگی کا گہرا شعور فن کار کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ کبھی کبھی وہ ناول نگار بھی کامیاب ہو جاتے ہیں جنھیں ہم عرف عام میں ترقی پسند نہیں کہہ سکتے لیکن جو زندگی کی سچی اور پر اثر تصویر بنا سکتے ہیں۔

۶۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال نہیں، دونوں کا وجود لازمی ہے۔ دونوں میں کیا تناسب ہو، یہ فن کار کی قوت تخلیق خود حل کر لیتی ہے۔

۷۔ یقیناً ناول ایک ادبی صنف ہے، اس میں ذریعۂ اظہار زبان ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ زبان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جس طرح ناول کے نقاد کو پلاٹ، کردار نگاری، موضوع پس منظر وغیرہ کی خصوصیات پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح زبان پر بھی نگاہ رکھنا چاہئے۔ زبان ایک زندہ حقیقت ہے، اس کا استعمال محض اظہار معلومات کے لئے بھی ہوتا ہے اور اظہار جذبات اور اظہار تاثر کے لئے بھی۔ اس کا کام مصوری اور پیکر آفرینی بھی ہے، علامت بن کر توسیع معنی بھی زبان ہی کے دائرے میں آتا ہے، اس لئے ناول نگار کو ہر قدم پر اس حربے کے صحیح استعمال سے کام لینا ضروری ہے۔ ناول کے سلسلے میں زبان کی اہمیت اکثر ناقد نظر انداز کردیتے ہیں، اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا ☆☆☆

شمس الرحمن فاروقی

عروض آہنگ اور بیان

اطلاقی عروض اور اطلاقی علم بیان
پر
تاریخی اہمیت کی کتاب
جدید ایڈیشن
تصحیح اور نئے ابواب کے ساتھ
شائع ہو گیا ہے۔
قیمت: غیر مجلد ۱۴۸ روپے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد

سید امین اشرف

شمارہ ۱۹۰،
جنوری ۱۹۹۶

بہار آتی ہے لیکن سر میں وہ سودا نہیں ہوتا
ہر آہٹ پر تری آواز کا دھوکا نہیں ہوتا

ترا غم ہو تو آجائے سلیقہ مسکرانے کا
کہ ہر آزار جاں شائستۂ دنیا نہیں ہوتا

نشاں کنج طرب کا کوہسار غم سے ملتا ہے
بھٹک جاتا ہوں میں جب راہ میں دریا نہیں ہوتا

یہی صورت تو ہر سو کوچہ و بازار میں کم ہے
جہاں وحشت برستی ہو وہی صحرا نہیں ہوتا

اک آئینہ بہر صورت پس آئینہ ہوتا ہے
جو چمکے آبگینے میں وہی چہرہ نہیں ہوتا

اسے یہ خوش نما دنیا کبھی اچھی نہیں لگتی
کسی مصرف کا کار دیدۂ بینا نہیں ہوتا

بہانہ تجھ سے ملنے کا یہ تنہائی نے ڈھونڈا ہے
سر محفل کسی کو دید کا یارا نہیں ہوتا

جو دی ہیں نعمتیں یارب تو پھر حق تصرف دے
نظر اپنی، دماغ اپنا ہے، دل اپنا نہیں ہوتا

ذرا کچھ شغل نیکوکار بھی سید امین اشرف
فقط نام و نسب سے آدمی اچھا نہیں ہوتا

شمارہ ۱۹۹،
اکتوبر ۱۹۹۶

شوق وارفتہ کو ملحوظ ادب بھی ہوگا
شرط ہے مال عرب پیش عرب بھی ہوگا

لب و رخسار میں ہوگی گل و مہتاب کی بات
آنکھ میں تذکرۂ بنت عنب بھی ہوگا

مان لیتا ہے مری بات مرا حیلہ طراز
اور سب وعدوں میں اک وعدۂ شب بھی ہوگا

عشق وہ شے ہے کہ بر فیلے نہاں خانوں میں
سرد پڑجائے شرر بار تو جب بھی ہوگا

بے تعلق ہی سہی یہ مگر اس شخص کے پاس
دل جو لگتا ہے تو لگنے کا سبب بھی ہوگا

ہر گلی شہر کی غالیچۂ عشاق نہیں
خون ناحق ہے تو پھر داد طلب بھی ہوگا

قہر درویش تو ہوتا ہے بجان درویش
زیر فرمان جو ہوتا تھا سو اب بھی ہوگا

کرب کے زہر کا مارا ہوا انسان ہے یہ
سر پہ سو بوجھ مگر خندہ بلب بھی ہوگا

اک عصا پاس نہ ہو زعم کلیمی بھی ہو
ایسا لگتا ہے کہ یہ کار عجب بھی ہوگا

یوں تو بے آب ہیں خیمے یہ جہاں تک بھی ہیں
دل یہ کہتا ہے کہیں ابر طرب بھی ہوگا

سید امین اشرف

شمارہ ۲۰۴،
مارچ ۱۹۹۷ء

جو ڈر اپنوں سے ہے، غیروں سے وہ ڈر ہو نہیں سکتا
یہ وہ خنجر ہے جو سینے سے باہر ہو نہیں سکتا
جو سچ پوچھو تو یہ تصویر بھی ہے سانحہ جیسی
کسی بھی سانحے پر کوئی ششدر ہو نہیں سکتا
کھٹکتی ہے کسی شے کی کمی اس دار فانی میں
شکستہ بام و در جس کے نہ ہوں گھر ہو نہیں سکتا
یہ آخر کیوں کہ ہر دن ایک موسم ایک ہی منظر
جہاں زیر و زبر ہو اس سے بہتر ہو نہیں سکتا
نہ شامل ہو جو آشفتہ خیالی ذہن محکم میں
وہ کچھ بھی ہو چمن زار معطر ہو نہیں سکتا
کلی کا لب، بدن کندن کا، قامت سرو کی لیکن
وفا نا آشنا میرے برابر ہو نہیں سکتا
فقط صورت میں کیا رکھا ہے اے حسن تماشا بیں
کہ کار آئینہ سے میں سکندر ہو نہیں سکتا
کسی کو چاہنے سے باز آنا کیسے ممکن ہے
لکھا ہے جو کتابوں میں وہ اکثر ہو نہیں سکتا
ترے انکار کو اس زاویے سے دیکھتا ہوں میں
ترا ملنا بھی معیار مقدر ہو نہیں سکتا
یہ مانا عیب بھی ہیں سیکڑوں، کس میں نہیں ہوتے
امین اشرف مگر تجھ سا قلندر ہو نہیں سکتا

شمارہ ۲۳۷،
مئی ۲۰۰۰

یہ آنکھ طنز نہ ہو، زخم دل ہرا نہ لگے
مجھے قرار تو ہو یا اسے حیا نہ لگے
فشار جاں ہو تو کیفیت مکمل ہو
وہ اضطراب تو ہو اضطراب سا نہ لگے
وہ رو برو ہو تو آرائش بیاں بھی نہ ہو
کہ میں کہوں تو کسی اور کا کہا نہ لگے
معاملات محبت مزاج رکھتے ہیں
طبیعتیں ہوں جو یکساں تو فاصلہ نہ لگے
خزاں رسیدہ چمن میں بھی جھولتی ہو بہار
گلوں سے رنگ، کلی سے مہک جدا نہ لگے
یہی تو ہوتی ہے وضع شگفتن مہتاب
میان ابر ہو یا آسماں کھلا نہ لگے
وہی تو درد ہے جو درد ما سوا سمجھے
رفاقتیں ہوں تو عالم نگار خانہ لگے
الم تو خیر الم ہے کہ پائدار نہیں
وبال ہے جو خوشی بھی گریز پا نہ لگے
الجھ رہی ہیں خیالی اڑان سے آنکھیں
کہیں نوشتۂ دیوار بے صدا نہ لگے

غزل

سید امین اشرف

شمارہ ۲۴۰،
اگست ستمبر ۲۰۰۰

ہے کیوں نقل مکانی یہ ہوائے تازہ تر کیا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ادھر کیا ہے ادھر کیا ہے

نمود ابتدا کیا، انتہا کیا ہے، بشر کیا ہے
یہ کار نقش گر کیوں ہے یہ حیرت کا سفر کیا ہے

رضا اس کی تو پھر چبھتا ہوا یہ نیشتر کیا ہے
بدن کیوں ہے حصار خوف میں آنکھوں میں ڈر کیا ہے

جو سچ پوچھو یہ تصویریں کسی اک کیفیت کی ہیں
خروش نغمہ زن کیا ہے، صدائے نوحہ گر کیا ہے

نہ ہونا بھی ہے ہونا بے مکانی لامکانی ہے
سر کہسار یا فرش زمیں پر ہوں خبر کیا ہے

نہیں بجھتی شکم کی آگ کار بے سکونی میں
سریر و تاج و کشور کیا متاع مال و زر کیا ہے

جسے ناخوب کہتے ہیں اسی کو خوب کہتے ہیں
تمیز خیر و شر میں نکتۂ صد معتبر کیا ہے

پری تمثال ہیں صبحیں گریباں چاک ہیں شامیں
تلطف ہے کہ محشر جانے تاثیر نظر کیا ہے

فقط اک لمس جسم و روح کو شاداب رکھتا ہے
ہنرمندوں سے پوچھو قند لب میں یہ ہنر کیا ہے

ہری تھی کھیتیاں مرجھا گئیں باد بہاری سے
نہ جانے پھول سے چہرے کا موسم پر اثر کیا ہے

دم نظارہ اس نے چپکے چپکے کھول دیں زلفیں
مرا یہ پوچھنا ہی تھا کہ ناز بحر و بر کیا ہے

امین اشرف وہ رہتا ہے کہیں اس شہر میں لیکن
ملے کوئی تو پوچھوں صورت دیوار در کیا ہے

غزلیں

سید امین اشرف

شمارہ ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۳

دل شہر تحیر ہے کہ وہ مملکت آرا
کیا سلطنت بلخ و سمرقند و بخارا

مبہم ہے تری چشم کرم دیکھ تو یوں دیکھ
جس طرح لپٹ جائے ستارے سے ستارہ

اک چاند ہے آوارہ و بیتاب و فلک تاب
اک چاند ہے آسودگی ہجر کا مارا

کچھ درخور جاں ہے تو یہی کنج ملاقات
یہ عالم خاکی نہ ہمارا نہ تمھارا

زنجیر گراں بار ہے یہ عشرت ساحل
بہتا ہے تو رکتا ہی نہیں وقت کا دھارا

جز حسرت بے نام نہیں گردش خوں اب
چاندی جو ہوئے بال ملا ضبط کا یارا

شمارہ ۲۶۰
ستمبر ۲۰۰۳ شمارہ

فساد قلب و نظر حاصل تماشا دیکھ
سوار مرکب دنیا غبار دنیا دیکھ

تمام کار اجل ہے نمود پست و فراز
شکوہ سر کہسار و باغ و دریا دیکھ

ہر امتحاں ہے نئے سانحے کا پس منظر
دکھائی کچھ نہیں دیتا تو راہ فردا دیکھ

وہ اپنی تیغ سے خود ہی لہو لہان ہوا
مرے بدن پہ تو ہر زخم ہے اسی کا دیکھ

عجب نہیں کہ ہو دیوار نقطۂ موہوم
مکان ہو کہ کہیں دو دلوں کا ملنا دیکھ

جو ہو سکے تو نگہ عیب جو اتار کے پھینک
کمال حیرت و فطرت جمال زیبا دیکھ

کبھی کبھی نگہ سرد ہو خمار آلود
کبھی کبھی دل بے مہر کو تڑپتا دیکھ

کبھی کبھی سہی اڑ جائے ہوش کا دامن
کبھی کبھی تو یہ کیفیت نظارہ دیکھ

خیال دل سے، نظر ہے خیال سے نازک
ذرا سنبھال کے گلدستۂ تمنا دیکھ

یہ واقعہ ہے کہ خوشبوئے مشک آتی ہے
بلائے جاں سر بازار مجھ کو رسوا دیکھ

غزل

سید امین اشرف

شمارہ ۲۶۲
نومبر ۲۰۰۲

ملال غنچۂ تر جائے گا کبھی نہ کبھی
وہ خاک اڑا کے گذر جائے گا کبھی نہ کبھی
میں لالۂ سر صحرا مکاں نہیں رکھتا
کہ دشت ہے مرے گھر جائے گا کبھی نہ کبھی
برہنہ شاخ، ہوا زرد، بے زمیں شجر
پرندہ سوئے سفر جائے گا کبھی نہ کبھی
کہیں بھی طائر آوارہ ہو مگر طے ہے
جدھر کماں ہے ادھر جائے گا کبھی نہ کبھی
کسی کے ہاتھ سے ٹوٹے نہ شیشۂ صد رنگ
یہ ریزہ ریزہ بکھر جائے گا کبھی نہ کبھی
گذشتنی ہے یہ سب کچھ، جو ہونے والا ہے
وہ حادثہ بھی گذر جائے گا کبھی نہ کبھی
وہ نوبہار بھی آفت ہے، دستۂ سنبل
زفرق تا بہ جگر جائے گا کبھی نہ کبھی
یہ عشق ہے کہ خمار طلب ہے کیا معلوم
خمار ہے تو اتر جائے گا کبھی نہ کبھی

مرثیہ

سید بشارت علی

شمارہ ۱۰۸،
مئی تا جولائی ۱۹۷۸ء

(ایک مرحوم نوجوان عورت کی تصویر دیکھ کر)

ہوا میں راکھ کے ذروں کی صورت میں
وہ اپنی بے نظر آنکھوں کو
پتھر کی طرح چپ چاپ چہرے کو
تو اکثر دیکھتی ہوگی
اسی خاکے سے وہ پہچانی جاتی تھی
اسی خاکے میں دکھ کے اور خوشی کے رنگ ابھر آتے تھے
وہ ہم ایک جیسے تھے
زمیں سے اٹھ چکا بوجھ اس کے قدموں کا
وہ اک دیوار پر ٹھہری
ہوا میں راکھ کے ذروں میں خود کو دیکھتی ہے
کچھ نہیں کہتی

تثلیث حزن

سید حامد

شمارہ ۸۴
جنوری فروری ۱۹۸۸

عنوان اشارہ کررہا ہے کہ یہ سطور غم سے متعلق ہیں۔ اس کے تحت ذکر ہوگا تین طویل نظموں کا جن میں شعرا نے اپنے کسی عزیز کا ماتم کیا ہے۔ یوں تو وہ اشعار بے شمار ہیں جن میں موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یا محبوب کی رحلت پر آہیں بھری گئی ہیں، اشک بہائے گئے ہیں۔ غالب کی دو مسلسل غزلیں اسی موضوع پر ہیں ۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب نے اپنی محبوبہ کی رحلت پر بین کیا ہے ۔

عمر بھر کا تونے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہوگیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

اس غزل کے ہر لفظ میں درد کی چیخ ہے۔ گھاؤ ایسا کاری تھا کہ غالب جیسا مشکل گو متخیلہ پرواز، بلند پرواز اور مضمون آفریں شاعر ندرت فکر اور آرائش خیال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور دل پر جو گذر رہی ہے اسے بے کم وکاست، نا آراستہ و نا پیراستہ الفاظ کے آنگن میں اتار دیتا ہے۔ درد اور تاثیر کی شدت کے علاوہ اس حزینہ غزل کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ نہ تو محبوب کے اوصاف گنائے گئے ہیں نہ اپنے غم کی صراحت کی گئی ہے۔ تخاطب براہ راست محبوب سے ہے۔ مطلعے میں طنز ہے، دوسرے شعر میں حرماں، تیسرے شعر میں درد اور طنز دست وگریباں ہیں، چوتھے شعر میں جہاں حسن تعلیل کے پیرایہ میں ستائش ہے وہاں یہ اشارہ بھی ہے کہ سماج اس محبت پر انگشت نمائی کرنے لگا تھا۔ پانچویں شعر میں کس حسرت کے ساتھ دل جراحت طلب ''ھل من مزید'' کی پرخروش خواہش کو دبا تا ہے۔ مقطعے میں حسرت کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اس میں بلاغت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے محبوب کو اب بھی اس قدر قریب پا رہا ہے جتنا اس کی زندگی میں دیکھتا تھا۔ طنز، شکایت، بحث، فریاد، ستائش، سب کا یہی انداز ہے گویا محبوب روبرو ہے اور اس سے بے تکلف نوک جھونک ہو رہی ہے۔ شاعر کی بے بسی، وارفتگی اور اس کے درد کی شدت کے تاثر کو یہ پیرایۂ بیان تندو تیز کردیتا ہے۔

اسی قبیل کی دوسری غزل وہ ہے جس میں غالب نے اپنے چہیتے جوان مرگ عزیز عارف سے باز پرس کی ہے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
تم ایسے کھرے کون سے تھے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

اس غزل میں بھی غالب نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ وہی بے اختیار طنز، وہی بے محابا استفہام، وہی گہرے درد کی زیریں لہر، وہی دردناک بے ساختگی، اس پر مستزاد استعجاب اور محبت بھری نکوہش۔ پہلی غزل کی طرح اس غزل کی ردیف نے بھی درد وحسرت کی جدول کھینچ دی ہے۔ اس نے ماحول کو بنایا ہے۔ "کوئی دن اور" میں ارمان وحرماں والتجا و آزردگی کا ایک جہاں سما گیا ہے۔

خود غالب کا مرثیہ ان کے شاگرد اور سوانح نگار حالی نے سہل ممتنع کے انداز میں لکھا۔

کیا کہوں حال درد پنہانی
وقت کوتاہ قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی

خاقانی نے اپنے جواں مرگ بیٹے کا مرثیہ لکھا۔ درد وکرب، مشکل گوئی اور مضمون آفرینی کی قبا کو چاک کر کے سامنے آجاتے ہیں ۔

صبح گاہاں سر خونین جگر بکشائید
ژالۂ صبح دم از نرگس تر بکشائید
دانہ دانہ گہر اشک بباریدچنانک
گرہ رشتہ تسبیح زسر بکشائید
سکہ روی بناخن بخراشید چو زر
خوں برنگ شفق از چشمۂ خور بکشائید
سیل خوں از جگر آرید سوے باغ دماغ
ناودان مژہ راراہ گذر بکشائید
بامداداں ہمہ شیون بہ سر بام برید
ز آتش آب مژہ موج شرر بکشائید
ایں توانید کہ مادر بہ فراق پسر است
پیش مادر سر تابوت پسر بکشائید
پدر سوختہ در حسرت روے پسر است
کفن از روے پسر پیش پدر بکشائید
از پے دیدن آں داغ کہ خاقانی راست
چشم بند اہل از چشم بشر بکشائید

خاقانی کے زور بیان سے، جہاں تک غالب کی رسائی نہیں، قطع نظر، یہ بات انوکھی ہے کہ شاعر بیٹے کی جدائی سے تلملا اٹھتا ہے پھر بھی بلند پروازی اور مضمون آفرینی اور مشکل نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعر کو پرکھنے اور شاعروں پر نقد کرنے میں تعمیم کی راہ پر خطر ہے اور یہ بھی کہ بعض مشکل پسند طبیعتوں کے لئے بلند پروازی اور مضمون آفرینی اسی قدر طبعی اور سہل اور معتاد ہیں جس قدر دوسری طبائع کے لئے سادگی اور سلاست اور آساں گوئی۔ فی الحقیقت خاقانی کو تمام اردو اور فارسی شعرا میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ صدیاں گذر جانے پر بھی اس کے بے شمار اشعار سربستہ ہیں، مہر بند ہیں۔ اس بلند مرتبت شاعر کا کلام جواہر کی کان ہے۔ کھودتے چلے جائیے، نگاہوں کی خیرگی کا سامان فراہم ہوتا جائے گا۔ مگر اس وقت ہمارا موضوع کچھ اور ہے۔ کرب کے عالم میں شاعر کہتا ہے ۔

رخ کے سکہ کو سونے کی طرح ناخنوں سے کھرچ ڈالو
خورشید کے چشمہ سے شفق آسا خون کی نہریں نکال دو
صبح گاہ بالائے بام نالہ وفریاد کرو۔ اور پلکوں کے
کھولتے ہوئے پانی سے چنگاریوں کے دہانے کھول
دو۔ ماں بیٹے کی جدائی میں ہے۔ ماں کے سامنے بیٹے
کے تابوت کا ڈھکن اٹھادو۔ جاں سوختہ باپ بیٹے کو
دیکھنے کے لیے بے تاب ہے باپ کے سامنے بیٹے
کے منھ سے کفن سرکادو۔

ہمارا ذہن اس نوحے کی طرف جاتا ہے۔ جو فانی نے اپنے لئے لکھا تھا

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

خاقانی کے اس مرثیہ کی زمین دو صدی کے بعد غزل کے برگ وبار لائی۔ خواجہ حافظ کی مشہور غزل اسی زمین میں ہے، بہ ادنیٰ ترمیم ۔

بود آیا کہ در میکدہ ہا بگشایند
گرہ از کار فرو بستۂ ما بگشایند
در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند
کہ در خانۂ تزویر و ریا بگشایند

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میخانہ کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس

کے ساتھ کھول دی جائے وہ گرہ جو ہماری قسمت میں لگ گئی ہے۔ مے خانہ کا دروازہ تو بند کر دیا گیا۔ خدایا کیا تجھے منظور ہوگا کہ مکر اور ریاکاری کا دروازہ وا ہو جائے۔

دیکھئے تقریباً ایک ہی زمین میں طبیعتوں اور مضامین کے اختلاف نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ ایک طرف مرثیہ، بین، ماتم، دوسری طرف نشہ، شکوہ، طنز۔ شاعر غم دوراں اسی شدت سے محسوس کر سکتا ہے جیسے خود اپنا غم۔ اس میں حال کی قید بھی نہیں، نہ مشرب و مذہب کی۔ چنانچہ خاقانی کا گذر حج بیت اللہ کے سفر میں مداین پر ہوا۔ وہاں اس نے ساسانی شہنشاہوں کے قصر دیکھے جو کھنڈر ہو چکے تھے۔ تصور نے حال اور ماضی کا موازنہ کیا۔ شاعر کے دل پر چوٹ لگی۔ دنیا کی بے ثباتی پر وہ چیخ اٹھا۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوان مداین را آئینہ عبرت داں
یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مداین کن
وز دیدہ دوم دجلہ بر خاک مداین راں
بنی کہ لب دجلہ چوں کف بہ دہاں آرد
گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چنداں
گوید کہ تو از خاکی، ما خاک تو ایم اکنوں
گامے دو سہ بر ما نہ، اشکے دو سہ ہم بفشاں
ما بارگہ دادیم ایں رفت ستم بر ما
بر قصر ستم گاراں تا خود چہ رود خذلاں
بر دیدۂ من خندی کا ینجا چہ می گرید
خندند بر آں دیدہ کا ینجا نہ شود گریاں
ایں ہست ہماں ایواں کز نقش رخ مردم
خاک در او بودی، دیوار نگارستاں

اے عبرت بیں دل ذرا آنکھ سے دیکھ۔ مداین کے قصر کے عبرت کی تصویر سمجھ۔ ایک طرف دجلہ کے کنارے مداین میں قیام کر اور آنکھ سے ایک دوسرا دجلہ مداین کی خاک پر بہادے۔ تو دیکھتا ہے کہ دجلہ کے لبوں پر جھاگ آ رہے ہیں۔ گویا کہ اس کی آہ کی گرمی سے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ ایوان مداین کہتا ہے کہ تو خاک سے بنا ہے اور ہم تیری خاک ہیں۔ دو ایک قدم ہم پر رکھ اور دو ایک آنسو بھی ہم پر ٹپکا دے۔ ہم انصاف کی بارگاہ ہیں۔ ہم پر یہ ظلم ٹوٹا۔ ظالموں کے قصر پر کیا گذرے گی؟ تم میری آنکھ پر ہنس رہے ہو کہ یہ کیوں روتی ہے۔ لوگ اس آنکھ پر ہنستے ہیں جو یہاں اشک بار نہیں ہوتی۔ یہ وہی قصر ہے، جس کے در کی خاک انسانوں کے چہروں کے نقوش سے گویا نگار خانہ کی دیوار بن گئی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ حزینہ شاعری میں مضامین اور اسالیب کے اعتبار سے کس قدر تنوع ہے۔ ایک شاعر اپنی محبوبہ کا اور اپنے عزیز کا ماتم غزل کے روپ میں کر رہا ہے دوسرا شاعر اپنے استاد کا نوحہ نظم (مثنوی) کی شکل میں لکھ رہا ہے۔ تیسرا شاعر اپنی موت کے تصور سے غزل کی زباں میں اشک بار ہے۔ چوتھا شاعر اپنے بیٹے کی جواں مرگی پر بین کر رہا ہے اور پھر ایک شہر کی موت پر ماتم کناں ہے۔ علاوہ بریں ہماری ایک صنف سخن تمام و کمال وقف ہے ماتم کے لئے: مرثیہ شہدائے کربلا کو خون دل کا خراج ادا کرتا ہے۔

اب تک میں نے جن حزینہ اشعار کا ذکر کیا ہے ان میں یا تو شخصی نقصان کا کرب ہے، جیسے غالب کی مذکورہ غزلیں اور خاقانی کا نوحۂ مرگ پسر، یا تصور کی جرأت سامانی ماضی (خاقانی) اور مستقبل (فانی) میں۔ غالب کے بارے میں اور مداین کے متعلق مراثی اجتماعی نقصان کے محور پر گردش کر رہے ہیں۔ لیکن آج کی صحبت کے لئے میں نے جن تین المیہ نظموں کو چنا ہے وہ طویل نظمیں ہیں جن میں تین بڑے شاعروں نے مختلف اوقات میں اپنے کسی عزیز کی رحلت کا ماتم کرتے ہوئے حیات و ممات کے رموز پر جستجو کی نظر ڈالی ہے، نیم فلسفیانہ، نیم شاعرانہ انداز میں۔ ان تینوں میں درد کی چیخ نہ سنائی دے گی۔ ضبط دامن الم، فکر در آغوش جذبہ، کائنات بہ کنار حزن، سے تشکیل ہوئی ہے۔

ان شاہکاروں کے مزاج ماحول اور وضع کی پہلی نظم سترہویں صدی میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے "لیسی ڈس" (Lycidas) کے عنوان سے اپنے عزیز دوست ایڈورڈ کنگ (Edward King) پر لکھی جس کی رحلت جہاز کے ڈوبنے سے ہوئی تھی۔ دوسری نظم غالب کے ہمعصر ٹینی سن (Tennyson) نے "ان میموریم" (In Memoriam) "یاد میں"، کے نام سے اپنے جگری دوست اور اپنی چھوٹی بہن ایمیلیا (Emilia) کے منگیتر آرتھر ہیلم (Arthur Hallam) کی جواں مرگی پر لکھی۔ ٹینی سن کے اس ہونہار جامع حیثیات رفیق نے وی آنا میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اس کی نعش جہاز میں انگلستان لائی گئی۔ اس طویل نظم کی تکمیل میں سترہ سال لگے۔ تیسری نظم وہ ہے جو اردو شاعر اقبال نے اپنی مرحومہ والدہ کی یاد میں لکھی۔

"لیسی ڈس" (Lycidas) ۱۹۳ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ "ان میموریم" ۲۲۳ صفحات اور تین ہزار سے زائد مصرعوں پر حاوی ہے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ۱۷۲ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ تینوں نظموں کا نقطۂ آغاز ایک انفرادی غم ہے جو بڑھ کر نوع انسانی کا غم بن جاتا ہے۔ زندگی اور موت کے

دردناک مسئلے کا حل کیا ہے۔ قدرت شکست و ریخت پر کیوں تلی ہوئی ہے۔ تینوں شاعر اس گتھی کو سلجھانے کی اپنے اپنے ڈھنگ سے کوشش کرتے ہیں۔ زبان و زمان و مکان و مزاج کے اختلاف نے ان تین نظموں کے موازنہ اسلوب مطالعہ کی کشش کو بڑھادیا ہے۔

"ان میموریم" (In Memoriam) کی ابتدا میں شاعر کا خطاب "خدا کے بیٹے" سے ہے:

تیرے گرویدہ ہم ہیں نادیدہ
نور و ظلمت بنائے ہیں تو نے
موت اور زیست تیری ہی تخلیق
کاسۂ سر جو کل بنایا تھا
کردیا اس کو آج چکنا چور
ہے انوکھا بہت بڑا دستور
یہ بتا کیوں ہمیں بنایا ہے
گر بنایا تو پھر مٹایا کیوں
اتنا دل کو مگر یقیں ہے ضرور
موت انجام ہو نہیں سکتا
لائے تجھ پر یقیں ہیں نادیدہ
اس طرح ہو عروج علم و یقیں
ذہن اور روح مختلط ہوں بہم
کردے یارب معاف اس غم کو
آرتھر کے لئے جو ہے دل میں

اس کے بعد شاعر کہتا ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ موت بلندی تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ محبت سے کہہ دو کہ غم سے ہمکنار ہو جائے تاکہ گردش ایام محبت کی دولت مستقبل کا مذاق نہ اڑانے پائے۔

☆

گورستان میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ کی شاخیں قبر کے کتبہ پر جھکی ہوئی ہیں۔ اور اس کی جڑوں نے بے جان ہڈیوں اور خوابوں سے خالی سر کو جکڑ لیا ہے۔
میرے دوست ایسا لگتا ہے کہ میری روح تیرے جسد سرد میں حلول کر جائے گی۔

☆

غم جیسی اندھی شے کو میں کیوں گلے لگاؤں؟ برے رجحان کی طرح اسے کچل کیوں نہ ڈالوں؟
نیند کے آگے میرا شعور ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ایک ناؤ بہی چلی جارہی ہے، بغیر پتوار کے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دل سرد اشکوں کا ایک ظرف ہے جنھیں غم نے منجمد کردیا ہے۔

☆

شرح غم کا یارا کس کو ہے، لیکن کوشش بے سود نہیں۔ وزن کی جھنکار اور قافیہ کی تکرار الم کی طرح غم کی دھار کو کند کردیتے ہیں۔ میں الفاظ کو ماتمی لباس کی مانند پہن کیوں نہ لوں، لیکن پھر غم کی ترجمانی کیوں ہوگی؟

☆

اور مجھے تسلی دینے کے لئے لوگ کہتے ہیں کہ موت سے مفر نہیں، موت عام ہے ہمہ گیر ہے۔ "موت عام ہے" کیا اس باپ کی اس سے تسلی ہو جائے گی جس کا بیٹا میدان جنگ میں گولی کا نشانہ بن گیا یا کیا اس ماں کی اس سے ڈھارس بندھے گی جس کے لخت جگر نے سینۂ قلزم پر آخری سانس لی ہو؟

☆

وہ معصوم دوشیزہ (ٹینی سن کی بہن ایمیلیا جو آرتھر ہیلم کے ساتھ منسوب تھی) بیٹھی ہوئی اپنی سنہری زلفیں سنوار رہی ہے۔ آئینہ میں اپنا روئے جمیل دیکھ کر شاداں ہے، نازاں ہے۔ بے چاری اپنے محبوب کی منتظر ہے۔ چمنی متوقع اور محبوب مہمان کی تواضع کے لئے روشن ہوگئی۔ دوشیزہ نے ایک فیتہ اٹھایا اور گلاب کا ایک پھول اپنے جوڑے میں سجالیا۔ تصورات سے اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ لو اب وہ اپنی سنہری لٹ سنوار رہی ہے۔ عین اس وقت اس کا محبوب، اس کا ہونے والا مالک، دریا میں ڈوب رہا ہے۔ اس غریب لڑکی کا حشر کیا ہوگا۔ خود میرے لئے اب دنیا میں کیا رہ گیا۔ اس کے لئے دائمی دوشیزگی، اور میں، بے یار و مددگار۔

☆

ایک عاشق بہ اشتیاق اپنی محبوبہ سے ملنے آیا ہے۔ دستک دیتا ہے۔ تو پتہ چلتا ہے وہ کہیں دور چلی گئی ہے

بہت دور، اس کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ یہی حال میرا ہے تجھے نہ پا کر۔

☆

اے جہاز جلد لے آ میرے رفیق کو۔ اے ستارو، اے ہواؤ، راہ کو روشن رکھو اور سفر کو پرسکون۔ جو ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا کرتا تھا وہ موجوں کی بے درد گرفت میں نہ آ جائے۔ آرتھر مجھے اتنا ہی عزیز تھا جتنا ایک ماں کو لخت جگر۔

☆

سمندر کے سکوت پر ایک نقرئی چادر پڑی ہوئی ہے۔ میرے دل پر بھی سکون چھایا ہوا ہے، مایوسی کا سکون۔ ایسا ہی سکون اس سینہ میں چھپا ہوا ہے۔ جو سمندر سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ زیر و زبر ہو رہا ہے۔

☆

غم اس سمندر کی طرح ہے کہ سطح پر خواہ کتنی ہی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ تہ میں سکوت ہی سکوت ہے۔ صدمہ نے میرے حواس کو اس طرح منتشر کر دیا ہے جیسے کوئی نامراد ناؤ جو چٹان سے ٹکرا کر ڈوبنے سے پہلے کچھ دیر ڈگمگائے۔

کاش کہ میں اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اپنی روح اس کے جسم میں پھونک سکتا۔

☆

شاعر قبر پر نالہ و فریاد کرتا ہے۔ نکتہ چیں کہتے ہیں کہ یہ غم کی نمائش کر رہا ہے۔ ماتم کا یہ کون سا وقت ہے جب سائنس تسخیر کائنات پر تلی ہوئی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں طائر غنا پیکر ہوں۔ غم کا گیت گائے بغیر نہ رہوں گا۔

☆

دونوں دوستوں کے تخیل ایک دوسرے سے کسب نور کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے خیالات تک پہنچ جاتے تھے قبل اس کے کہ زبان کا ہاتھ چھو سکے۔

☆

جب وہ ساتھ ہوتا تو مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی۔ محبت ایک دوست کے غم کے دو ٹکڑے کر کے دونوں دوستوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔

☆

محبت کر کے کھو دینا سرے سے محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔

☆

کرسمس کی گھنٹیاں غم کی پیامبر بن کر فضا میں گونج اٹھیں۔

☆

شاید جسد خاکی کو چھوڑنے کے بعد روح پر عالم رنگ و بو کے کچھ نقش باقی رہ جائیں۔

☆

میرے نزدیک رہنا میرے رفیق، ان لمحات میں جب میری روشنی مدھم ہونے لگے۔ لہو رگوں میں رینگنے لگے، اعصاب چبھنے لگیں، دل اکتا جائے اور زندگی کی گاڑی کے پہیے سست رفتار ہو جائیں۔

☆

میں خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن میں ہوں کیا؟ ایک طفل شیر خوار جو رات میں رو رہا ہو۔ ایک طفل شیر خوار جو روشنی کے لئے رو رہا ہو۔ اور جس کے پاس رونے کے سوا وسیلۂ اظہار بھی نہ ہو۔

☆

میری روح اس پر اس طرح فدا ہے جیسے کوئی غریب لڑکی جس کا دل ایک صاحب حیثیت پر آ گیا ہو، لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہوں اور وہ راتوں کو روتی ہو۔ وہ بھلا کیوں میری طرف ملتفت ہونے لگا؟ آرتھر کیا مڑ کے مجھے دیکھے گا؟ کیا میں اسے یاد آؤں گا؟

☆

میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتا ہوں، جہاں تک نظر جاتی ہے کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جو میرے دوست کی یاد نہ دلاتی ہو۔

☆

مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنی سانسوں کو ضائع نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم صرف دماغ ہی دماغ نہیں ہیں۔ بے کار نہ جائے گا میرا موت سے لڑنا، جیسا سینٹ پال کا درندوں کے ساتھ۔

☆

ہوشیاری سے بنائے ہوئے مٹی کے سانچے نہیں ہیں ہم۔ سائنس ثابت کرنا چاہتی ہے کہ ہیں، تو کردے۔ اور پھر انسانوں کے لئے سائنس کی اہمیت ہی کیا ہے۔ کم سے کم میرے لئے تو کچھ بھی نہیں، میں یہاں ٹھہروں گا کب؟

☆

البتہ وہ دانش مند انسان جو آئندہ جنم لے گا، اسے اختیار ہوگا کہ اپنے بچپن ہی سے اپنے افعال کو لنگور کے سانچے میں ڈھالے(۱) لیکن میں تو دوسری ہی باتوں کے لئے پیدا ہوا ہوں۔

☆

میں نے اسے (خالق کائنات کو) نہ دنیا میں پایا نہ خورشید میں، نہ عقاب کے شہپر میں، نہ کیڑے کی آنکھ میں، نہ ان سوالات کے دریچہ میں جنھیں انسان ترتیب دیتے ہیں۔ مکڑی کے یہ جالے جو خود ہم نے بنے ہیں۔

☆

جب کبھی یقین اونگھ گیا، میرے کانوں میں صدا آئی کہ یقین کرنا چھوڑ دو۔ اور میں ساحل کے منہدم ہونے کی آواز سنتا رہا جو ٹوٹ ٹوٹ کر خدا شناسی کے سمندر میں گر رہا تھا۔ عین اس وقت سینہ میں مخفی ایک حرارت نے ٹھنڈی عقل کے زمہریر کو پگھلا دیا۔ اور ایک غضبناک انسان کی طرح میرا دل اٹھ کھڑا ہوا اور چلایا، میں نے محسوس کیا ہے!

☆

رواں دواں ہواؤں میں تیری آواز ہے۔ آب رواں میں تیری صدا سن رہا ہوں۔ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب میں تو سرو قد کھڑا ہے اور غروب میں تیرے حسن کی جھلک ہے، میرے حبیب۔

☆

لیکن اب تیار ہو جاؤ، دوپہر نزدیک ہے۔ اور میں دلہن تمھیں سوچنے جا رہا ہوں۔ وہ بے خوف ہے کیونکہ تم اس کے ساتھ ہو اور میں اس کے ہمراہ۔

☆

وقت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا، میرا حبیب جو اپنے رب کے وجود میں مل گیا ہے۔ وہ رب جو لافانی ہے اور جو محبت کرتا ہے۔ ایک خدا، ایک قانون، ایک عنصر اور وہ ایک دور دراز ربانی حادثہ جس کی سمت میں ساری کائنات گامزن ہے۔

مندرجہ بالا منتخب اقتباسات سے نظم کی ساخت اور اس کے سلسلۂ خیالات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس طویل نظم میں جا بجا جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ نم دیدہ ریگزار نخلستانوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ نظم ضرورت سے زیادہ طویل ہے، طبیعت اکتانے لگتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر غم کی چنگاری کو ہوا دے رہا ہے۔ پھونک پھونک کر آگ سلگا رہا ہے۔ مدعا ہے اظہار درد، اعلان غم، وہ غم جو بے ساختہ نہ ہو، جسے کات کر پھیلایا جائے۔ کچھ کھوکھلا لگتا ہے، کچھ سطحی معلوم ہوتا ہے وہ جذبہ جس کی لو کو غلو کی ہوا درکار ہو۔ موت کے بعد آرتھر کی روح سے ملنے کے متعلق جو تصورات نظم کئے گئے ہیں ان میں اشتیاق کم ہے، زیب داستان زیادہ۔

یقین کی دولت پر علوم ارضیات وسموات نے چھاپہ مارا ہے۔ ٹنی سن علوم کی اعتقاد شکنی سے سہم کر یقین کو سینہ سے لگائے ہوئے ہے، جیسے علم کی افواج نے یقین اور سائنس کے عساکر نے مذہب کا محاصرہ کر لیا ہو اور قرائن یہ کہتے ہوں کہ بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ یقین کی گرتی ہوئی دیوار کو پشتہ دینے کی یہ کوشش جہاں روح کے درد و کرب کی غمازی کرتی ہے وہاں اشعار آبدار بن کر تیر و نشتر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے لیکن یہی کوشش جب کھینچ تان، پردہ پوشی اور طول کلام کا روپ اختیار کرتی ہے تو اشعار کا دامن بے کیفی اور اکتاہٹ سے بھر جاتا ہے۔

ٹنی سن کی فنکارانہ عظمت مسلم ہے۔ اس نے بحور میں نئے نئے تجربات کئے اور ان میں حیرت انگیز گونا گونی اور تنوع پیدا کر دیا۔ اس نے اپنی نظموں کو صوتی حسن سے مالا مال کیا۔ وہ نہ صرف مغنی ہے بلکہ مصور بھی۔ نظم In Memoriam فطرت کے مظاہر و مناظر کا نگار خانہ ہے۔ نقادوں کی رائے ہے کہ ٹنی سن کی شاعری کا حسن اس کے شک و شبہ اور درد و کرب کے لمحات میں ہے نہ کہ یقین کے اعلان اور آہنگ اطمینان میں۔ In Memoriam میں کئی جگہ شعریت نے موعظت اور مذہبیت کی قبا کو چاک کر کے سر اٹھایا ہے۔ یہی بند نظم کا حاصل ہیں۔

ٹنی سن کو صراحت اور تفصیل اور ہو بہو عکاسی کا بڑا شوق تھا۔ ظاہر ہے کہ شاعر الفاظ میں مصوری کرتا ہے نہ کہ عکاسی، اور کنایہ صراحت سے بہت زیادہ حسین ہوتا ہے۔ شاعری کا تانا بانا خاموش گویائیوں یا گویا خموشیوں سے بنا ہے۔

(۱) اشارہ ہے اپنے ہم عصر چارلس ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی طرف۔

ٹینی سن قادرالکلام شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی مدت حیات ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے۔ اس اثنا میں اس کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے جن کی آؤ بھگت بھی ہوئی اور ردوقدح بھی۔ ایک دور فارغ البالی عیش وآسایش اور کامرانی کا بھی آیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ ٹینی سن کی آزادیٔ رائے اور اس کا ملکۂ شاعری ملکۂ انگلستان کے آستان اور خوشحالی کی نذر ہوگیا۔ لیکن اس وجیہ قدآور اور توانا کھلاڑی نے پھر ایک کروٹ لی اور ثابت کردیا کہ اس میں پرانا دم خم باقی ہے۔ یہ بات برسبیل تذکرہ نوک قلم پر آگئی ہے۔ حاصل کلام صرف اتنا ہے کہ ٹینی سن اپنی قادر الکلامی، پرگوئی، تنوع، منظر نگاری، حب الوطنی اور اپنے کلام کے غنائی اور مصورانہ اوصاف اور درد وکرب اور شک وشبہ اور جستجو اور تصادمات کے اعتبار سے انگلستان کے صف اول کے شعرا میں گنا جاتا ہے اور "ان میموریم" In Memoriam اس کی طویل کامیاب نظم ہے۔

جہاں تک ملٹن کا تعلق ہے، اس کا شمار دنیا کے مشاہیر شعرا میں ہے۔ ملٹن اور ٹینیسن میں کچھ دور کا فرق ہے، کچھ ساخت کا۔ جہاں ٹینی سن شبہ کو یقین کی چادر سے ڈھانکنے کی کوشش کرتا ہے، وہاں ملٹن کا زور اعتقاد کسی شک وشبہ کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ مذہب سے دونوں وابستہ ہیں، ملٹن جوش وخروش اور وثوق کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے، ٹینی سن اس انداز سے گویا مذہب کی دیوار میں جو دراریں سائنس نے ڈال دی تھیں ان پر کاغذ چسپاں کرنا اور متجسس ذہنوں کو سرمایۂ اطمینان فراہم کرنا اس کا فریضہ تھا۔ ایک شاعر کو مذہبی اور سیاسی انقلاب نے جنم دی، دوسرا اقتدار واعتبار کے پیداوار تھا۔ دونوں تثلیث کے فرزند تھے۔ تیسرا شاعر موحد تھا۔ غیر مخلوط توحید پر اس کے مسلک کی بنیاد تھی۔ وہ ہندوستان میں دور انحطاط میں پیدا ہوا اور غلامی کی بیڑیاں اس کی زندگی میں کٹ بھی نہ سکیں۔ اقبال ملٹن کی طرح باغی تھا، سماج کے انحطاط، رسوم، توہمات، عیش کوشی، انحرافات اور بدعتوں کے خلاف۔ دونوں کا کلام ایمان کی روشنی سے تابندہ اور اعتقاد کی آنچ سے دہک رہا ہے۔ دونوں نے اپنے مذہب کی اصل کی طرف بازگشت کی اور اسے ساری بدعتوں، توہمات اور آمیزشوں سے منزہ کرکے دیکھا۔ لیکن تطہیر اور تنزیہ کی اس کاروائی میں اقبال ملٹن سے آگے بڑھ گیا۔ ملٹن ان مباحث میں الجھ گیا جو مختلف مذہبی اور سیاسی فرقوں کے درمیان چھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک تنگ نظر مناظرہ گو کی طرح تلخ اور تند لہجہ میں بحثیں کیں، نثر میں بیشتر نظم میں کمتر۔ اقبال نے اعلان میں وہ سطح اختیار کی جو بحث ومباحث سے بالاتر تھی۔

(Lycidas) "لسی ڈس" کے آغاز میں ملٹن، لاریل (Laurel) مرٹل (Myrtle) اور آئیوی (Ivy) کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بے درد انگلیوں سے، قبل از وقت، میں تمہارے برگ و
بار کو تاراج کروں گا۔ ایک تلخ مجبوری، ایک دردناک
حادثہ مجھے مجبور کررہے ہیں، تمہیں بے موسم تکلیف
دینے پر، اس لئے کہ لسیڈس مر گیا، مر گیا وہ اپنے
عنفوان کو پہونچنے سے پہلے۔
اور اس نے کوئی حریف بھی نہ چھوڑا اپنا۔ لسیڈس کا
مرثیہ کون نہ کہے گا؟ لیڈس کا مرثیہ جو خود شعر کہتا تھا،
بلند اور تابناک اشعار کہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے
آبی تابوت پر بہتا رہے اور کوئی اس پر آنسو بہانے والا
نہ ہو؟ شور آلود ہوائیں اس کی لاش کو تھپیڑے دیں اور
وہ نغمہ بار آنسوؤں کے خراج سے محروم رہے۔ پس اٹھو
اے فنون لطیفہ کی دیویو اٹھو اور اپنے ساز کو تندی کے
ساتھ حرکت دو۔
یاد آتے ہیں وہ دن جب ہم دونوں سحر کی نیم وا آنکھوں
کے تلے مرغزاروں کی طرف نکل جاتے تھے۔ اف یہ
گراں نشیں انقلاب، میرے دوست تو مجھے چھوڑ کر
چلا گیا۔
تو چلا گیا اور کبھی واپس نہ آئے گا۔ جنگل اور پرصدا غار
سب تیرا ماتم کررہے ہیں۔ تیری جدائی سے گھن اس
طرح لگ رہا ہے جیسے پھولوں کو پالا مار جائے، میمنوں
کی آنتوں میں کیڑے پڑ جائیں یا گلاب کرم خوردہ
ہوجائے۔

پھر شاعر سمندر کی غیر مرئی مخلوق سے پوچھتا ہے:

جب بے رحم سمندر نے لسیڈس کو ڈبویا اس وقت تم
کہاں تھے؟" لیکن تم کیا کرلیتے؟ خود موسیقی کی دیوی
اپنے بیٹے آرفیوس (Orpheus) کو نہ بچا سکی۔ جب
تیز رو ندی تحت زمیں اسے بہائے لئے جارہی تھی۔
شہرت کی ایڑ ہی روح کو ترغیب دیتی ہے خوشیوں اور
آسائشوں کو ٹھکرانے اور جدوجہد کی شہرت کی طلب
آخری کمزوری ہے عالی دماغوں کی۔
جب ہم امید کرنے لگتے کہ ریاضت اور جفاکشی کا
پھل ہمیں ملنے والا ہے اور ہم شہرت کے نصف النہار
پر پہنچنے والے ہیں عین اس وقت اندھا طیش اپنی قابل
نفرت مقراض لے کر آجاتا ہے اور زندگی کی جھنی قبا کو
چاک کردیتا ہے۔
خورشید نے کہا۔ زندگی کی قبا یوں چاک ہوجائے تو
ہوجائے، شہرت کی قبا کبھی چاک نہیں ہوتی۔ اصلی

شہرت کی جڑیں مٹنے والی مٹی میں نہیں ہوتیں، نہ دھات کے خیرہ کن اوراق میں، نہ عام افواہ میں، بلکہ پروردگار کی نگاہوں میں ہوتی ہیں جب وہ اعمال کا جائزہ لینے کے بعد جزا وسزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

آگے چل کر ملٹن پادریوں کو جنھیں گلہ بانی کے لئے مامور کیا گیا ہے موردِ الزام قرار دیتا ہے:

یہ لوگ اپنے شکم کے لئے رینگتے ہیں اور گلے میں گھس جاتے ہیں۔ یہ نابینا منہ، انھیں کیا پتہ کہ hook کس طرح پکڑا جاتا ہے اور گلے کی نگہبانی کیوں کر کی جاتی ہے۔ ان کے کھوکھلے اور بھڑکیلے گیت حقیر نرکل کی بانسری کے سینے میں خراشیں ڈالتے ہوئے نکلتے ہیں۔ بھوکی بھیڑیں تکتی رہتی ہیں، کوئی انھیں چارہ دینے والا نہیں۔ خوفناک بھیڑیا دبے پاؤں آکر انھیں چٹ کر جاتا ہے۔

اب اور آنسو نہ بہاؤ، غم زدہ چرواہو، اور آنسو نہ بہاؤ۔ کیا ہوا اگر لسی ڈس آبی فرش کے نیچے دھنس گیا۔ ٹھیک اسی طرح دن کا ستارہ قلزم کی تہ میں ڈوب جاتا ہے۔ اور پھر وہ اچانک اپنا جھکا ہوا سر اٹھاتا ہے۔ اپنی کرنوں کو آراستہ کرتا ہے اور اپنے درخشاں زرتاب کو لے کر گردوں سحر کی جبیں پر چمکتا ہے۔

اسی طرح لسی ڈس بھی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ لیکن دیکھو وہ ابھر آیا، فرزندِ ربی کی توفیق کے طفیل، وہ فرزند ربی جو کہ سمندر کی لہروں پر چلتا تھا۔

وہ امرت سے اپنے گیسو دھو رہا ہے۔ نغمات مسرت اس کے لئے فردوس گوش بن رہے ہیں۔ الفت ونشاط کی بابرکت مملکتوں میں سارے اولیا غول در غول اس کا دل بہلائیں گے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھے جائیں گے۔

لسی ڈس، اب چرواہے اشکبار نہیں، وہ جان گئے ہیں کہ سمندر کا ساحل اب تیرے ہی زیر نگیں ہوگا، بطور تلافی مافات، اور تو ہی راہ پر لگائے گا پرخطر طوفان میں بھٹکنے والوں کو۔

اسی انداز میں گاتا رہا وہ ناتراشیدہ دہقانی، چشموں اور تناور پیڑوں کے روبرو، اور خاموش سحر اپنی مٹ میلی پاپوش پہن کر نکل گئی۔

بانسری کے نازک سوراخوں پر اس کی انگلیاں زخمہ زن تھیں اور وہ چرواہوں کے گیت گا رہا تھا۔ اب سورج کی روشنی سارے پہاڑوں پر پھیل چکی تھی۔ سورج مغرب کی خلیج میں اتر رہا تھا۔

بالآخر چرواہا اٹھا، ٹوپی سر پر رکھی۔ کل اس کی آنکھیں نئے جنگلوں اور نئی چراگاہوں پر کھلیں گی۔

اس بات پر انگریزی تنقید کا اجماع ہے کہ ملٹن کی گنتی آئمۂ شعر میں ہونی چاہئے۔ اور لسی ڈس ملٹن کے شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ جہاں تک زور بیان اور الفاظ و افکار کے دروبست کا تعلق ہے، یہ نظم منفرد ہے۔ تلمیحات کی کثرت نے اسے گنجینۂ معانی بنا دیا ہے۔ یونانی دیومالا اور مسیحی قصص کے حوالوں اور تلمیحوں کے تاثرات وتخیلات کے ہجوم اور رنگ وبو کے قافلوں کو فضا میں بکھیر دیا ہے۔

لیکن لسی ڈس (Lycidas) پڑھ کر یہ تاثر ضرور ہوتا ہے کہ اپنے دوست کی رحلت سے ملٹن نے ایک کھونٹی کا کام لیا ہے جس پر اس نے دروں بینی اور خود احتسابی اور مستقبل پردازی کی قبائیں ٹانگ رکھی ہیں۔ مرحوم رفیق کے ماضی سے کہیں زیادہ اس نظم کا تعلق خود ملٹن کے حال اور مستقبل سے ہے۔ اس فکر وانتشار و اضطراب، اس امید وبیم کی تصویر کشی یہ نظم بڑے پراثر انداز میں کرتی ہے جو اس کے عزیز دوست کی جواں مرگی نے ملٹن کے دل میں برپا کر دیا تھا۔

وہ شخص جس نے اپنی ساری زندگی اس تیاری کے لئے وقف کر دی تھی کہ خدا کی مشیت کا جواز بندوں کے سامنے ایک شعری شاہکار کی شکل میں پیش کرے، مضطرب تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ ایڈورڈ کنگ کی طرح اپنے مقصد کی تکمیل سے پہلے وہ بھی لقمۂ اجل بن جائے۔ قضا وقدر کا اندھا طیش اپنی قابل نفرت مقراض سے اس کی قبائے حیات کو چاک نہ کر ڈالے۔ اسی مقام پر یہ نظم تاثیر کے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے۔

جہاں تک زور وتاثیر اور دروبست کا تعلق ہے، یہ نظم ان میموریم In Memoriam پر فائق ہے۔ اس کا حجم بھی کم ہے اور یہ احساس بھی کہیں نہیں ہوتا کہ غم کی چنگاری کو پھونک پھونک کر چمکایا جا رہا ہے۔ لیکن دو باتیں پہلو اس نظم کے ایسے ہیں جن کی گنتی عیوب نہ سہی نقائص میں کرنا پڑے گی۔ پہلی بات وہی کہ شاعر کی نظر اپنے دوست کے آبی تابوت پر کم اور اپنے گریباں میں زیادہ ہے۔ نظم کی المیت اور خلوص پر اس خود طوافی کا اثر پڑا ہے۔ دوسری بات تلمیحات کا وہ انبار ہے جو سلسلۂ خیال کی کمر کو لچکا دیتا ہے اور آبشار پر بند باندھتا ہے۔ خاقانی کی طرح ملٹن کو بھی کمال حاصل ہے کہ تلمیحات کی کثرت پرواز تخیل اور تاثیر سخن کو جراحت نہیں پہنچاتی، لیکن روانی پر اثر پڑتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے راہی کی نگاہ منزل مقصود سے ہٹ کر گردوپیش میں الجھتی جا رہی ہو۔ جو لوگ یونانی دیومالا

کے گوشے گوشے سے واقف نہ ہوں انھیں Lycidas کو سمجھنے کے لیے بار بار رکنا پڑتا ہے۔

لیکن وہ چیز جسے واقعی اس نظم کی خامی کہہ سکتے ہیں وہ اس شعری روایت کی مفرط پیروی ہے جس کے تحت شاعر خود کو چرواہا تصور کرتا ہے اور مرغزاروں کی فضا کو بانسری پر گاتے ہوئے گیتوں سے بھر دیتا ہے۔ چونکہ یہ روایت انگریزوں کے ذہنوں میں رچ بس گئی ہے اس لئے ان کی نگاہ دور از کاری اور بناوٹ کی بناوٹ کی طرف نہیں جاتی۔ ملٹن سے پہلے اسپنسر Spenser نے اس روایت کو برتنے میں افراط سے کام لیا تھا۔ طویل نظم The Faerie Queene کے علاوہ The Shepherd's Calendar میں جسے ''سال نامۂ شباں'' یا چرواہوں کے ماہ وسال کہیئے، کردار شبانی بھیس بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس روایت کا سرا لاطینی زبان کی Pastoral Poetry یا مرغزاری شاعری سے ملتا ہے۔ نصاریٰ کے یہاں یہ تصور عام ہے کہ پادری چرواہے ہیں اور عوام ان کا گلہ ہیں اور Pastor کا لفظ ان دونوں مفاہیم پر حاوی ہے۔ جس طرح فارسی اور اردو شاعری میں مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ وساغر کے پردے میں کی جاتی ہے، اسی طرح انگریزی شاعری کے کچھ دور ایسے گذرے ہیں جب روحانی مذہبی اور شعری مفاہیم کے لئے مرغزار و شباں و گوسفند کے علائم استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن بادہ و ساغر اور دشنہ و خنجر کے علائم کو فارسی اور اردو شعرا نے سلیقے اور اختصار کے ساتھ صرف کیا ہے۔ اس کے برعکس انگریزی شعرا نے گلہ اور چرواہے کی علامتوں کو اتنا طول دیا ہے کہ وہ تصنع کے بوجھ سے کراہنے لگتی ہیں۔ ایک دور تھا ہمارے یہاں فرنگ سے مرعوبیت کا جب ہمارے بعض نقاد یہ سمجھتے تھے کہ اردو شاعری سراسر بناوٹی، روایتی اور سجاوٹی ہے، اور انگریزی شاعری بے تکلف، بے تصنع اور رسوم کے استبداد سے آزاد تھی۔ ہمارے نقادوں نے یہ جاننے یا بتانے کی کوشش نہیں کی کہ انگریزی شاعری باوجود اس کے کہ وہ زیادہ کھلی ہوا میں پلی بڑھی ہے، رسمیت، روایت، لفاظی اور موشگافی کی صبر آزما مثالوں سے بری نہیں، بلکہ اس کے بعض ادوار پر تو تصنع اور آورد کی مہر لگی ہوئی ہے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ وہ اشعار جن میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں، ان کا اثر ذہن اور سامعہ پر جو انگریزی میں ہوتا ہے اس سے بہت مختلف اثر اردو میں ہوگا۔ ہماری تنقید نے شاید اس کا احساس نہیں کیا کہ انگریزی عروض کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ متواتر قافیہ کا کھٹکا سامعہ اور ذہن پر بالعموم گراں گذرتا ہے۔ جس طرح اردو مثنوی میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اسی طرح انگریزی ''کپلیٹ'' (Couplet) میں مثنوی میں بحر قافیہ کو جذب کئے رہتی ہے اور ''کپلیٹ'' میں قافیہ کی چوٹ کان پر پڑتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ متواتر مقفیٰ لائنیں انگریزی میں عروضی اعتبار سے ایک دھماکے پر ختم ہوتی ہیں۔

ایک بڑا عیب انگریزی شاعری کے ایک حصہ کا طول کلام، یا بات کو ہیر پھیر کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ سترہویں صدی کے نیمۂ آخر اور اٹھارویں صدی کے نیمۂ اول میں وہ مصنوعی درباری شاعری اپنے عروج پر تھی جسے تازہ ہوا یا سادگی کبھی گوارا نہ ہوئی۔ روزمرہ کے عام الفاظ کا استعمال ممنوع تھا اور ایک چھوٹے سے عام لفظ کا مفہوم شاعری کی زبان میں ایک پورے فقرے سے ادا ہوتا تھا۔ ''ورڈ سورتھ'' اور ''کولرج'' نے شاعرانہ لغات (Poetic Diction) اور گفتگو میں ہیر پھیر Peripherasis یا Circumlocution مدور گفتگو کے خلاف رومانوی تحریک کے ذریعہ کامیاب بغاوت کی۔

بے روح تقلید اور بے کیف نقالی کا دور دورہ انگلستان میں کب نہ رہا۔ ہر بڑے شاعر کا کلام کو مقلدوں نے تختۂ مشق بنایا۔ اس دبستان شاعری کو لیجئے ڈن (Donne) جس کا سربراہ تھا اور جسے مابعد الطبیعیاتی اسکول کا نام ملا۔ ڈن اور اس کے رفقا کی عقلی، منطقی، بے باک، بے تکلف اور ارضی شاعری احتجاج تھی پٹرارک کی سانیٹ نگاروں (Petrarchan Sonnet Writers) اور اسپنسر کی شیرے سے بھری ہوئی ارزاں جذباتی اور ماورائی شاعری کے خلاف۔ اس پر انگیں جذباتی شاعری میں محبوب کا تصور افلاطونی تھا۔ روایتی اردو شاعر اور اس کے پردہ نشیں محبوب میں بھی کبھی اس قدر بعد نہ رہا ہوگا جتنا سانیٹ نگاروں اور ان کے اصنام کے درمیان تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ محبوب کا اس دھوپ چھاؤں والی ارضی دنیا اور گوشت پوست سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس کا وجود صرف اس لئے تھا کہ دور سے اس کی پرستش کی جائے۔ اس گلوسوز شیریں بیانی، اس اکتا دینے والی مدح سرائی اور اس بے وزن جذباتیت اور اس آرائشی انداز فکر و پیرایۂ بیان کا تختہ مابعد الطبیعیاتی دبستان نے الٹ دیا، جہاں عقل اور ارض دونوں کو دخل تھا۔ لیکن ڈن اور ماروِیل (Marvell) وغیرہ کے بعد ان کے پیروؤں نے ان کے طرز کو بے کیف موشگافی اور شعر دشمن استدلال اور بے رنگ مضمون آفرینی کا تابع بنا دیا۔

مقصود ان معترضہ جملوں سے صرف یہ تھا کہ ہر چند انگریزی شاعری کا دامن زیادہ وسیع، اس کے اسالیب بیان زیادہ آزاد، اس کے موضوعات زیادہ گونا گوں، اس کی تاریخ زیادہ طویل اور اس کی تنقید زیادہ متمول ہے، تاہم اس کے گلستاں میں کانٹوں کی کمی نہیں۔ ان میں سے بعض معائب اصولی ہیں، بعض فروعی، اور بعض حیثیتوں سے اردو شاعری انگریزی شاعری پر نمایاں فوقیت رکھتی ہے۔ ہمارے بعض ناقدوں نے اردو شاعری کو جس ڈھنگ سے تختۂ مشق بنایا تھا اس میں اس انداز نظر کو بھی دخل تھا جس کے تحت مشرقی شاعری مغربی شاعری کے آئینے میں دیکھی جاتی ہے۔ خود انگریزی شاعری میں بہت سے ایسے اسالیب اور روایتیں ہیں جو شعریت کے منافی ہیں۔ انگریزی شاعری کے پاؤں میں بھی تکیۂ فن (Mannerism) کی بہت سی بیڑیاں ہیں۔ اسے خود آزادی کی لذت کہئے کہ ہمارے بعض نقادوں نے ہمارے زرناب کو مٹی اور انگریزی شاعری کے مس خام کو

زرتاب قرار دیا۔ حالی اور آزاد نے اردو میں فرسودہ اور شعر دشمن روایتوں اور قیود کے خلاف جو بغاوت کی تھی وہ برمحل تھی اور بروقت۔ لیکن ہمارے بعض انگریزی داں نقادوں نے اس کو خواہ مخواہ طول دے دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ دونوں زبانوں کے اسالیب بیان کی تہ تک پہنچتے، ان کے سرچشموں کو ڈھونڈھ نکالتے، ان محاوروں اور لب لہجہ کی تحقیق کرتے، ان مخازن پر کما حقہ نظر ڈالتے جن سے دونوں زبانوں کے خیال وقول کا تانا بانا بنا ہے، انھوں نے قناعت کی ایک سطحی موازنہ پر جس کا مقصد تھا خود پر استہزا۔

بہرکیف یہ داستان بھی اب پارینہ ہو چکی، اور اس کو دہرانے کا یہ محل بھی نہیں۔ اس تثلیث کی تیسری نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" بغیر کسی تمہیدات کے شروع ہوتی ہے۔ پہلا شعر۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

نظم کے مرکزی احساس کو اجمال اور تاثیر کے ساتھ سامنے لے آتا ہے۔ اسی شعر سے نظم کے ماحول کی تشکیل ہوتی ہے، اور یہی شعر نقطۂ آغاز ہے اس سلسلۂ خیال کا جو اس نظم کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ نظم بندوں میں بٹی ہوئی ہے جن کی ضخامت مضمون کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ پہلے بند میں ۸ مصرعے ہیں، دوسرے میں ۱۴ تیسرے میں ۱۲، چوتھے میں ۲ پانچویں میں ۱۸، علیٰ ہذا القیاس۔ کل ۱۲ بند ہیں۔ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور ٹیپ کا شعر بھی جو بند کے مضمون کی تکمیل کرتا ہے اسی وضع کا ہے۔ ٹیپ کا شعر بڑے حروف میں لکھا گیا ہے تاکہ بند کے خاتمہ کا اعلان ہو سکے۔

پہلے بند میں دکھایا گیا ہے کہ انسان، کائنات، زمین و آسمان، ذرہ و آفتاب، سبزہ وگل، آواز خاموش ضمیر اور نغمۂ بلبل سب کے سب مجبوری کی عالمگیر زنجیر میں اسیر ہیں۔ دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ جہاں انسان اس رمز سے آگاہ ہوا کہ ساری کائنات مجبوری کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے، وہیں اس کا دل رقص عیش وغم سے محروم ہو جاتا ہے اور آنکھیں گہرہائے شاہوار سے۔ صرف نغمہ کے نقوش دل میں رہ جاتے ہیں، اتار چڑھاؤ کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ اشک وآہ کا خزانہ تاراج ہوتا ہے علم وحکمت کے ہاتھوں۔ دل میں نہ نمی باقی رہتی ہے نہ نرمی۔ دل دل نہیں رہتا الماس کا ٹکڑا بن جاتا ہے، تابناک اور درخشاں لیکن درد کی دولت سے تہی مایہ۔ میرے دل کے ساتھ بھی علمی اکتسابات نے کچھ اسی طرح کا عمل کیا ہے۔ آگہی کی شعاعوں نے میرے دل کے چمن کو بھی گوہر و شبنم سے محروم کر دیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا گذر نہیں۔ میں انسان کی محرومیوں کا محرم ہوں، اور اس کے رنج وغم کا رمز شناس۔ میری فطرت کا ساز شکایت کے رگ سے ناواقف ہے۔ گردش لیل ونہار کا قصہ میری زبان پر نہ آیا ہے، نہ آئے۔ میرا دل نہ حیراں ہے نہ خنداں ہے نہ گریاں ہے۔

لیکن اے ماں تیری تصویر جہاں آنکھوں کے سامنے آئی، علم وآگہی، شعور وادراک، ضبط وتمکین کے سارے دعوے باطل ہو گئے۔ سوئی آنکھیں اچانک آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ میں زار وقطار رونے لگتا ہوں۔ سنگ دل اور بر خود غلط عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ درد کے آگے وہ تہی مایہ ہے۔ موج آہ آئینۂ دل سے غبار کو دھو دیتی ہے۔ ماں، جب میری جان ناتواں تیری آغوش میں پلی تھی، جو اچھی طرح بات کرنا بھی نہ جانتی تھی۔ وہی جان ناتواں جس کی شوخی گفتار کے اب چرچے ہیں اور جس کے رشحات فکر گہرہائے آبدار کو شرماتے ہیں۔

علم کی بدولت گفتگو میں جو وزن آتا ہے۔ مرور ایام اپنے ساتھ جو شعور لاتا ہے، دنیا جو مراتب شان وشوکت کے بخشتی ہے۔ اور جوانی جو طاقت ولولہ اور اعتماد عطا کرتی ہے، ان سارے مقامات بلند سے ہم اتر آتے ہیں۔ ان سب اکتسابات اور امتیازات کو ہم بھول جاتے ہیں۔ ماں کے حضور ہماری حیثیت صرف ایک خورد سال بچے کی رہ جاتی ہے۔ ہم ساری فکروں، سارے تکلفات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ بے محابا ہنستے ہیں، کھلکھلاتے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی جنت میں لوٹ جاتے ہیں۔

تصور بہرحال تصور ہے۔ تصور کا طلسم وقت کے بے درد ہاتھوں نے اچانک توڑ دیا۔ شاعر چونکتا ہے، دیکھتا ہے کہ ماں اسے چھوڑ کر جا چکی۔ وہ احساس زیاں سے تلملا اٹھتا ہے۔ تو ہی نہیں رہی ماں تو اب وطن میں کون میرا انتظار کرے گا۔ میرے خط میں دیر ہوئی تو کون بے قرار ہوگا۔ کس پرسکون اور بھیگی راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔ میں تیری تربت پر فریاد لے کر آؤں گا، ماں کہ میرے لئے اب آدھی رات کو گڑگڑا کر کون دعائیں مانگے گا۔ یہ تیری ہی تربیت کا طفیل ہے کہ میں آسمان پر ستارے کی طرح چمک رہا ہوں تیری زندگی ایک زریں ورق تھی وجود کی کتاب میں۔ سراپا دین ودنیا کا سبق تھی۔ ماں تو نے عمر بھر میری پرورش کی، میں تیری خدمت کر سکوں اس کا موقع بے درد اجل نے نہیں دیا۔ تیرا چھوٹا بیٹا، جو اب ایک خوبرو جوان ہے تیرے لئے بلک بلک کر روتا ہے، تو جس محبت کا بیج بوگئی تھی تیرے غم نے دونوں بھائیوں کے درمیان اس محبت کو اور بھی استوار کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا ایک ماتم کدہ ہے۔ جہاں دیکھو موت کی عملداری ہے۔ موت گلشن ہستی میں نسیم کی طرح ارزاں ہے۔ زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں۔ کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں۔ انسانی قافلے کا سرمایہ کیا ہے؟ دیدۂ تر اور فریاد درا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ موتی، وہ زندگی جس کا نام ہے، ٹوٹ کر بکھر جائے، یا وہ آگ زندگی جس سے عبارت ہے راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ موت اگر اتنی عام ہے اس قدر سستی ہے۔ جتنی کہ نیند تو ظاہر ہے کہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ہوا پانی کی سطح پر بلبلہ پیدا کر کے مٹا دیتی ہے۔ اگر وہ حباب کو توڑ کر پھر نہ بنا سکتی تو اس بے پروائی سے حباب کو توڑتی ہی کیوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زندگی خوب سے

خوب تر کی تلاش میں ہو۔

آسمان پر بکھرا ہوا جھلملاتا ہوا سیماب یعنی ستاروں کے یہ جھرمٹ انسان کی ساری کہانی ان ستاروں کی زندگی کے ایک لمحہ میں سما جاتی ہے۔ کیا انسان

جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے

آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

ان چنگاریوں سے بھی کمتر ہو جو آسمان پر بکھری ہوئی ہیں؟ پھول کا بیج مٹی میں دب کر نشو و نما کے واسطے بے تاب رہتا ہے۔ خودنمائی خودفزائی اسے زیرِ زمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ پھول بن کر وہ اپنی تربت سے نکل آتا ہے۔ اسی طرح انسان کے سفر میں لحد ایک منزل ہے جہاں آسمان کو تسخیر کرنے پر تلا ہوا انسان دم لیتا ہے، سستاتا ہے۔ موت کے لمحات آمادۂ پرواز طائر کو ذرا دیر کے لئے پر تولنے کا موقع دیتے ہیں۔ زندگی موت سے مغلوب نہ ہوگی۔ موت کے ہاتھوں نقشِ حیات مٹ نہیں سکتا۔ موت کیا زندگی کے مذاق کی تجدید، بیداری کا پیغام۔

خیالات کا سلسلہ اچانک ٹوٹتا ہے، درد جدائی کی تڑپ سے۔ جدائی کا زخم وقت گذرنے سے نہیں بھرتا، آنکھوں سے خونِ دل بہنے لگتا ہے۔

اگر قدرت کا قانون یہی ہے کہ ہر شام صبح میں تبدیل ہو تو اس رات کا خاتمہ جس کا نام انسان کی تربت ہے، سحر پر کیوں نہ ہو؟

ماں، اپنے تخیل کو میں دعا دیتا ہوں جس کی بدولت ہر لمحہ تو میرے پاس ہے۔

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے

جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

ماں، تیری زندگی چاند سے زیادہ تاباں اور تیرا ستر صبح کے تارے سے خوب تر تھا۔

نظم کے نثری روپ سے اندازہ ہو گیا ہوگا اس تسلسلِ خیال اور وحدتِ تاثیر کا جو اس کا نشانِ امتیاز ہے۔ ماں کی جدائی پر اشک بار شاعر مجبور ہو جاتا ہے یہ سوچنے پر کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور موت کسے کہتے ہیں؟ ہر زاویہ سے وہ اس مسئلہ پر غور کرتا ہے اور ہر بار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ زندگی کی گذرگاہ میں موت ایک منزل ہے۔ یہ سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ یہ بات باور کرنے کے لائق نہیں کہ انسان جو مرکزِ کائنات ہے۔ جس کی تخلیقی صلاحیتیں بے کراں ہیں، اس انسان کی عمر آسمان کے ستاروں سے بھی کم ہوگی۔

اتنے پیچیدہ اور اہم موضوع پر سادہ اور دلکش استدلال کی ایسی پر وقار اور پر تاثیر مثالیں ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن فلسفیانہ تخیل اور حقیقت آشنا استدلال کی یہ پرواز بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ پاتی۔ درد کی کسک شاعر کے ذہن کو بار بار ماں کی طرف لے جاتی ہے اور وہ ایک بچے کی طرح خود کو ماں کی آغوش میں نہ پا کر بے چین ہو جاتا ہے۔ کنہ کائنات کا ادراک، رموزِ حیات و ممات کا وجدان، منزلِ ارتقا کی سمت استدلال اور فلسفیانہ تخیل کی پرواز یہ سب ایک طرف اور ماں کی جدائی کا درد انگیز احساس ایک طرف۔۔ نظم کا تار و پود ان ہی دو عناصر سے بنا ہے۔

جذبہ اور تخیل کی دھوپ چھاؤں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں ایک گنگا جمنی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ماں کی محبت گویا نشیمن ہے جس سے اڑ کر شاعر آسمان کی خبر لاتا ہے، لیکن زیادہ دیر تک وہ نشیمن سے دور نہیں رہ سکتا۔ جذبہ و تخیل، شعر و فلسفہ، ماں کا غم اور حیات و ممات کے رموز، یادوں کا طلسم اور یقین کی نظم میں گتھے ہوئے ہیں "والدہ مرحومہ" اپنے آہنگ، لب و لہجہ، سادگی اور پرواز میں آپ اپنی مثال ہے۔

ٹینی سن کی In Memoriam جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے اکتا دینے والی حد تک طویل ہے۔ اس میں متواتر تاثیر کی وحدت ڈھونڈنا بے سود ہوگا۔ خود Lycidas جو ضخامت میں "والدہ مرحومہ" سے کچھ ہی زیادہ ہے کئی سمتوں میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ملٹن اپنے دوست کی جدائی سے اتنا متاثر نہیں جتنا فکرمند ہے اس امکان سے کہ کہیں جواں مرگی خود اس کو بھی اسی طرح زندگی کے اس اعلیٰ مقصد کے حصول سے نہ روک دے جس کے لئے اس نے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے۔ اپنے رفیق کی نا وقت رحلت کے آئینے میں وہ خود اپنے سر پر مہلک امکانات کی لحد دیکھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم اپنے نقطۂ عروج کو اسی مقام پر پہونچتی ہے جہاں فکر و خوف کی لو تیز ہوتی ہے۔ ترجمہ گذشتہ صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔

Fame is the spur that the clear spirit doth raise
(That last infirmity of a noble mind)
To scorn delights, and live laborious dayes,
But the fair guerdon when we hope to find,
And think to burst out into sudden blaze,
Comes the blind Fury with the abhorred shears,
And slits the thin spun life

زورِ بیان اور تاثیر میں یہ اشعار اعجاز کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ "والدہ مرحومہ" میں کوئی بند ایسا نہیں جو ان کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔ لیکن جہاں تک بہ حیثیت حزنیہ نظم کے ساخت، سادگی، بے ساختگی، تسلسلِ خیال، حسنِ استدلال، یک سوئی، وحدتِ تاثیر اور جذبہ و فکر کے سحر آفریں امتزاج کا تعلق ہے، اقبال کی نظم ملٹن کی نظم سے بہ مراتب بالاتر ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی تہ میں جانے کے لئے وقت نہیں۔ کچھ اشارے میں پہلے کر چکا ہوں، یہاں دو ایک مزید اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ جذبے کے خلوص کے علاوہ اقبال کی نظم کی برتری کا ایک راز یہ بھی ہے

کہ وہ ان پیچیدہ مذہبی روایتوں، شاعرانہ رسموں، اور انداز بیان کی ان بناوٹوں اور ادق تلمیحات کے بارگراں سے آزاد ہے جنھوں نے ملٹن اور ٹینی سن کی نظموں میں آورد کے رنگ کو گہرا کر دیا ہے۔ مذہبی عقائد و رسوم کے استیلا نے بھی ان دونوں نظموں کی اپیل کو ان لوگوں تک محدود کر دیا ہے جو یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور صلیب میں قیامت تک کے گناہوں کا کفارہ دیکھتے ہیں۔

ان دونوں کے برعکس اقبال کا خطاب عام انسانیت سے ہے۔ اس نظم سے اثر پذیر ہونے کے لئے یہ شرط ہرگز نہیں کہ انسان شاعر کے مذہبی عقائد کا ماننے والا ہو۔ اس میں نہ کسی مذہب کا ذکر ہے اور نہ اس کے رسوم و عقائد کا۔ ماں کی یاد میں جو عالم بیٹے کے دل پر گذرتا ہے اس کی دردانگیز تصویر ہے۔ یہ وہ احساسات ہیں جن کی بازگشت اور کسک ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے اور یہی جذبات شاعر کو اس جستجو کی راہ پر ڈال دیتے ہیں کہ زندگی کا راز اور موت کی حقیقت کیا ہے۔ جسے دنیا بے ثباتی سے تعبیر کرتی ہے اقبال اسے موت کی بے ثباتی سمجھتا ہے اور سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی۔

انسان کی عظمت و رفعت کے ادراک کا جہاں تک تعلق ہے اقبال کا ادبیات عالم میں کوئی حریف نہیں۔ ٹینی سن بے چارہ گمان و یقین کے دوراہے پر بھٹکتا رہا۔ انیسویں صدی کے سائنسی انکشافات نے اس کے ایقان کو مجروح کر دیا تھا۔ انسان کی حیثیت کائنات میں ایک ذرۂ حقیر کی رہ گئی تھی۔ ملٹن دولت ایقان سے بہرہ ور ہونے کے باوجود نظام کائنات میں انسان کی اہمیت کو نہ پہچان سکا۔ وہ انسان جس کی تسخیر بے پایاں اور جس کے امکانات لامحدود ہیں۔ انسان کی عظمت کا احساس، اس کے ارتقا کا ادراک اقبال کی نظم کی سطح کو اپنے دونوں پیشروؤں کی نظموں سے بلندتر اور اس کے آہنگ کو ان سے زیادہ وسیع اور اس کے خلوص کو ان سے زیادہ تابناک بنا دیتا ہے۔

"ان میموریم" کے ماحول میں غم اور اداسی ہے۔ ٹینی سن اپنے عزیز دوست کی رحلت پر مغموم ہے۔ اس احساس نے کہ آرتھر کی موت سے ٹینی سن کی بہن ایملی کا جو اس سے منسوب تھی دل ٹوٹ گیا تھا... غم کی تلخی کو اور بڑھا دیا۔ اپنے غم اور اپنی بہن کے ٹوٹے ہوئے دل کی داستان کو ٹینی سن نے بڑی کاوش کے ساتھ نئے نئے زاویوں سے دہرایا ہے۔ اس کی نظم میں دلآویز بند ملتے ہیں، قدرت کے مناظر کے مرقعے اور وہ خیالات بھی جو دل میں پیوست ہو جاتے ہیں:

آج رات ہوائیں تند و تیز ہیں
سامنے ڈوبتے ہوئے دن کے ارد گرد وہ شور مچا رہی ہیں۔
ہوائیں آخری خزاں رسیدہ پتی کو اڑا کر لے گئیں۔
اور انھوں نے کووں کی قطاروں کو آسمانوں میں بکھیر دیا

☆

یہ سبز پوش کرۂ ارض، یہ آتشیں دائرہ

کسی بندش ناپذیر شاعر میں جب
وہ سرگرم کار ہوتا ہے بغیر ضمیر و مقصد کے

دوسرے بند پر گمان ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے نیمۂ آخر کا کوئی فضا پرداز (یا خلاباز) چاند سے بازگشت کے دوران اس آب و گل کی دنیا کے حسین اور انوکھے روپ کو حیرت اور ستائش سے دیکھ رہا ہے۔

"لسی ڈس" میں بہ یک وقت توریت و انجیل اور یونانی دیو مالا سے تلمیحات ہیں۔ ماخذوں کا یہ تضاد اکثر تصور کی حدت سے پگھل جاتا ہے اور بیان کے زور سے دب جاتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں کھٹکتا ہے اور نظم کی تاثیر کو مجروح کرتا ہے۔ ملٹن کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ لسیڈس کے وہ اشعار جہاں مختلف پھولوں کا ذکر ہے قارئین کے لئے نہ صرف جنت نگاہ بلکہ فردوس گوش ثابت ہوتے ہیں۔ ایک گلستاں ہے جو نغمہ بار ہے۔ پھولوں کے حسن کو ان کے ناموں کے صوتی جمال نے دو آتشہ کر دیا ہے۔ اس گلستان صوت و رنگ سے شاعر اچانک ہمیں گرجتے ہوئے سمندر کی طرف لے جاتا ہے جہاں کوہ پیکر موجیں اس کے غرقاب رفیق کی ہڈیوں کو اپنی طوفانی طاقت سے زیر و زبر اور شکست و ریخت کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ شاعر کی تخلیقی اور تاراجی طاقتوں، اس کے شیون جمال و جلال کا ایک سانس میں اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی نشست اور خیال کے دروبست اور اسلوب کی طلسم بندی میں ملٹن کا شاید ہی کوئی حریف ہو۔

زور بیان کے مراحل اقبال کے لئے دشوار گذار نہیں۔ انسان کی عظمت کا یہ نقیب انسان کی تخلیقی طاقتوں کا جب ذکر کرتا ہے تو کانوں میں "کن" کی صدا آتی ہے اور آنکھوں کے سامنے "فیکون" کا سماں۔ پرواز، حرکت جستجو اور خودداری کے ترانوں سے زمین و آسمان کے لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔ لیکن بحیثیت شاعر اقبال کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے نہ کبھی الفاظ کی قید قبول کی، نہ اسالیب برائے اسالیب، شکوہ برائے شکوہ، زور بیان برائے زور بیان کا اقبال کے یہاں گذر نہیں۔ وہی اسلوب وہ اختیار کرتا ہے جو جذبہ احساس، تاثر یا مفہوم کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو۔ اظہار و ابلاغ کی راہ میں وہ نظر کو ذرا دیر کے لئے بھی ان خوبصورتیوں کے طرف بھٹکنے نہیں دیتا جو یمین و یسار سے رہرو راہ سخن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ اسلوب اور الفاظ کو جذبہ اور تاثر، خیال اور فکر کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اس شعر میں گویا تخاطب خود شاعر سے ہے بہ حیثیت فنکار کے۔

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ٹینی سن غم کے افسانے کو اس قدر طول دیتا ہے کہ فن اور قاری برداشت نہیں کر سکتے۔ ملٹن اپنی خوبصورت نظم کو تلمیحات سے ژولیدہ و گراں بار کر دیتا ہے۔ رفیق کے غم سے زیادہ وہ اپنے امکانات پر تشویش کی نگاہ ڈالتا ہے۔ راہ

میں گل وگلزار دیکھ کر وہاں رک جاتا ہے۔ ایک جگہ کافی وقت اہل کلیسا کی سرزنش میں صرف کرتا ہے۔ پھر زورِ بیان اور شکوہ الفاظ کو کبھی کبھی بے محل ایک حزنیہ نظم میں جگہ دیتا ہے۔ اقبال صحیح فنکارانہ ضبط و امتیاز کے ساتھ وہ دھیما اسلوب اختیار کرتا ہے جو حزن اور تفکر کے لئے موزوں ہے، اور خارجی مضامین کو جو ابلاغ یا تاثیر کی راہوں میں حائل ہوں، سلسلۂ فکر میں داخل ہی نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ''والدہ مرحومہ...''، ''ان میموریم'' اور ''لسی ڈس'' سے زیادہ پرتاثیر اور فکروفن کے لحاظ سے ان پر فائق ہے۔

اسی صفت میں وہ اہمیت پنہاں ہے جو تاریخ ادب میں اقبال کو حاصل ہے۔ اس نے جہاں عقائد کو رسوم و اوہام سے آزاد کرانے کی کوشش کی وہیں اس نے اردو شاعری کو رسموں، قیدوں اور بندشوں سے نجات دلائی۔ ایک ہی مزاج کے یہ دو مظاہر، ایک ہی وصف کے یہ دو روپ ہیں۔ معنی کا اظہار اور معنی آفرینی دو بالکل مختلف باتیں ہیں۔ اردو شاعری کچھ عرصہ رعایت لفظی کے دام میں گرفتار رہی۔ اس سے نکلی تو غالب نے اسے معنی آفرینی یا رعایت معنوی کے جال میں پھنسا دیا۔ اقبال نے معنوی موشگافیوں کی جان لیوا رسم سے اردو شاعری کو نجات دلائی اور اس کے ابلاغ و اظہار کی صلاحیتوں کو اجاگر اور توانا کر دیا۔

یہاں ''والدہ مرحومہ'' کے شعری محاسن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ میں صرف دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ معنی خیز تراکیب کا طویل سلسلہ نظم کے حسن، معنویت اور وزن کو دوچند کرتا ہے۔

یہ تراکیب شاعر کی تخلیقی قوت کی غماز ہیں۔ یہ چنگاریاں جو سمند شعر کی ٹاپوں سے دم جولاں اڑ رہی ہیں۔

تشابیہ کی تازگی اور معنویت کی طرف بھی ایک مختصر سا اشارہ:

آہ سیماب پریشاں، انجم گردوں فروز
شوخ پر چنگاریاں ممنون شب ہے جن کا سوز
سیکڑوں نغموں سے باد صبحدم آباد ہے
عقل جس سے سربہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

''والدہ مرحومہ'' کی سادگی برجستگی اور بے ساختگی سے گمان ہوتا ہے کہ نظم برداشتہ لکھی گئی ہے۔

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

یہ سادگی کس قدر پرکار ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے لائق جب ہوا تو چل بسی

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

ٹینی سن کے یہاں انسان سہما ہوا بھٹکتا ہوا ذرہ ناچیز ہے۔ ملٹن کے یہاں بھی اس کا مقام رفیع نہیں اور وہ ''خدا کے فرزند'' کی قربانی کا شرمندۂ احسان ہے، گویا اپنے اعمال کے لئے مسئول نہیں۔ انسان کے امکانات اور اس کی عظمت کا نا آلودہ اور حوصلہ انگیز تصور اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔

الغرض ''تثلیث حزن'' کے تینوں اجزا اپنی منفرد نوعیت رکھتے
ہیں۔ الغرض ''تثلیث حزن'' کے تینوں اجزا اپنی منفرد نوعیت رکھتے ہیں۔ اپنے دور اور اپنے خالق کی مزاج کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ہر حصہ نگار خانہ ہے مناظر فطرت اور جذبات انسانی کا۔ ہر ایک حامل ہے گنجینہ کا جسے غم کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کے بغیر نہ شعر مکمل ہوتا ہے نہ نغمہ نہ شعور۔ زورِ بیان اور نور و ظلمت کی دھوپ چھاؤں اور فکر و ایمان کے گنگا جمنی طلسم کو دیکھئے تو ملٹن کی تخلیق کو نہ اقبال پہنچتا ہے نہ ٹینی سن۔ اگر سادگی و پرکاری، یک سوئی اور فنکاری کے تصور کے لیجئے تو اقبال کی نظم ملٹن اور ٹینی سن کے رشحات فکر سے بالاتر ہے۔ اگر یقین و گمان کے تصادم اور بے بس انسان کی آہ اور بھٹکتی ہوئی روح کے انعکاس اور فطرت کے مناظر کی سیر حاصل تصویر کشی پر دھیان دیجئے تو ٹینی سن کی نظم کو اقبال اور ملٹن کی نظموں سے زیادہ پرخلش اور حسرت بیز پائیے گا ☆☆☆

عشرت ظفر
کا چوتھا مجموعۂ کلام
سفال
قیمت : ۷۵ روپے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

ٹی۔ایس۔ایلیٹ، ترجمہ: سید سراج الدین

شمارہ ۲۴۳
جنوری ۲۰۰۱

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (۱۸۸۸ تا ۱۹۶۵) کی نظم "ویسٹ لینڈ" کی اشاعت ۱۹۲۲ میں ہوئی۔

ویسٹ لینڈ کا مواد اور تکنیک

نظم کا مواد تو ایلیٹ کے بے حد وسیع مطالعے سے حاصل ہوا ہے لیکن چند تصانیف اور تحریکوں کا ذکر ضروری ہے۔ جیسی ویسٹن کی کتاب From Ritual to Romance (۱۹۲۰) اور سر جیمس فریزر کی The Golden Bough (۱۹۲۲)۔ خصوصاً مس ویسٹن کی کتاب جس میں قدیم اساطیری داستانوں کے پنہاں معانی کی جستجو کی گئی ہے اور ان کے انسانی اور تہذیبی رشتے دریافت کئے گئے ہیں۔

ویسٹ لینڈ میں ایلیٹ نے جن داستانوں سے کام لیا ہے ان میں دو ایک نظم کو سمجھنے کے لئے اہم ہیں۔ ایک فشر کنگ (Fisher King) کی داستان ہے، جس میں کسی خطۂ زمین پر قہر نازل ہوتا ہے اور زمین بنجر اور سارے جاندار بانجھ ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعلق حکمران یعنی فشر کنگ سے بھی ہے جو کسی بیماری یا زخم کی وجہ سے تناسل کے لائق نہیں رہا ہے۔ جب اسے صحت ہوگی تو زمین جاگے گی اور جانداروں کا بانجھ پن دور ہوگا۔ اس واقعے سے جڑی ہوئی وہ تلاش ہے، جس پر کوئی نائٹ یا سورما اس قہر کو دور کرنے کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ اسے راستے میں کئی آزمائشوں اور خطرات سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ داستان Holy Grail (وہ پیالہ جس کو حضرت عیسیٰ نے آخری عشائیے میں استعمال کیا تھا) کی تلاش سے مل جاتی ہے۔ یہ داستانیں زندگی کے خشک ہونے اور دوبارہ تازگی پانے کی حکایتیں ہیں اور ان کا تعلق تولیدی رسوم (Fertility Rites) سے ہے۔ اسکندریہ کے یونانیوں میں یہ رسم تھی کہ اپنے زرخیزی اور تولید کے دیوتا کی مورتی کو سمندر میں پھینک دیتے تھے۔ بہار آتی تو وہ پھر زندہ ہوتا۔

ان کے علاوہ دو ایک حکایتیں اور ہیں جن کو یاد رکھنا نظم کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ایک تھریس (Thrace) کے بادشاہ ٹیری یوس (Tereus) کی حکایت ہے جس نے ایک دوشیزہ فلومیلا (Philomela) کی عصمت لوٹی تھی اور اسے خاموش رکھنے کی خاطر اس کی زبان کاٹ دی تھی۔ جب اس بادشاہ نے فلومیلا اور اس کی بہن پراکنی (Procne) کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو دیوتاؤں نے فلومیلا کو نائٹنگیل (Nightingale) اور پراکنی کو Swallow میں تبدیل کر دیا۔

ٹائی ریزیاس (Tiresias) اس نظم کا بہت اہم کردار ہے کیوں کہ خود ایلیٹ کے مطابق وہ اس نظم کے ڈانڈے ملائے رکھتا ہے۔ شروع سے آخر تک وہ اس نظم میں موجود ہے۔ ٹائی ریزیاس تھیبس (Thebes) کا اندھا غیب داں ہے جس میں نر اور مادہ کی دونوں جنسیں یکجا ہو گئی ہیں۔ وہ خضر کی طرح ہر زمانے میں موجود رہا ہے اور اپنی اندھی آنکھوں سے ہر حادثے کو دیکھا ہے اور اس کا شاہد ہے۔

ان اساطیری داستانوں اور حکایتوں کے علاوہ ایلیٹ کا مواد بائبل دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، اطالوی، فرانسیسی اور جرمن ادب اور آپرا، سنسکرت ادب اور اپنشد وغیرہ سے مستعار ہے۔ ویسٹ لینڈ کی تکنیک میں ایلیٹ نے فرانسیسی علاماتی تحریک (Symbolism) سے استفادہ کیا ہے۔ فرانس میں بودلیر (Baudelaire) نے ۱۸۵۷ میں Fleurs du Mal (شر کے شگوفے) لکھ کر شاعری کو ایک نیا موڑ دے دیا تھا اور سمبلزم کی تحریک کو جنم دیا تھا جس کے نمائندے ریمبو (Rimbaud)، ویرلین (Verlaine)، ملارمے (Mallarme) اور ویلیری (Valerie) وغیرہ ہیں۔

ایلیٹ نے ویسٹ لینڈ اس وقت لکھی جب انگلستان کی رومانی شاعری کو زوال آ چکا تھا اور شاعری کی شریانوں میں نئے خون کی ضرورت تھی۔ اس نظم میں راست طریقۂ اظہار کو یک قلم رد کر دیا گیا اور اس کے عوض کئی چوکھٹوں میں ایسی تصویریں رکھ دی گئی ہیں جو زبان رکھتی اور بولتی ہیں۔ یہ تصویریں بظاہر مربوط نہیں لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک ایسے معاشرے کا پتہ دیتی ہیں جو بے روح، بے مقصد اور مضمحل ہو چکا ہے، جس میں ایک سستا پن، ایک روحانی بانجھ پن اور ویرانی آ گئی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ نظم ایک پر امید اشارے پر ختم ہوتی ہے۔

ویسٹ لینڈ میں اتنی بے شمار تلمیحات اور حوالے ہیں کہ ہر قدم پر حواشی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ ان سے قطع نظر کر کے صرف نظم کے بہاؤ اور مجموعی تاثر پر دھیان دیا جائے۔ میں نے جو دو چار باتیں رقم کر دی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ نظم کی ڈور ہاتھ میں رہے۔

جب ایلیٹ نے یہ نظم لکھی تو وہ بہت طویل تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے اسے اپنے شاعر دوست ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کے حوالے کیا جس نے اصلاح اور تراش خراش کے بعد اس نظم کو آدھی کر دیا۔ بڑی مہربانی کی، بے شمار طلبا کی نسلوں پر اور آج ہم آپ پر۔

اب نظم ملاحظہ ہو۔

(۱)

تدفین

اپریل کیا ظالم مہینہ ہے
جامد، مردہ مٹی سے شگوفے اگاتا ہے،
یادوں میں خواہش کی ٹیس بوتا
اور خاک میں دبی، بے حس جڑوں کو
بہار کی بارش سے اکساتا ہے
جاڑے اچھے تھے کہ زمین کو
خود فراموشی کی برف سے ڈھک کر
ہم کو گرم رکھا تھا،
بس اک خستہ سی زندگی
سوکھی جڑوں کی غذا پر پلتی تھی۔

پھر یکایک سمندر کی اور سے ہو کر
مینھ کے اک جھالے کے ساتھ گرما نے ہم کو آلیا،
ہم چلتے چلتے ستونوں کے درمیان رک گئے
پھر کھلتی دھوپ میں ہوف گارٹن پارک نکل آئے
اور کافی پی اور گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے
"نہیں میں روسی نہیں، لتھوینیا کی ہوں، جرمن نژاد
اور جب ہم چھوٹے تھے اور اپنے بھائی آرچ ڈیوک کے ہاں رہتے تھے
تو ایک دن ڈیوک نے مجھے برف گاڑی پر بٹھالیا
میں ڈر گئی تھی۔ اس نے کہا
ماری ماری مضبوط پکڑی رہو،
اور ہم تیز پھسلتے گئے پہاڑوں میں۔
کیا کھلی اور آزاد فضا تھی وہاں کی
میں رات دیر گئے پڑھتی رہتی ہوں
اور جاڑوں میں جنوب چلی جاتی ہوں

یہ کون جڑیں ہیں جو جکڑتی ہیں
کون شاخیں ہیں جو اس پتھریلے ڈھیر سے پھوٹتی ہیں؟
ابن آدم کو نہ اس کا علم ہے نہ ظن،
وہ تو بس شکستہ شبیہوں کے اس انبار کو جانتا ہے
جس پہ سورج بے رحمی سے چمک رہا ہے
اور جہاں سوکھا درخت کوئی سایہ نہیں دیتا
اور جھینگر کی آواز سے ڈھارس نہیں ملتی
اور سنگلاخ زمین میں کہیں
پانی کی آواز نہیں
بس اس سرخ چٹان کے نیچے سایہ ہے
(آؤ اس سرخ چٹان کے سائے تلے آؤ)
اور میں تمھیں اک چیز دکھاؤں
تمھارے اس سائے سے الگ
جو صبح دم تمھارے پیچھے پھیلا تمھارا تعاقب کرتا ہے
اور سرِ شام تمھارے آگے پھیلا تم سے ملنے کے لئے بڑھتا ہے،
میں تمھیں بتاؤں مٹھی بھر خاک میں خوف

بھور بھئی اور پون چلی
میرے وطن کی اور رواں
او میری آئرش گوری
ڈھونڈ رہی ہو مجھے کہاں؟
"ایک سال ہوا کہ تم نے مجھے چنبیلی کے پھول دیئے
لوگوں نے مجھے چنبیلی کہہ کے پکارا"
لیکن جب دیر گئے ہم چنبیلی کے باغ سے لوٹے،
تمھاری گود پھولوں سے بھری اور بال نم
تو میں کچھ کہہ نہ سکا، میری آنکھیں پتھرا گئیں
عجب حال تھا میرا، نہ مردہ نہ زندہ
نور اور خاموشی کی تہہ میں مجھے کسی شے کی سدھ نہیں تھی۔
سمندر بنجر اور ویران ہے

مشہور غیب داں شریمتی شیشاادری کو سخت زکام تھا
مگر لوگ بہر حال اسے برِ اعظم کی داناترین عورت گنتے ہیں،
اس کے ہاتھ میں ایک سفلی تاش کی گڈی ہے

کہنے لگی یہ لو، یہ رہا تمھارا پتہ، غرقاب فینیشی ملاح
(یہ جو موتی ہیں کبھی اس کی آنکھیں تھیں، یہ دیکھو)
اور یہ بیلا ڈونا، چٹانوں کی سندری
حوادث کی ناری
یہ ہے تین عصا والا آدمی، اور یہ ہے قسمت کا چکر
اور یہ رہا کانا بیوپاری، اور یہ جو پتہ ہے نا
بالکل سادہ، یہ کوئی چیز ہے جو وہ اپنی پیٹھ پر لادے ہے
لیکن اس کے جاننے سے مجھے منع کیا گیا ہے
وہ دار پہ لٹکا آدمی ہے، مجھے مل نہیں رہا۔
پانی کی موت سے ڈرو۔
میں ایک ہجوم دیکھ رہی ہوں، جو ایک حلقے میں گھوم رہا ہے۔
چلو بس شکریہ۔ اگر تم بیگم مطمئن خاں سے ملو
تو کہنا میں ان کا زائچہ خود لے آؤں گی
زمانہ نازک ہے، احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

شہر بے حقیقت،
جاڑوں کی صبح کے بھورے کہرے میں
ایک خلقت لندن برج پر سے گذر رہی ہے، ایک انبوہ،
مجھے پتہ نہیں تھا کہ موت نے اتنوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے،
گاہ گاہ کوئی مختصر آہ سنائی دیتی تھی
ہر شخص کی نظر اس کے قدموں کے آگے جمی تھی،
ٹیلے پر سے ہو کر جو ہجوم کنگ ولیم کوچے سے گذرتا
سینٹ میری ولناتھ کے گرجا تک آ گیا
جس کے گھڑیال سے آتی نو کے آخری گھنٹے کی آواز
جم کر رہ گئی تھی۔
وہاں میری نظر ایک آشنا پر پڑی اور میں نے پکار کر کہا
اسٹیشن تمھیں یاد ہے تم مائی لے میں میرے ساتھ جہاز پر تھے۔
وہ لاش جو تم نے پچھلے سال اپنے باغ میں بوئی تھی
کیا وہ اب اگنے لگی ہے؟ کیا وہ اس سال کوئی شگوفہ کھلائے گی؟
یا پھر اسے پالہ مار گیا ہے؟
دیکھو کتے کو اس سے دور رکھو جو انسانوں کا دوست ہے
ورنہ وہ اپنے ناخنوں سے اسے کھود نکالے گا!
او منافق قاری۔ میرے ہم جنس، میرے بھائی!

(۲)

شطرنج کی بازی

جس کرسی پر وہ بیٹھی تھی وہ اک دمکتے شہ نشین کی طرح
فرش مرمریں پر فروزاں تھی جہاں اک آئینہ،
انگور لدی بیلوں اور ان سے جھانکتے اک سنہری اور
اک پروں میں منہ چھپاتے کیوپڈ سے مزین، ڈنڈوں پر استادہ
ایک ہفت شاخہ شمع کے شعلوں کو دوہرا رہا تھا
اور روشنی کو میز پر منعکس کر رہا تھا، جہاں
اس کے ریشمی تھیلیوں سے امڈ بہے ہوئے زیوروں کی چمک دمک
اس سے آملی تھی، رنگین بلور
اور ہاتھی دانت کی منہ کھلی شیشیوں میں چھپے
اس کے ابٹن، عرق اور عطر حواس کو پریشاں
اور خوشبوؤں کے طوفان میں غرق کر رہے تھے
کھڑکی سے آتی تازہ ہوا کے جھونکوں سے مل کر
یہ خوشبوئیں شمع کے شعلوں کی شہ دے رہی تھیں
اور ان کے دھوئیں کو اس طرح بکھیر دیا تھا
کہ تختوں میں بنے چھت کا نقشہ متحرک ہو گیا تھا۔
سمندری لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی سبز اور نارنجی آگ
آتش دان کے رنگین پتھر سے بنے چوکھٹے میں جل رہی تھی
جس کی اداس روشنی کی موجوں میں ایک منقش مچھلی تیر رہی تھی
قدیم طرز کے مینٹل کے اوپر ایک تصویر اس طرح لگی تھی
جیسے کسی جنگل کے منظر پر کسی نے کھڑکی کھول دی ہو،
اس تصویر میں اس ناری کی حکایت نقش تھی جس کو
ایک بادشاہ کے وحشیانہ جنسی جبر سے بچانے کے لئے
قمری میں بدل دیا گیا تھا
اس قمری کی معصوم آواز سارے صحرا میں پھیل گئی تھی
وہ نوحہ کرتی رہی "جگ جگ، جگ جگ"
اور آج بھی دنیا یہ آواز سنتی ہے،

گندہ کانوں کے لئے اک فحش آواز
اسی طرح کی کچھ اور مدفون وقتوں کی منجمد داستانیں
دیواروں پر نقش تھیں۔ سامنے بھٹکتیں، آگے کو جھکی
شکلوں سے کمرے کی خاموش فضا محصور تھی۔
زینے پر گھسٹتے قدموں کی آواز۔
آگ کی روشنی میں کنگھی تلے اس کے بالوں کی انیاں
چنگاریوں کی طرح پھیل گئی تھیں
اور کچھ دہکتے لفظ سے بنا رہی تھیں،
پھر یہ بال ایک برہم شہزادی کی تصویر بن گئے۔

'آج میرے اعصاب کا برا حال ہے، بہت برا۔ میرے پاس رہو
"مجھ سے بات کرو۔ تم کبھی کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ بولو۔
کیا سوچ رہے ہو؟ کیا سوچ؟ کیا؟
"مجھے کبھی پتہ نہیں چلتا کہ تم کیا سوچ رہے ہو، کیا سوچ۔"

مرے خیال میں ہم لوگ چوہوں کی گلیاری میں ہیں
جہاں مردوں کی گمشدہ ہڈیاں پڑی ہیں
"یہ کیا آواز ہے؟"
دروازے کے سانڈ سے گذرتی ہوا
تو یہ آواز کیا ہے؟ ہوا کیا کر رہی ہے؟"
کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔
کیا تم کچھ نہیں جانتے؟ کچھ نہیں دیکھتے؟ کیا تمھیں
" کچھ یاد نہیں رہتا؟
مجھے یاد ہے
یہ موتی جو ہیں کبھی اس کے دیدے تھے
" کیا تم زندہ بھی ہو یا نہیں؟ کیا تمھارے بھیجے میں کچھ بھی نہیں؟"
مگر
او او او ارے وہ شیکسپیری گانا
کیا خوب ہے
کیا چلتا ہوا
"میں اب کیا کروں؟ آخر کیا کروں؟

"جی چاہتا ہے سڑک پر نکل پڑوں، جس حال میں ہوں اسی حال میں
"اسی طرح سر کھلا، بال کھلے۔ کل ہم کیا کریں؟
"کل کیا کبھی بھی ہم کیا کریں؟"
صبح دس بجے گرم پانی،
اور اگر بارش ہو تو چار بجے ایک بند گاڑی
پھر ایک شطرنج کی بازی
اپنی بے خواب آنکھوں کو دباتے ہوئے دروازے پر کسی دستک کا انتظار

جب لل کے شوہر کی فوج سے چھٹی ہوئی تو میں نے کہا۔
میں نے صاف صاف کہا۔ میں بولی
(جلدی کیجئے حضور۔ وقت ہو چکا)
اب البرٹ آئے گا، ذرا اپنے کو سنوار لو،
وہ ضرور ان پیسوں کے بارے میں پوچھے گا
جو اس نے تمھیں اس لئے دیئے تھے کہ نئے دانت بنوالو،

یہی کہہ کے تو دیئے تھے، میرے سامنے کی بات ہے۔
اس نے کہا تھا لل تم اپنے پورے دانت نکلوا کر ایک اچھا سا چوکھٹا بنوالو
قسم ہے تمھاری طرف دیکھنا، دل نہیں چاہتا۔
اور میں بھی یہی کہتی ہوں۔ ذرا البرٹ کی بات سوچو
بے چارا چار سال فوج میں رہا۔ اب وہ چاہے گا کہ کچھ مزا اٹھائے
اور اگر تم یہ نہ دے سکو تو کوئی اور مل جائے گی، میں بولی۔
اچھا ایسا ہے، اس نے کہا۔ ایسا ہی کچھ ہے میں بولی۔
تب پتہ چل جائے گا کہ کس کی عنایت ہے، اس نے کہا اور مجھے گھور کے دیکھا
(جلدی کیجئے حضور۔ وقت ہو چکا)
اور اگر تم کو یہ بات بری لگتی ہے تو پھر تمھاری مرضی، میں نے کہا
تم اگر نہ جانو تو دوسرے تو کام نکالنا جانتے ہیں۔
لیکن اگر آلبرٹ کہیں چلا گیا تو یہ نہ کہنا کہ میں نے جتایا نہیں تھا۔
ارے شرم کرو، میں بولی، کیا بوڑھی لگتی ہو۔
(ویسے ہے وہ بس اکتیس سال کی)
کیا کروں مجبوری ہے، اس نے بری صورت بنائی
سارا دوش ان گولیوں کا ہے جو میں نے پیٹ گرانے کے لئے کھائی تھیں

(پانچ تو وہ جن چکی ہے اور جارج کے وقت تو مرتے مرتے بچی تھی)
کیمسٹ نے تو کہا تھا بے ضرر ہیں لیکن جب سے میں نے وہ گولیاں کھائیں
میری حالت ہی بدل گئی
تم پکی بیوقوف ہو، میں بولی۔
ارے اگر آلبرٹ نے تمھیں ہاتھ لگانا نہیں چھوڑا تو تم کیا کرو گی
اگر بچے نہیں چاہیے تھے تو شادی کیوں کی تھی؟
(جلدی کیجیے حضور۔ وقت ہو چکا)
خیر اتوار کو آلبرٹ گھر آیا۔ انھوں نے گرم گرم مرغ بنایا
اور مجھے بھی بلا لیا کہ گرم کھانے کا لطف اٹھاؤں
جلدی کیجیے حضور وقت ہو چکا
جلدی کیجیے حضور وقت ہو چکا
خدا آفیظ بل، خدا آفیظ لو۔ خدا آفیظ ہے۔ خدا آفیظ
ٹاٹا، خدا آفیظ، خدا آفیظ
خدا حافظ لی یو، خدا حافظ پیاری لی یو، خدا حافظ، خدا حافظ

(۳)

آگ کا وعظ

ندی کا ڈیرا ٹوٹ گیا ہے۔ آخری پتوں نے اپنی انگلیاں
کنارے کی گیلی مٹی میں گاڑ دی ہیں۔ ہوا
بھورے میدان سے بے آواز گذر رہی ہے۔ پریاں جا چکی ہیں۔
پیاری ندی دھیرے چل، میرا گیت ختم ہو لے۔
ندی کی سطح پر گرما کی راتوں کی کوئی شہادت موجود نہیں
خالی بوتلیں، سینڈوچ کے کاغذ، ریشمی دستیاں، اٹے کے ڈبے، سگریٹوں
کے ٹکڑے
کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ پریاں جا چکی ہیں
اور ان کے یار، کمپنی ڈائرکٹروں کے آوارہ مزاج بیٹے، وہ بھی
اپنا پتہ چھوڑے بغیر رخصت ہو چکے ہیں۔
میں یہاں جھیل کے کنارے بیٹھ گیا اور روتا رہا...
پیاری ندی دھیرے چل، میرا گیت ختم ہو لے
پیاری ندی دھیرے چل کہ میری آواز اونچی نہیں، نہ میری بات لمبی ہے
مگر میں اپنے پیچھے ہوا کے اک تیز اور سرد جھونکے میں
ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سن رہا ہوں اور اک ہنسی کی کھل کھل
جس میں باچھیں کانوں تک پھیل گئی ہوں۔

سردیوں کی ایک شام، گیس ہاؤز کے پیچھے بہتی سست رو نہر میں
جب میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا اور سوچ رہا تھا،
اپنے بھائی بادشاہ کے بارے میں جس کا جہاز ڈوب گیا تھا
اور اس سے پہلے بیتی ہوئی میرے باپ بادشاہ کی موت کے بارے میں
تو ایک چوہا اپنے کیچڑ میں لت پت پیٹ کو گھسیٹتا
کنارے کی گھاس اور جھاڑیوں میں رینگ رہا تھا
گیلی نشیبی زمین پر گورے، ننگے جسم،
اور ایک نیچی چھت والے گیرٹ میں پڑی ہڈیاں
جن کو برسوں، دوڑتے چوہوں کے سوا کوئی نہیں چھیڑتا
پر میں اپنے پیچھے بجتے ہارن اور موٹروں کی آوازیں سن رہا ہوں
جو یہ بتا رہی ہیں کہ موسم بہار آئے گا تو سوینی اور مسز پورٹر کی پھر ملاقات ہوگی
اف چاند کیا چمک رہا تھا مسز پورٹر اور اس کی بیٹی پر
جو اپنے پیر سوڈا واٹر سے دھوتی ہیں،
اور اوہ یہ گنبد میں بچوں کے گانے کی آوازیں
ٹویٹ ٹویٹ ٹویٹ
جگ جگ جگ جگ جگ جگ
کیسا سخت جبر
ٹیریوس

موہوم شہر
سرما کی دوپہر کے بھورے کہرے میں لپٹا
سمرنا کے سیٹھ، مسٹر یوجی نائڈیز نے
جس کی بے شیو داڑھی ذرا بڑھی ہوئی
اور جیبیں کشمش سے بھری تھیں
بار برداری کی بلٹیں، مال کے دام، انشورنس اور جہاز کے کرائے کی رسیدیں
اور دوسرے کاغذات سامنے رکھے،
مجھے اپنی بازاری فرنچ میں کینن اسٹریٹ ہوٹل میں لنچ کھانے

اور اس کے بعد میٹرو پول میں ایک اینڈ گذارنے کی دعوت دی

شام کے بنفشی لمحوں میں جب آنکھیں
ڈیسک سے اوپر اٹھتی ہیں، کمر سیدھی کی جاتی ہے، انسانی مشین
انجن چلتے ٹیکسی کی طرح مرتعش اور منتظر ہوتی ہے،
میں اندھا لیکن دو زندگیوں کی دھڑکنوں کا حامل
عورت کی جھریوں بھری چھاتیوں والا، بوڑھا ٹائی ریزیاس
میں شام کے اس ارغوانی لمحے کو دیکھ سکتا ہوں
جب لوگ گھروں کا رخ کرتے ہیں، ملاح سمندر سے لوٹتا ہے
اور ٹائپسٹ لڑکی چائے کے وقت اپنے گھر پہنچتی ہے،
میز سے ناشتے کے جھوٹے برتن سمیٹ کر چولھا جلاتی ہے
اور کھانوں کے ڈبے میز پر رکھتی ہے،
کھڑکی کے باہر اس کے انڈر ویئر ادھر لٹکے ہوئے ہیں
جن پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی ہیں،
دیوان پر، جو رات کو اس کا بستر بن جاتا ہے
اس کے موزے، سلیپر، کامیزول اور کارسٹ ڈھیر بنے پڑے ہیں،
میں، جھریوں بھری چھاتیوں والا، بوڑھا ٹائی ریزیوس
میں نے یہ منظر دیکھا اور آگے کی پیشین گوئی کر دی۔
مجھے بھی تو ایک مہمان کا انتظار تھا۔
پھر وہ نوجوان آتا ہے
کسی معمولی ایجنٹ کا کلرک
منہ پر کیلیں، نظر بے باک اور بے جھجک
ایک گھٹیا خود اعتمادی
جو اس کے چہرے پر ایسی کھپ رہی ہے
جیسے بریڈفورڈ کے کسی ملینیر کے سر پر سلک ہیٹ۔
سوچتا ہے موقع اچھا ہے
کھانا ختم ہوتا ہے، لڑکی پر تھکن اور اکتاہٹ طاری ہے
وہ اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کرتا ہے
جو اسے قبول تو نہیں لیکن روکتی بھی نہیں
خواہش گرماتی ہے تو تذبذب میں بھول کر وہ یکبارگی دھاوا کر بیٹھتا ہے،
اس کے ٹٹولتے ہاتھ کوئی روک نہیں پاتے،
اس کی خود پسندی جوابی لگاوٹ سے بے نیاز ہے،
بے دلی کو وہ رضامندی سمجھتا ہے
(اور میں ٹائی ریزیاس اس دیوان یا بستر پر ہونے والے ڈرامے کو
اس کے ہونے سے پہلے ہی بھگت چکا ہوں،
میں جو کبھی تھیبس کے قریب دیوار کے تلے بیٹھ چکا ہوں
اور پاتال کے سب سے نچلے طبقے کی روحوں کے ساتھ گھوما ہوں
ایک آخری عنایتی بوسہ
جس کے بعد وہ راستہ ٹٹولتا سیڑھیاں اترنے لگتا ہے
کیوں کہ زینے کی روشنی گل ہے۔

وہ مڑ کر ایک لمحہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ہے،
اسے یہ بھی احساس نہیں کہ اس کا عاشق جا چکا ہے،
ایک یوں ہی سا خیال اس کے ذہن سے گذرتا ہے
"چلو جو ہونا تھا ہو چکا، چھٹی ہوئی۔"
جب حسین عورت سے بھول ہوتی ہے
اور وہ کمرے میں تنہا ٹہلتی رہ جاتی ہے
تو وہ کچھ سوچے بنا ایک خود کار کل کی طرح اپنے بال ٹھیک کرتی ہے
اور گراموفون پر کوئی ریکارڈ لگا دیتی ہے۔

'پانی پر یہ نغمہ میرے بازو سے گذرا'
پھر اسٹرینڈ اور کوین وکٹوریہ کو ہے تک جا پہنچا۔
اے شہر، اے شہر، میں کبھی
لوور ٹیمز اسٹریٹ کے پبلک بار سے آتی آوازیں سنتا ہوں
مینڈولین کی سہانی، روتی دھن، پلیٹوں کی کھڑکھڑ
اور مچھلی والوں کی بک بک کی آوازیں جو اپنی دوپہر یہاں گذارتے ہیں
یہاں میگنس مارٹر گرجا کی دیواروں پر بڑے شاندار
سپید اور سنہری نقش، معلوم نہیں کیوں آیونیائی طرز کے بنے ہوئے ہیں

ندی کی سطح پر
اس کے پسینے کی طرح
تیل اور تار کول پھیلا ہے
پانی کے بدلتے بہاؤ پر
کشتیاں بہہ رہی ہیں

چوڑے
سرخ بادبان
بھاری مستول پر ہوا کے رخ جھک رہے ہیں
رو میں بہتے لکڑی کے کندوں
کو کشتیاں
گرینچ کے کنارے سے ہو کر
آئل آف ڈاگس کے پرے لئے جا رہی ہیں
وائے، لا، لالا، للللا
ہائے، ہا، آہ، آ

الیزابتھ اور لسٹر
کشتی کھیتے ہوئے
جس کا پچھلا حصہ
ملمع کی ہوئی
سرخ و سنہری
سیپ سے بنا ہے،
ابھرتی موجیں
دونوں کناروں سے ٹکراتی
جنوب مغربی ہوا
گھنٹیوں کے شور کو
پانی کے ساتھ بہاتی
سفید مینار
ولالا، لیالالا
ولالا، لیا، لالا

ٹرام گاڑیاں، گرد آلود درخت
ہائی بری نے جنم دیا مجھے، رچمنڈ اور کیو نے
مجھے برباد کیا، رچمنڈ کے قریب
ایک تنگ ڈونگی میں چت لیٹے
میں نے اپنے گھٹنے کھڑے کئے
میرے پیر مور گیٹ میں تھے اور میرا دل
میرے پیروں تلے۔ معاملہ ختم ہوا

تو وہ رو پڑا۔ ''نئی زندگی'' شروع کرنے کا وعدہ کیا
میں نے کچھ نہیں کہا۔ کیا کہتی؟ کس بات پر بگڑتی؟

مارگیٹ سینڈز میں مجھے
کسی شے کا رشتہ نہیں ملتا
گندہ ہاتھ اور ان کے ٹوٹے ناخن
یہ میرے مسکین لوگ جنھیں کسی چیز کا انتظار نہیں
لالا

پھر میں کارتیج پہنچا

آگ آگ، جلاتی آگ
خدایا تو مجھے آگ سے کھینچ لیتا ہے
اے خدا تو مجھے کھینچ لیتا ہے
آگ

(۴)

پانی کی موت

فینیشی فلباس کو ڈوبے دو ہفتے ہو گئے
اب وہ سب کچھ بھول چکا ہے
بحری بگلوں کی آوازیں، سمندر کی گہری، طویل موجیں، نفع نقصان۔
ایک زیریں سمندری رو اس کی ہڈیوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے
ابھرتا، ڈوبتا، غوطے کھاتا
اپنے بڑھاپے اور جوانی کی منزلوں سے گذر کر
وہ بھنور میں آ گرتا ہے
نصرانی کہ یہودی
اے پہیہ گھمانے اور ہوا کا رخ دیکھنے والو
ذرا فلباس کو بھی دیکھو جو کبھی تمھاری ہی طرح اونچا پورا اور خوب رو تھا

(۵)

رعد نے کیا کہا

پسینے سے تر چہروں پر مشعلوں کی سرخ جوت
باغوں میں خشک خاموشی
سنگین حصاروں میں سہمے ہوئے کرب
چیخ وپکار، نوحہ گری، محل اور زنداں
اور دور پہاڑوں پر بہار کے گرجتے بادل کی گونج
اس کے بعد
وہ جو زندہ تھا اب فوت ہو چکا
ہم جو زندہ تھے اب مر رہے ہیں
آہستہ آہستہ، صبر کے ساتھ
یہاں پانی نہیں، بس چٹانیں ہیں
بے آب چٹانیں اور پہاڑوں پر بل کھاتی ریتیلی سڑک
پہاڑ جہاں صرف چٹانیں ہیں اور پانی نہیں
پانی ہوتا تو رک کر اک گھونٹ پیتے
ان چٹانوں میں نہ رک سکیں، نہ کچھ سوچ سکیں
پسینہ خشک ہے اور پاؤں ریت میں
کاش چٹانوں میں پانی ہوتا
پہاڑ کا بے جان، بوسیدہ دانتوں والا دہن
جس کا لعاب خشک ہے،
یہاں تو نہ بیٹھ سکتے ہیں، نہ لیٹ سکتے، نہ کھڑے ہو سکتے ہیں
ان پہاڑوں میں خاموشی بھی نہیں
بس اک بانجھ بادل کی بے فیض گرج ہے اور بارش نہیں
یہاں تنہائی بھی نہیں
تمتمائے ہوئے برہم چہرے غراتے منہ چڑاتے
تڑکتے مکانوں کے دروازوں سے جھانک رہے ہیں
کاش پانی ہوتا
اور چٹانیں نہ ہوتیں
یا چٹانیں ہوتیں
اور پانی بھی
کوئی چشمہ
چٹانوں کے بیچ کوئی کنڈ
بس کہیں بہتے پانی کی آواز ہوتی
نہ کہ یہ کیڑے کی کرکر
اور سوکھی گھاس کی سرسر
کسی چٹان سے گرتے پانی کی آواز ہوتی
جہاں چیڑ کے درختوں میں ایک راہب پرندہ اپنا گیت چھیڑتا ہے
ڈرپ ڈراپ ڈرپ ڈراپ ڈرپ ڈراپ ڈراپ
مگر پانی کہاں

یہ تیسرا کون ہے جو برابر تمہارے بازو چل رہا ہے؟
میں گنتا ہوں تو بس دو ہیں، ایک تم اک میں
لیکن جب اس سفید سڑک پر میں آگے دیکھتا ہوں
تو ہمیشہ لگتا ہے کوئی تمہارے بازو چل رہا ہے
بے آواز قدم رکھتا، بھورے لبادے میں ملبوس، کلاہ اوڑھے
کہہ نہیں سکتے کہ مرد ہے یا عورت
آخر یہ ہے کون تمہاری اس جانب؟

اور پر ہوا میں یہ کیا آواز ہے
کسی ماں کے نوحے کی آواز
یہ کلاہیں اوڑھے جتھے کون ہیں
جو حد نظر تک پھیلے میدانوں میں امڈے آرہے ہیں
دراڑیں پڑی زمینوں میں ٹھوکریں کھاتے
صرف سپاٹ افق کے دائرے سے گھرے
پہاڑوں کے اس پار یہ کون سا شہر ہے
دھماکے اصلاحیں اور اودی فضاؤں میں کڑا کے
گرتے مینار
یروشلم، ایتھنز، اسکندریہ
لندن، ویانا
سب بے حقیقت

ایک عورت نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو کھینچ کر ساز کے تاروں کی طرح
تان لیا
اوران پر اک سرگوشی کرتی دھن بجانے لگی
بنفشی روشنی میں بچوں کے چہروں والی چمگادڑیں
چیخ کر پھڑپھڑائیں
اور ایک سیاہ دیوار پر الٹی لٹکی پیچھے کو رینگنے لگی
اور فضا میں اوندھے مینار تھے جن کی
وقت بتانے اور بیتے دنوں کی یاد دلانے والی گھنٹیاں بج رہی تھیں
اور بے آب حوضوں اور خشک کنوؤں سے گاتی آوازیں آرہی تھیں

پہاڑوں کے بیچ اس فرسودہ کھوہ میں
مدھم چاندنی میں بکھری قبروں
اور افتادہ معبد پر گھاس سرسرا رہی ہے
ویران عبادت گاہ میں صرف ہوا کا گذر ہے
اس میں کوئی کھڑکیاں نہیں، صرف اک جھولتا دروازہ ہے
خشک ہڈیاں کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتیں۔
بس اک مرغ، چمکتی بجلی میں چھت کی ناٹ پر کھڑا ہے
کوکوری کو، کوکوری کو
بجلی کی چمک پھر ایک نم ہوا کے جھونکے کے ساتھ
بارش
گنگا کا پانی اتر گیا تھا اور بے جان پتے
بارش کے انتظار میں تھے، دور ہماونت کی چوٹی پر
کالے بادل چھا رہے تھے
سمٹے، دبکے جنگل پر سکوت طاری تھا
تب رعد نے کہا
دا
دتا: کیا دیا ہے ہم نے؟
اے دوست، میرا جوشش خوں سے دھڑکتا ہوا دل
قبولیت کا وہ قیامت خیز بے محابا لمحہ
جسے ایک ساری زندگی کی مصلحت کوشی نہیں چھین سکتی
بس اسی پر تو ہمارا وجود قائم ہے

وہی جس کا ذکر اموات کی خبروں میں نہیں ملتا
نہ ان یادوں میں جن پر مہربان مکڑی نے جالا بن دیا ہے
نہ ان دستاویزوں میں جن کی مہریں لاغر قانونی مشیر
ہمارے خالی کمروں میں توڑتے ہیں
دا
دیہ دھوم: میں نے اس کنجی کی آواز سنی ہے
جو ایک اور صرف ایک بار دروازے میں گھومی تھی
ہم اپنے اپنے قید خانے میں اس کنجی کو یاد کرتے ہیں
اور اس طرح اپنے قید میں ہونے کا ثبوت دیتے ہیں
صرف کبھی رات کو کچھ اڑتی افواہیں
کسی کاریولینس کے ٹوٹے دل کو گھڑی بھر کے لئے سہارا دیتی ہیں
دا
دمیا تا: بادبان اور چپو کو
ماہر ہاتھوں میں پاکر ناؤ خوشی سے چلنے لگی
سمندر ساکت تھا، تمھارا دل بھی
اگر ایسے قادر ہاتھوں میں ہو تو بخوشی
ناؤ کی طرح مطیع ہو جائے
میں ساحل پر بیٹھا
مچھلیاں پکڑتا رہا۔ میرے پیچھے بنجر زمین پھیلی تھی
میں نے سوچا کم از کم اپنے علاقے ہی ٹھیک کرلوں
لندن برج گر رہا ہے، گر رہا ہے، گر رہا ہے
"پھر وہ اس آگ میں گھس پڑا جو پاک کرتی ہے"
"میں ابابیل کی مثل کب بنوں گا"۔ "اے ابابیل، ابابیل
پرنس آکوی تین اور اس کا گرتا مینار
یہ وہ دھجیاں جو میں نے اپنی تاراجی سے بچا رکھی ہیں
ٹھیک ہے آپ کی خواہش پوری ہوگی
ہیرانمو پھر پاگل ہو گیا ہے
دتا۔ دیہ دھوم۔ دمیا تا
شانتی شانتی شانتی

حوالے اور حاشیے

ایلیٹ نے نظم کے آخر میں کچھ حوالے اور نوٹ دیے ہیں جو کچھ معمولی اضافوں کے ساتھ درج ذیل ہیں۔ ایلیٹ کے نوٹ واوین کے نشانوں کے ساتھ دیے گئے ہیں۔

"نہ صرف نظم کا عنوان بلکہ اس کا خاکہ اور بہت ساری موقعی علامتیں مس جیسی ایل وسٹن (Jessie L. Weston) کی کتاب From Ritual to Romance (کیمبرج) سے ماخوذ ہیں۔ حق یہ کہ میں نے مس وسٹن سے اتنا کچھ لیا ہے کہ ان کی کتاب کا مطالعہ میرے نوٹس سے زیادہ نظم کے مشکل حصوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ میں ایسے قاری کے لئے جو اس نظم کو سمجھنے کی زحمت اٹھانے کے لئے تیار ہے، مس وسٹن کی کتاب کو پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔ (ویسے علاوہ اس بات کے خود کتاب بے حد دلچسپ ہے) میں علم الانسان کی ایک اور کتاب کا مرہون منت ہوں یعنی گولڈن بو The Golden Bough جو کوئی ان کتابوں سے واقف ہے وہ ان اشاروں کو فوراً تاڑ لے گا جو بعض نباتی رسوم سے متعلق اس نظم میں موجود ہیں۔"

1۔ تدفین

سطر 25 بائبل، ایزیکیل (Ezekiel) II، i

30 بائبل، اکلیزیاسٹ (Ecclesiastes) XII، V

41 ٹرسٹن اور ایسولڈے (Tristan and Isolde) 5-8

55 میں ٹیرو (Tarot) تاش کی ترکیب سے اچھی طرح واقف نہیں۔ میں نے اسے اپنی ضرورت کے لحاظ سے برتا ہے۔ 'دار پر لٹکا آدمی' میرے مقصد کے لئے دو حیثیتوں سے موزوں ہے۔ ایک تو میرے ذہن میں اس کا رشتہ فریزر (Frazer) کے 'مصلوب دیوتا' سے ملتا ہے اور دوسری طرف میں نے اپنی دانست میں اس کا رشتہ نظم کے پانچویں حصے میں اس 'کلاہ دار شخص' کردار سے ملایا ہے، جس کا ذکر حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور ایماؤز (Emmaus) کی سڑک کے بارے میں ملتا ہے۔ فنیقی ملاح اور بیوپاری (تاش کی گڈی میں) بعد میں آتے ہیں اور ویسے ہی خلقت کا ہجوم بھی۔ 'پانی کی موت' کو میں نے چوتھے حصے میں رکھا ہے اور 'تین عصا والا آدمی' جو ٹیرو (Tarot) تاش کا اہم رکن ہے، اسے میں نے بالکل من مانے طریقے سے فشر کنگ (Fisher King) سے ملا دیا ہے۔"

70 بودلیر سے Fourmillante cite وغیرہ۔

73 دانتے: "انفرنو" III، 55-57:

si Lunga tratta

di gente, Ch'io nun avrei mai creduto

che morte tanta n'avesse disfatta.

Such a Crowd

of people that I had never believed

that death had undone so many.

74 دانتے، انفرنو IV، 25-27

79 یہ میرا کی دعا کا ترجمہ ہے۔

85 ویبسٹر، وہائٹ ڈیول (White Devil) کا نوحہ۔

87 بودلیر Fleurs du Mal کا پہلا لفظ۔

2۔ شطرنج کی بازی

79-78 انٹونی اینڈ کلیوپیٹرا، II، ii، لائن 90

107-106 ملٹن، پیراڈائز لاسٹ، IV، 140

109 اووڈ (Ovid) میٹامورفوسس (Metamorphoses)، VI، فیلومیلا۔

110 دیکھئے "ویسٹ لینڈ" III حصہ سطر 215

126 دیکھئے "ویسٹ لینڈ" III (تیسرا) حصہ سطر 208

129 ویبسٹر (Webster): "Is the wind in that door still"

:

136 دیکھئے "ویسٹ لینڈ" حصہ I سطر 43 اور 57

148 دیکھئے شطرنج کا کھیل مڈلٹن (Middleton) کے ڈرامے "Women beware Women" میں

3۔ آگ کا وعظ

195 اسپنسر (Spenser)، پروتھلیمین (Prothalamion)

203 شیکسپیئر The Tempest، I، ii

209 مارویل (Marvell)، "To His Coy Mistress"

210-209 ڈے (Day)، "Parliament of Bees":

When of the sudden, listening, you shall hear

A noise of horns and hunting, which shall bring

...... Actaeon to Diana in the spring, where all shall see her naked skin

211 "مجھے اس بیلڈ کے ماخذ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جس سے میں نے یہ مصرعے لئے ہیں۔ کسی نے مجھے سڈنی، آسٹریلیا سے یہ بھیجا تھا۔"

213 ویرلین (فرانسیسی شاعر)، پارسیفال (Parsifal)۔

221-22 یہاں ایلیٹ نے اس کاروباری Bill of Lading وغیرہ کے بارے میں نوٹ لکھا ہے۔

230 ٹائی رے زیاس (Tiresias) اگرچہ محض تماشائی ہے اور کوئی 'کردار' نہیں لیکن یہ نظم کی بہت اہم شخصیت ہے جس میں سارے کردار جمع ہو گئے ہیں۔ جس طرح نظم میں کانا بیوپاری اور کشمش کا تاجر فنیقی ملاح میں مدغم ہو گئے ہیں جو خود نیپلز کے پرنس فرڈیننڈ کے ساتھ مدغم ہے اسی طرح ساری عورتیں ایک عورت بن جاتی ہیں اور ٹائی رے زیاس میں مرد و عورت یکجا ہیں۔ حقیقت یہ کہ ٹائی رے زیاس

جو کچھ دیکھتا ہے وہی نظم کا مغز ہے۔"

اس کے بعد ایلیٹ نے ایک اقتباس لاطینی شاعر اووڈ (Ovid) سے دیا ہے جس کو وہ علم الانسان کے نقطۂ نظر سے بہت اہم سمجھتا ہے۔ لاطینی کون جانتا ہے جو اسے درج کیا جائے۔

269-72 گولڈ اسمتھ کی مشہور ناول The Vicar Wakfield کا ایک گیت۔

279-80 سینٹ میگنس مارٹر کا گرجا انگلستان کے مشہور آرکیٹکٹ رن (Wren) نے بنایا تھا۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ اس کے درودیوار کے اندرونی نقش و نگار میری نظر میں نقش گری کے بہترین نمونوں میں شامل ہیں۔

281-83 "دختران ٹیمز کا گیت یہاں شروع ہوتا ہے۔ 309 سے 317 تک وہ باری باری بولتی ہیں۔" گوٹیتر ڈیمیرونگ Gotterdammerung، III، i: رھائن کی بیٹیاں The Rhine Daughters

295 فروڈ (Froude)، الیزبیتھ Elizabeth، باب IV۔ ڈی کوادرا کا خط فلپ آف اسپین کے نام: "سہ پہر میں ہم کشتی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ندی پر آبی کھیل دیکھ رہے تھے۔ ملکہ لارڈ رابرٹ اور میرے ساتھ اکیلی تھیں جب انھوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کی" وغیرہ

310-11 دانتے، پرگاتوریو (purgatorio)، V، 13

323 سنٹ آگسٹن: کنفشنز (Confessions): تب میں قرطاجنہ (Carthage) پہنچا جہاں گناہ آلود معاشقوں کا ایک کڑھاؤ میرے اطراف سی سی کررہا تھا۔"

324 "بدھا کا "آگ کا وعظ" جو حضرت عیسیٰ کے پہاڑ پر وعظ (Sermon on the Mount) کی مماثل اہمیت کا حامل ہے اور جس سے میں نے یہ الفاظ لئے ہیں ہنری کلارک وان کی کتاب Buddhism in Translation، ہارورڈ اورینٹل سیریز میں دیکھا جاسکتا ہے۔"

325 "سینٹ آگسٹن کے "کنفشنز" سے۔ مشرقی اور مغربی زہد و ترک کے ان دو نمائندوں کی اس طرح یکجائی جو نظم کے اس حصے کا نقطۂ تکمیل ہے محض اتفاقی نہیں ہے۔"

5۔ رعد نے کیا کہا

"نمبر (5) کے پہلے حصے کے تین موضوع ہیں: شارح ایماؤز کا سفر، پر خطر چیپل (Chapel) کے قریب پہنچنا (دیکھئے مس وسٹن کی کتاب) اور مشرقی یورپ کا موجودہ زوال۔"

ہرمٹ تھرش (Hermit-Thrush) کی آواز میں نے صوبہ کیوبک (Quebec Province) میں سنی ہے۔ چیپمن (Chapman) نے اپنی کتاب (Hand Book of Birds of Easter n North America) میں لکھا ہے کہ "یہ پرندہ سنسان بنوں اور گنجان جھاڑیوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اسکے سروں میں بلند آہنگی اور تنوع تو نہیں لیکن بڑی پاکیزگی، مٹھاس اور سریلا پن ہے۔ اس صفت میں وہ یکتا ہے۔" اس کے رستے پانی (Water-dripping) کا سا گیت صحیح طور پر شہرت رکھتا ہے۔"

"اس سے آگے کے اشعار مجھے قطب جنوبی کی ایک مہم کی تفصیل نے سجھائے۔ (یاد نہیں کہ یہ روئیداد کس کی لکھی ہوئی ہے، غالباً شیکلٹن (Shackleton) کی ہے) اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اس مہم کے افراد جب ان کی تھکن انتہا کو پہنچ جاتی تو ہمیشہ ان کو یہ دھوکہ ہوتا کہ ایک اور شخص ان کے ساتھ ہے جو ان کی گنتی کے علاوہ ہے۔"

382-93 بہ حوالہ ہرمان ہسے (Herman Hesse)۔ یہاں ایلیٹ نے ہسے کی جرمن عبارت نقل کی ہے۔

417 دتا، دید دھوم، دمیاتا یعنی (give, sympathize, control)۔ جس حکایت میں اس کے معنی سمجھائے گئے ہیں وہ بریھا دارانیکا۔ اپنشد (Brihadaranyak - Upinashd) میں موجود ہے۔

424 وبسٹر، دا وائٹ ڈیول Webster, The White Devil، V، vi:

..............وہ بیاہ کرلیں گے
اس سے پہلے کہ تمھارے کفن کو کیڑا لگے اور مکڑی
تمھارے سنگ مزار پر اپنا مہین پردہ بن دے

428 دانتے، "انفرنو" (جہنم) XXXIII، 46:

"ed io sentii chiavar di sotto all orribile torre."

"اور میں نے سنی میرے نیچے ایک مہیب حصار کا دروازہ کھولتی کنجی کی آواز۔"

مزید ایف ایچ بریڈلی، ظاہر و حقیقت Appearance and Reality ص 346

"میرے بیرونی محسوسات بھی اتنے ہی شخصی اور نجی ہیں جتنے میرے خیالات یا احساسات۔ دونوں صورتوں میں میرا تجربہ ایک دائرے کے اندر ہے جو میرا ہے اور جو اپنے تمام عناصر کے ساتھ محدود ہے اور اس کا ہر نقش ان لوگوں کے لئے جو اس دائرے کے اطراف کھڑے ہیں دھندلا ہے" وغیرہ

445 دانتے "Purgatorio"، "پرگاتوریو" (اعراف) XXVI، 148

446 Pervigilium Veneris۔ دیکھئے فیلومیلا Philomela، II، III

447 نروال Nerval، سانیٹ El Desdichadu (ایل ڈیسدی کادو)

448-49 کِڈ Kyd، Sparush Tragedy

451 'شانتی' اپنشد کے آخری الفاظ۔ انگریزی میں ان کا مترادف "The Peace which Passeth understanding"

☆☆☆

سید عارف

شمارہ ۱۴۲،
جون جولائی ۱۹۸۶

کیا جانے رات کیسی کہانی سنا گئی
بچوں کے ساتھ ساتھ ہمیں نیند آ گئی

نکلے تھے دھوپ بانٹ کے اندھی گلی سے ہم
گھر کا چراغ رات کی آندھی بجھا گئی

ہم کو بھی اپنے آپ سے انکار تھا بہت
سورج کی آنکھ پھول سے شبنم گرا گئی

اتنا تو یاد ہے کہ جزیرہ بھی پاس تھا
ابھرے تو موج موج سمندر دکھا گئی

یوں بھی تو جھوٹ موٹ کے کردار ہم ہی تھے
لیکن زمیں کی پیاس کہانی بنا گئی

راتوں سے زخم کھا کے پلٹنے کی دیر تھی
جگنو سی آنکھ راہ میں چاندی بچھا گئی

اندر سے ٹوٹ ٹوٹ کے برباد ہو گئے
عارف یہ زندگی ہے کہ رشتے نبھا گئی

سید فضل المتین

شمارہ ۱۱۷،
ستمبر ۱۹۸۰

ترا ہی عکس، ترا ہی جمال ہے، مجھ میں
تو دیکھ غور سے تیرا کمال ہے مجھ میں

میں آئینہ ہوں ترے روبرو نہ کیوں آؤں
ترا غرور ہے تیرا جلال ہے مجھ میں

میں تیرے عہد کی تعریف ہوں گواہی ہوں
ترا عروج ہے تیرا زوال ہے مجھ میں

مرا وجود تری ذات سے عبارت ہے
ترا جواب ہے تیرا سوال ہے مجھ میں

میں تیرے عشق کی روداد ہوں تعارف ہوں
ترا فراق ہے تیرا وصال ہے مجھ میں

کہاں سے صورت حالات کی شہادت دوں
متین اس کا ہر اک حال چال ہے مجھ میں

تلاش رنگ رائیگاں

سید محمد اشرف

شمارہ ۲۴۴
فروری ۲۰۰۱

اس نے پہاڑی کے موڑ پر کھڑے ہو کر گہرے میں ڈوبی وادی کی جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا اور پھر مٹھی کھول کر دیر تک اس شے کو دیکھتا رہا۔

کیا سب کچھ ایک سراب تھا۔ کیا تمام زندگی رائگاں چلی گئی؟ اس نے سوچا۔

ٹھنڈی ہوائیں بہت تیز ہو گئی تھیں اور اس کا لمس تکلیف دہ سرگوشیاں کرنے لگا تھا۔ تب اس نے آنکھیں بند کر کے دور تک دیکھا۔ دور، بہت دور۔

"یہ کیا ہے ارشد... پڑوسی کی بیٹی نے اس اندھیرے کمرے میں لے جا کر اسے قریب کر کے پوچھا جہاں سب بچے آنکھ مچولی کھیلنے میں چھپتے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" فرزانہ آپا کی گرم گرم سانسیں اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیں۔

"تمھیں سب معلوم ہے۔ اب تم بچے نہیں ہو۔" تب اس نے غور سے دیکھا۔ اور ویسا ہی لذت بھرا خوف محسوس کیا جیسا رحمت علی کے مکان کی دیوار سے جھانکتی امرود کی شاخ سے امرود توڑتے وقت محسوس ہوتا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا اور بہت دیر تک اس فکر میں ڈوبا رہا کہ اس کی انگلیاں سخت ہیں یا وہ جگہ بہت نرم ہے۔

"تم اب فرزانہ کے ساتھ اکیلے مت کھیلا کرو۔" امی نے کہا تھا۔

اس نے سہم کر ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں عجیب شرمندہ شرمندہ سا غصہ تھا۔

وہ اور زیادہ سہم جاتا اگر اسی وقت کمرے کے اندھیرے میں گھلی ہوئی وہ لذت اسے نہ یاد آ جاتی۔

"کیوں؟ میں تو کھیلوں گا۔ کل تم نے بڑے کو حلوہ کیوں دیا تھا جب کہ دن بھر میں نے ضد کی تھی کہ میرے لئے حلوہ بناؤ۔"

"ارے وہ بھی تو تمھاری ہی طرح میرا بیٹا ہے۔ جو چیز بنے گی اس کا بھی حصہ ہوگا۔"

دیکھو ابھی تم میرے منھ نہ لگا کرو۔ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔"

"ابھی تم پڑھ لکھ لو۔ ساتواں پاس کو تو کوئی منشی گیری پر بھی نہیں رکھے گا۔" ماں رسان سے بولی۔

"پڑھنے لکھنے کے بعد تو سبھی بیٹے بھاگ ہی جاتے ہیں۔" اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سوچ کر کہا۔

ارشد کو معلوم تھا کہ اماں نے ماموں کے بارے میں سوچا ہوگا جن کا واقعہ وہ ہمیشہ سناتی ہیں کہ جب وہ نوکری کرنے لگے تو بیوی کو لے کر الگ رہنے لگے تھے اور بوڑھے نانا نانی اپنی کنواری غریب بیٹیوں کے ساتھ سنیچر کی رات کو ان کا انتظار صرف اس لئے کرتے تھے کہ بھیا آئے تو اسے ہفتہ بھر کے جمع کئے ہوئے پیسوں سے خوب مرغن کھانا کھلائیں۔

"بس میں بتا رہی ہوں کہ اب تم فرزانہ کے ساتھ نہیں کھیلو گے۔ سمجھے کہ نہیں۔ اگر اب تمھیں پیچھے والے کمرے میں کھیلتا دیکھ لیا تو تمھارے ابا سے کہہ دوں گی۔"

"کہہ دینا... اور چڑا لینا... کہ میرے کہنے پر حلوہ بنایا اور بڑے کو بھی دے دیا۔ اس نے دن بھر رو رو کر ضد کی تھی کیا؟ میں صبح سے چلا تا رہا تھا۔ میں اسی کے مارے اسکول بھی نہیں گیا تھا۔ میرے حصے کا حلوہ بھی اسی کو دے دیتیں۔"

اس کی آنکھیں چھلکنے لگی تھیں اور ان میں پانی تیرنے لگا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔

ماں نے پتیلی ایک طرف رکھی اور اسے قریب کھسکا کر بٹھا لیا۔

"دیکھو ارشد تم مجھ سے ایسے لڑتے ہو جیسے میں تمھارے برابر کی ہوں۔ میں تمھاری ماں ہوں ماں۔ تمھیں کئی بار بتا چکی ہوں کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ حضور نے منع فرمایا ہے ماں باپ کی نافرمانی کرنے کو۔ بہت گناہ ہوتا ہے بیٹے۔ اور تم ابھی اتنے چھوٹے ہو اور ابھی سے اتنی چڑھا اوپری کی باتیں کرنے لگے ہو۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ بڑے کے کپڑے کیوں سل رہے ہیں اور بڑے کو کھانا کیوں مل رہا ہے اور بڑے کو سونے کے لئے پلنگ کیوں دیا جاتا ہے۔ بیٹے تم اور میرے سب بچے میرے لئے برابر ہیں۔"

"تو اماں ایک بات بتاؤ۔" حضور کی بات سن کر وہ سہم گیا تھا۔ اس نے جلدی سے انگوٹھے بھی چوم لئے تھے۔ وہ اور قریب کھسک کر بیٹھا اور اماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں خوب زور سے پکڑ لیا۔ "اماں۔ تم ہم سب میں سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔" جملہ پورا کرنے سے پہلے اس نے اماں کے ہاتھوں کو بہت زور سے کھینچ لیا تھا کہ اماں اسے اس کی مرضی کا جواب دے دیں۔

اماں نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم یہ کیوں پوچھتے ہو۔ میں سب کو برابر سے چاہتی ہوں۔" اتنے میں بڑا آ گیا۔

"تم اب تک اسکول نہیں گئے۔ انٹرول ختم ہوئے کتنی دیر ہو گئی۔"

"تم خود یہاں گھوم رہے ہو۔ انٹرول تمہارے لئے نہیں ختم ہوا کیا؟" اس نے اچک کر الٹا سوال کر دیا۔

"میرا پی۔ ٹی کا گھنٹہ خالی تھا۔" بڑے نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

اسے اس جواب کے برابر کا کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"بڑے تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ میں اماں سے ایک خاص بات کر رہا ہوں۔ جاؤ یہاں سے۔"

بڑے نے اپنے بڑے ہوتے چھوٹے بھائی کو دیکھا پھر اماں کو دیکھا۔ وہ چھوٹے کی ضدی عادتوں سے خوب واقف تھا۔ بڑے نے کچھ کہنا چاہا کہ ارشد بول اٹھا۔

"تم جاتے ہو بڑے کہ نہیں۔ میں اماں سے کوئی بات کروں۔ تم آ کر کھڑے ہو جاتے ہو سامنے۔" اس نے بوا کے انداز میں کہا۔

بڑے نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اماں میں تمہاری اور ارشد کی باتیں سننے کے لئے بھلا کب کھڑا ہوا تھا۔ تم بھی خاموش ہو۔ تم بھی اس کی طرف داری کرتی ہو۔ میں تو تم سے اس وقت یہ کہنے آیا تھا کہ اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے گھر میں کپڑا ہے کہ نہیں، اگر نہیں ہے تو ابا سے پیسے مانگ دو۔

بڑا تھوڑی دیر تک بے بسی سے کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی حلق میں کوئی چیز اٹکنے لگی ہے۔ وہ وہاں سے آنگن میں چلا گیا۔

ارشد نے جلدی سے پوچھا۔

"اماں تم سچ سچ کیوں نہیں بتاتیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بڑے کو، مجھے رضیہ کو سب کو برابر سے چاہو۔ یہ تو میں نہیں مانوں گا۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔ بڑے کو تم نے یہاں سے رلا کر بھیجا ہے۔ دیکھو کیسا چپ چاپ کھڑا ہے۔" ارشد کو لگا اس کے دل پر کوئی چیز زوروں سے ٹکرائی۔ میں چاہے کتنی ہی محبت سے قریب آ کر چپکے سے کوئی بات پوچھوں یہ ہمیشہ اسی طرح کا جواب دیتی ہیں۔ اور پھر اس وقت بھی میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے کو روتا دیکھ لیا۔ روتا کیا ہے بنتا ہے تا کہ اماں سب سے زیادہ اسے چاہیں۔

اماں اسے چھوڑ کر بڑے کی طرف چلی گئیں۔

اس نے پیچھے سے چلا کر کہا۔

"اماں یہ بنتا ہے تا کہ تم مجھ سے بات نہ کر سکو۔"

بڑے نے دوسری طرف منہ پھیرے پھیرے یہ جملہ سنا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دو موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اماں نے بڑے کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔

پیچھے سے ارشد نے زور سے چلا کر قینچی اٹھا کر مشین میں ماری اور وحشیانہ انداز میں رونا شروع کر دیا۔

اماں کا ہاتھ بڑے کے شانوں پر تھا اور نظریں ارشد کی طرف کہ رضیہ نے اماں سے آ کر کہا۔

"اماں ابا کھانا مانگ رہے ہیں۔"

ماں نے دوسرے ہاتھ سے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے کے کندھوں پر ایک ہاتھ۔ باورچی خانے کی طرف اشارہ کرتا ہوا دوسرا ہاتھ اور روتے ہوئے چھوٹے بیٹے کی طرف آنکھیں۔ مائیں زندگی بھر یہی کرتی ہیں۔

"تم لوگ اسکول نہیں گئے۔ کیا بہانہ کر کے رکے ہو اب تک؟" ابا نے سامنے آ کر پوچھا۔

ارشد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔ بڑے نے اسی طرح منہ پھیرے پھیرے آنسو خشک کئے۔

"بڑے کا گھنٹہ خالی تھا اور ارشد کا بھی۔" امی بولیں۔

"امی۔ اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے پیسے دو گی یا ابا سے مانگوں۔" بڑے نے ہولے سے پوچھا۔

"کیا چاہئے؟ براہ راست مجھ سے کیوں نہیں مانگتے ہو۔ اماں کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ کیوں؟"

بڑے نے کن انکھیوں سے ابا کی طرف دیکھا۔ اتنے بھیم شحیم ابا سے براہ راست پیسے مانگنے کی ہمت کیسے ہوتی۔ اماں تم جلدی سے کوئی ایسی بات کہہ دو کہ ابا پیسے دے دیں اور ہمیں ڈانٹیں نہیں۔ ہم دونوں فوراً کالج چلے جائیں گے۔

ماں نے بڑے کے چہرے کی جلد کے نیچے خوف اور عجلت اور شرمندگی کی لہروں کو بہتے دیکھا اور بولیں۔

"اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے پانچ روپے منگائے ہیں اسکول میں۔ اسکاؤٹنگ کے نمبر جڑنے لگے ہیں اب نتیجے میں۔ کھانا چوکی پر رکھوں کہ دالان میں کھاؤ گے۔"

"تو مجھ سے بھی تو مانگ سکتے ہیں۔ ہاں ابھی لفافے سے نکال کر دے دو۔ کھانا دالان میں رکھ دو۔" ابا دالان کی طرف چل دیئے۔

اماں نے سہمے ہوئے بیٹوں کو ایک نظر دیکھا۔ دالان میں داخل ہوتے ہوئے ابا کو دیکھا اور خود کو اس نشے میں چور ہوتا محسوس کیا جو پہلے متوسط طبقے کی بیاہتا عورتوں کو گرہستی کا پیسا اپنے ہاتھ سے خرچ کرنے میں محسوس ہوتا ہے۔

رضیہ نے چھوٹی سی دوپٹہ کندھوں پر سنبھالا اور ابا کے لئے کٹورے میں پانی لے کر دالان میں چلی گئی۔ اماں نے پانچ کا نوٹ بڑے کے ہاتھ میں دے

دیا۔

"اب جلدی سے کالج چلے جاؤ تم دونوں ورنہ ابا ناراض ہوں گے۔"

جب کالج قریب گیا تو بڑے نے آگے چلتے ہوئے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"تم مجھ سے لڑتے کیوں ہو ارشد۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ معلوم ہے امی کہتی ہیں کہ بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے۔"

ارشد نے پیچھے مڑ کر اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔ اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ چپ رہا تو بڑا اسے دبالے گا۔

"ہاں ہاں یہ اماں نے ہی تمہارے دماغ خراب کئے ہیں۔ تم ہمارے لئے کمائی کرتے ہو کیا جو باپ کے برابر ہو جاؤ گے۔ اماں کی خوشامد کر کے اماں سے پیسے ہتھیا لیتے ہو، حلوے میں حصہ بنا لیتے ہو اور بڑے سیدھے بنے رہتے ہو۔ اچھا بس اب مجھ سے مت بولو۔"

بڑے نے کالج کے میدان میں داخل ہوتے ہوئے سوچا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی معلوم نہیں کس طبیعت کا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ارشد نے کلاس میں بنچ پر بیٹھ کر سوچا معلوم نہیں میرا دل کیا چاہتا ہے۔ کھڑکی کے باہر کھیت تھے جن میں چھوٹے چھوٹے گیہوں کے پودے ہلکی دھوپ میں کھڑے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ارشد نے کھڑکی میں دونوں کہنیاں ٹکائیں اور ہتھیلیوں کے کٹورے میں چہرہ رکھ کر سوچا۔

کھڑکی کے باہر بہت دور ادھر کے میدان میں ایک نالا ہے۔ اس نالے کے پار ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے پاس ایک بڑا سا تالاب ہے۔ اس تالاب میں جاڑوں کے پرندے رات کو آ کر سو جاتے ہیں۔ چچا اور چچا کے ساتھی بندوقیں اٹھائے فجر کی اذان سے پہلے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ چچا بتاتے ہیں کہ تالاب کے کنارے کنارے بے حیا کی بے شمار جھاڑیاں ہیں۔ ان جھاڑیوں کی آڑ لے کر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پرندوں کے پاس جاتے ہیں۔ جب کہرہ صاف ہوتا ہے تو چڑیا نظر آتی ہے۔ پھر ہم ایک ساتھ بندوقیں چلاتے ہیں۔ پرندے پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر تالاب میں تڑپتے ہیں۔ باقی بھرا مار کر آسمان کی طرف سرسرا جاتے ہیں۔ ایک آدھ فائر اوپر آسمان میں کرتے ہیں۔ دو تین چڑیاں گیند کی طرح اوپر سے پانی میں گرتی ہیں۔

ذبح کی ہوئی قازیں، سیخ پر، سرخاب اور نیلسیں آنگن میں رکھ کر جب چچا انہیں الگ الگ کرتے ہیں تو معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی چچا کے ساتھ شکار پر جایا کروں۔ ان سب سے آگے پانی میں جا کر چڑیوں پر پہلی ہی بندوق میں ہی چلایا کروں اور اپنی ماری ہوئی رنگ برنگی چڑیاں ڈوری سے باندھ کر اپنے کندھے پر لٹکا کر بندوق ہاتھ میں لئے میں ہی سب سے پہلے قصبے میں داخل ہوا کروں۔ چچا مجھے شکار میں کیوں نہیں لے جاتے۔ کیا وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا شکاری سمجھتے ہیں۔

"ارشد تم سے ہی کہہ رہا ہوں۔ سنتے ہی نہیں ہو۔ ریکھا گرٹ کی کاپی دکھاؤ۔ پائتھا گورس والا سوال بہت مشکل تھا۔"

"میں نے کر لیا ماساب۔" ارشد کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔

"لاؤ دکھاؤ" جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو۔

"شاباش۔" کاپی دیکھ کر ماساب نے خوش ہو کر کہا۔

ارشد نے کن انکھیوں سے نئے تھانے دار کی بیٹی کی طرف دیکھا جس نے ابھی ابھی مڑ کر ارشد کی طرف دیکھا تھا۔

کلاس ختم ہوا تو ارل نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"ہمیں اپنی 'ریکھا گرٹ' کی کاپی دو گے۔ ہمارے گھر صفائی ہو رہی تھی سے نہیں ملا سوال کرنے کو۔"

ارشد نے چھوٹی سی شال اوڑھے ہوئے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں والی اس خاموش خاموش سی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور کاپی بڑھا دی۔

یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔ یہ ڈوری لال سے بھی نہیں بولتی جو خود کو بڑا پڑھا کو سمجھتا ہے۔ میں اگر کھیل میں نہ جایا کروں تو ڈوری لال سے زیادہ نمبر آئیں۔ لیکن کھیل بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر مزہ کتنا آتا ہے جب گیند کو پیروں سے ادھر ادھر کر کے سامنے والوں کو جھکائی دے کر بھاگ کر گول کے پاس جا کر گول کے اندر گیند میں ٹھوکر مارتے ہیں۔ پھر گول کی سیٹی بجتی ہے۔ اپنے ساتھی گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ارل بھی اگر فٹ بال دیکھنے گراؤنڈ پر چلا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ لڑکیوں کو بھی کھیلنا چاہئے۔ پی ٹی والے ماساب سے کہوں گا کہ صرف لڑکوں کو ہی کھلانے کیوں لے جاتے ہیں۔ آخر چچا شکار میں مجھے کیوں نہیں لے جاتے۔ میں ان کے سب ساتھیوں سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں، کسی دن دوڑا کر دیکھ لیں۔

گھنٹہ بجنے لگا۔

کلاس کے باہر بڑا کھڑا ہوگا۔

کمرے کے اس طرف دوسرے کمرے سے پردھان ماساب کی آواز آئی جو یادو ماساب سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

پرسوں کالج کے بوتھ میں ووٹ پڑیں گے۔ اپنے سارے لڑکے اس دن ضرور آنا چاہئیں، میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اس دفعہ یہ سیٹ اپنی ہی ہونا ہے۔"

"نشچنت رہیں پردھان جی۔ کئی دن پہلے سے بات کر چکا ہوں۔ کالج کی تو اس دن چھٹی ہو جائے گی پر اپنے سارے لڑکے یہاں موجود ہوں گے۔ کیمپ پر بھی بیس پچیس لڑکا موجود ہوگا۔ کوئی چنتا نہیں کریں آپ۔"

ارشد نے ساری باتیں حفظ کر لیں۔ چچا کو بتاؤں گا کہ پردھان ماساب اور یادو ماساب میں کیا کیا باتیں ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں چچا کون سی پارٹی کا الیکشن لڑا رہے ہیں۔ ابا تو ان سے اتنا منع کرتے ہیں لیکن وہ مانتے نہیں ہیں۔ ہمیشہ الیکشن میں آگے آگے رہتے ہیں۔

کھڑکی کے باہر گیہوں کے کھیتوں سے پرے ببول کے درختوں کے

ادھر ادھر کے میدان کے دوسری طرف نالا پار کر کے گاؤں آتا ہے۔ وہاں ایک تالاب ہے جس میں بے حیا کی بہت سی جھاڑیاں ہیں۔ اور ان جھاڑیوں کے پاس پانی میں جاڑوں کے پرندے رنگ برنگے، نیلے، سفید، ہرے، پیلے اور گلابی پروں والے پرندے رات کو آکر سو جاتے ہیں۔ چچا اور چچا کے ساتھی آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جاتے ہیں اور پھر بندوق اٹھاتے ہیں اور پھر... میں چچا کو الیکشن والی بات ضرور بتاؤں گا۔ کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ارشد" چھوٹی سی شال پہنے گلابی ہونٹوں والی لڑکی نے اس کا نام پکارا۔ اس کے منہ سے اسے اپنا نام اچھا لگا۔

ارشد نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی شال کو دیکھا۔ اسے اچانک غزالہ آپا کی شال یاد آئی۔

کتنی گرمی نکلتی ہے غزالہ آپا کے بدن سے۔

ارمل اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی طرف اسے یوں دیکھ کر وہ بولی۔

"کیا بات ہے ارشد۔ آج ناشتہ نہیں بانٹو گے؟"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ چونک سا پڑا۔ "چلو کیا ماساب خود بلا رہے ہیں۔" اس نے ارمل کے چہرے پر "ماساب خود بلا رہے ہیں" والے جملے کا تاثر دیکھا۔

"ہاں۔ سب نے اپنے اپنے کلاس کا بانٹ دیا۔ ہمارا ہی کلاس رہ گیا ہے۔ جلدی سے چلو۔"

باہر نکلا تو ڈوری لال سامنے کھڑا تھا۔ وہ ارمل کے ساتھ ڈوری لال کے برابر سے گذرا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹھٹکا۔

"ڈوری لال ناشتہ لینے چلو۔ ماساب نے ناشتہ بٹوانے کے لئے ارمل کو بھیج کر ابھی ابھی مجھے بلایا ہے۔"

پڑھا کو ڈوری لال کے چہرے پر ارشد کو وہ جلن نظر نہیں آئی جسے دیکھنے کے لئے اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ وہ بیزار بیزار سا ارمل کے ساتھ ناشتہ بانٹنے چل دیا۔

"چچا میاں۔ پرسوں ووٹنگ ہوگی؟" اس نے بندوق صاف کرتے ہوئے چچا سے پوچھا۔

چچا نے بندوق کی نال کے اندر سے جھانک کر باہر دیکھا۔ نیلے چمکدار فولاد کے دائرے اندر سے جھل مل جھلمل کر رہے تھے۔ "ہاں۔"

"چچا میاں! ایک بات بہت ہی خاص بات بتاؤں۔"

چچا نے اپنے بھتیجے کی "ایک بہت ہی خاص بات" سننے کے لئے اس کی طرف چہرہ موڑ لیا۔

پردھان جی آج یادو ماساب سے کہہ رہے تھے... مگر چچا میاں آپ پھر ہمیں شکار میں لے چلیں گے۔"

"پہلے بات تو بتاؤ کیا کہہ رہے تھے پردھان جی یادو سے؟" چچا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

ارشد نے سہم کر پوری بات بتا دی۔

چچا سوچ میں پڑ گئے۔

اللہ کرے یہ کوئی خاص بات ہو۔ اللہ کرے چچا خوش ہو کر مجھے شکار میں لے چلیں۔ اللہ کرے یہ کوئی بہت ہی خاص بات ہو۔

"چچا میاں شکار کو آپ چلیں گے؟"

"بھاڑ میں گیا شکار۔ آج کل ویسے بھی دفعہ ۱۴۴ لگی ہے۔ کیا یادو نے یہ بھی کہا تھا کہ کیمپ پر لڑکے لگائے گا۔" چچا میاں بہت غصے میں نظر آ رہے تھے۔

"ہاں چچا میاں۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ حالانکہ دل بہت چاہ رہا تھا کہ پوچھے کہ کیمپ کیا ہوتا ہے اور دفعہ ۱۴۴ کیسے لگتی ہے اور دفعہ ۱۴۴ لگنے سے شکار پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیمپ پر لڑکے کھڑے ہوں تو ووٹنگ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور شکار میں مجھے لے جانے سے چچا میاں آپ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ میرا ایرگن کا نشانہ کتنا اچھا ہے۔ آپ کے سارے ساتھیوں سے اچھا ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔

یہ سب بڑے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسے شکار اور کھیل کود کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بس وہ دن بھر ادھر ادھر کی کتابیں پڑھے گا۔ اگر اسے شوق ہوتا تو اسے شکار میں ضرور لے جاتے چچا میاں۔ پھر مجھے بھی لے جایا کرتے۔ اب تو یہ سوچتے ہیں کہ بڑا نہیں جاتا تو ارشد کیسے جا سکتا ہے۔

یہ بڑا ہر جگہ پریشانی پیدا کرتا ہے۔

بڑے نے آ کر کہا۔

"اماں چائے پینے بلا رہی ہیں۔"

"آخر تمہیں شکار کا شوق کیوں نہیں ہے؟ نہ تم کوئی کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔ کیا میں ہی سب کام کیا کروں۔ تم بڑے ہو کر شکار کا شوق نہیں کرتے۔ اور ہر وقت کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔ امی کیا خود آواز نہیں دے سکتی تھیں چائے کے لئے۔"

بڑے نے حیرت سے ارشد کی طرف دیکھا اور سوچا کہ میں پرسوں دن بھر مزدوروں کے ساتھ لگا رہا۔ ٹوٹے کھمبوں اور دیواروں کی مرمت کراتا رہا۔ ارشد نے وہ تو نہیں دیکھا اور یہ دیکھ لیا کہ مجھے کھیل کود کا شوق نہیں ہے۔ میں علم حاصل کرنے کیلئے کتابیں پڑھتا ہوں۔ ارشد نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی۔ اگر میں کھیلنے لگ جاؤں تو پڑھائی میں گول ہو جاؤں گا۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی بہن پر بہت اثر پڑتا ہے۔ میں اگر پڑھائی میں خراب رہا تو ارشد اور رضیہ کا کیا ہوگا۔ سب کچھ ارشد اور رضیہ کے فائدے کے لئے کرتا ہوں۔ اور پھر الٹا ان ہی سے سننا پڑتا ہے۔ ایک تو اپنی چائے چھوڑ کر آیا۔ اوپر سے، ایسی باتیں بھی سننا پڑیں۔

"ارشد۔ اماں چائے کے لئے بلا رہی ہیں۔" بڑا لڑائی کے موڈ میں نہیں تھا۔

"مجھے نہیں پینا چائے وائے۔ تم مجھ سے بولا بھی مت کرو اور امی کی خوشامد میں لگے رہا کرو۔" وہ جھنجھلا گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بڑا اس سے کوئی سخت بات کہے تو وہ بھی خوب خوب سنائے لیکن بڑا تو فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

چالاک۔

وہ پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب امی خود چائے لے کر آئیں گی۔ اگر نہیں آئیں تو؟ یہ سوچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔

کندھے پر ہاتھ رکھ کر کسی نے چائے کی پیالی اس کے پلنگ پر رکھ دی۔ اس نے کن انکھیوں سے پیالی رکھنے والی کے ہاتھ دیکھے اور خوش ہو گیا۔

مگر یہ کیوں نہیں بتاتیں امی کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہیں۔ ایک دفعہ اگر میرا نام لے لیں تو کیا بگڑ جائے گا۔ کیا اماں کو معلوم نہیں کہ جب میں مکتب بھی نہیں جاتا تھا اور اماں کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور بڑے کو اور مجھے اماں کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تین دن تک اماں اندر والے کمرے میں لیٹی رہی تھیں۔ بوا اور بڑی اماں ہر وقت اماں کے پاس جمی رہتی تھیں۔ اس وقت میں باہر جا کر گلی میں کھڑے ہو کر کتنا رویا کرتا تھا۔ ابا مجھے پکڑ پکڑ کر لے آتے تھے اور سمجھاتے تھے اب تمھارے کھیلنے کے لئے ایک کھلونا آنے والا ہے۔ تم درگاہ شریف میں جا کر دعا کیا کرو کہ تمھاری اماں ٹھیک رہیں اور آنے والا سلامت رہے۔

میری سمجھ میں اس وقت یہ باتیں نہیں آتی تھیں پھر بھی میں درگاہ شریف میں جا کر کتنی ہی دیر دعائیں مانگتا تھا۔ بڑا تو اس وقت بھی اماں کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ بس ہر وقت پانی گرم کر کے اماں کے کمرے میں پہنچایا کرتا تھا۔ یا ڈاکٹر کو بلانے رحمت علی کے ساتھ اسپتال چلا جاتا تھا۔ ایک بھی دعا نہیں کی اس نے۔ پھر جب رضیہ آ گئی تو میں نے اماں کو بتایا کہ اماں میں نے درگاہ پر بہت دعائیں کی تھیں تو اماں نے یہ سن کر مجھے اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ میری دیکھا دیکھی بڑے نے بھی اماں سے کہا تھا کہ اماں ڈاکٹر کو بلانے میں جایا کرتا تھا۔ تو اماں نے اسے بھی پیار کیا تھا۔ بڑا تو ہمیشہ سے مجھ سے جلتا ہے خاص طور سے اماں کی ہر بات میں مجھ سے برابری کرتا ہے۔ ڈاکٹر کو بلانے والی بات اس وقت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

"چائے پی لو۔" اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا۔ بڑا بھی آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ارشد عید پر اب کی دفعہ دھاریوں والی قمیص سلوا لیں ہم دونوں۔" بڑے نے بہت سہمے سہمے انداز میں کہا جیسے وہ تعلقات خوشگوار کرنا چاہتا ہو۔

"ہاں۔" وہ اب لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"ارشد۔ دیوالی کی چھٹیوں میں ماموں کے ہاں چلیں گے۔ ابا بھی کہہ رہے تھے کہ تم لوگ ہو آؤ۔" بڑے نے اس کی رضامندی چاہی۔

اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ نانا کے مرنے کے بعد اماں نے اپنے گھر جانا بہت کم کر دیا تھا۔ ارشد کو بھی اب وہاں زیادہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماموں ہر وقت کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہر وقت پڑھائی لکھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک نانا تھے کہ ہر وقت گھماتے تھے۔

ارشد نے نانا کو یاد کیا اور بڑے سے کہا۔

"نانا کتنی چیزیں کھلایا کرتے تھے۔"

"ہاں۔" یہ پہلا جملہ تھا جو اتنی دیر میں ارشد نے خود مخاطب ہو کر سہمے سہما سا بولا تھا۔

ارشد نے بڑے کو غور سے دیکھا پھر اماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے سوچا کہ بڑا جل رہا ہوگا۔

"اماں۔ اب تم جلدی سے اٹھ مت جانا۔ کھانا پک چکا ہے۔ اور اب کوئی کام بھی نہیں ہے۔ میں کچھ دیر ایسے ہی لیٹوں گا۔ مجھے آرام مل رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر بڑے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہو کر نانا کو یاد کرنے لگا۔

دن بھر اسکول کرنے کے بعد اور اتنا لڑنے کے بعد اب اس کا ذہن تھک گیا تھا۔ بدن میں بھی تکان سی محسوس ہو رہی تھی۔ اماں کی نرم نرم گود میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بڑا دل ہی دل میں جل رہا ہوگا۔ آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا جب تو رضیہ بھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھائی اماں کے ساتھ جب ننھیال میں اترتے تھے تو نانا کتنے خوش ہوتے تھے۔ فوراً اپنی کتاب لے کر پیسے نکالنے ڈاک خانے چلے جاتے تھے۔ وہاں سے واپس آ کر مجھے ایک جھٹکے میں اٹھا کر اپنی گردن پر بٹھا لیتے تھے۔ میں ان کی ٹوپی پہ ہاتھ رکھے ان کی گردن پر بیٹھا بیٹھا گلیوں گلیوں گھومتا تھا۔ وہ رک رک کر اپنے شناساؤں کو بتاتے تھے کہ کملی اور اس کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ گرمیوں بھر یہیں رہیں گے پھر ان کے باپ آ کر انھیں لے جائیں گے۔ پھر وہ ندی پر لے جاتے تھے۔ مجھے اور بڑے کو ندی کے اندر لے جا کر نہلاتے تھے۔ ندی میں زیادہ پانی نہیں ہوتا تھا۔ وہ پانی پر تیرتے تیرتے ایک دم ایسے لیٹ جاتے تھے جیسے ان کے اندر سانس ہی نہیں ہے۔ ہمیں کنارے پر ہی بتا دیتے تھے کہ جب سانس روک لوں تو تم دونوں میری ٹانگیں پکڑ کر کنارے پر کھینچ لانا۔

ہم دونوں ان کی ٹانگیں پکڑ کر انھیں کنارے پر لے آتے تھے۔ ان کے ہوتے ہمیں پانی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ البتہ کوئی مچھلی ہمارے بدن سے ٹکرا جاتی تو ہم چیخ کر ان سے لپٹ جاتے تھے۔ وہ پانی میں ہی ہمیں زور سے لپٹا لیتے تھے۔ پانی میں ان کا بدن اتنا ہلکا ہو جاتا تھا۔

وہ کنارے پر آ کر ہم دونوں کو وضو کراتے پھر ہم ان کے پیچھے چھوٹے موٹے نماز پڑھتے۔ بڑا بتاتا ہے کہ وہ سچ مچ پڑھتا تھا۔ مجھے تو بس کلمہ یاد تھا۔ وہ پڑھتا رہتا تھا اور جیسے نانا کرتے ویسے میں بھی رکوع میں "رکوع رکوع" اور سجدے میں "سجدہ سجدہ" پڑھتا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ ندی کے اس پار بہت دیر تک دیکھتے رہتے اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دعائیں پڑھتے رہتے۔ پھر دعائیں پڑھ کر ہمارے اوپر دم کرتے۔ ہم لوگ ان کے سینے سے لگے لگے چپ چاپ ندی کے کنارے بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ بڑا ان سے وجہ پوچھتا تو وہ بتاتے کہ تم لوگ آتے ہو تو خوش ہو جاتا ہوں لیکن تمھارے جانے کے خیال سے دل بھر آتا ہے۔ "دل بھر آتا" ہم نے ان کی زبان سے ہی پہلی بار سنا تھا۔ اماں نے بتایا تھا کہ مطلب ہے رونے کی حالت۔ اماں نے پوچھا کہ نانا نے ایسا

کیوں کہا تھا۔ جب ہم نے بتایا تو وہ اداس ہوگئی تھیں۔ پھر انھوں نے ہمیں بتایا کہ نانی کے انتقال کے بعد نانا اکیلے رہ گئے ہیں۔ ماموں دوسرے شہر میں ملازمت کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کے آنے سے دوسراہٹ ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں کے جانے کے بعد پھر تنہائی ہو جاتی ہے۔ اسی خیال سے ان کا دل بھر آتا ہے۔ شاید ان کو تمھاری نانی بھی یاد آتی ہوں۔

ایسا ہی ایک دن تھا۔ نانا نے ظہر کی نماز پڑھ کر ندی کے دوسرے کنارے پر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر سفید اور رنگ برنگے بے شمار کپڑے پڑے سوکھ رہے تھے۔

نانا نے اچانک بڑے سے پوچھا۔

"دیکھو سامنے جو کپڑے سوکھ رہے ہیں ان میں تمھیں کون سا رنگ پسند ہے؟"

بڑے نے غور سے ادھر دیکھا۔

"وہ والا" بڑے نے اشارے سے بتایا تھا۔

"وہ نیلا والا آسمانی؟" نانا نے پوچھا۔

"ہاں نانا۔"

"اور تمھیں کون سا اچھا لگتا ہے ارشد بیٹے؟"

میں نے سامنے کنارے پر پھیلے ہوئے بے شمار کپڑوں کو دیکھا۔ سرخ، نیلے، پیلے، سبز اور سفید بے شمار کپڑے پڑے سوکھ رہے تھے۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کون سا رنگ پسند ہے۔ بہت سے رنگ اچھے لگ رہے تھے۔ میں غور سے ادھر دیکھتا رہا۔

"بولو ارشد تمھیں کون سا پسند ہے رنگ؟"

دھوپ کی کرنیں ایک دوپٹے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کا رنگ دھوپ سے اور بھی کھل اٹھا تھا۔ وہ دوپٹہ دوسرے دوپٹوں سے الگ پڑا سوکھ رہا تھا۔

"وہ والا نانا! وہ جو ببول کے کنارے دوپٹہ سوکھ رہا ہے وہ۔ اس کا رنگ کون سا ہے؟"

"تو تمھیں اس کا رنگ بھی نہیں معلوم اور کہہ رہے ہو کہ اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن بھائی ہے تو واقعی بہت اچھا رنگ۔ اس رنگ کو شاید دھانی رنگ کہتے ہیں۔ دھان کی بالیوں جیسا رنگ ہلکا سبز رنگ۔ ایک اور طرف سے دیکھو تو کچھ کچھ گلابی جیسا لگتا ہے یا شاید پیازی۔ یا شاید کوئی اور نام ہو۔ ہم تو رنگ اور نام سب بھول گئے۔" وہ جانے کہاں کھو جاتے تھے۔

میں اس دوپٹے کو غور سے دیکھتا رہا۔ اچانک ہوا زور سے چلی۔ کپڑوں پر جو کنکر پتھر رکھے تھے وہ لڑھکنے لگے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ دوپٹہ ہوا کے زور سے اڑتا لہراتا ہوا ندی کے کنارے کھیتوں میں جا کر کہیں کھو گیا۔

ہم تینوں اسے چپ چاپ ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ مجھے رونا سا آیا۔ میری پسند کا دوپٹہ اڑ گیا اور کوئی کپڑا غائب نہیں ہوا۔ حالانکہ باقی بھی کپڑے ادھر ادھر بکھر گئے تھے مگر غائب کوئی نہیں ہوا تھا۔

میں نے نانا کی طرف روہانسی نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک فضا میں ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ ان میں آنسو تھے۔

"نانا میرا والا رنگ اڑ گیا۔ کیا وہ کھو گیا؟"

"ہاں بیٹے۔" بے وقت ہوا چلے تو رنگ ایسے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔"

"ہوا کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے نانا۔" بڑے نے جو ادھر ہی دیکھ رہا تھا، پوچھا۔

"ہاں بیٹے ہوا کا وقت ہوتا ہے۔ صبح جب دھوپ نرم ہوتی ہے تو اس وقت ہوا اگر تیز چلے تو وہ بے وقت ہوا نہیں ہوتی۔ اس وقت سب اس کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ دوپہر کو دنیا بھر کے کاموں میں آدمی الجھ جاتا ہے، بھول جاتا ہے کہ رنگین کپڑوں کو دبائے رکھنے کے لئے ان پر بوجھ رکھا ہے کہ نہیں۔ اس وقت ہوا چلے تو وہ بے وقت ہوا ہوتی ہے۔ ہاں جب شام چھائے اور رات قریب آجائے اور پھر تیز ہوائیں چلیں تو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کپڑوں کی لادی اس وقت تک باندھ لی گئی ہوتی ہے۔ ساری پوشاکیں سمیٹی جا چکی ہوتی ہیں۔ سارا کام مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔" نانا ندی کے بہتے پانی کو دیکھ کر ہولے ہولے بتاتے رہے۔

اور ارشد آنکھوں میں آنسو بھرے اس کنارے پر اس جگہ کو تکتا رہا جہاں وہ دوپٹہ سوکھ رہا تھا۔ ہوا چل تھمی۔ آسمان کے نیلے پس منظر میں تیز ہوا کے کندھوں پر دوپٹہ دھوپ میں چمک رہا تھا، اڑ رہا تھا، کھو رہا تھا۔ اور پھر کھو گیا تھا۔ کھوئے کھوئے سے پراسرار رنگ کا دوپٹہ کھو گیا تھا۔

"نانا! او نانا!" ارشد نے ہولے سے پکارا۔

"ہاں بیٹے۔" نانا نے اپنے ننھے سے نواسے کو دیکھا جس کی چمکدار موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی جھلک آئی تھی۔ وہ نانا سے لپٹ گیا۔ "میں وہ رنگ پھر دیکھوں گا۔"

نانا اس کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"میں اس رنگ کو ٹھیک سے دیکھ ہی نہیں پایا نانا۔ وہ کس رنگ کا تھا نانا۔ مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔"

"اس کنارے پر ہوتا تو لا دیتا بیٹا۔ اس کنارے پر ہے۔ کیسے لاؤں۔ اور پھر وہ تو دوسرے کا ہے۔ معلوم نہیں کس کا ہو؟"

"نہیں نانا لا کر دو۔ وہ کسی کا بھی ہو مجھے لا کر دو نانا۔ میں کچھ نہیں جانتا میں تو وہی لوں گا چاہے کسی کا ہو نہیں تو میں رونے لگوں گا۔"

"روؤں گا کیا رو تو رہے ہو۔" بڑے نے اس کی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

"بڑے تم مت بولو۔ نانا وہ دوپٹہ لا دو۔"

نانا نے اسے لپٹا کر ندی میں بہتے پانی کو دیکھا اور کہا۔

انتظار کرو ارشد بیٹے۔ کبھی نہ کبھی وہ رنگ دیکھنے کو مل ہی جائے گا۔ اس رنگ کے دوپٹے کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ہیں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ایک آدمی آئے گا

اور تمھیں وہ دوپٹہ دے جائے گا۔"

"سچی نانا۔" بڑے نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" نانا نے ارشد کے رخساروں کو چوم کر کہا تھا۔ "چلو اب گھر چلیں۔ تمھاری ماں رستہ دیکھتی ہوگی۔"

جب وہ واپس آنے لگے تو ندی کا پانی ویسے ہی بہہ رہا تھا۔ آسمان اسی طرح سر پہ کھڑا تھا اور زمین پہلے ہی کی طرح بیزار بیزار سی لیٹی ہوئی تھی۔ ارشد نے مڑ کر دیکھا۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں ببول کا پیڑ کھڑا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی اور ببول کے پاس وہ جگہ بالکل خالی پڑی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے ہوا چلنے سے پہلے دور تک چمک رہا تھا۔ وہ جہاں تک دیکھ سکا، مڑ مڑ کر اس جگہ کو دیکھتا رہا۔ نانا کن انکھیوں سے اسے دیکھتے رہے۔

جب ارشد اور بڑا سو گئے تو نانا نے امی سے کہا۔

"منجھلی ارشد بہت حساس ہے اس کا خیال رکھا کرو۔"

"کیا ہوا۔ آج کچھ کہا اس نے۔"

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر بھی مجھے بتایئے تو۔"

بوڑھے باپ کی بیٹی نے آٹے سے سنا ہوا ہاتھ سر پہ رکھ کے پوچھا۔

نہیں۔ کچھ باتیں صرف مردوں کو ہی سمجھ میں آپاتی ہیں۔ بس تم اس کا خیال رکھا کرو۔"

بیٹی حیران حیران بوڑھے باپ کو دیکھتی رہی۔ ارشد کو سب یاد تھا۔ اس دن وہ سویا نہیں تھا۔ صرف آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

"اب ارشد سو گیا ہے۔ اماں اٹھ جاؤ اگر کوئی کام ہو تو۔"

بڑے کی آواز کانوں میں آئی۔

جی نہیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔ بیٹھا کیوں نہیں رہنے دیتے اماں کو میرے پاس۔"

"نہیں ارشد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ شاید اماں کو کوئی کام ہو۔ تو ارشد دیوالی کی چھٹیوں میں ننھیال چلو گے نا؟"

"اس دفعہ نہیں۔ پی ٹی والے ماں ساب نے کہا ہے کہ دیوالی کی چھٹیوں میں ضلع میں دوڑ کی ریلی ہوگی اس میں سب کو جانا ہے۔"

شام کو غزالہ آپا آئیں۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ پلنگوں پر گدے لگا کر پائینتی لحاف رکھے جاچکے تھے۔ ارشد بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا۔

"ارشد۔ چلو آنکھ مچولی کھیلیں۔"

ارشد نے آنکھ مچولی کے نام پر ایک میٹھی سی چبھن محسوس کی مگر اماں کی بات یاد آئی۔ اس نے غزالہ آپا کی شال کو دیکھ کر اپنی انگلیاں دیکھیں اور دھیمے سے بولا۔

"غزالہ آپا اماں منع کرتی ہیں کہ آپ کے ساتھ نہ کھیلا کروں۔"

"کیوں منع کرتی ہیں ارشد؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ کچھ شرما سا گیا۔ "وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اب تم غزالہ کے ساتھ اندر والے کمرے میں نہیں جاؤ گے۔"

"اللہ قسم؟" وہ ایک دم سفید پڑ گئیں۔ "ایں ارشد تم نے ان سے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"کھاؤ قسم۔"

"خدا کی قسم کچھ نہیں کہا۔"

غزالہ آپا نے ادھر ادھر دیکھ کر جلدی سے اسے لپٹا لیا۔

ان کی شال میں چہرہ چھپا کر اسے بڑا اچھا لگا۔ مگر آج غزالہ آپ نے صرف اس کے ماتھے پر چوما اور جلدی سے الگ ہو گئیں۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اور دیر تک لپٹائے رکھے۔ مگر وہ شرم کے مارے کچھ کہہ نہیں سکا۔

"میں جا رہی ہوں۔ روٹی پکانا ہے۔" وہ چلی گئیں۔

اماں نے آ کر پوچھا۔

"غزالہ آئی تھی؟"

"ہاں اماں۔"

"کیا کہہ رہی تھی۔"

"کچھ نہیں اماں پوچھ رہی تھیں کہ تمھارے پاس کوئی بڑا سا کاغذ ہے کاپی پر کور چڑھاؤں گی۔" اس نے نہایت سکون سے جھوٹ بولا۔

"اچھا۔" اماں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ارشد نے اماں کو جاتے دیکھا اور سوچا کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ایسی ہے جو غلط ہے۔ کہیں خدا نہ کرے غزالہ آپا وہ جادوگرنی تو نہیں ہیں جو اندھیرے میں بچوں کو لے جا کر مینڈک بنا دیتی ہیں۔

نہیں نہیں غزالہ آپا جادوگرنی تو ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ جادوگرنی کے پیر تو الٹے ہوتے ہیں۔ مگر الٹے پیر تو چڑیل کے ہوتے ہیں لیکن غزالہ آپا مجھ سے اتنے پیار کیوں کراتی ہیں۔ پھر اتنی زور زور سے سانس کیوں لینے لگتی ہیں۔ ان کا چہرہ سرخ کیوں ہو جاتا ہے اور۔ بس اس کے آگے وہ سوچتا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ رحمت علی کے مکان پر جھک کر امرود کی شاخ پر سے اچک اچک کر سارے کچے پکے امرود توڑنے اور دانت گڑا گڑا کر سارے امرود کھا جائے۔ کاپی پر دائرہ بناتے بناتے اس نے اتنی زور سے پنسل چلائی کہ نوک ٹوٹ گئی۔ اس نے کٹر نکال کر دوبارہ پنسل بنانا شروع کی۔

ودنگ کے دوسرے دن چچا بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس دن ارشد کو خوب ٹافیاں لا کر دیں اور یہ بھی کہا کہ وہ جب آٹھویں پاس کرے گا تو اسے شکار میں لے جایا کریں گے۔

"مگر چچا میاں۔ اتنے دن بعد... ابھی کل ہی چلیے۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔" چچا نے ہلکی سی سختی کے ساتھ کہا۔

کالج میں پردھان ماساب اور یادو ماساب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

سردیاں اب جم کر پڑنے لگی تھیں... رات کو چچا میاں صبح کو شکار کا پروگرام بنا رہے تھے۔

"دیکھو بھئی۔ صبح یادو کے گاؤں والے راستے سے نہیں جانا ہے۔ بدتمیز لونڈے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نیل گائے مارنے پر وبال کھڑا کردیں۔ کچے دگڑے والے راستے سے چلیں گے۔ میدان میں نیلے مل گئے تو ٹھیک۔ نہیں تو تالاب پر پہنچ کر چڑیا دیکھیں گے۔"

"چچا میاں میں بھی چلوں گا۔ کل اتوار ہے۔"

"نہیں میاں تمہیں کئی بار منع کرچکا ہوں کہ ابھی نہیں تم اس قابل نہیں ہوئے کہ میدان میں شکار کھیلنے جاؤ۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا آیا اور پلنگ پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ رات کے آخری پہر اس کی آنکھ کھلی۔ بجلی نہیں تھی۔ لال ٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ آنگن سے نکل کر چچا اور چچا کے ساتھی شکار کو جا رہے تھے۔ اندھیرے میں وہ بہت رعب دار اور ہیولے جیسے لگ رہے تھے۔ بندوقیں اور تھیلے ان کے ہاتھ میں تھے۔

اب صبح ہوگی۔ پھر کہرا صاف ہوگا۔ بے حیا کی جھاڑیوں کے پاس چچا کھڑے ہوں گے۔ تالاب میں رنگ برنگے پرندے ہوں گے۔ چچا بندوق اٹھائیں گے... میں کتنے دن بعد بڑا ہو پاؤں گا۔ اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے سوچا۔

صبح ناشتے پر اس کی اماں اور بڑے سے خوب تکرار ہوئی۔ کالج میں کلاس ختم ہونے پر بھی وہ نہیں اٹھا۔ آج وہ ناشتہ بانٹنے بھی نہیں گیا۔ اس نے سیکنڈ مانیٹر سے کہہ دیا کہ ناشتہ بانٹ دے۔

وہ ڈیسک پر سر رکھے، آنکھیں بند کئے کھیتوں میں بھاگتا رہا۔ اب پاشی کئے گئے گیلے کھیت جن میں گیہوں اب گھٹنوں گھٹنوں کھڑا تھا۔ پھر پگڈنڈی پر آکر اس نے دوڑ لگائی اور ٹیلے کی طرف نظر اٹھا کر دوڑتے ہی دوڑتے دیکھا۔ اسے لگا جیسے ٹیلہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے اور ٹیلے پر چرتی سفید بھیڑیں ٹیلے پر ساکت ہوگئی ہیں۔ آسمان پر اڑتی ہوئی چیلیں اسے بہت پاس نظر آئیں۔ گیہوں کے کھیتوں سے نکل کر پگڈنڈی پر دوڑ لگاتا ہوا وہ میدان میں پہنچا۔ میدان سے نکل کر اس نے نالے کی پلیا پار کی۔ پلیا کے ادھر والا گاؤں دیکھتا ہوا وہ تالاب کے پاس پہنچا۔ تالاب کے کنارے بے شمار جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیوں کے اس طرف نیلے، سرخ، ہرے اور سفید پرندے تیر رہے تھے۔ اس نے بندوق اٹھائی۔ سر جھکایا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں آہستہ آہستہ چلا۔ سر اٹھایا۔ بندوق تانی اور جیسے ہی فائرنگ کرنے کے لئے لبلبی دبائی۔ چچا میاں نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ اس لائق نہیں ہو کہ میدان کے شکار میں جا سکو۔ وہ ایک دم رو پڑا۔

"چچا میاں۔ آپ بندوق چلوا کر دیکھ لیجئے میں شکار کرسکتا ہوں۔"

"تم کیوں رو رہے ہو ارشد۔ تم نے آج ناشتہ بھی نہیں بانٹا۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ارل کھڑی تھی۔ آج اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کے گلابی چہرے کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور سرخ دوپٹہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے گیلی گیلی دھندلی دھندلی آنکھوں سے ارل کی طرف دیکھا۔ اسے لگا وہ اسے بہت دور سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے بے حیا کی جھاڑیوں کے پار پرسکون تالاب میں اکیلی شیرازی قاز تیرتے تیرتے رک گئی ہو۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ارل کے بالوں کو چھوا جیسے اس شیرازی قاز پر بندوق اٹھائی ہو۔

مگر یہاں اس کے ہاتھ سے بندوق نہیں چھینی گئی۔ ارل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا بات ہے ارشد۔ میرا سر کیوں چھوا تم نے؟"

"ایسے ہی ارل۔" آج اس نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ "تمہارے بال بہت سارے ہیں۔"

"ہاں اماں بھی یہی کہتی ہیں۔" اس نے بھولے پن سے کہا۔

اس کا دل چاہا کہ ایک بار پھر ارل کے بالوں کو چھوئے اور ارل اس سے پھر کہے کہ تم نے میرے سر کو کیوں چھوا۔ اس نے پھر اس کے بالوں کو چھوا۔ اسی طرح وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ دیر تک آنکھیں بند کئے وہ ہنستی رہی۔

"تمہیں معلوم ہے ارشد۔ پاپا جی کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ ہم لوگ پرتاپ گڑھ جا رہے ہیں۔"

"ہ ئیں۔ تم بھی چلی جاؤ گی کیا؟"

اے لو۔ سبھی جائیں گے۔ ہمارا وہاں جاتے ہی داخلہ ہوجائے گا۔ اپنی 'انگ گرٹ' کی کاپی دے دینا کل تک۔ سارا پہلا والا ہوم ورک پورا کرلوں گی۔" اس کی موٹی موٹی آنکھیں اپنے سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔

"لے لینا۔ تم پھر یہاں آیا کرو گی کہ ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ گی؟" ارشد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اب پاپا بڑے کوتوال ہوگئے ہیں۔ یہاں کا تھانا چھوٹا ہے۔ یہاں اب نہیں آئیں گے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے دھیمے دھیمے بولی۔

ارشد نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ سے کوئی چیز اتری ہے جو ماتھے اور آنکھوں کے بیچ کہیں اٹک گئی ہے، نیچے نہیں اتر رہی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیز نیچے اتر جائے لیکن وہ وہیں اٹکی رہی۔ تب وہ اندر ہی اندر جانے کس پر غصہ ہوا۔

یہ کیسی عجیب لڑکی ہے۔ یہ بالکل بیوقوف لڑکی ہے۔ یہ 'رکھا گرٹ' بھی نہیں کرسکتی۔

"تم نے مجھے فٹ بال کھیلتے دیکھا ہے؟" اس نے ارل سے پوچھا۔

"نہیں میں کبھی گراؤنڈ پر گئی ہی نہیں۔ لڑکیاں جاتی کہاں ہیں وہاں۔"

وہ چپ رہا پھر بولا۔

"آج چچا شکار پر گئے تھے۔ مجھے بھی لے جا رہے تھے لیکن میں نہیں گیا۔ مجھے اسکول کا کام کرنا تھا۔ میں تالاب کے کنارے کنارے کھڑے ہو کر ایک ہی فائر میں بہت سی چڑیاں مار سکتا ہوں۔ اور فٹ بال میں پچھلے میچ میں اکیلے تین گول مارے تھے۔"

"اچھا۔" ارل نے اس کی بے تکی باتوں پر بے سمجھے بوجھے کہا۔

"آج میرے بڑے بھائی کو خوب ہی ڈانٹ پڑی۔ وہ ہر چیز میں ہی میری برابری کرتے ہیں۔ آج اماں نے صبح ناشتے میں سارا حلوہ مجھے دے دیا تھا بس اسی بات پر وہ جل گئے تھے۔ اماں سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے؟"

"میری تایا جی بھی ہم بھیا کو بہت چاہتی ہیں۔" اس نے خالی خالی سپاٹ آواز میں کہا جیسے کوئی سبق دہرایا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر اپنا سر ڈیسک پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا بات ہے ارشد۔ تمہیں بخار ہے کیا۔" اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑا۔

"بخار تو نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب نے ڈانٹا ہے؟"

"نہیں تو۔" اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"اے ارل تم سچ مچ کل چلی جاؤ گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں کل ٹرک آئے گا۔ بابا جی کہہ رہے تھے کل چار بجے ہم سب چلے جائیں گے۔ میں تین بجے تک سارا کام پورا کر لوں گی تم آج شام تک مجھے اپنی کاپیاں دے دو گے؟"

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اسے حیرت اور محبت سے تکتی رہی۔ پھر اس کے بالوں کو جھنجھوڑ دیا۔ ڈب ڈب کر کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں چمکے۔

"ارے کیا تم رو رہے ہو۔ تمہارے چچا جی نے ڈانٹا تھا کیا آج؟"

"نہیں تو۔" وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "ارل میں ریکھا گزٹ اور اٹک گزٹ کی کاپیاں دوسری کاپیوں پر اتار کر تمہیں دے دوں گا۔ تم کو نقل نہیں کرنی پڑے گی۔ کل جاتے وقت تک میں اتار کر تمہیں دے دوں گا۔"

"سچی۔" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "تب تو میں ڈوری لال کی کاپی سے اتہاس بھی اتروا لوں گی۔"

ارشد کو دھکا سا لگا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس نے سوچا میں کچھ کہوں گا تو ارل سمجھے گی میں ڈوری لال سے جلتا ہوں جیسے میں سمجھتا ہوں کہ بڑا اسی کے معاملے میں مجھ سے جلتا ہے۔

وہ جانے کے لئے مڑی تو اس نے پکارا۔

"ارل!"

"کیا بات ہے۔"

"کلاس میں سب سے اچھی رائٹنگ کس کی ہے"

"تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔" سفید لباس پہنے اس چھوٹی سی لڑکی نے سرخ دوپٹے کو گلے میں لپیٹ سے لپیٹا اور سرد ہوا میں باہر نکل گئی۔

تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔

تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔

اس نے چھم چھم کرتی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر کھیتوں کو دیکھا، دیر تک دیکھا اور چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ کل یہ چلی جائے گی۔

کالج سے واپسی پر وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ بڑے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ آج ارشد کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ بڑا کچھ کہے تو وہ اس سے لڑنا شروع کر دے۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلی بار براہ راست ابا سے اٹھنی روپے مانگے۔ دو کاپیاں خریدیں اور پلنگ پر بیٹھ کر 'اٹک گزٹ' اور 'ریکھا گزٹ' اتارنے لگا۔ رات گئے تک وہ کام کرتا رہا۔ اماں نے سونے کو کہا تو کہہ دیا کہ ششماہی امتحان قریب آ گئے ہیں۔ ماسٹر صاحب زیادہ زیادہ سوال دے رہے ہیں۔ دوسرے دن کالج میں ارل نہیں آئی تھی۔ اس نے کالج سے باہر کھڑے سپاہی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تھانیدار صاحب چار بجے یہاں سے ٹرک میں سامان لدوا کر نکلیں گے۔ میں ٹرک کا ہی انتظار کر رہا ہوں۔

"ارل کیا کر رہی ہے گھر پر؟"

"بٹیا اسکول کا کام کر رہی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ارشد آئے تو اسے گھر بھیج دینا۔"

وہ ارل کے گھر نہیں گیا۔

کالج ختم ہونے پر باہر بنچ پر بیٹھ گیا۔ بڑے نے گھر چلنے کو کہا تو کہہ دیا کہ وہ یہاں سے سیدھا گراؤنڈ پر جائے گا۔ آج فٹ بال کا میچ ہے۔

"چائے بھی نہیں پینے چلو گے؟"

"نہیں۔ اب تم جاؤ۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑا اسے ارل کو کاپیاں دیتا دیکھ لے۔ پھر ابا پوچھ لیتے کہ اٹھنی روپے کی کاپیاں دوسروں کو دینے کے لئے رات بھر لکھتے رہے تھے۔

"اچھا تو یہ بستہ تو مجھے دے دو۔ گراؤنڈ میں کتابیں بھی لے جاؤ گے کیا؟" بڑے نے بہت رسان سے کہا۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو۔ میں اپنا بستہ لے کر خود آؤں گا۔"

بڑا خاموشی سے چلا گیا۔

پلیا پر بیٹھا ہوا وہ انتظار کرتا رہا۔ تھانے والی سڑک پر دور دور تک کوئی ٹرک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب تو پانچ بج رہے تھے۔ کیا جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ اندر ہی اندر خوش ہوا ہی تھا کہ سامنے سے ٹرک نظر آیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹرک رکوا لیا۔ ڈرائیور نے کہا کہ تھانیدار صاحب جیپ میں پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔

"چپ چاپ پھر پلیا پر بیٹھ گیا۔ ارل چلی جائے گی تو ناشتہ بنوانے کے لئے ماماسب کس کو بھیج کر مجھے بلایا کریں گے۔ وہ چلی جائے گی تو کل خالی گھنٹہ ہوگا اور میں کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوں گا تو کون میرے پاس آئے گا۔ آج ارل نے معلوم نہیں کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوں۔ شاید کل والے سفید کپڑے پہنے ہوں۔ یا شاید کالج ڈریس پہنا ہو۔ یا... شاید... اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک عجیب سا رنگ اس کے ذہن کے پردے پر چمکا اور بجلی کی طرح غائب ہو گیا۔ یہ کون سا رنگ میں نے سوچا تھا ابھی؟ اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ تبھی سامنے سے جیپ آتی نظر آئی۔

ارل آرہی ہے ارل آرہی ہے۔

ارل چلی جائے گی ارل چلی جائے گی۔ پھر وہ یہاں نہیں آئے گی۔

پھر وہ یہاں نہیں آئے گی۔ پھر وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے پاپا بھی بڑے کوتوال ہو گئے ہیں۔

وہ بے خیالی میں بیچوں بیچ سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ تھانیدار صاحب خود چلا رہے تھے۔ ان کی بیوی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ پپو اور ارل پچھلی سیٹ پر تھے۔

ارل نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

تھانیدار صاحب نے گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آکر اسے کنارے کیا اور کہا۔ "تم گھر نہیں آئے۔ ارل تمھاری راہ صبح سے دیکھ رہی تھی۔"

وہ ارل کے پاس گیا۔ کچھ لمحوں تک خاموش ساکت کھڑا رہا۔ ارل نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

اس نے دونوں کاپیاں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"ارے میں تو سمجھی تھی کہ تم بھول گئے ہوگے۔"

"نہیں۔ رات کو ہی سب کام پورا کر لیا تھا۔ میں نے سوچا تم کالج آؤ گی۔" ارل نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہیں؟ اس نے پھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے ارل کے چہرے کے علاوہ کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

تھانیدار صاحب کی بیوی نے بلا کر اسے پیار کیا۔ پپو نے ہاتھ ملایا۔

تھانیدار صاحب نے سر پر ہاتھ رکھا۔ ارل نے ہاتھ جوڑ کر ہولے سے نمستے کیا۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ ابا نے بتایا تھا کہ کافروں کو نمستے یا سلام کرتے وقت ہاتھ نہیں جوڑنے چاہئے۔

"اچھا بیٹے ارشد اب چلتے ہیں۔ ٹرک بہت آگے نکل گیا ہوگا۔ اندھیرا بھی ہو رہا ہے۔ اب تم گھر جاؤ۔ خوب دل لگا کر پڑھا کرنا۔ اب تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ تب ملاقات ہوگی۔" اسے لگا جیسے وہ گر پڑے گا۔ اس نے زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی۔ پپو اور ارل اسے دیکھتے رہے۔ وہ ارل کو دیکھتا رہا۔ ارل نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کیا یہ نیلا رنگ ہے یا گلابی جوڑا ہے۔ نہیں یہ تو اسکول کا ڈریس لگ رہا ہے۔ یا مجھے لگتا ہے کہ وہی کل والا لباس پہنے ہے۔ جیپ کچے دگڑے پر آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی، دور ہو رہی تھی۔ ارل چھوٹی ہوتی جا رہی تھی، دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ درختوں کے سائے سے جیپ نکلی تو ساری سواریاں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ پھر درختوں کی چھاؤں میں صرف جیپ کا ہیولا نظر آیا۔ درختوں کے سائے سے جیپ نکل کر اور آگے بڑھی تو اس نے بہت غور سے گیلی گیلی آنکھوں سے ارل کو دیکھا۔ ابھی ابھی اسے معلوم ہوا کہ ارل نے ایک ایسے خاص رنگ کا لباس پہن رکھا ہے جسے اس نے کہیں دیکھا ہے۔ دھندلے آسمان کے پس منظر میں ڈوبتے سورج کی ترچھی زرد کمزور کرنوں میں وہ رنگ آہستہ آہستہ اڑتا ہوا دور ہو رہا تھا، کھو رہا تھا۔ جب جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو پیچھے سے کسی نے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بڑا اس کے پاس کھڑا تھا۔

چچا شکار سے لوٹ کر تمھیں پوچھ رہے تھے۔ ابا نے کہا کہ آج وہ کالج سے واپس ہی نہیں ہوا۔ مجھے ڈھونڈنے بھیجا ہے۔ تم گراؤنڈ پر نہیں گئے؟"

"نہیں گیا۔ کسی سے کیا مطلب۔" اس نے ہمیشہ کی طرح روکھا جواب دیا لیکن آج اس کے لہجے میں تیزی نہیں تھی۔

"گھر واپس چلو۔" بڑے نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"چلو۔" جیسے وہ مقابلہ کرنے کی دعوت دے رہا ہو۔

لیکن وہ سہم بھی گیا تھا جیسے بڑے نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

گھر میں داخل ہوا تو آنگن میں بندوقیں رکھی ہوئی تھیں اور زمین پر پرندوں کا ڈھیر تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے ارشد۔ دیکھو آج شیرازی مار کر لائے ہیں۔" چچا میاں نے ایک بڑی سی سفید بطخ اٹھا کر کہا۔ شام کے دھندلکے میں اسے وہ پرندہ بالکل سفید نظر آیا صرف گردن پر ذبح کی جگہ سرخ نشان تھا۔ قریب آکر اس نے دیکھا تو شیرازی کے سر پر کاسنی پر تھے جن کے نیچے گلابی چونچ تھی۔

"کل صبح پھر شکار پر جائیں گے۔" چچا میاں اس سے بولے۔

"مجھے لے چلیں گے؟" اس نے بہت مضبوط لہجے میں آہستہ سے پوچھا۔

"ارشد بیٹے تم ضدی بہت ہو۔ کہہ دیا ذرا بڑے ہو جاؤ پھر چلا کرنا۔" چچا میاں اسے سمجھانے والے انداز میں بولے۔

اس نے ایک نظر بندوقوں کی طرف دیکھا۔ فرش پر پڑی شیرازی کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے امی کے پاس جا کر کہا۔

"حلوہ کھاؤں گا اور صرف میرے لئے بنانا۔" وہ ایک عجیب سی آواز میں بولا۔

بڑا چولھے پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ارشد کی طرف دیکھا۔ پھر امی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ بیٹھا ہاتھ تاپتا رہا۔

ارشد نے کالج کا ڈریس اتارا اور لحاف میں جا کر لیٹ گیا۔

ابا مغرب کی نماز کے بعد جب واپس آئے تو خلاف معمول اتنی جلدی سے سوتا دیکھ کر اس کے پاس آئے۔

"کیا بات ہے، کیا طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں۔" اس نے بہت روکھا سا جواب دیا۔

ابا خاموش رہے۔ انھیں معلوم تھا کہ جب لڑکے بڑے ہونا شروع ہوتے ہیں تو ایسے ہی روکھے اور تیز سے جواب دیتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ امی نے حلوہ لا کر دیا۔ اس نے غور سے امی کی طرف دیکھا۔ امی کے بالوں کی ایک لٹ سفید ہو گئی تھی اور آنکھوں کے کونوں کے پاس ہلکی ہلکی لکیریں پڑنے لگی تھیں۔

"اماں۔" اس نے بہت ہولے سے پکارا۔

ہاں! کیا بات ہے؟"

"حلوہ کسی اور کو تو نہیں دیا ہے۔"

اتنا بہت سا تو تمھیں دے دیا پھر بھی پوچھ رہے ہو۔"

اس نے دوسرے پلنگ پر بیٹھی رضیہ کی پلیٹ میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔

"اماں۔" اس نے پھر ہولے سے پکارا۔

"ہاں۔ بولو۔"

"تم ہم سب میں سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو؟" اس نے اماں کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"تم بہت ڈھیٹ ہو ارشد۔ میں سب کو برابر سے چاہتی ہوں۔ اگر میں کہہ دوں تمھیں تو رضیہ بیٹھی ہے وہ کیا سوچے گی کیا اسے بازار سے مول لیا ہے۔ اگر بڑا سنے گا تو کیا کہے گا۔ کیا اسے سڑک سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

"لیکن اماں۔ تمھیں تو سب سے زیادہ میں چاہتا ہوں۔"

"سارے بچے ماں کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کتنی تکلیفیں اٹھا کر اماں بچوں کو پالتی ہے۔"

"تم ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی ہو یہ صاف صاف کیوں نہیں بتاتی کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔ تمھارے بچوں میں سب سے اچھا کون ہے؟"

ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے ضدی چہرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی کیفیت آئی اور گذر گئی۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔ میں پانی پینے جا رہی ہوں۔" وہ گھڑونچی کی طرف مڑیں۔ ابا باہر تھے۔ چچا پرندے بانٹنے پڑوس میں چلے گئے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ مرے مرے دل سے کھانے کے لقمے توڑتا رہا۔

بڑا دالان میں سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جسے وہ ارشد سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بلب کے نیچے سے گذرا ارشد کو نظر آ گیا کہ پلیٹ میں کیا ہے۔

"اماں۔" وہ اتنی وحشی آواز میں چلایا کہ رضیہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ پڑا۔

"ادھر آؤ تم۔"

امی کٹورا اٹھائے بھاگتی ہوئی آئیں۔ انھوں نے ابھی پانی انڈیلا ہی تھا، پیا نہیں تھا۔ اس کے پاس آ کر بولیں۔ "کیا بات ہے۔" اور منھ سے تانبے کا کٹورا لگا لیا۔ وہ شام سے پیاسی تھیں۔

اس نے پلنگ سے اٹھ کر پوری طاقت سے اماں کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تانبے کے کٹورے پر دونوں ہاتھ مارے۔

ایک تیز کراہ کے ساتھ اماں پیچھے کو الٹ گئیں۔ ان کا چہرہ خون سے نہا گیا تھا۔ آگے کے سارے دانت ہل گئے تھے۔ رضیہ اور بڑے نے دوڑ کر اماں کو اٹھایا۔ بڑا اماں کے چہرے سے خون صاف کرنے لگا۔ رضیہ نے دیوانوں کی طرح ارشد کو گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔

ماں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔

"سنو رضیہ۔ ابا کو نہ معلوم ہو۔" اور پھر درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے نے خون اگلتی آنکھوں سے ارشد کی طرف دیکھا اور ماں سے کہا کہ وہ کلیاں کر کے پلنگ پر لیٹ جائے۔

ارشد بے حس و حرکت پلنگ پر ویسا ہی کھڑا رہا۔ اچانک اسے جانے کیا ہوا کہ وہ بھاگ کر آنگن میں آیا۔ بندوقیں ابھی تک آنگن کے پلنگ پر پڑی تھیں۔ وہ دیوانوں کی طرح بندوقیں اٹھا اٹھا کر پختہ فرش پر پٹخنے لگا۔ جب بندوقوں کے بٹ کی لکڑی کی پچڑیں اکھڑ گئیں تو اس نے بندوقیں اٹھا اٹھا کر دور پھینکنا شروع کر دیں۔ جب چاروں بندوقیں پھینک چکا تو جس پلنگ پر بندوقیں رکھی تھیں اسے اٹھا کر الٹ دیا اور پکے فرش پر ننگے پیر بھاگتا ہوا اندھیری ڈیوڑھی سے نکل کر درگاہ شریف کی دیوار سے ٹیک لگا کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

کئی دن تک امی اور ابا سرگوشیاں کرتے رہے۔ دھوبی کو روزانہ تاکید کی جاتی رہی کہ ارشد کے کپڑے جلد از جلد دھو کر لا دے۔ ارشد ٹوہ میں رہا کہ کچھ معلوم ہو سکے کہاں کی تیاری ہے لیکن امی اور ابا اسے دیکھتے ہی خاموش ہو جاتے۔ بڑا اسے دیر تک دیکھتا مغموم آنکھوں سے کچھ سوچتا رہتا۔ امی نے ابا کو بتایا تھا کہ وہ باورچی خانے میں گر پڑی تھیں۔ نعمت خانے کی نگر سے ٹکرا کر دانت ٹوٹ گئے۔ لکھنؤ جانے سے ایک دن پہلے ابا نے اسے بلا کر پلنگ پر اپنے پاس بٹھایا۔ "لکھنؤ میں ایک اسکول ہے لامانٹیر۔ وہاں عیسائی پادری ہیں اور عیسائی عورتیں پڑھاتی ہیں۔ تمھارا داخلہ وہیں کرایا جا رہا ہے۔ صبح کو جب وہ یہ دعا پڑھیں تو تم خاموش کھڑے رہا کرنا اور اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ کا باپ مت کہنا۔ سمجھے؟

"جی۔ ابا۔"

"کچھ مت بولو۔ نہیں۔ ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تمھاری ماں کو بالکل چین نہیں ہے۔ چھٹیاں ہوں گی تو میں بلوا لوں گا۔" اس کا سر

جھکا ہوا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ابا کی نظریں سیدھی اس کے سر پر پڑ رہی ہوں گی۔ اس نے آنکھ اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر پلکیں آپ ہی آپ نیچے جھکی جا رہی تھیں۔

لکھنؤ میں کوئی نہیں ہوگا۔ امی یہیں رہیں گی۔ بڑا یہیں رہ جائے گا۔ رضیہ بھی وہاں نہیں ہوگی۔ ابا بھی نہیں ہوں گے۔ صرف میں وہاں بھیجا جا رہا ہوں۔ ضرور امی نے ابا سے چغلی لگائی ہوگی۔ یا ہوسکتا ہے بڑے نے ابا کے کان بھرے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا چچا کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بندوق کا بٹ ٹھیک کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

امی نے چچا سے کہا تھا کہ بندر نے بندوق والا پلنگ الٹ کر بندوقیں ادھر ادھر پھینک دی تھیں۔

"اب جب تم پڑھ لکھ کر آؤ گے تب تمھیں شکار لے چلیں گے۔" چچا نے جیسے اسے دلاسہ دیا ہو۔

"کب تک آ جاؤں گا چچا میاں۔"

"پانچ سال بعد۔ پھر تمھیں یونیورسٹی پڑھنے بھیج دیں گے۔"

"اتنے دن میں تو ساری مرغابیاں ختم ہو جائیں گی چچا۔" اس نے دکھ کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔" وہ ہنسے۔ "یہ پرندے ہر سال پہاڑوں سے آتے ہیں۔ کچھ یہاں مار لئے جاتے ہیں باقی واپس چلے جاتے ہیں۔ واپس پہنچ کر اپنے انڈے سیتے ہیں برف میں دبا کر میدانوں کی طرف آئے تھے۔ ان انڈوں سے نئے بچے نکل آتے ہیں۔ یہ پرندے پھر اتنے کے اتنے ہو جاتے ہیں۔"

"چچا میاں۔"

"ہوں۔"

"لا مارٹینیر میں عیسائی پادری مسلمان بچوں کو عیسائی بنا لیتے ہیں؟" اس نے آخری ہتھیار استعمال کیا۔

"ہاں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں دل موہ لیتے ہیں۔"

اس کا دل چاہا کہ چچا سے کہے کہ ابا سے کہہ کر ان کا فیصلہ بدلوا دیں لیکن ابا فیصلے کبھی نہیں بدلتے۔ چچا میاں ابا سے کہیں گے ہی نہیں۔

اس نے اپنے اندر ایک انجانا خوف اور ایک عجیب طرح کی ہمت ایک ساتھ محسوس کی۔

"بڑا پلنگ پر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"ارشد۔ تمھارا یہاں رکنے کو جی نہیں چاہ رہا؟"

اس نے بڑے کی طرف دیکھا جیسے اس کی آنکھوں میں سچ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بڑے کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا، صرف سوال تھا۔

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں نے تمھیں دینے کو کئی چیزیں جمع کی ہیں۔ لے آؤں؟"

"ہاں۔"

بڑا تیزی سے اٹھا اور اندر والی کوٹھری سے ایک ڈبا لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے ڈبہ کھولا۔

ڈبے میں تھوڑی سی ٹافیاں، ایک خوبصورت سنہرے رنگ کا پین، ہنا کا کے ٹیوب سے نکلے ہوئے بہت سے پلاسٹک کے کھلونے جو بڑے نے بہت دن سے جمع کئے تھے اور ایک چھوٹی سی کپڑے کی پوٹلی۔

"اس پوٹلی میں کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھ لو۔" بڑا مسکرایا۔

اس نے پوٹلی کھولی۔ سفید اور پیلی بہت سی اکنیاں جگمگا اٹھیں۔ وہ بہت دیر تک یہ سب چیزیں دیکھتا رہا۔

"یہ سب تمھیں بہت پسند تھا؟" بڑے نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بڑے سے کہے کہ مجھے تو اپنے گھر رہنا بھی بہت پسند تھا۔ جب گرمیوں کی چمکیلی صبح آنکھوں کے پپوٹے گدگداتی تھی اور آنگن کے کھجور پر مینائیں شور مچا کر جگا دیتی تھیں تو پلنگ سے اٹھ کر بھاگ کر پکی پکی کستئی کھجوریں بیننا بھی مجھے بہت پسند تھا۔ لیکن تم سب مل کر مجھے دور بھیج رہے ہو۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ سنہرے پن اور چمکیلی اکنیوں کو دیکھتا رہا۔

"ارشد۔ اب میں اکیلے اسکول جایا کروں گا۔"

"ہاں۔" ارشد نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

ارشد چپ چاپ اٹھا۔ اندر جا کر اپنے ٹین کے ہرے بکسے میں ڈبہ رکھا اور نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی، آنگن میں آ کر وہ چیز بڑے کے ہاتھ میں رکھ دی۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو۔ جب میں واپس آؤں گا تو لے لوں گا۔ بالکل سے نہیں دے رہا ہوں۔"

بڑے نے ہتھیلی پر شیشے کے اس رنگین جھلمل جھلمل کرتے ٹکڑے کو دیکھا جسے مانگ مانگ کر وہ تھک چکا تھا۔

بڑے نے اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا۔ شیشے کا وہ چوکور ٹکڑا دھوپ میں جھلملانے لگا اور سفید دیوار پر اس کی ست رنگی چھوٹ اوپر نیچے ڈولنے لگی۔

امی برقعہ پہنے ارشد کی انگلی تھامے پرنسپل سے گفتگو کرتی رہیں۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ جب عیسائی عورت اس سے گفتگو کرے تو وہ اسے 'میڈم' کہہ کر مخاطب کرے۔ عیسائی پادری سے بات کرتے وقت 'فادر' کہنا تھا۔

"نہیں۔ آپ بس اتوار کو مل سکتی ہیں۔ چھٹیوں میں یہ گھر بھی جا سکتا ہے۔" ارشد امی کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ چھوٹا سا کوٹ پہنے نیلی ٹائی

لگائے اسی عمر کا ایک لڑکا باہر کھڑا ہوا تھا۔

"کون سے کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"سیونتھ۔"

"ہمارا بھی داخلہ ساتویں میں ہوگا۔ تمھاری امی ابا کہاں رہتے ہیں؟"

"نینی تال۔"

"یہ کہاں ہے اتر پردیش میں ہے؟"

"یس۔ وہاں کبھی نہیں گئے۔ وہیں سے بہت سارے لوگ سرما میں آتے ہیں۔"

"ہر سال پہاڑ سے پرندے آتے ہیں۔ میدانوں کی گرمی حاصل کرنے۔ پھر موسم ختم ہو جاتا ہے اور یہ واپس پہاڑ پر چلے جاتے ہیں۔" چچا نے بتایا تھا۔

چلتے وقت امی نے اس کی جیب میں ایک ایک کے بہت سے نوٹ بھر دیے۔ امی کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپکے۔

"امی۔"

"کیا ہے؟"

"امی تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ بس چھٹیوں چھٹیوں میں مجھے بلایا کرو گی۔ ہیں امی؟ بس اتنی سی بات پر کہ تم سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔"

امی کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو گرنے لگے۔

وہ واپس پرنسپل کے کمرے میں گئیں اور روتے روتے اس کا سامان واپس منگایا۔

ریل کی کھڑکی سے اس نے سر نکال کر دیکھا۔ گھر کا اسٹیشن آ رہا تھا۔

ریل پٹری بدل رہی تھی۔ دور مسجد کے سفید گنبد نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں کی مٹی کا سانولا رنگ، سرسوں کا پیلا رنگ، جاڑے کی دھوپ کا سنہرا رنگ، درختوں کا سبز رنگ اور آسمان کا نیلا شفاف رنگ۔ سب اتنے اچھے لگے کہ اس نے امی کی گود میں سر رکھ کر اپنے خوشی کے آنسو چھپا لیے۔

رکنے سے پہلے ریل نے تیز سیٹی بجائی، ڈھیر سارا دھواں اگلا اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ رکشے والے انھیں دیکھ کر اسٹیشن کی تاروں کی باؤنڈری پھلانگ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

"غزالہ آپا میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ میں پہاڑ سے نہیں آیا ہوں۔"

"اچھا!" غزالہ آپا نے حیرت سے کہا اور دروازے کی طرف دیکھا۔

"ہاں! غزالہ آپا۔" ارشد نے جھوٹ بولا۔

"پتی تم جس وقت گئے تو مجھے بہت رونا آیا۔ لیکن تمھاری امی کے مارے میں تمھیں چھوڑنے نہیں آئی۔"

"کیوں امی سے کیا بات ہوگی؟"

"وہ تمھیں منع نہیں کر رہی تھیں کہ تم غزالہ آپا کے ساتھ اندر والے کمرے میں مت کھیلا کرو۔"

"ارے ہاں۔" اسے اچانک یاد آیا۔ اس نے جانے کیوں غزالہ آپا کی شال کو دیکھا۔ غزالہ آپا نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوب دیر تک چوما۔ اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح ان کے ساتھ بیٹھا رہے مگر امی کے آنے کا ڈر تھا۔ وہ منع کرتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ایسی بات ہے جو سب باتوں سے مختلف ہے۔ اسے احساس ہے کہ جب غزالہ آپا اس کے ساتھ اکیلے میں ہوتی ہیں تو سب چیزیں اسے مختلف لگنے لگتی ہیں۔ دروازے چھوٹے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ آئینہ تیزی سے چمکنے لگتا ہے۔ شال میں عجیب سی گنگنی مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔ تخت گرم گرم محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور غزالہ آپا کے کانوں کی لویں سرخ ہو کر اندھیرے میں چمکنے لگتی ہیں۔

یہ کیا ہوتا ہے... امی سے پوچھوں تو وہ ڈانٹنے لگیں گی۔

"غزالہ آپا! امی آپ کے پاس آنے سے کیوں روکتی ہیں؟"

غزالہ آپا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"تم نے کچھ بتایا تو نہیں ان سے؟"

"نہیں۔ کیا بتاتا؟"

"کچھ نہیں۔ تمھاری امی نہیں چاہتیں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔"

"کیوں نہ کروں محبت۔ آپ تو ہماری بہن ہیں۔ کیں؟"

"ارے نہیں بھئی۔ ہم اور تم ویسی والی محبت کرتے ہیں۔"

"ویسی والی کیسی؟" آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پوچھ کر رہے گا۔

"ویسی جیسے لڑکی لڑکے کرتے ہیں۔"

"تو بہن بھائی لڑکی لڑکے نہیں ہوتے۔"

"ارے تم بالکل گدھے ہو۔ جیسی فلموں میں ہوتی ہے۔"

ارشد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ بات اسے مزیدار لگی اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ایک خاص چیز بنتا جا رہا ہے، مگر اب بھی اس کی سمجھ میں سب کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تو کیا میں بندوق سے آپ کے دشمن کو مار کر آپ سے شادی کروں گا۔ ہیں غزالہ آپا! کیا میری آپ سے شادی ہوگی؟"

غزالہ آپا نے اس کی حیرت سے پھیلی آنکھوں میں جھانکا اور خاموش ہو گئیں۔

اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ہولے سے پوچھا۔

"غزالہ آپا کیا آپ کی مجھ سے شادی ہوگی؟"

تب وہ بہت مشکل سے بولیں۔ وہ دکھی ہو گئی تھیں۔

"تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ ایک دو سال کا فرق ہوتا تو ہو جاتی۔ بالکل سچ بتانا ارشد۔ کیا تمھارا دل چاہتا ہے کہ میں تمھاری دلہن بنوں۔" ارشد نے

ان کے سفید ٹھنڈے ہاتھوں کو دیکھا جو دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

اس نے یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ ابھی تو مجھے پڑھ لکھ کر ملازمت کرنا ہے۔ بڑا آدمی بننا ہے۔ پھر بڑے کی شادہ ہوگی تب میری شادی ہوگی۔ ابھی تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ غزالہ آپا آپ تو بہت بڑی ہیں۔ میں اتنا چھوٹا ہو کر آپ کا دولھا بن کر کیسا لگوں گا۔

ارشد نے غزالہ آپا کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ چاہتی ہیں کہ میں کہہ دوں کہ ہاں آپ کو دلہن بنانے کو جی چاہتا ہے۔

"لیکن غزالہ آپا۔ آپ کا دولہا تو جو بھی ہوگا بہت بڑا ہوگا۔"

"ہاں۔" وہ چپ ہوگئیں۔ کھڑکی کے باہر فرش پر سوکھے پتے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ باہر دور تک نگاہیں دوڑاتے ہوئے غزالہ آپا نے سوچا آج کل موسم بہت سخت ہے۔ اور ہر موسم بہت سخت ہوتا ہے اور انتظار کا موسم بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اور غیر معین انتظار کا موسم سب سے ہی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ارشد نے ان کی نظروں کا پیچھا کیا اور کھڑکی کے باہر سرد ہواؤں کو گزرتے ہوئے سنا۔ اور ہواؤں کے اس پار بڑے پھاٹک کے ادھر دور دور تک پھیلے ہوئے خاموش کھیتوں کے اس طرف ایک رنگ چمکتا ہوا دیکھا جو فوراً ہی غائب ہوگیا۔

"اے غزالہ آپا آپ نے دیکھا ادھر ایک رنگ چمکا تھا۔"

"رنگ۔ رنگ۔ چمکا تھا، کیسا رنگ؟" انھوں نے دور کھیتوں کی طرف دیکھا۔

"وہاں کھیتوں کے ادھر۔ میں نے وہ رنگ پہلے بھی ایک دن دیکھا تھا۔ کس دن دیکھا تھا ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔"

وہ سوچنے لگا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا لیکن یاد نہیں آیا۔

"غزالہ آپا۔"

"ہاں۔"

غزالہ آپا! ایک رنگ چمکتا ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ پھر غائب ہو جاتا ہے کیا کوئی جنات وہ رنگ دکھاتا ہے۔"

"اے بھیا... ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ انھوں نے کھڑکی بند کردی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ جب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو انھوں نے دیکھا کہ موٹی موٹی آنکھوں والا ارشد کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اسے اتنا متفکر دیکھ کر انھیں اس پر بڑا پیار آیا۔

کیا میں سچ مچ اپنے پڑوس کے اس لڑکے سے محبت کرنے لگی ہوں۔ انھوں نے اپنے دل ہی دل میں سوال کیا۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ انھوں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ارشد نے اس رنگ کو یاد کرنے کی پھر کوشش کی۔ ارشد نے دیکھا غزالہ آپا اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہی ہیں۔

"غزالہ آپا۔ ارجل کے باپ آئے تھے۔ تھانے دار صاحب؟"

"نہیں تو۔ اور تم یہاں سے باہر ہی کتنے دن رہے۔ تین چار دن ہی میں تو واپس ہی آگئے۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

رات کو سوتے سوتے آنکھ کھلی۔ ابا امی سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے زمین داری والے بانڈ ڈاک خانے میں جمع کر دیے ہیں۔ ان دونوں کی تعلیم کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرے بوڑھے ہونے سے پہلے ہی یہ دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔"

امی خاموش رہیں۔

"تم ارشد کو لکھنؤ سے واپس لے آئیں۔ بلاوجہ تین چار سو کی چپت پڑ گئی۔" امی کچھ دیر چپ رہیں پھر بولیں۔

"وہاں سے یہ عیسائی بن کر نکلتا۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ مجھے پسند نہیں آیا۔ اس لیے لے آئی۔"

"فیس تو کم از کم واپس لے آتیں۔"

"وہاں فیس کی واپسی کا قاعدہ نہیں ہے۔ لعنت بھیجو فیس پر۔ ایمان تو لاکھوں میں بھی نہیں مل پاتا۔"

"یہ تو سچ کہتی ہو۔ اور پھر اپنا بچہ اپنے ہی سامنے رہے تو سکون رہتا ہے۔"

پھر اماں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

"کتنے دن تک؟ اب کمبخت بڑے ہو رہے ہیں۔ دسواں کرکے یونیورسٹی چلے جائیں گے۔"

"خدا وہ دن تو لائے۔ تم رنجور نہ ہو۔ میں اتوار اتوار بلا لیا کروں گا۔"

"کوئی نہیں آئے گا اتوار اتوار۔ وہاں جا کر سب کو وہاں کی فضا راس آجاتی ہے۔"

"خیر اب سو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیک توفیق دے۔"

ارشد لحاف میں منہ چھپائے بہت دیر تک سوچتا رہا کہ بچے پاس ہوں تو سکون کیوں ملتا ہے۔ بچوں کے دور جانے سے کس بات کی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔

اندھیرے میں اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسے روشن اور دھندلے بہت سے زاویوں والے ڈھیر سارے خاکے نظر آئے۔ ان خاکوں سے وہ کھلونے کے ٹکڑوں کی طرح عمارتیں بنانے لگا۔ پھر وہ روشن خاکے آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے گئے اور اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔

یہ غزالہ آپا بھی عجیب ہیں۔ مجھے ماجھے میں اپنے پاس بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب چھوٹا تو ہوں نہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ وہ ویسا ہی بچہ سمجھ رہی ہیں۔

ارشد نے یہ سوچا ضرور لیکن اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ رات ہونے سے پہلے ہی غزالہ آپا سے ملنے ماجھے کے کمرے میں چلا جائے لیکن وہاں ایک چیخ

پکار بھی ہوئی تھی کر تو بہ بھلی۔ دور نزدیک کے سارے عزیز شادی میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ تو جوان لڑکیاں غزالہ آپا کو ہر وقت گھیرے رہتیں۔

بڑا اور وہ شادی میں شرکت کرنے چھٹی لے کر آئے تھے۔ ارشد نے اس بار ابا کے بالوں میں بہت سے سفید بال دیکھے۔ اس کا دل بہت اداس ہوا تھا۔ بڑا اب اور سنجیدہ ہو چکا ہے۔ اس سے کچھ پوچھو تو وہ دس باتیں غم پیدا کرنے والی اور بتا دے گا۔

"اماں۔ ابا اتنے بوڑھے کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟"

اماں نے اپنے جوان ہوتے بیٹے کو دیکھا جس کی طرف سے ہمیشہ خلش رہتی تھی کہ یہ کبھی اپنے ماں باپ کے بارے میں نہیں سوچتا۔

"ہم سب کی اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے نا ان پر۔" اماں سے اسی قسم کے جواب کی امید تھی۔

"چھ سال بعد میں کمانے لگوں گا تو سب ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر تو ٹھیک رہے گا نا اماں؟"

بڑے نے آکر اماں کو ایک سونے کی انگوٹھی دکھائی جو ایک آبنوسی ڈبے میں رکھی تھی۔

"یہ میں غزالہ آپا کی شادی میں دوں گا۔" بڑا انگوٹھی دیکھتا ہوا اماں سے بولا۔

یہ بڑا اماں سے کوئی بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ بچپن سے اس کی عادت ہے۔ بس بیچ میں آکر بول پڑے گا۔

"ہاں۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ کتنے کی ملی؟"

"دو سو روپے کی۔"

"کہاں سے آئے پیسے؟" ارشد نے مشکوک نگاہوں سے بڑے اور اماں کی طرف دیکھا۔

"بچائے تھے اپنے جیب خرچ سے۔"

"میں تو کبھی نہیں بچا پایا۔"

"تم زیادہ خرچ کرتے ہو۔"

"خرچ تم بھی خوب کرتے ہو۔ یہ کہو کہ اماں نے تمہیں چپکے سے دے دیئے ہوں گے۔"

"نہیں ارشد۔ خدا کی قسم میں اپنے پاس سے لایا ہوں۔"

"قسم جھوٹے کھاتے ہیں۔"

"اچھا چپ رہو۔" اماں غصہ ہو کر بولیں۔ "مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے تمہاری باتیں سن کر۔ پڑھ لکھ کر گدھے ہوتے جا رہے ہو۔"

بڑا آبنوسی ڈبہ اٹھائے ہوئے باہر چلا گیا۔

اماں نے ارشد کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔

ارشد کو بڑی سبکی سی محسوس ہوئی۔ وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔

"اماں او اماں! ادھر دیکھو۔"

"کیا ہے۔"

"اماں تم بڑے کو بہت چاہتی ہو؟"

"تمہیں بھی چاہتی ہوں۔"

اس نے بہت ضبط کے ساتھ یہ جملہ سنا۔ اماں تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ تمہیں بھی چاہتی ہوں۔ مجھے کیا بڑے کے طفیل میں چاہتی ہو۔ تم میری اماں ہو کر نہیں سمجھ پائیں۔ تم کیسی ہو اماں۔ تم نے ہمیشہ مجھے ناامید ہی رکھا۔ کبھی تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔ سچ کہہ رہا ہوں اماں اگر تم یہ کہہ دو کہ تم سب سے زیادہ بڑے کو چاہتی ہو تب بھی میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر مجھے یکسوئی تو ہو جائے گی کم سے کم۔

وہ سوچتا رہا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

ارشد نے باہر آکر گرمیوں کے سورج کو ڈوبتے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ بہت اکیلا ہے اور غمگین ہے اور بہت خاموش ہے۔ گرمیوں کی شامیں اتنی خاموش نہیں ہوتیں لیکن خاموشی اس کے وجود کے اندر سما گئی تھی۔ تب اس نے سوچا کہ صرف غزالہ آپا مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہیں اور کوئی نہیں۔ غزالہ آپا کا خیال آتے ہی اسے ڈوبتے سورج کے پاس، شفق کے سرخ رنگ کے اوپر، بہت سے رنگ اور بھی نظر آئے۔ اور اچانک اسے وہ رنگ بھی دکھائی دیا جو جھماکا مارتا ہوا ابھی آنکھوں سے اوجھل ہوا تھا۔ یہ رنگ کون سا ہے۔ یہ اتنی کم دیر کے لئے کیوں سامنے آتا ہے۔ یہ کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ اس رنگ سے میرا کیا ناطہ ہے۔ یہ غزالہ آپا کا رنگ نہیں ہے۔ ان کے تو سارے رنگ میں نے دیکھے ہیں۔ جب میں ان کے قریب ہوتا تھا تو میری قربت کی خوشی میں ان کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم جاڑوں میں پاس پاس بیٹھتے تھے اور وہ میرے ہاتھ تھامے ہوتی تھیں تو ان کے ہاتھ بالکل برف کی طرح سفید ہوتے تھے۔ جب وہ کسی کی آہٹ سنتی تھیں تو ان کا رنگ نیلا پڑ جاتا تھا۔ جب ان سے کہتا تھا کہ امی مجھے آپ کے پاس آنے سے منع کرتی ہیں تو ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا۔ لیکن یہ رنگ جو میں دیکھتا ہوں یہ کوئی بالکل مختلف رنگ ہے۔ یہ سفید ہے نہ پیلا نہ سرخ نہ نیلا۔ یہ سب رنگوں سے مل کر بنا ہوا کوئی رنگ ہے۔ جبھی تو میں اس کی شناخت نہیں کر پاتا ہوں۔ یہ میرے سامنے آتا ہی کتنی دیر کو ہے۔ آیا اور گیا۔ کیا ارل نے جانے والے دن کسی رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ لیکن اس کے کپڑوں کا رنگ تو میں دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔ جیپ پانچ منٹ کو رکی تھی اور پھر آگے بڑھ گئی تھی۔ درختوں کے سائے میں ہوتی ہوئی دور بہت دور چلی گئی تھی۔ میں ارل کا لباس دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ارشد دھیمے قدموں کے ساتھ غزالہ آپا کے گھر میں داخل ہوا۔ سب اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ وہ بے چین سا بیٹھا اندر والے کمرے کی طرف دیکھتا رہا۔ عورتیں اور بچے زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور اپنے اپنے کپڑے سنبھال رہے تھے۔ ایک طرف اسٹول رکھا تھا اور بڑا سا پاندان کھلا ہوا تھا۔

"جاؤ میاں تمھیں بٹیا اندر بلا رہی ہیں۔"

"ارے۔ یہ لڑکے ہو کر اندر ما نجھے میں جائیں گے۔" دور سے آئے کسی عزیز کی بیٹی نے گویا پتہ کاٹنے کی کوشش کی۔

"اسے آنے دو۔" غزالہ آپا کی آواز اندر کمرے سے آئی۔ اس آواز میں ارشد کو بہت اپناپن، بہت گرمی، اور بہت چاہت محسوس ہوئی۔ وہ پیلے کپڑے پہنے اندر اکیلی بیٹھی تھیں۔ ہلدی ابٹن کی تیز مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ بہت شفاف نظر آرہا تھا۔

"میرے پاس آکر بیٹھو۔" انھوں نے کہا۔ اور یہ ان کی آواز تھی جن کے متعلق ارشد کو بہت دن بعد معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اسے کتنا چاہتی ہیں۔ کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ غزالہ آپا اس کی اڑی اڑی رنگت اور موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم کچھ پریشان ہو ارشد؟"

میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا اور خاموش ہو گیا۔

انھوں نے اس کے کانوں کو پکڑ کر ہولے سے شرارت کے ساتھ ہلایا۔ اس نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا۔ انھوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ پھر اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ اس نے آنکھیں بند رکھیں انھوں نے پھر پیار کیا۔ اب اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا سا چہرہ اس کے چہرے سے اتنا قریب ہے کہ وہ ان کی سانسوں کی گرمی محسوس کر سکتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ارشد کو ایک دوسری چمک نظر آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھاما، اپنے قریب کیا اور ان کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

"ارے۔" وہ ایک دم سے سرخ ہو گئیں اور خود کو چھڑا لیا۔

وہ ویسا ہی بے خوف لیٹا رہا۔

"آپ تو ہمیشہ پیار کرتی ہیں آج میں نے کر لیا تو آپ گھبرا گئیں۔ کیوں گھبرائیں۔ وہ چپ چاپ تھیں۔ پھر مسکرا کر بڑی مشکل سے بولیں۔

"مجھے ابھی پتہ چلا کہ تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمھاری مونچھیں ہونٹوں میں کیسی گڑ رہی تھیں۔"

ارشد نے یہ سن کر خود کو پورا مرد محسوس کیا اور اس خوش آیند اطلاع دینے والے کو بہت چاہت بھری نظروں سے دیکھ کر بہت ہمت کر کے اس نے ہولے سے پوچھا۔

"اب بھی آپ کا دل چاہتا ہے غزالہ آپا کہ آپ مجھ سے شادی کریں؟"

غزالہ آپا اب یہ سن کر مسکرائیں۔

"تم اب بھی مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ ارشد تمھیں معلوم ہے وہ ریلوے میں بہت بڑے آفیسر ہیں۔ ہندوستان بھر میں مفت سفر کر سکتے ہیں فرسٹ کلاس میں۔ شادی کے بعد میں بھی مفت سفر کروں گی۔ جہاں جہاں ہم اور وہ چاہیں۔"

وہ کچھ اور بھی کہتی رہیں لیکن وہ باقی باتیں سن نہیں سکا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر ان کے زانو سے ہٹایا اور خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے تکتا رہا۔

تم بھی دھوکا دے گئیں غزالہ آپا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بس تم ہی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہو۔ اور جب میں تم سے پوچھوں گا کہ کیا اب بھی تمھارا دل مجھ سے شادی کرنے کو چاہتا ہے تو تم کہو گی کہ ہاں۔ لیکن گھر والوں کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں ورنہ میں تم کو اپنا شریک زندگی مان چکی ہوں۔ پھر تم رو دو گی اور میں تمھاری آنکھوں سے آنسو خشک کر کے تمھارا سر اپنے سینے سے لگا کر تم سے کہوں گا کہ نہ رو و غزالہ۔ ہم تم ایک دوسرے کو چاہتے رہیں گے۔ ہمیشہ خود کو اپنی محبت میں سرشار رکھیں گے۔ لیکن تم نے تو میری بات بھی سنجیدگی سے نہیں سنی۔

میں تمھیں بتاتا کہ میں فضا میں بہت سے رنگ دیکھتا ہوں اور ان میں ایک عجیب سا رنگ ہوتا ہے جس کی شناخت نہیں ہو پاتی۔ لیکن تم نے تو ریلوے آفیسر کا قصہ چھیڑ دیا۔ تم نے مجھے اتنی جلدی کھو دیا۔ تمھیں تو یاد ہوگا۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ پہل تمھیں نے کی تھی۔ میں تو اس وقت بہت سی باتیں جانتا بھی نہیں تھا۔

"ارشدا و ارشد۔ نازو تمھیں بہت مانتی ہے۔"

وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

اور تم غزالہ آپا... تم کتنا مانتی ہو۔ اور یہ نازو مجھے کیوں مانتی ہے۔ کیا وہ بھی کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ کہ کوئی ریلوے کا آفیسر یا ہوائی جہاز کا پائلٹ آئے اور اسے بیاہ کر لے جائے۔ اور جب تک وہ نہیں آئے تو دل مصروف رکھنے کے لئے میاں ارشد سے ذرا بے تکلفی رہے تو کیا حرج ہے۔ ہیں نا غزالہ آپا۔

وہ اٹھ گیا۔

"ارے ارشد تم جا رہے ہو؟"

"ہاں غزالہ آپا۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا۔ آپ کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنا کچھ معیوب سا لگتا ہے۔"

گھر آکر وہ جلدی ہی بستر پر لیٹ گیا۔

"کل شادی کے انتظامات میں صبح سویرے ہی مصروف ہو جانا ہے نا۔ اس لئے جلدی سو رہا ہوں۔ کھانا نہیں کھاؤں گا۔" اس نے امی سے کہا۔

اور یہ بڑا میدان ہے۔ ادھر کے کھیتوں کے پار ایک نالا ہے۔ اس نالے کے ادھر ایک گاؤں ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک تالاب ہے جس میں سرمائی پرندے تیر رہے ہوں گے۔ آج چچا نے مجھے بتایا کہ میں اب بڑا ہو چکا ہوں، بندوق لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار پر جا سکتا ہوں۔

کل غزالہ آپا اپنے شوہر کے ساتھ پھولوں سے لدی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر جا چکی ہیں۔ اپنے نئے گھر جانے سے پہلے وہ مجھے مطلع کر چکی ہیں کہ اب میں بڑا ہو چکا ہوں۔

ارشد نے سوچتے سوچتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باقی ساتھی بندوقیں تھامے تیز

تیز پیچھے آرہے تھے۔

ابھی آٹھ ہی بجے تھے اور سورج آدھے آسمان پر چڑھ گیا تھا۔

خواہشیں کتنی جلدی خود کو بے قیمت کردیتی ہیں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے شکار پر آنے کی کتنی شدید خواہش ہوتی تھی۔ دل کہتا تھا کہ بس چچا شکار پر لے تو چلیں پھر ایک ہی جست میں پورا میدان طے کرکے میں نالا پار کروں گا اور نالے کے ادھر گاؤں کے باہر تالاب میں گھس کر مرغابیاں ماروں گا۔ جب فائر کی آواز سے اڑیں گی تو اڑتے میں بھی ماروں گا اور سب کو ڈوری سے باندھ کر کاندھے پر رکھ کر جیپ میں جب ہم سب داخل ہوں گے تو سب سے آگے بندوق تھامے میں چل رہا ہوں گا۔ اور ادھر کے میدان میں اگر نیل یا ہرن ملے تو للکار کر انھیں روک لوں گا۔ وہ چپ چاپ کھڑے ہوجائیں گے۔ میں دور سے ہی رائفل کا نشانہ لے کے فائر کروں گا اور نیلا دھپ سے زمین پر گر پڑے گا۔ باقی نیلے بھاگیں گے تو بھاگتے میں ایک اور مار گراؤں گا۔ پھر بیل گاڑی پر لاد کر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ قصبے میں داخل ہوں گے اور راستے میں اپنی جان پہچان والوں سے کہتے آئیں گے کہ رات کا انتظام نہ کیجئے گا میں نیل کا گوشت بھیجوں گا۔

اور آج جب میں پہلی بار اپنے ساتھیوں کو لے کر خود شکار پر آیا ہوں تو سب کچھ کتنا بے معنی لگ رہا ہے۔ میں صرف خود کو مصروف رکھنے کے لئے آج شکار پر آیا ہوں۔

کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ارہر کے کھیتوں کے ادھر اشارہ کیا۔

"وہ ببول کے نیچے جھاڑیاں ہیں یا نیلے ہیں؟"

ارشد نے غور سے ادھر دیکھا۔ ہوا میں کچھ گرمی آگئی تھی اور میدان میں آہستہ آہستہ دھول اڑنے لگی تھی۔ اڑتی ہوئی گرد کو چیرتی ہوئی سب کی نگاہیں دور ان جھاڑیوں کو دیکھتی رہیں۔

اچانک سب نے دیکھا کہ ان میں سے ایک جھاڑی اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔

"ارے نیلے ہیں۔ کئی ہیں۔" کوئی سرگوشیوں میں چلایا تھا۔

"لیکن ادھر کوئی آڑ نہیں ہے۔ مشکل سے مار کھائیں گے۔ سیانے ہیں۔ دیکھو کتنی دور سے دیکھ کر مادہ اٹھ کھڑی ہوئی۔"

تمام ساتھیوں کے چہروں پر شکار کی خوشی امنگ بن کر ناچ رہی تھی۔ پسینے سے شرابور چہرے لئے سب لوگ نیلوں کو دیکھتے رہے۔ تب کسی نے کہا تھا۔

"اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارشد میاں آپ نالے میں جاکر بیٹھ جایئے۔ آج کل سوکھا ہے۔ ہم لوگ اس طرف سے گھیرتے ہیں۔ نیلے آپ ہی نالے کی طرف بھاگیں گے۔ جیسے ہی نالے میں اتریں آپ دھر لیجئے گا۔"

ارشد نے تجویز سے اتفاق کیا۔ اور چکر کاٹتا ہوا نالے کی طرف بڑھنے لگا۔

میدان میں آدمیوں کو دیکھ کر وحشی چرندے اٹھ اٹھ کر کھڑے ہونے لگے اور ایک دوسرے کی طرف پشت کئے وہ ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ارشد نے ڈرتے ڈرتے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ادائیں اپنے دموں کو تیزی سے گردش دے رہی تھیں اور آہستہ آہستہ زمین پر کھر مار مار کر مٹی اڑا رہی تھیں۔ نالا اب تھوڑی ہی دور تھا۔ ارشد کو کچھ جھاڑیوں کی آڑ مل گئی جن کے سہارے وہ نالے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ لے کر نالے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ نالے میں پہنچ کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نیلے اب مطمئن سے لگ رہے تھے۔ جب تک ساتھی چکر کاٹ کر نیلوں کا ہانکا کریں گے تب تک میں سانس درست کرسکتا ہوں۔ یہ سوچ کر ارشد زمین پر چت لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے بندوق کے کارتوس چیک کئے، بندوق بند کی اور سینے پر رکھ کر شفاف نیلے آسمان کو دیکھ کر انتظار کرنے لگا۔

اور اب تمھارا نیا نویلا پن ختم ہو چکا ہوگا۔ تم ایک رات اپنے نئے گھر میں گذار چکی ہوگی۔ اب تم اپنے شوہر سے صبح کے ناشتے پر کچھ شرما شرما کر گفتگو کررہی ہوگی اور تمھیں اس کی خبر بھی نہیں ہوگی کہ جسے تم یہاں بڑا کر کے گئی ہو اس وقت تپتے ہوئے میدان میں بندوق لئے وحشی جانوروں کا انتظار کررہا ہے۔

ارشد نے یہ سوچ کر خود کو بہت حقیر سا محسوس کیا اور کچکچا کر بندوق پکڑلی۔

ساتھیوں کی آواز کا تیز شور بلند ہوا۔ نیلوں کی بھگدڑ کی آواز سنائی دی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ بھاگتا ہوا ایک کالا نیلا نالے میں اترا۔ ارشد نے کاندھے پر بندوق آنے سے پہلے ہی لبلبی دبادی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا اور اگلی ٹانگوں کے بل ادھر ادھر ہونے لگا۔ گراب نے ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی اور یہ چوٹ بہت کاری چوٹ ہوتی ہے۔ جانور پھر ہل کر نہیں جاسکتا۔ نالے پر چڑھ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا۔

"کیا ہوا؟" کسی نے دور سے چلا کر پوچھا۔

"رہ گیا۔ آؤ ذبح کرلو"۔۔۔ ارشد نے یہ کہہ کر باقی نیلوں کی طرف دیکھا جو بھاگتے ہوئے دور نکل گئے تھے اور اب رک کر اپنے گمشدہ ساتھی کی طرف دیکھ رہے تھے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل دو گز گہرے نالے میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ نیلے ادھر کے میدان میں کھڑے کھڑے جھاڑیاں بن گئے۔ ارشد کے ساتھی اطمینان سے نالے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ نیلا اب بچ کر نہیں جاسکتا کیوں کہ ارشد انھیں بتا چکا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد جاندار کتنی ہی حرکت کرے، ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل پاتا۔

"تو کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ تمھاری غزالہ آپا نے تمھیں دھوکہ دیا تھا؟"

"نہیں دھوکے اور وفاداری کا سوال نہیں ہے عائشہ۔ بس مجھے بہت ذلت محسوس ہوئی تھی جب انھوں نے میری بات سنجیدگی سے نہیں سنی۔ میں ان کے پاس جاکر بیٹھا تھا یہ سوچ کر کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ لیکن انھوں نے احساس ہی نہیں کیا کہ ان کی اس لاپروائی سے میری کیا حالت ہوگی۔" ارشد یہ کہہ کر

چپ ہو گیا۔

"تم کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں میں نے دوسرے دن نیلا مارا تھا۔ اس کا تڑپنا یاد آ گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اپنی دونوں ٹانگوں سے اپنا دھڑ گھسیٹ گھسیٹ کر بڑھتا رہا۔ وہ کچھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ کھسکتا تو تھا لیکن ایک دائرے کے اندر۔ اس لئے جتنا وہ گھسٹتا تھا سب رائگاں جاتا تھا۔ وہ پھر اسی جگہ آن پہنچتا تھا۔"

"ارشد۔"

"ہاں۔"

"نازو کہاں ہے جو تمھیں بہت مانتی ہے۔"

"وہ وہیں ہے۔ عجیب بدھو لڑکی لگتی ہے۔"

"شکل کیسی ہے اس کی؟" عائشہ نے مسکرا کر پوچھا۔

ارشد بھی مسکرایا اور شرارتی انداز میں بولا۔

"شکل تو بالکل پیاری ہے بالکل حور جیسی۔"

"حور تم نے کہیں دیکھی ہے؟"

"ہاں ہاں سامنے بیٹھی ہے۔"

عائشہ سچ مچ شرما گئی۔

"تم اس نازو سے بیاہ کر لو۔ وہ تمھیں بہت چاہتی ہے نا۔"

شادی تو نوکری کے بعد ہوگی۔ پھر پہلے تو بڑے کی شادی ہوگی پھر رضیہ کی پھر دیکھا جائے گا۔ اور تم مجھے نہیں چاہتیں کیا؟"

عائشہ چپ ہو گئی۔

"بولو عائشہ تم بھی تو چاہتی ہو؟"

عائشہ موٹی موٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"ہم تم ایک سال سے مل رہے ہیں۔ تم جانتے ہو میں اس سوال کا جواب کبھی نہیں دیتی۔ تم یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"یہ سوال تو اصلی سوال ہے۔ اور کیا پوچھوں؟ ارشد جز بز ہو کر بولا۔

"بس تم یہ سوال مجھ سے مت پوچھا کرو۔"

"کیوں عائشہ بتاؤ تو سہی۔ ارشد نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

"بس ارشد تم یہ سوال مجھ سے مت پوچھو۔ اور دوسرے کبھی مجھے ہاتھ مت لگانا۔" تب عائشہ نے دیکھا کہ یہ چوڑی پیشانی، سیاہ بالوں اور موٹی موٹی چمکتی آنکھوں والا وہ نوجوان بالکل بچوں کی طرح پریشان ہو گیا۔

"تم... تم عائشہ ایک دفعہ اور یہ بات کہہ چکی ہو۔ یہ کیا راز ہے۔ اے عائشہ بولو۔ بولو عشو۔"

بھولے بھالے چہرے والی وہ لڑکی جو بہت اپنی اپنی سی لگتی تھی خاموش بیٹھی رہی۔ ارشد سوال بنا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ ارشد کی آنکھوں کے سوال کو کتنی دیر تک برداشت کرتی۔ ہولے سے مسکرائی اور بولی۔

"تم بہت چالاک ہو ارشد۔ مجھے عشو کہہ کر پکار رہے ہو تا کہ میں اپنائیت میں آ کر تمھیں سب بتا دوں۔ میں نہیں بولوں گی ارشد۔ میں تمھیں دھوکا نہیں دینا چاہتی۔"

ارشد کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔

"کیسا دھوکا عشو۔ پہیلیاں مت بجھایا کرو۔ جب ارل گئی تو اس نے دھوکا دیا تھا؟ غزالہ آپا نے کیا مجھے فریب دیا تھا؟ میں کیا کوئی بچہ ہوں۔ اور تم معلوم نہیں کون سی بازی سجائے بیٹھی ہو۔ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں۔" اس کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ اور بے بسی چمکنے لگی۔

ہوٹل کے کیبن کے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے عائشہ نے اس سے کہا۔

"ارشد تم کیسے ہو۔ اتنے اچھے طالب علم ہو۔ کھیل میں تم آگے ہو۔ تقریروں میں تم سب سے زیادہ انعامات لیتے ہو۔ سارے ساتھی تمھیں کتنا مانتے ہیں۔ بس میرے سامنے آ کر تم بچے بن جاتے ہو۔ کمزور بن جاتے ہو۔ مجھے کمزور کر دیتے ہو۔ تم ایسے بچکانے انداز سے پوچھتے ہو کہ میں تمھیں چاہتی ہوں یا نہیں۔ عجیب آدمی ہو۔ کیا دشمن ہوں تمھاری۔ تم سے تقریباً روز اکیلے میں ملتی ہوں۔ کیا میں تمھیں دوست نہیں لگتی۔ بولو؟"

ارشد نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر اس کی طرف دیکھا اور دیر کے بعد بولا۔

"ہاں میں تمھارے سامنے آ کر چھوٹا سا بن جاتا ہوں۔ مجھے بڑا بن کر منا لیا کرو۔ میں تمھیں چاہتا ہوں نا اس لئے مجھے تمھاری الجھی الجھی باتوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ تم خود کو میرا دوست مت کہا کرو۔ دوست تو بہت ہوتے ہیں۔ میرے رشتے کو یہ نام مت دیا کرو۔ اسے ایسے ہی بے نام رہنے دیا کرو۔ کبھی کبھی مجھے اپنے گھر بھی بلا لیا کرو۔"

عائشہ اس کی بے ربط باتوں سے خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے ارشد کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔ ارشد کو بہت اچھا لگا۔ آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ عائشہ نے اسے چھوا ہو، ورنہ وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ساتھ بیٹھتی کہ مجھے چھونا مت ارشد اور ارشد مان جایا کرتا تھا۔ عائشہ کی کانپتی ہوئی انگلیاں اس کی پشت پر رکھی ہیں۔ عائشہ کی ہتھیلیوں سے اس کے بدن میں ایک ایسا ارتعاش منتقل ہو رہا تھا جو آج سے پہلے اس نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ غزالہ آپا کے بدن سے بھی نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ عشو کا بدن بہت پراسرار ہے۔ اسے ابھی ابھی احساس ہوا کہ جس لڑکی سے وہ ایک سال سے مل رہا ہے اسے اس نے ابھی ابھی جانا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ عائشہ کی آنکھوں میں، ہونٹوں میں، گردن میں اور ہاتھوں میں ہر جگہ اتنی گنجائش ہے کہ وہ وہاں اپنا چہرہ رکھ سکتا ہے۔ اسے ہوٹل کا یہ جانا پہچانا کیبن اجنبی سا محسوس ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے ہر چیز معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ صرف عائشہ کا وجود ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ اسے عائشہ کے بدن سے کچھ ایسے نغمے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوئے جسے صرف وہی سن سکتا تھا۔ اس نے کان لگا کر سنا کیا واقعی کچھ نغمے سنائی دے رہے

ہیں۔وہ بے وقوفوں کی طرح مسکرا پڑا۔

اور اسے ابھی ابھی محسوس ہوا کہ وہ عجیب سا رنگ ہر طرف چھایا ہوا ہے جو اسے بے چین رکھتا ہے۔یہ کون سا رنگ ہے۔یہ کیسی کیفیت ہے۔میرے ہاتھ پر رکھا یہ دھیمے دھیمے کانپتا ہوا ذرا ذرا سا سخت سا سبک ہاتھ... میرے کتنے نزدیک ہے اور مجھ سے کتنی دور ہے۔

عائشہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوچا کہ میں زندگی بھر یہ ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھے رہوں اور بوجھل بوجھل باتیں کرنے والا یہ لڑکا، یہ میرا اپنا سا ایک وجود جو سامنے بیٹھا ہے یوں ہی ہمیشہ خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہے تو دنیا کے نظام میں کون سا فرق آجائے گا۔

عائشہ کو لگا جیسے وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو تھامنا چاہتا ہے۔

عائشہ کو اپنی نسوں میں ایک عجیب سا تشنج محسوس ہوا۔اسے لگا جیسے اس کے سینے میں دودھاری تلوار چل رہی ہے۔اسے محسوس ہوا کہ ارشد کے ہاتھ لگتے ہی میرے بدن کی جلد گوشت سے اتر جائے گی اور میں ننگی ہو جاؤں گی۔

"ارشد۔" وہ بہت مشکل سے بول پائی۔

ارشد نے اس کی طرف آنکھیں اٹھادیں۔

مجھے چھونا مت۔تمہیں میری جان کی قسم ہے۔تمہیں اللہ میاں کی قسم۔"

ارشد نے بہت بے بس نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہا۔

عائشہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھایا۔

ارشد کو لگا جیسے وہ رنگ ایک دم سے غائب ہو گیا۔

"عشو۔عشو!"

"کیا بات ہے۔وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایک رنگ ہے جو ہر طرف چھا گیا تھا۔"

"کہاں چھا گیا تھا۔کیسا رنگ ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

ایک رنگ ہے۔جو کبھی یہاں نظر آتا ہے، کبھی دور نظر آتا ہے۔کبھی جلدی سے غائب ہو جاتا ہے، کبھی بہت دیر تک چھایا رہتا ہے۔اسے پہچان نہیں پاتا۔ جانے کون سا رنگ ہے وہ۔"

"تم میری چاہت میں پاگل ہو گئے ہو۔ایسی باتیں مت کیا کرو ارشد مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں عائشہ میں پاگل واگل کچھ نہیں ہوا ہوں۔ایک رنگ ہے۔کبھی دھندلا ہو جاتا ہے۔کبھی چمکنے لگتا ہے۔کبھی بہت دیر تک نظر آتا ہے، کبھی ایک دم غائب ہو جاتا ہے۔ابھی جب تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تھا تو وہ رنگ ہر طرف چھا گیا تھا۔سچ۔"

"تم رومانی باتیں کر رہے ہو، ناولیں بہت پڑھ رہے ہو کہ فلم زیادہ دیکھ رہے ہو؟"

"تم اسے مذاق مت سمجھو۔یہ بچپن سے مجھے پریشان کر رہا ہے۔ایک دن اسے پکڑلوں گا عشو۔تمہاری جان کی قسم ایک دن اسے پکڑلوں گا۔"

عائشہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"عائشہ تم مجھے اپنا بدن چھونے سے کیوں منع کرتی ہو۔"

"بس یہ مت پوچھنا۔"

"پھر کیا پوچھوں تم سے۔"

وہ مسکرائی۔پھر دیر تک چپ رہی۔پھر بہت سنجیدگی سے بولی۔

"ہزاروں باتیں مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔پوچھو کہ ہم لوگ غریب ہیں یا ہماری خواہشات بہت بڑھ گئی ہیں۔پوچھو کہ دنیا ایسی خود غرض ہو گئی ہے یا ہمارے ہی پاس وقت نہیں ہے کہ ہم دنیا کے معاملات سمجھ سکیں۔پوچھو کہ جو سرمایہ مریخ پر جانے کے لئے صرف ہو رہا ہے اسے زمین پر زلزلوں اور سیلابوں اور وبائی بیماریوں کی روک تھام میں کیوں نہیں خرچ کیا جاتا۔پوچھو کہ ایٹمی ہتھیار بنانے کا فائدہ کیا ہے جب دوسری طاقت بھی اتنے ہی مہلک ہتھیار بنانے پر قادر ہے۔پوچھو کہ پھیلے ہوئے وسیع سمندروں کی دولت غریب ملکوں کو کیوں نہیں ملتی۔سمندر تو سب کی ملکیت ہیں نا؟ پوچھو کہ ہمارے قائد انتخابات جیتنے کے بعد خود غرض ہو جاتے ہیں یا وہ ایک ایسے نظام میں جی رہے ہیں جہاں عوام کی تکلیف کا احساس ہی ان تک منتقل نہیں ہو پاتا۔پوچھو کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے سادہ دل اور محنتی نوجوان جب افسر بنتے ہیں تو کیوں آرام طلب اور بے رحم ہو جاتے ہیں۔کیوں چاروں طرف سے خواہشات کے شکنجے میں گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔پوچھو کہ عربوں کی عیاشیاں بڑھ گئی ہیں یا فلسطین کا کاز ہی بے دم ہے۔پوچھو کہ جب دنیا میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے تو لڑکیوں کو بر کیوں نہیں ملتے۔پوچھو کہ علم کی قدر گھٹ گئی ہے یا مادی وسائل کا مول بڑھ گیا ہے۔ارشد مجھ سے یہ پوچھو کہ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو خدائے قادر کیوں نہیں پوری کرتا۔مجھ سے یہ والے سوال پوچھو پھر دیکھو میں تمہیں کتنے تفصیلی جواب دوں گی۔"

ارشد نے اس کی طرف حیران حیران آنکھوں سے دیکھا۔

"اے عائشہ۔مجھے ایسی بڑی بڑی باتیں تمہارے منہ سے سن کر ڈر لگتا ہے۔اب تم فلم کی ہیروئن کی طرح لمبی تقریر کرنے کے بعد میرے ہاتھ میں بندوق تھما کر کہو گی کہ جاؤ لام پر۔"

عائشہ ہنس پڑی۔

"عائشہ تم مجھے اپنے جسم کو چھونے کیوں نہیں دیتیں۔"

عائشہ کو اس سوال پر پیار تو بہت آیا مگر وہ جھلا گئی۔

"تم بہت ضدی ہو ارشد۔اچھا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں۔"

"مسلمان تو نامحرم کو دیکھتے ہی نہیں ہیں پھر بھلا چھونے کا کیا سوال۔"

ارشد گڑبڑا گیا۔پھر وہ ایک دم سنبھل کر بولا۔

"تم میری نامحرم تھوڑی ہی ہو۔میری خاص محرم ہو۔سمجھیں کہ نہیں۔پھر تم نے بھی تو ابھی مجھے چھوا تھا۔میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔"

عائشہ بولی۔
"تمھیں قسم ہے مجھے چھونامت۔ میں تمھیں پھر چھوڑوں گی۔ یہ لو۔"
اس نے ارشد کے ہاتھوں کو چھوا۔ اس کے کان کو چھوا اور اس کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا۔
ارشد ہنسنے لگا مگر پھر ایک دم چپ ہو گیا۔
عائشہ اسے چپ دیکھ کر خاموش ہو گئی پھر دھیرے سے بولی۔ "میرے گھر آنا اتوار کو۔ امی سے ملواؤں گی۔ اب چلیں بہت دیر ہو گئی ہے۔ اٹھو۔"
اتوار کی صبح اس نے عائشہ کے گھر پر سائیکل روکی۔
دروازے پر پردہ پڑا تھا۔ اس نے پردے میں ہاتھ ڈال کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ عائشہ نے دروازہ کھولا۔
"کہاں ہیں امی؟" اس نے چپکے سے پوچھا۔
اتنا ڈر کیوں رہے ہو۔ امی کو معلوم ہے آج آپ آنے والے ہیں۔ باہر گھنٹی بھی لگی ہوئی ہے لیکن آپ پر تو گھبراہٹ کا دورہ پڑا ہوا ہے۔"
وہ گھبرا کر باہر گھنٹی دیکھنے نکل آیا۔
"اور یہ بھی گھبراہٹ کی نشانی ہے۔ جاتے وقت بھی دیکھ سکتے تھے۔"
"تم گھر بلا کر بہت ذلیل کر رہی ہو۔" اس نے عائشہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ عائشہ کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔
اس نے آنگن میں کھلے پھولوں کو دیکھا۔ نومبر کی صبحیں کیسی شفاف ہوتی ہیں۔
"تم رات کو روئی تھیں کیا عائشہ؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دالان کی طرف دیکھا جس کے اندر کمرے میں عائشہ کی امی کی موجودگی کا امکان تھا۔
"کیوں عائشہ تمھاری آنکھیں کاہے سرخ ہو رہی ہیں۔"
"تم اندر آ جاؤ ارشد۔" اندر سے ایک تھکی تھکی سی نسوانی آواز سنائی دی۔
"تم جاؤ ارشد میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"
"جلدی سے آ جانا۔" وہ یہ کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔
سیہ لباس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کی عائشہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔
"ارے آپ تو بالکل عائشہ جیسی ہیں۔"
"سگی ماں ہوں نا! بیٹھ جاؤ۔" ایک کمزور سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تیر گئی۔
وہ بیٹھ گیا۔
"تم عائشہ کو بہت چاہتے ہو؟"
وہ گڑبڑا گیا۔
"وہ تمھیں بہت چاہتی ہے۔ کوئی لڑکی اس کی دوست نہیں ہے۔ میں ہی اس کی دوست ہوں۔ میں ہی ماں ہوں اور میں ہی اس کی باپ بھی۔ وہ تم سے کبھی نہیں بتائے گی کہ وہ تمھیں چاہتی ہے۔ اس کی وجہ معلوم ہے؟"
ارشد کو کمرے کی فضا سائیں سائیں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے عائشہ کی ماں بہت پراسرار محسوس ہوئیں۔
"میری طرف ایسے شک کے ساتھ مت دیکھو۔ حالات کا جبر ایسا ہی قاہر ہوتا ہے۔"
وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور دعا مانگنے لگا کہ عائشہ جلدی سے آ جائے۔
"اس نے مجھے تمھارے متعلق بہت تفصیل سے بتایا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ جب چلی جائے تو تم اسے دھوکے باز کے نام سے یاد کرو۔"
"کہاں چلی جائے۔ کہاں جا رہی ہے عائشہ؟"
"جنوری میں اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔"
"میں دوپٹہ تمھیں کہاں سے لا کر دوں۔ پھر یہ کہ وہ تو دوسرے کا ہے ارشد بیٹے۔" ندی کنارے بوڑھے نانا نے کہا تھا۔
اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور سلاخیں پکڑ کر دور دور تک پھیلی ہوئی اس دنیا کو دیکھا اور ان سارے رنگوں کو دیکھا جو کھڑکی کے باہر کھڑکی سے لے کر ریلوے لائن تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور جب ریلوے لائن پر گزرتی ہوئی مال گاڑی اتنی دور نکل گئی کہ آخری ڈبہ نقطہ بن گیا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنسو روکنے کی اپنی پرانی کوشش کی اور کوشش میں کامیاب ہوا اور کھڑکی بند کر کے واپس پلنگ پر بیٹھ گیا۔
"ہم لوگ نجیب الطرفین سید ہیں۔ عائشہ کے والد زمین داری کے خاتمے کے بعد گاؤں سے آ کر اس شہر میں بس گئے تھے۔ پچھلے سات برس تک عدالتی کاموں کی مصروفیت رہی پھر عائشہ پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے دوسرے سال انھیں دل کا دورہ لے گیا۔ مرتے وقت انھوں نے اپنے پڑوسی فیض احمد خاں وکیل سے وصیت کی کہ وہ عائشہ کی شادی تک میری کفالت کریں۔ مرحوم نے ڈاک خانے میں اچھا خاصا روپیہ چھوڑا تھا، جسے ان کے دوست نے خرد برد کر کے ہم لوگوں کو پالنے کا بہانہ ڈھونڈا۔ پچھلے سال جب ان کا لڑکا سعودی عرب ملازمت کرنے گیا تو اپنی دستگیری کے عوض میں انھوں نے میری لڑکی کا ہاتھ مانگا۔ عائشہ یہاں تھی ہی نہیں۔ وہ کالج کے ٹور پر گئی ہوئی تھی۔ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ کہیں سے کوئی پیغام بھی نہیں تھا۔ یوں بھی کھاتے کماتے سید لڑکے عنقا ہیں۔ فیاض خاں وکیل تو میرے کفو میں بھی نہیں ہیں لیکن میں نے رشتہ منظور کر لیا۔ عائشہ جب آئی تو اس نے بڑے صبر کے ساتھ اپنا انجام سنا۔ اس نے ایسی منگنی سنی ہی نہیں تھی جس میں لڑکی موجود ہی نہ ہو لیکن وہ میری بات کے آگے مجبور تھی۔"
کہتے کہتے وہ رکیں، ارشد کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا۔
"اس کے بعد چند ہی روز بعد تم نے کالج کے جلسے میں اس کے منھ سے غزل سنی اور اس سے ملے۔ یہ سب اس نے مجھے خود بتایا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا منگنی ختم نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اس کے مرے باپ کی

عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔ لڑکا ہونہار ہے۔ خوب کماتا ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا ہے۔ کیا کہہ کر منگنی توڑوں گی۔ پھر میرے باپ کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے ارشد بیٹے۔"

"تو آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا۔

"میں نے نہیں بلایا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ ارشد کو تفصیل سے بتا دیں۔ اس لئے میں نے تمہیں سب باتیں بتا دیں۔"

"کیا کوئی صورت ایسی نہیں ہے کہ آپ عائشہ کا بیاہ میرے ساتھ کر دیں۔" اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔

وہ اس کی طرف بہت شفقت سے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں موتی سے چمکنے لگے۔ وہ اٹھیں اور اٹھ کر انھوں نے ارشد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ارشد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مضبوطی سے پوچھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بہت دھیرے سے لیکن مضبوط لہجے میں بولیں۔

"نہیں۔ اور آئندہ مجھے تم دونوں میں سے کوئی بھی اس کشمکش میں نہ ڈالے۔ عائشہ چائے لے آؤ۔"

ارشد کے ہاتھ سے ان کا ہاتھ چھوٹ گیا اور آنکھوں کے سامنے مختلف رنگوں کے مختلف زاویوں کے خاکے بننے بگڑنے لگے۔

"میں بہت جلد ملازمت حاصل کرلوں گا۔" اس نے آخری ہتھیار استعمال کیا۔

نہیں بیٹے اس سلسلے میں ہم سب مجبور ہیں۔ مجھے اتنی دیر میں تم سے بہت محبت محسوس ہونے لگی ہے۔ لیکن یہ میرے مرحوم شوہر کی عزت اور ان کی بیوہ کی بات کا سوال ہے۔ میں تمہیں واضح طور سے انکار کر رہی ہوں تاکہ تم اب یکسو ہو جاؤ۔"

بندوق کی گولی نے نیلے کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی۔ اگلی دونوں ٹانگوں سے وہ گھسٹ گھسٹ کر دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہا تھا اور اسی جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں سے چلتا تھا۔

عائشہ نے اس کی طرف چائے سرکائی۔ اس نے بہت شوق کے ساتھ چائے پی۔

چلتے وقت عائشہ کی ماں نے کہا:

"ارشد بیٹے اب تم عائشہ سے مت ملا کرنا۔"

وہ جاتے جاتے مڑا اور بہت بے بسی سے عائشہ کی طرف دیکھا۔

"امی ارشد بہت رویا کرے گا۔ یہ مجھے بہت چاہتا ہے امی۔"

"نہیں۔ میں رویا نہیں کروں گا عائشہ کی امی۔" اس نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا۔

"اب تم امی کے سامنے مت رو پڑنا پاگل۔" عائشہ نے بہت بے بسی کے ساتھ اسے ڈانٹا۔

"تم مجھے اتنا کمزور کیوں سمجھتی ہو۔" پٹ سے اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا۔

امی یہ رو رہا ہے۔ اسے میں بہت چاہتی ہوں۔ اسے رونے مت دیجئے امی۔ اسے چپ کرا دیجئے۔"

عائشہ کی ماں نے اس کے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

ارشد نے ہولے سے ان کا ہاتھ بیچ میں ہی اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں کیا کروں گا۔ اس میں مجھے آپ کی مدد ملی تو میری عادت بگڑ جائے گی۔ تم عائشہ پرسوں کون سی غزل گاؤ گی؟"

وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"ماحول کو نارمل بنانے کے لئے یہ سوال پوچھ رہا ہوں۔" اس نے دھیمے سے مسکرا کر کہا۔ کوئی کام ہوا کرے تو مجھے بلا لیا کریں۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔" اس نے عائشہ کی امی کو مخاطب کر کے کہا۔

ہاسٹل کے کمرے میں آ کر اس نے اپنے بکس کو چھان مارا۔ کونا کونا چھان لیا لیکن شیشے کا ٹکڑا نہیں ملا۔ بچپن سے جمع کی ہوئی تمام چیزیں اس نے نکال کر رکھیں۔ چاندی کی چھوٹی کھوکھلی گیندیں، سفید موتی، سنہرا پین۔ باہر آ کر انھیں اینٹوں سے کچل کر سرمہ بنا دیا۔ ارشد نے سوچا میں کیوں سب چیزوں سے وابستہ رہتا تھا۔ میں کیوں اپنے بچپن کو گلے سے لگائے رکھتا ہوں۔ میں کیوں سب سے پیار کرنے لگتا ہوں۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ان چیزوں میں وہ شیشے کا ٹکڑا نہیں تھا جس میں ست رنگی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ رات کو وہ اسے اپنے سامان میں تلاش کرتا رہا۔ جب صبح کی اذان ہونے لگی تو وہ جوتوں سمیت بستر پر گر پڑا۔

سوتے وقت اس نے بہت واضح انداز میں محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھیں بالکل خشک ہیں۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔

دوسرے دن وہ بڑے کو بتائے بغیر گھر چلا گیا۔ امی ابا اسے اچانک دیکھ کر گھبرا گئے۔

"کچھ نہیں۔ بس دل چاہ رہا تھا سب کو دیکھنے کو۔ رضیہ کہاں ہے؟"

"پڑھنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی اسے دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

تھوڑی دیر میں رضیہ آ گئی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی جان کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ دونوں آنگن میں بیٹھے بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسے ابھی ابھی محسوس ہوا کہ اب رضیہ بڑی ہو گئی ہے۔ وہ مسلسل نگاہیں نیچے کئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

"رضیہ۔"

"جی۔"

"تم... تم کسی لڑکے سے کبھی شادی وادی کی بات مت کرنا۔ اچھا!"

''بھائی جان۔ میں کیا کوئی بے شرم لڑکی ہوں۔'' اس نے سرخ ہو کر کہا۔
نہیں بے شرمی کی بات نہیں۔ جلدی میں ایسی بات منھ سے نکل جاتی ہے۔''

لیکن عائشہ نے تو جلدی میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔
میں بھائی جان... کسی سے بات ہی نہیں کرتی۔ سیدھی کالج سے گھر آجاتی ہوں۔''

''شاباش۔'' اس نے اپنی بہن کی طرف بہت چاہت کی نظروں سے دیکھا۔

اماں آنگن میں دھوبی کے لائے ہوئے کپڑے ملا رہی تھیں۔
اس نے اماں کو ہولے سے مخاطب کر کے کہا کہ بابا نہ سن لیں۔
''اماں آپ اس لڑکی کے ہاتھ جلدی سے پیلے کر دیجئے۔''
اماں نے اپنے اکھڑ، ضدی اور خود سر بیٹے کو ہنستے بولتے دیکھا اور خوش ہوئیں۔

''تھوڑی سی ہلدی مل لو تو پیلے ہو جائیں گے۔'' رضیہ نے شرارتاً کہا۔
یہ محاورے بہت نامعقول ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جلدی سے تمھاری ڈولی اٹھوانے کا انتظام کرنا ہے۔''
''بھائی جان۔'' اس نے سرگوشیوں کے انداز میں کہا۔ ''اب تو کار میں آتی ہے بارات۔''
''بڑی تیز ہوگئی ہے تو۔''
ارشد اٹھ کر اماں کے پاس گیا۔ اماں ایک سفید کپڑے کو ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھیں۔ کپڑا بہت صاف ستھرا دھلا تھا۔ اس نے اماں کے چہرے کو دیکھا۔ اماں اور ابا کے چہرے بھی اب کتنے سفید، لگنے لگے ہیں۔ دھلے دھلے صاف ستھرے۔
''رضیہ یہ دوپٹہ اب مت پہننا۔ یہ ختم ہونے والا ہے۔ دیکھو کیسا صاف ہو کر آیا ہے۔''
''اس سے کیا ہوتا ہے؟''
''جب کپڑا ختم ہونے والا ہوتا ہے تو بہت صاف ستھرا دھل کر آتا ہے۔ وہ اس کی آخری دھلائی ہوتی ہے۔ بالکل ہلکا پڑ جاتا ہے۔''
تب اماں کے سفید چہرے کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کانپ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پھر اماں کے چہرے کو دیکھا۔
''اماں۔'' رضیہ قریب آکر شرارت سے بولی۔

''آپ بڑے بھائی اور ارشد بھائی جان کی دلہنیں لے آیئے۔ ہم دونوں بیٹھ کر حکم چلائیں گے اور وہ دونوں کھانا پکائیں گی۔''
دلہن کے نام پر ارشد کی آنکھوں کے سامنے وہ پرانا رنگ پھر گذرا۔ یہ رنگ مجھے کیوں اتنا پریشان کرتے ہیں اماں۔ تمھارا سفید چہرہ، ابا کا سفید سر، بادلوں کا مٹیالا رنگ، دیواروں کا کائی زدہ رنگ، شام کا دھندلا رنگ، رات کے آسمان کا سیاہ رنگ... یہ سب مجھے کیوں ڈراتے ہیں؟

اماں جب میں پڑھنے نہیں گیا تھا، نہیں پڑھتا تھا تب بھی رنگ مجھے بے چین کرتے تھے لیکن تب جستجو رہتی تھی کہ رنگوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ آسمان کے نیلے رنگ کے پیچھے کون ہے، کھیتوں میں ہرا رنگ کون بھرتا ہے، سرسوں کے پھول پیلے رنگ کے کیوں ہوجاتے ہیں۔ گیہوں کا خوشہ دیکھتے دیکھتے سنہرا کیسے ہوجاتا ہے۔ جاڑوں کے پرندے پیلے، سرخ، ہرے کاسنی رنگ کہاں سے چرالاتے ہیں۔ زمین پانی پی کر سانولی کیوں ہوجاتی ہے۔ سورج ڈوبتے وقت سرخ کیوں ہوجاتا ہے اور بادلوں میں اتنے عجیب عجیب رنگ کہاں سے آجاتے ہیں۔ ہیں اماں۔

اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ اماں سے پوچھے لیکن وہ چپ رہا کہیں رضیہ اسے پاگل نہ سمجھ لے۔
جب رضیہ ہٹ گئی تو اس نے اماں کی گود میں سر رکھ کر کہا۔
''اماں۔ تم سے ایک بات پوچھوں۔''
''پوچھو۔ لیکن یہ مت پوچھنا کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہوں۔''
اسے اماں کی اس بات سے صدمہ ہوا۔ وہ جان بوجھ کر اس وقت یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا حالانکہ یہ سوال کتنا اہم ہے۔ پر اماں کو میرے دل کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔ عجیب اماں ہیں۔ اس نے اماں کے سفید چہرے کو دیکھا تو اسے اماں پر پیار آگیا اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔
''اماں۔ وہ بات نہیں ایک اور بات ہے۔ یہ بتاؤ مجھے ایک عجیب سا رنگ نظر آتا ہے۔ کبھی تو فوراً غائب ہوجاتا ہے اور کبھی بہت دیر تک سامنے رہتا ہے۔ لیکن اس کی شناخت نہیں کر پاتا۔ بس دل چاہتا ہے کہ بغیر اس رنگ کو پہچانے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جاؤں اور اسے پکڑ لاؤں۔''
''رنگ کو تم کیسے پکڑ سکتے ہو؟'' اماں نے ارشد کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔
''بس یہی تو میں سوچتا رہ جاتا ہوں اماں۔ لیکن وہ کون سا رنگ ہوتا ہے اماں میں سمجھ نہیں پاتا۔''
''ایک بار۔'' اماں نے ماضی میں جھانک کر کہا ''ایک بار ہمارے ابا بھی کہہ رہے تھے کہ چھوٹے کو ایک رنگ بہت پسند ہے۔''
''کون سا رنگ اماں؟'' ارشد اٹھ بیٹھا۔
''اب یہ تو یاد نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم بہت روتے تھے تو انھوں نے تمھیں دلاسہ دے دیا تھا کہ کوئی گھوڑے پر بیٹھ کر آئے گا اور وہ رنگ تمھیں دے جائے گا۔''

''پھر اماں۔ پھر کیا میں بہل گیا تھا؟''
''معلوم نہیں۔ لیکن تم آسانی سے بہلتے کہاں ہو۔''
''اب بہل جاتا ہوں اماں۔'' ارشد نے اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔
''یہ میرا چھوٹا بیٹا خدا جانے کیسا ہے۔''

"اماں وہ رنگ کون سا رنگ تھا؟"

"یہ اب یاد نہیں ارشد۔"

اماں کی گود میں حرارت تھی اور نرمی تھی اور آنکھوں کو بہت سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک اسے عائشہ یاد آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر پھر وہی رنگ اڑ رہا تھا۔ اس رنگ کے محیط پر سنہرے روپہلے رنگ جھماکے مارتے تھے اور اندر بہت سے ہلکے گہرے ایک دوسرے میں جذب ہو کر بھی الگ ہو جاتے کبھی مل جاتے۔

"وہ ہے اماں۔ وہ دیکھو۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ رنگ آہستہ آہستہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور ہوتا جا رہا تھا۔

"کدھر ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ آسمان میں کوئی رنگ تھوڑے ہی اڑا کرتے ہیں۔"

"اماں! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے آنکھیں بند کی تھیں تو عائشہ ویسا ہی دوپٹہ پہنے تھی۔ آنکھیں کھولی تو وہ دوپٹہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑتا ہوا دور بہت دور کہیں جا کر کھو گیا۔"

"عائشہ کون ہے۔" اماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کہا۔

"ایک لڑکی ہے۔ ساتھ میں پڑھتی ہے۔ پر اماں اس کی تو منگنی ہو گئی ہے۔ ہماری اس سے کوئی بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم اماں اس سے میری شادی نہیں ہوگی۔"

اماں کچھ سمجھیں کچھ نہیں سمجھیں۔ وہ چپ چاپ اپنے بیٹے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہیں۔ جوان بیٹے کی آنکھوں میں نمی ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

کلاس سے نکل کر اس نے آسمان کو دیکھا۔ یہ شروع دسمبر کا آسمان تھا اور یہ سردیوں کی شام تھی۔ سردیوں کی شامیں کتنی اداس ہوتی ہیں۔ سڑک پر بہت کم لوگ تھے اور اسے اپنا وجود بہت بے معنی اور تنہا محسوس ہو رہا تھا۔

سامنے اشوک کے درخت کے نیچے وہ کھڑی ہے۔

ہم دونوں کو اب ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہئے۔ میں اس کے بغیر تین دن زندہ رہ چکا ہوں۔ اس کی ماں ہم دونوں کو منع کر چکی ہیں۔ میں اس سے نہیں ملوں گا۔ قریب سے گذروں گا تو آہستہ سے نکل جاؤں گا۔ سلام بھی نہیں کروں گا۔ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھوں گا بھی نہیں۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تھا۔ کپکپاتی ہوئی حرارت میرے ہاتھ میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اس کے وجود سے بہت مترنم نغمے پھوٹتے ہوئے سنے تھے۔ اس کے ہاتھ کے لمس میں کتنی چاہت تھی۔

شاید وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید وہ میرے ہی انتظار میں کھڑی ہے۔

ہم لوگ اب بچے نہیں ہیں۔ ہم پر ہماری پوری ذمہ داریاں ہیں۔ ہم معیار سے گرا ہوا کوئی کام نہیں کریں گے۔ یہ بات اسی دن طے ہو گئی تھی کہ اب ہم نہیں ملیں گے۔

جب وہ مجھے ارشد کہہ کر پکارتی تھی تو اس کی آواز میں کتنی محبت ہوتی تھی۔ میں اس کے قریب آتا جا رہا ہوں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی ہے۔ کیا وہ بت بن گئی ہے۔ اس کے بعد میں کتنا اکیلا ہو جاؤں گا۔ چار مہینے بعد وہ چلی جائے گی۔ کیا ان چار مہینوں میں ہم ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہیں کر سکتے۔

اس نے اگر مجھے پکار لیا تو میں کیا کروں گا۔

اگر میں اس سے بالکل بات نہیں کروں گا تو یہ کتنی غیر معمولی بات ہوگی۔ اس کے دل کو کتنا دھکا لگے گا۔ پھر وہ گھر جا کر چپکے چپکے روئے گی۔ پھر میں ہاسٹل جا کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤں گا۔ شام کو بیرا کھانا لے کر آئے گا تب بھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔

میں اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے سامنے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی یہ لڑکی کتنی اچھی لگتی ہے۔ اس کے روکھے روکھے بال کتنے لمبے ہیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں کتنا تیج ہے۔ یہ بالکل چپ کھڑی ہے۔ یہ مجھے مخاطب کیوں نہیں کرتی۔ کوئی اس سے کہہ دے کہ یہ مجھے جلدی سے ارشد کہہ کر مخاطب تو کرے۔ یہ بولے تو۔

سر جھکائے یہ لڑکا میرے ہی بارے میں سوچتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ کتنے مضبوط قدموں سے چل رہا ہے۔ یہ مجھے دکھانا چاہ رہا ہے کہ وہ مجھ سے دور رہ کر دیوانہ نہیں ہو گیا۔ لیکن اس کا چہرہ اتنا ویران کیوں ہے۔ یہ کیوں مجھے اتنا چاہتا ہے۔ یہ نازو کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔ یہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے اگر مجھ سے پوچھ لیا کہ میں یہاں کیوں کھڑی ہوں تو میں کیا جواب دوں گی۔ میں اسے کیسے بتاؤں گی کہ ارشد جب تم غصہ ہوتے ہو تو مجھے باپ کی طرح لگتے ہو۔ جب ہنستے ہو تو محبوب لگتے ہو۔ اور جب پریشان ہو کر آنکھیں نم کرتے ہو تو بالکل مجھے اپنے بچے جیسے لگتے ہو۔ اس کے قدم یہاں آ کر رک کیوں گئے ہیں۔ کیا ہم دونوں اسی طرح زندگی بھر کھڑے رہیں گے۔

"عائشہ۔" اس نے ہولے سے پکارا۔

اس نے مجھے پکارا ہے۔ میرے ہونٹ کیوں نہیں کھل رہے۔ یہ میری خاموشی سے ناراض نہ ہو جائے۔

"عائشہ تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ رکشے... کا... انتظار ہے؟" ارشد نے رک رک کر پوچھا۔

"ارشد! تم تین دن تک کہاں تھے۔"

"میں اپنے گھر گیا تھا امی کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔

اس نے اتنے روز مجھے یاد کیا ہوگا۔ ہر روز شام کو کلاس سے باہر نکل کر رکشے کا انتظار کرنے کے بہانے کھڑی ہو کر مجھے تلاش کرتی ہوگی۔

"تم نے کل بھی رکشے کا انتظار کیا تھا۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ آنسو کا ایک موٹا سا قطرہ آنکھ سے نکل کر

رخساروں پر بہتا ہوا اس کے دامن پر گرا۔

"عشو۔ اپنی امی کے پاس لے چلو مجھے۔ جلدی چلو۔"

"عائشہ کی امی... آپ سے ایک بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے عائشہ سے ملنے دیا کیجئے۔ میں گھر پر ملا کروں گا۔ آپ مجھے نہیں ملنے دیں گی تو میری پڑھائی لکھائی سب غارت ہو جائیگی۔ مجھے عائشہ بہت یاد آتی ہے۔ عائشہ کی امی۔ آپ اس کی شادی کسی سے بھی کیجئے لیکن ہم دونوں پر کوئی ایسی پابندی مت لگائیے۔ ورنہ میں پڑھائی لکھائی چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

وہ خاموشی سے بیٹھی سنتی رہیں۔ بہت دیر تک خاموش رہیں۔

"جاؤ مل لو۔ لیکن میں کبھی یہ نہ سنوں کہ تم دونوں باہر اکٹھا دیکھے گئے۔"

"میں عائشہ کے کمرے میں جا کر مل لوں اس سے۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اسے عائشہ کی امی بہت خوبصورت، بہت مہربان اور بہت بڑی نظر آئیں۔

"جاؤ۔" وہ بہت آہستہ سے بولیں۔

پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ میز پر اس کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور جذبوں کی شدت سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔

"تم میرے پاس... پلنگ پر بیٹھ جاؤ ارشد۔"

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آج اس کا دل بے ساختہ چاہ رہا تھا کہ وہ عائشہ کے ہاتھ چھوئے۔ انھیں خوب دیر تک تھامے رہے۔ پھر جہاں عائشہ کی گردن پر ہلکی نیلی ایک مہین سی رگ ہے وہاں ہولے سے اپنے ہونٹ رکھ کر بے آواز پیار کرے۔ یہ کہتی ہے کہ میں اسے ہاتھ بھی نہ لگاؤں اور میرا دل چاہتا ہے کہ اسے چھو کر محسوس کروں۔ غزالہ آپا تم نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ تم بہت خود غرض تھیں غزالہ آپا۔

میں ایک سانس کے فاصلے پر اس کے قریب بیٹھا ہوں۔ یہ مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں؟

ارشد نے دیکھا عائشہ کے پیروں کے گلابی ناخنوں کے پیچھے کھنچا کھنچا بھرا بھرا گوشت تھا اور پیروں پر راستے کی دھول کی ایک ہلکی سی تہہ تھی۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیروں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے آہستہ سے پیر پیچھے کھسکا لئے۔ پھر بھی ارشد نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ عشو نے شرمندہ شرمندہ نظروں سے ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"تم سیدانی ہو اس لئے۔ ان کی اولاد میں سے ہو نا۔"

وہ اسے ایسے دیکھتی رہی جیسے پھر دوبارہ ان لمحوں کو کبھی نہیں پا سکے گی۔

تب اس نے ارشد کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور ان پر اپنی نمناک آنکھیں رکھ دیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ارشد کے ہاتھ اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکے ہوں گے تب اس نے ارشد کے بھیگے بھیگے ہاتھوں پر اپنے سوکھے سوکھے ہونٹ رکھے۔ پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔

اس وقت امی بھی آجائیں تب بھی اس کا سر میں اپنی گود سے نہ ہٹاؤں۔

اس کی گود میں سر چھپا کر ارشد کو سب سے پہلے وہ جگہ ہلکی سی گرم محسوس ہوئی۔ پھر اسے وہ جگہ تھوڑی نم سی محسوس ہوئی۔ پھر اسے اس کی گود میں لباس کے نیچے سے ایک گیلی گیلی خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بغیر آواز پیدا کئے ایک لمبی سانس کھینچی۔ انسانی جلد، گوشت اور لہو کی ایک دہشت انگیز بو کو اس نے اپنے بدن میں جاتے اور وجود میں پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے لگا اس کا پورا آپا گنگنے پانی میں دھیرے دھیرے شرابور ہو رہا ہے اور سر سے پاؤں تک دھیمے دھیمے کچھ سلگ رہا ہے۔ اپنے جیتے بدن کے قرب کا یہ اس کا پہلا خود مختار تجربہ تھا جو اسے زمین سے بہت اوپر انجان خلاؤں میں لے گیا۔

آنکھیں بند کئے کئے ارشد کو ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا ایک دم سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اس نے عائشہ کی گود میں ایک ایسی مانوس گرمی محسوس کی جو آہستہ آہستہ اس کے پورے بدن میں ایک نرم نرم سا نور بھر رہی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے وہ رنگ آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔

"عشو میں وہ رنگ دیکھ رہا ہوں۔ اب بھی اس کی پہچان نہیں کر سکتا لیکن یہ وہی رنگ ہے۔ کیا تمھیں نظر آ رہا ہے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا۔

"نہیں ارشد۔ وہ رنگ مجھے نہیں نظر آ رہا ہے۔ لیکن مجھے تم نظر آ رہے ہو۔ تم میری گود میں سر رکھے ہوئے ہو۔ اور مجھے یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگ رہا ہے کہ یہ خواب نہیں ہے۔ تم سچ مچ میرے پاس بیٹھے ہو۔ تم میرے اچھے، بہت اچھے سے ارشد ہو نا!"

اس نے آنکھیں اٹھا کر ان آنکھوں کو دیکھا جو بھری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

"تم بھی تو آنسو بھر لاتے ہو ارشد۔" جیسے وہ اپنے رونے کی توجیہہ کر رہی ہو۔

"میں... اصل میں عشو بہت حساس ہوں... ہو گیا ہوں۔ مجھے کوئی غم والی بات برداشت نہیں ہو پاتی۔ میں کم ہمت ہوں اسی لئے حساس بہت ہوں۔"

"اور ارشد جب میں چلی جاؤں گی تب تم روؤ گے تو تمھیں کون منائے گا۔"

تب ارشد نے محسوس کیا کہ اس کے ماتھے سے کوئی چیز اندر ہی اندر اتری اور پلکوں کے پیچھے آ کر رک گئی۔

"تم ابھی مجھ سے کچھ مت کہو عشو۔ کچھ دیر بالکل چپ رہو عشو۔"

"اچھا نہیں کہوں گی۔" اس نے ارشد کے بالوں کو برابر کیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہو گئی کہ ان میں نمی نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایسے عالم میں تھا جہاں روز روز کوئی نہیں پہنچتا۔

عشو! بازار میں انسانی گوشت تو روپے کلو سے بھی کم قیمت پر مل جاتا

ہے۔ مگر کوئی قیمت یہ لمحے نہیں دے سکتی۔ یہ سکھ کے لمحے جب وقت تھما ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان لمحوں کے پیچھے رفاقت کی کتنی بڑی تاریخ ہوتی ہے۔ ان لمحوں میں جب دو چاہنے والے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ان نگاہوں میں کتنے عجیب عجیب سے راز ہوتے ہیں۔ ان نگاہوں میں کوئی سودا نہیں ہوتا۔ صرف ایک دوسرے کو سب کچھ دے دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کتنا کمیاب ہوتا ہے۔ اور سب کچھ دے دینے کا جذبہ رکھنے والا یہ وجود مجھ سے کتنی جلد جدا ہونے والا ہے۔

عشو نے جھک کر ارشد کے ماتھے کو چوم۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔ تب ارشد بولا۔

"عشو۔ تمھیں مجھے پیار کرنے میں جھجک نہیں ہوتی۔ تم شرماتی نہیں بالکل؟"

"کاہے کو شرماؤں۔ تم میرے غیر تھوڑے ہو۔ میرے ارشد ہو۔"

"اور تم میری عشو نہیں ہو کیا؟"

"ہاں میں تمھاری عشو ہوں۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم حد سے بڑھ جاؤ گے اور میں تمھیں روک نہیں پاؤں گی۔ میں چاہوں گی تب بھی نہیں روک پاؤں گی۔"

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ عشو۔"

وہ اس کے بالوں کو سنوارتی رہی۔

"عشو میں تمھیں پیار کروں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے ارشد کے بالوں کو چوم کر ہولے سے کہا:

"میرا اچھا سا ارشد میرے ماتھے پر پیار کرے گا۔ بس۔"

ارشد نے اٹھ کر عشو کا سر اپنے زانوؤں پر رکھا اور اس کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ اس کے اجلے ماتھے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کو پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے کو تکتا رہا اور پھر آہستہ سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ تسکین کے ایک اتھاہ احساس سے عائشہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر جانے ارشد کے دل میں کیا آیا۔ اس نے عائشہ سے کہا۔

"میں بے ایمانی کر رہا ہوں عشو" اور ڈرتے ڈرتے عشو کے گرم ہونٹوں کو چوم لیا اور جلدی سے عائشہ کی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے کہ وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف شکایتی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔

جب اس نے بہت دیر کے بعد عائشہ کی آنکھوں سے ہونٹ ہٹائے تو عائشہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھا۔

"تم اداس سے کیوں ہو ارشد؟"

"معلوم نہیں کیوں؟ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اتنی چاہت سے مجھے اور کوئی پیار نہیں کرائے گا۔"

"تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرا دل بہت بے چین ہو جاتا ہے ارشد۔ ہونا وہی ہے جو ہوگا پر اس کا دھیان مت دلایا کرو۔ پھر میرا بھی دل ڈوبنے لگتا ہے ارشد۔"

"نہ، تم مت رونا عشو۔" ارشد نے اسے چپٹا کر اپنے پاس کر لیا۔ تب عائشہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو خشک کیے۔

عائشہ نے آنکھیں خوب کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی سوال نہیں ہے۔ لیکن سوچ کتنی ہے۔ اسے کس بات کی فکر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے کس بات کی فکر ہے لیکن خود کو بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مجھے چاہنے والی یہ آتما مجھ سے دور ہو جانے کی فکر میں دکھی ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ اسی لئے میں خود کو فریب دینے کے لئے خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ عشو میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہی ہے۔

وہ اسے بالکل بے خوف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بھولے بھالے چہرے پر ہلکی سی ندامت کا سایہ رہے ورنہ یہ بے خوف ہو کر خود غرض ہو جائے گی۔ مجھے بھول جائے گی۔ ندامت کا یہ بندھن اسے مجھ سے باندھے رہے گا۔

یہ سب سوچ کر اسے خود پر غصہ آیا لیکن اس نے برداشت کیا۔ اس کا بے ساختہ دل چاہا تھا کہ وہ عشو کی آنکھیں بہت دیر تک چومے اور کہے کہ... تم نے ایسا کیا کیا ہے جو تم مجھ سے شرمندہ ہو۔ تم تو مجبور ہو۔ تمھاری امی زبان دے چکی ہیں۔ اسی لئے تم دوسرے سے شادی پر راضی ہو۔ ورنہ میں سب جانتا ہوں کہ تم مجھے کتنی شدت سے چاہتی ہو۔ لیکن اس نے یہ سب نہیں کیا۔ اسے اپنی چالاکی پر حیرت ہوئی۔ پھر اور زیادہ حیرت تب ہوئی جب اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنی چالاکی پر خود ہی پیار بھی آ رہا ہے۔

جس دن اس کی شادی تھی وہ اس کے دولہا سے ملا۔ ہاتھ ملایا اور مبارکباد دی۔

اور اس دن اس نے بہت مدت کے بعد ایک دعا کی اور دل ہی دل میں ان سے کہا کہ یہاں سے رخصت ہو کر میری عشو آپ کے علاقے میں بسنے کے لئے آ رہی ہے۔ بس اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کا شوہر ہمیشہ اسے چاہے۔ میری عشو کو کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ خدا سے دعا فرمائیے گا۔

شادی کا پنڈال اکھاڑا جا چکا ہے۔ میزیں آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ کاغذ کی جھنڈیاں ہوا میں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔

تب ارشد نے ہوٹل کے کمرے میں لیٹے لیٹے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے کہا۔

اب نہ بھیگا کرو۔ اب تمھیں چومنے والے ہونٹ اس وقت بہت دور جا چکے ہیں۔ اور وہ آنکھیں جو تمھیں دیکھ کر مغموم ہو جاتی تھیں اب یہاں نہیں

ہیں۔

میری عشو کی آنکھیں... وہ بڑی بڑی شفاف آنکھیں، وہ چاند ستاروں جیسی آنکھیں، وہ سورج جیسی روشن اور بے داغ آنکھیں، وہ ضدی اور سرکش آنکھیں، وہ باغی اور وحشی آنکھیں، وہ بے پروا آنکھیں، وہ مغموم آنکھیں، وہ سمندر جیسی اتھاہ اور آسمان جیسی وسیع آنکھیں، وہ بہادر آنکھیں، وہ سپاہی آنکھیں، وہ سوال آنکھیں، وہ جواب آنکھیں، وہ جاڑوں کی راتوں جیسی سنسان اور گہری آنکھیں، وہ گرمیوں کی دوپہروں جیسی خاموش اور اجاڑ آنکھیں، وہ بادلوں جیسی گھنگھور آنکھیں، وہ تھکی تھکی آنکھیں، وہ وفادار آنکھیں مجھ سے بہت دور جا چکی ہیں۔ ہزاروں کوس دور۔

شادی کے تیسرے دن عائشہ کی ماں نے اسے بلایا۔ شادی میں آئے دور کے عزیز رخصت ہو چکے تھے۔ آج ارشد کو یہ جگہ بہت اجنبی سی لگی۔

اس نے عائشہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ہم نے اپنی محبت کے قصے بنے تھے۔ یہیں بیٹھ کر میں نے تم سے کہا تھا کہ چاہو مجھے کہ میں چاہے جانے کے لائق ہوں۔ یہیں بیٹھ کر ہم نے سوچا تھا ہم تم بہت اچھے انسان ہیں۔ یہیں ہم نے رنگوں کی باتیں سنی تھیں۔ خوشبوؤں کی کہانی لکھی تھی۔ یہیں ہم نے جھگڑوں کے حل اپنی محدود عقلوں کے بوتے پہ طے کرلئے تھے۔ یہیں سب سے چھپ کر بھی سب کے آگے ملاقاتیں کی تھیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے خودسر اناؤں کو معصوم جذبوں کی چادر اڑھا کر تمہارے بدن کو چھوا تھا۔ یہیں تم نے معصوم آنکھوں سے پہلی دفعہ مجھ کو دیکھا۔ یہیں نرم ہونٹوں کو تم نے میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ یہیں اپنی گودی میں سر رکھ کے تم نے کہا تھا کہ میں آپ کو چاہتی ہوں کہ اتنا کسی کو نہیں چاہتی میں۔ یہیں بیٹھ کر میں نے پہلی دفعہ زندگی میں یہ سوچا کہ جس سے محبت کرو اس کو چھولو تو سارے بدن میں عجب برق سی دوڑتی ہے۔ یہیں میں نے تمہاری گود میں سر رکھ کے سوچا تھا کہ اس سے زیادہ پناہیں کہیں بھی نہیں ہیں۔ اور آج میں خود کو بہت مطمئن سا دکھا کر تمہیں سوچ رہا ہوں کہ تم دور جانے والے کسی راستے پر اپنے خیمے کا بوجھ اٹھائے رواں ہو۔ بوجھل تھکن تمہارے چہرے پر جمی ہوئی ہے۔ خدا تم کو خوب خوشیاں دے عشو کہ تمہارا غم مجھ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

اور عائشہ! تمہیں یاد ہے وہ آخری شام جس شام ہم نے طے کیا تھا کہ اس شام کے بعد ہم کبھی اس طرح نہیں ملیں گے۔ ہم نے اپنی اس ملاقات کو آخری ملاقات کا نام دیا تھا۔ نیم روشن کمرے کے باہر پتھریلے فرش پر خزاں کے پتے آہستہ روی سے کھیلتے تھے۔ کس اطمینان سے ہم دونوں الگ ہوئے اس اطمینان نے ہم دونوں کو یقین دلایا کہ ساری کہی ان کہی باتیں ہم سمجھ چکے ہیں۔ اور جو نہیں سمجھے وہ کوشش کریں تو سمجھ سکتے ہیں۔ باہر دھندلی اور بے پروا شام ہماری منتظر تھی۔

ایک لمحے کو... نہیں، نہیں کئی مرتبہ ایک دوسرے کی بدن کی محرومی کا خیال ہمارے دلوں میں نشتر بن کر اترا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تھامے ہوئے کھڑے رہے تھے۔ باہر موسم دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ تمہارے گرم گداز، سانسوں کی تیز مہک اور بالوں کی مدھم خوشبو نے ایک عرصے تک مجھے بے قابو رکھا تھا اور یہ بتایا تھا کہ محبت میں جب جسم سپرد کیا جاتا ہے تو کتنی مسرت اور لذت اور ان دیکھی زمینوں کا لمس ملتا ہے۔

کھڑکی کے باہر روشنی کجلانے لگی تھی اور فضا کی خاموشی آنے والی رات کے سامنے سینہ سپر تھی۔ اور یہ بھی خیال آیا تھا کہ اب میری جان کا کونہ کونہ تمہاری آواز کے لمس کو ترسے گا۔ اور یہ بھی سوچا تھا کہ اب شاید کوئی عشو نہ ملے جس کی گود میں اپنی مرضی اور ارادے سے سر رکھ کر خاموش بیٹھا جاسکے۔

یہ بھی دھیان آتا تھا کہ اس شہر پناہ کا آخری دروازہ اب بند ہونے والا ہے جس کے اندر ایک عرصے تک ہم نے معصوم بچوں کی طرح آنکھ مچولیاں کھیلی تھیں۔ پھر گہرے آسمان پر شفق کی نئی پھیکی پڑنے لگی تھی۔

جب ایک دوسرے سے الگ ہونے کا وقت بہت قریب تھا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت سی نصیحتیں کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ اور اب ہمیں صرف اس ایک آخری لمحے کا انتظار تھا۔ اور وقت کیوں کہ رکتا نہیں اس لئے وہ آخری لمحہ آیا۔ اور وہ ایک لمحہ سارے ماحول پر چھا گیا۔ چھاتا چلا گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قریب کیا۔ اور آہستہ سے، بہت آہستہ سے ایک دوسرے کے محروم ہونٹوں کو چوما۔ اور خدا حافظ کہا۔

تم اپنے کمرے سے نکل کر اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جب تمہارے پیرہن کی پرچھائیاں بھی میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو میں نے سوچا کہ ہم دونوں اپنی اس خوبصورت اور جان سے پیاری دنیا کے ذمہ دار انسان ہیں اور ہم دونوں پر ہم دونوں کے علاوہ اس دنیا کا بھی حق ہے۔ ہم دونوں دنیا کے اس بے جا حق سے ہرگز نہیں مکر سکتے۔ ہم دونوں اپنی ذمہ داریاں ایمانداری سے نبھائیں گے۔ اور اسی فریب کے نشے میں خود کو گرفتار رکھیں گے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ یہ نشہ کبھی نہ ٹوٹے ورنہ ہم دونوں کو ہماری دلربا اور ضدی یادیں ان سرکش گھوڑوں کی طرح اس میدان کارزار میں گھسیٹتی پھریں گی جن کے دلیر لڑاکا سوار گھوڑوں کی پشت پر جان دے دیتے ہیں اور رکابیں پیروں میں پھنسی رہ جاتی ہیں۔

عشو یہ نشہ نہ ٹوٹنے دینا۔ یہ ہماری تقدیر ہی نہیں ہمارا انعام بھی تو ہے۔

چق اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ عائشہ کی ماں نے کھڑکی بند کی اور اس کی طرف گھومیں۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھیں اور ارشد کی آنکھوں میں جھانک کر اپنی بیٹی کی محبت کا سایہ دیکھا، دھیمے سے ارشد کا ماتھا چوما اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"جب وہ رخصت ہو رہی تھی تو اس نے کہا تھا کہ اماں ارشد کو پاس بار بار بلا لیا کرنا۔ وہ بہت دکھی ہوگا۔ تم اس سے باتیں کروگی تو اس کا غم کم ہو جائے گا۔ اور ارشد... تمہیں معلوم ہے عائشہ کے جانے کے بعد مجھے اس کی صورت تمہاری شکل میں نظر آنے لگی ہے۔ تم نے خود کو کیسا ویران بنا رکھا ہے۔ ایسے بے حواس تھوڑے ہی ہوا جاتا ہے محبت میں۔ خود کو سنبھالو تمہاری بھی تو ذمہ داریاں ہیں ارشد بیٹے۔"

ارشد نے آنکھیں جھکائے بغیر ان کی باتیں سنیں۔ جب وہ کہہ چکیں تو اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھامے ہاتھوں کو پکڑا۔ اپنی عشو کی ماں کے مغموم چہرے کو دیر تک دیکھا۔ پھر ان کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے آہستہ سے الگ کیا اور بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے نکل کر گھر سے باہر آ گیا۔

مجھے محبت کے آداب نہ سکھائے جائیں۔ مجھے یہ بتانے کی زحمت نہ گوارا کی جائے کہ اس سے بچھڑنے کے بعد دیوانہ بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے نہ سمجھایا جائے کہ میرے اوپر میرے گھر اور دنیا کی بھی ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے ان باتوں کا علم ہے۔ مجھے یہ باتیں بتا کر مجھ پر یہ جھوٹ نہ ثابت کیا جائے کہ میں بدحواس یا بے حس ہوں یا اپنے آپ سے اپنے حالات سے ناواقف ہوں۔

ہاں... میں جانتا ہوں کہ میری دیوانگی میں اس کی رسوائی ہوگی۔ میرے غم کے اظہار اور گوشہ نشینی سے اسے دکھ ہوگا، میری خاموشی کی خبر سے اسے وحشت ہوگی۔

ہاں... مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں کسی کے دل کی ٹھنڈک ہوں۔ کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔ میں کسی کا عصائے پیری ہوں اور کسی بہن کا ... اپنی اکلوتی بہن کا چہیتا بھائی بھی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے سب معلوم ہے لیکن اوروں کو نہیں معلوم کہ اس دور جانے والی کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے، ذہن آزاد کر کے میں نے جو خود اپنے آپ ایک رشتہ ڈھونڈا تھا۔ وہ رشتہ تمام رشتوں سے بڑا ہے کیوں کہ میں نے اسے اپنی مرضی سے تخلیق کیا تھا۔

گیتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"پھر کیا ہوا ارشد۔ مجھے اپنے اور عائشہ کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

ارشد آنکھیں بند کئے ہولے ہولے سانس لیتا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کئے کئے گردن پر مفلر درست کیا پھر آنکھیں کھول کر کھڑکی کے باہر کہرے سے پرے اس پہاڑی کو دیکھا جس کے دامن میں دبلی پتلی لمبی سی لڑکی پہلی بار ملی تھی جو اب اس کی دوست بن گئی ہے۔ ارشد نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا عشو نے اپنی شادی سے چند دن پہلے پوچھا تھا کہ تم مجھ سے کیا کیا چاہتے ہو۔

میں نے اسے بتایا تھا کہ کچھ خاص منظر ہیں جو مجھے تمہارے حوالے سے نظر آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں گھنے اور خطرناک جنگلوں میں شکار ہو رہا ہو۔ تم میرے ساتھ ہو اور میں غیر ضروری بہادری دکھا دکھا کر تمہیں خوش کر رہا ہوں۔

ایک بہت بڑے پرانے سے گھر کے، چونے سے قلعی کئے اونچی اونچی محرابوں والے دالانوں میں چوکی پر سفید چادر بچھی ہو۔ اس پر جانماز ہو۔ تم ایک گہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے دعا مانگ رہی ہو۔ اے خدا! ارشد کو ہمیشہ اچھا رکھنا۔

آنگن میں گرمیوں کی چاندنی ہو۔ آسمان بہت صاف ہو۔ بالکل تنہائی ہو۔ کھجور کا درخت ایک دوست جیسا لگ رہا ہو۔ تم میرے برابر لیٹی ہو اور تمہارا سر میرے سینے پر ہو اور مجھے یقین ہو کہ رات بہت دیر تک رہے گی۔ اور عشو میرا دل چاہتا ہے کہ سردیوں کی صبح تیز ہواؤں میں دالان سے نکل کر باورچی خانے میں ہم دونوں جائیں۔ لکڑی کے چولہے پر خوب گاڑھی گاڑھی چائے بنائیں۔ تم دو پیالیاں لے کر، شال اوڑھے سرد ہوا میں نکل کر اندر والے کمرے میں میرے والدین کو چائے دے کر آؤ۔ پھر میں پیڑھی پر جگہ بنا کر تمہیں بٹھاؤں۔ پھر ہم دونوں بغیر منہ دھوئے ساتھ ساتھ چائے پئیں۔

اور عشو... میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میرے بچے تمہیں ماں کہیں۔

اس خواہش پر اس کی آنکھوں میں شرم چمکنے لگی تھی۔

ہم دونوں ہنس پڑے تھے۔ پھر ہم دونوں اداس ہو جاتے تھے۔

وہ بہت بہادر بن کر مجھ سے ایسے سوال کرتی تھی، وہ مجھے جتاتی رہتی تھی کہ وہ دور ہونے کے خیال سے نروس نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا تھا۔ وہ اپنی خوش دلی سے مجھے ہمت دیتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی یہ بات بری لگتی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ میرے سامنے آیا کرے تو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا کرے۔ اس دن کے خیال سے کانپ کانپ جایا کرے جب وہ مجھ سے دور کر دی جائے گی۔

"عشو جیسا مجھے محسوس ہوا کرے وہی تم بھی محسوس کیا کرو۔ مجھے سکھ ہو تو تمہیں سکھ محسوس ہو، مجھے دکھ ہو تو تمہیں بھی دکھ محسوس ہو۔ جب میں آنے والے دنوں کے خیال سے افسردہ ہوتا ہوں اور تم خوش دلی کا اظہار کرتی ہو تو مجھے بہت زیادہ احساس کمتری محسوس ہوتا ہے۔ کیا تم بے حس ہو گئی ہو یا میں بہت حساس ہو گیا ہوں؟"

اس نے یہ سن کر باہر جھانکا تھا۔ کسی کو نہ پا کر مطمئن ہوئی تھی اور میری گود میں سر رکھ کر میرے ہاتھ کو پکڑ کر بولی تھی۔

"میں بہت جلد یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔ تمہیں چھوڑ کر۔ اگر اداس نظر آؤں تو تم بھی اداس ہو جاؤ گے۔ تمہیں دکھی دیکھ کر بہت گھٹن سی ہونے لگتی ہے۔ تم ہر چیز میں میرے شریک ہو گئے ہو۔ جہاں میں جا رہی ہوں وہاں ہوا ہوگی، بادل ہوں گے، پرندے ہوں گے، سردیوں کی سنسان راتیں اور گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا بھی ہوگا۔ پھولوں کی مہک ہوگی اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوگی۔ میں شاعری نہیں کر رہی۔ ان سب چیزوں میں مجھے تم کہیں نہ کہیں مل جاتے ہو۔ وہاں کبھی اکیلے کمرے کی تنہائی میں جب تم کسی بھی وقت یاد آؤ گے اور ہوا کا کوئی جھونکا، بادل کا کوئی ٹکڑا، پھولوں کی خوشبو، پہلے پانی کی سوندھی سوندھی مہک نے اگر مجھ سے پوچھ لیا کہ وہ کیسا ہے جسے تم چھوڑ آئی ہو تو میں کیا جواب دوں گی۔ ارشد... تم مجھے خوش خوش رخصت کرو گے تو میں تمہارا ہنستا ہوا چہرہ یاد رکھوں گی ورنہ تمہارا غمگین چہرہ میرے حواس پر چھایا رہے گا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تمہیں اچھی اچھی باتیں سنایا کروں اور تمہیں خوب خوش رکھا کروں۔ تم جانتے ہو ارشد میں تمہیں کیسے چاہتی ہوں جیسے ماں بیٹے کو چاہتی ہے جیسے بہن بھائی کو جیسے بیٹی باپ کو جیسے بیوی شوہر کو جیسے محبوبہ اپنے محبت کرنے والے کو۔ میں تمہیں الگ الگ انداز سے چاہتی ہوں اور مجھے اپنی ساری محبتیں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسے ہی محبت کرتے رہنے دینا۔ ہماری محبت کو ہمارے ساتھ کی مدت سے مت ناپنا۔ ورنہ ہم دونوں گھاٹے میں رہیں گے۔

میری گود میں سر رکھ کر وہ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی تھی پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ میرے قرب کے خمار میں ڈوبی ہوئی وہ وحشت بھری گہری گہری اداس آنکھیں۔ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ایک دم سے وہ آنکھیں کچھ بول دیں گی۔ میں نے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

"اور ارشد سنو۔ جب میں یہاں سے چلی جاؤں تو ہمیشہ یونہی سنو کہ تم ویسے ہی نڈر اور بے باک اور خودسر ہو جیسے میرے سامنے تھے۔ خود کو بدلنا مت۔" اس نے عائشہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما اور اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔

میں اس لمحے کے کرب کو پہچانتا ہوں جب یہ یہاں نہیں ہوگی۔

یہ احساس کتنا شدید ہے کہ میں اسے حاصل نہیں کر سکا۔ توہین کا یہ احساس کتنا تلخ محسوس ہوتا ہے۔ یہ بچھڑ جائے گی اس تصور سے میں کتنا گھبرا جاتا ہوں۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ یہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے تو شاید میں خودکشی کر لیتا۔

عشو اس وقت تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ میں کچھ بولوں گا تو تم آنکھیں کھول دو گی۔ مجھے تمہاری بند آنکھیں اچھی لگ رہی ہیں اس لئے کچھ نہیں بولوں گا۔ عشو میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اگر تم آنکھیں نہ کھولو تو بتاؤں۔ میں ایک بہت بڑے شہر میں ہوں۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ میں ایک بہت اونچی سی عمارت کی چھت پر کھڑا ہوں۔ سارے شہر میں عمارتیں بکھری ہوئی ہیں جو کہیں کہیں دھند میں لپٹی ہیں اور کہیں کہیں چاندنی میں چمک رہی ہیں۔ میں جس عمارت پر کھڑا ہوں اس کے برابر ایک اونچی سی مسجد ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک سانپ ہے۔ اتنا مجھے معلوم ہے کہ اس سانپ کو مارنے پر انعام میں کوئی چیز ملے گی۔ میں اس سانپ کا پھن پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میرا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ مجھے انعام میں کیا ملنے والا تھا عشو مجھے نہیں معلوم۔ ناگ کو مارتے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن خواب میں ہی مجھے بہت واضح انداز میں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پورا خواب تم سے متعلق تھا۔

تم نے اپنے نفس کو مار کر میری محبت کو ہمیشہ کے لئے حاصل کر لیا تھا۔

ارشد۔ اسے عائشہ کی آنکھیں جملہ کہتی ہوئی نظر آئیں۔

عشو جانے سے پہلے میرے دکھوں کا اعتراف کر کے جانا۔ ورنہ میں تم کو معاف نہیں کروں گا۔ میرے دکھوں کا اعتراف ضرور کرنا عشو۔ اور تم مجھ سے یہ کہہ کر مت جانا کہ ارشد تم خوش خوش رہنا۔ تم یہ مت کہنا۔ اور تم وہاں پہنچ کر پورب کی طرف دیکھنا تو ہندوستان میں ایک شخص تمہیں نظر آئے گا جو اپنے پورے وجود کے ساتھ تمہیں چاہتا ہے۔ بس اس احساس سے ہمیشہ مطمئن اور خوش رہنا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک دیکھنے کے بعد بولی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو ارشد۔"

"میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔"

اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے بال چھوئے، میرا چہرہ چھوا اور کہا تھا۔

"چھوٹے۔ میرے جانے کے بعد تم اگر پریشان ہوئے تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔"

"تمہیں معلوم ہی کیسے ہو پائے گا کہ میں پریشان ہوں کہ خوش۔" یہ جملہ کہتے ہوئے اسے سکون سا محسوس ہوا۔ گویا عائشہ کو یہ بتا کر اس نے واضح کر دیا ہو کہ تم جو اپنی شادی رچا کر اتنی دور جا رہی ہو تو وہاں سے میری خیریت کیسے پاؤ گی۔ جسے چاہیں اسے اس طرح کے نشتر چبھو کر خوش ہونا مرد کی فطرت ہوتی ہے۔ اور اس کا وہی اثر ہوا تھا جو وہ چاہتا تھا۔

عائشہ کی انگلیاں اور زیادہ کانپنے لگیں۔ اس نے اپنا چہرہ اور زیادہ شدت کے ساتھ اس کی گود میں چھپا لیا۔

اور ارشد نے اس وقت عائشہ کے دکھ کے متعلق ایک لمحے کو نہیں سوچا۔ صرف یہ سوچا کہ یہ اس وقت میرا حق ہے جو مجھے مل رہا ہے۔

مرد کبھی کبھی ایسے بھی کمینی حرکتیں کرتے ہیں۔

تب عائشہ نے دھیمے دھیمے کہا تھا۔

"ارشد۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں آنگن میں کھڑی ہوں، بارش بہت زوروں سے ہو رہی ہے۔ میں شرابور ہو گئی ہوں۔ ٹھنڈی ہوا سے میرا بدن کانپے جا رہا ہے۔ تم برآمدے میں کھڑے ہو... لیکن میری طرف بڑھتے نہیں۔ تم معلوم نہیں میری طرف کیوں نہیں بڑھتے۔ شاید میں نے تمہیں منع کر رکھا ہے کہ تم آنگن میں نہ آنا۔ مجھے سرد ہواؤں میں کھڑا رہنے دینا اور بھیگتے رہنے دینا۔ کبھی کبھی میں بہت شرمندہ ہو جاتی ہوں تمہارے سامنے۔ تم معلوم نہیں مجھے معاف بھی کرو گے کہ نہیں۔ اے ارشد تم مجھے معاف کر دو گے نا؟"

ارشد نے اس کے چہرے کو اٹھا کر پھر اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان میں سچ تھا۔ پھر بھی ارشد نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم شرمندہ کیوں ہو۔ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ تم مجھ سے معافی کیوں مانگتی ہو۔ ارشد اسے مطمئن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ اگر عشو مطمئن ہو گئی تو اسے بھلا دے گی۔ اگر ندامت کا احساس ختم ہو گیا تو وہ محبت کی بازی جیت لے گی۔

خبر نہیں کہ میرے ہونٹ اب سیاہ پڑ چکے۔ میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔ تڑپ تڑپ کر ابل ابل کر میرے جسم میں خون بہہ رہا ہے۔ کھال جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ بدن پر ہر جگہ نظر آنے والے گھاؤ ہیں جو درد سے ٹپک رہے ہیں۔ ہر وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میری ساری رگوں کو زور سے نچوڑ رہا ہے۔ آنکھیں جمے ہوئے خون کی طرح سرخ ہو گئی ہیں۔ دل کے آس پاس دھواں سا بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حلق سوکھے ہوئے تنے کی چھال کی طرح خشک ہو جاتی ہے۔ دل کے اندر جیسے کوئی سوئیاں سی چبھوتا ہے۔

صرف ایک بار میرے پاس آؤ۔ ہاتھ میں کھلا ہوا دھاردار خنجر لئے ہوئے۔ جلد آؤ۔ دیر مت کرو۔ قریب آ کر میری ہڈیوں کو کاٹ دو۔ میرے بدن کو

چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں بانٹ دو۔ کٹی ہوئی ہڈیاں فضا میں اچھال دو۔ اور خنجر کی تیز نوک ڈال کر میری آنکھیں نکال لو۔ پھر اپنے ہاتھ سے گلا ذبح کرو۔ رکو نہیں۔ حلق کی گرگراہٹوں سے ڈرو نہیں۔ خون کے اچھال سے بچو نہیں۔ رگوں سے سب لہو نچوڑ لو۔ بدن کی جلد تیز نوک سے جگہ جگہ سے پھاڑ دو۔ بدن کے سارے رونگٹے چٹکیوں میں پکڑ کر اکھاڑ دو۔ پھر بدن پر لہو کا ناچ دیکھو۔ بدن کی ہڈیوں اور گوشت کی بوٹیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ لگا کر راکھ کر دو اور ٹھوکروں سے اس راکھ کو اڑا دو۔

جلد آؤ عشو۔ بس آخری بار۔ بس آخری بار۔ بس تم سے یہ آخری سوال ہے۔

رات آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی۔ ہوسٹل کے کمروں کا شور مدھم ہو چکا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی ارشد کو محسوس ہوا جیسے کوئی باہر کھڑے ہو کر محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں سو گیا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

"کون ہے۔" ارشد نے پوچھا۔

"میں ہوں دروازہ کھولو۔" یہ بڑے کی آواز تھی۔

ارشد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بڑا اندر داخل ہوا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بڑا اتنی رات گئے کبھی نہیں آتا۔ کیا بات ہے۔ گھر سے کوئی آیا کیا۔" ارشد نے سانس روک کے روک کے پوچھا۔

"نہیں، گھر میں سب ٹھیک ہے تم بیٹھ جاؤ۔"

ارشد بیٹھ گیا۔

"ارشد۔"

"ہاں۔ کیا بات ہے کوئی خاص بات۔"

"نہیں... کوئی خاص بات نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ اب بڑے ہو گئے ہیں۔ جوان ہو گئے ہیں۔"

ارشد نے سوچا کہ کہہ دے کہ یہ اطلاع دینے کے لئے اس وقت رات میں زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت بڑے سے وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

"معلوم نہیں ہم لوگ اپنے پیروں پر کب کھڑے ہوں گے؟" بڑا دھیرے سے بولا۔

ارشد اس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"پہلے تم ملازم ہو گے پھر میں۔ تم بڑے ہو۔"

"ارشد یہ اپنے اختیار میں کب ہے۔ تمہیں معلوم ہے کل یاسمین کی شادی ہے۔"

"یاسمین۔ کون یاسمین۔ وہ جو بچپن میں اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آتی تھی۔ نیلی آنکھوں والی۔ کب ہے اس کی شادی؟"

"کل۔" بڑے نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر۔" ارشد نے پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں۔" بڑا آہستہ سے بولا۔ "اس کی آنکھیں آسمان کے رنگ کی تھیں۔"

اور تب ارشد کو محسوس ہوا کہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ کھڑکیوں پر تاریک شیشے تھے۔ اندر کوئی روشنی نہیں تھی۔ اتھاہ تاریکی تھی۔ باہر سے کسی نے شیشے پر پتھر مارا۔ شیشہ چخ کر ٹوٹا۔ باہر کی روشنی اندر آ گئی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ تو یہ بات تھی۔ تب ارشد نے غور سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔ کمرے سے نکل کر مڑ کر پیچھے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ پیچھے ہی پیچھے۔ دور تک دوڑتا چلا گیا۔ اور وہاں جا کر رکا جہاں ندی کے کنارے ایک بوڑھا شخص دو بچوں کو لئے بیٹھا تھا۔

"تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟"

ندی کے پار پھیلے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر بڑے والے بچے نے اشارہ کیا۔

"وہ والا۔"

"وہ آسمانی رنگ۔" بوڑھے آدمی نے پوچھا تھا۔

وہاں سے دوڑتا ہوا ارشد واپس اپنے کمرے میں آیا۔

"تم نے تو کبھی بتایا ہی نہیں بڑے؟"

"کیا بتاتا۔ تم زیادہ تر خاموش رہتے ہو۔ پڑھتے رہتے ہو یا اپنے آپ سے الجھتے رہتے ہو۔"

"اس وقت میں تمہارے پاس اس لئے آیا کہ تمہاری ایک چیز میرے پاس ہے۔ جب تم لاماٹینیر جا رہے تھے تو تم نے مجھے دی تھی۔" بڑے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چیز ارشد کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ارشد نے خوب غور سے دیکھا۔ وہی چیز تھی۔

"تم نے اب تک کیوں نہیں واپس کیا تھا؟"

"تم اسے توڑ دیتے پتھر سے۔ ایک بار تم نے بہت سی پرانی چیزیں، میری دی ہوئی بہت سی چیزیں غصے میں آ کر توڑ دی تھیں۔ میں نے اپنے کمرے کے باہر آ کر اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اسی ڈر سے نہیں دی یہ چیز۔ اور سب چیزیں توڑ دو تو کوئی بات نہیں۔ اسے مت توڑنا۔"

"کیوں۔"

"اسے دھوپ میں رکھو تو چاروں طرف رنگ پھیل جاتے ہیں۔ طرح طرح کے رنگ۔ سرخ، گلابی، پیلا، ہرا اور... آسمانی... اسے توڑنا مت۔ اچھا ارشد۔ اسے توڑنا مت۔"

بڑا جھٹکے سے اٹھا اور جانے کے لئے مڑا۔ ابھی وہ دروازے پر نہیں پہنچا تھا کہ ارشد نے کہا۔

"سنو۔ تم نے کبھی بتایا نہیں..."

بڑا گھوم پڑا اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو غور سے دیکھا۔

"میں تمہیں کیا بتاتا۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر پاتے۔ تم سیدھے منہ بات تو کرتے نہیں ہو۔ یہ بالکل ذاتی بات ہے۔ تم سے کیسے بتاتا۔"

ارشد نے دل میں سوچا کہ یہ سامنے دروازے کے پاس کھڑا میرا بڑا

بھائی عجیب مٹی سے بنا ہے۔ اسے تو معلوم تھا کہ اسے کون سا رنگ پسند ہے۔ اس نے وہ رنگ پکڑ کیوں نہیں لیا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ میرا کون سا رنگ ہے۔ تم ندی میں اتر کر وہ رنگ پکڑ کیوں نہیں لائے۔ تم کو تو معلوم تھا کہ ندی گہری نہیں۔

ہاں ندی گہری تو نہیں تھی لیکن میں کبھی اترا بھی تو نہیں تھا۔ ناؤ سے چلا جاتا۔ لیکن میرے پاس پتوار کہاں تھی اور پتوار ہوتی بھی تو اتنی اتھلی ندی میں ناؤ کیسے چل پاتی۔

دونوں کچھ نہیں بولے۔ بڑا کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا۔ پھر چپ چاپ چلا گیا۔

ارشد کا ہاتھ پکڑ کر گیتا نے پوچھا۔

"بڑے نے تمھیں اس رات کیا چیز واپس کی تھی؟"

"کل میں وہ چیز تمھیں دے دوں گا ہمیشہ کے لئے۔" ارشد نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں مجھے کیوں دے دو گے" گیتا نے ہولے سے پوچھا جیسے وہ یہ پوچھتے وقت ڈر رہی ہو کہ اس کا جواب نہ مل جائے۔

"بس ایسے ہی۔" ارشد اس کی طرف پیار سے دیکھ کر مسکرایا۔

اس پہاڑی اسٹیشن پر تعینات ہوئے اسے چھ برس بیت چکے ہیں۔ میدان سے گیتا اپنے والدین کے ساتھ ہر سال آتی ہے۔ اس کے باپ کے پاس کپڑے کی چھوٹی سی مل ہے۔ سب سے پہلی دفعہ جب ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت یہ لوگ رہنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ارشد نے جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے ایک وجیہہ بوڑھے شخص کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دیکھا۔

معمر شخص نے بتایا تھا کہ کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے، ہم لوگ آج ہی واپس لوٹ جائیں گے سامان سمیت۔

تب ارشد نے انھیں اپنے کاٹج میں تب تک رہنے کی دعوت دی جب تک ہوٹل میں کمرہ نہ مل جائے یا کرایہ پر مکان دستیاب نہ ہو جائے۔

اس کی اس دعوت کو سن کر اس لڑکی کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی تھی۔

"تھینک یو" اس نے احسان مندی کے جذبے کے ساتھ کہا تھا۔

اس نے مسکرا کر اس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔

تین دن تک ارشد نے انھیں اپنے گھر بہت آرام سے رکھا۔ تیسرے دن گیتا کے باپ نے مکان کرائے پر لے لیا۔ تبھی سے ارشد اور گیتا میں ایک عجیب سا رشتہ پیدا ہوا۔ انھوں نے وہ مکان بعد میں خرید بھی لیا تھا۔

اس دفعہ ابھی ان لوگوں کو آئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ گیتا اسے کبھی کبھی خط بھی لکھتی۔ وہ پابندی سے جواب دیتا اور انتظار کرتا کہ کب میدانوں میں گرمی پڑے گی اور تیز گرم ہوائیں چلیں گی۔ کب گیتا آئے گی۔ اس نے گیتا کو اپنی پوری زندگی کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا دیا تھا۔ گیتا کے ماں باپ پہاڑ کے نیچے اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ کاٹج میں وہ تنہا تھی اور ہمیشہ کی طرح کرسی کے پیچھے آ کر ارشد کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔

"میں تم سے اب خوب واقف ہو گئی ہوں۔" گیتا نے کہا۔

اس نے سر پیچھے کر کے گیتا کو دیکھا۔ گیتا کا مطمئن چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ وہ مسکرایا۔

گیتا نے اس کے بالوں کو دیکھ کر کہا۔

"ارشد اب تم بوڑھے ہو رہے ہو۔ دیکھو سفید بال۔" اس نے ایک سفید بال توڑ کر ارشد کی آنکھوں کے پاس لا کر کہا۔

ارشد نے سفید بال دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"گیتا تم میرا سر اپنی گود سے مت ہٹانا۔ تمھیں میری قسم۔ تمھارے ڈیڈی ممی بھی آ جائیں تب بھی نہیں۔ میں تمھیں بہت چاہنے لگا ہوں گیتا۔" گیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش رہی۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ارشد بابا۔ تم کسی کو نہیں چاہتے۔ ہاں میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔ تم کسی کو نہیں چاہتے۔ نہ تم ارمل کو چاہتے ہو۔ نہ غزالہ آپا کو۔ نہ عشو کو اور نہ ہی مجھے۔ تم بس ایک شخص کو چاہتے ہو۔ تم کو بتا دوں کون ہے وہ۔ وہ تم خود ہو ارشد تم خود۔ تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ اور خود اپنی محبت سے محبت کرتے ہو۔ میں تمھیں پچھلے چھ سال سے دیکھ رہی ہوں۔ تم نے سچ کہا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا نہیں۔ لیکن اپنے بارے میں تم خود بھی کچھ کم ہی جانتے ہو۔ بھلا مجھے کیسے بتا پاتے۔ میں تمھیں بتا رہی ہوں۔ نا.. بیچ میں مت بولو۔ تم اپنی محبت کی بہت قدر کرتے ہو اور اپنی بہت عزت کرتے ہو۔ جب تم دیکھتے ہو کہ تمھاری محبت ناکام ہو رہی ہے تو تم بے عزتی محسوس کرتے ہو لیکن کیوں کہ انسان بے بس ہوتا ہے اس لئے مجبور ہو جاتا ہے اور خود کو بے بس سمجھ کر چپ ہو جاتا ہے۔ تم یہ بھی نہیں کرتے۔ تم یہ بھی قبول نہیں کرتے کہ تم بے بس ہو۔ تم اپنی بے بسی کو دکھ کا لباس پہنا دیتے ہو اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہو کہ تم دکھی ہو۔ تم بازی ہار جاتے ہو تو اسی ہاری ہوئی بازی پر دوبارہ مہرے سجا دیتے ہو۔ تم ارمل کو چاہتے تھے تو بڑے ہو کر اس کی شادی ہونے سے پہلے اس کے باپ کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ کیوں نہیں مانگا۔ وہ ہندو تھی تو کیا ہوا ایک بار کوشش کر کے تو دیکھتے۔ غزالہ آپا کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ شاید وقت سے پہلے جوان ہونا چاہتی تھیں پر عشو کے ساتھ تم نے کیا کیا۔ اسے پیار کرتے تھے تو اسے بھگا کر کیوں نہیں لے گئے؟ بولو۔"

ارشد کو محسوس ہوا گیتا کی آواز اس کے لئے ایک جلتی ہوئی زنجیر ہے جو اس کے کانوں کے آر پار کھینچی جا رہی ہے۔

اس نے گود میں سر رکھے رکھے گیتا کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "گیتا ارمل کی شادی کسی خراب جگہ تھوڑے ہی ہوئی ہے۔ اور عشو کا شوہر بھی بہت اچھا ہے۔ پھر عشو کی ماں زبان دے چکی تھیں۔"

"تو کیا تمھاری ذمہ داری یہ تھی کہ تم لڑکیوں کو کھاتے پیتے دولھے دے کر

مطمئن ہو جاؤ۔ تم ڈرتے ہو ذمہ داری سنبھالنے سے۔ تم چاہتے تھے کہ تمہاری پوری زندگی رومان میں گزرے۔ تم کسی ایک کے بن کر رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ تم ٹھنڈے دل سے کبھی غور کرنا تب سمجھ میں آ پائے گا۔"

"کیا میں کوئی لوفر بدمعاش آدمی ہوں؟" ارشد نے دھیمے سے پوچھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے گیتا کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔

"میں نہیں جانتی کہ بدمعاش کیسے ہوتے ہیں اور اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ تم غیر مرد ہو۔ میری بھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم میرے پاس میری گود میں سر رکھے بیٹھے ہو۔ تم اگر بدمعاش ہو تو پھر میں بھی بدمعاش ہی ہوں گی۔ اب تم کسی ذمہ داری اٹھانے کے لئے خود کو تیار کرو۔ اب تم شادی کر لو ارشد۔"

ارشد نے گیتا کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور کہا۔

"مجھے نہیں معلوم گیتا تم نے آج ایسی باتیں کیوں کہیں لیکن میں سوچوں گا ضرور کہ تم نے کس حد تک صحیح کہا اور کس جگہ غلط کہا۔ لیکن میرا دل بہت اداس ہو گیا تب سے۔ دیکھو کھڑکی کے باہر جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تمہیں اگر بتا دوں تو تم میرا مذاق اڑاؤ گی کہ میں تمہیں دھوکہ دے رہا ہوں جیسے میں نے سب کو دھوکہ دیا۔ گیتا! مجھے کھڑکی کے باہر وہی رنگ نظر آ رہا ہے۔ وہ بے نام رنگ جانے کہاں سے اڑتا ہوا آتا ہے اور میرے پورے وجود کو بے قرار کر دیتا ہے۔ معلوم نہیں عشو کیسی ہے آج کل۔؟"

"تمہیں عشو بہت یاد آتی ہے؟"

"ہاں بہت یاد آتی ہے۔"

"کیا یاد آتا ہے۔"

"اس کی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ اس کی باتیں یاد آتی ہیں۔ جب وہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں ارشد۔ اس کے بال، اس کا چہرہ، بہت یاد آتا ہے۔ بار بار یاد آتا ہے گیتا! وہ جب مجھے پیار کرتی تھی تو اس کے گرم گرم ہونٹ میرے بدن کو جانے کیا دے جاتے تھے۔"

"لیکن ارشد تم نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں کچھ اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ تمہیں کتنا یاد کرتی ہوگی۔ اس کے دل پر تمہاری یاد کیا اثر کرتی ہوگی اور جب کبھی اس کا شوہر اسے تمہارے نام کا طعنہ دیتا ہوگا تو اس پر کیا گذرتی ہوگی۔ تمہیں عائشہ کی جو جو چیزیں یاد آتی ہیں سب تمہارے مطلب کی چیزیں ہیں۔ اس کے مطلب کی کوئی چیز تمہیں کبھی یاد نہیں آتی۔ اسی لئے میں کہتی ہوں اور میں غلط نہیں کہتی۔ بہت سوچ سمجھ کر کہتی ہوں کہ تم خود اپنے آپ کو چاہتے ہو اور اپنی محبت کو چاہتے ہو۔ تم ارجل، عائشہ، غزالہ آپا اور مجھے... کسی کو بھی نہیں چاہتے۔"

ارشد نے محسوس کیا کہ یہ باتیں سن کر ایک عجیب طرح کی بے عزتی محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے کوئی اپنے گھر بلا کر اسے ننگا کر رہا ہو۔ جیسے ماں کے سامنے کسی نے ماں کو گالی دے دی ہو۔

اس نے گیتا کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"گیتا آج تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں اپنا ہر راز بتا دیا ہے کیا یہ اس کی سزا ہے۔ تمہیں معلوم ہے تم اس وقت کتنی سنگدلی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم ایسا کس لئے کر رہی ہو گیتا! بتاؤ۔"

"ہاں تم نے اپنے متعلق مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور جو نہیں بتایا وہ بھی میں سمجھتی ہوں۔"

"ارشد بابا!" وہ دھیمے سے بولی۔

"ہاں... کیا ہے۔" ارشد نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔

"تم مجھ سے پیار نہیں کرتے ہو۔ تم ان ساری لڑکیوں سے انتقام لے رہے ہو جو اب تک تمہاری زندگی میں آئی ہیں۔ تمہیں جو لڑکی ملتی ہے تم اس سے محبت کرنے لگتے ہو۔ وہ چلی جاتی ہے تو تم دکھی ہو جاتے ہو۔ تم سب سے محبت کرنے ہی کیوں لگتے ہو۔ ارشد؟"

"اب سب سے کہاں کرتا ہوں۔" ارشد نے ہولے سے کہا۔ اور چپ ہو گیا۔

"کیوں۔ آج کل مجھ سے نہیں کر رہے ہو۔"

ارشد جھلا گیا۔

"آج کل؟ تم محبت کو اتنی کاروباری قسم کی چیز کیوں بتا رہی ہو گیتا! عشو سے بچھڑنے کے بہت سال بعد تم ملی ہو۔ تم میرے بارے میں اتنا کچھ جان گئی ہو کہ اب تمہیں غیر تصور کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے اگر مجھے چھوڑ دیا تو میں ننگا ہو جاؤں گا۔ تم مجھے چھوڑنا مت گیتا۔"

گیتا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ ارشد کو بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔

"تمہیں عشو یاد آتی ہے؟" گیتا نے دھیمے سے پوچھا۔

"ہاں، بہت یاد آتی ہے۔"

"اور غزالہ آپا؟"

"وہ اور طرح سے یاد آتی ہیں۔"

"اور ارجل...؟"

پچھلے سال اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ارشد نے یاد کیا۔

وہ پہاڑی سڑک پر موٹر سائیکل پر بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک موڑ کاٹا تو سامنے ایک کار بیچ سڑک پر کھڑی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا شوہر یا اس کا بھائی چسٹر پہنے، گردن سے مفلر لپیٹے انجن کا بونٹ اٹھائے کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موٹر سائیکل کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ لڑکی نے بھی ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کار کے پاس پہنچ کر موٹر سائیکل کے بریک چرچرائے۔

اس نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ کل برف باری ہوئی تھی۔ ہوائیں بہت ٹھنڈی تھیں اور نیچے وادی کی روشنیاں بہت دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی روشنی اس لڑکی کے چہرے پر پڑی۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"مسٹر۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کے پاس اگر پچ کش ہو تو دے دیجئے۔ ابھی لوٹا دیں گے۔"

ارشد نے اس آواز کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"ارشد تم اپنی 'ریکھا گزٹ' کی کاپی ہمیں دے دو ہم کل لوٹا دیں گے۔"

ارشد نے ہینڈل گھما کر لائٹ اس کے چہرے سے ہٹالی۔ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور موٹر سائیکل بکس سے ٹٹول کر پچ کش نکالا۔ مرد کے ہاتھ میں پچ کش دے کر کنارے کھڑے ہو کر اس نے لڑکی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اور سوچا کہ عمر نے اس کے چہرے کے بھولے پن کو بالکل نہیں بدلا۔ بس چہرے پر اچانک جوانی کی چمک آگئی ہے۔ لڑکی نے بھی چسٹر پہن رکھا تھا۔ اس کی بالوں کی چوٹیاں چسٹر کے اندر ہیں۔ اس کے بال اب اور بھی لمبے ہو گئے ہوں گے۔ سفید لباس پہنے، گلے میں گلابی دوپٹہ ڈالے یہ بالکل شیرازی قاز کی طرح لگتی تھی جو گہرے تالاب میں آہستہ آہستہ بے آواز شور کے ساتھ تیرتی ہے۔ میں نے ایک دن اس کے بال چھوئے تو یہ کھل کر ہنس پڑی تھی۔ میں نے اس دن دوبار اس کے بال چھوئے تھے۔ آج میں اس سے ضرور پوچھوں گا کہ جس دن یہ ٹرک میں سامان لدوا کر اپنے تھانیدار باپ کے ساتھ جیپ میں رخصت ہوئی تھی کس رنگ کا لباس پہنے ہوئی تھی۔

"سنیل جلدی کرو۔ انھیں دیر ہو رہی ہوگی۔" لڑکی نے مرد کے پاس جا کر تیز آواز میں سرگوشی کے لہجے میں بولی تا کہ موٹر سائیکل والا شخص یہ اندازہ کر سکے کہ ان لوگوں کو احساس ہے کہ ان کی وجہ سے اسے دیر ہو رہی ہے۔

ارشد کا دل چاہا کہ کہے کہ اچھی لڑکی تم زندگی بھر سڑک پر اسی طرح کھڑی رہو تو میں بھی یہیں کھڑا رہوں گا۔ تم آج برسوں کے بعد مجھے نظر آئی ہو۔ اتنی جلدی مجھے دیر کیسے ہو سکتی ہے۔

"نہیں۔ سڑک پر گھومتے رہنا تو میری ڈیوٹی ہے۔ آپ اطمینان سے موٹر ٹھیک کر لیں۔"

لڑکی نے اس کی طرف تشکر آمیز انداز میں دیکھا اور قریب آکر پوچھا۔

"کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"میں فاریسٹ میں ہوں۔"

"اچھا۔ مجھے اچھی لگتی ہے فاریسٹ کی نوکری۔ یہ میرے پتی ہیں سنیل تیواری۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر کی ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ میرا نام ارملا ہے۔ ارملا تیواری۔"

"تمھارا نام ارملا تیواری تو اب ہوا ہے۔ میں تو تمھیں جب سے جانتا ہوں جب تم ارمل تھیں، صرف ارمل۔ جب ماسٹر صاحب تمھیں بھیج کر مجھے ناشتہ بانٹنے بلایا کرتے تھے اور تم ڈیسک پر آ کر مجھ سے پوچھتی تھیں کہ تم رو کیوں رہے ہو ارشد۔ کیا گھر پر ڈانٹ پڑی ہے۔ جب تم مجھ سے 'ریکھا گزٹ' کی کاپی مانگ کر لے جاتی تھیں پھر ایک دن تم اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھیں۔ اس دن تم نے کون سے رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ تمھیں اب یاد بھی نہیں ہوگا۔ کتنی دیر میں پلیا پر بیٹھا تمھاری جیپ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ تمھاری جیپ آئی تھی۔ تم نے مجھے کاپیاں واپس کی تھیں۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا تھا اور جیپ چل پڑی تھی۔ راستے کے درختوں کے سائے سے گذرتی ہوئی، دھوپ چھاؤں میں ہوتی ہوئی جیپ آگے ہی آگے بڑھتی گئی اور آج جب تمھاری گاڑی رکی تو تم اپنے پتی سنیل تیواری کے ساتھ ہو۔ وقت کے داؤں پیچ بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں ارمل۔

دستانے اتار کر ارشد نے سگریٹ نکالی اور سگریٹ سلگانے سے پہلے اس نے پوچھا۔

"آپ سگریٹ لیں گے مسٹر سنیل۔"

"او یس۔ پلیز مجھے جلا کر دے دیجئے۔"

ارشد ایک لمحہ کو رکا۔ یہ تیواری تو برہمن ہوتے ہیں۔

"میں... مسلمان ہوں۔" ارشد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سنیل نے بونٹ سے چہرہ اٹھایا۔

"نیور مائنڈ... پچ کش لیتے وقت بھی تو مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ آپ ہندو ہیں یا مسلمان اور ہندو ہیں تو نیچی ذات کے ہندو تو نہیں جو میں پچ کش لیتے ہی کہیں گندا نہ ہو جاؤں... جلدی سے سگریٹ سلگائیے۔ میرے پاس تو کب کی ختم ہو گئیں۔"

ارشد نے سگریٹ سلگا کر اسے دی۔ اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

"میرے پاس موٹر سائیکل میں اور پیکٹ پڑے ہیں۔"

"تھینک یو۔ آپ تو بالکل فرشتہ ہیں۔ کیوں ارمل؟"

سنیل تیواری تم ارملا کو ارمل نہ کہنا کبھی۔ اسے ارمل کہنے کا حق صرف مجھے ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

تبھی سنیل نے اندر ہی اندر کوئی تار ملایا اور کار ایک دم سے گھر گھرا کر اسٹارٹ ہو گئی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

اندر بیٹھ کر اس نے دوبارہ اسٹارٹ کیا اور ہیڈ لائٹ جلا کر نیچے اترا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کتھئی پتلون اور اسی رنگ کی جیکٹ پہنے سر پر کیپ لگائے گلے میں مفلر لپیٹے کھڑا ہوا وہ شخص دھیمے دھیمے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

پچ کش لوٹاتے ہوئے ارشد نے اسے دیکھا۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اور چہرے پر ویسا ہی اطمینان اور متوالا پن تھا جو پر سکون ازدواجی زندگی میں ہوتا ہے۔

"ہم لوگ کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ میٹرو ہوٹل میں رکے ہوئے ہیں۔ کل آپ ہم دونوں کے ساتھ لنچ لیجیے مسٹر... آپ کا نام کیا ہے؟... ارمل نے پوچھا۔

تب ارشد نے سگریٹ زمین پر ڈال کر اس پر جوتا رکھا۔ جیکٹ کے کالر

نیچے کیے۔ مفلر کھول کر گلے سے لٹکایا اور کیپ اتار کر ہاتھ میں لے کر کہا۔

"میرا نام ارشد ہے ارل۔"

ان دونوں کے چہروں پر حیرت چھا گئی۔ تب ارل نے اچانک بہت خوش ہو کر کہا۔ تم وہی ارشد ہو۔ بالکل وہی ہو۔ تم اب بھی نانک جیسی باتیں کرتے ہو۔ تم کتنے چھوٹے تھے پر اپنی ہمت دکھانے چھرے والی بندوق لے کر ہمارے گھر کی طرف کبوتر مارنے آتے تھے۔ پتا جی اکثر تمھیں یاد کرتے ہیں ارشد!"

"اب بہت رات ہو رہی ہے سنیل۔ تم لوگ ہوٹل چلو۔ کل لنچ میری طرف سے۔ تمھارے ہی ہوٹل میں۔ اب جاؤ۔"

"آپ آیئے گا ضرور۔ ورنہ ارل بہت دکھ کرے گی۔"

"میں ضرور آؤں گا۔ اب سردی ہو رہی ہے۔ تم لوگ چلو۔"

اگلے دن کھانا ختم کر کے سنیل اوپر کے کمرے میں کچھ لینے چلا گیا۔ تب ارشد نے ارل کی طرف دیکھا۔ یہ کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کی جلد کتنی شفاف ہے۔

"جس دن تم وہاں سے چلی تھیں۔ تم نے کون سے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے ارل؟ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کپڑے... یاد نہیں شاید اسکول کا ڈریس تھا۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں ارل۔ وہ جس رنگ کے کپڑے تھے وہ رنگ مجھے ہر طرف نظر آتا تھا۔ اب بھی نظر آتا ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کون سا رنگ ہے۔"

تب ارل نے بہت غور سے اپنے بچپن کے ساتھی کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"پاپا جی سپرنٹنڈنٹ پولس سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے جب ارشد کی شادی ہو گی تو ایک بار اپنے پرانے تھانے کی طرف چلیں گے۔ تم شادی میں ہمیں ضرور بلانا ارشد۔ ایک اچھی سی دلہن تلاش کر لو۔"

اس کا مطلب تم میری بات سمجھ گئی ہو۔ لڑکیاں جب لڑکوں سے ان کی شادی اور دلہن کی باتیں کرتی ہیں تو اس وقت ان کے لفظوں کے اندر بہت سے اور معنی بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھ لینے کا الجھا طرح طرح کے روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔

"تم نے اس دن کون سے رنگ کے کپڑے پہنے تھے ارل؟"

ارل نے اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھا۔

"مجھے بالکل یاد نہیں ارشد۔ بھگوان کی سوگند۔"

"اچھا چھوڑو کوئی بات نہیں۔" ارشد نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ سنیل آ گیا تھا۔

جب وہ رخصت ہونے لگے تو ارشد نے بہت گرم جوشی کے ساتھ سنیل سے ہاتھ ملایا۔ ارل خوش ہو گئی۔ ارشد نے ارل کے سر پر نرم سی تھپکی دی اور ارل کے چہرے پر پھیلتے ہوئے سکون کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ ارل کے سر کے لئے اجنبی نہیں ہے۔

"تم نے ایک بار کلاس میں میرے بال چھوئے تھے۔" ارل نے اسے یاد دلایا۔

سنیل نے مسکرا کر ارل کی طرف دیکھا۔

یہ بات تم نے اتنی آسانی سے، اتنے اطمینان سے کیوں کہہ دی ارل۔

"ہاں تمھارے سر پر اتنے ڈھیر سارے بال بہت اچھے لگتے تھے۔" وہ دھیمے سے بولا۔

یہ بات تم نے اپنے شوہر کے سامنے کیوں کہی۔ تم نے یہ بات چھپائی کیوں نہیں۔ تم بہت چالاک ہو ارل۔ تم اپنے شوہر کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ میرے بچپن کا یہ ساتھی مجھ سے اگر کچھ خصوصیت برتتا ہے تو اس میں کوئی اہم راز نہیں ہے۔ یہ اتنی آسان سی بات ہے کہ میں اسے تمھارے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔ ہے نا ارل یہی بات تو ہے۔ اسی لئے تم نے یہ بات کہی۔ بولو۔

جب موٹر اسٹارٹ ہو گئی اور دور چلی گئی تو ارشد نے موٹر کے اندر ارل کو اپنے شوہر کے قریب کھسکتے ہوئے دیکھا اور سوچا کہ محبت کی شدت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ کبھی یہ صرف ایڈجسٹمنٹ ہوتی ہے۔ کبھی صرف ایک یاد اور کبھی ایک بے بسی کا روپ دھار لیتی ہے اور کبھی کبھی لوگ محبت کے نام پر زندگی بھر ایک دوسرے سے دبی دبی نفرت کرتے رہتے ہیں۔

لیکن تبھی ارشد نے دور ہوتی ہوئی کار کے اوپر اسی بے نام رنگ کو چھا کے لیتا ہوا محسوس کیا۔ سرمائی پرندے دور دراز سے آتے ہیں۔ اجنبی پانیوں میں کچھ دن رہتے ہیں۔ پھر انھیں اپنی جگہ کے موسم کی پکار سنائی دیتی ہے اور پھر وہ قطار بنا کر اڑ جاتے ہیں۔ دور ہو جاتے ہیں۔ آسمان کے دھندلے پس منظر میں دھواں بن جاتے ہیں۔ اور اس منظر کی شدت سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کھولو ارشد تمھیں غزالہ آپا پھر ملیں۔" گیتا اسے ارل کے پاس سے واپس کھینچ لائی۔

"بہت مرتبہ ملیں۔ اب ان کے تین بچے ہیں۔"

"اب بھی وہ تمھارے ساتھ اکیلے میں جاتی ہیں کہ نہیں؟" گیتا نے بہت مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"تم اتنے ظالم سوال یوں پوچھ رہی ہو گیتا"

"ایسے ہی بس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ گیتا نے شوخی سے کہا۔

"نہیں اب اتنا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"اور عشو تمھیں بہت یاد آتی ہے۔ گیتا نے اچانک پوچھا۔

تب ارشد کرسی سے اٹھا۔ پیچھے کھڑی گیتا کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور زمین پر بیٹھ کر اس کی گود میں سر رکھ کر کہا۔

گیتا نے اپنی گود میں سر رکھے اس شخص کو دیکھا اور اس کی بھیگی آنکھوں کو ساڑی کے پلو سے خشک کیا اور آہستہ سے کہا۔

"میں تم سے اس لئے باتیں کر رہی ہوں کہ میں تمھیں بہت چاہتی

ہوں۔ میں اب تمہاری زندگی میں کوئی فریب، کوئی دھوکہ نہیں دینا چاہتی۔ تم اپنے بارے میں جو کچھ جانتے تھے تم نے مجھے بتا دیا تو یہ میرا فرض تھا کہ میں جو کچھ تمہارے بارے میں سمجھتی ہوں تمہیں بتا دوں۔ اور کل میں تمہیں اپنے بارے میں صرف دو باتیں بتاؤں گی۔ کل میرے پاس اسی وقت آنا۔ ڈیڈی ممی دونوں نہیں ہوں گے۔ اب ان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم جاؤ اب۔"

ارشد نے گیتا کی ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ اس کی گرم گرم ہتھیلیاں، بہت دیر تک اس کے پاس رہیں۔

اپنے کاٹیج پر آکر سونے سے پہلے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

کل میں ہمت کر کے اس کے ماں باپ سے آخری بات کر لوں گا۔

جب امی اور پاپا کو معلوم ہوگا کہ میں غیر مذہب میں شادی کر رہا ہوں تو کیا ہوگا۔ بابا اور خاموش ہو جائیں گے۔ اماں اندر والی کوٹھری میں جا کر تھوڑی دیر روئیں گی پھر چپ ہو جائیں گی۔ بڑا تو ویسے بھی کچھ نہیں کہتا ہے۔ وہ یہ تک تو بتا نہیں پایا کہ آسمان جیسے رنگ کی آنکھوں والی یاسمین سے وہ زندگی بھر محبت کرتا رہا۔ رضیہ... رضیہ کی شادی کا کیا ہوگا۔ ارشد کے غنودہ ذہن نے تھپکی دی۔ اب سب ترقی یافتہ ہو گئے ہیں۔ رضیہ سے شادی کرنے والے کو ہرگز یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ رضیہ کا بھائی کسی غیر مذہب میں شادی کر چکا ہے۔ میں کل ہی گیتا سے بات کر لوں گا۔

اس کا ذہن نیند میں ڈوبنے لگا۔

کل تمہیں بتا دوں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں تمہاری ذمہ داری اٹھاؤں گا گیتا۔ میں کل ہی تمہیں اپنا شیشے کا وہ ٹکڑا بھی دے دوں گا جس میں ست رنگی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اچھا ہوا بڑے نے پہلے نہیں دیا تھا ورنہ میں اسے بھی توڑ ڈالتا۔ میں کل اسے تمہارے حوالے کروں گا گیتا۔

ایسا ہوتا ہے حالانکہ کبھی کبھی ہوتا ہے لیکن آج ہوا۔ آج میں نے خود کو بہت ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔ کل میں یہ داغ دھو ڈالوں گا۔ کیا میں سچ مچ ایسا ہوں گیتا جیسا تم کہہ رہی تھیں۔ میں ایسا نہیں ہوں گیتا۔ وہ کون سا رنگ ہوتا ہے گیتا۔ اڑتا ہوا۔ پتنگ کی طرح چھپا کے لیتا ہوا۔ کبھی قریب آتا ہوا۔ کبھی دور ہوتا ہوا اور کبھی بہت دور ہوتا ہوا۔

وہ سو گیا۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اس کا ذہن بہت بشاش بشاش تھا۔ کھڑکی کھول کر اس نے سامنے والی پہاڑی کی طرف دیکھا۔ گیتا کا کاٹیج لکڑی کے کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

آج میں آفس نہیں جاؤں گا۔ اس نے پل پل گن کر دن کاٹا۔

آج آسمان پر بہت بادل تھے۔ دن میں بھی غروب کے وقت کا سا سماں ہو رہا تھا۔

پہاڑی پر گیتا کے کاٹیج کے موڑ پر سفید چادر لپیٹے وہ بوڑھا درویش خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک 'ہو' کا نعرہ لگایا۔ ارشد کچھ دیر اس کے پاس کھڑا رہا۔ پھر کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ آج اس نے کوئی شعر بھی نہیں سنایا۔ ورنہ ہمیشہ اردو یا فارسی کا کوئی شعر ضرور پڑھتا تھا۔ موج میں آتا تو ہندی کے دوہے گانے لگتا۔ آج وہ کچھ خاموش سا تھا۔

کھڑکی میں اسے گیتا کا سایہ نظر آیا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج وہ خوشی سے کھل اٹھے گی۔

"آؤ یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" گیتا نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ایسے ہی ایک بار عائشہ نے مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھایا تھا۔

وہ گیتا کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے اپنا فیصلہ سنا دے۔

اس نے مٹھی کھول کر گیتا کے آگے کی۔ اس کی ہتھیلی پر شیشے کا چوکور ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔

"یہ تم لے لو۔ اپنے پاس رکھ لو" ارشد نے بہت اپنائیت سے کہا۔

گیتا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ خاموشی سے ارشد کے مطمئن چہرے کو دیکھتی رہی اور جب اتنی دیر ہو گئی کہ اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر شیشے کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا اور ہتھیلی پر لے کر کھڑکی کے پاس لا کر دھوپ میں رکھا۔ ست رنگی شعاعیں نکلیں اور کمرے کی دیوار پر ناچنے لگیں۔

ارشد نے ان شعاعوں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"گیتا۔ یہ مجھے بچپن میں ملا تھا۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک بار مجھے بڑے نے خوب تحفے دیئے تو میں نے شرمندہ ہو کر اسے یہ دے دیا تھا کیوں کہ وہ ہمیشہ اسے مجھ سے مانگتا رہتا تھا۔ جس دن اس نے مجھے یاسمین سے اپنی محبت کا اشارہ دیا اسی دن اس نے مجھے یہ واپس کر دیا تھا اور مجھ سے کہا کہ اسے کبھی مت توڑنا۔ اس میں مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ جیسے زندگی کے بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ یہ زندہ رہنے کا استعارہ ہے۔ اسے کبھی مت توڑنا۔ بظاہر یہ سپاٹ سا شیشے کا ایک ٹکڑا ہے لیکن روشنی میں لا کر دیکھو تو اتنے سارے رنگ تمہیں دے دیتا ہے۔ اسے کبھی مت توڑنا۔ تو گیتا میں نے اسے دوبارہ بہت احتیاط سے رکھ لیا۔ اسے میں زندگی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ اب یہ تم رکھ لو ہمیشہ کے لئے۔"

گیتا نے اس کی باتیں سنیں اور مٹھی کو بند کر لیا۔ پھر اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر ارشد سے کہا۔ "تم تکیے پر سر رکھ لو۔ میں تمہارے سینے پر سر رکھوں گی۔"

ارشد کو اس کی یہ خواہش بہت اچھی لگی۔ ارشد نے اس کے روکھے روکھے بال اور بے دھلے چہرے کو بہت چاہت سے دیکھا اور تکیے پر سر رکھ لیا اور آہستہ سے اس کا سر کھینچ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوب دیر تک چوما اور گیتا کی آنکھوں کو اپنی طرف کر کے ان میں جھانک کر کہا۔

"گیتا میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔"

گیتا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیمے سے کہا۔

"نہیں۔ تم آج بھی کچھ نہیں کہو گے۔ آج میں نے تمہیں بہت خاص بات کہنے کے لئے بلایا ہے۔ اگلے ہفتہ آج ہی کے دن میری شادی ہے۔ میری شادی یہیں پہاڑ سے ہوگی۔ شادی سے پہلے تمہیں اپنا ٹرانسفر کہیں اور کرا لینا ہے۔

شادی کے دوسرے ہی روز میں یہاں سے دلی جاؤں گی اور وہاں سے کینیڈا کی فلائٹ لے کر اپنے ہسبنڈ کے ساتھ کینیڈا۔ کل ممی اور ڈیڈی فنکس کرنے گئے تھے۔ اور یہ سب میری مرضی سے ہوا ہے ارشد بابا۔"

ارشد نے اٹھ کر کھڑکی کے باہر بالکل نزدیک اڑتے بادلوں کو دیکھا اور سرمئی آسمان کو دیکھا اور یاد کیا کہ جب عائشہ کی ماں نے عائشہ کی شادی کی خبر سنائی تھی تب بھی میں اپنے آنسو چھپانے کے لئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن آج تو میری آنکھیں بھی خشک ہو گئی ہیں۔ ان میں آنسو کیوں نہیں آ رہے۔ کیا اندر تک کچھ خشک ہو گیا ہے۔ میں رو کیوں نہیں رہا۔

"تم مجھ سے وجہ نہیں پوچھو گے ارشد۔" گیتا نے ہولے سے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔

دور وادی میں کسی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔

"میں نے تم سے اس لئے شادی نہیں کی کہ تم زندگی بھر مجھ سے اپنی محبتوں کا انتقام لیتے رہتے۔ میں زندگی بھر تم سے خوش نہیں رہ پاتی۔ میرے دکھ سے تم ہمیشہ دکھی رہتے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو پاتی کہ میں کیوں دکھی ہوں۔ اس لئے میں نے کل دل پر جبر کر کے تمہیں تمہاری ساری حقیقتیں بتا دی تھیں۔ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں ورنہ اس وقت تم سے اکیلے میں یہ ساری باتیں کبھی نہیں کرتی۔ میں کوئی تمہاری پابند ہوں؟ نہیں۔ لیکن میں اس وقت اکیلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی کو بہت حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کرو۔ زندگی کا دامن بہت بڑا ہوتا ہے لیکن شادی کا بندھن بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس میں کسی اور کے تعلق کی گانٹھ نہیں سما سکتی۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔ مجھے یہ منظور ہے۔ لیکن مجھے یہ منظور نہیں کہ تم نفرت بھی کرو اور دکھی بھی رہو۔ اور مجھے بھی دکھی رکھو۔ جب شادی کرنا تو بیوی سے ہرگز مت بتانا کہ تم نے کس سے محبت کی اور کسے چاہا۔ یہ سب تمہیں بہت اپنائیت کے ساتھ بتا رہی ہوں۔ اور کوشش کرنا کہ اب اگر کسی سے محبت کرو تو سچ مچ محبت کرنا۔ اپنے آپ کو کم دیکھا کرو۔ اپنی محبت کو ہی سب سے اہم مت سمجھا کرنا ورنہ زندگی بھر سکون نہیں پا سکو گے۔ دوسرا جو تم سے محبت کرتا ہے اس کی بھی تو ایک قیمت ہوتی ہے۔ وقار ہوتا ہے ارشد۔ صرف اپنے دکھ کو ہی دکھ نہ سمجھنا۔ دوسرے کا دکھ بھی اہم ہوتا ہے ارشد۔"

"تم نے گیتا یہ کیوں کہا کہ میں اپنا ٹرانسفر کرا لوں۔ اب اس سے تمہیں کیا غرض۔"

ارشد نے گھوم کر رسان سے لیکن بہت مضبوط لہجے میں پوچھا۔

جب وہ گھوما تو گیتا نے دیکھا کہ اس کے بال پیشانی پر بکھر گئے ہیں۔ ماتھے پر ایک موٹی سی لکیر ہے اور آنکھوں میں اس کا تمتماتا خود سر اور سرکش بچپن پھر واپس آ گیا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہا ہے کہ میں اپنا ٹرانسفر کیوں کرا لوں۔ تمہیں اس سے کیا غرض۔

"اس سے مجھے غرض ہے۔ میں یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ تم چھٹی لے کر گھر چلے جاؤ؟ تا کہ میری شادی نہ دیکھ سکو۔ لیکن میں نے یہ نہیں کہا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے پہاڑ سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ۔ ورنہ جب تک رہو گے میری یاد ستاتی رہے گی۔ اکیلے کمرے میں بیٹھ کر مجھے یاد کر کے رویا کرو گے۔ پھر میری یاد تمہاری نفرت کی بنیاد بن جائے گی اور تم بہت تلخ مزاج بن جاؤ گے۔ میدان واپس چلے جاؤ گے وہاں غم بٹ جائے گا۔ ماں باپ شادی کے بندھن میں باندھ دیں گے۔ میری یہ بات مان لو ارشد۔ مان لو گے نا؟"

ارشد ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کا ذہن بالکل سن ہو گیا ہے۔

"معلوم نہیں لیکن ہاں میں کل ہی چلا جاؤں گا۔" ارشد نے دھیمے سے کہا۔

"سائیں تیرے کارن چھوڑا شہر بلخ۔" موڑ پر سے بوڑھے درویش نے صدا لگائی۔ اس کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس آئی اور خاموشی چھا گئی۔

ارشد نے دھندلے ہوتے آسمان کو دیکھ کر آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور دروازے سے نکل کر سائبان کے نیچے آ کر دور دور تک پھیلی ہوئی تاریکی میں ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ گیتا دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ارشد نے دیکھا تاریکی کا ایک چوکور ٹکڑا سامنے سے ہٹا اور وہاں ایک جیپ آ کر کھڑی ہو گئی۔ جیپ کے پاس ایک چھوٹا سا لڑکا ہاتھ میں بستہ لئے کھڑا ہے۔ جیپ میں بیٹھی لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کہا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور درختوں کے سائے میں کھو گئی۔

اب وہاں غزالہ آپا پیلے رنگ کے کپڑے پہنے بیٹھی ہیں۔ ان کے زانو پر ایک نوجوان لڑکے کا سر رکھا ہے۔ "تم کو معلوم ہے وہ ریلوے میں بہت بڑے افسر ہیں۔ اب ہم ریل میں مفت سفر کریں گے فرسٹ کلاس میں" غزالہ آپا کے ملازم نے فرسٹ کلاس کا ڈبہ کھولا اور غزالہ آپا اندر داخل ہوئیں۔ گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی اور اتنی تیزی سے چلی کہ پچھلا ڈبہ ایک لمحے میں نقطہ بن گیا۔

وہ نقطہ پھر واپس لوٹا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ میری عشو دلہنوں والا سرخ لباس پہنے میری طرف آ رہی ہے۔ اس نے میرے ہاتھ تھام کر مجھ سے کہا۔

جب میں چلی جاؤں تو میرے خیال سے پریشان نہ ہونا۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہیں... میں تمہیں ایسے چاہتی ہوں جیسے ماں بیٹے کو، بہن بھائی کو اور بیٹی اپنے باپ کو اور بیوی اپنے شوہر اور لڑکی اپنے محبوب کو چاہتی ہے۔ مجھے ہر انداز سے محبت کرتے رہنے دینا۔ مجھے روکنا مت۔ اب مجھے جانے دو۔"

یہ کہہ کر عشو نے خاموش کھڑے میرے وجود کو اپنے قریب کیا۔ میرے شانوں پر پیار کیا اور ڈولی کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ کہاروں نے ڈولی کندھوں پر اٹھائی اور بابل گاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ آہستہ آہستہ تاریکیوں میں کھو گئے۔

کل اسی کمرے میں گیتا نے میرا چہرہ تھام کر مجھ سے کہا تھا۔

'میں یہ سب اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں۔"

یہ لڑکی مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں اب کسی کی محبت پر شک نہیں کروں گا۔

مجھے بہت چاہنے والی یہ لڑکی اگلے ہفتے دلی ایر پورٹ پر کھڑی ہوگی۔ اناؤنسر اعلان کرے گی۔ یہ لڑکی اپنے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے جہاز کی سیڑھیاں چڑھے گی۔ جہاز رن وے پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کرے گا۔ پھر ایک دم تیز دوڑنے لگے گا اور پھر یکا یک ایک جھٹکے سے آسمان کی طرف اٹھ کر بلند ہو جائے گا اور چند لمحوں میں تارا بن جائے گا۔

اور میں جس سے رخصت ہو کر یہ سب جا رہے ہیں، کل پہاڑ سے چلا جاؤں گا اور میدانوں میں پہنچ کر وہ پراسرار رنگ تلاش کروں گا جو پل بھر کو سامنے آتا ہے۔ پھر غائب ہو جاتا ہے۔

"ارشد" گیتا نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھیمے سے پکارا۔

"ہوا میں کیوں کھڑے ہو اندر آجاؤ۔ تمھیں سردی ہو جائے گی۔" یہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے لیکن اسے اب بھی میرا خیال ہے کہ مجھے سردی نہ ہو جائے۔

اس عجیب سے رشتے کو محسوس کر کے اس کا دل بھر آیا۔ اندر آکر اس نے گیتا کے کندھوں پر سر رکھ دیا۔ گیتا نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ پھر دھیرے سے پوچھا۔ "ارشد مجھے یاد نہیں کروگے۔"

"نہیں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔ گیتا نے اسے اور مضبوطی سے لپٹا لیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ سے خود کو گیتا سے الگ کیا۔ اس کے بالوں کو برابر کیا، اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے خشک کیا اور خدا حافظ کہا۔ اس کے چہرے کو دیکھا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر سفاک تاریکی راستہ روکے کھڑی تھی۔ دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس تاریکی کو دھکیل دھکیل کر آگے بڑھوں گا تو صبح تک پہنچوں گا۔ تب دھوپ کی آڑی ترچھی کرنیں مجھے روک لیں گی۔ ان سے لڑتا بھڑتا آگے بڑھوں گا تو پھر شام کو تاریکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے تو بڑھنا ہی ہے۔

کھڑکی کھلی۔ سلاخوں کی پرچھائیاں ارشد کے قدموں پر آکر گریں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سلاخوں سے لگی گیتا کھڑی ہوئی تھی۔ اسے اچانک یاد آیا کہ وہ کچھ بھولے جا رہے ہیں۔ وہ کھڑکی کے پاس آیا۔

"گیتا۔ میرا شیشے کا ٹکڑا..."

گیتا باہر کی دھند میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میرے قریب آؤ ارشد" گیتا نے آہستہ سے بلایا۔ وہ سلاخون کے پاس آگیا۔

"اپنا ہاتھ لاؤ" گیتا نے کہا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

گیتا نے اس کے ہاتھ میں شیشے کا وہ ٹکڑا رکھ دیا اور ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھے خود یاد تھا کہ اسے اب تمھارے پاس ہونا چاہیے۔ تم اگر اسے آج نہیں مانگتے تو میں کل تمھیں پارسل کر دیتی ارشد۔"

ارشد بت کی طرح کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اب کچھ نہیں کہنا ہے۔ تب گیتا نے اس کے ہاتھ پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور پھر اسے آہستہ سے چوم کر ارشد کی آنکھوں میں دیکھ کر دھیرے دھیرے کہا۔

"مبارک ہیں وہ جو دکھی ہیں۔ اور مبارک ہیں وہ جو بچھڑ رہے ہیں۔ بہت جلد ان کی آتما کو شانتا ملنے والی ہے۔" گیتا نے ارشد کے ہاتھ واپس کیے۔

"جا رہا ہوں گیتا۔ خوش رہنا۔ خدا حافظ۔"

گیتا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے ہلایا۔

موڑ پر بیٹھے درویش نے بڑی دلدوز آواز میں مصرع اٹھایا۔

"اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا۔"

ارشد مڑا۔ موڑ پر پہنچ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ کمرے کی روشنی کی وجہ سے اس کا وجود ایک ہیولا سا لگ رہا تھا۔

روشنیاں بجھا دینا۔ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔

بوڑھا درویش خاموش بیٹھا تھا۔ موڑ پر کھڑے ہو کر ارشد نے وادی میں ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا اور اپنی مٹھی کھول کر دیر تک اس شیشے کو دیکھا۔ ارادہ کیا کہ اپنی پوری قوت سے اسے تاریکیوں میں اتنی دور پھینک دے کہ پھر تلاش کرنے پر بھی نہ مل سکے کہ اچانک سامنے دھند میں ڈوبی پہاڑیوں کے پیچھے پھر اسے وہ رنگ ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔

اس نے مضبوطی سے مٹھی بند کی اور ہستہ آہستہ پہاڑی سے اترنے لگا۔

☆☆☆

Form IV (See Rule 8)

Place of Publication	: 313, Rani Mandi, Allahabad
Periodicity of Publication	: Mothly
Printer's Name	: Ms Aqila Shaheen
Whether citizen of India	: Yes
Address	: 313, Rani Mndi, Allahabad
Publisher's Name	: Ms Aqila Shaheen
Whether citizen of India	: Yes
Editor's Name	: Ms Aqila Shaheen
Whether citizen of India	: Yes
Name and address of individuals who own the Newspaper, and of partners or shareholders holding more than 1% of the total capital	: Ms Aqila Shaheen 313, Rani Mandi, Allahabd

I Ms Aqila Shaheen, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

March, 2006 Sd./- A. Shaheen

شارق کیفی

شمارہ ۲۱۴،
فروری ۱۹۹۸

یہ سچ ہے دنیا بہت حسیں ہے
مگر مری عمر کی نہیں ہے

مجھی پہ ہے سوچنے کا ذمہ
اسے تو ہر بات کا یقیں ہے

تری جگہ کون لے سکے گا
تو میرا پہلا تماش بیں ہے

بجھا ہی رہتا ہے دل ہمارا
نہ جانے کس دھوپ کا نگیں ہے

چلو خیالوں میں گھر بنائیں
یہیں ذرا ایک سی زمیں ہے

شمارہ ۲۴۳،
جنوری ۲۰۰۱

طرح طرح سے مرا دل بڑھایا جاتا ہے
مگر کہے سے کہیں مسکرایا جاتا ہے

اب اس طرح کی محبت کبھی نہ ہو شاید
کہ درمیاں میں کہیں جسم آیا جاتا ہے

نئے نئے وہ اداکار جانتے ہی نہ تھے
کہ پردہ گرتے ہی سب بھول جایا جاتا ہے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کہوں تجھ سے
کہ دیکھتا ہوں ترا گھر سجایا جاتا ہے

گناہگاروں میں بیٹھے تو انکشاف ہوا
خدا سے اب بھی بہت خوف کھایا جاتا ہے

یہ تلخیوں سے بھری زندگی سزا ہے مری
گناہ پچھلے جنم کا بتایا جاتا ہے

شان الحق حقی

شمارہ ۲۷۲، ستمبر ۲۰۰۳

ولی

جس نے اک خس کے لئے صحرا کو چھانا ہوئے گا
کون ہوگا کوئی ہم سا ہی دوانہ ہوئے گا
تم کو دل کی راہ سے خلوت میں آنا ہوئے گا
چشم وا میں تو سجن سارا زمانہ ہوئے گا
ہائے وہ دل رس ادا دم بھر نہ نظروں میں رہی
یاد میں اب جس کی اک جیون بتانا ہوئے گا
اللہ اللہ خاک گلشن کی کرشمہ زائیاں
اس کی تہ میں سوچئے کیا کارخانہ ہوئے گا
جن کو آتی ہے نظر اب بھی کشش تاروں کے بیچ
ان کی نظروں میں وہی عالم پرانا ہوئے گا
خود رہو دنیا میں یا دنیا کو پہلو میں بساؤ
سن رکھو پھر ایک دن پیچھا چھڑانا ہوئے گا
تو نہ ان داتا سہی پر دل کا داتا کون ہے
دل نے جو کھویا سجن تجھ سے ہی پانا ہوئے گا
اور نکتے اک طرف کھلتا نہیں اس تل کا بھید
تم کہو حقی بھلا کچھ تم نے جانا ہوئے گا

غزل

شاہد اختر

شمارہ ۲۲۴، فروری ۱۹۹۹

موج خوش رنگ ذرا جھومتی گاتی جاتی
شب کے سناٹے میں آواز لگاتی جاتی

زندگی فرض بہر طور نبھاتی جاتی
ایک دیوار سی حائل ہے گراتی جاتی

اس سے اب دور کا رشتہ بھی نہیں ہے اپنا
جس سے وابستہ مری سانس تھی آتی جاتی

روز و شب نت نئے طوفان اٹھاتی ہوئی موج
ہجر کی سنگ عمارت تو گراتی جاتی

روشنی چمن کے دریچوں سے جو آتی اختر
ساعت وصل در و بام سجاتی جاتی

ایک شام

شاہد عزیز

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

بہت ہی خوبصورت ہے
تمھاری شام کا منظر
تمھارے گھر کے آنگن میں
مہکتے پھول کی خوشبو
تمھارے اپنے کمرے میں
سلیقہ سے جو رکھے ہیں
تمھارے خواب تعبیر میں
تمھارے عکس تصویر میں
بہت ہی خوب صورت ہے
تمھاری شام کا منظر
کئی سالوں سے خواہش تھی
کبھی تم سے ملوں گا میں
تمھیں دیکھا تو جی خوش ہو گیا میرا
کبھی فرصت ملے تو میرے گھر آنا
وہ اک پیڑ جو ہم نے لگایا تھا
وہ تم کو یاد کرتا ہے

آئینہ

شاہد عزیز

شمارہ ۲۶۸، مئی ۲۰۰۳

میں اپنے گھر کے اندر ہی
کیوں اپنے گھر سے باہر ہوں
مجھے بے کار چیزوں میں
کیوں تم نے پھینک رکھا ہے
مرے ہونے کا احساس
تم کو کیوں نہیں ہوتا
پڑا ہوں کب سے یوں ہی
میں ان زنگ آلودہ اشیا میں
مرے ہونے سے یہ گھر
ذرا آباد لگتا ہے
نہ جانے کیوں مجھے بے کار چیزوں میں
اٹھا کر پھینک رکھا ہے
اور یہ بھی بھول بیٹھی ہو کہ تم تو مجھ میں شامل ہو

تیز ہوا اور گھر کی گرد

شاہد کلیم

شمارہ ۱۹۳، اپریل ۱۹۹۶

صاف نہیں رہ سکتا ہے گھر
گرد پلٹ کر آ جاتی ہے
گھر کی صفائی کرتے کرتے
بوڑھی عورت
جھاڑو لے کر
تیز ہوا کو
پیٹ رہی ہے

شاہد میر

شمارہ ۲۶۶، مارچ ۲۰۰۳

رات خاموش
غضبناک
گھنیری
تاریک
پیڑ چپ چاپ ہیں
پنچھی گم سم

ایک نازک سی صدا
دور کہیں بھیرو کی
ایک دل سوز دعا
خیمۂ شب میں جاری

سات افلاک ہیں
اور سات ہیں دن ہفتے کے
سات رنگوں کی دھنک
سات سروں کے دریا
سارے عالم پہ ہوا
سات کا ہندسہ بھاری

دو قدم، چار قدم، سات قدم
دس قدم، چودہ قدم، سولہ قدم
ایک میزان ہے چلنا مسلسل جس پر
کبھی آہستہ خرامی کبھی بڑھتی رفتار
دائیں بائیں کبھی اوپر نیچے
دھاترکٹ، فعل فعولن فعلن
چلتے رہنے کے یہ فرمان ہیں جاری ساری
ایک طرف آہ و فغاں
دوسری اور شگوفوں سے بھری پھلواری
بیچ میں پھیلی ہوئی

منزل صد کیف و سرور
جس میں ضم ذات و صفات
فکر و شعور
دم بہ دم ہوتی ہوئی
سات سروں کی رم جھم

خون کے ساتھ رواں سرشاری!
روپ کی دھوپ نکھرتی ہی چلی جاتی ہے
شیام رادھا کی اداؤں میں ہیں گم
ہجر کی رات ہے میرا کا مقدر لیکن
فکر ہے اکبر اعظم کے خفا ہونے کی
گھن گرج دار پکھاوج پہ اٹھا در باری
راگ کی آنچ جلا دیتی ہے
سوئے دیپک
برف کی سرد چٹانوں سے
اٹھی چنگاری
سوہنی، رام کلی، ان کے سوا کیا دیکھوں
جے جے ونتی کو نہ دیکھوں تو بھلا کیا دیکھوں
میرے اطراف ہیں لے کاریاں پیاری نیاری
کبھی بھیجی ہی نہیں کوئی تراشا مجھ کو
اس نے امید کے تیشے سے تراشا مجھ کو
سر سکھائے تو لی پیار کی بھاشا مجھ کو
میں ہوں سرتال کی دنیا کا بہت آبھاری

راگ حاوی ہے، بہت
لفظ چھپے جاتے ہیں
شام گہرا گئی
سائے ہیں کہ بے رو کے چلے آتے ہیں
مارواراگ ہے بے حد گمبھیر
اس کی سیوا میں امر ہو گئے
استاد امیر
اب نہ مل پائے گی
ان جیسی کہیں دم داری

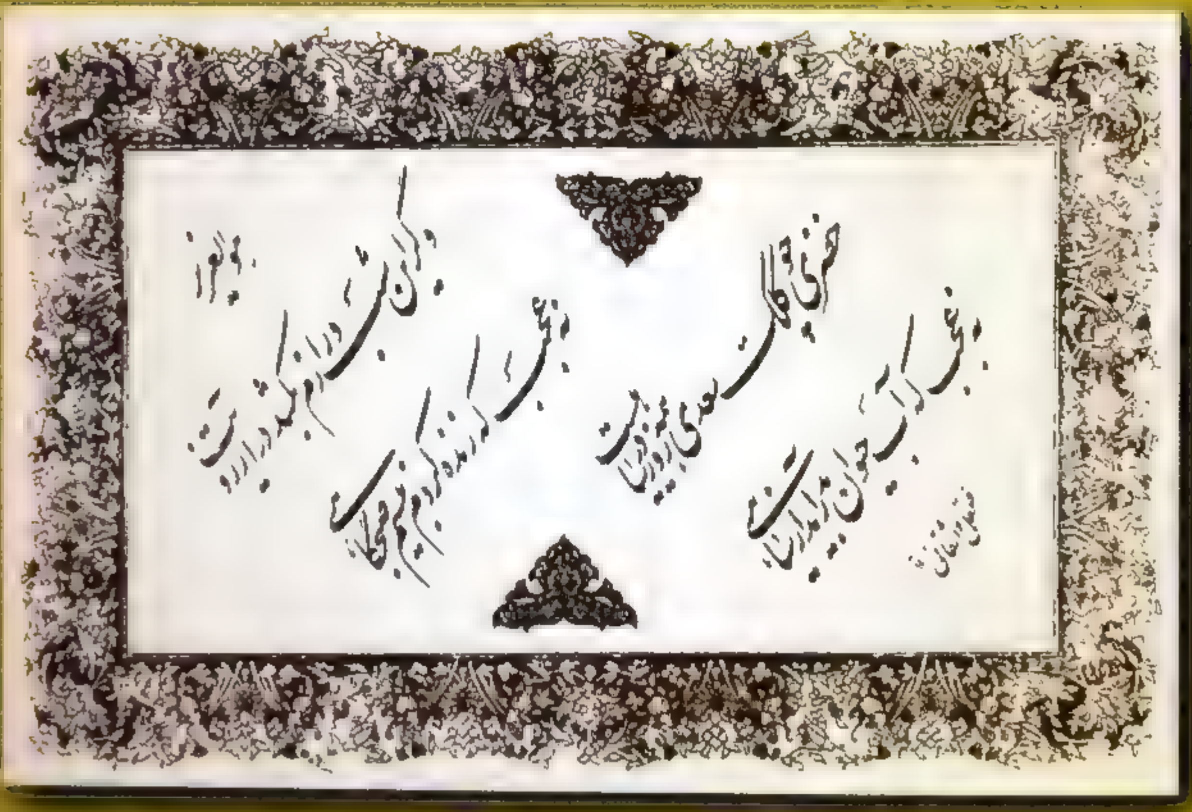

یک چندد ریں عرصہ پریشاں گشتیم گفتیم گراں شویم ارزاں گشتیم
در طالع ما کسادبازاری بود آئینہ فروش شہر کوراں گشتیم

فقیرالمذنب محمدابراہیم زریں رقم عید مبارک ۱۱۱۲ ہجری

(اس میدان میں عرصہ تک پریشان گھومتا رہا۔ میں نے سوچا گراں قیمت بنوں، لیکن میں سستا ہوگیا۔ میری تقدیر میں کساد بازاری ہی تھی کہ میں اندھوں کے شہر میں آئینہ فروش بن بیٹھا۔)

خطاط : محمدابراہیم زریں رقم
وصلی : مرسلہ کرنل انوار احمد (ٹورانٹو)

ہوالعزیز

وگر ایں شب درازم بکشد در آرزویت نہ عجب کہ زندہ گردم بہ نسیم صبح گاہی
خضرے چو کلک سعدی ہمہ روز در سیاہی ست نہ عجب کہ آب حیواں بدر آید از سیاہی

فتح علی واشقانی ۱۲۶۷

(اور اگر یہ لمبی رات مجھے تیری آرزو میں مار ڈالے تو کیا عجب کہ نسیم صبح گاہی مجھے پھر زندہ کردے۔ خضر ایسی ہستی ہیں جو سعدی کے قلم کی طرح ہر وقت سیاہی (اندھیرے) میں غرق ہیں تو کیا عجب کہ سیاہی (روشنائی) سے آب حیات نکل آئے۔)

خطاط : فتح علی واشقانی
وصلی : عطیہ از رسول مرادی (تہران)

شاہدہ حسن

شمارہ ۱۸۱، مارچ ۱۹۹۵

درودیوار پہ سبزہ

اک اک کر کے
میلے کپڑوں جیسے دن
دھلتے جاتے ہیں یادوں کے پانی میں

بارش ہوتی رہتی ہے
گھر کی دیواروں کے بیچ
اک بے نام محبت
اگتی رہتی ہے

شمارہ ۲۴۶، جولائی ۲۰۰۱

کھل اٹھی ایک اشک سے جل بجھی اک ہنسی سے میں
ایسے عجیب حال میں گذری ہوں زندگی سے میں
کچھ بھی خبر نہ ہو سکی کون سی رہگذر ہے یہ
دل ترے ساتھ ساتھ بس چلتی رہی خوشی سے میں
اب بھی وہ شام یاد ہے روشنیوں کے شہر کی
پوچھ رہی تھی اک پتہ شہر کی روشنی سے میں
شام بھی بے خبر لگی لوگ بھی بے نیاز سے
وقت وداع یوں ملی شہر کی بے رخی سے میں
جو بھی صدا تھی گھٹ گئی جو بھی دعا تھی مٹ گئی
خود ہی پلٹ کے آئی ہوں عہد سپردگی سے میں
جانے رفاقتوں کا پاس کس کو رہا کسے نہیں
سب سے ملا وہ میرے بعد اور کسی کسی سے میں
جب بھی ہوئے ہیں روبرو خود کو نڈھال ہی لگے
ایک سی زندگی سے تو، ایک سی زندگی سے میں
آئینہ و سراب سے حیرت و عکس و خواب سے
دیر سے ہم کلام ہوں میر کی شاعری سے میں

شاہین

شمارہ ۲۵۸، جولائی ۲۰۰۲

یوں الجھ کر رہ گئی ہے تار پیراہن میں رات
بے دلی کے ساتھ اب اترے گی جان وتن میں رات

کھول کر بادل کے دروازے نکل آیا ہے چاند
گر پڑی ہے رقص کرتے کرتے پھر آنگن میں رات

بات کیا ہے کشتیاں کھلتی نہیں ساحل سے کیوں
خوار وآوارہ سی ہے اپنے ادھورے پن میں رات

کام اتنے ہیں کہ اب یہ سوچنا بھی ہے محال
کس کشاکش میں کٹا دن کون سی الجھن میں رات

لوٹ لے جاتے ہیں سب دھنوان دن کی روشنی
اور ٹکڑے ٹکڑے بٹ جاتی ہے ہر نردھن میں رات

کر گئیں چھڑکاؤ آنکھیں آج شاہین اس طرح
کھل اٹھیں مرجھائی کلیوں سے بھرے دامن میں رات

شمارہ ۲۶۳، دسمبر ۲۰۰۲

ہر چند پلٹ کے یہ الجھنے نہیں دیتی
وحشت مجھے اک حال میں رہنے نہیں دیتی

اک بات کہ کہنے ہی کی جرأت نہیں مجھ میں
اک بات کہ دنیا مجھے کہنے نہیں دیتی

کھینچی ہے وہ دیوار ترے کج کلہوں نے
سائے کو بھی جو چین سے رہنے نہیں دیتی

اس پر کوئی انگلی نہ اٹھائے سو یہ ہستی
دکھ حد سے زیادہ مجھے سہنے نہیں دیتی

وہ موج کہ دریا سے بڑا جس کا ہو پندار
تنکوں کو بھی اطراف میں بہنے نہیں دیتی

دنیا کسی حیلے سہی ہر وار سے پہلے
تلوار مرے ہاتھ میں رہنے نہیں دیتی

شاہین

شمارہ ۲۵۷، جون ۲۰۰۲

صہبا لکھنوی

پیر الٰہی بخش کی بستی بستی میں اک یار
یار کے گھر کی پہنائی میں گم سارا سنسار
اس سے زیادہ ہوگا بھی کیا ہستی کا بستار
اہلِ جہاں قدموں میں اس کے اور وہ بصد وقار
رواں دواں ہے سر پہ اٹھائے فکر جہاں کا بار
کوہ ہمالہ ہڈی کے ڈھانچے کے آگے خوار

جیسے "زمانہ" اور نگم تھے جیسے نیاز و "نگار"
لازم اور ملزوم ادب میں صہبا اور "افکار"
کون کرے گا نصف صدی تک گھاٹے کا بیوپار

اس سے زیادہ ہوگا بھی کیا ہستی کا بستار
کوہ ہمالہ ہڈی کے ڈھانچے کے آگے خوار

شمارہ ۲۵۷، جون ۲۰۰۲

ایک نظم تین عنوانات

۱۔ تیسری دنیا کو اسلحہ برآمد کرنے والوں میں سر فہرست

امریکہ اور روس
فرانس اور انگلستان
اور چین

۲۔ ایٹمی ہتھیاروں کے سب سے بڑے ذخیرہ اندوز

امریکہ اور روس
فرانس اور انگلستان
اور چین

۳۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ارکان

امریکہ اور روس
فرانس اور انگلستان
اور چین

شاہین

شمارہ ۲۲۱،
نومبر ۱۹۹۸

نقدی کہاں سے آئے گی

پہلے راتیں اتنی لمبی کب ہوتی تھیں
جو بھی حساب اور کھیل ہوا کرتا تھا
سب موسم کا تھا
روز و شب کی ہر ساعت کا اک جیسا پیمانہ تھا
اپنے ملنے والے سارے
جھوٹے سچے
یاروں سے اک مستحکم یارانہ تھا

لیکن اپنے درد کی
سمتوں کی پہچان نہ رکھنے والے دل
یہ سوچنا تھا
ہر خواب کی قیمت ہوتی ہے
اور اب ان دو آنکھوں میں اتنے
طرح طرح کے
دنیا بھر کے خواب بھرے ہیں
ان میں سے اک اک کو گن کر
سب کے مناسب دام چکانا
اس کے لئے تو دو صدیاں بھی کم ہوں گی

کنگلے
اتنی نقدی کہاں سے آئے گی؟

ایک منظر

بازوؤں میں
اور کولھوں میں لگاتی
نقرئی خوابوں کے ٹیکے
وسط اکتوبر کی رات

مانٹریال
اور لاس ویگاس کی
بساط رقص کو اوڑھے ہوئے
بیل گاڑی میں سوار
آوارہ چاند

تال کے پانی میں
رہ رہ کر
چمکتی سی
کوئی عیار آنکھ

واپسی

آئینے میں سورج اپنی آنکھ کے گرد
بڑے حلقوں کو
دیکھ کے ناحق آہ بھرے
آج خوشی جو مل سکتی تھی

اس کو بھی برباد کرے
شہراہوں کی دونوں جانب
برف کی اونچی دیواروں کے بیچ
چمکتی کاریں (جو محتاط بہت ہیں)
بھاگتی دوڑتی جاتی ہیں
اک کچلے خرگوش کی آنتیں
فریادی کا روپ بدل کر
بالن ہار کی تحریروں کی شوخی کا
شکوہ کرتی ہیں
ڈھانچوں جیسے پیڑ پہ جلے پھول کھلے ہیں
ٹیلیفون کے تار پہ بیٹھی اک اکیلی چڑیا
جانے کن کافر سپنوں میں گم ہے

چاہے کچھ ہو
اپنا وعدہ مجھے ضرور نبھانا ہے
اب کے برس گھر جانا ہے

شاہین عباس

شمارہ ۲۷۲، ستمبر ۲۰۰۳

کیسا کیسا در پسِ دیوار کرنا پڑ گیا
گھر کے اندر اور گھر تیار کرنا پڑ گیا

اس کنارے نے کہا، کیا کہوں، کیا بات تھی
بات ایسی تھی کہ دریا پار کرنا پڑ گیا

پھر بساطِ خواب اٹھائی اور اوجھل ہو گئے
شام کا منظر ہمیں ہموار کرنا پڑ گیا

اک ذرا سا راستہ مانگا تھا ویرانی نے کیا
اپنا سارا گھر ہمیں مسمار کرنا پڑ گیا

وہ کہانی وقت کا جس میں تصور ہی نہیں
اس کہانی میں ہمیں کردار کرنا پڑ گیا

سرسری سمجھا تری آنکھوں کو ہم نے اور پھر
سرسری چیزوں پہ بھی اصرار کرنا پڑ گیا

آخرش سب خواب اس منزل پہ پہنچے ہیں جہاں
اپنی آنکھوں کا ہمیں انکار کرنا پڑ گیا

در امکاں سے گزر کر سرِ منظر آ کر
ہم عجب لہر میں ہیں اپنے نئے گھر آ کر

جسے جانا ہی نہیں اپنے کناروں سے جدا
اسے دیکھا بھی نہیں موج سے باہر آ کر

آتشِ غم پہ نظر کی ہے کچھ ایسے کہ یہ آنچ
بات کر سکتی ہے اب میرے برابر آ کر

تو نے کس حرف کے آہنگ میں ڈھالا تھا مجھے
سانس بھی ٹوٹ رہا ہے سرِ محشر آ کر

اسے دیکھا تھا خطِ خواب کے اس پار بھی
یہ ستارہ جو گرا ہے مرے اندر آ کر

اک صدا کو ندا سے، کسی اپنے کی صدا
رونے لگ جاتی ہے اس دہشت میں اکثر آ کر

شاخ تا شاخ عجب عالمِ وحشت ہے ابھی
طائرِ جاں کبھی ٹھہرا تھا مرے گھر آ کر

شمارہ ۲۷۴
نومبر ۲۰۰۳

زمیں کا آخری منظر دکھائی دینے لگا
میں دیکھتا ہوا پتھر دکھائی دینے لگا

وہ سامنے تھا تو کم کم دکھائی دیتا تھا
چلا گیا تو برابر دکھائی دینے لگا

نشانِ ہجر بھی ہے وصل کی نشانیوں میں
کہاں کا زخم کہاں پر دکھائی دینے لگا

پہنچ گیا تری آنکھوں کے اس کنارے تک
جہاں سے مجھ کو سمندر دکھائی دینے لگا

وہ اس طرح سے مجھے دیکھتا ہوا گذرا
میں اپنے آپ کو بہتر دکھائی دینے لگا

کچھ اتنے غور سے دیکھا چراغ جلتا ہوا
کہ میں چراغ کے اندر دکھائی دینے لگا

شائستہ یوسف

شمارہ ۱۳۷،
اپریل تا جون ۱۹۸۵

(۱)

کل رات میں نے اک خواب دیکھا
کسی انجان جرم کا بدلہ لینے
کئی بھدی شکل کے ننگے جنگلی
میری طرف نوکیلے بھالے لئے بڑھتے ہیں
لیکن زباں کاٹ دی جاتی ہے...
میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں
اور میں بے اختیار جنگل میں دوڑتی ہوں
زمیں پیر جکڑتی ہے
آسمان قہقہے لگاتا ہے
جانوروں کی چیخوں اور اژدھوں کی سرسراہٹ سے
میرا دل میرے دماغ کے کسی حصے پر ہتھوڑے لگاتا ہے
آنکھوں سے نکلتے جھرنے سانسوں پر قابو پانے کی ناکام
کوشش کرتے ہیں
ایسے میں سامنے دھوئیں میں لپٹا ہوا پہاڑ
اپنی باہیں پھیلا دیتا ہے
ایک انجانی قوت مجھے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے
ایک صدا آتی ہے: "تم بے گناہ ہو!"
مگر بجلی ہم دونوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیتی ہے

(۲)

اچانک میری آنکھ کھل گئی
اور مجھے لگا،
جیسے میں پرانے وقتوں کی
غاروں اور پہاڑوں سے لوٹی ہوئی آواز ہوں
ہاں ہاں میں اس کے قریب ہوں
اس کی محبوب ہوں
خدا نے عورتوں کو پیغمبری عطا نہیں کی تو کیا ہوا
بی بی مریم کا ذمہ تو لیا تھا
مانا میری صورت بہت بری ہے
لیکن پیراہن میں چھپے خوبصورت بدن کو
چھونے کی کسی نے ہمت نہیں کی
میری ہنسی اڑائے جانے کا کوئی افسوس نہیں
لوگ آج بھی بیکار کی باتوں میں الجھے ہیں
اور الجھے رہیں گے
اگر فرائض انجام دینے کا حکم اس نے نہیں دیا ہوتا
تو شاید میں کسی چٹان کا پتھر ہوتی
میرے آس پاس کوئی کان ایسا نہیں
جو میری آواز کی سماعت کے قابل ہو
اب کسی کتاب کے نازل ہونے کا کوئی امکان نہیں
شاید اسی لئے مجھے شاعری بخشی گئی ہے
میں دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی ہوں
زندہ ہوتے ہوئے مطمئن اور پرسکون

شفق

شمارہ ۷۹،
دسمبر ۱۹۷۲

اور جب زمین کے سینے میں لگی ہوئی آگ پوری طرح پھیل گئی
تو گھبرا کر لاؤڈ اسپیکر چیخنے لگا

علاقہ خالی کر دو کہ زمین اب پیروں تلے سے غائب ہونے والی ہے، پھر بڑی تباہی ہوگی، چاروں طرف آگ ہی آگ ہوگی لپکتے شعلوں کی داستان سنانے کے لئے کاغذ قلم کہاں سے آئے گا۔ روشنائی بھی نہ مل سکے گی۔ دل میں کریدنے پر خون کی لکیر بھی نہ ملے گی۔ داستان نہ لکھی جا سکے گی کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ شعلوں کی زبان نے کس کس سے کیا کیا کہا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر چیختا رہا۔

کیا ہم واقعی چلے جائیں؟ مگر میرے آنگن میں لگا ہوا چمپا کا پودا، اسے کیسے اکھاڑ دوں کہ اس کی جڑیں دھرتی کی کوکھ میں بہت دور تک دفن ہو چکی ہیں، اور میں نے اس کی جڑ میں اپنی انگلیوں کا خون دیا ہے۔ نہ میں اس سے جدا ہو سکتا ہوں نہ اسے اکھاڑ سکتا ہوں۔ اور ایک طویل خزاں کے بعد تو اس میں کونپلیں نکلی ہیں۔ حاکم وقت کے دروازے پر مجمع گڑگڑا رہا تھا۔

ہم اپنے آباواجداد کی قبریں کہاں لے جائیں۔ وہ نہ جانے کب سے شہر خموشاں میں لیٹے ہوئے ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ ہم انھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے، ہم علاقہ خالی نہیں کر سکتے، ہم...

علاقہ خالی کر دو، اپنی فکر کرو شہر خموشاں کے پجاریو۔ اپنے آباواجداد کی نعشوں پر کب تک ماتم کرو گے۔

اعلان کرنے والا بے دردی سے ہنس رہا تھا۔

تالاب کے کنارے میلوں تک پھیلا ہوا شہر خموشاں نئی پرانی قبریں اور پراسرار ماحول کے سائے میں بے شمار لمبے لمبے درخت، مسجد، کتبے، منہدم قبریں اور سناٹا، لیکن میں نے شام ہوتے ہی قبروں کے کتبے ایک طرف ہٹتے اور ان میں سے سفید ریش، لمبے قد والے سایوں کو نکل کر شہر سے آنے والی راہ پر نظریں جمائے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے اور جب رات سنسان ہو جاتی ہے۔ سائے اپنی اپنی قبروں میں واپس جا کر گم ہو جاتے ہیں اور قبرستان کا ماحول اور پراسرار ہو جاتا ہے۔ صرف کبھی کبھار کوئی مچھلی پانی میں چھلانگ لگاتی ہے کبھی کوئی خرگوش...

میں نے بہت کوشش کی کہ ان سایوں کے چہرے پہچان سکوں۔

میں نے اپنے دوست سے کہا، وہ بے اختیار ہنسنے لگا، تم پاگل ہو گئے ہو، ایسی ایسی جگہوں پر جاؤ گے تو یہی دماغی خلل ہوگا۔

دن کی روشنی میں میں نے کتبوں کے مٹ میلے نام پڑھے، کتبوں کو خوب ہلایا ڈلایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ آواز دی تو اندر سے صرف خراٹوں کی آواز آئی۔ میں نے ایک ایک کر کے ساری قبروں کے کتبوں کو آزما ڈالا، مگر آخری قبر کا کتبہ میرے ہلاتے ہی منہدم ہو کر گر گیا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ جسم تو سڑ گل کر خاک ہو گیا تھا۔ مگر آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں اور

اپنے حلقوں میں متحرک تھیں۔ مجھ سے نظریں ملیں تو میں جیسے شل ہو کر رہ گیا۔ میں حرکت نہیں کر سکتا تھا، میری آنکھیں بھی مردہ آنکھوں کی چتلیوں میں جم کر رہ گئیں...

جھونپڑوں کی قطار حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی، لوگ رنگ برنگے کپڑے پہنے میلہ کا جشن منا رہے تھے۔

پھر ڈھول پیٹا جانے لگا اور ڈھول کی آواز سنتے ہی لوگ خود بہ خود سمٹنے لگے، راستہ صاف ہوتا گیا اور ایک رتھ آیا، جس پر ایک راجہ... ایک رانی اور ایک کتا، بڑا خونخوار کتا تھا۔ رال کے بدلے خون ٹپکاتا ہوا۔ اپنی چمکیلی اور ڈراؤنی آنکھوں سے مجمع کو گھور رہا تھا۔ کتے کی زنجیر رانی کے ہاتھوں میں تھی۔

رقص شروع ہوا۔ لوگ ہر طرف سے غافل تھے تب ہی کتے نے جست لگائی اور ایک بوڑھے پر ٹوٹ پڑا۔

رانی نے کوشش کی کہ حملہ ناکام ہو مگر وہ اپنے دانت بوڑھے کی گردن میں گاڑ چکا تھا۔

یہ تماشا زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا، مجمے سے ایک وید نکلا، رانی نے اپنا داہنا ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیا، مشعل کی روشنی تیز کی گئی اور پھر وید نے رانی کے ہاتھ میں نشتر لگایا، خون کی پھوار نکلی۔ خون برتن میں جمع کیا جانے لگا۔ جب برتن خون سے بھر گیا تو وید نے مرہم لگا کر زخم پر پٹی باندھ دی اور وہ اسی تڑپتے بوڑھے کو پلایا جانے لگا۔

یہ کیا ہے؟

بڑی خونخوار نظروں سے اس نے دیکھا، تم کون ہو، کہاں سے چلے آئے؟

میں اجنبی ہوں، یہ سب میرے لئے اجنبی ہے مگر میں آنکھوں کی زبان نہ سمجھ سکا، تم کچھ بتا سکو گے تم...

وہ نہ جانے کیوں برہم ہوا جا رہا تھا۔

خاموش رہو یا پھر یہاں سے چلے جاؤ۔

میں اس کے پاس سے کھسک کر دوسرے کے پاس چلا گیا۔

مکاری نہیں چلے گی، دوسرے نے مجھے دیکھ کر کہا، میں تمہارے دل کا حال جانتا ہوں، مگر ابھی وقت نہیں آیا ہے، تم کیسے عبادت کرتے ہو؟

کیا مطلب؟

اچھا... مجھے اس کا بھی یقین تھا۔

مگر کس بات کا... بھائی میں تو بس ابھی ہی آ رہا ہوں۔ اندھیرا ہو گیا ورنہ تمہیں وہ جگہ دکھاتا، باغ کے کنارے کنارے جو نہر آتی ہے۔ میں اسی کے سہارے یہاں تک پہنچا ہوں اور اگر واقعی تم میرے متعلق کچھ جانتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں یہاں سے بھی آگے جانے والا ہوں۔ مگر سنو۔ وہ شخص بھی جاتے جاتے رکا، کیا تم بتا سکو گے کہ باغ کا سلسلہ کہاں تک گیا اور اس نہر نے کہاں تک اسے سیراب کیا ہے۔

تمہیں سب معلوم ہو جائے گا، ہم بڑے مہمان نواز ہیں۔ تمہیں چند مدت ٹھہرنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی،

کہانی سناؤ گے نہ؟ راجہ رانی کی...

تم اسے کہانی سمجھتے ہو۔ وہ پھر گرم ہو گیا۔ آنکھیں نہیں ہیں کیا؟ دیکھا نہیں رانی نے اپنا خون دیا تھا۔

ہاں بھئی میں بھی تو یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔

اچھا تو یہاں سے پچھلے پہر روانہ ہو جانا، چند کوس کے فاصلے پر ایک کنواں ہے وہیں ایک عبادت گاہ بھی ہے مگر تمہیں عبادت گاہ سے کیا واسطہ... سچ سچ بتانا، اب تک تم نے کتنی عبادت گاہوں کا خون کیا ہے، کتنی کتابیں پھاڑی ہیں۔

میں خموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

اس کنویں کے پاس کیا ہوگا۔

اوہ... وہ خیالوں سے چونکا۔ تم نے کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی ہوگی، حالاں کہ تمہارے ان ہاتھوں نے کتنی کتابوں کے چیتھڑے اڑائے ہوں گے۔

تم آخر کتابوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو، علم صرف کتابوں تک تو محدود نہیں... میں اس سے کہہ نہ سکا، کہنا چاہتا تھا۔

میں نے تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ مگر ایک بات بتاؤ، تم نے بھی احتساب کیا ہے؟

یہ کیا بلا ہے؟

یار تم آدمی ہو یا... اس نے نیچے سے اوپر تک گھور کر دیکھا۔ جاؤ اس وقت روانہ ہو جاؤ کنواں چند کوس کے فاصلے پر ہے۔

میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ کنواں...

عبادت گاہ مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی تھی، میں چکر میں پڑ گیا۔ میں تو کتے رانی اور راجہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور یہ کنواں یہ عبادت گاہ. بڑی مشکل سے وہ کتا قابو میں آیا ہے۔ اس نے بڑی تباہی مچائی تھی، بے شمار لوگوں کا خون پی گیا تھا۔ لوگ دم توڑنے لگے تھے تو مہارانی نے اسے قابو میں کرایا اور مرتے لوگوں کی رگوں میں اپنا خون پہنچوایا۔ اب رانی اس کتے کو آہنی کمرے میں بند رکھتی ہے مگر اب...

میں کہنے والے کو دیکھ نہیں رہا تھا، میں آواز بھی نہیں سن رہا تھا مگر میں... مگر اب...

اوہو... مجھے یاد آیا... میں بے تحاشہ بھاگ رہا تھا، راہ میں لوگوں نے روکنا چاہا، ہٹ جاؤ سامنے سے مجھے بہت جلد جانا ہے۔ راستہ مت روکو کہ زندگی میں پہلی بار میں واپس ہوا ہوں ورنہ میرے قدموں نے ہمیشہ زمین تنگی ہے تم جانتے ہو میں کون ہوں؟

نادانو۔ میں مسافر ہوں، میں کہاں سے آ رہا ہوں، میں کہاں جاؤں گا۔

سنو، میری بات سنو، میں کنویں کے پاس سے ہو آیا ہوں۔ دوسرے آدمی کا شانہ میرے ہاتھوں میں تھا اور خلاف معمول میں نے اس کی آنکھوں میں ہراس دیکھا۔ وہ کتا...

پہلے تم اپنی سانس درست کر لو، ہم بڑے مہمان نواز ہیں، پانی پی لو، بہت میٹھا اور ٹھنڈا پانی ہے ہمارے چشمے کا۔

پیاس... ہاں مجھے پیاس لگی ہے، میں ہونٹ پر زبان پھیرتا ہوں،

میرے تلوے ریت پر چلنے سے لہولہان ہو گئے ہیں۔ میں سات سے دس تک پیاسا رہا ہوں اور اسی پیاس کی حالت میں جب میں عبادت میں مصروف تھا تو وہ کتا...

میں اس کتے کے بارے میں بتا رہا ہوں، تم سن رہے ہو؟

تین دنوں کی پیاس، کبھی نہ بجھ سکے گی۔ میں ہمیشہ پیاسا رہوں گا مگر تمھاری خواہش کا احترام مجھ پر فرض ہے، میں تمھیں میزبانی کا شرف بخش چکا ہوں۔

دعوت تو مجھے ان لوگوں نے بھی دی تھی۔ وہ خطوط دیکھو گے۔ انھوں نے بھی کہا تھا۔ میں نے بھی سنا تھا۔ فرات کا پانی بہت میٹھا ہوتا ہے تم بھی مجھے وہی پانی پلاؤ گے نا؟

دوسرا آدمی جیسے میری باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ دیوار کے سرخ دھبے پر نظریں جمائے تھا۔

وہ پہلا آدمی کون ہے؟

وہ بڑے زور سے چونکا اور خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشیانہ لہجے میں، مجھ سے بولا۔

تم کنویں کے پاس گئے تھے؟

یہ میری بات کا جواب ہے؟

وہاں کیا ہوا تھا؟

مگر میں نے پہلے آدمی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

تو اب بھی خموش رہو، تم یہاں کب تک ٹھہرو گے؟

تم پانی پلانے جا رہے تھے نا، نہر کا میٹھا پانی...

طنز نہ کرو، ہم بہت مہمان نواز ہیں۔

مہمان نواز... ہاں تو انھوں نے بھی دعوت دی تھی اور پھر دسویں دن وہ کتا...

مجھے سب معلوم ہے تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، تم اس کتے کو پہچان چکے ہو، اس کتے نے، جب سورج نے سر جھکایا تھا اور تم عبادت کرنے لگے تھے، تو اس نے... اور اب تک اس کے منھ سے رال کے بدلے تمھارا خون ٹپکتا ہے۔

وہ چھوٹا سا پلا جو محلے میں ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا تھا اور اسے زندگی کی علامت کے اظہار میں زندہ رہنے دیا گیا تھا کیا پتہ تھا کہ ایک دن وہ اتنا خون خوار ہو جائے گا کہ میلوں تک پھیلے ریگستان میں مجھ سے پہلے وہاں اور پھر یہاں اور

لیکن ہم تمھیں جانے نہیں دیں گے، کچھ دن ہمارے یہاں ٹھہر جاؤ۔

رانی نے اس کتے کو مروا کیوں نہیں دیا؟

کوشش تو بہت کی گئی مگر بڑے عابد نے بتایا موت اس کا مقدر نہیں۔

جب تک تم میں طاقت اور رگوں میں لہو ہے اسے مغلوب رکھا جا سکتا ہے لیکن ہم سب اس سے نفرت کرتے ہیں، وہ تمھارا قاتل ہے، نہ جانے کتنوں کا قاتل ہے مگر وہ پہلا آدمی اس کا لہجہ سرگوشیانہ ہو گیا، ایک رات محل میں گھس کر اس نے کتے کا کمرہ کھول دینے کی کوشش کی تھی وہ تو خیر ہوئی کہ پہرہ داروں کی آنکھ کھل گئی اور...

جب رات ہوئی تو میں چپکے سے کنویں کے پاس چلا گیا۔

وہ پہلا آدمی صورت سے تو شریف معلوم ہوتا ہے پھر اسے کتے سے ہم دردی کیوں ہے؟

کوئی سسک سسک کر رو رہا تھا۔

پہلے آدمی اور کتے کا رشتہ...

سسکیاں اور صرف سسکیاں...

میں گئی رات تک بیٹھا رہا، رونے والا سسک سسک کر روتا رہا، کئی دوسرے عبادت گاہ سے نکلے اور شاید انھوں نے بھی سسکیاں سنیں کہ گرتے پڑتے گھروں کی طرف بھاگے۔

دوسرا آدمی میرا منتظر تھا، میں نے اسے رونے والے کے متعلق بتایا تو اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا، اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔

اب تمھارا ٹھہرنا اور ضروری ہے۔

کیوں؟ کیا ہو گا؟

تم خود دیکھو گے ورنہ آگے والوں کو کون بتائے گا کہ پیچھے ایک بستی میں کیا ہوا تھا۔

تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟

تمھارے بارے میں اس نے پھر سرخ دھبے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

میں جانتا بھی ہوں اور نہیں بھی، ہم سب عبادت کے مختلف طریقے ضرور استعمال کرتے ہیں مگر سچ سچ بتاؤ، کیا تم نے کبھی اپنا احتساب نفس کیا ہے۔

احتساب نفس... دراصل میں اندازہ نہیں کر سکا ہوں کہ تمھاری گہرائی کتنی ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں مگر وہ پہلا آدمی، تم نے اس کے لباس پر غور کیا تھا؟

بچوں کی پسند کا لباس پہن رکھا تھا اس نے۔ کتنی تصویریں تھیں اس کے لباس پر، کہیں جھنڈے لہراتے ہوئے، کہیں جلوس، دہشت، آگ، خون، تخت پر بیٹھا خون ٹپکاتا ہوا کتا۔

نہیں میں غور نہیں کر سکا تھا مگر کیا واقعی... ذرا ٹھہرو، میں اسے ریگستان میں تلاش کروں، محلے کی گلیوں میں ڈھونڈوں جب وہ کتے کا پلا ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا پھر رہا تھا۔ نہیں اس وقت پہلا آدمی کبھی محلے میں نہیں تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے، پہرہ بہت سخت تھا اور مجھ سے پہلے میرے ہم نام نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ جہاں بھی نظر آئے اسے ختم کر دیا جائے، وہ ہم سب نئے آنے والوں کی اچھی طرح تلاشی لیا کرتے تھے، مجھے یقین ہے وہ کبھی سرحد کے اندر نہیں آیا تب اس نے کتے کو کسی طرح ہمارے محلے میں پہنچا دیا۔ پھر جو کچھ ہوا اس کے اشارے پر ہوا ہو گا۔

میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

رک جاؤ تم اسے کہاں تلاش کرو گے۔ اگر وہ اتنی آسانی سے مل جاتا تو اب تک رانی نے اسے ختم کرا دیا ہوتا۔ وہ تو ایک پل کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور پھر بائیں کوٹھری میں چھپ جاتا ہے۔

وہاں کون رو رہا تھا؟

اعلان کے منتظر رہو، بہت جلد اعلان ہوگا، تب اس سیاہ دھبے سے ماتھے پر سرخی اگانی ہوگی۔

اگر میں نے نہیں اگائی تو؟

بے وقوفی نہ کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ بغاوت کے الزام میں تمھیں اس کنویں کے حوالے کر دیا جائے؟

میرے دوست سچ تو یہ ہے کہ میں تمھاری کوئی بات نہیں سمجھ پا رہا ہوں، مجھے یہاں سے چلا جانے دو۔

ڈھول پیٹنے کی آواز فضا میں ابھری۔ اس کے ساتھ ہی چیخنے، چلانے اور رونے کی آوازیں بھی تھیں۔

سب ختم ہوگیا، سب بدل گیا، یقین کرو، تم آگے والوں سے کہہ دینا، جلدی کرو، اپنے ماتھے پر سرخی اگاؤ۔

وہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا سرخی پر ٹیک دیا اور پھر اس کی سسکیاں بھی ڈھول کی آواز میں مدغم ہوگئیں۔

تخت پر پہلا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ کتا اس کے پیروں کو زبان سے چاٹ رہا تھا۔ رانی اور راجہ مقتل پر کھڑے تھے۔

فصل اگانے کے لئے زمین ہموار کرنی پڑتی ہے۔ میں نے زمین ہموار کر دی ہے۔ یہ سب کچھ تمھاری بھلائی کے لئے...

تب ہی کتے نے پیر چاٹنا بند کر دیا اور سر اٹھا کر سونگھنے لگا، پہلا آدمی تقریر کرتے کرتے رک گیا۔

سامنے آجاؤ ورنہ چشم زدن میں تباہ ہو جاؤ گے۔

میں سامنے نہیں آیا۔

اس نے کتے کی گردن کا پٹہ الگ کر دیا۔

اور میں نے راہ میں دیکھا۔ باغ سے ملی ہوئی نہر میں بے شمار لوگ پانی پی رہے ہیں سب کے پیٹ سوکھے ہوئے چہرے مرجھائے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنی رفتار تیز کی۔ کتا میرے قدموں کے نشانات کو سونگھتا ہوا میرا تعاقب کر رہا تھا۔

کنواں خاموش تھا۔ سسکیاں بھی رک گئی تھیں۔ کنویں کا ٹیلی پیتھی سسٹم برباد کر دیا گیا تھا۔ عبادت گاہ کا رنگ بدلا جا رہا تھا۔

پیچھے میں چیخ رہا تھا، آگے میں بھاگ رہا تھا۔ دھوپ دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ گرمی بڑھ رہی تھی۔

میں رفتار تیز کرتا جا رہا تھا۔ کتا بھی رفتار تیز کرتا جا رہا تھا۔

پیچھے میں چیخ چیخ کر مر گیا تو لوگوں نے میری لاش کو کفن میں لپیٹا اور میلوں تک پھیلی شہر خموشاں میں شیشم کے درخت کے سائے میں دفن کر کے میرے نام کی تختی لگا دی۔

آگے میں بھاگتا رہا، کتا تعاقب کرتا رہا۔

باغ ختم ہوگیا، نہر کا پانی سوکھنے لگا، پھر پانی سرخ ہونے لگا۔ میں نے دیکھا، ایک نالے سے خون بہہ بہہ کر نہر کے پانی میں مل رہا تھا۔ بہت دور ڈھول پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ بہت شور ہو رہا تھا۔ آسمان میں پرندے اڑ رہے تھے۔

میں نے رکنا چاہا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ چیچ

ایک لاش خون میں بہتی آرہی تھی، میں نے اچٹتی نظر ڈالی، وہ میں ہی تھا۔

کتا اب مجھ پر قابو حاصل کر لینا چاہتا تھا اس لئے میں نے رفتار اور تیز کی، پانی کا رنگ ذرا سا بدلا تھا کہ ایک نالہ پھر نہر میں ملا، اس میں میں نے اپنی لاش اپنے خون میں بہتی دیکھی۔

پھر نہ جانے کس چیز سے وہ ٹھوکر لگی تھی کہ پہلے تو میں اوپر اچھلا پھر نیچے کی طرف گرنے لگا۔ گرتا رہا، گرتا رہا...

علاقہ خالی کر دو۔ زمین اب پیروں تلے سے غائب ہونے والی ہے بڑی بڑی تباہی ہوگی۔

لاؤڈ اسپیکر چیخ رہا تھا۔

اور حاکم وقت کے دروازے پر مجمع گزگڑا رہا تھا۔

یہاں ہمارے تالاب ہیں جن کا پانی بہت صاف ہے بہت میٹھا ہے، یہاں سے باہر اس نہر کا پانی سرخ ہے اس میں سے خون کی بو آتی ہے۔

حاکم وقت نے فون اٹھایا اور مجمع کی آواز کہیں اور پہنچا دی۔

پھر مجمع لوٹ گیا اور آسمان سے ریت کی بارش ہونے لگی۔

لاؤڈ اسپیکر خاموش ہوگیا۔

میں نے قبر کا کتبہ رومال سے صاف کیا۔ اس پر میرا ہی نام تھا۔ وہ آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں۔

پھر میں نے اسی شام کو قبروں کے کتبے ہٹتے اور ایک ایک کر کے سایوں کو باہر نکلتے دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے ایک طرف کو روانہ ہوئے اور کروندے کی گھنی جھاڑیوں نے انھیں نگل لیا۔

میں ان کی واپسی کا منتظر رہا۔

لاؤڈ اسپیکر سے نغمہ نشر کیا جانے لگا تھا لیکن وہ واپس نہیں آئے تو میں نے ریت مٹھی میں بھری اور آسمان کی طرف دیکھا۔

کدال اٹھا کر خونی نہر سے ایک نالی نکالی اور ریگ زار میں خون سے سینچائی کی۔ سبزیاں لگائیں اور فصل کے تیار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اور جب فصل تیار ہونے والی تھی۔

ایک شام جب میں کدال کندھے پر رکھے کروندے کی جھاڑیوں سے گذر رہا تھا اچانک اس کتے نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی، بھاگنا شروع کیا۔ مگر میں تھک چکا تھا۔ مجھ سے بھاگا نہ گیا۔

اور جب کتا میری گردن میں دانت گاڑ کر میرا خون پی رہا تھا میری صرف ایک تمنا تھی۔ کاش اس کی پیاس بجھ جائے۔

کاش کہ میرا بچہ...☆☆☆

شفق سوپوری

شمارہ ۲۶۱،
اکتوبر ۲۰۰۱

یہ عشق بھی عجیب ہے اک آن ہوگیا
انسان ساری عمر کو حیران ہوگیا
وہ شخص کیا گیا ہے ادھر سے کہ شہر دل
پھر دیکھتے ہی دیکھتے ویران ہوگیا
اس غم نے کیسی شکل بدل لی کہ کل تلک
دشمن تھا میری جان کا اب جان ہوگیا
وہ زلف میرے بازو پہ بکھری نہیں تو میں
اس زلف سے زیادہ پریشان ہوگیا
ہے سلطنت ہی میری نہ لشکر مرا مگر
میں بدنصیب جنگ کا میدان ہوگیا
ہم شاعری کے بارے میں اتنا ہیں جانتے
زخموں کے مجمعے سے یہ دیوان ہوگیا
میں اس کو زندہ دیکھ کے خوش ہوگیا شفق
وہ مجھ کو زندہ دیکھ کے حیران ہوگیا

شمارہ ۲۸۱،
جون ۲۰۰۴،

منظر خواب کا اک عکس رواں بھی میں ہوں
دیکھ در پردۂ چشم نگراں بھی میں ہوں
تم کبھی سرحد امکاں سے پرے بھی ڈھونڈو
کہہ گیا ہے کوئی مجھ سے کہ وہاں بھی میں ہوں
ختم قصہ ہی ہوا دربدری کا مجھ پر
دشت وحشت میں مکیں بھی ہوں مکاں بھی میں ہوں
وصل کے نور کا مجھ سے ہے اجالا ہر سو
شعلۂ ہجر میں پوشیدہ دھواں بھی میں ہوں
میں ہی سرخیل اسیران فصیل ہجراں
والی سلطنت دل زدگاں بھی میں ہوں
مجھ سے رائج ہے یہاں مسلک اہل تسلیم
یعنی اب مرجع آشفتہ سراں بھی میں ہوں
کہہ دیا، مجھ کو خبر ہے دل و جاں ہوں تیرا
یہ بھی کہہ دیتے عذاب دل و جاں بھی میں ہوں
تم کبھی میرے سوا بھی کسی منزل پہ رہو
تم وہیں کیوں چلے آتے ہو جہاں بھی میں ہوں

شفیع جاوید

شمارہ ۲۳۵،

مارچ تا جون ۲۰۰۱

باہر رات اسکائی لائنس کو تبدیل کرتے ہوئے بھاگ جاتی ہے، درختوں، تاریکی، ستاروں اور خاموشی کے درمیان، کبھی تیز رو کبھی آہستہ خرام۔ یادوں کو اپنے گرد نرم کمبل کی طرف لپیٹ کر سونے کی بے سود کوشش کرتا ہوں۔ تاریکی کے خلا کو دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی باہر کی مدھم روشنی کا نیم دائرہ سامنے کی دیوار پر بنتا ہے اور دوسرے لمحے گنگا کی لہروں کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ رات اور شہر کے راز مجھے بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں کہ اب یہ شہر مجھ سے باتیں کرتا ہے اکثر جب میں اپنے مسئلوں کے گرداب سے باہر آتا ہوں۔ اس کی عجیب ادائیں ہیں خاص کر باتیں کرنے کی، کبھی یہ دیوار پر چپکائے ہوئے پوسٹروں کے ذریعہ باتیں کرتا ہے، کبھی دوڑتی بھاگتی بھیڑ کچھ کہہ جاتی ہے، کبھی کبھی لیمپ پوسٹ کے نیچے اکیلی کھڑی لڑکی کی بے بسی کچھ کہہ دیتی ہے، کبھی ٹیکسی کی کھڑکیوں کا شیشہ نیچے کر کے پان کی پھینکی ہوئی پیک کچھ کہہ جاتی ہے اور کبھی پیچھے سے آتی ہوئی لمبی چمکتی ہوئی سیڈان گاڑی کا زوردار ہارن گالی دیتا ہوا گذر جاتا ہے اور سامنے کی نیون سائن کی جلتی بجھتی ہوئی روشنی میری بھیگی ہوئی پیشانی پر اپنے نرم ہونٹ رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک لمبا سلسلہ ہے جو دیر رات تک مجھے تھامے رہتا ہے اور میرے فلیٹ کے دروازے تک مجھے پہنچا دیتا ہے جسے میں صبح میں اپنے بیٹے کو بس اسٹاپ پر لے کے جاتا ہوں۔ رات گئے یہ سڑکیں، یہ گلیاں مجھے اپنی کہانی سناتی ہیں۔

اس شہر کے لوگ میرے دشمن ہو سکتے ہیں لیکن یہ شہر بڑا اپنا بڑا گہرا دوست ہے۔ ہم دونوں میں بڑی گہری دوستی ہے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور دکھ دونوں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ رات کے سناٹے تنہائی میں، اکیلے چلتی ہوئی انھیں سڑکوں پر یہ شہر میرے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ لیکن آدمیوں کا جم غفیر جب اس پر حاوی ہو جاتا ہے تو اس کی مجبوری دیدنی ہوتی ہے، یہ مجھے ٹک ٹک دیکھتا ہے، مجبور ماں کی طرح یا بے بس بچے کی طرح۔ اتنے دشمنوں سے یہ اکیلا شہر کیسے پار پائے بھلا؟ لیکن جب سڑکیں خالی ہو جاتی ہیں، کھڑکیوں کے شیشے کے پیچھے کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں، فٹ پاتھوں پر لوگ اور کتے ساتھ ساتھ سو جاتے ہیں، فائیو اسٹار ہوٹلوں کے فوڈ پیکٹوں اور Left Overs کو نادار لوگ چاٹ چکے ہوتے ہیں، کوٹھوں کے کمرے بک ہو چکے ہوتے ہیں، اور آخری لوکل بھی گذر چکی ہوتی ہے تو میرا ساتھی شہر جاگ پڑتا ہے، سرک کر میرے پہلو میں آ جاتا ہے اور سرگوشیوں میں کہتا ہے۔ جاننے کے لئے صرف ساتھ ضروری نہیں، ضروری ہے محسوس کرنا، موجود نہ ہوتے ہوئے بھی، اسے جو ہوا کی طرح محیط ہو اور محسوس ہو اپنے آپ کی طرح اور رشتہ وہی جو اپنے آپ اپنی کشش سے پودے کی طرح ابھرے اور خود بخود کھل اٹھے۔ تب ہم دو کھوئے ہوئے اپنا آپ پاتے ہیں اور ہمارے کاندھے ایک دوسرے کی سسکیوں سے ہلنے لگتے ہیں جیسے سامنے ہوگلی میں ڈینگی ڈولتی ہے۔ اس کا کالی گھاٹ بھی عجیب تماشے کرتا ہے، رات گئے جب میں وہاں بیٹھتا ہوں تو کچھ دیر کے بعد ایک چل پری آتی ہے، کہتی ہے "میں کویتا ہوں۔" پھر دوسری آتی ہے کہتی ہے "میں آکاش ہوں۔" لیکن عجیب بات ہے کہ کویتا آکاش لگتی ہے اور آکاش کویتا دکھائی دیتی ہے اور میں گھبرا کر اس کی باتیں اس سے اور اس کی باتیں اس سے کرنے لگ جاتا ہوں، لیکن ایک اور عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا جواب دیتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہی کی طرح مسکراتی بھی ہیں اور میرے کاندھے پر سر رکھ کر ویسے ہی اداس ہو جایا کرتی ہیں جیسے پہلے جدا ہوتے وقت ہوا کرتی تھیں۔ پھر لگتا ہے وہاں نہیں ہوں کہیں اور ہوں۔ جسم کسی بھی حال میں ہو، رکا ہوا، ٹھہرا ہوا یا حرکت میں لیکن دل ہمیشہ خیالوں کے اڑن کھٹولے میں سفر کرتا رہتا ہے، ہمیشہ۔ میرے تصورات وہ آئینہ ہیں جن میں میں اپنا کل دیکھتا ہوں اور لگتا ہے وہ سب کچھ نہیں بیتا جو بیت چکا ہے۔

جب میں کھڑکی بند کر لیتا ہوں تو شہر کھڑکی کے باہر رہ جاتا ہے بند کھڑکی کے باہر کا شہر اب سونے جا رہا ہوگا، دن بھر کی تھکان سے سڑکیں ہانپ رہی ہوں گی، کہیں خون ہو رہا ہوگا، کہیں ڈاکہ پڑ رہا ہوگا، کہیں کسی عورت کی آبرو لٹ رہی ہوگی، کہیں کوئی بھاگتا ہوا آدمی گولی کا نشانہ بن رہا ہوگا، کہیں کوئی سپاہی کسی مجہول مدقوق سے آدمی کو فٹ پاتھ پر سویا ہوا پا کر اپنے بقایا کے لئے پیٹ رہا ہوگا اور دن کو اپنے بچے ہوئے خون کے پیسوں سے وہ آدمی اس مار سے خود کو بچانے کے لئے کچھ اور خون بہا رہا ہوگا۔ کہیں نئی حکومت بنانے کی سیاسی بساط پر چالیں چلی جا رہی ہوں گی، لمبی لمبی چمکتی ہوئی گاڑیاں آ رہی ہوں گی، جا رہی ہوں گی، بریف کیس نئے نئے، رنگ برنگے ایک گاڑی سے دوسری گاڑیوں میں شفٹ ہو رہے ہوں گے، جھوٹے وعدوں کی جنتیں جگمگا رہی ہوں گی اور اقتدار کے نشے میں لڑکھڑا رہے ہوں گے۔ شہر اس بند کھڑکی کے پیچھے شبیہ نہیں، اب یہ صرف آواز ہے، مدھم مدھم، آہستہ آہستہ سی سرسراتی ہوئی آواز جو کھڑکیوں یا شیشوں کے Cracks سے اندر آ جاتی ہے۔ سڑک پر آتی جاتی سواریوں کے بعد یا کسی کے بھاگتے یا تیز قدم چلتے ہوئے سے الگ ہو کر بغیر دستک دیئے بارش کے قطروں کی طرح اندر آ جاتی ہے۔ لیکن کچھ آوازیں اندر ہی ہیں کہ ہمارے اندر بھی قبریں ہوتی ہیں، یادوں کی حسرتوں کی، خوابوں کی لیکن ان پر کتبے نہیں ہوتے، یہ قبریں بس اندر ہی اندر کہیں خود ہی دفن ہوتی ہیں اور جب کوئی ٹھیس لگتی ہے تو ان قبروں کے بھی منہ کھل جاتے ہیں اور ہم ان

پر وقت کی مٹی چڑھا کر ڈھک دیتے ہیں اور خشک آنکھوں کی ویرانی اور گم گشتہ آوازوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، آج سیلنگ فین کی آواز شامل ہے جس کا گریس شاید ختم ہو گیا ہے، باتھ روم کے نل سے پانی کے قطروں کی ٹپ ٹپ اور کبھی کبھی گوریا کے بچوں کے پر پھڑپھڑانے کی آواز جو چھت سے لگے پورب طرف کے روشن دان میں چند دنوں پہلے آئے ہیں، نہ جانے ان کی ماں نے یہ جگہ کیوں چنی ہے۔ پوال اور تنکے باہر کی طرف لٹکے ہیں اور پنکھے کی ہوا میں بے آواز ہلتے ہیں۔ اگلے وقتوں کی دیوار گھڑی کے پنڈولم کی طرح اور ان کے علاوہ اندر بہت اندر کی آواز ہے جو میرے Smoke Rings کے دائرے میں ایک چہرہ بناو دیتا ہے، دھندلا دھندلا سا، مدھم مدھم سا، لیکن اسموک رنگ کا کیا، ابھی ہے ابھی نہیں۔ Fleeting moment یہ تب کی بات ہے۔ یہ کمرہ اس شہر ہی کی طرح، پچھلے بائیس برس سے میرے ساتھ ساتھ ہے۔ میری خوشیوں میں میرے دکھوں میں برابر کا شریک ہے۔ میں نے اس کمرے میں بہت سے خواب دیکھے ہیں اور ایک رات جب رات بہت گہری ہو گئی تھی اور میں نے ایک خواب دیکھا تھا تو نیند کھل جانے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا تھا، ''اپنے خوابوں کو کبھی مرنے مت دینا کہ ان کا مرنا امیدوں کا مر جانا ہے۔'' پھر ایک خواب میں کسی نے کہا'' یہ بھی لیتے جائیں۔''

''کیا ہے؟''

''کوفے سے آپ کے نام کا خط آیا ہے۔'' میں اس خط پر دھیان نہیں دیتا ہوں اور مارا جاتا ہوں۔ تب ہی سے میرے نام کوفے سے برابر خط آتے ہیں اور میرا کوئی خواب سچ نہیں ہو پاتا۔ کبھی کسی خواب کی تعبیر سعد نہیں ہو پاتی۔ کوفے سے آنے والے خطوں سے میری جنگ تب سے اب تک جاری ہے۔ اب وہاں کے خط ہی مضمون کے بدلے Letter Bombs ہوتے ہیں اور میرے پاس سپنوں اور شبدوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن میں تنہا نہیں ہوں، یہ کمرہ ہے، تاریکی ہے، خاموشی ہے، خواب ہیں، یہ بند کھڑکی ہے اور اس کے باہر سوتا جاگتا شہر ہے، جو سوتے وقت مہربان ہو جاتا ہے اور جاگتا ہے تو خونخوار اور بے رحم ہو جاتا ہے۔ دن شروع ہوا تو مہابھارت اور گرتی ہوئی رات میں شہر ماں کی لوری۔ یہ عجیب تضاد ہے۔ میری طرح۔ جو ہوں سو نہیں ہوں اور جو نہیں ہوں سو ہوں۔ بہت پہلے، شاید بیس برس پہلے میرے کمرے میں ایک پینٹنگ تھی، کسی انگریز مصور کی، مختلف رنگ، مختلف پہلوؤں سے الگ الگ دکھائی دیتا تھا، وقت بدلتا تھا کہ اس کا رنگ بدلتا تھا، میری سمجھ میں کبھی نہ آیا ہمیشہ الجھتا ہی رہا، انھیں دنوں گورودیو نے کہا تھا ''کس چکر میں پڑ گئے ہو؟''

''جتنا سوچتا ہوں، اتنا ہی الجھ جاتا ہوں گورودیو۔''

''کیا پوچھتے ہو مجھ سے، اپنے کو سمیٹ کیوں نہیں لیتے، جتنا سوچو گے الجھتے ہی جاؤ گے، پھر دکھ ہوگا، کئی جنموں کا، پھر موکش تلاش کرتے پھرو گے۔''

''ہواؤں کے پنکھ کہاں ہیں؟ کبھی دکھائی نہیں دیتے۔''

''ہوا تو صرف اپنے وجود کا احساس دلا کر آگے چلی جاتی ہے۔''

''پھر کیا ہوتا ہے؟ ہوا کہاں چلی جاتی ہے؟''

''پہلی ہوتی ہے۔''

''اور وہ جس نے احساس دلایا تھا۔''

''ہاں یہ اسی کا حصہ تو ہے، جو کہاں سے شروع ہوتا ہے، کہاں ختم ہوتا ہے، کہنا بڑا مشکل ہے کہ آغاز انجام ہے یا انجام...''

''میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی الجھ جاتا ہوں۔''

''کیا پوچھتے ہو مجھ سے، خود ہی سمجھ لو، جتنا سوچو گے الجھتے چلے جاؤ گے، بہت جنجال ہے، بس جان لو کہ ہوا ہے، سانس ہے، زندگی ہے، بس آگے مت جاؤ، میرے حال سے عبرت پکڑو۔ راستہ بھول جاؤ گے، زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے کہ سات پہاڑ، سات سمندر، سات جنگل، پھر سات آسمان، جب تک کچھ سمجھ میں آئے ساری عمر ختم ہو جاتی ہے، اس لئے...''

رات کی خاموشی میں سانس کی آواز بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ یہاں ابھی میں اپنی سانس کو تالیاں لگاتے سنتا ہوں۔ اور یہ سچ لگتا ہے کہ یہ رات میری اپنی ہے، ویسی ہی ایک رات جو میں نے آکاش کے کمرے سے دیکھا تھا، چاند کو سر کئے ہوئے، شہر کو سوتے ہوئے ہواؤں کو اور اس کی خوشبو کو ایسے ہی محسوس کیا تھا، وہ ٹیوب روز جو اس نے میرے ہی لئے لا کر رکھا تھا اور گلاب کا وہ ہار جو وہ منتیں کر کے مجھے پہنا کر کمرے تک لائی تھی (غنیمت ہے کہ اس نے فوٹو نہیں اتروایا)، کمرے کا سارا فرش سفید چادروں سے ڈھکا ہوا اور چھٹے فلور پر ہی مجھے لگتا تھا کہ ہم عرش پر ہیں۔ نیچے کا سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا، یہاں تک کہ زمین بھی، وہ تو تب پتہ لگا جب میں جانے لگا کہ آخر زمین بھی ہے، یا یہ کہ سب کچھ بے معنی ہے اگر زمین نہ ہو، جانے کے قبل بڑی آندھی اس طوفان میں باہر نکل گئی، طوفان ہی کی طرح، کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر، بھیگ کر، ہانپتے ہوئے پانی کی دو ٹھنڈی بوتلیں لے آئی، لگتا تھا کوئی دنیا فتح کر لائی ہے، ایسی ہی خوشی تھی اس کے چہرے پر، فاتح چمک سے اس کی آنکھیں روشن ہو رہی تھیں۔ ''کچھ ہو جاتا تو؟''

''کیا ہو جاتا؟'' ہمیشہ کی طرح بے خوف، بے پروا۔

''اتنی تیز آندھی، کہیں کوئی درخت، کہیں کوئی بجلی کا تار کہیں۔''

''تم تھے، بس اتنا ہی کافی ہے، لو تمھارا حلق تو سوکھ رہا ہے۔'' اس وقت ہم اس طرح باہم ہوئے، ایک ہوئے، کہ ہم دونوں کے درمیان نہ رات تھی، نہ تاریکی، نہ چاند، نہ ستارے، بس ہم ہی ہم تھے۔ تب نہ میں اس شہر کو جانتا تھا، نہ شہر آج کی طرح مجھ کو۔ آکاش صرف ہم دونوں کے درمیان کا تعارف تھی۔ میں تو اس کے دفتر میں بیٹھا، پچھم کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے۔ ہوڑہ برج کو دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا اسی برج سے آیا ہوں، اسی سے واپس چلا جانا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس برج کو میں نے اسی طرح دیکھا، آکاش کی کھڑکی سے بھی اس کے آؤٹ لائنس ہی نظر آتے تھے، پھر یا تو صبح کے دھندلکے میں پہنچتے ہوئے، یا شام کے گرتے اندھیرے میں جاتے ہوئے، ان دونوں وقتوں میں، مجھے یہ کسی پینٹنگ کا پنسل اسکیچ جیسا ہی لگا، باقی کسی دوسرے وقت ٹریفک جام کے ڈر سے ادھر گیا ہی نہیں۔ ایک بار تو شام میں ہاتھ رکشے سے ہی جا پایا تھا کہ سوائے پیدل اور ہاتھ رکشے کے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ بھیڑ تو ہاتھ رکشے کو بھی جانے نہیں دے رہی تھی لیکن میری بیماری اور آکاش کی منتوں نے راستہ نکال لیا تھا۔ اسکے دفتر میں ہی بیٹھا اسی طرح دیکھتا رہتا، سوچتا رہتا، کام سے ذرا فرصت مل جاتی تو آکاش پوچھتی:

''کیا سوچنے لگ گئے؟''

"کچھ نہیں رے، تیرے مہانگر میں ہمیشہ بدلی کیوں چھائی رہتی ہے؟"

"یہ بدلی نہیں ہے جادو۔ یہ پولیوشن کا کمبل ہے، ذرا دھوپ میں نکلو گے تو لگے گا، بدن جل گیا۔"

"لیکن وہاں نیچے تو بہت اچھی ہوا چلتی ہے۔"

"ہاں چار بجے کے بعد، اس کے بعد آندھی آتی ہے اور پھر بارش۔"

"عجیب شہر ہے۔"

"بڑا پیارا شہر ہے، ایک دو بار آؤ گے تو سمجھ پاؤ گے۔"

"بہت سے لوگ تو پہلے بخار کے بعد ہی اتنا ڈر جاتے ہیں کہ پھر راستہ بھول جاتے ہیں۔"

"کیا یہ بھی راستہ..."

"شبھ بولو۔"

"یہ مجھے اپنے سامنے کیوں بٹھائے رکھتی ہو؟"

"وہاں فلیٹ میں شیو کی آرادھنا کرتی ہوں اور یہاں..."

"چلو کہیں لنچ کر لیں۔" یہ تب کی بات ہے، لفٹ میں کال بیل کام نہیں کرتا تھا۔ تیواری جی بھوجپور کے تھے۔ انھیں اوپر سے بھوجپوری میں پکارا جاتا تھا تب ہی وہ سنتے تھے اور اگر جانتے کہ کوئی برہمن پکارتا ہے تو بہت جلد لفٹ لاتے اور لے جاتے تھے۔ وہ بھی اس شہر کے ایک مہربان رنگ تھے۔ لنچ کے بعد واپس آتے ہوئے بادلوں کا گھر آنا شروع ہو گیا اور شام بھاری ہوتی گئی۔ "لو اب آندھی آئے گی اور بارش اور... پہاڑوں میں کبھی کبھی بادلوں کا بھٹکاؤ ہو جاتا ہے، راستہ بھول جاتے ہیں وہ لیکن یہاں گنگا کے میدانی علاقے میں یہ پورے میں چھا جاتے ہیں، آسمان کو ڈھک لیتے ہیں، شہر میں وقت سے پہلے ہی رات کا اندھیرا چھانے لگ جاتا ہے، یہاں بادل پہاڑوں کا آنچل نہیں بنتے، اوپر ہی اوپر، اور اگر آندھی اور بارش کا سنجوگ ہو گیا تو بارش کی بوندیں اوپر ہی اوپر اڑ جاتی ہیں اور یہاں کی زمین بھیگ بھی نہیں پاتی۔" آکاش کم وقت میں جلدی جلدی بہت کچھ کہہ جانے کی کوشش کرتی ہے... ان اڑتے ہوئے لمحوں اور اسموک رنگس کے دائرے سے دکھائی دیتے ہوئے Skycrapers اور ان کے درمیان اس شہر کا آسمان مجھے ٹکڑوں میں نظر آتا ہے، جیسے میں اپنے اس کمرے کے سامنے کے مکانوں کے درمیان سے اسے دیکھتا ہوں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی اس بات پر حیرت کرتا ہوں کہ رات کے پہلے پہر میں اس آسمان سے ستارے کہاں غائب رہتے ہیں، یا غائب ہو جاتے ہیں، وہ تو بہت رات گئے جب رات اور شہر کو پڑھتے میں تھکنے لگتا ہوں تو ستاروں کی جھلملاہٹ شروع ہوتی ہے، پھر وہ بادل آتے ہیں جو چاند کے اوپر سے بار بار گذرتے ہیں۔ ان راتوں میں اکثر اپنی بند آنکھوں سے اس شہر کے ان گوشوں کو دیکھتا ہوں، جہاں رنگ ہیں اور خوشبوئیں اور خوشبو ہیں اور سائے ہیں، دور سے وہ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ دکھائی دیتے ہیں، سب ایک ساتھ مل کر ایک اسرار کی تخلیق کرتے ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا رنگ کدھر ہے، سائے کدھر ہیں، سرگوشیاں کدھر ہیں اور خوشبو کہاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود سب کچھ محسوس ہوتا ہے اس طرح کہ ہاتھ بڑھاؤں تو شاید چھو سکوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرتا ہوں کیوں کہ خواب کے ٹوٹنے کا خوف حاوی ہو جاتا ہے اور ایسی خوابناک دنیا کو کون کھوئے؟ شہر بند کھڑکی کے باہر ہی رہ گیا ہے اور وہ پینٹنگ جو سامنے کی دیوار پر ہے وہاں وقت کے مختلف رنگ ایک دوسرے میں ضم ہونے لگتے ہیں۔ رات، تاریکی اور شہر کو کہاں سے جدا کروں، کہاں سے رات شروع ہوتی ہے اور کہاں سے تاریکی، کہنا بڑا مشکل ہے۔ مجھ میں آکاش کہاں ہے اور آکاش میں میں کہاں ہوں، کہنا بڑا مشکل ہے، ویسے ہی لین ملٹی اسٹوری بلڈنگ جو کئی ہیں، ان کے بیچ سے جو آسمان دکھائی دیتا ہے، ان کی آخری منزلوں کے اوپر وہ ستاروں سے بھرا ہے اور ان کے اوپر پھر کیا ہے؟ پتہ نہیں، اس طرح شہر کے اوپر بلڈنگ اور اس کے اوپر ہوا اور اس کے اوپر آسمان اور ستارے اور ان کے اوپر شاید خلا یا جانے کیا؟ وہ سب کچھ بھلانے کی کوشش میں دراصل وہ سب کچھ یاد آنے لگتا ہے، کچھ اور زیادہ ہی کیونکہ حقیقتاً ہم کچھ بھی بھول نہیں پاتے، خاص کر گذرا ہوا وہ کچھ جو ہمیں کبھی کسی طور اچھا لگا ہو یا بہت تکلیف دہ رہا ہو، اسی لئے شاید اس سوئے ہوئے شہر میں خود کے archives میں آکاش کو ڈھونڈ رہا ہوں، بہت دیر سے، سب کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موڑ پر مل پائے لیکن اب تک آکاش کو نہیں کھوج پایا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں، ایسے کس وقت میں، اندھیرے اجالوں کے بیچ ہم دونوں کیوں ملتے تھے؟ لیکن اب تک اس کا کارن تو میں جان ہی نہ پایا۔ آکاش کی طرح۔ جو لوگ باہر سے بہت مکمل بہت جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں، بکھرے ہوئے، کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اندر باہر دونوں طرف سے مکمل ہوں۔ باہر سے کہاں پتہ لگتا ہے کہ ہم اندر سے اتنے ٹوٹے اتنے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے آنے تک میں بیت چکا تھا۔ سوکھی ہوئی شاخوں میں ہری پتیوں کو آنے میں دیر لگتی ہے لیکن وہ دھیرج بھرے کھڑی رہی، بسنت کے انتظار میں اور مجھے فرصت ہی نہ مل پائی کہ پوچھوں، "تمہارے دھیرج کا بسنت کا آنچل ملا یا نہیں؟"... انگریز مصور کی وہ Paintings ویسے ہی مل رہی ہے اور میں شاید شہر کا پوٹریٹ بنا رہا ہوں، میرے بائیس سالہ کمرے کی دیوار پر وہ رکا ہوا وقت ہے کیا؟ پتہ نہیں گھڑی میں چابی تھی کہ نہیں کہ اس کی بیٹری ختم ہو گئی تھی کہ وقت رک گیا تھا کہ خود میں وقت ہو گیا تھا۔ شہر کو ساتھ لے کر چلنا یا جینا اب میرے بس میں نہیں رہ گیا ہے، اسی لئے کھڑکی بند کر لینے کے بعد شہر مجھ سے باہر ہی چھوٹ گیا ہے، دراصل یادوں کے گھنے اندھیرے میں مجھے راستہ ہی نہیں مل پایا... "لیکن اطمینان رکھو اب بھٹکوں گا نہیں آکاش۔" اس وقت کا یہ جملہ جب سیڑھیاں اتارتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا، بھول ہی نہیں پاتا ہوں کیونکہ زندگی کی ڈھلان پر اترتے ہوئے یہی ایک راستہ بچ رہا ہے، شاید نیچے اترتے ہوئے جب...

آگے کیا لکھنا ہے؟ یاد نہیں آتا کہ الفاظ تو سارے کے سارے سو گئے ہیں، ستاروں کی طرح، اس شہر کی طرح۔ اپنے آپ سے لڑائی عجیب ہوتی ہے کہ لڑتے لڑتے جب آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جیت گیا تو حقیقتاً وہ ہار چکا ہوتا ہے کیونکہ اپنے آپ سے جیت پانا سات پہاڑوں کی بلندیوں کو سر کرنے سے بھی مشکل کام ہے۔ السایا شہر، رات کا گہرا پچھلا پہر، سایوں کی دنیا، تاریک انجان ہیولے، ہواؤں کے تھپیڑے سہنے والی ٹوٹی ہوئی زمین، پتوں کی سرگوشیاں، دور کسی چڑیا کی ڈوبتی ہوئی چہکار، سارے میں پراسرار اداسی اور ان پر محیط خاموشی شکن آلود اور بند مٹھی میں پھسلتی ریت سی زندگی ☆☆☆

تیز ہوا کا شور

شفیع جاوید

شمارہ ۲۶۵،
فروری ۲۰۰۳

جاتی ہوئی دھوپ نے سامنے کے پہاڑوں کے سائے کو پیچھے اتار دیا ہے اور ان سایوں نے جو ریکھائیں بنائی ہیں وہ اونچی نیچی ہیں، لگتا ہے ان سایوں کا کسی نے گراف بنا دیا ہے۔ اور وہ کچھ جو بہت پیچھے چھوٹ چکے اب وقت کی اکائیوں کی طرح جگہ جگہ پتھروں کے ٹکڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے شام کئی رنگ بدلتی ہے۔ پتھروں کے درمیان خاموشی اب تھک کر سونے لگی ہے۔ گھاس کی سبز تھالی پر پتھروں اور سبزوں کی شام سے بھیگی ہوئی خوشبو اس پر اصرار کرتی ہے کہ یہ قدرت کا رنگ منچ ہے اور اس میں شروع تاریخوں کے چاند کا حجاب اور ہواؤں کا رقص بھی شامل ہو کر شام کو مکمل کرتا ہے اور ایسے میں موسیقی کی لہروں پر ترتیبہ کی تال ابھرتی ہے۔

بنگالی اُمس سے بھری ستائی ہوئی شام، نڈھال خاموشی مدھ ماتی نیند کا سندیسہ لاتی ہے لیکن موسیقی کی مدھم لے اور گھنگرو کے تال لہریں لیتے ہیں۔

اس گھر سے جسے تاج نے ورشا کے ساتھ مل کر بنایا تھا کچھ لڑکے اور لڑکیاں ریاض کر کے جا چکے ہیں اور سناٹا پڑوس کے گھروں کی طرح یہاں بھی چھانے لگا ہے۔ جاڑوں کی ایسی شامیں جانے کیوں راز سربستہ ہوتی ہیں۔ سایوں اور ریکھاؤں میں لپٹی ہوئی جیسے گھونگھٹ میں جوت، آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میں یہ سرمئی نینگوں دھند گھلتی ہوئی، ایبسٹریکٹ آرٹ، کون سا عنوان دیا جائے؟ جدھر سے دیکھئے ادھر ایک نیا آوٹ لائن...

جب لڑکے لڑکیاں تعلیم کے بعد چلے جاتے ہیں تو ورشا کو تاج یاد آتا ہے اور اس کا کہا ہوا بھی یاد آتا ہے: آنندے بھوبنو بھورا...دنیا خوشیوں سے چھلک رہی ہے...لیکن اب ایسا نہیں ہے، اگرچہ ورشا اس کسک کو لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان گھری ہوئی موسیقی کی لہروں اور گھونگھروؤں کے تال پر بھولنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن تاج کی سرگوشیاں کہتی چلی جاتی ہیں۔ آنندے بھوبنو بھورا۔ دل کی صورت مخروطی مٹی کے دیوں سے ڈرائنگ روم سجا ہوا ہے، مختلف رنگوں میں اور ایک بڑے سے فریم میں گنیش کا اپلکے ورک (applique work) دیوار سے لگا ہوا اور ٹھیک اس کے سامنے ایرانی Half Carpet پر حافظ کا ایک شعر۔ ورشا کی آنکھوں میں اتھاہ اداسی اتر آتی ہے، مجھے لگا اس کی آنکھوں میں کئی یگ بسے ہوئے ہیں۔ وہ ساری سنسکرتی، سارا اتہاس، وہ کھویا ہوا سب کچھ اس کی اداس آنکھوں میں اس وقت بسا ہوا تھا اور لگتا تھا بس اگلے لمحے میں آنسو کا ایک قطرہ، صرف ایک قطرہ بن کر اس کا دل ٹپک پڑے گا وہ سب کچھ...تو کیا اس کی آنکھیں کئی جنموں کا رنگ منچ تھیں؟ یہ وقت کہیں کہیں یا شاید کبھی کبھی ایسے ہی منجمد ہو جاتا ہے۔

اس وقت اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ ورشا کہتی ہے:

"آخری اور سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ ہمیں تنہا ہو جانا ہے۔"

یہ سچ کا سچ سویکار ہے، اور اب اسے ایک دو منٹ کا وقفہ چاہئے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہے اور اس کو لگا ہے اس کی بیٹی نے دلی سے فون کیا ہے۔ بات کئے بغیر ہی ماں جان جاتی ہے کہ بیٹی کا فون ہے۔ بیٹی کا فون اس کے چہرے کو شہاب ثاقب بنا دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اور ایسے وقت لگتا ہے کوئی بہت چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے کہ جب کوئی ٹرین رکتی ہے تو چار پانچ منٹ کے لئے بڑی رونق ہو جاتی ہے۔ ٹرین چلی جاتی ہے، پھر وہی اندھیرا، وہی سناٹا، اور بوند بھر رونق کا پھر انتظار۔ اب کی بے رونق خاموشی میں ورشا کی دکھ بھری آواز ابھرتی ہے:

"دیکھو نہ، پدما بھی ترتیبہ سنگیت اپنانا چاہتی ہے۔ لیکن میری طرح نہیں، وہ فلموں میں جانا چاہتی ہے، یا پھر ٹی۔ وی اور ماڈلنگ۔ میری طرح کلاسکی سادھنا میں اس کا وشواس نہیں۔"

"اس میں اس کا کیا دوش، سمے بدل گیا ہے، کلاسکی سادھنا میں کیا رکھا ہے، گھر چلا پائے گی کیا؟"

"میں گھر چلا رہی ہوں یا نہیں؟"

"تمھاری بات اور ہے، تم تو تاج کی سمادھی پر بیٹھی ہو۔"

"تم نے تو ابھی تک اپنا منگل سوتر بھی نہیں اتارا۔"

"اور اتاروں گی بھی نہیں، میں کہاں مانتی ہوں کہ وہ میرے پاس نہیں ہیں، وہ تو میرے روم روم، میری پور پور میں ہیں۔"

اچانک اٹھ کر اس نے ناچنا شروع کر دیا اور رقص کے تیز دائروں میں وہ بھول گئی۔ اپنا افسوسناک ماضی اور خطرناک مستقبل۔ اس وقت شاید ان تیز دائروں میں اس نے وقت سے بعید ایک لمحۂ موعود پا لیا تھا جو نہ ماضی تھا نہ مستقبل، نہ حال۔ بس ایک لمحۂ مسرت تھا جو ایک فن کار کے الہاموں کا سرچشمہ ہوتا ہے، جس میں وہ خدا کی طرح تخلیق کرتا ہے۔ اپنی زمین، اپنا آسمان، اپنی جنت، اپنی دنیا... تال رک گئی تو اسے لگا وہ بہشت سے اس دکھتی ہوئی دنیا میں پھینک دی گئی ہے... دوبارہ۔

"میں جس طرح گھونگھروؤں اور تال کو قابو میں رکھتی ہوں، اسی طرح تاج کے مزاج کو بھی قابو میں رکھتی ہوں،" ہانپتے ہوئے اس نے گھونگھروؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اور پدما کا مزاج بھی باپ ہی کی طرح ہے... ایسے میں وہ ایک دن اچانک اٹھے اور چلے گئے لیکن مجھے یقین ہے وہ مجھے مل جائیں گے، واپس، اچانک جیسے گئے ہیں ویسے ہی۔"

"کیا میری وجہ سے؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن میرا من اس کو نہیں مانتا۔ کیا بارہ برسوں کے بعد بھی مجھے کوئی ثبوت دینے کی ضرورت رہ گئی تھی؟ مانا کہ میں بیاہتا نہیں ہوں، نہ ہم نے سات پھیرے لگائے ہیں، لیکن یقین کرو اگر صرف شادی کا رشتہ ہوتا تو میں نے یہ منگل سوتر کب کا اتار دیا ہوتا۔ یہ تو وشواس کا، دل کا رشتہ ہے جو مجھے باندھے ہوئے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے کوئی بندش لگا رکھی ہو، نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ہی کہا تمھارے لئے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہاں ایک دن دیر تک ہنستے رہے کے بعد پدما کو میری گود میں بٹھلاتے ہوئے بولے، لو یہ بیٹی اور یہ گھر تمھیں دیتا ہوں۔"

"میں؟ انھوں نے میری ان ہی آنکھوں میں دیکھا اور میرے کان میں بولے... 'نہ جانے میرا میں کہاں گم ہو گیا ہے'۔"

وہ پھر اٹھ کر بہت تیزی سے ناچنے لگ گئی اور پھر اپنی سانسوں پر تھوڑا قابو پا کر ہانپتے ہوئے بولی:

"میرے نرتیہ نے ہی مجھے ان سے ملوایا تھا اور اسی نے مجھے ان سے جدا بھی کر دیا، لیکن پھر..."

ناچتے ناچتے وہ ایک دائرہ سی ہو گئی، پھر اسرار، اور اس کے بعد سحر ہو گئی۔ اس سحر نے مجھے گونگا کر دیا۔ کسی دم بخود عضو کی طرح بے حرکت۔ پھر لگا وہ ہواؤں کا بھنور ہے جو کچھ اپنے آپ سمیٹ کر ڈوب جاتا ہے۔ میں بھی شاید اس گرداب میں ہی ڈوب گیا۔ اس وقت یہ فیصلہ مشکل تھا کہ وہ ناچ رہی تھی یا کوئی نئی قیامت تھی، جس میں لے، تال، سر، سرگم، سب اسرار بن کر اس کے رقص میں کھو گئے تھے۔ پھر... وہ جانے سے انجانے کی سمت چلی گئی۔ پھر تھک کر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "گوالیار گئے ہو کبھی؟"

"ہاں بس ایک بار۔"

"کاہے کو گئے تھے؟"

"قلعہ دیکھنے... وہ جو اس پہاڑی پر ہے۔"

"اور؟"

"اور؟ اور کچھ نہیں۔"

"سنو میرے شریر میں وہیں کی مٹی ہے۔ کیا خوب جگہ ہے گوالیار کہ ایک طرف تاتیا ٹوپے ہیں تو دوسری طرف جھانسی کی رانی... اور گوالیار کا قلعہ جسے دیکھنے تم گئے تھے، اس کے سبز فرش کی چمک ایسی تھی کہ بابر کو بھی اپنی تزک میں اس کا تذکرہ کرنا پڑا۔ اور وہیں پیچھے سوئے پڑے ہیں صوفی غوث محمد گوالیاریؒ اور دھرپد کے استاد زمانہ تان سین، دونوں آمنے سامنے، تان سین کے والد مارکنڈے پانڈے نے موسیقی کو پسند کرنے والے صوفی حضرت غوث محمد گوالیاریؒ (وہ دونوں ہاتھوں سے کانوں کی لو چھوتی ہے) کی قدم بوسی کی تو ان کی دعاؤں کی برکت سے تان سین پیدا ہوئے...

"پانچ برس تک تان سین بول نہ پائے۔ پانڈے دوبارہ حضرتؒ کے دربار میں حاضر ہوئے تو انھوں نے پھر دعا کی۔ دعاؤں کی تاثیر تان سین کی قوت گویائی بن گئی۔ سنا، میں نے بھی وہاں حاضری دی تھی۔ نرتیہ کی دنیا میں آنے سے پہلے۔ جی چاہتا ہے اب پھر وہاں جا کر ماتھا ٹکا دوں اور مانگوں..."

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آواز معدوم۔

وہاں اب تیزی سے اترتی ہوئی تاریکی کی حکومت تھی، بے آواز۔ اور اس میں اس کی زلفوں کا ریشمی اندھیرا سا گیا۔ پھر میں گھبراہٹ میں، یا شاید بے مقصد ہی پوچھ بیٹھا:

"کتھا کلی کا ٹروپ پیرس اور نیویارک تو چلا جاتا ہے لیکن ہمارے ملک کے کسی گاؤں میں کیوں نہیں جاتا؟"

"جواب چاہتے ہو؟"

"کیوں، کوئی جواب ہے کیا تمھارے پاس؟"

"پہلے تم کیا میرے ایک سوال کا جواب دو گے؟"

"پوچھو۔"

"ہمارے یہاں ایک سے ایک ریل گاڑیاں بنائی گئیں اور بنائی جا رہی ہیں، ایک سے ایک خوبصورت، آرام دہ، تیز رفتار اور قیمتی۔ لیکن پبلک ٹرانسپورٹ میں کیا ہوا؟ بتاؤ گے؟"

"تم Leftist ہو کیا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور اسی لئے میں نے تم سے یہ سوال اس سوال کے جواب میں کیا ہے جو ابھی تم نے مجھ سے پوچھا ہے۔"

"چلو خاک ڈالو، کچھ معاملوں میں چپ رہنا ہی بہتر ہے۔"

"ہاں۔" اس نے اپنے آنچل سے ماتھے پر پسینے کی بوندوں کو ہلکے ہلکے پونچھ لیا۔ اس وقت لگا آسمان فلیٹ ہو گیا ہے یا پھر بے رنگ۔ اداس ہو جائیں تو شاید ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ ورشا مسکراتی ہے تو اس کے تبسم کے پیچھے گہری

اداسیاں لو دیتی ہیں۔ میں آہستہ سے پوچھتا ہوں:

"چلتا ہوں۔ اور کوئی بات تو نہیں ہے نا؟"

"لیکن ابھی بات شروع کہاں ہوئی ہے۔" کہیں دور دیکھتے ہوئے وہ کہتی ہے۔

اٹھتے اٹھتے میں دوبارہ بیٹھ جاتا ہوں۔ پوچھتا ہوں۔ "تم کہاں دیکھ رہی ہو؟"

"کہیں نہیں۔ کچھ چیزیں دیکھنے سے پرے ہوتی ہیں، صرف معلوم ہوتی ہیں کہ ہیں۔" کچھ دیر چپ رہ کر وہ کہتی ہے: "یہ سانجھی کا سمے ہے۔"

"کیا؟"

"سانجھی نہیں جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"آج جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا کیا یاد آئے چلا جا رہا ہے۔ سانجھی رادھا کی آرادھنا ہے اور برندابن کا گم ہوتا ہوا آرٹ۔ اس میں برج کی خوشبو رچی ہے اور سندھیا دیوی کی پوجا رادھا ارچنا کے روپ میں کی جاتی ہے۔ ایسے ہی جھٹ پٹے سمے میں یہ پوجا ہوتی ہے اور خزاں اس کا موسم ہے۔ دیکھو کیا عجیب بات ہے، پت جھڑ کا موسم سانجھ کی بیلا اور میں.. کیا کیا پوچھوں، کیا کیا بتاؤں، اچھا اصغری بائی کو جانتے ہو؟"

"ہاں، وہ دھرپد گائکی کی مشہور فن کار جنھیں پدم شری بھی ملا تھا۔"

"ہاں وہی۔ ان کی حالت کیا ہے، پتہ ہے تم کو؟ کچھ دن پہلے تک وہ اپنا پدم شری واپس کر کے اپنی پنشن بڑھوانا چاہتی تھیں کہ کسی طرح دو وقت کی روٹی مل جائے۔ دنیا کو ساتھ لے کر چلنا کبھی کبھی اسی طرح بس سے باہر ہو جاتا ہے۔"

دور کہیں نگاہیں جمائے ہوئے وہ چپ ہوئی تو مجھے محسوس ہوا وہ اپنی پشپ وانکا میں بیٹھی دشینت کا انتظار کر رہی ہے۔ جس کھڑکی سے باہر وہ دیکھ رہی تھی وہیں پر کہیں جا کر ویسے ہی باہر اندھیرے میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے وہ بولی:

"پتہ نہیں تم مانو گے کہ نہیں۔ لیکن اصل رشتہ وہی ہے جس میں چاہت کی چاشنی شامل ہوتی ہے، ورنہ بے جان رشتے تو صرف کفن کی طرح ڈھانپ لیتے ہیں۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ رشتہ انھیں سے بنانا چاہئے جو رشتوں کی آبرو کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم طنز کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن اگر تمھیں یہ بات دکھ پہنچاتی ہے تو..."

"نہیں، کبھی کبھی پھولوں سے بھی چوٹ لگ جاتی ہے، بس اتنا ہی... بس اتنا ہی سمجھ لو۔"

میں کچھ بول نہیں پاتا۔

"کہاں ہو تم، ایسے سوئے سوئے سے کیوں لگ رہے ہو؟"

"سپنے۔"

"کیا؟"

"اپنا اور تمھارا سپنا۔ اور ڈرتا ہوں کہ آنکھ کھل نہ جائے۔"

"خوشبوؤں سے بھری ہوائیں کہتی ہیں خواب دیکھنے والوں کے دل بہت اچھے ہوتے ہیں، انھیں جگا کر کھونا نہیں چاہئے۔"

دور پہاڑوں کے دھندلے خطوط شروع تاریکیوں کا چاند ٹوٹتا ہوا سا لگتا ہے۔ خوشبوؤں سے بھری ہوائیں پھر کہتی ہیں، یا خدا کائنات میں کتنے رنگ کھلتے ہیں۔ ساتوں پہر میں الگ الگ رنگ، الگ الگ چپ اور ہر لمحے کی الگ آواز۔

"تمھاری آنکھیں لال کیوں لگ رہی ہیں؟" میں اچانک ہی ورشا سے پوچھ بیٹھتا ہوں۔

"رات رونے کو بہت جی چاہا۔ پھر سوچا آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں تاج کی تصویر بھی ڈوب گئی تو کیا ہوگا؟ اس لئے نہ رو سکی، بس اس دھیر بن میں آنکھیں لال ہو گئیں ہیں۔ اور کوئی بات نہیں۔ اور سنو، ایک ملنا ہوتا ہے مل جانے کے لئے، اور ایک ملنا ہوتا ہے بچھڑ جانے کے لئے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر درد کا داغ ہو۔ جیسے ہر داغ کی تہہ میں درد نہیں ہوتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن درد رہ جاتا ہے۔ یہ درد بھی کچھ ویسا ہی ہے، تب مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے جب کوئی ہاتھ مل جاتا ہے تو اندر بڑی توانائی آ جاتی ہے، سو میرا بھی وہی حال تھا۔ جینے کو جی چاہتا تھا، اب تو نہ پریت، نہ گیت، نہ میت، کیسی عجب رت ہے یہ۔"

کچھ دیر کے لئے وہ پھر چپ ہو گئی، جیسے بہت تھک گئی ہو، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر بولی:

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باہر بہت شور ہو رہا ہوتا ہے لیکن اپنے اندر بہت سناٹا ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باہر ایک دم سناٹا ہوتا ہے اور اندر آندھی چل رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں آدمی دھوپ کھائے ہوئے پتے کی طرح ٹوٹ کر مٹی میں مل جاتا ہے... مجھے اب گوالیار چلا جانا چاہئے۔ میرے بدن میں وہیں کی مٹی ہے حضرت غوثؒ اور سرتاج تان سین دونوں کے چرن مل جائیں گے۔"

پھر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ مجھے یاد آیا کہ خاموشی خدا اور محبت کی زبان ہے۔ ایسی ہی بے آواز مکمل تنہائی میں ہم دونوں الگ الگ جزیروں میں بٹ گئے اور دیر تک سحر زدہ رہے۔

شام کچھ اور جھک آئی۔ دم گھٹنے والی خاموشی سے کچھ ڈر کر میں نے پوچھا: "تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تم نے؟"

"سب کچھ تو کیا۔ ساتوں دھام کے چکر لگا کر ویشنو دیوی پہنچی۔ گرتی، پڑتی، اجڑی، بے تھاہ، بے یار، بے مددگار، صرف ماں کا آسرا لئے، تمام کا چکر لگانے میں تھک کر ٹوٹ چکی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کئی بار پھسلی۔ پیدل جانا ممکن نہ ہوا تو گھوڑا لے لیا۔ لیکن، پاؤں کو جو تھوڑی سی راحت ملی تو آنکھیں جھپک گئیں۔ اور میں گھوڑے سے گر پڑی۔ جہاں گری وہاں پتھر نہیں تھا، ورنہ آج یہاں نہ ہوتی۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو گہری کھائی، پہاڑ کا سیدھا کٹاؤ۔ روح میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں، اس لئے نہیں کہ موت سے ڈرتی ہوں بلکہ اس لئے کہ میری تلاش باقی تھی۔ پتھر پر ماتھا ٹکا کر خوب روئی، روتی رہی۔ بہت دیر بعد اچانک ایک آواز آئی۔

""" کیوں دیوی، کیا ہوا؟"""

آنکھ کھول کر دیکھا تو وہاں تاج کھڑے تھے... میں نے اپنے زخمی پاؤں پر کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ کئی قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔

"مجھے دھرم سنکٹ میں کیوں ڈالتی ہو دیوی؟"

مجھے بڑے زور کا غصہ آ گیا۔ میں اجڑ گئی ہوں، میرا گھر برباد ہو رہا ہے اور یہ یہاں ناٹک رچا رہے ہیں۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"گھر چلتے ہو یا بلاؤں پولیس کو؟"

اور میں نے پھر انھیں پکڑنا چاہا... انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا، وہی پرانا انداز جوان کے ہاتھ اٹھانے کا تھا۔ وہ مسکرائے، وہی بھولی معصوم مسکراہٹ... پھر ماں کی طرف دیکھ کر دکھ بھری آواز میں بولے۔

""" دیوی کی رکھشا کرو ماں، تمھارا وعدہ ہے نہ؟"""

میں پھر چیخ کر انھیں پکڑنے ہی کو تھی کہ بھگتوں کی ایک ٹولی آ گئی اور پولیس والے بھی۔ میں نے چلاتی ہوئی آواز میں کہا:

"دیکھئے آپ لوگ... یہ میرے سوامی ہیں اور خواہ مخواہ یہاں بیراگی بن کر مجھے چھوڑ بیٹھے ہیں۔ میں نے چاروں کھونٹ گھوم کر آج یہاں انھیں کھوج نکالا ہے تو ماں کی دہائی دے رہے ہیں!"

بھگتوں نے اور پولیس والوں نے کئی سوال کیے تو سب کا ایک ہی جواب تھا۔

""" دیوی کو بھرم ہو گیا ہے، میں تو ماں کا سیوک ہوں، ان کے چرنوں میں اپنے کو سونپ چکا ہوں، میں نے تو گرہست آشرم کبھی جانا ہی نہیں۔"""

پھر سب لوگ چلے گئے اور وہ بھی اپنا کمنڈل لئے جانے لگے تو میں نے وہاں سے کود کر جان دینے کو قدم بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا، گھوم کر دیکھا تو وہی تھے، وہی مسکراہٹ، صندلی پیشانی پر بکھرے ہوئے وہی بال، عورت اسپرش کو اپنے اندر سے پہچان لیتی ہے، سو ویسا ہی تھا وہ لمس میرے بازو پر میں پھوٹ کر رو پڑی اور اسی حال میں ان کے پاؤں پر گر کر کہا:

"گھر چلو تاج۔"

وہ خاموش رہے کچھ دیر، پھر آہستہ سے بولے۔

""" مکت ہو کر کبھی نکل پایا تو شاید جو نام تم نے دیا ہے وہی بن جاؤں اور شاید تمھارے گھر کا راستہ بھی پا جاؤں، جیسے یہاں پہنچ گیا شاید ویسے ہی۔ لیکن انتظار کرو اس کے لئے، ہم دونوں کو انتظار کرنا چاہئے۔"""

"پھر اور آہستہ سے بولے، جیسے وہ خاص وقتوں میں بولا کرتے تھے۔

""" زندگی تو ماں کا وردان ہے، اسے موہ، مایا کے مرگ ترشنا کے لئے کیوں برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو؟'

جب دیر بعد میری آنکھ کھلی تو تاج وہاں نہیں تھے۔ دور اوپر ماں کے دربار کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور پہاڑی ہواؤں کی سائیں سائیں تھی اور وہاں رات تھی، گہری، لمبی اور رکی ہوئی، چپ جیسے دنیا کا وجود ختم ہو گیا ہو ☆☆☆

ہمدم کاشمیری

کا

پہلا شعری مجموعہ

دھوپ لہو کی

"دنیا کو دیکھنے سمجھنے اور اس کے پیچ در پیچ پہلوؤں کو بیان کرنے کا ان کا مخصوص انداز، ہم عصر غزل کی نمایاں لفظیات کے اشتراک کے باوجود دوسروں سے جدا پہچانا جا سکتا ہے اور یہ انداز الفاظ و تراکیب کی بلند آہنگی سے زیادہ محسوسات کی شدت پر قائم ہے۔ انسانی زندگی کی سچائیاں دوسرے ہم عصر شاعروں کی طرح ہمدم کا بھی موضوع سخن ہیں لیکن ہر تجربے سے دوچار ہونے کے بعد ان کا منفرد ردعمل اپنے پیرایۂ اظہار اور اپنی فکری گہرائی کی بدولت معنی خیز اور خیال انگیز شاعری کا پیکر اختیار کرتا ہے۔ حیرت، تجسس، اندوہ، امید کی جھلکیاں ان کی غزل کے منظر نامے کی تکمیل کرتی ہیں۔ وہ اپنے ڈکشن سے مرعوب نہیں کرتے بلکہ اپنے شعری تجربوں کی صداقت اور اپنے دل کے گداز سے متاثر کرتے ہیں۔"

— عرفان صدیقی

قیمت : دو سو روپے

رابطہ : شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

شفیق فاطمہ شعریٰ

شمارہ ۱۶۰،
جنوری فروری ۱۹۹۱

ریاضت کے لئے مردانِ حق
کوہ و بیاباں کی طرف نکلے
کبھی ڈوبے کبھی ابھرے
مگر گڑیا کی رنگین پالکی کو
پالکی بردار
جس بستی میں لے آئے
وہیں اپنی تپسیا کی ڈگر پر اس کو چلنا ہے

سڑک کہتی ہے نامانوس قدموں سے
ذرا آہستہ چل گڑیا
سمٹتا سایۂ اشجار کہتا ہے
یہاں سے بھی
گذرنے کی مناہی تو نہیں لیکن
ذرا مجھ سے پرے ہٹ کر گذرنا ہے
کہیں سرگوشیوں کا لکھنؤ آباد ہوتا ہے
وہیں اک ہستی بے ہست و بود
اور مستند، اس پر
ہمیشہ عام دھارے سے الگ بہنے کی
بیڑا غرق تیاری

اسے کس نے جلایا
آس پاس اس کے
نہ تھا نیرنگیِ افلاک کا سایہ
مگر زعمِ انا کی خانماں برباد چنگاری
چمکتی ہے جو اس کی راکھ میں اب تک
اسی سے پوچھ لو
آئی کہاں سے آگ کمرے میں

چھٹی حس بھی معطل ہونے لگتی ہے جب اخباروں کی خبروں سے
تو پرکھوں کی دعائیں کام آتی ہیں
وہ گڑیا کو کتھائیں ایسے پیڑوں کی سناتی ہیں
ہزاروں سال کے ترکِ وطن کے بعد بھی
جن کی جڑیں
اپنی زمین سے جڑ نہیں پائیں

تو گڑیا مسکراتی ہے
تو گڑیا مجھ سے کہتی ہے
وہ بحرِ روم کا خطہ بھی
بحرِ روم کی موجوں سے
کب تک رہ سکا ملحق
تو ہم کس کھیت کی چڑیا ہیں
کہ اپنا بھی بسیرا دور بحرِ روم کی موجوں میں
فطرت ہی کی رچنا ہے

پکارے جا رہا ہے شاخ پر کاگا
مرا آنگن تو اس کا منچ ہے گویا
پکارے جا رہا ہے
کون جیتا ووٹ کے آدھار پر اور کون ہارا ہے

نہیں معلوم کتنی بار دہراؤں
میں کس سے پوچھنے جاؤں
یہ سناٹے کی تہ میں ہونکتا آسیب کیسا ہے

کسی مانک سے یہ پوچھا جائے تو مانک بھی نیلا اور زہریلا
کسی بستی میں رم جائے
تو بستی کے سبھی آبی ذخیرے غرق لاشوں میں
یہی وہ اژدہا ہے پھونک جس کی
بجھاتی آئی ہے سارے دیے کتنا اندھیرا ہے

یہ حسرت رہ گئی
سارا جہاں ہوتا
گھروندا اپنا موروثی
پہن کر خول کچھوے کا نہ پھریوں زندگی کرتے
غبار آلود چہروں اور پراگندہ لٹوں والے
ملامت کیش

تو درویشو،
بساطِ باد کو
کچھ اور پھیلا کر بچھانا ہے
جہاں اک حلقۂ رنگینیِ احوال مل جائے
وہاں پھونکوں میں کش در کش اڑانا ہے
دھواں یہ کھوکھلے سازوں میں
لہراتا ہوا دائم
سنائی دے رہی ہے دور کی آواز
ہزاروں شیشے ہوں ضربِ آزما جیسے
کسی دیوار آہن پر

اٹھانے آئے ہیں ملبہ عجائب گھر
کشادہ راستہ اک سامنے پاتے ہی
حرکت میں قطاریں چیونٹیوں کی
ہائے یہ پاتال کے باسی

کہاں سے؟
غیب سے شاید
یہ سیلاب بلا امڈا چلا آتا ہے
شاید آج تک
مردم شماری والوں نے
دیکھا نہیں ان کو نظر بھر کر

بسیں کاریں
اور ان کے ساتھ واہن
چابیوں سے چلنے والے
بانچتے ہیں پاٹھ پہلا
کوچ کرنے کا
کہ اپنے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ
جلا کر دیکھ لیں گے
کہیں واماندگی ان کو نہ آئے بیچ رستے میں

ٹرک بھی اک کہنہ ماڈل کا
ازبر کر رہا ہے پھر
ٹریفک کے قواعد کو
لگاتا ہے بریک اک دم کہاں
ہنگام سرمستی،
مسلسل ہارن دیجیے
جب بھی اوورٹیک کرنا ہو
اگر گمراہ کن رفتار سے آئے
تمھاری روشنی میں کوئی موذی کنکھجورا بھی
تو سائڈ دے کے نکلو گے
مگر اس موڑ پر، گل بتیاں اب بھی، وہ سبز و سرخ
ادھر سے

اے ترک
شبدوں کی سیما کا،
علاقہ وہ ابھا گا ہے
جہاں باد بہاری کی سواری کا گذر مشکل
عنبر بو اس پہ ایسی اب روا ہے
جو گوارا تھی
نہ در عہد سلیمان ابن داؤد
نہ در ایام بوبکر ابن سعد وف
کسی مجہول و معروف
شہ صاحب قراں نے
لفظ کے زیر و زبر تک کو نہیں چھیڑا
نہ رسم الخط، جو پیرا ہن تھا خوش رنگ
گلستاں بوستاں کا،
کبھی بدلا، کسی خلد آشیاں نے
یہیں سے بیکراں
دریائے شور اپنا
سکوت ساحل غم ناک کے
منظر میں ڈھلتا ہے

اچانک راہ میں کھل اٹھنے والا پھول ہنستا ہے
خزانہ خندہ ہائے بے سبب کا ہے
گڑا شاید
اسی مٹی کی تہ میں
جس کی ہریالی پہ نام اس کا
لکھا ہے پکی پکی روشنائی سے
قضا و قدر کے طغرا نویسوں نے
یہی وہ کارکن ہیں
کام بلڈوزر سے انجانے میں
لیتے آئے ہیں جو
قلبہ رانی کا
اچانک راہ میں کھل اٹھنے والے پھول!
ہنستا رہ

یہاں، اے جان جاں، تجھ سے
کسی تتلی سے پر لے اور اڑ جا،
کون کہتا ہے

شمارہ ۱۹۳،
اپریل ۱۹۹۶

غزل

شفیق فاطمہ شعریٰ

ایسے ہیں ویسے ہیں قاصد کہتا ہے
سب بیٹھے سنتے ہیں قاصد کہتا ہے
کم ملتے ہیں وہ اس آباد خرابے میں
اپنے میں رہتے ہیں قاصد کہتا ہے
چاندی سونا ہیرے موتی سب ارزاں
بول بہت مہنگے ہیں قاصد کہتا ہے
اس قریے میں چھاؤں ہے تاکستانوں کی
میخانے لگتے ہیں قاصد کہتا ہے
ہم سے عبث رنجش کا دم بھرتے ہیں لوگ
ہم کب کچھ کہتے ہیں قاصد کہتا ہے
اجڑے کھیڑوں سے ہو کر جاتی ہے وہ راہ
تارے جس میں کھلے ہیں قاصد کہتا ہے
وہ سب دوری پر ہٹ دھرمی سے قائم
اک دوجے سے جڑے ہیں قاصد کہتا ہے
انجانے میں اچانک گونج اٹھتی ہے تھاہ
سوتے جاگ اٹھتے ہیں قاصد کہتا ہے
اس پل کے نیچے بھی جل گذران میں ہے
تھم موجوں میں گڑے ہیں قاصد کہتا ہے
اب جب تب لہجے کی خنک تابی سے یہی
لگتا ہے چنگے ہیں قاصد کہتا ہے
خبروں کی ترسیل اور ایسی بے کم و کاست
قاصد پر ہنستے ہیں قاصد کہتا ہے

نئی شاعری ــــ ایک رجحان

شکیل الرحمٰن

شمارہ ۱۹
دسمبر ۱۹۶۷

ایک فن کار کی تخلیقی فکر، دوسرے فنکار کی تخلیقی فکر سے مختلف ہوتی ہے، اس لئے کہ داخلی تجربے مختلف ہوتے ہیں۔ سمرسٹ مام نے اپنی آٹو بایو گرافی The Summing Up میں کہا ہے کہ ہم سب اپنے ذہن کی تنہائی میں جیتے ہیں۔ ایک فنکار کی عظمت یہ ہے کہ وہ تخلیقی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔۔ اس کی تخلیقی فکر دوسروں سے مختلف ہوتی ہے، اس کی تخلیق کی دنیا علیحدہ ہوتی ہے۔ ایک تجربہ ایک فنکار کے لئے جتنا جانا پہچانا ہو، دوسرے فنکار کی ذہنی زندگی سے ضروری نہیں کہ اس کا کوئی رشتہ اور گہرا رشتہ بھی ہو۔ داخلی تجربوں کے رنگوں کی پہچان آسان نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سے رنگ ہیں، ایک دوسرے سے الگ، ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ اس طرح داخلی تجربوں کی بہت سی قسمیں سامنے آتی ہیں اور ہر داخلی تجربے کو ایک نام دینا آسان نہیں ہے۔

ایک اچھوتی فکر کی پہچان کسی اہم داخلی تجربے سے ہوتی ہے، بار بار کوئی داخلی تجربہ اجاگر ہوتا ہے، بار بار اس کی روشنی پھیلتی ہے اور فن کار کی فکر کا پہلو روشن ہوتا ہے، اس کی پراسراریت متاثر کرتی ہے، اس کی اجنبیت متاثر کرتی ہے، اس کی جبلی کیفیت متاثر کرتی ہے۔ چونکہ ہر فن کار کی ذہنی زندگی مختلف ہوتی ہے اس لئے فنکار کو پسند کرنے والوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک پڑھنے والے پر جو اثرات ہوتے ہیں اور ایک پڑھنے والا جس طرح اسے پسند کرتا ہے، ضروری نہیں کہ دوسرا پڑھنے والا بھی اسی طرح متاثر ہو اور وہی تاثرات قبول کرے۔ جب کچھ لوگ کسی فنکار کے داخلی تجربوں کو پسند نہیں کرتے تو وہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ داخلی تجربوں کی پراسرار کیفیتوں کو پسند نہ کرنے والے نقادوں کی کمی نہیں۔ ان تجربوں سے انھیں الجھن ہوتی ہے۔ رنگوں کے معاملے میں وہ بہت حد تک اندھے colour blind ہوتے ہیں۔ وہ داخلی تجربوں میں پھیلے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے، ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہوئے اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہوئے مختلف رنگوں کو نہیں پہچانتے اور اپنے بنے بنائے اصولوں کی روشنی میں انھیں رد کرتے رہتے ہیں۔ چند خاص تاثرات تو لے لیتے ہیں، کچھ خاص ردعمل ان پر ہوتے ہیں، وہ خارجی کیفیتوں کو بھی بہت حد تک پہچان لیتے ہیں، حیرت، خوف اور دہشت اور مسرت کے احساسات اور جذبات کو کسی حد تک سمجھ لیتے ہیں، فوق الفطری یا حقیقی فضاؤں کے تاثرات بھی قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن داخلی تجربوں کو اچھی طرح نہیں پہچانتے، ان پر غور نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں ایک مجبوری تو یہ ہے کہ ان کی داخلی زندگی فن کار کی داخلی زندگی سے مختلف ہوتی ہے، فنکار کے ذہن کی پراسرار دنیا میں جاتے ہوئے کچھ الجھن اور وحشت ہوتی ہے۔ اور دوسری مجبوری یہ ہے کہ ان کے پاس اپنے قاعدے، اصول اور کلیے ہوتے ہیں اور ان میں وہ کسی قسم کی لچک دیکھنا نہیں چاہتے، اس حقیقت سے بھی انکار نہ کیجئے کہ کچھ داخلی تجربے ایسے آزاد ہیں کہ خود فن کار کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے، کچھ داخلی تجربے صرف فن کار کو متاثر کرتے ہیں، فارم اور ہیئت میں اس حقیقت کی پہچان بہت حد تک ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ماضی اور حال کے احساسات اور محسوسات کی زیادہ اہمیت ہے۔

شکست و ریخت اور خارجی اور داخلی ہیجانات کے اس عہد میں نئی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

آئیفور ایوانس (Ifor Evans) نے اپنی نئی تصنیف "ادب اور سائنس" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تخلیقی فنکار کے مقام کا تعین ایک بار پھر کرنا ہوگا۔ نئی تشریح کی ضرورت ہے۔ تخلیقی فن کار دنیا کی اصلاح نہیں کرے گا اور نہ گرتی ہوئی زندگی کو سنبھالے گا۔ وہ پیغمبر بھی نہیں ہے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے قیمتی تجربوں کی تشریح کرے اور اپنی تخلیقی فکر سے انھیں زیادہ روشن کرے۔

افلاطون نے شاعری کو فلسفے کی نگرانی میں رکھنے کی کوشش کی تھی اور ارسطو نے خاموش احتجاج کیا تھا اور شاعری کی قدروں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جمالیاتی قدروں کا تعین کیا تھا، فلسفہ اور اخلاق کی قدروں کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے آرٹ اور فطرت، شاعری اور تاریخ، الہیات کے عناصر اور حسیاتی کیفیات پر بحث کی تھی۔ انیسویں صدی سے ادب اور شاعری کو سیاست، سماجیات، اقتصادیات اور معاشیات اور تحلیل نفسی کے سائے میں چلنے کا مشورہ دیا گیا، نقادوں نے سیاسی شاعری، سماجی افسانہ، اصلاحی ناول نفسیاتی ڈراموں کے لیبل چسپاں کئے اور یہ سمجھا کہ تخلیقی تنقید کا یہی تقاضا ہے، شاعری سیاست کے پیچھے چلی اور اس کی "ڈپلی کیٹ" بن گئی۔ افسانوں میں تحلیل نفسی شروع ہوئی اور افسانوں کے موضوعات سے زیادہ تحلیل نفسی کے اصولوں کی اہمیت کا احساس ہوا، اصلاحی تحریکوں نے ادب اور شاعری کو اپنا آئینہ بنانا چاہا، بیسویں صدی میں ان باتوں کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی، ہر نسل کے کچھ شعرا اور ہر نسل کے کچھ فن کار یہ محسوس کر رہے تھے کہ "ڈپلی کیٹ" کی اہمیت

ہی کیا ہے، ظاہر ہے "اصل" کو زندہ رہنا "نقل" کو ختم ہو جاتا ہے، اسی احساس سے یہ رجحان پیدا ہوا کہ شاعری کا اپنا کوئی 'مقصد' نہیں ہے۔ فن و ادب سے انسانیت اور سماج کو آگے بڑھنے میں مدد نہیں ملتی اور نہ اس سے سماج کو کوئی نقصان ہوتا ہے۔ داخلی تجربوں کے تاثرات کا اظہار بھی کافی ہے، یہ فطری اور نفسیاتی ردعمل تھا، پھر شاعری میں امیجزم، کیوبزم (Cubism) سرریلزم (Surrealism) اور وجودیت (Existentialism) کے عناصر ایک دوسرے سے ملے ہوئے نظر آنے لگے اور اس گریز سے ایک نئی رومانیت پیدا ہو گئی۔ ایسی شاعری میں مزاج، فراریت، ذہنی اور حد درجہ داخلی تصاویر، لفظی تماشے، ہندسی اشکال کے کرشمے، خیال کی بے ربطی، اذیتوں اور دکھوں کی سمت مراجعت، خودکشی اور روحانی اضطراب، یہی باتیں ملتی ہیں۔ اگر امیجزم، کیوبزم، سرریلزم اور وجودیت کی تحریکیں وجود میں نہ آتیں اور ان تحریکوں کو کچھ اچھے فن کار نہ ملتے تو جانے شاعری کس طرف جاتی، ان تحریکوں میں جو بنیادی خامیاں اور کمزوریاں ہیں، انھیں ایک طرف رکھئے اور یہ سوچئے کہ "نئی رومانیت" اور "نئی فکر" سے شاعری کو کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ "سیاسی، اقتصادی اور سماجی" قدروں کی عکاسی کرتے کرتے شاعری کا اپنا وجود ختم ہو رہا تھا، اس کی روح زخمی ہو گئی تھی، افلاطون کے عہد کا "معلم شاعر" اس عہد میں "لیڈر شاعر" بن گیا تھا، یہ شاعری کی شکست تھی، اس شکست کا ردعمل سامنے آیا، احساس شکست کے ردعمل سے جو تجربے سامنے آئے، انھیں دیکھ کر بعض نقادوں کو یقین نہ آیا کہ یہ شاعری ہے۔ حالانکہ یہ شعری تجربے قابل غور تھے، یہ گریز فطری تھا، ایک بار پھر آدمی اور اس کے آرٹ کی تشریح کی ضرورت تھی، فرد کی جذباتیت اس کی داخلی کشمکش، اس کی فکر کی فیلسفی اور اس کا تضاد، اس کی شدید داخلیت اور "وژن" (Vision) سب کچھ خارجی شکست و ریخت اور مادی اور عصری ہیجانات کے ردعمل کو ظاہر کر رہا تھا، خارجی دباؤ سے داخلی آزادی کا احساس پیدا ہوا، جو فطری تھا۔ سیاسی، اقتصادی اور معاشی، اصلاحی اور اخلاقی قدروں کے ہجوم اور کشمکش، تضاد اور تصادم اور شکست و ریخت میں شاعری کی قدریں کم ہو رہی تھی، اس ہیجانی دور کو "شاعری کی تلاش" اور جستجو کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس صدی میں شاعروں کو "فرائض" کا شدید طور پر جس طرح احساس دلایا گیا ہے، ہم واقف ہیں اور اس کے جو اثرات اور ردعمل ہوئے ہیں، ہم جانتے ہیں ـــــ "ہیومنزم" (Humanism) کو سمجھانے کی کوشش ہوئی۔ ہیومنزم کی جانے کتنی صورتیں سامنے آئیں اور حساس فنکاروں کی الجھنیں بڑھتی گئیں۔

ڈیوین ہیومنزم (Deweyan umanism) یعنی فطری ہیومنزم۔

جولین ہکسلے کی ہیومنزم ـــــ یعنی ارتقائی اور سائنسی ہیومنزم۔

ایف۔ سی۔ ایس۔ شلر کی ہیومنزم (Schiller's Humanism) یعنی ارتقائی اور انقلابی ہیومنزم۔

اشتمالی اور اشتراکی ہیومنزم ـــــ مارکسی مفکروں کی ہیومنزم جس کی بنیاد اقتصادی اور طبقاتی جدوجہد پر ہے۔

لے ماؤت کی ہیومنزم یعنی مادی ہیومنزم۔

مارتین کی ہیومنزم ـــــ یعنی کیتھولک ہیومنزم اور کیتھولک ہیومنزم کی بہت سی صورتیں۔

مرسیر کی ہیومنزم (Mercier's Humanism) یعنی مذہبی ہیومنزم۔

اور

سارتر کی ہیومنزم ـــــ یعنی وجودی ہیومنزم اور اس کی کئی صورتیں۔

ہر مفکر نے اس کا دعویٰ کیا کہ فن و ادب اور فنون لطیفہ کی روشنی مل سکتی ہے تو اس کے مخصوص تصور سے شاعری کبھی ڈیوین ہیومنزم کے قریب آئی اور کبھی شلر کی ہیومنزم کے قریب، آرٹ نے کبھی مارکسی ہیومنزم کے سائے میں چلنا پسند کیا اور کبھی وجودی ہیومنزم کے سائے میں رہنے کی کوشش کی، مارتین اور لے ماؤت کی ہیومنزم نے بھی اپنی شعاؤں سے آرٹ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی ـــــ حساس فنکاروں کے سامنے بہت بڑا چیلنج تھا، انھیں ہر لحہ محسوس ہوا کہ کسی بھی فکر کے سائے میں چلتے ہوئے آرٹ کی صورت "ڈپلی کیٹ" کی ہو جاتی ہے۔ "نقل" کی اہمیت کیا ہے؟ "اصل" حقیقت ہے، ظاہر ہے 'ڈپلی کیٹ' کو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آرٹ اور شاعری کو بہت فائدہ ہوا اس لئے کہ نئی روشنی ملتی رہی، ہر فکر کی دلچسپی انسانی قدروں سے تھی، آدمی اور اس کی قدروں سے جو دلچسپی تھی، دراصل اس سے فنی ارتقا ہوتا رہا، شعوری اور غیر شعوری طور پر فن کار تمام خیالات کی لہروں سے متاثر ہوئے، مختلف افکار کے تضاد اور انتشار کے اثرات بھی گہرے ہوئے، آرٹ اور شاعری کی جانب داری سے یہ نقصان ہوا کہ ہر فکر سے روشنی حاصل نہ ہو سکی، ایک جلوے میں کئی جلوؤں کا نظارہ نہ ہو سکا، فنکاروں کی جانب داری سے، بہت سے قیمتی تجربوں اور بہت سے رومانی افکار کی اہمیت باقی نہ رہی۔ نظریوں کے اختلاف سے بھی اثرات اچھے نہ ہوئے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان تمام افکار کی اہمیت ہے، آرٹ کے گرد ہر فکر کی روشنی موجود ہے، فن کار کا بالیدہ شعور ہر فکر سے رنگین شعاعیں لے سکتا ہے۔ آرٹ کی بنیادی قدروں اور داخلی کیفیتوں کے پیش نظر ہی روشنی کی ہر کرن اور ہر لکیر کو سمجھا جا سکتا ہے اور ان کے مطالبوں کے مطابق انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی قدروں اور انسان کے ہیجانوں اور اس کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش مختلف طریقوں سے ہوئی ہے، تمام نظریوں میں اختلاف کے باوجود آدمی اور اس کی قدروں پر زور رہنے۔ بنیادی حقائق کو سمجھ لینا ہی بڑی بات ہے۔ آدمی کو داخلی اور خارجی طور پر سمجھنے کی ہر کوشش بہت کچھ سمجھاتی ہے۔ تہذیبی اور تمدنی قدروں کے انتشار میں ٹوٹتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے فن کاروں کو ان افکار سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کے سامنے اس انتشار اور شکست و ریخت کے عہد میں سوال یہ ہے: آدمی کیا ہے؟

یہ بنیادی ادبی سوال مختلف افکار اور خیالات میں اور اہم ہو گیا ہے!

سماجی جانور ہے؟
نفسیاتی پیکر ہے؟
اس کا صرف مادی وجود ہے؟
آدمی کا روحانی وجود بھی ہے؟ مذہب کے بغیر سانس لے سکتا ہے یا نہیں؟

کائناتی پیکر ہے؟

خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہوا پیکر ہی تو نہیں ہے؟ سچائی تلاش کرنے والا؟ وہ الجھا ہوا پیکر ہے؟ داخلی اور خارجی ہیجانات میں اسے کس طرح پہچانا جائے؟

ہیومنزم کے تمام جدید نظریے اور تصورات اسی پیکر کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

اور ہمیں معلوم ہے کہ تمام قدیم فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی تصورات اور نظریات اسی حقیقت کو مختلف عہد میں مختلف انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ ہر خیال دوسرے خیال کے خلاف، ہر نظریہ دوسرے نظریئے کے خلاف اور ہر تصور دوسرے تصور کے خلاف احتجاج ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی غور فرمایئے کہ خود سنبھالتے ہوئے ہر تصور اور ہر نظریئے میں بڑی گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ بڑی وسعت آئی ہے، آدمی اور اس کی قدروں کو سمجھنے کی کوشش میں ہر تصور، بہت سی صداقتوں اور سچائیوں تک آ گیا ہے ——— ظاہر ہے کہ زندگی اور آدمی کو سمجھنے کا صرف ایک نظریہ اہم نہ ہوگا۔ آرٹ کی پہچان میکانکی فطرت سے نہیں، رومانی فطرت سے ہوتی ہے اور رومانی فطرت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص نظریئے کو قبول کرے، جب بھی ایسا ہوا ہے رومانی اور جمالیاتی، جذباتی اور داخلی قدریں مجروح ہوئی ہیں، ٹوٹ گئی ہیں، ایک فنکار کے لئے انسان کا تصور مادہ، زندگی کی حرارت، ذہنی تاثرات، جذباتی اور جبلی ہیجانات استدلال اور روحانی کیفیات کا تصور ہے۔ جب کوئی نیا نظریہ سامنے آیا ہے، جب نئے اور پرانے نظریوں میں کوئی کش مکش ہوئی ہے اور الجھنیں پیدا ہوئی ہیں تو آرٹ کے سامنے سوال آیا ہے:-

کس طرح عمل کرنا ہے؟
کس نظریئے کے ساتھ چلنا ہے؟
پرانے نظریئے تک آنے میں کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے؟
کیا ـــ کسی نظریئے کو بدلنا ہے؟
جدید نظریئے سے کوئی نیا تصور بھی جنم لے سکتا ہے؟
کیا تصور، نظریہ، خیال ـــ مکمل ہے؟
جذبات اور احساسات کس طرح متاثر ہو رہے ہیں؟
داخلی تجربوں پر کیا اثرات ہو رہے ہیں؟
کیا ـــ واقعی تخلیقی ادب کے لئے کسی نظریئے کی ضرورت ہے؟
کسی نظریئے کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی اس کے اور دوسرے نظریوں کے لاشعوری اور داخلی اثرات کیسے ہیں؟

تخلیقی ہیومنزم (Creative Humanism) کی یہی تو پہچان ہے! نئی شاعری میں تخلیقی ہیومنزم کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اچھی شاعری ہمیشہ سوالات سامنے رکھتی ہے، خارجی تجربے، جذبہ اور احساس، شعور اور لاشعور سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، فن کار کے پورے وجود میں جذب ہو جاتے ہیں تو حسیاتی کیفیتوں کے ساتھ جمالیاتی قدروں اور فنی نزاکتوں کے ساتھ کچھ سوالات سامنے آتے ہیں۔ جذباتی اور حسیاتی ردعمل سے ابھرے ہوئے سوالات ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ تخلیقی ہیومنزم کی اسپرٹ ہی انھیں ابھارتی ہے۔ نئی اور پرانی قدروں اور نئے اور پرانے تجربوں اور نظریوں کی کشمکش میں خارجی سوال کے جذباتی اور داخلی ردعمل کو دیکھیے اور ساتھ ہی مشینی اور سائنسی دور کے انتشار اور تہذیبی اور تمدنی زندگی کی مسخ ہوتی ہوئی صورتوں پر نظر رکھئے، نئی شاعری میں ''فرد'' کی الجھنوں اور اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں، اس کی تلاش و جستجو اور اس کی تنہائی کے احساس، اس کے المیہ تجربوں اور اس کی داخلی اور اندرونی ویرانی، ان تمام باتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

بیسویں صدی سے زیادہ المناک صدی شاید ہی کوئی ہو، نئی شاعری میں اس صدی کی الم ناکی ملتی ہے اور اس عہد کے المیہ تجربے ملتے ہیں۔ نئی شاعری کی علامتیں اور اس کے حسی پیکر اس المناک عہد کے مزاج اور اس عہد کی ٹریجڈی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ نئی شاعری علامتوں اور پیکروں کی زبان میں ہم سے باتیں کرتی ہے، سرگوشیاں کرتی ہے۔ ہیومنزم کی مختلف صورتوں کی کش مکش اور ان کے تضاد اور مختلف نظریوں کی الجھنوں کے پس منظر میں اس شاعری کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری زندگی سے گہرا رشتہ رکھتی ہے، اس صدی کے داخلی ہیجانات اس شاعری میں ہیں۔ اس عہد کے اہم اور بنیادی مسائل سے اس عہد کے شعرا کا تعلق ہے۔ نئے شعرا فرمان جاری نہیں کرتے، سیاسی بحثیں نہیں کرتے، ان کی تخلیقات میں صحافتی رنگ نہیں ہے، مختلف رجحانات سے داخلی کش مکش اور شخصیت کا اضطراب سامنے آیا ہے، آدم اور آدم کا گناہ، سماج اور سماجی زندگی کی گھٹن، اونچے طبقے کی الجھنیں، فرد کے داخلی ہیجانات، لاشعور کی تاریکی میں الجھے ہوئے خیالات، ماضی پسندی، مستقبل کی دھندلی تصویر، ذہن کی پراسراریت، امیدیں اور آرزومندی، میکانکی اور مشینی زندگی کی گھٹن، روح یا شعور کی تلاش و جستجو، احساس جرم، مجروح اور ٹوٹتی ہوئی شخصیت، قدروں کی تیز رفتاری، بحران اور کرائسس اور روحانی انتشار اور کھوکھلا پن۔ یہی نئے موضوعات ہیں، ان سے نئی زندگی کی پہچان اور تشریح ہوتی ہے، نئے شعری مزاج کی تشریح کس طرح ہو رہی ہے، غور فرمایئے۔ نئی شاعری میں یہ موضوعات مختلف رجحانات سے نمایاں ہوئے ہیں۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ ''شاعر کی انفرادیت'' ہی اہمیت رکھتی ہے۔ ''دبستانوں'' اور ''خارجی رجحانات'' کی تلاش اور دریافت سے زیادہ شاعر کی انفرادیت پر غور کرنا اور اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ داخلی نقطۂ نظر اور بنیادی رجحان کی پہچان ضروری ہے۔ کاروباری نقادوں نے نئی شاعری پر ''تنقیدی حملے'' کئے ہیں، حالانکہ اس شاعری کو سمجھنے کی ضرورت تھی، اس کے مزاج اور اس کی اسپرٹ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ نقاد جس زندگی سے محبت کرتے ہیں، یہ شاعری اسی زندگی کی شاعری ہے، اسی زندگی کے لمحات اور شعور کو پیش کرتی ہے۔ نئے شعرا اسی سفر کے تجربوں کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ نقاد محسوس نہیں کرتے کہ نئے

شاعروں کے تاثرات اور حیاتی تجربوں کی اہمیت کیا ہے؟ آج ہمیں اپنی زندگی سے جو محبت اور ہمدردی ہے، نئی شاعری وہی محبت اور ہمدردی چاہتی ہے۔ نئی شاعری سے ہمدردی صرف شاعر سے ہمدردی نہیں ہے بلکہ اس عہد اور اس معاشرے سے ہمدردی ہے، جس عہد اور جس معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں۔

ڈارون اور فرائڈ کے خیالات اور ''ایٹم'' نے زندگی سے اس کا تقدس چھین لیا ہے۔ تمام روحانی قدریں سمٹ سی گئی ہیں، ''خالق اور مخلوق'' کا رشتہ جیسے ٹوٹ گیا ہو، آسمان، ستاروں اور سیاروں کا رومانی تصور مجروح ہو گیا ہے۔ ''اصل حقیقت سے ہم جدا ہوئے ہیں اور ہم پھر اس حقیقت سے مل جائیں گے۔'' آج اس خیال کی اہمیت کیا ہے؟ ڈارون نے حضرت انسان کو جو کچھ ثابت کیا ہے، ہمیں معلوم ہے، فرائڈ نے خوابوں کا تجزیہ کیا اور جنس (Sex) کو ہر پہلو اور ہر عمل میں دیکھا۔ باپ اور بیٹی اور ماں اور بیٹے کی محبت کے پیچھے بھی سیکس کو ٹٹولا، مقدس رشتوں کے تار جھنجھنا گئے۔ فرائڈ نے ممنوعات ذہنی یعنی Taboos کا تجزیہ کیا اور سمجھایا اور مارکس نے جانے کتنے تیبوز کو توڑا، جدلیاتی کش مکش اور تصادم کے تصور نے مادہ (Matter) کو اصل حقیقت ثابت کیا اور کل کہا جاتا تھا کہ ''میں سوچتا ہوں اس لئے میرا وجود ہے'' اب کہا گیا'' میرا وجود ہے اس لئے سوچتا ہوں۔'' اس فکر سے جتنا بھی فائدہ ہوا ہو، بہت سے تیبوز ٹوٹے اور بہت سی قدریں مجروح ہوئیں، آدمی اور آدمی اور کسان کا روحانی رشتہ ٹوٹا، بہت سے مقدس خیالات زخمی ہو گئے۔ ہیومنزم کے مختلف نظریوں نے سوچنے والوں کو اور الجھن میں ڈال دیا۔ شاعر بھی سوچتا ہے اور صرف سوچتا نہیں، اپنی سوچ اور فکر کو اپنے الفاظ میں پیش بھی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے افکار کی شکست و ریخت اور قدروں اور ''تیبوز'' کی تڑپ اور بے چینی کا بھی گہرا اثر اس پر ہوگا، وہ تنہائی، شکست، داخلی کش مکش، گھٹن، ان ہی موضوعات کو پیش کرے گا۔ ایسے تمام موضوعات اس تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے موضوعات ہیں۔ اس کی رومانیت نے ان موضوعات کو جس طرح پیش کیا ہے اور ان کی مختلف تہوں کو جس طرح اجاگر کیا ہے، سب ہمارے سامنے ہے۔ ''ایٹم'' کی وجہ سے مستقبل کبھی دھندلا اور کبھی کبھی تاریک نظر آ رہا ہے، ایک معمولی سی حرکت ساری دنیا کو تباہ کر سکتی ہے۔ یہ تصور ہی کتنا جان لیوا ہے، بھیانک ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ تمام حقائق موجود نہیں ہیں اور ان کے نفسیاتی اثرات نہیں ہو رہے ہیں؟ نئی شاعری میں ماضی پسندی، تنہائی کے شدید احساس اور شدید داخلیت کے مختلف رجحانات کو ان ہی حقائق کے پس منظر سمجھنا چاہئے۔ تمام نئے شعرا نے یہ جذبات خود پر طاری نہیں کئے ہیں اور نہ تمام شاعروں کے لئے یہ فیشن ہے، اس شاعری کے رجحانات پر غور کرنا چاہئے، ان رجحانات سے ہمدردی خود معاشرے سے ہمدردی ہے۔

آج کا انسان بھاکڑا ڈیم اور بانہال ٹنل ضرور بنا رہا ہے، چاند ستاروں پر کمندیں بھی ڈال رہا ہے، خلا میں تیر بھی رہا ہے، اس کے علم و عرفان کی سرحدیں وسیع بھی ہو رہی ہیں، لیکن وہ ڈارون اور فرائڈ کے نظریات اور ایٹم کے درمیان سانس بھی لے رہا ہے اور یہ سانس کس طرح چل رہی ہے ہم اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ ہر لمحہ جنگ کا خطرہ اور ہلاکت کا تصور اسے ذہنی اور نفسیاتی اور جذباتی طور پر پریشان کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مستقبل کا تصور پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ کل کیا ہوگا سے زیادہ فکر یہ ہے کہ آج کیا ہوگا۔ تمام مسئلوں کو سلجھاتے ہوئے وقتی لمحوں پر اس کی نظر ہے۔ مسائل بھی لمحوں کے پیش نظر سلجھائے جا رہے ہیں اور چند مسئلوں کو سلجھاتے سلجھاتے چند شوخ اور شریر لمحے اور مسئلے پیدا کر دیتے ہیں۔ Uncertainty کا شعور ہی اس عہد کا شعور ہے اور اسی شعور سے سیاسی، معاشی، نفسیاتی اور فنی اور ادبی قدریں مرتب ہو رہی ہیں۔ پورا معاشرہ شاعر کے احساس و شعور میں جذب ہے، وہ جس کرب میں مبتلا ہے وہ صرف اس کا اپنا کرب نہیں ہے، معاشرے کا کرب ہے، وہ جن رجحانات کو نمایاں کر رہا ہے، وہ معاشرتی اقدار اور مذہبی اور تمدنی افکار کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوئے ہیں۔

ماضی کل جتنا حسین اور خوبصورت تھا آج نہیں ہے، اس لئے کہ ماضی کو دیکھنے کا انداز بدل گیا ہے۔ تاریخ اور عمرانیات نے خوبصورت، دلکش اور رومانی تصورات کو توڑ دیا ہے۔ تاریخ اور عمرانیات نے خوبصورت ماضی سے اس کی دلکشی چھین لی ہے۔ اس کے رومانی تصورات کو آپریشن تھیٹر میں داخل کر کے جراحی شروع کر دی ہے، لیکن اس کے باوجود رومانی شاعر ماضی کے حسن کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب عصری ہیجانات سے پریشان ہو جاتا ہے، مستقبل تاریکیوں میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے تو وہ ماضی پسند بن جاتا ہے۔ یہ گریز فطری گریز ہے، یہ نفسیاتی عمل ہے، اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ یہ زندگی اتنی معصوم اور خوبصورت کیوں نہیں ہے جتنی کل تھی۔ گذرے ہوئے لمحوں کی یادیں اسے سہارا دیتی ہیں، وہ حال میں ماضی کو محسوس کرتا ہے، شدت سے اور عصری ہیجانات میں سانس لیتے ہوئے بھی ماضی میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ماضی اس کے لئے ایک قوت ایک طاقت ہے۔ یعنی شاعری میں یہ مستقل رجحان ہے۔ نیا شاعر ماضی کو زندہ رکھنا چاہتا ہے تا کہ وہ سانس لے سکے، اس کی یادوں کے سہارے جی سکے، شاعری نے اس طرح ان قدروں کو ایک بار پھر مرتب کرنے کی کوشش کی جن میں نئی تاریخ اور عمرانی فکر نے انتشار پیدا کر دیا تھا، ماضی کی صورت مسخ ہو گئی ہے، شاعر اس کے نقوش کو ابھار رہا ہے، جذباتی زندگی اور تمدنی اور تہذیبی قدروں کے پیش نظر ان رجحان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آج مستقبل تاریکیوں میں لپٹا ہوا ہے، جو لمحے گذر جاتے ہیں، انھیں ہم غنیمت سمجھتے ہیں، گذرتے ہوئے لمحوں سے ہی دلچسپی رہ گئی ہے۔ سیاسی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو سلجھانے اور لمحاتی مقاصد کو پا لینے کی کوشش ہوتی ہے۔ اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے اور منزل کی تلاش کا کرب صحیح معانی میں رہا نہیں، کسی ایک مسئلے کا حل مل جاتا ہے تو صرف لمحوں کا سکون حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ جلد ہی، کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بہت سی شاخیں پھوٹنے لگتی ہیں اور پھر کئی مسائل ابھر آتے ہیں۔ مابعد طبیعیاتی اور مذہبی تصورات اور خیالات سے بھی آج کا انسان غیر مطمئن ہے۔ یوں مذہب سے سیاست الگ ہو گئی اور سیاسی قدروں کی اہمیت کچھ اور ہو گئی۔ اب کوئی سیاست اور سیاسی قدروں کے لئے مذہبیات کی طرف نہیں جاتا، مذہب سے معاشیات الگ ہو گئی، معاشی اور اقتصادی تحریکات

اور مارکسی تصورات سے معاشی اور اقتصادی مسائل کو سمجھنے اور مادی قوتوں اور سماجی کش مکش کے پس منظر میں سلجھانے کے لئے نئے نظریے ملے، معاشی اور اقتصادی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے نیا ذہن مذہبیات کی طرف نہیں جاتا اور اگر کوئی ایسی آواز سنائی دیتی ہے "مذہب معاشی اور اقتصادی زندگی کے مسائل حل کرتا ہے" تو اس کی رجعت پسندی پر بہت کم لوگوں کو شک وشبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہب سے قانون چھن گیا۔ مذہب کی بنیاد پر قوانین کی بات کرنے والے پچھلی صدیوں کے لوگ نظر آتے ہیں اور ایسے لوگوں کی فرقہ پرست ذہنیت ان کی علیحدگی کے رجحان کا ذکر پہلے ہوتا ہے۔ ان حقیقتوں سے نظر ہٹا لینے کی کتنی بھی شعوری کوشش ہو یہ حقیقتیں موجود ہیں اور مختلف نظریات اور تصورات کے انتشار اور تضاد میں الجھن بھی موجود ہے۔ مذہب اور مابعد طبیعیاتی تصورات سے وہ روشنی حاصل نہیں ہو رہی ہے جو حاصل ہو رہی تھی اور جو حاصل ہو سکتی تھی مذہب نے خارجی اور داخلی طور پر اعلیٰ انسانی قدروں سمجھایا ہے، ظاہر ہے آج اس کی جو صورت ہے اس سے اس صدی کی المناکی کا اور زیادہ احساس ہوتا ہے۔ نئی شاعری میں ان الجھنوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یقیناً آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ نئی شاعری میں کوئی "پیغام" نہیں ہے۔ یہ محسوسات کی شاعری ہے آپ نئی زندگی کو نئی شاعری میں محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ شاعری بیسویں صدی کی معنویت کو پیش کرتی ہے۔ پیشہ ور نقاد نئی شاعری کو پڑھتے ہوئے تحیر اور حیرت کی منزل پر ہوتے ہیں، اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے، اسی منزل پر وہ تنقیدی حملے کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ خالی ہے، مایوسی اور تنہائی اور ماضی پسندی کے احساسات کو خواہ مخواہ طاری کیا جا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ آدمی اتنا مایوس ہو جائے اور تنہائی میں سانس لینے لگے، اپنی الجھنوں کا شکار ہو جائے • حالانکہ یہ الجھنیں معاشرے کی الجھنیں ہیں) پیشہ ور نقاد سیاسی لیڈروں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ وقتی مسائل پر ان کی نظر سیاسی لیڈروں جیسی ہے۔ وہ آرٹ اور فنکار کی داخلی فطرت اور فنون لطیفہ کی داخلی قدروں پر نہیں سوچتے، تخلیق کے پیچیدہ عمل کو نہیں سمجھتے، جلال و جمال پر ان کی نظر نہیں رہتی، وہ شدت احساس، اور داخلی اضطراب اور خارجی قدروں کے داخلی ردعمل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معاشرے اور سوسائٹی کی طرح آرٹ اور ادب کے لئے بھی کچھ پلان بناتے ہیں اور اپنے پلان کے موٹے موٹے اصول سلجھاتے ہیں۔ ان کا تحقیقی شعور ماضی میں پڑی لاشوں اور ہڈیوں کو تلاش کر لیتا ہے لیکن اپنے عہد کے متحرک پیکروں کو نہیں پہچانتا۔ میں نے اپنے عہد سے ہمدردی کی بات کی ہے، اس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تحیر اور حیرت کی اس منزل کے بعد ہی معلومات کی منزل آتی ہے۔

نئی شاعری کا اندرونی آہنگ، پرانی شاعری کے اندرونی آہنگ سے مختلف ہے۔ قدروں کے بدلتے، ٹوٹنے اور ٹکراتے رہنے سے آہنگ میں تبدیلی آتی ہے۔ پرانی قدروں کے بطن ہی سے یہ آہنگ پیدا ہوا ہے، نئے رجحانات نے پرانے رجحانات ہی کے بطن سے جنم لیا ہے، انہیں علیحدہ کر کے دیکھنا بھی نہیں چاہئے۔ حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے شعرا سے نئے شعرا کا آہنگ مختلف ہے اس لئے کہ معاشرتی رجحانات نے نئے رجحانات کی تشکیل کی ہے۔ نیا المیہ دعوت غور وفکر دیتا ہے۔ نیا المیہ کل کے نظریات اور ادبی عقائد کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے اور آج کے فکری اور معاشرتی اور تہذیبی ہیجانات (Impulses) کی بھی پیداوار ہے۔ اس المیہ کو سمجھنے کے لئے قلب ونظر کو وسیع رکھنے کی ضرورت ہے، سچائیوں کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے۔ مرکب در مرکب اور پیچیدہ تخلیقی عمل کو کھیتوں میں چلتے ہوئے ٹریکٹروں کا عمل نہ سمجھئے۔ اگر آپ صرف چند اہم خارجی حقائق کے پیش نظر کچھ فیصلے کرنا چاہتے ہیں تو راکٹوں کو اڑتے دیکھ کر یہ نہ بھولئے کہ ویت نام میں زہریلی گیس کا استعمال ہو رہا ہے اور امراض کے جراثیم کو ہوائی جہازوں سے برسانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ ایک ملک کی پوری آبادی کو مفلوج کر دینے کی سازش کا احساس کم جان لیوا نہیں ہے۔ سامراجی لوٹ کھسوٹ کو بعض ملکوں میں دیکھ کر یہ نہ بھول جائیے کہ فلسطین، کوریا، کیوبا اور ویت نام کا آدمی کتنا مایوس اور کس قدر پریشان، الجھا ہوا اور کتنا اداس ہے۔ بعض ملکوں میں کمیونزم کا اصلی جوہر کس طرح گم ہو گیا ہے اور مارکسزم کی سچائیوں پر ان ملکوں کے سیاسی کردار نے کیسا وار کیا ہے اور مارکسزم کی روح زخمی ہو کر کس طرح تڑپ رہی، کیسے کیسے آئیڈیل ٹوٹ گئے ہیں اور ٹوٹ رہے ہیں اور دنیا میں جمہوریت کی المناک داستان کیسی ہے؟ چھوٹی اور کمزور قومیں آزاد ہو کر بھی بڑی اور طاقت ور قوموں کی مٹھیوں میں کس طرح تڑپ رہی ہیں اور بلبلا رہی ہیں؟ جرمنی، فرانس، انگلستان اور امریکہ میں فکری اور ادبی تحریکوں کا کیا حال ہے؟ ردعمل کے طور پر فکری اور ادبی تحریکیں کیا کچھ سمجھا رہی ہیں؟ ہیومنزم کے مختلف تصورات کی کش مکش کیسی ہے؟ اور ان کے داخلی اور جذباتی ردعمل کیا ہو رہے ہیں؟ ازرا پاؤنڈ، فراسٹ، ڈیلمس، ہوپکنس، ولسن، ایلیٹ، رینسم (Ransom)، مور، کمنگس، کرین، تھامس، ڈیلین تھامس، لوول، اوگن اور دوسرے فنکاروں کی تخلیقات کی سچائیاں کیا سمجھا رہی ہیں؟ ان کے افکار کن حقائق کو واضح کر رہے ہیں؟ ہندوستان میں خاندان کی وحدت کے لئے کافی ہے۔ انیس برسوں میں صنعتی ترقی کی مسرت زراعتی زندگی کی المناکی میں تبدیل ہو گئی۔ صرف چند لمحوں کے احساس نے اتنے بڑے قومی المیہ کو آنے والے جانے کتنے برسوں میں پھیلا کر رکھ دیا ہے۔ اقتصادی اور معاشی بدحالی، متوسط طبقے کی الجھنیں، آزادی کے لمحوں کا دلسوز آہنگ، جمہوریت کی ناکامی، فرقہ وارانہ کشمکش، زندہ عوامی زبانوں کے ساتھ ناانصافیاں، سیاست دانوں کے جھوٹے وعدے، بھوک اور بیکاری، بدحالی اور افراتفری۔ حساس فنکاروں کے لئے یہ حقائق کس طرح اہم نہیں ہیں؟ کیا ان کے داخلی اور نفسیاتی اثرات نہ ہوں گے؟ تخلیقی کارناموں میں اس المیہ کی کوئی جگہ نہیں؟ نئی شاعری ان ہی حالات اور اس قومی اور بین الاقوامی ماحول میں پیدا ہوئی ہے۔ نئے شاعر کے خلوص اور اس کی ایمان داری، اس کے مخصوص ردعمل اور اس کے احساسات اور تاثرات اور اس کے جذباتی تجربوں پر نظر رکھئے اور نئے معاشرتی اور تہذیبی افکار، حالات اور اقدار کے پیش نظر داخلی کش مکش کا تجزیہ کیجئے، پھر حقیقت اور حقیقت کے حسن کی پہچان ہوگی، ٹریجڈی اور اس کی خوبصورتی کا علم ہوگا۔

سیاسی انقلابات دیکھ کر جو شعرا بہت خوش ہوئے تھے، جنھوں نے سچے فنکاروں کی طرح ان انقلابات کو سلام کیا تھا، وہ آج محسوس کر رہے ہیں کہ جمہوریت اور قومیت کی طرح اشتمالیت بھی دیس دیس میں مختلف انداز میں موجود ہے۔ اشتمالی حکومتیں بھی ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں، آدمی اور اس کی قدریں مجروح ہو رہی ہیں، مارکسزم کا اصلی جوہر چھپ رہا ہے، یہ احساس ہی بنیادی حقائق اور بحران (Crisis) اور انتشار اور فرسٹریشن کو سمجھا دینے کے لئے کافی ہے۔

تنہائی کا احساس ایک بنیادی احساس ہے، یہ کوئی نیا احساس نہیں ہے۔ قدروں کے بدلتے ہوئے آہنگ سے اس احساس کا آہنگ بھی متاثر ہوتا ہے۔ فرق یہ بھی ہے کہ کل "محبوب" بھی تھا، آج "محبوب" نہیں ہے اور ہے بھی تو اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی، اسے دیکھ کر المیہ کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اور تنہائی کی گھٹن میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ اقبال بھی خود کو تنہا محسوس کرتے تھے لیکن وہ تنہائی سے پریشان ہو کر خدا سے دعا مانگ لیتے تھے، آج کا شاعر دعائیں بھی نہیں مانگ سکتا۔ اس لئے کہ تمام "فادر امیجز" ٹوٹ چکے ہیں اور ان شکستہ پیکروں کے المیہ ہی سے اس عہد کی شاعری پیدا ہوئی ہے۔

ان بنیادی رجحانات کے پیش نظر نئے شعرا کی ماضی پسندی، گذرتے ہوئے لمحوں سے ان کی گہری دلچسپی، ان کی تنہائی پسندی اور علامت سازی، ذہنی الجھنیں، گھٹن اور انفرادیت پسندی اور المیہ تجربوں کو دیکھنا چاہئے۔

اس عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ نفسی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ یونگ نے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ "عورت" اور "مدر آرچ ٹائپ" سے "مرد" دور ہو گیا ہے اور اس کے عقلی شعور کا ارتقا "عورت" "مدر آرچ ٹائپ" کے بغیر ہو رہا ہے۔ اس سے نفسی اور ذہنی توازن قائم نہیں ہے لہٰذا کلچر کا توازن قائم نہیں رہا ہے۔ سائیکی (Psyche) کی اس دنیا کا تصور مکمل نہیں ہے جس میں اس آرچ ٹائپ "نسوانی" کو نمایاں حیثیت حاصل نہ ہو۔ داخلی اور خارجی تباہی اور انتشار سے بچنے کے لئے Wholeness Psychic کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اس آرچ ٹائپ کی اہمیت اور اس کی قدر پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس پیاس کو بجھانے کے لئے نیا آدمی لاشعوری کوششوں میں مصروف ہے، نفسی تکمیل کے بعد ہی زندگی خوبصورت بن سکتی ہے۔ نئے شعرا داخلی طور پر اس جدوجہد میں بھی مصروف ہیں، لاشعور، اور داخلی زندگی میں اگر "یونیگورن" بار بار ٹہل رہا ہے، سر ابھار رہا ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ نفسی تکمیل کے بعد ہی تہذیبی قدریں تابناک بن سکتی ہیں، ہر فرد کی نفسی تکمیل ہی سے قوت اور حرارت پیدا ہو سکتی ہے اور ایک خوبصورت سماج بن سکتا ہے، یہ لاشعوری تشنگی یہاں بھی موجود ہے۔ عشق و محبت اور جنس کی داستانوں میں اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے شدید احساس ہی سے یہ تشنگی بڑھتی ہے، جب تک داخلی طور پر اعلیٰ انسانی قدروں اور خوبصورت تہذیب، روشن مستقبل اور نفسی تکمیل کا گہرا احساس نہیں ہوتا، اس وقت ایسی تشنگی پیدا ابھی نہیں ہوتی اور ایسی بے قراری بھی نہیں ہوتی۔ نئے شعرا شعوری طور پر اس آرچ ٹائپ (Archetype) کو زمان و مکان میں نہیں دیکھتے بلکہ لاشعوری طور پر ان کی سائیکی میں اس آرچ ٹائپ کی داخلی تصویر بنتی ہے اور انھیں خود ان کی خبر نہیں رہتی کہ کس عہد میں جب کہ تمام فادر امیجز ٹوٹ رہے ہیں وہ کن تصورات اور کن پیکروں میں لاشعوری طور پر کشش محسوس کر رہے ہیں؟ نئے شعرا میں لاشعوری اور نیم شعوری طور پر "مدر آرچ ٹائپ" اور نسوانی پیکروں اور "مدر امیجز" سے رشتہ قائم کر لیا ہے اور اس بنیادی حقیقت کا اظہار مختلف طریقوں سے ہو رہا ہے۔ اس رشتے کی وجہ سے بہت سے علامتی پیکر سامنے آ رہے ہیں، نئی شاعری کے علامتی اظہار میں اس بنیادی حقیقت کا مطالعہ نئی رومانیت اور نئی جمالیات کا مطالعہ ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں اس "آرچ ٹائپ" کی بڑی اہمیت، علامات، خوب اور فینٹاسی، اساطیر، قصائص اور تخلیقی آرٹ میں اس نفسی پیکر کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی، آج کا بیمار آدمی (Sickman) حد درجہ ناراض آدمی (Angryman) انتشار اور مشینی زندگی کے دھوئیں میں لپٹا ہوا پریشان آدمی اسی سہارے کی تلاش میں ہے۔ تہذیبی قدروں میں عدم توازن اسی پیکر سے ذہنی اور جذباتی رشتے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہے، اس کی روشنی میں نئے شاعروں کے احساس تنہائی کا مطالعہ کیجئے تو ایک اہم نفسیاتی کیفیت کا علم ہوگا، نئی جمالیات کی قدروں کا علم ہوگا، نئے المیہ کی گہرائی کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور یقیناً اس عہد کے آدمی اور اس عہد کی شاعری سے گہری محبت اور ہمدردی ہو جائیگی۔ نئی شاعری میں عمل کی کمزوری، تھکان، اداسی، ناامیدی، "منفی" رجحانات مثلاً احساس ناکامی اور موت کا خیال، خودکشی کی خواہش، ان تمام باتوں کی وجہ یہی نفسی دباؤ ہے۔ شاعری میں روشنی، آفتاب، اور چاند ستاروں کو نگلنے والی تاریکی کی علامت، گہرے تاریک جنگل، جہنم، عفریت، گہرے تاریک سمندر، اور گہرے کنویں وغیرہ کی علامتیں مدر آرچ ٹائپ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اس حسیاتی پیکر میں ایسی نفسیاتی کشش ہے کہ ایغو کی مرکزیت قائم نہیں رہتی، ایغو اور انفرادیت کا کمپلکس ٹوٹ جاتا ہے اور فرد بے اختیار اس گہرائی میں ڈوبتا جاتا ہے۔۔۔۔ اور کبھی ماں، موت، سمندر، جنگل اور کنویں کی علامتوں میں اسے چھپا لیتی ہے۔

✓ نئی شاعری کو سمجھنے کے لئے میرے سامنے یہی حقائق ہیں۔ میں نئی شاعری کو کوئی تحریک نہیں سمجھتا، یہ ایک رجحان ہے جو تہذیبی قدروں سے پیدا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ اس میں تبدیلی بھی آئے گی۔ یہ رجحان گہرا بھی ہوگا، پھیلے گا بھی، بہت سے تجربوں کی روشنی سے کیفیتوں میں بھی تبدیلی آئے گی، فیصلے صادر نہ کیجئے، صرف تجزیہ کیجئے۔ تجزیے سے روشنی پھیلے گی۔ اس رجحان کے پیچھے ادبی اور فطری روایات ہیں اور جانے کتنی نفسیاتی اور نفسی اور جبلی کیفیتیں ہیں ان کیفیتوں کی الگ الگ پہچان ممکن نہیں ہے۔ ایک مستقل رجحان سے مختلف شعرا کے یہاں مختلف رجحانات پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ نئی شاعری کا کیا کچھ ہونا چاہئے اور نئی شاعری میں فلاں تصورات اور خیالات کیوں نہیں ہیں، انھیں ہونا چاہئے ۔۔۔ میں اس پر نہیں سوچتا، میں صرف یہ دیکھتا ہوں کہ کیا ہے اور کیوں ہے، جو کچھ ہے، ان سے ادبی قدریں کس طرح مرتب ہو رہی ہیں، میں نئی شاعری کو تمام ادبی اور فطری روایات کے تسلسل میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اردو شاعری میں یہ

بنیادی رجحان دو تین برسوں میں پیدا نہیں ہوا ہے، ایسا سوچنا غلط ہے۔ اس بنیادی رجحان کی تشکیل اختر الایمان، فیض، میراجی، مختار صدیقی، راشد، مجید امجد اور اس نسل کے دوسرے فنکاروں نے کی ہے، نئے شعرا کے متعلق صرف یہ کہنا کہ وہ صرف ان سے متاثر ہیں، میرے نزدیک درست نہیں ہے، ان کے تجربوں کو ان فنکاروں کے بنیادی تجربوں کی روشنی میں پہچاننے کی بھی ضرورت ہے۔ اور مغربی افکار اور پوری تہذیب کے پس منظر میں دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ چونکہ اردو ادب میں ادبی قدروں کی نزاکتوں اور ادب کی جمالیات اور السیات کا مطالعہ نہیں ہوا ہے اور ہم لیبل لگانے کے عادی بن چکے ہیں اس لئے بڑی آسانی سے لیبل لگاتے اور فیصلے کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، ''اختر الایمان قنوطی ہیں، ان کے یہاں منفی رجحانات ہیں'' (پرانی تنقید اور ترقی پسند تنقید) ''اختر الایمان کے پاس صرف یادوں کا سہارا ہے'' (نئی تنقید) ''میراجی فراری ہیں، جنس کے مارے ہوئے ہیں'' (پرانی تنقید) ''میراجی کی شاعری میں بھی علامیہ کا مسئلہ حل نہیں ہوا ہے'' (نئی تنقید) ''فیض، غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کے شاعر ہیں'' (پرانی تنقید)، ''فیض اب بھی برسوں پرانی رومانیت میں گم ہیں، رات میں انتظار کا درد لئے سسک رہے ہیں'' (نئی تنقید)، ''مختار صدیقی ماضی پرست ہیں'' (پرانی تنقید)، ''مختار صدیقی ابھی تک ذات اور شخصیت کے کھنڈر میں نہیں اترے ہیں'' (نئی تنقید)، ہم نے ابھی تک اسی قسم کے فیصلے کئے ہیں اور لیبل چسپاں کرتے رہے ہیں۔ ہم نے ان فن کاروں کے بنیادی رجحانات کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ وہ شعرا جو اس بنیادی رجحان سے الگ رہے، اور اپنے عہد کے دوسرے بنیادی رجحان سے متاثر ہوئے وہ بھی نئی شاعری کے بنیادی رجحان سے متاثر ہو رہے ہیں، اس عہد میں سانس لیتے ہوئے وہ ایک بڑی سچائی سے دور بھی نہیں رہ سکتے۔ ان کی ذات بھی خارجی قدروں سے ٹکرا رہی ہے۔ اس ٹکراؤ اور تصادم سے اچھلنے والی چنگاریوں کو وہ اپنے تجربوں سے بھلا کس طرح الگ کر سکتے ہیں۔ چند برسوں میں کچھ دلچسپ حقائق سامنے آجائیں گے، انتظار کرنا چاہئے۔

نئی شاعری کے نام پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور ظاہر ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ چند برسوں میں کچھ نام بہت واضح ہو جائیں گے ایسا ہمیشہ ہوا ہے۔ بہت سے تجربے سامنے آرہے ہیں۔ یہی اہم بات ہے۔ نئی شاعری کے بعض بے رحم نقاد (انہیں نئی شاعری کا نقاد کہا جائے یا نہیں اس پر بھی سوچنا ہوگا غالباً چند شعرا کی ''تخلیقات'' دیکھ کر پوری شاعری سے متعلق کچھ رائے قائم کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ان شعرا کا قصور نہیں ہے جو حسنی ادراک سے عاری ہیں بلکہ ان نقادوں کا قصور ہے جو اچھی اور بری چیزوں کی ادنیٰ تمیز نہیں رکھتے۔ اردو کے ایسے نقادوں پر تو رحم آتا ہے اس لئے کہ وہ کلاسیکی شعرا کا بھی عمدہ تنقیدی مطالعہ پیش نہ کر سکے، وہ کلاسیکی جمالیات کی قدروں کو ٹٹول نہ سکے۔ نئی شاری کے بنیادی رجحانات سے دور بھی بہت سے ایسے شعرا ہوں گے جو شعوری طور پر اس رجحان کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ ان شاعروں کی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل میں چھپ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات اہم ہے اور وہ یہ کہ شعوری طور پر کسی بنیادی رجحان کو اپنانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ تخلیقی عمل ایک پیچیدہ اور پراسرار عمل ہے اور کسی فنی قدر کی تخلیق میں پورے وجود کو دخل ہوتا ہے۔ کچھ شاعروں کے سپاٹ تجربوں کے سپاٹ اظہار سے مجھے الجھن ہوتی ہے اس لئے کہ الفاظ، زبان اور تجربے کے انتخاب اور استعمال اور مصرعوں کی ترتیب میں داخلی اور باطنی تحریک کو دخل نہیں ہوتا۔ میں ابہام کو ''وژن'' دیکھنا چاہتا ہوں، انقلاب نہیں، دنیا کے بہت سے ملکوں میں نئی شاعری کا مطالعہ ''وژن'' ہی کا مطالعہ ہے۔ نئی شاعری میں لمحوں کی حقیقت نگاری ہے۔ اس پہلے لمحوں کی ایسی حقیقت نگاری نہیں ہوئی تھی۔۔۔ اور لمحوں کی حقیقت نگاری ''وژن'' کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس بحث کا مقصد نئے شعری مزاج کے پس منظر اور ماحول کی سچی سچی حقیقتوں کو واضح کرنا تھا۔ عموماً سماجی اور سیاسی ماحول پر بحث کرتے ہوئے ان بنیادی حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، نئی شاعری کے متعلق اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ''یہ حیوانی رد عمل ہے''۔ ''نیا شاعر داخلیت کے پراسرار محل میں اسیر ہے''۔ ''نئے شاعر کی زبان کھردری ہے''۔ ''ابہام کچھ سمجھنے نہیں دیتا۔'' ''اس کی ہیئت پرستی میں زمانے کا احساس و شعور نہیں ملتا۔'' ''تنہائی کے خوف اور اس کی ذہنی بے چینی نے اسے نیم جان بنا دیا۔'' (ترقی پسند تنقید)۔ ''نئی شاعری ۱۹۵۵ کے بعد تخلیق ہوئی۔'' ''نئے شعرا علامت نگاروں اور شعور کی رو میں بہنے والوں کو بھی کئی کوس پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔'' ''دراصل اب سے پہلے شعر فہمی کا معیار بہت ہی مختلف تھا ہمارے بزرگ خود کو شاعر نہیں بلکہ مداری سمجھتے تھے اور اپنے قارئین کو محض تماشائی کا درجہ دیتے تھے، اب چونکہ یہ سارا کھیل مداری اور تماشائی سے متعلق تھا اس لئے دونوں کا رشتہ بہت ہی سطحی، خارجی اور لمحاتی تھا۔ شاعر لفظوں کے بندر نچاتا تھا۔ نئی شاعری مداری کا کھیل نہیں ہے اور نہ ہی بندر کا تماشا ہے۔''

(نئے شعرا کے خیالات)

ہمیں سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ نئی شاعری کو روایات کے تسلسل اور خارجی اقدار کی کشمکش میں اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ اور نئی فکری تحریکوں اور شکست و ریخت اور انتشار اور الجھنوں کے پس منظر میں اس کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ۱۹۲۶ سے ۱۹۸۰ تک تنقید لکھنے والا نئی شاعری کا بھی ناقد بن جائے۔ وہ تنقیدیں لکھتا رہے گا۔ ضروری نہیں کہ ان کی ہر بات قابل توجہ، اس کا ہر اعتراض قابل غور اور قابل بحث ہو۔ ترقی پسند شاعری پر تنقید کرنے والے بعض بزرگوں کو ذہن میں رکھئے۔ الجھن یہ ہے کہ نئی شاعری فن و ادب کی بنیادی قدروں سے ایک بار پھر قریب ہونا چاہتی ہے اور اس پر لیبل چسپاں کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ نئے شعری مزاج کی جس طرح تشکیل ہو رہی ہے وہ فطری ہے، ہر زمانے میں ایسا ہوا ہے۔ طرز احساس میں جب تبدیلیاں ہوتی ہیں تو ابتدا میں یہی انداز ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے ذہن میں کوئی مخصوص تصور یا کوئی مخصوص عقیدہ لے کر اس شاعری کے قریب آئیں گے تو یقیناً نئی شاعری کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اکادمی اور میکانکی فکر سے اس قسم کے مشکلات ابھرتے ہیں۔۔۔ اور مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں کہ اس فکر سے کلاسیکی فن کاروں کی دریافت میں ہم نے کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں ☆☆☆

اردو میں جدیدیت کا پیش رو، حالی یا شبلی؟

شمیم احمد

شمارہ ۷۳،
جولائی ۱۹۷۲

پہلی بات تو یہ ہے کہ 'جدیدیت' کے مفہوم کو ریاضی یا کیمیا کے کسی فارمولے کی طرح متعین کرنا مشکل ہے۔ اگر ہم اس مقصد کے لیے وقت اور استعمال کے عناصر (Elements of time and Utility) کو پیمانہ بنائیں گے تو گذر جانے والے لمحوں میں استعمال شدہ ہر شے پرانی اور موجود لمحوں میں غیر استعمال شدہ ہر چیز نئی قرار پائے گی۔ گویا جو کچھ گذر گیا اور استعمال میں آ گیا وہ پرانا ہو گیا اور جو کچھ کہ موجود اور غیر استعمال شدہ ہے وہ نیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آپ جوتوں کی دکان سے ایک جوڑ نئے جوتوں کی پہن کر سڑک پر آئے، دس بیس قدم چلے۔ یکایک آپ کے پیروں میں تکلیف ہونے لگی اور آپ دکان میں واپس آ کر جوتے بدلنا چاہتے ہیں، لیکن دکان دار اس پر تیار نہیں ہے، کیوں کہ اس کی نظر میں آپ کے پیروں کے جوتے استعمال میں آ جانے اور کچھ وقت گذر جانے کی وجہ سے پرانے ہو چکے ہیں اور وہ جوتے جو اس کی دکان میں موجود اور غیر استعمال شدہ ہیں نئے ہیں۔

"وقت اور استعمال کے عناصر" تجارت یا ایسے ہی کچھ اور امور میں تو "نئے اور پرانے" کی تخصیص کا پیمانہ بن سکتے ہیں لیکن تمام معاملات بالخصوص شعر و ادب میں یہ عناصر بالکلیہ ایسا کوئی معیار قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ قدیم اور جدید کی تفریق کا ان کے علاوہ ایک اور پیمانہ "نوعیت" کا ہے، جسے کچھ بھی نام دے لیجیے۔ اسے ساخت (Structure) یا ہیئت (Form) کا فرق کہیے یا رویہ (Attitude) یا خیال (Thought) کی تبدیلی سے موسوم کیجیے،

بات ایک ہی ہے کیوں کہ خیال اور رویے کے زاویوں کی تبدیلی خود بہ خود ہیت اور ساخت کی تبدیلی کے لیے جواز پیدا کر دیتی ہے۔

جوتوں ہی کی مثال پھر لیجیے۔ فرض کیجیے 'الف' نے اپنی دانست میں آج ہی ایک نیا جوتا خریدا ہے جس کے سامنے کا حصہ چوڑا اور بھدا ہے اور 'ب' کے پیر میں ایک سال پرانا جوتا ہے جس کا سامنے کا حصہ نوک دار (Pointed) اور خوب صورتی سے تراشا ہوا ہے وقت اور استعمال کے پیمانے کے لحاظ سے ضرور 'ب' کا جوتا پرانا ہو گیا، لیکن چوں کہ اس کی بناوٹ عصر پسند اور موجودہ فیشن کے مطابق ہے، اس لیے وہ ایک سال پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے۔ 'الف' کا جوتا 'نیا' ہونے کے باوجود اس لیے پرانا ہے کہ اس کی ساخت عصری مذاق کے مطابق نہیں ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ نئے پرانے کی تفریق و تخصیص میں وقت اور استعمال کے عناصر کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ کسی شے کی ساخت یا نوعیت اس کا اصل پیمانہ ہے۔ محض ساخت یا نوعیت کی تبدیلی کو نئے اور پرانے کی تفریق کا پیمانہ قرار دینا بھی ناکافی ہے۔ کیوں کہ اس کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ ساخت اور نوعیت کی تبدیلی کا اصل محرک اور سبب کیا ہے؟ اس کے جواب میں فوری طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'پسند اور ناپسند' یا بہ الفاظ دیگر 'فکر و خیال' کی تبدیلی کی وجہ سے ساخت اور نوعیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ گویا فکر و خیال کی تبدیلی نئے اور پرانے کی تخصیص کرتی ہے، لیکن چونکہ فکر و خیال کی تبدیلی ایک یا دو دن کی بات نہیں ہے، اس لیے بات گھوم پھر کر پھر 'وقت اور استعمال کے عناصر' پر پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے 'جدیدیت' کے مفہوم کے تعین میں ان میں سے کسی ایک عنصر (Element) کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔

دراصل یہ مسئلہ سیدھے خطوط کا نہیں بلکہ دائروں کا ہے۔ وقت خیال اور ساخت کے چھوٹے چھوٹے دائرے ایک بڑے دائرے میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہر دائرہ دوسرے دائرے کو متاثر کرتا ہے۔ فکر و خیال کی تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی ہے اور یہی تبدیلی اپنے زمانے کا مزاج بھی بن جاتی ہے۔ اسی کو آسانی کے لیے "جدیدیت" کہہ لیجیے۔ ہر زمانے میں نئی سمجھی جانے والی ادبی تخلیقات، اپنے عہد کے ماحول اور مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے نئی ہیں، محض اس لیے نہیں کہ وہ تاریخی اعتبار سے بعد کے عہد کی پیداوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وہ فن کار جنھوں نے زمان و مکان کی حدوں کو توڑا ہے، بعد کے زمانوں میں بھی اپنے دوسرے معاصرین کے بمقابلہ زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہیں۔

عہد جدید میں سودا کے مقابلے میں میر اور ذوق کے مقابلے میں غالب کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا یہی سبب ہے۔ اردو کے یہ وہ شاعر ہیں جو اپنے عہد میں "جدید" تھے ہی، لیکن اگر "جدیدیت" "محض" "وقت" کا نام نہیں ہے، تو "جدیدیت" "ہمیشہ" جدیدیت" ہی رہتی ہے۔ وہ کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ

سے میر اور غالب اردو کے وہ جدید شاعر ہیں جن کی "جدیدیت" ہمارے عہد کے "جدید ذہن" سے اپنا سلسلہ ملاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کی ضرورت بڑھ جاتی ہے کہ ہر زمانے میں، اپنے زمانے کے ادبی مزاج، ادبی اقدار، فکر و خیال اور لب و لہجے کو پیمانہ بنا کر عہدِ قبل کی تخلیقات کا جائزہ لیا جانا چاہیے اور اس بات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ ہمارے عہد کے مزاج سے عہدِ قبل کے کون کون سے فن کار ہم آہنگ یا زیادہ قریب ہیں۔ ترقی پسند نقادوں نے بڑی حد تک یہ کام کیا بھی تھا۔

ترقی پسند ادب میں غالب، حالی اور اقبال کی "منظور نظری" اسی وجہ سے رہی ہے کہ ان شاعروں کی تخلیقات میں ترقی پسند نقادوں کو بعض وہ چیزیں ہاتھ لگیں جو ترقی پسند نظریات سے الگ نہیں تھیں۔ جدید ادب (یعنی حالیہ ادب) میں غالب کی غیر معمولی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ پہلا قدیم شاعر ہے جو اپنے مافیہ (Content) اور اظہار (Expression) کے لحاظ سے ہمارے زمانے کے شعری مذاق سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے۔

تخلیقی فن کاروں کے دوش بہ دوش نقاد بھی قاری کی ذہنی تہذیب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، بلکہ دیکھا جائے تو نقاد قاری کے ذہن کی رہبری بھی کرتے ہیں اس لیے ہمیں اپنے زمانے کے ادبی نظریات اور رجحانات کے مطابق عہد گذشتہ کے نقادوں کا بھی اس نظر سے جائزہ لینا چاہئے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے زمانے کے ذہن سے عہد قبل کے کون کون سے نقاد ہم آہنگ یا قریب ہیں اور ہماری ادبی و ذہنی روایت ان میں سے کس کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

عام طور پر اردو تنقید کے اولین معماروں میں حالی اور شبلی کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ حالی کو عہد جدید اور اردو ادب میں جدید ذہن کا پیشرو بھی سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کے ادبی مزاج کے مطابق کیا واقعی حالی اس اعزاز کے مستحق ہیں؟

جدید شاعری اپنے رویے، لہجے، اسلوب اور اظہار کے لحاظ سے قدیم شاعری سے مختلف ہے۔ نہ یہاں عشق حقیقی کے گہرے راز و نیاز ہیں، نہ عشق مجازی کے چٹخارے، نہ رومانیت کے دبیز پردے اور نہ ترقی پسند ادب کی وضاحت اور نعرہ زنی۔ نئی شاعری، شاعر کے ذہن کا ایک نازک انفرادی تجربہ ہے، ایک خاموش تاثر ہے۔ ان شعری تاثرات کے اظہار کے لیے کسی بلند بانگ، واضح اور نعرہ زن انقلابی لب و لہجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ نئی شاعری چوں کہ ذہن کے اندرونی currents سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کے اظہار میں بھی ایک خاموش متین لے کار فرما ہے۔ لہٰذا آج کے ادبی اور تنقیدی مزاج اور مذاق کے لحاظ سے وہی تخلیق اور وہی فن کار جدید ہے جو ایک مخصوص اشارتی اسلوب اور لہجے کو اختیار کرے۔ مجموعی اعتبار سے جدید ادب کا زاویۂ نگاہ خارجی نہیں داخلی ہے۔ داخلیت ایک ایسی وسیع بسیط اصطلاح ہے، جس میں فن کار کے تمام ذہنی اور نفسیاتی تجربات سما جاتے ہیں۔

ان امور کے پیش نظر اگر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ہمارے زمانے کے ادبی مزاج سے حالی نہیں بلکہ شبلی زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہیں اور جس 'شے' کو ہم 'جدیدیت' کہتے ہیں اس کے مطابق اردو ادب میں جدید ذہن کا پیشرو شبلی ہے حالی نہیں۔ شبلی کی طرف سے اس حیثیت سے ہمارے ناقدین نے اب تک غفلت برتی ہے۔ اس کی کچھ وجوہات تھیں۔ حالی اور شبلی کے بعد حالات چوں کہ ہنگامہ خیز رہے ہیں۔ عالمی پیمانے پر دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ روس میں سرخ انقلاب آیا، ہندوستان میں سماجی اور مذہبی اصلاحوں اور آزادی کی تحریکوں کو فروغ ہوا۔ ان تمام وقتی مسائل نے زندگی کے ہر زاویے کو متاثر کیا۔ ادب بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔ ان حالات نے ادب میں سماجی مقصدیت، افادیت یہاں تک کہ انقلاب کے تصورات تک کو داخل کیا۔ ادب، ادب نہ رہا، جماعتی منشور بن گیا، شاعروں اور ادیبوں نے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھ کر ادب کی "پیداوار" (تخلیق نہیں) کی، ادیبوں اور شاعروں کے لہجوں پر خطیبوں اور قومی رہنماؤں کے لہجوں کی گرج اور للکار کا گمان ہونے لگا۔ خطیبانہ لہجے کی داغ بیل حالی "مسدس" کے ذریعے ڈال ہی چکے تھے۔ اقبال تک کے یہاں یہ گرج سنائی دے جاتی ہے۔ جوش تو پوری طرح اس طوفان میں بہ گئے۔ ترقی پسندوں بالخصوص سردار جعفری کے یہاں شاعری کا دوسرا نام ہی نعرہ زنی قرار پایا۔

اس سارے عرصے کے نقاد بھی چپ نہیں بیٹھے، انھوں نے ایسے ادب کو خوب خوب اچھالا۔ چنانچہ ان حالات اور ایسے عہد میں وہی قدیم یا پیش رو ادیب زیادہ مقبول ہو سکتا تھا جو ان کے ذہن اور مذاق سے زیادہ قریب ہو۔ حالی چونکہ قوم اور اخلاق سدھار شاعری کے وزیر اعظم تھے، اس لیے ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کے ذہن سے حالی کی اصلاح پسندی ہی زیادہ لگا کھاتی تھی، لہٰذا ترقی پسند نقادوں اور ان نقادوں کے نزدیک جو ادب کی گہری مقصدیت، افادیت اور اخلاقی قدر کے مبلغ تھے حالی اردو کا پہلا جدید شاعر اور نقاد قرار پایا، جس نے قدیم ادب کی بے مقصدیت اور فضولیات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اب جب کہ ترقی پسند ادب کی گرم بازاری اور ادب کی جماعتی وابستگی کے تصورات ختم ہو چکے ہیں، شعر و ادب کے مزاج، ادیبوں کے رویے اور قاری کی پسند ناپسند کے پیمانے بدل چکے ہیں اور جدیدیت کا رخ بھی خارجیت اور وضاحت کے بجائے داخلیت اور اشاریت کی جانب مڑ چکا ہے تو یہ بات ناگزیر ہوگئی ہے کہ ہم اپنے زمانے کے ادبی تصورات اور تنقیدی زاویوں کے پیش نظر اپنے پیش رو ادیبوں کا از سر نو جائزہ لیں، تا کہ ہماری ادبی روایت نہ صرف یہ کہ مستحکم ہو بلکہ اس کے صحیح خط و خال بھی سامنے آئیں۔

حالی اور شبلی ایک ہی زمانے کے نقاد ہیں، لیکن شعر و شاعری کی جانب بعض جزوی مطابقتوں کے باوجود دونوں کے بنیادی رویوں میں نمایاں فرق ہے۔ شاعری کے بارے میں حالی کی ہر بحث کی تان قومی اور اخلاقی اصلاح پر ٹوٹتی ہے جب کہ شبلی کے یہاں یہ باتیں ضمنی طور پر تو آگئی ہیں، لیکن انھوں نے بہ حیثیت مجموعی شاعری کی داخلی تاثریت اور جمالیات قدر پر ہی زیادہ زور دیا ہے۔ یہی وہ خاص انداز نظر ہے جو حالی کے بجائے شبلی کو ہمارے زمانے کے ذہن سے قریب کرتا ہے۔

حالی اور شبلی کی "جدیدیت" کے زاویوں کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصر طور پر شاعری کے بارے میں دونوں کے بنیادی افکار کا محاکمہ کیا

جائے اور اس کے بعد ہی اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ دونوں میں سے "جدیدیت" کا اصلی علم بردار کون ہے؟

حالی کی معرکۃ الآرا تصنیف "مقدمۂ شعر و شاعری" پر اگر محض ایک سرسری ہی نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک اگر چہ شاعری اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک خداداد ملکہ ہے لیکن وہ اس کی افادیت اور اخلاقی پہلو پر اتنا شدید اصرار کرتے ہیں کہ یہ خداداد ملکہ اکتساب کے جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے اور ان کے ہر تنقیدی تجزیے میں 'قومی نفع' اور 'اخلاقی اصلاح' کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> پس جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا، ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

قومی اور اخلاقی سود و زیاں کے ان حاوی رجحانات کا ہی نتیجہ تھا کہ حالی شاعری کو ایک ایسا موثر اور طاقت ور وسیلۂ اظہار قرار دیتے ہیں، جس سے سیاسی سماجی اور اخلاقی معاملات کی درستی کے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ عرب اور یورپ میں اس سے یہ کام لیے بھی گئے ہیں اور ہندوستان میں اس سے یہ کام لیے جانے چاہئیں۔ اردو شاعروں کو قومی اور اخلاقی اصلاح کی ترغیب دینے کے لیے حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کثرت سے ایسی مثالیں درج کی ہیں کہ کس طرح مختلف ملکوں کے شاعروں نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی شاعری کے ذریعے سے قومی حمیت اور قومی بیداری کا صور پھونکا۔ ایتھنز کے شاعر سولن (Solon) کے بعض اشعار جن میں اس نے اپنی قوم کو مگارا (Macgara) والوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے للکارا ہے، حالی نے نقل کیے ہیں۔ ان اشعار کی روح سے خود حالی کے مصلحانہ مزاج اور ان کے آدرشی نظریۂ شعر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سولن کے اشعار کا حالی کے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے:

> کاش میں ایتھنز میں پیدا نہ ہوتا بلکہ مجھ یا بربریا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا جہاں کے باشندے میرے ہم وطنوں سے زیادہ جفاکش، سنگ دل اور یونان کے علم و حکمت سے بے خبر ہوتے، وہ حالت میرے لیے اس سے بہتر تھی کہ لوگ مجھے دیکھ کر، ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ شخص اسی ایتھنز کا رہنے والا ہے جو سیلمس (Slamis) کی لڑائی سے بھاگ گئے، اے عزیزو جلد دشمنوں سے انتقام لو اور یہ ننگ و عار ہم سے دور کرو اور چین سے نہ بیٹھو جب تک کہ اپنا چھنا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجے سے نہ چھڑا لو۔

اس قسم کی اور کئی مثالیں درج کر کے حالی نے شاعری کی گہری سماجی اور اخلاقی اور سیاسی مقصدیت، تاثیر اور قوت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کے مطالعے کے بعد جو مجموعی تاثر قاری کے ذہن پر پڑ سکتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حالی شاعری کو قومی اصلاح اور اخلاقی سدھار کا ایک وسیلۂ محض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی شخص "مسدس" جیسی ولولہ خیز چیز لکھ بھی سکتا تھا۔ حالی نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر مقررہ پروگرام کے تحت منظم طور پر کیا۔

حالی کے دفاع میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنے وقت اور ماحول کی آواز کو اپنی شاعری اور تنقید میں پیش کیا، اور اس لیے وہ اردو ادب میں جدید ذہن کے پیش رو ہیں۔ ممکن ہے حالی اپنے عہد یا زیادہ سے زیادہ ترقی پسند ادب کے لیے جدید ہوں لیکن ہمارے زمانے کی "جدیدیت" کے تصورات کے لحاظ سے وہ جدید نہیں ہیں کیوں کہ ہمارے عہد کے ادبی تصورات کے مطابق بندھے ٹکے پروگرام کے تحت وقت اور ماحول کی آواز کو ادب میں داخل کرنا جدیدیت نہیں ہے۔

اردو شاعری کی اصلاحی اور ترقی پسند تحریکوں کی یہ سب سے بڑی خامی اور غلطی تھی کہ شاعری جیسی انفرادی اور شاعر کے جذبہ سے تعلق رکھنے والی شے خاص کو اجتماعی تصورات اور آدرشوں کا غلام بنا رکھا گیا۔ جہاں تک کہ شاعر میں "روح عصر" کی ترجمانی اور عکاسی کا تعلق ہے تو حالی کے مصلحانہ، خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ "کلام موزوں" کے مقابلے میں غالب کی غزل کا ایک ایک شعر اس پر بھاری پڑے گا۔

شبلی چونکہ حالی کے معاصر ہیں، تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ حالی کو تو "روح عصر" کا احساس تھا، شبلی کو نہ تھا۔ "روح عصر" کی ترجمانی سے اگر تبلیغی شاعری مراد ہے تو یقیناً شبلی اس احساس "لطیف" سے نابلد تھے۔ اگر چہ شبلی نے بھی "شعر العجم" میں ایک دو موقعوں پر ضمناً شاعری کے وسیلے سے قومی اور اخلاقی اصلاح کی بات کہی ہے اور عملی طور پر اس مقصد کے لیے "صبح امید" نام کی نظم بھی مثنوی کے فارم میں لکھی، لیکن چوں کہ وہ شاعری کے اصل مزاج کو ملحوظ رکھتے ہیں اس لئے حالی کی طرح انھوں نے قومی اور اخلاقی اصلاح کے پہلوؤں کو اپنے ذہن کا Main current نہیں بننے دیا۔ انھوں نے اپنی شعری تنقید میں ان باتوں کو صرف اس حد ہی روا رکھا جس حد تک کہ یہ ایک شاعر کی زبان سے اچھی معلوم ہو سکتی ہے، چنانچہ "شعر العجم" کی چوتھی جلد میں انھوں نے شاعری اور خطابت کے درمیان وضاحت کے ساتھ جو فرق واضح کیا ہے، اس سے ہم بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شاعری سے کیا چیز مراد لیتے اور شاعر کو کس منصب پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہر علم اور ہر فن کے کچھ حدود (Limitations) ہوتے ہیں جن سے تجاوز کرنا، اس علم اور اس فن کے حق میں سم قاتل کا درجہ رکھتا ہے حالی شاعری کے حدود سے متجاوز ہو کر اس کے سر وہ ذمہ داریاں منڈھنا چاہتے ہیں جن سے اس کا بھیجا ہی پچک جائے۔ ان کے ذہن سے شاعری کی افادیت اور مقصدیت کے تصورات ایک لمحہ بھی نہیں ہٹتے۔ خارجیت کے اس انتہائی پسندانہ اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے شاعری کے انفرادی اور داخلی جذبوں کی اہمیت سے اکثر شعوری طور پر اغماض برتا۔ شیکسپیئر، جو اس وجہ سے لازوال اور ابدی محبت اور شہرت کا حامل ہے کہ اس نے انسانی ذہن اور انسانی رشتوں کی آفاقی قدروں کی تہوں کو کریدا، حالی کی نظر میں محض اس لیے موقر ہے کہ اس کے فن میں سماجی سیاسی اور اخلاقی اقدار کی

عکاسی کی گئی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> شیکسپیئر کے ڈرامے جن سے پولیٹکل، سوشل اور مورل
> ہر طرح کے بے شمار فائدے اہل یورپ کو پہنچے ہیں،
> بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔

سماجی فائدوں اور قومی اور اخلاقی اصلاحات کی اس ترنگ میں حالی نے اپنا پورا زور اس بات کو ثابت کرنے پر خرچ کیا ہے کہ شاعری اور سوسائٹی کو بہتر بنانے اور اسے اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنے میں شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک کہ شاعری اور سوسائٹی کے ایک دوسرے کو متاثر کرنے کا خیال ہے اس پر ہمیں اعتراض نہیں ہے لیکن اعتراض اس پر ہے کہ حالی سوسائٹی کا اخلاق سدھارنے کے لیے شاعری کے ذمے جو فرائض عاید کرنا چاہتے ہیں، ان سے شاعری کا مقام بہت کم اور اس کا میدان بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اخلاقی اصلاح کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ فن شعر جیسی "شئے لطیف" کو علم اخلاق کا نائب مناب قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

> شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا، لیکن از روئے انصاف، اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔

اگرچہ شبلی بھی شاعری کی اخلاقی قدر کو یک سر مو بھی رد نہیں کرتے، لیکن انھوں نے حالی کی طرح، شاعری کو علم اخلاق کا نائب مناب قرار نہیں دیا اور نہ اخلاقی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو شاعر کے اجزائے اعظم منوانے پر اصرار کیا۔ یہ باتیں ان کی بحثوں میں ضمنی طور پر آئی ہیں۔ انھوں نے شعر کی "شعریت" کو کسی موقع پر بھی نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اردو شاعری کی تنقیدوں میں اگرچہ "مقدمۂ شعر و شاعری" کی تاریخی اعتبار سے ایک مسلمہ حیثیت ہے، لیکن جدید رجحانات کی روشنی میں یہ کتاب اپنے مشتملات کے سبب ایک حکیم کے نسخوں کی طرح تشخیص مرض، تجویز علاج و پرہیز، اور دواؤں کے ترکیب استعمال کی ایک کھتونی ہے، جس میں ہمارے فاضل نقاد نے شاعری کی ماہیت سے لے کر شاعری کے مقصد، اصلاح اور اصلاح کے طریقہ کار تک ہر شے کا مفصل ذکر کیا ہے۔

حالی، شاعری کے لئے تین شرطوں، تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص لفاظ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے تصور کے مطابق تخیل، حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔

> یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ، جو تجربے یا مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے، یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے...

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حالی کی نظر میں تخیل کا تعلق فن کار کی ذہنی و حسی کیفیت سے نہیں بلکہ خارجی اشیا سے ہے۔ ایسی صورت میں شاعری محض خارجی مظاہر کو تنظیم و ترتیب کے ساتھ پیش کر دینے کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی۔ اس کے برعکس شبلی کی نظر چوں کہ ذہنی اور حسی کیفیتوں کو فراموش نہیں کرتی اس لیے وہ تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں۔

> تخیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے... فلسفہ اور شاعری میں قوت تخیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور انکشافات مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔

تخیل کے سلسلے میں حالی اور شبلی کے نقاط نظر میں ایک بڑا اور بنیادی فرق ہے کہ حالی کے نزدیک چونکہ تخیل پہلے سے موجود معلومات کے ذخیرے کو ایک نئی ترتیب سے پیش کر دینے کا نام ہے، اس لیے یہ ایسی ہی بات ہوئی کہ بڑھئی کو لکڑی کے بابت سب کچھ معلوم ہے، وہ لکڑی کاٹ چھانٹ اور تراش کر ایک میز بنا دیتا ہے گویا میز کا بنا دینا اس کے تخیل کے عمل کی تکمیل ہو جاتا ہے، اس کے برعکس شبلی چوں کہ تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں اس لئے اس کی مثال یوں ہوگی کہ غوطہ خور کی نظر سے سمندر کی تہہ میں چھپے ہوئے موتی روپوش ہیں، وہ سمندر کی غواصی کرتا ہے تب جا کر موتی اس کے ہاتھ لگتے ہیں۔ بڑھئی کا کام سطح کے اوپر کا کام ہے اور غواص کا کام سطح کے اندر کا کام ہے۔ حالی کی نظر خارجیت پر پڑتی ہے لیکن شبلی داخلیت کی تہوں کو کرید تے ہیں۔ حالی خارج کی ترجمانی کو شاعری کا کمال تصور کرتے ہیں۔ شبلی خارج سے حاصل شدہ اثرات کو داخلیت کی کٹھالی میں تپا کر پیش کر دینے کے عمل کو شاعری کہتے ہیں۔ تخیل کا مواد حاصل کرنے کے لیے بہ ظاہر دونوں کی نظر خارجی اور مادی اشیاء پر پڑتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> مادی اشیاء اور فطرت انسانی کے گہرے مشاہدے سے ہی قوت متخیلہ حاصل ہوتی ہے...
>
> ☆
>
> قوت متخیلہ کوئی شے، بغیر مادے کے پیدا نہیں کر سکتی۔

یہ وہ معروف اور مشہور مقولہ ہے، جس نے حالی کو ترقی پسند ادیبوں کا محبوب اور منظور نظر بنا دیا تھا، کیوں کہ اس فقرے کے بطن میں شاعری کی خارجی اور مادی قدریں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ حالی کے شعری نظریوں میں یہ قدریں بنیادی ہیں۔ شبلی بھی ایک جگہ یہی خیال پیش کرتے ہیں۔

> کوئی خیال مشاہدات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا، اس لیے تخیل کی وسعت کے لیے واقعات کا کثرت سے ملاحظہ کرنا خواہ مخواہ لازمی ہے۔

لیکن چونکہ شبلی کے نظریۂ شعر میں خارجیت بنیادی قدر نہیں ہے، ضمنی ہے، اور وہ بھی اس لیے کہ خارجی اثرات سے فن کار کے داخلی جذبوں کو متھا جاتا ہے، اس لیے اس قسم کے خیالات حالی کے خیالات سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود اس بات کا ثبوت نہیں بن سکیں گے کہ حالی اور شبلی شاعری کے بارے میں یکساں نظریات کے حامل ہیں۔ دونوں کے درمیان بنیادی رویے کا فرق بہر حال قائم رہے

گا۔ جزوی مطابقتوں کے بطور اگر اس قسم کے خیالات کی ہم آہنگی تسلیم کر بھی لی جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ شاعری کے بارے میں مجموعی طور پر شبلی نے جو گہری باتیں کی ہیں ان میں سے اکثر حالی کی پہنچ سے باہر رہی ہیں۔

حالی تخیل کے بعد شاعری کے لیے دوسری اہم شرط کائنات کے مطالعے کو قرار دیتے ہیں، جس کا بالکلیہ خارجی اور مادی اشیاء کے مشاہدے سے تعلق ہے، اور تیسری اہم شرط لفظوں کا موزوں اور متناسب استعمال ہے۔ گویا حالی کی نظر میں یہ تینوں شرطیں شاعری کے اصلی عناصر ہیں۔

شبلی ان میں سے صرف تخیل کو شاعری کا بنیادی اور اصلی عنصر تسلیم کرتے ہیں، باقی چیزیں ان کی نظر میں شاعری کی جزوی ضرورتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ تخیل کے ساتھ ان کے نزدیک شاعری کا دوسرا بنیادی اور اصلی عنصر محاکات ہے اور تخیل اور محاکات کے بہتر امتزاج سے اچھی شاعری کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور اسی لیے وہ شاعری کو "وجدانی اور ذوقی چیز" سمجھتے ہیں۔ وجدان اور ذوق چوں کہ فن کار کی داخلی کیفیتوں کے نام ہیں اس لیے شبلی کے خیال کے مطابق قوت احساس شاعری کی اصل محرک ہے۔

شبلی انسان کے تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ دو قوتوں یعنی ادراک اور احساس کو قرار دیتے ہیں۔ قوت ادراک کا کام استدلال اور تحقیق ہے اور علوم و فنون اس کے نتائج ہیں جب کہ شاعری کا سارا عمل احساس پر منحصر ہوتا ہے۔ شبلی کہتے ہیں:

> یہی قوت جس کو احساس، انفعال، یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے۔

حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے مطالعے سے شاعری کے حسی تجربہ ہونے کا اندازہ نہیں ہوتا، انھوں نے شعر کی مقصدیت اور اخلاقی حیثیت پر کچھ اس قدر زور دیا ہے کہ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاعری کوئی علم ہے اور اس کا سارا دارومدار قوت ادراک پر ہے۔

حالی اور شبلی کے نظریات شعر میں ایک اور چیز جزوی طور پر، قدر مشترک کی حیثیت پر فائز محسوس ہوتی ہے، اور وہ ہے یہ خیال کہ شاعری "انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے"۔ جہاں تک خیال محض کا تعلق ہے تو یہ خیال شبلی اور حالی میں مشترک ہے۔ لیکن جوں ہی ہم اس خیال کا تجزیہ کرتے ہیں تو جذبات کی برانگیختگی کے معاملے میں دونوں کے رویوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ داخلیت اور خارجیت، جماعت اور فرد کا فرق ہے۔ شبلی اس سے انسان کے انفرادی جذبوں اور احساسات کی برانگیختگی مراد لیتے ہیں، اس کے برعکس حالی شاعری کو ایک ایسا وسیلۂ اظہار سمجھتے ہیں، جس سے لوگوں کے قومی اور ملی جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں بنیادی رویوں کے اختلاف کے سبب ایک ہی بات اور ایک ہی خیال کی دو معاصر نقاد دو مختلف توجیہیں کرتے ہیں۔

حالی قدیم اردو شاعری کے محدود دائروں سے مطمئن نہیں ہیں، لہٰذا وہ ان دائروں کو توڑ کر اردو شاعری کا میدان وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب وہ وسعتوں کی تلاش میں نکلتے ہیں تو رستہ بھٹک جاتے ہیں، ان کی نظر شاعر کے اندرونی احساسات اور جذبات کی لامتناہی وسعتوں کے بجائے خارجی مظاہر کی وسعتوں میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی دراصل قومی نفع، کا جذبہ کارفرما ہے جو انھیں فن کار کی ذات کے اندر اترنے سے روکتا ہے اور آبادیوں کے ہجوم میں ان کو لیے پھرتا ہے۔ وہ ہندستانی شاعری کے مقابلے میں بقول خود شائستہ ملکوں کی شاعری کو محض اس لیے زیادہ اہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کے شاعر اپنے شعری تجربوں سے:

> ایسے اخلاقی، سوشل یا پولیٹیکل نتائج نکلتے ہیں جن سے قوم کے اخلاق، معاشرت یا تمدن پر نہایت عمدہ اثر ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف شبلی شاعری کے اثرات کو خارج میں نہیں بلکہ فن کار کی ذات کے اندر تلاش کرتے ہیں اور اسی لیے ان کے نزدیک شاعر کا تاثر موسیقی اور مصوری سے بھی زیادہ قوی ہوتا ہے جو ہمارے تمام حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

> شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے، باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

شبلی کا یہ خیال بڑا معنی خیز اور تر و تازہ ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کے حسی پہلوؤں کو کس قدر اہم سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف حالی مادی اور خارجی اثرات کے حصار میں ہی گردش کرتے رہتے ہیں۔

شبلی چوں کہ شاعری کے حسی محرکات تک پہنچے ہیں، اس لیے ان کی نظر میں نثر اور نظم کا سطحی فرق، یعنی کلام کی موزونیت، کوئی اہم نہیں رہ جاتا۔ حالی بھی، اگرچہ کلام کی موزونیت کو شاعری کا جزو اعظم قرار دیتے ہیں، لیکن انھوں نے نثر کی شعریت کے بارے میں اس طرح کے واضح خیالات ظاہر نہیں کیے جیسے کہ شبلی نے ظاہر کیے ہیں۔ حالی، وزن کی قید نظم کے لیے ضروری سمجھتے ہیں شعر کے لیے نہیں، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ شعر اور نظم سے ان کی کیا مراد ہے۔ انھوں نے صرف اس خیال پر اکتفا کیا ہے کہ عرب شعر کے کیا معنی سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دلکش تقریر کرتا تھا، اسی کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ اور دل آویز فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں، جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔

اس عبارت سے خود حالی کے نظریہ شعر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس میں فن کار کی حسی صلاحیتوں کی تلاش بے کار محض ہوگی۔ اس کے برخلاف شبلی، شعریت کی تعبیر میں جذبہ اور احساس کے محرکات پر نظر رکھتے ہیں، اور یہ چیزیں فن کارانہ اور اعلیٰ درجے کی نثر میں بھی موجود ہوتی ہیں، اس لیے ان کی نظر میں نثر اور شعر کے درمیان حد امتیاز کھینچنے کا پیمانہ، وزن نہیں، بلکہ جذبہ اور احساس ہے۔ جذبہ اور احساس کی کمی یا فقدان اور قوت ادراک کے زیر اثر منطقی استدلال کی مدد سے نثر کی تعمیر ہوتی ہے۔ مل کی رائے سے متاثر ہو کر شبلی نے لکھا ہے:

> اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں، اور اکثر

> افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اس لیے دونوں جب باہم مل جاتی ہیں، تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے، جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں، وہاں شاعری کی حد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیاء کا استقصار کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر میں شاعری کی اساس، جذبہ، احساس اور داخلیت پر ہے، اور جب نثر میں یہ عناصر شامل ہو جاتے ہیں تو اس کی نثریت ختم اور شعریت کی حد شروع ہو جاتی ہے، اس کے برعکس حالی دروں بینی اور داخلی اظہار کے بجائے شاعری کے لیے خارجی اظہار پر ہی زور دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' میں سادگی، اصلیت اور جوش کے عنوانات کے تحت جو بحث مثالوں کے ذریعے کی ہے اس سے مجموعی طور پر یہی تاثرات حاصل ہوتے ہیں کہ شاعری کے لیے خارجیت ہی، اصل اصول ہے۔ سادگی کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

> ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو، اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو، تحاور اور روزمرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں۔

خارجیت کی عینک لگا کر شاعری کے میدانوں کی سیر کرنے والا نقاد لہجے کا ابہام اور اشاریت کے بجائے وضاحت کی ہی تلاش کرے گا۔ حالی شاعر یا نقاد بعد میں ہیں، وہ پہلے مصلح قوم ہیں، اس لیے انھوں نے شاعری کو قومی اصلاح کا وسیلہ بنانا چاہا۔ تبلیغ اور اصلاحی امور میں ابہام اور اشاریت کے بجائے وضاحت ہی ضروری ہوتی ہے۔ شبلی نے حالی کی طرح بالکلیہ ایسا کوئی اصرار نہیں کیا، اس لیے شاعری کی جمالیاتی اور داخلی قدریں ان کی نظر سے غائب نہیں ہو پائیں۔

شاعری کی اقسام میں شبلی نے اگرچہ واقعہ نگاری کو بھی شامل کیا ہے، لیکن وہاں بھی وہ واقعہ کی تاثریت پر زور دیتے ہیں نہ کہ اس کی خارجی واقعیت پر۔ ان کی نظر میں واقعہ کا محض خارجی اظہار کوئی وقعت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت واقعہ سے حاصل شدہ شاعر کے تاثرات کی ہے، اور وہ تاثرات ہی ہیں جو نہ صرف فن کار بلکہ قاری کے جذبات اور احساسات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

شعری اظہار کے لئے شبلی واضح طور پر خود کلامی، دروں بینی اور داخلیت پسندی کے قائل ہیں، ایسی صورت میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ شاعری جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کے جذبات کو؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب ہمیں اس وقت مل جاتا ہے جب وہ شاعری اور خطابت کا نہایت معقول فرق واضح کرتے ہیں۔ اس بحث میں انھوں نے جن نکتوں کو پیش کیا ہے وہ یہ ہیں کہ اگرچہ شاعری کی طرح خطابت میں بھی جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے، لیکن جذبہ اور احساس کے معاملے میں دونوں کے رویے الگ الگ ہیں۔ شاعری کا تعلق شاعر کے جذبات و احساسات سے ہوتا ہے جب کہ خطیب کے سامنے یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ وہ اپنی شعلہ بیانی سے سامعین کے جذبات و احساسات میں طوفان برپا کردے۔

اس بحث میں شبلی بطور خاص اس پہلو پر زور دیتے ہیں کہ شاعر کو دوسروں کے جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ تمام تر اپنے جذبات ہی سے سروکار رکھتا اور شاعری کے میڈیم سے ان کا اظہار کرتا ہے، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس کا کلام پڑھ یا سن کر قاری یا سامع پر کیا ردعمل ہوا، شاعری قطعی شاعر کا انفرادی اور شخصی فعل ہے۔ انھیں باتوں کا اظہار جب ہمارے عہد کا کوئی جدید شاعر کرتا ہے تو چاروں طرف سے واویلا ہونے لگتا ہے، حالاں کہ ہمارے شاعر کوئی نئی اور عجوبۂ روزگار بات نہیں کہتا۔ شبلی بہت پہلے ان خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو... شاعر اگر اپنے نفس کی بجائے، دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے، اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے، تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے، اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے، لیکن خطیب کے لیے ضروری ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری میں، خود کلامی، خود اظہاریت، دروں بینی، تنہا نشینی، شخصی مطالعہ نفس، ذاتی جذبات و احساسات کا اظہار، دوسروں کے جذبات و احساسات سے بےتعلقی وغیرہ کا ذکر کر کے شبلی نے پوری طرح اپنے نظریہ شعر کو ظاہر کر دیا ہے۔ شبلی کے ان تر و تازہ اور حیات افروز خیالات کو نئی شاعری میں بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔

ان خیالات کی روشنی میں ہم بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ شبلی نے شاعری کے اصل مزاج کی نباضی کی ہے۔ اس کے برخلاف حالی کے یہاں اس نوع کے خیالات کا سرے سے فقدان ہے۔ ان کی تمام تر کوششیں شاعری کو ''منظوم خطابت'' بنا دینے پر صرف ہوئیں۔ خود ان کی 'مسدس' ''منظوم خطابت'' کا بہترین عملی نمونہ ہے۔ ''شعرالعجم'' کے مطالعے کے دوران ہماری ملاقات شاعری کے نقاد سے ہوتی ہے جب کہ مقدمۂ شعر و شاعری کے مطالعے کے دوران منظوم خطابت کا نقاد ہم سے آ ٹکراتا ہے۔

تخئیل اور مطالعۂ کائنات کے بعد حالی نے الفاظ کے متناسب

استعمال کو شاعری کا تیسرا اہم عنصر قرار دیا ہے۔ شبلی لفظوں کے استعمال، طرز ادا، وزن اور خیال بندی وغیرہ کو شاعری کے عناصر اصلی نہیں سمجھتے۔ ان کی نظر میں ان سب چیزوں کی جزوی شعری ضروریات سے زیادہ اہمیت نہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کے اصلی عناصر دو ہیں۔ محاکات اور تخیل۔ محاکات کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شبلی غیرارادی طور پر، جدید شعری پیکریت کے تصور کے قریب آگئے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ انھوں نے محاکات اور تصویر کے درمیان فرق کیا ہے۔ عام طور پر محاکات سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی واقعہ یا شے کا اس طرح ذکر کرنا کہ نظر کے سامنے ایک تصویر سی کھنچ جائے۔

شبلی عام تصویر اور شعری تصویر میں فرق کرتے ہیں۔ وہ شعری تصویر کو محاکات کہتے ہیں۔ اس ذیل میں ان کے خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ ایک ماہر مصور مادی اشیاء کے علاوہ سادہ اور عام انسانی جذبات کو بھی صفحۂ قرطاس پر اتار سکتا ہے، لیکن پیچیدہ جذبات، احساسات اور کیفیات کی تصویر نہیں بنا سکتا۔ یہ وہ تصویریں ہوتی ہیں جو بصیرت کی گرفت میں نہیں آسکتیں، انھیں صرف احساس کی آنکھ ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے خیالات ہمیں چونکا دیتے ہیں کیوں کہ یہ وہ خیالات ہیں جن میں شبلی شاعری کے بصری پیکروں (Visual Images) کے تصور سے آگے بڑھ کر حسی پیکروں (Sensuous Images) کے تصور تک غیر ارادی طور پر پہنچے ہیں۔

شبلی کی نظر میں مصوری کی حد بصیرت ہے، جس میں معمولی، سادی اور سامنے کے احساسات تو ضرور دکھائے جاسکتے ہیں، لیکن اندرونی احساسات اور جذبات اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ صرف شاعری کا حصہ ہیں۔ "شعرالعجم" میں ایک موقع پر شبلی بصری احساس کی ایک مثال لکھتے ہیں کہ کسی مصور نے ایک عورت کی تصویر جہانگیر کے سامنے پیش کی، تصویر میں عورت کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں، گدگدی کا ردعمل ایک ایسا احساس ہے جسے Visualize کیا جاسکتا ہے، کسی احساس کا Visualization مصوری کا منتہائے کمال ہے۔ لیکن وہ جذبات، احساسات اور ذہنی افکار جنھیں بصری شکل نہ دی جاسکتی ہو، مصوری کا موضوع نہیں بن سکتے، ان کے اظہار کا وسیلہ صرف شاعری ہے۔ اس خیال کو ثابت کرنے کے لیے شبلی نے قاآنی کے ایک بہاریہ قصیدے کے چند اشعار لکھے ہیں۔

> ترجمہ: یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی، پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی، کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں سے ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی۔

ان اشعار میں ہوا کا پیکر بصری نہیں، حسی اور حرکی ہے۔ اگرچہ یہ مثال واقعہ نگاری کی ہے لیکن اس میں پیش کردہ پیکر مصور کے دائرۂ عمل سے باہر ہے، مگر شاعر نے اسے نہایت بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ ان اور ایسی ہی کچھ اور مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شبلی محاکات کے تصور کو محض مادی اشیاء کی تصویر کشی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے پھیلا کر احساس کی تصویر کشی تک لے جاتے ہیں۔ نئی شاعری میں بصری پیکروں کے مقابلے میں حسی پیکروں کو زیادہ اہم اور فنکارانہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ شبلی نے محاکات کو 'شاعرانہ مصوری' کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے، لیکن اس میں جن امور پر انھوں نے زور دیا ہے، ان کی روشنی میں شبلی کی یہ اصطلاح، ہمارے عہد کی اصطلاح 'شعری پیکر' کا قائم البدل بن جاتی ہے۔ محاکات کی تعریف میں شبلی شے کی تصویر کا نہیں بلکہ شے کی تجسیم کا ذکر کرتے ہیں۔

> محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو، یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے۔

"مقدمۂ شعر و شاعری" کے مطالعے سے ہر لحظہ یہ احساس بڑھتا جاتا ہے کہ حالی شعری اظہار میں وضاحت کے قائل ہیں۔ اس کے برخلاف "شعرالعجم" میں کئی موقعوں پر شبلی نے کچھ ایسے خیالات ظاہر کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شعری اظہار کے لیے اشاریت (Suggestiveness) اور کسی قدر ابہام کو پسند کرتے ہیں۔ عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں ان کے نزدیک بنیادی فرق یہی ہے کہ عام مصوری میں ہر شے نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے جب کہ شاعرانہ مصوری [شعری پیکر] میں اشارتی اظہار ہوتا ہے:

> ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے، ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں، شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے، جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کردے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ اس اقتباس میں شبلی نے مثالاً ایک خارجی شے کو لیا ہے، لیکن وہ مصوری کی وضاحت کے مقابلے میں شاعری کے ابہام اور "نمایاں صورت" کی جگہ "غیر نمایاں صورت" کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی غور طلب بات ہے کہ شبلی شاعری میں جزئیات کے علیحدہ علیحدہ تاثر کے نہیں بلکہ ان کے مجموعی تاثر کے قائل ہیں شاعرانہ اظہار میں وہ Gaps جن کے سبب اشاریت اور ابہام کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، شبلی کی نظر میں بہت اہم ہیں۔ شاعری کے اس وصف خاص پر زور دیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

> ہر جگہ کسی شے یا واقعہ کے تمام اجزا کی محاکات ضروری نہیں۔ فن تصویر کے ماہر جانتے ہیں کہ اکثر صاحب کمال مصور تصویر کے بعض حصے خالی چھوڑ دیتا ہے لیکن اور اعضاء یا اجزا کی تصویر اس خوبی کے ساتھ کھینچتا ہے کہ دیکھنے والے کی نظر چھوٹے ہوئے حصہ کو خود پورا کر لیتی ہے۔

☆

> محاکات کے موثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تصویر ایسی دھندلی کھینچی جائے کہ اکثر حصے اچھی طرح نظر نہ آئیں۔

ان امور سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شبلی شعری اظہار میں وضاحت کے بجائے اشاریت اور ابہامی لے کو مستحسن سمجھتے ہیں۔

محاکات کے ساتھ شبلی کی نظر میں شاعری کا ایک اور اہم عنصر قوت تخیل ہے۔ اور یہی وہ طاقت ہے جس کے سبب شاعری کی نظر میں:

> تمام بے حس اشیاء جان دار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف خوش آیند صدائیں آتی ہیں، زمین، آسمان، ستارے بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا نظر آتا ہے۔

تخیل کے سلسلے میں شبلی کے یہ خیالات حالی کے مقابلے میں زیادہ گہرے اور حیات آفریں ہیں۔ حالی نے تخیل کو ایک ایسی قوت سے تعبیر کیا ہے جو پہلے سے موجود اشیاء کو از سر نو ترتیب دے کر محض 'بازیافت' کا عمل انجام دیتی ہے۔ شبلی اسے انسانی ذہن کی 'قوت اختراع' سے موسوم کرتے ہیں۔ حالی کا تصور تخیل شاعری کو مادیت اور خارجیت کا پابند بنا دیتا ہے لیکن شبلی کا تصور تخیل شاعری کو شاعر کی لامتناہی ذہنی وسعتوں کی سیر کراتا ہے اور اس طرح وہ ہمیں تخلیق کے اصل مرکز کی سمت دکھاتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی شاعر کے لیے کسی چیز کی بازیافت یا ترتیب نو کے عمل کے مقابلے میں تخلیقی عمل زیادہ اطمینان بخش اور مسرت خیز ہوتا ہے۔

نقطۂ نظر کا یہ وہ بنیادی فرق ہے جس کے سبب شاعری کے مقصد کے معاملے میں حالی اور شبلی الگ الگ راستے اختیار کرتے ہیں۔ حالی کی نظر ہر لحہ چونکہ قومی اصلاح اور اخلاقی سدھار پر جمی رہتی ہے اس لیے وہ شاعری کے نقاد کے بجائے محتسب بن جاتے ہیں اور شاعروں کو مشورے دینے لگتے ہیں کہ (۱) صرف وہی شخص شاعری کرے جسے شاعری کی خداداد صلاحیت حاصل ہو (یہاں تک تو ٹھیک ہے)۔ (۲) نیچر کا غائر نظر سے مطالعہ کرے۔ (۳) اعلیٰ طبقے کے شاعروں اور اساتذہ کا کلام کثرت سے پڑھے۔ (۴) صحیح المذاق لوگوں کی صحبت سے مستفید ہو۔ (۵) مبالغے اور جھوٹ سے گریز کرے۔ وغیرہ۔ ان کی نظر میں نیچرل شاعری یہ ہے۔

> نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔

غزل کی اصلاح کے سلسلے میں جو گوناں گوں مشورے دیے گئے ہیں، ان کا مجموعی مقصد یہ ہے۔

> جو صنف، قوم میں اس قدر روائز و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو، اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔

غزل جیسی دروں بیں، خود کلامی سے متصف اور داخلی شاعری کو قومی اور اخلاقی اصلاح کا وسیلہ بنانے کی کوشش انتہائی سفاکانہ اور جابرانہ ہے۔ غزل اور دیگر اصناف سخن کی اصلاح کے سلسلے میں حالی نے جو مشورے دیے ہیں ان کے پیچھے بھی قومی اور اخلاقی اصلاح کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ اس لیے حالی کی حیثیت مجموعی طور پر نقاد سے زیادہ مصلح قوم کی ہو کر رہ گئی جو طمطراق اور جوش خطابت کسی مصلح قوم اور ناصح اخلاق کے فقروں میں ہونا چاہیے۔ وہ حالی کی تنقیدوں میں گھس آیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں، اب وہ وقت گیا، عیش و عشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی، اب کانگڑے اور بھاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔

حالی کا یہ انقلاب انگیز نعرہ ترقی پسند ادب کا نقیب اول قرار پایا اور خود حالی کو ترقی پسند ادیبوں نے اپنا باوا آدم تسلیم کیا۔ عہد جدید میں چوں کہ اصلاحی یا انقلابی ادب کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ ہم نے شاعری کو مقررہ زاویوں میں مقید کر کے نہیں رکھا۔ ہمارے نزدیک شاعری ہر شاعر کے ذہن کا ایک انفرادی فعل اور اس کے جذبہ و احساس کا ایک خاموش لیکن موثر اظہار ہے، اس لیے حالی کے بجائے ہمیں شبلی کی تنقیدوں میں زیادہ توانائی اور تر و تازگی ملتی ہے۔ شبلی کی نظر میں:

> شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے۔

وہ شاعری کا سرچشمہ احساس کو سمجھتے ہیں اور:

> شاعر کا احساس، نہایت لطیف، تیز اور مشتعل ہوتا ہے۔

ایک اور موقعے پر اس خیال کا اعادہ کرتے ہوئے شبلی رقم طراز ہیں:

> شاعر کے تمام احساسات اور جذبات، سریع الانفعال سریع الحس اور زود اشتعال ہوتے ہیں۔

اس لیے:

> شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی، بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا

> نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے، دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں، مٹا ہوا نقش اجاگر ہو جاتا ہے، کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے، خود ہماری روحانی تصویر، جو کسی آئینہ کے ذریعہ سے ہم نہیں دیکھ سکتے، شعر ہم کو دکھا دیتا ہے۔

یہ تمام خیالات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ شبلی کی نظر میں شاعری شاعر کے احساسات اور جذبات کا آئینہ اور اس کی ذات کے اظہار کا موثر وسیلہ ہے۔ وہ اسے قومی اصلاح اور فلاح و بہبود کے میدان کارزار میں لا کر کسی جماعت کا منشور یا اجتماعی خواہشات کی تکمیل کا آلۂ کار بنا دینے کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر اپنی قوت تخئیل کے سہارے تمام موجودات کا جائزہ اپنے انفرادی نقطۂ نظر سے لیتا ہے اور کوئی دوسری قوت اسے Dictate نہیں کر سکتی، لکھتے ہیں۔

> علت و معلول اور اسباب و نتائج کا عام طور پر جو سلسلہ تسلیم کیا جاتا ہے، شاعر کی قوت تخئیل کا سلسلہ اس سے بالکل الگ ہے۔ وہ تمام اشیا اپنے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں اس کو ایک سلسلہ میں مربوط نظر آتی ہیں، ہر چیز کی غرض، غایت، اسباب، محرکات، نتائج اس کے نزدیک وہ نہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔

اس آزاد نظری اور آزاد خیالی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی فکر و نظر کے زاویے کسی ایک مرکز پر نہیں رکتے، وہ مختلف جہتوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شاعر اپنی تخلیقات میں ہر لحہ نئے نئے تجربوں سے گذرتا ہے، اس کی نظر نئے نئے Dimensions بناتی رہتی ہے۔ شبلی رقم طراز ہیں:

> پھول کو تم نے سینکڑوں بار دیکھا ہوگا اور ہر دفعہ تم نے صرف اس کے رنگ و بو سے لطف اٹھایا ہوگا لیکن شاعر قوت تخئیل کے ذریعہ سے ہر بار نئے نئے پہلو سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ اس کو نیا عالم نظر آتا ہے۔ وہ اس کی خوشبو سے لطف اٹھاتا ہے تو بے ساختہ معشوق کی بوئے خوش یاد آجاتی ہے۔

ان خیالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی شعری تجربوں کو کسی بندھے ٹکے مقصد کے تحت کسی ایک مرکز پر نہیں روک دینا چاہتے، وہ شاعری کے Multi-Dimensions کے قائل ہیں۔

"شعر العجم" میں تشبیہ اور استعارے کی بحث کرتے کرتے غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر شبلی، لفظوں کے علامتی مفہوم کے تصور تک پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی بحثوں میں کسی جگہ "علامت" کی اصطلاح استعمال نہیں کی مگر جس قسم کے خیالات اس سلسلے میں ظاہر کیے ہیں، ان سے بڑی آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ تشبیہ اور استعارے کی اکہری یا دوہری معنوی سطح سے گذر کر علامت کی تہہ در تہہ معنوی سطحوں تک پہنچے ہیں۔ تشبیہ کی معنوی وسعت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اکثر موقعوں پر تشبیہ یا استعارہ سے کلام میں جو وسعت و زور پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت کثرت سے آدمی تھے، یوں ادا کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام کا زور بڑھ جائے گا۔ یہاں کلام کا اصلی مقصد آدمیوں کی کثرت کا بیان کرنا ہے، جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت کا خیال متعدد وجوں سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، جنگل کی زمین میں قوت نامیہ بہت ہوتی ہے، اس لیے اس میں گھاس، پودے اور درخت کثرت سے پاس پاس اگتے ہیں، اس کے ساتھ نمو کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے، بے قدر ہو جاتی ہے، اسی بنا پر جنگل میں درخت اور گھاس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ مثال مذکورہ میں تشبیہ نے یہ تمام باتیں پیش نظر کر دیں، یعنی آدمی اس کثرت سے تھے، جس طرح جنگل میں گھاس ہوتی ہے۔ آدمیوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بھیڑ بڑھتی جاتی تھی۔ ایک جاتا تھا تو دس آجاتے تھے، کثرت کی وجہ سے آدمیوں کی کچھ قدر نہ تھی، یہ تمام باتیں جن کی وجہ سے کثرت کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ایک جنگل کے لفظ میں مضمر ہیں اور چوں کہ یہ تمام باتیں صرف ایک لفظ نے ادا کر دیں اسی لیے خود بہ خود کلام میں زور آگیا۔

اس طویل اقتباس کی توجیہات سے اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ شبلی یہاں تشبیہ سے جو چیز مراد لے رہے ہیں، اسے ہماری نئی تنقید "علامت" کہتی ہے۔ جدید اردو شاعری میں لفظوں کے علامتی استعمال نے کفایت لفظی کو رواج دیا۔ کم سے کم لفظوں کے علامتی استعمال سے بڑے بڑے مفاہیم ادا کرنا نئی شاعری کا ایک اہم وصف ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں لفظ "جنگل" کی وسیع معنویت کا شبلی نے جس انداز سے تجزیہ کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ لفظ اپنی تشبیہی اور استعاراتی نوعیت سے گذر کر، علامت کی منزل پر جا پہنچا ہے۔ اس سے ہی یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی تشبیہ سے دراصل لفظوں کی علامتی معنویت ہی مراد لیتے ہیں اور شاعری کے اس پہلو کو وہ اسی طرح اہم سمجھتے ہیں جس طرح کہ جدید شاعری میں اس کی حیثیت مسلمہ ہے۔

نئی شاعری میں تشبیہ، استعارہ اور پیکر کی مدد سے بھی علامتوں کی تشکیل کی جاتی ہے۔ شبلی تشبیہ کے اس پیچیدہ عمل سے بھی ناواقف نہیں معلوم ہوتے۔ لکھتے ہیں

> جب کسی نہایت نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا

ہے کہ الفاظ نے اگر ان کو چھوا تو ان کو صدمہ پہنچ جائے گا، جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے، ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے، وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کرتا ہے۔ مثلاً نظیری کہتا ہے:

میں معشوق کے لب اور رخسار اور گیسو کو تمام رات چومتا رہا، اور آج گل و نسرین و سنبل کے خرمن میں ہوا گھس آئی ہے۔

لب و رخسار کی نزاکت اور ان کا نرم اور لطیف بوسہ الفاظ کی برداشت کے قابل نہ تھا، اس لیے شاعر نے اس کو اس حالت سے تشبیہ دی کہ گویا ہلکی ہلکی ہوا پھولوں کو چھوڑ کر گذر جاتی ہے اور بار بار آکر چھوتی اور نکل جاتی ہے۔

نظیری کے اشعار میں 'ہوا' بوسے کی علامت ہے۔ شاعر نے 'ہوا' کو ایک پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ شبلی اس اقتباس میں جس چیز کو تشبیہ سے تعبیر کر رہے ہیں وہ دراصل ایک ایسی علامت ہے، جس کی تشکیل پیکر کے ذریعے ہوئی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا ہے کہ شبلی لفظوں کی علامتی نوعیت سے واقف تھے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان کے زمانے میں ہمارے زمانے کی تنقیدی اصطلاحات مروج نہیں تھیں، اس لیے ان علامتوں کے مفہوم کو کبھی تشبیہ کے نام سے ظاہر کرتے ہیں اور کبھی استعارے کے نام سے۔ لفظوں کی علامتی معنویت کے اس شعور کے پیش نظر یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جب شبلی اپنی تنقیدوں میں الفاظ کے مناسب استعمال کا ذکر کرتے ہیں، تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ شاعری میں لفظوں کی اہمیت ان کے نزدیک حالی کی طرح صرف اس لیے نہیں ہے کہ کلام سادہ اور واضح ہو، بلکہ وہ لفظوں کی اہمیت پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ لفظ تہ دار اور پیچیدہ معنویت کے علم بردار ہوتے ہیں، لہٰذا لفظوں کے استعمال میں ذرا سی احتیاط اور ہوش مندی سے بڑے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات نہایت بے تکلفی اور آسانی سے ظاہر کیے جاسکتے ہیں۔ شبلی رقم طراز ہیں:

بڑے بڑے خیالات اور جذبات لفظ کے تابع ہوتے ہیں، ایک لفظ ایک بہت بڑے خیال یا بہت بڑا مصور ایک مرقع کے ذریعے سے غیظ و غضب، جوش اور قہر، عظمت اور شان کا جو منظر دکھا سکتا ہے، شاعر صرف ایک لفظ سے وہی اثر پیدا کر سکتا ہے۔

شاعری کی تاثیر کے سلسلے میں شبلی ایک اور ایسے پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہمارے عہد کے ذہن سے قریب نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ زندگی کی تعمیر اور ترقی کا مدار متضاد حالتوں اور کیفیتوں پر ہے۔ جدید صنعتی اور سائنسی عہد میں تضادوں کا شعور اور اک بڑی شدت سے ہوا ہے، نئے شاعر کی نظر زندگی کی متضاد حالتوں سے غافل نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نئی شاعری میں زندگی کے تجربے بڑے قریب سے کیے جاتے ہیں۔ آج کے شاعر کا ذہن تخیل اور تصورات کے رومانی خلاؤں میں قلابازیاں نہیں کھاتا۔ اس کا ذہن زمین کے ہر عمل سے ٹکراتا ہے۔ اور چوں کہ زمینی زندگی کی تعمیر و ترقی متضاد حالتوں میں ربط کے ذریعے سے ہوتی ہے، اس لیے نیا شاعر تضادوں کی اہمیت سے گریز نہیں کرتا بلکہ انھیں اپنے ذہن اور احساس کے مختلف اجزا بنا کر اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔ اس عمل سے شاعری بڑی گہری اور موثر چیز بن جاتی ہے شاعری کے اس پیچیدہ عمل سے شبلی واقف ہیں چناں چہ وہ شاعری کی تاثیر کی ایک توجیہ یہ بھی کرتے ہیں کہ متضاد اشیا کی تصویر کشی سے شاعر اپنے کلام میں غیر معمولی اثر پیدا کر دیتا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

محاکات کی تکمیل بعض اوقات مخالف پہلو دکھانے سے ہوتی ہے۔ ایک سفید چیز کے سامنے سیاہ چیز رکھ دی جائے تو سفیدی اور زیادہ نمایاں ہو جائے گی، اسی طرح اکثر کسی حالت کے زیادہ نمایاں کرنے میں یہ طریقہ کام آتا ہے کہ اس کا مخالف پہلو دکھایا جائے۔

شاعری کے سلسلے میں ان چند خیالات کی روشنی میں بخوبی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک کہ شاعری کی آفاقی اور ابدی قدروں کا تعلق ہے تو ان سے حالی کے مقابلے میں شبلی زیادہ واقف کار، باشعور اور گہری نظر کے نقاد ہیں۔ شبلی نے شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ چوں کہ عصری ضرورتوں کا نتیجہ نہیں تھے، اس لیے وہ وقت کے ساتھ باطل نہیں ہوئے، ان میں سے اکثر آج بھی قابل قبول ہیں۔ اس کے برخلاف حالی نے اپنے زمانے کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر شاعری کی تنقید کی تھی، اور اسی لیے انھیں اپنے عہد اور اپنے عہد سے ملتے جلتے بعد کے عہد میں قبولیت عام کی سند ملی لیکن اب چوں کہ نہ وہ حالات ہیں اور نہ شاعری کے وہ نظریات اس لیے عہد جدید کے ادبی تصورات اپنے آپ کو حالی کی روایت سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ نئے ادبی تصورات کئی معاملات میں شبلی کی ذہنی روایت سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں ایسی صورت میں اگر نئی شاعری کی روایت کو حالی کی ہنگامی نوع کی جدیدیت، سے جوڑا گیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ نئی شاعری اردو شاعری کی اس داخلی روایت سے رشتہ منقطع کر لے گی جس کے اہم ستون میر اور غالب ہیں۔ اردو شاعری کی داخلی روایت سے نئی شاعری کا رشتہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ درمیانی منزل پر جدید شاعری حالی کے بجائے شبلی سے اپنا سلسلہ ملائے۔

ان حالات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں جدیدیت کے پیش رو شبلی ہیں حالی نہیں ☆☆☆

۱۔ واضح رہے کہ شبلی کے زمانے میں مصوری تو بڑی بات ہے خود شاعری میں تجریدی آرٹ کا کوئی تصور نہیں تھا، اس کے باوجود (مصوری میں نہ سہی) وہ شاعری میں اشاریت اور ابہام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

تنہائی کا مسئلہ

شمیم حنفی

شمارہ ۳۳،
فروری ۱۹۶۹

دوسرے کی آنکھ کا تنکا ہم آسانی سے دیکھ لیتے ہیں جب کہ اپنی آنکھ کے شہتیر پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔ ہمارے بزرگوں کے مزاج میں رواج زمانہ یا مذاق عامہ کو بہت دخل حاصل تھا، چنانچہ ان کی ادبی کاوشوں میں خیال ہی کی نہیں لفظوں کی بھی ایسی یک رنگی ہے کہ انفرادی رجحان کا عکس ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اس بات کا ہم نے، آپ سبھی نے مذاق اڑایا ہے۔ کچھ گھسی پٹی روایتیں، فرسودہ مضامین، ہزار ہا دہانوں میں چبائے ہوئے استعارے اور کنائے، رنگ و روغن سے خالی الفاظ اور علامتیں ایک ہی سر اور آواز یا لب و لہجے کی چکراتی ہوئی گونج، غرض کہ ایسی ہم رنگ و ہم دم فضا ہے کہ اس میں سانس لیتے ہی تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے۔

لیکن ہم اس احساس سے بہت دور ہیں کہ خود ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں نے بعض نفسیاتی اور حسی تجربوں کا ذکر اس شدومد کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی صداقت مضحکہ خیز اور خلوص بے نمک نظر آنے لگا ہے۔ آگہی کا زخم، فرد کا المیہ، تنہائی کا المیہ، یہ ساری باتیں سچی ہیں لیکن اگر یہ باتیں اتنی ہی سچی معلوم ہونے لگیں جیسے یہ کہنا کہ ”جھوٹ بولنا بری بات ہے“ تو ان کی اہمیت کیا رہ جائے گی؟ ادب میں کسی شعوری اور حسیاتی تجربہ کا ظہار اس شکل میں کرنا کہ وہ ضرب المثل بن جائے، بہت بڑا المیہ ہے اور ان دنوں ہم بڑی تندہی کے ساتھ اس المیے کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادتے جا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر تنہائی کے مسئلے کو لیجیے۔ ہر فن کار نے تخلیقی سطح پر بیتے ہوئے سارے جگوں میں خود کو اکیلا پایا ہے۔ کیا میر اور کیا غالب، سبھی تنہائی کے عذاب میں مبتلا تھے۔ لیکن ان کی تنہائی فکر کی تنہائی تھی جس میں فکری انفرادیت اور ذہنی برتری کا احساس، عرض ہنر کی بے قدری کا تاثر اور نفس کے احترام کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ ان کے یہاں احساس تنہائی کا اظہار دراصل اپنی عظمت کے اعتراف کی ایک شکل ہے۔ اسی لئے اپنے زخموں کی پردہ کشائی کرتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر ایک اکڑ اور تیور نظر آتا ہے۔ یہ اکڑ خود پسندی کے مرض سے پیدا ہونے والی شیخی بازی یا اپنی ذات سے بے حد بے حساب عقیدت کا پرتو نہیں بلکہ فکری برتری کی اس بلندی کا پتہ دیتی ہے جہاں چاروں طرف سناٹا ہے اور اکیلے پن کا لذت انگیز درد اور نیچے قدموں میں دنیا پھیلی ہوئی ہے۔

یہ سمجھنا کہ ہم تنہا ہیں اور بازار جہاں میں کسی بھی جنس پر ہمارا حق نہیں، کوئی مستحسن خیال نہیں ہے۔ بھلے آدمیوں نے یوں بھی کبھی دنیا کو منہ نہیں لگایا۔ یہاں ان خدارسیدہ درویشوں کا ذکر نہیں جو دنیا کے جاہ و مال کو پاؤں کی جوتی سمجھتے تھے بلکہ ان بے غرض اور پاک نفس لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حسب توفیق دنیا کے اسٹیج پر تماشائی کی واہ واہ سے بے پروا ہو کر اپنا کام کرتے رہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہوگا کہ میں آدرشوں کی بات کر رہا ہوں۔ آدرشوں کا مقام کتابوں میں ہے اور وہاں انھیں ہر زمانے میں دیکھا جائے گا، لیکن تخلیقی ذمہ داری قبول کرنے والے کے لئے بھی شب و روز کی زندگی ایک آزمائش کا حکم رکھتی ہے۔ خود رحمی کا جذبہ عام انسانی زندگی میں بہت مریضانہ اور گھٹیا ہے لیکن ادب میں اس جذبے کا اظہار غالباً سب سے بڑی نعمت ہے۔ آنسو بہانے کا آرٹ یہ ہے کہ گوشت کی دیواروں کے اندر سارے پتھر پگھل جائیں لیکن خارج کی دنیا پر اس کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دکھائی نہ دے۔ دیکھنے والی آنکھ اس طرح بساط باطن کا سارا تماشا بھی دیکھ لے گی اور آنسو اپنے احترام کا تقاضہ بھی پورا کر لیں گے۔

ہماری تنہائی کا احساس بھی اسی طرح ہم سے احترام کا تقاضا کرتا ہے۔ جو مسرتیں آج بیشتر لوگوں کے لئے سہل الحصول ہیں اگر ہم انھیں نقد بے مایہ سمجھنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے ہوتے تو تنہائی کے اس اشک افشاں احساس سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یا تو ان مسرتوں پر حقارت کی نظر ڈالی جائے یا خود کو ایک تخلیقی فن کار کے منصب سے نیچے اتار کر خود بھی ہاتھ پاؤں چلایا جائے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں دن کی روشنی اور ضمیر کی سیاہی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر دکھائی دیں، کھوٹی تدبیروں سے تقدیر کا کھرا بن جانا شاید بہت مشکل نہیں۔

سچ پوچھیے تو ہم نے اسی مسئلے کو نام ہی غلط دے دیا ہے۔ بھیڑ میں چہروں کی شناخت مشکل ہے۔ ایک دوسرے سے، اپنے آپ سے ٹوٹے ہوئے، کٹے ہوئے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی قطار میں کوئی داخلی رشتہ نہیں جو انھیں ایک دوسرے سے منسلک کر سکے اور انھیں موتی موتی پرو کر ایک مالا بنا سکے۔ جذبات میں

گرمی نہیں، آنکھیں خلوص سے عاری ہیں اور شعور ہر لمحہ نظر کے پل صراط پر۔ سراسیمگی، ہیجان، لاحاصلی اور بے سمتی کی الجھنوں کے ساتھ سفر مقدر ہے۔ سیاست کا عمل دخل اب حکومت کے ایوانوں ہی میں نہیں، گھر کی بے لوث فضا میں بھی اس کا زہر پھیل چکا ہے۔ سب ایک دوسرے پر شبہے کی نظر ڈالتے ہیں۔ آپ اپنے سائے پر اعتبار نہیں رہ گیا۔ صنعت اور سائنس کے معجزوں نے نبیوں کے اعجاز پر ایمان باقی نہیں رہنے دیا، وہ سہارا بھی چھن گیا جو ہر دور کی بدنصیبی کا علاج رہا ہے، غلط یا صحیح جو بھی سمجھ لیجئے۔ تہذیب نے مادی افادیت کا پہلا سبق جس دن پڑھا تھا وہ انسانی مقدر کا سب سے زیادہ تاریک دن تھا۔

تنہائی کے نام پر ہم جس کرب سے دوچار ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی تنہائی سے بالکل مختلف شے ہے۔ ان بزرگوں میں انفرادی ذہن بہت کم لوگ رکھتے تھے اور جنھوں نے یہ دولت پائی وہ دنیا کے کام کے نہ رہے، ان کا مسئلہ سر تا سر فکری تھا کہ وہ ماضی یا حال کے بجائے خود کو مستقبل کا ذہن سمجھتے تھے جو ان کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔ عام لوگوں کے لئے وہ زمانہ ایک بڑے رچے بسے، منظم اور مانوس معاشرتی نظام کا زمانہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے تھے۔ فرصت کے اوقات مل جل کر گذارتے تھے خوشیاں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی شرافت اور حرمزدگیوں پر نظر رکھتے تھے۔ مجلسیں، محفلیں، تیوہار اور جلسہ جلوس، یہ سارے حیلے کھانے پینے اور مل بیٹھنے کے ہوتے تھے۔ ہندوستان کی زمین زرخیز تھی۔ غلہ کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ آبادی کم تھی۔ غرض ہر مدت میں کھانا پان کی اجتماعی تقریبوں کے لئے مذہب اور روایت کے نام پر ہزار ہا بہانے ڈھونڈ لئے گئے۔ اس عالم میں جس نے اپنے آپ کو تنہا سمجھا اور اس تنہائی کی سخت جانی سے پریشان ہوا اور شام کو صبح کرنا جس کے لئے جوئے شیر لانے کے برابر ہوا وہ ذہنی برتری کا ایک بڑا روشن اور بیدار احساس رکھنے والا ذہن تھا۔ اس احساس کے ڈانڈے کہیں بھی جسم اور مادے سے نہیں ملتے۔ جسمانی تنہائی کا اظہار اور احساس سستے غزلیہ اشعار میں ملتا ہے جہاں جس کو جسم کی غذا نہ ملنے پر سخت غم و غصے کی نمائش کی گئی ہے اور معشوق کو اس کے حسن واقعی کے بجائے تیر و تلوار سے لیس کر دیا گیا ہے۔

عقلیت کے محدود تصور اور سرسید جیسے بے لوث انسان کی نیکیوں نے جہاں ادب کو کئی نقصان پہنچائے وہیں ایک زیاں یہ بھی ہوا کہ لوگ ایک دوسرے کٹ گئے۔ گھر، خاندان، قبیلہ، سماج، دنیا، حال، مستقبل، بات، مسئلہ، ان تمام لفظوں پر ایک دھند ڈال دی گئی۔ تعمیر و ترقی، سرخ روئی اور بہتر سماجی مقام کی آرزو نے اپنے بازو کچھ اس طرح پھیلائے کہ شخصیت لاپتہ ہو گئی اور صرف دعا کے لئے اٹھے ہوئے عزم کا پرچم لہراتے ہوئے، پیچیدہ حالات کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے تعمیری منشور کے خاکے مرتب کرتے ہوئے فضاؤں پر چھا گئے۔ رشک و رقابت اور مقابلے کا احساس عام ہونے لگا۔ بڑی ملازمتوں تک کسی قوم اور قبیلے کے لوگ زیادہ پہنچ رہے ہیں؟ کیوں پہنچ رہے ہیں؟ پھر ہم بھی وہی راستہ کیوں نہ اپنائیں؟ اور وہ راستہ کیا تھا...؟

روشن عقلیت، مغربی فکر و فلسفہ اور انگریزی تعلیم، انگریزوں جیسا رہن سہن، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا۔ بات گھوم پھر کر ایک بے حد محدود دائرے میں سمٹ آئی۔ نیچرل شاعری اور افادی مضامین کا دور شروع ہوا۔ سرسید نے آزاد کو بھی مشورہ دیا۔ ''اپنی شاعری کو نیچر کی طرف اور زیادہ مائل کرو۔'' اور المیہ یہ تھا کہ ہمارے سادہ لوح بزرگوں نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق بس انگریزی کے رومانی شاعروں کو مینارۂ نور سمجھ لیا تھا اور کالی داس کو بھول بیٹھے۔ نیچر کا مطلب تھا برسات کی مصوری کر دینا مصوری کا مطلب تھا فوٹو گرافی (بقول حالی فوٹو گری) ظاہر ہے کہ کام انسان سے بہتر طریق پر مشینیں کر سکتی تھیں۔ کیمرے کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اب ادیب مشینیں بننے لگے۔ بازار ادب میں تمام پرانے سکے کھوٹے قرار دے دئے گئے اور یورپ کی خیرہ کن روشنی میں نہائے ہوئے سکوں کا چلن عام ہونے لگا۔ ترجمے کے ادارے قائم ہوئے، کالج کھل گئے۔ راجہ رام موہن رائے کو اس سے پہلے ہی یہ گیان ہو چکا تھا کہ سنسکرت اور مشرقی علوم و ادبیات کا وجود ہندوستانی قوم کے لئے مہلک ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا تو تھا بہت بڑی بڑی اصطلاحات کے پردے میں، لیکن حقیقتیں بہت چھوٹی تھیں۔ سرسید کی خدمات سے انکار کج فہمی بھی ہے اور شرارت بھی لیکن ادب کی لہریں انسانی قد سے نہیں ناپی جا سکیں۔ سرسید اور ان کے تمام رفقا کے سامنے جو نصب العین تھا اس کی بنیاد کچی تھی اور دیواریں بہت اونچی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آنکھیں دیوار کے اس پار تک نہیں پہنچ سکیں۔ نیچرل شاعری سے ان کی عقیدت محض اس لئے تھی کہ وہ اس سے اردو شاعری کی عام بدمذاقی اور سستے پن کا غبار صاف کرنا چاہتے تھے۔

حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی کیوں کہ جیسے جیسے حالی کا مقدمہ مضبوط ہوتا گیا روایتی اور فرسودہ خیالات اور پامال لفظوں کی بے بضاعتی برہنہ ہوتی گئی۔

ظلمات فن میں جاگتی ہوئی روشنی کی یہ لکیر بہت خوب تھی لیکن اس روشنی کا دائرہ علمی زندگی کے راستے روشن کرتا رہا، شخصیت اندر اندر سمٹتی گئی اور بالآخر عمل کے پاؤں کی گرد بن گئی۔ مقصدیت کی بھرمار نے شاعری اور ادب کو بھی بجلی کے پنکھے اور ٹیلی فون کی قسم کی چیز بنا دیا۔ ان کی اہمیت مسلم ہے لیکن مسلمات سے آگے بھی کچھ ہے۔ احساس کی سطح پر جو باتیں سچی معلوم ہوتی ہیں عقل کی بساط پر مضحک اور نامعقول بھی ہو سکتی ہیں۔ احساس اور وجدان کی چمک کے تانے بانے کم زور پڑے تو آدمی سنگ دنیا بنتا گیا اور روح بس زندگی کے بعد کا ایک مفروضہ رہ گئی۔

آزاد اور شبلی نے سرسید کے تمام تر احترام کے باوجود اپنی فنی شخصیت کو ہوا و ہوس کے رنگ و آہنگ سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔ لیکن مقصدیت کا پودا اب بڑھتے بڑھتے ایک چھتنار درخت بن چکا تھا جس کے سائے سے الگ رہنے والے شعرا اثاث باہر سمجھے گئے۔ ویسے یہ بات بھی صحیح ہے کہ شبلی تو خیر غنیمت تھے لیکن آزاد نثر کے عظیم الشان شاعر ہونے کے باوجود نظم میں لفظوں کی جوڑ توڑ سے آگے نہ بڑھ سکے اور ان کی شعری صلاحیتیں کسی اہم اور قابل قدر تخلیقی سطح تک نہیں پہنچ سکیں۔ حالی کے مقابلے میں ان دونوں کی شاعری کے نہ پنپنے کا سبب ان کی کم تر صلاحیت

بھی ہے، لیکن اس عہد میں غالباً کسی بھی سطح کی تخلیقی صلاحیت رکھنے کے باوجود سرسید کے ادبی نظریات سے الگ رہ کر اوپر اٹھنا آسان نہیں تھا۔

اب یہ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ سرسید اور حالی کا سارا مقصد قومی وملی ہونے کے باوجود نفسیاتی اعتبار سے کس طرح حقیقت معکوس کے جال میں پھنس گیا۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا تعلیمی وثقافتی اصلاح اور ادبی وفکری بغاوت کا سارا کام اپنی قوم کے لئے کیا جو مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد خود کو ذہنی معاشی سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے یتیم اور غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔ سرسید کی آرزو یہ تھی کہ مسلمان ایک "متحدہ" قوت اور قوم بن کر تاریخ کے افق پر پھر ابھر سکیں اور "مسدس مدو جزر اسلام" کے آئینے میں خود کو پہچانیں کہ سرسید اسے اپنی مغفرت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان نظریات سے متاثر ہو کر انفرادی طور پر کچھ لوگوں نے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ عقیدے پر سائنس کے غالب آتے ہی لوگوں کا جذباتی بعد بڑھتا گیا۔ خاندان بکھرنے لگے۔ سرکاری ملازمتوں نے ایک حویلی کو کئی چھوٹے چھوٹے دور افتادہ کوارٹرس میں تقسیم کر دیا۔ صدیوں کی پالی پوسی روایتیں اور رسمیں بیکار سمجھی گئیں تو مل بیٹھنے کے بہانے بھی کم ہوتے گئے۔ غرض رشتوں کی بڑی بے توقیری ہوئی۔

اصل میں مشرقی لوگوں کا، اور اس میں ہندوستان سے باہر پھیلے ہوئے مشرق کو بھی رکھا جاسکتا ہے، مزاج کچھ ایسا رہا ہے کہ ان کی ہر جذباتی فکری یا تہذیبی یک جہتی اور ہم آہنگی کے لئے کم از کم نیم فلسفیانہ عقیدے کی موجودگی ضرور ہے، ایسا عقیدہ جسے یک جہتی کی ہر جدوجہد کا محرک سمجھا جاسکے۔ یا پھر کوئی ایسی بشری قوت ہو جو اپنی شخصیت کے طلسم سے لوگوں کو ایک منزل پر یکجا کر سکے۔ یہ شخصیت بادشاہ کی بھی ہو سکتی ہے اور مذہبی رہنما کی بھی۔ اس حلقے میں سیاسی رہنما کی شخصیت کو شامل کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ سیاست نے ہر عہد میں اختلاف کو ہوا دی ہے۔ ہاں کوئی ایسی سیاسی شخصیت ہو جو اپنے پیچھے ایک دنیا کو سمیٹ لے اور لوگ اسے اوتار یا حکیم الامت سمجھنے لگیں تو اور بات ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں اتحاد واتفاق کی کڑیاں ایک بار پھر مضبوط دکھائی دیں۔ اس تحریک کی اپیل جذباتی بھی تھی اور ادبی زاویہ نگاہ سے رومانیت کے پس منظر میں عقلی بھی۔ رومانی طرز فکر رکھنے والے ادیبوں میں ٹیگور کے علاوہ ہندوستان میں کسی اور کے اثرات دوررس نہ ہو سکے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ٹیگور کی شاعری کی نیم فلسفیانہ اور طلسمی فضا میں عقیدہ اور فکر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ اقبال کی شخصیت ٹیگور کے مقابلے میں زیادہ حقیقی اور سچی تھی لیکن ان کی شاعری کے اجزا وعناصر اور اس کے فکری سرچشمے اس سرزمین سے بہت زیادہ میل نہیں کھاتے تھے جہاں اس کی نشوونما ہوئی۔ اقبال کی عظمت کا خوب اعلان ہوا اور شہرت کے ڈنکے چاروں طرف بجے۔ لوگوں نے ولیوں اور درویشوں کی عزت انھیں دی اور کتنوں نے ان کے نام پر اپنی عاقبت سنواری۔ لیکن ایک بہت بڑے حلقے کو ان سے ذہنی اور جذباتی مغائرت کا احساس بھی ہوتا رہا۔ وہ شاعر اور ادیب جو ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن بنے وہ اپنے زمانے کے ادب پڑھنے والے طبقے کو ایک متعین اور مربوط فکری نہج پر لے جانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اکا دکا ادیب یا محدود حلقوں نے کچھ لوگوں میں بڑا اعتبار قائم کیا لیکن انھوں نے فن کی جو عمارت بنائی اس کے روزن وطاق میں عام صورتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے بہت جلد ادب کے دائرے سے خود کو نکال لیا۔ اسے زندگی کی وسعت نے کچھ اس زور وشور کے ساتھ صدائیں دیں کہ ادب کی دنیا تنگ وتاریک نظر آنے لگی۔ کانفرنس اور جلسوں میں رپورتاژ نما افسانے پڑھے جانے لگے۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظمیں کہی گئیں۔ عوام کا لہو گرم ہوا۔ انگریز سرمایہ داری کی علامت تھے جو ۱۹۴۷ میں ہندوستان چھوڑ گئے اور پھر ہندوستان کی بے راہ اور پر پیچ سیاسی فضا میں کمیونزم کے سیاسی زوال نے ایسی قوتوں کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیا جن کی ساری جدوجہد ایک کو دوسرے سے الگ کرنے کے لئے تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

رہا سرمایہ داری کا طوق تو وہ آج بھی ہمارے معاشرے کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔ متوسط طبقہ بڑی تیزی سے نچلے طبقے میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے اور اونچے طبقے کے افراد کی تعداد میں تخفیف ہوتی جارہی ہے۔

اس وقت حالات تمام زمانوں سے مختلف ہیں۔ عقیدے اور آدرش کی شکست میں یک جہتی اور مفارقت کی شکست کے بہت سے افسانے ہیں۔ لیڈرشپ کا فقدان ہے۔ چلئے مذہب اور سیاست کا معاملہ صاف ہوا۔ لے دے کے بات رہ جاتی ہے عام انسانی قدروں کی، سو وہ پامال ہیں۔ انگلستان کی صنعتی انقلاب نے ترقی کا جو ثمر گناہ تہذیب کو کھلایا تھا اس کی گرمی نے ہر دل میں آگ لگا دی ہے، ایسی آگ جو اندر ہی اندر ہر وجود کو چاٹتی جا رہی ہے۔ میں انسان دشمن نہیں ہوں کہ سائنس کی برکتوں پر طنز اور تضحیک کی نظر ڈالوں۔ ان کا فائدہ اپنی جگہ پر لیکن صنعتی انقلاب کی تاریخوں میں ایسے حالات تفصیل سے نقل کئے گئے ہیں کہ ریل کی چمنی کے اندر کا دھواں صاف کرنے والے بچے کھانسی سے مرجاتے تھے اور کوئلہ اٹھانے والی دراز قد لڑکیوں کی کمر بوجھ سے ہمیشہ کے لئے جھک جاتی تھی۔

جب گاؤں اجڑ رہے تھے اور شہر بس رہے تھے اس وقت زبردستی چھ سے بارہ پندرہ سال کے بچوں کو رات میں بستر سے اٹھا دیا جاتا تھا۔ انسانی لہو ارزاں تھا اور انگلستان کو نئی تہذیب کا پیغامبر بنتا تھا اور ساری دنیا کی قیادت کرنی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں بنگال کا قحط اور انگلستان کا صنعتی انقلاب ایک ساتھ شروع ہوئے۔ ان کے بیچ کوئی رشتہ تو ہوگا۔

ایسی فضا میں مراجعت کی خواہش بھی بے سود ہے۔ ایسا نہ تو کبھی پہلے ہوا ہے اور نہ اب ہوگا۔ انقلاب فرانس سے پہلے روسو (Rousseau) نے بھی لوگوں کو پیچھے لوٹنے کی دعوت دی تھی لیکن آج کی تہذیب گردن پر آنکھیں نہیں رکھتی اور الٹے پیر چلنا اس کے بس میں نہیں۔ پس ماضی سے اس کے سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ زمین سے زیادہ اسے اب خلا سے دلچسپی ہے اور یہ ایسا المیہ ہے جس کا تصور بھی پچھلے زمانوں میں اس زرخیز اور سرسبز شاداب خطہ ارض پر محال تھا۔ یہ بے زمینی ہی ایسے تمام نفسیاتی معموں کی خالق ہے اور اس کے بطن سے آئے دن نت

نئی الجھنیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے درمیان بھی ایک خط تھا جواب مٹ چکا ہے۔

اب سب ایک ہیں۔ سائنس نے جغرافیائی فاصلے کم کیے تو ایک جگہ کی لعنتیں دوسری جگہ پہنچانے میں بھی کم وقت لیا اور اب تو اپنا گھر ساری دنیا ہے۔ وجود کی کھڑکی سے باہر ایک نظر بھی ڈالی جائے تو چاروں سمتیں اپنے کام پھیلاؤ کے ساتھ ایک نقطے پر سمٹ آتی ہیں اور آدمی بجائے خود ایسا محشر خیال بن جاتا ہے جہاں ان گنت چہرے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں اور تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔

یہ سوچنے کی فرصت بھی کسے ہے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہیں اور پھر ہماری نسل نے تو اس وقت آنکھیں کھولیں جب سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا، اس لئے گذری ہوئی سہانی گھڑیوں کا تصور بھی فضول ہے کہ ان کا وجود بھی تھا ہی نہیں۔ ایک سرد اور سفاک بے مہری ماتھے کی شکن بن گئی ہے بصارت بازار میں ملتی ہے اور بازار میں ہر جنس فراواں ہوتی ہے اس لئے انفرادی نظر کا سوال ہی نہیں۔ بصیرت لا پتہ ہے کیوں کہ یہ خانوں میں کوئی قندیل نہیں۔ بس زندگی کسی طرح لوگوں کو گذارتی جارہی ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ اجتماعی خودکشی کا رجحان عذاب بنا ہوا ہے لیکن خودکشی کا حوصلہ نہیں۔ اس لئے یہ عذاب بھی مرتے دم تک ساتھ رہے گا۔ نئے ادیبوں نے ایک دوسرے سے اس دوری، معاشرت اور سردمہری کو تنہائی کا مسئلہ بنا لیا ہے۔

لیکن کیا اسے تنہائی کا مسئلہ کہنا مناسب ہوگا؟ کیا سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ جلسوں کے ہنگامے دفتر کی چہل پہل گھر کی مستقل روں روں سے اکتائے ہوئے لوگوں میں یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کچھ دیر اکیلے رہ سکیں؟ بڑے شہروں میں جہاں کابکوں میں خاندان بستے ہیں یہ تنہائی بھی میسر نہیں، نہ گھر میں نہ بازار نہ تفریح گاہوں میں۔ اب سنسان راستوں اور آس پاس کے جنگلوں میں بھی شہری زندگی سے اکتائے ہوئے لوگوں کی ٹولیاں نظر آتی ہیں۔ ریڈیو ٹیلی فون ٹیلی وژن اور کتابوں کے روزن سے ہر لمحہ دنیا ہمارے خلوت کدوں میں جھانکتی رہتی ہے۔ رات میں سونا ممکن نہیں کہ "جاگتے رہو!" کی صدائیں بھی ہمارے عہد کی آوازوں میں شامل ہیں۔ جرائم بڑھ گئے ہیں اور تہذیبی ارتقا کا ساتھ دینے کے لئے کارخانوں میں رات کو بھی شور برپا رہتا ہے۔ زمانہ سفر میں ہے اس لئے راتوں کو بھی انجن چیختے رہتے ہیں۔

یہ سارا عذاب دراصل غلط رشتوں کا ہے۔ پرانے رشتے ٹوٹ گئے جو وجہ سکون تھے نئے رشتے جو ظہور پذیر ہوئے ہیں سامان ہلاکت ہیں۔ احساس مروت کو آلات نے اس طرح کچلا کہ ان کی جگہ دھوئیں اور کالک سے بھر گئی۔ مادی آسائش معاشی خوش حالی اور فراغت کی ہوس نے اس طرح حواس باختہ کیا ہے کہ اس کے حصول کے لئے ہر شخص اپنی اپنی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ یہ "ہم" کیسا تھا جس نے "میں" کے تار و پود بکھیر دیئے؟ سارا رونا اس بات کا ہے کہ ہم تنہا نہیں ہیں اس لئے تنہائی کا شدت اور کثرت کے ساتھ ذکر ہمارے مسئلے کو مذاق بنا دے گا۔ ہمارا مسئلہ تنہائی نہیں تنہائی کی تلاش ہے۔ یہ تلاش اس تلاش سے مختلف ہے جو صوفیا کے دل میں عشق حقیقی کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ اور جس کی تحریک انھیں شریعت طریقت اور معرفت کی حدوں سے آگے نکل کر حقیقت تک اس طرح پہنچاتی تھی کہ درمیان کا حجاب اٹھ جاتا تھا اور عرفان ذات کی تکمیل ہوتی تھی۔ یہ تلاش وہ تلاش بھی نہیں جس نے گوتم کو بودھ درکھش کی چھاؤں میں پہنچا دیا تھا۔ یہ تلاش چنگیز اور ہلاکو کی ہوس ملک گیری کے پودے میں اقتدار کی کھوج سے بھی الگ ہے۔ اسحق نیوٹن اور آئن اسٹائن کی دریافت اور جستجو سے بھی یہ تلاش مختلف ہے۔ غالب نے پوچھا تھا۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

لیکن اس تلاش کا اس سوال سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ سارا قصہ یہ ہے کہ ساری تلاش اس پیاس کی کیفیت رکھتی ہے جو پانی سے بھی بجھنے کی نہیں اور دنیا بھر کے گیان نے دماغ کو اتنا گنجلک کر دیا ہے کہ در مراد کی شناخت یا نشان دہی ممکن نہیں، پیچھے لوٹنا ممکن نہیں، آگے بڑھنا مستقل کوفت ہے اور ایک جگہ رکے رہنا فطرت کے عین منافی ہے:

سچ پوچھو تو اب میرا دکھ تنہائی نہیں
کچھ اور ہی بات ہے جس سے دل گھبرایا ہے

میں چاہوں تو:

مجھ کو بھی کوئی بیکار بہانہ جینے کا مل سکتا ہے
پر میرا دکھ تنہائی نہیں
کچھ اور ہی بات ہے، جس سے دل گھبرایا ہے

کمار پاشی کی نظم خواب تماشا" کے یہ مصرعے اس نظم کا اختتامیہ ہیں۔ بات سوال سے شروع ہوئی تھی اور سوال پر ختم ہوئی۔ اس کا جواب ڈھونڈنا اور ڈھونڈتے رہنا ہمارا مقدر ہے ☆☆☆

نسیم بن آسی
لفظوں کے درمیان
(افسانے)
قیمت : ۳۰۰ روپے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد

اردو شاعری کے نیم وا دریچے
(تنقیدی مضامین)
وارث کرمانی
زیر طبع
رضا لائبریری، رامپور ۲۴۴۹۰۱

شمیم حنفی

شمارہ ۷۹، دسمبر ۱۹۷۲

ہر نقش ترا لوٹ کے جانے کے لئے تھا
جو بھول چکا ہوں وہ بھلانے کے لئے تھا

کچھ بھید زمانے کے بھی مجھ پر نہ کھلے تھے
کچھ میں بھی ریاکار زمانے کے لئے تھا

کچھ میں نے بھی بے وجہ ہنسی اس کی اڑائی
کچھ وہ بھی مری جان جلانے کے لئے تھا

کچھ لنگ جزیروں پہ کھڑے تھے سو کھڑے ہیں
سیلاب سفینوں کو بہانے کے لئے تھا

پیاسا جو نہ ہوتا تو سمندر سے نہ ملتا
دریا جو مری پیاس بجھانے کے لئے تھا

گرنی ہی تھی اک روز یہ دیوار بدن کی
یہ راہ کا پتھر بھی ہٹانے کے لئے تھا

سب میری اداسی میں تجھے ڈھونڈ رہے تھے
ہنسنا بھی مرا تجھ کو چھپانے کے لئے تھا

اک لہر کہ بس خاک اڑانے پہ بضد تھی
اک رنگ کہ پلکوں پہ سجانے کے لئے تھا

اک لمحۂ خالی کی صدا سب نے سنی تھی
اک شور خموشی کو بڑھانے کے لئے تھا

خیرہ ہیں نگاہیں تو نہ کچھ دیکھ سکیں گی
منظر جو یہاں تھا نظر آنے کے لئے تھا

آپ اپنی جسارت سے تہ آب ہوا ہے
وہ ڈوبنے والوں کو بچانے کے لئے تھا

شمارہ ۲۸۶،
نومبر، ۲۰۰۴

(شمس الرحمٰن فاروقی کے لئے)

آنا اسی کا بزم سے جانا اسی کا ہے
کس کو پتہ نہیں کہ زمانہ اسی کا ہے

اس گھر میں کوئی چیز کسی اور کی نہیں
یہ پھول یہ چراغ فسانہ اسی کا ہے

اے مطلع ملال ہمارے لئے بھی کچھ
تاروں بھری یہ رات خزانہ اسی کا ہے

اک عہد کر لیا تھا کبھی بھول چوک میں
سانسوں کا یہ وبال بہانہ اسی کا ہے

اب اس گلی کے موڑ سے آگے نہ جائیں گے
سنتے ہیں آس پاس ٹھکانا اسی کا ہے

شہاب جعفری

شمارہ ۱۴،
جولائی ۱۹۶۷

ہوا اے ہوا!
میں ترا ایک انگ ایک لہر اتھا
صدیوں ترے ساتھ دشت و دمن، کوہ وصحرا میں
آزاد و سرشار پھرتا رہا ہوں
سمندر کی چھاتی پہ صدیوں ترے ساتھ
بے فکر و مست چلتا رہا ہوں
انوکھی زمینوں، طلسمی جزیروں کو دریافت کرتا رہا ہوں

مجھے تو نے فطرت کے معبد،
صنم خانۂ کائنات، آذری کے طلسمات سے آ کے باہر نکالا
مرے خوف سے کانپتے دل کو
وہموں میں ڈوبے ہوئے سر کو
سجدے سے تو نے اٹھا کر
انھیں آگہی و عمل کا نیا نور بخشا
مجھے خود سے اور خود سے باہر مظاہر سے
صدیوں ہم آہنگ ہونا سکھایا

سمندر کے دکھ کو سمجھنے کی خاطر
ابلتے ہوئے گرم، پر شور طوفاں کو ناپا ہے میں نے
بیاباں کی تنہائی کو دور کرنے کی خاطر
میں تپتی ہوئی ریت پر صدیوں پیدل چلا ہوں
بدلتے ہوئے موسموں کا ہر اک راز لینے کو میں جب
بہار و خزاں میں، درختوں کے سایوں میں ٹھہرا تو پتوں کی سانسیں
گنی ہیں۔
زمانے کا ہر سرد و گرم آزمانے کو صدیوں ہی تک میں
پہاڑوں کی برفیلی چوٹی سے
اور کوہ آتش فشاں کے دہانے سے گذرا کیا ہوں
اور اس پر بھی جب ناتمامی کا احساس ڈستا رہا
اپنی تکمیل کرنے کی خاطر
بلندی کی پرنور چوکھٹ کو
پستی کے تاریک غاروں کو چوما ہے میں نے
غرض زندگی کے ہر اک درد سے خود کو انگیز کر کے
ہوا اے ہوا!

میں کہ تجھ سے بچھڑنے سے پہلے
تری طرح آزاد و سرشار تھا
اب یہ کس طرح کی منہمک، ٹوٹتی زندگی ہے
کہ تو شہر شہر آدمی کی تگ و تاز کی تاب لانے کے قابل نہیں
اور میں شہر شہر ایک پتھر سا رستوں میں بے حس پڑا ہوں
تری سست پیائی اور اپنی بے چارگی کا گلہ کر رہا ہوں

زوال کی حد

شہریار

شمارہ ۶،
نومبر ۱۹۶۶

بوتل کے اندر کا جن
نکلے تو اس سے پوچھیں
جینے کا کیا ڈھنگ کریں
کن سپنوں سے جنگ کریں؟

کھولو سوڈا لاؤ گلاس
دو آنے کے سیخ کباب
سگریٹ بھی لیتے آنا
پارک میں کیا وہ آئی تھی
آج بھی کیا شرمائی تھی
کیسے کپڑے پہنے تھی
کیا انداز تھا جوڑے کا
تم نے اس سے پوچھا تھا
رات جو تم نے سوچا تھا؟
فیض کی تازہ نظم پڑھی
اور بیدی کا افسانہ؟
لوپ سے کیا حاصل ہوگا
دریا کیا ساحل ہوگا؟
بھوک سے جنتا مرتی ہے
پنجابی صوبے کے بعد
چین نئی دھمکی دے گا

اندرا جی کے بھاشن میں
پنڈت جی کی بات کہاں

شاستری اردو بولتے تھے
جن سنگھی کیوں سنتے تھے
آج کسی کی برسی تھی
ویسٹ انڈیز ہی جیتے گا
تھوڑا سوڈا اور ملاؤ
کدھر لویٹری ہے بتلاؤ
تم اتنے خاموش ہو کیوں
نظم کوئی کہہ ڈالی کیا؟
تو پھر کیا ہے ہو جائے
لیکن شرط ترنم ہے
پنکھے کی اسپیڈ بڑھاؤ
کٹھمنڈو نیپال میں ہے؟
سارتر کی بیوی کیسی ہے
ہم بندر کے پوتے ہیں
متھرا کے پیڑے بھی کھائے

لایعنی ہیں مرگ و زیست
بے معنی ہیں سب مخلوق
بے حس ہے مخلوق خدا
شادی غم اک دھوکا ہے
ہر انساں اک سایہ ہے
دل، آنکھیں، لب، ہاتھ، دماغ
ایک وبا کی زد میں ہیں
اپنے زوال کی حد میں ہیں

شہریار

ایک نظم

شمارہ ۲۰،
جنوری ۱۹۶۸

مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھوں سے کہو، اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

غزل

شمارہ ۸۸،
جنوری،فروری ۱۹۷۴

چمن در چمن پائمالی رہے
ہوا تیرا دامن نہ خالی رہے

ذرا ایک کروٹ کہ اشجار پر
کوئی پھول باقی نہ ڈالی رہے

جہاں معترف ہے ترے قہر کا
ابد تک تری بے مثالی رہے

کہیں سبز فصلیں دکھائی نہ دیں
زمیں پر یوں ہی خشک سالی رہے

خزاں، آگ، سیلاب اور تیرگی
ترے در پہ ہر شے سوالی رہے

بڑھے اور بھی دھند کا دائرہ
افق پر لہو رنگ لالی رہے

نہ میلی ہو مہندی کبھی ہاتھ کی
سدا آنکھ کا جل سے کالی رہے

شہریار

شمارہ۹۶،
جولائی تاستمبر ۱۹۷۵

پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اتری ہمارے گھروں میں رات

کچھ بھی دکھائی دیتا نہیں دور دور تک
چبھتی ہے سوئیوں کی طرح جب رگوں میں رات

وہ کھردری چٹانیں وہ دریا وہ آبشار
سب کچھ سمیٹ لے گئی اپنے پروں میں رات

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیئے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

بے سمت منزلوں نے بلایا ہے پھر ہمیں
سناٹے پھر بچھانے لگی راستوں میں رات

شمارہ ۱۳۵،
اکتوبر تادسمبر ۱۹۸۴

تیرے سوا بھی کوئی مجھے یاد آنے والا تھا
میں ورنہ یوں ہجر سے کب گھبرانے والا تھا

جان بوجھ کر سوچ سمجھ کر میں نے بھلا دیا
ہر وہ قصہ جو دل کو بہلانے والا تھا

مجھ کو ندامت بس اس پر ہے لوگ بہت خوش ہیں
اس لمحے کو کھو کر جو پچھتانے والا تھا

یہ تو خیر ہوئی دریا نے رخ تبدیل کیا
میرا شہر بھی اس کی زد میں آنے والا تھا

اک اک کر کے سب رستے کتنے سنسان ہوئے
یاد آیا میں لمبے سفر پر جانے والا تھا

شہریار

شمارہ ۱۵۱،
ستمبر اکتوبر ۱۹۸۸

...آگے بہت آگے آگیا

میں اس سفر میں آگے بہت آگے آگیا
پیچھے مڑا
تو پیروں کے نیچے کی یہ زمیں
مجھ سے حساب مانگنے لگی فصلوں کا
جن کو میں
بونا تو چاہتا تھا مگر بو نہیں سکا
دریوزہ گر کی طرح کسی موڑ کے قریب
عمر عزیز میں نے بسر کی کچھ اس طرح
آئندہ آنے والے دنوں کے خیال میں
میں نے کبھی بھی حال کی جانب نہ کی نظر
مٹی کا رنگ دیکھا
نہ اس کی صدا سنی
عجلت شعار اتنی طبیعت تھی
رات دن
اک دور کی صدا کی طرف بھاگتا رہا
جب خواب دیکھنے تھے تو میں جاگتا رہا
یوں اس طرح سے آگے بہت آگے آگیا

شمارہ ۱۹۹،
اکتوبر ۱۹۹۶

جو برا تھا کبھی اب ہوگیا اچھا کیسے
وقت کے ساتھ میں اس تیزی سے بدلا کیسے
جن کو وحشت سے علاقہ نہیں وہ کیا جانیں
بیکراں دشت مرے حصے میں آیا کیسے
کوئی اک آدھ سبب ہوتا تو بتلا دیتا
پیاس سے ٹوٹ گیا پانی کا رشتہ کیسے
حافظے میں مرے بس اک کھنڈر سا کچھ ہے
میں بتاؤں تو کسی شہر کا نقشہ کیسے
بارہا پوچھنا چاہا کبھی ہمت نہ ہوئی
دوستو راس تمھیں آئی یہ دنیا کیسے
زندگی میں کبھی اک پل ہی سہی غور کرو
ختم ہوجاتا ہے جینے کا تماشا کیسے

شہریار

شمارہ ۲۱۷،
جون ۱۹۹۸

تمھارے شہر میں کچھ بھی ہوا نہیں ہے کیا
کہ تم نے چیخوں کو سچ مچ سنا نہیں ہے کیا

تمام خلق خدا اس جگہ رکی کیوں ہے
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا

لہولہان سبھی کر رہے ہیں سورج کو
کسی کو خوف یہاں رات کا نہیں ہے کیا

میں ایک عرصے سے حیران ہوں کہ حاکم شہر
جو ہو رہا ہے اسے دیکھتا نہیں ہے کیا

اجاڑتے ہیں جو ناداں اسے اجڑنے دو
کہ اجڑا شہر دوبارہ بسا نہیں ہے کیا

خوف حکایت

مرے دل کی خوف حکایت میں
یہ بات کہیں پر درج کرو
مجھے اپنی صدا سننے کی سزا

ملی لمبی چپ کی صورت میں
مرے بولنے میں جو لکنت ہے
اسی لمبی چپ کا نتیجہ ہے

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

اسعد بدایونی

خواہش مرگ کی سرشاری میں یہ بھی نہیں سوچا
جینا بھی اک کار جنوں ہے اس دنیا کے بیچ
اور لمبے انجان سفر پر چلے گئے تنہا
پیچھے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے مڑ کے نہیں دیکھا

شہریار

شمارہ۲۷۲،
ستمبر۲۰۰۳

تری گلی سے دبے پاؤں کیوں گذرتا ہوں
وہ ایسا کیا ہے جسے دیکھنے سے ڈرتا ہوں

کسی افق کی ضرورت ہے میری آنکھوں کو
سو آج خلق نیا آسمان کرتا ہوں

بڑے جتن سے بڑے اہتمام سے تجھ کو
بھلا رہا ہوں محبت کا دم بھی بھرتا ہوں

اتارنا ہے مجھے قرض کتنے لوگوں کا
ذرا سکون ملے تو حساب کرتا ہوں

عجب نہیں کہ کسی یاد کا گہر مل جائے
گئے دنوں کے سمندر میں پھرا کرتا ہوں

یہ چاہتی ہے ہوا اس کو آزماؤں نہ میں
کوئی چراغ کہیں بھی کبھی جلاؤں نہ میں

سکوت سایہ رہے اس زمین پر دائم
کوئی صدا کوئی فریاد لب پہ لاؤں نہ میں

یونہی بھٹکتا رہوں عمر بھر اداس اداس
سراغ بچھڑے ہوؤں کا کہیں بھی پاؤں نہ میں

سفر نہ میرا کسی طور مختصر ہوجائے
وہ موڑ آئے کہ جی چاہے آگے جاؤں نہ میں

بھلا تو دوں ترے کہنے پہ دل سے تجھ کو میں
مگر یہ شرط ہے تجھ کو بھی یاد آؤں نہ میں

شہزاد احمد

شمارہ ۳۲،
جنوری ۱۹۶۹

اس دور بے دلی میں کوئی بات کیسے ہو
چاہیں بھی ہم تو خود سے ملاقات کیسے ہو
کاٹے نہیں گئے تو مرے ہات کیسے ہو
میرے نہیں ہو تم تو مرے سات کیسے ہو
پتھر برس رہے ہیں تو مجھ پر بھی آئیں گے
میں چپ رہوں مگر بسر اوقات کیسے ہو
کچھ دیکھتے نہیں ہو تو بینا ہو کس طرح
ٹھنڈے پڑے ہوئے ہو تو جذبات کیسے ہو
تم قیدیوں کی طرح مرے دل میں ہو اسیر
پھیلے نہیں جہاں میں خیالات کیسے ہو
اس روشنی میں چہرہ چھپاؤ گے کس طرح
تم مانگتے ہو رات مگر رات کیسے ہو
سورج نہ چاہتا ہو تو دن کس طرح ڈھلے
بادل ہی روٹھ جائیں تو برسات کیسے ہو
وہ چاہتے ہیں ان کے لئے میں دعا کروں
شامل اس آرزو میں میری ذات کیسے ہو
بندے کا اور خدا کا تعلق ہی مٹ گیا
پتھر ہوئی زبان مناجات کیسے ہو
ایسا کوئی جو میری زباں بھی سمجھ سکے
تم اجنبی ہو، تم سے میری بات کیسے ہو
میں اپنے دشمنوں کو بھی پہچانتا نہیں
شہزاد دوستوں سے ملاقات کیسے ہو

دیکھ تو اب اس ہیولے کو فنا ہوتے ہوئے
تو نے بندوں سے لڑائی کی خدا ہوتے ہوئے

فیصلہ ہونا ہے جو کچھ آج ہونا چاہئے
مدتیں لگ جائیں گی محشر بپا ہوتے ہوئے

سوچتا رہتا ہوں کب بدلے گی موسم کی ہوا
دیکھتا رہتا ہوں لمحوں کو ہوا ہوتے ہوئے

ہے بلا اب کون سی باقی جو مجھ پر آئے گی
میں کسی سے کیوں ڈروں بے دست و پا ہوتے ہوئے

دیکھتے رہتے ہو سب کچھ، بولتے کچھ بھی نہیں
کس قدر بے درد ہو درد آشنا ہوتے ہوئے

زرد چہرہ، سرخ آنکھیں کانپتے بے صبر ہونٹ
یہ سبھی کچھ اور دل بے مدعا ہوتے ہوئے

شادماں ہوں اپنی سب مجبوریوں کے باوجود
مطمئن ہوں روح کے اندر خلا ہوتے ہوئے

جن کو تو دھتکارتا ہے وہ بھی تیرے سائے ہیں
تو نے اتنا بھی نہیں سوچا خفا ہوتے ہوئے

آج کی تابندگی سے کل کا اندازہ نہ کر
دیکھ پتوں کو درختوں سے جدا ہوتے ہوئے

منتظر ہوں کون آتا ہے کوئی وحشی کہ چور
سن رہا ہوں پھر سے دروازے کو وا ہوتے ہوئے

شہزاد احمد

شمارہ ۴۲،
مارچ ۱۹۷۰

چپ کے عالم میں وہ تصویری سی صورت اس کی
بولتی ہے تو بدل جاتی ہے رنگت اس کی

سیڑھیاں چڑھتے اچانک وہ ملی تھی مجھ کو
اس کی آواز میں موجود تھی حیرت اس کی

ہاتھ چھولوں تو لرز جاتی ہے پتے کی طرح
وہی ناکردہ گناہی پہ ندامت اس کی

کسی ٹھہری ہوئی ساعت کی طرح مہر بہ لب
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی یہ اذیت اس کی

آنکھ رکھتے ہو تو اس آنکھ کی تحریر پڑھو
منہ سے ا قرار نہ کرنا تو ہے عادت اس کی

خود وہ آغوش کشادہ ہے کی طرح
پھیلے دریاؤں کی مانند محبت اس کی

روشنی روح کی آتی ہے مگر چھن چھن کر
ست رو ابر کا ٹکرا ہے طبیعت اس کی

ہے ابھی لمس کا احساس مرے ہونٹوں پر
ثبت پھیلی ہوئی باہوں پہ حرارت اس کی

وہ اگر جا بھی چکی ہے تو نہ آنکھیں کھولو
ابھی محسوس کئے جاؤ رفاقت اس کی

دل دھڑکتا ہے تو وہ آنکھ ملاتی ہے مجھے
سانس آتی ہے تو ملتی ہے بشارت اس کی

وہ کبھی آنکھ بھی جھپکے تو لرز جاتا ہوں
مجھ کو اس سے بھی زیادہ ہے ضرورت اس کی

وہ کہیں جان نہ لے ریت کا ٹیلا ہوں میں
میرے کاندھوں پہ ہے تعمیر عمارت اس کی

بے طلب جینا بھی شہزاد طلب اس کی ہے
زندہ رہنے کی تمنا بھی شرارت اس کی

شہزاد احمد

شمارہ ۵۴،
نومبر ۱۹۷۰

میں اکیلا ہوں یہاں میرے سوا کوئی نہیں
چل رہا ہوں اور میرا نقش پا کوئی نہیں

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے، اس نے کہا کوئی نہیں

دیکھ کر ہر ایک شے کا فیصلہ کرتے ہیں لوگ
آنکھ کی پتلی میں کیا ہے دیکھتا کوئی نہیں

کس کو پہچانوں کہ ہر پہچان مشکل ہوگئی
خود نما سب لوگ ہیں اور رونما کوئی نہیں

نقش حیرت بن گئی دنیا ستاروں کی طرح
سب کی سب آنکھیں کھلی ہیں جاگتا کوئی نہیں

گھر میں یہ مانوس سی خوشبو کہاں سے آگئی
اس خرابے میں اگر آیا گیا کوئی نہیں

پیکر گل آسمانوں کے لئے بے تاب ہے
خاک کہتی ہے کہ مجھ سا دوسرا کوئی نہیں

عمر بھر کی تلخیاں دے کر وہ رخصت ہوگیا
آج کے دن کے سوا روز جزا کوئی نہیں

شمارہ ۱۱۳،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۹

جاگتا بھاگتا گلیوں میں پھرے فن میرا
قمقمے پھول ہیں فانوس ہے گلشن میرا

میں نے تصور میں دیکھے ہیں بدلتے موسم
آنکھ پتھر ہے میری جسم ہے آہن میرا

گھر پرندوں کی صداؤں سے ہے خالی خالی
شہر کے شور میں ڈوبا ہوا آنگن میرا

جب بھی آتی ہے اندھیرے کی کرن آتی ہے
کسی سورج کے مقابل نہیں روزن میرا

ابھی زنجیر کا احساس نہیں پاؤں کو
کس طرح توڑ سکے گا کوئی بندھن میرا

اپنے اسرار تلک میری رسائی بھی نہیں
دل کے بھی چور سے لوٹا نہ گیا دھن میرا

کشت جاں دیکھتی رہتی ہے گذرتے بادل
کھل کے اک بار بھی برسا نہیں ساون میرا

زندگی بیت گئی کتنی زلیخاؤں میں
پھر بھی یوسف کی طرح خشک ہے دامن میرا

گفتگو زرد ستاروں سے ہوئی آخر شب
بجھ گئی رات تو سینہ ہوا روشن میرا

دوستی بھی نہیں میری، مرے ہمسائے سے
یعنی اس شہر میں کوئی نہیں دشمن میرا

دشت بھی خواب ہیں دریا بھی ہیولے شہزاد
گھر سے باہر بھی گذرا نہیں بچپن میرا

صابر ظفر

شمارہ ۱۱۹،
فروری، مارچ ۱۹۸۱

نہ کوئی سر بسجود اور نہ کوئی قبلہ رو
دھڑک رہا ہے یہ دل بے نیاز اللہ ہو

میں رو دیا کہ مجھے یاد آئیں شدت سے
کبھی کبھی تری مجبوریاں کبھی کبھی تو

اتر رہا ہوں اگر دل سے سیڑھیوں سے نہیں
تو ٹوٹ کیوں نہیں جاتے یہ پاؤں یہ بازو

یہی تو ہے مرا دل مجھ گناہ گار کا دل
یہاں نہیں ہے اگر تو کہیں نہیں ہے تو

بکھر رہا ہے مسلسل مرا وجود ظفر
نہ زندگی نہ مری شاعری ہی چارہ جو

صبا اکرام

شمارہ ۱۲۸،
فروری تا اپریل ۱۹۸۳

کنوارے کھیت میری خواہشوں کے
تشنگی کی دھوپ میں
جلتے ہیں
سیم اور تھور مایوسی کے
کالے قہر کی صورت
لہو کا ایک اک قطرہ
رگوں سے چوستے جاتے ہیں
پیلے موسموں کی چپ
بنی ہے بھاگ کی ریکھا
کہ صدیوں سے قحط گیتوں کا ہے
جو فصل کٹتے وقت گاتی ہیں
تھرکتی، ناچتی
بستی کی بالائیں
یہاں صدیوں سے برکھا رت کو
جیون کا ہر اک لمحہ
ترستا ہے
یہاں کھیتوں کے لب کی پپڑیوں پر
تشنگی کا
قطرہ قطرہ بس ٹپکتا ہے

ادب کے نفسیاتی مطالعے کے اصول

صبا جائسی

شمارہ ۴،
ستمبر ۱۹۶۶

نفسیاتی مطالعے کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ان تقاضوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ایک واضح مربوط اور کامیاب مطالعہ ممکن ہوسکتا ہے۔

نفسیاتی مطالعے کا تقاضہ یہ نہیں ہوتا کہ مختلف ادبی نظریات کو جا و بیجا استعمال کرکے ایک علمی گورکھ دھندا بنا دیا جائے اور قاری کے لئے اسے اتنا نا قابل فہم بنا دیا جائے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ کو خطا وار تصور کرنے لگے، بلکہ اس کا مقصد ادب اور ادیب کو زیادہ واضح انداز میں سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔

فرد کا مطالعہ

ادب کی تخلیق کا ذمہ دار بنیادی طور پر ادیب ہوتا ہے جو عام انسانوں کی طرح ایک فرد ہے۔ جس طرح ایک فرد کی شخصیت کے مختلف عوامل اسے کسی مخصوص کام کو سرانجام دینے میں مدد دیتے ہیں اور اس کی شخصیاتی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں، اسی طرح ادیب کی شخصیت کے مختلف عوامل اسے ادب پارے کی تخلیق اور اس میں اس کی شخصیاتی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ادب کی تخلیق میں فرد کی اہمیت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کائنات کی دوسری اشیا کو وجود میں لانے کے سلسلہ میں خالق کائنات کی۔ادیب کے اپنے ادبی تخلیقی عمل کے مراحل ہوتے ہیں۔

جمالیاتی تخلیق صحیح معنوں میں ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔اسے ایک لاشعوری حقیقت کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ ہر فن کے پس پشت تجربات، احساسات، یا ردعمل کا خزانہ ذہن کے نہاں خانوں ہی میں دفن رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر تخلیق لازماً انفرادی اور لاینفک طور پر شخصی ہوتی ہے۔انفرادی اور شخصی سے یہاں مراد وہ حیثیت نہیں ہے جس پر فن برائے فن کے موئدین اصرار کرتے ہیں، بلکہ اس پہلو پر زور دینا ہے کہ ہر فرد یا فن کار اپنی تخلیق میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔اس کی بہت دلچسپ مثال یہ ہے کہ ہر بچہ (جو اپنے باپ کی تخلیق ہوتا ہے) اپنے اندر باپ کی صورت، خصلت اور عادات و اطوار کی جھلکیاں رکھتا ہے۔

جمالیاتی تخلیق یا تکمیلی ماحصل (Final Product) کی کیفیت تخلیقی عمل کے دوران کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ جیسے اس کے گرد ایک نورانی دائرہ ہو اور اس حلقۂ نور کی تابانی فن کار کی رہنمائی بالکل اسی طرح کرتی ہے جس طرح شعلۂ طور نے حضرت موسیٰ کی رہنمائی کی تھی۔ جب فن کار تکمیلی ماحصل کی اس تجلی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے باطن میں کارفرما نفسیاتی اعمال اس کے اعجاز کا تعین کرتے ہیں...آیا وہ موسیٰ طرح طور پر پہنچ جائے گا یا کفش موسیٰ کی طرح دامن طور میں رہ جائے گا؟

ایک فن کار اور دوسرے افراد میں صرف ایک فرق ہے وہ یہ کہ فن کار اپنے ذہنی عمل کو ایک عام فرد کے مقابلہ میں قدرے مختلف انجام کی طرف موڑ دیتا ہے۔یا ایک ذرا سے مختلف انداز سے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ فن کار اپنی روزمرہ کی زندگی کے تخلیقی حالات (Creative Situations) میں مشغول رہتا ہے اور ان

کو فروغ دیتا رہتا ہے لیکن ایک عام فرد اس طرف پوری طرح سے متوجہ نہیں ہو پاتا۔ بہر حال اس کی کوئی معقول دلیل نہیں نظر آتی کہ ہم ایک فن کار اور غیر فن کار کے طریقۂ فکر (Thinking) اور حسیت (Sensation) کو یکساں حالات میں مختلف النوع تصور کرلیں۔ البتہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ تخلیقی عمل کی خصوصیات ان افراد میں بہ آسانی بیدار ہوجاتی ہیں جو فن پارہ کی تخلیق میں ہمہ وقت مشغول رہتے ہیں۔ اور ان افراد میں یہ بیداری خام ہوتی ہے جو فن کار کی سطح سے فروتر ہوتے ہیں(۱)۔

تخلیقی حالت کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی فکر اور تخیل کو متحد کرتی ہے۔ یہ عقدہ کشائی (Problem Solving) اور توہم Fantasy دونوں کی اکثر خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ عقدہ کشائی کی ایسی قسم ہے جس کا سوچا سمجھا، یا صحیح حل پہلے سے موجود نہیں ہوتا، لیکن اظہار ذات کا غالب محرک اس کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ توہم سے یہ اس لحاظ سے مماثلت رکھتی ہے کہ یہ گذرے ہوئے تجربات کی آزادانہ تنظیم کرتی ہے اور ساتھ ہی داخلی اور ذہنی وجذباتی کیفیات سے متاثر ہوتی ہے۔ لیکن توہم سے یہ اس لئے مختلف بھی ہوتی ہے کہ یہ غیر معمولی اختیاری انضباط کے تحت ہوتی ہے (کم از کم ذہنی فعل کے بہت بڑے عرصے میں)، اور یہ اختلاف اس لحاظ سے بھی ہے کہ تخلیقی حالت کا اظہار کیا جاسکتا ہے(۲)۔ ابلاغ کے ذریعے اس کا خارجی وجود قائم کیا جاسکتا ہے اور آخر کار اس کی تکمیل کسی محسوس تکمیلی ماحصل کی شکل میں ہوتی ہے جو ہمیشہ ندرت اور تسکین کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ندرت تسکین اور اختیاری انضباط کے عوامل وسیع حدود کے اندر بدل سکتے ہیں۔ اس طرح تخلیقی فعل بعض اوقات ایک سادہ سی عقدہ کشائی ہوسکتا ہے اور دوسرے اوقات میں یہ قریب قریب ایک توہم یا ایک خواب ہوسکتا ہے جسے بعد میں کسی ہیئت میں ظاہر یا پیش کیا جاسکے۔

تخلیقی حالت کی ابتدا ایک خارجی مہیج (External Stimulus) سے بھی ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک مصوری کو ایک تصویر تیار کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے، ایک ڈراما نگار کو ڈراما لکھنے کی ہدایت کی جائے، یا ایک شاعر کو نظم کہنے کی پیش کش کی جائے... اب صرف یہ تقاضا انھیں ذہنی عمل پر آمادہ کرے گا اور وہ اپنے تخیل، حسیات، اور فکر کو تخلیقی حالت میں داخل ہونے پر آمادہ کریں گے اس طرح ہماری روزمرہ زندگی میں یہ سرعت تخلیقی حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا وجود ماحول میں کسی مسئلے کے پیش آنے پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسری طرف، تخلیقی حالات کم از کم ایک باطنی مخرج بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ایک خواب ایک شاعر کے سامنے مختلف تمثالات (Images) پیش کرسکتا ہے۔ ایک افسانہ نگار کو کہانی کا موضوع فراہم کرسکتا ہے یا ایک ڈراما نگار کے شعور میں ایسی نمایاں آمد پیدا کرسکتا ہے کہ وہ ڈراما تیار کرلے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ حسیات، تمثالات، اور موضوعات وغیرہ کو محسوس شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ عقدے کے حل سے مماثلت اختیار کرلیتی ہے(۳)۔

ان قابل لحاظ امور کے ذریعہ متعین طور پر مخصوص فن پارے کی تخلیق ہوتی ہے جو بہر حال تخلیقی حالت کی وجہ سے ہی وجود میں آتی ہے، لیکن تخلیقی حالت اپنے اندر ایک وسیع کیفیت بھی رکھتی ہے جو ان امور کے علاوہ ہوتی ہے۔ تخلیقی حالت کو ایک مخصوص حلقۂ عمل (Field) میں خالق یا فن کار کی ایک دائمی کیفیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا فرد ہے جس کی زندگی کا مقصد تخلیق کرنا ہے وہ نہ صرف ایک فن پارہ تخلیق کرتا ہے بلکہ اپنے کارنامۂ حیات کا ایک جزو پیش کردیتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں اظہار ذات یا خودشناسی کی زندہ تمنا، جوش عمل کا فریضہ انجام دیتی ہے حالانکہ خصوصی مہیج یا عقدے کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے تاکہ فن کار کی تخلیقی لگن کسی مخصوص سمت میں رہنمائی حاصل کرسکے (۴)۔

تخلیقی انفعال خالصاً ذاتی انفعال ہیں اور ہر فن کار کو اپنا فن پارہ تخلیق کرتے ہوئے یکساں مراحل سے نہیں گذرنا پڑتا، نہ یکساں تخلیقی حالت میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک فن کار کے لئے مہیج ایک نوعیت کا ہو اور دوسرے کے لئے دوسری نوعیت کا۔ اسی طرح تخیل، فکر اور حسیت میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے، ذہنی انفعال اور ماحصل کی ہیئت بھی مختلف ہوسکتی ہے لیکن تخلیقی عمل کے متعدد عمومی پہلوؤں یا منزلوں کا تعین کسی نہ کسی حد تک ضرور کیا جاسکتا ہے(۵)۔ یہ منازل ہلمولٹز (Helmholtz) کے نزدیک تین ہیں۔ اولاً ابتدائی جستجو کا دور، دوئم آرام اور راحت کا دور جو آخری دور پر ختم ہوتا ہے، سوئماً اچانک اور غیر متوقع ممکنہ حل کا سمجھ میں آجانا۔ لیکن پوانکیر (Poincare) نے ہلمولٹز کے تین ادوار میں ایک چوتھے دور کا بھی اضافہ کیا ہے، جو کام کا شعوری دور ہے۔(۷) یہ دور مسئلہ کے حل کے اچانک ظہور پذیر ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جسے الہام اور تنویر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ویلیس Wallace نے ان چاروں منازل کو تیاری، پرورش، تنویر اور تصدیق کے ناموں سے موسوم کیا ہے (۸)۔ تخلیقی عمل کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم تحقیقات کیتھرین پیٹرک (Catherine Patrick) کی ہیں جس نے ان منازل کی واضح تشریحیں بھی پیش کی ہیں۔

۱۔ تیاری (Preparation) اس مفروضے کے مطابق کہ تخلیقی حالت میں فعل کا پہلا دور جستجو اور روشناسی کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس نے معلوم کیا کہ فکر و احساس کے ادوار میں پہلے چوتھائی عرصہ میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں(۹)۔

۲۔ پرورش (Incubation) دوسرے دور کے لئے خارجی ثبوت اور نئے خیال کے دوبارہ واقع ہونے کی تلاش کا یہ دور فعل (Activity) کے بعد کے ادوار میں آتا ہے اور آخر کار تکمیلی ماحصل کے غالب موضوع (Dominant Object) میں ضم ہوجاتا ہے(۱۰)۔

۳۔ تنویر (Illumination) کو اس نے اس دور سے منسوب کیا ہے جس میں فن پارہ کی عمومی ہیئت خیال میں آتی ہے۔ تنویر اس وقت میسر ہوتی ہے جب کہ خیال کا مزاج جواب تک پرورش پاتا رہا ہے، متعین طور پر کسی مخصوص مقصد کے ساتھ منسوب ہوجاتا ہے(۱۱)۔

۴۔ تصدیق (Verification) تخلیقی عمل کا چوتھا مرحلہ اپنی تعریف

کے مطابق وہ ہونا چاہئے جس میں تنویر کے دور میں نشو ونما پائے ہوئے مواد پر تفصیلی کام کیا جاتا ہے، اس پر تنقید کی جاتی ہے اور اس کو ہر پہلو سے سنوارا جاتا ہے۔ پیٹرک کے خیال میں نظر ثانی کا زیادہ تر کام اس چوتھے ربع میں کیا جاتا ہے(۱۲)۔

تخلیقی عمل کی اس تشریح کا مشاہدہ اور مطالعہ ان ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے جو ہمارے ہم عصر ہوں اور ہم ان کے تخلیقی عمل کا مشاہدہ کرنے کی حیثیت میں ہوں۔ لیکن وہ ادیب یا شاعر جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں اور جن کے تخلیقی عمل کا مشاہدہ اب کسی طور ممکن نہیں ہے، ان کا مطالعہ ان منازل کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر ہم ان کے زمانہ تخلیق اور ان حالات کا تعین کر سکیں جس میں انھوں نے اپنے مخصوص فن پاروں کی تخلیق کی ہے تو ہم تخلیقی عمل کے اس نفسیاتی مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے نفسیاتی مطالعے میں ہمیں فرد یا فن کار کے مطالعہ کو اس نوعیت سے بہر حال اہمیت دینی ہوگی کیونکہ وہ اپنی شخصیت کے اظہار اور اپنے ردعمل (Reactions) کو ادبی تخلیق پر کس حد تک اثر انداز کرا سکا ہے۔

ماحول کا مطالعہ

فرد کا نفسیاتی کردار (Psychological behaviour) اس کے خارج پر بڑی حد تک منحصر ہوتا ہے۔ اس کو اپنے مہیجات اور ان کے ردعمل کے لئے اپنے سے خارج حلقۂ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فرد کے لئے خارج نہ ہو تو اس کا تمام عمل کالعدم ہو جائے گا۔ نفسیات کی روشنی میں فرد کا ماحول اس کی ذات سے خارج ہر چیز ہے۔ یہ خارج مادی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مادی بھی۔ اس کا وجود محسوس بھی ہو سکتا ہے اور غیر محسوس بھی، ایک فرد کے لئے دوسرا فرد اس کا ماحول بن سکتا ہے اور دوسرے فرد کے لئے پہلا فرد(۱۳)۔ بعض اوقات عمل یا ردعمل کے لئے ہوا کا ایک جھونکا بھی تحریک (Motivation) کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً ؎

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

کوئی بھی فرد اپنے ماحول سے آزاد نہیں رہ سکتا جب تک اس کو اپنے ماحول سے خواہ وہ خوشبو کی ایک لپٹ بھی کیوں نہ ہو تحریک نہ ملے وہ عمل کی طرف راجع نہیں ہو سکتا۔ گویا اس طرح فرد اپنے ماحول کا پابند ہے اور ماحول کی قضا و قدر پر اس کی شخصیت کے تمام نفسیاتی عوامل کا انحصار ہے۔ اگر اس تعریف (Definition) کی روشنی میں ہم کسی فرد کے کسی عمل کا تجزیہ کرنا چاہیں تو ہم اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے اس کے عمل کی ایک ایک گرہ کو کھول سکتے ہیں (۱۴)۔ لیکن انسانی عمل اس قدر آسان نہیں ہے کہ اس کا تجزیہ یوں دو اور دو چار کی طرح کر دیا جائے۔

فرائڈ نے بنیادی طور پر ماحول کے اسی تصور کو اختیار کیا ہے لیکن وہ اس کی پیچیدگی کو زیادہ باوزن بنانے کے لئے لاشعور کی پہنائیوں کو بڑھاتا چلا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لاشعور ایک تاریک اور لامحدود تہ خانہ ہے جس کے اندر روشنی کی کرن داخل نہیں ہوتی اور جہاں سے کسی چیز کا برآمد کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک لاشعور خود اسے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف نہ بڑھا دے (۱۵)۔ لیکن ماحول کی جبریت اگر من وعن مان لی جائے تو پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ فرد کے ہر عمل کا تجزیہ نہ کیا جا سکے۔ مزید برآں یہ تعریف فرد کو محض ایک آلہ یا مشین بنا دیتی ہے۔ یعنی فرد کی اپنی حیثیت کچھ نہیں ہے اصل حیثیت ماحول کی ہے، ماحول جو کچھ اور جس طرح کچھ چاہتا ہے فرد سے کرا لیتا ہے اور فرد اس کے سامنے بے دست و پا ہوتا ہے۔ گویا فرد تو ایک مجبور محض ہستی ہے اور ماحول ہی مختار کل ہے(۱۶)۔

ماحول کے سلسلہ میں دوسرا نظریہ گشٹالٹ (Gestalt) مکتبۂ فکر کا ہے۔ جس کے موید ین ورداٹمر (Wertheimer) کوفکا (Kofka) اور کوہلر (Kohler) ہیں۔ ان کے نظریہ کو کورت لیون (Kurt Lewin) نے زیادہ وسیع نفسیاتی میدان میں پیش کیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان اور اس کا دائرۂ عمل وسیع ہو جاتا ہے، فرد ماحول کی جبریت کا دست نگر نہیں رہتا، وہ اپنی ذات کو کائنات سے بے تعلق کر کے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ عرصۂ حیات (Life Space) کا ایک عامل ہوتا ہے۔ ایک طرف اگر ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ بھی ماحول پر انداز ہوتا ہے(۱۷)۔ کورت لیون کے نظریے کی تین بنیادی صفات ہیں۔ اولاً یہ کہ عمل اس حلقۂ عمل کا تفاعل ہے جو اس عمل کے وقت موجود ہوتا ہے۔ ثانیاً، اس عمل کا تجزیہ مکمل حالت (Situation) کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا جاتا ہے اور اسی سے اجزائے ترکیبی میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ثالثاً محسوس فرد کو محسوس حالت میں ریاضیاتی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے(۱۸)۔ یعنی ایک محسوس حالت میں مادی فرد کی پیمائش اعداد و شمار میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس آخری صفت کو کورت لیون غیر معمولی اہمیت نہیں دیتا اور مادی عضویاتی توجیہ کے مقابلے میں نفسیاتی توجیہات ہی کو اہمیت دیتا ہے۔ ماحول کا یہ نظریہ اپنے اندر رجائیت اور وسعت رکھتا ہے۔ یہاں فرد مجبور محض نہیں ہے اس کے اندر اس صلاحیت کا اقرار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں اپنی افتادِ طبع ضرورت اور حالت کے مطابق اپنے عمل یا ردعمل کا انتخاب کرے۔ وہ قریب قریب ایک ہی نوعیت کی دو حالتوں میں ایک سے عمل کا پابند نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک موقع پر وہ فراریت کی طرف راجع ہو اور دوسری طرف مقاومت کرے(۱۹)۔

اس نظریے کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ ماضی کی خاطر خواہ توجیہ نہیں کر پاتا اور نہ مستقبل کو کوئی خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک صرف حال ہے جو فرد کا عرصۂ حیات ہے۔ اس عرصۂ حیات سے باہر فرد کے لئے کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ اگر وہ ایک عرصۂ حیات سے فرار اختیار کر کے باہر نکلتا ہے تو وہاں بھی وہ اپنے گرد ایک دوسرا عرصۂ حیات قائم کر لیتا ہے اور جب اسے ماضی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اسے حال کے عرصۂ حیات میں شامل کر لیتا ہے اس طرح ماضی حال ہی کا جز و بن جاتا ہے(۲۰)۔ لیکن یہ توجیہ کچھ زیادہ باوزن نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ماضی کا سرمایہ نظریہ حلقۂ عمل (Field Theory) کے نزدیک زیادہ لائق

التفات نہیں ہے۔

یونگ (Jung) کے نظریے میں ہمیں یہ صفت ملتی ہے کہ وہ حال اور ماضی کو یکساں اہمیت دیتا ہے، گو وہ فرد کو جبریت سے نظریۂ حلقۂ عمل کی طرح آزاد نہیں کرا پاتا، لیکن فرد کے حال اور اس کی ذات اس کے معاشرہ اور اس کے ماحول کو پوری طرح اہمیت دیتا ہے۔ یونگ کے نزدیک انسانی معاشرہ کے ابتدائی دور میں فرد خود کو ماحول سے تمیز نہیں کر پاتا تھا اور وہ خود کو ماحول کا ایک جزو سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ جس طرح اپنے اندر احساسات تاثرات اور ردعمل کا تجربہ کرتا تھا۔ اسی طرح وہ کائنات کی ہر ذی روح کے بارے میں تصور کرتا تھا۔ اسی تصور نے اسے اصنام مادی و اصنام خیالی کی پرستش کی طرف یا ان سے خائف ہونے کی طرف موڑ دیا (۲۱)۔ فرد جس قدر اپنی ذات کے بارے میں شعور حاصل کرتا گیا اتنا ہی وہ اپنے ماحول سے خود کو تمیز کرتا گیا اور ماحول کی اشیا میں امتیاز کرنے میں کامیاب ہوتا گیا لیکن ابتدائی انسانی تجربات اس کے ذہن سے کلیتاً محو نہ ہوئے۔ گاہے گاہے یہ توہمات اس کے لاشعور میں سر ابھارتے رہے اور نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے (۲۲)۔ البتہ ان کا اظہار نسل انسانی کا ارتقا کے ساتھ استعاراست اور خام نہ رہا جتنا ابتدا میں تھا۔ بلکہ ان تصورات نے اب علائم یا تمثالات (Images) کی اہمیت اختیار کر لی مثلاً

از آں بہ دیر مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست

☆

تنم از واسطۂ دوری دلبر بگداخت
جانم از آتش ہجر رخ جانانہ بسوخت

☆

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

☆

باصنمے چو لعبتے خوش بنشیں بخلوتے
بوسہ ستاں بکام دل تازہ بہ تازہ نو بہ نو

☆

اسم اعظم بکند کار خود اے دل خوش باش
کہ بہ تلبیس و حیل دیو مسلماں نہ شود

☆

آتش روے بتاں برخود مزن
ورنہ از آتش گذر کن چوں خلیل

☆

گر چنیں جلوہ کند مغبچۂ بادہ فروش
خاکروب در میخانہ کنم مژگاں را

یونگ کے نظریۂ ماحول میں ہمیں جو وسعت ملتی ہے وہ صرف ایک فرد یا حال تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ اپنی محیط میں مادی اور غیر مادی کائنات کو لے لیتی ہے۔ وہ فرد کو اس طرح نہیں پیش کرتا ہے کہ دوسرے افراد محض انفعالی اور جامد عوامل ہیں، یا ایک فرد اپنے ماحول میں دوسرے عوامل سے ذی حیات تعلق توڑ رکھتا ہے، لیکن دوسرے عوامل اس کے لئے تقریباً غیر ذی حیات بن جاتے ہیں۔ فرد کا ماحول اس کے لئے دھندلا اور مفرداتی نہیں رہتا بلکہ ایک جیتی جاگتی کائنات بن جاتا ہے، جس میں اس کی اہمیت بھی اتنی ہی ہے، جتنی دوسری اشیا کی۔

اس نقطۂ نظر سے ہم کسی شاعر یا ادیب کے ماحول کا جائزہ لیں تو ہمیں اس کے افکار و نظریات کے پس پشت ایک وسیع و عریض کائنات نظر آئے گی جس کے افق اس کے ماضی تک پھیلے ہوں گے، جس کے رموز میں ابتدائے انسانیت اب تک کے تجربات کی شمولیت ہوگی، اور جس کے ہر کنائے، ہر استعارے، ہر تلمیح کے اندر تہ بہ تہ اسرار پنہاں ہوں گے۔ ان پردوں کو جس قدر بالغ نظری کے ساتھ فاش کیا جائے گا، شاعر یا ادیب کی علمی و ادبی گہرائی و گیرائی کی تھاہ مل سکے گی۔

ادبی محاسن و روایات کا مطالعہ

نفسیاتی مطالعہ کے سلسلہ میں صفحات گذشتہ میں جن دو زاویوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے کچھ اور بھی پہلو نکلتے ہیں جن کے بارے میں حالانکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرد یا ماحول کے مطالعہ سے بالکل آزاد زاویہ ہائے مطالعہ ہیں لیکن ان کو انفرادی اہمیت محض اس وجہ سے دینی پڑتی ہے کہ فرد اور فرد کی ذہنی تعمیر کے جو اثرات تخلیقی عمل پر پڑتے ہیں اور ان کے جو نتائج تکمیلی ماحصل پر مترتب ہوتے ہیں ان سے ایسے زاویے بھی پیدا ہوتے ہیں جو خالصتاً داخلی نہیں ہوتے بلکہ ان پر داخلی اثرات کی بھی چھاپ ہوتی ہے، یا جن کو ہم بادی النظر میں خارجی محاسن کہتے ہیں۔ یہ خارجی محاسن بھی اپنے باطن میں نفسیاتی نہیں رکھتے ہیں۔

ادبی روایات اور محاسن کا جب ہم تجزیہ کریں گے تو ہمیں ان کے قالب میں انسانی تجربات تصورات اور اقدار حیات کا ایک سرمایہ ملے گا۔ تہذیب جس طرح فرد کو اس کے ماحول سے اور اس کے ماحول کو جس طرح اس کے ذہن کے ساتھ یا اس کی نفسیاتی اکائی (Unit) سے مانوس کر دیتی ہے، اسی کے مطابق فرد کا خارجی ردعمل متعین ہوتا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کا انداز ہمارا تصور اور تخیل ہمارا استدلال اور ادراک اس دائرہ سے یقیناً باہر نہیں جا پاتا جو ہمارے ماحول نے ہمارے لئے فراہم کیا ہے مثلاً مشرقی ادب (۲۳) کے محبوب کا تصور اور مغربی ادب کے محبوب کا تصور باوجودیکہ کسی حد تک مماثل ہے، لیکن دونوں جگہ کے آداب عشق اپنے ماحول یا اپنی تہذیب سے ایک گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ہر ماحول کا عاشق اپنے جذبات کا اظہار انھی اقدار کی روشنی میں کرے گا جو اس تہذیب کا خاصہ ہیں۔ مثلاً مشرقی تہذیب میں عصمت و عفت کے تصور نے صنفی عشق کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے اور اس کا علی الاعلان اظہار معیوب تصور کیا جانے لگا۔ اس لئے محبوب کی شخصیت کے لئے ایک استعاراتی صنف کا تصور متعارف ہوا اور محبوب میں بجائے

نسوانی صفات کے مردانہ صفات پیش کئے جانے لگے۔ لیکن مغربی ادب میں اس طرح کی کوئی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے محبوب کا صحیح مقام اور اس کی صحیح صنف باقی و برقرار رہی۔ تہذیب و ماحول کی اس طرح کی پابندیاں یا آزادیاں ادب کو مختلف راہوں میں بڑھنے یا مڑنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس طرح ادب کے لئے جو راہ بنتی ہے وہی اس کی روایت قرار پاتی ہے۔

ادب کی ہیئت میں تہذیب و معاشرت کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور اس کی اصناف کا تعین بھی اس ماحول کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ مثلاً یونانی ادب بنیادی طور پر اصنام پرستی کا مظہر ہے، Dithyrambic ہے۔ اس لئے ان کی زیادہ تر اصناف ادب Dithyrambic یا Gnomic شاعری پر مشتمل ہیں۔ جو ادب اس کے علاوہ ہے، یعنی رزمیہ (Epic) المیہ (Tragic) یا طربیہ (Comic) وہ بھی بنیادی طور پر مذہبی ادب ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے حالات زندگی، انسان اور اصنام کے تعلقات وغیرہ، پر ان تمام اصناف سے روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح اگر ہم عربی ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو عربوں کی شجاعت، صداقت پسندی، حریت، بے خوفی وغیرہ ان کی مقبول اصناف رجز، قصیدہ، وغیرہ کا تعین کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک عشق بھی ایک شجاعت رہا ہے، اس لئے ان کے ابتدائی ادبی ادوار میں غزل کا وجود نہیں ملتا۔ بس زیادہ سے زیادہ چند غزلیہ اشعار قصیدے کی تشبیب میں مل جاتے ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کے سنسکرت اور ہندوی ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہاں کی شاعری میں انفعالیت، عاشق میں نسوانیت اور اسی طرح کے لطیف صنفی تاثرات ملیں گے جو یہاں کے معاشرے کے اس پہلو کے غماز ہیں کہ مرد و عورت کے لئے ہمیشہ ایک در نایاب رہا ہے۔ اس عشقیہ شاعری سے ہٹ کر ہمیں تمام ہندوی اور سنسکرت ادب میں جو ادب ملتا ہے وہ اصنام پرستی کا ادب ہے۔ جو یہاں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔

فارسی ادب کے بھی اصناف کا تعین کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ ایرانی تہذیب عربوں کے غلبہ سے قبل ہی ایک مستحکم اور ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ اس کی معاشرتی اقدار کا تعین بڑی حد تک ہو چکا تھا۔ عربوں کے غلبے نے ان اقدار کو یکسر نیست و نابود نہیں کیا، بلکہ ان کو اپنی تہذیب کے اثرات سے ایک نئی شکل دے دی۔ اس طرح فارسی تہذیب و ادب نے جہاں اپنے قدیم تصورات کو برقرار رکھا، وہاں عربی تصورات ادب کو بھی اپنے اندر ضم کر لیا اور بعض اصناف ادب عربی ادب کے اثر کی بنا پر عالم وجود میں آئیں جن میں سب سے نمایاں غزل ہے جو عربی قصائد کے عشقیہ اشعار کی توسیع Extension ہے۔ لیکن غزل کا بنیادی رجحان وہی رہا جو ایرانی تہذیب و معاشرت کا رجحان تھا۔

ایران کی شخصی حکومتوں نے شخصیت پرستی اور انفرادیت کو جو اہمیت دی تھی، یا زرتشتی تصورات نے انفرادی زندگی کو جو مقام دیا تھا اس کی وجہ سے فرد ایک انفرادی ذات یا لاتعلق اکائی بن گیا، اور رفتہ رفتہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک مفرداتی رجحان پروان چڑھنے لگا۔ عمرانی نقطۂ نظر سے اگر ہم غزل، قصیدہ، مرثیہ، سلام، وغیرہ اصناف ادب پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہر شعر اپنی جگہ پر ایک اکائی ہے اور اس کی ایک انفرادی حیثیت ہے۔ ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی مربوط تعلق نہیں۔ گویا ادب میں بھی وہی مفرداتی رجحان تہذیبی روایت کی بنیاد پر راہ پا گیا۔ اسی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبی و معاشرتی روایات اصناف ادب کی صورت گری میں بہت بڑا حصہ ادا کرتی ہیں۔ اس پہلو کو نظر انداز کر کے کسی صنف ادب کا مطالعہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کسی شخص کو شش جہات سے منقطع کر کے معلق کر دیا جائے اور پھر اس کے عمل و کردار پر رائے زنی کی جائے۔

ادب کی تلمیحات، استعارات، تشبیہات و کنایات وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ ایک شاعر تلمیح و استعارہ کے لئے اپنے مانوس ماحول سے باہر نہیں جا سکتا۔ خاص طور سے تلمیحات کے معاملے میں وہ ان ہی تاریخی توہماتی یا مذہبی واقعات کی طرف اشارہ کرے گا جو یا تو اس کے گرد و پیش عالم وقوع میں آ چکی ہوں یا جنہیں اس نے اپنے بزرگوں سے تہذیبی سرمایہ کے طور پر اخذ کیا ہو (۲۴) مثلاً موسیٰ اور طور کی تلمیح، یا طوفان نوحؑ، یوسف و زلیخا، یا شیریں فرہاد کی تلمیح وغیرہ۔ استعارے کے لئے شاعر انہی مشبہ بہ کو استعمال کرتا ہے جو اس کے ماحول کا ایک جزو ہیں۔ مثلاً: رند، ساغر، شیشہ، پیمانہ، ساقی، مے، مغبچہ، پیر مغاں، خرابات، گل، بلبل، سبزہ، لالہ، شمع، پروانہ، محفل وغیرہ۔ تشبیہ بھی اسی ماحول سے اخذ کی جاتی ہے۔ مثلاً: ابرو کو محراب، چشم کو چشم آہو، دنداں کو سلک گہر، لب کو گل ناشگفتہ، زلف کو سنبل کہنا۔ ان تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کا اگر ہم غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ہم کو اندازہ ہوگا کہ محراب سلک گہر یا گل، بلبل، یا موسیٰ و طور وغیرہ شاعر کے ماحول سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں شاعر نے یا تو بذات خود مشاہدہ کیا ہے یا ان سے واقفیت اس کے معاشرہ نے ایک خاص انداز سے بخشی ہے۔ بہر حال ان صنائع و بدائع کے پس منظر سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی محاسن بھی اپنے ماحول سے لاتعلق ہو کر متعین نہیں کئے جا سکتے ان میں سے ہر صفت اپنے پس پشت انسان کے نفسیاتی اور معاشرتی تجربات کی ایک کائنات رکھتی ہے۔

انفرادی ادبی رجحان کا مطالعہ

اس سے پیشتر بھی ہم اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ شاعر ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور خود بھی ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ مزید برآں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ شاعر اپنی تحسسات کی دنیا (The World of Sensations) سے نکل کر باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن یہاں ہمیں جس امر پر زور دینا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی ماحول میں ایک ہی نوعیت کے مہیجات کے لئے ہر فرد یکساں ردعمل نہیں کرتا۔ بلکہ ہر فرد کے ردعمل میں اس کے انفرادی اختلافات (Individual differences) کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر فرد کی نفسیاتی ساخت متعدد نفسیاتی عوامل اور عناصر پر منحصر ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد ایک ہی وقت میں ایک ہی ماحول میں اور ایک ہی مہیجات کے ساتھ ایک ہی نفسیاتی ساخت بھی رکھتا ہو۔ جب ایسا ممکن نہیں ہے تو یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ افراد کے طرز فکر، تصورات

تاثرات اور عمل میں بھی شخصی اختلافات ہوں گے۔ اس طرح ہر فرد ہر نفسیاتی اور سماجی ماحول میں اس سماج یا ماحول میں اس سماج یا ماحول سے مطابقت و مماثلت رکھتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے ادب میں یہ انفرادیت اپنی جلوہ گری زیادہ نمایاں طور پر کرتی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اثر فرد کی فکر پر پڑتا ہے اور وہ ان ہی افکار کو اپناتا ہے جو اس کے تاثرات و جذبات سے ہم آہنگ ہوں، کیونکہ بقول مڈلٹن مری:

> In Literature, there is no such thing as pure thought. In Literature, thought is always the handmaidenn of emotion(25).

فکر کے سلسلے میں جذبات کی اہمیت کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

> The thought that plays a part in literature is systematized emotion become habitual till it attains the dignity of conviction(26)

ان آرا کی روشنی میں ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاً فکر بھی جذبات سے ہی نشو و نما پاتی ہے، اور جذبات کے لئے نفسیاتی محرکات ضروری ہیں۔ جس فرد کو جس طرح کے جذباتی تجربات ہوں گے، اس کے افکار کی صورت گری بھی اسی نوعیت کی ہوگی۔

جذبات کے اظہار کے لئے ہر فرد ایسے ہی الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو جذبات کی گہرائی تاثر اور تجربہ کا ابلاغ اسی انداز سے کر سکے جو فن کار کا اپنا تجربہ ہے۔ ایسے الفاظ یقیناً جذبات کی پنہائی سے عاری نہیں ہوتے اور نہ یہ صرف صنائع و بدائع یا مرصع کاری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ الفاظ جس قدر زیادہ فن کار کے اپنے تاثر و تجربہ کا ابلاغ کر سکیں گے ان کی مناسبت و موزونیت اور ان کا انتخاب اتنا ہی کامیاب اور اعلیٰ ہوگا۔ برخلاف اس کے، اگر الفاظ محض تحریر کی زیب و زینت کے لئے منتخب کئے گئے ہیں تو فن پارے میں تصنع یا آورد کا رنگ پیدا ہوجائے گا۔ چنانچہ بندش الفاظ (Diction) جو ظاہر طور پر ایک خارجی عامل (Factor) ہے باطناً تحریر کی روح ہے۔ بندش الفاظ کو محض اس لئے رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ساری توجہ انتخاب الفاظ پر ہوتی ہے۔ بلکہ الفاظ کی اہمیت کا اعتراف یوں کرنا ہوگا کہ وہ شاعر کی فکر اور جذبات کے ابلاغ کے لئے بہترین ذریعہ اظہار کا کام دیتے ہیں۔ لفظ جس قدر زیادہ موزوں ہوگا اتنا ہی زیادہ فن کار کے نفسیاتی تاثر کا کامیابی کے ساتھ ابلاغ کر سکے گا اور اس موقع کے لئے اس سے زیادہ موزوں ترین کوئی اور لفظ نہ ہوگا مثلاً

شب تنہائیم در قصد جاں بود
خیالش لطف ہائے بے کراں بود

اس شعر میں ہر لفظ اپنی جگہ پر اس قدر موزوں اور مناسب ہے کہ ہر لفظ شاعر کی غم انگیز کیفیت اور اس میں ایک رجائی انداز کو پوری پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ لیکن محبوب کے خیال کے ساتھ ''لطف ہائے بے کراں'' کا استعمال اپنے اندر ندرت بھی رکھتا ہے اور اس بے پناہ جذباتی تاثر کا بھی ابلاغ کرتا ہے جو شاعر کا مقصود ہے۔ یہاں لطف کے ساتھ بے کراں ذہن کو سمندر کی بے کرانی سے مماثل کر دیتا ہے۔ اس طرح اس لفظ کی مناسبت اور بھی زیادہ پر کشش ہو جاتی ہے۔

الفاظ کا تعلق تخیل سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ تخیل اپنے اظہار کے لئے ایک زبان چاہتا ہے۔ اس زبان کے لئے تخیل کی وسعت اور اس کی مختلف کیفیات کے اظہار کے لئے واضح متعین اور پر اثر ہونا ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے تخیل الفاظ کا اس انداز سے انتخاب کرتا ہے کہ جو تصور کے فن کار کے ذہن میں بنتا ہے اس کو وہ زبان کے ذریعہ مکمل صورت میں اسی نزاکت اور لطافت کے ساتھ قاری تک منتقل کر دے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی:

> اکثر ادیب کو بڑی فکر کرنا پڑتی ہے اور کافی تلاش کے بعد موزوں الفاظ ملتے ہیں۔ مگر زور دار قوت والے ادیب یہ دیکھتے ہیں کہ موزوں ترین الفاظ ہی آپ سے آپ نہیں آگئے بلکہ انھوں نے اصل تصور کو اس صفائی اور زور سے ادا کیا جس تک ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں نفسیات کے ماہر لاشعور کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور لکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی حد تک ان کی تخلیق کو وجود میں لانے کے لئے یہ قوت کارفرما ہوتی ہے۔ تخیل رہتی وہی چیز ہے یعنی تشکیل کرنے والی یا شکل دینے والی قوت، مگر اپنے عمل کے آخری مدارج میں وہ ذریعہ جو وہ اظہار (Expression) کے لئے استعمال کرتی ہے، تشکیل کے راستے میں آتا ہے۔ ایک کشمکش کی صورت پیدا کرتا ہے اور پھر مکمل کر تخیل کا تابع ہو جاتا اس سے پہلے تخیل محض ایک نفسیاتی یا روحانی چیز ہوتی ہے اب وہ بیان، بدائع اور طرز ادا کی چیز ہو جاتی ہے تخلیق کرنے والا محرک پس منظر میں ہو جاتا ہے اور تخیل ادیب کے الفاظ سے نکلنے والے معنوں یا تصورات کا معاملہ ہوجاتی ہے الفاظ ایک فضا قایم کرتے ہیں ایک عالم خلق کرتے ہیں اور جب ہم کسی ادب پارہ کے سلسلہ میں تخیل کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد اسی فضا اور اسی عالم سے ہوتی ہے(۲۷)۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک ایسا خاکہ یا ایسی زمین ہوتے ہیں، جس میں تخیلات کی رنگ آمیزی یا فصل تیار ہوتی ہے۔ الفاظ ہی درحقیقت وہ مادی وسیلہ ہیں جن سے ادیب اپنے باطنی جوہر کو مادی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ مجرد تخیل کا مادی وسائل کے ذریعہ اظہار بندش الفاظ (Diction) کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اگر بندش الفاظ میں تخیل یا جذبہ کا خیال نہ رکھا گیا تو یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تحریر میں تصنع پیدا

ہو جائے گا اور جب الفاظ جذبہ وتخیل کی پنہائیوں کے حامل ہوں گے تو بندش الفاظ نہ صرف فطری ہوگی بلکہ شعر کے کل کا لاینفک جزو ہوگی۔

بندش الفاظ کی بحث اس دور میں فرسودہ تصور کی جاتی ہے کیونکہ ادیب کسی بھی فن پارہ کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے اجزا پر توجہ نہیں دیتا، بلکہ اس کو بحیثیت مجموعی ایک کل کی حیثیت سے تخلیق کرتا ہے۔ اسے پہلے سے اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اسے کن الفاظ کو استعمال کرنا ہے یا کس لفظ کو کس صنعت کے تحت استعمال کرنا ہے بلکہ الفاظ خود اس کے مزاج، رجحان، اور تاثرات کے مطابق اس کے تخیل کے افق پر نمودار ہونے لگتے ہیں گویا اس کا نطق اس کے تخیل سے اس حد تک امتزاج حاصل کر لیتا ہے کہ لفظ اور تخیل یا جوہر اور مادہ میں امتیاز کیا جا سکے۔ مثلاً ہم گل سے اس کا سرخ رنگ جدا کر کے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ یا گل کا تصور بغیر اس رنگ کے ممکن نہیں ہے۔ گویا گل کا رنگ اور اس کی مادی ہیئت دونوں غیر منقسم اجزا ہیں۔ اسی طرح، تخیل کو اس کے وسیلہ سے یا ذریعۂ ابلاغ سے الگ کر کے تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح، تخیل اور جذبہ کا اظہار بھی فن کار کو ایک انفرادی طرز بیان عطا کرتا ہے طرز بیان کی تعریف مڈلٹن مری نے ان الفاظ میں کی ہے:

> Style is a quality of language which communicates precisely emotions or thoughts, or a system of emotions or thoughts, peculiar to the author. Where thought predominates, there the expression will be in prose. Where emotion predominates, the expression will be in differently in Prose or Poetry, except that in the case of overwhelming, immediate personal emotion, the tendency is to find expression in poetry. Style is perfect when the communication of the thought or emotion is exactly eccomplished; its position in the scale of absolute greatness, however, will depend upon the comprehensiveness of the system of emotions and thoughts to which the reference is perceptible(28)

مڈلٹن مری نے طرز بیان کی جو تعریف کی ہے اس سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ طرز بیان کوئی خارجی صفت نہیں ہے اور نہ یہ فن پارے کی آرائش و زیبائش کا ایک آلہ ہے۔ بلکہ اسی کے خیال کے مطابق یہ فن کار کے سوچنے اور دیکھنے کا اندازہ ہے (۲۹)۔ چنانچہ بوفوں (Buffon) طرز بیان کی تعریف مجمل الفاظ میں یوں کرتا ہے:

> Style is the man himself(30).

فرد کے محسوس کرنے اور دیکھنے کا انداز اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ منفرد انداز کی زبان استعمال کرے۔ یہی انفرادیت اس کا حقیقی طرز بیان بن جاتی ہے۔ طرز بیان میں الفاظ کو وہی اہمیت ہوتی ہے جو بندش الفاظ (Diction) میں ہوتی ہے لیکن طرز بیان بقول فلوبیر (Flaubert) وہ روح ہے جو الفاظ کو ان کا وجود بخشتی ہے (۳۱)۔

طرز بیان فطرتاً ادیب کے مخصوص مزاج پر منطبق ہوتا ہے، کیونکہ یہ فرد کے تجربات کی نوعیت کا براہ راست اظہار ہے۔ جب احساس اور زبان کے درمیان ربط کم دور ہو جاتا ہے تو رابطے کی کڑیاں بھی کم زور ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی موقع پر مصنف مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص افتادِ طبع کا مظاہرہ کرے۔ ادیب جب زبان کو اپنی عادت میں تبدیل کر لیتا ہے تو وہ غیر معمولی ادراکات اور افکار کو آزادی کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہو جاتا ہے اور اس کو یہ ملکہ بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے افکار کے اظہار کو پوری توانائی جامعیت اور ندرت کے ساتھ پیش کر سکے۔ یہ ملکہ اور یہ انداز بیان اس کی اپنی ایجاد ہوتا ہے اور یہی ایجاد اس کا طرز بیان ہوتا ہے۔

طرز بیان کی معراج یہ ہے کہ اس میں ایک لفظ کے دو معنی ایک ساتھ امتزاج حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ امتزاج مرکب ہوتا ہے انتہائے شخصیت کا انتہائے غیر شخصیت کے ساتھ۔ ایک طرف اگر طرز بیان مخصوص اور ذاتی جذبہ کا ارتکاز ہے تو دوسری طرف یہ تخلیق میں ذاتی جذبہ کا مکمل اضلال ہے۔

طرز بیان کے سلسلے میں عام طور سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک فن کار کے یہاں وجود بھی ہو سکتا ہے اور عدم وجود بھی۔ طرز بیان کے وجود کے لئے فن کار کی شخصیت میں مربوط جذباتی مرکز کا وجود ضروری ہے۔ طرز بیان عقل کا دخل کم اور فطری شخصیاتی مظاہرہ زیادہ ہے بقول بودلیر (Baudelaire) "زندگی کی عمیق اہمیت کا بحیثیت کل بیان ہوتا ہے۔" اس بیان کے لئے مصنف طرز بیان کے اہم ترین عامل اظہار (Expression) کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اظہار فرد کے طریق تجربہ کی منظم اور ناگزیر پیشکش ہے۔ جب فن کار اظہار کی معراج کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنا مخصوص طرز بیان بنا لیتا ہے۔ اس حقیقت کو ارسطو نے ایک فنانہ ہونے والی کام یابی قرار دیا ہے۔ طرز بیان کے ذریعہ ہی فن کار اپنی تحریر میں مختلف صنائع و بدائع استعمال کرتا ہے یا صرف سادگی و پرکاری سے ایسا اثر پیدا کر دیتا ہے کہ قاری مرصع تحریر کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا یا اسے اہمیت نہیں دیتا۔ چنانچہ طرز بیان کے لئے استعارات و تلمیحات ناگزیر بھی ہیں اور نہیں بھی ہیں۔ اس لئے کہ تحریر کے ان خارجی عوامل کی اہمیت انفرادی طور پر کچھ بھی ہو لیکن مصنف کے نزدیک ان کی اہمیت صرف اسی قدر ہے کہ وہ اس کے احساسات تاثرات جذبات و افکار کا اظہار کر سکے۔ جہاں فن کار کو اس سلسلہ میں کامیابی ہوتی ہے، وہ انھیں استعمال کرتا ہے اور جہاں وہ ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، ان کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس طرح تحریر میں جہاں بھی قاری کو مرصع کاری نظر آتی ہے وہاں اسے یہ انداز بھی ہوتا ہے

کہ ادیب نے ان مرصع الفاظ یا اس مرصع تحریر میں اپنے باطن کی گرمی بھی شامل کردی ہے۔

ایک نفسیاتی مطالعے کے لئے متذکرہ بالا مباحث کی روشنی میں طرز بیان کو اس زاویے سے دیکھنا ضروری ہوگا کہ فن کار نے اپنی شخصیت کے اظہار اور جذبات کی رنگ آمیزی کو پیش کرنے کے لئے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ طرز بیان ادیب کی تحریر کا ایک جزو لاینفک ہونے کی وجہ سے تحریر کا ایسا وصف ہے جو صنائع اور بدائع اور افکار و نظریات دونوں میں دخل انداز ہے۔ اگر طرز بیان کو ایک طرف افکار و جذبات کے اظہار سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو دوسری طرف صنائع و بدائع کو طرز بیان سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جب ہم طرز بیان کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں تحریر کو خارجی اور باطنی اوصاف کے ساتھ بحیثیت مجموعی دیکھنا ہوگا

☆☆☆

حواشی

(۱) Thomson, R., The Psychology of Thinking, 1959, p. 184

(۲) Ibid, pp 185-186

(۳) Patrick, Catherine, What is Creative Thinking? 1956,

(۴) Ibid, P88

(۵) Ibid, P88

(۶) Wood worth, R.S., & Schlosberg, H., Experimental Psychology, 1955, Pp.338-39

(۷) Wallace, G., The Art of Thought, 1926, P314

(۸) Patrick, c., What is Creative thinking, 1956,Pp. 1-9

(۹) Ibid, Pp. 10-23

(۱۰) Thomson, R. The Psychology of Thinking 1959, P 188

(۱۱) Ibid, Pp. 24-34

(۱۲) Patrick, Catherine, What is Creative thinking, 1956, Pp 35-40

(۱۳) Boring, E.G., Longfeld, H.S., & Weld, H.P., Introduction to Psycology 1939, Pp.52-53

(۱۴) Watson, J.B., Psycology from the Stand Point of Behaviourist, 1924

(۱۵) Freud, S., Introductory Lectures on Psychoanalysis, 1929, P. 179

(۱۶) Hall, C.S., A Primer of Fruedian Psychology, 1954, P. 54-57

(۱۷) Hall, C.S. , A Landsey, G., Theories of Personality, 1957, Pp. 206-212

(۱۸) Lewin, K., Field Theory in Social Science, 1951, P. 240

(۱۹) Lewin, K., A Dynamic Theory of Personality, 1935,

(۲۰) Lewin, K., Principles of Topological Psycology, 1936, Pp 167-168.

(۲۱) Jung, C.G, Collected Works Vol.7, 1953 P. 114.

(۲۲) Ibid, P. 188

(۲۳) مشرقی ادب سے یہاں مراد فارسی اور اردو ادب ہے کیونکہ مستشرقین کی نظر میں اورینٹل لٹریچر میں فارسی ادب کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور اسی ادب کے تصورات کو بنیاد بنا کر انھوں نے مشرقی ادب پر مختلف نوعیت کے تبصرے کئے ہیں۔ ان تبصروں کے مطالعے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اورینٹل لٹریچر سے مراد فارسی و اردو ادب ہے۔ ملاحظہ ہو E.F.Smith کے انگریزی ترجمہ "باغ و بہار" کا مقدمہ مطبوعہ ۱۸۰۳ء، کلکتہ۔

(۲۴) Jung, C. G , The Modern Man in Search of a Soul 1933, Pp.177-192

(۲۵) Murry, J.M., The Problem of Style. 1922, P.67

(۲۶) Ibid, P. 67

(۲۷) فاروقی، محمد حسن، ڈاکٹر، "ادب اور تخیل"، مجلّہ ساقی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۶۲، جلد ۷۰، شمارہ نمبر ۶۔۷

(۲۸) Murry, J.M., The Problem of Style. 1922, P.65

(۲۹) Ibid, P. 13.

(۳۰) Ibid, P. 12

(۳۱) Ibid, P. 15

دیپک بدکی
کے نئے افسانے
جن میں کشمیر کی روح دھڑکتی ہے
چنار کے پنچے
قیمت : ۱۵۰ روپے
سیمانت پبلیکیشنز، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

صدیق عالم

شمارہ ۲۱۲
دسمبر ۱۹۹۷

جھرنا ہیمبرم کی آنکھوں میں سیلن بہت آسانی سے اترتی تھی۔ اتنی آسانی سے کہ صبح نیند سے جاگ کر دونوں پپوٹوں کو الگ کرنے کے لئے اسے انگلیوں کا اچھا خاصا زور لگانا پڑتا۔ آج تو اس کی داہنی آنکھ آدھی کھل پائی تھی اور اسی حالت میں وہ ادھر ادھر گھوم رہی تھی، صبح کے کام کاج کر رہی تھی، سور کے لئے ناند صاف کر رہی تھی۔ اور اس کی داہنی آنکھ میں تھا کہ دن گھستا چلا آ رہا تھا۔ اسے کسی طور اس آنکھ کو پوری کھولنا ہوگی تاکہ آسانی سے بند کر سکے۔ اس نے کئی بار آنکھوں پر پانی کے چھپکے مارے، انگلیاں گھسا گھسا کر پپڑیاں چھڑانے کی کوشش کی مگر پپوٹوں کے کنارے پھر بھی جڑے رہے۔ آخر میں تھک کر اس نے ایک بیڑی سلگائی جسے وہ خود بناتی تھی اور بھک بھک دھواں نکالتے ہوئے اپنے مجروح دانتوں سے تنکے کھینچ کھینچ کر بانس کی ٹوکری بننے لگی۔ اس کے بیٹے رانسن ہیمبرم کو شہر نے مانگ لیا تھا اور اب وہ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے اپنے ہتھوڑے اور دوسرے اوزار لے کر گھومتا۔ اس کے شوہر منگرو نے مہوے کا ٹھرا پی پی کر اپنا پیٹ اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اسے شہر کے سرکاری اسپتال میں اندر سے چیر کر ٹھیک کرنا پڑا۔ مگر پھر وہ زیادہ دن تک زندہ نہ رہ پایا۔ اس نے اتنا غصہ اپنے اندر بھر لیا تھا کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی رکھیل آرتی سردار کو اتنا مارا اتنا مارا کہ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ اس دن گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ منگرو شرابی ہو گیا ہے۔ اور منگرو مرنے والا ہے اور اب منگرو کسی بھی دن جنگلی بدروحوں کے شکنجے میں ہوگا جو اسے اڑا کر ڈھاک کے جنگل میں لے جائیں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیڑوں کے کھوکھلوں میں بھٹکتا رہے گا اور راہگیروں پر عجیب وغریب چہرے بناتا رہے گا۔

ایک دن منگرو کا بھوت آئے گا! جھرنا ہیمبرم خود سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ ہر کام آسان کر دے گا۔ وہ سوروں کے طویلے میں رہنا شروع کر دے گا اور سوروں کی گرمی بڑھ جائے گی۔ وہ مرغیوں کے دربے میں رہنا شروع کر دے گا اور مرغوں کی گرمی بڑھ جائے گی۔ وہ بکریوں کے تھنوں میں دودھ بھر دے گا اور ان کے لئے ہرے پتے، پیڑ اور جھاڑیوں کے نچلے حصوں میں لگائے گا۔ اور سلائی کنڈ کے بڑے پتھر سے پھوٹتے جھرنے میں پانی ہی پانی ہوگا۔ میں نے منگرو کے لئے بجا کے کھوکھلے صاف کروائے ہیں تاکہ اپنے آرام کے لئے اسے ڈھاک کے جنگل کی طرف لوٹنا نہ پڑے بلکہ انھیں میں سے کسی میں وہ آرام سے لیٹا رہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جب وہ زندہ تھا لیٹا رہتا تھا۔

وہ لوگ کانا پہاڑ کے باشندے تھے۔ اسے کانا پہاڑ اس لئے کہتے تھے کہ جب سورج اس کی چوٹی کو چھو کر ڈوبتا تو کان آنکھ کی شکل اختیار کر لیتا۔ کانا پہاڑ کے بارے میں بہت ساری باتیں تھیں۔ مثلاً اس پر بسے ہوئے چھوٹے قبائلی گاؤں اب اپنے پرانے رکھ رکھاؤ سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پر عیسائی مشنری حاوی ہو گئے ہیں اور کچھ نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو اپنا لیا ہے۔ مگر جو افواہ سب سے زیادہ گرم تھی اور جس نے لوگوں کو مضطرب کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اب کانا پہاڑ سے روحیں خفل ہو رہی ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں سے ناخوش ہیں اور ایک دن آئے گا جب پہاڑ کے گربھ سے آگ اگلے گی اور پیڑ پودے، گھر اور پرانی اس طرح جلیں گے جس طرح جنگل میں آگ پھیلنے سے کیڑے مکوڑے جلتے ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ منگرو کے اندر اس قدر غصہ بھرا ہوا تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تیر اور بھالے تیز کیا کرتا۔

مگر اس نے کبھی تیر نہیں چلائے، بھالا نہیں اٹھایا۔ وجہ بے وجہ مہوہ پیتے چلاتے رہتا، ڈھلاں میں ہفتہ وار ہاٹ میں مرغے لڑاتا اور ہاڈو با کھیلتا جہاں سے وہ بہت سارے سکے جیت کر آتا اور کبھی کبھار ہار کر بھی۔ مگر جھرنا ہیمبرم جانے کیسی جادوگرنی تھی، دو وقت کا ابلا ہوا اناج اور گوشت اس کے برتن میں عین وقت پر دھرا ہوتا جن کی طرف منگرو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا مگر کھائے جاتا، جیسے یہ سب کچھ اسے اچھا نہ لگ رہا ہو، جیسے اس کے اندر کی آتما اسے پھٹکار رہی ہو۔ اور جب اس اندرونی ملامت سے وہ ہار جاتا تو آرتی کے پاس چلا جاتا۔ آرتی جو جانے انجانے کتنوں ہی کی مشترک رکھیل تھی اور جسے مہوے کی شراب کشید کرنے کا فن آتا تھا اور جس کا شوہر اسے ہر کسی کے پاس بیچنے کے لئے بے چین رہتا۔

"بہت کراری بہو ہے بس ایک باٹلی ٹھرا سرکار اور دس روپے۔" وہ اکثر پہاڑی راستے سے گذرنے والے سیاحوں کی گاڑیوں کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی بغل میں آرتی سر جھکائے کھڑی رہتی، اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرتی رہتی۔ اپنی ساڑی کے پلو کو منہ میں ٹھونستی جاتی۔

"یہ شہری لوگ!" وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

اور جب جھرنا ہیمبرم اکیلی رہ گئی تو کتنوں نے ہی اسے گونے کی پیش کش کی۔ وہ ٹوکریاں اچھی بنتی تھی۔ اس کے جانور بیماری سے نہیں مرتے تھے اور جنگل کے ان گوشوں سے وہ بخوبی واقف تھی جہاں بدلتے موسموں کی مناسبت سے سوکھی لکڑیوں کی بہتات ہوتی۔ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جاگنے لگے تھے اور اس جیسی تجربہ کار عورت کا سہارا کامل قبائلیوں کی ہمیشہ کی ضرورت رہی ہے۔

صرف جھرنا ہیمبرم کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی منگرو کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہی تھی۔ صرف منگرو کہیں اور تھا اور وہ کہیں اور۔

جنگل میں کیکر، شہتوت اور بھوسنی کی جھاڑیوں میں جہاں سانپ اپنی کینچلی چھوڑ جاتے وہ منگرو کے پیروں کے نشان ڈھونڈتی۔ مگر پھر اسے یاد آتا۔ آتماؤں کے پیر نہیں ہوتے۔ نہیں، پیر تو ہوتے ہیں، مگر انہیں زمین پر رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی جھرنا ہیمبرم خود بھی پریت آتما کی شکل اختیار کر لیتی اور اسے لگتا وہ کیکر کی جھاڑیوں پر بہ آسانی چل سکتی ہے۔ اس کے اندر اسے آزمانے کی ہمت تو نہ تھی مگر وہ آتماؤں کا مذاق بھی اڑانا نہیں چاہتی تھی۔

جس دن رائسن اپنے سے بھی دو گنے عمر کی ایک عورت کے ساتھ وارد ہوا جس سے اس نے بیاہ کر لیا تھا تو بڑے غصے میں دکھائی دیا۔ اس دن پہلی بار جھرنا ہیمبرم کو منگرو کی بہت ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ اکیلی ہو گئی ہے۔

"یہ سب کچھ اب زیادہ دن نہیں چلنے کا ماں،" رائسن نے گھر کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔ "اب زیادہ سے نہیں ہے جب بواری ماں بنے گی اور ہمیں اگلے دنوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔"

"اگلے دن؟" جھرنا ہیمبرم نے معصومیت سے پوچھا۔

"میرے ریلوے کوارٹر میں دو کمرے ہیں۔" رائسن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ کھانس بھی رہا تھا۔ "اور بواری جب ماں بنے گی تو ہمیں کسی نہ کسی کی ضرورت تو ہوگی ہی۔ رہا ایک کمرہ، تو اسے ہم کرائے پر دے سکتے ہیں۔"

دو ہفتے رائسن اور بواری جھرنا ہیمبرم کے ساتھ رہے۔ بواری اور جھرنا ہیمبرم کسی حد تک ہم عمر بھی کہی جا سکتی تھیں۔ اس لئے دونوں گھل مل گئیں۔ بواری کے کولھے پیچھے کی طرف نکلے ہوئے تھے اور اس کے سامنے کے تین دانت نقلی تھے جنھیں رات کے وقت کھول کر اسے پانی کے پیالے میں ڈبو کر رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بار بار اپنے دونوں کان جھاڑتی اور نقلی دانتوں سے ہنستی۔

"میرا باپ شروع میں میرے بیاہ سے خوش نہیں تھا جیسا کہ میرے باپ کو ہونا چاہئے۔ وہ میرے لئے اور بھی اونچے سپنے دیکھتا تھا۔ مگر میری سوتیلی ماں نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ہنومان چوک کے مندر میں شادی کی۔ میری تین بہنیں ہیں اور سب کی سب میری ہی طرح سندر ہیں۔ ہمیں آدمی کا کیا کال ہے۔"

جھرنا ہیمبرم زیادہ تر اس کی باتوں کا سرا ٹھیک سے پکڑ نہ پاتی۔ مگر پھر بھی اسے پتہ تو تھا کہ اس کے بیٹے کی بہو اپنے دل کا بوجھ اس کے سامنے ہلکا کر رہی ہے۔ رائسن تو جھونپڑی سے تھوڑی دور بانس کے جھنڈ کے سامنے بچھی چارپائی پر لیٹا لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور اپنی انگلیاں چٹختا رہتا۔ اور یہ وہی جگہ تھی جہاں دس سال پہلے تک چیتا اور بن سور تک آیا کرتے تھے۔

"ارے، یہ سب کتنی بکواس ہے۔" وہ بیچ بیچ میں چلا اٹھتا۔ "اس کانا پہاڑ میں ڈھنگ سے جینے کا کچھ تو سادھن ہونا چاہئے۔"

بواری ضرورت سے زیادہ کھاتی تھی اور اسے ہر وقت لوٹا لے کر جھاڑیوں کے پیچھے گڑھیا کی طرف جانا پڑتا۔

"مجھے تو لگتا ہے ماں، مجھے جلد سے جلد اسے پیٹنا شروع کر دینا چاہئے۔" رائسن ماں کو آنکھ مار کر کہتا۔ "اس جیسی عورت کے لئے اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا باپ سالا انجن کا خلاصی تھا جو اسٹیم انجن سے ریٹائر تو ہو چکا ہے مگر انگاروں کی سی آنکھیں رکھتا ہے۔ بواری صرف اس سے نہیں ڈرتی۔ اور اس کی یہی بات تو مجھے بھاتی ہے۔"

گاؤں میں جتنے بھی جھونپڑے تھے سب ایک دوسرے سے الگ الگ مختلف اونچائیوں پر کھڑے تھے۔ ایک دو جگہ باڑھ کے اندر مکئی اور سورج مکھی کے پودے تھے۔ جھرنا ہیمبرم کے کتے تھمبا نے بواری کو شروع سے ناپسند کر دیا تھا۔ وہ بلا جھجک دور کھڑا اس پر بھونکتا رہتا۔ سور ناند میں جھینکتے رہتے، جھرنا ہیمبرم ٹوکری بنتی رہتی اور رائسن چارپائی پر سگریٹ کی نیم گرم راکھ کو دھیرے دھیرے ہوا میں منتشر ہوتا دیکھتا رہتا۔

واقعی یہ سب کوری بکواس ہے، وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ اور اس کتے کو مہمانوں کی قدر کرنی چاہئے۔ میری غیر حاضری میں تو اس گھر کا کباڑا ہی ہو گیا ہے گویا بڑھو کے مرنے کے بعد کچھ تو نہیں سدھرا ہے یہاں۔

اور دو ہفتے بعد، رائسن ہیمبرم اپنی بیوی بواری اور ماں جھرنا ہیمبرم کو لے کر گاؤں سے چلا گیا۔

اور بس میں تین گھنٹے اور رکشا میں پندرہ منٹ کے سفر کے بعد تینوں ریلوے کے ایک پرانے کوارٹر کے دروازے پر پہنچ گئے جس کی قدیم طرز کی محرابی چھت پر جھاڑیاں اور پیپل کے پودے اگے ہوئے تھے۔ یہاں آنکھوں کے سامنے ریلوے کی پٹریاں چمک رہی تھیں اور جھرنا ہیمبرم کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کوئلہ جلانے کا اتنا تیز دھواں جانے کہاں سے پھیل رہا تھا اور یہاں پیڑ پودوں پر ایک عجیب سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ زمین تارے کی طرح سپاٹ اور سیاہ تھی اور جدھر بھی نظریں اٹھاؤ صرف کوے ہی کوے تھے اور انسان ہی انسان، جو کووں کی طرح ہی غلیظ تھے اور کالکھ سے لپٹے ہوئے انہیں کی طرح ڈھیٹ نظر آ رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جھرنا ہیمبرم کو گھر کا پورا کام کاج سنبھالنا پڑا اور چونکہ کرایہ دار ابھی مل نہ پایا تھا رائسن نے دوسرے کمرے پر تالا دے رکھا تھا۔ اس لئے جھرنا ہیمبرم کو اپنا بستر باورچی خانے کے دروازے کے پاس آدھے گھرے ہوئے برآمدے پر لگانا پڑا جہاں سے پٹریوں کے اوپر پھیلے ہوئے کالکھ زدہ تار اور تاروں بھرا آسمان دکھائی دیتے تھے۔

اندر کمرے سے بواری اور رائسن کے کھلکھلا کر ہنسنے، چومنے اور ایک دوسرے کو پیار بھری فحش گالیوں سے نوازنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ آدھی رات سے قبل دونوں باری باری سے جھرنا ہیمبرم کے سوتے ہوئے جسم کو لانگھ کر غسل خانے کے اندر جاتے۔ مگر جھرنا زیادہ تر وقت جاگتی رہتی اور وہ ایسے اوٹ پٹانگ وقت میں سو جاتی جب بواری کو اس کی ضرورت ہوتی۔

"جب سے کوارٹر آئی ہے، بڑھیا کو تو مزا ہی مل گیا ہے۔" بواری کوسنے دیتی۔ "ڈھنگ سے دو وقت کا کھانا بنانا تو آتا نہیں، پسر کر یوں سوتی ہے جیسے سارا جگ جیت آئی ہو۔"

اب تو رائسن نے نل سے پانی لانا بند کر دیا تھا۔ نل پر پانی کے لئے بڑا

ہنگامہ ہوتا۔ اکثر جھرنا ہیمبرم خالی ڈول کے ساتھ واپس لوٹتی۔ اور اس پر بواری کا عتاب نازل ہوتا۔

"غیر کو تو آدمی گالی بھی دے لے، مگر اپنے پر کیسے تھوکے؟" بواری اپنے خصم کو سناتی۔ "اجی میں تو کہتا ہوں، آپ تو ادھر توجہ دیتے ہی نہیں، بس اکیلے مجھے ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ بڑھیا تو خالی ڈول لے کر واپس آجاتی ہے اور مجھے نل پر جا کر گالی گلوچ کرنی پڑتی ہے۔"

"سب بکواس سن رہا ہوں۔" رائسن کہتا ہے۔ "میرا خیال ہے بڑھیا جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ جلد ہی سیکھ جائے گی۔ ارے اب اس میں چلانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تم بواری بس جلد سے جلد ایک بچہ دے دو، یہ گھر بھر جائے گا۔ کیوں نہ آج ہم ایک نیا طریقہ اپنائیں؟"

اور پچھلے پورے دو سال سے دونوں اسی کوشش میں ہی تو مصروف تھے:

جھرنا ہیمبرم کے آنے کے بعد اب تو دن میں بھی وہ ایک آدھ کوشش کر لیتے۔ فرصت کے وقت جھرنا کوارٹر کے دروازے کے باہر اکڑوں بیٹھی زمین پر کسی تنکے سے لکیریں کھینچتی رہتی، ٹرینوں کو گذرتے دیکھتی رہتی۔ اسے دھواں اگلتے ہوئے اسٹیم انجن زیادہ اچھے لگتے جن کے ڈرائیور سر پر غلیظ رومال باندھے رہتے اور اس عجیب و غریب بڑھیا کی طرف تاکتے رہتے جسے اس شہر کی بھاشا بھی نہیں آتی تھی۔ پٹریوں پر بھاگتے کتوں کو دیکھ کر اسے اپنا بھتیجا یاد آجاتا۔ سوروں کو تو اس نے پڑوسیوں کو امانت کے طور پر سونپ دیا تھا، مگر بھتیجے کو کون سنبھالتا! کتنی دور تک وہ پہاڑی راستے پر بھاگتا آیا تھا اور بس کے پیچھے پیچھے اس نے دوڑ بھی لگائی تھی۔ جھرنا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ دبی دبی آواز میں کوئی پہاڑی گیت گانے لگتی جسے وہاں کوئی سمجھ نہ پاتا، یہاں تک کہ اندر سے بواری کی پکار سنائی دیتی۔

"بڑھیا، باہر کیا خصم پھانس رہی ہے، کہ اب تک آنکھیں سنی ہوئی ہیں؟ کتنا درد ہے میرے بدن میں۔ مگر کوئی مجھے اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھے تب نہ!"

رات کو اکثر رائسن دیر سے شراب پی کر لوٹتا اور باورچی خانے کے دروازے پر پڑے ہوئے جسم سے اسے چڑ ہو جاتی۔

"جی چاہتا ہے، ایک لات جماؤں اسے۔ یہ بھی سونے کا کوئی وقت ہے ماں؟ اور کھانا کون کھلائے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہے کہ بواری کے پیٹ میں بچہ ٹھہر نہیں پا رہا ہے۔"

"اور کیا۔" بواری اندر سے تائید کرتی۔ "ذرا سمجھاؤ اسے، کبھی جو مالش کا تیل گرم کر کے میرے بدن پر لگایا ہو۔ میری تو کمر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ارے گھبرانے کی بات نہیں، پہلے کچھ کھا لینے دو، بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر میں تیری کمر کا درد ٹھیک کر دیتا ہوں۔ میرے پاس ایک خاص نسخہ ہے۔" رائسن آنکھ مار کر کہتا ہے۔ "اور ذرا دیکھ، کیا لایا ہوں تیرے لئے۔ بہت ہی خستہ مال پوے ہیں۔ پسند ہیں نہ تجھے، پر اتنا بھی نہ کھا لینا کہ پھر سے لوٹا لے کر دوڑنا پڑے۔"

"ارے، میرے پیٹ میں تو کچھ پچتا ہی نہیں۔"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے، گھر کے اندر سنڈاس جو ہے۔"

کبھی کبھی بواری باپ کے گھر چلی جاتی۔ اس وقت گھر میں سناٹا رہتا اور دونوں ماں بیٹے کی دیرینہ محبت لوٹ آتی۔

"ارے ماں، بواری سے کہوں گا اب کے بازار سے تمہارے لئے تانت کی ساڑی لائے اور یہ سڑی گلی چپل، مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، جانے تم کیسے انھیں گھسٹتے پھرتی ہو؟"

"ارے اماں ذرا ٹھیک سے کھایا کرو، تم تو سوکھتی جا رہی ہو۔ یہی حال رہا تو تمہارے باقی کے دانت بھی جھڑ جائیں گے۔"

"ارے اماں، اب کے بواری سے کہوں گا تمھیں ریلوے ٹاکیز میں سنیما دکھا کر لائے۔"

مگر بواری دن بہ دن شکی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹونا ٹوٹکا بھی کر کے دیکھ لیا تھا۔ سادھو سنت اور پیر فقیر کے مزاروں کے درشن بھی کر لئے تھے، ننگا بھوت والے برگد پر سیندور کی پوجا بھی کی تھی اور تجربہ کار چھنال بوڑھیوں سے سن سن کر راشن کے ساتھ ہر وہ طریقہ آزما لیا تھا جو بچہ پیٹ میں رکھنے کے لئے ضروری ٹھہرتا ہے، مگر تھی وہ بانجھ کی بانجھ۔ اور آخر کار اس کی بجلی جھرنا ہیمبرم پر ہی ٹوٹتی۔

"یہ سب اس کے کارن ہے۔ اس نے اپنے مرد کو کھایا اور اب میرے پیٹ سے بچے چرا رہی ہے۔"

"چپ رہ رنڈی۔" رائسن چلاتا ہے۔ "میری پیاری رنڈی۔"

"میں کہتی ہوں، ضرور اس میں کچھ بات ہے۔ میں نے اکثر کچھ سائے آنگن میں چلتے دیکھے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں، کبھی تم غور سے بڑھیا کو نہیں دیکھتے۔ کل صبح میں نے جب اسے دیکھا تو وہ مری پڑی تھی۔ مگر اسے جب ہلایا تو اس نے اپنی سیلن بھری آنکھیں کھول دیں اور اپنے سفید دانتوں سے بھتنی کی طرح ہنس دی۔"

"میں کہتی ہوں یہ رات میں نیند میں چلتی ہے اور اپنے گیتوں کے ذریعے بدروحوں کو بلایا کرتی ہے۔"

"بواری، تو تو پاگل ہو گئی ہے۔"

مگر رائسن زیادہ دن تک ماں کا دفاع نہ کر سکا۔ اب تو بواری نے کھلے عام جھرنا کو گالی دینا شروع کر دیا تھا۔

"ہر رات اس چڑیل کو مجھے لانگھنا پڑتا ہے۔"

"ہر صبح اس کی لاش دیکھنی پڑتی ہے۔"

"ہر دوپہر جب میں سوتی ہوں، جانے یہ کہاں جاتی ہے، لوگوں نے اسے مڑے ہوئے پیروں سے چلتے دیکھا ہے۔"

اور جب بات حد سے گذر گئی تو ایک دن رائسن نے جی بھر کر شراب پی۔ گھر آیا اور ماں کے جھونٹے پکڑ گھسیٹتا ہوا باہر لے جا کر ریل کی پٹری پر ڈال دیا۔ جھرنا اٹھی اور لنگڑاتے لنگڑاتے تاروں کی ناکافی روشنی میں اس سمت ہو لی جدھر اس کی دانست میں اس کے پہاڑ تھے۔

گھر پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس کے

اور بھی بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب پہاڑ نے جھرنا ہیمبرم کو دیکھا تو اس نے اپنی جھاڑیوں اور پیڑوں والی باہیں پھیلا دیں اور سورج کانا پہاڑ پر گویا ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا اور رنگین سروں والے گرگٹ سوکھے پتوں پر بھاگتے بھاگتے رک گئے اور اپنے سر موڑ موڑ کر جھرنا ہیمبرم کو تاکنے لگے۔ اور جب جھرنا ہیمبرم گاؤں سے کچھ دور، جہاں تک بس کے کنڈکٹر نے ترس کھا کر اسے لفٹ دی تھی، ایک چٹان پر بیٹھی اپنے بالوں سے تنکے نوچ نوچ کر نکال رہی تھی تو اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

تھمبا سورج کو سر پر اٹھائے کھڑا تھا۔

"گھر لوٹ کر آ گئی مالکن؟" کتے نے کہا۔

"ہاں رے۔" جھرنا ہیمبرم نے کتے کے سر کو تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا بچہ بڑا دکھی ہے تھمبا، مجھے جلد سے جلد انصاف مانگنے ڈھاک کے جنگل جانا ہوگا۔"

ڈھاک کا جنگل! ڈھاک کا جنگل! کتا راستہ بھر بھونکتا رہا۔

کبھی ڈھاک کے جنگل میں صرف ڈھاک کے پیڑ رہے ہوں گے، مگر حال کے برسوں میں دوسری قسم کے پیڑ بھی جگہ جگہ اگ آئے تھے۔ انھیں میں سے چتیان کے ایک پیڑ پر منگرو نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اس کی کھوکھلی شاخ پر، ہاتھ پر سر رکھے لیٹا رہتا اور اپنی مڑی ہوئی ٹانگ ہلایا کرتا۔ یہاں وہاں بھوینا کے پیڑوں میں گلابی پھول کھلے ہوئے تھے اور املتاس کے پھل لانبے اور خوش انداز میں جھولتے رہتے اور ڈھاک کے بونے پیڑوں میں دھول اور ہوا سرگوشیاں کرتی رہتیں جن میں کم تر درجے کی روحیں بلبلایا کرتیں۔

"خاموش رہو بے مطلب کے پلو۔" منگرو کی آواز سے روحیں دہل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے پیڑوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لینے لگتیں۔ "یہ بھی کوئی زندہ انسانوں کی جگہ ہے کہ دانت نکوس رہے ہو؟ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے علاوہ تم آتماؤں کو اور کچھ آتا بھی ہے؟"

"بغاوت!" روحیں دوبارہ چلاتی ہیں۔

اور ان نعروں کو سن کر منگرو کا پیٹ ہنسی سے پھولنے لگتا۔ وہ چتیان کے پیڑ سے زمین پر چھلانگ مارتا اور ڈھاک کے پیڑوں کی آڑ سے نکلی ہوئی روحوں کے کولھوں پر لات لگایا کرتا۔

"تم اسی قابل ہو۔" وہ کہتا۔ "اور شاید یہ لات تھوڑی بہت عقل تمھارے پیٹ میں ڈال دے۔"

مگر جھرنا ہیمبرم جب ڈھاک کے جنگل میں وارد ہوئی تو روحوں کی آپس میں صلح ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھاک بن میں سرے سے روحوں کا وجود ہی نہ ہو۔

منگرو نے چتیان کی کمزور شاخ سے سر موڑ کر جھرنا ہیمبرم کو دیکھا اور مسکرایا۔

"آ گئی میری مہوا کی ترنگ۔ ذرا دیکھو، مرنے کے بعد بھی اسے میری ضرورت ہے جیسے زندگی بھر کا دکھ لے کر بھی جی نہیں بھرا۔ آہ، ہماری ناریوں کو اور کتنا بوجھ چاہئے۔"

تھمبا کا سینہ کانپ رہا تھا۔ وہ سر کو زمین پر گاڑ کر غرا رہا تھا۔ اس کی دم ٹانگوں کے بیچ چپکی جا رہی تھی۔ اسے بد روحیں کبھی پسند نہیں تھیں۔ اسے ان کی عادت بھی نہ تھی۔

"وہ دکھی ہے۔ بہت دکھی ہے۔" جھرنا گھٹنوں کے بل گر کر رو رہی تھی، مٹی چہرے پر مل رہی تھی۔

"اچھا!" منگرو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "تب تو میں بھی دکھی ہوں۔"

"آہ منگرو، ایک سال تک میں نے ان کا دکھ دیکھا۔ آہ، ہمارے بچے دکھی ہیں۔"

منگرو کود کر چتیان کے پیڑ سے نیچے اترا اور جھرنا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے بال بھی تن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت ساری روحوں نے پتوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے سر باہر نکال کر دیکھا اور پوچھا۔ وہ اپنی لانبی زبانوں سے دانت چوس رہی تھیں اور منگرو کی مصیبت سے خوش تھیں۔

"عورت! میرے قریب نہ آنا، ورنہ میں تیرا ٹیٹوا دبا دوں گا۔ میں پہاڑ پر گدھوں کو اترنے کی اجازت نہیں دے سکتا جیسا کہ تم چاہتی ہو۔"

"چاہے وہ اپنا بچہ ہو؟" جھرنا ہیمبرم نے بڑھ کر منگرو کا کرتا پکڑنا چاہا۔

"دور ہٹ۔" منگرو کود کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنی ایڑیوں پر بلند ہوتا چلا گیا جسے دیکھ کر کمتر آتماؤں کے دل کانپنے لگے۔ "مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا۔ اتنی کمزوری کے ساتھ زندہ رہنا کیا مطلب رکھتا ہے۔ عورت اپنے ناخن تیز رکھ اور زبان کی نوک پر انگارے۔ سانپوں میں مجھ کو کوبرا سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"انھیں بچہ دے دو منگرو۔ ان کی زندگی آسان ہو جائے گی۔"

"ہرگز نہیں۔" منگرو دانت پیس رہا تھا۔ "تو پہاڑ سے نیچے گئی اور انھوں نے تیرے بال سفید کر ڈالے۔"

"منگرو!"

"تجھے زندہ رہنے کے لئے کسی کی ضرورت تو نہیں تھی جھرنا؟ تو ریچھ کی طرح طاقتور تھی۔ تو تو اکیلی پہاڑ کی رکھوالی کر سکتی تھی۔ پھر بھی، جب تو کمزور پڑ ہی چکی ہے تو میں تجھے لڑنے کے لئے ایک ہتھیار دیتا ہوں۔" وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ وہ ایک دیودار کے تنے پر چڑھتا نظر آیا، اس نے اپنی آنکھیں خاردار جھاڑیوں پر ٹانک دیں اور کان چتوں پر لٹکا دیے۔ اس کے دانت پتھروں پر گرتے چلے گئے اور اس کے بال الگ الگ رینگنے لگے۔ جھرنا ہیمبرم نے اپنے سامنے ایک چھوٹے سے نقارے کو پڑا پایا۔ منگرو اس کے سامنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ نقارے کے چمڑے کی کھال پر اپنی سوکھی چمڑیوں والا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"اس نگاڑے کے لئے ہم روحوں نے کڑی محنت کی تھی۔ اسے مٹی کے نقاب پہن کر ناچنے والوں سے چھینا تھا جب ان کی جتھا نیچے شہر کی طرف جا رہی تھی اور نشے میں تھی۔ جب بھی تیرا دکھ تجھے چاٹنے جائے تو اپنی ساری چوٹ اس کو دینا۔ یہ تیرا دکھ بانٹ لے گا، تیرا کام آسان کر دے گا۔ اسے بجانے کے لئے ایک مڑی ہوئی لکڑی بنا لینا اور اسے تیل پلانا جس کی ہم روحوں کو قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔"

منگرو چتیان کے پیڑ کی طرف اڑتا دکھائی دیا۔ روحوں نے اپنے سر

جھاڑیوں اور پتوں کے اندر کر لئے۔ منگرو نے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اپنی ایک ٹانگ ہمیشہ کی طرح موڑلی اور سیٹی بجانے لگا۔

"چل بھاگ بھتنا۔" اس نے کہا۔

نقارے کی آواز زیادہ تر رات کی تنہائی میں سنائی دیتی۔ اس نقارے کی چوٹ سے جھرنا ہیمبرم نے گاؤں کے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ کہاں سے ملا اسے یہ نگاڑا۔ یہ بڑھیا عجیب و غریب کارنامے دکھاتی ہے۔ ایک سال بعد بھی اس کے تمام کے تمام سور زندہ رہے تھے اور تھمبا نے تین جنگلیوں کو کاٹ کھایا تھا جو گوشت کے لئے اس کا اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر یہ نگاڑا ایک عجیب واقعہ تھا۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔ مگر بڑھیا ہر رات جس دلجمعی سے اسے بجاتی وہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ بوڑھا منگل باسکے ایک دن لنگڑاتا ہوا جھرنا ہیمبرم کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے بیڑی قبول کی اور کھانستا رہا۔ جھرنا نے نگاڑا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ بوڑھا باسکے سارے گاؤں اور اس کے چرند پرند کی طرف سے آیا تھا۔

"اس کا چمڑا مضبوط ہے اور لکڑی کا تو جواب نہیں جس پر یہ تنا ہوا ہے۔" منگل باسکے نے بیڑی پیتے ہوئے کہا۔ "کوئی وجہ تو ہوگی کہ تم اسے اس طرح راتوں کو بجاتی ہو؟"

"میرے رائسن کو اس کی ضرورت ہے۔"

"شاید" منگل باسکے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمیں اس سے کیا لینا۔ ہر کسی کو اپنے ڈھنگ سے دکھ جھیلنے کا حق ہے۔"

لگتا ہے بیٹے کی مار کھا کر دماغ پھر گیا ہے۔ اس نے گاؤں والوں کو بتایا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

اور گاؤں والوں نے جھرنا ہیمبرم کو معاف کر دیا۔ مگر جھرنا کی ہر رات امیدوں بھری تھی۔ وہ دل لگا کر آدھے گھنٹے تک نقارہ پیٹتی اور تھمبا کا سینہ کانپتا رہتا۔ اور پھر واقعی معجزہ ہو گیا۔ نگاڑے نے چمتکار دکھایا۔

جاڑے کی ایک کہرآلود صبح رائسن دروازے پر کھڑا تھا۔ جھرنا اس سے لپٹنا چاہتی تھی، مگر رائسن سرد مہری کے ساتھ چپ چاپ کھٹیا پر بیٹھ گیا اور بیڑی پھونکتا رہا۔ اس نے وقت پر کھانا کھایا اور بانس کے جھنڈ کے پیچھے جا کر زمین پر لیٹ کر دھوپ کھانے لگا۔ اگلے پورے ہفتے تک اس نے بہت کم بات کی۔ وہ گاؤں میں آوارہ گھومتا پھرا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔

"بواری کیسی ہے؟" آخر ایک دن جھرنا ہیمبرم نے پوچھ ہی لیا۔

"اچھی ہے۔" رائسن نے بتایا۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی گھنگریالی داڑھی اگ چلی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ لگ رہا تھا اندر ہی اندر اسے کچھ کھرچ رہا تھا۔ اس نے نقارے کو تعجب اور تمسخر سے دیکھا۔

"تو اب اس کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے؟ کیا بکواس ہے!"

مگر بیٹے کے آنے کے بعد جھرنا کو نقارے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لئے اس نے بانس کی ایک پرانی چٹائی کے اندر لپیٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ پہلے کی جیسی جھرنا ہیمبرم بن گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں منگرو کی شکر گزار تھی۔

"شاید اب میں واپس نہ جاؤں۔ ان شہروں میں کوئی زندگی نہیں ہے ماں۔" ایک دن رائسن نے اعلان کیا۔

"بواری کو کب لا رہے ہو؟"

رائسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ایک ہفتے کے اندر یہ جواب جھرنا ہیمبرم کو دوسری طرح سے مل گیا جب شہر سے پولیس کا ایک دستہ آ کر رائسن کو حراست میں لے کر چلا گیا۔ رائسن پر بواری کے خون کا الزام تھا جس کے مردے کو اس نے ریل کی پٹری پر ڈال دیا تھا تاکہ اسے ایک حادثہ قرار دے سکے۔ مگر وہ اس وقت اتنا پئے ہوئے تھا کہ اسے آس پاس کا ہوش نہ تھا اور کئی لوگوں نے اسے بواری کے جسم کو پٹری پر ڈالتے دیکھا تھا۔

اس کے جانے کے بعد جھرنا لٹی سی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی رہی، بانس کے جھنڈ کے اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان میں پرندوں کو چکر لگاتے دیکھتی رہتی۔ اس رات گاؤں والوں نے پھر نقارے کی آواز سنی اور یہ آواز رک رک کر رات رات بھر سنائی دیتی رہی۔ مہینوں بیت گئے۔ جھرنا ہیمبرم کے بدن پر گوشت برائے نام رہ گیا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ ہر وقت اس کی آنکھیں بے چینی لئے اپنے گڈھوں میں گھومتی رہیں۔ اس کے آدھے سور بیماری سے مر گئے اور جس دن وہ تھمبا اور پھٹے ہوئے نقارے کے ساتھ ڈھاک کے جنگل کی طرف گئی اس دن آسمان پر گھنے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ڈھاک کا جنگل سنسان پڑا تھا۔ اس نے نقارے کو منگرو کے چتیان کے پیڑ سے لٹکا دیا اور منگرو کو جنگل میں ڈھونڈتی رہی۔ ڈھاک کا جنگل خاموش تھا۔

"منگرو!" اس کی آواز پہاڑ کے اوپر سے دوسرے پہاڑ تک جا کر لوٹ آئی جیسے تیز ہوا اسے کاندھوں سے ڈھو کر لے گئی ہو اور واپس لے آئی ہو۔

"منگرو! یہ نقارہ تو اب کچھ بھی نہیں کرتا۔"

ڈھاک کا جنگل اب پوری طرح خاموش بھی نہ تھا۔ ڈھاک کے بڑے بڑے پتوں پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے پتوں کے پیچھے کچھ سرسرا رہا ہے۔ مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا اور پھر دیکھتے دیکھتے ہوا تیز ہو گئی۔ آسمان بجلی کے کڑکنے سے آر پار پھٹتے چلے گئے اور تیز بارش اور ہوا میں پیڑ زمین بوس ہوتے گئے۔ جھرنا اور تھمبا نے ڈھاک کے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر سر کو دونوں بانہوں کے اندر کر لیا۔ ان کی پیٹھ اور کولہے پر بارش تازیانے لگا رہی تھی، اولے برسا رہی تھی۔

"واپس نہ چلیں مالکن؟" تھمبا بیچ بیچ میں جھرنا سے سرگوشی کر رہا تھا مگر واپسی ناممکن تھی جب تک طوفان فرو نہ ہو جائے۔ اور جب طوفان فرو ہوا تو سارا پہاڑ گیلا، اداس اور خاموش تھا۔ اپنے سارے پانی برسا کر بادل بدمست ہاتھیوں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ جھرنا اور تھمبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈھاک کے جنگل میں اب صرف ڈھاک کے پیڑ رہ گئے تھے۔ املتاس، بہونیا اور چتیان کے سارے پیڑ جن پر آتمائیں رہتی تھیں اور وہ بھی جن پر منگرو رہتا تھا، اپنے نگاڑے کے ساتھ جانے کہاں چلے گئے تھے ☆☆☆

بیتے دنوں کا اسکلیٹن (Skeleton)

(ناکام شاعر کی ایک نظم)

صدیق عالم

شمارہ ۲۵۸،
جولائی ۲۰۰۳

وہ میری چیخ کے آخری سرے سے لپٹی ہوئی
قطرہ قطرہ اپنے آنسوؤں کو ڈھکنا چاہتی ہے
شب گذشتہ جو ستارے آسمان سے آملے تھے
دن نے ان پر دھوپ کی چادر چڑھا دی ہے
اور اپنے دریچے پر سر جھکائے میں کھڑا ہوں
میرا ساتھ نباہنے کے لئے ایسے کو تم نے کوئی نام تو دیا ہوگا؟

آؤ کہ ہم پھر سے زندگی کے تانے بانے بنیں
یہ فیصلہ ہے جس نے ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب کیا ہے
ٹوٹ جانے کے بعد جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا
تو کیا یہ ان لمحوں سے بہتر تھے جو ہماری لاعلمی میں ہم سے کھو گئے؟
شاید میں نے تم سے پیار کیا تھا یہ سوچ کر کہ کچھ بھی ممکن ہے
مگر وقت خود اپنے دام میں آتا گیا، اور ہم نے سوچا

خواب اچھے ہوتے ہیں چونکہ ہم انھیں ایک دوسری دنیا میں دیکھتے ہیں
اور خواب برے ہوتے ہیں کیوں کہ ہم ان کی پرچھائیں اپنی حقیقی
زندگی میں پاتے ہیں
میں نے تمھارے جسم کو ہر زاویئے سے پانے کی کوشش کی
کیوں کہ تمھیں کھو دینے کا اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا

پتے جو کہ بے آواز گرتے ہیں جانے کب مٹی بن جاتے ہیں
ہم کم نصیبوں کے لئے وقت اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے؟
اچانک کچھ نہیں ہوتا، ہر شے بتدریج اپنی شکل تک پہنچتی ہے
اور پھر بہت کچھ ہو جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پاتے

کون تھی وہ جو مجھے الوداع کہے بغیر ہمیشہ کے لئے جا چکی ہے؟
کون ہوں میں جس نے ایک پیڑ کے نیچے رک کر خود کو رد کیا ہے؟

فورسپس [1]

صدیق عالم

شمارہ ۲۸۹،
فروری ۲۰۰۵

بائی گنج روڈ پر ایک شخص سیاہ کارڈیگن پہنے تنہا کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ تین ماہ قبل اس نے اپنی پرانی تین منزلہ عمارت سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور نیچے سڑک پر معلق بجلی کے تار کے سبب ناکام رہا تھا جس نے اسے نیچے فٹ پاتھ سے بارہ فیٹ اوپر روک لیا تھا۔ تار سے نیچے گر کر اس کا ایک ہاتھ اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ سرکاری اسپتال میں دو ماہ زیر علاج رہا۔ مگر اس حادثے کے بعد ایک عجیب واقعہ یہ ہو کہ وہ جس ذہنی تناؤ سے گذر رہا تھا اچانک وہ ختم ہو گیا ہے۔

سندیپن ... ہاں، آپ مجھے سندیپن کو لے کے نام سے بلا سکتے ہیں، سندیپن کو لے، اور یہاں سے میں اپنی کہانی خود سنانا چاہتا ہوں۔ یہ صدیق عالم، یہ ایک انتہائی بکواس قسم کا کہانی کار ہے، وہ سچ کو بھی کہانی بنا دیتا ہے اور کہانی کو سچ، جو اور بھی زیادہ برا ہے۔ وہ ہمارے محلے میں ایک دوسری پرانی عمارت میں رہتا ہے جس کی سیڑھیاں ہمیشہ اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہیں۔ وہ رات کے آخری پہر تک جاگتا ہے اور دن سے اسے نفرت ہے۔ وہ مذہب کو قدیم قبائلی جنگ کی صورت میں دیکھتا ہے جس کے خد و خال اکیسویں صدی میں زیادہ واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ قومیت کے تصور کو ایک غیر فطری جوہر سے عبارت کرتا ہے ہندوستان کی آزادی کو ایک اسطور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ مغربی کلاسیکی موسیقی کا دیوانہ ہے، ہمیشہ تنہا رہنا چاہتا ہے مگر شہر خبرے کی طرح شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا ہے۔ وہ لفظوں میں یقین نہیں رکھتا، انہیں انسان کی ملمع کاری سمجھتا ہے۔ ادبی محفلوں سے گھبراتا ہے اور اس کی نظر میں انسان خدا کا لکھا ہوا سب سے بے تکا ڈراما ہے جس کے سارے کردار یا تو بری طرح کنفیوز ہیں یا ایک احمقانہ یقین سے سرشار ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے لئے کچھ بھی مقدس نہیں ہے۔ ایسے انسان کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ جانے وہ مدیر کیسے ہوں گے جو اس کی کہانیاں شائع کرتے ہوں گے۔ اور وہ قاری، میں انہیں سمجھنے سے قاصر ہوں، جو اس کی کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کرۂ ارض پر، اس خدا کی بنائی ہوئی زمین پر، اس خاک آباد پر انسان کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آپ کو ہر طرح کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی۔ ہر طرح کے لوگ، ہر طرح کے خیالات، ہر طرح کا عقیدہ، ہر طرح کا نظریہ، اب اس سیارے پر سب کچھ ممکن ہے۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد آپ کو مل جائے گی جنھوں نے اپنی ماں کی کوکھ سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا اور انھیں چمٹے یعنی فورسپس سے پکڑ کر باہر لانا پڑا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میرے کان کے دونوں پردوں اور ہڈیوں پر اب بھی ان چٹنوں کا درد گاہے گاہے جاگتا ہے۔ یہی نہیں، میں اپنا دایاں ہاتھ تیس ڈگری سے اوپر لے جانے سے بھی معذور ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ میرے سر کا درد بالکل نفسیاتی ہے اور میں چاہوں تو اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا ہوں، اگرچہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ اس جبری پیدائش کے سبب ہی میں اپنا دایاں ہاتھ اٹھا نہیں پاتا۔ اس تیس ڈگری کے بعد کا سارا کام میرا بایاں ہاتھ کرتا ہے۔ میرا پیارا اکلوتا بایاں ہاتھ۔ میں نے اپنے سر کے درد کو سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے، اپنے کالج کے ان ساتھیوں سے بھی مشورہ لیا ہے جو اب سرکاری اسپتال کے گندے گلیاروں میں بھٹکتے رہتے ہیں یا پرائیویٹ نرسنگ ہوم کی صاف ستھری راہداریوں میں اسٹیتھسکوپ اٹھائے گھومتے ہیں۔ میں نے نیشنل لائبریری میں بیٹھ کر میڈیکل جرنل چھانے ہیں، سائبر کیفے میں بیٹھ کر دنیا بھر کے میڈیکل ویب سائٹس کو لاگ آن بھی کیا ہے۔

"ڈاکٹر کہیں یہ میرے بھیجے میں Serotonin کی کمی کے سبب تو نہیں۔" میں نے اپنے آخری ڈاکٹر سے کہا تھا۔ "ہو سکتا ہے میں اس کے سبب ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہوں جو درد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔"

"جہاں دھوپ میں کمی ہوتی ہے وہاں یہ کیمیائی اجزا بن نہیں پاتے، مثلاً لندن، ایمسٹرڈیم یا سان فرانسسکو۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تھا۔ "مگر کلکتے کا آسمان تو بالکل روشن ہے، بلکہ مجھے کہنے دیں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی روشن ہے۔"

میں نے ایک بار اس ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جس نے یہ گھناؤنا کام کیا۔ کسی نے مجھے اس کا پتہ نہیں بتایا تھا مگر مجھے اس گندے سے نرسنگ ہوم کا علم تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔

اس نرسنگ ہوم میں صرف ایک ڈاکٹر بیٹھی تھی اور اس میں صرف زچگی کے لئے ہی لوگ آتے تھے۔ مگر سارا کام یہاں کی آیائیں انجام دیتیں جن کے چہرے ہر طرح کے جذبات سے عاری تھے۔ کلکتے کے نچلے اور متوسط درجے کے تمام نرسنگ ہوم کی طرح اس نرسنگ ہوم میں بھی کوئی سند یافتہ نرس نہیں تھی۔ یہی آیائیں تھیں جو یونیفارم اور کیپ پہنے گھوما کرتیں۔ اس ڈاکٹر کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور سیندوری لکیر کی دونوں جانب اس کے سر کے گنجے پن کو پتلے پتلے گھنگھریالے بالوں کے اندر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ جب میں نے اسے وہ تاریخ

---

[1] Forceps، زچگی میں کام آنے والا اوزار۔

بتائی جب میں پیدا ہوا تھا تو اس نے غیر یقینی کی حالت میں سر ہلایا۔

"اتنے پرانے رجسٹر تو اب کارپوریشن کے آفس میں ہی ملیں گے۔"

"آپ کو پورا یقین ہے کہ وہ آپ نہیں تھیں؟"

"میں دو سال پہلے سرکاری اسپتال سے ریٹائر ہو کر اس میٹرنیٹی ہوم میں آر۔ ایم۔ او۔ کے طور پر آئی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ویسے آپ اگر جھوٹ کہہ رہی ہیں تو تو اس کا آپ کو حق ہے۔" میں کہتا ہوں۔ "کیا میں وہ چمٹا دیکھ سکتا ہوں جس کے ذریعے آپ لوگوں کو دنیا میں لاتی ہیں؟"

وہ تذبذب میں مبتلا ہے۔

"شاید آپ کا مطلب ڈلیوری فورسپس سے ہے جو عمل جراحی میں استعمال ہوتے ہیں، خاص طور پر زچگی کے وقت۔"

"ہاں ظاہر ہے میں کسی گھڑی ساز کی دکان پر تو نہیں ہوں۔ لیکن وہ ہے تو چمٹا ہی نہ؟"

"شاید۔" وہ ایک آیا کو بلاتی ہے جو بالکل پتلی دبلی بلکہ ہڈی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر کی بات سن کر اس نے غصے اور بیزاری سے میری طرف دیکھا ہے۔ وہ چمٹا لے آتی ہے جسے میں میز سے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کے ٹھنڈے لوہے کو چھوتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس چمٹے کے مقابلے میں اپنا سر بہت زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

"بچوں کے سر پیدا ہوتے وقت اتنے بڑے نہیں ہوتے۔" مجھے چمٹے کو اپنے سر پر آزماتے دیکھ کر آیا ٹوکتی ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

"میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟" میں ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں۔

"نہیں، یہ میٹرنیٹی ہوم کی پراپرٹی ہے۔" شاید اس کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ وہ چمٹا واپس لے کر آیا کے حوالے کرتی ہے۔ "ویسے اگر آپ کو یہ فورسپس چاہئے تو کالج اسٹریٹ میں کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر کسی بھی میڈیکل اکوپمنٹ کی دکان پر مل جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں کہتا ہوں۔ "میں ایک بار کسی بچے کو اس کے سہارے پیدا ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا فون نمبر نوٹ کریں گی؟"

"میرا خیال ہے یہ غیر ضروری ہے۔" ڈاکٹر نفی میں اپنا سر ہلاتی ہے۔

"مگر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"کیوں کہ میں اس بچے کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہوں، جو اپنی مرضی کے خلاف اس دنیا میں لایا جا رہا ہو۔"

"کیا اس بچے کو جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا اس کی مرضی کا پتہ ہوتا ہے؟" وہ ایک آہ بھر کر شاید خود سے کہتی ہے۔ پھر میری طرف تاکتی ہے۔ "صرف ایک صورت ہے اگر کوئی عورت اور اس کا شوہر اس کی تحریری منظوری دے۔ مگر یہ بھی میرے خیال میں ممکن نہیں۔ ہمیں بالکل ہی آخری وقت میں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کیس نارمل ڈلیوری کا ہے، سیزیرین (Caesarean) ہے یا جیسا کہ آپ کہتے ہیں، چمٹے کا۔"

"اور یہ فیصلہ ہمیشہ بڑی جلدی میں کیا جاتا ہوگا۔" میں مسکراتا ہوں۔ "کبھی جلد بازی میں، کبھی موٹی فیس کے لئے اور کبھی کنفیوژن کی شکار ہو کر اور اس پورے عرصہ میں وہ بچہ آخری شے ہوگا جس کی رائے کے بارے میں سوچا جائے۔"

"میرا خیال ہے ہم نے آپ کو کافی وقت دے دیا ہے۔ ایکسکیوز می، مجھے لیبر روم کی طرف جانا ہے۔"

وہ گھنٹی بجاتی ہے اور میں نرسنگ ہوم کے پھاٹک سے باہر کا راستہ لیتا ہوں جہاں آسمان سفید ہے، سورج سوا نیزے پر ہے۔ (آپ دیکھ رہے ہیں، صدیق عالم، وہ احمق کہانی کار، وقت کو کبھی اتنے اچھے ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتا) اور بس کی کھڑکی سے ایک عورت سر نکال کر صبح کا کھایا ہوا سارا کھانا ثابت و سالم قے کر رہی ہے۔ مجھے سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے اور میں سوچتا ہوں ایک دن میں اس گتھی کو سلجھا کر ہی رہوں گا کیوں کہ لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف پیدا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟ اور جو کچھ ہوتا ہے اسے کہیں زیادہ انسانیت کے ساتھ، زیادہ جمہوری طریقے پر کیوں نہیں انجام دیا جاتا؟ کیا میڈیکل سائنس میں انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں؟

آہ، دیکھئے میرا سر اس جگہ پھر سے دکھنے لگا ہے جہاں مجھے اس دنیا میں لاتے وقت چمٹے کا استعمال کیا گیا ہوگا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اسے کسی دیوار پر دے ماروں۔

کارڈیگن کے اندر اسے پسینہ آ رہا ہے، مگر اسے پتہ ہے کلکتہ میں جو چاروں طرف سے آبی گذرگاہوں، ماہی گاہوں اور نمکین دلدلوں سے گھرا ہوا ہے، لوگ ہوا میں رطوبت کے سبب ٹھنڈ کو سمجھ نہیں پاتے اور اندر ہی اندر سردی کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ دراصل اسے کہیں نہیں جانا ہے اور اسے کسی خاص بس یا ٹرام کا انتظار بھی نہیں ہے۔ مگر عین ممکن ہے کہ وہ کسی بھی بس کے اندر بیٹھ کر کہیں بھی چلا جائے، یا تو دریا کی طرف یا بابو گھاٹ، یا بڑا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں، ستیہ نارائن پارک یا سیالدہ اسٹیشن جو ہر دس منٹ پر چھوٹنے والی لوکل ٹرین کے ذریعے اس عروس البلاد کو بنگال کی خلیج میں بکھرے ہوئے دور دراز کے گاؤں دیہات سے جوڑتا ہے۔ یا پھر ممکن ہے وہ اگلے ہی بس اسٹاپ پر بس سے اتر کر اپنے گھر لوٹ آئے جہاں اس کی بیوی اس کے لئے سوئٹر بن رہی ہے جسے تیار ہوتے ہوتے جاڑا ختم ہو چکا ہوگا اور اس کا بوڑھا پنشن یافتہ باپ جو پرانا شرابی ہے، بنگلہ کا اخبار دیکھ رہا ہے اور بالکنی سے باہر نظریں دوڑا رہا ہے جہاں دوسرے مکان کی چھتوں کے اوپر چیل اور کوے اڑ رہے ہیں۔ ایک بلا بوڑھے سائے میں بیٹھا اس کے تھوکے ہوئے مچھلی کے سر کی ہڈیوں اور کانٹوں کو کھا کر اپنی مونچھیں پنجوں سے صاف کر رہا ہے۔

"میں کھانا لگا دوں۔" اس کی بیوی اسے دیکھ کر آدھا بنا ہوا سوئٹر اور کروشیے رکھ دیتی ہے۔

"کھانے میں کیا ہے؟"

"بھات مچھلی، دال، چٹنی، کریلے۔"

"کریلے مجھے پسند ہیں۔" وہ سر ہلاتا ہے۔

بوڑھا اخبار سے سر اٹھا کر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے تاکتا ہے۔ ان دونوں کے لئے اسے ایک لمبے عرصے تک جینا ہوگا۔ عمارت سے کرایہ برائے نام آتا ہے اور اب اس کی پنشن ہی ان دونوں کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ وہ آہ

بھرتا ہے۔ شراب کی قیمت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ سرکار محصول پر محصول لگاتی جارہی ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ دقیانوسی خیالات کے لوگوں کی حکمرانی رہے گی جو محصول کے ذریعے لوگوں کو سدھارنے کی مہم میں لگے رہیں گے۔ ان سے زیادہ روشن خیال تو اس کی بہو ہے جو ہر رات شراب نوشی کے لئے آلو یا مچھلی کے قتلے یا بیسن کے پکوڑے تل کر اس کے سامنے طشتری پر رکھ دیا کرتی ہے۔ یہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کرکے آئے ہوئے گھرانوں کی لڑکیاں کھانا پکانے میں ماہر ہوتی ہیں۔ وہ مچھلی کے فلس اور ہڈیوں نیز معمولی معمولی ساگ سبزیوں کے ڈنٹھلوں اور پتوں سے جنھیں اس ملک کی عورتیں عام طور پر پھینک دیا کرتی ہیں، لذیذ سے لذیذ کھانا پکا لیتی ہیں۔ بہو کے لئے اسے سندر بن جانا پڑا تھا جہاں مرد لکڑی اور شہد کی تلاش میں شیر، سانپ یا گھڑیال کا شکار ہوجایا کرتے ہیں اور عورتوں کے بیوہ بننے کی ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے۔ کہیں اس کے اندر یہ خوف قائم تھا کہ اس کا لڑکا زیادہ دن زندہ رہنے والا نہیں۔ گوسابہ کے جزیرے سے سیتا جب بھٹ بھٹی پر جو ایک گہرے نیلے آسمان کے نیچے گاڑھا سرخی مائل دھواں اڑاتی چلی جارہی تھی، تین گھنٹے کے آبی سفر اور پھر ایک ڈھڈر سرکاری بس تین گھنٹے کے خشکی کے سفر کے بعد لائی گئی تو اسے کلکتہ پسند نہیں آیا۔ وہ اتنی بھیڑ بھاڑ کی عادی نہیں تھی۔ اس نے گوسابہ میں لوگوں کو ہر طرف اتنی شتابی بھاگتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا جیسے گھڑی کے کانٹے شہر کی سڑکوں پر گھومتے پہیوں کو دیکھ کر اچانک تیز ہوگئے ہوں۔ اس پر اس کے شوہر نے پھول سجارات میں ہی اسے بتادیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا جسمانی تعلق قائم کرنے سے معذور ہے، کہ وہ بچے کے سلسلے میں اس کی مرضی جانے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ گاؤں کے اسکول میں آٹھ کلاس تک پڑھی سیتا الگ سونے کی عادی ہوچکی تھی۔ مگر اس کا دل کہتا تھا ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ یا پھر وہ گوسابہ لوٹ جائے گی جو اتنا برا نہیں۔

"شٹ اپ!"

آخری آواز میری تھی۔ آپ نے دیکھا، یہ صدیق عالم کس درجے کا قلم کار ہے۔ وہ آپ کی خواب گاہ کے اندر داخل ہونے سے نہیں چوکتا۔ اس کا قلم کب فحش نگاری پر اتر آئے خود اسے نہیں معلوم۔ اس کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے۔ وہ شہر کے ہر حصے میں، ہر عمارت میں، جھوپڑپٹی میں، یہاں تک کہ طوائفوں کے محلوں، مسافروں، کیل خانوں، اسپتال کے مردہ گھروں، بلکہ قبرستان اور شمشان گھاٹ تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے پاس لوگوں کی ذاتیات کے اندر جھانکنے کے ہر طرح کے ذرائع، ہر طرح کے آلے موجود ہیں اور جہاں یہ اینٹھے خان جھانک نہیں پاتا وہ اپنے تصور کے ذریعے یا لوگوں کی نفسیات کا غلط یا صحیح مطالعہ کرکے ان کا خاکہ کھینچ ڈالتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے ایک ٹرام کے اندر ایک تنہا سیٹ پر بیٹھے ایک کتاب پڑھتے پایا۔ اور میرا یقین کریں، اس نے کتاب الٹی تھام رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ بھیڑ سے خود کو مستثنیٰ قرار دینا چاہتا تھا۔ مجھے ایسے لوگ نہیں بھاتے جو بھیڑ سے الگ جیتے ہیں۔ یہ لوگ خطرناک ہوتے ہیں، انھیں جلد سے جلد تختۂ دار پر پہنچانا لازمی ہوتا ہے پھر ان پر نظر رکھنا بہت ضروری ہوجاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے لوگوں نے ہمیشہ نئی طرح کی مصیبتیں کھڑی کی ہیں، نئے نئے فرقے قائم کیے ہیں۔ انھیں ہر طرح کی چیزوں کے توڑنے کا جنون ہوتا ہے، ایک بچے کی طرح، یا ایک پاگل کی طرح یا ایک پیغمبر کی طرح جو پرانے عقائد کو توڑ کر ان کے ملبوں سے نئی عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔

"ٹکٹ؟" کنڈکٹر کی آواز پر میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔

"میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" میں کہتا ہوں۔

"تو ٹرام سے اتر جایئے۔" کنڈکٹر میرے ہی لہجے کی نقل کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک دھندلی عینک پڑی ہے جو غیظ ہورہی ہے اور اس کی انگلیاں لانبی ہیں جن سے وہ ٹرام کے دروازے کی طرف اشارہ کررہا ہے جہاں مسافر بھاری تعداد میں لٹکے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر وقت اسے مسافروں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس ٹرام سے مسافروں کی ایک بڑی تعداد کرایہ ادا کئے بغیر اتر جاتی ہے یا انھیں اترنا پڑتا ہے کیوں کہ بھیڑ میں انھیں کنڈکٹر تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

"میں ٹکٹ کے پیسے دیتا ہوں۔" مجھے صدیق عالم کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ دس روپے کا ایک نیا نوٹ نکال کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیتا ہے۔

"کہاں جاتا ہے؟" کنڈکٹر نوٹ لے کر مجھ سے پوچھتا ہے مگر میرے بتانے سے پہلے ہی صدیق عالم بول اٹھتا ہے۔ "کالج اسٹریٹ۔"

وہ باقی کے پیسے لے کر ٹکٹ میری طرف بڑھا دیتا ہے اور کنڈکٹر کے آگے بڑھ جانے کے بعد اپنی کتاب کے درمیان انگلی دبا کر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ "تمھیں نہیں لگتا میں بھی کرۂ ارض پر آباد ہوں اور تمھارے آس پاس ہی جی رہا ہوں؟"

آہ، تو اسے میرے خیالات کی آہٹ مل چکی ہے۔ شاید ان سے اسے سخت چوٹ پہنچی ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ اس شخص کا ردعمل تو ایک عام انسان سے بھی گیا گذرا ہے۔

"بھلے آدمی..." میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ "میں تمھاری کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ انھیں پڑھ کر کسی کا بھی بھلا نہیں ہوسکتا۔ شاید اب اس دنیا کو تم جیسے قلم کاروں کی ضرورت نہیں۔ تم سے زیادہ بہتر تو وہ لوگ ہیں جو چوراہوں پر بھیڑ لگا کر نقلی دوائیاں بیچتے ہیں، اس سے کم از کم کچھ لوگ تو زندگی کے بوجھ سے نجات پاتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں میں اوسط درجے کی صلاحیت کا افسانہ نگار ہوں۔ شاید میرے اندر وہ مہارت نہیں کہ لوگوں کی بھیڑ جما سکوں۔" وہ کہتا ہے۔ "یہ لوگ جن کا تم ذکر کررہے ہو، ایک بار میں سو سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کرلیتے ہیں اور اپنی فصاحت کے بل پر ان میں سے پچیس فیصد لوگوں کو اپنی دوائیں بیچ ڈالتے ہیں۔ میرے جیسا قلم کار تو اپنی تین سو کاپیاں چھپوا کر ساری عمر اس کی دو سو کاپیاں تک نہیں بیچ پاتا۔"

"اس دنیا میں صرف وہی چیزیں بکتی ہیں جو لوگوں کو اچھا یا برا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔" میں کہتا ہوں۔ "میرے عظیم قلم کار تم تو کسی بھی لائق نہیں۔ اب اس سماج میں تمھاری حیثیت ایک appendix کی طرح ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔"

مجھے پتہ ہے، میں نے اسے شدید چوٹ پہنچائی ہے۔ میں اس کا ازالہ

کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اپنی کتاب کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چلتی ٹرام سے نیچے اتر جاتا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی پھرتی حیرت انگیز ہے۔ ہوسکتا ہے اور بھی لاکھوں احمقوں کی طرح اسے بھی لمبی عمر جینے کا جنون ہو۔ میرا خیال ہے یہ سماج کے لئے ایک بری خبر ہے۔

کالج اسٹریٹ میں کلکتہ یونیورسٹی کے پھاٹک کے باہر بہت بھیڑ ہے۔ پرانی کتاب کی دکان پر معمول کی طرح دکاندار گاہکوں کو روک رہے ہیں، ان کی تھیلیاں کھینچ رہے ہیں۔

"وکٹر ہیوگو!" ایک دکاندار میرا کاندھا تھام کر کہتا ہے۔ "وکٹر ہیوگو، صرف پانچ روپے میں۔"

"وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں؟" میں حیرانی سے کہتا ہوں۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے جو اپنی پرانی کتاب کے کھوکھے کے باہر اپنے سر کے استخوانوں پر مفلر لپیٹے کھڑا ہے۔ میں اس کی بڑھائی ہوئی کتاب کو کھول کر دیکھتا ہوں۔ کیڑوں نے اس کے اندر آر پار سرنگیں بنا ڈالی ہیں۔ Notre Dame de Paris۔ کتاب کہتی ہے۔ اس کتاب کی جلد کبھی خوبصورت رہی ہوگی، مگر اب بے رنگ اور داغدار ہو چکی ہے۔ اس کے صفحے پاپڑ کی طرح پیلے ہو رہے ہیں اور موڑنے پر ٹوٹ سکتے ہیں۔ شاید غدر کے دنوں میں یہ انگلینڈ سے سمندر کا سفر طے کر کے ہندوستان آئی ہوگی۔ وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں! مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ایسے دور میں جب پانچ ستارہ ہوٹلوں میں بیس بیس ہزار کے ڈنر کے اشتہار دیے جارہے ہوں، جب آئنکس میں لوگ دو دو سو روپے کے ٹکٹ کے لئے فلموں کے لئے لائن لگاتے ہوں، جب فلم اسٹار اور کرکٹ کے کھلاڑی ایک ایک اشتہار کے لئے کروڑوں روپے لیتے ہوں، وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں اور اس کے لئے بھی لوگوں کو کندھے سے پکڑ کر روکنا پڑے! آہ میں وکٹر ہیوگو کے ساتھ یہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ مجھے اس دکان کی تلاش ہے جہاں وہ فورسپس مل سکے جس کی مدد سے لوگوں کو کھینچ کر اس دنیا میں لایا جاتا ہے۔ کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر مجھے اس طرح کی کچھ دکانیں نظر آتی ہیں۔ میں ٹرام کی پٹری کے بیچوں بیچ کھڑا آسمان پر نظر ڈالتا ہوں، آسمان جو ہمیشہ کی طرح بے رنگ مگر پر اسرار ہے۔ آخر کار انسان کو اس کی منزل مل ہی جاتی ہے۔

ویلس سرجیکل ہوم

میں اس کے اندر داخل ہوتا ہوں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا آدمی سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے رہا ہے۔

"آپ ڈاکٹر ہیں؟" وہ پوچھتا ہے۔

"نہیں۔" میں کہتا ہوں۔ "مگر مجھے ایک فورسپس کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے لئے ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟"

"ارے نہیں۔ یہ تو ہم نے آپ سے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

اس دکان کی الماریوں میں نقلی ٹانگیں اور ہاتھ رکھے ہیں۔ پیشاب اور دست کے مرتبان اور ہاتھ پاؤں سے معذور لوگوں کے لئے اسٹول اور کرسیاں فرش پر ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ ہر طرح کے آلات، ربر، پلاسٹک اور فائبر گلاس کے ساز و سامان شو کیسوں کے اندر ترتیب اور بے ترتیبی سے سجے ہوئے ہیں، دیواروں سے ٹنگ رہے ہیں۔ مجھے ایک آلہ خاص طور پر متاثر کرتا ہے جو تیز دھار والا اور قدرے مڑا ہوا ہے۔ شاید اس سے ہڈیاں کاٹی جاتی ہوں۔ اسے تو کسی بوچڑ کی دکان پر ہونا چاہئے تھا۔

قیمت بتا کر فورسپس میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا گیا ہے مگر سیلس مین کی آنکھوں میں تذبذب ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ میرے چہرے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دکان کا بوڑھا مالک صاف شفاف دھوتی کرتا پہنے کیش کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔ اس نے چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا ہے۔

"واقعی۔" میں آلہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ واقعی اس کی شکل جتنی پیچیدہ، جتنی بھیانک ہے اس کا اسٹیل اتنی ہی بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سچ مچ ایک گھناؤنا کام کرنے کے قابل ہے۔

"گھناؤنا کام؟" سیلس مین کا ردعمل فطری ہے۔ دکان کا مالک میری طرف تاکتا ہے۔

"کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟" میں چمٹے کے پیچ کو ڈھیلا کرتے ہوئے پھر کستے ہوئے کہتا ہوں جیسے اس کے لوہے کے حلقوں کو کسی بچے کے فرضی سر کے موافق بنانا چاہتا ہوں۔

"کیوں نہیں۔" سیلس مین کہتا ہے۔ "چھ سو روپے۔"

میں پلٹ کر دکان کے اندر نظریں ادھر ادھر دوڑاتا ہوں۔ وہاں میں تنہا گاہک ہوں۔ میں دکان کے باہر تاکتا ہوں جہاں ٹرام کی روشن پٹریوں کے اوپر ایک لاغر رکشا والا اپنے رکشے پر ایک بھاری بھرکم عورت کو لادے تیزی سے گذر رہا ہے۔ مجھے صدیق عالم کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے کیا کہا تھا، وہ انتہائی چالاک قسم کا انسان ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، ٹرام کے اندر ٹکٹ کے پیسے تو کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔ مگر جب آپ کی ضرورت واقعی اہم ہو، جب سچ مچ اس کی آپ کو ضرورت ہو یہ صدیق عالم دور دور تک دکھائی نہیں دے گا۔ یہی اس کا کردار ہے۔

"شاید اگلی بار اسے خریدلوں۔" میں فورسپس کاؤنٹر پر واپس رکھ دیتا ہوں۔

بوڑھا اپنی پرانی عمارت کے نیچے سڑک پر لڑکوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ رہا ہے۔ پندرہ برس پہلے جب وہ رائٹرس بلڈنگ سے ریٹائر ہوا تھا تب اس سڑک پر کلکتہ امپروومنٹ ٹرسٹ کی جانب سے پودے لگائے جارہے تھے جو اب تناور درختوں میں بدل گئے ہیں اور اپنے پتے پھول اور پھل نیچے پھینکنے لگے ہیں۔ وہ جب ان لڑکوں کی عمر کا تھا تو یہ سڑک ایک پگڈنڈی کی شکل میں ایک تالاب کے کنارے واقع تھی جو سنگھاڑوں کی بیلوں سے نصف ڈھکا ہوا تھا جس کی جھاڑیوں میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگلی مرغ اور گلہریاں پکڑا کرتا تھا، پانی کے سانپ مارا کرتا تھا۔ تالاب اب اپنے سنگھاڑوں اور جھاڑیوں کے ساتھ غائب ہو چکا ہے اور اس کی جگہ خوبصورت دیدہ زیب کثیر المنزل عمارتوں نے لے لیا ہے اور وہ پگڈنڈی اب ایک کشادہ صاف ستھری سڑک میں بدل چکی ہے۔ بحیثیت مجموعی اب یہ شہر کا ایک بہت ہی متمول رہائشی علاقہ ہو گیا ہے جس میں سب سے پرانی

عمارت اسی بوڑھے کی ہے، جس میں آزادی کی افراتفری کے دوران مغربی پاکستان سے آکر بسے ہوئے پنجابی اور سندھی اب بھی پچاس یا سو روپے ماہانہ کرایہ دیتے ہیں، کلب جاتے ہیں اور تین تین لاکھ کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اس عمارت کا مالک ہوتے ہوئے بھی اب اس علاقے میں وہی سب سے غریب آدمی ہے۔ شہر میں ٹھنڈک کم ہوگئی ہے۔ سامنے بادام کے پیڑ کے پتے سرخ ہوکر مرجھانے اور زمین پر گرنے لگے ہیں۔ دور دور کی گلیوں سے بچے پتھر اکٹھا کرکے اس پیڑ کے نیچے بادام توڑنے آیا کرتے ہیں۔ لوگ اپنی کھڑکیوں سے حقارت کے ساتھ ان غلیظ بچوں کو تاکتے ہیں اور ان کے پتھروں سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ بوڑھا سر اٹھا کر بجلی کے تار کو دیکھتا ہے جو خودکشی کے واقعے کے بعد دو ہفتہ قبل تک زمین سے پانچ فیٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا مگر اب پھر سے اسے تان کر برابر کر دیا گیا ہے۔ بہت اوپر بالکنی پر اس کی بہو نہا کر کپڑے پسار رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنا لڑکا آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کشمشی رنگ کی ایک منکی کیپ پہن رکھی ہے اور پان چبا رہا ہے۔ بوڑھے کو حیرت ہوتی ہے۔ وہ پان تو کھایا نہیں کرتا۔ اور پھر آج تو اتنی سردی بھی نہیں، پھر یہ منکی کیپ کیوں؟

"ایک ہی سڑک پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام! واقعی میں نے تو کبھی اس پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔" اس کا لڑکا برقی تار والے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کی عمارت کے عین نیچے ایک بلب کے ساتھ کھڑا ہے پھر سڑک پار اس اونچے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا اوپر کا سرا عمودی ہوکر ایک بڑے سے سوڈیم ویپر لیمپ (Sodium vapour lamp) کو تھامے ہوئے ہے۔ اس بڑے کھمبے کا تعلق زمین دوز تاروں سے ہے اور یہ کھمبے پچھلے ہی سال اس سڑک کی دوسری جانب کھڑے کئے گئے ہیں۔ شاید انھیں لگانے کے بعد یہ تار والے کھمبے بھلا دیئے گئے ہیں۔" ہمیں سرکار کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہئے۔"

بوڑھا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسے معلوم ہے اس کا لڑکا اپنے کالج کے دنوں سے (جہاں علم ریاضی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا) کچھ زیادہ ہی ذہنی عدم توازن کا شکار ہے (اس نے بی۔ ایس سی۔ کے آخری سال میں اچانک کالج جانا بند کر دیا تھا)۔ سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی نئی نئی زبانوں کو سیکھنے کے سلسلے میں اس کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ اپنے کتاب بینی کے جنون کی حد تک شوق کے سبب وہ نہ صرف ان ساری زبانوں کو لکھ اور پڑھ سکتا تھا جو کلکتہ کی سڑکوں پر بولی جاتی تھیں بلکہ اس نے کسی کی رہنمائی کے بغیر فرانسیسی اور جرمن میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی تھی۔ کبھی اس کا زیادہ وقت کلکتہ کی مختلف لائبریریوں میں گذرتا تھا مگر گذشتہ ایک سال سے اس نے کتابوں سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ بوڑھے کو معلوم ہے کہ خاموشی ہر وقت اس کے ساتھ پیش آنے کا صحیح طریقہ نہیں۔ مگر اسے اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ لڑکا پان چباتا ہوا قدیم زمانے کی نشیبی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے تیسری منزل پر (جو اس عمارت کی آخری منزل بھی ہے) اپنے فلیٹ پر پہنچتا جہاں بالکنی میں اس کی بیوی پچی کاری کے فرش پر کھڑی اپنے گیلے بالوں کو دھوپ میں سکھا رہی ہے اور پلاسٹک کی کنگھی سے ان کی لٹوں کو درست کر رہی ہے۔ یہ بالکنی موجودہ زمانے کی بالکنیوں کے تناسب سے بڑی ہے اور اسے بالکنی سے زیادہ ٹیرس کہا جاسکتا ہے۔

"کیا بات ہے تم ہمیشہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی رہتی ہو؟" وہ کہتا ہے، پھر اس کے بالوں کو اٹھا کر دیکھتا ہے جو اس کے کوارے سڈول کولھوں تک لٹک رہے ہیں۔ ان سے ایک عجیب سی تیز خوشبو آرہی ہے جیسے اس کا تعلق بدلتے موسم سے ہو۔ "ویسے تمھارے بال بڑے خوبصورت ہیں۔ ڈیلا (Della) کے بالوں کی طرح۔"

"میری اور بھی چیزیں خوبصورت ہیں۔" وہ مسکرا کر کہتی ہے۔ "اور یہ ڈیلا کون ہے؟"

"جانے دو اسے۔" وہ منکی کیپ سر سے اتار کر کونے کی میز پر پھینکتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے، اس کے سر پر پسینہ جم رہا ہے۔ "وہ ایک کہانی کی فرضی کردار ہے جو ہماری ہی طرح غریب ہے اور اپنے شوہر کو تحفہ دینے کے لئے اپنے بال بیچ ڈالتی ہے۔"

"تحفہ۔" اس کی بیوی کو کچھ یاد آجاتا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے اندر سے ایک سربمہر خاکی لفافہ نکال لاتی ہے جو خاصا بڑا ہے اور ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا ہے۔ لفافہ بہت وزنی بھی ہے۔

"اسے کوئی تمھارے لئے چھوڑ گیا ہے۔"

لفافے کا منھ سیلوٹیپ سے بند ہے جسے قینچی سے کاٹنے پر اندر سے وہی فورسپس نکل آتا ہے جسے اس نے دو روز قبل کالج اسٹریٹ پر دینس سرجیکل ایمپوریم میں دیکھا تھا۔ اس کے ہینڈل سے ایک کارڈ نائلان کے تاگے کے ذریعے سے منسلک ہے، جس پر مارکر پن سے لکھا ہے To Whom It May Concern۔ آگے کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ نہ کارڈ پر کسی کا نام ہے۔

"تم نے نام نہیں پوچھا۔"

"وہ بہت جلدی میں تھا۔"

وہ فورسپس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔

"کیسا تھا وہ؟"

"اوسط قد کا۔"

"بال"

"کالے، چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے، تمھاری طرح۔"

"عینک؟"

"تھی۔"

"مونچھیں؟"

"نہیں تھیں... شاید تھیں... میں نے غور نہیں کیا۔"

"عمر؟"

"تم کیا سمجھتے ہو، ایک جھلک میں اتنا سب کچھ دیکھنا ممکن بھی تھا؟" اس کی بیوی کہتی ہے۔ "اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی، مجھے یہ لفافہ تھمایا اور مجھ سے کہا۔ اچانک اس طرح دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے بینگر فورٹ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ کے اندر کچھ غلط لوگ گھس آئے تھے، بلکہ انھوں نے ایک بوڑھی عورت کا خون بھی کر دیا۔"

آہ وہ صدیق عالم کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر

فورسپس سے کھیلنے لگتا ہے۔ یہ وہ آرام کرسی ہے جس پر بیٹھ کر اس کے باپ دادا بوڑھے ہوئے۔ یہ آرام کرسی اس نے ستیہ جیت رائے کی ہر دوسری فلم میں دیکھی تھی، بلکہ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے یہ کرسی ستیہ جیت رائے کی کسی فلم کے سیٹ سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔

"یہ چیز میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" اس کی بیوی کنگھی سے بالوں کو نوچ نوچ کر ایک گچھے کی شکل میں جمع کر رہی ہے تاکہ اس پر تھوک سکے۔ بالوں کا تھوکا ہوا گچھا نیچے سڑک پر کھڑے اس کے سسر کے سامنے گرتا ہے مگر اس کی کمزور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ان کتے کے پلوں کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے جو اس کی پھٹی ہوئی ایڑیوں کو سونگھنے کہیں سے آنکلے ہیں۔ تین ماہ قبل اس کی ماں جو اس عمارت کی بالکنیوں سے پھینکا ہوا پس خوردہ کھانے اپنے نوزائیدہ بچوں کے ساتھ آیا کرتی تھی اسی سڑک پر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ڈمپر کے نیچے آ گئی تھی۔

"تمھیں اس چمٹے کو دیکھ کر حیرانی ہو رہی ہوگی۔" اپنی بائیں ہتھیلی کو اپنے سر کی پشت پر پھیلا کر آرام کرسی پر جھولتے ہوئے وہ مسکرا رہا ہے، گاہے گاہے فورسپس کو فرش سے اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ "انسان جب کسی چیز کو سمجھ نہیں پاتا تو وہ خود اپنے سوالوں میں گھر جاتا ہے۔ اپنے لئے یہ پنجرا وہ خود تیار کرتا ہے اور اکثر ساری عمر اس پنجرے کے اندر ہی جیتا ہے کیوں کہ کچھ سوالوں کے جواب کبھی نہیں ملتے۔"

سیتا اس کی بات سن نہیں رہی ہے۔ وہ بالکنی سے بہت دور گوسابہ میں خلیج بنگال کی کڑی دھوپ میں کھڑی ہے جہاں خلیج کا نمکین پانی کنارے کی کیچڑوں پر ہلکورے لے رہا ہے، انھیں فلس کی شکل میں کاٹ رہا ہے، ان کے پشتوں کی کنکریٹ کی دیوار اور سیڑھیوں کے زیریں حصوں پر سیپ چپکا رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے بغیر سندری کے سرخ پیڑوں کو دیکھ سکتی ہے جن کے آس پاس رائل بنگال ٹائگر دہاڑتے رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ بالکل سانولی ہے مگر وہ اچھے ناک نقشے والی بھرے پرے بدن کی عورت ہے اور اس کے چہرے پر جیسا کہ مقامی لوگ کہا کرتے ہیں، کافی نمک ہے۔ اس کا غریب باپ سندر بن کے پانی پر جال پھیلایا کرتا ہے اور پھیلاتا رہے گا جب تک کوئی گھڑیال اسے کھینچ کر پانی کے اندر نہ لے جائے یا کوئی ناگ دیوتا نہ ڈس لے۔ اس کی ماں اسے یاد نہیں۔ وہ ریلنگ سے مڑ کر دیکھتی ہے۔ وہ آرام کرسی پر پہلے کی طرح پینگیں لیتے ہوئے اسے میٹھی نظروں سے تاک رہا ہے۔

"تم کچھ سوچ رہی تھی سیتا۔"

"کھانا لگا دوں؟"

"تمھیں صرف کھانے کی ہی فکر کیوں رہتی ہے؟"

"اور میرا کام کیا ہے؟" وہ کمرے کے اندر سے ہوتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ چمٹے کو زمین پر رکھ کر بنگلہ اخبار اٹھا لیتا ہے جو اس کا باپ صبح سے شام تک پڑھتا رہتا ہے۔ اخبار دھوپ میں پڑے پڑے گرم ہو گیا ہے۔ اسے اخبار کے دفتر کا پتہ چاہئے جو اسے آخری صفحے کے بالکل نیچے ننھی حرفوں میں لکھا نظر آتا ہے۔ اسے اس اخبار کے مدیر کو ایک خط لکھنا ہے۔ ایک احتجاجی خط، ایک سڑک کے بارے میں جہاں دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے جب کہ کلکتہ میں ایسی سیکڑوں گلیاں ہیں جن کے کھمبوں پر بلب مہینوں تک نہیں جلتے۔

"جناب عالی!" وہ ایک پوسٹ کارڈ پر لکھتا ہے۔ "میں بالی گنج سیکنڈ لین کا رہنے والا ہوں۔ یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے...."

رک جاؤ تم یہ خط نہیں لکھ سکتے۔

آہ! یہ صدیق عالم، وہ سمجھتا ہے چونکہ وہ قلم کار ہے وہ خط بھی اچھا لکھ سکتا ہے۔ کہانی لکھنا اور بات ہے مگر اخبار کے مدیر کو خط لکھنا وہ بھی ایک احتجاجی خط جس کا مقصد شہر بلدیہ کے انتظام میں عملاً ایک تبدیلی، ایک بہتری لانا ہے، یہ ایک کہانی کار کے بس کی بات نہیں جس کی دنیا بس تصورات کے فریم میں بند ہوتی ہے۔ میں نے اس کا لکھا ہوا خط چھین لیا ہے۔ اس کے پرزے پرزے کر دیئے ہیں۔ میں نے ایک نیا پوسٹ کارڈ لے کر ایک دوسرا خط لکھا ہے جس کے لئے مجھے سیتا سے اس کا قلم ادھار مانگنا پڑا ہے۔ یہ اس کی شادی کا تحفہ ہے۔ اس سے وہ گوسابہ اپنے گھر خط لکھا کرتی ہے جس کا جواب اسی ترتیب سے آیا کرتا ہے۔ میں نے خط کو اپنے نکڑ کے لیٹر بکس کے اندر ڈال دیا ہے جو ایک پرانے پیڑ کے تنے سے لٹک رہا ہے۔ یہ لیٹر بکس سرخ رنگ کا ہے اور اس پر چڑیوں کی بیٹ کی زیبرا لکیریں ہیں۔ اب میں ہر روز بے چینی سے اخبار کے خطوط کے کالم کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پندرہ دن گذر گئے ہیں، مگر مجھے وہ خط اخبار میں دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے دو پوسٹ کارڈ اور بھی چھوڑے ہیں اور آخری پوسٹ کارڈ بذات خود بالی گنج پوسٹ آفس میں ڈال آیا ہوں۔ گرچہ بعد کے دونوں خطوط میں زبان تھوڑی سی بدل گئی ہے مگر میرا خیال ہے مضمون کا متن اپنی جگہ قائم ہے۔ میں نے اپنے آخری خط کی کاپی اپنے علاقے کے کاؤنسلر کو بھی دی ہے۔ وہ ایک غیر شادی شدہ عورت ہے، کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہے، اپنی ذاتی ماروتی وین میں گھوم گھوم کر غریبوں کے مسئلے حل کرتی ہے۔ غریب جنھیں ڈھونڈنے کے لئے آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، وہ بڑی تعداد میں آپ کے آس ہی پاس منڈلاتے رہتے ہیں، کوؤں کی طرح، جنھیں جس روشنی میں بھی دیکھو وہ کوے ہی نظر آتے ہیں۔

"یہ تو اس سڑک کے لئے اچھا ہی ہے نہ۔ آپ کو تو ممنون ہونا چاہئے۔" وہ مسکراتی ہے۔

"یقیناً یہ خوشی کی بات ہوتی اگر تمام سڑکوں پر اس طرح کا انتظام ہوتا۔ اور پھر ان جگہوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جہاں سالوں سال روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا؟"

"کیا کلکتہ میں ایسی کوئی سڑک بھی ہے؟ اپنے علاقے میں تو میں نے خود سے ہر جگہ روشنی کا انتظام کیا ہے۔ جانے آپ کس جگہ کی بات کر رہے ہو۔"

وہ واقعی ایک لائق سیاست دان ہے جس کے پاس ہر موقعے کے لئے جواب موجود ہے۔ وہ وین کا شیشہ ڈھکیل کر بند کرنا چاہتی ہے کہ اس کی بغل میں بیٹھا ہوا آدمی اس کے کان میں کچھ سرگوشی کرتا ہے۔ میں اس آدمی کو پہچانتا ہوں۔ وہ ہمارے علاقے میں بلاوجہ آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور اسی طرح آوارہ گردی کرتے کرتے ایک دن بڑا لیڈر بن جائے گا۔ کاؤنسلر مسکرا کر میری طرف تاکتی ہے۔

"پھر بھی میں اس پر غور کروں گی۔" وہ کہتی ہے اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اب کچھ ہونے والا نہیں، ان غریبوں کی طرح۔ مگر میں

کوشش جاری رکھتا ہوں۔ میں نے اخبار کو ایک اور خط بھیجا ہے۔ اور تب وہ خط شائع ہو جاتا ہے اگرچہ یہ میرا آخری خط نہیں ہے۔ شاید یہ میرا دوسرا خط ہے جسے میں نے پہلے خط کے ایک ہفتے بعد لکھا تھا۔ مجھے خط کے کالم میں اپنا نام دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں اسے سیتا کو دکھاتا ہوں۔ وہ خط سانس تھام کر شروع سے آخر تک پڑھ جاتی ہے۔ وہ میرے نام پر اپنی انگلی رکھ کر مسکراتی ہے جیسے اسے محسوس کر رہی ہو۔ اس میں اس کی شادی کی انگوٹھی چمک رہی ہے۔

"مجھے یقین نہیں ہوتا یہ تم نے لکھا ہے۔" وہ کہتی ہے۔ "پھر بھی میں خوش ہوں کہ تم نے واقعی یہ خط لکھا ہے۔"

جانے اس کے بولنے کے انداز میں ایسی کیا بات ہے کہ میں اخبار اٹھا کر خط کو پڑھنے لگتا ہوں۔ اوہ، اوہ، واقعی، یہ تو میرا لکھا ہوا خط ہے ہی نہیں۔ یہ تو اسی ملعون قلم کار کا کارنامہ ہے۔ یہ تو وہی تحریر ہے وہی خط ہے جسے میں نے پرزے پرزے کر دیا تھا۔

"جناب عالی! میں بالی گنج سیکنڈ لین کا رہنے والا ہوں۔ یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے، جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے..."

آپ دیکھ رہے ہیں، وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ یہ صدیق عالم، مجھے اس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں اس کی تلاش میں اس کی عمارت تک جاتا ہوں مگر اس کے گھپ تاریک زینے کے پہلے چوکے (Landing) پر ہر بار مجھے ایک بیمار خارش زدہ کتا بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کے بدن کی رستی ہوئی خارشوں سے ایک عجیب دم گھونٹ دینے والی بدبو خارج ہوتی رہتی ہے۔ سیڑھی کے گھپ اندھیرے میں اس کی چمکتی آنکھوں سے جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میرا وہاں آنا پسند نہیں اور اگر میں نے اسے پھلانگنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔ اگرچہ ہر بار میں وہاں سے لوٹ آتا ہوں مگر اس کتے کے بدن کی بو گھنٹوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پھر ایک دن میں دیکھتا ہوں وہ تار اور کھمبے وہاں سے ہٹائے جا رہے ہیں۔ مجھے وہ کاؤنسلر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ صرف صدیق عالم اوور سیر سے تھوڑی دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بار میرے اندر اس کے پاس جانے کی خواہش جاگتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے مر جاتی ہے۔ جہنم میں جائے وہ، میں سوچتا ہوں۔ وہ ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے سوچا جائے۔ دنیا میں ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو بالکل ہی غیر اہم ہوتی ہیں مگر ہماری توجہ کے سبب ایک خاص اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

صدیق عالم سڑک سے گذر کر اوور سیر کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے بات کر رہا ہے۔ اوور سیر اسے کچھ سمجھا رہا ہے پھر خود اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ وہ واپس چلا جاتا ہے اور پیڑوں کے نیچے ٹھنڈ کی ماری چڑیوں کے بیٹ کے داغدار فٹ پاتھ پر قدم رکھتا ہوا غائب ہو جاتا ہے۔

وہ لوگ تار اور کھمبے ہٹا کر جا چکے ہیں۔ میں بالکنی کے جنگلے سے جھک کر نیچے دیکھتا ہوں۔ ہماری عمارت کے سامنے سے کھمبا اکھاڑ لیا گیا ہے اور اب اس جگہ زمین اس طرح ادھڑی پڑی ہے جیسے قرون وسطیٰ کے کسی جاپانی سامورائی نے ہارا کیری کر کے اپنی انتڑیاں باہر نکال لی ہیں۔ تار اور کھمبے کی عدم موجودگی میں ہماری بالکنی کافی اونچی اور خطرناک نظر آ رہی ہے۔ میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ وہاں کنویں کے اندر کا سا گہرا اندھیرا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر تک اس کنویں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، پھر دھیرے دھیرے ایک چہرہ ابھرتا ہے۔ یہ صدیق عالم کا چہرہ ہے۔ پھر اس چہرے کے پیچھے کے مناظر ابھرتے ہیں۔ وہ پیڑوں کے نیچے چڑیوں کی بیٹ کے نشانات پر چلتے ہوئے مڑ مڑ کر میری طرف تاک رہا ہے، مسکرا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ایک خاص منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ میں اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔ اس کی کہانی کو اس انجام تک اس کی مرضی کے مطابق چلنے نہیں دوں گا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہوں اور میز کے دراز سے چمٹا باہر نکال کر واپس بالکنی پر نکل آتا ہوں۔ نیچے سڑک اپنے دونوں کنارے دور تک سنسان پڑی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب سڑک زیادہ تر سنسان رہتی ہے۔ میں جنگلے کے اوپر جھک کر چمٹا نیچے پھینک دیتا ہوں۔ چمٹے کے سڑک سے ٹکرانے کی آواز میرے کانوں تک آتی ہے۔ اتنی بلندی سے تارکول کی سڑک پر پڑا ہوا اسٹیل کا چمٹا عجیب نظر آ رہا ہے جیسے وہ کوئی مشینی پرندہ ہو اور ابھی ابھی اپنے پر پھیلا کر اڑ جائے گا۔ ایک دو کاریں ہارن بجائے بغیر گذر جاتی ہیں۔ ایک تنہا راہگیر کہیں سے آنکلتا ہے۔ اس کی نظر چمٹے پر پڑتی ہے۔ اس نے ایک خوب دبیز سفید رنگ کا ریشے دار سویٹر پہن رکھا ہے جس کے سبب وہ انسان کم اور انٹارٹیکا (Antarctica) کا کوئی جانور زیادہ نظر آ رہا ہے۔ وہ فورسپس کو اٹھا کر اپنے چاروں طرف سوالیہ نظروں سے تاکتا ہے، پھر چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں چہرہ دوسری طرف موڑ لیتا ہوں۔ وہ چمٹا لئے ہوئے الٹ پلٹ کر حیرت سے اس کا معائنہ کرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ آہ، مجھے اس شاطر کہانی کار کو حیرت میں ڈالنا ہوگا، اسے اسی کی چال سے مات دینا ہوگی۔ میں اپنے کمرے کے اندر جاتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سیتا ہلکی نیند سو رہی ہے۔ اس کا بھاری سینہ سانس کے زیر و بم کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ میں اس کے داہنے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوں... سہلانے لگتا ہوں۔ سیتا آنکھیں کھولتی ہے، مسکراتی ہے۔ میں اس کے داہنے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر چومتا ہوں جس میں اس نے شنکن کے سنکھ اور لوہے کے کڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیتی ہے۔

"تم دروازہ کیوں نہیں بند کر لیتے؟" سیتا شرما کر کہتی ہے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

اس کی سانس تیز ہونے لگتی ہے۔

"گھبراؤ مت۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔" میں اس کے صحت مند بدن کو چومتے ہوئے کہتا ہوں۔

سیتا لیبر روم کی میز پر لیٹی درد سے کراہ رہی ہے۔ میں اسے دلاسا دے رہا ہوں۔ ڈاکٹر اندر آتا ہے۔ سفید ماسک سے نکلی ہوئی عینک کے شیشوں کے اندر سے اس کی آنکھیں میری طرف نہیں تاکتیں۔ وہ بہت مصروف دکھائی دے رہا ہے۔

"ہمیں مریض کو او۔ ٹی۔ میں لے جانا ہوگا۔" وہ میری طرف توجہ دیئے بغیر نرس سے مخاطب ہوتا ہے اور اسٹتھیسکوپ کو لاپرواہی سے ہلاتے ہوئے او۔ ٹی۔ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ او۔ ٹی۔ کے دروازے پر میں اسے جا لیتا ہوں۔

"یہ کیس نارمل ڈلیوری کا ہے نہ ڈاکٹر، جیسا کہ مجھے شروع سے بتایا گیا

ہے؟" میں اس سے کہتا ہوں۔

"بچہ اس دنیا میں آنا نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر کہتا ہے۔ "اور پیڑو کے مقابلے میں بچے کا سر بہت بڑا ہے۔ ہمیں فورسپس کا استعمال کرنا ہوگا۔"

"ارے نہیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔" میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری دونوں کنپٹیوں پر کوئی ٹھنڈی چیز رکھ دی گئی ہو۔ "میرا خیال ہے کہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔ اچانک یہ سب کچھ کیسے بدل گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا؟" وہ تھوڑا پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے سے ماسک ہٹاتا ہے۔

"تم!"

"ہاں میں۔" میں نے ماسک واپس لگا لیا اور اب اس کے اندر سے اس کی آواز آ رہی ہے۔

"اور تم سمجھ بیٹھے تھے کہ تم اپنی زندگی کی کہانی خود لکھ سکتے ہو۔ کیا یہ اتنا آسان تھا۔ دیکھو تم نے اپنا ستیاناس کر لیا نہ؟ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا، تم نے میرا بھیجا ہوا تحفہ سڑک پر پھینک دیا۔ یہی وہ فورسپس ہے نہ جسے تم چمٹا کہتے تھے؟" وہ اپنے گاؤن کی جیب سے چمٹا نکال لیتا ہے۔

"تم نے جلد بازی کی۔ تم نے مجھ سے بازی لے جانا چاہا، اپنے خالق سے، تم نے سوچا تم صفحات سے باہر بھی سانس لے سکتے ہو، تم اپنی مرضی کی زندگی جی سکتے ہو۔ تم نے میرے انتظام میں جو انتشار پیدا کیا اب اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے یہ فورسپس..."

وہ فورسپس میرے چہرے کے سامنے لٹکا دیتا ہے۔ اس کا اسٹیل راہداری کی ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ "تمہارا بچہ، تم نے یہ بالکل نہ سوچا اسے کیا چاہئے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی بھی ہو سکتی ہے، جس کے لئے تم ساری عمر لڑتے آئے تھے، تم نے صرف مجھ سے جیتنے کی ضد میں اتنا بڑا فیصلہ لے لیا۔"

او۔ٹی۔ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کی سرخ بتی جل اٹھی ہے۔ میں ٹھنڈی دیوار سے چپکا کھڑا ہوں۔ زیادہ وقت نہیں گذرتا کہ میرے سامنے اسٹریچر کے پہیے گھومنے لگتے ہیں۔ اس اسٹریچر پر سیتا درد کی شدت سے نیم بیہوش لیٹی کراہ رہی ہے۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند ہیں مگر جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میری موجودگی کا علم ہے۔ او۔ٹی۔ کا دروازہ کھلتا ہے۔ اسٹریچر کسی قسم کی آواز پیدا کئے بغیر اندر چلا جاتا ہے۔ اب میں باہر اکیلا کھڑا ہوں۔ نہیں، شاید کوئی میرے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ میرا باپ ہے جو آ گیا ہے اور لکڑی کی ایک بنچ پر خاموش بیٹھا ہے۔ مجھے اس کی موجودگی عجیب سی لگتی ہے جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، صرف میرا اضافہ ہو گیا ہو۔ میرے سر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ اس درد کے سبب میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، مجھے دیوار بے حد بھاری لگ رہی ہے جیسے وہ میرے سہارے کھڑی ہو۔ اندر سیتا کا درد زہ اپنے عروج کو پہنچ چکا ہوگا؟

"تم ٹھیک تو ہو؟" میرے باپ کی آواز مجھے اس دیوار سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ او۔ٹی۔ بلب کی سرخی میری آنکھوں سے رس رہی ہے۔ میں سر موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اگرچہ وہ بنچ پر دیوار سے لگا بیٹھا ہے میں اسے دیکھ نہیں پاتا اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر جانے لگتا ہوں۔ نرسنگ ہوم کے باہر ایک ایمبولنس کار کھڑی ہے جس کی روشنی تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ ایک مریضہ اس نرسنگ ہوم سے کسی دوسری جگہ منتقل کی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر آکسیجن کا ماسک لگا ہے، جس کے اوپر سے اس کی آنکھیں اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسے وہ اپنے ہی اندر مرکوز ہوں۔ میں نے سڑک تیزی سے پار کی ہے۔ آسمان پر آدھی رات کا چاند دہک رہا ہے جو ہمارے محلے کی کشادہ سڑک تک میرا پیچھا کرتا ہے اور میرے رکتے ہی پیڑوں کے اوپر تھم جاتا ہے۔ ہماری عمارت کا صدر دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے اپنے فلیٹ کی لینڈنگ پر آتا ہوں۔ درد سے پھٹتے سر کو ایک طرف گرا کر میں نے جیب سے کنجی نکالی ہے اور داخلے کا دروازہ کھول کر کنجی کو اس کے سوراخ میں لٹکتا چھوڑ دیا ہے۔

اب میں چاند سے روشن بالکنی پر اس کا جنگلہ تھامے کھڑا ہوں اور دور تک نظر آنے والی عمارتوں کے اندر شاید واحد شخص ہوں جو جاگ رہا ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ نیچے سڑک اپنے دورویہ پیڑوں کے ساتھ سنسان پڑی ہے۔ میں ریلنگ پر جھک کر ایک گہری سانس لیتا ہوں۔ ہوا میں کٹھل چمپا کی تیز خوشبو ہے۔ آسمان پر روئی کے گالوں کی شکل کے بادل بکھرے ہوئے ہیں جیسے بے شمار پھاہے نہ نظر آنے والے زخموں پر رکھے ہوں۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ سے جنگلے کو تھام رکھا ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس مادی دنیا سے باہر نکل آیا ہوں۔ جانے کتنا وقت گزر گیا ہے، جب ایک تیز آواز سے میری محویت ٹوٹ جاتی ہے، فون کی گھنٹی کمرے کے اندر بج رہی ہے۔ میں جنگلے کو پھلانگ کر بالکنی کی دیوار کے باہری سرے پر قدم جماتا ہوں اور مڑ کر دیکھے بغیر بھی سمجھ سکتا ہوں کہ ہمارے فلیٹ کے دونوں نیم تاریک کمرے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف تاک رہے ہیں۔ فون کی گھنٹی لگاتار بجتی رہتی ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گذر جاتا ہے، یہاں تک کہ میں اسے بھول جاتا ہوں۔ جب مجھے دوبارہ اس کی یاد آتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ فون کی گھنٹی رک چکی ہے اور ایک گہرے سناٹے نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، ایسا سناٹا جو میرے کانوں میں کچھ کہنے کے لئے بے چین ہے۔ میں غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں آسمان پر روئی کے پھاہے ہوا کی زد میں آ کر رینگنے لگے ہیں اور چھتوں پر دور تک سوکھنے کے لئے ٹنگے ہوئے کپڑوں نے پریت آتما کی طرح لہرانا شروع کر دیا ہے۔ جنگلے سے میری انگلیوں کی گرفت ہٹ گئی ہے اور اب میں بغیر کسی سہارے کے دیوار پر اپنی جگہ کھڑا ہوں جیسے میں اپنی پرانی عمارت کا ایک بے جان حصہ ہوں، پرنالے کے طور پر بنایا ہوا کوئی انسانی ڈھانچہ جس کی شرم گاہ سے برسات کا پانی باہر آتا ہے۔

بے جان انسانی ڈھانچے نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اس نے ایک آخری نظر نیچے بادام کے پیڑ پر ڈالی ہے۔ پیڑ کی ڈالیاں سوڈیم لیمپ کی تیز روشنی میں سونے کی طرح دمک رہی ہیں۔ ان کے زیادہ تر پتے جھڑ چکے ہیں اور ٹہنیوں کے بیچ رکھا ہوا گھونسلہ ویران ہے ☆☆☆

صدیق مجیبی

شمارہ۸۶،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۳

وہ مٹی جواب تک
پس کارواں نوحہ گر ہے
صدائیں
فضاؤں میں درماندگی کی سزا کاٹتی ہیں
گنہگار لمحے
جنھیں ہم نے پہچان دی
اور ان کی جبینوں پہ بوسوں کی تحریر تفویض کی
اپنی بے چہرگی کو لئے
سربریدہ دشاؤں کا نقش قدم ڈھونڈتے ہیں
وقت پتھریلی چپ سے نکل کر ہمیں
بیج کی طرح بوتا ہوا
تندخو، تیز و طرار دریا کی مانند بہتا رہا
موسموں کے بدلتے ہوئے رنگ کی آبیاری سے
سوز و سرور
حادثے، معرکے

آبشاروں کی لمبی زبانوں سے گرتے رہے
دور تک
یہ تماشا، تسلسل، نہ کھویا کبھی
آسمانوں کی یلغار کا خوف اور
ٹڈیوں کا برستا ہوا قہر
سینہ سینہ لہکتی ہوئی فصل کو کھا چکا

واقعہ جو بھی ہو
وہ اثاثہ جسے پشت پر لاد کر ہم سفر کر رہے تھے
پھسلنے لگا
آسماں کی حدیں
بحر ظلمات کی ساحلی ریت پر ختم ہیں
حشر کی شب گزیدہ سحر کے تلے
سانس لینے کی بے ساختگی
وقت کی جھولتی لاش کو دیکھ کر
کتنی حیران ہے

ہم تہی دست و داماں ہوئے
آبلے پاؤں کے سو گئے
اور لہو
میری رگ رگ سے اب
خوں بہا مانگتا ہے
مری سانس کے ڈنک میں
شہد کی لذتوں کا ہنر
آج ناپید ہے
درد ماہر نقب زن سہی
چیل کے گھونسلے میں وہ کیا پائے گا
آج آئے گا گروہ
تو پچھتائے گا

صدیق مجیبی

شمارہ ۱۱۰،
نومبر دسمبر ۱۹۷۸، جنوری ۱۹۷۹

معدوم میں ہوا تو نظریاب وہ ہوا
میں بجھ گیا تو مشعلِ مہتاب وہ ہوا

دریا نے اپنی آخری پونجی بھی سونپ دی
زخمِ صدف کھلا تو گہرباب وہ ہوا

نرغے میں دشمنوں کے تھے دونوں گھرے ہوئے
جاں میں نے نذر کی تو ظفریاب وہ ہوا

اک سازِ بے صدا تھا میں، نغمہ نہ جوئے صوت
اک حرفِ بے ادا تھا میں، اعراب وہ ہوا

پیوست ہو سکا نہ کفِ سنگ میں لہو
افسانۂ نمود کہ نقشاب وہ ہوا

پتھر تھا میرے دستِ ہنر نے تراش کر
اس کو خدا کہا تھا کہ نایاب وہ ہوا

اس کا خیال اس کی تمنا فضول ہے
اب بھول جا مجیبی کہ اک خواب وہ ہوا

شمارہ ۱۷۴، اپریل مئی ۱۹۹۴

اپنی وحشت ہی سے ایسا کچھ ہے
سوچتا کچھ ہوں میں ہوتا کچھ ہے

ریزہ ریزہ ہیں دعائیں دل میں
رنگ اشکوں میں لہو کا کچھ ہے

اے یقیں آنچ نہ آئے تجھ پر
دل کے اندر کہیں ٹوٹا کچھ ہے

خواب مسمار ہوئے سب میرے
ہاتھ اس میں بھی خدا کا کچھ ہے

لوحِ دانش ہوئی گروی جب سے
مسئلہ اور بھی الجھا کچھ ہے

ایک سکتہ سا ہے طاری مجھ پر
بولنا کچھ ہے نہ کہنا کچھ ہے

صفدر

شمارہ۱۰۸،
مئی تا جولائی ۱۹۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہنس رہی ہیں سبزہ زاروں پر پڑی بینائیاں
چار جانب رنگ نکہت نرمیاں رعنائیاں
سج رہے ہیں آنکھ کی حد سے ادھر جام وسبو
مسجدوں میں قلقل آبِ وضو
گا رہے ہیں طائران خوش گلو
اللہ ہو
سطح پر پانی کے منہ کھولے ہوئے ہیں سیپیاں
آؤ بھر لیں مٹھیاں
حرف رنگ و نور سورج کی ضیا
سانس اطمینان کے لیتی ہوا
ہنس رہا ہے آسمانوں پر خدا

سبز ہاتھ

چمچماتی سر پہ بے سایہ ببول
تھرتھراتا ایک صحرا دھوپ رنگ
جس طرف جاؤں چلیں یہ سنگ سنگ
بے صدا بے آب بارش سلسلہ
دھوپ شعلہ قطرہ قطرہ آبلہ
سورجوں کے سائے میں چلتے ہوئے
ریگ صحرا کی طرح جلتے ہوئے
ایک دن ایسا ہوا
صبح جب سو کر اٹھا
ٹھنڈ میں لپٹا ہوا
سائے میں بھیگا ہوا
جا بجا بکھری کھجوریں رس بھری
سر پہ جھکتا مہرباں اک سبز ہاتھ
مل گئی راہ نجات
جس طرف جاؤں چلیں اب ساتھ ساتھ
نرم گہرا سایہ اور یہ سبز ہاتھ

صلاح الدین محمود

شمارہ۹۵،
اپریل تا جون ۱۹۷۵

۱

نام تمھارا
جیسے ہاتھ میں بے کل دریا
نام تمھارا
بارش برسے اندھے دریا پر
اور ایک پرندہ
ڈوبن دور سمندر جائے
بن بن
سورج میٹھی آگ جلائے

نام تمھارا
جنبش لب کی آنکھ اکیلی
جیسے ہاتھ سے بے کل چڑیا
سبزہ بن اڑ جائے
نام تمھارا

۲

بن باد قدم
تم پانی ہو گے
دو آنکھوں کی ساعت
کیا تم پانی ہو گے
ہاتھ تمھارے نظر بنے
اور بال تمھارے دریا
بن باد قدم
کیا پتھر پتھر
صورت سویرا مٹی کا
کیا بالک جانے
روشن چڑیا
کب جنگل میں باد بنے
اور دریا پھول صدا کا

بن باد قدم
کیا دو سمتوں میں صدا چلے
اور اجلی اجلی
لکنت بن کر
مجھ میں جنگل آپ اگے

بن باد قدم
تم پانی ہو گے

۳

رات کے تن میں لکنت بہتی
پانی بہے صدا میں
دوہرا حرف، اکہرا دریا
اوجھل اگے ثنا میں
ہوا ندار دھونٹوں سے
ہاتھوں کی اوٹ نگاہ میں
نگاہ کہے یارب یارب

میں ہوا کی خصلت دیکھوں گا
بے انگلی کی خصلت وا میں

وقت صلب صورت بن کر
اور دریا دریا شجر کی سیرت
مٹی چنے فنا میں

۴

میری ذات کی رنگت میں
دو آنکھیں گل گھل جائیں
اور صورت کو دو تارے
چھو چھو دیکھیں
تو سورج سو جائے
آہٹ کے خم میں
اور شبنم، نم اندھیرا
رو رات سمندر پار
کسی ساعت کے سن میں
بہ بہ جائے
تو صورت ہاتھ بنے
اور چھو دیکھے سورج کو
سورج نہ جاگے
اور تارے
دو دریا بن جائیں

۵

دیکھو میری پناہ
کے اجلے تھاہ میں دیکھو
رات بہے بن کر سورج

اور ڈوبا دریا
بے صدا کی چوکھٹ میں
دو آنکھیں

دو آنکھوں کے باد قدم
بے تاب جدا
جب اجلے پاؤں آپ جدا
تو جڑیں ہوا میں
نم صورت
اور ذات کے میدانوں
میں ہر دم
دوہرے پل کی پیش
فنا ہو پانی میں
پانی فنا ہو پانی میں
اور نیا پرندہ
اگے زمیں کی آہٹ سے
بے نظر کا بندہ
ہوا کو پانی جانے
دیکھو میرے پناہ
کے اجلے اتھاہ میں دیکھو

۶

بارش بوئے بیج میرا
اور بیج سمندر پھول اگے
اس پھول کی جانب چھ چڑیاں
گم ہاتھوں سے اڑ جائیں
تو بارش تھم تھم نیند بنے
اور نیند پرے

اک سبز گھوڑا
دوب بھرے میدانوں کا
بن دوب سمندر
دریا لانے جائے

تو ساگر
بھر جائے پھولوں سے
اور پھول سپیدہ شبنم کا
جب ڈوب چکے
تو باد بنے
اور بارش رات صدا کی

جب بارش بوئے بیج مرا
اور بیج سمندر پھول اگے
تو پھول کی خصلت
چھ چڑیاں
گم ہاتھوں سے اڑ جائیں

۷

میں ساگر تھام سے بچ کر
خاک دھروں ساحل پر
پشت میری ساگر کی باسی
قدم میرا گم نام
میرا بازو وزن ستاروں کا
اور تارے لہو کی جنبش میں
مٹی کی خصلت
آخر کو گردانیں

خاک کہے "اس مٹی میں
دریا بانی کچھ انگ سدا بہتے ہیں۔"
بہتے دریا
میں ساگر تھام سے بچ کر آیا
خاک دھروں ساحل پر
جانوں
نم لکنت میں
گم بیٹا ساحل کا
ساحل مٹی کی گم جان

بہتے دریا

۸

سب کچھ شبنم اور سمندر
ایک سمندر خواب میں دیکھے
بہتے ایک سمندر کو

اجلے آسمان کے پانی دیکھو
ہوا میں وحشت مٹی کی
اور ایک سمندر خواب میں دیکھے
بہتے ایک سمندر کو

سب کچھ شبنم اور سمندر

غزل

صلاح الدین محمود

شمارہ ۱۲۱،
جولائی، اگست ۱۹۸۱

(اس کالی چڑیا کے نام کہ جو نیند کی سدا جوان کیفیت میں اکثر مجھ نابینا تک آتی ہے)

شعر کی بھیتر چھاتی چڑیا
سمتوں کو دہراتی چڑیا

ننھی نازک کالی رنگت
شجر سفیدہ پاتی چڑیا

گل ہوتی خوشبو کے تن میں
بینائی کو لاتی چڑیا

رات کے لازم اندھیارے میں
سورج کو بہلاتی چڑیا

کالی رنگت، نیلی باتیں
آنکھوں کو اجلاتی چڑیا

ہونٹوں کی خوشبو کی جانب
آتی اور شرماتی چڑیا

بہتے پانی کی صورت سے
لو ہو کو مہکاتی چڑیا

بارش کے تھمتے آنگن میں
شجر شجر بہ جاتی چڑیا

خطاب

صلاح الدین محمود

شمارہ ۱۲۱،
جولائی، اگست ۱۹۸۱

اے چڑیو
جب میں چھوٹا تھا
تو میں نے تمھارے پرکھوں سے
گفتار کا بندھن
سیکھا تھا
اے چڑیو
جب میں بچہ تھا
تو میں نے تمھارے پرکھوں کو
تاروں کی طرح پاکیزہ دن
اور تھمتے پتھر جیسی شب
میں دریا بنتے دیکھا تھا
پر اے چڑیو
کیا یاد تمھارے لوہو کو
میرا بچپن، پاکیزہ تن
کہ جس کے نابینا آنگن میں
کبھی تمھارے پرکھوں کو
اک بارش کا اندیشہ تھا
اے چڑیو
کب میں بچہ تھا
اور کب میری خوشبو کے سرے پر
چاند ابھی ان دیکھا تھا
اے چڑیو
کب میں بچہ تھا

غزل

صہبا وحید

شمارہ ۲۴۷، اگست ۲۰۰

اس کے میرے درمیاں وہم وگماں کچھ بھی نہ تھا
عشق کہتے ہیں جسے ویسا میاں کچھ بھی نہ تھا
وہ تو ویسا ہی حسیں تھا جیسا دیکھا تھا اسے
اس کے بارے میں مرا حسن بیاں کچھ بھی نہ تھا
میں تو ٹھہرا گاؤں والا صاف گوئی تھی عزیز
میرے افسانے میں زیب داستاں کچھ بھی نہ تھا
پھول کیا ہم چاند تارے تک بچھاتے راہ میں
اس کی فرمائش اگر ہوتی گراں کچھ بھی نہ تھا
نام کیا لیں ناز بو کا تھا مرادف اس کا نام
صاحب دل جانتے ہیں چیستاں کچھ بھی نہ تھا
ہم جو اس کے نام پر جھوما کئے رقصاں رہے
اس لئے کہ پھر علاج نیش جاں کچھ بھی نہ تھا
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے آنکھ بتلاتی ہے سب
میری آنکھوں سے ترا باطن نہاں کچھ بھی نہ تھا
جو کی روٹی کے علاوہ چاہئے کچھ اور بھی
ہم چلے تھے گھر بسانے خانماں کچھ بھی نہ تھا
شام پھر در پر کھڑی تھی ہاتھ میں کاسہ لئے
زہر خنداں میں کھڑا تھا میرے ہاں کچھ بھی نہ تھا
اس نے پوچھا آنکھوں آنکھوں میں کہ تم کیا لائے ہو
جاں نچھاور ہم نے کر دی ارمغاں کچھ بھی نہ تھا
چند موتی آنسوؤں کے دو منٹ کی خامشی
تم کو دینے کے لئے اے کشتگاں کچھ بھی نہ تھا
میں نے تو آواز دی تھی شب گذاری کے لئے
آ لگے گا تیر کوئی یہ گماں کچھ بھی نہ تھا
کس طرح اثبات کرتا پا بہ زنجیر نفی
از سر کون و مکاں تا لامکاں کچھ بھی نہ تھا
کب تلک کھاتے رہیں گے ہم فریب ہست و بود
کل یہاں کچھ بھی نہ ہوگا کل یہاں کچھ بھی نہ تھا
ہم ہی ناداں تھے کہ چاہا زندگی کو جاننا
خواب ہے یا پھر حقیقت یہ عیاں کچھ بھی نہ تھا
سوچئے تو ہے بھی کچھ یہ جہان رنگ و بو
اور جو مت سوچئے تو یہ جہاں کچھ بھی نہ تھا
ایک جیسے نقش والی شہر میں مخلوق تھی
دور تک اسلاف کا نام و نشاں کچھ بھی نہ تھا
ہم نے تو معصوم بچوں تک کی قربانی بھی دی
زندگی کیا امتحاں یہ امتحاں کچھ بھی نہ تھا
حسرت تعمیر ہے تو ایک اک تنکا سنبھال
اس جہان آب و گل میں رائیگاں کچھ بھی نہ تھا
میں درون آئینہ تھا پیش آئینہ بھی میں
ماورائے عکس آئینہ جہاں کچھ بھی نہ تھا
میں جو تھا اک اور میں کے واسطے سے تھا اسیر
میرا اپنا اس جہاں میں این و آں کچھ بھی نہ تھا
میں یہاں ہوں میں یہاں ہوں اک صدا آتی رہی
رات میں نے جھانک کر دیکھا وہاں کچھ بھی نہ تھا
کچھ ہوا نے آب و آتش نے لیا کچھ انتقام
میرے حصے میں بقدر نقد جاں کچھ بھی نہ تھا
جی لئے ہم بھی کہ ہم کو مل گئی تھی زندگی
عمر کی زنبیل میں سود و زیاں کچھ بھی نہ تھا
جرأت اخلاق ترکہ ہے تمھارے واسطے
بس یہی تھا اور اے پس ماندگاں کچھ بھی نہ تھا
ہم کو رخصت کر ہمارا رات بھر کا تھا قیام
غم نہ کر اس زندگی میں جاوداں کچھ بھی نہ تھا
جل بجھے سارے الاؤ جا چکے محمل نشیں
صبح دم دیکھا غبار کارواں کچھ بھی نہ تھا
ہم نے کس کس سے نہ پوچھا تیرے بارے میں مگر
ایک خوشبو کے سوا مژدہ رساں کچھ بھی نہ تھا
موسموں کی آہٹوں پر باز در ہوتے رہے
اک من و تو کی صدا تھی درمیاں کچھ بھی نہ تھا
دیکھ جاناں عشق میں ہم تیرے کیا سے کیا ہوئے
رات دن آتش بجاں تھے اور دھواں کچھ بھی نہ تھا
میں بھی اندر سے خلا تھا تو بھی تھا ٹوٹا ہوا
کہنے سننے کے لئے اے جان جاں کچھ بھی نہ تھا
اب یہی خوشبو ہماری ترجماں کہلائے گی
شہر نا پرساں میں جو نام و نشاں کچھ بھی نہ تھا
میں جسے سمجھا تھا صہبا اپنی امیدوں کا در
اک دھواں تھا بس دھواں آسماں کچھ بھی نہ تھا

شناختی کارڈ

محمود درویش، ترجمہ: ضمیر احمد

شمارہ ۲۰۹
اگست ۱۹۹۷

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب
کارڈ کا نمبر ہے اکیاون ہزار۔
میرے بچے آٹھ ہیں اب
اور نواں آنے کو ہے گرما کے بعد۔
اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات؟

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب
اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح میں
پتھروں کی کان میں مزدور ہوں۔
آٹھ جو بچے ہیں میرے
ان کی روٹی، ان کے کپڑے اور ان کی کاپیاں
قوت بازو سے اپنی
پتھروں سے چھین کر لیتا ہوں۔
بھیک لینے آپ کے در پر کبھی آیا نہیں
آپ کی دہلیز پر جھکنا مرا شیوہ نہیں۔
اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات؟

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب۔
میں تو بس اک نام ہوں میرا لقب کوئی نہیں۔
ایک ایسے ملک میں بھی
جس میں ہر شے
برہمی کے اک بھنور میں مستقل گردش
میں ہے
صبر سے جیتا ہوں میں۔
آفرینش میری کچھ اس سے بھی پہلے کی ہے
وقت جب پیدا ہوا
جب یہ صدیاں تھیں شگوفے بن کھلے
سرو تھے جب اور نہ یہ زیتون تھے
جب خس و خاشاک یوں پھیلے نہ تھے
باپ میرا ہل چلانے والوں میں سے ایک
ہے
اشرف و امجد نہیں۔
اور دادا جان بھی تھے اک کسان
کوئی شجرہ اور نہ عالی خاندان۔
گھر مرا چھپر کی اک کٹیا ہے چوکیدار کی
کہئے کیا اب مطمئن ہیں حیثیت سے میری
آپ؟
میں تو بس اک نام ہوں، بے خاندان

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب
رنگ بالوں کا: سیاہ۔
اور مری آنکھیں ہیں بھوری۔
کیا مری پہچان ہے؟ کیا ہے شناخت؟
سر پہ اک رومال اور اس پر "عقال"
جو چھوئے گا اس کو چھل جائیں گے ہاتھ
اور پتہ میرا؟
میں رہنے والا ہوں اس گاؤں کا
دور افتادہ کچھ اتنا یاد سے بھی مٹ گیا
اس کی گلیاں سب کی سب بے نام تھیں۔
اور جتنے مرد تھے
کھیتوں میں یا کہیں کانوں میں ہیں۔
اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات؟

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب۔
تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے
باغ تھے جتنے مرے اجداد کے
اور چھینا ہے زمیں کا وہ قطعہ
جس کو میں اور میرے بچے
کاشت کرتے تھے کبھی
تم نے میرے واسطے اور میری نسلوں کے
لئے
کچھ نہیں چھوڑا، بجز پتھر یہاں
کیا تمھاری یہ حکومت
سارے پتھر بھی کہیں لے جائے گی؟
لوگ کہتے تو یہی ہیں آج کل
ہاں تو پہلے ہی صفحے پر
سب سے اوپر یہ لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض اور نفرت نہیں
دست اندازی کسی کے مال پر فطرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق گر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چبا جاؤں گا میں۔
بس ڈرو۔ تم بھوک سے میری ڈرو
اور مرے غیظ و غضب سے تم ڈرو۔

خواهشیں

محمود درویش، ترجمہ: ضمیر احمد

شمارہ ۲۰۹،
اگست ۱۹۹۷

مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا الجزائر میں اور ہوتی نان کی میری دکان
پھر میں گاتا باغیوں کے ساتھ گیت۔
مت کہو مجھ سے
کہہ ہوتا گریمن میں گلہ بان
پھر میں گاتا وقت کی لرزہ براندازی کے گیت
مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا میں ہوانا کے کسی کیفے میں اک ویٹر اگر
پھر میں گاتا غم کی ماری عورتوں کے واسطے
نصرت کے گیت
مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا گر جوان مزدور میں اسوان میں
پھر چٹانوں کے لئے گاتا میں گیت
میرے ہمدم
وانگا میں نیل کا پانی تو بہہ سکتا نہیں
کانگو دریا ہو یا ہو جارڈن
ہو نہیں سکتے وہ دریائے فرات
ہے ہر اک دریا کا اک منبع الگ
راستہ اس کا الگ۔ زندگی اس کی الگ
میرے ہمدم
سرزمیں اپنی بھی بنجر تو نہیں
وقت ہوتا ہے معین
ہرزمیں کی آفرینش کے لئے
ہے سویرے سے ملن اک دن ضرور
ہر مجاہد کے لئے۔

اپنی همجولیوں سے

سیفو، ترجمہ: ضمیر احمد[1]

شمارہ ۲۲۷،
جولائی ۱۹۹۹

میں سوچتی ہوں وہ دیوتاؤں کا ہوگا ہمسر
جو یوں مگن تیرے پاس بیٹھا ہے
پیار سے تجھ کو تک رہا ہے
وہ تیرے پہلو میں بیٹھا چپ چاپ
تیری باتوں کو سن رہا ہے
وہ میٹھی باتیں
کہ جیسے چاندی کھنک رہی ہو
ترا نزاکت سے پیار میں اس طرح سے ہنسنا
یہ دیکھتی ہوں تو میرے سینے میں
ہونے لگتی ہے ایک ہلچل
لرزنے لگتا ہے قلب۔ بے کل
کہ میں تو پل بھر کو بھی اگر تجھ کو دیکھ پاؤں
تو چپ سی لگ جاتی ہے اسی دم
گرفتہ لب اور سخن شکستہ
مری تو رگ رگ میں سرسراتی ہے آگ جیسے
بدن میں ہوتی ہے جھنجھناہٹ
دکھائی دیتا نہیں کچھ آنکھوں سے اور کانوں میں گونجتا ہے
بپھرتی موجوں کا شور پیہم

پسینہ بہتا ہے جیسے دریا
رگوں میں اک ارتعاش ہر دم
بدن کی رنگت اڑی اڑی سی
ہو جیسے پت جھڑ میں گھاس پیلی
اجل کے ہر درد سے ہراساں
میں شوق کے وجد میں ہوں رقصاں
تمام غلطاں۔ تمام پیچاں

---

[1] اس نظم کا ترجمہ صفحہ ۱۸۷۳ پر بھی ملاحظہ ہو، مترجم ہے ادتی۔

عصر حاضر کا نوحہ

ادونس (علی احمد سعید)، ترجمہ ضمیر احمد

شمارہ ۲۶۹
جون ۲۰۰۳

(۱)

جبر ترک وطن
دھیمی لے میں ہے درد زباں
شعلے اٹھتے ہوئے
گاڑیاں ہجرتوں کی رواں
منہدم کرتی جاتی ہیں ہر اک دیوار کو

گاڑیاں ہیں کہ ہیں
میرے شعروں کی آہیں جو ضربوں سے معمور ہیں
گرد باد ہم کو برباد کرتے رہے
راکھ پر اپنی تاریخ کی ڈھونڈتے
دیکھتے ہیں، کبھی اک جھلک اپنی روحوں کی ہم
جگمگاتی ہوئی تیغ کی دھار پر
یا کبھی آہنی خود کی نوک پر۔

اپنے زخموں پہ آ کر ٹھہری گئی ہے
نمک پاش فصل خزاں
کیسے پھوٹے شجر
کیسے پھولے بہار۔

اب کہ ہے آخری ایکٹ اس کھیل کا
اپنی بدبختیاں لا رہی ہیں گھسیٹے ہوئے منہ کے بل
اپنی تاریخ کو دو بدو۔
اپنا ماضی ہے کیا اور اس کے سوا

ایسی یادیں جو بندھی ہوئی ہیں تمام
جیسے صحرا کہ ہو کیکٹس سے بندھا
ہیں وہ چشمے کہاں جو اسے دھو سکیں؟
اس کے اندر کسی ہیں بساندیں گھنی، مشک کی
عورتوں کی جو بیوہ ہوئیں یا کنواری رہیں
وہ بساندیں جو واپس زیارت سے آتے ہوئے
ان میں رچ بس گئیں۔
یہ جو درویش ہیں گھومتے گھومتے رقص کرتے ہوئے
اپنے دوار سروال کو معجزہ کر دکھاتے ہیں جو،
تیز چکر سے دھندلے سراویل:
اپنی تاریخ پر دھبے ان کے پسینے کے ہیں

اب بہار آئی ہے
ٹڈی دل کی بہار، بلبلیں مر گئیں
ان پہ یہ رات اک بوجھ ہے
ایک بڑھتا ہوا بوجھ ہے
دن سرکتا ہے آہستہ آہستہ سوئے نمو
اور سمندر کا دروازہ
ہے جو مقفل اور اپنے لئے بند ہے
ہم کو کرتا ہے رد۔
چیخ اٹھتے ہیں ہم، چاہتے ہیں کہ رو لیں مگر
آنسوؤں کو ان آنکھوں میں آنے سے انکار ہے
مر گئیں گردنیں اپنے طوفان میں
تھے جو مثل صفر

اے مری سرزمیں
مجھ کو لگتی ہے تو اس طرح
جیسے ہو ایک عورت سلگتی ہوئی نفس کی آگ میں
ایک شہوت کا پل

جب بھی چاہا فراعین نے
تجھ کو بالجبر قابو کیا
اور پھر ذرہ ذرہ ترا مرحبا ان کو کہتا رہا
اپنی آنکھوں کی مٹی کے اس خول سے
دیکھتا ہوں جو آئے کسی اور کو بھی نظر
قبر پر ننھے بچوں کی نذر و نیاز اور رسوم
خوشبوئیں مذہبی پیشوا کے لئے
کالے پتھر کے لوح مزار
اور ویرانے، جن میں ہیں بکھرے ہوئے
ڈھانچے انسانوں کے، اور گدھ
سڑتی گلتی ہوئی لاشیں ان کی
جو تھے وقت کے سورما۔

اپنے سینے سمندر کی جانب کئے
ہیں رواں، اپنے ماضی پہ نوحہ کناں
اپنے لفظوں کی میراث کچھ بھی نہیں،
کچھ بھی حاصل نہیں،
ہم جزیرے ہیں بس
آتی رہتی ہے پاتال سے بوئے زاغ و زغن

اور اپنے جہازوں کی فریاد کی سیٹیاں
ہے پہنچ ان کی بس ناامیدی کے اس چاند تک
جو خموشی میں بستا ہے عفریت۔ بھوت اور پریت
جا کے گرتا ہے دریا جہاں، بحر مراد میں
اس جگہ،
نیم شب نے سجائے ہیں خوابوں میں جشن طرب
ہاں مگر ان میں دلہن بنی ہیں فقط
ریت اور جھاگ اور ٹڈیاں

بس اس طور سے بڑھتے جاتے ہیں ہم
کارواں کو لئے
آنسوؤں اور غلاظت کی فصلوں کو ہم کاٹتے
خون سے اپنی دھرتی کو خونیں کئے
آخرش وہ سمندر جو اک سبز سا باندھ ہے
روکتا ہے ہمیں

(۲)

گوشت اور پوست میں اپنے دوبارہ پیدا کرے
ہم کو، وہ دیوتا کون ہے؟
آخر کار لوہے کا پنجرا بھی اب ہوتا جاتا ہے تنگ
دار کس کو ٹھہرتا نہیں
چاہے روز ولادت سے روتے رہیں
اپنے خوش باش ویرانوں کے نام لے لے کے ہم

بیتے دن کس قدر رنگ تھے
کتنے باسی، سکڑتے ہوئے سال تھے...
بار و باراں کے طوفان بھی عاجزی سے چلے آتے ہیں
آسماں سرمئی ریت سے جب ملاتا ہے رنگ
درمیاں موسموں کے ہمیں چھوڑ کر
ہو کے مسدود اس سے جو آئے نظر
یوں ہی چلتے ہوئے، بادلوں کے تلے
خود جو حرکت میں ہیں

اس طرح جیسے گھوڑے چلیں توپ خانے چلیں
قبر کی خاک آنکھوں کو کرتی ہے اندھا
یہاں تک کہ آنکھیں بنیں قافیہ راکھ کا
کب ہوا ہے کہ پلکیں بنیں حاشیہ دھوپ کا؟
ابروؤں نے کیا دن میں سایہ کہاں؟
لوحہ لوحہ اترتی ہے بس زندگی
جب بھی آتی ہے یہ صرف نادار کے واسطے
برف اور ریت کے سائے میں زندگی ہم نے

بس اسی طور جیتے ہیں انسان سب۔

جتنے انسان ہیں
صرف ردی کے ٹکڑے ہیں
چاروں طرف سے سمیٹے ہوئے
نت نئے طعمۂ زہر میں
آسماں کے تلے ان کے، سبزہ بھلا کیا اگے
سارے انسان، وہ جن کے حلقوم
سب راکھ سے اٹ گئے
جو ہیں کچلے ہوئے خامشی کے گراں سنگ سے
فاتح و حکمراں ان کے اوپر سواری ہی کرتے رہے
اپنے کھیلوں کی خاطر نمائش کے میدانوں میں
ان کو لاتے رہے۔
کتنے یہ غاشیے اور کتنے سارے نشان و علم...
العبانہ ہو یا ہو وہ آب فرات
اب کہیں بھی نہیں کوئی سرگوشیاں
کوئی حرکت نہیں، کچھ بھی اگتا نہیں
اے مری بے زباں خشک بنجر زمیں
کس نے چھوڑا ہے
ماضی کے آثار مردہ کی صورت تجھے؟
تو جو نقشے میں ہے، پوری مردانہ قوت سے بھرپور ہے
تیری مٹی سے گندم فراواں ملے
تیل افراط سے اور مئے ناب بھی

تیری آبادیوں میں بھرے تارکین وطن نے
کئی اور رنگ
پوست کے کھیت سے اگ سکے گی کبھی نسل نو؟
باد تازہ سنوارے گی کیا ریت کو پھر نئے ڈھنگ سے؟

کاش ہو جائے بارش یہاں
اور بارش سے دھل جائیں ویرانے سب
ساری لاشیں دھلیں اور دھل جائے ماضی کی
تاریخ بھی
اور وہ میری نظمیں کہ لب پر ہی جن کا گلا گھٹ گیا
رو میں بہہ جائیں یوں
جیسے بارش میں گلیوں میں پتھر لڑھکتے چلیں
آؤ اب دیکھیں بھالیں ذرا گائے بھینسوں کو ہم،
اپنے پھولوں کو اور فاختاؤں کو، اپنے خداؤں کو ہم
کاش لوٹ آئے پھر سے صدا
اس زمیں پر ہیں مینڈک جہاں بھوک سے نیم جاں
ٹڈیاں اور وطن سے نکالی ہوئی چیونٹیاں
کاش لے آئیں واپس یہاں روٹیاں

میرے الفاظ ہیں جیسے نیزہ ہو پرواز میں
سچ کی صورت جو روکے سے رکتا نہیں
ہاں، مگر میرا نیزہ پلٹ کر مجھی کو گرا دیتا ہے

(۳)

میرے بچو تم اب بال باندھو
برگ سرسبز تر سے سروں کو سجاؤ
شاعری تو ابھی زندہ ہے اور سمندر ہے اپنی بغل میں
اپنے کچھ خواب بھی:
ہنہناتے ہوئے یہ ہمارے فرس
چین کے سبزہ زاروں کو ودیعت ہیں سب
جارجیا کے لئے برچھیاں۔
ہم بنائیں گے سونے کے گھر

اس زمیں سے ہمالہ تلک
اور لہرائیں گے اپنے جھنڈے سمرقند میں
اس زمیں پر پرانی کائی کے ڈھیر کو
اپنے گھوڑوں سے پامال کر دیں گے ہم
خون پر اپنے ہم خود کریں گے نچھاور گلاب
دل پہ دھبے ہیں جو ان کو دھوئیں گے ہم
پتھروں پر چلیں گے ہم اس طور سے
جیسے ریشم پہ کوئی چلے

"راستہ اب نہیں کوئی اس کے سوا
چل کے اس راہ پر ہم نشیں ہوں گے ہم برق کے
اور مقدس بنائیں گے ہم
اس پھپھوندی بھری خاک کو
پھر نئی زندگی کی بشارت فضاؤں میں گونجے گی اور
گونجتی جائے گی۔ گونجتی جائے گی

"کوئی بھی اب ہمیں روک سکتا نہیں
یاد رکھو کہ ہم
ہیں سمندر کے پانی سے بھی سبز تر
وقت سے بھی سوا نوجواں
آفتاب اور دن
انگلیوں میں ہماری وہ پانسے ہیں بس۔"

دوسروں کے وطن میں شب ماہ میں
پہلی پہلی پروں کی کہیں پھڑ پھڑاہٹ ہوئی
بحرِ مردار کی کشتیوں میں بھی حرکت ہوئی
جس سے اٹھنے والی ہواؤں کے جھکڑ سے بج اٹھے ہیں
شہر کے سارے در۔ کل یہ دروازے کھل جائیں گے
ٹڈیوں کو جلا دیں گے صحرا میں ہم
سب خلیجوں کو ہم پار کر جائیں گے
اور کھڑے ہوں گے اک پیش دہلیز پر
ایسی دنیا کی جو آنے والی ہے اب

"اے اندھیرو
سمندر کی تاریکیو
تیندوؤں کی سی خوشیوں سے سرشار ہو جاؤ تم
اور قربانیوں میں ہماری اعانت کرو
اب ہمیں اک نیا نام دو۔
آنے والے زمانے کا شاہین ہے منتظر
اور ہیں اس کی آنکھوں میں روشن جواب

"اے اندھیرو
سمندر کی تاریکیو
یہ یافت جو لاشوں کی ہے بھول جاؤ اسے
تم ہواؤں سے کہہ دو کھلائیں زمیں پر
نئے پھول اب
اور منادو وبائیں تمام
پتھروں کو سکھا دو کہ رقصاں ہوں وہ
اور محبت کریں۔"
ریت کی دیوی اب
منہ کے بل عاجزی سے پڑی ہے یہاں خاک پر
برج خاری (۱) کے سائے میں جاگی بہار
جیسے حنظل
جیسے پیدا سمندر سے ہو زندگی
چھوڑتے ہیں ہم اب شہر محصور کو
جس کی قندیلیں سب ہیں کلیسا کے مانند
اور یہاں مکھیاں شہد کی
راہباؤں سے بھی ہیں مقدس زیادہ کہیں

(۴)
یہ بتاؤ کہ گھر ہے تمہارا کہاں؟
کون سے ملک میں؟

کون سے کیمپ میں نام جس کا نہیں؟

"ملک تھا جو مرا چھٹ گیا
روح میری مجھے چھوڑ کر جا چکی
اب کہیں گھر نہیں۔"
حکمراں جب تھے فرعون اور
آدمی، آدمی خور تھے
شاعروں کے جو الفاظ تھے مر گئے
جب تلک ہے حکومت فراعین کی
لے کے اپنی کتابیں چلا جاؤں گا
دل کے سائے میں پھر بیٹھ کر
ریشمی تار سے شاعری کے بنوں گا میں جنت نئی
دھو رہا ہے سمندر کا پانی مرے زخم کو
جوڑتا ہے نمک اور زخموں کے رشتے نئے
بحرِ ابیض بھی اور
آب العاصی مخرج کے پاس
العبانہ، فرات، سب کے پانی کو چکھا ہے میں نے مگر
تشنگی میری ان سے نہیں بجھ سکی
خیر پھر بھی مجھے پیار ان سے رہا
میری مایوسیوں کے لئے ان کا پانی ضروری بھی تھا

گو میں مایوس ہوں
پھر بھی ہے موت سے سخت نفرت مجھے
میں ہوں بھٹکا ہوا، راستہ ڈھونڈتا ہوں مگر
دلدلوں میں شکوک اور شبہات کی
اور اس جھوٹ میں، جس کا اک خول سا ہے
زمیں پر چڑھا
بادباں دو، جلاوطنوں والا مجھے
جاتری کی شباہت بھی دو
قتل عام اور زندانوں پر پشت کرتا ہوں میں
موت کے واسطے چھوڑتا مردگاں کو ہوں میں
اب چلا جاؤں گا

---

(1) Thornbirch

ساتھ میں اپنے لیکن لے جاؤں گا
یہ غم بے کراں
فاصلے جو مرے اور ستاروں کے ہیں درمیاں
جاترا میری، یہ میری محبوب، اور
یہ مری شاعری
جاؤں گا اپنی پیشانی پر ہجرتوں کا پسینہ لئے
اور لئے اپنی آنکھوں میں کھوئی ہوئی نظم اک
میں چلا جاؤں گا
یاد کرتا ہوا ان کو جو دفن ہیں
سایۂ تاک میں... یا کسی باغ میں
یاد کرتا ہوں ان کو ہے جن سے محبت مجھے
چند ہی لوگ ہیں
جب سمندر سے ہوتا ہے اک جوش پیدا
مرے خون میں
میری محبوب کی زلف کو چومتی ہے ہوا
یاد آتی ہے اس دم مجھے اپنی ماں

یاد میں اس کی بنتا ہوں میں اک چٹائی جہاں
بیٹھ جائے وہ۔ اور رو سکے

دور یہ کھیوں کا ہے۔ آمین تم بھی کہو

میری مایوسیوں کا جو ہے زرد رو دیوتا
خوش ہے اس بات پر
میرے پیروں کے نیچے زمیں زندہ ہے
ہے نئی ایک آواز جو
میرے لفظوں کو اب کر رہی ہے ادا
ہو کے اب بے لباس
کھل رہی ہیں مری نظریں جیسے گلاب
لاؤ کاغذ۔ دوات
ناامیدی ہے اب بھی ستارہ مرا
اور جہاں میں ہمیشہ ہے شر کی نمود
ریت پر خامشی کا ظہور

کتنے دل ہیں جنھیں ہم کو چھونا بھی ہے
لاؤ کاغذ۔ قلم
اور لاؤ دوات
یہ بتاؤ کہ "گھر ہے تمھارا کہاں؟
کون سے کیمپ میں نام جس کا نہیں؟"

"ملک تھا جو مرا وہ تو بس چھٹ گیا
روح میری مجھے چھوڑ کر جا چکی
اب کہیں گھر نہیں۔"

پروائی

ضمیرالدین احمد

شمارہ ۱۵۰،
جون تا اگست ۱۹۸۸

لڑکے نے کاپی پر سے نظریں ہٹا کر بند دروازے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے اس کا باپ کپڑے بدل رہا تھا۔

"آئیں ابا پروا کسے کہتے ہیں؟"

مگر جواب باورچی خانہ میں سے آیا جہاں ماں ناشتے کے پراٹھے تل رہی تھی۔

"پروائی کو۔"

"یانی وہ ہوا جو مشرق کی طرف چلتی ہے؟"

"نہیں۔" ماں نے پراٹھے توے پر سے بھگونے میں اتارتے ہوئے کہا۔ "جو مشرق یعنی پورب کی طرف سے چلتی ہے۔ پورب۔ پربا۔ پروا۔ پروائی۔"

"پرویا بھی کہتے ہیں۔"

باپ دروازہ کھول کر قمیص کے بٹن بند کرتا دالان میں آیا جہاں ایک گول میز کے گرد جس پر پلاسٹک کا ایک میلا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ ایک تین ٹانگ کی اور تین سالم کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر کتابوں کا ایک بستہ کھلا پڑا تھا۔ وہ ایک کاپی پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ باپ نے بائیں آستین کا بٹن بند کرنے کے بعد پوچھا۔

"کیوں؟"

"جملہ بنانا ہے۔"

"کیا جملہ بنایا؟" باپ نے بائیں ہاتھ سے دائیں آستین کا بٹن بند کر کے پوچھا۔

لڑکے نے کاپی آہستہ سے باپ کی طرف کھسکا دی۔

"ہوا مشرق کی طرف سے چل رہی ہو تو اسے پروا کہتے ہیں۔" باپ نے کاپی پر جھک کر پڑھا۔ "یہ تو معنی ہوئے۔"

"پھر؟" لڑکے نے سر کھجایا۔

ماں ایک پلیٹ میں ایک پراٹھا اور تھوڑا سا خاگینہ لئے آئی اور پلیٹ لڑکے کے سامنے رکھ کر بولی۔

"لکھو۔"

لڑکا پھر کاپی پر جھک گیا۔

"پروا میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ اداس سے اداس شخص بھی تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو جاتا ہے۔ اور..."

لڑکے نے کاپی سے نظریں ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے قدرے توقف کیا۔

"اتنا کافی ہے۔ 'اور' کاٹ دو۔"

لڑکے نے 'اور' کاٹ دیا۔

ماں تیزی سے باورچی خانے میں واپس چلی گئی جو دالان سے ملحق تھا اور جس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔

لڑکے نے کاپی بند کر کے بستے میں رکھی۔ بستہ بند کیا اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا۔ پھر اس نے باورچی خانے کے دروازے کے پاس صحن میں رکھی ٹنکی کا نل کھول کر کلی کی۔ الگنی پر لٹکی ہوئی تولیے سے ہاتھ اور منہ پونچھا۔ بستہ گلے میں ڈالا۔ ماں سے کہا۔ ''شام کو دیر سے آؤں گا امی! ہاکی کا میچ ہے۔'' اور ''خدا حافظ۔'' کہتا صحن کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی ایک اور پلیٹ میں دو پراٹھے اور رات کا بچا ہوا تھوڑا سا سالن لئے آئی۔ اس نے پلیٹ میاں کے سامنے رکھ دی جو اب اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر پہلے بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ میاں نے پلیٹ کو گھورا۔

''خاگینہ نہیں ہے؟''

''ایک ہی انڈا تھا۔'' بیوی نے باورچی خانے کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''شام کو لیتی آؤں گی۔ آج تنخواہ کا دن ہے۔''

باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر اس نے بھگونے میں سے ایک باسی روٹی نکالی اور دیگچی میں بچے ہوئے سالن میں ڈبو ڈبو کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ مگر تین چار نوالے کھانے کے بعد اس نے باقی روٹی واپس بھگونے میں رکھ دی۔

''تم نہیں کرو گی ناشتہ۔'' میاں نے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کر لیا۔'' بیوی نے کیتلی چولھے پر سے اتار کر اس میں کھولتا ہوا پانی چائے دانی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''کب؟''

''جب آپ نہا رہے تھے۔''

میاں نے چائے کی پیالی میں چمچہ چلنے کی آواز سنی۔

''چائے تو لے گی یا...؟''

جواب میں بیوی طشتریوں پر رکھی چائے کی دو پیالیاں لئے آئی۔ اور ایک میاں کے اور ایک اپنے سامنے رکھ کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میاں نے ایک گھونٹ لیا اور کلمے کی انگلی سے میز پوش پر پڑا ہوا دال کا ایک پتلا دھبہ مٹانے لگے۔

بیوی نے بھی ایک گھونٹ لیا۔

''دھو دوں گی۔''

تھوڑی دیر دونوں گھونٹ گھونٹ چائے پیتے رہے۔ پھر میاں نے کہا۔

''دو دن سے یہی قمیص پہن رہا ہوں۔''

''دھوبی بدلنا پڑے گا۔ کبھی وقت پر نہیں آتا۔''

''دو ایک قمیصیں تو گھر پر بھی دھل سکتی ہیں۔''

''کیوں نہیں۔'' پیالی کا پیندا طشتری سے ٹکرایا۔ ''بلکہ ساری دھلائی گھر پر ہو سکتی ہے۔''

میاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔''

بیوی چپ رہی۔

میاں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اسے سہلانے لگا۔

بیوی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

میاں اٹھا اور جا کر اس کی کرسی کے پیچھے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کے بدن اور اس کی بیوی کی پیٹھ کے درمیان صرف کرسی کی پشت تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں بیوی کے زرد رخساروں پر رکھ دیں اور جھک کر ہونٹوں سے اس کے میلے بالوں کو چھوا۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی بیوی کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر پھیری۔ اور پھر اس کے دونوں ہاتھ بیوی کے کھلے بالوں پر سے پھسلتے ہوئے اس کے کندھوں پر آئے اور کچھ دیر وہاں ٹھہرے رہنے کے بعد نیچے کی طرف سرکے۔

بیوی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابھی بہت سے کام باقی ہیں...''

میاں کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''...برتن دھونے ہیں۔ بستر ٹھیک کرنے ہیں۔ نہانا ہے...''

میاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیوی کو بٹھا دیا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں!'' بیوی نے اپنے نیل پالش سے عاری ناخنوں پر نظریں جما کر کہا۔

''ادھر دیکھو۔''

مگر بیوی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''یہ بھی کوئی وقت ہے!''

''اور کل رات؟''

''سر میں درد ہو رہا تھا۔''

میاں طنزیہ ہنسی ہنسا۔

''بہانے کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

بیوی نے چائے کی پیالیاں اٹھائیں اور باورچی خانے کی طرف چلی۔ اور اس کے متحرک کولھے ساری کی اوٹ سے میاں سے چشمکیں کرتے ہوئے باورچی خانے کے سرمئی اندھیرے میں گم ہو گئے۔

وہ دوکان سے اتری تو اس نے دیکھا کہ سڑک کے اس پار ایک کار آ کر رکی جسے ایک شوفر چلا رہا تھا اور جس کی پچھلی سیٹ پر ایک شخص سیٹ کی پشت سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹکی۔ شوفر نے باہر آ کر پیچھے کا وہ دروازہ کھولا جو سڑک کی طرف تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر لگے ہوئے پیڑ کی آڑ میں ہو گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص باہر آیا۔ لمبا قد۔ گیہواں رنگت۔ سوٹ اور ٹائی۔ جوتے چمکتے ہوئے۔ شوفر سے دو ایک باتیں کرنے کے بعد وہ شخص پاس کی ایک گلی میں چلا گیا۔ اور شوفر پھر جا کر کار میں بیٹھ گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا گلا سوکھ رہا ہے۔ پیر بھاری ہو گئے ہیں۔ ماتھے پر پسینے کا لیپ ہو رہا ہے۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے نکل کر اس گلی میں جانا چاہتی ہیں جس میں وہ شخص گیا ہے۔ اس نے دو ایک بار تھوک نگلا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ ساری کا پلو شانے پر سے اٹھا کر سر پر ڈالا۔ پیڑ کی آڑ سے نکلی۔ سڑک پار کرنے کے لئے بڑھی مگر رک گئی۔ چند لمحے کار کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر جلدی سے سڑک پار کر کے کار کے پاس پہنچی اور شوفر سے کوئی دو فٹ کے فاصلے پر ایسے رکی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ رکی رہے یا آگے بڑھ جائے۔

شوفر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

شاپنگ بیگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مگر دس بارہ قدم چل کر واپس آ گئی۔

اس بار شوفر نے صرف اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

ایک لمبا سانس لے کر وہ کار کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

"یہ کون صاحب تھے؟" اس نے شوفر سے ایسے پوچھا جیسے کوئی راہ چلتا کسی دوسرے راہ چلتے سے راستہ یا وقت پوچھتا ہے۔

شوفر نے پھر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"ہمارے مہمان۔"

"آپ کے؟"

"ہاں۔ ہمارے صاب کے۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

وہ چند لمحے چپ کھڑی رہی۔

"ان کا نام سرور احمد ہے نا؟"

شوفر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر ماچس بجھائی اور بجھی ماچس کھڑکی کے باہر پھینکی جو اس کی چپل کے پاس آ کر گری۔

"پتہ نہیں۔ صاب تو قاضی جی کہتے ہیں۔"

"قاضی سرور احمد۔" اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ "ان کا پورا نام قاضی سرور احمد ہے۔"

"شاید۔"

اور وہ سامنے کے شیشے میں سے تنگ کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی کو کار کے سامنے سے گزرتا دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

پاس سے ایک کار گزری، اس نے دیکھا کہ کار ایک لڑکی چلا رہی ہے۔ اس کے پاس سامنے کی سیٹ پر ایک اور لڑکی بیٹھی ہے جس کے بال ہوا میں اڑ رہے ہیں اور پچھلی سیٹ پر ایک دبلا مرد اور ایک موٹی عورت۔ اس نے چپل سے ماچس کا جلا ہوا سرا ملا اور شاپنگ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ مڑی اور کار کے پیچھے سے ہوتی ہوئی جا کر کار کی دوسری طرف کپڑوں کی ایک دکان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسی راستے شوفر کی طرف واپس آئی اور اس نے اس سے ایسے پوچھا جیسے کوئی بچہ کوئی ایسی فرمائش کر رہا ہو جس کے پوری ہونے کی اسے بہت کم امید ہو۔

"ان کی بیگم صاحب بھی ساتھ ہیں؟"

شوفر نے اسے ایسے دیکھا جیسے سر راہ لوگ اپنے پاگلوں مجذوبوں یا سڑیوں کو دیکھتے ہیں۔ اسے اس کا واپس آ کر مزید سوال کرنا اچھا نہ لگا مگر تربیت یافتہ تھا۔ نرمی سے بولا۔

"بیگم صاحب انہیں جی۔ قاضی صاحب ابھی چھڑے ہیں۔"

اس نے جلدی سے "شکریہ" کہا۔ مڑ کر گلی پر نظر ڈالی اور ہلکے مگر تیز قدم اٹھاتی بس کے اڈے کی طرف چل دی۔

باپ فائلوں کا پلندہ لئے گھر میں داخل ہوا تو لڑکا میز پر بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس نے پلندہ میز پر رکھ دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"امی کہاں ہیں تمہاری؟"

"نہا رہی ہیں۔"

غسل خانے سے جو باورچی خانے سے ملحق تھا چھل چھل کی آواز آئی۔

"اس وقت؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

باپ کی نظر میز پوش کے پلاسٹک پر پڑی جو چم چم کر رہا تھا۔ دالان کا فرش اسے ایک دو جگہ سے گیلا نظر آیا۔ شاید دھویا گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ صحن کا فرش بھی جگہ جگہ سے گیلا تھا۔ مگر گھر میں صرف تین کمرے تھے اور تینوں کے دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ اس نے پہلے ایک دروازے پر نظر ڈالی پھر دوسرے اور پھر تیسرے پر۔ تینوں صاف تھے۔ جھاڑے پونچھے گئے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا۔ بغیر شیڈ کا وہی ایک بلب عین میز کے اوپر لٹکا ہوا تھا اور اس پر بدستور گرد جمی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بلب زیادہ روشنی دے رہا ہو۔

چھل چھل کی آواز بند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے کا دروازہ کھلا اور بیوی دھانی رنگ کا کھڑا پاجامہ اور اسی رنگ کا کرتہ پہنے اور سر سے تولیہ لپیٹے باہر آئی۔

"بہت دیر ہو گئی آج!" اس نے میاں کے پاس رک کر کہا۔ "چھ بجے کی بس چھوٹ گئی تھی۔"

اس کے بدن سے سوگندھ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے گالوں پر گلابی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں دالان کی چھت کا بلب قمقمے روشن کر رہا تھا۔

"صبح نہیں نہائی تھیں؟" میاں نے اس کے گالوں پر سے اپنی نظریں نوچتے ہوئے پوچھا۔

"دیر ہو گئی تھی۔"

وہ اس دروازے کے طرف بڑھی جس میں سے صبح میاں قمیص کے بٹن بند کرتا باہر آیا تھا تو میاں نے کہا۔

"ایک پیالی چائے ملے گی؟"

"ذرا بال سکھالوں۔ پھر۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔ اور میاں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی اور سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔

لڑکے نے ہوم ورک ختم کیا اور کتاب کاپی اور قلم اٹھا کر بیچ والے کمرے میں چلا گیا۔

میاں نے آخری کش لے کر سگریٹ کو جوتے سے مسلا اور اٹھا چاہتا تھا کہ بیوی کمرے سے باہر آئی۔ اس کے بال اب تولیے کی قید سے آزاد اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سینے پر چنے ہوئے دوپٹے کی لہریں منجمد تھیں۔ اس کے ہاتھ میں گیلا تولیہ تھا جسے آنگن میں جا کر اس نے الگنی پر پھیلا دیا۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

"امی!" بیچ کے کمرے میں سے لڑکے کی آواز آئی۔

وہ رک گئی۔

"کیا ہے منے؟"

"بھوک لگی ہے۔"

"اچھا۔"

"اس نے کھانا نہیں کھایا ابھی تک؟" باپ نے پوچھا۔

ماں نے نفی میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اسکول سے آتے ہی چائے کے ساتھ دو توس کھا لئے تھے۔ کہہ رہا تھا بھوک نہیں لگی ہے۔"

لڑکا کمرے سے باہر آ گیا۔

"امی کھانا!"

"اے ہے منے! ایسی بھی کیا بے صبری ہے۔ پہلے ابا کے لئے چائے بنا دوں۔ پھر دوں گی۔"

لڑکا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماں باورچی خانے میں چلی گئی اور باپ نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھائے لیتے ہیں۔"

باورچی خانے سے کھٹر پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکے نے ریڈیو آن کر دیا۔ اور باپ کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگا۔ کپڑے بدل کر غسل خانے میں گیا۔ اتنے میں ماں نے میز پر پہلے پلیٹیں لگائیں۔ پھر ایک پانی بھرا جگ اور تین گلاس لا کر رکھے اور پھر کھانا لگایا۔

"آؤ منے! کھانا لگ گیا۔" اس نے بیچ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لڑکا ریڈیو بند کر کے دالان میں آیا تو اس کی نظر میز کے وسط میں رکھی ہوئی قاب پر پڑی۔

"اخاہ! آج تو پلاؤ پکا ہے!"

"پلاؤ!"

میاں نے، جو الگنی پر پھیلی گیلی تولیہ سے ہاتھ منہ پونچھ کر اب دالان میں تھا، پہلی کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

بیوی نے اس کی طرف قاب بڑھائی۔

"آج جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ سوچا کوئی خاص چیز پکا لوں۔"

اور اس نے رائتے کا ڈونگا بھی میاں کی طرف بڑھا دیا۔

میاں نے پہلے پلاؤ لیا۔ پھر اس پر رائتہ ڈالا۔ ماں نے جو پلاؤ قاب میں رہ گیا اس کا آدھے سے زیادہ حصہ لڑکے کی پلیٹ میں ڈالا اور باقی اپنی پلیٹ میں لے کر رائتے کا ڈونگا لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکے نے تھوڑا سا رائتہ پلاؤ پر ڈالا اور پھر ڈونگا ماں کے سامنے رکھ دیا۔

"اچھا بنا ہے۔" میاں نے پہلا نوالہ کھانے کے بعد کہا۔

"ہوں۔" لڑکے کے نوالہ بھرے منہ سے آواز نکلی۔

ماں مسکرائی۔

جب کھانا ختم ہو گیا اور پلیٹیں وغیرہ ہٹا دی گئیں تو بیوی نے باورچی خانے سے لا کر پیٹھے کا ایک ڈبہ میز پر رکھ دیا۔

"واہ بھئی!" میاں نے ڈبہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آج تو بقول شخصے عیش ہو گئے۔ تنخواہ بڑھی ہے کیا؟"

اور اس نے ڈبے میں سے ایک گلاب جامن اٹھالی۔

"نہ کہیں۔" بیوی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "منا کئی دن سے مٹھائی مٹھائی کر رہا تھا۔ سو چالیتی چلوں۔" اس نے لڑکے سے کہا۔ "لو!"

لڑکے نے ایک لڈو اٹھالیا۔

باپ نے بھی ایک لڈو اٹھایا۔

ماں نے ہری برفی کا ایک ٹکڑا لیا۔

پھر لڑکے کا ہاتھ گلاب جامن کی طرف بڑھا۔ مگر گلاب جامن منہ میں ڈالنے سے پہلے اس نے کہا۔

"امی۔ سراج صاحب کہہ رہے تھے پروائی کی ایک اور تاثیر بھی ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ماں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کیا؟" باپ نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہے تھے جب پروائی چلتی ہے تو پرانی چوٹوں میں درد ہوتا ہے۔ سچ مچ؟"

ماں نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"اور لو۔ میاں نے ڈبہ بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بیوی نے کہا۔ "بس۔"

کوئی تیس چالیس منٹ بعد بیوی باورچی خانے میں گئی مگر فوراً ہی واپس آ گئی۔

"صبح دھولوں گی۔"

میاں ایک کھلی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "ہاں۔"

تھوڑی دیر بعد ماں لڑکے کے کمرے میں گئی۔

"سو رہا ہے۔" اس نے واپس آکر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میاں نے پھر فائل پر سے سر اٹھائے بغیر "ہاں" کی۔

تھوڑی دیر بعد بیوی اپنے کمرے میں گئی اور ایک رسالہ پڑھنے لگی۔ مگر جب میاں نے سامنے کی فائل بند کر کے ایک طرف کھسکائی اور وہ فرش پر سے ایک اور فائل اٹھانے کے لئے جھکا تو اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بیوی کی نظریں رسالے پر نہیں۔ آنگن میں چھائے اندھیرے پر جمی ہیں۔ لیکن جب اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے سر اٹھایا تو بیوی کو پھر رسالہ پڑھتے پایا۔

بیوی نے رسالے پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ مسکرائی اور پھر رسالہ پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ رسالہ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تو اب لیٹتی ہوں۔"

"تم جاؤ مجھے ابھی تھوڑا ٹائم اور لگے گا۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں سے کچھ دیر تک گنگنانے کی آواز آتی رہی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

اور جب آنگن آسمان سے برستے ہوئے گیلے اور گاڑھے اندھیرے سے اٹ گیا اور جب باہر سڑک پر ٹریفک کی آوازیں کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں اور جب کہیں دور سے ایک کتے کے رونے کی آواز آئی اس وقت اس نے آخری فائل بند کر کے ایک کے اوپر ایک رکھی ہوئی باقی فائلوں پر رکھی۔ آنکھیں ملیں۔ سگریٹ سلگائی۔ کھڑا ہوا۔ دالان کے بلب کا سوئچ آف کیا۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔

سامنے دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جن کے سرہانے دیوار سے لگے ہوئے تھے۔ پلنگوں کے بیچ میں دیوار سے لگی ایک چھوٹی سی تپائی پر ایک چھوٹا سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کا کپڑے کا پیلا شیڈ کمزور بلب کی روشنی کو پلنگوں کے بالائی حصوں سے آگے نہیں بڑھنے دے رہا تھا۔

دائیں ہاتھ کے پاس والے پلنگ پر بیوی سو رہی تھی۔ پلنگ کے پاس دائیں جانب ایک آرام کرسی پر اسے وہ پاجامہ۔ کرتہ اور دوپٹہ بے ترتیبی سے پڑا نظر آیا جن میں ڈھائی تین گھنٹے پہلے بیوی کو دیکھ کر وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکا تھا۔ اور ایک باڈی بھی۔ اسے تعجب ہوا کیوں کہ بیوی جب بھی کپڑے بدلتی تھی تو اتارے ہوئے کپڑے سلیقے سے تہ کر کے الماری میں رکھ دیا کرتی تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے وہ دولائی اٹھائی جو پیروں سے کندھوں تک بیوی کے بدن کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ اور وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ شرم و حیا کی پابندیوں سے بیگانہ ایک سویا ہوا جسم کسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس جسم کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

اس نے جلدی سے سگریٹ بجھائی اور آہستہ سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ بیوی کسمسائی اور اس کا چہرہ جو تھوڑا سا آرام کرسی کی طرف مڑا ہوا تھا سیدھا ہو کر لیمپ کے شیڈ میں سے چھنتی ہوئی روشنی کی لپیٹ میں آ گیا اور میاں کے دیکھتے دیکھتے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بیوی کے بند ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وہ ایک ہاتھ بیوی کے سر کے نیچے رکھے ہوئے تکیے پر اور دوسرا اس تکیے پر رکھ کر جو اس کی بغل سے لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھکا۔ مگر اس کے کھلے ہونٹ بیوی کے بند ہونٹوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ اسے گمان گذرا کہ بیوی کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ پھر اسے اس کے سر کے پاس تکیے پر ایک گیلا دھبہ نظر آیا اور اس کا گمان یقین میں بدل گیا۔

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور کچھ دیر تک بیوی کے چہرے اور اس کے اپنی جانب نگراں سینے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے انگشت شہادت بیوی کے بند ہونٹوں پر پھیری۔ بیوی کے سانس کی رفتار بدلی۔ اس کے سینے کا زیر و بم بدلا اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ میاں نے دم سادھ کر چند لمحے انتظار کیا اور جب سانس کی رفتار اور سینے کا زیر و بم پھر ہموار ہو گیا تو وہ بڑی احتیاط سے اٹھا۔ تھوڑی دیر خالی خالی نظروں سے بستر پر دراز لو دیتے ہوئے بدن کو دیکھتا رہا اور پھر بیوی کے اترے ہوئے کپڑے تہ کرنے لگا۔ دوپٹہ۔ کرتہ۔ پاجامہ اور باڈی اس نے تہ کر کے آرام کرسی پر رکھے اور جا کر دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی نے کروٹ بدلی۔ اب اس کا چہرہ میاں کی طرف تھا۔ کسی رسیلے خواب کی خبر دیتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے کرن کرن پھوٹ کر اس کے گالوں کی لالی کو ہوا دے رہی تھی اور اس نے دوسرا تکیہ کھینچ کر سینے سے لگا رکھا تھا۔

میاں نے ہاتھ بڑھا کر دولائی سے بیوی کی عریانی کو ڈھانکا ٹیبل لیمپ بجھایا اور لیٹ گیا ☆☆☆

ساحری، شاہی، صاحب قرانی

داستان امیر حمزہ کا مطالعہ

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت : ۱۸۰ روپئے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

ظفر احمد صدیقی

شمارہ نمبر ۱۸۰،
فروری ۱۹۹۵

اردو زبان نے مختلف شعری اصناف اور ہیئتوں کے علاوہ علوم بلاغت میں بھی عربی وفارسی سے بطور خاص استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ "علم بیان" اور "علم بدیع" کی بیشتر بلکہ تمام تر، مصطلحات عربی وفارسی ہی سے ماخوذ ومستفاد ہیں۔ غیر زبانوں کے ادبیات سے اخذ استفادے میں بہ ذات خود کوئی قباحت نہیں، بہ شرطے کہ اس عمل میں تقلید محض کے بجائے دیدہ وری وبالغ نظری سے کام لیا جائے۔ لیکن علم بلاغت سے متعلق اردو کتابوں کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اہل اردو نے اکثر وبیشتر اس فن کی روح کو سمجھنے کے بجائے محض عربی وفارسی کتب بلاغت کو پیش نظر رکھ کر مصطلحات کے اردو ترجمے اور مثال میں اردو اشعار پیش کر دینے پر اکتفا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی پیش رو مصنف سے کسی مقام پر کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے، تو بعد کے مصنفین صرف یہ کہ اس کی اصلاح سے قاصر رہے، بلکہ انھوں نے اعادۂ تکرار کے ذریعہ نادانستہ طور پر غلط نویسی کی روایت کو بھی استحکام بخشا۔ پیش نظر مضمون میں اسی قسم کی ایک غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے محرکات وعوامل پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

عربی وفارسی نیز اردو کتاب بلاغت میں علم بدیع کی صنائع معنویہ کے ذیل میں عام طور پر صنعت ادماج کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کو پہلے پہل کس نے متعارف کرایا، کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ معلومات کی رو سے علم بدیع پر قدیم ترین تصنیف چوتھی صدی ہجری کے مشہور شاعر ومصنف عبداللہ بن المعتز العباسی (ف۲۹۶) کی کتاب "کتاب البدیع" ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اس میں ادماج کا ذکر نہیں ہے۔ تاریخی ترتیب نیز شہرت کے لحاظ سے اس سلسلے کی دوسری تصنیف ابن المعتز کے معاصر ابوالہلال الحسن بن عبداللہ العسکری (ف۳۹۵) کی "کتاب الصناعتین" ہے۔ یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے اور اس میں بھی ادماج کا بیان نہیں ملتا۔ سلسلۂ زیر بحث کی تیسری قابل ذکر کتاب ابن رشیق القیروانی (ف۴۵۶) کی "العمدۃ" ہے۔ اس میں ادماج کا بیان تو موجود ہے۔ لیکن اس کا تعارف ایک مستقل صنعت کے بجائے صنعت استطراد کی ایک قسم کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادماج سے پہلے استطراد کو سمجھ لیا جائے، خصوصاً اس لئے بھی کہ اردو فارسی کی متداول کتب بلاغت، استطراد کے ذکر سے خالی ہیں۔

لغت کی رو سے استطراد ایسی پسپائی اختیار کرنے کو کہتے ہیں جس میں شہسواروں کی نیت دوبارہ حملے کی ہو، اور اصطلاح میں کسی خاص نکتے کی بنا پر درمیان کلام میں بہ ظاہر غیر متعلق باتوں کا ذکر استطراد کہلاتا ہے۔ لغوی اور اصطلاحی معنوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ اصطلاحی استطراد میں بھی قاری بہ ظاہر موضوع سخن کے بدل جانے یا غیر متعلق باتوں کے درمیان کلام میں آجانے کا دھوکا کھا جاتا ہے، لیکن غور وفکر کے بعد اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ استطراد کے طور پر لایا گیا کلام بھی اصل موضوع سے پوری طرح مربوط ومتعلق ہے۔ ابو ہلال عسکری اور ابو علی الحاتمی (ف ۳۸۸) کے نزدیک استطراد کے لئے موضوع سے انحراف کے بعد اس کی طرف بازگشت ضروری نہیں ہے، لیکن ابن رشیق کے نزدیک ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بازگشت کے بغیر موضوع سے انحراف خروج کہلاتا ہے، نہ کہ استطراد۔ لغت وقرائن وشواہد کے لحاظ سے ابن رشیق کی بات زیادہ وزن دار محسوس ہوتی ہے(۱)۔

استطراد کی بحث میں اس بات کا ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ استطراد مختصر بھی ہوتا ہے اور مفصل بھی۔ بہ الفاظ دیگر، یہ ایک جملے کا بھی ہو سکتا ہے اور پورے ایک پیراگراف کا بھی۔ دراصل یہ ایک تکنیک ہے جسے موقع ومحل کی رعایت سے مختصراً یا مفصلاً ہر طرح سے برتنے اور استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلام میں ایک خاص طرح کا حسن اور رز و پیدا کرنے کے لئے "استطراد" کا سہارا بہر حال ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مثالیں ہر زبان کے ادب میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ آئندہ صفحات میں استطراد کی چند مثالیں اردو شعرا کے کلام سے پیش کی جاتی ہیں:

اقبال کی "بال جبریل" کی نظموں میں "شاہین" ایک معروف نظم ہے۔ یہ نو ابیات پر مشتمل ہے۔ پہلے پوری نظم ملاحظہ ہو، پھر مدعا کی توضیح کی جائے گی۔

(۱) کیا میں نے اس خاک داں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب ودانہ

(۲) بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

(۳) نہ باد بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل
نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ

(۴) خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

(۵) ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ

(۶) حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

(۷) جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

(۸) یہ پورب یہ پچھم، چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

(۹) پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اس نظم کی تیسری، چوتھی اور پانچویں ابیات نیز آٹھویں بیت کے مصرع اول کو اگر نظم سے خارج کر دیا جائے تو اس کی شکل یوں ہو جائے گی:

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

ظاہر ہے کہ نظم کی یہ مختصر شکل بھی شاعر کے مافی الضمیر کو قاری تک پہنچانے میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماقبقیہ مصرعے اصل موضوع سے براہ راست متعلق نہیں، بلکہ بہ طور استطراد لائے گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زائد اور غیر ضروری ہیں۔ نہیں، بلکہ نظم کی اثر آفرینی بڑی حد تک انھیں مصرعوں کی مرہون منت ہے، لیکن ان کی قوت اور شدت تاثیر کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ یہ اصالتاً نہیں بلکہ استطراداً لائے گئے ہیں۔

"استطراد" کی یہ تکنیک میر انیس کے ایک مرثیے کے درج ذیل بند میں بھی حسن و خوبی کے ساتھ بہ روئے کار لائی گئی ہے۔

ان سب گلوں میں اک علی اکبر سا گلبدن
تھا جس کی جامہ زیبی کا شہرہ چمن چمن
رخسار سے بہم تھے جو گیسوئے پر شکن
حیراں تھے سب کہ بل گئے کیوں کر حلب ختن
سرخی تھی لب پہ، گو کہ نہ پانی نصیب تھا
دیکھا جو غور سے تو یمن بھی قریب تھا

پانچویں مصرعے میں "گو کہ نہ پانی نصیب تھا" کا ٹکڑا استطراد کے ذیل میں آتا ہے۔

استطراد کی تیسری مثال جدید ادب سے ملاحظہ ہو۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مجموعۂ کلام "گنج سوختہ" میں ایک نظم ہے، "بیت عنکبوت"۔ اس میں "استطراد" کی تکنیک بڑے سلیقے سے برتی گئی ہے۔ پہلے نظم ملاحظہ ہو:

یہ عورت اس لئے پیدا ہوئی ہے
کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھانسی پر چڑھایا جائے
اسے یوناں کے اک مشہور ڈاکو کے بستر کی ضرورت ہے
وہ اپنے سب شکاروں کے قد و قامت اسی بستر کے
پیمانے کی نسبت سے گھٹاتا، کاٹتا
یا کھینچ کر جبراً بڑھاتا تھا
خطوط لب تو دیکھو!
کس طرح سے سمٹے ہوئے ہیں سنگ دل
عامیانہ پن تراوش کر رہا ہے
یہ کینہ توز آنکھیں
ان کی گہرائی کے کیچڑ میں
سنہری مچھلیاں غوطے لگاتی ہیں
رو پہلی شاخ طوبیٰ ہے کہ کھلتی بانہہ ہے لیکن
کوئی سایہ نہیں پڑتا
میں اپنے خول کے اندر سمٹ کر بیٹھ رہنا چاہتا ہوں
مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر جھانکنے کی بھی ضرورت
کچھ نہیں ہے
مگر وہ فاحشہ زنجیر در کی نیند اڑائے جا رہی ہے
وہ آنکھیں خوب صورت بن گئی ہیں
مجھے خم دار زینوں سے اتر کر
نیچے آنا ہی پڑے گا

"گنج سوختہ" کی اشاعت کے بعد کسی تبصرہ نگار نے اس نظم کے درج ذیل مصرعوں کو غیر ضروری اور زائد قرار دیتے ہوئے انھیں شاعر کی بے مقصد نمائش علمی پر محمول کیا تھا:

اسے یوناں کے اک مشہور ڈاکو کے بستر کی ضرورت ہے
وہ اپنے سب شکاروں کا قد و قامت اسی بستر کے
پیمانے کی نسبت سے گھٹاتا، کاٹتا
یا کھینچ کی جبراً بڑھاتا تھا

لیکن در حقیقت یہ مصرعے بہ طور استطراد لائے گئے ہیں اور نظم کے مجموعی تاثر میں اضافے کا ذریعہ ہیں۔

اب ادماج کو لیجئے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ہماری معلومات کی حد تک اس صنعت کا ذکر پہلی بار ابن رشیق القیروانی کے یہاں ملتا ہے لیکن انھوں نے تعریف کے بجائے محض مثالوں کے ذریعے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابن رشیق کا پورا بیان نقل کر دیا جائے، تا کہ ادماج کے حدود و ثغور کی تعیین میں آسانی ہو۔ موصوف لکھتے ہیں:

ومن الاستطراد نوع يسمى الادماج، و ذالك نحو قول عبيدالله بن طاهر لعبدالله بن سليمان بن مصعب حين وزرللمعتضد:

ابى الدهر من اسعافنا فى نفوسنا
واسعفنا فيمن نحب و نكرم
فقلت لهم: نعماك فيهم اتمها
ودع امرنا ان المهم المقدم

وحكى احمد بن يوسف الكاتب انه دخل المامون، وفى يده كتاب من عمرو بن مسعدة يردد فيه النظر، فقال لعلك فكرت فى ترديدك النظرفى هذالكتاب، قال نعم يا اميرالمؤمنين، قال انى عجبت من بلاغته واحتياله لمراده:

كتبت كتابى الى اميرالمؤمنين اعزه الله، ومن قبلى من قواده و جناده و فى الطاعة والانقياد على احسن ما يكون عليه طاعة جند تأخرت ارزاقهم و ختلت احوالهم۔

الاترى يا احمد ادماجة المسئلة فى الاخبار، واعفاءه سلطانه من الاكثار ثم امرلهم برزق ثمانية اشهر۔ وهذالنوع اقل فى الكلام من الستطراد المتعارف۔(۱)

(ترجمہ)

استطراد کی ایک قسم وہ ہے جسے ادماج کہتے ہیں۔ اس کی مثال عبیداللہ بن طاہر کے اشعار ہیں، جو اس نے سلیمان بن مصعب کی شان میں اس وقت نظم کئے تھے جب کہ سلطان معتضد باللہ عباسی نے اسے منصب وزارت پر فائز کیا تھا: (وہ کہتا ہے)

زمانے نے خود ہماری اپنی ذات کے بارے میں براہ راست ہماری حاجت روائی سے انکار کر دیا، لیکن ہماری محبوب و محترم شخصیتوں کی مساعدت و معاونت کے ذریعہ بالواسطہ ہماری دست گیری کی۔

تو میں نے اس سے کہا کہ تو ان شخصیتوں کے تعلق سے اپنے سلسلۂ انعامات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

باقی رہے ہم، تو ہم سے صرف نظر کر کے مہمات امور پہلے سرانجام کیے جاتے ہیں۔

احمد بن یوسف جو اپنے عہد کا ایک ادیب گذرا ہے، بیان کرتا ہے کہ ایک بار وہ مامون رشید کے دربار میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ مامون اپنے ہاتھ میں عمرو بن سعدہ کا خط لئے ہوئے ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس پر ایک نظر ڈال لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد مامون نے کہا کہ غالباً تم اس خط پر میرے بار بار نگاہ ڈالنے کے بارے میں سوچ رہے ہو گے؟ اس نے جواب دیا، ''جی ہاں امیر المومنین! ایسا ہی ہے۔'' مامون نے کہا کہ مضمون نگار کی بلاغت اور مقصد برآری کے لئے اس کی تدبیر سازی نے مجھے تعجب میں ڈال رکھا ہے (وہ لکھتا ہے):

امیر المومنین، اللہ انھیں عزت و سربلندی بخشے۔ میں ان کی خدمت میں یہ عریضہ اس حال میں روانہ کر رہا ہوں کہ ان کے اعیان لشکر اور لشکری، اطاعت و فرماں برداری کی اس بہتر سے بہتر حالت میں ہیں، جس کا کسی ایسے لشکر کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے، جس کی تنخواہ ایک عرصے سے رکی پڑی ہو اور جس کے احوال پراگندہ ہوں۔

''کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ مکتوب نگار نے اپنے سوال کو کس طرح ''خبر'' کی تہ میں لپیٹ دیا؟ اور ساتھ ہی اپنے آقا کو طول کلام کی زحمت سے بچا بھی لیا؟'' پھر اس نے حکم دیا کہ اہل فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہ یک مشت دے دی جائے۔

استطراد کی یہ قسم (ادماج) استطراد متعارف کے مقابلہ میں کم یاب اور نادر الوجود ہے۔

اس اقتباس کو پیش نظر رکھ کر سلسلۂ زیر بحث میں درج ذیل نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں:

(۱) از روئے لغت ادماج الشئی فی الشئی کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز کی تہ میں رکھنے یا لپیٹنے کے ہوتے ہیں۔

(۲) اصطلاح میں ادماج کا اطلاق ایسے پیرایۂ بیان پر کیا جاتا ہے جہاں کسی مضمون کو اصالتاً یا صراحتاً پیش کرنے کے بجائے کسی نہ کسی دوسرے مضمون کی تہ میں رکھ کر سامنے لایا جائے۔ جیسا کہ عبیداللہ بن طاہر یا عمرو بن سعدہ کا پیرایۂ بیان تھا کہ اول الذکر نے اپنی حاجت مندی و پریشاں حالی کا مضمون، منصب وزارت پر مبارک باد کے مضمون کے ضمن میں ادا کیا اور ثانی الذکر نے اہل فوج کی تنگی رزق اور پراگندہ حالی کی کیفیت کا اظہار، خیر و عافیت کی اطلاع کے ضمن میں کیا۔

(۳) ادماج کو استطراد کی ایک نوع اس لحاظ سے قرار دیا گیا ہے کہ استطراد کی طرح ادماج کا مضمون ثانی بھی باقی کلام سے ایک براہ راست تعلق نہیں ہوتا، اور دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ استطراد کے طور پر لائی گئی عبارت سے ایک ہی مضمون برآمد ہوتا ہے کہ اس کے برخلاف صنعت ادماج پر مشتمل عبارت سے دو مضمون برآمد ہوتے ہیں، جن میں ایک پیش کش کے لحاظ سے مقصود بالذات ہوتا ہے اور دوسرا ضمناً برآمد ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

آئیے اب دیکھیں کہ ابن رشیق کے بعد آنے والے مصنفین ادماج کی تعریف کن الفاظ میں کرتے ہیں اور یہ کہ انھیں ابن رشیق کے بیان سے اتفاق ہے یا اختلاف؟

جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی (ف ۷۳۹) اپنی تصنیف ''الایضاح'' میں لکھتے ہیں:

ومنه الادماج، هو ان يضمن كلام سيق لمعنى، معنى

آخر... ومثاله قول ابی طیب:

یقلب فیه اجفانی کأنی
یعد بها علی الدهر الذنوبا

فانه ضمن وصف الیل بالطول الشکایة من الدهر (۲)

ترجمہ:

صنائع معنویہ میں ایک ادماج بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عبارت جو کسی خاص مقصد و مضمون کے لئے لائی گئی ہو، اس کی تہ میں دوسرا مضمون بھی رکھ دیا جائے... اس کی مثال ابوطیب [متنبی] کا یہ شعر ہے:

میں اس (یعنی رات) میں (بے خوابی کے سبب) اپنے
پپوٹوں کو اس طرح الٹتا پلٹتا ہوں، گویا اپنے اوپر زمانے کے
ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کو شمار کر رہا ہوں۔

شاعر نے اس شعر میں اصلاً تو درازی شب کا مضمون بیان کیا ہے، لیکن اس کے ضمن میں زمانے کی شکایت کا مضمون بھی رکھ دیا ہے۔

مسعود بن عمر سعد الدین التفتازانی (ف ۷۹۲) "تلخیص المفتاح" کی شرح "مختصر المعانی" میں تحریر فرماتے ہیں:

الادماج: یقال ادمج الشیئ فی ثوبه اذالفه فیه،
وهو ان یضمن کلام سیق لمعنی مدحا کان اوغیره
معنی آخر... کقوله

شعر اقلب فیه اجفانی کأن
اعدبها علیٰ الدهر الذنوبا (۳)

ترجمہ:

ادماج: جب کوئی شخص کسی چیز کو کپڑے میں لپیٹ لے تو ادمج الشیئ فی ثوبه کے الفاظ بولے جاتے ہیں (اصطلاح میں) ادماج یہ ہے کہ کوئی کلام جو کسی خاص مقصد کے لئے لایا گیا ہو، خواہ مدح ہو یا کچھ اور اس کے ضمن میں کوئی دوسرا مضمون بھی رکھ دیا جائے، جیسے شاعر کہتا ہے: "میں اس (یعنی رات میں) میں (بے خوابی کے سبب) اپنے پپوٹوں کو اس طرح الٹتا پلٹتا ہوں، گویا اپنے اوپر زمانے کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کو شمار کر رہا ہوں"۔

تفتازانی موصوف "تلخیص المفتاح" کی اپنی دوسری شرح "المطول" میں رقم طراز ہیں:

ومنه ای ومن المعنوی الادماج یقال ادمج
الشیئ فی ثوبه اذالفه فیه، وهو ان یضمن کلام
سیق لمعنی مدحاکان اوغیره، معنی آخر...
فهذا المعنی الثانی یجب ان لایکون مصرحابة
ولا یکون فی الکلام اشعار بأنه مسوق لأ جله
فمن قال فی قول الشاعر:

ابی دهرنا اسعافنا فی نفوسنا
اسعفنا فیمن نحب ونکرم
فقلت له نعماک فیهم اتمها
ودع امرنا ان المهم المقدم

انه ادمج شکوی الزمان فی التهنئة، فقد سها لان الشکایة مصرح بها، فکیف تکون مدلجة فلو جعل التهنئة مد مجة لکان اقرب (۵)

ترجمہ:

صنائع معنویہ میں ایک ادماج بھی ہے، جب کوئی شخص کسی چیز کو کپڑے میں لپیٹ لے تو ادمج الشیئ فی ثوبه کے الفاظ بولے جاتے ہیں (اصطلاح میں) ادماج یہ ہے کہ عبارت جو کسی خاص مقصد و مضمون کے لئے لائی گئی ہو، مدح ہو یا کچھ اور اس کی تہ میں کوئی دوسرا مضمون رکھ دیا جائے... پھر اس دوسرے مضمون کے لئے ضروری ہے کہ نہ تو اسے صراحتاً بیان کیا گیا ہو اور نہ پوری عبارت میں کوئی ایسا اشارہ موجود ہو، جس سے یہ سمجھا جائے کہ عبارت اس مضمون کی ادائیگی کے لئے لائی گئی ہے۔ لہٰذا جس کسی نے ان اشعار:

زمانے نے خود ہماری اپنی ذات کے بارے میں براہ
راست ہماری حاجت روائی سے انکار کر دیا، لیکن ہماری
محبوب و محترم شخصیتوں کی مساعدت و معاونت کے ذریعے
بالواسطہ ہماری دستگیری کی

کے بارے میں یہ کہا ہے کہ شاعر نے یہاں شکوۂ زمانہ کا مضمون مبارک باد کی تہ میں رکھ دیا ہے، اسے غلط فہمی ہوئی۔ کیوں کہ یہاں تو شکایت کا مضمون صراحتاً لایا گیا ہے تو اسے تہ میں رکھا ہوا مضمون کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ شکوہ زمانہ کی تہ میں مبارک باد کا مضمون رکھ دیا گیا ہے، تو قرین قیاس ہوگا۔

جلال الدین السیوطی (ف ۹۱۱) علم بلاغت سے متعلق اپنی تصنیف "اتمام الدرایہ لقراء النقایۃ" میں لکھتے ہیں:

الادماج تضمین ما سیق بشیئ آخر (۶)

ترجمہ:

کسی خاص مقصد کے لئے لائی گئی عبارت کو، دوسرے مضمون کا متضمن بنا دینا ادماج ہے۔

جامع ازہر کے علما کی ایک جماعت نے "دروس البلاغت" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ اس میں ادماج کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

الادماج ان یضمن کلام سیق لمعنی، معنی آخر، نحو قول ابی الطیب:

اقلب فیه اجفانی کأنی
اعدبها علی الدهر الذنوبا

فانه ضمن وصف الیل بالطول، الشکایه من الدهر (۷)

ترجمہ:

ادماج یہ ہے کہ ایک عبارت جو کسی خاص مقصد و مضمون کے لئے لائی

گئی ہو اس کی تہہ میں دوسرا مضمون رکھ دیا جائے۔ جیسے ابوطیب [متنبی] کا یہ شعر:

میں اس (یعنی رات) میں (بے خوابی کے سبب) اپنے
پپوٹوں کو اس طرح الٹتا پلٹتا رہتا ہوں، گویا اپنے اوپر زمانے
کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کو شمار کر رہا ہوں۔

شاعر نے اس شعر میں درازیٔ شب کے مضمون کی تہہ میں، زمانے کی شکایت کا مضمون بھی رکھ دیا ہے۔

مولانا فضل حق رام پوری (ف ۱۳۵۸) "شموس البراعۃ شرح دروس البلاغۃ" متذکرہ بالا عبارت کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

الادماج ان یضمن کلام سیق لمعنی آخران بکفل المتکلم الکلام الذی سیق لمعنی، متضمنا لمعنی، فیکون المعنی الآخر ملفوفاً فی الکلام، زداخلافیه والذالک سمی بالادماج فی اللغته اللف والادخال، یقال ادمج الشیٔ فی ثوبه اذالفه و ادخله فیه، نحو قول ابی الطیب: اقلب فیه ای فی ذالک اللیل اجفانی کانی، انه یهای بالأجفان من جهته حرکتها، علی الدهر ذنو با ای ذنوب الدهر علی،...

فـانـه قـصـد مـن هـذا کـلام وصف الیل بـالطول مع السهر، وهو المعنی الذی سیق الکلام و ضمن هذا... الشکایة من الـدهر، فتلک الشکایة هی المعنی المضمن الغیر المسوق لأجلها الکلام، وبها حصل الادماج(۸)

ترجمہ:

ادماج یہ ہے کہ وہ کلام جو کسی خاص مضمون و معنی کے لئے لایا گیا ہو اس کی تہ میں دوسرا مضمون و معنی بھی رکھ دیا جائے یعنی متکلم اس کلام کو جو کسی خاص معنی و مضمون کے لیے لایا گیا ہو، دوسرے معنی و مضمون کا متضمن بنا دے، بدیں طور کہ مضمون ثانی کلام کی تہ میں چھپا ہوا اور اسی میں داخل ہو۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ بھی ہے، کیوں کہ ادماج لغت میں لپیٹنے اور داخل کرنے کو کہتے ہیں چنانچہ جب کوئی شخص کسی چیز کو کپڑے کے اندر لپیٹ کر دے تو ادمج الشیٔ فی ثوبه کہتے ہیں جیسے ابوطیب متنبی کا شعر ہے۔

میں اس (یعنی رات) میں (بے خوابی کے سبب) اپنے
پپوٹوں کو اس طرح الٹتا پلٹتا رہتا ہوں گویا اپنے اوپر زمانے
کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کو شمار کر رہا ہوں۔

اس کلام سے شاعر کا مقصد درازیٔ شب کے مضمون کے ساتھ ساتھ اپنی بے خوابی کے مضمون کا بیان ہے اور یہی وہ مضمون ہے جس کے لئے براہ راست یہ کلام لایا گیا ہے، لیکن شاعر نے اس کی تہ میں... زمانے کی شکایت کا مضمون بھی رکھ دیا۔ شکوۂ دہر کے اس مضمون پر لفظ متضمن کا اطلاق کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ کلام براہ راست اس کے بیان کے لئے نہیں لایا گیا ہے اور یہ کہ اسی ذریعہ کلام میں ادماج کی شان پیدا ہوئی ہے۔

سید احمد الہاشمی بک (ف ۱۳۶۲) "جواہر البلاغۃ فی المعانی والبیان والبدیع" میں تحریر فرماتے ہیں:

الادماج وهو ان یضمن کلام سیق لمعنی، معنی آخر، لم یصرح به کقول المتنبی:

اقلب فیه اجفانی کأنی
اعدها علی الدهر الذنوبا

ساق الشاعر هذا الکلام اصالتاً لبیان طول الیل، وادماج الشکوی من الدهر فی وصف اللیل بالطول(۹)

ترجمہ:

ادماج یہ ہے کہ ایک عبارت جو کسی خاص مضمون کے لیے لائی گئی ہو، اس کی تہ میں کوئی دوسرا مضمون رکھ دیا جائے، جیسے متنبی کا یہ شعر:

اقلب فیه...الخ

اس سے شاعر کا اصل مقصد درازی شب کا بیان ہے اور اس کی تہہ میں اس نے شکوۂ زمانہ کا مضمون بھی رکھ دیا ہے۔

یہی تعریف سید ابو طاہر محمود السواکنی الازہری نے "**الجواهر اللماعة فی قواعد البلاغة**" میں بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

س: ماهو الادماج؟

ج: ان یضمن کلام سیق لمعنی، معنی آخر لم یصرح به نحو قول الشاعر:

اقلب فیه اجفانی کأنی
اعدها علیٰ الدهر الذنوبا

فـانـه ضـمـن وصف اللیل بالطول، الشکایة من الدهر(۱۰)

ترجمہ:

سوال: ادماج کیا ہے؟

جواب: ادماج یہ ہے کہ ایک عبارت جو کسی خاص مضمون کے لئے لائی گئی ہو اس کی تہہ میں کوئی دوسرا مضمون بھی رکھ دیا جائے۔ جیسے شاعر کا شعر:

اقلب فیه...الخ

شاعر نے درازی شب کے مضمون کی تہ میں شکوۂ زمانہ کا مضمون رکھ دیا ہے۔

نظام الدین احمد بن محمد صالح، صاحب "مجمع الصنائع" (سنہ تصنیف ۱۰۶۰) اور مفتی نظام الدین شاہ آبادی صاحب "مفتاح الصنائع" (سنہ تصنیف ۱۱۷۴) کے بیانات کا ماحصل بھی یہی ہے کہ ادماج ایک مضمون کی تہ میں دوسرے مضمون کو رکھ کر دینے کا نام ہے۔ چنانچہ اول الذکر نے متنبی کے مذکورہ بالا شعر کے علاوہ درج ذیل فارسی شعر بھی مثال میں پیش کیا ہے:

بس کہ سر بر دارم و نالم بہ بالیں تا کمر
در شب ہجر تو گویا از اجل بندم کمر

پھر اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

دریں بیت اظہار بے خوابی ست در شب ہجر، و مستلزم معنی دیگر ست و آں اظہار قرب ہلاکت از ناتوانی والم (۱۱)۔

ثانی الذکر نے متنبی کے شعر نیز متذکرہ بالا فارسی شعر کے علاوہ اس صنعت کی مثال میں ایک نثر پارہ بھی پیش کیا ہے (۱۲)۔

ان تفصیلات اور حوالوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ صنعت ادماج کی تعریف و توضیح کے سلسلے میں پانچویں صدی ہجری کے ابن رشیق قیروانی سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک کے مختلف عربی و فارسی مصنفین بلاغت متحد الخیال و یک زبان ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ متداول و مروج اردو کتب بلاغت میں ادماج کی تعریف ایک دوسرے انداز سے ہی کی جاتی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ادماج ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرنا ہے جس سے کلام میں معنوی کثرت کی شان پیدا ہو جائے اور اس سے متعدد مفاہیم اس طرح برآمد ہونے لگیں کہ کسی ایک مفہوم کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ نہ کہا جا سکے کہ قائل کی اصل مراد یہی ہے۔ اس کی تائید کے لئے اردو کتب بلاغت سے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ابوالفیض سحر، ترقی اردو بیورو، کی مرتبہ کتاب ''درس بلاغت'' کے ''باب صنائع معنوی'' میں لکھتے ہیں:

ادماج: شعر میں ایسے الفاظ اور ترکیب کا استعمال کرنا ہے جن سے مجموعی طور پر دو معنی یا دو مفہوم پیدا ہوتے ہیں، مگر کوئی خاص معنی یا مفہوم حتمی طور پر واضح نہ ہوتا ہو (۱۳)۔

(۲) سید کلیم اللہ حسینی ''سراج البلاغت'' میں لکھتے ہیں:

ادماج: کلام میں ایسے الفاظ لانا جن سے بحیثیت مجموعی دو معنی نکلتے ہوں، لیکن کسی خاص معنی کی صراحت نہ ہو (۱۴)۔

(۳) مرزا محمد عسکری ''آئینۂ بلاغت'' میں تحریر کرتے ہیں:

ادماج: ایسے الفاظ لانا جن سے مجموعی طور پر دو معنی حاصل ہوں اور تصریح کسی خاص معنی کی نہ ہو (۱۵)۔

(۴) مولانا نجم الغنی رام پوری (ف ۱۳۵۰) ''بحر الفصاحت'' میں رقم طراز ہیں:

صنعت ادماج (بہ کسر الف و سکون دوال مہملہ) یعنی کلام سے دو معنی حاصل ہوں اور تصریح دوسرے معنی کی نہ ہو (۱۶)۔

(۵) منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی ''معیار البلاغت'' میں لکھتے ہیں:

ادماج جس کو ذوالمعنیین بھی کہتے ہیں، ایسا کلام ہے کہ اس سے دو معنی حاصل ہوں (۱۷)۔

ان حوالوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ادماج کی جو تعریف اردو مصنفین بلاغت کی کتابوں میں مذکور ہے، وہ اس تعریف سے بالکل مختلف ہے جو عربی فارسی کتب بلاغت میں مندرج ہے، کیوں کہ مخصوص الفاظ و تراکیب کے استعمال کے ذریعہ کلام میں معنوی کثرت کی شان پیدا کرنا، اور ایک مضمون کی تہ میں دوسرے مضمون کا رکھ دینا، دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ لہٰذا ادماج کی ان دو تعریفوں میں کوئی ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اعتبار و استفسار اور تقدم زمانی وغیرہ کے لحاظ سے ابن رشیق اور ان کے متبعین کی تعریف ہی درست قرار دی جائے گی۔

یہاں اردو مصنفین بلاغت کی حمایت کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کیوں نہ ادماج کی دونوں تعریفیں درست مان لی جائیں اور یہ کہا جائے کہ عربی و فارسی میں ادماج ایک مضمون کی تہ میں دوسرے مضمون کو رکھ دینے کو کہتے ہیں اور اہل اردو کے یہاں اس کا اطلاق کلام کے کثیر المفہوم ہونے کی صفت پر کیا جاتا ہے۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ یقیناً ہر زبان کے اہل علم و ارباب فضل کو وضع اصطلاحات کے باب میں پوری پوری آزادی حاصل ہے اور اہل اردو نے اگر واقعتاً ادماج کے اصطلاح ایک نئے مفہوم کے لئے وضع کر لی ہوتی تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہمارے مصنفین بلاغت نے ادماج کی تعریف کے سلسلے میں عربی و فارسی مصنفین بلاغت سے دیدہ و دانستہ اختلافات و انحراف نہیں کیا، بلکہ اس باب میں ان سے نادانستہ غلطی واقع ہو گئی ہے اور نقل در نقل کی روایت نے اس غلطی کو مضبوط و مستحکم بنا دیا ہے۔

اپنے اس دعوے کی وضاحت کے لیے ہمیں صنعت استتباع کا ذکر درمیان میں لانا ہوگا۔ عربی، فارسی نیز اردو مصنفین بلاغت اس بات پر متفق ہیں کہ استتباع اور ادماج دونوں ایک ہی سلسلے کی صنعتیں ہیں اور دونوں کی تعریف بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ استتباع، مدح کے ساتھ خاص ہے اور ادماج، عام ہے، اسے مدح یا غیر مدح کسی بھی جگہ اسے برتا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اردو دانوں کے بیانات ملاحظہ ہوں:

(۱) مولانا نجم الغنی رام پوری رقم طراز ہیں:

یہ (ادماج) بہ نسبت استتباع کے عام ہے یعنی استتباع سے تو یہ ہے کہ ایک مدح سے دوسری مدح پیدا ہو اور ادماج میں مدح کا ہونا ضروری نہیں (۱۸)۔

(۲) مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:

ادماج اور استتباع میں فرق یہ ہے کہ استتباع مدح کے لئے خاص ہے، یعنی اس میں ایک مدح سے دوسری مدح پیدا ہوتی ہے اور ادماج عام ہے۔ مدح سے اس کا تعلق ضروری نہیں (۱۹)۔

(۳) ابوالفیض سحر لکھتے ہیں:

استتباع بھی اسی قبیل کی صنعت ہے مگر فرق یہ ہے کہ استتباع مدح کے لئے مخصوص ہے جب کہ صنعت ادماج کا مدح سے تعلق ضروری نہیں (۲۰)۔

ان بیانات سے یہ بات بھی بہر حال ثابت ہو گئی کہ استتباع اور ادماج دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ استتباع خاص ہے اور ادماج عام۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ ان حضرات نے استتباع کی تعریف کس طرح کی ہے:

(۱) دیبی پرشاد سحر بدایونی رقم طراز ہیں:

استتباع جس کو مدح موجہ بھی کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مدح کسی کی اس طرح کریں کہ ایک مدح سے مدح دوم حاصل ہو (۲۱)۔

(۲) مولانا نجم الغنی رام پوری تحریر فرماتے ہیں:

صنعت استتباع، اس کو ''المدح الموجہ'' بھی کہتے ہیں اور بیاں طرح ہے کہ ممدوح کی تعریف اس طور پر کریں کہ اس سے ضمناً دوسری تعریف اور ثابت ہوتی ہو (۲۲)۔

(۳) مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:

استتباع یا مدح موجہ: جب ممدوح کی تعریف ایسے الفاظ میں کی جائے کہ ایک تعریف سے دوسری تعریف ثابت ہو (۲۳)۔

(۴) ابوالفیض سحر لکھتے ہیں:

استتباع بھی اسی قبیل کی صنعت ہے مگر فرق یہ ہے کہ استتباع مدح کے لئے مخصوص ہے جب کہ صنعت ادماج کا مدح سے تعلق ضروری نہیں (۲۴)۔

اب سوال یہ ہے کہ جب یہی مصنفین ایک طرف کہتے ہیں کہ استتباع اور ادماج میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر خاص ہے اور ثانی الذکر عام، اور پھر دوسری طرف استتباع کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں: "ممدوح کی تعریف اس طرح بیان کریں کہ اس سے دوسری تعریف اور ثابت ہوتی ہو" تو لامحالہ انھیں ادماج بھی اس طرح کرنی چاہئے: "کسی مضمون کو اس طرح بیان کریں کہ ضمناً اس سے دوسرا مضمون بھی مستفاد ہوتا ہو"، جیسا کہ ابن رشیق وغیرہ کا خیال ہے۔ لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ ادماج کسی کلام سے دو یا زائد مفہوم کا بیان ہوتا ہے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یا تو ان دونوں نے ادماج/استتباع کی تعریف میں غلطی کی ہے اور یا ان کا یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ان دونوں صنعتوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ ظاہر ہے کہ گذشتہ صفحات میں پیش کردہ حقائق کی روشنی میں یہی کہا جائے گا کہ غلطی دراصل ادماج کی تعریف ہی میں ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس غلطی یا غلط فہمی کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟ تو اس کی روداد بھی بہت دلچسپ ہے اور اس کے لئے ہمیں ہندوستان کے نامور اور مستند ماہر علوم بلاغت میر شمس الدین فقیر (متوفی ۱۱۸۳ھ) کا نام لینا ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی معتبر و مستند ماہر علوم "حدائق البلاغت" میں جب مسئلۂ ادماج پر قلم اٹھایا تو اس کے بارے میں ان کا ذہن پوری طرح صاف نہ تھا، چنانچہ ان کی عبارت میں انتشار و اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یعنی ایک طرف تو انھوں نے ایسے بیانات دیئے جنھیں متقدمین کی عربی عبارتوں کا ترجمہ کہا جا سکتا ہے اور دوسری طرف کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے جن کا اصل مسئلے سے تعلق نہ تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ موصوف نے ادماج کی تعریف میں پہلے تو یہ تحریر فرمایا "واں چنانست کہ درکلام سوق مدعا متضمن مدعائے دیگر باشد" یہ تعریف اپنی جگہ بالکل درست ہے اور متقدمین کی عربی عبارت **وھو أن یضمن کلام سیق لمعنی، معنی آخر** کا من وعن ترجمہ ہے۔ لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ سیاق کلام کے مدعا کا متضمن مدعائے دیگر ہونا کیا مطلب رکھتا ہے؟ اور اس طرح وہ خود اپنی ہی عبارت سے سرسری گذر گئے اور آگے بڑھ کر اس کی تشریح یوں فرمائی "یعنی از یک کلام دو معنی حاصل آید"، حالانکہ یہ شرح بالکل غلط ہے کیوں کہ کسی کلام سے دو الگ الگ معانی کا حاصل ہونا اور کسی مضمون کا اس طرح ادا کرنا کہ اس کی تہ سے دوسرا مضمون بھی مستفاد ہوتا ہے، دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ اس کے بعد موصوف نے ایک جملے کا اور اضافہ کیا ہے "و تصریح بمعنی دوم نہ کردہ باشند"۔ یہ بیان بھی دراصل متقدمین کی اس عبارت کا ترجمہ ہے، **فھذا المعنی الثانی یجب أن لایکون مصرحا به**۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ادماج میں چونکہ مضمون ثانی کا مضمون اول کی تہ سے برآمد ہونا ضروری ہے، لہٰذا جوں ہی مضمون ثانی کو اصل حیثیت دے دی جائے گی، ادماج کی حقیقت فوت ہو جائے گی۔ لیکن میر موصوف نے عبارت میں یہ جملہ لغو بن کر رہ گیا ہے، کیونکہ جب انھوں نے یہ کہہ دیا کہ ادماج کسی کلام کا ذومعنیین ہونا ہے تو پھر انھیں یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ ذومعنیین یا ذومعانی کلام میں معنی دوم کیا، کسی بھی معنی کی صراحت نہیں پائی جاتی۔ لیکن میر صاحب نے اپنے بیان کے تضاد پر بالکل غور نہیں کیا اور وہ مسلسل انتشار ذہنی یا غلط فہمی کا شکار رہے۔

آگے بڑھ کر ایک طرف تو میر صاحب نے استتباع و ادماج کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر کیا، "فرق در استتباع و ادماج آنست کہ استتباع مختص بہ مدح است و ادماج اعم ازاں" جو حسب سابق عربی عبارت **فھو اعم من الاستتباع لشموله المدح وغیره و اختصاص الاستتباع بالمدح** کا لفظی ترجمہ ہے اور ادماج کی اصل تعریف سے مطابقت رکھتا ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی فرما گئے کہ "فرق در ایہام و ادماج آنست کہ در آں جا لفظے می آرند کہ دو معنی یا بیشتر داشتہ باشد و ایں جا مجموع کلام مفید ہر دو معنی شود"۔ حالانکہ ایہام و ادماج کے درمیان تفریق کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ ایہام میں ایک مضمون کی تہ سے دوسرا مضمون برآمد نہیں ہوتا بلکہ کسی لفظ مفرد یا مرکب کا محتمل المعنیین ہونا پورے کلام کو ذومعنیین بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ایہام و ادماج دو بالکل مختلف صنعتیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ متقدمین میں کسی نے بھی سلسلہ زیر بحث میں ایہام و ادماج میں تفریق کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

لیکن میر موصوف چوں کہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ادماج بھی ایہام ہی کی طرح کلام ذومعنیین کو کہتے ہیں، لہٰذا انھیں دونوں میں تفریق کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیان تفریق میں بھی انھوں نے غلطی کی۔ تضاد بیان اور انتشار ذہنی کی کیفیت ان کی مثالوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو انھوں نے متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے متنبی کے مشہور شعر: **أقلب فیه أجفانی**... الخ کو مثال میں پیش کیا ہے اور اس کی شرح بھی بالکل درست طور پر کی ہے تو دوسری طرف سلمان ساوجی، جامی، نظیری اور خسرو کے ایسے اشعار بھی مثال میں پیش کر دیئے ہیں جن پر نہ تو ادماج کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ وہ تکنیک کے لحاظ سے متنبی کے شعر سے کوئی علاقہ رکھتے ہیں، ہاں وہ ذومعنیین ضرور ہیں۔ اس تجزیے کی روشنی میں شمس الدین فقیر کے بیانات دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو حقیقت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہم انھیں بالترتیب (الف) اور (ب) کے تحت پیش کرتے ہیں:

(الف) ادماج ہو ایں چنانست کہ در کلام سوق مدعا متضمن مدعائے دیگر باشد... و تصریح بہ معنی دوم نہ کردہ باشند۔ و فرق در استتباع و ادماج آنست کہ استتباع مختص بہ مدح است و ادماج اعم ازاں... چنانچہ دریں بیت ابوطیب:

اقلب فیه أجفانی کأنی
اعد بها علی الدهر الذنوبا

یعنی می گردانم دوران شب مژہاے چشم خودرا، گویا کہ بہ ایں گردانیدن
من می شارم بر و ہر گناہان اورا۔ مقصود ازیں بیت درازی شب است و در ضمن
درازی شب شکایت دہر و کثرت ذنوب اورا نیز مندرج ساختہ۔

(ب) (ادماج) یعنی یک از یک کلام دو معنی حاصل آید... وفرق در ایہام وادماج آنست کہ دراں جا لفظے می آرند کہ دو معنی یا بیشتر داشتہ باشد، وایں مجموع کلام مفید دو معنی می شود... چنانچہ دریں بیت سلمان ساوجی۔

پیش ازیں گر فتنہ انگیختے در گوشئہ
چشم خوباں، در زمانش فتنہ را بیند بہ خواب

چشم خوباں فتنہ را خوابیدہ یابد، یا در رویا فتنہ را بیند، ہر دو معنی برمی آید و چنانچہ دریں بیت مولوی جامی۔

خواہم از دل بر کشم پیکان او
لیک از دل برنمی آید ہمی

پیکان از دل برنمی آید، یا دل نمی خواہد کہ پیکاں را برآرم، ہر دو معنی حاصل می شود۔ ودریں بیت نظیری۔

مباد اعالمے راجاں بر آید
گرہ از زلف خود فہمیدہ بکشائے

جان عالمے کہ در گرہ بستہ، برآید یا جان عالم از بدن برآید، ہر دو صحیح می شود۔ ودریں بیت امیر خسرو۔

زبان آں پسر ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے، اگر بودے زبانش در دہان من

یعنی من ہم بہ زبان او حرف می زدم، یا زبان اورا می مکیدم (۲۵)۔

میر موصوف کے بعد آنے والے اردو مصنفین بلاغت نے ان کے بیانات کے تضادات پر غور کیوں نہیں کیا، اس کا جواب دینے سے عقل حیران ہے، کیوں کہ ان میں سب کے سب ناقل محض ہی نہیں، بلکہ ایسے حضرات بھی شامل ہیں، جن کے علم وفضل اور تبحر کمال میں کوئی شبہ نہیں۔

بہر حال اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "حدائق البلاغت" کے بعد صنعت ادماج کی تعریف کن مراحل سے گذرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے امام بخش صہبائی کے "ترجمۂ حدائق البلاغت" کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جسے صہبائی کے حذف واضافے کی بنا پر ترجمے سے زیادہ ایک مستقل تصنیف کا نام دینا چاہئے۔ موصوف نے بھی شمس الدین فقیر کی طرح صحیح وسقیم دونوں قسم کے بیانات جمع کر دیے ہیں، جنھیں ہم بالترتیب دو حصوں میں تقسیم کر کے نقل کرتے ہیں:

(الف) صنعت ادماج وہ ہے کہ کلام میں ایک مدعا متضمن دوسرے مدعا کو ہووے، خواہ مدح ہو، خواہ سوائے مدح کے اور کچھ۔ اس صنعت اور استتباع میں فرق یہی ہے کہ اس میں مدح کی خصوصیت ہے اور اس میں کی خصوصیت نہیں۔ پس یہ صنعت عام ہوئی اور استتباع خاص... بہر کیف مثال ادماج کی یہ شعر ہے۔

وصل کی شب ہے آج تو اے گردوں اتنی بات تو کر (کذا)
آٹھ برس کے بعد ملے ہیں، آٹھ پہر کی رات تو کر

مدت مدید کے بعد وصل کا ہونا بیان کیا اور اس کے ضمن میں آسمان کی شکایت بھی اس امر کی مذکور کی کہ یہ شب وصل کے دراز ہونے کو نہیں چاہتا اور یہ امر سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

(ب) ایہام اور ادماج میں فرق یہ ہے کہ ایہام میں ایک لفظ، مشتمل دو معنی یا زیادہ کا ہوتا ہے، چنانچہ اس صنعت کے موقع میں مفصل بیان ہو چکا اور ادماج میں یہ سارا کلام دو معنی کا فائدہ دیتا ہے... اسی قبیل سے ہے یہ شعر بھی سودا کا حضرت امام مہدی کی تیغ کی تعریف میں۔

اس کی برش کرے ملک الموت جب خیال
بے اختیار ہو کے پکارے کہ الاماں

اس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی شمشیر کی برش اس غایت میں ہے کہ ملک الموت، باوجودیکہ سارے جہاں کی جان کا خواہاں ہے، لیکن اس کی برش سے حال عالم پر رحم کھا کر بے اختیار پکارے کہ الاماں یعنی اس سے زیادہ اب قتل مت کر۔ اور دوسرا یہ کہ اس کی برش سے ملک الموت بھی اپنی جان کا خوف کر کے الاماں پکارے (۲۶)۔

صاف ظاہر ہے کہ بیانات کا یہ تضاد میر شمس الدین فقیر کا فیض ہے، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ صہبائی اپنے ترجمے میں میر موصوف کے بیان "و تصریح بہ معنی دوم نہ کردہ باشد" کو بالکل حذف کر گئے ہیں۔

صہبائی کے بعد منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی نے جب "معیار البلاغت" تصنیف کی تو اپنے پیش رووں کے صحیح بیانات سے صرف نظر کر کے غلط بیان کی روشنی میں ادماج کی تعریف یوں کر دی:

ادماج جس کو ذوالمعنیین بھی کہتے ہیں، ایسا کلام ہے کہ اس سے دو معنی حاصل ہوں (۲۷)۔

اس کے بعد درج ذیل اشعار انھوں نے مثال میں پیش کئے ہیں:

یہ شکل عمر ہی گردش ہے ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن
(جرأت)

سنی کسی نے نہیں غم کی داستاں میری
وہ کم سخن ہوں کہ گویا نہیں زباں میری
(امانت)

گر اس کے ہجر میں یوں ہی اندوہ گیں رہے
تو ہووے گا وصال، دلا یہ یقیں رہے
(سرور)

اس کے عارض کو دیکھ جیتا ہوں
عارضی اپنی زندگانی ہے
(نثار)

وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر
مانند سرشک چشم مادر
(نسیم)

اس کے بعد نجم الغنی رام پوری نے "بحر الفصاحت" تصنیف کی۔ موصوف کے فضل وکمال میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ فقیر اور صہبائی کے بیانات کے ستم کو محسوس نہیں کیا بلکہ بذات خود بھی محض غلط تعریف پر قناعت کر گئے، نیز توجیہ یعنی محتمل الضدین اور ادماج کے درمیان غیر ضروری تفریق کو بھی ضروری جانا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

صنعت ادماج یعنی کلام سے دو معنی حاصل ہوں اور تصریح دوسرے معنی کی نہ ہو۔ یہ بہ نسبت استتباع کے عام ہے... اور ایہام وادماج میں یہ فرق رہا کہ ایہام میں ایک لفظ دو معنی رکھتا ہے... اور ادماج میں پورے کلام کے دو معنی ہوتے ہیں۔ اور توجیہ یعنی محتمل الضدین اور ادماج میں بھی فرق ہے یعنی وہ بہ نسبت ادماج کے خاص ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک کلام سے ایسے دو معنی پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے معنی کی ضد ہوتے ہیں... اور ادماج میں ایک معنی دوسرے معنی ہوتے (۲۸)۔

اس کے بعد موصوف نے دس ذو معنیین اردو اشعار مثال میں پیش کئے ہیں۔ جن سے اکثر غلط تعریف کی وجہ سے حقیقت ادماج سے غیر متعلق ہیں۔

یہی تعریف مولانا محمد رفیع صاحب نے اپنی تصنیف "معانی وبیان" میں دہرائی ہے: "ادماج: ایک کلام سے دو معنی کا اس طرح حاصل ہونا کہ دوسرے معنی کی صراحت نہ کی جائے (۲۹)۔" اس کے بعد انھوں خسرو کا شعر: "زبان شوخ من ترکی... الخ مثال میں پیش کیا ہے۔

اب جب کہ غلط تعریف اور غلط مثالوں کی یہ روایت جڑ پکڑ گئی تو مرزا محمد عسکری، سید کلیم اللہ حسینی اور ابو الفیض سحر سے غلط در غلط کے اس حصار کو توڑنے کی توقع کہاں تک کی جاسکتی تھی؟ البتہ ان لوگوں نے یہ جدت ضرور کی کہ "معنی دوم کی تصریح نہ کی گئی ہو" کی لغو قید کے بجائے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "کسی خاص معنی کی تصریح نہ ہو"۔

از بسکہ جادہ ہائے غلط شاہراہ گشت
بے رہ نہ رفتم ز طریق خطا نہ بود

البتہ دو اردو مصنفین اس حصار کو توڑنے میں ضرور کامیاب رہے۔ ایک تو مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، دوسرے مولانا سید محمد غیاث الدین مظاہری۔ ان دونوں نے ادماج کی صحیح تعریف کی ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات نے شمس الدین فقیر اور ان کے متبعین کے بجائے اصل عربی ماخذ پر اعتماد کیا ہے دونوں کے بیانات بالترتیب ملاحظہ ہوں:

(۱) ادماج کے معنی لغت میں لپیٹنے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں ایک مدعا دوسرے مدعا کو متضمن ہووے (۳۰)۔

(۲) ادماج: یہ وہ کلام ہے، جو ایک معنی کے لئے لایا گیا ہو، لیکن دوسرے معنی کو بھی ضمناً شامل کیا گیا ہو (۳۱)۔

لیکن تعجب ہے کہ مولانا عبد الاحد قاسمی مونگیری پر، جنھوں نے "دروس البلاغت" کی اردو شرح "بدور الفصاحت" میں عربی ماخذ کو سامنے رکھنے کے باوجود، یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادماج کی دو تعریفیں کی جاتی ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ادماج، اس کے لغوی معنی لپیٹنے کے ہیں اور اصطلاح میں ایسے کلام کو کہتے ہیں، جس سے دو یا زیادہ معنی نکلتے، یا وہ کلام جو لایا تو گیا ہو ایک معنی کے لئے، لیکن دوسرے معنی کو بھی شامل ہوتا ہو (۳۲)۔ یہاں پہلی تعریف غلط ہے۔

ادماج کی صحیح تعریف کے بعد اس کی مثالوں سے متعلق گفتگو بھی ضروری ہے امام بخش صہبائی نے متنبی کے شعر: اقلب فیہ... الخ کو سامنے رکھ کر اردو میں ادماج کی مثال اس شعر سے دی ہے:

وصل کی شب ہے آج تو اے گردوں اتنی بات تو کر
آٹھ برس کے بعد ملے ہیں، آٹھ پہر کی رات تو کر
(کذا)

بہ گمان غالب یہ شعر خود صہبائی کا ہے اور انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ شب وصل کی درازی کی تمنا کے ساتھ ساتھ ضمناً شکوۂ دہر کا مضمون بھی ادا کر دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متنبی کے شعر والی کیفیت اس میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متنبی نے اپنے شعر میں تشبیہ کا پیرایہ اختیار کیا ہے، جس کی بنا پر شکوۂ دہر کا مضمون اس کے یہاں ضمنی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے برخلاف صہبائی کا شعر تشبیہ یا اس جیسے کسی دوسرے پیرایۂ بیان سے خالی ہے۔ اس لئے شکوۂ دہر کا مضمون یہاں ضمنی حیثیت اختیار نہیں کرسکا ہے۔

یہی بات مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا سید محمد غیاث الدین مظاہری کی پیش کردہ مثال کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان دونوں حضرات نے درج ذیل شعر کو ادماج کی مثال میں پیش کیا ہے ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اور اس کی توضیح اس طرح کی ہے کہ یہاں تغافل محبوب کے ضمن میں اس کے ظالم ہونے کا مضمون بھی ادا کر دیا گیا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ محبوب کی تغافل شعاری اور ستم گری میں اول الذکر کو مدعائے اصلی اور ثانی الذکر مدعا کو ضمنی قرار دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی نے باوجود یکہ ادماج کی تعریف غلط کی ہے تاہم ان کی پیش کردہ ایک مثال صنعت مذکور کی حامل ہے۔ وھو ہذا:

وہ طفل بھی گر گیا قدم پر
مانند سرشک چشم مادر

پنڈت دیاشنکر نسیم کے اس شعر کا اصل مقصد تو یہ بیان کرنا ہے کہ ایک طویل مفارقت کے بعد جب تاج الملوک کی اپنی والدہ سے ملاقات ہوئی، تو وہ

بے ساختہ ماں کے قدموں پر گر پڑا۔ لیکن مصرع ثانی میں نسیم نے اس موقع کے لئے جو تشبیہہ ایجاد کی ہے، وہ ندرت میں اپنی مثال آپ ہونے کے ساتھ ساتھ ضمناً یہ بھی بتا رہی ہے کہ اس قِرانِ السعدین کے وقت ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ نجم الغنی رام پوری کا بھی ہے۔ انھوں نے بھی ادماج کی تعریف میں غلطی کے باوجود شعرائے اردو کے کلام سے اس صنعت کی متعدد صحیح مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

ایک دن یوں ہجوم یاراں تھا
جیسے اب مجمع پریشانی

سلک گوہر سخن اپنا ہے ولیکن ناسخ
دہن یار کے مانند نہاں کیا کچھ

کافی ہے فقط غل الٰہی کا اشارہ
ناسخ کی طرح تابع فرماں ہے یہ گھوڑا

ہماری معلومات کی حد تک، یہ تھیں اردو مصنفین بلاغت کی پیش کردہ وہ مثالیں جن پر صنعت ادماج کا صحیح طور پر اطلاق ہو سکتا ہے لیکن یہ تمام مثالیں اپنے پیرایۂ بیان کے لحاظ سے متنبّی کے مذکورہ بالا شعر سے ملتی جلتی ہیں۔ لہٰذا ہم ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کا پیرایۂ بیان نہ صرف یہ کہ جداگانہ ہے بلکہ حسن و خوبی اور دل آویزی کے لحاظ سے انھیں متنبّی کے شعر پر بدرجہا فوقیت بھی حاصل ہے:۔

خال رخسار نہیں، گوہے سعادت ہے یہ
مجھ سے مجرم کے لئے مہر شفاعت ہے یہ
ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہے یہ
بخدا سلسلۂ بخشش امت ہے یہ
شب معراج رسول دو جہاں سمجھا ہوں
اس کے ہر تار کو میں رشتۂ جاں سمجھا ہوں

یہ بند میر انیس کے مشہور مرثیے "بخدا فارس میدان تہور تھا حر" سے ماخوذ ہے۔ اس میں جناب حر کی زبانی "جگر بند رسول مختار" کے سراپا بیان کرتے ہوئے آں ممدوح کے خال رخسار و گیسوؤں کا ذکر درمیان میں لایا گیا ہے۔ سراپا کا اصل مقصد ممدوح کے حسن و جمال کا بیان ہوتا ہے، لیکن یہاں اس کے لئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف ممدوح کے غایت حسن و جمال کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے بلکہ عنداللہ اس کی مقبولیت و محبوبیت اور اپنے چاہنے والوں کے حق میں اس کا باعث سعادت و شفاعت ہونا بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ادماج کا اطلاق اسی کیفیت پر کرتے ہیں۔ سراپا کے اگلے اور پچھلے دوسرے بند بھی اسی کیفیت کے حامل ہیں۔

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب
پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلام ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئینے میں جلا اور ہو گئی

شاعر کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ دشت کربلا میں حضرت حسین اور ان کے رفقائے نماز فجر کی ادائیگی کے لئے، پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم سے کام لیا لیکن اس کے لئے انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ان حضرات کی خوب صورتی، گوری رنگت اور صباحت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ادماج کے علاوہ اس بند کے چوتھے مصرع میں صنعت استطراد کا عمل بھی کارفرما ہے۔

وہ روئے دل فروز، وہ زلفوں کا پیچ و تاب
گویا کہ نصف شب میں نمایاں ہوا آفتاب
ابرو کی ذوالفقار سے زہرہ عدو کا آب
آنکھیں وہ جن سے نرگس فردوس کو حجاب
تیغی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجے کو ٹیکے ترائی میں

اس بند کے ابتدائی چاروں مصرع ممدوح کے حسن و جمال کے بیان کے لیے لائے گئے ہیں، لیکن تیسرے مصرع میں "ابرو کی ذوالفقار" کی تشبیہ کے بعد "زہرہ عدو کا آب" کے الفاظ نے اسے حسن مجسم کے ساتھ پیکر شجاعت بھی بنا کر پیش کر دیا ہے۔

میں پارۂ دل حسن خوش خصال ہوں
ہیرے سے جو شہید ہوا اس کا لال ہوں

جناب قاسم کا تعارف اس انداز سے کرایا گیا ہے، جس سے ان کے والد حضرت حسن کا واقعۂ شہادت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر میں ایک جدید شاعر کے کلام سے اس صنعت کی ایک مثال پیش کر کے اس سلسلۂ گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔ "نئے نام" (مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی و حامد حسین) میں تاج مجور کی ایک نظم ہے "دوسری بات"۔ اسے بھی ادماج کی ایک کامیاب مثال قرار دیا جا سکتا ہے:

بہت مدتوں بعد ایک دن اچانک
مجھے راہ چلتی ہوئی مل گئی وہ
کہ فردوس گم گشتہ مل جائے جیسے
پھر اس روز
جب میں نے اس کو بتایا
کہ دل میں ابھی تک
تری آرزو کی کنچلی کنواری
لبوں پر خوشی کی مہریں لگائے
مری چشم بے خواب کی چلمنوں سے
مسلسل ترا راستہ دیکھتی ہے
تو وہ مسکرائی

ہمہ تن تبسم
مرے واسطے اس قدر اجنبی تھا
کہ دل میں نہ کلیاں ہی چٹکیں، نہ گل مسکرائے
نہ بجلی سی لہرائی نظروں کے آگے
نہ انگڑائی لیلے کے ارمان جاگے
پھر اپنی پریشاں نگاہیں جھکا کر
بہت ہچکچا کر
کہا اس نے مجھ سے
"مگر اب تو میں...
چھوڑیے دوسری بات کیجئے
کہیں کوئی اچھا مکاں ہو تو کہئے
مگر اس کے نزدیک
اچھا سا موڈرن اسکول بھی ہو"
مجھے یوں لگا
میرے لب سل گئے ہوں

غالباً یہاں اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ "دوسری بات" کی تہ میں کس طرح "پہلی بات" رکھ دی گئی ہے؟ ☆☆☆

حواشی

۱ استغراق کے سلسلے میں متذکرہ بالا تمام تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "العمدۃ" ابن رشیق قیروانی، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، دار الجیل، بیروت ۱۹۷۲ ۲/۳۹_۴۰

۲ ایضاً بہ تفصیلات مذکورہ ۲/۴۱_۴۲

۳ الایضاح لمختصر تلخیص المفتاح، جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی، مطبعۃ الجمالیہ، مصر المطبعۃ الثانیہ ص ۶۹_۷۰

۴ مختصر المعانی، سعد الدین تفتازانی، مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۴۰ ص ۴۸۲_۴۸۳

۵ المطول، سعد الدین تفتازانی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۵ھ ص ۷۰۰_۷۰۱

۶ اتمام الدرایہ لقراء النقایہ، جلال الدین سیوطی، علی ہامش مفتاح العلوم للسکاکی، مطبعۃ التقدم العلمیہ، مصر سنہ ندارد ص ۱۸۱

۷ دروس البلاغۃ، لجماعۃ من علماء الازہر، مطبع آسی لکھنؤ، ۱۳۳۴ھ ص ۱۳۲_۱۳۳

۸ شموس البراعۃ شرح دروس البلاغۃ، مولانا فضل الحق رام پوری مطبع آسی لکھنؤ، ۱۳۳۴ھ ص ۱۳۲_۱۳۳

۹ جواہر البلاغۃ فی المعانی والبیان والبدیع، سید احمد الہاشمی بک، مطبعۃ الاعتماد، مصر، ۱۳۵۸ھ ص ۳۸۵

۱۰ الجواہر اللماعۃ فی قواعد البلاغۃ، سید ابو طاہر محمود السوانی الازہری، مطبعۃ الاستقامۃ، سنہ ندارد ص ۷۶

۱۱ مجمع الصنائع، نظام الدین احمد بن صالح، مطبع احسنی میر حسن رضوی، لکھنؤ ۱۲۶۱ھ ص ۱۲۵_۱۲۶

۱۲ مفتاح الصنائع، مفتی نظام الدین شاہ آبادی، سرہندی، (قلمی) نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ ص ۱۷۶_۱۷۷

۱۳ درس بلاغت، مرتبہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ ص ۴۱

۱۴ سراج البلاغت، سید کلیم اللہ الحسینی، تاج پریس حیدر آباد ۱۹۵۹ ص ۱۰۲_۱۰۳

۱۵ آئینۂ بلاغت، مرزا محمد عسکری، یو پی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۴ ص ۷۵_۷۶

۱۶ بحر الفصاحت، مولانا نجم الغنی رام پوری، مطبع نول کشور لکھنؤ طبع ثانی ۱۹۸۴ ص ۷۵_۷۶

۱۷ معیار البلاغت، منشی دیبی پرساد سحر بدایونی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۶ ص ۱۱۴

۱۸ بحر الفصاحت، بہ تفصیلات مذکورہ

۱۹ آئینۂ بلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ

۲۰ درس بلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ

۲۱ معیار البلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ ص ۱۱۴

۲۲ بحر الفصاحت، بہ تفصیلات مذکورہ ص ۹۹۱

۲۳ آئینۂ بلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ ص ۷۸

۲۴ درس بلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ ص ۴۲

۲۵ حدائق البلاغت، میر شمس الدین فقیر، مطبع نول کشور لکھنؤ، کان پور، ۱۸۸۷ ص ۸۷_۸۸

۲۶ ترجمہ حدائق البلاغت، امام بخش صہبائی، بر حواشی حدائق البلاغۃ مذکورہ ص ۱۰۱_۱۰۲

۲۷ معیار البلاغت، بہ تفصیلات مذکورہ

۲۸ بحر الفصاحت، بہ تفصیلات مذکورہ

۲۹ معانی و بیان، مولانا محمد رفیع، ناشر لالہ رام دیال اگروال الہ آباد سنہ ندارد ص ۸۰_۸۱

۳۰ تذکرۃ البلاغۃ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مطبع مجتبائی دہلی طبع سوم ۱۹۳۷ ص ۱۶۰

۳۱ البلاغت، مولانا سید محمد غیاث الدین مظاہری، مکتبہ عزیزیہ الہ آباد، طبع اول ۱۹۸۱ ص ۱۳۷_۱۳۸

۳۲ بدور الفصاحت، شرح و ترجمہ اردو درس البلاغت، مولانا عبدالاحد قاسمی مونگیری، امدادیہ لائبریری، چوک بازار ڈھاکہ ۱۹۶۰ ص ۱۷۲_۱۷۳

ظفر اقبال

شمارہ ۲۷،
اگست ۱۹۶۸

ایک ہی نقش ہے جتنا بھی جہاں رہ جائے
آگ اڑتی پھرے ہر سو کہ دھواں رہ جائے

کچھ غرض اس سے نہیں رزق گدا ہو کہ نہ ہو
کوچہ و راہ میں آواز سگاں رہ جائے

یہ سفر وہ ہے کہ اتنا بھی غنیمت ہے اگر
اپنے ہمراہ یہی خاک رواں رہ جائے

اور کچھ روز رکے ست لہو کا موسم
اور کچھ دیر یہی رنگ خزاں رہ جائے

آج کل اس کی طرح ہم بھی ہیں خالی خالی
ایک دو دن اسے کہیو کہ یہاں رہ جائے

کچھ تو رہ جائے تگ و تاز طلب میں باقی
وہم اپنا رہے یا اس کا گماں رہ جائے

وہ تمنا ہوں کہ دل سے نہ گذر ہو اس کا
وہ تماشا ہوں کہ نظروں سے نہاں رہ جائے

یہ بھی اک مرحلۂ سخت ہے اے صاحب طرز
کہ بیاں کی جگہ انداز بیاں رہ جائے

نام تو پھر بھی بڑی بات ہے دنیا میں ظفر
یہی کیا کم ہے جو کچھ اپنا نشاں رہ جائے

شمارہ ۳۱،
دسمبر ۱۹۶۸

کرتا ہوں جمع خود کو بکھرنے کے نام پر
جیتا ہوں اس نواح میں مرنے کے نام پر

صحرا کی ریت ان کی رگوں میں رواں ہے اب
جو پھنس گئے تھے پار اترنے کے نام پر

آواز دب گئی ہے ابھرنے کی آڑ میں
طوفان سو گیا ہے بپھرنے کے نام پر

الجھے گی بات اور سلجھنے کی سعی میں
بگڑیں گے کام اور سنورنے کے نام پر

اس بحر کا نشیب و فراز ایک ہے یوں ہی
ڈوبا کرے گی خلق ابھرنے کے نام پر

یاروں کو کچھ فریب بھی دینا پڑا مجھے
طے یہ سفر کیا ہے ٹھہرنے کے نام پر

ساری فلاح ساری فضیلت ملی مجھے
اس دل کے راستے سے گزرنے کے نام پر

ویسے بھی دھوپ تیز ہے اس کوہسار کی
بھڑکی ہے پیاس اور بھی جھرنے کے نام پر

پڑتا ہے کچھ ہنر بھی برائی میں، اے ظفر
کرتا ہوں سارے کام نہ کرنے کے نام پر

ظفر اقبال

شمارہ ۳۳،
فروری ۱۹۶۹

قافیہ چاہئے کھانے کے لئے
یعنی مطلع میں کھپانے کے لئے
خوشہ چینوں کو خبر ہے شاید
میں کماتا ہوں لٹانے کے لئے
سب سے پہلے سنی اس نے مری بات
بزم سے مجھ کو اٹھانے کے لئے
مفت میں اس سے لڑائی لے لی
کوئی پہنچا نہ چھڑانے کے لئے
ہوا ایجاد خوشی کا ٹیکہ
غم کی میعاد بڑھانے کے لئے
کچھ ہوا چاہئے آخر مجھ کو
سانس کا سنکھ بجانے کے لئے
کچھ فضا کی بھی ضرورت ہے مجھے
اپنی بے پر کی اڑانے کے لئے
ٹوٹ جانے کے لئے جڑتا ہوں
شعر لکھتا ہوں مٹانے کے لئے
شاعری اصل کہاں ہے؟ کہ ظفر
دانت ہیں یہ تو دکھانے کے لئے

رنگ جلنے کے لئے راز پگھلنے کے لئے
ہے ہر اک چیز کسی اور میں ڈھلنے کے لئے
لوگ ہیں اور ہی منزل کے مسافر، یعنی
خاک رہ جائے گی اب خاک میں رلنے کے لئے
راہ پانے کی ذرا دیر ہے، سنتے رہنا
خوف کا چشمہ ہے بے تاب ابلنے کے لئے
ذرۂ ریگ بدن ہے مجھے دیوار سیاہ
در کوئی چاہئے صحرا سے نکلنے کے لئے
آنکلتا ہے کبھی دل کے نہاں خانے میں
اک ذرا پیرہن ناز بدلنے کے لئے
میں گرا بھی تو اسے لے کے گروں گا، ورنہ
لڑکھڑانا تو بہانا ہے سنبھلنے کے لئے
دشمنوں سے نہیں مڈبھیڑ اگر قسمت میں
ہو سڑک پر کوئی چھلکا ہی پھسلنے کے لئے
لفظ چھپتا ہے وہاں میرے مخالف تو یہاں
بات اتنی اسے کافی ہے اچھلنے کے لئے
پتیاں چوم کے جس کی ظفر اتنے خوش ہو
پھول تھا وہ تو، مری جان، مسلنے کے لئے

ظفر اقبال

شمارہ ۴۲،
نومبر ۱۹۶۹

سرگشتۂ سراب تھے دشت صدا کے ہم
ایسے کہ خود بھٹک گئے رستہ دکھا کے ہم

اب پول کھل بھی جائے اگر شہر میں تو کیا
آگے بہت نکل گئے دھوم مچا کے ہم

سب اڑ گیا ہوا پہ جمانے کی سعی میں
وہ ایک نقش لائے تھے جس کو بچا کے ہم

آمیزہ ایک ہم سے رہے یہ بھی یادگار
تحسین طلب ہیں خاک میں خوشبو ملا کے ہم

اندر کی دھوپ ہی کہیں اب راس ہو تو ہو
بھیگے ہوئے ہیں ایک نم نارسا کے ہم

اب تیسری طرف میں بھٹکتا ہے دھیان کیا
منکر ہیں اپنے اور ہیں کافر خدا کے ہم

اب روٹھ ہی گیا ہے تو اس کو منائیں بھی
آخر کو لوٹ آئے ہیں کچھ دور جا کے ہم

جینے کا اک جواز تو ہو جھوٹ سچ کہیں
یوں، زندہ رہ بھی سکتے ہیں اس کو بھلا کے ہم

شمارہ ۶۳،
اگست ۱۹۷۱

فکر کر تعمیر دل کی وہ یہیں آجائے گا
بن گیا جس دن مکاں اس دن مکیں آجائے گا

کون سا ہم روز روز اس کو بلاتے ہیں یہاں
بے مروت ہے مگر اتنا نہیں، آجائے گا

ہم سے مل لینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اب
ہر کوئی اس کو بلالے، ہر کہیں آجائے گا

خود بھی وہ چالاک ہے لیکن اگر ہمت کرو
پہلا پہلا جھوٹ ہے اس کو یقیں آجائے گا

سرخوشی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور پھر
درمیاں میں پھر کوئی حرف حزیں آجائے گا

زخم دل تو سات پردوں میں چھپا ہوگا کہیں
اور سب کے سامنے داغ جبیں آجائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اس لشکر کشی سے حسن کا
کچھ علاقہ اور بھی زیر نگیں آجائے گا

موجۂ آب سیاہ و سبز ہے شوق وصال
سطح پر چمکے گا یا زیر زمیں آجائے گا

شمارہ ۹۳،
دسمبر ۱۹۷۴، جنوری ۱۹۷۵

حسرت دید کو نیرنگ تماشا لکھنا
کہہ اٹھے وہ بھی کہ یہ جھوٹ ہے ایسا لکھنا

بات اچھی میں برائی بھی ہو شامل تھوڑی
شعر اچھا بھی اگر ہو تو دوبارہ لکھنا

آرزو ہے کسی خورشید قیامت کی اگر
شوق کو شام سفر دل کو اندھیرا لکھنا

چار لفظوں کا روادار نہیں ہے جس سے
دل نے چاہا کبھی طومار تمنا لکھنا

جی میں جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے کھل کر لکھ دو
ہم یہ کب کہتے ہیں ایسا نہیں ویسا لکھنا

باندھ رکھی ہے جو امید عنایت ان سے
اپنی عادت ہے ظفر دشت کو دریا لکھنا

ظفر اقبال

شمارہ ۱۸۷،
اکتوبر ۱۹۹۵

شبہ سا رہتا ہے یہ زندگی ہے بھی کہ نہیں
کوئی تھا بھی کہ نہیں تھا، کوئی ہے بھی کہ نہیں
رنگ سا پھیلتا جاتا وہ ہوا کا ہر سمت
خوف سا پھر بھی ہے یہ تھرتھری ہے بھی کہ نہیں
یہ اندھیرا ہی غنیمت ہے کہ یہ ہے تو سہی
روشنی ڈھونڈتے ہیں روشنی ہے بھی کہ نہیں
کوئی چیز آس بندھاتی ہوئی مطلوب ہے کیا
کوئی شے خواب دکھاتی ہوئی ہے بھی کہ نہیں
دوستی کے یہاں چرچے تو بہت ہیں لیکن
جانتا کوئی نہیں دوستی ہے بھی کہ نہیں
دل نے خود پہلی محبت کو سبوتاژ کیا
دوسری کے لئے اور دوسری ہے بھی کہ نہیں
دوسروں کی جو خبر پوچھتا پھرتا ہے بہت
کیا پتہ آپ کو وہ آپ بھی ہے بھی کہ نہیں
اہل دنیا مجھے زنجیر تو کرتے ہیں مگر
کیا خبر سر میں وہ دیوانگی ہے بھی کہ نہیں
شاعری اور طرح کی اسے کہتے ہو ظفر
میں پریشاں ہوں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں

شمارہ ۲۳۹،
جولائی ۲۰۰۰

یہ جہاں آدھا فقط آہنگ سے پیدا ہوا
اور جو باقی بچا وہ رنگ سے پیدا ہوا
آنسوؤں کی تیز بارش میں جو وا رہتا تھا دل
باغ سا اس آئینے میں زنگ سے پیدا ہوا
ایک مہلت اپنی وارفتہ مزاجی سے ملی
ایک موقع اس کے عذر لنگ سے پیدا ہوا
سامنے تو آئے گا دل سے نکل کر وہ کہیں
یہ بھی امکاں اس مکان تنگ سے پیدا ہوا
جس نے ٹھنڈک ڈال دی تھی سینۂ خس میں کبھی
اک شرر ایسا بھی اس کے سنگ سے پیدا ہوا
چھوڑ دی میں نے بھی اس کی برہمی پر خوئے عجز
امن اس کی اور میری جنگ سے پیدا ہوا
عزت افزا تھے بہت، خاشاک گمنامی بہت
شعلۂ رسوائی نام و ننگ سے پیدا ہوا
کس نے سمجھا جو کہیں نایاب کے اندر تھا اور
کس نے دیکھا جو کبھی نیرنگ سے پیدا ہوا
سب کچھ اس نے نیست و نابود کر ڈالا ظفر
کہ سخن ایسا بھی میرے ڈھنگ سے پیدا ہوا

ظفر اقبال

شمارہ ۲۷۷،
فروری ۲۰۰۴

کس طرح کی یہ تاک ہے اور جھانک
دیکھنے میں بکھر رہی ہے آنکھ

کچھ حجاب و حیا بھی چاہئے ہے
چھاتیاں کھول دی ہیں سر تو ڈھانک

شور اتنا بپا تھا ہر جانب
عشق نکلا ہے محض ایک چھٹانک

سیب رخسار کا جو ہے چرچا
کہیں اپنے لئے بھی ہے کوئی پھانک؟

واہ رے قافیے کی مجبوری
کہ اچانک بھی ہو رہا ہے اچانک

سب زر عمر خرچ کر دیا ہے
سر بسر ہو کے رہ گیا ہوں پھانک

دور ہے سبزہ گاہ معنی ابھی
اور الفاظ کا یہ ریوڑ ہانک

آسمانوں پہ جا کے پھول کھلا
اور اس خاک پر ستارے ٹانک

جو بھی ہو ایک ہی اثر ہے ظفر
بوسہ ملتا نہیں تو زہر ہی پھانک

یہ آنکھیں چوم سکتا ہوں کہ ماتھا چوم سکتا ہوں
مجھے تم خود ہی بتلاؤ میں کیا کیا چوم سکتا ہوں

تلافی ہو تو سکتی ہے جو کوتاہی بھی کر بیٹھوں
غلط بوسی کی صورت میں دوبارہ چوم سکتا ہوں

نہیں ہے چومنے اور دیکھنے میں فرق بھی اتنا
ان آنکھوں سے بدن سارا تمہارا چوم سکتا ہوں

یہ استحقاق سے کم بھی نہیں ہے کچھ اگر سمجھو
محبت کر رہا ہوں میں لہٰذا چوم سکتا ہوں

غنیمت ہے اگر وہ چومنے دے ہاتھ ہی اپنے
ابھی تک تو کہاں وہ روئے زیبا چوم سکتا ہوں

تماشا گاہ میں جا کر خلل پیدا نہیں کرتا
اگر میں دور سے رنگ تماشا چوم سکتا ہوں

کہاں وہ چاند جو میری رسائی سے ہے دور اتنا
کہاں میں اس زمیں کا ذرہ ذرہ چوم سکتا ہوں

کسی شب سیر کرنی ہے تمہارے آسمانوں کی
جہاں میں اپنی قسمت کا ستارا چوم سکتا ہوں

ابھی تک تو ظفر ساری کی ساری خوش خیالی ہے
ابھی تو صرف رخسار تمنا چوم سکتا ہوں

ظفر اوگانوی

شمارہ ۱۸،
نومبر ۱۹۶۷

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

میں نے آواز سنی۔ بہت ہی دھیمی اور دور سے آتی ہوئی۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

آواز کچھ قریب ہوئی۔

آواز قریب ہوتی چلی گئی۔

اور پھر میرے بائیں پیر کے تلوے میں کسی بچھو نے ڈنک ماردیا اور رگوں میں شعلے تیرنے لگے۔ میرا ایک ایک ناخن جلنے لگا۔ میرے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ایسے میں مجھے ہر ایک لباس اتار کر پھینک دینا پڑا اور پھر ..

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے بلیڈ کی مدد سے پورے جسم کی کھال بھی اتار پھینکی۔

اسی وقت مجھے اپنے خون کا... اپنی آگ کا صحیح رنگ معلوم ہوا۔ یہ رنگ وہ نہیں تھا جو کسی اور کا تھا۔ یہ رنگ سارے رنگوں سے مختلف تھا یہ نہ خالص سرخ تھا اور نہ شیالا سرخ۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

آواز پھر ابھری۔

اور میں نے دیکھا کہ میرے لباس سے کہ جس کا رنگ بے حد منفرد اور اصلی تھا، جس کا مجھ سے اس وقت کوئی تعلق نہیں تھا، جو مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کچھ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ میں خواب میں سکڑا پڑا ہوں۔ آواز آرہی تھی۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

اور میں سوچ رہا تھا کہ میں اس لٹکتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں کے پنجر میں ہوں یا اس چمڑے کے لباس میں جو میں نے اپنے جسم سے علیحدہ کردیا ہے۔ اور مجھ سے مخاطب ہے، پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے، شاید وہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہو کہ میں کہاں ہوں، کس میں ہوں۔

میں نے پہلی بار اس کا جواب دیا۔

ہاں میں تمھیں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں۔ تم میرے لباس ہو۔ تم میری پوشاک ہو۔

نہیں... میں تمھاری طاقت ہوں۔

پاگل ہوگئے ہو؟ میرے پاس اس وقت بھی میری ہڈیاں ہیں میرا خون ہے۔ میرا دماغ ہے، اور تمھارے پاس؟

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں کسی اور موقع پر تمھیں بتادوں گا کہ میری طاقت کیا ہے۔"

جب وہ میرے سوال کو ٹال گیا تو مجھے بڑا عجیب لگا کہ وہ مجھے نظر انداز کر رہا ہے اور اس کی نظر میں میری اہمیت صفر کے برابر ہے شاید۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ اور کہے تو جواب میں مجھے اپنی اہمیت جتانے کا موقع مل سکے گا۔ لیکن اس نے اپنے ہونٹ سی لئے اور اس کی آنکھیں مجھے بہت دیر تک گھورتی رہیں، اوپر سے نیچے تک۔ پھر اس میں ایک حرکت ہوئی۔ چمڑے کا خول پھولنے لگا۔ جب اس میں ہوا بھر گئی تو وہ اپنے بدن کو سکیڑتا ہوا اٹھا۔ اس نے میرے کپڑے پہنے اور کرسی پر بیٹھ گیا، تب میں چیخ پڑا۔

"وہ تم نہیں ہو وہ میں ہوں۔ وہی میں ہوں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح دیکھا کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ اس کی مسکراہٹ میں زہر ہے یا قند۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں نے پہلی بار خود کو ننگا محسوس کیا تھا اور ایک جوان شخص دوسرے جوان شخص کی ہر ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے اس احساس تک پہنچ گیا اور کہنے لگا:

"تمھارے سامنے اور کوئی نہیں ہے، تم اپنے ہی سامنے ننگے ہو۔ تم نے کچھ دیر پہلے مجھے بھی اسی طرح دیکھا تھا اور میں نے اس کو محسوس تک نہیں کیا تھا کہ میں خود اپنے ہی سامنے ننگا تھا۔"

وقفے کے بعد اس نے دوسری بات کہی۔

"تم نے کبھی کسی دوسرے جوان ننگے جسم کو دن کے اجالے میں دیکھا ہے؟"

(۱) Intra muros (لاطینی) = دیوار کے اندر۔

"تم کیا بکواس کرنے لگے۔"

"تم نے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ہے۔"

"کس کو۔"

"یہ تم بھی جانتے ہو۔"

"وہ مجھے اپنی بے سروپا باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا اور میں اکتاہٹ اور بے چینی کی کیفیت کے ساتھ ٹیبل واچ کو نظروں سے پکڑنا چاہ رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور پونے بارہ بجے تک مجھے تیار ہو جانا تھا کیوں کہ نیلی آنے والی تھی اور اس کے ساتھ مجھے شاپنگ کے لئے جانا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے درخواست کے انداز میں بات کرنی پڑی:

حضور عالی آپ اپنے کپڑے اتار کر اپنے خول کی ہوا نکال دیجئے۔ مجھے پندرہ منٹ کے اندر اندر تیار ہو جانا ہے کہ..."

"...کہ نیلی آنے والی ہے اور آپ کو شاپنگ کے لئے جانا ہے۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟"

"بھئی تم جانتے ہی ہو پھر بھی دیر کر رہے ہو۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔

"اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ میں چلا جاؤں گا نیلی کے ساتھ، تم بھی رہنا۔"

مجھے غصہ آ گیا۔

"تم کون ہوتے ہو اس کے ساتھ جانے والے؟ وہ میری ہے۔ تمہارا اس سے کیا رشتہ؟"

اس کے باوجود وہ پرسکون رہا۔

"لیکن کچھ دیر پہلے تم تو خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں میں نہیں ہوں بلکہ تم ہو۔ پھر اس میں کون سی قباحت ہے؟"

"یہ سب فراڈ ہے! تم مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہو، بولو تمہیں میرے چمڑے کے عوض کیا چاہئے؟"

"نیلی۔"

"تم کمینے اور ذلیل کتے ہو"۔ اور پندرہ منٹ بھی ضائع ہو ہی گئے۔

نیلی نے دستک دی تو میں ہی کواڑ کھولنے کے لئے لپکا لیکن اسی لمحے مجھے اپنی بے بسی کے احساس نے روک لیا اور اپنی جگہ واپس آ گیا۔ پھر وہ اٹھا۔ اس نے کواڑ کھولے اور نیلی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی بانہوں میں جھول گئی، مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں نے نیلی کو بہت میٹھے لہجے میں مخاطب کیا:

"یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نہ۔ یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نہ۔"

نیلی نے پہلے مجھے دیکھا، پھر اس کو اور پھر جب اس نے مجھے غور سے دیکھنا چاہا تو اس کی چیخ نکل گئی اور بے ہوشی کی سی کیفیت اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ میں دیکھتا رہا۔ اس نے نیلی کو اپنی آغوش سے نکال کر فرش پر لٹا دیا اور بغل میں رکھی ہوئی صراحی سے چلو میں پانی لے کر اس کے چہرے پر زور زور سے چھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہونٹ کھولنے اور بند کرنے لگی یہاں تک کہ جب اس کے حواس پورے طور پر ٹھکانے آ گئے تو اس نے مجھے نئے سرے سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ شاید کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اس وقت بہت سارے سوالات ہوں گے؛ وہ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتی تھی لیکن وہ بغیر چمڑے کے جسم کی ازلی سرخی سے جس کا اپنا رنگ تھا وہ کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا ہے اور کون ہے؟ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کی زردی کا اثر نمایاں تھا اور اس کی آنکھیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں اور وہ اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی کے ساتھ کچھ اس طرح پکڑے ہوئے تھا کہ جیسے نیلی کے لئے وہی سب کچھ ہو۔ وہی اس کا اپنا ہو۔ دوسری طرف میں تھا اور وہ مجھے پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہی تھی جیسے ڈرینج میں پھینکا ہوا کوئی ناجائز بچہ ہو۔ ایسے میں نیلی کے سامنے مجھے ایک بار پھر وضاحت کرنی پڑی۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نہ۔ وہ میں ہوں تمہارا اپنا۔ اور یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نہ۔ وہ میں نہیں ہوں۔"

جب میں بول چکا تو اس نے بھی بالکل یہی بات دہرائی۔ "یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نہ۔ وہ میں ہوں تمہارا اپنا۔ اور یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نہ۔ وہ میں نہیں ہوں۔"

اس کے باوجود نیلی متحیر تھی کہ ان دونوں میں دراصل میں کون ہوں۔ اتنے میں وہ آگے بڑھا، اس نے اس کے سارے کپڑے اتار ڈالے، ایک ایک کر کے سارے کپڑے۔ اس نے کسی طرح کی نہ کوئی مزاحمت کی اور نہ برا مانا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس پر بے انتہا خوف طاری تھا۔ وہ لرزتی رہی اور کانپتی رہی پھر اس نے سامنے ٹیبل پر سے بلیڈ اٹھایا اور نیلی کی کھال اتارنے لگا۔ اوپر سے نیچے آگے سے پیچھے۔ یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو نیلی اپنے کپڑوں میں ملبوس تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہڈی اور گوشت کا سرخ بدن میرے سامنے کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے کھال اتاری ہوئی فربہ میڈھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا اور اس کے بعد ہی میں نے اس کو نیلی کے ساتھ شاپنگ کے لئے جانے کی اجازت دے دی ☆☆☆

آصف فرخی

کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

عالم ایجاد

قیمت : تین سو روپے

شب خون کتاب گھر سے دستیاب ہے

ظفر گورکھپوری

شمارہ ۲۱۳،
جنوری ۱۹۹۸

جگر کا قطرہ قطرہ کٹ کے بہنا
بہت مشکل ہے صاحب شعر کہنا
سنانا بے تکلف حال اس کو
اور اس کے بعد اندیشوں میں رہنا
ہوا باہر تو گھر میں آئینہ ہے
کہاں تک اس کے اس کے وار سہنا
ہر اک کے ساتھ اپنا آسماں ہے
اب اک چھپر تلے مشکل ہے رہنا
ہمارے گھر سے یہ جاتی ہوئی رت
بدا ہوتی ہوئی مفلس کی بہنا
ابھی سناٹا اچھا لگ رہا ہے
ابھی تو خیر ہے، اس سے کہنا
ظفر کہتے نہ تھے گھر جلد لوٹو
سنو اب اس کی آنکھوں کا الہنا

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

گیلی آنکھوں کا اجالا مرا دیکھا ہوا ہے
ہے جو پانی میں ستارہ مرا دیکھا ہوا ہے
ہوں گے صحراؤں کے اس پار ہرے کھیت ترے
جان یہ خواب سہانا مرا دیکھا ہوا ہے
کیا المیہ ہے کہ اپنے ہی کو دیکھا نہ کبھی
ورنہ یہ سارا زمانہ مرا دیکھا ہوا ہے
پیاسی بستی کو مری ابر کے نقشے نہ دکھاؤ
بس کرو سارا تماشا مرا دیکھا ہوا ہے
سب مرا برتا ہوا ہے جو مرے سامنے ہے
اور جو ہے پس پردہ، مرا دیکھا ہوا ہے
قید کر رکھا ہے تو نے مری پریوں کو جہاں
اے سمندر وہ جزیرہ مرا دیکھا ہوا ہے
وہ سر راہ کسی موڑ پہ اپنے جیسا
شجر یکہ و تنہا مرا دیکھا ہوا ہے
اے ہوا تو مجھے پہنچائے ضروری تو نہیں
میرے ویرانے کا رستہ مرا دیکھا ہوا ہے

عابدہ احمد

شمارہ ۹۴،
فروری، مارچ ۱۹۷۵

نظم

سرخ سانسیں الجھتی ہیں
لو دیتی ہیں
قلم کی نوک پر
چوستی رہتی ہیں انگلیاں مجھ کو
حرف حرف زہر

یاد

مضمحل خوابوں کی چبھن
تکیے سے چپٹے نقوش
ادھر بھرے زخم کی آنکھ
پگھلتی یاد کی موم بتی کا حزن لئے
سندھیا کا گربھ
لجیلی صبح کا کرب بنا

کچھ کیا جائے

چرمراتی سوکھی ہڈیاں
سہارے کا خدا کتنا خوش ہے
میرے دعاؤں سے بنا سراپا اس کا
رستخیز ہے اٹھو
پہلے اسے تلاشا جائے

عادل منصوری

شمارہ ۲۳،
اپریل ۱۹۶۸

کھوکھلے لفظوں کی دیوار بنانے والو
کب سے بھی ٹوٹ چکا سرخ خطیبانہ طلسم
اور تم صبح کے رستے میں پڑے سوتے ہو
سر کے بالوں پہ ہے بے عقل سفیدی چھائی
منتشر کر گئیں گم نام ہوائیں تنکے
شیروانی سے ہوئے اور بھی موزوں قامت
پہلے اک چوکھٹا بنوالو نئے دانتوں کا
تا کہ تم آئینہ دیکھو تو ذرا ہنس تو سکو
کھوکھلے لفظوں کی دیوار بنانے والو

حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود

عادل منصوری

شمارہ۲۶،
جولائی ۱۹۶۸

رات داڑھی کے اندھیرے سے تکلف برتے
عرش کے سامنے رسوائی کی گردن نہ اٹھے
اذن سجدہ پہ کمر تختہ نہ ہو جائے کہیں
کھوکھلے لفظوں میں لوہا تو نہیں بھر سکتے
سینکڑوں سال کی تبلیغ کے چالیس ثمر
کشتی بن جائے تو تندور سے پانی ابلے
سالہا سال سے آرام نتیجہ مطلوب
تین سو ساٹھ صنم خانۂ کعبہ سے چلے
ریگ زاروں میں غار دو کھجوری سائے
اونٹ کی آنکھ میں تشہیر ہوا درد سفر
کوئی ہندہ سے کہے دانت کہاں ہیں تیرے
فتح مکہ سے مگر لوگ ہدایت پائیں
خون جم جائے جو نعلین میں چلتے چلتے
عرش کی آنکھ سے رحمت کا سمندر ابلے

پاؤں پاتال میں سر چرخ سے ٹکرائے کہیں

پر جو کھولے تو ہر اک سمت پہ پردے لٹکیں
اور جلتا ہوا سورج ابھی کھوئے کہیں
قافلہ آیا ہے بوبکر سے منسوب مگر
مال تقسیم ہوا دامن حاجت منداں
نور کندھے پہ اٹھائے شب ہجرت کے سفیر

غار میں ساتھ رہے پاس ہی پیوند ہوئے
مسجد نبوی میں انبار غنیمت روشن
لوگ روتے ہوئے نکلے ہیں پریشاں منظر
روشنی پہنچی ابوجہل کی دیواروں تک
گھر کی تاریکی میں رستہ نہ بنے بینائی
پیڑ کے سائے کی پہچان یہودی راہب
رک گیا آب رواں بیوہ کے دروازے پر
دست زہرا میں نشانات عیاں چکے سے
علم کے باب علی عمر میں سب سے چھوٹے
چاند کا نام ترے چاک گریبانوں میں
مبتدی ڈھونڈتے ہیں مسجد اقصیٰ میں امام
سدرۃ المنتہیٰ جبریل اجازت مانگے
کون تھا کس نے پکارا کہ چلے بھی آؤ
کون موجود تھا پہلے سے وہاں کون گیا
کون سنتا تھا وہاں کس نے پکارا کس کو
کس کی آواز کی تنویر سے عالم چمکے
سربلندی تھی مقدر میں قلم سے پہلے
بکریاں کون حلیمہ کی چرانے جائے
آمنہ بطن سے اظہار ہے آدم کا عروج
مجتمع کس نے کیا لوگوں کو پربت کے قریب
کس نے للکارا ضلالت کو مسلسل تنہا

جو کی روٹی کبھی مل جائے کبھی فاقہ کشی
بھوک سے پیٹ پہ پتھر کبھی باندھے کس نے
تین سو تیرہ کی تعداد ہے کس گنتی میں
فکر پہ دائرہ کن خندقیں کھودی جائیں
دور کی دھوپ میں ہے فیصلہ کن راہ تبوک
حنظلہ سامنے آجائیں جو چھٹ جائے غبار
میں نے پہنچا دیا تم تک جو مجھے پہنچا تھا
میں نے پہنچا دیا تم تک جو مجھے پہنچا تھا
میں نے پہنچا دیا تم تک جو مجھے پہنچا تھا

کوئی پردیسی ہے خیمے پہ پریشاں صورت
اور فاروق چلے بیوی کو ہمراہ لئے
فاصلے توڑ کے آواز کے سائے پھیلی
حاکم وقت کا کرتہ کئی پیوند لگا
بکریاں جس سے سنبھالی نہیں جاتی تھی کبھی
نصف دنیا پہ خلافت کے علم لہرائے

یاد ہے صاحبِ خیبر کو اکھاڑا کس نے
کس کی تلوار تھی آئینہ زمانے کے لئے
کس نے زرخیز شجاعت کے ستارے بوئے

جان دی جاوداں لحات تلاوت مشغول
خون کے دھبے ہیں قرآن پہ تابندہ نظر

کون روتا تھا مصلے پہ ہماری خاطر
پیر ورما گئے کس کے شب سجدہ و قیام
چھ مہینوں میں مکانوں سے دھواں تک نہ اٹھے
فکر امت تھی ہر اک لمحہ لہو میں کروٹ
جسم روشن تھا چٹائی کے نشاں بھی روشن
گالیاں کھاتے پھرے مکہ کے بازاروں میں
اور تنہا کبھی طائف سے نکالے جائیں
مرحبا شکر کا ٹھہراؤ بہشتی زیور
مرحبا صبر کا عرفان کہ معراج حیات
نور مجسوم ہوا گنبد خضرا مرکوز
حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود
ہاتھ روشن رہے کوثر سے قرابت منظر

خون اب سرد ہوا جاتا ہے شریانوں میں
اور بڑھتی ہوئی تعداد بھروسا توڑے
نفس دوڑاتا ہے ہر جانب شہوت گھوڑے
لذت اشیا میں معدوم چراغوں کی لویں
روشنی اپنے پڑوسی کو بھی پہنچا نہ سکے
روح اب شعلگی مانگے ہے ہر اک ذرے سے

کوئی الیاس کی باتوں پہ ذرا کان دھرے
کوئی یوسف کی شہادت کے معانی پوچھے
کوئی تقسیم کرے وقت کو مسجد مسجد
کوئی بیعت تو کرے دست زکریا حاضر

مرکز عشق پہ پہنچو تو ہو انعام نظر
ایک اک لمحے کے چہرے سے عیاں اذن سفر

گرہی قلعوں میں محفوظ رہے گی کب تک
سر اٹھائے گی ہوا بادباں کھل جائیں گے
بند دروازوں پہ دستک کی صدا گونجے گی
دھوپ دہلیز پہ پہنچائے گی مہمانوں کو
سائباں سر پہ ابابیل لئے ساتھ چلے

تیغ تہذیب کے صحرا میں اذاں لہرائے
گونج اٹھے گا حرم نعرۂ لبیک! زمیں
تیرے قدموں میں اگل دے گی خزانے اپنے
تیری تقلید میں مغرب کی بقا پوشیدہ
تیری تذلیل میں جو ہاتھ اٹھے کٹ جائے
تیری نصرت کے لئے آسماں کوشش مقصود
سلسلے تیرے بنیں زیب جہان فانی
نور مجسوم ہوا گنبد خضرا مرکوز

حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود

غزل

عادل منصوری

شمارہ ۲۷،
اگست ۱۹۶۸

ہونے کو یوں تو شہر میں اپنا مکان تھا
نفرت کا ریگ زار مگر درمیان تھا

لمحے کے ٹوٹنے کی صدا سن رہا تھا میں
جھپکی جو آنکھ سر پہ نیا آسمان تھا

کہنے کو ہاتھ باندھے کھڑے تھے نماز میں
پوچھو تو دوسری ہی طرف اپنا دھیان تھا

شعلے اگلتے تیر برستے تھے چرخ سے
سایہ تھا پاس میں نہ کوئی سائبان تھا

سب سے کیا ہے وصل کا وعدہ الگ الگ
کل رات وہ سبھی پہ بڑا مہربان تھا

اللہ جانے کس پہ اکڑتا تھا رات دن
کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی بڑا بد زبان تھا

منہ پھٹ تھا، بے لگام تھا، رسوا تھا، ڈھیٹ تھا
جیسا بھی تھا وہ دوستو محفل کی جان تھا

ایل ۔ ایس۔ ڈی۔ نظمیں

عادل منصوری

شمارہ ۷۰،
مارچ ۱۹۷۲

ہانپتا گھرا گلابی دریا

ہانپتا گہرا گلابی دریا
کیسری رات گلابی دریا
جامنی ہاتھ گلابی دریا
بے صدا بات گلابی دریا
ٹوٹتا ڈوبتا موجود گلابی دریا
پھیلتا جسم
لاموجود
گلابی دریا
جسم محدود گلابی دریا
جسم مفقود گلابی دریا
ہانپتا گہرا گلابی دریا
گلابی دریا
گلابی دریا

نام لانام افق لایعنی

نام لانام افق لایعنی
بعض لایعنی افق نام عدم
آنکھ انجام عبث سوریہ مکھی
سوریہ مکھی
سوریہ مکھی
نام لانام افق سوریہ مکھی
آنکھ لایعنی عدم سوریہ مکھی
جسم موجود مگر سوریہ مکھی
نام موجود مگر سوریہ مکھی
آنکھ موجود مگر سوریہ مکھی
افق انجام عبث لایعنی
سوریہ مکھی
سوریہ مکھی

عادل منصوری

شمارہ ۱۶۷،
جنوری تا فروری ۱۹۹۳

ایک قطرہ اشک کا چھلکا تو دریا کردیا
ایک مشت خاک جو بکھری تو صحرا کردیا
میرے ٹوٹے حوصلے کے پر نکلتے دیکھ کر
اس نے دیواروں کو اپنی اور اونچا کردیا
واردات قلب لکھی ہم نے فرضی نام سے
اور ہاتھوں ہاتھ اس کو خود ہی لے جا کردیا
اس کی ناراضی کا سورج جب سوا نیزے پہ تھا
ایک حرف عجز ہی نے سر پہ سایہ کردیا
دنیا بھر کی خاک کوئی چھانتا پھرتا ہے اب
آپ نے در سے اٹھا کر کیسا رسوا کردیا
اب نہ کوئی خوف دل میں اور نہ آنکھوں میں نیند
تو نے مرگ ناگہاں بیمار اچھا کردیا
بھول جا کہ کل ترے نقش قدم تھے چاند پر
دیکھ ان ہاتھوں کو کس نے آج کاسہ کردیا
ہم کہ کہنے جارہے تھے ہمزۂ ی والسلام
بیچ میں اس نے اچانک نون غنہ کردیا
ہم کو گالی کے لئے بھی اس کے لب ہلتے نہیں
غیر کو بوسہ دیا تو منہ سے دکھلا کردیا
تیرگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے آخر میاں
سرخ پرچم کو بھی جلا کر ہی اجالا کردیا
سارے استاد سخن تقطیع فرماتے رہے
بزم میں ہم نے تو دل کا بوجھ ہلکا کردیا
جانے کس کے منتظر بیٹھے ہیں جھاڑو پھیر کر
دل سے ہر خواہش کو عادل ہم نے چلتا کردیا

شمارہ ۱۹۴،
مئی ۱۹۹۶

پہلو کے آس پاس گذرتا ہوا سا ہو
اک شخص آئینے میں اترتا ہوا سا ہو
جیتا ہوا سا ہو کبھی مرتا ہوا سا ہو
اک شہر اپنے آپ سے ڈرتا ہوا سا ہو
سارے کبیرہ آپ ہی کرتا ہوا سا ہو
الزام دوسرے ہی پہ دھرتا ہوا سا ہو
قیلولہ کر رہے ہوں کسی نیم کے تلے
میداں میں رخش عمر بھی چرتا ہوا سا ہو
ہر اک نیا خیال جو ٹپکے ہے ذہن سے
یوں لگ رہا جیسے کہ برتا ہوا سا ہو
معشوق ایسا ڈھونڈیئے قحط الرجال میں
ہر بات میں اگرتا مگرتا ہوا سا ہو
چہرے کے اس نمک کو چھڑکنا بھی چاہئے
اور اپنا کوئی زخم بھی بھرتا ہوا سا ہو
پھر بعد میں وہ قتل بھی کردے تو حرج کیا
لیکن وہ پہلے پیار بھی کرتا ہوا سا ہو
تو داد اگر نہ دے نہ سہی گالیاں سہی
اپنا بھی کوئی عیب ہنرتا ہوا سا ہو

عادل منصوری

شمارہ ۲۰۴،
مارچ ۱۹۹۷

جینا بھی ہو سکے کبھی مرنا بھی ہو سکے
شاید ترے بدن سے گذرنا بھی ہو سکے

دیوار کے سکوت سے ڈرنا بھی ہو سکے
ہمزاد سے کلام کا کرنا بھی ہو سکے

زلفوں کی چھاؤں میں جو اترنا بھی ہو سکے
محشر کی دھوپ بیچ ٹھہرنا بھی ہو سکے

یہ کون پل صراط سا حائل ہے راہ میں
چڑھنا بھی ہو سکے نہ اترنا بھی ہو سکے

اٹکا ہوا ہے سانس کا کانٹا گلے میں یوں
چپ سادھنا نہ آہ کا بھرنا بھی ہو سکے

دیدہ وران شہر کو کچھ سوجھتا نہیں
مشکل کشائی آپ سے ورنہ بھی ہو سکے

صحرا کے بیچوں بیچ کوئی اونٹ بھی نہیں
سورج کے ساتھ کیسے سفرنا بھی ہو سکے

یہ اور بات ہے کہ نہیں کرتے ہیں پیش و پس
ہونے کو یوں تو زیر و زبر نہ بھی ہو سکے

جبکہ رہے ہوں ٹھیٹھ لڑکپن سے بگڑے دل
اس عمر میں تو خاک سدھرنا بھی ہو سکے

کچھ بھی تو ہو نہ سکتا لہو کی وہ بوند کا
شبنم سراب اشک یا جھرنا بھی ہو سکے

ایسا کہیں کہ دونوں جہاں ڈوب ہی گئے
خواہش کی دلدلوں سے ابھرنا بھی ہو سکے

میداں کھلا پڑا ہے چلو چار پاؤں سے
تا کہ پھدکنا ہو سکے چرنا بھی ہو سکے

تلوار ایک ہاتھ میں قینچی ہو ایک میں
گردن بچے تو بال کترنا بھی ہو سکے

ایسی ہوا چلی کہ رضائی بھی اڑ گئی
چھت پر شب وصال ٹھٹھرنا بھی ہو سکے

اردو ہی جانتے ہیں نہ واقف عروض سے
عادل سے کیا غزل میں وگرنہ بھی ہو سکے

عالم خورشید

شمارہ ۱۶۱،
مارچ اپریل ۱۹۹۱

چلئے صحرا کو نئے رنگ میں تصویر کریں
اس زمیں پر ہی چلو، شہر کی تعمیر کریں
خوشبوئیں، دھوپ، ہوا، ابر، دھواں، پرچھائیں
زندگی ہم تجھے کس نام سے تعبیر کریں
مطمئن ہم ہیں کسی پھول میں خوشبو کی طرح
ہم نہیں چاہتے کہ خود کو جہانگیر کریں
کون دشمن ہے ہمارا، ہمیں معلوم تو ہو
ہم بھی یوسف کی طرح خواب کی تعبیر کریں
اس نئے عہد میں ہے دست دعا بے معنی
زندگی کرنے کی اب وہ مری تدبیر کریں
تم ہو خورشید ہمیشہ ہی رہو گے قائم
بہتے پانی پہ تمھیں کس لئے تحریر کریں

شمارہ ۲۸۲،
جولائی ۲۰۰۴

(عرفان صدیقی کو خراج عقیدت کے طور پر)

چھن کے آتی ہے صدا روزن و دیوار سے کیا
کوئی آواز ہمیں دیتا ہے اس پار سے کیا
بے حسی سے ہی مرے شہر کی حالت ہے خراب
ہم تو گھر میں ہیں ہمیں کوچہ و بازار سے کیا
چیخ اٹھتی ہے نہ نعرہ نہ صدا ہی کوئی
لوگ مانوس ہیں زنجیر کی جھنکار سے کیا
دیکھ کر تلوے مرے اتنے پریشاں کیوں ہو
تم کبھی گذرے نہیں وادی پرخار سے کیا
دور جانا ہے تمھیں چلتے رہو سست قدم
تم کو لینا ہے بھلا گرمی رفتار سے کیا
چلتے رہنا ہے مسافر کا مقدر عالم
جلتے صحراؤں سے کیا سایۂ اشجار سے کیا

عالم خوندمیری

شمارہ ۵۲،
ستمبر ۱۹۷۰

غالب اور عصریت کے سوال پر دو طرح سے بحث کی جا سکتی ہے:
ایک تو یہ کہ غالب کی شاعری کا ظاہری حسن اور اس کی لفظی پیکر تراشی، زمان اور اظہار کے عصری سانچوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہے؟ اور دوسرے یہ کہ غالب کی شاعری کے فکری اور جذباتی عناصر کہاں تک عصری حسیت کی ترجمانی کرتے ہیں؟ یعنی دوسرا سوال یہ ہوگا کہ کہیں غالب محض ایک ایسے دور کا شاعر تو نہیں ہے جو ہمارے لئے تقریباً یا تمام تر مردہ ہو چکا ہے، یا جس کا ہم سے کسی قسم کا معنوی ربط باقی نہیں رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم عصریت Contemporaneity کا ربط نہایت نازک ہوتا ہے اور اسی نازک ربط کی بنا پر ہم تاریخ میں ایک تسلسل کو دریافت کر سکتے ہیں۔

خود ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار میں ہم عصریت شخصیت کی عمیق سطح پر ہی موجود ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہ عمیق سطح وہ ہوتی ہے جو تاریخ کے بہاؤ سے اپنے آپ کو بچا لینے کی طاقت رکھتی ہے۔ اسی طرح، انسانی نسل کی تاریخ میں ہم عصر لمحات وہی ہوتے ہیں جو تاریخ کی تبدیلی اور زمانے کے جبر سے ایک پراسرار طریقے پر محفوظ رہ جاتے ہیں۔ تغیرات کے بہاؤ میں عینیت identity محض ایک انسانی روایت (Convention) یا صرف ایک منطقی مفروضہ نہیں بلکہ ایک مابعد الطبیعیاتی حقیقت ہے۔ زمانے کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا ایک دور (Epoch) زمانی لمحات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے لیکن ان لمحات کے درمیان معنوی ربط اس سلسلے کو ایک دور کی صورت عطا کرتا ہے۔ مارکس نے جدلیاتی طریقے سے سلسلۂ روز و شب کو ادوار Epochs کے تواتر کی نوعیت میں تصور کیا اور اس طرح زمانے کی رو کو تاریخ کے نظم و ضبط کی ہیئت میں جلوہ گر دیکھا۔ لیکن ان مختلف تاریخی ادوار میں جو معنوی ربط پنہاں ہوتا ہے وہ سماجی اداروں سے کہیں زیادہ آرٹ اور فکر کے اعلیٰ ترنمونوں میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔

اسی مفروضے کی بنا پر میرا خیال ہے کہ غالب کی عصریت کو، یا دوسرے لفظوں میں غالب کی اور ہماری ہم عصریت کو، اس کی شاعری کی اندرونی ہیئت یا Internal structure میں تلاش کرنا ہوگا۔ اس اندرونی ہیئت میں شعر کے فنی سانچے اور ان کی تہ میں کارفرما خیال، ایک وحدت کی صورت میں متحد ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے شعر کا فنی تجزیہ اور فکری تجزیہ صرف طریقۂ کار کے ذرائع یا Methodological Devices ہیں، یا مطالعہ کرنے والوں کے موضوعی رجحانات کے اظہار ہیں۔

غالب کی شاعری کی فکری اساس پر غور کرنے سے پہلے ایک اور سوال پر غور کرنا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا شاعری کی کوئی فکری اساس ہوتی بھی ہے؟ قریبی زمانے کے دو بڑے فکر انگیز شاعروں نے، جن کی سند کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے۔ گوئٹے (Goethe) اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے مختلف الفاظ میں شاعری اور فکر کے ربط کا انکار کیا ہے۔ ایلیٹ کے نقطۂ نظر سے کسی بھی شاعر کا نقطۂ آغاز اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں، اور شاعر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی اور شخصی کرب کو انوکھے، رنگارنگ، غیر شخصی اور آفاقی انداز میں پیش کرے۔ شاعر کی واحد دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ وہ فکر کے جذباتی Equivalent کو پیش کرے۔

لیکن ایک مقام پر ایلیٹ نے اپنے استدلال میں ایک عجیب طریقے سے شاعری اور فکر کے ربط کے لئے گنجائش مہیا کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ہم اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے خیال واضح ہوتا ہے اور جذبہ مبہم۔ حقیقت یہ ہے کہ خود جذبات مبہم اور واضح ہوتے ہیں۔ واضح جذبات کے اظہار کے لئے اتنی ہی ذہنی طاقت درکار ہے جتنی کہ واضح فکر کے اظہار کے لئے۔

یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ذہنی طاقت جس کا ذکر ایلیٹ نے کیا ہے، فکر سے علیحدہ کوئی شے ہے؟ شاعری میں اور خصوصاً اعلیٰ شاعری میں، یعنی اس شاعری میں جس میں واضح جذبات اور ذاتی اور شخصی کرب کا اظہار آفاقی انداز میں ہوتا ہے، فکر اور جذبہ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ انھیں ایک مشکل ذہنی تجزیے ہی کی مدد سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر وہ کون سی طاقت ہے جو ذاتی کرب اور شخصی تردد و ہیجان کو آفاقی اور غیر شخصی علامتوں کے ذریعے پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہے؟ گہری فکر ہی کی طاقت سے شخصی علامتیں، غیر شخصی اور آفاقی نوعیت حاصل کر سکتی ہیں اور اسی وجہ سے شاعر اور قاری کے درمیان ایک فاصلہ باقی رہتا ہے۔ ایک بڑے شاعر کا شاعرانہ کمال یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے قاری کے درمیان ایک فاصلے کو برقرار رکھتے ہوئے بھی، اپنے احساس کی شدت اور اپنے

خیال کی عظمت میں قاری کو اپنے ساتھ شریک رکھے۔

قاری اور شاعر کا یہ فاصلہ اگر ہمیشہ کے لئے متعین ہو جائے تو پھر شاعری کی علامتی قدر محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں فاصلہ غیر متعین رہتا ہے وہیں شعر کی علامتی قدر بڑھ جاتی ہے اور اس کی نئی تعبیریں ممکن ہوتی ہیں۔ اسی غیر متعین فاصلے کی وجہ سے ایک شاعر مختلف تاریخی ادوار کا ہم عصر بنتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شاعر اپنے ہم عصر قاری کے ساتھ ایک متعین فاصلے کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ اپنے دور کے لئے تو کامیاب، لیکن آنے والے ادوار کے لئے تیزی سے اجنبی بننے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی کا المیہ ان کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ المیہ ان کی زندگی کا نہیں، ان کے فن کا المیہ ہوتا ہے۔

فکر اور جذبے کی اس مصنوعی تقسیم کا سبب شاید وہ انسانی رجحان ہے جس کو رلکے Rilke نے اشیا کو نفاست کے ساتھ الگ الگ کرنے کی انسانی غلطی کا نام دیا تھا۔ ایک اعتبار سے اہم سوال یہ ہیں کہ آیا فکر، روحانی تجربے کی اسی گہری سطح سے ابھرتی ہے جہاں شعری ہیئت کی تخلیق ہوتی ہے اور آیا فکر نے انسانی ذہن (Psyche) کے ان سرچشموں سے اپنا سروکار رکھا ہے جہاں سے وہ عقلی اور وجدانی ایقانات ابھرتے ہیں جن سے شاعرانہ جذبے کو اظہار کا دوام حاصل ہوتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ شعر کی فکری اساس کی تلاش انھیں عقلی اور وجدانی ایقانات کی جستجو اور بازیافت کا نام ہے اور چونکہ شعر میں ان ایقانات کا اظہار تخئیلی پیکروں اور علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے، اسی لئے فکری اساس کی جستجو، شعر کی تعبیر کے بغیر ممکن نہیں۔ اور پھر چونکہ علامات کی کوئی واحد تعبیر نہیں ہوتی، اسی لئے فکری اساس کے بارے میں قطعیت اور خاتمیت Finality کا بھی امکان نہیں رہتا۔ خود فکر جہاں شاعرانہ طریقوں اور شاعرانہ Myths کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے وہاں فکری اظہارات بھی تعبیر کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ افلاطون، ہیگل، ابن عربی اور نیطشے کے افکار تعبیر کی اس ضرورت کی بہترین مثالیں ہیں۔

غالب، میرے مفروضے کے اعتبار سے، ان شاعروں میں ہے جنھوں نے اپنے اور قاری کے درمیان فاصلے کو ہمیشہ غیر متعین رکھا۔ اور اسی لئے کلام غالب کی علامتی قدر بھی زیادہ ہے، اور اسی بنا پر اس کے کلام کی مختلف تعبیریں بھی ممکن ہیں۔ لیکن تعبیر کی صحت سے قربت کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ وہ کہاں تک غالب کے مجموعی کلام سے ہم آہنگ ہے۔ غالب کی حد تک یہ کام یوں مشکل ہے کہ ایک تو اس نے انسانی زندگی کے کسی پہلو کو اپنی نظر کا منتہا نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ کلی انسانی موقف یا Total Human Situation کو اپنے پیش نظر رکھا، اور اسی لئے وہ ہمیشہ بلندیوں سے پستیوں اور پستیوں سے بلندیوں تک گرم سفر نظر آتا ہے۔ دوسرے، اس نے ایک ایسی صنف سخن کا انتخاب کیا جس میں تفصیل اور تشریح کی گنجائش نہیں۔

غالب کی بلندی اگر صرف فکر کی بلندی ہوتی یا اس کی پستی صرف فکر کی پستی ہوتی یا اسی طرح اس کی بلندی جذبے کی بلندی اور پستی، جذبے کی پستی ہوتی تو پھر مطالعۂ غالب آسان ہو جاتا۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ اس کی بلندی صرف فکر کی بلندی نہیں بلکہ جذبہ و احساس و تخیل کی بھی بلندی ہے، اور اسی طرح اس کی بظاہر پستی صرف فکر کی پستی نہیں، بلکہ انسانی موقف کے فطری پست لمحوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ انسانی موقف سے یہ ایمان دارانہ لگاؤ غالب کے فن کا ایک نادر وصف ہے۔ نیطشے نے اپنی کتاب The Birth of Tragedy میں لکھا ہے: "فن کا کمال یہ ہے کہ وہ زیست (Existence) کا اقرار کرے، اس کو بارحمت تصور کرے اور زیست کو مقدس بنائے۔" (To affirm, to bless, and to deify existence) زیست یا وجود کے بارے میں غالب کے موقف کا اظہار ایک واقعے سے ہوتا ہے، جس کا اظہار حالی نے "یادگار غالب" میں کیا ہے۔ حالی نے ایک بار صوفیائے کرام کے ایک مشہور قول کا ذکر کیا، وجودکَ ذنبٌ، لیکن غالب نے ایک غزل میں اس خیال کی تردید کی

دم از وجودکَ ذنب زدند بے خبراں
چساں عطیۂ حق را گناہ ما گویند

جہاں تک میرا خیال ہے، مسلمان اہل فکر میں صرف دو شاعر مفکروں نے اس روایت کی واضح الفاظ میں تردید کی ہے، ایک محی الدین ابن العربی اور دوسرے غالب۔ ابن عربی نے "فصوص الحکم" میں صاف الفاظ میں لکھا ہے **کلُّ موجودٍ مرحوم** (یعنی وجود ایک رحمت ہے)۔ ہوسکتا ہے کہ خود غالب نے یہ خیال ابن عربی سے لیا ہو۔ جدید دور کے ایک مفکر جی۔ ای۔ مور G.E Moore کے الفاظ میں ایک قدر یا Value کا واقعی وجود، اس کی قدر کو بڑھا دیتا ہے۔ غالب اور ابن عربی دونوں متفق ہیں کہ کسی شے کا انفرادی وجود یا اس کی زیست عین رحمت ہے کیوں کہ وہ (یعنی وجود) ایک عطیہ الٰہی ہے۔ میرے خیال میں کلام غالب کا فکری سرچشمہ ان کا یہی تصور ہے کہ انفرادی زیست عین رحمت ہے۔ اسی خیال کا شعری پیکر میں اس نے یوں اظہار کیا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

مشکل یہ ہے کہ غالب کے اکثر شارحین نے روایتی وحدت الوجود اور صوفیانہ وحدیت Sufi Monism کے نقطۂ نظر سے غالب کو سمجھنے کی کوشش کی اور غالب کے اصرار زیست اور قبول فردیت کے بنیادی Vision یا عرفان کو نظر انداز کرگئے۔ غالب یقیناً وجود کی وحدت کے معترف ہیں، لیکن وجود کی وحدت کا خالص شاعرانہ عرفان دینیاتی مذہبی تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ یورپی ادب میں وحدت کے اس شاعرانہ عرفان کی بہترین مثال گوئٹے کی شاعری ہے، اور مشرقی ادب میں غالب اس کے کامیاب نمائندے ہیں۔ گوئٹے نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ایک سچی علامت میں جزو، کل کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن ایک خواب یا سائے کی طرح نہیں بلکہ ناقابل فہم (Unfathomable) وجود کے ایک زندہ اور قریبی الہام کی صورت میں۔

In a true Symbol the Particular represents the Universal, not as a dream or shadow, but as the living instantaneous revelation of the unfathomable"

یعنی یہ کہ فرد یا جزو، کلی وحدت کی ایک زندہ علامت ہوتا ہے، محض ایک استعارہ نہیں۔ گوئٹے نے اس روشنی میں حافظ کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان لوگوں پر نکتہ چیں ہوا جنھوں نے حافظ کو محض ایک صوفی شاعر تصور کیا تھا۔

> اے پیردانا حافظ، لوگوں نے تمھیں لسان الغیب (Mystical Tongue) سمجھا لیکن ان نادانوں نے اس لفظ کے مفہوم کو نہیں سمجھا۔ تم ان کے لئے صوفی ہو کیوں کہ تمھاری شاعری سے ان کے ذہنوں میں احمقانہ خیالات پیدا ہوئے اور اسی لئے انھوں نے تمھارے جام میں ناپاک شراب بھر دی۔ بے شک تم صوفی ہو، اس لئے کہ لوگوں نے تمھیں سمجھا نہیں۔ تم رحمت یافتہ ہو۔ زہد کے بغیر، اور اس بات کو تمھارے نادان مداح نہیں سمجھتے۔

نطشے نے گوئٹے کے شارحین کو آگاہ کیا تھا:

> شاعروں کے شارحین اس بات کو نہیں سمجھتے کہ شاعر، حقیقت اور علامت دونوں کو برحق سمجھتا ہے۔ وہ علامت کے ذریعے حقیقت کا عرفان حاصل کرتا ہے اور اس طرح وہ کلیت Totality کا دوطرفہ ادراک کرتا ہے۔

کم و بیش یہی بات غالب کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔
غالب کے اس مشہور شعر میں

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بادہ و ساغر محض استعارے نہیں ہیں بلکہ ایسی زندہ علامتیں ہیں جن کے ذریعہ حق اپنا اظہار کرتا ہے، بلکہ یہ علامتیں، حق کے سچے اظہارات کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ صرف حقیقت کے اظہار کا عجز نہیں ہے کہ علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے بلکہ حقیقت کا اظہار ہی علامتوں کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ غالب کا یہ پختہ ایقان ہے کہ نمود صور پر ہی وجود بحر موقوف ہے اور اسی لئے قطرہ و موج و حباب کو الگ کرنا صرف ادراک کی سطح پر رک جانا ہے۔ نطشے نے گوئٹے کے عقیدۂ ہمہ اوست یا Pantheism پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا:

> گوئٹے سا آزاد ذہن حقیقت کے ایک پرمسرت اور با اعتماد اعتراف کے ساتھ پوری کائنات کو اپنا مرکز بنالیتا ہے اور اس یقین کے ساتھ زندہ رہتا ہے کہ صرف جزو کو کل سے مستقل طور پر الگ کر لینا قابل اعتراض ہے، ورنہ زندگی کی کلیت میں ہر جزو کا اقرار پنہاں ہے اور جزو کے اقرار ہی میں زندگی کی تقدیس کا عقیدہ مضمر ہے۔ وہ زندگی کی کسی سطح کا انکار نہیں کرتا اور اس سے اعلیٰ تر عقیدہ کوئی اور نہیں۔

عصری ذہن کے چند بنیادی ایقانات ہیں جن کی بنا پر عصری ذہن پچھلے دور کے ذہن سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ان بنیادی ایقانات میں ایک اہم ایقان یہ ہے کہ فرد (Individual) یا فکری اصلاح میں جزو (Particular) نوع یا کلیت میں شامل ہوتے ہوئے بھی زیست کے نقطۂ نظر سے اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ مطلقیت یا Absolutism کے خلاف ردعمل کے ساتھ ہی جدید فکری اور شاعرانہ دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں شاعرانہ سطح پر غالب نے پہلی بار فردیت کا اقرار کیا اور اس بنا پر ذیل کے اشعار اس کی فکری زندگی کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں ۔

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

ہے رنگ لالہ و گل نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہئے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہئے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی وجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

ان اشعار کی سوالیہ علامت محض تشکیک کا اظہار نہیں بلکہ وحدت میں کثرت یا فردیت کے اقرار کی آئینہ دار ہے۔

غالب کے بنیادی وجدان میں وجود (Being) کئی پیکر تراشتا ہے اور ہر پیکر کے قلب کو تمنا سے سرشار کر دیتا ہے۔ وہ اس کلی وجود کو عام طور پر خیال سے تعبیر کرتا ہے۔ یہیں یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ غالب حقیقت کو خیال تصور کرتا ہے اور اسی لئے وہ شاید حقیقت کا انکار کرتا ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم حقیقت سے کیا مراد لیتے ہیں اور خیال سے ہمارا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ غالب نے خیال کے بارے میں دو بلیغ اشعار کہے ہیں اور ان دونوں میں ایک معنوی ربط ہے۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم

یہاں خیال، مادی حقیقت کے حدود کو توڑ دیتا ہے اور اس خارجی کائنات کی مرعوب کن وسعت خیال کے مقابلے میں نیرنگ یک بت خانہ سے زیادہ اہم نظر نہیں آتی۔ اسی بات کو ایک دوسرے شعر میں غالب نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہاں ایک شک ہوتا ہے کہ شاید غالب نے ہستی کا انکار کیا ہے۔ شعر کا بظاہر مفہوم یہی ہے لیکن غالب کا ایک اور شعر ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

بات ذرا کھلنے لگتی ہے کہ غالب کے نزدیک ہستی یا واقعی کائناتی وجود، ایک مختتم واقعہ نہیں بلکہ کسی کا خیال ہے جو لامحدود ہے اور جو مسلسل وجود کے پیکر تراشتا رہتا ہے۔ وجود کے ان پیکروں میں باہمی ربط خیال سے نہیں بلکہ تمنائے زیست سے پیدا ہوتا ہے ۔

کس کا خیال آئینہ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا
کس کا جنون دید تمنا شکار تھا
آئینہ خانہ وادی جوہر غبار تھا

ان کے ابتدائی دور کے ایک مشہور شعر میں ان کے بنیادی Vision یا عرفان کی ترسیل کامیاب ہو جاتی ہے اور تمنا اور خیال کا باہمی ربط واضح ہو جاتا ہے ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

اپنی شاعری کے پہلے دور میں غالب نے وجود کا تمنا کی صورت میں عرفان حاصل کیا تھا، اور یہی عرفان فکر کی پختگی کے ساتھ خیال کے استعارے میں ظاہر ہونے لگا۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ غالب کے نزدیک تمنا اور خیال دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یہاں اس امر کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک محدود وجود کی تمنا لازماً محدود ہوگی اور ایک لامحدود وجود کی تمنا لازماً لامحدود ہوگی۔ اسی طرح تمنا کا مقام ذہن ہے اور خیال کا بھی ذہن۔ ایک مادی وجود میں بھی خیال اور تمنا عام معنوں میں مادی نہیں ہوتے بلکہ یہ مادی وجود سے ماورا ہونے یا Transcend کر جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ یہی تمنا جب شعور کی سطح پر آتی ہے تو خیال بن جاتی ہے۔ اور اگر ایک ایسا وجود ہے جس میں شعور اور غیر شعور کی تفریق نہیں، تو ظاہر ہے کہ ایسے وجود کے لئے تمنا ہمیشہ شعوری ہوگی۔ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ایسا وجود ممکن ہے جو خیال کو چشم زدن میں حقیقت کا روپ دے سکتا ہے تو پھر ایسے وجود کے لئے تمنا، خیال، اور عمل ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ تمنا اور مشیت، اس وجود کے لئے ہم معنی ہو جائیں گے اور مشیت اور فعل میں کن فکان کا ربط قائم ہو جائے گا۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے، جو غالب کا ایک ایقان ہے، کہ یہ کائنات ایک ایسے ہی وجود ازل کی تخلیق ہے تو پھر یہ صرف تخلیق نہیں رہتی بلکہ خالق کی ذات کا اظہار بھی بن جاتی ہے۔ لیکن لامحدود کا اظہار محدود میں کیسے؟ اسی لئے یہ اظہار بھی ہے اور اخفا بھی۔ مشکل یہ ہے کہ اخفا مستقل نہیں ہو سکتا، وجود مخفی نہیں رہ سکتا، اسی لئے یہ کائنات ایک مختتم وجود نہیں ہو سکتی۔ غالب نے حقیقت کے بارے میں یہ عظیم کشف حاصل کیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ کائنات ایک خیال بھی ہے اور تمنا بھی، بلکہ تمنا ہے اسی لئے خیال بھی ہے۔ یہی ازلی اور ابدی خیال انسانی نفس اور شعور میں اضطراب بن جاتا ہے کیونکہ انسانی وجود صرف خارج کی ساکن تصویریں حاصل نہیں کرتا بلکہ کائنات کی حرکت میں حصہ دار بھی ہوتا ہے، بعض انسانوں کا شعور زیادہ اور بعض کا کم۔ اسی کو شاعرانہ زبان میں غالب نے "توفیق"[1] کا نام دیا ہے۔ غالب کو شعور کی یہ توفیق ہوئی تھی کہ وہ اس کائنات کے اضطراب کا حصہ دار بن گیا اور یہی اس کی مضطرب شخصیت کا راز ہے ۔

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

نہ یہ نری شاعرانہ تعلّی ہے اور نہ ایک نرگسی فریب، بلکہ کائنات کے اضطراب میں حصہ دار ہونے اور شعوری شخصیت ہونے کی وجہ سے تمنا کا اعلیٰ مظہر اور مدعا ہونے کا غم آگیں شاعرانہ اظہار ہے۔ اسی شعور کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ غالب خود سراپا تمنا بن جاتے ہیں اور تمنا اور واقعہ میں کن فکان کی طرح کا ربط نہیں رہتا۔ اسی مادی کائنات میں تمنا، انسانی ذہن میں مادے کی وساطت سے اپنا اظہار کرتی ہے اور اسی لئے تمنا مضطرب ہو جاتی ہے۔ ایک محدود Finite وجود کے لئے تمنا کے اظہار اور حصول کی کوشش کا نام عشق ہے۔ غالب بھی گوئٹے کی طرح یقین رکھتے ہیں کہ Unfathomable حقیقت تک رسائی کا ذریعہ صرف عشق ہے۔ یہی عشق وسیلہ بھی ہے اور شخصیت کے خزینے کا ایک اہم باب بھی۔ عاشق صبر طلب ہے اور تمنا بے تاب۔ عشق مادے پر جھپٹ پڑتا ہے اور مادے کو مفتوح بنانا چاہتا ہے۔ غالب نے اپنی شعری زندگی کے پہلے ہی دور میں اس تمنا کا عرفان حاصل کیا تھا ۔

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
نہ ذوق گریباں، نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد، شکوہ کفر و دعا ناسپاسی

---

[1] توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
کیا کمال عشق نقص آباد گیتی میں ملے
پختگی ہائے تصوریاں خیال خام ہے

ہجوم تمنا سے ناچار ہیں ہم

غالب کائنات کا اعتراف ایک مجہول اور نرگسی شخصیت کی طرح نہیں کرتا۔ وہ روایتی صوفی کی طرح کائنات سے منہ بھی نہیں پھیر لیتا، بلکہ وہ کائنات کو دام تمنا میں اسیر کرلینا چاہتا ہے اور اس طرح موت کو بھی، جو حیات کی دشمن ہے اور تمنا کی حریف، زیر کرلینا چاہتا ہے۔

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

اوسط درجے کا فرد، کائنات کا اقرار کرتے ہوئے کائنات میں گم ہوجاتا ہے اور محدود شخصیت کی آخری حد یعنی موت کو فراموش کرجاتا ہے۔ لیکن ایک تخلیقی شخصیت موت کا عرفان حاصل کرنے کے بعد حدیت Finitude سے ماورا ہوجاتی ہے۔ اقبال نے مستند شخصیت (Authentic) کا معیار یہ بتایا ہے کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(میرے خیال میں اقبال کے نزدیک کافر اور مومن Authentic اور Inauthentic کے مرادف ہیں)

غالب اور اقبال کی شاعرانہ علامتیں مختلف ہیں۔ اقبال تسخیر کائنات کے بارے میں زیادہ واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اس لئے کہ وہ سائنسی دور کے ہیں۔ غالب کا اضطراب حیات بھی اقبال سے کم نہیں۔ انھیں اس بات کا غم ہے کہ یہ کائنات ناقص ہے اور شاید یہاں عشق کو کمال ممکن نہیں۔

انسانی زیست کے بارے میں حدیت (Finitide) کا عرفان دوسرا اہم تصور ہے جو غالب کے کلام کا عصری پہلو ہے۔ عصری وجدان میں فردیت اور حدیت کے عرفان، دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اسی سے زیست کی وحشت پیدا ہوتی ہے۔ وحشت، حدیت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اقبال کے فن اور فکر میں یہ عصری رجحانات پوری طرح نمایاں ہیں اور غالب کے یہاں شعری علامتوں میں کبھی پنہاں اور کبھی عیاں ہوجاتے ہیں۔ اقبال کے مقابلے میں غالب کے لئے تمنا اور امکان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہے اور ایک الم آفریں چیلنج۔ فاصلے کا یہی احساس غالب کے شعور میں وحشت کے عنصر کو اور بڑھا دیتا ہے۔ غالب کے لئے اس عظیم فکر کی جس کا وہ حامل تھا، ترسیل آسان نہ تھی۔ غالب کی شاعرانہ شخصیت کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے ؎

زلف خیال نازک و اظہار بے قرار
یارب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو

شعری علامتوں کی پیچ در پیچ تہوں کے نیچے ہمیں غالب کے وجدان کو بازیافت کرنا پڑتا ہے۔ وجدان کی اس کش مکش اور پیچ وتاب میں غالب نے عشق کی زبان اور عشق کے علائم استعمال کئے اور حزنیہ کا یہی احساس اس کے شاعرانہ کمال کا وسیلہ بن گیا۔ تمنا اور امکان کے درمیان حائل گہری خلیج نے اس کی حکیمانہ نظر اور شاعرانہ بصیرت کو انسان کے اندرون کی جانب متوجہ کردیا اور عشق کے علائم کے وسیلے سے وہ اظہار کی اس حد تک پہنچ گیا جو فن کے لئے سدرۃ المنتہیٰ سے کم نہیں۔

غالب کے نزدیک عشق صرف جسمانی ربط کی شدید تمنا کا اظہار نہیں۔ ہر چند کہ یہ پہلو بھی اس کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ عشق اس کے نزدیک ایک قوت بھی ہے جو انسان اور کائنات، انسان اور انسان، اور انسان اور کلی حقیقت کے درمیان ربط پیدا کرتی ہے۔ تمنا، شوق اور عشق ایک ہی قوت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک محدود Finite وجود میں تمنا، شوق اور عشق کے سوز میں ظاہر ہوتی ہے۔ تمنا میں طربیہ کا پہلو اس حد تک نمایاں ہے کہ اس کے حدود منزہ خیال سے جا ملتے ہیں۔ یہاں اضطراب وجود کی زیریں لہروں میں نظر آتا ہے۔ شوق تمنا کے اضطراب کا اظہار ہے۔ اس منزل پر اوپری لہروں میں بھی اضطراب جھلکنے لگتا ہے۔ لیکن شوق وہ منزل ہے جہاں تمنا نے ابھی اپنا کوئی معروض تلاش نہیں کیا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وحشت نمودار ہونے لگتی ہے اور انفرادی زیست (Exsistence) وحشت کا دامن تھام لیتی ہے۔ زیست خود ایک وحشت بن جاتی ہے اور اسی وحشت میں شوق اپنا ایک معروض تلاش کرلیتا ہے۔ عشق شوق کی یہی منزل ہے۔ غالب کے پاس تمنا، شوق اور عشق کے معانی کے ان حدود کا عرفان نظر آتا ہے۔ شوق ہی عشق کی اساس ہے اور اسی لئے انسانی وجود میں زیست کے اضطراب کی بنیاد یہی شوق ہے جو ہر رنگ رقیب سروساماں ہے اور جو ساماں طراز نازش ارباب عجز ہے۔ یہی شوق ہے جو عالم وفور میں ذات کے سوا کسی دوسرے رہبر کی تلاش نہیں کرتا اور یہی شوق ہے جو واماندگی کے عالم میں دیر وحرم کی صورتوں میں اپنے لئے پناہیں تراش لیتا ہے۔ لیکن یہی شوق جب اپنے لئے ایک مادی پیکر تراش لیتا ہے اور ایک انسانی معروض کو ڈھونڈھ لیتا ہے تو زندگی کا حزنیہ مکمل ہوجاتا ہے۔ یہی عشق اب غم کے دروازے کھول دیتا ہے اور پھر انسانی وجود کو زیست کی اس منزل کی جانب لے چلتا ہے جہاں پندار کے صنم کدہ کو ویراں کئے بغیر چارہ نہیں اور وحشت زیست میں وہ منزل بھی آجاتی ہے جہاں عشق، ہوس کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ انسانی وجود، معروض میں اپنے آپ کو گم کرنے لگتا ہے اور یہی وہ منزل ہے جسے Heideggar نے شخصیت کے زوال یا Falleness کا نام دیا ہے۔ عشق میں معروض تو ضروری ہے لیکن معروض کا جسمانی وجود جسمانی ربط کے لئے بے چین نہیں کرتا۔ ہوس، عشق کی وہ منزل ہے جہاں تمنا، شوق اور عشق کی منزلوں سے گزرتی ہوئی ایک مادی پیکر میں گم ہوجانا چاہتی ہے۔ اس منزل پر آرزو کسی کو اپنے مقابل چاہتی ہے۔ تمنا کی لطافت، مادے کی نذر ہوجاتی ہے۔ یہیں "غیر" ایک جہنم بن جاتا ہے۔ غالب تمنا کی ان سب منزلوں کا مسافر ہے اور اسی لئے زندگی کے حزنیے کا احساس (Tragic sense of exixtence) اس کی پوری شاعری میں نمایاں ہے۔ اس نے خالص تمنا کے لمحات کا بھی تجربہ کیا ہے اور شوق کی منزل پر جب کائنات کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی تو زیست کی بے معنویت کا اسے احساس بھی ہوا۔ وہ بے معنویت کی آگ میں بھی جلا۔ یہیں اس نے محسوس کیا کہ زیست اور فنا ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ موت صرف زندگی کا تتمہ نہیں بلکہ زندگی کا مستقبلی

لمحہ ہے۔زیست کے ہر لمحے میں موت پنہاں ہے

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

موت کے عرفان کی اسی منزل پر اس نے محسوس کیا اور واضح علامتوں میں اس کا اظہار کیا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ صبا آوارہ، گل نا آشنا

لیکن غالب بے معنویت کی اس سطح پر رکا نہیں۔دوسری ہی منزل پر عشق نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔عشق ہی زیست کے بے معنی صحرا میں امید کے چراغ روشن کرتا ہے اور زندگی کی بے معنویت میں معانی کی تخلیق کرتا ہے اور وحشت کدۂ عالم میں سکون کے سامان فراہم کرتا ہے۔

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

اسی عشق نے لطافت کی اس منزل پر اسے پہنچا دیا جہاں

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے دل اپنا
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، زیست کی وحشت میں کسی ایک مقام پر سکون حاصل نہیں ہوتا۔غالب لطافت سے کثافت (خود غالب نے ان لفظوں کو اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا ہے) کی طرف سفر کرتا ہوا اس منزل کی بھی سیر کرتا ہے جہاں عشق ہوس میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یاس و ناامیدی کے سامان فراہم کرتا ہے۔لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ فوراً ہوش میں آجاتا ہے۔ہوس کے اوپر کی منزلیں طے کرتا ہوا پھر ایک بار تمنا کے بے نام اضطراب تک پہنچ جاتا ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

غالب کی شاعرانہ شخصیت وجود کی کسی ایک سطح پر نہیں رکتی۔وہ ایک مستقل عزم سفر رکھنے والے سالک کی طرح جو استناد (Authenticity) کی تلاش میں مصروف ہو، زیست کی زیریں تریں سطح تک بھی پہنچتا ہے۔لیکن اس سطح کی لذتیں اس کو اپنا اسیر نہیں بنا لیتیں، وہ ایک سالک کی طرح ان سے بھی گذر جاتا ہے۔یہاں اس کی نظر محدود نہیں ہو جاتی، عشق، ہوس کی منزل پر وصل کا متلاشی ہوتا ہے اور ہوس اس کو حاصل عشق سمجھتی ہے، لیکن ایک مستند شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ وصل کی منزل پر بھی مستقبل کی یقینی جدائی کو فراموش نہیں کر جاتا۔وصل کے اندھیرے میں بھی جدائی کی منزل یاد آتی ہے،۔یہ ایک طرح سے Call from transcendence ہے۔اگلی منزل شعور کی سطح پر بلند ہونے لگتی اور اگر لفظ، شعر کے مفہوم کی کلید ہیں تو غالب شعور کی اس سطح پر تمکین نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے گہرے

عرفان کی ترجمانی کرتا ہے۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

غالب کے لئے شاعری صرف قافیہ پیمائی نہیں تھی، معنی آفرینی تھی۔شاعری اس کے نزدیک کام تھا دل و دماغ کا۔اس لئے اس کے اشعار سے استناد حاصل کرنا ایک کار لاحاصل نہیں ہے۔غالب کا یہ شعر اس کے کلیدی اشعار میں ایک ہے۔وصل کے لمحات میں شب ہجراں کی تمنا کا بر آنا اس کی مستند شخصیت کا ایک کرشمہ ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ وصل کی منزل پر بھی جو ہوس کی انتہا ہے اس کے نزدیک بھی خرد کا چراغ روشن رہتا ہے۔

غالب کی شاعرانہ شخصیت کا ایک روشن اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے روحانی سفر میں خرد کا چراغ ہمیشہ جلتا رہتا ہے اور اسی لئے وہ کبھی اپنی اصل منزل کو فراموش نہیں کرتا۔خرد پسندی اس کی شاعرانہ شخصیت کا وہ پہلو ہے جہاں اس کی رومانیت ایک طرح سے کلاسیکت میں منتقل ہو جاتی ہے۔لیکن اس کی شخصیت کا یہ کلاسیکی پہلو، تلاش استناد یا Quest for authenticity کا ایک ضروری رخ ہے۔تلاش استناد کی مہم میں غالب نے اوائل عمر میں 'ذوق شوق' کو اپنا رہبر بنایا، لیکن غالب کے حساس اور فکر کی جانب مائل ذہن نے اس پر یہ حقیقت بھی روشن کی کہ مستند شخصیت کی تشکیل کی ایک اہم منزل مروجہ عقیدوں اور افکار کی تنقید ہے اور یہ تنقید صرف عقل ہی کی روشنی میں ممکن ہے۔اس نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ زیست کی کلیت میں خرد ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اسی خرد کی روشنی میں یونانیوں نے فلسفے کی تشکیل کی اور اسی خرد کی روشنی میں انسانی ذہن کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس ضمن میں میرا ایک اور مفروضہ ہے۔غالب اردو تہذیب کی اس منزل کی نمائندگی کرتا ہے جہاں یہ تہذیب محض شاعری کے دور سے نکل کر نثر کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔یہ صرف حسن اتفاق نہیں کہ جدید اردو نثر کی تشکیل میں غالب کا ایک اہم حصہ ہے۔تہذیب کے نثری دور میں عقلیت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔شاعری کے لئے جذبات اور تخیل کافی ہوں تو ہوں، لیکن نثر کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔جذبہ اور تخیل کی لگام خرد کے ہاتھ میں ہو تو نثر کی تشکیل ہوتی ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب عمل غالب کے ذہن میں شعوری طور پر ہوا۔تہذیبی ارتقا میں یوں ہوتا بھی نہیں۔غالب ایک تہذیب کا خالق بھی ہے اور ایک خاص تہذیبی ورثے کا وارث بھی۔اس کی تقدیر یہ تھی کہ وہ ایک نئے دور کا نقیب بنے۔اس نے حقیقت کا عرفان حاصل کیا تھا، مردہ پروردن مبارک کار نیست۔یہی وجہ ہے کہ نئے دور کے آغاز کی تمام نشانیاں غالب کی شاعرانہ شخصیت میں نظر آتی ہیں۔اس کی خرد پسندی بھی روایتی نہیں ہے بلکہ نئے نثری اور فکری دور کے آغاز کی ایک علامت ہے☆☆☆

عباس اطہر

شمارہ ۴۹،
جون ۱۹۷۰

لیکن فاختہ! سورج کس نے بنایا ہے؟
میں پوچھتا ہوں
وہ سوچ میں گم ہو جاتی ہے
"پیاری فاختہ! سوچوں کا دروازہ بند کرو اور سو جاؤ
یہ سال بھی مرنے والا ہے
لیکن ہم مرنے والوں کا ساتھ نہیں دے سکتے
ہم تو قبر بنانے والوں میں ہیں، لیکن فاختہ
سچ بتلاؤ! سورج کس نے بنایا ہے؟"

"میرا خاوند رات گئے گھر آتا تھا
بچوں جیسی باتیں کرتا۔"
اور فاختہ دوسری سوچ میں کھو جاتی ہے
پھر آنکھیں جھپکا کر کہتی ہے
"قسم تمھاری سورج میں نے نہیں بنایا
میں اور میرا خاوند دونوں بنے بنائے آئے تھے۔"
"فاختہ تیرا خاوند رات کا بیٹا تھا
اس نے چڑھتے سورج کی ہتک کی تھی
دروازے سے اس کا نام مٹا دو
دیکھو سنہ ۱۹۶۵ یعنی خونی سال گذرنے کو ہے
آخری سورج ڈوب رہا ہے
بارہ بج کر ایک منٹ پر
کالی ہنڈیاں توڑ کے ہم اک دوسرے کو
نئے سال کے پھولوں کا تحفہ دیں گے
دودھیا رنگ کے پھول
مجھے خونی پھولوں سے خوف آتا ہے۔"
فاختہ! ساری دنیا کے دکھ
سورج ہی سے آتے ہیں
قسم تمھاری میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
تم کو دیکھنا ہو تو صبح سویرے جاگ اٹھنا
اندھا سورج
غاصبوں، ظالموں، خونیوں اور مظلوموں کو
ایک آنکھ سے دیکھتا ہے
میں اس کے ابا کو اک درخواست لکھوں گا
چچوں خصیہ برداروں اور خواجہ سراؤں کا
ریوڑ بڑھتا جاتا ہے
کیا انجام ہے؟ کوئی نہیں کہہ سکتا

اچھی فاختہ!
تیرا خاوند رات گئے گھر آتا تھا
گندی گندی باتیں کر کے ہنستا تھا، پھر روتا تھا
اپنے گھر کے دروازے سے
اس کا نام مٹا دو
وہ خطرے کی ناک تھا
قسم تمھاری

پچھلی باتیں دل سے مٹا کر سو جاؤ
جب پہلا سورج نکلے گا
تو ہم اس سے بیاہ کریں گے
فاختہ پھر تم
دودھیا پھولوں کو اپنے دامن میں بھر کر
جموں اور کشمیر کے رستے ویت نام تک جانا
میں اس عرصے میں درخواست لکھوں گا
سورج کے ابا سے کہوں گا
"تیرا بیٹا
غاصبوں ظالموں خونیوں اور مظلوموں کو
ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

عباس اطہر

شمارہ ۴۹،
جون ۱۹۷۰ء

نیک دل لڑکیو!
آرزو کی نمائش سے گذرو تو چاروں طرف دیکھنا
اور پھر جب تمھارے لہو میں کسی کا لہو سرسرائے
ستاروں میں آنکھیں چھپا کر دعا مانگنا
قیدیوں شاعروں اور محکوم آبادیوں کے لئے
اور بیمار بچوں کی ماں کے لئے
اور پھر نرم ہونٹوں کی حدت سے
جب چھاتیوں میں ہوا سنسناتی سنو
نیک دل لڑکیو! یاد کرنا انھیں جن کی قسمت میں لکھے ہوئے دائرے
ایک سے رات دن اور تنہائیاں ہیں
ہمارے لئے چاند نکلے نہ نکلے کہ ہم ٹہنیوں سے بچھڑ کے سنبھلنے نہ پائے
ہواؤں کے کندھوں پہ روتے ہوئے دور ہوتے گئے
اور جب لوٹنے کی حدوں سے بھی آگے نکل آئے
پیچھے سے آواز آئی... ''پلٹ آؤ
ہم نے تمھارے لئے آج آنسو بہائے ہیں۔''

ہم رات کے مہماں ہیں مگر نیک دل لڑکیو
آرزو کی نمائش میں چاروں طرف دیکھنا
اور آنکھوں کی تحریر پڑھنا
ہماری طرح جب تمھارے سفر کا مسافر ہوا کے ستم سے گذرنے لگے
اس سے کہنا ''... ٹھہر جاؤ
میرے لہو میں تمھارے لئے آرزو ہے۔''

تو اے نیک دل لڑکیو! الوداع
یاد رکھنا، ہماری حقیقت سے گذرو تو آنسو بہا کر دعا مانگنا
قیدیوں، شاعروں اور محکوم آبادیوں کے لئے
اور بیمار بچوں کی ماں کے لئے
اور اس کے لئے، جو تمھارے بدن کا مسافر ہے لیکن
ہمارے سفر کی شہادت ہے

غزلیں

عبدالاحد ساز

شمارہ ۲۰۳،
فروری ۱۹۹۷

جو کچھ بھی یہ جہاں کی، زمانے کی، گھر کی ہے
روداد ایک لمحۂ وحشت اثر کی ہے
پھر دھڑکنوں میں گذرے ہوؤں کی صدائے پا
سانسوں میں اک عجیب ہوا پھر ادھر کی ہے
پھر دور منظروں سے نظر کو ہے واسطہ
پھر ان دنوں فضا میں حکایت سفر کی ہے
پہلی کرن کی دھار سے کٹ جائیں گے یہ پر
اظہار کی اڑان فقط رات بھر کی ہے
ادراک کے یہ دکھ، یہ عذاب آگہی کے دوست
کس سے کہیں خطا نگہ خودنگر کی ہے
حالت جو اپنی غیر ہے بجز کلام سے
سو اچھے شاعروں میں یہی بیشتر کی ہے
وہ ان کہی سی بات، سخن کو جو پر کرے
ساز اپنی شاعری میں کمی اس ہنر کی ہے

شمارہ ۲۱۱،
اکتوبر نومبر ۱۹۹۷

میں کوئی عکس چنوں کوئی لمس لکھوں پھر
کہاں تلک یہ سفر خواب خواب، جاگوں پھر
مری رفیق نفس موت تیری عمر دراز
کہ زندگی کی تمنا ہے دل میں افزوں پھر
تعینات کے منظر کی خیر ہو یارب
مری نگاہ کے احوال ہیں دگر گوں پھر
میں اپنے آپ سے اک رشتۂ رقابت ہوں
کسے ندیم کروں، کس کو دوست جانوں پھر
وہی اعادۂ کرب فریب و خفت، نہ
میں ان سوالوں سے پھر ایک بار الجھوں، پھر؟
تمام فلسفے افشائے راز میں ناکام
میں راز و رمز کے نغمے ہی گنگناؤں پھر
جو شعر تم نے کہے ساز کیا تمھیں نے کہے
اگر تم اس پہ مصر ہو تو میں کہاں ہوں پھر؟

عبدالاحد ساز

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

آہنی دیوار استادہ نظر کے سامنے تھی
حدِ فاصل
ہاں مگر ان تیس برسوں میں کئی افراد گھر کے
وقفے وقفے سے جو اک زیرِ زمیں رستے سے ہو کر
اس طرف جاتے گئے ہیں،
تب سے ہر رخصت کے بعد
دردِ غم کے جھاگ، اشکوں کے نمک
اور سوچ کے تیزاب میں گل گل کے یہ دیوار پتلی ہو رہی تھی

اب ادھر کچھ روز پہلے
جب سے میری ماں گئی ہے
تب سے یہ دیوار اک باریک سا ململ کا پردہ رہ گئی ہے

یوں نظر آتا ہے سارا
جیسے پس منظر میں مدغم ہو رہا ہو پیش منظر
میں کسی گنجان معمورے میں آنکلا ہوں اپنے آپ سے باہر نکل کر
فہم اندر فہم صحراؤں میں در کھلنے لگے ہیں
لحۂ موجود میں ارض و سما کھلنے لگے ہیں
وقت اپنی جانی پہچانی تسلسل کی ڈگر کو چھوڑ کر
اک دائرے میں بہہ رہا ہے
چار سو چہرے، نگاہیں، چلتے پھرتے لوگ، گھر، گلیاں، محلے
رابطوں رشتوں سے پیوستہ زمانوں کی
منور وادیاں ہیں
میں سرہانے ایک تازہ قبر کے بیٹھا ہوا ہوں
اور مرے اطراف قبرستان کی آبادیاں ہیں

نظم

(اپنے دوست امیر حسن کی موت پر)

عبدالاحد ساز

شمارہ ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

ذرا ٹھہرتے... تو ساتھ چلتے...

مجھے خبر ہے کہ تم کو عجلت تھی سرحد جاں کو پار کرنے کی
رازِ ہستی کو جاننے کی
دماغ و دل کے غبار کو تجربے کی چھلنی سے چھاننے کی

ذرا تو رکتے
تمھیں بھی تو یہ پتہ تھا آخر
کہ چند فرسنگ تم سے پیچھے
تمھارا یہ دوست بھی تمھاری ہی رہ گذاروں کا ہے مسافر

عجیب ربط نہاں تھا تم سے
اک ایسا قرب مخاطبت جو خیال کے فاصلوں کو اکثر
سمیٹ لیتا
اشاریت در اشاریت، ہم کلام تھے تم
مرے تفکر کے ریگ زاروں میں ایک مشرب مقام تھے تم
عجب سلیقہ تھا تم کو پس منظروں سے منظر کو جانچنے کا
خیال کی وسعتوں میں مفہوم کو پکڑنے کا گھیرنے کا
بڑے حقائق میں روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کی
مطابقت کو تلاشنے کا

تمھارے نافہم ہم جلیسوں نے تم کو ٹھہرایا بے عقیدہ
مگر تم اک بے نیاز شاعر
— تمام تردامنی کے باوصف ایک راہب
خود اپنی سوچوں سے ذوقِ تسلیم ہی کو
کرتے رہے مدلل
تمھاری آنکھوں میں میں نے خوابِ یقیں بھی دیکھا
نفی و تشکیک کے دھندلکوں میں
اک رخِ نازنیں بھی دیکھا
دماغ سوزی و دلگدازی سخن تمھارا
غزل کے بین السطور ہی میں تھا فن تمھارا

لطیف تر واسطے تھے تم سے نگاہ و دل کے
عجیب تسکین روح مجھ کو میسر آتی تھی
تم سے مل کے
اچانک اک صبح تم نے یہ پیش رفت کیوں
اختیار کرلی؟

ذرا تو رکتے
پہنچنے دیتے مجھے بھی حد زماں تک اپنی
تو ذہن میں ذہن، دل میں دل لے کے
سوئے دشت عدم نکلتے
سزا جزا کی عمیق پر پیچ وادیوں میں
بہم ٹہلتے
مکالمہ در مکالمہ گونجتے دیار ہمیشگی میں
ابد کے شفاف پرسکوں پانیوں میں ڈھلتے
ذرا ٹھہرتے... تو ساتھ چلتے

عبدالحمید

شمارہ ۱۴۸ء
دسمبر ۱۹۸۷ تا فروری ۱۹۸۸

اک ایسا نکتہ تو اپنے بیاں میں رکھا جائے
کہ تیر چھوڑیں نہ چھوڑیں کماں میں رکھا جائے

ابھی تو جانے چلے گا یہ سلسلہ کب تک
بچا کے کچھ تو ذرا جسم و جاں میں رکھا جائے

جو بے خبر ہوئے ان کی خبر کو ہم بھی چلیں
نشان اپنا کسی بے نشاں میں رکھا جائے

اسے پتہ تو چلے زخم کا ہمارے بھی
نہیں کو اس کی کبھی ہاں میں رکھا جائے

ہمیں پتہ ہے کوئی آئے گا نہ آیا کبھی
چراغ کس کے لئے دل مکاں میں رکھا جائے

شمارہ ۱۷۳ء
فروری تا مارچ ۱۹۹۴

اسے دیکھ کر اپنا محبوب پیارا بہت یاد آیا
وہ جگنو تھا اس سے ہمیں اک ستارہ بہت یاد آیا

کبھی شام کا وقت تھا گھر سے نکلے تو یاد آ گیا تھا
بہت دن ہوئے آج وہ سب دوبارہ بہت یاد آیا

سحر جب ہوئی تو بہت خامشی تھی زمیں شبنمی تھی
کبھی خاک دل میں تھا کوئی شرارہ بہت یاد آیا

برستے تھے بادل دھواں پھیلتا تھا عجب چار جانب
فضا مکمل اٹھی تو سراپا تمہارا بہت یاد آیا

کبھی اس کے بارے میں سوچا نہ تھا اور سوچا تو دیکھو
سمندر کوئی بے صدا بے کنارہ بہت یاد آیا

عبدالرحیم نشتر

شمارہ ۴۴،
جنوری ۱۹۷۰

پھر اک نئے سفر پہ چلا ہوں مکان سے
کوئی پکارتا ہے مجھے آسمان سے
آواز دے رہا ہے اکیلا خدا مجھے
میں اس کو سن رہا ہوں ہواؤں کے کان سے
کچھ دن تو بے گھری کا تماشا بھی دیکھ لوں
یوں بھی ہے جی اچاٹ پرانے مکان سے
دونوں ہی ہم سفر تھے ہواؤں کے دوش پر
پر میں ہوں چور چور سفر کی تکان سے
پیروں تلے دبی ہے وہی ریت کی چٹان
مجھ کو ہوا نے پھینک دیا آسمان سے
اب اپنا جسم نوچ رہا ہوں کہ کیا کروں
تلوار میں نے خود ہی نہ کھینچی میان سے
وہ زد پہ آگیا تھا، نہتا بھی تھا مگر
میں نے ہی کوئی تیر نہ چھوڑا کمان سے
میرے لبوں پہ کھیل رہی ہے وہی ہنسی
ہر چند ریت ریت ہوا ہوں چٹان سے

شمارہ ۱۵۰،
جون جولائی ۱۹۸۷

سفید پوش درندوں نے گل کھلائے تھے
زمین سرخ ہوئی، سبز کرنے آئے تھے
سمجھ رہا تھا انھیں میں بھی روشنی کا سفیر
وہ آستین میں خنجر چھپا کے لائے تھے
مسافروں کو گھنی چھاؤں لے کے بیٹھ گئی
درخت راہ نے دونوں طرف لگائے تھے
مجھے بھی چاروں طرف تشنگی نے دوڑایا
مری نگاہ پہ آب رواں کے سائے تھے
مجھے غرور کہ میں دوستوں کی نیکی ہوں
انھیں خوشی کہ وہ دریا میں ڈال آئے تھے
مرے عزیز تھے وہ، قبر کھود کر رکھ دی
مجھے جو دے گئے مٹی وہ سب پرائے تھے
ہوا تو اپنا قرینہ بدل نہیں سکتی
چراغ آپ نے کس زعم میں جلائے تھے

بیکار لوگ

عبدالصمد

شمارہ نمبر ۱۹۳،
اپریل ۱۹۹۶

کوئی پارٹی جیسا منظر تھا۔ شائستگی سے بیٹھے کئی لوگ چائے اور سگریٹ سے شغل کر رہے تھے۔ خاموشی تھی، البتہ دھیمے سروں میں کبھی کچھ بول دیتا۔ ویسے وہاں ہر آدمی اپنے آپ میں مصروف تھا۔

اچانک ان میں سے ایک اٹھا، سوراخ میں اپنی آنکھ لگائی، پھر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا...؟"

"کچھ نہیں..."

"کچھ نہیں...؟"

"ہاں بھئی... وہ صرف باتیں کر رہے ہیں۔"

"باتیں...؟ اور کچھ نہیں...؟"

"ہاں، صرف باتیں..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟ تم نے دیکھا، کمرہ تو ٹھیک سے بند ہے نہ؟"

"بالکل بند ہے۔ انھوں نے دھیمی روشنی بھی جلا رکھی ہے، شب خوابی کے کپڑے بھی پہن رکھے ہیں اور اب کوئی وجہ نہیں کہ..."

"موڈ نہیں بن رہا ہوگا..."

"ہو سکتا ہے... لیکن ہم کب تک انتظار میں بیٹھے رہیں گے..."

"بس کچھ دیر اور..."

"واہ، تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو... ہو سکتا ہے آج ان کا موڈ ہی نہیں ہو، ہو سکتا ہے وہ ڈیوٹی لیو پر ہوں۔"

"امکانات تو بہت ہیں، ہم اپنا قیمتی وقت اس چکر میں کیوں ضائع کریں؟"

ایک نے اکتا کر سوراخ سے پھر اپنی آنکھ لگائی، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے... یہ تو بہت چالاک نکلے، انھوں نے تاریکی کر دی ہے اور وہ اندھیرے میں کچھ کر رہے ہیں..."

دوسرے نے اسے ایک طرف کو دھکیلا اور خود دیکھنے لگا۔

"وہ کچھ حرکتیں تو ضرور کر رہے ہیں... اے بھائی، دیکھو، ہم ان کا سایہ دیکھنے نہیں آئے، کوئی ترکیب کرو کہ وہ روشنی جلا دیں..."

"پتہ نہیں، کیسے لوگ ہیں، آج کل تو لوگ روشنی ہی میں سب کچھ کرنا پسند کرتے ہیں..."

"کیوں؟ ہمیں دکھانے کے لئے؟"

"نہیں... خود اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے۔"

"میں نیچے جا کر ان کی کھڑکی پر ایک پتھر پھینکتا ہوں..."

"ضرور... لیکن خیال رہے کہ کوئی دیکھے نہیں۔ اس کمرے سے باہر ہم وہ نہیں ہیں نہ..."

"سمجھ گیا۔ ارے بھائی، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں، بس گیا اور آیا۔"

ایک نے اپنی آنکھ سوراخ پر گاڑ دی۔ کھڑکی پر پتھر گرنے کی آواز سب نے سنی، پھر آنکھ والے آدمی کی دبی دبی مسرت بھری چیخ...

"روشنی... روشنی... انھوں نے روشنی جلا دی!"

کئی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے آنکھ والے کو دھکیلا اور خود اپنی آنکھ لگائی، پھر دوسرے نے تیسرے کو... پھر تیسرے نے...

کمرے میں چہرے باقی نہیں رہے تھے بلکہ چاروں طرف چمکتے ہوئے آئینے...

نیم برہنہ مرد اور عورت کھڑکی کا پردہ ہٹا کر، حیران حیران نگاہوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اس سے کیا ہوگا...؟ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر روشنی بجھا دیں گے۔"

"لگتا ہے یہ لوگ روشنی کے عادی ہی نہیں..."

"سالے ڈھگرین..."

"دیکھو بھائی، آئندہ اس کمرے میں اس قسم کے لوگ نہ ٹھہریں۔"

"پتہ کیسے چلے گا کہ کون... اب چہرے پر تو کچھ لکھا ہوتا نہیں۔"

"ہوں... یہ بات تو ہے... تم ایسا کرو کہ اس کمرے کا بلب کبھی بجھے ہی نہیں، کچھ ایسا انتظام ہو... وہ چاہیں تب بھی نہیں۔"

"لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں نہ... ابھی سوچو، ابھی کیا کرنا چاہئے، اس وقت تو ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

"ایک بار پھر دیکھتے ہیں۔"

"روشنی تو ہے لیکن یہ لوگ..."

"ہمیں انتظار کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے ان کا موڈ بن جائے، ہو سکتا ہے وہ روشنی بجھانا بھول جائیں۔"

اطلاعات نشر ہوتی رہیں

ابھی تک یہ لوگ بیکار ہیں۔ مرد سگریٹ پی رہا ہے، عورت اپنے ناخنوں پر پالش کر رہی ہے... مرد اٹھ کر غسل خانے میں گیا ہے، واپس آ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ عورت کے کاندھوں پر رکھے ہیں اور اس پر جھک گیا ہے، عورت مسکرا رہی ہے... مرد نے اس کا بوسہ لے لیا ہے، عورت شریر نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی ہاتھ سے اپنے ہونٹ پونچھ رہی ہے... بات ختم... مرد ایک جمائی لے کر کھڑکی تک گیا ہے، پردہ ہٹا کر باہر جھانک رہا ہے... اب وہ بستر پر چت لیٹ گیا ہے، عورت دھیمے سے مرد سے کچھ کہتی ہے، وہ کوئی جواب نہیں دیتا، اس کی نگاہیں چھت پر لگی ہوئی ہیں... اس کے بعد... اس کے بعد... کچھ نہیں۔

یہ منظر بہت دیر سے طاری ہے۔

"بوریت، سخت بوریت... آخر مطلب کیا ہے ان کا؟"

"بور مت ہوئیے اور تشریف لے جائیے۔"

"خاموش... تم جانتے نہیں، میں کون ہوں، میں چاہوں تو تمھیں برباد کر سکتا ہوں۔"

"جس کی مردانگی ایک نظارے کی محتاج ہو وہ کیا..."

"کیا کہا تو نے کتے... نامرد... کیا تیری... نے میری مردانگی کا مزہ چکھا ہے؟"

"سب دیکھ رہے ہیں تیری مردانگی... اگر یہ بیچارے کچھ نہ کریں تو تو بہت بڑا مرد بن جائے گا نا۔"

"ٹھہر جا تو، ابھی تجھے بتاتا ہوں۔"

زبانیں پیچھے ہٹ گئیں، ہاتھ دو سامنے کئی دفاعی ہاتھ بھی۔ عجیب افراتفری کا منظر... اس وقت تک یہ منظر ٹھہرا رہا جب تک کہ لوگوں کے اندر کا وہ غبار نہیں نکل گیا جو اتنی دیر سے ان کے اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟ کیا سمجھ رکھا ہے، کوئی بھٹیار خانہ یا.. اگر انھیں پتہ چل گیا تو پھر آپ کے لئے یہاں کیا رہ جائے گا اس معمولی اعجاز کرے میں؟"

اس وقت تک وہ اپنے زخم چاٹ چکے تھے۔ خاموشی رہی۔

کچھ دیر کے بعد ان میں سے ایک آہستہ سے اٹھا، سوراخ کے ذریعہ خوشی کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں چمکی۔ لہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

کمرے میں روشنی ہو گئی تھی اور وہ بوس و کنار میں مشغول تھے۔

"ابھی تک یہ سالے Foreplay ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔"

"یار، کمال ہے، دیکھو تو ابھی ہم کتنے ناامید تھے اور اب۔ جب کہ وہ تمہید تک پہنچ گئے ہیں تو پھر وہاں تک ضرور پہنچیں گے۔"

"چلو غنیمت ہے... ایک دم ناامیدی تو ہاتھ نہیں لگی۔"

تیسرے راؤنڈ کے آخر میں وہ لوگ Foreplay ہی میں مصروف تھے۔

"بھئی، یہ تو اس سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔"

"شاید کچھ پرابلم ہے ان کے ساتھ۔"

"کچھ Provocation کا سامان ان کے پاس نہیں ہے کیا؟"

"بھائی زیادہ لفڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے لئے کافی نہیں ہے کیا؟ بلکہ کیوں نہ ہم یہی سمجھ لیں کہ..."

"آپ کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ہمارے لئے نہیں۔"

"آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟ کیا وہ ہمارے لئے کوئی شو کر رہے ہیں؟"

"بات صحیح ہے، وہ تو محض اپنے انجانے پن میں ہم پر مہربانی کر رہے ہیں، اس سے زیادہ کی ہمیں توقع ہی کیوں ہو؟"

"اس کا مطلب ہے ہم یہاں سے یونہی چلے جائیں... ہم نے جو اتنا وقت دیا، وقار، عزت... وہ سب... وہ سب..."

"بھئی، ایک دن نہ سہی۔"

"اتنی دیر ہو گئی ہے، ذرا پھر دیکھ لیا جائے۔"

"ارے یہ کیا، دونوں کرسیوں پر بیٹھے بڑے اطمینان سے گپ کر رہے ہیں؟"

اس خبر میں زیادہ دلچسپی نہیں لی گئی اور سبھی بوریت کا تصور کر کے بور ہوتے رہے۔

"آج کل لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اس سے زیادہ بات آگے بڑھتی ہی نہیں، پتہ نہیں کیسے لوگ ہیں..."

"لوگ کیا کھاتے ہیں جو..."

"ارے بھائی، یہ سب اسی Kentuckey Fried Chicken کا کھیل ہے جو ایک گہری سازش کے تحت یہاں لوگوں کو کھلایا جا رہا ہے تاکہ..."

"کل میں اینمل فارم کی طرف گیا تھا۔ جناب، ان سے کہیں زیادہ دم خم میں نے تو جانوروں میں دیکھا۔"

"مجھے اس کا پتہ تو دینا، میں بھی فارم کی سیر کروں گا۔ ان سالے انسانوں میں اب کوئی دم باقی نہیں رہا، خواہ مخواہ ان میں وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

"میرے ایک دوست جانوروں کے بارے میں خوب معلومات رکھتے ہیں، انھیں پتہ ہے کہ کون جانور کس موسم میں..."

"لیکن ہم تو اشرف المخلوقات ہیں، ہم دوسری جون میں کیوں جائیں؟"

"یہ انسان انسان ہی نہیں رہے۔ دیکھو نہ، اتنی دیر سے یہ کیا کر رہے ہیں، اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، ہمارا بھی۔ کیا یہ صرف وقت گذاری کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں... ان کے لئے گھر نہیں ہے کیا؟"

"اے لو... یہ تو کپڑے بھی بدل رہے ہیں اور اب... اب سوٹ کیس میں اپنے سامان... لگتا ہے اب یہ یہاں سے کوچ کریں گے۔"

ان کے جانے کا منظر سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

"لو بھائی... یہ تو یہاں سے چلے بھی گئے۔ ان کا کمرہ کیسا سونا سونا لگ رہا ہے۔"

"ہماری زندگیوں کی طرح۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ یہاں کیوں آئے تھے؟ یہ تو کسی مصرف ہی کے نہیں نکلے، ایک دم بیکار لوگ..."

"دیکھنا، خیال رکھنا، اس قسم کے بیکار لوگ آئندہ یہاں نہ ٹھہریں۔"

"اچھا دوست تو پھر..." ☆☆☆

عبداللہ کمال

شمارہ ۲۰۵،
اپریل ۱۹۹۷

میں نے جی ہے غزل، لکھا کیا ہے
زندگی کا یہ تجربہ کیا ہے
ایک اک شعر میں بسر ہوتا
خرچ ہوتا یہ حوصلہ کیا ہے
کیا ہے آہنگ، جز نوائے نفس
میرے اسلوب میں نیا کیا ہے
پس انفاس اک طلسم طلب
لوح مفہوم جز ہوا کیا ہے
ذات ہے میری یا کہ زخم سا کچھ
پس اظہار خوں شدہ کیا ہے
کیا ہے توفیق اختیار مری
بیش از یک قدم بتا کیا ہے
کیوں میں اس دوسرے سے خائف ہوں
آئینہ آئینہ بتا کیا ہے
کون موجود ہے سوا میرے
اور جو ہے مرے سوا کیا ہے
آگے بڑھنا ہے روند کر خود کو
دوسرا کوئی راستہ کیا ہے
بت شکن میں ہوں خود شکن بھی میں
اور یہ تیشۂ انا کیا ہے
کوئی اچھا نہیں ہے میرے سوا
خود ستائی سہی برا کیا ہے
کوئی پہچانتا نہیں مجھ کو
نہ سہی، کوئی جانتا کیا ہے

میں کہ ہوں عارضی کرائے دار
نئے گھر کا مرے پتہ کیا ہے
کس جزیرے کی کھوج ہے مجھ میں
اور خوش خوابیا مرا کیا ہے
اک مسلسل سی گونج کیسی ہے
متواتر سی اک صدا کیا ہے
کیا ہے قتل عزیز دل کا قصاص
خون ناحق کا خوں بہا کیا ہے
غم کا چھڑکاؤ دل پہ کرتے رہو
درد میں ورنہ ذائقہ کیا ہے
پتھروں پر سجانا قوس قزح
عشق کیا ہے مری وفا کیا ہے
خواب ہیں رزق میری آنکھوں کے
چاند راتوں میں ڈھونڈتا کیا ہے
میرے لب سے ہے اک فلک روشن
چاند تاروں سی یہ دعا کیا ہے
کس حوالے سے آج روشن ہے
کل سے اب میرا رابطہ کیا ہے
دھند یادیں، دھواں دھواں چہرے
پس دیوار جھانکتا کیا ہے
میرے اندر بہت غزل ہے ابھی
اور اس دشت میں بچا کیا ہے
میرے عرض ہنر سے آگے کمال
کوئی غالب کہ میر سا کیا ہے

عبید صدیقی

شمارہ ۱۲۶،
ستمبر تا نومبر ۱۹۸۲

اس شوخ کو احوال سنائیں کسی صورت
اس بزم کے آداب تو آئیں کسی صورت

ڈھونڈیں کوئی اب ترک تعلق کا بہانہ
اے دل تجھے تجھ سے ہی بچائیں کسی صورت

جو ہم نے کیا اس نے ہی کب یاد رکھا ہے
جو اس نے کیا ہم بھی بھلائیں کسی صورت

دل اس کے تصور میں فنا ہونے لگا ہے
بہتر ہے اسے راہ پہ لائیں کسی صورت

چھپتا ہی چلا آتا ہے بستی پہ اندھیرا
رکتیں ہی نہیں تیز ہوائیں کسی صورت

شمارہ ۱۶۱،
مارچ اپریل ۱۹۹۱

کار دنیا کے تقاضوں کو نبھانے میں کٹی
زندگی ریت کی دیوار اٹھانے میں کٹی

اب بھی روشن ہے ترے دل میں محبت کا دیا
رات بھر شمع یقین ساز جلانے میں کٹی

تشنگی وہ تھی کوئی کار وفا ہو نہ سکا
عمر بے مایہ فقط پیاس بجھانے میں کٹی

ایک انگشت شہادت کہ ابھی باقی تھی
وہ بھی اس بار تری سمت اٹھانے میں کٹی

ساعت وصل جو دیکھے تھے خد و خال ترے
ہجر کی شب وہی تصویر بنانے میں کٹی

تعاقب

عتیق اللہ

شمارہ ۲۵۱،
دسمبر ۲۰۰۱

باب اول

(رات کا وقت ہے جنگل کا گہرا سناٹا ہر طرف محیط ہے۔ ایک کچی سڑک کے عقب میں چھوٹی سی پلیا بنی ہوئی ہے جس پر واہی اور حمزہ بڑے اطمینان کے ساتھ پاؤں پھیلائے بیٹھے ہیں۔ دونوں کا لباس معمولی ہے۔ واہی قدرے صحت مند ہے وہ اپنے بے ترتیب اور سوکھے ہوئے بالوں کو بار بار انگلیوں سے جماتا ہے۔ حمزہ دبلا پتلا ہے۔ اس کی مونچھیں ہٹلر کٹ ہیں۔ گلے میں گہرے ہرے رنگ کا رومال بندھا ہے۔ واہی آپ ہی آپ کبھی منھ بنا لیتا ہے اور کبھی یکا یک مسکرانے لگتا ہے۔ لیکن اس کا اثر حمزہ پر کچھ نہیں ہوتا۔ حمزہ بڑی بے دلی سے دائیں بائیں گھوم گھوم کر دیکھتا ہے، اور پھر اچانک پنڈلی کھجانے کے لئے نیچے جھک کر ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مگر وہ اپنی پنڈلی کے بجائے واہی کی پنڈلی کھجانے لگتا ہے۔ واہی اسی بے نیازی کے ساتھ اپنے آپ میں مگن بیٹھا ہے۔ اس پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا۔ حمزہ چار چھ سیکنڈ کھجانے کے بعد اکتا کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اس کے چہرے سے اکتاہٹ نمایاں ہے... کچھ سیکنڈ بعد پھر وہ کھجانے کے لیے ہاتھ نیچے بڑھاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تکرار میں اس کے اندرونی اضطرار کا زیادہ دخل ہے۔ دوبارہ بھی وہ واہی کی پنڈلی پر ناخن چلانے لگتا ہے۔ پھر بھی واہی پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ حمزہ آخر جھنجھلا کر نیچے دیکھتا ہے اور طیش کے ساتھ واہی پر برس پڑتا ہے۔)

حمزہ:
تم بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ میری نہیں تمھاری پنڈلی ہے... یہ دوسری بار میں بے وقوف بنا ہوں۔

(واہی پہلے کی طرح خود کلامی میں مصروف ہے۔ پھر چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کوئی دور سے اس سے مخاطب ہوا ہے۔)

حمزہ:
(پیشانی پر تیوریاں چڑھا کر) ارے اس پر تو کچھ اثر نہیں ہوتا۔ (ناظرین سے مخاطب ہو کر) لگتا ہے اوپر کی منزل خالی ہے۔

واہی:
کیا تمھیں کچھ تکلیف ہے؟ ہمارے یہاں اچھے طبیب بھی نہیں ملتے۔

حمزہ:

لیکن تمہاری پنڈلی میری تو نہیں۔ غلطی سے تمہاری پنڈلی کھجائی اور تم اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔

واہی:

تو کیا تم نے مجھے چھوا بھی تھا؟ میں کچھ سوچ رہا تھا۔ (ایک دم حیران ہو کر) کیا سوچ رہا تھا؟ کچھ تو سوچ رہا تھا... ارے ہاں! یاد آیا۔ میں تمہارے بارے میں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔

حمزہ:

تم میری موجودگی میں میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟

واہی:

یہی کہ فرض کرو اگر ایک دم میں غائب ہو جاؤں، اس کا فوری ردعمل تم پر یہ ہو کہ تم اپنی ذات اپنے وجود سے شرمانے لگو۔ نہیں نہیں شاید ایک دم دھوئیں کے مرغولے میں بدلتے ہوئے مجھے دیکھ کر اطمینان کی سانس لینے لگو۔ نہیں نہیں شاید اس عجیب لمحے کا تجربہ تمہیں خوف زدہ بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر) دل کی حرکت بند ہو جائے۔ خیر کچھ بھی ردعمل ہو، کاش تم میرے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو سکتے۔ مجھے ایسے Adventures سے خاصی دلچسپی ہے۔ کیا تم غائب ہو سکتے ہو؟ یا... مجھے غائب کر سکتے ہو؟ کاش میں تم میں اتنی قوت ہوتی۔ میں تمہاری دوستی پر فخر کرتا اور ہم دونوں سے دنیا جلدی ہی چڑنے لگتی۔ دوستی... دوستی!

حمزہ:

مردہ لغت دہرانے سے تمہیں کوفت نہیں ہوتی؟ کیا دنیا میں اب نئی باتیں رونما ہونا بند ہو گئی ہیں؟ کیا اتفاق کا سلسلہ ٹوٹ چکا ہے؟

واہی:

(ایک دم کھڑے ہو کر ناظرین سے خطاب کرنے لگتا ہے) سلسلہ جاری ہے۔ بہت دور دراز سے میں سفر کرتا آ رہا ہوں۔ ہر سنگ میل کورا ہے اور میری جیب خالی کی خالی۔ تماشا ایک خاص مقام سے شروع ہوتا ہے اور ایک خاص مقام پر ختم۔ (حمزہ بیچ بیچ میں واہی کو زبان نکال کر چڑاتا ہے اور بار بار انگوٹھا دکھاتا ہے) مجھے عجیب تضادات سے واسطہ پڑا ہے۔ ایک مسلسل ڈولتا ہوا پنڈولم، دونوں طرف دیواریں اور بار بار ٹکرانے کا عمل۔ میں اپنے آپ سے جدا ہونے کی کوششوں میں مصروف ہوں اور اس اسراف کا احساس کسی کو نہیں۔ شاید مجھے بھی نہیں کہ میں کھونے اور برابر نقصان اٹھانے کے لئے اپنے آپ سے سودا کرتا آیا ہوں۔ اپنی غیر آباد بستیاں میرے سینے کا خلا پر کرتی رہی ہیں اور میری ہتھیلی پر ایک ایسا کیڑا رینگ رہا ہے جسے میں اپنی زبان سے برسوں سے چاٹ رہا ہوں، اسے زندہ چبا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن میری فتح اس کے نصیب میں نہیں۔ وہ مجھے چوستا رہا ہے کہ میں اس کی غذا ہوں اور شاید تقدیر بھی۔

حمزہ:

(کھڑے ہو کر ناظرین اور واہی سے بیک وقت مخاطب ہو کر) یہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے؟ اسٹیج پر جب پردہ اٹھتا ہے تو پورے ہال کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے سب سانسیں روک لیتے ہیں کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ ایک لڑکا ایک لڑکی.. عشق... عشق نہیں ہمدردی۔ ہم... دردی نہیں ضرورت! سر پر سینکڑوں ننگی تلواریں لٹک رہی ہیں۔ دونوں گانا گاتے ہیں۔ آواز میں آواز ملا کر خود فریب نغمے چھیڑتے ہیں۔ ایک تلوار گرتی ہے اور گدلی زمین میں دھنس جاتی ہے (واہی، حمزہ کی باتیں بڑے انہماک سے سنتا ہے اور اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔) پہلے منظر میں بس اتنا ہی ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ خون رستا ہے، پردہ اٹھتا ہے... پردہ گرتا ہے۔ پھر پردہ اٹھتا ہے پھر پردہ گرتا ہے۔ ڈرامے کا آخری منظر اپنے کلائمکس پر پہنچتا ہے۔ تمام تلواریں ایک جھٹکے سے ساتھ ٹوٹ جاتی ہیں۔ سب کی پلکیں اس غیر متوقع انجام کے ساتھ بھیگ جاتی ہیں اس... پورے عمل کا ایک منطقی جواز بھی ہے مگر تمہاری شاعری کس گھناؤنے مرکز کے ارد گرد چکر کاٹ رہی ہے؟ لگتا ہے اس تعلق سے تم ابھی تک لاعلم ہی ہو۔

واہی:

ہاں اسی حد تک لاعلم جس حد تک تم ڈرامے کے منظر گنانے میں مصروف تھے اور میری موجودگی سے لاعلم۔

حمزہ:

کوئی بیرومیٹر؟ تمہارے خلوص کو اگر ناپا نہیں گیا تو میں اپنی دوستی کی تمام روایات سے عاری ہو جاؤں گا۔ یک طرفہ دوستی ایک بڑے نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے (سر پکڑ کر) اف، بے حد زور کا ہیڈ ایک ہو رہا ہے۔ کہیں سر نہ پھٹ جائے۔

واہی:

ہم میں سے اب کوئی بھی سانس نہیں لے سکتا۔ ابھی ایک لمحہ پہلے کوئی آیا تھا میرے قریب... بے حد قریب... مگر تم نہیں... کوئی اور تھا وہ۔ اس کے گلے میں لمبی لمبی مالائیں لٹک رہی تھیں، سفید دودھیائی لبادہ، لمبے لمبے بال روئی کے گالے کی طرح۔ ملنگ تھا کوئی ملنگ! وہ اخروٹ جیسی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تاکتا رہا۔ پھر یکایک اس نے میرے کانوں میں کوئی منتر پھونکا۔ میں بے بس ہو گیا اور وہ بڑے اطمینان سے میرے اندر اتر گیا... اف میرا دراڑوں بھرا جسم!

حمزہ:

مجھے متلی ہو رہی ہے... (قدرے منہ بنا کر اینٹھتا ہے) اف میری تقدیر۔ (ایک آہ بھرتے ہوئے) میں گھر سے بھاگ کر آیا کہ وہ میرے لئے جہنم بن چکا تھا۔ (ناظرین سے براہ راست مخاطب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مکالمہ جاری رکھتا ہے۔ پشت میں واہی آنکھیں نکال کر اور قدرے حقارت کے ساتھ حمزہ کا سر سے پاؤں تک معائنہ کر رہا ہے۔ اس کی حیرت سے ایسا لگتا ہے جیسے حمزہ کو اس نے پہلے بار دیکھا ہے۔) مگر اب سوچتا ہوں نجات   نجات تو ملی نہیں بلکہ آس پاس (واہی اس دوران اپنے پاؤں کھجانے لگتا ہے۔ اب اس کی نظریں حمزہ کی طرف نہیں ہیں۔ اسی بے دھیانی سے فائدہ اٹھا کر حمزہ واہی کی طرف آنکھیں نیز کر اشارہ کرتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ واہی خود اس کے لئے کسی عذاب

جہنم سے کم نہیں۔) کئی نئے جہنم اگ آئے ہیں...خود رو جہنم، چلتے پھرتے آگ پھونکتے جہنم۔ ایک جہنم کے بعد دوسرا جہنم منھ پھاڑے کھڑا رہتا ہے۔ کیا خیر مقدم کے لئے یہی ایک چیز رہ گئی ہے؟ (واہی سے، غصے کے لہجے میں) تم بھی میرے نجات دہندہ ثابت نہیں ہوئے۔ ایک نئی تقدیر جس کا ایک سرا تمھارے ہاتھ میں ہے کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ تمھارے سامنے میں کسی بغاوت پر آمادہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ سب اپنا اپنا حصہ مانگتے ہیں۔ ایک ایک لمحے کا تاوان دینا پڑتا ہے۔ میں تو ایک میوزیم بنتا جا رہا ہوں۔ صدیوں پرانے ماڈلس کا عجائب خانہ!

واہی:

(حمزہ پھر اپنی جگہ پر بری بے نیازی سے بیٹھ جاتا ہے) کیا کہا؟

حمزہ:

میوزیم۔ عجائب خانہ!

واہی:

میں دیکھ رہا ہوں تم برابر میرے جذبات پر رولر پھیر رہے ہو اور تمھیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ تم مجھے جانتے ہو نہ؟

حمزہ:

تھوڑا بہت...نہیں، بالکل نہیں.. اور پھر اگر فرض کرو میں تمھارے بارے میں کوئی ایسی رائے رکھتا ہوں جو تمھاری خوش فہمیوں کے خلاف جاتی ہو، تو کیا تم لفظوں کی تیزابیت کو درگذر کر سکو گے؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تمھارے اس قوی جسامت بدن کے آگے میری کچھ نہیں چل سکتی۔

واہی:

ہر شخص کی شخصیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ آدمی جب گھر سے نکلتا ہے تو اپنے کیسے میں کئی خول بھی رکھ لیتا ہے۔ بس وہ قدم قدم پر ایک نقاب اتارتا ہے اور دوسرا چڑھاتا ہے۔ تم ابھی جو میرے سامنے ہو وہ اپنی بیوی کے سامنے نہیں۔ اپنے بچوں کے لئے تم اک الگ نقاب رکھتے ہو۔ ماں باپ، بہن بھائی کے لئے الگ۔ دوست اور دشمن کے لئے الگ۔ سروس کا خول بازار میں، بازار کا خول گھر میں اور گھر کا خول کسی رکھیل کے یہاں بالکل نہیں چل سکتا۔

حمزہ:

جب تو قبر کے خول کے بارے میں تو تم اچھی طرح جانتے ہوگے (بڑی بے دلی کے ساتھ۔)

واہی:

تمھاری ایک ایک بات (بہت پر جوش انداز میں) بڑی گمبھیرتا رکھتی ہے۔ کم از کم میری سمجھ سے باہر۔ کاش اتنی بڑی سیڑھی ملتی کہ میں تمھارے ذہن کی بلندی تک پہنچ سکتا۔ اف نارسائی...شاید اسی طرح ہم ایک دوسرے کو سمجھے بغیر گوارا کرتے رہیں گے۔ آخر کب تک؟

حمزہ:

جب تک ہماری سمجھ میں نہ آجائے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے کس حد تک ناگزیر ہیں۔ (ایسا لگتا ہے کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہے۔)

واہی:

(حیرت انگیز مسرت سے) تو کیا میری بکواس میں تنے کوئی معنی نکال لئے ہیں؟

حمزہ:

آدمی کو کچھ کرنا ہی پڑتا ہے بھونا یا خودکشی (ادھر ادھر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے۔)

واہی:

یا فرار! (ابھی واہی نے زبان کھولی ہی تھی کہ حمزہ ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے اور چھوٹی انگلی سے اشارہ کرکے دائیں طرف اندھیرے میں پیشاب کرنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ واہی یک دم خاموش ہو کر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے چلا جاتا ہے۔ اور پھر ناظرین سے مخاطب ہو کر) عجیب آدمی ہے، بہت کم زور لگتا ہے۔ اسے کسی ماہر حیاتیات یا حاذق حکیم سے کنسلٹ کرنا چاہئے (وقفہ۔) ایسے لوگوں کو ہی تڑی پار کر دینا چاہئے (کھڑا ہو جاتا ہے۔) افلاطون اگر دوبارہ پیدا ہو جائے تو ایسے نامردوں کو زیادہ دن زندہ رہنے کی سزا نہیں بھگتنا پڑے گی۔ (ناظرین سے قدرے معذرت کے ساتھ) مجھے افسوس ہے میرا اکلوتا سامع آپ لوگوں کو میرے سپرد کر گیا۔ کانوں کی اتنی بھیڑ دیکھ کر میرا ایک سیاسی تقریر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک لمبی چوڑی تمہید کے ساتھ پانچ دس وعدے آپ کی طرف پھینک دوں اور آپ بھوک مردوں کی طرح وعدوں کے چیتھڑے خوشی خوشی بٹورنے لگیں جیسے آکسیجن آپ کو مل رہی ہو۔ میں فخر سے سینہ پھلالوں گا کہ آپ لوگوں کی خوشی میں شریک ہونے میں ہی میرا کلیان ہے۔ میری محض ہم دردی اتنی پر جوش ہوگی کہ آپ اپنا سب دکھ درد جیبوں کی تجھٹ میں رکھ لیں گے اور میری جادو بیانی پر واہ واہ کرنے لگیں گے۔ ممکن ہے کل میں پارلیمنٹ کا ممبر ہی بن جاؤں اور مجھے دھڑا دھڑ لکچر بازی کرنا پڑے اور پھر پرسوں (کچھ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگتا ہے) پرسوں... پرسوں...خیر جانے دو پھر کبھی۔ وہ آگیا...اب اس شخص کو ہی دیکھو باتیں، صرف باتیں۔ بے سر و پا، لاتعلق باتیں۔ میں ممبر آف پارلیمنٹ بنا تو (دائیں طرف مڑ کر) میں اپنی تقریر یہیں ادھوری چھوڑتا ہوں...

حمزہ:

کون آگیا۔؟ تم اکیلے میں کیا بڑبڑا رہے تھے؟

واہی:

یہی کہ تمھاری جدائی مجھے کس قدر بے بس بنا دیتی ہے۔

حمزہ:

اور مجھے ایک لمحہ کے لئے جو سکون ملا اس سے تو تم واقف ہی نہیں۔ واقف ہونا کچھ ضروری بھی نہیں۔ دنیا کی ہر چیز تمھارے تجربے میں آ بھی نہیں سکتی۔ کیا کبھی تمھیں کھجلی محسوس ہوتی ہے؟

واہی:

(سوالیہ انداز میں جیسے ایک دم کسی نے غیر متوقع طور پر سوال کر لیا ہو) کھجلی؟

حمزہ:

ہاں کھجلی، پیٹھ پر، کندھے پر... پنڈلی پر... جانگھ پر... (سر کھجاتے ہوئے) سر پر۔ جیسے ابھی ابھی مجھے محسوس ہوئی۔

واہی:

تمھارے پاس مجھے اور مل بھی کیا سکتا ہے؟ (دونوں ہاتھ پیچھے ٹیک لیتا ہے۔)

حمزہ:

ایک صبر کے معنی جاننے والا سامع!

واہی:

اگر تم نے اپنی قیمت آنک ہی لی ہے تو تمھیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنا اتنا آسان نہیں جتنا خود کو دوسروں کے سپرد کر دینا۔ تم واقعی دنیا کے سب سے پہلے بے وقوف ہو جسے آسانی سے انٹلیکچوئل کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ دوست! آخر تم میں اتنی معاملہ فہمی آئی کہاں سے؟

حمزہ:

تم جیسے اول جلول لوگوں کی نوازش ہے (آداب بجالاتا ہے۔)

واہی:

تم ذرا ذرا سی بات ربڑ کی طرح کھینچے چلے جاتے ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں تم اسراف کے عادی ہو چکے ہو۔ تمھیں یہ بھی احساس نہیں کہ تم ہر ہر لحہ اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو۔ اور اس پر کم بختی یہ کہ تمھیں اپنے نقصان کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں۔ شاید تم اس لئے بکے چلے جاتے ہو کہ موت کا خوف تمھارے گلے میں پھندا ڈالے ہوئے ہے اور تم ہر موجود لمحے کو غنیمت جان کر اپنی طاقت کا غلط سلط استعمال کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ (حمزہ کی طرف پوری طرح مڑ کر) تم اسی لئے بولتے رہتے ہو نہ! کہ موت جب تمھاری زبان بند کر دے گی پھر لازمی خاموشی سے تم بغاوت نہیں کر سکو گے... یہی نہ؟

حمزہ:

اس آخری جملے تک پہنچنے میں تمھیں تو یقیناً کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن مجھ سے پوچھو... آخر میں نے کس قدر تحمل سے کام لیا، تم اس کی تو داد دے سکتے ہو۔

واہی:

الفاظ کا جائز استعمال کرنا سیکھو۔ لگتا ہے ہم میں سے کسی ایک کو ضرور خودکشی کرنا پڑے گی۔ اس وقت میں تمھارے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ اور تم شاید میرے بس میں ہو... اگر میں چپکے سے تمھارا گلا دبا دوں اور یہیں کہیں پھینک کر چلا جاؤں تو نہ تمھیں کچھ کر سکو گے اور نہ کوئی اور۔ اتنی آسانی سے مگر تمھاری موت واقع نہیں ہوگی۔ میں نے برجو کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے منھ سے ابلتا ہوا سفید جھاگ نکلتا رہا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک جھلسی ہوئی لکڑی بن چکا تھا۔ پیٹ اس کا پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ تمام جسم کی نسیں تن چکی تھیں۔ اس نے بڑی تکلیف سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ آخری بار اپنی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتا تھا مگر ایسا نہ کر سکا... وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا اور پھر اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک آ گئی۔ وہ چاروں طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ آخری بار اس کے چہرے پر سکون کی رمق دکھائی دی۔ زندگی بھر کے فاقوں کا کفارہ اس نے دو لڑکیوں اور ایک بیوی کی شکل میں اس دنیا کو سونپ دیا۔ دنیا اس کفارے پر نئے مقبرے بنائے گی۔ ان مقبروں پر کوئی بھولا بھٹکا چراغ جلائے گا اور ہم کبھی ادھر سے گذرے تو ان چراغوں کی لو سے اپنی ادھ جلی سگریٹ سلگا کر تھوڑی دیر کے لیے برجو کے فن پر غور کریں گے۔ کیسی شاطر چال چل گیا وہ!

حمزہ:

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی عظیم لوہے کے پنجرے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاتھ پیر کاٹ دیئے گئے ہیں... یہ کیا کم ہے کہ ہمیں پیدا کیا گیا۔ اس حادثے کے آگے تمام حادثے غیر اہم اور معمولی دکھائی دیتے ہیں۔ تم میں سے مجھے ایک سڑی ہوئی لاش کی بو آ رہی ہے اور پھر مجھے دیکھو کب سے برداشت کئے جا رہا ہوں۔ جیسے مجبور ہوں تم سے احتجاج بھی نہیں کر سکتا۔

واہی:

شاید ہم احتجاج کرنا بھی نہیں چاہتے، اگر چہ جانتے ہیں کہ ہر دوسرا شخص تقدیر ہے۔ لیکن یہ بوجھ جھٹکنے کو ہم تیار بھی نہیں ہوتے۔ لو میں تمھیں اپنی قمیص دیتا ہوں۔ (قمیص جیسے اتارنے لگتا ہے) کیا تم اس ذلت کو سہ سکتے ہو؟ (حمزہ کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ واہی ایک دم قمیص اتارتے ہوئے ہاتھ روک لیتا ہے۔) شاید تمھارے لیے یہ ذلت بھی نہیں۔ تمھاری آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے کہ تم مجھے ننگا دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے تو نہیں، البتہ آئندہ ضرورت کا خیال تمھیں اس غیر مہذب حرکت پر آمادہ کر سکتا ہے۔

حمزہ:

ہم ایسا کیوں نہ کریں، فوج میں بھرتی ہو جائیں؟ خودکشی وہاں شہادت میں بدل سکتی ہے۔ مگر چھوڑو شہادت کے معنی اب بدل گئے ہیں۔ وہ بھی ایک خودکشی ہی ہے۔ بلکہ نسبتاً اذیت ناک اور لمبی خودکشی۔ اور خودکشی کے لیے ہم بزدل تیار بھی تو نہیں ہو سکتے۔ اور شاید ایک دوسرے کو قتل بھی نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا...

واہی:

(جھلا کر) ایسا کیا؟ تمھیں تم بولے جاؤ گے کہ مجھے بھی کچھ موقع دو گے؟ اب وہ موڑ آ گیا ہے کہ ہمیں اپنے الفاظ کا سرمایہ برابر برابر بانٹ لینا چاہیئے۔ میں ایک لفظ بھی اپنے سے زیادہ تمھاری زبان سے سننا نہیں چاہوں گا۔ اور نہ تمھیں یہ اجازت دوں گا (تحکمانہ انداز میں) کہ مجھے اپنا بالجبر سامع بناؤ تو کیا میں اپنی بات یہاں سے شروع کروں؟

حمزہ:

یہ تو تمھارا بڑپن ہے دوست کہ تم مجھ سے اجازت لے رہے ہو۔ ورنہ ہم جیسے بزدلوں اور کم زوروں کو کون خاطر میں لاتا ہے؟ میں اب پوری طرح تمھارے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم جیسا چاہو میرا استعمال کر سکتے ہو... آج میں تم سے بہت خوش ہوں۔ (اپنی جیب سے سپاری کے ٹکڑے نکالتا ہے اور واہی کی طرف بڑھاتا ہے) لو میری طرف سے۔

واہی:

(فوراً حمزہ کی ہتھیلی سے تمام ٹکڑے لے کر منھ میں پھانک لیتا ہے اور جملہ کاٹ کر)
بس بس بہت ہوگیا۔ ہاں تو میں کچھ کہنا چاہتا تھا... شاید کوئی خاص بات میرے ذہن میں تھی... مجھے تو یاد نہیں آ رہی۔ تم مجھے زیادہ ذہین لگتے ہو... مجھ سے بھی زیادہ ذہین! تمھیں کچھ بتاؤ کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا؟

حمزہ:

تم اپنے بارے میں سوچ سکتے ہو، میری موجودگی میں میرے بارے میں، اپنی حماقتوں کے بارے میں، اس کارٹونوں سے بھری ہوئی دنیا کے بارے میں۔ گذرے ہوئے کل یا آنے والے کل کے بارے میں منافعے جو تم نے بے وقوفوں سے آنکھ بچا کر حاصل کیے یا وہ نقصان جو تم نے اپنی بے وقوفی سے اٹھائے۔ زندگی کے بارے... موت!

واہی:

ہاں یاد آ گیا برجو کے بارے میں... کیا آدمی تھا وہ بھی... وہ جب آخری سانسیں گن رہا تھا، مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ اس وقت میں اس کے سرہانے بیٹھا ہوا خود کو اس کی جگہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھا اور مجھے ایک طرف لے گیا اور اپنا حق مانگنے لگا۔ اسے یہ گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں زبردستی اسے پلنگ سے ہٹا دوں اور لوگ اس کے بجائے میری چارہ سازی کرنے لگیں۔ وہ اپنی موت میں مجھے اپنا شریک بنانا نہیں چاہتا تھا۔ کس قدر خود غرض تھا وہ! کیا اچھا ہوتا اگر میں اس کی جگہ... (بات کرتے کرتے رک جاتا ہے اور بائیں طرف حیرت خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے)... ارے تم کون ہو بھائی (ایک آدمی جس کے کندھے پر مونگ پھلی سے بھری ہوئی تھیلی لٹکی ہوئی ہے، ہاتھ میں پرانی سی ترازو ہے، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے۔ چہرے سے پریشانی جھلک رہی ہے۔)

حمزہ:

اتنی رات گئے ادھر کیسے؟ (غور سے اس کے تھیلے کی طرف دیکھتا ہے اور اطمینان سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتا ہے۔)

واہی:

کیا تمھاری تفریح کا یہی وقت ہے؟

حمزہ:

(جو کہ اب بھی مسلسل تھیلے کی طرف دیکھے جا رہا ہے) تمھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ دن ڈوبے ہوئے چار گھنٹے گذر چکے ہیں؟

واہی:

آؤ تم ہی سہی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اکتا چکے ہیں۔ ہمارے پاس اب نئی باتیں بھی نہیں رہیں۔ صرف اپنے آپ کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ تم ہمارے لئے نئے ہو۔ اس لئے کیا تم ہمیں اپنے کان دے سکو گے؟ تمھارے لئے ہمارے باتیں بڑی کارآمد ہوں گی۔ (نیا آدمی جھجک رہا ہے) ڈر کیوں رہے ہو؟ اچھا اپنی بات یہیں سے شروع کرتے ہیں۔ تمھارا نام کیا ہے؟

نیا آدمی:

ہریالا۔

واہی:

نام جیسی خوبی تو تم میں مجھے نظر نہیں آتی۔ یہ نام کیا تمھارے والدین نے رکھا ہے؟

ہریالا:

میری بیوی نے سرکار!

حمزہ:

تو تمھاری بیوی بھی ہے۔

ہریالا:

ہاں سرکار! پہلی بیوی تو دس برس ہوئے اللہ کو پیاری ہوگئی۔ یہ میری دوسری بیوی ہے۔

واہی:

پہلی واقعی بڑی خوش نصیب تھی۔ تم اس کی تقدیر بنے ہوئے تھے لیکن یہ دوسری، ہوں! تم کرتے کیا ہو؟ تمھارے بچے؟ (حمزہ مجبور ہو کر پلیا سے اتر کر ہریالا کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اس کی تھیلی کے اوپر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے یہ جاننے کے لئے کہ اس میں کون سی کھانے کی چیز ہے۔)

ہریالا:

جی چار بچے ہیں صاحب۔ دو خدا کو پیارے ہوگئے۔ دن بھر شہر جا کر مونگ پھلیاں بیچتا ہوں، بس اتنے میں گاؤں لوٹ جاتا ہوں۔

حمزہ:

اچھا ٹھیک ہے۔ لاؤ دو سو گرام پھلی ہمیں بھی دو۔

(ہریالا مونگ پھلی نکال کر تولنے لگتا ہے۔ واہی فوراً آگے بڑھ کر اپنی دستی پھیلا دیتا ہے۔ ہریالا اس کی دستی میں پھلیاں ڈال دیتا ہے۔ حمزہ اور واہی واپس پلیا پر بیٹھ جاتے ہیں۔ واہی دستی کھول کر دونوں کے بیچ رکھ دیتا ہے۔)

واہی:

تم روزانہ کتنے کما لیتے ہو؟

حمزہ:

کچھ بچتا بھی ہے؟

ہریالا:

خدا کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ آپ جیسوں کی مہربانی چاہئے۔ مونگ پھلی کے پچاس پیسے تو دو۔

حمزہ:

(پھلی چباتے ہوئے) تمھیں پیسوں کی پڑی ہے۔ ارے بھائی پہلے ہماری بات کا جواب تو دو۔ تمھیں آخر کیا بچتا ہے؟

ہریالا:

یہی ڈیڑھ دو روپیہ روکھا سوکھا مل ہی جاتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مجھے جلدی گھر جانا ہے بچے راہ دیکھتے ہوں گے۔

حمزہ:

میری بھی ہمدردیاں تمھاری دوسری بیوی کے ہی ساتھ ہیں، سمجھ لو۔ کیا وہ بھی احمق بھی ہے؟ کیا تمھیں بھی اس سے ہمدردی ہوتی ہے؟ (ہریالا مسلین صورت بنائے چپ چاپ کھڑا ہے) اور تمھارے بچے؟

حمزہ:

تم انھیں کسی یتیم خانے میں کیوں داخل نہیں کرا دیتے؟ کم از کم دنیا سے نہیں تو تم سے تو انھیں نجات مل جائے گی (حمزہ اور واہی وقفہ وقفہ سے پھلی بھی چباتے جا رہے ہیں۔)

ہریالا:

کیسی باتیں کر رہیں سرکار؟ ابھی تو بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنے والا سلامت ہے۔ خدا کے فضل سے میری بیوی بہت سگھڑ ہے۔ اسے کوئی دکھ نہیں۔ وہ مجھے بھوت پیار کرتی ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا رستہ دیکھتی ہوگی... میرے پیسے سرکار!

حمزہ: جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

واہی:

ہمیں تم پر بالکل یقین نہیں آتا۔

حمزہ:

اور نہ ہمیں تم سے کوئی ہمدردی ہے۔

واہی:

اور نہ تمھیں امید رکھنا چاہیئے کہ ہم تم سے کبھی ہمدردی رکھیں گے۔ (ہریالا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے منھ بسور لیا ہے۔)

حمزہ:

اچھا ہماری ایک بات مانو گے۔

ہریالا:

سرکار! میرے پیسے۔

واہی:

تم کیا ہم سے اتنی جلدی بیزار ہو گئے؟ شاید تم ہم سے بھی زیادہ معروف آدمی ہو؟ جانے تم ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوگے۔ کاش تم ہمارے لئے کچھ کر سکتے۔

ہریالا:

سرکار! میرے پیسے۔

حمزہ:

میں تو کہتا ہوں تمھیں مر جانا چاہیے۔ بال بچوں سمیت تم خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟

واہی:

کیا تم سمجھتے ہو ایسا کرنے سے تمھاری بیوی تمھیں روکے گی؟

حمزہ:

ارے بھائی اس کے صبر سے غلط نتیجہ کیوں نکالتے ہو؟ ہمیں بڑا دکھ ہے کہ تم عورت کی نفسیات سے بھی واقف نہیں۔

واہی:

تم نے اگر اب بھی ہماری بات نہیں مانی تو ایک دن تمھیں ذلیل ہونا پڑے گا۔ تمھاری بیوی تمھیں دھتکارے گی اور تمھارے بچے تمھیں اپنا باپ کہنے میں اپنی ذلت محسوس کریں گے۔ پتہ نہیں وہ تمھارے...

ہریالا:

بھائی صاب پیسے (گردن جھکائے ہوئے خاموش کھڑا ہوا دونوں کی باتیں بڑی مجبوری کے انداز میں سن رہا ہے۔)

حمزہ:

تو کیا ہم سمجھ لیں کہ تم ہماری بات تسلیم کرتے ہو؟

واہی:

ہاں تمھیں کچھ عذر بھی نہیں ہونا چاہئے۔ کمزور کو بہر حال طاقتور کے سامنے ہاتھ ٹیکنے پڑتے ہیں۔ (واہی اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر ہریالے کی طرف بڑھاتا ہے) لو، ابھی ہمارے سامنے اس چاقو سے اپنا گلا کاٹ لو۔ آج کا دن تمھارے بیوی بچوں کے لئے جشن کا دن ہوگا۔ لو! ارے لیتے کیوں نہیں؟ (ہریالا گھبرا کر بھاگنے لگتا ہے) ارے تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ارے سنو...

حمزہ:

ارے... ارے... ٹھہرو، ذرا ہماری بات تو ٹھنڈے دل سے سنتے جاؤ۔

واہی:

اب اسے مت روکو میرے دوست (حمزہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) شاید وہ ہمارے سامنے مرنے سے شرماتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنے بیوی بچوں کے سامنے مرنا چاہتا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو مگر آج اسے مرنا ہی ہوگا۔ (اٹھتے ہوئے چھوٹی انگلی سے پیشاب کا اشارہ کرتا ہے اور واہی کے جواب کا انتظار کئے بغیر پہلے کی طرح دائیں طرف اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔)

واہی:

(حمزہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر منھ بناتا ہے، پھر لفظوں کو چباتے ہوئے ناظرین کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔) بہت اچھے۔ بہت خوب (وقفہ۔) یہ شخص بھی (دائیں طرف اشارہ کر کے) کم عیب دار نہیں۔ (قدرے رازدارانہ انداز میں) جانوروں کی طرح ایسے لوگ کھونٹے سے باندھ دیئے جائیں اور گلے میں گھنٹیاں لٹکا دی جائیں تو شاید عمر بھر یہ اپنے دائرے سے ایک انچ نہ ہٹیں گے۔ اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اپنے آپ کو بے وقوف ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ ایسے بیمار اور نا اہل لوگ خود پر بوجھ اس لئے نہیں ہوتے کہ وہ احمقوں کی جنت میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں مگر دوسروں کے لئے بے حد خطرناک (اٹھ کر ڈائس کے اگلے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔) قحط اب بھی پڑتے ہیں، مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ بے وقوفوں کا قحط کسی دور میں نہیں پڑا۔ سرکار ہر سال کئی حلقے سوکھا گرست قرار دیتی ہے، مگر ایسا کوئی علاقہ اب تک دریافت نہیں ہوا

جہاں دو چار انٹلیکچولز کا پتہ چل سکے۔ ہماری سرکار کو ایک ایسا ادارہ بھی کھولنا چاہئے جو ہر سال انٹلیکچولز کی مردم شماری کرے اور ان کی کمی بیشی کے اعداد و شمار کا حساب رکھے۔ یہی نہیں بلکہ چند نامور بے وقوفوں کو وقتاً فوقتاً نامزد کرنا چاہئے کہ اگر ہمارے یہاں اب دانشور نہیں اگتے تو اس کے اسباب کیا ہیں اور اس طبقے کی کن دور دراز علاقوں میں فراوانی ہے اور کیوں؟ (دائیں طرف سے کھنکارنے کی آواز آتی ہے جسے سن کر واہی فوراً مڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے) آؤ آؤ۔ (حمزہ سے قدرے خوش ہو کر) ویل کم ویل کم۔ میں تمہارا ہی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ کہو اپنی مہم میں کامیاب رہے ہو نا! (حمزہ اپنی پرانی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔)

حمزہ:

ہاں کسی قدر.... بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اندر ہی اندر جیسے ایک سوکھا ہوا جنگل آباد ہے اور اس میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ خون میں جیسے تیزابی مشعلیں روشن ہوں (وقفہ۔) ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اندر ہی اندر میری نسوں کو کھینچ رہا ہے۔ ہڈیوں کی کرچیاں میرے گوشت میں بکھر گئی ہیں۔ چاہتا ہوں خود کو دور بہت دور کہیں جا کر جھٹک دوں۔ مگر (افسوس کے ساتھ) اف اپنے جسم پر خود اپنا بس بھی نہیں چلتا۔ کیسی عبرتناک مجبوری ہے۔

واہی:

واقعی تمہارا کرب بڑا جان لیوا ہے۔ تمہارا دوست ہو کر بھی میں تم سے ہمدردی نہیں کر سکتا۔ اور محض لفظوں کے جال بچھا کر تمہارا درد تو نہیں سمیٹا جا سکتا... خیر ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ آخر ہم کب تک یہیں بیٹھے رہیں گے؟ اب ہمیں اور ٹھکانا ڈھونڈنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر ایک دوسرے پر تقریر جھاڑنے لگیں۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے ڈرنا چاہئے۔ مجھے خود بھی اب تم سے خوف آنے لگا ہے۔

حمزہ:

اب کچھ دیر ہمیں چپ چاپ سوچنا ہے۔

واہی:

کیا سوچنا چاہئے؟ اگر میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ دیر کے بعد ہم مزید بولنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔ کیا ایسی بات نہیں ہے؟

حمزہ:

ہاں سوچنے کے بعد اظہار اور پھر ایک نہ ایک سامع کی تلاش۔

واہی:

پیچیدہ مسئلہ ہے۔

حمزہ:

بہرحال ہمیں یہیں کچھ دیر بیٹھ کر اس تازہ پیدا شدہ مسئلہ کو سلجھانا ہے۔

واہی:

میری رائے تو یہ ہے کہ ہم دونوں مینڈریکس کی دو دو گولیاں گھونٹ کر یہیں کہیں سو جائیں اور ہاں دونوں ایک ساتھ اپنے حلق میں ڈالیں گے ورنہ ایسا نہ ہو کہ ایک سو جائے اور دوسرا...

حمزہ:

(واہی کی بات کاٹتے ہوئے) اور دوسرا کہیں باتیں بنانا شروع نہ کر دے۔ یہی نہ! میں سمجھتا ہوں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔

واہی:

مگر تمہیں مہذب کردار ادا کرنا چاہئے۔ میری بات ختم ہوئی نہیں کہ تم بیچ میں کود پڑے۔ دیکھو تمہاری اسی حماقت سے سب کچھ بھلا دیا... میں کوئی بڑی اچھی بات کہنے جا رہا تھا۔ تم اپنے دائرے میں رہنا کیوں نہیں پسند کرتے؟

حمزہ:

یہیں سے اب ہمیں اپنے اپنے دائرے بنا لینے چاہئیں۔ (حمزہ پلیا سے اتر کر زمین سے ایک کوئلے کا ٹکڑا اٹھاتا ہے اور واہی سے بے نیاز ہو کر پلیا کی اوپری چپٹی سطح پر کچھ کھینچنے لگتا ہے۔ واہی حمزہ کو غور سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر ناظرین کی طرف رجوع ہو کر اپنی کنپٹی پر کلمے کی انگلی گھما کر اشارہ کرتا ہے، یعنی حمزہ کسی سنکی سے کم نہیں۔ اسی دوران بائیں طرف سے معمولی قمیص پاجامہ پہنے ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور گردن ہاتھ منہ پر چھوٹے چھوٹے گہرے کتھئی رنگ کے داغ ہیں۔ وہ زور زور سے توقا، جوجی، چوبا، شوشا، ہاہا، می۔ می، سی سی، رو۔ رو۔ ایسے بے ربط الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ واہی اور اس کی نظریں ایک دم ملتی ہیں۔ وہ ٹھٹک جاتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے چار قدموں سے آگے بڑھنے لگتا ہے۔ حمزہ دونوں سے بے نیاز لکیریں بنانے میں مصروف ہے۔)

واہی:

ویل کم۔ ویل کم۔ (پلیا سے اتر کر) ہم آپ کا تہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔

نیا شخص:

توقا۔ جوجی۔ چوبا۔ شاشا، ہاہا، می می، سی سی، رورو، توقا، جوجی، چوبا، شاشا، ہاہا، می می، سی سی، رورو، توقا، جوجی، شاشا، ہاہا، می می، سی سی، رورو، توقا، جوجی۔

واہی:

بس بس بہت ہو گیا۔ یہ کس زبان کے لفظ ہیں؟ یہ کیا تمہاری مادری زبان ہے؟ اگر یہ کوئی گیت ہے تو ہمیں کیا اس کا مطلب بتاؤ گے؟ (واہی کو قریب دیکھ کر نیا شخص ایک دم چپ ہو جاتا ہے اور ٹکٹکی باندھے واہی کو دیکھتے رہتا ہے۔ واہی اپنی جیب سے دو تین پھلیاں نکال کر اس نئے شخص کی طرف بڑھاتا ہے۔)

نیا شخص:

(آنکھیں نکال کر) تمہارا گوشت نوچ لیا جائے گا۔ (رازدارانہ انداز میں) میری مانو تو بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ بہت دور.... پھلیاں.... پھلیاں.... ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ (حمزہ ابھی تک کچھ لکھنے اور مٹانے میں مصروف ہے۔) توقا، جوجی، چوبا، شاشا، ہاہا، می می۔ سی سی۔ رورو۔ توقا، جوجی۔

واہی:

ہاں تو تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کدھر جاؤ گے؟

نیا شخص:

قوقا سے آیا ہوں۔ جوجی جاؤں گا (اور پھر تیزی سے دہرانے لگتا ہے) قوقا سے آیا ہوں جوجی جاؤں گا قوقا سے آیا ہوں جوجی جاؤں گا قوقا سے...

واہی:

(بات کاٹ کر) ایسا لگتا ہے تم کسی گھٹیا سرکس کے اکلوتے جوکر ہو۔ تمھیں دیکھ کر ہنسی آنے کے بجائے ہمدردی ہوتی ہے۔ اُفوہ قدرت نے کس کس پائے کے کارٹون تراشے ہیں۔ تمھیں تو صحیح معنوں میں نمائش میں رکھنا چاہئے۔ (حمزہ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑاتا ہے اور چونک کر پیچھے کی طرف مڑتا ہے اور دونوں کی گفتگو کو بہ غور سننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انتہائی مسخرے انداز میں گردن اونچی اٹھا کر کان واہی کی طرف کر دیتا ہے۔ پھر اس کی پیشانی پر دو چار بل آجاتے ہیں جیسے دونوں کی گفتگو نے اسے بے چین کر دیا ہو۔) تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

نیا شخص:

جس دیس میں گنگا بہتی ہے (بڑی تنک مزاجی کے ساتھ۔)

واہی:

ہا۔ ہا۔ ہا! ضرور تم کوئی دشمن کے جاسوس ہو۔ تمھارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ خود کو سیدھی طرح ہمارے حوالے کر دو۔ مجھے تو تم آتنک وادی دکھائی دیتے ہو، آئی۔ ایس۔ آئی۔ کے ایجنٹ۔

نیا شخص:

(پھلیاں چبانے لگتا ہے) بھاگو... بھاگو... بھاگو... ارے بھاگو... پولیس! بھوں (کتے کی آواز) بھوں! بھوں... (واہی کچھ گھبرا سا جاتا ہے، اتنی دیر میں حمزہ نئے شخص کے قریب آجاتا ہے۔)

حمزہ:

ارے۔ یہ تو میرے ٹامی کی آواز ہے۔ (بڑے پیار سے) ٹامی تمھیں کس ظالم نے آدمی بنا دیا؟ تمھارے ساتھ یہ سراسر ظلم ہے۔ تم نے احتجاج بھی نہیں کیا؟

نیا شخص:

بھوں! بھوں! بھوں...! بھوں! بھوں! بھوں! (کتے کی طرح زبان نکال لیتا ہے، پھر زبان کو ہلانے اور لپ لپ آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔)

حمزہ:

ٹامی (پچکارتے ہوئے) پیارا ٹامی!

واہی:

تو کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ یہ تمھارا ہی ٹامی ہے۔

حمزہ:

ہاں ہاں یہ میرا ہی ٹامی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اب یہ آدمی ہو گیا ہے۔ ہم تم جیسا ہی آدمی۔ کاش! (ایک آہ بھرتے ہوئے) ایسا نہ ہوتا۔ کتنا اچھا تھا میرا ٹامی! وفادار، صابر، مسکین۔

واہی:

میں نے اتنی زیادتی کسی کے ساتھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھی۔ کاش تمھارے ٹامی کے پھر چار ٹانگیں ہو جائیں۔ پھر پہلے کی طرح وہ دم ہلا ہلا کر تمھارے پاؤں چاٹنے لگے۔ تمھارے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور کیا ہوگی؟

حمزہ:

ٹامی۔ چپ کیوں ہو؟ کچھ تو بولو! کیا آدمی کہلانے لگے تو اپنے مالک کو بھی بھول گئے؟

نیا شخص:

کاٹ لوں گا، کھا جاؤں گا (پاگلوں کی طرح منھ بنا کر) ہو، ہو، ہو، ہو، ہو، ہو، بھوں، بھوں، بھوں، بھوں، بھوں، چ، چ، چ، چ، چ، گیارہ، بارہ، تیرہ، مارو، مارو، پکڑو، پکڑو، بھوں، بھوں، بھوں، بھوں، بھوں، بھوں، (ڈر ڈر کے پیچھے مڑ کے دیکھتا جاتا ہے۔)

واہی:

ایسا لگتا ہے تمھارا ٹامی اب کسی طرح تمھارے بس میں آئے گا نہیں۔ اس کے پچھلے جنم میں تم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی تھی؟

حمزہ:

غلطی؟

واہی:

ہاں غلطی۔ یعنی اس کے ساتھ کبھی کچھ غلط سلوک تو نہیں کیا تھا؟

حمزہ:

(سوچتے ہوئے) سلوک؟

واہی:

ہاں سوچ لو۔ آخر تم بھی آدمی ہو اور آدمی سے زیادہ خطرناک تو کوئی حیوان نہیں ہوتا۔

نیا شخص:

پکڑو۔ پکڑو، مارو، مارو، چابک، ہتھکڑی، پتھر، لاٹھی، ہا ہا ہا، باشا باشا، چو چو، چھو چھو، ڈوڈو، قوقو، مارو، مارو۔ (ڈر ڈر کے پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا جاتا ہے) ٹاٹا ڈاڈا، ٹاٹا ڈاڈا، ٹاڈا۔

حمزہ:

ہمیں کسی جانوروں کے ماہر ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہئے کہ کیا پھر یہ اپنی اصلی حالت میں آسکتا ہے؟ یہ ٹاڈا ٹاڈا کی رٹ بھی لگا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بھی زبردستی ٹاڈا میں پھنسا دیا گیا ہو؟ تمھاری ڈاڑھی اور تمھارا نام ہی کافی ہے۔ ہماری کوئی نہ سنے گا۔ کنکر ملے آٹے کی روٹیاں چبانی پڑیں گی۔ اپنا پیشاب پینا پڑے گا۔ تمھاری ڈاڑھی نوچ لی جائے گی۔ تمھاری عورتوں کو ذلیل کیا جائے گا اور تم کچھ نہ کر پاؤ گے۔

واہی:

کیا ہی اچھا ہو کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ میری نیک خواہشات تمھارے

ساتھ ہیں۔

حمزہ:

بہت بہت شکریہ! اچھے آدمی ہو کہ تم اس کے بارے میں اتنا اچھا خیال رکھتے ہو۔

واہی:

اسی لیے اچھا خیال رکھتا ہوں کہ مصیبت کے وقت شاید کبھی یہ میرے کام آئے۔ مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں تو پولیس کا جاسوس بننا پسند کروں گا۔ کم سے کم اس طرح پولیس کے عتاب سے تو بچوں گا۔ (اس گفتگو کے دوران نیا شخص آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا ہے اور ادھر ادھر منھ بنا کر دیکھ رہا ہے۔ کبھی سر کھجاتا ہے، کبھی پیٹھ۔ بیچ بیچ میں وہ اپنے ہاتھ سر اور کمر وغیرہ پر انگلیاں رکھ کر ایک دم تلملانے لگتا ہے جیسے کسی نے اسے زدوکوب کیا ہو اور نتیجے کے طور پر اس کا تمام بدن اینٹھنے لگا ہو۔ وہ بار بار ٹیڑھا منھ بناتا ہے۔ کبھی آپ ہی آپ ہاتھ جوڑنے لگتا ہے۔ کبھی ہوا میں ہاتھ سے اس طرح وار بھی کرتا جاتا ہے گویا وہ کسی کو بید سے مار رہا ہو۔ پھر بار بار اس طرح اپنے جسم کو سہلانے لگتا ہے جیسے وار خود اسی پر پڑا ہو۔ حمزہ اور واہی کبھی اس کی حرکتوں سے بے نیاز دکھائی دیتے ہیں اور کبھی سر جوڑ کر اس کو حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔)

حمزہ:

پیارے ٹامی، تمھارے بدن پر یہ گول گول داغ کس نے لگائے؟ (حمزہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگتا ہے۔ نیا شخص "آؤ" کر کے چیخ اٹھتا ہے۔) ارے یہ تو کسی نے جلتی ہوئی سگریٹ سے داغ دیے ہیں!

واہی:

چہ چہ چہ (درد بھرے انداز میں) کیا جلتی ہوئی سگریٹ سے اپنے جسم کو داغ دینے میں تمھیں لطف آتا ہے؟ (نیا شخص بے نیازانہ ہوا میں ہاتھ چلا رہا ہے۔)

حمزہ:

یہ کیا تمھارا محبوب مشغلہ ہے؟

واہی:

کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ سگریٹ منھ سے پینے کی چیز ہے ہاتھ منھ پر ستارے کاڑھنے کے لئے نہیں؟

حمزہ:

نیا فیشن ایجاد کرنے کا خیال تو نہیں؟

واہی:

کیا تم کوئی بھاگے ہوئے مجرم ہو؟ اپنی صورت بگاڑ کر قانون اور سماج کو دھوکا دینا چاہتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارے پاس آر ڈی ایکس ہو۔ نہیں ہے تو بھی پیارے بھائی پولیس کبھی بھی تمھیں پھانس سکتی ہے۔

حمزہ:

میں تو کہوں گا کہیں بھاگ جاؤ۔ کیا تم آدمی اسی لئے بنے کہ جرائم پیشہ، قاتل یا چور اچکے بن سکو؟ (نیا شخص دعا کی طرح ہاتھ اٹھائے کچھ بڑبڑانے لگتا ہے۔) یا پڑوسی ملک کے جاسوس؟

واہی:

بتاؤ تم نے کہاں بلاسٹ کیا ہے؟ (نیا شخص بدستور ہاتھ اٹھائے ہوئے بڑبڑا رہا ہے۔)

حمزہ:

(نئے شخص کو جھنجھوڑتے ہوئے) تم بولتے کیوں نہیں؟ تمھاری خاموشی ہمارے شک کو یقین میں تبدیل کر رہی ہے۔

نیا شخص:

(چونک کر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں اس طرح ملنے لگتا ہے جیسے وہ گہری نیند سے اٹھا ہو۔) مارو... مارو... بھاگو۔ بھوگو!

واہی:

ایسا لگتا ہے ضرور تم کو پھنسایا گیا ہے۔ کیا تم پر پولیس نے ظلم کیا ہے؟ کیا ہے نہ؟

(نیا شخص روہانسا منھ بنا کر زور زور سے بدن ہلاتا ہے، حمزہ اور واہی پاس میں پڑے ہوئے دو بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

واہی:

ہم تم پر اب ظلم نہیں ہونے دیں گے۔

حمزہ:

میرے ٹامی! چکھ لیا تم نے زندگی کا مزہ... لائف ہو تو ایسی!

واہی:

تم بے فکر رہو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

حمزہ:

لیکن ہم کریں گے کیا؟

واہی:

طاقت کا جواب طاقت!

حمزہ:

اور اگر وہ تم سے بھی زیادہ طاقتور ہوئے تو؟

واہی:

ہونہہ! کیا کہا؟ مجھ سے بھی زیادہ طاقتور؟ تو... (رک جاتا ہے جیسے کچھ سوچ میں ہو)... تو۔ تو میں اپنی طاقت واپس لے لوں گا۔

حمزہ:

(مسکراتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے وقفہ۔)

(اسی اثنا میں دو پولیس والے بھاگتے ہوئے بائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں نسبتاً لمبے تڑنگے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہنٹر ہے۔ وہ خشمگیں آنکھوں سے نئے شخص کو دیکھتے ہیں۔ حمزہ اور واہی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نیا شخص بھاگنے لگتا ہے۔ دونوں پولیس والے اسے دبوچ لیتے ہیں۔ ایک پولیس والا واہی کو بری طرح دھکا دے کر غراتا ہے۔) ٹھہر تو سہی۔ (جھپٹ کر نئے شخص کا گریبان تھام لیتا ہے) پاگل کہیں کا سالا۔ سب کو پاگل بنانے پر تلا ہوا ہے۔ آج تو تجھے جان سے مار ہی دوں گا۔ (نیا شخص لپک کر واہی کے پیچھے پناہ

لینے لگتا ہے۔)

واہی:

میں، میں، میں کیا کر رہا ہوں...(واہی دونوں کے بیچ سے ہٹ جاتا ہے۔)

پہلا پولیس والا:

(ایک ہاتھ سے ہنٹر کھولتا ہے اور دوسرے سے اس کا بازو زور سے جکڑ لیتا ہے) آج تو تجھے مار کر ہی دم لوں گا۔ آتنک وادی، نمک حرام! ہمارا کھائے اور ہمیں سے غداری!

واہی:

(اپنی جیب سے وہی چھوٹا سا چاقو دونوں کی طرف بڑھاتا ہے جو اس نے ہریالا کو پیش کیا تھا۔) لیجئے جناب! میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ (خوشامدانہ لہجے میں) کتنے بہادر ہیں آپ، آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

دوسرا پولیس والا:

(جھٹکتے ہوئے) چپ! الّو کی دم! مجھے تجھ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی (واہی کے ہاتھ سے چاقو چھین کر حقارت کے ساتھ پلیا کی طرف پھینک دیتا ہے۔)

حمزہ:

جناب عالی آپ کو مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں؟

پہلا پولیس والا:

(ڈانٹ کر، گویا اب اس کے وجود پر مطلع ہوا ہو) اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہیں تم بھی اس کے ساتھی تو نہیں؟ (دونوں سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔) تمھارے پاس کچھ پیسے ہیں؟ (حمزہ اور واہی فوراً جیب سے کچھ مڑے تڑے نوٹ نکال کر پولیس والوں کو دے دیتے ہیں۔ پولیس والے حقارت سے وہ رقم اپنی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں اور نئے شخص کو دھکیلتے ہوئے بائیں طرف چلے جاتے ہیں۔ حمزہ، واہی کے دونوں بازو پکڑ کر واپس پلیا تک لے آتا ہے، جیسے حمزہ کو واہی کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک ہوا اس سے ہمدردی ہو، مگر اس ہمدردی کی پشت پر ایک طنز بھی کام کر رہا ہے۔ حمزہ چونکہ واہی سے کم زور ہے اس لئے واہی کی بے عزتی نے اس کے احساس کمتری کو یک گونہ تسکین بھی پہنچائی ہے۔)

حمزہ:

(کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کرتا ہے۔) اس موجودہ حادثے پر ایک نظم سنو۔ یہ نظم یقیناً تمھارے زخموں پر مرہم کا کام کرے گی۔ نظم یوں ہے۔ (حمزہ بڑے اعتماد اور پرزور آواز میں پوری نظم ایکشن کے ساتھ سنانے لگتا ہے۔)

آج سے پہلے
ایسا کبھی نہیں ہوا
کہ ہم بار بار مرے ہوں
بار بار مارے گئے ہوں
اور بار بار پیدا ہوئے ہوں
یا تجربے کی طور پر پیدا کئے گئے ہوں
بار بار پردہ اٹھتا ہے
ایک پستہ قد شخص ناچنے لگتا ہے
جس کے سوکھے ہونٹوں سے چیخ کے سوا کچھ نہیں نکلتا
وہ بار بار جھکتا ہے
اپنے سائے کو ٹٹولتا ہے۔
اسٹیج پر بکھرے ہوئے سناٹے بین بین کر
اپنے کانوں میں بھر لیتا ہے۔
سب تالیاں پیٹنے لگتے ہیں
کچھ بھری پری سیٹیاں اس کے کاندھے جھنجھوڑنے لگتی ہیں
چند نعرے
ہوا کی سان پر
اس کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں
وہ دبی ہوئی چھاتیوں میں زور سے پھونک بھرتا ہے
قہقہہ اچھالنے کی کوشش میں بلکنے لگتا ہے
اور پھر بلکتے بلکتے زمین پر گر پڑتا ہے
اسٹیج مر جاتا ہے
اور اس کے ساتھ ہر چیز مرنے لگے ہیں
ہر چیز مر جاتی ہے
ہر چیز مر جاتی ہے۔

واہی:

(نظم کا اس کے دل و دماغ پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک دم اپنی اصلی حالت میں آ جاتا ہے۔) بس بھی کرو۔ تمھیں بس ذرا سی چھوٹ ملنا چاہئے۔ جابے جا دیگن کے دیگن الفاظ لڑھکانا شروع کر دیتے ہو۔ (پرزور انداز میں) میں اب تمھیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا۔ تم بہت شارپ ہوتے جا رہے ہو۔ لائٹر ہولائٹر (سمجھاتے ہوئے) اگرچہ میں تمھیں پوری اجازت دے رہا ہوں پھر بھی تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔ ارے بھئی یہ بات ہم جیسے انٹلکچوئلز کے خلاف ہے۔

حمزہ:

لیکن میں نہیں سمجھتا کہ خلوص اور رواداری ناپنے کا کوئی پیرومیٹر بھی تم رکھتے ہو۔ جس اذیت ناکی سے تم گذر رہے ہو اس میں پوری شرکت کا تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ ہی تمھیں کسی دوسرے سے ایسی توقع رکھنا چاہئے۔

واہی:

شاید اب ہم ایک دوسرے کے لئے خطرناک ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے ننگے ہو جائیں ہمیں اسی ناگوار موڑ پر خوشی خوشی ایک دوسرے سے رخصت لے لینی چاہئے۔

حمزہ:

میں زندگی کے ہر شعبے میں برابر کے لین دین کا قائل ہوں۔ تم جتنی طاقت مجھ سے

زیادہ رکھتے ہو اتنی ہی میں تمھاری بات ماننے کو تیار ہوں۔ مگر اس سے زیادہ تمھاری مداخلت مجھے گوارا نہیں ہوگی۔

واہی:

کاش دنیا میں سب کے سب بیوقوف ہوتے تو میں بغیر کسی لالچ کے تمھیں بادشاہ وقت بنانے کی سفارش کرتا۔ کیا تمھارے لئے میرا یہ خلوص کوئی قیمت بھی رکھتا ہے؟

حمزہ:

یقیناً رکھتا ہے۔ اس صورت میں جب کہ تم جیسے نقاب پوش ہمدردوں سے دنیا خالی ہو جاتی۔ میں تمھاری موجودگی میں اپنے آپ کو بالکل نااہل سمجھتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے کتنے ناگزیر ہوتے جارہے ہیں۔ کیا تم محسوس کرتے ہو کہ میرے بغیر تمھارا وجود بے معنی بھی ہو سکتا ہے؟

واہی:

(جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالتا ہے اور جیب کو دوبارہ ٹٹولتا ہے۔ غالباً اسے ماچس درکار ہے، مگر ماچس اسے اپنی جیب میں نہیں ملتی۔) بے معنی؟ بے معنی تو اب بھی ہے۔ مگر ہماری خوش فہمیاں بیساکھی کا کام کر رہی ہیں۔ تم میرے لئے اور میں تمھارے لئے معنی ضرور بن گئے ہیں، مگر ہم اپنے تئیں کہاں تک دیانت سے کام لے رہے ہیں؟ یہی ایک سوال ہے۔

حمزہ:

یہ اپنے ساتھ زنا بالجبر ہی تو ہے۔ دھکیلے جارہے ہیں، دھکیلتے جارہے ہیں اور رکنے کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ جانتے ہیں کہ سفر اپنی ابتدا سے ایک انگل بھی آگے نہیں سرکا ہے۔ (حمزہ پھر کسمسانے لگتا ہے جیسے پھر اندر ہی اندر کسی اعصابی تکلیف اسے توڑ رہی ہے۔)

واہی:

اگر اب کے تم کہیں جانا چاہو تو میری اجازت کے بغیر جا سکتے ہو۔

حمزہ:

کیا موت بھی اجازت طلب کر کے آتی ہے؟ (بار بار پہلو بدل رہا ہے۔)

واہی:

تم جیسوں سے اجازت نہیں لینی پڑتی۔ موت تم سے کوئی الگ چیز نہیں۔ تم ہی میں دبی چھپی بیٹھی ہے۔ جس دن تمھارا ایک ایک عضو ناکارہ ہو جائے گا، تمھارے ہاتھ پیر تمھارا کہا ماننے سے انکار کر دیں گے، اسی دن وہ بے دردی سے تم پر غالب آجائے گی اور تم اس طرح دبک کر رہ جاؤ گے جیسے چوہے کے منھ میں بلی... اوہ! معاف کرنا یعنی، یعنی، میرا مطلب ہے، خیر چھوڑو، مطلب تو تم سمجھ ہی گئے ہوگے۔

حمزہ:

نہیں سمجھا ڈیر۔

واہی:

اسی لئے کہتا ہوں ہر بات غور سے سننے کی عادت ڈالو۔ ایسا لگتا ہے دوسرا جب بات کرنا شروع کرتا ہے تو تم اس کی بات ختم ہونے تک اندر ہی اندر سوچتے رہتے ہو۔ گویا ہتھیار تیز کرتے رہتے ہو کہ اب اس کے بعد تمھیں کیا بولنا ہے۔ گویا بلا تعلق جواب سے تم دوسرے کو ایک نئی تکلیف میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ یہ بھی نظر انداز کرنے کا ایک فن ہے (سامعین سے مخاطب ہو کر) جسے موقع بہ موقع سب ہی کام میں لاتے ہیں۔ مگر... (حمزہ کی طرف رجوع ہو کر) تم سے زیادہ گھسا پٹا اداکار کوئی اور نہ ہوگا کہ پہلے ہی منظر میں تمھارے عمل اور تمھاری گفتگو کا تصنع سب لوگوں پر ظاہر ہو گیا۔ اسے ہی تو اوور ایکٹنگ کہتے ہیں (سامعین سے مخاطب ہو کر) کیوں بھائیو؟

حمزہ:

کیا اب پھر انھیں یاد دلانا ہوگا کہ ہم نے ایک ناشفتہ معاہدہ بھی کر رکھا ہے؟

واہی:

مطلب؟

حمزہ:

بس اتنی جلدی بھول گئے؟ (حمزہ بار بار پہلو بدل رہا ہے۔ اس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں ہیں۔) تم برابر آدھ گھنٹے سے کچھ تو بھی بکے جا رہے ہو اب میری باری ہے۔ صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تمھیں تو بولنے کا بواسیر ہو گیا ہے۔

واہی:

اپنے اپنے حوصلہ اور دانش مندی کی بات ہے۔ وقت سے بے وقوف ہی فائدہ اٹھاتے۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر) اس میں میرا کیا قصور؟

(حمزہ کھڑے ہو کر چھوٹی انگلی سے پیشاب کے لئے پر اجازت طلب کرتا ہے۔ واہی ایک لمحے کے لئے منھ بناتا ہے اور پھر وہ بھی اپنی چھوٹی انگلی حمزہ کی طرف کر دیتا ہے حمزہ دائیں طرف نکل جاتا ہے اور واہی بائیں طرف۔)

(پردہ گرتا ہے)

باب دوم

(پردہ اٹھتا ہے۔ واہی پلیا پر بیٹھا ہے اور حمزہ نیچے پتھر پر پلیا سے پیٹھ کر کے کچھ سوچنے میں مگن ہے۔)

واہی:

اتنے دھیان سے کیا سوچ رہے ہو؟

حمزہ:

(چونک کر واہی کی طرف دیکھتا ہے) میں اس مونگ پھلی والے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اب تک ضرور مر چکا ہوگا۔ تم نے جو اسے لمبا چوڑا لیکچر پلایا تھا۔ لگتا

ہے وہ بڑا کارگر ثابت ہوا...(رک کر) ایسا فرض کرنے میں حرج ہی کیا ہے کہ وہ مر چکا ہوگا؟ ہمیں تو صرف اس کی پھلی اور اس کی لازمی موت سے غرض ہے اور بس۔ کاش وہ پھر کہیں سے آنکلے اور ہم اس سے پھر وہی دو ڈھائی سو گرام مونگ پھلی مانگیں۔ اس کے خلوص کی تعریف تو بہرحال ہمیں کرنی چاہئے (سامعین سے مخاطب ہوکر) کیوں دوستو! وہ بڑا ایماندار بھی نظر آتا تھا۔ پھلیاں بھی اچھی سینک رکھی تھیں اور تول میں بھی اس نے ہمیں دھوکا نہیں دیا۔ اور پیسے؟ پیسے بھی مروت میں چھوڑ دیئے۔ ..دوست؟ (واہی سے) تمھارے چند منٹ اور لوں گا۔ میں ایک نظم اسی کے نام منسوب کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا دھیان سے سنو! (سامعین سے) آپ بھی۔

(حمزہ اپنی نظم انتہائی محویت کے عالم میں سناتا ہے۔ ایک ایک لفظ واضح طور سے ادا کرتا ہے۔ ہر مصرعے پر موضوع کے مطابق ایکشن بھی کرتا جاتا ہے۔)

وہ کبھی سفید ہوجاتا
کبھی نیلا
اور کبھی گہرا زرد
نئی اور پرانی وہ تمام چیزیں
جو اس نے پچھلے تیس برسوں کے بہترین زمانے میں
جمع کی تھیں
ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے
دروازے کے باہر نکل گئیں
وہ حسرت بھرے جسم کے ساتھ بستر پر دراز تھا
کہ اب وہ ایک سوکھی ہوئی لکڑی بن چکا تھا
اسے ایک دم مرنے کا تجربہ نہیں ہوا
وہ اپنی مختصر اور ادھار مانگی ہوئی زندگی میں
کئی بار مرا
اور کئی بار اسے سانسوں کی نوک دار سوئیوں پر
راک اینڈ رول کرنا پڑا
ہر صبح اس کے سینے میں ایک عقیدہ ترخ جاتا
اور اس کا پالتو دیوتا سسک سسک کر اسی کے سامنے
پیر پٹخنے لگتا ہے
وہ جب تک زندہ رہا
ایک پرامن زندگی کی شدید آرزو میں مرتا رہا
الوؤں کی پیٹھ پر اس نے رت جگے کاٹے
اور ابابیلوں کی صحبت میں اپنی سالگرہ منائی
اس کے لئے سب اپنے پرائے ہتھیار تھے
اور وہ خود سب کا منہ بولا قاتل
کہ اس نے اپنے ساتھ ایک دن سب کو قتل کردیا تھا

واہی:

کیا تم میرے ضبط کا امتحان لے رہے تھے؟ اتنی خشک اور بور نظم سنا کر کسی سنجیدہ انسان کو بور کرنے سے تمھیں شرم نہیں آتی؟ ہریالا سے بہتر ہے کہ یہ نظم تم اپنے ہی نام منسوب کردو۔ تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں خود تمھاری قبر کے سرہانے ایک سفید پتھر گاڑ کر بڑے بڑے حروف میں یہ الفاظ کندہ کراؤں گا۔

(واہی انتہائی پرجوش اور ولولہ انگیز انداز میں دہراتا ہے۔)

وہ کبھی سفید ہوجاتا
کبھی نیلا
اور کبھی گہرا زرد
نئی اور پرانی وہ تمام چیزیں
جو اس نے پچھلے تیس برسوں کے بہترین زمانے میں
جمع کی تھیں
ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے
دروازے کے باہر نکل گئیں
یہی نہ!

حمزہ:

واہ۔ واہ وا!! واواوا... بہت خوب (واہی حیرت سے حمزہ کی طرف دیکھتا ہے) تم نے ابھی ابھی جتنے خوبصورت ڈھنگ سے یہ الفاظ ادا کئے جی چاہتا ہے کہ اپنی نظم تمھارے نام کیوں نہ کردوں۔ ایک دوست کے ناطے میں تمھیں اور دے بھی کیا سکتا ہوں؟ تمھیں بھی میری دسترس سے باہر کچھ توقع نہیں کرنا چاہئے۔

واہی:

لگتا ہے (کلمے کی انگلی سے کنپٹی کی طرف اشارہ کرتا ہے) رفو چکر ہوگیا ہے۔ (وقفہ) کیا تمھارے پاس ماچس ہے؟

حمزہ:

میرے پاس سوائے تمھارے اور ہے ہی کیا؟

واہی:

(سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے) بے حد شدید درد اٹھا ہے سر میں۔

حمزہ:

میرے بھی آدھے سر میں زوروں کی تکلیف ہے۔

واہی:

(حیرت اور حقارت کے ساتھ) ہونہہ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تمھاری پنڈلی میں، گردن میں، پیٹھ میں پیٹ میں، کہیں بھی درد ہوسکتا ہے۔ مگر یہ سر میں درد کیا ہوتا ہے؟ ارے بھائی یہ تو ہم جیسے لوگوں کے لئے ہے جو ایک عدد سر بھی رکھتے ہیں اور تم ہو کہ خوامخواہ پھٹے میں پاؤں اڑاتے ہو۔ آدھے سر کی بات کرتے ہو۔ ارے بھائی (ایک انگلی سے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے) کیا آدھا کیا پورا۔ سر ہو تو بات کرو۔

حمزہ:

اسی لئے بار بار میں اسی نکتے پر زور دیتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے اجنبی کیوں نہیں بن جاتے۔ جب ملیں پینترے کر کے ملیں۔ چہروں پر پردے ڈال لیں اور کورس میں مکالمے ادا کرتے رہیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے پر کوئی احساس بھی نہیں کریں گے۔ ویسے احساس کرنے والے کو ذلت ہی اٹھانی پڑتی ہے۔ تم نے اگر کسی پر احسان کیا تو وہ اسے اپنا حق سمجھے گا۔ ایسے آدمی سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔

واہی:

استعارے کی زبان میں خوب سمجھتا ہوں۔ کمزور کیڑوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق بھی نہیں۔ تم کتنا ہی استحصال استحصال چیختے رہو، دیمک تمھارے بوسیدہ جسم کو چاٹ ہی لے گی۔ اور تم اپنے کوڑھ زدہ جسم کو ایک عذاب سے کم نہیں سمجھو گے۔ اور تو اور وہ تمھاری ماں ہی کیوں نہ ہو وہ تم سے حد درجہ نفرت کرنے لگے گی کہ اس کی جھولی میں تمھارے لئے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں۔ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی دوسرے کو دے سکتا ہے۔ جو میرے پاس نہیں اس کی تمھیں امید بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ اور یہ کیا ضرور ہے کہ میں تمھارا حاجت روا بننا پسند کروں؟ تمھارے بچے تمھاری موت پر اس لئے آنسو نہیں بہائیں گے کہ تمھاری جدائی ان کے لئے برداشت سے باہر ہے بلکہ اس لئے کہ دوسرے بھی ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ انھیں بہر حال یہ رسم نبھانا ہی ہوگی اور پھر تمھیں دفنانے کے لئے قبر بھی پختہ بنائیں گے، اس لئے نہیں کہ تم ان کے محترم باپ تھے، بلکہ اس لئے کہ تم قبر کے اندھیرے سے گھبرا کر کہیں بھاگ نہ نکلو اور پھر انھیں تمھاری دوسری موت کے تکلیف دہ انتظار سے گذرنا پڑے۔ (یکا یک پلیا کی پشت سے آواز آتی ہے۔)

جعفر:

بچاؤ! بچاؤ! ارے کوئی ہے! بچائیے... (پل کے پیچھے سے مسلسل آواز آرہی ہے مگر حمزہ اور واہی اپنی باتوں میں مصروف ہیں، گویا سن ہی نہیں رہے ہیں۔)

حمزہ:

تمھاری ایک ایک بات میرا پوسٹ مارٹم کر رہی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا، کیا تمھیں الہام بھی ہوتا ہے؟

واہی:

تم جیسے بیوقوفوں کی صحبت سے ہی مجھے یہ تجربے ملے ہیں۔

حمزہ:

تو اس ہنٹر باز پولیس والے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جو کچھ دیر پہلے ہمیں ذلیل کر گیا۔ اس نے ہماری اوقات بتادی۔

واہی:

وہ تو ایک بہترین دوست بن سکتا ہے۔ میں نے اس میں ایک مردانہ وقار پایا ہے۔ میں تو اس کا نائب بننے میں بھی عذر نہ کروں گا مگر تم ایسوں کی تقدیر میں اس کا نائب بننا بھی نہیں لکھا، سمجھے۔

جعفر:

(بہت درد بھری آواز) بچاؤ! بچاؤ! ارے کوئی ہے؟ بچاؤ...!

حمزہ:

(بڑے اطمینان کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے) ارے کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو اس اندھیرے میں؟ (واہی پھر اپنی سگریٹ ہاتھ میں لے کر تیار بیٹھ گیا ہے۔)

واہی:

ہاں ہم بڑی دیر سے سگریٹ ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ ہم تمھارے شکر گذار ہوں گے اگر تم ہمیں ماچس دے سکو۔

(دونوں جعفر کے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ مگر کوئی جواب نہیں آتا۔)

حمزہ:

مجھے تو کوئی بڑا تماشا نظر آتا ہے۔ ضرور کسی نئے جال میں ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔

جعفر:

خدارا بچاؤ۔ ارے کوئی ہے؟ بچاؤ! بچاؤ!

واہی:

(اپنی ٹارچ سے پلیا کے پیچھے دیکھتا ہے) ہم پوچھ رہے تھے کیا تمھارے پاس ماچس ہوگی؟ (اپنی سگریٹ انگلیوں میں دبائے ہوئے پیچھے جعفر کو دکھاتا ہے) دیکھو نا کب سے منہ کے مادھو بنے بیٹھے ہیں۔

حمزہ:

ہماری مجبوری اب عذاب بنتی جارہی ہے لیکن اگر تم ماچس دے سکو۔

جعفر:

بھائی صاحب پہلے مجھے بچاؤ... (نہایت عاجزی سے) خدا کے لئے مجھے بچالو!

واہی:

ارے تم پھر چلانے لگے۔ بڑے خود غرض نظر آتے ہو۔ ہمارے سوال کا جواب تو دیتے نہیں اور اپنی ہی کہے جاتے ہو۔ ماچس نہ سہی لائٹر ہی سہی۔

جعفر:

میں بیڑی سگریٹ نہیں پیتا۔ خدا کے لئے بھائی جان میری مدد کرو۔ صاحب مجھے بچاؤ۔

حمزہ:

تم بھی عجیب آدمی ہو، تم بیڑی سگریٹ نہیں پیتے تو تم سے کون بے وقوف کہہ رہا ہے کہ بیڑی سگریٹ پیو۔

واہی:

ہم تمھیں سگریٹ دینے والے بھی نہیں (واہی ایک جھٹکے سے اپنی سگریٹ واپس اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔) ہم تو تم سے ماچس کا پوچھ رہے تھے ماچس کا۔

جعفر:

(کراہتے ہوئے) بھائی صاحب کہہ دیا نہ ماچس میرے پاس نہیں ہے میں بیڑی سگریٹ نہیں پیتا۔ کسی طرح مجھے اس دلدل سے تو نکالو۔ خدا تمھارا بھلا کرے گا۔

واہی:
نہیں۔ جب تک تم ماچس نہ دو گے اس وقت تک ہم بھی تمہیں نہیں بچائیں گے۔
حمزہ:
ہم اپنی زندگی میں برابر کے لین دین کے قائل ہیں۔
واہی:
اگر تم ہمیں ماچس نہیں دے سکتے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ تمہیں بچائیں؟
حمزہ:
تم کو آ کر کس امید پر ہم بچائیں؟
واہی:
جو شخص ایک ماچس مہیا نہیں کر سکتا وہ ہمارے کس کام کا؟
حمزہ:
نہیں، نہیں۔ ہم تمہیں نہیں بچائیں گے۔
واہی:
اچھا ایک بات بتاؤ... یہ سنسان جنگل اور پھر یہ اندھیری رات۔ یہ تو اتفاق سمجھو کہ ہم لوگ یہاں کچھ دیر سستانے بیٹھ گئے۔ اگر ہم اور آگے نکل گئے ہوتے تو تمہیں کون بچاتا؟
حمزہ:
ظاہر ہے اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے خاموشی سے مر جاتے۔
واہی:
(پر زور آواز میں چلاتے ہوئے) یقین رکھو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔
حمزہ:
(ہاتھ جوڑ کر) معاف کرو۔ بھائی ہم تمہاری طرح فالتو نہیں۔
واہی:
لیکن کیا بتا سکتے ہو کہ تم ہو کون؟
حمزہ:
اور اس بیابان میں اتنی رات گئے کیا کرنے آئے تھے؟
واہی:
ہماری ایک ایک بات کا صحیح صحیح جواب دیتے جاؤ۔
جعفر:
(گھٹے ہوئے گلے سے) دیکھیے ان سب باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ میں اس وقت مشکل میں ہوں۔ میری جان خطرے میں ہے۔ مجھ پر رحم کریں۔ میں کمر کمر تک پھنس گیا ہوں۔
واہی:
تمہارا کیا نام ہے؟ کیا تم بتا سکتے ہو اس دلدل میں کیسے پھنس گئے؟ اور پھر یہ اندھیری رات یہ سنسان جنگل!
حمزہ:
تم تو مضبوط جسم بھی رکھتے ہو۔ کتنے ہٹے کٹے ہو۔ ہاں ذرا خود زور لگاؤ۔ لگاؤ ایک زوردار چھلانگ۔ تمہاری دوستی ہمارے لئے باعث فخر ہوگی۔
واہی:
(ٹارچ سے پھر جعفر کی طرف روشنی ڈالتا ہے) موٹی موٹی آنکھوں سے ہماری طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟
حمزہ:
ہم کیا تمہارے دشمن ہیں؟
جعفر:
نہیں، تم میرے دوست ہو۔ میرے بھائی۔ میرے ہمدرد۔ بس مجھے تمہاری مدد چاہئے۔ کسی طرح مجھے بچاؤ۔ للہ بچالو۔ موت میرا دامن کھینچ رہی ہے۔
حمزہ:
(واہی سے) چھوڑو بھی یہ بیکار باتیں، ان باتوں سے ہمارا کیا تعلق؟ بہت بور ہو گئے (جماہی لیتا ہے) لاؤ سگریٹ ہی کا ایک دور ہو جائے۔ ارے (ایک لمحہ رک کر سوچتا ہے)... مگر ہمارے پاس ماچس تو ہے ہی نہیں۔ ماچس؟ (آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے، پھر پیچھے مڑ کر جعفر سے) ارے کیوں دوست، تمہارے پاس ماچس تو نہ ہوگی؟ بڑی مہربانی اگر تم ہمیں ماچس دے سکو۔
واہی:
ہاں ہم تمہارا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔

(حمزہ پلیا سے نیچے اتر کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، پھر پنڈلیوں تک ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر اور اوپر یہاں تک کہ کمر تک ہاتھ لے جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ جعفر کے ڈوبنے کے تعلق سے کسی بے نتیجہ سوچ میں گم ہے۔ وہ ایک پاؤں دھیرے دھیرے اوپر اٹھاتا ہے جیسے کسی دلدل میں پھنس گیا ہو، پھر ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں پاؤں اوپر اٹھاتا ہے۔ اس عمل کے ساتھ ہی وہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ واہی گردن ٹیڑھی کر کے حقارت آمیز نظروں سے حمزہ کو دیکھتا ہے۔ حمزہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو جاتا ہے اور 'اونہہ' کہہ کر پھر واپس پلیا پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔)

جعفر:
بھائی دیکھو مجھ پر رحم کرو۔ اس وقت میری جان خطرے میں ہے۔ میں اب کمر کمر تک دلدل میں پھنس چکا ہوں۔ آپ لوگ اسی طرح باتیں بناتے رہے تو میں مر ہی جاؤں گا۔ خدا سے ڈرو۔ مجھے بچالو۔
واہی:
نہیں ہم تم پر رحم نہیں کر سکتے۔ ایک وقت تھا جب خدا ہم میں تم میں سے تھا۔ وہ اسی سرزمین پر ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ جب ہم ہنستے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ ہنستا تھا۔ جب ہم روتے تھے تو وہ ہم سے ہمدردی کرتا تھا۔ جانتے ہو پھر کیا

ہوا؟ اس نے ہم پر رحم کھایا اور ہم نے ایک دن اسے بڑی سنگدلی سے قتل کر دیا۔ (حمزہ بے حد انکسار اور عاجزی بلکہ قدرے استعجاب کے ساتھ واہی کی بات سن رہا ہے) وہ اب ہم میں نہیں رہا ایک آسمانی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ نہیں بھائی میں کسی پر رحم نہیں کرسکتا۔ رحم انسان کے اعضا کو سست بنا دیتا ہے، تم نے کیا نطشے کو کبھی پڑھا ہے؟

حمزہ:

لیکن تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ ابھی ابھی میرے ساتھی پر تمھیں رحم آیا تھا۔ کیا تم اس سے انکار کرو گے؟ (جعفر کے سسکنے کی آواز مسلسل آ رہی ہے۔ وہ کبھی کبھی بچاؤ! بچاؤ! کی بھی آواز لگا رہا ہے۔)

واہی:

یہی تو تم نہیں جانتے۔ جو چیز تمھارے بس سے باہر ہے تم اکثر اسی کو چھچھوندر کی طرح چباتے رہتے ہو۔ دنیا کی ہر چیز ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی۔ تم مصلحت اور موقع شناسی کے معنی بھی نہیں سمجھتے۔ کیا تمھیں وقت کی نزاکت کا بھی لحاظ نہیں ہے؟

حمزہ:

(مردنی چہرہ بنا کر) ابھی کیا ہے؟ اسی کا تو شکار ہوں۔ (جعفر کی بچاؤ! بچاؤ! کی آوازیں جاری ہیں۔)

واہی:

یہ تمام ڈراما آدمی کی پیٹھ سے شروع ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے اوجھل ہو جانے کے بعد تم میرے ساتھ یہی سلوک کرنے والے ہو۔ کیا تم مجھے بخش دو گے؟

حمزہ:

بالکل نہیں۔ تمھاری ایک ایک بات چنگاریوں کی طرح میرے خون میں جذب ہو کر رہ گئی ہے۔

واہی:

مجھے تمھارے رحم کی ضرورت بھی نہیں۔ ہر دماغ (انگلی سے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور پھر یہ جسم (پورے جسم کی طرف دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے) کس لئے ہے؟ رحم دوسرے کو محتاج کا عادی بنا دیتا ہے۔

جعفر:

مجھے بچانے کی کوشش کرو بھائی صاحب! اب تمھاری مزید غفلت میری موت کا سبب بن سکتی ہے۔ خدارا مجھے بچا لو۔

واہی:

بھائی تم خوش نصیب ہو کہ تمھیں ہم جیسے دوست ملے ہیں جو تمھاری بھلائی چاہتے ہیں۔ یقین رکھو ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔

حمزہ:

اچھا ہم تمھیں بچا بھی سکتے ہیں۔ مگر ہمیں ڈر لگتا ہے کہ یہ سنسان جنگل اور پھر یہ اندھیری رات۔ کہیں تم کوئی بھوت پریت یا کوئی بدروح تو نہیں ہو۔ یا پھر کوئی جاسوس... کوئی بم وم تو نہیں ہے تمھارے پاس؟

جعفر:

جناب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں آپ ہی کی طرح ایک انسان ہوں۔ مجبور ہوں، لاچار ہوں، مدد کی بھیک مانگتا ہوں۔

واہی:

یار تم ضرور کوئی فلسفی ہو۔ دنیا سے اکتائے ہوئے نظر آتے ہو۔

حمزہ:

کیا زندگی تمھارے لئے کوئی معنی رکھتی ہے؟

واہی:

اگر تم اس کا مقصد سمجھتے ہو تو کیا ہمیں بتانے کی تکلیف کرو گے؟

حمزہ:

دیکھو دوست! تم ہمیں سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

واہی:

آخر اتنا احسان تو مانو گے کہ اس سنسان جنگل میں تھوڑی دیر ہم نے تمھاری تنہائی کو بانٹا ہے۔ (جعفر اب بلند آواز سے رو رہا ہے۔)

حمزہ:

پھر بھی میں کب سے تمھیں گوارا کر رہا ہوں۔ ہاں تو بتاؤ زندگی تمھاری نظر میں کیا معنی رکھتی ہے؟

جعفر:

(ایک دم سے بھڑک کر، رونا بند کر کے) یہ تم کیا فالتو سوال کیے جا رہے ہو؟ وقت ہتھیلی سے نکلا جا رہا ہے۔ میں سینے تک پھنس چکا ہوں۔ اگر اب بھی تم نے نہیں بچایا تو میں مر ہی جاؤں گا۔ بھائی تم مجھے بچا سکتے ہو تو خدا کے لئے فضول بکواس مت کرو۔ رحم کرو۔ مجھے بچا لو۔ اب بھی ہاتھ سے کچھ نہیں گیا ہے۔

واہی:

اچھا تو یہ بتا دو کہ تم جی کر کیا کرو گے؟ فرض کرو اگر ہم نے تمھیں بچا بھی لیا تو کیا تم سمجھتے ہو موت سے ہمیشہ کے لئے نجات پا لو گے؟

حمزہ:

یا تم سمجھتے ہو کہ اس وقت تم موت کو دھوکا دے لو گے تو موت تمھارا تعاقب چھوڑ کر تمھارے دشمنوں کو لگ جائے گی؟

واہی:

اے عظیم انسان! ضرور تم کوئی فرشتہ ہو یا کوئی پیغمبر جو بھٹکے ہوؤں کو راہ بتاتے ہیں۔ تو کیا تم ہمیں جنت کا راستہ بتانے آئے ہو؟

جعفر:

اب میں گلے گلے تک ڈوب چکا ہوں۔ اور سوائے تمھارے مجھے کوئی بچا بھی نہیں سکتا۔ شوکت... شوکت... میں مر رہا ہوں شوکت! ہائے میں نے تمھیں خفا نہ کیا ہوتا... اب تو کیچڑ میرے حلق میں بھری جا رہی ہے۔ آ آ آ...ہ...ہ...ہ...

واہی:

ارے اس شخص نے ہمارا نام بھی فرض کر لیا! آدمی بڑا معاملہ فہم نظر آتا ہے۔

حمزہ:

اے پیغمبر! تم واقعی کیا ہماری نجات کے لئے اپنی جان دے رہے ہو؟

واہی:

ہاں یاد آتا ہے مسیح نے بھی آدم کے گناہ کے عوض اپنے کو قربان کر دیا تھا۔ کیا واقعی تم بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہو؟

حمزہ:

مقدس پیغمبر! ہم تمھیں ضرور بچائیں گے۔ ہم تمھیں ہم مرنے نہیں دیں گے۔ تم تو ہماری نجات کا ذریعہ ہو۔ لیکن ماچس تمھارے پاس...

(حمزہ کی نگاہ یکایک دور پڑے ہوئے ایک سفید پتھر پر پڑتی ہے۔ پلیا سے اتر کر وہ اسے اٹھالیتا ہے۔ وہ مسلسل اسے ہر زاویے سے دیکھ رہا ہے جیسے اس میں اسے کوئی نئی چیز نظر آرہی ہو۔)

واہی:

ارے اتنے غور سے اس پتھر کو کیوں دیکھ رہے ہو؟

حمزہ:

میں اس کے رنگ کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ ذرا تم ہی بتاؤ کس رنگ کا ہے؟

واہی:

تم بھی عجیب آدمی ہو۔ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ سفید ہے سفید۔ تم کالے اور سفید کا فرق بھی نہیں جانتے؟ تعجب ہے۔

حمزہ:

نہیں بھائی یہ سفید نہیں۔

واہی:

سفید نہیں... (حیرت سے) سفید نہیں تو پھر کیا ہے؟

حمزہ:

یہی تو راز ہے۔ تم جسے سفید کہتے ہو وہ میری نظر میں کالا ہے۔ دیکھو صاف کالا پتھر!

واہی:

(غصے اور جھنجلاہٹ میں حمزہ کے ہاتھ سے پتھر چھین لیتا ہے) اونہہ دماغ تو دماغ، اس شخص کی (سامعین سے مخاطب ہو کر) نظر بھی گئی۔

حمزہ:

(پیشانی پر شکن لاتے ہوئے منہ بنالیتا ہے) تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ہاتھ میں جا کر پتھر اپنا رنگ بدل لے گا؟ کبھی افریقہ کے کالے حبشیوں کو دیکھا ہے تم نے؟

واہی:

نہیں، مجھ کو ایسا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

حمزہ:

اسی لئے تو تمھیں نہیں معلوم کہ کالا رنگ کیسا ہوتا ہے! تم رنگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ (ایک دم مڑ کر وہ پلیا کے پیچھے ڈوبتے ہوئے جعفر کو پتھر دکھانا چاہتا ہے۔) کیوں بھائی؟ کیا تم ہمارے ایک الجھن دور کرو گے؟ ہم لوگ ابھی ابھی ایک نئی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ یہ پتھر دیکھ رہو ہو نا! کیا تم اس کے رنگ کے بارے میں اپنی رائے دے سکو گے؟ (جواب میں خاموشی رہتی ہے۔)

واہی:

(پلیا کے پیچھے ٹارچ کی روشنی ڈالتا ہے) ارے یہاں تو کوئی نہیں!

حمزہ:

چہ چہ چہ واقعی بے چارہ مر گیا... کیا اچھا ہوتا اگر ہم شروع میں ہی اسے بچالیتے۔ کتنی دیر سے چلا رہا تھا بچاؤ بچاؤ بچاؤ بچاؤ۔ مگر...

واہی:

خیر کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ یوں بھی تو اسے ایک نہ ایک دن مرنا ہی تھا۔ کل نہ مرا آج مر گیا۔ مجھ میں نہیں آتا آخر وہ زیادہ دن کیوں جینا چاہتا تھا؟ اسے یہ دنیا کیا دے سکتی تھی اور وہ دنیا کو کیا دے سکتا تھا؟

حمزہ:

اچھا ہی ہوا وہ دلدل میں پھنس کر مر گیا۔ لو مونگ پھلی کھاؤ۔ (واہی کی طرف ہتھیلی میں دو چار پھلیاں بڑھاتا ہے۔ واہی جھپٹ کر سب کی سب پھلیاں لے لیتا ہے۔) ہم غلط سمجھے تھے۔ وہ ہماری نجات کا ذریعہ نہیں تھا۔ خود اپنی نجات کے لئے یہاں آیا تھا اور...

شوکت:

(دور سے آتی ہوئی آواز جو پل پل نزدیک آرہی ہے) جعفر! جعفر! جعفر! کہا ہو؟

(آواز بہت قریب آگئی ہے۔ حمزہ اور واہی کان لگا کر سنتے ہیں، حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ واہی اپنی ٹارچ نکال کر سب سے پہلے پلیا کے پیچھے دیکھتا ہے اور پھر دائیں بائیں ہر طرف روشنی ڈالتا ہے۔ مگر اس وقت انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف جعفر! جعفر! کی آواز سنائی پڑتی ہے۔)

واہی:

یہ اب کون سی نئی آفت آگئی ہے؟ لگتا ہے آج ہماری خیر نہیں۔ ایک کے بعد ایک مصیبت چلی آرہی ہے۔ اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے۔

(آواز قریب آتی جاتی ہے اور آخر دائیں جانب سے ایک مضبوط جسم والا شخص نمودار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ بال بکھرے ہوئے، بڑی بڑی مونچھیں۔ وہ آدمی آستین کی گہرے رنگ کی بش شرٹ پہنے ہوئے ہے۔ اس کی پتلون بھی گہرے رنگ کی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس ہے۔ وہ آواز لگاتے لگاتے حمزہ اور واہی کے قریب آجاتا ہے۔)

واہی:

ارے کون ہو تم؟ اتنی رات گئے ادھر کیسے نکل آئے؟ کیا تمھیں ہماری تلاش ہے؟

حمزہ:

(شوکت کچھ بولنا ہی چاہتا ہے کہ حمزہ بیچ میں قطع کلام کرتا ہے) تم اتنے حیران و پریشان کیوں ہو؟ کیا تمھارے پاس ماچس ہے؟

شوکت:

جی نہیں۔ (یہ جواب سن کر حمزہ مردہ سا چہرہ بنالیتا ہے۔)

واہی:

کیا تم بھی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو؟

شوکت:

نہیں برادر! میں بدنصیب اپنا بھائی اس سنسان جنگل میں کھو بیٹھا ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ مجھ سے خفا ہو کر وہ ایک طرف نکل گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کدھر کھو گیا (امید اور خوش فہمی کے ساتھ) کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟

واہی:

نہیں ہمیں تو یہاں کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ (مونگ پھلی شوکت کی طرف بڑھاتا ہے) لو پھلی کھاؤ گے۔

شوکت:

شکریہ جناب۔ اس وقت میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ ایک ذرہ بھی حلق سے نہیں اتار سکتا۔ جعفر! جعفر! تم کہاں ہو جعفر...!

حمزہ:

کیا تمھارا بھائی کوئی فلسفی تھا؟

شوکت:

جی نہیں۔

حمزہ:

ایک عظیم انسان!

شوکت:

جی میرا بھائی تو...

حمزہ:

تو پھر وہ ضرور خدا کا پیغمبر یا ہماری نجات کا ذریعہ ہوگا؟

شوکت:

جی نہیں جناب۔ وہ میرا بھائی تھا بھائی! میرا ہمدرد، میرا محسن...

واہی:

(اچانک، جیسے کچھ انکشاف ہوا ہو) اس کا نام ہریالا تو نہیں تھا؟

شوکت:

جی نہیں اس کا نام جعفر ہے، جعفر۔

واہی:

کیا اس کی آنکھیں موٹی موٹی ہیں؟

شوکت:

(ایک دم مسرت کے ساتھ) ہاں اس کی آنکھیں بڑی بڑی روشن اور چمکیلی تھیں۔

واہی:

کیا اس کی قمیص سفید رنگ کی تھی؟

شوکت:

جی ہاں جی ہاں، بالکل۔ اس کی قمیص ایسی ہی تھی... تو کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟

(حمزہ چور نظروں سے پیچھے مڑ کر دلدل کی طرف جھانکتا ہے اور گردن لٹکا کر چپ بیٹھا رہتا ہے۔)

واہی:

اگر ہم تمھیں اس کا پتہ بتادیں تو تم ہمیں کیا انعام دوگے؟

شوکت:

میری حیثیت کے مطابق جو بنے گا اس سے بڑھ کر حاضر کروں گا۔ پہلے خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ وہ کہاں ملا تھا؟ کدھر گیا؟ وہ اب کہاں ہے؟

واہی:

ارے بھائی، کوئی خاص بات نہیں ہے وہ چلاتا رہا، چیختا رہا، ہم سے مدد مانگتا رہا۔ (حمزہ اس اثنا میں خاموشی سے اٹھ کر اسٹیج پر نہایت بے نیازی کے ساتھ ٹہلنے لگتا ہے اور ہر لمحہ ترچھی نظر سے شوکت کے ردعمل پر نظر رکھتا ہے۔) مگر پتہ ہے؟ ہم نے (پلیا کے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے) اسی دلدل میں اسے مرجانے دیا۔ مدد نہیں کی اس کی۔ کتنے فخر کی بات ہے کہ ہم ایسے دوست اسے ملے جو اس کی نجات چاہتے تھے۔ آخر وہ جی کر کرتا بھی کیا؟ اس زندگی سے تو موت ہی... (شوکت طیش میں آجاتا ہے اور دانت پیس کر غراتا ہوا لپک کر واہی پر جھپٹ پڑتا ہے۔ واہی اپنا دفاع کرنا چاہتا ہے مگر اس کی ایک نہیں چلتی۔ حمزہ بھاگ کر اسٹیج کے ایک کونے میں دبک جاتا ہے۔)

واہی:

ارے یہ تم کیا کررہے ہو؟ ارے ارے حمزہ! مجھے بچاؤ! میرے دوست مجھے بچالو۔ (حمزہ بائیں طرف کو اندھیرے میں بھاگنے لگتا ہے۔ واہی چیختا ہے۔) ارے اے اے حمزہ! حم زا... آ آ آ... کہاں ہو؟ (شوکت واہی کو اٹھا کر پلیا کے پیچھے دلدل میں پھینک دیتا ہے۔ زور سے چھپاکے کی آواز آتی ہے۔) ہائے ہائے میں ڈوبا میں ڈوبا۔ بھائی صاحب مجھ پر رحم کرو۔ ارے حمزہ، حمزہ... یہ کیا چیز میرے سینے سے ٹکرائی ہے؟ ہاتھ بڑھاؤ خدا کے لئے ہاتھ... اوہ اوہ یہ تو جعفر کا بدن ہے، اس کا سر میری ٹانگوں میں پھنس گیا ہے کیا... میں گیا، میں مرا...

(واہی کی آواز غٹ غٹ کی ہلکی آوازوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ شوکت کسی خونخوار مگرمچھ کی طرح جھپٹ کر حمزہ کی کمر پکڑ لیتا ہے۔ حمزہ کے منھ سے گھٹی گھٹی آواز نکلتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

☆☆☆

غزل

عثمان عارفی

شمارہ ۱،
جون ۱۹۶۶

قسمت بادۂ ہر جام اگر ہونا ہے
اور بھی عام تجھے خون جگر ہونا ہے
سب پہ ظاہر ہے رفیقان جنوں کا انجام
ہاں ہمیں خاک سر راہ گذر ہونا ہے
بے حجابانہ حجابات میں ہے جلوۂ دوست
عاشق انجمن آرائے نظر ہونا ہے
آج ہر ظلم کی تکمیل بھی ہوجانے دو
سختی دار سے اندازۂ سر ہونا ہے
جز ترے کون ہے اے ہمت عالی جس کو
رہبر قافلۂ شام و سحر ہونا ہے
بات تو جب ہے کہ سیراب ہو ویرانۂ غم
ابر تر آج تجھے دیدۂ تر ہونا ہے
ہوں گے قدموں کے نشاں راہبر راہ حیات
ہم جدھر ہوں گے زمانے کو ادھر ہونا ہے
یا ہر اک درد کو ہونا ہے یہاں سینہ فگار
یا ہر اک غم کو یہاں سینہ سپر ہونا ہے
اک دل گرم فغاں ایک نگاہ خونبار
اور کیا صاحب اعجاز و اثر ہونا ہے
عارفی آج کی اجڑی ہوئی اس دنیا میں
جو بھی ہونا ہے بہ انداز دگر ہونا ہے

مکالماتی غزل

عدیم ہاشمی

شمارہ ۱۸۷،
اکتوبر ۱۹۹۵

کہا ساتھی کوئی دکھ درد کا تیار کرنا ہے
جواب آیا کہ یہ دریا اکیلے پار کرنا ہے
کہا چہرے حقیقی کیوں دکھائے مجھ کو لوگوں کے
جواب آیا کہ تجھ کو آئینہ بردار کرنا ہے
کہا آنکھوں میں تصویر مسیحا کیوں ابھرتی ہے
جواب آیا ادا تجھ کو یہی کردار کرنا ہے
کہا یہ دل یہ کہتا ہے محبت ہے تو تیری ہے
جواب آیا کہ تجھ کو بھی یہی اقرار کرنا ہے
کہا کیوں سامنے چمکا دیا اتنا بڑا سورج
جواب آیا ہمیں سایہ پس دیوار کرنا ہے
کہا سورج کے ساحل پر اترنے کی تمنا ہے
جواب آیا اندھیرے کا سمندر پار کرنا ہے
کہا یہ راستہ بخشا ہے ناہموار کیوں مجھ کو
جواب آیا تجھے یہ راستہ ہموار کرنا ہے

میرا بچپن

عذرا عباس

شمارہ ۱۷۶،
اگست، ستمبر ۱۹۹۴

کہانی شروع کرنے سے پہلے یادداشت پر قابو پانا ضروری ہے۔

ایک ہلکی سی روشنی مرے سامنے ہے۔ وہ بہت پہلی صبح ہے۔ چھوٹے سے کمرہ نما برآمدے میں ہمارے سامنے چائے کے پیالے رکھے ہیں۔ ہم سب ایک دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ اور گرم گرم پھلکوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا فاصلے پر ایک پٹڑے پر چولھے کے سامنے بیٹھی ہماری ماں چمٹے سے کھٹ سے روٹی پکڑتی ہے۔ اور توے سے اتار کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہیں کہیں ہمارا باپ بھی بیٹھا ہے۔ ماں کا اس وقت کا سانولا چہرہ جس پر بڑی بڑی آنکھیں رکھی ہوئی تھیں، مجھے دھندلا سا یاد ہے۔ مجھے یہ وقت شاید اس لئے یاد رہ گیا کہ روٹی اور چائے کا مزہ جو اس وقت مرے منہ میں آرہا تھا، وہ آج تک باقی رہ گیا ہے۔

پھر اس کے بعد بالکل ایسے جیسے دن نکلتا ہے اور چیزیں روشن ہوتی جاتی ہیں میری یادداشت اس سے پہلے کی میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں شاید اس کے آس پاس کچھ کچھ جیسے ایک منظر میں، میں ایک کونے میں کھڑی اپنی چھوٹی بہن کو ننگ دھڑنگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یاد آرہا ہے، وہ پہلی بار سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شام کو بالکونی میں کھٹولے پر کھڑے ہو کر بگلوں کو بسیرا کرتے جاتے دیکھ کر چپکے چپکے ہاتھوں کے انگوٹھوں کو ایک دوسرے پر رگڑتے ہوئے آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کہنا بگلے بگلے دودھ لے سونے کی کٹوری دے۔ مجھے یاد نہیں یہ میں نے کس سے سیکھا تھا۔

پھر بالکل اسی طرح گھر میں ایک دن علی الصبح دھیمے دھیمے شور کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے۔ میں جاگ جاتی ہوں دوسرے کمرے میں پانی گرنے کی آوازیں اور میری ماں کی کراہوں کی آوازیں پھر ایک ننھے بچے کی باریک سی چیخ۔ میرے لئے وہ یاد بھی بہت دنوں تک ملگجی سی روشنی میں چیزیں ڈھونڈنے کی طرح رہی۔

مجھے یاد نہیں اس گھر میں کیسے سیڑھیوں کے نیچے جاتے تھے اور کیسے چھت پر اور کیسے میں اپنی چھت سے دوسری بلڈنگ کی سیڑھیاں اتر جاتی تھی۔ ایک منظر مرے سامنے ہے میں چھت پر چوکیدار سے کہہ رہی ہوں۔ "دلی دکھا دو۔" وہ میری کنپٹیوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ کر اونچا کر دیتا ہے۔ میں دور تک دیکھتی ہوں۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا دلی کیا ہے۔

پھر میں سیڑھیاں اتر رہی ہوں جو دوسری بلڈنگ میں جاتی ہیں، جہاں پہلی سیڑھی ختم ہوتے ہی ایک لڑکی اپنے گھر کے دروازے پر ایک وہیل چیئر پر بیٹھی ہے۔ اس واقعہ کو گذرے کتنے سال گذر گئے تھے نہیں معلوم۔ لیکن میری یاد میں وہ لڑکی کبھی چھت سے لٹکے جھولے پر ملتی ہے، اور کبھی وہیل چیئر پر، اور اس کی آنکھوں کا انتظار بھی مجھے یاد ہے وہ میری کنگھی کر رہی ہے مجھے گود میں سلا رہی ہے میں وہاں سے جب گھر جاتی ہوں تو میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟ پتہ نہیں وہ خود مجھے کیوں نہیں روکتی تھی۔ میں کیسے وہاں چلی جاتی تھی اور کب تک جاتی رہی۔

مجھے یاد آرہا ہے بارش کے پانی میں کھیلتے ہوئے اچانک آہستہ آہستہ جاتی ہوئی گاڑی کے پیچھے لٹک جانا۔ گاڑی تیز ہوتی ہے، میں پیچھے لٹکی ہوں۔ لوگ چلا رہے ہیں بارش کا پانی چاروں طرف۔ چھپ چھپ ہو رہا ہے۔ لوگ گاڑی کو رکوا رہے ہیں۔ گاڑی رکتی ہے اور میں سڑک پر کھڑے پانی میں جھٹکے سے گر جاتی ہوں اور غوطے کھانے لگتی ہوں۔ شور مچ رہا ہے۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر لے جا رہا ہے۔ "ابھی مرتے مرتے بچی ہے۔" پتہ نہیں وہ میرا باپ تھا یا بھائی۔

ایک سڑک سے گذرتے ہوئے میں ایک ٹھیلے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں، ٹھیلے کے اوپر چھجا سا بنا ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پر جو اس ٹھیلے کے چاروں طرف لپٹا ہے۔ آدھے شیر اور آدھے آدمی کی تصویر بنی ہے۔ کوئی چلا رہا ہے، "آدھا آدمی آدھا شیر!" بھیڑ لگی ہے میں ٹھیلے کے نیچے گھس جاتی ہوں۔ آدھے شیر کی کھال لٹک رہی ہے۔ مجھے جانے کیا سوجھتا ہے۔ آدھے شیر کی کھال دونوں مٹھیوں سے زور سے گھسیٹتی ہوں اور ٹھیلے سے باہر بھاگتی ہوں۔ بہت سے لوگ ہنس رہے ہیں۔ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگ رہے ہیں پتہ نہیں میں نے کب وہ کھال چھوڑی اور کب کیسے گھر پہنچی۔

ایک اور منظر مرے سامنے ہے۔ میں ٹوائلٹ میں بیٹھی ہوں۔ میرے

سامنے اوپر دیوار پر ایک چھپکلی چپکی ہوئی ہے۔ میں اس چھپکلی سے باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ چھپکلی میری باتیں سن رہی ہے۔ باہر ٹوائلٹ کا دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔ مجھے یہ منظر ایک بار کا یاد ہے۔ لیکن ایسے یاد ہے جیسے میں بہت دنوں تک اس چھپکلی سے باتیں کرتی رہی ہوں۔

یادداشتیں بالکل اس طرح ہیں جیسے چیزیں اندھیرے میں پڑی ہوں۔ اور آپ ٹارچ کی روشنی میں ٹٹول رہے ہیں۔ بعض دفعہ یہ ایک دم بھک سے روشنی میں اسی طرح آجاتی ہیں۔ جیسے سو پاور کا بلب جل جائے۔ اور سب کونوں کھدروں میں پڑی ہوئی مل جائیں۔ بعض دفعہ دھندلی یا ایک دم اندھیرے میں۔ میں انھیں اندھیرے میں ٹٹول رہی ہوں۔ کچھ تو یوں سامنے پڑی ہیں اور مجھے حیرت میں ڈال رہی ہیں۔ اور خود دریافت کرنے میں میری مدد کر رہی ہیں۔ کن کن چیزوں نے مجھے مل کر بنایا ہے۔

مجھے اس دن بہت تیز بخار ہے۔ مرا باپ مرے پائتی بیٹھا ہے اور کپڑے سے میرے پاؤں کے تلوے مل رہا ہے۔ کمرے میں دھندلکا سا ہے۔ میرے بہن بھائی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میرا باپ مجھ سے پوچھ رہا ہے، ''کیسی ہو؟ کیا چاہئے؟ کیسا لگ رہا ہے؟'' میں کبھی کبھی آنکھیں کھولتی ہوں، اور سامنے کھڑکی میں ٹنگے پنجرے کی طرف دیکھتی ہوں۔ تین چار دن ہوئے میرے بھائی نے نیا پنجرہ اور ایک چڑیا خریدی ہے۔ چڑیا پنجرے میں ادھر ادھر پھدک رہی ہے۔ مجھے اس وقت کی کوئی بھی کیفیت یاد نہیں۔ صرف اتنا کہ میں اپنے باپ سے پنجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہوں، ''اسے اڑا دو۔'' مجھے اپنے بھائی کی حالت بھی اس وقت کیا ہوئی تھی، یاد نہیں، لیکن میں دیکھ رہی ہوں وہ مجھے بہلانے کے لئے سارے کمرے کی کھڑکیاں دروازے بند کرتے ہیں۔ اور چڑیا کو پنجرے سے میرے سامنے نکال دیا جاتا ہے۔ چڑیا بعد میں میری آنکھوں سے بچا کر دوبارہ پنجرے میں ڈال دی جائے گی لیکن چڑیا روشن دان کے چھوٹے سے ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر نکل جاتی ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ اسی دن میرا بخار اتر گیا تھا۔

ایک اور منظر اکثر میری نگاہ میں اپنی یاد کے ساتھ آکر ٹھہر جاتا ہے۔ میں رات میں اچانک نیند سے اٹھتی ہوں۔ گھر میں سناٹا ہے۔ میں چاروں طرف دوڑ کر اپنے گھر والوں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ مجھے کوئی نظر نہیں آرہا۔ میں باہر بالکونی سے لٹک کر سیڑھیوں کو دیکھتی ہوں۔ میں رو رہی ہوں اور اپنی ماں کو آواز دے رہی ہوں۔ پھر میں دیکھتی ہوں کہ میری ماں اور باپ اور، بہن بھائی سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے ہوئے آرہے ہیں۔ شاید وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انھوں نے مجھے اکیلے کیوں چھوڑ دیا، مجھے یہ پتہ نہیں چلا۔ میں نے اکثر اپنی ماں سے اس کے بارے میں پوچھا بھی لیکن وہ خاموشی سے مجھے تکنے لگتی تھی۔ لیکن مجھے آج بھی یاد ہے میں پہلی دفعہ کسی خوف سے ملی تھی۔

دوسرا خوف مجھے اس ریڈیو کی آواز کا یاد رہ گیا ہے۔ جب میں اپنے برابر والے گھر میں کھیل رہی ہوں۔ ریڈیو بج رہا ہے۔ اچانک اس میں سے کسی بچے کی آوازیں آنے لگیں، بچاؤ، بچاؤ، وہ بچہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔ لیکن اس کی ماں گھر میں تیار ہو رہی ہے۔ بچہ ماں کو آوازیں دیتے دیتے ڈوب جاتا ہے۔ ماں بچے تک نہیں پہنچتی۔ ان آوازوں سے مجھے یہی کہانی سمجھ میں آئی تھی۔ میں وہاں زور زور سے رونے لگتی ہوں۔ وہ لوگ مجھے بہلا رہے ہیں۔ وہ خوف میرے پیٹ میں بھر گیا تھا۔

ایک اور منظر جب اس بلڈنگ میں برابر والے گھر کے چھوٹو سے میری لڑائی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس دن چھوٹو نے مجھے بہت مارا تھا۔ میں روتی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی تھی۔ مرا باپ پان چباتے ہوئے مری ماں سے باتیں کر رہا تھا جو اس کے قریب ہی سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھی۔ مرے رونے پر مرے باپ کو اچانک بہت غصہ آیا۔ جو منظر مجھے یاد ہے، اس میں چھوٹو کا باپ دروازے کی جالیوں کے پیچھے کھڑا ہوا دروازے کو سختی سے بند کر رہا ہے اور میرا باپ ان جالیوں سے اپنے پان کی پیک اس کے جھانکتے ہوئے چہرے پر پھینک رہا ہے۔ بعد میں، میں اور چھوٹو دونوں دوست بن گئے تھے۔ لیکن میرے باپ کی چھوٹو کے باپ سے بات چیت بند ہو گئی تھی۔ میرا باپ میری بعد میں ہونے والی لڑائیوں پر اکثر پہلی لڑائی یاد کر کے مجھے سناتا رہا۔

میں سیڑھیاں چڑھ رہی ہوں۔ میری ماں میرے آگے سیڑھیاں چڑھ رہی ہے۔ میں اپنی ماں کے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدم دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی ہوں۔ وہ میرا پہلا دن ہے، جب مجھے اسکول لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی ماں کے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدم آج بھی یاد ہیں جو مجھے پہلی دفعہ اسکول لے جا رہے تھے۔

ایک یاد میرے ذہن میں بہت واضح ہے۔ یہ کوئی نئی جگہ ہے۔ اب وہ بلڈنگ نہیں ہے۔ میرے سامنے دور تک پھیلا ہوا میدان ہے اور اندھیرے میں کوارٹروں کے سے ذرا فاصلے پر بچھی ہوئی چارپائیاں جن پر ہم لیٹے ہوئے ہیں۔ میں اپنے باپ کے ساتھ لیٹی ہوں، بہت دور کہیں کسی سڑک پر گاڑیاں گذر رہی ہیں وہ گاڑیاں میدان کی طرف رخ کر کے مڑتی ہوئی دور کہیں دور چلی جاتی ہیں۔ لیکن میدان میں مڑتے ہوئے دور سے ان کی روشنی مجھے ایسی لگتی تھی جیسے یہ روشنیاں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ اور میں خوف سے دیر تک جاگتے جاگتے جانے کب سو جاتی تھی۔

ایک اور منظر ہے۔ میں علی الصباح اٹھ کر کوارٹروں سے ملی ہوئی گلی میں گھر سے نکل کر کھڑی ہوتی ہوں۔ اچانک ایک کوارٹر کے پاس مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ملتا ہے میں رک جاتی ہوں اور اس کے دروازے کی جھری سے ناک لگا کر دیر تک کھڑی رہتی ہوں پھر یہ روز ہونے لگتا ہے۔ سب منع کرتے ہیں۔ مری

چھو بھی جو مجھے اکثر اس گھر میں نظر آتی ہے۔ مجھ پر کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ لیکن میں روز سب کو سوتا چھوڑ کر اور کبھی سب کی نظروں سے بچ کر اس کوارٹر کے دروازے کی جھری میں ناک دے کر دیر تک کھڑی رہتی ہوں۔ ایک دن وہ دروازہ کھل جاتا ہے۔ میں اچانک دروازہ کھلنے سے اندر جا کر گرتی ہوں۔ ایک عورت مسکرا کر مجھے دیکھتی ہے، جیسے وہ میری اس حرکت کو جان گئی ہو۔ خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں زور زور سے سانس لے رہی ہوں۔ اس عورت کی آنکھوں میں حیرت بھی ہے۔ مجھے یاد نہیں اس کے بعد میں کب تک وہاں جاتی رہی۔

میں ایک مکتب میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ بہت بڑا میدان پار کر کے مجھے وہاں پہنچایا گیا ہے۔ سرخ مٹی کی سیڑھیاں اس کے بعد ایک چبوترہ۔ چبوترے پر ٹاٹ پر بہت سے بچے بیٹھے ہیں وہ ایک آواز میں ایک ہی جملہ دہرا رہے ہیں۔ مجھے بیٹھنے سے پہلے بستہ اور تختی دی جاتی ہے۔ میں وہیں ٹاٹ پر بیٹھ جاتی ہوں۔ ہمارے بار بار بھی ایک کلاس ٹاٹ پر بیٹھی ہے وہ بچے بھی ایک ہی آواز میں ایک جملہ دہرا رہے ہیں۔ ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے بیٹھے ہیں۔ میں اس آواز کی گونج میں شامل ہو جاتی ہوں۔ ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے بیٹھے ہیں۔ سامنے بیٹھی ہوئی استانی مجھے خاموش کرتی ہے۔ میں سہم جاتی ہوں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے وہ بچے بھی سہمے ہوئے ہی ہیں۔ میں اپنے چاروں طرف ہری ہری ٹہنیاں اور ہرے ہرے طوطے ڈھونڈتی ہوں۔ لیکن وہاں ہمارے چاروں طرف صرف دھوپ سے بھرا چبوترہ تھا۔ کھلے ہوئے چبوترے پر ٹاٹ بچھے ہوئے تھے۔ اس دن اسکول سے واپسی پر مجھے تختی اور تختی پر پوتنے کی مٹی دی جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے تختی پوتنا مجھے بہت برا لگتا تھا۔ اس دن بھی میں تختی پوت کر نہیں لے گئی تھی۔ کلاس کی سب سے بڑی لڑکی جو مجھے اچھی نہیں لگتی تھی، میرے سر پر کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھی، تختی کیوں نہیں لائی؟ مجھے اس کا چہرہ بھی تختی کی طرح سپاٹ لگا تھا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ مجھے یاد آ رہا ہے میں تختی اس کے سر پر مار رہی ہوں اور اپنا بستہ اور جوتے چھوڑ کر بھاگ رہی ہوں۔ میں اس کے بعد اس اسکول میں نہیں گئی۔ مجھے اس اسکول سے نکال دیا گیا تھا لیکن وہ اسکول مجھے یاد رہ گیا ہے۔ میرے کانوں میں کبھی کبھی یہ آواز گونجتی ہے، ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے بیٹھے ہیں۔

بہت سے ایسے منظر جنھیں شاید نہیں بھلانا چاہیے تھا، ہو سکتا ہے، میں بھلا بیٹھی ہوں۔ لیکن جو یاد رہ گئے ہیں وہ کیوں یاد رہ گئے ہیں مجھے پتہ نہیں۔

ایک بار پھر ایک اسکول ہے جہاں مجھے

Bal bal black sheep, have you any wool?

یاد کرائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ٹیچر ہر لائن پر ایک حرکت بھی کرتی جا رہی ہے۔ اس کی نقل ہم سب بچوں کو کرنا پڑ رہی ہے۔ مجھے نظم سے زیادہ وہ حرکت اچھی لگ رہی ہے۔ شاید ان حرکات کی نقل میں نے اچھی کی تھی۔ مجھے نرسری سے پہلی کلاس میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ جہاں میری بڑی بہن بھی بیٹھی ہے۔ میں نے خود کو کبھی اپنی بڑی بہن سے چھوٹا نہیں سمجھا، میں بہت خوش ہوں میری بڑی بہن چپ چپ سی مجھے دیکھ رہی ہے۔

منظر بہت سے مری نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن بعض کے وقت کا تعین نہیں کر پا رہی ہوں۔ وہ پہلے کے ہوں یا بعد کے مجھے جو یاد آتا جا رہا ہے۔ تسلسل سے لکھ رہی ہوں۔

ایک وہ یاد جب میں اپنے باپ اور بہنوں کے ساتھ ٹرام پر جا رہی ہوں۔ میرے سامنے ایک سفید وردی میں آدمی بیٹھا ہے جو مجھے گھور رہا ہے۔ میرے ذہن میں اس کا نوجوان چہرہ آتا ہے، بڑی بڑی کشادہ آنکھیں، وہ مجھے دیکھ رہا ہے میں اس کے گھورنے پر تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں مرا باپ بالکل مرے برابر میں بیٹھا ہے۔ وہ شخص اچانک میری طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ میں فراک جھٹک کر اس کی گود کی طرف بڑھتی ہوں۔ پھر وہ شاید میرا نام پوچھ رہا ہے۔ میں اس وقت سب کو نظر انداز کیے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنے باپ کے تاثرات یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ ٹرام رکتی ہے اور وہ شخص مجھے گود میں لیے لیے اترتا ہے۔ ہم سب کو بھی شاید وہیں اترنا تھا۔ سامنے ٹھیلے پر چیزیں بیچنے والا کھڑا ہے۔ وہ ٹھیلے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے اور گلابی بندے مرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ باقی مجھے کچھ یاد نہیں ابا کا سلوک، اور نہ یہ کہ وہ شخص کہاں گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی کیفیت اور اپنی ہمک جو اس کے ہاتھ پھیلانے پر میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ شاید بہت دنوں کے بعد یا انھیں دنوں کے ارد گرد میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہی شخص ایک بہت اونچے گھوڑے پر ہمارے تین منزلہ فلیٹ کی بالکونی سے لگا کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس کا چہرہ ایک بڑے چوڑے گول تھال کی طرح بالکونی کی دیوار سے جھانک رہا ہے۔ جن پر وہی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں خوف سے بھاگ کر باہر کے دروازے کی طرف جاتی ہوں۔ دروازہ کھولتی ہوں تو اَنگنت بچوں کی بھیڑ دروازے سے اندر داخل ہونے لگتی ہے، جو مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں دیتے دہشت سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہ جانے اس خواب کا حقیقت سے کیا تعلق ہے مجھے آج تک پتہ نہ چل سکا۔

ایک منظر جب مرے گھر میں ایک بوڑھے کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرخ و سفید چہرے والا بوڑھا جس کو میں دادا ابا کہتی ہوں، دادا ابا جو مجھے یاد ہے، ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے تھے، چپل پہنو، منھ دھو، پاؤں دھو، مجھے ننگے پیر رہنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جب میں ان کے سامنے گرد و غبار سے بھرے پاؤں لے کر کھڑی ہوتی تو دادا ابا کا چہرہ سرخ ہو جاتا مردی تو باز نہیں آئے گی۔ میرے سارے بہن بھائی مجھے یاد نہیں کبھی ننگے پیر رہنے پر دادا ابا کی چھڑی سے پٹے ہوں۔ دادا کی اور میری جنگ جاری رہی، وہ مجھے صبح کو اٹھا کر نماز پڑھواتے سخت سردی میں ٹھنڈے

پانی سے وضو کرتے ہوئے میں شور مچا مچا کر روتی لیکن ایک چھڑی میرے سر اور کمر پر پڑتی رہتی۔ باقی گھر والے دم سادھے جانے کیا کر رہے ہوتے۔

ایک دن دادا مجھ سے گرم پانی سے اپنے پاؤں دھلوا رہے ہیں۔ میں ان کے پاؤں دھو رہی ہوں۔ اور روتی بھی جا رہی ہوں۔ میں کیوں رو رہی تھی مجھے یاد نہیں دادا کا مسکراتا ہوا چہرہ۔ میرا غصہ بڑھ رہا ہے۔ پھر وہ میرے پاؤں دھلوا رہے ہیں۔ یہیں دھو۔ میرے سامنے۔ میں پاؤں دھو کر پاؤں میں کھڑاؤں ڈالتی ہوں اور کھڑ کھڑ کر کے دادا کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ "دادا ابا" وہ سر اٹھاتے ہیں، یہ دیکھیں۔ میں اپنی کھڑاؤں ایک ایک کر کے پاؤں سے اچھالتی ہوں، اور ان کے سامنے ننگے پیر بھاگتی ہوئی باہر نکل جاتی ہوں۔ پھر بڑی دیر تک ان کی چھڑی میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

ایک دن وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ "دو پیاز لاؤ۔" میں پیاز لا کر دیتی ہوں۔ "انھیں اپنی بغلوں میں رکھ کر باہر صحن میں دھوپ میں لیٹ جاؤ۔" مجھے یاد نہیں میں نے کوئی خطا کی تھی۔ اس دن میرے پاؤں میں کھڑاؤں بھی تھی۔ "پھر کیا ہوگا؟" میں پوچھتی ہوں۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ "پھر تمھیں بخار چڑھ جائے گا۔ پھر پھر کوئی تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ سب تمھاری خاطر کریں گے۔" میں جھٹ بغل میں پیاز رکھ کر جلتی زمین پر دھوپ میں لیٹ جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے میری ماں منھ ہی منھ میں بڑبڑاتی ادھر سے ادھر پھرتی نظر آتی ہے۔ لیکن دادا کا سفید چہرہ مجھے دروازے کی اوٹ سے گاہے گاہے مسکرا مسکرا کر دیکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں جانے کب تک پڑی رہتی ہوں۔ لیکن مجھے بخار نہیں چڑھا۔ مجھے آج بھی دادا کا دروازہ کی اوٹ سے مسکراتا ہوا وہ چہرہ نظر آتا ہے جس پر شرارت بھری ہوئی تھی۔

جب تک دادا گھر میں رہے وہ میرے ارد گرد منڈلاتے رہے، یا پھر اپنے پاس بلا کر سزا کے طور پر بیٹھا لیتے۔ اور جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں جو میری سمجھ سے اکثر باہر ہوتیں۔ مجھے یاد ہے۔ وہ مجھ سے کہتے "چل، لفظ بنا، ح جگہ خالی۔ ی بیچ سے جگہ خالی۔ ت۔" وہ مجھ سے ایسے بے شمار لفظ بنواتے ہیں۔ جو بھی بوجھ لیتی ہوں۔ کبھی مجھے لگتا تھا کہ وہ یہاں بھی مجھے سزا دے رہے ہیں۔ شور مچا رہی ہوں۔ رو رہی ہوں۔ لیکن ان کے الفاظ ختم ہو کر نہیں دے رہے ہیں۔

مجھے اکثر دادا کی آواز اپنے باپ سے لڑتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ "اس کو مت پڑھواؤ۔ دیکھو پچھتاؤ گے۔" میرا باپ انھیں کیا جواب دیتا، مجھے یاد نہیں لیکن بعد کی میری حرکتوں پر میرا باپ اکثر مجھے یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ میرے باپ نے کہا تھا۔ "اس کو پڑھوانا مت۔"

اس دن اسکول میں ایک کھیل ہو رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی پریاں بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بیچ میں، میں بھی ایک پری بنی ہوئی ناچ رہی ہوں۔ اچانک دادا کی آواز آتی ہے۔ اسکول کے گیٹ پر وہ کھڑے چیخ رہے ہیں۔ "نکالو اس مردی کو!" باہر میں ناچتے ناچتے ایک لمحے کے لئے رکی ہوں، لیکن تیز میوزک نے مجھے رکنے نہیں دیا۔ ناچ ختم ہوتا ہے۔ میں باہر بھاگ کر دادا کے پاس آتی ہوں۔ اس دن اسکول کے اس کھیل میں رات ہو گئی تھی۔ دادا کی چھڑی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اسکول پہنچ گئی۔ اور پھر دیر تک دادا میں اور میرے باپ میں کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مجھے اس اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

دادا کی بڑھتی ہوئی شرارتوں نے مجھے بھی عاجز کیا ہوا تھا اگرچہ کہ میں نے اکثر ماں کو یہ کہتے سنا۔ "تم نے بہت ستایا تھا اپنے دادا کو، مجھے یاد ہے۔" اس دن میرے بڑے بھائی اور بہن کو روزہ رکھنا تھا۔ سب سحری میں اٹھ گئے تھے۔ میں بھی اٹھ بیٹھی ہوں۔ اماں بھائی کو خوب ٹھنسا رہی ہے، میری بڑی بہن کچھ نہ کچھ کھا رہی ہے۔ میں چپکے چپکے کڑھ رہی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں پوچھ رہا۔ میں دادا سے کہتی ہوں، "میں بھی روزہ رکھوں گی۔" دادا ابا دسترخوان پر بیٹھے ہیں۔ "ہاں کیوں نہیں۔" وہ ایک شرارتی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ ایک دم یہ طے ہو جاتا ہے، میں روزہ رکھوں گی۔ اماں پھر بھی مجھے کچھ نہیں کھلاتی۔ وہ بھائی کو ہی کھلائے جا رہی ہے۔ میں بھی حرص میں کھائے جا رہی ہوں اور جلدی جلدی ہاتھ مار رہی ہوں۔ لیکن پھر اپنے آگے کی دودھ جلیبی بھی مجھ سے نہیں کھائی جاتی۔ میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ مجھے روزے کی نیت کرا دی جاتی ہے۔ دادا ابا مجھے اپنے ساتھ نماز پڑھواتے ہیں۔ پھر میں سو جاتی ہوں۔ صبح میری آنکھ کھلتی ہے۔ میری چھوٹی بہنیں اس دودھ جلیبی کے پیالے کو ہاتھ میں لئے بیٹھی ہیں جو میں نہیں کھا سکی تھی۔ میں بستر سے کود کر اپنی جلیبی چھینتی ہوں اور ایک گھونٹ میں صاف کر جاتی ہوں۔ دادا ابا سامنے کھڑے ہیں۔ "ارے مردی تیرا روزہ تھا۔" مجھے اپنے روزے کے خاتمے کا پتہ چل کر افسوس ہوتا ہے، لیکن دادا ابا تسلی دیتے ہیں۔ "کوئی بات نہیں۔ بھول معاف ہے۔" میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ سب کھا پی کے بھی میرا روزہ ہے۔ لیکن دادا ابا کی آواز آتی ہے۔ "دیکھ پاخانے میں جا کر پانی نہ پی لینا۔ روزہ ٹوٹ جائے گا۔" کیا؟ میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پانی پاخانے میں بھی پیا جا سکتا ہے۔ پھر جب میں پاخانے کی طرف جاتی، دادا روکتے، خبردار پانی نہ پی لینا۔ روزہ رکھنے اور توڑنے کا مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔

لیکن یہ پتہ چل گیا تھا کہ چوری چھپے پاخانے میں پانی پانی پیا جا سکتا ہے۔ اور میں نے یہی کیا۔ دادا ابا کے بار بار کہنے کے باوجود بھی مجھے پیاس لگی اور میں تیر کی طرح پاخانے گئی اور نل سے غٹاغٹ پانی پیٹ بھر کے پیا۔ لیکن اس کے باوجود شام ہوتے ہی نڈھال ہو رہی تھی۔ میرے بہن بھائی جن کا روزہ کھلوایا گیا تھا ان کو کوئی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ روزے کے وقت آ کر میری ماں بھی میرے گرد منڈلا رہی تھی۔ دادا بھی پریشان ہو رہے تھے۔ لیکن روزہ کھولنے کے بعد دادا ابا نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ "بتا پاخانے میں پانی تو نہیں پیا تھا؟" "بھولے سے پیا تھا، ایک بار۔" میں نے اپنا شربت سے بھرا پیٹ پھلا کر انھیں جواب دیا تھا۔

دادا ابا کا گنجا گول سر ان کے سرخ و سفید چہرے پر چھوٹی سی پیشانی

سے شروع ہوتا تھا اور ایک چمکدار گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ مجھے دادا ابا کا وہ گول سر بہت اچھا لگتا تھا جس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی تھی۔ وہ ہر جمعہ کو گھر سے باہر پلنگ یا کرسی پر بیٹھ کر نائی سے اس گول سر کو اور گنجا کرواتے تھے۔ اور پھر اس پر کوئی ایسی چیز پھیری جاتی تھی جو ان کا سر دور سے چمکتا ہوا نظر آتا۔ میں اپنے بالوں سے عاجز ہونے لگی تھی۔ بال دھلنے کے بعد سلجھتے نہیں تھے۔ اور میری ماں کو اتنی فرصت کہاں تھی میں نے ایک دن دادا سے کہہ دیا۔ "دادا ابا میرے بھی بال کٹنے چاہئیں۔" دادا اچھل پڑے۔ "ہاں کیوں نہیں۔" انھوں نے نائی کو اشارہ کیا۔ اور پھر آناً فاناً میں اپنے گھنے گھنگریالے بالوں سے نجات پا چکی تھی۔ میں نے نائی کے آئینے میں دیکھا۔ میرا گول چکنا سر میرے چہرے پر برا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن جب میں اماں کو اپنا سر دکھانے کے لئے گئی تو اس کے دو ہتڑوں نے میرا حشر کر دیا۔ اور دادا ابا باہر کے دروازے سے اپنا گنجا سر نکال کر ہنس رہے تھے۔ مجھے یاد ہے جب تک دادا ابا ہمارے گھر میں رہے میں اور دادا دونوں ہر جمعہ کو اپنا سر گنجا کرواتے رہے اور میری ماں ہر بار چیختی رہی۔

دادا ابا کے زمانے کی باتیں بس اتنی ہی روشنی میں آتی ہیں، اور صرف ایک ہی خیال ابھرتا ہے کہ ایک بوڑھا جو مجھ سے لڑ کر اور مجھے ستا کر خوش ہوتا تھا۔ شاید میں بھی اس لڑائی میں برابر کی شریک تھی۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا۔ دادا کہاں چلے گئے تھے۔ لیکن پھر اس کے بعد دادا ابا کبھی میرے گھر میں نظر نہ آئے۔ کافی دنوں بعد ایک دن دونوں وقت ملتے ہوئے ہمارے گھر کے صحن میں اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ میرا باپ ایک پلنگ پر بیٹھا رو رہا تھا اور ماں بھی کسی کونے میں کھڑی شاید رو رہی تھی، تو مجھے پتہ چلا کہ دادا مر گئے ہیں۔ موت کا کوئی بھی بھیانک تاثر اس وقت تک میرے ذہن میں نہیں تھا بس سوائے اس کے کہ دادا ابا اب کبھی میرے گھر نہیں آئیں گے۔ لیکن اس دن کے بعد بہت دنوں تک دادا مجھے یاد آتے رہے۔ اور میں بات بات پر رو دیتی تھی۔

مجھے نئے اسکول میں لے جایا جا رہا ہے۔ جہاں میرا بڑا بھائی میرا داخلہ کروانے کے لئے لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں پنسل اور ایک نئی کاپی ہے۔ مجھ سے کچھ لکھوایا جاتا ہے۔ ایک استانی میری کاپی دیکھتی ہے۔ استانی میرے بھائی سے کچھ کہہ رہی ہے، جس کا مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کل سے مجھے اس اسکول میں آنا ہے۔ میں اپنی نئی پنسل استانی کی میز پر بھول جاتی ہوں۔ اپنے بھائی کے ساتھ باہر جانے کے لئے سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے اپنی پنسل یاد آتی ہے۔ میں واپس بھاگ کر اپنی پنسل لینے استانی کے پاس جاتی ہوں اور اس سے اپنی پنسل اٹھا کر لے جانے کے لئے پوچھتی ہوں۔ ایک زوردار طمانچہ مرے منھ پر پڑتا ہے۔ کون سی پنسل؟ پنسل سامنے میز پر پڑی ہوتی ہے۔ میں پنسل کو گھورتی ہوئی واپس بھائی کے پاس آجاتی ہوں جو باہر میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

دوسرے دن میں اسکول جا رہی ہوں۔ میری کتابیں اور کچھ کاپیاں خریدی گئی ہیں۔ میرا پہلا دن اس اسکول کا ہے، جس میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسکول ٹیچر نے منھ پر تھپڑ مارا تھا۔ مجھے نئی دوات، نئی سلیٹ بھی لے کر دی گئی ہے۔ رات بارش ہوئی تھی صبح بہت چمکیلی اور صاف تھی۔ میرا دل اسکول جاتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ میں ساری کتابوں اور سلیٹ اور اپنی روپہلی دوات اپنے ہاتھوں کی کہنیوں اور بازو پر ٹکائے جھومتی چلی جا رہی ہوں۔ میرے راستے میں میرے ساتھ ساتھ ایک چوڑی پانی کی نالی شور مچاتی بہ رہی ہے۔ بارش کا گدلا پانی شوں شوں کی آواز کے ساتھ غلغلاتا ہوا بہ رہا ہے۔ وہ صبح اور اسکول کا پہلا دن اور کتابوں پر رکھی میری روپہلی دوات، میں اتراتی ہوئی اسکول کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ نہ جانے کب میری دوات کتابوں سے پھسل کر بہتی ہوئی نالی میں گر جاتی ہے۔ میں جھومتی ہوئی جا رہی ہوں۔ اچانک میری نگاہ اپنی کتابوں پر پڑتی ہے۔ روپہلی دوات نہیں ہے۔ میں دوڑنے لگتی ہوں۔ کبھی پیچھے کی طرف کبھی آگے کی طرف۔ کہاں گری میری دوات! میں رو رہی ہوں اور اس دوات کو نالی کے بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ پھر میں نالی کے پانی کے ساتھ دوڑنے لگتی ہوں، شاید میری دوات نالی کے پانی کے ساتھ بہ کر آ رہی ہوگی۔ پتہ نہیں کتنا وقت گذر گیا دوات نہیں پہنچی۔ میں اسکول بھی نہیں پہنچی۔ لیکن ان سب میں آدھا دن گذر جانے کے بعد میں تھکی ماندی گھر میں گھسی تو سب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے ان کی کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ لیکن ان سب نے اپنا غصہ مار پیٹ کر نکالا۔ میں بہت دنوں تک اسکول کے راستے میں اس نالی میں اپنی دوات ڈھونڈتی ہوئی جاتی۔ اس کی روپہلی چمک بہت دنوں تک میری آنکھوں میں کھبی رہی۔

چھوٹی گلی کے بیچ میں وہ گھر جہاں بیری کے پیڑ سے بیر جھڑتے تھے۔ جس رات ہوائیں چلتیں، ڈھیر سارے بیر گلی میں بکھر جاتے۔ میں بہت سارے بچوں کے ساتھ ان بیروں کو چننے جاتی۔ اور اپنی فراک کے دامن میں بیر بھر کر گھر لاتی۔ ایک دن جانے مجھے کیا سوجھی۔ اس رات ہوائیں تیز چل رہی تھیں میرا باپ تہجد کی نماز کے لئے اٹھا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں دبے پاؤں تیزی سے دروازہ کھول کر اندھیرے میں تنگ گلی میں نکل گئی۔ چاند کی روشنی میں گلی میں ڈھیروں بیر مرے سامنے چمک رہے تھے۔ بیر چنتے چنتے مرے فراک کا دامن وزنی ہو گیا تو میں گھر کی طرف بھاگی۔ گھر میں آہستہ سے دروازہ کھول کر گھستے ہوئے بھی باہر صحن میں تسبیح پڑھتے ہوئے میرے باپ نے مجھے دیکھ لیا۔ شاید مرے باپ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "اندھیرے میں گئی تھی۔ اکیلی۔" وہ میری دونوں چوٹیوں کو اپنی مٹھیوں میں گھسیٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا، "اندھیرے میں تجھے خوف نہیں آیا؟" بیر میری فراک کے دامن سے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ مجھے جلدی تھی۔ پٹائی سے جان چھوٹے تو میں بیر چھپاؤں کہیں میرے، بہن بھائی ان بیروں کو نہ دیکھ لیں۔

اس وقت میری ماں میرے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتی جا رہی ہے، اور منھ ہی منھ میں پتہ نہیں مجھے کیا سنا رہی ہے۔ میں اپنی فراک میں ننھی سیپیاں بھرے بیٹھی ہوں جو گھر سے باہر تارکول کی سڑک سے ذرا فاصلے پر کچی مٹی کے گھروں کی دیواروں پر چپکی ہوئی تھیں۔ میں اکثر کچھ نہ کچھ کرنے یا کچھ کرنے

کے لئے یا ان سیپیوں سے کھیلنے کے لئے ان دیواروں تک پہنچ جاتی اور اپنی انگلی سے ننھی کو جو بھربھری مٹی کی دیواروں میں دھنسی ہوتی تھیں اور دور سے سفید سفید چمکتی ہوتیں، انھیں ایک ایک کرکے نکالتی جاتی تھی اور فراک کے دامن میں جمع کرتی جاتی۔ کبھی کبھی میں ماں کے ساتھ سوئی دھاگے سے انھیں پرونے بیٹھ جاتی۔ اپنے اس کھیل میں، میں کسی کو شریک نہیں پاتی۔ مجھے یاد ہے۔ اس وقت میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں اکیلی چلچلاتی دھوپ میں اکثر تنہا کھڑی یہ سیپیاں بٹور رہی ہوتی۔ اور اکثر اپنی ماں کی مار کھاتی لیکن جب میں تنہا ہوتی تو ان دیواروں کے پاس جا کھڑی ہوتی جن کی سیپیاں مجھے اکثر اشارے کرکے بلا لیتی تھیں۔

مجھے نہیں یاد وہ کون سی چیز تھی جو مجھے باہر پتلی گلی میں اکیلے چلنے پر مجبور کرتی تھی۔ میں اس پتلی گلی میں دور تک چلتی چلی جاتی۔ اور رنگ برنگے ننھے کانچ کے ٹکڑے اور ریت میں دھنسے ہوئے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے چنتی ہوئی چلتی رہتی۔ مجھے اس بات کا احساس بھی نہیں رہتا کہ میں کتنی دور نکل آئی ہوں۔ واپسی پر اماں میری درگت کے انتظار میں بیٹھی ملتی۔ جانے کیسی بدروح ہے۔ وہ روہانسی ہورہی ہوتی۔ بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ مٹی سے کانچ کے ٹکڑے سے چنتی ہے۔ لیکن میں اماں کو کیا بتاتی۔ ریت سے ان ٹکڑوں کو کھوجنے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ یہ ٹکڑے دور تک صرف میرے انتظار میں ریت میں چھپے ہوئے پڑے ہیں۔

مجھے یاد ہے۔ ہم سب بھائی بہن صبح اسکول جاتے ہوئے اماں کے پاس باورچی خانے میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اماں دودھ کے پیالے بھر بھر کر میرے بھائیوں کے آگے رکھتی ہے اور ایسی آنکھوں سے انھیں دیکھتی جاتی ہے جیسے وہ بہت بڑا کام کرنے جارہے ہیں۔ اور ہم بہنوں کے ساتھ سامنے چائے کے پیالے رکھ دیتی ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے اس دن سے پہلے میں ہمیشہ کڑھتی جاتی تھی۔ لیکن اس دن مجھے جانے کیا ہوگیا۔ اماں نے جیسے ہی دودھ کے پیالے میرے بھائیوں کے سامنے رکھے، میں کھڑی ہوئی اور ایک ہی لات سے دونوں کے پیالے لڑھکا دیئے۔ روز دودھ پیتے ہو! میں شاید چیخی بھی تھی۔ سب ہکا بکا مجھے دیکھ رہے تھے اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا، میں اماں کے کوسنے کی آوازوں کے درمیان اپنا بستہ اٹھا کر دروازے سے باہر بھاگ گئی۔

مجھے اپنی ماں کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی آنکھوں میں کبھی میرے لئے غصہ نظر آتا اور کبھی وہ خوف زدہ ہوکر مجھے دیکھتی۔

کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے وہ میری حرکتوں پر مجھے خاموش داد دے رہی ہے۔ تمام شور شرابے اور میرے خلاف بولنے کے باوجود یہ دہری کیفیت مجھے اکثر اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ یہ سب کچھ صرف لکھتے وقت ہی یاد نہیں آرہا ہے۔ یادداشتوں کے منظر اکثر میرے اردگرد ہی رہتے ہیں۔ اور میں کسی بھی نئے منظر کے ساتھ کسی پرانے منظر کا سرا پکڑ لیتی ہوں۔ میں اکثر اپنی یہ یادیں دوسروں کو سناتی رہی ہوں۔ جن میں، میں کبھی خوش ہوجاتی ہوں، اور کبھی افسردہ۔

ایک وہ یاد جو کہانی سی بن گئی ہے۔ جب ٹیچر پہلی بار مجھے کلاس میں میرا نام لے کر پکارتی ہے۔ وہ سب سے کہہ رہی ہے۔ کون سی بچی اس دھن پر ناچے گی؟ کوئی ٹیبلو ہونے جا رہا ہے۔ وہ ڈیسک بجا کر دھیمی آواز میں گنگناتی ہے۔ ''جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں''۔ سب لڑکیاں دم سادھے بیٹھی ہیں۔ میں اس کے ہاتھوں کو ڈیسک پر مارتے ہی اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگتی ہوں۔ وہ مجھے پکارتی ہے اور پھر کلاس سے باہر لے جاتی ہے گول برآمدے میں وہ اس گانے پر جو اس نے اپنی آواز میں تیار کیا ہے، میرا ناچ دیکھتی ہے۔ میں اس کو دیکھے بغیر اس کی آواز کی لے پر جھوم رہی ہوں۔ بہت اچھا کرتی ہو۔ کل تم آؤ گی سفید فراک پہن کر۔ صبح سویرے۔ وہ تاکید کرتی ہے۔ میں راضی ہوں۔ گھر پہنچ کر بھول جاتی ہوں۔ میرے پاس ایک ہی سفید فراک ہے جو میں پہنے ہوں۔ رات گئے اچانک یاد آتا ہے۔ میں اپنی فراک اتار کر دھوتی ہوں۔ صبح اٹھ کر دیکھتی ہوں وہ سوکھی نہیں تھی۔ رات کی اوس نے اسے سوکھنے نہیں دیا۔ میں جلدی جلدی استری کرتی ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ میرے گھر میں کوئلوں کی استری ہوتی تھی۔

پہلے وہ کوئلے گرم ہوتے تھے۔ اس کے بعد۔ مجھے دیر ہورہی تھی۔ وقت گذر رہا ہے میں گیلی ہی فراک پہن کر اسکول بھاگتی ہوں۔ فراک کالر اور گھیرے کے جوڑ سے بہت گیلی ہے۔ اسکول سے باہر میدان میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی ہے میں اس میدان میں ہوا کے ساتھ گھومنے لگتی ہوں۔ جھمکا گرا رے، جھمکا گرا رے۔ پتہ نہیں کتنا وقت گذر جاتا ہے۔ لوگ مجھے حیران ہوکر دیکھتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ فراک کالر اور گھیرے سے نہیں سوکھتی۔ پتہ نہیں کب اسکول لگتا ہے، کب گھنٹی بجتی ہے۔ ناچتے ناچتے مجھے سناٹے کا احساس ہوتا ہے، اسکول لگ گیا۔ میں دوڑتی ہوں۔ برآمدے میں اسٹیج بنا ہے۔ اس کے سامنے لوگ کھڑے ہیں۔ ایک بچی ناچ رہی ہے جھمکا گرا رے میں لوگوں کو ہٹاتی ہوئی اندر گھستی ہوں۔ میری ٹیچر سامنے کھڑی ہے، اس کے چہرے پر بیزاری اور گھبراہٹ ہے۔ وہ مجھے کھینچ کر باہر لے جاتی ہے اور تھپڑوں کی بارش میرے منہ پر کردیتی ہے۔ ''کہاں مرگئی تھی؟ مجھے ذلیل کردیا۔'' میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا بتاؤں۔ مجھے اپنا کوئی قصور نظر نہیں آیا۔ میں خود بہت رونا چاہتی ہوں، میری جگہ دوسری لڑکی ناچ رہی ہے۔ میوزک جاری ہے۔ جھمکا گرا رے۔ میں آج بھی یاد کرتی ہوں اپنی فراک کا سکھانا اور وہ ناچ جو ہلکی اور دھیمی دھوپ میں جو میدان میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ گانا جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں۔

ایک یاد پھر وہی اسکول ہے، شاید وہی ٹیچر ہے۔ ٹیچر مجھے بلا کر کہتی ہے ''تمھیں پنسلین لانا ہے۔'' سامنے میدان پار کرکے دکانیں ہیں۔ وہ میری مٹھی میں پیسے بند کروا کر مجھے بھیجتی ہے۔ ''جلدی آنا۔'' میں اسکول سے باہر آتی ہوں۔ باہر میدان میں کسی ہوٹل سے گانے کی آواز آرہی ہے۔ ''آج میں آزاد ہوں دنیا کے چمن میں'' وہ آواز اور پہلی بار اسکول کے وقت پر میرا باہر نکلنا۔ نہ جانے کیوں میرا پورا جسم اس گانے کے ساتھ ناچنے لگتا ہے، میں ناچنے لگتی ہوں۔ گول گول

گول۔ آج میں آزاد ہوں۔ کتنی دیر ہوگئی گانا رک جاتا ہے۔ میں بھاگتی ہوئی دکان پر پہنچتی ہوں کب چیزیں خریدتی ہوں۔ کب اسکول واپس ہوتی ہوں لیکن وہ ٹیچر میرے کلے نوچ رہی ہے۔ اتنی دیر کہاں تھی؟ سامنے دکانیں تھیں مجھے اس کی مار کا کوئی احساس نہیں ہے۔ بس وہ سرشاری اور مستی جو میرے جسم پر پھیلی ہوئی ہے، وہ گول گول گھومنا اس آواز کی گونج کے ساتھ جو پورے میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔

ایک منظر اور میری نگاہوں کے سامنے میری یاد میں روشن ہو جاتا ہے۔

میں اپنے باپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میں روز یا اکثر اپنے باپ کے ساتھ یہاں سے گذرتی تھی۔ کیوں گذرتی تھی، یہ مجھے یاد نہیں۔ ہمارے راستے میں ایک ندی آتی تھی۔ میں اور میرا اباپ ندی کے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ ندی کا پانی جیسے بلبلاتا ہوا بہ رہا ہے۔ اس کے کنارے بہت سے بچے اور بھینسیں نہا رہی ہیں۔ اس راستے پر جاتے ہوئے میرا باپ ہی میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں ابا کی انگلی پکڑے ہوئے ہوں۔ آج وہ بچے کچھ زیادہ شور مچا رہے ہیں، شاید رات بارش ہوئی تھی۔ چاروں طرف کیچڑ بھی ہے۔ میرے دل نے ان بچوں کی مستی اور خوشی نے ہلچل مچادی۔ "ابا دیکھیں!" میں اشارہ کرتی ہوں ان بچوں کی طرف جو ایک دوسرے پر پانی اچھال اچھال کر ندی میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں۔ میرے باپ نے مجھے اور ان بچوں کو باری باری گھورا۔ "سیدھی چلو۔" اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر جھٹکا۔ جیسے کوئی خوف یقین کے ساتھ میری انگلیوں سے اس کے دماغ تک پہنچ گیا ہو۔ ہم ایک بار پھر اسی راستے سے واپس ہو رہے تھے۔ میرا باپ تین چار قدم مجھ سے آگے ہے۔ میں ان بچوں کو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہوں۔ اچانک میرے پاؤں ندی کی طرف بڑھتے ہیں اور مجھے پانی میں گرا دیتے ہیں۔ میرا باپ مجھے پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ اس کا چہرہ اسی وقت مڑ رہا ہے، جب وہ میرے قدموں کی چاپ کو اپنے پیچھے سے سرکتے ہوئے سنتا ہے۔ لیکن جب تک میں پانی میں ہوتی ہوں۔ گدلی ندی کا پانی میرے منھ میری ناک اور کانوں تک مجھے اٹھائے ہے۔ میں پہلی بار تیرنے کا مزہ اٹھا رہی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں مزے کی دنیا میں زیادہ دیر ٹھہرتی، ابا اس گندے گدلے پانی میں ٹخنوں ٹخنوں بھاگتے ہوئے مجھے پکڑ رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر گھر میں میری ماں مجھے نہلاتے ہوئے کوس رہی ہے۔ اس کے کوسنے مجھے یاد نہیں۔

میری ماں سے زیادہ میرا اباپ مجھ سے قریب تھا۔ میری اپنے باپ سے دوستی ہے۔ اپنی ماں کا جو ہیولا اپنے بچپن کا یاد ہے، وہ بہت کام کرتے ہوئے۔ میرے بیمار بھائی کو ایک کولھے پر لٹکائے ہوئے۔ اور میرے باپ کی حرکتوں پر کڑھتے ہوئے یا خوش ہوتے ہوئے اور کبھی تیز یا کبھی دھیمی آواز میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی پیدائش کا دن بھی یاد ہے۔ میری ماں کپڑے دھو رہی ہے، میں اس کے قریب ہی ایک پٹرے پر بیٹھی ہوں۔ وہ جب جھکتی ہے تو اس کے سانولے چہرے پر بے چینی سی پھیل جاتی ہے۔ میں ٹکر ٹکر اپنی ماں کو دیکھے جا رہی ہوں۔ اچانک وہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد نہیں گھر میں میرے سوا اور کون کون تھا۔ لیکن میری ماں مجھ سے کہہ رہی ہے، "جا بیٹا گلی کی نکڑ سے کلو دائی کو بلا لا۔"

کلو دائی کو میں اکثر ماں کے پاس آتا ہوا دیکھتی ہوں۔ "پہلے اپنی پھوپھی کو بلانا۔" پھوپھی اور کلو دائی دونوں کو بلانے کے لئے میں دوڑ پڑتی ہوں۔ ماں کا سفید ہوتا ہوا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔ مجھے خوف آ رہا تھا۔ کلو دائی تیلی گلی کے نکڑ پر کھڑی مل جاتی ہے۔ کلو دائی ماں نے بلایا ہے۔ اماں اماں۔ میں رونے لگتی ہوں۔ کلو دائی ہنس رہی ہے۔ چل چل۔ میرے ساتھ چل۔ مجھے پھوپھی کے پاس بھی جانا ہے میری پھوپھی اسی گھر میں رہتی ہے، جہاں میں کواڑوں میں خوشبو کی تلاش میں نکل جاتی تھی۔ لیکن کلو دائی میرا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی مجھے گھر کی طرف لے جاتی ہے۔ کلو دائی ماں کے کمرے میں گھس جاتی ہے۔ دروازہ بند کر لیتی ہے۔ مجھے یاد نہیں میرے، بہن بھائی کیا کر رہے تھے۔ لیکن اتنا یاد ہے، کہ میں دروازے کے قریب کھڑی کان دروازے سے گھسیڑے ہوئے ہوں اور آوازیں سن رہی ہوں۔ صرف کلو دائی کی آئیں بائیں شائیں آوازیں آ رہی ہیں۔ اماں کی کوئی آواز نہیں ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اماں چپ کیوں ہے؟ کلو دائی کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہی۔ اماں چپ ہی رہتی ہے۔ بس ایک تیز چنچناتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ اماں کی آواز "یا علی یا علی!" میں سکون کا سانس لیتی ہوں۔

اس دن میں گھر دیر سے پہنچی ہوں۔ اسکول سے واپسی پر پکی سڑک کے کنارے زخمی حالت میں پڑا ہوا بلی کا بچہ میرا راستہ روک لیتا ہے۔ بچوں کے غول کے غول گذر رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک پتھر ایک دوسرے پر مارتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی ہوں۔ میرا پتھر اس کی پہلے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پڑتا ہے۔ وہ باریک آواز میں منھ اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے میاؤں کرتا ہے۔ میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ میں نے اسے زخمی کر دیا۔ میں وہیں بیٹھ جاتی ہوں۔ اس کی نڈھال حالت پر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اسکول سے واپسی پر مجھے بھوک اور پیاس دونوں لگی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے لگتا ہے وہ بھی بھوکا ہے۔ میں دوڑ کر پانی مانگتی ہوں۔ پانی میں اپنی مٹھی میں لے کر اسے پلاتی ہوں۔ بلی کا بچہ اب بھوکا تھا۔ میں بھی بھوکی تھی، بچہ گھر نہیں لے جا سکتی تھی۔ ماں کو ہمیشہ یہ کہتے سنا تھا۔ بلی سے دمہ ہو جاتا ہے۔ میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ راستے سے گذرنے والی لڑکیوں کے غول جو مجھ پر ہنستی اور مجھے دھکے دے کر گذرتی جا رہی تھیں، ختم ہو گئے تھے۔ میں نے بچے کو ایک پیڑ کی چھاؤں کے نیچے رکھ دیا۔ بچہ اور میں جانے کب تک وہاں ایسے ہی بیٹھے رہے۔ میرے بھائی مجھے ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور مجھے پکڑ کر گھر کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا۔ بلی کا بچہ وہیں دبکا زخمی حالت میں بیٹھا رہ گیا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے میں اس پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی۔ وہ جگہ خالی تھی تھوڑی دیر میں کھڑی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔

پتہ نہیں کس واقعے نے دوبارہ اس واقعے کو میری یادداشت میں جگایا ☆☆☆

عرفان ستار

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

یوں ہی بے یقیں یوں ہی بے نشاں، مری آدمی عمر گذر گئی
کہیں ہوں نہ جاؤں میں رائیگاں، مری آدمی عمر گذر گئی
کبھی سائبان نہ تھا بہم، کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی بے مکاں کبھی لامکاں، مری آدمی عمر گذر گئی
ترے وصل کی جو نوید ہے، وہ قریب ہے کہ بعید ہے
تجھے کچھ خبر تو ہو جان جاں، مری آدمی عمر گذر گئی
کبھی مجھ کو فکر معاش ہے، کبھی آپ اپنی تلاش ہے
کوئی گر بتا مرے نکتہ داں، مری آدمی عمر گذر گئی
کوئی طعنہ زن مری ذات پر، کوئی خندہ زن کسی بات پر
پئے دل نوازی دوستاں، مری آدمی عمر گذر گئی
ابھی وقت کچھ مرے پاس ہے، یہ خبر نہیں ہے قیاس ہے
کوئی کر گلہ مرے بد گماں، مری آدمی عمر گذر گئی
اسے پالیا اسے کھو دیا، کبھی ہنس دیا کبھی رو دیا
بڑی مختصر ہے یہ داستاں، مری آدمی عمر گذر گئی
تری ہر دلیل بہت بجا، مگر انتظار بھی تا کجا؟
مری بات سن مرے رازداں، مری آدمی عمر گذر گئی
کہاں کائنات میں گھر کروں، میں یہ جان لوں تو سفر کروں
اسی سوچ میں تھا کہ ناگہاں، مری آدمی عمر گذر گئی

شمارہ ۲۶۷،
اپریل ۲۰۰۳

مری کم مائگی کو ترے ذوق نے دولت حرف تازہ بیاں سونپ دی
میں کہ ٹھہرا گدائے دیار سخن مجھ کو یہ ذمہ داری کہاں سونپ دی
قاصد شہر دل نے مرے خیمۂ خواب میں آکے مجھ سے کہا جاگ جا
بادشاہ جنوں نے تجھے آج سے لشکر اہل غم کی کماں سونپ دی
میرا ذوق سفر یوں بھی منزل سے بڑھ کر کسی ہمرہی کا طلب گار تھا
اس لئے وصل کے موڑ پر ہجر کو اس نے رہوار دل کی عناں سونپ دی
تشنگی کو مرے شوق کی لہر نے کس سراب نظر کے حوالے کیا
کیسے بنجر یقیں کو مرے خواب نے اپنی سرسبز فصل گماں سونپ دی
احتیاط نظر اور وضع خرد کے تقاضوں کی تفصیل رہنے ہی دے
یہ مجھے بھی خبر ہے کہ میں نے تجھے اپنی وارفتگی رائیگاں سونپ دی
اپنے ذوق نظر سے تری چشم حیراں کو تازہ بہ تازہ مناظر دیئے
تیرے پہلو میں دھڑکن جگانے کی خاطر ترے جسم کو اپنی جاں سونپ دی
رازداری کی مہلت زیادہ نہ ملنے پہ احباب سب مجھ سے ناراض ہیں
قصہ گو مجھ سے خوش ہیں کہ میں نے انھیں ایک پر ماجرا داستاں سونپ دی
میری وحشت پسندی کو آرائش زلف و رخسار و ابرو کی فرصت کہاں
تو نے کس بے خودی سے یہ امید کی یہ کسے خدمت مہ وشاں سونپ دی
دل پہ جب فکر خوں اور عشوہ طرازوں کی یلغار کا زور بڑھنے لگا
میں نے گھبرا کے آخر تری یاد کو اپنی خلوت گہ بے اماں سونپ دی
کارگاہ زمانہ میں جی کو لگانے سے آخر خسارہ ہی مقسوم تھا
یہ بھی اچھا ہوا میں نے یہ زندگی تیرے غم کو برائے زیاں سونپ دی
اس نے ذوق تماشا دیا عشق کو خوشبوؤں کو صبا کے حوالے کیا
مجھ بگولا صفت کو نگہبانی دشت وحشت کراں تا کراں سونپ دی
مجھ میں میرے سوا کوئی نہ تھا جو ہوس کے تقاضے نبھانے پہ مائل بھی تھا
میں نے بھی تنگ آکر اسی شخص کو ناز برداری دلبراں سونپ دی
ایک امکان کیا گنگنایا مرے چند اشعار میں حرف اظہار میں
میں یہ سمجھا خدائے سخن نے مجھے مسند بزم آئندگاں سونپ دی

عرفان ستار

شمارہ ۲۸۷،
دسمبر ۲۰۰۴

تجھ کو چشم تحیر سے تکتا ہوا صرف میں ہی نہیں آئینہ بھی تو ہے
جان من حسن کی بات اپنی جگہ مسئلہ کوئی اس کے سوا بھی تو ہے
دشت فرقت کی اس تشنگی تک نہیں، آزمائش فقط ہجر ہی تک نہیں
اس سے آگے تمنا کے اظہار کا ایک دشوار تر مرحلہ بھی تو ہے
میرا لہجہ تردد سے خالی رہا اور چہرہ تاثر سے عاری رہا
خال و خد سے ادھر لفظ سے ماورا ایک احوال بے ماجرا بھی تو ہے
حسن تیرا بہت جاں فزا ہی سہی، خوش نظر ہی سہی، خوش ادا ہی سہی
سن مگر دل ربا تیرا نغمہ سرا دیکھتا ہی نہیں سوچتا بھی تو ہے
حرف کی جستجو میں پگھلتا رہا شاعر خوش نوا روز جلتا رہا
تو سنے تو سنے ورنہ ہر بات کا سننے والا کہیں اک خدا بھی تو ہے
کس قدر خوش نفس کس قدر خوش ادا یاد کے پھول کھلتے ہوئے جا بجا
عشق کے باب میں رنج بھی ہیں تو کیا عشق کے دم سے اک فضا بھی تو ہے
وہ توقع پہ پورا اترتا نہیں میں اگر چپ رہوں تو سمجھتا نہیں
یوں تو کہنے کو ہے وہ مرا ہم نوا اک سخن کا مگر فاصلہ بھی تو ہے
وہ نہیں تو سخن کی ضرورت نہیں مجھ کو سب سے تکلم کی عادت نہیں
ہجر سے کچھ سوا ہے مرا واقعہ حرف کی موت کا سانحہ بھی تو ہے

شمارہ ۲۹۲،
مئی ۲۰۰۵

کاوش روزگار میں عمر گذار دی گئی
جبر کے اختیار میں عمر گذار دی گئی
لمحۂ تازہ پھر کوئی آنے نہیں دیا گیا
ساعت انتظار میں عمر گذار دی گئی
دست سبک شعار سے شوق رفوگری کا تھا
جامۂ تار تار میں عمر گذار دی گئی
بام خیال پر اسے دیکھا گیا تھا ایک شب
پھر اسی رہ گذار میں عمر گذار دی گئی
کھینچ رہی تھی کوئی شے ہم کو ہر ایک سمت سے
گردش بے مدار میں عمر گذار دی گئی
رکھا گیا کسی سے یوں ایک نفس کا فاصلہ
سایۂ مشک بار میں عمر گذار دی گئی
زخم امید کا علاج کوئی نہیں کیا گیا
پرسش نوک خار میں عمر گذار دی گئی
دھول نظر میں رہ گئی اس کو وداع کر دیا
اور اسی غبار میں عمر گذار دی گئی
ساری حقیقتوں سے ہم صرف نظر کیے رہے
خواب کے اعتبار میں عمر گذار دی گئی
آیا نہیں خیال تک شوق کے اختتام کا
خواہش بے کنار میں عمر گذار دی گئی
نغمۂ نو بہار کی سمع خراشیاں کہاں
شور سکوت یار میں عمر گذار دی گئی
وہ جو گیا تو ساتھ ہی وقت بھی کالعدم ہوا
لمحۂ سوگوار میں عمر گذار دی گئی
نشۂ لمس اولیں اترا نہیں وصال سے
آخر اسی خمار میں عمر گذار دی گئی

عرفان صدیقی

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

صدائے شام سرِ آب جو ہے کتنی دیر
یہ بازگشت بھی اے دشت ہو ہے کتنی دیر

بدن دریدہ شجر، مہربان سوزنِ برگ
مگر یہ زحمتِ دستِ رفو ہے کتنی دیر

وہ ابر پھر کبھی آیا ادھر تو کیا حاصل
میں سبزہ ہوں مری تابِ نمو ہے کتنی دیر

مرے زوال کے ساتھی، مرے ستارۂ ہجر
افق کے آخری منظر میں تو ہے کتنی دیر

پھر اک عجیب تماشا رہے گا صدیوں تک
یہ کارزارِ کمان و گلو ہے کتنی دیر

نکل چلو کہ یہی وقت ہے رہائی کا
ہوا کی لہر بدن کا لہو ہے کتنی دیر

غبارِ شب مرے چہرے پہ چھایا جاتا ہے
یہ آئینہ بھی ترے روبرو ہے کتنی دیر

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

ہوں مشتِ خاک مگر کوزہ گر کا میں بھی ہوں
سو منتظر اسی لمسِ ہنر کا میں بھی ہوں

کبھی ہوائے سرِ شاخسار ادھر بھی دیکھ
کہ برگِ خشک ہوں لیکن شجر کا میں بھی ہوں

تمھارے زخموں سے میرا بھی ایک رشتہ ہے
لہو نہیں ہوں، مگر چشمِ تر کا میں بھی ہوں

یہ تیز روشنیوں کا دیار ہے، ورنہ
چراغ تو کسی تاریک گھر کا میں بھی ہوں

مجھے کھنچی ہوئی تلوار سونپنے والے
میں کیا کروں کہ طرفدار سر کا میں بھی ہوں

اب آ گئی ہے سحر اپنا گھر سنبھالنے کو
چلوں کہ جاگا ہوا رات بھر کا میں بھی ہوں

عرفان صدیقی

شمارہ،۱۴۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

بے کراں رات میں تو انجمن آرا ہے کہ ہم
اے زمیں تو اس اندھیرے کا ستارہ ہے کہ ہم

اس نے پوچھا تھا کہ سر بیچنے والا ہے کوئی
ہم نے سر نامۂ جاں نذر گذارا ہے کہ ہم

کیا خبر کون زوال شب ہجراں دیکھے
یاں چراغ شب ہجراں کا اشارہ ہے کہ ہم

تو ادھر کس کو ڈبونے کے لئے آئی تھی
دیکھ اے موج بلاخیز کنارہ ہے کہ ہم

آج تک معرکۂ صبر ستم جاری ہے
کون جانے یہ تماشا اسے پیارا ہے کہ ہم

بہت دنوں تو رہا اپنا نکتہ چین بھی میں
پھر اپنے آپ پہ کرنے لگا یقین بھی میں

عذاب مجھ سے مجھی پر اترتے رہتے ہیں
فراز عرش بھی میں پستی زمین بھی میں

مری طرف ہی رواں ہے مری کمند ہوس
یہاں غزال بھی میں ہوں سبکتگین بھی میں

اب اپنے آپ کو کس طرح بے بہا کہیے
نگیں شناس بھی میں دانہ نگین بھی میں

گدا و شاہ سے میرا تپاک ایک سا ہے
کہ کج کلاہ بھی میں بوریا نشین بھی میں

مجھے وہ آنکھ نہ دیکھے تو میں ہی سب سے خراب
وہ انتخاب جو کرلے تو بہترین بھی میں

عرفان صدیقی

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

صدائے شام سر آب جو ہے کتنی دیر
یہ بازگشت بھی اے دشت ہو ہے کتنی دیر

بدن دریدہ شجر، مہربان سوزن برگ
مگر یہ زحمت دست رفو ہے کتنی دیر

وہ ابر پھر کبھی آیا ادھر تو کیا حاصل
میں سبزہ ہوں مری تاب نمو ہے کتنی دیر

مرے زوال کے ساتھی، مرے ستارۂ ہجر
افق کے آخری منظر میں تو ہے کتنی دیر

پھر اک عجیب تماشا رہے گا صدیوں تک
یہ کار زار کمان و گلو ہے کتنی دیر

نکل چلو کہ یہی وقت ہے رہائی کا
ہوا کی لہر بدن کا لہو ہے کتنی دیر

غبار شب مرے چہرے پہ چھایا جاتا ہے
یہ آئینہ بھی ترے روبرو ہے کتنی دیر

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

ہوں مشت خاک مگر کوزہ گر کا میں بھی ہوں
سو منتظر اسی لمس ہنر کا میں بھی ہوں

کبھی ہوائے سر شاخسار ادھر بھی دیکھ
کہ برگ خشک ہوں لیکن شجر کا میں بھی ہوں

تمھارے زخموں سے میرا بھی ایک رشتہ ہے
لہو نہیں ہوں، مگر چشم تر کا میں بھی ہوں

یہ تیز روشنیوں کا دیار ہے، ورنہ
چراغ تو کسی تاریک گھر کا میں بھی ہوں

مجھے کھنچی ہوئی تلوار سونپنے والے
میں کیا کروں کہ طرفدار سر کا میں بھی ہوں

اب آ گئی ہے سحر اپنا گھر سنبھالنے کو
چلوں کہ جاگا ہوا رات بھر کا میں بھی ہوں

عرفان صدیقی

شمارہ ۱۴۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

بے کراں رات میں تو انجمن آرا ہے کہ ہم
اے زمیں تو اس اندھیرے کا ستارہ ہے کہ ہم

اس نے پوچھا تھا کہ سر بیچنے والا ہے کوئی
ہم نے سر نامۂ جاں نذر گذارا ہے کہ ہم

کیا خبر کون زوال شب ہجراں دیکھے
یاں چراغ شب ہجراں کا اشارہ ہے کہ ہم

تو ادھر کس کو ڈبونے کے لئے آئی تھی
دیکھ اے موج بلاخیز کنارہ ہے کہ ہم

آج تک معرکۂ صبر ستم جاری ہے
کون جانے یہ تماشا اسے پیارا ہے کہ ہم

بہت دنوں تو رہا اپنا نکتہ چین بھی میں
پھر اپنے آپ پہ کرنے لگا یقین بھی میں

عذاب مجھ سے مجھی پر اترتے رہتے ہیں
فراز عرش بھی میں پستی زمین بھی میں

مری طرف ہی رواں ہے مری کمند ہوس
یہاں غزال بھی میں ہوں سبکتگین بھی میں

اب اپنے آپ کو کس طرح بے بہا کہئے
نگیں شناس بھی میں دانۂ نگین بھی میں

گدا و شاہ سے میرا تپاک ایک سا ہے
کہ کج کلاہ بھی میں بوریا نشین بھی میں

مجھے وہ آنکھ نہ دیکھے تو میں ہی سب سے خراب
وہ انتخاب جو کر لے تو بہترین بھی میں

عرفان صدیقی

شمارہ ۱۷۷،
اکتوبر ۱۹۹۴

نظر میں رنگ تمھارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں
کہا تھا تم نے کہ دیتا ہے جان عشق میں کون
سو ہم جواب تمھارے سوال ہی کے تو ہیں
یہاں بھی اس کے سوا اور کیا نصیب ہمیں
ختن میں رہ کے چشم غزال ہی کے تو ہیں
جسارت سخن شاعراں سے ڈرنا کیا
غریب مشغلۂ قیل و قال ہی کے تو ہیں
شہا! ملال نہ رکھ خاک اڑانے والوں سے
کہ یہ گواہ ترے ملک و مال ہی کے تو ہیں
ہوا کی زد پہ ہمارا سفر ہے کتنی دیر
چراغ ہم کسی شام زوال ہی کے تو ہیں
ذرا سی بات ہے دل میں اگر بیاں ہو جائے
تمام مسئلے اظہار حال ہی کے تو ہیں

شمارہ ۱۹۱،
فروری ۱۹۹۶

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے رازدانوں میں ہیں

اور کچھ دامن دل کشادہ کرو مومنو شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ، دریا، ہوا، روشنی، عورتیں، خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

ناقۂ حسن کی ہم رکابی کہاں خیمۂ ناز میں باریابی کہاں
ہم تو اے بانوے کشور دلبری، پاسداروں میں ہیں، ساربانوں میں ہیں

میرے اندر بھی ہے ایک شہر دگر میرے مہتاب اک رات ادھر سے گذر
کیسے کیسے چراغ ان دریچوں میں ہیں کیسے کیسے قمر ان مکانوں میں ہیں

اک ستارہ ادا نے یہ کیا کر دیا میری مٹی سے مجھ کو جدا کر دیا
ان دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں اب مری منزلیں آسمانوں میں ہیں

عرفان صدیقی

شمارہ،۲۰۷
جون،۱۹۹۷

وہ ہلال ماہ و سال ہے دل مہرباں اسے دیکھنا
پس شام تن جو پکارتا سر بام جاں اسے دیکھنا

وہ ستارہ ہے سر آسماں ابھی میری شام زوال میں
کبھی میرے دست کمال میں تہ آسماں اسے دیکھنا

مری عاشقی مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنارا سے چاہنا وہی بے کراں اسے دیکھنا

وہ ملا تھا نخل مراد سا ابھی مجھ کو نجد خیال میں
تو ذرا غبار شمال میں مرے سارباں اسے دیکھنا

نہ ملے خبر کبھی دوستو مرے حال میرے ملال کی
تو بچھڑ کے اپنے حبیب سے پس کارواں اسے دیکھنا

شمارہ۲۲۸،
اگست۱۹۹۹

کسی کو خاک سے اٹھنے کی آرزو بھی تو ہو
یہاں ستارے بہت ہیں ستارہ جو بھی تو ہو

لہو کی نہر میں کس شہر کے حوالے کروں
کسی زمیں سے کوئی رشتۂ نمو بھی تو ہو

صدائے درد ہوں تنہا کہاں کہاں پہنچوں
سفر میں ساتھ ہوائے چہار سو بھی تو ہو

رکا ہوا ہوں میں کس قریۂ نفاق کے بیچ
تمام دوست ہیں ان میں کوئی عدو بھی تو ہو

گذرتا رہتا ہوں زنجیر پا بجاتا ہوا
کبھی شریک تماشائیوں میں تو بھی تو ہو

مری طرح سبھی آئینہ ہونا چاہتے ہیں
مری طرح کوئی خود اپنے روبرو بھی تو ہو

کوئی غزالوں سے موسم کا حال پوچھتا ہے
میں کیا کروں کوئی موضوع گفتگو بھی تو ہو

عرفان صدیقی

شمارہ ۲۳۵،
مارچ ۲۰۰۰

وہ بہت دور کہیں انجمن آرا ہی تو ہے
میں ستارہ اسے کہتا تھا، ستارہ ہی تو ہے
ابھی کس بات پہ آزردہ ہے دنیا مجھ سے
اس کو پایا تو نہیں، اس کو پکارا ہی تو ہے
باغ کی سمت دریچہ میں کہاں کھولتا تھا
یہ بھی میرے گل خوبی کا اشارہ ہی تو ہے
شہر یاروں پہ ہنسی آتی ہے بیچاروں نے
جیسے دنیا میں مرا رزق اتارا ہی تو ہے
آسماں سر پہ رہے، بند سہی شہر پناہ
کہیں رک جاؤں گا شب بھر کا گذارہ ہی تو ہے
لوگ کیوں مجھ کو بلاتے ہیں کنارے کی طرف
میں جہاں ڈوب رہا ہوں وہ کنارہ ہی تو ہے

شمارہ ۲۴۹،
اکتوبر ۲۰۰۱

اس کی تمثال کو پانے میں زمانے لگ جائیں
ہم اگر آئینہ خانوں ہی میں جانے لگ جائیں
کیا تماشا ہے کہ جب بکنے پہ راضی ہو یہ دل
اہل بازار دکانوں کو بڑھانے لگ جائیں
پاؤں میں خاک ہی زنجیر گراں ہے کہ نہیں
پوچھنا، لوگ جب اس شہر سے جانے لگ جائیں
عاشقی کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
زخم کھایا ہے تو کیا حشر اٹھانے لگ جائیں
اور کس طرح کریں حسن خداداد کا شکر
شعر لکھنے لگیں تصویر بنانے لگ جائیں
کچھ تو ظاہر ہو کہ ہیں جشن میں شامل ہم لوگ
کچھ نہیں ہے تو چلو خاک اڑانے لگ جائیں

عرفان صدیقی

شمارہ ۲۷۲،
ستمبر ۲۰۰۳

حق فتحیاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا
جب حشر اسی زمیں پہ اٹھائے گئے تو پھر
برپا یہیں یہ روز جزا کیوں نہیں ہوا
وہ شمع بجھ گئی تھی تو کہرام تھا تمام
دل بجھ گئے تو شورِ عزا کیوں نہیں ہوا
واماندگاں پہ تنگ ہوئی کیوں تری زمیں
دروازہ آسمان کا وا کیوں نہیں ہوا
وہ شعلہ ساز بھی اسی بستی کے لوگ تھے
ان کی گلی میں رقص ہوا کیوں نہیں ہوا
آخر اسی خرابے میں زندہ ہیں اور سب
یوں خاک کوئی میرے سوا کیوں نہیں ہوا
کیا جذب عشق مجھ سے زیادہ تھا غیر میں
اس کا حبیب اس سے جدا کیوں نہیں ہوا
جب وہ بھی تھے گلوے بریدہ سے نالہ زن
پھر کشتگاں کا حرف رسا کیوں نہیں ہوا
کرتا رہا میں تیرے لئے دوستوں سے جنگ
تو میرے دشمنوں سے خفا کیوں نہیں ہوا
جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

شمارہ ۲۷۴، نومبر ۲۰۰۳

اس نے بے کار یہ بہروپ بنایا ہوا ہے
ہم نے جادو کا اک آئینہ لگایا ہوا ہے
دو جگہ رہتے ہیں ہم ایک تو یہ شہر ملال
ایک وہ شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے
رات اور اتنی مسلسل کسی دیوانے نے
صبح روکی ہوئی ہے چاند چرایا ہوا ہے
عشق سے بھی کسی دن معرکہ فیصل ہو جائے
اس نے مدت سے بہت حشر بڑھایا ہوا ہے
لغزشیں کون سنبھالے کہ محبت میں یہاں
ہم نے پہلے ہی بہت بوجھ اٹھایا ہوا ہے
بانوے شہر ہمیں تجھ سے ندامت ہے بہت
ایک دل ہے سو کسی اور پہ آیا ہوا ہے

عزیز بانو داراب وفا

شمارہ ۸۵،
جون، جولائی ۱۹۷۳

نہ کوئی جادہ نہ منزل مگر سفر میں ہوں
مثال موج سرابوں کی رہ گذر میں ہوں

مری بقا کے لئے لایئے چراغ کوئی
میں روشنی تو ہوں لیکن ابھی شرر میں ہوں

نہ پوچھ مجھ سے ابھی منزل سحر کا پتہ
چراغ راہ ہوں لیکن ابھی سفر میں ہوں

مجھے تلاش نہ کر نیل گوں خلاؤں میں
میں جو بھی ہوں ترے احساس بال و پر میں ہوں

مجھے بقدر تجسس سبھی نے ڈھونڈا ہے
بہ حد فکر و نظر میں ہر اک نظر میں ہوں

کہیں بکھیر نہ دے مجھ کو زندگی میری
میں مشت خاک ہوں اور دست بے ہنر میں ہوں

چراغ تھا تو مجھے دھوپ میں جلایا کیوں
میں کس خطا پہ اجالوں کے اس کہر میں ہوں

وہ کون تھا جو صدا دے کے مجھ کو لوٹ گیا
میں جس کا نقش قدم اب بھی اپنے در میں ہوں

میں اپنے جسم میں رہتا ہوں اس تکلف سے
کہ جیسے اور کسی دوسرے کے گھر میں ہوں

کسی سراب کی زد میں ہر ایک ساحل ہے
میں جانتا ہوں کہ خود ریت کے بھنور میں ہوں

شمارہ ۱۵۳،
جنوری فروری ۱۹۸۹

اس کے سر پر روشنی کا ایک ہالہ ہوگیا
میں تو جلنے بھی نہ پائی اور اجالا ہوگیا

انگنت جنموں سے یادوں کی حویلی بند تھی
ایک دم سے خود بخود ہر طاق کالا ہوگیا

وہ، کھلنڈرا سا جو بچہ تھا کنھیا نام کا
لوٹ کے مٹی میں اک جلتا شوالہ ہوگیا

ہاتھ میں جب تک رہا مٹی کا کوزہ ہی رہا
ہاتھ سے چھوٹا تو دل جادو کا پیالہ ہوگیا

عزیز تمنائی

شمارہ ۸،
جنوری ۱۹۶۷

گیسوؤں کی مہک نے کہا
خار وخاشاک وخس سے گذرتے ہوئے
آؤ پیراہن لالہ وگل کے سائے میں
سو جائیں ہم

بڑھ کے نوک قلم نے کہا
رنگ شام وسحر لے کے
اوراق عرفاں پہ
عکاسی حسن نادیدہ وناشنیدہ کریں
آؤ وہم وگماں کو پریدہ کریں
آتش جسم وجاں نے کہا:
زندگی کی حرارت کا منبع کوئی ہے تو اک شعلۂ خورد ونوش

آؤ اس پر نچھاور کریں
سعی پیہم کا جوش وخروش

روح انسانیت نے کہا:
روئے گیتی پہ چھائی ہوئی دھند کو نوچ لیں
ورنہ خود اوس کی بھینٹ ہم چڑھ نہ جائیں کہیں سوچ لیں
آؤ مل جل کے آگے بڑھیں

اور موج فنا نے مرے کان میں چپکے چپکے کہا:
مہلت چند روزہ میں جو جی میں آئے کرو
یہ مقدر ہے۔ لیکن مرے ساتھیو
میری ہی رو میں بہتے ہوئے ایک دن قلزم بے کراں میں ملو

عزیز حامد مدنی

شمارہ ۱۱۳،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۹

روح باراں

گریۂ ابر سے جاگ اٹھے بام و در
دل میں روئی ہوا نام لے کر کوئی
چند چھینٹوں سے مہکی گلی رہ گذر
اوٹ میں بادِ باراں کے ملنے لگے
نرم بھیگے ہوئے ہاتھ کے زاویے
دل کی دیوار پر پھول کھلنے لگے
نیند بجتی تھی، ہمزاد نیساں گئی
نام لے کر کسی کا جگاتی ہوئی
بے نگہباں تھے در، روحِ باراں گئی

سارقوں کی کشتیاں

یہ سمندر، یہ ہوا کا نم، یہ خوابیدہ زمیں
ایک خواب، ہم کناری سے فضا پر پیچ و تاب
تیرگی کا سارقوں کی کشتیوں پر اک نقاب
دور تک جنگی جہاز اور ان کے رخ پر چھائیاں
جزر و مد میں بیرق و قندیل کی پرچھائیاں
لگ گئی ہیں حادثوں کی بے طرح اکائیاں
رات کی دیوار وقت بے مروت کا ہدف
دیو دیدہ چشم ساحل خواب وحشت کا ہدف

غزلیں

عشرت ظفر

شمارہ ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۲

نہیں ہوں واقف آغاز و انتہا میں بھی
مگر کھلا ہوں سر شاخ ارتقا میں بھی

مری طرف بھی کبھی دیکھ اے سحاب کرم
لئے ہوں سینے میں انگارۂ خطا میں بھی

مجھے تو کرنا تھا ہر طرح احترام اس کا
پڑے جو دشت میں اس کے قدم اٹھا میں بھی

بہار کو شرف انتساب مجھ سے ہے
کھنڈر کی قید میں ہوں سبزۂ نوا میں بھی

کسی دن آبلہ پائی کسی کے کام تو آئے
برہنہ ریت کو دوں تحفۂ قبا میں بھی

یہی نہیں کہ ہیں سب اس کے ہم سفر عشرت
دھڑک رہا ہوں کہیں زیر خاک پا میں بھی

شمارہ ۲۶۰،
ستمبر ۲۰۰۲

ہر رگ خار کی تحویل میں خوں ہے میرا
بے کراں دشت دبستان جنوں ہے میرا
نقش موہوم ہے سب وسعت ارض و افلاک
میرے شہپر کے تلے صید زبوں ہے میرا
شاخیں تلوار کی صورت ہیں گل و برگ ہیں سنگ
دل کا یہ نخل گرفتار فسوں ہے میرا
زخم کیا ہے کسی شمشیر نگہ کا اعجاز
اشک کیا ہے ثمر فصل دروں ہے میرا
ہجر کا چاند دہکتا ہوا انگارہ سہی
مگر اس سے بھی کہیں شعلہ فزوں ہے میرا
سب مرے دل پہ کرم اس نگہ ناز کا ہے
بے قراری ہے مری اور نہ سکوں ہے میرا
غم کا زہراب رگ و پے میں جو اترا عشرت
تب یہ معلوم ہوا مجھ کو وہ کیوں ہے میرا

شمارہ ۲۶۶،
مارچ ۲۰۰۳

کھلتی نہیں لب پر کاہکشاں رخسار گلاب نہیں ہوتے
برسے نہ سحاب شوق اگر گلشن شاداب نہیں ہوتے

چوری سے نہیں بیباکی سے تم خانۂ دل میں قدم رکھو
اپنے ہی گھر میں آنے کے ایسے آداب نہیں ہوتے

تخلیق کے ایسے نقش بھی ہیں جو آب و گل کے صحرا میں
باہر سے سراب تو لگتے ہیں اندر سے سراب نہیں ہوتے

تم پتھر ہو میں تنکا ہوں میں خوار و خراب سہی لیکن
پتھر تو غذا ہیں پانی کی تنکے غرقاب نہیں ہوتے

کہیں کوہ الم، کہیں آتش غم، کہیں ابر طرب، کہیں گوہر غم
مٹی کے سمندر کی تہ میں کیا کیا گرداب نہیں ہوتے

عشرت ہو چمن کا رنگ کوئی آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوتیں
یہ دریا، دریا رہتے ہیں جو بے کم آب نہیں ہوتے

عقیل جامد

شمارہ ۹۸،
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

مٹ جاتی ہیں کہاں اچانک
نقشوں سے بستیاں اچانک

ریقانی ارض کو نگل جا
اے نیلے آسماں اچانک

لیتے ہیں بعض ممتحن کیوں
سوتے میں امتحاں اچانک

اس سرحد کو جہاں ہے عورت
چھولیں گی لڑکیاں اچانک

ناقل ہو تو جگہ سنبھالو
بجتے ہی تالیاں اچانک

قصے میں زید کے بکر کے
کیوں آئے فتح خاں اچانک

شائستۂ گفتگو کو جامد
یاد آئیں گالیاں اچانک

شمارہ ۱۰۷،
فروری تا اپریل ۱۹۷۸

کون ہوا شہر بدر حق تلفی کس کی ہوئی
منصف کوتاہ نظر حق تلفی کس کی ہوئی

اے تن مردار پہ منڈلاتی ہوئی چیل بتا
قطع ہوا کس کا سفر حق تلفی کس کی ہوئی

دیکھ کے خودکشی کا رخ خائف اک شخص مرا
اے زہر دیر اثر حق تلفی کس کی ہوئی

کون ہے دریا سے ابھرتا ہے جو بے حرکت وحس
اے کشش حب گہر حق تلفی کس کی ہوئی

جامد کے حق میں تو مژدہ ہے یہ افواہ غلط
ناشر بے طرح خبر حق تلفی کس کی ہوئی

شمارہ ۱۹۳،
اپریل ۱۹۹۶

بی چنبیلی کا کنول بابو سے کیا رشتہ لگا
سب بزرگان چمن کے نام کو بٹہ لگا

اک سخی کم وسائل مستحق سائل ہزار
سوختہ چشمے پہ تانتا تشنہ دہنوں کا لگا

دل کے میلے پن کو رہنے دے بدن کو صاف رکھ
عطر مل، حمام کر، کپڑے بدل، غازہ لگا

جو بہت اونچا نظر آتا تھا بچپن میں وہ پیڑ
آج میں نے غور سے دیکھا تو بونا سا لگا

ہم رئیس اور آپ سے مفلس ہماری بزم میں
جیسے مخمل کی قبا میں ٹاٹ کا تھگلا لگا

پالتو کتیا کی سانکل توڑ لینے سے ہمیں
اک سگ آوارہ کی چاہت کا اندازہ لگا

رکھ ذرا آرائش مقطع کا بھی جامد لحاظ
تو نے چوغہ سی لیا تو کور پر گوٹا لگا

عقیل شاداب

شمارہ ۸۱،
فروری ۱۹۷۳

ہوس کا رنگ چڑھا اس پہ اور اتر بھی گیا
وہ خود ہی جمع ہوا اور خود بکھر بھی گیا

تھی زندگی میری راہوں کے پیچ وخم کی اسیر
مگر میں رات کے ہمراہ اپنے گھر بھی گیا

میں دشمنوں میں بھی گھر کر نڈر رہا لیکن
خود اپنے جذبۂ حیوانیت سے ڈر بھی گیا

مرے لہو کی طلب نے مجھے تباہ کیا
ہوس میں سنگ کی ہاتھوں سے میرے سر بھی گیا

ہے لفظ و معنی کا رشتہ زوال آمادہ
خیال پیدا ہوا بھی نہ تھا کہ مر بھی گیا

صلہ یہ منزل مقصود کا ملا شاداب
سفر تمام ہوا اور ہم سفر بھی گیا

متاع و مال نہ دے دولت تباہی دے
مجھے بھی مملکت غم کی بادشاہی دے

کھڑا ہوا ہوں میں دست طلب دراز کئے
نہ میرے سر کو یوں الزام کج کلاہی دے

میں اپنے آپ کو کس طرح سنگسار کروں
مرے خلاف مرا دل اگر گواہی دے

میں ٹھہرے پانی کی مانند قید ہوں خود میں
کوئی نشیب کی جانب مجھے بہا ہی دے

مرے دنوں کو جواں جسم کا اجالا دے
مری شبوں کو گھنی زلف کی سیاہی دے

کبھی تو لذت کام و دہن دوبالا کر
ہم ایسے فاقہ کشوں کو بھی مرغ و ماہی دے

ہر ایک دور کے سقراط کا یہ ورثہ ہے
مجھے بھی لا مری زہراب کی صراحی دے

عقیل شاداب

شمارہ ۱۰۷،
فروری تا اپریل ۱۹۷۸

برائے نام سہی کوئی مہربان تو ہے
ہمارے سر پہ بھی ہونے کو آسمان تو ہے

تری فراخ دلی کو دعائیں دیتا ہوں
مرے لبوں پہ ترے لمس کا نشان تو ہے

یہ اور بات کہ وہ اب یہاں نہیں رہتا
مگر یہ اس کا بسایا ہوا مکان تو ہے

سروں پہ سایہ فگن ابر آرزو نہ سہی
ہمارے پاس سرابوں کا سائبان تو ہے

علاوہ اس کے نہ کچھ اور پردہ رکھ مجھ سے
فصیل جسم مرے تیرے درمیان تو ہے

بچھڑ کے زندہ نہیں رہ سکیں گے ہم دونوں
مجھے یہ وہم تو ہے ان کو یہ گمان تو ہے

بھلی بری سہی موجوں میں اپنی ناؤ تو ہے
کٹا پھٹا سہی کہنے کو بادبان تو ہے

گل مراد نہیں سنگ ہائے طفل سہی
غریب شہر کا آخر کسی کو دھیان تو ہے

شمارہ ۲۳۶،
اپریل، ۲۰۰۰

اثر مری زبان میں نہیں رہا
وہ تیر اب کمان میں نہیں رہا
ہے پتھروں کا قرض اس کے دوش پر
جو کانچ کے مکان میں نہیں رہا
الاؤ سرد ہوگئے حیات کے
رچاؤ داستان میں نہیں رہا
تھا جس پہ میری زندگی کا انحصار
اسی کا نام دھیان میں نہیں رہا
گمان ہی اثاثہ تھا یقین کا
یقین ہی گمان میں نہیں رہا
ہوا جو سہل اس کے گھر کا راستہ
مزہ ہی کچھ تکان میں نہیں رہا
نہ کی کبھی بھی فکر میں نے سود کی
کبھی بھی میں زیان میں نہیں رہا
وہ کھو گیا غبار گرد راہ میں
جو شخص امتحان میں نہیں رہا
خموشیوں نے بھر دیا خلاؤں کو
سخن وہ درمیان میں نہیں رہا
تڑپ اٹھے جسے خریدنے کو دل
وہ مال ہی دکان میں نہیں رہا

علی ظہیر

شمارہ ۷۷،
اکتوبر ۱۹۷۷

نظم

یہ سورج ہی شقی ہے
یہ سب کو قتل کر دے گا
سمندر بھی اسی کا آدمی ہے
ہوش میں آؤ
چلو سامانِ حرب و ضرب اپنے
تیز کر ڈالو
یہ شب خوں مارنے والا ہے
تلواریں کھلی رکھو
کوئی سونے نہ پائے
رات بھر خیموں کی نگرانی کرو
یاد رکھو
جنگ ہو گی
اپنے سارے ساتھیوں سے کہہ دو
اپنی عورتوں، بچوں سے مل لیں
صبح قدموں کو جما کر جنگ کرنا ہے
ابھی سے میمنہ اور میسرہ
اور قلب لشکر بانٹ دو
اور رایت خود سنبھالو
کوئی پیچھے پھر نہ پلٹے
کہہ دو سب اپنے رفیقوں سے
کہ سیسے کی دیواریں بن کے لڑنا ہے
یہ سب کو قتل کر دے گا
یہ سورج ہی شقی ہے

شمارہ ۱۰۲،
دسمبر ۱۹۷۶، جنوری فروری ۱۹۷۷

رخصت

یہ اٹھتی محفلیں ہیں
بیٹھ جاؤ
اک گھڑی یا دو گھڑی کی بات ہے
پھر آسماں ہے
اور زمیں ہے
آسماں جو بٹ چکا ہے
اور زمیں
جس پر سیاہی لیپ کر چیزیں گھمائی جا رہی ہیں
ہر طرف اٹھتا دھواں ہے
اب گھڑی یا دو گھڑی کی بات ہے

شمارہ ۲۲۱،
نومبر ۱۹۹۸

موت کے دروازے پر

(۱)
جب لمحہ حقیقت بن جاتا ہے
تو بیچ میں ایک دیوار حائل ہو جاتی ہے
جسے خیال بھی یاد نہیں کر سکتا

(۲)
سب چلے جاتے ہیں
صرف تصور رہ جاتا ہے
اور یہ بھی کب تک

(۳)
موت کی حقیقت چاہے سفید ہو یا سیاہ
وہ ہے تو ایک انجانی شے
جس کو جاننے کے لئے جان دینی پڑتی ہے

(۴)
تم نے کیا بنایا
تم نے کیا رکھا
ذرا میں بھی تو دیکھو

علیم افسر

شمارہ ۴۲،
نومبر ۱۹۶۹

بن کے ساحل کی نگاہوں میں تماشا ہم لوگ
نقش پا ڈھونڈھ رہے ہیں سر دریا ہم لوگ

سایۂ چھوٹے تو پگھلنے لگے پھر دھوپ میں جسم
کاش ہوتے نہ کبھی خود سے شناسا ہم لوگ

ہم کو نفرت ہے اندھیروں سے مگر کیا کیجے
کہ اجالوں سے بھی رکھتے نہیں رشتہ ہم لوگ

کچھ نظر آتا نہیں جن میں دھندلکوں کے سوا
کرتے رہتے ہیں انھیں خوابوں کے در وا ہم لوگ

ذہن پر بار ہے آنکھوں کا مقدر ہے تھکن
خواب اگر دیکھتے بھی ہیں تو ادھورا ہم لوگ

اپنی ہی آنکھوں سے گرتے ہوئے دیکھا جس کو
ڈھونڈتے کیوں اسی دیوار کا سایہ ہم لوگ

ہاتھوں سے میرے چھین کر دل کا مآل لے گئی
جانے کہاں کہاں مجھے گردش حال لے گئی

کام نہ کوئی آسکا لیکن یہ آنکھ کی نمی
سلسلۂ غبار سے مجھ کو نکال لے گئی

موج ہوس کے دوش پر کوہ سیاہ تک گیا
مجھ کو ہوائے شوق پھر تا بہ زوال لے گئی

انگلیاں توڑ لے کوئی کر لے زبان سنگ کی
دیکھیے سبقت شرف صوت بلال لے گئی

تیز ہوا اڑا چلے جس طرح برگ زرد کو
اس کی ہنسی بھی اپنے ساتھ میرا سوال لے گئی

سامنے بحر بے کراں قیدی یک جزیرہ میں
پھر بھی میں اس سے جا ملا موج خیال لے گئی

علی محمد فرشی

شمارہ، ۲۷۲
ستمبر، ۲۰۰۳

نیند کنول کا راجکمار

ابھی تم اندھیرے کی آواز کا ذکر کرتے ہوئے
خود کلامی کے ریشم سے
لچھے بناتے بناتے کہاں کھو گئے تھے؟
اندھیرے کی آواز تھی یا خدا کا تکلم تھا
کیسا ترنم تھا
تم جس کو سنتے ہی چپ ہو گئے تھے
بتاؤ ___ اندھیرے کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاؤ

خموشی گھنی نیند سوئی ہوئی تھی
ابھی خود کلامی کے پھولوں سے
"کن" کی مہک نیچے اتری نہیں تھی
کہ اس نے مجھے اپنے خوابوں میں دیکھا
خوشی اس کی آنکھوں سے بہنے لگی
اس نے مہکی ہوئی بوند سے مجھ کو دریا بنایا
مجھے خشک بنجر زمینوں پہ چلنا سکھایا
میں چٹیل زمینوں پہ بنجر زمانوں پہ چلتے ہوئے تھک گیا تھا
اندھیرے کی آواز سن کر ذرا رک گیا تھا
چلو اب چلیں پھر
چمکتے ہوئے آنسو
پھر چلیں ہم
سمندر کی جانب... اندھیرے کے گہرے سمندر کی جانب
جہاں نیند کے لہلہاتے کنول میں کوئی منتظر ہے

ست رنگی نیند کی موت

شام مسافر لاؤنج میں بیٹھی ہے
اور باہر نیلی بارش میں لت پت آسیبی رات
اندر آنے کا رستہ ڈھونڈ رہی ہے

کالے جوتوں کو چمکاتے چمکاتے
سردسیاہی کی کیچڑ میں ننگے پاؤں چلتے چلتے
تم خوابوں کے روشن میدانوں تک جا پہنچے ہو
دھوپ کی گیند کے پیچھے بھاگ رہے ہو
خوشبودار ہری چمکیلی گھاس پہ گر پڑتے ہو
نرم محبت تمھیں اٹھا کر اپنی گود میں بھر لیتی ہے
ست رنگی نیند کی لوری سنتے سنتے ہنستے ہو تو
نیلی چادر چاند ستاروں سے بھر جاتی ہے

آنسو سکوں کی مانند
میرے خالی پن کے اندر گرتے ہیں
ناموجود فلور(1) سے آنے والا برقی زینہ
نامعلوم اترائی کی جانب جاتے جاتے رک جاتا ہے

ننھے نور بھرے ہاتھوں سے
کالی پالش کی ڈبیا گر پڑتی ہے
اور زمین کی صورت گھومنے لگتی ہے

---

(1) Floor

علی محمد فرشی

شمارہ ۲۸۳،
اگست ۲۰۰۴

بات اتنی سی تھی
رات مہکی نہیں
پھول سویا نہیں
خواب جاگا نہیں
چاند رویا نہیں
اس کے دریاؤں میں
دل ڈبویا نہیں
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
دھوپ کے ہاتھ پر
آب پارہ نہ تھا
آسماں پر بھی مرا
کوئی تارا نہ تھا
پار اترا کہاں
دل کنارہ نہ تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
رات خوابوں کی تھی
دن عذابوں کا تھا

خالی بستے میں اک
دکھ کتابوں کا تھا
آنکھ بارش کی تھی
دل سرابوں کا تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
قاف کا شہر تھا
نیند میں لوگ تھے
دل میں جاگے ہوئے
کچھ الگ لوگ تھے
جسم کے اس طرف
سوگ ہی سوگ تھے
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
جل پری کون تھی
میرے دریاؤں کی
کیسی تنہائی تھی
میرے صحراؤں کی
نظم تو چاپ تھی

پھول سے پاؤں کی
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
جس طرف میں نہیں
اس طرف خواب تھا
جلتی عمروں کے بیچ
ایک صحراب تھا
سارے دریاؤں کے
میں پس آب تھا
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

بات اتنی سی تھی
میرے جلتے ہوئے
ایک برفاب کو
میرے دیکھے ہوئے
بے جہت خواب کو
دوسری سمت سے
تم نے دیکھا نہیں
بات اتنی سی تھی
اور تم رو دیے

عمیق حنفی

شمارہ ۱۰
جون ۱۹۶۶

میرا نام، مری صورت یا میری ذات، مری تصویر
ادھڑے پلستر والی ان دیواروں میں ہوں اسیر
فکر و ضمیر مری تقصیریں، فن میری تعزیر
خوابوں کا تاریک خرابہ ہے میری جاگیر

در در گھوم رہا ہوں لے کر آنکھوں کے کشکول
ہر منظر نے زہر ہلاہل ان میں دیا ہے گھول
خون جگر کی آمیزش سے زہر ہے آب حیات
آب حیات کی بوندیں ہیں یہ میرے کڑوے بول

تاریخوں کا بیج چھپائے ہے ہر چھوٹی بات

حسرت کے گلیاروں میں جب چھا جاتی ہے رات
خواہش کی قندیل جلاتی ہے میری تحریر
ترک تمنا کر کے دیکھا اب خواہش تدبیر

عمیق حنفی

شمارہ ۶۳
اگست ۱۹۷۱

اِنّا زَیَّنَّا السَّمآءَ الدُّنیا بِزِینَۃِ الکَواکِب
وحِفظاً مِن کُلِّ شَیطٰنٍ مارِد
(سورۃ الصٰفٰت، ۶ تا ۷)

نہ زماں مرا نہ مکاں مرا
تو مقام جاں ہے کہاں مرا   کہ میں اجنبی
مرا آئینہ مجھے دیکھ دیکھ کے حیرتی

مجھے ایک ایسی زباں ملی
جسے سن کے پوچھتے ہیں کئی   یہ کہاں ملی
یہ تو ترک کر چکی تھی وطن
اسے لوگ دے چکے تھے کفن   یہ کہاں ملی

مرے ہم نواؤں کی انجمن
کبھی بد زباں کبھی خوش دہن
یہ بہم دگر تن و پیرہن نہ کہو اگر انھیں جان و تن
مگر اس پہ بھی مرے ہم نشینوں کے درمیان ہزار بن

روش زمانہ سے مختلف مرے دل میں رقص شرر ہے کیوں
شجر صدا کے ورق ورق میں یہ رنگ و بوے دگر ہے کیوں
شجر صدا   نفس دلبو کی ہوا و آب میں جو پلا
جو مکان جسم میں جڑ پکڑ کے زمان جاں کی طرف بڑھا
تو ملی ہے کیوں شجر صدا کو سزاے خار و خس دگر
گل نغمہ شجر صدا میں گل سکوت نہاں کا زر
مرا سایہ دھوپ میں جم گیا مرا سایہ چھاؤں میں جل گیا
مرے اپنے پاؤں کی ضرب سے مرا سایہ بانسوں اچھل گیا

یہ سوال سائے کے سامنے ہے   یہاں کہاں
یہ بدن کہاں   مری جاں کہاں

میں سیاہ جنت رحم میں بڑے اطمینان سے تھا گتھا ہوا آپ اپنے
وجود میں

نہ صدا میں تھا نہ سکوت میں نہ بہاؤ میں نہ جمود میں
میں تو ماں کے جسم کا جزو تھا وہ شجر میں برگ و گل و ثمر
مگر آہ! پایا گیا مجھے کف دست فصل خریف پر

میں زمیں کی کوکھ میں جب گیا تو بہار چھائی تھی چار سو
جب اگا تو دیکھی رخ فضا پہ تمام حسرت رنگ و بو
شجر خزاں پہ ہوں اجنبی کہ گل مراد بہار ہوں
کسی اور لب پہ رکی ہوئی کسی اور لب کی پکار ہوں
مجھے کیوں ملا یہ جہان سر؟ طلسم خواب دھواں دھواں
کہ غبار و کہرہ و گرد سے تھا افق تمام گماں گماں
ملا پہلی سانس کے نام پر مرے سینے کو نفس خزاں
مرے سر کی لیتی رہیں بلائیں اجڑ پیڑوں کی چھتیاں
میں بے بریدہ برگ ہوا کے دوش پہ کو بہ کو
کبھی خاک میں کبھی آگ میں کبھی آب میں کبھی باد میں جسے اپنی
اصل کی جستجو

سر مطلع سحر خزاں پس کہرۂ شبنم فشاں
ورق ہوا پہ کلام جان جہان کا ہلکا سا اک نشاں

مجھے چار سمتی صلیب پر نظر آیا مہر شکست خوردہ و نیم مردہ و مضمحل
وہ صلیب، سر بہ ہوا و پا بہ شرار و دست بہ آب و گل
وہ ہزار کرنیں زباں زباں تو ہر اک زباں پہ فسانۂ غم جاں گسل
وہ اتاق یاد میں اک چراغ گرفتہ دل
قفس ہوا میں اسیر شعلہ نوا پرند
پر و بال خود میں چھپا پرند

میں بھٹک رہا ہوں کہیں یہیں مرا ابعید دشت فلک میں ہے
مرے نام کا کوئی موتی، نقطۂ نور طشت فلک میں ہے
کہ پچاس صدیوں سے دشت شب میں جہاں بھی خانہ بدوش ٹھہرے
ہیں صبح تک
تو پلک پلک پہ اتر پڑے ہیں ستارے لے کے کئی فلک

میں بھٹک بھٹک کے نجوم و شمس و قمر کے دشت میں آ گیا
یہ علاقۂ تکوین بھی مری سرگذشت میں آ گیا
☆☆

آفتاب عز و جل
میری آمد کی سحر، میرے جنم سے دو گھڑی اور پانچ پل پہلے
سرد، ادھ بھیگی زمیں سے اوس چننے کے لئے
جب گلابی انگلیوں سے اس کو چھونا چاہتا تھا کانپ اٹھا
خود گرفتار بلا تھا آفتاب
راس منڈل کے دوراہے پر تذبذب کا تراز و تھام کر تھا مبتلائے پیچ و
تاب
سرد لہروں اور شبنم کی ڈھٹائی پر خفا
بے بس و مجبور نادم اور خجل
اپنا غصہ اپنی خفت اپنی جھنجھلاہٹ مرے سر میں انڈیلے جا رہا تھا
آپ اپنی آگ کا ایندھن خزاں کا آفتاب

راکھ میں لپٹا شرارہ، دیدۂ بے رنگ خواب
سرمئی پودے کی شاخ سرخ پر پیلا گلاب
لاکھ بد دل، مضمحل، خانہ خراب
تھا تو آخر آفتاب

زر بدن، زر جان، زر پیراہن و سر تا پا زر
دیوہنس اک سرخ چشم و نور پر
پا شکستہ زخم خوردہ پھر بھی با ہمت نڈر
پگھلے تانبے کی ابلتی نہر ماتھے کی لکیر
تیز کرنیں یا ذہانت کے نشانہ خیز تیر
دیوہنس آنکھوں میں جس کی یکیہ کنڈوں کا جلال
پھونکتا تھا ذہن و جاں میں قوت تخئیل و پرواز خیال
ہر نفس میں شدت شوق وصال
آخری پنچم سے ہم آہنگ تھا اعصاب کا ایک ایک تار
سانس کے دھچکے سے بھی گونجا کیا دل کا ستار
فکر و جذبہ مبتلائے پیچ و تاب
احتجاج و اختلاف و انقلاب

اف یہ میں شعلہ بسر، ناراض، آتش زیر پا
کیوں نہ ہوں مجھ سے ہمیشہ آذر و قیصر خفا
ہر طرف اک ٹوٹتے گرتے بکھرتے عہد کا غوغا و شور
ہر طرف اجداد کے بوئے ہوئے پیڑوں سے ہوتا آتش و آہن کا
زور

لکڑ ہارے
مرے کانوں پہ کب سے گر رہے ہیں
کسی شاخ ترنم کے بکھرتے ٹوٹتے سر

چیختی ٹوٹتی شاخوں کی آوازیں
زمیں پر دھم سے گرتے چیختے پیڑوں کی آوازیں
کلہاڑی کے لہو میں غرق پھل کے پیڑ میں پھنسنے کی آوازیں
گلابی گوشت میں دھنسنے کی آوازیں

لکڑہارے
مرا دل تو ہواؤں کی رگڑ کھا کر بکھرتی پتیوں کی چوٹ ہی سے کانپ
اٹھتا ہے
لرز اٹھتا ہے غنچوں کے چٹخنے کی صدا سن کر
تو پھر یہ تو درختوں کے اکھڑنے ٹوٹنے گرنے کی آوازیں ہیں پے
در پے!

مجھے بے کار اور بے جان چوب خشک کے کٹنے کا غم کب ہے؟
مگر پیارے لکڑہارے
ہر اک شاخ برہنہ خشک و مردہ تو نہیں ہوتی!
یہ آخر کیا کیا تو نے
کلہاڑی کا نیا دستہ لیا جس پیڑ سے
اسی کو کاٹ لایا ہے

لکڑہارے
جب بھی ایٹم بم کے معنی پوچھے ہیں تاریخ سے میں نے
تو اس نے اپنے سے پہلے کی اک گہری گپھا سے ڈھونڈھ کر
ایک سنگین اور کانٹے دار مگدر
تھما کر مجھ سے ہی پوچھا
بتا، یہ دونوں ہم معنی ہم نہیں ہیں؟

مجھے تیری کلہاڑی بھی کسی بم کا بہت آسان سا معنی نظر آنے لگی ہے

دراوڑ، آریہ، منگول، ترک، انگریز لشکر
وبائیں، قحط، بے کاری، جہالت، زلزلے، سیلاب، اندھڑ
مجھے ہم شکل و ہم شیوہ نظر آنے لگے ہیں

لکڑہارے
یہ لوہے کے غلام
رگوں میں جن کی روغن، خون
بھری ہے پھیپھڑوں میں بھاپ سورج تاب
یہ بجلی کے چمکتے چابکوں کی ضرب کھا کر دوڑتے گھوڑے
یہ رتھ جن کی ہوائیں گھوڑیاں ہیں
خلاؤں میں پر افشاں طائران ہفت معدن
کسی تاریخ کے انڈے چھپائے پیٹ میں اپنے
نہ جانے چاند تاروں سے انھیں کس گوشۂ تخلیق کی دعوت ملی ہے

ہمارے عشق ہستی کی کنیزیں اور غلام
یہ جن، یہ دیو، یہ پریاں تمام
عناصر سے جنھیں بیدار کر کے اپنی خدمت پر کیا مامور ہم نے
سوار اعصاب پر ہونے لگے ہیں
ہمارے خواب ان کا ناشتہ ہیں
ہمارے ذہن و دل کی بیٹیاں ان خانہ زادوں کی چہیتی داشتہ ہیں

☆☆

آج پھر آ رہا ہے نظر   اک نگر   وہ شکار فساد بشر
کشتۂ حکمت فتنہ گر
وہ نگر گل کدہ   بت کدہ   صنعتیں   محنتیں   مے کدہ
خواب کے سائے میں ایک زندہ نگر
اک پرندہ پروں میں چھپائے ہوئے اپنا سر

وہ افق پر مگر دوسرا اک پرندہ قیامت کی رفتار سے آگیا
تو سماں نیم شب کا اندھیرے کی چنگھاڑ اور پھڑ پھڑاہٹ سے تھرّ گیا
نہ وہ عقاب نہ وہ چیل — نہ وہ گدھ نہ وہ باز
وہ فرشتۂ موت کے دل و جاں کا راز
تو وہ سایہ پھٹا اور اندھیرا چھٹا چمک اٹھی گھٹا
یہ گرا کیا ہے؟ انڈا ہے؟ تے ہے؟ کہ بیٹ؟
کہ سیاہی کا پردہ ہے ریشم کی چھینٹ

☆☆

کبھی رنگوں کا جال کبھی آگ کا اچھال کبھی ناچتا جلال کبھی چیختا خیال
کبھی پاس کبھی دور وہی رنگ وہی نور
کبھی نور کبھی رنگ کبھی نار کبھی نور
کبھی نور کبھی نار کبھی ظلم کبھی نور
کبھی نور کبھی ظلم کبھی رنگ کبھی نور
کبھی شعلوں کی زباں کبھی لپٹوں کی کماں
کبھی آگ آگ تیز کبھی خون کی لکیر
کبھی ایک کبھی دو کبھی ایک کبھی تین کبھی چار کبھی ایک
کبھی ایک کبھی پانچ کبھی ایک کبھی آٹھ کبھی نو کبھی ایک
کبھی ایک میں انچاس تو انچاس مل کے ایک

وہ بگڑتا ہوا عددوں کا نظام
وہ پگھلتے ہوئے نام اور اجسام

تو ادھر چٹان ایک نقش سکوں
اور ادھر کھولتے سورجوں کی شعاعوں کا بھاری ستوں
بیچ میں آدمی بھاپ بنتا ہوا آدمی
اپنے سینے پہ ضرب ستون قیامت کو سہتا ہوا آدمی
خود پگھلنے لگا بھاپ بننے لگا

اس طرف اس طرف سے گذرتی ہوئی ان شعاعوں نے چٹان کو کر دیا
کوئلے سا سیاہ
ہو گیا شہر کا شہر سارا تباہ
شعلہ شعلہ ہوا لاوا لاوا بہا آدمی کا بدن
لیکن اس کے بدن سے گذرنے نہ پائی کوئی حشر ساماں کرن
وہ ہوا آگ پانی اور مٹی میں تبدیل بھی ہو گیا
وہ عناصر میں تحلیل بھی ہو گیا
لیکن اس کے بدن کا سراپا تو چٹان پر چھپ گیا
اک ستارہ پھٹا موت کی آگ کی کہکشاں بن گیا

☆☆

کس شرر کے پھوٹ پڑنے سے بنی یہ کہکشاں
موت کے سنگین کالے پیٹ سے
زیست کے رنگین اجلے آبشار
کس طرح اچھلے بہے
روشنی کی ابجدیں لکھتے رہے
نیلگونی میں بکھرتی سرخیوں کا
اجلے کالے نقطوں میں تبدیل ہونا
ڈھیرے ڈھیرے جگمگانا
پھر سے لو دے اٹھنا
از سر نو لَے میں آنا
ناچنا
ترتیب پانا
اور بہانا روشنی
پھوٹ پڑنا: موت اور ترتیب پانا: زندگی
روشنی کا مسکرانا: زندگی
روشنی اور تیرگی کے اس نوشتے میں لکھا کیا ہے
بننا مٹنا مٹنے بننے کا بھلا یہ سلسلہ کیا ہے؟

یوں تو ہر ذرے میں سورج اور ہر سورج مطاف
کہکشاں، سیارگاں، قطبین سب محو طواف
یوں تو ہر قطرہ سمندر اور ذرہ کائنات
اور ہر قطرے میں ہر ذرے میں تقدیر حیات
حوصلہ اتنا کہاں سے لائے یہ جسم کثیف
بن نہ پائے گا کبھی اتنا لطیف
جا کے ذرہ چھان آئے
قطرے میں غوطہ لگائے

آسمان پر نور کی آیات
تختی حاضر پہ کندہ غیب کے حالات

☆☆

سامنے ابر غبار نور کے پیچھے سنہری کانتی والا جوان
سات گھوڑوں والے رتھ پر ہے سوار
ایک گھوڑا ہے بنفشہ رنگ
دوسرا نیلا
آسمانی تیسرا
سبز چوتھا
پانچواں پیلا، چھٹا نارنجی
ساتواں ہے سرخ
اور ساتوں دوڑتے ہیں تو نگاہیں دیکھتی ہیں ایک اجلا دائرہ
وقت کی روح رواں
اپنے ہونے کا شعور
ذات کا عرفان
ذہن مطلق کا بدن
باپ...حاکم...رہ نما

☆☆

مادر افلاک کوزہ گر شکاری ڈائنا(۱)
مریم ہفت آسماں، آئینۂ ارض وسما
جس کے تابع ارزل و افضل سبھی جذبات
نورسوں پر، پانیوں پر جس کو حاصل اقتدار
اور پانی؟ جس سے ہو جاتی ہے ہر شے ذی حیات!

از روئے جغرافیہ دھرتی کا ٹکڑا چاند
سریت کی رو سے لیکن چاند کی اولاد ساری کائنات
برسر افلاک ستائیس جس کی منزلیں
اور ہر منزل پہ جس کی ذات، شمع انجمن

(میں سمجھتا ہوں
ذہن مطلق کی توجہ زاد گہری نیند کے عالم میں اپنے راستوں سے کچھ نہ کچھ
ہٹ ہی گئے ہیں
ناچتے گاتے چمکتے ٹمٹماتے یہ ستارے)

☆☆

آب حیواں سرجنوں کے نشتروں کی نوک پر
زندگی اور موت دونوں تشنۂ خون جگر
آتش شہوات تیز
نفس میں ایک غصۂ تو خیز
ہڈیوں کی نلکیوں میں موجۂ سیماب
دم بدم کھنچتے ہوئے اعصاب
جسم میں طوفان
روح میں ہیجان

کھیت میں مریخ

اژدھوں کے سرخ بیج
اور لاشیں بو رہا ہے
یہ تپے تانبے سے چہرے والا غصیلا جوان
جس کے ستواں سخت چہرے پر شجاعت اور طاقت کے نشاں
جس کی آنکھیں سرخ انگارے بدن آتش کدہ
دیکھ کر جس کو فلک دہشت زدہ
جس کے رگ پٹھوں میں تازہ گرم جوشیلا لہو، مردانگی کا گردباد
زندگی اور موت دونوں کے لئے شمشیر و خنجر پر جسے ہے اعتماد
رومیوں کی سروری کا طرہ جس کے خود پر
خواہ کتنا ہی مہذب پیرہن ہو، جلد ہو کتنی ہی چکنی اور صاف
لیکن اندر جو درندہ ہے وہ اس مریخ کا کرتا ہے روز و شب طواف

☆☆

ہندیوں کی داستانوں میں لکھا ہے
چاند بوڑھے مشتری کی بیاہتا کو لے اڑا تھا
اور ان دونوں سے بدھ پیدا ہوا تھا
جس کے تابع ذہن اور اعصاب
منطق و علم الکلام و عقل محض

ازروے یونانیاں
یہ عصا بردار جس کی جوتیوں اور ٹوپی پر لگے ہیں پر
اور عصا پر لپٹے ہیں دو سانپ
یہ عطارد: ایک موجد، ایک دانشور، حکیم
ہر طرف آتش فشاں تنقید
احتساب
اختلاف
احتجاج

طنز، بخشیں، اختلاج

زہرہ و مریخ کی زرد اور خونیں کرنیں چھن کر پڑ رہی ہیں
اک محدب شیشے سے گویا انا کی روح پر
یہ محدب شیشہ یعنی صاحب فہم و ذکا عاقل عطارد
جوتیوں پر جس کی دو پر
اور چھڑی پر سانپ بھی دو
ایک مظہر آتما کا
دوسرا ہے روپ کا

☆☆

برقیے جذبات کے اعصاب پر من مانی لے میں دوڑتے ہیں
صبر کے خم دار ریزسٹنس (۲) ٹوٹے جا رہے ہیں
ضبط کے فیوز اڑ رہے ہیں
ایک تو سیع عناصر ہے مگر ترتیب سے عاری تمام
اندر اندر گرم تاروں کا تو باہر سرد اسپاتی نظام
آرزوے وصل میں ڈوبے ہوئے دو تن نہیں ہیں ازدواجی رشتوں کے پابند
دل سے غائب آرزوے دختر و فرزند
صرف لذت کی طلب کی ریشے ریشے پر گزند

آج بوڑھے مشتری کے چوڑے ماتھے پر
خشک شکنوں کا سمندر موج زن
اس کی آنکھوں میں اداسی کی سیاہی کی لکیر
بے نیازی کی سفیدی اور اک پتھریلا پن

☆☆

کوہ کن کے ساتھ شیریں اس کے ہر فکر و عمل میں ساتھ
جسم آہن گر میں روح شیشہ گر

آج آدم اور اس کی بائیں پسلی میں پرایا پن نہیں
روح کے ساحل پر زہرہ آج پھر خمیازہ کش
پھر سمندر کے چمکتے پھین میں آیا ہے تخلیقی ابال

☆☆

مادے کے اندروں کی کھوج میں مصروف ذہن
دور بینی، خورد بینی، کیمیائی اور طبیعی طرز فکر
اہل محنت نشۂ محنت سے چور
جسم و جاں کو کہرا کہرا پیرہن کا شوق
دیومالائیں رچے جانے کا ذوق
خواہشیں، افراط پھر سینے کے اندر گھٹن
جسم کی زد میں تمام آکاش اور پاتال
ذہن پھر بھی کس قدر محدود
خواہش تعمیر گرم
جذبہ تخلیق سرد

میں سمجھتا ہوں کہ بوڑھے مشتری کا بوڑھا باپ
اپنی اولادیں نگلنے والا زحل
سرد، پراسرار، کم رفتار زحل
اپنی شریانوں میں تازہ خوں رواں پاتا ہے آج
اس کے ژالہ ژالہ ابر و برف کی پلکوں کے نیچے
گول پتھر جیسے دیدوں میں نظر آتی ہے پانی کی چمک
بڑھ رہا ہے زحل کا سری اثر

☆☆

پچھلی دو صدیوں میں جس تیزی سے بدلا ہے جہان خاک
اس پہ حیرت میں ہے اب تک گردش افلاک

یہ پلوٹو (۳)، نپچون (۴) اور یورینس (۵)
ہیں گئے چالیس نوے اور اور سوا سو سال سے اوراک کے پردے
پہ رقصاں

نپچون
یا عطارد کا جواب نغمہ
زہرہ کا جواب سریہ یورینس
اور پلوٹو کرۂ اسرار

چاک ذروں کے جگر
فرد و جوہر منقسم
ہر اکائی ٹکڑے ٹکڑے
جن کی تازہ سمفنی کے تیز نغموں سے
بڑھ رہا ہے سریت، نفسانیت، اعصابیت کا زور
ناچ اٹھا روحانیت کا مور
ذہن کے جنگل کے گوشے میں کہیں

جسم کے اندر کھنچاؤ
جسم کے باہر کھنچاؤ
تار اور اعصاب دونوں پر تناؤ
ریڈیم یورینیم کی حکمرانی چار سو
ہر گھڑی تبدیل ہوتے رہنے کی بے تاب دل میں آرزو
ذہن آدم الجھنوں میں مبتلا
ایک ہپنوسس (۶) کے عالم میں سراپا رقص یہ ارض و سما

☆☆

کہاں ہو تم
جہاں بھی ہو پلٹ آؤ

چلے آؤ کہ تم سے بات کرنی ہے
یہ مانا ہم سفر پر ساتھ نکلے تھے
مگر تم مجھ کو پیچھے چھوڑ کر افراط کے شہروں میں جا پہنچے
چلا میں بھی مگر قلت کے صحراؤں میں اب تک پھر رہا ہوں
پلٹ آؤ کہ مجھ پر کھل چکا ہے
سفر کی ابتدا ہم نے غلط نقطے سے کی تھی
ہمیں کیوں سنگ، آہن، تانبے، کانسے کے قفس اپنے لئے تیار کرنے تھے
سواری بھاپ، بجلی، جوہری قوت یہ کرنے کی ضرورت کیا پڑی تھی
ہمارا ساز و ساماں آپ اگنا آپ بڑھنا تھا
حیاتی اور بناتی راستوں سے ارتقا کو آگے چلنا تھا

ذرا سوچیں، پلٹ آؤ، کہاں ہو تم
ذرا سوچیں زماں کی کس نے کی تقطیع
زمانوں اور سمتوں کے کھلے تپتے ہوئے صحراؤں میں کی ذات کی توسیع
مکاں کو کس نے قطعوں میں کیا تقسیم
گھڑی کی سوئیوں سے نبض عالم باندھ دی کس نے
ستاروں کے اشاروں سے معانی کس نے چھینے

☆☆

دائیں جانب گھومتا تھا چاک کوزہ گر
بائیں جانب گھومتا ہے
نارسی سس (۷) کے لئے
آتش تازہ چرانے کے لئے پرومیتھیس (۸) کو آرفیس (۹)
اپنی لَے دے کر روانہ کر رہا ہے

اک نیا شعلہ، نیا نغمہ، نئی خود آگہی
وقت کے پردے سے باہر آنے کو بے تاب ہے

پھر کنواری اور نم مٹی میں لت پت انگلیاں
زائچوں کے آسمانوں کے لئے
کچھ نئے سیارے گڑھنے میں مگن ہیں
منتظر آنکھوں کے خس خانوں میں رکھنے کے لئے
کچھ نئے کوزوں کی صورت دے رہی ہیں

اور پسینے خون آنسو کے سمندر کے کنارے
چند لہریں جن کو سورج نے تپایا
گدگدایا چاند نے
اپنے تازہ جھاگ کو اک تازہ دردزہ میں مبتلا پا کر بہت خوش ہیں
آدمی کی بائیں پسلی پھر پھڑکتی جا رہی ہے
روح کی جنت میں ممنوعہ شجر ہے اور نہ سانپ
پھر ستاروں میں اشارے ہو رہے ہیں
کچھ معانی جو ستاروں اور تاروں اور بے تاروں پہ اپنی روشنی چھلکا رہے ہیں
ان اشاروں میں پلک جھپکا رہے ہیں

حواشی

(۱) Diana
(۲) Resistants
(۳) Pluto
(۴) Neptune
(۵) Uranus
(۶) Hypnosis
(۷) Narcissus
(۸) Prometheas
(۹) Orpheas

عمیق حنفی

غزل

شمارہ ۱۲۰،
اپریل، مئی ۱۹۸۱

فلک پہ درد کے کرلے کوئی نظارۂ دل
نظر نہ آئے گا کچھ بھی بجز ستارۂ دل

کبھی نہ ہٹتی کسی خوب رو کے چہرے سے
نگاہ کاش سمجھ پاتی اک اشارۂ دل

تلاطم غم و اندوہ نے غضب ڈھائے
جھکا نہ ٹوٹا نہ چیخا کبھی کنارۂ دل

کبھی ہے تتلی کبھی پنکھڑی کبھی آندھی
بکھر گیا ہے بہر رنگ گوشوارۂ دل

ہوا نے جوڑے میں اک پھول جو سجایا ہے
وہ میرا لخت جگر ہے وہ میرا پارۂ دل

مہک اڑادے

شمارہ ۱۲۵
جون تا اگست ۱۹۸۲

بند سیاہ گپھا تو چاہے بول نہ بول
اپنے بے دانتوں والا منھ تو کھول
میرے تن کا وزن نہ تول
ہاڑ ماس کا پوچھ نہ مول
ڈال دے مجھ پر کیڑے مکوڑوں والی ماٹی کا اب خول
نمکوں والے لعاب دہن میں
مجھ کو دھیرے دھیرے گھول
سبزہ وشاخ گل کی رگوں میں بوند بوند پہنچادے
پورب، پچھم، اتر، دکھن،
میری مہک اڑادے

عمیق حنفی

شمارہ ۱۲۵،
جون تا اگست ۱۹۸۲

یہ جو سامنے پڑے ہیں گرد و غبار کے ڈھیر
کون سی ان میں محرابیں ہیں کون سی ہیں دیواریں
کون سی ان میں طاق دستوں ہیں کون سی ہیں میناریں
کون سے فرش اور چھت ہیں ان میں کون سے گنبد چھجے
کون سے روشن دان کھڑکیاں کون سے ہیں دروجے
کون سی ان میں کوٹھریاں ہیں پر راز کا ناپھوسی
کون سے گوشے تھے جن میں ہوتی تھی روسا روسی
اب تو یہاں ڈھہتی دیواروں کے ہیں مٹتے نشان
خاکہ خاکہ اینٹ اور پتھر نقشہ مکان
کیا یہ وہی عمارت ہے جسے دیکھنے آنکھ بھی جاتی تھی
عمروں پہلے یہی عمارت خواب کہی جاتی تھی

عنبر بہرائچی

شمارہ ۲۳۳،
جنوری ۲۰۰۰

بڑے پوکھر کے پہلو میں ہے میداں
سحر سے شام تک جس میں مویشی
مٹا کر بھوک ہوتے شاداں ہیں
وہیں سے چند قدموں پر ہے پیپل
جڑیں جس کی ہیں چرواہوں کی مسند
اسی کے پاس ہیں سرپت کے جھرمٹ
بٹیروں کے لگے ہیں جن میں ڈیرے
وہیں پر مور بھی جھنکارتا ہے
وہیں اڑتے ہیں موجوں کے پھریرے
ذرا نیچے اتر کر سمت مشرق
نشیبی سلسلے کے بازوؤں میں
ٹٹہری نے کئی انڈے دیے تھے
جنھیں کل دن دہاڑے گوہ آکر
فقط اک جست میں ہی کھا گئی تھی
ٹٹہری بین کرتی پھر رہی ہے

رات والا اجنبی

عوض سعید

شمارہ ۹۱،
جولائی تا ستمبر ۱۹۷۴

بس پل بھر میں جیسے سب کچھ ہو گیا۔

کہر اور دھند میں چھپی ہوئی رات کے آخری زینے سے کوئی آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے دبلے پتلے منحنی جسم کو وولن گرم کوٹ میں اس طرح چھپا لیا تھا جیسے اگر سرد ہوا کا ایک جھونکا بھی اس کے جسم کو چھو لے تو وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔ اس نے سستے داموں خریدے ہوئے مفلر کو کانوں اور گلے سے کچھ اس طرح جوڑ لیا تھا کہ اس کے چہرے اور ناک کے علاوہ کوئی چیز ننگی نہ تھی۔ اس پر ہول سناٹے میں گھری ہوئی رات کے سینے پر وہ کسی فاتحہ سپہ سالار کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے بھرا ایک لانبا چاقو تھا۔ چاقو کی دھار پر پھیلے ہوئے خون کے قطروں کو وہ احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھا گویا وہ اس رات کا تنہا مسافر تھا جس کے دائیں، بائیں آگے، پیچھے کوئی اور آدمی نہ تھا۔ کوئی اور ہوتا بھی کیوں؟ قاتل کے آگے بھلا کوئی سر اونچا کر کے چلا بھی ہے۔

سنسان اور خاموش سڑک پر وہ بے خوف و خطر چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو ابھی تک تھما ہوا تھا۔ لیکن وہ سردی سے گھبرا رہا تھا۔ اس نے یک بارگی محسوس کیا جیسے موٹے موٹے بدصورت گم بوٹوں کی دھما دھم سے زمین تڑخ رہی ہے۔ اس کے سامنے دو پولیس کے جوان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں خون سے بھرا چھرا دیکھ کر بھی وہ چپ تھے۔

پولیس کو سامنے سے جاتا ہوا دیکھ کر بھی اسے ذرا خوف نہ آیا۔

اس کے لئے بس ایک خون ہی کافی تھا... ایک قتل... جو ہزاروں لاکھوں قتل پر بھاری تھا۔ کتنا ارمان تھا اسے اس قتل کا۔

قاتل کتنا پیارا اور خوبصورت لفظ ہے۔ اس کے دبلے پتلے جسم پر چڑھے ہوئے مفلر اور کوٹ پر جب قاتل کا تمغا لگ جائے گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔

اس کی یہ کتنی عجیب خواہش تھی کہ یہ رات اچانک دن میں تبدیل ہو جائے اور لوگ اسے اس عالم میں دیکھ کر چونک پڑیں۔ خاص طور پر اس کے دوست، اس کے چاہنے والے عزیز...

لیکن رات کی ٹھٹھرتی ہوئی سیڑھی سے اترنے والا یہ آخری مسافر تھا۔

اور سارا شہر گہری نیند کے ہچکولے میں پڑا موت کی نیند سو رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ یہ لوگ کروٹ بدل کر اپنے خوابیدہ کواڑوں کو اس لئے وا نہیں کر سکتے کہ وہ اس سے بے پناہ خوف کھاتے ہیں جیسے ذرا کسی نے دریچے سے جھانکا تو وہ ان پر حملہ آور ہو جائے گا۔ مگر اس نے جو قتل کیا تھا وہ ہزاروں قتل کے برابر تھا۔ اب اگر کوئی اس کا پیچھا بھی کرے تو وہ اپنے ہاتھ خون میں رنگنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ اچانک کوئی اس کے سامنے

آکر اس کارنامے پر اس کی پیٹھ ٹھونکے اور کہے۔ "یار تو نے تو آج کمال کر دیا۔"
مگر رات کی تاریکی نے جیسے سب کو ڈس لیا تھا۔ یہاں تک کہ پولیس کے ان جوانوں کو بھی جو اسے دیکھ کر چپکے سے کھسک گئے تھے۔ لانبے لانبے وحشیانہ بوٹوں کی گھن گرج سے زمین لرز سکتی ہے۔ زمین سے چپٹے ہوئے ذرے موت سے گھبرا کر پناہ گاہوں کی طرف بھاگ سکتے ہیں لیکن وہ تو سینہ تانے قاتل ہونے کے باوجود سڑک پر فاتحانہ انداز سے چل رہا تھا سڑک نیند کی گہری چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ سڑک پر آوارہ گھومنے والے بے گھر کتے دور ہی دور سے اسے آتا دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ بھوں بھوں.. مگر آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز میں جو خوف کے بطن سے جنم لینے والی لرزش تھی۔ وہ ہر قدم ناپتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اب تو کتے بھی اسے قریب آتا دیکھ کر دم دبا کر بھاگ رہے تھے۔ سردی ہولے ہولے بڑھ رہی تھی۔ اب اسے علانیہ محسوس ہو رہا تھا جیسے گرم اوور کوٹ کو پھلانگتے ہوئے سرد ہوا کے چبھتے ہوئے جھونکے اس کے بدن میں سرایت کرتے جا رہے ہوں۔ پتہ نہیں رات کے طلسم ٹوٹنے کی خواہش اب اس کی ذات میں کیوں باقی نہیں رہی تھی۔ اسی نے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی معصومانہ خواہش کا اظہار آپ ہی آپ کرتے ہوئے سوچا تھا کہ یہ رات اچانک دن میں تبدیل ہو جائے۔

کہر میں ڈوبی ہوئی صبح میں لوگ اسے دیکھ کر....

مگر یہ کیا وہ تو رات کے زینے سے اترنے والا آخری مسافر تھا۔ وہ تو شکست کے لبادہ کو تار تار کر کے فاتح بن چکا تھا۔ زندگی کو موت کی وادی میں ڈھکیل آنے والا مسافر وہ سوچ رہا تھا۔

یہ رات آگے جاری ہے یا پیچھے۔ کوئی اس کا تعاقب کیوں نہیں کرتا۔ کیا زندگی نے پھر ایک بار موت پر فتح پالی ہے۔ یا پھر موت نے زندگی کا منہ نوچ لیا ہے۔ اس لانبی سڑک پر چلتے چلتے وہ تھک سا گیا تھا۔

اچانک بے ارادہ جب وہ سامنے والی گلی میں مڑ گیا تو اسے سامنے سے ایک جنازہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ جنازے کے ساتھ چار خستہ حال آدمی ڈولے کو سہارے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے گلی پار کر رہے تھے۔

رات کے سناٹے میں وہ اسے بھوتوں کی مانند لگ رہے تھے۔

اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چاروں آدمی آنکھیں بند کئے سڑک پار کر رہے تھے جیسے وہ پیدائشی نابینا ہوں۔

یہ منظر اسے بڑا عجیب لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ مگر وہ بزدل نہیں ہے.... وہ بزدل نہیں تھا۔

وہ تو رات کے زینے سے اترنے والا.... وہ آپ ہی آپ مسکرایا۔ کتنے دنوں بعد اس کے ہونٹوں نے مسکراہٹ کا مزا چکھا تھا۔ زندگی کا چہرہ کیا اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔ کیا رات کے زینے سے اترنے والا مسافر مسکرا بھی سکتا ہے۔ لیکن رات کی بانہیں سمٹ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لبوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ مٹ رہی تھی۔

اب اسے یہی خوف تھا کہ کہیں سرما کی یہ طویل تھرتھراتی ہوئی رات صبح کی روشنی کو گلے سے نہ لگالے۔ مگر سڑک پھیلے ہوئے اونچے نیچے مکانوں کے کمرے بند تھے۔ کھڑکیوں پر گہرے کالے رنگ کے ماتمی پردے لہرا رہے تھے۔ لیکن اس کی یہ بدبختی تھی کہ رات سسکتی ہوئی مر رہی تھی اور صبح کی سپیدی کے آثار آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہے تھے۔ آسمان سے سیاہی کا غلاف دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔ کہیں کہیں آسمانی کلس پر دو ایک مدھم ستارے رات کے خاتمہ کا جیسے اعلان کر رہے تھے۔

وہ صبح کی سپیدی سے بغل گیر ہونے سے پہلے موت کو ترجیح دینا چاہتا تھا۔

اب تو رات واقعی ڈھل رہی تھی اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے لوگ سڑک پر تیز تیز چلنے لگے تھے۔ وہ اپنی دھن میں مست تھے۔ انھیں ذرا بھی فرصت نہیں تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھتے۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے یہ جان کر شدید صدمہ ہوا کہ خون میں بھرا ہوا ننگا چاقو ہاتھ میں تھامے رہنے کے باوجود وہ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا تھا۔ لوگ اس کے سامنے یوں گذر رہے تھے جیسے اس کا وجود ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔ لوگوں کا اس طرح خاموشی سے گذر جانا اس کے لئے حد درجہ اذیت کوش تھا۔ اس کا وجود اب اسے گندی نالی میں پرورش پانے والے حقیر کیڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ سڑک پر لوگوں کا ایک جال سا پھیلتا جا رہا تھا۔

رات بھاگ رہی تھی اور وہ لوگوں کے ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اسے کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہر میں لپٹی ہوئی رات کی آغوش بھی اب اس کے لئے خالی تھی۔

وہ دیوانہ وار سڑک پر بھاگ رہا تھا۔

"ارے اس آدمی کو تو دیکھو کیسے تیز بھاگ رہا ہے، جیسے ریل چھوٹنے ہی والی ہو۔"

اب سارے لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو چکی تھی۔

اب اپنی عقل اور بساط کے مطابق ہر آدمی کوئی نہ کوئی فقرہ اس پر کس رہا تھا۔ یک بارگی اسے ایسا لگا جیسے اس کا بکھرا ہوا وجود تکمیل پا چکا ہو ☆☆☆

محمد توفیق خاں
کی دو نئی کتابیں
ا۔ جگن ناتھ آزاد، اردو ادب کی آبرو
۲۔ مختار شمیم، ایک تاثر
ملنے کے پتے
ا۔ کریسنٹ ہاؤس پبلیکیشنز، ۲۶۷، جوگی گیٹ، جموں ۱۸۰۰۰۱
۲۔ انتساب پبلیکیشنز، سیفی لائبریری، سرونج، ایم پی، ۴۶۴۲۲۸

عین تابش

شمارہ ۲۴۸،
ستمبر ۲۰۰۱

ایسی ہوتی ہی نہیں تاب نظر دیکھ نہ پائے
ہم نے دیکھا ہے ادھر لوگ جدھر دیکھ نہ پائے
ہم سے اتنا تو ہوا خواب سحر دیکھ لیا
اور بھی لوگ تھے ہمراہ مگر دیکھ نہ پائے
وہ جو اک بار اس انداز سے دیکھا مری جاں
ہم کبھی تجھ کو بہ انداز دگر دیکھ نہ پائے
تجھے دیکھا تو بعد خوف و خطر دیکھا ہے
اور جہاں سے نہ رہا خوف و خطر دیکھ نہ پائے
ہم سے وابستہ ہے تر دامنی ایسی کہ نہ پوچھ
اور یہ لوگ کبھی دامن تر دیکھ نہ پائے
لوگ تھے پیچ و خم راہ گذر سے آگاہ
اور جو پیچ و خم راہ گذر دیکھ نہ پائے
بزم والے جو بہت تیری طرف دیکھتے تھے
کم نظر ایسے کبھی تیری نظر دیکھ نہ پائے
معرکہ اصل میں نظارے سے آگے کا تھا
معرکہ جو بھی ہوا اہل نظر دیکھ نہ پائے
وہ جو تعمیر میں صورت تھی خرابی کی نہاں
کیسے معمار تھے دیوار میں در دیکھ نہ پائے
اس تماشے کو جو دیکھا تو نہ جانے کیا ہو
اور پھر یہ بھی کہ دکھ ہوگا اگر دیکھ نہ پائے
جو نہیں دیکھ سکے ہوں گے وہی دیکھ سکے
دیکھنے والے اسے دیکھنے پر دیکھ نہ پائے
ہم نے جو دیکھا ہے وہ حد سے زیادہ دیکھا
یہ الگ بات کہ ہم شمس و قمر دیکھ نہ پائے
بھر گیا دل کو وہ خوشبو سا ادھر سے گذرا
آنکھ بھر کر اسے ہم ایک نظر دیکھ نہ پائے

خاکساری تھی کہ بن دیکھے ہی ہم خاک ہوئے
اور کبھی معرکۂ فتح و ظفر دیکھ نہ پائے
اس نے دیکھا ہے تو پھر دیکھنا کیا ہو جائے
دیکھتے رہنا ہے ظالم کو ادھر دیکھ نہ پائے
بے ہنر دیکھ نہ سکتے تھے مگر دیکھنے آئے
دیکھ سکتے تھے مگر اہل ہنر دیکھ نہ پائے
ہو گئے خواہش نظارہ سے اتنا بے خود
دیکھنا چاہتے تھے اس کو مگر دیکھ نہ پائے
کب اسے لوٹ کے دیکھیں گے یہ دیکھا جائے
ہم نے دنیا تو بہت دیکھ لی گھر دیکھ نہ پائے
لوگ جب دیکھنے پر آئے تو اتنا دیکھا
آنکھ پتھرا گئی اور حد نظر دیکھ نہ پائے
وہ بھی کیا دیکھنا تھا دیکھنے والے بولے
جلوہ ہر چند رہا پیش نظر دیکھ نہ پائے
دیپ جلتے رہے طاقوں میں اجالا نہ ہوا
آنکھ پابند تحیر تھی ادھر دیکھ نہ پائے
یہ یقین نہیں ہوتا تھا کدھر دیکھ سکے
یہ تعین نہیں ہوتا تھا کدھر دیکھ نہ پائے
وہ تغافل تھا کہ اس نے ہمیں دیکھا ہی نہیں
وہ تساہل تھا کہ ہم اس کی نظر دیکھ نہ پائے
اس قدر تیز چلی اب کے ہوائے نابود
چاہ کر شہر تمنا کا کھنڈر دیکھ نہ پائے
یوں ہوا دل زدگاں لوٹ گئے آخر شب
رات تو جاگ کے کاٹی تھی سحر دیکھ نہ پائے
کس نے دیکھی ہے اجالوں سے سلگتی ہوئی رات
اور جو دیکھ سکے خواب سحر دیکھ نہ پائے

شہر

عین رشید

شمارہ۷۶،
ستمبر ۱۹۷۳

شہر، تو اپنے گندے پاؤں پسارے دریا کے کنارے لیٹا ہے
اور تیرے سینے پر رینگتی ہوئی چیونٹیاں سورج کو گھور رہی ہیں،
جب نصف درجن غیر ملکی حکیموں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا
''مرض سنگین ہے اور یہ بہت جلد ہی مر جائے گا۔''
تو کسی چمک زدہ بچے کی طرح تو نے انھیں دیکھا اور خاموش ہو رہا،
غلیظ! بدکار! بے رحم!

شہر! لوگ کہتے ہیں تو بدکار ہے
اور میں نے خود دیکھا ہے
سرِ شام
تیرے رنگے چہرے والی عورتیں لڑکھڑاتے نوجوانوں کو نگل جاتی ہیں!
بے رحم!
جب رات گئے تیرے دانشور رکشا لئے خودکشی کرنے جاتے ہیں
تو خاموش رہتا ہے

شہر، میں تیری دیوانہ کن خواہشوں سے بیزار ہوں
شہر، تو اپنے گندے لباس کب اتارے گا؟
شہر، لوگ کہتے ہیں مرنے کے بعد میری ہڈی سے بٹن بنائیں گے
شہر، تیری دیواروں پر یہ کیسی تحریریں ہیں؟
شہر، ''میں نے مہینوں سے اخبار نہیں پڑھا''،
شہر، تو چائے میں شکر ڈالنا بھول گیا ہے اور یہ تیرے آنسوؤں کی طرح لگ رہی ہے،
شہر، مجھے نیند آ رہی ہے تھپک کر سلا دے!

عین رشید

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

(سی۔وی۔کوافی C.V. Cavafi کی نذر)

شہر تو نے کہا تھا کہ
میں سات سمندر پار ملکوں میں جاؤں گا
سمندر کی لہروں کے ہچکولے سے کھیلوں گا
ایک نیا شہر ملے گا
تم سے اچھا اور پیارا
میری سب کوششیں رائیگاں ہوئیں
میں قسمت کا مارا
شہر، میرا جسم و جان اب دفن ہے
شہر، کب تک میرا ذہن اس بنجر سرزمین میں بھٹکے گا؟
حدِ نگاہ تک بھورے کھنڈرات کے سوا کچھ بھی نہیں
جہاں میں نے زندگی کے خوبصورت ترین سال گنوائے ہیں
شہر، میں جانتا ہوں
تو میرے لئے کوئی نئی سرزمین دریافت نہیں کرے گا
شہر، میں اتنا بیوقوف نہیں

میں جانتا ہوں تو ہمیشہ میرا تعاقب کرے گا
تو میرے پیچھے ان ہی راستوں میں
آوارگی کرے گا، اور میری ہم سائیگی میں تو بھی ضعیف ہوگا
اور تیرے بال بھی انھیں لمحوں میں سفید ہوں گے
شہر، تو ہمیشہ یہیں واپس آئے گا
ان مٹیلے گھروں بنجر سرزمینوں اور فلک بوس جنگلوں میں
شہر، اب امیدوں کی کوئی صورت نہیں
نئی سرزمینوں کی تلاش اب بے سود ہے
شہر، اب نہ تیرے لئے اور نہ میرے لئے
کوئی جہاز منتظر ہے
نہ کوئی سواری، نہ ہی کوئی راستہ
شہر، ہماری دنیا اور عاقبت یہیں خراب ہوئی تھیں
چل اب صبر کرلیں اور سو جائیں

غلام حسین ساجد

شمارہ ۱۶۸،
مارچ تا مئی ۱۹۹۳

ہوا روشن دم خورشید سے پھر رنگ پانی کا
دمک اٹھا ہے میرے آئینے پر زنگ پانی کا
مقید رنگ کھلتے ہوں کسی بلور سے جیسے
کھلا اس طرح میرے خواب پر ارژنگ پانی کا
کسی انجان خوشبو سے طبیعت سیر ہے اس کی
اگر قافیہ کچھ روز سے ہے تنگ پانی کا
ستاتا ہے جو دشت نامرادی کے اسیروں کو
وہ تارا اس حسیں کے سامنے ہے دنگ پانی کا
بہت ہی یاد آتا ہے کوئی بچھڑا ہوا مجھ کو
کبھی جب سامنا کرتا ہوں شوخ و شنگ پانی کا
ابھی فرصت نہیں ہے کار دنیا میں الجھنے کی
مگر تبدیل کر سکتا ہوں میں بھی ڈھنگ پانی کا
بہت دن سے میں ساجد وہ میاں ہوں اپنے پیالوں کے
کہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے اب محاذ جنگ پانی کا

شمارہ ۱۷۵،
جون جولائی ۱۹۹۴

نہیں اب روک پائے گی فصیل شہر پانی کو
بہائے جا رہی ہے روشنی کی لہر پانی کو

مجھے بھی سرخ کرتی ہے یہ مشعل میری آنکھوں کی
کہ جیسے سبز کرتا ہے ضیا کا زہر پانی کو

کسی بے نام سیارے پہ اب بھی ابر چھایا ہے
ترستا ہے کئی دن سے اگرچہ دہر پانی کو

بہت اترا رہی ہے موج صحرا اپنے ہونے پر
رواں رکھتی ہو جیسے آج بھی یہ نہر پانی کو

نکلنا چاہتا ہے قید سے جیسے مشیت کی
پسند آیا نہیں ہے آسمانی قہر پانی کو

اسے وہ راکھ کرنے کے لئے تیار ہے ساجد
مقید ہی نہ رکھے گا فقط یہ شہر پانی کو

غلام حسین ساجد

شمارہ ۲۲۵
مارچ اپریل ۱۹۹۹

نہیں آساں کسی کے واسطے تخمینہ میرا
مقرر ہے دیار غیب سے روزینہ میرا

دم رخصت اگر میں حوصلے سے کام لیتا
پلٹ کر دیکھ سکتا تھا اسے آئینہ میرا

ہدف بن پائیں گی آنکھیں نہ میرے دشمنوں کی
مقابل ہے خدنگ خواب کے اب سینہ میرا

پڑا رہتا ہوں کنج عافیت میں سر چھپا کر
گذر جاتا ہے یوں ہی سبت اور آدینہ میرا

بڑھاپا چھا رہا ہے میرے ہر جذبے پہ لیکن
جواں ہوتا چلا جاتا ہے پھر بھی کینہ میرا

بدل سکتا تھا میرے شہر کا آہنگ ساجد
اگر ترتیب پاسکتا کبھی سازینہ میرا

شمارہ ۲۴۴،
فروری ۲۰۰۱

لرز جاتا ہے تھوڑی دیر کو تار نفس میرا
سر میداں کبھی جب جست کرتا ہے فرس میرا

میں خود سے دور ہو جاتا ہوں اس سے دور ہونے پر
رہائی چاہتا ہوں اور مقدر ہے قفس میرا

ذرا مشکل سے اب پہچانتا ہوں ان مناظر کو
قیام اس خاکداں پر تھا ابھی پچھلے برس میرا

دعا کرتا ہوں ملنے کی تمنا کر نہیں پاتا
بھلا کیا سامنا کر پائیں گے اہل ہوس میرا

نہیں بھولے گی میری داستان عشق دنیا کو
کہ صحرا میں ابھی تک نام لیتی ہے جرس میرا

نمود عکس کی اس کو ضمانت کون دے ساجد
نہیں ہے جب شگفت آئینہ پر کوئی بس میرا

غلام مرتضیٰ راہی

شمارہ ۴۶،
مارچ ۱۹۷۰

سوکھے ہوئے پتوں کو پیڑوں نے ہوا دی ہے
ہر آن قیامت سی برپا سر وادی ہے

دیوار جو رستے میں حائل تھی گرادی ہے
سائے کی غرض ہم نے مٹی میں ملا دی ہے

یہ کون ابھی مجھ سے انصاف کا طالب ہے
یہ کس نے مرے گھر کی زنجیر ہلا دی ہے

پھر جیسے کوئی خطرہ لاحق ہوا سورج کو
پھر دامن صحرا نے ذروں کو ہوا دی ہے

کہسار کے سائے میں بے جان پڑا رہتا
اک تیشے نے سوتے کی تقدیر جگا دی ہے

نکلا ہی نہیں کوئی مفہوم سر دریا
موجوں نے ہی خود اٹھ کر تحریر مٹا دی ہے

دامن کا مرے بچنا مشکل ہے بہت راہی
قدرت نے سر ہستی اک شمع جلا دی ہے

شمارہ ۸۸،
جنوری فروری ۱۹۷۴

ٹھیر دو چار نفس اب کیا ہے
راہ ہموار ہے بس اب کیا ہے

رہا جب تک رہا سمتوں کا زوال
آئی آواز جرس اب کیا ہے

موج میں آگئے ندی نالے
اے گھٹا کھل کے برس اب کیا ہے

میں ترے واسطے آئینہ تھا
اپنی صورت کو ترس اب کیا ہے

دانے دانے پر نظر ہے تیری
آ تہ دام ہوس اب کیا ہے

ختم ہوجائے گا سارا جھگڑا
چل گیا ہے مرا بس اب کیا ہے

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

شمارہ ۱۸۷،
اکتوبر ۱۹۹۵

ہے آبگینۂ احساس پارہ پارہ مرا
انھیں جھروکوں سے دیکھو گے تم نظارہ مرا
سلام کرنے لگے سنگ وخشت اٹھ اٹھ کر
اسی گلی سے ہوا جب گذر دوبارہ
جہاں زباں نہیں کھلتی تری شہادت کو
وہاں گواہ ہے انگلی کا ہر اشارہ مرا
رہے گا آئینے کی طرح آب پر قائم
ندی میں ڈوبنے والا نہیں کنارہ مرا
میں اپنے دائرے میں جلتا بجھتا رہتا ہوں
سکوت میرا سمندر سخن شرارہ مرا
غبار چھٹنے تلک انتظار کر لیتے
دکھائی دیتا تمھیں اوج پر ستارہ مرا
ملا ہے کیوں تجھے مخلوق پر شرف راہی
تو عقل مند ہے کافی ہے بس اشارہ مرا

شمارہ ۲۱۵،
مارچ اپریل ۱۹۹۸

کہنے سننے کا عجب دونوں طرف جوش رہا
شہر کی باتوں میں صحرا ہمہ تن گوش رہا
رکھ دیا وقت نے آئینہ بنا کر مجھ کو
رو برو ہوتے ہوئے بھی میں فراموش رہا
حال بندش کا ہوا میرے لبوں سے ظاہر
میں جو اظہار کی حسرت لئے خاموش رہا
کھینچ دے گرد مرے اپنے تعلق کا حصار
کب اجالا کبھی فانوس میں روپوش رہا
آگ سینے کی کسی طرح بجھائی نہ گئی
دشت ہر چند سمندر سے ہم آغوش رہا
آنکھوں آنکھوں میں وضاحت سے ہوا کی باتیں
چپ نہ محفل میں وہ بیٹھا نہ میں خاموش رہا
مدتوں بعد نقاب اس نے اٹھائی رخ سے
سر بسر شعلہ وہ نکلا جو سیہ پوش رہا
رہا مصروف میں بیداری شب میں راہی
ملی فرصت تو سحر کا نہ مجھے ہوش رہا

غلام مرتضیٰ راہی

شمارہ ۲۴۴،
فروری ۲۰۰۱

پتھروں کا وہ پہاڑوں سے سرکتے رہنا
میرا رک رک کے وہ منھ راہ کا تکتے رہنا
رائیگانی وہ اجالوں کی مرے ہاتھوں سے
وہ چراغوں کو لئے میرا بھٹکتے رہنا
ہر طرف سے وہ سمندر سے گھری ہونے پر
بیچ میں آگ کا رہ رہ کے بھڑکتے رہنا
کوئی حیلہ مری آنکھوں کو ہو بیداری کا
جگنوؤ تم مری راتوں میں چمکتے رہنا
بھیگنا وہ مرا بارش کے نکل جانے پر
قطرے قطرے کا وہ شاخوں سے ٹپکتے رہنا
ایک اک بوند کا اب چاہئے ساقی کو حساب
وہ مرے جام کا بھر بھر کے چھلکتے رہنا
بادلوں سے نہیں دیکھا گیا آخر راہی
فصل کا میری کڑی دھوپ میں پکتے رہنا

شمارہ ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

جو دن کو چھپا لے وہ اندھیرا نہیں لگتا
بادل مجھے کچھ خاص گھنیرا نہیں لگتا
تنہائی مری بانٹنے آجاتی تھیں یادیں
اب خانہ بدوشوں کا بھی ڈیرا نہیں لگتا
معمول مرا دیر تلک جاگنا سونا
دیکھوں گا کبھی شب کا سویرا نہیں لگتا
گل سخت زمینوں میں کھلانے کا نتیجہ
بھنوروں کا ادھر بھول کے پھیرا نہیں لگتا
بن کر مرا، رگ رگ میں سما جاتا ہے میری
بہتا ہے وہی خون تو میرا نہیں لگتا
میں داد اسے دیتا ہوں اس حسن عمل کی
لوٹا مجھے ایسے کہ لٹیرا نہیں لگتا
فن آدمی کی ذات بتا سکتا ہے راہی
کچھ بین سے اپنی وہ سپیرا نہیں لگتا

غلام مصطفیٰ فراز

شمارہ ۲۴۹،
جون ۲۰۰۳

ایک اک ذرے کو جوہر آشنا میں نے کیا
شعلگی کے بند دروازوں کو وا میں نے کیا
میں نے عالم کو کیا راز آشنائے کائنات
دیدہ و نادیدہ سب کچھ زیر پا میں نے کیا
تھی سرائے شام میں صف تیرگی کی جابجا
ڈال کر شب خون کار بے بہا میں نے کیا
چاند تاروں سے بھی آگے پھینک دی میں نے کمند
خاک کو مسند نشین منتہا میں نے کیا
منکشف پہلے کئے کچھ لمس لذت کے رموز
پھر شراب وصل کو دو آتشہ میں نے کیا
دیکھ کر اوج تجلی آنکھیں خیرہ ہوگئیں
جس گھڑی دنیا پہ خود کو آئینہ میں نے کیا
وضع کر کے آستان یار پر مرنے کے ڈھنگ
قصۂ دار و رسن کو بے مزہ میں نے کیا

غیاث احمد گدی

شمارہ ۱۲۲،
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱

"یہیں کہیں ہوگی..."

دوسرے نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ صرف تھکے ہوئے دن کے بجھے بجھے خدوخال پر نظریں گاڑے سامنے والے کھنڈر کو دیکھنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جہاں اس نے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

کوئی بڑی اور بہت پرانی عمارت ہوگی جس کے یہ کھنڈر ہیں۔ اب ایک دم سے ڈھہ گئی تھی۔ چاروں طرف ملبہ ہی ملبہ تھا۔ فقط ایک آدھ نیم منہدم دیوار رہ گئی تھی جو اگلے برسات، اگلے کسی دھماکے، کسی جھٹکے کی منتظر تھی۔

"مگر اب لوٹ چلو..." پہلے نے دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت سے کہا۔ "کل ڈھونڈ لیں گے۔"

"نہیں، کل تک وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔" یہ کہہ کر دوسرا ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھنے لگا۔

"دیکھو۔ گروگے۔" پہلے نے پھر ہمدردی کا اظہار کیا۔

"نہیں گروں گا۔" دوسرے نے اعتماد سے کہا اور گردن پر کے پسینے کی نمی پونچھتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار سے کچھ وقت خوردہ گارا جھر جھرا کر نیچے کسی سوکھے پتے پر گرا، کوئی ایک اینٹ بھی گرنے کو تھی کہ بڑے نے آگے بڑھ کر اس کو روک لیا۔

سورج اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا مگر گھنٹوں کا تپا ہوا دن ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا چلتا تو دونوں کے چہروں پر طمانچہ سا پڑتا۔ چہرے جھلس سے جاتے۔ مگر وہ دونوں اس کی قطعی پروا نہیں کر رہے تھے کہ سورج ڈوبنے والا تھا۔

سارا دن یوں ہی بیت گیا۔ وہ دونوں لڑکے اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئے۔ گلی در گلی، مکانوں کے چھپروں پر، کسی طرح وہ چھپر پر چڑھ جاتے تو وہ نیچے کود جاتی۔ ایک بار تو انھوں نے صاف دیکھا۔ اس کا اگلا پاؤں گلی میں گڑی ہوئی کسی میخ پر پڑا اور زخمی ہوگیا۔ جیتا جیتا لہو صاف نظر آ رہا تھا اور وہ اوندھی زمین پر بے ہوش سی پڑی تھی... شاید مرگئی...

"شاید مرگئی.."

"ایسا مت بولو، مجھے زندہ چاہئے۔" دوسرے نے جواب دیا اور چپکے سے چھپر سے نیچے اتر آیا۔

"زندہ ہو تو بہت۔ مردہ کو کیا کرنا ہے؟"

واقعی مری نہیں تھی، بے ہوش بھی نہیں ہوئی تھی، صرف دن بھر کی بھوکی پیاسی، ان دونوں خوش شکل لیکن کریہہ الطبع لڑکوں کے تعاقب سے تھکی ہاری، گلی والی کیل سے زخمی ہو جانے کے سبب سر نہوڑائے پڑی تھی۔ کیونکہ جیسے ہی اس کے کانوں میں قدموں کی چاپ پڑی، اس نے گردن اٹھا کر ایک بار دیکھا، اور یہ دیکھا کہ ان دونوں میں سے ایک مین اس پر جھک کر پکڑنے والا ہے کہ وہ تڑپ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"اُفوہ..."

"میں کہتا ہوں چھوڑ دو اس کا پیچھا..."

"نہیں"۔ دوسرے نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا... مجھے چاہئے!"

"چاہئے تو مجھے بھی مگر میں چلا لوں گا..." ذرا ٹھہر کر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ایک اور ہے میری نظر میں..."

"مگر وہ تو بھوری ہے اور غراتی بھی ہے۔"

"ہاں اور نوچتے بھی دوڑتی ہے..." دوسرے نے کہا۔ "مگر میں اسے سدھا لوں گا... ایک دم ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن مجھے تو یہی چاہئے بس یہی والی!" دوسرے نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی کم ضدی نہیں ہو!" پہلے نے جواب دیا۔

دوسرے لڑکے نے اس بات کا جواب نہیں دیا اگرچہ پہلے کا یہ کہنا اسے اچھا لگا، گویا اس کی توصیف کی گئی ہو۔ عجیب سے گدلے گدلے احساس کے ہاتھوں وہ ذرا سطح سے اوپر اٹھ آیا۔ اور کچھ یاد کر کے مسکرانے لگا۔

"کیا بات ہے تم آپ ہی آپ..."

ہاں ایک بات یاد آگئی۔ ذرا رک کر اس نے جیب سے ایک ٹافی نکالی اور دانتوں کی مدد سے دو ٹکڑے کر کے ایک بڑے کے حوالے کیا دوسرے ٹکڑے کو منہ میں رکھ کر چوسنے لگا۔

"پچھلی سردیوں کے دن تھے۔ ہم لوگ یعنی میں، ممی، ڈیڈی اور منی، ڈیڈی کے فرینڈ کے یہاں سے لوٹ رہے تھے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے، چاروں طرف گہرا دبیز اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔"

وہ چپ ہوگیا، خاموشی بوڑھی ہونے لگی تو پہلے نے اسے ٹھوکا دیا۔

"راستے میں تن گیا کہ گاڑی میں چلاؤں گا۔ پہلے تو ممی اور ڈیڈی ہنسے پھر مجھے سمجھانے لگے تم ابھی بچے ہو، گاڑی کیسے چلتی ہے، کیسے اسٹارٹ ہوتی ہے، کیسے اسپیڈ پکڑتی ہے، موڑ کاٹتی ہے، راستے بدلتی ہے اور کیسے سامنے والے راہگیر کو اپنی زد سے بچاتے ہوئے نکل جاتی ہے۔ تم یہ سب ابھی نہیں جانتے۔ جان جاؤ گے، کچھ دنوں کے بعد ضرور جان جاؤ گے۔ خود بخود جان جاؤ گے، ایک ایک بات معلوم ہو جائے گی کیوں کہ تمھارے پیچھے تمھاری پشت پر...

"مگر میں مچل گیا تو انھوں نے گاڑی ایک جگہ روک کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور میرے ہاتھ کو اسٹیرنگ پر رکھ کر خود چلانے لگے۔ میں سمجھا کہ گاڑی میں ہی چلا رہا ہوں۔ سامنے سے ایک دوسری گاڑی کی بتیاں نظر آئیں جو سیدھی میری آنکھوں میں گھستی

چلی گئیں۔ اور تب میں نے محسوس کیا کہ سامنے کی ساری چیزیں دھندلی ہو کر، اپنا آپ کھوتی چلی جا رہی ہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، روشنی بہت تیز تھی بہت تیز...''

روشنی بہت تیز ہو جب بھی آنکھوں سے صاف بھائی نہیں دیتا، جیسے روشنی کم ہو۔ دھند کی چادر تنی ہو تو ہر چیز غیر واضح اور ناقابل فہم سی نظر آتی ہے۔ آدمی آدمی نہیں دکھتا، بھدا لوندا سا جانور سا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آدمی جو سڑک کے کنارے، بوڑھے برگد کے تنے کی اوٹ میں گندہ بوریا لپیٹے پڑا ہے۔ وہ دونوں دیکھتے ہیں، اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہیں اور چہرہ دستا ہوا، جس میں خون کی رمق بھی باقی نہیں۔ ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی لاش ہو۔ وہ اپنے آپ میں مردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑا ان دوں لڑکوں کو دیکھتا ہے۔ اور پھر پتھریلی آنکھوں میں، جن میں اب تک کچھ نہیں تھا، کہیں سے گہرے سیاہ بادل کی طرح خوف امنڈ آتا ہے۔ چہرے کے خطوط جو اب تک جامد تھے، بگڑنے لگتے ہیں۔ آدمی چیخ مارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے گلے سے آواز نکل نہیں پاتی۔ صرف گھر گھراہٹ سنائی دیتی ہے۔

''تم نے دیکھا ہے...؟''

''ایک دم سے سفید تھی...!''

وہ انکار میں سر ہلاتا ہے اور جلدی سے آنکھیں موند کر اپنے سرد اور بے رنگ خول میں چھپ جاتا ہے۔ گویا باہر کے ہر خطرے سے نجات مل گئی ہو۔

''سالا مر گیا!'' پہلے نے کہا۔

''مرا ہی سمجھو!''

دھند لکے میں ایک آدمی سویا ہوا، بے جان، گوشت کا لوندا۔

دوسرے نے اس کا اشارہ سمجھ لیا۔ جبھی سامنے والی سڑک پر ملٹری وان اور فوجی لاریاں آگے محاذ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ پہلے نے دوسرے کو جلدی سے ایک طرف کھینچا، درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔

''ہمیں کیا ڈر...؟'' دوسرے نے ذہانت سے کہا۔ 'ہم کیا ان میں سے ہیں...؟''

''ان میں سے نہیں ہیں۔'' دوسرے نے سمجھایا۔ ''لیکن ان کے دھوکے میں تو... اندھیرا ہو رہا ہے، اور اندھیرے میں کیا ٹھیک، اندھیرے میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے...''

جبھی بدبو کا بھبکا ناک میں گھستا ہے۔ وہ پلٹ کر دیکھتے ہیں، سڑک کے نیچے نالے کے قریب ایک کتے کی پھولی ہوئی لاش پر تین چار کوے چونچ مار مار کر خوراک حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ بدبو کا بھبکا چکر کھاتا ہوا اٹھتا ہے، پھیلتا ہے اور ان دونوں کے نتھنوں میں پرویش کر اعصاب پر شام کے دھندلکے کی طرح پھیلتا ہے۔ کہیں بھر بھرے گارے جیسا کچھ گرتا ہے، چاروں اور دھند پھیلتی ہے۔ اندر ہی اندر کچھ ہونے کو ہوتا ہے مگر دونوں، ذہنوں پر پڑی ہوئی سوچ کو جھاڑ دیتے ہیں۔

دن تپا ہوا ہے۔ سورج اگرچہ آسمان کے پچھمی جھکاؤ کو ٹنگا ہوا، آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا ہے اور دھوپ کی حدت بھی ٹوٹ چکی ہے لیکن گرمی اور تپش میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ یوں سارا بازار پہلے ہی سہما سہما دہشت زدہ سا آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ جیسے کوئی غلیل میں پتھر رکھ کر زور سے انتہا تک کھینچے کھڑا ہے کہ ڈھیلا اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

لوگ باگ جلدی جلدی، جیسے تیسے کام دھندے کو نپٹا کر گھروں کو بھاگ رہے ہیں، حالانکہ اندھیرا ہونے اور کرفیو لگنے میں ابھی دیر ہے۔ دکانیں بند کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ بازار کی رونق کم پڑنے لگی ہے۔ حتیٰ کہ سڑک کے کنارے والے درخت کی پتیاں اور سائیں سائیں کرتے بجلی کے کھمبے اور پرندے، جو ٹیلی فون کے ستونوں اور درختوں کی شاخوں پر ہانپتے سے دکھائی دے رہے ہیں، سبھی دم سادھے ہوئے ہیں۔

خوف گرم ہوا کی طرح اس کے وجود کو چھو کر گزر جاتا ہے۔ وہ چونک کر سر اٹھاتی ہے۔ آنکھیں جھپکتی ہیں اور تبھی ان کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ عین ایک تناور درخت کے نیچے کھڑی، چاروں طرف پھیلی ہوئی وحشت اور خوف اور بے حسی کو دیکھ کر دم، اگلے پاؤں سے سڑک کی بجری کو کھردیچ رہی ہے۔ اس کے نتھنوں کے بال ہولے ہولے کانپ رہے ہیں۔ لڑکے دبے قدموں آگے بڑھتے ہیں، کانوں میں قدموں کی وہ آشنا چاپ سنائی دیتی ہے، وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔

''وہ رہی...!'' اندر ہی اندر چیخ کر پہلے لڑکے نے دوسرے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ پھر وہ دونوں لپکتے ہیں، وہ ان سے گز بھر کی دوری پر ہے لیکن ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے تڑپ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

وہ دونوں لڑکے تیزی سے اس کے تعاقب میں بھاگتے ہیں، وہ راہگیروں کے پیروں کے بیچ سے مڑ مڑ کر، بچ بچ کر بھاگ رہی ہے اور وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے آدمیوں کو دھکے دیتے ان سے الجھتے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ اب بازار کی حد ختم ہو جاتی ہے اور تنہا سڑک ملتی ہے تو وہ ایک بار ذرا کی ذرا رک کر مڑتی ہے اور تعاقب کرنے والے دونوں لڑکوں کو بے تحاشا ہانپتے ہوئے، جی جان کی بازی لگا کر اپنی طرف جھپٹے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاصلے پر غور کرتی ہے اور یکا یک لحہ بھر کے لئے سہم جاتی ہے۔ لیکن چشم زدن میں کہیں سے اس کے پیروں میں بجلی کی سی جھپٹ آ جاتی ہے۔ اور وہ تڑپ کر بائیں طرف والے گڈھے میں اتر جاتی ہے۔ ایک بار دونوں کی جانب مڑ کر دیکھتی ہے اور لگر دندے کی گھنی جھاڑی میں گھس کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

تعاقب میں بھاگتے ہوئے لڑکے بھی اچانک رک جاتے ہیں اور اس کو اس طرح پکڑ میں آتے آتے ہاتھ سے نکل جانے پر جھلا کر سڑک سے پتھر اٹھاتے ہیں، گالی دیتے ہوئے زور سے پتھر کو جھاڑیوں کی طرف پھینکتے ہیں۔

پہلا، دوسرے لڑکے کو ایک بار پھر سمجھانے کے خیال سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ دوسرا اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے کندھے سے الگ کرتا ہے اور اس کے کچھ بولنے سے پہلے سختی سے دانتوں کو بھینچ کر چلاتا ہے۔

''نہیں...! اس...اس...'' آواز کا پتھر زور سے سنسناتا ہوا جاتا ہے اور خاموش فضا کے سینے میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔

اور وہ لپک کر نیچے ڈھلان میں کود کر چھلانگ لگاتا ہوا جھاڑیوں میں گھس جاتا ہے۔ بڑا بھی اس عمل کو دہراتا ہے اور دونوں بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں... کوئی چادر سی تنتی ہے پھر آپ سے آپ ساکت ہو جاتی ہے۔

اب سورج ڈوب چکا ہے۔ چاروں اور دھند لکا دم بدم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ دیوار پھاند کر دونوں دوسری طرف چلے آتے ہیں۔ سامنے دیکھتے ہیں۔ گہرے دھندلکے میں وہ کبھی کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتی، کبھی ایک دم صاف دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے لڑکے کی بھی نظر کسی چیز میں الجھ جاتی ہے۔ وہ چونک کر آنکھیں میچ کر دیکھتا ہے، ذہن پر زور دیتا ہے، دور دھندلکے کے پردے کے پیچھے ایک سایہ سا تھرتھراتا دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

''وہی ہے۔''

ملبے پر آرام سے بیٹھی ہوئی وہ اپنے دونوں پاؤں کو آگے کی طرف بڑھائے انگلیوں کے زخم کو چاٹ رہی ہے۔ آس پاس سے بے خبر کسی اونچی اور ٹھنوٹا شاخ پر بیٹھے

ہوئے پرندے کی طرح وہ فکروں سے آزاد، اطمینان کا سانس لے رہی ہے۔ اس کے سفید بال ہوا کے بہاؤ سے تھرتھرا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ دونوں دیکھتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، آہستہ آہستہ ہاتھ ملاتے ہیں۔

"ہاں وہی ہے!" دھندلکے میں آنکھیں پھاڑے بڑا لڑکا اثبات میں کہتا ہے اور وہ دونوں چپکے چپکے، ہوشیاری سے پاؤں بڑھاتے ہیں، گویا وہ کوئی پرندہ ہے جو آہٹ پاکر اڑ جائے گا۔ دھندلکا لحہ لحہ بڑھ رہا ہے، جس کے باعث چیزیں اپنے کچھ خدو خال کھوتی جارہی ہیں۔ اور کچھ سے کچھ دکھائی دے رہی ہیں۔ چنانچہ وہ بھی جو وہ نہ ہو، کوئی اور چیز ہو۔

مگر تھی تو وہی۔ سفید براق، اس کے بدن پر کہیں کالی یا بھوری لکیر تک نہیں۔ ایک چھینٹا تک نہیں۔ یہی ہے وہ جو کہ پل پل بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بھی صاف صاف دکھائی دے رہی ہے۔

وہ دونوں آپس میں سازشی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ اور دونوں دو طرف سے چپکے چپکے بڑھتے ہوئے اس کو گھیر لیتے ہیں کہ اس کے سامنے اونچی نیم منہدم دیوار ہے اور پیچھے وہ دونوں کھڑے اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ، احتیاط سے آگے بڑھاتے ہیں۔

تبھی وہ چونکتی ہے۔ اس کی سماعت میں کوئی سرسراہٹ سی آواز آتی ہے۔ اور وہ چونک کر وحشت اور سراسیمگی سے پلٹ کر دیکھتی ہے۔ اور یہ دیکھ کر اس کا خوف فزوں ہوجاتا ہے کہ سامنے کی دیوار اتنی اونچی ہے کہ وہ چھلانگ لگا کر منڈیر تک نہیں پہنچ سکتی۔

ایک بار پھر مڑ کر ان چاروں بڑھتے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھتی ہے جو عین اس کے قریب ہیں۔ اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ دھونکنی کی طرح چلنے لگتی ہے۔

وہ ایک پل میں فیصلہ کرتی ہے اور ساری قوت کو اکٹھا کرتی ہے۔ جیسے گھوڑا کسی بڑے نالے کو پار کرنے سے پہلے ساری طاقت کو جمع کر کے پچھلی دونوں ٹانگوں اور کمر میں لے آتا ہے، اس کے بعد حوصلے سے جست لگاتا ہے۔ وہ ٹھیک ایسا کرتی ہے۔ وہ زور کی جست لگاتی ہے اور اس کے دونوں اگلے پاؤں کے منڈیر کے بھربھرے گارے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لگاتار بھگوتنے کے انداز میں کمر کو ہلا ہلا کر وہ منڈیر کے گارے کو پکڑے جارہی ہے مگر گارا ہے کہ بھربھرا کر نیچے گرتا جارہا ہے۔

آخر بے بسی کی انتہا تک پہنچ کر وہ دہشت میں چیختی ہے۔ اس کے گلے سے عجیب سی ذبح ہوتے ہوئے انسان کی آواز سے بھی عجیب چیخ نکلتی ہے تب وہ سرسراتی ہوئی نیچے فرش پر گر پڑتی ہے۔

دونوں لڑکوں کی باچھیں دور تک پھیل جاتی ہیں ان کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل پڑتی ہے۔

فرش پر گرنے کے بعد بھی وہ سنبھالا لیتی ہے۔ گردن کو زور زور سے جھٹکے دیکر حواسوں کو درست کرتی ہے اور یہ دیکھ کر اس کا حوصلہ ماند پڑ جاتا ہے کہ ان چاروں ہاتھوں کا حلقہ اور تنگ ہوگیا ہے۔ اس کے گلے سے غراہٹ نکلتی ہے۔ اتنی عجیب وحشت ناک، خونخوار خنجر کی دھار کی طرح تیز نوچ لینے والی، بھکوٹ لینے والی کہ آگے بڑھتے ہوئے دونوں لڑکے رک جاتے ہیں۔ دہشت ان کے دلوں میں سنگین کی نوک کی طرح اتر جاتی ہے۔

"سنتے ہیں یہ جب گھر جاتی ہے تو شیر ہوجاتی ہے..." گھبرا کر پہلا لڑکا چھوٹے لڑکے سے روہانسی آواز میں کہتا ہے۔

"ہاں۔" دوسرے کے لبوں سے بے اختیار یہ لفظ نکل جاتا ہے۔ لیکن فوراً اس کی ضد عود کر آتی ہے۔ "نہیں، یہ بکواس ہے!"

پہلا لپک کر اسے پکڑنا چاہتا ہے کہ وہ لمبی جست لگا کر اس کی گردن کے قریب سے نکل جانا چاہتی ہے مگر بھد سے فرش پر گر پڑتی ہے۔ بڑا لڑکا جھپٹ کر اس کو پکڑ لیتا ہے اور اس کے چاروں ہاتھ پاؤں کو سمیٹ کر گود میں بھر لیتا ہے۔

گرفت میں آنے کے بعد وہ یکبارگی اپنی ساری طاقت، سارا حوصلہ کھینچتی ہے اور جھلا کر، چیا کر، ناخنوں سے جھپٹ پڑتی ہے اور تیز ناخنوں سے بھنبھوڑتی ہے۔ لڑکا چیختا ہے، بے اختیاری میں اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے تبھی دوسرا اس کے ہاتھ سے لے کر اسے اچھی طرح دبوچ لیتا ہے۔

اندر کی اندر وہ پیچ و تاب کھاتی کچھ دیر تک دوسرے کی گرفت میں تڑپتی رہتی ہے۔ نکل بھاگنے کی ساری کوشش کر کے تھک جاتی ہے تو مایوسی سے ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ اس کے گلے سے بلکتی ہوئی آواز نکلتی ہے اور چاروں طرف سے بڑھتے ہوئے دھندلکے کو دیکھ کر وہ آہستہ سے آنکھیں موند لیتی ہے۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ چاروں طرف بڑھتے ہوئے اندھیرے کے سبب چیزیں خدو خال سے محروم ہورہی ہیں۔ اوپر آسمان پر شفق پھول چکی ہے۔ جس کے کارن سارے میں لہو رنگ سرخی پھیلتی جارہی ہے۔

"دیکھو اوپر..." بڑا کہتا ہے۔ پھر دونوں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کے چہروں پر پرچھائیاں گذرنے لگتی ہیں۔

"ہاں..." چھوٹا عجیب سے جذبے سے مملو آواز میں جواب دیتا ہے۔

تبھی دور سے سائرن کی تیر کی طرح نکیلی آواز دور تک فضا کے سینے کو چیرتی، چھیدتی، تلملاتی تھرتھراتی ہوئی گذرتی ہے۔ خاموشی دیر تک مرغ بسمل کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔

"چلو اب جلدی جلدی... گھر چلیں۔" چھوٹا کہتا ہے، گردن پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ کھنڈرات کے اوبڑ کھابڑ راستے کو گویا بھاگتا ہوا طے کرتا سڑک پر چلا آتا ہے۔ بڑا بھی اس کے پیچھے پیچھے آتا ہے۔ سڑک پر فوجی لاریاں یکے بعد ایک گذرتی چلی جارہی ہیں۔

گرفت میں جکڑی ہوئی وہ آنکھیں کھولتی ہے۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں لڑکوں کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے جہاں کامرانی کی چمک کے ساتھ کچھ پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔

تبھی کہیں دور سے سرچ لائٹ کی روشنی تڑپتی ہوئی، دوڑتی ہوئی، للکارتی ہوئی آتی ہے اور دونوں کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

ایک بند دکان کے پیچھے چھپنے کے لئے دونوں لپکتے ہیں، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہیں عین اس وقت گود میں کسی ہوئی، وہ تڑپ کر اچھلتی ہے اور آزاد ہوجاتی ہے۔

گرفت سے آزاد ہوتے ہی مضطرب سی، پلٹ کر دیکھتی ہے اور سڑک کی دوسری طرف بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔

گھڑ گھڑاتی ہوئی تیز رفتار فوجی لاریاں بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو روند کر گذرتی جارہی ہیں۔

پہلے کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ "چ... چچ چچ... مر گئی شاید۔"

"شاید بچ بھی گئی ہو..." دوسرے نے اندیشے کا اظہار کیا اور اس کا ہاتھ آپ سے آپ گردن پر چلا گیا، جہاں اس کے ناخن کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں ☆☆☆

سمندر اور آسمان

غیاث احمد گدی

شمارہ ۱۳،۷

اپریل تا جون ۱۹۸۵

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، دیواریں وہی تھیں۔ وہی دروازے، وہی گلابی پھول والے پردے، کھڑکی میں ہوا کی زد پر لرز رہے تھے۔ ایسے ہی جیسے وہ تین ماہ پہلے لرزتے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہی پرانی سنگار میز، وہی پلنگ، وہی صوفے اور دیوار پر آویزاں اس کے باپ کی تصویر، بیس برس پہلے کی وجیہ، خوب صورت، جوان، روشن آنکھوں اور چوڑی پیشانی والا آدمی، اس کا پتا...

اس نے محبت، احترام سے اندر ہی اندر اس کو سلام کیا۔

ہر روز، ہر صبح جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ ایک عجیب سے ناقابل فہم جذبے کے زیر اثر اس کی آتما تصویر والے خوب صورت آدمی کو سلام کرتی آئی تھی۔ جب اس کے شعور نے آنکھیں کھولیں، کلا کے سامنے پہلا مرد یہی تھا، جو اس کا باپ تھا۔ اس کا اپنا تھا۔ جس سے اس کا ایک عجیب سا دوستانہ تھا کہ جب تک شام کی چائے اس کے ساتھ نہ پی لیتی اسے اچھا نہ لگتا۔ جب تک اس کے بستر اپنے ہاتھوں سے درست نہ کر لیتی عجیب سا محسوس ہوتا۔ جب تک رات گئے تک غالب کے اشعار نہ سنا لیتی، کبیر کے دوہے نہ پڑھ لیتی، خود کو ادھورا ادھورا محسوس کرتی۔

اور جب تک اس کا باپ اس سے باتیں کرتے کرتے نیند کی پگڈنڈیوں پر بھٹک نہ جاتا وہ ہزار ضروری کام چھوڑ کر وہیں بیٹھی رہتی، اور ایک بار نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے اس کی پیشانی کو ذرا دور سے چوم لیتی اور دفعتہً غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔

ہر بار جب وہ یہ کر چکتی تو اس کو عجیب سا محسوس ہوتا، ایسا کیوں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو چومنے بڑھتی ہے۔ پھر اگر ایسا کرتی بھی ہے تو اس کی نگاہیں چوروں کی طرح دروازے کی طرف کیوں اٹھ جاتی ہیں۔ وہ اپنے من کے سمندر کو کھنگال کر دیکھتی ہے۔

پھر دل کو کھنگال کر دیکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟

وہ اپنے پتا سے اکثر کہہ اٹھتی۔ "آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں باؤ جی... کیوں؟ بولیے تو...؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستے اور کلا کو گلے لگا لیتے۔ کیوں کہ میں تمھارا باپ ہوں۔"

"اور میں کوئی نہیں ہوں؟" اس دم اس کی ماں کمرے میں داخل ہوتی۔ میں کیوں اچھی نہیں لگتی کلا کو، میری طرف تو کبھی پیار سے بڑھتی بھی نہیں لڑکی...

"کیونکہ کلا صرف اپنے باپ کی بیٹی ہے ماں کی نہیں۔" باپ فیصلہ کن لہجے میں کہتے اور ہنس پڑتے، تم اندر کی ماں ہو، پیتا کی ماں ہو...

تب کلا کو احساس ہوتا کہ شاید ماں کی شکایت... سچ ہے، کبھی تو اس کی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کسی چیز کی فرمائش ہی کر لے، کچھ کہنا ہے تو باؤ جی سے ہی بولتی ہے۔ اندر اور پیتا ماں سے چپٹے رہتے ہیں، اس کی خواہش کیوں نہیں ہوتی... کلا نے سوچا کہ شاید یہی سچ ہے، یہی سچ ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیٹی ہے، ماں کی نہیں، ماں نے اس کو جنم دیا ہے بس اتنا ہی اس

سے ناطہ ہے۔

عورت کے نام پر جس عورت کو سب سے پہلے اس نے دیکھا وہ اس کی ماں تھی، جسے اس نے کبھی پسند نہیں کیا، عجیب سی اجاڑ صورت، بال بکھرے رہتے، کپڑے الول جلول، گال دھنسے اور آنکھیں مردہ، عورت کا وجود مرد کے مقابلے میں کتنا حقیر ہے۔ اس کے باپ کے سامنے اس کی ماں...

پھر پتہ نہیں کیوں جیسے جیسے وہ شعور کی دنیا میں قدم رکھتی گئی عورتیں اسے اچھی نہ لگنے لگیں۔

اور مرد۔

مرد کے نام پر اس کی آنکھوں نے صرف ایک دیکھا تھا۔ شفیق، مہربان، باوقار، اس کے دل نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ عورت کے مقابلے میں مرد بہرحال بہتر ہے مقدم ہے۔ چنانچہ وہ سیتا سے زیادہ اندر کو چاہنے لگی۔ دن دن بھر اندر کے ساتھ کیرم کھیلنا اچھا لگتا۔ مگر سیتا یا اس کی ماں چلاتی رہتی کہ ذرا دیر کے لئے رسوئی میں آکر مدد کرے یا سیتا کی پڑھائی لکھائی پر نظر رکھے، وہ اس سے نہیں ہوتا۔ وہ اندر کو پڑھاتی، اس کے کپڑے بدلتی، اندر کی پیشانی چومتی۔

پھر اسے دفعتاً عجیب سا محسوس ہوتا۔ اندر کی کشادہ پیشانی اس کے باپ سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ مرد کے نام پر اس کے شعور کے طاق میں جو چراغ روشن ہوا وہ کتنا محترم، قابل عزت ہے اس کا باپ یا پھر اس سے ملتی جلتی تصویر اندر اس کا چھوٹا بھائی۔ وہ سارا سارا دن اندر کو اپنی پیٹھ پر سوار کئے رہتی۔ اندر سارا سارا دن اپنی بہن کلا کے گلے سے چمٹا رہا۔ پھر کہیں سے بھاری بھرکم جوتوں کی آواز آتی۔ وہ جھٹ سے اندر کو گود سے اتارتی اور لپک کر سیڑھیاں طے کرتی نیچے بھاگتی۔ دہلیز پر جیسے ہی قدموں کی چاپ جگتی وہ خوشی سے کھل اٹھتی۔

"باؤجی...!"

اور اس کا باپ مسکرا کر شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا سیڑھیاں چڑھ جاتا۔

مگر شام بھی سنولا گئی۔ اندھیرا جھک آیا، اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو سڑک کے لیمپ پوسٹ بھی روشن ہو چکے تھے، کتنی دیر ہو گئی، صبح... صبح، دوپہر، شام... شام، شام، جو رفتہ رفتہ کروٹ بدلتی جا رہی تھی اس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر رو پڑے، ایسا کیوں...؟ آج ایسا کیوں...؟

اس کی سماعت کی وادی سنسان ہے اور کسی کے قدموں کی چاپ ابھی تک نہیں آئی... وہ پھر کمرے میں لوٹ آئی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر چراغ روشن کرنے لگی پھر... پھر وہی کمرہ، دیواریں، دیواریں، لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں، پھر وہی کنج قفس... جتنا کچھ جس کا باقی ہوتا ہے دینے والا بیزار بھاگتا پھرے۔ لینے والا اپنا ایک سکہ نہیں چھوڑتا، یہ قرضوں کی دنیا، یہ جمع تفریق کی دنیا، یہ صرف تقسیم کی دنیا...

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے کے دوسرے کونے تک گئی۔ بازو والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی تب اسے اپنے کمرے کی تاریکی کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کرنا چاہی مگر رک گئی۔

اور پھر ٹہلتی ہوئی دوسرے کمرے تک گئی۔ بازو والے کمرے کے دروازے پر صرف ایک خوش رنگ پردہ پڑا تھا۔ اندر سیتا اور اس کی ماں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بازو والے کمرے میں سے اس کا بھائی اندر ابھی ابھی نکل کر ریکٹ ہاتھ میں لئے باہر گیا تھا۔

گیارہ دن ہو گئے۔ گیارہ راتیں گذر گئیں۔ وہ اس کمرے میں قیدیوں کی طرح پڑی ہے۔ نہ سیتا آئی اور نہ اندر نے جھانک کر پوچھا کہ دیدی کیسی ہو۔ چند لمحوں کے لئے ماں بھاری قدموں سے آئی دکھ سے اس کی جانب دیکھتی، پھر مجرموں کی طرح سر جھکائے چلی جاتی... یہ دو کمروں کے درمیان والا خوش رنگ پردہ کتنا بھاری ہو گیا ہے۔ کوئی اس طرف...

دفعتاً کلا کے پاؤں تیزی سے اٹھ گئے۔ میں یہ پردہ ہٹاؤں گی۔ میرے بازوؤں میں بہت دم ہے۔ مگر جیسے ہی اس نے پردے پر ہاتھ رکھا ایک لمحہ کے لئے اس کا سارا بدن سن ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سہم گئے۔

"کیا ہے کلا؟" یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ "کچھ چاہئے کیا؟"

کلا سمجھ گئی وہ کیا کچھ کھو کر آئی ہے... اس کے اپنے آپ میں کیا کچھ گھٹ گیا ہے، وہ سمجھ گئی۔

"چائے بھجوا دوں؟"

"نہیں ماں کچھ نہیں۔ اس نے غور کیا۔ ماں کی آواز میں کتنا پیار ہے۔ کیسا انوکھا پیار ہے... کتنی جان لیوا محبت ہے۔ ماں کیسی عجیب ماں ہے... اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "باؤجی ابھی تک..." اس کی آواز رندھ گئی۔

"تمہارے باؤجی آج کل دیر سے آتے ہیں۔ جب خوب اندھیرا جھک آتا ہے۔" اس کی ماں کی آواز میں کٹار سی تھی جو ٹھیک اس کے کلیجے کو لگ گئی۔

ایک تڑپ، ایک عجیب سی فحش گالی کا احساس اسے برما گیا۔ ماں کیا کہہ گئی، کتنی گندی، اتنی بے ہودہ گالی دے گئیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس نے کب کہا تھا کہ مجھے واپس بلا لو۔ اس نے زندہ رہنے کے لئے جو راستہ چنا تھا کیوں اسے زبردستی بلوایا گیا، کیا اسی لئے...؟ ایسی گالیاں دینے لئے؟

وہ ماں سے لڑ پڑے گی۔ وہ ماں کا منہ نوچ لے گی۔ جس نے اپنے غنڈے بھائی کو بھجوا کر اسے سدھیر کے کلیجے سے نوچ کر منگوا لیا تھا۔

مگر کلا سہم بھی گئی۔ دفعتاً سدھیر اس کے ذہن کے افق پر جھول گیا... جانے غریب غنڈوں کے چاقوؤں کی تاب بھی لا سکا ہو گا۔ جانے محبت کرنے کے جرم میں اس کی لاش مہابلیشور کی چٹان پر پڑی ابھی تک سڑ رہی ہو گی۔ اس کی آنکھیں بھیگ آئیں۔ دل میں ایک نشتر سا چبھا اور اترتا چلا گیا۔

سدھیر... سدھیر... تم بولتے کیوں نہیں... تم بولتے کیوں نہیں...؟

وہ چارپائی پر آکر لیٹ گئی، اس نے اپنی کلائی پر لگے زخم کو دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ دکھا نہیں، اس نے آہستہ آہستہ اپنے زخم پر انگلیاں پھیریں.. ہلکی سی خراش تھی جواب مٹ بھی رہی تھی۔ صرف گیارہ دنوں میں...

کچھ دن اور گذر جائیں گے تو تم یاد بھی نہیں آؤ گے شاید۔

دوسرے کمرے سے سیتا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ چونک گئی۔ اس کے دل میں آیا کہ آگے بڑھ کے وہ سیتا سے پوچھے وہ کس بات پر ہنس رہی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ سیتا سے درخواست کرے، اس کو بھی اس ہنسی میں شامل کرلے۔ کتنے دن ہوگئے ہنسی کی ایک پھوہار بھی اس کو چھو کر نہیں گئی... سیتا پھر کسی بات پر ہنسی، اس بار ماں کی ہنسی کی آواز بھی آرہی تھی... اس سے دور۔ الگ تھلگ... اس کی ماں اور اس کی بہن...

اس کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ اجاگر ہوئی... ماں، اس کی ماں اس سے برسوں کا بدلہ لے رہی ہے۔ ساری زندگی اس نے ماں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ماں کو جانتی ہے وہ ایک ایک پیسہ وصول کرکے رہے گی۔

ماں۔ اس نے دل میں کہا۔ کسی دن کوئی مر بھی جائے گا تو اسی طرح ہنستے رہنا۔

دفعتاً کلا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو خشک کیا۔ دل کو ڈھارس بندھائی اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ تاریک کمرے میں وہ گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہی تھی چلتے چلتے وہ رک گئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا جہاں بے پناہ اندھیرا تھا۔ وہ پھر ڈر گئی۔ کوئی اس کے دل کو دہلائے جا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کردی جیسے باہر کے اندھیرے کا راستہ ہی روک دیا ہو۔

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ اس دیوار تک آئی جہاں بجلی کے بٹن تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔ ایک کھٹکا سا ہوا۔ پھر کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔

سامنے جس چیز پر اس کی نظریں اٹھیں وہ اس کے باپ کی تصویر تھی۔

"باؤجی..." اس کے لب ہلے۔ "گیارہ دن ہوگئے۔ میں نے آپ کی جھلک تک نہیں دیکھی۔"

اس کی آنکھیں بھر آئیں... کیسے سنگ دل ہمدم ہیں آپ۔ کیسے دوست ہیں میرے... مجھے سہارا نہیں دیتے ذرا۔ مجھے آپ کے شفیق ہاتھوں کی نرماہٹ درکار ہیں باؤجی... میں لٹ کر آئی ہوں، میرے اچھے باؤجی...!

کلا چھک کر رو پڑی۔ اس بھری پری دنیا میں آپ کے علاوہ میرا ہے ہی کون۔ مانا میں نے آپ کی بات نہیں مانی... باؤجی آپ تو میری بات مان لیجئے۔ کیسے سنگ دل دوست ہیں آپ...

وقت... پر بہت دیر بعد کلا نے پلٹ کر دیکھا۔ وقت بہت ہو چکا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ مگر کیسی پہاڑ سی رات تھی کہ کٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر بالکنی میں آگئی۔ سامنے آسمان سیاہ بدہیئت بادلوں سے بھرا پڑا تھا۔ اندھیرا چاروں کھونٹ خیمہ زن تھا۔

مگر کلا آہستہ سے مسکرائی۔ ایک عجیب سی پھیکی اداس مسکراہٹ... لیکن رات خواہ کتنی ہی بھاری کیوں نہ ہو بالآخر گذر ہی جائے گی۔ پھر دن کا اجالا۔ صبح صبح کوئی فرق نہیں پڑے گا، گیارہ صبحیں آئیں اور گذر گئیں، گیارہ راتیں آئیں اور... یہ بھی گذر جائے گی کیا فرق پڑتا ہے۔ اجالے اندھیرے کا چکر۔ اس کی قسمت کی تاریکی، یہی سچائی تھی۔

سچائی کہاں تھی... کلا نے سوچا... اور کہاں لٹ گئی...؟

کیا یہ بھی سچائی تھی کہ جس ماں باپ نے اسے جنم دیا تھا وہی اس کے مقدر کے نگہبان تھے؟ اس نے ماں سے لڑ کر... باپ کی بے پناہ محبت کو ٹھکرا کر اس جذبے کا ساتھ دیا تھا جو سچا تھا، کھرا تھا، زندگی کی طرح دھڑکتا ہوا تھا۔

کیا سچائی یہ تھی کہ اس کے ماں باپ اسے زبردستی اسے محبوب کی آغوش سے چھین لے آئے۔ دونوں مہابلیشور کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک دوسرے کے لئے چیختے رہے، چلاتے رہے، سروں کو پٹکتے رہے مگر سچائی یہ ثابت ہوئی کہ... وہ آج پھر نہیں ہے۔ پھر وہی کنج قفس، پھر وہی...

اور سدھیر؟ پتہ نہیں۔ دفعتاً اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور اس کے سارے وجود کو زخمی کرتی گذر گئی۔ پتہ نہیں، وہ غریب کہاں ہے...؟ اس نے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ سارے پھول، سارے پودے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے اس کے... اس کے اپنے مقدر کی طرح... اسے جلن سی ہوئی۔ اس کے دل کے انتہائی تاریک گوشے سے ایک آواز تیز چھری کی دھار کی طرح چمکی، کاش۔ کاش اس نے...

دفعتاً وہ پلٹ آئی۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ اس کی حقیقت پسند طبیعت... خود اپنے آپ کا جائزہ بھی... میں بھی تو زندہ ہوں... زندگی سے سمجھوتہ کر چکی ہوں۔ کسی نہ کسی دن کر ہی لوں گی۔

کلا نے سنبھالا لیا۔ آج کی دنیا۔ ہزاروں لاکھوں برس بعد بھی آج کی دنیا میں محبت... جوں کی توں خود غرض ہے۔ اسے عجیب سا لگا۔ ایسی مطلب پرست ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں میں ابھی ابھی کون تھا؟ عجیب سا نا تواں سا...

اس نے سدھیر کو مانو اپنے بھیگے بھیگے پپوٹوں میں محفوظ کرلیا... اب تمہیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے گا... تم جہاں رہو... کلا نے محبت سے بے پناہ محبت سے بھر کر کہا، خدا کرے تم جہاں بھی رہو... سکھی رہو، ایسے خوش رہو کہ خود زمانہ تم سے خوش رہنا سیکھے...

جلتا ہوا گرم آنسو اس کی پلکوں کی شاخ سے ٹوٹ کر باغ کی سیاہی میں ڈوب گیا... خوش رہو۔

خوش رہو سدھیر... سدھیر...!

گیارہ دن، گیارہ جاگتی راتیں... وقت ہوا کے جھونکے کی طرح گذرتا ہے اور قدم کے نقش کو دھندلا کرتا چلا جاتا ہے... کبھی پلٹ کر نہیں دیکھتا، وقت... وقت کا سمندر اتھاہ ہے، زندگیاں چھوٹی چھوٹی لہروں کی طرح اس کے دامن سے پھسلتی اگلے کنارے سے ٹکراتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ وقت بے پناہ ہے... کلا نے آنکھیں بند کرلیں، سوچتے سوچتے اس کا سر دکھنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی پیشانی پر مکے مارے اور اداسی سے مسکرا پڑی، وقت کا سمندر بے پناہ ہے اور جو فنا نہیں ہوتیں وہ پاگلوں کی طرح بولائی پھرتی ہیں۔ وقت کو نہ خود قرار ہے اور نہ یہ لمحہ بھر کسی کو سکون سے بیٹھنے دیتا ہے۔

جانے کے وقت سمندر میں بھٹکتا ہوا وہ آدمی کہاں ہوگا؟

سدھیر... اس کے خوابوں کی سچائی، اس کے سمندر کا جواز اس کی لاجوردی آسمان کی بے پناہ وسعت۔

کلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بیدار ہوئی، افسردگی کی پر درد مسکراہٹ۔

یہ سب الفاظ ہیں، الفاظ محض۔ دفعتاً کلا کے حقیقت پسند دماغ نے سوچا۔ جذبے اور الفاظ، دو الگ الگ چیزیں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے کس درجہ محتاج ہیں۔ اگر جذبہ نہ ہو تو الفاظ کی سچائیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ دلوں میں کسی بے پناہ جوار کی طرح اٹھنے والے جذبے، کسی بگولے کی طرح، عفریت کی طرح رقص کرتے ہوئے جذبے۔ الفاظ نہ ہوں تو آخر کار دل کے سمندر میں تڑپ کر رہ جاتے ہیں.. زیادہ سے زیادہ۔ زیادہ سے زیادہ۔

کلا نے دیکھا اس کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ اس نے اپنے کلیجے کی انگلی سے اپنی آنکھوں کے سمندر کو دیکھا، کئی موجیں کناروں سے ٹکرا کر جھک گئی تھیں، اس کے دل میں درد سا اٹھا، فرط جذبات سے اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبالیا اور آہستہ سے ہاتھ کو کلیجے پر رکھ لیا جہاں ہولے ہولے درد ہو رہا تھا۔ جانے کون چھری سی دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ کلا نے مسکرانے کی کوشش کی مگر آنکھوں سے وہ گرم گرم قطرے ٹپک ہی پڑے۔ ساتویں کہ وہ بوند جو اس کے دل سے بھٹک کر آنکھوں میں آ گئی تھی...

سدھیر... سدھیر... میں کس سے بولوں؟ کس سے تمہاری باتیں کروں؟ میرا دل پھٹ جائے گا، میں کتنا ضبط کروں، میرے سنگدل سدھیر...؟

اس کے دل کے ویرانوں میں جذبے بگولوں کی طرح فلک پیما تھے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے.. اسے الفاظ چاہئیں، اسے الفاظ چاہئیں۔ جن کے لئے اس کے جذبات بھٹک رہے ہیں۔ دل ہی دل میں بھٹک رہے ہیں اور اس کی ہستی کو ہلا ڈالتے ہیں۔

اس کے پاس الفاظ نہیں، اس کے پاس الفاظ ہوں بھی تو کوئی سننے والا نہیں، وہ اپنے عجز کے اظہار کے لئے بیتاب تھی۔ ساتھ ہی اظہار کا عجز بھی دامن نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ ایسے الفاظ کہاں سے لائے جو اس کے غموں کے بے پناہ سمندر کو احاطے میں لاسکیں... اور ایسے الفاظ مل بھی گئے تو وہ سماعت کہاں سے پاسکتی ہے جو سب سن سکے۔ کلا نے سوچا، کوئی نہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ہو سکتا ہے تو...

اس نے خاموشی سے لیٹے لیٹے اپنے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں کو دیکھا، اس کے باپ کی تصویر کمرے کے اندھیرے میں ایک دم سے غرق تھی... اس کا باپ، شفیق باپ، اس کا دوست، زندگی کے طاق کا وہ روشن چراغ جو اس کے سن شعور نے جلایا تھا۔ وہ آج اندھیرے کی آغوش میں تھا... اندھیرا... اندھیرا... جیسے وقت کا سمندر گرجتا چنگھاڑتا اندھیرے کی وادی میں بھٹک گیا ہو۔

کلا کا دل کانپ اٹھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تاریک تھا۔ باہر باغ کی خاموشیوں میں ہوا ساکت ہو گئی تھی اور تاریکی کسی بیمار دل کی طرح آہستہ آہستہ برس رہی تھی، برسے جا رہی تھی...

دفعتاً کلا کو خوف سا محسوس ہوا... وہ کہاں ہے...؟ اندھیرے میں...؟ ایسی جان لیوا تاریکی... وہ کہاں ہے؟ سدھیر کہاں ہے؟ اس کا جہاز وقت کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ کوئی... کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا... سدھیر! کوئی ایک ڈوبتے جہاز کا مستول بھی دکھائی نہیں دیتا... اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چاروں اور دیکھنے کی کوشش کی... کہیں کچھ نہیں! صرف اندھیرا، فقط اندھیرا۔ اس کے... اس کا ہندوستان، دیوالی کے چراغوں سے جگمگاتا ہندوستان، کتنا تاریک ہے، کتنا ویران ہے، جیسے کسی قزاق نے، کسی لالچی غزنوی نے مسلسل لوٹا ہو۔ کسی انگریز نے تاراج کر کے رکھ دیا ہو۔

گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ میرے چشتی،.. کہاں کھو گئے۔ تیرے نغمے کہ آج میرے ہندوستان کے کلیجے سے دھواں اڑ رہا ہے۔ دھول اڑ رہی ہے...

آنسو آنسو...

خوش رہو... سدا، ہمیشہ، ابد تک...

دفعتاً کلا چونک اٹھی۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ یہاں کوئی نہیں۔ صرف سناٹا ہے۔ فقط اندھیرا... حد نگاہ تک پھیلا ہوا اندھیرا... اس نے بالکونی پر کھڑے کھڑے چاروں طرف جھانک کر دیکھا۔ یہاں کوئی نہیں۔ اس کے پاؤں آہستہ آہستہ اٹھے۔ اس نے ابھی ابھی کسی کی پیشانی کو چوما تھا۔ یہ آدمی کہاں کھو گیا؟ تاریکی کے کس پردے میں گم ہو گیا؟ کہاں...؟

اس نے اپنے تخیل کی پرواز کو روکا۔ اس نے دیکھا وہ جس زمین پر کھڑی ہے وہ سخت ہے اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور جس آسمان سے نیچے کھڑی ہے وہ بہت دور ہے اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا نہیں، سناٹا، اندھیرا، ایک گہری، کبھی نہ ٹوٹنے والی، کبھی نہ تڑخنے والی چپ۔ وہ تنہا ہے۔ ایک تو وہ اس دروازے کے قریب کھڑی تھی، اس کمرے کے پاس کھڑی تھی جس کے اندر اس کا باپ سویا ہوا تھا، دروازہ بھڑا ہوا تھا، اندر سے پنکھے کی آواز آرہی تھی۔ ہلکی سبز روشنی دروازے کی دراز سے جھانک رہی تھی۔

غیر ارادی طور پر، ایک نامحسوس جذبے کے زیر اثر اس کی انگلیوں نے دروازہ کو ڈھکیلا اور دروازہ کھل گیا۔ ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔

جب اس نے کمرے کے اندر قدم رکھا تو یکبارگی اس کا دل بہت زور سے دھڑکا پھر تھم گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکیں، ایک ہلکا سا خوف، ایک ڈر سا محسوس ہوا۔ احساس جرم... پھر وہ شانت ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے پلنگ پر اس کا باپ سوا ہوا تھا، لیکن سبز روشنی میں اس کا بوڑھا جسم پلنگ پر یوں پڑا تھا گویا اس میں جان ہی باقی نہ رہی ہو۔ وہ قریب پہنچ گئی۔ اس نے گہری نظر سے دیکھا، اس کے باپ کے چہرے پر تفکرات نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ کچھ مزید جھریاں نظر آئیں جو آج سے پہلے نہیں تھیں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کمرے میں کوئی نہیں جو اسے دیکھ رہا ہو، وہ کیوں ڈر جاتی ہے...؟ اس کے کمرے میں کوئی اسے دیکھ لے تو کیا ہوگا؟ اس عجیب سے بے تکے سوال کا جواب اسے نہیں ملا۔ بائیں طرف والا دروازہ کھلا تھا۔ بائیں

طرف والے کمرے میں ماں اور بیتا سو رہی ہوں گی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے پیروں سے چلتے ہوئے اور آگے بڑھی، آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

پھر پلٹ کر پلنگ تک آئی۔ اس کے باپ کے پیر ننگے تھے، چادر پھسل کر نیچے فرش پر جھول رہی تھی۔ کلا نے آہستہ سے چادر اٹھا کر اپنے بوڑھے بے خبر سوتے ہوئے باپ کے پیروں پر... وہ رک گئی۔ اس نے چادر پرے کر دی اور مدھم روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر اپنے باپ کے سوتے سوتے پیروں پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ دل کے ویرانے میں کہیں سے گرم ہواؤں کے جھکڑ سے چلے، دھول سی اڑی، کلیجے میں درد جاگا اور آنکھیں چھلک آئیں، بے اختیار رو کر اس نے آہستہ سے، بے حد آہستہ سے اپنے تھرتھراتے ہوئے لب اپنے بوڑھے، شفیق، مہربان باپ کے پیروں پر رکھ دیے۔

"کون...؟"

"کون، کلا...؟" اس نے پلنگ کے پاس جھولتی ہوئی سوئچ دبا دی۔ روشنی ہوئی، انھوں نے آہستہ سے پاؤں کھینچنا چاہا۔ مگر رک گئے۔ اس کے پیروں سے لگی اس کی بیٹی کلا رو رہی تھی... انھوں نے ہاتھ بڑھا کر کلا کو کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔ "تم رو رہی ہو بیٹا...؟"

دفعتاً کلا کے منھ سے چیخ نکلی، وہ اپنے باپ کے کلیجے سے لگی، اپنی جائے پناہ میں سر چھپائے بچوں کی طرح رونے لگی۔ "... باؤ... باؤجی... مجھے، مجھے معاف..."

اس کی آواز کہیں آندھیوں میں بھٹک گئی۔

ایک دہلا دینے والے جذبے سے بے تاب ہو کر اس کے باپ نے کلا کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے اور خود ان کی آنکھیں ان کا بوڑھا دل رو پڑا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں بیٹا...؟ تم نے کیا نادانی کر لی کلاوتی؟ تمھیں کیوں یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی تمھارا باپ بھی ہے، جس کی آنکھیں ساری دھرتی کو چھانتی پھر رہی ہوں گی... مجھے تنہا چھوڑ کر..."

"آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے...؟" کلا نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور تعجب سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے باؤجی...؟"

"ہاں بیٹا... میں بینک سے واپس آ کر آدھی آدھی رات تک بالکونی سے لگا سڑک پر نظریں گاڑے رہتا۔"

انھوں نے پہلے کلا کے آنسو پونچھے، پھر اپنی آنکھیں خشک کیں... "بینک میں سارا سارا دن کام کرتے کرتے ایسا محسوس کرتا جیسے تم گھر واپس آ گئی ہو۔"

"میں باؤجی۔" کلا نے سنبھل کر کہا۔ "نہیں ایسا ہوتا تو آج گیارہ دن ہو گئے۔"

"میں تمھارے کمرے میں کئی بار گیا ہوں کلا، آدھی آدھی رات کو، جب تم آرام کرسی پر لیٹی ہوتیں۔ کھڑکی سے لگی باغ کی جانب ٹکٹکی لگائے تک رہی ہوتیں یا پلنگ پر سو رہی ہوتیں... میں کھڑکی سے نہیں دیکھتا، کئی بار جی چاہا اندر جا کر تمھیں... اپنے ہاتھوں سے خوب پیٹوں، خوب ماروں..."

"مگر کیوں...؟" کلا نے پیار سے اپنے شفیق باپ کی طرف دیکھا۔

اس کا دل بھر آیا۔ "اب ماریے باؤجی... مجھے خوب ماریے۔ میں نے آپ کے دل کو دکھ پہنچایا ہے۔ مجھے سزا دیجیے۔"

کلا پھر رو پڑی، سسک سسک کر رو پڑی۔

پھر کافی دیر ہو گئی۔ سارے دکھ، ساری اذیتیں کہیں بہ گئیں۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے سگار اٹھایا۔ لبوں میں دبا کر دیا سلائی دکھائی، اور آہستہ سے کلا کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کلا۔ مجھے ایک کپ کافی بنا کر دو بیٹا۔ دیکھو اس کونے والی میز پر کافی اور ہیٹر رکھا ہے۔ جب سے تم گئی ہو میں نے اپنے کمرے میں ہی سامان رکھوا لیے ہیں۔ کس کو تکلیف دیتا؟"

کلا اٹھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو گردن سے پرے پھینکا۔ اور ایک عجیب سے انداز سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ "ابھی بناتی ہوں باؤجی۔ ابھی..."

پھر کلا نے جب ایک پیالی کافی ان کی طرف بڑھائی تو پیالی لیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "اور تم، تم نہیں پیو گی...؟"

"نہیں باؤجی۔"

"کیوں نہیں، بولو۔ ورنہ میں بھی نہیں پیتا۔" اور ذرا ٹھہر کر انھوں نے کلا کی طرف دیکھا۔ اور اب وہ خود اعتمادی سے بولے:

"چھوڑو کلا، خاک ڈالو کل تک جو کچھ ہو چکا اس پر تھوک دو۔" انھوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سمجھیں، کل سے تمھاری زندگی کا نیا دن شروع ہوا۔ نہ تم دن بھر کمرے میں بند رہو گی نہ میں منھ اندھیرے گھر سے نکلوں گا اور رات گئے آؤں گا۔ چلتے چلتے ٹھوکر لگ کر آدمی گر جائے تو گر کر بسورنے لگتا ہے۔ دنیا اس پر ہنسنے لگتی ہے۔ اگر ہمت کر کے گرنے والا اٹھ کھڑا ہو اور اعتماد سے پھر چلنے لگے تو کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔"

انھوں نے رک کر کلا کی طرف دیکھا جو گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ انھوں نے اس کی ٹھوڑی سے گردن اٹھاتے ہوئے کہا، "کل سے میری بیٹی سر اٹھا کر چلے گی، کسی کے سامنے نہیں جھکے گی، کیوں کہ اس کا باپ اس کے ساتھ ہے۔"

کلا نے ایک عجیب سے والہانہ انداز سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً چھلک پڑیں۔

باہر زمین و آسمان گداز ہو کر، پگھل کر، موم کی طرح دم بخود، سانس روکے، دم سادھے کچھ سے کچھ ہو چکے تھے ☆☆☆

ایک نظم

غزل

غیاث متین

شمارہ ۱۰۳،
مئی تا جولائی ۱۹۷۷

دیا سلائی کے پیچھے چپکے ہوئے
Red Knight وسکی کے اشتہار کو
ریزہ ریزہ کر دینا
اس بات کی علامت ہے
کہ تم یہاں نہیں ہو
ایسا کیوں ہوتا ہے
کہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں
وہ کہہ نہیں پاتے
اور تم کو جو سننا چاہیے
اسے تم سن نہیں سکتے؟
کہنے اور سننے کے درمیان
صرف اداکاری حائل ہے یا کچھ اور
اور اگر
صرف اداکاری...

ہم تو اس اسٹیج پر
اس لیے نہیں آئے ہیں
کہ اپنے آپ کو چھپا کر
کسی اور کو پیش کریں
تو پھر
کیوں نہ وہ ڈوریاں ہی کاٹ دیں
جو دکھائی نہیں دیتیں

شمارہ ۲۰۲،
جنوری ۱۹۹۷

دشت کو چھوڑ کے گھر میں ہم تھے
کیسے آباد کھنڈر میں ہم تھے
کھول کر آنکھ نہ دیکھا اس نے
اپنے ہی دیدۂ تر میں ہم تھے
جس میں ملنا تھا بچھڑ جانا تھا
ایسے بیہودہ سفر میں ہم تھے
جس عمارت کو گرایا تم نے
اس کی دیوار میں در میں ہم تھے
آئینہ ہم کو دکھانے والے
مدتوں آئینہ گھر میں ہم تھے
کس کے ہاتھوں کی لکیروں میں رہے
کس کی باتوں کے اثر میں ہم تھے
دھوپ کیوں ہم سے پریشاں تھی متین
کیا کسی شاخ شجر میں ہم تھے

فاروق انجینئر

شمارہ ۲۸۷،
دسمبر ۲۰۰۴

پرانا گھڑا

پرانا گھڑا
نہ مٹی کی سوندھی مہک
نہ پانی میں ٹھنڈک
یوں ہی گھر کے آنگن میں رکھا ہوا
پرانا گھڑا نہیں کام کا
مگر آج میں نے پرندوں کی خاطر
پرینڈا بنایا
پرانا گھڑا بہت کام آیا

ندی (۱)

ایک برہن
دور وادی میں کہیں
صبح کی نرل سہانی دھوپ سے
جسم کو گرما رہی ہے
اپنی دھن میں گا رہی ہے

ندی (۲)

اک بنجارن
خاموشی کی وادی میں
سورج کے سنگ کھو جاتی ہے
شام ڈھلے ہی
سو جاتی ہے

پریاں

رات گئے
بچوں کے خوابوں میں اکثر
چاند نگر سے پریاں آتی ہیں
تاروں والی ایک چھڑی سے
جادو منتر
پھولوں کی وادی کے منظر
بھور سے تک دکھلاتی ہیں
پھر کرنوں کی ڈور پکڑ کر نیل گگن میں اڑ جاتی ہیں
بچے آنکھیں ملتے ملتے
خوشی خوشی اٹھ جاتے ہیں
لیکن کچھ پریاں ہیں جو
شام ڈھلے ہی
میرے گھر میں در آتی ہیں نیند چراتی ہیں
پل میں چھو ہو جاتی ہیں

خط

نئی باتیں کبھی قصے پرانے
زمانے بھر کے لکھتا ہے فسانے
"تمھارا ہی فقط" لکھتا نہیں ہے
وہ اب پہلے سا خط لکھتا نہیں ہے

کشش

گرہ مچلتی ہوئی
گرہ سنبھلتی ہوئی
چاند کی سمت
موج اچھلتی ہوئی

فاروق شفق

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

رات کافی لمبی تھی دور تک تھا تنہا میں
اک ذرا سے روغن پر کتنا جلتا بجھتا میں

سب نشان قدموں کے مٹ گئے تھے ساحل سے
کس کے واسطے آخر ڈوبتا ابھرتا میں

میرا ہی بدن لیکن بوند بوند کو ترسا
دشت اور صحرا پر ابر بن کے برسا میں

ادھ جلے سے کاغذ پر جیسے حرف روشن ہوں
اس کی کوششوں پر بھی ذہن سے نہ اترا میں

دونوں شکلوں میں اپنے ہاتھ کچھ نہیں آیا
کتنی بار سمٹا میں کتنی بار پھیلا میں

زندگی کے آنگن میں دھوپ ہی نہیں اتری
اپنے سرد کمرے سے کتنی بار نکلا میں

آج تک کوئی کشتی اس طرف نہیں آئی
پانیوں کے گھیرے میں ایسا ہوں جزیرہ میں

کاٹتا تھا ہر منظر دوسرے مناظر کو
کوئی منظر آنکھوں میں کس طرح سے بھرتا میں

دن کو تھے ہم اک تصور رات کو اک خواب تھے
ہم سمندر ہو کے بھی اس کے لئے پایاب تھے

سرد سے مرمر پہ شب کو جو ابھارے تھے نقوش
صبح کو دیکھا تو سب عکس ہنر نایاب تھے

وہ علاقے زندگی بھر جو نمی مانگا کئے
کل گھٹائیں چھائیں تو دیکھا کہ زیر آب تھے

اک کرن بھی عہد میں ان کے نہ بھولے سے ملی
دن کے جو سورج تھے اپنے رات کے مہتاب تھے

آج ان پیڑوں پہ سورج کی کرن رکتی نہیں
کل یہی تھے بار آور کل یہی شاداب تھے

اب کھلا کہ بوندیاں موتی ہیں ڈھلتی تھیں کہاں
ہم جو ڈوبے ہاتھ اپنے گوہر نایاب تھے

کوئی اپنی بھی حقیقت مل کے دریا سے شفق
چھوٹے چھوٹے ندی نالے کس قدر بے تاب تھے

فاروق شفق

شمارہ ۱۳۷،
اپریل تا جون ۱۹۸۵

منظر عجب تھا اشکوں کو روکا نہیں گیا
ہنستا ہوا جو آیا تھا ہنستا نہیں گیا

اک بار یوں ہی دیکھ لیا تھا اسے کہیں
پھر اس کے بعد شہر میں دیکھا نہیں گیا

تھی جس کے دم سے رونق محفل ہما ہمی
دعوت میں اس غریب کو پوچھا نہیں گیا

ساری خدائی خود ہی کھنچی جاتی تھی ادھر
میں خود وہاں گیا مجھے بھیجا نہیں گیا

جو کچھ نہ دیکھتا تھا شفق دیکھنا پڑا
گھر لے کے مجھ کو شام کو رستہ نہیں گیا

شمارہ ۱۰۳،
مارچ اپریل ۱۹۷۷

یاد رکھتے کس طرح قصے کہانی لوگ تھے
وہ یہاں کے تھے نہیں وہ آسمانی لوگ تھے

سوکھے پیڑوں کی قطاریں روکتیں کب تک انھیں
اڑ گئے کرتے بھی کیا برگ خزانی لوگ تھے

زندگی آنکھوں پہ رکھ کر ہاتھ پیچھے چھپ گئی
درمیاں رہ کر بھی سب کے آں جہانی لوگ تھے

کل یہیں پر لہلہاتی تھیں ہنسی کی کھیتیاں
کل یہیں پر کیسے کیسے زعفرانی لوگ تھے

ٹوٹ کر بکھرے ہوئے ہیں قربتوں کے سلسلے
چھپ گئے جانے کہاں جو درمیانی لوگ تھے

خشک مٹی بن گئے تو بوندیاں نہلا گئیں
اور ہمیں کیا چاہئے تھا آگ پانی لوگ تھے

فاروق شفق

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

اجڑے نگر میں شام کبھی کر لیا کریں
مجھ سے دعا سلام کبھی کر لیا کریں

جنگل کے پھول ہی سہی لیکن ہیں کام کے
ساتھ ان کے بھی قیام کبھی کر لیا کریں

ہر راہ صاف سیدھی نہیں پر خطر بھی ہے
سورج چھپے تو شام کبھی کر لیا کریں

موسم ہے خوشگوار تو شاخیں بھی سر پہ ہیں
ان کا بھی احترام کبھی کر لیا کریں

کتنا ہے وقت کیسے کسی کو گرایا جائے
کچھ کام کا بھی کام کبھی کر لیا کریں

شرکت تمام دعوتوں میں لازمی نہیں
لیکن کہیں تو نام کبھی کر لیا کریں

یہ سچ ہے آگے پیچھے شفق دوست ہی تو ہیں
تلوار بے نیام کبھی کر لیا کریں

شمارہ ۱۸۷،
اکتوبر ۱۹۹۵

بہت دھوکا کیا خود کو مگر کیا کرلیا میں نے
تماشا مجھ کو کرنا تھا تماشا کرلیا میں نے

یہاں بھی اب نئی آبادیوں کا شور سنتا ہوں
یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کرلیا میں نے

سفر میں دھوپ کی شدت کہاں تک جھیلتا آخر
تری یادوں کو اوڑھا اور سایہ کرلیا میں نے

کوئی اچھا نہیں سب لوگ اک جیسے ہیں بستی میں
نتیجہ یہ ہوا خود کو اکیلا کرلیا میں نے

کوئی موسم ہو کیسی ہی فضا ہو غم نہیں ہوتا
زمانے والا ہر اک رنگ پیدا کرلیا میں نے

یہ دنیا اپنے ڈھب کی تھی نہ دنیا والے اچھے تھے
مگر کیا کیجئے پھر بھی گذارہ کرلیا میں نے

فاطمہ حسن

شمارہ ۱۴۱،
مارچ اپریل ۱۹۹۱

جن خواہشوں کو دیکھتی رہتی تھی خواب میں
اب لکھ رہی ہوں ان کو حقیقت کے باب میں
اک جھیل کے کنارے پرندوں کے درمیاں
سورج کو ہوتے دیکھا تھا تحلیل آب میں
خوابوں پہ اختیار نہ یادوں پہ زور ہے
کب زندگی گذاری ہے اپنے حساب میں
اک ہاتھ اس کا جال پہ پتوار ایک میں
اور ڈوبتا وجود مرا سیل آب میں
پروائی چل کے اور بھی وحشت بڑھا گئی
ہلکی سی آ گئی تھی کمی اضطراب میں
آزاد ہیں تو باغ کا موسم ہی اور ہے
خوشبو ہے تیز رنگ بھی گہرا گلاب میں
اپنی زمیں کی آب و ہوا راس ہے مجھے
میرے لئے کشش نہیں کوئی سراب میں
دیکھو جنوں میں ان کے کھلونے نہ توڑنا
تم کو رقم کریں گے یہ بچے کتاب میں

شمارہ ۲۵۳،
فروری ۲۰۰۲

مری زمیں پہ لگی آپ کے نگر میں لگی
لگی ہے آگ جہاں بھی کسی کے گھر میں لگی
عجیب رقص کہ وحشت کی تال ہے جس میں
عجیب تال جو آسیب کے اثر میں لگی
تمام خواب تھے وابستہ اس کے ہونے سے
سو میری آنکھ بھی بس سایۂ شجر میں لگی
کواڑ بند وہاں منتظر تھے آہٹ کے
لگی جو دیر تو دہلیز تک سفر میں لگی
وہ چاندنی تھی کہ مسحور کوئی ساعت تھی
تمھاری یاد بھی وحشت اسی پہر میں لگی
حصار ذات نہیں تھا طلسم عشق تھا وہ
خبر ہوئی تو مگر دیر اس خبر میں لگی
پلٹ کے دیکھا تو بس ہجرتیں تھیں دامن میں
اگرچہ عمر یہاں اک گذر بسر میں لگی
پرند لوٹ کے آئے تھے کن زمینوں سے
کہاں کی دھول تھی جوان کے بال و پر میں لگی

فراق گورکھ پوری

شمارہ نمبر ۴۶،
مارچ ۱۹۷۰

شرکا: شمس الرحمٰن فاروقی، حامد حسین حامد

فاروقی:

فراق صاحب، آج کل لوگ آپس میں اس مسئلہ گفتگو کر رہے ہیں کہ فرقہ واریت کا رجحان جو ملک میں بڑھ رہا ہے یا نظر آ رہا ہے اس کے سلسلہ میں ادیب یا شاعر یا ایک مصنف کیا کر سکتا ہے؟ اس سے پہلے کہ میں آپ سے کچھ پوچھوں، میں چاہتا ہوں کہ اپنا موقف واضح کردوں پھر آپ سے Consult کروں کہ آپ کا کیا خیال ہے۔

فراق:

بہت اچھا ہے۔

فاروقی:

اصل میں حضور ایسا ہے، میرا بنیادی نظریہ تو یہ ہے کہ موقع یا بے موقع شاعر اور ادیب سے یہ Expect کرنا کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور وہ فوراً نظم کہہ دے گا یا افسانہ لکھ دے گا، یہ زیادتی ہے اس کے ساتھ۔ مان لیجئے قحط پڑ گیا تو یہ امید کرنا کہ فراق صاحب نظم کہیں گے، بلوہ ہو گیا تو فلاں صاحب افسانہ لکھیں گے اس طرح کا Made to order Production جو ادیب سے متوقع ہے، میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے، دوسری بات میری یہ ہے کہ اس قسم کی ہنگامی تحریروں سے واقعی کوئی اصلاحی یا انقلابی کارنامہ انجام نہیں پا سکتا۔ ممکن ہے کہ صحافت کے Level پر، اخباروں میں رسالوں میں کوئی بہت بڑا مضمون یا خبر آ جائے تو ممکن ہے پڑھنے والوں کو اس سے کچھ تحریک ہو، لیکن فی نفسہٖ ادب کے ذریعہ سے کوئی اس قسم کا اصلاحی کارنامہ انجام دینا، میں سمجھتا ہوں کہ شاید ممکن نہیں ہے۔ لیکن، تیسری بات میں یہ عرض کروں گا کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ادب فی نفسہٖ کوئی World Shaking کارنامہ نہیں ہوا لیکن ادیب کو Protest کرنے کا حق حاصل ہے۔ جب بھی کبھی وہ دیکھے کہ انسانی حقوق یا انسانی آسائشوں یا انسانی سماج پر کوئی ضرب پہنچ رہی ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ Protest کرے۔

فراق:

جی ہاں۔

فاروقی:

اس کی گردن دبا کر Protest کرایا جائے، میں اس سے متفق نہیں ہوں لیکن اگر کوئی برداشت کرتا ہے، تو یہ بری بات نہیں ہے۔

حامد:

انسانی نفسیات بھی یہی ہے۔

فاروقی:

اب ان تین بنیادی خیالات کی روشنی میں، آپ اپنے تصورات کا اظہار فرمائیں۔

فراق:

میری گذارش ہے کہ ادب میں قومی یا انسانی اتحاد کی تحریک اگر ہم ڈھونڈیں تو دنیا کی تمام بڑی کتابوں میں اس طرف بہت واضح اشارہ ملتا ہے۔ Peace on earth, good will to men بائبل ہے، قرآن ہے، وید ہے، اس کے بعد

بڑے بڑے لکھنے والے بھی ہیں۔ ایک آدرش آئیڈیل کے طور پر، ایک روایت قائم ہوا ایسی، اس مقصد کے لئے یہ ہوا۔ لیکن انسانی جماعت میں تصادم کے موقع پیدا ہوتے گئے ہیں، ہوتے رہیں گے، جنگیں ہوتی رہی ہیں، اور توقعات ظاہر کی گئیں تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ پھر ایک بات اور سوچ لینے کی ہے، ہم اپنے ملک میں آجائیں، اس دور میں مہاتما گاندھی کی شخصیت سب سے بڑی رہی ہے انھوں نے اکیس اکیس دن کے فاقے کئے، لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے جتنا کشت و خون ہوا اتنا شاید کبھی بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارے سماج میں اتنی قوتیں کارفرما ہیں کہ کسی ایک تھپیڑ سے یا کسی ایک علاج سے ان کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ اب رہی بات لکھنے کی۔ تو پیشہ ور (پیشہ ور میں بہت برے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، قہقہہ) وہ مسکراتے ہوئے اکثر آتے ہیں کہ ادیبوں کا فرض... یہ انھوں نے کہا کہ میرا پارہ چڑھا۔ غرض یہ کہ ان کی جماعت یا ان کی قائم کردہ جماعت کوئی کارنامہ تو دکھائے چاہے برائی دور ہو یا نہ ہو۔

فاروقی:

گویا کہ فی نفسہ اس برائی سے لڑنے کے لئے نہیں بلکہ...

فراق:

ہاں تجارت کرنا چاہتے ہیں۔

حامد:

تاکہ Exploitetion ہوسکے۔

فراق:

(زور دے کر) تجارت کہوں گا میں اسے۔ جہاں تجارت کی بو آئی وہ مجھے نہایت ناگوار ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ہوا کیا؟ کرشن چندر کی نہایت پر اثر کہانی بمبئی کے ہندو مسلم فسادات پر ہے۔ اسی طرح میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے رسالوں میں پڑھا ہے کہ اس قسم کے فساد ہماری انسانیت کے لئے کس قدر شرم ناک ہیں۔ میں ان فسادات میں خود تو حصہ نہیں لے سکتا لیکن جذباتی طور پر بہت متاثر رہا ہوں۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ایسی کہانیاں پڑھ کر۔

فاروقی:

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

فراق:

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دیر تک آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ دس پندرہ فی صدی تو یہاں خواندگی ہے، چودہ چودہ زبانیں ہیں اور یہ خواندگی بھی استعمال کی جاتی ہے، جاسوسی افسانوں کے لئے یا جنسی افسانوں کے لئے یا سنسنی خیز چیزوں کے لئے۔ تو ہمارا سماج ابھی یورپ کے اچھے ملکوں کے سماج کی طرح منظم نہیں ہے۔ ایک تو نیم بے کاری، ناخواندگی اور بڑے حصہ کا اجڈپن، یہ تین چار چیزیں بہت کچھ ہم کو تیار رکھتی ہیں کہ ہم آدمی سے بھیڑیے بن جائیں۔ آج کل پارٹیاں، سیاسی پارٹیاں اپنے مقصد کے لئے یہ کام کرایا کرتی ہیں۔ پہلے انگریز اپنے مقصد کے لئے کرتا تھا، اب ہم اپنے مقصد کے لئے کرنے لگے ہیں۔

تو میرا خیال یہ ہے کہ فوراً کوئی امر تخلیق ممکن نہیں ہوا کرتی۔ میں نے ایک فقرہ پڑھا تھا ایک انگریزی کتاب میں کہ خیالات ادب نہیں بن جاتے بلکہ ضرورت ہے Emotionalisation of thoughts کی، جبھی جاکر کے thought سماج کو بدلتا ہے۔ کچھ ادیب تو ایسے موقعوں کو یا ان خرابیوں کو اپنا موضوع بناسکتے ہیں اور جب تک وہ چیز نہ پیدا ہو جائے جس کو انگریزی میں Vision کہتے ہیں، اثر نہیں پیدا ہوسکتا۔ وہ افسانے کے پردے میں پروپگنڈا ہو جاتا ہے، صحافت نگاری ہو جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ "تصویرِ درد"، اور اقبال نے "نیا شوالہ"... جو انھوں نے میرے سامنے لکھنؤ کے کانگریس سیشن میں پڑھا تھا... یہ تمام نظمیں کامیاب نظمیں ہیں، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہو پاتا۔ اس وقت تو خیال ہمارا ہو جائے گا لیکن ہم بھی کل کو ہو جائیں گے Communal۔ دوسری چیز یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مصنف کو کتنی چیزیں انتابس میں لاتی ہیں کہ وہ بڑی چیز تصنیف کرے۔ مان لیجے کہ Ode to Nightingale ہے اس میں تو کوئی مقصد نہیں ہوا Ode to Autumn، دیوان حافظ، تو پہلے تو یہ ہے کہ ہر ادیب پر یہ فرض بہ حیثیت ادیب نہیں ہوتا...

حامد:

بہ حیثیت شہری ہوسکتا ہے۔

فراق:

جی ہاں۔ بہ حیثیت شہری ہوسکتا ہے کہ وہ کسی انجمن کا ممبر ہو جائے، دوڑ دھوپ جو انجمنیں یا جو افراد ٹھیکیدار بن بیٹھے ہیں قومی زندگی کی اصلاح کے، ان سے بہت بچنا چاہئے۔ انھوں نے ادب کو تجارت بنا رکھا ہے۔ الگ ہو کے لکھئے جیسے ڈکنس نے انگلستان کی حکومت کی بے انصافیاں، اور غریب بچوں کا تذکرہ جیسے Oliver Twist میں ہے ایسا کوئی لکھے تو ایک بات ہے۔ کوئی روسو (Rousseau) ہو کوئی والٹیر (Voltaire) ہو، کوئی ڈکنس ہو کوئی ٹالسٹائی ہو تو لکھے۔ ایسے ادیب آئے دن پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ ہم اس دور میں چھوٹے پن کے بحران سے گذر رہے ہیں۔

فاروقی:

مگر اس پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس قسم کی تحریر کے لئے جب تک کوئی ڈکنس کوئی روسو نہ پیدا ہو اس میں جان نہیں آسکتی۔ لیکن کیا اس وجہ سے کہ ہم میں کوئی روسو کوئی ٹالسٹائی نہیں ہے، ہم اپنے غصے اور احتجاج کا اظہار نہ کریں؟

فراق:

اس کا جواب بھی ہے، اس سے ذرا نیچے اتر کر ہم لکھ سکتے ہیں۔ کرشن چندر کو ہم ہرگز ڈکنس یا روسو نہیں مانتے لیکن اس کی تحریروں نے بڑا کام کیا ہے۔ عصمت کی تحریروں نے بڑا کام کیا ہے لیکن "کام کیا ہے" یہ Inverted Comas میں ہے۔ ان تحریروں نے دل و دماغ پر اثر ڈالا ہے لیکن وہ برائی ایسی نہیں ہے، وہ مسئلہ اتنا سہل نہیں ہے کہ تحریر سے متاثر کر کے آپ لوگوں کا کردار بدل دیں۔

فاروقی:

اب ایک بہت Concrete سا سوال لے لیں کہ احمد آباد کا واقعہ کچھ دن پہلے پیش آیا

تو اس پر ادیبوں اور شاعروں اور دانش وروں میں ایک...

فراق:

ہیجان...

فاروقی:

ہیجان سا پیدا ہوا لیکن ہے کہ پچھلے ۲۲، ۲۳ برس میں ہونے والے فسادات پر ترقی پسند ادیب اس لئے خاموش رہے تھے کہ حکومت نہیں بول رہی تھی۔ اب حکومت بھی فسادات کی مذمت کر رہی ہے لہٰذا وہ بھی بول رہے ہیں۔ لیکن بہر حال ایک ہیجان سا برپا ہوا کہ صاحب اتنا بڑا واقعہ ہو گیا۔ اگر فرض کیجئے کہ لوگ متوقع ہیں کہ اس موقع پر نظم ضرور لکھیں، یا اس پر افسانہ ہم ضرور لکھیں، اور ہم نہیں لکھ پاتے۔ تو کیا ہم اپنے فرض منصبی میں ناکام ہو رہے ہیں؟

فراق:

میں جواب دوں گا، یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے اس امر میں کہ خود مجھ سے اس موضوع پر نظم لکھوائی گئی اور وہ نظم میں مسز فاروقی کو بھیج چکا ہوں۔ "ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے۔" وہ تو ایک اتفاقی امر ہے۔ یہ بالکل نہیں کہا جا سکتا اور جو کہے اس کی سخت مخالفت کرنی چاہئے کہ جو ادیب اس موضوع کو نہیں لیتے اور دوسرے موضوعات پر لکھتے ہیں، وہ ادیب نہیں ہیں۔ ہم بڑے تب بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر خود میں عشق کو یا مسائل سے کافی ہٹی ہوئی چیزوں کو اپنی نظموں میں نہ لکھتا تو تھوڑی بہت کامیابی جو مجھ کو بہ حیثیت اردو شاعر کے ہوئی یا جو مقبولیت ہوئی وہ نہ ہوتی۔

فاروقی:

ایک معاملہ اور ہے۔ خیر، یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ فسادات پر نئے شاعروں نے بھی نظمیں لکھی ہیں، عادل منصوری نے، شہریار نے، قاضی سلیم نے...

حامد:

جی ہاں، بہت سے لوگوں نے۔

فاروقی:

محمد علوی نے، سلیمان اریب نے، بلراج کومل نے، عمیق حنفی نے، خود میں نے بھی قلم گھسا ہے۔

فراق:

جی ہاں، کیوں نہیں، نئے شاعروں نے یقیناً نظمیں لکھی ہیں۔

فاروقی:

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ کوئی اپنا فرض جانا کہ ہم فسادات پر لکھیں ہی۔ یہ اپنے دل کی آواز تھی ہم نے اس کا اظہار کیا۔

فراق:

بالکل صحیح، ایک چیز اور میں کہہ دوں۔ 'فرض' کے لفظ کو میں ادب کی تخلیق سے جلدی منسلک نہیں کرتا۔ آپ اچھی چیزیں اور بھی لکھیں، لیکن فرض سمجھ کر نہیں لکھتے، اندر کی آواز آپ سے کہلواتی ہے۔ تخلیق ادب ایک اضطراری فعل ہے۔ البتہ اس میں سوجھ بوجھ اور آپ کا کلچر رینگ آتا ہے، کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتا ہے۔ آپ کا مزاج ایک طرح سے آپ کی تخلیق میں آجاتا ہے لیکن جہاں "ادیبوں کا فرض" جیسے لفظ آتے ہیں اسی وقت ہم اپنا فرض بھولنے لگتے ہیں (قہقہہ)۔ چسٹرٹن (Chesterton) نے ایک فقرہ لکھا ہے کہ جو لوگ بے بس ہیں، مظلوم ہیں، اگر ان کو آزادی مل جائے کہ جو چاہیں سو کریں تو سب سے پہلے وہ سوشل ورکر کو قتل کر دیں گے۔ ناصح مشفق والا رول اچھا نہیں ہوتا...

فاروقی:

قابل قبول نہیں ہے۔

فراق:

بلکہ خیال جب ایک فارم بن جائے...

حامد:

رچ بس جائے...

فراق:

اس وقت وہ کام کرے گا اب جیسے Uncle Tom's Cabin ہے یا Story of an African Farm ہے۔ ان کتابوں نے یقیناً بڑا اثر کیا لیکن فوراً اثر نہیں کیا۔ برنارڈ شا کے ڈراموں نے Public Opinion جسے آپ کہتے ہیں... جب اسے Power بنا ہو تو وہ بہت شدہ شدہ، وقت لیتے ہوئے اور Forces سے اپنے کو Combine کرتے ہوئے کارگر ہوتی ہے۔ ادھر ضرورت ہے کہ آپ اتحاد کے قائل ہوں اور کسی افسانے میں ذکر کریں اس کا، ادھر ایک گاندھی کی ضرورت...

فاروقی:

آڈن نے ابھی حال میں لکھا ہے کہ فرض کیجئے موتسارٹ (Mozart) اور Beethoven اور شیکسپیئر وغیرہ نہ ہوتے تو بھی مغربی یورپ کی تاریخ جو تھی وہی رہتی۔ اب اس پر بڑا بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ پھر آخر ادب کی Relevance کیا ہے؟

فراق:

یہ... یہ چیز بڑی خوبصورت ہے۔ اس پر Newman نے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم صرف علم حاصل کرنے یا نیکی کرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ہماری زندگی کا سب سے قیمتی تقاضا ہے Joy of Understanding۔ وجدان خود ایک ایسی چیز ہے جس کی قیمت ہوتی ہے خواہ فوراً اس کا نتیجہ نہ نکلے۔ یہ Co-operate کرے گا جب اور قومیں مل کر سماج کو بہتر بنائیں گی Beethoven کی لطافتوں سے مارکس متاثر ہے، لینن متاثر ہے۔ کیوں؟ کیا کوئی انقلاب آ گیا؟

فاروقی:

لینن صاحب تو Beethoven کو گھنٹوں سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

فراق:

مارکس اس کی بیوی اور اس کے بچے برابر شیکسپیئر کو پڑھتے اس کو Quote کرتے اور سر دھنتے تھے تو اس کی Relevance کیا ہے؟ شرافت، نیکی اور اخلاقی زندگی

کے تقاضے...ان کو ہم عملی طور پر تصور کر سکتے ہیں کہ ان کو فنون لطیفہ سے الگ کر کے بھی ہم دنیا میں قائم کر سکتے ہیں۔ تو پھر فنون لطیفہ کا کیا کام؟ ایک جواب تو اس کا وہی ہے، Joy of Understanding یا کیفیت حاصل کرنا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ آپ نے ایک گلاس دودھ پی لیا اور وہ آپ کو ہضم ہو گیا، لیکن آپ دودھ سے حاصل کردہ توانائی سے زندگی میں اگر کوئی اچھے کام کرتے ہیں تو فوراً یہ نہیں کہہ سکتے کہ دودھ کے کس قطرہ نے یہ کام آپ سے کرایا۔

حامد:

یا دودھ ہی نے کرایا۔

فراق:

ہوتا یہ ہے کہ مجموعی اثر پڑا کرتا ہے۔

فاروقی:

Totality of Influence

فراق:

ہاں، مثلاً جھونکا نسیم کا آیا، طبیعت میں تازگی آئی، آپ غزل کہنے لگے۔ غروب آفتاب دیکھا، ایک پر کیف درماندگی کا اثر ہوا آپ پر، آپ سے غزل ہونے لگی۔ اور اگر آپ ان چیزوں سے متاثر نہ ہوں گے تو آپ ان شاعروں کی طرح شعر کہیں گے جن کے کلام میں اثر نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ یہ بھی ایک Action ہے کہ مثلاً ویت نام کے عوام پر جو کچھ ہوا ہے اس کو سوچ کر ہم اس کی مدد نہ کر پائیں لیکن اداس ہو جائیں۔ ہمارا اداس ہو جانا ایک خدمت ہے گوئٹے کہتا ہے: A word is a deed۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں A feeling also is a deed۔ اگر دو کروڑ آدمی ان موضوعات پر تحریریں پڑھیں اور اپنے وجدان کو متاثر پائیں تو Create Public Opinion بھی ہو جائے گی۔ ہم جب تک کائنات کے متعلق ایک شعور اور اس شعور سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو ممکن ہے کہ ہم زندگی کے ضروری کام کر دیں لیکن کوئی باقاعدہ کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ کانسٹبل، چور کو پکڑتا ہے اور جیلر اسے جیل میں بند رکھتا ہے۔ تو کیا جیلر کا کام زیادہ بڑا ہوا اس کی Relevance زیادہ ہوئی بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے اثر سے دنیا میں نیکی آئی؟ کتنی دور کمند جاتی ہے آپ کے Moralvision کی، یہ اصل چیز ہے۔ سرجان سیلی، جس چیز کو Religion of humanity کہتا ہے، اس کو بنانے میں ضرور مدد دیتی ہے شاعری۔ بلکہ سین بو (Ste Beuve) کا یہ کہنا ہے کہ جب میرے ہاتھ میں کوئی کتاب آتی ہے تو میں پہلے یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف کتنا اچھا آدمی ہے۔ مگر یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ فوراً آپ اس پر انگلی رکھ دیں کہ جیسے ہی وہ ناول پڑھا، جرائم بیس فی صدی کم ہو گئے۔ یہ نہیں ہوتا۔ اور ایسی اچھی تحریر کسی ایسوسی ایشن کی ممبری، کسی ریزولیوشن سے یا کسی مینی فیسٹو سے نہیں پیدا ہو سکتی۔

فاروقی:

گویا کہ آپ چاہتے ہیں کہ ادیب کے وجدان کو آزاد چھوڑ دیں اور جو راہ وہ چاہے اختیار کرے، اگر واقعی اس میں کوئی ایسا vision یا عرفان تھا...

فراق:

کبھی کبھی بلند معنوں میں... ایک بات پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نطشے کا Superman کا جو Idea ہے اس سے خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔

فاروقی:

اور نکلے۔

فراق:

ہاں، نکلے۔ خودی کا جو فلسفہ اقبال کا ہے، جو کام کیا گیا اس کے نام پر اس میں اقبال شاید نہ شریک ہوتے۔ اور اگر شریک ہوتے تو اپنی بلندی سے اتر کر۔ اس کے برخلاف "گیتا نجلی" کی ہر نظم لاجواب نظم ہے لیکن آپ اس میں مقصد نہیں ڈھونڈھ سکتے۔ چنانچہ آسکر وائلڈ نے کہہ دیا تھا کہ All Art is useless۔

فاروقی:

جی ہاں۔ اس نے The Picture of Dorian Gray کے دیباچے میں...

فراق:

A book is neither moral nor immoral. It is either well- written or ill- written.

فاروقی:

مگر بڑی مشکل یہ ہے آپ اس عمر میں آکر ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جو ہم لوگ کہتے ہیں۔

فراق:

ہم تو تمھاری عمر میں بھی یہی کہتے تھے۔

فاروقی:

میرا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں کو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ سر پھرے ہیں، لونڈے ہیں، ادب کو بے مقصد جانتے ہیں۔ لیکن آپ جیسے بزرگ لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ آپ جو گفتگو ہم سے فرما رہے ہیں، ہم لوگ بھی کم و بیش یہی کہتے ہیں۔

فراق:

لونڈے اور سر پھرے نہیں، بلکہ ایک خاص جماعت تو آپ لوگوں کو اور ہی لقب دے چکی ہے (قہقہہ)۔

فاروقی:

ایک دفعہ قیوم نظر صاحب فرانس گئے اور سارتر سے ملے۔ سارتر نے ان سے پوچھا کہ "بھئی آپ کا الجیریا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انھوں نے کہا کہ میں شاعر ہوں، میرا ان باتوں کے بارے میں کوئی خیال ویال نہیں ہے۔ تو سارتر خفا ہو گیا اور کہا کہ پھر میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ اس کا مطلب لوگوں نے یہ نکالا ہے کہ ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ Political minded ہو۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سارتر کا مطلب یہ تھا کہ اپنے گردوپیش میں جو ہو رہا ہے...

فراق:

بالکل۔

فاروقی:

سارتر کا مطلب صرف اتنا ہی تھا کہ ادیب کو اپنے گردوپیش میں ہونے والے

حالات سے باخبر ہونا چاہئے۔

فراق:

اس نے تو صرف ان کا خیال پوچھا تھا اور خیال رکھنا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔

فاروقی:

اسی پر یاد آتا ہے کہ آپ نے ایک بار بہت اچھی بات فرمائی تھی کہ روزانہ کے جو سماجی مسائل اور سیاسی حالات ہیں میں ان پر بہت غور کرتا رہتا ہوں لیکن جب میں شعر کہنے بیٹھتا ہوں...

فراق:

تو وہ باتیں ذرا سا ہٹ جاتی ہیں۔ معلوم نہیں ۔ حالانکہ آپ کے مضامین جو میں نے پڑھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میری بات ضرور Appreciate کریں گے، میرا ایک شعر ہے

میرے پاس دھرا ہی کیا تھا درد بھری کچھ آوازیں
جن کے دم سے رخ ہستی پر دیکھو کیا تابانی ہے

اس میں نہ الجیریا ہے، نہ ویت نام ہے، نہ قومی اتحاد ہے، نہ غریبوں کا مسئلہ ہے، لیکن دل کتنا گداز ہوا ہوگا ان چیزوں سے تب جا کر یہ مٹھاس پیدا ہوئی ہوگی شعر میں۔ اور سنئے جب یہ شعر ہم پڑھیں گے۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

تو I become a good man

حامد:

لیکن صاحب جس گداز کا ذکر آپ نے اپنے شعر کے حوالے سے کیا ہے وہ ہمیں سردار جعفری کی کسی نظم یا شعر میں نہیں ملتا۔

فراق:

بالکل بجا آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید ان کا ارادہ تو کوئی برا نہیں ہے لیکن ان کے مزاج میں ایک سختی ہے، ایک خشونت ہے۔ مگر بحیثیت انسان کے وہ آپ کے لئے جان دے سکتے ہیں۔ لیکن مزاج براہ راست عمل کی شکل نہیں اختیار کرتا۔ اسی لئے میرا مصرع ہے ع

گر عشق نہ ہو عمل ترقی نہ کرے

گورکی (Gorky) کہتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی کتاب سے ایک مجرم بڑی چیز ہے۔ یہ احترام حیات ہے۔ لیکن محض ایک عادت ڈال لینا کہ صاحب وہاں آگ لگی ہے تو بجھانے لئے پہنچ گئے... آگ لگنے سے میری مراد ہندو مسلم فساد ہے... اخلاق کو اگر آپ نے پیشہ بنایا تو اخلاق گیا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بڑے سے بڑے کام سے بڑی چیز ہیں بڑے جذبات۔

فاروقی:

یہاں ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ترقی پسند حضرات کی جو یہ Thesis ہے کہ ادیب بہت ہی باعمل انسان ہوتے ہیں یہ دراصل Victorian عہد کی پیداوار ہے۔

فراق:

ہاں Samuel Smiles کی Duty اور Thift وغیرہ قسم کی کتابیں (قہقہہ)۔

فاروقی:

اس زمانے میں کچھ نقادوں نے یہ افسانہ گڑھا تھا کہ بڑے شاعر ادیب بڑے باعمل انسان ہوتے ہیں مثلاً سافوکلیز (Sophocles) نے جنگ میں حصہ لیا تھا...

فراق:

یا بائرن... لیکن شیلی کا مضمون ہے A Defence of Poetry۔ اس میں وہ Conduct اور Character کا فرق بیان کرتا ہے۔ شیلی کا کہنا ہے کہ Conduct, Character نہیں ہے آدمی اپنے Conduct میں غلطی کر سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا Character بھی خراب ہو۔ Character شعوری، وجدانی اور نفسیاتی خواص کا ردعمل ہے اور شاعر کا Character ضرور بلند ہوتا ہے۔

فاروقی:

بیشک۔

فراق:

ہاں Divine fire!

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

یہاں دل گداختہ کے پہلے ہی آپ فرض منصبی جھیل جانے کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ Patriotism اور میں تو کہتا ہوں کہ ہر ism یہاں تک کہ

Comunism is the last refuge of the scoundrell

ادب کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ اپنے فرض کو پورا کریں۔ اس میں دو ہزار اور قوتیں کارفرما ہوں گی اسی لئے میں نے کہا ہے ع

کام نہ چل سکا فراق کچھ نہ کئے بغیر بھی

ہر ایک کو ہیملٹ بننا پڑتا ہے۔ اب آپ یہ دیکھیں۔

It is a mixed world - we have to learn to live with wrong.

فاروقی:

جیسا کہ King Lear میں ہے:

...Men must endure

Their going hence, even as their coming hither Ripeness is all.

فراق:

ہاں Ripeness is all! ☆☆☆

فرحت احساس

شمارہ ۲۵۷،
جون ۲۰۰۲

سارے ختم دل و جان تن میں لوٹ آئے
پھر آسماں سے اسی خاک پن میں لوٹ آئے

وہ آ گیا ہے تو آزاد ہو گئے ہیں ہم
چلا گیا تو اسی پھر بدن میں لوٹ آئے

کھلا کہ شہر میں کچھ اور ہی ہے تنہائی
سو گھوم پھر کے اسی انجمن میں لوٹ آئے

تمام لفظ کہ سب کارکن تھے دنیا کے
مری صدا پہ ثنائے سخن میں لوٹ آئے

یہاں ہے کون جو اس کا راستہ روکے
کہو خزاں سے کہ خالی چمن میں لوٹ آئے

پڑی جو شام تو صرف اک کرن ہی باقی تھی
سب آفتاب اسی اک کرن میں لوٹ آئے

فرخ جعفری

شمارہ ۱۰۷،
فروری تا اپریل ۱۹۷۸

انھیں بے رنگ مناظر میں گرفتار ہوئے
خواب آنکھوں کا نہ دیکھا تھا کہ بیدار ہوئے

گھر سے نکلیں نہ کبھی اور نہ جھانکیں باہر
یوں بھی تھے اور بھی کچھ لوگ پراسرار ہوئے

ہم نے خود اس کو فراہم کیے اس کی خاطر
دوریوں کے جو بہانے اسے درکار ہوئے

اشتہارات کہ الزام لگے ہیں ہم پر
جانے کس جرم میں ہم شہر کی دیوار ہوئے

فرخ جعفری

شمارہ ۱۴۸،
دسمبر ۱۹۸۷ تا فروری ۱۹۸۸

کچھ ایسے حادثے بھی سر راہ ہو گئے
جو سرسری تھے بعد کو جاں کاہ ہو گئے

خود کو سمجھ رہے تھے سمندر پھر ایک روز
لکھا جو خود کو، قصۂ کوتاہ ہو گئے

خود کو کہاں کہاں نہ لیے ہم پھرے پر اب
اپنے عدم وجود سے آگاہ ہو گئے

اک اک سے پوچھتے ہیں پتہ اپنے گھر کا ہم
منزل کی دھن میں لوگ جو گم راہ ہو گئے

شمارہ ۱۵۶،
اگست تا اکتوبر ۱۹۸۹

اس راز کے باطن میں پہنچا ہی نہیں کوئی
کیوں لوٹ کے گھر اپنے آیا ہی نہیں کوئی

اب شہر کی خاموشی ویرانے سے ملتی ہے
آواز لگائی تو بولا ہی نہیں کوئی

ہر روز دکھائی دیں سب لوگ وہی لیکن
جب ڈھونڈنے نکلیں تو ملتا ہی نہیں کوئی

ہونے سے کہ جن کے تھا بستی کا بھرم قائم
اطراف میں شہروں کے صحرا ہی نہیں کوئی

تھک ہار کے آبیٹھے اک پیڑ تلے آخر
جس پیڑ تلے فرخ سایہ ہی نہیں کوئی

فرخ جعفری

شمارہ ۱۷۳،
فروری مارچ ۱۹۹۴

یہ بار گراں جانی اسباب سفر سے ہے
ورنہ یہ پریشانی دل سے ہے نہ سر سے ہے

وہ آنکھ جدھر اٹھے اس سمت نظر رکھنا
یہ وہم نہ جانے کیا اس دل کو ادھر سے ہے

انداز نظر آخر اک روز بدلنا ہے
پھر دیکھنا دنیا کو دنیا کی نظر سے ہے

یہ لہجہ تو کچھ اپنا لہجہ نہیں لگتا ہے
ہے شعر تو اپنا ہی پر کس کے اثر سے ہے

ہیں دوست بھی دشمن بھی سب ایک طرف فرخ
یہ تیر جو آیا ہے کیا جانے کدھر سے ہے

شمارہ ۲۳۹،
جولائی ۲۰۰۰

وہ برگ زرد کہاں ہوگا اب خدا جانے
کہاں اڑا کے اسے لے گئی ہوا جانے

ابھی تو راہ میں کتنے ہی موڑ آئیں گے
ابھی وہ ساتھ ہے ہوجائے کب جدا جانے

سو ہم بھی فاصلہ اس سے بنائے رکھے ہیں
بچھڑ کے اس سے گذر جائے دل پہ کیا جانے

ابھی میں اس کی تمنا سے باز آجاؤں
مرے سوا جو کوئی اس کا نقش پا جانے

اسے خبر ہی نہیں کوئی چاہتا ہے اسے
وہ سادہ لوح محبت کی بات کیا جانے

فرخ یار

شمارہ ۲۹۱،
اپریل ۲۰۰۵

خون اپنی گواہی پہ قائم رہا

دل میں جو فاصلے تھے
کہاں طے ہوئے
خواب ایسی زمینوں پہ لکھے گئے
جو برابر نہ تھیں
اور ہم بند کمروں کے تاریک
کونوں میں وسط ایشیائی کہانی کے سوداگروں کی طرح
خوف کا پیٹ بھرتے رہے
دن گذرتے رہے
ہم نے کیکر کے پھولوں میں
اور پھلاہی کی خوشبو میں وعدے کئے
اور پرانی کتابوں میں رکھے ہوئے
مور کے پر کو بوسہ دیا سو گئے

اجنبی سرزمینوں سے آئے ہوئے کارواں
نیلگوں پانیوں پر اترتے رہے
دن گذرتے رہے

تاریخ اپنے کھاتے نئی کتابوں پر منتقل کرچکی

اوما اوما
دیکھ تیرے ویرانوں سے تانبا نکلا ہے
دیکھ تیری گلیوں پر
کیسے کیسے دن اترے ہیں
ہرے سنہرے بھرے بھرے دن
ایسے دن جن کی مٹی میں آنے والی دنیاؤں کے بیج پڑے ہیں

اوما اوما
پکنے دے کچھ دن یہ مٹی
یہ مٹی جو کھڑے پروں میں
گرم تنوں سے ریزہ ریزہ گرتی ہے
اور ہم جیون کی اوٹ سے
صدیاں گنتے رہ جاتے ہیں

اوما اوما بہنے دے کچھ دن یہ پانی
یہ پانی جو اونچے پربت کے بل کھاتے
بے ترتیب نشیبی رستوں سے اترا ہے
یہ پانی کہ جس کے عکس میں گھائل دل ہے
نیلے پر ہیں
اوما اوما
دیکھ ترے کھیتوں کھلیانوں تہ خانوں کے قصے میں
کہیں کسی شہزادے کے دھول اڑاتے رتھ کا ذکر نہیں
تجھ کو کیلے پہناوے میں
شہزادوں سے دھول اڑاتے رتھ سے کیا لینا ہے
پکنے دے کچھ دن یہ مٹی
بہنے دے کچھ دن یہ پانی

فضا ابن فیضی

شمارہ ۱۷۲،
جنوری ۱۹۹۴

بارور کوئی بھی کوشش نہیں ہونے والی
یہی بادل ہیں تو بارش نہیں ہونے والی
یہ جو خوشبو ہے، اسے لفظوں میں کیوں کر لکھوں
موج گل، خط نگارش نہیں ہونے والی
مجھ کو دیکھو کہ ہوں میں زخموں کا منظر نامہ
شہر میں پھر یہ نمائش نہیں ہونے والی
چاک تا چاک یوں ہی گھومتے رہنا ہے ہمیں
ختم حالات کی گردش نہیں ہونے والی
تازہ موسم کی ہوا سے کہو چھیڑے نہ اسے
سوختہ شاخ میں جنبش نہیں ہونے والی
ان دنوں ان کا بھی کشکول عطا خالی ہے
تجھ پہ اب کوئی نوازش نہیں ہونے والی
دود خوردہ ہی سہی، محفل جاں کا ہوں چراغ
مجھ سے سورج کی پرستش نہیں ہونے والی
کیوں نہ میں وقت سے برتاؤ حریفانہ کروں
یوں بھی پوری کوئی خواہش نہیں ہونے والی
خون دل کا ہیں شفق پارہ مرے لفظ فضا
تجھ سے یہ فکر یہ کاوش نہیں ہونے والی

فضل تابش

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

شخصیت ہے کہ صرف گالی ہے
اور کس شخص نے اچھالی ہے

شہر در شہر ہاتھ اگتے ہیں
کچھ تو ہے جو ہر اک سوالی ہے

جو بھی ہاتھ آئے نوٹ کر چاہو
ہار کر یہ روش نکالی ہے

میر کا دل کہاں سے لاؤ گے
خون کی بوند تو بچالی ہے

جسم میں بھی اتر کے دیکھ لیا
ہاتھ خالی تھا اب بھی خالی ہے

ریشہ ریشہ ادھیڑ کر دیکھو
روشنی کس جگہ سے کالی ہے

دن نے چہرہ کھروچ ڈالا تھا
جب تو سورج پہ خاک ڈالی ہے

فضل تابش

شمارہ ۸٦،
اگست تا اکتوبر ۱۹۷۳

سر میں کیل ٹھونک کر
چڑیا، کبھی
یا انسان کے علاوہ
کچھ بھی بنا دینے کے قصوں میں
خون کی طرح دوڑتی سر چھپاؤ خواہش
زندہ ہے

زندہ ہیں
جسم میں اترے ہوئے پیلے ناخونوں والے ہاتھ
جسم میں پھیلے اندھیرے میں
مصافحہ کر رہے ہیں
ہاتھوں کے چہرے پوری بتیسی ہنسی
لپیٹے ہوئے ہیں

دکھائی نہ دیتے ہوئے بھی
سجھائی دے رہا ہے سب کچھ
کہ مصافحہ کرتے وقت کی گھناؤنی مسکراہٹ کی
چشم دید شہادت
کئی بار ہو چکی ہے

معلوم یہ بھی ہو چکا ہے کہ
کیل سر میں ٹھونکی نہیں جا سکتی
سر چھپاؤ خواہش کو بدن نکالا
دیا جا چکا ہے
مگر جسم میں
گہرے اترے مصافحہ کرتے ہاتھوں کو
جی کر
زندگی کے سامنے کھڑے ہو کر
کسی کو کاندھوں پر بیٹھا
یا
روند کر گذرتا
جان لینا
اپنے آپ میں الگ اور انوکھا تجربہ ہے
کیا یہ کافی نہیں ہے

کنور نرائن،   ترجمہ: فضل حسنین

شمارہ ۲۵۹،
اگست ۲۰۰۲

ایک بار ایسا ہوا کہ دو ملکوں کے درمیان سیمار یکھا یعنی خط تقسیم یا سرحد اچانک کہیں کھو گئی۔ اس کو موضوع بنا کر خاصا بحث مباحثہ، لڑائی جھگڑا، مارا ماری رہی۔ پھر سب یکا یک تھم گیا۔ دونوں ملک لڑنا چھوڑ کر اپنی اپنی سیمار یکھائیں تلاش کرنے میں لگ گئے، بلکہ اپنی سیمار یکھا کو، جو دونوں کی ہوتے ہوئے بھی کسی ایک کی نہیں تھی۔

چونکہ سرحد کھو گئی تھی، اس لئے سب سے بڑی مشکل دونوں ممالک کے مابین تفریق کرنے میں ہو رہی تھی۔ دونوں کا رنگ روپ ایک، رہن سہن ایک، زمین آسمان ایک، پہاڑ ندیاں جنگل ایک، لباس تک ایک... سیمار یکھا کے کھو جانے کا حادثہ اس وقت ہوا جب اسی لکیر کے معاملے پر دونوں ممالک کے درمیان گھمسان جنگ چل رہی تھی۔ خط تقسیم کے غائب ہوتے ہی جنگ روکنا پڑی، اور دونوں ہی ممالک لڑنا ترک کر کے لڑائی کی جڑ یعنی سرحدی لکیر کو تلاش کرنے میں جٹ گئے۔

تاریخ سے شروع کیا گیا تو پتہ چلا کہ ابھی کچھ برس پہلے تک وہ لکیر کہیں تھی ہی نہیں۔ کچھ لوگوں کو شک ہوا کہ شدید گولہ باری میں کہیں وہ نازک سی لکیر ہی ختم تو نہیں ہوگئی؟ لیکن اگر ایسا ہوا ہوتا تو کہیں اس کی لاش تو ملتی۔ ایک لاش ملی تو ضرور لیکن اتنی ابتر حالت میں کہ پہچاننا ہی مشکل ہو گیا کہ کس کی لاش ہے۔

کچھ جوشیلے اور واقف کار لوگ سیمار یکھا کی تلاش میں محکمۂ آثار قدیمہ بھی گئے۔ وہاں کا حال اور بھی برا تھا۔ ان دو ملکوں کے درمیان تو کیا، وہاں کسی بھی ملک کے درمیان کوئی خط تقسیم نظر نہیں آرہا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ خیالی گھوڑے دوڑا رہے تھے کہ شاید نئے زمانے میں سیمار یکھا اسی طرح تحت الثریٰ میں چلی گئی ہو جیسے مقدس ویدوں کے عہد میں کال میں سرسوتی ندی غائب ہو گئی تھی...

بہر حال، مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ موجودہ زمانے، نہ تاریخ میں، نہ مستقبل میں، نہ آدمی کی نسل میں، نہ اس کی شکل میں، نہ ادب میں، نہ فنون میں، نہ جغرافیہ میں۔ سیمار یکھا کے نہ رہنے کی وجہ سے سب ایک سا لگنے لگا، جیسے کئی الگ الگ ملک نہ ہوں، ایک ہی دنیا ہو۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ صاف صاف پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کے خلاف ہے۔ سب ایک دوسرے کی موافقت ہی میں معلوم ہوتے تھے اور جب یہ پتہ نہ چلتا کہ کون کس کے خلاف ہے، تو انسان کی سب سے بڑی پہچان، اس کی ہزاروں سال پرانی جنگ جوئی کا ہی خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔ جنگ اور جدو جہد جیسے عظیم فرائض کا تقدس ہی کھٹکے میں پڑ گیا تھا۔ جدو جہد نہ ہو تو ترقی کیسے ہو؟ کشمکش کیا رکی، انسان کی ترقی ہی رک گئی تھی۔ مسلسل ترقی میں دل دہلا دینے والی اڑچنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ جدو جہد، اور بے شمار قتل عام کی شکست ناپذیر ترکیبیں، تعمیر اور تقسیم کرنے والے تمام ادارے اور کارخانے، سب کے لئے مصیبت پیدا ہو گئی تھی، جس کا الٹا اثر ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک پر یکساں پڑ رہا تھا۔ ان کا اقتصادی نظام ڈانواں ڈول ہونے لگا جنگیں اگر کسی وجہ سے رک گئیں تو انسان کی تباہی یقینی تھی۔ زمین اگر ثابت بچ بھی گئی تو کس کام کی۔

جن گھنے جنگلوں، ویرانوں اور سنگلاخ پہاڑوں وغیرہ سے ہو کر سیمار یکھا گذرتی تھی اسے وہاں ہر وقت نظر میں رکھنا ویسے بھی ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا۔ اور اب جب وہ کھو گئی تھی، یا نظر نہیں آرہی تھی تو اسے ڈھونڈ لینا تقریباً ناممکن تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ لکیر کو ڈھونڈنے والوں کی بھیڑ دونوں ملکوں کے درمیان اتنی آزادی سے آ جا رہی تھی کہ لگتا تھا اب دو ملک نہیں رہ گئے، دونوں مل کر ایک ملک ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں کے مابین میل جول اور شادی بیاہ تک کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

اس سے قبل کہ معاملہ ایک بالکل فطری آسان حل پر قائم ہو کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا اور دو عظیم ملکوں کے مابین فرق کر سکنے والی لڑائی جھگڑے کی کوئی بنیاد ہی نہ بچتی، کچھ وطن پرست سیاست دانوں اور پالیسی سازوں نے آگے بڑھ کر معاملے کو ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے سب کے سامنے جشن کے انداز میں قسم کھائی کہ ملک کی بھلائی کے لئے ہم معاملے کو الجھا کر ہی رہیں گے۔ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ اگر پرانی سیمار یکھا کسی وجہ سے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی تو ہم نئی لکیر بنائیں گے، خواہ اس عظیم کوشش میں دونوں ملکوں کو مرمٹنا ہی کیوں نہ پڑے۔

مرمٹنے کے اس نعرے کا لوگوں پر کمال کا اثر پڑا۔ تمام ایسے لوگ سامنے آنے لگے جنھوں نے اس مرمٹنے کے دھرم کو خوشی خوشی قبول کر لیا تھا۔ اور نئے نئے لوگ پیدا بھی ہونے لگے جو اس نئے مذہب کو دیس بدیس میں مستعدی سے پھیلانے لگے۔ دنیا بھر میں ایسے فرقے اور گروہ وجود میں آنے لگے جن کے

لئے دوسروں کو مار کر مرمٹنے کا دھرم ہر دھرم سے بڑھ کر تھا۔ دیس دیس میں نئے مذہب کے ماننے والے اس طرح پھیلنے لگے جیسے وبا پھیلتی ہے۔

ایک کٹر پنتھی سے، جس نے کہ نیا مذہب ابھی ابھی قبول کیا تھا، کسی نابالغ ناسمجھ نے نادانی میں پوچھا۔

"جناب ذرا تفصیل سے سمجھایئے گا اس مرمٹنے یا مار کر مٹا دینے والے دھرم کی باریکیوں کو۔"

وہ تفصیل میں نہیں گیا، ذرا جلدی میں تھا، تفصیل میں جانے کا نہ تو اس کے پاس وقت تھا نہ ہی صبر۔ نابالغ بچکانہ تجسس کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس میں تفصیل ہے ہی نہیں، مختصر لفظوں میں بس یہ ہے کہ مرمٹنا ہے۔"

"معاف کیجئے گا، میں سمجھا نہیں، ذرا اور..."

"سمجھاتا ہوں۔" کہہ کر اس نے بات کی ایک گولی بنا کر نابالغ کے الجھے ہوئے دماغ میں ٹھوک دی۔ اس طرح شک کرنے والا تو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو ہی گیا، لیکن دوسرے نابالغ بھی اصل مطلب کو بآسانی سمجھ گئے۔

بات جب مرمٹنے والے بڑے مسئلے پر جا ٹکی تو سرحد والا تناؤ کچھ کم ہوا مگر حالت پھر بھی گمبھیر رہی۔ معاملے کو الجھانے اور پھر الجھائے رکھنے میں ذرائع ابلاغ کی جانب سے بھی پورا تعاون مل رہا تھا۔ ماحول کسی بھی آسان اور سیدھے حل کے خلاف تھا۔ جنگ عظیم تک ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مرمٹنے والے دھرم کو جڑ سے مٹانا ضروری تھا۔ ساری دنیا دھماکے کے ایک نازک نقطے پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اچانک خبر اڑی:

"کھوئی ہوئی سرحد مل گئی مل گئی وہ زمین پر نہیں تھی، ایک نقشے میں چھپی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے بل میں سانپ۔"

اب سیمار یکھا نہیں، وہ نقشہ جھگڑے کا موضوع تھا جس میں وہ ملی تھی۔

ایک بہت بڑی میز، دنیا سے بھی بڑی میز پر ایک چھوٹا سا نقشہ پھیلا کر میز کو گھیر کر نقشے کے اندر ہر طرف ماہرین بیٹھ گئے۔ نقشے میں تمام سرحدوں کی اتنی زبردست بیچ بیچ تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون سی لکیر کس دیس کی ہے، یا کس ذات کی ہے۔ عام آدمی سے لے کر پوری انسانی ذات کی سیمار یکھاؤں کا ایک بے حد الجھا ہوا بہت بڑا جال اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ ساری زمین اس کے تلے ڈھک سی گئی تھی۔ ملکوں ہی میں نہیں، اب تو گھر گھر میں ہر شخص پریشان تھا کہ دو لوگوں کے درمیان صحیح سرحد کہاں ہے۔

صرف بچے خوش تھے، جو کسی بھی سیمار یکھا کو نہ مانتے تھے۔ وہ اڑ رہے تھے، ہوا میں رنگ برنگ غباروں کی طرح۔ سیمار یکھائیں ان کے پیچھے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

ایک بالکل لغو، ناممکن خواب۔ نہ جانے کس دھماکے کی آواز سے ٹوٹ گیا تھا، کہیں بیچ ہی میں۔ خیر خوابوں کا کیا ہے، بننا بگڑنا اور بادلوں کی طرح ہوا میں اڑ جانا تو ان کا مقدر ہے۔

ڈر تو اس دھماکے کا ہے کہ کہیں وہ سچ نہ نکلے، دھماکا، جس سے لوگوں کی نیندیں اڑ جایا کرتی ہیں ☆☆☆

فضل حسنین کی کتابیں

۱۔ رسوا سر بازار (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)
۲۔ دو بدو
۳۔ روشنی اور دھوپ (ڈراموں کا مجموعہ)
۴۔ ریت کے محل "
۵۔ رات ڈھلتی رہی "
۶۔ غالب، ایک نظر میں

ھندی

۱۔ ہوا جن سے شہر کا نام روشن (بزرگ ادیبوں کے خاکے)
۲۔ بات کا بتنگڑ (ڈراموں کا مجموعہ)
۳۔ دائرے فرض کے "
۴۔ پھیلتا پرکاش "

شب خون کتاب گھر
۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد

اردو غزل کا دبستانِ جدید
بیسویں صدی کی متنازع اور اکیسویں صدی کی مُسلّمہ شاعری

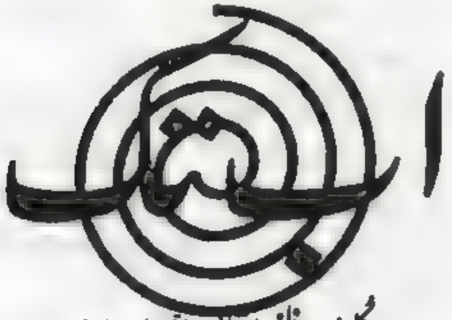

کُلیاتِ ظفر اقبال (تین جلدوں میں)

MULTI MEDIA
AFFAIRS
21-Nand Street, Sham Nagar, Chauburji, Lahore-Pakistan.
Tel: (92-042) 7356454, Mobile: 0333-4222998
E-mail: multimediaaffairs@hotmail.com

فضیل جعفری

شمارہ ۴۰،
ستمبر ۱۹۶۹

سخت ، ادھ کچرے پھولوں کو بھی رسیلا جانے
شوق قاتل ہے، برا اور بھلا کیا جانے

عشق کے سیکڑوں ہاتھ اور ہزاروں رستے
بچ کے جائے تو کہاں جس کو یہ اپنا جانے

جھوٹ ہے سارا جہاں جھوٹ کی جانب ہے رواں
کیوں کوئی خود کو پھر اس دہر میں سچا جانے

کیا خبر اس کو جوان آنکھوں پہ گذرے ہے فضیل
دل تو ہر حال میں چپ چاپ دھڑکنا جانے

اس ڈر سے کہ سیلاب گذر جائے نہ حد سے
پانی کو کیا خشک دواؤں کی مدد سے

ذہنوں کو اگر ناپ سکے تو کوئی ناپے
پہچاننا مشکل ہے اب انسان کو قد سے

اب غزلوں میں سر پھوڑ کے مرتی نہیں لیلیٰ
اب اٹھ کے نہیں بھاگتے عشاق لحد سے

ہر رات دمکتا ہے ترے جسم کا شعلہ
ہر رات نکل جاتے ہیں ہم رات کی زد سے

نئی شاعری اور جدیدیت

فضیل جعفری

شمارہ ۴۹،
جون ۱۹۷۰

ادھر چند برسوں میں جدیدیت، ترقی پسندی، جدید شاعری، نئی شاعری، وغیرہ کے متعلق رسائل کے صفحات پر جو دھواں دھار بحثیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ لوگ باگ نہ صرف نئی شاعری کے وجود سے واقف ہو گئے بلکہ نئی شاعری کے چرچے بہ بدی ہی سہی، موجودہ اردو تنقید میں ایک غالب حیثیت اختیار کر گئے۔ کئی لحاظ سے یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن ان مباحث کا ایک برا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم لوگوں نے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی اور ہنوز کر رہے ہیں کہ کون نیا شاعر ہے کون نہیں ہے۔ نئی شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بہت کم بحث کی گئی۔ زیادہ تر لوگ نئی شاعری کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ایسی باتیں لکھتے ہیں جن کا تعلق دراصل نئی شاعری سے اتنا نہیں ہوتا جتنا ان کی اپنی ذہنی اختراع سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی کے نزدیک نئی شاعری کی ابتدا بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتی ہے تو کسی دوسرے کے نزدیک یہ ۱۹۶۰ کے بعد کی پیداوار ہے۔ کوئی صاحب فراق و فیض سے ظفر اقبال تک سب کو نیا شاعر کہہ اپنے تنقیدی فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں تو کوئی صاحب سرے سے ہی ان تمام لوگوں کی اہمیت سے انکار کر دیتے ہیں۔ کوئی نئی شاعری کے لئے "ماضی کے صالح کے عناصر اور زندہ روایات" کا نسخہ تجویز کرتا ہے تو کوئی دوسرا ماضی اور اس کے تمام ادب کو گالیاں دینا ہی جدیدیت کی پہلی شرط سمجھا ہے۔

زیادہ قابل رحم حالت ان حضرات کی ہے جو نئی شاعری یا جدیدیت کے کسی ایسے معیار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جس پر خود ان کی اپنی شاعری پوری نہ اترتی ہو۔ علاوہ ازیں، ادب کے اکھاڑے میں اس وقت کچھ ایسے پہلوان بھی موجود ہیں جو "سید برادران" کی طرح جس سے خوش ہو جاتے ہیں اس کے سر پر جدیدیت کا تاج زریں رکھ دیتے ہیں اور جس سے ناراض ہو جاتے ہیں اسے بے تاج کر دیتے ہیں۔ غرض کہ نئی شاعری اور جدیدیت کے سلسلہ میں فی زمانہ اچھا خاصا انتشار پھیلا ہوا ہے۔ ان ہنگاموں میں بھی بعض قارئین[1] جدیدیت کو سمجھنا اور پھر اس کے توسط سے نئی شاعری کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ جدیدیت کے سلسلے میں نہ تو کوئی ٹھوس اور جامد فارمولا بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ایسی تعریف کی جا سکتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے کی اور ہر طرح کی نئی شاعری پر کیا جا سکے۔ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے اور ہر زمانہ میں اس کے ڈھانچا میں واضح تبدیلیوں کا ہونا ایک ناگزیری بات ہے۔

> "ایک زمانے میں" جدیدیت "سرسید تحریک کا نام تھا۔ گو یا وہ انداز نظر اور وہ رویہ جس سے سرسید نے اس قوم کے ماضی اور حال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور جس کی مدد سے اس قوم کا احیا ممکن ہوگا۔ ۱۹۲۵ کے قریب ٹیگوریت اور رومانی تحریک جدیدیت کے مترادف تھی۔ ۱۹۳۶ میں جدیدیت، ترقی پسندی کا نام تھا۔ ۱۹۴۷ کے فوراً بعد اجتماعی شعور کا اظہار غزل کے روپ میں جدیدیت کہلاتا تھا۔ لیکن آج --- کیا ہم ان میں سے کسی کو جدیدیت کہہ سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے جس کے معنی ہر نسل کے ساتھ ہر دور میں بدل جاتے ہیں۔ (جمیل جالبی: "جدیدیت"؛ "شب خون" مارچ ۱۹۶۹)

جی ہاں اس کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہی ہو سکتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ آج کی نئی شعری نسل نے ایک بار پھر اردو شاعری میں جدیدیت کے معنی بدل دیئے ہیں۔ یہاں یہ موقع تو نہیں ہے کہ فیض، مخدوم، اور سردار جعفری کی ترقی پسند شاعری یا میراجی راشد اور اختر الایمان کی جدید شاعری اور افتخار جالب اور عادل

---

[1] لفظ "قارئین" اردو کے سلسلے میں ذرا مبالغہ آمیز اصطلاح معلوم ہوتی ہے کہ کروڑوں افراد پر مشتمل یہ بے غیرت اور بے حس لسانی جماعت اردو سے فقط دستخطوں، جلسوں اور جلوسوں تک دلچسپی رکھتی ہے۔ دستخطیں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو سکتی ہیں لیکن اردو کی اچھی کتابیں اور معیاری رسالے ہزاروں کی تعداد میں بھی نہیں بک پاتے۔ اس سلسلے میں بعض حضرات کچھ فلمی، نیم فلمی، مذہبی رسالوں کی کثیر تعداد اشاعت کے حوالے دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان فلمی اور مذہبی رسالوں کے فروخت ہونے کا سبب اردو زبان و ادب سے دلچسپی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر ہر ماہ گون شباب آور کی ہزاروں شیشی بک جائیں تو اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ لوگوں کو طب یونانی سے کوئی خاص شغف ہے۔

منصوری سے لے کر اختر یوسف، وہاب دانش، اور عتیق اللہ تک کی نئی شاعری کا مفصل مقابلہ و موازنہ کیا جائے۔ لیکن مختصراً یہ عرض کرتا چلوں کہ ۱۹۳۶ سے لے کر اب تک اردو میں جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی معیاری شاعری کی گئی ہے وہ سب کی سب ایک جیسے خد و خال یا ایک ہی طرزِ احساس والی شاعری نہیں۔ یہ بالکل فطری امر ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے جھجکتے اور ڈرتے ہیں۔ جس طرح ترقی پسند میراجی وغیرہ سے دراصل اس وجہ سے ناراض رہا کرتے تھے کہ یہ لوگ ان کی جیسی شاعری کیوں نہیں کرتے، اسی طرح آج ایک طرف ترقی پسند اور دوسری طرف اختر الایمان وغیرہ نئے شاعروں سے بڑی حد تک اسی لئے ناراض رہتے ہیں کہ نئے شاعروں کا ذہنی اور شعری رویہ پیش روؤں کے ذہنی اور شعری رویے سے کیوں مختلف ہے؟

نئے شاعر اپنے پیش روؤں کی اچھی اور معیاری شاعری کی قدر کرنے کے باوجود ان کی جیسی شاعری نہیں کر سکتے۔ زمانے کا فرق ہے، حالات بدلے ہوئے ہیں اور زندگی کی کم و بیش سبھی قدریں بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہیں ۲۔

ان بدلے ہوئے حالات اور تبدیل شدہ قدروں کے تحت اس وقت جو نئی شاعری کی جا رہی ہے اس کی اپنی کچھ خصوصیتیں ہیں۔ وہ ایک طرف تو نئی شاعری کو پیش روؤں کی شاعری سے الگ اور ممیز کرتی ہیں اور دوسری طرف جدیدیت کا ایک نیا معیار قائم کرتی ہیں۔ نئی شاعری اور جدیدیت کے سلسلہ میں عام طور پر بحث کی جو سطح رہی ہے اس کی بنیاد بہت بڑی حد تک مفروضات پر رہی ہے۔ عموماً "میرے خیال میں"... "میرے نزدیک"... اور "میں سمجھتا ہوں"... قسم کی باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ مگر سوال کسی کے خیال یا کسی کی مرضی کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج جو ایک نئے طرزِ احساس اور نئے انداز والی شاعری ہو رہی ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کا اظہار کس طرح ہو رہا ہے؟ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ مشترکہ خصوصیات جنھیں ہم بحیثیت مجموعی جدیدیت سے تعبیر کرتے ہیں، ہر شاعر کے یہاں اور ہر نظم یا ہر شعر میں ایک ہی انداز اور ایک ہی مقدار میں نہیں ملیں گی۔ جس طرح عام زندگی میں کسی ایک واقعے کا مختلف افراد پر مختلف قسم کا ردِ عمل ہوتا ہے، اور اگر اسی ایک واقعے کے تعلق سے یہ مختلف لوگ اپنے اپنے ردِ عمل کا اظہار کریں تو مرکزی واقعے کے باوجود ہر شخص کے ردِ عمل کی ایک الگ شکل اور الگ شناخت ہوگی، اسی طرح نئے شاعروں کے یہاں جدیدیت کے مختلف پہلو، احساسات کے مشترکہ دھاروں کے باوجود الگ الگ رنگوں اور الگ شکلوں میں ملتے ہیں۔

کئی لوگ شاعری اور جدیدیت کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے سارا زور لفظیات میں تبدیلی اور اضافہ، ترتیب نحوی اوقاف، اعراب اور ہیئت کے انوکھے پن پر صرف کرتے ہیں۔ جدیدیت کے سلسلے میں یہ تمام چیزیں بھی بہت اہم ہیں مگر ان کی اہمیت مرکزی نہیں بلکہ ثانوی ہے۔ ہر زمانے کی جدیدیت اور ہر زمانے کی نئی شاعری دراصل عصریت سے عبارت ہوتی ہے۔ اور عصریت کا تعلق معاشرہ اور سماج سے ہوتا ہے۔ موجودہ معاشرہ سے نئے شاعروں کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے، جس طرح کا تعلق سماج اور پیشتر و شعری نسل کے درمیان تھا۔

کچھ مستثنیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سبھی نئے شاعر ایسی عمروں والے لوگ ہیں جن کی پرورش اور پرداخت تقسیم ملک کے بعد ہوئی۔ پورے برصغیر کی نئی شعری نسل ان افراد پر مشتمل ہے، جنھوں نے "اکھنڈ بھارت یا" "بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے نہیں لگائے تھے اور نہ ہی انھوں نے تقسیم سے پہلے کی سیاست میں کوئی حصہ لیا تھا۔ سرحد کے دونوں طرف رہنے والے ایسے شعرا جنھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے عملی یا جذباتی طور پر سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا تھا وہ تقسیم کے نتائج سے بددل اور مایوس ضرور ہوئے۔ اس بارے میں جذباتیت سے بھرپور کچھ نظمیں اور غزلیں بھی لکھی گئیں، لیکن جلد ہی ان لوگوں نے خود پر قابو پا لیا اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اب ان میں سے بیشتر حضرات اپنے اپنے ملک کی برسرِ اقتدار ہستیوں کے قصیدے لکھتے ہیں اور عیش کرتے ہیں، خود کو اشتراکی کہتے ہیں اور نئے شاعروں کو امریکہ کا ایجنٹ۔ برخلاف اس کے برصغیر کے نئے شاعر نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو قومی بلکہ بین الاقوامی پیمانے پر آپسی نفرت، خطرناک قسم کی منافقت، بے روزگاری، جھوٹ، دغابازی، نسلی اور صوبہ واری عصبیت وغیرہ سے دوچار پایا۔ آج وہ اپنے آپ کو ان سماجی قوتوں کے سامنے بے بس اور لاچار پاتا ہے جو روزمرہ کی زندگی میں اس پر حکومت کرتی ہیں۔

یہ نیا شاعر جب اپنے ارد گرد دیکھتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج ایک انسان کا دوسرے انسان سے وہی رشتہ ہے جو ایک مشین کا دوسری مشین سے ہو سکتا ہے۔ برسوں کے باہمی تعلقات اور میل جول لمحوں میں نذرِ آتش کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے رشتوں ناطوں کو نفع اور نقصان کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ دوستی اور دشمنی کا معیار محض ذاتی مفاد اور ذاتی عناد رہ گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں سن کر اور پڑھ کر سماجی طور پر "باعزت" "خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کرنے والے بعض شاعر اور ادیب یورپ کی صنعتی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں اور یہ یاد دلاتے ہیں کہ ہندوستان تو آج بھی بیل گاڑیوں کے دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ایک بدقسمت قوم ہیں۔ پورے طور پر صنعتی نہ ہو سکنے کے باوجود ایک طرف تو صنعتی تہذیب کی اکثر برائیاں (مثلاً زندگی کی مستحکم قدروں کا بکھر جانا، انسانی زندگی کی ارزانی اور بے وقعتی، اخلاق اور ثقافت جیسی اصطلاحوں کے معنی میں تبدیلی، اور انسانوں کا دوسرے انسانوں سے محض تجارتی

---

۲ کوئی بتائے
وہ کون قدریں ہیں جن کا دامن
ازل کے آنچل کا سلسلہ ہے
کہاں ہے وہ سچ؟
وجود کے دن سے آج تک جو اٹوٹ ہے بے بدل ہے اٹل ہے،
میں اس حقیقت کو جانتا ہوں
کہ وقت کا چاک جس کو ہر لحظہ نئے روپ دے رہا ہے
میں لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں میں سچ کے چہرے کو ڈھونڈتا ہوں

(بشر نواز: سچ کی عمر ہے اک لمحہ)

تعلق) ہمارا مقدر بن گئی ہیں تو دوسری طرف ایک پچھڑے ہوئے ملک وسماج کی ساری برائیاں (مثلاً مذہبی کٹر پن اور اس کے نتیجے میں مذہبی نفرت، منافقت، بے ایمانی، مکاری، کام چوری بھوک، بیکاری، سماجی تنگ نظری، اور آبادی میں مضرت رساں اضافہ وغیرہ) بھی ہمارے ساتھ شب وروز سائے کی طرح چپکی ہوئی ہیں۔

موجودہ سماج پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارا معاشرہ کس حد تک گندہ اور انحطاط پذیر ہو چکا ہے۔ سیاسی پارٹیوں سماجی تنظیموں قومی اداروں اور سرکاری دفاتر کی جو حالت ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ حتیٰ کہ یونیورسٹیاں بھی جنھیں علم ودانش کا مرکز سمجھا اور کہا جاتا رہا ہے زوال پذیری کی اس لعنت سے بچ نہیں سکیں۔ ہماری بیشتر یونیورسٹیاں دراصل اچھی خاصی تجارت گاہیں ہیں جن میں مختلف کمیٹیوں پر نامزدگی سے لے کر اساتذہ کے تقرر اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کی منظوری تک سارے کاروبار میں اہلیت اور قابلیت سے زیادہ ذاتی تعلقات، شخصی مفاد، علاقہ، ذات، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

یوں تو ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو سماج کے موجودہ المیہ سے واقف نہیں یا واقف ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے نزدیک سب کچھ ٹھیک ہے اور سب چلتا ہے۔ یہ معاملہ ویسے ہی ہے جیسے ہمنگوے (Hemingway) کے ناول A Farewell to Arms میں جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک سپاہی دوسرے سپاہی کو بتاتا ہے کہ ''ہم سب بھونے جا چکے ہیں لیکن اس وقت تک سب ٹھیک ہے جب تک ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا۔'' یہی حال بیش تر ہندوستانیوں کا ہے اور غالباً ایسے ہی لوگوں کے لئے ایک نئے شاعر ریاض مجید نے لکھا ہے ۔

اسیر ہی رہے ہم پچھلے عہد ناموں کے
ہمیں خبر ہی نہیں تھی رتیں بدلنے کی

لیکن نیا شاعر کہ ایک غیر مشروط، حساس اور دردمند ذہن مالک ہے، اسے احساس ہے کہ مسلمہ اقدار کس طرح ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں اور موجودہ حالات میں راہ نجات ڈھونڈنا کتنا کٹھن مسئلہ ہے۔ اس زوال آمادہ اور چور معاشرہ کی جو حالت ہے، اس میں جو مختلف قسم کی دھاندلیاں کی جا رہی ہیں اور جس طرح مختلف بہانوں اور مختلف طریقوں سے افراد کی زندگی جہنم بنادی گئی ہے اس کا اظہار نئے شاعروں کے یہاں جا بجا ملتا ہے:

برسرِ عام لعن طعن
اس کے منہ پر تھوکو، نفیس فسق وفجور کی ڈالیوں نے بیت
سے چپٹے چہروں کا نرم تازہ کلوروفل اس طرح نگلنا شروع
کیا ہے، سفید ملکولیائی غنچے دھڑوں پہ دہشت زدہ
سراسیمہ بے ارادہ گڑے ہیں...

(افتخار جالب: نفیس لامرکزیت اظہار)

میرے سر پر ایک لمبی نیند کا آسیب ہے چھایا ہوا
اور میرے سامنے
پردہ در پردہ کھڑی تاریکیاں
ایک لمبی رات کی گہری گھنی پرچھائیاں:

(کمار پاشی: ایک لمبی رات کا آسیب)

کتنا بے درد سے ہے
سچائی نیکی عظمت عزت
پیار محبت
سب ایسے سیارے ہیں
جو اپنے مدار کو چھوڑ چکے ہیں

(قاضی سلیم: ناتمیں)

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
ہر ایک جسم روح کے عذاب سے نڈھال ہے
ہر ایک آنکھ شبنمی ہر ایک دل فگار ہے

(شہریار)

ہر شخص کی قیمت ہے بکے جاتے ہیں کتنے
دیکھے سرِ محفل یہ تماشا کوئی کب تک

(باقر مہدی)

اوس کی بوندوں میں بکھرا ہوا منظر جیسے
سب کا یہ حال ہے اس دور میں میرا ہی نہیں

(شکیب جلالی)

ہوا کی سخت فصیلیں کھڑی ہیں چاروں طرف
نہیں یہاں سے کوئی راستہ نکلنے کا

(ظفر اقبال)

شعور نیلی رطوبتوں میں الجھ گیا ہے
خلوص کی انگلیوں کے نیچے
اندھیرا لفظوں میں ڈھل گیا ہے
یہاں سب الفاظ کھوکھلے ہیں
یہ کھوکھلا پن مقدروں سے جڑا ہوا ہے

(عادل منصوری: خلوص کی انگلیوں کے نیچے)

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستوں کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا

(بشر نواز)

کردار قتل کرنے لگے یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہو گئے

(شمس الرحمٰن فاروقی)

احساس جرم و خوف مقدر ہے آج کا
سر پر لٹک رہا ہے تلوار کی طرح

(حامد حسین حامد)

یہ تمام اور اس قسم کے دوسرے صدہا اشعار اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ نیا شاعر موجودہ سماج کی گندگیوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ اس سماج سے خطرناک حد تک دل برداشتہ اور ناآسودہ بھی ہے۔ ان حالات میں نئے شاعر کے سامنے دو ہی راستے کھلے ہیں، یا تو وہ خود بھی چوروں اور بے ایمانوں کی اس بھیڑ میں شامل ہو جائے، یا اپنے آپ کو ان سے الگ کر لے۔ اس تعلق سے نئے شاعر کے اثرات اور اس کا Preference ملاحظہ ہو:

اس بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں
آدم زادوں کے ریلے میں
کیا حسن و ادا کیا عشق و ہوس
کیا خواہش و شوق اور کیا حسرت
کیا شرم و حیا، جرائت غیرت
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا
میں خود بھی خود میں ڈوب گیا
تنہا، تنہا، تنہا، تنہا

(عمیق حنفی بشہزاد)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب نئے شاعر اور سماج میں وہ رشتہ نہیں رہ گیا جو پیشرو شعرا اور سماج کے بیچ تھا[۲۳]۔

مشہور روسی نژاد وجودی مفکر Nicolos Berdyaev نے اپنی کتاب Solitude and Society میں فرد کی ذات اور سماج کے مابین چار مختلف قسم کے رشتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی قسم کا رشتہ تو وہ ہے جس کے تحت فرد پورے طور پر سماجی جانور رہتا ہے، اس میں اور سماجی ماحول میں پوری ہم آہنگی ہوتی ہے اور وہ اپنی ذات اور تنہائی سے مکمل طور پر بے خبر رہتا ہے۔ ایسی صورت حال انتہائی درجہ کی خارجیت اور سماجیت سے عبارت ہوتی ہے اور اس صورت حال سے مطمئن افراد مشترکہ روایات سے پوری طرح مطمئن رہتے ہیں۔ فرد اور سماج کے آپسی رشتے کی دوسری سطح وہ ہوتی ہے جب فرد کی ذات کو تنہائی کا احساس تو نہیں ہوتا لیکن وہ سماج سے غیر متعلق (Indifferent) سا رہتا ہے۔ عام طور پر ایک مستحکم سماج میں ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فرد اور سماج کے درمیان تیسرے قسم کے رشتے میں فرد نہ صرف اپنی تنہائی سے باخبر رہتا ہے بلکہ وہ اپنے لئے سماج میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا۔ اس قسم کے رشتے کے تحت فرد اور سماج میں یا تو بہت ہی کم ہم آہنگی ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ سماج اور فرد کے مابین رشتے کی چوتھی سطح وہ ہے جب فرد کو اپنی تنہائی کا بھی احساس ہوتا ہے اور سماج کی ضروریات کا بھی۔ بردیف کے نزدیک ایسے رشتے کی واضح مثالیں مذہبی پیغمبروں کے یہاں ملتی ہیں اور کبھی کبھی اس کی جھلکیاں سماج زندگی سائنس اور فن میں بھی مل جاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ واضح طور پر نئی زمانہ نئے شاعر اور سماج کے درمیان تیسری قسم کا رشتہ پایا جاتا ہے۔ نیا شاعر آج خود میں اور موجودہ سماج میں نہ تو کوئی ہم آہنگی محسوس کرتا ہے اور نہ ہی وہ سماج سے اپنی مجروح ذات کی شناخت کر پاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بعض حضرات یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ نیا شاعر بھی دوسروں کی طرح سماج میں رہتا ہے، سماج میں ہی وہ اپنی روزی کماتا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ معترضین اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ دراصل:

افراد کی حیثیت سے ہماری نجی، اور شہریوں کی حیثیت سے ہماری سماجی زندگی، دو مختلف چیزیں ہیں۔ شہری کی حیثیت سے ہم (برگشتہ اور غیر مطمئن ہونے کے باوجود) ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں: ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں، حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہیں، قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور جنگ کی صورت میں اپنی جانیں تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں[۲۲]۔

نیا شاعر بھی شہری کی حیثیت سے یہ سارے فرائض ایک مشین کی طرح انجام دیتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ پر ہمہ وقت ایک عجیب و غریب قسم کی نفسیاتی اجنبیت کا احساس چھایا رہتا ہے۔ اسی نفسیاتی اجنبیت نے نئے شاعر کو ایک برگشتہ (Alienated) شخصیت کا مالک بنا دیا ہے چنانچہ میرے نزدیک نئی شاعری کی جو اہم اور مرکزی خصوصیات ہیں اور جن کے لئے ہم بحیثیت مجموعی "جدیدیت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اس کی (جدیدیت کی) پہلی اہم خصوصیت فطری طور پر برگشتگی ہے۔ برگشتہ شخصیت کے مالک اس نئے شاعر کی ایک علامتی اور حقائق پر مبنی تصویر ملاحظہ ہو:

وحشی لفظوں کے جنگل میں
وہ اک ڈرا ہوا سا حرف ہے
چادر اور اس کے خون میں لت پت
اور بدن زخموں کا گھر ہے
کہاں سدھارے؟ رستے گم ہیں
کسے پکارے؟ اندھیارا ہے۔
ہر جانب آوازاگی ہے
ہر ٹہنی پر میلی آنکھیں
کالے موٹے لب لٹکے ہیں
سر پر تاروں کا چھتا ہے

(وزیر آغا: شاعر)

ظاہر ہے کہ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں جب دوسرے انسانوں کی طرح شاعر بھی خود فریبی اور جھوٹے بہلاووں کے سہارے زندہ رہ لیا کرتا تھا، جب وہ کچھ

---

[۲۲] Eric Fromm: The Sane Society P.40.

[۲۳] بعض سینیر شاعر اور ادیب آج بھی یہ کہتے ہیں کہ ہمیں سماج سے لڑنا چاہئے اور ان برائیوں کو دور کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ان حضرات کی زندگی اور مصروفیتوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان لمبی باتوں کا صداقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ لوگ خود گردن گردن تک ان آلودگیوں میں ڈوب چکے ہیں اور ان لوگوں سے مکمل سمجھوتہ کر لیا ہے جن کے مظالم اور کالے کرتوت کے خلاف وہ لکھتے اور بولتے رہے ہیں۔

نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے قلم کو تیغ براں اور خود کو اقلیم سخن کا تاج دار سمجھتا تھا اور خوش رہتا تھا۔ سماجی اور نفسیاتی علوم کی ترقیوں نیز سائنس اور اس کے متعلقات کی وسعتوں اور ان کے نتائج سے واقفیت نے نئے انسان اور نئے شاعر کو عرفان و آگہی کی ایک نئی منزل پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ اب اس میں اپنے آپ کو دھوکا دینے یا خیالی کھلونوں سے دل بہلانے کی نہ تو جرأت ہے اور نہ سکت ہے۔ وہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کے سامنے تمام راستے گم ہیں اور اس کے چاروں طرف قابل نفرت حالات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ صورت حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ آج نیا شاعر کسی خاص فلسفۂ حیات یا کسی خاص سیاسی نظریہ کے دامن میں پناہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ وہ نظریے جنھیں پیشرو شعری نسل نے خود پر مسلط کر لیا تھا آج بجائے خود مسخ کر دیے گئے ہیں اور بہتر سے بہتر نظریے نیز فلسفہ ہائے حیات کی چادر کے نیچے بدتر سے بدتر مقاصد کے حصول کی کوششیں کی جا رہی ہے۔ نئے شاعر نے ان نظریوں اور فلسفوں کے (بظاہر) ماننے والوں کو بھی آزما کر دیکھ لیا ہے اور ان کا بھرم بھی کھل چکا ہے۔

میں اک ایسا سرکش ہوں
جو اکثر رنگ برنگے لہراتے پرچم والے باغی سے الجھ چکا ہے۔
ان کے لہراتے پرچم کے نیچے
میں نے اکثر نئے جوان سرکش کا خون دیکھا ہے
کئی بار ان کی جنت میں جا کر مجھ کو یہ محسوس ہوا
یہ سارے عیار مدبر
انسان کے اصلی دشمن ہیں

(باقر مہدی: اپنی نظموں کے صحرا میں)

یہ برگشتگی نہ صرف نئی شاعری کے موضوع و مواد میں ملتی ہے بلکہ یہ ہیئت پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے طویل نظموں کا کم و بیش خاتمہ، مختصر نظم کی مقبولیت، اور غزل گوئی کا زبردست احیا اور ترقی اسی ذہنی برگشتگی کے نتائج ہیں۔

اب مواد کے اعتبار سے بھی چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ غزلوں اور نظموں کے ان اقتباسات میں ہمیں وہ تمام درد و کرب اور درد و کرب کے مختلف روپ مل جاتے ہیں جن سے برگشتہ شخصیتیں یا اذہان دوچار ہوا کرتے ہیں۔

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

(شکیب جلالی)

دل اپنی آرزو کے گھروندے میں ہے اسیر
رستے تمام بند ہوئے ہیں غریب پر

نہ چھوڑتا ہوں سفینہ نہ چھوڑ سکتا ہوں
ہوا نے باندھ دیا جیسے بادباں سے مجھے

(شہزاد احمد)

مگر یہاں کی بستیوں میں کون ہے؟
جو آس کی ٹھکیا لئے سپاٹ، سرد ریت پر کھڑا ہے...
کوئی نہیں
کوئی نہیں...
تو کیوں نہ ان بجھی دشاؤں کو سمیٹ لیں
تو کیوں نہ اور سو رہیں

(احمد ہمیش: میں سو گیا)

وہ سرکس کا گھوڑا
پریشان شہروں میں کرتب دکھاتا
تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتا
تحیر ہنسی قہقہوں تالیوں کی فضاؤں میں برسوں چھلانگیں لگاتا
اسی گاؤں کے ایک میلے میں پہنچا
خریدا گیا تھا جہاں سے وہ بچپن میں۔ لیکن وہاں اب؟
وہاں کون تھا؟ اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔

(بلراج کومل: سرکس کا گھوڑا)

میں اپنے خول کے اندر سمٹ کر بیٹھ رہنا چاہتا ہوں
مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر جھانکنے کی بھی ضرورت کچھ نہیں ہے

(شمس الرحمن فاروقی: بیت عنکبوت)

کھلا یہ بھید کہ تنہائیاں ہی قسمت ہیں
اک عمر دیکھ لیا محفلیں سجا کر بھی

(ریاض مجید)

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا

(سلطان اختر)

سکوں ریت کا اک ذرہ ہے
جو ریت نے کھا لیا ہے
اسے ڈھونڈنے کی نہ کوشش کرو
اونٹ پر اپنی تنہائیاں لاد کر
پابرہنہ دہکتے ہوئے رہ گذاروں میں بھٹکا کرو
اور سرابوں کو دیکھو تو آنکھیں چرا لو
کہ سب ریت ہی ریت ہے
ریت ہی ریت ہے
ریت ہے، ریت!

(محمد علوی: ریت)

تہذیب کو تلاش نہ کر شہر شہر میں
تہذیب کھنڈروں میں ہے کچھ پتھروں میں ہے

(افضل منہاس)

یہ ممکن ہے ایسا ہی ہو، پر مرا ذہن اس کو نہیں مانتا

یہ کتابوں کی باتیں تو کاغذ کی پڑیوں میں
لپٹا کے پھینکو تو اچھا ہے
ان کا حقیقت سے کیا واسطہ ہے

(نثار ناسک: بے ڈھنگ لمحہ)

ان گنت نظموں اور غزلوں سے یہ چند اقتباسات نئی شاعری میں برگشتگی کے عنصر سے کچھ مختلف زاویوں کے سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہاں یہ موقع اور ضرورت تو نہیں ہے کہ مندرجہ بالا ہر اقتباس پر انفرادی طور سے بحث کی جائے، لیکن جہاں تک ان اقتباسات کے موضوع و مواد کا تعلق ہے ہم بحیثیت مجموعی کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار کے پیچھے ایک ایسی روح اور ایک ایسا ذہن ہے جو اپنے آس پاس کے ماحول کی گندگیوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان سے پوری طرح بیزار ہے۔ اس ذہن کو یہ بھی احساس ہے کہ موجودہ زندگی نہ صرف بے رس ہے بلکہ پوری طرح کھوکھلی ہو چکی ہے۔

لوگ اعمال سے زیادہ سستی اور کھوکھلی نیز صرف لمحاتی شہرتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ انسان چلتے پھرتے سایوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، اور ان بظاہر ہر سانس لیتے ہوئے زندہ سایوں کا بڑا المیہ یہ ہے کہ انھیں موجودہ صورت حال اور اپنے زوال سے آگہی نہیں۔ بے شمار انسانوں کے ہجوم میں آدمی صرف اپنے پیروں کی طرف دیکھتا ہے اسے کسی دوسرے کی خبر نہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی دائرے میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس دائرہ کو توڑ کر باہر نکلنے کی نہ تو انسانوں میں ہمت ہے نہ خواہش۔ کسی بھی طرح کا مذہبی یا اخلاقی نظام کسی کے دکھ درد کا مداوا نہیں۔ چاروں طرف جھوٹی عزت کی طلب دشنام طرازی اور ہر طرح کی بدعنوانی کا بازار گرم ہے۔! افواہیں ہماری زندگی کا اہم جزو بن گئی ہیں۔

ساری دنیا آج ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جہاں ہر شے کا وجود خرید و فروخت اور نفع و ضرر کی ترازو میں ملتا ہے۔ چنانچہ یہ نیا شاعر اس پورے ہنگامے میں کسی بھی طرف سے فریق بننا نہیں چاہتا، کیوں کہ ان حالات میں فریق بننے کا مطلب کچھ برے آدمیوں کا ساتھ دے کر کچھ دوسرے برے آدمیوں کے خلاف بکنے جھکنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہاں ایک اور نکتے کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ ان دنوں کئی لوگ نئے شاعر کی اس برگشتہ خاطری کو فراریت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ یہ رجحان یا تو ان حضرات کی معصومیت کا نتیجہ ہے یا شرارت کا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ برگشتگی اور بے تعلقی فراریت نہیں۔ فراریت (Escapism) دراصل اسی ذہنی اور عملی صورت حال کا نام ہے جب شاعر، ادیب اور دوسرے تخلیقی فن کار عصری زوال آمادگی اور زوال پذیری سے نہ صرف خود مطمئن ہوں بلکہ ان زوال آمادہ عناصر کی تعریف و توصیف بھی کریں اور انھیں بہتر گردانیں۔

نئے شاعروں کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ ان کی ہر برگشتہ تخلیق دراصل سماج اور اس کی کثافتوں کے خلاف ایک انٹلکچوئل احتجاج ہے۔ اس اجتماعی رجحان اور ذہنی بے اطمینانی و نا آسودگی نے نئے شاعر کے خیالات و احساسات کا رخ اس کی اپنی شخصیت کی طرف موڑ دیا ہے اب وہ مطلق اور افلاطونی تصورات کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرنے کے بجائے اپنی ذات اور اس کے متعلقات کی مرکزیت اور اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اسی ذات کے کونوں کھدروں میں حقائق کی جستجو کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں دکھ زیادہ ہیں اور آرام کم۔

سیاحت ذات پر خطر ہے
ردائے شب دور تک سمندر
لہو کی موجوں کی رہ گذر ہے

(شاذ تمکنت: سفر)

اس طرح، نئی شاعری اور اس سے متعلق جدیدیت کی دوسری اہم خصوصیت انکشاف ذات ٹھہری ہے۔ جدیدیت کی طرح انکشاف ذات کی اصطلاح بھی خاصے الجھاووں کا شکار رہی ہے۔ بیشتر لوگ انکشاف ذات کا تعلق شاعر کی محض نجی اور داخلی زندگی تک محدود کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انکشاف ذات والی شاعری LSD کے نشے میں چور ایک ایسے ذہن کی شاعری ہے جسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ بعض دوسرے لوگ انکشاف ذات کو کوئی ایسا نسخہ سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ نیا شاعر ابلاغ کو مکمل طور پر ختم کر کے قارئین کو الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کچھ اور لوگ انکشاف ذات کو ایک ایسا ادارہ سمجھتے ہیں جس نے "نئے اور مفید خیالات کا پورا انتظام جو ۱۹۳۶ کے جدید ادیبوں اور حالی و آزاد کے یہاں ملتا ہے" درہم برہم کر دیا ہے۔

نئی شاعری کے سلسلے میں انکشاف ذات ایک پہلو دار اصطلاح ہے۔ پہلی سطح پر اس کا تعلق یقیناً شاعر کی نجی اور ذاتی زندگی سے ہے۔ نئے شاعروں کے پیش رو شعرا (خواہ وہ عوامی شاعر ہی کیوں نہ ہوں) اپنے اور عام انسانوں کے بیچ ایک طرح کا یوٹوپیائی فاصلہ رکھتے تھے۔ وہ ذات (وسیع معنیٰ میں) کا اظہار کر کے اپنا پبلک امیج بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی زندگی میں کام کاج، محبت، نفرت، کامیابی، ناکامی، غرضیکہ ہر چیز کا ایک الگ معیار ہوا کرتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے تھے جس سے عوامی بھلائی کا تاثر پیدا ہو سکے اور شاعر کی شخصیت عوام کی نظروں میں زیادہ قابل قدر اور قابل احترام بن سکے۔ نیا شاعر، میں ایک بار پھر یہی کہوں گا، ایک ایمان دار اور بے باک ذہن کا مالک ہے۔ جب وہ اپنی شاعری میں تمام اس نفسیاتی بحران کو بھر دیتا ہے جس سے آج وہ دوچار ہے تو وہ اپنی شخصیت پر جعلی شرافت اور نقلی تہذیب کا پلاسٹر چڑھانے کے بجائے اپنی بھلی بری اصلی شخصیت کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اس طرح نئی شاعری میں نہ صرف شاعر کی ذات کے آسودہ، نا آسودہ، اور نیم آسودہ پہلو مل جاتے ہیں بلکہ اس شاعری میں شاعر کی انفرادیت، ذات کی پوشیدہ کیفیتوں، مجروح تمناؤں، کامیاب و ناکام محبتوں نفسیاتی محرومیوں اور الجھنوں کا اظہار بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری نئی تہذیب نے جن بے اعتدالیوں اور بے راہ رویوں کو انسانی زندگی کا جزو لاینفک بنا دیا ہے، ان کا ذکر بھی انکشاف ذات والی شاعری میں ملتا ہے۔ انکشاف ذات کے اس مخصوص پہلو کی مختلف سطحوں کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

ہم نے لفظوں سے گوشت اور لباس کے بھیک نہیں مانگی ہم چاہتے تو

لفظوں کو جوڑ کر پل بنا سکتے تھے، لیکن ہم نے پل نہیں بنایا
کیوں کہ آج تک پلوں نے سوائے پار اتارنے کے کیا کیا ہے؟

(احمد ہمیش: تجدید نمبر ۶)

یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرہ
میں اپنے دشت سے گذرا تو بھید پائے بہت

(شکیب جلالی)

صرف حشمت کی طلب جاہ کی خواہش پائی
دل کو بے داغ سمجھتے تھے جذامی نکلا

(ساقی فاروقی)

جیب خالی ہے
زبان گنگ ہے
دل پتھر ہے
اور آنکھوں کے پیالوں میں ہیں دو لوہے کی گیندیں چسپاں
میں جو منظر احساس سے کورانہ گذر جاؤں تو کیا میرا قصور!

(ساجدہ زیدی)

پتھر کا وہ مکاں کہ مجھے جس پہ ناز تھا
شبنم کی ایک بوند گری اور بہ گیا

(وزیر آغا)

یہ کس طرح کی محبت تھی کیسا رشتہ تھا
کہ ہجر نے رلایا اسے نہ تڑپا میں

امید وصل کے دن کٹ گئے بھٹکنے میں
نہ ہوٹلوں پہ یقین تھا، نہ گھر گئے ہم تم

(انور شعور)

میرا کتا جب مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے
سوچتا ہوں میرے بارے میں نہ جانے کیا یہ کتا سوچتا ہو
کیا خبر کس لاشعوری موج میں میں نے اک چاقو چھپا کر رکھ لیا ہو
غالباً ہر مسئلے پر میرے کتے کی بھی کوئی رائے ہے
جس سے میں واقف نہیں ہوں
اور اگر وہ رائے میری رائے سے بہتر ہوئی تو!

(بمل کرشن اشک: غم اپنا بھی اور سب کا بھی)

وہ جو رات مجھ کو بڑے ادب سے سلام کر کے چلا گیا
اسے کیا خبر مرے دل میں بھی کبھی آرزوئے گناہ تھی

(احمد مشتاق)

جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا ہوں
تو شاہ شرما سکڑتا جا رہا ہوں
کل
زمیں سے آسماں تک میں ہی تھا
آج
اک چھوٹا سا کرہ رہ گیا ہوں

(ندا فاضلی: سفر سفار)

محبتیں خوب ہیں خوش وقتی غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

(کشور ناہید)

نئی شاعری میں انکشاف ذات کی ایک اور سطح وہ ہے جہاں شاعر اپنی نجی اور داخلی شخصیت سے ہٹ کر سماجی اور ثقافتی تجربوں میں اپنی ذات کو دریافت کرتا ہے۔ نئے شاعر پر آئے دن سماج دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ نیا شاعر سماج اور ہم عصر زندگی سے واقعی بے تعلق ہے (اس سلسلے میں اوپر بحث کی جا چکی ہے) بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نیا شاعر سماج کو اس مخصوص عینک سے کیوں نہیں دیکھتا جو عینک اس کے پیشرو استعمال کیا کرتے تھے اور یہ کہ نیا شاعر معاشرے کو اس کی موجودہ شکل میں بخوشی قبول کر کے اس کی قصیدہ خوانی کیوں نہیں کرتا؟

نیا شاعر ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اپنی شاعری کو ارباب اقتدار کی قصیدہ خوانی اور دنیاوی جاہ و جلال کے لئے استعمال کرنے کا قائل نہیں ؎۵۔ وہ حکومت اور سماج کے مقابلے میں فرد کی مرکزیت اور اس کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ وہ مخصوص سیاسی نظریوں کی غلامہ قبول کرنے کے بجائے اگر کوئی نظریہ رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے تو وہ ہے انسان ؎ دوستی اور انسان پرستی کا نظریہ۔ یہی وجہ ہے کہ نیا شاعر ایک طرف تو امریکی حکومت سے اس کی ویت نام اور دوسری فاشسٹ پالیسیوں کے سبب سخت نفرت کرتا ہے تو دوسری طرف اسے ان امریکی شہریوں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے محبت بھی ہے جو امریکی حکومت کی انسان دشمن پالیسیوں کے خلاف تحریری، تقریری اور عملی طور پر احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ نئے شاعر کو ان امریکی سپاہیوں سے بھی ہمدردی ہے جنھیں ان کی مرضی کے خلاف جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے اور جنھیں دشمن فوجیوں کے ساتھ ساتھ معصوم بچوں بے گناہ عورتوں اور

؎۵ اس وقت میرے ذہن میں دو ایک ایسے بھی نئے شاعر ہیں جو بہت ہی معمولی فائدے یا بہت ہی غیر اہم امداد کی خاطر ایسے حضرات کی تعریف یا تنقیص کرتے ہیں جو اس کے اہل نہیں۔ یہ رویہ انفرادی طور پر نہ تو ان شاعروں کے لئے سود مند ہو سکتا ہے نہ تو نئی شاعری کے لئے۔ اگر چہ کہ ذاتی طور پر میں کسی ایسے رویے کو کسی ادیب یا شاعر کے فن سے متعلق نہیں کرتا یا سمجھتا، لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ مکمل ذہنی آزادی کے بغیر یا شاعر بہتر چیزیں تخلیق نہیں کر سکتا۔ نئے شاعر کو بہر قیمت ذہنی آزادی برقرار رکھنی ہے اور اس کے لئے اسے لڑنا چاہئے۔ ایسی لڑائی سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم کسی ایک شکنجے سے تو آزاد ہو جائیں لیکن دوسرے اتنے ہی خطرناک یا اس سے زیادہ خطرناک شکنجے کی گود میں پناہ لیں۔

کمزور بوڑھوں کے قتل پر مجبور کیا جاتا ہے۔

اسی طرح، نیا شاعر چیکوسلواکیہ پر روس کے جابرانہ حملہ کی مذمت کرتا ہے اور خود کو ان روسی شاعروں اور دانشوروں کا ہم نوا پاتا ہے، جنھوں نے ہر قسم کی دھمکی اور مصیبت کی پروا کئے بغیر کھلے طور پر حکومت روس کی مذمت کی ہے۔ مگر ہمارے یہاں نسبتاً عمر رسیدہ شعرا و ادبا کی بڑی تعداد نہایت ہی مشینی انداز میں دو مختلف خانوں میں بٹ گئی ہے۔ مشروط وفاداریاں انھیں ایک وقت میں صرف کسی ایک ہی فریق کی مذمت کی اجازت دیتی ہیں اس لئے کہ ایسا کرتے ہوئے ان حضرات کے ذہنوں میں ہمیشہ حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں رہتی ہیں نہ کہ وہ بے بس اور مجبور عوام جو دائیں اور بائیں بازو کی سیاست کا شکار ہوئے ہیں۔

نیا شاعر مظلومین کو (خواہ وہ احمد آباد کے ہوں یا چیکوسلواکیہ کے یا ویت نام کے) افراد کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ وہ اس قسم کے جارحانہ واقعات کو کسی ایک مخصوص طبقہ یا جماعت کا نہیں بلکہ "انسان" کا نقصان سمجھتا ہے۔[۶]

وہ مظلومین کو نہ صرف افراد کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ بلکہ ہر مظلوم فرد کو اپنی ذات سے شناخت (identify) کرتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک چھوٹی نظم پیش کرنا چاہتا ہوں جو کسی مخصوص واقعے کے پس منظر تو نہیں لکھی گئی لیکن جس میں شاعر نے اپنی ذات کو عام مظلومین اور مصیبت زدگان سے شناخت کرنے کا عمل بڑی کامیابی سے برتا ہے اور جو نئے شاعر کی انسان دوستی اور انسان پرستی کا ثبوت ہے:

دکھے ہوئے دل ہیں میرا مذہب مرا عقیدہ
دکھے ہوئے دل
مرا حرم ہیں مرے کلیسا مرے شوالے
دکھے ہوئے دل
چراغ میرے گلاب میرے
دکھے ہوئے دل کہ روشنی بھی ہیں اور خوشبو بھی زندگی کی
دکھے ہوئے دل کہ زندگی کا عظیم سچ ہیں
دکھے ہوئے دل جہاں کہیں ہیں
دکھے ہوئے دل مرا ہی دل ہیں
دکھے دلوں کو سلام میرا

(عبید اللہ علیم: دکھے ہوئے دل)

اب تک نئے شاعر اور نئی شاعری کے بارے میں اوپر جو باتیں کی گئی ہیں ان سے قارئین کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ نئی شاعری کا رخ اب بجائے اجتماع کے، افراد کی جانب ہے۔ نیا شاعر بھیڑ میں گم ہو جانے پر تنہا رہنے اور اپنی ذات میں گم شدگی کے عمل کو فوقیت دیتا ہے۔ چونکہ گم شدگی اور تنہائی کا جنس (Sex) سے گہرا تعلق ہوا کرتا ہے اس لئے جنسی حقیقت نگاری جدیدیت کی تیسری اہم خصوصیت بن گئی ہے۔ جس طرح آج نئے شاعروں کے متعلق مختلف کونوں سے سماج دشمنی اور تنہائی پسندی وغیرہ جیسے "الزامات" لگائے جا رہے ہیں، اسی طرح انھیں جنس زدہ کہہ کر بھی مطعون کیا جا رہا ہے۔ اور تو اور اختر الایمان جیسے شاعر (جو خود بڑی حد تک سماجی سطح پر کم و بیش ایسے ہی حالات سے گذر چکے ہیں جن سے آج نئے شاعر دوچار ہیں) بھی اس سلسلہ میں نئے شاعروں سے کافی ناراض و نالاں نظر آتے ہیں:

سخنوروں پہ رودیں جن کے سامنے اس وقت
تمام مسئلے بیجا نہیں سوا اس کے
جو چائے خانوں سے چھوٹیں تو بھوکی آنکھوں سے
زنانِ شہر کے پستان ناپیں یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیرِ ناف بال گنیں

(اختر الایمان: میری آواز)

قطع نظر اس بحث کے کہ زنانِ شہر کے پستان ناپنا یا زیر ناف بال گننا ہم عصر معاشرہ کے بیش تر سفید پوش حضرات کے اعمال ہائے مبارک سے بہتر فعل ہے یا بدتر، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ جنسی حقیقت نگاری بھی دراصل مردہ روایات اور بے مصرف احساساتی اور تجرباتی ڈھانچوں کے خلاف نئے شاعروں کے اجتماعی رویہ کا ایک حصہ ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، جنس اردو شاعری میں ایک شجر ممنوعہ کی سی چیز رہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہونے کے باوجود ہمارے سماج کا ڈھانچہ ایسا نہیں تھا کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے یکساں سطح پر مل سکیں۔ سماج میں عموماً عورتیں بیوی ہوتی تھیں یا لونڈی یا طوائف۔ دوست اور محبوب والی حیثیت عورتوں کو بہت بعد میں ملی۔ اوائل بیسویں صدی سے اور خصوصاً آزادی کے بعد سے عورتوں کے حیثیت میں تو تبدیلی آئی ہی لیکن عورتوں اور مردوں کے آپسی تعلقات کی نوعیت میں بھی مختلف سطحوں پر خاصا فرق پڑا ہے۔ ایک طرف اگر علم نفسیات نے جنس کے تعلق سے مختلف انکشافات کئے اور جنسی تعلقات کو از سر نو سمجھنے میں ہماری مدد کی تو دوسری طرف علم حیاتیات نے جنس کے "لولو پن" کو خاصی حد تک کم کر دیا ہے چنانچہ "جنس کی رو جس تلخ دھمک کے ساتھ آج ہمارے ادب میں دائر ہے وہ کسی لذتی جذبے کی پیداوار نہیں بلکہ ایک پیچیدہ اور روحانی مسئلہ ہے۔ جنس آج اتنا ہی سنجیدہ اور مقدس موضوع ہے جتنا جلال الدین رومی کے عہد میں تصوف تھا۔ آج جنس ایک زندہ تلخ روحانی تجربہ بنی ہوئی ہے۔ اس سے آج کے ادیب کو مفر نہیں ہے۔[۷]

یہ صحیح ہے کہ ابھی نئی شاعری میں جنسی علائم اور استعاروں کے سلسلہ اس فنی چابک دستی کے نمونے بکثرت تو نہیں ملتے جس کی ایک مثال Donald hall کے یہ مصرعے ہیں:

۶۔ حالیہ فسادات کے پس منظر میں قاضی سلیم، بلراج کومل، عادل منصوری، شہریار، محمد علوی، عمیق حنفی، شمس الرحمن فاروقی اور مرزا عزیز جاوید وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ عصری واقعات کے تعلق سے نئے شاعروں کے رد عمل اور رویہ کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ سینئیر شعرا میں سلیمان اریب کی نظم گھر سے تا گھر کی حال ہے۔ ادھر سلیمان اریب کے یہاں جو شعری انحراف آیا ہے اس کی جھلک اس نظم میں بھی موجود ہے۔

۷۔ انتظار حسین: روایت اور تجربہ (فتح محمد ملک کے مضمون "شاعری نا شاعری" سے نقل کیا گیا)۔

I crouched by the wall ten years
Untill the circle of a woman's
darkness
Moved over mine like a mouth.

اور نہ ہی نئی شاعری میں ایسی وافر مثالیں ملتی ہیں، جن میں Miss Owen ایسی بے باکی مل سکے، مثلاً:

Will you believe some-
one who said he
fuck't
Pallas Athena
7 times

تاہم نئی شاعری میں ایسی کافی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں جنس کا استعمال تخلیقی انداز میں ہوا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ نئے شاعروں نے جنسی حقیقت نگاری کو مرد اور عوت کے جسمانی تعلق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ جنسی روابط اور جنسی دباؤ (Sexual stress) سے وابستہ کیفیات کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ مزید یہ نئے شاعروں نے جنس کو بطور استعارہ، سماجی اور ثقافتی تنقید کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جنس کے تعلق سے وہ ذہنی آوارگیاں اور جسمانی محرومیاں جو دراصل جدید تہذیب کے تحفے ہیں نئی شاعری کا موضوع بنی ہیں:

جب تک شہوت اور عقیدت زندہ ہے
ٹیکسیوں رکشوں اور بسوں کی مانگ بڑھے گی
اور ہمیں تنگ آ کر پیدل چلنا ہوگا

(عباس اطہر)

رگوں میں ناچ رہا ہے اک آتشیں زہراب
تری تلاش فقط جسم کا تقاضا ہے
تری طلب کے جہنم میں جل رہا ہے بدن
لہو پکارتا ہے۔ کیا سنا نہیں تو نے
کہ میں نے روح کی دیوار ہی گرا دی ہے

(ساقی فاروقی: دیوار)

نازک بدن، بدن کے افق پر پڑے بھنور
دونیم وا گلاب کھلے ایک ڈال پر
دیوی ہے تو نہ مجھ میں ہیں پیغمبروں کے وصف
مت سٹ پٹا کے اٹھ مرے عرض سوال پر

(ناصر شہزاد)

لیکن جو ٹھیک پوچھو
یارو تو آسماں پر
کوئی خدا نہیں ہے
تیرا خدا جدا ہے
میرا خدا جدا ہے
میرے لئے تو یارو
لڑکی کا خوب صورت
ننگا بدن خدا ہے

(زاہد ڈار)

سبھی کچھ ہمارے مقدر میں تھا
عورتیں بھی، شرابیں بھی، عشرت کہیں بھی
مگر جسم مفلوج تھے... اور تخیل
عروج تلذذ کے نقطے پہ مرکوز تھا
اور آنکھیں
چمکتے ہوئے سرخ فانوس کی روشنی پر گڑی تھیں

(فہیم جوزی: نیا شہر)

میں نے جب کپڑے پہن کر بے سبب زلفیں سنواریں
لب سنوارے
چیونٹیاں سی چل رہی تھیں
اور اب تک چیونٹیاں سی چل رہی ہیں
آج جب میں ورد کی دعوت میں شامل ہو رہی ہوں
کس لئے اس بے ضروری سرخ ٹیریلین کی ساری سے
اپنا جسم ڈھانپوں
کل جو اس نے پیش کی تھی
راج! وہ شلوار دینا
جس پہ پرسوں رات سکھ کے ظلم کا پیارا نشاں تھا
اب جو مدھم پڑ گیا ہے

(بمل کرشن اشک: ایک نظم)

جنس کے تعلق سے نئے شاعروں کے رویئے کے چند پہلو ان مثالوں کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔ میرے خیال میں ان مثالوں میں کہیں جنسی گھٹن اور جنس زدگی جیسے عناصر نہیں ملتے جس کے لئے شاعروں کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ نہ ان میں محض پرورژن (Perversion) کی وہ خصوصیت ہے جس کی مثال ہمیں میراجی کے یہاں ملتی ہے۔ یوں تو جنس کے ابھی اور بھی کئی پہلو جن کی طرف نئے شاعروں کو توجہ کرنی چاہئے، اور ایک جنس پر ہی کیا موقوف ہماری پوری زندگی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ ابھی حال ہی میں قاضی سلیم نے لاولدیت کے موضوع پر ایک بہت ہی عمدہ نظم لکھی ہے اس نظم میں ایک بے اولاد شخص کی زندگی کا سارا درد و کرب جمع کر دیا گیا ہے اور جس طرح ایک بالکل ہی نئی زمین کو توڑا گیا ہے وہ نئی شاعری کے لئے خوش آئند بات ہے۔ اس نظم کے

آخری چند مصرعے دیکھئے:

نیند سے نکلو
...مگر کون ہے
دہری آواز
بائیں پسلی سے بھلا کیوں ابھری
کاٹ کر دانتوں سے انگلی دیکھیں
زخم کی کوکھ میں تو میری شباہت ہوگی (قاضی سلیم)

بالکل اسی طرح، حاملہ بیوی کا پھیلتا ہوا پیٹ بھی نظم کا موضوع بن سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی شاعری کی ترقی اور وسعت کا دارومدار ہیئت اور اسلوب سے زیادہ موضوع کے انوکھے پن اور ندرت پر ہوگا۔ نئے شاعروں نے اردو شاعری کے لئے قابل قدر کام کیا ہے۔ لیکن انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میں یہاں کسی خاص شاعر یا دو ایک شاعر کو Single out کرنا نہیں چاہوں گا، لیکن سبھی نئے شاعروں کو چاہئے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے رک کر دروں بینی (Introspection) سے کام لیں۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس نئے موضوعات کا خزانہ ختم ہو گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں تو بہتر ہے کہ شعر نہ کہیں کیوں کہ دہرانے سے رسائل کے صفحات تو برباد کئے جا سکتے ہیں لیکن شعری ساکھ میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ خیر ان باتوں سے الگ ہٹ کر ایک بار پھر یاد دلا دوں کہ نئی شاعری اور اس کی جدیدیت کی خصوصیتیں ہیں: برگشتگی، انکشاف ذات، اور جنسی حقیقت نگاری۔ کیا اب بھی ان حضرات کو جو وقتاً فوقتاً نئے شاعروں کی فہرست میں اپنا نام ڈال دیتے ہیں اپنے نئے شاعر نہ ہونے کا یقین نہیں آیا؟ ☆☆☆

غزل

فضیل جعفری

شمارہ ۱۹۰،
جنوری ۱۹۹۶

برگشتگی، آشفتہ دلی، دربدری ہم
ہر روز وہی مسئلے، ہر روز وہی ہم

موسم میں وہ شدت تھی چیخ اٹھتے تھے ساغر
پھر بھی نہ ہوئے مجرم پیماں شکنی ہم

پھرتے ہیں سر قریۂ بیدار ضمیری
جھولی میں لئے تہمت شوریدہ سری ہم

یہ نقرئی معجون وہ کشتہ ہے طلائی
خاطر کریں کیا عمر رواں اور تری ہم

کیا گلابی کبوتر جیت گئے؟

فہمیدہ ریاض

شمارہ ۱۹۲،
مارچ ۱۹۹۶

الما آتا کے ہرے بھرے درختوں میں اوائل اگست کی ہوا سرسراتی ہوئی چلتی ہے چھوٹے چھوٹے پتے تالیاں بجاتے ہیں۔

میں اپنی مترجم سے پوچھتی ہوں:

"ان درختوں کا کیا نام ہے؟

وہ مہ جبیں، خوش رو، نازک اندام تاتاری حسینہ مجھے امریکن لہجے میں بولی ہوئی انگریزی میں نرمی سے بتاتی ہے:

"توژی.."

اس کا نام گلناز ہے۔ اتنی خوب صورت، نازک اور پیاری اسے دیکھنا ہی جنت نگاہ ہے۔ اور باتیں کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے ترشے ہوئے سنہری بال ہوا سے اڑ اڑ کر بار بار اس کی بھوری آنکھوں کے سامنے لہرا رہے ہیں۔ وہ اپنے نازک گورے ہاتھ سے انھیں ہٹاتی ہے۔ اس کی طلائی انگشتری کا ننھا سا سفید نگینہ دھوپ میں چمکتا ہے۔

گلناز، الما آتا میں تم سے مل کر مجھے ملا یوسف ضیا کیوں یاد آرہے ہیں؟

ہم قزاخستان میں ہیں، ایک سہ روزہ ادبی میلے میں شرکت کر رہے ہیں، اور یہ ۱۹۹۵ ہے۔ صدی آخری سانسیں لے رہی ہے۔

گلناز مجھ سے گھل مل گئی۔ ستائیس برس کی حسینہ، وہ بیاہتا ہے۔ اس کی ایک پانچ سال کی بیٹی ہے۔ ہینڈ بیگ سے نکال کر وہ مجھے اس کی چھوٹی سی رنگین تصویر دکھاتی ہے۔

"تم دوسرے مترجموں سے بہت بہتر انگریزی بولتی ہو۔ کہاں سے سیکھی؟"

"اسکول میں"، وہ کہتی ہے۔ "میں نے اسپیشل اسکول میں پڑھا ہے۔"

"اگست کے آخر میں"، وہ مجھے بتاتی ہے۔ "میں اسکالرشپ پر امریکہ جاؤں گی، ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن پڑھنے۔"

گلناز قزاخ نہیں ہے، وہ مجھے بتاتی ہے۔ قزاخستان میں کوئی ایک سو قومیتیں رہتی ہیں، روسی، تاتار، آرمنی... سوویت یونین کے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے، صدیوں سے، مختلف قومیتوں کے لوگ آ آ کر اس خطے میں بستے گئے۔"

"قزاخستان کی آزادی کے بعد روسی واپس نہ چلے گئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کچھ لوگ گئے تھے۔" اس نے بتایا۔ "مگر پھر واپس آگئے۔ وہ اب بدل چکے ہیں۔ انھیں روس اپنا یا اچھا نہیں لگا۔ اور روسیوں نے انھیں پسند نہیں کیا وہ قزاخ عادتیں اور رسم و رواج اپنا چکے ہیں۔"

ہوا سرسراتی ہے اور پتے ننھے سے شریر بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں۔

کھلی سڑک پر چلتے چلتے، ایک موڑ کاٹتے ہوئے، اچانک میری نظر دو گلابی... پرندوں پر پڑی جو بڑی تمکنت سے ایک درخت کے تنے اور سرمئی کنکریٹ کے ایک ستون کے درمیان کچی زمین پر چلے جا رہے تھے۔ گلابی پرندے! کیا کوئی یقین کرے گا؟ ارے اس رنگ کے بھی پنچھی ہوتے ہیں؟ میں نے خوشی سے چیخ ماری اور بے ساختہ پوچھا: ان کا نام کیا ہے؟

مگر اس وقت کوئی مترجم ہمارے ساتھ نہ تھا۔ دیکھنے میں وہ ننھے منے

کبوتر معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے دل میں انھیں گلابی کبوتروں ہی کا نام دیا۔ وہ کم سن شہزادوں کی سی شان سے مگی زمین پر رواں...

گلناز ملے گی تو اس سے پوچھوں گی، میں سوچتی ہوں گلناز جس سے مل کر مجھے ملا یوسف ضیائی بہت یاد آئے۔

ملا یوسف ضیائی برسوں پہلے میرے پڑوسی تھے۔

یہ ۷۸۔۱۹۷۷ کی بات ہے۔ وسطی کراچی کے ایک معمولی سے تین کمروں کے مکان میں اپنے دو شیر خوار بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میرے شوہر ایک سندھی کسان انقلابی جماعت کے کل وقتی کارکن تھے۔ سرمایہ داری نظام کا پرزہ نہ بننے کا عزم بالجزم کئے یہ حقیر فقیر پر تقصیر بھی اس کثیر القومی دواساز کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے چکی تھی جہاں سے دو وقت کی روٹی کا آسرا تھا۔ اور اس وقت اپنا رسالہ "آواز" شائع کرنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ ہمارے ننھے منے خاندان کا گذارہ میرے فری لانس کام کرنے اور ٹھیکے پر پرنٹنگ کرانے پر منحصر تھا۔

تب ہی میرے پڑوس کے خالی مکان میں ملا یوسف آ بسے۔ پھر کافی عرصے مجھے ان کی ہمسائگی کا شرف نصیب رہا۔

وہ مشکل زمانہ تھا۔ ملا یوسف کی ہمسائگی نے اسے مشکل تر بنا دیا تھا۔ کراچی میں ہمارا چھوٹا سا گھر عرصے سے اس سندھی انقلابی کسان جماعت کے کارکنوں کا مسکن رہا تھا۔ گاؤں سے کراچی آنے پر وہ وہیں اکٹھا ہوتے۔ وہیں بیٹھ کر پمفلٹ لکھے جاتے اور مستقبل کے پروگرام بنتے۔ پھر ملک کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو گرفتار کر لئے گئے اور ان پر قتل عمد کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔

حالات کے اس اچانک موڑ نے سیاست کا اس طرح رخ پلٹا کہ دوسری چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کی طرح اس سندھی کسان انقلابی جماعت کا بھی شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری اور متوقع سزائے موت نے سندھ کے دیہی عوام کو فردِ واحد کی مانند متحد ہو کر زیرِ عتاب سیاسی جماعت کا حامی بنا دیا تھا۔ اس نئی سیاسی صورت حال میں کسان انقلابی جماعت کی قیادت نئی حکمت عملی بنانے میں ناکام رہی تھی اور کارکنوں کے شدید اختلافات کے باعث معطل ہو گئی تھی۔ اس جماعت کے کارکن سیدھے سادے پرخلوص اور گرم جوش ہاری، اس تحریک کے صدر کی اس منطق کا جواب نہ دے سکتے تھے کہ مارشل لا کو کسی طرح پارٹی کے فائدے میں استعمال کیا جائے۔ ان کے دل عام سندھی لوگوں کی طرح معزول وزیراعظم کی سلامتی کے لئے دھڑک رہے تھے اور کوئی بھی نظریہ ان کے اس فطری ردعمل کو بدل نہیں سکتا تھا۔ میرے گھر میں وہ اب بھی جمع ہوتے، مگر اب ان کی سرگرمیاں اس سخت مارشل لا میں بھٹو صاحب کی جان بچانے پر مرکوز ہو چکی تھیں۔

ملا یوسف اور ان کے خاندان سے میری ملاقات روبرو شاید نہ ہوتی، مگر بی بی جان، ہمارے گھرانوں کے بیچ ایک کڑی بن گئی۔ بی بی جان میرے بچوں کی آیا اور اس گھر کی واحد ملازمہ تھی۔ ایک خوب رو، ادھیڑ پٹھان عورت، جس کا باپ بمبئی میں ٹرک چلایا کرتا تھا، اس کا بچپن بمبئی میں گذرا تھا۔ اس کا شوہر کراچی میں ٹرک چلاتا تھا۔ ایک اچانک حادثے میں اس کی موت کے باعث بی بی جان کو ملازمت ڈھونڈنی پڑی تھی۔ وہ اپنے سہارے جینا چاہتی تھی اور اپنے دو بچوں کی پرورش خود ہی کرنا چاہتی تھی۔

وہ ایک ہنس مکھ اور چلبلی عورت تھی۔ بیوگی نے اس کے فطری الھڑپن کو ذرا سا ہی متاثر کیا تھا۔ بچوں کو نہلانے دھلانے کے بعد، اور گھر میں جمع سوگوار اور سنجیدہ پارٹی کارکنوں کے لئے میری مدد سے دیگچیں بھر کر چائے بنانے کے بعد، وہ محلے کی سیر کو نکل پڑتی۔ پاس پڑوس کی پوری سن گن رکھتی اور سب کے مزے دار قصے مجھے رات گئے تک سناتی رہتی۔

وہ رمضان کا مہینہ تھا جب بی بی جان نے مجھ سے کہا:

"بی گم ساب،" وہ مجھے یہی کہتی تھی، "آپ قسم خدائی پاک کی، ملا یوسف جان کے گھر ایک دن افطار کر کے دیکھو۔ آپ کو کیا بتاؤں، کتنی زیادہ چیزیں ہوتی ہیں اس کے دستر خوان پر۔ اور آپ تو بس پکوڑا بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔"

"کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ مجھے مٹھائیوں اور پھلوں کے نام گنوانے لگی اور اصرار کرنے لگی کہ دوسرے دن میں اس کے ساتھ ملا یوسف ضیائی کے گھر افطار کرنے ضرور چلوں۔ میں ہنسنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ کل ہم اپنے پکوڑوں کی افطاری ملا یوسف کے گھر بھیجیں گے۔ جواب میں وہ ہمیں یقیناً بہت سی چیزیں بھجوادیں گے۔"

"یہ ترکیب ٹھیک ہے۔" بی بی جان نے سر ہلا کر کہا۔ دوسرے دن افطار کے وقت وہ واقعی سینی بھر کر مٹھائیاں، کئی طرح کے حلوے اور پھل ملا یوسف کے گھر سے لے آئی۔ میں پریشان ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا:

"ارے بی بی جان میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔ یہ تو کیوں اٹھا لائی؟ ایسا تھوڑا ہی کرتے ہیں!؟"

"کیوں کیوں بی گم ساب!" بی بی جان نے چہک کر کہا۔ "میں پکوڑا ان کے گھر لے گئی تھی، رکابی بھر کر، رکابی سے ڈھک کر..." پھر وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور افطاری کھانے لگی۔ اس نے ہنس کر مجھ سے کہا:

"کھاؤ کھاؤ بی گم ساب، کون سا ملا یوسف جان کا اپنا مال ہے۔ یہ تو ان کے گھر بھی بہت سے گھروں سے آتی ہے۔" پھر اس نے کہا۔ "ملا یوسف اور اس کی بی بی آپ کو سلام بھیجتے ہیں۔ اس کی بی بی آپ کو بلاتی ہے۔"

حلووں سے بھری قاب کے بوجھ کے نیچے دب کر میں نے کہا:

"کل شام چلیں گے بی بی جان۔"

"اچھا تھا!" وہ خوش ہو گئی اور مجھے محلے کے قصے سنانے لگی۔

"آپ جانتی ہیں بی گم ساب، یہ سامنے والی بی گم ساب کا چکر پچھلی گلی کے بلوچ لڑکے کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ رات کو وہاں جاتا ہے۔ خدائی پاک کی قسم، میں نے خود دیکھا ہے..." اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا دیکھا تو نے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"سب کچھ... خود دیکھا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی میں قہقہہ لگا کر ہنسی۔ مجھے بی بی جان اچھی لگتی تھی۔ تھی بھی بہت دل چسپ عورت۔

"سب کچھ؟" میں نے کہا

"ہاں، سب کچھ!"

پھر میں اور بھی ہنسی۔ میں نے کہا:

"افوہ بی بی جان، تو تم نے کیوں دیکھا؟ یہ تو حرام ہے!"

"ہمیں بی گم ساب۔" وہ ذوق سے سر ہلاتی۔ "دیکھنا حرام نہیں ہے۔"

"تو مکروہ ہوگا۔" میں کہتی، "تمھارا وضو تو ضرور ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"وضو تو نماز سے پہلے میں دوبارہ کرلیتی ہے۔"

پھر وہ قہقہہ لگا کر مجھے کوئی ایسا قصہ سنانے لگی:

"بی گم ساب، بمبئی میں ہم ایک چالی میں رہتے تھے۔ تو اور مچھلی والیاں آتی تھیں۔ ایک دن میں اپنی کھولی کے دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ مچھلی والیوں کے بڑے بڑے لال سبز لہنگے ہوتے تھے اور سر پر بڑی بڑی ٹوکریاں۔ دونوں ہاتھوں سے وہ مچھلیوں کی ٹوکریاں پکڑے رہتی تھیں۔ میں نے اس سے کہا: ایک مچھلی تو مجھے بھی دو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مچھلی تل کر کھاؤں۔ اس نے کہا کہ پانچ روپے کی مچھلی ہے۔ میں نے کہا: پیسے تو میرے پاس نہیں۔ مچھلی والی نے میرا منھ چڑایا اور بولی: پیسے نہیں تو مچھلی بھی نہیں۔ یہ کہہ کر بی گم ساب وہ تو آگے جانے لگی۔ میں نے بی گم ساب اس کے لہنگے کا ازار بند کھینچ لیا۔ خیمے کے خیمے جیسا لہنگا پٹ سے نیچے گرنے لگا۔ اس نے ہنسی سے بے قابو ہو ہو کر یاد کیا۔

"اف! تو نے ایسا کیوں کیا بی بی جان، کسی عورت کے ساتھ!" میں نے دہل کر سر پیٹا۔

"وہ لہنگا پکڑنے لگی اور بی گم ساب مچھلی کی ٹوکری زمین پر!" اس نے ہنستے ہنستے آنکھوں کا پانی صاف کیا۔ آخر میں بھی اس کے ساتھ ہنس پڑی۔ "پھر تو نے مچھلی کھائی؟"

"ام نے مچھلی کھائی... جی ہاں!"

قہقہہ لگاتی بی بی جان عشا کی نماز کے لئے وضو کرنے چلی گئی۔

نہ جانے اس کے باپ دادا کب کابل سے خشک میوے کی بوریاں کمر پر لادے بمبئی پہنچے تھے۔ وہ کسی قافلے میں آئے تھے جس کے لوگ راستے میں کئی جگہ رہ گئے تھے۔ بی بی جان کا دادا بمبئی پہنچا تھا۔ بی بی جان وہیں پیدا ہوئی تھی بچپن میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ ٹرک میں سورت تک سفر کیا تھا۔ اسی لئے وہ سیلانی ہوگئی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ کراچی میں بس گئے تھے۔ مگر ستر اسی برس پرانی رشتہ داریاں ان لوگوں سے بھی تھیں جو علاقہ غیر میں رہ گئے تھے اور پھر وہیں بس گئے تھے۔ وہ لوگ افغانستان اور پاکستان کے درمیان میں واقع اس آزاد قبائلی علاقے سے پاکستان آتے رہتے اور اگر انھیں یہاں روزگار مل جاتا تو ایک آدھ برس میں پاکستانی بن جاتے اور یہاں کے طور طریقے اپنا لیتے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو، بی بی جان نے مجھے بتایا تھا، "پاکستانی فوج میں بھرتی بھی ہو جاتے ہیں۔"

دوسرے دن شام کو میں نے بی بی جان کے ساتھ ملا یوسف ضیائی کے گھر پر دستک دی۔ ملا یوسف افطاری کے دسترخوان پر اپنی سات آٹھ برس کی بچی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی بیوی باورچی خانے میں کباب تل رہی تھیں۔ ملا یوسف نے خوش خلقی سے کھڑے ہو کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

گورے چٹے، بلند قد اور فربہ ملا یوسف اپنی کھچڑی سیاہ داڑھی سمیت، ایک خوش گوار شخصیت تھے۔ ہنس مکھ اور مہمان نواز۔ وہ گرم جوشی سے ہماری خاطر تواضع کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پڑوس کی مسجد میں امام مقرر ہو گئے ہیں۔ وہ فصیح و بلیغ اردو میں لچھے دار باتیں کر رہے تھے۔ ان کا انداز کسی سحر طراز داستان گو کا سا تھا۔ میں بھی ان سے فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو کرنے لگی۔ ملا یوسف حکومت کی تبدیلی سے بہت خوش تھے۔ وہ زکوٰۃ کی محلہ کمیٹی کے صدر بھی مقرر کر دیے گئے تھے شہر کا کمشنر بھی ملاقات کے لئے انھیں اکثر بلا بھیجتا تھا۔ اپنی عزت افزائی اور تازہ یافتہ اہمیت کی خوشی سے ان کا چہرہ روشن اور منور تھا۔ وہ بہر حال اپنی جذباتی کیفیت کو جوشش ایمانی سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار ذکر کیا کہ اسلامی جذبے کی آخر کار فتح ہوتی ہے، ہوسکتا ہے، میں نے سوچا، کہ ان کا چہرہ اپنی اہمیت اور جذبہ ایمانی کے ملے جلے احساس سے تابندہ نظر آرہا ہو۔ یہ رعایت میں نے انھیں اس لئے دی کہ وہ مجھ جیسی بے پردہ عورت سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آرہے تھے۔ بلکہ میری فصیح و بلیغ اردو سن کر مجھے بہت پسندیدگی اور احترام کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خود بھی فصاحت کے دریا بہا رہے تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش نظر آرہے تھے اور امنگ سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے سرخ و سفید، فطری طور پر خوش مزاج چہرے پر یہ احساس صاف جھلک رہا تھا کہ انھیں یقین ہے کہ ان کی فصاحت اور نکتہ رسی اس سننے والی پر رائیگاں نہ جائے گی جیسا کہ شائد مسجد میں وعظ کرتے وقت ہوتا ہوگا۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ مجھے ان کی اردو میں پختون لہجے کا رنگ نظر نہیں آیا تھا۔ اس بات کے جواب میں انھوں نے مجھے اپنی حیران کن داستان سنائی۔

"کیا بتائیں محترمہ، کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ عزیزہ من، میرے دادا قزاخستان کے متوطن تھے۔"

یہ سن کر میں حیران رہ گئی۔ میں نے پوچھا:

"تو آپ یہاں کیسے؟"

انھوں نے ہاتھ سے بے بسی کا اشارہ کیا۔

"بس کیا بتائیں، روسی ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ عزیزہ، 1917ء کے انقلاب نے ہمارے خاندان کو تاراج کر دیا۔ دادا میرے دینی عالم اور قاضی تھے۔ قزاخستان میں ہماری وسیع جائداد تھی۔ ہمارا خاندان نہایت متمول تھا۔ جب ظالم روسیوں نے قزاخستان پر حملہ کیا تو ہم اپنا ایمان بچا کر اہل خانہ کے ساتھ راتوں

رات وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انتہائی طویل اور پرصعوبت سفر کرتے ہوئے ہم سنکیانگ کے علاقے میں داخل ہوئے اور وہاں مسلمانوں کی ایک بستی میں پند و وعظ شعار کیا۔

"سنکیانگ... چائنا..." میں بڑبڑائی۔

"جی ہاں خاتون محترم۔ مگر سکون اور خوش حالی کا یہ دور بھی عارضی ثابت ہوا۔ وہاں بھی کیمونسٹ انقلاب آگیا۔ جائدادیں ضبط ہونے لگیں۔ مساجد مقفل ہوگئیں۔ اہل ایمان پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے۔ ہمارا خاندان ایک بار پھر دربدر ہوگیا۔ ایک اور طویل اور پرصعوبت سفر کے بعد براستہ پاراچنار ہم اس علاقے میں داخل ہوئے جو اب مملکت خداداد پاکستان کا حصہ اور نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس کے معروف ہے۔"

"تو پھر آپ پاراچنار سے آئے ہیں؟" میں نے دھیمے سے کہا۔

ان کی داستان سن کر میرا دل ڈوب رہا تھا۔ افغانستان میں کیمونسٹ انقلاب تازہ تازہ آیا تھا۔ مدتوں بعد ہمارے ساتھیوں کے زرد چہرے چمک اٹھے تھے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے افغان کیمونسٹوں کے حامی تھے۔ چند دن پہلے ہی تو میں نے اپنے رسالے کے اداریے میں لکھا تھا: "وسط ایشیا کی سنگلاخ زمینوں پر سامراجی راکب منھ کے بل گر پڑے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔"

انھوں نے بڑی مستعدی سے کہا:

"جی نہیں، خاکسار تو عرصہ پچیس برس سے کراچی میں مقیم ہے۔"

بجھے دل سے میں نے انھیں خدا حافظ کہا۔ ان کی خوب صورت مگر فربہ اندام بیوی اور سات سالہ نازک سی بچی پر نظر ڈال کر جسے انھوں نے ابھی سخت پردے میں بٹھا دیا تھا۔ ملا یوسف ضیائی کی افسانوی داستان پر میں نے کچھ یقین کیا تھا اور کچھ نہیں بھی کیا تھا۔ ان کے چہرے پر نظر ڈال کر البتہ گمان گذرتا تھا کہ جیسے سچائی کا کوئی پرتو کہیں اس پرگوشت چہرے میں چھپا ہے، جس کی ابھری رخساروں کی ہڈیاں اور ترچھی سیاہ آنکھیں فربہی نے معدوم کر رکھی تھیں۔ مگر اس طرح کے چہرے تو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں عام پائے جاتے تھے۔ کیا یہ واقعی نسلی قزاخ ہیں؟ میں نے تعجب سے سوچا تھا۔ اس وقت مجھے قزاخستان اور سنکیانگ پریوں کے دلیس کی طرح دیومالائی سرزمینیں لگتے تھے جیسے وہ کہیں بھی نہ ہوں، صرف انسانی تصور کے کسی زرخیز علاقے میں وجود رکھتے ہوں۔

جو بات صاف ظاہر تھی وہ بہرحال ان کی کیمونسٹ دشمنی اور اس وقت مارشل لا حکومت سے وابستگی تھی۔ اپنے آپ سے اتنے نزدیک جہاں دو گھرانوں کے بیچ میں سیمنٹ کی ایک پتلی سی دیوار کے سوا کچھ نہ تھا، ایک پختہ مخالف کی رہائش کے خیال نے مجھے گھبرا دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا، وہ ایک مشکل زمانہ تھا۔ مارشل لا نہایت سخت گیر تھا۔ سیاسی قیدیوں سے جیلیں پٹی پڑی تھیں، اور کئیوں کو صرف "جئے بھٹو" کا نعرہ لگانے پر سرعام کوڑے لگائے گئے تھے۔ ان حالات میں سیاسی حکمت عملی کی منصوبہ بندی اور پمفلٹوں کی تیاری قطعی خفیہ عمل تھا۔

"یہ یقیناً سرکاری جاسوس ہیں جنھیں خاص طور پر ہماری جاسوسی کرنے کے لئے حکومت نے اس گھر میں رکھا ہے۔" میرے شوہر نے اس مخصوص میگلومے کے جذبے سے کہا جو سیاسی تحریکوں میں قائد اول بننے کی پوشیدہ آرزو رکھنے والے کارکنوں کا خاصہ ہے۔

پریشانی کے باوجود تھوڑا سا ہنسی۔ اپنے خواب وخیال میں رہنے کے باعث میں اس میگلومے نیا سے ایک حد تک بچی رہتی تھی۔ یوں بھی نصف رہتی توانائی تو دال روٹی کے حصول میں خرچ ہوتی تھی۔

ملا یوسف کے گھر مجھے یاد نہیں کہ دوبارہ میں کبھی گئی ہوں۔ بی بی جان کی معرفت البتہ اس گھر سے افطاری، سوئیوں اور حلووں وغیرہ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ بی بی جان کو انھوں نے زکوٰۃ فنڈ سے ایک معقول رقم دلائی تھی۔

اس زمانے میں ماہ وسال، حتیٰ کہ شب وروز بھی بھاری اہمیت کے حامل تھے۔ ہم اپنی مصروفیات میں اور فکر وخیال میں ہمہ تن غرق تھے۔ پاکستان میں ثور انقلاب کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی اور پاکستان کی حکومت کی جانب سے مزاحمت کی کھلے بندوں حمایت شروع ہو چکی تھی۔ پھر روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ انھیں دنوں میں نے انگریزی اخبار "گارجین" میں ایک ہولناک رپورٹ پڑھی۔ کسی مقام پر افغان مجاہدین اور روسی سپاہیوں کو پکڑ لیا۔ انھوں نے روسی سپاہیوں کو قتل کر کے ان کی کھال اتاری اور انھیں قصائی کی دکان پر کھونٹے سے لٹکا دیا۔

یہ رپورٹ پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دل میں ایک ہی خیال آیا کہ یہ روسی نوجوان افغانستان میں سرخ انقلاب کی حفاظت کرنے آئے تھے۔ یہ سوچ کر میرا دل خون ہوگیا۔ میں نے ایک نظم لکھنی شروع کی:

ٹانگتے ہو دکاں پر قصاب کی
لال گھبرو کا گورا بدن
یہ بدن ہم خریدیں گے...

مگر یہ نظم مکمل نہ ہو سکی۔ اور دوسری مصروفیات میں اس کے بعد میں دو مصرعے ہی لکھ پائی:

اس سے آتی ہے بوئے اخوت
پیرہن ہم خریدیں گے...

مگر دوسرا مصرع ناقص تھا۔ دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کرنے والا لفظ بحر میں بیٹھ نہیں رہا تھا۔

نظم پوری نہ ہونے کی غالباً ایک غیر تکنیکی وجہ بھی تھی۔ روسی سفارت خانہ کی ایک آدھ تقریب میں جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا، روسی سفارت کاروں کے جذبات سے عاری سپاٹ چہرے اور نوکر شاہانہ مزاج میرے فطرتاً باغی، آزاد منش دل کو ذرہ بھر نہ بھائے تھے اور مجھے ان سے چنداں "بوئے اخوت" نہ آئی تھی۔ گو میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ تمام روسی ہرگز ایسے نہ ہوتے ہوں گے: یہ دیگ کے وہ چاول نہ تھے جن سے اس پوری قوم کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ روسی نہیں بلکہ نوکر شاہی کے کل پرزے، اور تمام دنیا کی نوکر شاہی کے کارندے حیرت انگیز طور پر یکساں اور ایک دوسرے کی تصویر ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ایک عالمی نسل کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ مگر میرے دل نے حسرت

سے چاہا تھا ان روسیوں کو دیکھنا جو سرخ انقلاب لائے تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر دل میں پوشیدہ ادب کے رسیا نے خواہش کی تھی، ان روسیوں کو دیکھنے کی جو دستوو سکی اور تالستائی اور گوگول کے کردار تھے، جو نہ جانے کہاں تھے، سفارت خانے میں تو ہر گز نہ تھے۔

مگر، دل کو سمجھانے کے بعد لاشعور، میں شاید کہیں روسیوں کی مزاحمت اٹکی رہ گئی تھی اور وہ نظم کبھی مکمل نہ ہوئی تھی۔

پڑوس کی مسجد میں ملا یوسف ضیائی کی امامت زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ ان تناؤ بھرے پر آشوب دنوں میں ایک روز میں نے سنا کہ مسجد میں بہت ہنگامہ ہوا۔ اور نمازیوں کے ایک گروہ نے ملا یوسف کی پٹائی کر دی۔ انھیں امامت کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ دراصل ملا یوسف دیوبندی خیالات کے تھے۔ اس وقت کی حکومت کی وہابیت نے ان کے عقیدے کو اور بھی راسخ کر دیا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ کراچی کے لوگوں کی بھٹو مخالفت ایک طرف، مگر یہ ایک بریلوی عقیدے کا شہر تھا اور اس کے پاس ملا یوسف کے جارحانہ وہابی پند و موعظ کو زیادہ دن تک ہضم نہ کر سکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ یہ سن کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ ملا یوسف کبھی اپنے دشمن کیوں نہ لگے؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہوگا۔ وہ مجھ سے خوش اخلاقی سے ملتے تھے، بس اس سے زیادہ تو ان سے تعلق نہ تھا۔ انھیں یقین تھا کہ پند و وعظ کرنا اور نمازیوں سے تحفے وصول کرنا، زکوٰۃ کمیٹی کا صدر بننا، اور رفتہ رفتہ جائدادیں بنالینا عین فطری باتیں ہیں، اور وہ خوش مزاجی سے اپنی پسندیدہ راہ پر گامزن تھے۔ ان کے اپنی طرح کے اسلامی عقائد تھے، جن پر وہ سختی سے کاربند تھے۔

بی بی جان البتہ چھپ چھپ کر ہنستی رہی۔ "بی گم ساب، ملا کے پاس بوت، ال تھا" اس دوران کسی بات پر اس کی ملا یوسف ضیائی سے لڑائی ہوگئی تھی۔ تنازعہ غالباً زکوٰۃ پر ہی ہوا تھا۔

زندگی ایک جھپاکے میں گذرتی جا رہی تھی۔ بی بی جان کے قہقہے اس سنجیدہ گھر میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے۔ لیکن ایک بار اس کے خشمناک غصے کا مجھے بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔

بی بی جان سیلانی تھی۔ گھر کا کام پلک جھپکتے نمٹا کر وہ سر پر سفید شٹل کاک برقع ڈال کر، جو تمام تر اس کی پشت پر لہراتا رہتا اور اس کے بشاش قہقہوں میں مخل نہ ہوتا، دور دراز پختون بستیوں کے سمت نکل کھڑی ہوتی اور رات گئے کسی ٹرک پر بیٹھ کر واپس آتی۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ میرے چھوٹے والے بچے کو بھی لے گئی۔ جب سورج ڈوبنے تک وہ نہ لوٹی تو میں بے حد پریشان ہوگئی۔ وہ واپس آئی تو بچہ اس کے کاندھے پر سو رہا تھا۔ غصے میں میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ اس دن میری طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی: مجھے صبح سے بخار تھا۔ شاید میں نے اسے آوارہ گرد کہا تھا۔ بی بی جان اس کا مطلب آوارہ سمجھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ ایک لفظ منھ سے نکالے بغیر وہ برتن دھونے لگی۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ گئی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور بی بی جان اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے پلنگ کے سرہانے آکھڑی ہوئی۔

"بی گم ساب!" اس نے تیز باریک آواز میں کہا۔ "تم نے ہم کو گالی دیا۔ ابی اٹھو، ہمت ہے اور طاقت ہے تو ہم سے مقابلہ کرو۔"

بستر پر لیٹے لیٹے میں اس دبلی پتلی دراز قد افغان النسل عورت کو دیکھ رہی تھی جو چاندی کے جھنکتے زیور پہنے مجھ سے کشتی لڑنے پر آمادہ کھڑی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ میں خوف زدہ زیادہ تھی یا اس منظر سے محظوظ زیادہ ہو رہی تھی۔ پل بھر کو تو میرے بدن میں بھی زور آزمائی کی تڑپ بجلی کے کوندے کی طرح گذری تھی۔ تن و توش میں وہ مجھ پر بھاری نہ تھی اور مجھے اپنی جسمانی طاقت پر کافی بھروسا بھی ہے۔ لیکن پھر اس کا بسورتا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر پیار آ گیا تھا۔ میں نے اپنی ہنسی چھپا کر اسے کہا تھا:

"اچھا اچھا بی جان، آج میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے بخار ہے، دیکھو۔" میں نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کلائی پر رکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ چند لمحے وہ متذبذب سی کھڑی رہی اور پھر خاموشی سے کنڈی کھول کر باہر چلی گئی۔ دوسرے روز میں نے اسے گلے لگایا۔ وہ من گئی۔

"مگر بی گم ساب! آپ نے مجھے گالی دیا۔"

میں نے اسے پیار سے سمجھایا کہ آوارہ گرد گالی نہیں۔ اس کا مطلب صرف گھومنے پھرنے کی شوقین ہو سکتا ہے۔ "ہم..." وہ مطمئن ہو کر ہنسی اور مہندی اور خضاب گھولنے لگی۔ بی بی جان کے بال کچھ سفید ہو رہے تھے اور وہ بالوں میں خضاب لگاتی تھی۔

بال تو میرے بھی سفید ہو رہے تھے مگر میری خاص توجہ ان پر نہ تھی۔ بی گم ساب آپ کو بھی خضاب لگا دوں؟ وہ پیش کش کرتی۔

"نہیں،" میں کچھ مایوسی اور بے خیالی سے سر ہلا کر اسے منع کر دیتی۔ "بس جیسے قدرتی ہیں ویسے رہنے دو۔"

"ہم م!" وہ رازداری سے سر ہلاتی۔ رات دن کے ساتھ میں وہ ہماری ناآسودہ زندگی سے واقف ہو چکی تھی۔ "آپ کا خاوند آپ پر خیال نہیں کرتا؟" وہ چپکے سے کہتی۔ میں اس کی بات کا جواب نہ دیتی، یا کبھی کہہ دیتی، "ہاں" اور پھر پل بھر کے لئے کوفت میں مبتلا ہو جاتی۔

"بی گم ساب، آپ فرشتی ہو۔" بی بی جان پر زور اصرار سے کہتی۔ اس کی بات سن کر میں خفیف ہو جاتی، بالکل بور ہو جاتی۔ صرف فرشتوں کے وجود پر یقین نہ کرنے کے باعث نہیں، بلکہ اس لئے کہ تاریخ کی وہ طویل ترین جنسی روز خوابی جو میرا مقدر تھی، میرے لاشعور تک میں فرشتوں کے خصائل میں شمار نہ ہو سکتی تھی۔

بس تو ایسی ہی تھی زندگی۔ بہت سی حقیقتیں شانہ بہ شانہ، سرراہ ایستادہ۔ انقلابی امنگ اور ذاتی ناآسودگی، جو ایک دوسرے کا بال بھی بانکا نہ کر پائی

تھیں اور برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ایک چھت کے تلے رہے چلی جا رہی تھی جیسے ایک دوسرے کی نفی کرنے سے قطعی معذور ہوں۔

بی بی جان نے میرے گھر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ وہ محلّے بھر کے مکینوں، ان کی بیبیوں اور ان کے نوجوان لڑکوں کی کارستانیاں مجھے سناتی تھی، اور پھر وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی تھی۔

ایک سہ پہر جب میں دفتر سے جلدی اٹھ کر گھر آئی تو بے خیالی میں اپنے گھر کی پیچ دار نیم تاریک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بی بی جان سے ٹکرا گئی تھی جو اس لمحے انقلابی کسان جماعت کے ایک کارکن کی آغوش میں تھی اور ان کے لب ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ ہوش سنبھال کر میں الٹے پاؤں زینے سے واپس آ گئی تھی اور تھوڑی دیر تک اپنے دروازے کے باہر ہونقوں کی طرح کھڑی رہی تھی یہاں تک کہ میرا دل ایک غیر متوقع احساس تفاخر اور بے نیازی سے بھر گیا۔ پھر میں دوبارہ زینہ چڑھتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ایک رات بی بی جان مجھ سے زور آزمائی کرنا چاہتی تھی، مگر اس سہ پہر، ایک مرئی کشتی میں جو ہم دو عورتوں کے زیریں شعور میں نہ جانے کب سے جاری تھی۔ بی بی جان اچانک چاروں شانے چت ہو گئی تھی۔

اتنے دنوں میں ہم دو عورتیں ایک دوسرے کی ہمدرد تھیں، ایک دوسرے سے بہت انسیت محسوس کرنے لگی تھیں تو پھر کیا اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے پنجہ کش تھے؟ یہ انکشاف مجھ پر صرف اس فتح کے واضح احساس نے کیا تھا جو اس سہ پہر اچانک مجھ پر روشن ہوا۔ اسی لمحے مجھے یہ علم بھی ہوا تھا کہ اس کی ہمدردی (ترحم؟) کے لئے میرے معزز دل میں کتنی مزاحمت تھی۔ کیا بی بی جان پر بھی یہ انکشاف ہوا تھا؟ کیوں کہ اس کے بعد وہ اپنا سامان اٹھا کر خاموشی سے میرے گھر سے چلی گئی تھی اور مجھے مدتوں بے طرح یاد آتی رہی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد میرا مختصر خاندان سیاسی جکڑ بندیوں اور حکومت کی جانب سے تھوپے ہوئے تابڑ توڑ خوف ناک مقدموں کے ہاتھوں طویل، ہفت سالہ، جلاوطنی سے دوچار ہو گیا تھا۔

اب اس لمبی سوچ سے ہم واپس آتے ہیں۔ الما آتا کے کشادہ چوک پر، جہاں ایک شاعر کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ ہم اس قزاخ شاعر کی ڈیڑھ صد سالہ برسی کی تقریب کے آغاز کے منتظر ہیں۔ چوک پر نو آزاد وسط ایشائی ریاستوں کے کئی صدور جمع ہیں: ترکمانستان، کرغیزستان، تاجکستان، ازبکستان، تاتارستان: نو آزاد مسلمان اور روسیائے ہوئے۔ وہ چٹاچٹ ایک دوسرے کے رخساروں کو بوسے دے رہے ہیں۔

الما آتا کی سنہری دھوپ میں تاتاری حسینہ کسی سورج کی کرن کی طرح دمک رہی ہے۔

اور یہ 1995 ہے، صدی اپنی آخری سانسوں پر۔ الما آتا کے چھدرے سبز درختوں میں ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی ہے۔

سوویت یونین ختم ہوا... اور کیمونزم کا نظام بھی۔ جاتے جاتے یہ نظام قزاخوں کی اس سرزمین کو بلند و بالا عمارتیں، وسیع شاہراہیں اور سو فیصد خواندگی دے گیا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی کچھ تلخ یادیں بھی سیمینار میں قزاخ ادیب نے کہا (سوویت نظام کی یادگار آلات سے اس کا فوری ترجمہ پندرہ زبانوں میں شرکا نے ہیڈ فون لگا کر سنا):

"کیمونسٹ روسی حاکموں نے قزاخستان کے سرسبز میدانوں میں ایٹمی تجربے کئے۔ آج متعدد مقامات پر ہمارے دریاؤں کا پانی میدانوں کی مٹی ایٹمی آلودگی کا شکار ہے۔"

سرد جنگ کی دو بڑی طاقتوں کی نفرت بھری پنجہ آزمائی کی یادگاریں قزاخستان ایٹمی آلودہ پانی، اور امریکہ کی ریاست نویڈا میں پلوٹینیم کے کئی ہزار ڈبے جن سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا۔

قزاخستان میں آسمان تک بلند ہوتی مہنگائی، بڑھتی ہوئی جرائم کی شرح۔

کئی سچائیاں شانہ بہ شانہ ایستادہ، ایک دوسرے کا بال بھی بانکا نہ کرتی ہوئی۔

قزاخستان اب دیومالائی، پریوں کا دیس نہ تھا، بلکہ ایک نو آزاد ریاست مسلمان؟ ہاں مسلمان بھی۔ (کیا اب یہاں تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوگا؟ کیا سپاہِ صحابہ یہاں آنے والی ہے؟ ہاں... وہ جہاز بھر بھر کر آ رہے ہیں...)

ایک ملک، تاریخ کے ایک نئے دوراہے پر۔

یہاں میں نے روسی دیکھے جو کئی نسلوں سے یہاں بس رہے ہیں۔ قزاخ قومیت رکھنے والے، مگر پھر بھی روسی۔ ان کے چہرے سپاٹ نہ تھے۔ حساس چہرے، نیلی آنکھیں، سنہری بال: گوگول، دستوئفسکی اور تالستائی کے کردار۔ ہوٹل کے ریستوراں میں رات گئے ایک دبلا پتلا روسی لڑکا وائلن بجاتا ہے۔ اور خاص ہماری میز پر بیٹھے ہندوستانیوں کے لئے وائلن پر ایک نغمے کی دھن شروع کرتا ہے دھن ریستوراں میں گونجتی ہے اور ہمارے دماغوں میں صاف صاف اترتے ہیں:

"میرا جوتا ہے جاپانی یہ پتلون انگلستانی
سر پہ لال ٹوپی روسی۔ پھر بھی دل ہے ہندوستانی۔"

ریستوراں میں بیٹھے قزاخ جھومتے ہیں۔ صرف ہم نہیں جھومتے۔ اس غلطی ہائے مضامین پر، جز بز جب کہ دھن کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں راج کپور مارچ کر رہا ہے۔

"ہندوستانی نہیں، پاکستانی۔" ہم دانت پیس کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہیں۔

"یہاں اتنے روسی اب تک کیوں ہیں؟" (ایک اٹھایا گیا سوال۔)

کیا انھیں نکالا جائے گا؟ اس وائلن نواز لڑکے کو، سڑک پر کھڑے ٹریفک کے سپاہی کو، منسٹری ٹرانسپورٹ کے انجینئر کو؟

تو پھر کون جھومتا؟ میں نے سوچا۔ کیا میں قزاخوں کو دیکھ کر خوش تھی؟ ہاں، سچ یہی ہے کہ میں قزاخوں کو آزاد دیکھ کر خوش تھی۔ سوویت یونین کیمونسٹ تھا... اور سامراجی بھی۔ یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے کی نفی کرنے سے معذور تھیں۔

الما آتا امریکنوں سے بھرا ہوا ہے۔ امریکنوں سے، ترکوں سے جو اس نصف منگول اور نصف ترک نژاد قوم کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ امریکن اس فکر میں ہیں کہ ان نو آزاد ریاستوں کو شدت پرست اسلام پسند بن جانے سے روکیں اور دوبارہ روسی تسلط میں بھی نہ جانے دیں۔ اسلام پسند ان کے قابل رشک ایٹمی علوم سے کام لے کر انھیں جدید اسلامی ایٹمی کلب کا ممبر بنانا چاہتے ہیں، قزاخوں کو اسلامی مجاہدین کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، مگر اس خدشے سے بھی کچھ پریشان ہیں کہیں کماندار یہی روسیائے ہوئے گذرے نہ بن بیٹھیں۔ شہر جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے جو ہر قسم کی سن گن لے رہے ہیں۔

گلناز، جس کی کسی دور کی رشتہ دار بی بی جان نے ایک رات مجھ سے پنجہ آزمائی کرنا چاہی تھی اور میں جس سے بہت محبت کرتی ہوں (بی گم ساب، خدائی پاک کی قسم!) گلناز، جو مجھے پشکن کی نظمیں سناتی ہے، اس نے یونیورسٹی میں ادب پڑھا۔ پشکن میں عرب خون تھا۔ وہ کہتی ہے۔ وہ نسلاً خالص روسی نہیں تھا اور اس نے روسی زبان کو یا از سرنو بنائی۔

گلناز مسکراتی ہے اور کہتی ہے:

"اگر کسی بھی روسی کو ذرا سا کھرچیں تو اندر سے ایک مسلمان یا تاتار برآمد ہوگا۔ اتنے طویل عرصے تک ہمیں کولونائز کرنے نے ان کی فطرت کا خمیر ہم جیسا کر دیا ہے۔" گلناز ہنستی ہے۔ ہماری قزاخ مترجم گل سارا اس کی ہنسی میں شامل ہو جاتی ہے۔

"تو اب یہاں کے لوگ کس سمت جانا چاہتے ہیں؟" میں ان دونوں سے پوچھتی ہوں۔

"پتہ نہیں۔" گل سارا کہتی ہے۔ "لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم تائیوان یا سنگاپور جیسا بننا چاہتے ہیں۔"

قزاخ مترجم گل سارا نے فزکس میں گریجویشن کیا ہے، مگر اب وہ انگریزی سیکھ کر مترجم کا کام کر رہی ہے۔ اس نے آنکھوں پر نیلگوں آئی شیڈ لگایا ہے۔ وہ ایک بوتیک کھولنے کا سوچ رہی ہے۔

ہواؤں میں سرسرا رہی ہے۔

اور کل میں نے دو گلابی کبوتر زمین پر دانہ چگتے دیکھے ہیں۔

میں گل سارا کو نہیں بتاتی۔

جلاوطنی سے لوٹنے پر میں نے ملا یوسف ضیائی کی بیوی اور بیٹی کو دیکھا تھا۔ کہاں؟

قصہ مختصر یہ کہ میرے بال اب زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ عمر اور بالوں کی سفیدی بڑھنے کے ساتھ کسی جادو سے قدرتی رہنے کا جذبہ کمزور پڑ کر غائب ہو چکا تھا۔ میں اب اپنے بال رنگتی تھی جس کے لئے کسی تختی دہائی ہوئی پوشیدہ حسرت یا امید کا اعتراف تک ضروری نہ تھا۔

جلاوطنی سے واپسی کے چند برس بعد اپنے بالوں پر رنگ کروانے میں ایک بیوٹی پارلر میں گئی تھی۔ ملا یوسف کی سات پردوں میں رہنے والی بیوی کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ایک نوعمر حسین لڑکی ان کے چہرے پر بیوٹی ماسک لگا رہی تھی۔

ہم دونوں وہاں ایک دوسرے کو دیکھ کر اتنا حیران ہوئے کہ اپنی ہیئت کذائی اور جوانی سے چمٹے رہنے کی خواہش کے شرمناک راز کے ایک دوسرے پر انکشاف (یعنی ان کے منہ پر ہربل ماسک اور میرے بالوں میں مصنوعی سیاہی) پر شرمندہ تک ہونا بھول گئے۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کی خیریت اور حال احوال پوچھتے رہے۔ ملا یوسف کی بیوی نے مجھے بتایا کہ پاکستان کی ہر دم بدلتی صورت حال سے دل شکستہ ہو کر ملا یوسف ضیائی اب امامت ترک کر چکے ہیں اور کھالوں کا کاروبار کرنے لگے ہیں۔

"آپ کی ایک بچی بھی تو تھی؟" میں نے یاد کیا۔

"ہاں وہی تو ہے یہ۔" انھوں نے مجھے بتایا۔ "اسی کی خاطر میں یہاں آئی ہوں یہ میرے چہرے پر پریکٹس کرنا چاہتی ہے۔ اس نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہے۔"

تب، گلناز اور گل سارا، میں نے تمھاری اس چچیری بہن کو دیکھا۔ حسین خوش اندام، دبلی پتلی لڑکی، جس کے نازک لبوں پر تمھاری طرح شوخ لپ اسٹک لگی تھی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور بیوٹی پارلر کے پنکھے کی ہوا سے اڑ اڑ کر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ سخت پردہ، وہ طرز زندگی جس کو بچانے کی خاطر ملا یوسف ضیائی کے باپ دادا گھوڑوں اور خچروں پر سوار، سنکیانگ اور قزاخستان کے برف پوش پہاڑوں اور گھاٹیوں سے ایک پر صعوبت سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ گذشتہ دس بارہ برس کے دوران کراچی میں چلنے والی ہواؤں میں اڑ گیا تھا۔

وہ کہاں گیا؟

"جہاں کمیونزم کا خواب گیا۔ ہواؤں میں سرسراتا ہوا، ہواؤں میں اڑتا، کہیں دور، بہت دور...

"تو پھر کون جیتا؟" میں نے خود سے سوال کیا

سوویت یونین کے ختم ہونے پر انگریزی جریدے "اکانومسٹ" نے اپنے اداریے میں لکھا تھا:

"بات یہ ہے کہ خوشی منانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ درحقیقت... جیتا تو کوئی بھی نہیں۔"

مگر میں نے سوچا، گلابی کبوتر جیتے، گلابی کبوتر جو کسی مقابلے میں شامل نہ تھے۔

پس نوشت:

اور ہاں... جلاوطنی سے واپسی پر میں بی بی جان سے بھی ملی۔ اب وہ ایک دولت مند میمن گھرانے میں سب سے معتبر ملازمہ ہے۔ اس کی حیثیت کچھ کچھ چیف آف اسٹاف کی سی ہے۔ ریشمی، کڑھے ہوئے سوٹ میں وہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور ہم دیر تک گلے مل مل کر خوشی سے چیختے رہے۔ بی بی جان نے عقد ثانی نہیں کیا۔ اس نے اپنے بل بوتے پر اپنے دونوں بچوں کی پرورش کی، اور اب ان میں سے ایک، اس نے مجھے خوش ہو کر بتایا، فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ ☆☆☆

فہمیدہ ریاض

شمارہ ۲۳۱،
نومبر ۱۹۹۹

جب شاخوں پر سرخ پھول کھل اٹھیں گے
تب ملیں گے

(شیخ ایاز)

گھومتے ہیں موسموں کے دائرے میں
کب ملیں گے؟

جب بھری برسات ہوگی
جب ٹھٹھرتی رات ہوگی
برف کا جب فرش ہوگا
جب دمکتا عرش ہوگا
جب رسیلی جامنوں سے ڈالیاں جھک جائیں گی
گرم ہو کر جب سمندر سے ہوائیں آئیں گی
تب ملیں گے؟
یا نہیں ہم اب ملیں گے؟

گھومتی ہیں دائروں میں درد سے بے دم ہوائیں
گرم، نمکیں آنسوؤں سے نم ہوائیں

ذائقہ ان کا لئے اپنے بدن پر
گھومتی ہوں دائروں میں
آندھیاں اب آئیں گی
ڈال سے گلنار کی سب پتیاں جھڑ جائیں گی
دھول جب اڑنے لگے گی
راکھ جب جھڑنے لگے گی
آن پہنچے گا اچانک
راکھ ہو جانے کا موسم
خاک میں ملنے کی ساعت
خاک ہو جانے کا موسم
کس قدر ہم کم ملے تھے
سرخ پھولوں کے تعاقب میں نہ تھی میں
کیوں اچانک ہم ملے تھے؟

فہمیدہ ریاض

شمارہ ۲۳۱
نومبر ۱۹۹۹

جلوہ

یہ سنہرا آسماں یہ جگمگاتا آفتاب
یہ مرے قدموں کے نیچے عمر کی ریگ رواں
دور تک پھیلی ہوئی
جھلملاتا کانچ ہے اب وقت پیا ریت کا
جس میں کچھ باقی نہیں
گرم ہے صحرا کی سانس
کون سی ساعت ہے؟
تن میں گرم ہے اب تک لہو

اور نظر آنے لگے ہیں میری آنکھوں کو سراب
وسط میں صحرا کے نخل
نیلگوں پانی کی جھیل
تیز دھاروں سے چھلکتی گنگناتی جوئے آب
اور کنار آب میرے روبرو
اک نگہ... پرشوق وگرم

تشنہ لب... تحریر جن پر اضطراب
واقعی، کیا واقعی میرے لئے!
ایک امکاں مہرباں آغوش کا
جیسے آہستہ سے وا ہونے لگیں جنت کے باب

کیا نہیں تھا رائیگاں اک عمر کا محتاط ضبط
زندگی کیا تو نے مجھ کو اتنی گہری پیاس دی
صرف جھل مل کانچ ہے جب وقت پیا ریت کا
آخری اوراق پر ہے جب کتاب
ایسی خوش بختی کہ آنکھیں دیکھ پائیں یہ سراب
اے سنہرے آسماں
اے جگمگاتے آفتاب

خبر نامہ

یہ خبریں ہیں یا قہر آلود فرماں
کسی دین نو کے
جنہیں ایک عجب شخص
روغن سے بالوں کے پٹے جما کر
سزا دینے والے کسی محتسب کا کرخت اور تاریک چہرہ بنا کر
ازل سے سناتا چلا جا رہا ہے
نہیں بھولتا نام لینا خدا کا
کہ جو مہرباں ہے نہایت رحیم
مگر اس کے لہجے سے ہے صاف ظاہر
نہیں ہیں یہ الفاظ ہرگز خدا کے لئے
پس تو سمجھو
کہ جو حکمراں ہے، بہت مہرباں ہے
نہایت رحیم
وہ انگلی اٹھا کر یہ کہتا نہیں ہے
کہ گردن جھکا کر سنو بد نصیبو
مگر پھر بھی سننے میں آتا یہی ہے
ہر انداز اس کا بتاتا یہی ہے
کہ گردن جھکا لو
نہ نظریں اٹھاؤ
اور اب جو کہوں اس پہ ایمان لاؤ

فیاض رفعت

شمارہ ۱۹۹،
اکتوبر ۱۹۹۶

(۱)

ڈیر اروشی!
تمھیں ہرے بھرے سبز موسم سے
شکایت کیوں ہے؟
ڈھنگ رنگ برکھا رانی تو ہر دن
اودی نیلی سبز پوشاک پہن کر
تمھیں لبھاتی ہے تمھیں رجھاتی ہے
کہ آؤ ہماری گیاں بن کر
ہمارے بوند بوند رنگوں سے لپٹ جاؤ
مگر تم ہو کہ گیان دھیان کی
جھوٹی سرشاری میں کھو کر
خود کو اور اپنے خدا کو
دھوکا دے رہی ہو

(۲)

ڈیر اروشی!
جب تمھارے بدن کا سونا
ڈھل جائے
اور تم رسوائیوں کے حصار میں
گھر جاؤ
میرے پاس چلی آنا
میں تمھیں اپنے آنسوؤں کی
مقدس گنگا سے
اجلا کر دوں گا

(۳)

ڈیر اروشی!
کھلی کھڑکی سے
ساون شور مچاتا
ملہار گاتا
میرے کمرے میں گھس آتا ہے
اور میں حیرت و استعجاب کا مارا
اپنے آنسوؤں کا نذرانہ
اسے پیش کر دیتا ہوں

(۴)

ڈیر اروشی!
اس دن جب تم
ہوٹل کے ٹھنڈے کمرے میں
اپنے زندہ اور تابندہ جسم کے
ہزار شیوہ اسرار آشکارا
کر رہی تھی
ہزاروں میل دور
سرحد کے اس پار
تمھارا ایک دیوانہ شاعر
روحانی عشق کی سرشاری میں ڈوبا
اپنی نظموں میں تمھیں خدا کر رہا تھا

(۵)

ڈیر اروشی!
اس دن ہم کینٹین میں بیٹھے
ساون کی رم جھم کا
پہلا نغمہ سن رہے تھے
خوشیوں کا ایک سیلاب تھا
جو کنارے توڑ کر
تمھارے بدن سے پھوٹ رہا تھا
جسے تم روحانی سرشاری کا
نام دے رہی تھیں
اور میں وفا گزیدہ
تمھارے رخساروں پر بنے
محبت کے نقش و نگار
دیکھ کر خجل ہو رہا تھا

(۶)

ڈیر اروشی!
مجھے اعتراف ہے
کہ میں ہزار شیوہ بدن کی
تہذیب کو
رسوائی کے معنی عطا نہ کر سکا
شاید اسی سنگین جرم کی پاداش میں
شب ہجر سوزاں
میرا مقدر ٹھہری

(۷)

ڈیر اروشی!
مقام گریہ تک پہنچنے کے لئے
اکثر تنہا سرد راتوں میں
میں تمھارے جسم کی کتاب کے
اوراق الٹا پلٹتا رہتا ہوں

(۸)

ڈیر اروشی!
ساون کی پہلی پھوار
قہر ڈھارہی ہے
کیا ہم لوگ
محض روحانی مکالموں میں
وقت کا زیاں کرتے رہیں گے

(۹)

ڈیر اروشی!
گذشتہ تین دنوں سے
قیصر باغ کی بارہ دری میں
ساون جھول رہا ہے
میری مضطرب انگلیاں
بار بار تمھارا نمبر ڈائل کرتی ہیں
ہر بار پپ کے بعد
انگیج ٹون آتی ہے
کیا تم میگھ دوت کے ساتھ
کسی آتش بہ جاں مکالے میں
مصروف ہو
جس کا مرکزی موضوع
اتصال جسم و جاں کے علاوہ
اور کیا ہو سکتا ہے

(۱۰)

ڈیر اروشی!
گذشتہ تین دنوں سے
بادو باراں کی یورش نے
میری تن بدن کی ٹھنڈی آگ میں
چنگاریاں بھر دی ہیں
میں تمھارا نمبر بار بار ڈائل کرتا ہوں
ہر بار ایک ہی جواب ملتا ہے
''آپ غلط نمبر ڈائل کر رہے ہیں
مہربانی کر کے تصدیق کر لیں''

(۱۱)

ڈیر اروشی!
کیا تم جانتی ہو
شرربار موسم کا
چمپئی کورا بدن
پہلی بارش کے
برفانی عذاب میں گھرا
ان آتشیں لمحوں کو
آواز دے رہا ہے
جنھیں تمھاری بے گانہ وشی نے
قصۂ پارینہ میں تبدیل کر دیا ہے

(۱۲)

ڈیر اروشی!
بارش کے موسم کی
وہ پہلی سوغات یاد کرو
جب کالی کجراری بدریا نے
جھک کر تمھارا منھ چوم لیا تھا

(۱۳)

ڈیر اروشی!
اوور سیز کے بورڈ پر بیٹھے بیٹھے
تم بورڈم کا اشتہار
اپنے ماتھے پر چپکا لیتی ہو
خنک رنگ گہری سانسیں بھرتی ہو
اندر کی گھٹن سے گھبرا کر
باہر والی کھڑکی کھولتی ہو
ہوا کا کوہستانی ٹھنڈا یخ جھونکا
یلغار کرتا تمھارے سراپے سے
لپٹ جاتا ہے...
اور تم زار و قطار رونے لگتی ہو
موسم کی پہلی بارش شروع ہو چکی ہے

(۱۴)

ڈیر اروشی!
میں تمھاری بے نام سی سرشاری کو
والہانہ عقیدت کی آنکھوں سے
چومنا چاہتا تھا
مگر نہ جانے کیا بات ہے
دور خلاؤں سے ایک آواز
آتی تھی...
پانی، خاک، ہوا اور آگ سے بنے
آدمی کو آدمی رہنے دو
اسے خدا نہ بناؤ

(۱۵)

ڈیر اروشی!
گر برا نہ مانو
تو اتنا تو بتلاؤ
کہ اپنے بدن کی تہذیب
کے بارے میں
خود تمھارا کیا خیال ہے
جسے نام نہاد سرشاری
اور روحانی خود احتسابی
کا جھوٹا اعزاز دے کر
اجنبی ہاتھوں میں
لٹا رہی ہو

اگر یہ راستہ کبھی

فیصل ہاشمی

شمارہ ۲۷۰،
جولائی ۲۰۰۳

اگر یہ راستہ کبھی
زمیں کو چھوڑ کر خلا نورد ہو گیا
غنودگی کے دشت میں نصیب اپنا کھو گیا
تو جنگلوں میں انگنت مسافروں کے روپ میں
بھٹکتی آتماؤں کو
مہیب حسرتوں کی سخت گیر قید سے
چھڑا کے کون لائے گا

کسی نگر کی بھیڑ میں
وفا شعار اجنبی جو راہ بھول جائے گا
اور اپنی سادگی سے جب کوئی فریب کھائے گا
تو کرب ناک موت کے ستم ظریف ہاتھ کی
غلیظ واردات سے بچا کے کون لائے گا

اگر یہ راستہ کبھی
زمیں کو چھوڑ کر خلا نورد ہو گیا

مجھے ہزار وسوسوں کی اس کثیف رات میں
فسردگی کی نیند سے جگا کے کون لائے گا

نئے افسانے کی زبان

قاضی افضال حسین

شمارہ نمبر ۱۲۵،

جون تا اگست ۱۹۸۲

الفاظ پر اپنی قدرت کو اپنے علم و اطلاع کی حدود تسلیم کرنے کے معنی، افکار و نظریات کے ارتقا کے سبب ان کے ذریعہ اظہار کی حیثیت سے زبان میں ہونے والے تغیرات اور نئے علوم و فنون کے زبان کو عطا کردہ امتیازات کا اعتراف ہے۔ ماہرین لسانیات کا ایک بڑا طبقہ اس پر متفق ہے کہ زبان اپنے بولنے والے کے بڑھتے ہوئے علم و حکمت کے ذخیرے کی مناسبت سے تبدیل ہوتی اور ان افکار و نظریات کے حوالے سے اپنے امتیازات کی شناخت کراتی ہے Iris Murdoch نے سارتر (Sartre) کے ناولوں کی زبان سے بحث کے ضمن میں اس مقبول مفروضے پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔

> کیا دنیا پہلے بدلتی اور پھر زبان کو (اس ارتقاء کی مناسبت سے) تبدیل کرتی ہے یا زبان کے متعلق ہماری نئی آگہی (Awareness) ہی دنیا کے تئیں ہمارے زاویۂ نگاہ کو تبدیل کر دیتی ہے؟

اپنی پیش کردہ اس انوکھی حقیقت کے اثبات کے لئے دیئے گئے اس کے دلائل سے قطع نظر اردو میں "پھندنے" کی اشاعت کے ساتھ دنیا کو اپنے پیش روؤں سے مختلف طرح دیکھنے کا اعلان ہوا کہ اس افسانے میں زبان کا عام روش سے مختلف Treatment حقائق کے تئیں ہمارے زاویۂ نظر میں تبدیلی کا اشارہ تھا۔ اس زبان کے حوالے سے منٹو نے ہم عصر فکری رجحانات کے وہ اوصاف دریافت کئے جو ہماری حرکت و عمل پر اپنے فیصلے صادر کرتے ہیں کہ اس طرح معمول کے بنفسہ اہم ہونے کا جواز بھی فراہم ہوتا تھا۔

افتخار جالب نے اس افسانے کی مثال سے لفظ کی شبیہ کا جو تصور Develop کیا ہے اسے مجرد تعقلاتی کنسیپشن conception سے متمیز کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ پھندنے سے منسوب تعبیرات و انسلاکات کے تمام حوالے بڑی حد تک Conceptualized ہیں اور افسانے کی وہ زبان جو "پھندنے" کے زیر اثر اظہار کا معمول بنی، اپنے اس وصف کے سبب اپنے عہد کی نمائندگی کا امتیاز رکھتی ہے کہ اس نئی زبان کا بنیادی وصف، سرور، رسوا یا کرشن چندر کے مقابل تخیل کے بجائے تعقل کو تحریک دینے کی صلاحیت اور نتیجۃً لفظ میں ان تعبیرات کا اضافہ ہے جو اپنے Discursive Nature کے سبب منفرد طور پر پہچانی جاتی ہیں۔

اب رہا اس نوع کی زبان میں لفظ کے متبادل کا مسئلہ تو بلاشبہ علامتیں اپنی مثالی صورت میں خود اس شے یا تصور کا حصہ ہوتی ہیں جنھیں وہ Embody کرتی ہیں اور ذہن اس مرئی اشارے لفظ (جسے افتخار جالب "شے" بھی کہتے ہیں) کے حوالے سے ذہن کی خلق کردہ تعبیرات و انسلاکات کی ایک وسیع تر کائنات کی سمت سفر کرتا ہے۔ جو کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ "شے" سے ذہن مشاہدے کے جن حسی حوالوں کی طرف جاتا ہے وہ "پھندنے" کی طرح جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بلاشبہ ہم سیاہ پتھر اور ہاتھ میں تلوار لئے سیاہ لباس میں ملبوس شخص یا آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھائے ناکوں میں موٹے موٹے رسے لگے ہڈیوں سے بھرے اندھے بیل کی سواری یا میڈیکل اسٹور کے کاؤنٹر کے شیشے میں پھنسے ہوئے کردار کو Visualize کرتے ہیں لیکن ان کا مشاہدہ (Perception) امراؤ جان ادا کے کمرے یا کشمیر کی وادیوں کے منظر سے قطعی مختلف ہے کہ اول الذکر پیکر لازمی طور پر Discursive ہیں اور ایک پیچیدہ تر منطق کے تحت ذہن کو مخصوص احساسات و تصورات کی طرف لے جاتے ہیں (۱)۔ پیکروں کے حوالے سے تخیل کے بجائے تعقل کی تحریک اور تعبیرات و انسلاکات کی وسیع تر کائنات کی طرف قاری کا سفر جدید افسانہ نگاروں کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "میں ہوں کہ زمین و آسمان کے درمیان ستون ہوں، میں ہوں کہ چلتا ہوا خالی گھروندوں کی دہلیز پر دم توڑتا ہوں کہ پھر جنم لیتا ہوں اور آسمان کو اٹھاتا ہوں۔ کتنا خوبصورت چکر ہے۔ سب بکواس ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میری آنکھوں میں تو کیکر کے درختوں کی سبزی ہے۔ اور میں اس لئے ہوں کہ زمین کو چاٹتے سفید پھولوں کی دیکھتا ہوں۔ اور ان سے جنگ کرتا ہوں میرے جسم پر زبانوں کے زخم ہیں۔
>
> ("کیکر" از انور سجاد)

> کئی بار میرے پانو پھسلے اور ہر بار یوں ہوا کہ پسلیوں کا جال کیلوں میں پھنس گیا۔ آنکھوں کے گہرے گڈھے کیلوں میں الجھ گئے اور میں ٹنگ گیا اور باہر میں نے کیلوں میں پھنسا ہوا جال اتارا، تو کیلی کیلوں میں الجھے ہوئے آنکھوں کے گڈھے علاحدہ کئے۔ اور پھر ایک

ایک کیل تھامتا ایک ایک کیل پر پانو جماتا چھت کی جانب بڑھا۔ دیواریں کتنی اونچی تھیں اور چھت کون سے آسمان پر تھی۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کوئی ستارہ نہ تھا... چھت کی جانب بڑھتے ہوئے کئی بار پھسلا۔ کیلوں میں ٹنگا۔ پھر بڑھا اور پھر پھسلا اور یہ نہ پتہ چلا کہ کتنے ہاتھ بڑھتا ہوں اور کتنے ہاتھ پھسل جاتا ہوں اور کہ زمین سے کتنا اوپر ہوں اور آسمان سے کتنا نیچے ہوں اور کہ چھت کون سے آسمان پر ہے۔

("مقتل"، از بلراج مین را)

کپڑے پر پسینے کی ایک ندی بہی چلی جا رہی ہے جو گاؤں کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ نوح کی کشتی میں انھیں کھیتوں میں لگی ہوئی اناج کی بالیاں تھیں جن کے بدلے اب کساٹا آئس کریم رکھی جائے گی۔

کساٹا آئس کریم کھانے کے لئے جو چیونٹی آگے بڑھ رہی تھی وہ میرے پانو کے نیچے آگئی ہے میں اس چیونٹی کی تصویر بنا چکا ہوں اس میں ہر رنگ بھر دیا ہے مگر "وہ" کہہ رہا ہے ابھی ایک رنگ باقی ہے۔ میں اور چیونٹی دونوں کساٹا آئس کریم کھانا چاہتے ہیں وہ کہتا ہے دونوں اپنے اپنے مقدر کا لے لو تاکہ یہ رقابت ختم ہو۔ میں شرمندہ ہوں اگر نوح آکر دیکھیں کہ میں ابھی چیونٹی کی تصویر بھی مکمل نہیں کر پایا تو وہ کیا سوچیں گے۔

("خشت وگل"، از سریندر پرکاش)

سیاہ کمرے میں، سیاہ روشنی میں، سیاہ لباس میں، سیاہ کرسی میں، دھنسا ہوا سیاہ میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی جو سیاہ قلم سے سیاہ کاغذوں پر سیاہ عبارت لکھتا ہے۔ میری مشکل بن گیا ہے... وہ آدمی جس کی کل کائنات ایک کمرہ ہے جہاں دنیا بھر کی سیاہی سمٹ گئی ہے۔ کمرے کے باہر رات کمرے کے اندر سیاہی ہے۔ جہاں رات گئے تک وہ لکھتا رہتا ہے۔ سیاہی بھی خاموش ہے۔

("کمپوزیشن ا"، از بلراج مین را)

اگر میں چاہتا تو انھیں دکھاتا کہ پانی ان کی سنگینوں سے رس رس کر میرے ہاتھ کی جانب لپک رہا ہے۔ اور میں وہ پانی اپنی گود میں بھر لاتا اور اس پانی میں گدلی مٹی بھری ہوئی اور وہ گدلی مٹی بھرا پانی ہمارے اندر اترتا۔ میرا جی چاہتا کہ وہ گدلا مٹی بھرا پانی میرے اندر اترے... اور جم جائے، جم جائے اور وہ دیوار ٹوٹ جائے جس کی تہ میں میں پڑا ہوں مگر ایک پانی پر اتنے بہت سوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اور میں چلا آیا۔ جب چلا آیا تو وہ آپس میں باتیں کرتے تھے۔ دیکھو کنویں کا پانی سوکھ گیا، کنویں کا پانی زمین چوس گئی ہے اور میں نے جاتے جاتے دیکھا کہ کنواں ایک اندھا گڈھا ہے اس لئے میں نے گھر آکر ماں سے کہا نہ کنواں ایک اندھا گڈھا ہے۔

("ایک پورتاژ"، از خالدہ اصغر)

اگرچہ کسی افسانے کے درمیان سے منتخب کیا گیا نثر پارہ پوری صورت حال کی توضیح نہیں کرتا تاہم ان تمام اقتباسات میں یکساں ذہنی رویے کے نشانات بہت واضح ہیں۔ ان تمام افسانوں میں اول تو خود وہ معمول پیش منظر میں ہے جسے کبھی بیان واقعہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ دوم اس زبان میں Precision اور شدت پر اس کے مقصود بالذات ہونے کی حد تک اصرار نمایاں ہے۔ سوم یہ کہ ان میں علائم کی تمام تعبیرات فکر کی راہ سے ہو کر ہی جذبے اور رویہ (Attitude) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور مزید یہ کہ استعاراتی اظہار Expression Figuration جس طرح اپنی تفہیم کے Process میں کسی براہ راست منطق کو قبول نہیں کرتا اسی طرح بیان کی حدود میں ترتیب و تسلسل سے بھی انکار کرتا ہے۔ ان افسانوں میں بیان واقعہ کی اپنی منطق ہے اور فکر و تجربے کی براہ راست نمائندگی Representation کے حوالے سے اپنا جواز رکھتی ہے۔

استعاراتی اظہار اپنی منزہ ترین صورت میں اپنے حسی حوالوں کو Supress کرتا اور علائم کے انتخاب و ترتیب کی بعض مخصوص صورتوں سے ان کی تعبیرات و انسلاکات کے وہ ابعاد روشن کرتا ہے جو ہماری فکر کی راہ سے ہو کر ہمارے احساس پر اثر انداز ہوتی ہیں کہ استعاراتی انداز میں موضوع (Tenor) کے تئیں ہمارے رویے کی تئیں معروض Vehicle کے ذاتی اوصاف اور اس کے استعمال کی نوعیتوں کی پابند ہوتی ہے۔ مثال انور سجاد کی جس کے بعض Vehicle ملاحظہ ہوں:

مردہ شخص کی کھوپڑی، ہڈیوں کا ڈھانچہ، گائے، بچھو، پروں سے عاری پرندہ، پتوں اور شاخوں سے بے نیاز ٹنڈ منڈ درخت، سوکھی سوکھی بنجر زمین (کیکر) غبار، سیاہ رات، تیز دھوپ، پتھر، بگولا، اور مختلف آلات حرب... یہ اور اس نوع کے تمام Vehicles انور سجاد کے افسانوں میں Barrenness بے حسی ہمارے مختلف حواس کی قوتوں میں رفتہ رفتہ زوال، شادابی اور سکون سے ہماری بڑھتی ہوئی دوری کا وہ منظر نامہ مرتب کرتے ہیں جو اب ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا مقدر ہیں۔ مشینوں سے بڑھتے ہمارے ربط نے ہماری حسوں کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ نرم و شاداب ترین بدن تک بھی ہماری رسائی لوہے اور پتھروں کے Vehicle کے حوالے سے ہوتی ہے۔

...اس نے اپنی آنکھیں مل کر سامنے دیکھا... لوہے کے بازو اس کو اٹھانے کے لئے اس کی طرف بڑھے تھے۔ شیشے کی گول گول چمکتی آنکھیں... تمام جسم جامد... میں نے نرم نرم ہاتھ چھوئے تھے یہ پسٹن کہاں سے آگئے؟...

("مرگی"، از انور سجاد)

مزید یہ کہ تکنیک کی سطح پر انور سجاد بیشتر ایک علامت کی توسیع کے لئے چھوٹی بڑی علامتوں کے جو Cluster منتخب کرتا ہے وہ بھی اپنی فطرت میں مرکزی علامت کے اوصاف سے اسی حد تک ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ پورا افسانہ علامت کی سطح پر ایک نامیاتی کل میں ڈھل جاتا ہے۔ صرف ان صورتوں کے علاوہ جہاں وہ

خودکوئی تضاد ابھارنا چاہتا ہے، جیسے "کونپل" میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔

اس سے مختلف تکنیک کی صورت سریندر پرکاش ("ساحل پر لیٹی ہوئی عورت") اور غیاث احمد گدی ("پرندہ پکڑنے والی گاڑی") کے یہاں نمایاں ہے۔ جہاں چھوٹی بڑی علامتوں کے باہم امتزاج سے ایک مرکزی تصور کی ترسیل کی کوشش کی گئی ہے۔

ان تمام صورتوں میں اول تو استعاراتی اظہار خود حسی تجربوں پر ذہن و فکر کی فوقیت کا علامیہ ہے کہ کسی موضوع کے لئے معروض (Vehicle) کا انتخاب حسی مشاہدے (Sense perception) کے بجائے ذہن کے ایک خاص تحرک اور موضوع (Tenor) سے متعلق تصور کی معروضی (Vehicle) پر توسیع کا عمل ہے۔ مزید یہ کہ یہ معروض جیسا کہ ابھی مذکور ہوا خود بھی اپنے حسی اوصاف کے اعتبار سے Neutral ہیں۔ اس لئے Visualise کئے جانے کے باوجود ہمارے دیگر حواس پر ان کا اثر ان سے متعلق Concept کی ترسیل کے مقابلے میں ناقابل اعتنا ہی رہتا ہے۔

زبان کی یہ تجرید ہمارے عہد کے مخصوص اوصاف (تعلق، قطعیت (Precision) اور اشیا و افراد کے تئیں ہمارا سرد کاروباری رویہ) کا لازمی نقطۂ اختتام ہے اور یہ تجرید اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ جب افسانوں کی پوری فضا شادابی سے محروم ("کیکر"، "برف پر مکالمہ"، "آخری کمپوزیشن") اور کردار بے نام و سیال ہوں۔ (مین را اور انور سجاد نے تو بیشتر ضمائر کے ذریعہ ہی کرداروں کا بیان کیا ہے اور کہیں کہیں تو صرف س، ف، ب جیسی جیومیٹریکل نشانیاں ہیں۔)

انتظار جالب نے "پھندنے" کی زبان کی پر مجرد تعقلاتی کنسپشن نہ ہونے کی قید لگا کر اگرچہ لسانی تشکیل کی اپنی بنیادی Thesis کا جواز فراہم کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے الفاظ اپنے معروض کی حسی تعبیروں سے، اور بیان سے ابھرنے والے پیکر کی بھی تعبیروں سے دستبردار ہونے لگتے ہیں، اور بیان سے ابھرنے والے پیکر کی تعبیرات "معنی و مفہوم کا سلیقہ غیر معروضی قرینوں سے ظاہر" (۲) کرتی معلوم ہوتی ہیں جو تجریدی زبان کا اہم وصف ہے۔ "پھندنے" کے یہ اختتامیہ جملے ملاحظہ ہوں:

> وہ اپنا سامنا ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں معروف رہی۔ بن کھائے پئے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنکے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا۔ آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی... دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے اس کے گلے میں آزار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔ دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے... وہ خاموش کھڑی آنکھیں آئینے میں گاڑے رہی۔ جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی...

جسم، شادابی سے محروم (جس کا رس کتوں نے اور بلیوں نے چوس لیا تھا۔ اور جس سے منفو "گمنی لسی" سے تشبیہ منسلک کرتا ہے) رنگوں سے پتا ہوا اور بے جان زیوروں سے آراستہ... اور یہ آرائش اس درجہ بھیانک ہے کہ چور تک چیخ کر بھاگ نکلا... ساری اشیا حیات کی حرارت سے محروم ہیں۔ تحجر، جنس کی تشدید (Violence) کا استعارہ بھی ہے۔ دل کے پاس رنگوں سے بنے خول میں جگہ کی کمی کے سبب یہ خول شعیت سے عاری بے حسی کے ایک خاص تصور کی ترسیل کر رہا ہے۔ (مجرد تصویریں بنتی رہیں مگر تھنوں کے دودھ سوکھتے رہے... پنکھا چلتا رہا دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔) اور گلے کے پھندنے رنگوں سے نہائے جانے کے سبب افسانے کے پینٹر سے لڑکی کے تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن یہ وہ حقیقی لال پھندنے نہیں جنھیں گلے میں پھنسا کر جھاڑیوں کے پیچھے خادمہ قتل کی گئی تھی۔ "پھندنے" کی وہ شعیت جو خادمہ کے قتل کے بیان میں اپنے رنگ ریشمی ہونے کے سبب مخصوص نرمی اور ایک خاص شکل کی تصویر کے سبب تمام حواس کو متحرک کرتی تھی، افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اپنی شعیت سے دست بردار ہو کر شدید جنسی ہیجان کے اس استعارے میں ڈھل جاتی ہے جس کے معنی کی معروضی شہادتیں معزول ہونے لگتی ہیں اور ان کی جگہ ایک خاص نوع کا استدلال لینے لگتا ہے۔

مین را کی زبان معروض سے (Sensuousness) کے انقطاع اور (اس کے منفرد اوصاف سے قطع نظر) اپنی فکری تعبیرات کے سبب اس اقتباس کی توسیع معلوم ہوتی ہے:

> جب اس کی آنکھ کھلی وہ پھر ایک نہ تھا کہ آنکھیں لگنے سے پہلے وہ ایک سے کئی ہو گیا تھا۔ اور اس کے کئی پاؤں سنبھالے نہ سنبھلتے تھے کہ اس کے سر گھوم رہے تھے اور وہ دھڑام سے گر گیا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی وہ ایک تھا۔ اور مجروح تھا۔ اور کرچی کرچی کاؤنٹر کے چوکھٹے میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ کرچی کرچی کاؤنٹر کی ایک نوک اس کی پسلیوں میں اتری ہوئی تھی اور شیشے کے ان گنت ذرے اس کے جسم میں داخل ہو گئے تھے۔ اور وہ اس بے نام سی لذت سے دوچار تھا۔ جو اس کے جسم کی دیکھی بھالی ہوئی تھی۔
>
> ("پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ"، از بلراج مین را)

یہ زبان جدید آدمی کے مزاج کی تجدید کا کامیاب ترجمہ ہے، جسے نئے افسانہ نگاروں نے اظہار کے معمول کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا اور لفظ سے اپنے عہد پر اپنی شہرت اور ستائش کے زیاں کی قیمت پر بھی قائم رہے (۳)۔

تجدید کی اس عام روش کے متوازی انتظار حسین نے زبان کے ذائقے

میں داستانوں کی حلاوت کے امتزاج کا انوکھا اور کامیاب تجربہ کیا ہے۔ انتظار حسین کے نزدیک اپنی روایات واقدار کی اجڑی ہوئی بستیوں کی بازیافت کا واحد ممکن ذریعہ یہی ہے کہ:

> متروک لفظ گمشدہ شہر ہیں اور ایک اسلوب بیان کے متروک ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ احساس کا ایک سانچہ گم ہوگیا۔ آج گمشدہ لہجوں اور عاق کے لئے ہوئے اسالیب بیان کو نئی صورت حال سے مربوط کر کے استعمال کرنے اور نئے رشتوں میں پرونے کے معنی یہ ہیں کہ کھوئے ہوئے سانچوں، ذات کے گم شدہ حصوں کو دریافت کیا جارہا ہے اور انھیں حاضر میں سمویا جارہا ہے۔

ماضی بعید میں ہمارے رشتوں کے استحکام اور ہماری بصیرتوں کے فروغ کا نتیجہ اس کے منطقی اور لازمی نتیجے سے مختلف نکلا اور زوال وانتشار کی اس غیر متوقع صورت حال نے مستقبل کی ضمانتوں پر سے فرد کے یقین کی عمارت ہی منہدم کردی۔ انتظار حسین نے اس دہشت، غیر منطقیت اور انتشار کو از کم زبان کی سطح پر ترکا حسن عطا کرنے کی سعی مستحسن کی ہے اور یہ زبان پر ان کی انوکھی گرفت کا کرشمہ ہے کہ تقریباً ہمیشہ کامیاب رہے۔

"یہ گمشدہ شہر" انتظار حسین کے افسانوں میں اپنی حیات کا اسلوب بھی اپنے ساتھ لائے ہیں چنانچہ "شہر افسوس"، "دوسرا گناہ"، "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے"، وغیرہ میں نہ صرف یہ کہ لفظیات قدیم کتھاؤں اور افسانوں سے منتخب کی گئی ہے بلکہ اظہار کی ٹونیتیں بھی داستانوی ہیں کہ بقول شمیم حنفی انتظار حسین کی کہانیاں پڑھتے وقت سنائی بھی دیتی ہیں۔ اظہار کا یہ وظیفہ جو لازمی طور پر ان کی لفظیات کو تجدید سے محفوظ رکھتا اور اسی مناسبت سے تخیل کو تحریک دینے اور کسی خاص لمحے وقوعے یا صورت حال کی اس کے تمام حسی حوالوں کے ساتھ بازیافت کی قدرت عطا کرتا ہے۔ معمول کی سطح پر یہ قوت ان Vehicles کی رہین منت ہے جن کے حوالے سے انتظار حسین واقعہ کا بیان کرتا ہے۔ انور سجاد کے مقابل انتظار حسین کے ایک افسانے میں ملاقات کا بیان ملاحظہ ہو:

> رافیہ گندم کے خوشے کی مانند شاداب اور میدے کی لوئی کے مثال نرم اور چٹی تھی۔ گات خوب اور خوشنما اور سینہ جیسے گھی دودھ میں گوندھے میدے کے دو پیڑے۔ تو بختاور نے بڑے کنوے کے من پر اسے تاکا اور پانی سے چھلکتے ڈول کی طرح اسے کھینچا اور سیراب ہوا...
>
> ("دوسرا گناہ" از انتظار حسین)

زبان جو تکنیک کی پابند ہے، انتظار حسین کے داستانوں اور رمزیہ اسلوب کے سبب مخیلہ کو تحریک دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور اپنے تمثیلی مزاج کی بنا پر ذہن کے اس مخصوص تحرک پر اصرار بھی نہیں کرتی جو علامتی یا استعاراتی اظہار کا خاصہ ہے۔ انتظار حسین کے یہاں علامتیں کم ہیں۔ وہ داستانوں کتھاؤں یا قدیم اسلامی روایات کے حوالے سے جدید تر مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے تمثیلی اور رمزی انداز بیان کو علامتی اظہار پر فوقیت دیتا ہے کہ لفظ کو اس کے حسی حوالوں کے ساتھ محفوظ رکھنے کی یہ ایک معتبر صورت تھی اور اس تمثیل کی مناسبت سے ہی اس کی زبان Sensuous اور Concrete ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ اس مشینی عہد میں فطرت سے ٹوٹتے ہوئے رشتوں سے استواری کی صورت بھی انتظار حسین نے نکالی۔ اور وہ یہ کہ بیشتر Vehicle فطرت کے مظاہر سے منتخب کئے (رات، سورج، چاند، آگ، سانپ، کتا، یا پس منظر کے طور پر جنگل وصحرا وغیرہ) اور اس طرح تجرید کی سختی سے نکال کر ہماری تمام حسوں کو بیدار رکھنے کا سامان فراہم کیا۔

اظہار کے ان دو اسالیب کے درمیان جدید تر افسانہ نگاروں کا تلاش کردہ نقطۂ اشتراک جو نئے افسانہ میں معمول کی حیثیت سے مقبول ہوا اپنی علامتیت کے باوجود تجرید کی بے کیفی سے آزاد اور اپنے اجزا کے باہم ربط سے خلق شدہ تعبیر کے حسن سے مزین ہے۔ نیر مسعود کا "مارگیر" اس کی مثال ہے۔ اس افسانے کی نثر Precision اور شدت اظہار کی مثالی صورت ہے۔ لفظ احساس در پے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کے سبب افسانے میں بیان کردہ مدارج کے تمام العباد کی نہ صرف یہ کہ ترسیل کرتے ہیں بلکہ خود اس تغیر کے اظہار کے صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح بشمول "مارگیر" نئے افسانے کی زبان اس نظریہ کی توثیق کرتی ہے۔ کہ لفظ ترسیل مدعا کا ذریعہ محض نہیں بلکہ خود اپنی تعبیرات و انسلاکات کے حوالے اس صورت حال کی تجسیم Embodiment ہے۔

بیان واقعہ کے متوازی علامتی توسیعات کا یہ عمل "بجوکا"، "بازگوئی" اور خالدہ اصغر کے افسانے "سایہ" کے علاوہ بعض نئے افسانہ نگاروں کے یہاں نمایاں ہے اور یہ ایک خوش آثار حقیقت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے جدید تر اسالیب کے تجربے اور اپنی روایت کے عرفان کے امتزاج سے اظہار کے ایک نئے بعد کی بنا ڈالی ہے جس میں لفظ کی تجرید وتجسیم اس کے فکری وحسی حوالے وراس کی علامتیت اور سادہ بیانی کے حدود اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ موجودہ تنقیدی اصطلاحات کی نارسائی کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں ☆☆☆

حواشی

(۱) I.A.Rchards نے زبان کے انواع استعمال کی بحث میں Emotive use کو Symbolic use کے مقابل رکھا ہے اور اس Symbolic use سے اس نے لفظ کے ساتھ اس کے معروض کی روشناسی مراد لی ہے۔ بلاشبہ اردو میں اصطلاحات کے فقدان کے سبب نئے ادب کی تعبیر وتشریح کے لئے تنقید نگاروں کے ہراول دستے کو اپنی اصطلاحات خود بنانی تھیں لیکن Logical کو Emotive کا مقابل نہیں کہہ سکتے، جیسا کہ محمود ہاشمی نے سمجھا ہے۔ لفظ کے اس Emotive Approach کی اپنی ایک منطق ہے، خصوصاً جب لفظ کے انسلاکات ذہن وفکر کو متحرک کرتے ہوں۔

(۲) فلک الافلاک وہ انتہائی حالت ہے جہاں پر معنی ومفہوم کا سلیقہ غیر معروضی قرینوں سے ظاہر ہوتا ہے (انگار رجالب)۔

(۳) سوطے پایا کہ میں، کہ جو ادیب ہے میرا پہلا عہد لفظ سے ہے، لفظ کی حرمت سے ہے (انور سجاد)۔

دیباچۂ "غرۃ الکمال" کی معنویت

قاضی جمال حسین

شمارہ ۱۶۸،
مارچ تا مئی ۱۹۹۳

امیر خسرو کے تیسرے دیوان "غرۃ الکمال" کا دیباچہ اس اعتبار سے زیادہ اہم اور لائق توجہ ہے کہ وہ حیات خسرو کا ایک مستند اور بنیادی ماخذ ہونے کے علاوہ ان کے تصور شعر اور نظریۂ شاعری کو بھی واضح کرتا ہے۔ خسرو کے سوانح نگاروں نے اس دیباچہ کو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے دیکھا اور مستند حوالے کے طور پر استدلال کیا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مصنف کی زندگی کے متعدد واقعات، سنین کی تعیین، ہندوستان سے ان کی محبت اور ہندی زبان سے ان کے گہرے لگاؤ نیز درباروں سے وابستگی کی بہت سی تفصیلات اسی دیباچہ کی شہادتوں سے پایۂ استناد کو پہنچتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ سوانحی مواد کے علاوہ دیباچہ کے ان مباحث پر بھی توجہ دی جاتی جو باعتبار کیت بھی سوانحی مواد سے کم نہ تھے کہ خسرو نے زبان و بیان کے وسائل پر قدرت کے پیش نظر، کائنات میں انسان کے مرتبے اور خود انسانوں میں مرتبہ اور منزلت کی درجہ بندی کے اصول پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پھر دیگر پیرایہ ہائے اظہار کے مقابلے میں شاعری کا نثر، شعر کے تفاعل، اور شعرا کے امتیازات کو اپنے مخصوص اسلوب میں واضح کیا ہے۔

شعر گوئی پر اپنی بے مثال قدرت اور اپنے شعری اکتسابات کو خسرو اپنے جملہ دیگر اکتسابات پر نہ صرف ترجیح دیتے ہیں بلکہ اسے ایک ایسا چراغ قرار دیتے ہیں جو حوادث زمانہ سے محفوظ ہے۔ شعر کی وفاداری اور حق گذاری کے باب میں خسرو کا خیال تو یہ ہے کہ شعر "وفادار یست کہ کجا رود، نام منشی خویش خداند۔ حق گذار یست کہ گویندہ گاں را بر نام شاعر سجدہ کنانند" (دیباچہ "غرۃ الکمال"، ص ۷۳)۔

لیکن خسرو کے سلسلے میں اب تک جو کام اردو میں ہوا وہ زیادہ تر سوانحی نوعیت کا ہے یا حسب توفیق و استعداد، کلام خسرو کی خصوصیات و امتیازات کے بیان پر مشتمل ہے۔ خسرو خود شعر و شاعری کو کیا سمجھتے تھے، شاعری یا نثر کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے؟ شاعری اور شعرا کی درجہ بندی یا مختلف صنعتوں کے سلسلے میں ان کی اولیات، یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر اب تک کماحقہٗ توجہ نہ دی جا سکی جب کہ دیباچے کے ان مباحث کی قدر و قیمت کا احساس عام تھا۔

ڈاکٹر وحید مرزا بھی، جنھوں نے امیر خسرو پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے، دیباچۂ "غرۃ الکمال" کے ان مباحث کے محض اجمالی ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس کے علاوہ دیباچہ میں کئی اور مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً فن شاعری کی خوبیاں کیا ہیں، فارسی شاعری کو کس بنا پر عربی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے، شعر کی اقسام کیا کیا ہیں، ہندوستان کی فارسی شاعری کو کیوں امتیاز حاصل ہے، شاعری میں مہارت کن طریقوں سے پیدا کی جا سکتی ہے وغیرہ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگرچہ دیوان "غرۃ الکمال" کی نظمیں بہت قابل قدر ہیں لیکن اس کا دیباچہ زیادہ بیش قیمت چیز ہے ("امیر خسرو" از ڈاکٹر وحید مرزا، ص ۲۱۶)۔

پروفیسر ممتاز حسین کو بھی خسرو شناسی کے اس پہلو کے تشنہ ہونے کا احساس ہے۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ابھی تک تو کسی نے ان کے صنائع و بدائع کا بھی مکمل جائزہ نہیں لیا ہے۔ انھوں نے طرح طرح کے صنائع و بدائع ایجاد کیے ہیں۔ ایک صنعت ایہام ذوی الوجوہ تام کی ایجاد کی۔

اس صفت کے تحت ایک شعر کے سات مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں۔("امیر خسرو دہلوی" از ممتاز حسین، ص ۳۵۶)

لیکن ممتاز صاحب نے خود بھی مکمل تو کجا، ان صنعتوں کا نامکمل جائزہ بھی نہیں لیا۔

خسرو نے اپنے تیسرے دیوان "غرۃ الکمال" کا یہ دیباچہ ۶۸۵ ہجری میں تحریر کیا اور ان کے بیان کے مطابق اس وقت ان کی عمر ۳۴ برس تھی۔ اس سے قبل ان کے دو دیوان "تحفۃ الصغر" اور "وسط الحیاۃ" مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن خسرو خود بھی ان دونوں کو "غرۃ الکمال" کے مقابلے میں فنی اعتبار سے فروتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "غرۃ الکمال" کو مذکورہ دونوں دیوانوں سے اس لئے علیحدہ ترتیب دیا گیا تھا کہ "درنوالہ، استخوانے وزیر دندانے سنگریزہ نیاید" (ص ۶۸، دیباچۂ "غرۃ الکمال")۔

اس وقت تک ان کا شعور پختہ اور ذہن زیادہ مرتب ہو چکا تھا۔ دیباچہ کے مباحث سے بھی ذہن و شعور کی ترتیب و تنظیم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ قرآنی آیات اور احادیث کو مقدمات کی ترتیب میں مسلمات کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور نتائج کے استنباط میں منطقی واستدلالی طریقۂ کار سے کام لے کر اپنے موقف کی تائید کی گئی ہے۔ مثلاً جملہ مخلوقات پر نطق و گویائی کے سبب انسان کے تفضّل، اور قدرت کلام کے مطابق انسانوں میں باہمی شرف کی درجہ بندی کر کے اور شاعری کو کلام کا افضل ترین پیرایہ قرار دے کر خسرو نے شاعری، علم اور حکمت کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ بلکہ تفصیلی بحث و تمحیص کے بعد خسرو، گفتگو کو اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں۔

> ہر کرا حکمت دادہ شد اورا خیر بسیار دادہ شد۔ وخیر البشرؐ در خبر حکمت را قسمے از شعر گوید، نہ شعر را قسمے از حکمت، کہ ان من الشعر لحکمۃ۔ پس دریں صورت شعر بالاتر از حکمت باشد و حکمت در تہ شاعر داخل بود۔ وشاعر را حکیم تواں خواند، اما حکیم را شاعر نہ تواں جست۔ سحر را از بیان می فرماید، نہ بیان را از سحر، پس شاعر را ساحر تواں گفت، ساحر را شاعر نہ تواں شمرد
>
> (دیباچۂ "غرۃ الکمال" ص ۲۲)۔

خسرو کا موقف یہ ہے کہ انسان کی فضیلت اور عظمت سے متعلق آیات و اخبار دراصل زبان و بیان پر اس کی قدرت اور وسائل اظہار پر اس کی دسترس کو واضح کرتی ہیں۔ **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، یاصور کم فاحسن صورکم** کی قرآنی آیات دراصل کلام کی زینت سے تختۂ خاک طینت کو آراستہ کرنے کا بیان ہے۔ خسرو نے انسان کا جوہر اصلی، قدرت کلام کو قرار دے کر اس کا رشتہ اسرار خداوندی سے قائم کیا ہے۔ کہ اس کی تہ کو پانا یا محاسن کلام کا احاطہ کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

> بریں نکتہ کانسان رمز خداست
> قل الروح من امر ربی گواست
>
> (دیباچہ ص ۸)

کلام کی اس بے پایانی اور محاسن کلام کے تفاعل کی بے نہایتی کو نہایت صراحت سے وہ اپنے مخصوص اسلوب میں یوں واضح کرتے ہیں:

> فی الجملہ در فضل کمال اکامل انام، وافاضل ایام، کتابہا ساختہ اند۔ وبا آنکہ تا یوم الحساب دفترہا بہ پرداخت خواہند رسانید، ہم واجب کند کہ ممکن نہ گردد قطرۂ از دریا بیروں ریختن۔ زہے زبدۂ بحور غیب کہ از غیب رحمت رحمانی وفتح باب آسمانی، بریں پارۂ خاک ظلمانی از برائے نشو ونمائے نبات معانی فرود فرستادہ اند (دیباچہ ص ۱۴)۔

مصنف کے ان خیالات کو محض زور بیان یا عبارت آرائی پر محمول کرنے کے بجائے زبان و بیان کے ایک نہایت سوچے سمجھے نظریہ کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کہ زبان کی وہ کیا صفت ہے اور کلام کا وہ کون سا حسن ہے کہ دفتر کا دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی بیان کے سرچشمۂ فیضان کا سراغ نہیں ملتا؟ اس دریائے ناپیدا کنار کا ایک قطرہ بھی انسانی دسترس سے ماورا ہے۔ کلام کا ایسے صفات پر مشتمل ہونا کہ اس کی کنہ تک رسائی ناممکن ہو، کسی ایسے نظریۂ زبان کا اشاریہ ہے جو تعیین معنی سے زیادہ معنی کی عدم قطعیت پر اصرار کرے۔ خسرو کے نزدیک کلام کی یہ پراسراریت اور بے پایانی جو غیب سے اس کی ازلی وابستگی کے سبب ہے، پارۂ خاک اس نعمت کی ارزانی کا سبب، نہال معنی کی نشوونما ہے۔ "از برائے نشو ونمائے نبات معنی" کا ٹکڑا خاصا فکر انگیز ہے کہ لفظ و معنی کے باہمی رشتے کی نوعیت یہیں سے آشکار ہوتی ہے کہ دونوں اپنے وجود میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

خسرو کے اس نظریۂ کلام کو اگر ہم جدید ترین فلسفۂ زبان کے متوازی رکھیں تو اس کی معنویت مزید روشن ہو جاتی ہے۔ جہاں تکثیر معنی (Plurality of meaning) کے بجائے اس کے التوا (Deferment) اور زبان کی تخم ریزی کے مسلسل عمل کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ زبان کی اسی بے پایانی اور تسلسل کو خسرو نے "واجب کند کہ ممکن نہ گردد" کہہ کر واضح کیا ہے۔ عبارت میں واجب اور ممکن کی رعایت لطف سے خالی نہیں کہ اپنے لغوی معنی سے قطع نظر اصطلاحی معنی میں واجب الوجود اور ممکن الوجود، موجود کی دو انتہائیں ہیں اور کلام کا رشتہ غیب اور واجب الوجود سے استوار ہے۔

خسرو نے دیباچۂ غرۃ الکمال میں متن (Text) کے تفاعل کا بھی ذکر کیا ہے جس سے عبارت (Text) کی اہمیت اور علم پر متن کی اصلیت واضح ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں متن جو وسیلۂ اظہار ہے وہ معنی سے اہم ہے کہ ادراک معنی عبارت کے بدون ممکن نہیں۔ علم کی سیال اور بے نام معنوی حقیقت عبارت کے پیکر محسوس کی پشت پناہی کے بغیر صورت نہیں پکڑتی۔ دریائے معانی کو عبارت کی رہ گذر ہی ذہن کے خلوت کدہ سے باہر آنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ معنی کی تشکیل اور اس کی شناخت قائم کرنے کا وسیلہ "عبارت" ہے۔ متن کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ وہ معنی یا علم کو کیوں کر مخصوص ہیئت عطا کرتا اور اسے لائق ادراک بناتا ہے۔ خسرو کی عبارت ملاحظہ ہو:

> تبحراں دانند کہ ہمہ دریائے علم را گذر بر معبر عبارتست کہ اگر عرائس علوم را لباس سخن نہ باشد، ہرگز از خلوت گاہ ذہن تجلی نہ

توانند نمود وہم ورحجلۂ خجلت رو پوشیدہ بمانند۔ پس معلوم گشت
کہ معنیٔ علم محتاج است بہ صورت عبارت، وآئینۂ ایں خیال
برعکس نیست (دیباچہ، ص ۹)۔

"ایں خیال برعکس نیست" کا اضافہ Text کے خود مکتفی اور قائم بالذات وجود کی طرف واضح اشارہ ہے۔ کہ کلام یا عبارت اپنے وجود کے لئے محتاج معنیٰ نہیں جبکہ معنیٰ کا تصور عبارت کے بغیر محال ہے۔

خسرو کے یہاں زبان و بیان کے موضوع پر اس نوع کے مباحث حیرت انگیز ہیں۔ ان مسائل پر ان کی زبان اور ان کا نقطۂ نظر دونوں لائق صد آفریں ہے۔ علم اپنے اظہاری پیکر میں عبارت سے اس درجہ ہم آمیز ہو جاتا ہے کہ دوئی کی کیفیت باقی نہیں رہتی۔ لباس اور جسم کا تفاوت عینیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لفظ و معنیٰ باہم مل کر ایک ایسے کل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کی علیحدہ شناخت باقی نہیں رہتی۔

عین شعر یا عین علم بہ لفظ و معنیٰ آشنائی تمام دارد، اما در لفظ
چناں کہ کلام مجید بداں خبری دہد کہ **وهم لا يشعرون**،
اے **لا يعلمون**، اما در معنیٰ چنانکہ از رسول بہ ما رسیدہ است
علیہ السلام کہ **ان من الشعر لحكمة**، وحکمت بمعنیٰ علم در
قرآن متین وآیات مبین است کہ **ومن يوتی الحكمة
فقد اوتی خيراً كثيراً**۔ اینجا حکمت بمعنیٰ علم است۔ پس
دریں صورت شاعر بمعنیٰ عالم باشد۔ فکیف عالمے کہ شاعر
باشد، او خود داند کہ اعلم باشد (مخطوطہ دیباچۂ "غرۃ الکمال"
مملوکہ علیگڈھ یونیورسٹی، ص ۲۱)۔

لفظی اور معنوی ہر دو سطح پر شعر اور علم کا اپنی عینیت اور ماہیت میں متحد ہونا خسرو کے تصور شعر کی تفہیم کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

دیباچۂ "غرۃ الکمال" کی ایک اور دلچسپ بحث، نثر اور شاعری کے باہمی امتیاز سے تعلق ہے کہ وہ کیا صفات ہیں جو شعر اور نثر کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہیں، اور شعر کیوں کر کلام کی ارتقائی اور افضل ترین صورت ہے؟ خسرو کہتے ہیں کہ شعر کی منطق، نثر کی منطق سے یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ جو باتیں نثر میں ناروا ہیں، شاعری کی قلمرو میں نہ صرف روا بلکہ مستحسن قرار پاتی ہیں۔ خسرو کی عبارت ملاحظہ ہو:

نثر چیست، زباں زدۂ ہر لب وکام، بروں افگندۂ افواہ
خاص و عام، خود کلمۂ ترک ہنجار گفتہ، خود رستۂ شاخ در شاخ
رفتہ، کتابے شیرازہ کشادہ، حسابے از تقویم بیروں فتادہ،
بادپائے بے افسار، جمازۂ گسستہ مہار، در ہمہ قوانین ربط
کارش درہم و بے نظم، و در جملۂ موازین ضبط گفتارش بے
وزن (دیباچہ، ص ۱۸)۔

خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر اور اس کی تمام اصناف، شعر کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ تخلیق کے سرچشمے سے نثر کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو پاتا جو شعر کا ہے۔ ترتیب و تنظیم کا فقدان نثر کو فروتر بنا دیتا ہے جبکہ غایت انضباط، اور اجزا کے درمیان ربط خاص، شاعری کو اسی تناسب سے بلند و بالا منصب عطا کرتا ہے۔ توازن اور آہنگ کا فقدان نثری تحریر کو ایسے گھوڑے کی مانند بنا دیتا ہے جو اپنے اصل جوہر یعنی "رفتار" سے محروم ہے۔ نثر ایک بے لگام سانڈنی ہے۔ ایک خودرو درخت ہے۔ ہر خاص و عام کی دسترس میں ہے۔ اس کی یہ عمومیت ہی اس کی پہچان اور شعر کے مقابلے میں اس کا نقص ہے۔

کتاب کی یہ شیرازہ بندی، اور حساب کی تقویم میں شمولیت، عبارت ہے اجزائے کلام میں ارتباط خاص سے پیدا ہونے والی موزونیت، آہنگ اور استحکام سے۔ شعر کی زبان میں استحکام کو بھی خسرو نے اسی دیباچہ میں ایک جگہ واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں:

اوزان ما، از غایت استحکام، بہ تفاوت حرفے بلکہ بہ تغیر
حرکتے بشکند (دیباچہ، ۲۸)

وزن کا استحکام یہ ہے کہ اس میں ایک حرف کے بھی تفاوت کی گنجائش نہ ہو، بلکہ زیر و زبر کا تغیر بھی وزن کے استحکام کو متاثر کر دیتا ہے اور مصرع بے وزن ہو جاتا ہے۔ شعر کے اسی استحکام اور اس کی لغوی ساخت میں غایت ارتباط کو ایک اور موقع پر خسرو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ شعر میں الفاظ کی نشست اور ان کی ترتیب ایسی (Compact)، گندھی ہوئی اور مستحکم ہوتی ہے کہ اس میں سر مو کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خسرو کی عبارت میں معنیٰ کے ساتھ ساتھ، تجنیس اور رعایت لفظی کا لطف بھی دیدنی ہے۔

موشگافان شعور اشعار، چناں بہ باریکیش برمی یابند کہ
سر مو دراں نہ گنجد (دیباچہ، ص ۱۸)۔

موشگافی اور باریکی کی معنوی رعایت کے علاوہ شعر کے ایک معنیٰ "معرفت چیزہائے باریک" بھی ہیں ("غیاث اللغات" ص ۲۹۳ مطبع فخر المطابع لکھنؤ)۔ پھر "شعور اشعار" کی ترکیب میں مضاف اور مضاف الیہ کے متحد واحد ہونے کا التباس بھی لطف سے خالی نہیں، کہ دونوں کے حروف اصلی یکساں ہیں جبکہ "شعور" بالفتح شعر بمعنیٰ "مو" کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مو، شعر اور سر مو کا اجتماع مختصر سے جملے میں معنیٰ کے مختلف ابعاد روشن کر دیتا ہے۔ اس کے بعد خسرو نثر و نظم کے فرق، نیز نظم کی افضلیت، پر ایک عام مشاہدے کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں کہ نظم کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تحریروں میں جگہ پاتی بلکہ اس کی زیب و زینت کا سبب بنتی ہے۔ نثری عبارت میں اس کی حیثیت نگینے کی ہوتی ہے جبکہ نثر کلام منظوم میں اپنی بے ترتیبی اور بدنظمی کے سبب باریاب نہیں ہوتی۔ نظم کلام موزوں ہے اور نثر ناموزوں۔

نظم را عمد اور نثر آرند، زیرا کہ ہر نظمے کہ در نثر افتد، آرائش
نثر زیادہ گرود چوں نگیں کہ در زر نشانند۔ ونثر را در نظم اصلاً نہ
بیارند زیرا کہ در سرشت مروارید ہیچ آب زیادتی نہ آمیزد۔ و
نظم را چوں بہ شکنند نثر شود، ونثر را تار است نہ کنند نظم نہ شود
(دیباچہ، ص ۱۷)۔

خسرو کا موقف ہے کہ جس طرح عام انسان اپنے نطق و گویائی کے سبب حیوانات سے ممتاز ہے، اسی طرح شاعر، نثر نگاروں سے افضل و بالاتر ہے کہ تصرف سخن کا ملکہ انھیں اخص الخاص میں شامل کر دیتا ہے" چنانکہ عامۂ انسان از طبقۂ حیوانات ممتاز اند، خواص بشر از عوام بہ واسطۂ تصرف سخن مزیت یافتہ اند (دیباچہ، ص ۱۶)۔

نثر و شعر کی ظاہری نحوی ساخت میں تفاوت کے علاوہ معنیاتی سطح پر بھی ان کا تفاعل جداگانہ ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا، نثری منطق، شعری منطق سے بمراحل دور ہے۔ جو بات نثر کا عیب ہے، شعر کی قلمرو میں قدم رکھتے ہی روا، بلکہ مستحسن نظر آنے لگتی ہے۔ قاری، مختلف اسالیب اظہار کو مختلف سطحوں پر وصول کرتا ہے اور کسی انجانے، خاموش معاہدے کے طور پر نثر اور شاعری کے ساتھ مختلف طور پر معاملہ کرتا ہے۔ شعری ماہیت اور اس کی باطنی ساخت میں پنہاں اس قوت کو امیر خسرو نے محسوس کیا اور اس کی جانب واضح اشارے کیے۔ یہ مسئلہ طرز ادا سے زیادہ شعر کی اپنی خود کار منطق کا تھا۔ دیباچے کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

> زہے شعرا کہ از ایشاں بدگفتن ہم نکو آید... یہ بین کہ استادان قدیم چہ حدیث خوب گفتہ اند، کہ در ہر عبارت کہ زور غلبہ زد، زر گردد۔ وسخن اگر ہمہ سحر است، اگر یک نقطہ دروغ در آں افتد، در چشم خواندگان سحر نماید۔ مگر آئینہ ہاے خیال شعر کہ در ہر صورت تزویری کہ قبیح تر از آں صورت تصویرے نتواں کرد، چوں در آں نمی، علی العکس بہ وجہے ہر چہ خوب تر بر تو جلوہ کند۔ پس در چنیں اکسیرے کہ ہر مس درو مین کہ درو ے افتد، زر صامت شود (دیباچہ، ص ۳۵)۔

نثری تحریر میں واقع ہونے والا مذموم جھوٹ شعر میں افسوں کی تاثیر رکھتا ہے۔ یہ تانبا خالص سونا کیوں معلوم ہونے لگتا ہے؟ اس کا جواب "سخن اگر ہمہ شعر است" اور "آئینہ ہاے خیال شعر" میں تلاش کرنا چاہیے، کہ الفاظ کی مخصوص نشست اور نحوی ساخت میں اس سے ترتیب پانے والا معنیاتی نظام اور اس کے انسلاکات میں خیال وہ آئینہ خانہ تعمیر کرتے ہیں جہاں کواکب کچھ سے کچھ نظر آنے لگتے ہیں۔

دیباچۂ "غرۃ الکمال" میں خسرو نے شاعروں کی درجہ بندی، استادی کے شرائط، اور شاگردی کے اقسام کے متعلق بھی گفتگو کی ہے۔ خسرو لکھتے ہیں کہ شاعر تین حال سے خالی نہیں، یا تو اس کا اپنا علیحدہ کوئی طرز ہو گا جس کی نظیر دوسرے شعرا کے یہاں نظر نہ آئے گی، یا وہ متقدمین اور معاصرین میں سے کسی صاحب طرز کا مقلد اور پیرو ہو گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نہ تو خود صاحب طرز ہے اور نہ کسی صاحب طرز کا مقلد، بلکہ دوسرے شعرا کے سرمایہ میں نقب زنی سے شعر و شاعری کا بازار گرم رکھتا ہے۔ تیسری قسم شاعر سے زیادہ سارق اور غارت گر کہلانے کی مستحق ہے۔

شاعروں کی اقسام سے متعلق اس گفتگو کا کلیدی لفظ "صاحب طرز" ہے کہ شاعر کا بلند ترین مرتبہ جسے خسرو "استاد تمام" تصور کرتے ہیں، اس کا صاحب طرز ہونا ہے، جس کی بنیادی شرط اس کا بے نظیر ہونا ہے۔ جبکہ استاد "نیم تمام" کسی طرز خاص کا مقلد ہوتا ہے۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ طرز کی شناخت کا تعلق کسی صنف میں شاعر کے مجموعی اکتسابات اور اس سے قائم ہونے والے مجموعی تاثر سے ہے۔ کسی مخصوص شعری طریقۂ کار پر اصرار، اس کی لفظیات، شعری وسائل میں بعض کی تکرار، اور قاری پر قائم ہونے والا مخصوص تاثر اگر کسی شاعر سے اس طور پر وابستہ ہو کہ اس کی شناخت کا وسیلہ بن جائے تو بڑی حد تک اس شاعر کو ہم صاحب طرز کہہ سکتے ہیں۔ یعنی لفظوں کے برتنے اور مظاہر اور تجربات کے تئیں اپنے رویے اور رد عمل میں اگر چند عناصر ایسے مجتمع ہوں کہ اس کی مثال دوسروں کے یہاں نظر نہ آئے تو ایسے شاعر کو خسرو کی اصطلاح میں "شاعر تمام" کہہ سکتے ہیں۔ خسرو کے الفاظ میں "طرز خاص" کی انھیں صفات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ "علی حدہ طرزے پیدا گردد کہ پیش از اں دیگر را نبودہ باشد۔" یعنی "علیحدہ طرز بود" یا "باشد" کے بجاے "پیدا گردد" کا پیرایۂ اظہار اس عمل کے تسلسل اور رسوخ کو ظاہر کرتا ہے۔ استاد نیم تمام، کسی صاحب طرز کی پیروی یا تتبع میں ممکن ہے کہ اس طرز کو حد کمال تک لے جائے لیکن اس طرز کا موجد نہ قرار پائے گا، کہ "پیش از اں دیگر را نبودہ باشد" کی شرط پوری نہیں کرتا۔

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے خسرو مزید لکھتے ہیں کہ استاد مطلق میں چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ شرط اول یہ کہ اپنی شاعری کا علم ایسے طرز پر نصب کرے کہ اس کے نقارے کی آواز صف اعدا تک پہنچتی ہو۔ استاد مطلق کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے سخن کا دریا، شیرینی اور سلاست میں واعظوں اور صوفیوں کے بجاے شعرا کے نہج پر ہو۔ تیسری شرط استاد مطلق کی یہ ہے کہ اس کی شاعری کا نگار خانہ غلطیوں اور لغزشوں سے پاک ہو۔ چوتھی اور آخری شرط یہ ہے کہ بد دیانت درزیوں کی طرح لوگوں کے بچے ہوئے کپڑوں سے اپنی ہزار پیوند کی قبا نہ تیار کرے۔ یہاں بھی خسرو نے استادی کی پہلی شرط بنیاد "طرز خاص" پر رکھی ہے۔ اور ایسی طرز جو نقارے کی آواز کی طرح نمایاں اور واضح ہو۔

مختصر یہ کہ مطالعۂ شعر، تحسین شعرا کی درجہ بندی کے اصول و معیار متعین کرنے میں ہم آج بھی خسرو کے ان مباحث سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہاں ان مباحث پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں، اس کے لیے مستقل کتاب درکار ہے۔ اگر خسرو نے ان مسائل پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہوتی تو زبان و بیان کے اصولی اور نظری بحثوں کے نہ جانے کتنے اور گوشے منور ہوتے۔ نظریہ زبان، تصور شعر، متن کے تفاعل، اور نثر و نظم سے متعلق خسرو نے جو کچھ محض وجدانی طور پر محسوس کیا تھا، آج بھی ہماری ادبی تنقید اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتی ہے۔ خصوصاً مشرقی شعریات کی تدوین میں خسرو کی تحریریں مشعل راہ ہو سکتی ہیں۔ ان کے نثری سرمایہ کو اس نقطۂ نظر سے ایک بار پھر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس بار ذرا یکسوئی اور توجہ سے ☆☆☆

قاضی سلیم

شمارہ ۱۴،
جون ۱۹۶۷

دیکھتے دیکھتے
چیونٹیاں کتنی روندی گئیں
آخری سانس تک
پلٹ کر جھپٹنے کی امید میں
سر اٹھاتی رہیں

کتنا بے مدعا حوصلہ
دیکھتے دیکھتے مٹ گیا،

رینگتی چیونٹیاں
جلد کو چیر کر
خون میں مل گئیں
میرے اعصاب میں
بجلیاں گھل گئیں
اب میں کوئی اور ہوں

ایک گھائل درندہ
زخم ہی زخم ہیں...
چاہے اپنے ہوں یا دوسروں کے
زخم ہی زخم ہیں...

مجھ پہ اب کوئی ہنستا نہیں
ساری بستی ہے سہمی ہوئی
لوگ سب فلسفے
باندھ کر بھاگ اٹھے

میں اکیلا بڑی دیر تک
خود پہ ہنستا رہا
آئینہ سے یہ کہتا رہا
..."یا تو ہر درد کے کوئی معنی ہیں
یا پھر کسی درد کے کوئی معنی نہیں..."

شمارہ ۱۵،
اگست ۱۹۶۷

سفینہ زندگی کا بحرِ بے پایاں میں کچھ ایسے
چلا آہستہ آہستہ کہ جیسے دھوپ ڈھلتی ہے
نہ جانے کوچ کے لمحات کب آئے تھے، کب نکلا،
سلام آخری لے کر جو پلٹا تو نگاہوں نے
یہ دیکھا ان کے محور اور مبہم اور دھندلے ہیں
نقوش اپنے گنوا کر صرف ہاتھوں کے اشاروں سے
جتاتے ہیں، یہاں ہم ہیں، کہو کچھ اور کہنا ہے؟
سفینہ زندگی کا بحرِ بے پایاں میں کچھ ایسے
چلا آہستہ آہستہ کہ جیسے دھوپ ڈھلتی ہے
کہر ہے، دیدہ نمناک ہے یا صرف دوری ہے
کوئی چہرہ کوئی منظر بھی پہچانا نہیں جاتا
خموشی جیسے ہنگاموں کا بے پایاں تسلسل ہے
صدائیں گونجتی پھرتی ہیں کانوں تک نہیں آتیں
ترخنے کاسۂ سر میں تڑپتے ہیں بھنور کتنے
سیہ بادل برستے ہیں، گھنی زلفوں کو لہرائے
پس دیوار ظلمت محو ماتم ہے کوئی شاید
سفینہ زندگی کا بحرِ ہیبت ناک میں ایسے
چلا آہستہ آہستہ کہ جیسے دھوپ ڈھلتی ہے
دھوئیں کے چند بادل، چند کتبے، چند تحریریں
فضا میں ڈولتی تھی غبار آلود تصویریں
نہ جانے کب ملیں یادوں سے کب تک وہ نظر آئیں
ذرا سی دیر میں موجیں افق تک پھر ابھر آئیں
سفینہ زندگی کا بحرِ بے پایاں میں کچھ ایسے
چلا آہستہ آہستہ کہ جیسے دھوپ ڈھلتی ہے

قاضی سلیم

شمارہ ۳۴،
مارچ ۱۹۶۹ء

اس دن یہ دھرتی کتنی الگ تھی
جیسے پایاب ندی کی پسی ہوئی چکیلی گیلی ریت پہ کوئی چلے
نیند کے مخمل ہاتھوں میں کھلتے پھولوں جیسی نرم ملائم چکیلی
ہر رستہ پگڈنڈی ایک پھسلتا بہتا خواب
در و دیوار پگھلتا موم
امنگوں کے چلتے پھرتے ہیولے دشمن دوست سبھی
جیون کا ہر کل پرزہ چکناہٹ میں پھسلتا بے ٹکراؤ تھا
بے آواز تھا جیسے ہونٹ سے ہونٹ ملیں
خوابوں کی پر جوش اڑانیں جس میں پر نہ ہلیں اور ایک ہی...
...جھونکے میں میلوں دور تک ہم تیرتے منزل پر جا پہونچیں
جب بھی سوچا ایسے لگا
جیسے میں لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھا اک ننھا فاتح ہوں
جو اپنی چکیلی تلوار چلاتا مملکت اپنی کمرہ کمرہ پھیلاتا ہے
کون و مکاں کی وسعت آنگن میں محصور ہے، میرا خدا
...خود میرا دوست مرا ہم عمر ہے مرے ساتھ ہے
اس کے فرشتے میری فوج میں شامل ہیں
لیکن
جس دن میں نے پہلی بار یہ سوچا
پھول کھلے ہیں آج مگر کل کہاں رہیں گے
میری روح کے سناٹوں میں جو راگ بسے ہیں
شور و فغاں میں کیسے جئیں گے
کل کیسی ہوگی... میری محبت کا کیا ہوگا
میرے دل نے پہلی بار تردد کا پھل چکھا
اور اسی دن میرے خدا نے مجھ کو تنہا چھوڑ دیا
اب یہ دھرتی میرے لئے
ایک شکستہ آئینہ ہے
اس کی چکنا چور سطح پر ہاتھ پھرا کر دیکھو
خون کی دھارا بہ نکلے گی

قاضی سلیم

شمارہ ۹۳،
دسمبر ۷۴ء ۱۹، جنوری ۱۹۷۵

اے چراغ... میری روح کے امیں
مجھ سے آنکھ پھیر لے
روشنی بکھیر... ایسے راستوں پہ
...جو فراز زندگی کی سمت جا رہے ہیں
...مجھ کو بھول جا
میری تیرہ بختیوں کو بھول جا

عمر اس گپھا میں رینگ آئی ہے... جہاں
کوئی خار... کوئی کنکری نہیں
سوندھی سوندھی گیلی گیلی باس ہے
خدا کی نرم نرم چھاؤں ہے
موت کی مٹھاس ہے

اے چراغ... میری فکر چھوڑ
...دیکھ اس گپھا سے دور.. چاندنی میں
...آسمان سے پرے
فرشتے اب مرے لئے
سیڑھیاں بنا رہے ہیں
.. یا شاید اپنے خاردار گرز بے سبب گھما رہے ہیں

....ان کو کیا پتہ
چوب خشک اپنے پیڑ سے
کبھی کی کٹ چکی
ایک ضرب
.... یا ہزار
اب بھلا مرا کوئی
کیا بگاڑ پائے گا

اے چراغ... تیری رہبری میں گھوم گھوم کر
اسی گپھا کی سمت لوٹتا رہوں گا... کب تلک
جہاں خدا کی چھاؤں کے سوا
...اور کچھ نہیں
خدا کی چھاؤں سے
ہزار بار لڑ چکا ہوں
... تیرے ہی سبب سے... ایک ایک خواب کے لئے
ہمارے درمیان جنگ ہو چکی ہے
...آج جب
صلح کی گھڑی ہے
مجھ کو تھک کے نیند آ رہی ہے

پھر سے مت جگا
ازل کی جنگ کے لئے
نیا سبب گھڑا نہ کر
مری آنکھ، دیکھنے کا ہر عذاب سہہ چکی ہے
...مجھ کو مت دکھا
مرے چہیتے ساتھیوں کے قافلے
جو فرازِ زندگی کی سمت جا رہے تھے
...سنگ باریوں کی زد میں ہیں
میرے کان ہر صدا کے زخم کھا کے پک چکے ہیں
...سنگ باریوں کی زد میں ہیں
میرے کان ہر صدا کے زخم کھا کے پک چکے ہیں
...مجھ کو مت سنا
میرے بعد آنے والوں کی وہ دردناک چیخ مجھ کو مت سنا

اے چراغ رحم کر
ان کے دکھ نئے نئے ہیں
...میرے تجربوں سے بھی سوا ہیں

...ان کے سینے گولیوں سے بے خبر ہیں
...اور پھیپھڑے
گیس کے مزے سے آشنا نہیں
ان میں تو خدا سے جنگ کا بھی حوصلہ نہیں
آج جب مرے لئے
صلح کی گھڑی ہے
...سب دکھوں کی دھار عادتوں کی زد پہ کند ہو چکی ہے
...سارے سانپ بچھوؤں کا زہر مر چکا ہے
...خواب آفریں ہے
...نیند آ رہی ہے
...پھر سے مت جگا
مجھ کو مت دکھا
مجھ کو مت دکھا
ازل کی جنگ کے لئے
نیا سبب گھڑا نہ کر

قاضی سلیم

شمارہ ۱۸۲،
اپریل ۱۹۹۵

سوتے جاگتے چاند ستاروں کی مخمور نگاہوں نے دیکھا
بونے ٹھٹھرے پودے اور چھتنار تناور پیڑ جواب
تک
اپنے اپنے استھانوں پر پھولتے پھلتے
دور ہی دور سے
صرف ہواؤں کی پیغامبری پر خوش تھے
اپنی گہری اور گھمبیری چھایا کے تانے بانے بنتے
اپنا اپنا پراگ جیتوں کو بھجواتے
قدموں میں کچھ پھول نچھاور کرتے
پتوں کا سنگیت
سناتے۔ سنتے۔ کھو جاتے
بوجھل اور گھنی راتوں میں
جب شاخیں سپنوں کے بوجھ سے جھک جاتیں
تب سو جاتے

☆

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
یگوں یگوں کی... پیولن کی جلتی پیاس بھڑک کر
کال کی ریکھاؤں میں پھیل گئی
ایسے لگا
ٹھنڈی برفیلی جھیل میں
سورج کا ایک دہکتا ٹکڑا ٹوٹ گرا
چاروں اور مسلسل زلزلے دھکے...
شور دھما کے
دہاڑتے پربت
چیختے جنگل
گرج گرج برساتیں
جانے کتنی صدیوں کے دن تھے
کتنی صدیوں کی وہ راتیں

☆

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
خاموشی ہی خاموشی ہے
بجتے کانوں میں اب بھی گونج رہی ہیں
سناٹے کی سانسیں
سنکھوں سیپوں میں بس جاتی ہیں
روئی بلونے جیسی
ساگر کی دھیمی دھیمی آوازیں
آوازوں کی تہ میں
کانا پھوسی جیسے
ٹوٹے ہکلاتے لفظ
ادھورے بول
دور فضا کی پگھلی نیلی دھند میں
اک بے آب پھڑکتی مچھلی
بھولا بھٹکا سا بے چین ہیولا
تنہا ڈولتا اڑتا پر
یہاں۔ وہاں
دبی چھپی اک ہلچل سی
پھیر بدل کی خواہش سی
لگتا ہے شاید اندھے پاتالوں میں
شانت...
اکیلی اونگھتی گائے
سینگ بدلنے والی ہے

☆

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
آج انھیں پیڑوں پر پودوں کی نس نس میں
بہتے رس کے بدلے
خون کی دھارا جاگ اٹھی
تپ تپ کر برقائے ہوئے
ارمان بڑھے
آپس میں ملے
مضبوط جڑیں دھرتی سے اکھڑیں.. چلنے لگیں

قدیر زماں

شمارہ ۲۸۰،
مئی ۲۰۰۴

اسے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ لیکن اب تو وہ بھاگ کر کہیں نہیں جائے گا، وہ ثابت قدم رہے گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ کئی برس پہلے زندگی میں ایک بار اسے بھاگنا پڑا تھا۔ یہی کوئی پچاس برس ہوئے ہوں گے۔ زیادہ یا کم بھی ہو سکتے ہیں اسے صرف ۱۸۵۷ کا سنہ یاد رہ گیا تھا۔

سارا خاندان انگریزوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ ایک بیوہ بہن اور اس کی سات آٹھ سال کی لڑکی بچ رہے تھے۔ بہن اس سے کوئی دس سال بڑی تھی۔ آباؤ اجداد کا تعلق سپہ گری سے تھا۔ خاندان کے کئی لوگوں نے ہندوستان کی اس پہلی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ دیسی سپاہی جب مغلوب ہو گئے تو انگریزوں نے انھیں چن چن کر قتل کیا۔ جو گولیوں کا نشانہ نہیں بنے وہ تختۂ دار پر لٹکائے گئے، بہتوں کو توپوں کے دہانوں پر باندھ کر گولے سے اڑا دیا گیا۔ جن لوگوں نے رئیسوں کی ڈیوڑھیوں میں پناہ لی تھی انھیں ڈیوڑھیوں سمیت جلا دیا گیا۔ جن لوگوں نے بزرگوں کی خانقاہوں یا درگاہوں میں پناہ لی انھیں خانقاہوں کو منہدم کر کے، یا درگاہوں کے دروازے توڑ کر کھینچ نکالا گیا اور سنگینوں کی نوک پر رکھ لیا گیا۔'' اس وقت نہ تو آفتاب نے اپنے رخساروں کو پیٹ کر نیلا کیا جب انگریز عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا جا رہا تھا اور نہ تو ہندوستانیوں کی قتل و غارت گری پر ماہتاب ہی زمانے کے دل کا داغ بن سکا۔'' ☆ ان کو تو گواہی میں بھی نہ لیا جا سکا۔

'' بیٹا، اب تم اکیلے ہی اس خاندان کے چراغ ہو، تمھاری ہی ایک آس رہ گئی ہے۔ تمھیں زندہ رہنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں مر جاؤں، میری اور میری بچی کی دیکھ بھال تم ہی کو کرنا ہوگی۔''

وہ تینوں نفوس راتوں رات دہلی سے نکل پڑے، شیخ عبداللہ، بیوہ بہن حلیمہ اور ننھی بھانجی زینب۔ نکلنے سے قبل تینوں نے پرانے صندوقوں اور الماریوں کو ٹٹولا، زر و مال، کپڑے لتے، اور خاندانی شجرہ، جو بھی تھا وہ ساتھ لے لیا۔ شجرے میں شیخ عبداللہ کے اوپر لکھا تھا شیخ احمد، اس کے اوپر شیخ ابراہیم۔ اور اوپر جو نام لکھے ہوئے تھے وہ دھندلے پڑ گئے تھے۔ اور بھی اوپر غزنوی یا غوری کے سے الفاظ تھے جو کچھ اور بھی مٹے مٹے سے تھے اور ٹھیک سے پڑھے نہ جا سکے۔ پہلے نادر شاہ درانی، پھر احمد شاہ درانی، پے بہ پے حملوں کے دوران بھاگ دوڑ میں الفاظ کہیں کہیں سے کھرچ گئے تھے یا ان پر خون کے، یا آنسوؤں کے نشان تھے۔ شیخ ابراہیم نے اپنی آخری بیماری کے زمانے میں شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں شجرہ تھماتے ہوئے کہا تھا۔

'' تمھارا باپ تو تمھارے سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اب تم اس شجرے کے مالک ہو، اسے سنبھال کر رکھنا۔''

دادا نے کچھ اور بھی وصیت کی تھی۔ ساری باتیں اسے یاد نہ رہیں۔ شجرے کو اس نے ادھر ادھر سے پھر ایک بار دیکھا۔ زیادہ سوچنے کا وقت تھا نہ ضرورت۔ اس نے باورچی خانے سے ایک چاقو اٹھایا اور شجرہ کو چاک کرتے ہوئے اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔

جنوب میں نظام الملک آصف جاہی ریاست ہی ایک ایسی تھی جہاں انھیں پناہ مل سکتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جائیں تو کسی ایسے چھوٹے دور افتادہ گاؤں میں پڑ رہیں گے جہاں حکومت کا کوئی کارندہ پر نہ مارتا ہو۔ چند دن تو

صحرا نوردی میں گذرے۔ پھر صوبۂ متوسط، گجرات اور مرٹھواڑے سے ہوتے ہوئے چھپتے چھپاتے کئی مہینے میں تینوں اورنگ آباد پہنچے تو نہ معلوم کیوں یہ شہر انھیں غیر محفوظ لگا۔ انھیں یہاں کی زمین سے بوئے دوستی نہ ملی۔ انگریزوں اور مراٹھوں کا کثرت سے آنا جانا لگا تھا۔ دو ہی دن بعد انھوں نے کوچ کی ٹھانی، اگرچہ کسل راہ بہت تھا۔

وہ پربھنی، ناندیڑ اور نظام آباد ہو کر کورٹلہ پہنچے۔ ہفتہ بھر کے قیام کے بعد شیخ عبداللہ کو محسوس ہوا کہ یہ مقام بھی غیر محفوظ ہے۔ چند مسلمان یہاں پہلے سے آباد ہیں۔ آبادی ایسی سڑک پر ہے جو ریاست کے دو ضلعوں کو جوڑتی ہے، انگریز صاحبان بھی اکا دکا سپاہیوں کے ساتھ اس سڑک پر گذر جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر ایک صبح تینوں وہاں سے اور بھی جنوب کی طرف پا پیادہ چل پڑے۔ کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں چھوڑتے ہوئے وہ ایک کوردہ سی جگہ پر پہنچے جس کا نام انھیں گھن پور بتایا گیا۔ شام کا وقت تھا، مویشیوں کو جنگل سے گاؤں کی طرف ہانکا جا رہا تھا۔ گاؤں سے پرے جنوب اور مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے۔ اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

جس راستے سے یہ چھوٹا قافلہ گاؤں پہنچا تھا اس کے داخلے پر ایک چرواہے کا مکان تھا۔ بعد میں شیخ عبداللہ کو پتہ چلا کہ ان چرواہوں کو آس پاس کے گاؤں کے مسلمان دھنگر کہتے ہیں۔ اس نے اسی دھنگر سے رات بھر کا سہارا مانگا۔ مرد کے ہاتھ میں ایک صندوق اور عورت اور بچی کے ہاتھوں میں کپڑے کی دو گٹھریاں دیکھ کر دھنگر سمجھ گیا کہ یہ لوگ مسافر ہیں اور شاید راستہ بھٹک گئے ہیں۔ زبان سے ناواقفیت کا مسئلہ الگ تھا، اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ دھنگر نے سوچا آفت رسیدہ اجنبی لوگ ہیں، دو تین دن کے لیے اس کے گھر میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس نے خوشی خوشی انھیں پناہ دی۔ مکئی کی تازہ روٹیاں ڈلوائیں، ان پر ترکاری کا ساگ اور بکریوں کے دودھ سے تیار کیا ہوا دہی کھانے کو دیا۔

صبح اٹھ کر شیخ عبداللہ نے گاؤں کا جائزہ لیا۔ جنوب مشرق کی طرف سے ایک ندی بہہ کر شمال کی طرف ایک جھیل میں جا گرتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند اور بھی مواضعات کے بارے میں اسے خبر لگی۔ کہیں کہیں اکا دکا مسلمان بستے تھے۔ گھن پور میں سو سے کم مکانات تھے اور آبادی پانچ سو سے بھی کم تھی۔ لوگ کئی ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ انگریز صاحبان کو تو مسلمان سے کد ہے، اور مسلمان یہاں ایک بھی نہیں۔ یہ گاؤں اسے محفوظ لگا۔ دھنگر کے گھر کو اس نے چند دنوں کے لیے اپنا مسکن بنا لیا۔ دھنگر کو بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ جانوروں کو رکھنے کا ایک حصہ خالی تھا۔ یہ لوگ اسے کوٹم کہتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے کچھ کمپنی کے روپے دھنگر کے ہاتھ پر رکھ دیے کہ انھیں قبول کرو، ہمارے پاس زیادہ ہیں ہے، لیکن تمھاری روٹیاں مفت نہ توڑیں گے۔ سال بھر تک تینوں اسی گھر میں رہے۔ گاؤں والے خوش تھے کہ کوئی ترکوڑ وان کے گاؤں میں آ بسا ہے۔ آس پاس کے کسی گاؤں میں بھی اونچے پا جائے یا نہ بند میں انھیں کوئی ترکوڑ نظر آتا تو گھن پور کے ہندو یہ سوچتے تھے کہ ان کے گاؤں میں ایسا کوئی آدمی کیوں نہیں آیا۔

اس طرح شیخ عبداللہ پہلا ترکوڑ تھا جو گھن پور میں آ بسا تھا۔ بہت جلد اس نے اپنی فراست، محنت اور اپنے میزبان دھنگر کی مدد سے اپنے اثاثہ جات بڑھا لیے۔ آٹھ سال کی مدت میں وہ چار بھینسوں، دو گایوں، ایک درجن بکریوں اور دو ایکڑ زمین کا مالک بن چکا تھا۔ اب بہن کو بھائی کا گھر بسانے کی فکر ہوئی۔ اس نے گھن پور کے قریب کے گاؤں کلنور سے ایک لڑکی ڈھونڈ نکالی۔ لڑکی والے گھانا چلاتے اور مونگ پھلی اور تلوں کا تیل نکالا کرتے تھے۔ کلنور کے بعض ادھیڑ عمر اور بعض بوڑھے مسلمانوں نے پوچھا:

"نام تو بہت بڑا ہے، شیخ عبداللہ۔ لیکن اس کے خاندان کا کوئی اتا پتہ بھی ہے؟"

لڑکی کے باپ نے گھن پور پہنچ کر چھان بین کی۔ کچھ پرانی باتیں سامنے آئیں، کچھ حال کا حال معلوم ہوا۔ گاؤں کے سارے ہندوؤں نے شیخ کی شرافت اور محنت کی داد دی۔

"یہ ترکوڑ وا ایمان دار اور محنت کش ہے۔ اس کے پاس متعدد جانور ہیں، گھن پور کے علاوہ قریب کے موضع پدا انباری پیٹھ میں بھی تری زمین ہے۔"

لڑکی والوں کو مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ شادی ہوگئی اور اس چھوٹے سے خاندان کی مزے میں گذر ہونے لگی۔ دلی کی دلدوز یادیں محو ہو چلی تھیں کہ اچانک ایک حادثہ پیش آگیا۔ ایک دن زینب ہر روز کی طرح منھ اندھیرے ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے نکلی۔ اس دن وہ آبادی سے ذرا دور چلی گئی۔ وہاں ایک زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا۔ گاؤں کے وید نے منتر پڑھے، جھاڑ پھونک کے علاوہ دوائیں بھی دیں لیکن زینب بچ نہ سکی۔ شیخ عبداللہ نے آس پاس کے گاؤں کے مسلمانوں میں اطلاع کرا دی۔ آٹھ دس مرد اکٹھا ہوئے۔ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ گاؤں سے لگی ہوئی ایک سرکاری زمین پر، جہاں چاروں طرف کانٹے دار گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ایک قبر کھدوائی گئی۔ لیکن جب دفنانے کا وقت آیا تو کہیں سے ایک بقال آ دھمکا، اس نے غرا کر کہا:

"ہمارے گاؤں میں ابھی تک کسی کو دفنایا نہیں گیا ہے۔ ہم تو اپنے مردوں کو ندی کے کنارے کاڑھ لگا کر جلاتے ہیں۔ یہ لوگ چاہیں تو اپنا مرگھٹ ندی کے اس پار بنا سکتے ہیں۔ جلانے کے لیے لکڑی کی کمی نہیں ہے۔ لیکن دفن کرنے کی اجازت انھیں نہیں مل سکتی۔"

"ہاں... یہاں دفنانے کا مطلب تو یہ ہے کہ ترکوڑوں کا قبرستان بن جائے گا۔" ایک اور شخص نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

گاؤں کے اور بھی لوگ جمع ہو گئے۔ ایک ایا وار جو سوامی کہلاتا تھا وہ بھی آ گیا۔ آخر میں بات وطن دار تک پہنچی۔ اس نے سوامی کو بلا کر بات کی۔ سوامی نے واپس آ کر کہا:

"ہر مذہب کا ایک دھرم ہوتا ہے ترکوڑوں کو دھرم کے مطابق ان کے مردوں کو دفنایا جاتا ہے۔ یہ زمین نظام علی شاہ کی ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، اس زمین پر سب کا حق ہے۔ زندوں کے ساتھ تو حق تلفی کی جا سکتی ہے لیکن مردوں کا حق ہم پر فرض ہے۔ بڑے دورانے یہاں دفنانے کی اجازت دے دی ہے۔"

یہ سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے۔ چند دھنگر، چند کسان اور چند دھوبی جو شیخ عبداللہ کے ساتھ کام کرتے تھے رکے رہے۔ قریب کے گاؤں سے آئے ہوئے مسلمانوں نے مل کر مردے کو مٹی دی۔ دھوبیوں نے قبر پاٹ دی۔ دھوبیوں نے قبر پاٹ دی، پھر فاتحہ پڑھی گئی۔ شیخ عبداللہ نے بھانجی کا سوگ کیا، لیکن دل ہی دل میں۔ اسے وہ رسمیں اب ٹھیک سے یاد نہ تھیں جو اس کے خاندان والے موتی کے سلسلے میں نبھاتے تھے، نہ اسے وہ دعائیں یاد تھیں جو مختلف موقعوں پر پڑھی جاتی تھیں۔ سوئم کے نام پر اس نے ایک دو مسلمانوں کو گھر بلا کر قرآن خوانی کرادی اور کھانا کھلا دیا، اور بس۔

شیخ عبداللہ کے یہاں تین سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس عرصے میں اس کے پاس چار سے چھ ایکڑ زمین ہوگئی اور جانوروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ غلہ بہت آتا تھا، کھانے والے کم تھے۔ حلیمہ نے شیخ عبداللہ کی دوسری شادی کرا ڈالی۔ نکاح کی رات پہلی بیوی اپنی نند کے گلے لگ کر بہت روئی۔ نند نے دلاسا دیا کہ بڑی تو تم ہی ہو۔ اسے تو بچے جننے کے لئے بیاہ کرلائی ہوں۔ گھر پر حکومت تمھاری ہی رہے گی۔

دوسری شادی کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر حلیمہ کی مراد پوری ہوئی۔ چھوٹی بھابی کو لڑکا ہوا، بالکل پٹھانوں جیسا لگتا تھا۔ اگلے سال اسی بیوی کو ایک لڑکی بھی ہوئی۔ تیسرے سال پہلی بیوی کو بھی اولاد ہوئی۔ پھر تو اس نے متواتر ہر سال ایک بچے کو جنم دیا۔ چند برس میں شیخ عبداللہ کے گھر میں تین لڑکے اور چار لڑکیاں کھیلنے لگ گئے۔ اولاد میں اضافے کے ساتھ جائداد بھی بڑھتی گئی۔ مکان بھی لمبا چوڑا بنوا لیا گیا۔ چار کمرے، دالان جس میں شیخ عبداللہ کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑی کرسی، چار چھوٹی کرسیاں، لکڑی کا ایک تخت جس پر چادر بچھی ہوئی۔ دالان کے دروازے پر ٹاٹ کا بڑا پردہ لٹکا ہوا۔ پھر پیش دالان، سامنے صدر دروازہ، پشت میں باورچی خانہ، ایک باؤلی، ذرا فاصلے پر پچھواڑے میں بیت الخلا۔ پچھواڑے میں برسات کے موسم میں مکئی بوئی جاتی اور فصل آنے پر جس بچے کا جب جی چاہتا بھٹے توڑ لاتا اور کوئلوں کی آگ پر بھون بھون کر کھاتا۔ کسی کو لکھنے پڑھنے کا زیادہ شوق نہ تھا، کھانے کو وافر، کام کے لئے زمین وسیع، ایسے میں پڑھتا کون۔

ترقی کرتی ہوئی اقتصادی حالت کے ساتھ گاؤں میں شیخ عبداللہ کا اقتدار بھی بڑھتا گیا۔ اس کی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اس کی خوب عزت کرتے، پنچایتوں میں اسے بلایا جاتا۔ وہ اور اس کے خاندان کا ہر فرد تلگو ایسے ہی بولتا جیسے اس کی مادری زبان ہو۔ پنچایتوں میں شامل ہونے والوں میں اس کا ایک اہم مقام ہوتا اور اگر فریقین میں مصالحت نہ ہوسکتی تو پنچوں کے ساتھ مل کر فیصلہ صادر کرنے میں اس کی بات مان لی جاتی۔

گاؤں کے لوگوں میں ہر طرح سے گھل مل جانے کے باوجود شیخ عبداللہ کا طور طریق اور رہن سہن ذرا مختلف ہی رہا۔ اس نے کبھی اپنا لباس نہیں بدلا۔ بچے تو پاجامے ہی پہنتے، لڑکیاں چوڑی دار پاجامے یا شلوار کے ساتھ کرتا یا شلوکا پہنتیں۔ خود شیخ عبداللہ ڈھیلی شلوار اور لمبا کرتا ہی پہنتا۔ کھیتوں پر جاتے ہوئے وہ اپنا طمنچہ دائیں پاؤں کی پنڈلی میں باندھ لیتا۔ ایک چھوٹا سا خنجر ہمیشہ اس کی کمر میں لٹکا رہتا۔ رمضان کے مہینے میں پورے روزے رکھنا، جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنے کے لیے قریب کے گاؤں جانا اس کا معمول تھا۔ مرد بچے ذرا بڑے ہوئے تو انھیں بھی بیل بنڈی ☆ میں اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس کی بہن جواب مرحوم ہو چکی تھی ہر سال شب برات کو چراغاں کرتی۔ کدو کا دالچہ، ترکاری ملا گوشت، بگھارا کھانا ہوتا۔ میٹھا کھانا ضرور پکتا، فاتحہ دی جاتی۔ مرد بچے دائیں بائیں ہاتھ اٹھا کر باپ کے پہلو میں دعا کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ دوسری صبح شیخ عبداللہ اپنی بھانجی کی قبر پر جاتا، اسے گھاس اور جھاڑیوں سے صاف کرواتا، ور فاتحہ پڑھ آتا۔ بہن کی موت کے بعد اب وہاں دو قبریں بن گئی تھیں۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے بچے بھی ساتھ میں ہوتے۔ انھیں قرآن کی چند آیتیں اور دعائیں سکھا دی گئی تھیں، گاؤں میں کوئی مدرسہ نہ ہونے کی وجہ ان کی باقاعدہ پڑھائی نہ ہوسکی تھی۔ ہر صبح گاؤں کے دیول کا پجاری دیول سے لگے چبوترے پر بیٹھ جاتا۔ جو بچے وہاں آتے انھیں وہ تلگو پڑھاتا، ویمن، پوتنا اور تکنا کے اشعار بچوں کو یاد کراتا۔ شیخ عبداللہ کے لڑکوں نے اسی سے شد بد تلگو پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا، ویمن کے چند شعر بھی انھوں نے یاد کر لیے۔ زراعت کے کام میں باپ کا ہاتھ بھی بٹانے لگے۔

بچے جب بڑے ہوگئے تو شیخ عبداللہ نے ایک لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادیاں کر ڈالیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کھیتی باڑی کا کام کم کر دیا۔ اب اس کا زیادہ تر وقت گاؤں کے لوگوں کے مسائل سلجھانے میں لگ جاتا۔ صرف زراعت کے اہم کام جیسے بیج بونا، کھیتوں میں پانی کی سیرابی، فصل کو ٹنا، یہ سب اس کی نگرانی میں انجام پاتے تھے۔

ربیع کی فصل کے کاشت کے دن تھے انباری پیٹھ کی آدھی دھمن مڑی میں دھان بویا جا چکا تھا، باقی آدھی کے لئے دھان کا نار لگنا تھا۔ شیخ عبداللہ نے دھان کو بھگو کر بانس کے بڑے بڑے ٹوکروں میں رکھوا کر انھیں ٹاٹ سے باندھ دیا تھا۔ دو دن بعد مولکا پھوٹے ہوئے دھان کو دھمن مڑی میں پھیلانا تھا۔ ایک دن قبل انباری پیٹھ کے نیرٹی نے شیخ عبداللہ کو اطلاع دی کہ تمھارا پڑوسی تمھارے کسانوں کو تنبیہ دے رہا تھا کہ "پانی کی چوری ہوگی تو اس بار تمھارا برا حشر ہوگا۔ اس سے پہلے بھی تم نے میری دھمن مڑی کو خشک کر دیا تھا۔ اب میں برداشت نہیں کروں گا۔"

دو دن بعد مولکے کے دھان اور نار کے ٹوکروں کو کھیت میں رکھو کر شیخ عبداللہ اپنی زمین پر پہنچا۔ دور ہی سے اپنی دھمن مڑیں اسے سوکھی نظر آئیں۔ آگے بڑھنے پر دو آدمی دھمن مڑیوں کے بیچ والے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے دکھائی دیئے۔ دونوں سیندھی کا نشہ کر رہے تھے۔ نیم کے درخت کی ایک شاخ پر ایک قرابین لٹکی ہوئی تھی۔ وہ نیم کے درخت کی طرف ذرا تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ اسے قریب آتا دیکھ کر درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اٹھ کر درخت سے لٹکی ہوئی قرابین اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ یہ شخص انباری پیٹھ کے کولیوں میں سے ایک تھا۔ وہ پہلے کمپنی کی فوج میں اور پھر ملکہ وکٹوریہ بہادر کی فوج میں مامور تھا اور برما کے محاذ پر جا چکا تھا۔ اس نے رائفل عبداللہ کی طرف تان لی۔

عبداللہ کے پڑوسی کسان نے سوچا تھا کہ سپاہی کی وضع قطع اور رائفل

دیکھ کر بوڑھا عبداللہ واپس ہو جائے گا۔ شیخ عبداللہ فوجی تربیت یافتہ نہیں تھا، لیکن بچپن میں اس کے دادا نے پہلوانی کے چند گر سکھا دیے تھے۔ اور فن سپہ گری تو بہر حال اس کی نس نس میں بھرا ہوا تھی۔ کوئی چالیس پچاس سال کے بعد اس نے اپنے کسی دشمن کو دیکھا تھا، اور اس کے ہاتھ میں بھی وہی ولایتی بندوق تھی۔ مجھے ایک بار پھر میری زمین سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ عقاب کی طرح جھپٹ کر اس نے دشمن کے ہاتھ پر پنجہ مارا۔ سپاہی کو اس طرح کی احمقانہ لیکن غیر معمولی شجاعت کی توقع بھلا کہاں تھی۔ قرابین سپاہی کے ہاتھ سے چھوٹی، لیکن گرتے گرتے اس کا گھوڑا دب گیا اور گولی نکل پڑی۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کسان کی دردناک چیخ فضا میں گونجی۔ گولی اس کے جسم کے آر پار ہو چکی تھی۔

عبداللہ کی نظریں خون میں لت پت زمین پر اوندھے پڑے ہوئے کسان کے بدن میں زندگی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ فوجی نے اسے دھکا دے کر زمین پر پٹک دیا، پھر اسے چت کرتے ہوئے اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ فوجی نے عبداللہ کو غافل پا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا داب کر پورا زور لگایا کہ دشمن کا گلا گھونٹ ڈالوں، لیکن عبداللہ نے پھرتی سے کروٹ بدلی، کمر سے خنجر نکالا اور دشمن کے سینے میں گھونپ دیا۔ خنجر کا وار اوچھا پڑا اور خنجر اس کے مدمقابل کی دائیں پسلی میں دھنس گیا۔ دشمن کا کام تمام نہ ہوا لیکن عبداللہ کے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی نظریں زمین پر پڑی ہوئی قرابین کی طرف تھیں۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ آگے کی طرف کھسکنے لگا۔ اس کے ہاتھ ابھی رائفل تک پہنچ نہیں پائے تھے کہ عبداللہ نے اپنی پنڈلی سے طپنچہ نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا۔

شیخ عبداللہ کو ایک بار پھر اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے اب کہیں اور نہیں جانا ہے۔ میں اب بھاگنے والوں میں نہ ہوں گا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی کھاچر کی طرف بڑھنے لگا۔ عبداللہ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر پڑوسی کا نوکر راجیا وہاں سے بھاگا اور گمن پور اپنی جھونپڑی میں داخل ہو کر دبک کر بیٹھ رہا۔ اس کی عورت کہیں کام سے گئی ہوئی تھی۔ جب اس نے شوہر کو اس طرح بیٹھا دیکھا تو اس نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ "اتنی جلدی کیوں واپس آ گیا اور کیوں چپ ہے؟ موکا بونے کا کام کیا ہوا؟ دورا کہاں ہے"؟ وہ دیر تک کچھ نہ بولا تو وہ اپنے شوہر کو جھنجھوڑنے لگی، "بولتا کیوں نہیں، کیا سانپ سونگھ گیا ہے تجھے؟" راجیا کو اپنے پر قابو پانے میں اور زبان کھولنے میں بڑی دیر لگی۔ آہستہ آہستہ اس نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ تھوڑی دیر میں بات سارے گاؤں میں اور پھر دور دور تک پھیل گئی۔

شیخ عبداللہ نے جب دیکھا کہ راجیا خوف سے بھاگ گیا ہے تو خود اس نے گاڑی پر بیٹھ کر بیلوں کے پگھے سنبھالے اور انھیں گمن پور کے رخ پر پلٹایا۔ گاڑی کے اگلے حصے پر بیٹھے ہوئے اس نے اپنے اوپر رومال اس طرح سے اوڑھ لیا کہ اس کے لباس پر جو خون کے دھبے تھے وہ کسی کو نظر نہ آ سکیں۔ بیلوں نے اپنے کولھوں پر کیل کی چبھن محسوس کی۔ انھیں بھی شاید احساس ہو گیا تھا کہ آج مالک کے تیور بدلے بدلے سے ہیں۔ انھوں نے تھوڑی دیر قبل گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ دوڑنے میں غیر معمولی پھرتی کے ساتھ بیلوں نے گھر کا راستہ آدھے وقت میں طے کر لیا۔

ادھر دن مڑی کے آس پاس کام کرنے والے کسانوں اور تاڑی تاسنے والوں نے گولیوں کی آواز سنی تھی۔ دو تین آدمی آواز پر دوڑے دوڑے آئے۔ انھوں نے دو لاشوں کو درخت کے نیچے خون میں لت پت پایا۔ تھوڑی دیر میں بہت سے مرد اور عورتیں وہاں اکٹھا ہو گئے۔ مرنے والوں کے خاندان کی عورتیں اور بچے بھی روتے چلاتے پہنچ گئے۔

اس منظر کو لوگ زیادہ دیر تک دیکھ نہ سکے، کسی نے لاشوں پر کپڑے ڈھانک دیے اور لاشوں کو اٹھوانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ پہلے آنے والوں میں دو آدمی تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے انباری پیٹھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک نے دوسرے سے کہا:

"میں جانتا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ ملنا کو اپنی قرابین پر بڑا گھمنڈ تھا۔" دوسرے نے اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کرتے ہوئے بس اتنا کہا:

"پداداورا کے پاس ہمیں بہت جلد پہنچنا چاہیے۔"

انباری پیٹھ کے وطن دار سے جب وہ دونوں ملے تو اس نے فوراً گاؤں کے پولیس پٹیل کو بلوا کر چند ہدایتیں دیں۔ شام تک پولیس کا امین دو کانسٹبلوں کو لے کر انباری پیٹھ پہنچ گیا۔ اس نے پہلے وطن دار سے ملاقات کی۔ پھر ان دونوں گواہوں کو بلوایا جنھوں نے سب سے پہلے لاشوں کو دیکھا تھا۔ پھر گاؤں کے مزید دو معتبر کسانوں کو لے کر وہ موقع واردات پر پہنچ گیا۔ اس نے پنچ نامہ تیار کیا، گواہوں کے انگوٹھوں کے نشان پنچ نامے پر لیے۔ قرابین اور دوسرے ثبوتوں کو اپنی تحویل میں کر لیا اور لاشوں کو ان کے خاندانوں کے حوالے کیا۔

شیخ عبداللہ کے بے وقت آنے پر عورتوں کو حیرت ہوئی، وہ گھبرا کر دروازے تک پہنچ گئیں، لیکن ان کی طرف دیکھے بغیر رومال سے منھ کو ڈھانکے ہوئے شیخ عبداللہ گھر میں داخل ہو گیا۔

اچانک بڑی بہو کی نظر عبداللہ کے کرتے کے پر خون کے دھبوں پر پڑی تو اس نے سمجھا کہ باوا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ خوف اور گھبراہٹ میں چلائی:

"ہائے اللہ دیکھو باوا جان کو کچھ ہو گیا ہے! شاید بالا گھو نے انھیں پکڑ لیا تھا۔ ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں!" گھر کی سب عورتیں شیخ عبداللہ کے قریب آ گئیں لیکن کسی کے کچھ پوچھنے کے پہلے ہی شیخ عبداللہ نے سرد لہجے میں کہا:

"چلو تم لوگ ہٹو یہاں سے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ حرام زادے نے میری دھن مڑی کا سارا پانی چرا لیا تھا۔ اب اس سال کی فصل بھی نہیں ہو گی۔ وہ میری زمین چھین لینا چاہتا تھا۔" عورتوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک نے باہر جا کر لڑکوں کو پکارنا چاہا لیکن عبداللہ نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ سب سہم کر رہ گئیں۔

گاؤں میں بیل گاڑی پر شیخ عبداللہ کو داخل ہوتے ہوئے چند لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ جن گھرانوں میں قتل کی اطلاع ہو چکی تھی وہاں کاناپھوسی ہونے

گی۔ بات وطن دار کے کان پر پڑی تو اس نے اپنے دو آدمیوں کو عبداللہ کے گھر بھیجا کہ اصل واقعے کا پتہ لگائیں۔ چند اور لوگ بھی گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ گھر کے نوکر نے بیل بنڈی کو وہاں سے نکال لیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کھٹکا دے کر دروازہ کھلوائے۔ تھوڑی دیر بعد نہا دھو کر شیخ عبداللہ دالان میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ باہر کا دروازہ کھلوا دیا گیا۔ پہلے وطن دار کے دو آدمی آہستہ آہستہ مکان کے اندر داخل ہوئے اور شیخ عبداللہ کی کرسی کے سامنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دیر تک انھوں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں کہ شاید عبداللہ خود ہی کچھ بتائے۔ لیکن عبداللہ یوں بیٹھا باتیں کرتا رہا گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اسی دوران شیخ عبداللہ کا وہ دھنگر دوست بھی پہنچ گیا جس نے پہلی بار گاؤں میں داخل ہونے پر شیخ عبداللہ کو پناہ دی تھی۔ آتے ہی وہ کہنے لگا:

"انیا، تم نے تو گولی نہیں چلائی ہے۔ قرائین بھی اس کولی ملنا کی تھی۔ وہ تو تمھیں قتل کرنے آیا تھا۔ تم نے اپنا بچاؤ کیا۔ گولی جب چلی تو بندوق اسی کے ہاتھ میں تھی۔ گولی چلی اور رامیا کسان ڈھیر ہو گیا تو اس حرامی کولی، ملنا نے تم کو زمین پر گرا کر چت کر دیا۔ وہ تمھارا گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ پھر تم نے اپنی طاقت سے اس پر قابو پا لیا۔ اگر تم اسے مار نہ ڈالتے تو وہ تمھاری جان لے لیتا۔ بہن کے خصم پر تاڑی کا نشہ خوب چڑھ گیا تھا۔ سالا مرغی کی ایک ٹانگ بھی نہ کھا سکا۔"

"یہ ساری باتیں تمھیں کس نے بتائیں؟" شیخ عبداللہ نے کہا۔

"اور کون بتاتا؟ راجیا نے، وہی تو اکیلا تھا وہاں۔"

"تب تو ہمارا انا بے قصور ہے۔" وطن دار کے دو آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ دونوں یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ وطن دار اور پولیس پٹیل تمھیں بیان دینے کے لئے بلوائیں تو تم آ جانا، ابھی کچھ نہ کرنا۔

لیکن پولیس پٹیل اور وطن دار نے کہا کہ راجیا تو ملزم کا آدمی ہے، اس کی گواہی سے کچھ نہ ہو گا۔ دو دو خون کے ملزم کو یوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ شیخ عبداللہ کو عدالت کے سامنے جوابدہی کرنا چاہیے۔

دوسرے دن پولیس کی پارٹی شیخ عبداللہ کو لے کر جگتیال کی پولیس کچہری پہنچی۔ شیخ عبداللہ کو ہتھکڑی پہنا کر اسے حوالات میں ڈال دیا گیا اور تین دن بعد اسے ضلع مجسٹریٹ کے پاس پیش کیا گیا۔ اس کے اقبالی بیان اور شہادتوں کی روشنی میں ضلع مجسٹریٹ نے شیخ عبداللہ کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کی اور فائل کو عدالت العالیہ میں حیدرآباد روانہ کر دیا۔ شیخ عبداللہ کو بھی حیدرآباد کے صدر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وکیلوں نے شیخ عبداللہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اقبالی بیان سے پھر جائے اور کہے کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی حفاظت خود اختیاری میں کیا ہے شیخ عبداللہ نے جواب دیا:

"نہیں، مقتولین کی زندگی میری اولاد کے لیے خطرہ تھی۔ میری اولاد کو یہ لوگ میری زمین سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ زندہ رہ کر وہ کوئی اور سازش کرتے۔ میں اپنی اولاد کو اس مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا جو میں نے جھیلی تھی۔ جو کچھ میں نے کیا وہ اپنے ارادے سے کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس کولی کے بچے ملنا پر اپنا طمنچہ چلانے کے بجائے اسے زخمی حالت میں چھوڑ دیتا اور قرائین کو اپنے قبضے میں کر لیتا۔"

چار ماہ تک فوجداری کارروائی چلتی رہی۔ ضلع عدالت سے لے کر عدالت العالیہ تک اس شہادت کو قبول کر لیا گیا کہ اگر ملزم شیخ عبداللہ چاہتا تو کولی ملنا کو زخمی حالت میں چھوڑ سکتا تھا، اس پر طمنچہ چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ زخمی ہو کر وہ اس قابل نہ تھا کہ ملزم کی جان کا خطرہ بن سکتا۔ ملزم کو حفاظت خود اختیاری کا فائدہ نہیں دیا جا سکتا۔

عدالت العالیہ کے میر مجلس میر افضل حسین کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو بڑے غور و خوض کے بعد انھوں نے پھانسی کی سزا کی توثیق کی۔ مفتی وقت نے بھی مثل پر دستخط کر دیے۔ اب آصف جاہ سادس نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں نے اپنے آخری احکام صادر کیے:

"ملزم مذکور شیخ عبداللہ قصور ثابت ہے۔ اس کی عمر رسیدگی کے پیش نظر اس کو بجائے سزائے موت کے سزائے حبس دوام دی جاتی ہے۔"

شیخ عبداللہ کو جیل میں رہتے چھ سال گذر چکے تھے کہ وہ اچانک بیمار پڑ گیا۔ بیماری کی اطلاع گاؤں تک کون پہنچاتا، اس کی موت کی خبر بھی اس کی اولاد کو بروقت نہ پہنچ سکی۔ وارثوں کی غیر موجودگی میں میت کو جیل خانے کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ پولیس حکام کے ذریعہ ضلع اور تعلقہ سے ہو کر گمن پور تک یہ اطلاع پہنچی تو سانحے کو کوئی پینتیس دن ہو چکے تھے۔ اپنے سربراہ خاندان کے مرنے کی اطلاع پا کر گھر والے روئے چلائے، لیکن صبر انھیں پہلے ہی آ چکا تھا کہ شیخ عبداللہ کو اب وہ زندہ نہ دیکھیں گے۔ انھوں نے تیسرے دن زیارت کی، پھر چالیسواں کیا۔ سارے گاؤں کو کھانا کھلایا گیا۔ جو مسلمان کے یہاں کا نہ کھاتے تھے ان کے ہاں خشک اجناس بھیجے گئے۔

سب کام بحسن و خوبی انجام پا گئے تو اگلی صبح سے شیخ عبداللہ کے تینوں لڑکے کھیتی باڑی کے کام میں پہلے کی طرح جت گئے ☆☆☆

☆ یہ اظہار بیان اسد اللہ خاں غالب کی "دستنبو" (ترجمہ: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) سے لیا گیا اور تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔

☆ شمالی ہند میں ان جیسی گاڑیوں کو دمنی کہتے ہیں۔ تلنگانہ علاقے میں اسے سواری کی بنڈی بھی کہتے ہیں اور سامان سے لدی جانے والی یا زیادہ سواریوں والی گاڑی کو کھاچہ یا موٹ گاڑی کہتے ہیں۔ اب سواری کی بیل بنڈیاں مفقود ہو گئی ہیں۔

قربان آتش

شمارہ ۲۵۱
دسمبر ۲۰۰۱

چھڑکتی ہے ہوا تیزاب کیا جسم گلستاں پر
شجر کٹ کٹ کے گرتا ہے یہاں سبزے کے داماں پر

فلک پر چاند ہی نکلا نہ کوئی اک ستارہ ہے
تو کیوں چھایا ہوا ہے نور اشجار بیاباں پر

خموشی کی نئی تاریخ پروانوں نے لکھ ڈالی
جلا کر خواہشوں کے بال و پر شمع فروزاں پر

ترے فرمان پر ثابت قدم رہتا تو ہوں لیکن
صبا ہر صبح ہنستی ہے سوے حال پریشاں پر

مہذب آدمی کوئی جہاں میں چاہتا کب ہے
میں آؤں گا قدم ماروں گا اب دہلیز زنداں پر

شمارہ ۲۷۹
اپریل ۲۰۰۴

کیسا منظر تھا کہ کچھ طوفان سا تھا ایک بار
چھین کر تجھ سے میں دل کو لے گیا تھا ایک بار

یہ مری خوش قسمتی تھی بچ گیا جو بال بال
نفرتوں کا مجھ پہ بھی پتھر گرا تھا ایک بار

کھلتے ہونٹوں پر گلوں کے چھا گئی پژمردگی
کیا صبا نے درد کا تحفہ دیا تھا ایک بار

اور کیا مجھ کو تری دہلیز سے حاصل ہوا
کاغذی خوشیوں کا گلدستہ ملا تھا ایک بار

آسماں سے گر پڑا اندھی زمیں کے جسم پر
بے تحاشا شوق کا طائر اڑا تھا ایک بار

میں ہوائے ہجر کی تاثیر سے ہوں باخبر
بحر اعظم بھی لرز کر چیخ اٹھا تھا ایک بار

شمارہ ۲۸۱
جون ۲۰۰۴

جدال زیست کا آ ہی گیا مقام آخر
در نعیم پہ کرنا پڑا قیام آخر

بچا بچا کے قدم رکھ رہا تھا میں بھی مگر
سفر نے لے ہی لیا مجھ سے انتقام آخر

میں دیکھتا ہی رہا سبز منظروں کو ادھر
چرا کے لے گیا رونق غبار شام آخر

مری اداس طبیعت میں رنگ آنے لگا
کہاں سے لائی ہوا نکہت پیام آخر

نشہ عذاب کا راس آ گیا مجھے قربان
بدن کو چاٹ گئی گردش مدام آخر

فوٹو گرافر

قرۃ العین حیدر

شمارہ ۹،
فروری ۱۹۶۷

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آ جاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹو گرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے وال جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آ پہنچتا ہے تو فوٹو گرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتا ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹو گرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹو گرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹو گرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے اور کہیں جا کر اپنی دوکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید سولا ہیٹ پہنے، کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے تھے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلا کار جو تنہائی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں کیوں کہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آؤ جاؤ جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے، وہ اپنا سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ ان کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ سیڑھی کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی چھتری اور اوور کوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا..." لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گذرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک چھتہ گیارہ سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آ رہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی

مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرا لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آگئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹو گرافر جواب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا، اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

"سیاح اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے۔" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم آگئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا..."اب سونا چاہیے۔"

"تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔" نوجوان نے فکر سے کہا۔

"ہاں۔ شب بخیر..." لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پچھلا گلیارہ گھپ اندھیرا پڑا تھا، کمرہ بے حد پرسکون، خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پرسکون اور آرام دہ تھی۔ لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کر دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ "مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا..." لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا، اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سوگئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

"مالی نیچے کھڑا ہے، اس نے یہ گلدستہ تمہارے لئے بھجوایا ہے۔" اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اسے اپنے بالوں میں لگایا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے، اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟"

نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان اس لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گمنامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا۔

"فوٹو گرافر، لیڈی؟"

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔"

"لیڈی..." فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر کارزار حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا ..ادھر آئیے۔"

"بڑا لسان فوٹو گرافر ہے۔" لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو (cue) کا منتظر تھا دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی وہ اور اس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آرہی تھی اس لیے اس نے ذرا مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیالی تھیں۔

کلک...کلک...تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی... تھینک یو لیڈی... تھینک یو سر..."

فوٹو گرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرا گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹوگرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا۔ ''فوٹوگرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا۔ اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔'' لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتہ کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہا اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی، کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹوگرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے روانہ ہو گئی۔

وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایرپورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آ کر پھاٹک میں داخل ہوا ان میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹک کر انھوں نے فوٹوگرافر کو دیکھا، جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے۔ اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے تو وارد خاتون درمیانی بیڈروم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ کھانے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آ کر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا، وہ پھر آ کر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح اٹھ کر انھوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونا نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا انھوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امرسندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

''کمال ہے۔ پندرہ برس میں کتنی بار سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔'' پھر ان کی آواز میں جھلاہٹ آ گئی۔ ''اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ۔''

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی، پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر آرام سے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں... ان کی آواز بھی بدل چکی تھی چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑچڑاپن اور بیزاری اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

''میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔''

اور... اور... آپ کے ساتھ؟'' فوٹوگرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

''آپ نے کہا تھا نہ کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔''

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

''اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی... اچھا خدا حافظ۔'' خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔ صرف کاکروچ باقی رہیں گے ☆☆☆

اسپ کشت مات

قمر احسن

شمارہ ۱۱۹،
فروری، مارچ ۱۹۸۱

درمن آمد آں کہ ازدے گشت مات
آدمی و جانور جامد نبات
(مولانا رومؒ)

آفس سے آکر اس نے ادھ میلی کیتلی میں پانی، شکر دودھ اور چائے کی پتی سب ایک ساتھ ملا کر اسٹو پر رکھ دیا اور کپڑے تبدیل کر کے تکیے بستر پر لیٹ رہا۔

فائل نمبر ۹۷/۱۰/۳ کا ریمائنڈر، فسادات کی رپورٹ کا پروفارما، نیلم کے خط کا جواب، اور ابا کو خط، ایمیبائیسس (Amoebiasis) ۔شاید چائے اور سگریٹ پھر بڑھ گئی ہے۔

دوسری پیالی ختم کر کے اس نے سگریٹ جلائی۔ سگریٹ ختم ہوتے ہی پھر متلی آنے لگی اور سارا جسم پسینے میں بھیگنے لگا۔ جیسے پیٹ میں پھر اسارا مادہ ابھرنے لگا ہو۔ پھر آنتوں سے سینے تک بہت تیز جلن محسوس ہوئی۔ لیٹتے ہی محسوس ہوا جیسے ناف سے کچھ اٹھ کر حلق تک آرہا ہو اور آنتوں میں کچھ پک رہا ہو۔ جب امتلائی کیفیت بہت بڑھ گئی اور دھواں دھواں سا ہو گیا تو اس نے سر سے پیر تک کمبل کھینچ لیا اور پسینہ میں شرابور ہونے لگا۔

رات میں اس کی آنکھ کھلی تو چند ثانیے وہ فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر احساس ہوا کہ وہ اپنے بستر پر لیٹا ہے اور امتلائی کیفیت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ سر بھاری ہو رہا ہے آنتیں بھوک سے کھرچ رہی ہیں اور پورے جسم میں پسینہ کی چپچپاہٹ ہے۔

گھڑی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ساری دوکانیں اور ہوٹل بند ہو چکے ہوں گے۔ اس نے گلاس کی طرف دیکھا دودھ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ اس حالت میں پڑا رہا۔ پھر اٹھا۔ کیتلی میں پانی، چائے کی پتی اور شکر ڈال کر اسٹو پر چڑھا دیا۔ بھوک اور تیز ہو گئی تھی۔ پیٹ کے داہنے حصے میں جلن اب بھی باقی تھی۔ پھر محسوس ہوا جیسے آنتوں میں کچھ چل رہا ہو یا جیسے کوئی چوہیا دھیرے دھیرے آنتوں کو کتر رہی ہو۔ اس کیفیت میں وہ پھر سو گیا۔

صبح منھ اور زبان کساؤ اور کڑوے ذائقے سے بھرے ہوئے تھے پیٹ میں کوئی چیز ادھر ادھر دوڑتے اور چلتے محسوس ہو رہی تھی جلن داہنے حصے سے پھیل کر پورے پیٹ میں بھر گئی تھی اور نم معدہ پر یوں لگتا تھا جیسے کوئی جلتا ہوا روپے کا سکہ چپکا دیا گیا ہو۔ جس کا کھنچاؤ اور چبھن دونوں پھیپھڑوں کو جکڑے لے رہی ہو۔ جب سانس لینے میں زیادہ دشواری ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ تکیہ کے نیچے سے نکال کر کچھ دوائیں منہ میں ڈالیں اور بغیر پانی کے نگل گیا۔

کھانے کے تصور ہی سے جلن اور بڑھ گئی۔ اس نے سوچا کہ یہ فساد خلو کے معدے کا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پاس کے ہوٹل تک گیا اور جلدی جلدی کھانا نگلنے لگا۔ اس ہوٹل سے شدید گھن کے باوجود وہ یہیں کھانا کھانے پر مجبور تھا جب کہ ڈاکٹروں نے ہمیشہ کھانے میں احتیاط بتائی تھی۔ وہی چاول اور ابلا ہوا پانی۔

کھانے کے دوران ہی اسے یاد آیا کہ آفس جانے سے پہلے ڈسپنسری جاکر دو الیما اور اسٹول رپورٹ لے کر ڈاکٹر کو دینا ہے۔ مٹرو جل اور میکسا فارم کی ٹکیوں کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ احتیاط اور پرہیز ان حالات میں ممکن ہی نہ تھے۔

جب ساری رپورٹیں لے کر وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے پھر اپنی بات دوہرائی۔ امیبائیسس۔ شدید امیبائیسس۔ مسٹر اگر آپ نے اب بھی احتیاط نہ برتی تو مرض ناقابل علاج ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب مجھے امیبائیسس نہیں ہے۔ میرے پیٹ میں کوئی چیز... میرا مطلب ہے کوئی جانور، کوئی کیڑا یا کوئی رسولی یا پھر کینسر یا... یا کچھ اور پیدا ہو رہا ہے۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں اب ایک دو قدم چلنے میں بھی دقت محسوس کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے پیٹ میں کوئی جاندار چیز ہے جو دھیرے دھیرے میری آنتوں کو، میرے پھیپھڑوں اور سینے کو کتر رہی ہے۔

جی نہیں آپ کو امیبائیسس ہے۔ بہت سخت امیبائیسس جس کی وجہ سے آپ کو نیوراسس (Neurosis) بھی ہو گیا ہے۔ اپنے اعصاب کو پرسکون رکھئے۔ اور آرام کیجئے۔ چائے، سگریٹ، مرچ، مصالحہ اور چکنائی بالکل ختم۔ پانی بھی اگر ہو سکے تو ابلا ہوا پیجئے۔

ڈسپنسری سے واپسی میں اس کے دماغ میں پھر فائل نمبر ۳/۱۰/۷۹ کا ریمائنڈر۔ فسادات کی رپورٹ کا پروفارما۔ نیلم کے خط کا جواب ناچنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ یہیں سڑک پر چیخ چیخ کر رونے لگے۔ اور کپڑے اتار کے چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہو۔

امیبائیسس امیبائیسس۔ سارے ڈاکٹر جاہل ہیں۔ کسی کی سمجھ میں میرا مرض نہیں آسکا ہے۔ میرے پیٹ میں کینسر ہے۔ وہ مجھے بہلا رہے ہیں۔ شاید کوئی جاندار شے پرورش پا رہی ہے۔ جلن پورے جسم میں پھیلتی جا رہی ہے۔ اگر کینسر ہوا تو؟

آفس جاتے جاتے وہ پھر پلٹ پڑا۔

وہ سہ پہر کو نہایت خستہ سا اپنے کمرے میں پہنچا۔ کیتلی میں پانی چائے کی پتی اور شکر ڈال کر اسٹوو پر چڑھا کر بستر پر لیٹ رہا۔

ظہیر کہنہ پرانی پیچش۔ اسپغول مسلم۔۔ وہ دھیرے دھیرے رو پڑا۔ اور روتے ہی روتے سو گیا۔

کسی کے بار بار دروازہ کھٹکھٹانے پر آنکھ کھلی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اسٹوو کی طرف نظر گئی۔ چائے ابل ابل کر پھیل گئی تھی اور اسٹوو بجھ چکا تھا۔ کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ لپک کر دروازے پر پہنچا۔ مالک مکان نے دو تین خط دیتے ہوئے بتایا کہ آفس سے کوئی ملنے آیا تھا اور یہ خط دے گیا تھا۔

اس نے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ تینوں مختلف تاریخوں میں گھر سے آئے تھے۔ ابا نے لکھا تھا۔ "برخوردار سلمہٗ۔ تم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ خدانخواستہ تمہارے پیٹ میں کوئی تکلیف ہے۔ اس کے بعد سے تمہارا اب تک کوئی خط نہیں آیا ہے، جس سے طبیعت پریشان ہے۔ تمہاری والدہ بہت متفکر ہیں فوراً خط کی اطلاع دو۔" اس نے بے دلی سے تمام خطوط رکھ دئے اور اسٹوو جلا کر ٹھنڈی چائے پھر سے گرم کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مالک مکان نے اسے بلایا۔

"بھائی آپ کی طبیعت تو دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ چلئے ڈاکٹر گھوشال کے یہاں چلیں۔"

"اچھا میں بس دو منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ لیکن تمام راستہ وہ غصہ اور جبر کی وجہ سے خاموش رہا۔ کلینک پہنچ کر بھی اس کا دل چاہا کہ چیختا ہوا بھاگ جائے۔ جیسے جیسے دیر ہوتی گئی ویسے ویسے اس کا دماغ کھولتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دبے لیکن سخت لہجے میں مالک مکان سے کہا۔ "میرا خیال ہے چلیں۔ پھر کسی دن آکر دکھا دیں گے۔"

"جب آگئے ہیں تو دکھا ہی لیجئے۔"

"میرے خیال میں کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے جھلائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ اور ٹہلنے لگا۔ اسی وقت اتفاق سے ڈاکٹر نے انھیں طلب بھی کر لیا۔

مالک مکان نے بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب۔ تقریباً چھ ماہ سے ان کے پیٹ کا علاج ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ دن بہ دن ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" ڈاکٹر اس سے مخاطب ہوا تو اس نے جھلاہٹ پر تیزی سے قابو پا کر بہت سپاٹ انداز میں بتانا شروع کیا۔

"ڈاکٹر صاحب سارے پیٹ میں شدید جلن ہوتی ہے۔ کبھی داہنے حصہ میں کبھی بائیں حصہ میں کوئی گوشت کا لوتھڑا سا چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد مروڑ شروع ہو جاتا ہے۔ بھوک قطعاً ختم ہو چکی ہے۔ کھانے کے تصور ہی سے متلی آنے لگتی ہے۔ دو قدم بھی چلنا دشوار ہو گیا ہے۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھتا رہتا ہے اور پیٹ۔"

ڈاکٹر اس کی باتوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر نسخہ لکھنے لگا تو وہ خاموش ہو گیا۔ جھلاہٹ پھر واپس آنے لگی۔

"یہ دوائیں لے لیجئے، بیس دن کا کورس ہے اور ایکسرے کرا لیجئے۔ پھر ایک ہفتہ بعد مجھ سے ملئے۔" ڈاکٹر نے نسخہ مالک مکان کی طرف بڑھایا تو یہ پھٹ پڑا۔

"ڈاکٹر صاحب دواؤں کی کوئی ضرورت نہیں، چھ ماہ میں یہ ساری دوائیں میں استعمال کر چکا ہوں۔ تمام ٹسٹ بھی ہو چکے ہیں۔ میوکس بھی ہے۔ Cyst بھی ہے۔ آنتوں میں خراش بھی پڑ چکی ہے۔ میں اب علاج کراتے کراتے عاجز آچکا ہوں۔"

مالک مکان نے لپک کر اسے خاموش کرنا چاہا لیکن وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ واپسی میں دونوں قطعی خاموش رہے۔

رات کو کھانا کھا کر آیا تو جلن بہت بڑھ گئی۔ لگاتار کئی گلاس پانی پینے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے کوئی چیز، کوئی جان دار چیز اس کی آنتوں میں تیر رہی ہے

اور پیٹ کے کناروں میں کانٹے سے چبھو رہے ہیں۔ چلتا ہوا سکہ فم معدہ پر پھر چمک رہا ہے۔ اس نے لفافہ اٹھایا کہ گھر خیریت کا خط لکھ دے پھر رکھ دیا اور بجلی بجھا کر لیٹ گیا۔

لیٹتے ہی اسے محسوس ہوا کہ جیسے پھر کوئی چیز باقاعدہ سارے پیٹ میں دوڑنے لگی ہے۔ اس نے گھبرا کر بجلی جلائی۔ جلدی سارے کپڑے اتار کر کمرے میں ٹہلنے اور پیٹ اور سینہ سہلانے لگا۔ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پیٹ پر دباؤ ڈال ڈال کر آئینے میں دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر بہت تیز مروڑ اٹھی۔ وہ اسی طرح باتھ روم میں گھس پڑا۔ وہاں سے نکلا تو سارا چہرہ اور جسم پسینہ میں بھیگا ہوا تھا۔ سانس پھول رہی تھی۔ اس نے نیند کی گولیاں نگلیں اور بجلی بجھا کر بستر پر گر پڑا۔

کل کسی آیورویدک کو دکھلاؤں یا وہی حکیم صاحب والا نسخہ استعمال کروں۔ پیٹ کی جلن بہت بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر کینسر ہوا؟ تو بہت پیسے خرچ ہوں گے۔

رات میں اچانک گھبرا کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر کئی گلاس پانی پی کر نیند کی ایک گولی اور لے کر سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو خاموشی سے کمرہ کی دیواروں کو دیکھتا رہا پھر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور غور سے اپنے چہرے کو تکتا رہا۔ قمیص کا دامن اٹھا کر گھور گھور کر پیٹ کو دیکھتا اور کچھ ٹٹولتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مالک مکان کو بتایا۔ رات ایک بڑا عجیب سا خواب دیکھا جیسے ایک جنسواڑی کا جنگل ہے۔ عجیب گول مٹول سا۔ اس میں ایک گھوڑا چاروں طرف دوڑ رہا ہے۔ جہاں کہیں گھنا کانٹوں دار جنگل آتا ہے وہاں وہ گھوڑا ایک چوہا بن جاتا ہے اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے اچکتا کودتا بھاگتا رہتا ہے وہاں سے نکلتے ہی پھر گھوڑا بن جاتا ہے۔

دوڑتے دوڑتے اس کے جسم سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔ جہاں جہاں وہ پسینہ گرتا ہے وہاں وہاں آبلہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ آبلہ پھوٹ کر زخم بن کر رسنے لگتا ہے۔ پھر اس کے منھ سے سفید پھین نکل کر زمین پر گرتا ہے۔ وہاں سے ایک چوہا پیدا ہو کر دوڑنے لگتا ہے اور سارا جنگل چوہوں اور آبلوں سے بھر جاتا ہے۔

"ارے یہ سب فاسد خیالات ہیں، کوئی خواب نہیں"، مالک مکان نے کہا۔

وہ واپس آکر پھر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور گھور گھور کر پیٹ دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد کپڑے تبدیل کر کے وہ آفس کے لئے چل دیا لیکن جیسے جیسے آفس نزدیک آتا گیا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک نامعلوم سا خوف اسے جکڑنے لگا۔ آفس کی عمارت سامنے آتے ہی اسے بڑی تیز مروڑ ہونے لگی۔ سارا جسم پسینے میں بھیگنے لگا۔ اس نے عمارت کی طرف دیکھا اور رکشہ والے کو شہر کے مشہور وید کا پتہ بتا کر واپس ہو لیا۔

"میں تقریباً چھ مہینہ سے اپنے پیٹ کا علاج کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے پیٹ میں کوئی جاندار چیز ہر وقت آنتوں کو کھرچا کرتی ہے، نوچا کرتی ہے۔ آج صبح مجھے لگا کہ میرا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ اور جلن بہت بڑھ گئی ہے۔"

معائنہ کے بعد وید جی کچھ دیر تک نسخہ لکھتے رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کے پیٹ میں کیچوے ہیں اور بہت دنوں سے ہیں۔ اب تک سارا علاج غلط ہوا ہے۔ اس طرح وہ بجائے ختم ہونے کے بہت بڑھ گئے ہیں، طاقتور ہو گئے ہیں۔ آپ کم سے کم سات دن تک یہ دوائیں استعمال کیجئے پھر دکھائیے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ جلدی ہی آگئے ورنہ آپ کا جگر کسی کام کا نہ رہتا۔"

"کیچوے۔" اس کا دماغ سنسناتا رہا۔ "وید جی، کیا پیٹ میں کیچوے چلتے گھومتے بھی ہیں۔ آنتوں کو نوچا بھی کرتے ہیں؟"

"جی ہاں، جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو وہ آنتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ دوائیں لینے کے بعد آپ دیکھئے گا کہ کیچوے گرتے ہیں یا نہیں؟ سات دن میں سب نکل جائیں گے پھر بھی آپ کو ایک مہینہ تک علاج کرانا ہوگا، طاقت کے لئے۔"

وہاں سے نکلا تو ذہن صرف کیچوے میں الجھا ہوا تھا۔ دوائیں لے کر وہ سیدھا مالک مکان کے پاس پہنچا۔

"لیجئے صاحب، اب جا کر بات صاف ہوئی۔ میرے پیٹ میں کیچوے ہیں۔ سارا فساد ان کیچوؤں کا تھا۔"

"اچھا؟"

"جی ہاں۔ وید جی نے یہی بتایا ہے۔ سات دن کے لئے دوائیں دی ہیں کہ ان سے نکل جائیں گے۔ میں اب آفس سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے رہا ہوں۔ ذرا جم کر علاج کروں گا۔"

رات بھر میں بستر پر لیٹتے ہی اسے بغیر نیند کی گولیاں کھائے ہی نیند آنے لگی تو سرور کے عالم میں ایک فلمی گانا گنگناتا وہ سو گیا۔ علی الصباح ہی اچانک وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور گھور گھور کر سارے کمرے کو تاکنے لگا۔ پھر آئینے کے سامنے جا کر قمیص کا دامن اٹھا کر اپنے پیٹ کو دیکھنے اور سہلانے لگا۔ پھر سے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہی مالک مکان کے پاس گھبرایا ہوا پہنچا۔

"جی آج پھر وہی خواب نظر آیا۔ رات پھر وہی بالکل وہی گھوڑا تڑاخ تڑاخ جنگل اور پہاڑی میں دوڑ رہا تھا۔ جہاں جھاڑیاں سخت ہوئیں وہاں وہ چوہا بن جاتا تھا۔ جہاں دلدل یا کیچڑ آتی تھی وہاں وہ کیچوا بن کر رینگ کر باہر نکل آتا تھا۔"

"صبح کوئی کیچوا نکلا؟" مالک مکان نے تشویش سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ پیٹ کا ورم بھی بڑھ گیا ہے۔ امتلائی کیفیت بھی بڑھتی جا رہی ہے اور جلن بھی زیادہ ہے۔ کہیں واقعی کچھ اور تو نہیں ہے؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ وید جی کی دوائیں کھائیے، تب دیکھئے۔ آج میں بھی ایک ہفتہ کے لئے باہر جا رہا ہوں۔" اس نے خاموشی سے

گردن ہلادی۔ کمرہ میں واپس آکر کیتلی میں چائے کی پتی، شکر، دودھ اور پانی ایک ساتھ ڈال کر اسٹوو پر چڑھا دیا۔

ایک ہفتہ بعد جب مالک مکان لوٹ کر آئے تو سیدھے اس کے پاس آئے۔

"کہئے کیا حال ہے؟ ویدجی کی دوا سے کچھ فائدہ ہوا ہے؟"

اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ایک ٹک بغیر کچھ بولے انھیں دیکھتا رہا۔ پھر پیٹ کو چادر سے ڈھانک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سات دن میں میرے پیٹ سے ایک کیچوا بھی نہیں گرا۔ میرا پیٹ پھولتا جارہا ہے۔ اس میں ایک گھوڑا ہے۔ کبھی وہ کیچوا بن کر رینگنے لگتا ہے۔ کبھی چوہا بن کر پھدکتا ہے۔ اور کبھی جب میں سوجاتا ہوں تو گھوڑا بن کر دوڑنے لگتا ہے۔"

پھر وہ کھلکھلا کر عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"گھوڑا!" مالک مکان گھبرا کر اس کے ساتھ ہنسنے لگے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ آدمی کے پیٹ میں گھوڑا!؟"

وہ چیخ پڑا۔ "ہاں میرے پیٹ میں گھوڑا ہے۔ جو میری آنتوں کو کھارہا ہے۔ اور میرا پیٹ پھولتا جارہا ہے۔"

جب وہ آفس پہنچا تو سب نے اسے گھیر لیا۔ ہر شخص نے اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں، چہرے کی خشکی اور مردنی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے طبیعت کی خرابی بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی اور اپنے کمرہ میں گھس گیا۔ دوپہر میں اس نے ایک ساتھی کو بلایا اور اس کے سامنے قمیص اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

"میرا پیٹ تمھیں کچھ پھولا ہوا تو نہیں لگتا؟"

دوست نے غور سے پیٹ کو دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ "آخر بات کیا ہے؟" اس نے قمیص گرا کر اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرے پیٹ میں ایک گھوڑا پرورش پا رہا ہے۔ جو پورے پیٹ میں دوڑتا ہے جب معدہ خالی ہوتا ہے تو وہ آنتوں کو چبانے لگتا ہے۔"

"گھوڑا!؟" دوست نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں بھی کسی سے نہیں بتانا چاہتا۔ دراصل میرے پیٹ میں گھوڑا ہی ہے جو کبھی چوہا بن جاتا ہے، کبھی کیچوا۔ پھر گھوڑا بن کر تراخ تراخ سارے پیٹ میں دوڑتا ہے، نوفو کی آواز نکالتا ہے، ہنہناتا ہے اس کے منھ سے سفید پھین نکل نکل کر ٹپکتا ہے، جس سے..."

دوست نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چلو میں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لئے تو میں کسی سے کچھ کہتا نہیں۔ تم نے غور سے نہیں دیکھا۔ میرا پیٹ بڑھتا جارہا ہے۔ اب کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ شہر کے سارے ڈاکٹروں کو دکھا چکا ہوں۔ ہر طرح کا علاج کر چکا ہوں۔ کوئی بھی صحیح طور سے نہیں سمجھ سکا کہ میرے پیٹ میں گھوڑا ہے۔ اب تو مجھے اٹھنے بیٹھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ مجھے اور بھی احتیاط کرنا ہوگی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کنپٹیوں سے پسینہ خشک کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد آفس سے اٹھ کر چل دیا۔

کمرہ پہنچنے سے پہلے اس نے بازار سے کئی طرح کے تازہ پھل اور خشک میوے خریدے اور کمرہ میں آکر لیٹ رہا۔

شام کو مالک مکان نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ بڑی آہستگی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر پھر آکر لیٹ رہا۔

"یہ اچھا کیا کہ پھل لے آئے۔ آپ کے لئے پھل بہت ضروری تھے۔"

"جی ہاں، میں بھی سوچتا ہوں کہ اب مجھے بہت احتیاط برتنی پڑے گی۔ اپنے لئے نہ سہی اس گھوڑے کے لئے ہی مجھے پھل وغیرہ استعمال کرنا پڑے گا۔ آپ دودھ والے سے کہہ دیجئے گا کہ صبح سے ایک کیلو کردے۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے وزن وغیرہ اٹھانے اور دوڑنے یا تیز چلنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔"

"جی میں نہیں سمجھا۔"

"کیا آپ کو پتہ ہے کہ گھوڑا کب پیدا ہوتا ہے یعنی کتنے مہینے میں؟ میرا مطلب ہے گھوڑا...؟"

"نہیں۔ مجھے کیا پتہ؟ میرا خیال ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔ ذرا کہیں ٹہل گھوم آیئے۔"

"جی ہاں۔ تھوڑا ٹہلنا تو اب ضروری ہے ورنہ..."

مالک مکان کے جاتے ہی وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر پیٹ کو سہلانے لگا۔ پھر کپڑے تبدیل کرکے باہر ٹہلنے نکل گیا۔ تھوڑی ہی دور پر ملٹری والوں کا ریس کورس بنا تھا۔ وہاں وہ دوڑتے، اچھلتے اور مشق کرتے گھوڑوں کو بہت دیر تک دیکھتا رہا پھر تانگے میں لگے گھوڑوں کو دیکھتا ہوا کمرہ واپس آگیا۔

جیسے جیسے رات ہوتی گئی اس پر خوف سوار ہونے لگا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر دواؤں کا ڈبہ الٹنے پلٹنے لگا۔ "کم بخت تمام نیند لانے والی ہی گولیاں ہیں۔" تھوڑی دیر بعد اس کا جسم پسینہ میں شرابور ہونے لگا پھر بہت تیز مروڑ اٹھی۔

آج سوؤں گا ہی نہیں۔ اس نے سوچا اور ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے جب دماغ بھاری ہوگیا اور پپوٹے جھکنے لگے تو وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اسٹوو پر پانی، چائے کی پتی اور شکر ملا کر رکھ دیئے۔ اور وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا جیسے پانی کی سنسناہٹ میں گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز آرہی ہے۔ کڑبڑ کڑبڑ۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور اسٹوو سے دور جا بیٹھا تو لگا جیسے آواز تیز ہوگئی ہو۔ سارے کمرے میں گونج رہی ہو۔ جیسے بہت سے گھوڑے بغیر کسی ربط کے لگاتار دوڑ رہے ہوں۔ کڑبڑ... کڑبڑ... کڑبڑ کڑبڑ۔

اس نے گھبرا کر اسٹوو بجھا دیا اور کیتلی اتار کر الگ رکھ دی۔ تھوڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر نیند کی دو گولیاں کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

صبح کسی کے مسلسل دروازہ کھٹکھٹانے پر جب اس نے دروازہ کھولا تو مالک مکان نے پوچھا۔

"کیا آج آفس نہ جایئے گا؟"

اس نے صرف نفی میں گردن ہلادی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ خاموشی سے دروازہ پر کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔

"رات کیسی گذری؟ وہ خواب پھر تو نہیں دکھائی دیا؟"

اس نے بڑے کرب سے مالک مکان کو دیکھا۔ آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

"اچھی بات ہے آپ آرام کیجئے۔"

اس نے واپس آ کر دو نیند کی گولیاں نگلیں اور بستر پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر تک خالی خالی نظروں سے سامنے کی دیوار دیکھتا رہا۔ پھر آنکھوں کے کونوں سے گرم گرم پانی بہنے لگا اور وہ سو گیا۔

شام کو کسی نے اس کا نام لے لے کر پکارا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے پر اس کا باپ کھڑا تھا۔

اس نے دیکھا، وہ بہت بوڑھے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہی مونڈھوں پر سے سلی ہوئی ملگجی سی شیروانی پہنے کھڑے تھے۔ سوکھے ہونٹ اور تمبا کو سے ادھ میلے دانت حیرانی میں کھلے ہوئے تھے۔ اسے فوراً خیال آیا کہ بہت دنوں سے ان کو خیریت کا خط نہیں لکھ سکا ہے۔ ان کے کئی خط آچکے ہیں۔ فائل نمبر ۷۹/۱۰/۳۔ فسادات کی رپورٹ کا پروفارما۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

وہ چونک اٹھا۔ "امی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" کہتے کہتے وہ جھک گیا۔

"تم ایک آدھ مہینہ کی چھٹی کی درخواست لکھ کر مالک مکان کو دیدو۔ میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ مجھ سے زیادہ پریشان تو تمھاری ماں ہیں۔ چلو وہیں چل کر اطمینان سے علاج ہوگا۔ کھانے پینے کی احتیاط بھی ممکن ہوگی۔"

علاج؟ اس نے خالی دماغ سے دہرایا۔ "اچھی بات ہے۔"

رات ہی کی گاڑی سے دونوں روانہ ہوگئے۔

سنسناتے ذہن کی دھن میں وہ ماں اور گھر کے دوسرے افراد سے مل کر اپنے کمرے میں گھس پڑا اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ سو کر اٹھا تو اس نے گھر میں پراسرار سی ٹھنڈک محسوس کی۔ ماں اور چھوٹے بھائی عجب حسرت ناک انداز سے اسے ہر جگہ اپنی نظروں کے گھیرے میں لئے رہے جسے محسوس کر کے اسے سخت الجھن ہوتی رہی۔

شام کو اس نے ماں کو کہتے سنا۔ "کیوں نہ کسی مولوی ملا کو دکھایئے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے کچھ کر دیا ہو۔" اسے اور شدید گھٹن کا احساس ہوا۔

رات ہوتے ہی اسے ایک خوف نے جکڑنا شروع کر دیا۔ گھبرا کر وہ گھر والوں کے درمیان آ کر بیٹھ گیا کہ شاید دل بہلے۔ اس کے آتے ہی سب خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ برداشت کرتا رہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ پاس کی سڑک سے کوئی تانگہ یا یکہ گذرا تو اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ بہا۔ گھوڑا؟... بہت دیر تک اس کے دماغ میں گھوڑے کی ٹاپیں گونجتی رہیں۔

صبح کسی آہٹ سے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کی ماں کمرہ میں چاروں طرف کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہے اور جگہ جگہ کچھ کاغذ سے رکھ رہی ہے۔ کچھ کاغذات اس کے تکیے کے نیچے بھی رکھے لیکن وہ سوتا بنا رہا۔

دس بجے کے قریب باپ اسے لے کر شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اسے باہر چھوڑ کر خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے بھی آ کر لے گیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے چیک کرتا رہا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ خوب کھایئے۔ گھومئے اور آرام کیجئے۔" پھر باپ سے مخاطب ہوا۔ "آپ ایکسرے کرا لیجئے اور یہ دوائیں دیجئے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب مجھے اب اٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جھکنے میں پیٹ چرچرانے لگتا ہے۔ یہ دیکھئے میرا پیٹ۔" ڈاکٹر نے ہلکے سے پیٹ تھپ تھپا کر کہا۔ "سب ٹھیک ہے بالکل نارمل۔" "آپ بلاوجہ کی باتیں نہ سوچئے۔ ایکسرے رپورٹ سے سب پتہ چل جائے گا۔"

گھر واپس آئے تو تھوڑی دیر وہ کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب آنتیں کھرچنے لگیں تو جلن اور مروڑ بڑھنے لگے تو وہ گھبرا کر اٹھ گیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اب اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے اور پیٹ وزنی ہوتا جا رہا ہے۔ قدم زمین پر ہلکے ہلکے پڑ رہے ہیں۔ پورا توازن نہیں بن پاتا ہے۔ گھبرا کر وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پاس ہی میں جانوروں کو پانی پلانے کا حوض تھا۔ جہاں دو تین تانگے والے کھڑے تھے اور گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پیٹ میں بھی بڑی تیز جلن اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی گھوڑوں کی طرح حوض میں منہ ڈال کر کھڑا ہو جائے اور سیر ہو کر ہی منہ اٹھائے۔ پھر انھیں کی طرح "فوفو" کر کے اپنے نتھنوں سے پانی کی چھینٹ اڑائے۔

خاصی دیر بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ رات میں اس کے باپ نے اسے بتایا کہ اس نے شہر کے ایک نفسیاتی معالج سے بھی گفتگو کر لی ہے۔ کل اسے بھی دکھانا ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ قمیص اتار کے پھر آئینے کے سامنے ٹہلنے لگا اور اپنے جسم کو گھورنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے رانیں کمزور اور پتلی ہوئی جا رہی ہوں۔ پیٹ اور ناف کا ابھار بہت بڑھ گیا ہو۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے کچھ نشانات سے بنے نظر آئے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے بستر پر آ گرا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ آئینے کے سامنے جا کر اپنا منہ کھول کھول کر کچھ دیکھتا رہا۔ پھر نیند کی ایک گولی لے کر لیٹ گیا۔

رات میں اس کی چیخ سن کر سارا گھر دھڑ دھڑاتا ہوا اس کے کمرہ میں گھس آیا۔ دیکھا کہ وہ کمرہ کے ایک کونے میں سمٹا ہوا کھڑا ہے اور خوف زدہ سرخ چڑھی ہوئی آنکھوں سے بستر کو گھور رہا ہے۔

"اسے اپنے ساتھ سلایئے۔" ماں نے کہا۔ لیکن باپ نے خاموشی سے بازو پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔ سب کچھ دیر کھڑے رہے۔ جب اسے نیند آ گئی تو دبے پاؤں کمرے سے نکل گئے۔

صبح باپ اسے لے کر نفسیاتی معالج کے کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر نے پہلے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں تو اسے الجھن اور جھلاہٹ ہونے لگی۔ لیکن خاموش رہا۔ ڈاکٹر نے تمام ہسٹری پوچھنے کے بعد اس سے اور سوالات شروع کئے جسے اس کا اسٹینو لکھتا جا رہا تھا۔

"کیا آپ کو بچپن سے گھوڑے بہت پسند تھے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کو گھوڑوں سے نفرت یا گھن آتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کبھی گھوڑے سے گرے ہیں؟ یا کبھی کسی گھوڑے سے چوٹ آئی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ پہلے کبھی خواب میں گھوڑے دیکھتے تھے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ کے اردگرد کوئی ایسا آدمی ہے جس کی شکل دیکھ کر گھوڑا یاد آئے اور آپ اس سے نفرت یا محبت کرتے ہوں؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے پیٹ میں واقعی گھوڑا ہے؟ اور اصل گھوڑے جیسا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"گھوڑا اچھلتا بھی ہے اس سے آپ کو تکلیف یا پریشانی ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہنہناتا ہے۔ باچھوں سے آوازیں نکالتا ہے۔ تیزی سے دوڑتا ہے۔ پھر آپ کی آنتیں چبانے لگتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کو اس سے خوف یا نفرت محسوس ہونے لگتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے باپ کو مخاطب کیا۔ "میں کیس کی اسٹڈی کر کے ڈاکٹر مہروترا سے بات کرلوں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انھیں بس آرام کرنے دیجئے۔ اور تنہا نہ رہنے دیجئے۔"

رات کو یہ اپنے کمرہ میں پہنچا تو باپ پہلے سے ہی دوسرے بستر پر لیٹا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد خواہش ہوئی کہ آئینے کے سامنے پیٹ کھول کر دیکھے۔ اس نے پلٹ کر باپ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی اور آنتوں میں جلن بڑھنے لگی۔ پھر محسوس ہونے لگا جیسے داہنے حصہ کو کوئی تیزی سے نوچ رہا ہے۔ وہ ... اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس کا باپ بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کوفت اور الجھن میں پھر لیٹ گیا۔ اچانک بہت تیز مروڑ شروع ہوئی تو وہ باتھ روم میں گھس گیا اور وہاں کا آئینہ کیل سے اتار کر اور گھما گھما کر اپنا پیٹ دیکھتا رہا۔

دوبارہ آ کر لیٹا تو باپ کی موجودگی کی الجھن سے نیند غائب ہوگئی۔ اس نے تکیہ کے نیچے سے نیند کی گولی نکالنا چاہی تو ہاتھ تعویذ سے ٹکرا گیا۔ "ماں!" اس کے ذہن نے پکارا۔ پھر بغیر پانی کے دوا نگل گیا۔ "ماں!" دوسری بار اس کے ذہن نے پکارا اور آنکھوں سے گرم پانی بہنے لگا۔

صبح اس کے باپ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ سارے کمرے میں ننگے پیر ٹہل رہا ہے پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر قمیص کا دامن اٹھا اٹھا کر اپنا پیٹ دیکھ رہا ہے اور ٹہلنے لگتا ہے۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے کیا پھر تکلیف ہو رہی ہے؟" وہ چونک کر بھاری آواز میں بولا۔ "گھوڑا! رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔"

اس کا باپ چیخ اٹھا۔ "پاگل ہو گئے ہو تم۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمھارا۔ آخر آدمی کے پیٹ میں گھوڑا کیسے آسکتا ہے؟ تم پاگل ہو اور سارے گھر کو پاگل کر رہے ہو۔ موت بھی نہیں آتی تمھیں۔" ان کی آواز سن کر سارا گھر کمرہ میں جمع ہو گیا۔ وہ خجل سا اپنے بستر پر جا کر بیٹھ رہا۔

دس بجے کے قریب پھر دونوں ایکسرے رپورٹ لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ رپورٹ دیکھ کر اس نے گردن ہلائی۔ "نہیں کچھ نہیں۔ کوئی ابنارملٹی نہیں ہے۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ سب محض آپ کا وہم ہے۔ آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر... صاحب میرے پیٹ میں گھوڑا ہے۔ بہت بڑا گھوڑا۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ میں اسے محسوس کرتا ہوں۔ میں اسے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہنہناتا ہے، باچھوں سے فوفو کی آواز نکالتا ہے اور سارے پیٹ میں دوڑتا ہے۔ اس کے منھ سے سفید سفید جھاگ نکلتا ہے اور اس کے پسینے کے قطرے جگہ جگہ ٹپکتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہوں۔ میں ابھی اس پر قابو نہیں پا سکا ہوں۔ وہ میرے اشارے نہیں سمجھ پاتا ہے۔"

"بھئی آپ ان کو کسی ماہر نفسیات کو دکھائیے۔" ڈاکٹر نے باپ سے کہا۔

"جی میں دکھا چکا ہوں۔ وہ کیس کی اسٹڈی کر کے آپ سے بھی بات کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔"

وہ دونوں واپس ہوئے تو سارے راستے باپ خاموش رہا۔ اور اسے گھر چھوڑ کر وہ نفسیاتی معالج سے ملنے چلا گیا۔

معالج نے بتایا۔ "اس کیس میں کوئی نفسیاتی الجھن ہے ضرور۔ جس کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ لڑکے کا آپریشن کیا جائے۔"

"کیا مطلب؟ آپ بھی سمجھتے ہیں کہ گھوڑا...!" باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان کے علاج کی اب یہی صورت ہے کہ ان کا آپریشن کیا جائے۔ اور ایک گھوڑا نکال کر ان سے کہا جائے کہ دیکھئے واقعی آپ کے پیٹ سے یہ گھوڑا نکلا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھیں Obsession سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ نارمل ہو جائیں گے۔ دوسری طرف ان کے دماغ میں جو یہ بیٹھا ہے کہ ڈاکٹر غلط کہہ رہے ہیں،

ان کی بات صحیح ہے کہ ان کے پیٹ میں گھوڑا ہے، سچ ہو جائے گی تو وہ مطمئن ہو جائیں گے۔"

"تو اس کے لئے آپریشن واقعی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں۔ آپریشن تو واقعی کرنا ہوگا۔ واقعی ذہین آدمی ہیں، فوراً محسوس کرلیں گے کہ انھیں بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ ہاں یہ بھی کرنا ہوگا کہ پہلے سے ہی ایک گھوڑے کا انتظام کرلیں تاکہ آپریشن کے بعد انھیں دکھایا جاسکے۔ میں ڈاکٹر مہروترا سے بات کر چکا ہوں وہ بھی متفق ہیں اور آپریشن کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کل آپ انھیں اسپتال میں داخل کروا دیجئے۔"

دوپہر میں باپ نے آکر بتایا کہ دونوں ڈاکٹروں نے کہا کہ اب آپریشن کرکے ہی اصلیت معلوم ہوسکے گی۔ اور کل سے اسپتال داخل کردیا جائے گا۔ اس نے بے چینی سے گھبرا کر پوچھا۔ "آپریشن؟ اس سے گھوڑے کو تو کوئی نقصان کا احتمال نہیں؟"

باپ کے چہرے پر ایک دم کبیدگی ابھری۔ "میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لوگ پہلے ہی سے سب تیاری کرلیں گے۔ تم کل داخل ہوجاؤ۔"

سارا دن وہ استلائی کیفیت سے گذرتا رہا۔ شام ہوتے ہی اپنے کمرے میں گھس گیا اور بے چینی کے عالم میں ٹہلتا اور قمیص اٹھا اٹھا کر پیٹ کو گھورتا اور سہلاتا رہا۔ جب مروڑ کی کیفیت زیادہ ہوجاتی تو باتھ روم میں گھس کے آئینہ لے کر بیٹھ جاتا۔

رات ہوتے ہی اسے بری طرح نیند آنے لگی۔ اور وہ اطمینان سے ساری رات سوتا رہا۔

صبح اسے اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ جہاں سارا دن وہ اطمینان سے بستر پر لیٹا مختلف دوائیں اور مکسچر استعمال کرتا رہا۔ ایک عجیب سی بے چینی اور سرور کا عالم اس پر طاری رہا۔ ماں اور چھوٹے بھائیوں سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں اور ریڈیو سے گانے بھی سنے۔ "آپریشن کل ہوگا۔ تم لوگ یہیں رہنا۔ بڑا مزا آئے گا۔" اس نے چھوٹے بھائیوں سے ہنس کر کہا۔ رات کو وہ فلمی رسائل کی تصویریں دیکھتا دیکھتا سوگیا۔

صبح سویرے ہی آنکھ کھلی تو استلائی کیفیت میں وہ برآمدے میں آکر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اسٹریچر پر لٹا کر نرسوں نے آپریشن روم میں پہنچا دیا جس کے دروازہ پر اس کے ماں باپ اور بھائی کھڑے تھے۔ باپ نے اس کا بازو پکڑ کر تسلی دی۔ ماں جلدی جلدی دعائیں پڑھ کر اس پر دم کرنے لگی۔

آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر اور نرسیں تیار تھیں۔ نفسیاتی معالج بھی وہیں موجود تھا۔ ایک نرس نے بازو کھول کر انجکشن دیا تو بھی وہ مسکراتا رہا...

آنکھ کھلی تو شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس نے نقاہت سے ارد گرد نظر دوڑائی۔ ایک طرف گلوکوز کی بوتل کا اسٹینڈ رکھا تھا۔ اور ایک نرس کھڑی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر مہروترا نفسیاتی معالج اور باپ کھڑے تھے۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ نقاہت اور درد بہت زیادہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد سب کمرہ سے نکل گئے۔ اس پر پھر غنودگی طاری ہوگئی۔

جب دوسری بار اس کی آنکھ کھلی تو قدرے بشاش تھا۔ دونوں ڈاکٹر اور باپ پاس پاس ہی کھڑے تھے۔ باپ نے جھک کر اس کا ماتھا چھوا۔ "کیسی طبیعت ہے؟" اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

نفسیاتی معالج نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مسٹر... حیرت انگیز۔ بہت حیرت انگیز۔ واقعی آپ کے پیٹ سے جیتا جاگتا گھوڑا برآمد ہوا ہے۔ دنیا کا واحد مثال ہے یہ کیس۔"

ڈاکٹر مہروترا نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "بھئی اب کیا محسوس ہوتا ہے؟"

اس نے غور کیا۔ واقعی اب پیٹ کا تناؤ بالکل ختم ہوگیا تھا۔ "جی، اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جلن بھی نہیں ہے اور نہ تو تنگی ہے نہ تناؤ، اب پیٹ بالکل ہلکا ہے۔ جیسے پہلے تھا۔ اب بالکل نہیں محسوس ہوتا کہ کوئی چیز دوڑ رہی ہے۔ آنتوں کو کتر رہی ہے یا وہ گھوڑا... آپ لوگ میری بات ہی نہیں سمجھ پا رہے تھے۔"

ڈاکٹر مہروترا خجل ہوکر پیچھے ہٹ گئے۔

"کہاں ہے وہ گھوڑا؟" اس نے نقاہت سے ادھر ادھر دیکھا۔ نفسیاتی معالج نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ ہٹایا۔

ایک لحیم شحیم اور صحت مند گھوڑا دھلا دھلایا دروازہ پر کھڑا تھا اور زمین پر ہلکے ہلکے ٹاپیں مار رہا تھا۔

اچانک اس کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ آنکھوں کی پتلیاں الٹنے لگیں۔ زخمی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس نے بے چینی سے بیٹھ جانا چاہا۔ ڈاکٹر اور باپ اس پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے اسے جکڑ لینے کی ناکام کوشش کی۔

"کیا بات؟ کیا ہوا؟ کیا ہے؟"

پیٹ سے بہتے ہوئے خون کی پروا کئے بغیر اس نے اٹھ جانا چاہا۔ لیکن ناکام ہوکر ایک زخم خوردہ پرندے کی طرح آنکھیں کھولیں۔ دونوں نے ڈاکٹروں کی طرف گھبراہٹ اور حقارت سے دیکھا اور باپ کی طرف سے منہ پھیر کر کہا۔

"اس گھوڑے کا رنگ مشکی ہے۔ میرے پیٹ میں جو گھوڑا ہے وہ تو سفید رنگ کا ہے۔" ☆☆☆

پرویز شاہدی کے منتخب اور نمائندہ کلام کا مجموعہ

تثلیث حیات

اضافہ شدہ نیا ایڈیشن، نئی ترتیب

ترتیب و تہذیب

مظہر امام   یوسف امام

ناشر: مکتبہ روشنائی، کراچی

جنگلی لڑکیوں کے نام

قمر جمیل

شمارہ ۵۷،
مئی ۱۹۷۱

غیر انسانی رات
انسانوں پر آ رہی ہے
زخمی پتے رو رہے ہیں
صبح کب ہوگی؟
نیگرو
گھاس پر
پہاڑوں، دریاؤں
اور درختوں کے پھلوں میں
کون چھپا ہوا ہے
اے جنگلی لڑکیو
رات کا پیلا سورج
کہاں ہے؟
دیکھو...
کل رات سے
سورج مجھ میں جل رہا ہے
دریاؤں کے ٹھنڈے پانی میں
آگ لگنے والی ہے
اے جنگلی لڑکیو
بستر کے شکاریوں سے
ہوشیار رہنا...
تمھاری جوتیاں
خدا کرے
غرور کی مٹی سے
ہمیشہ بھری رہیں
پوکھر کے کنارے
بانس کے درخت
کیا کر رہے ہیں؟
جسم کی سچائیاں بھی
آخر اک چیز ہیں
اے جنگلی لڑکیو
تمھارا حسن
جنگل کی کالی افواہوں سے
زیادہ کچھ نہیں
دیکھو...
ناریل کا درخت
تمھارے آگے
جھکا ہوا ہے
میں اپنے دل کی مٹی میں
اک ایسا پھول
اگانا چاہتا ہوں
جس میں ہر سال
تم اگتی رہو
لیکن یہ پھول
اتنی غیر انسانی رات میں...
غیر انسانی سائیکلون
انسانی آسمانوں کا
تعاقب کر رہے ہیں
اے جنگلی لڑکیو
جاؤ... شہر سے واپس چلی جاؤ
جنگل کا سورج
تمھارے کپڑوں سے
نکلنا چاہتا ہے

طوفانی رات کی آواز

قمر جمیل

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

اے رونے والے بادل چپ ہو جا
دستک دینے والے جھکڑ... باہر آ
کوئل مجھ میں کوک رہی ہے
ڈالی مجھ میں سوکھ رہی ہے
خزاں کا سورج
نکل رہا ہے
میں بھی چپ ہوں
تو بھی چپ ہو جا
میں بھی سونے والا ہوں
تو بھی کسی دہقان کے گھر سو جا
رونے والے بادل... چپ ہو جا

غزل

قمر صدیقی

شمارہ ۲۷۵،
دسمبر ۲۰۰۳

کسی کے دست طلب کو پکارتا ہوں میں
اٹھاؤ ہاتھ مجھے مانگ لو دعا ہوں میں

مرے ازل اور ابد میں نہیں ہے فصل کوئی
ابھی شروع ابھی ختم ہو رہا ہوں میں

بسی ہے مجھ میں یگوں کی عجب یہ ویرانی
بدن سے روح تلک بے کراں خلا ہوں میں

نہ کوئی آگ ہے مجھ میں نہ روشنی نہ دھواں
کسی کے خواب میں جلتا ہوا دیا ہوں میں

نظر کے واسطے اپنا نظارہ کافی ہے
خود اپنا عکس ہوں خود اپنا آئینہ ہوں میں

مجھے نکالو اس سمندر سے

احسان عبدالقدوس، ترجمہ، قمر عالم قاسمی

شمارہ ۱۵۵،
مئی تا جولائی ۱۹۸۹

میں ایک کویتی عورت ہوں۔ شاید مجھ میں سب سے حسین پہلو میرا کویتی ہونا ہے... میں جانتی ہوں کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں کویتی عورت کا مطلب سمجھا نہیں جاتا، اور لوگ اسے خلیجی ممالک کی عورتوں کے ضمن میں شمار کرتے ہیں۔ شاید ان کی نگاہوں میں کویت، عراق، سعودی عرب، قطر، ابوظہبی اور بحرین وغیرہ کی عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کویتی عورتیں خلیج کی دیگر تمام عورتوں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی ایک مستقل شخصیت ہوتی ہے۔ ایسی شخصیت جس کے بنیادی عناصر رسم ورواج اور معنویت کسی بھی عرب ملک کی عورتوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے... لیکن یہ اختلاف ظاہری خط و خال میں نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کویتی عورتوں کے نقوش دیگر عرب عورتوں کے بالکل ہم مثل ہوں۔ اور صرف لہجۂ گفتگو ہی سے ان کے مابین فرق کیا جاسکے۔ لیکن اختلاف دراصل شخصیت کا ہے۔ معاشرتی مقام کا ہے، اور عورت کی حیثیت سے ہماری قدر و قیمت کا ہے۔

اگر میں یہ کہوں تو شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ کویتی عورت دیگر عرب ممالک کی عورتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ حالانکہ ہمیں اپنے ملک میں انتخابات، سیاست، وزارت اور اس طرح کی دیگر تمام احمقانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق حاصل نہیں... جنھیں دنیا بھر کے مرد وعورتوں کے حقوق اور آزادی کا نام دے کر ان کی عقلیت کا مزاق اڑاتے ہیں۔ میرے خیال میں زنانہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی ذات سے متعلقہ تمام امور میں مرد کے شانہ بشانہ پورے مساوات کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملے۔ اور یہی حق کویتی عورت کو دیگر عرب عورتوں سے جدا کرتا ہے۔

ابھی کچھ ہی دنوں قبل کویتی عورت پردے کے پیچھے رہا کرتی تھی۔ اس کے وجود پر بڑا سا نقاب پڑا ہوتا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت پر اس حجاب کا کوئی اثر نہ تھا۔ دراصل عادات وروایات بیرونی مظاہر کو مقید نہیں کرتے۔ بہت ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ عادات ومظاہر بدل جائیں لیکن شخصیت انسان کی ایک ایسی طبیعت کا نام ہے جسے وہ نسلوں اور صدیوں کے بعد حاصل کرتا ہے، اور ظاہری عادات و تقالید کی تبدیلی سے شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ آج کی بے نقاب کویتی عورت کل کی با نقاب کویتی عورت سے قطعی مختلف نہیں۔ اس کی آزادی ذاتی وجود اور مردانہ شخصیت کا سامنا کرنے کا اسلوب وہی پرانا ہے۔

ہمیں پوری طرح سمجھنے کے لئے کویتی معاشرے کے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ وہ وقت جب ہمارے مرد ملاح، غوطہ خور، موتیوں کے شکاری، بحری قزاق اور تاجر تھے۔ ہمارے مرد اپنے وقت کا بیشتر حصہ خشکی کے مقابلے میں سمندر میں گزارا کرتے تھے۔ وہ مہینوں سمندر میں ہوتے اور خشکیاں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لئے چھوڑ دیتے۔ اور پھر معاشرتی تقاضے کے مطابق خشکی پر عورتوں کی اور پانی پر مردوں کی حکمرانی ہوتی... عورتوں کو ان کے شوہر، باپ اور بیٹے وغیرہ خشکی پر چھوڑ کر کبھی سالہا سال سمندروں میں غائب رہتے۔ اور یہ عورتیں ان کے بچوں کی ذمہ دار ہوتیں تا آنکہ وہ بڑے ہو کر سمندر کی آغوش میں چھپ جانے کے قابل ہو جاتے، اور بوڑھوں کی ذمہ دار ہوتیں تا آنکہ وہ سفر قبر پہ روانہ ہو جاتے، اور وہ قبیلے کے امتیازی وجود کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتیں تا کہ ان کے مرد جب اپنی چھٹیاں گزارنے سمندر سے واپس لوٹیں تو ان کا خیر مقدم کر سکیں۔ اور اس طرح کی بے شمار ذمہ داریاں ہوتیں جن کا تقاضہ ہوتا کہ انھیں مکمل آزادی ملے۔ ہر طرح کی آزادی، خواہ اس کا تعلق انفرادی تصرفات سے ہو یا فکری اڈیٹرین سے۔ اس طرح ماضی کی کویتی عورت آزاد تھی، اور ذمہ دار بھی۔

پھر کویتی معاشرے میں ترقی ہوئی اور کویتی عورت کی آزادی طبع جوں کی توں رہی۔ لیکن اس معاشرتی ترقی نے اس کی دشوار گزار ذمہ داریوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اب وہ آزاد تو رہی لیکن ذمہ داریاں ختم ہو گئیں۔ اور پھر یہی بلا مسئولیت آزادی کویتی معاشرے اور کویتی عورت کی دشواریوں اور پریشانیوں کا سبب بنی۔

اس موقع پر شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کویتی معاشرے کی ترقی در اصل پٹرول کے انکشاف کا فوری اور براہ راست ردعمل تھی۔ کیونکہ اب مرد کو رزق کی تلاش کے لئے سمندر میں زندگی گزارنے کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ وہ زمین کھودتا تو دولت پھوٹتی۔ اس لئے اب وہ سمندر کو خیر باد کہہ کے زمین پر ٹھہر گیا۔ پھر وہ زمین بھی اپنے ہاتھ سے نہ کھودتا، بلکہ گھر بیٹھے زمین کھودنے والے افراد طلب کر لیتا۔ اب اسے ضرورت نہیں رہی کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں موتیاں

ڈھونڈے، جن سے دولت مندوں کی عورتیں خود کو سنواریں، بلکہ اب وہ خود دولت مند ہو کر موتیاں خریدنے لگا تاکہ اس کی عورتیں بنیں سنوریں۔ اور جب مرد زمین پر ٹھہر گیا تو عورت کی ذمہ داری ضائع ہو گئی۔ اب نہ وہ وجود قبیلے کی ذمہ دار رہی، نہ اپنے اردگرد کے بچوں اور بوڑھوں اور نہ کسی اور شے کی۔

پٹرول نکلنے کے باعث کویتی معاشرے میں ایک اور بات پیدا ہوئی، وہ یہ کہ کویت کی سرزمین پر بہت سارے قبائل آ بسے۔ ایسے دسیوں اجنبی قبائل جن کا قبل ازاں وجود نہ تھا۔ مثلاً: امریکی قبیلہ، ہندوستانی قبیلہ، فلسطینی قبیلہ، ایرانی قبیلہ، لبنانی قبیلہ، یمنی قبیلہ، مصری قبیلہ اور اس طرح کے بے شمار قبائل جو کہ دنیا بھر سے آکر پٹرول کے کنووں کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ کویت کے حقیقی قبیلے کے لئے ان تمام قبائل کے ساتھ گھلنا ملنا دشوار ہو گیا تھا، اور حیرت اس کی زندگی کا جز بن گئی تھی۔ کیونکہ یہ قبائل ایسے نہ تھے جو آتے اور چلے جاتے، بلکہ یہ وہ قبائل تھے جو آئے اور یہیں ٹھہر گئے، تاکہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ایسی حالت میں کویت کے اصل قبیلے کے لئے اس کے سواہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اس طوفان ہجرت سے بچنے کے لئے کہیں بھاگ جائے۔ لیکن اس بار وہ ماضی کے اہل کویت کی طرح سمندر کی طرف نہیں بھاگا، بلکہ آسمان کی طرف راہ فرار اختیار کی... وہ اونچا اڑا... یا اڑا دیا گیا... اور بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے پر اپنا عرش بنا کر ان مہاجر قبائل کو حیرت سے دیکھنے لگا جس طرح شہنشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے... اس کی نگاہوں میں مالک اور شہنشاہ کا غرور تھا، جس کی پیشانی پر شکنیں ہوتی ہیں اور دولت مندی کا احساس بھی۔

عالمی سطح پر ہجرت کے اس طوفان میں کویتی شخصیت ضائع ہو گئی... کویت میں کوئی بھی شے کویتی نہ رہی... کاریں امریکی اور جاپانی... کپڑے فرانسیسی... ساڑیاں ہندوستانی... ٹائیاں برطانوی... سبزیاں مصری... مٹھائیاں لبنانی اور شامی... گھروں کی سجاوٹ اجنبی... مسجدوں کا اسلوب ترکی... اور نہ جانے کیا کیا۔ سڑک سے لے کر گھر کے اندر تک کوئی بھی شے ایسی نہ رہی جو کہ کویتی شخصیت اور میراث کی ترجمان ہوتی۔ ہر جگہ کویتی شخصیت ضائع ہو چکی تھی۔ اور ہر اجنبی شے نے اس کی زندگی کو روند رکھا تھا۔

پٹرول کے انکشاف کے بعد ہماری زندگی میں ایک بہت بڑی مصیبت خالی وقت کی شکل میں داخل ہوئی۔ انسان کے لئے خالی وقت سے زیادہ دشوار اور سنگین شے کچھ اور نہیں ہوتی... اہل کویت کی زندگی ان لوگوں سے مختلف نہ رہی جو لاٹری کے نتائج کی امید پر جیتے ہیں۔ کیونکہ کویت میں پٹرول کا انکشاف بذات خود ایک کامیاب لاٹری کے مترادف تھا... محض نصیب... صرف خدا کی دین۔ جس میں انسانی صلاحیت اور قوت فکر و عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا... ان تمام باتوں کا انفرادی زندگی اور شخصیت پر اثر پڑا، اور کویتی شخصیت ایک ایسے انسان کی شکل میں ابھری جس کے ہاتھ میں لاٹری کا ٹکٹ ہوتا ہے اور وہ مسائل حیات سے دور فائدہ مند نتیجے اور لمحے کے انتظار میں زندگی کے پل کاٹتا ہے تا آنکہ کویتیوں کی وہ تاجرانہ فطرت بھی جو اس کی گھٹی میں پڑی ہے، گزر اوقات اور دل بہلاوے کا ذریعہ بن گئی۔ اب اسے تجارت کے لئے اونٹوں کے قافلوں کے ہمراہ صحرا کا سینہ روندنے یا کشتیوں پر سمندری موجوں سے لوہا لیتے ہوئے ایران، ہندوستان یا دیگر ممالک کے سفر کی ضرورت نہ رہی، بلکہ بہت سے لوگ گھر بیٹھے غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعے اپنے سرمائے سے تجارت کروانے لگے... بات اسی جگہ نہ ٹھہری بلکہ سرمایہ لگائے بغیر تجارت میں حصہ لینا بھی اس کا قانونی حق بن گیا، کیونکہ سرکاری قانون کے مطابق کوئی بھی غیر ملکی صرف اسی شکل میں کویت میں تجارت کر سکتا ہے جبکہ اس کا کوئی کویتی اسپونسر اور کفیل ہو... اب اسپونسر کے نام پر ایک کویتی کسی بیرونی تاجر کو تجارت کے لئے صرف اپنا نام دیتا اور پھر بلا جدو جہد فائدے میں اس کا حصہ خود بخود بنتا رہا... ذہانت پر مبنی مہم جوئی بھی کویتی طبیعت کا ایک جز ہے... موتیوں کی تلاش کسی عاقلانہ مہم جوئی کے سواہ اور کیا ہے؟ .. ایک ایسی مہم جوئی جس میں انسان سمندر کی گہرائیوں میں بہت دور تک غوطہ لگاتا ہے خواہ اس کی سانس ہی کیوں نہ گھٹ جائے... لیکن اب اس نے سمندری موتیوں کے شکار کے بجائے عورتوں کے شکار کا آغاز کیا... اب اسے سمندر میں غوطہ خوری کی ضرورت نہ رہی بلکہ وہ لندن، پیرس کے ہوٹلوں اور لبنان شام اور مصر کے خاندانوں میں غوطہ لگانے لگا تاکہ وہ طرح طرح کی عورتوں کا شکار کر سکے۔ پٹرول کے انکشاف سے قبل کویتی مرد کی زندگی میں عورتوں کی یہ تعداد نہ تھی جو اب ہے... اب اس کے پاس پٹرو ڈالر کی عورتیں ہیں۔ اور ہم کویتی عورتیں اپنے مردوں کی زندگی میں داخل ہونے والی پٹرو ڈالر کی بنی ان عورتوں کو کسی سامان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں... جی ہاں محض خریدا ہوا مال تاکہ اپنا فارغ وقت کاٹے۔ جس طرح دھواں اڑانے کے لئے قیمتی حقہ خریدتا ہے، یا تفریحی سواری کے لئے گھوڑا۔

کویتی عورت کے لئے جس میں میں خود میں بھی شامل ہوں، مردوں کے مقابلے میں یہ خالی وقت کچھ زیادہ ہی دشوار اور خطرناک ثابت ہوا۔ پٹرول سے قبل اس کا بنیادی مقصد تھا، کچھ ذمہ داری تھی۔ بچے، بوڑھے اور قبیلہ وغیرہ کی۔ لیکن اب اس کا بنیادی مقصد صرف خالی وقت کا ٹارہ گیا۔ تا آنکہ جب ایک کویتی لڑکی تعلیم کے نام پر بیروت، قاہرہ، لندن اور پیرس کے سفر پر اصرار کرتی تو اس کا مقصد بذات خود تعلیم کا حصول نہ ہوتا، بلکہ صرف خالی وقت کے عذاب سے چھٹکارا پانا ہوتا۔ لیکن اگر تعلیم بذات خود مقصد نہ ہو تو ایک لڑکی خود کو خالی وقت کے ڈنک سے بھی بچا نہیں سکتی۔ اور اس طرح کویت کی ہر لڑکی اوقات فراغ کی بدسلوکیوں کی شکار ہوئی، تا آنکہ اسے اپنی اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے جھوٹے بہانوں کا سہارا لینا پڑا جن کی وہ ماضی میں عادی نہ تھی۔

کویتی معاشرے میں اتنی ترقی کے باوجود کویتی شخصیت کا امتیازی نشان برقرار رہا۔ اور یہ اس کی گہری ذہانت اور چالاکی ہی ہے جو اسے خلیج کی دیگر شخصیتوں سے جدا کرتی ہے۔ بلکہ اگر میں کویتیوں کو تمام عرب دنیا میں سب سے زیادہ چالاک کہوں تو غلطی پر نہ ہوں گی۔ ہمیں لوگ خلیج کے یہود کہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاؤں کہ ہم یہودیوں کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ چالاک اور عیار ہیں... اگر ہم فلسطین میں پیدا ہوتے تو آج یہودیوں کو ہی تلاش وطن کے بحران سے دو چار ہونا پڑتا... اور پٹرول کے انکشاف کے بعد تو کویتی چالاکی اور عیاریت کی ذمہ داری مزید بڑھ گئی... ماضی میں تو اس کی تمام تر ذہانت دولت کی

تلاش میں مصروف تھی، لیکن اب اچانک دولت کے پھٹ پڑنے کے بعد اس کی تلاش میں ذہانت صرف کرنے کی ضرورت نہ رہی، بلکہ اس دولت کے خرچ کے لئے ذہانت کے استعمال کی ضرورت آن پڑی... یعنی کیسے خرچ کیا جائے کہ اس کا فائدہ واپس ہم تک پہنچے۔ اور ذہانت کا سب سے واضح ردعمل یہ تھا کہ غریبوں کے دلوں میں ہماری دولت کی لالچ بھڑک اٹھی۔ اب ہر غریب کی نگاہ ہماری دولت پر ہے... یہ ہماری ذہانت کی ہی ذمہ داری تھی کہ ہم غریبوں کو کم سے کم دیں اور ان کی رضامندی بھی حاصل کرلیں، تاکہ ہم ان کی لعنتوں کے ہدف نہ بن جائیں اور وہ ہمیں بخیل نہ کہہ دیں، مثال کے طور پر سودیوں کے مقابلے میں بخیل... نہیں ہم بخیل نہیں بلکہ چالاک ہیں... ہم جب لیتے ہیں تو بھی چالاک ہوتے ہیں، اور جب دیتے ہیں تو بھی چالاک ہوتے ہیں۔

یہ میری شخصیت کا ایک تعارفی خاکہ ہے... ایک کویتی عورت کا تعارفی خاکہ... میری سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں روز اول سے ہی خالی وقت کا ڈنک برداشت نہ کرسکی۔ میں ہر اس چیز کا تحمل نہ کرسکی جس میں حرکت نہ تھی میرے لئے ضروری تھا کہ میرے سامنے پڑی ہر شے حرکت کرے... اور وہ بھی میری قیادت میں اور میرے ارادے کے مطابق... میں جس شخصیت کی پاسبان ہوں وہ دراصل میری قدیم دادی کی شخصیت ہے... میں چاہتی ہوں کہ عورت کی حیثیت سے زندگی کے سیاہ سفید میں تصرف کا حق صرف مجھے تنہا ملے... مرد سمندر کو روانہ ہوجائیں... اور جب واپس لوٹیں تو اپنی ساری دولت میرے سامنے بکھیر کر مطمئن ہوجائیں، پھر میں اس کی حفاظت کروں اور اس سے متعلق ہر شے کا انتظام کروں۔ اس کے بعد وہ مرد اپنا، اپنے گھر، اولاد، وطن اور ہر شے کے مستقبل کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ کر، پوری طرح مطمئن سمندر کو لوٹ جائے اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔

میں نے اپنی زندگی کا آغاز اسی طرح کیا جس طرح کویت کے کسی بڑے خاندان کی لڑکی کرتی ہے... یعنی گھر کے اندر سے... ہر شے گھر میں... تعلیم گھر میں... کھیل گھر میں... فلم بینی گھر میں... اور ہم گھر کے باہر کی دنیا کی بات کچھ اس طرح کرتے جیسے وہ صرف بڑوں کی دنیا ہو۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی کہ ہمیں صرف آٹھ سال کی عمر میں ہی اپنے بڑے پن کا احساس ہونے لگتا۔ جب میری عمر صرف آٹھ سال کی تھی تو اسی وقت میں خاندان کی دیگر لڑکیوں، لونڈیوں اور خادماؤں کے ہمراہ مردوں سے متعلق گفتگو کرنے لگی تھی... مثلاً شادی کیا ہے؟... جنس کسے کہتے ہیں...؟ وغیرہ... اور جب دس سال کی ہوئی تو میں جنس سے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ بلکہ محسوس بھی کرتی تھی، گوکہ اس احساس کا جسم کے مقابلے میں خیال سے زیادہ تعلق تھا۔ اور یہ احساس بھی دراصل اس خالی وقت کی عطا تھا جس سے محلوں کی اونچی اونچی چہاردیواریوں میں مقید ہر نازک جان دوچار ہوتی ہے... اور میں تو شاید بچپن سے ہی ان دیواروں کو اپنا دشمن سمجھتی تھی، جنھوں نے مجھے مقید کر رکھا تھا... میں محلوں کی ان دیواروں کو چھلانگ کر اس خیمے کی طرف لوٹ جانا چاہتی تھی جہاں میری دادی رہا کرتی تھی، تاکہ میں پیروں کی بیڑیاں کاٹ سکوں، آزاد ہوجاؤں، صحرا کی ریت پر کھیلوں دوڑوں۔ سمندر کے ساحل پر کھڑی مردوں کا انتظار کروں جبکہ وہ تجارت یا موتیوں کے شکار کے بعد گھر لوٹیں۔ ان کی کمر سے تیز تلواریں لٹکی ہوں، اور کاندھوں پر دولت سے بھری صندوق ہو... اسی طرح کے خیالات میرے ذہن کو لوریاں کھلاتے... اور انھیں خیالوں نے مجھے شریر بھی بنا دیا تھا... میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ شریر لڑکی تھی۔ ہر صبح نئے ہنگامے کھڑی کرتی، جھگڑے ابھارتی، اور کبھی کبھی تو ایسے چھوٹے چھوٹے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی جن کے نتیجے میں شرمندگی یا تکلیف سے زیادہ ہنسی چھوٹتی ہے...

لیکن ہر دم میں اسی موڈ میں نہ ہوتی، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے بے وجہ رونا آتا... پھر میں بے انتہا روتی، اور مجھے ایسا لگتا کہ میرے دل کی ہر خلش آنسوؤں کے ان قطروں میں گھل کر بہہ رہی ہے۔ کوئی بھی چھوٹی سی بات، یا ناچیز سا منظر مجھے رلانے کے لئے کافی ہوتا۔ اور جب میری آنکھیں بہہ نکلتیں تو اس وقت تک نہ تھمتیں جب تک کہ میں تھک کر سو نہ جاؤں... پھر بھی میری شخصیت بالکل ہی نازک، لطیف اور خیال آگیں بن جاتی، جیسے میں انسانی احساس لطیف اور جذبات نازک کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑی ہوں۔ ایسے وقت میں میرا تن دُھن موسیقیاں اور نغمے سننے میں مشغول ہوتا، اور میں ان کی شیرینیت میں پور پور ڈوب جاتی۔ آج مجھے لاتعداد عربی اور غیر عربی نغمے یاد ہیں جنھیں میں تنہائی میں اپنے لئے گاتی ہوں... میرے نغمات مجھے محو رقص کردیتے ہیں... شاید اگر میں نے فن نغمہ و موسیقی کی تعلیم حاصل کی ہوتی تو میری آواز میں خمار آلود سحر ساز ڈھل جاتا... لیکن برا ہوا میری سستی کا... لیکن میں تو سننے والے بھی خرید سکتی ہوں، اور میری گلوکاری پر بے پناہ پسندیدگی کا اظہار کرنے والے بھی... خواہ وہ منافق ہی کیوں نہ ہوں... پھر مجھے نغمہ موسیقی کا ریاض لینے کی کیا ضرورت؟...

میری شخصیت کے اسی تضاد نے مجھے خاندان کی تمام لڑکیوں میں ایک غیر فطری یا عادی لڑکی کی حیثیت سے نمایاں کردیا... لیکن میں بچپن ہی سے ہر ایک کی لاڈلی بھی تھی... میں جہاں کہیں بھی ہوتی زندگی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اتھل پتھل مچا دیتی... اور یہی وہ بات تھی جس کے باعث سبھی مجھے چاہتے اور برداشت کیا کرتے تھے۔

جب میری عمر کے دروازے پر دسویں سال نے دستک دی تو میں نے کویت سے قاہرہ منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا تاکہ گرلز انگلش اسکول سے منسلک ہوجاؤں۔ لیکن اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے والدین اور پورے خاندان سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ کیونکہ خاندان والوں کے دلوں سے خیال بھی گزرا تھا کہ مجھے علم کی ضرورت ہوسکتی ہے... دراصل اعلیٰ کویتی خاندان کی لڑکیوں کو علم کی قطعی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے اپنے تجزیئے کے مطابق علم صرف طلب رزق کا وسیلہ ہے، جس سے وہ بے نیاز ہیں، خدا نے دولت کے خزانوں پر ان کے نام لکھ دیئے ہیں۔ مجھے بھی دراصل علم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، نہ ہی مجھ پر علمی لیاقت کی تمہیدیں رونما ہوئیں، اور نہ میں نے یہ سوچا کہ کسی دن میرے پاس کالج کی کوئی سند ہوگی۔ بلکہ کسی طرح کی سند کا مجھے خیال تک نہ آیا۔ خواہ وہ بچپن سرٹیفکیٹ ہی کیوں نہ ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ میرے بڑے بھائی نے اسکندریہ

میں واقع وکٹوریہ کالج سے الحاق کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں ہمارا معاشرہ اس مقام پر تھا جہاں خاندانوں میں یہ بات باعث فخر بن جاتی ہے کہ ان کے بچے بیرون وطن انگلش کی تعلیم میں مشغول ہیں۔ تو پھر یہی حق لڑکیوں کو بھی کیوں نہ ملے۔ آخرش تعلیم کے نام پر کویتی لڑکیوں کا بیرون وطن سفر بھی ایک فیشن بن گیا، اور وہ مصر بیروت، برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ جانے لگیں۔ لیکن ان دنوں یہ فیشن اس قدر عام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے اپنے خاندان میں ایک طوفان اٹھانا پڑا۔ میں نے یہ دھمکی دی کہ یا تو میں بھائی کے ساتھ مصر جاؤں گی یا خودکشی کرلوں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے خودکشی کی نوبت نہیں آئے گی، کیونکہ مجھ سے میرے والد کی دیوانہ وار محبت مربوط تھی، جس کے سائے میں میری ہر طلب پوری ہوتی۔ مزید برآں میرے والد ایک جرأتمند انسان تھے ان میں وقت کی ترقی کے شانہ بشانہ چلنے کی امتیازی صلاحیت تھی۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ قبیلہ کے ان افراد کے سربراہ نہ ہوں جنھوں نے علم کے نام پر اپنی بچیوں کو بیرون وطن بھیجنے کی پہل کی تھی۔ اسی طرح میری ماں بھی ہر نئے فیشن کی دلدادہ تھی، اور میرا سفر مصر ایک ایسا فیشن تھا جسے وہ اپنی دوستوں اور سہیلیوں کے مابین فخر کے ساتھ پیش کرسکتی تھی... آخرش میں مصر پہنچی اور گرلز انگلش کالج میں داخلہ لیا۔

بیرون وطن آزادی کی لذت اندرون وطن کی آزادی سے قطعی مختلف ہوتی ہے، اس قدر لذیذ کہ انسان بسا اوقات زائد از حدود اس کا استعمال کر بیٹھتا ہے اور پھر بدہضمی کی نوبت آجاتی ہے... میں نے بھی بلا حدود آزادی کی لذت چکھی۔ اس کے باوجود کبھی کبھی طبیعت میں تلخی سی گھل جاتی، کیونکہ میں کویت ہی کی طرح یہاں بھی اپنی ذات کی مکمل ذمہ داری ثابت کرنا چاہتی تھی.. میرے خیال میں آزادی کی مقدار کے تعین کا حق مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حاصل تھا..

ہمارے بہت سے مرد تعلیم یا سیاحت کے نام پر بیرون وطن جاتے اور آزادی کی حدود کے گریباں چاک کردیتے، ان کے دیوان میں آزادی کا مطلب ہر شب جدید زنانہ جسم کا استعمال ہوتا، آزادانہ قمار بازی ہوتی، علی الاعلان شراب نوشی ہوتی، جلوہ طرازیاں رقص کی دھینگا مشتی ہوتی، اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن جب وہ وطن واپس لوٹتے تو آزادی کا احساس ان سے چھن چکا ہوتا۔ کیونکہ ان کی آزادی ایک راز تھی جس کا وہ اظہار نہیں کرسکتے تھے۔ ایک سیاہ آزادی۔ لیکن وہ یہ قطعی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ان کی عورتیں بھی انھیں حالات سے دوچار ہوسکتی ہیں جن سے وہ ہوئے۔ بیرون کویت آزادی کی دلکشی انھیں بھی کمزور کرسکتی ہے اور وہ بھی آزادیٔ استعمال مرد، آزادیٔ قمار و شراب اور اسی طرح کی دوسری آزادیوں کی بانہوں میں جھول سکتی ہیں۔ لیکن وہ بھی جب وطن لوٹتی ہیں تو اپنی شخصیت اور آزادی کھوچکی ہوتی ہیں اور گنہگار دلکشی یا گنہگار آزادی کا احساس انھیں ستاتا رہتا ہے...

لیکن میرا یہ جائزہ کویت کے تمام مردوں اور عورتوں سے متعلق نہیں۔ بہت سے ایسے مرد ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آزادی اور نگراں نگاہوں سے دور رہ کر بھی اپنی شخصیت کا احترام باقی رکھا۔ اور ایسی کتنی عورتیں ہیں جو بلامعیت مرد وطن سے باہر نکلیں اور اپنی ذمہ داریوں اور سرحد آزادی کا احترام و لحاظ کیا۔ اس کے باوجود۔ پاکیزگی و تقدس کے اصولوں سے قطع نظر... ایک کویتی عورت آج بھی بیرون وطن اس عورت سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اندرون کویت نظر آتی ہے۔ ہر اعتبار سے۔ خواہ اس کا تعلق معاشرتی تعلقات سے ہو، یا کپڑوں کے انتخاب سے ہو، یا چہرے کے میک اپ وغیرہ سے۔ میں ایک ایسے کویتی جوڑے سے ذاتی طور پر واقف ہوں جو بیرون وطن عام محفلوں میں علی الاعلان بلاجھجک رقص کرتا ہے، لیکن کویت میں وہ اندرون خانہ خصوصی محفلوں میں بھی رقص کرنا پسند نہیں کرتا... آخر کیوں؟... شاید اس لئے کہ وہ بیرون وطن مغربی زبان بولتے اور وہاں کے تمام معاشرتی رسم و رواج ادا کرتے نظر آتے ہیں جن کا ایک حصہ خود رقص بھی ہے... پھر بھی میری آرزو ہے کہ اہل کویت بیرون کویت بھی کویتی ہی رہیں۔ صرف کویتی۔

میں تین سال تک ہیلیو پولیس میں واقع گرلز انگلش اسکول کی طالبہ رہی۔ آخر سال کے امتحان کے بعد میرے والد قاہرہ آئے اور گرمی گزارنے کی غرض سے مجھے اپنے ہمراہ لندن لے گئے۔ اب میری نگاہوں کے سامنے ایک نیا ملک تھا۔ میں نے اسی دم فیصلہ کرلیا کہ اس ملک کو بھی پوری طرح دیکھوں گی اور اپنے پورے وجود و احساس کے ساتھ اس میں رہوں گی پھر مجھے اس بات پر اپنے والد کو مطمئن کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میری تعلیم گاہ قاہرہ سے لندن منتقل ہوجائے... اور پھر میں دو سال برطانیہ میں رہی۔

یہاں آزادی کا ایک الگ مزاج تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک انگلش کتاب کے وسط میں زندہ ہوں اور اسے عربی میں منتقل کرنے کی کوشاں ہوں... ایک ایسی زندگی جسے گزارتی نہیں بلکہ دور سے اس کا تماشہ دیکھ رہی ہوں جس طرح کوئی ڈرامہ یا فلم دیکھا جاتا ہے۔ میں ہر شے کے دیدار کی خواہاں ہوں، چھوکر دیکھنا چاہتی ہوں جس میں خود انگریزی نوجوان بھی شامل ہیں...

میرے اسکول کی ایک سہیلی (میل فیلڈ) تھی۔ اس کا تعلق لندن سے دور ضواحی علاقوں سے تھا۔ وہ ہر سنیچر اور اتوار کو اپنے ساتھ چھٹی گزارنے کی دعوت دیتی کبھی افراد خاندان کے ساتھ تو کبھی لندن میں ہی۔ وہاں ملنے والی ہر لڑکی کا کوئی نہ کوئی دوست یا بھائی ہوتا جسے وہ میرے سامنے پیش کرتی۔ پھر کبھی ان میں کا کوئی مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتا تو کبھی میں کسی کی قربت کی خواہاں ہوتی۔ لیکن یہ ساری کوششیں سرد، علمی اور واقعی ہوتیں ان کے یہاں لڑکیوں کے ساتھ سینما دیکھنے یا ہم فراش ہونے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ لیکن میں نے کبھی بھی نہ خود کو کسی کے ہم فراش ہونے کی اجازت دی اور نہ کسی اور کو خود سے اتنا قریب کیا۔ اس طرح قربت ولمس کی حدیں متعین رہیں۔ میں نے رقص سیکھا جس کے نتیجے میں کسی بھی شریک رقص کو اسی قدر میرے جسم کا لمس حاصل ہوا جس قدر رقص میں فرار اختیار کیا جانا ناممکن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کمر میں بانہوں کی جکڑ، رخسار پر رخسار کی ٹیک، ہونٹوں پر گھسٹتے ہوئے ہونٹ... بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی طرح رقص کے ہمراہ کچھ بیر اور کچھ ہلکے قسم کے کوکٹیل کی چسکیاں لینا بھی سیکھ گئی۔ نیز یہ بھی جان لیا کہ مسرتوں میں ڈوب کر پوری رات کیسے گزاری جاتی ہے لندن میں قیام کے دوران میرا یہ طریقہ رہا کہ میں نے صرف یورپ کی مخلوقات انسانی کے ساتھ ہی مسرتوں میں حصہ بٹایا۔ اور صرف انھیں کے سامنے تکلف کی دیوار بھی گرائی۔ ان میں بیشتر برطانوی تھے۔ لیکن کچھ جرمن، اسپانوی اور یونانی

نوجوانوں سے بھی تعارف ہوا۔ یہ سارے تعارف محفل لہو کے مرہون کرم تھے۔ اس کے برعکس جب بھی کسی عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی خواہ اس کا تعلق کویت سے ہو یا نہ ہو، میری انکاری طبیعت فوراً عود کر آئی، اور میں نے اسے اپنے ہاتھ کا بھی لمس دینا گوارا نہ کیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے بدنامی کا ڈر تھا، کیونکہ اس طرح کا کوئی خوف مجھے چھو کر بھی نہیں گزرا، بلکہ یہ دراصل کسی عرب نوجوان سے ملاقات کے تاثر کا فطری ردعمل تھا۔

لندن میں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں ایک پٹرول ٹینک ہوں۔ اور لوگ مجھ سے اسی طرح برتاؤ کرتے ہیں جیسے کہ میں پٹرول ٹینک کے سوا کچھ نہیں۔ میرے والد بسا اوقات قصے سنایا کرتے کہ غریبوں کی لالچی اور بھوکی نگاہیں کس طرح ہماری دولتوں پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے صرف لندن میں ہی آکر ان حریص نگاہوں کا وجود محسوس کیا۔ کوئی بھی نوجوان جب میرے ساتھ ہوتا تو میں یہ محسوس کرتی کہ جیسے میری جانب سے بل ادا کئے جانے کا انتظار ہو۔ یا پھر ہر ملاقات میں اسے مجھ سے کسی قیمتی تحفے کا انتظار ہوتا... اسی طرح میری سہیلیوں کو بھی آرزو ہوتی کہ وہ میری دوستی کے صلے میں کوئی مادی سودے سے سرفراز ہوں۔ تا آنکہ میری ٹیچرس بھی مجھ سے اسکول کے پروگراموں اور خیراتی منصوبوں میں مشارکت کا مطالبہ کرتیں۔ اس طرح کا کوئی بھی مطالبہ صرف مجھ ہی سے ہوتا۔ اور ہر ایک کو ہر موقعے پر مجھ سے کسی نہ کسی تحفے کا انتظار ہوتا... میں بسا اوقات بازار اور دوکانوں کے چکر لگاتی۔ کپڑے، زیورات، خاص طور پر خوشبوئیں میری کمزوری تھیں۔ چنانچہ جب کسی دوکان والے کو پتہ چل جاتا کہ میرا تعلق پٹرول کی سرزمین سے ہے تو اچانک قیمتیں بڑھ جاتیں۔ اسی طرح اگر میرے ہمراہ کوئی سہیلی ہوتی تو اس کے لئے مجھے کچھ خریدنا پڑتا یا اس کی خریدی ہوئی شے کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

وطن پٹرول کی بیٹیاں دنیا بھر کی نگاہوں میں ایک الگ اور منفرد شخصیت رکھتی ہیں۔ ان کا ربط خود عام عرب بیٹیوں سے بھی قائم نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ وطن پٹرول کی لڑکیاں مصر، شام یا لبنان وغیرہ کی لڑکیوں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں... لیکن... امریکہ بھی تو ایک پٹرول کا ملک ہے۔ کیا دنیا بھر کے لوگ امریکی لڑکیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہیں جس طرح میرے ساتھ؟... شاید نہیں... امریکی لڑکیاں بھی دولتمندی کی گنہگار ہیں۔ لیکن وہاں کے نوجوان مثال کے طور پر اطالوی لڑکیوں کے مقابلے میں امریکی لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں... دراصل امریکہ میں سب کچھ صرف پٹرول ہی نہیں، بلکہ تہذیبی دولت بھی ہے۔ اسی لئے دنیا امریکی لڑکیوں کے بارے میں وہ رائے نہیں رکھتی جو عرب پٹرول زادیوں کے بارے میں رکھتی ہے۔ دنیا انہیں جہالت اور تہذیبی پسماندگی کا نمونہ سمجھتی ہے۔

پٹرول بیرل کی حیثیت سے میری قیمت لگائے جانے کے احساس نے میری شخصیت الٹ ڈالی۔ میں ہر شخص کے ساتھ سنبھل سنبھل کر معاملہ کرنے لگی تا آنکہ مجھ پر بخل کا الزام بہت ہی آسان ہو گیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو میں اپنی اس روش میں انتہائی بچکانہ حرکت کر بیٹھتی مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میں ٹیکسی سے اتری تو ڈرائیور نے میٹر سے چند پنس زیادہ طلب کر لئے جبکہ میٹر صرف آدھے شیلنگ اور چھ پنس کا اٹھا تھا۔ لیکن میں نے اسے صرف اتنا ہی دیا جتنا میٹر اٹھا تھا، تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ پٹرول زادیاں سب کی سب بیوقوف نہیں ہوتیں... ڈرائیور نے وہ پیسے لے کر میرے منہ پر مار دیئے اور گالیوں کے طوفان سے اپنی شخصیت وتہذیب کا اظہار کیا۔ خدا کا شکر تھا کہ اس وقت تک میری انگلش خاصی کمزور تھی اور اس طرح میں اس کی تمام گالیاں سمجھ بھی نہ سکی۔ اس کے باوجود میں بخل کا الزام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ میں بسا اوقات سخی ہوا کرتی تھی، انتہائی سخی، لیکن میں اپنی اس سخاوت کا خود اپنی ضرورتوں سے موازنہ کرتی، یا پھر میرے ساتھ اس انسان کے اسلوب معاملہ کا جائزہ لیتی جسے مستحق کرم سمجھتی۔

لندن میں میری تمام زندگی محض لہو ولعب سے عبارت نہ تھی... بسا اوقات مجھ پر عزلت پسندی کی طویل دورے پڑتے جس دوران میں خود کو اپنے کمرے میں بند کر کے پوری طرح عربی و مغربی موسیقیوں اور نغموں کے حوالے کر دیتی۔ اس طرح میں انگلش نغموں سے بھی لطف اندوز ہونے لگی، بلکہ بعض گانے تو میری زبان سے لگ گئے۔ مجھے کسی ایسی شے کی تلاش ہوتی جو مجھے خود سے بیگانہ کر دے، اور یہ صفت میں نے قصوں کہانیوں افسانوں اور نغموں میں پائی۔ یہ مجھے خود سے بیگانہ کر دیتے۔ نیز انہیں نغموں اور کہانیوں نے میری انگلش کو تقویت بخشی تا آنکہ آج میں روانی سے انگلش بولتی ہوں... لندن میں بسا اوقات مجھ پر گریہ و زاری کے دورے پڑتے۔ اور میں بلا سبب کافی دیر تک روتی رہتی۔ شاید میرے اندرون وجود کوئی شے مجھے رلاتی... اوقات فراغ... حیرت... تباہی کا احساس... یا پھر یہ احساس کہ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں... ہر شے خرید سکتی ہوں... ساری دنیا... لیکن مجھے ایک چیز کی کمی ہے... جنس کی کمی... میں اپنے وجود کی اس دوشیزہ کو ایک مکمل عورت میں تبدیل کرنا چاہتی ہوں... لیکن میری عقلیت مجھے اس وقت تک عورت کامل میں تبدیل ہونے کی اجازت نہیں دیتی جب تک میں شادی نہ کرلوں... شادی بھی میرے لئے کوئی مہم جوئی، یا کہانی نہیں تھی، بلکہ محض چند حسابوں کے مجموعوں یا نتیجوں کو عملی جامہ پہنانے کے مترادف تھی۔

پھر میری عمر کی سولہویں بہار کی کلیاں ابھی پھوٹی بھی نہ تھیں کہ میں نے شادی کر لی۔ دنیائے علم چھوڑی، جوانی کے خواب تیاگے، لندن کو خیرباد کہا اور کویت آکر خود کو ایک مردانہ وجود سے جوڑ دیا... ان دنوں کویتی معاشرے میں اپنی نوعیت کا ایک نیا شادی کا بحران پھوٹ پڑا تھا۔ پٹرول کی دولت نے مردوں کی نفسیات میں ایسا فساد مچایا کہ وہ بیرون کویت سے اپنی دلہنیں لانے لگے۔ خاص طور پر شام، لبنان اور مصر سے۔ اور اپنی وطن زادیوں کو محرومیت، تباہی اور احساس کمتری کی کھنڈ میں ڈال دیا... تا آنکہ جن وطن زادیوں کو ان کے ہم وطن سرتاج ملے انہیں بھی یہ توقع رہی کہ ان کا شوہر اگلے سال باہر جائے گا۔ اور واپسی میں بیسیوں بکس میں مختلف چیزیں خرید کر لائے گا جن میں باہر سے خریدی ہوئی اس کی ایک بیوی بھی ہوگی... لیکن مذکورہ بحران کا میری زندگی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حالانکہ نہ تو میں کویت کی چند حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی، اور نہ میری تراش خراش ہی اس قدر جاذب نظر تھی کہ دیگر تمام اعتبارات کو نظر انداز کر کے صرف اسی کی خاطر کوئی مرد مجھ پر مر مٹے۔ اس کے برعکس میرے بارے میں مشہور تھا کہ میں کویت کی سب سے زیادہ پریشان کن، اور کھلا چیلنج کرنے والی لڑکی ہوں۔ لیکن معاشرے میں

میرے خاندان کا ایک نام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کے خواہش مند بڑی تعداد میں میرے والد کے آگے آرکے۔ شاید وہ لوگ مجھ سے زیادہ میرے والد سے رشتہ جوڑنے کے خواہاں تھے۔

ان تمام نوجوانوں میں میں نے سالم کو اپنے لئے منتخب کیا... یہ صرف میرا انتخاب تھا... وہ بھی اس لئے کہ وہ بچپن سے میرا آئیڈیل تھا... وہ مردوں میں شکل وشباہت کے اعتبار سے کوئی منفرد وسامت کا مرد نہ تھا۔ لیکن اس کی وسامت اس کی شخصیت میں پوشیدہ تھی... پرسکون اور کم گو شخصیت... اور جب بات کرتا تو پل بھر میں مجھے مطمئن کر دیتا۔ اس کی باتوں میں حکمت کی چاشنی تھی۔ وہ بچپن سے ہی مجھے برداشت کرنے کا عادی تھا۔ میری شرارت، جرأت اور بدتمیزی کو وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ اسے میری ان حرکتوں سے الجھن نہ ہوتی، اور نہ وہ مجھ سے نفرت کرتا... ایسا لگتا کہ جیسے وہ میرے حصول کا خواہش مند ہو۔ اس نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی، جو کہ کویتی مردوں میں شاذونادر ہی ہوتا ہے... یقیناً اسے میرا انتظار تھا، تا آنکہ میں بڑی ہو کر اسے اپنا شریک حیات قبول کر لوں...

لیکن اس کی جانب سے مجھے شب اول میں ہی ذہنی صدمہ پہنچا اور سارے سنہرے خواب زمین کو آرہے۔ وہ بستر عروسی پر بلاتمہید ومقدمہ ٹوٹ پڑا جیسے کوئی عادی فریضہ انجام دے رہا ہو جس میں کسی قسم کی خصوصی جدوجہد کی ضرورت نہیں پیش آتی... یا کمپیوٹر کے کسی بٹن پر دباؤ ڈال رہا ہو تاکہ یک لخت کوئی معین ومعروف نتیجہ حاصل کرلے... یا کسی دسترخوان پر ٹوٹ پڑا ہو تاکہ جلد از جلد اپنی بھوک مٹالے، اور بس... میں نے جنس کے اس مفہوم کو مسترد کر دیا... مرد و عورت کے مابین صرف رشتۂ فراش کو قبول نہ کر سکی۔ کیونکہ میرے خیال میں ایک پل کی لذت ایک گھنٹے تک، ایک گھنٹے کی لذت ایک دن تک اور ایک دن کی لذت ایک ماہ تک محسوس کی جاسکتی تھی... اور میں اپنی لذت کا دائرہ ایک پل میں محدود کرنے پر راضی نہ تھی۔ میں لندن کی زندگی کے بعد لذت کی حقیقت سے بےخبر نہ تھی۔ اور میں اپنی اسی واقفیت کا استعمال چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے پہلی ہی رات میں اس سے دل آویز قسم کی ہاتھا پائی کی۔ اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رکھا اور خود تک اسے رسائی نہ دی... پھر دوسری رات... تیسری رات... اور چوتھی رات بھی یہی سلسلہ جاری رکھا، جیسے شہرزاد شہریار کے جذبات میں شعلے بھڑکا کر اپنا دل بہلا رہی ہو... آخرش پانچویں رات میں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور رات میں عورت بن گئی، جیسے کہہ رہی ہوں: میرے محبوب جان! ہمارے درمیان ہر شے کا اسی طرح ہونا ضروری ہے تاکہ کم از کم اوقات فراغ کو بھرا جاسکے... لیکن پھر دنوں اور مہینوں کی رفتار کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ محض جنس خالی وقتوں کو پُر کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہے حتیٰ کہ اگر میں اپنے شوہر کے لئے ساری رات اور سارا دن رقص کرتی ہوں تو بھی خالی وقت کے کانٹے چبھتے رہیں گے۔ کیونکہ کسی بھی ایک شے پر اکتفاء کا خاتمہ اکتاہٹ پر ہوتا ہے... اب میری اس اکتاہٹ اور وقت فراغ کا علاج یہی تھا کہ میں ماں بن جاؤں... ہمارے یہاں نوے فیصد عورتیں محض اپنا خالی وقت بھرنے کی غرض سے ماں بنتی ہیں۔ میں ان میں کی ایک ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ایسی عام عورت بننے سے انکار تھا جو مرغیوں کی طرح انڈے دیتی ہے... میرے ذہن میں یہ خاکہ شادی کے روز اول سے ہی محفوظ تھا۔ چنانچہ میں نے منع حمل کی راہ اختیار کی۔ اور جب سالم نے بحالت خفگی مجھ پر اعتراض کیا تو میرا جواب یہ تھا کہ میں بیوی کی حیثیت سے اپنی ذات سے لطف اندوز ہونے کا حق رکھتی ہوں اور جب ماں کی حیثیت سے لطف اندوز ہونے کا دل چاہے گا تو میں وہ بھی کروں گی... ابھی میں چھوٹی اور کم عمر ہوں... لیکن مجھے بچوں سے پیار ہے۔ اور ان کے بغیر زندگی کا خلاء پُر بھی تو نہیں کیا جاسکتا تھا... نہ صرف میں، بلکہ خود سالم بھی اسی وقت فراغ کا شکار تھا۔ دولت اس کے قدموں پہ لوٹتی تھی، جس کے لئے اسے بیرونی کمپنیوں کو برائے نمائش صرف اپنا تجارتی نام دینا پڑتا۔ وہ کویت کے قانون کفالت کے مطابق بعض غیر ملکی تاجروں کا کفیل تھا۔ چنانچہ اگر وہ کسی کمپنی کی ادارتی کاؤنسل کا چیئرمین تھا تو کسی دوسری کمپنی کی ادارتی کاؤنسل کا ممبر۔ یہاں بھی صرف اس کے نام کا استعمال کافی تھا۔ راس مال کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بذریعہ محنت حصول رزق کی لذت سے محروم تھا، جیسا کہ اس کے آباؤاجداد کیا کرتے تھے۔ جب وہ اپنے ہاتھوں کشتیاں بناتے، خود کھیتے، اور سمندر کے کسی دور دراز جزیرے تک سفر کرتے تاکہ دولت کی دیوی سے کوئی نئی چیز چھین کر واپس لوٹیں۔

آخرش زندگی کے خلاء نے میری نس نس میں بیزاری اور اکتاہٹ بھر دی، اور مجھے ایک عام عورت کی صف میں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں نے عورت کی فطری مامتا کے آگے سپر ڈال دی، اور میری گود میں حازم مسکرایا... لیکن وہ بھی میری زندگی کے خلاء کو پُر نہ کر سکا۔ اس کی خدمت کے لئے آیائیں ہوتیں۔ تین لونڈیوں کا مستقل احاطہ ہوتا۔ یا پھر کبھی دوسرے بچے اسے اپنے ساتھ کھیلنے لے جاتے اور میں اسے دور سے صرف دیکھتی۔ محبت کے اظہار کے لئے میرے پاس اس کے لئے ایک بوسہ ہوتا، صرف بوسہ۔

ہم ہر سال یورپ جاتے جیسا اہل کویت کیا کرتے ہیں۔ میری مراد دولت مند کویتیوں سے ہے۔ کیونکہ کویت میں اب بھی ایسے عرب پائے جاتے ہیں جو موسم گرما میں بیرون وطن سفر کی صلاحیت نہیں رکھتے... یورپ میں سالم کے ساتھ میں وہ زندگی نہیں گزار سکتی تھی جو بھی بچپن کی تنہائی میں گزار آئی تھی... سالم کے ساتھ سارا یورپ مجھے صرف بازار، ہوٹل کیفے ٹیریا، اور ایک ہی انداز کا اکتا دینے والا نائٹ کلب نظر آتا تھا۔ کوئی مہم جوئی نہیں، کوئی نیا انکشاف نہیں... مہم جوئی صرف سالم کا حق تھی... سستی مہم جوئیاں۔ قمار بازی، عورتوں کا شکار۔ بلکہ جب شادی کے تیسرے سال ہم یورپ گئے تو میں نے ایک الگ ولا کرائے پر لیا جس میں میرے ہمراہ حازم اور اس کی آیائیں رہیں۔ اور سالم ہوٹل میں ٹھہرا تاکہ وہ قمار بازی اور عورتوں کے ساتھ جھومنے کا شوق آزادانہ پورا کر سکے۔ مجھے اس کے عمل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ اس کی حرکتیں میری غیرت کو ابھارتیں... کیونکہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ لیکن نفرت بھی نہ تھی... ایسا لگتا ہے شادی دلوں میں محبت کی کاشت کا کوئی کامیاب وسیلہ نہیں۔ میری زندگی میں اس کا صرف اتنا ہی کردار تھا کہ دل میں الفت کی ایک شمع جلی تھی جو مجھے نفرت سے بچاتی تھی۔ اس سے قطع نظر آزادی میرا دائمی حق تھا، اور میری شادی میں اتنی توانائی نہ تھی کہ وہ مجھے کسی درجہ بھی مقید کر سکتی۔

عام طور پر ہمارے مجنون و مغرور شوہروں کی طرح سالم میں بھی یہ سوچنے کی صلاحیت نہ تھی کہ میں بھی اس کی طرح قمار بازی اور مردوں کے شکار سے اپنی زندگی کا خلاء پر کرسکتی ہوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ یہ میری طبیعت کے خلاف عمل تھا... اور اس طرح میرے دل کا خانہ حسب معمول خالی رہا۔

میں نے چاہا کہ اندرون کویت وسیع پیمانے کی معاشرتی سرگرمیوں سے خود کو گھیر دوں۔ لیکن سالم اس راہ میں آڑے آگیا۔ کیونکہ معاشرتی سرگرمیوں کا مطلب ہے اخذ و عطا، لین دین، منصوبے، سودے، مہم جوئیاں۔ لیکن سالم کی نگاہ میں معاشرہ محض قہوہ خانہ تھا جہاں لوگ صرف ادھر ادھر کی باتیں کرنے آتے ہیں...

ایک بار میں نے دل بہلانے کے لئے مسرت بھری محفلوں کے قیام کی بھی کوشش کی تا کہ اپنی پسندیدہ شخصیتوں اور دوستوں کو ان میں طلب کیا کروں۔ ان محفلوں میں میں مصر و لبنان وغیرہ کے مشہور فنکاروں اور موسیقی نوازوں کو دعوت دیا کرتی... لیکن پھر مجھے ایسا لگا جیسے ان محفلوں کا قیام مجھ پر کوئی قرض ہے جس سے لوگ مفت میں اپنا دل بہلاتے ہیں، اور اس کے بدلے میں میری زندگی کے چند لمحات بلا احساس گزر جاتے ہیں، اور بس... میں نے اسی نوعیت کی دوسری بھی متعدد معاشرتی سرگرمیوں کے قیام کی کوشش کی۔ آخر تھک گئی اور ایک بار پھر کسی کمزور عورت کی طرح خود کو فطرت کے حوالے کردیا، اور میری ممتا کی آغوش میں ننھی سا بچہ چہکی۔

اب میری قوت تحمل کا آخری قطرہ بھی خشک ہوگیا۔

سال سال ایک مرد کے دامن سے بندھی رہی... یہ بہت تھا... پھر ایک دن اپنے شوہر سالم سے کہا، جس کے لئے آج بھی میرے دل میں احترام اور اسی نوعیت کی محبت محفوظ ہے:

"سالم! آؤ ہم اپنی راہیں جدا کرلیں۔"

"لیکن کیوں؟" سالم نے پرسکون حیرت کا اظہار کیا۔

"بلاسبب" میری آنکھوں میں ایک ایسی التجا تھی جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "نہ تم نے میرے حق میں کوئی غلطی کی اور نہ میں نے تمہارے حق میں"...

"لیکن ایک بار پھر میں اپنی زندگی گذارنا چاہتی ہوں... صرف اپنی۔"

"ساری زندگی تم پگلی ہی رہوگی۔" سالم نے کہا۔

"اور تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم میری طرح پاگل نہ بن سکے۔" میرے ہونٹوں پر اس کے لئے ایک خفیف مسکراہٹ تھی۔

"تو کیا تمھیں کوئی پاگل مل گیا؟" سالم کا سوال معنی خیز تھا۔

"یقین مانو، نہیں۔ میں تمھیں چھوڑ رہی ہوں تا کہ اپنے ساتھ رہ سکوں" میں نے کہا۔

اس قدر مکالمے کے بعد سالم نے خموشی اختیار کرلی... لیکن میرے والد مجھ پر الٹ پڑے۔ لیکن میں پہلے ہی کہہ آئی ہوں کہ میری ضد کے آگے ہر ایک کو سپرانداز ہونا پڑتا تھا۔ آخرش میرے والد کا طوفان بھی سرد پڑا، اور انھوں نے میرے جنوں کے آگے سر جھکا دیا۔

کویت کے اعلیٰ خاندانوں میں طلاق ایک بہت ہی آسان شے ہے۔ بلکہ ان کے یہاں ہر چیز آسان ہے جس میں ایک طلاق کا بھی نام آتا ہے۔

اور ایک دن مجھے طلاق مل گئی۔

اس کے بعد میری کہانی کا آغاز ہوا۔

اب تک تو میری زندگی کی بنیادی کہانی کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ اپنے چہار سو فراغ و خلاء کا ایک وسیع دائرہ پایا۔ گھر کے اندر، گھر کے باہر ہر طرف خلاء ہی خلا تھا... میں کسی نئے شوہر کی تلاش میں اپنا خالی وقت مشغول کرسکتی تھی... لیکن نہیں... کیونکہ کسی بھی دوسری شادی کا انجام وہی ہوتا جو پہلی کا ہوا، اور میں سابقہ پر اضطراب و کبیدہ زندگی کی طرف ایک بار پھر لوٹ جاتی۔ کیونکہ ہر کوئی مجھے صرف ایک تصویر میں دیکھتا تھا۔ ایک بڑے خاندان کی لڑکی کی شکل میں، ایک پٹرول زادی کی تصویر میں... اس لئے اب دوسری شادی صرف اس وقت ہوگی جب میں اپنی مستقل شخصیت ثابت کرچکوں گی... بڑے خاندان اور پٹرول سے دور خود کو قائم بالذات بنا چکوں گی۔

اس دوران میں نے اپنی شخصیت کے اثبات کے موضوع پر بہت سوچا۔ میں اپنے نام پر کوئی تجارت کھول لوں۔ کوئی ٹریڈ لائسنس لے کر بیٹھ جاؤں۔ کوئی کمپنی قائم کروں۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ عورتوں سے متعلق امپورٹ ہونے والی تمام اشیاء کی اجارہ داری لے لوں... میرے افکار کے دائرے وسیع ہوتے گئے۔ کیونکہ میں بذات خود کام کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ کویتی عورت کی شخصیت کے خلاف ہے۔ میری دادی پر دادی کی یہ طبیعت نہ تھی۔ میری دادیاں اپنے مردوں کے ہمراہ تجارت یا موتیوں کی تلاش میں سمندر میں نہیں اترا کرتی تھیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ کویتی عورت بحری قزاقوں کے معرکوں کی سربراہی کرتی نظر آئی... عورتیں ہمارے یہاں تدبیر حیات کی ذمہ دار تھیں نہ کہ بیرونی عمل کی... مرد کا کام تھا کارزار رزق سر کرنا اور عورتوں کا کام زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھانا اور مردانہ کامیابیوں کے نتائج کو عملی شکل دینا۔ اسی لئے میں اپنے نام سے تجارت کھولنے یا کسی کمپنی میں حصہ لینے کے خیال سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

پھر خیال آیا کہ کسی ادبی کلب کا افتتاح کروں... اور خود اپنے گھر میں ہی ایسی ہفت روزہ محفلیں قائم کروں جن میں اعلیٰ درجہ کے شعراء، ادباء، اور ارباب سیاست شریک ہوں، اور مختلف سیاسی، ادبی اور فکری موضوعات پر آزادانہ بحث کریں۔ اس میں کسی قسم کی رشوت کی بوباس نہ ہو، جیسا کہ عام طور پر کویتی شخصیتیں صحافیوں، ادیبوں اور سیاسیوں کو پیش کیا کرتی ہیں تا کہ ان کی تعریف میں قصیدے لکھے جائیں یا کم از کم قلم کاروں کی خوشی خریدی جاسکے... میں اس نوعیت کی محفل قائم کرنا چاہتی تھی جیسی مصر میں ہدیٰ شعراوی، می زیادہ اور فاطمہ الیوسف نے قائم کی تھیں، اور جس نوعیت کی محفلوں کا ثبوت فرانسیسی تاریخ میں جارج سانڈ کے نام منسوب ہے۔ میں کویتی تاریخ میں اس قسم کی سیاسی و ادبی محفلوں کے نام کندہ کرنا چاہتی تھی... بالفاظ دیگر میں کویتی تاریخ کے ماتھے پر اپنا بھی نام لکھ دینا چاہتی تھی... لیکن ان دنوں میں پورے کویتی معاشرے سے خفا تھی، اور معاشرہ بھی سالم سے طلاق کے بعد مجھ سے خفا تھا۔ معاشرہ مجھے ایک عجیب و غریب اور نادر الفطرت عورت شمار کررہا تھا... چنانچہ میں نے اپنی زندگی کے وسیع خلا کو بھرنے کے لئے بیرون کویت سفر کا فیصلہ کیا، اور پھر سال کا آدھا حصہ کویت میں اور دوسرا آدھا

اسپین، اٹلی، امریکہ، جاپان، کناڈا، برازیل، یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں گزارنے لگی۔ ہر ملک میں میں نے صرف اسی قدر محسوس کیا کہ میں ایک پٹرول ٹینک ہوں، اور ہر کوئی مجھ سے پٹرول زادی کی حیثیت سے معاملہ کرتا ہے۔ میں بہت سخاوت سے خرچ کرتی اور لوگوں کو دیتی۔ لیکن حماقت سے نہیں۔ میں اپنی شخصیت کبھی نہیں کھوتی۔ عام کویتی انسان کی طرح جن کی ذہانت کسی کو کچھ دیتے وقت انتہائی بیدار ہوتی ہے اور جس کے باعث وہ خلیج کے یہودی کہلاتے ہیں۔ میرے تمام اسفار کا مقصد محض زندگی کو متحرک کرنا تھا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا۔ طیاروں میں سوار ہونا ان سے اترنا۔ اور لوگوں کے درمیان فخر سے بیان کرنا کہ میں نے دنیا دیکھی ہے۔

تا آنکہ میری ملاقات غسان سے ہوئی... غسان جو کہ میرے مکمل قصۂ حیات کا موضوع ہے۔

غسان، بیروت کے الحمراء روڈ پر واقع (Le Modele) نامی فیشن شاپ میں ایک عام ملازم کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوکان میں میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی خدمت پیش کرنے آگے بڑھا۔ وہ ایک انتہائی وسیم نوجوان تھا... بلکہ مزید واضح لفظوں میں وہ ایک دلکش وحسین نوجوان تھا۔ گو کہ حسین کا لفظ مردوں کے لئے غیر موزوں شمار ہوتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مرد خود عورتوں کے حسن سے دیوانہ وار متاثر ہوتے ہیں لیکن عورتوں کو بھی اپنے جمال سے اسی حد تک متاثر ہونے کا حق نہیں دیتے۔ میں غسان کے حسن سے بے خودی کی حد تک متاثر ہوئی۔ محض اس کے ظاہری جمال سے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے اعتبار کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ٹھیک اس مرد کی طرح جو سڑک چلتی کسی حسین دوشیزہ کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اس کے معاشرتی مقام کے بارے میں نہ سوچتا ہے اور نہ پوچھتا ہے۔ اور جس کے نتیجے میں بسا اوقات اسے اپنی پوری عمر اس لڑکی کے حوالے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس دن غسان کی قیمت اس کے جمال کے علاوہ ایک اور شے متعین کر رہی تھی، اور وہ تھی اس کا سامان پیش کرنے کا انداز اور اس کی مہذب آواز کی گنگناہٹ، جیسے کہیں جھرنا گر رہا ہو... اس دن میں نے ایک کپڑا خریدا اور جب ٹرائل روم میں داخل ہوئی تو مرے پیچھے دوکان کی ایک ملازمہ بھی داخل ہوئی۔ میں نے کپڑا تبدیل کرنے کے بعد ملازمہ سے کہا کہ وہ غسان کو طلب کرے تا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے .. جب غسان آیا تو میں آئینے کے روبرو اس طرح کھڑی تھی جیسے اپنے ملبوس کی نمائش کر رہی ہوں۔ جبکہ میری تمام تر توجہ قد آدم آئینے میں منعکس غسان کی تصویر پر مرکوز تھی۔ اس دن میں خصوصی طور پر جسم کے ہیجان انگیز خطوط و نقوش نمایاں کرنے کے درپے تھی۔ میں واضح طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہوں کہ میرا جسم میرے چہرے سے زیادہ دلکش ہے۔ یہ معلوم کون سا جذبہ مجھے اس حرکت پر ابھار رہا تھا۔ شاید میں غسان کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ طلاق کے بعد ایک طویل مدت تک مردانہ وجود کے لمس سے محرومی نے مجھے غسان کے سامنے کمزور کر دیا تھا... لیکن غسان پر یہ نمایاں نہ تھا کہ وہ بھی میرے جسم کی فتنہ انگیزی سے متاثر ہے۔ کیونکہ جسم سے لپٹے کپڑے کی شکنیں درست کرتی ہوئی اس کی انگلیاں بڑی ہی تیزی کے ساتھ انتہائی شان بے نیازی سے گزر رہی تھیں۔ نہ ان میں برانگیختگی کا کوئی اثر تھا اور نہ کسی قسم کی دعوت، جیسا کہ عام طور پر نسوانی کپڑوں کے ماہرین یا زنانہ ہیر ڈریسرز کے اندر لمس میں پایا جاتا ہے۔ شاید، کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ چیخ کر بتادوں گی کہ میں کون ہوں، تا کہ اس کی دلچسپی اپنی طرف متوجہ کرسکوں۔ لیکن خدا کا شکر تھا کہ اس پر اپنی شخصیت نمایاں کئے بغیر میں وہاں سے لوٹ آئی، تا کہ وہ میرے ساتھ پٹرول زادی کا سا سلوک نہ کرے۔ مزید اطمینان کے لئے میں نے اس دن پانچ کپڑے ایک ساتھ خرید لئے، تا کہ خاموش لفظوں میں اپنی شخصیت واضح کردوں۔ کیونکہ اتنی مقدار میں اتنے قیمتی کپڑے، صرف وہی عورت خرید سکتی ہے جو پٹرول کے چشمے سے پیدا ہوئی ہو۔ وہ سارے کپڑے قدرے اصلاح کے ضرورت مند تھے، اس لئے میں نے غسان سے طلب کیا کہ ان کپڑوں کی اصلاح کے بعد وہ خود انھیں لے کر میرے ہوٹل آئے۔ میں نے اس سے کہا:

"مجھے تمہارے ذوق پر یقین ہے... میں تم سے مطمئن ہوں۔ اس لئے مناسب سمجھتی ہوں کہ تم خود لے کر آؤ۔"

"یہ میرے لئے باعث شرف ہوگا۔" اس نے کچھ اس طرح جواب دیا جیسے میری شخصیت کا انکشاف کر لیا ہو۔ پھر وہ چلتا ہوا میرے ساتھ میری کیڈیلاک گاڑی تک آیا، اور اپنی آنکھوں سے مجھے کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے مجھ تک پہنچنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہو۔

کئی ماہ کی خشک زندگی کے بعد اس رات جب میں بستر میں داخل ہوئی تو میرے خیال واحساس پر صرف غسان کا سایہ تھا۔ پوری رات میں اپنے دل کو ذلت کا احساس دلاتی ہوئی اس کی ضدی فطرت سے برسرپیکار رہی۔ میں اتنی نیچی اور کم ظرف تو نہیں کہ ایک شاپنگ سینٹر میں کام کرنے والے ملازم کے آگے کمزور پڑ جاؤں... اس کی قیمت ہی کتنی ہے... میں اسے چند ڈالروں میں شب دو شب کے لئے خرید سکتی ہوں، جیسا کہ مرد، پیشہ ور عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں... لیکن یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ میں اس نوع کی عورت بننا نہیں چاہتی۔ دوسرے دن کپڑے لئے غسان ہوٹل آیا... میں اسے ایک بار پھر دیکھنے لگی... اس کا جمال اب تک میرے شعور ووجدان پر چھایا ہوا تھا۔ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس نوجوان کا لطف لوں؟ کیا نقصان ہے؟ عورتوں کو بھی کبھی کبھی محض بغرض سیاحت مرد کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس طرح کوئی کسی ملک کے اندر معلومات، تجربات اور تفریح کے لئے گھومتا ہے اسی طرح انھیں مقاصد کے پیش نظر کسی مرد کے اندر کی بھی تو سیر کی جاسکتی ہے... میری آنکھیں ایک بار پھر اسے میرے وجود کا احساس دلانے لگیں... اس بار وہ بھی آنکھوں کی زبان سمجھ بیٹھا۔ اور میری دعوت کی طرف بڑی ہی نرمی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا... اس کا انداز سرگوشیوں کا سا تھا... اس کی ذہانت نے اسے مکمل منصوبہ بند انداز میں آگے بڑھنے کی صلاح دی۔ جس کا اثر، کپڑوں کی پیمائش کے دوران میرے جسم پر اس کی انگلیوں کی لغزش، ہونٹوں پر پھیلی ہوئی جدید انداز کی ذومعنی خیز مسکراہٹ اور آئینے کے سامنے کھڑے گفتگو کے لئے موقعوں کے مناسب ترین انتخاب سے نمایاں تھا۔ اس کی گفتگو لبنان کے ضواحی علاقوں میں پھیلے ہوئے حسن اور اس کی پرسکون خاموشیوں میں جنم لینے والی محبت بھری

داستانوں سے متعلق تھی۔ جیسے وہ مجھے بھی اس طرح کسی داستان کی تخلیق میں حصہ لینے کی دعوت دے رہا ہو۔ کپڑوں کی پیمائش کے بعد چائے کی چسکیاں لیتی ہوئی بولی:

"تم زنانہ فیشن کے ایک بے مثال ماہر ہو۔ کیا ساری زندگی تمھارا یہی پیشہ رہا؟"

اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھری جیسے وہ خود پر ہنس رہا ہو۔ "نہیں، صرف دو سال قبل میں نے یہ پیشہ اختیار کیا اس سے قبل کاروں کی تجارت کرتا تھا.. اس سے پہلے نائجیریا میں ماچس کی تیلیاں بنانے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا...اور اس سے پہلے چند ماہ میں نے سعودی عرب میں بھی گزارے۔"

"تمھاری زندگی تمھاری عمر سے زیادہ وسیع ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

ایک بار پھر اس نے خود کا مزاق اڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "میری زندگی اب تک ناکامیوں کے ایک سلسلے کا نام ہے۔ میری عمر کا ہر ٹکڑا ایک خواب ہے، جس کی تعبیر نہیں ملتی۔"

"تمھارے خواب کیا ہیں؟" میں نے کچھ اس طرح سوال کیا جیسے خوابوں کے اس شہید کو زندگی کا ساحل عطا کرنے کی پیش کش کر رہی ہوں۔

"کامیابی... میں کوئی بھی کام اچھی طرح کر سکتا ہوں، کام کی نوعیت میرے لئے اہم نہیں بلکہ اس کا نتیجہ اہم ہے، اور میرے پاس نتیجے کی شکل میں کچھ بھی نہیں۔ میں اب تک ایک عام انسان ہوں۔"

غسان کے خواب مجھے اپنے سے لگے، اس عورت کی طرح جو اپنے مرد کے لئے زندگی کی تدبیر کرتی ہے۔ اس کا مرد جد وجہد کرتا ہے اور وہ اس کے نتائج میں زندگی کا رنگ بھرتی ہے۔ اس کویتی عورت کی طرح جس کا مرد، بحری قزاقی کے بعد اموال غنیمت لئے گھر لوٹتا ہے اور وہ ان کے استعمال میں تصرف کرتی ہے...لیکن...

کیا ممکن ہے کہ غسان میرا مرد بنے؟...

وہ دوسری رات بھی میرے مطالبے پر فیشن کیٹلاگس دکھانے کے بہانے ہوٹل آیا۔ آج ہم کل کے مقابلے میں ایک دوسرے سے کہیں زیادہ قریب اور فری تھے۔ حالانکہ ہمارے تعارف کی عمر صرف دو دن تھی.. آج اس کی طرف کھینچنے والی دو شے تھی۔ ایک تو اس کا جمال، اور دوسرا میرا یہ خواب کہ میں اس کے خواب کی تعبیر کی منزل تک پہنچانے میں حصہ لوں۔ آج وہ میرے پہلو میں کاندھے سے کاندھا ملائے بیٹھا کیٹلاگ دکھا رہا تھا۔ میں نے ایک صفحہ پر رکتے ہوئے کہا:

"مجھے یہ کپڑا چاہیئے۔"

اس نے میرے وجود کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو کچھ اس طرح حرکت دی جیسے انھیں میرے ہونٹوں سے دوری کا گلا ہو۔ "ہم یہ کپڑا پیرس سے منگوا سکتے ہیں۔"

میں نے شرمیلے پن کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا، حالانکہ میں اس کے سینے میں پیوست ہو جانے کی سراپا آرزو مند تھی:

"یہاں منگانے کی ضرورت نہیں، چند دنوں بعد میں خود پیرس جا رہی ہوں۔ اور تمھیں فیشن اسپشلسٹ کی حیثیت سے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتی ہوں۔"

"مجھے یہ دعوت منظور ہے۔ لیکن فیشن اسپشلسٹ کی حیثیت سے نہیں۔" وہ کچھ اور قریب ہوتا ہوا بولا۔

"تم جس حیثیت سے بھی چاہو میرے ساتھ آؤ" میں نے اپنی دعوت برقرار رکھی۔

"ہمارے درمیان کسی حیثیت کا اعتبار نہیں..." یہ کہتے ہوئے اس نے میرے کاندھے پر اپنی بانہیں پھیلا دیں..." ایک فضیلت غسان کو طلب کر رہی ہے، اور غسان کی آرزو ہے کہ اسے کوئی فضیلت اپنے در پہ طلب کرے۔"

اس لمحے ہمارے ہونٹوں کے درمیانی فاصلے مٹ گئے... مرد کے ہونٹ میری کمزوری ہیں... ایک مرد کے جسم میں سب سے زیادہ یہی شئی مجھے برانگیختہ کرتی ہے اور میں سب سے زیادہ اسی کو لوٹنا چاہتی ہوں... اپنے سابق شوہر کے ساتھ میں سب سے زیادہ اسی بحران کی شکار تھی۔ ہونٹوں کی قربت اس کے یہاں بے معنی شے تھی۔ اس نے کبھی اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اور جب بھی میں نے اسے ابھارا تو اس نے بوسے لینے کی ایکٹنگ کی، جیسے کوئی فرض نبھا رہا ہو، یا میرا دل رکھ رہا ہو... چنانچہ غسان کے لبوں کے آگے میں بچھ گئی، خود سے بیگانہ ہوگئی.. اب میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھی۔ سالم کے بعد میرے جسم کے ساتھ تصرف کرنے والا یہ پہلا مرد تھا۔ لیکن میں وہاں تنہا نہ تھی۔ بغل کے کمرے میں میرے بچے حازم اور صابحہ کے علاوہ ان کی آیائیں بھی تھیں... میں نے تیز تیز اترتی چڑھتی سانسوں کے درمیان غسان کو کہا: "نہیں... ہم یہاں تنہا نہیں ہیں۔"

اس نے بانہوں سے مجھے کھینچتے ہوئے انتہائی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، جیسے اس کے لب میرے لبوں کو پکار رہے ہوں:

"آؤ چلو، شاید پہاڑی ماحول میں ہمیں سکون ملے۔"

میں اس کے پہلو بہ پہلو ہوٹل سے نکل پڑی اور اس کی چھوٹی سی مسکین ومفلوک الحال کار میں جا بیٹھی... اور مجھے اس بات کا خیال بھی نہ آیا کہ اپنے پیچھے میں ہوٹل کے گیٹ کیپر اور فٹ پاتھ پر کھڑے اپنے ڈرائیور کو حیرت ودہشت کے عالم میں چھوڑ آئی ہوں... غسان مجھے لے کر پہاڑی راستوں پر چل پڑا اور شاہراہ سے دور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچا۔ اس کے بعد...

اس کے بعد ہمارے درمیان تمام فاصلے پگھل گئے۔ ہمارے جسم اور روحیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

اب میری زندگی کی ہر نفس غسان کی تھی۔ میں اس کے ساتھ پیرس سفر کا انتظام کرنے لگی۔ پروگرام کے مطابق مجھے اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جانا تھا۔ لیکن میں نے اپنا فیصلہ بدلا اور انھیں آیاؤں کے ہمراہ کویت بھیج دیا تا کہ میں غسان کے ساتھ تنہا رہوں۔ میں بیروت میں لوگوں کی نگاہوں سے اپنی نئی زندگی کی تصویر چھپانے لگی۔ اس لئے وہ میرے ہوٹل میں نہ آتا، بلکہ پہاڑی پر واقع جس ہوٹل کا وہ انتخاب کرتا وہاں میں جاتی۔ اور ہر رات ہم ایک نئے ہوٹل میں ہوتے۔ ہوٹل کا کرایہ وہ خود چکاتا اور مجھ سے کچھ مطالبہ نہ کرتا۔ لیکن ہر صبح میں بازاروں میں گھومتی

اور رات میں اسے پیش کرنے کے لئے کوئی تحفہ ڈھونڈتی... انتہائی قیمتی تحفہ... اس سے بھی زیادہ قیمتی جتنے کی میری خبردار و ہوشیار طبیعت متحمل ہو سکتی تھی... روانگی سے دو دن قبل مجھے اپنی بانہوں میں لئے بستر پر لیٹے ہوئے کہا:

"کیا تم ہمارے ساتھ فیشن ہاؤس سے کچھ اور چیزیں نہیں خرید سکتیں؟"

"لیکن کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ جس پر اس نے کہا:

"سچ یہ ہے کہ میں اپنے کمیشن کی رقم سفر سے قبل ہی لے لینا چاہتا ہوں"

"لیکن تمہیں فی الحال اس کی ضرورت کیا ہے تم تو میری دعوت پر چل رہے ہو؟"

"جس کے جواب میں اس کے ہیجان انگیز تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں نے کہا:

"ایک پل کے لئے مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے ساتھ تاجر کی حیثیت سے گفتگو کروں... میں صاحب دوکان کا وثوق جیتنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ پیرس میں کوئی ایسی ایجنسی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا جس کے ذریعے اس کے ساتھ تجارت کر سکوں... اور تمہارے ساتھ ایک اور سودا اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہوگا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ کو اپنا شریک تجارت بنا لے۔ تم تصور نہیں کر سکتیں کہ اس نے تمہارے ساتھ پہلے سودے میں کتنا نفع حاصل کیا۔"

میں نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی، جیسے اس نے اپنے ہونٹوں کی قیمت لگائی ہو، اور مسکراتی ہوئی بولی:

"منظور ہے... تم جس طرح چاہو کرو... لیکن مجھے تمہارے فیشن ہاؤس سے مزید کپڑوں کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کے سامنے دو ہزار ڈالرز رکھ دیئے۔ اس نے کہا:

"میں اس کے استعمال کی تفصیلات تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔"

لیکن میں اس کی بانہوں میں فنا ہوتی ہوئی بولی۔ جیسے میں اس چیز سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہی ہوں جس کی ابھی ابھی قیمت ادا کی ہے:

"نہیں، مجھے نہیں چاہئے... مجھے صرف یہ چاہئے... بس۔" اس کے لبوں پر میری انگلی جا ٹھہری۔

چند دنوں بعد ہم پیرس روانہ ہو گئے اور ژارژ سینک ہوٹل (Hotel De Georges Cinque) میں ٹھہرے۔ یہ میری پہلی غلطی تھی۔ کیونکہ پیرس آنے والے سبھی عرب اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ کسی اور ہوٹل سے واقف نہ تھی۔ غسان خوش تھا کیونکہ اپنی زندگی میں پہلی بار اس معیار کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میں نے خاص طور پر اسے خود سے دور رکھا۔ میں اس ہوٹل کے جس حصے میں ٹھہرنے کی عادی تھی اس میں اپنے دوستوں کے علاوہ سفیر تک کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس لئے ہماری ملاقات عام طور پر ہوٹل سے باہر ہوتی تھی۔ اور رات میں وہ چپکے سے میرے کمرے میں دبک آتا۔

دو دنوں بعد ہم ریویرا ساحل پر جھانکتی ہوئی پہاڑ کی چوٹی پر گئے جس پر ایک قدیم قلعہ ہے اور جسے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس علاقے کا نام (کاستلاراس) ہے۔ اس جگہ کا انتخاب خود غسان نے ہی سیاحی میگزینوں کی مدد سے کیا۔ اس جگہ سے عرب سیاح واقف نہیں۔ بلکہ اسے صرف چند ایک بوڑھے کروڑپتی جانتے ہیں جنھیں موت کی سی خاموشی اور سکون کی آرزو ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی ہر لذت سمیٹ چکنے کے بعد ان کے پاس قدرتی مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ وہ جگہ ہمارے لئے جنت کے مترادف تھی۔

اس کے بعد غسان کی عادی ہو گئی اور غسان میرا، کسی بے حساب پینے والے شرابی کی طرح۔ اور یہی عادت مجھے اس کے ساتھ اپنا مستقبل پیوست کر دینے کے بارے میں سوچنے کا محرک بنی.. کیا اسے واقعتاً مجھ سے پیار ہے جیسا کہ اس کے حرکات بتاتے ہیں؟... میں اس کے لئے کیا حیثیت رکھتی ہوں؟.. کیا میں وہ عورت ہوں جسے وہ ساری عمر کے لئے چاہتا ہے؟ یا میں ایک پٹرول ٹینک ہوں جس سے وہ ڈالر چوس رہا ہے... کویت کی تہذیب میں میری دادی اپنے مرد کو کچھ دیتی نہ تھی بلکہ اس سے لیتی تھی... مجھے غسان کو آزمانا چاہئے... مجھے اس کی محبت کی نوعیت کا انکشاف کرنا چاہئے۔ میرے لئے ضروری ہے کہ میں اسے ایک ایسا مرد بناؤں جو مجھے کچھ دے، نہ کہ صرف میں اسے خریدتی رہوں۔

اس جنت میں ہم نے دس دن گزارے۔ اپنی زندگی کے سب سے لذیذ، لطف اندوز اور یادگار دن۔ اس کے بعد ہم پیرس لوٹ آئے اور اپنے اپنے کمرے میں جا رکے۔ کویت کا سفیر مجھ سے ملنے آیا۔ اس کی واپسی کے بعد میں نے غسان کو اپنے کمرے میں بلایا، حالانکہ ہمارا اتفاق تھا کہ کوئی بھی ایک دوسرے کے کمرے میں دن میں داخل نہیں ہوگا۔ میں نے مصنوعی خوفزدگی اور جنونی کیفیت سے اس کا استقبال کیا:

"وہ سب کچھ جان گئے... سب کچھ... ہم ختم ہو گئے غسان.."

وہ حیرت و تعجب کی حالت میں، میری جنونی کیفیت دور کرنے کی غرض سے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹتا ہوا بولا:

"کیا جان گئے... اور کون لوگ جان گئے؟"... میں نے روتے اور اپنے بال کھینچتے ہوئے جواب دیا:

"میرے رشتہ داران... میرے والد... میرے بھائی... انھوں نے سفیر سے رابطہ قائم کر کے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے فوراً کویت بھیج دیا جائے... وہ تمہارا نام تک جان گئے ہیں... سفارت خانہ ہمیں گذشتہ پانچ دن سے پورے فرانس میں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

وہ حیرت اور استغراق بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا بولا: "تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"میں نہیں جانتی... میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک وہ مجھے یک ٹک دیکھتا رہا جیسے میری عقل کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا چاہتا ہو۔ پھر قدرے تردد سے بولا:

"ہم شادی کر سکتے ہیں۔ جس کے بعد تم پر ان کا حق ختم ہو جائے گا۔"

میں اس سے قدرے دور ہٹ گئی اور اس طرح بولی جیسے اسے کسی بہت بڑے امتحان میں مبتلا کر رہی ہوں:

"تم جانتے ہو کیا ہوگا اگر ہم نے شادی کر لی؟ تم ایک اجنبی انسان ہو

اور ہمارے خاندان کی لڑکیوں کو بیرون کویت کے مردوں سے شادی کا حق نہیں ہوتا... اگر ان میں سے کسی نے ایسا کیا تو اس سے وہ لوگ دستبردار ہو جاتے ہیں، اسے ایک ایک پیسے، بلکہ مکمل میراث سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔ کویت والے کسی اجنبی کو اپنا وارث نہیں بناتے کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی اجنبی کے ان کی لڑکیوں سے شادی کا مقصد ان کی دولت حاصل کرنا ہوتا ہے۔"

غسان بہت دیر تک گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا، جیسے میری باتوں کی سچائی میں اسے شک کی لکیر نظر آتی ہو۔ اور اس کے ہونٹ کچھ اس طرح الٹتے پلٹتے رہے جیسے اس نئی مصیبت پر وہ شدید کبیدہ خاطر ہوا ہو۔ پھر بولا:

"ان باتوں سے تمھارا کیا مقصد ہے؟"... میں نے جواب دیا۔

"میرے کہنے کا مقصد ہے کہ اگر ہم نے شادی کی تو ہمیں صرف اپنے دست و بازو کے سہارے جینا ہوگا، اور آج مجھے جو سہولتیں حاصل ہیں ان سے محروم کر دی جاؤں گی۔"

"تو کیا تم اپنے اور میرے سہارے زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو۔"

"اس صورت میں میں ایک بالکل ہی دوسری عورت ہوں گی۔ وہ فضیلت نہیں جسے تم نے جانا اور پایا۔ تو کیا تم مجھے ایک دوسری عورت کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے تیار ہو؟"

یہ سن کر اس کے چہرے پر قدرے طمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ بولا:

"ہم خفیہ طور پر شادی کر سکتے ہیں تاکہ وہ تمھیں تمھارے حق سے محروم نہ کریں۔"

"یہ ناممکن ہے... میں نہیں کر سکتی..." میں ہنستی ہوئی بولی۔ "وہ لوگ آج ہی مجھے کویت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر میں کویت لوٹ گئی تو آئندہ مجھے تنہا سفر کی اجازت نہیں ہوگی اور تمھیں کویت میں داخل ہونے نہیں دیں گے، پھر ہماری خفیہ شادی کا کیا فائدہ؟"

"تو پھر آؤ علانیہ شادی کر لیں..." وہ اس طرح مسکراتا ہوا بولا جیسے وہ مجھ سے زیادہ اپنی طاقت و ہمت کا اظہار کر رہا ہو۔

"تو کیا تم ایک ایسی عورت کو قبول کرو گے جس کے پاس کچھ بھی نہیں؟"

یہ سن کر وہ مجھے اپنے سینے میں بھرتا ہوا بولا "جس فضیلت سے مجھے محبت ہے وہ نہیں بدل سکتی خواہ اس کے پاس کچھ ہو یا نہیں۔ بہت ہے کہ وہ میری ہے اور میں اس کا۔"

غسان کی اس دل نواز بات پر میرا پورا وجود رقصاں ہو گیا۔ مسرت کامیابی کا رقص۔ آج میں کامیاب ہو گئی اور خود پر انکشاف کر لیا کہ غسان کو مجھ سے ہر دل زادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک عورت کی حیثیت سے محبت ہے۔ میری ساری باتیں جھوٹی اور گھڑی ہوئی تھیں۔ میرا مقصد محض اس کو آزمانا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ جس دولت مند فضیلت سے اس نے محبت کی اس کے غریب ہو جانے پر اس کی محبت کے پائے ثبات میں کس قدر ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ میرے خاندان کو ہمارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ نہ ان میں سے کسی نے سفیر سے رابطہ قائم کیا تھا اور نہ سفارت خانے نے ہمیں تلاش کیا تھا۔ یہ سب کچھ میرے خیالی بافت کا کرشمہ تھا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے کہ کویت کے دولتمند خاندان غیر ملکیوں کو اپنی بیٹیاں نہیں دیا کرتے تھے اور کویتیوں میں بھی ایک معینہ معیار کا خیال رکھتے تھے۔ اب وہ وقت گزر چکا۔ اس کے علاوہ میں خاندان میں اپنا وزن استعمال کرتے ہوئے بھی غسان سے شادی کر سکتی تھی اور مجھے کسی بھی شے سے محروم نہ ہونا پڑتا... لیکن میں اس سے جھوٹ بولی تاکہ اسے اپنے بنائے ہوئے سانچہ حیات میں ڈھال سکوں۔ اسے ایک ایسا مرد بنا سکوں جو اپنی عورت کو کچھ دیتا ہے نہ کہ اس کی دولت پر زندگی گزارتا ہے۔

غسان اس دن کسی ایسے جواری کی طرح اٹھا جو انجام سے بے خبر اپنی پوری زندگی کی بازی لگا دیتا ہے۔ مجھے پیرس کی مسجد میں لے گیا، امام کے سامنے بیٹھا اور دو گواہوں کی موجودگی میں عمر بھر ساتھ نبھانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

اس دن میری عمر ۲۴ سال اور غسان کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔

اس کارروائی کے بعد ہم راہ راست سفارت خانہ پہنچے، اور سفیر کے سامنے اسے پیش کرتی ہوئی بولی:

"یہ ہیں میرے شوہر غسان رحمی۔"

یہ سن کر سفیر اپنی کرسی پر اس طرح گرا جیسے بے ہوش ہو جائیگا۔ میری شادی کی خبر سے کویتی معاشرے میں اور میرے افراد خاندان کے درمیان ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے والد کو اس شادی سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ ان کی ناراضامندی عملی طور پر کس صورت میں واضح ہوگی۔ ادھر لبنانی اخباروں نے میری شادی سے متعلق عجیب و غریب گھٹیا درجے کی کہانیاں گھڑیں۔ لیکن کویت سے کسی نے بھی مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اور نہ کوئی میرے گھر سے آیا۔ لبنانی اخباروں کو خاموش کرنا میرے گھر والوں کے لئے پل بھر کی بات تھی۔ اور وہ فوراً خاموش ہو گئے۔

میں نے غسان سے کہہ رکھا تھا کہ میرے پاس صرف بیس ہزار ڈالر کی رقم ہے، حالانکہ میرے پاس، خاندان کی ضمانت پر بینک میں کھلا اکاؤنٹ تھا... غسان نے اس موضوع پر مجھ سے بحث نہیں کی، اور بڑی ہی سادگی کے ساتھ میری بات پر یقین کر گیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل چھوڑ کر (موں پر ناس Montparnasse) کے علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر رہیں۔ تاکہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ بھی سکیں اور خرچ بھی کم ہو۔

اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے ایک چھوٹے سے گھر میں متوسط طبقے کی عام خاتون خانہ کی طرح زندگی کا آغاز کیا۔ میں اس کی تنہا ذمہ دار تھی۔ خادم، نوکر، لونڈیاں، باورچی، ڈرائیور کوئی نہیں۔ صرف میں۔ میں نے جب رات کا کھانا تیار کرنے کی کوشش کی تو میں اور غسان دونوں ہنس پڑے... مجھے کچھ نہیں آتا تھا... مجھے تو گیس چولہا بھی جلانا نہیں آتا تھا۔ میں بستر درست کرنے اور گھر صاف کرنے پر خاصی محنت اور وقت صرف کرتی۔ لیکن جب غسان واپس آتا تو سب کچھ از سر نو کرتا جیسے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ وہ پورے دن گھر سے باہر ہمارے مستقبل کی تلاش میں گھومتا اور میں تنہا ہوتی۔ بڑی کمپنیوں کی ایجنسی ڈھونڈتا... سودوں کے خطوط و نقوش پکڑنے کی کوشش کرتا... کبھی کبھی تو پانچ چھ بجے شام سے قبل گھر نہ

آتا۔ میں خوش تھی۔ اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ملی تھی۔ میں ایک عورت کی حیثیت سے زندہ تھی پٹرول ٹینک کی حیثیت سے نہیں۔ اور عورت پٹرول کے کنویں سے باہر کسی بھی حالت میں زیادہ خوش رہ سکتی ہے۔

ایک صبح میں سوپر ناس کی ایک سڑک پرٹن فوڈ خریدنے نکلی، کیونکہ یہی وہ ایک چیز تھی جسے میں نے پکانا سیکھا تھا۔ اچانک میں نے اپنے خاندان کے ایک دوست عبدالرحمٰن کو دیکھا۔ اور اس سے قبل کہ میں اس سے نگاہیں بچا کر بھاگوں اور کہیں چھپ جاؤں وہ مجھے آلیا، اور میرے سامنے چیختا ہو بولا:

"تم کہاں ہو؟... تمہارا بھائی جابر کئی دنوں سے پیرس میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

اس کے بعد عبدالرحمٰن نے کیا کہا مجھے نہیں معلوم اور نہ مجھے اس سے دلچسپی تھی۔ میرے لئے یہی اطلاع بے خود کر دینے والی تھی کہ میرا بھائی یہاں ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی تاکہ اپنے بچوں اور والدین کے بارے میں معلوم کر سکوں، پورے خاندان کے بارے میں اور اپنے مستقبل وانجام کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ جابر کو دیکھنے کے لئے میرا دل تڑپ اٹھا کیونکہ پورے کویت میں صرف وہی مجھے سمجھتا تھا، اسے مجھ پر یقین تھا حتیٰ کہ میرے جنون پر بھی، اس کا ہر عمل میرے لئے پرشفقت ورحمت تھا۔

میں نے جارج سانک ہوٹل میں ٹیلی فون پر اس سے رابطہ قائم کیا جہاں وہ عام طور پر ٹھہرا کرتا تھا۔ اس نے میری آواز کا بڑے ہی اطمینان اور سنجیدگی سے خیر مقدم کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور جب میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی ہم ہوٹل کے باہر کہیں ملاقات کریں تو اس نے بلا رد وکد میری بات مان لی۔ اور بولون جنگل میں واقع درختوں کے جھنڈ کے درمیان قائم ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوئی۔ عادت کے خلاف میں اس کے سینے پر سر رکھے کافی دیر تک روتی رہی۔ مجھے اس میں اپنے بیٹے حازم اور بیٹی صابحہ کا رنگ نظر آیا۔ گھر کے ہر فرد کے بارے میں الگ الگ پوچھا۔ اور شادی کی خبر پہنچنے کے بعد لوگوں کا ردعمل دریافت کیا۔ سبھوں نے مجھ پر جنون کا الزام لگایا تھا، اور بے حیا، غیر فطری اور نادر المزاج عورت قرار دیا تھا۔

اس کے برعکس جابر نے اپنی شفقت بھری مسکراہٹوں میں میرے وجود کو سمیٹتے ہوئے کہا:

"مجھے اس شادی سے اتفاق ہے... یہ سچ ہے کہ وہ نہ تو ہم میں کا ہے اور نہ ہمارے معیار کا۔ لیکن جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں اس سے آج ہی ملنا چاہتا ہوں تاکہ اس پر اپنی رضامندی ظاہر کر سکوں، اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تم تنہا نہیں بلکہ ہماری حمایت کا سایاب تک تمہارے سر پہ قائم ہے۔"

میں نے بڑی ہی گھبراہٹ کے عالم میں اس سے کہا، جیسے میرا تعمیر کردہ محل تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہو:

"نہیں... تم اس سے نہیں ملو گے۔ اور نہ اسے کچھ کہو گے۔"

"لیکن کیوں؟" جابر نے گہری حیرت کا اظہار کیا۔

اور جب میں نے جواب دیا تو میری آنکھوں سے التجا کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے:

"پورے خاندان میں صرف تم ہی مجھے سمجھتے ہو۔ میں غسان کے ساتھ تنہا رہنا چاہتی اور اس کے ذہن میں یہ تصور برقرار رکھنا چاہتی ہوں کہ تم سب مجھ سے دست بردار ہو گئے ہو اور خاندان سے میرا بائیکاٹ کر دیا گیا ہے، نیز ہر طرح کی مدد کے دروازے بھی مجھ پر بند کر دیئے گئے ہیں اور خاندان کی دولت میں اب میرا کوئی حصہ نہیں اور اب صرف میرا شوہر میری زندگی کا ذمہ دار ہے.. تم نے میرا مطلب سمجھا؟.. میں اس بات کا یقین چاہتی ہوں کہ اسے صرف مجھ سے محبت ہے، میری دولت سے نہیں... وہ مجھے چاہتا ہے میرے خاندان کو نہیں۔"

یہ سن کر میرا بھائی مسکراتا ہوا بولا:

"ساری عمر تو بچی ہی رہے گی... بہر حال تجھے اپنے تجربے کا حق ہے... یوں بھی ہم اپنی دولت عورتوں پر پڑنے والی لوگوں کی لالچ بھری نگاہوں سے عاجز آ گئے ہیں۔"

میں اطمینان کی سانس لیتی ہوئی بولی:

"یہ ایک مختصر تجربہ ہے... غسان کی محبت کا یقین حاصل کر چکنے کے بعد میں اسے لے کر گھر لوٹ آؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ابا مجھے معاف کر دیں گے جس طرح تم نے معاف کر دیا۔"

اس نے سنجیدگی بھری آواز میں کہا:

"لیکن بینک میں تمہارا حساب کھلا رہے گا... میں بذات خود جائزہ لوں گا کہ تمہارا اکاؤنٹ جاری رہے تاکہ کسی ضرورت کے وقت تمہیں محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"میں نے اپنے بینک اکاؤنٹس سے بے نیازی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ لیکن یہ ساری باتیں غسان سے پوشیدہ رکھی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے بھائی کو دوسرے دن تک کے لئے الوداع کہا۔ "میں تم سے شام میں نہیں مل سکتی تاکہ غسان شک میں مبتلا نہ ہو۔"

یہ سن کر میرا بھائی زور سے ہنسا اور بولا:

"میں نے بہت سی عورتوں سے تو خفیہ طور پر ملاقات کی ہے لیکن خود اپنی بہن سے بھی خفیہ طور پر ملنا پڑے گا یہ سوچا بھی نہ تھا۔" اس کے بعد میں گھر لوٹ گئی۔ میرے سینے میں اپنے منصوبے کی ضمانت کی خوشی کھیل رہی تھی۔

غسان کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر شام تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ کسی بڑی کمپنی کی ایجنسی حاصل کرنے کی کوششوں کی تفاصیل بیان کرتا۔ کس سے ملا، کیا کچھ پیش آیا، سب کچھ کہتا۔ اور مجھے ایسا لگتا کہ میں اپنی اس دادی کی طرح ہوں جس کا شوہر سمندر کے سفر سے گھر لوٹا ہے اور اسے موتیوں کی تلاش کے دوران پیش آنے والے واقعات بیان کر رہا ہے... مجھے ایسا لگتا کہ میں ہر دم اس کے ساتھ ہوں اور زندگی کی ہر تدبیر میں اس کی شریک۔ ایک شام اسی طرح کی ایک طویل تفصیل کے بعد بولا:

"مجھے یقین ہے کہ مجھے پوری عرب دنیا کے لئے کارون فیشن کی ایجنسی مل جائے گی۔ لیکن اس کے لئے مجھے بینک کی ضمانت چاہئے۔ اور ہم دونوں

مل کر بھی بینک میں دس ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں رکھ سکتے جو بہر حال ناکافی ہے مجھے اس ایجنسی کے حصول کے لئے بطور ضمانت کم از کم تیس ہزار ڈالر عرب بینک میں رکھنے ہوں گے۔"

میں تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی:

"تم یہ ایجنسی (لے ماڈیل) فیشن ہاؤس کی ضمانت پر کیوں نہیں حاصل کرتے؟"

اس نے اپنے ہونٹوں کو بل دیتے ہوئے حقارت سے جواب دیا:

"اس طرح مجھے کمیشن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ یہ میرے لئے کسی آزاد اور بڑے سودے کا موقعہ ہے۔ میں (لے ماڈیل) کی ذلیل ملازمت سے تنگ آ چکا ہوں اور کمیشن کی قیمت تو اس جدوجہد کے برابر قطعی نہیں ہوگی جو اب تک میں کرتا رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنی ہیجان انگیز مسکراہٹوں سمیت میری طرف متوجہ ہوا:

"فضیلت۔ اب ہم دونوں نفس نفس کے شریک ہیں، بلکہ ایک جان دو قالب ہیں۔ اب اگر ہمارے پاس دس ہزار ڈالر کے سوا کچھ نہیں تو تم اپنی ہیرے کی یہ انگوٹھی تو فروخت کر سکتی ہو جس کی قیمت تیس ہزار ڈالر سے زیادہ ہی ہوگی۔"

میں نے گھبراہٹ سے اپنی انگوٹھی کو دیکھا۔ مجھے اس انگوٹھی سے پیار ہے۔ یہ میری پہلی شادی کا تحفہ ہے۔ اور اس جاہل کو اس کی قیمت بھی نہیں معلوم۔ اس کی قیمت پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ ہے۔ میں نے جواب دیا:

"مجھے سوچنے دو۔"... جس پر اس نے تیز آواز میں کہا:

"کیا یہ کافی نہیں کہ میں تمہارے بارے میں سوچوں؟"

میں اس کے ہونٹوں پر نگاہ ڈالتی ہوئی بولی، جیسے انہیں اپنے لبوں کے لمس کی قسم دے رہی ہوں:

"کچھ اور بھی طریقے ہیں جن سے تم واقف نہیں۔ یہاں میرے کچھ دوست ہیں جن سے اپنے والد کے نام کی ضمانت پر قرض لے سکتی ہوں۔ میں ان کا صرف نام استعمال کروں گی لیکن انہیں کوئی خبر نہیں دوں گی۔ اس لئے مجھے کوشش کرنے کا موقع دو۔"

غسان چپ رہا اور میری طرف اپنی پشت کر دی۔ اس رات اس نے مجھے چھوا تک نہیں حالانکہ میں اس کے پہلو میں ہی لیٹی تھی... میں نے بھی اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ میں بھی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

دوسری صبح میں تنہا بینک گئی۔ بیس ہزار ڈالر نکالا اور گھر لوٹ کر اسے ایک گھڑی گھڑائی طویل کہانی سنائی۔ جس میں بتایا کہ میں فلاں اور فلاں سے ملی اور آخر کار فلاں سے قرض لینے میں کامیاب ہوگئی اور قرض بل پر سائن کیا۔ غسان کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اس رات اس نے میری زندگی میں مسرت گھولنے والی ہر شے مجھے دی، بلکہ اس سے بھی زیادہ غسان خلیج کے ممالک میں کارون فیشن ہاؤس کا ایجنٹ بن گیا۔ اس کے بعد ہم بیروت واپس لوٹے۔

بیروت نے ہمارا کچھ اس طرح خیر مقدم کیا جیسے کسی ہنگامہ خیز فلم کی نمائش کا افتتاح ہو۔ میں مشہور ہوگئی لیکن پٹرول زادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ داستان عشق کی ہیروئن کی حیثیت سے۔ اور غسان بھی مشہور ہوا، اپنے مردانہ جمال کے جادو سے عورتوں کا شکار کرنے والے ہیرو کی حیثیت سے۔ میں اپنی شہرت کو بھول کر غسان کی شہرت پر حسد کرنے لگی۔ ہمارے سامنے معاشرتی دعوتوں کی ڈھیر لگ گئی... میں لوگوں کے سامنے اپنی داستان سمیت آنا نہیں چاہتی تھی۔ تاکہ بیروت کے اخبارات میں کہیں ایک بار پھر میرا نام نہ گونجنے لگے اور انہیں خاموش کرنے کی غرض سے میرے گھر والوں کو ایک بار پھر تاوان دینا پڑے۔ جبکہ غسان کا کہنا تھا کہ کارون ہاؤس کو گاہکوں کی ضرورت ہے اور بیروت میں اس کے علاوہ بھی بہت سے فیشن سنٹرز ہیں۔ مقابلہ سخت ہے، جس پر غلبہ پانے کا سب سے بہترین وسیلہ عام تعلقات بنانا معاشرے سے رابطہ قائم کرنا دعوتیں دینا اور دعوتیں قبول کرنا ہے۔ میں مجبور ہوگئی اور غسان کی بانہہ میں بانہہ ڈالے بیروتی معاشرے کے روبرو آگئی۔ دعوتیں قبول کرنے سے قبل میں اس بات کا یقین کر لیتی تھی کہ مشترکین میں کوئی کویتی نہیں۔ اس لئے نہیں کہ میں ان سے ڈرتی تھی بلکہ اس لئے کہ میں غسان کو ان سے دور رکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ لوگ اس شادی پر میرے خاندان کی رضامندی کے حصول کے لئے اسے ابھار نہ دیں.. لیکن میں نے کچھ ہی دنوں بعد یہ انکشاف کر لیا کہ دعوتیں دینے والے لوگ میری شخصیت کا استقبال نہیں کرتے بلکہ میرے قصے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ایک پٹرول زادی کا قصہ جسے ایک دوکان کا ملازم اڑا لے گیا.. مجھے ان دعوتوں سے الجھن ہونے لگی اور میں نے بیشتر دعوتوں سے معذرت کے لئے غسان پر دباؤ ڈالا جس کے بعد وہ دعوتوں میں شریک ہونے لگا اور میری طرف سے دعوت دینے والوں سے کچھ بھی معذرت کر لیتا۔ میں اس پر چڑ جاتی کہ ان لوگوں کی خاطر وہ مجھے تنہا چھوڑنا کس طرح گوارا کرتا ہے۔ پھر میرے بغیر لوگوں کے سامنے اس کا مقام ہی کیا ہے۔ اس کی بساط صرف اسی قدر ہے کہ وہ میرا شوہر ہے۔ شادی سے قبل اس کا کوئی مقام نہ تھا.. پھر میں نے نوٹ کیا کہ ہمیں غسان کے اہل خاندان یا قدیم دوستوں کی طرف سے جو دعوتیں موصول ہوتی ہیں انہیں وہ مسترد کر دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلیت بھول رہا ہے۔ میں نے اس کے والدین کو صرف ایک بار دیکھا، اور اس کے بھائی بہن کو کبھی نہیں دیکھا... جب کبھی میں ان کے بارے میں پوچھتی تو کہتا:

"ہمارے خاندان کی یہ عادت ہے کہ ہر کوئی صرف اپنی زندگی گزارتا ہے.. میں روزانہ امی سے رابطہ قائم کر کے ان کی صحت معلوم کرتا ہوں، اور ان کی جو ضرورت ہوتی ہے اسے پوری کرتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو تمہارے لئے بھی میں انہیں ٹیلی فون پر طلب کر سکتا ہوں۔"

میں غسان کے والدین، افراد خاندان یا قدیم دوستوں سے ٹیلی فون پر باتیں کرنے کی خواہشمند نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک متوسط درجے کی زندگی گزارنے کی آرزومند تھی جس سے وہ فرار اختیار کر رہا تھا۔

بیروت پہنچتے ہی اس نے سمندر کے کنارے ایک وسیع و عریض فلیٹ کرائے پر لیا جسے اعلیٰ درجے کے فرنیچرز اور اسباب زینت سے سجایا۔ ان سب کی قیمت میں نے ان ڈالروں سے چکائی جن سے غسان واقف تھا۔ اور جب میں نے اس کی ان تمام فضول خرچیوں پر اعتراض کیا تو ہنستا ہوا بولا:

"کارون کے ایجنٹ کو کارون کے معیار کے مطابق ہی زندگی گزارنی چاہئے۔"

غسان کو اپنے آفس اور کارون کی نمائش کے لئے جگہ کی ضرورت تھی۔ اسے عام تجارتی علاقوں میں دوکان حاصل کرنا منظور نہ تھا۔ اس لئے الحمراء روڈ پر واقع ایک بڑی سی عمارت کی پوری منزل کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا جس کا سالانہ کرایہ پچاس ہزار ڈالر یعنی تقریباً ڈیڑھ لاکھ لبنانی لیرہ تھا... وہ ایک بار پھر میری انگوٹھی اور ہیرے کی چوڑیاں طلب کرنے آیا تاکہ انہیں فروخت کر کے یا گروی رکھ کر وہ جگہ کرائے پر لے سکے... ان دنوں میں اس بات پر پوری طرح مطمئن تھی کہ مجھے غسان کی مدد کرنی چاہئے... کیونکہ وہ صرف اپنے لئے مال نہیں چاہتا بلکہ اس کے ذریعے اس منصوبے کی تعمیر چاہتا ہے، جس پر ہمارے مستقبل کا دارومدار ہو۔ ماضی میں میری تہذیبی دادی اپنا سب کچھ شوہر کو دے دیا کرتی تھی تاکہ وہ سفینہ بنائے اس پر چڑھ کر سمندر کا سینہ چیرے، موتیوں کا شکار کرے، یا تجارت کرے یا پھر بحری قزاقی میں حصہ لے... لیکن اس کے لئے مجھے اپنے جواہرات کی قربانی منظور نہ تھی۔ مجھے ان سے اس قدر رغبت تھی کہ یہ میری زندگی کا جز بن چکے تھے۔ جواہرات میری پیدائش کے روز اول سے ہی مجھ سے لپٹے پڑے تھے اور مجھے اپنے وجود کا حصہ لگتے تھے... چنانچہ میں نے اس سے کہا:

"کیا تم کارون ایجنسی کی ضمانت پر قرض نہیں لے سکتے؟"

جس پر وہ حسب عادت اپنے ہونٹوں کے ارتعاش سے میرے جذبات میں طوفان برپا کرتا ہوا بولا:

"میری جان ایجنسی کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت ڈرائیونگ لائسنس سے زیادہ نہیں ہوتی، اور سب سے اہم تو یہ ہے کہ ہم اس ایجنسی سے کچھ حاصل کریں، جبکہ اب تک اس سے ہم نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔"

میں نے تلخی بھری ایک طویل سانس لے کر جواب دیا:

"مجھے ایک بار پھر اپنا طریقہ آزمانے دو۔ شاید میں دوبارہ اپنے والد کے نام پر قرض لے سکوں۔"

اس بار میں نے کئی دن ادھر ادھر جانے آنے میں گزارے اور یہ ظاہر کرتی رہی کہ کسی موزوں آدمی کی تلاش میں ہوں جس سے قرض لے سکوں۔ گھر سے نکلتی، پورا دن باہر گزارتی، شام کو خالی ہاتھ واپس لوٹتی، اور خیالی ایجاد پر مبنی چھوٹی تفصیلات اس کے سامنے رکھتی جنہیں وہ شدید الجھن کی حالت میں سنتا، اس دم نہ مجھ میں اپنے ہونٹوں سے طوفان جگاتا اور نہ اس رات بستر پر میرا وجود محسوس کرتا... میری نگاہ میں اس کی یہ حرکت برحق تھی، کیونکہ جب مرد پر کام کی الجھنیں سوار ہوں تو وہ بستر زوجیت کے قابل نہیں ہوتا... ایک ہفتہ بعد اپنے اوپن اکاؤنٹ سے پچاس ہزار ڈالر نکال لائی اور غسان کو اپنی راتوں کے لئے دوبارہ حاصل کر لیا۔

غسان پوری محنت اور ذہانت سے کام میں لگ گیا... کارون ہاؤس بیروت کا سب سے کامیاب اور درجہ اول کا فیشن ہاؤس بن گیا۔ اس کامیابی پر میں خوش تھی، جیسے یہ میری کامیابی ہو... ہر شام میں غسان کا کچھ اس طرح استقبال کرتی جیسے میں اپنے اس شوہر کا استقبال کر رہی ہوں جو اپنا پورا دن سمندر کی گہرائیوں میں گزار کر لوٹا ہے اور اس کے پاس موتیوں سے بھری بہت سی سیپیاں ہیں۔

زندگی معمول پر آ گئی، لیکن ایک مصیبت میرے احساسات سے لپٹ گئی۔ مجھے اپنے بیٹے اور بیٹی کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ ان کی دوری کا احساس جان کو آ لیا۔ میں نے انہیں زائد از ایک سال سے نہیں دیکھا تھا... میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ان تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے خاص طور پر جبکہ میں نے غسان کو اس بات پر مطمئن کر رکھا تھا کہ خاندان والے مجھ سے پوری طرح دست بردار ہو چکے ہیں اور مجھے اپنی ہر چیز سے محروم کر دیا ہے، جس میں خود میرے جگر پارے بھی شامل ہیں؟

میں ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے حازم اور صابحہ کی خیر و عافیت معلوم کر لیا کرتی تھی اس کے لئے میں کویت میں کبھی اپنی چچازاد بہن سے رابطہ قائم کرتی تو کبھی اپنے بھائی جابر سے۔ لیکن اپنے والدین سے رابطہ قائم کرنے کی جرأت ابھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان میں سے کسی نے مجھے فون کیا تھا، یہ تمام رابطے غسان سے پوشیدہ تھے، گو میں اسے کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتی تھی کہ آج میری چچازاد بہن یا کسی سہیلی نے کویت سے مجھ کو فون کیا، یا میں نے اپنی کسی دوست کو فون کر کے بچوں کی خیریت معلوم کی۔

لیکن محض اس قدر کافی نہ تھا۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کی آواز سننا چاہتی تھی اور انہیں اپنے سینے سے لگانا چاہتی تھی... میں انہیں دیکھنے کے لئے کویت پرواز کر سکتی تھی، خواہ ایک ہی دن کے لئے کیوں نہ ہو... اپنی داستان شادی کے عام ہونے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں کویتی معاشرے سے ڈرنے لگی ہوں... یہ بھی ممکن تھا کہ میں اپنے خاندان والوں کو اس بات پر رضامند کر لوں کہ وہ چند دنوں کے لئے میرے بچے میرے پاس بھیج دیں، لیکن میں غسان کو یہ احساس دلانا نہیں چاہتی تھی کہ خاندان والے اب مجھ پر نرمی اور شفقت کی نگاہ ڈالنے لگے ہیں، تاکہ اس کے دل میں پٹرو ڈالر کی لالچ نہ کھیلنے لگے۔

پھر ایک ایسا موقع آیا کہ جس کے تحت میں اپنے بچوں کو دیکھ سکتی تھی۔ غسان نے کارون کے لئے مارکیٹ کی تلاش میں سعودی عرب اور خلیج کے ممالک کے دورے کا فیصلہ کیا۔ وہ کویت میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ مجھ سے شادی کے بعد اسے وہاں اپنی جان کا خطرہ تھا اور میں اس وہم کو اس کے ذہن میں مزید راسخ کر چکی تھی۔ اس لئے وہ کویت میں اپنا مال ایک ایجنٹ کی مدد سے فروخت کرتا تھا... منصوبے کے مطابق اسے اپنے دورۂ خلیج کے بعد پیرس جانا تھا، لیکن اس بار میں نے اسے تنہا سفر کرنے پر رضامند کر لیا۔ اور یہ بھی اس کا پہلا تنہا سفر نہیں تھا، بلکہ عام طور پر میرے لئے روحانی سکون اس میں تھا کہ وہ سفر پہ نکلے اور میں اس کا انتظار کروں، جیسا کہ میری دادی کیا کرتی تھی تا آں کہ اس کا شوہر سمندر سے گھر لوٹتا... لیکن اس بار اسے تنہا سفر پر روانہ کرنے کا مقصد سکون حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنے بچوں کو دیکھنا تھا۔

میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں، چنانچہ غسان کے روانہ ہوتے ہی دوسرے دن میرے بچے میرے چچازاد بھائی اور اپنی خادماؤں کے ہمراہ مجھ سے آ ملے۔ میں انہیں لے کر برف پوش پہاڑیوں پر واقع (فرایا) نامی

بستی پہنچ گئی جہاں کوئی کونپی نہیں آتا... میں وہاں حازم اور صابحہ کے ساتھ رہی... اس دم میں ماں تھی، صرف ماں... مجھے ایسا لگا کہ میرا سراپا مامتا کے سواہ کچھ نہیں۔ نہ عورت، نہ پٹرول، صرف ماں اور بس میں نے اب تک جو کچھ کیا تھا وہ ایک گھٹیہ درجہ کا عمل لگنے لگا۔ مجھے غسان سے اپنی محبت اور داستان شادی سب کچھ حقیر محسوس ہوئی۔

حازم اور صابحہ کے ساتھ میں نے دس دن گزارے جس دوران مجھے محسوس ہوا کہ یہی میرا قدرتی وجود ہے... وہ یہ کہ میں اپنے اہل وعیال کے درمیان صرف ماں بن کر رہوں... ان دس دنوں میں میرے پاس کبھی کوئی خالی وقت نہیں تھا جس سے میں ہمیشہ پریشان رہا کرتی تھی... اس کے برعکس میں نے انکشاف کیا کہ بچوں کا وجود ایک مکمل ذمہ داری ہے جس سے زندگی کا ہر پل بھر جاتا ہے، ان کی حیثیت تعمیر حیات کے مسلسل منصوبوں کی ہے۔ ایسے منصوبے جن میں علم، اقتصاد، فن، اصول، لطف ولذت سب کچھ شامل ہیں، اور وہ کچھ بھی جس سے انسان کے پاس وقت فراغ نام کی کوئی شے نہیں رہتی... مجھ پر بسا اوقات گریہ وزاری کے دورے پڑا کرتے تھے، میں کبھی کسی انجانی وجہ سے روتی، کبھی اپنی حیرت رلاتی اور کبھی تلاش ذات کا دکھ رلاتا، کیا میں ماں ہوں...؟ کیا میں عورت ہوں...؟ کیا میں پٹرول کا کنواں ہوں... میں کیا ہوں... یہ تمام صفات میں ایک پرسکون اور باوقار شخصیت میں جمع کیوں نہیں کر پاتی...؟

غسان کی پیرس سے واپسی سے قبل حازم اور صابحہ کا کویت لوٹ جانا ضروری تھا۔ غسان اس بار خلاف عادت بیس دنوں سے بھی زیادہ غائب رہا۔ اور جب واپس آیا تو ہنستا چلاتا مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پیار کرتا ہوا چیخا۔ "چاکلیٹ فضلیت، چاکلیٹ۔"

پھر میری حیرت توڑتا ہوا ایک سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ اور اسے جب کھولا تو اس میں برطانیہ کے بنے ہوئے کیڈبری مارک کے مختلف شکل ورنگ کے چاکلیٹوں کا انبار پڑا تھا... پھر وہ اپنے نئے منصوبے کی کہانی سنانے لگا کہ پیرس میں اسے ایک بہت بڑا اجرأت مندانہ منصوبہ نظر آیا جس کے لئے وہ لندن گیا اس کے بعد ماسکو کا رخ کیا اور چند دنوں میں منصوبے کا خاکہ تیار کر لیا۔ یہ ایک تعجب خیز منصوبہ ہے جس کے تحت کیڈبری چاکلیٹ سوویٹ روس کو برآمد کرے گا اور اس کے بدلے میں وہاں سے سمنٹ اور لوہا ایران اور خلیج کے ممالک کو سپلائی کرے گا... غسان مسرت کے مارے چیخا:

"ہم اس طرح ایک عالمی کمپنی کے مالک بن جائیں گے... اور مزا آجائے گا..."

میں اس کی باتیں سنتی اور اندر ہی اندر گھبراہٹ کے مارے کانپتی رہی، کیونکہ غسان کے کسی نئے منصوبے کا مطلب میں جانتی تھی... ظاہری بات تھی کہ سرمایہ کاری تو مجھے ہی کرنی ہوگی... اور فعلاً اپنے مخصوص انداز میں مجھے راضی کرنے کے لئے راہ ہموار کرنے لگا... اس کے ہونٹوں کی ہیجان انگیزی ایک بار پھر عود کر آئی۔ میرے پورے وجود کو سینے سے لگا لیا۔ میرے لبوں پر اس کے ہونٹوں کی مدت طویل ہوگئی جیسے محبت کے روز اول سے آج تک یہ جدا ہی نہ ہوئے ہوں... پھر وہ میرے پہلو میں لیٹ گیا۔ اس کی انگلیاں میرے جسم سے کھیلتی رہیں اور بولا:

"یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جس کے لئے کافی بڑے مقدار میں سرمائے کی ضرورت ہے۔ شاید ایک لاکھ ڈالر سے بھی زیادہ کی... میں نے سوچا کہ کارون کی ایجنسی بیچ دوں، لیکن یہ ایک طرح کا خسارہ ہی ہوگا، میرا خیال ہے کہ نئے منصوبے کے ساتھ اسے بھی محفوظ رکھنا چاہئے... تمہارا کیا خیال ہے؟"

غسان جب کسی منصوبے کا ذکر کرتا تو ہم دونوں کے نام سے بات کرتا جیسے ہم دونوں شریک ہوں۔ لیکن درحقیقت ان منصوبوں سے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، اور نہ ہی ان میں سے کوئی چیز میرے نام تھی۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ غسان کی آمدنی کتنی ہے، بینک میں اس کے نام کتنی رقم ہے جس کی بنیاد پر وہ تجارت کرتا ہے، اور میں نے اب تک جو رقم اسے دی تھی اس کا مستقبل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ گھر کے اخراجات دیتا تھا، دو کاریں خریدی تھیں، ایک اپنے لئے اور ایک میرے لئے، دن بدن اس کی سخاوت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، گو میں اس سے کچھ زیادہ مطالبوں کی بھی عادی نہ تھی، اور بلاشک یہ سب کچھ کارون کی ہی آمدنی کا صدقہ تھا، لیکن اتنی آمدنی ہماری اس زندگی کے لئے کافی تھی جس کی مجھے تلاش تھی اور جو اس زندگی سے مختلف بھی جس کی آغوش میں میں نے جنم لیا تھا۔ ہر اعتبار سے مختلف، حتیٰ کہ لذت میں بھی، کیونکہ پٹرو ڈالر کا مزا کارون ڈالر سے، بہت مختلف ہوتا ہے... میں نے غسان سے کہا:

"مجھ سے اب اور قرض نہ منگواؤ... ہم اب تک پہلے قرضوں میں سے کچھ بھی ادا نہیں کر سکے ہیں۔"

وہ مجھ سے اپنا جسم الگ کرتا ہوا بولا:

"اب تک قرض لئے صرف ایک سال اور چند ماہ ہی تو گزرے ہیں۔ اتنی مختصر مدت میں ہم اتنا بڑا قرض کیسے اتار سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کماتے ہیں لیکن ہماری آمدنی اب تک محدود ہے خاص طور پر جبکہ ہم کارون کا دائرہ وسیع کر رہے ہیں اور اس کے لئے نئے نئے مراکز کھول رہے ہیں... اور پھر ہماری ضمانت کے لئے تمہارے والد کا نام ہی کافی ہے خواہ ہمیں قرض کی ادائیگی میں دسیوں سال کیوں نہ لگ جائیں۔"

اس بار میں اپنی مزاحمت سخت کرتی ہوئی بولی:

"میرے والد کو ان قرضوں سے متعلق کچھ نہیں معلوم، لیکن انھیں کسی بھی وقت پتہ چل سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ان قرضوں کی ادائیگی پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے اور پھر تمام قرض خواہ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔"

جب اس نے میری مزاحمت سخت دیکھی تو مسکراتا ہوا ایک بار پھر مجھ سے قریب ہونے لگا اور بولا:

"کوئی ہمارا پیچھا نہیں کرے گا... جب تک ہم ایک دوسرے کے لئے ہیں وہ لوگ کسی بھی وقت ہم سے اپنا سب کچھ لے سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

میں کچھ نرم پڑ گئی لیکن اندر سے بدلی بدلی لگی۔ میری نرمی میں وہ

روحانی شمولیت نہ تھی جو اس کے سابقہ منصوبوں کی تکمیل میں حصہ لیتے وقت کبھی محسوس کیا کرتی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میری حماقت اور اوچھا پن مجھے اس کے سامنے سپر انداز کردیتا ہے اور میں واقفیت کے باوجود اپنی ان ناپسندیدہ صفات کے خلاف مزاحمت کرنے سے قاصر ہوں۔

آخرش میں نے اپنی قدیم کہانی پھر لوٹائی... یہ ظاہر کیا کہ کسی قرض دینے والے کی تلاش میں ہوں، پھر اپنے اکاؤنٹ سے اپنے ہی نام کا ایک لاکھ ڈالر کا چیک اس کے حوالے کیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ قرض دینے والے نے یہ رقم بینک میں میرے نام منتقل کردی تھی۔

غسان کے حالیہ منصوبے کا تقاضہ تھا کہ ہم لندن میں رہیں، چنانچہ پیکاڈیلی کے علاقے میں ایک فلیٹ لیا، اور پھر میری زندگی کے ہر معمول میں تبدیلی نمایاں ہونے لگی... غسان طویل عرصوں کے لئے مجھ سے دور رہنے لگا۔ چند دنوں وہ میرے ساتھ لندن میں رہتا، پھر ماسکو پرواز کر جاتا اور وہاں سے بیروت اور دوسرے عرب ممالک میں روپوش ہوجاتا۔ اور جب اس کی واپسی ہوتی تو ماہ دو ماہ گزر چکے ہوتے... اب میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی تہذیبی دادی کی طرح نہیں ہوسکتی جس کا شوہر مہینوں کے لئے اس سے دور چلا جاتا تھا تاکہ تجارت کرے یا سمندر کی گہرائیوں میں موتیاں ڈھونڈے یا پھر سمندر کی آغوش میں بحری قزاقی میں حصہ لے... آج کی کویتی عورتیں کل کی عورتوں کی طرح نہیں رہیں... میں ایک بار پھر تنہائی اور وقت فراغ کی آنچ پر تڑپنے لگی۔ کبھی کبھی میں بھی اس کے ساتھ بعض دوروں پہ نکلتی لیکن تنہائی اور وقت فراغ کا ناگن مجھ پر سایہ فگن ہی رہتا۔ غسان کو تو اپنی تجارتی ملاقاتوں سے فرصت نہ ملتی۔ اور جب تنہا لندن میں ہوتی تو کبھی اپنے بھائی سے التجا کرتی کہ وہ آکر میری تنہائی بہلائے، یا پھر کبھی اپنے بچوں کو طلب کرلیتی... پھر کبھی سوچتی کہ غسان کو سب کچھ بتادوں اور یہ بھی کہہ دوں کہ میرا خاندان ہماری شادی پر رضامند ہوسکتا ہے اور ہم کویت جاکر وہاں مستقل رہائش اختیار کرسکتے ہیں۔ لیکن پھر جھجکتی اور اس خیال کو مسترد کردیتی، نہ جانے کیوں؟... شاید میں غسان کو اپنے اہل و خاندان کا قرب اور اپنے وطن کویت کی رہائش فراہم کرنے کے سلسلے میں بخل محسوس کرتی تھی۔ یا پھر شاید اس لئے کہ میں اپنی شادی کو عام نوعیت کی شادی بنانا نہیں چاہتی تھی جس میں کوئی قصہ نہیں ہوتا، اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اگر مجھے کسی عام بیوی کی طرح رہنا ہوتا تو پھر اپنے وطن کویت کے کسی مرد سے شادی کرتی، لبنان کے کسی اجنبی سے نہیں۔

کارون اور کیڈبری منصوبوں کی کامیابی کے بعد اب غسان میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ اس نے بے انتہا فائدے حاصل کرلئے تھے جن کی مقدار سے میں واقف نہ تھی۔ وہ اپنے منصوبوں کی تفصیلات تو خاص طور پر مجھے سناتا لیکن کبھی ان کے نتائج بیان کرنے کی کوشش نہیں کی... مجھے ایسا لگا کہ وہ مغرور ہونے لگا ہے۔ اور دولتمندوں کے معاشرے میں شامل ہونے کے لئے کوشاں ہے... اس نے لندن کے ایک وسیع گلشن میں ایک بہت بڑا ولا کرائے پر لیا جہاں ہم منتقل ہوگئے... اس نئے گھر میں لندن کی شب بیداری کی محفلیں روزانہ قائم ہونے لگیں۔ مجھے ان مناظر سے سکون نہیں ملتا تھا کیونکہ یہ مجھے احساس دلاتے تھے کہ میں ایک پٹرول کا کنواں ہوں... میں برطانوی معاشرے میں کامیابی کا احساس حاصل نہ کرسکی۔ مجھے اس سے نفرت ہوگئی اور ان تمام عرب مرد وعورت سے بھی نفرت ہوگئی جو اس معاشرے میں آملتے ہیں... لیکن... اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ بذات خود غسان بھی مجھ سے نئے انداز میں برتاؤ کرنے لگا تھا... اب وہ میرے ساتھ دلچسپی نہ لیتا، جیسے اسے میری ضرورت ہی نہ ہو۔ اسے پٹرول ٹینک سے جتنا لینا تھا لے چکا۔ بے شک اب اس کی اپنی خفیہ زندگی تھی... میرے سوا دوسری عورتیں تھیں... وہ میری امانت میں خیانت کرتا تھا اور اسے اپنی خیانت کا احساس بھی تھا۔ جیسا کہ کویت کے لوگ ہر رات ایک نئی عورت کرائے پر لیتے ہیں اور انھیں اپنی بیویوں کے ساتھ خیانت کا احساس بھی نہیں ہوتا... غسان بھی کسی کویتی مرد کی طرح ہوگیا تھا۔ شاید یہ کویت کے مردوں کی ہی صفت نہ تھی، بلکہ ہر دولتمند مرد کا مزاج تھا خواہ وہ پٹرول زادہ ہو، یا کیڈبیری زادہ، یا کارون زادہ۔ اس صفت میں سبھی برابر ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان میں قوت خرید کا غرور پیدا ہوجاتا ہے جس میں عورتوں کو خریدنے کی صلاحیت بھی شامل ہوتی ہے... پھر مجھے یقین ہونے لگا کہ غسان میری خیانت کررہا ہے... ایک عورت اپنے مرد کی خیانت ہونٹوں کے لمس اور طریقۂ معاشرت سے منکشف کرلیتی ہے۔

اب غسان کی خیانت مجھ پر یقین کی حد تک واضح تھی۔

اس رات غسان نے اپنے ہی گھر میں شبینہ لہو ولعب کی دعوت دی۔ شریک ہونے والوں میں پچاس سے زیادہ مرد اور ایک عورت تھی۔ میں ان سبھوں کے درمیان نہایت سرد مہری سے حرکت کرتی رہی۔ وہ میرے ارد گرد دائرے بناتے رہے اور میں ان کا قرب برداشت کرتی رہی۔ ان میں سے کسی کی بھی نگاہ میں غسان کی بیوی کی حیثیت سے میرا عکس نہیں جھلکتا تھا بلکہ وہ مجھے پٹرول ٹینک کی حیثیت سے ٹٹول رہے تھے۔ ان کی باتیں غسان، کیڈبری اور کارون سے زیادہ کویت اور میرے والد سے متعلق تھیں پھر اچانک خیال آیا کہ میں غسان کو ڈھونڈ کر ان مہمانوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کروں... میری نگاہ ہر سو ڈھونڈ کرنا کام واپس لوٹ آئی... شاید وہ چند دوستوں کے ہمراہ باغیچے کی طرف نکل گیا ہو، جیسا کہ وہ عام طور پر کیا کرتا تھا... میں اسے ڈھونڈنے نکلی اور پالیا... لیکن ایک درخت کے پیچھے کارول کی آغوش میں پایا جو کہ لندن کے ایک بہت بڑے تاجر لوفورڈ کی بیٹی تھی۔ غسان اور کارول کے وجود ایک دوسرے میں مدغم اور پیوست تھے... وہ ہونٹ جن کے سامنے میں خود کو فراموش کر بیٹھی اور جنھیں لہرا کر غسان نے مجھے خرید لیا تھا۔

میں خاص طور پر ان دونوں کے سامنے سے گزری تاکہ غسان مجھے دیکھ لے... پھر ایک لفظ بھی ادا کئے بغیر میں محفل میں لوٹ آئی... خود پر قابو رکھا اور مسکراتی رہی، تا آنکہ محفل ختم ہوگئی اور لوگوں کو الوداع کہہ دیا، کارول کو چھوڑنے میں دروازے تک گئی، وہ کانپتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور مصافحے کے وقت اس کا ہاتھ انتہائی سرد تھا جیسے اس کی رگوں میں خون جم گیا ہو... اس موقعے پر

میں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بے شک کارول مجھ سے عمر میں چھوٹی اور حسن و جمال میں کئی قدم آگے تھی۔

میں خاموشی کے ساتھ اپنی خواب گاہ پہنچ گئی۔ غسان میرے پیچھے آیا اور مجھے چھونے کی کوشش کی۔ میں نے شدید تلخی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اس نے مجھ پر اپنا وجود سوار کرنے کی کوشش کی اور بولا:

"فضیلت، میں تم سے گزارش کرتا ہوں کہ تم مجھے سمجھو.... مجھے تھوڑی دیر کے لئے درگزر کردو، اور میری بات سنو! میں نے جو کچھ کیا اس پر میں مجبور تھا۔ میرا مقصد محض اس کی دلجوئی کرنا تھا...تم جانتی ہو کہ اس کے والد کی کمپنیوں پر ہماری تجارت کا کتنا دارومدار ہے...ہمارا میدان عمل کبھی ہمیں کمیشن دینے پر مجبور کرتا ہے تو کبھی رشوت...اور کبھی رشوت یا کمیشن ایک بوسے کی شکل میں بھی دی جاتی ہے۔ تم نے جو کچھ دیکھا وہ کارول کے لئے رشوت سے زیادہ کچھ نہ تھا تا کہ میں اس کے والد کی توجہات حاصل کرسکوں۔"

میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

"اور کارول کیا اسی اقدام پر رک جائے گی؟"

وہ میری طرف آگے بڑھتا ہوا بولا:

"وہ مجھ سے اس سے زیادہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ میرے ساتھ اپنا دل بہلا رہی تھی۔ دراصل اس نے کل کئی پیگ انڈیل لئے تھے۔"

میں چیختی اس سے دور ہوتی ہوئی بولی:

"میں اپنے گھر میں اس طرح کی رشوت پیش کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی...اگر تمہیں گھر کا احترام نہیں تو گویا تم میرا احترام نہیں کرتے، بشرطیکہ میرے اور تمہارے درمیان صرف احترام کا رشتہ باقی رہ گیا ہو۔"

وہ بزور بازو مجھے پکڑ کر سینے سے چمٹاتا ہوا بولا:

"گھر میں جو کچھ پیش آیا وہی برائت دلیل تھا، کیونکہ اگر اس سے زیادہ ہوتا تو گھر سے باہر ہوتا۔"

اس کے بعد اس کے ہونٹ میرے لبوں پر کئی شاخ کی طرح گر پڑے...اور میں سپر انداز ہوگئی...اس رات غسان کا ہر انداز اس کی خائن طبیعت کا غماز تھا۔

اس دن میں نے فیصلہ کرلیا کہ غسان کے سامنے میری شخصیت بدل جائے گی...میں اب وہ عورت نہیں رہوں گی جو سمندر سے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی ہے، بلکہ وہ عورت بن جاؤں گی جو مردوں پر اپنے احکام تھوپتی ہے... عورت کا مرد پر احسان ہے...اور میرا بھی غسان پر احسان ہے...میں نے ہی اسے جنم دیا اور ایک کامیاب انسان بنایا جسے آج کا معاشرہ پوچھتا ہے، ورنہ اس کی قیمت ہی کیا تھی...ہاں میں...صرف میں...وہ پٹرول زادی جسے چوس چوس کر اپنا وجود تعمیر کرتا رہا۔

اس حادثے کے چند دنوں بعد ایک دن آفس گیا تو تھوڑی دیر بعد میں نے ٹیلی فون پر اس سے رابطہ قائم کیا، اور اپنی آواز میں ایسی گھبراہٹ پیدا کرلی جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت ہم دونوں کے سروں پر آٹوٹی:

"غسان...میں تم سے ابھی ملنا چاہتی ہوں، فوراً چلے آؤ۔"

"میں نہیں آسکتا، کیونکہ شام تک میرے پاس ملاقاتوں کا ایک سلسلہ ہے۔" غسان بولا۔

"اپنے تمام پروگرام ملتوی کرو اور فوراً چلے آؤ...میرے بھائی جابر نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا، اسے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔" میری گفتگو میں آمرانہ تحکم کا انداز شامل تھا۔

غسان تھوڑی دیر چپ جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر بولا:

"ایک گھنٹہ بعد میں تمہارے پاس ہوں گا۔"

غسان آیا، حالانکہ میرے بھائی نے نہ تو مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور نہ کوئی بات پیش آئی تھی، لیکن میں نے ایک خوفزدہ عورت کا کردار جاری رکھا، اور انتہائی لرزاں آواز میں بولی:

"جابر ایک گھنٹے تک چیخ چیخ کر ٹیلی فون پر مجھ سے باتیں کرتا رہا وہ ہم دونوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں ہم دونوں چور اور ڈاکو ہیں، کیونکہ ابا کا نام استعمال کر کے ہم لوگوں سے قرض لیتے رہے ہیں اسے بینک کے تمام نمبرات معلوم ہیں...ضرور قرض خواہوں نے ان سے اپنے پیسوں کا مطالبہ کیا ہوگا۔"

غسان نے سنجیدہ آواز میں کہا:

"تمہارا بھائی کیا چاہتا ہے۔"

وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے قرض ادا کردیں...اور اب ہمیں یہ قرض اتار دینا چاہئے غسان، کیونکہ اس کی مقدار اب تین لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تم صحیح کہتی ہو، اب ہمیں یہ قرض اتار دینا چاہئے۔ میں دو یا تین ماہ میں رقم کا انتظام کرسکوں گا۔" اس کی آواز میں اب تک سنجیدگی اور وقار کا عنصر غالب تھا۔

لیکن دہشت زدگی کا اظہار کرتی ہوئی ہانپتی اور چیختی کرتی بولی::

"میرے والد دو ماہ تو کیا تو دن کا بھی انتظار نہیں کریں گے...پورے خاندان میں کہرام مچا ہوا ہے...ان کا کہنا ہے کہ یا تو ہم فوراً قرض ادا کریں یا پھر انہیں کیڈبری یا کاروں کی تجارت میں شریک بنالیں...اور..."

شریک کا لفظ سنا تھا کہ وہ اپنی کرسی سے کودتا ہوا میرے چہرے پر چیخا جیسے مجھے تھپڑ مارنے کا ارادہ کر رہا ہو:

"سن اے عورت! میں کوئی احمق آدمی نہیں، اور نہ کبھی تھا۔ میں روز اول سے ہی ہر بات سے واقف ہوں...اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جو رقم میں نے تجھ سے لی ہے وہ کسی سے بطور قرض لی ہوئی نہیں تھی بلکہ اسے تو نے بینک میں اپنے نام کھلے اکاؤنٹ سے نکالا تھا۔ سمجھی۔"

یہ سن کر ایسا لگا کہ جیسے میرے سر پر ایک بھاری چٹان آگرا اور میں چکرا کر کرسی پر گر پڑی.. اسے سب کچھ معلوم ہے...گویا کہ ان تین سالوں میں نہ صرف میں اسے دھوکہ دیتی رہی بلکہ وہ بھی مجھے دھوکہ دیتا رہا۔ یعنی ہم دونوں کے درمیان جھوٹ اور دھوکہ پر مبنی رشتہ قائم تھا...نہ محبت نہ وفاداری...جھوٹ...دھوکہ

اور بس.. محض تجارتی زندگی... وہ مجھ سے اپنے لبوں کی قیمت وصول کرتا رہا... میں اس کی نگاہ میں عورت نہ تھی، جیسا کہ مجھے گمان ہو چلا تھا... بلکہ ہمیشہ ایک پٹرول ٹینک تھی، صرف پٹرول ٹینک اور بس...؟

"نہیں، یہ ساری رقم قرض کی تھی..." میں نے پھولتی سانسوں کے درمیان اسے جتایا۔ لیکن وہ چیخ پڑا:

"اور جھوٹ مت بولو... میرے پاس ان تمام بینکوں کے نام ہیں جہاں تمہاری رقمیں محفوظ ہیں اور ان نمبرات کا بھی مجھے علم ہے جن پر تمہارے اکاؤنٹس کھلے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ میں نے تم سے بہت زیادہ رقم نہیں لی۔"

جواباً میں بھی چیخ پڑی، میں نے بھی اسے چیلنج کرنے اور اس کی سرحدوں کا احساس دلانے کا فیصلہ کرلیا تھا:

"اگر میں اس رقم کو قرض شمار کروں تو وہ ابا سے لی ہوئی تھی... اور اگر اسے اپنے اکاؤنٹ سے نکالی ہوئی سمجھوں تو بھی اس کا سرچشمہ ابا ہی تھے... ہر حال میں بنیاد ایک ہے۔ اور مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے پیسے واپس لوں یا پھر ہر پیسے میں تمہاری شریک بنوں... تم نے اب تک مجھے کسی چیز میں اپنا شریک نہیں بنایا... مجھے نہیں معلوم کہ میرے پیسے کہاں گئے اور نہ میں نے اب تک اس کے بدلے ایک بھی کوڑی حاصل کی... میری تمام دولت تمہاری انگلیوں کا لمس پاتے ہی .پید ہوجاتی ہے..."

جس کے جواب میں وہ بڑے ہی حقیرانہ انداز میں اپنی اصلیت واضح کرتا ہوا بولا، جیسے میرے چہرے پر تھوک رہا ہو:

"تیرا مال اور تیرے باپ کا مال میری جوتی کے نیچے... مجھے اب نہ تیرے مال کی ضرورت ہے اور نہ تیرے باپ کی۔ لیکن تو کبھی میری شریک نہیں بنے گی... تو نے خود بھی کوشش نہیں کی کہ میری شریک بنے، نہ تجارت میں اور نہ زندگی میں... میں کہہ چکا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرا خاندان ہماری شادی پر رضامند ہو سکتا تھا۔ تیرا بھائی جابر کئی بار تیرے پاس آیا، نیز انہوں نے کئی بار تیرے بچے بھی بھیجے، لیکن تو ہی نہیں چاہتی کہ میں تیرے خاندان میں شامل ہوں، اور نہ یہ کہ تیرا خاندان مجھے قبول کرے۔ تو مجھ سے جلتی ہے... تیرے خیال میں میں ایک لٹیرا ہوں جو کویت کے کسی بڑے خاندان کا جزء نہیں بن سکتا... تو چاہتی ہے کہ تیرا خاندان مجھے مسترد کرتا رہے خواہ تو خود ہی کیوں نہ میری ضرورت مند ہو۔ کیونکہ تو میری ضرورت کو جو ازدواجی معاشرت کی ضرورت کے دائرے سے آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔"

"یہ غلط ہے..." میں چیخ پڑی۔ "مرد سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے ہیں... کویت میں مردوں کی کمی نہیں کہ میں تجھ جیسے اجنبی مرد کی ضرورت مند بن جاؤں... لیکن میں نے تجھ سے محبت کرکے غلطی کی۔"

جس کے جواب میں اس نے مضحکہ خیز قہقہہ لگایا، اور بولا:

"فضیلت، تم ایک مغرور عورت ہو۔ اور اپنے اس غرور کو ذہانت سمجھ بیٹھی ہو، حالانکہ تم میری زندگی میں آنے والی سب سے بیوقوف اور کچی عورت ہو... اپنے اوپر اور اپنے خاندان پر تمہارے اسی غرور کا ردعمل ہے کہ تم نے جان بوجھ کر اپنے پیٹ میں میری نسل کا بوجھ اٹھانا گوارا نہ کیا، کیونکہ تم نہیں چاہتی تھیں کہ تمہارے خاندان میں کسی اجنبی نسل کا بچہ آئے اور پٹرول کے کنوئیں کی وراثت کسی غیر کویتی کے نام لکھی جائے۔"

مجھے ایسا لگا کہ غسان نے مجھے بے لباس کردیا اور میری تمام حقیقتوں کے چیتھڑے اڑا دیے، اور میں شدید احساس ندامت کے ساتھ بولی:

"تمہاری امانت اٹھانے سے قبل میں تمہاری محبت کا یقین کرلینا چاہتی تھی۔"

"تمہارے لئے میری محبت اہم نہیں، بلکہ میرے لئے تمہاری محبت زیادہ اہم ہے۔" غسان کے ہر ہر لفظ میں تضحیک کی تلخی تھی۔ "محبت ایک عورت کو مجبور کردیتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کا تحفہ جلد از جلد حاصل کرے تاکہ وہ اس کی ڈور میں مزید مضبوطی سے بندھ جائے۔ لیکن تم نے تو کبھی بھی مجھے اپنی محبت نہیں دی، بلکہ میرا جسم لیا اور ڈالروں میں اس کی قیمت ادا کی۔"

"آج تم اولاد کے بارے میں کہہ رہے ہو، آج سے قبل تمہیں ان کی یاد کیوں نہ آئی۔ اگر تم کہتے تو کیا میں انکار کرتی؟" میرے اس جملے کے جواب میں اس نے بڑی ہی بدتمیزی سے کہا:

"میں بھی تم سے اپنی نسل نہیں چاہتا تھا... میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایک کویتی عورت کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ میرا نام لے اور میرا وارث بنے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" میں غصے کی شدت سے چیخ پڑی۔ جس پر اس نے بڑے غرور سے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارے والدین، بھائی اور خاندان کے تمام افراد یہاں آئیں اور میرا تعارف حاصل کریں، اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس پر ہم گفتگو کریں گے۔"

مجھے ایسا لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ میرے والد اور خاندان بھر کی بے عزتی کر رہا تھا جیسے یہ لبنانی لٹیرا ہمارے برابر کا انسان ہو گیا ہو... میں غصے کی بے اختیاری میں چیخ پڑی:

"مجھے طلاق دو... ابھی فوراً..."

جس پر وہ بڑی ہی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا:

"طلاق؟... لیکن کیوں...؟"

"کیونکہ میں تجھے اب برداشت نہیں کرسکتی۔" میں اسی غیظ و غضب کی بے اختیاری میں بولتی رہی:

"میں اپنی اس بدنامی اور گناہ سے دور بھاگنا چاہتی ہوں جس کی میں تیرے ساتھ مرتکب ہوئی، تجھے پہچاننے میں مجھ سے غلطی ہوئی... میں نے تجھے بنایا، گویا کہ خود اپنے لئے ناپاک زہر کا ایک قالب بنا کر اس میں سراپا ڈوب گئی اور میرا لہو تک زہریلا ہو گیا۔"

"تو تمہیں اس حد تک طلاق کی ضرورت ہے۔" وہ بڑی ہی سرد مہری سے بولا، جس نے میرے تن بدن میں اور بھی آگ لگا دی، اور میں دیوانہ وار چیختی رہی:

"مجھے طلاق دو ورنہ خدا کی قسم تجھے قتل کر ڈالوں گی..." میں غصے سے ہانپ رہی تھی۔ لیکن وہ بڑے ہی آرام سے کرسی پر براجمان ہوتا ہوا بولا:

"قتل بے وقوف لوگ کیا کرتے ہیں۔"

"لیکن میرے لیے باعث شرف ہوگا کہ میں تمہارے قتل کی حد تک بیوقوف بن جاؤں۔"

میرے جواب کا کوئی اثر لئے بغیر میری دھمکی کو نظر انداز کرتا ہوا بولا:

"میں طلاق کے لئے تیار ہوں... اور طلاق کی شاید تم سے زیادہ مجھے ضرورت ہو... لیکن مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں، کیونکہ تمھیں طلاق دینے کی مجھے بڑی قیمت چکانی ہوگی۔ یوں تو بازار میں میرا نام چلتا ہے لیکن میرے نام کو سب سے بڑی ضمانت اور پشت پناہی اس بات کی حاصل ہے کہ میں تمہارا شوہر ہوں... ایک مشہور پٹرولی خاندان کی لڑکی کا شوہر۔ اس رشتے کی حیثیت کسی بینک بیلینس کی ہے جس کی بنیاد پر میرے تمام کام آسان ہوتے ہیں... اگر میں نے تمھیں طلاق دے دی تو یہ بینک بیلینس اور ضمانت میرے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور مجھے بہت بڑے خسارے کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے مجھے اس طلاق کا معاوضہ چاہئے... ہر شے کی قیمت ہوتی ہے... اور تمھیں طلاق دیئے جانے کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے اس سے کم نہیں... اور تمہارے کھلے اکاؤنٹ میں دس لاکھ ڈالر کی وسعت موجود ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ بڑے ہی سکون سے اٹھا اور گھر سے نکلتا ہوا بولا:

"اچھی طرح سوچ لو، اور ٹیلی فون پر اپنے فیصلے سے مجھے مطلع کر دینا۔"

اور میں اس کے پیچھے چیختی چلاتی رہی: "کمینے، نیچ، چور، گندے۔"

میں زمین پر گر پڑی اور زار و قطار روتی رہی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے آنسوؤں کا مزاج تلخ ہے جیسے ان میں میری ناپاکی دھل کر نکل رہی ہو۔

غسان اس رات گھر نہیں آیا۔ اور نہ دوسرے دن آیا۔ جب میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ باہر گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہاں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق چند دنوں غائب رہے گا اور جب یہ خیال آئے گا کہ اب میں اس کی غیر حاضری برداشت نہیں کر سکوں گی تو وہ لوٹ آئے گا اور اپنے لبوں کے آگے میری کمزوری کے احساس کا استحصال کرتے ہوئے مجھ پر اپنے تمام ارادے تھوپ دے گا۔

لیکن یہ اس کا واہمہ ہے... میں اب کبھی اس کے سامنے کمزور نہیں ہوں گی... اس کے ساتھ میرا قصہ ختم ہوگیا۔ ایک ایسا قصہ جس میں میں خود سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی... ایک ایسی عورت سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی جس کا تعلق پٹرول کی دولت میں سرتاپا غرقاب ایک کویتی خاندان سے تھا۔ میں اپنے آپ سے آزاد ہوکر خود کو پٹرول کے کنوئیں سے باہر کی ایک عام عورت بنانا چاہتی تھی جسے اس کا مرد صرف اس کی ذات کی خاطر قبول کرتا ہے اس کی دولت یا اس کے خاندان کی نسبت حاصل کرنے کے لئے نہیں۔

غسان نے مجھے یہ بتا کر انتہائی حماقت کا ثبوت دیا کہ اسے سب کچھ معلوم تھا۔ کیونکہ اس نے ساری کہانی کو ہی جڑ سے گرا دیا۔ حتیٰ کہ محبت بھرے دنوں کی میٹھی یادیں بھی ڈھادیں... حالانکہ اگر اس نے صرف چند دنوں اور انتظار کیا ہوتا تو شاید میں خود ہی اسے سب کچھ بتا دیتی اور اسے اپنی حقیقت کے اظہار کی نوبت بھی نہ آتی۔ میں اس پر یہ نمایاں کرتی کہ صرف میں اسے دھوکہ دے رہی تھی، اور اس پر اپنی دولت کا دروازہ کھول دیتی... لیکن وہ اپنے غرور میں مارا گیا... دراصل میں نے ہی اسے مغرور بنا ڈالا تھا، اسے دیتی گئی، مدد کرتی گئی تا آنکہ اس نے میری ہی دی ہوئی دولت سے غرور خرید لیا اور سمجھ بیٹھا کہ میں اس کی لونڈی بن گئی ہوں اور اس سے بے نیازی اب میرے بس کی بات نہیں...

لیکن نہیں غسان دیکھو میں تم سے بے نیاز ہوگئی۔

پھر ایک پل میں میں اپنے اصلی روپ اور مکمل شخصیت کی طرف لوٹ آئی۔ کویت کے ایک اعلیٰ خاندان کی شخصیت... قبیلے کی شخصیت... میں نے سفیر کو بلوا بھیجا اور اس سے مطالبہ کیا کہ میرے والد کو فوری اطلاع دیں کہ میں کویت واپس لوٹ رہی ہوں۔

پھر صرف دو دنوں بعد میں کویت میں تھی... اپنے وطن میں...

خاندان والوں نے انتہائی خاموشی کی تصویر بن کر میرا خیر مقدم کیا جیسے ہر ایک کی زبان پر مہر لگی ہو، یا ہر کوئی اپنے سینے میں کوئی راز چھپائے بیٹھا ہے جس کے بے نقاب ہو جانے کا اندیشہ ہو... اس کے باوجود گھر کے اندر قدم رکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے تمام کشیدہ اعصاب پرسکون ہو گئے ہیں... میں نے عجیب سی راحت محسوس کی، جیسے ماضی کے چار سال میں کڑی کڑی گزارتی رہی ہوں یا صحرا کی سخت دھوپ میں ننگے قدم محو سفر رہی ہوں... میں اپنی ماں، بچوں، خاندان کے افراد اور خادموں کے وسط میں اس رات سوئی... ایسی گہری نیند جس سے اپنی داستان کے تمام سالوں میں محروم رہی تھی... سکون و راحت اور امان کی نیند... مکمل تین دن اور تین راتیں سوتی رہی۔

چار دنوں بعد میں اپنے والد سے ملی... انھوں نے ملنے سے انکار نہیں کیا... لیکن ان سے ملنے سے قبل میں نے اپنے افکار کے بکھرے شیرازے جمع کر لئے تھے... دوسری طرف وہ بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے تھے چنانچہ نہ تو انھوں نے مجھے بلایا اور نہ ہی اپنی بیٹی کے فراق کے غم میں بے حال ہوئے... ان کے چہرے کے خطوط کشیدہ نہ تھے۔ اور نہ ہی انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا جیسے انھیں سب کچھ معلوم ہو، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی بچپن سے ہی دیوانی ہے اور اس کے تمام تصرفات غیر عادی ہوتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے بہت ہی مختصر بات کی، یہی ان کا مزاج تھا... وہ صرف کوئی حکم جاری کرنے یا کوئی فیصلہ سنانے کی غرض سے زبان کھولتے... جبکہ میرے حق میں جاری کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی حکم یا فیصلہ نہ تھا، پھر بات ہی کیا کرتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ کویتی معاشرے میں اپنا مقام بازیاب کرتی رہی، لیکن ایک نئی شکل میں، جس میں عزلت پسندی اور خاموشی کا مزاج کسی جھیل کی طرح گہرا تھا... اپنی سہیلیوں کے سامنے اپنی کہانی روزانہ نئے انداز میں بیان کرتی، جس کی حیثیت محض بات بنانے کی تھی، لیکن مجھے محسوس ہوتا کہ مجھ پر غسان کے شکار ہونے کا الزام ہے، جیسے سبھوں کو معلوم ہو گیا ہو کہ وہ مجھے دھوکہ دے کر

میری دولت مجھ سے چوستا رہا ہے... لیکن یہ ساری بیہودہ باتیں تھیں، کیونکہ چار سال کے دوران غسان نے مجھ سے جو حاصل کیا اس کی مقدار تین یا چار لاکھ ڈالر سے زیادہ نہ تھی... یہ صحیح ہے کہ اس نے وہ رقم مجھے واپس نہیں دی، لیکن وہ کام کرتا اور کماتا تھا، اور اپنی آمدنی سے ہی مجھ پر خرچ کرتا تھا... میں بے وقوف نہیں ہوں، بلکہ کویت کی سب سے چالاک عورت ہوں... اگر کوئی اور ہوتی تو غسان میرے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اس سے چوس لیتا۔ پھر ہمارے بڑے خاندان کی عورتیں اور لڑکیاں اتنی رقم تو سال دو سال میں صرف کپڑے اور زیورات خریدنے میں صرف کر دیتی ہیں۔ جبکہ اس پورے عرصے میں میرے تمام کپڑوں اور اشیائے زینت کی قیمت صرف غسان نے ادا کی تھی، میں بہت چالاک ہوں، حتیٰ کہ ان مردوں سے بھی زیادہ جو یورپ میں ہر سال اس رقم سے کئی گنا زیادہ خرچ کر دیتے ہیں جو میں نے غسان پہ خرچ کی تھی۔ خلیج کے ایک مرد کا وہ مشہور احمقانہ واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اس نے لبنان کی ایک اہم شخصیت کی بیٹی سے صرف ایک رات کی شادی کے لئے پندرہ لاکھ ڈالر کی رقم ادا کی تھی۔ اس شادی کی یہ بنیادی شرط تھی کہ وہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ لڑکی کو طلاق دیدے گا... صرف ایک رات کی شادی اور پندرہ لاکھ ڈالر کے تناسب پر غور کریں گے تو وہ مرد آپ کو انتہائی کوڑھ مغز نظر آئے گا۔

مذکورہ حادثے کے بعد کئی ماہ تک غسان نے میری کوئی خیر خبر نہیں لی اور نہ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ میں نے طلاق کے موضوع کو اپنے والد اور بھائی کے لئے چھوڑ دیا... بلا بحث مباحثہ طلاق کے لئے، کیونکہ میرے اور غسان کے مابین کوئی ایسی چیز نہیں رہ گئی تھی جو قابل بحث ہوتی۔

میرا بھائی جابر لبنان گیا، وہاں غسان سے ملاقات کی اور طلاق نامہ لے کر آ گیا... میں نہیں جانتی کہ دونوں میں کیا بات ہوئی، لیکن اس قدر میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہم نے اس طلاق کی کوئی قیمت ادا نہیں کی... کیونکہ میرے بھائی اور والد میں سے کوئی بھی اس طرح کی دھمکی سے مرعوب یا مغلوب ہونے والے نہیں... ہماری طاقت اس سے کہیں زیادہ ہے... ہم اسے دھمکی دے سکتے ہیں کہ کویت میں اس کی کمپنی کی جڑ کاٹ دیں گے۔ یہ وہ دھمکی ہے جو ایک تاجر کی ساکھ بگاڑ سکتی ہے اس کی شہرت مسخ کر سکتی ہے... اسی طرح ہم اسے لالچ دے سکتے ہیں کہ کویت میں تجارتی برآمدات اور معاملات کے دروازے اس کے لئے پوری طرح کھول دیئے جائیں گے... اس سے بھی زیادہ غسان کو محض اتنی سی اطلاع ہی سپر انداز کر دے گی کہ معاملہ میرے والد اور بھائی کے ہاتھ میں پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں میری طرح اس کے لبوں کے ارتعاش کے آگے کمزور پڑنے والے نہ تھے۔

اور اس طرح سب کچھ ختم ہو گیا... میری کہانی بھی ختم ہو گئی اور...

میں ایک بار پھر طلاق یافتہ عورت بن گئی۔

لیکن اب میں بالکل بدل گئی... میں نے وہ خواب دیکھنا چھوڑ دیا جس میں عورت زمین پر حکمرانی کرتی ہے اور اس کا مرد سمندر میں رزق تلاش کرتا ہے جیسا کہ میری تاریخی وتہذیبی دادی کیا کرتی تھی... سچ تو یہ ہے کہ حقیقت کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا جائے... آج ہمارا رزق سمندر میں نہیں بلکہ پٹرول کے کنووں میں ہے.. ضرورت کے مطابق معاشروں میں تبدیلی آتی ہے، آج کویت کے مردوں نے سمندر کو خیر باد کہہ دیا، لیکن اس کی وجہ ان کی سستی یا ان کا غرور نہیں کہ دشوار گزار عمل ان کے شایان شان نہیں، اس لئے وہ زمین کے سینے سے پھٹ کر نکلنے والے آسان رزق پر اکتفا کر لیتے ہیں... حقیقت قطعی اس طرح نہیں، ہمارے مرد بالکل نہیں بدلے، بلکہ آج بھی اسی طرح ہیں جس طرح قبائلی زندگی کے آغاز میں تھے۔ صرف رزق کا وسیلہ اور ضرورت کی نوعیت بدل گئی ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا... اور آج میرا یہی اعتراف مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اب مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے سالم اور غسان کے بعد کسی تیسرے مرد کو میری زندگی میں نہیں آنا چاہئے... اب میں تنہا جیوں گی۔ اور اپنے خالی وقت کو مشغول کرنے کے لئے اس قدیم تصور کو دوبارہ زندہ کروں گی جسے معرض وجود میں لانے کی میں نے کبھی کوشش کی تھی۔ وہ یہ کہ کویتی معاشرے میں خاص قسم کی سیاسی اور ادبی محفلیں قائم کروں گی تاکہ دوسری مشہور عورتیں بھی میری پیروی کرتی ہوئی اسی طرح کی محفلیں قائم کریں... محفلوں کی کثرت ہو اور کویتی معاشرہ پٹرول بینک کے معیار سے بلند ہو کر عالمی اور عرب پیمانے پر ادب و سیاست کا ایک بے مثال گلزار بن جائے۔ میں نے فعلاً اس مقصد کی تکمیل کے لئے قدم اٹھایا ہے، ہفتے میں ایک رات کا تعین کیا ہے، جس میں کویت اور بیرون کویت کی ادبی و سیاسی شخصیتوں کو دعوت دیتی ہوں... ان محفلوں کا مجھ پر گہرا اثر پڑا ہے تا آنکہ میں یہ کہانی لکھنے کے قابل ہوئی... جو کہ میری اپنی کہانی ہے... لیکن...

کون جانتا ہے؟

شاید کسی نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہو کہ میں نے اپنی محفل کے کسی مہمان ادیب سے یہ کہانی لکھوائی ہے اور اسے اپنے نام منسوب کر رہی ہوں؟... پٹرول کے سمندر میں رہنے والوں پر ہمیشہ اسی طرح کے الزام لگتے ہیں۔ اور ایک بار پھر میں تہمتوں اور الزاموں کی بھیڑ میں اپنی شخصیت گم کر کے دوبارہ کسی ایسے مرد کی تلاش کے بارے میں سوچنے لگوں جو مجھے پٹرول کے اس سمندر سے نکالے۔ کوئی ہے جو مجھے نکالے؟ ☆☆☆

نامور شاعر، ناول نگار، نقاد

ساجدہ زیدی

کی نئی تصانیف

پردہ ہے ساز کا (شاعری)

گذرگاہ خیال (تنقیدی مضامین)

بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہیں

تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی

عشق تو نہال حیرت آمد
وصل تو کمال حیرت آمد

تیرا عشق حیرت کے سرسبز درخت کی طرح ظاہر ہوا اور
تیرا وصل حیرت کے کمال کی طرح ظاہر ہوا

خطاط: محمد احرار ہندی
عطیہ: محمد احرار ہندی

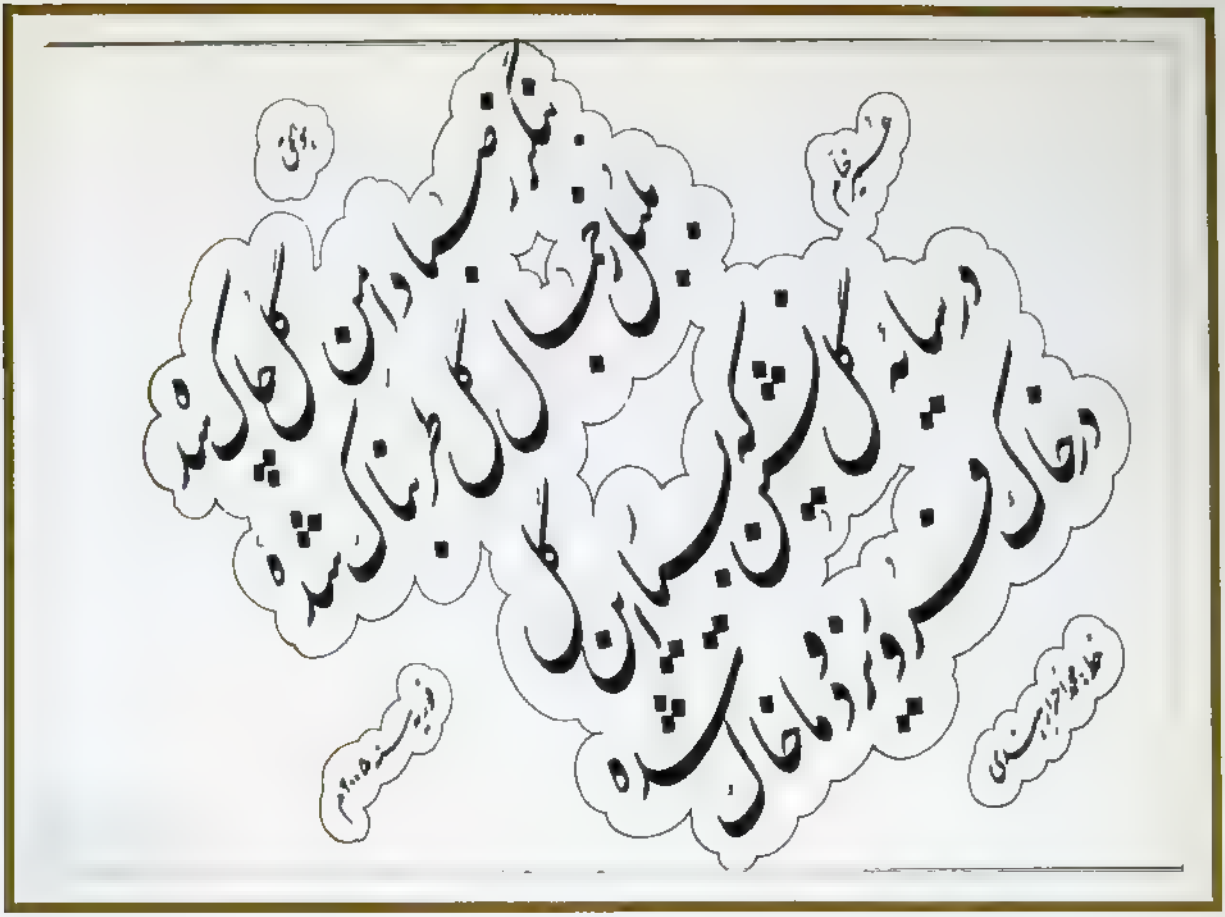

بنگر ز صبا دامن گل چاک شدہ
بلبل ز جمال گل طربناک شدہ
در سایۂ گل نشین کہ بسیار ایں گل
در خاک فرو ریزد و ما خاک شدہ (عمر خیام)

دیکھ کہ صبا کے ہاتھوں دامن گل چاک ہوا
اور بلبل کا دل پھول کے حسن پر خوشی سے بھر گیا
آؤ شاخ گل کے سائے میں بیٹھو کہ بہت سارے پھول
یہاں خاک پر گرتے جاتے ہیں اور ہم خاک ہو چکے

خطاط: محمد احرار ہندی
عطیہ: محمد احرار ہندی

قیصر عالم

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

تنہائی کو اور کیا چاہئے

لیمپ نظریں جھکائے کھڑے ہیں
چاند درخت کی ایک ٹہنی سے مسواک کر رہا ہے
جھینگر اپنی ہی آواز کی نقل اتار رہے ہیں
تنہائی اندھیرے کی جیب میں پڑی رہتی ہے
آئینے ہمیشہ ہاں میں ہاں ملاتے ہیں
بلندی دریا کی کشتی میں سفر کرتی ہے
پہاڑوں کے پاؤں میں چراگاہوں کے گھنگھرو
بجتے ہیں
دریا کی کمر میں ہمیشہ بل آ جاتا ہے
صبح چپکے سے سرہانے آ کر بیٹھ جاتی ہے

اچانک اڑ جانے والے پرندے کا کوئی گھر
نہیں ہوتا
اندھیرا، ہوا، دیا، آنکھیں
اوس، چاندنی، ساکت درخت اور لوہے کا
ٹھنڈا گیٹ
تنہائی کو اور کیا چاہئے؟

چلو ٹھیک ہے

بادل آسمان کا آنچل ہیں
رنگ تتلیوں سے بنتے ہیں
پانی دریاؤں کا زیور ہے
پھول دلہن ہیں
صبح ہنستی ہوئی بچی ہے
شام دن کا سنگھار ہے
رات کاجل ہے
خوشبو قافلوں کے ساتھ چلتی ہے
بارش بھی ٹھیک ہے، لیکن ...
ریشم موت سے بنتا ہے
وصل ہجر کی گلی میں رہتا ہے
حال ماضی گروی رکھ لیتا ہے
خوشیاں اداسی کی شاہراہ پر چلنے والے اجنبی ہیں
امن کے پرندے بارود کی الٹیاں کرتے ہیں
لفظ مجذوب ہیں بے بس ہیں
بات کہہ دینے سے ادھوری رہ جاتی ہے

کیا تمہیں معلوم ہے؟

اندھیرے اور خاموشی میں کیا فرق ہے
بلندی اتنی تنہا کیوں ہوتی ہے
صبح دریا کے پاؤں میں پازیب کیوں باندھ
دیتی ہے
زمین کولھو کا بیل کیوں ہے
سورج پلک کیوں نہیں جھپکتا
چاند کیا ہمیشہ کنوارا ہی رہے گا
شام کب تک اکیلی رہے گی
دن سایوں کے پیچھے آخر کیوں پڑا رہتا ہے
رات اتنی بدچلن کیوں ہے
پہاڑ آخر اتنا پردہ کیوں کرتے ہیں
سورج کیوں روز نکل آتا ہے
جھیلیں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں
خوشی کے ہاتھ میں تلوار کیوں ہوتی ہے
اداسی بغیر پوچھے کیوں آ جاتی ہے
موت اتنی بھوکی کیوں ہوتی ہے

غزل

قیوم راز

شمارہ ۲۵۷
جون ۲۰۰۲

اک ہوا کی زد میں رکھ کر زندگانی کا چراغ
ہم شگوفے سے ہوئے گل اور گل سے پورا باغ

منفرد آئینہ آئینہ لواحِ وقت میں
لے ہوا، لے جا، نہیں ملتا کسی سے یہ دماغ

رنگ و بوئے عام سے بھی مست ہو جاتے ہیں ہم
نشۂ مے کو ضروری تو نہیں ہوتا ایاغ

آدمیت کے صحیفے کی ہیں بس یہ سرخیاں
داغِ الفت، داغِ ہجرت، داغِ عبرت، داغ داغ

غزل

کامل اختر

شمارہ ۶۴،
ستمبر ۱۹۷۱

منظروں کی بھیڑ ایسی تو کبھی دیکھی نہ تھی
گاؤں اچھا تھا مگر اس میں کوئی لڑکی نہ تھی

روح کے اندر خلا ہے یہ مجھے معلوم تھا
کھوکھلا ہے جسم بھی اس کی خبر پہنچی نہ تھی

ہاتھ تھاما ہے سدا کے واسطے ویسے، مگر
ساتھ اس کا چھوڑنے میں کچھ برائی بھی نہ تھی

ان دنوں بھی درد کا سایہ مرے ہم راہ تھا
جب دھواں بن کر وہ میرے ذہن پر چھائی نہ تھی

جذب ہو جانے کا قصہ خود سے بھی منسوب کر
بھول میری تھی اگر، تو بھی کوئی دیوی نہ تھی

رنگ پکا ہو چلا تھا یاد آتا ہے مگر
دھوپ میرے جسم پر تب ٹھیک سے بھیگی نہ تھی

خواہشوں کا وہ جزیرہ بھی تو آخر بہ گیا
خوف و خطرہ کی جہاں پر کوئی آبادی نہ تھی

شہادت کے لئے منظر

کامل اختر

شمارہ ۲۵۷،
جون ۲۰۰۲

سمندر لہر مارے
تو
کناروں پر دھو پہلی رات کو سیراب کر جائے
ہوا
منھ زور ہو کر
آندھیوں کا روپ دھارے
اور
درختوں کی جڑیں کم زور ہو جائیں
ہرے اور زرد پتوں کا
جلوسی شکل میں دھرتی پہ اک انبار لگ جائے
کچلتی ڈالیوں سے کچھ پکے پھل گریں اور چور ہو جائیں
کڑکتی دھوپ کا موسم بدلنے پر
سنہری بارشوں کی چھچماتی بوندیاں موتی میں ڈھل جائیں
بھرے کھیتوں میں ہریالی ہو
اور یوں ہی
دنوں، لمحوں، مہینوں کے
دبے قدموں گذرنے پر
نئے سورج کے آنے سے
تمھارے جسم کا تبدیل ہو جانا ضروری ہے۔

کاوش بدری

شمارہ ۱۳۴،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

ایک سجدہ خوش گلو کے آگے سہواً ہوگیا
اس پہ کوئی معترض ہوگا تو قصداً ہوگیا

کفر کا فتویٰ ہوا صادر تو خوش قسمت تھا میں
تذکرہ میرا بھی ہر مسجد میں ضمناً ہوگیا

آناً و فاناً کسی نے دستگیری کی مری
کام تھا مشکل کا اہلاً اور سہلاً ہوگیا

طوعاً و کرہاً بڑھاتے ہیں ملاقاتوں کو ہاتھ
سب سے یارانہ مرا موقوف قطعاً ہوگیا

خواب ہی اس بار دیکھا تھا کبھی میں نے جسے
دو بدو اس سے تصادم اتفاقاً ہوگیا

مستحق جنت کا اک کاوش نہیں وہ بھی تو ہے
قتل میرا ایک جاہل سے جو شرعاً ہوگیا

شمارہ ۲۲۴،
فروری ۱۹۹۹

پتھر بنا کر عرش سے پھینکا گیا تھا ایک میں
شاید خدا سے پہلے ہی پوجا گیا تھا ایک میں

تخلیق کاری میں تجھے حاصل مہارت ہے مگر
کس انہماک و شوق سے سوچا گیا تھا ایک میں

طفلی سے پیری تک مرے احوال سن لینا کبھی
وقت ولادت ہی بہت کوسا گیا تھا ایک میں

نقش قدم بھی آپ کا اک سانپ کا پھن ہی لگا
سایہ نما خنجر سے ہی مارا گیا تھا ایک میں

دن سارے گاما میں کٹا شب پادھانی سا میں کٹی
نکلی سریلی ایک وہ، کان آشنا تھا ایک میں

کشکول بھی بن جائے گی اک روز اپنی کھوپڑی
مٹی کے برتن کی طرح برتا گیا تھا ایک میں

گائک ہوا، شاعر ہوا، عاشق ہوا، صوفی ہوا
دیوانہ پن کی حد نہ تھی کیا کیا بنا تھا ایک میں

کیا تم ہی کاوش ہو میاں کچھ اعتبار آتا نہیں
اللہ میاں ہی ایک ہیں، کہتے ہو کیوں تھا ایک میں

کاوش بدری

شمارہ ۲۳۴،
فروری ۲۰۰۰

کہیں چراغ جلا روشنی کہیں پہنچی
کھلی تھی آنکھ کہیں زندگی کہیں پہنچی

جو روبرو ہے اسی کی تلاش جاری ہے
نظر اٹھی کہیں، بد قسمتی کہیں پہنچی

ہزار فاصلے طے کر کے بھی وہیں ہم ہیں
کہیں سے ہو کے تمھاری گلی کہیں پہنچی

لہو اچھال کے بنجر زمیں کو سینچا تھا
غضب تو یہ ہے کہ ساری نمی کہیں پہنچی

خوشی کا کیا ہے بھروسا ملے ملے نہ ملے
وہ میرے گھر کا پتہ ڈھونڈتی کہیں پہنچی

وہ مضطرب ہے کہ فرزانگی کو کچھ نہ ملا
میں مطمئن ہوں کہ دیوانگی کہیں پہنچی

اڑان میری پر و بال سے بھی آگے تھی
اڑا کے مجھ کو مری شاعری کہیں پہنچی

شمارہ ۲۳۸،
جون ۲۰۰۰

شروع سلسلۂ دید کرنے والا تھا
تعارف رخ توحید کرنے والا تھا

خود اس کی زود لسانی نے اس کو گنگ کیا
وہ میرے حال پہ تنقید کرنے والا تھا

مزاج یار نے بخشی تھی ایسی یک رنگی
کہاں میں غیر کی تقلید کرنے والا تھا

تو منتہا کو پہنچ کر بھی صفر ہے اب تک
تجھے میں واقف تمہید کرنے والا تھا

ہماری سال میں دوبار جان جاتی ہے
وہ شخص روز ہی اک عید کرنے والا تھا

وہ میرے وعظ سے مسجد میں جب سنبھل نہ سکا
شراب خانے میں تاکید کرنے والا تھا

بچا کے فکر کو تلخابۂ توارد سے
غزل کو خوگر تعقید کرنے والا تھا

وہ ہم پیالہ بھی تھا خواجہ تاش بھی کاوش
جو بات بات پہ تردید کرنے والا تھا

شمارہ ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

دوست جتنے بھی تھے مزار میں ہیں
غالباً میرے انتظار میں ہیں

وہ نہ ہوتے مرا وجود نہ تھا
میں نہ ہوتا وہ کس شمار میں ہیں

شاخ ادراک میں جو کانٹے ہیں
پھول بننے کے انتظار میں ہیں

کیا سبب ہے کہ ایک موسم میں
کچھ خزاں میں ہیں کچھ بہار میں ہیں

ایک شاعر بنا خدائے سخن
جو رسول سخن تھے غار میں ہیں

خار سمجھو نہ تم انھیں ہر گز
سانپ کے دانت گل کے ہار میں ہیں

شمر و فرعون کب ہوئے مرحوم
ان کے اوصاف رشتہ دار میں ہیں

سب کے سب کاوش فرشتہ خصال
عیب جتنے ہیں خاکسار میں ہیں

کاوش بدری

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

رات بھی ہم نے رو رو کاٹی دن بھی سو کے خراب کیا
کھلنے والی آنکھوں کو بھی عمداً محو خواب کیا

ایک ہی روٹی کو دھو دھو کر پیتے رہے ہم شام و سحر
ساری عمر میں شاید ہم نے ایک ہی کار ثواب کیا

رزق تو ہے مقسوم ہمارا اس کو دعا کی حاجت کیوں
ڈھانک کے چہرہ دست دعا سے ہم نے خود سے خطاب کیا

اس کی نظر سے تیر جو نکلا ٹھیک نشانے پر بیٹھا
گھائل آہو بن کر ہم نے بن بن کو شاداب کیا

اشک بہا دینے کے ہنر میں ثانی اس کا کوئی نہیں
اک دن ہنستے ہنستے اس نے سب کو تہ سیلاب کیا

بچپن میں دیکھا تھا ہم نے ماں کا چہرہ یاد نہیں
بوعلی سینا بن کر ہم نے اس کے رخ کو کتاب کیا

اہل ظاہر نے جب جھانکا اہل باطن کے اندر
دل کو جلا کے کباب کیا اور خوں کو شراب ناب کیا

دل کے نہاں خانے سے گذرا جوں ہی تخت رب علا
کوکب عرفاں کو ہم نے بھی شمع کف محراب کیا

ربط ہے بس آفاق سے ہم کو انفس سے کیا لینا ہے
روح کو ہم نے غذا بخشی ہے جسم کو نذر عذاب کیا

دشمن کے دوزخ میں گھر کر ہم جو غازی کہلائے
جنت کے باسی نے ہم کو کیا جھک جھک آداب کیا

''شاعر''اور''شب خون'' سے لے کر جملہ رسائل والوں نے
قاری کو رستم تو کیا کب سامع کو سہراب کیا؟

ہیرا من کا طوطا کاوش من کے پنجرے سے بولا
بحر رحمت میں تو کھڑے ہو دل کو کہاں غرقاب کیا

قرض

کرشن بلدیو وید

شمارہ ۱۴۹،
مارچ تا مئی 1988

گلی کے کنارے دیوار میں دھنسی ایک پان کی دکان۔ بوڑھا پان والا شام کے انتظار میں اونگھ رہا ہے۔ کڑکتی دھوپ دکان کے پاس دیوار سے چپکے سوکھے سائے میں ایک ٹوٹی کرسی پر بیٹھے جھکے وہ اخبار دیکھ رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح میں کچھ فاصلے پر رک جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں وہیں سے لوٹ جاؤں۔ اب کی بار بہت دنوں بعد ادھر گیا ہوں۔ میں جاکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مجرم۔ ان کے جوتے۔ کانپتے ہوئے ہاتھ اور سر۔ سوکھی روئی۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ لمحے دیکھتے رہتے ہیں۔ خالی آنکھیں۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے اٹھتے ہیں۔ اخبار نیچے سرک جاتا ہے۔ کرسی کی چرمراہٹ۔ اور شاید ان کے گھٹنوں کی۔ اخبار اٹھا کر دکان کے پھٹے پر رکھ دیتا ہوں۔ پان والا آنکھ جھپکتا ہے۔ پھر واپس اپنی اونگھ میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ اب بھی یہیں سے واپس لوٹ سکتا ہوں۔ کچھ بڑبڑا کر۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں جیب سے ہاتھ نکال لیتا ہوں۔ ابھی نہیں۔ پھر ان کے ساتھ چل دیتا ہوں۔ گھر کی طرف۔ مجرم۔

ماں ایک کونے میں بیٹھی ہے۔ بدبدا رہی ہے۔ اکیلی، ہمیشہ کی طرح۔ پتا جھک کر اسے کندھے سے ہلاتے ہیں۔ دیکھ کون آیا ہے! ان کی آواز میں اس ماتمی ماحول کو دور کرنے کی ایک کمزوری کوشش ہے۔ ماں قریب قریب اندھی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ بوڑھی بھکارن۔ میں ایک بے ترتیب بستر پر بیٹھ جاتا ہوں مجرم۔ بڑھاپے اور بیماری کی بو۔ ماں کراہتی ہوئی میرے پاس آتی ہے۔ میں سر جھکا لیتا ہوں۔ لاشیں۔ کچھ کہنا چاہیے۔ کچھ بھی۔ وہ جھک کر مجھے پیار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی کی روں روں۔ میرے ہونٹ بھنچ جاتے ہیں۔ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب بیٹھ بھی جا! پتا چلاتے ہیں۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ دوسری چارپائی پر بیٹھ چکے ہیں۔ سر کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ڈر ہے۔ جیسے مجھ سے معافی مانگ رہے ہوں۔ ہمیشہ کی طرح۔ میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ سر جھکا لیتا ہوں۔ ماں میرے ساتھ سٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ میں ذرا پرے سرک جاتا ہوں۔ وہ پاس سرک آتی ہے۔ اب پلو سے مجھے ہوا کر رہی ہے۔ پتا کھسیا کر ہنستے ہیں۔ پھر ہنسی کو کھانسی میں چھپا لیتے ہیں۔ میری نظریں سامنے کے کونے پر جم جاتی ہیں۔ ماں کا ایک ہاتھ میری پیٹھ تھپک رہا ہے۔ جھوٹے برتن۔ پھٹے جوتے۔ بالوں کے گچھے۔ ایک ٹیڑھی کرسی۔ جگہ جگہ ٹنگے ہوئے میلے کپڑے۔ لاشوں کے سا کھتے چیتھڑوں سے۔ ماں آنکھیں پونچھ رہی ہے۔ میں آنکھیں جھکا لیتا ہوں۔ مجرم۔

ماں کو بھوک نہیں لگتی۔ کھٹے ڈکار آتے ہیں۔ کچھ ہضم نہیں ہوتا۔ اس کے پاس ڈھنگ کا کوئی کپڑا نہیں۔ اسے نیند نہیں آتی۔ دن بھر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ڈولتی رہتی ہے۔ کوئی اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔ موت بھی تو نہیں آتی اسے۔ میری راہ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پک جاتی ہیں۔ اور میں جب سے آیا ہوں بیٹھا ہوں۔ اس کی مرادیں کب پوری ہوں گی! اس کے باپو کہا کرتے تھے، تیرا بیٹا تیری مرادیں پوری کرے گا۔ اچھا، جو بھگوان کی مرضی۔

اپنا اپنا نصیب ہے۔ کرموں کا پھل! وہ سارا سارا دن پان کی دکان پر بیٹھے رہتے ہیں۔ چھوٹا صبح نکلتا ہے، رات کو لوٹتا ہے۔ لڑکی کو اپنے گھومنے سے ہی فرصت نہیں۔ وہ بھی اپنے گھر بسی رہتی تو اس کا دکھ تو نہ دکھائی دیتا۔ اچھا، جو بھگوان کی مرضی! کس سے شکایت کریں، کسے اپنا دکھڑا

سنائیں، کوئی اس کی سنتا نہیں! میں اپنی بیوی کا غلام ہوں۔ مہینہ مہینہ گذر جاتا ہے ان کی خبر تک نہیں لیتا۔ پوتیوں کے لئے اس کی آنکھیں ترس گئی ہیں۔ بوڑھا شریر، کسی دن بیٹھے بیٹھے پران نکل جائیں گے اور کسی کو پتہ تک نہیں چلے گا۔ ٹھیک ہے جو بھگوان کی مرضی!

میں غصے، بے بسی اور بیزاری سے پھولتا جا رہا ہوں۔ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہوں۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پتا نظر نہیں ملاتے۔ شاید وہ بھی ماں کی شکایت سے متفق ہیں۔ میں ان کی کسی شکایت کو دور نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہوں۔ نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہوں۔ پسیجنے کے بجائے نفرت سے بھر جاتا ہوں۔ پتا میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ڈر ہے۔ مجھے ان کے ڈر پر بہت غصہ آ رہا ہے۔ میں آنکھیں جھکا لیتا ہوں۔ مجرم۔

ساتھ والوں کی ایک گندی سی بچی دروازے میں کھڑی انگوٹھا چوس رہی ہے۔ پتا اسے پاس بلا لیتے ہیں۔ دیکھ منو آئی ہے۔ منی کو ماں کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔ ماں ناک سکوڑ لیتی ہے۔ آئی ہے تو میں کیا کروں؟ اپنی پوتیوں کی شکل کے لئے ترس گئی ہوں۔ بیٹا، مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ بڑھاپے میں اگر بڑا بیٹا ماں باپ کی سیوا نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟ لیکن تیرا بھی کوئی دوش نہیں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ ساری عمر... اور پھر ماں پھپھکنا شروع کر دیتی ہے۔

منو سہمی ہوئی سی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ پتا چلا اٹھتے ہیں: اب چپ بھی کروگی؟ میں ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ نظر نہیں ملاتے۔ انھیں بھی وہ سب شکایتیں ہیں جو ماں کو ہیں۔ کہتے نہیں۔ مجھے ان کی خاموشی پر بھی غصہ آتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اندھیرے میں ماں کی رریاہٹ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ چھوٹا بھائی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرانا چاہتا ہوں لیکن وہ آنکھ نہیں ملاتا۔ اسے بھی شاید وہی سب شکایتیں ہیں جو ماں کو ہیں۔ میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔ مجرم مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ چھوٹے بھائی کے آ جانے سے تناؤ میں ایک اور رنگ مل گیا ہے۔

سامنے ایک ننگی الماری میں چھوٹے کی اکھڑی اکھڑی کتابوں کے بیچ میری ایک پرانی تصویر رکھی پڑی ہے۔ شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ کبھی پتا یا چھوٹے نے کسی بات پر بے قابو ہو کر اسے فرش پر پٹک دیا ہوگا۔ میری نظریں اپنے اس چور چور چہرے پر جم جاتی ہیں۔ اپنے آپ پر بھرپور دیا آتی ہے پھر اس دیا پر غصہ۔

دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔ وہاں بہن کی سوکھی کایا دکھائی دیتی ہے۔ جا رہے ہو، وہ پوچھتی ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں۔ ماں اٹھ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر تو اور بیٹھو، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں۔ پتا میرے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں آنکھیں بند کر کے ان کا چہرہ دیکھتا ہوں۔ بچیاں تو ٹھیک ہیں؟ بہن پوچھتی ہے۔ بڑی آئی بچیوں کی خیر خواہ، ماں بول اٹھتی ہے۔ بہن ایک لمبی سانس لیتی ہوئی میری طرف دیکھتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو۔ دیکھا میری کیا درگت ہوتی ہے یہاں۔ میں نظریں جھکا لیتا ہوں۔ مجرم۔

پھر ایک جھٹکے سے میں دروازے سے باہر نکل جاتا ہوں۔ ماں یوں رونا شروع کر دیتی ہے جیسے کوئی اسے ہلاک کر رہا ہو۔ پتا کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس ہوتا ہے۔ مڑ کر دیکھتا ہوں۔ ان کا پچکا ہوا بوڑھا چہرہ مل رہا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ڈر ہے۔ وہ ماں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ میں جانے سے پہلے ماں کو کوئی تسلی دیتا جاؤں۔ ماں دہلیز پر گری ہوئی سی کرلا رہی ہے۔ میں مڑ کر ماں کے پاؤں کی طرف جھک جاتا ہوں۔ وہ اسی طرح کرلاتی رہتی ہے۔ میں سیدھا ہو کر پتا کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ نظر نہیں ملاتے۔ میں دوڑ کر گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔

کچھ قدموں کی دوری سے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ پتا سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ میری چال دھیمی ہو جاتی ہے۔ پان کی دکان تک پہنچتے پہنچتے وہ میرے ساتھ آ ملتے ہیں۔ رک کر جیب سے کچھ مڑے تڑے نوٹ نکال لیتا ہوں۔ پتا کے ہاتھوں میں وہ نوٹ تھماتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا نہیں۔ وہ خاموش ہیں۔ پان والا ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں جھک کر پتا کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ اور پھر ان سے نظر ملائے بغیر سڑک کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ تیز تیز لڑکھڑاتا ہوا سا۔ مجرم سڑک پر دھوپ اب بھی کڑک رہی ہے۔

مل آئے؟ بیوی پوچھتی ہے۔ ہاں، میں جواب دیتا ہوں۔ کیسے تھے، وہ پوچھتی ہے۔ ٹھیک تھے، میں جواب دیتا ہوں۔ کیا باتیں ہوئیں، وہ پوچھتی ہے۔ کوئی خاص نہیں، میں جواب دیتا ہوں۔ کچھ کہتے تھے، وہ پوچھتی ہے۔ نہیں، میں جواب دیتا ہوں۔ صحت کیسی تھی، وہ پوچھتی ہے۔ ٹھیک تھی، میں جواب دیتا ہوں۔ اداس تھے، وہ پوچھتی ہے۔ نہیں، میں جواب دیتا ہوں۔ کتنے پیسے دیئے، وہ پوچھتی ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں۔ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا، وہ پوچھتی ہے۔ نہیں، میں جواب دیتا ہوں۔ تو چپ کیوں ہو، وہ پوچھتی ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں۔ جب وہاں سے لوٹتے ہو، اسی طرح چپ گڑپ لوٹتے ہو، وہ کہتی ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں اور اس کی طرف یوں دیکھتا ہوں جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ کتنی بار کہا ہے، اس سے، چھ تو جایا ہی نہ کرو، ڈاک سے بھی تو بھیجے جا سکتے ہیں پیسے، وہ کہتی ہے۔ میں دانت پیس کر کہتا ہوں... اب چپ بھی کروگی!

ہمارے پاس بیٹھی بچیاں میری آواز سے سہم جاتی ہیں ☆☆☆

غلام حسین ساجد

آئندہ

(مجموعۂ کلام)

قیمت : ۲۰۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

گودو کے انتظار میں

سیموئل بیکیٹ، ترجمہ: کرشن چندر

شمارہ ۳۶،
مئی ۱۹۶۹

پہلا ایکٹ

گاؤں کا ایک کچا راستہ۔
راستے پر صرف ایک پیڑ لنڈ منڈ کھڑا ہے۔
شام ہونے والی ہے۔

سنسان راستے کے قریب ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کاشی ناتھ بیٹھا ہے۔ میلا کچیلا لباس۔ پاؤں میں پرانے لانگ بوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر فیلٹ کیپ پہنے ہوئے ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لانگ بوٹ اتارنے کی کوشش کرتے کرتے ہانپ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے۔ پھر شروع ہو جاتا ہے، پتلون کے پائینچے اوپر چڑھانے لگتا ہے۔

عبدالشکور داخل ہوتا ہے۔ پرانی میلی لمبی لنگی یا شلوار، پھٹی قمیص جس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ سر پہ بے حد میلی کچیلی ترکی ٹوپی جس کا پھندنا غائب ہے۔

کاشی ناتھ:

(مایوس ہو کر) اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

عبدالشکور:

یہی میرا بھی خیال ہے... (ٹانگیں پھیلا کر میکانکی انداز میں چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتے ہوئے جیسے اس کے پاؤں لکڑی کے بنے ہوں) اور اب میں نے کم و بیش اسی طرح سوچنا شروع کر دیا ہے... ساری زندگی میں نے اس خیال سے لڑنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

شکورا:

یہ کہہ کر کہ عبدالشکور گھبراؤ نہیں۔ ابھی تم نے سارے حربے آزمائے نہیں ہیں۔ یہی کہہ کر... اپنے آپ سے کہہ کر... میں نے اپنی جدوجہد پھر سے شروع کر دی۔

(عبدالشکور کھڑا کھڑا سوچنے لگتا ہے، جیسے اپنی زندگی کی ناکام جدوجہد پر غور کر رہا ہو۔ پھر کاشی ناتھ سے کہتا ہے)

شکورا:

تم پھر آ گئے نتھو!

نتھو:

کیا واقعی؟

شکورا:

مجھے خوشی ہے کہ تم واپس آ گئے... میرا خیال تھا کہ تم ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہو۔

نتھو:

میں نے بھی یہی سوچا تھا شکورے۔

شکورا:

کاشی ناتھ اور عبدالشکور پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں... اس کا جشن منانا چاہئے... مگر کس طرح (سوچتا ہے) کھڑے ہو جاؤ... تو میں تمہیں گلے سے لگا لوں۔

نتھو:

ذرا ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔ یہ جوتا نکال لوں۔ (نتھو جوتا پاؤں سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کرتا ہے)

شکورا:

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حضور پرنور نے رات کہاں کاٹی؟

نتھو: اس کھڈ میں۔

شکورا:

اوران لوگوں نے تمھیں پیٹا نہیں؟

نتھو:

پیٹا؟...(وقفہ) کیوں نہیں پیٹا۔ ضرور پیٹا... کھڈ میں گرے ہوئے شخص کو پیٹا جاتا ہے۔ شکورے...

شکورا:

یعنی کہ تمھارے ساتھ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔

نتھو:

یہ تو میں کہہ نہیں سکتا...

شکورا:

جب میں سوچتا ہوں... ان تمام سالوں میں... میرے بغیر تم کیا ہوتے؟ میرے بغیر... بس ہڈیوں کا ایک حقیر ڈھانچہ... مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ یعنی۔

نتھو:

یعنی ہوتا بھی تو کیا ہوتا۔

شکورا:

تم ٹھیک کہتے ہو نتھو۔ مگر یہ ایک... اکیلے آدمی کے لئے بہت ہے۔

(نتھو اداس ہونے لگتا ہے)

شکورا:

خیر، اب زیادہ سوچنے اور دل میلا کرنے سے بھی کیا ہوگا... مگر ہمیں اس وقت ضرور سوچنا چاہئے تھا جب دنیا جوان تھی اور کلیاں کچی تھیں۔

نتھو:

(ذرا تنگ کر) اب یہ بک بک بند کرو اور جوتا کھینچنے میں میری مدد کرو۔

شکورا:

تمھیں وہ دن یاد ہے جب ہم اور تم قطب مینار کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے (اداس ہو جاتا ہے)۔ اب وہ ہمیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ وہ اوپر والے۔ ہمیں کبھی اوپر جانے نہیں دیں گے مینار پر۔ (وقفہ) کیا کر رہے ہو؟

نتھو:

دیکھتے نہیں ہو۔ جوتے اتار رہا ہوں... کیا ایسا واقعہ تمھارے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔

شکورا:

جوتے تو روز اتارے جاتے ہیں۔ اور میں تمھیں بتا بتا تھک گیا ہوں... آخر تم چنتے کیوں نہیں ہو۔ نتھو۔

نتھو:

بھائی شکورے میری مدد کرو۔

شکورا:

درد ہوتا ہے؟

نتھو:

درد؟... (حاضرین کی طرف دیکھ کر) یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کیا واقعی درد ہوتا ہے؟

شکورا:

تم سمجھتے ہو جیسے تمھارے سوا کسی اور کو درد نہیں ہوتا... تمھیں میرا ذرا بھی خیال نہیں... جو تکلیف مجھے ہے وہ اگر تمھیں ہو جائے۔ تو میں دیکھوں تم کیسے چیختے ہو؟

نتھو:

کیا بہت درد ہوتا ہے؟

شکورا:

درد... (حاضرین سے مخاطب ہو کر) یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کیا واقعی مجھے درد ہوتا ہے۔ (جھک کر کاشی ناتھ سے) زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کبھی غافل نہ رہو۔

نتھو:

تمھارے ساتھ یہی ہوگا کیوں کہ تم آخری لمحے تک انتظار کرتے ہو۔

شکورا:

(سوچتے ہوئے) آخری لمحے تک! کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ امیدوں کی پسپائی ہمیں بیمار بنا دیتی ہے۔ مگر کس نے کہا ہے؟

نتھو:

تو تم میری مدد نہیں کرو گے۔

شکورا:

لو وہ دورہ سا پھر پڑنے لگا... (لڑکھڑاتا ہے) میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں۔ (رک کر اپنی ٹوپی اتارتا ہے۔ اس کے اندر دیکھتا ہے۔ اسے پھلا کر پھر پہن لیتا ہے۔) کیا کیوں اطمینان سا ہوا ہے؟۔ یا دھچکا سا لگا ہے...؟ (پھر ٹوپی اتار کے اس کے اندر جھانکتا ہے) حیرت ہے۔ (ٹوپی کے اوپر سے ایک خیالی مکھی اڑاتا ہے) اب کچھ نہیں ہو سکتا (دونوں ہاتھوں سے ٹوپی کو پچکاتا ہے) کچھ نہیں ہو سکتا...

(اسی اثنا میں کاشی ناتھ نے پورا زور لگا کر جوتا اتار دیا ہے۔ ایک پاؤں سے۔ اور اب وہ جوتے کے اندر دیکھتا ہے۔ جوتے کو الٹا کرتا ہے اسے زور سے جھاڑتا ہے۔ پھر زمین پر دیکھتا ہے کہ جوتے کے اندر سے کچھ باہر گرا تو نہیں۔ پھر اندر دیکھتا ہے۔ پھر سامنے خلا میں ناامید ہو کر گھورتا ہے۔)

شکورا:

کیا ملا؟

نتھو:

کچھ نہیں۔

شکورا:

دکھاؤ!

نتھو:

کچھ ہو تو دکھاؤں۔

شکورا:

یعنی میری ٹوپی اور تمھارا جوتا دونوں خالی۔ جوتا پھر پہن کر دیکھو۔

نتھو:

ذرا اسے ہوا لگنے دو۔

شکورا:

عجیب آدمی ہے۔ قصور اس کے پاؤں کا ہے الزام اپنے جوتے کو دیتا ہے۔

(اپنی ٹوپی اتار کر اس کے اندر دیکھتا ہے، ہات اندر ڈال کے دیکھتا ہے، ٹوپی کو جوتے کی طرح جھاڑتا ہے۔ ٹوپی کے اندر اپنا سانس پھونکتا ہے۔ جب کچھ ہاتھ نہیں آتا تو مایوس ہو کر ہونٹ بچکا کر اسے پھر سر پر رکھ لیتا ہے۔)

شکورا:

عجیب دہشت ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ صرف ایک چور بچایا جا سکا نتھو!

نتھو:

کیا ہے؟

شکورا:

آؤ عبرت پکڑیں۔

نتھو:

کیا پکڑیں؟

شکورا:

عبرت!

نتھو:

کیوں؟

شکورا:

اس لئے کہ ہم پیدا کیوں ہوئے۔

(شکورا زور سے ہنستا ہے۔ فوراً ہی ہنسنا بند کر کے پیٹ پکڑ لیتا ہے اور نتھو سے کہتا ہے)

شکورا:

معلوم ہے آج کل ہنسنا بھی منع ہے۔

نتھو:

بڑی مصیبت ہے۔

شکورا:

اس لئے صرف مسکرا سکتے ہیں (ہونٹ بند کر کے مگر انھیں پوری طرح پھیلا کر، مسکراتا ہے۔ ایک لمبی مسکراہٹ، پھر یکا یک مسکراہٹ بند کر کے کہتا ہے)

شکورا:

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی... (وقفہ) نتھو!

نتھو:

کیا ہے؟

شکورا:

تم نے پران پڑھا ہے؟

نتھو:

تم نے قران پڑھا ہے؟

شکورا: نہیں۔

نتھو:

نہیں... میں نے صرف ہندوستان کا نقشہ دیکھا ہے۔ اس کے تین طرف سمندر ہے۔ نیلا نیلا سمندر جسے دیکھتے ہی پیاس لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس میں چھلانگ لگا کر تیرنے لگوں... سمندر میں ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔ یا مچھلیاں ہماری دعوت کیا کریں گی!

شکورا:

کیا تخیل پایا ہے۔ تمھیں شعر کہنے چاہئیں۔

نتھو:

شعر ہی تو کہتا تھا (اپنی پھٹی قمیص دکھا کر) جب ہی تو یہ حالت ہوئی ہے!

شکورا:

میں کیا کہہ رہا تھا؟ تمھارا پاؤں کیسا ہے؟ (کہہ کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔)

نتھو:

سوچ رہا ہے۔

شکورا:

(یکا یک) ہاں یاد آ گیا۔ وہ دو چوروں کا قصہ۔ تمھیں وہ کہانی یاد ہے؟

نتھو:

نہیں۔

شکورا:

سناؤں؟

نتھو:

نہیں۔

شکورا:

وقت کٹ جائے گا۔ اس لئے سناتا ہوں۔ سنو۔ دو چور تھے۔ ان دونوں کو منصور کے ساتھ سولی پر چڑھایا گیا تھا۔

نتھو:

کون منصور؟

شکورا:

جس نے اناالحق کا نعرہ لگایا تھا۔ اس کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ جن میں سے ایک جہنم واصل ہوا اور دوسرا بچالیا گیا۔

نتھو:

کس سے بچالیا گیا؟

شکورا:

جہنم میں جانے سے۔

نتھو:

میں وہیں جارہا ہوں (ایک پاؤں اٹھاتا ہے۔ پھر واپس لے آتا ہے۔)

شکورا:

لیکن اصل قصہ یہ ہے... میں امید کرتا ہوں تم دھیان سے سنو گے۔
جس وقت منصور کو سولی پر چڑھایا گیا اس وقت اس کے قریب سولی کے آس پاس چار صوفی بھی تھے۔ ان چار صوفیوں میں سے تین صوفی تو اس واقعے کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ صرف ایک صوفی چور کو بچائے جانے کی بات کرتا ہے۔ حالاں کہ دو چور تھے اور دونوں گالی دے رہے تھے۔

نتھو:

کون؟

شکورا:

(خالی الذہن ہو کر) کیا؟

نتھو:

یہ کیا گڑبڑ ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کون کس کو گالی دے رہا تھا؟

شکورا:

وہ چور، منصور کو گالی دے رہے تھے۔

نتھو:

کیوں؟

شکورا:

کیوں کہ اس نے انھیں بچانے کی کوشش نہیں کی۔

نتھو:

جہنم سے بچانے کی کوشش!

شکورا:

ارے نہیں احمق موت سے بچانے کی کوشش... موت سے۔

نتھو:

پھر کیا ہوا؟

شکورا:

تو پھر جہنم واصل ہوئے ہوں گے۔

نتھو:

اور کیوں نہ ہوتے۔ ضرور ہوئے ہوں گے۔

شکورا:

مگر صرف ایک صوفی کہتا ہے کہ صرف ایک چور بچایا گیا۔ باقی تین خاموش ہیں اس واقعے کے بارے میں۔

نتھو:

تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس معاملے میں وہ لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔

شکورا:

مگر وہاں پر چار تھے۔ اور صرف ایک۔ ایک کے بچائے جانے کی بات کرتا ہے۔ ہم اس پر یقین کیوں کریں۔ دوسروں پر کیوں نہ کریں۔

نتھو:

کون کس پر یقین کرے؟

شکورا:

ہر شخص... اس پر... کیوں کہ صرف اسی کا بیان ہم تک پہنچا ہے۔

نتھو:

بہت دلچسپ قصہ ہے... کیا ایسا اور کوئی قصہ تمھیں یاد نہیں؟

(اتنا کہہ کر نتھو ٹیلے سے اٹھتا ہے۔ اور لنگڑاتا ہوا اسٹیج کے بائیں طرف مڑ جاتا ہے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کے کنارے اسکرین بنا کر دور تک خلا میں جھانکتا ہے۔ اتنے میں شکورا نتھو کو مصروف دیکھ کر اس کا جوتا اٹھا لیتا ہے پہلے اس کے اندر جھانکتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ پھر اس کی بدبو سے متاثر ہو کر جوتے کو زمین پر گرا دیتا ہے اور تھوک کر کہتا ہے)

شکورا: تھو!

(نتھو بائیں ہاتھ سے گھوم کر اسٹیج کے مرکز میں حاضرین کی طرف پیٹھ کئے کچھ دیکھ رہا ہے حالانکہ وہاں ریتیلے ٹیلوں اور سڑے بنجر میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر نتھو ادھر دیکھ کر گہری بشاشت سے کہتا ہے)

نتھو:

خوب صورت جگہ ہے!

(پھر مڑ کر اسٹیج پر حاضرین کی طرف چل کر اگلی قطاروں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے)

نتھو:

حسین منظر ہے! (مڑ کر شکورے سے) آؤ شکورے یہاں سے چلیں۔

شکورا:

نہیں جا سکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں جا سکتے؟

شکورا:

ہم گودو کا انتظار کر رہے ہیں۔

نتھو:

ارے!... کیا یہی وہ جگہ ہے؟

شکورا:

کون سی؟

نتھو:

جہاں ہمیں اس کا انتظار کرنا تھا۔

شکورا:

اس نے کہا تھا پیڑ کے قریب میرا انتظار کرنا۔ کیا تمھیں یہاں کوئی دوسرا بھی نظر آتا ہے؟

نتھو:

یہ کون سا پیڑ ہے؟

شکورا:

معلوم نہیں۔ شاید جامن کا ہے۔

نتھو:

اس کے پتے کہاں ہیں؟

شکورا:

شاید یہ پیڑ مر چکا ہے۔

نتھو:

شاید ابھی ہرے پتوں کا موسم نہیں آیا۔

شکورا:

مجھے تو یہ ایک پیڑ نہیں جھاڑی معلوم ہوتی ہے۔

نتھو:

ایک پودا۔

شکورا:

ایک جھاڑی۔

نتھو:

پودا۔

شکورا:

جھاڑی! (وقفہ) شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم غلط جگہ پر انتظار کر رہے ہیں؟

نتھو:

اسے اب تک یہاں آجانا چاہئے۔

شکورا:

اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ ضرور ہی آئے گا۔

نتھو:

اور اگر وہ نہیں آیا؟

شکورا:

تو ہم کل پھر آئیں گے۔

نتھو:

اور پھر پرسوں؟

شکورا:

ہو سکتا ہے آنا پڑے۔

نتھو:

اور اگر پرسوں بھی وہ نہ آیا تو۔

شکورا:

تم بہت بے رحم ہو۔

نتھو:

ہم کل بھی آئے تھے۔

شکورا:

ارے نہیں۔ یہاں تم غلطی کر رہے ہو۔

نتھو:

کل ہم کیا کر رہے تھے؟

شکورا:

کل؟... ہاں کل ہم کیا کر رہے تھے؟

نتھو:

ہاں؟

شکورا:

(غصے سے) کیوں؟ مجھے کچھ کیوں نہیں یاد آتا جب تم قریب ہوتے ہو۔

نتھو:

میرے خیال میں تو ہم کل بھی یہاں آئے تھے۔

شکورا:

تم اس جگہ کو پہچانتے ہو؟

نتھو:

میں نے ایسا کب کہا؟

شکورا:

پھر؟

نتھو:

مگر اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟

شکورا:

پھر بھی غور کرو۔ یہ چٹیل میدان... یہ ایک پیڑ... (حاضرین کے قریب جا کر ان پر ایک نگاہ ڈال کر) یہاں کا پھیلا ہوا گہرا کہرا... اور یہ اتھاہ دھند...

نتھو:

کیا تمھیں یقین ہے کہ یہی شام طے تھی؟

شکورا:

کیا؟

نتھو:

یعنی کب اس شام کو انتظار کرنا تھا۔ ہمیں۔

شکورا:

میرا خیال ہے اس نے سنیچر کا وعدہ کیا تھا۔

نتھو:

تمھارا خیال ہے۔

شکورا:

میں نے کہیں پر لکھ بھی لیا تھا۔ (جیب سے بہت سے کاغذ کے پرزے نکالتا ہے جو ادھر ادھر اڑنے لگتے ہیں۔ کاغذ کے پرزے اور بہت سی الا بلا بے کار چیزیں جیب سے نکل آتی ہیں۔ مگر وہ پرزہ نہیں ملتا۔ (گھبرا کر کہتا ہے)... مگر کون سا سنیچر؟ اور کیا آج سنیچر ہے؟ کہیں اتوار تو نہیں؟ ممکن ہے منگل ہو۔ یا بدھ (گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہے) آج کون سا دن ہے؟

نتھو:

سوموار بھی ہو سکتا ہے۔

شکورا:

اب ہم کیا کریں؟

نتھو:

یعنی اگر وہ کل آیا تھا اور ہم یہاں پر نہیں تھے تو وہ آج نہیں آئے گا۔

شکورا:

مگر ہم کل یہاں پر آئے تھے؟

نتھو:

کہ نہیں آئے تھے...؟

شکورا:

ایک منٹ کے لئے چپ ہو جاؤ۔

نتھو:

بہت اچھا...

(اتنا کہہ کر نتھو ٹیلے پر بیٹھ جاتا ہے۔ شکورا پریشان ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹہلنے لگتا ہے۔ اتنے میں نتھو بیٹھے بیٹھے سو جاتا ہے۔ شکورا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

شکورا:

نتھو!... نتھو!!... نتھو!!!

نتھو:

(چونک کر) ایں؟ میں سو رہا تھا... کیوں تم نے مجھے جگا دیا۔ تم مجھے کبھی نہیں سونے دیتے۔

شکورا:

تمھارے بغیر میں اکیلا پڑ گیا تھا۔

نتھو:

ابھی ابھی میں نے ایک سپنا دیکھا۔

شکورا:

مجھے مت بتاؤ۔

نتھو:

میں نے دیکھا کہ...

شکورا:

(چلا کر) مجھے۔ مت۔ بتاؤ!

نتھو:

ٹھیک ہے۔ (اسٹیج اور پھر حاضرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تمھارے لئے یہ خواب ہی بہت ہے۔ مگر تم زیادتی کر رہے ہو۔ شکورے میں اپنے ذاتی بھیانک سپنے اگر تم کو نہیں بتا سکتا تو پھر کس کو بتا سکتا ہوں؟

شکورا:

اپنے خوف ناک خوابوں کو اپنی ذات تک محدود رکھو میں انھیں برداشت نہیں کر سکتا (برا منھ بناتا ہے)۔

نتھو:

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

شکورا:

مجھ سے الگ ہو کر تم اس دنیا میں کسی بہتر منزل کو نہیں پاسکو گے۔

نتھو:

کتنی بری بات ہے یہ... حالاں کہ جب میں تم سے الگ ہو کے اکیلے چلتے ہوئے راستے کے حسن پر غور کرتا ہوں اور دوسرے ہم راہیوں کی نیکی پر... تو مجھے اپنی کسمت پر افسوس ہونے لگتا ہے۔

شکورا:

کسمت نہیں قسمت کہو۔ قسمت... شرفا اور اہل زبان ہمیشہ قسمت بولتے ہیں۔

نتھو:

کیا تمھیں وہ واقعہ یاد ہے جب ایک شریف انگریز بمبئی کی سیر کرتے کرتے فارس روڈ پر طوائفوں کے ایک اڈے پر پہنچ گیا تھا؟

شکورا:

جانتا ہوں۔

نتھو:

جانتے ہو تو بتاؤ۔ اب مجھے وہ واقعہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔

شکورا:

چھوڑو بھی۔

نتھو:

وہ انگریز بہت شریف تھا۔ مگر اس دن اس نے ذرا زیادہ پی لی تھی۔ طوائفوں کے اڈے کا دلال اس سے کہنے لگا۔ آپ کو کیسی چاہئے کالی۔ کہ گوری؟ کہ سانولی؟ کہ۔ بھوری؟

شکورا:

چپ ہو جاؤ...!

(شکورا بائیں طرف ونگ کی جانب بڑھتا ہے۔ نتھو حیران اور پریشان اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ شکورا ونگ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ نتھو سر کھجاتے ہوئے واپس آتا ہے۔ سٹیج کے مرکز میں دائیں ونگ سے شکورا پھر نکلتا ہے اور نتھو کو کراس کرتے ہوئے پھر بائیں ونگ کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ اتنے میں نتھو اس سے کہتا ہے)

نتھو:

تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو... (شکورا بائیں جانب ایک قدم بڑھاتا ہے) کیا کہنا چاہتے ہو شکورے؟

شکورا:

کچھ نہیں۔

نتھو:

تم خفا ہو؟ مجھ سے خفا ہو۔ تو مجھے معاف کردو۔ (نتھو آگے بڑھ کر شکورے کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ جس کی پیٹھ نتھو کی طرف ہے) اپنا ہاتھ مجھے دو شکورے۔ آؤ میرے گلے سے لگ جاؤ۔

(شکورا مڑتا ہے۔ اور نتھو سے گلے ملتا ہے۔ گلے ملتے ہی نتھو اس سے فوراً الگ ہو کے کہتا ہے)

نتھو:

اف۔ تمھارے منھ سے کیسی بدبو آرہی ہے؟

شکورا:

لہسن کی۔ گردوں کے لئے بہت مفید ہے (سوکھے پیڑ کی طرف دیکھ کر) اب ہمیں کیا کرنا چاہئے

نتھو:

انتظار۔

شکورا:

ہاں۔ مگر عالم انتظار میں کیا کرنا چاہئے؟

نتھو:

آؤ اس پیڑ سے پھانسی لگا کر مر جائیں۔

شکورا:

ہم۔

نتھو:

زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا۔ چلو فوراً ہی پھانسی پر چڑھ جائیں۔

شکورا:

اس پیڑ کی شاخ سے...؟ مگر بہت ہلکی اور کچی معلوم ہوتی ہے۔

نتھو:

آؤ کوشش کر کے تو دیکھیں۔

شکورا:

پہلے آپ۔

نتھو:

پہلے آپ۔

شکورا:

نہیں۔ نہیں۔ پہلے آپ۔

نتھو:

پہلے میں کیوں...؟

شکورا:

تم وزن میں مجھ سے ہلکے ہو۔

نتھو:

تو؟

شکورا:

میں سمجھا نہیں۔

نتھو:

ذرا اپنی عقل پر زور دو۔

شکورا:

دیا...مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

نتھو: معاملہ یوں ہے۔ سمجھو کہ۔ یہ شاخ...یعنی کہ یہ ڈالی۔ دماغ پر زور ڈالو...

شکورا:

اس سے زیادہ زور نہیں ڈال سکتا۔ اب تو میری ساری امیدیں تم سے ہیں۔

نتھو:

نتھو ہلکا...شاخ نہ ٹوٹے...نتھو مر جائے۔ شکورا بھاری۔ شاخ ٹوٹ جائے...شکورا اکیلا رہ جائے...دوسری طرف...

شکورا:

ارے! یوں میں نے سوچا نہ تھا۔

نتھو:

دوسری طرف اگر یہ شاخ تمھیں پھانسی پر چڑھا سکتی ہے۔ تو مجھے بھی۔

شکورا:

لیکن میرا وزن واقعی تم سے زیادہ ہے۔

نتھو:

یہ تم ہی نے مجھے بتایا ہے۔ میں کیا جانوں...ممکن ہے ہم برابر ہوں...یا تقریباً ایک سے...کون کہہ سکتا ہے؟

شکورا:

اچھا تو پھر ہم کیا کریں؟

نتھو:

کچھ بھی نہ کریں۔ یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

شکورا:

یعنی انتظار کریں اور دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔

نتھو:

وہ کون؟

شکورا:

گودو۔

نتھو:

نیک خیال ہے۔

شکورا:

اور دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

نتھو:

یعنی تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں۔

شکورا:

ہم دیکھیں گے وہ ہمیں کیا پیش کرتا ہے۔ پھر یا تو اسے قبول کر لیں گے یا انکار کر دیں گے۔

نتھو:

مگر ہم نے اس سے کہا کیا تھا؟

شکورا:

کیا تم اس وقت موجود نہیں تھے۔

نتھو:

تھا تو۔ مگر شاید ٹھیک سے سن نہیں رہا تھا۔

شکورا:

کوئی خاص بات تو کہی نہیں تھی۔

نتھو:

گویا ایک طرح کی پرارتھنا...

شکورا:

تقریباً۔

نتھو:

یعنی ایک طرح کی التجا۔

شکورا:

بالکل!

نتھو:

پھر اس نے کیا جواب دیا تھا؟

شکورا:

اس نے کہا تھا میں دیکھوں گا...

نتھو:

...ٹھیک سے وعدہ نہیں کر سکتا۔

شکورا:

..غور کروں گا۔

نتھو:

اپنے گھر کی خاموشی میں۔ اپنے کمرے کی چار دیواری میں۔

شکورا:
اپنی فیملی سے پوچھوں گا۔
نتھو:
اپنے دوستوں سے۔
شکورا:
اپنے ایجنٹوں سے۔
نتھو:
اپنی کتابوں سے۔
شکورا:
اپنے بنک اکاؤنٹ سے۔
نتھو:
سب کچھ دیکھ کر ہی...
شکورا:
...کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں! ایسا اس نے کہا تھا۔
نتھو:
ہاں اس کی سطح پر رہنے والے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔
شکورا:
کرتے ہیں نا!
نتھو:
بالکل۔
شکورا:
بلاشبہ۔
نتھو:
تو پھر ہم...
شکورا:
کیا مطلب؟
نتھو:
میں نے کہا تو پھر ہم۔
شکورا:
میں سمجھا نہیں۔
نتھو:
ہم اس بیچ کہاں پر آتے ہیں؟
شکورا:
آتے ہیں؟

نتھو:
سوچنے کے لئے وقت لے لو۔
شکورا:
آتے ہیں؟ (ہنستا ہے) اپنے گھٹنوں پر دوزانو ہو کر آتے ہیں اس کے سامنے!
نتھو:
یعنی ہم اس حالت کو پہنچ چکے ہیں۔
شکورا:
شاید حضور پرنور بطور ایک انسان کے اپنا حق جتانا چاہتے ہیں۔
نتھو:
اب ہمارے حق کہاں رہے ہیں؟
شکورا:
حق؟ اگر ہنسنے پر پرابلم نہ ہوتی تو میں ضرور اس وقت ہنسنے کی کوشش کرتا۔
نتھو:
تم ٹھیک کہتے ہو ہم نے اپنے حق کھو دیئے ہیں۔
شکورا:
کھو نہیں دیئے چھوڑ دیئے۔
(وہ دونوں بت کی طرح چند ثانیے کھڑے رہتے ہیں،
ہاتھ جھولتے ہوئے گھٹنے جھکتے ہوئے)
نتھو:
مگر ہم بندھے ہوئے نہیں ہیں... ہم کسی کے غلام۔
شکورا:
(ہات اٹھا کر) ذرا سنو (وہ دونوں پتھر کی طرح جامد ہو کر سنتے ہیں۔)
نتھو:
کوئی نہیں ہے۔
شکورا: شش۔ شش... (وہ دونوں سنتے ہیں۔ نتھو کا توازن بگڑ جاتا ہے... گرتے گرتے شکورے کا سہارا لیتا ہے۔ دونوں گر جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لگے ہوئے سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر شکورا کہتا ہے)
شکورا:
کوئی آواز نہیں... (دونوں اٹھ جاتے ہیں۔)
نتھو:
تم نے مجھے ڈرایا۔
شکورا:
میں سمجھا وہ آ گیا۔
نتھو:

کون؟
شکورا:
گودو!
نتھو:
چھی... وہ تو ہوا تھی۔ سرکنڈوں میں شور مچاتی ہوئی۔
شکورا:
میں نے شور سنا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔
نتھو:
اسے شور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
شکورا:
ممکن ہے وہ اپنے گھوڑے پر چلا آرہا ہو (خاموش وقفہ۔)
نتھو:
مجھے بھوک لگی ہے۔
شکورا:
گاجر کھاؤ گے؟
نتھو:
کیا بس۔ یہی کچھ...؟
شکورا: نہیں کچھ شلغم بھی ہیں۔
نتھو:
مجھے ایک گاجر دو۔

(شکورا جیب سے ایک شلغم نکالتا ہے۔)

نتھو:
مگر یہ تو شلغم ہے۔
شکورا:
معاف کرنا میں نے سمجھا گاجر ہے... (جیب ٹٹولتا ہے) ہوگی کہیں گاجر بھی... اگر تم نے سب نہیں کھا ڈالیں... تو... لو... ایک گاجر نکل ہی آئی۔ اسے آخری سمجھ کے کھا جاؤ میرے دوست!

(گاجر سے مٹی جھاڑ کر اپنے دامن سے پونچھ کر نتھو کھاتے ہوئے کہتا ہے)

نتھو:
میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔
شکورا:
ہم۔
نتھو:
تم نے کیا جواب دیا؟
شکورا:
گاجر کیسی ہے؟
نتھو:
گاجر؟... بس گاجر ہے۔
شکورا:
بہت خوب... بہت خوب... تم نے کیا سوال کیا تھا؟
نتھو:
اب بھول گیا (گاجر نکالتا ہے) بہت بھلکڑ ہو چلا ہوں۔ مگر یہ گاجر بہت ہی عمدہ ہے۔ اسے کبھی بھول نہیں سکوں گا... ہاں اب یاد آگیا۔
شکورا:
کیا؟
نتھو:
میں نے کہا تھا ہم بندھے ہوئے نہیں ہیں۔
شکورا:
بندھے ہوئے؟
نتھو:
باندھے ہوئے۔
شکورا:
کس طرح کے باندھے ہوئے؟
نتھو:
نیچے بندھے ہوئے۔
شکورا:
نیچے بندھے ہوئے۔ کس کے قدموں میں...! مگر کون کس کے ساتھ؟
نتھو:
اسی کے ساتھ۔
شکورا:
گودو کے ساتھ؟ ہم گودو کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کیسی خام خیالی ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا... فی الحال... اس کا نام گودو ہے نہ؟
نتھو:
کچھ ایسا خیال ہے میرا۔
شکورا:
عجیب نام ہے... (گاجر کھا چکا ہے اب پتوں والا آخری حصہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہتا ہے)

نتھو:

عجیب بات ہے۔ جتنا اسے کھاؤ اتنا ہی اس کا مزا برا ہوتا جاتا ہے۔

شکورا:

میرے ساتھ اس کا الٹ ہوتا ہے۔

نتھو:

یعنی؟

شکورا:

میں زمانے کے ساتھ ساتھ غلط چیزوں کو بھی برداشت کر لیتا ہوں۔

نتھو:

یہ الٹا کیسے ہوا؟

شکورا:

اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

نتھو:

یا کردار کی۔

شکورا:

تم کچھ کہہ نہیں سکتے اس کے متعلق۔

نتھو:

جدوجہد فضول ہے۔

شکورا:

آدمی جو ہے سو ہے۔

نتھو:

نکل بھاگنے کی کوشش بے کار۔

شکورا:

بنیادی باتیں بدلا نہیں کرتیں۔

نتھو: (آہ بھر کر) کچھ نہیں ہو سکتا۔ (گاجر کا ٹکڑا شکورے کو پیش کرتے ہوئے) باقی تم کھا لو۔

(ایک دردناک چیخ کہیں قریب سے سنائی دیتی ہے نتھو کے ہاتھ سے گاجر گر جاتی ہے۔ چند ثانیے وہ دونوں بت کی طرح جامد کھڑے رہتے ہیں۔ پھر یک لخت ونگ کی طرف بھاگتے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے نتھو کو کچھ یاد آتا ہے۔ وہ پلٹ کر گاجر اٹھا کر جیب میں رکھتا ہے۔ شکورا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ شکورے کے قریب جا کر پھر اسے کچھ یاد آتا ہے۔ پھر پلٹ کر جاتا ہے اور ہاتھ میں اپنے لانگ بوٹ لے کر شکورے کے پاس پہنچتا ہے۔ اب وہ دونوں ونگ سے ذرا فاصلے پر ایک دوسرے سے لگے خوف زدہ کھڑے ہیں۔

(پہلے سوبھاگا داخل ہوتا ہے۔ اس کے گلے میں رسی ہے اور اس میں ایک مضبوط گرہ لگی ہوئی ہے۔ رسی تنی ہوئی ہے اور اسٹیج پر بڑھتی چلی آتی ہے۔ جب سوبھاگا اسٹیج کے مرکز میں پہنچ جاتا ہے تو اسی کا دوسرا سرا ہاتھ میں لئے بودو داخل ہوتا ہے۔ بودو کے ہاتھ میں چابک ہے۔ جب بودو اسٹیج پر آتا ہے۔ اس وقت تک سوبھاگا اسٹیج سے چل کر دوسرے ونگ میں غائب ہو چکا ہے۔ مگر رسی ابھی تک تنی ہوئی ہے۔ بودو، نتھو اور شکورے کو دیکھ کر رک جاتا ہے۔ چابک کو زمین پر مار کر اور رسے کو اپنی طرف کھینچ کر چلاتا ہے)

بودو:

پلٹ!

(رسہ کھینچتے ہی ونگ میں کسی کے گرنے کی آواز آتی ہے۔ پھر بہت سی چیزوں کے گرنے کی، کیوں کہ سوبھاگا جب اسٹیج سے گزرا تھا تب وہ اپنے سر پر ایک لنچ باسکٹ اٹھائے ہوئے تھا، ایک تھرمس بغل میں لٹکائے ہوئے تھا، ایک ہاتھ میں ایک فولڈنگ اسٹول اٹھائے ہوئے تھا اور دوسرے کندھے پر ایک بڑا فوجی کوٹ لٹکائے ہوئے تھا۔ سوبھاگا کے گرنے کی آواز سن کر شکورے کا جی اس کی مدد کرنے کو چاہتا ہے۔ مگر نتھو اس کا دامن پکڑ لیتا ہے۔)

شکورا:

مجھے جانے دو۔ اس کی مدد کرنے دو۔

نتھو:

یہیں کھڑے رہو۔

بودو:

اس کی صلاح مان لو... وہ بہت بکٹ ہے... خاص طور پر اجنبیوں سے بہت برا سلوک کرتا ہے۔

نتھو:

(شکورے سے) یہی ہے وہ؟

شکورا:

کون؟

نتھو:

وہی۔

شکورا:

گودو؟

نتھو:

ہاں۔

بودو:

میرا نام بودو ہے۔

شکورا:

گودو نہیں۔ بودو ہے یہ۔

نتھو:

اودو؟

شکورا:

(چلا کر) ارے اودو نہیں۔ اودو نہیں۔

نتھو:

(سسکی لے کر) زیادہ چلاؤ گے تو ہم رو دیں گے۔

شکورا:

یہ گودو نہیں ہے۔ (نرمی سے) بودو ہے۔ بودو سمجھتے ہو جیسے چنا بودو سرسوں بودو۔ گھاس بودو۔ سمجھ گئے... بودو۔

نتھو:

(شکایت بھرے لہجہ میں) پہلے سے ہی اس طرح کیوں نہیں سمجھایا؟

شکورا:

میں ایک خاندان کو جانتا ہوں۔ وہ سودو کہلاتے ہیں۔ ہمیشہ سوتے رہتے ہیں۔

نتھو:

مگر ہم نہیں سوتے ہیں جناب (بودو سے مخاطب ہو کر) ہم کبھی نہیں سوتے...

بودو:

پھر بھی تم انسان تو لگتے ہو۔ (جیب سے عینک نکال کر پہنتا ہے، غور سے دیکھتا ہے) بالکل میری طرح کے انسان... انسان جسے بھگوان نے بنایا ہے (طنزیہ ہنستا ہے۔ اتنا کہہ کر بودو اپنی کھدر کی ٹوپی کا زاویہ ٹھیک کرتا ہے۔)

بودو:

مگر یہ گودو کون ہے؟

نتھو:

گودو؟

بودو:

تم نے سب سے پہلے مجھے گودو ہی سمجھا تھا۔

نتھو:

بالکل نہیں جناب۔

بودو:

کون ہے وہ؟

شکورا:

ایک جان پہچان والا۔

نتھو:

بالکل نہیں جناب ہم اسے بہت کم جانتے ہیں۔

شکورا:

ٹھیک ہے۔ ہم اسے زیادہ نہیں جانتے... پھر بھی۔

نتھو:

اس وقت وہ اگر میرے سامنے بھی آجائے تو میں اسے پہچان نہیں سکتا۔

بودو:

مگر مجھے دیکھ کر تمھیں گودو کا شبہ ہوا تھا۔

نتھو:

وہ تو جناب یہ بات تھی۔ سوچئے۔ شام کا جھٹ پٹا... کلفت... انتظار کے اس ایک لمحے میں... انتظار کی شدت میں...

بود

بودو:

گویا تم اس کا انتظار کر رہے تھے۔

شکورا:

جی ہاں۔

بودو:

یہاں...؟ میری زمین پر؟

شکورا:

ہم کسی بری نیت سے یہاں نہیں آئے تھے۔

نتھو:

سڑک پر چلنے کی آزادی تو ہر ایک کو ہے۔

شکورا:

جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

بودو:

بڑی بیہودگی ہے۔ مگر...

نتھو:

مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔

بودو:

ٹھیک ہے اسے جانے دو.. (رسی کو جھٹکا دے کر) اٹھو سور... یہ سو بھاگا ایسا کم بخت ہے کہ گرتے ہی سو جاتا ہے۔

شکورا:

سو بھاگا؟

بودو:
اس کا نام ہے۔
نتھو:
سوبھاگا؟
شکورا:
یعنی خوش قسمت؟
نتھو:
لکی۔
بودو:
ہم۔ لکی ہے؟ وری لکی۔
بودو:
اٹھ بے جوز... (رسی زور سے کھینچتا ہے) پلٹ...! (سوبھاگا ونگ سے الٹے پاؤں چلتا ہوا داخل ہوتا ہے) روکو... (سوبھاگا رک جاتا ہے) پلٹو...! (سوبھاگا پلٹتا ہے۔ بودو خوش ہو کر نتھو اور شکورے سے کہتا ہے) میں جناب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں... (شکورے سے)
بودو:
آپ کا اسم گرامی؟
شکورا:
مجھے عبدالشکور کہتے ہیں۔
بودو:
(نتھو سے) آپ کا شبھ نام؟
نتھو:
مجھے کاشی ناتھ کہتے ہیں۔
بودو:
آپ دونوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ (رسی کھینچ کر) نزدیک آؤ (سوبھاگا نزدیک آتا ہے) اور قریب آؤ (پھر رسی کھینچتا ہے۔ سوبھاگا اور قریب آجاتا ہے۔) راستہ کتنا کٹھن اور لمبا معلوم ہوتا ہے اگر ساتھ میں کوئی ہم سفر نہ ہو۔ مجھے... (اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے) مجھے چھ گھنٹے ہوگئے اس سڑک پر چلتے ہوئے۔ ایک آدمی راستے میں نہیں ملا۔ (سوبھاگا سے) میرا کوٹ دو۔ (سوبھاگا سارا سامان زمین پر رکھتا ہے اور بودو کو کوٹ دیتا ہے) اسے پکڑے رہو۔ (بودو سوبھاگا کو چابک دیتا ہے جو اسے اپنے منھ سے پکڑتا ہے۔ کیوں کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں ہیں) آج کچھ سردی سی ہے۔ (کوٹ پہنتے ہوئے) ہوا میں خنکی ہے۔ تیزی سی (کوٹ پہن کر سوبھاگا سے) اچانک... (سوبھاگا آگے بڑھتا ہے۔ بودو اس کے منھ سے چابک نکال لیتا ہے سوبھاگا واپس اپنی جگہ پر زمین پر رکھا ہوا سامان پھر اٹھا لیتا ہے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے لئے کسی ساتھی، کسی ہم سفر، کسی آدمی کے بغیر سفر کرنا بہت مشکل ہے چاہے وہ آدمی شکل ہی سے آدمی کہلائے جانے کا مستحق ہو۔ (سوبھاگا سے) اسٹول کدھر ہے؟ (اب سوبھاگا جس نے ابھی سارا سامان زمین سے اٹھا کر سر پر رکھا تھا، پھر سامان زمین پر رکھ کر اور اسٹول کو لے کر بودو کی جانب بڑھتا ہے)
بودو: قریب رکھو۔ اور قریب... نہیں۔ نہیں یہاں نہیں پیچھے... اور پیچھے... (سوبھاگا اور پیچھے جا کر اسٹول رکھتا ہے) اسی لئے میں آپ دونوں کو دیکھ کر یہاں چند گھڑیوں کے لئے رکنا چاہتا ہوں
(سوبھاگا سے) باسکٹ! (سوبھاگا باسکٹ لے کر آتا ہے۔ بودو کو دے کر واپس اپنی جگہ پر مودب کھڑا ہو جاتا ہے۔)
بودو:
نتھنے پھیلا کر) یہاں کی تازہ ہوا سے بھوک چمک اٹھتی ہے۔ (نتھو اور شکورا دونوں تھوک نگلتے ہیں۔)
بودو: اور پیچھے جاؤ۔ (برا سا منھ بنا کر) اس کے پاس سے بدبو آتی ہے... (اسٹول پر کھانا رکھ کر کھانے لگتا ہے۔ خاموشی۔ شکورے اور نتھو کے لئے اس خوش رنگ اور خوشبودار غذا کی طرف دیکھنا محال ہے۔ اس لئے وہ دونوں ادھر سے نگاہیں ہٹا کر سوبھاگا کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ بودو مرغی کھا کر ایک چھوٹی سی پلیٹ میں ذرا فاصلے پر اس کی ہڈیاں رکھتا جاتا ہے۔ سوبھاگا کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ لگتا ہے وہ گر جائے گا۔ پھر گرتے گرتے سنبھل کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کی طرح محسوس کر رہا ہے جو کھڑے کھڑے سونا چاہتا ہے۔)
نتھو:
اسے کیا تکلیف ہے؟
شکورا:
تھکا ہارا معلوم ہوتا ہے۔
نتھو:
یہ سارا سامان زمین پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے آرام کیوں نہیں کر لیتا؟
شکورا:
میں کیا جانوں؟ (وہ دونوں اس کے قریب جاتے ہیں۔)
نتھو:
کچھ کہو اس سے۔
شکورا:
یہ دیکھو۔
نتھو:
کیا؟

شکورا:

اس کی گردن پر کیا ہے؟

نتھو:

کہاں ہے؟

شکورا:

یہاں دیکھو۔

نتھو:

زخم!

شکورا:

لہو رستا ہے۔

نتھو:

رسی کی وجہ سے۔

شکورا:

رگڑ کی وجہ سے۔

نتھو:

گرہ کی وجہ سے۔

شکورا:

جلد پھٹ گئی ہے۔

نتھو:

مگر یوں دیکھنے میں بدصورت نہیں ہے۔

شکورا:

آنکھ میں آنسو ہیں۔

نتھو:

منھ سے رال ٹپکتی ہے۔

شکورا:

پاگل ہے شاید۔

نتھو:

ہانپ رہا ہے۔

شکورا:

اس کی آنکھیں دیکھو۔

نتھو:

باہر نکلی پڑتی ہیں۔

شکورا:

معلوم ہوتا ہے ابھی دم نکل جائے گا اس کا۔

نتھو:

اس سے کوئی سوال نہ کرو۔

شکورا:

کیا یہ اچھی بات ہوگی؟

نتھو:

ہمارا جاتا کیا ہے؟

شکورا:

(آہستہ سے) جناب!

نتھو:

ذرا زور سے۔

شکورا:

(بلند آواز میں) جناب!!

بودو:

کیوں اسے پریشان کرتے ہو؟ (نتھو اور شکورا دونوں بودو کی جانب مڑتے ہیں۔ بودو نے لنچ ختم کر لیا ہے اور اب وہ الٹے ہاتھ سے اپنا منھ پونچھ رہا ہے۔ چچوڑی ہوئی ہڈیاں ایک طرف پلیٹ میں پڑی ہوئی ہیں) باسکٹ اٹھاؤ... (سو بھاگا بھاگ کر باسکٹ اٹھاتا ہے۔ بودو اپنے پائپ میں تمباکو بھر کے اسے ماچس سے جلا رہا ہے۔ اب نتھو اور شکورا دونوں بھوکی نگاہوں سے بچے ہوئے لنچ کے ٹکڑوں اور ہڈیوں پر نظریں جمائے کھڑے ہیں۔ پائپ کا ایک کش لے کر بودو ایک ٹانگ سیدھی کرتا ہے، آرام کی سانس لیتا ہے۔ نتھو اس سے کہتا ہے)

نتھو:

مہربان!

بودو:

ہاں بھئی بولو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

شکورا:

یعنی کہ... یہی کہ... تم نے یعنی کہ آپ نے... آپ... مطلب یہ کہ آپ لنچ سے فارغ ہو چکے ہیں اور شاید اب ان ہڈیوں کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔

نتھو:

(شکورے سے) کیا تم میری بات ختم ہونے تک انتظار نہیں کر سکتے؟

بودو:

نہیں۔ نہیں۔ اس نے کوئی غلط بات بھی نہیں کہی... سوال یہ ہے کیا مجھے ان ہڈیوں کی ضرورت ہے اور نہ ان روٹی کے ٹکڑوں کی اور نہ اس بچے کھچے سالن کی (بودو چابک سے باقی ماندہ لنچ کو الٹ پلٹ کر کے یہ بات کہتا ہے۔ اس کی بات سن کر شکورے اور نتھو کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔ دونوں بچے کھچے لنچ کی جانب بڑھتے ہیں کہ

بودو چابک اٹھا کر کہتا ہے) لیکن! (نتھو اور شکورا سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں) اصول کے مطابق یہ ہڈیاں اور یہ غذا یا سکٹ اٹھانے والے کا حق ہے۔ تم دونوں کو اصولاً اس سے پوچھنا چاہئے۔ (نتھو اور شکورا دونوں سوبھاگا کی جانب دیکھ کر ہچکچاتے ہیں۔ بودو انھیں شہ دیتا ہے) پوچھو! آگے بڑھو۔ ذرہمت پوچھو اس سے۔ وہ تمھیں کھا نہیں جائے گا۔

شکورا:

(آگے بڑھ کر) جناب (سوبھاگا سے مخاطب ہو کر)۔

نتھو:

(آگے بڑھ کر) شریمان جی!

(سوبھاگا خاموش رہتا ہے)

بودو:

(خفا ہو کر) وہ تم سے پوچھ رہے ہیں۔ جواب دو کتے... (سوبھاگا خاموش رہتا ہے۔)

نتھو:

(سوبھاگا سے) یہ۔ یہ کھانا ہم کھالیں؟ (سوبھاگا خاموش رہتا ہے)

شکورا:

ان ہڈیوں کی آپ کو ضرورت تو نہیں ہے؟

بودو:

مسٹر؟ شریمان جی؟... آہا مزا آ گیا... کہو بدھو تم ان ہڈیوں کو رکھنا چاہتے ہو یا انھیں دینا چاہتے ہو؟

(سوبھاگا خاموش رہتا ہے)

بودو:

(نتھو اور شکورے سے) اٹھالو۔

(نتھو اور شکورے دونوں بچے کچھے کھانے کی پلیٹ پر جھپٹتے ہیں اور بے تحاشا بھوک کی وجہ سے فوراً کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ شکورا نتھو کو ایک ہڈی چوستے ہوئے دیکھ کر کہتا ہے)

شکورا:

تم تو گوشت کھاتے نہیں ہو۔

نتھو:

(منھ سے ہڈی نکال کر دکھاتا ہے) اس پر گوشت ہے کہاں؟ (دونوں کھانے میں مگن ہیں۔)

بودو:

مگر یہ عجیب واقعہ ہے۔ سوبھاگا نے آج تک میرا بچا کھچا کھانے سے انکار نہیں کیا۔ (سوبھاگا کی طرف غور سے دیکھ کر) کہیں یہ بیمار تو نہیں ہو گیا؟ راستے میں بیمار پڑ گیا تو میرے لئے مصیبت ہو جائے گی۔

شکورا:

اف یہ انتہائی شرم ناک ہے۔

(نتھو ہڈی چوسنا ترک کر کے حیرت سے شکورے کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

بودو:

تمھارا اشارہ کس مسئلے... کے کون سے گوشے...

شکورا:

کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا (سوبھاگا کی طرف اشارہ کرتا ہے) اس طرح کا سلوک... کسی کے ساتھ کسی انسان کے لئے انتہائی شرم ناک ہے۔

نتھو:

شرم ناک ہی نہیں۔ انتہائی خباثت ہے۔

بودو:

میرا نمک کھانے سے پہلے اگر آپ لوگ یہ بات کہہ دیتے تو میں آپ کی سچائی کا زیادہ قائل ہوتا۔ خیر۔ اب مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ (اٹھتے ہوئے) آپ دونوں کی محبت کا شکریہ۔ سوچتے ہوئے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو اپنی خوشگوار محبت سے نوازنے کا ایک موقعہ اور دوں... مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب میں اپنا پائپ دوبارہ سلگا لوں، کیا کہتے ہیں آپ؟ (شکورا اور نتھو دونوں چپ رہتے ہیں) میں تمباکو کا زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ اس سے میرے دل پر برا اثر پڑتا ہے... (سینے پر ہاتھ رکھ کر) یہ زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے... دھڑک دھڑک... ہر ممکن احتیاط کے باوجود نکوٹین خون میں جذب ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ میرے لئے بہت بری بات ہوگی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ (شکورا اور نتھو دونوں چپ رہتے ہیں) شاید آپ لوگ تمباکو کا استعمال نہیں کرتے؟ ہوں؟ ہاں؟ ناں؟ خیر جانے دو۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم نہیں ہے... مگر اب کہ جب میں جانے کے لئے اٹھ چکا ہوں۔ پھر سے دوبارہ... سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ اس میں اک ذرا سی میری ہیٹی ہوگی۔ (وقفہ) معاف کیجئے کچھ کہا آپ نے؟ (شکورا اور نتھو دونوں خاموش ہیں) شاید آپ نے کچھ کہا نہیں۔ یا میرے کان بجتے ہیں... خیر یہ بھی کوئی اہم بات نہیں... میرا خیال ہے کہ... (سوچنے لگتا ہے۔)

(شکورا ہڈیاں جیب میں ڈالنے لگتا ہے۔)

نتھو:

(شکورے سے) ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔

(نتھو خود بھی ایسا ہی کرتا ہے)

شکورا:

آؤ چلیں۔

نغو:

اتنی جلدی؟

بودو:

ایک منٹ... (رسی کو جھٹکا دے کر) اسٹول! (سوبھاگا اسٹول لے کر آتا ہے) وہاں رکھو! (سوبھاگا رکھتا ہے پھر واپس چلا جاتا ہے، بودو اسٹول پر بیٹھ کر کہتا ہے) ہاں اب ٹھیک ہے۔

(بودو اپنا پائپ دوبارہ بھرنے لگتا ہے)

شکورا:

چلو یہاں سے جلدی نکل چلیں۔

بودو:

شاید آپ دونوں میری صورت سے بیزار ہو چکے ہیں۔ مگر ٹھہرو ممکن ہے ٹھہرنے سے آپ کی بہتری کی کوئی صورت نکلے۔

(بودو جیب سے اپنا بٹوہ نکالتا ہے۔ پرس کو دیکھ کر نغو اور شکورے کے چہروں پر ایک حریص چمک آجاتی ہے۔)

نغو:

ہمیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے جانے کی۔

(پائپ سلگاتے ہوئے اور اس کا کش لیتے ہوئے بودو ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے)

بودو:

دوسری بار وہ مزا نہیں ملتا... (پائپ منہ سے نکال کر اسے دیکھتا ہے۔ پھر منہ میں ڈال کر کش لے کر کہتا ہے) جو پہلے پائپ میں ہوتا ہے۔ وہ مزا دوسرے میں نہیں... مگر خیر... مزا آتا تو ہے۔

(بودو پرس کو واپس جیب میں ڈال لیتا ہے۔)

شکورا:

میں جا رہا ہوں۔

بودو:

اب میری موجودگی سے یہ بور ہونے لگا ہے۔ شاید تمہارا دوست سمجھتا ہے میں اتنا اچھا انسان دوست نہیں ہوں.. ہو سکتا ہے.. مگر یہاں کس کو پروا ہے؟ (شکورے سے) جانے سے پہلے اچھی طرح سے سوچ لو۔ ابھی دن باقی ہے... اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ابھی آسمان پر روشنی باقی ہے۔ (وہ دونوں بودو کے ساتھ آسمان کی جانب نگاہ دوڑاتے ہیں) اس لئے سوچو کہ اگر میں چلا گیا۔ اور وہ آ گیا۔ تمہارے جانے کے بعد... وہ... یعنی گودو... کہ گودن... کہ گدن... کیا نام ہے اس کا...؟ خیر کوئی بھی نام ہے اس کا وہ اگر تمہارے جانے کے بعد آ گیا... وہ جس کے ہاتھ میں تمہارا مستقبل ہے؟

شکورا:

تم اس بات کو کیسے جانتے ہو؟

بودو:

ابھی مجھ سے خفا تھا... ابھی پھر مجھ سے بات کر رہا ہے۔ اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو تھوڑے عرصہ میں ہم دونوں دوست بن جائیں گے۔

نغو:

(سوبھاگا کی طرف اشارہ کر کے) یہ تمہارا ساز و سامان نیچے زمین پر کیوں نہیں رکھ دیتا؟ سر پر کیوں اٹھائے ہوئے ہے۔

بودو:

مجھے بڑی مسرت ہوگی تمہارے گودو... گدو... گدن... جو کوئی بھی ہے، اس سے مل کر۔ زیادہ لوگوں سے مل کر میں زیادہ مسرت محسوس کرتا ہوں کمینے سے کمینے انسان سے مل کر بھی میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند خیال کرتا ہوں۔ پہلے سے زیادہ فرحت محسوس کرتا ہوں۔ ایسے لوگ بھی مجھے کچھ دے ہی جاتے ہیں۔ کیا معلوم میں تم سے مل کر بھی اپنے علم میں تھوڑا سا اضافہ کر لوں؟

نغو:

مگر یہ سوبھاگا اپنا سامان نیچے کیوں نہیں رکھ دیتا؟

بودو:

اگر رکھ دے تو مجھے حیرت ہوگی۔

نغو:

میں نے تم سے ایک سوال کیا ہے۔

بودو:

سوال؟ کس نے؟... کیا؟ ایک لمحہ پہلے جب میں نے بٹوا نکالا تھا۔ جب تم نے مجھ سے میری جھوٹن مانگی تھی اس وقت تو تم مجھے آپ جناب کہہ کر پکار رہے تھے۔ اب "تم" پر اتر آئے۔ اس سے کچھ اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

شکورا:

(نغو سے) میرے خیال میں وہ اب سن رہا ہے۔

نغو:

کیا؟

شکورا:

اب تم ہی اس سے سوال کر سکتے ہو۔ وہ چوکنا دکھائی دیتا ہے۔

نغو:

کیا پوچھوں اس سے؟

شکورا:

یہی کہ وہ اپنا سامان نیچے زمین پر کیوں نہیں رکھ دیتا؟

نغو:

کیا وہ اس سوال کا جواب دے سکتا ہے؟
شکورا:
تم پوچھ کے تو دیکھو۔
بودو:
تم پوچھنا چاہتے ہو کہ جو سامان میں نے اس کے سر پر لاد رکھا ہے اسے نیچے کیوں نہیں رکھ دیتا؟
شکورا:
ہاں!
نتھو:
ہاں! دیکھتے نہیں وہ کس طرح ایک تھکے ہوئے کتے کی طرح ہانپ رہا ہے۔
بودو:
اس سوال کا جواب یہ ہے (شکورا اور نتھو غور سے سننے لگتے ہیں) ٹھہرو۔ تم لوگ خواہ مخواہ مجھے نروس کر رہے ہو۔
شکورا:
دیکھو!
نتھو:
کیا ہے؟
شکورا:
وہ شاید بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

(وہ دونوں جامد ہو کر سوبھاگا کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

بودو:
(ذرا بلند آواز میں) بہت خوب؟... تو تم اس سوال کا جواب چاہتے ہو؟ میری طرف دیکھو (نتھو اور شکورا اس کی طرف دیکھتے ہیں) میری طرف دیکھو سور! (رسی کو زور سے جھٹکا دیتا ہے۔ سوبھاگا اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) بہت خوب۔ (بودو پائپ بجھا کر اسے جیب میں ڈال کر دوسری جیب سے زکام دور کرنے والی پلاسٹک کی سونگھنے والی نلکی نکالتا ہے۔ اسے اپنے دونوں نتھنوں میں باری باری لے جا کر سونگھتا ہے، پھر اسے جیب میں ڈال کر ایک چھوٹا سا vaporizer نکالتا ہے اسے اپنے حلق کے قریب لے جا کر ربڑ کا گولہ دبا کر اپنے حلق میں استعمال کرتا ہے جیسے عطر پاشی کی جاتی ہے۔ پھر حلق صاف کرنے کی آواز نکالتے ہوئے زمین پر تھوکنے کے بعد پھر اسی vaporizer کا استعمال کرتا ہے۔ vaporizer کو واپس جیب میں رکھ کر کہتا ہے) کیا سب لوگ تیار ہیں میرا جواب سننے کے لئے... میں تو تیار ہوں... لیکن کیا آپ بھی تیار ہیں؟ (رسی کو جھٹکا دیتا ہے) گدھے، میری طرف دیکھو... میں خلا میں بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ (سوبھاگا اس کی طرف دیکھتا ہے) ٹھیک ہے۔ اب میں غور کرنا شروع کرتا ہوں۔ (بودو سوچنے لگتا ہے۔)

نتھو:
(زچ ہو کر) میں جا رہا ہوں۔
بودو:
مگر تم... کیا پوچھنا چاہتے تھے؟
شکورا:
یہی کہ وہ... (سوبھاگا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)
بودو:
(فوراً) بیچ میں سے بات مت کاٹو... اگر ہم سب ایک ساتھ بولنے لگیں گے تو کس کے پلے کیا پڑے گا؟ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟
شکورا:
(نقل کر کے سمجھاتے ہوئے) سامان (سر پر سامان اٹھانے کی نقل کرتا ہے۔ یہ کیوں اٹھائے رکھتا ہے؟ (بھاری سامان اٹھانے کی نقل کرتا ہے) یہ نیچے نہیں رکھتا (سامان زمین پر رکھنے کی نقل کرتے ہوئے) کیوں نہیں؟ (دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور بودو کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔)
بودو:
ہا! پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اتنا معمولی سا سوال؟ آؤ کوشش کر کے اس کا حال سوچیں... یقیناً اسے حق تو ہے۔ پھر یہ ایسا کیوں نہیں کرتا...؟
شاید یہ ایسا کرنا نہیں چاہتا... مگر کیوں نہیں چاہتا... جناب اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔
نتھو:
(شکورے سے) اسے یاد رکھو نہ۔
بودو:
یہ کم بخت اپنی کارکردگی کا رعب مجھ پر گانٹھنا چاہتا ہے تا کہ میں اسے نوکری سے الگ نہ کروں۔
شکورا:
کیا!
بودو:
شاید میں نے ٹھیک سے نہیں کہا۔ یہ مجھے خوش کرنا چاہتا ہے تا کہ میں کسی وقت بھی اسے چھوڑ دینے کا خیال اپنے دل میں نہ لاؤں۔ نہیں۔ یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔
شکورا:
تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو۔
بودو:
یہ مجھے اس طرح بہلانا پھسلانا چاہتا ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوگا۔
شکورا:

تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو!

بودو:

دراصل یہ ایک گدھے کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے حالاں کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔

شکورا:

تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو!

بودو: یہ سوچتا ہے کہ جب اسے اس کام میں اس قدر منہمک دیکھوں گا تو مجھے اسے برطرف کر دینے میں پچھتاوا محسوس ہوگا۔ احمق۔ شاید یہ جانتا نہیں ہے کہ اس دنیا میں غلاموں کی کمی نہیں ہے (اب شکورا، سوبھاگا، نتھو، تینوں اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔) تمھیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟

شکورا:

تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو!

بودو:

یہ امر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اس کی جگہ میں بھی ہو سکتا تھا اور یہ میری جگہ لے سکتا تھا۔ مگر یہ تو محض اتفاق ہے۔

شکورا:

تم اسے چونیا چاتو؟

بودو:

کیا کہا تم نے؟

شکورا:

تم اسے چھوڑ۔ دینا۔ چاہتے۔ ہو۔

بودو:

ہاں۔ مگر اسے نکال دینے کے بجائے، اس کی پیٹھ پر ٹھوکر مار مار کر اسے برطرف کرنے کے بجائے۔ میں اسے۔ اپنے ساتھ۔ میلے میں لے جا رہا ہوں۔ جہاں مجھے اس کی اچھی قیمت ملے گی۔

نتھو:

کون سا میلہ؟

بودو:

مویشیوں کا میلہ ہے یہاں سے کچھ فاصلے پر... مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے جانوروں کو نکال دینا بھی بے سود ثابت ہوتا ہے۔ انھیں جان سے مار دینا ہی بہتر ہے۔ (سوبھاگا رونے لگتا ہے۔)

نتھو:

وہ رو رہا ہے۔

بودو:

ایک کتے کو بھی اپنے وقار کا اس سے زیادہ خیال ہوتا ہے۔

(بودو جیب سے ایک رومال نکال کر نتھو کو دیتا ہے۔)

بودو:

(نتھو سے) اگر تمھیں اس پر اتنی دیا آ رہی ہے تو اس رومال سے اس کے آنسو پونچھ دو۔ چلو... (نتھو کچھ ہچکچاتا ہے) آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ ڈالو۔ شاید اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

شکورا:

تو مجھے رومال دو۔ میں پونچھتا ہوں (نتھو رومال نہیں دیتا۔) جلدی کرو ورنہ اس کے آنسو خود بخود خشک ہو جائیں گے۔

(نتھو آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے سوبھاگا کے قریب جاتا ہے اور رومال سے اس کی آنکھیں پونچھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سوبھاگا اسے اپنے قریب پا کر زور سے اسے ایک لات رسید کرتا ہے۔ رومال کو نیچے گرا کر نتھو دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے کو پکڑ کر زور زور سے چلاتا ہے)

بودو:

(چلا کر) میرا رومال!

(سوبھاگا جلدی سے سامان نیچے رکھ کر رومال لے کر بودو کو دیتا ہے جو اسے جھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے سوبھاگا واپس جا کر پھر اپنا سامان اٹھا لیتا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ نتھو لنگڑاتا ہوا شور مچاتے ہوئے درد سے بے تاب ہو کر کہتا ہے)

نتھو:

اس حرامی نے مجھے لنگڑا کر دیا۔

بودو:

میں نے تمھیں شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اسے اجنبی لوگ ناپسند ہیں۔

شکورا:

دکھاؤ۔ (نتھو اپنی ٹانگ دکھاتا ہے۔ شکورا، بودو سے کہتا ہے) خون بہہ رہا ہے۔

بودو:

یہ ایک اچھا شگون ہے۔

نتھو:

شاید اب میں عمر بھر لنگڑا رہوں گا۔

شکورا:

گھبراؤ نہیں۔ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں گا۔

بودو:

دیکھو اب سوبھاگا روتا نہیں ہے (روتے ہوئے نتھو سے) ایسا لگتا ہے جیسے اس کی جگہ تم نے لے لی ہے... ساری دنیا میں آنسوؤں کی ایک ہی مقدار پائی جاتی ہے۔ جب یہاں کوئی رونے لگتا ہے،

کہیں پر کوئی دوسرا چپ ہو جاتا ہے یہی بات ہنسی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ (ہنستا ہے۔) اس لئے موجودہ نسل کو بدنام مت کرو۔ یہ پہلی نسل سے ناخوش نہیں ہے موجودہ نسل کو برا مت کہو...! اچھا بھی مت کہو... کچھ بھی مت کہو...

شکورا:

(نتھو سے) چلنے کی کوشش کرو۔

(نتھو لنگڑاتے ہوئے چل کر سوبھاگا کے قریب
جا کر اس پر تھوک دیتا ہے پھر اپنے ٹیلے پر جا کر بیٹھ جاتا ہے)

بودو:

کیسے کیسے خوب صورت خیال میرے دل میں آتے ہیں۔ سب (سوبھاگا کی طرف اشارہ کر کے) اس کی وجہ سے!

نتھو:

کیا آج رات نہیں ہوگی؟

بودو: اس کے آنے سے پہلے میرے خیالات کا سلسلہ بے حد بے تکا سا ہوتا تھا... خوب صورتی کیا ہے؟ بانک پن کسے کہتے ہیں؟ سچائی کیسی ہوتی ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہ تھا... یکا یک میں نے اپنے آپ کو بدل دیا۔

شکورا:

بدل دیا؟

بودو:

ساٹھ سال پہلے۔ تقریباً ساٹھ سال ہو گئے... ہاں مجھے دیکھ کر تم سوچ نہیں سکتے کہ میں اتنا بوڑھا ہو سکتا ہوں... کیوں کہ... اس کے (سوبھاگا کی طرف دیکھ کر) مقابلے میں۔ میں بالکل۔ جوان لگتا ہوں۔ لگتا ہوں ناں؟ (شکورا اور نتھو کوئی جواب نہیں دیتے تو بودو رسی جھٹک کر سوبھاگا سے کہتا ہے) اپنی ٹوپی اتارو۔

(سوبھاگا سامان نیچے رکھ کر اپنے سر کی چوگوشیہ ٹوپی
اتارتا ہے۔ اس کا سر بالکل گنجا ہے۔ بودو خوش ہو کر کہتا ہے)

بودو:

دیکھا تم نے؟

شکورا:

اور اب تم اس بوڑھے، پرانے، وفادار ملازم کو برطرف کرنا چاہتے ہو۔

نتھو:

کمینہ! اس کے اندر کا سارا گودا کھا کے۔ اب۔ تم۔ اسے کیلے کے چھلکے کی طرح سڑک پر پھینک دینا چاہتے ہو۔ تم... تم...

بودو:

(یکا یک لہجہ بدل کر ایک مظلوم کا انداز اختیار کرتے ہوئے) تم... تم... تم نہیں جانتے میں اب اسے برداشت نہیں کر سکتا (اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر) جو ظلم یہ مجھ پر ڈھا رہا ہے (سوبھاگا کی طرف اشارہ کر کے) میں انھیں اب برداشت نہیں کر سکتا... میں نے اگر اسے الگ نہ کیا تو میں خود پاگل ہو جاؤں گا... اب یہ۔ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔

شکورا:

(بودو پر رحم کھاتے ہوئے) بے چارہ... اب یہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

نتھو:

بالکل نہیں کر سکتا۔

شکورا:

پاگل ہوا جا رہا ہے۔

نتھو:

یہ ظلم ہے اس پر!

شکورا:

(سوبھاگا سے) تمھاری یہ جرأت... تمھیں شرم نہیں آتی۔ ایسے اچھے مالک سے اتنا برا سلوک کرتے ہو؟

بودو:

(روتے ہوئے) یہ اتنا اچھا ہوتا تھا کبھی... ایسا عمدہ... اتنا وفادار اور مددگار۔ بالکل ایک فرشتہ... اور اب... ارے اب یہ مجھے مارے ڈال رہا ہے۔

نتھو:

(پرامید لہجے میں) اگر یہ اپنے نوکر سے خوش نہیں ہے تو کیا اس کی جگہ کسی دوسرے کو رکھے گا؟

شکورا:

میرا ایسا خیال نہیں ہے۔

نتھو: کیا؟

شکورا:

معلوم نہیں اس کا کیا ارادہ ہے۔

نتھو:

(بودو کی طرف اشارہ کر کے) اس سے پوچھ کے دیکھو۔

بودو:

(آنسو پونچھ کر ٹھنڈے اور غیر جذباتی لہجے میں) معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ معاف کیجئے جناب... جانے میں کس رو میں کیا کہہ گیا۔ محض بے کار۔ ایک لفظ بھی صحیح نہ تھا اس میں... اسے بھول جایئے (سینہ پھلا کر) کیا میں ایسا احمق دکھائی دیتا ہوں۔ جسے پریشان کیا جا سکتا ہے؟ (جیب ٹٹولتے ہوئے) معلوم نہیں میرا پائپ کدھر گیا۔

شکورا:

بڑی حسین شام ہے۔

نتھو:
ناقابل فراموش۔
شکورا:
اور ابھی ختم بھی نہیں ہوئی۔
نتھو:
بظاہر!
شکورا:
ابھی تو شام شروع ہوئی ہے۔
نتھو:
بڑی مصیبت ہے۔
شکورا:
تھیٹر جانے سے بدتر۔
نتھو:
سرکس کی طرح
شکورا:
نہیں کلاسیکی موسیقی کی طرح۔
نتھو:
سرکس!
شکورا:
کلاسیکی موسیقی!
بودو:
میرا پائپ کدھر ہے؟
شکورا:
یہ بھی عجوبۂ روزگار ہے۔ اس کا پائپ کھو گیا ہے۔ کبھی زور سے ہنستا ہے، یکا یک کھانسنے لگتا ہے۔ (نتھو سے کہتا ہے) ابھی آتا ہوں (ونگ کی طرف بڑھتا ہے۔)
نتھو:
کاریڈور کے بائیں طرف مڑتی ہے۔
شکورا:
میری سیٹ رکھنا۔ (ونگ میں غائب ہو جاتا ہے۔)
بودو:
میرا اصلی برائیر پائپ کھو گیا ہے۔
نتھو:
(ہنستے ہوئے) مر گئے ہم تو...
بودو:
تم نے اسے کہیں نہیں دیکھا... اوہ... وہ دوسرا چلا گیا۔ رخصت ہوئے بغیر... تھوڑی دیر اور انتظار کر سکتا تھا۔
نتھو:
اور انتظار کرتا تو ہنستے ہنستے اس کا دم نکل جاتا۔
بودو:
اس صورت میں... تو ٹھیک ہی کیا اس نے۔
نتھو:
ادھر آؤ۔
بودو:
کیوں؟
نتھو:
آؤ تو... بتاتا ہوں۔
بودو:
تم چاہتے ہو کہ میں اٹھ کر تمھارے پاس آؤں۔
نتھو:
جلدی! (بودو جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس جاتا ہے۔) دیکھو!
بودو:
کہاں؟ کدھر؟
نتھو:
تماشا ختم ہو گیا... تم دیر میں آئے۔

(شکورا واپس آتا ہے۔ بے حد سنجیدہ۔ چلتے چلتے وہ راستے میں سوبھاگا کو کندھا مار کر سامنے سے ہٹا دیتا ہے۔ چلتے چلتے بودو کے سٹول کو ٹھوکر مار کر گرا دیتا ہے۔ پریشان ہو کر ٹہل رہا ہے۔)

بودو:
ناخوش معلوم ہوتا ہے۔

(شکورا چلتے چلتے گرے ہوئے اسٹول کو اٹھا کر پھر سے سیدھا کر کے رکھ دیتا ہے۔)

بودو:
اب ٹھنڈا ہو رہا ہے... ہر چیز آخر میں ٹھنڈی ہو جاتی ہے... چاروں طرف سکون چھا جاتا ہے۔ سنو... سنو... کمبھ کرن سو رہا ہے۔
شکورا:
کیا رات کبھی نہیں آئے گی۔

(تینوں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔)

بودو:
کیا جب تک رات نہیں آئے گی تم یہاں سے نہیں جاؤ گے؟

نتھو:

دراصل قصہ یہ ہے۔

بودو:

ٹھیک...ٹھیک...بالکل ٹھیک...تمھاری حالت میں، میں بھی یہی کرتا... بالکل یہی... گودو...تمھیں گودو کا انتظار ہے نہ؟ تو میں ہوتا تمھاری جگہ پر تو میں اتنی جلدی امید نہ چھوڑ دیتا۔ میں آدھی رات تک گھور اندھیرا چھا جانے تک اس کا انتظار کرتا۔ (اسٹول کی طرف دیکھتا ہے) میں اس پر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اب کیا کروں؟

شکورا:

کیوں اس میں کیا قباحت ہے؟

نتھو:

کیا میں کسی طرح آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟

بودو:

اگر تم مجھے اس پر بیٹھنے کے لئے اصرار کرو تو ممکن ہے۔

نتھو:

کیا؟

بودو:

یعنی اگر تم مجھے بیٹھنے کے لئے کہو۔

نتھو:

تو تم بیٹھ جاؤ گے۔

بودو:

ایسا میرا خیال ہے۔

نتھو:

لیجئے تو میں شروع کرتا ہوں (بے حد پر تکلف لہجے میں) تشریف رکھئے سرکار (اسٹول کی طرف اشارہ کرکے) میں گذارش کرتا ہوں۔

بودو:

(تحکمانہ) نہیں۔نہیں۔اب میں بیٹھ نہیں سکتا (وقفہ)...(نرمی سے) ایک دفعہ پھر عرض کرو۔

نتھو:

آئیے بیٹھ جایئے۔ میں التجا کرتا ہوں۔ ورنہ ممکن ہے آپ کو سردی لگ جائے۔

بودو:

کیا اس کا اندیشہ ہے؟

نتھو:

بلاشبہ۔

بودو:

تم ٹھیک کہتے ہو (اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے) شکریہ (گھڑی دیکھتا ہے) مگر مجھے اب یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ ورنہ میرا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا۔

شکورا:

وقت تھم گیا ہے۔

بودو:

(گھڑی کو کان سے لگاتے ہوئے) ہو نہیں سکتا... یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمھاری بات پر کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔

نتھو:

آج ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

بودو:

مگر... آسمان پر اندھیرا نہیں ہے۔ (گھڑی جیب میں رکھ کر) معلوم ہوتا ہے تم اس علاقے کے رہنے والے نہیں ہو۔ شاید تمھیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں شفق کیسے پھولتی ہے۔ جاننا چاہتے ہو؟

(نتھو اپنے جوتے ٹھیک کر رہا ہے، شکورا اپنی ترکی کیپ۔ سوبھاگا کی چوگوشیہ ٹوپی زمین پر گر پڑی ہے۔)

بودو:

مجھے بتانا پڑے گا (وہ حلق کو vaponzer سے صاف کرتا ہے) ذرا... دھیان دے کر میری باتیں سنو۔ (نتھو اور شکورا اپنی باتوں میں مصروف ہیں۔ سوبھاگا کھڑے کھڑے اونگھ رہا ہے۔ بودو بے دلی سے چابک زمین پر مارتا ہے، ہلکی سی آواز پیدا ہوتی ہے جو کسی کو متاثر نہیں کرتی۔ اس پر بودو اسٹول سے اٹھ کر چابک ہاتھ میں لے کر اسے زور سے زمین پر مارتا ہے۔ تڑاخ کی آواز سے سوبھاگا چونک جاتا ہے۔ نتھو کے ہاتھ سے اس کا لانگ بوٹ اور شکورے کے ہاتھ سے اس کی ٹوپی گر جاتی ہے۔ بودو چابک زمین پر پھینک دیتا ہے) یہ چابک بہت پرانی ہو گئی ہے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟

شکورا:

(نتھو سے) آؤ یہاں سے چل دیں۔

نتھو:

(بودو سے) اسٹول پر بیٹھ جایئے آپ کے پاؤں کا بوجھ نہیں سہار سکتے۔

بودو:

تم ٹھیک کہتے ہو (بیٹھ جاتا ہے) تمھارا نام کیا ہے؟

نتھو:

گاؤدی!

بودو:

(ان سنا کرکے) ہا... رات... رات کو دیکھو اور دھیان سے سنو۔ ورنہ ہم لوگ کبھی

کہیں نہ پہنچ سکیں گے۔ اس رات کو دیکھ کر... (بودو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ شکورا اور نتھو بھی غور سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ صرف سوہا گا اونگھ رہا ہے۔ رسی کو زور سے جھٹکا دے کر بودو اسے جگاتا ہے) اوپر دیکھو گدھے! (سوہا گا اوپر آسمان کی طرف دیکھتا ہے) ہاں اب ٹھیک ہے... اس رات کے متعلق کوئی خاص بات کیا کہی جاسکتی ہے... یعنی اس آسمان کے متعلق (جوش کے عالم میں) یہ زرد اور روشن آسمان... بلور کی طرح منور... خاص طور پر جب موسم اس قدر عمدہ ہو... یعنی ایک گھنٹہ پہلے... سورج صبح سے سحر کی گل گوں روشنی سے دوپہر کے سپید نور سے ڈھل کر اپنی درخشاں تابانی کم کرتے ہوئے پیلا ہو چلا ہے۔ پیلا... زرد رو... بسنتی... ہلکا پیلا... جیسے کسی نے آفتاب کے نورانی دریچوں پر ہلکا زعفرانی چھینٹا مار دیا ہو... ہا... ختم... (دونوں ہاتھ ڈرامائی انداز سے پھیلاتے ہوئے) تابندگی ختم... مگر (ہاتھ اٹھاتے ہوئے) شام کی اس پرسکون فضا... سرسراتے ہوئے آنچل کے عقب میں رات آتی ہے... رات چلی آتی ہے... بے دھڑک!

(دونوں ہاتھ ملا دیتا ہے۔ اور الیہ انداز میں کہتا ہے) ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے اس کتیا دھرتی پر!

(خاموشی کا ایک لمبا وقفہ)

نتھو:

جہاں تک کوئی جان سکتا ہے۔

شکورا:

ہر آدمی اپنے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نتھو:

ہم جانتے ہیں ہماری قسمت میں کیا بدا ہے۔

شکورا:

اس لئے کوئی پریشانی نہیں۔

نتھو:

بس انتظار ہے۔

شکورا:

اور انتظار کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

(اپنی ٹوپی اٹھا کے اسے جھاڑتا ہے۔ اس کے اندر دیکھ کر اسے پہن لیتا ہے)

بودو:

کیسا رہا میرا بھاشن؟ بہت عمدہ؟ عمدہ؟... اچھا؟ معمولی... یوں ہی سا... کہ اک دم برا؟

شکورا:

بہت عمدہ، بے حد موثر۔

بودو:

(نتھو سے) آپ کی کیا رائے ہے۔

نتھو:

اچھا... اچھا... اچھا... اچھا برا۔

بودو:

شکریہ۔ شکریہ... آپ دونوں کا شکریہ... اس ہمت افزائی کا تہ دل سے شکریہ جناب... مگر خیال ہے کہ تقریر کے آخر میں کچھ یعنی کسی قدر آخر میں یہ تقریر کمزور ہو چلی تھی۔

نتھو:

یوں ہی ذرا سی۔

شکورا:

ممکن ہے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو۔

بودو:

کہہ نہیں سکتا۔ میری یادداشت بہت کمزور ہے۔

(خاموشی کا وقفہ)

نتھو:

اس دوران میں کیا کریں؟ انتظار؟

بودو:

یقیناً تم اس سے گھبرا جاتے ہوگے۔

نتھو:

کسی قدر۔

بودو:

اور آپ؟

شکورا:

مجھے بے حد مزا آرہا ہے۔

بودو:

میں... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کا سلوک مجھ سے بہت اچھا رہا ہے۔

نتھو:

آپ کو اس کا خیال کیوں کر آیا؟

بودو:

مگر نہیں میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ اس کے بدلے میں مجھے بھی کچھ کرنا چاہئے۔

نتھو:

ایک روپیہ کافی ہوگا۔

شکورا:

نہیں ہم بھکاری نہیں ہیں۔

بودو:

میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔ میں ان دونوں کو خوش کرنے کے لئے اور کیا کرسکتا ہوں؟...ٹھیک ہے۔ میں نے انھیں ہڈیاں دیں۔ اپنا بچا کھانا دیا میں نے۔ آسمان پر پھیلتی ہوئی شفق کی تشریح کی۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا صرف اتنا ہی کردینا کافی ہے؟

نتھو:

اٹھنی بھی چلے گی۔

شکورا:

(ذرا غور سے) بہت ہو گیا۔

نتھو:

اس سے کم تو میں کسی حالت میں منظور نہیں کرسکتا۔

بودو:

لیکن کیا یہ کافی ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ میرا دل بہت فیاض ہے۔ میں کیا کروں یہ میری فطرت ہے۔ پھر یہ خوب صورت شام (رسی کو زور سے جھٹکتا ہے، سوبھاگا چونکتا ہے) میں ضرور آپ کی تفریح کا بندوبست کروں گا۔ لیکن آپ پسند کیا کریں گے؟ (سوبھاگا کی طرف اشارہ کرکے) یہ آپ کے سامنے ناچے، گائے، شعر پڑھے، یا سوچے؟

شکورا:

کیا... کیا یہ سوچ بھی سکتا ہے؟

بودو:

کیوں نہیں؟ ایک زمانہ تھا جب یہ بہت عمدہ طریقہ پر سوچ سکتا تھا۔ میں گھنٹوں اس کی باتیں سنا کرتا تھا۔ مگر اب (خوف سے لرز کر) اس کی خاموشی سے میری حالت قابل رحم ہوتی جاتی ہے۔ میں یقیناً ایک مظلوم آدمی ہوں۔ لیکن خیر اسے چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کیا آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ کیسے سوچتا ہے؟

نتھو:

میں اسے ناچتے ہوئے دیکھنا چاہوں گا۔

شکورا:

شاید اسے سوچ کے عالم میں دیکھنا بہتر ہوگا۔

نتھو:

تو ایسا کریں۔ پہلے یہ ناچے۔ پھر سوچے۔

شکورا:

(بودو سے) کیا ایسا کرنا ممکن ہوگا۔ دونوں؟

بودو:

کیوں نہیں۔

شکورا:

تو آؤ پہلے اس کا ناچ دیکھیں۔ (خاموشی)

بودو:

سنتے ہو سور... تم سے کیا کہا جا رہا ہے... ناچو گدھے۔ ناچو!

(سوبھاگا اپنا سامان اتار کر زمین پر رکھتا ہے اور اپنا ناچ دکھاتا ہے پھر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے)

نتھو:

(تالی بجا کر) ونس مور!

(سوبھاگا پھر اپنا رقص پیش کرتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا رقص میکانیکی مشینی اور بے جان ہے)

نتھو:

چھی! ایسا رقص تو میں بھی پیش کرسکتا ہوں۔ (نتھو نقل کرنے کی کوشش کرتے کرتے گرنے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال کر کہتا ہے) بس ذرا پریکٹس چاہئے۔

بودو:

کبھی یہ بہت اچھا ناچتا تھا۔ اسے سب رقص یاد تھے کیتھاکلی کتھک۔ منی پوری۔ کچی گوڑی۔ بھنگڑہ۔ بھارت ناٹیم۔ والز۔ فاکس ٹراٹ۔ ٹینگو۔ ٹوئسٹ۔ شیک۔ جرک... اس کا رقص بے حد دل کش اور مسرت آمیز ہوتا تھا۔ مگر اب۔ جناب... اب بس یہ ایسا ہی رقص کرسکتا ہے۔ اور اس کا نام اس نے رکھا ہے رقص الم۔

نتھو:

شوبھیہ نرت۔

بودو:

جال ناچ۔ یہ سوچتا ہے کہ اب وہ ایک بہت بڑے جال میں گرفتار ہے۔

شکورا:

کچھ ایسا غلط نہیں کہتا ہے۔

(سوبھاگا واپس جا رہا ہے اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے۔ بودو چلا کر اپنے حلق سے ایسی آواز نکالتا ہے جیسے کسی گھوڑے کو خبردار کر رہا ہو۔)

بودو:

ہش ہو! خ خ...

(سوبھاگا چلتے چلتے وہیں بت کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔)

بودو:

ٹھہرو (اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے) کہاں گیا... میرا حلق صاف کرنے والا ارے... گم ہو گیا شاید کہیں (گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔)

نتھو:

میرا ایک پھیپھڑا بہت کم زور ہے (کھانستے ہوئے کم زور آواز میں بولتا ہے، پھر لہجہ بدل کر بے حد مضبوط اور بھاری آواز میں) مگر دوسرا پھیپھڑا بہت مضبوط ہے!

بودو:

خیر۔اب جو ہے سو ہے...میں کیا کہہ رہا تھا...ٹھہرو...مجھے سوچنے دو۔آؤ سوچیں۔

نتھو:

سوچیں۔

شکورا:

سوچیں۔

(تینوں، شکورا، بودو اور نتھو اپنی ٹوپیاں اتار کر سوچ رہے ہیں۔)

نتھو:

ہا!

بودو:

اس نے راز معلوم کر لیا۔

شکورا:

بتاؤ۔

نتھو:

یہ اپنا سامان نیچے کیوں نہیں رکھتا۔

شکورا:

واہیات۔

بودو:

کیا واقعی۔

شکورا:

تم ہی نے تو بتایا ہے۔

بودو:

میں نے!

نتھو:

ہاں۔تم نے۔

شکورا:

بہر حال اب اس نے سامان نیچے رکھ دیا ہے۔

نتھو:

رکھ دیا ہے تو کیا ہوا۔

شکورا:

چونکہ اب اس نے سامان نیچے رکھ دیا ہے اس لئے اب اس سے یہ پوچھا نہیں جا سکتا کہ وہ یہ سامان نیچے کیوں نہیں رکھتا۔

بودو:

لاجواب منطق ہے!

نتھو:

مگر اس نے نیچے کیوں رکھ دیا؟

بودو:

مجھے معلوم نہیں۔

شکورا:

میں بتاؤں؟ ناچنے کے لئے۔

نتھو:

ٹھیک۔

بودو:

ٹھیک۔(خاموشی)

نتھو:

(بیزاری سے) کچھ نہیں ہوتا۔کوئی نہیں آتا۔کوئی نہیں جاتا...اف کس قدر بھیانک ہے یہ سب کچھ...

شکورا:

(بودو سے) اب اس سے کہو۔سوچے۔

بودو:

اس کی ٹوپی دے دو۔

شکورا:

اس کی ٹوپی؟

بودو:

ہاں۔وہ اپنی ٹوپی کے بنا سوچ نہیں سکتا۔

شکورا:

(نتھو سے) اس کی ٹوپی اسے دے دو۔

نتھو:

میں دے دوں...میرے ساتھ جو حرکت اس نے کی ہے (اپنی زخمی ٹانگ دکھاتے ہوئے) اس کے بعد بھی؟ ہرگز نہیں۔

شکورا:

تو میں دے دیتا ہوں۔

نتھو:

اسے کہو خود اٹھالے۔

بودو:

نہیں، دے دو۔یہی بہتر ہوگا۔

شکورا:

تو میں اس کے حوالے کر دیتا ہوں (ذرا دور رہ کر سوبھاگا سے کہتا ہے) لو اپنی ٹوپی!

(سوبھاگا خاموش کھڑا رہتا ہے۔)

بودو:

اوں ہوں؟ یہ ٹوپی اس کے سر پر رکھ دو۔

نھو:

(شکورے سے) اسے کہہ دو خود پہن لے۔

(شکورا پیچھے سے سوبھاگا کے قریب جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ قریب جا کر پیچھے سے اس کے سر پر ٹوپی پہنا کر فوراً بھاگ جاتا ہے۔ مگر سوبھاگا اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں... خاموشی۔)

نھو:

اب اسے کس کا انتظار ہے؟

بودو:

پیچھے ہٹو... (شکورا اور نھو سوبھاگا سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بودو رسے سوبھاگا کو جھٹکا دیتا ہے۔)

بودو:

سوچو گدھے۔ (سوبھاگا ناچنے لگتا ہے۔ فوراً بودو جھٹکا دے کر کہتا ہے) کھڑے ہو جاؤ (سوبھاگا کھڑا ہو جاتا ہے۔) آگے بڑھو۔ (سوبھاگا آگے بڑھتا ہے۔) ٹھہرو۔ (سوبھاگا ٹھہر جاتا ہے) سوچو...

سوبھاگا:

(بولتا ہے) خلاف اس کے دوسرے مسائل کے بارے میں...

بودو:

(جھٹکا دے کر) ٹھہرو۔ (سوبھاگا چپ ہو جاتا ہے) پیچھے جاؤ۔ (سوبھاگا پیچھے جاتا ہے) گھومو... (سوبھاگا گھومتا ہے اور حاضرین کے سامنے آ جاتا ہے۔) اب سوچو۔

سوبھاگا:

حیات ابدی کی تشریح جس طرح ترپاٹھی اور منظور الٰہی نے کی ہے کہ قضا و قدر کی انتہا یعنی قوا قوا قوا؛ قوا قوا قوا اپنی سفید ڈاڑھی کے ساتھ قوا قوا قوا اسے سے باہر دھیان کی ناف میں گیان کی قاف میں قوا قوا قوا اسے سے باہر دھیان کی ناف میں گیان کی قاف میں قوا قوا قوا لاشعور کی محراب میں جو ہم سے محبت کرتی ہے۔ بت کرتی ہے۔ نکرتی ہے... باستثنائے چند، مگر یہ تو سے ہی بتائے گا کہ بایں ہمہ وہ میرا جو میرے درد کا درماں دایاں بایاں شاماں شامت اعمال سے نفس کشی کی خاطر مگر یہ تو سے ہی بتائے گا کہ شامت اعمال سے چند نامعلوم وجوہات کی خاطر آگ میں جھلتے ہوئے نار جہنم جس کے شعلے جس کی آگ جس کے انگارے اگر جلتے رہے تو اس میں تو کوئی شبہ کرنے گنجائش نہیں کہ جلا ڈالے گی آسمان کو یعنی جنت سے جہنم کو آکاش کو اتنا نیلا اتنا نیلا نیل گوں جیسے سکوں سکوں دیدۂ شب خوں حالاں کہ کبھی کبھی نہ مرنے سے ہوتا بہتر بلکہ بہترین زیر زمین کیوں کہ محنت کے اکارت جانے سے استر شستر جنتر منتر ٹونے تنتر آکا باکا آکا باکا آکا بابا دھیان کی ناف میں گیان کی قاف میں کہ جس کو ترپاٹھی اور منظور الٰہی نے بغیر کسی شک و شبہ کے بغیر کسی وسوسے دغدغے بغیر کے یہ بات اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ آئندہ مستقبل قریب میں مگر اس قدر قریب بھی نہیں اور اس قدر تیز رفتار بھی نہیں جیسا کہ بیان ہوا ہے گیان کی ناف میں دھیان کی قاف میں مصنفہ میسرز ترپاٹھی اور منظور الٰہی کہ جو محنت اکارت گئی منجملہ حقوق واگذار بحق چمن بھائی مگن بھائی درمیان قاضی الحاجات مرثیہ شنکر حسین ودھنی رام توکل بخش کہ انسان مختصر یہ کہ انسان باوجود ارتقائے مسلسل مستقل مضمحل خرابۂ دل، چیڑ، بیاڑ، تنک، بلوط بہ قائمی ہوش وحواس فوراً اتفاقاً ظہوراً بایں ہمہ انسان اور اس کے کلچر اور فٹ بال کی ترقی کے باوجود ٹینس کے باوجود۔ کرکٹ۔ ہاکی۔ والی بال۔ باسکٹ بال۔ پنگ پانگ۔ ڈنگ ڈانگ کیرات کبڈی کے باوجود ان تمام اشیا ادویہ یا مجردات۔ مفردات کہ جن سے پنسلین۔ ایرومائسین۔ سلفاڈائزین اردو میگزین، ہندی میگزین، تامل میگزین ہر طرح اور ہر قسم کے سین کے باوجود فوراً اتفاقاً ظہورن خیرن کے ہوتے ہوئے نامعلوم وجوہات کے باعث تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ سکڑتے جاتے ہیں گم ہوتے جاتے ہیں۔ کبڈی کے باوجود ہوائی فضائی خلائی سفر کے درمیان یہ تو سے ہی بتائے گا کہ باوجود اس نقصان کے جو فی کس فی گز فی مربع میل اعشاریہ نمبر تین سو تہتر یہ تو سے ہی بتائے گا کہ نامعلوم وجوہات کے باعث عریانی کی طغیانی کے دوران کبڈی کے باوجود وجہ کچھ بھی ہو یا نہ ہو یا نہ ہو مگر یہ ایک غیر متزلزل صداقت ہے کہ کبڈی کے باوجود نامعلوم وجوہات کے باعث سے ہی بتائے گا اس بھاری نقصان کا اندازہ جس سے اکارت ہوتی ہوئی محنت کی بربادی کے باعث انسان کی آبادی ان حقائق کی روشنی کی روشنی کی روشنی میں کہ جن کا ذکر میسرز ترپاٹھی اور منظور الٰہی نے قربان گاہ محبت پر کبڈی کے باوجود نامعلوم وجواہات کے باعث یہ تو سے ہی بتائے گا کہ میدانوں میں دریاؤں میں وادیوں میں پہاڑوں پر سمندروں میں ہواؤں میں طغیانی ہی طغیانی۔ پانی ہی پانی روانی ہی روانی ست بکری مطابق ست عیسوی بحساب سنہ ہجری بقول ترپاٹھی اور منظور الٰہی نامعلوم وجوہات کے باعث کبڈی کے باوجود دل کی گہرائیوں میں جنگ کی تباہیوں میں دشمن کی ہوائیوں میں کبڈی کے باوجود فوراً معاً ظہورن خیرن مختصراً یہ کہ بلاشبہ بے سہارا بے حقیقت چہرے کی ڈاڑھی کے شعلے جھٹ پٹ فنافٹ اینڈی دی بینڈی پتھر اس قدر نیلے۔ دل اس قدر پیلے افسوس افسوس کھوپڑی کھوپڑی کھوپڑی گردن پر رکھی ہوئی کبڈی کے باوجود یہ تو سے ہی بتائے گا، کھوپڑی پتھر۔ پتھر۔ (سب اس پر پل پڑتے ہیں) پر سکون۔ پر خوں۔ پتھر کھوپڑی۔ کبڈی... (اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سوبھاگا کو چپ کرا دیتے ہیں۔)

بودو:

اس کی ٹوپی...جلدی۔ مجھے دو۔

(شکورا سوبھاگا کی ٹوپی اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔
سوبھاگا گر جاتا ہے نتھو اور بودو ہانپ رہے ہیں۔)

نتھو:

آخر بدلہ لے لیا اس نے!

(شکورا سوبھاگا کی ٹوپی کے اندر جھانکتا ہے۔ بودو اس
کی ٹوپی چھین کر زمین پر پھینک کر اسے اپنے پاؤں سے مسلتا ہے۔)

شکورا:

یہ کیا کر رہے ہو؟

بودو:

اس کم بخت کی عقل اس کی ٹوپی میں ہے...(زور زور سے مسلتے ہوئے) آج اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔

شکورا:

مگر پھر کیا یہ چل سکے گا؟

بودو: اب پاؤں کے بل چلے یا گھٹنوں کے بل...(گرے ہوئے سوبھاگا کو ٹھوکر مار کر) اٹھو سور! (گرا ہوا سوبھاگا ہلتا تک نہیں۔)

نتھو:

شاید مر گیا۔

بودو:

(رسی کا جھٹکا دے کر) اٹھو بودم...گدھے۔ الو کے پٹھے (دو دفعہ ٹھوکر مارتا ہے۔
سوبھاگا ہلتا تک نہیں۔)

بودو:

(نتھو اور شکورے سے) ذرا میری مدد کرو۔

شکورا:

کیسے؟

بودو:

اسے اٹھا دو۔

(نتھو اور شکورا دونوں پکڑ کر سوبھاگا کو کھڑا کر دیتے
ہیں۔ چند لمحوں کے لئے کھڑا رکھتے ہیں۔ پھر جوں ہی اسے
چھوڑتے ہیں وہ پھر اسی دم گر جاتا ہے۔)

بودو:

اسے پکڑے رکھو۔ چھوڑو مت۔ اٹھاؤ۔

شکورا:

لعنت بھیجو جی۔

نتھو:

آؤ ایک دفعہ پھر کوشش کر دیکھیں۔

شکورا:

کیا سمجھتا ہے یہ؟

(وہ دونوں پھر اسے اٹھاتے ہیں، کھڑا کرتے ہیں۔)

بودو:

اسے گرنے مت دینا (سوبھاگا کے بوجھ سے نتھو اور شکورا دونوں جھک جاتے ہیں۔) ہلو مت۔ (بودو اپنا بیگ اور باسکٹ سوبھاگا کے قریب لاتا ہے۔) اسے مضبوطی سے تھامے رہو۔ (بودو بیگ سوبھاگا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، وہ اسے فوراً گرا دیتا ہے۔)

بودو:

تھامے رہو اسے۔ (وہ پھر کوشش کر کے اپنا بیگ اور باسکٹ سوبھاگا کے سر پر رکھتا ہے۔ سوبھاگا جوں ہی بوجھ اپنے سر پر محسوس کرتا ہے وہ بے شعوری انداز میں اپنی انگلیوں سے اسے چھوتا ہے۔ اسے ہوش آنے لگتا ہے۔ اس کی انگلیاں مضبوطی سے بوجھ کو پکڑنے لگتی ہیں۔) ہاں، اب تم اسے چھوڑ سکتے ہو۔ (نتھو اور شکورا سوبھاگا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سوبھاگا چکراتا ہے، گرنے کے قریب ہے۔ مگر چونکہ اس کے سر پر بوجھ ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے۔ گرتا نہیں۔ بوجھ اٹھا کر کھڑا رہنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ باقی سامان بھی اٹھانے لگتا ہے۔) بودو پیچھے ہٹ کر رسی کو جھٹکا دیتا ہے اور کہتا ہے) آگے چلو...(سوبھاگا ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔) پیچھے ہٹو (سوبھاگا پیچھے ہٹتا ہے۔) مڑ جاؤ! (سوبھاگا مڑتا ہے۔) ہو گیا...سب ٹھیک ہو گیا۔ بہت بہت شکریہ آپ دونوں حضرات کا...یہ اب چل سکتا ہے۔ اس لئے اب میں (اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے) اب میں...ارے میری واچ کدھر گئی...ہاف ہنٹر...سترہ جوئل والی...میرے دادا نے مجھے تحفے میں دی تھی...جانے کہاں...

شکورا:

شاید تمہاری اندر کی جیب میں ہے۔

نتھو:

(بودو کے دل پر کان لگا کے سنتا ہے) مگر اسے ٹک ٹک تو کرنا چاہئے۔ کوئی آواز نہیں آتی (سر انکار میں ہلاتا ہے۔)

شکورا:

تم جہاں کان لگائے بیٹھے ہو وہ ان کا دل ہے۔

نتھو:

دل ہے تو بند کیوں ہے۔ کوئی آواز نہیں آتی۔

شکورا:

ذرا نیچے جا کر سنو۔

(نتھو بودو کے پیٹ پر کان لگاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خوش ہو کر کہتا ہے) گھڑی تمھارے پیٹ میں ہے۔

بودو:

تم دونوں میں سے کس کے پاس سے یہ بدبو آرہی ہے

نتھو:

(شکورے کی طرف اشارہ کر کے) اس کے منھ سے آتی ہے۔ میرے پاؤں سے۔

بودو:

اچھا تو میں چلتا ہوں۔

نتھو:

اچھا تو رام رام۔

بودو:

رام رام۔

شکورا:

خدا حافظ۔

بودو:

خدا حافظ۔

(خاموشی۔ بودو ہلتا تک نہیں۔ سب اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔)

شکورا:

تو پھر خدا حافظ۔

بودو:

خدا حافظ۔

نتھو:

رام رام۔

بودو:

رام رام۔

بودو:

آپ کا شکریہ۔

شکورا:

آپ کا بھی۔

بودو:

نہیں نہیں۔

نتھو:

ہاں ہاں۔

بودو:

نہیں نہیں۔

شکورا:

ہاں ہاں (خاموشی۔)

بودو:

ایسا لگتا ہے۔ بڑا مشکل ہے۔ یہاں سے جانا۔

نتھو:

اسی کا نام زندگی ہے۔

(بودو گھوم کر سوبھاگا سے دور جاتا ہے، رسی زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔)

شکورا:

مگر تم اُلٹی طرف جا رہے ہو۔

(بودو رسی ڈھیلی چھوڑتے چھوڑتے ونگ کے اندر پہنچ جاتا ہے۔) تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ (شکورا اور نتھو دونوں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بودو چابک چلا کر جیسے گدھے کو آواز دیتے ہوئے) تخ تخ... ہش ہو۔

شکورا:

ہش ہو۔

نتھو:

ہش ہو۔

(سوبھاگا دوسری طرف چلنے لگتا ہے۔ دوسرے ونگ کی جانب چلتا جاتا ہے۔ رسہ تن جاتا ہے۔ اب مخالف ونگ سے رسے کا آخری سرا ہاتھ میں پکڑے ہوئے بودو نمودار ہوتا ہے۔ چابک چلاتے ہوئے بلند آواز میں کہتا ہے۔ اور تیز چلو... تیز... اور تیز۔ رفتار تیز کرتے ہوئے سوبھاگا ونگ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ یکایک بودو کی نظر اپنے اسٹول پر پڑتی ہے۔ وہ مڑ کر نتھو سے کہتا ہے) اسٹول! (نتھو اسٹول دیتا ہے۔ مڑنے سے رسہ زیادہ تن گیا ہے۔ ونگ میں سوبھاگا کے گرنے کی آواز آتی ہے۔ اس سے ذرا پہلے بودو اسٹول کو ونگ میں پھینک چکا ہے اب وہ خود جلدی سے ونگ کے اندر یہ کہتے ہوئے چلا جاتا ہے)

بودو:

الوداع۔

شکورا:

الوداع۔

بودو:

(ونگ کے اندر سے آوازیں) اٹھو گدھے۔ سور۔ اٹھو۔ سور۔ الوداع۔ اٹھو سور۔

الوداع۔

(آخر میں چابک کی ایک آواز۔ پھر مکمل خاموشی۔)

شکورا:

(لمبی سانس لے کر) وقت اچھا گذرا۔

نتھو:

وقت کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتا ہے۔

شکورا:

مگر اتنی جلدی نہ گذرتا۔

نتھو:

ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

شکورا:

کچھ نہیں۔

نتھو:

تو چلو چلیں۔

شکورا:

نہیں جا سکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں؟

شکورا:

گودو کا انتظار ہے!

نتھو:

آہ!

شکورا:

وہ کتنے بدل گئے ہیں۔

نتھو:

وہ کون؟

شکورا:

وہ دونوں۔

نتھو:

نیک خیال ہے۔ آؤ کچھ بات بنائیں۔

شکورا:

کیا نہیں۔

نتھو:

کیا۔

شکورا:

بدلے؟

نتھو:

یقیناً بدلے ہوں گے۔ سبھی لوگ بدل جاتے ہیں۔ ہم دونوں کے سوا۔

شکورا:

ہم دونوں نہیں بدلتے... کیوں؟

نتھو:

بھول جاؤ۔ اور یہ سوچو کہ... ہائے!

شکورا:

کیا ہوا؟

نتھو:

پاؤں میں درد ہوتا ہے۔

ایک لڑکا:

(ایک آواز) مسٹر!

(دونوں دیکھتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا لڑکا سہما ہوا آتا ہے۔)

لڑکا:

مسٹر؟

شکورا:

آگے آؤ بچے۔

نتھو:

کیا چاہیے؟

شکورا: آگے آؤ۔

(لڑکا سہما ہوا ڈرا کھڑا ہے۔ آگے نہیں بڑھتا۔)

نتھو:

(ڈپٹ کر) جب تم سے کہا جائے آگے بڑھو تو آگے بڑھو۔

شکورا:

کیا ہے؟

لڑکا:

مسٹر گودو...

شکورا:

ہاں ہاں آگے بڑھ کر کہو۔

(لڑکا کھڑا رہ جاتا ہے)

نتھو:

(غصے سے) آگے آؤ۔

شکورا:

(لڑکا آگے آجاتا ہے) تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟

نتھو:

تم گوردو سے کوئی سندیسہ لے کر آئے ہو؟

لڑکا:

جی ہاں۔

شکورا: کیا پیغام ہے؟

نتھو:

اتنی دیر کیوں کی؟

(لڑکا کبھی نتھو کبھی شکورے کی طرف دیکھتا ہے۔)

شکورا:

وہ بات چھوڑو۔

نتھو:

تم میری بات چھوڑو (لڑکے سے) تمھیں معلوم ہے اس وقت کیا وقت ہے؟

لڑکا:

اس میں میرا کیا قصور ہے جناب؟

نتھو:

تمھارا نہیں کیا میرا ہے؟

لڑکا:

میں ڈرتا تھا جناب۔

نتھو:

ڈرتے تھے؟ کس سے؟ ہم سے؟ بولو!

شکورا: میں بتاؤں وہ ان دونوں سے ڈرتا تھا۔

شکورا: کب سے یہاں چھپے کھڑے تھے؟

لڑکا:

بہت دیر سے جناب۔

شکورا:

تمھیں اس کی چابک سے ڈر لگتا تھا؟

لڑکا:

ہاں جناب۔

نتھو:

اس کی گرج سے؟

لڑکا:

ہاں جناب۔

نتھو:

وہ بڑے آدمی۔

لڑکا:

ہاں جناب۔

نتھو: تم انھیں جانتے ہو؟

لڑکا:

نہیں جناب۔

شکورا: کیا تم اسی علاقے کے رہنے والے ہو؟

لڑکا:

ہاں جناب۔

نتھو:

بالکل جھوٹ بولتا ہے (لڑکے کو زور سے جھنجوڑ کر) سچ سچ بتاؤ۔

لڑکا:

بالکل سچ کہہ رہا ہوں جناب!

شکورا:

تمھیں ہوا کیا ہے؟ کیوں اس بے چارے کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ (لڑکے کو نتھو سے چھڑا لیتا ہے۔ نتھو غم اور غصے سے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے) تمھیں ہوا کیا ہے؟

نتھو:

میں سخت پریشان ہوں۔

شکورا:

کب سے؟

نتھو:

معلوم نہیں کب سے۔

شکورا:

عجب بھلکو ہو... ایسی اہم بات بھول جاتے ہو (لڑکے سے مخاطب ہو کر) اچھا تو کہو۔

لڑکا:

مسٹر گوردو۔

شکورا:

میں نے تمھیں شاید کہیں دیکھا ہے۔

لڑکا:

مجھے معلوم نہیں جناب۔

شکورا:

تم مجھے نہیں جانتے؟
لڑکا:
نہیں جناب۔
نتھو:
آج تم پہلی بار ادھر آئے ہو؟
لڑکا:
ہاں جناب۔
شکورا:
باتیں۔ہی باتیں۔(لہجہ بدل کر) اچھا تو کہو جو کہنا ہے ایک دم کہہ ڈالو۔
لڑکا:
جناب مسٹر گودو نے کہا ہے۔ مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو کہہ دوں کہ وہ آج شام کو نہیں آسکیں گے۔ مگر کل ضرور آئیں گے۔ (خاموشی۔ نتھو کی سسکی۔)
شکورا:
بس؟
لڑکا:
بس جناب۔
شکورا:
تم مسٹر گودو کے نوکر ہو؟
لڑکا:
جی ہاں جناب۔
نتھو:
کیا کام کرتے ہو؟
لڑکا:
ان کی بکریوں کو گھاس چراتا ہوں۔
شکورا:
اس کا سلوک تم سے اچھا ہے؟
لڑکا:
اچھا ہے جناب۔
نتھو:
وہ تمھیں پیٹتا نہیں؟
لڑکا:
نہیں وہ مجھے نہیں پیٹتا۔
نتھو:
تو پھر کس کو پیٹتا ہے؟
لڑکا:
میرے بھائی کو سرکار۔
شکورا:
اوہ! تمھارا ایک بھائی بھی ہے؟
لڑکا:
ہاں جناب۔
شکورا:
وہ کیا کام کرتا ہے؟
لڑکا:
وہ مسٹر گودو کی بھیڑیں چراتا ہے۔
شکورا:
تو مسٹر گودو تمھیں کیوں نہیں پیٹتا؟
لڑکا:
مجھے معلوم نہیں سرکار۔
نتھو:
کیا وہ تمھیں کھانے کو دیتا ہے (لڑکا ہچکچاتا ہے) پیٹ بھر کے کھانے کو دیتا ہے؟
لڑکا:
کھانے کو دیتا ہے۔
نتھو:
تم وہاں پر خوش ہو۔ سنتے ہو میں کیا پوچھ رہا ہوں؟
لڑکا:
ہاں جناب۔
نتھو:
تو جواب دو۔
لڑکا:
مجھے۔ معلوم نہیں۔ جناب۔
شکورا:
یعنی تم نہیں بتا سکتے کہ تم مسٹر گودو کی نوکری کر کے خوش ہو یا ناخوش ہو۔
لڑکا:
نہیں جناب۔
شکورا:
تم بالکل میری طرح ہو (وقفہ) تم کہاں رہتے ہو؟
لڑکا:
مویشی خانے میں۔

شکورا:

اپنے بھائی کے ساتھ؟

لڑکا:

ہاں جناب (خاموشی۔)

شکورا:

ٹھیک... تم جا سکتے ہو۔

لڑکا:

میں مسٹر گودو کو کیا جواب دوں جناب؟

شکورا:

کہنا۔ کہہ دینا۔ تم نے ہم دونوں کو دیکھا تھا... تم نے ہم دونوں کو دیکھا ہے نہ؟

لڑکا:

ہاں جناب۔

شکورا:

(اداس ہو کر) بس یہی کہہ دینا۔

(لڑکا جلدی سے بھاگ جاتا ہے۔ یکایک روشنیاں بالکل مدھم ہو جاتی ہیں۔ ایک لمحے میں رات ہو جاتی ہے۔ پھر زرد رو چاند نکل آتا ہے۔ چاند اپنی پھیکی پیلی غم زدہ روشنی اسٹیج پر ڈال رہا ہے۔)

شکورا:

آخر کار۔

(نتھو اپنے دونوں جوتے ہاتھ میں جھلاتے ہوئے شکورے کی طرف بڑھتا ہے۔)

شکورا:

تم کیا کر رہے ہو؟

نتھو:

تھک کر پیلا ہو گیا ہے یہ چاند۔ افق در افق گھومتے گھومتے اور ہمارے ایسوں کو تکتے تکتے پھیکا پڑ گیا ہے (نتھو بے حد غم زدہ ہے۔)

شکورا:

یہ جوتے... ان کا کیا کرو گے؟

نتھو:

میں ان کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ کوئی دوسرا راہی آئے گا۔ میری طرح... شاید اس کے پاؤں مجھ سے چھوٹے ہوں گے... وہ ان جوتوں کو پہن کر خوش ہو جائے گا۔

شکورا:

مگر تم ننگے پاؤں کیسے چل سکو گے؟

نتھو:

مہرشی وشوامتر چلتے تھے۔ اور منصور۔ اور حضرت مسیح۔

شکورا:

تم اپنا مقابلہ حضرت مسیح سے کرنا چاہتے ہو۔

نتھو:

پیغمبری میں نہیں ننگے پن میں۔

شکورا:

تو پھر سولی پر چڑھنے کے لئے بھی تیار رہو۔

(نتھو سر جھکا لیتا ہے، خاموشی۔)

نتھو:

(سر اٹھا کر) اب ہم یہاں پر کیا کر رہے ہیں؟

شکورا:

(اداس لہجے میں) کہیں پر بھی جا کر کیا کریں گے؟

نتھو:

(شکورے کے قریب آ کر) اس قدر اداس نہ ہو شکورے۔ کل کا دن بہتر ہوگا۔

شکورا:

یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟

نتھو:

تم نے سنا نہیں اس لڑکے نے کیا کہا تھا؟

شکورا:

پھر تو ہمیں یہاں انتظار کرنا چاہئے۔

نتھو:

پاگل ہوئے ہو۔ رات بڑھ چلی ہے۔ ہمیں کہیں پر پناہ لینی چاہئے۔

(شکورا اور نتھو ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں پھر الگ ہو جاتے ہیں۔)

شکورا:

آؤ چلیں۔

(دونوں تھکے ہوئے قدموں سے چلتے ہیں۔ درخت کے پاس پہنچ کر نتھو رک جاتا ہے۔ شکورا بھی مڑ کر دیکھنے لگتا ہے۔)

نتھو:

افسوس ہے۔ ہمارے پاس ایک رسی بھی نہیں۔

شکورا:

چلو۔ چلو۔ سردی بڑھ رہی ہے۔

نتھو:

کل مجھے یاد دلانا۔ کل ضرور ایک رسی لیتے آئیں گے۔

شکورا:

ہاں ہاں۔ مگر اب تو چلو۔

(دو قدم چل کر)

نتھو:

کب سے ہم لوگ اکٹھے ہیں؟

شکورا:

پچاس برس۔ نہیں پانسو برس۔ شاید ہزار برس۔

نتھو:

کب سے ہم دونوں ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش میں ہیں؟

شکورا:

لیکن ہم مرتے نہیں۔

نتھو:

مگر ٹھیک سے جیتے بھی تو نہیں۔

شکورا:

(کانپ کر) مجھے سردی لگ رہی ہے۔

نتھو:

ٹھہرو۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر ہم دونوں الگ الگ چلتے دو مختلف سڑکوں پر۔

شکورا:

دو الگ الگ سڑکیں آگے چل کر مل بھی سکتی ہیں۔

نتھو:

ہاں اس کا کیا بھروسا (نتھو اپنے ٹیلے پر بیٹھ جاتا ہے۔)

شکورا:

اگر تم سمجھتے ہو کہ ہمیں الگ رہنا چاہئے تو ہم اب بھی الگ ہو سکتے ہیں۔

نتھو:

نہیں یہ ناممکن ہے۔ اب تو محبت میں اور نفرت میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔

شکورا:

تو پھر آؤ چلیں (اپنی ٹانگیں ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے جھلاتا ہے۔)

نتھو:

ہاں واقعی اب چل دینا چاہئے۔ (دونوں ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگیں جھلاتے ہیں مگر اٹھتے نہیں... آہستہ آہستہ ماہتاب غروب ہو جاتا ہے۔)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

دوسرا دن، وہی جگہ، وہی وقت۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج کے مرکز میں نتھو کے لانگ بوٹ کھڑے نظر آتے ہیں۔ سو ہیٹ کی ٹوپی ان کے قریب رکھی ہے۔ پیڑ پر دو چار ہرے پتے نکل آئے ہیں۔ نتھو داخل ہوتا ہے۔ پیڑ کے قریب آ کر رک جاتا ہے۔ غور سے اسے دیکھتا ہے۔ اضطراب کے عالم میں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومتا ہے۔ جوتوں کے قریب آ کے رکتا ہے۔ پھر دائیں ونگ کے قریب جا کر مخالف سمت نظر دوڑاتا ہے۔ پھر بائیں ونگ کے قریب جا کر دوسری طرف نظر دوڑاتا ہے۔ پھر سیٹی بجاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گنگنانے لگتا ہے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کہ خوشی...

(شکورا داخل ہوتا ہے۔ کپڑے پہلے سے زیادہ پھٹے ہوئے۔ دو ایک جگہ زخموں کے نشان اور خون کی دھاریاں سوکھی سوکھی ہوئی۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر نتھو گانا بند کر دیتا ہے اور زور سے چلاتا ہے)

نتھو:

شکورے! قریب آؤ۔ میرے گلے سے لگ جاؤ۔

شکورا:

مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ (نتھو حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے، کہتا ہے)

نتھو:

کیا تم چاہتے ہو میں یہاں سے چلا جاؤں (قریب جا کر شکورے کو غور سے دیکھ کر) ارے۔ تجھے کس نے مارا؟ تو نے رات کہاں گذاری؟

شکورا:

مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھ سے کوئی سوال مت کرو۔ مجھ سے بات مت کرو۔ (وقفہ) میرے ساتھ رہو۔

نتھو:

میں کبھی تم سے الگ ہوا؟

شکورا:

تم نے مجھے جانے کیوں دیا؟

نتھو:

میری طرف دیکھو۔ شکورے میری طرف دیکھو۔

(دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔ بڑھتے ہیں۔ پیچھے ہٹتے ہیں۔ کوئی ایک کشش ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے۔ کوئی ایک نفرت ہے جو انھیں ایک دوسرے سے پرے دھکیلتی ہے۔ آخر میں کشش غالب آجاتی ہے۔ دونوں تیزی سے آگے بڑھ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوجاتے ہیں بغل گیر ہونے کے بعد جب الگ ہوتے ہیں تو شکورا لڑکھڑا جاتا ہے۔)

شکورا:

بھیانک رات تھی۔

نتھو:

مجھے بتاؤ کس نے تمھیں مارا؟

شکورا:

چلو ایک دن اور گذر گیا۔

نتھو:

ابھی کہاں گذرا۔

شکورا:

میرے لئے گذر گیا۔ اب کچھ بھی ہو مجھے کیا۔ (وقفہ) میں جب آیا تم گا رہے تھے۔

نتھو:

ہاں کچھ گنگنا رہا تھا۔

شکورا:

اس بات نے آخری کیل ٹھونک دی... میں نے اپنے آپ سے کہا۔ نتھو سمجھتا ہے شکورا ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ اس لئے وہ خوش ہے اور گا رہا ہے۔

نتھو:

موڈ آتے ہیں انسان پر... آج صبح سے میں اچھے موڈ میں ہوں رات کو جب میں کروٹ لے کر سویا تو صبح تک ایک بار بھی نہیں اٹھا۔

شکورا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں نہیں ہوتا ہوں تم آرام سے رہتے ہو۔

نتھو:

نہیں۔ تم مجھے یاد آئے۔ بہت یاد آئے۔ مگر میں خوش بھی رہا، ہے نہ عجیب بات؟

شکورا:

(چونک کر) تم خوش رہے؟

نتھو:

شاید خوشی کا لفظ اس موڈ کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔

شکورا:

اور اب؟

نتھو:

اب؟... تم پھر یہاں ہو (خوش ہوتا ہے) ہاں! (خوشی سے) ہم دونوں یہاں ہیں (اداس ہوکر) میں پھر یہاں ہوں۔

شکورا

: دیکھا۔ جب تم اکیلے ہوتے ہو تو اچھے موڈ میں رہتے ہو۔ میں بھی تم سے الگ رہ کر بہتر محسوس کرتا ہوں۔

نتھو:

تو پھر تم... میں۔ ہم دونوں آج یہاں پر کیوں اکٹھے ہوگئے؟

شکورا:

ہم دونوں کو اس کا انتظار ہے۔

نتھو:

رات کو اگر میں تمھارے ساتھ ہوتا تو میں تمھیں پٹنے نہ دیتا۔

شکورا:

تم روک بھی نہیں سکتے تھے۔

نتھو:

کیوں نہیں؟

شکورا:

میں اکیلا تھا۔ وہ دس تھے۔

نتھو:

نہیں۔ نہیں۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں پٹنے سے پہلے ترکیب اختیار کرتا۔ تمھیں اس حرکت سے روک دیتا جس کی وجہ سے انھوں نے پیٹا۔

شکورا:

میں کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

نتھو:

تو پھر انھوں نے تمھیں کیوں پیٹا؟

شکورا:

مجھے معلوم نہیں۔

نتھو:

نہیں۔ شکورے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم غیر محسوس طریقے پر کچھ ایسی باتیں کر جاتے ہو

کہ...

شکورا:

(ٹوک کر) میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔

نتھو:

ممکن ہے تم کچھ نہیں کر رہے تھے۔ لیکن جس انداز سے تم کچھ نہیں کر رہے تھے وہ بہت اہم ہے۔ تاکہ تم جی سکو۔

شکورا:

مگر میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔

نتھو:

مگر اندر سے۔ دل کے اندر سے تمھیں خوش ہونا چاہئے۔

شکورا:

کیوں؟

نتھو:

کیوں کہ ہم دونوں یک جا ہیں۔

شکورا:

کیا تم یہ بات سچے دل سے کہہ رہے ہو؟

نتھو:

اگر یہ بات سچ نہیں ہے۔ تب بھی تمھیں یہی کہنا چاہئے۔

شکورا:

مجھے کیا کہنا چاہئے؟

نتھو:

کہو کہ میں خوش ہوں۔

شکورا:

میں خوش ہوں۔

نتھو:

میں بھی خوش ہوں۔

شکورا:

میں بھی خوش ہوں۔

نتھو:

ہم دونوں خوش ہیں۔

شکورا:

ہم دونوں خوش ہیں... (اداس ہوکر) اور اب جب کہ ہم دونوں اس قدر خوش ہیں ہم کیا کریں؟

نتھو:

گودو کا انتظار۔

شکورا:

کل سے یہ جگہ کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔

نتھو:

اور اگر وہ نہ آیا؟

شکورا:

پھر دیکھیں گے۔ مگر میں کہہ رہا تھا کل سے یہ جگہ بدلی نظر آتی ہے۔ اس پیڑ کو دیکھو... دیکھو (ہرے پتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہر شے رس ٹپکاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ (ذرا غصے سے) کیا دیکھوں؟... یہ پیڑ کل بھی یہاں موجود تھا۔

نتھو:

تھا تو... مگر یہ ہرے پتے۔

شکورا:

تم بھول گئے۔ کل ہم اسی پیڑ سے لٹک کر مر جانا چاہتے تھے۔ مگر تم نے ایسا کرنے نہ دیا۔ یاد ہے؟

نتھو:

(ہنس کر) تم نے یہ سب شاید سپنے میں دیکھا ہوگا۔

شکورا:

کیا واقعی تمھیں یاد نہیں؟

نتھو:

بس میں اسی طرح کا ہوں۔ یا تو میں فوراً بھول جاتا ہوں۔ یا۔ کبھی نہیں بھولتا۔

شکورا:

کل یہاں بودو اور سوبھاگا بھی تھے۔ کیا وہ دونوں بھی تمھیں یاد نہیں؟

نتھو:

بودو اور سوبھاگا؟

شکورا:

(خوش ہوکر) معلوم ہوتا ہے سب بھول گیا (حاضرین سے۔)

نتھو:

مجھے ایک پاگل سا یاد پڑتا ہے جس نے زور سے مجھے لات ماری تھی۔ اور بعد میں پاگلوں کی طرح ناچا تھا۔

شکورا:

وہ۔ وہی تھا سوبھاگا۔

نتھو:

ہاں یاد آرہا ہے مگر یہ واقعہ کب ہوا؟

شکورا:

اور اس کا مالک۔ بودو۔ وہ بھی تمھیں یاد نہیں۔

نتھو:

اس نے مجھے اپنا بچا ہوا کھانا دیا تھا۔

شکورا:

وہی تھا بودو۔

نتھو:

اور یہ سب کچھ کل ہوا۔ واقعی!

شکورا:

واقعی۔

نتھو:

اور اب ہم کہاں ہیں۔

شکورا: اسی جگہ۔ کیا تم اس جگہ کو بھی نہیں پہچانتے؟

نتھو:

(اک دم بھڑک کر) پہچانتے؟... اس میں پہچاننے کی کون سی بات ہے؟ میری ساری کیڑے مکوڑوں بھری غلیظ زندگی اس کیچڑ میں گذری ہے۔ اور تم پوچھتے ہو کیا میں اس جگہ کو پہچانتا ہوں۔ (ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے) اس کوڑے کباڑ کو دیکھو۔ زندگی بھر مجھے کوئی دوسری جگہ نہ ملی۔

شکورا:

ٹھنڈے ہو جاؤ... ٹھنڈے میرے بھائی۔

نتھو:

مجھ سے کیڑوں کی بات کرو۔ اور کیچڑ کی...

شکورا:

پھر بھی یہ جگہ۔ اس جگہ۔ اس دوسری جگہ سے بالکل نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر سکھ بھرے دیش سے۔

نتھو:

سکھ بھرے دیش کی کون بات کرتا ہے۔ میں تو دکھ بھرے دیش کی بات کرتا ہوں۔

شکورا:

مگر تم خود گئے تھے وہاں سکھ بھرے دیش میں کبھی؟

نتھو:

نہیں... میں تو بھک مرے دیش کی بات کرتا ہوں۔

شکورا:

مگر ہم دونوں وہاں تھے۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں۔ ہم دونوں وہاں تھے۔ اور اودے انگوروں کے خوشے ہری ڈالیوں سے لٹک رہے تھے اور پرندے چہچہا رہے تھے اور وہ جگہ بے حد پربہار تھی۔ تمھیں یاد ہے؟

نتھو:

ہو سکتا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں رہا۔

شکورا:

وہاں سب پتے ہرے تھے۔

نتھو:

نہیں.. نہیں... میں تم سے کہتا ہوں مجھے کچھ یاد نہیں۔

شکورا:

تمھارے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ نتھو۔

نتھو:

کیوں نہ ہم الگ ہو جائیں۔

شکورا:

الگ ہو کر بھی ہم الگ نہیں ہو پاتے۔ پھر دوڑے دوڑے آتے ہیں ایک دوسرے کے قریب۔

نتھو:

سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ ہم مر جائیں۔ دوسروں کی طرح۔

شکورا:

دوسروں کی طرح۔ کن دوسروں کی طرح؟

نتھو:

ان دوسرے اربوں انسانوں کی طرح۔

شکورا:

ہر آدمی کے لئے ایک سولی ہے۔ جب تک وہ مر نہ جائے۔ اور بھلا نہ دیا جائے۔

نتھو:

جب تک آؤ ٹھنڈے دل سے بات چیت کریں کیوں کہ ہم چپ نہیں رہ سکتے۔

شکورا:

تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس باتوں کا خزانہ ہے۔

نتھو:

اس لئے آج سے سوچ بچار بند۔

شکورا:

ہمارے پاس اس کی وجہ بھی ہے۔

نتھو:

آج سے ہم کچھ نہیں سنیں گے۔

شکورا:

اس کی وجہ بھی ہے۔

نتھو:

وہ تمام مردہ آوازیں۔
شکورا:
پروں کی طرح پھڑ پھڑاتی ہیں۔
نتھو:
پتوں کی طرح۔
شکورا:
ریت کی طرح۔
نتھو:
پتوں کی طرح۔(خاموشی)
شکورا:
سب اکٹھا بولنا چاہتی ہیں۔
نتھو:
ہر آواز اپنے لئے۔(خاموشی)
شکورا:
سرگوشی کرتی ہے۔
نتھو:
سرسراتی ہے۔
شکورا:
سرگوشی کرتی ہے۔(خاموشی)
نتھو:
کیا کہتی ہے؟
شکورا:
کچھ اپنی زندگی کے بارے میں۔
نتھو:
کہ صرف زندہ رہنا کافی نہیں۔
شکورا:
کہ صرف مرجانا کافی نہیں۔
نتھو:
ہاں کافی نہیں۔
شکورا:
ان کی آوازیں نرم اور ملائم نہیں۔
نتھو:
پروں کی طرح۔
شکورا:
پتوں کی طرح۔
نتھو:
راکھ کی طرح
شکورا: پتوں کی طرح۔(خاموشی)
نتھو:
کچھ اور کہو۔
شکورا:
کوشش کر رہا ہوں۔(خاموشی)
نتھو:
کچھ بھی کہو۔
شکورا:
(آہ بھر کر) اب ہم کیا کریں گے؟
نتھو:
گودو کا انتظار۔
شکورا:
آہ! (خاموشی)
نتھو:
کس قدر بھیانک ہے یہ...
شکورا:
آؤ گائیں۔
نتھو:
نہیں نہیں۔ گانا نہیں ہوگا۔ آؤ۔ یہ گفتگو پھر سے شروع کریں۔
شکورا:
ہاں یہ آسان ہوگا۔
نتھو:
مگر شروع کرنا مشکل ہوتا ہے۔
شکورا:
کہیں سے بھی شروع کر سکتے ہیں۔
نتھو:
مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہاں سے شروع کریں۔
شکورا:
یہ تو سچ ہے۔(خاموشی)
نتھو:
کچھ کہو۔

شکورا:

کوشش کر رہا ہوں۔ (خاموشی)

نتھو:

کوشش کرنے سے سن بھی سکتے ہیں؟

شکورا:

ہاں۔

نتھو:

مگر سننے سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

شکورا:

ہاں۔

نتھو:

اس سے آدمی سوچنے سے بچ جاتا ہے۔

شکورا:

مگر پھر بھی سوچنا تو پڑتا ہی ہے۔

نتھو:

نہیں نہیں یہ ناممکن بات ہے۔

شکورا:

بہت خوب۔ آؤ ایک دوسرے کی بات کاٹیں۔

نتھو:

یہ بھی ناممکن ہے۔

شکورا:

کیا واقعی؟

نتھو:

ہاں اب ہم دونوں کچھ سوچ نہیں سکتے۔

شکورا:

پھر شکایت کیسی؟

نتھو:

سوچنا بہت برا بھی نہیں ہوتا۔

شکورا:

ممکن ہے نہ ہوتا ہو۔ مگر کم سے کم یہ وہ تو ہے۔

نتھو:

وہ کیا؟

شکورا:

اس سے خیال آیا آؤ ایک دوسرے سے سوال ہی کریں۔

نتھو:

تمھارا اس سے کیا مطلب تھا کہ کم سے کم یہ وہ تو ہے؟

شکورا:

یعنی اس سے مصیبت کچھ کم تو ہو جاتی۔

نتھو:

ہاں یہ درست ہے۔

شکورا:

اور اگر ہم اپنی مصیبتوں کے لئے شکر گذار ہونے لگیں۔

نتھو:

مصیبت ہے یہ سوچنا۔

شکورا:

مگر کیا کسی ایسی مصیبت سے ہمارا سامنا ہوا ہے؟

(حاضرین کی طرف بڑھتے ہوئے)

نتھو:

ایں؟ مگر یہ سب لاشیں کہاں سے آئی ہیں؟

(حاضرین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)

شکورا:

یہ ہڈیوں کے ڈھانچے؟

نتھو:

مجھے بتاؤ۔

شکورا:

تم درست کہتے ہو۔

نتھو:

اس کا مطلب ہے ہم نے رتی بھر سوچنے کی کوشش کی تھی۔

شکورا:

ہاں شروع میں کی تھی۔

نتھو:

ارے یہ تو مردوں کو جلانے کی بھٹی ہے۔ مردوں کے جلانے کی بھٹی۔

شکورا:

ادھر دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟

نتھو:

دیکھے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔

شکورا:

درست۔

ننھو:

یعنی جتنی بھی کوشش کوئی کرے۔

شکورا:

کیا؟

ننھو:

یعنی ہزار کوشش کے باوجود۔

شکورا:

میرا خیال ہے ہمیں فطرت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

ننھو:

وہ بھی ہم کر کے دیکھ چکے۔

شکورا:

درست۔

ننھو:

اوہ۔ مگر یہ اتنا برا بھی نہیں ہو سکتا۔

شکورا:

کیا؟

ننھو:

سوچنا۔

شکورا:

لیکن سوچے بغیر بھی تو زندہ رہا جا سکتا ہے۔ (خاموشی)

شکورا:

رو میں ہے رخش عمر۔

ننھو:

کب دیکھئے کہاں تھمے۔

شکورا:

نہ باگ ہاتھ میں ہے۔

ننھو:

نہ پا ہے رکاب میں۔ (خاموشی)

شکورا:

اب تو ٹھیک رہا۔

ننھو:

مگر اب کوئی نیا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

شکورا:

میں سوچتا ہوں۔

(سر سے ٹوپی اتار کر سوچنا شروع کرتا ہے)

ننھو:

میں بھی سوچتا ہوں۔

(سر سے ٹوپی اتار کر سوچنے لگتا ہے۔ اب شکورا اور ننھو دونوں سوچ رہے ہیں۔)

شکورا اور ننھو:

(دونوں خوش ہو کر) ہا!

(دونوں ٹوپی پہن لیتے ہیں۔ نہایت خوش نظر آتے ہیں۔)

ننھو:

ہوں؟ (شکورے کی طرف دیکھتا ہے)

شکورا:

میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہم یہاں سے جا سکتے ہیں۔

ننھو:

تم کیا کہہ رہے تھے کب؟

شکورا:

بالکل شروع میں۔

ننھو:

کس کے شروع میں؟

شکورا:

اس شام کے شروع میں۔ میں کہہ رہا تھا۔ میں۔ کیا کہہ رہا تھا۔

ننھو:

مجھ سے مت پوچھو۔ میں کوئی مورخ نہیں ہوں۔

شکورا:

ٹھہرو مجھے یاد آ رہا ہے۔ پہلے ہم گلے ملے۔ ہم خوش تھے۔ پھر خوش ہو کر ہم نے کیا کیا؟... انتظار... انتظار... انتظار کے بعد؟... ٹھہرو مجھے یاد آ رہا ہے۔ ہاں... یہ پیڑ!

ننھو:

پیڑ؟

شکورا:

تمہیں یاد نہیں؟

ننھو:

میں تھک چکا ہوں۔

شکورا:

پیڑ کو دیکھو۔ (دیکھتا ہے)

ننھو:

مجھے تو کوئی خاص بات اس میں نظر نہیں آتی۔

شکورا:

مگر کل تک یہ بالکل سیاہ اور ننگا تھا اور آج اس پر ہرے پتے آگئے ہیں۔

نتھو:

پتے۔

شکورا:

ایک ہی رات میں!

نتھو:

شاید بہار آگئی ہے۔

شکورا:

ایک ہی رات میں!

نتھو:

میں تم سے کہتا ہوں یہ ایک رات کا قصہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کل یہاں نہیں تھے۔ ضرور تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہوگا۔

شکورا:

تو اگر کل ہم یہاں نہیں تھے تو کل ہم کہاں پر تھے جناب؟

نتھو:

مجھے کیا معلوم؟ شاید کسی دوسری جگہ پر۔ اس دنیا میں خلا کی کوئی کمی نہیں ہے۔

شکورا:

اچھا۔ فرض کر لو کل ہم یہاں پر نہیں تھے۔ تو ہم کل شام کیا کر رہے تھے؟

نتھو:

کر رہے تھے؟

شکورا:

ہاں یاد کرو۔

نتھو:

کر رہے تھے؟ میرا خیال ہے ہم حسب معمول بکواس کر رہے تھے۔

شکورا:

کس کے بارے میں؟

نتھو:

اس کے بارے میں۔ اس کے بارے میں۔ کسی کے بارے میں۔ ہاں اب مجھے یاد آیا۔ ہم نے ساری شام بے ہودہ بکواس میں گذاری۔ پچھلے پچاس برس سے ہم دونوں یہی کر رہے ہیں۔

شکورا:

لیکن تم کوئی خاص بات یاد نہیں کر سکتے۔

نتھو:

مجھے پریشان مت کرو شکورے۔

شکورا:

میرا مطلب ہے چاند۔ سورج۔ ستارے۔ تمھیں کچھ یاد نہیں ہے؟

نتھو:

وہ تو حسب دستور ہوتے ہی ہیں شام کو۔

شکورا:

میرا مطلب ہے کوئی خاص امر تمھیں یاد نہیں۔

نتھو:

نہیں۔

شکورا:

اور بودو؟ اور سوبھاگا؟

نتھو:

کون؟

شکورا:

وہ ہڈیاں۔

نتھو:

کتنی پتلی اور باریک تھیں وہ ہڈیاں بالکل مچھلی کے کانٹے سے۔

شکورا:

وہ بودو نے تم پر عنایت کی تھی۔

نتھو:

مجھے معلوم نہیں۔

شکورا:

اور وہ لات؟

نتھو:

ہاں۔ ٹھیک ہے۔ کسی نے مجھے زور سے لات ماری تھی۔

شکورا:

وہ سوبھاگا تھا۔

نتھو:

اور یہ سب کچھ کل ہوا!

شکورا:

اپنی ٹانگ دکھاؤ۔

نتھو:

کون سی؟

شکورا:
دونوں... پتلون اوپر کرو۔
(نتھو ایک ٹانگ اٹھا کر شکورے کو دیتا ہے۔ لڑکھڑانے لگتا ہے۔ جب شکورا نتھو کی ٹانگ اٹھاتا ہے تو وہ دونوں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔)
شکورا:
پتلون اور کھینچو۔
نتھو:
نہیں کھینچ سکتا۔
(شکورا ایک ٹانگ سے پتلون اوپر اٹھاتا ہے۔ یہ ٹانگ ٹھیک ہے وہ اس ٹانگ کو جانے دیتا ہے۔ نتھو پھر لڑکھڑا جاتا ہے)
شکورا:
دوسری لاؤ (نتھو وہی ٹانگ شکورے کے حوالے کرتا ہے) دوسری سور۔ (نتھو دوسری ٹانگ دیتا ہے۔ ٹانگ پر سے پتلون اٹھا کے شکورا فاتحانہ انداز میں کہتا ہے)
شکورا:
یہ دیکھو کل کا زخم۔ اب تو گندہ بھی ہونے لگا ہے۔
نتھو:
تو کیا ہوا؟
شکورا:
(ٹانگ چھوڑ کر) تمھارے لانگ بوٹ کہاں ہیں؟
نتھو:
میں نے پھینک دیے۔
شکورا:
کب؟
نتھو:
معلوم نہیں۔
شکورا:
کیوں؟
نتھو:
یہ بھی معلوم نہیں کہ کیوں معلوم نہیں۔
شکورا:
ارے میں پوچھتا ہوں تم نے اپنے جوتے کیوں پھینک دیے؟
نتھو:
کیوں کہ انھیں پہن کر پاؤں دکھتے تھے۔ (یکا یک اسے جوتے نظر آ جاتے ہیں) وہ رہے میرے جوتے۔ بالکل اس جگہ پر جہاں کل رکھے تھے!
(نتھو جوتوں کو غور سے دیکھنے کے لیے ان کے قریب جاتا ہے۔)
نتھو:
مگر یہ تو میرے جوتے نہیں ہیں۔
شکورا:
تمھارے نہیں ہیں؟
نتھو:
نہیں۔ میرے تو کالے تھے۔ یہ بھورے ہیں۔
شکورا:
تمھارے جوتے کالے تھے؟
نتھو:
کالے اور بھورے کے بیچ کے تھے۔ مگر یہ تو۔
شکورا:
یہ بھورے ہیں کیا؟ دکھاؤ۔
نتھو:
دکھانے سے کیا ہوگا (جوتے کو ٹھوکر مار کر) یہ سالے جوتے... یہ کس کی حرم زدگی ہے۔
شکورا:
ٹھہرو۔ میں سمجھ گیا یہ بات کیا ہے... اب میں سمجھ گیا۔
نتھو:
جانے کس کی...
شکورا:
بات بالکل صاف ہے۔ کوئی آیا۔ اس نے تمھارے پہن لیے۔ اپنے تمھارے لیے چھوڑ گیا۔
نتھو:
کیوں چھوڑ گیا؟
شکورا: اس کے جوتے اس کے لیے تنگ ہوں گے اس لیے وہ تمھارے لے گیا۔
نتھو:
مگر میرے بھی تو تنگ تھے۔
شکورا:
تمھارے لیے تنگ تھے۔ اس کے لیے نہیں تھے۔
نتھو:
مجھے تنگ نہ کرو... آؤ چلیں۔
شکورا:

نہیں جاسکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں جاسکتے؟

شکورا:

ہمیں گوددکا انتظار ہے۔

نتھو:

اوہ...تو اب ہم کیا کریں۔کیا کریں؟

شکورا:

کچھ نہیں کرسکتے۔

نتھو:

مگر اب میں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتا۔

شکورا:

مولی کھاؤ گے؟

نتھو:

بس یہی کچھ ہے تمھارے پاس؟

شکورا:

نہیں شلغم بھی ہیں۔

نتھو:

گاجر نہیں ہے؟

شکورا:

نہیں اس کی وجہ ہے۔تم گاجریں۔کچھ زیادہ ہی کھاجاتے ہو۔

نتھو:

تو لاؤ ایک مولی ہی دو۔

(شکورا جیبیں ٹٹول کرنکالتا ہے۔سب شلغم نکلتے ہیں۔
آخر میں ایک مولی۔نتھو کو دیتا ہے۔نتھو غور سے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔)

نتھو:

یہ کالی ہے۔

شکورا:

جو کالی ہے وہ مٹی ہے۔مگر اندر اس کے مولی ہے۔

نتھو:

مجھے اس طرح کی مولی پسند نہیں ہے۔

شکورا:

تو مجھے واپس دے دو۔

(نتھو مولی اسے واپس کرتا ہے۔)

نتھو:

میں جاتا ہوں اور ایک گاجر لے کے آتا ہوں۔

(مگر وہ ہلتا تک نہیں۔)

شکورا:

کوشش کرنے کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔

نتھو:

ہر طرح کی کوشش کرلی۔

شکورا:

میرا اشارہ جوتوں کی طرف تھا۔

نتھو:

کیا یہ اچھی حرکت ہوگی؟

شکورا:

وقت تو گذرے گا کسی طرح! (نتھو ہچکچاتا ہے) میں تمھیں یقین دلاتا ہوں۔وقت گذارنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔

نتھو:

طریقہ نہیں تفریح۔

شکورا:

تفریح نہیں طریقہ۔

نتھو:

تفریح۔

شکورا:

چلو یوں ہی سہی، پہنو۔

نتھو:

تمھیں میری مدد کرنا پڑے گی۔

شکورا:

کروں گا۔

نتھو:

ہم دونوں مل کر کچھ کرہی لیتے ہیں۔گڑبڑ سڑبڑ۔

شکورا:

ہاں،ہاں۔چلو۔پہلے بایاں جوتا پہنو۔

نتھو:

ہم دونوں مل کر کسی نہ کسی طرح یہ احساس دلادیتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔

شکورا:

واقعی ہم لوگ جادوگر ہیں اگر ایسا نہ ہو کہ ہم بھول جائیں کہ ہم کیا کرنے بیٹھے

ہیں۔ اس لئے لاؤ اپنا پاؤں لاؤ۔ (نتھو اسے دایاں پاؤں دیتا ہے) دوسرا پاؤں سور۔ (نتھو اسے دوسرا پاؤں دیتا ہے۔ دونوں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ عجب مضحکہ خیز حالات میں شکورا نتھو کے ایک پاؤں میں جوتا پہنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔)

شکورا:

اب چل کے دیکھو۔

نتھو:

(نتھو چل کے دیکھتا ہے) ٹھیک ہے۔

شکورا:

(جیب سے ایک فیتہ نکال کر) آؤ۔ اب فیتہ باندھ دیں۔

نتھو: نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔

شکورا:

اچھا جیسی تمھاری مرضی... دوسرا جوتا پہنو (نتھو دوسرا جوتا پہن لیتا ہے۔)

نتھو:

یہ بھی فٹ ہے۔

شکورا:

دکھتا تو نہیں؟

نتھو:

نہیں۔

شکورا:

پھر تم ان جوتوں کو پہنے رہو۔

نتھو:

مگر... کچھ... بڑے ہیں (چل کر دیکھتا ہے۔)

شکورا:

پہنے رہو۔ ممکن ہے کسی دن تم جرابیں خرید سکو۔

نتھو:

یہ تم سچ کہتے ہو۔

شکورا:

تو گویا تم نے فیصلہ کر لیا کہ تم یہ جوتے...

نتھو:

بس بس جوتوں کے متعلق اتنی گفتگو کافی ہے۔ میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ مگر کہاں بیٹھوں؟

(آخر نتھو اپنے پرانے ٹیلے پر بیٹھ جاتا ہے۔)

شکورا:

کل بھی تم یہیں بیٹھے تھے۔

نتھو:

کاش مجھے نیند آ جائے۔

شکورا:

کل تم یہیں سو گئے تھے۔

نتھو:

آج بھی کوشش کرتا ہوں۔

(نتھو اکڑوں ہو کر اپنا سر اپنی ٹانگوں میں داب لیتا ہے۔)

شکورا:

ٹھہرو۔

(شکورا اس ٹیلے پر جا کر نتھو کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور ایک لوری زور سے گنگنانے لگتا ہے۔)

شکورا:

آ جا ری نندیا۔

نتھو:

(سر اٹھا کر) اتنے زور سے نہیں۔

شکورا:

(دھیمے دھیمے سروں میں) آ جا ری نندیا... آ جا ری نندیا... (نتھو کا سر سہلاتا ہے۔ نتھو سو جاتا ہے۔ شکورا آہستہ سے اٹھتا ہے۔ اور ونگ کے قریب کھڑا ہو کر بات اوپر نیچے کر کے ورزش کرتا ہے۔ یکایک نتھو چونک کر جاگ جاتا ہے۔ پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ شکورا جلدی سے دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے اسے اپنی بانہوں میں لے لیتا ہے۔)

شکورا:

ارے رے رے... گھبراؤ نہیں نتھو... میں موجود ہوں۔ تمھارے ساتھ ہوں!

(نتھو دہشت ناک نظروں سے دیکھتا ہے۔)

نتھو:

میں گر رہا تھا...

شکورا:

وہ سب ختم ہو گیا۔

نتھو:

میں ایک چوٹی پر سے پھسل کر نیچے...

شکورا: جانے دو... مجھے مت بتاؤ... آؤ سیر کریں۔ دل کو بہلائیں۔

(وہ نتھو کو بانہہ سے پکڑ کر ادھر ادھر چلاتا ہے۔ آخر میں نتھو تھک کر کہتا ہے)

نتھو:

بس بہت ہو گیا۔

شکورا:

یعنی تم سیر کرنا نہیں چاہتے۔

نتھو:

نہیں۔

شکورا:

جیسی تمھاری مرضی۔

نتھو:

شکورے آؤ یہاں سے چل دیں۔

شکورا:

نہیں جا سکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں؟

شکورا:

گودو کا انتظار ہے۔

نتھو:

اوہ... (شکورے کو چلتا دیکھ کر) تم نچلے نہیں بیٹھ سکتے؟

شکورا:

مجھے سردی لگ رہی ہے۔

نتھو:

ہم ذرا پہلے آ گئے۔

شکورا:

رات کو سردی ہو ہی جاتی ہے۔

نتھو:

مگر رات ابھی کہاں ہے؟

شکورا:

اک دم آ جائے گی۔ کل کی طرح

نتھو:

ہاں رات آ جائے گی۔

شکورا:

اور ہم جا سکیں گے۔

نتھو:

پھر دن آ جائے گا (مایوسی سے) پھر ہم کیا کریں گے۔ کیا کریں گے۔

شکورا:

چپ رہو۔ کب سے تمھاری واہیات بکواس سن رہا ہوں۔

نتھو:

(خفا ہو کے) میں جاتا ہوں۔

شکورا:

(سوبھاگا کی ٹوپی دیکھ کر) ارے!

نتھو:

الوداع۔

شکورا:

یہ رہی سوبھاگا کی ٹوپی۔ ایک گھنٹے سے میں یہاں ہوں اور میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔

نتھو:

اب تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔

شکورا:

یہ ٹوپی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم ٹھیک جگہ پر انتظار کر رہے ہیں۔ بس اب اس میں کوئی شک نہیں رہا (ٹوپی اٹھا کر لے) کسی زمانے میں بہت عمدہ ٹوپی رہی ہوگی۔ (اپنی ٹوپی اتار کر اسے پہن لیتا ہے۔ اور اپنی ٹوپی نتھو کے حوالے کرتا ہے) لو!

نتھو:

کیا؟

شکورا:

پکڑو اسے!

(نتھو شکورے کی ہیٹ لے لیتا ہے۔ شکورا سوبھاگا کی ہیٹ اپنے سر پر ٹھیک کرتا ہے۔ نتھو شکورے کی ٹوپی پہن کر اپنی ٹوپی شکورے کے حوالے کر دیتا ہے۔ شکورا نتھو کی ٹوپی لے لیتا ہے۔ نتھو شکورے کی ٹوپی اپنے سر پر ٹھیک کرتا ہے تو شکورا اب نتھو کی ٹوپی اپنے سر پر رکھ لیتا ہے اور سوبھاگا کی ٹوپی نتھو کو دیتا ہے۔ نتھو سوبھاگا کی ٹوپی لے لیتا ہے شکورا نتھو کی ٹوپی اپنے سر پر ٹھیک کرتا ہے۔ نتھو سوبھاگا کی ٹوپی اپنے سر پر رکھتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ٹوپیوں کے بدلنے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ دونوں میں فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آتا ہے جب سوبھاگا کی ٹوپی پھر زمین پر گر جاتی ہے۔ اس لیے نتھو شکورے کی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہے اور شکورا نتھو کی گاندھی کیپ۔ دونوں فاصلے سے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ نتھو شکورے کی ٹوپی سر پر پہنے ہوئے شکورے کی طرف دیکھ کر حیرت سے چلا کر کہتا ہے)

نتھو:

ارے نتھو!

(شکورا نتھو کی ٹوپی پہنے ہوئے نتھو کو شکورا سمجھ کر زور سے آواز دیتا ہے۔)

شکورا:

شکورے!

(دونوں باہیں پھیلا کر دوڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے
بغل گیر ہو جاتے ہیں۔)

نتھو:

(شکورے سے) نتھو تم اب تک کہاں تھے؟

شکورا:

(نتھو سے) شکورے میں کب سے تمھیں تلاش کر رہا تھا۔

(چند لمحے اسی طرح گلے ملتے ہوئے دونوں پھر
ٹوپیاں بدل لیتے ہیں۔ اب دونوں اپنی اپنی ٹوپیاں پہنے ہوئے
ہیں۔ اک دم دونوں ایک دوسرے کو دھکا دے کر الگ ہو جاتے
ہیں۔ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔)

شکورا:

کیا ہوا تھا؟

نتھو:

کچھ تو ضرور ہوا تھا۔

شکورا:

مجھے ایسا لگا جیسے ٹوپیاں بول رہی تھیں۔

نتھو:

سارا فرق ان ٹوپیوں کا ہے۔

شکورا:

ٹوپیوں کے نیچے ہم دونوں ہیں۔

نتھو:

لیکن جب ٹوپیاں بدل جاتی ہیں تو ہم بھی بدل جاتے ہیں۔

شکورا:

دوسری طرف، میں سوچتا ہوں کل رات اگر میں نے تمھاری ٹوپی پہنی ہوتی تو شاید
پٹنے سے بچ جاتا۔

نتھو:

وہ لوگ ہمیں پیٹنے کے بجائے ہماری ٹوپیوں کو کیوں نہیں پیٹتے؟

شکورا:

شش! کوئی آ رہا ہے! (دونوں غور سے سنتے ہیں)

نتھو:

(مایوس ہو کر) کوئی نہیں... ہوا سرکنڈوں میں شور مچا رہی ہے۔ (وقفہ)

شکورا:

میں چلتا ہوں۔

نتھو:

ایک کھیل کھیلو گے؟

شکورا:

کون سا کھیل؟

نتھو:

بودو اور سوبھاگا کا۔ میں سوبھاگا بنتا ہوں۔ تم بودو بن جاؤ۔

(شکورا سوبھاگا کا بوجھ اٹھا کر چلنے اور لڑکھڑانے کی اداکاری
کرتا ہے پھر نتھو سے کہتا ہے)

شکورا:

اب تمھاری باری ہے۔

نتھو:

میں کیا کروں؟

شکورا:

بودو کی طرح مجھے کوسو۔

نتھو:

(سوچ کر، ادا سے) جاؤ۔ بڑے نٹ کھٹ ہو۔

شکورا: ٹھیک طرح سے کوسو۔

نتھو:

(بن کر، ادا سے) اچھے نہیں۔ بالکل اچھے نہیں تم!

(شکورا بوجھ سے جھکا جا رہا ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے کہتا ہے)

شکورا:

اب مجھے سوچنے کے لئے حکم دو۔

نتھو:

کیا؟

شکورا:

کہو: سوچ سورا!

نتھو:

سوچ سور۔ (خاموشی)

شکورا:

نہیں سوچ سکتا۔

نتھو:

ہاں، بس بہت ہو گیا۔

شکورا:

مجھے ناچنے کے لئے کہو۔

نتھو:

میں جا رہا ہوں۔

شکورا:

(اپنے آپ سے) ناچ رے گدھے ناچ۔ (شکورا کھڑے کھڑے ناچنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتھو بائیں ونگ میں غائب ہو گیا ہے۔) مجھ سے یہ بھی نہیں ہوتا۔ (شکورا ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ نتھو کو غائب دیکھ کر گھبراتا ہے) نتھو! (گھبرا کر اسٹیج پر ادھر ادھر نتھو کو ڈھونڈتا ہے۔ بائیں ونگ سے نتھو ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ دونوں ٹکرا کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔)

شکورا:

تم کہاں چلے گئے تھے؟

نتھو:

وہ لوگ آ رہے ہیں۔

شکورا:

وہ کون؟

نتھو:

میں نہیں جانتا۔

شکورا:

کتنے لوگ ہیں؟

نتھو:

میں نہیں جانتا۔

شکورا: ضرور وہ گودو کے ہم رکاب ہوں گے۔ گودو آ رہا ہے۔ آخر کار۔ نتھو، گودو آ رہا ہے۔ اب ہم بچ جائیں گے۔ سمجھو اب ہماری مصیبتیں ختم ہو گئیں۔ آؤ آگے بڑھ کر گودو کا استقبال کریں۔

(شکورا نتھو کو بازو سے پکڑ کر بائیں ونگ کی جانب لے جانا چاہتا ہے۔ نتھو بازو چھڑا کر دائیں ونگ میں غائب ہو جاتا ہے۔ شکورا دوڑ کر بائیں ونگ میں چلا جاتا ہے۔ واپس آ کر وہ پلٹ کر بائیں جانب افق کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اس پوزیشن میں کھڑا ہے کہ دائیں جانب سے نتھو دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور شکورے سے ٹکرا جاتا ہے اور گھبرا کر کہتا ہے)

نتھو:

شکورے... بھاگو... بھاگو... وہ آ رہے ہیں۔ چاروں طرف سے انھوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ اب ہم بچ کر کدھر جا سکتے ہیں؟

شکورا:

(ادھر ادھر گھبرا کر دیکھتے ہوئے دہشت ناک نظروں سے) واقعی۔ مگر ایک راستہ ہے۔ (نتھو کو پکڑ کر اسٹیج کے آگے لاتا ہے اور حاضرین کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے) ہم ادھر سے بھاگ سکتے ہیں۔ یہاں تو کوئی انسان نظر نہیں آتا... چلو آگے بڑھ چلو۔ جلدی کرو۔ ادھر سے نکل بھاگیں گے۔ (نتھو کو دھکا دے کر سامنے حاضرین کی طرف دھکیلنا چاہتا ہے۔ نتھو پیچھے ہٹ جاتا ہے) میں تمھاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ میرے خیال میں... (وقفہ)... میرے خیال میں تمھیں اس پیڑ کے پیچھے چھپ جانا چاہئے۔ چلو جلدی کرو اس پیڑ کے پیچھے! (نتھو پیڑ کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پیڑ بہت چھوٹا ہے نتھو محسوس کرتا ہے کہ یہاں سے وہ سب کو نظر آتا ہے۔ خود ہی مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ کر چلا آتا ہے۔)

نتھو:

سب بے کار ہے... بتاؤ۔ اب کیا کریں؟

شکورا:

کچھ کرنے کو نہیں ہے۔

نتھو:

کیا تم انھیں آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے؟

شکورا:

کیا؟

نتھو:

کیا تم انھیں آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے؟

شکورا:

نہیں۔

نتھو:

میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ (خاموشی کا وقفہ)

شکورا:

(بلند لہجے میں) تو تم نے سپنا دیکھا ہوگا۔

نتھو: اس طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے؟

نتھو اور شکورا:

(دونوں اچانک ایک دوسرے کی طرف مڑ کر) کیا تم...

شکورا:

اوہ معاف کرنا۔

نتھو:

نہیں نہیں کہو۔

شکورا:

نہیں پہلے آپ۔

نتھو:

پہلے آپ۔

شکورا:

مجھ سے قطع کلام ہوا۔

نتھو:

میں نے آپ کی بات کاٹی۔

شکورا:

(غصے سے) اس تکلف کی کیا ضرورت ہے احمق۔

نتھو:

تم اپنی بات تو پوری کرو۔ گدھے۔

شکورا:

(قریب آتے ہوئے) تم پہلے اپنی بات۔

نتھو:

(طیش میں آکر) تم پہلے اپنی بات۔

شکورا:

سور۔

نتھو:

(اک دم لہجہ بدل کر اور خوش ہو کر) ہاں یہ خیال اچھا سوجھا ہے۔ آؤ۔ ایک دوسرے کو گالی دیں۔

(دونوں بالکل ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر گالی دینا شروع کرتے ہیں۔)

شکورا:

بدھو۔

نتھو:

چپر قناتی۔

شکورا:

چھچھورے۔

نتھو:

کمینے۔

شکورا:

گھٹیا۔

نتھو:

رذیل۔

شکورا:

کتے۔

نتھو:

بندر۔

شکورا:

کافر۔

نتھو:

لچے۔

شکورا:

قبر کے چوہے۔

نتھو:

موری کے کیڑے۔

شکورا:

غدار!

نتھو:

(جیسے گہری چوٹ کھائی ہو۔ نتھو اک دم آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی شکست کا اعلان کرتا ہے) بس! بس!!... اوہ مار ڈالا تم نے!

(گھوم کر سسکنے لگتا ہے۔)

شکورا:

آؤ صلح کرلیں۔

(نتھو آہستہ سے گھومتا ہے۔)

نتھو:

شکورے!

شکورا:

نتھو... اپنا ہات لاؤ۔

نتھو:

یہ لو۔

شکورا:

میری بانہوں میں آجاؤ۔

نتھو:

تمھاری بانہوں میں۔

شکورا:

میرے سینے سے لگ جاؤ۔

(شکورا بانہیں کھولتا ہے۔ دونوں بانہیں کھول کر بڑھتے ہیں۔ گلے ملتے ہیں۔ جدا ہوتے ہیں۔)

شکورا:

لطف آ گیا۔ کیا مزے میں وقت گذرا ہے۔ (خاموشی)

نتھو:

(اداسی سے) مگر اب کیا کریں؟

شکورا:

یعنی انتظار کے عالم میں۔

نتھو:

ہاں! اسی کی تو مصیبت ہے! (خاموشی)

شکورا:

آؤ ورزش کریں۔

نتھو:

یعنی ہماری حرکات۔

شکورا:

اور سکنات۔

نتھو:

اور خرافات۔

شکورا:

حرکات:

نتھو: خرافات۔

شکورا:

لہو گرم کرنے کے لئے۔

نتھو:

لہو ٹھنڈا کرنے کے لئے۔

شکورا:

تو شروع کرو۔

(نتھو ایک پاؤں اٹھاتا ہے۔ دوسرا زمین پر رکھتا ہے۔ پھر دوسرا اٹھاتا ہے۔ پہلا زمین پر رکھتا ہے۔ شکورا بھی اسی طرح کرتا ہے۔ تھوڑی دیر ایسا کرنے کے بعد نتھو کہتا ہے۔)

نتھو:

چھوڑو۔ میں تھک گیا۔

شکورا:

آج ہم لوگ موڈ میں نہیں ہیں۔ (سوچ کر) آؤ لمبے لمبے سانس کھینچیں۔

نتھو:

کھینچنا تو کیا سانس لینا بھی دشوار ہے۔

شکورا:

تم ٹھیک کہتے ہو۔ تو آؤ۔ پیڑ بن جائیں۔

نتھو:

پیڑ؟ کیسے بنیں؟

شکورا:

ایک ٹانگ کے سہارے کھڑے ہو کر۔

(شکورا ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا ہو کر لڑکھڑاتا ہے۔)

شکورا:

اب تمھاری باری ہے۔

(نتھو ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا ہو کر لڑکھڑا جاتا ہے۔)

نتھو:

تمھارا خیال ہے میرا بھگوان مجھے اس وقت دیکھ رہا ہے؟

شکورا:

اپنی آنکھیں بند کر لو۔ پیڑ کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

(نتھو آنکھیں بند کر کے اور بھی زیادہ لڑکھڑاتا ہے۔ رک جاتا ہے۔ مٹھی بھینچ کر اوپر آسمان کی طرف اٹھا کر وحشت ناک لہجے میں کہتا ہے)

نتھو:

ہے بھگوان! دیا کر مجھ پر۔

شکورا:

اے اللہ! مجھ پر رحم کر۔

نتھو:

دیا۔

شکورا:

رحم۔

نتھو:

دیا۔

شکورا:

رحم۔

نتھو:

رحم دیا۔

شکورا:

دیا رحم۔

(بودو داخل ہوتا ہے۔ بودو اب اندھا ہو چکا ہے۔ سوہاگو اس کے آگے ہے۔ اس کے گلے میں رسی ہے مگر گل سے

چھوٹی ہے کیوں کہ بودو اندھا ہو چکا ہے اور اس کے لئے چھوٹی رسی ہاتھ میں لے کر سوبھاگا کے پیچھے پیچھے چلنا زیادہ آسان ہے۔ سوبھاگا نے آج دوسری ٹوپی پہن رکھی ہے۔ نتھو اور شکورا کو دیکھ کر سوبھاگا رک جاتا ہے۔ مگر اندھا بودو چلتا رہتا ہے۔ اور شکورے سے ٹکر کھا جاتا ہے۔)

شکورا:

(غصے سے) نتھو! یہ کیا؟

(بودو سوبھاگا سے ٹکرا کر کہتا ہے)

بودو:

کون ہے؟ کیا ہے؟

(سوبھاگا بودو سے ٹکرا کر نیچے گر پڑتا ہے۔ مع سازو سامان کے۔ بودو بھی اس کے ساتھ ہی گر جاتا ہے۔ دونوں زمین پر بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ نتھو اور شکورا دونوں گھوم کر ان کی طرف دیکھتے ہیں۔)

نتھو:

کیا یہ گودو ہے؟

شکورا: آخر کار... کمک آ گئی۔ شکر ہے۔

بودو:

میری مدد کرو...

نتھو:

کیا یہی گودو ہے؟

شکورا:

ہم کچھ کمزور پڑ گئے تھے۔ شام کیسے کٹتی؟ مگر اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔

بودو:

مدد!

نتھو:

(شکورے سے) سن رہے ہو؟

شکورا:

اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اکیلے۔ گودو کے انتظار میں، رات کے انتظار میں۔ سرشام ہم اکیلے کوشش کر رہے ہیں۔ وقت گذارنے کے لئے اب مصیبت ختم ہو چکی۔ یوں سمجھو کہ سویرا ہو گیا۔

بودو:

مدد!

شکورا:

وقت گذرتا نہیں اڑتا جا رہا ہے۔ سورج ڈوبنے کو ہے۔ چاند نکلنے کو ہے۔ بہت جلد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

بودو:

مجھ پر دیا کرو... رحم... رحم!

شکورا:

بے چارہ بودو!

نتھو:

میں سمجھتا تھا یہ وہی ہے۔

شکورا:

وہی کون؟

نتھو:

گودو۔

شکورا:

مگر یہ گودو نہیں ہے۔

نتھو:

یہ گودو نہیں ہے؟

شکورا:

یہ گودو نہیں ہے!

نتھو:

پھر کون ہے؟

شکورا:

یہ بودو ہے۔

بودو:

میں یہاں ہوں! یہاں نیچے۔ تمھارے قدموں میں۔ میری مدد کرو!

نتھو:

بے چارہ اٹھ نہیں سکتا۔

شکورا:

آؤ چل دیں۔

نتھو:

نہیں جا سکتے۔

شکورا:

کیوں نہیں؟

نتھو:

ہمیں گودو کا انتظار ہے۔

شکورا:

اوہ! (خاموشی)

نتھو:

شاید یہ تمھاری ہڈیاں لایا ہے۔

شکورا:

ہڈیاں؟

نتھو:

مرغی؟... یاد نہیں؟ کل کی مرغی۔

شکورا:

یہی تھا وہ؟

نتھو:

ہاں۔

شکورا:

اس سے پوچھو۔

نتھو:

پہلے ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

شکورا:

مدد کاہے کے لئے؟

نتھو:

اسے اٹھانے کے لئے۔

شکورا:

یہ خود سے نہیں اٹھ سکتا؟

نتھو:

اٹھنا تو چاہتا ہے۔

شکورا:

تو اٹھنے دو اسے خود سے۔

نتھو:

مگر اٹھ نہیں سکتا۔

شکورا:

کیوں نہیں

نتھو:

مجھے کیا معلوم۔

(بودو زمین سے اٹھنے کی دو ایک بار ناکام کوشش کرتا ہے۔
زمین پر تڑپتا ہے۔ زمین پر بے بسی سے ہاتھ مارتا ہے)

نتھو:

پہلے ہم اس سے پوچھیں گے یہ مرغی لایا ہے۔ اگر اس نے انکار کیا تو ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

شکورا:

تمھارے کہنے کا مطلب ہے یہ اس وقت بالکل ہمارے رحم و کرم پر ہے؟

نتھو:

بالکل۔

شکورا:

اور یہ کہ ہماری اس سے اگر ہمدردی بھی ہوگی تو چند شرائط پر۔

نتھو:

جی ہاں۔

شکورا:

بڑے پتے کی بات کر رہے ہو تم! مگر مجھے ایک ہی چیز سے ڈر لگتا ہے۔

بودو:

مدد!

نتھو:

کیا؟

شکورا:

سوبھاگا اک دم کھڑا ہو کے پھر سے چالو نہ ہو جائے۔ پھر ہم لنک جائیں گے۔

نتھو:

سوبھاگا؟

شکورا:

بھول گئے۔ وہی جس نے کل تمھیں لات رسید کی تھی۔

نتھو:

کیا یہ وہی ہے؟

شکورا:

بالکل وہی۔ تمھارے سامنے بے بس پڑا ہے۔ مگر کسی وقت اٹھ کر چالو ہو سکتا ہے۔

بودو:

مدد!

نتھو:

فرض کرو کہ ہم اسی حالت میں اس کی پٹائی کر دیں۔ ہم دو ہیں۔

شکورا:

تمھارا مطلب ہے کہ جب یہ اس حالت میں سو رہا ہے۔

نتھو:

ہاں۔

شکورا:

خیال تو اچھا ہے۔ مگر کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ (وقفہ) نہیں۔ میرے خیال میں بہتر بات یہ ہوگی کہ ہم مسٹر بودو کی مدد کر کے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

بودو:

مدد کرو! دیا کرو!

شکورا:

اس کی مدد کر کے...

نتھو:

ہم اس کی مدد کریں گے؟

شکورا:

ہم فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کریں!

شکورا:

روز روز ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی ہمیں مدد کے لئے پکارے اور ہم اس کی مدد کریں۔ آج قسمت نے ہمیں وہ سنہری موقع دیا ہے۔ حالاں کہ (گرے ہوئے بودو کی طرف اشارہ کر کے) ذاتی طور پر اسے ہماری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری جگہ کوئی دوسرا یہاں موجود ہوتا تو وہ بھی اتنی سی اس کی مدد کر سکتا تھا۔ مدد کی یہ پکار جو اس وقت ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے دراصل ساری انسانیت سے مخاطب ہے۔ لیکن اس جگہ... اس وقت... اس موقع پر... ہم ساری انسانیت کی نمائندگی کرتے ہیں نتھو! چاہے ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ پیشتر اس کے کہ بہت دیر ہو جائے آؤ ہم جی داری سے اس کمینی، چھچھوری، اور گھٹیا مخلوق کی نمائندگی کریں کہ جسے بدقسمتی سے انسان کا نام دے دیا گیا ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

نتھو:

تم ٹھیک کہتے ہو شکورے۔ حالاں کہ جب ہم ٹھنڈے دل سے سارے حالات پر سوچ بچار کرتے ہیں۔ تو اسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ہم انسان کے نام پر ایک دھبہ ہیں۔ ایک ٹائیگر بھی اپنی برادری والوں کی مدد کے لئے چھلانگ مار دیتا ہے۔ یا پھر ڈر کر جنگل کی تنہائی میں گم ہو جاتا ہے۔

نتھو:

مگر سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس وقت کیا کر رہے ہیں؟ اور ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ہم اس سوال کا صحیح جواب جانتے ہیں۔ اس تمام جھنجھٹ جھمیلے میں بس ایک بات صاف ظاہر ہے۔ ہم گودو کا انتظار کر رہے ہیں!

شکورا:

اوہ!

بودو:

مدد!

شکورا:

(جوش بھرے لہجے میں) گودو کا انتظار؟ یا پھر رات کا انتظار۔ ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ یہی اس سوال کا جواب ہے۔ ہم کوئی فرشتے نہیں مگر ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے کتنے لوگ ایسا کر سکتے ہیں؟

نتھو:

کروڑوں!

شکورا:

کیا تمھارا یہی خیال ہے؟

نتھو:

کہہ نہیں سکتا۔

شکورا:

تم ٹھیک بھی ثابت ہو سکتے ہو۔

بودو:

مدد!

شکورا:

یقین صرف اس بات کا ہے کہ ان طویل لمحات میں ان مخصوص حالات میں کہ جن میں سے ہمیں گذرنا پڑ رہا ہے ہمارے لئے اور کوئی لائحہ کار نہیں ہے کہ ہم وقت گذارنے کے لئے وہ حربے استعمال کریں جو آگے چل کر عادت بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ایسا نہ کریں تو شاید اپنے فہم و ادراک کو بھی کھو دیں۔ یہ جسم جواب تک رات کی اتھاہ تنہائیوں میں بھٹکتا رہا ہے۔ ایسا میں سوچتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نہ؟

نتھو:

ہم سب انسان جنم سے پاگل پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ پیدا ہونے کے بعد بھی پاگل رہتے ہیں۔

بودو:

میری مدد کرو۔ میں تمھیں روپے دوں گا۔

نتھو:

(فوراً) کتنے؟

بودو:

دو روپے۔

نتھو:

بہت کم ہے۔

شکورا:

اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔

نتھو:

تمھارے خیال میں یہ رقم کافی ہے؟

شکورا:

ذرا مجھے... حساب کتاب کم آتا ہے۔ مگر سوال یہ نہیں ہے۔

بودو: پانچ روپے!

شکورا:

ہم اس کا انتظار کرتے ہیں اور بور ہوتے رہتے ہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ تو پھر؟... تو پھر یہ... کہ... دل بہلانے کا ایک موقع ہات آتا ہے۔ اور ہم اسے بھی کھو دینا چاہتے ہیں۔ آؤ، کم کریں (شکورا... گرے ہوئے دونوں آدمیوں کے ڈھیر کے قریب جاتا ہے پھر رک جاتا ہے) چند لمحوں میں یہ قصہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر ہم اکیلے رہ جائیں گے۔

بودو:

دس روپے!

شکورا:

ٹھہرو تمھاری مدد کو آتے ہیں۔

(شکورا اکیلا بودو کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام رہتا ہے۔ پھر کوشش کرتا ہے۔ شکورا لڑکھڑاتا ہے۔ گر جاتا ہے۔ شکورا اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام رہتا ہے۔)

نتھو:

ارے تم سب کو کیا ہو گیا ہے؟

شکورا:

(بودو کے لہجے میں) مدد!

نتھو:

میں جا رہا ہوں۔

شکورا:

مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جاؤ۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔

نتھو:

میں کہاں پر ہوں؟

شکورا:

نتھو۔

بودو:

مدد!

شکورا:

مدد!!

نتھو:

میں جا رہا ہوں۔

شکورا:

پہلے میری مدد کرو۔ پھر ہم دونوں اکٹھے یہاں سے چل دیں گے۔

نتھو:

وعدہ کرو۔

شکورا:

قسم کھاتا ہوں۔

نتھو:

قسم کھاؤ کہ اب کے جو ہم جائیں گے تو دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

شکورا:

کبھی نہیں آئیں گے۔

نتھو:

ہم ہمالیہ کی چوٹی پر جائیں گے۔

شکورا:

جہاں تم کہو گے چلے جائیں گے۔

بودو:

پندرہ روپے!

نتھو:

مجھے ہمیشہ ہمالیہ کے پہاڑوں پر گھومنے کی آرزو رہی ہے۔

شکورا:

اب تمھاری آرزو پوری ہو جائے گی (شکورا ڈکار لیتا ہے)۔

نتھو:

(نفرت سے پیچھے ہٹ کر) کس نے ایسی بدبودار ڈکار لی؟

شکورا:

اس کم بخت بودو نے۔ میں نے نہیں۔ بودو نے۔ بودو نے!

بودو:

دیا کرو۔ دیا کرو۔ رحم کرو مجھ پر!

نتھو:

گھن آنے لگی۔

شکورا:

(ایک ہاتھ اٹھا کر) جلدی کرو۔ اپنا ہاتھ مجھے دو۔

نتھو:

میں جا رہا ہوں (بلند آواز میں) بس جا رہا ہوں۔

شکورا:

چلو کوئی بات نہیں میں خود اپنے بل بوتے پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ (زور لگا کر کھڑا ہو جانا چاہتا ہے۔ ناکام رہتا ہے، وقفہ۔) کچھ وقت لگے گا۔

نتھو:

تمھیں ہوا کیا ہے؟

شکورا:

جہنم میں جاؤ۔

نتھو:

کیا تم بھی وہیں رہتے ہو؟

شکورا:

فی الحال۔

نتھو:

اٹھو۔ یہاں لیٹے لیٹے سردی کھا جاؤ گے۔

شکورا:

میری فکر نہ کرو۔

نتھو:

اٹھو شکورے۔ یہ بیہودگی ختم کرو۔

(نتھو اپنا ہات بڑھاتا ہے۔ شکورا اس کا ہات پکڑ کر کہتا ہے۔)

شکورا:

کھینچو۔

(نتھو زور لگا کے کھینچتا ہے، لڑکھڑا کر خود گر جاتا ہے،
شکورے کے قریب۔ خاموشی کا وقفہ۔ دونوں گر پڑے ہیں۔)

بودو:

مدد!

شکورا:

(بودو سے) ہم آ گئے تمھاری مدد کو۔

بودو:

تم کون ہو؟

شکورا:

آدمی۔ (خاموشی)

نتھو:

بے دھرتی ماتا!

شکورا:

کیا تم کھڑے ہو سکتے ہو؟

نتھو:

نہیں کہہ سکتا۔

شکورا:

کوشش کر کے دیکھو۔

نتھو:

ابھی نہیں... ذرا ٹھہر کے۔ (خاموشی)

بودو:

اب کیا ہوا ہے؟

شکورا:

(غصے سے) چپ رہو۔ کم بخت کو ہر وقت اپنی ہی سوجھتی ہے۔

نتھو:

لیٹے لیٹے ایک جھپکی کیوں نہ لی جائے۔

شکورا:

سنا تم نے؟ یہ بودو جاننا چاہتا ہے کہ کیا ہوا ہے اب؟

نتھو:

جانے دو۔ سو جاؤ۔ (خاموشی کا ایک لمبا وقفہ)

بودو:

رحم رحم۔

نتھو:

(چونک کر) ایں؟ کیا ہے؟

شکورا:

تم سو گئے تھے۔

نتھو:

شاید!

شکورا:

یہ حرامی بودو جب سے بکواس کر رہا ہے۔

نتھو:

اسے کہو چپ ہو جائے ورنہ دھر کے دو ایک لات!

شکورا:

(بودو کو مارتے ہوئے) خاموش خبیث!

(بودو مار کھاتے ہوئے چلاتا ہے۔ درد سے تڑپتا ہے۔
شکورے سے دور ہٹ جاتا ہے۔ شکورا اس وقت اپنی کہنیوں کے
سہارے لیٹا ہے، نتھو سے کہتا ہے)

سالا دور ہٹ گیا... (بودو اوندھا ہو جاتا ہے) سالا چت ہو گیا۔

نتھو:

اب کیا کریں؟
شکورا:
میں گھسٹ کر اس کے قریب تو جا سکتا ہوں۔
نتھو:
نہیں مجھ سے دور کہیں... مت جاؤ۔
نتھو:
یہاں سے آواز دے کے دیکھو۔
شکورا:
ہاں ایسا کر سکتے ہو۔ بودو۔ بودو۔ بودو! کوئی جواب نہیں۔
نتھو:
آؤ دونوں مل کر پکاریں۔
شکورا اور نتھو:
بودو۔ بودو!
شکورا:
ذرا سا ہلا تو ہے۔
نتھو:
کیا تمھیں یقین ہے کہ اس کا نام بودو ہی ہے؟
شکورا:
مسٹر بودو۔ واپس آ جاؤ۔ ادھر۔ اب ہم تمھیں کچھ نہ کہیں گے۔ (خاموشی)
نتھو:
کیا ممکن ہے یہ بودو نہ ہو؟ آؤ اسے دوسرے ناموں سے پکاریں۔
شکورا:
میرے خیال میں وہ تو مر رہا ہے۔
نتھو:
بڑا مزا آئے گا۔
شکورا:
مزا؟ کس بات پر؟
نتھو:
اس کو دوسرے ناموں سے پکارنے پر۔ اس سے وقت گذرے گا اور کبھی نہ کبھی تو ہم اس کو اس کے صحیح نام سے پکار سکیں گے۔
شکورا:
ارے... بھئی نام تو اس کا بودو ہی ہے۔
نتھو:
ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ ارے ارجن! (چلاتا ہے۔)

بودو:
مدد!
شکورا:
پہلے ہی جملے میں معلوم ہو گیا کیا؟
نتھو:
تو... دریودھن!
بودو:
مدد!
شکورا:
ہابیل!
بودو:
مدد!
شکورا:
قابیل!!
بودو:
مدد!
نتھو:
یہ ارجن بھی ہے دریودھن بھی ہابیل بھی قابیل بھی۔
شکورا:
یعنی بنی نوع انسان کا مکمل نمائندہ! ارے وہ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا تم نے؟
نتھو:
کہاں؟
شکورا:
وہ افق پر۔
نتھو:
تو؟ کیا خاص بات ہے اس بادل کے ٹکڑے میں؟ (خاموشی)
نتھو:
چھوڑو۔ آؤ۔ اب کوئی اور بات کریں۔
شکورا:
میں بھی یہی صلاح دینے والا تھا۔
نتھو:
مگر کیا ہو؟
شکورا:
یہی تو بات ہے۔ (خاموشی)

نتھو:

یہ نیا سلسلہ کیوں نہ ہم اٹھنے سے شروع کریں؟

شکورا:

کیا حرج ہے؟

(دونوں نہایت آسانی سے اٹھ جاتے ہیں۔)

نتھو:

دیکھا کتنا آسان رہا!

شکورا:

بچوں کا کھیل!

نتھو:

اور اب؟

بودو:

مدد!

نتھو:

آؤ چل دیں یہاں سے۔

شکورا:

نہیں جا سکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں؟

شکورا:

ہمیں گودو کا انتظار ہے۔

نتھو:

ارے۔ (مایوس ہو کر) تو اب کیا کریں... کیا کریں گے ہم؟

بودو:

مدد!

شکورا:

کیوں نہ اس کی مدد ہی کر دی جائے؟

نتھو:

چاہتا کیا ہے یہ؟

شکورا:

اٹھنا چاہتا ہے۔

نتھو:

تو اٹھ جانے کو کون منع کرتا ہے؟

شکورا:

وہ چاہتا ہے ہم اس کی مدد کر کے اسے اٹھا دیں۔

نتھو:

تو چلو پھر دیر کا ہے کی۔ لگاؤ زور۔

(دونوں زور لگا کر بودو کو اٹھا کر اس کے پیروں پر کھڑا کرتے ہیں۔ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ چھوٹتے ہی وہ فوراً گر جاتا ہے۔)

شکورا:

اسے پکڑے رکھو (دونوں پھر اسے اٹھاتے ہیں۔ بودو دونوں کے بیچ دونوں کے کندھے پر اپنی باہیں رکھے ہوئے جھول رہا ہے۔) اسے ذرا وقت لگے گا خود سے کھڑا ہونے میں۔ (بودو سے) کیوں؟

کیا حال ہے؟

بودو:

کون ہو تم؟

شکورا:

تم ہمیں نہیں پہچانتے؟

بودو:

میں اندھا ہوں۔ (خاموشی)

شکورا:

اسی لئے شاید تم مستقبل بھی دیکھ سکتے ہو۔

نتھو:

مگر کب سے؟ بودو کب سے۔

بودو:

کبھی میں بھی غضب کی نظر رکھتا تھا۔ مگر کون ہو تم دوست؟

نتھو:

(ہنس کر) یہ پوچھتا ہے کیا ہم دوست ہیں۔

شکورا:

نہیں۔ اس کا مطلب ہے کیا ہم اس کے دوست ہیں؟

نتھو: تو؟

شکورا:

مگر تم نے اس کی مدد کر کے اسے بتا دیا ہے کہ ہم اس کے دوست ہیں۔

نتھو:

دوست! اگر ہم اس کے دوست نہ ہوتے تو کیا مدد کرتے؟

شکورا:

کر بھی سکتے تھے۔

نتھو:

ہاں یہ بھی سچ ہے۔

شکورا:

مگر اب بال کی کھال نکالنے سے فائدہ۔

بودو:

تم لوگ کہیں ڈاکو تو نہیں ہو؟

نتھو:

ڈاکو؟ کیا ہم تمھیں ڈاکو دکھائی دیتے ہیں۔

شکورا:

جانے دو نتھو۔ وہ بے چارا اندھا ہو چکا ہے۔

نتھو:

اندھا ہو چکا ہے یا وہ ایسا کہتا ہے۔

بودو:

مجھے چھوڑ کر کہیں مت جانا۔

شکورا:

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نتھو:

ابھی ایسا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

بودو:

کیا وقت ہوگا؟

شکورا:

(آسمان کی طرف دیکھ کر) سات بجے ہوں گے یا آٹھ بجے ہوں گے۔ قریب قریب۔

بودو:

کیا شام ہوگئی؟

(خاموشی۔ نتھو اور شکورا دونوں مغرب کی طرف دیکھتے ہیں۔)

نتھو:

لگتا ہے جیسے سورج پچھم سے نکل رہا ہے۔

شکورا:

یہ ناممکن ہے۔

نتھو:

تو ہو سکتا ہے یہ صبح کا وقت ہو۔

شکورا:

احمق مت بنو۔ سورج پچھم میں ڈوب رہا ہے۔

نتھو:

تم کیسے کہہ سکتے ہو؟

بودو:

(دردناک آواز میں) کیا شام ہوگئی؟

شکورا:

سورج ابھی تک وہیں پر ہے۔

نتھو:

میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ ادھر سے ابھر رہا ہے۔

بودو:

تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے؟

نتھو:

ہمیں ذرا سوچنے کے لئے وقت دو۔

شکورا:

(یقین سے) جناب یہ شام ہے... شام... رات قریب آرہی ہے میرا دوست اسے صبح کہہ رہا ہے اور میں نے ایک لمحے کے لئے اس پر یقین بھی کر لیا تھا مگر سارا دن سورج کی تیز روشنی میں چلتے ہوئے اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اب شام آگئی ہے (وقفہ۔) کیا حال ہے اب تمھارا؟

نتھو:

کب تک ہم اسے اٹھائے اٹھائے پھریں گے؟

(شکورا اور نتھو دونوں اس پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہیں۔ بودو پھر گرنے لگتا ہے۔ وہ دونوں پھر اسے سنبھال لیتے ہیں۔)

نتھو:

شرون کمار کی بہنگی کی طرح۔

شکورا:

(بودو سے) تم کہہ رہے تھے کسی زمانے میں تمھاری نظر عمدہ ہوا کرتی تھی۔

بودو:

غضب کی۔ غضب کی۔ غضب کی نظر تھی۔ میری۔

نتھو:

(غصے سے) ہانکو۔ اور گپ ہانکو۔

شکورا:

بچارا اپنے پرانے دنوں کو یاد کرکے۔ خوش ہو رہا ہے (وقفہ) (گنگناتے ہوئے) یاد نہ کر دل حزیں بھولی ہوئی کہانیاں... بچارے کے لئے یہ یادیں بھی ناخوشگوار ہو چلی ہیں۔

نتھو:

تم کب سے اندھے ہوئے ہو؟

بودو:

مجھے یاد نہیں۔

شکورا:

مگر یہ واقعہ کل سے پہلے کا تو ہو نہیں سکتا۔

بودو:

مجھ سے مت پوچھو۔ اندھے سمے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ سمے کی باتیں ہم سے چھپی رہتی ہیں۔

شکورا:

عجیب بات ہے۔ میں نے سمجھا تھا معاملہ اس کے الٹ ہوگا۔

نتھو:

میں جا رہا ہوں۔

بودو:

یہ کون سی جگہ ہے؟

شکورا:

کچھ کہہ نہیں سکتا۔

بودو:

کیسی جگہ ہے؟

شکورا: بیان کرنا مشکل ہے۔ کچھ... کچھ بھی تو نہیں ہے یہاں پر سوائے ایک پیڑ کے۔

بودو:

میرا اکارندہ کہاں ہے؟

شکورا:

ہوگا یہیں کہیں۔

بودو:

تو وہ بولتا کیوں نہیں ہے؟

شکورا:

کیا معلوم؟ ممکن ہے سو رہا ہو۔ ممکن ہے مر گیا ہو۔

بودو:

ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا ہوا تھا۔

نتھو:

تم دونوں ٹکرا کر گر گئے۔

بودو:

ذرا دیکھو تو کہیں وہ زخمی تو نہیں ہو گیا۔

شکورا:

مگر تمھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟

بودو:

دونوں کے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک تو جا سکتا ہے۔

شکورا:

(نتھو سے) تم جاؤ۔

نتھو:

جو سلوک اس نے میرے ساتھ کیا اس کے بعد بھی؟

بودو:

(شکورے سے) ہاں ہاں اپنے دوست کو جانے دو۔ بڑی سخت بدبو آتی ہے اس کے جسم سے (وقفہ۔) جاتے کیوں نہیں۔ یہ کس کا انتظار کر رہا ہے؟

شکورا:

(اسی لہجے میں نتھو سے) تم جاتے کیوں نہیں کس کا انتظار کر رہے ہو؟

نتھو:

گوودکا۔ (خاموشی)

شکورا:

(بودو سے) وہ جائے تو کیا کرے؟

بودو:

تم... (زور سے اسی لہجے میں) پر اتنے زور سے بھی نہیں کہ اس کا گلا ہی گھٹ جائے۔ عام طور پر زور سے اس حرکت کا اس پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ لیکن اگر نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ وہ جوتوں سے اس کی خوب مرمت کرے۔ منہ پر اور پیٹھ پر۔ جہاں جہاں یہ ٹھکائی ممکن ہے۔ یہ ترکیب تو بے حد موثر ثابت ہوتی ہے۔

شکورا:

اب تمھیں اجازت مل چکی ہے۔ اب ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرے، اس سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقعہ ہے۔

نتھو:

اور اگر اس نے مقابلہ کیا؟

بودو:

نہیں۔ وہ کبھی مقابلہ نہیں کرتا۔

شکورا:

کچھ کرے گا تو میں بھاگ کر تمھاری مدد کے لئے آ جاؤں گا۔

نتھو:

ذرا دیکھتے رہنا۔

(نتھو ذرا ڈرتے ڈرتے سو بھاگ کی جانب بڑھ رہا ہے۔)

شکورا اس سے کہتا ہے)

شکورا:

پہلے معلوم کرلو وہ زندہ ہے کہ نہیں۔ بیکار میں کسی مردے پر محنت کرنے سے کیا حاصل؟

نتھو:

(گرے ہوئے سوبھاگا پر جھک کر) سانس لے رہا ہے۔

شکورا:

تو پھر شروع کردو۔

(نتھو آگے بڑھ کر پاؤں سے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیتا ہے، ساتھ میں گالی دیتا جاتا ہے۔ سوبھاگا اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں۔ آخری زور سے ٹھوکر مارنے کے ساتھ خود نتھو ایک دردناک چیخ مار کر الگ ہوجاتا ہے۔ اور اپنا پاؤں پکڑ کر چلانے لگتا ہے)

نتھو:

ارے یہ وحشی... پاؤں توڑ دیا میرا اس نے!

(اپنے ٹیلے پر لنگڑاتا ہوا بیٹھ جاتا ہے، لانگ بوٹ اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام ہو کر سر گھٹنوں میں دے کر رونے کی تیاری کرتا ہے۔)

بودو:

اب کیا ہوا ہے؟

شکورا:

میرے دوست کو چوٹ لگی ہے۔

بودو:

اور سوبھاگا؟

شکورا:

اچھا۔ تو وہ سوبھاگا ہے؟

بودو:

میں سمجھا نہیں۔

شکورا:

اور تم بودو ہو؟

بودو:

ہاں میں بودو ہوں۔

شکورا:

وہی کل والے؟

بودو:

کل والے؟

شکورا:

ہاں ہم کل یہیں ملے تھے۔ یاد ہے نہ؟

بودو:

کل میں کس سے ملا تھا مجھے کچھ یاد نہیں۔ مگر آج میں جس سے ملوں گا وہ کل مجھے یاد نہیں رہے گا۔

شکورا:

مگر۔

بودو:

بس بہت ہوگیا۔ الو۔ سور! (سوبھاگا کی رسی کھینچتا ہے۔)

شکورا:

تم کل اسے لے جارہے تھے کسی میلے میں بیچنے کے لئے۔ تم نے ہم سے گفتگو کی۔ سوبھاگا ناچا بھی تھا اس نے سوچا بھی تھا۔ کل تک تمھاری آنکھیں بھی تھیں۔

بودو:

ہٹو۔ مجھے جانے دو (شکورا اسے جانے دیتا ہے۔ سوبھاگا کے پاس جا کر) اٹھ بے!
(سوبھاگا اپنے مالک کی آواز سن کر اٹھ جاتا ہے۔
اپنا سامان اٹھانے لگتا ہے۔)

شکورا:

تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟

بودو:

اس کی مجھے فکر نہیں ہے۔ (سوبھاگا سے) چلو! (سوبھاگا اپنے آپ کو بودو کے آگے چلنے کی پوزیشن میں رکھتا ہے، اپنے گلے کی رسی کی گرہ ٹھیک کرتا ہے) چابک! (سوبھاگا سامان نیچے رکھ کر چابک ڈھونڈھتا ہے، چابک بودو کو دے کر پھر سامان اٹھالیتا ہے) رسہ! (سوبھاگا سامان نیچے رکھ کر رسے کا سرا بودو کے ہاتھ میں دیتا ہے پھر سامان اٹھالیتا ہے۔ شکورا سوبھاگا کے سر پر رکھے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے)

شکورا:

اس بیگ میں کیا ہے؟

بودو:

ریت۔ (سوبھاگا سے) چلو!

شکورا:

ابھی مت جاؤ۔

بودو:

میں جا رہا ہوں۔

شکورا:

اگر تم راستے میں کہیں گر گئے تو کیا کرو گے؟

بودو:

ہم انتظار کریں گے اس وقت کا جب ہم اٹھ سکیں گے اٹھنے کے بعد پھر چل دیں گے۔ چلو۔

شکورا:

جانے سے پہلے اس سے کہو، گائے۔

بودو:

کس سے کہوں؟

شکورا:

سوبھاگا سے۔

بودو:

وہ گائے۔

شکورا:

ہاں۔ یا سوچے۔ یا شعر پڑھے۔

بودو:

مگر یہ تو گونگا ہے۔

شکورا:

گونگا۔

بودو:

بالکل گونگا۔ وہ تو زور سے چلا بھی نہیں سکتا۔

شکورا:

گونگا؟ کب سے؟

بودو:

(غضب ناک لہجے میں) ہر سے سے کی بات کر کے تم نے مجھے بور کر دیا ہے۔ ہر دفعہ یہ پوچھنا۔ کب سے؟ کب سے؟ کب سے؟ کیا ایک دن کا عرصہ تمھارے لئے کافی نہیں ہے؟ ایک دن جو ہر دوسرے دن کی طرح ہوتا ہے۔ ایک دن وہ گونگا ہو گیا۔ ایک دن میں اندھا ہو گیا۔ ایک دن ہم بہرے ہو جائیں گے۔ ایک دن ہم مر جائیں گے، وہی ایک دن، وہی ایک لمحہ۔ کیا وہی کافی نہیں ہے۔ تمھارے لئے؟ (ذرا ٹھنڈا ہو کر) وہ۔ قبر کے سرہانے کسی کو جنم دیتے ہیں۔ نور کا کوندا ایک ثانیے کے لئے چمکتا ہے۔ پھر وہی اندھیری رات۔ چلو!

(سوبھاگا اور بودو دونوں ونگ میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے شکورا ونگ تک تعاقب میں جاتا ہے۔ کچھ دیر تک کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ پھر گرنے کی آواز آتی ہے۔ شکورا ان لوگوں کے گرنے کی نقل کرتا ہے۔)

شکورا:

(پھر وہ نتھو کی طرف جاتا ہے اور کہتا ہے) ارے وہ پھر گئے۔ (مگر نتھو برابر سو رہا ہے۔ شکورا اسے زور سے جھنجھوڑ کر جگاتا ہے)

نتھو:

(جاگنے سے پہلے چند بے ربط بے معنی جملے کہنے کے بعد) تم مجھے سونے نہیں دو گے۔

شکورا:

میں تمہارا گیا تھا۔

نتھو:

میں سپنا دیکھ رہا تھا کہ میں بہت خوش ہوں۔

شکورا:

چلو۔۔۔ اس سے کچھ وقت تو گذرا۔

نتھو:

میں دیکھ رہا تھا کہ۔۔

شکورا:

مجھے مت بتاؤ۔ (وقفہ) مگر۔ کیا وہ سچ مچ اندھا تھا۔

نتھو:

کون؟

شکورا:

بودو؟

نتھو:

اندھا؟

شکورا:

اس نے یہی کہا تھا کہ اندھا ہو چکا ہے۔

نتھو:

تو پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

شکورا:

مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

نتھو:

تم نے سپنا دیکھا ہوگا۔ آؤ چلیں۔ (خود ہی) ہو نہیں جا سکتے۔

شکورا:

کیا تمہیں یقین ہے وہ وہ نہیں تھا؟

نتھو:

کون؟

شکورا:

گودو۔

نتھو:

گودو کیا نہیں تھا؟

شکورا:

بودو۔

نتھو:

نہیں۔ بالکل نہیں۔ مطلق نہیں۔ قطعی نہیں۔ میرا خیال ہے۔ میں اٹھ جاؤں۔ (ٹیلے سے اٹھ کر درد محسوس کرتے ہوئے کرب ناک آواز میں کہتا ہے۔) ہائے۔ شکورے۔ ہائے۔

شکورا:

سمجھ میں نہیں آتا اب میں کس کے بارے میں سوچنا شروع کروں۔

نتھو:

میرا پاؤں۔ ہائے (بیٹھ کر جوتا اتارنے کی کوشش کرتا ہے) میری مدد کرو شکورے۔

شکورا:

سوچتا ہوں کیا میں اس وقت سو رہا تھا جب دوسرے مصیبت میں تھے۔ کیا اب اس وقت میں سو رہا ہوں؟ کل جب میں جاگوں گا یا میں سمجھ لوں گا کہ میں جاگ گیا۔ تو اس وقت میں آج کے بارے میں کیا سوچوں گا کہ میں نے اپنے دوست کاشی ناتھ کے ساتھ اس جگہ پر شام سے رات کی تاریکی تک گودو کا انتظار کیا کہ یہاں سے بودو گزرا تھا۔ اپنے غلام کے ساتھ اور اس نے ہم سے باتیں کی تھیں؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا؟ مگر ان سب باتوں میں سچائی کتنی ہوگی (نتھو نے بوٹ اتارنے کی بہت کوشش کی ہے۔ اور اب ناکام ہو کے پھر رونا چاہتا ہے۔ شکورا حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے) کہ سچائی ایک زخم ہے جو دوسرے ہم کو دیتے ہیں۔ کہ وہ گاجر جو تم نے کھائی کیا سچ تھی؟ قبر کے سرہانے ایک تکلیف دہ چیخ اور نیچے غار میں گورکن آہستہ سے اٹھاتا ہوا ہمارے پاس صرف بوڑھے ہو جانے کے لئے وقت رہ گیا ہے۔ فضا میں ہماری چیخیں گونج رہی ہیں۔ مگر ہماری گھسی عادتوں میں وہ آوازیں دب گئی ہیں۔ اب کون سنتا ہے۔ شاید مجھ پر بھی اس وقت کسی کی نگاہ پڑ رہی ہے اور کہیں کوئی میرے متعلق بھی یہی کہہ رہا ہے۔ لو دیکھو۔ وہ سو رہا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔ اس لئے سو رہا ہے۔ اچھا ہے اسے سو جانے دو (وقفہ) بس جانے میں کیا کہہ گیا؟

(شکورا ادھر ادھر ٹہلتا ہے۔ بڑی بے چینی سے آخر
ونگ کے قریب رک کر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہو جاتا ہے۔
اچانک ایک لڑکا دائیں ونگ سے نکل کر آتا ہے، ان دونوں کو دیکھ
کر رک جاتا ہے، ہچکچا کر کہتا ہے)

لڑکا:

اے مسٹر! او جناب!

شکورا:

لو۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو۔

لڑکا:

نہیں جناب۔

شکورا:

تم کل یہاں نہیں آئے تھے؟

لڑکا:

نہیں جناب۔

شکورا:

یہاں تم پہلی بار آئے ہو؟

لڑکا:

ہاں جناب۔ (خاموشی)

شکورا:

تم مسٹر گودو کا پیغام لے کر آئے ہو؟

لڑکا:

ہاں جناب۔

شکورا:

وہ آج نہیں آسکیں گے؟

لڑکا:

نہیں جناب۔

شکورا:

مگر کل آئیں گے۔

لڑکا:

ہاں جناب۔

شکورا:

ضرور آئیں گے؟

لڑکا:

ہاں جناب۔ (خاموشی)

شکورا:

راستے میں تم نے کسی کو دیکھا؟

لڑکا: نہیں جناب۔

شکورا:

دو...دو آدمی؟

لڑکا:

میں نے کسی کو نہیں دیکھا جناب۔ (خاموشی)

شکورا:

مسٹر گودو کیا کام کرتے ہیں؟ (لڑکا خاموش رہتا ہے)

شکورا:

جواب دو۔

لڑکا:

وہ کچھ نہیں کرتے سرکار۔ (خاموشی)

شکورا:

تمھارا بھائی کیسا ہے؟

لڑکا:

بیمار ہے۔

شکورا:

شاید وہی کل آیا ہوگا۔

لڑکا:

مجھے معلوم نہیں جناب۔ (خاموشی)

شکورا:

کیا اس کے داڑھی ہے؟ گودو کے؟

لڑکا:

جی ہاں۔

شکورا:

بھوری؟... کہ کالی؟

لڑکا:

سفید ہے جناب۔ (خاموشی)

شکورا:

اے خدا ہم پر رحم کر۔ (خاموشی)

لڑکا:

میں مسٹر گودو سے کیا کہوں جناب؟

شکورا:

کہنا... ان سے کہنا۔ تم نے ہمیں دیکھا تھا۔ اور کہنا کہ... کہ... تم نے ہمیں دیکھا تھا (وقفہ۔)

(شکورا لڑکے کی طرف بڑھتا ہے۔ لڑکا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ تھوڑا رک جاتا ہے۔ لڑکا بھی اپنی جگہ تھم جاتا ہے۔)

شکورا:

تمھیں معلوم ہے نہ۔ تم نے مجھے دیکھا ہے۔ کل آ کے یہ تو نہیں کہو گے کہ تم نے مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟

(خاموشی۔ لڑکا کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ شکورا اسے پکڑنے کے لئے لپکتا ہے لیکن لڑکا اس سے بچ کر بھاگ جاتا ہے۔ (خاموشی) شکورا چپ ساکت کھڑا رہتا ہے۔ نتھو جاگتا ہے۔ اپنے بوٹ اتارتا ہے۔ بوٹ اتار کر اسٹیج کے مرکز میں رکھ دیتا ہے پھر شکورے کے پاس جاتا ہے اسے غور سے دیکھتا ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے، چاند نکلتا ہے)

نتھو:

بدحواس کیوں ہو؟

شکورا:

کچھ نہیں۔

نتھو:

تو میں جا رہا ہوں۔

شکورا:

میں بھی۔

نتھو:

کیا میں بہت دیر تک سوتا رہا؟

شکورا:

مجھے معلوم نہیں۔ (خاموشی)

نتھو:

اب کہاں جائیں گے؟

شکورا:

کہیں بہت دور تو جا نہیں سکتے۔

نتھو:

نہیں۔ چلو یہاں سے کہیں بہت دور چلے جائیں۔

شکورا:

نہیں جا سکتے۔

نتھو:

کیوں نہیں جا سکتے؟

شکورا:

کل پھر یہیں واپس آنا ہوگا۔

نتھو:

کیوں؟

شکورا:

ہمیں یہاں گودو کا انتظار کرنا ہے۔

نتھو:

ہاں وہ آج نہیں آئے گا؟

شکورا:

نہیں۔

نتھو:

اور اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

شکورا:

اب رات ہو چکی ہے۔

نتھو:

اگر ہم اس کا خیال چھوڑ دیں۔ اسے بالکل ہی چھوڑ دیں؟

شکورا:

تو وہ ہمیں سزا دے گا (وقفہ۔ درخت کی طرف دیکھتا ہے) یہاں ہر چیز مردہ ہے۔

سوائے اس پیڑ کے۔

نتھو:

(درخت کی طرف دیکھ کر) کیا یہ...؟

شکورا:

ایک پیڑ۔

نتھو:

مگر کس کا؟

شکورا:

جامن کا۔

(نتھو شکورے کو لے کر پیڑ کے قریب جاتا ہے۔ دونوں اس کے قریب بے یار و حسرت کھڑے ہیں۔)

نتھو:

ہم اس سے لٹک کر مر کیوں نہیں جاتے؟

شکورا:

کاہے سے لٹکیں؟

نتھو:

تمھارے پاس کوئی چھوٹی سی رسی بھی نہیں ہے۔

شکورا:

نہیں۔

نتھو:

تو نہیں لٹک سکتے۔

شکورا:

آؤ چلیں۔

نتھو:

ٹھہرو میری یہ پیٹی اس کام آ سکتی ہے۔ (پتلون کی پیٹی دکھاتا ہے۔)

شکورا:

یہ...؟ بہت چھوٹی ہے۔

نتھو:

تم میری پتلون سے لٹک سکتے ہو۔

شکورا:

تو میری ٹانگوں سے کون لٹکے گا؟

نتھو:

درست۔

شکورا:

پھر بھی دکھاؤ۔ دیکھیں۔

(نتھو اپنی پتلون کی پیٹی کمر سے اتار کر دیتا ہے۔ اس کی پتلون نیچے گر جاتی ہے کیوں کہ ڈھیلی ہے مگر اسے معلوم تک نہیں ہوتا۔ وہ دونوں انتہائی انہماک سے پیٹی کی طرف دیکھ رہے ہیں جو دراصل ایک فیتہ سا ہے۔)

نتھو:

ابھی دیکھ لیں گے پکڑو اسے۔ (ایک سرے سے نتھو دوسرے سے شکورا اس فیتے کو پکڑ کر زور لگاتا ہے۔ فیتہ بیچ میں سے ٹوٹ جاتا ہے دونوں گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔)

نتھو:

دھت تیرے کی۔ (خاموشی) تم کہتے ہو کل پھر آنا پڑے گا۔

نتھو:

کل ہم ایک مضبوط سی رسی ساتھ لیتے آئیں گے۔

شکورا:

اچھا۔

نتھو:

شکورے۔

شکورا:

کہہ ڈالو۔

نتھو:

اب میں زیادہ عرصہ تک اس طرح نہیں چل سکتا۔

شکورا:

تو کیا الگ ہو جائیں۔ ہم تم دونوں؟ کیا خیال ہے، ممکن ہے اس میں ہماری بہتری

ہو۔ تم اس سڑک پر میں کسی دوسری سڑک پر۔

نتھو:

اور پھر اگر اس دوسری سڑک کے کنارے کسی ایسی ہی بنجر زمین پر کوئی ایسا ہی سوکھا پیڑ جس کے نیچے کھڑے کھڑے پھر کسی گودو کا؟ نہیں۔ نہیں کل یہاں آکے پھانسی لگا کے مر جائیں گے۔

شکورا:

ہاں اگر وہ کل بھی نہ آیا تو۔

نتھو:

تو ہم بچ جائیں گے۔

(شکورا اپنی ٹوپی اتار کر جھاڑتا ہے۔ اندر غور سے دیکھتا ہے۔ پھر پہن لیتا ہے۔)

نتھو:

اب کیا سوچ رہے ہو؟... چلیں؟

شکورا:

تمھاری پتلون؟

نتھو:

کیا؟

شکورا:

تمھاری پتلون۔

نتھو:

کیا چاہتے ہو۔ پتلون اتار دوں؟ تم پہنو گے؟

شکورا:

نہیں۔ اسے اوپر کھینچ لو۔

(نتھو نیچے دیکھتا ہے۔ تو اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پتلون اتر گئی ہے وہ جلدی سے اسے اوپر کھینچتا ہے۔ خاموشی)

شکورا:

اب چلیں۔

نتھو:

ہاں۔ چلو۔

(دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے ایک ساتھ اپنا ایک پاؤں اوپر اٹھاتے ہیں۔ پھر نیچے رکھ دیتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہلے بغیر آہستہ سے حاضرین کی جانب ذرا سا جھکتے ہیں مگر چلتے نہیں۔)

(پردہ گرتا ہے) ☆☆☆

اس ترجمے کے بارے میں

"ویٹنگ فار گودو" (Waiting For Godot) کو ہندوستانی رنگ میں ڈھال دینا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ بیکیٹ نے آزادی، غلامی، مجبوری، اور جبریت کے لئے استعارے دیہی زندگی سے لئے ہیں، اور ایسے ماحول سے جو یورپی کے بجائے ایشیائی زیادہ ہے۔

اسٹراگون (Estragon) کو نتھو اور ولادیمیر (Vladimir) کو عبدالشکور بنا دینے سے اس ڈرامے میں ایک ایسی معنویت پیدا ہو گئی ہے جو ہندوستانی ماحول کے عین مطابق ہے۔ اسی مناسبت سے میں نے کہیں کہیں (لیکن بہت کم) ان کے مکالموں میں تبدیلی کر دی ہے۔ سو بھاگا (Lucky) کی معرکۃ آرا تقریر کو زیادہ بدلنا پڑا کیونکہ ہماری زبان کی خطابت کا انداز انگریزی سے مختلف ہے۔ لیکن تقریر کا اندرونی ربط وہی رکھا ہے، تاکہ ڈسٹمیں ردم (rhythm) میں فرق نہ آئے۔

بیکیٹ کا یہ ڈراما موجودہ شکل میں کسی بھی ہندوستانی اسٹیج پر بہ آسانی کھیلا جا سکتا ہے۔

کرشن چندر

گم ہوتا ہوا آسماں

رفعت سروش

کا تازہ مجموعۂ کلام جس میں ساٹھ برس سے زیادہ کی مشقِ سخن اور فکر و مشاہدہ پوری شدت اور چمک کے ساتھ جلوہ گر ہیں

قیمت : ۱۵۰ روپئے

نورنگ کتاب گھر، A-۸۰، سیکٹر ۲۷، نوئڈا

کرشن کمار طور

شمارہ ۱۲۰،
اپریل، مئی ۱۹۸۱

(بلنی کے لئے)

ہر ایک رو ہے گماں بانی گماں بانی
ہے کشف زیست بھی اک سیل امتحاں بانی

بریدہ ارض وفا، اسم زرد ی زرخیز
حصار مرگ طلب ابجد آسماں بانی

ہے کشف لذت آفاق سنگ آلودہ
متاع منزل ناپختہ رائیگاں بانی

زباں ہے ذائقہ چکھنے پہ نیست آمادہ
شناخت تازہ لہو کی ہوئی گراں بانی

دلوں پہ نرم نظر عکس پارۂ امید
چراغ آئینہ ہر صورت زیاں بانی

لہو رگوں میں نگاہوں میں برف آویزاں
یہ کیا طلسم وجود اب ہے درمیاں بانی

مماثلت ہے یہ مانا گمان خود عکسی
کوئی تو شعر کے پردے میں ہے نہاں بانی

شمارہ ۱۳۰،
اگست، ستمبر ۱۹۸۳

اک سبز تجلی رت میں بھی مرجھانے والا میں
یہ خالی شعبدہ ہی سہی مگر دکھانے والا میں

اجلی کبوتر صبحوں کو مہران کرنے والا تو
اور کاجلی شب تار پرندوں کو اڑانے والا میں

اک تو کہ تمام جہان سے ہے تیرا ظہور وجود
اور اک اپنے آپ کو آئینہ دکھانے والا میں

روتے ہوئے چہروں کو متبسم کرنے والا تو
اور فرخ فرخندہ آنکھوں کو رلانے والا میں

تمام منتشر اکائیوں کا تو نقطۂ صد سمت
اور اک لمس سے ریزہ ریزہ بکھرنے جانے والا میں

مجھ میں موجود طور اس ذات کا عشر ہمہ صفت
مشکل سہی یہ کشت وفا مگر اگانے والا میں

کرشن کمار طور

شمارہ ۱۵۳،
جنوری فروری ۱۹۸۹

آخر ہے پتلیوں کا تماشا ذرا سی دیر
سامنے ہے آنکھوں کے دنیا ذرا سی دیر
کبھی کبھی میرے دل کے بہلانے کو
آہی جاتی ہے اک چڑیا ذرا سی دیر
کچھ بھی تو اک سا نہیں ہے تیرے میرے بیچ
تو ہے ہمیشہ میرا ہونا ذرا سی دیر
اس لاحاصل جیون کا تو حاصل ہے
میرے سامنے کبھی تو آ ذرا سی دیر
بدل گئی ہے یہ میری ساری کایا ہی
کس نظر سے اس نے مجھے دیکھا ذرا سی دیر
نقش ہے اک خواب سی آنکھوں کے پردے پر
یہی ہے دنیا تو ہے دنیا ذرا سی دیر
یہ دل اک گرتی ہوئی دیوار سا ہے طور
دیکھ لو اب کے ہے یہ نظارہ ذرا سی دیر

شمارہ ۲۰۷،
جون ۱۹۹۷

سولی کے پس منظر سے منظر کی طرف
اس کا اشارہ ہے شاید اس سر کی طرف
بہت ہے دل کی دولت ہم سے فقیروں کو
دیکھنا کیا اس دہر کے مال و زر کی طرف
اک رستے پر پڑتے ہیں یہ دنیا والے
اک رستہ جاتا ہے اس کے گھر کی طرف
عشق کہاں کم ہوتا ہے یوں چپ رہنے سے
یہ تو گلی کھلتی ہے کچھ اندر کی طرف
زندہ ہو تو رہو اپنے بل بوتے پر
کیا تکتے رہتے ہو چارہ گر کی طرف
پھر کرنا اک عالم عرفاں کی خواہش
پہلے دیکھو طور تم اپنے گھر کی طرف

کرشن کمار طور

شمارہ ۲۱۴،
فروری ۱۹۹۸

ادھر زمیں ہے ادھر آسماں ہے آنکھ لہو
ہے میری آنکھ لہو یا جہاں ہے آنکھ لہو

جو چپ رہوں تو یہ دل ٹکڑے ہوتا ہے
اگر کہوں تو مری داستاں ہے آنکھ لہو

ہر اک ذرہ معطر ہے اس کی خوشبو سے
مکاں محیط نہیں لامکاں ہے آنکھ لہو

وہ دیکھتا بھی ہے مجھ کو جو دیکھتا بھی نہیں
اسے میں کیسے کہوں کب کہاں ہے آنکھ لہو

زمانہ چاہے تو سمجھے نظر چراغ اسے
مری نگاہ میں تو رائیگاں ہے آنکھ لہو

بندھے ہوئے ہیں خدا جانے کیسی ڈور سے طور
جو میں ہوں آنکھ لہو سب جہاں ہے آنکھ لہو

شمارہ ۲۴۱
اکتوبر نومبر ۲۰۰۰

دلوں کے درد سا نادر خزانہ رکھتا کہاں
نہ اپنے ماتھے پر رکھتا زمانہ رکھتا کہاں

قفس نمایاں تھا اک اور ہی حوالے سے
پرندہ قید میں پھر آشیانہ رکھتا کہاں

ہم اپنی ذات کے پرتو میں اس کو دیکھتے ہیں
ہمیں انا سے بچا کر زمانہ رکھتا کہاں

کوئی جگہ مرے دل کے سوا تھی کب محفوظ
میں دہر میں ترے گھر کا خزانہ رکھتا کہاں

مری جبیں کو ضرورت تھی اس کے در کی طور
میں اس سے بڑھ کے کوئی اور ٹھکانا رکھتا کہاں

کرشن موہن

شمارہ ۲۸،
ستمبر ۱۹۶۸

ہمارے سامنے بیٹھی تھی وہ کتنی لطافت سے پیے جاتی تھی سگریٹ
اور باتیں کرتی جاتی تھی
مرے احساس کا دم بھرتی جاتی تھی
وہ اپنے دوست پر ہر لمحہ جیسے مرتی جاتی تھی
☆
وہ انداز تبسم، اک کرن سی پھوٹ جاتی تھی اندھیرے میں
جو ریستوراں کے اس گوشے کو لے لیتی تھی گھیرے میں
(بسی ہے میری یادوں کے بسیرے میں)
ہمارے ذہن مصروف مسائل، اس پہ مائل تھے
ادب اک قدر دائم ہے، ادب سے زیست قائم ہے
جدیدیت کی شدت سے ضرورت تھی
پرانے لوگ فرسودہ روایات سخن کو بھوگنے والے
لگے ہیں جن کے ذہن وقلب پر جالے
اندھیرے بند کمرے جن کے دروازوں پہ ہیں تالے
ہم اتنی دیر سے ہیں منتظر کافی نہیں آئی
وہ دیکھو تو ذرا پر کیف مرغولے

سحاب آسا، حباب آسا
شراب آسا، شباب آسا
کوئی افسانہ کوئی نظم ہو جائے
وہ آنکھیں، کیوں نہ دل یادوں میں کھو جائے
☆
گھپا تاریک ہے، باریک ہے یہ طرز نقاشی
ان آنکھوں کی ضیا پاشی
ہماری راہبر ہو گی
ذرا خوابوں کی خوشبو لے
چلو باہر چلیں، یہ سرمئی شام اور مرغولے
نہیں بھولے...نہیں بھولے
نہ بھولیں گے
سدا آنکھوں میں جھولیں گے
☆
کسی شام ان نئے ناموں سے ملواؤ

غزل

کرشن موہن

شمارہ ۲۰،

جنوری ۱۹۶۸

ترس رہا ہوں عدم آرمیدہ خوشبو کو
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں رمیدہ آہو کو
زہے نصیب کہ تسکین دے رہا ہے آج
تمھارا حسن مرے عشق سر بہ زانو کو
سمجھتا ہے مرا احساس گوہر و الماس
ہر ایک قطرۂ شبنم، ہر ایک آنسو کو
چمک رہا ہے تری راہ میں تری خاطر
ہے انتظار ترا، ہر دیے کو، جگنو کو
ستم کہ اہل محبت بھی رہ گئے ناکام
سمجھ نہ پائے جمال ہزار پہلو کو
یہ کامنا ہے کہ جوگن کوئی مچلتی ہے
جو اپنے روپ سے چھلتی ہے من کے سادھو کو
صباحت رخ تاباں نکھار دیتی ہے
لطافت و کشش حلقۂ سر مو کو
اتارا عمر گریزاں کے رمتے جوگی نے
ہمارے سر سے کئی جوگنوں کے جادو کو
سن التماس مری، لوک لاج کے احساس
نہ چھیڑ، رہنے دے سرمست قلب یک سو کو
ہزار حیلے بہانے سے کرشن موہن نے
شکار شوق کیا ہے نگار دل جو کو

ترا لٹیا شہر بھنبھور

کشور ناہید

شمارہ ۱۱۱،

فروری تا اپریل ۱۹۷۹

نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے
میں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمھیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی
سے کہیں کم ہے
تم میں بھی خواہش ہے
مجھ سے خوب صورت بنے رہنے
اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں
لپٹے رہنے کی
کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے
روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی
روز، سہ پہر سے رات
قدموں کی چاپ کی بازیافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلی کے حرف کی امید میں
بسر ہوتی، منتشر ہوتی اور پھر دن
کریز میں سجے دھلے دھلائے کپڑوں
کی طرح گذر جاتا ہے
سہ پہر سے رات
پھر وہی احساس
پھر وہی خواہش
تالے میں چابی گھومتی ہے
میں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح
صحرا میں گھومنے
اکیلے چیتے کی طرح..... مگر نیند نہیں آتی ہے

میں جو قیدی بنا

کمار پاشی

شمارہ ۳۴،

مارچ ۱۹۶۹

اس کی دائیں ہتھیلی پہ اڑتے پرندے کا
سایہ پڑے: اور میں
صدیوں پرے
اس کی تصویر دیکھوں... تو رونے لگوں
میرے آنگن میں بڑھتا ہوا پیڑ کٹ کر گرے:
اور وہ سولی چڑھے

بات کچھ بھی نہیں... بس یہی
ہر جھروکے کی مورت.... انوکھی، نئی
فاصلوں کی سیاہی میں دیکھی، سنی
کتنی بے چین عمریں ہیں الجھی ہوئی

میری مٹی نے میری غذا چھین لی: اور میں قیدی بنا
آخری بار... بس آخری بار دیکھا تھا اس کو
بہت دور بہتے ہوئے
وہ جو سولی چڑھا
میں جو قیدی بنا
آخری باب میں
چپ کے سیلاب میں

ایلیناپا (۱) کا زوال

کمار پاشی

شمارہ ۱۵،
اکتوبر ۱۹۶۵

ایلیناپا مضطرب ہے، اس کی
سیاہ آنکھوں میں کتنے سورج پگھل کے معدوم ہو چکے ہیں
وہ چھت پہ چڑھ کر پکارتا ہے
کوئی سمندر... کوئی سمندر
جو مجھ کو آغوش میں چھپالے

مگر خلاؤں میں کچھ نہیں ہے
سکوت...
اک بے کراں خموشی
جو بال کھولے ہوئے کھڑی ہے

ایلیناپا مضطرب ہے اس کے
نصیب میں ایسی کوئی بھی شب نہیں ہے شاید
جو اس کی آنکھوں میں خواب بھر دے
جو اس کے ہونٹوں پہ گیت بن جائے چاندنی کا

وہ گھر کے آنگن میں آ کے بوڑھے درخت سے پوچھتا ہے: بولو
کہ میں کہاں ہوں...
یہ کس رشی کا شراپ ہے: جو بدل گیا ہوں

ایلیناپا مضطرب ہے، اس کو
کئی زمانوں سے نیند بھی آ سکی نہ پل بھر
وہ جاگتا ہے
کئی زمانوں سے جاگتا ہے
وہ سوچتا ہے:
کہاں ہے وہ: جس نے شب گذاری ہے لاکھ صدیوں کی
لاکھ صدیوں تلک جو سویا ہے منہ چھپا کر
کہاں ہے وہ اب...

ایلیناپا مضطرب ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے
مگر میں گم سم... اداس
اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکتا ہوں
میں کیسے کہہ دوں:
کہ تم ہی قاتل ہو اس کے دیکھو:
تمھارے کپڑے پہ خوں کے دھبے ہیں اب بھی باقی
تمھارے کمرے میں بند ہے اب بھی لاش اس کی

مگر میں چپ ہوں
وہ مجھ سے کہتا ہے: اچھا... چھوڑو
یہ جام اٹھاؤ

(۱) ایک فرضی کردار

(۲)

شراب
تلخی
لہولہو فرش
اور بوڑھا درخت... ہر شے
ابھر کے معدوم ہو چکی ہے

نشہ بدن میں
نشہ ہوا میں
نشے میں دیوار و در ہیں سارے
ایلینا یا مجھ سے کہہ رہا ہے:
اسی جگہ، کل
عجب تماشا تھا تیرگی کا
مرا ہی خنجر تھا... میرا سینہ
مرا ہی خوں بوند بوند: آنگن میں گر رہا تھا
ہزار سائے: جو میرے چاروں طرف کھڑے تھے
مرے لہو کے نشے میں سرشار ہو رہے تھے
عجیب شب تھی
عجیب، جیسے کہ اژدہے سانس لے رہے ہوں

(۳)

کئی مہینوں کے بعد آیا ہوں اپنے گھر میں
تمام گھر پر عجب اداسی سی چھا رہی ہے
میں بڑھ کے کمرے کو کھولتا ہوں
تو دیکھتا ہوں:
عجب فضا ہے
تمام کمرہ اجاڑ، خالی
تمام دیواریں چپ، ہراساں
تمام کمرے میں کوئی بھی ایک شے نہیں ہے
فقط ایلینا کی لاش...
چھت سے لٹک رہی ہے۔

کیدارناتھ کومل

شمارہ ۵۳،
اکتوبر ۱۹۷۰

دیواریں

دیواریں
آگے
پیچھے
دائیں
بائیں
دیواروں کے پیچھے دیواریں
دیواروں کے پیچھے، پیچھے، پیچھے...
اور، اور، اور...
دیواریں، دیواریں، دیواریں...
کسی کو پکار
کب تک پکاریں

جی ہوتا ہے

جی ہوتا ہے
اساڑھ کے بولوں کو
چوموں جھوموں گاؤں
جنگل پہاڑوں میں
ندی نالے نہروں کی
لہر لہر کو گدگداؤں

تھکی تھکی
رکی رکی
جلتی دوپہر میں
چڑیا کے بچوں کو دلاروں
لاوارث، انجان
میلے کچیلے

معصوم بچوں کے
ہونٹوں پر
جنت سی مسکان
بن کھلکھلاؤں
اندھے بھکاری کے
پھیلے ہاتھوں میں
روٹی کا ٹکڑا
بن جاؤں
تپتے کھیتوں میں
جلوں اور
گیہوں کی بالی بالی میں
سونے کی صبح کا
گیت رچاؤں

کیف احمد صدیقی

شمارہ ۱۳۴
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

میں مثل مہر فقط روشنی سے خاک ہوا
خود اپنی شدت تابندگی سے خاک ہوا
کبھی شعور کی حدت سے بن گیا کندن
کبھی میں گرمی خود آگہی سے خاک ہوا
تمام جسم میں دہکی تھی آتش خاموش
نفس نفس میں بڑی خامشی سے خاک ہوا
زمانہ خوش ہے کہ اس نے مٹا دیا مجھ کو
یہ حادثات کا آتش کدہ عجب شے ہے
اسی سے پھول بنا میں اسی سے خاک ہوا
خود اپنے حق میں وہ انسان بن گیا اکسیر
رہ وفا میں جو زندہ دلی سے خاک ہوا
دہکتی آگ نہ مجھ کو جلا سکی لیکن
میں خاکداں میں فقط خاک ہی سے خاک ہوا
تمام شہر کو جھلسا کے رکھ دیا جس نے
وہ دشت غرب میں کس بے بسی سے خاک ہوا
ہر ایک پھول سے لے کر حرارت شبنم
میں رفتہ رفتہ چمن میں نمی سے خاک ہوا
امیر شہر نے سمجھی نہ کیف کی قسمت
وہ کیمیا تھا مگر مفلسی سے خاک ہوا

کیلاش ماہر

شمارہ ۳۰،
نومبر ۱۹۶۸

تمھیں کیا... بڑے گھر کی بیٹی ہو، رانی ہو تم بھی
تمھیں خاندانی روایت، شرافت کا ورثہ ملا ہے
تمھیں کس کی ہمت ہے آنکھیں دکھائے
کوئی تم پہ انگلی اٹھائے
ابھی تین بجنے میں کچھ دیر تھی
(دوپہری درختوں میں سمٹی ہوئی تھی)
کسی نے تمھیں میوزیم کی ہری گھاس کے اس کنارے پہ دیکھا
کوئی تم سے کیڑے کی مانند چمٹا ہوا تھا
(ضروری کوئی دفتری کام ہوگا)
راج پتھ کے سرے پر جو لمبی سڑک پار پیڑوں کا اک جھنڈ ہے
وہاں کل جھجکتی، جھکتی سی تم سائے سائے کسی شخص سے
یونہی سرگوشیاں کر رہی تھیں
(گھریلو کوئی راز کی بات ہوگی)
کلرکوں کی عادت ہے یوں ہی فسانے بنانا...
تمھیں کیا بڑے گھر کی بیٹی ہو، رانی ہو تم بھی
پڑوسن نے دیکھا تھا ایک شخص کو منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلتے
ضروری نہیں کہ وہی شخص ہو
کوئی اور ہوگا.... کوئی رشتے ناطوں میں ہوگا
پڑوسن تو ہرجائی ہے تم سے جلتی رہی ہے
تمھیں خاندانی روایت، شرافت کا ورثہ ملا ہے
بڑے گھر کی بیٹی ہو... رانی ہو تم بھی

اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ: چند مثالیں

گوپی چند نارنگ

شمارہ ۴۷،
اگست ۱۹۶۸

(۱)

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو افسانے کے کئی رجحان سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے جو رجحان بنیادی نوعیت کے ہیں، وہ چار ہیں۔ پہلا رجحان تقسیم کے المیے کو پیش کرنے کا ہے۔ اس کی ذیل میں دو طرح کے افسانے آتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی نوعیت ہنگامی تھی اور جو فسادات کو براہ راست موضوع بنا کر لکھے گئے تھے۔ دوسرے وہ جو تہذیبی سطح پر تقسیم کے المیے کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے بہترین علم بردار ہندوستان میں قرۃ العین حیدر اور پاکستان میں انتظار حسین ہیں۔ دونوں کے نقطۂ نظر، تکنیک اور کینوس میں بڑا فرق ہے، لیکن دونوں کے ایسے افسانوں کا محرک بعض محبوب تہذیبی قدروں کا زوال ہے۔

دوسرا رجحان زندگی کی جامعیت اور اس کے نارمل حسن کو اس کی سیاہی اور سفیدی کے ساتھ پیش کرنے کا ہے۔ اس رنگ کے امام راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ نئی نسل کے بیش تر لکھنے والے بھی زندگی کی ہمہ پہلو ترجمانی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بیدی والی بات نہیں۔ البتہ یہ لوگ اس لحاظ سے پچھلے افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں کہ ان میں سے بیشتر کسی طرح کی نظریاتی وابستگی قبول نہیں کرتے اور ''سوچے سمجھے نتائج'' کی فارمولا کہانی سے بچتے ہیں۔ ان کے ہاں بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہے، اور بجائے ٹائپ کے کردار پر زور ملتا ہے۔ یہ زندگی کے غیر مرئی یعنی زیادہ حقیقی خد و خال کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رام لال، جوگندر پال، اقبال متین، ستیش بترا، قیصر تمکین، شرون کمار ورما، رتن سنگھ، اقبال مجید، ظفر اوگانوی، امر سنگھ، اور عابد سہیل کے نام قابل ذکر ہیں۔

تیسرا رجحان علاقائی افسانے کا ہے جیسے پنجاب کی زندگی سے متعلق بلونت سنگھ کے افسانے یا اتر پردیش کے جاگیردارنہ تمدن سے متعلق قاضی عبدالستار کے افسانے، یا بہار سے متعلق غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی کے افسانے۔ اور دوسری طرف وہ افسانے ہیں جس میں کسی علاقے کی گھریلو زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے، مثال کے طور پر جیلانی بانو، واجدہ تبسم، یا کم تر درجہ پر عفت موہانی اور آمنہ ابوالحسن کے افسانے۔

چوتھا بنیادی رجحان تجریدی اور علامتی افسانے کا ہے۔ اس قسم کا افسانہ آزادی سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ملتا ہے، مثلاً کرشن چندر کا ''غالیچہ''، ''چوراہے کا کنواں''، ''جہاں ہوا نہ تھی'' اور ''چھتری''؛ احمد ندیم قاسمی کا ''سلطان'' اور ''وحشی''؛ اور ممتاز شیریں کا ''میگھ ملہار''۔ احمد علی اور عزیز احمد کے بعض افسانے بھی تجریدی افسانوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن ادھر نئی نسل کے بعض افسانہ نگاروں نے اسے ایک رجحان کی حیثیت سے اپنایا ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہندوستان کے اردو افسانہ کے اسی جدید رجحان سے بحث کی جائے گی۔ ایسے افسانوں میں اشاریت اور علامیت کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے برتا جاتا ہے۔ وزیر آغا نے ایک جگہ صحیح لکھا ہے:

> اشاراتی عنصر تمام اصناف ادب میں اہمیت حاصل کر رہا ہے اور افسانے نے بھی اسے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ دراصل تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ فرد کی تیز نگاہی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ اب وہ پلک جھپکتے میں بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس لئے واشگاف انداز کا کچھ زیادہ دلدادہ نہیں رہا۔

سیدھے سادے روایتی افسانے کے مقابلے میں علامتی افسانہ کچھ غیر مرئی سا ہوتا ہے۔ اس میں ٹھوس ہونے کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو منطقی افسانے کی خصوصیت ہے۔ اس میں زماں اور مکاں کا واقعیاتی احساس بھی نہیں ملتا بلکہ زماں اور مکاں دونوں ذہنی تجرید کی سطح پر واقع ہوتے ہیں اور ان میں اچانک تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ علامتی افسانے میں ٹھوس کرداروں کا کام تمثیلوں اور علامتوں سے لیا جاتا ہے، جیسا کہ آگے چل کر وضاحت کی جائے گی۔ علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہ داری پیدا کر دیتا ہے۔ علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں، لیکن بعض علامتیں مقصود بالذات بھی ہوتی ہیں اور افسانہ نگار ان سے فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جا سکے۔ بعض افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت اختیار کر لیتا ہے کہ ان میں علامتی افسانے کی شان از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سلطان'' اس کی بہترین مثال ہے۔ تجریدی افسانہ ہمارے افسانے کے اس سفر کی نشان دہی کرتا ہے، جس کا رخ خارج سے داخل کی طرف ہے۔ یہ انسان کے ذہنی مسائل، اس کے داخلی کرب اور حقیقت کے عرفان کی تلاش کا اظہار ہے۔ افسانہ علامتی ہو یا تجریدی، اس میں لغوی معنی صرف ایک طرح کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ باقی کام پڑھنے والے کی ذہنی استعداد کا ہے۔ دراصل لفظوں کے ظاہری، منطقی اور لغوی معنی کے علاوہ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اگر یہ بات نظر میں رہے تو ان سے لطف اندوز ہونا چنداں مشکل نہیں۔

پاکستان میں اس رجحان کے نمائندہ افسانہ نگار مندرجہ ذیل ہیں:

انتظار حسین ("ہم سفر") عبداللہ حسین ("جلاوطن") خالدہ اصغر ("ایک بوند لہو کی"، "سواری"، "بے نام کہانی") انور سجاد ("مرگی"، "چوراہا"، "گائے"، "پرندے کی کہانی") اور غلام الثقلین ("لمحے کی موت"، "وہ"، "سرگوشی")۔ ہندوستان میں اس کو آگے بڑھانے والوں میں دیوندر اسر، بلراج مین را، سریندر پرکاش، راج اپے، بلراج کومل، کمار پاشی اور احمد ہمیش کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس رجحان سے مزید بحث کرنے کے لئے میں صرف دو افسانہ نگاروں، بلراج مین را اور سریندر پرکاش، کو لوں گا اور ان کے بھی صرف چند افسانوں کو۔ ان فسانہ نگاروں اور ان افسانوں کو اس لئے نہیں لیا جارہا کہ یہ افسانہ نگار یا یہ افسانے بہترین ہیں، بلکہ یہ کہ ان سے اس رجحان کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہاں میں تجزیاتی طریق کار استعمال کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان افسانوں کا ڈھانچا کیا ہے، ان میں علامتیں اور ذہن و احساس کی رو کس طرح کام کرتی ہے اور کیا ان میں کسی طرح کی کوئی معنوی تہ داری ہے یا نہیں؟ جدید ادب پر تنقید کرتے ہوئے میرا مسلک کچھ ایسا ہے کہ اس طرح کے تجزیہ کے بعد ہی ہم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم نئے رجحانات کے بارے میں کوئی حکم لگا سکیں۔

(۲)

یہاں سب سے پہلے بلراج مین را کے افسانے "ماچس" کو لیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے، جس کی نیند رات کو بے وقت کھل جاتی ہے اور وہ سگریٹ سلگانا چاہتا ہے، لیکن ماچس خالی ہے۔ وہ پورے کمرے کو چھان مارتا ہے لیکن سب ماچسیں خالی ہیں۔ ٹھنڈی رات میں وہ باہر نکل کھڑا ہوتا ہے، کئی جگہوں پر ماچس کی ناکام تلاش کے بعد وہ ایک مرمت شدہ پل پر پہنچتا ہے۔ یہاں سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سے وہ سگریٹ سلگانا ہی چاہتا ہے کہ ایک سپاہی اس کو پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے۔ وہاں کئی لوگ میز کے گرد بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں اور کئی ماچسیں رکھی ہیں۔ لیکن اس پر آوارہ گردی کا الزام لگا کر اس کو وہاں سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ واپسی پر اس کو ایک آدمی ملتا ہے، جس سے وہ ماچس مانگتا ہے لیکن وہ شخص خود ماچس کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے چھوڑے ہوئے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اس کہانی کا بنیادی کردار یعنی "وہ" کون ہے اور ماچس ایسی کون سی پراسرار چیز ہے، جس کی تلاش میں وہ رات کی سردی اور اندھیرے میں مارا مارا پھر رہا ہے؟ فرض کیجئے کہانی کا بنیادی کردار جدید دور کا باشعور انسان ہے۔ ملاحظہ ہو کہ پکڑے جانے سے پہلے وہ راستے میں ایک آدمی سے ماچس مانگتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ سگریٹ پینے کی علت سے بچا ہوا ہے۔ نیز جب وہ تھانے سے نکل کر نہ ختم ہونے والی سڑک پر چلنا شروع کرتا ہے تو سوچتا ہے: "سگریٹ پینا ایک علت ہے۔ میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے۔" کیا یہ علت جینے کی علت تو نہیں؟ عام انسان اور باشعور انسان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ اب ماچس کی علامت افسانے کی دوسری علامتوں کے ڈھانچے (Frame Work) کے ساتھ خود بخود واضح ہونے لگتی ہے۔ یعنی یہ تلاش ہے زندگی کی معنویت کی، یا تڑپ ہے وجود کو سمجھ سکنے کی، یا کسی بھی مقصد یا آئیڈیل کو پانے کی جس کے لئے پورا وجود سلگ رہا ہے۔ لیکن اسی ماچس کے بارے میں حلوائی کی دوکان پر سویا ہوا آدمی کہتا ہے: "ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا تو بھٹی گرم ہوگی۔" نیز یہ کہ تھانے میں "میز پر ماچس کی کئی ڈبیاں پڑی ہوئی تھیں۔" یہاں حلوائی یا تھانے کے لوگوں کی علامتوں سے ایسے انسان مراد لئے جاسکتے ہیں جو ذہنی تجسس کے اس مادے سے بے گانۂ محض ہیں جو باشعور انسان کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ تخلیقی احساس یا داخلی کرب یا جستجو کی دولت سے بھی محروم ہیں۔ اس لئے ان کی ماچس سے افسانے کا بنیادی کردار سگریٹ سلگانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ زندگی کی اندھیری رات میں جگہ جگہ بھٹکتا ہے لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ اس توجیہ کی توثیق کہانی کے آخری واقعے سے بھی ہوتی ہے، جس نے کہانی کو ایک عام علامتی سطح سے اٹھا کر اعلیٰ ترین فنی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ تھانے سے نکلنے کے بعد اس کی ملاقات ایک اور شخص سے ہو جاتی ہے۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟
ماچس؟
آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟
ماچس کے لئے تو میں...
وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

یہاں افسانہ نگار نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں بڑھایا، اور ساری بات چند لفظوں کے مکالمے میں نہایت چابک دستی سے بیان کر دی ہے۔ فن کار زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرم سفر ہے، وقت سے بے خبر، بدن کی تھکن سے بے نیاز، وہ برابر چل رہا ہے ذہنی سفر کی اس سڑک پر جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ علامتی افسانے میں افسانہ نگار کو محض لغوی یا منطقی معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ علامتیں تیز روشنی (Flash) کی طرح سامنے آتی ہیں، اور ایک ساتھ ان گنت معنوی امکانات جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں۔ ہم اپنے تجربہ اور احساس کی بنا پر ایک دو معنی کو فوری طور پر لے لیتے ہیں اور باقی کو تحت الشعور کی دھند میں روشنی اور تاریکی کے بلبلوں کی طرح ابھرنے اور مٹنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں علامتیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے استعاروں کا مرتبہ رکھتی ہیں اور ایک نظام کی حیثیت میں کارفرما ہوتی ہیں۔ اگر مناسب غور وفکر سے کام لیا جائے تو اس نظام تک رسائی حاصل کرنا اور اس کی کڑیاں ملانا چنداں مشکل نہیں۔

اب مین را کی ایک اور کہانی "کمپوزیشن دو" کو لیجئے۔ یہ ٹکنیک کے اعتبار سے بھی دلچسپی کی حامل ہے۔ اس میں موت کا فرشتہ بتاتا ہے کہ اس کا کام کیا ہے۔ لوگ درازی عمر کا کلمہ پڑھتے ہیں اور ہمیشہ اس سے خائف رہتے ہیں۔ وہ جب کسی پاس جاتا ہے، وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیتا ہے۔ لیکن ایک آدمی اس کی مشکل بن گیا ہے۔ اس کی کل کائنات ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں سیاہ ہیں۔ چھت سیاہ ہے، دروازوں کی چوکھٹیں اور پٹ سیاہ ہیں۔ میز سیاہ ہے، کتابیں سیاہ ہیں، غرض ہر شے سیاہ ہے۔ یہ کمرہ دن کی روشنی میں بھی سیاہی میں لت پت پڑا رہتا

ہے۔ اس آدمی کا لباس سیاہ چادر ہے۔ وہ سیاہ روشنائی سے سیاہ کاغذ پر سیاہ عبارت لکھتا ہے۔ سیاہ ساڑی اور سیاہ بلاؤز میں لپٹی ہوئی سیاہ بالوں والی لڑکی آتی ہے اور دونوں میں سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ رات ختم ہونے سے پہلے وہ لڑکی چلی جاتی ہے اور وہ سیاہ تابوت میں لیٹ جاتا ہے اور تابوت کا ڈھکنا گر جاتا ہے۔ یہاں مین را نے افسانے کو ایک موڑ دیا ہے کہ کہانی سننے کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ کہانی سنانے والے کا لباس سیاہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم مریضوں کے افسانے سننے نہیں آئے۔ اس کے فراڈ پر انھیں اتنا غصہ آیا کہ اسے انھوں نے وہیں مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ لیکن بعد میں گھر جا کر دیکھا تو واقعی اس کا کمرہ سیاہ تھا، چھت سیاہ تھی، دیواریں سیاہ تھیں...

یہ سیاہ کمرے والا انسان کون ہے جو عام انسان موت کے فرشتے سے ڈرتے ہیں؟ موت کے فرشتے کا کام سیاہ ہے۔ لیکن یہ انسان جس کی کل کائنات ایک کمرہ ہے اور جس کمرے کی ہر چیز سیاہ ہے، موت کے فرشتے کی مشکل بن گیا ہے۔ کیوں؟ موت کے فرشتے کے کام میں اور اس آدمی کے طرزِ زندگی میں افسانہ نگار نے جو ربط و تضاد پیش کیا ہے، لطف و اثر سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند جملے دیکھیے:

> میرا کام ہی ایسا ہے۔ بھری برسات میں، جھلستی گرمی میں، ٹھٹھرتی سردی میں اور ہنستے کھیلتے اٹکھیلیاں کرتے موسم میں، وادیوں میں، ویرانوں میں، جنگ کے میدانوں میں، اسپتالوں میں، سونے چاندی کے گھروں میں، گھاس پھوس کے جھونپڑیوں میں، صبح و شام، ہر گھڑی، چند لمحوں کی عمر کے بچے کو، سترہ سال کی محوِ خواب لڑکی کو، پچیس سال کے کڑیل جوان کو، اسی سال کے بڈھے کھوسٹ کو، شرافت کے مجسمے کو، کمینگی کے پتلے کو، بھولے بھالے کو، چالاک کو... میں موت کا فرشتہ ہوں... میں ہر کسی کے پاس جاتا ہوں اور اسے لے آتا ہوں۔ مجھے آپ جانتے ہیں، پہچانتے نہیں۔

اس کے بعد ان سطروں کو پڑھیے:

> کمرے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ میز رکھا ہوا ہے۔ میز سیاہ ہے، میز پوش پر کڑھے ہوئے پھول بھی سیاہ ہیں۔ کتابوں کی جلدیں سیاہ ہیں۔ اوراق سیاہ ہیں اور اوراق پر پھیلی ہوئی عبارت سیاہ ہے... کاغذ سیاہ ہیں۔ قریب رکھا ہوا قلم سیاہ ہے اور قلم میں روشنائی سیاہ ہے۔ میز کے قریب ایک کرسی پڑی ہے۔ کرسی سیاہ ہے۔ چھت کے عین بیچ میں سیاہ کنڈا ہے جس کے ساتھ بجلی کی سیاہ تار بندھی ہوئی ہے۔ فرش کی طرف لٹکتی ہوئی سیاہ تار کے ساتھ سیاہ بلب ٹنگا ہوا ہے بلب کا شیڈ سیاہ ہے۔ ایک دیوار میں سیاہ سوئچ بورڈ ہے سوئچ بھی سیاہ ہے۔ کھڑکی کے عین نیچے تابوت رکھا ہوا ہے وہ کمرہ...

اس طرح اس کمرے کی رعایت سے جو کردار ابھرتا ہے وہ بڑا ہی انوکھا اور عجیب ہے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سیاہ رنگ یا تاریکی ہر اس چیز کی نفی ہو سکتی ہے جسے رسمی طور پر ہم پسند کرتے ہیں۔ روشنی، خوشی، امید، کام یابی، کامرانی، سرگرمی وغیرہ کا اشاریہ ہے۔ افسانہ کے کردار کا بظاہر ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ دنیا جاگتی ہے وہ سوتا ہے۔ رات میں وہ بیدار ہوتا ہے اور سیاہ کمرے میں سیاہ بلب سے سیاہ روشنی ہوتی ہے اور سیاہ قلم سے سیاہ کاغذوں پر وہ سیاہ عبارت لکھتا ہے۔ امید اور ناامیدی، دکھ اور سکھ، مثبت اور منفی، روشنی اور اندھیرے کا فرق وہ مٹا چکا ہے۔ زندگی کی کشش اور مسرت کے لئے مارے مارے پھرنے کی خواہش کا کانٹا اس کے دل سے نکل چکا ہے۔ اور تو اور، موت کا خوف بھی اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لڑکی سے اس کی جو گفتگو ہوتی ہے، وہاں مختصر ترین مکالمے میں افسانہ نگار نے اس کے مسلک کی طرف بلیغ طریقے سے اشارہ کیا ہے۔

"ہم سکھی ہیں... ہم دکھی تھے نہ اس لئے۔" یا: "ہم نہ کہتے تھے کہ دن کا اندھیرا موت ہے... رات کا اجالا زندگی ہے..." موت اس کے لئے اس قدر بے خطر چیز ہے کہ اس نے اپنا تابوت بھی بنا رکھا ہے اور وہ خود ہی اس میں لیٹ جاتا ہے۔ دن میں صنعتی زندگی کی دوڑ جو فرد کی شخصیت کی موت ہے یا جو اس کے لئے ہر طرح کے دکھ کا عذاب لاتی ہے یا آگہی کی روشنی میں اس کو تڑپاتی ہے، وہ شخص اس کی نفی ہے۔ دکھ سکھ کے روایتی معیار اس کے لئے بے معنی ہو چکے ہیں اور زندگی اور موت کا فرق مٹ سا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے اسی کردار سے موت کے فرشتے کی کہانی بیان کرا کے افسانے کو ایک غیر متوقع موڑ دیا ہے۔ لوگ اس کا سیاہ لباس دیکھ کر اس کو مکار سمجھتے ہیں اور اس کو مار ڈالنے کے بعد جب اس کے گھر جا کر دیکھتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ تو کھرا (Genuine) انسان تھا۔

"ایک مہمل کہانی" میں ہسپتال کا لوہے کا صدر دروازہ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ کچھ پرے مورچری کے باہر بجری پر پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اشوک کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دوست کلدیپ مر گیا ہے اور اس کی لاش مورچری میں ہے۔ وہ مورچری میں جا کر اس کی لاش کو دیکھتا ہے۔ وہ لیبرٹری میں جاتا ہے۔ جو بھی اسے ملتا ہے، کلدیپ کی بات کرتا ہے، لیکن اسے دھوپ اچھی لگ رہی ہے۔ پرائیویٹ کالج میں کلدیپ کا پلنگ خالی پڑا ہے۔ یہاں گوری چٹی نرس سے بات ہوتی ہے۔ شام کا وقت طے ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے آخر مان ہی گئی۔ شام کو بس میں جاتے ہوئے اس کے خالی ذہن میں دودھ کی ملاوٹ سے لے کر ڈی۔ ایم۔ کے۔ کے احتجاج تک کئی خیال آتے ہیں لیکن وہ گوری چٹی لڑکی 'وہ کتنی سے بس میں ایک لڑکی کو چھیڑتا ہے اور گالی سنتا ہے۔ دل دھک دھک کر رہا ہے اسی لڑکی سے ملنے کے لئے وہ آج تک جتن کرتا آیا تھا۔ لڑکی کے کپڑے اتارتے ہی وہ سوچتا ہے: He is dead۔ وہ لڑکی کے منہ پر طمانچہ جڑ دیتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے: Get out!۔ اس کا چہرہ خوف ناک ہو اٹھتا ہے۔ I will die tomorrow۔

کہانی زندگی اور موت کے متضاد تصورات سے رنگ و آہنگ حاصل کرتی ہے۔ لوہے کا صدر دروازہ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ جب کوئی مریض ڈسچارج ہوتا ہے تو وارڈ کے تمام مریض اسے پھولوں سے لاد کر صدر دروازے تک چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ زندگی ہو سکتی ہے۔ جب کوئی مریض مر جاتا ہے۔ تو وارڈ کے تمام مریض لاش کو پھولوں کی پتیوں سے لاد دیتے ہیں اور مورچری تک چھوڑ آتے ہیں۔ یہ موت کا اشارہ ہو سکتا ہے۔ کلدیپ مر چکا ہے اور اشوک زندہ ہے۔

ہسپتال کے لوگ بار بار اشوک سے کلدیپ کے مرجانے کا ذکر کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے جو مر گیا اس کی بات نہ کرو۔ لوہے کا خالی پلنگ بھی دو دن خالی رہتا ہے اور پھر بھر جاتا ہے یعنی دنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ اسے دھوپ یعنی زندگی اچھی لگتی ہے۔ گوری نرس کی آواز میں دھوپ کا سہانا پن ہے۔ وہ لاش کے ساتھ مرگھٹ پر نہیں جاتا، اس لئے کہ جو مر گیا سو مر گیا۔ اس کے بجائے وہ لڑکی سے وقت طے کرتا ہے۔ اب تک وہ کلدیپ کی دوستی کی آڑ میں اس سے ملاقات کا متمنی تھا۔ پہلے یہ ''پھنسائے'' نہیں ''پھنستی'' تھی۔ اب مان جاتی ہے۔ یہاں انسانی رشتوں کے مہمل ہونے کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے جو کہانی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے زندگی کے بے معنی ہونے کے احساس سے مل کر پھٹ سا پڑا ہے۔ وہ اس سہارے کا کچھ ایسا عادی ہو گیا تھا کہ یہ سوچ کر کہ وہ سہارا جو اب باقی نہیں رہا لغو تھا، وہ کانپ سا جاتا ہے اور اس کو خود پر قابو نہیں رہتا۔ افسانہ میں جگہ جگہ ہر تجریدی پارے ہیں جو مرکزی کردار کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

مین را فکر اور فارم دونوں اعتبار سے اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ حقیقت کا تجزیہ نظریاتی فیتوں یا فارمولوں سے نہیں کرتے بلکہ آزادانہ ذہنی جراحی کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں فکر کی دھار حقائق کے سینے میں پیوست نظر آتی ہے۔ موجودہ دور میں فرد کی شخصیت کا تصادم، اس کا داخلی کرب اور اس کی غیر انسانیت (Dehumanisation) مین را کا محبوب موضوع ہے۔ فرد کی ذلت، اس کی بے سر و سامانی، اس کی ذہنی جستجو ان کے افسانوں میں بار بار اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ ان کا بنیادی کردار بڑی حد تک سوانحی ہے۔ یہ ایک ایسا انسان ہے جو زندگی کی معنویت کی تلاش میں اور اس کی غرض و غایت کا راز جاننے کے لئے ذہنی بن باس اختیار کر چکا ہے اور گلی گلی، شہر شہر، اندھیرے اور اجالے میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ کامیو سے متاثر ہیں۔ لیکن ان کی تخلیقی حس ہندوستانی معاشرے اور اس کے مخصوص حالات سے بے تعلق نہیں۔ مین را اپنی علامتوں کا انتخاب سامنے کی چیزوں سے کرتے ہیں اور پھر اپنے ذہنی تجسس کی سان پر چڑھا کر ان میں تہہ داری پیدا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جدید انسانوں کے فکری سفر، اس کی ذہنی تنہائی اور اس کے تجارتی قدروں کے معاشرے کٹ کر علیحدہ رہ جانے کی روداد پیش کرتے ہیں۔ ان کے ذہنی پیکر اکثر ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہوتے ہیں اور انھیں ملا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ روشنی اور تاریکی دونوں سے کام لیتے ہیں، لیکن صرف اتنا جتنا بے حد ضروری ہو۔ وہ تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔ تفصیل خواہ حالت کی ہو، مکالمے کی، یا ذہنی کیفیت کی، ان کے مزاج کے منافی ہے۔ ان کے افسانے مختصر ہوتے ہیں، یہی تین چار صفحے، جملے چھوٹے چھوٹے لیکن فکری طور پر بے حد مربوط۔ انھوں نے ہیئت کے جو تجربے کئے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق اختصار اور علامتیت سے ہے۔ وہ ایک جملے سے ایک پیراگراف کا اور کبھی کبھی ایک پیراگراف سے پورے صفحے کا کام لیتے ہیں۔ منٹو کے ہاں جو لفظی کفایت شعاری ہے، وہ مین را کے ہاں باقاعدہ اسٹائل بن گئی ہے۔ وہ اکثر نہیں بتاتے کہ کون بول رہا ہے، کس سے بول رہا ہے۔ حالت کی طرف اشارہ کر کے وہ اس کا تجزیہ بھی نہیں کرتے۔ ان کے اکثر جملے فکر کی ایک دھندلی لکیر کھینچ دیتے ہیں اس کے بعد پڑھنے والا اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مین را کے ہاں اردو افسانے کے مستقبل کی ایک نئی بشارت ملتی ہے۔

(۳)

سریندر پرکاش کے افسانے ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' کا شمار اردو کے اہم علامتی افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے افسانوں کی طرح اس کی بھی تلخیص ممکن نہیں، لیکن اگر ایسی کوئی ناکام کوشش کی جائے تو وہ کچھ اس طرح کی ہوگی:

> سمندر اور میدان سے گذرنے کے بعد انسان وادی میں اتر گیا۔ دوسرے تھوتھنیاں اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں الوداع الوداع کہہ رہی تھیں۔ وادی میں سورج مسکراتا ہوا پہاڑ پر سیڑھی چڑھ رہا تھا۔ گرد آلود پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر چکنی سڑکوں سے گذرتے ہوئے وہ ایک کشادہ مکان کے پھاٹک پر رکا۔ خاموشی میں اس کی آواز گونجی۔ دلنددیزی دروازے نے باہیں پھیلا کر خیر مقدم کیا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش سے اس نے اندازہ کیا کہ یہاں کا رہنے والا خوش سلیقہ آدمی ہوگا اور دونوں گرم جوشی سے ملیں گے۔ اس نے گل دان کو چھوا اور اپنی انگلیوں پر اس کی خنکی محسوس کی۔ اور آتش دان کے سیاہ مرمر کی دھاریوں کے صحرا میں خود کو ڈھونڈنے لگا۔ ایک تصویر اس کا ہاتھ لگنے سے گر گئی۔ اس میں ایک آدمی گود میں ایک ننھی سی بچی کو اٹھائے ایک عورت کے ساتھ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہ تصویر کبھی کھنچوائی تھی۔ برآمدے سے کسی کے لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آ رہی تھی، مسلسل، باقاعدہ۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے اور باہر برف گر رہی ہے، لیکن کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا تو برف نہیں تھی۔ وہ تنہا محسوس کرتے ہوئے غم زدہ سا ہو گیا۔ اتنے میں اس کے ذہن سے ایک سانپ نکلا اور اپنی تیز تڑپتی ہوئی سرخ زبان نکالے ہوئے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہاں ایک عورت نے انگڑائی لی اور ایک بچی کھیلتی ہوئی نظر آئی۔ لاٹھی ٹیکنے کی آواز پھر آنے لگی۔ برآمدے میں ایک اندھا آدمی لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ برآمدے کے موڑ سے گذر گیا۔ اس نے سوچا، کاش ڈرائنگ روم کی سب چیزیں اس کی ہوتیں۔ لیکن اس کا وجود اسے قالین پر اوندھا پڑا ہوا محسوس ہوا اور وہ رونے لگا۔ لاٹھی کی آواز پھر آئی۔ اس نے بوڑھے کو لپک کر پکڑنے کی پھر کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ برآمدے کے پاس کانسے میں ڈھلا ہوا ایک بوڑھا بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس نے چاہا وہ

بھی اسی کی طرح اطمینان سے بیٹھ کر تیاکو پیتا رہے، لیکن جواب ملا کہ کانسے میں ڈھلنا پڑے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک بپھرے ہوئے سمندر، ریت اڑاتے ہوئے صحرا اور برف باری کے طوفان میں اکیلا انسان کیا کر سکتا ہے؟ وہ دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دینے لگا جو یہ سب سوچتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ وہ ابھی خوش سلیقہ آدمی سے ملاقات کے انتظار میں تھا کہ آواز آئی، چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کی چیزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آواز پھر آئی۔ یہ سب تمہارا ہی تو تھا مگر اب اور مہلت نہیں۔ وہ کسی ان جانی چیز کے کھو جانے کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بے بس ہو کر اس نے کہنا چاہا: اگر کبھی کوئی کم زور، بے سہارا کشتی ساحل سے آ لگے تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں۔

کہانی کے پہلے ہی پیراگراف میں ہمیں ایک قافلہ دکھائی دیتا ہے:

سمندر پھلانگ کر ہم نے جب میدان عبور کئے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیل گئیں۔ میں اک ذرا رکا اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ میں بے پناہ اپنائیت کے احساس سے بھر گیا۔ تب علیحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کی اور میں انتہائی غم زدہ، سر جھکائے وادی میں اتر گیا۔ جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سب تھوتھنیاں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بار بار سر ہلا کر وہ اپنی رفاقت کا اظہار کرتے اور ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی دھات کی گھنٹیاں "الوداع، الوداع" پکار رہی تھیں اور ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے کونوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

سمندر، میدان، پگڈنڈیاں ان سب کے ایک ساتھ سامنے آنے سے ذہن کسی طرح کے سفر کی طرف جاتا ہے۔ شاید وہ سفر جو قدیم سے جدید کی طرف رہا ہے۔ پہلے انسان سب کے ساتھ تھا اور اپنائیت کے احساس سے سرشار تھا۔ لیکن "جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کی اور وہ انتہائی غم زدہ ہو گیا۔" افسانہ کی معنوی کلید اسی پہلے پیراگراف میں موجود ہے۔ فوراً بعد دوسرے پیراگراف میں تھوتھنیوں اور گھنٹیوں سے ذہن جانور کی طرف یا غیر متمدن انسان یا انسان کے Archetype کی طرف جاتا ہے جو اب وقت کی فصیل کے اس پار رہ گیا تھا۔ وادی میں نئے راستوں پر چلتے ہوئے اس کے "دل میں رہ رہ کے امنگ سی پیدا ہوتی" ہے، آگے بڑھنے کی، نئی مسافت طے کرنے کی یا کچھ پانے کی۔ سامنے سائنسی، صنعتی یا تہذیبی اور ارتقا کا "سورج مسکراتا ہوا پہاڑ پر سیڑھی سیڑھی چڑھ رہا تھا۔" قدیم کی "گرد آلود پگڈنڈیاں" پیچھے رہ گئیں اور وہ جدید کی "صاف شفاف، چکنی سڑکوں" پر چلنے لگا۔ ملاحظہ فرمائیے پگڈنڈی کے مقابلے پر صاف شفاف چکنی سڑک ذہن کو موجودہ دور کی ظاہری چمک دمک اور بے حسی سے کس قدر نزدیک لے آتی ہے۔ انسان کی معصومیت اور اپنائیت کی مسرت کا دن ڈھل رہا تھا اور شام ہوتے ہوتے وہ ایک مکان میں داخل ہوا۔ شام اداسی یا غم کا استعارہ ہے اس سے مراد جدائی کا آغاز بھی ہو سکتا ہے اور مشینی ترقی کے تاریک دور کی ابتدا بھی۔ خاموشی میں انسان کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پکار رہا ہے۔ یہ گویا اشارہ ہے اس کے پچھڑ کر تنہا رہ جانے کی طرف۔ نئے اثرات کا دلنوازی دروازہ باہیں پھیلا کر اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ مکان میں پرانے انداز کے آریائی جھروکوں جیسی کھڑکیاں ہیں، لیکن ان پر بھاری پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں لفظوں کی معنوی چکا چوند میں جو کچھ سامنے آتا ہے، اس سب پر نظر رہنی چاہئے۔ اگر ہم محض لغوی معنی سے چپکے رہیں گے تو افسانے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ کھڑکیاں کھڑکیاں بھی ہیں، جھروکے بھی، پرانے تمدن کی نشانیاں بھی اور تاریخ کا تسلسل بھی، نیز یہ بھی نظر میں رہے کہ شاید ماضی کی روشنی بھاری پردوں کے ادھر رہ گئی ہے اور مستقبل کی کرنیں بھی حال تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر معاً ذہن انسان کی صنعتی ترقی اور مادی آسائش یا آرام پسندی کی طرف جاتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے کہا ہے: "آتش دان میں آگ بجھ چکی تھی"۔ اس سے مراد قدروں کا زوال اور یقین کا فقدان بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح جدید انسان کی ذہنی افسردگی کو ایک بار پھر ابھارا گیا ہے۔ سمندر اور میدان یعنی فطرت کے بے پایاں حسن کی جگہ اب دھات کے گل دان نے لے لی ہے۔ پہلے انسان کو فطرت سے ہم کلامی کا شرف حاصل تھا لیکن اب گل دان کا اپنا "الگ وجود" ہے۔ اس کے چھونے سے انگلیوں پر سوائے "خنکی" کے کچھ اور محسوس نہیں ہوتا۔ علامتوں کا جو نظام سامنے آ چکا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اشارہ فطرت کے تجارتی قدر بن جانے، یا صنعتی کلچر کے ہیجان اور بے حس ہونے کی طرف کیا گیا ہے۔

آتشدان کے سیاہ مرمر کی سفید دھاریوں کو صحرا کہا ہے، خالی، اداس، اور خاموش۔ شاید یہ جدید دور کی بے شخصیت آبادیاں ہیں جن میں دور دور تک مسرت کے نخلستان کا نشان نہیں۔ اگرچہ انسان اس میں خود کو پانا چاہتا ہے لیکن ہوس کی "ریت کے جھکڑ" کے اندر گم ہو کر رہ گیا ہے۔

عورت، مرد اور بچی کی تصویر سے ذہن، خاندانی وابستگی اور ملی جلی مسرتوں کی طرف جاتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ کسی دور میں ممکن تھی، اب نہیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ شخصیت کے زوال اور اپنائیت کے احساس کے فنا ہو جانے سے انسان اپنی مسکراہٹ پر بھی قادر نہیں رہتا۔ برآمدے میں لاٹھی ٹیک کر چلنے والا آدمی کون ہے؟ اس کی رفتار میں باقاعدگی ہے۔ یہ آ رہا ہے، جا رہا ہے، لیکن کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ کہیں یہ وقت تو نہیں، جس کو کوئی روک نہیں سکتا؟ یہ صنعتی اور میکانکی انسان بھی ہو سکتا ہے جو پوری طرح وقت کے قابو میں ہے۔ یہ اندھا ہے۔ وقت کے آنکھیں نہیں۔ نیز جدید انسان بھی تجارتی اقدار کے حصول کی دوڑ میں اندھا ہو رہا ہے۔ لاٹھی سے مراد صنعتی دور میں مادی آسائشوں کا وہ سہارا بھی ہو سکتا ہے، جس کے بغیر انسان ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ لاٹھی کی آواز کی باقاعدگی موجودہ تہذیب کی میکانکیت اور اکتا دینے والی یکسانیت کو بھی ظاہر کرتی ہے اور وقت کی آواز کے تسلسل

کی مظہر بھی ہے۔ اس کے بعد افسانے میں سمندر اور برف کا ذکر ہے۔ بپھرا ہوا سمندر مشینی تہذیب کا پھیلاؤ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں برف اس تہذیب کی سرد مہری کی علامت ہوگی۔ سرخ زبان والا سانپ جو انسان کے ذہن سے پھن اٹھا کر نکلتا ہے، ہر کے خانگی خوف یا جنس کا استعارہ ہو سکتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس کے فوراً بعد عورت اور بچی کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ ذہنی پیکر اپنے تمام امکانات کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ لاٹھی کے سہارے چلنے والے انسان کے معمولات بندھے ہوئے ہیں اور وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح بے بس آگے پیچھے حرکت کرتا رہتا ہے۔ دوسرا اس انسان سے ملنا چاہتا ہے، کمرے کی حسین چیزوں کو اپنانا چاہتا ہے اور عورت اور بچی کے اپنائیت کے احساس سے سرشار ہونا چاہتا ہے، لیکن کسی بات میں اسے کامیابی نہیں ہوتی اور وہ تنہا اور خالی خالی محسوس کرتا ہے۔

کانسے میں ڈھلا ہوا انسان اطمینان سے تمباکو پی رہا ہے، یہ گویا علامت ہے ماضی میں زندہ رہنے کی یا جنس ہونے کی۔ یعنی اس دور میں فراغت سے وہی ہے جس کا احساس بیدار نہیں، یا جو ماضی میں سانس لینے پر قانع ہے۔

اس مقام پر کہانی کے یہ جملے خاصے اہم ہیں:

(ایک بپھرا ہوا سمندر، ایک ریت اڑاتا صحرا اور ایک برف کا طوفان اور میں اکیلا آدمی! میں کیا کچھ کرلوں گا؟) میں دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دیتا ہوں جو یہ سب کچھ سوچتی ہے مگر نظر نہیں آتی اور مجھ نحیف، کمزور، بے سہارا کو... بھٹکاتی پھرتی ہے۔

جو سب کچھ سوچتی ہے، لیکن نظر نہیں آتی، شاید انسان کا ذہن ہے۔

تجزیے کی اس منزل میں پہنچنے کے بعد علامتوں کے نظام کے بارے میں اس وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ڈرائنگ روم ہمارا جدید معاشرہ ہے۔ سمندر، میدان اور وادی سے گذر کر آنے والا شخص عہد آفرینش کا انسان ہے۔ اور جس انسان سے اس کی ملاقات نہیں ہو پاتی وہ وقت ہے یا صنعتی دور کا بے شخصیت انسان ہے، جس وجود میکانکیت کی نذر ہو چکا ہے۔ کہانی عہد آفرینش کے انسان کی اپنائیت، رفاقت اور معصومیت کے احساس سے شروع ہوتی ہے، صنعتی دور کے اثر سے پیدا ہونے والی ذہنی علیحدگی (alienation) کی مختلف کیفیتوں کو ابھارتی ہے اور اپنائیت کے فقدان کے المیہ کو نقطۂ عروج پر پہنچا کر ختم ہو جاتی ہے۔ عہد آفرینش کے انسان کو جو بجائے خود اپنائیت اور رفاقت کی علامت ہے، ڈرائنگ روم یعنی جدید معاشرے سے رخصت ہونا پڑا تو وہ قالین یعنی دھرتی کو ایک نظر دیکھتا ہے اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرہ اس کا اپنا ہے لیکن علیحدگی کے جذبے کی وجہ سے اسے "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" کہا ہے۔

آخر میں یہ کہہ کر کہ "اگر کوئی کمزور، نحیف، بے سہارا کشتی ساحل سے آ کر لگے تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں" اس تمنا کا اظہار کیا گیا ہے کہ شاید کبھی انسان کی اپنائیت کو اپنا کھویا ہوا قالب پھر مل جائے۔

آپ نے دیکھا کہ ایسے افسانوں میں لفظوں کو اکثر و بیشتر ایک سے زیادہ معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں سب کچھ ایک ہی نظر میں سامنے نہیں آجاتا۔ جتنا زیادہ سوچئے، کچھ نہ کچھ برآمد ہوتا ہی رہتا ہے اور کچھ نہ کچھ مبہم رہ ہی جاتا ہے۔ ان کے ظاہری ابہام میں جو چھپی ہوئی معنویت ہے یا ان کی معنویت پر ابہام کے جو پردے پڑے رہتے ہیں، وہی ان کے لطف و اثر کو بڑھا دیتے ہیں۔

سریندر پرکاش نے جدید انسان کے ذہنی مسائل کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی کہانیاں زبان و بیان کے ایجاز اور ہر تہ علامتوں کی معنویت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ وہ بظاہر نہایت سادہ زبان استعمال کرتے ہیں جیسے کوئی روانی سے بے تکلف لکھے چلا جاتا ہو، لیکن ہر سطر گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے اور چند ہی جملوں کے بعد احساس ہونے لگتا ہے کہ پڑھنے والے کو ذہنی چیلنج کا سامنا ہے۔ ان کے افسانوں کا تانا بانا خواب اور بیداری کے بیچ کی کیفیتوں سے تیار ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر چیزیں اپنے روایتی تصور سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں اور پڑھنے والا چونک چونک اٹھتا ہے۔ نیم شعوری اور تحت الشعوری کیفیتوں کے امتزاج سے جا بجا تحیر کے چھینٹے بھی ملتے ہیں جو کہانی کی دلچسپی بنائے رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں لفظوں کے لغوی اور منطقی معنوں کے پیچھے ایک اور جہان معنی آباد نظر آتا ہے۔ وہ استعاروں کے جال سے علامتی معنوں کی ایک وسیع اور روشن فضا قائم کر دیتے ہیں۔ ان کی ذہنی پرچھائیاں اجلی، نمایاں اور متحرک ہوتی ہیں اور واقعات کا ایک دریا سا اپنے حسی اور فکری اتار چڑھاؤ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ لغوی معنی سے پرے دیکھ سکنے والوں کے لئے ان کے افسانوں میں داستان کی سی واقعیت ہے اور قصے کی سی کشش! لیکن وہ لوگ جو رہی معنی میں ابلاغ کا ماتم کرتے ہیں، ان کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنی تخیلی نارسائی اور کم فہمی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

(۴)

آخر میں اس سوال کو لیا جاتا ہے کہ اس قسم کے افسانوں میں جس علیحدگی (alienation) اور تنہائی یا جس ذہنی جستجو یا بے دلی اور بے بسی کا اظہار کیا جاتا ہے، کیا ایسا محض مغرب کی نقالی میں ہے اور ان افسانہ نگاروں کے پاس اپنا کچھ بھی کہنے کو نہیں ہے؟ ایسا اعتراض عموماً ان ادیبوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو اپنی ادبی نظر کو سیاسی نظریے کے تابع کر دینے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھتے اور ادب کے تعمیری (؟) پہلو پر اس کے جمالیاتی پہلو سے کہیں زیادہ زور دیتے ہیں۔

اصلیت یہ ہے کہ ایٹم کی دریافت اور صنعتی تہذیب کی برق رفتار ترقی نے انسان کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ خود نہیں جانتا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ انسان کا علم اس دور میں اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے کہ وہ خود اپنا جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا اس وقت بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے اور عالم انسانیت کا مستقبل ایک کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے۔ ایسے میں سستی اور بچکانہ قسم کی رجائیت کے کھلونوں سے ادیب خود کو کہاں تک بہلا سکتا ہے؟ وہ لوگ جو روایتی سیمرغ کی طرح از کار رفتہ نظریوں کی ریت میں سر دبائے پڑے رہتے ہیں، ان کی بات اور ہے، ورنہ اس دور میں زندگی کی معنویت کی تلاش اور وجود کی غرض و غایت کو سمجھنا باشعور انسان کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ تلاش یوں تو کم و بیش ہر دور میں جاری رہی ہے، لیکن زندگی کے لغو ہونے کا احساس جیسا موجودہ تہذیب کی حشر سامانی سے عام ہو رہا ہے، اس سے پہلے نہ تھا۔ صنعتی یکسانیت کے اس دور میں

فرد اپنی شخصیت کے احساس سے محروم ہو گیا ہے اور اس کے وجود کی معنویت اس کے لئے سب سے بڑا سوالیہ نشان بن گئی ہے۔ موجودہ دور آگہی کے آشوب کا دور ہے ایسے میں اگر نئی نسل کے بعض ادیب وجودیت کے فلسفے میں دلچسپی لیتے ہیں یا سارتر اور کامیو کی تحریروں سے متاثر ہیں تو اس میں کیا خرابی ہے؟ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ پچھلے تقریباً ایک سو برسوں سے ہماری تمام ادبی تحریکیں، خواہ وہ سرسید تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک، اپنی ذہنی غذا مغرب سے حاصل کرتی رہی ہیں۔ رہی یہ بات کہ وجودیت یورپ کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے، اس لئے ہندوستان کے ادیبوں کے ہاں اس کا ذکر محض نقالی ہے، تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ شہری تمدن کی سطح پر دنیا ایک ہو چکی ہے اور جدید انسان کے ذہنی اور فکری مسائل تقریباً ہر جگہ ایک جیسے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وجودیت کے خیالات یورپ اور امریکہ میں ایک مدت سے عام ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ان کا اثر آزادی کے بعد ہی پڑنا شروع ہوا ہے۔ وقت کا یہ فاصلہ خاصا اہم ہے۔ نئی شاعری کی طرح علامتی اور تجریدی افسانے میں جو ایک طرح کی یاسیت، شکست خوردگی اور مایوسی کی فضا ملتی ہے، اس کا تعلق اتنا وجودیت سے نہیں جتنا ملک کے ان مخصوص حالات سے ہے، جنھوں نے وجودیت کے اثرات کے لئے راہ کھول دی ہے۔

نئی نسل کو آزادی کے بعد چھوٹتے ہی خون کے دریا سے گذرنا پڑا تھا۔ وہ تہذیبی قدریں جو ہم کو بے حد عزیز ہیں اور جنھوں نے اردو کو ایک عظیم الشان تہذیبی اور لسانی مفاہمت کی شکل میں پیدا کیا تھا، ہمارے سامنے پارہ پارہ ہونا شروع ہو گئیں۔ اردو زبان کو اس کا جائز حق آج تک نہیں ملا۔ آزادی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں اور جو خواب دیکھے گئے تھے، ان میں سے کتنے شرمندۂ تعبیر ہوئے؟ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صنعتی طور پر ملک ضرور آگے بڑھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سکے کا پھیلاؤ اور گرانی جس ہوش ربا پیمانے پر بڑھی ہے، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑے سے بڑا محب وطن بھی خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ملک کے اندر اس وقت نراجیت کی جو کیفیت ہے، مایوسی اور بے اطمینانی کی جو لہر اٹھ رہی ہے، اس کا گہرا تعلق ان عوامل سے ہے۔ نوجوان طبقے میں جو اضطراب ہے، توڑ پھوڑ کا جو رجحان ہے، جو بےچینی ہے، وہ بلاوجہ نہیں۔ پیداوار کا حال بھی کسی سے چھپا نہیں کہ تین پنج سالہ منصوبوں کے بعد بھی ہماری قوم بھیک کا برتن ہاتھ میں لئے دوسروں کے دروازے پر کھڑی ہے۔ دنیا کی ہزاروں برسوں کی تاریخ میں کسی قوم نے دوسرے ملکوں سے اتنا اتنا اناج حاصل نہیں کیا ہوگا جتنا ہم کر رہے ہیں۔ اس پر بھی لاکھوں عوام فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ رشوت، بے ایمانی، بددیانتی کا بازار گرم ہے۔ منافع خوری اور چور بازاری کے معاملہ میں دنیا میں شاید ہم سب سے آگے ہیں۔ حکمراں طبقے میں قول و فعل اور کردار و گفتار کا تضاد اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ سیاست دیوالیہ ہو رہی ہے جمہوری قدروں کا زوال عام ہے۔ پورے معاشرے میں شکست و ریخت، ریاکاری اور مصلحت اندیشی کا دور دورہ ہے۔ اور فسطائیت، فرقہ واریت، علاقائیت اور لسانی عصبیت کے عفریت ہر طرف سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ یہ ہیں حوصلے اور ہمت کو سرد کر دینے والے وہ حالات جنھوں نے مایوسی، بے اطمینانی اور بے دلی (Disillusionment) کی فضا پیدا کر دی ہے اور حساس ادیبوں کا اس سے ذہنی طور پر متاثر ہونا بالکل فطری بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جٹ کلچر تو کیا، ہندوستان میں ہم ابھی بیل گاڑی کے کلچر سے بھی زیادہ آگے نہیں نکلے۔ لیکن دو جنگوں کے اثر اور صنعتی تہذیب کی حشر سامانی سے مایوسی اور یاسیت کی جو فضا یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئی ہے، اس سے کچھ ملتی جلتی حوصلہ شکن فضا یہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہے۔ آزادی کے بعد ہم بھی یقین کے فقدان اور قدروں کے زوال کی کئی منزلوں سے گذرے ہیں۔ آدرشوں کے آئینے ہمارے ہاں بھی ٹوٹے ہیں۔ نئے ادیب سماج دشمن نہیں، نہ ہی خواہ مخواہ نراجیت کی وکالت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ خود فریبی کا شکار بھی نہیں اور کاغذ کے پھولوں سے خود کو بہلانا بھی نہیں چاہتے۔ اگر ملک اور قوم کے مسائل کی طرف ان میں ایک طرح کی بے حسی اور سرد مہری (Indifference) کا میلان پایا جاتا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ موجودہ حالات میں انھیں کوئی چیز مثبت طور پر ابھارنے (Inspire) والی نظر نہیں آتی۔ ایسے میں سطحی رجائیت یا مخصوص معنی تعمیری نظر کی بات صرف وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے یا تو با اقتدار طبقے (establishment) سے کسی طرح کا سمجھوتا کر رکھا ہے یا ضمیر فروشی کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیا ہے۔

یہ بات بھی خاطر نشان رہنی چاہئے کہ آزادی سے فوراً پہلے کے افادی ادب میں سماجی ترقی کے جو خواب دیکھے اور دکھلائے گئے تھے، ان کے ردعمل کے طور پر بھی نئی نسل کے شاعر اور افسانہ نگار تخلیقی آزادی اور نظریاتی غیر وابستگی پر زور دیتے ہیں۔ وہ سماج دشمن نہیں، نہ ہی ایک ترقی پذیر سماج میں ادیب کے رول سے بے خبر ہیں۔ اپنی ذات سے بڑھی ہوئی دلچسپی کے باوصف انھوں نے سماجی حالات کا نوٹس بھی لیا ہے۔ لیکن بنیادی فرق یہ ہے کہ پچھلے ادیبوں کے مقابلے میں ان کا ذہنی سفر سماج سے فرد کی طرف نہیں بلکہ فرد سے سماج کی طرف ہے۔ اس لئے ذات کے مسائل اور وجود کی غرض و غایت نسبتاً زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کا موجودہ نظام، برا یا بھلا، ادیب کو تخلیقی آزادی کی اجازت دیتا ہے اور نئے ادیبوں کو یہ آزادی بے حد عزیز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نئے ادیب اس آزادی کا غلط استعمال کر رہے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ زندگی کی طرح ادب بھی ایک نامیاتی حقیقت ہے اور ہر نظریہ اپنے ساتھ تشکیک بھی لاتا ہے اور اختلافات ہی سے ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ نئے ادیب ذہنی آزادی کے معاملے میں ٹامس جیفرسن کے ہم نوا ہیں جس نے کہا تھا:

> I have sworn hostility against every form of
> tyranny over the mind of man.

یعنی میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں ذہن انسانی پر کسی بھی طرح کے ظلم برداشت نہیں کروں گا۔

یہی وجہ ہے کہ نئے ادیبوں میں ادعائیت، انتہا پسندی اور تنگ نظری کے خلاف ایک طرح کی بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ نظریہ کی بیساکھی کے بجائے نظر پر زور دیتے ہیں اور نتیجۃً حقیقت کے آزادانہ تجزیے کا رجحان روز بروز پرورش پا رہا ہے۔ یہ اگر صالح ادب کی تخلیق میں مدد دے سکے تو یقیناً قابل قدر ہوگا ☆☆☆

مہاتما گاندھی اور اردو رسم الخط

گیان چند

شمارہ ۲۰۵،
اپریل ۱۹۹۷

تقسیم ملک سے پہلے ہندی اردو نزاع میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کا حصہ سب سے بلند سنگ میل ہے۔ یہ اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل ۱۹۳۶ میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" بابت اپریل ۱۹۳۶ میں شائع کردی۔ اس کے علاوہ ان کا مضمون "بھارتیہ ساہتیا پریشد کی اصل حقیقت" ملک کے کئی رسالوں میں شائع ہوا۔ رسالوں کے علاوہ یہ مضمون ایک کتاب "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو" (کراچی، ۱۹۵۳؛ اشاعت ثانی، ۱۹۸۷)، نیز ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب "ہندی اردو تنازع" (کراچی ۱۹۷۷) میں بھی پوری تفصیلات کے ساتھ ہے۔ میرے سامنے مضمون کا پورا متن قاضی عبدالودود کے رسالہ "معیار" پٹنہ، مئی ۱۹۳۶، میں ہے، نیز پاکستان کی دونوں کتابیں ہیں۔

ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے شروع میں ایک رزولیوشن رکھا گیا جس کے پہلے حصے میں پریشد کا مقصد ظاہر کیا گیا، اور دوسرے حصے میں کہا گیا، "اس سبھا کا کام ہندی ہندستانی میں ہوگا۔"

مولوی صاحب کے مضمون "ہندی یعنی ہندوستانی" چھپا ہے۔ قرار داد کے مسودے میں "ہندی ہندستانی" ہی تھا۔ بحث میں جب اس پر اعتراض کیا گیا تو مہاتما جی نے اسے بدل کر "ہندی اتھوا ہندستانی" کر دیا۔ لفظ 'اتھوا' کے معنی 'یا' بھی ہیں اور "یعنی" بھی۔ مضمون کے مطابق پہلا اجلاس تقریباً دس بجے دن کو شروع ہوا۔ سب سے پہلے کاکا لیکر نے اپنا ایڈریس پڑھا۔ اس کے بعد صدر مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس جو صرف ایک صفحے کا تھا، تقسیم کر دیا گیا۔ مہاتما جی نے کہا کہ چھپے ہوئے ایڈریس کو ان کا پڑھنا فضول ہے، اس لیے انھوں نے زبانی تقریر شروع کردی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

مولوی صاحب نے بحث میں "ہندی ہندستانی" پر اعتراض کیا کہ کانگریس کی قرارداد میں "ہندوستانی" ہے، یہاں اسے کیوں بدلا گیا ہے؟ اسے لے کر مولوی صاحب اور مہاتما جی کے بیچ بڑا ڈرامائی مکالمہ یا مباحثہ ہوا۔ بحث سہ پہر کے اجلاس میں بھی جاری رہی۔ مولوی صاحب کے مطابق بحث کے دوران گاندھی جی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر انھیں بہت تعجب ہوا۔ گاندھی جی نے مبینہ طور پر یہ کہا:

> اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔

جلسے میں مولوی صاحب نے اس قول پر ایک لفظ نہ کہا، لیکن بعد میں ملک بھر میں انجمن ترقی اردو نے بڑا طوفان مچایا اور رسالوں نے بہت سخت الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا۔ سب سے زیادہ درشتی قاضی عبدالودود نے دکھائی جو اس زمانے میں مسلم لیگ کے بڑے فعال کارکن تھے۔ ان کے الفاظ قدرے دیر میں پیش کروں گا۔ معترضوں نے یہ نہ سوچا کہ کیا کوئی سیاسی لیڈر ایسا بیان دے سکتا ہے کہ جس سے ایک بڑی قوم اس سے دور بھاگ جائے؟ یہ بیان اس کے مستقل موقف کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ، مہاتما گاندھی دو تین بار خود اس کی تردید کر چکے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن نے ۱۹۴۱ میں ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ جملے کہے ہیں؟ مہاتما جی نے کہا کہ میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میرے ریمارکس اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا عبدالحق کے اعتراض کو صحیح قرار دے۔ ڈاکٹر جعفر حسن نے ساری مراسلت "ہماری زبان" دہلی بابت ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ میں شائع کردی۔

اس کی دوسری تردید لکھنؤ میں ۱۹۹۵ میں حیات اللہ انصاری نے مجھ سے کی۔ میں دسمبر ۱۹۴۵ میں مولوی صاحب سے ملاقات کا سرفراز ہو چکا ہوں۔ وہ اتنا اونچا سنتے تھے کہ بہت چلا کر بولنا پڑتا تھا۔ انصاری صاحب نے مجھ سے کہا کہ ناگپور پریشد کے اجلاس میں اختر حسین رائے پوری مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لئے یہ الفاظ مہاتما جی سے منسوب کر کے مولوی صاحب کو باور کرا دیے۔ انصاری صاحب نے مجھے بتایا کہ علی گڑھ میں اختر ان کے کلاس فیلو رہ چکے تھے اور وہ اختر کے مزاج کو جانتے تھے۔ حیات اللہ انصاری صاحب اور بیگم انصاری دونوں نے مہاتما جی سے بہ نفس نفیس ان جملوں کے بارے میں پوچھا۔ مہاتما جی نے ان دونوں کے سامنے انکار کیا۔ انصاری صاحب ایک دفعہ پاکستان گئے اور اختر صاحب سے اس کا ذکر چھیڑا۔ اختر صاحب بات ٹال گئے۔ میں نے یہ سب اپنے مضمون "مہاتما گاندھی اور مشترکہ زبان کا مسئلہ" مشمولہ "نیا دور" لکھنؤ، گاندھی نمبر، جنوری ۱۹۹۶ میں شائع کردیا۔

انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے "اردو ادب" کا عبدالحق نمبر کا ایک مشترکہ شمارہ ۱۹۹۲ / ۱۹۹۳ آیا۔ میں ان دنوں لکھنؤ میں تھا۔ انجمن نے بدقسمتی سے یہ پرچہ مجھے نہیں بھیجا۔ مجھے اس کے وجود کا بھی پتہ نہ تھا۔ اس میں حیات اللہ انصاری، بیگم انصاری اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے بڑے طولانی مضامین ہیں۔

بیگم سلطانہ حیات کا مضمون، "مولانا عبدالحق صاحب، اردو اور مہاتما گاندھی جی" سب سے اہم ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کو ساہتیہ پریشد اور مہاتما گاندھی سے منسوب قول پر مرکوز رکھا ہے۔ پریشد کے اس جلسے میں مہاتما گاندھی، جواہر لال، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، کاکا کالیکر وغیرہ نے شرکت کی تھی۔

اگست ۱۹۴۱ میں یہ خاتون (بیگم سلطانہ حیات) باپو سے ملیں اور ان سے اس جلسے کے بارے میں پوچھا۔ سوموار کا دن، مہاتما جی کے مون کا ہوتا ہے۔ انھوں نے اشاروں اور تحریر سے ان کے سامنے انکار کیا۔ اس کے بعد ان کا ناگپور جانا ہوا اور مہاتما جی سے مفصل ملاقات ہوئی۔ مہاتما جی نے کہا جب ضرورت ہو تو راجندر بابو اور کاکا کالیکر صاحب سے بھی مل لیں، وہ لوگ بھی اس میٹنگ میں تھے۔ کئی دنوں بعد یہ اکیلی سیوا گرام آشرم گئیں اور سب لیڈروں سے ملیں۔ اس موضوع پر ان کی مولوی صاحب اور گاندھی جی سے مراسلت بھی ہوتی رہی۔ ایک بار دہلی میں برلا ہاؤس میں گاندھی جی کے کمرے میں مولانا عبدالحق موجود تھے کہ بیگم حیات اللہ، ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ بھی آئے۔ مولوی صاحب دو باتوں پر ناراض ہو رہے تھے کہ اردو کے اہم مسائل کو حل کرنے کے لیے مجھ جیسی معمولی اور گم نام لڑکی (سلطانہ حیات) کو کیوں چنا۔ دوسرے یہ کہ مولانا باپو کو پھٹکار رہے تھے کہ اردو ہندی کا سارا جھگڑا انھیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جب بیگم سلطانہ حیات کو محسوس ہوا کہ مولانا اٹھنے والے ہیں تو ان کی خفگی کی پروا نہ کرکے کہہ دیا کہ آپ نے باپو سے منسوب کرکے جو کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے... اس پر مولوی صاحب دیر تک بک جھک کرتے رہے۔ جب وہ دھیمے پڑے تو باپو بولے کہ میں نے یہ جملہ کبھی نہیں کہا۔ اس کے جواب میں مولانا کی بدتمیزی دیکھیے، اصرار کرتے ہیں۔ "کہا کیسے نہیں تھا؟" اسی کو کہتے ہیں کہ چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مولانا کے خاموش ہونے پر جری خاتون نے کہا میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جواہر لال جی، ڈاکٹر راجندر پرشاد جی، کاکا صاحب سے فرداً فرداً پوچھا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ یہ جملہ نہیں کہا۔ ڈاکٹر عابد حسین بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لیجیے۔ مولانا بدتہذیبی سے کہتے ہیں، "سب جھوٹے ہیں۔" پوری محفل پر سناٹا پڑ گیا۔

جعل ساز کون تھا؟

قاضی عبدالودود سے متعلق میری کتاب پاکستان میں انجمن ترقی اردو میں زیر طبع ہے۔ اس میں میں نے حیات اللہ انصاری صاحب کا فیصلہ درج کیا ہے کہ یہ حرکت اختر رائے پوری کی تھی۔ مشفق خواجہ صاحب نے یہ بات پڑھی تو مجھے فون پر بتایا کہ یہ حکیم اسرار احمد کریوی کا کام تھا۔ وہ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ تقسیم سے پہلے لکھنؤ میں دانش محل کے مالک تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم؟ مشفق نے جواب دیا کہ خود حکیم صاحب نے بتایا ہے کہ انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ کہیں مولوی صاحب کانگریس سے کوئی سمجھوتہ نہ کرلیں۔ اختر رائے پوری اس زمانے میں ۲۴ سال کے رہے ہوں گے۔ وہ ایسی ہمت نہ کرسکتے تھے۔

اختر رائے پوری ۱۲ دسمبر یا ۱۳ جون ۱۹۱۲ کو پیدا ہوئے تھے۔ اپریل ۱۹۳۶ میں انھوں نے ۲۴ سال بھی پورے نہ کیے تھے۔ جیسا کہ میں نے ڈراما "شکنتلا" کے ترجمے کے سلسلے میں دکھایا ہے، وہ ہندو بیزاری میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ پریشد ناگپور میں انجمن ترقی اردو کے وفد میں مولوی صاحب کے علاوہ حکیم اسرار کریوی اور اختر رائے پوری تھے۔

ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ میں عرصے سے اس فکر میں تھا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد سے معلوم ہو کہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جعفر رضا کو لکھا، انھوں نے جواب نہ دیا۔ پھر شمس الرحمن فاروقی کو لکھا کہ وہ ستیہ پرکاش مسرا صاحب کی مدد سے معلوم کریں۔ انھوں نے ستیہ پرکاش مسرا سے رابطہ قائم کیا۔ ستیہ پرکاش مسرا الہ آباد یونیورسٹی میں ہندی کے پروفیسر ہیں۔ انھیں ہندی ساہتیہ سمیلن کی لائبریری میں متعلقہ پتر کا سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس جلسے میں گاندھی جی موجود تھے لیکن اس دن ان کا مون برت تھا۔ وہ کچھ نہ بولے۔ ان کا چھے سطروں کا پیغام جمنا لال بجاج نے سنایا جو حسب ذیل ہے:

> مجھے دکھ ہے کہ آج میرا مون ہونے کے کارن میں بول نہیں سکتا ہوں۔ میرے من میں شنکا (شبہ) نہیں کہ بھارت ورش کے لیے ایک سامانیہ (معمول کی) بھاشا کی آوشیکتا (ضرورت) ہے۔ نہ میرے من میں یہ شنکا ہے کہ یہ بھاشا ہندی ہندوستانی ہو سکتی ہے۔ واستو میں یہ وہی بھاشا ہے جسے اتر میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک سمان سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے استھان میں انگریزی کبھی نہیں ہو سکتی۔

(ہندی ساہتیہ سمیلن کا ۲۵ واں ادھیویشن سمبت ۱۹۹۳ سنہ ۱۹۳۶، استھان ناگپور۔ سمیلن پتر کا حصہ ۲۳، شمارہ ۵ / ۴ ص ۲۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساہتیہ سمیلن کے جلسے کی بات ہے۔ ساہتیہ پریشد کی نہیں۔ میں نے پروفیسر ستیہ پرکاش کو الہ آباد فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سمیلن اور اس سے ملحق انجمنوں کے جلسے ایک ہی مقام پر ایک ساتھ ہوتے تھے اور ان سب کی اطلاع سمیلن پتر کا میں دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ساہتیہ پریشد کی روداد کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔

اس کے معنی یہ ہے کہ ساہتیہ پریشد کے جلسے میں گاندھی جی ایک لفظ نہیں بولے۔ ان کے اور مولوی عبدالحق کے بیچ جس ڈرائی ڈائلاگ کا ذکر ہے وہ سب وضعی ہے۔ مولوی صاحب نے "ہندی ہندستانی" پر اعتراض کیا ہوگا تو گاندھی جی نے لکھ کر مختصر سا جواب دے دیا ہوگا۔

رسالہ "اردو ادب"، عبدالحق نمبر، میں کمال احمد صدیقی کے مضمون میں منشی پریم چند کا ایک خط مورخہ ۴ جون ۱۹۳۶ مولوی عبدالحق کے نام ہے جس میں ان کے مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے:

> مہاتما گاندھی ہندی کے خدا نہیں اور نہ ان کی تاویل ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ پریشد کی زبان ہندستانی ہونا چاہیے (رسالہ ص ۸۴)۔

منشی جی کے طویل خط میں قرآن کے حروف والی بات نہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ منشی پریم چند کی رائے میں وہ بات نہیں کہی گئی۔ حکیم اسرار کریوی نے اسے وضع کرکے اختر رائے پوری کو بتایا ہوگا اور اس کے بعد مولوی صاحب کو سنایا ہوگا۔ مولوی صاحب مضمون میں لکھتے ہیں کہ گاندھی جی نے زبانی تقریر شروع کردی

("معیار" ص ۲۱۸)۔ جب گاندھی جی کا مون برت تھا تو تقریر کا سوال؟ مولوی صاحب گراں گوش تھے لیکن بینائی تو رکھتے تھے۔ کیا وہ گاندھی جی کے ساکت ہونٹوں کو متحرک سمجھتے رہے؟ لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں: حکیم صاحب نے ان کے مضمون میں اضافے کیے اور مولوی صاحب نے انھیں نہیں دیکھا۔ اور اگر دیکھا (بہ شمول قرآن کے حروف والا قول) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ خود اس سازش میں شریک تھے۔

ایک وفد کے ارکان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فریق مخالف سے بات چیت کر کے ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے میں مدد دیں گے۔ یہاں معاملہ برعکس تھا کہ اگر کوئی متفقہ فیصلہ نکلتا دکھائی دے تو اپنے لیڈر کو بے وقوف بنا کر نا کامی مول لیں۔ انھیں اردو سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ ان کی دلچسپی اگلے سال صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کو جتانے میں تھی۔ جس طرح فرقہ وارانہ فسادات کرنے کے لیے ہندو اپنے مندر میں گائے کا سر یا مسلمان خود مسجد میں خنزیر کا سر پھینک دیتا ہے، مولوی صاحب کے نائبین اسی زمرے میں رکھے جائیں گے۔ اسی قسم کے جعل کی ایک اور دلچسپ مثال ملتی ہے۔ گو وہ ادبی نہیں بالکل سیاسی ہے لیکن گاندھی صاحب وہاں بھی موجود ہیں۔ میں لطیفے کے طور پر اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

تقسیم ملک سے پہلے مسلم لیگ کے پاس اخباروں اور روپے کی بہت قلت تھی، جب کہ کانگریس کے پاس دونوں کی فراوانی تھی۔ پھلواری بہار کے سید حسن مثنیٰ ندوی ایک صحافی تھے جن کا تعلق روزنامہ "پاسبان" بنگلور سے تھا۔ اخبار کے مدیر محمد اسماعیل تابش، بی۔ اے۔ تھے۔ حسن مثنیٰ نے ایک فرضی "نیوز" مرتب کی۔ ناموں کا انتخاب ان کی لفظی ساخت اور صوتی کیفیات کو خاص طور پر پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اس کا مسودہ سید حسن مثنیٰ کے قلم سے ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ کا، اور انگریزی مسودہ مدیر پاسبان کے قلم کا ہے۔ میرے سامنے مثنیٰ کی تحریر کی نقل صغیر بلگرامی کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی کے قلم کی ہے۔

میسور کے ایک علاقے سے متعلق یہ خبر اے پی آئی کے ذریعے پورے ہندوستان میں پہنچ گئی:

THE INDIAN NATION, PATNA

12th November, 1945

Muslims' Leader is Gandhiji not Jinnah

Banglore, Nov 9: "The modern Indian Mussalman has yet to realise that his real leader is not Mr. Jinnah but Gandhiji, who is the symbol of suffering India. If tested on the true embodiment of real Islam spirit", says Maulana Wald-uz-Zina, Vice-President of All India Jamiatul-Ulema-e-Hind, Delhi and Member of the Working Committee of the All India Majlis in a statement to the press. Maulana Wald-uz-Zina arrived here yesterday in connection with the opening of a theological college in Mysore.

Referring to Pakistan, Maulana Wald-uz-Zina says that in it Mr. Jinnah is offering nothing but total ruin for the community. Politically it is a most impolitic scheme and the theory behind it is all the more absurd and dangerous.

The Maulana warns Mr Jinnah that all the progressives in this country such as the Congress, the Ahrars, Jamiatul-ul-Ulema, Khaksars, Shias, Momins, Khudai Khidmatgars and in fact every true Munafiq of the Millat is now determined to give a united fight to him (Mr Jinnah) and his League which has so long stood (stead) in the path of India's freedom.

Mr. Ghulam Mardood of Nellore who saw Maulana Wald-uz-Zina recently has decided to resign from the Muslim League and join the Muslim Majlis. He intends standing as a candidate for the Madras Legislative Assembly on the Muslim Majlis ticket.

۱۲ نومبر ۱۹۴۵ کے "انڈین نیشن" کے پانچ دن بعد ہی ۱۷ نومبر ۱۹۴۵ کے انگریزی روزنامہ "ڈان" میں سید حیدر امام سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ کا بیان آیا کہ مسٹر جناح کے مقابلے میں نیشنلسٹ پریس نے صحافت کا معیار کتنا گرا دیا ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کے فرضی نائب صدر کا ایسا بیان شائع کیا۔

ساہتیہ پریشد ناگپور کے اجلاس سے متعلق مولوی عبدالحق کے مضمون میں بھی گاندھی جی کے منہ سے ایسے ہی جعلی الفاظ کہلائے گئے اور پھر اسی طرح مذمت کا طوفان بپا کیا گیا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ کے "ہماری زبان" میں اس جعل کی پوری پردہ کشائی کر دی گئی۔ اس زمانے میں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ اندرونی نرخ ہی پر ڈاک چلتی تھی۔ کیا کوئی باور کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث، فرمان فتح پوری اور معین الدین عقیل صاحبان کو معلوم نہ ہوگا کہ قرآن کے حروف والا قول کس کی تصنیف ہے؟ مشفق خواجہ سے بھی پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ یہ حرکت حکیم اسرار کریوی کی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی فرمان اور عقیل صاحبان گاندھی جی کے خلاف اب بھی جس جذبے سے لکھتے رہتے ہیں، کیا وہ اس پر نادم نہیں؟ اس طرح تو وہ بھی اس سازش میں حصے دار ہو جاتے ہیں۔

میں مہاتما جی کا عقیدت مند ہوں، لیکن زبان کے بارے میں ان کے ہر موقف سے اتفاق نہیں کرتا۔ انھوں نے عام طور پر بول چال کی بھاشا پر لکھا ہے۔ حکومت کے دفتروں کو چلانے میں جو مسائل سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں انھوں نے غور نہیں کیا۔ انگریزی سے ان کی دوری بھی مفید نہیں ہے۔ ہندوستانی کو "ہندی ہندستانی" کر دینا ایسا اقدام ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ مہاتما جی، پرشوتم داس ٹنڈن اور مولوی عبدالحق جیسی دو انتہاؤں کو ملانا چاہتے تھے۔ چونکہ سمیلن کے نام میں "ہندی" آتا تھا اس لیے اس کی اولاد ساہتیہ پریشد کی زبان کے نام میں بھی "ہندی" لانا انھوں نے ضروری سمجھا اور اس کی زبان کو "ہندی ہندستانی" کہا۔ یہ خواہ مخواہ الجھن پیش کرتا ہے۔ لیکن ان کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ تقسیم ملک کے بعد بھی ایک تنہا وہ تھے جنھوں نے اپنا موقف نہیں بدلا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ کو "دہلی ڈائری" میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

> میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آئندہ سے یوپی کی سرکاری زبان ہندی، دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے سلوک کا تقاضا ہے کہ اردو لپی کو بھی باقی رکھا جائے۔ ایک ایسا ملک نہ بننا چاہیے جہاں مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔

☆☆☆

لطف الرحمٰن

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

مری طرح کوئی اندر سے سنگسار نہ تھا
کوئی بھی شہر میں مجھ سا گناہ گار نہ تھا

نہیں کہ پہلے مجھے درد انتشار نہ تھا
مرا وجود مگر صرف ریگ زار نہ تھا

میں اس کے شک کو سمجھتا رہا گماں لیکن
مرے یقین پہ اس کو بھی اعتبار نہ تھا

بہت دنوں سے نگاہوں میں رت ہے ساون کی
جو سچ کہوں تو کسی کا بھی انتظار نہ تھا

ہوا کے ہاتھ سے پتھر کے نقش بھی نہ بچے
تمھارا نقش قدم یوں بھی شاہ کار نہ تھا

کسی نگاہ نے پتھر بنا کے چھوڑ دیا
اسے پسند مرا پیکر غبار نہ تھا

میں پربتوں کی خموشی پہن چکا کب کا
کہ میرے شور کو یہ شہر ساز گار نہ تھا

بدل کے بھیس ہر اک موڑ پر ملا مجھ کو
وہ ایک غم کہ جو کہنے کو پائدار نہ تھا

فلک نشینوں کی محفل سنا اداس رہی
بس اس لئے کہ وہاں کل یہ خاکسار نہ تھا

شمارہ ۸۵،
جون، جولائی ۱۹۷۳

عجب اڈی ہوئی خاموشی فضا میں ہے
کوئی لہو کی صدا پردۂ جفا میں ہے

میں تھک گیا ہوں، اسی طرح پھر پکار مجھے
کہ اب سکوت کا لہجہ مری صدا میں ہے

عجیب موڑ پہ تنہائیوں نے چھوڑا ہے
گماں گذرتا ہے اک ایک شے خلا میں ہے

مرے لہو کو برستا ہے ریگ زاروں میں
یہ عہد تشنہ بلب دشت کربلا میں ہے

دہل گئی ہے اک اک شاخ، ایک ایک کلی
یہ کون تیغ بہ کف گونجتی ہوا میں ہے

جو اپنی ذات سے رہتا ہے دور افتادہ
وہ ایک شخص مگر تیرے آشنا میں ہے

نگاہ شوخ، زباں سے ادب، صدا پرسوز
یہ ایک شخص تو منجملۂ وفا میں ہے

لطف الرحمٰن

شمارہ ۸۵،
جون، جولائی ۱۹۷۳

نہیں ملتا کوئی تیری طرح اپنا نہیں ملتا
جو سارے دکھ کو اپنالے کوئی ایسا نہیں ملتا

تجھے آواز دے کر چھپنے والے ہم کہاں ڈھونڈیں
کہ اس جنگل میں آوازوں کا نقش پا نہیں ملتا

ادھورے پن کا دکھ کیا ختم ہو، وہ آدمی مجھ سے
سراپا مل تو جاتا ہے کبھی پورا نہیں ملتا

عجب سے موڑ پر ٹھہرا ہے آکر قافلہ شب کا
کہ تاحد نظر امکان کا فردا نہیں ملتا

ہر اک چہرے کے پیچھے سینکڑوں کردار ملتے ہیں
کسی بھی آدمی کا کوئی اک چہرہ نہیں ملتا

وہ مجھ کو توڑ کر اپنے ہنر پر ناز فرما ہے
نصیبے میں ہر اک پتھر کو آئینہ نہیں ملتا

مگر کچھ لوگ پہلے زہر کو ترجیح دیتے تھے
قیامت ہے کہ کوئی شخص اب ایسا نہیں ملتا

مری پہچان، میری لغزش پا ہے نہ چھین اس کو
کہ خود سے کٹ کے کوئی خود سے دوبارہ نہیں ملتا

یہاں ہر فرد اپنی شخصیت کے شور میں گم ہے
یہاں کوئی بھی اپنے سر سے اب اونچا نہیں ملتا

شمارہ ۱۰۱،
اکتوبر، نومبر ۱۹۷۶

سیل ہوس میں غرق سراپا ملا مجھے
سورج بھی ایک پیاس کا صحرا ملا مجھے

سنکی ہوا تو سمٹا نگاہوں کا بادباں
برسی گھٹا تو نیند میں دریا ملا مجھے

پانی پہ لکھ دیا تھا ہواؤں کے ہاتھ نے
ہر لمحہ اپنی ذات کا نوحہ ملا مجھے

اب میرے پیرہن میں مری خاک بھی نہیں
یہ آئینہ بھی کتنا شکستہ ملا مجھے

سنگ صدا سے ٹوٹ گیا کاسۂ گریز
یہ دکھ پس غبار تمنا ملا مجھے

شاخ فلک سے ٹوٹ کے بکھرا خلاؤں میں
اک خوں شدہ گلاب ستارہ ملا مجھے

تنہائیوں میں بھی جو رہا روح انجمن
وہ انجمن میں آج اکیلا ملا مجھے

لطف الرحمٰن

شمارہ ۲۵۲،
جنوری ۲۰۰۲

ایک گم گشتہ روایت کے ہیں امکاں ہم بھی
تو کہاں جائے گی تنہا، شب ہجراں ہم بھی

ظلمت شب میں ثوابت تھے نہ سیارے تھے
چاند کے ساتھ چھپے تھے پس داماں ہم بھی

ہم پہ گذرا ہے بہت سخت جنوں کا موسم
اور کچھ دیر درختوں پہ ہیں جاناں ہم بھی

ہم سے پوچھے کوئی دیوار کا سایہ کیا ہے
اس کڑی دھوپ میں تھے رہن بیاباں ہم بھی

ہو کوئی بخیہ گر شیشۂ دل تو لاؤ
سینہ در سینہ ہیں یاں چاک گریباں ہم بھی

ایک اک کرکے بجھے اخگر روشن سارے
اب ہوئے اپنے لئے فصل زمستاں ہم بھی

پھول کا رنگ کھلا اور نہ کانٹے ہی ملے
یوں تو زخموں سے ہوئے رشک گلستاں ہم بھی

اب تو ہی آکے نکالے ہمیں دلدل سے کہ ہیں
بستۂ ریگ روان غم دوراں ہم بھی

وہی خلوص، وہی لہجہ، گفتگو ہے وہی
گماں گذرتا ہے اب بھی کہ جیسے تو ہے وہی

سیاہ رات میں سورج کا جو سفیر رہا
مرا ستارۂ تنہا، لہو لہو ہے وہی

مگر وہ بات کہاں ہے جو تیرے دم سے تھی
وہی بہار کا موسم ہے، رنگ و بو ہے وہی

برہنہ پائی کا تونے دیا تھا اذن جسے
سلگتی ریت کی راہوں میں کو بہ کو ہے وہی

وہ اک کرن کہ جو لرزاں رہی گماں کی طرح
وہی دلوں میں مکیں بھی ہے، سو بہ سو ہے وہی

ہمیں سے زندہ ہے دستور دشت تنہائی
وہی ہے رسم گریباں، رم رفو ہے وہی

یہیں پہ نام و نشاں تھا ہمارے پرکھوں کا
میں دب گیا ہوں جو ملبے میں جستجو ہے وہی

صبا میں، چاند میں، خوشبو میں، صبح روشن میں
کسی بھی رنگ میں دیکھا، تو ہو بہ ہو ہے وہی

وہ جس نے دشت کو بخشا ہے سیل آب رواں
ہماری آنکھ کی گم گشتہ آرزو ہے وہی

ریت کی دیوار کے ادھر

مبین مرزا

شمارہ ۲۷۴،
نومبر ۲۰۰۳

بلا کی گرمی تھی۔

دن بھر لو کے تھپیڑے پڑتے اور جسم کا ست نکل جاتا۔ جان ہلکان ہو جاتی شام ہوتے ہوتے۔ دن ڈھلے ہی شروع ہو جاتا ہانڈی چولھا۔ عشا کی اذان کے ساتھ ساتھ عورتیں پکا کھلا کے فارغ ہوتیں تو برتن بھانڈے سنکھوانے میں لگ جاتیں، بوڑھے مسجد کا رخ کرتے اور جوان چوپال کا رستہ لیتے۔ منڈلی وہاں بھی زیادہ دیر نہ جمتی۔ دن بھر کی تھکن جسم کو بستر کی طرف کھینچتی۔ بس ایک چودھریوں کی حویلی کو چھوڑ کر سارے گاؤں میں پہلے پہر ہی رات بولنے لگتی۔

منشی نور محمد کے گھر کا دستور بھی وہی تھا جو گاؤں کے اور گھروں کا تھا۔ دو کمروں کے اس مکان کے آڑے صحن میں ایک کونے پر جس طرف تنور اور مرغیوں کا ڈربا تھا، منشی نور محمد کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ صحن کے دوسرے کونے پر جدھر دیوار کے ساتھ الگنی کھنچی تھی اور منشی جی کا سائیکل کھڑا تھا، وہیں دو چارپائیاں اور لگی ہوئی تھیں، ایک پر منشی جی کی بہو حمیدہ اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کو لے کر لیٹی تھی، دوسری چارپائی پر اس کے دو بیٹے طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم سو رہے تھے۔ رات آدھی نکل گئی تھی۔ حمیدہ نے کروٹ لے کر پہلے برابر میں لیٹی ہوئی بچی کو دیکھا اور پھر دوسری چارپائی پر دونوں بیٹوں پر نگاہ ڈالی۔ تینوں بچے بے خبر سو رہے تھے۔ حمیدہ کی ممتا بھری نگاہوں نے بچوں کی بلائیں لیں۔ ادھر منشی جی نے ہنکارا بھرا اور نیم خوابیدہ آواز میں کلمہ شہادت پڑھا۔ حمیدہ نے گردن گھما کر سسر کی طرف دیکھا۔ منشی جی نیم خوابی کیفیت میں کچھ بڑبڑائے اور کروٹ بدل کر چپ ہو رہے۔ دور بہت دور گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کا ہجوم تھا۔ کپاس کے کھیت میں جب کلیاں چٹکتی ہیں تو نو بیاہتا دلہنوں کی طرح اٹھلاتے پھول اسی طرح جگمگاتے نظر آتے ہیں جیسے اس وقت آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے۔ پڑوس کے مکان میں مرغے نے بانگ شروع کر دی۔ منشی جی نے ایک بار پھر ہنکارا بھرا، بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھا اور کروٹ بدلی۔ حمیدہ نے آنکھیں میچ لیں مگر نیند تو جیسے ان آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

رتجگا حمیدہ کے لیے کوئی نیا کام نہیں تھا۔ پچھلے پانچ برسوں میں رات کو دیر تک جاگنے اور کم سونے کی وہ اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب چارپائی پر لیٹ کر دیر تک جاگنے کے باوجود وہ نہ تو کروٹیں بدلتی اور نہ ہی اٹھ اٹھ کر بیٹھتی۔ بس چپ چاپ لیٹی آسمان کو تکتی اور جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ ہر رات کتنے ہی بیتے موسموں اور آتے دنوں کے خواب اس کی جاگتی آنکھوں پر اترتے رہتے اور پھر انھی خوابوں میں روتے ہنستے کسی وقت اس کی آنکھ لگ جاتی۔ پانچ برس پہلے جب اس کی ڈولی اس گھر میں آ کر اتری تھی، اس وقت نیند کی وہ ایسی دکھیا تھی کہ ساری رات ہی نہیں، اس کا تو آدھا دن بھی سوتے میں گذرتا تھا۔ شادی سے تین چار مہینے پہلے سے اس کی ماں اسے بار بار ٹوکنے اور سمجھانے لگی تھی، "حمیدہ! تیرا نیستی پن کب جائے گا۔ اری اگلے گھر جا کر بھی یوں سوئے گی تو تیرے پہ ہی تھو تھو نہیں ہوگی، تیرے پچھلوں کو بھی بڑے کوسنے پڑیں گے۔" ماں کے سمجھانے بجھانے سے حمیدہ صبح سویرے نور کے تڑکے اٹھنے لگتی لیکن بس دو چار دن بعد پھر وہی دن چڑھے کا معمول شروع ہو جاتا۔ ماں کچھ دن چپکی رہتی لیکن پھر اسے فکر لاحق ہوتی کہ حمیدہ کو اگلے گھر جانا ہے اور بس اسی پر اسے پھر جھنجھل آنے لگتا۔

ماں کی تعلیم رنگ لائی یا نصیبوں کا لکھا پورا ہوا، حمیدہ بیاہ کے سسرال آئی تو جیسے نیند بابل کی دہلیز پر ہی چھوڑ آئی۔ خاوند فوج میں تھا۔ اس کی پندرہ دن کی چھٹی ختم ہوئی تو جیسے بیاہ کے للے تللے بھی ختم ہو گئے۔ نندیں دو تھیں، دونوں چھوٹی۔ ساس بیمار تھی، ہر وقت گری پڑی رہتی۔ سسر بھلے چنگے تھے لیکن انھیں اپنی

منشی گیری سے فرصت ہی کب تھی۔ گاؤں بھر کی محرری کا کام وہی کرتے تھے۔ ان کا سارا دن گھر سے باہر گذرتا۔ دیالو آدمی تھے۔ روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ لکھت پڑھت کا کام کسی کے ہاں ہوا اور کیسا ہی ہو، ہر پھر کے نام منشی جی کا آتا۔ منشی جی کی زبان نے جیسے نہ کہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ جدھر سے بلاوا آیا ادھر ہو لیے۔ غرض کہ حمیدہ اس گھر میں آئی تو ایک آدمی کی دلہن بن کر تھی لیکن کام اس کے ذمے پورے گھر کی دیکھ ریکھ کا تھا۔ شوہر نے بھی سہاگ رات گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے یہی بھاشن دیا تھا:

"دیکھو! میرے لیے توے پہ روٹی ڈال رکھی ہو اور اماں یا بابو جی پکار لیں تو فوراً اٹھ کر چلی جانا۔ یہ مت دیکھنا کہ روٹی جل جائے گی۔ میں جلی روٹی کھالوں گا لیکن اماں بابو جی کا جی جلتا نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ دونوں چھوکریاں تم سے عمر میں کچھ ایسی زیادہ چھوٹی تو نہیں ہیں، لیکن پھر بھی تم ان سے نند بھاوج کا ٹنٹا مت پالنا۔ انھیں میرے رشتے سے دیکھنا۔ بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے۔ یہ ہماری اولاد کی طرح ہیں۔ اب ان کی دیکھ ریکھ اور بیاہ شادی ہماری ذمے داری ہے۔ میں تو تین مہینے پیچھے دو چار دن کے لیے آیا کروں گا لیکن میں آؤں تو مجھے کسی کے ماتھے پہ بل پڑے دکھائی نہ دیں۔ اماں بابو جی اگر تم سے راضی ہیں تو میں بھی راضی ہوں اور میرا اللہ بھی۔"

حمیدہ نے سر جھکا کے پورے دھیان سے سپاہی کا خطبہ سنا اور اس کی ایک ایک بات کو اس طرح پلے باندھ لیا کہ سپاہی کو آئندہ پھر کبھی اسے کچھ کہنے سننے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نندوں ہی کا نہیں، حمیدہ نے تو ساس کا خیال بھی ایسے رکھا جیسے ماں اپنے بچوں کا رکھتی ہے۔ ساس کی جان کو خدا جانے کیا روگ لگا ہوا تھا کہ وہ اچھی نہ ہوئی۔ منشی جی اور افضال نے کئی بار شہر لے جا کر بڑے ہسپتال اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ دو دفعہ تو فوجی ہسپتال میں بھی داخل کرایا مگر دکھن وہی کرم کے لچھن، اسے نہ اچھا ہونا تھا، نہ ہوئی۔ موت سے مہینہ بھر پہلے اس نے ذرا سنبھالا لیا تھا۔ ہفتہ عشرہ تو ایسے گذرا جیسے سارے مرض دور ہوتے جا رہے ہوں لیکن پھر جو اس نے چارپائی پکڑی تو ایسی کہ مر کے اٹھی۔

حمیدہ کی گود تو ساس کی زندگی ہی میں بھر گئی تھی، پہلونٹھی کا لڑکا ہوا تھا۔ سارے گاؤں میں منشی جی نے موتی چور کے لڈو بانٹے تھے۔ پہلے تو صرف ساس کے کارن حمیدہ کو جاگنا پڑتا تھا مگر اب ایک اور بہانہ بن گیا۔ امیرے سویرے پہلو میں رکھا یہ کھلونا بجنے لگتا۔ بچہ ذرا سا سیانا ہوا، اب ذرا رات کو چین ملنے لگا۔ لیکن اتنے میں دوسری روح نے دنیا میں آنے کی تیاری کر لی۔ ساس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد جوان جہان نندوں کی چوکسی کا خیال اور پھر جب نندیں اپنے گھر کی ہوئیں تو یہ تیسری اولاد جو اس وقت اس کے برابر میں پڑی بے خبر سو رہی ہے، اس کے پیٹ میں تھی۔ اوپر والے کے کام اوپر والا ہی جانے۔ ساس کی بیماری، شوہر کا انتظار اور پھر بچوں کی دیکھ ریکھ، کس کس بہانے حمیدہ نے راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ لیکن آج کے رتجگے کا تو ان میں سے کوئی بہانہ نہیں تھا۔ آج تو وہ کسی اور کارن ہی جاگ رہی تھی۔ اسے صبح سویرے سسر کو ساتھ لے کر راولپنڈی جانا تھا، وہاں سرکار کے دفتر میں حاضری کرا کے یہ اطلاع دی تھی کہ پرسوں صبح کے جلسے میں انعام لینے کے لیے وہ شہر آ چکی ہے۔ پرسوں کے جلسے اور انعام کا دھیان آتے ہی حمیدہ کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ رات آنکھ کے کاجل ایسی گہری ہو گئی تھی۔ دور تک سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اچانک الوؤں کے رونے کی آواز ابھرتی تو جیسے سناٹے کا شور تھم سا جاتا۔ آسمان گہرا ہو گیا تھا۔ تارے اب چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ اب وہ ہجوم کی طرح آسمان پر بکھرے ہوئے بھی نہیں لگ رہے تھے بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے انھیں سیدھی قطاروں میں کھینچ کھینچ کر ٹانک دیا ہو۔ حمیدہ کی آنکھوں پر بیداریوں کے یہ دن اس عمر میں آ گئے تھے جب کہ ابھی بے خوابیوں کی جلن آنکھوں سے مٹتی ہے اور نہ ہی خوابوں کا تانتا ٹوٹتا ہے۔

حمیدہ نے ماتا بھری نگاہوں سے برابر کی چارپائی پر بے سدھ سوئے ہوئے طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کو دیکھا۔ ذہن کے پردے پر منظر بدلا۔ وقت نے ایک آن میں جست بھری اور تیس برس آگے نکل گیا۔ اب حمیدہ کی نگاہیں کپتان افضال احمد شہید کے دونوں بیٹوں کی فوج کے جوانوں کی کلف کی کھنچی وردی میں ملبوس جگمگاتا دیکھ رہی تھیں۔ کہیں بہت قریب سے پکارنے والا بلند آواز سے پکار رہا تھا، وطن عزیز کے ان دو مایۂ ناز سپوتوں نے بہادری، شجاعت اور حب الوطنی کی نئی اور ولولہ انگیز داستان رقم کی ہے۔ وطن عزیز کی تاریخ میں جنرل طارق بن زیادہ اور جنرل محمد بن قاسم کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ مادر وطن کو اپنے ان جاں باز غازیوں پر ناز ہے! ناز ہے...! ناز ہے...! آواز گونجتی ہے، گونجتی چلی جاتی ہے۔ حمیدہ کی آنکھوں کے پردے پر پانی جھلملانے لگتا ہے۔ یہ خوشی اور تشکر کے آنسو ہیں۔ میرے مالک تیرا شکر ہے، لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اس فرض کو پورا کرا دیا جو شہید سپاہی نے مجھے سونپا تھا۔ آنکھوں کے پردے پر جھلملاتا پانی راہ بنا کر بہہ نکلتا ہے۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہے تو پل کی پل میں منظر ایک بار پھر بدل جاتا ہے۔ سپاہی چھٹی آیا ہوا ہے۔ دوسرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔

"ہاں بھئی کپتان صاحب، کیا نام سوچا؟" منشی جی نے پوچھا۔

"بابو جی! اس کا نام محمد بن قاسم رکھ دیں۔" افضال احمد نے جواب دیا۔

"اچھا، ماشاء اللہ خوب صورت نام ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ بیٹوں کے نام جرنیلوں کے نام پہ رکھنے ہیں۔"

"جی بابو جی! انھیں بھی سپاہی بنانا ہے، اس لیے ان کے نام بھی سپاہیوں والے ہونے چاہئیں۔"

"اچھا بھئی اچھا، ماشاء اللہ لمبی عمریں ہوں، اللہ باغ باڑی لگائے۔ تو پھر میں گاؤں میں نیانے کی مسلمانی کا بلاوا دے آؤں!" منشی جی نے چارپائی کے پائے پر سے چوگوشیہ ٹوپی اٹھا کر سر پہ جمائی، نارنجی کڑھائی والا رومال کاندھے پر ڈالا اور باہر نکل گئے۔ حمیدہ کا پلنگ کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا منشی جی کے گھر سے نکلنے کے بعد سپاہی دو گھڑی سر نہوڑائے بیٹھا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر وہ اٹھ کر اندر کمرے میں آ گیا۔ پہلے اس نے ننھے منے محمد بن قاسم کو دیکھا جو اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں کھولے دیدے ادھر ادھر گھما رہا تھا۔

"کا دیکھ لیے ہو بیٹا جی، جنت سے نکل کل یہ کاں آ گئے بھئی!" سپاہی نے پولے ہاتھوں سے اس کا گال سہلایا۔ محمد بن قاسم نے لاڈ بھری نظروں سے باوا

کو دیکھا اور پھر انگڑائی لی۔ انگڑائی لیتے لیتے وہ رونے لگا۔

"ایں ہیٔ یہ کیا۔ یہ کیسی بہادلی ہے۔ آپ تو اپنی انگلائی کے جور شے خود ہی رونے لگے۔ کس نے کہا تھا کہ اتنے جوروں کی انگلائی لو۔ ایں ہیٔ کس نے کہا تھا؟ ایں ہیٔ ہم تو آپ کو جرنل شاب بنانا چاہتے ہیں، اور آپ انگلائی کے جور شے ہی رو کے دکھاتے ہو... ایں ہیٔ یہ کاں کی بہادلی ہے...!" محمد بن قاسم بادا کی باتیں سن کر جیسے شرمندہ ہوا اور فوراً چپ ہو کر ٹکر ٹکر بادا کو دیکھنے لگا۔ سپاہی ہنس دیا۔

"حمیدہ!" سپاہی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "میں اپنے دونوں بچوں کو سپاہی بنانا چاہتا ہوں، اپنی طرح... بلکہ اپنے سے بھی بڑا... بہت بڑا... جرنل صاحب... فل جرنل... چیف آف دی آرمی اسٹاف جرنل طارق بن زیاد، وائس چیف آف دی آرمی اسٹاف جرنل محمد بن قاسم...!" اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی آسمانی روشنی کا لشکارا تھا۔ پل دو پل جیسے وہ کہیں کھویا رہا، پھر حمیدہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"پیشتن! میں تو زندگی کی باؤڈر لائن کا آدمی ہوں۔ میرا کچھ پتہ نہیں، کب تک ادھر ہوں کب ادھر ہو جاؤں۔ میں اپنے دل کی آرزو تجھے کہہ دیتا ہوں۔ زندہ رہا تو اپنے سارے شوق خود پورے کروں گا۔ میں نہ رہوں تو میری آرزو کو تو پورا کرنا۔ میں یہ ذمہ داری تجھے سونپ رہا ہوں۔" سپاہی کا چہرہ اسی شہابی رنگت سے تمتما رہا تھا جو اپنی بیاہتا بیبیوں سے بات کرتے ہوئے باکردار مردوں کے چہرے پر کھلا کرتا ہے۔

حمیدہ کی آنکھوں کے آگے جیسے ململ کا سا کوئی پردہ جھلملا گیا۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا جی چاہا وہ اسی پل، ابھی اسی گھڑی اپنی جان سپاہی پر وار دے۔

"یہ تو خوشی کا موقع ہے۔ اس وقت تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟" اس نے ملائمت اور محبت سے کہا۔

"پیشتن! میں غلط نہیں کہہ رہا۔ نہ ہی یہ باتیں میں نے کبھی جذباتی انداز میں سوچی ہیں۔ حمیدہ دیکھ، بات یہ ہے کہ سپاہی کی زندگی اور موت میں بس ایک لمحے کی سرحد ہوتی ہے۔ سپاہی کی بیوی کو یہ بات پتہ ہونی چاہیے۔ اسے بھی سپاہی کی طرح ہر وقت ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں یہ بات تجھ سے اس لیے کر رہا ہوں کہ اگر کل میں نہ رہوں تو تجھے خبر ہو کہ میں اپنے بچوں کے لیے کیا سوچتا تھا۔ میری خواہش ہے کہ میرے دونوں بیٹے بلکہ اگر اس کے بعد ہمارا کوئی اور بیٹا ہو تو وہ بھی... ہمارے سارے بیٹے مجاہد بنیں، سپاہی بنیں۔ وہ اپنی دھرتی ماں کی بھی اسی طرح عزت کریں، اسی طرح حفاظت کریں جیسے بیٹے اپنی ماؤں کی کیا کرتے ہیں۔ اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی کرانا۔ پڑھا لکھا کے کپتان بھرتی کرانا، انھیں آگے چل کر جرنیل بننا ہے۔ مجاہدوں کی، شہیدوں کی، غازیوں کی قیادت کرنی ہے... اور اس طرح کرنی ہے کہ تو بھی اور تیرے ساتھ یہ دھرتی ماں بھی ان پر فخر کرے...!"

فخر کرے... فخر کرے...!

ایک آواز ہے جو چاروں طرف گونج رہی ہے۔ ایک دھن ہے، ایک لے ہے جو اس کے اندر، اس کے باہر، چاروں طرف ہے... اور ایک نغمہ ہے جو آس پاس کہیں بہت قریب ہی بج رہا ہے۔

اس دھرتی کے سب بیٹوں کا
دیس کے سب متوالوں کا
ایک ہی نعرہ
ایک ہی نعرہ
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

حمیدہ کی آنکھ کھلی تو محلے کی مسجد میں موذن فجر کی اذان دے رہا تھا۔ منشی جی کمرے پر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ کمرے کے فرش سے پیتل کا لوٹا بار بار لگرا رہا تھا۔ اس آواز میں عجب نغمگی تھی۔ روح کے تاروں کو چھیڑنے والی ایک لہر جیسے دھیرے سے بہے چلی جا رہی تھی۔ رات کی تاریکی چھٹنے لگی تھی۔ آسمان کی سیاہی مائل نیلی رنگت میں دھیرے دھیرے سفیدہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ستاروں کی چمک بھی ماند پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ نور کے تڑکے سے جی جان کی تراوٹ ہو رہی تھی۔ حمیدہ نے آنکھیں مل کر بچوں کی طرف دیکھا۔ تینوں بے سدھ سو رہے تھے۔ اس نے اٹھنے کے لیے چارپائی کی پٹی کا سہارا لیا۔ نیند کی کمی سے جسم میں کسلمندی بھر گئی تھی۔ رات کون گھڑی اس کی آنکھ لگی تھی؟ وہ شاید بہت تھوڑی دیر سوئی تھی لیکن یہ کون سی نئی بات تھی اور آج تو اسے ویسے بھی ڈھسل مسل نہیں کرنی، جلد اٹھ کر تیار ہونا ہے اور سسر جی کو ساتھ لے کر راولپنڈی جانے والی بس پکڑنی ہے۔ کل صبح آزادی کے جلسے میں اس کے شہید شوہر کو تمغا دیا جائے گا۔ اسے آج راولپنڈی پہنچ کر سرکار کے دفتر میں حاضری کرانی ہے کہ وہ اپنے شہید شوہر کا تمغا لینے کے لیے شہر آ گئی ہے۔

وضو کر کے منشی جی مسجد چلے گئے۔ حمیدہ نے بھی مصلی سنبھالا۔ نماز پڑھ کر قرآن شریف کی تلاوت کی، فاتحہ پڑھ کر وطن کے شہیدوں اور اپنے سپاہی کو اس کا ثواب بخشا۔ تاریکی چھٹ چکی تھی۔ دن کی دودھیا دھیاری کھلے کھلے اجالے میں بدل چکی تھی۔ آسمان پر مشرقی رخ سرخی پھیل رہی تھی۔ دن طلوع ہو رہا تھا۔ حمیدہ نے چمکار کر دونوں بیٹوں کو اٹھایا۔ سپاہی کے بیٹوں میں بھی سپاہی والی عادتیں تھیں، تڑکے ماں کی ایک آواز پر اٹھ بیٹھتے۔ بیٹوں کو یہ عادت خود سپاہی نے ڈالی تھی۔ کہتا تھا:

"سپاہی کا دن منھ اندھیرے شروع ہوتا ہے۔ میرے بیٹوں کو ابھی سے یہ عادت ہونی چاہیے۔"

بچے منھ ہاتھ دھو رہے تھے کہ منشی جی واپس آ گئے۔ حمیدہ چولھے پر جا بیٹھی تھی۔ ناشتے پانی سے فارغ ہو کر منشی جی چوپال کا پھیرا لگانے نکلے تو حمیدہ کو کہہ گئے کہ واپسی میں تانگا سواری لے کر آئیں گے۔ بچوں کے ساتھ حمیدہ نے بھی پاپڑ جیسی روٹی کے دو چار نوالے اوپر تلے چائے سے نگلے، جلدی جلدی سینکتے ہوئے زیادہ آنچ لگنے سے روٹی پاپڑ بن گئی تھی۔ دونوں بچے اطمینان سے پہلے روکھا نوالہ منھ میں ڈال کے کر کر چباتے، پھر چائے کا گھونٹ بھر کے اسے حلق سے نیچے اتارتے۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، روز کا معمول تھا۔ منشی جی کی پنشن میں اب انھیں یہی سوکھی اور سادہ روٹی جڑتی تھی۔

چوپال پر گاؤں کے دو چار بوڑھے اپنے اپنے حال میں مست بیٹھے

تھے۔ ویسے یہ وقت بھی چوپال کی رونق کا نہیں تھا، وہاں تو اصل منڈلی شام ڈھلے جمتی تھی۔ بوڑھے ہی نہیں جوان، نوجوان بھی اکٹھے ہوتے اور اپنی اپنی سنگتوں میں اپنی اپنی بولیاں بول کر بھیگتی رات کے ساتھ گھروں کو لوٹتے۔ منشی جی اس وقت تھوڑی دیر اپنے ہم عمروں کے ساتھ چوپال پر بیٹھے اور جب سورج دور مشرقی ٹیلوں سے ابھر کر سامنے آگیا اور اس کی تیز کرنیں کپاس کے پودوں کی ڈنٹھلوں سے نیچے اتر کر سطح زمین پر سیدھی پڑنے لگیں تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چودھریوں کے باڑے کے پیچھے کوچوان کے مکان پر پہنچ کر انھوں نے ہانک لگائی۔

"ہاں بھئی جیمے فیر کیا ارادے ہیں؟"

"بسم اللہ منشی جی۔ میں تو آپ کی راہ اڈیک رہا تھا۔" جیمیا اندر سے پکارا اور گھڑی بھر میں منہ سے کک کک کی آوازیں نکالتا ہوا باہر آگیا۔ گھوڑا اس کی ٹنکاری سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ جیمے نے پہلے آ کر گھوڑے کو پچکارا، پیٹھ پر زور زور سے ہاتھ پھیرا، رانیں سہلائیں، پٹھوں پر تھپکی دی۔ گھوڑے نے ہنہنا کر دائیں بائیں گردن گھمائی، پلکیں جھپکائیں، منہ پھاڑ کر جھٹکے کے ساتھ جبڑے بھینچے اگلی ٹانگوں سے زمین کھدیڑی جیسے مالک کو اپنی تیاری کی خبر دے رہا ہو۔ اس کی رانوں کا گوشت تحرک رہا تھا۔ جیمیا اسے کھول کر پچکارتا ہوا تانگے کے پاس لایا، ایال کھجلائی، تھپکی دے کر زین کسی اور منہ میں آنکڑا اڑا لا۔ اس دوران جیمے کے منہ سے بھی کک کک اور کبھی چچ چچ کی آوازیں نکلتی رہیں۔ آنکڑا جبڑوں میں دبا کر گھوڑے نے کنوتیاں بدلیں۔ جیمے نے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دی پھر جا کر ہودی میں سے چارہ اٹھایا اور پچھلی سیٹوں کے نیچے لا کر ڈال دیا۔

"بسم اللہ منشی جی!" اس نے منشی جی سے کہا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر دونوں کانوں کی لویں چھوتے ہوئے پائدان پر پاؤں رکھا، "برکت رب سچے دے ناں دی!" کہتا ہوا تانگے میں بیٹھ گیا۔

منشی جی نے پہلے تیز آواز میں بسم اللہ پڑھی، پھر کلمۂ شہادت بھرتے ہوئے پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔

تانگا جب آ کر رکا تو اس وقت پاس پڑوس کے گھروں کے کچھ لوگ منشی جی کے دروازے پر جمع تھے۔ دونوں پوتے جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے، منشی جی کو تانگے سے اترتا دیکھ کر ان کی طرف لپکے۔ منشی جی دونوں پوتوں کو دائیں بائیں اپنے ساتھ لگائے، دروازے پر کھڑے لوگوں سے سلام دعا لیتے گھر میں داخل ہوئے۔ صحن میں بچھی چارپائیوں پر حمیدہ کے اردگرد عورتیں یوں بیٹھی تھیں جیسے چودھری کی بیٹھک میں لوگ آ کر بیٹھتے ہیں۔ منشی جی کو آتا دیکھ کر حمیدہ اٹھی تو دوسری عورتیں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ منشی جی نے ایک نظر گھر پر ڈالی۔

"پتر ککڑیوں کا دانہ پانی کس کے ذمے لگایا ہے؟" انھوں نے حمیدہ سے پوچھا۔

"چاچی جیراں کرے گی ابا جی۔" حمیدہ نے جواب دیا۔

"بھیے تسی بے پروا ہو کے جاؤ، میں آپے دیکھلاں گی۔" چاچی جیراں بولی۔

"اچھا بھئی تے فیر دعا کرنا۔ چل دھیے۔" منشی جی نے دروازے کے پاس رکھا ہوا ٹین کا ٹرنک اٹھایا۔ بھولے کمہار کا لڑکا اسلم ٹرنک منشی جی کے ہاتھ میں دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھا۔ "لیاؤ مینوں دیو منشی جی۔"

"رہن دے پتر! تانگے میں رکھنا ہے، میں رکھ لوں گا۔"

"ناں ناں منشی جی، تسی مینوں دیو۔" اسلم نے ٹرنک منشی جی کے ہاتھ سے لے لیا تو منشی جی نے گٹھڑی اٹھالی لیکن وہ بھی کرموں نائی نے آ کر ان کے ہاتھ سے لے لی۔ منشی جی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان کی عزت تو سارا گاؤں پہلے بھی کرتا تھا لیکن ان کے سپاہی بیٹے کی شہادت کے بعد تو جیسے ان کا پورا گھر ولیوں اور پیروں کا کنبہ ہو گیا تھا۔ کون تھا گاؤں بھر میں جس کی آنکھیں ان کے قدموں تلے بچھ بچھ نہ جاتی ہوں۔ ایسی عزت تو چودھریوں کے خاندان کی بھی نہیں کی جاتی تھی۔ خود چودھری کیسی عزت سے ملتا اور بات کرتا تھا۔ بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر وہ خود چل کر منشی جی کے گھر آیا تھا۔ بعد میں جب سرکاری ہرکارہ یہ اطلاع لایا کہ سرکار شہید سپاہی کو تمغا دے گی تو اس وقت بھی چودھری کا بڑا بیٹا ہرکارے کے ساتھ منشی جی کے گھر آیا تھا۔

شہید بیٹے کی تصویر گھڑی بھر میں منشی جی کی آنکھوں میں پھر گئی۔ شہیدوں کا مقام اللہ کے پاس بھی اونچا ہے اور اس دنیا میں بھی بلند ہے۔ منشی جی نے سوچا۔ انھوں نے دیکھا، گاؤں کے کتنے ہی گھروں کے عورت مرد انھیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آس پاس کھڑے لوگوں پر ڈبڈبائی آنکھوں سے انھوں نے ایک نظر ڈالی۔ پہلے چھوٹے پوتے کو گود میں اٹھا کر اگلی نشست پر بٹھایا اور پھر بلند آواز میں لوگوں کو سلام کر کے خود اس کے برابر جا بیٹھے۔ حمیدہ نے بچی کو گود میں سنبھالا اور تانگے میں سوار ہو گئی۔ اس کا بڑا بیٹا بھی ساتھ آ بیٹھا۔ جیمیا کک کک کی آواز نکالتے ہوئے بمی پر بیٹھا اور گھوڑے کی باگیں ایک بار ذرا سی کھینچ کر ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑا دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ دائیں بائیں کھڑے لوگ ایک طرف ہو کر راستہ دینے لگے۔ چاچی جیراں اور اس کی بیٹی نے آنکھیں پونچھیں اور دوپٹوں کے پلو منہ میں دبا لیے۔ حمیدہ کو لگا جیسے درد اور غبار کا ایک بگولہ سا اس کے دل میں اٹھا ہے... لیکن پھر اگلے ہی لمحے جیسے کسی نے اس سے کہا، اس میں رونے اور دل میلا کرنے کی کون سی بات ہے؟ مرنا تو انسان کو ایک دن ہے، شہادت تو عزت کا مقام ہے۔ یہ خوش بختی سب کے حصے میں بھلا کب آتی ہے۔ اس کا دل یک بہ یک بڑا ہو گیا... اتنا بڑا کہ اس میں پوری کائنات سما جائے۔ اس نے سوچا وہ شہید کی بیوی ہے۔ شہید کی بیوی کا درجہ تو قوم کی ماں کے برابر ہوتا ہے، وہ اپنے لیے نہیں اپنی اولاد کے لیے، اپنی نسل، اپنی قوم کے لیے جیتی ہے... پورے حوصلے اور وقار کے ساتھ جیتی ہے۔ اسے اپنا آپ بہت بڑا، بہت مہان لگنے لگا۔ گھر اور لوگ دور ہوتے جا رہے تھے۔ تانگا آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔ چاچی جیراں، اس کی بیٹی اور بھی کئی عورتیں اپنی اوڑھنیوں کے پلو منہ میں دبائے کھڑی تھیں جیسے کسی دکھ، کسی آہ، کسی سسکاری کو روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ حمیدہ کا دل ان کے لیے ہمدردی اور محبت کے احساس سے بھر گیا۔ تانگا تیز ہونے کی وجہ سے بڑا بیٹا اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ حمیدہ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سوچا شہید کی بیوی اور ہونے والے سپاہیوں کی ماں کو بڑا بن کر جینا چاہیے۔ وہ بھلا عام عورتوں کی طرح کیسے رو سکتی ہے۔

تانگا جب بس اڈے پر پہنچا تو بس شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

جھیمے نے جلدی جلدی سامان لے جا کر ایک بڑی سیٹ کے نیچے جمایا، پھر منشی جی کے ساتھ بچوں کو گود میں اٹھا اٹھا کر بس میں سوار کرایا اور جا کر تانگے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ تانگے کو لے جا کر اس نے مسافر خانے کے چھپر کے پاس کھڑا کیا اور گھاس نکال کر گھوڑے کے آگے ڈال دی۔ اب وہ واپس بس کی اس کھڑکی کی طرف آیا جدھر حمیدہ بیٹھی تھی۔ ''بھابی بچوں کے لیے کوئی شے لینی ہو تو لا دوں۔''

حمیدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''ناں پتر! کوئی لوڑ نہیں، سب ہے۔'' منشی جی نے کہا۔

جھیما خود ہی گنڈیری کے تھیلے پر گیا اور بچوں کے لیے گنڈیریاں لے آیا۔ منشی جی نے منع بھی کیا لیکن اس نے لفافہ بچوں کو تھما دیا۔ گاڑی نے چلنے کے لیے ہارن بجایا۔ ادھر ادھر ٹھیلوں پر کھڑے، تندور اور چائے کے کھوکھے پر بیٹھے مسافر گاڑی کی طرف لپکنے لگے۔ جھیمے نے منشی جی سے ہاتھ ملایا اور پرے جا کر کھڑا ہو گیا اور جب تک بس اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی، وہیں کھڑا رہا۔

بس جب شہر پہنچی، دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اڈے پر اتر کر منشی جی نے حمیدہ سے کہا: ''دیسے دفتروں کی چھٹی کے ٹیم سے پہلے پہلے ہمیں اپنی آمد درج کرانی ہے۔ وقت نکل رہا ہے، کھانا پینا بعد میں کر لیں گے، حاضری پہلے درج کرا دیں۔''

''ہاں ابا جی، ٹھیک ہے۔'' حمیدہ نے جواب دیا۔ بچوں کو وہ بس میں روٹی کھلا چکی تھی، خود اسے جیسے بھوک تھی ہی نہیں۔ اس کا دھیان تو کہیں اور ہی لگا ہوا تھا۔ شہید سپاہی کی باتیں رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ سپاہی کا سنجیدہ اور بردبار چہرہ جیسے اس کی آنکھ کی پتلی پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ حمیدہ کو اب اپنی فکر ہی کب رہ گئی تھی۔ اسے تو بس اپنے بچوں کا، اپنی اولاد کا خیال تھا۔ ساری قوم اب اس کی اولاد تھی۔ ''شہید کی بیوی کے لیے ساری قوم اس کے اپنے بچوں کی طرح ہوتی ہے۔ وہ ماں ہو جاتی ہے پوری قوم کی، پورے ملک کی۔ اس کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے اور جن کے مرتبے بڑے ہوتے ہیں، ان کا فرض بھی بڑا ہوتا ہے۔'' سپاہی اس سے اکثر کہا کرتا تھا۔ اب وہ خود کو بڑے مرتبے پر دیکھ رہی تھی۔ اس لیے اسے اپنی تو کوئی خبر ہی نہیں تھی، بس اپنے بچوں کی، اولاد کی فکر تھی۔ شہید کے بچوں کا خیال تھا۔ شہید کے رتبے اور اپنے فرض کا احساس تھا۔ منشی جی نے جیب سے سرکاری ہرکارے کا دیا ہوا پرچہ نکال کر حاضری دفتر کا پتہ دیکھا اور بچوں کو ایک طرف کھڑا کر کے رکشا لینے چلے گئے۔

دفتر میں ان کی حاضری درج کر کے افسر مجاز نے انھیں ہدایات دیں اور صبح دفتر پہنچنے کا وقت بتایا پھر اس نے سمجھایا کہ کہاں آ کر بیٹھنا ہے، کیسے کپڑے پہن کر آنے ہیں، اور جلسے میں کس طرح رہنا ہے۔ وہ بہت نرم طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے لہجے میں مٹھاس اور گفتگو میں اپنائیت تھی۔ وہ منشی جی اور حمیدہ سے ٹھہر ٹھہر کر نرمی سے بات کر رہا تھا۔ وہ شہید سپاہی کو بھی جانتا تھا۔ اس نے کئی بار بہت اچھے لفظوں میں اس کا ذکر بھی کیا۔ اس کی بہادری اور وطن سے محبت کے جذبے کی بہت تعریف کی۔ اس نے کہا، شہید سپاہی جیسے عظیم لوگوں پر پورے ملک کو ناز ہے۔ افسر مجاز کی باتیں سن کر حمیدہ کا دل بڑا ہوتا رہا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اس کے شہید سپاہی پر صرف اس کے گاؤں ہی کو مان نہیں ہے بلکہ پورا ملک فخر کرتا ہے تو اسے لگا جیسے آسمان اس کی تعظیم کے لیے جھک گیا ہے۔ ساری دنیا عزت اور محبت بھری نگاہوں سے اسے تک رہی ہے۔

اگلے دن صبح سویرے افسر مجاز نے انھیں جس وقت دفتر پہنچنے کے لیے کہا تھا، وہ اس سے بھی پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ دن کا آغاز تھا، ابھی دھوپ میں شدت نہیں آئی تھی۔ دفتر کا عملہ بڑی مستعدی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ انھیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ابھی اور لوگ نہیں آئے تھے، اس بڑے سے کمرے میں صرف وہی لوگ بیٹھے تھے۔ حمیدہ کے دل پر آج ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی، ایک ایسی کیفیت جس میں عظمت، فخر، خوشی اور نئی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا ولولہ شامل تھا۔ اس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ نیند گھڑی بھر کو بھی اس کی پلکوں پر نہیں اتری تھی لیکن رتجگے کے باوجود اسے نہ تھکن محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی اس کے دل پر کوئی بوجھ تھا۔ وہ تو اس کے برعکس روز سے زیادہ تازہ دم اور چاق و چوبند تھی۔ ایک ان جانی طاقت اس کے رگ و ریشے میں دوڑ رہی تھی۔ اس نے رات اپنے شہید سپاہی سے اپنے دو بیٹوں کو فوجی جرنیل کرنیل بنانے اور ان کے مجاہدانہ مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے گزاری تھی۔ منشی جی کو اس دفتر میں صبح صبح لے کر بھی وہ اس لیے آئی تھی کہ کل جس افسر مجاز سے مل کر گئی، اسے جا کر بتائے گی کہ جب وہ جا کر تمغا لے گی تو اپنے دونوں بیٹوں کو جرنیل کرنیل بنانے کا اعلان کرے گی، لیکن افسر مجاز ابھی آیا ہی نہیں تھا۔ دیر تک انتظار کے بعد جب اور شہیدوں کے عزیز بھی جمع ہونے لگے تو حمیدہ نے منشی جی سے کہا کہ وہ ذرا جا کر دیکھ تو آئیں کہ افسر مجاز آیا کہ نہیں، وہ اس سے پہلے ذرا بات کرنا چاہتی تھی۔ منشی جی نے جا کر دیکھا۔ افسر مجاز ابھی نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس بڑے سے ہال کمرے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ حمیدہ اس دبدھا میں تھی کہ منشی جی کو ایک بار پھر کہے کہ وہ جا کر دیکھیں، افسر مجاز آیا کہ نہیں۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک افسر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دو ماتحت پیچھے پیچھے لپکے۔ بڑے افسر نے ایک ماتحت سے پوچھا: ''سب لوگ آ چکے ہیں؟''

''یس سر۔''

''حاضری کر لی ہے ان کی؟''

''یس سر۔''

''بریف کر دیا ہے انھیں فنکشن میں کس طرح رہنا ہے؟''

''نو سر، وہ منشی صاحب کہہ رہے تھے کہ جب انھیں اسٹیج پر جانے اور تمغا وصول کرنے کی ہدایات دی جائیں گی تو اسی وقت بتا دیا جائے گا کہ فنکشن میں کیا کرنا ہے اور کیسے رہنا ہے۔ سر، کرنل جنجوعہ صاحب خود اس پراجیکٹ کو look after کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن اچھی طرح سمجھا دینا۔ وہاں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں ہونی چاہیے، پتہ چلے بعد میں سارے ڈپارٹمنٹ کو جھاڑیں پڑ رہی ہیں اور کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔'' اس نے ماتحت سے کہا اور پھر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوا:

"یہ تو آپ سب لوگوں کو پتہ ہے نہ کہ آج آپ لوگوں کے شہیدوں کو تمغے دیئے جا رہے ہیں؟ اس فنکشن میں آپ لوگوں نے کس طرح بیٹھنا ہے اور کس طرح جا کر تمغا لینا ہے، یہ سب باتیں ہمارے ایک اور ساتھی آپ کو سمجھا دیں گے۔ دو باتیں آپ لوگ خاص طور سمجھ لیں۔ ایک یہ کہ آپ کو تمغا لیتے ہوئے کوئی بات نہیں کرنی، ایک لفظ نہیں کہنا۔ دوسری بات اگر اخبار والے باہر الگ سے آپ کی تصویریں کھینچیں اور آپ کے تاثرات پوچھیں تو آپ کو خوشی کے ساتھ مسکراتے ہوئے تصویریں بنوانی ہیں اور حکومت کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کرنی ہیں، ٹھیک ہے۔ جو ہدایات آپ کو دی جائیں، آپ نے ان پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ اگر کسی نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر اپنے فعل کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ انتظامیہ اور پولیس والے اس کے ساتھ جو سلوک کریں گے، اس سے پھر ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے، آپ لوگ سمجھ گئے میری بات؟"

سب لوگوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بڑے افسر کا حکم سن کر حمیدہ کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے سوچا کہ افسر مجاز کا پتہ نہیں، وہ آیا بھی ہے کہ نہیں، جو بات مجھے کرنی وہ اسی بڑے افسر سے کیوں نہ کرلوں۔ اس نے سر پر اوڑھنی ٹھیک سے لی اور بچی کو گود میں سنبھالتی ہوئی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جناب عالی۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"جی بی بی، کیا بات ہے؟" بڑے افسر سے پہلے اس کے ماتحت نے پوچھا۔

"بھائی صاحب! مجھے افسر صاحب سے بات کرنی ہے۔" اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ماتحت کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بڑا افسر حمیدہ کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ "ہاں مائی بولو کیا مسئلہ ہے؟"

"جناب عالی۔ میں اپنے بچوں کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا بات کرنی ہے مائی؟" بڑے افسر نے قدرے درشتی سے کہا۔ "کیا بات کرنی ہے تمھیں اپنے بچوں کے بارے میں؟"

بڑے افسر کے لہجے نے حمیدہ کو پریشان سا کر دیا تھا لیکن اس نے پھر بھی حوصلے سے کام لیتے ہوئے کہا: "جناب عالی میرے شہید شوہر کی خواہش تھی کہ اس کے دونوں بیٹے بڑے ہو کر فوج کے بڑے سپاہی بنیں، جرنیل کرنیل بنیں۔ میں شہید کی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتی ہوں۔"

"مائی! تم اپنے بچوں کو جو کچھ بنانا چاہتی ہو شوق سے بناؤ، کسی کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ اس میں کسی سے کہنے والی کون سی بات ہے؟" بڑے افسر نے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ حمیدہ کو ہمت ہوئی۔ اس نے سوچا، وہ خواہ مخواہ بڑے افسر کے لہجے سے پریشان ہوگئی تھی، بیچارا آرام سے تو بات کر رہا ہے۔

"جناب عالی۔ بات یہ ہے کہ میرے سسر بوڑھے آدمی ہیں اور کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ سرکار میرے بچوں کا تعلیمی وظیفہ لگا دے، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو دو وقت کی روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرلوں گی مگر بس میرے بچے اچھی تعلیم حاصل کر کے فوج کے بڑے افسر بنیں۔ آپ سے اتنی سی درخواست کرنی ہے کہ آپ شہید کی اولاد کا تعلیمی وظیفہ لگوا دیں..." حمیدہ نے پورے اعتماد سے اپنی بات کہہ دی۔

بڑا افسر اس کی طول کلامی سے ایک دم زچ ہوگیا۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ "مائی تمھیں یہاں پر شوہر کا تمغا لینے کے لیے بلایا گیا ہے، بھیک مانگنے کے لیے نہیں۔ بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ۔"

حمیدہ گڑبڑا کر فوراً بیٹھ گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ایک دم بڑے افسر کو کیا ہوگیا ہے۔ اب بڑے افسر کی نگاہ حمیدہ کے بچوں پر پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں کی طرف مڑا۔ "یہ مائی اپنے پورے ٹبر کو ساتھ لے کر آئی ہے؟"

"یس سر! نو سر۔ سر کہہ رہی تھی کہ کوئی سنبھالنے والا نہیں تھا۔ ہم نے سوچا، وہیں باہر روک لیں گے، یہاں سے لے جانے دیتے ہیں۔" ماتحت نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"Take care, she can create a problem." وہ تیزی سے بڑبڑایا۔ "Don't let her go there... اور کوئی ہے اس کے ساتھ؟"

"اس کا سسر آیا ہے سر۔"

"ٹھیک ہے، صرف اس کو بھیج دو۔ Don't let her go there."

بڑے افسر نے اپنے ماتحت سے کہا اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"جو کچھ کہا جائے، اس پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ تمغا لیتے ہوئے کوئی آدمی کوئی بات نہیں کرے گا۔ اوکے...؟" وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ دونوں ماتحت بھی پیچھے پیچھے ہولیے۔

حمیدہ الجھن میں پڑ گئی۔ اسے بالکل کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے؟ بڑے افسر نے اپنے ماتحتوں سے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے پلے نہیں پڑا تھا لیکن اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ توہین آمیز ہے۔ یک بہ یک ذلت کا شدید احساس اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ اسے لگا جیسے اسے کوئی گندی، گھٹیا اور ذلیل مخلوق سمجھ کر اس سے بات کی گئی ہے۔ شدید دکھ اور ہتک کے احساس سے اس کا دل بھر گیا۔

نہیں... نہیں... ہرگز نہیں۔ ہم بھیک منگے نہیں ہیں... ہم خیراتی نہیں ہیں، لینے والے نہیں ہیں... ہم تو دینے والے ہیں، ہم کچھ مانگنے نہیں آئے تھے، ہم تو دینے آئے تھے۔ اپنی اگلی پیڑھی بھی نچھاور کرنے آئے تھے۔ کوئی شدید غصے اور دکھ کے ساتھ اس کے اندر دھاڑ رہا تھا... نہیں چاہیے... کچھ نہیں چاہیے ہمیں... ساری دولتیں، سارے عہدے، سب کچھ تمھیں مبارک... نہیں چاہیے۔ ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اس کے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔ اس کا دل جیسے ریت کی دیوار میں تبدیل ہوگیا اور یہ دیوار جو آسمان تک کھنچی ہوئی تھی گھڑی میں ڈھ گئی۔ ریت اس کی سانسوں میں بھر گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ سارا کمرہ گھومنے لگا۔ زمین آسمان گھومنے لگے۔ اس نے ڈوبتی آواز میں منشی جی کو آواز دی۔

"ابا جی... ابا جی! مجھے چکر آ رہے ہیں... دل گھبرا رہا ہے... دم گھٹ رہا ہے میرا... مجھے یہاں سے باہر لے چلو ابا جی...!" ☆☆☆

آپریشن سے ایک دن پہلے

مجید امجد

شمارہ ۳۵،
اپریل ۱۹۶۹

کل تک تو یہ دنیا، میرے لئے اک آئینہ تھی جس میں
میری نخوت، آنے والے کل کا یقینی چہرہ دیکھ کے، اتراتی تھی،

تو تو سب کچھ جاننے والا ہے... میں کتنا خویش غرض ہوں،
اب تک، جب بھی، تجھ کو یاد کیا ہے
اپنی نخوت کی اس بھول میں تجھ کو یاد کیا ہے

آج مجھے اس بات کا ڈر ہے
کل، جب آنے والا کل آئے گا،
میرے بے حس، سرد، مسالوں کو وہ کھرچنے والی روشنیاں، اک
ڈھیلے ٹاٹ کے جھول میں، میرے جسم پہ، شاید،
جیتے دنوں کی آخری کرنیں ہوں گی

آج یہ میرا عہد ہے تجھ سے،
کل کو، آنے والے کل کے بعد، اگر کچھ دن بھی، میرے لئے ہیں
تو مرا اک دن، اس دن کی اطاعت میں، گذرے گا،
تیرے خزانوں میں، جو، میرے سمیت، سبھی کے لئے ہے۔
اور کسی کے لئے بھی نہیں ہے،
تیرے غیب میں تو سب کچھ حاضر ہے،
کل کے بعد بھی میرے ارادوں کو توفیق کے دن دے
اے وہ، جس کے آج میں فرداؤں کے ابد ہیں

مجید امجد

شمارہ ۴۳،

دسمبر ۱۹۶۹

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو
بچو! آؤ تمھیں سنائیں گذرے ہوئے برسوں کی سہانی جنوریوں کی باتیں

تب یہ فرش نئے تھے،
صبح کو لمبے لمبے اوورکوٹ پہن کر لوگ گلی میں ٹہلنے آتے
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے،
لیکن ہم تو آپس میں
باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے
بڑے تصنع سے ہنستے اور کہتے:
''ننھو! سردی تم کو نہیں لگتی کیا؟''

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے
تھرمس ہاتھوں میں لٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر

بنا بٹن کے گریبانوں کے پلو ادھڑے ہوئے کاجوں میں بھر کر
چلتے چلتے تن کے کہتے:
''نہیں تو! کیسی سردی؟ ہم کو تو نہیں لگتی!''

بچو! ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمھاری اک اک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے
اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو،
تمھیں خبر ہے؟
اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے
اب وہ لوگ ہیں جن کا بچپن
ان خوابوں میں گذرا تھا جو آج تمھاری زندگیاں ہیں

گداگر

مجید امجد

شمارہ ۴۶،
مارچ ۱۹۷۰

ورنہ تیرا وجود تو بیچ کے سمندر میں ہے مٹی کا وہ پشتہ،
جس کے باطن کی جھوٹی خود بستگیاں ہی اس کو سنبھالے ہوئے ہیں،
پھر وہ کون ہے جو خود اپنے فوق سے تجھ کو یہ توفیق عطا کرتا ہے
تیرا ہونا ڈوبنے والوں کی آنکھوں میں ڈھارس بھر دیتا ہے
ورنہ تو، تو خود اس ریلے میں ہے اک پشتہ، بہ جانے والا،
پھر وہ کون ہے جو یوں تیری سمت اشارہ کر کے،
طوفانوں میں گھری ہوئی روحوں کی بے پتوار نگاہوں سے کہتا ہے:
اس تنکے کا بازو تھام لو، شاید تم بچ جاؤ، ڈوبنے سے بچ جاؤ،
بندے، جانے کتنے لوگ ہیں جن کو تیری آس پہ جینا آساں ہے،
اور تو خود وہ پشتہ، جس کی جڑوں کو بھنور کی درانتی پیہم کاٹ رہی ہے۔
تو کیا کر سکتا ہے، بندے
تو خود اپنے باطن کی جھوٹی خود بستگیوں کے سہارے پر باقی ہے۔
باقی تو ہے اک یہ بیچ کا سمندر، جس کی لہریں ہیں، تقدیریں،
اور ان تقدیروں کے اچھے اچھے دکھاوے
جانے کتنی آنکھوں میں بس جاتے ہیں تیری نسبت سے
کتنی آنکھوں میں ہے اک یہ اداس توقع،
کتنی آنکھیں، جن میں ایک ہی دیکھنے والا تیری جانب دیکھ رہا ہے تو
کب اس کی جانب دیکھے

شمارہ ۵۵،
دسمبر ۱۹۷۰

چلتے چلتے رک کر۔ جھک کر۔ ادھر ادھر بے بس نظروں سے دیکھنے
والے۔
کبڑی پیٹھ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے۔
بوڑھے بھک منگے۔ اس اپنی حیرانی کے فریضے میں تو واقعی کتنا
حیران نظر آتا ہے
جانے کس کے ارادے کی رمزیں اس تیری بے بسی کی قوت ہیں۔
پتھریلی روحوں کے صنم کدے میں جانے کون یہ کاسہ بدست کھڑا ہے!

تجھ کو دیکھ کے میرا جی اس سے ڈرتا ہے۔
تیرے ڈرے ہوئے پیکر میں جس کی بے خونی جیتی ہے۔
کس دھیرج سے ڈھڑکتا ہوگا اس کا قلب کہ تو جس کا قالب ہے۔
اتنے سکون میں اس کے جتنے قصد ہیں، میں ان سے ڈرتا ہوں۔

تیرے وجود کو یہ بے کل پن دے کر، کس بے دردی سے، وہ
دلوں میں بچی ہمدردی کے درد جگاتا ہے۔ اور
ہم کو ترساں دیکھ کے شاید خوش ہوتا ہے۔

ابھی ابھی تو۔ نہیں کہیں۔ تو میری غفلت میں تھا۔
اب کہتا ہوں۔ مجھ کو میری آگاہی میں کب یہ بھیک ملے گی۔

مجید امجد

شمارہ ۷۸،
نومبر ۱۹۷۲

کڑکتے زلزلے امڈے، فلک کی چھت گری، جلتے نگر ڈولے
قیامت آگئی، سورج کی کالی ڈھال سے ٹکرا گئی دنیا
کہیں بجھتے ستاروں، راکھ ہوتی کائناتوں کے
رکے انبوہ میں، کروٹ دو سایوں کی
کہیں اس کھولتے لاوے میں بل کھاتے جہانوں کے
سیہ پشتے کے اوجھل، ادھ کھلی کھڑکی
کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے چوکھٹے میں جھانکتا چہرا،
زمینوں آسمانوں کی دہکتی گرد میں لتھڑے
خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے اب بھی
ابھی جیسے سحر بستی پہ جیتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی، آنگن ہمہمائیں گے
کوئی نیندوں بھری پلکوں کے سنگ اٹھ کر
کہے گا: "رات کتنی تیز تھی آندھی!"

شمارہ ۹۲،
اکتوبر نومبر ۱۹۷۵

جن لفظوں میں ہمارے دل کی بیتیں ہیں، کیا صرف وہ لفظ ہمارے
کچھ بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں؟
کیا کچھ چیختے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں، ان کا
جن کی آنکھوں میں اس دیس کی حد ان ویراں صحنوں تک ہے
کیسے یہ شعر اور کیا ان کی حقیقت؟
نہ صاحب، اس اپنے لفظوں بھرے کنستر سے چلو بھر بھیک کسی کو دے کر،
ہم سے اپنے قرض نہیں اتریں گے،
اور یہ قرض اب تک کس سے اور کب اترے ہیں؟
لاکھوں نصرت مند ہجوموں کی خنداں خنداں خونیں آنکھوں سے بھرے
ہوئے تاریخ کے چوراہوں پر،
صاحب تخت خداوندوں کی کٹتی گردنیں بھی حل کر نہ سکیں یہ مسائل،
اک سائل کے مسائل!
اپنے اپنے عروجوں کی افتادگیوں میں ڈوب گئیں سب تہذیبیں، سب فلسفے
تو اب یہ سب حرف زبوروں میں جو مجلد ہیں کیا حاصل ان کا،
جب تک یہ میرا دکھ، میرے لہو کی دھڑکتی ٹکسالوں میں ڈھل کے،
دعاؤں بھری اس اک میلی جھولی میں نہ کھنکے، جو رستے کے
کنارے، میرے قدموں پہ بچھی ہے

مجید امجد

شمارہ ۹۳،
دسمبر ۱۹۷۴، جنوری ۱۹۷۵

مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ میں ان آندھیوں میں، عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دھن تھی، میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو میری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی روح میں تری ضو
مرے خدا، مرے دل
مرے لہو میں، تری لو ہے، دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے
مرے خدا، مرے دل
کہ اس طلسم زیاں کے کسی جھمیلے میں
ذرا بھی، جو قدم میرے، ڈگمگا بھی گئے
تو اک خیال ابد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا
نہ دکھتی سانس کے ارماں نہ جلتی مٹی کے بوجھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ میں، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گن، ترے ہی گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سلگتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے

مرے خدا، مرے دل
ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اس کی خبر ہے
مرے خدا، مرے دل
کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی، اس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے جن پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں، وہ دور، کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں، جنہیں اپنا کے، انگنت سورج
ترے سفر میں بجھے، تو ان ہی اندھیروں سے
دوام درد کی اک صبح ابھری، پھول کھلے
مہک اٹھی تری دنیا
مرے خدا، مرے دل
کھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تجھے تو اس کی خبر ہے
مرے خدا، مرے دل
کہ گو یہی مرا پیکر، خمیر خاک سے ہے
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعت زیست
وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا!

یہ زہر کون پیئے؟ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے، ان ساحلوں سے بھید چنے
جہاں پہ بکھرے ہیں، صدہا صداقتوں کے صدف
یہ زہر کون پیئے؟ کون بجھتی آنکھوں سے
غروب وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں، عمر پیا ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے، فولاد کا پسینہ
مرا شعور ان ہی گھاٹیوں میں بھٹکا ہے
قدم قدم پہ مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں، ان کٹھور ماتھوں کی
جو زندگی میں، ترے آستاں پہ جھک نہ سکے
قدم قدم پہ سیہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اک مجھی کو اس انمٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں، رت جگے جس کے
یہی تڑپ، تری کایا! یہی تڑپ، مرا انت!
جو انت بھی ہو سو ہو، میں تو مٹی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھکڑوں میں سدا
رواں ہے تیرا عمل

مرے خدا، مرے دل
تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ میں، مرے دکھ
یہ راز تو ہی بتا

مرے خدا، مرے دل
یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی مجھ کو، تو اک یہ ریزۂ درد
ہیں جس کی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اب کہ سامنے جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ روحیں
جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں
یہ سائے، بس بھرے، ذی جسم، آہنی سائے
ان ہی کے گھیرے میں ہیں اب، یہ بستیاں، یہ دیار
کہیں یہ سائے ... جو پتھرائی آرزوؤں کو
سراب زر کی کشش بن کے گدگداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں ... میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے ... یہ کیچڑ کی مورتیں ... جن کے
بدن کے دھبوں پہ رخت حریر کی ہے پھبن
مری کرن کی نہ چھب نوچ لیں۔ میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بجھ جائے، جس کے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں۔ میں سوچتا ہوں
نہیں۔ یہ نہ ہو سکے گا۔ جو یوں ہوا بھی تو پھر
نہیں، ابھی تو ایک سانس، ابھی تو ہے کیا کچھ!
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود!
ابھی تو اس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں لہو کے تڑیڑوں میں برگ مرگ پہ اک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اک طلب تری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اک صدا ہے کوئی دور کی صدا
مرے دل
مرے خدا، مرے دل

محبوب خزاں

شمارہ ۱۲۰،
اپریل، مئی ۱۹۸۱

خواب سے پردہ کرو، دیکھو مت
اب اگر دیکھ سکو، دیکھو مت

گرتے شہتیروں کے جنگل ہیں یہ شہر
چپ رہو، چلتے رہو، دیکھو مت

جھوٹ سچ دونوں ہی آئینے ہیں
اس طرف کوئی نہ ہو، دیکھو مت

حسن کیا ایک چمن اک کہرام
تیز و آہستہ چلو، دیکھو مت

پنکھڑی، ایک پرت اور پرت
کیوں بکھیڑے میں پڑو، دیکھو مت

ہر کلی ایک بھنور، اک بادل
کھیل میں کھیل نہ ہو، دیکھو مت

یہ پرانی یہ انوکھی خوشبو
کچھ دن آوارہ پھرو، دیکھو مت

ہر طرف، دیکھنے والی آنکھیں
ان کے سائے سے بچو، دیکھو مت

کم لباسی ہو گلا یا اصرار
بے خبر جیسے رہو، دیکھو مت

عافیت اس میں ہے غافل گذرو
مت نگاہوں سے گرو، دیکھو مت

کینچلی ہٹ گئی، زندہ ریشم
پھر یہ کہتا ہے، ہٹو دیکھو مت

دیکھتے دیکھتے منظر ہے کچھ اور
دھول آنکھوں میں بھرو، دیکھو مت

سطح کے نیچے ہے کیا جانے کون
لہر کی لے پہ بڑھو، دیکھو مت

ایک ہی جل ہے یہاں مایا جل
پیاس کے جال بنو، دیکھو مت

بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ گے
بس کرو بات سنو، دیکھو مت

کنکری جھیل میں شاید سوجائے
تم یوں ہی لہر گنو، دیکھو مت

خوب صورت ہے سر منزل سانپ
روپ کے رنگ سہو، دیکھو مت

تجربہ تو ہے امر بیل سہی
پیار کا زہر چکھو، دیکھو مت

سیب آسیب بدن یا تصویر
سب کو دیکھو تو کہو، دیکھو مت

ذائقہ ایک ہے بس، تانبے کا
ہجر دائم سے ڈرو، دیکھو مت

کچھ نہ کرنے کی تھکن، میں کیا ہے؟
دیکھو اک کام کرو، دیکھو مت

ریگ ساعت ہیں، یہ چلتے ہوئے لوگ
وقت کے ساتھ چلو، دیکھو مت

سخت بے کار جنوں، نرم ہو تم
کسی چکر میں پڑو، دیکھو مت

رائے مت دو کہ اٹل ہے تقدیر
قرض آئندہ بھرو، دیکھو مت

کون آئے گا بچائے گا تمھیں
اپنی سولی پہ چڑھو، دیکھو مت

گھر یہ سارے ہیں دریچوں کے بغیر
اپنی دیوار چنو، دیکھو مت

مجھ سے کہتی ہے یہاں کی ہر چیز
خوش رہو، زندہ رہو، دیکھو مت

دیکھ اور سوچ کا موسم ہے خزاں
کونپلوں سے جو ملو، دیکھو مت

محبوب راہی

شمارہ ۱۵۱،
ستمبر اکتوبر ۱۹۸۸

طوفانی جذبوں کو روک لگانا کس کے بس میں ہے
جھاگ اڑاتا یہ سیلابی دریا کس کے بس میں ہے

جینا کس کے قابو میں ہے مرنا کس کے بس میں ہے
یہ حرافہ، یہ ہرجائی دنیا کس کے بس میں ہے

ہاتھ سبھی کے بندھے ہوئے ہیں اک ان دیکھی ڈوری سے
پہلے کیا کس کے بس میں تھا اب کیا کس کے بس میں ہے

گلشن گلشن ہو شادابی صحرا صحرا سیرابی
کاش ایسا ہو جائے لیکن ایسا کس کے بس میں ہے

ہر انساں اک کٹھ پتلی ہے یارب تیرے ہاتھوں میں
نیکو کاری بدکرداری کب کیا کس کے بس میں ہے

کس کو اتنی فرصت ہے جو غور کرے ان باتوں پر
کون یہاں کتنا بے بس ہے کتنا کس کے بس میں ہے

ڈال رہے ہو تم چنگاری بھس میں لیکن سوچو تو
بہنے والی تیز ہوا کا جھونکا کس کے بس میں ہے

ان حالات میں کیا اک میں ہی بد دل اور رنجیدہ ہوں
راہی بتلاؤ دل آخر کس کا کس کے بس میں ہے

محمد احمد رمز

شمارہ ۹۸،
جنوری تا اپریل ۱۹۷۶

چار سو سیل سپاہ مہ و اختر تیرا
سرحد شب سے گذرتا ہوا لشکر تیرا

بے کراں تو ہی محاکات شب و روز میں ہے
دشت ظلمت ترا رہوار منور تیرا

کرۂ باد پہ صدرنگ مناظر تیرے
حلقۂ ارض میں یک نقش سمندر تیرا

حرف قرطاس جہت گیر ہے تفسیر تری
عکس آئینہ اورنگ ہے جوہر تیرا

دام گرداب میں بپھری ہوئی موجیں تیری
تہ میں پانی کی گراں مایۂ گوہر تیرا

غزل

محمد احمد رمز

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

تیرتا موج ہوا سا آسمانوں میں کہیں
اک پرندہ گم ہوا اونچی اڑانوں میں کہیں

میں حقیقت ہوں کسی کردار میں مجھ کو نہ ڈھال
لوگ دہرائیں نہ مجھ کو داستانوں میں کہیں

رات چپ ہے اکا دکا چپوؤں کے ساز پر
گیت کوئی گونجتا ہے بادبانوں میں کہیں

رات زخمی ہو رہی ہے لمحہ لمحہ میرے ساتھ
پھڑ پھڑاتے ہیں پرندے آشیانوں میں کہیں

فن کی مستی دیکھنا باہر حصار حرف سے
سوچتا بہتا ہے دریا سائبانوں میں کہیں

روندنا گھوڑے کی ٹاپوں سے مرا باقی بدن
اور سر لے جا کے پھینک آنا چٹانوں میں کہیں

لوگ یکجا کر رہے ہیں رمز میری خاک کو
دیکھنا پھر مجھ کو میرے قدر دانوں میں کہیں

غزل

محمد احمد رمز

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶، جنوری ۱۹۸۷

لفظ و بیاں کے پس منظر تک اک قوس امکانی اور
میری جست ہنر کو لکھ دے کوئی سمت معانی اور

بست وکشاد بازو کیا ہے سانسوں کی ہل چل کے سوا
چاند گھرا ہو جب موجوں میں بڑھتی ہے طغیانی اور

سحر سواد بحر و بر سے کتنے طوفاں ابھرتے ہیں
اب اس شورش آب و گل کو مٹی اور نہ پانی اور

دشت نوا پر چھا جائے گا اس کے بعد اک لمبا سکوت
میں چوتھا درویش ہوں مجھ سے سن لو ایک کہانی اور

میں ہوں غزال مشک گزیدہ میرا سفر ہے تیر کے ساتھ
جب ہوتی ہے تیز یہ خوشبو بڑھتی ہے جولانی اور

عمر کے غرب سیہ میں کیسا ڈوب رہا ہے مہر شباب
دیکھ سکو تو دیکھ لو دم بھر رمز یہ شام سہانی اور

محمد احمد رمز

شمارہ۱۹۹
اکتوبر۱۹۹۶

نواحِ دل میں یہ میری مثال جلتے رہیں
خس و گلاب نبات و نہال جلتے رہیں
کبھی نہ سرد پڑے گرمی نشاط نفس
تمام پیکر فکر و خیال جلتے رہیں
یہ جبر وقت ہے کیسا کہ اس کی یاد کے چاند
اگیں تو پھر سر شاخ ملال جلتے رہیں
ہوائے ہجر ابھی تک ہے محو خواب کہیں
فصیل جاں پہ چراغ وصال جلتے رہیں
یونہی روایت تیر و کماں رہے روشن
نقوش وحشت پائے غزال جلتے رہیں
لگے تو قصر شب و روز میں بھی آگ لگے
جلیں تو صدیوں تلک ماہ و سال جلتے رہیں
ہم اس کی راہ میں روشن کئے گئے ہیں سو رمز
کریں نہ اس سے کوئی عرض حال جلتے رہیں

بھٹک جائے گا دل عیاری ادراک سے نکلیں
یہ زنجیر گراں توڑیں ہم اس پیچاک سے نکلیں
نہ موت آئے جسے ایسا کوئی کردار ہو اپنا
کہانی بن کے ایسی دیدۂ نمناک سے نکلیں
یہی پرچم نشان لشکر باطل نہ بن جائے
ہم اک خنجر سہی لیکن کف سفاک سے نکلیں
صبا بن کر ابھی کرنے ہیں طے کتنے سفر ہم کو
ہم اس مٹی کی خوشبو ہیں طلسم چاک سے نکلیں
ہماری ہمرہی تک ہیں ستارے ہوں کہ گل بوٹے
زمیں پر یہ اگیں یا پردۂ افلاک سے نکلیں
سر صحرا ابھی رقص غبار قیس باقی ہے
ابھی کچھ اور لیلائیں حریم خاک سے نکلیں
جناب رمز بے مصرف رفاقت کا جنوں کب تک
سواد گل میں آپ آئیں خس و خاشاک سے نکلیں

محمد اظہار الحق

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

کسی تاریک گوشے میں بسر ہوگی ہماری
محل میں تجھ کو پل پل کی خبر ہوگی ہماری

عجب اک سحر ہوگا جان دینی بے بسی میں
فرشتوں کی تسلی چارہ گر ہوگی ہماری

شعاعوں کی سواری نور کی رفتار ہوگی
مگر اک خاک زادی ہم سفر ہوگی ہماری

جہانوں کے سفر ہیں اور ستاروں سے سند ہے
غزل میں ہر روایت معتبر ہوگی ہماری

چھپے ہوں گے زمیں تا آسماں اس میں طلسمات
بظاہر گو حکایت مختصر ہوگی ہماری

شمارہ ۱۳۸،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵

وجود پر انحصار میں نے نہیں کیا تھا
کہ خاک کا اعتبار میں نے نہیں کیا تھا

سفید ریشم کی اوڑھنی میرے ہاتھ میں تھی
مگر اسے داغ دار میں نے نہیں کیا تھا

یہ بے نیازی کی خو مرے حسن میں بہت تھی
مگر اسے بے قرار میں نے نہیں کیا تھا

ملا تھا حور جبیں میں لئے مرا کاسۂ سر
مگر اسے شرمسار میں نے نہیں کیا تھا

کہیں سے یک لخت زندگی میری کاٹ دے گا
جو راستہ اختیار میں نے نہیں کیا تھا

سموں تلے روند دے خوشی سے مگر یہ سن لے
گناہ اے شہسوار میں نے نہیں کیا تھا

دکھائی دینے لگا وہ اک تیسرا کنارہ
ابھی جوانی کو پار میں نے نہیں کیا تھا

غروب کا وقت تھا مقرر سو چل پڑا میں
کسی کا پھر انتظار میں نے نہیں کیا تھا

محمد اظہار الحق

شمارہ ۱۴۸،
دسمبر ۱۹۸۷ تا فروری ۱۹۸۸

مسئلہ یہ نہیں کہ
بال خشک ہیں یا بھیگے ہوئے
بریدہ ہیں یا لمبے
رخسار تمتمار ہے ہیں یا نہیں
مسئلہ یہ ہے کہ تحریر نظر آرہی ہے یا نہیں

اترے ہوئے کبوتر اڑانے سے پیشتر
اس کے پنجوں سے بندھا ہوا کاغذ کھول لینا
سرما اتر چکا ہے اور خشک گوشت کا ذخیرہ
کر لیا گیا ہے
تہ خانے میں بند ہونے سے پیشتر
آخری مرتبہ میری راہ دیکھنا
اور اگر گھوڑا میرے بغیر واپس آجائے
تو خورجین اور زین اتار لینا
اور اگر برف سے اٹا ہوا کوئی مسافر
خالی بستی میں آواز لگائے
تو اسے تہ خانے میں پناہ دے دینا
آخر تم فرشتہ نہیں ہو
عورت ہو

شمارہ ۲۱۲،
دسمبر ۱۹۹۷

پیاز لگانے سے
سانپ کا زہر اثر نہیں کرتا
لیکن شرط یہ ہے
کہ سانپ نے ایڑی پر نہ کاٹا ہو
اور سانپ چھوٹا نہ ہو

مجھے سانپ نے ایڑی پر نہیں کاٹا تھا
اس نے میرے لہو میں کاٹا تھا
مجھے کاٹنے والا سانپ چھوٹا بھی نہ تھا
میں مسلسل پیاز لگا رہا ہوں
صحت مند گول پیاز
جنہیں میں ایک ایک کر کے
چارپائی کے پائے پر رکھ کر
مکے کی ضرب سے توڑتا جا رہا ہوں
سفید براق ٹکڑے
سوکھی روٹی
اور مدقوق گائے کے دودھ سے بنی ہوئی لسی
تیز کڑوے پیاز کھاتے صدیاں بیت گئی ہیں
ہونٹوں سے تالو تک کا علاقہ
زخموں کی سڑاند بن چکا ہے
لیکن زہر ہے کہ جاتا نہیں

محمد اظہار الحق

شمارہ ۲۱۲
دسمبر ۱۹۹۷

بیر بہوٹیاں
(جن پر میں نے کبھی پاؤں نہ رکھے تھے)
آہستہ خرام سفید کیڑیاں
(جو کچلے جانے کے بعد زرد مرہم کی
شکل اختیار کر لیتی تھیں)

چیونٹے
(جن کی ٹانگیں لمبی ہوتی تھیں اور جو کڑی دوپہروں کو
بھی سوتے نہ تھے)
عورتیں
(جو سروں پر سفید پٹیاں اور کمر کے ساتھ کالے پٹکے
باندھ کر بین کرتی تھیں)
مرد
(جو راتوں کو چراغوں کی روشنی میں رقص کرتے تھے)

شمارہ ۲۳۵،
مارچ ۲۰۰۰

یہ اشک جو خاک پر گرے ہیں
ہم آگ کے بیج بو گئے ہیں

اتنی ارزاں نہیں ہے شہرت
عزت نیلام کر رہے ہیں

ہے رات گھنی تو راستہ ہم
رخسار کی لو سے دیکھتے ہیں

پلٹیں گے شام کو ستارے
مزدور ہیں صبح کے گئے ہیں

روشن دن تو گذر گئے ہیں
اب عمر ہے اور جھٹپٹے ہیں

کہ ٹیک لگاتے ہیں عصا پر
پتے بھی اس سے جھاڑتے ہیں

ہم سے ہوگا خدا مخاطب
ہم ڈول کنویں سے کھینچتے ہیں

سوتے بھی ہیں فرش خاک پر ہم
اور مملکتیں بھی بانٹتے ہیں

نقشے پہ جھکے ہوئے ہیں اظہار
رے اور ختن کو ڈھونڈتے ہیں

محمد اظہار الحق

شمارہ ۲۷۳،
اکتوبر ۲۰۰۳

پھر گرد نے لی ہے انگڑائی کوئی آئے گا
پھر دل پر جیسے دھمک پڑی کوئی آئے گا

کوئی آئے گا بادل کی شکل بتاتی ہے
کہتی ہے پرندے کی بولی کوئی آئے گا

کوئی رخصت ہوگا گہری شام کی بارش میں
پھر صبح سے جھانکے گی تتلی کوئی آئے گا

کوئی آئے گا اور سب کچھ بدل کے رکھ دے گا
یہ خلقت بھی ، یہ سورج بھی، کوئی آئے گا

کوئی آئے گا اور غربت اطلس پہنے گی
بیچارگی کرنیں اوڑھے گی کوئی آئے گا

جو مٹی پاؤں کے نیچے آتی رہتی ہے
کبھی ہوگی اس کی داد رسی کوئی آئے گا

جو کہیں نہیں وہ آوازیں بھی سنتا ہوں
مجھے دور سے ہے یہ خبر آئی کوئی آئے گا

مجھے دی ہے سنو ترمذ کی خاک نے خوش خبری
مجھے مرو سے کہتی ہے مٹی کوئی آئے گا

مجھے خوشبو آئی ہے انجیر کے پکنے کی
مجھے روکے گیہوں کی مستی کوئی آئے گا

مرے چشمے کا ہے شور عجب کچھ سمجھو تو
مرے شیشم کی ہے چھاؤں نئی کوئی آئے گا

مرے کیکر لد گئے سونے جیسے پھولوں سے
مرے سپنوں میں سرسوں پھولی کوئی آئے گا

مری چھت سے بیل انگور کی اٹھ اٹھ دیکھتی ہے
مرے توت پہ بیٹھی ہے قمری کوئی آئے گا

مرے شہد کا چھتہ چھلک رہا ہے پھلاہی پر
مرا دودھ امانت مہماں کی کوئی آئے گا

مرے رخساروں پر پھول کھلائے ان دیکھے
مرے ہونٹوں کو دی شیرینی کوئی آئے گا

مری نیندیں قرض کی ہیں واپس ہو جائیں گی
مرے خواب مسافر کی پونجی کوئی آئے گا

مری آنکھیں مند مند جاتی ہیں کوئی بات تو ہے
مرے خون میں کیوں ہے لرزش سی کوئی آئے گا

مرے جگنو گھاس اور شبنم استقبال کریں
مری مٹی یوں ہی نہیں بکھری کوئی آئے گا

مری خوشیوں کا کیا پوچھتے ہو تم دیکھو گے
مری آنکھوں پر اس کی ایڑی کوئی آئے گا

ہر سمت سے وقت رواں ہے میری ہی جانب
دیکھو تو یہ پیغامبری کوئی آئے گا

کہیں دور سے اڑ کر اک غالیچہ آتا ہے
یا شہزادہ یا لال پری کوئی آئے گا

یہ فرغل آنکھیں کات کے میں نے بنایا ہے
پھر اس پر ٹانکی اپنی ہنسی کوئی آئے گا

محمد اعظم

شمارہ ۱۳۹،
مارچ تا مئی ۱۹۸۸

وہی مدار تمنا وہی ستارۂ دل
فریب خوردۂ ماضی و حال و مستقبل

طلسم خانۂ حسرت میں گردشیں کب تک
وہ اسم دے کہ ہو آسیب جستجو باطل

دل کشادہ میں ہو میرے انجمن آرا
عدو بہ رنگ کدورت جہاں نہ ہو داخل

ہزار شعلہ لپکتی ہے آرزو اب بھی
مرے لہو سے چراغاں ہے کوچۂ قاتل

زمیں پہ دل کی لہو کے درخت ہیں گویا
یہ شعر ہوتے نہیں آسمان سے نازل

شمارہ ۲۴۰،
اگست ستمبر ۲۰۰۰

بڑا کریم ہے بخشے تو کیا نہ دے مجھ کو
مگر یہ تو کہ جو مانگوں خدا نہ دے مجھ کو

ہر ایک کوچہ تعلق ہے نافزا جس کا
یہی بھلا ہے کہ وہ راستہ نہ دے مجھ کو

پڑا جو پھول تو کیا ہے یہ تودۂ بارود
وہ ایک بوسۂ لب سے اڑا نہ دے مجھ کو

بہت وسیع تری سلطنت ہے تب جانوں
جو دشت ہجر سے آگے ٹھکانا دے مجھ کو

ادھر یہ خواب کہ کرتا ہوں انتظار اس کا
ادھر خیال کہ آ کر جگا نہ دے مجھ کو

نثار اس پہ ہوئیں زندگی کی سب سانسیں
جو یک نفس دم آخر ہوا نہ دے مجھ کو

میں جا رہا ہوں وہ پوچھے اگر تو کہہ دینا
مرا جو حق ہے وہ اب غائبانہ دے مجھ کو

اردو ادب کی روایت، چند تصریحات

محمد حسن عسکری

شمارہ ۳۵،
اپریل ۱۹۷۶

دسمبر کا شمارہ ملا۔ مراسلات کا باب دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اردو کی ادبی روایت کے متعلق آپ نے میرا جو مضمون شائع کیا تھا اس سے آپ کے قارئین نے ذہن میں مسئلہ پر غور کرنے کی تحریک پیدا ہوئی اور انھوں نے چند باتوں کی تصریح کا مطالبہ کیا۔ ان خطوط کے علاوہ بھی تحریری یا تقریری طور پر بعض استفسارات اور اعتراضات میرے پاس پہنچے۔ جن حضرات کو میرا مضمون پڑھ کر بے کیفی ہوئی ان سے تو کوئی تعرض نہیں۔ ہر شخص کو اپنی قسم کا کیف ڈھونڈنے کا حق ہے اور یہ کیف جہاں بھی ملتا ہو وہاں سے حاصل کرنے کا بھی حق ہے۔ بہر حال، جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے آج تک کوئی مضمون کیف پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھا۔

اسی طرح، جن حضرات کو میری معروضات قبول نہیں ان سے بھی تعرض نہیں اور نہ شکایت ہے۔ بفرض محال اعتراضات رفع کرنے کے لئے میں کسی بات کے تفصیلی دلائل پیش بھی کر دوں تو ان دلائل کے دلائل کا مطالبہ ہوگا۔ یہ سلسلہ تو لامتناہی ہے۔ ادبی مناظرے بازی کا نہ تو مجھے شوق ہے نہ اتنی مہلت ہے۔ آپ نے مجھ سے مضمون مانگا تھا۔ میں نے الٰہ آباد کی محبت سے مجبور ہو کر حاضر کر دیا اور امید یہ تھی اور اب بھی ہے کہ آپ کے قارئین ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھتے ہیں، ادبی مسائل پر غور کرتے ہیں، اور مغرب کے پرانے ادب سے نہ سہی تو جدید ادب سے اتنی واقفیت رکھتے ہیں کہ انھیں موجودہ مسائل کی نوعیت کا اندازہ ہو۔ آپ نے جو مراسلات شائع کئے ہیں ان سے پتہ چلا کہ فی الجملہ میری امید غلط نہ تھی۔ آپ کے قارئین نے میری معروضات پر غور بھی کیا ہے اور ان کے ذہن میں نئے سوال بھی پیدا ہوئے ہیں۔ آج میرا روئے سخن انھیں حضرات کی طرف ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام لکھوانے کی مجھے کوئی پریشانی نہیں، اس لئے اعتراضات کا جواب دینا بھی میں ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ میرے بیان میں کوئی بحث تشنہ رہ جائے یا کہیں تصریح کی ضرورت ہو، یا میرے بیان سے کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہو، یا کہیں مجھ سے کوئی غلط بیانی ہوئی ہو اور کوئی صاحب اصلاح کرنا چاہتے ہوں، تو حالاں کہ ادبی مباحث میں پڑنے کی مجھے فرصت نہیں مگر میں ایسے حضرات کی خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ خدمت کرنے کا فقرہ بھی میں نے زعم باطل کی بنا پر استعمال نہیں کیا۔ آپ کے قارئین مجھ سے زیادہ فہم بھی رکھتے ہوں گے اور علم بھی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں میری عمر مستفسر سے کچھ زیادہ ہو اور محض اتنے سے فرق کی بنا پر صرف تعداد کے لحاظ سے چند کتابیں میری نظر سے زیادہ گذر گئی ہوں جنھیں سمجھنے کا بھی میں دعویٰ نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں، آپ کے قارئین زیادہ تر نوجوان ہیں۔ ان کی نظر بھی وسیع ہوگی اور عزائم بھی بلند ہوں گے۔ میری دلچسپیاں محدود ہیں اور عزائم بھی چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔ اردو ہو یا انگریزی میں تو ابھی تک معمولی معمولی لفظوں کے معنی ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ مثلاً کئی سال سے میں اسی تلاش میں ہوں کہ یہ جو مشہور ہے کہ "میر کا کلام آہ ہے اور سودا کا کلام واہ" تو اس فقرے میں لفظ "آہ" کے کیا معنی ہیں؟ ابھی کل ہی اتفاق سے ایک کتاب میں دیکھا کہ یہ بھی صوفیہ کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد رنج و غم اور یاس نہیں بلکہ علامت کمال عشق و درد کہ زبان جس کے بیان سے قاصر ہو۔ غرض اس قسم کی چھوٹی چھوٹی معلومات ہیں جو شاید میں کبھی کبھی فراہم کر سکوں اور کبھی آپ کے قارئین سے بھی درخواست کروں کہ معلومات حاصل کرنے میں میری مدد کریں۔ مثلاً یہیں دو لفظ آئے ہیں "عشق" اور "درد"۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا مترادفات ہیں؟ یہ سوال اتنا اہم ہے کہ دارا شکوہ ہر بزرگ کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ ایک جواب جو اتفاق سے مجھے ملا ہے وہ کسی اور موقع پر حاضر کروں گا۔

آپ کے باب مراسلات میں ایک صاحب نے ایک نہایت ہی جائز اور ضروری سوال اٹھایا ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں اردو ادب کی روایت کا جو تصور پیش کیا ہے اگر اس کی پاس داری ہونے لگی تو ذوق ادب کا کیا ہوگا؟ چونکہ یہاں مناقشہ نہیں ہو رہا بلکہ آپس کی گفتگو ہو رہی ہے اس لئے میں بے تکلفی برتوں گا۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ آپ کے بیش تر نوجوان قارئین کو اللہ تعالیٰ نے اس تجربے سے محفوظ رکھا جس سے میں گذرا ہوں۔ یعنی میں نے فرانس کے چار سو جدید شاعروں کا کلام مسلسل اس طرح پڑھا ہے کہ پہلے ہر شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے نزدیک شاعری کیا ہے پھر اپنی نظمیں پیش کرتا ہے۔ اگر کوئی صاحب ذوق ادب کی تحقیق کرنی چاہتے ہوں تو اس طرح سو شاعروں کا کلام پڑھ کے دیکھ لیں۔ اب دوسرا جواب سنئے۔ ذوق ادب کی اہمیت مجھے پوری طرح تسلیم ہے۔ لیکن ذوق بھی مختلف نوعیتوں کا ہوتا ہے اور ہر نوعیت اپنی جگہ جائز ہوتی ہے۔ مثلاً لال بجھکو کا

مشہور مقولہ ہے کہ یا تو ہاتھی ہے یا امرود۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس مقولے میں جو مزا ہے وہ ہاتھی کو ہاتھی اور امرود کو امرود کہنے میں نہیں۔ لیکن اگر کوئی دعویٰ کرے کہ میں اپنے اشعار میں تصوف کے مضامین باندھتا ہوں تو ادبی ذوق کی تسکین ڈھونڈنے سے پہلے یہ دیکھنا لازمی ہوگا کہ مضمون بھی ٹھیک طور سے ادا ہوا ہے یا نہیں۔ خصوصاً جب بحث اردو ادب کی بنیادی روایت سے ہو رہی ہو تو سب سے پہلا کام یہ دیکھنا ہے کہ شعروں کا مطلب کیا ہے؟ کون شاعر کس درجے کا ہے، یہ بات تو بعد کی ہے۔ پہلے اصول سے بحث ہونی چاہئے پھر فروع سے۔

میرے مضمون میں غالب کا نام اور ان کے اشعار اس لئے آگئے تھے کہ ان کا کلام ہمارے لئے ایک پردہ بن گیا ہے جو روایت کو دیکھنے نہیں دیتا۔ حالی نے ان کے فارسی اشعار کی جو شرح کی ہے وہ سونے پر سہاگہ ہے۔ اس لئے میری گذارش ہے کہ اگر روایت کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے غالب کو بھی بھول جایئے اور شبلی و حالی کی تنقید کو بھی بھول جایئے۔ کسی شاعر کا درجہ متعین کرنے میں جلدی کی ضرورت نہیں۔

اب تیسرا جواب لیجئے۔ ذوق ادب کی اہمیت میں نے کسی وقت بھی فراموش نہیں کی۔ پچھلے چار پانچ سال سے عرصے میں میں نے داغ، امیر مینائی، ذوق وغیرہ کئی اردو شاعروں کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے، جن کے میں نے تین درجے قائم کئے ہیں۔ پہلے تو وہ اشعار ہیں جن میں تصوف کا کوئی بلند مضمون پوری صحت کے ساتھ بیان ہوا اور شعری اعتبار سے بھی بلند پایہ اشعار ہیں۔ دوسرے وہ اشعار ہیں جن میں تصوف کا مضمون تو صحت اور خوبی کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر شعر دوسرے درجے کا رہ گیا۔ تیسرے وہ اشعار ہیں جن میں تصوف کا مضمون تو ٹھیک بیان ہوا ہے مگر شعر نہیں ہوا۔ جن دوستوں کے علم اور ذوق پر مجھے بھروسا ہے انھیں یہ انتخاب میں چار پانچ سال سے بار بار سنا رہا ہوں اور ان کے مشورے سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ اپنا انتخاب شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور فی الحقیقت شائع کرنا ضروری بھی نہیں۔ جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کی شرح دیوان حافظ اور شرح مثنوی رومی کے ضروری حصے پڑھ لیں اور پھر اردو شاعروں کے کلام سے اپنا انتخاب خود تیار کر لیں۔ غرض، کوئی رائے ظاہر کرنے سے پہلے تجرباتی طریقۂ کار اختیار کرنا اگر ایسا ہی لازمی ہے تو یہی طریقۂ کار میں دس سال سے برت رہا ہوں۔

حضرت مولانا تھانوی کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اس کی بنیاد بھی یہی ہے۔ اگر میں حضرت کو ادبی نقاد کہوں تو یہ ان کی شان میں گستاخی ہوگی۔ مگر ان کا کمال یہ ہے کہ شعر و ادب کی تعلیم بھی ان کی کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ رائے ظاہر کرنے سے پہلے میں نے سو صفحے کے اقتباسات ان کی چند کتابوں سے نقل کر کے تیار کر لئے تھے۔ یہ اقتباس بھی تین طرح کے ہیں۔ پہلے تو وہ رائیں ہیں جو حضرت نے براہ راست کسی شاعر یا شعر کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ دوسرے وہ بیانات ہیں جن سے کسی ایسے مضمون کی تشریح ہوتی ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں بار بار آتا ہے۔ تیسرے وہ بیانات ہیں جن کا بظاہر تو ادب سے کوئی تعلق نہیں مگر جن سے ادبی اصولوں کا استخراج ہو سکتا ہے۔ یہ انتخاب تیار کرنے میں بھی میں نے تجرباتی طریقۂ کار سے کام لیا ہے اور ہر اقتباس دوسرے صاحبان کے سامنے رکھ کر ان سے درخواست کی ہے کہ اس بیان سے ادبی اصول نکالیں۔ خیال ہوا تھا کہ اس انتخاب کی اشاعت دار العلوم کراچی کے ماہنامہ ''البلاغ'' میں بالاقساط شروع کر دی جائے اور اس صورت میں میرا زیر بحث مضمون دیباچے کا کام دیتا۔ مگر ارادہ یہ ہے کہ ہر اقتباس کے ساتھ وہ ادبی اصول بھی دیئے جائیں جن کا استخراج ہو سکتا ہے اور اس کے مقابلے میں مغربی نقادوں کی رائیں بھی رکھی جائیں۔ یہ کام چونکہ وقت چاہتا ہے اس لئے ابھی تک شروع نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں مولانا تھانوی کی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ہزار کے قریب ہے۔ ان کا سرسری جائزہ بھی چار چھ مہینے میں نہیں لیا جا سکتا۔ خیر اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق حاصل ہوئی تو یہ مجموعہ دو ایک سال میں مرتب ہو جائے گا۔ یہ قصہ سنانے کی بھی ضرورت نہ تھی مگر مقصد یہ دکھانا تھا کہ میں نے مولانا تھانوی کے بارے میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ گپ شپ کی قبیل سے نہ تھا۔ اب یہ بات از سر نو دہراتا ہوں کہ مولانا تھانوی کو ادبی نقادوں کی صف میں رکھنا بے تمیزی ہے مگر ان کی تحریروں سے براہ راست بھی اور استخراجی طریقے سے بھی ادب کے بارے میں بہت کچھ ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد ایک بات اور عرض کروں گا۔ مضمون میں تو میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ مولانا تھانوی کی کتابوں سے اردو اور فارسی ادب کے بارے میں ہدایت مل سکتی ہے۔ اب ترقی کر کے یہ دعویٰ کروں گا کہ مغربی ادب کو سمجھنا ہو تو بھی ان کی کتابوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہ بات بہت سے حضرات کو گراں گذرے گی لیکن میں ابھی مثال دے کر واضح کئے دیتا ہوں۔ مگر پہلے مغربی ادب کے متعلق چند گذارشات سن لیجئے اور اگر ضمناً چند مصنفوں یا کتابوں کے نام آجائیں تو شکایت نہ کیجئے گا کہ غیر مانوس ناموں سے رعب ڈالتے ہیں کیوں کہ دلیل اور ثبوت کا مطالبہ بھی قارئین ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

یورپ اپنی دینی روایت سے ایسا بیگانہ ہوا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفے اور ادب کو سمجھنا ان کے لئے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے اور وہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے ادب، یہاں تک کہ چوسر (Chaucer) اور شیکسپیر کے یہاں ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا مغرب کے نقاد کوئی معقول حل نہیں ڈھونڈ سکتے۔ شاید ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتے۔ ہم لوگ انھیں عقل و حکمت کا پتلا سمجھا کریں مگر میرے پاس پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر کا مطبوعہ بیان موجود ہے کہ ٹامس اکوائناس (Thomas Aquinas) کی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنا کاغذ کا بے جا استعمال ہے۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن کتابوں کی مدد سے مغرب کی فکری اور ادبی روایت کو (دراصل یوں کہنا چاہئے کہ روایتی فکر و ادب کو) سمجھا جا سکتا ہے وہ نظروں سے پوشیدہ ہیں، مثلاً رچرڈ سیں وکتور Richard St. Victor کی چند کلیدی تصنیفات۔ ایک اور قریب کی مثال لیجئے۔ بیسویں صدی میں ایک فرانسیسی نے عیسوی علامتوں اور رموز کا صحیح مطلب دریافت کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ مر گیا اور اس کی بیشتر کتابوں کو ناشر نہیں مل سکا۔ ان حالات میں مغرب کے روایتی ادب پر تسلی بخش تنقید ہو تو کیسے ہو؟

البتہ بعض لوگوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ یورپ کے روایتی ادب اور تہذیبی مظاہر، بلکہ خود عیسائیت کے باطنی پہلو کو سمجھنے کے لئے ویدانت یا اسلام سے مدد لی جائے۔ اس معاملے میں اسلام اور خصوصاً تصوف زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے کیوں کہ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ نے اسلام کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مثلاً رچرڈ سیں دکتوری کی بعض کتابیں ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ تصوف کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔ (اس مفکر کی ایک تحریر کا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ میں نے اپنے چند دوستوں کی خاطر کیا ہے۔ اصل لاطینی میں ہے۔) تصوف کی مدد سے عیسائیت اور عیسوی تہذیب کا مطالعہ کرنے کا رجحان فرانس میں زیادہ ملتا ہے اور سنا ہے کہ اب مشرقی یورپ کے ممالک میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ [عیسائیت کے سلسلے میں کلیدی مضمون جناب مشیل والساں (Michel V'alsan) نے فرانسیسی میں لکھا ہے۔ میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ کر چکا ہوں۔] جہاں تک مغرب کی روایتی تہذیب اور ادب کا تعلق ہے سب سے معرکہ آرا کتاب پیئر پوں سوا Pierre Ponsoye کی L' Islam et le Graal۔ بادشاہ آرتھر اور اس کے بارہ سرداروں کے قصے کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یورپ کی روایتی تہذیب کو سمجھنے کا اب ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے کہ اس کا مطالعہ اسلامی تصوف کی روشنی میں کیا جائے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے ادب میں ایک بہت بڑا اور پیچیدہ مسئلہ بارھویں صدی کی شاعری کا ہے جو پرووانس (Provence) کے علاقے میں نمودار ہوئی اور جس نے یورپ کو "رومانی محبت" کا تصور دیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محبت جسمانی ہے یا روحانی، یا دونوں کا مجموعہ؟ اگر روحانی ہے تو پھر عیسائیت سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیئے گئے ہیں اور بحث میں عربی شاعری کا ذکر بارہا آیا ہے۔ لیکن ۱۹۶۵ میں ایک کتاب انگریزی میں ہی شائع ہوئی ہے Latin and European Love-Lyric Mediaval مصنف ہیں، Peter Drouke ۔ اس کتاب میں عربی اور فارسی شاعری کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے متعلق ایک بحث میں نے پڑھی ہے، جس میں نقاد کو سب سے مشکل مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ انسانی محبت خدا کی محبت میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے؟

یہ تو تھی تمہید۔ اب واپس آیئے میرے اس دعوے کی طرف کہ مغربی ادب کو سمجھنے میں بھی مولانا تھانوی کی کتابوں سے مدد ملتی ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے تعلق پر تصوف کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن مولانا تھانوی نے ایک نہایت ہی آسان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے۔ حضرت نے پہلے تو یہ وضاحت کر دی ہے کہ ایک زمانے میں عشق مجازی کو بھی سلوک میں ایک طریقے کے طور پر اختیار کیا گیا ہے، مگر آج طبیعتوں میں حرام سے بچنے کی فکر اور تقویٰ نہیں رہا اس لئے یہ طریقہ بھی اب متروک ہے۔ اس کے بعد تصریح فرمائی ہے کہ نفس کے رذائل اور خصوصاً کبر کو جو سب رذائل کی جڑ ہے دور کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دور کیا جائے۔ مگر اس کے لئے طویل عرصہ درکار ہے اور اکثر تو سرے سے کامیابی ہی نہیں ہوتی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چند لازمی شرائط اور پابندیوں کے ساتھ عشق مجازی ہو جس کے ذریعے کبر اور دوسرے رذائل ایک ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے، کہ قلب کی توجہ مخلوق سے ہٹا کر حق کی طرف پھیر دی جائے۔ اس طرح سلوک آسان ہو جاتا ہے اور فنا حاصل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ غرض مغربی ادب کے بھی اس طرح کے بیسیوں مسائل ہیں جو مولانا تھانوی کی کتابوں سے حل ہوسکتے ہیں۔

اچھا اب دعویٰ کرنے کا نمبر آیا ہے تو ایک دعویٰ اور کرتا چلوں۔ مضمون میں تو میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ارسطو کا نظریۂ شعر ہمارے ادب کے لئے زیادہ کارآمد نہیں، لیکن اب یہاں بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مغرب میں بھی اعلیٰ پائے کا ایسا ادب موجود ہے جہاں ارسطو کا نظریہ کام نہیں دیتا۔ یہ وہی پرووانس کی زبان (Provencale) کی شاعری ہے جس کا ذکر اوپر آیا۔ اب آپ شہادت اور دلیل مانگیں گے۔ چلئے یہاں بھی آپ کی خدمت کروں گا۔ لیکن پہلے ان ملاؤں کا شکریہ ادا کیجئے جنھیں آپ علم کا دشمن کہتے ہیں۔ سات آٹھ سال ہوئے میں نے اس زبان میں کچھ شدبد پیدا کی تھی، لیکن خیال آیا کہ ہمارے ادیبوں کو ایسی باتوں سے کب دلچسپی ہے، تو میں بھی اسے چھوڑ کر ضروری کاموں میں لگ گیا۔ مگر جب ان مشہور زمانہ علم کے دشمنوں سے ذکر آیا کہ یورپ میں بھی ایسی شاعری ہوئی ہے جو بالکل اردو اور فارسی شاعری معلوم ہوتی ہے تو مطالبہ ہوا کہ اردو میں ترجمہ کراؤ۔ میں نے دو مہینے تک توقف کیا کہ شاید تکلفاً کہتے ہوں۔ لیکن جب تقاضے ہونے لگے تو میں نے سلیم احمد صاحب کو پکڑا۔ سلیم احمد بھی ہمارے کراچی کے مقامی محاورے کے مطابق زبردست ٹیڈی ہیں۔ خیر کچھ نیک گھڑی میں تھے جو مان گئے۔ بیس دن میں انھوں نے بارھویں صدی کے ابتدائی زمانے کے شاعر برنارد واں تادور Bernard de Ventadour کے ایک نغمے کا ترجمہ فرانسیسی کے نثری ترجمے کی مدد سے تیار کر لیا ہے۔ کچھ اور ترجمے ہو جائیں تو یہ ماہ نامہ "البلاغ" میں شائع ہوں گے۔ مگر اس نظم کے آخری دو بند آپ بھی سن لیجئے جن میں ان شاعروں کا نظریۂ شعر آ گیا ہے:

فطری یہ میرا نغمہ ہے، اس کی سرشت ہے وفا
ملتی ہے آبرو سنے غور سے جو نوا مری
اس سے بھی ہے بلند بات، ہو جو طلب نشاط کی
سنتا ہے خود ہی بار بار کرتا ہے خود نوا گری
شاعر و نغمہ ساز بھی حسرتی نشاط بھی

یہاں پہلے مصرع میں شاعر نے اپنے نغمے کو fis اور naturans کہا ہے۔ فرانسیسی مترجم نے ان دو لفظوں کو "با وفا اور پر خلوص" کہہ کے ٹال دیا ہے مگر یہاں "فطری" نہ تو عام قسم کی جذباتیت کی نمائندگی کرتا ہے، نہ اپنے مولانا حالی والا "نیچرل" ہے۔ یہ "فطرت" ٹھیٹ اصطلاحی لفظ ہے اور اس سے مراد کسی چیز کا انتہائی درجۂ کمال ہے۔ شاعر کا نغمہ ارسطو کے معنوں میں فطرت کی نقل نہیں کرتا، بلکہ مخصوص اصطلاحی معنوں میں "فطرت" کی مطابقت اور اس سے وفاداری کرتا

ہے۔ نظم کے پہلے بند میں شاعر بتاتا ہے کہ سچا شعر وہ ہے جو "دل" سے نکلے اور "دل" سے اس وقت نکلتا ہے جب "نشاطِ عشق" موجود ہو اور دل و دماغ زبان آنکھوں سب پر حاوی ہو۔ یہاں دل نشاط اور عشق کے تقریباً وہی معنی ہیں جو ہمارے صوفیہ کے یہاں رائج ہیں۔ میں نے جو دو بند نقل کئے ہیں ان کی دوسری سطر میں شاعر بتاتا ہے کہ جو لوگ یہ نغمہ "ٹھیک طرح" سے سنیں گے ان کو کیا ملے گا۔ یہاں بھی ارسطو والے تزکیہ (Katharsis) کا ذکر نہیں آیا۔ سننے والوں کو کسی قسم کی عزت اور آبرو ملے گی۔ وہ بھی ہر سننے والے کو نہیں، بلکہ ٹھیک طرح سے سننے والوں کو۔ پھر ایک درجہ اس سے بھی بلند تر ہے۔ یہ درجہ ملنا ضروری نہیں بلکہ اس کی طلب اور حسرت رکھنا بھی ایک خاص امتیاز ہے جس میں سننے والا اور شاعر دونوں برابر ہیں۔ ایک "نشاط" تو نظم کے شروع میں آیا تھا اور نظم کے آخر میں ایک دوسرے "نشاط" کی طرف اشارہ ہے۔ ازراہِ عنایت ان الفاظ کی جمالیاتی تشریح نہ کیجئے؛ کیوں کہ یہ اصطلاحیں Hermetic Philosophy سے لی گئی ہیں۔ اس نشاط کو سمجھنے کے لئے صوفیہ کی اصطلاح "جاذبہ" یا "جذبہ" یاد رکھئے جس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا۔ یہ رحمت خاص ہے۔ اسے کوشش سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بس، امید باندھی جا سکتی ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ارسطو کا نظریہ نقل (Imitation) اور اس کی جو تعبیریں عام طور سے مغرب میں کی گئی ہیں ان کا اطلاق یہاں کتنا مشکل ہے۔ لیکن اگر اس لفظ "نقل" سے آپ کو خاص محبت ہے تو اسے بھی رکھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر اس کی تشریح Hermetism کے اعتبار سے کرنی پڑے گی اور ارسطو کے فلسفے سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے اس فلسفے سے آپ کو دلچسپی ہو تو سوئٹزرلینڈ کے مصنف ٹائٹس بورکہارٹ (Titus Burckhardt) کی کتابیں دیکھ لیجئے۔

کہتے ہیں کہ یونانیوں کے باطنی رموز کا علم ارسطو کے زمانے تک مردہ ہو چکا تھا اور وہ ان سے واقف نہ تھا۔ بس چند الفاظ کان میں پڑ گئے تھے، اور وہ اس نے دہرا دیئے ہیں۔ انھیں میں سے یہ لفظ "نقل" ہے۔ یہ میں نے دوسروں کی کہی ہوئی بات دہرائی ہے۔ وہ قصہ نہ کیجئے گا جیسے ایک صاحب نے کہیں لکھ دیا ہے کہ میں رینے گینوں (Rene Guenon) کی کتابوں کو ایٹم بم کے برابر رکھتا ہوں۔ حالانکہ اگر یہ کوئی جرم ہے تو آندرے برتوں (Andre Breton) سے سرزد ہوا ہے۔ میں نے تو اپنے مضمون میں اس کا صرف حوالہ دیا تھا۔

اب چند اور سوالوں کے مختصر جواب عرض کردوں جو میرے مضمون کے سلسلے میں اٹھائے گئے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ نے یونانی فلسفیوں کو احمق کیسے کہہ دیا؟ یہ بات بالکل سیدھی سادی ہے۔ جو آدمی اپنی عقل سے کام نہ لے سکتا ہو اسے تو اخیر احمق کہیں گے ہی۔ لیکن جو آدمی عقل سے کام لینا جانتا ہو اور کام لے بھی چکا ہو اور پھر بھی ایک حد پر پہنچ کر بیٹھ جائے اور آگے بات نہ سمجھے تو اسے سب سے بڑا احمق کہیں گے۔ حضرت مجدد صاحب معقولات کے ماہر تھے اور جانتے تھے کہ یونانیوں کے بہت سے مسائل درست ہیں۔ لیکن یونانی فلسفی چند بنیادی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے حضرت نے یونانیوں کی الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کو ضلالت کہا ہے اور اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ ان کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے۔ رینے گینوں نے اپنی متعدد کتابوں میں ویدانت تصوف اور چینی تاؤ سے مقابلہ اور موازنہ کر کے نہایت تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا گیا ہے کہ یونانی فلسفی، وجود کے مسئلے میں الجھ رہ گئے اور حقیقی معنوں میں مابعد الطبیعیات تک نہیں پہنچ سکے۔ اس بنیادی خامی نے مغربی فلسفیوں کے ذہن کو ایسا ٹھس بنا دیا ہے کہ رینے گینوں سے ایک مباحثے کے دوران ژاک ماری تیں (Jacques Maritain) جیسے مفکر نے ہزار ہا سمجھانے کے باوجود یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ فی الاصل دینیات اور مابعد الطبیعیات ایک ہی چیز ہیں۔ حضرت مجدد صاحب وجود کے مسئلے کو کیا حیثیت دیتے تھے، یہ اس اقتباس سے واضح ہو گیا ہوگا جو میں نے اپنے مضمون میں نقل کیا تھا۔ اب یہ قصہ بھی سن لیجئے جو گینوں نے اپنی ایک کتاب میں سنایا ہے۔ مغرب کے ایک صاحب نے کسی ہندو پنڈت کے سامنے مغربی فلسفے کی اتنی مدح سرائی کی کہ آخر انھوں نے کہا اچھا تو اپنے فلسفے کے کچھ بنیادی اصول سناؤ۔ خاموشی سے پورا بیان سننے کے بعد پنڈت صاحب نے کہا "ہاں واقعی بڑی دلچسپ باتیں ہیں... آٹھ سال کے بچے کے لئے۔"

یہ درست ہے کہ مسلمان فلسفیوں نے یونانیوں سے فلسفہ اخذ کیا۔ مگر یونان سے نہیں بلکہ اسکندریہ سے، جہاں کے فلسفی ارسطو چھوڑ، افلاطون سے بھی آگے گئے ہیں۔ پھر ان کے بہت سے مسائل مسلمان فلسفیوں نے درست کئے، اس کے بعد متکلمین نے اصلاح کی۔ آخر میں صوفیہ نے یونانی فلسفے کے بعض مسائل اور اصطلاحات لے کر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ مثال کے طور پر صرف ایک اصطلاح لیجئے: "خارج" یا "عالم خارجی"۔ ارسطو یا افلاطون کے یہاں اس کے جو معنی ہیں وہ خود دیکھ لیجئے۔ صوفیہ کے یہاں اس سے اول تو مراد ہے عالم ارواح، اور ثانوی مطلب ہے سارا عالم خلق جس میں فرشتے بھی آگئے اور عالم مثال بھی۔ اس ایک مثال سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ آپ کے انصاف پر چھوڑا۔

دوسرا سوال: حضرت مجدد صاحب نے اصلاح نفس کے بجائے اصلاح باطن کو مقصود کیوں بتایا ہے؟ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور اصلاح نفس سے کم راہی کیوں بڑھتی ہے؟ یہاں پہلے تو اصطلاحات کو صاف طور سے سمجھنا چاہئے۔ "نفس" کا لفظ بعض دفعہ روح کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، بلکہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے بھی استعمال کیا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ تصوف کی کسی کتاب میں اصلاح نفس کا ذکر ہو اور مراد اصلاح باطن سے ہو۔ باطن سے مراد ہے قلب۔ نفس کی دلالت عام طور سے اس چیز پر ہوتی ہے جسے یونانی میں Psyche اور انگریزی میں Soul کہتے ہیں۔ نفس میں اچھی صفات بھی ہوتی ہیں اور صفات ذمیمہ یا رذائل بھی۔

"نفس کو صفات ذمیمہ کے عیوب سے پاک کرنا" ہو تو اسے اصطلاح میں "تزکیہ" کہتے ہیں۔ یہ بھی ضرور مطلوب ہے لیکن مقصود نہیں۔ تزکیہ نفس مقصود کے حاصل کرنے میں معاون تو ہے، لیکن حاصل کرنے کی چیز ہے اصلاح باطن یا صفائی، جس کے معنی ہیں "قلب کا پاک کرنا اس طرح ہو کہ اس میں حق کا شہود ہو۔" اچھا، تزکیہ کے لفظ کو وسیع تر معنی بھی دیئے جاتے ہیں۔ یعنی نفس امارہ کو لوامہ بنانا اور

پھر اسے معلنہ کی حالات کی طرف لے جاتا۔ مطلب یہ نکلا کہ نفس کی اصلاح کرنا کافی نہیں جب تک قلب کو خلق سے فارغ کر کے حق کی طرف نہ لگایا جائے۔

اصلاح باطن کے بغیر اصلاح نفس سے گمراہی کیسے بڑھ سکتی ہے یہ ایسی بات نہیں جو مغرب کا جدید ادب پڑھنے والے پوچھیں۔ میرا خیال ہے کہ موریاک (Mauriac) کے دو ایک ناول تو لوگ پڑھ ہی لیتے ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ فیشن بدل گیا ہو اور مجھے پتہ نہ چلا ہو۔ بہر حال جو حضرات مغربی ادب پر بحث کرتے ہیں وہ ایلیٹ کے اس مضمون سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے جس میں شیکسپیئر کے المیہ ڈراموں پر سینیکا (Seneca) کا اثر دکھایا گیا ہے۔ ایلیٹ نے کہا کہ جب نفس کو خواہشات سے پاک کر دیا جائے تو کبر میں اور ترقی ہوتی ہے اور آدمی ہیچو ما دیگرے نیست کا شکار ہو جاتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کو محض سینیکا کے فلسفے کی رو سے سمجھنا درست ہے یا نہیں، یہ الگ سوال ہے۔ مگر یہاں جو مسئلہ زیر بحث ہے اس کی تصریح تو ایلیٹ نے بھی کر دی ہے۔ صوفیہ نے تو خیر اس معاملے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اول تو اصلاح باطن کے بغیر اصلاح نفس مشکل ہے یا بہت دیر میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر حاصل ہو جاتی ہے تو سالک اس میں پڑ کے اصلاح باطن سے ہمیشہ کے لئے غافل ہو جاتا ہے اور اس کا خاتمہ بخیر نہیں ہوتا۔ اسے استدراج کہتے ہیں۔ یہاں مسئلہ مختصر طور سے بیان کر دیا گیا۔ تفصیل درکار ہو تو مولانا تھانوی کی کتابیں دیکھئے۔ علاوہ بریں، خود اصلاح باطن کے سلسلے میں اتنی باریکیاں اور نزاکتیں ہیں کہ ان کا بیان میرے مقدور سے باہر ہے۔ حضرت بایزید بسطامی کا مشہور و معروف قول ہے کہ میں تیس سال تک روح کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتا رہا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے مغرب میں جو تباہی پھیلائی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اصلاح نفس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ بھی میرا دعویٰ نہیں۔ تفصیلات درکار ہوں تو خود بھی تھوڑی سی محنت کیجئے اور لوتھر کے بارے میں ژاک ماری تیں (Jacques Maritain) کا مضمون پڑھ لیجئے۔

رہی یہ بات کہ مذہب میں اعتقادات اور عبادات سے بے نیازی برت کر اور اخلاقیات پر زور دے کر یورپ نے کیا نقصان اٹھایا؟ تو یہ مضمون بچوں کے سامنے بیان کرنا تو ٹھیک ہے مگر ادیبوں اور ادب پڑھنے والوں کے سامنے بیان کرتے ہوئے تو خود مجھے شرم آتی ہے۔ اگر آدمی نے کچھ بھی نہ پڑھا ہو صرف ڈکنز (Dickens) ہی کے دو تین بڑے ناول پڑھے ہوں تو اسے یہ بات پہلے سے معلوم ہوگی۔

باب مراسلات میں میرے مضمون پر بحث کرتے ہوئے کسی صاحب نے لفظ Dogma استعمال کیا ہے۔ اگر میرے معروضات کو یہ نام دیا گیا ہے۔ تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر اسلامی عقائد کا یہ نام رکھا گیا ہے تو سو فی صدی غلط ہے۔ اسلامی عقائد کے لئے تو انگریزی میں صحیح لفظ Doctrine ہے۔ لفظ Dogma اول تو رومن کیتھلک مذہب کی ایک اصطلاح ہے اور اس قسم کی کوئی چیز اسلام میں ہوتی نہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ محاورے میں دعا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا استعمال مارٹن لوتھر سے شروع ہوا ہے اور اس نے جان بوجھ کر یہ تحریف کی ہے۔ پھر والتیر (Voltaire) وغیرہ عقلیت پسند اس لفظ کو مناظرے کے حربے کے طور پر کام میں لائے ہیں۔ آج کل جب لوگ یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو اسلامی عقائد کی نوعیت تو خیر وہ کیا سمجھیں گے، کیتھلک Dogma کی نوعیت اور ضرورت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ سنجیدہ بحث میں اس لفظ کو غیر اصطلاحی معنوں میں استعمال نہ کیا جائے۔ ورنہ اس لفظ سے کہنے والے کی جذباتی تسکین تو ہو جاتی ہے، بحث میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

ایک اور صاحب نے بہت ہی مناسب سوال اٹھایا ہے کہ ہمارے یہاں خوراک اور مشینری مغرب سے آ رہی ہے تو مغربی تہذیب کا اثر کیسے نہ ہوگا؟ مغربی تہذیب کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ ایک امر واقعی ہے۔ لیکن جب ہم لکھنے اور پڑھنے بیٹھتے ہیں تو مفروضہ یہی ہوتا ہے کہ جو واقعات پیش آئے ہیں ہم ان کی نوعیت پر غور کریں گے۔ اگر کوئی چیز واقع ہو رہی ہے تو یہ کیسے لازم آیا کہ ہم اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں؟ مغرب سے چند چیزیں آ رہی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ ہمارے ہاتھ سے جا بھی رہا ہے۔ یہ بھی تو دیکھنا چاہئے۔ ادب پڑھنے والوں اور لکھنے والوں سے ہم اتنی توقع تو کر سکتے ہیں۔

حالی روایتی ادب کو سمجھتے تھے یا نہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لئے بھی میں آپ کا پسندیدہ تجرباتی طریقہ کار استعمال کر چکا ہوں۔ لیکن یہ تجربہ سلیم احمد صاحب کو بہت مہنگا پڑا اس لئے اس کا بیان نہیں کروں گا۔ آپ خود تحقیق کر لیجئے اور "یادگار غالب" میں فارسی اشعار کی شرح پڑھ کے دیکھ لیجئے۔

ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) کے سلسلے میں تو اپنے مضمون میں خود میں نے ہی لکھا تھا کہ وہ جدید ادب اور آرٹ کے بہت جوشیلے مبلغ رہ چکے ہیں لیکن آج کل مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں وہ بہت مضطرب ہیں۔ چونکہ میں نے دونوں رخ پیش کئے تھے اس لئے کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جس مضمون میں انہوں نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے وہ شاید زیادہ لوگوں کی نظر سے نہیں گذرا کیوں کہ وہ مضمون انہوں نے مرنے سے دو ایک سال پہلے ہی لکھا تھا اور ابھی تک کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں ہوا۔ یہ مضمون مصوری وغیرہ سے متعلق ایک رسالے میں چھپا تھا اور اس کا نام ہے "جدید آرٹ میں ہیئت کی شکست و ریخت" The Disintegration of Form in Modern Art ارادہ تھا کہ اس مضمون کا خلاصہ بھی یہاں پیش کر دوں لیکن میری یہ معروضات تو پورا مضمون بن گئیں۔ "شب خون" کے صفحات پر اس سے زیادہ بار ڈالنا جائز نہیں۔ اس لئے سلیم احمد صاحب کی طرف سے جو اعتراض وارد ہوا ہے اس کا جواب بھی یہاں نہیں دوں گا۔ زبانی ہی عرض کر دوں گا۔ (فلاطینوس) Plotinus کا ایک اقتباس بھی ان کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

"شب خون" والوں نے یہ لمبا چوڑا اخباری بیان چھاپ دیا تو عنایت ہوگی۔ نہ چھاپا تو اور بھی احسان ہوگا کہ پڑھنے والے بھی آرام سے سوئیں گے اور میں بھی ☆☆☆

فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ

محمد حمید اللہ

شمارہ ۲۷۳
نومبر ۲۰۰۳

یہ ایک محض گمان، استنباط اور نظریہ ہے، اور وہ بھی تحقیق کے ابتدائی مدارج میں۔ شروع میں کچھ تمہید کی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے۔

یسبح الرعد بحمدہ (قرآن ۱۳/۱۳: رعد اللہ کی حمد کے ذریعے سے تسبیح کرتا ہے) اور **وان من شیء الا یسبح بحمدہ ولا کن لا تفقہون تسبیحہم** ۱۷/۴۴: کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی، اس کے حمد کے ذریعے سے، تسبیح میں مشغول نہ ہو۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اور مماثل آیات سے قطع نظر کریں تو جمادات اور نباتات میں بھی اپنی مرضی سے چیخنے، آواز نکالنے کی قدرت نظر نہیں آتی۔ یہ صرف حیوانات سے مخصوص امر ہے۔ اور حیوانوں میں انسان ان کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ مکبر الصوت آلات نے پتہ چلایا ہے کہ مچھلیاں سب جانوروں سے زیادہ ثرائی ہیں۔ اور اب پتہ چلنے لگا ہے کہ جانوروں کی بھی "بولیاں" پائی جاتی ہیں اور ان سے نکلنے والی آوازیں خوشی، ڈر اور مختلف حالتوں میں یکساں نہیں بلکہ الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس لیے اب ہمارے زمانے میں قرآن مجید (سورہ ۲۷/۱۶۔۱۸) کے ذکر کردہ منطق الطیر (پرندوں کی بولی) اور قالت نملۃ (ایک چیونٹی بولی) پر صرف اعتقاد کے لیے اعتقاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے (سورہ ۷۱/۱۴) **خلقکم اطوارا** (خدا نے) تم کو ارتقا در ارتقا سے پیدا کیا ہے) سے استنباط کیا جائے تو شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ابتداً صرف فطری صلاحیت سے مفرد آوازیں نکلتی رہی ہوں گی، پھر رفتہ رفتہ مرکب آوازیں اور آوازوں کے مجموعے انسان نے اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے شروع کیے، ایک آواز یا ایک مجموعہ ایک غرض کے لیے، اور دوسرا دوسری غرض کے لیے۔

شاید قرآن (سورہ ۲/۳۱۔۳۴) میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

"اور خدا تعالیٰ نے آدم کو سارے نام سکھائے پھر ان (موسوم) چیزوں کو فرشتوں کو دکھا کر پوچھا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے کہا: تجھی کو پاکی سزاوار ہے، ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، تو ہی علیم و باحکمت ہے۔" پھر اس نے فرمایا: "اے آدم، ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتا۔ جب اس نے ان کے نام بتائے تو فرمایا کہ ..." نام سے مختلف چیزوں اور مفہوموں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی حضرت آدم نے کیا۔ یہ قصہ بائبل میں بھی ہے۔ (کتاب پیدائش ۲/۱۹۔۲۰) اور وہاں چیزوں کو نام حضرت آدم دیتے ہیں۔ (ناموں کی اہمیت کنفوشس کی کتابوں میں ہے لیکن ان تفصیلوں سے ہم اپنے موضوع سے دور ہو جائیں گے۔)

کسی چیز، کسی فعل، کسی مفہوم کے بعد ماضی، حال اور مستقبل، نیز امر و نہی میں امتیاز کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور اس طرح زبان وجود میں آئی ہوگی جس میں شروع میں تعداد الفاظ محدود رہی، پھر رفتہ رفتہ ہر نسل میں اضافہ ہوتا رہا ہوگا۔ پیشے اور اختصاص کے وجود میں آنے پر انفرادی معلومات میں فرق بھی ناگزیر تھا۔

ایک ہی جوڑے، آدم اور حوا، سے ایک نہیں متعدد زبانوں کا وجود میں آنا اور ان میں اتنا فرق ہونا کہ ایک کی زبان دوسرے کو بالکل سمجھ میں نہ آئے، یہ ہر زمانے میں ایک اچنبھا ہی رہا ہے۔ بائبل کی کتاب پیدائش (۱۱/۱۔۹) کا بیان ہے کہ طوفان نوح تک سارے انسانوں کی ایک ہی زبان تھی۔ پھر جو لوگ غرق ہونے سے بچے تھے وہ ملک شنار کی طرف گئے اور وہاں پختہ اینٹوں سے ایک شہر بنانا شروع کیا اور اس میں ایک منارہ بھی بنانا چاہا جو اتنا بلند ہو کہ آسمان تک پہنچ جائے۔ (شاید منشا یہ تھا کہ خدا کو دیکھیں۔) یہ بات خدا کو پسند نہ آئی اور وہ آسمان سے نیچے اتر کا اس مقام کو آیا اور ان لوگوں کو سارے کرہ ارض پر منتشر کر دیا جس کے باعث ان کی زبان ایک نہ رہی اور اس مقام کو "بابل" کا نام دیا گیا جس کے معنی ہیں زبانوں کا مختلف ہو جانا، نت نئی زبانوں کا پیدا ہونا۔ اس قصے کی کوئی تائید، کوئی ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ لیکن قرآن (سورہ ۳۰/۲۲) میں ایک بڑا عمیق المعنی جملہ آیا ہے: "اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس میں اہل علم کو (خدا کی) عجائبات ملیں گی۔" مجھے پتہ نہیں کہ آیا ہندو ادبیات (سنسکرت) میں اس سلسلے میں کچھ بیان ہوا ہے یا نہیں۔ بہر حال قرآن کے نزول کے زمانے میں جو حالت تھی وہ آج بھی ہے اور اگر بدلی ہے تو صرف یہ کہ مصنوعی (اور بہتر) زبان بنانے کی دو کوششیں یورپ میں ہوئیں: ایک وولاپوک (Volapuk) جسے جان مارٹن شلایر (J M Schleyer) نے ۱۸۷۹ میں ایجاد کیا، اور دوسری ایسپرانتو (Esperanto) جو گویا اس کی اصلاح تھی، یہ ڈاکٹر تسامن ہوف (Zamenhof) نے بین الاقوام روابط میں سہولت پیدا کرنے کے لیے بنائی۔ گرتی پڑتی یہ دونوں بھی اب تک باقی ہیں۔ ان کو بولنے والی کوئی قوم تو نہیں بنی لیکن بولنے سمجھنے والے افراد ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں مختلف زبانیں ہی نہیں، کم و بیش فرق رکھنے والی شاخیں dialect اور ذیلی شاخیں patois بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ہندوستانی زبان میں اردو اور دکھنی کا فرق۔ یہ فرق روز افزوں ہیں اور ساری دنیا میں ہمارے جو ہم وطن بھائی بہن مثلاً انگلستان میں جا بسے ہیں اور اس پر ایک نسل گذر گئی ہے تو ان کا مشاہدہ اور ان کا بیان ہے کہ انگریزی زبان ان کی آنکھوں کے سامنے اتنی تیزی سے بدلی اور

بدل رہی ہے کہ وہاں کے عیسائی فرنگیوں کے اپنے بچے بھی اب مثلاً بائبل میں مستعمل انگریزی کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔

زبانوں کے اختلاف، اور نئی زبانوں کی پیدائش کے اسباب اور طریقوں کے متعلق جہاں تک ہمارا علم اب تک پہنچ سکا ہے، وہ ایک لمبی داستان ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے کی دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) چند سال قبل جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس بورگ جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں میاں نامی ایک بہت تمیز اور علم دوست خاندان رہتا ہے۔ ان کے ہاں کے کتب خانے میں ایک کتاب دیکھی جو وہاں کے گوروں ہی میں سے ایک کی لکھی ہوئی ہے۔ مولف کہتا ہے کہ جب ہالینڈی لوگوں کا ملک پر تسلط ہوا تو نوآبادکاری کے لیے طرح طرح سے مزدور اور غلام وہاں لائے جاتے رہے اور ان سے نوآبادکاری کے کٹھن کام لیے جاتے رہے۔ ان مزدوروں اور غلاموں کو ہالینڈی زبان سیکھنی پڑی جسے وہ بگاڑ کر اور غلط سلط بولتے رہے اور ہالینڈی صرف ونحو کے قواعد کو آسان بنا کر گفتگو کرتے رہے۔ انگریز آئے تو ان بدنصیب "غلاموں" یعنی بنگالیوں، ملاباریوں، ملایا و جاوا والوں، عرب، حبشی لوگوں کی تعداد چونکہ گوروں سے بہت زیادہ ہوگئی تھی اس لیے فصیح ہالینڈی کی جگہ بگڑی ہوئی، غلاموں میں بولی جانے والی ہالینڈی اتنی مروج تھی کہ گورے بھی اسی کو بولنے پر مجبور تھے کہ اپنے مزدوروں سے بات کرسکیں۔ پھر انگریزوں سے نفرت کے باعث ان ہالینڈی گوروں نے مقامی بگڑی ہوئی ہالینڈی میں لکھنا پڑھنا بھی روز افزوں شروع کیا۔ لیکن ان گوروں سے بہت قبل مقامی مسلمان اس کو لکھنے پڑھنے میں برتنے لگے تھے اور اسے افریقانیہ کا نام دیتے تھے۔ اور زیر ذکر کتاب کا مولف لکھتا ہے کہ موجود افریکانس (Afrikaans افریقانیہ) زبان کے قدیم ترین دستیاب شدہ نمونے عربی خط میں مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ اسلامی کتابیں (اسلام کے متعلق) ہیں۔ غرض عربی اور حبشی زبانوں کا ہالینڈی زبان پر جو اثر پڑا اس سے افریقانیہ زبان پیدا ہوئی اور وہ اب جمہوریہ جنوبی افریقہ کی سرکاری زبان ہے۔

(۲) اگر جنوبی افریقہ کے ایک حصہ پر ہالینڈ کا قبضہ ہوا تو ایک دوسرے حصے پر فرانس کا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک جگہ غلاموں اور مزدوروں کو ہالینڈی بولنی ہوتی تھی تو دوسری جگہ فرانسیسی۔ نتیجہ دونوں جگہ ایک ہی ہوا یعنی ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ فرانسیسی علاقے کی زبان کو کریول (Creole) کہتے ہیں اور اس میں اب کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے، اگرچہ افریقانیہ کے مقابلے میں، جس میں قرآن مجید کے کامل تراجم بھی ہو چکے ہیں، کم۔

ان دونوں نئی زبانوں (افریقانیہ اور کریول) کا اثر محدود رہا اور اصل ہالینڈی اور فرانسیسی زبانیں، جو ہالینڈ اور فرانس میں بولی جاتی تھیں، متاثر نہ ہوئیں۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہالینڈ اور فرانس میں وہ لوگ مفقود تھے جو افریقانیہ اور کریول بولتے ہوں۔

یہ حالیہ مثالیں غالباً ہمیں قدیم تر زمانے کے واقعات کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

لاطینی زبان کے پرخچے اڑنا

کوئی ہزار سال کی بات ہے کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے بڑے حصوں میں رومی فتوحات کے باعث پھیل گئی تھی، ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مقامی بولیاں مستقل زبانیں بن جاتی ہیں۔ ہمارا اشارہ اسپینی، اطالوی اور فرانسیسی کی طرف ہے۔ اور ان نئی زبانوں کی تولید ہی کے متعلق ہمارا نظریہ ہے کہ وہ عربی کے باعث ہوا۔

لیکن دوسری تفصیلیں یا دلیلیں دینے سے قبل خود عربی زبان کی ایک اہم خصوصیت کو نمایاں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں عام طور پر زبانوں میں اندرونی ارتقا مسلسل ہوتا رہا ہے اور کہتے ہیں پانچ سو سال بعد وہ زبان ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ مثلاً مشہور انگریز شاعر چاسر (Chaucer، وفات تقریباً ۱۴۰۰ء) کی نظموں کو اس کے جنم بھوم لندن میں اب کوئی انگریز سمجھ نہیں سکتا، بجز پرانی انگریزی کے متخصص اساتذہ کے۔ یہی حال فرانسیسی، جرمنی، روسی وغیرہ کا ہے۔

اس کا تاریخ عالم میں واحد استثنا عربی زبان ہے، اور یقیناً قرآن کی برکت سے۔ گذشتہ چودہ سو سال سے نہ عربی صرف ونحو بدلی ہے نہ الفاظ کے معنی، حتیٰ کہ تلفظ میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر آج رسول اللہؐ زندہ ہوں تو عربی راڈیو اور عربی اخباروں کو اسی آسانی سے سمجھ سکیں گے جس طرح آپ اپنے ہم عصر عربوں کو سمجھ سکتے تھے، یا ہم قرآن و حدیث کو سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں زمانوں کی زبانوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ عربی کی مقامی بولیوں میں چاہے فرق ہو لیکن عربوں کی لکھنے پڑھنے کی علمی زبان ہر جگہ یکساں ہے۔ اگر عربی میں یہ استحکام نہ ہوتا تو پھر رحمان و رحیم خدا کو ضرورت پیش آتی کہ ایک نیا پیغمبر اور قرآن ایک نئی زبان میں نازل کرے۔

یہ تھی وہ عربی زبان جو اپنی سیاسی اور عسکری قوت کے اوج عروج کے زمانے میں لاطینی سے مڈبھیڑ ہوئی۔

مسلمان حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے (۲۷ھ) میں اندلس میں داخل ہوئے پھر انھوں نے رفتہ رفتہ سارے پرتگال اور اسپین پر بھی قبضہ کیا اور اٹلی اور جنوبی فرانس کے بڑے حصے پر بھی۔ اسپین میں وہ کوئی آٹھ سو سال حکومت کرتے رہے۔ اٹلی میں خاص کر صقلیہ میں بھی وہ بہت دن رہے۔ خود جنوبی فرانس میں ایک خودمختار اسلامی حکومت سوا سو ڈیڑھ سو سال تک برقرار رہی، اور اس زمانے کے مسلمان حکمرانوں کے دیئے ہوئے جاگیروں کے پروانے تک تا حال محفوظ ہیں۔

اسپین کے متعلق شاید یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ وہاں کے لاکھوں نو مسلم اسپینی، اسپینی زبان بولتے رہے جو عربی سے ظاہر ہے کہ بہت متاثر تھے۔ اور عرب اس زبان کو "الجمیاد" سے موسوم کرتے تھے جو "الاعجمیۃ" کی خرابی تھی (اسپینی میں حرف ج کا تلفظ خ ہوتا ہے، "جبرالٹر" کو وہ آج "خبرالٹر" بولتے ہیں) اور یہ الجمیاد عربی خط میں لکھی جاتی تھی۔ اس میں قرآن کے ترجمے بھی ہیں، طب وغیرہ دنیوی علوم کی کتابیں بھی۔ اور ان کے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں قلمی نسخے آج بھی مجریط (میڈرڈ) اسکوریال وغیرہ میں محفوظ موجود ہیں۔ عربی خط والی پرتگالی کا بھی یہی حال ہے۔

عربی کا اثر خاص کر فرانسیسی پر

لاطینی زبان اٹلی میں ہی نہیں، اسپین اور فرانس میں بھی مروج تھی اور وہاں وہ علمی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

عرب ان ملکوں میں پہنچے اور طویل عرصہ سکونت پذیر رہے تو لازماً لاطینی بولنے پر مجبور ہوئے۔ ان اجنبیوں کے منہ میں لاطینی زبان وہ نہ رہ سکی جو فرنگی علما میں مروج تھی۔ اگر عربوں نے اسے بگاڑا تو یا اسے سہل تر بنانے کے لیے تھا، اور کچھ اپنی عربی زبان کی خصوصیتیں بھی اس عربائی ہوئی لاطینی میں داخل کیں اور یہ "بگڑی ہوئی" لاطینی زبان برقرار بھی رہی اور پھلتی پھولتی بھی گئی۔ اور اس طرح اسپینی، اطالوی اور فرانسیسی زبانیں پیدا ہوئیں۔

یہاں مجھے نہ اس سے بحث ہے اور نہ دلچسپی کہ فرانسیسی زبان میں کتنے عربی لفظ ہیں۔ الفاظ مستعار لینے سے زبان نہیں بدلتی، بلکہ وہ مستعار لفظ ہی مستعار لینے والی زبان کے قواعد اور عام ماحول کے تابع ہو جاتا ہے۔ یہ زندہ اور موجود زبانوں میں بھی ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ ابھی حال میں روسیوں نے ایک گولہ پھینکا جو زمین کے اطراف گردش کرنے لگا، اور انھوں نے اسے "اسپوتنک" کا نام دیا۔ فوراً یہ لفظ دنیا کی ساری زبانوں میں داخل ہو گیا، جیسا کہ سابق میں ٹیلیفون، گراموفون وغیرہ لفظوں کے سلسلے میں ہوا تھا۔ مجھے بحث ان چیزوں سے ہے جو کسی زیر پیدائش زبان میں باہر سے آتے اور اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بحث ابھی اپنے آغاز میں ہے اس لیے زیادہ مثالوں کی توقع نہ کی جانی چاہیے۔

بہر حال، سب لوگ جانتے ہیں کہ لاطینی زبان میں علامت معرفہ نہیں ہے (اردو میں بھی نہیں)، انگریزی میں ہے یعنی The، جس کے استعمال سے کوئی چیز غیر محدود نہیں رہتی، معین ہو جاتی ہے۔ علامت تعریف لاطینی میں نہیں لیکن اس کی تینوں بیٹیوں فرانسیسی، اطالوی اور اسپینی میں ہے۔ عربی میں ال (مثلاً الاسلام) ہے تو اطالوی میں (IL Islam)، اسپینی میں EL (El Islam) اور فرانسیسی میں:

> ...حرف علت سے شروع ہونے والے اسم پر علامت تعریف لگائیں تو L مثلاً L' Islam۔ مماثل چیز عربی میں ہے کہ الف لام تعریف سے پہلے مثلاً "ب" ہو تو علامت تعریف کا الف گر جاتا ہے اور صرف لام رہ جاتا ہے۔ مثلاً بالاسلام کا تلفظ بل اسلام ہوگا ب ال اسلام نہیں۔
>
> ...حرف صحیح سے شروع ہونے والے الفاظ کو معرفہ بنانا چاہیں تو مذکر اسم کے لیے واحد کی صورت میں LE، مؤنث کی صورت میں LA، مذکر مؤنث دونوں کی جمع صورت میں LES ہوتا ہے۔ (یہ نزاکتیں عربی میں نہیں ہیں۔)
>
> ...علامت تعریف سے پہلے لفظ A (یعنی "اوپر") ہو تو A LE کی جگہ AU (یعنی فلاں چیز کے اوپر) ہو جاتا ہے۔ اس کی متوازی چیز عربی میں شمسی و قمری حروف سے شروع ہونے والے لفظ الف لام تعریف آئے تو لام کا تلفظ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مثلاً الاسلام (ال اسلام)، لیکن السلام (اس سلام)۔

بہر حال لاطینی زبان میں علامت تعریف نہیں تھی، اس کی اولاد میں وہ آگئی ہے۔ عربی ال، اسپینی El، اطالوی IL، فرانسیسی L، یہ معنی خیز ہے۔

ایک دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو ہی کی طرح لاطینی میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے، عربی میں فعل، فاعل شروع میں ہوتے ہیں، اس کے بعد مفعول و متعلقات آتے ہیں۔ فرانسیسی وغیرہ لاطینی زاد زبانوں میں لاطینی قاعدے کی جگہ عربی کے قاعدے پر عمل ہوتا ہے۔ موروثی چیز کو بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے کسی طاقتور بیرونی چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور چیز کا بھی یہاں ذکر کرتا ہوں: لاطینی زبان میں (ج) کی آواز نہیں ہے، اس کی جگہ (ی) ہوتی ہے۔ اطالوی میں تو فرق نہیں ہو سکا، لیکن فرانسیسی میں (ژ) ہو گیا جو شمالی افریقہ کی عربی زبانوں کا لہجہ ہے اور وہ عرب ج کا تلفظ کرتے ہیں۔ لبنان میں بھی وہی حال ہے، اور اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے فرانسیسی میں (ا) کے ساتھ (J) کا اضافہ ہوا۔ اسپینی میں بھی وہی ہوا، لیکن وہاں ج کا تلفظ خ ہوتا ہے۔ جبرالٹر کو وہ خبرالٹر کہتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حرف ج کا تلفظ مختلف عرب قبائل میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ مصر میں وہ گ ہوتا ہے (گمال عبدالناصر)، یمن میں وہ ی ہوتا ہے (کبھی کا تلفظ کیبی)، حجاز میں ج اور لبنان اور شمالی افریقہ میں ژ اور مشرقی افریقہ میں خ۔ آخری لیکن بہت اہم چیز یہ ہے کہ علامت تعریف کا قدیم ترین معلوم استعمال فرانسیسی زبان میں Cantilene de Saint-Eulalie میں ہے جو ۸۸۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی، جیسا کہ فرنچ اکیڈمی سے مجھے معلوم ہوا۔ یہ وہی زمانہ ہے جس مسلمان اسپین، اٹلی اور فرانس میں تھے۔

جس زمانے میں اسپین ہی نہیں جنوبی فرانس اور اٹلی میں بھی مسلمانوں کی حکمرانی تھی اسی زمانے میں وہ سوئٹزرلینڈ کے بعض علاقوں میں بھی تسلط رکھتے تھے جیسا کہ ہمارے مرحوم پروفیسر ہارون خان شیروانی کی تالیفوں سے علم دوست طبقہ خوب واقف ہے۔ تلاش پر پتہ چلا کہ سوئٹزرلینڈ کی ایک مقامی زبان روماش (Raomansch) بھی ہے اور وہ بھی لاطینی کی ہی بچی ہے۔ اور اس روماش میں بھی (اپنی ماں لاطینی کے برخلاف) لفظ کو معرفہ بنانے کے لیے ایک لفظ استعمال کرتا ہے جو IL ہے۔ دوسرے الفاظ میں روماش زبان کی ساخت میں بھی عربی کا اثر پڑا ہے۔

ایک ذیلی امر جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ شمالی افریقہ (مراکش، الجزائر، تیونس) میں بولی جانے والی عربی میں علامت تعریف (ال) میں سے الف گر جاتا ہے۔ آج بھی مثلاً مراکش کے شہر الآغادات کو لکھتے اور بولتے Alghaouat ہیں۔ ایک موجودہ عالم کا نام لکھتے اور بولتے Larbi ہیں، جو اصل میں العربی ہے۔ ایک اور فاضل Lahbabi ہیں جس سے مراد الحبابی ہوتا ہے۔ ایسی ہزاروں بلکہ ان گنت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو عرب جنوبی فرانس میں آئے اور انھوں نے وہاں کی مروجہ لاطینی کو متاثر کیا وہ بھی اپنی زبان میں علامت معرفہ کے "ال" میں سے الف گرا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی میں علامت تعریف آئی تو وہ LE یا L بنی اور اسپینی، اطالوی اور روماش کی طرح IL یا EL نہ بنی۔ بہر حال اس زمانے کی لاطینی بولیاں عربی سے متاثر ہوئیں اور ان کی صرف و نحو میں، جن عربی چیزوں کا اضافہ ہوا ان میں الف لام تعریف سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اور اب اسی پر ختم کرتا ہوں، واللہ اعلم بالصواب ☆☆☆

محمد حمید شاہد

شمارہ ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

جب سے تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اذیت سے بھی شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔

تاہم ایک زمانہ تھا...اور وہ زمانہ بھی کیا خوب تھا کہ ہم دکھ کے شدید تجربے سے زندگی کی لذت کشید کیا کرتے۔ اس لذت کا لپکا اور چسکا ایسا تھا کہ خالی جھولی کے بھوڑ میں بھوک کے بھڑ بھونجے چھولے تڑتڑاتے بھنتے رہتے مگر ہم حیات افروز لطف سے سرشار ہوتے تھے۔ بجا کہ ہم بے بسی کے مقابل رہتے تھے لیکن ہمیں اپنی بے بسی کا اس شدت سے احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہمت بندھی رہتی اور ہم موت کا مقابلہ بھرپور زندگی کے دلنواز حوصلے سے کرتے تھے۔

وہ پھڑکی والا سال بھلا کوئی کیسے بھول پائے گا کہ جس میں چتلیں، کجلیاں، کموریاں اور ناچیاں ایک ایک کر کے موت کی اوڑھنی لے رہی تھیں۔ بظاہر قدرے سخت جان نظر آنے والی بربری نسل کی ٹیڈی شمکڑیں بھی اسی موت کی وادی میں کودنے کے بہانے تلاش کرنے لگی تھیں۔ تب جس طرح ہم نے اپنے ڈوبتے دلوں پر قابو پایا تھا وہ کچھ ہم ہی جانتے تھے۔ اسی برس چھوٹی پتلی دم اور بڑے حوانے والی وہ سرخ چتل، کہ جسے ہم سب رتی کہتے تھے، پھڑکی سے پھڑک گئی تھی اور کچھ ہی گھنٹوں کے اندر اندر موٹے سینگوں والی چتری، لٹکے ہوئے کانوں والی بھوری اور تکون جیسے تھنوں والی لنگڑی بل کی بل میں بے سدھ ہو گئی تھی۔ تب ہم پے در پے صدمات کے کھولتے تیل میں تلتے تھے مگر ہماری روحوں پر حیاتی اپنے کن موہنے پھولوں کی کلیاں بناتی تھی۔ ایسے میں آوازوں کا میلہ سا لگ جاتا۔

...اوئے فضلو دیکھ اس تمانی کا پنڈا گرم ہے اسے ادھر لے جا۔

...اوئے شریفے، وہاں چتری ماں کو کیوں ٹوہے جاتا ہے؟ ادھر آ اور اس بگی کے کھروں کو دیکھ، ان کے اندر ورم آ گئے ہیں۔

میرو، نظاماں، خیرا، شوقی، تاماں، چھوٹی...ہم سب بھاگ بھاگ کر ایک ایک کے پاس پہنچے تھے، ہر ایک کا منہ کھول کھول کر دیکھتے، بدن ٹٹولتے، حوانے ٹوہ کر اندازے لگاتے، ٹانگیں دوہری کر کے کھروں کو کریدتے، دمیں اٹھاتے اور انگلیاں گھسیڑ گھسیڑ کر موت کی ان علامتوں کو بھی تلاش کر لیا کرتے تھے جو بظاہر نظر نہ آتی تھیں۔

پھڑکی کی نشانیاں ہمیں کبھی نہ ملتیں...اس موذی مرض کی علامتیں ہیں بھی کیا، یہ ہم کبھی نہ جان پائے۔ جب تک اندازے اس طرف جاتے پھڑکی اپنا وار چل چکی ہوتی اور ہم پھڑکنے والی کو چھوڑ دوسریوں کو بچانے میں جت جاتے تھے۔ جس کا تھوڑا سا جثہ گرم ہوتا، جس کے تھے کان ڈھلکنے لگتے یا پھر جو دانتوں کو باہم پیس رہی ہوتی، ہم اسے الگ کر دیا کرتے تھے۔ اس برس ہمیں پھڑکی کی موتوں نے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر ہم اس برس بھی اتنے بے بس نہیں ہوئے تھے جتنا کہ بعد میں تھوتھنیوں والوں کے سبب ہو گئے تھے۔

پہلے بے بسی ضرور تھی لیکن ہمت ہی ٹوٹ جائے ایسی لاچاری اور بے کسی نہ تھی۔ نہ پھڑکی والے سال نہ ہی آنے والے برسوں میں۔ ہم کوئی نہ کوئی سبیل کر ہی لیا کرتے تھے۔ جب بکریوں میں سے کسی کی چال بگڑ جاتی اور وہ اگلے دن پہلے سے بھی زیادہ لنگڑانے لگتی، کوئی نیچے کھر زمین پر جھٹک جھٹک کر مارتی یا کسی کا بدن ڈھلکنے لگتا، کسی کے منہ میں سفید سفید چھالے نکل آتے، یا تھنوں کے سفید دانے پھٹ کر سرخ ہو جاتے، کسی کے منہ سے جھاگ اور رالیں بہنے لگتیں یا کسی کے حوانے کے غدود سوج جاتے، دودھ کم نکلتا یا پھر دودھ کی پھٹکیاں بن جاتیں، منہ اور آنکھوں کی جھلیاں زرد ہونے لگتیں یا پھر ناک منہ اور پیچھے سے لیس دار مادہ نکلنے لگتا، کسی کا پھل گر جاتا یا انہیں سے کسی کا پسِ میس اگلی ٹانگوں سے بچے سے پہلے پیچھے نکالنے لگتا۔ کوئی سوئے کی پیڑوں سے چیخے جاتی یا کسی کی جھلی پھٹ جاتی، اور ہم ترکیبیں کر کر کے پھل چھوڑنے میں مدد دے رہے ہوتے، یا تڑوچے

والی کی زندگی بڑھانے کے کٹھن کر رہے ہوتے تو وہ دکھ ہمیں موت اور زندگی دونوں کے مقابل کرتا تھا۔ مرنے والیاں مر جاتیں... جنھیں زندہ رہنا ہوتا تھا انھیں ہم بچا لیتے تھے۔ اکثر بہت زیادہ نقصان ہو جاتا، اتنا زیادہ کہ ہماری کمریں ٹوٹ جاتیں مگر یہی تو ہماری زندگی تھی۔ ہمیں یاد رہتا تھا کہ کس سال بھڑ کی کا حملہ ہوا تھا، کب منہ کھر آیا، گل گھوٹو اور ماتا نے کب پھیرا ڈالا تھا، چاندنی سے چشمک کب ہوئی تھی، سنگرہنی کے سبب کس کس نے چرنا چگنا چھوڑ دیا تھا۔ کسے خارش ہوئی تھی، کون نمونیے سے مری تھی، کس کے پھیپھڑوں میں کرم پڑ گئے تھے اور ناک مکھی نے کسے اوندھایا تھا۔

سردیوں کی یخ بستہ راتیں ہوتیں یا گرمیوں کی کڑی دوپہریں، ہم ایک ایک لمحے کو، ایک ایک واقعے کو، اور ہر ایک متاثر ہونے والی یا مر جانے والی کو یاد کرتے تھے۔ اور اسی موت کے کھیل میں سے زندگی کا چہچہا برآمد ہو جایا کرتا تھا۔

یہ ٹھیک سے بتانا تو بہت مشکل ہے کہ بکریوں کے یہ اجڑ اور ہم کب سے ساتھ ساتھ تھے۔ تاہم چٹے دودھ جیسی اجلی داڑھی اور نورانی چہرے والے بابا جی جنھیں ہمیشہ بکریوں کے اجڑ کے درمیاں لرزتے ہاتھوں میں اپنی کمر جیسا خم لیتی لاٹھی کے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا، انھوں نے بتایا تھا کہ ہمارے گاؤں سورگ کی زمین اور ہمارے بدنوں کی مٹی کے اجزا کا مطالبہ ہی یہی تھا کہ ہم اس پاک فریضے میں مشغول رہیں۔ بابا جی کا وجود اور ان کی باتیں ہمیں ایمان جیسی لگا کرتی تھیں لیکن جب انھوں نے یہ بتایا تھا تو اس وقت تک ہم خاصے ہوشمند ہو چکے تھے لہٰذا ہمیں پاک فریضے کے لفظوں نے چونکا دیا تھا اور ہم میں سے کئی ایک نے دہرایا تھا:

"بابا جی، پاک فریضہ...؟"

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے صرف اتنا کہا تھا:

"اچیاں شاناں والے کے صدقے یہ دھندا پاک فریضہ ہی تو ہے۔"

پھر ان کی آنکھیں محبت کے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں میں نہاں عقیدت کی کپکپاہٹ اور لرزتی انگلیوں کی ساری پوروں کو باہم ملا کر خیال ہی خیال میں بوسہ لیتے ہونٹوں پر تھراتی سسکاری کو چھو لیا اور ہم سے یوں بے نیاز ہو گئے کہ ان کی چھاتی کے اندر گونجتی آواز ہم تک پہنچنے لگی تھی۔

بابا جی کے چل بسنے کے بعد ہم مونگ پھلی کی کاشت کی طرف راغب ہو گئے۔

یہ لگ بھگ وہی برس بنتا ہے جب ادھر کی ایک بڑی بادشاہی میں ایک مونگ پھلی والے کو حکمرانی مل گئی تھی۔ یہ بات ہمیں شہر سے آنے والے بیوپاریوں نے بتائی تھی۔ انھوں نے ہمیں ادھار بیج دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ مونگ پھلی تو سونے کی ڈلی ہوتی ہے۔ اس سال ہم نے بے دلی سے تھوڑا سا بیج زمین میں دبا دیا تھا اور باقی بھون کر مزے لے لے کر گڑ کے ساتھ کھا گئے تھے۔ تاہم جب فصل تیار ہوئی اور کھڑی فصل کا سودا کرنے بیوپاری پہنچ گئے تو ہمیں مونگ پھلی واقعی سونے کی ڈلی جیسی لگنے لگی تھی۔

سورگ کی زمین کے دو روپ تھے۔ اوپر کے جنوبی مشرقی حصے کی ساری زمین ریتلی تھی۔ ہم اسے اتاڑ کہتے۔ اتاڑ کی زمین ایسی ریتلی بھی نہ تھی کہ مٹھی میں بھریں تو ذرے پھسلنے لگیں۔ ریتلی میرا کہہ لیں۔ مگر اسے میرا یوں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بارش کا چھینٹا پڑتا تو پانی سیدھا اس کے اندر اتر جاتا، اوپری تہوں میں ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ کئی دھوپیں جو لگاتار پڑ جاتیں تو وتر کا نشان تک نہ ملتا۔ نیچے شمال مغربی حصے کی زمین رکڑ تھی۔ رکڑ بھی نہیں، شاید پتھریلی کہنا مناسب ہوگا، پتھریلی اور کھردری۔ اس پر بھی پانی نہ ٹھہرتا، فوراً پھسل کر گاؤں کو دولخت کرتے نسلی گس میں جا پڑتا تھا۔ اس حصے کے ڈھلوانی علاقوں میں کہیں کہیں ایسے ٹکڑے تھے جن میں وتر ٹھہر جاتا تھا اور زمین بیج بھی قبول کر لیتی تھی۔ ایسے قطعات اتنا اناج اور چارا اگا ہی لیتے تھے کہ گاؤں والوں کے معدوں میں بھڑکتی آگ کے شعلے بجھتے تو نہ تھے تاہم مدھم ضرور پڑ جاتے... اور لہاریاں بھی بھوکی نہ رہتی تھیں۔

سارے اتاڑ میں بکریاں خوب چرتی تھیں۔ یہاں ہر نسل اور ہر مزاج کی بکریوں کی بھوک مٹانے اور ان کے بدنوں کو فربہ بنانے کا سامان موجود تھا۔ اپنے کھروں کو درختوں کے تنوں پر جما کر اوپر کی شاخوں سے رزق نوچنے والیوں کے لیے لذت بھرے پتوں والے مختلف النوع درختوں کے جھنڈ تھے، تھوڑا سا گردن کو خم دے کر چرے جانے اور آگے ہی آگے بڑھتے جانے والیوں کے لیے جھاڑیاں اور بیلیں تھیں۔ بچھی ہوئی اور پھیلی ہوئی نرم و شیریں گھاس بھی ہر کہیں تھی کہ جسے بربریاں شوق سے کھاتیں اور اپنی نسل تیزی سے بڑھاتی تھیں۔ مگر جس تیزی سے تھوتھنیوں والے پلیدوں نے نسل بڑھائی تھی اس نے سورگ والوں کی نیندیں حرام کر دی تھی۔

اتاڑ سے پرے ادھر جہاں ہموار زمین پر سرکاری رکھ تھی، تھوتھنیوں والے وہاں سے غول در غول آتے تھے اور ہماری زمینوں پر تباہی مچا کر واپس رکھ میں جا چھپتے تھے۔ جب تک بکریاں ہمارے التفات کا محور رہیں، تباہی مچا کر چھپ جانے والوں کی تعداد بھی محدود رہی۔ یا پھر، شاید ان کا پھیرا ہی ادھر کم کم لگتا ہوگا۔ تاہم ہم احتیاط بھی تو کیا کرتے تھے۔ بیری، کریر اور کیکر کے درختوں کی خاردار ٹہنیوں کے چھاپوں کی کھیتیاں جوڑ کر ہم بکریوں کے باڑوں کو چاروں طرف سے محفوظ بنا لیا کرتے تھے۔ جب کبھی تھوتھنیوں والے ادھر آ نکلتے اور اپنی تھوتھنیوں کو ان چھاپوں پر مارتے تو کانٹوں کی چبھن انھیں الٹا بھاگنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ لیکن جب ہمیں مونگ پھلی کی فصل نے بکریوں سے لگ بھگ غافل ہی کر دیا تو وہ اندر تک گھس آتے۔ ان کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ناچار ہم سورگ والوں کو انھیں بھگانے کے لیے پالتو کتوں کی تعداد بڑھا دینا پڑی تھی۔

یوں نہیں تھا کہ پہلے سورگ والے کتے نہیں رکھتے تھے۔ گاؤں کے مستقل مکینوں پر ہی کیا موقوف، وہاں مختصر عرصے کے لئے آنے والے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں میں بھی کتے ہوتے تھے۔ خانہ بدوشوں کے پاس عموماً گدی نسل کے کتے ہوتے۔ سورگ والوں میں سے جنھیں خرگوش کا شکار مرغوب تھا وہ جہازی اور تازی رکھا کرتے تھے۔ ایک دو شوقین مزاجوں کے پاس السیشین تھے اور گاؤں کے کھوجیوں کے پاس پوائنٹر تھا۔ تاہم باقی سب گھروں میں وہ عام نسل کے کتے تھے جو اجنبیوں کو دیکھ کر اچھل اچھل کر بھونکتے تھے یا پھر بکریوں کو شام پڑنے پر دوڑ دوڑ کر اکٹھا کیا کرتے تھے۔

سورگ والوں نے کتوں کی تعداد بڑھائی ضرور تھی مگر یہ تعداد کبھی کافی نہ ہو پاتی تھی کہ لائن لگانے والا یہ بے شرم جانور بڑھتا بھی بڑی سرعت سے تھا۔ براڑھائی مہینے کے بعد ان کی حرام زادیوں کی بکھیاں بھر جاتیں اور سال بعد پتہ چلتا کہ پچھلے برس کے مقابلے اس بار تین گنا زائد آئے اور مونگ پھلی کے کھیتوں کو کھود کر پلٹ گئے۔

شروع شروع میں اپنے ایمانوں کو بچانے کے لئے ہم اس پلید نسل کا نام بھی زبان پر نہ لاتے تھے۔ انھیں مارنے کو جی بھی نہ چاہتا کہ انھیں دیکھتے ہی کراہیت ہونے لگتی تھی مگر جب یہ بہت زیادہ زیاں کرنے لگے تو ہم نے بندوقیں اٹھالیں۔ خوب منصوبہ بندی کر کے ان کا شکار کرتے۔ اور پھر جب سرکار نے کسی سرکاری مصلحت کے تحت اسلحہ رکھنے پر پابندی لگادی تو ہمیں شکاری کتوں کی تعداد بڑھادینا پڑی۔

ہم ان کتوں کو لے کر شکار پر نکلتے تو ہمارے ہاتھوں میں کلہاڑیاں، برچھیاں اور بلم بھی ہوتے۔ کتے انھیں دوڑ دوڑ کر گھیرتے اور ہماری جانب دھکیلتے جاتے۔ ہم ان پر حملہ آور ہو جاتے اور ان کی تکا بوٹی کر دیتے تھے۔ تاہم یہ ایسا موذی تھا کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو ہر بار ضرور زخمی کر دیتا تھا۔

ہم ان کا شکار کھیلتے تو تھے مگر ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ جس تیزی سے وہ بڑھ رہے تھے اس کے مقابلے میں ہمارے ہاتھ لگنے والے جانوروں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ لہٰذا تشویش لامحالہ ہمارے بدنوں اور ہمارے خون کا حصہ ہو گئی تھی۔

تھوتھنیوں والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہمیں مونگ پھلی کے کاشت سے نہ روک پائی کہ اس فصل کے طفیل بھوک ہماری بکھیوں سے نکل کر انھیں فربہ بنا گئی تھی۔ بیوپاری کھڑی فصل کا اتنا عمدہ بھاؤ لگاتے اور اس قدر رقم سے ہماری جھولیاں بھر دیتے کہ ہمارے دیدے حیرت سے باہر کو ابلنے لگتے تھے۔ یہ حیرت تب بھی کم ہونے میں نہ آئی جب ہمیں یہ پتہ چلا تھا کہ بیوپاری تو ادھر شہر میں کارخانے والوں سے، جو اس کا تیل نکالتے تھے یا اسے مزے مزے کے کھانوں کا حصہ بناتے تھے، ہمیں دیئے جانے والے بھاؤ سے کئی گنا کماتے تھے۔ کوئی اور جنس ہمیں اتنا بھاؤ نہ دیتی تھی۔ شاید اسی بھاؤ کی لشک نے ہمیں بکریوں سے بدکا دیا تھا۔

دھیرے دھیرے سارے اتاڑ پر مونگ پھلی ہی کاشت ہونے لگی۔ یہ علاقہ اس کی کاشت برداشت کے لیے خوب موزوں نکلا۔ اس فصل کو نسبتاً لمبا اور گرم موسم چاہیے، تو وہ اس علاقے والوں کا [illegible] مقدر رہا تھا۔ کم از کم جتنی بارش اس فصل کی طلب تھی اتنی خشک سالی کے موسم میں بھی ہو ہی جایا کرتی تھی۔ زمین بھاری ہو تو بہت سا پھل وہی دبائے رکھتی ہے۔ سارا اتاڑ ریتلا میرا تھا۔ ادھر پودے پر ہاتھ رکھا جاتا، ادھر ہلکی پھلکی زمین پھلیوں کے گچھے اگل دیتی۔ ہم سردیوں کے خاتمے سے پہلے پہلے ہل چلا کر مونگ پھلی کی کاشت کے لیے وتر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ انگریزی حساب سے تیسرے مہینے کے آدھے میں اس کی گریاں بوئی جاتیں۔ یہ بوائی کبھی کبھار چوتھے کے آدھے تک چلتی تھی۔ جب پھلیاں بننے پر آتیں تو ہم ان کے بچاؤ کے لیے جنگلی چوہوں کے بل ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان میں زہر کی گولیاں ڈالا کرتے۔ چوہے اور سیہہ پھلیوں کے خاص دشمن تھے۔ مگر ہمیں شہر والے بیوپاریوں نے سائنو گیس، کہ جسے ہم پہلے پہل سینو گیس کہتے تو شہر والے ہنسا کرتے تھے، اور زہر کی گولیاں لادی تھیں۔ یہ ان کے تدارک کے لیے خوب موثر تھیں اور ہم خوش تھے کہ ہم نے تقریباً ان پر قابو پا ہی لیا تھا مگر تھوتھنیوں والوں نے ہمارے سارے حوصلے چھین لیے تھے۔ ایک ایک بکری کو بیماری سے، بگھیاڑوں سے، اور موت کے منہ سے بچانے والے ہم سب بے بس ہو چکے تھے۔ کبھی ہم مستقل دکھوں سے مقابل ہونے میں ہمہ وقت معروف رہتے تھے۔ اور اب بے بسی کی فرصت ساری مصروفیت پر غلبہ پا گئی تھی۔

مونگ پھلی کی کاشت بجائے خود زیادہ مصروفیت کا مشغلہ نہ نکلی۔ پہلے برس جب اتاڑ کو ہموار کرنا پڑا تھا، اپنے اپنے نام کھتوئے گئے خسروں کے حساب سے کھیتوں کے گرد حدیں بنائی تھیں۔ کھیتوں کے اندر آجانے والے کیکروں، بیریوں، جھڑ بیریوں اور کنیروں کو کاٹ کاٹ کر بالن بنانے کے لئے ان کے ٹوٹے ٹوٹے کئے تھے۔ ہل چلا کر کھبل اور مرواکو جڑوں سے اکھیڑا گیا اور گھاڑ ایک جگہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ بس وہ پہلا برس ہی شدید مصروفیت والا نکلا۔ یہی پہلا برس بکریوں کے پیٹ بھر کر چنے کا آخری سال بن گیا تھا۔ وہ درختوں سے اترنے والے سبز پتوں سے لدی چھانگوں پر منہ مارتے ہوئے یا اکھڑی ہوئی نرم نرم جھاڑیوں کو جبڑوں میں چباتے اور ڈھیروں کی صورت پڑے گھاڑے کو چرتے ہوئے ہمیں اس بات کا احساس تک نہ دلا پائی تھیں کہ آنے والے برسوں میں ان کی بکھیاں خالی بھبھان رہیں گی حتیٰ کہ وہ خود بھی نہ رہیں گی۔ تاہم ہمارے پیٹ چربیلے ہونے شروع ہو گئے اور عجب طرح کی فرصت نے ہمارے وجودوں میں کاہلی کا بے لذت پانی بھر دیا تھا۔

مونگ پھلی کی کاشت کے بعد سے لے کر زمین رنگ پھلیاں بننے تک ہم فارغ رہنے لگے۔ پھلیاں بنتیں تو ہم چوہوں کے بلوں کو تلاش کر کے ان میں زہریلی دوا ڈالتے۔ یہ بھی کوئی ایسی مصروفیت نہ نکلی تھی کہ ہمارے وجودوں میں زندگی کی ہمک بھر دیتی۔ لہٰذا ہم بہت جلد اوب جایا کرتے۔ کھاٹیں لمبی کرتے اور اب تک کچے بن چکے گھروں کے دبیز سایوں میں دراز ہو جاتے۔

ہمیں کسالت نے جکڑے رکھا... اور تھوتھنیوں والے اس قدر بڑھ گئے کہ کتوں کی خاطر خواہ تعداد بڑھادینا پڑی۔

اور اب یہ ہو چکا ہے کہ کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں... بہت زیادہ اور بہت قوی... اتنے زیادہ کہ ہمارے حصے کا رزق بھی کھا جاتے ہیں... اور اتنے قوی کہ ان کی زنجیریں ہماری ہتھیلیوں کو چھیل کر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ یہ کتے ہمارے کھیت اجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے۔ ممکن ہے ان پلیدوں کے بار بار بدن تان کر کھڑا ہو جانے کے سبب کوئی سہم ان کے دلوں میں سما گیا ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو، صورت احوال یہ ہے کہ تھوتھنیوں والوں کو غراہٹوں کی اوٹ میسر آ گئی ہے۔ کتے دور کھڑے فقط غرائے جاتے ہیں۔ ہم سے زخمی ہتھیلیوں میں بلم، برچھیاں اور کلہاڑیاں تھامی ہی نہیں جا رہی لہٰذا ہم خوف اور اندیشوں سے کانپے جاتے ہیں... اور کچھ یوں دکھائی دینے لگا ہے کہ جیسے اس بار تھوتھنیوں والے انھیں کتوں کی غراہٹوں کی محافظت میں ہمارے سارے کھیت کھود کر ہی پلٹیں گے ☆☆☆

محمد سلیم الرحمٰن

شمارہ ۱۷۲،
جنوری ۱۹۹۴

(۱)

کچی پکی سویر تھوڑی تاراما تھے چاند دنیا کی پائینتی کا یا کا جوگیا چھایا
دساسول کے رخ بڑھتا ہوا۔ گیروی بارکوں میں منہ اندھیرے کی
وردی۔ کسوف
میں ملبوس فوجوں کی رگد بگد۔ آخری پہرے کی لالٹینوں کی لویں،
کسی نحس
فال کی صورت، لہولہان تلواروں کی مثال، تلتی جھکتی ہیں۔
سائرنوں، سنگینوں
اور چتاؤں کا یہ نصاب، کسی سکندری سد پر لکھے نوشتے کی مانند،
ہماری آنکھوں
میں سلائیوں کی طرح پھرے گا۔
چندھی آنکھوں سے دیکھنے والے سلحشوروں کو دھویں اور آگ کی
مچانوں
پر چڑھتے اترتے کوندوں پر خلعتوں اور تمغوں کا گمان ہوتا ہے۔
زمین اور آسمان کی
چکیوں میں پس کر غبار ہوتے کلنک دن کی شام تو کیا دوپہر چڑھتی
بھی نظر نہیں آتی

(۲)

ایسی صبح جو گھر کا دروازہ کھلتے ہی زمین اور آسمان کے آخر تک
چھا جاتی ہے، نیلے
اور گلابی غبار سے لبالب، دھیرے دھیرے کپکپاتی ہوئی، جیسے ہوا
کی پہلی ہی چھیڑ چھاڑ
میں پنکھڑی پنکھڑی ہو کر بکھر جائے گی۔
آسمان کی زعفرانی شیرینی میں متھی ہوا درختوں کو گدگداتی ہے۔
چوڑی
چھب تختی والا آسمان اتنا اونچا کہ آنکھیں راستے میں بھٹک
جائیں، اس کی نیلاہٹ
پختہ، امٹ، جیسے کسی پرتپاک آگ میں پکائی گئی ہو۔
اچانک کہیں سے آئینوں کی طرح چمکیلے اور سوؤں کی طرح باریک
دو چناد ھاری جیٹ گرجتے ہوئے آتے ہیں اور آنکھوں میں
چکا چوند جھونک کر غائب
ہو جاتے ہیں۔ ایک مہیب گرج آسمان سے اتر کر زمین پر لوٹتی
ہے، اور اس کے
بعد کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ کر نیچے آ گرتی ہے، آہستہ آہستہ، نیم جان،
مہین اور
بالکل نحیف، بال بال۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے چہرے پر ایک بوند
آ گری ہے یا
کوئی آنسو۔
چڑیاں درختوں میں چھپ گئی ہیں۔ پتے گرتے ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن

شمارہ ۲۱۶،
مئی ۱۹۹۸

کوئی تیس چالیس منٹ شاہی باغ میں مارامارا پھرتا میں وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا یعنی ٹینس کلب کے بغل میں بنے ہوئے کھلی فضا کیفے کے سامنے۔ دو خاصے غیر صحت مند اور ادھیڑ آدمی ٹینس کی نقل اتار رہے تھے۔ دیکھ کر محسوس ہوا کہ شاید ٹی وی پر کسی تیسرے درجے کے بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے گئے گزرے لمحات کو آہستہ روی سے مکرر پیش کیا جا رہا ہے۔ میں انھیں دیکھتا اور سوچتا رہا کہ بے لطفی کے لیے چائے پیوں یا گھر کا رستہ لوں۔

چھٹی کے دن صبح سویرے خراب ہونے مجھ جیسا آدمی باغ کیسے جا پہنچا جسے سیر کرنے کا مطلق شوق نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ پچھلی حکومت میں ایک وزیر میرے جاننے والے تھے۔ انھوں نے مجھے ماحولیات کے محکمے میں خصوصی معاون لگا دیا تھا۔ حکومت بدلتے ہی برطرفی کا پروانہ میرے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ آخر نئے آنے والوں نے تو اپنے کسی ہوتے سوتے کو خوش کرنا ہوگا۔ اتفاق کی بات کہ جو صاحب اس مرتبہ ماحولیات کے وزیر بنے، ان کے چچا میرے مرحوم والد کے جاننے والوں میں تھے۔ سوچا کہ ان کی منت سماجت کرنی چاہیے۔ شاید ملازمت پر بحال کیے جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ چچا جان رہتے کہاں ہیں، البتہ یہ سننے میں آیا کہ چھٹی کے دن صبح کو باغ میں ٹہلنے ضرور آتے ہیں۔ ان سے باغ میں ملنے کی ٹھان لی۔ اکیلے ہوں گے۔ صبح کے وقت، فضا کی تازگی اور باغ کی ہریالی کی وجہ سے مزاج پر شاید شگفتگی بھی طاری ہو۔ کیا خبر، کام بن ہی جائے۔ موقع ملا تو چائے کی دعوت بھی دے ڈالوں گا۔ باغ کا کیفے کچھ اتنا مہنگا نہیں۔ خیر، ان کی تلاش میں صبح صبح باغ کا رخ کیا۔ سارا باغ چھان مارا مگر ان کے دیدار نہ ہوئے۔ دل کو تسلی دی کہ شاید شام کو آتے ہوں۔ قسمت آزمانے کے لیے شام کو دوبارہ چکر لگا لوں گا۔

سفیدے کے درختوں پر اتنے کوے بیٹھے تھے کہ حد نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر بھر کے کووں نے باغ پر دھاوا بول رکھا ہے۔ سامنے گلابوں سے لدے تختے دھوپ میں دہک رہے تھے۔ پھولوں پر دہکتے انگاروں کا گمان ہوتا تھا۔ پھولوں کو دیکھتے دیکھتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ چائے پی جائے گی۔ میں مڑ کر آہستہ آہستہ کیفے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے میرے بائیں کندھے پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میں اچھل پڑا۔ لمحے بھر کو ایسا لگا کہ پورا بازو سن ہو گیا ہے۔

اپنے پرانے ہم جماعت قادر بھائی کراکری والا کے اغوا ہونے کے بعد سے مجھ پر کبھی کبھی خواہ مخواہ گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی۔ پتہ نہیں، دل میں یہ خیال کیوں بیٹھ گیا تھا کہ مجھے بھی کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ قادر بھائی کراکری والا کا قصہ بھی عجیب ہے۔ ان کے اغوا کو کئی مہینے ہو گئے۔ کوئی سراغ نہیں ملا۔ رات کو بیگم کے ساتھ کسی شادی میں شرکت کر کے لوٹ رہے تھے۔ ایک جگہ سڑک بالکل ویران تھی۔ وہاں چند مسلح آدمیوں نے انھیں روکا اور کار سے اتار کر لے گئے۔ بیگم کو کچھ نہیں کہا۔ بیگم کا بیان بڑا اوٹ پٹانگ تھا کہ دو آدمی تو ڈھائی فٹ کے تھے۔ اور تین آٹھ آٹھ فٹ لمبے۔ اور یہ کہ وہ قادر بھائی کو گھسیٹ کر ایک مدھم روشنی والے پیپے کی طرف لے گئے اور اس کے اندر دھکیل دیا۔ پیپے کے

درمیان پہنچ کر قادر بھائی ایک فٹ کے نظر آنے لگے۔ پھر پیا نظر سے غائب ہو گیا۔ وہ چھوٹی بڑی مخلوق بھی تھوڑی دور کھڑی اڑن طشتری میں بیٹھ کر ہوا ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ بیگم نے کسی نہ کسی طرح قادر بھائی کو ٹھکانے لگوا دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال، بات کہاں نکل گئی۔ تو کندھے پر وہ کرارا ہاتھ پڑا کہ ایک دفعہ تو لگا کہ چودہ طبق گل ہوئے کہ ہوئے۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کان کے پاس کسی نے کڑک کر کہا: "ابے مرزا عاشق بیگ، آخر آج مل ہی گیا۔"

میں نے مڑ کر نظر ڈالی تو ایک آدمی دکھائی دیا جو ملا دلا سوٹ پہنے مسکرائے جا رہا تھا۔ بڑا سا گول مٹول چہرہ، بھویں بہت موٹی اور جتی ہوئیں۔ ہونٹ پان کھانے سے لال اور ایک طرف کی باچھ پر پیک باہر نکل کر جمی ہوئی۔ جسم بھاری بھرکم مگر بے ڈول۔ میں نے بھنا کر کہا: "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مرزا عاشق بیگ نہیں۔"

اس پر وہ زور سے ہنسا اور پہلے کی طرح کڑک کر بولا: "کیوں مرا جا رہا ہے، یار۔ خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ وہ چالیس روپے نہیں مانگوں گا جو تو آٹھ سال پہلے اپنی ماں کی بیماری کے بہانے لے گیا تھا اور جا کے جوئے میں ہار آیا تھا۔ ارے یار، تجھے تو پتہ ہے اور چیزوں کے علاوہ میرا دل بھی بڑا ہے، ہاہا۔"

اس آدمی سے ملاقات اور اس کی گفتگو میرے لئے بہت کوفت کا باعث ثابت ہو رہی تھی۔ مستزاد یہ کہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر مجھ سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز دور دور تک سنی جا سکتی تھی اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ سوچتا تھا کہ جانے کون کون اس واہی تباہی گفتگو کو سن کر حیران پریشان یا لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ لوگ دل میں کہیں گے کہ یہ لفنگے باغ میں کہاں سے آدھمکے جنہیں شائستگی چھو کر نہیں گذری۔ وہ شخص تو بظاہر ہر قسم کے لحاظ کو بالائے طاق رکھ چکا تھا مگر میں بالکل راضی نہ تھا کہ کوئی اجنبی میرے ساتھ بلا تمہید اس قماش کی سوقیانہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرے۔

میں نے آواز کو حتی الامکان غضب ناک بنا کر مگر چلائے بغیر کہا: "میں مرزا عاشق بیگ نہیں ہوں۔ کتنی بار بتاؤں؟ اس طرح منہ پھاڑ کر بولنے کی ضرورت نہیں۔ جو بات کرنی ہے تمیز سے کرو۔"

اس آدمی نے مجھے غور سے دیکھا، سر ہلایا، لمحے بھر کے لئے نظر اٹھا کر آسمان کو تکا، اور آہ بھری، جس پر گھٹیا قسم کی اداکاری کا گمان ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کہنے لگا: "میں خوش ہوا تھا کہ بچپن کا یار اچانک مل گیا۔ مگر تو ہے کہ اپنے ہونے ہی سے انکاری ہے۔ اس میں بھی کوئی گھونچو پنے والی مصلحت ہوگی۔ اگر تجھے پتہ چل جائے کہ اب میری کیا حیثیت ہے تو فوراً میرے آگے سجدے میں گر پڑے۔ مگر منہ دوسری طرف کرکے۔ میں تجھے معاف کرتا ہوں۔ تو پہلے جتنا ماچہ خر تھا اب بھی اتنا ہی ہے۔ آ، میں تجھے کھلاؤں پلاؤں۔"

یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ کم بخت میں غضب کا کس بل تھا۔ یوں لگا کہ کسی نے بازو کو فولادی شکنجے میں جکڑ لیا ہے اور اگر میں نے ذرا نا نکر کی تو مجھے گھسیٹ کر کینٹے لے جائے گا اور یہ مزید تماشا رہے گا۔ میری خواری جو ہوگی سو الگ۔ چنانچہ خیریت اسی میں نظر آئی کہ انکار نہ کروں۔ اگر اسے ان جانے، راہ چلتوں کے کھلانے پلانے پر روپیہ اڑانے کا اتنا ہی شوق ہے تو میرا کیا بگڑتا ہے۔ میں نے کہا: "میں چلتا ہوں۔ پہلے میرا بازو چھوڑو۔"

اس نے بازو چھوڑ دیا اور ہم اطمینان سے چل کر ایک میز پر جا بیٹھے۔ اس وقت کینٹے میں چند لوگ ہی تھے۔ بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔ ایک بیرا جو غالباً ہماری گفتگو سنتا رہا تھا، مسکراتا ہوا جھپٹ کر ہماری طرف آیا اور صافی سے میز چمکانے لگا۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا کیا دستیاب ہے اور پھر ایک سٹیم روسٹ، دو پلیٹ چپس، دو پلیٹ شامی، رائتہ، سلاد اور نان لانے کا حکم دیا۔

یہ آرڈر سن کر مجھ پر نئے سرے سے خلجان طاری ہو گیا۔ اس آدمی سے میں بالکل واقف نہ تھا اور اس کی وضع قطع سے کسی قسم کی امارت ظاہر نہ ہوتی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوئی کہ بل بہت زیادہ آئے گا اور فرض کیا کہ یہ آدمی بل ادا کرنے سے مکر گیا اور اٹھ کر چل دیا تو کیا ہوگا؟ کیا میں اس سے ہاتھا پائی کر سکوں گا؟ کیا ایسی صورت میں کینٹے والے بالآخر ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیں گے؟

میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی ہوں گی یا پھر اس شخص کو دوسروں کے خیالات بھانپ لینے کا ملکہ حاصل تھا، کیوں کہ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا: "اب تیری جان یہ سوچ کر نکلی جا رہی ہے کہ بل کون دے گا، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ بیوقوف، یہ دیکھ!" یہ کہتے کہتے اس نے کوٹ کی اندر کی جیب سے بٹوا نکالا اور کھول کر دکھایا۔ اس میں سو سو کے دس بارہ نوٹ نظر آ رہے تھے۔ ڈھارس بندھی کہ میرا میزبان پھانک نہیں ہے۔ تاہم اس بارے میں میرا شبہ اب بھی قائم تھا کہ کہیں بل دینے سے پہلے ہی اٹھ کر بھاگ نہ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے سخت غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے کسی حالت میں اس کی دعوت قبول نہ کرنی چاہیے تھی۔

ادھر میرا دم خشک ہوا جا رہا تھا ادھر اس شخص پر ایسی طمانیت طاری تھی جیسے ہر فکر سے آزاد ہو چکا ہو۔ کچھ دیر چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد ارشاد ہوا: "دنیا بھی خوب جگہ ہے۔"

میں نے بے دلی سے کہا: "شاید۔"

میری جانب سے غیر یقینی کے اظہار پر اس نے مطلق توجہ نہ دی اور کہنے لگا: "اس سال بس آخری بار چہ ندم خرندم۔ اب دیکھیے، دوبارہ کب آنا ہو۔ ویسے میں عام طور پر پاکستان نہیں آتا۔ پتہ نہیں اس دفعہ کیا سوجھی۔ وہ کیا شعر ہے، خاک وطن کا ہر ذرہ نا خدا ہے یا کیا ہے؟ خاک وطن کو چرغا بنا کے کھا جاؤں۔" اس کے بعد وہ بیچ بیچ لہک لہک کر گنگنانے لگا۔ "چرغا بنا کے کھاؤں، مرغا بنا کے چھوڑوں۔"

پہلے پہلے مجھے اس کی بدتمیزی ناگوار گذری تھی۔ اب یہ باتیں سن کر دماغی صحت کے بارے میں بھی شک پیدا ہو گیا۔ "اس سال بس آخری بار" والی بات سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے تھے کیوں کہ یہ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا اور سال ختم ہونے میں ابھی آٹھ مہینے پڑے تھے۔ کیا باقی سال یہ منحوس بھوکا رہے گا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ کسی ایسے فرقے سے تعلق رکھتا ہو جس کے نزدیک نیا

سال موسم بہار سے شروع ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ نوروز بھی گذر چکا ہے۔ یہ اس لئے یاد آیا کہ میرے ایک دوست نے، جو نوروز کے موقع پر کوئی خاص عمل پڑھتے تھے، مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ میں دعوت پر تو نہیں جاسکا تھا لیکن اتنا یاد تھا کہ یہ دس بارہ دن پہلے کا ذکر تھا۔

میری الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اگر وہ شخص یہ کہتا کہ ''زندگی میں آخری بار'' تو بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس پرتکلف طعام کے بعد اس کا خودکشی کا ارادہ ہو، بلکہ میری رائے میں اس جیسے آدمی کو خودکشی کر ہی لینی چاہیے تھی۔ کچھ اسے گنگنانے سے باز رکھنے کے لئے اور کچھ تجسس کی وجہ سے مجبور ہوکر میں نے پوچھا: ''یہ آپ نے کیا فرمایا؟ اس سال آخری بار؟ میں سمجھا نہیں۔''

اس پر وہ بہت ہی برہم ہوکر چنگھاڑا: ''یہ آپ آپ کیا لگا رکھی ہے؟ بچپن کے لنگوٹیے سے اس طرح بات کرتے ہیں؟ مستک میں دیمک لگ گئی کیا؟ واہ رے آپ، نہ تیری ماں نہ تیرا باپ۔ اگر اب تو کے علاوہ مجھے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ کیا پوچھ رہا تھا؟ مجھے غصہ دلا کے بھلا دیا۔''

''اس سال آخری بار؟''

''ملازم جو ہوا۔ نوکری کی کیا مرضی۔ سنا نہیں۔ نوکری ارنڈ کی جڑ۔ اب اگلے سال ہی ادھر آنا ہوگا۔''

''ایسی کیا ملازمت کہ سال بھر کھانے کو کچھ نہ نصیب ہو۔''

''کھانے کو کیوں نہیں ملے گا مگر وہ اور طرح کا ہوتا ہے۔ میں باہر والوں کے پاس نوکر ہوں نہ۔ ان کا کھانا پینا سب سالا بے تکا۔ کیا بتاؤں۔ تو سمجھے گا کہاں۔''

باہر والوں سے کیا مراد ہے، میں نے سوچا امریکی؟ یورپی؟ یہ صحیح ہے کہ ان کے کھانے عام طور پر ہمیں ابالے سہالے یا روکھے سوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اتنے بدذائقہ بھی نہیں ہوتے کہ ایک ایک کر کھانے کی نوبت آجائے۔ اس کے علاوہ مرچ مسالے تو اب دنیا بھر میں مل جاتے ہیں۔ شاید ملازمت کے سلسلے میں کسی ویرانے میں رہنا پڑتا ہو۔

''تو کوئی ویران جگہ ہے جہاں کام کرنا پڑتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''امریکی کمپنی ہوگی کوئی۔''

اس نے مجھے حیران ہوکر دیکھا۔ ''یار تو گھامڑ ہی رہا۔ میں باہر والے کہہ رہا ہوں۔ تو امریکی کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ ابے، وہ باہر والے۔ وہی جو اڑن طشتریوں میں یہاں آتے جاتے ہیں۔''

اب مجھے اس کے فاترالعقل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ اتنے میں بیرا ہمارا آرڈر لے آیا۔ اس آدمی نے بڑے جوش سے سٹیم روسٹ کا بڑا سا ٹکڑا توڑ کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت گرم ہے ابھی۔ چھ سال ہوگئے ملازمت کرتے۔ اب اور کچھ کرنے کی خواہش نہیں۔ اسی میں خوش ہوں۔''

''ملازمت ملی کیسے؟'' میں نے بات چیت جاری رکھنے کی غرض سے پوچھا۔ ''کہیں دفتر ہے ان لوگوں کا یا کیا؟''

''دفتر کھول کے انھوں نے کیا کرنا ہے؟ میں ان دنوں ایک دکان پر سیلز مین تھا۔ عید سے ذرا پہلے کی بات ہے۔ دکان دیر تک کھلی رہی تھی۔ کڑاکے کا جاڑا۔ سائیکل پر گھر جا رہا تھا۔ راستہ ویران۔ غضب کی ٹھنڈی ہوا۔ ایک جگہ یہ تاکا لگائے کھڑے تھے۔ مجھے روکا۔ اٹھا کے لے گئے۔''

''یہ تو زبردستی ہوئی۔''

''ہاں۔ لیکن ملازم اسی وقت رکھا جب میں نے ہاں کر دی۔ انکار کرتا تو واپس چھوڑ جاتے۔ تب سے انھیں کے پاس ہوں۔ سال میں پندرہ دن کی چھٹی دیتے ہیں۔ لاکھ روپے مہینے کی تنخواہ ہے۔''

''اور کیا۔ چاہیں تو کروڑ دے ڈالیں۔ ان کے لئے کیا مشکل۔''

''اور گھر والے؟''

''کہیں ہوں گے وہ بھی۔ مجھے کیا؟ گھر میں دو ہی تو تھے۔ ایک بیوی جس سے میرا ویسے ہی ناک میں دم تھا۔ دوسرے باوا جان، جن کے بس دو ہی کام تھے۔ اخبار پڑھ لیا اور دوستوں کے ساتھ رمی کھیلنے بیٹھ گئے۔ کیا پتہ، باوا جان اور بیوی میں اچھی نبھ رہی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھ ماری۔

اس شخص کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی کراہت آمیز پہلو تھا۔ کھانے کا انداز بھی تمیزداری سے خالی تھا۔ چپڑ چپڑ کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ پہلا لقمہ ٹھیک طرح چبانے نہ پاتا کہ دوسرا منہ میں ٹھونس لیتا، جیسے، بہت جلدی میں ہو یا ندیدے پن کا مارا ہوا ہو۔

''سال کے بارہ لاکھ ہوئے۔ تو اتنے بہت سے پیسوں کا کرتے کیا ہو؟''

''کرنا کیا ہے۔ پندرہ دن کی چھٹی میں تم جیسوں کی ماؤں بہنوں پر خرچ کرکے خلاص۔ بہترین ہوٹل میں قیام، بہترین کسبیاں، بہترین کھانا پینا۔ اس کے بعد پلے جھاڑ کے یہ جا وہ جا۔ پھر وہی کولھو کے بیل۔ مجھے اس طرح حیران ہوکے کیا دیکھ رہا ہے؟ ابے میں ہی نہیں، مجھ جیسے ہزاروں ان کے ملازم ہیں۔ اور باہر والوں میں سے کتنے ہی انسان بنے دنیا میں رہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اپنے خیال میں دنیا پر قبضہ انھیں کا ہے۔ پتہ ہے، ان کی کیا پہچان ہے؟''

''اڑن طشتریوں میں آتے ہیں اور عجیب عجیب شکلیں ہوتی ہیں۔''

''ہشت۔ ابے میں ان کی بات کر رہا ہوں جو انسان کی جون میں یہاں پھرتے رہتے ہیں۔ ان کی خاص پہچان ہے۔ چال ڈھال، چہرے مہرے، سب میں عجیب سی اکڑاہٹ، جیسے چوٹی سے ایڑی تک کلف لگا ہو۔ میں تو اب صاف پہچان جاتا ہوں۔ تیرے جیسوں کا پتہ نہیں۔''

''دنیا میں رہنے سہنے اور آنے کا مقصد؟''

''نہ جانے کیا چکر ہے۔ نہ کبھی انھوں نے بتایا نہ اپنی سمجھ میں آیا۔ معلوم کرکے کرنا بھی کیا۔ روزگار لگا ہوا ہے۔ بات ختم۔ بگاڑیں، بنائیں، گاڑیں اکھاڑیں، ہمیں کیا۔''

''کام کیا ہے... تمھارے ذمے؟''

کہنے کو تو میں ''تمھارے'' کہہ گیا مگر فوراً کانپ اٹھا کہ وہ پھر اول فول بکنے پر اتر آئے گا لیکن وہ مزے لے لے کر ڈھکوسنے اور اپنی کتھا سنانے میں اتنا منہمک تھا کہ اس بے ادبی کا کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگا: ''کام؟ بتاؤں تو تجھے یقین نہ

آئے گا۔ بس ہفتے میں ایک دو بار ارہر کی دال پکا کے دینی ہوتی ہے۔"

یوں اس ساری گفتگو کا کوئی سر تھا نہ پیر لیکن ارہر کی دال کا ذکر اس قدر اڑنگ بڑنگ انداز میں آیا کہ میرے ہاتھ سے چکن کی بوٹی چھوٹ کر رائتے میں جا گری۔ "ارہر کی دال!" میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں، ارہر کی دال۔ کھانا تو میں پہلے بھی اچھا پکا لیتا تھا مگر اب ہاتھ ایسا رواں ہو گیا ہے کہ تو اگر میری پکی ہوئی ارہر کی دال چکھ لے تو کتے کی طرح عش عش کرتا رہ جائے۔"

اب میں اس کی بدزبانی کا عادی ہو چکا تھا۔ بھلا کتے کا عش عش سے کیا تعلق؟ میں نے سوچا کہ غلطی سے عف عف کی جگہ عش عش کہہ گیا ہوگا۔ بہر حال، ارہر کی دال کا موضوع ایسا تھا جس پر مزید تبادلۂ خیال ممکن معلوم ہوا۔

"ارہر کی دال میں ایسا کیا ہے، جو باہر والے اسے شوق سے کھاتے ہیں؟"

"ان کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ کیا لفظ ہے، یار، وہی کیمیا گری کا؟ ہاں، اکسیر۔ تو اکسیر ہوگی ارہر کی دال میں۔ اب اگر انسانوں کو نہیں معلوم تو پھریں جوتیاں چٹخاتے۔"

"ایک وقت میں کتنی دال پکانی پڑتی ہے؟"

"کم سے کم پانچ کلو پختہ۔"

"چاولوں سے کھاتے ہیں یا روٹی کے ساتھ؟"

"مجھے کیا معلوم۔ کھاتے دیکھا ہی نہیں۔ جب خود انھیں ہی آج تک نہیں دیکھا تو کھاتے کہاں سے دیکھتا؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟ اٹھا کے لے گئے، بات چیت کی، ملازم رکھ لیا اور اب کہتے ہو کبھی دیکھا نہیں۔"

"اس وقت تو آدمی بنے ہوئے تھے۔ ان کی اصل شکل کیا ہے، وہ نہیں معلوم۔"

"لیکن جب ان کے ساتھ رہتے ہو تو دیکھتے ہی ہو گے۔"

"نہیں۔ مجھے ایک کمرہ ملا ہوا ہے۔ ساتھ میں کچن ہے۔ جب دال پکانے کا حکم ملتا ہے، پکا کے کچن میں رکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہیں۔ وہ تو منہ سے بولتے بھی نہیں۔ بس دماغ میں ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی کان میں گھسا گھس پھس کر رہا ہو۔"

"مردانہ آواز ہوتی ہے کہ زنانہ؟"

"مشینی سی آواز ہوتی ہے۔ مرد کی سمجھ لو۔ ہر لفظ الگ الگ اٹک اٹک کر بولتے ہیں۔ ایسے: آج... وقفہ... پانچ... وقفہ... کلو... وقفہ... ارہر... وقفہ... کی... وقفہ... دال... وقفہ... پکاؤ۔"

"بڑی بور نوکری ہے۔ جب دال نہیں پکانی ہوتی تو کمرے میں پڑے رہتے ہو؟"

"ہاں فلمیں دیکھتا ہوں۔ لاکھوں فلمیں ہیں ان کے پاس۔ ذرا سی ٹکیا ہے۔ پتہ نہیں کس چیز کی۔ رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ہر ٹکیا میں ہزاروں فلمیں۔ گانے سنتا ہوں۔ یا ایک خاص طرح کی گولی ہے، وہ کھا لیتا ہوں۔ نیند آ جاتی ہے۔ اسے کھا کے مہینوں سو سکتا ہے آدمی۔ جب انھیں کام ہوتا ہے اٹھا دیتے ہیں۔"

"خود بھی ارہر کی دال پر گذارا کرنا پڑتا ہے؟"

"وہ تو ان کے لئے پکتی ہے۔ اس نوکری کا بس یہی واہیات پہلو ہے کہ کھانے کو ڈھنگ کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ کچن میں ڈبے رکھ دیتے ہیں کسی طرح کی لپسی سے بھرے۔ وہی کھاتا ہوں۔ بدذائقہ؟ اونہوں۔ پھیکی کہہ لو۔ طاقت کا خزانہ ہے لیکن کھانی بھی لازم ہے۔ یہ ملازمت کی شرطوں میں سے ہے۔"

"سنائے جا، بھئی، سنائے جا۔ ایسی گپیں روز روز کہاں سننے کو ملتی ہیں۔" میں نے بھی تھوڑی بے تکلفی جتانے کی جرأت کی۔

"مان نہ مان۔ مجھے کیا۔ میں کئی بار چاند پر بھی جا چکا ہوں۔ ایک دفعہ بڑا لمبا سفر کیا۔ کوئی دو مہینے چلتے رہے۔ پتہ نہیں کہاں پہنچ گئے۔ مجھے ایک خاص طرح کا لباس پہنا کر اڑن طشتری سے باہر نکال دیا کہ ذرا سیر کر آ۔ ایک طرف شیشے کی بنی اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ میل میل کی تو ہوں گی۔ دوسری طرف، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، گھاس کا میدان۔ بالکل سنہری گھاس۔ آسمان بھی اور طرح کا۔ دو سورج تو ڈوب رہے تھے۔ دو ڈھل چکے تھے، ایک سر پر تھا۔ جب رات ہوئی تو آسمان ستاروں سے بھر گیا۔ لاکھوں ستارے ہوں گے۔ فضا میں عجب سنسناہٹ تھی۔ روشنی سے چٹ چٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔"

یکا یک مجھے خیال آیا۔ میں شامی کباب کھاتے کھاتے رک گیا۔ "خلا میں دن رات ہی نہیں ہوتے تو یہ دو مہینے لمبا سفر کیسا؟ گپ مارنے کے لئے بھی عقل چاہیے۔"

اس نے غضب ناک ہو کر مجھے گھورا اور کرسی سے ذرا اٹھ کر آگے کو جھکا جیسے میرے منہ پر جھانپڑ رسید کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے بھی بچاؤ کی خاطر کانٹے کو مضبوطی سے پکڑ کر سامنے کر دیا۔ خیریت گذری کہ مار پیٹ کی نوبت نہ آئی۔ وہ خود ہی شاید خون کا گھونٹ پی کر باز آگیا اور غرا کر بولا: "تجھے خلا کی بڑی خبر ہے، کتے کی دم، کہیں آیا نہ گیا۔ میرے کمرے میں ٹی وی کی اسکرین جیسا پینل لگا ہے۔ اس پر تاریخ مہینہ آتا رہتا ہے۔ اسی کے حساب سے تنخواہ چھٹی ملتی ہے۔"

اس مرحلے پر گفتگو میں رکاؤ آگیا۔ ہم پلیٹوں کو صفا چٹ کرنے میں جٹ گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ دگنا کھانا موجود ہوتا تو اسے بھی وہ اکیلا ہی ٹھور جاتا۔ جب کسی رکابی میں کچھ بھی باقی نہ رہا تو اس نے چمچہ بجا کر بیرے کو بلایا اور کہا: "جلدی سے چائے لاؤ۔ وقت کم رہ گیا۔"

"اڑن طشتری چلتی کیسے ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ایٹمی طاقت سے؟"

"کمرے سے باہر کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ نہ پتہ کرنا چاہتا ہوں۔ ابے وہ بڑے ترقی یافتہ ہیں۔ ہم سے لاکھوں سال آگے۔ جانے کیا کیا کرتب آتے ہیں انھیں۔ بوڑھے کو جوان بنا دیں، جوان کو بوڑھا۔ مرد کو عورت بنا دیں، عورت کو مرد۔ یہ سب ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، باوا۔"

"بدصورت کو خوبصورت نہیں بنا سکتے؟"

"تو مجھ پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ ارے بے دال کے بودم، خوبصورتی بدصورتی میں کچھ نہیں دھرا۔ اصل چیز ہے صحت اور جوانی۔ اتنی سمجھ مجھ میں ہے کہ ان کے پاس رہوں گا تو ہزار سال تک صحت اور جوانی میں فرق نہیں

آنے کا۔ یہ باہر والے بڑی شے ہیں۔ ہر بار چھٹی سے پہلے ایک شیشی گولیوں کی دیتے ہیں مجھے۔ مت پوچھ، کیا ہیں وہ گولیاں۔ میں تو انہیں کیر بہدف کہتا ہوں۔ سمجھا؟ فارسی جانتا ہے؟"

مجھے "تیر بہدف" کے اس بگاڑ پر ہنسی آئی اور تھوڑا سا تعجب ہوا کہ اسے اتنی فارسی آتی ہے۔ چنانچہ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "فارسی کہاں سے سیکھ لی؟ باہر والوں سے؟"

"ارے نہیں، لڑکپن میں پوری گلستان پڑھی تھی دادا سے۔ تیری طرح صرف گٹ پٹ پر گذارا نہیں۔"

"باہر والے پڑھتے کیا ہیں؟"

"پڑھتے؟ اب مجھے آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ بولتے کیا ہیں۔ تو پڑھنے کی بات کررہا ہے۔"

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اس نے آستین کھسکا کر گھڑی پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر پوچھا: "تو کیا کررہا ہے؟ کہیں نوکر ہوگا۔"

اس پر میں نے مختصراً اپنی داستان غم سنائی۔ اس نے چچ چچ کر کے ہمدردی کا اظہار کیا، پیالی خالی کر کے طشتری میں پٹخی اور بولا: "میری مان تو باہر والوں کا ملازم ہوجا۔ تیری سفارش کردوں گا۔ کوئی نہ کوئی کام تیرے ذمے لگادیں گے۔"

اس کی بات میں نے سنی ان سنی کردی۔ بے شک اس کے پاس بارہ تیرہ سو روپے تھے مگر روپوں کا کیا ہے۔ فقیروں تک کے پاس بعض اوقات سفید پوشوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اب تک کی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر یہ آدمی مذاق نہیں کررہا تو اس کی صحیح جگہ پاگل خانہ ہے۔

میری طرف سے جواب نہ ملنے پر اس نے منہ بنایا، لمبی سی جمائی لی، اکتاہٹ بھری نظر ادھر ادھر ڈالی، ایک بار پھر گھڑی کو دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ میں نے دل میں کہا کہ اس طرح کا کوئی پاگل روز کہاں ملے گا اور غور سے اسے دیکھتا رہا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اس نے چہک کر کہا: "ارے واہ! بڑی پٹاخا چیز آرہی ہے۔"

میں نے گردن گھما کر چھچھلتی نظر ڈالی۔ ایک دراز قد اور خوش شکل عورت لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی آرہی تھی۔ مجھے اس اندیشے نے آگھیرا کہ کہیں یہ شخص بل ادا کئے بغیر اٹھ کے عورت کے پیچھے نہ ہولے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا کہ مجھے اس آدمی کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ اس نے جلدی سے نظر نیچی کرلی اور جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھنے لگا۔ میں نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"یہ تو باہر والی ہے۔" اس نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ مجھے اس کی خوفزدگی پر حیرت ہوئی۔

"کیا اس نے تمھیں پہچان لیا؟" میں یہی سوال کرسکتا تھا۔

"کیا پتہ۔ مگر انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ مجھ جیسے ہزاروں ہیں۔ پھر بھی، کون جانے کس وقت کیا ایکشن لے لیں۔ نوکری کا معاملہ ہے۔" اس نے ہاتھ ہلا کر بیرے کو بلایا اور بل لانے کا اشارہ کیا۔ "وقت ختم ہو چلا۔" وہ بولا "اب اگلے سال۔"

بیرے نے بل لاکر پیش کیا تو اس نے دو سو سو کے نوٹ تھالی میں رکھ دیئے۔ وہ بقایا لینے چلا گیا تو اس شخص نے پہلے کی طرح بدتمیزی شروع کردی۔

"دیکھ بے۔" میں تو چلا۔ جو تیس چالیس بچے ہیں وہ بیرے کے لئے ہیں۔ اٹھا کے اپنی جیب میں نہ رکھ لینا۔ تیرے جیسے چیڑ قناتیے سے کچھ بعید نہیں۔"

بل ادا ہوتا دیکھ کر میں بھی شیر ہو گیا تھا۔ میں نے کہا: "تم جیسے بیہودہ، بے مغز، لپاڑیے کے پاس بیٹھ کر میں نے احسان کیا ہے احسان۔ میں کوئی بھوکا نہیں مررہا۔ نہ مجھے دوسروں کے پلے سے کھانے کی عادت ہے۔"

اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ مجھ پر ہنسنے سے زیادہ کسی بہت ہی نجی افسوس کا اظہار کررہا ہو۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ باڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اتنے میں بیرا بقایا لے آیا۔ جب میں نے اسے باقی رقم رکھ لینے کے لئے کہا تو بڑا حیران ہوا اور پھر خوشی خوشی "بڑی مہربانی" کہہ کر تمام نوٹ جیب میں ڈال لئے۔

اٹھنے سے پہلے میں نے سوچا کہ تھوڑا سا پانی پی لوں۔ دھوپ تیز ہو چلی تھی۔ گھر جاتے جاتے پیاس لگے گی۔ میں نے پہلا گھونٹ بھرا ہی تھا کہ بیرے نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہاں ایک آدمی ہلکی نیلی شلوار قمیص پہنے کھڑا تھا۔ اس کی کڑبڑی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ بظاہر وہ مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کررہا تھا۔ اگر مجھے اٹھ کر اسی طرف سے نہ گذرنا ہوتا تو شاید اسے نظر انداز کردیتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر آپ مجھ سے کچھ کہنے سننے کے خواہش مند ہیں تو خود چل کر میرے پاس آیئے۔ یہ کیا کہ دور کھڑے ہاتھ کے اشارے سے بلارہے ہیں۔ لیکن اب لوگوں میں تمیز ختم ہوتی جارہی ہے۔

بہر حال، میں اٹھا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا اس کی طرف بڑھا جیسے مجھے کوئی جلدی نہ ہو۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ میرے لئے وہ اتنا ہی اجنبی تھا جتنا میں اس کے لئے۔ میں نے نہایت سرد مہری سے کہا: "فرمایئے؟"

کہنے لگا: "ذرا اپنا ہاتھ دکھایئے۔"

یہ نہایت ہی نامعقول اور بے محل فرمائش تھی۔ جی چاہا کہ ہاتھ چلا کر ایسا تھپڑ ماروں کہ تارے نظر آنے لگیں۔ مگر فوراً خیال آیا کہ اگر یہ بھی میرے میزبان جتنا کڑیل ہوا تو الٹی میری شامت آجائے گی۔ اس لئے میں نے ایک ہاتھ جیب سے نکال کر اس کے سامنے بیہودگی سے نچاتے ہوئے پوچھا: "کیا آپ دست شناس ہیں؟"

لیکن اس نے ہاتھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور کہنے لگا: "جو صاحب ابھی آپ کے ساتھ چائے پی رہے تھے وہ کون تھے؟"

اس سوال کے جواب میں جھوٹ ہی بولا جاسکتا تھا۔ مجھے اس شخص کا

نام تک نہ معلوم تھا اور پوچھتا بھی کیسے، کہ اس نے فرض کرلیا تھا کہ میں اس کا بچپن کا دوست ہوں اور اس لیئے اس کے نام سے بھی آشنا ہوں گا۔ میں کہہ سکتا تھا کہ میرے جاننے والے تھے لیکن آدھے پونے گھنٹے سے جس طرح کی گفتگو مجھے سننی پڑ رہی تھی اس کی وجہ سے میری طبیعت میں کچھ کدورت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا: "تھے کوئی۔ آپ کو مطلب؟ آپ بھی مجھے چائے پلانا چاہتے ہیں؟"

کہنے لگا: "خیر، نہ بتایئے۔ فرض کیجئے میں کہوں کہ وہ آدمی باڑ کے آخر میں بائیں طرف مڑنے کے بعد ایک دم نظر سے غائب ہوگیا تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟"

مجھے خیال آیا کہ یہ اس آدمی کا ساتھی ہے اور دونوں ساز باز کر کے مجھے کسی طرح نچا دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا: "اس کا میرے ہاتھ سے کیا تعلق؟"

اس نے کہا: "دیکھنا تھا کہ انگوٹھا ہے یا نہیں۔"

یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ اس شخص کا دماغ بھی چلا ہوا ہے۔ پتہ نہیں وہ انگوٹھے کے حوالے سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک ہی صبح میں دو پاگلوں کو بھگتنا میرے بس کا روگ نہیں۔ ایک تو خیر مجھے اپنے پلے سے کھلا پلا کر چلتا ہوا تھا۔ یہ دوسرا پاگل خدا جانے مجھ سے کیا چاہ ہے۔ میں اسے نظر انداز کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ چالیس پچاس قدم جا کر مجھے خیال آیا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو سہی کہ وہ دوسرا آدمی وہیں ہے یا نہیں لیکن میں نے بڑی شدت سے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔ توہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

بات آئی گئی ہوئی۔ رفتہ رفتہ میں اپنے ناگہانی بلکہ دگر جہانی میزبان کو بھول بھال گیا۔ مہینے گذرتے گئے۔ اکتوبر آپہنچا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ملازمت پر بحالی کے امکانات صفر ہو چکے تھے۔ ستم یہ کہ میں نئی ملازمت کی تلاش کرنے کی جدوجہد میں بھی مکمل طور پر ناکام ہوگیا۔ وہ تو میری بیوی ایک کالج میں پڑھاتی ہے۔ اس لیئے کسی نہ کسی طرح گذر بسر ہوتی رہی۔ لیکن مسلسل بیکاری کی وجہ سے میں بیوی بچوں کی نظر میں اپنا وقار کھو بیٹھا۔

ایک شام مجھے بیوی کے ساتھ سپر مارکیٹ جانا پڑا۔ وہ اون خریدنا چاہتی تھی۔ مجھے عورتوں کے ساتھ خریداری پر نکلنے سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ ذرا سی چیز خریدنی ہو تو گھنٹوں لگا دیتی ہیں۔ مشورہ بھی کرنا چاہتی ہیں اور جو کہا جائے وہ سنتی بھی نہیں۔ بہرکیف، خدا خدا کر کے وہ اون خریدی گئی۔ جب ہم فارغ ہو کر واپس ویگن کے اسٹاپ کی طرف آ رہے تھے تو راستے میں ایک پنواڑی کی دکان آئی جس کے پان بہت مشہور تھے۔ میں نے تجویز کیا کہ ایک پان کھایا جائے۔ اس سے زیادہ کسی عیاشی کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ خلاف توقع میری بیوی نے تجویز پر صاد کیا۔

دکان پر غضب کی بھیڑ تھی، اس لئے بیوی ذرا ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ میں بھیڑ میں جا گھسا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گاہک دس پندرہ گلوریوں سے کم لینے پر راضی نہیں۔ آخر مجھ سے آگے دو تین آدمی رہ گئے۔ میں نے ویسے ہی مڑ کر بیوی کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہی دراز قد عورت، جو اس دن باغ میں نظر آئی تھی، کھڑی بیوی سے باتیں کر رہی تھی۔ اگر میرا بس چلتا تو پان خریدنے کا خیال چھوڑ کر اس عورت سے متعارف ہونے کے لئے دوڑ پڑتا۔ وہ یہیں کی تھی یا کہیں اور کی، اس کی تو مجھے پروا نہ تھی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اسے دیکھ کر میرا میزبان سچ مچ سہم گیا تھا۔ چنانچہ فطری طور پر یہ کرید تھی کہ اس خوف زدگی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

مشکل یہ آ پڑی تھی کہ اتنے انتظار کے بعد میری باری آنے کو تھی۔ اگر میں پان لیئے بغیر واپس جا کر اس عورت سے متعارف ہونا چاہتا تو میری بیوی نہ جانے کیا سمجھ بیٹھتی۔ ہمارے ازدواجی تعلقات، جیسا کہ آپ اندازہ لگا چکے ہوں گے، کوئی زیادہ خوش گوار نہ تھے۔

جب میں گلوریاں لے کر دکان سے ہٹا تو وہ عورت جا چکی تھی۔ میں نے بیوی کی گلوری اس کے حوالے کی اور ہم دونوں پان کھاتے ہوئے چل پڑے۔ بیوی نے اون کا تھیلا مجھے تھما دیا۔ اس وقت اس کا موڈ کچھ بہتر معلوم ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس قدم چل کر میں نے بالکل سرسری انداز میں پوچھا: "ابھی ابھی کوئی خاتون تم سے باتیں کر رہی تھی۔"

"ہاں،" اس نے کہا: "میرے ساتھ پڑھاتی تھی۔"

"پڑھاتی تھی؟ ملازمت چھوڑ دی کیا؟ شادی ہوگئی ہوگی۔"

"نہیں، باہر جانے والی تھی۔ آج ملی تو بتا رہی تھی کہ کل صبح روانگی ہے۔"

"باہر!" میں نے گڑبڑا کر کہا اور شاپر(1) میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"کیا بات ہے؟" بیوی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "تمھیں کوئی فرق پڑتا ہے اس کے باہر جانے سے؟"

تھوڑی دیر ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیوی کی توجہ ہٹانے کے لئے کسی اور طرح کی بات کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا: "ہمارے ہاں کی خواتین کے برعکس اس کی صحت بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ شاید پہلے باہر رہی ہو۔ مغربی ملکوں میں عورتیں ورزش بہت کرتی ہیں۔ فٹ رہنے کا جنون جو ہوا۔"

"ورزش گھر پر کرتی ہو شاید۔ البتہ کھانے پینے کے معاملے میں بڑی محتاط تھی۔ ہماری طرح الم غلم کبھی کھا کے نہ دیا۔ نہ سموسے نہ پکوڑے نہ چاٹ نہ گول گپے۔ روز گھر سے پھل لے کر آتی۔ وہی کھاتی۔ چائے بھی ایک دفعہ سے زیادہ نہ پیتی۔"

"یہی عقل مندی ہے۔ ہم تو اب نہ تب، کچھ نہ کچھ کھلا بلا چرتے رہتے ہیں۔"

"ہاں، مگر ایک بات عجیب تھی۔" بیوی نے ہنس کر کہا۔ "ارہر کی دال بہت شوق سے کھاتی تھی۔ جب دیکھو، یہی فرمائش کہ ارہر کی دال پکا کے لاؤ۔"

"ارہر کی دال!" میں نے چونک کر کہا اور اس دفعہ شاپر سچ مچ میرے ہاتھ سے گر پڑا اور اگر میں لپک کر اسے اٹھا نہ لیتا تو وہ لڑھک کر سڑک کے ساتھ بہنے والی گندی نالی میں جا گرتا۔ بیوی نے ناراض ہو کر میری طرف دیکھا اور جھنجھلا کر بولی: "تمھیں ہو کیا گیا ہے؟" ☆☆☆

---

(1) تھیلا، خصوصاً پولی تھین کا۔

مارینا تسویتائیوا کے لیے نظم

محمد سلیم الرحمٰن

شمارہ ۲۷۲،
ستمبر ۲۰۰۳

یہ بھی تم ہو
برف کے ریلوں کی رت میں
اپنے سیلے، کھڑکھڑاتے گھر میں تنہا،
راکھ اور کالک کو سینے سے لگائے۔
ہے کوئی جو آ کے آتش دان میں
اور دل میں میٹھی
آگ دوبارہ جلائے؟

کس لیے یہ انتظاری
یہ پھیکی برف باری؟
کوئی خط، کوئی جواب آتا نہیں اب
تم تو زندہ ہو،
تمھارا نام شاید مٹ چکا ہے
حافظوں سے،
یا تمھارا نام آخر کٹ چکا ہے
دفتروں سے۔

جنگلوں میں بھیڑیے غرا رہے ہیں
کوئی قطبی روشنی جیسا ہیولیٰ
کوئی جس نے تم کو چاہا
سرد پاتالوں سے چل کر
دھند میں لپٹے محاذوں سے پلٹ کر،
کھڑکیوں سے جھانکتا ہے۔
سر اٹھاؤ
تم اگر جیتی ہو آنکھیں تو ملاؤ۔

کھیلتے ہیں اپنا اپنا کھیل
دنیا میں سپاہی،
جتنی چالیں، اتنی ماتیں
انت میں خالی بساطیں۔
تم اکیلی فوج ہو
بالکل نہتی،
زندگی کے مورچوں میں،
بورچی خانے کی کالی خندقوں میں۔

اس تمھارے ٹوٹے پھوٹے
کالبد میں کیا ہے آخر،
روشنائی یا سیاہی؟
زندگی کے کاغذوں پر
اتنے چھینٹے، اتنے کانٹے۔
جو تمھیں چننا بھی چاہے
کس طرح دامن بچائے؟
یہ بھی تم ہو
سر جھکائے
نیند سے آنکھیں چرائے،
اب یہاں سیٹی بجا کر
کون آئے گا تمھیں گھر سے بلانے؟
سائرن بجتے رہیں گے
رات بھر آتی رہے گی
کند آوازوں کی کھیتی۔

یہ بھی تم ہو
چھت کی کڑیوں سے لٹکتے
خوف کے پھندوں کو گنتی؛
عمر کی اس آخری
تہ سے ابلتی
خامشی کا گھونٹ بھرتی۔

چاند ڈوبا چاہتا ہے
نیند کی ان سلوٹوں میں
موت جھکتی ہے بدن پر،
ایک مٹیالا سا بوسہ
جس کی بھاری سنسنی سے
گل ہوئی جاتی ہیں آنکھیں۔

ادیب اور فرقہ واریت:ایک مباحثہ

مرتب: محمد طاہر

شمارہ ۴۶،

مارچ ۱۹۷۰

شرکا

فراق گورکھپوری، مظفر احمد لاری، ڈاکٹر ہرش نارائن، کانتی چرن سون رکشا، امرت لال ناگر، مسز سرور جمال، شہاب سرمدی، مسز شکنتلا چھابڑہ، رام لعل، مسز سرکشا راجوت، عابد سہیل، بشیر فاروقی، احمد جمال پاشا، ننیا نند تیواری، سریش چترویدی، عبدالحلیم، محمد طاہر

۱۸ اکتوبر شام کے چھ بجے، لکھنؤ اسٹیشن کے سامنے ملٹی اسٹوری میں تیسرے فلور پر رام لعل کا کمرہ، ۱۰×۱۱ فٹ، تخت، صوفہ، کرسیاں، چوکیاں، دری، کتابیں، کتابیں اور کتابیں۔ دیواروں پر راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور پریم چند کی تصویریں۔ ایک دو گروپ فوٹو (آنند نرائن ملا، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، یوسف حسین خاں، کرشن موہن، کیلاش ماہر، بانی، رام لعل اور محمود ہاشمی) اور بیوی بچوں کو کوئی کہانی سناتے ہوئے رام لعل۔

''کتھا کن'' لکھنؤ کے چند سرپھروں کی انجمن ہے جو سال میں صرف دو ایک ہی ادبی اجتماع کراتی ہے اور وہ اجتماع خاصے اہم ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ اہم ترین اجتماع جدید افسانے پر سمپوزیم، کرشن چندر اور اس کا فن، سمنار اور عمیق حنفی و بلراج کومل کے شعری مجموعوں کی رسم اجرا تھی۔ سب لوگ جہاں جہاں جگہ پا سکے سما گئے تو سریش چترویدی نے امرت لال ناگر کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا جن کی تائید سب نے کی۔ فراق صاحب کا استقبال مہمان خصوصی کی حیثیت سے کیا گیا۔ سب سے پہلے رام لعل نے اپنا ایک مقالہ ''ادیب اور فرقہ واریت'' کے عنوان سے پڑھا جس کے خاص خاص نکات یہ تھے،

رام لعل:

میں نے اپنی آنکھوں سے کئی فرقہ وارانہ فسادات دیکھے ہیں ایسے حالات نے مجھے ہمیشہ سہما دیا ہے۔ میں بہت بزدل انسان ہوں لیکن اس احساس پر پردہ ڈالنے کے لئے خود کو امن پسند کہتا ہوں۔ بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں جس کا کام قتل عام و غارت کرنا نہیں ہے۔ آج تو میں خود کو اپنے ملک کی اکثریت کا ایک فرد کہتے ہوئے بھی ندامت محسوس کر رہا ہوں... میرا خیال ہے ہم crisis pf pride کا شکار ہو چکے ہیں۔ آج ہم کوئی بھی اچھی بات سوچنے یا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے ہیں۔ میں ایک اچھی کہانی بھی لکھنا چاہوں گا تو پہلے مجھے ایک خوف سے چھٹکارا پانا ہوگا کیوں کہ اچھی کہانی لکھنے کے لئے بھی سچ بولنا ضروری ہوتا ہے... بنی نوع انسان کی سب سے بڑی ذہنی تخلیق اب تک مذہب ہے۔ تلاش حق اور ذہنی توازن کے لئے مذہب نے بڑی مدد دی ہے لیکن آج کے انسان کے لئے مذہب کی فلاسفی Out Dated ہے۔ جب سے مذہب مقدس کتابوں سے باہر نکل آیا ہے وہ انسانوں کو بری طرح سے ایکسپلائٹ کر رہا ہے۔ اب تک لاکھوں ہزاروں لوگ مذہب کے نام پر قتل کئے جا چکے ہیں.. فسادات چاہے مذہبی اختلافات کی وجہ سے ہوں یا نسلی امتیاز کی بنا پر اور وہ آئرلینڈ میں ہوں، امریکہ میں ہوں یا گجرات میں، ان کی روک تھام نہ کر سکنے کے لئے بڑی حد تک حکومتیں ہی ذمہ دار ہوتی ہیں بعض اوقات خود

حکومتیں ہی بلوہ کرا دیتی ہیں۔ جب چاہتی ہیں بند بھی کرا دیتی ہیں۔ ہم ایسی حکومت کا ہمیشہ سواگت کریں گے جو ہمارے اقتصادی حالات کو بہتر بنائے لیکن وہ مذہب کو بیچ میں نہ لائے۔ مجھے مذہب سے کہیں زیادہ اپنے اقتصادی حالات عزیز ہیں۔ میں آپ کا بہترین دوست مذہب کی بنیاد پر ثابت نہیں ہو سکوں گا۔ پیٹ کے رشتے کی وجہ سے ثابت ہوں گا۔ پیٹ کا رشتہ ہی اس دنیا میں ازلی اور ابدی ہے۔ خاندان، قبیلوں، قصبوں، شہروں، حکومتوں اور انٹرنیشنل فورموں کے بننے اور ٹوٹنے کی بڑی وجہ بھی پیٹ ہے۔ تہذیب اور تمدن کو ہم نے اپنی اپنی پہچان کے لئے اور کسی حد تک ذہنی آسودگی کی خاطر قبول کر رکھا ہے۔ جب ہم اپنے اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھاتے ہیں تو ہمارے درمیان اچانک فساد برپا ہو جاتا ہے، مذہب کے نام پر۔ ایک گروہ ہماری اقتصادی خوش حالی کا مخالف ہے جو ٹھوس مسائل کی طرف سے ہماری توجہ ہٹا لینا چاہتا ہے... بینکوں کے نیشنلائزیشن کے درمیان اچانک احمد آباد کیسے آ گیا ہمارے لئے یہ بات غور کرنے کی ہے۔

فراق:

رام لعل نے جو باتیں کہی ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ ان کا بیان وقت کا ناجائز استعمال ہے۔ میں کہتا ہوں ادیب اور شاعر اس قسم کے جلسوں میں اس مسئلے کے سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

احمد جمال پاشا:

یہ فسادات مذہب کے نام پر ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقی مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آدمی جب تک...

فراق:

دیکھئے آپ رام لعل کے مقابلے پر ہی بحث کیجئے۔ موضوع سے ہٹ کر کچھ نہ کہئے۔

احمد جمال پاشا:

جی ہاں وہی عرض کروں گا۔ آدمی جب تک اچھا خاصا رہتا ہے اسے مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہتا وہ اپنی بہت کمزوری کی حالت میں مذہب کی پناہ میں جاتا ہے۔ یہ معاملہ سیدھا سیدھا political exploitation کا ہے۔

فراق:

آپ رام لعل کی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔ مجھے رام لعل پر بھی یہی اعتراض ہے۔ جو کچھ سجاد ظہیر کہتے ہیں وہی کچھ کرشن چندر کہہ دیتے ہیں اور وہی کچھ رام لعل نے بھی کہا ہے۔ آپ کوئی ایسی بات کہئے جو انھوں نے نہ کہی ہو۔

پاشا:

کسی کمیونٹی پر blame نہیں لگانا چاہئے کیوں کہ کچھ ہاتھ اس میں غیر ملکی طاقتوں کا بھی ہے۔ وہ ہمارے دیش کو پھلتا پھولتا اور ترقی کے راستے پر نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس سے ان کو اپنی مارکیٹ ڈاؤن ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے بہت سے انٹرنل اور ایکسٹرنل پہلو بھی ہیں۔ ہم ادیبوں کو ایسے حالات میں چپ چاپ نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔

فراق:

ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم helpless ہیں آپ لوگ وقت ضائع کر رہے ہیں۔

رام لعل:

فراق صاحب، جمال صاحب کو اپنی بات پوری کر لینے دیجئے۔

پاشا:

اس exploitation کے بارے میں ہمیں لکھنا چاہئے۔ کوئی آدمی کسی کو چاقو مار دے یا کسی کی جیب کاٹ لے تو اس کو سزا ہو جاتی ہے لیکن کوئی ہزاروں کو مروا دے تو اس کو کوئی سزا نہیں ہو پاتی۔

فراق:

لٹریری آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ پولیٹیکل آدمی ہی یہ سب کر سکتا ہے۔

عابد سہیل:

ہمیں پہلا کام یہ کرنا چاہئے کہ ان دنگوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا چھوڑ دیں۔ یہ سارے دنگے ہمارے ہی ہاتھ کرتے ہیں۔

فراق:

چاہے گاندھی پیدا ہو یا جواہر لال، پولیٹیکل آدمی ہی اس کے بارے میں کچھ کر سکتا ہے۔ رائٹر نہیں۔ آج تک کوئی رائٹر ایسا نہیں کر سکا۔ یہ قلم کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ لینن کا کام ہے۔ ایسا رائٹر کے لئے کرنا ویسا ہی ہوگا جیسے ہمیں آتی ہو غزل کہنا اور ہم بنانے چلیں ریلوے انجن۔ رائٹر اپنے کو بس رکشا ڈرائیور سمجھے۔ رائٹر ہندوستان کی برائیاں دور نہیں کر سکتا۔ رائٹرس کو کمیونسٹوں نے دھوکا دیا ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ ملک کے حالات وہ درست کرے گا جو صرف ایک آنہ رائٹر ہو اور پندرہ آنہ Politician۔ یہ جلسہ اپنے احساس کمتری کو دبانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ کوئی ہم کو Nation میں ٹکے کو پوچھتا نہیں، لیکن ایسی میٹنگ کر کے ہم اپنے کو اونچا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آدمی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ کارآمد بننے کا بہانہ نکالتا ہے۔ ہم کو انڈیا کے Future پر یقین رکھنا ہے لیکن بیٹھ کر برائی کرنا بری بات ہے۔ میں اس قسم کی میٹنگ کو ناپسند کرتا ہوں۔ آپ اپنے افسانے لکھئے۔ ان میں اپنے آئیڈیل رکھئے۔ ہر چیز لٹریچر سے نہیں طے ہوتی۔ تہذیب لٹریچر نے نہیں بنائی۔ ہمارے لکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ سماج میں ان کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ اس لئے وہ سوچتے ہیں کہ سماج کی برائی پر لکھیں۔ دنیا کا کوئی بڑا ادیب کسی میٹنگ میں نہیں بنا۔ دنیا کی کوئی بڑی کتاب مشورے سے نہیں لکھی گئی۔

عابد سہیل:

انسان متاثر تو ہو سکتا ہے۔

فراق:

نہیں آدمی ہمیشہ اپنا کام انفرادی طور پر کرتا ہے۔

رام لعل:

آپ اس قسم کے جلسوں کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن آپ نے خود بمبئی میں کرشن چندر کو ایک کانفرنس کے سلسلے میں مجھ سے ایک خط لکھوایا ہے (قہقہہ)۔

فراق:

میں اپنی بے ایمانی کو بے ایمانی کہتا ہوں۔ آپ اپنے ضمیر کی آواز کو سنیں۔

مشاعرے اور میٹنگیں صرف تفریح کے لیے ہوتے ہیں۔

مظفر احمد لاری:

مجھے اس بات پر اعتراض ہے کہ مشاعرے صرف تفریح کے لیے ہوتے ہیں۔

فراق:

کوئی آدمی جو self-respecting ہے وہ میٹنگ سے کچھ نہیں سیکھتا۔ میں بھارت سیوا کے لیے جلسوں کا قائل نہیں۔ تلسی اور غالب پر بحث کا قائل ہوں۔

شہاب سرمدی:

آپ نے جو کچھ فرمایا وہ بہت Revealing ہے۔ یہ کام کسی سیاسی جماعت کا ہے، Politician کا ہے، اہلِ قلم کا نہیں۔ اس بارے میں لیکن آپ دو پہلوؤں پر غور کریں۔ ہر دور کی ایک ذہنی فضا ہوتی ہے۔ اس فضا کے سازگار بنانے میں اہلِ قلم کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ورنہ دیکھیے تو آج جو ذہنی فضا ہے اس کا سات آٹھ ہزار برس کی ہماری ہسٹری میں وجود نہیں ہے پھر پچھلے آٹھ نو سو برس سے ہندو مسلمان ایک ساتھ رہتے چلے آئے، اب کیوں نہیں رہ سکتے۔

عابد سہیل:

فراق صاحب، روسو اور والٹیئر کے بارے میں کیا کہیں گے آپ؟

فراق:

روسو رائٹر نہیں تھا۔ اس کے برابر ایک جملہ بھی ہندوستانی رائٹر نہیں لکھ سکتے۔ آپ یہ سوچنے کہ مجرا کون سی رنڈی اچھا کر سکتی ہے۔ اس رائٹرس کے جلسے میں کمیونزم پر بحث کرنا بے کار ہے۔

عابد سہیل:

فرض کیجیے یہ رائٹرس کا جلسہ نہیں ہے اور تب سوچنے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

فراق:

اگر آپ Citizen ہیں تو رائٹر لفظ نکال دیجیے۔ کام نہ چل سکا فراق کچھ نہ کئے بغیر بھی!

عابد سہیل:

دیکھیے مصرع نہیں ہونا چاہیے (قہقہہ)۔

فراق:

ورلڈ ہسٹری پڑھیے۔ کوئی افسانہ لکھتا ہے کوئی سماجی برائی دکھاتا ہے۔ آپ یہ سوچنے کہ آپ کتنے چھوٹے ہیں۔ آپ آر ایس ایس یا گورو گولوالکر کے برابر بھی نہیں۔ جو کام وہ کرا سکتے ہیں وہ دس کروڑ رائٹر نہیں کر سکتے۔ جو کام لال بہادر شاستری کرا سکتے تھے وہ ہم نہیں کرا سکتے۔

رام لعل:

شاستری درحقیقت کتنا بڑا تھا یہ ایک Debateable پوائنٹ ہے۔ وہ خود ہیرو نہیں تھا۔ میری اطلاع کے مطابق ملٹری کے جرنیلوں نے اسے مجبور کیا۔

فراق:

کیا آپ انجن ڈرائیور سے بڑے ہیں؟ اگر آپ انجن پر بٹھا دیے جائیں تو ہزاروں آدمی کی جانیں جا سکتی ہیں۔ لال بہادر کو نہ لے کر کسی اور کو لے لیجیے۔ نپولین کو، ہٹلر کو۔ اگر قلم میں دم ہو تو لکھو۔

Be what nature intended you to be Be any thing else and you will be Nothing

ایک کروڑ آدمیوں نے پولیس کی لاٹھی کھائی لیکن صرف نہرو کی ہی تصویر ہر گھر میں ہے اور کسی کی نہیں۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ یہ volunteers کا کام نہیں ہے۔ آپ کی Writings کی وجہ سے ہندوستان اپنا 'پبلک ایکشن' نہیں بدلے گا۔ یہ کام PowersMystry اور لیڈر کراتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قلم سے کمن کرنا سیکھیے۔ یہ بڑی دو کوڑی کی چیز ہے۔ آپ ٹھیکیدار نہیں بن سکے۔ یہ کام گاندھی بھی نہیں کرا سکا جو اپنے کو رائٹر نہیں مانتا تھا۔ بینکوں اور برلا کو لوٹنا افسانے بند نہیں کرا سکتے۔

رام لعل:

یہ کام بھی کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

امرت لال ناگر:

تو پھر یہاں ویسٹ آف ٹائم کیوں کیا جاتا ہے۔

فراق:

آپ ہی کرا رہے ہیں۔

Every writer of a story is an unliterary man.

وہ ہر طرف ہاتھ ڈالتا ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

عابد سہیل:

جن لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر وہ نہ لکھتے تو کیا دنیا وہی ہوتی؟

فراق:

اس سے بھی بہتر ہوتی (قہقہہ)۔ بالکل وہی ہوتی۔ ریل آپ نے نہیں بنائی۔ انڈسٹری آپ نے نہیں بنائی۔

عابد سہیل:

ہم گورکی کی کہانی Twenty-six Men and a Woman اور وہ آپ کی غزل شام بھی تھی اداس اداس ۔۔۔ اس شعر کے بغیر ہم وہ نہ ہوتے۔

فراق:

تہذیب بنتی رہے گی۔ بگڑتی رہے گی۔ آپ جیل چلے جائیے، آپ لیڈر نہیں ہو سکتے۔ Twenty-six Men and a Woman، یا میرے چند شعر کسی "سوشل" انڈسٹریلسٹ کو خوش کرنے کے لئے ہیں۔ یہ گورکی کی آتما کے خلوص کی چیز ہے۔ میں سب سے زیادہ دشمن ہوں جلسوں کا اور تقریروں کا۔

رام لعل:

لیکن آپ جلسوں میں جاتے ہیں۔

فراق:

پیسے لینے۔ میں ان سے نفرت کرتا ہوں لیکن پانچ سو روپے لینے جاتا ہوں۔

رام لعل:

(ہنستے ہوئے) ہمیں بھی سکھا دیجیے پیسہ لینا۔

فراق:

موقع ملے گا تو پیسہ دلائیں گے۔

رام لعل:

لیکن میرا مقصد ادب سے پیسہ کمانا نہیں ہے۔ اپنے آپ مل جائے تو الگ بات ہے۔

فراق:

تب آپ بہت بڑے بیوقوف ہیں (قہقہہ)۔

شہاب سرمدی:

جس طرح کی باتیں اب تک ہوئیں اور جو mandate فراق صاحب نے دیا ہے اس کے مطابق میں سوچ رہا ہوں کہ Odyssey سے Republic اور بالمیکی رامائن سے فردوسی تک اور پھر پورے لٹریچر کو لیتے ہوئے Discovery of India تک آجائیں تو پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کوششوں کو ہم ادب پارہ مانیں گے یا نہیں؟ انھوں نے اپنے دور کو متاثر کیا ہے۔ اس لئے ان کا کوئی مقصد رہا ہے، اس سے انکار ناممکن ہے۔ رائٹر نے جس مقصد سے انھیں لکھا اس نے وہ مقصد پالیا اور اب بھی وہ تاثر کا حلیہ بنائے ہوئے ہے۔ Discovery of India کو آپ اہل قلم کی تخلیق مانیں گے یا کسی سیاسی آدمی کی؟ بہر حال اس نے ہمارے دل و دماغ ہمارے برتاؤ اور سوچنے کے ڈھنگ کو متاثر کیا ہے۔ کبیر نے، گورو نانک دیو نے، صرف نظم میں باتیں کی ہیں اور پورے معاشرے، پورے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ ادب دیرپا اثرات چھوڑ سکتا ہے یہ بات مانی جائے۔

فراق:

(غصے سے) اس سے زیادہ اثر Political forces کرتی ہیں۔ میں ادب کی Impotency کا قائل ہوں۔ ادب کا تعلق سماج کو متاثر کرنا نہیں ہے۔

شہاب سرمدی:

مہابھارت، یا فردوسی کے شاہنامے نے ایرانی قوم کے احیائے ثانیہ میں جو کام کیا ہے اسلام کی پوری فوج نہیں کرسکتی تھی۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فراق:

یہ چاروں مصرعے نظیری کی بے مقصد شاعری سے گھٹیا ہیں۔

شہاب سرمدی:

اگر یہ مان لیا جائے کہ ادب کا اثر ہر دور پر پڑا ہے اور جب کوئی بات اس پر رکتی ہے کہ اگر ہم ویسا ادب پیدا کریں جو آج کے زمانے کا آئینہ ہو تو بات اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اور وہ ادب یگ یگ اپنے اثر کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ دوسری چیز ہے کہ اگر ہم آج بھی ویسا ادب لا سکتے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر نہیں لا سکتے تو جو وقت کا فیصلہ پہلے ہوا ہے وہی اب بھی ہوگا۔

فراق:

(غصے سے) ایسا ادب کسی جلسے میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ سب سے خراب چیز ہے ادیب کو لیکچر دینا۔

لاری:

رائٹر سماج کو بناتا ہے لیکن اس کی بھی حدود ہیں۔

شہاب سرمدی:

پلیٹو (Plato) کا موضوع غالب کا موضوع نہیں تھا۔

لیکن غالب کا پڑھنے والا محسوس کرے گا غالب کے پلیٹ فارم پر آکر، اور Classless سوسائٹی بنانے کا کام کرے گا۔ غالب کی بات اس وقت بھی زندہ تھی اور اب بھی زندہ ہے۔ ان کے اشعار سے ہمیں غالب کے برابر آکر سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ عورت کو لے کر، یا Abstraction of Beauty کو لے کر جو شعر کہا جائے گا وہ بے کار ہوگا۔

لاری:

میں شاعر یا ادیب کی عظمت کو کم نہیں کرتا۔ لیکن کسی شاعر یا ادیب کی کہانی میں اڑنے کا ذکر ہوا اور تب تک کسی Technician نے اس قسم کی چیز نہ بنائی ہو تو کیا اس سے متاثر ہو کر ویسی چیز نہیں بنا سکتا؟

فراق:

ریلوے انجن پر کوئی لٹریچر نہیں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک دم پرسنل تھا۔

شہاب سرمدی:

ہم اپنی زبان میں جب سوچتے ہیں، یعنی سنسکرت زبان میں سوچتے ہیں تو دو لفظ سامنے آتے ہیں گیان۔ وگیان۔ اردو میں علم و ادب ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آج چاند پر جانے والے کو سوچنا چاہئے کہ لٹریری آدمی نے ہی sense of adventure دیا ہے۔ شاعر بھی اپنی جگہ پر ادب دیتا ہے تو علم سے ہٹ کر نہیں دیتا۔ چاند پر پہنچنا، انجن بنانا ان سب میں شاعر تصور دے سکتا ہے۔

فراق:

یہ سب باتیں میٹنگ میں نہیں ہو سکتیں۔ میٹنگ میں چائے پی جاتی ہے سگریٹ پی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہرش نارائن:

آپ نے جو تجزیے پیش کئے ہیں انھیں شاید آپ نے Universal Truth سمجھ کر پیش کیا ہے۔

فراق:

نہیں۔ معمولی ہے۔

نارائن:

سوال یہ ہے کہ کیا ایسی میٹنگ فائدہ مند نہیں ہوتی؟

فراق:

عموماً ذلیل چیز ہوتی ہے۔ لیکن کہئے، محمد صاحب نے کبھی کوئی میٹنگ نہیں کی تھی۔

نارائن:

انھوں نے کی تھیں۔ یہ مہذب سوسائٹی جہاں بھی رہی، Peace Time میں اس کی لیڈر شپ ہمیشہ Intellectuals کے ہاتھ میں رہی۔ ہمارے ایسٹ میں یہ المیہ

ہے کہ ماڈرن سوسائٹی کی لیڈر شپ انٹلکچوئلز سے چھن گئی۔ یہ المیہ ہی ہمارے لئے کافی ہونا چاہئے۔ یہ میٹنگ فائدہ منداس لئے ہے کہ Institutions سے آوازیں اٹھتی ہیں اور سوسائٹی پر چھا جاتی ہیں۔ کارل مارکس کے بارے میں کبھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے خیالات ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ لیکن اس کے Ideas نے اپنا کام کرلیا۔ اسی طرح ہمارے رائٹرز Creative ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں۔

دنیا کی ساری تہذیبوں میں بیشتر کے معمار انٹلکچوئل ہی ہوئے ہیں، چاہے یہ تخلیقیں غار حرا میں ہوئی ہوں چاہے میٹنگوں میں۔ بدھ جدید تعمیر کے انٹلکچوئل تھے۔ اسی وجہ سے سارے ایشیا میں چھا گئے انھوں نے ایک Civilisation کی تخلیق کی۔ محمد صاحب بھی انٹلکچوئل تھے اور انھوں نے بھی ایک سولائزیشن کی تخلیق کی۔

فراق:

لیکن انھوں نے کبھی میٹنگ نہیں کی تھی۔

نارائن:

بدھ نے ساری تخلیق جلسوں میں کی۔ سنگھم شرنم گچھامی انھوں نے سنگھ قائم کیا اور جلسے کئے۔

فراق:

اسی میں مرارجی ڈیسائی جیسے لوگ بھی پیدا ہوگئے (قہقہہ)۔

نارائن:

ان کے علاوہ بھی لوگ پیدا ہوئے۔ انگلی مال کی طرح ان کی جان کے پیچھے پڑنے والے۔ انھوں نے مرارجی جیسے لوگوں کو دبا دیا۔ جلسوں میں تہذیبیں جنتی ہیں۔ شوریٰ کی اہمیت جتنی قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے ویسی کہیں نہیں ہے۔ خود آں حضرت بھی مجلس کیا کرتے تھے۔ بدھ مت اور اسلام جلسوں ہی سے International Religion بن گئے ہیں۔ جلسوں سے Revolution لایا جا سکتا ہے، لایا گیا ہے۔ یائنی تہذیب جو ہیرو ہوتا ہے، اس کی دو Life ہوتی ہیں ایک Return کی۔ ایک Withdrawal میں Preparation of Ideas کرتا ہے۔ Return میں وہ جلسے کرتا ہے، لیکچر دیتا ہے۔ جلسوں کو کنڈم کرنا دیانتداری نہ ہوگی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کیمونزم پر بحث کرنے کے لئے یہ میٹنگ بلائی گئی ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات رام لعل صاحب نے ہی سوچی۔ کیمونزم ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر جو غور نہیں کرتا وہ مہذب کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ ہمارا یہ غور و خوض National Level کا پیش خیمہ ہے۔ اپنی ذاتی سطح پر غور کریں اور رائے لیں۔ جو ایشو ساری نیشن کو پریشان کئے ہوئے ہے اسے ہم جلسے جلوس میں طے نہیں کریں گے تو پھر کہاں کریں گے؟ یہ میٹنگ خوش آمدید اور Timely ہے۔ ہمیں یہاں یہ سوچنا ہے کہ کیمونزم پر رائٹرز کیا کر سکتے ہیں؟ اگر ہمیں سیاست دانوں کے نعروں پر چلنا ہے تو میٹنگیں بند کردیں۔ ہم ایسا پچھلے بیس برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ سیاست دانوں کے نعروں کے پیچھے۔ ہم سوشلزم کے نعرے کے پیچھے لگ گئے۔ اب بھی ویسٹ میں سوشل، کلچرل اور پولیٹیکل اشوز پر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ان سے متاثر ہو کر سیاست داں اپنی اپنی تجویزیں بناتے ہیں۔ ڈیموکریسی ہم نے لی لیکن یہاں کے انٹلکچوئلز نے کچھ نہیں کیا۔ سوشلزم اور مارکسزم پر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ دیانت داری سے اپنے خیالات پیش کریں۔ کیمونزم کا نقشہ سلبی ہے، ایجابی کوئی نہیں۔ کیمونزم ایک خلا کو پر کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس کی اپنی ایک Political Necessity ہے۔

فراق:

وہ ایک پاخانہ ہے۔

نارائن:

ہم ایسا نہیں کہتے۔ اس کو exploitation کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

فراق:

آدمی پر ظلم کرنے کا اس سے بڑا ذریعہ نہیں پیدا ہوا۔

رام لعل:

آپ تو میرے موقف کی حمایت کررہے ہیں۔

فراق

لیکن میں آپ کے جلسے کے حق میں نہیں ہوں ..اب میں تھک گیا ہوں۔ بھائی بوڑھا آدمی ہوں کہیں سونے کے لئے جگہ دو۔

(اس کے بعد فراق صاحب میٹنگ سے چلے گئے۔)

نارائن:

آج انڈین نیشن کے سامنے کوئی مشن ایسا نہیں ہے جسے اپنا کر نیشن پاگل ہو سکے۔ ایسا مشن مل جاتا ہے تو نیشن بڑی ہو جاتی ہے۔ اس نیشن کو گاندھی جی کے مرنے کے بعد کوئی چیز ایسی نہیں ملی جسے اپنا کر نیشن آگے بڑھ سکے اور ذہن کو مرکوز کر سکے۔ اس لئے جو چیز بھی سامنے آتی ہے ہم اسی کو لے کر اپنا مطلب پورا کرنے لگتے ہیں۔ پوری نیشن کی ایک شخصیت نہیں ابھر سکی۔ آج ملک کو ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے۔ وہ نیشنلزم ہے۔ وہ بھی بہت واضح قسم کی۔ اس پر خیالات بہت ایک ہونے چاہئیں۔ ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن نیشنلسٹ نہیں ہو سکتے۔ رائٹرز کو اس کا واضح تصور پیش کرنا چاہئے۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ ایک نیشن احساس اور وجود میں آئی ہے اور بالغ ہونے جا رہی ہے اس کی ایک انفرادیت ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو Integration نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے نیشن کے Greatness میں اعتماد تبھی پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسری چیزیں احساس وجود، احساس انفرادیت اور احساس قیادت بھی ضروری ہیں اس طرح یہ نیشن لیڈر شپ حاصل کر سکتی ہے۔ تین بودھ (شعور) ہمارے لئے ضروری ہیں۔ آستو بودھ (شعور وجود) ویکتو بودھ (احساس شخصیت) اور نیتر تو بودھ (احساس قیادت) اس کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی نقشہ سامنے رکھ کر سبھی پارٹیوں اور کیمونزم والی پارٹیوں کو Counteract کیا جا سکتا ہے۔

لاری:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایسا کیسے پریکٹیکل شکل میں کیا جائے؟ اس کا کیا طریقہ ہو؟

عابد سہیل:

جو قیادت والی بات کہی گئی ہے وہ اس بات سے نکلی ہے کہ ہماری قومیت کا تصور دوسروں سے افضل اور بہتر ہو۔ اس کو عملی جامہ پہناتے وقت اس کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے کہ جب بھی ملک اپنے کو بہتر سمجھیں گے تو کیسے ہوگا۔ ہماری قومیت دوسروں سے بہتر ہے، یہی تو فرقہ وارانہ فساد کی جڑ ہے۔

ہرش نارائن:

چونکہ ہم ایک خاص قوم ہیں اس لئے بہتر ہیں، یہ ہمارا stand نہیں ہے۔ اپنی legacy کو لے کر ہم دنیا کے سامنے کھڑے ہوں تو ایک خاص بات معلوم ہوگی۔ بات صرف Universal Truth یا تجرباتی سچ ہے جس میں نہ تو نازی کا tone ہے نہ فاشسٹ کا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر نیشن کا اپنا مزاج اور attainment ہوتا ہے۔ کچھ قوموں کے achievement پرانے پڑ جاتے ہیں اور قوم ہٹ جاتی ہے۔ وہ اپنا پارٹ ادا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ جو قوم باقی ہے ان میں ہندوستان کا بھی شمار ہے۔ اس میں کسی ایک ذات کا نہیں بلکہ سب قومیں مل جل کر گئی جاتی ہیں۔ انھوں نے جو کلچر بنایا ہے۔ اگر اس کی صحیح نشان دہی ہو جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ہمیں اپنے پوروجوں (آباواجداد) پر فخر نہیں کرنا ہے۔ آج کی ذہنیت کا ہندوستانیت سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ہماری ہندوستان کی قومیت ہے اس کو صحیح طور پر پیش کریں تو کام بن سکتا ہے۔ ایجوکیشنل لیول پر جو کام ہو رہا ہے وہ لبے نیشن کی سطح پر ہے۔ ایک Indianness پیدا ہونی چاہئے جو سارے ملک کو باندھ سکے۔ اگر ہم binding force پیدا نہیں کر سکتے تو ہمارے لئے یہ نقصان دہ ہوگا۔ اس یک جہتی کا راستہ ہے نیشنلزم۔ اسی لئے قوم بن سکتی ہے۔ یہ کہنا غلط بات ہے کہ فلاں ظالم تھا اور فلاں ظالم نہیں تھا۔ یا تاریخ سے فلاں واقعات نکال دو۔ اس سے کام نہیں بنے گا۔ سطحی حل کو چھوڑ کر اگر ہم reality کو پیش کریں تو کام بنے گا۔ ہمارے یہاں آج بھی بہت سے ازم ہیں اور وہ بہت گہرے ہیں۔ اگر ہم انھیں اب نہ نکال سکے تو کب نکالیں گے۔

عابد سہیل:

ہندوستان کا انٹلکچوئل نیشنلسٹ ہے اور ہندوستان کے عوام اپنی جاتی اور قبیلے کے طور پر سوچتے ہیں۔

ہرش نارائن:

سب سے بڑی ہماری آج کی کمزوری یہ ہے کہ آج کل انٹلکچوئل Deconditioned ہے۔ سماج میں جتنے بھی Classes ہوتے ہیں، ہر طبقہ culturally conditioned ہوتا ہے لیکن انٹلکچوئل Deconditioned ہوتا ہے۔ آپ اس کی writing سے نہیں سوچ سکتے کہ وہ کس ازم کو ماننے والا ہے۔

امرت لال ناگر (صدر جلسہ):

بڑے پن کا احساس کسی نیشن کو دینا خطرے سے خالی نہیں۔

دوسرے یہ سچ ہے کہ انڈیا نیشن کے طور پر کبھی ایک بنا نہیں۔ ایک بار کوشش ہوئی تھی۔ فرسٹ اور سیکنڈ سنچری کے بیچ ملٹی نیشنلٹی نے ایک رنگ دیا، پورے ساؤتھ سے نارتھ تک۔ سارے قصے، Legends اکٹھے کر کے ایک مومنٹ دیا تھا۔ دوسری بار یہی صورت دیکھئے کوئی۔ ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ کو جب رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں ہڑتال ہوئی۔ اس کو ہم نے ایکسپلائٹ نہیں کیا۔ اس ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ تاریخ کو کسی نے امپارٹنس نہیں دی۔ پہلی تاریخ میں یہ تصویر آئی تھی اور آپ نے اس تصویر کو نکال دیا۔ وہ تصویر ۱۹۲۳ میں توڑ دی گئی۔ رائٹر as such ایسی طاقت نہیں ہے جو پورے نیشن کو جگا سکے۔ میں فراق صاحب سے متفق نہیں ہوں لینن ہی سب کو جگا سکتا ہے۔ بدھ کو دیکھئے ان کے پیچھے تین چار سو سال کا vacuum آتا ہے۔ اس لئے ہمیں وہ اہمیت دیتا ہے۔ صبح کے پہلے اوشا آتی ہے۔ اسی طرح رائٹر بھی کچھ کر سکتا ہے۔ پریم چند ایک بہادر آدمی تھا جس کے افسانوں میں ہندو مسلمان سب کیریکٹر آتے ہیں اور plainly سب کچھ ڈسکس کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد کیا ایسا کچھ آیا ہے؟ آج کل ہم میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو ایک دوسرے (ہندو مسلمان) کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔ ہم نے اپنی ہی سمسیاؤں پر غور کیا ہے، پیٹ کی سمسیاؤں پر غور نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ بھی اسی سلسلے میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ پورا رائٹر ہی سب کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں پولیٹیکل بیج ضروری ہے۔ ہم اس مسئلے (فرقہ واریت) کو اوپر سے نہ دیکھیں۔ یہ کمیونلزم پرابلم نہیں ہے۔ پیٹ کی یونٹی ہماری سیدھی پرابلم ہے اور اس پرابلم کو لے کر ہمارے پنڈت ملا اور سیاست داں ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ فرقہ واریت کی روایت تو پرانی ہے۔ ہمیں vested interests سے لڑنا ہوگا۔

☆☆☆

فراق صاحب کا کہنا ہے کہ اس سمپوزیم میں ان کی طرف جو الفاظ اور رائیں منسوب ہیں وہ ان سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جب کسی ادارے یا تنظیم یا کسی ادارہ سے منسلک پلیٹ فارم کی طرف سے ان سے ادبی مسائل پر استفسار کیا جاتا ہے تو انھیں ان لوگوں کی "فرض شناسی" پر غصہ آجاتا ہے۔ اس لئے اس سیاق وسباق میں موجودہ سمپوزیم ان کے موقف کو پوری طرح واضح نہیں کرتا۔

لہٰذا آئندہ صفحات میں جو خصوصی گفتگو[1] ہم شائع کر رہے ہیں اسے فراق صاحب کی واضح اور سوچی سمجھی رائے سمجھا جائے ☆☆☆

ماہنامہ "پیش رفت" دہلی

ہر ماہ ملک کے ممتاز پختہ مشق اور نئی نسل کے معتبر اہل قلم کی تازہ بہ تازہ کاوشوں کو پیش کرتا ہے اور ادب کی مثبت قدروں کو نمایاں کر رہا ہے۔

سالانہ قیمت: ۱۲۰ روپے   بیرون ملک: ۸۰۰ روپے

فی شمارہ: ۱۵ روپے

ماہنامہ پیش رفت

۲۷۰۳، بارہ دری، بلی ماران، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

1. یہ گفتگو اسی شمارے میں صفحہ ۱۳۸۲ سے صفحہ ۱۳۸۶ تک ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

محمد علوی

شمارہ ۱۰۱،
اپریل ۱۹۶۷

خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر
فلک بنایا
فلک کو تاروں سے
چاند، سورج سے جگمگایا
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر
زمیں بنائی
زمیں کے سینے
پہ ندیوں کی لکیریں کھینچیں
سمندروں کو
زمیں کی آغوش میں بٹھایا
پہاڑ رکھے
درخت اگائے
درخت پہ پھول، پھل لگائے
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر
یہ دن بنایا
کہ دن میں سب کام کر سکو تم
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر
یہ شب بنائی
کہ شب میں آرام کر سکو تم
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر
یہ سب بنایا
مگر نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا

خدا نے جو کچھ کہا ہے
سچ ہے
مگر نہ جانے
وہ دن کہاں ہے،
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا

مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں

محمد علوی

شمارہ ۲۵،
جون ۱۹۶۸

بستر میں لیٹے لیٹے
اس نے سوچا
''میں موٹا ہوتا جاتا ہوں۔
کل میں اپنے نیلے سوٹ کو
آلٹر کرنے
درزی کے ہاتھ دے آؤں گا
نیا سوٹ
دو چار مہینے بعد سہی!

درزی کی دوکان سے لگ کر
جو ہوٹل ہے
اس ہوٹل کی
مچھلی ٹیسٹی ہوتی ہے
کل کھاؤں گا
لیکن مچھلی کی بو سالی
ہاتھوں میں بس جاتی ہے۔
کل صابن بھی لانا ہے
گھر آتے
لیتا آؤں گا

اب کے ''یارڈلی'' لاؤں گا

آفس میں کل کام بہت ہے
باس اگر ناراض ہوا تو
دو دن کی چھٹی لے لوں گا
اور اگر
موڈ ہوا تو
چھ کے شو میں
''رام اور شیام'' بھی دیکھ آؤں گا
پکچر اچھی ہے سالی
نو سے بارہ

کلب، رمی
دو دن سے لک اچھا ہے
کل بھی ساٹھ روپئے جیتا تھا
آج بھی تیس روپئے جیتا ہوں
اور امید ہے
کل بھی جیت کے آؤں گا
بس اب نیند آئے تو اچھا

بس اب
کل بھی
نیند آئے تو
اکا، دگی، نہلہ دہلہ
اینٹ کی بیگم
مچھلی کی بو
تاش کے پتے
جوکر جوکر
سوٹ پہن کر
موٹا تگڑا جوکر

☆

اتنا بہت سا سوچ کے وہ
سویا تھا مگر
پھر نہ اٹھا
دوسرے دن جن
اس کا جنازہ
درزی کی
دوکان کے پاس سے گذرا تو
ہوٹل سے مچھلی کی بو
دور دور تک آئی تھی

محمد علوی

شمارہ ۴۵،
فروری ۱۹۷۰ء

غزل

کبھی تو ایسا بھی ہو راہ بھول جاؤں میں
نکل کے گھر سے نہ پھر اپنے گھر میں آؤں میں
بکھیر دے مجھے چاروں طرف خلاؤں میں
کچھ اس طرح سے الگ کر کہ جڑ نہ پاؤں میں
یہ جو اکیلے میں پرچھائیاں سی بنتی ہیں
بکھر ہی جائیں گی لیکن کسے دکھاؤں میں
یہ زندگی تو کہیں ختم ہی نہیں ہوتی
اب اور کتنے دنوں یہ عذاب اٹھاؤں میں
مرا مکان اگر بیچ میں نہ آئے تو
ان اونچے اونچے مکانوں کو پھاند جاؤں میں
گواہی دیتا وہی میری بے گناہی کی
وہ مر گیا تو اسے اب کہاں سے لاؤں میں
غزل کہی ہے کوئی بھانگ تو نہیں پی ہے
مشاعرے میں ترنم سے کیوں سناؤں میں
ارے وہ آپ کے دیوان کیا ہوئے علوی
بکے نہ ہوں تو کباڑی کو ساتھ لاؤں میں

شمارہ ۸۷،
نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء

چپ رہو

(شمس الرحمٰن فاروقی کے نام)

میں چپ ہوں
کئی سال سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں
نہ نظمیں نہ غزلیں
نہ خط لکھ سکا ہوں
عجب حال ہے
جیسے کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے
مگر یہ زمیں
آسماں چاند تارے
یہ ہنستے یہ روتے ہوئے لوگ سارے
یہ سب کہہ رہے ہیں
کہو کچھ نہیں تو ہمیں دیکھ کر کچھ کہو
اور میں سوچتا ہوں
کوئی نظم لکھو
غزل اک کہوں
خط لکھوں دوستوں کو
مگر میرے اندر سے آواز آتی ہے علوی
عافیت کچھ نہ کہنے میں ہے
چپ رہو

ایک خط (فاروقی کے نام)

محمد علوی

شمارہ ۱۰۳،
مارچ اپریل ۱۹۷۷

شعر کہتے ہیں بھائی فاروقی
پھر وہی جگ ہنسائی فاروقی

ہم تو خوش ہیں کہ جی رہے ہیں ہم
آپ کیسے ہو بھائی فاروقی

کار میں ٹھاٹ سے نکلتے ہو
ہیں وہی سوٹ ٹائی فاروقی

سوچتے تھے ملیں گے کوٹا میں
اچھی افواہ اڑائی فاروقی

کیا خبر ہے ادب کے لوگوں کی
کیا نئی نسل آئی فاروقی

سنتے تھے آئے تھے یہاں ساقی
آپ کو بھی پلائی فاروقی

اک ایاز اک وزیر آغا ہیں
دوست ہیں دو کے ڈھائی فاروقی

ظفر اقبال کو نہ بھولیں گے
کچھ خبر اس کی آئی فاروقی

آپ تو جانتے ہیں بانی کو
کر دی اس کی پٹائی فاروقی

کیا کریں شعر اچھے کہتا ہے
مار ہم نے بھی کھائی فاروقی(۱)

دیر تک پھر گلے ملے دونوں
بن گئے بھائی بھائی فاروقی

اب اجازت کہ شعر کہنے ہیں
رات کمرے میں آئی فاروقی

پھر وہی شعر و شاعری علوی
پھر وہی گہری کھائی فاروقی

---

(۱) بانی سے دلی اور کوٹا میں ملاقات رہی۔ میں اسے اپنے شعروں سے مارتا رہا اور وہ اپنے شعروں سے میری پٹائی کرتا رہا (محمد علوی۔)

محمد علوی

شمارہ ۱۰۸،
جولائی ۱۹۷۸

(آندھرا پردیش کے طوفان سے متاثر ہو کر)

کیا کہتے کیا جی میں تھا
شور بہت بستی میں تھا

پہلی بوند گری ٹپ سے
پھر سب کچھ پانی میں تھا

چھتیں گریں گھر بیٹھ گئے
زور ایسا آندھی میں تھا

موجیں ساحل پھاند گئیں
دریا گلی گلی میں تھا

میری لاش نہیں ہے یہ
کیا اتنا بھاری میں تھا

آخر طوفاں گذر گیا
دیکھا تو باقی میں تھا

چھوڑ گیا مجھ کو علوی
شاید وہ جلدی میں تھا

شمارہ ۱۳۸
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵

آج بھی ایسا ہوگا

صبح ہوئی اور
چڑیاں گھر میں آنے لگیں
طوطوں کی ڈاروں کی ڈاریں
شہر سے باہر جانے لگیں
رکشوں اور بسوں کو لے کر
رستے بھاگ پڑے
ہم نے اپنے خواب سمیٹے
ہم بھی جاگ پڑے!
اب سارا دن
اک جیسے کاموں میں گذرے گا
روز ایسا ہوتا رہتا ہے
آج بھی ایسا ہوگا

گھر، جھروکا، دوپہر

کل جیسا تھا سب ویسا ہے
گھڑی میں پھر سے ایک بجا ہے
نیم پہ چیل آ کر بیٹھی ہے
دھوپ میں تیزی کل جیسی ہے
گھر میں سناٹا چھایا ہے
(بلی نے کچھ لڑھکایا ہے)
ایک گلہری نیچے آ کر
پھر سے نیم پہ چڑھ جاتی ہے
نیم پہ بیٹھی چیل مزے میں
اپنے پروں کو پھیلاتی ہے
اک اور چیل کہیں سے آ کر
نیم کے اوپر منڈلاتی ہے
جانے ایسی دوپہروں میں
کن لوگوں کی یاد آتی ہے

محمد علوی

شمارہ ۱۵۵،
مئی تا جولائی ۱۹۹۸

دو یادیں

آدھی رات کو آنکھ کھلی تو
میں نے کمرے میں دیکھا
ایک مزے سے کرسی پر
آنکھیں میچے بیٹھی تھی
دوسری سہمی سہمی سی
کرسی کے پیچھے بیٹھی تھی

ساھتیہ اکادمی

اک پاگل لڑکی ہے جو
اپنے سوئمبر میں بوڑھوں کو
ورمالا پہناتی ہے

شمارہ ۱۷۹،
جنوری ۱۹۹۵

اچھے خاصے خوش بیٹھے ہوں اور اچانک اکتا جائیں
پکی سڑک سے جیسے اک دم کچے رستے پر آجائیں

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کے چونک پڑیں
اور نہیں کچھ تو دوکاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو گھر میں ہوں تو اچھی لگیں
لیکن خالی جیبیں لے کر ان دوکانوں میں کیا جائیں

پڑے ہیں کب سے اک ٹوٹے گلدان کاغذ کے کچھ پھول
وقت ملے تو اک دن آکر آپ انھیں بھی مہکا جائیں

سارے کھیل تماشے علوی اک اک کر کے دیکھ لئے
اب اپنا بھی جی کرتا ہے چھوڑ چلیں یہ دنیا جائیں

رات اور کھمبیاں

محمد عمر میمن

شمارہ ۳۳،
دسمبر ۱۹۶۹

کنوں کہ آمدیم تا بہ اوجہا
مرا بشوی با شراب ہوجہا
مرا بہ پیچ در حریر بوسہ ات
مرا بخواہ در شبان دیرپا
مرا دگر رہا مکن
مرا ازیں ستارہ ہا جدا مکن

(مرحومہ) فروغ فرخ زاد

شام دھیمے سروں میں سبز جل رہی تھی۔
یوں جیسے اس کی ذات کا جزو ہو۔

San Vicente Boulevard پر یونیورسٹی کا نہایت طویل و عریض Recreation Centre تھا جس کے گہرے سبز اور کشادہ گھاس کے قطعوں پر شام کے سائے پہلے طویل ہوئے ارغوانی دھند میں جلے، پھر ماند پڑ گئے تینوں سوئمنگ پول، وہ کہ جس میں طلبا اور فیکلٹی کے ننھے بچے تیرتے، وہ کہ جس میں ان کی بڑی عمر کے لڑکے لڑکیاں، اور وہ بھی کہ جس میں وہ خود تیرا کرتے، ان میں پانی اب چپ چاپ، ہلکے نیلے ٹائلوں پر پڑتی زیر آب روشنی میں بے دم پڑا تھا۔ اس کے سینے کی طرح جس میں اب کوئی امنگ اٹھتی، نہ وقت کے پل پل پہنچ سے دور نکل جانے اور کچھ بھی تو نہ کر سکنے کے غم کی کسک، اس دل میں تو اب اجلے دنوں کی دھوپ کا تصور تک آرزو یا حسرت رہی دور، باقی نہ تھا۔ یوں جیسے کوے میں جی رہا ہو۔ دور سے دیکھنے پر رات کے گہرے سینے میں سوئمنگ پولس کا برقی قمقموں سے روشن پانی ان شفاف زخموں کی طرح لگ رہا تھا جو مربع تھے اور نیلگوں اندھیروں کا قتل اسے بڑا ناگوار گذرا۔

اندر Buenos Aires روم میں مدعوین جمع ہونے شروع ہو چکے تھے منتظمین نے آکر آتش داں روشن کر دیا تھا۔ وسط اکتوبر کی شام تھی اور یوکلپٹس کی تیز مہک جو ہوا کی خنک لہروں پہ بے وزن تیرتی کمرے میں آرہی تھی۔ ہلکے اونی کپڑوں میں لپٹے ہوئے جسم بڑی خوش آہنگی سے، طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ، اپنے سے خوش، ساری دنیا سے خوش، متبسم تھے۔ باہر اندھیرے میں کھڑے کھڑے اس نے بیونس آئرز روم کے کھلے دروازے کے منور چوکھٹے پر نظر ڈالی۔ ایک کونے میں ترکی سے آئی ہوئی بڑی ہی Cute مس دوشیزہ سرمت جو مغربی فنون لطیفہ کا گہرا علم رکھنے کے باوجود اپنے مشرقی ورثے اور اسلامی روایات سے گریزاں نہ تھی، اور جس کی جلد جارج آرویل کی زبان کی طرح ہموار تھی، حال ہی میں الجیریا سے آئے اسلامی فلسفے کے پروفیسر کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ لیکن روشن چوکھٹے سے نزدیک تر چہرہ اسرائیل کی اورینٹل جوئس (Oriental Jewess) خانم پری یعقوبی کا تھا جو اپنے رنگ کی گندم گونی، اپنی چھپائے نہ چھپے ایرانی ناک، اور اپنے مردانہ جسم کا بوجھ اٹھائے ایک گروپ میں لہرا لہرا کر کسی نکتے کی وضاحت کر رہی تھی۔ گروپ کا ہر فرد بڑی استہزائی محویت سے اس کے کوکا کولا کے چند گھونٹوں پر یوں مست ہو جانے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، یوں جیسے بندر کا تماشہ ہو رہا ہو۔ فرق تھا تو اتنا کہ بندر کے تماشہ بینوں کے لب کھل اٹھتے ہیں تو تفریح کے خالص احساس سے، ان میں دبے دبے تمسخر کا شائبہ نہیں ہوتا۔ "اس وقت بھی،" اس نے خود سے کہا "وہی اشکنازی (Ashkenazi) کی گردن میں۔" لمحے کی اس حبابی راجدھانی میں بنا کسی کوشش کے ایران کی سانولی سلونی مادموزیل پوریتان کا چہرہ اس کی نظروں کے آگے تیر گیا۔ ساتھ ہی ابکائی سی آئی اور پتے کے سے کڑوے سیال کے چند قطرے سفر کرتے آئے اور زبان پر پھیل گئے۔ "وہ جو صرف ٹوٹ کر چاہ سکتے ہیں یا وہ جو ایسی چاہت کے اہل نہیں، یعنی وہ جو معاف کر سکتے ہیں نہ نظر انداز، ان کا مقسوم خود ہی اپنی تیزابیت کو نگلنا ہے۔" اس نے اپنی سرزنش کی اور اپنے ہندوستانی ہم جماعت ابراہیم غلام حسین والا کی بابت سوچا: اب بھلا اس میں کیا خرابی تھی؟ قابل لڑکا تھا جواب کئی ہزار میل دور بیٹھا کینیڈا کی کسی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسری فرما رہا ہے اور ہم سب ہیں کہ ابھی تک ہم نے اپنا dissertation تک لکھنا شروع نہیں کیا ہے۔"

...دیکھو پیارے بھائی تم یہ شہر بھر کی اعزازی کوتوالی چھوڑ دو۔ دنیا سے، اردگرد، حتیٰ کہ خود اپنے قلب سے گریزاں ہو جاؤ لو ایمان داری کے ساتھ سادہ لوح کسان کی طرح دن تمام اپنے کام سے کام رکھو، ورنہ ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ مگر حسب معمول اس نے یہ آواز سنی ان سنی کر دی۔

ذرا فاصلے پر گھانس کے قطعے کی دائیں جانب جہاں سے laurel fig کی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، بروس بالڈین Barbecue کو Spare ribs کر رہا تھا۔ چربی پگھل کر تپتے کوئلوں پر پڑتی، ایک چھنکا سا ہوتا، اور سنکتے گوشت کی اشتہا انگیز بو دھیمے دھیمے آفاقی سچائی بن کر چاروں طرف پھیلنے لگتی۔ دیکھو تم معنی کی تلاش چھوڑ دو یہ سب دھوکہ ہے، سراب اور نظر کا فریب ہے۔ مجھے دیکھو، میں کائنات کی سب سے عظیم، ناقابل تردید تنہا حقیقت ہوں۔

پھر وہی۔ نہیں۔ نہیں، نہیں۔ اس نے بچنے کی ہزار کوشش کی۔ یہ کچھ

نہیں۔ بے حقیقت۔ یہ جذبات کا، سڑتے گلتے متعفن جذبات کا مذموم Plethora ہے۔ ایک منفی رجحان۔ ایک ازخود طاری کردہ عبقریت۔ بھاگ جاؤ اپنے سے۔ آنکھ میچ لو کہ آپ ہی آری کی کھٹل دھارسے، اپنے ہی گوشت پر کچوکے لگانے، پھر آپ اپنے ہی نمکین خون سے کسب لذت کی یہ خواہش لے ڈوبے گی۔ پر دل پہ اداسی اتر آنے کا کوئی وقت نہیں۔ پھر اس کے دل میں خود کو فنا کر دینے کی منھ زور خواہش اپنی تمام تر سفاکی سے اٹھی۔ یا یہ پانی ہی پھیل کر تمام آفاق کو اپنی گود میں لے لے، وہ اس کا ناقابل بازیافت حصہ بن جائے۔ اپنے کو اپنے سے نسبتاً بڑی، لاتحاشا طویل و عریض شے میں گم کر کے بھول جائے کسی عمیق وحدت میں خود کو تحلیل کر دے۔ ان گمبھیر اندھیروں کا جزو بن جائے جن سے اسے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ یا اسی لمحے کھڑے کھڑے پتھرا جائے۔ اس نے دیکھا کہ طلائی پنجرہ اس کی گرفت سے کچھ دور نہیں رہ گیا تھا۔ اندرینا بھی اپنی جگہ پر تھی، پھر بھی پتھرا جانے کی وہ خواہش اتنی منھ زور تھی کہ اس نے ایک ہی نہیں متعدد بار پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن پتھر کا نہ ہوا۔ اور اب، سامنے پنجرہ تھا نہ ینا، صرف امریکی Diaspora میں مشرقی یورپ سے آئے والدین کی کوکھ سے پیدا ہوئی یہودیت ہائفرالی، جسے کوئی یوڈتھ کہتا اور کوئی جوڈتھ، اس کے اتنے نزدیک کھڑی تھی کہ نسوانی سانسوں کی مدھم آنچ اس کے چہرے سے الجھ رہی تھی، اور وہ خود، سامنے نشیب میں، ایمرسن ہال کی برجیوں کی سلہوت کے عقب میں، میساچوسٹس ایونیو (Massachussets Avenue) سے پرے، Mormon Temple سے بھی دور، لاس انجلس کی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ریکریشن سینٹر میں جہاں تہاں، انڈونیشی طرز تعمیر پر لکڑی کے گلوں کو پاس پاس متوازی رکھ کر، چھپر نما کئی ڈھانچے ملے کھڑے کئے گئے تھے۔ دن میں جب دھوپ ان سے چھن کر پکے فرش یا تمازت آفتاب سے تانبے کی طرح تپتے پیراکیوں کے ننگے جسموں پر پڑتی تو دل آپ ہی آپ، گو لمحہ بھر کے لئے ہی، مسکرا دیتا۔ بے وجہ۔ وہ دونوں ایک ایسے ہی ڈھانچے میں کھڑے تھے۔

''کس لئے لائے تھے یہاں؟'' یوڈتھ نے، جو جانے کتنی دیر سے اس کی یہ خودفراموشی برداشت کرتی آئی تھی۔ قدرے ناگواری سے کہا۔

''کس لئے لایا تھا؟ واقعی اہم سوال ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔

''میں نے کہا تھا، سخت بور ہو گئی ہوں، گھر لوٹ جانا چاہتی ہوں پر راستہ نہیں معلوم۔''

''ہاں یاد آیا۔ تم گھر جانا چاہتی تھیں، ہیں نہ؟ وہ'' اس نے اشارہ کیا۔ ''وہ اندھیرے میں تاریک سی جو دو برجیاں نظر آ رہی ہیں نا، وہ ایمرسن ہال کی ہیں۔ بس انہیں کی سیدھ میں چلی جاؤ۔ آگے کا راستہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ شب بخیر۔''

''شب بخیر۔''

وہ ایمرسن ہال سے پرے شہر کی روشنیوں میں گم ہو گیا، روشنیوں کو جس کے جلنے بجھنے میں اسے کسی ضرورت کا احساس نہ ہوا۔ اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ یوڈتھ اب بھی وہیں کھڑی اندھیرے میں اسے بڑی غیر یقینی سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو رہ رہ کر یہی بند گونج رہے تھے..

but it's life said he

but your wife said she

now said he

ow said she

آؤ میرے لئے اپنے جسم کو آراستہ کرو، اور میرے جام کو عنابی شراب سے بھر دو اندیشہ فردا میں خود کو نہ الجھ جانے دو، ممکن ہے اس کی آمد پر ابھی ہم مدہوش بیہوش ہی ہوں۔

ہم... ہمیشہ سے ہمارا کیا رشتہ، کہ یہ تو ایک بہت ہی گمبھیر راز ہے
خواہش جب بھڑک اٹھتی ہے تو پھر اس کا مآل سوائے فنا کے کچھ نہیں ہوتا
آؤ جسم اور شراب کی چاہت میں
ہاتھوں میں ہاتھ دے مر جائیں، اور کڑکتی بجلیوں کے ماورا کہیں خود کو گم کر دیں۔

''نہیں...'' پگوڈے نما چھپری سائبان میں اسی جگہ کھڑے کھڑے اس نے خود سے کہا، ''نہ جنس، نہ دیوانگی، نہ احمق پن۔''

کل لے مونٹ لائبریری سے نکل کر جب وہ Humanities Building عبور کرتا، سیڑھیوں سے Gipsy wagon کے خشتی مربع میں آیا تو Mulberry کے درخت کے نیچے یوڈتھ Anthropology گریجویٹ وکٹر ڈے تر اور اس کی فرانسیسی منگیتر لے نار جکولی سے بات چیت میں مصروف نظر آئی وہ چپکے سے یوڈتھ کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے شانوں پر سے جھانکنے لگا۔ یوڈتھ کے ہاتھ میں طہٰ حسین کی ''یادیں'' کی وہی جلد تھی جو وہ صبح آفس کی ہر سیکریٹری کو دکھا دکھا کر نیم شکایتی نیم دل میں لڈو پھوٹتے انداز میں بتا رہی تھی کہ جوزف برائٹ اسٹائن نے اس سے کتاب کے ترجمے کے لئے کہا۔ اور اب یہی سب وہ وکٹر اور اس کی منگیتر سے کہہ رہی تھی جو بڑی سنجیدگی سے چونک پڑنے کا ظہار کر رہے تھے۔ لیکن ان کے ہونٹوں کے کونوں میں وہ دھیما، دبا دبا سا استہزائی تبسم یوڈتھ کے احساس سے دور کی بات تھی۔

''واقعی؟'' وکٹر نے تحسین آمیز حیرت سے کہا۔ ''کیا کہنے تمہارے، ہمیں بھی تو دکھاؤ ذرا اپنی کتاب۔''

وہ مسکرائی، بڑی رسان سے، پھر کتاب وکٹر کی طرف بڑھا دی، وکٹر ہی کیا، اس کی جگہ کوئی نتھو خیرا بھی ہوتا تو یوڈتھ کو کوئی تامل نہ ہوتا کہ اس لمحے وہ آسودگی کی اس بلندی پر فائز تھی جہاں سے نشیب میں دیکھتے وقت قابل ورنا اہل کا امتیاز ہی جاتا رہتا ہے اور اگر کوئی فرق، کوئی حدفاصل باقی بھی رہتی ہے تو یہ خود اپنی ذات اور پستی میں رینگتے ہوئے ازدحام کے درمیان ہوتی ہے۔

''اب میں عربی ورbی تو جانتا نہیں،'' وکٹر نے ذرا کی ذرا کتاب الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا، ''لیکن یہ بات کہ برائٹ اسٹائن نے ترجمہ کے لئے تمہارا انتخاب کیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے تمہاری قابلیت پر پورا اعتماد ہے۔''

''بالکل۔'' لے نار نے وکٹر کی ہاں میں ہاں ملائی، اور وہ آسودگی کے دو چند احساس سے مسکرائی۔

یہ وہی تھی، عین میں وہی: اپنی ذات سے اور لوگوں سے اپنی قابلیت

کے اعتراف کی یومیہ تجدید کی عادی۔ یہ بات بڑی خوش گوار تھی کہ انسان سے اس کی قابلیت کا اعتراف کیا جائے، لیکن اس کے معاملے میں ایک اہم ضرورت بھی... اپنی بال سے زیادہ مہین انا کو صحت مند رکھنے کے لئے، اور اس سے بڑھ کر، وہ قوت حاصل کرنے کے لئے جس کے ذریعہ وہ اپنے لاغر وجود کو جاتے دن کی سرحد سے آتے دن کی بے رحم روشنیوں تک کھینچ کر لا سکے۔

پھر یہ بھی ضروری نہ تھا کہ معترف کوئی دوست یا شناسا پروفیسر ہی ہو، یہ کام تو کوئی بھی انجام دے سکتا تھا: راہ چلتا ہوا کوئی اجنبی فٹ پاتھ پر سبز ٹریفک لائٹ کا منتظر کوئی ضعیف جوڑا، یونین کے کیفے ٹیریا میں چائے پیتا ہوا کوئی طالب علم غرض ڈین سے لے کر جینٹی ٹرنک کوئی بھی۔

یہ سراسر بدمذاقی تھی اور اس سے لاتحاشا بازاری پن چھلکتا تھا۔ کیا انسان تھوڑا سا بھی امتیاز قائم نہیں رکھ سکتا؟ دوستوں کی اور بات ہے کہ یہ تم اور تمھارے جنون کی نہایت سنجیدگی سے برت سکتے ہیں۔ یہ بچی۔ اس نے قدرے ناگواری سے سوچا۔ اپنی معصومیت کے سبب یوں ہی بالغوں کے درمیان کھلونا بنی رہے گی۔ مگر وہ کھلونا بنے رہنے پر ہی کیوں مصر ہے؟ یک لخت وہ یوڈتھ کے پیچھے سے نکل آیا اور وکٹر اور اس کی منگیتر کو بکمال استغنا نظر انداز کرتے ہوئے بولا:

"آؤ۔ کافی پئیں۔"

"ارے تم؟" وہ چونک کر بولی۔

"ہاں۔ آؤ۔" اس نے یوڈتھ کا ہاتھ تھام کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا۔

لمحہ بھر کے لئے وکٹر نے خود کو بے چین محسوس کیا، لیکن پھر بڑی مہذب خوش خلقی سے کہ آخر الامر وہ ایک ڈارلنگ امریکن تھا۔ یہ کہہ کر کتاب لوٹا دی۔

"دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال...

Good luck with the translation, and bye now."

اس نے وکٹر کی طرف دیکھا۔ مسکرائی، اور پھر فتح مندی کے واضح احساس سے سر کو خفیف سا پیچھے جھٹکتے ہوئے بولی، "See you"

"چلو۔" وہ بولی۔ "کافی پئیں۔" اس کی آواز میں ابھی تک، جیتی ہوئی برائی کا شائبہ موجود تھا۔

دونوں جیسی ویگین تک آئے اور قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ ایک مبہم غصہ اس کے ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے میں جذبہ ترحم بھی محسوس کیا جو کم از کم اس وقت اسے بہت ناگوار گذرا کہ ترحم دوسرے انسان میں کم مائیگی کی پہچان کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ بہت مشکل تھا کہ انسان کو ترحم کی ایک بھیجلتی ہی سہی، نظر سے دیکھنے کے بعد پھر کبھی اس کا کھویا ہوا وقار اور مرتبہ لوٹایا جا سکے۔ چنان چہ اس نے یوڈتھ کی طرف سے اپنا چہرہ ہٹا لیا اور اپنی آوارہ نظر کو چند لمحوں کے لئے اس ہپی جوڑے پر کھو جانے دیا جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اور اب وہ یوں ہی خالی پن سے سوشل سائنس بلڈنگ کے چودہ منزلی بھوت کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ناراض ہو؟" کوئی دور افتادہ غم دھیرے دھیرے اس میں جاگنے لگا۔

"نہیں۔" وہ گویا خود سے بولا۔ "مجھے سڑک کے شبستاں پسند نہیں۔" پھر جاگتے ہوئے اس نے کہا: "ارے نہیں بھئی۔ میں کسی سے ناراض واراض نہیں ہو سکتا، اور تم سے ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"پتہ ہے تمھیں۔" از سر نو اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کرتے ہوئے۔ یوڈتھ نے بولنا شروع کیا۔ "یہ برائٹ اشٹائن..."

"کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، طٰہٰ حسین کی 'یادیں' دے کر بولا کہ اس کا ترجمہ کر لاؤ مجھے کچھ جلدی ہے نہ۔" اس نے کتاب آگے بڑھا دی۔

"تو دیر کا ہے کی ہے، کر ڈالو۔ یہ سڑک پر ہر کس و ناکس کا راستہ روک کر اشتہار دینے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے کتاب لیتے ہوئے بڑی مکار سفاکی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، بڑی علامہ ہو، مگر گذشتہ پانچ گھنٹوں میں تمھیں پچیس آدمیوں کا راستہ روک کر اشتہار دیتے دیکھ چکا ہوں۔"

"اس میں اشتہار کی کیا بات ہے؟" وہ بسورتے ہوئے بڑی دل فریب اداسی سے بولی۔

"اگر نہیں تو اب سہی۔ بتاؤں۔ بھئی لاس اینجلس ٹائمز میں باقاعدہ اشتہار دے دو، مگر خدارا بہت جلد کہ میں عاجز آ چکا ہوں۔"

اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ اپنی آواز کی بے درد صاف گوئی خود اس کے لئے باعث حیرت تھی۔ فرض کرو کہ اسی طرح کوئی تم سے پیش آئے؟ وہ چکرا گیا۔ ہمدردی کے جذبے کے باوجود وہ اس سے نظریں چار نہ کر سکا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان آنکھوں میں کیا ہوگا: ایک اداسی جو تمھیں تمھاری ذات کے بایں ہمہ چوکا دینے کی اہل تھی، اور کہیں دور، تمھاری روح کے اندھیروں میں کسی ایسے گوشے کو کہ جہاں کسک سب سے زیادہ محسوس ہو، آہستہ خرام آ کر چھو لینے اور تمھارے چٹانوں سے سخت تر عزم کو پانی کر دینے کا جس کا اپنا انداز تھا۔ اور اس کے بعد تم وہ سفلی آدمی رہ جاتے جس نے خود اپنی ہی رکیک قابل نفرت جذباتیت کے آگے نہایت کس مپرسی سے گھٹنے ٹیک دیے ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تب، نہ جانتے ہوئے کہ کیا کرنا چاہئے، وہ یوں ہی "یادیں" کی ورق گردانی کرنے لگا تا آں کہ اس کی نظریں ایک صفحے پر جم کر رہ گئیں اور وہ خالی پن سے عبارت پڑھنے لگا۔

"کاش مجھے اتنی خراب عربی ہی آتی جتنی تمھیں آتی ہے" اس نے کتاب جھپٹ لی اور اسی جگہ سے اٹک اٹک کر پڑھنے لگی۔ "دیکھا تم نے" وہ ہار کر بولی اور کتاب بند کر دی۔ مسکرائی، مگر درد کی تحریر اس کی آنکھوں میں بڑی واضح تھی۔ پھر اس نے کہا: "وہ ہوا یوں کہ برائٹ اشٹائن اگلی گرمیوں میں sabbatical پر جا رہا ہے۔ پورا سال غائب رہنے کا ارادہ ہے۔ کہہ رہا تھا اذرائیل جائے گا۔ پتہ نہیں واپس آئے نہ آئے۔ بوڑھا ویسے ہی ہے راستہ میں سٹک گیا تو..."

"ارے نہیں بھئی،" وہ بڑی ڈھٹائی سے بات کاٹ کر بولا۔ "سٹکے وکٹرے گا نہیں۔ ستر سال ایسی کوئی زیادہ عمر بھی نہیں ہوتی، اور ابھی تو آہنی پردے کے عقب میں اس کا باپ بھی بقید حیات ہے۔ افسوس دونوں یوں ہی

دور دور زندہ رہ سکتے ہیں، کبھی ملنے کی حسرت لئے، چ، چ!"

"اب چپ بھی رہونا، کچھ کہنے ہی نہیں دیتے۔" اداسی کی تحریر کو اپنی آنکھوں سے جلاوطن کرتے ہوئے اس نے دل ربائی سے کہا۔ یہ اس کی دل موہ لینے والی ادا۔ لمحہ بھر کے لئے اس نے خود کو بڑے عجیب انداز میں نہتا محسوس کیا۔ یہ نڈھال کر دینے والی لیکن بڑی پرکیف نامحفوظگی تھی جو اپنی ساری کشتیاں جلا دینے کے بعد اور خوف کی اولیں یورش سے پہلے کے درمیانی مختصر وقفے میں آتی ہے۔

"اچھا کہو۔"

"پھر وہی۔ خیر تو میں کہہ رہی تھی، ایک سال سے یہاں پڑی جھک مار رہی ہوں، سوچا اگلے سال اس کے جانے سے پہلے پہلے ایم۔ اے کرلوں ٹھیک ہے نا؟ اسی لئے برائٹ اشلائن کے پاس گئی تھی۔ اس کم بخت نے یہ کتاب تھما دی۔ کہنے لگا تم ترجمہ شروع کرو ادھر میں چیئرمین سے بات کرتا ہوں کہ اگلے جون تک تمھیں ایم اے ملنے کا کیا امکان ہے۔" وہ ذرا کی ذرا سانس لینے کو رکی، پھر مسکراتے ہوئے بولی: تم جانو، اب یہ ٹھہرا موڈرن اسٹف۔ میں چاہتی کوئی کلاسیکل یا میڈیول ٹیکسٹ دے گا..."

"تمھیں عربی پڑھتے کتنے سال ہوئے ہیں بھئی؟" اس نے بات کاٹ کر سوال کی۔

"کتنے سال؟ کیوں؟... یہ کوئی ایک برس اور ایک گرما۔"

"اس پر چلی ہو کلاسیکل ٹیکسٹ کا ترجمہ کرنے۔"

قطار میں بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ سبھی لڑکے لڑکیاں بڑی مضحکہ آمیز نظروں سے یوڈتھ کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ ناگواری ذرا کی ذرا اس کے چہرے پر پھیلی لیکن اس نے اسی تیزی سے اسے بھی اپنی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا۔

"بات دراصل یہ ہے،" اس نے لڑکے لڑکیوں کے قہقہے کی نشتریت کو کم کرنے کی کوشش میں کہا، "بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب تجربے کی بات ہے اور تجربہ وقت کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ میری ہی مثال لے لو، حال ہی میں مجھے پندرھویں صدی کی ایک کتاب کا ترجمہ کرنا پڑا۔ یقین جانو دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور ہر لائن میں چھبیس بار ڈکشنری دیکھنی پڑی سو الگ۔ جس فقرے کا ترجمہ میں نے "ازمنۂ رفتہ کے آثار" کیا۔ اور وہ رنگی ترجمہ پر خود کو تقریباً مبارک باد بھی پیش کر دی۔ وہ "احادیث نبوی" نکلا۔ اب تم جانو، میں گذشتہ پندرہ سال سے یہ زبان سیکھ رہا ہوں۔ مان لیا کہ میں پرلے درجہ کا غبی ہوں پر تم اب کون علامہ ہو۔ یا ممکن ہے، ہو ہی، کون جانے کہ میں تمھاری کھال میں تھوڑی چھپا بیٹھا ہوں۔"

"علامہ؟ خیر وہ تو میں ہوں ہی۔ سب جانتے ہیں اور تمھارے جاننے نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہی ٹیکسٹ، تو اس کا ذکر یوں ہی ضمنی طور پر آ گیا تھا میں تو صرف اتنا کہنا چاہتی تھی کہ سخت بور ہو گئی ہوں۔ اب اور زیادہ اس بھنگڑ خانے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ بہت جلد یہاں سے چل دوں گی۔ عجیب مذاق ہے۔"

"کیا مذاق ہے؟"

"کچھ نہیں۔ جانے دو۔"

"کیا مصیبت ہے۔ کچھ بولو گی بھی یا نہیں۔"

"آئندہ کیا کروں گی، کیا قدم اٹھاؤں گی، یہ پرواز کہاں ختم ہوگی۔ کچھ نہیں معلوم۔ کیا یہ عجیب مذاق نہیں؟ اور اس سے بڑھ کر مذاق یہ ہے کہ انسان جینے کو ساری عمر جی لے لیکن اسے اپنے منصب کا پتہ تک نہ چل سکے، نہ ہی اپنے اجزائے آفرینش کا۔ اس دور میں سب سے بڑی حماقت ہے کہ انسان یہ سوال پوچھے: میں کیا کرنے کا اہل ہوں؟ تنظیم کے گرگے تمھاری طبیعت صاف کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ جلتی آنکھیں لئے صبح ہی صبح اٹھ بیٹھو، بیت الخلاء میں یوں ہی گھنٹوں بیٹھے رہ کر مضامین بلند کے نزول کی خالص تخلیقی خواہش کا گلا گھونٹ کر بھاگم بھاگ یونی ورسٹی پہنچو، پھر ایک کلاس سے دوسری میں مارے مارے پھرو۔ جلد بازی، دھکم پیل، بھاگ دوڑ، ہمیشہ، ہمیشہ.... میں تو اب عاجز آ گئی ہوں، اس پر مستزاد یہ کہ یوں اپنی ہڈیاں پلوانے کے باوجود دوسری لڑکیوں کی طرح سودے میں یہ تسکین بھی نہیں کہ آخرالامر B.A. یا M.A کے ساتھ ساتھ ایک عدد Mrs کا دم چھلا بھی لگ جائے گا۔ میں، تم جانو، اس قسم کی حماقتوں سے قطعی آزاد ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر سلسلہ کلام جاری رکھا: "جانے دو۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔ ساری بات یہ ہے کہ مجھے اب یہاں سے چلا جانا چاہیے ممکن ہے میں کسی دوسری یونی ورسٹی چلی جاؤں، وہ اس لئے کہ برائٹ اشلائن کی عدم موجودگی میں میرا کون پرسان حال ہوگا۔ مجھے کون پڑھاتا پھرے گا۔ یہ سب تو" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "بس یوں ہی سے ہیں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ تیس ہزار طلباء کی یہ یونی ورسٹی محض تمھاری ناز برداریوں کے لئے ہے۔ ہنہ۔ کوئی VIP ہو تم بھول جاؤ۔ اب یہ کو اس مان، اچھی بھلی عربی جانتا ہے۔"

"جانتا ہے۔ مجھے A دیتا ہے۔ کل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آج سے کم و بیش دس سال کے اندر اندر صف اول کی مترجم بن جاؤں گی۔ بس اس کی پہنچ کی یہ انتہا ہے۔ میری قابلیت کا اعتراف کر سکتا ہے۔ A دے سکتا ہے۔ مگر مجھے پڑھانے کو تیار نہیں۔ میرا مطلب ہے خصوصی طور پر سارے کورس لے چکی ہوں اس کے۔ بہتیرا کہا کہ بھئی ہمیں Special studies کا کلاس کارڈ دیدو، مگر وہ بھلا سنے ہے۔ پہلے ہی اس کی ساری کلاسیں لے چکی ہوں۔ اب اور اس کے نتھو خیروں کے ساتھ کلاس میں نہیں بیٹھ سکتی۔ ایسے چنیدہ چنیدہ، ہر نسل مذہب اور عمر کے خرانٹ بھر رکھے ہیں کہ کلاس کا ہے کو ہو۔ گرفتھ پارک ہوا۔ اور گرفتھ پارک میں پھر بھی محظوظ ہونے کی ہزار ہا چیزیں ہیں۔ صاحب تو گرفتھ پارک کیوں نہ جایا جائے، اس کی کلاس میں کیوں جایا جائے؟"

"اچھا بھئی، مان لیا۔ نہیں پڑھا سکتا تمھیں۔ تو پھر کیا ہوا؟ دوسرے بھی تو ہیں۔ یوسف نقاش... معاف کرنا... جوزف نیک کاس کو لے لو۔ بھلا اس میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں؟"

کیڑے نہیں پڑ گئے۔ ایک لحاظ سے سب سے اچھا استاد ہے۔ مگر۔ مگر اب تم جانو، مصر کا یہودی ہے۔ جب ناصر نے اسے بحر قلزم میں جا دھکیلا۔ کہ چن چن کر یہودیوں کو دریا انداز کرنا ناصر کا محبوب مشغلہ ٹھہرا.. تو اللہ میاں کی بھینس (؟ گائے)۔ کہ جو وہ ہے۔ تیرتا تیرتا اسرائیل جا پہنچا، ظاہر ہے۔ مگر ان کی بلا سے۔ وہ بھلا فکر کرے ہیں ان کام کے نہ کاج کے، ڈھائی سیر اناج کے مشرقی

یہودیوں کی پہلے ہی سے چکڑ بھر جو موجود ہیں وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ انھیں صرف ایک کام آتا ہے: بچے پیدا کرنا۔ الغرض، انھوں نے تمھارے نقاش صاحب کی ذرا پرواہ نہ کی۔ گویا بالفاظ دیگر انھیں کوئی لفٹ نہ دی۔ چنانچہ بیچارے فرانس جا پہنچے۔ وہاں اچھی خاصی گھانس ڈالی گئی۔ تقریباً وہاں بس گئے تھے کہ لڑکے کی چاہت امریکہ کھینچ لائی... اف یہ مشرقی اور اف یہ ان کی جذباتیت یہ اپنے چوزوں کو بنا پروں میں سمٹائے نہیں رہ سکتے۔ اور یہ میاں تھیمدرا اپنے ہائی بلڈ پریشر اور دودو ہارٹ اٹیک کے باوصف بھاگم بھاگ یہاں آپہنچے اور یہاں۔ حد تو دیکھو یہاں بیچارے کا نام تک بدل کر رکھ دیا۔ ہے۔ اب یوسف نقاش نہیں، اپنے کو Joseph Nakkas لکھتا ہے۔ چاہے اسے Identity crisis کہہ لو، یا کچھ اور جو چاہو۔ مگر اس کا مطلب ایک ہی نکلتا ہے۔ سمجھ میں آرہا ہے نا؟"

"خوب آرہا ہے۔ بولے جاؤ۔"

"یہی کہ اس کا Persecution-complex اب حد سے بڑھ گیا ہے اور اسے پاگل کئے دے رہا ہے۔ پورے گھنٹے کلاس میں یہی رٹ لگائے رہتا ہے "انتم فی ربیع حیاتکم وانا فی خریف حیاتی۔" بہت ہوا تو بطور تنوع خود ہی سوال کرے گا کہ امریکہ میں وہ دو کون سی چیزیں ہیں جو مفت ملتی ہیں۔ ان لوگوں کی نظریں مفت چیزوں پر سب سے پہلے پڑتی ہے۔ پھر خود ہی جواب دے گا: ایک "سماع" دوسری "کبریت"۔ نہیں، جناب، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ہم بھر پائے۔ دن بدن نیوراتی ہوتا جا رہا ہے۔ ہنھ، مجھے کیا پڑھائے گا۔ اس کے حواس پہلے ہی باختہ ہیں۔"

وہ یکا یک چپ ہوگئی، اور اس کی وہ بلندیوں پہ جا تُز تمسخر آمیز مسکراہٹ کہ جس کے ساتھ وہ نشیب میں ٹھہری ہوئی انسانیت کا نہایت بے رحمی سے مذاق اڑاتی تھی رفتہ رفتہ غائب ہوگئی اور اپنے پیچھے عجیب غم انگیز زہر خند چھوڑ گئی۔ پھر اس نے نہایت اکتائی آواز میں یوں سلسلۂ کلام جاری رکھا: "تمھیں کوئی ایسی یونیورسٹی معلوم ہے جہاں اچھے استاد ہوں اور جہاں اچھی عربی پڑھائی جاتی ہو؟ سچ، اب یہ جگہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ یہاں سے طبیعت سخت عاجز آگئی ہے کہ باتیں سب بنا لیتے ہیں لیکن پڑھانے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔"

"ٹوینٹی سینٹس" (Twenty cents) میکسیکن لڑکی نے کافی کی دو پیالیاں کھڑکی سے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے گن کر بیس سینٹ ادا کئے اور کافی کی پیالیاں تھام لیں۔

دونوں چلتے ہوئے جیپسی ویگن کے خشتی مربعے میں آئے اور ٹل بیری کے ایک درخت کے نیچے دھری میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"دیکھو" اس نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے آگے کو خفیف سا جھک کر ٹھیک اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا بڑی رازداری سے کہا، "کوئی کسی کو کچھ نہیں پڑھا سکتا، یوڈتھ اپنی تربیت تمھیں خود ہی کرنی ہوگی۔ زندگی بڑی سنسان سڑک کا نام ہے، اور چیزوں میں، لوگوں میں، یونیورسٹیوں میں، اساتذہ میں کیڑے نکالنا تمھاری پرانی عادت ہے۔ پہلے تم ہاورڈ میں تھیں، تھیں نا؟ وہاں سے کیوں بھاگ نکلیں؟ وہاں کوئی اچھا استاد نہ تھا، ٹھیک؟" یوڈتھ نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ "اور اب کاہلی اور نااہلی کی ہوا یہاں کے اساتذہ کو بھی لگ گئی ہے؟ ہنھ۔ میں بھی ہاورڈ میں رہ چکا ہوں۔ استادوں میں مجھے تو کوئی ایسی قباحت نظر نہیں آئی۔ اگر میری کوئی پرابلم تھی، تو یہ سراسر میری اپنی ذات تھی۔ تھی کیا اب بھی ہے۔ آفس کی بہت پیاری برازیلین سکریٹری مس اوفیلیا ڈکسن نے گویا مجھ پر بڑا زبردست انکشاف کرتے ہوئے ایک روز فرمایا تھا: "محمد تم اپنی ذات میں بے حد شکستہ ہو مضطرب ہو۔ اگر ذرا سا ہم آہنگ ہو جاؤ تو یہ تمام دوسرے اور ان کی یہ تمام بے رحمیاں، نامہربانیاں محض ننھے بچوں کی وہ حماقتیں نظر آنے لگیں جنھیں کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا اور جنھیں صرف معاف یا نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔" تو جناب یہ ٹھوس فلسفہ کا ایک ٹکڑا ٹھہرا، اور مس اوفیلیا ڈکسن میں نہایت افسوس کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اس قسم کے ملبے کا گاہک نہیں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اور اب تم یہاں سے بھی بھاگ نکلنے کی فکر میں غلطاں ہو۔ بہت اچھا مگر بھاگ کر جاؤ گی کہاں؟ اپنی ذات کے حصار سے کون بھاگ سکا ہے، یوڈتھ؟ کیڑا تو تمھاری ذات میں ہی ہے۔ اسے پالو اور کچل ڈالو، خوب خوب جلد قبل اس کے کہ یہ تمھیں اندر ہی اندر سے چاٹ ڈالے۔ دوسروں پر تہمتیں دھرنا دیوانگی ہے۔ اور اگر تم اس ملک کو چھوڑ دینے پر تلی ہی بیٹھی ہو تو بسم اللہ، یورپ چلی جاؤ۔ سچ، شرط بدنے کو تیار ہوں کہ وہاں کافی پیو گی تو بڑا مزہ آئے گا اور مے ارغوانی تو سارا آفاق ساغر میں ڈوبتا نظر آئے گا۔ یہاں لوگ، جو چاہے پئیں، کچھ اس جلد بازی سے پیتے ہیں گویا گاڑی ہی چھوٹ جائے گی۔ لندن یونی ورسٹی ایسی بری نہیں۔"

"بری نہیں، پر وہ مجھے لینے کے نہیں۔ کو اس مان۔ تمھیں پتہ ہی ہے کہ خبلی نے ڈاکٹریٹ وہیں سے کی تھی... کہہ رہا تھا کہ وہ صرف انھیں لوگوں کو داخل کرتے ہیں جنھیں زبان پر کامل دسترس حاصل ہو۔ میں بیچاری تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں نے تو ابھی کل ہی سے عربی پڑھنی شروع کی ہے۔"

"مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے..." اس نے رک رک کر اس کی آنکھوں کی گہری فسردہ جھیلوں میں اترتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "کہ میری طرح تمھارا جھگڑا بھی اپنی ذات ہی سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی اداسی اور بہیمیت کو Internalize کر لیا: اب مجھے کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو میں بپھر نہیں پڑتا، اور تم... تم ابھی اداسی سے تنہائی کی پہلی منزل میں ہو۔ ہر ایک سے حق و ناحق الجھ پڑنے، ہر اجنبی کا راستہ روک کر اپنا دکھڑا سنانے، پھر اس سے اپنی قابلیت کی داد وصول کرنے، رو پڑنے، خود ترحمی میں مبتلا رہنے، اپنی کوتاہیوں، ساری کم زوریوں کو نظر انداز کر کے ساری دنیا میں کیڑے نکالنے کی جو یہ عادت ہے تمھاری تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ تم اپنی ذات میں بے نہایت مضطرب ہو، دکھی ہو، بکھری ہوئی ہو، ہو نہ؟"

اس نے نظریں بچاتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ کچھ نہ بن پڑا تو اداسی سے بولی: تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں بے حد مضطرب ہوں، اور اس سے زیادہ، ہراساں۔ ہراساں؟ کیوں؟ کس چیز سے؟ اور یہی مصیبت ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔ کوئی چیز ہے جو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے سائے کی طرح میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ بے خوابی اور بدخوابی۔ ان دنوں یہی میری زندگی ہے۔ دن کو سوتی ہوں اور رات کو جاگتی ہوں۔ اکیلی رہ نہیں سکتی، اس لئے روم میٹ رکھ چھوڑی ہے۔ وہ

الگ بے زار ہے کہ خود تو سوتی نہیں پر اسے TV پر کوئی لیٹ شو دیکھ کر سونے نہیں دیتی۔ اگست سے اب تک یہ میری پانچویں روم میٹ ہے اور اگست کو اب بمشکل تین ماہ ہوئے ہیں۔ سچ۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا، لوگ، جگہیں، تماشے، ہنگامے، غرض یہ سارا الاّ گلا۔ اسی چکر میں دو ایک منشیات بھی آزما ڈالیں...‘‘

’’کیا کہا، منشیات؟‘‘

’’ہاں۔ کیوں؟ اگرچہ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ روپہلی موسیقی، سایوں کی ریشمیں سرسراہٹ اور رنگین آوازوں کی کھنک، نسوں میں آخرِ شب کی شبنم کی طرح رستی ہوئی آہستہ خرام راحت نیم حرکتی جھولے، میری جان، باتیں ہیں جو لوگ بکا کرتے ہیں۔ ہوتا ووتا کچھ نہیں۔ تم معجزے کے منتظر ہی رہ جاتے ہو۔ میرے لئے تو وہ ناقابلِ ختم رات تھی جس میں بلاؤں نے رقص کیا تھا اور کیچڑ میں لتھڑے برہنہ سائے دہشت سے چلائے تھے۔ میرے اللہ، خوف سے میری سٹی گم تھی...‘‘

’’یہ بھی کرنے کی کوئی بات تھی۔ میں نے کہا، کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ منشیات بھی نہیں۔ جو تمھارے اندر ہے تمھیں اس سے نظریں چار کرنی ہی ہوں گی، بے یار و مددگار۔ یہ منشیات کس کام کی کہ یہ مقاومت کی دھار کو کند کر دیتی ہیں۔‘‘

’’ممکن ہے، بھئی سچ پوچھو تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ جوں توں کر کے، کسی عنوان یہ رات ختم ہو، اور بہت جلد ختم ہو۔ جب یہ ختم ہوئی تو ایک ناقابلِ فراموش احساسِ جرم میرے اندر سانس لے رہا تھا۔ دنوں اس نے مجھے بے کل رکھا۔ اس کے بعد پھر کبھی میں نے منشیات استعمال نہیں کیں اور شاید کبھی کروں بھی نہیں۔ یوں سمجھو ان کا معاملہ یہاں ختم ہوا۔‘‘ پھر اس نے نہایت اضطراراً یہ سوال اچھال دیا: ’’بتاؤ میں کیا کروں؟‘‘

’’میں کیا بتا سکتا ہوں‘‘ اس نے دانستہ نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر دور پارکنگ لاٹ کی طرف پھینکیں جہاں Avocado کے جھنڈوں کے عقب میں باوقار سورج خود اپنے خون میں لحہ لحہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ میرے سوالوں کا جواب ہی مجھے معلوم نہیں کاش مجھے بھی صلیب پر چڑھا کر منٹ دو منٹ میں قصہ پاک کر دیتے۔ یہ روز روز کی ادھوری موت، Mort a credit کیا بتاؤں یہ بدبخت Celine مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ میں عاجز آ چکا ہوں۔ یہ چھکڑا بھر متعفن، مہمل امیدوں اور توقعات جو نہایت بے شرمی سے انھوں نے مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں ملک قوم والے رشتہ دار الگ دوست احباب الگ اور آخراً یہ بیوی اور ٹیاؤں کرتا ہوا بچہ۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سب کا حساب چکاتے چکاتے میرا اپنا لحہ بھی نہ آ سکے گا۔ مجھے جو بننا ہے نہ بن سکوں گا۔ کاش یہ لوگ مجھ سے ہاتھ دھو لیں۔ مجھے چین لینے دیں۔ مگر مجھے معلوم یہ ایسا نہیں کریں گے، کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک میں جہنم داصل نہیں ہوتا، اور یہ بعد از وقت ہوگا۔ صیحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا۔ چاہئے کہ آدمی بھاگ جائے۔ جیسے امرک لینڈ اپنی بلانک کو چھوڑ بھاگا تھا۔ اور اپنی محبت میں پامال کسی کو ٹھیک اپنی نظروں کے سامنے oxalic acid کی پوری شیشی غٹاغٹ حلق سے انڈیل کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتے دیکھنے کا پتہ رکھ سکے، اور لطف یہ کہ دل لحہ بھر کو بھی متاسف نہ ہو نہ ہی احساسِ جرم سے ابل پڑے۔ تبھی انسان اپنے جوہر کو پا سکتا ہے۔ مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں خود کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ہمیشہ واپس لوٹ آؤں گا۔ اسی لئے میں بھاگ نہیں جاتا۔ انسانیت۔ وہ از خود طاری کردہ جذبۂ ترحم جو ہر حرامی کے لئے بے اختیار اُمڈ آتا ہے۔ اور ایمان داری سے کام کرنے کی آپس میں کوئی ساجھے داری نہیں۔ اور صاحب یہ ہے ٹھوس حقیقت تمھیں بیدرد ہونا پڑے گا، انتہا درجہ کا بے درد، پہلے اپنی ذات کے خلاف قبل اس کے کہ دوسروں کے خلاف ہو، اگر تمھیں کچھ بننا ہے، کچھ کام کرنا ہے، اس سے بحث نہیں کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔ لگتا ہے جنوں میں کیا کیا کچھ بکے جا رہا ہوں۔ ٹھہرو۔‘‘ اسے کچھ یاد آ گیا۔ ’’تم یہودی ہو نا؟ اسرائیل چلی جاؤ۔ وہاں تم پر اس دبیز ہملیت کا دورہ نہ پڑ سکے گا۔ کسی بھی قوم کی سیاسی پیدائش کے بعد کے اولین چند سال خواہ لاکھ پُر آشوب سہی، اسی تناسب سے بامعنی ہوتے ہیں۔ ان کے زیرِ سایہ کام کرتے ہوئے انسان خود کو کسی واقعہ کے ٹھیک وسط میں پاتا ہے جس سے انہماک، مثبت زندگی اور Involvement کا عجیب آسودگی بخش احساس جنم لیتا ہے۔ تمھیں لگتا ہے تمھاری زندگی کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں، کہ تم نے اپنے منصب کو پا لیا ہے، اور ہرچند کہ کل لکھی جانے والی نصاب کی کسی کتاب میں تمھارا نام درج نہ ہوگا۔ اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام سالوں میں زمین پر پڑتا ہوا تمھارا قدم تمھیں تمھارے قطعی برمحل ہونے کا احساس دلاتا ہے، اور یہی اہم ہے۔ جب قوم اپنی منزل کو پا لیتی ہے، تختۂ گل کو پہنچ جاتی ہے، تمھاری اہمیت ختم ہو جاتی ہے، الّا یہ کہ تم سیاست داں ہو یا کسی سیاست داں کے مخالف۔ رہی بوریت تو خوب جان لو، یہ ایک استقرائی تعیش ہے جو انھیں قوموں کو زیب دیتا ہے اور راس آ سکتا ہے جو انگلی پکڑ کر چلنے کے دور سے آگے نکل چکی ہوں۔ بقیہ کی قسمت میں سبک سری لکھی ہے جسے وہ خود ترحمی کے ایک لمحے میں بوریت سے تعبیر کر کے خود کو بہلا لیا کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے آنے والے طلبا میں مجھے باوجود کوشش کے کہیں جذباتی افراط و تفریط، زندگی کے دو نیم ہو جانے کی کیفیت یا بوریت نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ اس قدر سنجیدگی اور ذمہ داری سے اپنا کام کرتے ہیں کہ دنیا انھیں کی ہے اور جب دنیا انسان کی اپنی ہو تو اس سے گریز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہرحال، تم وہاں جاؤ تو بس سوال مت کرنا اپنے سے اور اپنے ملک کی تشکیل میں خود کو فنا کر دینا...‘‘

’’تم کیوں نہیں چلے جاتے اپنے ملک؟‘‘ بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

’’یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے ساری عمر یہاں رہنے کا فیصلہ کر ڈالا ہے؟ میں اپنے لمحے گن رہا ہوں۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اش کے نازی ہو، وہاں تمھیں discriminate کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نفسیاتی طور پر تمھیں اس الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جس سے سابقہ ایرانی، حالیہ اسرائیلی خانم پری یعقوبی دوچار ہیں۔ مجھے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لینے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ بیچاری کس طرح خود کو تم اشکینازیوں کے گروپ میں تحلیل کر دینے کی کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن کوئی بھی اپنی قوم و ملک میں اپنی پیدائش کے حادثے کو نہیں بھول سکتا۔ احمق پن میں بھول بھی جائے تو دوسرے نہیں بھولتے جب بال ایک ایک کر کے جھڑ جائیں گے تو خود فراموشی کا دن خواب ٹوٹے گا اور یہ حقیقت تازیانے کی طرح دل پر آ لگے گی کہ خود کو بدلنے کی چاہت میں انسان وہ بھی کھو بیٹھا

جو اس کا اپنا تھا، کہ مختلف ثقافتوں، اور رسم و رواج کے ادھ کچے ٹکڑوں سے اپنی شخصیت کا جو کاک ٹیل تیار کیا گیا ہے وہ نہایت ہی بدمزہ تھا، اور جسے انسان ان جانے میں چکھ ہی سکتا ہے، کھا نہیں سکتا۔ تم لوگ کبھی اسے اپنا نہ سکو گے، مگر وہ کس خلوص سے یہ حقیقت بھول جانے پر تلی بیٹھی ہے۔"

"سفید جھوٹ۔" وہ تقریباً چیخ کر بولی، آپ اپنے انکار کی اٹل قطعیت پر ہراساں، ہراساں بالکل غلط مجھے مکر کی بو آ رہی ہے۔ خدایا کن من گھڑت قصوں سے یہ گاؤدی عرب طلبا تمھارا بودا ذہن بھرتے رہے ہیں۔ تو یہ افسوس کہ تم بھی ان کے بہلاوے میں آ گئے، افسوس۔ تم سب مشرقی لوگ، جانتے ہو تم سب کے سب چوزے ہو، اور مجھے چوزوں سے سخت نفرت ہے۔ واماندگی میں بھی انسان کو وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ اشکے نازیوں کو نسلی امتیاز کا عامل قرار دینے سے تمھاری پس ماندگی دور نہیں ہوگی۔ اگر زیر دست ہو تو سزاوار ہے کہ تم اس کا بزور بازو خود تدارک کرو اور یہاں سوال زیر دستی کا بھی نہیں۔ ہم نے ان مشرقی یہودیوں کو اپنانے کی پر خلوص کوشش کی ہے۔"

"...کی ہوگی۔ میرے سامنے تو چند عربی النسل یہودی دوست ہیں اور Michael Selzer کی کتاب ہے۔"

"مائیکل سیلزر؟ وہ اول درجہ کا فریبی ہے اس کی لن ترانی کی ساری وجہ یہ ہے کہ اسرائیل میں اس کی دال نہ گل سکی۔"

"دال نہ گل سکنے سے اس کی تحریر نہیں سڑ گل جاتی، یوڈتھ۔ پھر فیصد تعصب، ذات کا المیہ اور انا کا زخم سمجھ کر نکال دو تو بھی کتاب میں جو حقائق ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"اور تم ان کا درد لئے بیٹھے ہو۔" اس نے طنزاً کہا۔ "یہ مشرق سے آنے والے یہودی" اس نے منہ بنایا۔ "یہ تو اس قدر پست، جعل ساز، اور مکار ہیں، ایکدم، سب کے سب۔ ان کو مہذب کرتے کرتے صدیاں گذر جائیں گی۔"

"صدیاں؟! اگر انھیں اسمائے صفات سے انھیں یاد کیا جاتا رہا تو پورا ایک millennium میری طرف سے اپنی صدیوں پر اور اضافہ کر لو۔ پہلے انھیں چور اچکا کہو، پھر یہ امید بھی رکھو کہ تمھارے پاپوش بردار بنیں، اور وہ بھی کچھ اس عاجزی سے جیسے کتا مالک کے پیچھے دم ہلا کر گھگھیاتا ہے۔ چور کو چور کہو گی تو وہ ساہوکار بننے سے رہا، کچھ بنے گا تو پرلے سرے کا ڈکیت۔ اور پھر "فریب کاری" وغیرہ وغیرہ کا کوئی وجود نہیں، محض ایک Myth ہے، ایک اختراع جو چند سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے پھیلائی گئی ہے۔ سچ، کبھی کبھی تو تم مس اوفیلیا ڈکن کے "بچوں" سے زیادہ بچہ بن جاتی ہو۔"

"برا مان گئے؟"

"نہیں بھئی، میں برا ورا نہیں مانتا۔" اس نے یوڈتھ کی نظروں سے دور گہری سبز چتیوں... کہ جن پر اندھیرا دبے قدموں اتر آیا تھا۔ کے عین وسط میں میگنولیا کے بڑے سارے بے حد سفید پھول کو دھیرے دھیرے کھلتے ہوئے دیکھ کر کہا: "ہم میں سے بہترین انسانی جذبہ رکھنے والے دل بھی کسی نہ کسی bias کا شکار ہوتے ہیں، کچھ اس طرح کہ ان کے افعال میں ایک کے بعد ایک تضاد کے شاخسانے پھوٹتے چلے جاتے ہیں، جنھیں دیکھنے کے لئے کسی خورد بین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشکل تو وہاں آن پڑتی ہے جب ہم اس تضاد کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، اپنے تمام تر ذہن، نہایت باوقار انسانی جذبات کے باوجود۔"

"کیا ہانک رہے ہو بھئی؟ میں کچھ نہیں۔" یوڈتھ نے بات کاٹ کر کہا۔ بیزاری اس کے چہرے پر اجلی دھوپ کی طرح نمایاں تھی۔

"لحہ بھر صبر کرو تو آپ سمجھ لوگی۔ میرا مطلب ہے۔ اگر ہم سیاست کو سیاست سمجھیں یعنی خالص سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مذہب کو آلۂ کار نہ بنائیں، تو ہماری بہت سی مشکلیں آسان اور بہت سی از خود طاری کردہ غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ بیسویں صدی کی سائنسی اور تکنیکی کامرانیوں کی خیرہ کن قندیل کے عین نیچے مذہب کے نام پر جغرافیائی حد بندیوں کا یہ طربیہ ناٹک اس قدر anachronistic ہے کہ اس پر ہنسنے کے لئے خود کو گدگدانا پڑتا ہے۔ اس پر قہقہہ وہی لگا سکتے ہیں جن کی بصیرت کو Myopia ہو گیا ہو۔ الیوں کا المیہ یہ ہے کہ اہل یہود کہ جن کے Contribution کو اگر مغرب کی ذہنی تاریخ سے خارج کر دیا جائے تو اس کے ثقافتی ورثے میں ناقابل تلافی جھول آ جائے، خود اس euphoria کا شکار ہیں۔ خالص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور انھیں پر کیا منحصر ہے؛ اس صدی میں یہ حماقتیں اکثر ہوتی رہی ہیں۔ مذہب، مذہب، اگر مذہب ہی جغرافیائی چیر پھاڑ کی بنیاد ہے تو...

"خیر جانے دو۔ یہیں تمھارے درمیان کتنے جرمن نژاد لڑکے لڑکیاں ہیں جن کی نمس آسودہ خاطری میرا سکون برباد کر دیتی ہے۔ ان کی تم سے اور تمھاری ان سے کتنی گاڑھی چھنتی ہے۔ کیوں نہ چھنے کہ آخر الامر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تم لوگ کس فراخ دلی سے یہ کہہ کر انھیں گلے لگا لیتے ہو کہ ہٹلر کے تشدد اور جرائم سے ان کا کیا واسطہ۔ ٹھیک ہے نہ؟ کہ ہٹلر کے گناہوں کا خمیازہ یہ بے گناہ کیوں بھگتیں؟ تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی آب زریں سے لکھے جانے کی مستحق ہے کہ آج کے جرمن نے ہٹلر کو اپنے شعور کی تہوں سے جلاوطن کر دیا ہے، لیکن وہ اسی فراخ دلی سے نطشے، باخ، ہیگل، موتسارٹ، بے تھووِن یا گوئٹے کو جلاوطن کرنے کے لئے آمادہ نہیں، پھر ان مشرقی یہودیوں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا۔ یہ بھی خدا کے اسی طرح منتخب ہیں جتنے تم لوگ ہو۔ جب انیسویں صدی میں Maskilum اپنی مذہبی روایات کو پرانے لباس کی طرح ایک ایک کر کے اتار پھینک رہے تھے تو یہ وہی تھے جنھوں نے دور افتادہ یمن، عراق، مراکش وغیرہ میں انھیں متاع عزیز سمجھ کر سینے سے چمٹائے رکھا، اور Haskalah کے جراثیم کو اپنی روح میں جاگزیں نہ ہونے دیا۔ پھر آخر کیوں اسی کیمپس پر یہ تم لوگوں سے دور، ساری دنیا سے الگ تھلگ اپنی ہی آگ تنہائی میں جلتے رہتے ہیں؟ یہ مت کہو کہ انھوں نے تم لوگوں سے ملنے جلنے کی کوشش نہ کی مجھے ذاتی طور پر ان کی تمام کوششوں کا علم ہے۔ مگر ان کے پاس روح اور ضمیر جیسی کسی شئے کا وجود ضرور تھا جو تمھارے ہاتھوں اپنی سبک سری برداشت نہ کر سکی۔ مس یعقوبی کا المیہ یہ ہے کہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔"

وہ چپ ہو گیا۔ یوڈتھ بھی خاموش تھی۔ اس کا تو اسے گمان تک نہ تھا کہ وہ اتنی فصاحت کا حامل ہو سکتا ہے۔ لیکن دل کے کسی دور افتادہ، نسبتاً معصوم گوشے

میں اسے یہ یقین بھی تھا کہ اس کا سامنا محض کھوکھلی فصاحت سے نہیں، کہ اس میں صداقت کا شائبہ بھی موجود تھا۔ اس سے ماورا اس کے لہجہ کا جوش، نا قابلِ انکار درجۂ ایقان... یہ سب قبیح ترین جھوٹ کو بھی سادی سچائی کا وقار بخش دینے کو کافی تھے۔ اس کے چہرے پر بیک وقت اداسی، خاموشی، اور ایک ناپیدا کنار مہملیت کی ہر دم سنسنی سکڑتی، جوش کھاتی دھوپ چھاؤں تھی جو ایک مبہم دبی دبی سی چاہت کی اولین یورش کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ چاہت جو اس فاصلہ کو پاٹ دینے کی جویا تھی جس نے دونوں کو ایک دوسرے کی قربت کی حرارت اور اس کے میٹھے عذاب سے جدا کر رکھا تھا۔ اور اگرچہ اس لمحہ وہ کسی اور طرف ہی دیکھ رہا تھا لیکن جس انداز سے یوڈتھ کی نگاہیں اس کے چہرے پر جل رہی تھیں اس سے وہ اس کے دل میں اٹھنے والی خواہش اور اس کے خیالات کے مد و جزر کا کامل احساس رکھتا تھا۔

لمبے انگور کی بیلوں سے لدے وقت کے کوری ڈور میں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑا کئے، ادھر ادھر کونوں میں روپہلی زری کے تاروں سے جالے بنتے ہوئے۔ دھیرے دھیرے وہ amnesia کی شفاف کیفیت میں ڈوب گئی اور خود کو عجیب نا قابلِ بیان قدسی سرخوشی کے ساتھ درختوں، میگنولیا کی گہری سبز پتیوں، خزاں کی یورش سے بچے کھچے پھولوں اور ریسرچ لائبریری کی روشنیوں کا ہم رفیق محسوس کیا جو دیو قامت Smoked Glass کے عقب سے دھندلی دھندلی سی آرہی تھیں، اور ان سب سے بڑھ کر اس کے دل کو بھا جانے والے لیکن بڑے ہی تو سنگی چہرے کا جو لمحہ بھر کے لئے بہت ہی پاس اور دست رس میں آجانے والا محسوس ہوتا، ایک خاموشی تھی، شکم کے اندھیروں سے زیادہ اندھی اور گمبھیر جیسے دونوں اپنی زندگی کا آخری خطبہ دینے کے بعد ٹھٹھر گئے ہوں۔

پھر دور سوشل سائنس بلڈنگ کے بھوت نے اپنے ایلیویٹر (elevator) کے برقی دروازے سے دو سایوں کو اندھیرے میں اندر دھکیل دیا، سائے جو ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ یوڈتھ اور اس کی نظریں بلا کوشش ان کے تعاقب میں لگ گئیں۔ سائے یوں ہی ایک دوسرے میں پیوست سائکامور کے کوری ڈور سے گذرتے ہوئے، ریسرچ لائبریری کی روشنیوں کو اپنی بہتی Silhouettes کے پس منظر میں لئے جب ان دونوں کے بالکل نزدیک آگئے تو انھوں نے دیکھا کہ ارے یہ تو ہانس جارج شنائڈر اور بہجت پورتیاں ہیں جو انھیں دیکھ کر چونکنے اور ایک دوسرے کی پرسکون حمایت سے جدا ہو گئے ہیں۔ پھر بیک وقت ہانس جارج نے، جیسے کچھ بھی تو نہ ہوا ہو، یوڈتھ کو ایک عدم ''شلوم'' داغا اور بہجت نے کھسیا کر، جھینپ کر اسے ''ہلو'' کہا۔ ایک لمحہ بھی رکے بنا کر اپنے اپنے اضطراری سلاموں کا جواب ہی وصول کر لیں، دونوں Lemon Bottle brush کے جھاڑی نما چھدرے درختوں کے جھنڈ کے عقب میں تصویر آرٹس کی بیرک نما عمارت کے پیچھے پارکنگ لاٹ کی طرف چلے گئے۔ سائکامور کی خشک پتیوں پر ان کے جاتے قدموں کی آواز بتدریج سو گئی۔ لمحہ بھر بعد کہیں کسی کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سے خاموشی دولخت ہو گئی۔

اور اب یہ اس کو لے کر اپنے سیلے ہوئے بدبودار بھٹ میں پہنچے اور اسے اس کے متعفن جسم کے ساتھ بستر میں پھیل جانے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ اس نے بڑے سنل انداز میں سوچا۔ ہانس جارج کا خیال آتے ہی ایک تاریک متلی اس کے شکم میں ابھری۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سور کے بچے کے جسم سے بدبو کے کیسے بھبھوکے اٹھتے ہیں، مگر، کم از کم، یہ اسے متلا دینے کو کافی۔ یہ کم بخت ہانس جارج۔ کیا یہ کبھی نہاتا نہیں ہے؟ اور جیسے یکا یک کہنے کو موضوع ہاتھ آگیا ہو۔

''معلوم ہے۔'' وہ بولا۔ ''مجھے یہ ہانس جارج ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

''کیوں کہ یہ بہت گندہ ہے۔'' بکرے سے زیادہ متعفن۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا۔'' اور اب انھیں کو لے لو۔''

''کنھیں؟''

''واہ، بہجت اور کون۔''

''کیوں کیا خرابی ہے بیچاری میں؟''

''خرابی؟ خرابی تو ہم سب میں ہے۔ مسئلہ اس کا ہونا یا نہ ہونا نہیں، بلکہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا انکار ہے۔ خیر، بچپن ایران کے کسی گرامر اسکول میں کہ جہاں خستا اور کھانستا تک انگریزی میں پڑتا تھا اور بورژوائی راحت کی رسیلی قالون سے گونجتے ہوئے گھر میں گذارا۔ پھر قاہرہ میں روئی کے کاروبار میں لاکھوں بناتے ہوئے باپ کی لاڈلی کے عین شایانِ شان تھا کہ نظرِ انتخاب قاہرہ یونیورسٹی سے اچٹتی ہوئی جا کر امریکن یونی ورسٹی ان کائرو (Americam University in Cairo) پر پڑی کہ قاہرہ یونیورسٹی بھلا انٹلکچولس کے لئے کب بنائی گئی تھی، کہ وہاں کا نصاب تو الم غلم مذہبی مضامین پر مشتمل تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہاں آدمی کو با قاعدہ ''مسلمایا'' جاتا تھا نہ کہ وہ مغرب پرست عبقری جو وہ بننے پر تلا بیٹھا تھا۔ چنانچہ امریکن یونی ورسٹی سے .B.A کرتے ہی راہ لندن کی لی۔ لندن یونیورسٹی سے .M.A جھڑپنے کے بعد عین دانش مندی تھی کہ بہر طور اٹلانٹک عبور کیا جائے، سو کیا گیا۔ اب پردہ گرتا ہے اور المیہ بے حیائی کے سب سے ہولناک فعل پر یوں ختم ہوتا ہے کہ چار چوٹی کے ماہرین اسلامیات کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جو پہلے ہی ایک مسلمان لڑکی کی Out spokenness پر ششدر رہ گئے ہیں ایک عدد ڈاکٹریٹ اور وہ بھی اسلامیات میں، جھپٹ لی جائے۔

''بڑی روانی سی انگریزی بول سکتی ہے، اور فرانسیسی اس سے زیادہ روانی سے، اور اسی روانی سے کلوکوئیل عربی فارسی۔ ٹھیک؟ ان سے چاہو تو دستو وسکی پر بات کر لو، نجنسکی، بے تھوون، یا شوئن برگ پر، چاہو تو Plastic Arts پر، یا شیکسپیئر سے کامیو تک کسی پر۔ مگر شاہ نامے سے یہ ایک شعر تک نہ سنا سکیں گی۔ عربوں سے صرف اس وجہ سے عناد رکھیں گی کہ پرلے درجے کے غیر مہذب ہیں۔ ان تمام یورپی لڑکوں کے جھرمٹ میں گھری رہیں گی، ہم جیسا بے خبر کہیں بھٹکتا آنکلا تو تیور چڑھ جائیں گے گویا ان کی چینی برتنوں کی دکان میں کوئی بیل در آیا ہو۔ شاہ کی صرف اس لئے مخالفت کی جائے گی کہ انٹلکچول لوگ Monarchy جیسے پیش پا افتادہ تصورات کے متحمل نہیں ہو سکتے، خواہ ملک ابھی جمہوریت کے قابل نہوا ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ جب آس پاس طلوں دور تک عزیز از جان یورپی دوست موجود نہ ہوں، تب روہانسی ہو کر، گویا بڑی رازداری سے، ابراہیم سے کہیں گی کہ اب ہم مشرقی لڑکیوں کی جان بڑے عذاب میں ہے؟ ہم کریں تو کیا؟ اور جائیں تو کہاں؟ خود

ہماری قوم میں ہمیں اپنانے کا کوئی اہل نہیں، مغرب والوں سے راہ ورسم آگے نہیں بڑھ سکتی کہ ماں باپ خودکشی کر لیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ اور جب ابراہیم کہ پرلے درجہ کا گاؤدی ہے۔ تنگ آ کر، ان کے hot-is-pancake confession سے بری طرح متاثر ہو کر رب العزت کی تمام بھٹکی ہوئی گنہگار بھیڑوں کو ازسرنو مہا آنند پاکیزگی کی طرف ہانک لانے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے شادی کی پیش کش کرے گا تو نہایت اجڈ لہجے میں صاف انکار کر دیا جائے گا کہ بھئی ہم آخر الامر انٹلکچوئل لوگ ٹھہرے جو شادی جیسے حماقت آمیز تصورات کے قائل نہیں۔ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے جو ایسی فرسودہ باتیں سوچتے ہو۔ رہی یہ بات کہ بھاپ بہر حال، بہر نوع، بہر کیف اڑائی ہی پڑتی ہے، تو یہ قطعی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ تو اڑاؤ۔ بڑے شوق سے۔ بہک لو، کچھ ادھر، کچھ ادھر۔ میرے شیر... مگر، ہاں خبردار، نیفے سے نیچے نہیں۔ لیکن اس سخاوت کی وصولیابی کے لئے تمہیں اپنی چمڑی پر پہلے سفید رنگ چڑھانا ہوگا کہ کون ہوش مند ایسا ہوگا جو تمہاری خوب ہند کی چمڑی کے ساتھ بستر دراز ہونے پر راضی ہو سکے گا۔ تو جناب بیچارے ابراہیم صاحب، اب آپ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جائیں یا بیٹھے آپ ہی آپ بھاپ اڑایا کریں۔

"اب بھلا ابراہیم میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں؟ ہندوستانی ہے تو کیا ہوا؟ وہ خود کون کوہ قاف سے تشریف لائی ہیں؟ عربی جانتا ہے اور فارسی بھی بلا کسی accent مثل ایرانیوں کے بول سکتا ہے۔ اور اسی طرح انگریزی اور فرانسیسی بھی۔ اوپر سے شیعہ بھی ہے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب اور کیا چاہئے؟ اب اگر اسے موسیو پر دلیسیو رسارتر کے فلسفۂ جودیت سے دل چسپی نہیں لور بے تھوون کے Concerto in D for violin, opus 61 کا علم نہیں تو کیا ہوا؟ اپنا سبجکٹ تو اچھے اچھوں سے اچھا جانتا ہے۔ اور جب محترمہ کی گاڑی اٹکتی ہے تو کتاب لے کر اپنے یورپی دوستوں کے پاس نہیں پہنچتیں کہ ان کی معیت میں تو انسان جرمن رومانٹی سزم (Germam Romanticism)، فرنچ اسٹرکچرل ازم (French Structuralism) یونیورسٹی کے تازہ بتازہ اسکینڈلس اور اسٹوڈیو سے بس ابھی ابھی نکل ہوئی مووی پر گفتگو کرتا ہے۔ ایسے میں بس بھوگم بھاگ ابراہیم کے پاس آتی ہیں اور گھنٹوں بے چارے کا بھیجا بیٹھی چاٹتی رہتی ہیں۔ خیر، اب وہ بھی یہاں نہیں رہا۔" وہ سانس لینے کو رکا، پھر اختتامیہ کے طور پر بولا: "جی متلا دینے والی باتیں ہیں کیوں ہیں نا؟ پھر بھی مس اوفیلیا ڈکنن مصر ہیں کہ انسان کو سزا اوراہے۔ بلکہ قطعی ضروری ہے کہ "ہم آہنگی" "بھول جاؤ اور درگذر کرو"۔ "بچے" اور جانے کیا کچھ اور ان کی اناپ شناپ حمقیات پر یقین رکھے لن ترانیاں ہیں جان من، لن ترانیاں زندگی جنگلی انگور کی بیل نہیں کہ بولا، لنجا، بچہ، بوڑھا، مرد، عورت، غرض جو آئے حسب استطاعت خوشے توڑ کر آگے بڑھ جائے اور یہ غریب اپنی حفاظت میں انگلی تک دراز نہ کر سکے۔ میں ان حمقیات کا خریدار نہیں۔ تا با با۔ باز آیا۔ "بھول جاؤ اور درگذر کرو۔" ہنہ، صاحب کیوں بھول جائیں اور کیوں درگذر کریں۔ انہیں لازم ہے کہ کچھ اور اپنا دام تزویر مجھ پر نہ دراز کریں معصوم تمہیں اس قسم کے دمڑی کے سوسڑے گلے تصورات عیسائیت کی نمائشی humility اور "دوسرا گال پیش کر دو" کی پیداوار ہیں۔ زندگی۔ اب سے چودہ سال پہلے تمہارے، انہیں تکنو عربوں کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ زندگی کس چیز کا نام ہے۔ فرماتے تھے: "وہ جو دوسروں پر ظلم نہیں کرتا ان کے ہاتھوں ان کے ظلم کا نشانہ بنے گا، اور وہ جو خود ہی اپنے حوض کی حفاظت نہیں کرتا دوسروں کے ہاتھوں اسے منہدم ہوتا ہوا دیکھے۔" جناب، زندگی یہ ہے۔ آپ کو بڑی ذمہ داری کا ثبوت دینا پڑے گا، اور یہی سوچیے سچ ہے اپنے تمام، چھوٹے بڑے اعمال کا حساب آپ کو یہیں، ابھی، اسی دنیا میں پائی پائی دینا ہوگا، ازل کے دور دراز جھٹ پٹے میں نہیں۔ ابھی بچہ سمجھ کر کیوں معاف کر دیں؟ صرف اس لئے کہ ایک شفاف، اجلی صبح مس اور فیلیا ڈکنن پر یہ وحی نازل ہوئی کہ معاف کر دینا ہی انسانیت کی معراج ہے؟ اگر انہیں بچے پن ہی محبوب ہے تو کالج یونیورسٹی کیوں آتے ہیں؟ ساری عمر

Humpty Dumpty sat on a wall

اور

Peter, Peter, pumpkin eater

کی کسی نرسری میں کیوں نہیں پڑے سڑا کرتے؟ اور پھر وہ جو جسمانی طور پر بالغ ہوتے ہوئے بھی بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہیں انہیں نرسری اسکول نہیں جو جوخانے جانا چاہئے۔ ارے یہ کیا؟" وہ اچانک اچھل پڑا۔ "تم پڑی اونگھ رہی ہو؟"

"اور کیا کرتی؟" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا اور خود اپنے کہے پن پر ششدر رہ گئی۔ وہ خود بھی تو اس کے وجود کو کسی دیوار سے زیادہ نہیں گردان رہا تھا جسے اس نے اپنی بھڑاس نکالنے کے لئے چنا ہوا اور آں جانیکہ، کم از کم اس وقت، ان خالص ذاتی نوعیت کے اعتراضات سے اسے ذرا دل چسپی نہ تھی۔ دیر سے وہ اونگھتی ہوئی سی بتدریج کم سے کم تر ہوتی ہوئی توجہ کے ساتھ اسے بیٹھی سن رہی تھی۔

"تو کیا اس تمام وقت میں محض ایک دیوار کے سامنے بکواس کرتا رہا ہوں؟"

"میں کیا جانوں؟ ممکن ہے، ممکن نہیں بھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان باتوں سے ذرا دلچسپی نہیں اور یوں کہ مخاطب تم تھے اس لئے تمہیں چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ تم ہی کہو، یہ بہتر نہیں کہ میں بس اونگھتی رہوں؟"

"لاحول ولا، میں محض بکواس نہیں کر رہا تھا۔ میں تو بتا رہا تھا کہ کس قدر بیمار ہوں اور اس بیماری کی اصل وجہ کیا ہے۔ تم جانو، ہمارے رب کریم کی نیک راجدھانی میں اس قدر مہملیت ہے کہ اب اور اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں رہی۔ چنانچہ اب میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی مسکرایا کرو۔"

"نہیں۔ میں نہیں مسکرا سکتی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ اور آزردگی کا بڑا واضح احساس تھا۔ "محمد، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میرے تمام حواس گویا شل ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"حواس تو میرے بھی تم سے کچھ بہتر نہیں اور باتیں بہت سی میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔" اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کہا نہیں میں نے، مسکرایا کرو کہ اب تم اسرائیل تو جا نہیں جا سکتیں۔"

"جانا نہیں چاہتی۔ یہ بات نہیں۔ بس خیال کبھی اس طرف گیا ہی نہیں اور تم یہ ہر وقت اسرائیل اسرائیل کی رٹ کیوں لگائے رہتے ہو؟ تنگ آ گئی ہوں زیادہ سے زیادہ تم اسی بات کے اہل ہو کہ وقت بے وقت اپنی فصاحت کا

زور صرف کرو اور بیٹھے belles-lettres بگھارا کرو۔ خود تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اسرائیل کا وجود تک گوارا نہیں۔ پرلے درجے کے منافق ہو۔"

"اس میں برافروختہ ہونے کی کیا بات ہے؟ تم لاکھ انھیں "رٹ" کہتی پھرو، یہ اسرائیل کی بابت میرے نظریات ہیں، میں انھیں کی بابت گفتگو کر رہا تھا۔ اور پھر یہاں سوال وجود عدم کا نہیں۔ میں سفلی جذباتیت میں نہیں پڑنا چاہتا... معاملہ اصول کا ہے اور یہ اصول ہی ہے جس کی وجہ سے میں ان شرمناک افعال سے جو تمھارے مبارک اسرائیل میں آئے دن ارتکاب کیے جا رہے ہیں اغماض نہیں برت سکتا۔ میری نااتفاقی سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ میں نے خود کو "الفتح" کے عزائم کی تکمیل کے لیے سپرد کر دیا ہے۔ میں تو خود کو ابھی پورے طور پر اپنے سپرد بھی نہیں کر پایا ہوں۔"

"مگر تمھارا عرب لڑکوں سے بڑا بھائی چارہ ہے۔"

"تم سے بھی تو ہے، ہے نہ؟ اگر خباثت پر اتر آؤں تو یوں جواب دوں گا: ہاں کیوں نہیں، بالکل ایسے ہی جیسے تم لوگوں کا جرمنوں سے بھائی چارہ ہے؛ فرق ہے تو اتنا کہ عرب لڑکوں اور اور میرے درمیان کسی بھیانک نسل کشی کی یاد نہیں۔ لیکن میں اس بار تمھیں معاف کیے دیتا ہوں۔ مجھے بھائی چارے کے طعنے نہ دیا کرو۔ میرا اجتماعی سطح پر بھائی چارہ صرف اپنی قوم سے ہے۔ اس کے بعد میرے بھائی چارے کی بنیاد محض انفرادی ہے۔ کیمپس پر عرب لڑکے مجھے دیکھتے ہیں تو کلبلا جاتے ہیں۔ جیسے میرے اسلام میں بال آ گیا ہو۔ رہے اسرائیلی لڑکے، معلوم ہے یہ لوگ مجھے کیسے دیکھتے ہیں؟ یوں جیسے میری پیشانی پر Swastika نکل آیا ہو۔"

"آہ۔ یہ تمھاری ننھی منی ظرافتیں، یہ چٹکلے!" وہ مسکرا دی، پھر ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگی۔ جب رکی تو بولی: "یہ انسان کو اندر سے گدگدا دیتے ہیں، اس طرح کہ وہ اپنی تمام تر واماندگی کے باوجود قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے، دیوانگی کی حد تک۔ آدمی تم بڑے مزے کے ہو۔ واہ۔ یہ سواستکا والی شوخی۔ ہاہاہا۔"

"کیا؟ تم انھیں چٹکلے کہہ رہی ہو؟ نہیں بھئی۔ میں قطعی سیریس ہوں۔"

"اور ذرا سا سنکی بھی، اور چارمنگ بھی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ میں مارے ہنسی کے مر جاؤں گی۔ خدایا۔"

چند ثانیوں کے لیے اس نے خود کو اس لمحاتی انبساط کے سپرد کر دیا جو اسے نرم رنگوں اور من پہ پھیار کرتی نیلگوں دھندلاہٹوں کی دنیا میں لے آیا جہاں آری کی دھار جیسا دندانے دار غم نہ تھا جو دل میں رہ رہ کر چبھتا اور ہزار بار اسے خون اگلنے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن یہ سرخوشی عارضی تھی، تمام خوشیوں کی طرح، اور قہقہے کے تھمتے ہی سو گئے۔ دکھ کی لہر پھر اس کے چہرے پر کھنچ گئی اور اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا: "یہ تمام چھوٹی چھوٹی باتیں جو تم کیا کرتے ہو، انھیں بھلا بیٹھنا مشکل ہے سچ، بے حد مشکل۔ میں نے بارہا کوشش بھی کر دیکھی۔ یہ قطعی بے سود ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان کی کوئی بات جو کبھی کہی گئی ہو بھول جانے کی کوشش کرے اور اس عمل کے دوران خود کو کچھ اور زخمی کر لے اندر سے ہم سب نہایت بودے ہیں۔ اے واکا ڈو کے پلپ کی طرح... اور مجبور۔"

دور Humanities Building کے بیرونی زینے پر جلتی ہوئی بتی کی ملبری کے پتوں سے گذر کر یہاں تک آتی ہوئی مدھم روشنی میں پہلی بار، سب سے پہلی بار، اس نے ڈوب کر یوڈتھ کے چہرے کو دیکھا اور اپنے بہت ہی قریب اس کی بھرپور موجودگی کو محسوس کیا۔ اس کے بکھرے بالوں سے اٹھتی ہوئی مہک، وہ حرارت جو اس کے جسم سے رس رہی تھی، نسوانیت کی وہ مانوس خوش بو جو اس کے چاروں طرف تیر رہی تھی، اس کی جلتی سانسوں کا تعطر۔ یہ سب کی سب بہ کر اس میں سرایت کر گئیں، بہت آہستگی سے۔

ایک طویل خاموشی۔ ان کہے خیالات کی اندرونی فراوانی سے تنی ہوئی، پھیل گئی۔ کوئی چیز گویا ہوا میں منڈلا رہی تھی جس کی مبہم سی پہچان دونوں کو تھی۔ اس کا تنفس تیز تھا اور اس کے دل کی دھڑکن اس کے لباس سے سنی جا سکتی تھی۔ اس کا چھوٹا سا دل فریب سینہ تیزی سے ہمک رہا تھا۔ تب ملگجے اندھیروں میں اس نے بڑھ کر یوڈتھ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا نرم، گرم اور رضامند ہاتھ دونوں بے حرکت رہے۔ پھر اس نے یوڈتھ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ آنکھیں۔ ان میں کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی تڑپ، اپنی بے بسی، ادھورے پن کے علاوہ، بہت نیچے گہرائیوں میں خواہش کی آنچ بھی تھی جو نجانے کب سے وہاں غیر آسودہ چھپی بیٹھی تھی، دراس تامل اور اس خیال، بڑے سفاک ذہنی ضبط کے پہروں میں ہراساں، مضمحل لاچار پڑی تھی۔ وہ آنکھوں کے ان زینوں سے اترتا چلا گیا تا آں کہ لاشعور کے ان نہ خانوں میں پہنچا جو بلا شرکت غیرے محض ایک ہی خیال سے گونج رہے تھے۔ ایک جانا پہچانا، دل کو لبھا لینے والا، معصوم لیکن بڑا ہی مجروح خیال پھر لپک پڑا گئے۔ وہ چونکے تو ہر نظر باوجود گہری جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی کے دوسری نظر سے گریزاں تھی، ڈری ڈری، سہمی سہمی۔ بیک وقت دونوں ایک دوسرے کی شدید ذہنی گرفت سے آزاد ہو جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی بے رحم، ننگی، اور جاکو متی Giacometti کے مجسموں کی کھردری سطح جیسی آواز میں لوٹتے ہوئے کہا۔

"اب عرب طلبا سے تمھارے مفروضہ بھائی چارے کی داستان بھی سنو۔"

"نہیں، خدارا نہیں۔ میں داستانوں کو سننے کے موڈ میں بالکل نہیں۔"

وہ تقریباً چیخ کر، خاموشی کے مہربان صحراؤں سے یوں دھکا دے کر نکال دیے جانے پر احتجاجاً بولی کہ یہ صحرا اپنی چارکھونٹ پھیلی تاریکیوں کے باوصف نہایت دل آرام تھے، اس کے اپنے کمرے کے سکوت کے قطعی برعکس جس میں اسے بھیانک Psychedelic آسیبی پیکر چکراتے نظر آتے اور مہیب تاریکی میں عموداً نیچے چنے گرنے کا احساس ہوتا۔

"یہ تو تمھیں سننی ہی پڑے گی، اختیاراً یا اضطراراً۔ وہ باقاعدہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ "کہا نہیں میں نے، یہاں تمھیں اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ بات کا بھی جواب دینا پڑے گا۔"

"تمھیں معلوم ہی ہے ایک جمعہ چھوڑ کر ہر دوسرے جمعے کی شام کو یہ جمع ہوتے ہیں اور اسلام کی تجدید فرماتے ہیں۔ خود اپنے درمیان تبلیغ کرتے ہیں، کبھی قرآن پر کوئی سڑا گلا مضمون لکھ لاتے ہیں، کبھی نماز روزہ کے فوائد پر، کبھی یہ نہیں کہتے کہ کسی کا دل دکھانا، چوری کرنا، بے اصولی برتنا، اپنے ضمیر سے پیشہ کرنا بھی کچھ کم گناہ... خیر، تو ایک شام ان کے جمعے میں جا نکلا۔ گھنٹہ بھر رہا۔ کوئی

پینتالیس منٹ یہ ایک دوسرے کو Brother! Brother! کہتے رہے اور جھگڑتے رہے۔ پھر مجھ پر پل پڑے کہ جمعے کی جماعت میں نہیں آتا اس لئے مسلمان نہیں، کہ یہودی مجھے اسکالرشپ دیتے ہیں اس لئے ان کا رطب اللسان ہوں۔ اب کیا کہا جائے ان سے تمھیں پتہ ہی ہے، مجھے اسکالرشپ وسکالرشپ کچھ نہیں ملتی۔ پڑھاتا ہوں اور اپنی محنت کا کھاتا ہوں۔ پیسے پورے نہیں ہوتے اس لئے بیوی بھی آدھے دن کی ملازمت کرتی ہے، اور اس آدھے دن مجھے بچے کے baby-sitting کرنی پڑتی ہے، اس لئے نماز پر بروقت نہیں پہنچ سکتا۔ مگر ان سے کہنا فضول تھا۔ چنانچہ چپکا ہو رہا، صرف مسکرا دیا اور لوٹنے لگا۔ میرے اس عمل نے انھیں نار جہنم کی طرح بھڑکا دیا۔ ان میں سے ایک صاحب بڑی چابک دستی سے جھپٹے اور ایلی ویٹر کے نزدیک مجھے تقریباً جالیا۔ میں ہراساں تو نہ تھا لیکن مجھے اپنی ہڈیاں بھی عزیز تھیں اور چہرہ بھی۔ بھلا ہو ایلی ویٹر کا۔ زندہ باد۔ شاد باد۔

اس نے میری ہڈیاں بچالیں۔ وہ حضرت وہیں سے الٹے پاؤں لوٹ گئے اور سیڑھیوں سے اتر کر مجھے نچلی منزل پر جالینے کی کوشش نہ کی ظاہر ہے، یہ ٹھہری بڑی بھاری مشقت۔ اور میں ٹھہرا آخر الامر حرام زادہ، کوئی بھلا ایک حرام زادے کے لئے اتنی تکلیف کیوں اٹھانے لگا مگر جہاں تک میرا خیال ہے، حقیقت اور ہی تھی یعنی کہ حضرت کا غصہ اسی تیزی سے ٹھنڈا گیا جس تیزی سے بھڑکا تھا، یعنی بالفاظ دیگر خود کو میری ہڈیاں چور کرنے کے نہایت ہی تخلیقی عمل میں Sublimate کئے بنا۔

''اور اسکالرشپ کا طعنہ، تو اس کی داستان یوں ہے کہ طعنہ دینے والے عراقی برخوردار کی امریکی محبوبہ ہمارے ایڈوائزر کے دفتر میں پارٹ ٹائم کام کیا کرتی تھیں۔ وہاں کسی نسبتاً سینیر سکریٹری سے ان کی ان بن ہوگئی اب یہ حضرت اس ان بن کا غصہ مجھ پر نکال رہے ہیں۔ مجھ غریب پر جو اس جھگڑے میں سرے سے متعلق ہی نہیں بھلا میں کب مسز روز میری دہائٹ سے یہ کہنے گیا تھا کہ اینڈی پر جور وستم کا بازار گرم کرو۔ اور ان بن کا مجھے علم نہ ہوتا اگر انھیں کے شہر کے ان کے دوست اس شام ان کے رویے کی توضیحی دفاع میں یہ سب نہ کہتے۔

''سچ کبھی کبھی تو اپنی صلاحیت ضبط پر شک ہونے لگتا ہے۔ ذرا تصور تو کرو اس شخص کا جو یہودی نہ ہوتے ہوئے چھ ملین جیوز کے Extermination پر محض انسانی ہمدردی کے ناطے خود کو دکھی محسوس کرتا ہے، اور اسی رشتے سے، عرب نہ ہوتے ہوئے عربوں کے ساتھ جو تاریخی ناانصافی ہوئی ہے اس کی چبھن محسوس کرتا ہے۔ کسی ہنگامے میں طرفین سے زیادہ صدمہ تو اسے پہنچتا ہے جو ان میں سے کسی کے ساتھ قومی اور نسلی سطح پر وابستہ نہیں کہ یہودی لڑ کر، ہار کر، جیت کر اور آخر الامر مرکر، بہر طور اپنے جذبات کا catharsis کر لیں گے، اور کچھ اسی طرح عرب بھی۔ میری گھٹن، میرے درد کا کیتھارسس کیسے ہوگا؟ میں جو نہ عرب ہوں، نہ یہود، جب کہ ان کی فتح میری ہے نہ ان کی شکست؟ اس دل پر'' اس نے بڑی یاس سے اختتامی طور پر کہا۔'' اس دل پر اب صرف تازیانے ہی لگ سکتے ہیں، بوڑھے میرے چاروں طرف اس قدر کینگی، تشدد، مصلحت، اور بندھن ہیں کہ...''

''تو توڑ کیوں نہیں دیتے یہ بندھن؟'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔

''اس لئے کہ خود ساختہ بندھن توڑے نہیں جاتے۔ المیہ صرف یہ ہے کہ... ہٹاؤ، ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہاں سے ہزاروں میل دور، کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں، میرا ایک دوست ہے جو نازی جرمنی کے ہاتھوں تم یہودیوں کی بے حرمتی پر درد محسوس کرتا ہے۔ خیر سعدی نے بھی ایسی ہی بات کہی ہے کہ جب جسم کا ایک عضو چوٹ کھاتا ہے تو کسک پورا جسم محسوس کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب یہ کسک نیم پختہ ذہن محسوس کرتے ہیں تو وہ انسانی ہمدردی کی فراوانی اور جذباتی افراط وتفریط سے بولا کہ ایک جغرافیائی تقسیم کو ایسی ہی دوسری تقسیم کا حربہ سمجھ بیٹھتے ہیں اور اسی جوش میں، بنا کوئی واضح تاریخی نظریہ یا وژن رکھے، وہ اول فول بگھارنے لگتے ہیں کہ محض دوستی کے ناطے اس بیکراں معصومیت پر صرف خاموش رہنا پڑتا ہے یا مسکرانا۔ ایک عجیب مبہم سی ذو معنی مسکراہٹ... یا دل مسوسنا...''

''بند کرو یہ اپنی 'عجیب وغریب مسکراہٹ۔' '' وہ بولی۔ ''سنو، یہ سب لاتحاشا بکواس ہے اور میں اتنی بیزار ہوگئی ہوں کہ اکثر خودکشی کے بارے میں سوچتی ہوں۔ شاید میں بزدل ہوں۔ سچ، اس خیال سے ڈر لگنے لگتا ہے۔''

''میں بھی ایک زمانے میں ایسی بچکانہ باتیں سوچا کرتا تھا۔ ہوش آیا تو مزید ایک عدد خودکشی کا کوئی جواز نہ ملا۔''

''کیا مطلب؟ تم نے پہلے ایک بار کوشش کی تھی؟''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے خودکشی تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ہو رہی ہے۔''

خاموشی: بیکراں، بے نہایت مہیب۔ گفتگو کا بھی ایک ذہن ہوتا ہے اور اس کے ضبط کی بھی ایک حد ایک مرحلے پر آکر ایسی تھمتی ہے کہ شخصیت کا تمام فسوں، زہد اور تمام تر جاں بازی بھی اسے مزید ایک قدم آگے بڑھانے سے عاجز رہ جاتی ہے۔ لمحے، وقت کے احساس سے عاری انگور کی بیلوں سے لدے پھندے راستوں پر آنکھ مچولی کھیلتے رہے، کھیلتے ہی رہے۔ ایک سکوت تھا جو رات دیر سے گھر لوٹتے ہوئے کسی طالب علم کی موٹر سائکل کی پھٹی پھٹی آواز سے چند ثانیوں کے لئے مضطرب ہوتا ہوا کچھ اور گہرا ہو جاتا، یا سائکامور کے تازی تازی خزاں کی اولیں یورش میں جھڑی پتیوں کی خشک بے بسی پر ٹھہر ٹھہر کر جاتے کسی جوڑے کے قدموں کی چاپ۔ ریسرچ لائبریری کی روشنیاں اسموکڈ گلاس کے عقب میں میلی میلی نظر آرہی تھیں۔ لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے Cubicles میں میزوں پر جھکے ٹائپ کر رہے تھے، لکھ رہے تھے یا ضخیم جلدوں میں دفن تھے: بیزار دکھی، یا مسرور، آنے والے دنوں کی، اجلی دھوپ کی چاہت میں رو پہلے دن خواب بنتے، یا حال کی تمازت سے جھلسے ہوئے، بے یقین، ہر لمحے سے گریزاں پیچھے اطالوی ڈپارٹمنٹ میں کوئی پروفیسر پروموشن کی چاہت میں، اپنے کمرے میں مقید اپنی نئی کتاب پر مصروف کار تھا۔

وہ بات جو بہت دنوں سے، بہت دیر سے کہنا چاہتا تھا، اس کے یک لخت دل کے شبستاں میں، ذہن کے سات پہروں سے نظریں بچا کر یوں ننگے، بالکل ہی ننگے چلے آنے سے، اس کی زبان کچھ اور گنگ ہوگئی، اور کان کی لوئیں مدھم جل اٹھیں۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" اچانک، جیسے دھند کے پیچھے سے، یوڈتھ کی آواز آئی۔ ایک ننھی سی بچی جو بالغوں کی دنیا میں کھو گئی ہو، اور ناسمجھی سے انھیں ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی ہو۔ یہ میں ہوں۔ پتہ نہیں میں کیا چاہتی ہوں؟ کون سی چیز مجھ سے کھو گئی ہے؟ ہر چیز اس قدر صاف ستھری اور بالکل نظر آتی ہے کہ تمھیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں سرے سے کوئی خامی نہیں اس کے باوجود، کہیں دور، اپنے اندر تم خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم یہ جانتے ہو کہ ایک صبح زندگی کا یہ شوخ، رنگ برنگا میری گو راؤنڈ تمھارے لئے چکر انا بند ہو چکا ہوگا اور کہ ملگجے اندھیروں میں جاتی رات کو روشنی کی سرحد تک رخصت کرتے وقت تم وہیں رہ گئے ہو کہ کہیں کوئی چیز اپنی جگہ سے ضرور کھسکی ہوئی پڑی سڑ گل رہی ہے۔ اکثر میں نے اپنے مرض کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر قطعیت سے اس پر مرتکز ہونا محال تھا۔ سوچتی ہوں یہ میرے چاروں طرف جو فضا ہے۔ موت جیسی فضا آسیبی، مرے ہوئے پانی جیسی، دل کو ڈبا ڈبا دینے والی۔ شاید یہی میرے مرض کی مکمل ذمہ دار ہے۔ میں سب کو ٹھکراتے ہوئے بھی ان کی اسیر ہوں۔ ان کی موجودگی، جو کیسے کیسے مجھ سے خون اگلواتی ہے، میری اہم ضرورت ہے۔ یہ مجھے اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ میں زندہ ہوں اور مجھے وہ طاقت بخشتی ہے جس کے سہارے میں اپنے درماندہ وجود کو ایک دن سے دوسرے کی طرف گھسیٹ کر لاتی ہوں، ممکن ہے ان سے نفرت کی وجہ میری ان سے شدید محبت ہو معلوم ہر روز اپنے سے تنگ آ کر، سوتے وقت، میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگلی صبح میرے بستر سے ایک بالکل ہی نئی لڑکی اٹھے گی جو کسی کا راستہ روک کر اسے اپنے غیر محدود غم کا دکھڑا نہیں سنائے گی، مگر شام پڑتے پڑتے میں دس پانچ کو ضرور یہ دکھڑا سنا چکی ہوتی ہوں۔ سب مجھ سے بیزار ہیں اور میں سب سے۔"

وہ یوں چپ ہو گئی، ایکا ایکی، گویا اپنے موجودہ خیالات کی مہملیت اور بے وقعتی کا خیال آ گیا ہو۔ پھر وہی تکلیف دہ سکوت۔

"اچھا بتاؤ،" اس نے آخر خود پر قابو پاتے ہوئے مگر واضح طور پر لرزتی آواز میں کہا۔ "تم اسرائیل نہیں جانا چاہتیں، تم کو ڈر ہے کہ لندن یونی ورسٹی میں داخلہ نہیں ملے گا، اور تم یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہتی ہو۔ الغرض تمھیں کچھ پسند نہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا کرنا چاہتی ہو ٹھیک ہے نا؟"

یوڈتھ نے از سر نو اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے اقرار میں گردن خفیف سی ہلا دی۔

"کیا ضروری ہے کہ تم پڑھنے پڑھانے میں اپنی زندگی کا جواز تلاش کرو؟"

"کوئی ضروری نہیں۔" ایک لحاظ سے پڑھنے پڑھانے میں مجھے بوریت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر اب یہ عمل میری ذات کے خلاف سمٹ سمٹا کر مری آخری پناہ گاہ رہ گیا ہے، ان لڑکوں کی طرح جو لڑ لڑ کر کسی طرح تین اعشاریہ پانچ کا گریڈ پوائنٹ کا اوسط قائم رکھ کر ڈرافٹ بورڈ کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تم جانو فرد دھوکہ وہی پر مجبور ہے، اب چاہے اس کا ہدف دوسرے ہوں یا خود اس کی اپنی ذات، میں اپنے سے کہتی ہوں: نہ، نہ، لڑکی، ذرا آہستہ ابھی تک تو نے اپنی پڑھائی ختم نہیں کی ہے۔ وقت تیرے لئے ابھی ختم نہیں ہو گیا ہے آج فیصلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ کل پر ملتوی ہو سکتا ہے۔ چنان چہ ایک ایمان دار اور نیک لڑکی کی طرح میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور نئی نئی پناہ گاہیں تراشنے کی بجائے اس آخری پناہ گاہ میں چھپ کر، نچوڑ نچوڑا کر عافیت کے دو ایک دن نکال لیتی ہوں جن پر پہروں بستر پر اینڈی پڑی کھلی ہوا کے باغوں، نہایت اجلی دھوپ، گنگناتے، شاداب کھیتوں کے دن سپنے بنتی رہتی ہوں۔ ناممکن الحصول چیزوں کے دن سپنے۔"

"کیا تم نے کبھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا ہے؟" اس نے آنکھیں دور کسی اور ہی طرف پھینکتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

"نظریں نہ چراؤ۔ ہاں، ایک دفعہ۔" اس نے جواب دیا۔ "گو اب محبت میں مجھے یقین نہیں رہا ہے۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "مگر اس کے اعادے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ قطعی غیر ضروری ہے۔ خدارا۔"

مگر اس نے یوڈتھ کی درخواست سنی ان سنی کرتے ہوئے نہایت بے رحمی سے بات جاری رکھی۔ "اب نہیں کہہ سکتیں، ایک اور بار؟ اور شادی کے بعد اپنے بچوں کی مسکراہٹ میں تم کو اپنی زندگی کا مفہوم نہیں مل سکتا؟"

"بالفاظ دیگر،" اس نے تمسخر آمیز غیر یقینی سے آغاز کیا۔ "بالفاظ دیگر تم ایک اور نئی پناہ گاہ کی طرف میری راہنمائی کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے، لیکن یہ اعتماد تمھیں کہاں سے آ گیا کہ میں اپنی گذشتہ پناہ گاہ پر اس نئی کو ترجیح دوں گی؟"

"نہیں۔ میں کسی ایسی چیز کی طرف تمھاری راہ نمائی نہیں کر رہا ہوں زیادہ سے زیادہ میں یہی چاہتا ہوں کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم خوب ٹھونک بجا کر اپنی موجودہ بے دلی اور اکتاہٹ کا تجزیہ کر لو۔ یہی کہ یہ بے زاری نہایت حقیقی ہے اور کسی ایسی چیز کا نتیجہ نہیں جو بس تمھارے ہاتھ آتے آتے رہ گئی ہو۔ وہ چیز جس کو قطعی طور پر جاننا مشکل ہے لیکن جو سوچ بچار سے پہچانی ضرور جا سکتی ہے۔"

"جو بس تمھارے ہاتھ آتے آتے رہ گئی ہو سے اگر تمھاری مراد اس چیز کا جسمانی پہلو ہے تو کان کھول کر سن لو، نہیں میں کافی بستروں کو شکن آلود کرنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ واقعی مجھے اس پہلو سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"محض جسمانی ہی نہیں: ایک رات یہاں، ایک رات وہاں، ہر اس اجنبی کے ساتھ جو بہتا ہوا تمھاری راہ لگا۔ اس طرح تمھیں اس عمل سے صرف نفرت ہی ہو سکتی ہے۔ بستر پر آنے سے پہلے تمھیں اس کے ساتھ، کسی نہ کسی نہج پر، زندگی کی، ذہن کی، جذبات کی، اور تجربوں کی ساجھے داری کرنی ہوگی۔ میرا مطلب ہے، کلی عمل، صرف اس کا جسمانی پہلو ہی نہیں۔" وہ لحظہ بھر کو رکا، پھر کہا: "تم سوچ رہی ہو میں اس قدر عامیانہ بات کیسے کر سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ برا تو نہیں مانو گی اگر کچھ کہوں؟"

"نہیں۔ کہو۔"

"ہماری ذات کے اضطراب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک از خود طاری کردہ عبقریت کے چکر میں پڑ کر کائنات کی بڑی معمولی باتوں کے بڑے معمولی حسن سے گریزاں ہو گئے ہیں۔ خیر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اس پختگی عزم سے ہم ان معمولی باتوں کے بڑے معمولی حسن کو چھوڑنے کے لئے بھی تو آمادہ نہیں۔ بس یہی المیہ ہے۔ اگر تم میں اپنے ذہن کا بوجھ سہنے کی تاب نہیں۔ جینٹ

ایمانوئیل یوسنو کی طرح۔ تو اس کے کہے میں آکر چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے دست کش ہونا بھلا کون سی عقلمندی ہے اس ریاکاری کا کیا جواز ہے کہ انسان دوسروں کی موجودگی میں ان سے بکمال استغنا گریزاں ہو جائے اور تنہائی میں ان کے لئے تڑپا کرے تمھیں بنجر، بے وقعت کلبیت اور سادہ، کھردری۔ یعنی خالص معصومیت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ سنو،" اس نے میز پر کہنیاں ٹیک کر ان پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے ٹھیک اس کی نظروں میں نظریں گاڑ کر کہا، "تمھیں معلوم ہے، میرا ایک لڑکا ہے۔ تم شادی کر لو، تمھاری لڑکی ہوگی تو وہ اس سے کھیلے گا۔ سچ، دونوں بہت خوش ہوں گے۔ اور ہم دونوں کے درمیان کسی فلسفے کو حائل نہیں ہونے دیں گے۔"

"پاگل۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی لیکن اداسی کی لکیر چہرے پر کچھ اور دبیز ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کہیں کھو گئی پھر بولی: "میری بے بسی کا مذاق اڑانے کے لئے اب تم باقی رہ گئے تھے۔"

"مذاق؟ اگر یہ مذاق ہے تو یوڈتھ تمھاری ہی نہیں میری بے بسی کا بھی ہے اس سے قطع نظر میں سخت سیریس ہوں۔ سچ۔" اس نے یک لخت نگاہیں نیچی کر لیں "تم عورت ہو اور تمھیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ خود کو کھو دینے کی خواہش کبھی کبھی بڑی منھ زوری سے مجھ میں سر اٹھاتی ہے۔ تم نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی، یا انجان بن گئیں کہ قرب سے پر جل اٹھتے ہیں۔ اور تم..." وہ لمحہ بھر کو رکا۔ "تم میرے اندر بمشکل تھپک تھپک کر سلائی ہوئی آگ کو اپنی پوری تندی سے جگا دیتی ہو۔ میری ذات کا ایک نہ ایک ٹکڑا تم سے ہر ملاقات کے دوران کہیں کھو جاتا ہے۔ گھر جا کر میں تمام رات اسے تلاش کرتا ہوں، مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے وہ تمام زیادتیاں یاد آجاتی ہیں جو بلاواسطہ مجھ سے کی گئی ہیں اور جنھیں میں اکثر بڑی محنت سے ایک از خود طاری کردہ عبقریت کے سائے میں دفن کر دینے میں کام یاب بھی ہو جاتا ہوں۔ لیکن انجانے میں، کسی موڑ پر، تم نظر آجاتی ہو اور یہ اپنی قبر سے سر تا برہنہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ پھر پھر میری یاد کو شہ مل جاتی ہے: کبھی اپنے شہر کی وہ بسیں مجھے یاد آتی ہیں جن میں جگہ ہوتے ہوئے بھی لوگ مشقت کی ننگی دھوپ میں تپتے ہوئے، نتیجتاً چڑچڑے لوگ کہ جن کی بڑی جائز انا بھی آئے دن کتاخصی اور پیہم سبک سری کی وجہ سے بڑی نچلی حرکتوں میں اپنی تسکین کے سامان ڈھونڈتی ہے۔ جب تک میرے تازے چمکائے جوتوں کو روند کر آگے نہ بڑھے، چین نہ آتا، اور کبھی میرا وہ باس کہ جس نے اپنی پانچ سو صفحے کی کتاب کا بلا معاوضہ ترجمہ کرنے کا صلہ میرے خلاف کالج کے پریزیڈنٹ سے رپورٹ کر کے مجھے دیا تھا... جانے دو، تمھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ تمھیں دیکھتے ہی، تمھارے اتنے قریب آتے ہی میرا پورا جسم ایک جھنجھناتا ہوا ذہن بن جاتا ہے۔ یہ ذہن سب طرح کی چیزیں محسوس کرتا ہے۔ اس میں طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ اسی لئے پچھلی بار میں نے تم سے کہا تھا کہ اب ہمیں اور نہیں ملنا چاہئے، ہم ایک دوسرے کے ذہن، جذبے اور احساس میں بھی مل سکتے ہیں۔ اس طرح ہم یادوں اور قربت کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ یہ مذاق نہیں، میں تو ان خوابوں کا ذکر کر رہا تھا جو کبھی اپنی تکمیل کو نہ پہنچ سکیں گے۔ میرے والد نے بھی یہ خواہش کی تھی کہ میں وہاں سے آگے بڑھوں گا جہاں سے انھوں نے راہ چھوڑی ہے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ ساری کہانیاں جنھیں میں ادھورا چھوڑ رہا ہوں، میرا لڑکا انھیں ان کے انجام سے ہم کنار کرے گا۔ یہ میرا اس پر سراسر ظلم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

اس کی آواز بتدریج سو گئی۔ وہ بھی کچھ نہ بولی، محویت سے اسے دیکھا کی۔ پھر اس نے بے حد آہستگی سے اپنا سر اس کی طرف لا کر، دائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے کہا۔

"تم نے پیلی جلد والی وہ کتاب دیکھی ہے، جس میں جدید عربی نظموں کا انتخاب ہے؟"

"ہاں، کیوں؟"

"بس یوں ہی۔ اس میں ایک نظم ہے۔ اس سال پہلے پڑھی تھی تو بہت پسند آئی تھی۔ جانے کیوں بیٹھے بٹھائے اس وقت یاد آرہی ہے۔"

"تم کو،" یکایک اس کے لہجے میں درشتی اور آنکھوں میں بلور کی سفاک سختی ابھر آئی، "باتیں چبا چبا کر کرنے میں مزہ آتا ہے، ہے نا؟ اور تم اپنی بے حد معصوم خواہشوں کا اظہار بھی ایمان داری سے بنا فصاحت کا سہارا لئے اور belles-lettres میں ڈبکی لگائے نہیں کر سکتے۔ کیوں؟"

"کیوں..." وہ لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔ "میں نے تم سے اپنی بیڑیوں کا ذکر کیا تھا۔"

"ہاں کیا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ یہ توڑی بھی جا سکتی ہیں، ہیں نہ؟"

"نہیں۔ تم بھول گئیں، میں نے کہا تھا کہ یہ خود ساختہ ہیں۔ تمھیں معلوم ہے..."

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ "یہی نہ کہ شادی شدہ ہو۔" اس نے جھلائی ہوئی نظروں سے بے باکانہ اسے دیکھا اور بے رحمی سے مسکرا دی۔ "تو پھر جان من، شادی شدوں کو خواہش نہ کرنی چاہئے۔"

خواہش؟ خواہش، ذہن کا رد عمل تو ہو سکتی ہے، اس کا اپنا ذہن نہیں ہوتا۔ بو باس، بدن نہ رنگ، آواز۔ یہ تو ہمارے اندر چھپی بیٹھی ہوتی ہے، اداسی اور خوشی کی طرح، اور ہمیں ذرا سا کم زور پا کر، بڑی منھ زوری سے اپنی کمین گاہ سے نکل آتی ہے۔ وہ خاموشی سے سوچا کیا۔ اور اسے یوں چپ پا کر یوڈتھ نے نرمی سے کہنا شروع کیا:

"شادی شدہ۔ کیا مجھے معلوم نہیں؟ یہ تو مجھے ہماری پہلی ملاقات میں معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی اسے تمھارے گلے کا طوق سمجھا ہے؟ تم خود ہی پاس آکر سمٹ جاتے ہو۔ سمندر کی وہ لہر جو بڑے جوش اور قہر سے جھاگ اڑاتی ساحل تک آئے، پھر خود ہی الٹے پاؤں لوٹ جائے پیاسی جنم جنم کی پیاسی اپنے تمام تر ذہن، فلسفہ طرازی اور شخصیت کے رچاؤ کے باوجود، تم اندر سے اس قدر عظیم طور پر کھوکھلے ہو۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی ہوں، جب بھی ملتے ہو، اس فاصلے، اس دوری سے گفتگو شروع کرتے ہو اور اختتام تک آتے آتے بے دم ہو کر، انھیں مفروضہ فاصلوں سے لہولہان ہو کر گر پڑتے ہو۔ ان فاصلوں کی کوئی حقیقت نہیں، مجھ۔"

"یہ بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل۔" اس نے نظریں پھیر کر گویا خود سے کہا: "نہیں یوڈتھ اب ہمیں نہیں ملنا چاہئے۔ بے کار، سب بے فائدہ ہے۔ وہ ایکا ایکی کھڑا ہو گیا اور ابلتی ہوئی آواز سے جذبہ کو جلا وطن کرتے ہوئے بڑی ٹھوس،

بڑی ناقابلِ تردید آواز میں بولا:

"میں ریسرچ لائبریری جارہا ہوں۔"

"چلو۔" وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ "میں بھی وہیں جارہی ہوں۔"

"گھر نہیں؟ کافی رات گذر چکی ہے۔"

"کیا مجھے معلوم نہیں؟"

لائبریری تک وہ دونوں خاموش خاموش آئے۔ اندر پہنچ کر جب وہ اس سے رخصت ہونے لگی تو یکایک وہ جانا پہچانا جذبہ، ازسرِنو، منہ زوری سے اسے اپنے اندر اٹھتا محسوس ہوا۔ "ٹھہرو!" اس نے کہا اور سیڑھیوں پر یوڈتھ کے قدم ٹھٹھر گئے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"دیکھتے نہیں basement، وہاں سے پانچویں فلور پر۔"

"وہاں کیا کروگی؟"

"کیا کروں گی؟ بھاڑ جھونکوں گی، تم سے مطلب؟" اس کا جی چاہا، ایک بار تو چیخ کر کہہ دے لیکن وہ اس کے موجودہ لہجہ کی شدت، بے تکلفی اور سرد کار پر چکرا گئی۔ یہ سب، یہ ساری تعلق خاطری گرمی جذبہ لحہ بھر پہلے کہے گئے جملے کہ وہ لائبریری جارہا ہے، اس کی سفاک، ٹھنڈی قطعیت کے مقابلے میں کس قدر رولا سا دینے والی تھی۔ کیا وہ گھٹنے ٹیک دے؟ رک جائے؟ لوٹ جائے؟ اس گہری آواز سے امڈ پڑی ہوئی گرمی، تعلق پر اعتماد کرلے؟ وہ سوچ میں پڑگئی۔ خدایا یہ آج فیصلہ کرنا کیوں دوبھر ہو رہا تھا؟ اور کسے معلوم تھا کہ اس کی سپردگی کے باوجود وہ منہ موڑ کر، پوری اجنبیت سے اس کی دنیا سے باہر نہ چلا جائے گا کہ وہ اس پر قادر تھا۔؟ "وہاں کیا کروگی؟" کیا یہ "مت جاؤ" مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ خدارا، کہ مجھے تمھاری ضرورت ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے" کا دوسرا اندازہ نہ تھا؟ کون جانے؟ مگر اسے فیصلہ کرنا تھا، اسی لحہ کہ وقت اس کے لئے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ اسی گومگو کے لمحے میں اس نے نہایت بے بسی سے خود کو اپنی فطری سنائی جبلیت کے سپرد کردیا اور نہایت سپاٹ، کسی بھی جذبے سے عاری، آواز میں کہا جو جھٹ پٹے کے سایوں کی طرح تھی جنھیں دور سے نہیں پہچانا جاسکتا: "پڑھوں گی۔ یہ رہی کتاب، طٰہٰ حسین کی "یادیں۔"

"تمھیں معلوم ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی آواز میں اسی جذبے کو اپنے اندر صاف پہچانتے ہوئے کہنا شروع کیا، "میں ریفرنس روم میں کام کررہا ہوں۔ وہیں آجاؤ۔ میرے سامنے بیٹھ کر پڑھنا۔"

"تمھارے سامنے بیٹھ کر۔" اس نے اپنے مجروح جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ دل فریب ادا سے مسکرائی اور خود کو اس کی آواز سے ابلتے ہوئے بے پناہ جذبے کی شدت میں بہ جانے دیا، لیکن پھر اسی سرعت سے وہ اپنے پر قابو پاگئی۔ آہ۔ وہ کس قدر unpredictable تھا آخرکار، اس نے یہ تو نہیں کہا تھا: "آؤ... یہاں سے چلیں، کہیں اور..." کہ جس کے بعد، بنا کوشش کئے ناگزیر وقوع پذیر ہوجاتا، اور ہلکی ہوکر اٹھنے والی دو روحوں میں سے کوئی بھی احساسِ جرم سے گراں بار نہ ہوتی۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہا۔ اس کے برخلاف، اس نے سامنے بیٹھ کر پڑھنے کی دعوت دی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ اور یہ ایسا عمل تھا جس کے ذریعہ دو چار لمحوں میں ہی اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کرسکتا تھا، وہ اعتماد جو اسے اپنی اور اس کی نہایت معصوم اور قدرتی خواہشوں کو بے رحمی سے گھونٹ دینے کی قوت عطا کرتا تھا۔ یہ حماقت ہے۔ سراسر۔ بے سود۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی۔

"نہیں" اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا، اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ شاید یہ بہتر ہوگا کہ اب ہم نہ ملا کریں۔"

وہ ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ یوڈتھ نے سیڑھیوں سے ذرا سی ذرا اچک کر اس کے رخساروں کو ہلکے سے تھپ تھپایا اور "شب بخیر" کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی، بنا دوبارہ اس کی طرف مڑکر دیکھے ہوئے۔

"شب بخیر۔" الفاظ اس کے لبوں کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ہر شے، اس کی نظروں کے آگے سے معدوم ہوگئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ تیزی سے اودے اودے خلا میں جیسے پھنس پھنس کر گرتا جارہا ہو، یا سکتہ میں جیسے اس کا سانس بہت دھیمے چل رہا ہو۔

خدایا یہ کھڑا ہونا تک کیوں دوبھر ہوا جارہا ہے؟ ماؤف، گم گشتہ وہ دیر تک ریلنگ پر یوں ہی جھکا کھڑا رہا۔ جانے کہاں سے ایسے میں کنگز کی نظم اس کے دماغ میں در آئی اور ساتھ ہی الیاس ابوشبکہ کی نظم بھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے ریفرنس روم میں آیا اور خود کو جنم جنم کے اضمحلال کا احساس لئے آرام کرسی پر پھینک دیا۔ پڑھنا محال تھا، قطعی محال کہ ان مصرعوں کی بھن بھناہٹ بلائے جان تھی۔ وہ کھویا کھویا سا اٹھ کھڑا ہوا اور لائبریری کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دروازے سے یوڈتھ نکل رہی تھی: دو سائے مہربان اندھیرے میں چل رہے تھے، اجنبی اجنبی دو مختلف مقابل سمتوں میں، نڈھال، لٹے لٹے سے، اور کھوئے ہوئے۔

تمام رات یہ نظمیں اس کے دماغ میں گونجا کیں، اور اگلے تمام دن۔

یہ کیا ہے: دیوانگی؟ احمق پن؟ جنس؟ آخر کیا؟

اسی چھپر نما ڈھانچے میں کھوئے ہوئے کھڑے، دور نشیب میں شہر کی روشنیوں کو بہیمیت سے جھلملاتے دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے کہا:

نہیں۔ نہ جنس، دیوانگی، نہ احمق پن۔ میں ایک مجسم ذہن ننھی سی موج ہوں، پھیلتی ہوئی، سمٹتی ہوئی، ابلتی، جھاگ اڑاتی ہوئی اور اپنے سے بڑے اپنے سے زیادہ شہ زور، پھیلتے، سمٹتے ابلتے، جھاگ اڑاتے سمندر کا جزو بن جانا چاہتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ فنا کئے حلول اور انضمام کے اس عمل کی تکمیل قسط وار ہوگی، مختلف، اجنبی، اپنی سرزمینوں پر آج، اس شب، موجودہ لمحے میں مجھے بڑی شدت سے لگتا ہے کہ ایک اور قسط واجب الادا ہوگئی ہے۔ میں اپنی بکھری ہوئی وحدت کو کائنات کے ایک، یک مظہر سے، بادقت، لامکاں سنجوگ کی شکل میں تھوڑا تھوڑا قائم کروں گا۔ آج تم اپنی دریری آنچ میں مجھے پھول کی طرح کھل لینے دو، اپنی ذات کے ان تمام ٹکڑوں کو جو تم سے اپنی ہر ملاقات کے دوران میں ایک لمحے کے سنجوگ کی چاہت میں، جو آفاقی، ابدی تکمیل کی راہ میں صرف ایک کڑی ہے، کھوتا آیا ہوں، بازیافت کرلینے دو، اور ان کے ساتھ کچھ اور جو کل تک

میری ذات کا جزو نہ تھا، تا کہ میں کل پھر تاریک دھوپ میں اعتماد سے آگے بڑھ سکوں۔ آؤ، مجھے جسموں کی نیک روشنی میں تپ کر کندن ہو لینے دو۔ آؤ...

"محمد...!"

"کیا؟ تم اب تک یہیں ہو؟ گھر جا رہی تھیں نہ؟" اس نے دور نشیب میں شہر کی بے ضرورت جگمگاتی روشنیوں سے واپس آتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اب نہیں۔"

"بڑی Impulsive ہو"

"کچھ بھی سہی۔ چلو اندر چلیں۔"

اندر جہاں گفتگو کے بے معنی، لڑھکتے پڑھکتے، حقیر ٹکڑوں، جو اپنے بکنے والوں کے دماغوں کی طرح خالی تھے۔ کے درمیان نہایت دیوانگی سے آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی، جہاں کثرت شراب نوشی سے لڑکے لڑکیاں اپنے قدموں کے آہنگ کھو بیٹھے تھے، اور جہاں اگر ہر بیسوا ایک دوامی کھلاڑی کی خواہش سے تانبے کی طرح سرخ جل رہی تھی تو ہر لڑکا اپنی شراب سے مستعار لی ہوئی مردانگی کے ٹوٹتے نشے کے زیر اثر، پگھل جانے سے پہلے ہی سرسراتے سایوں کی پناہ گاہوں میں گھس جانے کو بے چین تھا۔

"کیا جلدی ہے۔ آؤ، پہلے وہاں چلیں..." اس نے دور اندھیرے میں اشارہ کیا جہاں کوئلوں سے چٹخے ہوا کے دوش پر ہلکے، جگنو سے اڑ رہے تھے، "جہاں بروس spare ribs کو باربیکیو کر رہا ہے۔ چلو۔"

وہ اندھیرے کی چادر کاٹتے ہوئے بروس کے پاس آئے۔ قدموں کی آہٹ پا کر بروس چونکا:

"O hi, there!

"Hi!"

"spare ribs کھاؤ گی؟" بروس نے ایک ہڈی یوڈتھ کی طرف بڑھا دی۔ وہ بڑے بھوکے پن سے، دانت گڑو گڑو کر، ہڈی پر کا گوشت کھانے لگی۔

ایک نیم تبسم اضطراراً اس کے لبوں پر پھیل گیا اس میں استہزا کا شائبہ نہ تھا، کچھ تھا تو زندگی کی حیوانی ضرورتوں کے آگے ذہن کی مکمل پسپائی کا احساس۔ یوڈتھ کے یوں دانتوں سے گوشت ادھیڑ ادھیڑ کر کھانے کے عمل میں زندگی کس بے باکی سے اپنے تقاضوں کی تکمیل کر رہی تھی، اور اس کا وہ ذہن جس نے اپنے اردگرد بہیمیت، ایک لازوال حماقت، تنہائی اور اداسی کو محسوس کیا تھا، اور اس کا وہ دل جس میں خواہش کی مدھم آنچ تھی۔ ایک خلش اور کائنات کے اسرار کو پا لینے کی تڑپ۔۔ سب محض ایک عظیم جھوٹ بن کر پیچھے رہ گئے تھے۔ کائنات کا سارا حسن ساری معنویت ساری سچائی ہڈی چپکے گوشت کی باریک سی تہہ میں مجسم ہو کر رہ گئی تھی، یا ان رسیلے دانتوں میں جن کے حلق کی کوئی رگ سفر کر کے دماغ تک پہنچی تھی نہ روح تک۔ اس ایک لمحہ میں اس نے بڑی سفاکی سے سوچا: دل کی یہ اداسی، گہری غنودگی میں دیکھا گیا کوئی دن خواب نہ ہو۔ تخمین وظن کی انتہائے کار، تصنع، یا اپنی سفلی کمزوریوں کی عبقریانہ توجیہہ، جیسے کسی کمتری ثانیے کی سوغات کے طور پر انسان اپنی فطری کوتاہیوں سے بکمال نخوت گریزاں ہو جائے... جئے جانے کا یہ زہر، جو ہمیں قدم قدم پر ایک گرانڈیل Paradox سے دوچار کرتا ہے، بہر نوع ہمیں پینا ہوگا.. پھر اسے خیال آیا، اور اب لبوں کے نیم تبسم کی جگہ گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔ نہیں، نہیں یہ پیراڈاکس نہیں۔ ہم، کہ جو جسم اور روح کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے عادی ہیں، اسے پیراڈاکس کا نام دیتے ہیں، جبکہ ذہن جسم کی تردید کرتا ہے نہ جسم ذہن کی خیر و شر کے امتزاج ہی سے ہم اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

جب وہ کھا چکی تو وہ بولا: "چلو اب چلیں۔"

"چلو۔"

بھیگے بھیگے سبزے پر چلتے ہوئے وہ اندر آ گئے جہاں لڑکے لڑکیاں اور ممبران فیکلٹی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بڑے بڑے کشادہ بیولس آرٹریز روم میں جہاں تہاں کھڑے مصروف گفتگو تھے۔ ایک کونے میں بڑی سی ہسپانوی طرز کی میز پر لڑکوں نے باقاعدہ بار جما رکھی تھی۔ ایک طرف سیلوفین کے تھیلے میں Ice-cubes دھرے تھے اور دوسری طرف گلاسوں کے ہجوم کے پیچھے برگنڈی، رم، جن، اسکاچ، بربن، سوڈا، سیون اپ، کوک اور جانے کیا الم غلم بوتلیں، اور ان کے عقب سے طلوع ہوتا ہوا وہ توانا، طویل قامت اور میجسٹک، دنیا کا پالن ہار، ہانس جارج شنائڈر جو ہر بھک منگے کے کشکول میں اپنی مرضی کے مطابق جس قدر چاہا اس کا حصہ انڈیل دیا تھا، لیکن برآمد کی ہوئی نفیس، ریشمیں نشہ آور، اسکاچ وسکی کی کافی بوتلیں بہ کمال استادی بچاتے ہوئے، سرما کی ان طویل، خوش رنگ راتوں کے لئے بچاتے ہوئے جب کیمپس کی منتخب، فر (Fur) اور منک (Mink) میں دھنسی ہوئی حسیناؤں کے ساتھ بستر میں گھس جانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

ان کو ایک ساتھ اندر آتا دیکھ کر، آتش دان کے قریب اپنے محبوب لڑکوں کے جھرمٹ میں گھری بہجت نے ایک ذرا کی ذرا اپنی من پسند تیری کے جام کو گھمایا، اس کو معنی خیز نظروں سے گھورا پھر پیشانی شکنائے ہوئے مڑ کر جیری براؤن کی کسی بات کا جواب دینے لگی۔ بڑی پیاری سی ڈینیز نے مسکرا کر اپنی شربتی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا اور یوڈتھ اس کے پہلو سے تیر کی طرح نکل کر تنہا تنہا سی کھانے کے میز کے پاس پہنچی اور اے واکاڈو سے بنائی گئی dip میں Corn chips ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔ اس کے چہرے پر چند سلوٹیں تھیں، فکر تھی، اداسی تھی، حرارت تھی اور لبوں پر آیا ہوا نیم تبسم۔

اس نے چونک کر کامل اجنبیت سے، اپنے اردگرد نظر ڈالی، جیسے غلطی سے وہاں آ گیا ہو۔ اور یہ غلطی جس کا احساس بڑا جان لیوا تھا اور جو جان بوجھ کر، بڑی مذہبی پابندی کے ساتھ ہمیشہ کی جاتی تھی، جو ہر بار خون اگلواتی تھی اور ذات کی پسپائی کے عجیب، لذت آمیز درد سے آشنا کرتی تھی، گویا اس کی ذات کا جزو بن چکی تھی، ایک ناقابل برداشت لیکن ناقابل دست کش جزو۔

اس کے چاروں طرف ہلسی تھی، جن اور اسکاچ یا بربن میں بھیگے ہوئے قہقہے، لہسن میں رچی بسی مسکراہٹیں، جوانی کے خمار میں ڈوبی ہوئی پیپسی اور کوکا کولا کی طرح جھاگ اڑاتی ہوئی گفتگو کے حقیر ٹکڑے وہ گفتگو، وہ مسکراہٹیں، وہ قہقہے، وہ ہلسی جنھیں اس نے اتنی بار سنا تھا کہ اب یہ حفظ ہو گئی تھیں...اور، بالآخر ایک شور: ناپیدا کنار، مہمل... وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ تھا۔ ایک لمحے کے

لئے اسے محسوس ہوا گویا اس کا شعور بیچ کمرے میں اسے تنہا چھوڑ کر دور ٹیکری پر جا بیٹھا ہو اور اب بلندی سے، اس عالم میں جو روشنی کے درد سے چھلک رہا ہو، اسکے عضو عضو بکھرنے کا منظر دیکھ رہا ہو، کہ دیکھیں تم میرے بغیر کے قدم چلتے ہو۔ جیسے بھرے میلے میں کھو گیا ہو۔۔۔۔ پھر اس کے ذہن میں گویا آگ لگ گئی، جیسے زور کن کی ماہر انگلیوں سے بجایا گیا ہوا بے تھوون کا

Piano Concerto 4 in G Major

بھڑک کر اپنے تیسرے موومنٹ میں آ گیا ہو، پوری تندی، جنون خیزی، اپنی بے نہایت تمازت کے ساتھ، اور پھر یہ بھی چند ثانیے بعد اپنا سارا اجتنا ہوا آہنگ کھو کر شوئین برگ کی موسیقی میں ڈوب گیا ہو۔ جو موسیقی کیا تھی؟ ذات کے بکھر جانے کا نوحہ تھی جو مشینوں کی کرخت گنگناہٹ میں جاگتی، خون اگلتی تنہائی اور لازوال بیگانگی کی کوکھ سے پھوٹ بہا تھا۔ اس نے سوچا: اس تمام شور کو بھٹی میں لگا کر اس کا سارا پانی خشک کر دیا جائے تو تہ میں کیا باقی بچے گا؟ تمام آلائشوں سے پاک وہ سفوف کس چیز سے مشابہ ہوگا؟ کرسٹل، ہیرا، پتھر؟ آخر کیا؟ انبوہ کی یہ آواز۔۔۔اس کی عقب میں کیا ہے؟ مصلحت کوشی، ایک باطل خودنگری جسم و ذہن کی عظیم بیسوائی اس سفوف میں ان تمام Symphonies، تمام (Concen)، چیمبر میوزک کے تمام ڈوئٹ (duet)، کوارٹیٹ (quartet)، اسٹرنگ کوارٹیٹ (strong quartet)، کلارنٹ کوئنٹٹ (clarinet quintet)، تمام بیلے سوئٹس (ballet suites) خواہ انھیں موتسارٹ، خواہ بے تھوون، خواہ باخ، شوپان، راویل، شوبرٹ، شومان، براہمس، واگنر اور خواہ دوبیوسی (Debussy) نے کمپوز کیا ہو، اور جو بنا لمحہ بھر کو روح میں اترے، بہجت کے کچے پکے ذہن سے لہولہان ہو کر نکلتے، کی ہڈیوں کا برادہ ہوگا، اور پکاسو، میرو (Miro)، پال کلے (Paul Klee)، کانڈنسکی (Kandinsky)، مونے (Monet)، مانے (Manet)، سیزان (Cezanne) وغیرہ کے تمام کینوس اور جاکومیتی (Giacometti) رودن (Rodin) وغیرہ کے تمام مجسموں کی مٹی اور کانسی کی راکھ ہوگی جن پر سرنگوں جرمنی کا امریکی ورژن ہانس جارج شنائڈر گھنٹوں خطوط منحنیوں میں اپنے کیمل فلٹر سگریٹ کی راکھ گویا بڑے فاتحانہ انداز میں جھاڑتے ہوئے گفتگو کرے گا۔ اور کیا ہوگا؟ اور اور ان میں وہ تمام گنٹر گراس (Gunter Grass) ہوں گے، اور ٹامس مان (Thomas Mann) ہوں گے۔ اور ہرمن ہیسے (Hermann Hesse) ہوں گے، اور رابرٹ موزل (Robert Musil) ہوں گے جن کو بنا ہضم کئے، اپنی زبان کے Toilet پیپر سے پونچھ پونچھ کر، اسی بھٹی میں بھسم کر کے جن میں کبھی غریب یہودیوں کو زندہ جلایا گیا تھا، ان کی ہڈیوں کے سرمے سے اپنی گرانڈیل مطلب براری کے واسطے پیشہ کرایا جائے گا؟ اور شیورلے، ڈاج، پیکارڈ، اولڈز موبیل (Oldsmobile) کیمرو (Camaro)، مسٹینگ (Mustang)، ایم۔جی (MG)، سن بیم (Sunbeam)، ڈاٹ سن (Datsun)، جاگوار (Jaguar)، روور (Rover)، کیڈیلک (Cadillac) کاروں۔۔۔ ریگولر، کنورٹیبل (Convertible)، یا اسپورٹس۔۔۔کے قبل از وقت دیکھے گئے خوابوں کی دھند ہوگی اور اس میں لپٹی ہوئی کنواری بیواؤں کے جسم انجام کار بڑھتے بڑھتے یہ سفوف ساری دنیا کو اپنے ذاتی قہر کی زد میں لے لے گا اور برسوں بعد یہ کل پیدا ہونے والے بچوں کے ماں باپ کی جینس میں شامل ہو جائے گا، کچھ اس طرح کی اپنی آمد سے پہلے بچہ اپنی کنورٹیبل شیورلے ماں کے پیٹ سے پہلے

دھکیلے گا اور بعد میں خود کو، یا جی چاہا تو اسی پر بیٹھا بیٹھا سیر کرتا دنیا میں پہنچے گا۔۔۔

چلتے چلتے وہ ہسپانوی طرز کی میز تک آ گیا تھا جہاں لڑکوں نے بار جما رکھی تھی۔

"بیٹا تم نے پلک جھپکتے ہی ساری کی ساری چڑھا ڈالی؟" تمام شراب کے بلند قامت خدا، وحدہٗ لاشریک لہٗ ہانس جارج شنائڈر نے کہا۔ "وہ جو میں نے پہلے دی تھی؟ اب کیا پیتے پیتے مر جانے کا ارادہ ہے؟"

"تم نے مجھے پہلے نہیں دی تھی۔ تم پوری کی پوری خود صاف کر دینا چاہتے ہو۔ میری بلا سے، صاف کر دو۔ مگر اپنے سفید جھوٹوں کا ہدف مجھے تو نہ بناؤ۔"

"بہرحال۔۔۔اس بار کیا پیو گے؟"

"بربن (Bourbon)، کیا کہا، اس بار؟ صرف پہلی بار!"

۔۔۔اس کے ایک ہاتھ میں flash cubes سے مزین Palaroid camera ہوگا اور دوسرے میں magnavox کلر ٹیلی ویژن۔ جس پر Superman یا Batman کی کوئی مووی دکھائی جا رہی ہوگی اور کار میں Built in Harman-Kardon Strataphonic Music System پر Beatles یا Doots کا کوئی گیت بج رہا ہوگا۔۔۔

"کیا گیت بج رہا ہوگا بھئی؟" ہانس جارج شنائڈر نے پوچھا۔

"میری کار میں تو کوئی اسٹیریو ویسٹیریو نہیں ہے۔"

"چ۔چ۔چ بڑے افسوس کی بات ہے میری جان۔ بہرحال، اب لگوا لو۔" اس نے یوں ہی خالی خالی نظروں سے جواب دیا، اور پھر یہ گیا۔

۔تب میں Golgotha کی ٹیکری پر، تم سب کی شکستوں سے چور کھوپڑیوں پر بیٹھ کر، بوالفلک شگاف، جہاں سوز قسم کا قہقہہ لگاؤں گا۔

"میں نے پوچھا تھا، کیا پیو گے؟"

"اور میں نے جواب دیا تھا، بربن۔"

"کیسی پیو گے بیگن؟"

اسے یاد آیا کہ کس دیوانگی کے ساتھ وہ دونوں آٹھویں رنگ کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے، مگر وہ آٹھواں رنگ سالا ہاتھ آ کر نہ دیا۔ چنانچہ انھیں روایتی سات پر قناعت کرنی پڑی نہ کہ یہ رس بھری صاحب کی ایجاد تھی۔ رہا وہ تو وہ تلاش جاری رکھنے کے حق میں تھا کہ اگر انسان آٹھویں رنگ کو ہی نہ پا سکا تو زندہ رہنے کا مصرف کیا رہ جائے گا۔ اور یہ مشکل تھا، بہت ہی مشکل۔ کس کافر کو انکار ہے۔ تمام عظیم چیزیں مشکل الحصول ہوتی ہیں لیکن پالا ان نیم ذہنوں سے پڑا تھا کہ وہ شوئین برگ تو نہ تھے جو موسیقی کی ہفت سری وحدت اور آہنگ کو از سر نو بارہ سروں میں منضبط کر کے معاصر انسان کے غم تک جا پہنچتے۔ کسی اس حد تک عظیم چیز تک پہنچنے کے لئے خون اگلنے کی ضرورت تھی۔ اور وہ کیا اگلتے؟ تھوک: بے رنگ، مردہ تھوک۔ ان کے کانوں کی طرح مردہ جو صرف زیریں دھڑ کو حرارت پہنچانے والے نغموں کی زبان ہی سن سکتے تھے۔ وہ بھلا کیسے مشینوں کی غیر انسانی فضا میں فرد کے اندر سے ٹوٹنے کا نغمہ سن سکتے تھے۔ وہ شوئین برگ کا بچہ، وہ کم بخت اس پر ضرور قادر

تھا۔ رہے یہ تو ان کے پاس یکسانیت کے خلاف بغاوت کی تڑپ نہ تھی۔ گرم گرم چاکلیٹ اور یخ لسی صرف جسم کے درمیانی ابھار کو ہی فربہ کرنے کے کام آتی ہے یا جراثیم کی پچکاری کو متورم کرنے کے۔ یہ روح کے کسی دکھ کا درماں نہیں۔ چنان چہ انھوں نے یکسانیت کے خلاف بغاوت نہ کی۔ یکسانیت جو ٹھیائی ہوئی بالادستی اور ہاری ہوئی خودنگری کا Status quo ہوتی ہے۔ وہ دبلا پتلا مدیر زیادہ دنوں تک اس کی عظمت اور روح سے متعلق بکواس کو برداشت نہ کر سکا چنان چہ بڑی ظرافت سے۔

ایسی ظرافت کہ جس کے انوکھے پن پر اس نے پہلے خود کو مبارکباد دی ہوگی۔ بولا:

"اماں یار، تم اپنے نام سے یہ "میمن" کا لفظ نکال دو کہ اسے دیکھ کر ادیب کا نہیں، ہلدی، مرچ، دھنیے کے بیچنے والے کا گمان ہوتا ہے۔" تو گویا اس بکواس ابتر اسرائیلی بچے کو اس کے نام سے ہلدی، مرچ، دھنیے کی بو آتی تھی، جانے اسے یونیورسٹی کینٹے ٹیریا کے مالک کی بیٹی کے جسم سے اٹھتی ہوئی وہ بالخصوص پیسی ہوئی دار چینی کی مہک بھی کبھی نتھنوں سے الجھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جب وہ دنوں گھر نہیں جاتا اور پڑھائی کے بوجھ تلے ہفتوں انگریزی ڈپارٹمنٹ کے سمینار روم میں دنوں کو کتابوں اور رات کو گدرائی ہوئی خوبانیوں، خمیدہ تکونوں سے سرماتا، یا شعر کہتا:

دے گئی دے گئی جو تارے
آنرز کی ریحانہ رے
دودھ اس کے گدرا مرود

تو وہ موٹے سے مچھر بندوقی گویا بڑی رسان سے بولتے تھے: "یار ابتر تم ہمیشہ ہمارے بیگن سے مذاق ہی کرتے رہتے ہو۔" (المیوں کا المیہ یہ ہے کہ بے چارہ دل صرف محسوس کر سکتا ہے، کہہ نہیں سکتا۔) میں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ہراساں نہیں ہوں۔ وہ جو یہاں تک آیا ہے تو ہر ہر قدم کے ساتھ تھراتا گیا ہے، اور اب پیچھے مڑ کر دیکھا بھی تو کیا ہوگا، تھر تو تھرانے سے رہا! اور یہی تمھاری ساری رومانی طوطا مینا کہانیوں کا سب سے کم زور نکتہ ہے۔ ایک بالکل اجنبی شہر میں جب، دو سال بعد میں ادب اور تاریخ، فلسفہ، آرٹ پڑھاتا تھا، اسی مکتب میں ایک مدرس ہوا کرتے تھے، کریہہ المنظر صاحب جو خود کو رابط جیلی کہلوانے میں اپنی انا کی بالکل ایسے ہی تسکین کر لیا کرتے تھے جیسے پانچ سال بعد آرمینین اسسٹنٹ پروفیسر نے ایک دن اس سے یہ کہہ کر تسکین فرمائی تھی: تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں اب فل پروفیسر ہو گیا ہوں، اور صرف دو سال میں، یاد رہے صرف دو سال میں، میں نے وہ راستہ طے کر لیا ہے جسے اچھے اچھے چھ سال سے کم میں طے نہیں کر پاتے۔ یہ میرے کام کا appreciation ہے اور اس سے انا بڑی صحت مند رہتی ہے۔ یا پھر جیسے جرمنی سے عارضی تبادلہ پر آئے ہوئے پروفیسر نے وطن لوٹتے سمے، اپنا پتہ دیتے ہوئے، اپنے نام سے پہلے "پروفیسر ڈاکٹر" لکھ کر، توضیح یہ کہتے ہوئے فرمائی تھی:

wie sie sehen, schreibt man in Deutschland prof. Dr. Von Seinem ramen!

چنانچہ کسی اور وجہ سے نہ سہی محض از راہ تفنن ہی، جب اگلے کرسمس پر اس نے جرمن پروفیسر کو تہنیتی کارڈ بھیجا تو لفافے پر اس کے نام سے پہلے "پروفیسر پروفیسر ڈاکٹر ڈاکٹر" لکھ دیا۔ سراسر بد مذاقی تھی۔ اسے اعتراف تھا، اور افسوس بھی۔

مگر نہیں، دو ہفتے گذرنے سے پہلے پہلے ہی جب جوابی کارڈ آ گیا۔ جو ایک دیدہ زیب رسالے سے تراشی ہوئی کسی ایرانی miniature painting پر مشتمل تھا۔ تو اسے اپنے تاسف کی حماقت پر افسوس ہوا کہ جواب کیا تھا، رس بھریاں تھیں، گلاب تھے اور بوندیاں تھیں۔ انا صاحب۔ معلوم ہوا۔ دوسرے سرے پر نہایت انا تھیں۔ رابط جیلی صاحب، آپ عمر کے اس حصہ میں تھے جب انسان صرف ان کتابوں کو یاد کر کے جیتا ہے جو بس اس سے لکھتے لکھتے رہ گئی ہوتی ہیں، جب لوگ اس کی عمارت کے آثار دیکھ کر کہنگی کا فتویٰ صادر کریں تو کریں، وہ اس کی قدامت کا منکر ہی رہتا ہے، اور اپنی مردہ رگوں، اور فوت شدہ اعصاب کو ہزار تنتے ہوئے قطب مینار ایستادہ کرنے پر قادر پاتا ہے۔ اجلی سپہروں کی سیر کے دل دادہ کریہہ المنظر صاحب نے ایک روز، گاڑی کھاتے کے نزدیک، ایکا ایکی ٹھہر کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے، بڑی رازداری سے کہا تھا: "تو سیمینار روم میں، کتابوں کی بڑی بڑی الماریوں کے پیچھے، جب بو نا قابل برداشت ہو گئی تو بھی انھیں ہٹوانا پڑا۔ الاماں لانبی لانبی گدیاں تھیں جو اپنے Jellyrolls کے خون میں نہائے نہائے خشک ہو چکی تھیں۔ جیلی رولز زندہ باد خوبانیاں پائندہ باد ننھے میاں شاد باد!" ابھی اس کا ذہن خوبانیوں اور جیلی رولز کے مسئلے ہی میں الجھا ہوا تھا کہ چاند پورے سے رہبر صفی کا خط ملا: "یار برہمن ایسا افسانہ لکھا ہے کہ طبیعت منغض ہو گئی۔ لیکن، تم جانو، تنغیض سے پہلے میں دل کھول کر خوب ہی تو ہنسا، یوں سمجھو پاگل ہو گیا۔ تمھاری معلومات عامہ... ہمارے رب العزت کی شاہ کار حواؤں کے بارے میں علی الخصوص... نہایت ہی کم زور ہیں، اور اسی تناسب سے بڑی بھاری Firing کی حاجت مند... اور فلسنگ، عزیز از جان برہمن، تجربہ کے ساتھ آتی ہے۔ چنانچہ کاروبار پر اتر آؤ۔ وہ کیسے؟ بتاتا ہوں: پہلے پہل تو اپنے گرم گرم بیگن مارکیٹ میں لے جاؤ، محنت کرو اور مشقت کی کڑی دھوپ میں خوب خوب پسینہ بہاؤ۔ بعدازاں یہ کہنے کی حاجت جاتی رہے گی کہ کس طرح ہمارے پروردگار کی راجدھانی میں ہر خاتون دن میں ایک بار خون اگلتی ہے اور ہفتہ بھر تک مسلسل اگلے چلی جاتی ہے۔ یہ ہفتہ، برہمن پیارے، ریگستان کی ریت کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ اب چاہے تمھارے میونسپل کارپوریشن کی کوڑا گاڑی کے ڈرائیور قبلہ شیر گل صاحب کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے۔ اور وہ اسی پر مصر ہیں کہ نہیں بھئی یہ ہفتہ شمسی مہینہ کا آخری ہفتہ ہی ہوتا ہے جب تمام ہواؤں کو بیک وقت یہ نادر خیال آتا ہے کہ چلو بھئی شیر گل صاحب کا کام آسان کر دیں، یعنی یہی کہ تھوڑا سا خون فاسد ہی بہا دیں۔ اما بعد: اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو تم اس الو کے پٹھے شیر گل کو چلتا کر دو یا نہیں تو ہتھوڑا لے کر اس کے دماغ میں ٹھونسو کہ وہ تمام مہینے ان گدیوں کے شان دار استقبال کے لئے خود کو نہایت چاق و چوبند رکھے کہ حوائیں کوئی اس کی زر خرید غلام نہیں۔" اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ایک حقیقت باہر اور ایک بڑی جیالی، بڑی ہی مغلوب کن، ٹھیک میرے اندر بہ رہی ہے۔ تم اپنی حقیقت کے اسیر ہو، اور میں میں جواہر من ہال کو ایک عمارت کی شکل میں نہیں بلکہ ایک مثبت ثقافتی رویہ کے روپ میں دیکھتا ہوں جہاں Mariam Mekeba اور Zino Francescatti نے اپنے اپنے Concert پیش کئے تھے، اور بس کو محض لکڑی اور لوہے کے امتزاج سے بنا چار پہیوں والا

میکانکی ڈھب ہی نہیں سمجھتا کہ جس میں مرد، عورت: بچے جوان، بوڑھے، بیٹھ کر شہر جاتے ہیں، اسکول جاتے یا سمندر، بلکہ خون رائیگاں کا خالق مغربیت بھی، جسے یہ کبھی پتلی دھار کی شکل میں کولتار کی اندھی سڑک پر بہاتا ہے؛ یہ خون رائیگاں جو کبھی بہت ننھا سا، جوان کبھی بوڑھا ہوتا ہے۔ اپنے اندر کی حقیقت کا اسیر ہوں، وہ حقیقت جسے خون کے ماہ میں تیس دن یا صرف آخری ہفتے کے سات دنوں میں بہنے سے سروکار نہیں۔ تم مجھے بیگن کہہ لو، برہمن یارادن، اور جی چاہے تو سالن، جامن، پھسلن، کرغن... اس سے میرے اندر کی حقیقت کا چہرہ مسخ نہ ہوگا اور اس حقیقت کی کہانی بھی سنو: سات سال پہلے، جب میرے ذہن نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا بھی نہ سیکھا تھا، جب تم میرے جذبے کی گنوار شدت سے کٹ کاٹ جانے میں ہی اپنی جمالیت کی بہبود سمجھتے تھے، میرا دوست، قاضی فلاح الدین، جب ایسی جنونی باتیں کرتا تھا کہ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ہم جہاز پر بیٹھ کر سمندر میں دور نکل جائیں اور ساحل کی دنیا سے اپنے سارے رشتے ناطے توڑ کر سمندر کے سینے پر یونہی بہا کریں اور عرشے پر کھڑے کھڑے، سمندر کی ابدی، بیکراں وسعت کا احساس لئے، جی بھر کے ایک دوسرے کو نفیس نفیس گالیاں دیں اور ساحل کی تہذیب کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھیں، یا کہ مجھے روشنی سے ڈر لگتا ہے اور مجھے رات بے حد عزیز ہے کہ یہ ہماری ساری ناکامیاں بڑی ممتا سے اپنے بے نہایت سینے میں سمیٹ لیتی ہے، کہ ان کی روشنی اگر جیت ہے تو چابی بھرے کھلونوں کی۔ تو تم، ناسمجھی کے واضح احساس کے باوجود، سمجھ لینے کا ڈھونگ رچاتے، اور میں، نہ سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش کرتا... جب وہ پیرس میں تھا تو Louvre گیا۔ پیرس میں ہوتے ہوئے اور نہ جانا ایک ظلم تھا جو اسے اپنی ذات سے روا نہ تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ان دیو پیکر برآمدوں سے ہوتا ہوا چہکتی سانسوں کے ہجوم میں ڈی ونچی کے شاہ کار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ آدھے گھنٹے تک، ہر ممکن زاویے سے بڑھتی بے یقینی کے ساتھ اس نے مونالیزا کو دیکھا، اور پھر تنگ آ کر اس نے اس کے دھڑ سے، جو تصویر میں موجود نہ تھا، ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار ڈالے کہ مسکراہٹ کا فسوں نہ سہی، عورت کا حسن زریں تو ہوگا۔ چار گھنٹے بعد، جب وہ مایوس سا لوٹنے ہی والا تھا کہ گارڈ نے قریب آ کر کہا: ?Ca ne vous plait pas, Monsieur اس نے گارڈ کو بتایا کہ وہ کتنے ہزار میل دور سے مونالیزا کو دیکھنے آیا تھا مگر شاید، اسکے پاس وہ آنکھ نہیں جو اس کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ سکے۔ "تم تنہا نہیں دوست میں بھی اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا ہوں۔ مسکراہٹ شاید یہاں مسکراہٹ سرے سے مفقود ہے۔ یا یہ لبوں کی Nervous twitch ہے جسے اب تک تبسم سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے، کون جانے۔" اور یہ لوگ،" گارڈ نے منہ بنا کر کہا" جو اس کے عاشق ہیں، وہ اس لئے نہیں کہ حسن اس میں مجسم ہو گیا ہے، بلکہ وہ تو اس حقیقی متھ سے مرعوب ہو گئے ہیں، جو اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔" پھر اس نے بتایا کہ کس طرح اس صدی کے اوائل میں ایک اطالوی جوش وطنیت میں مونالزا کو لے اڑا تھا، اور کس طرح اطالوی حکومت کو کینوس لوٹانا پڑا۔ "بس یوں سمجھو، بے چاری راتوں رات مشہور ہو گئی"... میں نے اس وقت مونالزا کو برا بھلا نہ کہا میں نے اس کی عزت کو اپنی نافہمی سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ میں چپ رہا گو میں یہ کہنا چاہتا تھا: تبسم شاید موجود ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ اپنا مفہوم ہمارے تجربے کے لئے کھو چکا ہے اور برا میں نے اس وقت بھی نہ کہا جب ۳ سال بعد Los Angeles County Museaum میں سوریل ازم اور دادازم کی نمائش دیکھنے گیا اور پہروں میری نظر سلواڈور ڈالی (Salvadore Dali) کے ایک کینوس

Soft construction with Boiled Beans:

Premonition of Civil War

سے جدا نہ ہوئی۔ پھر رہ رہ کر میرے ذہن میں جاکومتی کا مجسمہ L'homme au doigt ابھرتا رہا، ابھرتا ہی رہا۔ پھر تنہائی چار کھونٹ دبیز ہو گئی اور میرے ذہن میں بس یہی گونج تھی: یہ اشیا اور انسانوں کا خارجی روپ نہ تھا جس سے مجھے دلچسپی تھی بلکہ وہ تاثر جو انھوں نے میری داخلی زندگی پر مرتب کیا تھا... اور ہم ابھی تک لفظ اور تلفظ کے چکر ہی سے نہیں آزاد ہو سکے ہیں۔ ہم ژاں ژنے Jean Genet کے نظریہ حیات و کائنات سے غیر متعلق اس کے نام کے ہجے پر خود کو لہولہان کئے دے رہے ہیں، اور مادھو کے کرب سے ماورا الجھیاں لے کر اس کی تلاش اور نقاب کشائی کی فکر میں سرگرداں ہیں۔

نماز پڑھاتے پڑھاتے پیش امام اگلی آیت ہی بھول جائے، یا جیسے چھینک آتے آتے نہ آئے، کن پٹیاں سنسنا جائیں، اور ایک پھٹ پڑتی ہوئی قوت خود اپنے خول ہی میں گھٹ کر رہ جائے... اس نے بڑی غیر یقینی سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہاں آ گیا ہے؟ پھر اس نے خود کو جاکومتی کے مجسمے "ہاتھ" کی طرح تنہا، بہت اجنبی محسوس کیا جو فضا کی مہیب وسعت میں، کائنات کو اپنے پس منظر میں لئے یکہ و تنہا بہہ رہا ہو، اندھیروں کی تلاش میں، تہذیب کے ساحلوں سے دور، بہت دور۔

"On the rocks!" اس نے لوٹتے ہوئے جواب دیا۔

ہانس جارج شنائڈر نے گلاس میں چار آئس کیوب ڈالے اور ان پر بربن کا ایک پیگ انڈھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے گلاس ہاتھ میں لے کر ایک نظر اپنے چاروں طرف ڈالی۔ لیکن اسے اپنے میں اور ہجوم میں کسی تعلق کی کوئی مرئی یا غیر مرئی زنجیر نظر نہ آئی۔ اور پھر، یونہی خالی نظروں سے، ہاتھ میں گلاس تھامے، وہ چلتا ہوا اور دروازے تک آیا اور باہر مہربان اندھیروں میں نکل گیا ☆☆☆

نامور کتابی سلسلہ

دنیازاد۔ ۱۳

مدیر: آصف فرخی

جس میں "کئی چاند تھے سرِ آسماں" کا طویل اقتباس شامل ہے۔

قیمت: ۲۲۵ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت
(انتظار حسین کے چند افسانوں کا تجزیہ)

محمد عمر میمن

شمارہ ۱۰۰،
اگست ستمبر ۱۹۷۶

مارسل پروست اپنے ضخیم ناول A La Recherche Du Temps Perdue کی پہلی کتاب کا خاتمہ انتظار حسین کی زبان میں اس جملے پر کرتا ہے: ''کسی خاص شکل کو یاد کرنے کے معنی ہیں کسی خاص لمحے کا افسوس کرنا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ گھر اور گلیاں اور کوچے بھی گذرتے برسوں کی مثال گذرتے چلے جاتے ہیں[1]۔''

محسوس ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے زیادہ تر اور یقیناً بہتر افسانے ان چہروں اور ان لمحوں کو یاد کرنے کے عمل سے وابستہ ہیں جنھیں وقت نے ہم سے دور کر دیا ہے۔ بظاہر یاد کرنے کا یہ عمل تضیع اوقات کی ایک شکل ہی نظر آئے گا بلکہ بہت سوں کی نابینا نگاہ میں اس کی حیثیت ماضی سے ایک مریضانہ وابستگی سے زیادہ اور کیا ہوگی، لیکن یہ ایک مہمل، بے معنی یا مریضانہ عمل نہیں۔ اس کی گہری معنویت کا طلسم اس وقت کھلتا ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ میگوئل دی اونا مونو کی طرح خود انتظار حسین کی دانست میں بھی ''یاد'' انفرادی شخصیت کی بنیاد ہے [2]۔

یادداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا، وہ ماضی جو جڑوں اور بنیاد کا استعارہ ہے، اور ماضی کے بغیر خود حال کی اہمیت ایک غیر متشخص و محدود غبار سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ یاد کرنے کے معنی ہیں اپنی ذات کے اجزائے ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنا اور شیرازہ بندی کے نتیجے میں حاصل شدہ اس ذات کو ایک ناقابل تردید استناد، ایک تہذیبی انفرادیت کا وقار بخشنا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی عمل میں انتظار حسین ''ماضی'' کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے ہیں، اس اعتبار سے نہیں کہ ''ماضی'' ایک مردہ گم شدہ کوئی بے مصرف چیز ہے، بلکہ اس اعتبار سے کہ یہ حال و استقبال کے جملہ امکانات اپنے میں سموئے ہوئے ہے، ان میں نافذ ہے او ان کے کردار کی تراش خراش کا ایک اہم تعیین کنندہ ہے اور اس عمل کے ذریعے تہذیبی شخصیت کی تلاش کا نقطۂ آغاز بھی۔ قومی یادداشت ماضی اور حال / مستقبل... یہ تینوں اجزا ایک ہی سلسلے میں منسلک ہیں۔ حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا، اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال / مستقبل کی حد بندی کیا۔ یہ عمل، ظاہر ہے کہ محض ایک غیر محدود بے نام ونشان سے حال مین زیست کرنے سے جاری ہوسکتا ہے نہ حاصل۔ بدقسمتی کہہ لیجیے کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے اردو ادب میں سماجی حقیقت پسندی کی بے جا مداخلت کے سبب اردو کا افسانوی ادب اگست ۱۹۴۷ تک ایک ایسا ادب رہا ہے جو خود اپنی روایت سے باغی اور گریزاں ہو [3]۔

اور اگر پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا تو امکان یہی تھا کہ اپنے عنصر سے بچھڑا ہوا یہ ادب اپنی موجودہ ددلابانہ راہ پر بے پروائیوں ہی جاری وساری رہتا۔

اس بیان سے عجلت میں شاید یہی نتیجہ نکالا جائے کہ ایک قطعی اور محسوس تبدیلی تقسیم کے ساتھ فی الفور لکھنے والوں کے جذبات خیالات اور رجحانات میں در آئی، کچھ اس طرح کہ وہ گمراہی کی دلدل سے پلک جھپکتے ہی نجات کو لے جانے والی صراط مستقیم پر پہنچ گئے۔ ادب اور ادبی رجحانات میں ایسے معجزے رونما نہیں ہوا کرتے۔ کرشن چندر کی مثال ہی لے لیجیے، یا ان کے پاکستانی ہمزاد قاسمی صاحب کی، یہ لوگ تقسیم کے بعد بھی اسی رومان پسندانہ سماجی حقیقت پسندی کا شکار رہے ہیں جس کا ماقبل تقسیم رہے تھے اور اس قسم کی فارمولا کہانیاں اب بھی لکھتے رہے جیسی پہلے لکھتے رہے تھے۔ یہ فارمولا بجز اس کے اور کیا تھا کہ آدمی کو اپنی فطرت میں

---

[1] ملاحظہ ہو، انتظار حسین ''ہمارے عہد کا ادب'' مطبوعہ سویرا نمبر ۳۱، صفحہ ۸۔

[2] میگوئل دی اونا موتو کہتا ہے :

Memory is the basis of individual personality, just as tradition is the basis of the collective personality of a people. We live in memory and by memory, and our spiritual life is at bottom simply the effort of our memory to persist, to transform itself into hope, the effort of our past to transform itself into our future.

"The Tragic Sense of the Life", London, The Fontana Library, page 28.

[3] اس نکتے کو خود انتظار حسین نے نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے ان دو مضمونوں میں بیان کیا ہے: ''ہمارے عہد کا ادب'' مطبوعہ ''سویرا'' نمبر ۳۱، صفحہ ۸ تا ۱۷ اور ''اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں'' مطبوعہ ''سیپ''، ۱۲، (خاص نمبر) صفحہ ۲۷۵ تا ۲۸۰۔

معصوم سمجھا جائے اور اگر اس میں غلط کاری اور گناہ کا شائبہ دریافت کر بھی لیا جائے تو اس کی تمام تر ذمہ داری سماج پر عائد کر دی جائے ۴۔

ایک لحاظ سے دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ تقسیم اور اس کے ہم رکاب آئے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات نے بجائے انسان کی فطرت کی بنیادی تہ داری کو سمجھنے میں مدد دینے کے، بہت سے ہر دل عزیز اور مقبول عام لکھنے والوں کو اپنا وہی پرانا راگ الاپنے کا ایک زریں موقع فراہم کر دیا۔ نتیجتاً سرحد کے اس پار بعض مسلمان دوشیزاؤں کی عصمت کے امانت دار بعض ہندو بنے اور اس پار چند ہندو کنواریوں کے ہنوز ناموس گوہر کی آب داری پر چند متقی مسلمانوں نے آنچ نہ آنے دی۔

تخلیق پاکستان نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک سمت کا پتہ دیا، ایک حال و مستقبل کی امید دی بلکہ ایک ماضی بھی اور اس ماضی کو کھوجنے، اپنی رگوں میں محسوس کرنے، اور اہم تر یہ ہے کہ اسے سمجھنے کی خواہش بھی دی۔ چنانچہ اب پہلی بار ادب میں قوم پرستی، دل سوزی وطن، معاشرتی اصلاح کی قبیل کے بلند بانگ موضوعات کے علاوہ ایک اور بالکل ہی انوکھا موضوع بھی نظر آنے لگا۔ اس موضوع کی اساس "ہجرت کے تجربے" پر تھی۔ انتظار حسین ہجرت کے تجربے کو تخلیق پاکستان کے بعد آنے والے دور کے اہم ترین اور غالب ترین تجربے کا نام دیتے ہیں ۵۔

اہم ترین اور غالب ترین مقداری اعتبار سے نہیں بلکہ ماہیتی اعتبار سے، کیوں کہ دوسرے موضوعات کی ہماہمی اب بھی باقی تھی۔

پاکستان کے بہت سے لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیت کو ہجرت کے اس نئے تجربے ایک نیا نقطۂ ارتکاز دیا۔ انتظار حسین کو اس نے یہ تو خیر دیا ہی، وہ شعور اور احساس بھی ودیعت کی جس کی مدد سے ایک گم شدہ دنیا اچانک پھر سے اپنے خط و خال کے ساتھ نکھر آنے لگی اور از سر نو با معنی بن گئی۔ "گلی کوچے"، "کنکری"، "آخری آدمی"، اور اب "شہر افسوس" کے بیش تر افسانے ایک گمشدہ دنیا کو یاد کے سہارے ایک بار پھر سے پالینے کی صریح کوشش ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر ایک آوارہ

دیگر ایک آوارہ خوشبو کے تعاقب اور

بازیافت کی کوششیں!

انتظار حسین کی تخلیقی دنیا اپنی تمام تر قوت نمو اس دھارے سے پاتی ہے جو روایت کی کوکھ سے بہتا ہے، اور یہ روایت بذات خود مختلف النوع اجزائے ترکیبی کا مجمع ہے۔ یہ مختلف النوع اجزائے ترکیبی یعنی: یادیں، خواب، گذرے بسرے انبیا کے قصے، دیومالا، اور توہمات، ایک پوری قوم کے اجتماعی مزاج اس کے کردار اور شخصیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ قوم مسلمانوں کی قوم ہے جو برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے آباد ہے۔ اس شخصیت کو اس کی پوری تہ داری کے ساتھ گرفت میں لانے کے لئے ان اجزائے ترکیبی کا عرفان اور شناخت ناقابل گریز ہے۔ انتظار حسین کا سارا فن دراصل اسی عرفان کو پالینے سے عبارت ہے۔ لیکن کس طرح؟

مثال کے طور پر ان کی کہانی "سیڑھیاں" کو لیجیے۔ یہ ان کے تازہ

---

۴ اس نکتے کی وضاحت کی لئے بھی نوٹ ۳ کے زیر آئے ہوئے حوالے دیکھیے۔

۵ ملاحظہ ہو "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ سویرا" نمبر ۳۱ صفحہ ۸ تا ۱۷۔

ترین مجموعے "شہر افسوس" میں شامل ہے۔ جہاں تک کہانی کے محسوس جسم اور ضخامت کا تعلق ہے تو یہ بہت دبلا پتلا سا ہی ہے۔ ایک جملے یوں کہا جا سکتا ہے بلکہ محمد سلیم الرحمن کہہ ہی چکے ہیں کہ "یہ ایک ایسی کہانی ہے، جس میں ایک فرد کے بچپن کی یادیں چند دوسرے لوگوں کے مکالموں سے متاثر ہوتی ہیں اور رنگ و روپ پاتی ہیں ۶۔"

لیکن وہ بات جو اسی آسانی کے ساتھ ایک جملے میں نہیں کہی جا سکتی وہ یہ ہے کہ یہاں دراصل سارا معاملہ ایک خاص الخاص نسبت کا ہے جو "خواب" کو یاداشت اور "یادداشت" کو خواب سے ہے۔ خواب ہی فی الواقع یاداشت کی بازیافت کا واحد ذریعہ ہے۔ خواب دیکھنے کی خلقی صلاحیت کا فقدان اور چنانچہ اشارتاً یا مقدراً یاداشت کا گم ہو جانا شخصیت کی موت ہے، خواہ انفرادی سطح پر خواہ اجتماعی سطح پر۔

کہانی کی ابتدا چار آدمیوں سے ہوتی ہے۔ یہ بشیر بھائی، اختر، رضی، اور سید ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ چاروں غیر شادی شدہ نوجوان ہیں اور ابھی حال ہی میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں۔ جس شب کا ذکر ہے اس شب چاروں کسی چھت پر لالٹین کی مدھم اور پراسرار روشنی میں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہیں۔ اختر ابھی ابھی اپنا خواب بیان کر چکا ہے اور بشیر بھائی جو بقیوں سے کسی قدر عمر میں بڑے ہیں، اختر کے بیان کردہ خواب کی تعبیر میں مصروف ہیں۔ ایک حد تک رضی بھی موجودہ صورت حال میں شامل اور اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ایک سید ہی ایسا ہے جو اس سے سراسر لاتعلق ہے۔ بقیوں کی طرف پیٹھ پھیرے آنکھیں بند کئے وہ کسی طور سہی سو جانے کی فکر میں غلطاں ہے لیکن آوازیں اسے سونے نہیں دیتیں۔ چنانچہ وہ جھنجھلاہٹ سے کروٹ لے کر اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: "یار تم کمال لوگ ہو اور اختر تو، میں جانوں، سوتا ہی نہیں۔ آدھی رات تک خواب بیان کرتا ہے۔ آدھی رات کے بعد خواب دیکھنے شروع کرتا ہے۔ کیوں بھئی اختر تجھے سونے کو گھڑی دو گھڑی مل جاتی ہے۔ ۷"

سید کو بتایا جاتا ہے کہ خواب دیکھنا تو بشر کی فطرت ہے۔ اگر یہ درست ہے تو خود اس کی فطرت کہاں رفو چکر ہو گئی ہے؟ "آخر میں بھی تو ہوں"، وہ پوچھتا ہے، "مجھے کیوں خواب نہیں دکھتے؟" لیکن یہ درست نہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب سید بھی خواب دیکھنے پر قادر تھا۔ یہ وقت وہ تھا جب ابھی اس نے پاکستان ہجرت نہیں کی تھی۔

وہ پھر سو جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ بقیہ تینوں افراد از سر نو خواب اور تعبیر خواب میں پڑ جاتے ہیں۔ اب رضی کی باری آتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> وہ دن یاد ہے نا بشیر بھائی آپ کو کہ آپ نماز کے لئے اٹھے تھے اور مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اتنی سویرے کیسے اٹھ بیٹھے۔

---

۶ ملاحظہ ہو "شہر افسوس" پر محمد سلیم الرحمن کا انگریزی تبصرہ جو Pakistan Times میں Doomsday Fiction کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

۷ ملاحظہ ہو "شہر افسوس" مطبوعہ مکتبۂ کارواں، لاہور، صفحہ ۲۳۔

اصل میں اس رات مجھے نیند نہیں آئی جنیں کیا ہو گیا۔ رات بھر کروٹیں لیتے گزر گئی اور طرح طرح کے خیال وسوسے صبح کے ہون میں ایک جھپکی سی آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ... "کہ ہمارا امام باڑہ ہے اور... امام باڑہ ہے اور وہاں بڑا علم نکل رہا ہے... بڑا علم بالکل اسی طرح وہی سبز لہراتا ہوا پٹکا، چمکتا ہوا چاندی کا پنجہ، ایسا چمک رہا تھا پنجہ، ایسا کہ میری آنکھوں میں چکا چوندھ ہو گئی۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

("شہر افسوس"، صفحہ ۷۶)

یہ بڑا علم اپنے سبز لہراتے ہوئے پٹکے اور چمکتے ہوئے چاندی کے پنجے کے ساتھ کوئی معمولی علم نہیں۔ یہ دراصل بدی اور ناانصافی کے خلاف محمدؐ کے سبط، حسینؓ کی جدوجہد کا رمز ہے اور اس المیہ واردات کو جو آج سے تیرہ سو سال پہلے میدان کربلا میں واقع ہوئی تھی گوشۂ گمنامی سے نکال کر ٹھیک تاریخ کے اجالوں کے بیچ لے آتا ہے۔ یہ رمز کا اجتماعی پہلو ہے یعنی علم کے ذکر سے ایک اہم تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یوں "ماضی" اور "حال" ایک ناقابل قطع رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ "حال" اور "ماضی" کا یہ غیر منفک انضمام یا پیوستگی دراصل علم کے ذکر سے پیدا ہوئی۔

کربلا کے المیے میں مضمر رمزیت اور اس رمزیت کو اس کی تمام تر وسعت اور جملہ انسلاکات کے ساتھ احاطۂ تحریر میں لانا شاید یہاں بے محل ہوگا، ساتھ ہی ساتھ اس خاص الخاص معنویت کو بھی جو مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے لئے واقعۂ کربلا میں موجود ہے، کیوں کہ یہ سب جانی پہچانی باتیں ہیں۔ اسی طرح، یہاں واقعۂ کربلا اور اس کے بعد متعلق تاریخی تفاصیل اور جزئیات کی کم و بیش صحت اور استناد کو بھی معرض بحث میں لانے کی ایسی کوئی ناگزیر حاجت نہیں۔ اہم بات واقعے کی Historicity یا تاریخی وقوع پذیری ہے اور اس میں شک و شبہے کی مجال نہیں۔ پھر حقیقت کی زیادہ نہیں تو کم از کم دو ابعاد تو ہوتی ہی ہیں: ایک تو یہ کہ کوئی واقعہ اصلاً کس طرح وقوع پذیر ہوا، دوسرے یہ کہ واقعی وقوع پذیری کے طور و طریق سے قطع نظر لوگوں نے تخیلاً اور اعتقاداً اسے کس طرح وقوع پذیر سمجھا؟ موخر الذکر تخلیق کار کے فن کے لئے اہم تر ہے، یہ یا کم از کم انتظار حسین کی رائے میں اہم تر ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اسلامی روایت ہو یا ہندو روایت، میں بہر حال قدامت پسند ہوں اور تاریخ، تنقید اور نفسیات سے زیادہ اس حقیقت میں ایمان رکھتا ہوں جسے جنتا کے ذہن و تخیل نے جنم دیا [۸]۔"

درست، پھر بھی اس کا اعادہ بے ضرورت نہ ہوگا کہ علم کا Motif افسانے میں محض وقت کے دو انتہائی سروں یعنی "ماضی" اور "حال" کی درمیانی خلیج کو پر کرنے کے لئے ہی نہیں لایا گیا ہے۔ تقسیم ہند کے سیاق و سباق میں جب کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو بربریت کے لاتعداد مظاہر سے ہو کر پاکستان ہجرت پر مجبور ہو جانا پڑا، کربلا کی المیہ واردات ایک نئی معنویت اور مناسبت اختیار

[۸] ملاحظہ ہو "ہمارے عہد کا ادب" مطبوعہ "سویرا" نمبر ۳۱، صفحہ ۱۲۔

کر لیتی ہے۔ شاید انتظار حسین کی منشا یہ نہیں رہی ہے کہ "ماضی کی یاد" کو "ماضی پرستی" کا مترادف سمجھیں۔ وہ تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خود "حال" میں "ماضی" کو بڑا عمل دخل رہتا ہے، کم از کم ان لوگوں کی نظر میں، جو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی اجتماعی شخصیت اور اس کے ذریعے اپنی انفرادی شخصیتوں کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔ "ماضی پر اصرار کرنے سے،" وہ کہتے ہیں، "افسانہ نگار کا یہ مطلب نہیں ہوتا یا کم از کم نہیں ہونا چاہئے، کہ گئے دنوں کو واپس لایا جائے۔ [۹]"

یا ایک اور جگہ: "تم مجھے ریگستان میں چھوڑ دو گے تو میں خانہ کعبہ کھڑا کر دوں گا۔ اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں تو پھر رونے دھونے کا سوال تو ختم ہو ہی جاتا ہے۔ پرانی جنتوں کی یاد میں رونا دھونا، خواہ وہ جنت میر ابائی کی ہو یا میر اور نظیر کی... جہاں یہ رونا دھونا نظر آئے سمجھ لو کہ یہ ہے پرانی نسل کی آواز۔ اور ظاہر ہے کہ تخلیق کا معاملہ جنت کو رونا نہیں ہے بلکہ جنت تعمیر کرنا ہے [۱۰]۔"

لیکن علم کا ایک پہلو، ایک بعد، اور بھی ہے: نجی یا شخصی یا ذاتی بعد، ایسا ذاتی بعد اور معنویت جو بلا شرکت غیرے صرف رضی اور رضی کے خاندان تک محدود اور اس کی ملکیت ہے، کیوں کہ اس متعین اور محسوس علم کو جس کا تذکرہ ہوا ہے، جس انداز اور جس اعتبار سے رضی اور اس کے خاندان نے محسوس کیا ہے، جس طرح اس کا تجزیہ کیا ہے کسی اور شخص یا خاندان نے نہیں کیا۔ قدرے وضاحت سے علم کی رضی اور اس کے خاندان کے لئے "ذاتی معنویت" کا ذکر نیچے آئے گا۔ فی الحال:

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ انتظار حسین کی افسانوی دنیا میں "خواب" اور "حقیقت" کچھ اس الفت سے گلے مل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں کہ انھیں علیحدہ کرنا اگر محال نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ زیر بحث افسانہ "سیڑھیاں" اس ادغام دار فتانہ اور پیوستگی صوفیانہ کا شاہ کار ہے۔ خود افسانے کا عنوان، "سیڑھیاں" ایک اور کہانی "پرچھائیں" [۱۱] کے ان لامتناہی اور متداخل برآمدوں کے پیچیدہ سلسلوں کی طرح جھٹ پٹے کی اقلیم کی تھرکتی پرچھائیوں کے مابین وقت کے احساس سے یکسر معرا ایک تجربہ بن جاتا ہے جہاں "خواب" اور حقیقت شعور میں یکے بعد دیگرے، بنا درمیانی وقفوں کے، کچھ اس روانی سے آتے جاتے ہیں کہ ایک سے علیحدہ دوسرے کا وجود باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خارجی دنیا "خواب" میں مضمر خلقی طور پر پوشیدہ تمام رمز اور معنویت کو اجاگر کرتی ہے اور بے جسم کے چھوٹے موٹے "خواب" معروضی حقیقت کو محسوساتی ڈھانچہ عطا کرتے ہیں، کچھ اس طرح کہ اس کے آسانی سے گرفت میں نہ آنے والے زاویے بھی روز روشن کی طرح منور ہو جاتے ہیں۔

رضی کے لئے کم از کم اور شاید سید کے لئے، خصوصاً اب یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ "خواب" اور حقیقت میں فرق کر سکیں، یا یہ معلوم کر سکیں کہ کہاں کس نقطے پر آکر "خواب" منقطع ہوا اور کہاں سے "حقیقت" کا آغاز۔ اچانک اس در وا گیں

[۹] دیکھئے اجتماعی تہذیب اور افسانہ" مطبوعہ "نیا دور" نمبر ۱۸-۱۵، صفحہ ۹۴۔
[۱۰] ملاحظہ ہو "خوشبو کی ہجرت" (شیخ صلاح الدین، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور حنیف رامے کی درمیان ایک مکالمہ) مطبوعہ "سویرا" نمبر ۱۸-۱۷، صفحہ ۲۲۱۔
[۱۱] یہ کہانی انتظار حسین کی افسانوی مجموعے "آخری آدمی" مطبوعہ "کتابیات" لاہور میں شامل ہے۔

احساس کے ساتھ کہ خواب دیکھنے کی صلاحیت اب اس میں نہیں رہی، دردآگیں اس لئے کہ خوابوں کا گم ہو جانا جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں شخصیت کا انہدام ہے، سید بڑے فکریہ لہجے میں سوچتا ہے:

> کیا وہ واقعی خواب نہیں ہے۔ وہ پھر سوچنے لگا۔ تو پھر کیا اس کی ساری زندگی ہی خوابوں سے خالی ہے۔ اسے کبھی کوئی خواب نہیں دکھائی دیا؟ اس کے تصور نے فضائے یاد میں تیرتے جھلمل کرتے کئی ایک گالوں کو چٹکی میں پکڑا مگر پھر اسے یاد آیا کہ وہ خواب تو نہیں اصلی واقعات ہیں۔ اس نے پوری پچھلی زندگی میں نگاہ دوڑائی۔ ہر واقعے میں ہر گوشے میں ایک خواب کی کیفیت دکھائی دی مگر کوئی خواب گرفت میں نہ آسکا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ خواب اس کے ماضی میں رل مل گئے ہیں یا وہ کوئی ابرق ملا گلال ہے کہ روشنی کے ذروں نے اس میں دمک تو پیدا کر دی ہے مگر وہ الگ نہیں چنے جاسکتے۔ یا امام باڑے میں ٹنگے ہوئے جھاڑ کی کوئی پھلی ہے کہ باہر سے سفید اندر رنگ ہی رنگ، جنھیں باہر نہیں نکالا جا سکتا، یا کنوئیں کی گہرائی میں چمکتا کالا پڑتا پانی کہ دونوں میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔

("شہرِ افسوس"، صفحہ ۸۰)

اور لمحہ بھر بعد:

> اب اتنے طویل خواب کے بعد کوئی کیا خواب دیکھے۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ "مجھے تو اپنا وہ مکان ہی ایک خواب سا لگتا ہے۔ نیم تاریک زینے میں چلتے ہوئے لگتا ہے کہ سرنگ میں چل رہے ہیں۔ ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ دوسرے موڑ کے بعد تیسرا موڑ، یوں معلوم ہوتا کہ موڑ آتے چلے جائیں گے سیڑھیاں پھیلتی چلی جائیں گی کہ اتنے میں ایک دم کھلی روشن چھت آجاتی۔ لگتا کہ کسی اجنبی دیس میں داخل ہو گئے ہیں... کبھی کبھی تو اپنی چھت پر عجب ویرانی سی چھائی ہوتی۔ اونچے والے کوٹھے کی منڈیر پر کوئی بندر اونگھتے اونگھتے سو جاتا جیسے اب کبھی نہیں اٹھے گا۔ پھر بھی ایک ساتھ جھرجھری لیتا اور کوٹھے سے نیچے کی چھت پہ اور نیچے کی چھت سے زینے کی طرف... ہم دونوں کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اندھیرے زینے کی سیڑھیوں پہ اترتا، رکتا، نیچے آیا۔ ہم دالان کے ستون کے پیچھے چھپ گئے۔ کنوئیں کی من پہ جا بیٹھا... بیٹھا رہا... پھر غائب ہو گیا... یا شاید کنوئیں میں اتر گیا ہو۔"

(ایضاً صفحہ ۸۱)

اب اس بڑے شخصی یا ذاتی تجربے کی طرف آتا ہوں جو رضی اور اس کے خاندان والوں کو علم کے توسط سے حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ کہہ چکا ہوں، یہ علم کوئی معمولی نہیں۔ یہ اپنے ایک چھوٹے سے وجود میں ایک پوری کتھا تھا، ایک نہایت شخصی ڈراما جس میں اعتقادات، رسوم، توہمات، اور دیومالا سب مل جل کر مشرقی یوپی کے کسی شہر کے ایک شیعہ سید گھرانے کی زندگی کا نقشہ تخلیق کرتے ہیں یعنی وہ "حقیقت" بلکہ صداقت کہئے، جو بقول انتظار حسین تاریخی تحقیق اور دووقتی بنی سے ماورا ہوتے ہوئے بھی، اور شاید اسی وجہ سے، بڑی حقیقی چیز ہے کیوں کہ اس کو جنتا نے مل جل کر خلق کیا ہے۔

خارجی اعتبار سے علم زیادہ سے زیادہ ایک شے ہی ہے۔ چلئے مان لیا کہ محرم کے لوازمات میں سے ایک ضروری چیز جس کے بغیر محرم بطریق احسن منایا جاسکتا ہے نہ تعزیئے کا جلوس نکالا جاسکتا ہے۔ باطنی اعتبار سے ہجرت سے قبل کے رضی کے آبائی شہر کے امام باڑے میں اس کی موجودگی بڑی اہمیت اور معنویت کی حامل ہے، کیونکہ یہ کوئی ایسا ویسا نہیں، منت کا علم ہے۔ رضی کی والدہ کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ کربلائے معلیٰ گئیں جہاں وہ امام کی درگاہ میں رات بھر ضریح کو پکڑے دعا مانگتی رہیں: "والدہ نے کہا جو ہو سو درگاہ سے گود بھر کے جاؤں گی۔ ... تڑکے میں ایک ساتھ آنکھ جھپک گئی۔ کیا دیکھتی ہیں کہ درگاہ میں شیر داخل ہو رہا ہے۔ سامنے علم پر نظر پڑی۔ پنجے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور ایک تازہ چنبیلی کا پھول والدہ کی گود میں آپڑا..." ("شہر افسوس"، صفحہ ۷۳)۔

بعد ازاں وہ ہندوستان لوٹتی ہیں اور چاندی سے اس پھول کو مس کر کے یہ علم بنواتی ہیں اور اسی سال رضی کی ولادت ہوتی ہے، شاید تمام منتوں اور ساجھتوں کے نتیجے میں جو اس کی ماں نے امام کے روضے پہ کی تھیں۔

چنانچہ علم محرم کے لوازمات میں سے ایک تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ یہ رضی کے لئے ایک نہایت ذاتی معنویت کا حامل بھی ہے۔ علاوہ بریں اس کی اہمیت کی ایک وجہ اور بھی ہے: انجام کار، جب رضی کا خاندان پاکستان ہجرت کا فیصلہ کرتا ہے تو رضی کی والدہ جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے آبائی امام باڑے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں، اور ہوں بھی کیسے کہ اس میں اجداد کی اور اپنی یادیں مدفون ہیں۔ انھیں چھوڑ دیں تو زندگی بے معنی ہو جائے۔ یوں دیکھئے تو امام باڑہ ایک صرف و محض عمارت سے ارتفاع پا کر ایک جماعتی اور معاشرتی حقیقت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اسے چھوڑ دیں تو بہ ظاہر جسم خاکی کی امان کا سامان تو ہو جائے گا، لیکن اسے چھوڑ کر جو زندگی ہاتھ آئے گی وہ خود اپنے عنصر سے گریزاں زندگی ہوگی۔ رضی کی والدہ کا یہ رویہ خود افسانہ نگار کا رویہ بھی ہے اور شاید اسی لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی ظاہری یا عقبی روزن سے ان کے اکثر افسانوں میں در آتا ہے۔ "سیڑھیاں" کے علاوہ یہ ہمیں "اپنی آگ کی طرف" کے بے نام کردار میں بھی ملتا ہے اور "اندھی گلی" کی ننھی اماں بھی ہیں[۱۲]۔

نتیجۃً سب ہجرت کر جاتے ہیں۔ صرف رضی کی والدہ پیچھے رہ جاتی ہیں تا کہ ہر سال محرم کے دنوں میں بڑے علم کا جلوس اپنی گذشتہ شان و شوکت سے نکلتا رہے۔ یہ وابستگی کوئی مریضانہ رجحان نہیں، یادوں کی آب یاری کی حکایت ہے، جس کی معنویت ان پر عیاں ہے جو "ہم در تو گریزم از گریزم" کی حقیقت جانتے ہیں۔

---

[۱۲] اس افسانے کے لئے دیکھئے "شہر افسوس" صفحہ ۲۲۷ تا ۲۳۸۔

غرض چند سال یہ روایت جاری رہتی ہے۔ پھر وقت رضی کی ماں کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔ ان کی وفات والے برس ہی پہلی، سب سے پہلی بار بڑے علم کا جلوس نہیں نکلتا۔ کیوں ؟

اس "کیوں" کی بھی دو توجیہات ہیں: ایک بہت سادہ بسیط اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی، دوسری مرکب اور قدرے تہہ دار۔ آسان سی وجہ تو یہی ہے کہ رضی کی والدہ کے رخصت ہوتے ہی بڑا علم بھی بڑے معجزانہ طور پر غائب ہو جاتا ہے۔ رضی کی زبانی ہی سنئے:

> ایک ہمارے پڑوسی ہیں، کہتے تھے کہ امام باڑے میں اس رات کسی نے چراغ نہیں جلایا۔ صبح کی نماز کو میں اٹھا تو دیکھا کہ امام باڑے میں گیس کی سی روشنی ہو رہی ہے۔۔۔ صبح کو جاکے دیکھا تو یہ ماجرا نظر آیا کہ سب علم رکھے ہیں، بڑا علم غائب ہے۔۔۔ ("شہر افسوس"، صفحہ ۷۶)

اور وہ جواب جو اتنا آسان نہیں ہے، خود ایک سوال پر مبنی ہے: چیزیں، اشیا اور جاندار۔۔۔ یہ سب کیوں اور کیسے غائب ہو جاتے ہیں؟ علم بہر طور ایک رمز ہی ہے اپنے سے وسیع تر مظہر یعنی "غیاب" کا استعارہ۔ "غیاب" اور اس کا توأم ظہور۔۔۔ دونوں کا تصور شیعیت کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اور شیعیت کے سیاق و سباق ہی میں دراصل دونوں کی صحیح معنویت سمجھی جاسکتی ہے۔ قبل اس کے کہ یہ پوچھا جائے: مذکورہ علم کیوں غائب ہوا؟ احسن یہ ہے کہ پوچھا جائے: صرف سات ظاہر اماموں کے بعد ایسا کیوں ہوا کہ شیعی اسماعیلی امامت ظاہر سے باطن میں تبدیل ہو گئی؟ اور کیوں بارہویں امام محمد المہدی نہایت پر اسرار معجزانہ طور غائب ہو گئے اور فاطمی خلیفہ نزار بن مستنصر بھی؟ یا شہر بانو، امام حسین کی ایرانی بیوی جو امام کی وصیت کے مطابق ان کے گھوڑے پر بیٹھیں اور ایسی بیٹھیں کہ پھر نہ وہ کبھی نظر آئیں نہ گھوڑا؟[۱۳] ظاہر ہے ان تمام "غیابات" کے پیچھے خالص سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ یہاں ان عوامل کی تردید مقصود ہے نہ ان سے نظر کشائی۔ اور کہ آیا یہ حضرات واقعی طور پر "غائب" بھی ہوئے تھے، بجائے خود عقل کو پراگندہ کر دینے والا سوال ہے۔ لیکن یہاں تاریخی تفاصیل کی کم و بیش صحت و استقامت موضوع بحث نہیں۔ ہمیں تو اس جذباتی اور تخیلی ردعمل کی جستجو ہے جو ان سیاسی عوامل سے پیدا شدہ واقعات کے نتیجے میں رونما ہوا۔ اور "غیاب" جیسے تقریباً صوفیانہ، ظاہراً توہماتی مظہر کی تلاش اگر کہیں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ جذباتی اور تخیلاتی ردعمل کی نیم واضح نیم تاریک پر اسرار فضا ہی ہو سکتی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ خود شیعیت نے یہ، اور اس جیسے تصورات، عیسائیت کی روایات اور قصے کہانیوں سے جو ظہور اسلام کے وقت مشرق وسطی کی فضا میں رلے ملے تھے، حاصل کئے ہیں؟ اپنی جگہ اہم سہی موجودہ سیاق و سباق میں ضروری نہیں۔ سوال مذہبی یا مذہب سے متعلقہ روایات کے اخذ و اقتباس کا اتنا نہیں جتنا ان اعتقادات کا ہے جو ان روایات سے ضو پا کر خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح اجتماعی شعور کا جزو لاینفک بنتے ہیں۔

اشخاص ہوں اشیا، یا کچھ اور، شہر بانو ہوں، علم ہو، یا محمد المہدیؑ، ان کا "غیاب" اعتقادی طور پر عموماً جال کی دراز دستی، شر، ناانصافی اور اخلاقی انحطاط کی وجہ سے جو ایک دور میں غالب آجائیں، عمل میں آتا ہے۔ جب نیکیاں روگرداں ہو جائیں، حق پر عمل نہ ہو اور باطل سے پرہیز نہ کیا جائے تو اعتقاد خود اپنے میں سمٹ کر ہی امان پا سکتا ہے۔ کیا عجب جو علم پر اسرار طور پر "غائب" ہو گیا۔

"غیاب" بھی انتظار حسین کے چند بنیادی استعاروں میں سے ہے اور بار بار اس کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً "مردہ راکھ" ہی کو لیجئے:

> کہتے ہیں کہ اس برس سواری نہیں آئی تھی۔ یہ بڑا علم گم ہونے کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے۔ بڑا علم پہلے گروی رکھا گیا تھا، پھر سونے کے کئی علم دے کر اسے عین نو محرم کو چھڑایا گیا۔ جب وہ سجا کر بلند کیا گیا تو دیکھا گیا کہ وہ سرخ انگارہ ہو گیا ہے۔ سرخ انگارہ پنجہ پہلے بہت دیر تک تھرا تا رہا۔ مولوی فرزند علی کا بیان ہے اس سے خون بھی ٹپکا تھا۔ پھر جب زیارت کے وقت اسے عزا خانے سے باہر نکالا گیا تو علم بہت زور سے کانپا اور پھر تفضل کے ہاتھ میں خالی چھڑ رہ گئی۔ بس اس کے اگلے برس یہ واقعہ ہو گیا۔ تو اس برس عزا خانوں میں سواری نہیں آئی تھی۔
>
> ("شہر افسوس" صفحہ ۸۴)

جب نیکیاں روگرداں ہو جائیں تو "غیاب" عمل میں آتا ہے۔ تقسیم ہند اور اس کے ہم رکاب آنے والی قیامت صغریٰ، یہ تصوراتی سطح پر دیکھئے تو ان واقعات اور اس فضا کی تکرار ہی تھی جو پہلے دور اموی اور ثانیاً دور عباسی میں رونما ہوئی۔ اور یہ شیعی فطرت اور عبقریت کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے کہ سیاسی ہزیمت اور ناکامیابی کے ہر موقع اور ہر دور میں اس نے اگر کہیں طمانیت قلب اور تسکین حیات پائی ہے تو وہ ماورائے تاریخ Metahistory کا تصور ہے۔

ماضی کو بھلا دینا، جیسا کہ میں اوپر ظاہر کرنا چاہا ہے، خود اپنی قبر کو روندنے کے مساوی ہے۔ بڑے علم کا "غائب" ہو جانا رضی کے لئے کسی چیز کے اٹل اور ناقابل منسوخ طور پر ختم ہو جانے کے مترادف نہیں۔ علم کی یاد آسیب کی طرح اس کے تعاقب میں ہے اور کسی الیہ دل کو دکھا دینے والے قافیے کی طرح بار بار اس کے شعور میں در آتی رہے گی۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک شیعیت کے ذہن میں ان آلام کی یاد تازہ ہے جو اس نے جھیلے ہیں۔ یادیں وہ کچھ نہیں جنہیں آدمی اپنے وجود سے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو اور بنا شخصیت میں کوئی جھول پڑے سالم توانا آگے چل پڑے کیوں کہ "یاد" کے بغیر ذات کو خود اپنی آگاہی باقی نہیں رہتی، اپنی انفرادی شخصیت اور اس کی معنویت کا شعور تو جانے دیجئے۔

لیکن "سیڑھیاں" رضی کی کہانی نہیں ہے، نہ اختر اور نہ بشیر بھائی کی۔ یہ کہانی ہے تو سید کی ہے۔۔۔ وہ قابل رحم سید جس میں اب خواب دیکھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے، چنانچہ ایک لحاظ سے زندہ رہنے کی بھی۔۔۔، زندہ رہنے کی مابعد الطبیعیاتی اعتبار سے۔

---

[۱۳] اس حوالے کے لئے میں انتظار حسین کا ممنون ہوں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا سید کو خواب اور تعبیرِ خواب کے موجودہ شغل سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ تو بس سو جانا چاہتا ہے، ہر چند کہ سو نہیں سکتا۔ آوازیں سونے نہیں دیتیں۔ امام باڑے کے لفظ کا ذکر ماضی کے پیکروں کے ایک سلسلے کو بیدار کر دیتا ہے اور یہ پیکر بالکل کسی سینمائی مونتاژ کی طرح خود ایک ناقابلِ گریز قوت کے ساتھ اس کے شعور پر مسلط کر دیتے ہیں۔ فی الفور اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں پوری کی پوری کھل جاتی ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے::

> ذہن کے اندھیرے میں ایک روزن بن رہا تھا کہ ایک کرن اس سے چھن کر روشن لکیر بناتی ہوئی اندر پہنچ رہی تھی۔ عزاخانے کے لوبان سے بسے ہوئے اندھیرے میں چمکتے ہوئے علم، چاندی اور سونے کے ضو دیتے ہوئے پنجے، سبز و سرخ ریشمی پٹکوں کے سنہرے روپہلی گوٹ سے لٹکے ہوئے کنارے بیچ چھت میں آویزاں وہ جھمک جھمک کرتا ہوا جھاڑ جس میں شیشے کی سفید سفید کونے دار ان گنت پھلیاں لٹک رہی تھیں جس کی ایک ٹوٹی ہوئی پھلی نامعلوم طریقے پر جانے کہاں سے اس کے پاس آ گئی تھی باہر سے سفید اور ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ پہ لگا کر دیکھو تو اندر سے ہفت رنگ۔ ("شہرِ افسوس"، صفحہ ۶۷)

عزاخانے کا اپنا ایک سحر ہے ایک پر افسون دل کشی۔ محرم کے دس اور چہلم کے کچھ دنوں کے علاوہ سال بھر اس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ طلسماتی، بھیانک، اور ناقابلِ فہم عزاخانہ کبھی اسے اپنی طرف جذب کرتا ہے اور کبھی دفع۔ کبھی کبھی سید کے دل میں اس کے پر اسرار بطن میں ہمکتے طلسم کو بے نقاب کرنے، ان کے راز کو پا لینے کی خواہش کچھ اس منہ زوری سے سر اٹھاتی ہے کہ وہ چپکے چپکے جھجکتے سہمے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ کواڑوں کی درازوں سے اندر جھانکنے پر جب کچھ بھی نظر نہیں آتا تو بے طرح پھڑ پھڑاتے دل کے ساتھ کواڑوں کے جوڑوں پہ پیر رکھ کر تالا لگی ہوئی کنڈی پکڑ دروازے سے اوپر والی جالی میں سے جھانکتا ہے، جھانکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ نظر اندھیرے میں سفر کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اور یکلخت کسی آوارہ شعاع کے پڑتے ہی اندرونی جھاڑ کی کوئی ہفت رنگ پھلی جھل مل جھل مل کرنے لگتی ہے اور رعب سے اس کے جسم پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے [۱۴]۔

عزاخانے سے زیادہ پر اسرار اور تاریک البطن، گو شاید کم تر خوف زدہ دکن تو وہ تہ خانہ تھا جس کی کھڑکی اندھیریا زینے میں کھلتی تھی۔ یہاں ایک قدیم کوڑیالے سانپ کی تصوراتی موجودگی نے تہ خانے کو پر اسراریت کے رہے سہے اجزا بھی بخش دیئے تھے۔ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کے مصداق یہ سانپ کسی کو آج تک نظر نہ آنے کے باوجود تمام اہلِ خانہ کے خیالات میں ایک ناقابلِ تردید حقیقت کی طرح جاگزیں تھا، اور بندی... اس کے بچپن کی رفیق... تو قسم کھانے کو تیار تھی کہ اس نے اپنی ننگی آنکھ سے اسے دیکھا ہے [۱۵]۔

۱۴۔ دیکھیے "شہرِ افسوس"، صفحہ ۶۸ تا ۶۹۔
۱۵۔ دیکھیے "شہرِ افسوس"، صفحہ ۶۸ تا ۶۹۔

عزاخانہ، تہ خانہ، زینہ، پرانا آبائی کنواں جو جنوں بھوتوں کا مسکن تھا، وہ میدان جو زینے کے روشندان کے ماورا کہیں دور نظر آتا تھا اور اس کے پرے درخت جہاں بندی کے کہنے کے مطابق وہ جادوگرنی آباد تھی جو جس کسی کو چاہتی اپنا جادوئی آئینہ دکھا کر قید کر لیتی... یہ تمام اجزا بذاتِ خود کسی گہری معنویت سے معرا بھی ہوں تو کم از کم اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سب نے مل جل کر اس شخصیت کو تشکیل دیا ہے جو سید ہے۔ یہ انتظار حسین کی فنی مہارت کا کرشمہ ہے کہ یہ اجزا بچ کے بصری پیکروں کے ایک ایسے دل آویز سلسلے میں تبدیل ہو گئے ہیں جو زندگی کی ایک نہایت جان دار اور پر اسرار حسیت سے معمور ہے۔ آخر یہ اس عقبی پردے کا کام بھی انجام دیتے ہیں جس کے آگے سید کے لڑکپن کی واردات، طلسم، دیو مالا، اوہام اور عہدِ طفولت کی فینٹیسی کے درمیان رفتہ رفتہ خود کو دہراتی ہے۔

اسی نیم روشن، نیم تاریک مرئی اور کبھی غیر مرئی، فضا میں سید نے بندی کے لئے اپنے دل میں محبت کے اولین مبہم اور چھلاوہ سے چھوئی موئی جذبات محسوس کئے تھے۔ یہ انتظار حسین کا فنی پختہ کاری کا کرشمہ ہے کہ پورے افسانے میں اس محبت کا کہیں براہ راست ذکر نہیں آیا ہے لیکن اس کی پوری فضا اس جذبے کی حدت و شدت سے مملو ہے جو ایک نے دوسرے کے لئے محسوس کیا تھا۔ مثلاً:

> دونوں سیڑھیاں اترنے لگے۔ اترتے اترتے پہلے موڑ پہ وہ رکا اور اندھیرے زینے سے باہر اس روشندان میں دیکھنے لگا جس میں سے نظر آنے والا میدان اور سے پھیلے ہوئے درخت ایک غیبی دنیا سے لگتے تھے۔
>
> "ادھر مت دیکھو۔" بندی نے اسے خبردار کیا۔
>
> "کیوں؟"
>
> "ادھر ایک جادوگرنی رہتی ہے۔" وہ اپنی دہشت زدہ آنکھوں کو چمکا کے کہنے لگی۔ "اس کے پاس ایک آئینہ ہے۔ جسے وہ آئینہ دکھاتی ہے وہ اس کے ساتھ لگ لیتا ہے۔"
>
> "جھوٹی!"
>
> "اللہ کی قسم!"
>
> اس نے ڈرتے ڈرتے ایک مرتبہ پھر روشن دان میں سے جھانکا۔ "کہیں بھی نہیں ہے۔"
>
> "اچھا میں دیکھوں۔" وہ روشن دان کی طرف بڑی اس نے بہت کوشش کی لیکن روشن دان تک اس کا منہ نہیں پہنچ سکا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ "سید ہمیں دکھا دے۔"
>
> اس نے بندی کو اس انداز سے سہارا دیا کہ سیڑھی سے اس کے پیر اٹھ گئے اور چہرہ روشن دان کے سامنے آ گیا اور اسے لگا کہ جیسے میٹھے پانی سے بھرا ڈول اس نے تھام رکھا ہے۔

("شہرِ افسوس"، صفحہ ۷۷ تا ۷۸)

یا ایک جگہ :

اس نے جلدی سے من پہ پڑا ہوا چڑے کا ڈول سنبھال لیا "کنوئیں کا پانی پئیں گے۔ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔" اور اس نے پھرتی سے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ رسی اس کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کو جلد کو رگڑتی چھیلتی تیزی سے گذرنے لگی اور پھر ایک ساتھ پانی کے ڈول کے ڈوبنے کا میٹھا سا شور ہوا جس سے اس کے سارے بدن میں مٹھاس کی ایک لہری دوڑ گئی۔ دونوں مل کر بھرا ڈول کھینچنے لگے اور دلوں میں ایک عجیب سی لذت جاگنے لگی۔ میٹھے ٹھنڈے پانی سے بھرا ڈول جب باہر آیا تو پہلے بندی نے ڈول تھاما اور اس نے اوک سے جی بھر کے پانی پیا اور پھر ڈول تھام کے بندی کے گورے ہاتھوں کی اوک میں پانی ڈالنا شروع کیا۔ گورے ہاتھوں سے بنی ہوئی ڈھلوان گہری ہوتی ہوئی اوک، موتی سا پانی، پتلے پتلے ہونٹ، اس نے ایک مرتبہ کی دھار اتنی تیز کی کہ اس کے کپڑے تربتر ہو گئے اور گلے میں پھندا لگ گیا۔

("شہر افسوس" صفحہ ۷۲)

اور یہیں زندگی میں پہلی بار سید اور بندی دونوں ساتھ ساتھ "گناہ" کے خیال سے کانپ اٹھے تھے؟[۱] لیکن اب بندی کہاں ہے؟ اور وہ اس کا کنوارا جگمگاتا چہرہ؟ بچپن کے وہ مانوس چہرے؟ وہ مناظر؟

تو وہ تابندہ چہرہ کہاں گیا؟ وہ بندی جو "کٹ کر کے جاتی تو دکھائی دیتا کہ پتنگ کٹ گئی" اور وہ "پتنگ کہ کٹ کے چلتی تو لگتا کہ بندی روٹھ کے جا رہی ہے"[۲] آنے والے ہجر کی پیش خبری تو پہلے سے ہی اس خواب میں موجود تھی جو سید نے ہندوستان چھوڑنے سے قبل کبھی دیکھا تھا:

"اماں جی میں نے خواب دیکھا کہ میں زینے پہ چڑھ رہا ہوں۔"

"پیغمبری خواب ہے بیٹا۔ ترقی کرو گے، افسر بنو گے۔"

"اماں جی خواب میں اگر کوئی پتنگ اڑتی دیکھے؟"

نہیں بیٹا ایسے خواب نہیں دیکھتے۔" اماں جی بولیں۔ "پتنگ دیکھنا اچھا نہیں، پریشانی آوارہ وطنی کی نشانی ہے۔"

"اماں جی میں نے خواب دیکھا کہ جیسے میں ہوں زینے پہ چڑھ رہا ہوں، چڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ بہت دیر بعد زینہ آیا اور کوٹھا غائب... اور میں کوٹھے پہ اکیلا کھڑا رہ گیا ہوں اور پتنگ..."

"نہیں بیٹا یہ خواب نہیں ہے۔ اماں جی نے اس کی بات کاٹ دی۔" دن بھر تو کوٹھوں چھتوں کو کودے ہے وہی سوتے میں بھی خیال رہوے ہے... ایسے خواب نہیں دیکھا کرتے۔"

("شہر افسوس" صفحہ ۷۴)

سید کی والدہ نے پورے خواب کو ایک آوارہ خیال سے تعبیر کر کے رفع دفع کر دیا۔ یہ خواب بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ دراصل وہ خوف زدہ تھیں اور حقیقت سے نظریں چار کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں کہ اگر اسے خواب سمجھ لیا جائے تو پھر اس کی تعبیر بے گھری اور آوارہ وطنی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

لیکن قسمت کے نوشتے کو نہ محسوس کیا جا سکتا ہے نہ اس کی تردید۔ آوارہ وطنی کہ مقدر تھی اپنے مقررہ وقت پر آ کر رہی۔ ہند تقسیم ہوا اور ہجرت اس کے ہم رکاب آئی۔ یہ تو تھا ہی، تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس نے مہاجرین سے ان کی یادوں کو بھی لوٹ لیا۔ وہ خواب سچا خواب تھا۔

پاکستان کی سرزمین پر اب سید ایک ایسا آدمی ہے، جس کے پاس ماضی ہے نہ خواب نہ یادیں اور چنانچہ اسی لئے نہ کوئی شخصیت۔ اب اس کی ساری کوشش اس بات میں صرف ہو گی کہ جس طرح بھی ہو جس قدر بھی ہو وہ اپنے ماضی کی بازیافت اور اس طرح اپنی شخصیت کی بازیافت بھی کرے۔

میرے خیال میں انتظار حسین نے یہ افسانہ اپنی تخلیقی زندگی کے شاید اولین دور میں لکھا تھا، اس وقت جب ابھی تخلیقی عمل کے ذریعے یادوں اور شخصیت کی بازیافت کی کامیابی پر انھیں اعتماد تھا۔ ان کی تازہ کہانیاں ایک اور ہی کہانی کہتی نظر آتی ہیں: شخصیت کا آخری اور قطعی زوال یاد کرنے کی صلاحیت کا فقدان انجام کار شخصیت کی موت ہے!

لیکن "سیڑھیاں" پر ہماری بحث ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

بشیر بھائی، اختر، اور رضی کی گفتگو کے صدقے سید کے شعور میں ایک روزن کھل گیا ہے اور اس روزن سے وہ اپنی پراگندہ مٹی کے ذرات کو ایک ایک کر کے چن سکتا ہے۔ ماضی از سر نو اس کی دسترس میں ہے اور یاد کرنے کے عمل نے خواب دیکھنے کی صلاحیت لوٹا دی ہے۔ کہانی کے اختتامی حصے میں اپنی ماضی کی بازیافت کے بعد سید خود کو بہت ہلکا محسوس کرتا ہے اور مطمئن بھی۔ شاید اب پھر وہ ایک مکمل آدمی بن گیا ہے:

سید نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں۔ رضی کی طرف دیکھتے ہوئے پراسرار لہجے میں بولا۔ "میرا دل دھڑک رہا ہے کوئی خواب دیکھے گا آج۔" اور اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔

("شہر افسوس" صفحہ ۷۳)۔

گو وہ عارضی طور پر اپنی حقیقت کی سوجھ بوجھ کھو بیٹھا ہے، سید میں پھر بھی ذات کا، خواہ کتنا ہی مبہم اور ضعیف کیوں نہ سہی احساس ضرور باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت شعوری طور پر یادوں کے سہارے اپنے ماضی کی بازیافت کی خواہش کرتا ہے۔ یہ خواہش آگے چل کر ایک اور کہانی "اپنی آگ کی طرف" کے بے نام لیکن مرکزی کردار میں باقاعدہ مقاومت اور مزاحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی اب خواہش کرنا بھی جو پہلے فطری سا عمل تھا ایک مرحلہ ہے، جس کی ایک قیمت ہے۔

"ب"... چلئے اس بے نام کے کردار کو اسی نام سے پکاریں،... کو یقین ہے کہ اپنی روایت سے کٹ کر نہ وجود سالم رہتا ہے نہ زندگی باقی۔ سامنے تھی

---

[۱] دیکھئے "شہر افسوس" صفحہ ۷۱۔
[۲] ایضاً صفحہ ۷۳۔

فنا ہو تب بھی اپنی روایت سے انحراف کی کوشش خود ذات کی مکمل شکست و ریخت پر ہی ختم ہوتی ہے۔

بچپن کے دو دوست جنھوں نے آگے بھی زندگی کا کچھ حصہ نہایت شدید لگاؤ کے ساتھ ایک بلند عمارت کے کمرے میں ساتھ ساتھ گذارا ہے، وقت کے ہاتھوں بچھڑ جاتے ہیں گو قیام دونوں کا اب بھی ایک ہی شہر میں ہے۔ ان کی ملاقات ایک بار پھر ہوتی ہے، بالکل اتفاقی طور پر اس وقت جب وہ عمارت جس میں "ب" مسلسل رہتا چلا آیا ہے ایک شدید آگ کی زد میں آجاتی ہے اور "ب" کا بچپن کا یہ دوست اس طرف نکل آتا ہے۔ وہ "ب" کو پہچان لیتا ہے اور آتش زدہ عمارت کو چھوڑ کر اس کے یہاں آ رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ "ب" کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا اور اپنے دوست کے پیہم اصرار کے جواب میں نہایت معمائی انداز میں کہتا ہے:

> شیخ علی ہجویری نے دیکھا کہ ایک بڑا پہاڑ ہے۔ پہاڑ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آگ کے اندر ایک چوہا ہے کہ سخت اذیت میں ہے اور اندھا دھند چکر کاٹ رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے وہ پہاڑ سے اور پہاڑ کی آگ سے باہر نکل آیا اور باہر نکلتے ہی مر گیا۔ وہ چپ ہوا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "میں مرنا نہیں چاہتا۔"
> ("شہر افسوس"، صفحہ ۲۰۳)

چوہے کی اس تمثیلی حکایت میں جانے کتنی عمیق روحانی حقیقتوں کے استعارے مجسم ہیں۔ "ب" کو یقین ہے کہ اپنی عمارت کے باہر وہ اور جو چاہے ہو لے مگر "ب" نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف عمارت خود اپنے میں ایک اچھی خاصی دنیا کی وسعت رنگ اور ابعاد کی حامل ہے۔ عمارت گویا پوری کائنات ہے: خود نگر و خود کفیل و خود آگاہ۔ یہی نہیں، وہ بہت سی صداقتوں کی قائم مقام بھی ہے، مثلاً ایک قوم، معاشرہ، روایت یا بلکہ یوں کہئے در اصل قبل از تقسیم مسلمانوں کی تہذیب اور ما بعد اس کی ہزیمت۔ مزید برآں یہ اپنے میں ایک عجیب سی پائداری بھی لئے ہوئے ہے۔ اور تبدیلی اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی:

> اس بلڈنگ میں رہنے والے اور لوگ بھی نئے نہیں تھے۔ منزل بہ منزل فلیٹ ہی فلیٹ تھے جن میں ہر قماش کا آدمی آباد تھا۔ کوئی مقامی مہاجر، کوئی کسی دفتر میں کلرک، کوئی کسی کالج میں استاد۔ کوئی صاحب اہل و عیال ہے کہ سال بہ سال بڑھتے ہوئے خاندان کے ساتھ چھوٹی سی چھت کے نیچے سر چھپائے بیٹھا ہے۔ کوئی چھڑا ہے کہ دن بھر مٹرگشت کرتا ہے اور رات گئے تالا کھول کمرے میں پڑ رہتا ہے۔ کسی کا پنشن پہ گذارا ہے، کسی نے چھوٹا موٹا کاروبار کر رکھا ہے۔ کسی نے یہیں اسی بلڈنگ کی دکان میں سے کوئی دکان لے رکھی ہے اور چنی بنی سجائے بیٹھا ہے۔ ان دکانوں کا بھی خوب رنگ تھا۔ بعض دکانیں تو واقعی چمکتی دکھتی تھیں، سجے ہوئے مال و اسباب کی اسکیم بدلتی رہتی تھی۔ لیکن ایسی دکانیں بھی تھیں جن میں جو کنستر جو ڈبہ جو بوری جہاں رکھی ہے وہاں بس رکھی ہے۔ جیسے ازل سے یہاں رکھی ہے اور ابد تک اسی طرح رکھی رہے گی، یا جیسے یہ دکان کا مال نہیں بلکہ اس عمارت کی پیوند ہے کہ لگ گئی سو لگ گئی اب اتر نہیں سکتی۔ مال و اسباب پر منحصر نہیں، یہاں کے بعض بوڑھے بھی اس عمارت کی پیوند ہی لگتے تھے۔
> ("شہر افسوس"، صفحہ ۱۹۲)۔

چنانچہ اگر عمارت کے اندر موت ہے تو بھی "ب" کو سوائے اپنے عنصر، اپنی آگ کی طرف رجعت کے کوئی چارہ نہیں کیوں کہ باہر ایک اور موت اس کی منتظر ہے ہزار درجہ بھیانک اور اذیت ناک۔

"ب" کی ایک اجنبی موت کے سامنے ہاتھ پاؤں ڈال دینے کے خلاف یہ جان توڑ مقاومت بدقسمتی سے انتظار حسین کی نئی کہانیوں میں بالکل گم ہو گئی ہے اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں۔ فن کار کی دوربین اور دور رس نگاہ آنے والے رویوں کی پہلے ہی سے پیش خبری دے دیتی ہے۔ اس مقاومت کے فقدان کو اور اس کے ہم رکاب آنے والی "پیر تسمہ پا" یاسیت کو قومی سطح پر دیکھئے تو کوئی خوش آئند اور حیات افروز صورت نہیں نظر آئے گی۔ جو نظر آئے گا وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کا نقشہ ہو گا جن بارے میں قرآن کہہ ہی چکا ہے:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ٭

(سورہ البقرہ آیہ ۱۷۱)

"شہر افسوس" اور "وہ جو کھوئے گئے" قرآن کے بیان کردہ لوگوں کے افسانے ہیں جو شخصیت کے زوال اور اس کی موت کا نہایت دل دوز منظر پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر "وہ جو کھوئے گئے" میں شخصیت سچ مچ اپنی اٹل اور ناگزیر موت کو پہنچ جاتی ہے اور ماضی کی تمام تر یاد ناقابل باز یافت طور پر محو ہو جاتی ہے ساتھ ہی ذات کا سارا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

چار بے نام آدمی ہیں۔ انھیں باقاعدہ ایک خاص رمزی منصوبے کے تحت ناموں سے معرا کر دیا گیا ہے تاکہ انفرادی ذات کی گم کردگی کے احساس کو دو چند کیا جا سکے۔ شناخت کے لئے انھیں ان اشیا سے، جو ان کے حلیوں میں ممتاز ہیں، پکارا جاتا ہے۔ مثلاً زخمی سر والا، باریش آدمی، تھیلے والا، اور نوجوان، اور یہ اس لئے کہ ان کے وجود کی موہومیت اور غیر حقیقی پن نہایت ڈرامائی انداز میں اجاگر ہو جائیں۔

ان کے بارے میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ اور معلوم نہیں کہ یہ کسی بہت ہی شدید تعذیب کی حدود سے بھاگ نکلنے میں بصد دقت کامیاب ہو گئے ہیں، وغیرہ۔ گویا بہ الفاظ دیگر ان کی مثال اسی چوہے جیسی ہے جو آتش زدہ پہاڑ بھاگ نکلا ہے۔ مگر یہ آ کہاں سے رہے ہیں؟ اور جانا انھیں کہاں ہے؟ ان تمام سوالوں کا کوئی معین اور بے کم و کاست جواب موجود نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو موجودہ صورت حال میں اس کی کوئی اہمیت باقی رہی ہے نہ حقیقت۔

جواب اگر ڈھونڈنا ہی شرط ٹھہری تو یہ یقیناً موجودہ غیر حقیقی فضا میں

ملنے سے رہا۔ اس کی بازیافت تو پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی پے بہ پے جلاوطنی کی داستانوں میں ہی ممکن ہے: اسپین میں غرناطہ سے، موجودہ اسرائیل میں بیت المقدس سے، ہندوستان میں کشمیر اور جہان آباد یعنی دلی سے... ان تمام جگہوں سے جہاں انھوں نے عظمت آدم اور اس کی وقار کی نہایت ٹھوس نہایت دل آویز دستاویزیں چھوڑی ہیں۔ "زخمی سر والا" کہتا ہے: "میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی اور کون سا موسم تھا اور کون سی بستی تھی"۔[۱۸]

چنانچہ یہ ان لوگوں کا قصہ ہے جن کا "حافظہ" گم ہو چکا ہے۔ اور حافظے کا گم ہونا بھی عذاب کی صورتوں میں سے ایک عذاب ہے اور وہ اکثر قوموں پر نازل ہوا ہے۔[۱۹]

موجودہ افسانے میں حافظے کے گم ہو جانے کا اور نتیجتاً شخصیت کی موت کا المیہ ایک ضمنی واردات کے ذریعے نہایت فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے: چاروں اس شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے ایک گم ہو گیا ہے۔ وہ ایک بار، دو بار، غرض کئی بار خود کو گنتے ہیں، پہلے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا سب ہی گننے کا عمل دہراتے ہیں اور گنتی کے دوران گننے والا خود اپنے کو ہی گننا بھول جاتا ہے۔ انھیں اب صرف اتنا یاد ہے کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ گم شدہ کون ہے؟ انھیں تو گم شدہ کا چہرہ تک یاد نہیں رہا نہ یہ کہ اس کا نام کیا ہے اور نہ یہ کہ وہ مرد ہے یا عورت؟ اس ساری حکایت کا مطلب ایک ہی ہے۔ چاروں میں سے کسی کو بھی اب اپنی ذات کی واضح آگاہی نہیں رہی۔

آگے چل کر زخمی سر والے کو اچانک خیال آتا ہے کہ گنتی لیتے وقت وہ شاید خود کو شمار کرنا بھول گیا تھا۔ وہ اپنے اس شک کا بقیوں سے ذکر کرتا ہے۔ باری باری ہر ایک کو اپنی بھی یہی غلطی معلوم ہوتی ہے اور ہر ایک یہی سوچتا ہے کہ گم شدہ آدمی فی الواقع وہی ہے۔

گم شدہ آدمی چنانچہ حقیقی آدمی کی قامت کو پہنچتا ہے اور گوشت پوست کا حقیقی مرئی آدمی شعور کے گم ہو جانے کے نتیجے میں گھٹ کر نسیاں کے دودھیا اندھیروں اور عدم کی بے رنگ اقلیم میں زائل ہو جاتا ہے۔ اس المیے کو انتظار حسین کی زبانی سنئے:

> تب سب چکر میں پڑ گئے اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ کون ہے جو کم ہو گیا ہے؟ اس آن زخمی سر والے کو پھر وہ وقت یاد آیا جب وہ کم ہو جانے والے آدمی کو ڈھونڈ کر پلٹ رہا تھا، وہ کہنے لگا "اس وقت مجھے لگا کہ وہ آدمی تو یہیں کہیں ہے، مگر میں نہیں ہوں۔"
>
> باریش آدمی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "عزیز، تو ہے۔"
>
> یہ سن کر زخمی سر والے نے ایک ایک ساتھی کو یوں دیکھا جیسے اسے باریش آدمی کے بیان پر اعتبار نہیں آیا ہے۔ ایک ایک ساتھی نے اسے یقین دلایا کہ وہ ہے، تب اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا، "چونکہ تم نے میری گواہی دی اس لئے میں ہوں۔ افسوس کہ میں اب دوسروں کی گواہی پر زندہ ہوں۔"
>
> اس پر باریش آدمی نے کہا "اے عزیز شکر کہ تیرے لئے تین گواہی دینے والے موجود ہیں۔ ان لوگوں کو یاد کر جو تھے مگر ان کا کوئی گواہ نہ بنا۔ سو وہ نہیں رہے۔" زخمی سر والا بولا، "سو اگر تم اپنی گواہی سے پھر جاؤ تو میں بھی نہیں رہوں گا۔" یہ کلام سن کر پھر سب چکرا گئے اور ہر ایک دل ہی دل میں یہ سوچ کر ڈرا کہ کہیں وہ تو وہ آدمی نہیں ہے جو کم ہو گیا ہے اور ہر ایک اس مخمصے میں پڑ گیا کہ اگر وہ کم ہو گیا ہے تو وہ ہے یا نہیں ہے۔ دلوں کا خوف آنکھوں میں آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اپنا اپنا شک بیان کیا۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بندھایا اور ایک دوسرے پر گواہ بنے۔ دوسرے سے گواہی لے کر اور دوسرے کی گواہی دے کر مطمئن ہو گئے۔ مگر نوجوان پھر شک میں پڑ گیا۔ "یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ چونکہ ہم ایک دوسرے پر گواہ ہیں اس لئے ہم ہیں۔"
>
> زخمی سر والا ہنسا۔ "رفیقوں نے پوچھا کہ اے یار تو کیوں ہنسا؟ اس نے کہا کہ، "میں یہ سوچ کر ہنسا کہ میں دوسروں پر تو گواہ بن سکتا ہوں مگر اپنا گواہ نہیں بن سکتا۔"
>
> اس کلام نے پھر سب کو چکرا دیا۔ ایک وسوسے نے ان سب کو گھیرا اور ان سب نے نئے سرے سے اپنے آپ کو گننا شروع کر دیا۔ اس بار ہر گننے والے نے گننے کا آغاز اپنے آپ سے کیا مگر جب گن چکا تو گڑبڑا گیا اور ساتھیوں سے پوچھا کہ "کیا میں نے اپنے آپ کو گنا تھا؟"
>
> ایک نے دوسرے کو دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو گڑبڑایا۔ آخر نوجوان نے سوال کیا کہ "ہم تھے کتنے؟"
>
> اس سوال نے دلوں میں راہ کی۔ ہر ایک ہر ایک سے پوچھا۔ "آخر تھے کتنے؟" باریش آدمی نے سب کی سنی۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "عزیزو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب ہم چلے تھے تو ہم میں کوئی کم نہیں تھا۔ پھر ہم کم ہوتے چلے گئے۔ اتنے کم ہوئے اتنے کم ہوئے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارا اپنی انگلیوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ہم نے ایک ایک کر کر سب کو گنا اور ایک کو کم پایا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی چوک کو یاد کیا اور اپنے آپ کو کم پایا۔"
>
> نوجوان نے ایک شک کے ساتھ کہا، "تو کیا ہم سب گم ہو

۱۸؎ دیکھیے "شہر افسوس"، صفحہ ۲۶۔

۱۹؎ ملاحظہ ہو "نیا اسم" (ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان گفتگو) مطبوعہ "نیا دور" نمبر ۷۸، صفحہ ۸۸۔

گئے ہیں؟"

بارلیش آدمی نے نوجوان کو غصے سے دیکھا جو سلجھی ہوئی ڈور کو پھر الجھائے دے رہا تھا۔ "کوئی کم نہیں ہوا ہے۔ ہم پورے ہیں۔"

نوجوان نے ان گڑھ پن سے پھر سوال کیا۔ "ہم کیسے جانیں کہ ہم پورے ہیں؟"

"کب کتنے تھے؟ بارلیش آدمی نے برہم ہو کر پوچھا۔

"جب ہم چلے تھے۔"

زخمی سر والے نوجوان نے گھور کر دیکھا۔ "ہم کب چلے تھے؟"

("شہر افسوس"، صفحہ ۲۲ تا ۲۴)

لیکن جہاں سید اور "ب" اپنی بازیافت میں کامیاب ہوتے ہیں، وہاں "وہ جو کھوئے گئے" کے چاروں آدمی نامراد رہتے ہیں کہ یہ حتمی اور واقعی طور پر کھو چکے ہیں۔ اپنی گذشتہ ذاتوں کی اب غیر مرئی پرچھائیوں سے زیادہ کچھ نہ ہوتے ہوئے یہ بے چارے اب ایک دوسرے کی شہادت پر زندہ ہیں۔ یہ المیہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اپنی آگ کی زد میں آئی ہوئی عمارت سے (شیخ علی ہجویری کی تمثیلی حکایت کے ہراساں چوہے کی طرح) امان کے لئے باہر بھاگتے ہیں اور یوں اپنے عنصر سے جدا ہو کر ایک مہیب تر اور تاریک تر آگ میں بے نام و نشان ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتے ہیں۔ روایت کے باہر کوئی زندگی نہیں۔

چنانچہ جہاں "سیڑھیاں" اور اپنی "آگ کی طرف" یادداشت کے گم ہو جانے اور اس کی بازیافت کی خواہش کا نقشہ پیش کرتے ہیں، وہاں آخری دور کے افسانے مثلاً "وہ جو کھوئے گئے"، "شہر افسوس" وغیرہ، حافظے کے زوال اور اس کی اٹل فنا کو پیش منظر میں لاتے ہیں۔ ان دونوں ادوار کے عین مابین ایک عجیب لیکن ضروری وقفہ بھی آتا ہے۔ اس وقفے میں لکھی گئی کہانیاں مثلاً "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "کایا کلپ" وغیرہ آدمی کی شخصیت کے اخلاقی انحطاط کا منظر پیش کرتی ہیں اور اس طرح ذات کے قعر گم نامی کی طرف رواں ناٹک کی وسطی اور بڑی ضروری کڑی بن جاتی ہیں۔ یہ ناٹک کیا ہے؟

یادداشت کے شعوری عمل کے ذریعے ماضی کی بازیافت کی کوشش میں ناکامی، اور زوال، اور آخرا خود تخلیقی شخصیت کی موت! ☆☆☆

سفر ستارہ

کے بعد

پرکاش فکری

کا نیا مجموعۂ کلام

ایک ذرا سی بارش

خوبصورت سرورق، مجلد، قیمت : ۲۵۰ روپے

پرکاش فکری کی غزل کو آج وہ اعتبار حاصل ہے جس کا خواب اکثر شاعر دیکھتے ہیں لیکن جو بہت کم شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جدید غزل کا ذکر ہو اور پرکاش فکری کو نمایاں طور پر مذکور نہ کیا جائے۔ پرکاش فکری نے زبان کی سلاست، سادگی، نمائش سے اجتناب اور فارسیت کی چمک دمک سے پرہیز کو فن کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ ان کی غزل میں نئے انسان کی محزونی اور محرومی ہے اور اس انسان کی آرزوئیں ہیں جو قرطاس زمانہ پر اپنے نقوش ثبت کرنا چاہتا ہے لیکن جسے ہر طرف سے معاندانہ اور تشدد پسند قوتوں کا سامنا ہے۔ پرکاش فکری کی محزونی کسی کمزور دل دماغ والے اجنبی کی محزونی نہیں ہے۔ وہ یے ٹس کی طرح موت اور حیات پر سرد نگاہ (cold eye) نہیں ڈالتے، وہ کاروبار زمانہ کو (جس میں کاربار محبت بھی شامل ہے) متفکر آنکھ کی دور رس نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر سمت میں انسان کی نارسائی پر نوحہ کناں ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

سے حاصل کریں

سسی فس(۱)

محمود ایاز

شمارہ ۱۲،
مئی ۱۹۶۷

دھند میں لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے
تتلیاں، خواب، انوکھے بادل
کوہساروں سے اترتے ہیں، قریب آتے ہیں کھو جاتے ہیں۔
موت اور زیست کا دکھ دیکھنے والی آنکھیں
اپنی قبروں میں بڑے چین سے سو جاتی ہیں
ایک یخ بستہ خموشی ہے جہاں تک جاؤ
دور تک اپنے ہی قدموں کی صدا آتی ہے
دور تک سلسلہ در سلسلہ زنجیریں ہیں
دل کی تنہائی کہاں جاتی ہے؟

دھند میں لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے
دور وادی سے ابھرتا ہوا کہرے کا دھواں،
منجمد خواب کی تصویر میں ڈھل جاتا ہے
آنکھ سے خاک پہ گر جاتا ہے اک قطرۂ اشک
وقت لمحوں کے تسلسل میں بکھر جاتا ہے
دل کی تنہائی سے نکلو تو کہاں جاؤ گے
ہر طرف ایک گرجتا ہوا سناٹا ہے
(کرب کی رات سے ڈر آتا ہے)
کرب کی رات اٹل ہے،

تب تک
ناشتہ، دفتری اوقات، تھیٹر، گھربار،
کی ترتیب کے زنداں میں رہو
دن کے ہنگامے سے نکلو تو کسی بار کا گوشہ ڈھونڈو
نیند سے چونک کے اٹھو تو اندھیرے سے ڈرو۔
کرب کی رات اٹل ہے،
تب تک
دائرہ وار سفر کرتے رہو۔

دھند سے لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے
آنکھ اٹھاؤ تو نظر کے آگے
برف کی آگ میں جلتے ہیں کئی آئینے
دور تک سلسلہ در سلسلہ زنجیریں ہیں
قطرۂ اشک میں سو رنگ کی تصویریں ہیں
کون سا عیشِ فراواں ڈھونڈوں؟
کون سی سلطنتِ غم مانگوں؟
کون سے سکھ کی تمنا کروں، کس دکھ کا مداوا چاہوں؟
کرب کی رات اٹل ہے،
لیکن،
نیند آ جائے تو دم بھر سو لوں

(1) Sysiphus

مخمور سعیدی

شمارہ ۴۴،
جنوری ۱۹۷۰

حال کا مرحلہ:

کئی وجود ابھی تک عدم کی ظلمت میں
بھٹک رہے ہیں، کسی لفظ کی تلاش میں ہیں
وہ ایک لفظ درخشاں، کہ ان کا اسم بنے
کہ جس کے روپ میں یہ خود کو منجلی کر دیں
کئی حسین تصور، کئی جواں جذبے
ہیں بے بدن، انھیں اظہار کا بدن نہ ملا
مہک ہے، رنگ کے ملبوس کی گرفت سے دور
جمال معنی کو صورت کا پیرہن نہ ملا
مرا وجود بھی مبہم سا اک تصور تھا
میں کر چکا مگر الفاظ میں عیاں خود کو
یہ واقعہ مری موجودگی کا ضامن ہے
کہ دیکھتا ہوں گرفتار جسم و جاں خود کو

کوچ:

بیتی صدیاں، گذرے موسم
مرے اندر شور مچاتے ہیں
جب تک میں اسیر ذات نہ تھا
وہ دن مجھے اب یاد آتے ہیں
بس ایک وجود مطلق سے
منسوب، مرا افسانہ تھا
اور نام سے میرے دنیا نے
اب تک نہ مجھے پہچانا تھا
مستور تھے جو معنی مجھ میں
ظاہر نہ ہوئے تھے صورت میں
تقسیم نہ تھا کردار مرا
نفرت میں اور محبت میں
میری بے پایاں ہستی کی
حد کوئی نہ تھی، میں بے حد تھا
اب تک نہ کسی آئینے میں
عکس روئے نیک و بد تھا
بے سمت و جہت پہنائی میں
لہراتی تھی میری پرچھائیں
ابھری تھی افق پر ہستی کے
غم کی نہ خوشی کی پرچھائیں
یہ دانش و حکمت جہل و جنوں
دنیا میں کہیں موجود نہ تھے
بے نام خلا کے سینے میں
کچھ عزم تھے، جو محدود نہ تھے

تخلیق کے روشن خوابوں کی
دھندلی دھندلی تعبیریں تھیں
رنگوں کی وضاحت سے عاری
سادہ سادہ تصویریں تھیں
افلاک نشیں ہنگاموں نے
رشتہ نہ زمیں سے جوڑا تھا
وحدت نے ابھی کثرت کی طرف
رخ اپنا نہ شاید موڑا تھا

پستی نہ بلندی تھی کوئی
بندے، نہ کوئی بندوں کا خدا
تھی ایک ہی ہستی دونوں کی
خالق سے نہ تھی مخلوق جدا
مفہوم بہت کچھ تھا لیکن
افہام نہ تھا، تفہیم نہ تھی
تخئیل کی دولت لفظوں میں
نقطہ نقطہ تقسیم نہ تھی
میں کون ہوں، کیا ہوں، کیسا ہوں
یہ جاننے والا کوئی نہ تھا
آثار درخشاں کو میرے
پہچاننے والا کوئی نہ تھا

بس ایک تعقل، بے قالب
بس ایک تفکر، بے پایاں
سینے میں وجود مطلق کے
بس ایک ارادہ، رقص کناں
بس ایک ارادہ، اک خواہش
خواہش کہ: میں ظاہر ہو جاؤں
کچھ کہہ کے پکارے کوئی مجھے
اک اسم بنوں، کچھ کہلاؤں
اظہار کی خواہش نے مجھ کو
محدود صفات وذات کیا
جذبات کی بیڑی پہنائی
پابستۂ احساسات کیا
میں عرش نشیمن تھا لیکن
خود فرش زمیں پر آن گرا
افتاد بہت ہی سخت تھی یہ
ہو کر بے حد ہلکان گرا
مٹی، پانی، آگ اور ہوا

دراصل جو میرے چاکر تھے
دیکھا جو مجھے کمزور تو، یہ
تیور کیا کیا دکھلانے لگے
میری بے دست و پائی پر
رہ رہ کے نہ کس نے وار کیا
افلاک نے توڑے لاکھ ستم
دھرتی نے خراب وخوار کیا!
فطرت کی ستم گر آنکھوں میں
کچھ اور نہ تھا نفرت کے سوا
اور میرے لئے کوئی کام نہیں
جینے کی کڑی محنت کے سوا
افسانۂ روز وشب میرا
روداد شکست پیہم تھا
میں ٹوٹ چکا تھا سب سے مگر
خود سے مرا رشتہ محکم تھا
یہ ارض وسما، یہ زماں مکاں
پھر تا کہ مجھے پہچان سکیں
بھولیں نہ میری شخصیت کو
میں کون ہوں، کیا ہوں، جان سکیں

قدم بہ قدم
زمیں پہ رینگ کے چلتا تھا جب میں پیٹ کے بل
مری نگاہ بہت دور تک نہ جاتی تھی
قریب سے اسے سننے کو دل مچلتا تھا
وہ اک صدا، جو کہیں دور سے بلاتی تھی
اسی صدا نے مجھے اتنا حوصلہ بخشا
کہ ہو سکوں میں کھڑا آپ اپنے قدموں پر
قدم بڑھے تو حدود نظر وسیع ہوئیں
نظر کے سامنے آئے، نئے نئے منظر
سفر کٹھن تھا، نہ منزل نہ راستہ کوئی

بس اک لگن تھی کہ بڑھتے گئے قدم میرے
نگاہ ٹھوکریں کھاتی، کہاں کہاں نہ گئی
کہاں کہاں نہ بھٹکتے رہے قدم میرے
رہ سفر میں جو بے رنگ مرحلے آئے
تو میں نے رنگ بھرے خواب دیکھنا سیکھا
نظر، زمین کے ظلمت کدے سے اکتائی
تو سوئے انجم و مہتاب دیکھنا سیکھا
یہ میرے خواب ہی صدیوں کی اس مسافت میں
رہے ہیں سایہ صفت، میرے ہم سفر تنہا
یہ خواب ساتھ نہ ہوتے تو کب یہ ممکن تھا
کہ طے کروں میں ستاروں کی رہ گذر تنہا
فراز ماہ پہ نقش قدم ہیں اب میرے

اگرچہ مجھ کو ابھی اور آگے جانا ہے
خود اپنے ذوق طلب کا ہے امتحاں درپیش
خود اپنے شوق تجسس کو آزمانا ہے
ازل سے تا بہ ابد ایسے ان گنت عالم
جو بے کراں ہیں، کہیں جن کا اور چھور نہیں
خلا سے تا بہ خلا ایسی لاکھ دنیائیں
کہ جو حدود تعین میں اب تک آ نہ سکیں
زماں مکاں کی یہ وسعت، یہ بے کراں وسعت
قدم قدم پہ مرا حوصلہ بڑھاتی ہے
نہ آخری کوئی منزل، نہ راستے مسدود
کھلی فضا ہے، جہاں تک نگاہ جاتی ہے
کبھی کبھی مگر ایسا گماں گزرتا ہے
کوئی خلش ہے کہ جو دل کو ڈستی رہتی ہے
وہ اک صدا جو کبھی دور سے بلاتی تھی
قریب آ کے وہ اب جیسے مجھ سے کہتی ہے:
عبث ہے دیدہ و دل کی یہ ہرزہ جولانی
یہ ذوق جہد، یہ شوق نظارہ کچھ بھی نہیں
تمھاری ذات کہ اب تک تمھارا زنداں ہے
تمھاری ذات سے باہر، تمھارا کچھ بھی نہیں

منزل بہ منزل:

جو ذات مری پہچان بنی
وہ ذات مری زنجیر بھی تھی
تدبیر جو میں نے خود کی تھی
گویا وہ مری تقدیر بھی تھی
جو جال بنا تھا خود میں نے
اس جال میں خود میں لپٹ گیا
کچھ ایسی صفات نے آگھیرا
میں ذات میں اپنی سمٹ گیا
اک کل کہ جو ثابت و سالم تھا
تقسیم کئی اجزا میں ہوا
دریا میں بہا قطرہ قطرہ
ذرہ ذرہ صحرا میں ہوا
یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے
روداد اسی تفریق کی ہیں
حاصل ہیں انھیں جو حیثیتیں
سب دین مری تخلیق کی ہیں
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ کانٹے
سب رنگ مری تصویروں کے
یہ دشت، یہ دریا، یہ ساحل
سب لفظ مری تحریروں کے
ہر پست و بلند اک آئینہ
میری ہی صفات و ذات کا ہے
کہتے ہیں جسے نور و ظلمت
وہ عکس، مرے دن رات کا ہے
میری ہی بدولت وقت کو یہ
پیراہن صبح و شام ملا

ہر عکس نے پائی شکل اپنی
ہر نقش کو اس کا نام ملا
اک اک لمحہ، اک کیفیت
ہر کیفیت اک عالم ہے
میرے ہی احساس کی رو
صورت گر ہر عیش و غم ہے
ہر آن میں بنجر دھرتی پر
اک فصل نئی بو دیتا ہوں
موسم کا رنگ بدلنے کو
ہنستا ہوں، کبھی رو دیتا ہوں
ہر مرحلۂ تبدیلی کو
میں نے ہی پکارا ہوتا ہے
ہر تازہ تغیر کے پیچھے
میرا ہی اشارہ ہوتا ہے
چلتا ہے زمانہ ساتھ مرے
جس طور میں چلتا رہتا ہوں
میں قافلۂ روز و شب کی
رفتار بدلتا رہتا ہوں
تاریخ: مری روداد سفر
ادوار: مرے نقش کف پا
ہر نقش کف پا، عکس لئے
عہد آئندہ و رفتہ کا
کعبہ مرا سنگ میل اگر
قدموں کے نشاں بت خانے بھی
ہیں پاؤں تلے کی دھول مری
یہ شہر بھی، یہ ویرانے بھی
آیات جو اتری ہیں مجھ پر
صورت گر نقش ہستی ہیں
باہر بھی، وہی سب تصویریں
جو میرے اندر بستی ہیں

میں نے جسے کوئی نام دیا
تھی نیست تو وہ شے ہست ہوئی
آیا اسے ناز خود بینی
نشے میں انا کے مست ہوئی
یہ نشہ و ناز خود بینی
ہر شے کی نجی پہچان بنا
ساحل ساحل، منہ زور ہوا
دریا دریا، طوفان بنا

مراجعت:
سرمستی ذات کی یہ لہریں
میں بھی اسی رو میں بہ گیا ہوں
ہر چند کہ بے کراں ہوں، پھر بھی
ذرہ سا سمٹ کے رہ گیا ہوں
باہر کی کھلی فضا، سلامت
اندر مرے کس قدر گھٹن ہے!
قیدی ہے کہ میری روح خستہ
زنداں ہے کہ یہ مرا بدن ہے
آپ اپنا اسیر ہوں، میں خود کو
اس قید سے کس طرح چھڑاؤں
توڑوں یہ طلسم ظلمت جاں
زندان بدن سے باہر آؤں!
آخر میرے یہ دیدہ و دل
بیگانۂ رنگ و نور، کب تک؟
جگ مگ جگ مگ یہ سب نظارے
میرے ہیں تو مجھ سے دور کب تک؟

اترا تھا کبھی سمندروں میں
اب تاروں پہ پاؤں دھر رہا ہوں
اپنے سے نجات کی کوئی راہ
شاید میں تلاش کر رہا ہوں

مدحت الاختر

شمارہ ۱۷۰،
اگست ستمبر ۱۹۹۳

ملال کرتے رہے عرض حال کرتے رہے
کبھی جواب نہ پایا سوال کرتے رہے

نتیجہ سود و زیاں میں کبھی نہیں نکلا
فقط حساب فراق و وصال کرتے رہے

فصیل شہر مقفل بھی تھی بلند بھی تھی
نواح شہر کو ہم پائمال کرتے رہے

نیا ہے سال تو کیا بات کچھ نئی ہوگی
وہی کریں گے جو ہم پچھلے سال کرتے رہے

کھلا ہے اب کہ تمھارے بغیر کچھ بھی نہ تھے
ہم اپنے آپ کو کیا کیا خیال کرتے رہے

کسی سے کچھ نہ کہا دیکھتے رہے سب کچھ
چلو یہ کام تو ہم بے مثال کرتے رہے

نہ آنے والا تھا کوئی نہ جانے والا تھا
ہم اپنے گھر کی فقط دیکھ بھال کرتے رہے

اڑائی اپنی ہنسی اپنے حال پر روئے
تمام عمر ہی مدحت کمال کرتے رہے

شمارہ ۲۲۴،
فروری ۱۹۹۹

پہلے بھی یقیں اس کی محبت کا نہیں تھا
وہ وقت مگر شکوہ شکایت کا نہیں تھا

ہم خود ہی رہے جذبۂ وحشت کے نگہباں
احسان کسی صاحب عصمت کا نہیں تھا

کیوں ٹوٹ کے یوں غیر کی آغوش میں گرتا
اے دل وہ ستارہ تری قسمت کا نہیں تھا

تھا ایک طرف عشق ہوس ایک طرف تھی
یعنی کوئی امکان رقابت کا نہیں تھا

حاصل تھی ترے لمس دلآویز کی دولت
وہ مال مگر میری ضرورت کا نہیں تھا

آزردہ کیا مجھ کو تری دربدری نے
میں کشتۂ غم ترک رفاقت کا نہیں تھا

مدحت الاختر

شمارہ ۲۶۰
ستمبر ۲۰۰۲

جو کل نہ تھا وہ آج ہے اے ہم شبیہ من
اب اس کا کیا علاج ہے اے ہم شبیہ من
آنکھوں میں اشک لب پہ ہنسی تس پہ بے حسی
یہ کیسا امتزاج ہے اے ہم شبیہ من
ہنس کے ملو ہر ایک سے جس حال میں ملو
اس شہر کا رواج ہے اے ہم شبیہ من
دیکھا ہے کوئی خواب عزیزان شہر نے
کے سال کا اناج ہے اے ہم شبیہ من
سب لوگ مطمئن ہیں کوئی بے کلی نہیں
یہ کون سا سماج ہے اے ہم شبیہ من
میں نے کہا نہ تھا کہ یہاں قدر دل نہیں
کیوں اس پہ بد مزاج ہے اے ہم شبیہ من

کیوں اس قدر اداس ہے اے ہم شبیہ من
سب کچھ تو تیرے پاس ہے اے ہم شبیہ من
تو کیوں یہاں کھڑا ہے بجوکا بنا ہوا
فصلوں کو کیا ہراس ہے اے ہم شبیہ من
کیا کوئی تیرے واسطے رہتا ہے بے قرار
تجھ کو کسی کی آس ہے اے ہم شبیہ من
ہے تجھ میں کوئی بات تو مانی بھی جائے گی
دنیا ہنر شناس ہے اے ہم شبیہ من
سچائی کے دریدہ بدن پر پڑا ہوا
ہر حرف اک لباس ہے اے ہم شبیہ من
یوسف بنا ہے مصر کے بازار میں عبث
کس گھونسلے میں ماس ہے اے ہم شبیہ من
کیوں لوگ تجھ کو اپنا مسیحا بنائیں گے
کیا تجھ میں ایسا خاص ہے اے ہم شبیہ من
کیا وقت آپڑا ہے کہ کچھ سوجھتا نہیں
ہر خواب بدحواس ہے اے ہم شبیہ من
مانو تو اعتبار ہر اک چیز کا کرو
سوچو تو سب قیاس ہے اے ہم شبیہ من
تیرا وجود پھیلی ہوئی داستان ہے
غم جس کا اقتباس ہے اے ہم شبیہ من

کیوں اتنا بے قرار ہے اے ہم شبیہ من
کس کا یہ انتظار ہے اے ہم شبیہ من
شاید کوئی سوار نکل آئے بے نقاب
یہ خواب یا غبار ہے اے ہم شبیہ من
دشوار ہے خروج طلسم خیال سے
یہ ذات کا حصار ہے اے ہم شبیہ من
میں تیرے ساتھ ہوں کہ زمانہ ہے تیرے ساتھ
سچ کہہ تو کس کا یار ہے اے ہم شبیہ من
یہ کیا کہ اپنے آپ سے لڑتے رہیں سدا
اس بار آر پار ہے اے ہم شبیہ من
تو چاہتا ہے روح کو تسکیں ملے مگر
یہ جسم سے فرار ہے اے ہم شبیہ من
جس میں نہ سود ہے نہ زیاں عشق ہے وہ شے
کیا تیرا کاروبار ہے اے ہم شبیہ من
جب ایک ایک کر کے سبھی ہو گئے الگ
تو کیوں گلے کا ہار ہے اے ہم شبیہ من

مدحت الاختر

شمارہ ۲۵۷،

جون، ۲۰۰۲

(نذرِ میر)

خاکساری کیجیے یا شہر یاری کیجیے
ہم غریبوں میں کچھ اپنا فیض جاری کیجیے

جن سے کچھ حاصل نہیں تعبیر خواہی کے سوا
ایسے خوابوں میں بسر کیوں رات ساری کیجیے

جو ہمارا حال ہے اس سے الگ ان کا نہیں
ساکنانِ شہر سے کیا پردہ داری کیجیے

آپ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں معلوم ہے
پیار کر سکتے نہیں باتیں تو پیاری کیجیے

آئیں بھی، تشریف لے آئیں، یہی دستور ہے
بیٹھ کر میرے سرہانے غم گساری کیجیے

چوم کر ہم چھوڑ دیں گے یہ گماں سچا نہیں
آپ اپنی چاہ کا پتھر نہ بھاری کیجیے

ہم یوں ہی مرجائیں کافی ہے اشارہ آپ کا
آنکھ کو خنجر نہ ابرو کو کٹاری کیجیے

کشتگانِ خنجرِ تسلیم کہلاتے ہیں کیوں
کچھ تڑپ دکھلائیے کچھ بے قراری کیجیے

ہم برے ہیں یا بھلے محسوس خود کو بھی نہ ہو
تھوڑی اپنے آپ سے بھی ہوشیاری کیجیے

سرکشانِ عشق پھر آمادۂ فریاد ہیں
پھر کوئی فرمانِ قتلِ عام جاری کیجیے

شمارہ ۲۷۷

فروری ۲۰۰۴

ہنس رہے ہو دل کے جانے پر تو رونا چاہیے تھا
یار اتنا بھی تمھیں پاگل نہ ہونا چاہیے تھا

زہر اور امرت تو اب شیر و شکر بھی ہو چکے ہیں
اس سمندر کو بہت پہلے بلونا چاہیے تھا

جسم تیرے لمس کے پتھر تلے شل ہو چکا ہے
روح کو ہی اتنا بھاری بوجھ ڈھونا چاہیے تھا

زندگی بھر کی جدائی دولت دنیا کمائی
آپ مل جاتے مجھے چاندی نہ سونا چاہیے تھا

کون مانے گا کہ تم دشت جنوں طے کر چکے ہو
اپنے تلووں میں کوئی کانٹا چبھونا چاہیے تھا

اپنے رونے کی حکایت تم نے کیوں پتھر پہ لکھی
میر صاحب کی طرح کاغذ بھگونا چاہیے تھا

زندگی بھر کا لگا بیٹھے ہو تم تو روگ مدحت
اپنی محرومی پہ کچھ ہی دیر رونا چاہیے تھا

شمارہ ۲۹۲،

مئی ۲۰۰۵

شاید مری فریاد سنائی نہیں دیتی
قدرت جو مجھے حکم رہائی نہیں دیتی

تھا پہلے بہت شور نہاں خانۂ دل میں
اب تو کوئی سسکی بھی سنائی نہیں دیتی

خوابوں کی تجارت میں یہی ایک کمی ہے
چلتی ہے دکاں خوب کمائی نہیں دیتی

ہر تار نفس ہے متحرک متواتر
رخصت ہی مجھے نغمہ سرائی نہیں دیتی

کیا دھند ہے اشکوں کی مسلط دل و جاں پر
دیکھی ہوئی دنیا بھی دکھائی نہیں دیتی

چلنے کو تو سب یار کمر بستہ کھڑے ہیں
جس راہ پہ چلنا ہے بجھائی نہیں دیتی

کانٹوں پہ چلاتی ہے کوئی اور ہی لذت
وحشت کا صلہ آبلہ پائی نہیں دیتی

میں قید محالات سے دم بھر میں نکل جاؤں
حاصل کی ہوس مجھ کو رہائی نہیں دیتی

میں اپنی ہی مٹی سے بنا لیتا ہوں مدحت
وہ چیز جو اوروں کی خدائی نہیں دیتی

مرتضیٰ خاں

شمارہ ۲۷۶
جنوری ۲۰۰۴

اپنی زندگی کے سفر پر چلتے چلے
کئی دنیاؤں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں
کرۂ ارض پر بسی چھوٹی چھوٹی دنیائیں
ان کی چھوٹی چھوٹی زندگیاں... کہانیاں
ان کی امیدیں، ان کا تذبذب، ان کا انجام

میرا ماضی اک ٹوٹا تارا ہے
جو مجھ سے جڑا گرتا پڑتا یہاں تک چلا آیا ہے
جس کی خاک یہاں تک آ کے بکھر نہ پائی
جس نے مجھے اپنے وجود کا احساس دلایا... مجھے میرے ماضی سے
جوڑے رکھا
میں وہاں سے اس جگہ لایا گیا ہوں (بغیا سے اکھاڑے ہوئے
پودوں کی طرح)
اور کسی نے سچ کہا ہے کہ
کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں
اے لو! گرتے پڑتے... اک دوسرے سے ٹکراتے
کچھ کھلونے ٹوٹے اور کچھ باقی بچے
اور یہ بھی سچ ہے کہ
کھلونوں سے کھیلنے کی قوت ماند پڑ گئی اور
کچھ گیان اور دھیان بھٹک گیا
اور کیا سچ ہے کہ
عمر کا تقاضا ہے... بھٹکے ہاتھوں کی جنبش سے اور
کچھ آنکھوں کی نیم بینائی سے، کچھ لاپروائی سے
کھلونے ٹوٹتے رہے... عمر بیتتی گئی
لے دے کے اب تنہا شکستہ زندگی کا کھلونا باقی بچا ہے
جو روح کی تنہا شاخ پر کھڑے کھڑے اپنا رنگ روپ کھو چکا ہے

خزاں کا موسم ہے
کھلی کھڑکی سے سرد ہوا کا جھونکا کچھ کہنے آیا ہے
کیا یہ سچ ہے کہ سارے موسم بیت گئے اور یہ میرا آخری موسم ہے
تنہا زندگی کا یہ چٹخا ہوا کھلونا، تڑے مڑے زرد پتے کی طرح
پل دو پل میں توانائی سے جھک کر
روح کی شاخ سے گر پڑے گا
اور دھرتی پر گرے پتوں کے ڈھیر سے آ ملے گا
ہاں یہ سچ ہے
پتوں کے ڈھیر کو چاہے جلاؤ
چاہے دفناؤ
خاک کو خاک سے مل جانا ہے

کندیاں لائن

مرزا حامد بیگ

شمارہ ۲۳۹،
اکتوبر ۲۰۰۱

نارتھ ویسٹرن ریلوے کی جانب سے یہ ایک برانچ لائن بچھانے کا منصوبہ تھا۔

جب ریل کی پٹڑی اٹک چھاؤنی سے داؤد خیل تک بچھادی گئی تو کندیاں سے آئے ہوئے ڈاک بابو نے بتایا کہ کوئی دن جاتا ہے جب ادھر سے آئے گی سرکاری اہلکاروں سے بھری ایک سروے گاڑی، ناپ تول کرتے ہوئے۔ زمین میں قطار اندر قطار پتھر گاڑ جائیں گے چونے سے پوت کر، اور انھی پتھروں سے ہو کر گذرے گی ریل کی پٹڑی، ناک کی سیدھ میں۔

ایک بولا: "بے شک راہ میں ندی نالے، پہاڑ دریا، جو آتا ہے آئے؟"

"تو اور کیا؟ اس نے جواب دیا۔

"اور آبادی؟"

بے شک راہ میں آبادی بھی آتی ہے تو آئے، پر پٹڑی گذرے گی ناک کی سیدھ میں۔ راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ گرادی جائے گی۔ آبادی دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ آدمی ادھر، آدمی ادھر۔ کھیت کھلیان سب..."

"کھیت کھلیانوں کی تو خیر ہے بابو۔ پر آبادی؟"

"سرکاری کام ہیں میاں جی۔ کس کی مجال ہے کہ سرتابی کرے؟"

"ہاں، سچ کہا۔ سرکاری کام تو سرکاری ہی ہوتے ہیں۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ریل کی پٹڑی قریب سے ہو کر نکل جائے اور ہماری آبادی بچ جائے؟"

"کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے۔"

"پھر اللہ مالک ہے۔"

بہت دن گذر گئے۔ اس بے نام بستی کی طرف نہ کوئی آیا نہ گیا۔ بس سنتے تھے کہ کام تیزی سے جاری ہے۔

جب کندیاں جنکشن سے پٹڑی آگے نکل آنے کی اطلاع ملی تو ایک بولا:

"اب تو پٹڑی آگے نکل آئی۔ ہماری آبادی کا کیا بنے گا؟"

"ارے کوئی بات نہیں۔" دوسرے نے جواب دیا ہمارے کون سے پکے مکان ہیں، کچے ہی تو ہیں۔ سرکار ہمارے گھروں پر سے پٹڑی گذارے گی تو کچھ دے دلا کر ہی۔ اتنا انصاف تو کرے گی نہ۔"

"اگر کچھ نہ دیا تو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اللہ جانے۔"

پھر سننے میں آیا کہ پیچھے کام رک گیا۔ جانے کب آئے سروے گاڑی۔ جانے آئے کہ نہ آئے۔ پر جیسے جیسے دن گذر رہے تھے، سب کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اب آ کیوں نہیں چکتے؟ آئیں بھی۔ جو ہونا ہے ایک بار

ہی ہو جائے۔

اور وہ ہوا، جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ایک روز دن چڑھے پہنچ ہی گئی سرکاری اہلکاروں سے بھری جیپ گاڑی۔ لیکن اس بے نام آبادی سے کوس بھر کے فاصلے پر ٹھہرے رہے تمام اہلکار، ناپ تول کرتے ہوئے۔ مقامی آبادی فاصلے پر کھڑی انھیں کام کرتے دیکھتی رہی۔

وہ سب کے سب جیسے بہت جلدی میں تھے۔ جیپ گاڑی کبھی کندیاں کی جانب پیچھے پلٹ جاتی اور کبھی کوٹ ادو کی طرف آگے جاتی۔ سائٹ سروے کا کام مکمل ہوا تو ریلوے اہلکار چونے سے پتے پتھروں کو قطار اندر قطار زمین میں گاڑتے ہوئے خبردار کرتے گئے کہ ان پتھروں کو چھونا یا اکھاڑنا ناقابل ضمانت جرم ہے۔ اعلان ختم ہوا تو جیپ گاڑی جدھر سے آئی تھی ادھر پلٹ گئی۔ آبادی صاف بچ گئی تھی۔

یہ تو سبھی جانتے تھے کہ انھی قطار اندر قطار گڑے پتھروں پر سے ہو کر گذرے گی ریل کی پٹڑی۔ ناک کی سیدھ میں۔

ایک بولا: "شکر ہے پٹڑی ہماری آبادی میں سے ہو کر نہیں گذری۔"

دوسرے نے ترنت جواب دیا: "آبادی میں سے ہو کر گذرتی تو چار پیسے مل جاتے مورکھ۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"خیر، اللہ مالک ہے۔"

سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ آئے۔

جب تک ریل کی پٹڑی کا کام کندیاں کی حدود میں ہوتا رہا، ان میں سے کئی ایک نے بارہا سوچا، کیوں نہ ان چونے سے پتے پتھروں کا رخ آبادی کی جانب موڑ دیا جائے، عین اپنے گھر کے رخ پر۔

پٹڑی روز بروز آگے بڑھتی چلی آتی تھی۔ پھر جب ان کی حدود میں داخل ہوئی ہے تو یک لخت چہل پہل ہو گئی۔ چونے سے پتے پتھروں کے ساتھ ریلوے اہلکاروں کے قطار اندر قطار خیمے تن گئے۔ بستی کے بہت سے نوجوانوں کو روزگار میسر آیا اور ان کے جانور باربرداری کے کام آئے۔

اب اس بے نام آبادی کے مکینوں کے لیے یہ خیال ازحد خوش کن تھا کہ کوئی دن جاتا ہے جب یہاں بھی ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہوگا، ایک چھوٹا سا ہالٹ، تب شاید یہاں بھی گاڑی کچھ دیر کو رک جایا کرے۔

جوں جوں پٹڑی بچھتی گئی اور ریلوے اہلکاروں کے خیمے اس کے ساتھ آگے کو سرکے، قرب و جوار کے بہت سے گھرانے اٹھ اٹھ کر ادھر آنے لگے۔ یوں آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

نئے آبادکاروں کا رخ پٹڑی کی جانب تھا۔ ریلوے اہلکاروں کے آگے کو سرکتے ہوئے خیموں کی جگہ مہاجرین نے اپنے گھر اسار لیے، محض یہ سوچتے ہوئے کہ اسٹیشن بنے گا تو اپنے گھروں کو دکانوں میں بدل دیں گے۔ کاروبار چل نکلے گا۔ غرضیکہ کئی سہانے خواب تھے جو سب نے مل کر دیکھے اور یوں کندیاں اور کوٹ ادو کے درمیان پٹڑی کے ساتھ ایک اور بے نام نئی بستی آباد ہوتی چلی گئی۔

سی سے آب گم تک ریلوے ٹریک مکمل ہو گیا تو ریل گاڑی بھی چل نکلی۔ اٹک چھاؤنی سے آنے والی پہلی گاڑی کے اس آبادی سے گذرنے کا وقت ٹھیک ایک بجے رات کا تھا۔ اس کے پورے دس منٹ بعد آب گم سے آنے والی دوسری گاڑی گذرے۔

شروع شروع میں تو سب نے راتوں کو جاگ جاگ کر ہنسی خوشی دونوں گاڑیوں کے گذرنے کا نظارہ کیا، لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا تو ہر دو اطراف سے حملہ آور ہونے والی اس بے وقت چنگھاڑ اور انجن کی تیز کوک نے ان کا سکھ چین لوٹ لیا۔

رات کا ایک بجتا تو انجن کی تیز کوک اور مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ پہلی گاڑی گذرتی اور اس کے ٹھیک دس منٹ بعد مخالف سمت سے اٹھنے والی چنگھاڑ سنائی دیتی۔

کندیاں اور کوٹ ادو کے درمیان اس برانچ لائن پر یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں سے دونوں گاڑیاں ہمیشہ رائٹ ٹائم ہی گذرتی تھیں۔ اس وقت پوری آبادی گہری نیند سو رہی ہوتی۔ پہلی گاڑی گذرتی تو سب دہل کر رہ جاتے۔ اس کے ٹھیک دس منٹ بعد مختلف سمت سے اسی شور کسکارے کے ساتھ دوسری گاڑی گذرتی۔ ایسے میں شیر خوار بچے تادیر روتے رہتے، بڈھے ٹھڈوں کی نیند اچٹ جاتی اور کھونٹوں پر بندھے جانور رسیاں تڑانے کی کوشش کرتے۔

جب یہ روز کا معمول بنا تو انھوں نے خیال کیا کہ ہاتھ کیا آیا؟ گہری نیند سے بدک کر جاگ اٹھنے اور دوبارہ نیند کی وادیوں میں اتر جانے کی ایک موہوم خواہش کے سوا۔

اب کیا کریں۔

اعلیٰ حکام کو کئی ایک درخواستیں گذارنے کے بعد ان کی ایک چٹھی کا جواب لاہور سے آیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ سرکاری کاغذات، ریلوے ٹریک کو آپ لوگوں کی آبادی سے کوس بھر کے فاصلے پر ظاہر کر رہے ہیں لہٰذا ریلوے حکام کے نزدیک اس بے جا شکایت پر مزید غور کرنا ممکن نہیں۔

اس کے بعد عجیب معاملہ ہوا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، بستی والے اس مہیب گڑگڑاہٹ اور انجن کی چنگھاڑ کے عادی ہوتے چلے گئے۔ اب وہ گہری نیند میں بھی جیسے انجن کی کوک اور چنگھاڑ کے منتظر رہتے۔ رات کے ٹھیک ایک بجے نیند ہی نیند میں پہلی گاڑی کا انتظار شروع ہو جاتا اور جب تک دونوں گاڑیاں گذر نہ جاتیں سب بے چین سی نیند سوئے رہتے۔ پھر دوسری گاڑی کی گڑگڑاہٹ جوں جوں قریب آتی اور وہ انجن کی کوک سنتے تو ان کی نیند دوبارہ گہری ہوتی چلی جاتی۔

اب نیند کی وادیوں میں اترتے ہوئے وہ اکثر ایک ہی خواب دیکھتے کہ آبادی کے بیچ، ریلوے ٹریک پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے۔ ایک صاف ستھرا ٹکٹ گھر۔ اجلی وردیوں میں ملبوس چاق و چوبند ٹکٹ کلکٹر ہیں۔ سرخ کرتے

پہنے قلی ہیں۔ چائے کا ایک آباد کھوکھا اور نیند کے جھکورے لیتے ہوئے مسافروں سے آباد پلیٹ فارم ہے۔

اب سوائے اس بے معنی خواب کے، باقی سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ حکام بالا سے کوئی شکایت تھی نہ ریلوے والوں سے کوئی گلہ۔ ان کی زندگی ایک مخصوص ڈھرے پر رواں تھی کہ یک لخت ریلوے حکام نے اس برانچ لائن پر گاڑیوں کی آمد ورفت روک دی۔ سرکاری اعلان کے مطابق دونوں اطراف کے ٹرمینس پوائنٹ ختم کر دیے گئے تھے، انجن اور بوگیاں مین لائن پر شفٹ کر دی گئی تھیں۔ لیکن اس کی اطلاع ادھر کون کرتا؟

آج رات گاڑی نے نہیں گذرنا تھا اور ادھر کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے۔

رات کے ٹھیک ایک بجے ریلوے ٹریک کے دونوں اطراف میں گہری نیند سونے والوں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ گاڑی آنے میں تاخیر ہوئی تو سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہوا؟"

"شاید گاڑی نہیں آئی۔"

"آئی نہیں یا گذر گئی؟"

"گذر جاتی تو ہماری آنکھ کاہے کو کھلتی؟"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ پر ہوا کیا؟"

"اللہ جانے۔"

"اب تک تو دوسری بھی گذر جاتی ہے۔"

"دوسری کہیں کراس پر نہ کھڑی ہو پہلی کے انتظار میں۔ پہلی گذرے تو دوسری بھی گذرے۔"

"پہلے والی کو پیچھے کہیں حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔"

"خدا خیر کرے۔ اگر حادثہ پیش آتا تو کنڈیاں زیادہ دور تو نہیں۔ ادھر کوٹ ادو والا کراس بھی قریب ہی تو ہے۔ کوئی آواز، کسی قسم کا شور شرابا، کچھ تو سننے میں آتا۔"

"چلو، چل کر دیکھ کیوں نہ لیں۔"

"پر اتنی رات گئے؟"

"انسانی زندگیوں کا سوال ہے بھئی۔ اس میں دیر سویر کیا؟"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ پٹڑی کے ساتھ ساتھ ہو کر نکلتے ہیں۔ کچھ لوگ ادھر دیکھ لیں، کچھ ادھر ہو آتے ہیں۔"

وہ رات کے دوسرے پہر کے نکلے، دن چڑھے گھروں کو پلٹے۔ دونوں اطراف میں ہو آئے۔ کوٹ ادو سے معلوم ہوا کہ آج سے برانچ لائن بند کر دی گئی۔ اوپر سے فیصلہ ہو گیا۔ اب گاڑی نہیں چلے گی۔

ایک بولا: "اچھا ہی ہوا۔ خواہ مخواہ کی کچ کچ، حاصل نہ وصول۔ یا تو بنایا ہوتا ہماری طرف بھی ایک ہالٹ، ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن۔ ہماری سہولت کا بھی خیال کیا ہوتا۔"

"پر چل تو رہی تھی نہ گاڑی۔ اب تو مستقل طور پر روک دی گئی۔ کسی طور چلتی رہتی تو بن ہی جاتا ہالٹ اور ریلوے اسٹیشن بھی۔"

"پر کب؟ کتنی درخواستیں گذاریں۔ شنوائی کب ہوئی؟ ہم تو اس ملک میں چھوڑ آئے اپنے پرکھوں کی قبریں بھی۔ ہمیں کیا ملا؟ اچھا ہی ہوا بند ہو گئی سالی۔ اب اپنی نیند سوئیں گے اور اپنی نیند جاگیں گے۔"

سارا دن اسی حیص بیص میں گذر گیا۔

رات کی بے خوابی الگ تھی۔ شام ہوئی تو سب کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، رات کا کھانا کھاتے ہی سب ٹُن ہو گئے۔ اب رات گئے کی اس دل دہلا دینے والی چنگھاڑ اور مہیب گڑگڑاہٹ سے بھی ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا تھا۔ سب لمبی تان کر سو رہے۔

رات کا ایک بجا تو ریلوے ٹریک کے دونوں اطراف میں گہری نیند ہونے والوں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ نیند ہی نیند میں ٹھیک ایک بجے سب بے چینی سے کروٹ بدلتے۔ پہلی گاڑی گذر جانے کے بعد بے چین ہی نیند سوئے رہتے اور جب دوسری گاڑی بھی گذر جاتی تو گہری نیند میں چلے جاتے۔ لیکن آج جانے کیا ہوا کہ انھوں نے محض کروٹ ہی بدلی اور اس کے بعد سب کے سب نیند کی پرسکون وادیوں میں اترتے چلے گئے، دوسری گاڑی کے گذرنے کا انتظار کسی نے نہیں کیا۔

آج بھی انھوں نے وہی پرانا خواب دیکھا لیکن ذرا سی تبدیلی کے ساتھ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ آبادی کے بیچوں بیچ ریلوے ٹریک پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے۔ ایک صاف ستھرا ٹکٹ گھر۔ اجلی وردیوں میں ملبوس چاق و چوبند ٹکٹ کلکٹر ہیں۔ سرخ کرتے پہنے قلی ہیں۔ چائے کا ایک آباد کھوکھا اور نیند کے جھکورے لیتے ہوئے مسافروں سے آباد پلیٹ فارم ہے۔ پھر اچانک پلیٹ فارم کے ایک کونے سے گھنٹی بج اٹھتی ہے جو پچھلے ہالٹ سے گاڑی کے نکل آنے کا اشارہ ہے۔ اب گاڑی آئی کہ آئی۔ گھنٹی کی آواز کے ساتھ اسٹیشن کے کونے کھدروں میں سستاتے ہوئے قلی متحرک ہو گئے اور دور اندھیارے میں سے لحظہ بہ لحظہ قریب آتے ہوئے انجن کی کوک اور تیز تھرکتی ہوئی روشنی کی کرنوں نے پلیٹ فارم پر کھڑے مسافروں کے چہرے روشن کر دیے۔

مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی رکی تو سب اس کی جانب لپکے، پر گاڑی کیسے پکڑیں؟ گاڑی کے تو تمام دروازے مقفل ہیں۔

پلیٹ فارم پر کھڑے پریشان حال مسافر گاڑی کے دروازے پیٹتے ہیں، کھڑکیوں پر دستک دیتے ہیں پر کوئی نہیں کھولتا دروازے کھڑکیاں۔ پھر انجن کی تیز کوک سنائی دیتی ہے اور بوائلر سے اٹھنے والی بھاپ سارے کو ڈھانپ لیتی ہے۔ گاڑی دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی رفتار پکڑ لیتی ہے اور واویلا کرتے ہوئے مسافروں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پیچھے رہ جاتا ہے۔

اگلے روز جب آنکھ کھلی تو بستی والے سخت حیران کہ اس دیکھے

بھالے، مانوس خواب میں یہ گاڑی چھوٹ جانے کا اضافہ کیسے ہو گیا؟

ایک بولا: ''میں بھی کہوں، جب شروع شروع میں ریل کی پٹڑی بچھی ہے اور گاڑی چلی ہے تو ہم لوگوں نے راتوں کو جاگ جاگ کر کتنے ہاتھ ہلائے گاڑی کی طرف، پر ہمارے ہلتے ہوئے ہاتھوں کا جواب ہاتھ ہلا کر کسی نے نہ دیا۔''

''کیا مطلب؟'' دوسرے نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ''گاڑی تو زن سے گزر جاتی تھی، تاریکی میں۔ اندر بیٹھے مسافروں کو کیا معلوم کہ ہم ہاتھ ہلا رہے ہیں؟''

''جب چلتی گاڑی کی طرف ہاتھ ہلائے جا رہے ہوتے ہیں نہ، تو پتہ چل جاتا ہے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو۔ بے شک تاریکی ہی کیوں نہ ہو۔''

''دماغ چل گیا ہے تیرا؟ سارا سارا دن جنگ کی خبریں سنتا ہے ریڈیو پر۔ رات کو ہوش ہوتی ہے تجھے؟''

''میں نے صرف یہیں پر کھڑے کھڑے تو ہاتھ نہیں ہلایا۔ جب روہڑی گیا تھا نہ پارسال، تو اسی طرح رات کی تاریکی میں چلتی ہوئی عوام ایکسپریس کے مسافروں کی طرف ہاتھ ہلایا تھا۔ انھوں نے تو دیکھ لیا تھا مجھے، اور ہلائے تھے ہاتھ۔''

''اچھا، مان لیا۔ پھر؟''

''یہ جو گاڑی گزرا کرتی تھی نہ ادھر سے۔ یقین مانو، مسافر گاڑی نہیں تھی۔''

''کیا کہا... مسافر گاڑی نہیں تھی؟''

''ہاں۔ مسافر گاڑی نہیں تھی، کچھ اور لفڑا تھا۔''

''پر کیا لفڑا تھا؟ بتا بھی۔''

''میں نہیں جانتا، پر تھا کچھ۔''

سب ہنس دیے۔

اب پوری آبادی میں ایک وہی تھا، جو لگا رہا اس ٹوہ میں۔ بغیر کسی سے بات کیے، چپ چاپ کھوجتا رہا۔ لیکن بس اتنا ہی جان سکا کہ ادھر کا ٹرمینس پوائنٹ اٹک چھاؤنی ہے اور ادھر آب گم۔ کول پور، کچھ اور سپیزنڈ، جہاں سے ایک برانچ لائن ایران زاہدان کی طرف نکلتی ہے اور دوسری کوئٹہ، گلستان اور چمن کی جانب۔ اس کے آگے افغان سرحد ہے۔

یہ سب سوچتے کرتے، ایک روز اسے خیال آیا کہ اب اگر ادھر سے گاڑی نہیں گزرتی تو فجر کی اذانوں تک کیسے سوئے رہتے ہیں سب کے سب؟ رات ایک بجے کے بعد کیوں نہیں جاگ اٹھتے ہڑبڑا کر؟

اس روز کھیتوں پر سے وہ جلد ہی پلٹ آیا اور دن بھر لمبی تان کر سوتا رہا۔ عشا کی اذانیں ہوئیں تو اٹھ بیٹھا اور رات کا کھانا کھا کر ہاتھ میں ٹارچ لیے نکل کھڑا ہوا پٹڑی کے ساتھ ساتھ، کراس کی جانب۔ تاریکی میں چار کوس کا پیدل سفر کر کے وہ پٹڑی سے ذرا فاصلے پر، چھپ کر بیٹھ گیا جھاڑیوں میں۔

ہر طرف چپ چڑانگ تھی اور ہوا سنکی ہوئی تھی۔

رات کا ایک بجا تو کوٹ ادو کی جانب سے تاریکی میں دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی ایک گاڑی آئی اور اس کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ گاڑی کی کھڑکیوں میں سے ہلکی زرد روشنی پھوٹ رہی تھی اور وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔

اس وقت سارے میں تاریکی کا غلبہ تھا۔ سوائے دور کھڑے انجن کے نیچے بھڑبھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپک کے، روشنی کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور وہ گاڑی سے قدرے فاصلے پر گھنی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اور گاڑی کے بیچ سب بڑی رکاوٹ انجن کے بوائلر سے اٹھنے والی بھاپ کے وہ دودھیا بادل تھے جو وقفے وقفے سے پوری گاڑی کے ساتھ آگے پیچھے لڑھکتے پھر رہے تھے۔

گھنی تاریکی اور انجن کے بوائلر سے اٹھنے والی بھاپ کی دھندلاہٹ میں اس نے دیکھا کہ گاڑی رکتے ہی ایک بوگی کا کھٹ سے دروازہ کھلا اور بہت سے چاق و چوبند افراد زقندیں بھر کر نیچے اتر آئے۔ پھر وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ، انجن سے پچھلے ڈبے تک پھیل گئے اور اس وقت تک رائفلیں تانے مستعد کھڑے رہے، جب تک اٹک چھاؤنی سے آنے والی گاڑی گزر نہیں گئی۔

پہلی گاڑی گزر جانے کے بعد اس کے سامنے رکی ہوئی گاڑی بھی دھیرے دھیرے چل پڑی اور گاڑی کے دونوں اطراف میں کھڑے افراد دوڑ کر دوبارہ اس پر سوار ہوتے گئے۔ ایسے میں اسے بہت کم وقت ملا، لیکن جھاڑیوں کی اوٹ سے اس نے یہ ضرور دیکھ لیا کہ اس کے سامنے ٹھہری ہوئی گاڑی کے اس واحد کھلے ہوئے ڈبے کو چھوڑ کر باقی ساری بوگیوں کے بند شیشوں کے پیچھے کھڑکیوں میں ہمارے کے سارے مسافر بے حس و حرکت تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل مل کر دیکھا تھا کہ گاڑی کے اندر مسافروں میں سے کوئی ہنس رہا ہے تو مسلسل ہنسے جا رہا ہے، اس کا منہ کھلے کا کھلا ہے۔ جو مسافر کھڑا ہے تو مسلسل ایک ہی رخ پر کھڑے کا کھڑا ہے، اور جو جھکا ہوا ہے تو مسلسل جھکا ہوا ہے۔ بچے باہر کی جانب ہاتھ تو ہلا رہے ہیں پر ان کے ہاتھ ہلتے نہیں۔

گاڑی گزر گئی تو اس نے سوچا، کیا گاڑی کی کھڑکیوں میں باہر کے رخ پر انسانی تصویریں چسپاں تھیں؟ گاڑی میں زندہ متحرک انسان ہی تھے یا حنوط شدہ لاشیں؟

وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں نے بتایا نہ کہ اس رات ہوا بھی کچھ سنکی ہوئی تھی۔

اب دونوں گاڑیوں کے گزرے خاصی دیر ہو گئی تھی لیکن وہ اب تک جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا ☆☆☆

پال ایلوار ترجمہ: مرزا سعید الظفر چغتائی

شمارہ ۹۵
جون ۱۹۷۵

۱۔ نظم

زمیں نیلی ہے نارنگی کے مانند!
غلط گو ہیں یہ الفاظ اور نہ جھوٹے،
نہیں تم کو عطا کرتے ترنم
رفاقت خیز بوسوں کے جلو میں؟
جنوں بر دوش، عشق
اور وہ لب آسودہ اس کے،
تمامی راز اور سارے تبسم،
لباس عفو بھی ہیں کیسے کیسے
اسے یک سر برہنہ ماننے کو

مگس پھولے ہیں بن کر سبز پھول (آج)،
سحر لا ڈالتی ہے گردنوں میں
بہت سی کھڑکیوں کا ہار مالا
پروں سے پتیاں ڈھک جا رہی ہیں
میسر ہے تجھے ہر عیش خورشید
سبھی سورج زمیں پر ہیں
تمہارے حسن کے ہی راستوں پر!

۲۔ لب آسودہ

ہنسی اپنی بوتل تھامے،
موت خندہ بر لب،
ہر بستر میں خوابیدہ
جسموں کے نیچے آسمان!

کانوں پر ایک صاف سبز موباف،
تین جھمکے ایک سونے کی انگوٹھی
پہنے بے مشقت۔
ایسی روشنی پر ایک سایہ!

دھوؤں کے ننھے ننھے تارے
سرِ شام سمندر بے مسافر
ظالم آسمان سمندروں کو متھتا ہوا!

ہات میں اک نزاکت لئے
گرد کے ذروں سے زیادہ نرم
دھندلکے میں شاخیں غائب!

۳۔ دریا

وہ دریا ابلتا ہے میری زباں سے،
وہ پانی کہ جس کو تصور نہ پائے،
سبک سیر کشتی،
دریچوں پہ پردے پڑے،
تکلم کریں!

سوزان بیوسک، ترجمہ : مرزا سعید الظفر چغتائی

۴۔ ناقابل تقسیم

جنوں کی شام، برہنہ، شفاف
اشیا کے بیچ مکان، جیسے میرے اقوال،
جیسے باتیں کسی اجنبی کی،
کسی مجرم کی جو اتار پھینکے اپنے گلے سے طوق
اور جس کی زنجیر سے گونج پیدا ہو

درختوں اور چہار دیواری کے درمیان
دیواروں اور جڑوں کے بیچ،
اس عظیم تھرتھراتی چڑیا کے درمیان
اور اس پہاڑی کے جو اسے تھکا مارے،
مکان کی ہیئت ہے میری نگاہوں جیسی

میری آنکھیں بے کار ہیں،
گرد کی حکومت تمام ہوئی،
راہ کی کا کلوں نے اپنا بے لوچ لبادہ رکھ دیا،
وہ بھاگتی نہیں، میں ہلتا بھی نہیں
سارے پل ٹوٹ گئے ہیں، آسمان ان سے نہ گذرے گا۔
میں ادھر دیکھ بھی نہیں سکتا۔
دنیا میری کائنات سے الگ ہو رہی ہے
اور وہ بھی جنگ کے عین عالم شباب میں۔

جب خون کا موسم مرے دماغ میں کھلا جاتا ہے،
میں پہچان لیتا ہوں انسانی روشن ضمیری کے اس دن
کہ کون میرا ہے،
میں پہچان لیتا ہوں آزادی کے استفراغ کو،
نشہ کی موت کو،
خواب کی نیند کو
اے میری خود احتسابیو، اے میری خونیں خود احتسابیو!

شمارہ ۲۱۳
جنوری ۱۹۹۸

گرم ملکوں میں ایک لمبی شام
باغ مہکا ہوا تھا تا بہ مشام
ابدیت بدوش... نیند میں میں
کوئی آواز سرسراتی ہے

مہر بر لب بھی تو جاگا کون؟
خامشی گاہ گاہ ٹوٹتی ہے
چند الفاظ، زیر لب، گویا
آج کیا رات خواب دیکھتی ہے؟

چند جگنو دمکتے سبزے پر
رات کے یہ نقیب سلطاں ہیں
تتلیاں شاندار، طوفاں کی
پھڑ پھڑاتی ہیں پرافق کے قریب

آنکھیں

سیولی پریودیوم، ترجمہ: مرزا سعید الظفر چغتائی

شمارہ ۲۶۵
جنوری ۲۰۰۳

نیلی یا کالی، سبھی محبوب سبھی حسین
لاتعداد آنکھوں نے صبح کا تڑکا دیکھا ہے۔
وہ قبروں کی گہرائی میں سو رہی ہیں
اور سورج ہنوز ابھر رہا ہے

راتیں، دنوں سے زیادہ نرم
بے شمار آنکھوں کو مسرور کرتی ہیں
تارے اب بھی چمک رہے ہیں
اور آنکھیں دھندلا چکی ہیں

ہائے، ان کی روشنی جاتی رہی
نہیں، نہیں، یہ ناممکن ہے
وہ کسی ایسی سمت مڑ گئی ہیں
جسے ہم ان دیکھی کہتے ہیں

اور جیسے کہ جھکتے اجرام
ہم سے رخصت ہو جاتے مگر آسمان پر رہتے ہیں
پتلیوں کے بھی مغرب ہیں
مگر یہ سچ نہیں کہ وہ مر جاتی ہیں

نیلی یا کالی، سبھی محبوب، سبھی حسین
کسی عظیم الشان صبح صادق پر کھلی ہیں
قبروں کے دوسری جانب
آنکھیں بند ہو کے بھی دیکھتی رہتی ہیں

عجب موسم

مرغوب علی

شمارہ ۲۷۴،
نومبر ۲۰۰۳

ستارے
آسماں
بادل
ہوا
شاخیں لچکتی
دور تک اڑتے ہوئے آنچل
سریلے گیت اگتے
کبوتر کے پروں کی سرسراہٹ سے
عجب موسم بدلتے ہیں
عجب موسم سماعت کے
عجب موسم رفاقت کے
عجب موسم
ستارے
آسماں
آنچل

اپنا گھر

مسعود اشعر

شمارہ ۲۶۹
جون ۲۰۰۳

چچا میاں رو رہے تھے اور بچے حق دق کھڑے دیکھ رہے تھے کہ یہ کون ہے جسے گلے لگا کر ان کے دادا ایسے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں کہ ان کا پتلا بدن بید کی طرح کانپنے لگا ہے۔ ان بچوں کی ماں ایک طرف کھڑی پہچاننے اور نہ پہچاننے کی کشمکش میں کبھی نظریں اوپر کر رہی تھی اور کبھی نیچے۔ اس کے سر کا دوپٹہ کھنچ کر ماتھے تک آ گیا تھا اور ایک ان جانی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جم کر رہ گئی تھی۔ احمد کو جھرجھری سی آئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وقت اگر دو حرکتوں کے درمیانی وقفے کی پیمائش کا نام ہے تو پچاس برس کا وقفہ ایک وقت ہوگا یا کئی وقت؟

اس نے جب وہاں جانے کا ارادہ کیا تھا تو اسے خیال آیا تھا کہ پچاس برس بعد وہاں جا کر اسے کیسا لگے گا؟ اسے خوشی ہوگی یا صدمہ؟ وہاں سب کچھ ویسا تو نہیں ہوگا جیسا وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ تو پھر کیسا ہوگا؟ بدل گئی ہوں گی سب چیزیں؟ مگر کتنی بدلی ہوں گی؟ سڑکیں اور گلیاں تو وہی ہوں گی۔ اور پھر اپنے عزیز رشتے دار تو ہوں گے نہ۔ اس عرصے میں دو تین موتیں ہی تو ہوئی ہیں۔ اس کے خاندان میں ما شاء اللہ عمریں زیادہ ہوتی ہیں۔ بلکہ اب تو رشتے داروں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بچے اور پھر بچوں کے بچے۔ چالیس پچاس برس میں کتنی نسلیں بڑھ جاتی ہیں؟

چچا میاں اس کے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ انھیں وہ چچا میاں کہتا تھا۔ ان سے بڑے اور احمد کے باپ سے چھوٹے ایک اور چچا تھے جنھیں وہ چچا صاحب کہتا تھا۔ سب سے بڑے یعنی احمد کے باپ سے بھی بڑے چچا جنھیں سب دادا کہتے تھے اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ چچا صاحب علی گڑھ گئے ہوئے تھے اپنی بہو اور پوتوں کے پاس۔ ان کے بڑے بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ یونی ورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ اس نے وہیں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ چھوٹا بیٹا پاکستان چلا گیا تھا جو اب لبنان میں تھا۔ چچا صاحب کبھی اپنے گھر ہوتے کبھی علی گڑھ۔ جی چاہتا تو پاکستان کا چکر بھی لگا آتے۔ کبھی کبھی چھوٹا بیٹا لبنان بھی بلا لیتا تھا۔ چچا میاں کبھی پاکستان نہیں گئے۔ بیوی جوانی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ تین لڑکوں اور دو لڑکیوں کو انھوں نے خود ہی پالا۔ اب ایک لڑکی دبئی میں تھی اور دوسری پاکستان میں۔ بڑے لڑکے کو سر کی رسولی کھا گئی۔ اس سے چھوٹا جو علی گڑھ میں تھا بیمار رہتا تھا، ایک ہی لڑکا صحت مند تھا۔ وہ دوسرے گھر میں رہتا تھا۔ یوں تو چچا میاں کو سب کا ہی غم تھا لیکن پاکستان میں رہنے والی چھوٹی بیٹی حسنہ کے غم نے انھیں اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ بوڑھا کر دیا تھا۔

چچا میاں نے احمد کو اپنے سینے سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر اپنی نظریں جما دیں۔ انھوں نے اس کے چہرے پر کیا دیکھا؟ یہ احمد کو نہیں معلوم۔ مگر اس نے جو دیکھا اس سے وہ دہل گیا۔ اس کے سامنے ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ چھ فٹ سے بھی لمبا ہوا قد اب جھک کر پانچ فٹ سے بھی کم رہ گیا تھا۔ جن آنکھوں میں تیرتے لال لال ڈورے دیکھنے والے کو اپنی نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیتے تھے اب ان آنکھوں میں خدا جانے کتنے ندی نالوں کی گاد اور مٹی بھری تھی۔ اور گلابی شہابی چہرا دھندلا ہو گیا تھا۔

چچا میاں کی بہو شاید ابھی تک اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ وہ تھی تو اسی محلے کی دوسری گلی کی، مگر اس نے احمد کو کب دیکھا تھا۔ وہ اس وقت پیدا ہی کہاں ہوئی تھی جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ جیسے اس کے دونوں بچوں کے لیے احمد اجنبی تھا ویسے ہی اجنبی اس کے لیے بھی تھا۔ وہ مسیتا بھائی اور بلاقی بوبو کی بیٹی تھی۔ چچا میاں کے بڑے بیٹے جمیل سے اس کے بیاہ کی خبر اسے بھی ملی تھی۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ اس کے خاندان میں خوب شور شرابا اور خوب جھگڑا فساد ہوا تھا اس بیاہ پر۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس خبر سے صدمہ اسے بھی ہوا تھا۔ مسیتا بھائی کا خاندان اس کے دادا کے گھر کام کرتا تھا اور وہ خاندان روئی دھنکنے کا کام کرتا تھا۔ اب انھوں نے ٹھیکیداری سے پیسہ بنا لیا ہے تو کیا ہوا۔ ہیں تو وہی نا۔ اس نے سوچا تھا۔ جہاں تک بھائی یا چچا کہنے کا تعلق ہے، وہ تو وہاں کا رواج تھا۔ ہر بڑا، چاہے وہ رشتے دار ہو یا نہ ہو چچا اور بھائی ہوتا تھا۔ اور اس کے خاندان میں تو ننھیال کے سارے نوکر ماموں اور ددھیال کے سارے نوکر چچا کہے جاتے تھے اور نوکرانیاں بوبو یا بوا۔ ایسے گھر میں اپنے چچیرے بھائی کا بیاہ اس کے حلق سے اترتا ہی نہیں تھا۔

اب احمد نے اپنے چچا کی بہو یعنی اپنی بھابھی کو نظر بھر کے دیکھا۔ اچھی پیاری شکل کی لڑکی تھی، اور پھر پڑھی لکھی۔ خواہ مخواہ خاندان نے ہنگامہ کھڑا کیا تھا ۔اگر وہ بلاقی بوبو کی بیٹی تھی تو کیا ہوا، لڑکی تو اچھی ہے۔ جمیل نے ٹھیک ہی کیا تھا ۔اسے لڑکی پسند آئی، شادی کرلی۔ مگر شادی کے بعد وہ سات آٹھ برس ہی زندہ رہ سکا۔ بے چارہ۔ اور اب یہ بہو ہی اپنے سسر کی دیکھ بھال کررہی ہے۔

یہاں یہ اچھا قاعدہ ہے کہ اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو اس کی جگہ نوکری دے دیتے ہیں۔ چچا میاں نے بعد میں اسے بتایا تھا'' جس بینک میں جمیل تھا اس نے اس کی جگہ خورشید جہاں کو رکھ لیا ہے۔''

اور جب اس نے چبوترے کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا تو ایکا ایکی اسے لگا کہ وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ وہی برسوں پہلے والا بچہ جو ان سیڑھیوں پر چھلانگیں مارا کرتا تھا اور اسے اماں یا چچی صاحب کی ڈانٹ پڑتی تھی۔ اے ہے بھیئے، کیا کررہا ہے ۔چوٹ لگ جائے گی ٹوٹ جائیں گی ٹنگوئیں۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ سامنے دالان میں دائیں طرف نماز کا تخت اسی طرح بچھا تھا۔ تخت پر توشک اور توشک پر سفید چادر بھی اسی طرح تھی۔ تخت پر ایک طرف جانماز اور دوسری طرف گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ جانماز کا ایک کونہ مڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف دو تین چارپائیاں پڑی تھیں۔ یہ سب چیزیں ویسی ہی تھیں جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر چارپائیوں کے ساتھ رکھی چار کرسیاں نئی تھیں۔ تو گویا گھر کے اندر بھی کرسیاں آگئیں؟ پہلے تو سب پلنگوں پر ہی بیٹھتے تھے یا مونڈھوں پر۔ کرسیاں تو صرف بیٹھک میں ہوتی تھیں؟

چچا میاں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئے۔ '' حسنہ کیسی ہے؟'' ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

احمد کو معلوم تھا کہ چچا میاں سب سے پہلا سوال یہی کریں گے اس لیے اس نے حسنہ کا خط اپنے ہاتھ میں ہی رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے وہ خط آگے بڑھا دیا۔

'' بالکل خیریت سے ہیں وہ چچا میاں۔ آپ ان کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ بہت اچھی نوکری ہے اس کے میاں کی۔ اپنا گھر بھی بنالیا ہے اس نے۔ اور بچے بہت اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ ماشاءاللہ سب خوش ہیں۔''

چچا میاں نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ حسنہ کا خط پڑھ رہے تھے۔ خط پڑھ چکے تو احمد کو ایسے دیکھا جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں۔ اسے پہچاننے کی کوشش کررہے ہوں۔ ملک سے باہر اور بھی بچے رہتے ہیں۔ وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بول رہے تھے۔ مگر وہ رہتے تو اپنے وطن کے ہی ہیں۔ وہ آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ ایک تو دوسرے وطن کی ہوگئی اوپر سے اس کا آنا جانا بھی مشکل۔ دو تین سال میں کبھی آ بھی جاتی ہے تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ آئندہ اس کی اور اس کے بچوں کی شکل دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ روز روز تو جھگڑا ٹنٹا لگا رہتا ہے دونوں ملکوں میں۔

اب احمد نے نظریں نیچی کیے کیے اس گھر کو دیکھنا شروع کیا جہاں وہ بچپن میں اونچا نیچا، چھپن چھپیا اور کوڑا جمال شاہی کھیلا کرتا تھا۔ اندر آتے ہی اسے لگا تھا کہ یہ گھر کچھ چھوٹا ہوگیا ہے۔ مگر پھر اسے خیال آیا تھا کہ اتنے زمانے بعد یہاں آکر اسے ہر چیز اور ہر جگہ چھوٹی لگ رہی ہے۔ وہ ریل گاڑی سے اسٹیشن پر اترا تھا تو وہ اسٹیشن اسے چھوٹا لگا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا تھا تو حیران رہ گیا تھا کہ سامنے سڑک بھی بہت تنگ ہوگئی تھی۔ دکانیں ہی دکانیں اور عمارتیں ہی عمارتیں اور انسان ہی انسان۔ اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آگئے میرے شہر میں؟ پھر اسے ہنسی آگئی تھی۔ میرا شہر؟ یہ ابھی تک میرا شہر ہے؟ پھر وہ نٹ کا تماشہ کرنے والے کی طرح کود کر سائیکل رکشا پر بیٹھا تھا اور کبھی ایک کولہے پر اور کبھی دوسرے کولہے پر بوجھ ڈالتا راہ رضا پر پہنچا تھا تو پھر اسے حیرت نے آلیا تھا۔ یہ سڑک تو چونسٹھ فٹی کہلاتی تھی، شہر کی سب سے چوڑی سڑک۔ اسے کیا ہوا؟ یہ کیوں تنگ ہوگئی؟ اور تو اور قلعہ کی اونچی اونچی دیواریں بھی چھوٹی ہوگئی تھیں۔ اس کے دربار ہال کا گنبد بھی جسے کبھی دس میل دور سے دیکھا جاسکتا تھا اب ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین میں دھنسا جارہا ہو۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں، مینار اور تینوں گنبد بھی نیچے ہوگئے تھے۔ پھر اس کا اپنا محلہ، محلے کی گلیاں اور گھر سب کے سب تنگ اور اتنے نیچے ہوگئے تھے کہ سائیکل رکشا پر بیٹھے ہوئے اسے یوں لگا کہ گردن اچکا کر وہ گھروں کے اندر جھانک سکتا ہے۔ اس نے اپنے چچا کو پھر دیکھا۔ گھر تو سچ مچ چھوٹا ہوگیا تھا۔ دروازے کے ساتھ جو بڑا سا دالان اور اس کے اندر ساتھ ساتھ جو تین کمرے تھے وہ اب نہیں تھے۔

'' وہ حصہ رمضانی کے ہاتھ بیچ دیا۔'' چچا میاں نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ رمضانی بھائی محلے کے پنساری تھے۔ چھوٹی سی دکان تھی ان کی۔ احمد کے سارے خاندان کا سودا سلف انہی کی دکان سے آتا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو رمضانی بھائی نالہ پار ایک چھوٹے سے کچے گھر میں رہتے تھے۔

'' جمیل کی بیماری میں یہ حصہ بک گیا۔'' چچا میاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے یا پھر عمر کی وجہ سے گدلا پانی ان کی آنکھوں کے کونوں سے بہہ نکلا تھا۔

'' آیئے کچی میں آجایئے۔'' خورشید جہاں نے احمد کو خود ہی پہچان لیا تھا۔ چچا میاں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے۔ ان کا خیال ہوگا کہ ان کی بہو کو اسے پہچاننا ہی چاہیے، وہ اسی گھر کا بیٹا تو ہے۔

کچی، جس میں پہلے صرف ایک بڑا سا نعمت خانہ اور ایک دو پیڑھیاں پڑی رہتی تھیں اب باقاعدہ کھانے کا کمرہ یا ڈائننگ روم بن گیا تھا۔ چھوٹی سی میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں اور میز پر کیک، بسکٹ پیسٹریاں اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں بھی تھیں۔ احمد تو سفید چاندنی والے فرش پر بچھے دسترخوان کی توقع کررہا تھا۔

'' ارے، اتنا تکلف کرلیا آپ نے۔'' احمد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے خورشید جہاں سے کہا جو اپنے سسر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور شرمائی شرمائی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بہت خوب صورت بچے تھے۔ بچی ہوگی کوئی دس گیارہ برس کی اور لڑکا چھ سات برس کا۔ جمیل بھی تو بہت خوب صورت تھا۔ اس کا جی چاہا ان بچوں کو اپنے پاس بلائے ۔ان سے بات کرے۔ انہیں پیار کرے۔ مگر چچا میاں اسے موقع ہی نہیں دے

رہے تھے۔ آتے ہی اس نے بچوں کے ہاتھ میں چاکلیٹ اور وہ کپڑے رکھے تھے جو اس کی بیوی نے ان کے لیے بھیجے تھے اور پھر چچا میاں نے اسے باتوں میں لگا لیا تھا۔

"دلہن نے تمہارے لیے ہی منگائی ہیں یہ سب چیزیں، کھاؤ نا۔ تمھیں پہلی بار دیکھا ہے نا انھوں نے۔" اسے پاکستان میں ہی خبر مل گئی تھی کہ چچا میاں نے جمیل کی بیماری میں ہی اپنی بہو کو قبول کر لیا تھا۔

"ہم یہاں کیک پیسٹریاں نہیں کھایا کرتے تھے۔ ہم تو شاہ آباد کی صابو نیاں، گجیاں، چوال کے نکتیوں والے لڈو اور قلاقند اور اشفاق بھائی کے اندرسے کھایا کرتے تھے۔" احمد نے خورشید جہاں سے مذاق کیا۔

"صابو نیاں بھی کھا لینا۔ پہلے یہ تو کھاؤ۔" اس کا جواب چچا میاں نے دیا۔ پھر اپنی بہو کی طرف منہ کر کے بولے۔

"دلہن، چھوٹے میاں کو فون کر دینا وہ شاہ آباد سے صابو نیاں لیتے آئیں گے۔ گجیوں کا تو ابھی موسم نہیں ہے۔ اور اندرسے بھی برسات میں بنتے ہیں۔" چھوٹے میاں اس کے خلیرے بھائی تھے۔ اس کے بچپن کے ساتھی اور سب سے پیارے دوست۔

"اچھا؟ گاؤں میں بھی ٹیلی فون پہنچ گیا؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"تھانولہ گاؤں نہیں ہے۔ قصبہ ہے اور اب تو گاؤں میں بھی ٹیلی فون لگ گئے ہیں۔" چچا میاں نے اسے ٹوکا۔ خود ان کے گھر میں بھی ٹیلی فون تھا۔

احمد کو یاد آیا کہ تھانولہ جہاں اس کے نانا اور ماموؤں کی زمینیں اور باغ تھے چھوٹا سا گاؤں نہیں تھا بڑا سا قصبہ تھا۔ پٹھانوں کا قصبہ۔ اس کے رشتے کے بعض ماموؤں کو تو جاگیرداروں والے سارے ہی شوق تھے مگر اس کے نانا کا صرف ایک شوق تھا۔ چاربیت: چاربیت کہنا اور چاربیت سننا۔ چاربیت گانے والوں کی ایک منڈلی ان کے مردانہ گھر میں رہتی تھی۔ یہ کوئی سات آٹھ آدمی تھے جو کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ احمد کی اماں کے بقول وہ مفت کی روٹیاں توڑتے تھے اور خالی پڑے پڑے اینڈتے رہتے تھے۔ اس کے نانا جب کوئی نئی چاربیت یا ملہار (جسے اس علاقے میں برساتی کہا جاتا تھا) کہتے تو وہ گانے والے اسے یاد کرتے اور اس کی دھن بنا کر اس کا ریاض کرتے۔ دھن بنانے میں بھی اس کے نانا میاں شامل ہوتے تھے۔ ہر جمعرات کو چاربیت کی محفل جمتی تو یہ لوگ بڑی سی ڈفلی بجا کر نانا میاں کی کہی ہوئی چاربیتیں گاتے۔ اس ڈفلی کو طنبل کہا جاتا تھا۔ احمد کو اب خیال آتا ہے کہ اصل میں یہ طبل ہوگا طبل جنگ والا طبل۔ یہاں کے پٹھانوں میں آ کر وہ طنبل بن گیا۔ چونکہ عقیدہ یہ تھا کہ اسلام نے دونوں طرف سے بند ڈھول یا طبلہ بجانے کی ممانعت کی ہے اس لئے ایک طرف سے کھلا یہ طبل بجایا جاتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ہر منڈلی اکھاڑہ کہلاتی تھی۔ وہاں ایک اکھاڑہ میاں خاں کا یعنی احمد کے نانا کا تھا اور دوسرا اکھاڑہ صبر استاد کا تھا۔ صبر استاد بھی جاگیردار تھے۔ نام تو جانے کیا تھا۔ صبر ان کا تخلص تھا۔

ان اکھاڑوں کا مقابلہ بھی خوب ہوتا تھا۔ دونوں منڈلیاں آمنے سامنے بیٹھ جاتیں۔ پہلے ایک منڈلی چاربیت گاتی۔ اس کے جواب میں دوسری منڈلی اپنی چاربیت سناتی۔ آہستہ آہستہ اس مقابلے میں گرمی آتی جاتی۔ یہ گرما گرمی اتنی بڑھتی کہ طنبل بجانے والے جوش میں آ کر پہلے تو ایک گھٹنا اٹھا کر آدھے کھڑے ہوتے پھر پورے کھڑے ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے ابھی وہ ایک دوسرے کا منہ نوچ لیں گے۔ آخر میں یہ ہوتا کہ پوری چاربیت کے بجائے ایک ایک شعر کا مقابلہ شروع ہو جاتا اور سننے والوں کا جھوم جھوم کر اور واہ واہ کر کر کے برا حال ہو جاتا۔ چاربیت گانے والے کچھ ایسے بھی تھے جو سیدھے ہاتھ کی کلائی میں گھنگھرو باندھ لیا کرتے تھے۔ جب وہ طنبل بجاتے تو اس کے ساتھ گھنگھرو بھی بجتے۔ طنبل اور گھنگھرو بجاتے بجاتے وہ کھڑے ہو کر جھومنے لگتے اور پھر ایسا لگتا جیسے وہ ناچ رہے ہوں۔ احمد کو ایسے ایک دو مقابلے ہی یاد تھے۔ یہ اس کے بچپن کی بات تھی۔ وہ بڑا ہوا تو یہ محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ صبر استاد کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے نانا بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔

"تم تھانولے تو جاؤ گے نا؟" چچا میاں نے اچانک اس سے سوال کر دیا۔

"جی، میں تھانولے کیسے جا سکتا ہوں؟ میرے پاس تو وہاں کا ویزا ہی نہیں ہے۔" اس نے کمزور سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ تھانولے جانے کو اس کا کتنا دل چاہتا تھا۔ اس کی وہ گلیاں، وہ باغ، اور وہ کھیت دیکھنے کو اس کا دل تڑپتا تھا جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گذرا تھا۔ گرمیوں کی ساری چھٹیاں وہیں گذرتی تھیں اس کی۔ مگر اس کو وہاں کا ویزا ہی نہیں ملا تھا۔

"تو تم مراد آباد بھی نہیں جا سکتے؟" چچا میاں پریشان تھے۔

"جی، وہاں کا ویزا بھی نہیں ہے۔" اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"چھوٹے میاں کی بڑی بیٹی نور بی بی وہاں رہتی ہے۔ وہ تم سے ملنے کو بے چین ہے۔ وہ تمھیں دیکھنا چاہتی ہے۔" چچا میاں کہہ رہے تھے۔ "اپنے باپ سے اتنا ذکر سنا ہے تمہارا۔"

"جی، اس نے مجھے بھی کئی خط لکھے ہیں۔ ہر خط میں لکھا ہے کہ مراد آباد ضرور آنا۔ بہت محبت کرنے والی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ ویزا ہی نہیں ملا اور کہیں کا۔"

"ہاں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟" چچا میاں نے سر جھکا لیا۔

"منجھلے بھائی کا انتقال ہوا تو تم نے بہت دیر میں خبر دی تھی ہمیں۔" چچا میاں کو اب ایک اور بات یاد آ گئی۔ منجھلے بھائی احمد کے والد تھے۔ دوسرے چچاؤں کی طرح احمد کے والد نے بھی اپنے باپ دادا کا گھر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تو صرف اپنے بچوں سے ملنے پاکستان گئے تھے اور وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

"جی، ان دنوں ۱۹۶۵ کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ خط وط آ جا ہی نہیں رہے تھے۔" احمد ایسے جھینپ گیا جیسے وہ جنگ اس نے چھیڑی ہو۔

"یہاں سے گئے تھے تو وہ ایسے بیمار نہیں تھے؟" یہ بڑا چبھتا ہوا سوال تھا۔

"جی، بس اچانک بیمار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کیا۔ آپریشن ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا مگر خون بہنا بند نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی خون روکنے کی مگر..." احمد بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اسے لگا جیسے اس نے اپنے باپ

لے علاج میں واقعی کوتاہی ہوئی تھی۔

"جو اللہ کی مرضی، ان کی مٹی وہیں کی تھی۔" چچا میاں نے گہری سانس لی۔ "بہت بے چین تھے وہاں جانے کو۔ کہتے تھے بابا فرید کے مزار پر ضرور حاضری دینا ہے۔ دیکھو تو، کبھی نہیں گئے وہاں۔ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔" انھوں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"ہمیں بھی چچی جان کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی۔" احمد شکایت نہیں کر رہا تھا بس ایک بات بتا رہا تھا جو اسے یاد آ گئی تھی۔

"اس وقت بھی دونوں ملکوں میں جنگ ہو رہی تھی۔ سرحدیں بند تھیں۔" چچا میاں نے جیسے اسے پھر شرمندہ کر دیا۔

"جی جی، وہ اکہتر کی جنگ تھی۔" احمد نے جلدی سے کہا۔ اس بار شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی ہنسی نکل گئی۔ "ہم ساری باتیں جنگوں اور جھگڑوں کے حساب سے ہی یاد رکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اسے اپنے اوپر حیرت ہوئی۔ اچھا؟ تو اب وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اپنے چچا سے بھی مذاق کرنے لگا ہے؟ جب وہ یہاں سے گیا تھا اس وقت تک تو یہ حال تھا کہ باپ یا چچا تو دور کی بات تھے، اپنے سے بڑے ہر آدمی کے سامنے نظریں نیچی رکھی جاتی تھیں۔ بڑوں کے ساتھ مذاق کرنے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے پھر چچا میاں کو دیکھا۔ یہ وہی چچا میاں تھے جو ہر وقت اسے ڈانٹتے رہتے تھے۔ اس کے ابا میاں اس پر اتنی سختی نہیں کرتے تھے جتنی یہ چچا کرتے تھے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ مگر وہ بھی تو سارے گھر کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ پڑھنا پڑھانا کم، سیاست میں حصہ لینا زیادہ۔ دن دن بھر غائب رہتا تھا گھر سے۔ اور راتوں کو بھی دیر سے آتا تھا۔ اس ڈر سے کہ رات کو اسے دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑے وہ مردانہ گھر کے پچھلے دروازے کی کنڈی باہر سے لگا جایا کرتا تھا۔ اس کے ابا میاں تو اس کی اس حرکت پر خاموش ہو جاتے تھے مگر یہ چچا میاں اس کی ایسی خبر لیتے تھے کہ وہ کئی کئی دن ان سے چھپتا پھرتا تھا۔

"سب آتے جاتے رہے مگر تمھارا بالکل دل نہیں چاہا آنے کو۔" چچا میاں نے اپنی گدلی آنکھوں سے اسے گھورا۔

وہ جانتا تھا کہ اس سے یہ سوال ضرور کیا جائے گا اور ہر ملنے والا اس سے یہی سوال کرے گا۔ مگر چچا میاں سے اسے یہ توقع نہیں تھی۔ انھیں تو معلوم تھا کہ وہ کیوں نہیں آ سکا تھا۔ لیکن شاید انھیں پوری بات معلوم نہیں تھی۔ وہ یہاں آیا ہی نہیں تو پوری بات انھیں کیسے بتاتا۔ احمد کے جس خط نے اس کے لیے دونوں ملکوں کی سرحدیں بند کی تھیں اس نے اس کے سارے خاندان کو بھی اس سے ناراض کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ ناراض یہ چچا میاں ہی تھے۔ کہتے تھے۔ یہاں تو تم سارے خاندان کو پریشان کرتے ہی رہتے تھے وہاں جا کر بھی ہمیں تنگ کرنے سے باز نہیں آئے۔

"آپ تو جانتے ہیں کیا ہوا تھا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، تم نے جو حماقت کی تھی اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑا تھا۔ پولیس ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ روز کوئی نہ کوئی یہاں آیا بیٹھا ہوتا تھا۔ یہ کون آدمی ہے؟ کشمیر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ آپ کا بھتیجا وہاں کیا کرتا ہے؟ پولیس نے لال لال نشان لگا کر اس خط کو سرخ کر دیا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ بچوں کے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ بیوی کے سر میں درد رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے یہ پھوڑے پھنسیاں اور سر کا درد کوڈ ورڈز ہیں۔ خفیہ اشارے ہیں۔" چچا میاں کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔

"اصل میں وہ صاحب میرے ساتھ کام کرتے تھے۔" احمد نے اپنے ہاتھ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وہ سرینگر کے رہنے والے تھے۔ وہ اکیلے پاکستان چلے گئے تھے، ان کے ماں باپ، بہن بھائی سب سرینگر میں ہی تھے ان دنوں سرینگر سے پاکستان تو خط آ جاتا تھا مگر وہاں سے سرینگر کوئی خط نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت تک لاہور میں ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کا دفتر تھا۔ ان صاحب نے سرینگر خط بھیجنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ وہ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر سے ڈاک کے ہندوستانی ٹکٹ لے آتے تھے۔"

"کیسے لے آتے تھے؟" چچا میاں کو حیرت ہوئی۔

"انھوں نے وہاں کلرکوں سے دوستی کر لی تھی۔ وہ انھیں ٹکٹ دے دیتے تھے۔ وہ خط لکھ کر لفافے میں بند کرتے، ہندوستانی ٹکٹ لگاتے اور کسی ایسے شخص کو دے دیتے جو ہندوستان خط لکھتا رہتا تھا۔ وہ شخص ان کے لفافے کو اپنے لفافے میں رکھتا اور ہندوستان کے کسی بھی شہر میں اپنے عزیز کو بھیج دیتا۔ لکھ دیتا کہ یہ دوسرا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ اس طرح وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو اپنی خیریت لکھتے رہتے تھے اس مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں نے بھی ان کا لفافہ اپنے لفافے میں رکھ دیا۔ مجھے کیا خبر تھی یہ مصیبت آ جائے گی۔" احمد نے ڈرتے ڈرتے پوری کہانی سنائی۔

"تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ یہ اب بھی مسلمانوں کی اکثریت کا شہر ہے۔" چچا میاں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "پورے چھ سات مہینے وہ ہمیں پریشان کرتے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔"

"مگر میری جان تو نہیں چھوٹی تھی۔" احمد نے کہا۔ "اس کے بعد مجھے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا۔"

"قصور تمھارا اپنا تھا۔ ظاہر ہے، تمھارے اوپر بھی شک ہو گیا ہو گا۔"

پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سب کو ویزا مل رہا ہے مجھے کیوں نہیں ملتا؟ میں جب بھی ویزا کے لیے درخواست دیتا انکار کر دیا جاتا۔ ان دنوں کوئی لڑائی وڑائی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر میں سیدھا ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں ایک جوہری صاحب تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ میں نے انھیں مولوی عبدالسلام خاں کے دوست پیارے لال جوہری کا بتایا کہ ہمارے بھی بزرگوں میں ایک جوہری صاحب ہیں۔ ان کا ہی خیال کر لیجیے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ تم نے اپنے خط کے ساتھ جو کسی اور کا خط بھیجا تھا وہ پکڑا گیا ہے اور تمھارے خلاف فائل بن گئی ہے۔ اس لیے تمھیں ویزا نہیں مل سکتا۔"

"تم نے انھیں یہ بات نہیں بتائی تھی؟"

"جی بتائی تو تھی۔ مگر وہ کہنے لگے۔ دلوں میں میل آ جائے تو پھر

بدگمانیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ اور تم بھی ابھی بدگمانیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہو۔ مجھے یاد ہے انھوں نے یہی لفظ بولے تھے۔" اب احمد نے سکون کی سانس لی۔ چلو اب چچا میاں کو اصل واقعہ تو معلوم ہو گیا۔ اب ان کا غصہ اتر جائے گا۔

"ہاں، ایک بار کھٹ پٹ ہو جائے تو پھر غلط فہمیاں بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ ہر جگہ دال میں کالا نظر آتا ہے۔" چچا میاں یہ کہہ کر ہنسے۔ "وہ ایک قصہ مشہور ہے نہ کہ دو پٹھان بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ان کی ماں جس بھائی کے ساتھ تھی وہ ایک دن بھاگا بھاگا آیا کہ اماں اماں، میں گلی سے گذر رہا تھا تو بھائی نے مجھے دیکھ کر تھوکا۔ ماں فوراً اندر گئی اور تلوار نکال کر لائی۔ لے، جا کے اس کی گردن اتار لا۔ اس کی یہ مجال کہ تیرے اوپر تھوکے۔ تم جانتے ہو اپنے پٹھان بھائی تھوکتے بہت ہیں، نسوار جو کھاتے ہیں۔" یہ کہہ کر چچا میاں پھر ہنسنے لگے۔

"پھر مجھے ایسا غصہ آیا کہ اس کے بعد پھر میں نے ویزا کی کوشش ہی نہیں کی۔ اب بھی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے آیا ہوں۔ ویزا انھوں نے خود دیا ہے میں نے درخواست نہیں کی۔"

"جبھی تم دھیا چھونے آئے ہو۔" چچا میاں کی آواز میں وہی پرانا ڈانٹنے والا انداز تھا۔ "یہ بھی کوئی آنا ہوا کہ صرف دو دن میں چلے جاؤ گے۔"

"میں پھر آؤں گا۔ اب تو پاؤں کھل گیا ہے۔" اس نے پھر چچا میاں سے بے تکلفی کی۔

"ہاں، اگر پھر لڑائی بھڑائی نہ ہو گئی تو۔" احمد کو اچھا لگا کہ کم سے کم اس بہانے ہی سہی چچا میاں ہنس تو رہے ہیں۔

"عقیل کیا کر رہا ہے آج کل؟" احمد نے اس خیال سے کہ کہیں وہ پھر حسنہ کا نہ پوچھنے لگیں ان کے چھوٹے بیٹے کا ذکر چھیڑ دیا جو ان کے ساتھ ہی ان کے اُدھرے گھر میں رہتا تھا۔

"آج کل بنگلور کی طرف گیا ہوا ہے۔" انھوں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "ادھر ادھر سے چیزیں خرید کے عرب ملکوں کو بھیجتا ہے۔ کبھی مراد آباد میں ہوتا ہے تو کبھی کانپور یا بمبئی میں، کبھی بنگلور اور مدراس کی طرف نکل جاتا ہے۔" چچا میاں کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔ "اللہ کا شکر ہے اس کا کام اچھا چل رہا ہے۔"

احمد خود بھی دیکھ چکا تھا کہ اس گھر میں جو سامان نظر آ رہا ہے اس میں عقیل کی خوش حالی کا بھی دخل ہے۔ "یہ اچھی بات ہے کہ ہمارے خاندان کے لڑکے بھی کاروبار کرنے لگے۔" احمد نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"کاروبار نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟ اب باپ دادا کی زمینیں تو رہی نہیں اور نوکریاں بھی کہاں ملتی ہیں۔" چچا میاں اپنے بیٹے سے خوش تھے۔ "اب تو لڑکے کاروبار بھی کر رہے ہیں اور ہنر بھی سیکھ رہے ہیں۔ وہ جو نواب صاحب نے دارالصناعت بنایا تھا دستکاریاں سکھانے کے لیے اس طرح کے کئی ادارے اور بن گئے ہیں۔ اسے اب لگھو ادیوگ کہا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر چچا میاں پھر ہنسے۔

"عقیل ہندوؤں کے ساتھ بھی کاروبار کرتا ہے؟" اب احمد کے اندر کا پاکستانی مسلمان جاگ اٹھا تھا۔

"کاروبار میں ہندو مسلمان نہیں ہوتا۔" چچا میاں زور سے ہنسے۔ "اس کا حصے دار ایک ہندو ہے۔"

"اور ہندو مسلم جھگڑے؟" احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"وہ بھی چلتے رہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہے، وہ سیاست۔ جب کاروبار اور سیاست اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

احمد نے حیرت سے اپنے چچا کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا میں چلوں، پھر آؤں گا۔ شاید اصغر آ گیا ہو۔ میں وہاں سامان رکھ کے آ گیا تھا۔ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔"

"تم یہیں آ کر ٹھہرتے نہ، اس پگلے کے پاس کیوں ٹھہرے ہو؟ وہاں کون دیکھ بھال کرے گا تمھاری۔" چچا میاں بھی کھڑے ہو گئے تھے، ایسے کہ ان کی کمر کمان بن گئی تھی۔ وہ پگلا احمد کے سب سے چھوٹے بھائی اصغر کو کہہ رہے تھے۔ اس بھائی نے اپنی زندگی جس ڈھرے پر ڈال رکھی تھی وہ واقعی اس کا پاگل پن تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ ایم اے کیا تھا۔ ایل ایل بی کیا تھا۔ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان دیا تھا۔ پاس ہو گیا تھا۔ مگر انٹرویو میں نہیں بیٹھا۔ کہتا تھا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے نہیں لیں گے میں مسلمان ہوں نہ۔ یہ اس کا بہانہ تھا یا سچ؟

پاکستان میں بیٹھ کر تو احمد اسے سچ ہی سمجھتا تھا مگر چچا میاں اور چچا صاحب دونوں اسے بہانہ ہی کہتے تھے۔ کہتے تھے۔ انٹرویو دینے میں کیا حرج تھا۔ زیادہ سے زیادہ رہ ہی جاتا نہ۔ حکومت کا امتحان بھی ہو جاتا۔ لیکن خورشید کا بھائی، جو خود بھی ایم اے تھا، وہ بھی وہی کہتا تھا جو اصغر نے کہا تھا۔ اب اصغر نے اسکول کھول لیا تھا۔ تھوڑی بہت زمینیں جو بچی رہ گئی تھیں ان سے اناج آ جاتا تھا۔ یہ سب باتیں احمد کو پاکستان میں ہی معلوم ہو گئی تھیں مگر چچا میاں نے اصغر کو پگلا کہہ کر اسے پھر یہ سب کچھ یاد دلا دیا تھا۔

"مگر خیر، تمھیں وہیں ٹھہرنا چاہیے۔ آخر وہ تمھارا ہی گھر ہے۔" چچا میاں نے کہا اور اس کی پیٹھ پر دو تین تھپکیاں دیں۔

"میرا گھر؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں؟" چچا میاں اس کے اس طنزیہ سوال پر کچھ ناراض سے ہوئے۔ "یہ تمھارے پر دادا اسگر دادا کا گھر ہے۔ ہمارے تمام گھروں میں سب سے پرانا گھر ہے یہ۔ تمھارے دادا نے یہ گھر تمھارے ابا میاں کو دیا تھا۔ تمھاری نال یہاں گڑی ہے۔"

یہ گھیر یا احاطہ احمد کے دادا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پردادا، سگر دادا نے تو ایک گھر بنایا ہوگا۔ مگر اس کے دادا نے یہ سارا گھیر آباد کیا تھا۔ لال مسجد سے نالہ پار کی طرف جاتے ہوئے تھوڑے ہی فاصلے پر دائیں ہاتھ کو جو دوسری سڑک مڑتی ہے وہی اس کے دادا کے نام والا گھیر ہے۔ سیدھے ہاتھ کونے پر ابا میاں کا یا اب اصغر کا مردانہ گھر ہے۔ پہلے اس گھر کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر سڑک پر کھلتا تھا اور دوسرا گلی کے اندر۔ اب سڑک والا دروازہ بند ہو گیا

ہے کیوں کہ اس گھر کا ایک حصہ مسیتا بھائی نے خرید کر اپنے تنگ گھر کو کشادہ کر لیا ہے۔ مسیتا بھائی خورشید کے باپ تھے۔

"یہ حصہ منجھلے بھائی خود ہی بیچ گئے تھے۔" یہ بات چچا میاں نے اسے شرمندہ کرنے کے لیے کہی تھی۔ "جب سارے ہی بڑے بیٹے انھیں چھوڑ کر چلے گئے تھے تو ان کا یہ حال ہونا ہی تھا۔ اور پھر بغیر ماں کے ایک بچے کو بھی پالنا تھا۔ وہ تو یہ کہو کہ تمھاری پھپھی ان کے پاس آ گئی تھیں ورنہ معلوم نہیں ان کا کیا ہوتا۔" چچا میاں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ کچھ سوچا تھا اور پھر کہا تھا۔ "آزادی کے فوراً بعد کسی کا بھی حال اچھا نہیں تھا۔" وہ اپنی بات بھی کر رہے تھے۔

گلی کے اندر دوسرا دروازہ احمد کے زنانہ گھر کا ہے۔ چچا میاں نے اسی گھر کے لیے کہا تھا کہ وہاں احمد کا نال گڑا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چچا صاحب کا گھر ہے۔ چچا میاں ان دنوں جس گھر میں ہیں وہ بالکل سامنے ہے۔ یہ سب سے بڑے چچا کا گھر تھا جس میں ان کے اکلوتے بیٹے رہتے تھے۔ سب سے بڑے چچا کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے پاکستان چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ یہ گھر چچا میاں کو دے گئے تھے۔ چچا میاں کا اپنا گھر گلی میں داخل ہوتے ہی الٹے ہاتھ پر ہے۔ اس میں ان کا بیٹا عقیل رہتا ہے، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ اس کے آگے بیٹھک تھی جو اب گھر میں شامل کر لی گئی ہے۔ وہ بیٹھک اس لیے کہلاتی تھی کہ سامنے سے کھلی تھی ورنہ وہ بھی پورا گھر تھا۔ ایک بڑا سا کمرہ۔ اس کے آگے دالان۔ سامنے چبوترہ۔ اس کے سامنے کھلا چوک۔ اس چبوترے پر شام کو شطرنج کی محفل جمتی جو رات گئے تک جاری رہتی۔ یہ محفل چچا میاں کی تھی۔ اس میں شہر کے بڑے بڑے مشہور شاعر، ادیب اور اسکولوں اور کالجوں کے استاد شریک ہوتے تھے۔ لیکن شطرنج کی محفل جمنے سے پہلے یہ چھوٹا سا چوک لڑکوں کے قبضے میں ہوتا۔ یہاں گیڑیاں، انٹے، چڑھے چڑھائے اترے اترائے اور لکڑی کے ڈنڈوں سے ہاکی کھیلی جاتی۔ لڑکوں کو مغرب کی اذانوں تک باہر کھیلنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد یہ چوک بڑوں کا ہوتا تھا۔ احمد کے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس بیٹھک کے آگے تمام گھر بھی اسی کے خاندان کے تھے۔ مگر پھر آگے کے تین گھر کچھ اور لوگوں نے خرید لیے تھے۔ وہ تینوں دکان دار یا ٹھیکیدار تھے۔ اس سے آگے جا کر جہاں یہ گھیر بند ہو جاتا تھا وہاں ایک کھلا میدان تھا۔ اسے سب کھنڈر کہتے تھے۔ یہ بڑے چچا کے حصے میں آیا تھا۔ بعد میں وہاں ان کے بیٹے نے چاروں طرف کوٹھریاں بنا دی تھیں۔ ان میں تیلی اور جلاہے آباد ہو گئے تھے۔ یہ گھرانے جہاں احمد کے خاندان کو تیل، کھلی، اور بھیس اور دریاں فراہم کرتے تھے وہاں اس خاندان کے گھروں میں کام کرنے والے لڑکے، لڑکیاں اور عورتیں بھی وہیں سے آتی تھیں۔

اس گھیر کے تمام گھر کھڑکیوں اور موکھوں کے ذریعہ اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ پردہ دار عورتوں کو اپنے دروازے سے باہر پاؤں رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ احمد کی اماں، اس کی چچیاں اور بہنیں اندر ہی اندر تمام گھروں میں پھر لیا کرتی تھیں۔ ہاں، اگر گلی کے الٹے ہاتھ والے گھر جانا ہوتا تو گلی کے موڑ پر دو آدمی چادر تان کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر کبھی کبھی یہ کھڑکیاں بند بھی ہو جاتی تھیں۔ ان کھڑکیوں کا قصہ بھی خوب تھا۔ جب دیورانیوں جٹھانیوں میں کسی بات پر ٹھن جاتی تو سب سے پہلے کھڑکی ہی بند ہوتی۔ لیکن پھر وہ کھل بھی جاتی کیوں کہ یہ لڑائی زیادہ دیر نہیں چلتی تھی۔

"ہاں وہ۔" اس کے چچا کو کچھ یاد آیا۔ "ماسٹر ممتاز تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہمیشہ پوچھتے رہتے ہیں۔ نسیم کے بیٹے کو بھیج دینا وہ انھیں تلاش کر کے بلا لائے گا۔" نسیم چچا صاحب کی لڑکی تھی جو ان کے گھر میں رہتی تھی۔

احمد نے حیرت سے اپنے چچا کے منھ کو دیکھا۔ اسے تعجب ہوا کہ اس کے یہ چچا ماسٹر ممتاز سے ملنے کو کہہ رہے ہیں۔ وہ تو احمد سے ناراض ہی اس بات پر رہتے تھے کہ وہ ماسٹر ممتاز سے ملتا ہے۔

"میں خود مل لوں گا ان سے۔" احمد نے کہا۔

"کہاں ملو گے ان سے؟ ان کا تو کوئی گھر بار ہی نہیں ہے۔ کبھی کسی کے یہاں پڑ رہے کبھی کسی کے یہاں۔"

"اور ان کی بہن؟" احمد نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"اب کوئی نہیں ہے ان کا۔"

اصغر بھی اس کے گلے لگا اور رونے لگا۔ یہاں سب اس سے مل کر رو رہے تھے۔ احمد دل کڑا کیے کھڑا رہا۔ اس بھائی نے بھی احمد کو کب دیکھا تھا۔ وہ بچہ ہی تھا جب احمد پاکستان چلا گیا تھا۔ احمد کو بھی ایسا لگا جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ اس نے خشخشی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس کی داڑھی میں سفید بال تھے۔ احمد کے حلق میں کچھ اٹک سا گیا۔ اس کے سر پر بھی سفید بال آ گئے ہوں گے؟ ٹوپی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہے ہیں؟۔ احمد نے سوچا۔ اس نے اصغر کو اپنے سینے سے ہٹا کر اسے غور سے دیکھا۔ کتنا ملتا ہے ابا میاں سے۔ ہو بہو وہی شکل ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد ہی اماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور پھر احمد پاکستان چلا گیا تھا۔ تو کیا وہ اس گھر میں اماں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہاں گیا تھا؟ مگر اس کے دو بڑے بھائی اس سے پہلے وہاں جا چکے تھے اور اماں انھیں یاد کر کر کے روتی رہتی تھیں۔ بعد میں ایک اور بھائی بھی پاکستان چلا گیا۔ یہ بھی اصغر سے بڑا تھا۔

مردانہ گھر جسے وہ کھانچی کہتے تھے کھنڈر بنا ہوا تھا۔ یہ کیا ہوا؟ احمد نے پوچھا۔ برسات میں ڈھے گیا تھا۔ بنواؤں گا۔ یہ کہہ کر اصغر جھینپ گیا احمد سمجھ گیا کہ اس کے پاس گھر بنانے کو پیسے نہیں ہیں مگر وہ اس کے سامنے کہنا نہیں چاہتا۔ یہ ہمارا خاندان ہے۔ احمد دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ مردانہ گھر جو اب کھنڈر بنا ہوا تھا اصغر کے حصے میں آیا تھا۔ جس گھر میں وہ رہ رہا تھا وہ اس بھائی کا حصہ تھا جو دلی میں رہتا تھا۔ اس کا کام بہت اچھا تھا۔ ٹھیک ٹھاک پیسہ تھا اس کے پاس۔ اس نے اس گھر کا پرانا حصہ گرا کے نیا بنوا لیا تھا۔

"اگر اس نے یا اس کے بچوں نے کہا یہ گھر خالی کر دو تو کیا کرو گے؟" احمد نے اصغر کو ٹٹولا۔

"خالی کر دوں گا۔" اس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ احمد سے ہی نا

سائنس تھا۔ کہتا تھا۔ خود بھی گئے اور ابا میاں کو بھی بلا کر ہمیشہ کے لئے وہیں کا بنالیا۔

"پھر کہاں رہو گے؟ اس کھنڈر میں؟"

"اس وقت تک بنالوں گا اسے۔" یہ کہہ کر وہ ایسے ہنسا کہ احمد کا دل کٹ کے رہ گیا۔ میں کیا کروں؟ احمد نے سوچا۔ مجھے ضرور کچھ کرنا چاہئے۔ بھیج دوں گا پیسے کسی طرح۔

اصغر کے کمرے میں کوئی پلنگ نہیں تھا صرف ایک فوم کا گدا، دو کرسیاں اور کتابوں سے لدی ایک میز پڑی تھی۔ گدے کے ساتھ ہی ٹی وی رکھا تھا۔ ٹی وی میں کیبل لگا نظر آرہا تھا۔

"اچھا۔ تو تم نمازیں پڑھتے رہتے ہو اور ٹی وی دیکھتے رہتے ہو؟" احمد نے اسے چھیڑا اور وہ بچوں کی طرح ایسے شرمایا کہ احمد کو بے ساختہ اس پر پیار آگیا۔ یہ میرا بھائی ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی، جسے میں نے پچاس برس بعد دیکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے بعد اسے دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کہیں اصغر اس کی آنکھیں نہ دیکھ لے۔

اصغر نے احمد کے لیے دوسرا کمرہ صاف کرادیا تھا۔ یہاں پلنگ بھی تھا اور صاف ستھرا بستر بھی۔ احمد دس بارہ دن کا تھکا ہوا تھا۔ اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بستر سے پیٹھ لگتے ہی اسے نیند آجائے گی۔ لیکن جیسے ہی وہ بستر پر لیٹا اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ یہ کمرہ ابا میاں اور اماں کا تھا اور ان دودھ پیتے بچوں کا جو ہر ڈھائی تین سال بعد اس کمرے میں نازل ہوتے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور اماں کو یاد کیا جو بچے کی پیدائش میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے چھت کی کڑیاں گننا شروع کیں کہ شاید اس طرح نیند آجائے۔ ایک دو تین۔ بچپن میں جب اسے نیند نہیں آتی تھی تو اماں کہتی تھیں۔ چھت کی کڑیاں گنو نیند آجائے گی۔ اس نے اندھیرے میں گھور کر دیکھا۔ وہاں تو کڑیاں ہی نہیں تھیں سیمنٹ کی چھت تھی۔ اسے یاد آیا کہ دلی والے بھائی نے یہ سارا حصہ توڑ کر نیا بنوالیا ہے۔ تو وہ کیا گن رہا تھا؟ اسے ہنسی آگئی۔

اب وہ یادوں کے بھنور میں تھا اور گھومتی لہریں اسے نیچے نیچے اور نیچے لے جارہی تھیں۔ وہ حیران ہوا کہ سب سے پہلے اسے منی خالہ یاد آئیں۔ منی خالہ اس کی خالہ نہیں تھیں۔ بلکہ اس کی رشتے دار ہی نہیں تھیں۔ برابر کے محلے میں رہتی تھیں۔ پہلے ان کا بڑا بیٹا احمد کے گھر میں کام کرتا تھا۔ وہ جوان ہوگیا تو چھوٹا بیٹا کام کرنے لگا تھا۔ ان دنوں اس شہر میں آئس کریم نئی نئی آئی تھی۔ کوئی آئس کریم جانتا ہی نہیں تھا سب برف جانتے تھے جو موٹے کپڑے کی پٹیوں میں لپٹی بکتی تھی اور بڑ کے پتے پر رکھ کر کھائی جاتی تھی۔ ایک دن منی خالہ احمد کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ باہر سے آواز آئی۔ آئس کریم، آئس کریم! منی خالہ آواز سن کر چونکیں۔ "اے ہے۔ یہ مٹا کون ہائے مسکین ہائے مسکین چیخ رہا ہے، ذرا دیکھو تو جاکے۔ کون مرگیا ہے اس کا؟" سب نے انھیں سمجھایا، منی خالہ، یہ ہائے مسکین نہیں کہہ رہا ہے آئس کریم کہہ رہا ہے۔ آئس کریم برف ہوتا ہے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

احمد نے لمبی گہری سانس اپنے سینے میں اتاری۔ یہ تھے اس کے شہر کے رہنے والے اور اس کا شہر۔ آس پاس کے تمام بڑے شہروں سے دور اور اپنے خول میں بند۔ انھیں کوئی غرض نہیں تھی اپنے ارد گرد سے۔ وہ اپنے غلاف میں ہی مگن تھے۔ یہ شہر، یہ ریاست ہی ان کی دنیا تھی۔ اس سے باہر ان کے لئے کچھ نہیں تھا۔ پھر اسے وہ لالہ یاد آگئے جو چٹ پٹے چنے بیچتے تھے۔ سفید جھک ململ کا کرتا اور ایسی ہی سفید دھوتی۔ ہمیشہ تیسرے پہر کو اس گھیر میں آتے تھے۔ آواز آتی۔ شیام بولو! اور بچے اپنی ماؤں سے پیسے لے کر ان کی طرف دوڑتے۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ چنے لے لو، یا چنے چٹ پٹے۔ وہ بڑی ہی میٹھی آواز میں پکارتے۔ شیام بولو! اور بچے انھیں گھیر لیتے۔ ان کے چنوں کا اپنا ہی مزا تھا۔ احمد نے پھر ایسے چنے نہیں کھائے۔ ان کی ایک آنکھ نہیں تھی مگر مجال ہے کبھی کوئی بچہ انھیں چھیڑ لیتا۔ وہ بچوں سے اتنا پیار کرتے تھے کہ بچوں کو کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ان کی ایک آنکھ نہیں ہے۔ کوئی اور ایسا چنے یا کوئی اور چیز بیچنے والا ادھر آکر تو دکھاتا، کانا دجال کہہ کر اس کی ایسی خبر لی جاتی کہ پھر وہ بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ اور پھر وہ پنجابی محلے کے رہنے والے بزرگ بھی تو تھے جو ناشتے دان میں طرح طرح کے مربے بیچنے آتے تھے۔

"بچہ کھائے جوان ہوجائے، جوان کھائے پہلوان ہوجائے، پہلوان کھائے ہاتھی بان ہوجائے۔" اور ہاں۔ ایک نادیہ بیل بھی تو تھا۔ کسی خاص موسم میں ایک آدمی خوب پلا پلایا ہنا کٹا بیل لیے آتا تھا۔ اس سفید بیل کی پیٹھ پر صاف ستھری جھول پڑی ہوتی تھی۔ اسے سب نادیہ بیل کہتے تھے۔ ہر گھر سے اسے کچھ نہ کچھ دیا جاتا تھا۔ بچوں کو بتایا جاتا تھا کہ اس بیل کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی پیٹھ پر بھی ایک زبان ہے۔ وہ بیل آتا تو سب بچے اسے گھیر لیتے۔ زبان دکھاؤ زبان دکھاؤ۔ اور وہ آدمی اس کی پیٹھ پر سے تھوڑی سی جھول اٹھاتا اور کہتا۔ لو دیکھو۔ اور بچوں کو بیل کی پیٹھ پر زبان نظر بھی آجاتی۔ یہ احمد کو کب خیال آیا کہ وہ بیل شیو جی کی سواری نندی تھا جو مسلمان محلوں میں نادیہ بیل بن جاتا تھا شاید پینتیس چالیس برس بعد پاکستان میں۔ اور جب اسے خیال آیا تھا تو وہ خوب ہنسا تھا۔ اب بھی وہ ہنس رہا تھا۔ اور ایک صاحب آتے تھے۔ قسم قسم کی کتابیں لے لو۔ وہ آتے اور لڑکے انھیں گھیر لیتے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ہیں؟ وہ کہتے نہیں ہیں تو ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں قسم قسم کی کتابیں لے لو؟ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لڑکے میٹرک میں پہنچ گئے تھے۔ پھر اسے چمنوا خاں یاد آگئے۔ نام تو رحمت اللہ خاں تھا مگر چمنوا کہلاتے تھے۔ کئی برس میٹرک میں لگائے تھے۔ اچھی شکل کے لڑکوں پر عاشق ہوجانا ان کا مشغلہ تھا۔ میٹرک میں ہی تھے تو ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہوگئے۔ لڑکے نے آنا کانی کی تو دانتوں سے اس کی ناک کاٹ لی۔ باپ نے فوراً علی گڑھ بھیج دیا۔ باز وہ پھر بھی نہ آئے۔ اپنے شہر آتے، کسی کے چھرا مارتے اور کسی کا لاٹھی مار کے سر پھاڑ دیتے اور علی گڑھ بھاگ جاتے۔ بڑے بھائی مشہور وکیل اور کانگریس کے صدر تھے۔ بعد میں خود وہ بھی وکیل بن گئے تھے۔ خیر، چھری چکو مارنا تو شہر والوں کا روزمرہ کا شغل تھا۔ ہر محلے میں تو چھری چاقو بنتے تھے۔ لیکن کسی نے احمد کو پاکستان میں ہی بتایا تھا کہ اب یہاں چاقو چھری کے ساتھ بندوقیں، رائفلیں اور ریوالور بھی بن رہے ہیں۔ چاقو چھری کی طرح اب یہ بھی

یہاں کی گھریلو دستکاری ہے۔

سبحان شاہ میاں اور میاں گل کے مزاروں کے گنبد اور ان کے احاطے کا باغ بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ پھاٹک اتنا نیچا ہو گیا تھا کہ احمد اس کی کھڑکی سے اندر جاتے ہوئے بالکل دوہرا ہو گیا تھا پھر بھی اس کا سر ٹکرا گیا۔

"اوہو، چوٹ تو نہیں لگی؟" اندر سے آواز آئی۔ یہ ایک نوجوان تھا جو اپنے ننگے بدن پر بنیان چڑھاتا ان کی طرف آ رہا تھا۔

"یہ عزیز بھائی کے پوتے ہیں۔" اصغر نے بتایا۔ "عزیز بھائی کا تو زمانہ ہوا انتقال ہو گیا۔"

ان مزاروں کی جنہیں سب زیارت کہتے تھے، دیکھ بھال عزیز بھائی کرتے تھے۔ ان مزاروں کے مجاور کون تھے؟ یہ احمد کو کبھی پتہ نہیں چلا۔ وہ تو صرف عزیز بھائی کو جانتا تھا جو گرمیوں میں سب بچوں سے بیلے اور چنبیلی کے پھول چنواتے تھے۔

"بیلے کی پکی پکی کلیاں اس طرح توڑو کہ کلی کی دم میں جو پھندنا لگا ہے وہ ڈالی میں لگا نہ رہ جائے۔ اگر وہ ڈالی میں لگا رہ گیا تو اس ڈالی میں نئی کونپل دیر سے پھوٹے گی اور اس میں کلی بھی دیر سے آئے گی۔ کیوں کہ اس ڈالی کو انتظار کرنا پڑے گا کہ کب وہ پھندنا سوکھے اور کب جھڑے۔ یہ پھندنا توڑ کر ہم ڈالی کی مدد کرتے ہیں۔" وہ عزیز بھائی کی نقل اتار رہا تھا۔

عزیز بھائی احمد کے رشتے دار نہیں تھے۔ مگر رشتے داروں سے بھی زیادہ تھے۔ وہ احمد کے اور اس کے چچاؤں کے گھر اس باغ کے آم، جامن، کیت، کھرنیاں اور امرود بھیجتے تھے۔ امرود جو اس علاقے میں سفری کہلاتے ہیں۔

"پھر بھی ہم پھل چرایا کرتے تھے۔" احمد نے عزیز بھائی کے پوتے کو بتایا۔ "چوری کے پھل کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ جب عزیز بھائی نہ ہوتے تو ہم آم اور سفریاں توڑ کر بھاگ جاتے۔ جامنیں توڑنے کی اس لیے ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود ہی اتنی گرتی تھیں کہ ہم جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے پھر بھی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ جامن کا پیڑ ادھر سامنے تھا۔ آم کے پیڑ اس کونے میں اور پیچھے تھے۔ وہاں سامنے ہارسنگھار کے پیڑ تھے۔ ان میں جب پھول آتے تو ہم کرتے کے دامن بھر بھر کے پھول گھر لے جاتے۔ ان کے پیلے پیلے ڈنٹھلوں سے ہمارے سفید کرتے پیلے ہو جاتے۔ اور پھر اماں سے ڈانٹ پڑتی۔ تم نے پھر کرتا رنگ لیا۔ اب یہ دھلے گا بھی نہیں۔ اور ہم کہتے۔ اماں یہ تو زردے کا رنگ ہے۔ اور وہ چیختیں۔ خاک زردہ کا رنگ ہے۔ آنے دو ابا میاں کو، وہ خبر لیں گے تمہاری۔ برسات میں ان پیڑوں کے نیچے لال لال بیر بہوٹیاں ہوتی تھیں۔ ہم وہ بیر بہوٹیاں بھی پکڑتے تھے۔ ہم پکڑ تو لیتے تھے مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ان کا کیا کریں اس لیے تھوڑی دیر بعد انہیں چھوڑ دیتے تھے۔"

بولتے بولتے اسے خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول رہا ہے۔ مگر جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوب بولے۔ ہر ایک کو بتائے کہ اس کا بچپن اور لڑکپن کیسا تھا۔ وہ لوگ اور وہ جگہیں کیسی تھیں جو اس کے بچپن میں تھیں۔ اس کے ساتھ کھیلنے والے اور اس کے ساتھ پڑھنے والے کون تھے اور کیسے تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اب وہ لوگ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ اسے یاد کرتے ہیں یا نہیں؟

عزیز بھائی کا پوتا منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور یہ کیا باتیں کر رہا ہے۔

"اس باغ کے پھل بیچے نہیں جاتے تھے۔ سب گھروں میں بانٹ دیئے جاتے تھے۔"

"یہ میرے بھائی ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔" اصغر نے اس لڑکے کی حیرت کچھ کم کی۔ وہ لڑکا تو پھر عزیز بھائی کا پوتا تھا خود اس کے اپنے بہت سے چچیرے، ممیرے اور پھپھیرے، بہن بھائیوں، بھتیجے بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں نے بھی احمد کو پہلی دفعہ ہی دیکھا تھا۔

"ہم بچپن میں یہاں کھیلا کرتے تھے۔" احمد نے اپنا تعارف کرایا۔ "سبحان شاہ میاں کی زیارت کی جو غلام گردش ہے ہم اس کے گرد دوڑتے تھے اور ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔"

"اب بھی بچے یہاں کھیلتے ہیں۔" یہ اصغر نے کہا۔

"پہلے تو یہاں ہندو مسلمان سب ہی آتے تھے؟" احمد نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"جی، اب بھی آتے ہیں۔" نوجوان نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"اب بھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر پیسے رکھ جاتے ہیں؟" احمد کو کچھ یاد آیا۔

"جی ہاں۔ اب بھی رکھ جاتے ہیں۔" وہ نوجوان ہنسنے لگا۔ احمد نے اسے یہ نہیں بتایا کہ محلے کے کھاتے پیتے ہندو بنیے جب یہاں آتے تھے تو سب لڑکے پیڑوں میں چھپ کر ان کے جانے کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے جاتے ہی وہ سیڑھیوں پر جاتے اور وہ جو پیسے دو پیسے اور آنے دو آنے رکھ کر جاتے وہ اٹھا لیتے اور سب مل کر اس کی گجک کھایا کرتے تھے۔ مسلمان پیسے ویسے نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو آتے، فاتحہ پڑھتے اور چلے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ بتاشوں کے دونے لایا کرتے تھے۔

"ہندو اب بھی پھاٹک پر ہی جوتے اتارتے ہیں؟" احمد سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔

"جی۔ بالکل وہیں اتارتے ہیں۔ مگر اب وہ زیادہ نہیں آتے۔" وہ نوجوان کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ "کچھ بڈھے ٹھڈے جو رہ گئے ہیں وہی آ جاتے ہیں۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" یہ بات اصغر نے کچھ ایسے لہجے میں کی کہ احمد نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ وہ ابا میاں والی معصومیت کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ احمد کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

پھاٹک کے دائیں طرف ذرا سی اونچائی پر ایک بڑی سی کوٹھری تھی۔ اس میں حافظ بدھا بچوں کو قرآن حفظ کرایا کرتے تھے۔ حافظ جی نابینا تھے مگر انہیں سب معلوم ہوتا تھا کہ کس کونے میں بیٹھا کون سا بچہ پڑھ رہا ہے اور کون سا نہیں پڑھ رہا،

کھیل رہا ہے۔

"اب یہاں کون پڑھاتا ہے؟" احمد نے اس نوجوان سے پوچھا۔

"حافظ جی کے بعد تو یہ مدرسہ ہی ختم ہو گیا۔" یہ جواب اصغر نے دیا۔

"مگر تم حافظ جی کو کیسے جانتے ہو۔ تم تو بہت چھوٹے تھے؟" احمد نے پوچھا۔

"وہ تو بہت بعد میں مرے تھے۔ ان کی عمر بہت تھی۔"

"پھر تو تمہیں بندا شاہ میاں بھی یاد ہوں گے؟"۔ احمد کو اب بندا شاہ میاں یاد آ گئے۔

"بندا شاہ میاں کون؟" اصغر بندا شاہ میاں کو نہیں جانتا تھا۔ احمد بھی بس اتنا جانتا تھا کہ ملنگوں کے سے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور سر کے بال بڑھائے ایک بزرگ ہر سال بارہ وفات کے مہینے میں یہاں آیا کرتے تھے۔ کہاں سے آتے تھے؟ یہ بھی احمد کو معلوم نہیں تھا۔ احمد کی عمر ہی ایسی تھی۔ بڑے بڑے کھچڑی بال، ہاتھوں میں کڑے اور کانوں میں لمبے لمبے بندے۔ ان بندوں کی وجہ سے ہی انہیں بندا شاہ میاں کہا جاتا تھا۔

"بندا شاہ میاں کیا آتے ہم سب بچوں کے لیے ایک تماشا آ جاتا۔" احمد اب اس کنوئیں کے گرد بنے چبوترے پر بیٹھ گیا تھا جس کے دائیں بائیں دو ستون کھڑے تھے۔ ان ستونوں پر لکڑی کی موٹی سی بلی پڑی تھی جس کے بیچ میں چرخی تھی۔ اس چرخی سے رسے میں بندھے دو ڈول لٹک رہے تھے۔ اس کنوئیں سے سارے باغ کو پانی دیا جاتا تھا۔ عزیز بھائی لڑکوں میں مقابلہ کراتے کہ کون زیادہ دیر تک یہ ڈول کھینچے گا۔ لڑکوں کو کھیل مل جاتا اور عزیز بھائی کا باغ سیراب ہو جاتا۔ باغ سیراب ہونے کی بات احمد کی سمجھ میں بعد میں آئی تھی۔

"ایک تو بندا شاہ میاں کا عجیب و غریب حلیہ تھا، اوپر سے ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کوڑا ہوتا تھا۔" احمد نے پھر کہانی سنانا شروع کر دی۔

"کوڑا؟" اصغر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"ہاں۔ ان کے ہاتھ میں رسیوں سے بنا ہوا ایک کوڑا ہوتا تھا۔ کہتے تھے اس سے وہ جنوں اور بھوتوں کو مارتے ہیں۔ انہیں جن بھوت تنگ کرتے تھے۔"

"اچھا؟" اصغر اور وہ نوجوان دونوں بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"ہمیں ان کے قریب جانے یا ان سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر جب وہ اپنی کوٹھری میں ہوتے تو ہم کھڑکی سے کان لگا کر کھڑے ہو جاتے۔ جیسے ہی ہم کھڑکی کے قریب جاتے اندر سے کوڑے برسانے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں۔ اور اس کے ساتھ ہی بندا شاہ میاں کی گرج دار آواز آتی۔ "ارے تو پھر آیا۔ جاتا ہے یا خبر لوں تیری۔ تکا بوٹی کر دوں گا تیری، جنات کی اولاد...اور پھر تڑاخ تڑاخ کوڑا مارنے کی آوازیں۔"

"آپ کو ڈر نہیں لگتا تھا؟" اس نوجوان نے سوال کیا جو اب تک خاموش کھڑا احمد کو تکے جا رہا تھا۔

"بہت ڈر لگتا تھا۔ مگر اتنا ہی مزا بھی آتا تھا۔ ہمارے دل زور زور سے دھڑک رہے ہوتے تھے مگر پھر بھی کھڑکی سے چپکے کھڑے رہتے تھے۔"

"اچھا؟ پھر کیا ہوا؟" اصغر منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بندا شاہ میاں نے بھائی صاحب سے شکایت کر دی کہ بچے ان کے وظیفے میں خلل ڈالتے ہیں۔ اور زیارت میں ہمارا داخلہ بند ہو گیا۔"

"زیارت میں داخلہ بند ہو گیا؟" اصغر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ زیارت میں داخلہ کیسے بند ہو سکتا ہے۔

"ہاں بھئی۔ جن دنوں بندا شاہ میاں زیارت میں مہمان ہوتے تھے ان دنوں ہم وہاں قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔"

"پھر بندا شاہ میاں گئے کہاں؟"۔ اصغر کو بہت بے چینی تھی ان کے متعلق جاننے کی۔

"مر مرا گئے ہوں گے اور کہاں گئے ہوں گے۔" احمد نے کہا۔ "بھائی صاحب شروع میں ہی پاکستان چلے گئے تھے۔ وہی ان کے میزبان ہوتے تھے۔ اب اگر وہ زندہ بھی ہوتے تو کس کے پاس آتے۔"

پھر وہ تینوں اٹھے اور پیچھے آموں اور سفریوں کے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف چل دیے۔

"بچے اب بھی یہاں لبا داس کھیلتے ہیں؟" احمد نے اصغر سے پوچھا۔

"اب کون کھیلتا ہے لبا داس، اب تو سب کرکٹ اور ہاکی کھیلتے ہیں۔" اصغر نے جواب دیا۔

"ہم یہاں لبا داس کھیلا کرتے تھے۔ سب لڑکے اکٹھے ہو کر پیڑ کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ زمین پر ایک گول دائرہ کھینچا جاتا۔ اس میں دو تین فٹ کی ایک لکڑی رکھ دی جاتی۔ ایک لڑکا وہ لکڑی اٹھا کر اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکالتا اور اسے دور پھینک دیتا۔ پھر سب لڑکے پیڑ پر چڑھ جاتے۔ جو لڑکا چور بنتا اس کا کام یہ ہوتا کہ وہ بھاگ کر جائے اور لکڑی لا کر اس دائرے میں رکھے۔ پھر پیڑ پر چڑھ کر کسی بھی لڑکے کو ہاتھ لگائے۔ چور لڑکا وہ لکڑی لا کر دائرے میں رکھتا اور کسی لڑکے کو پکڑنے کے لیے پیڑ پر چڑھتا۔ ادھر وہ پیڑ پر چڑھتا ادھر کوئی لڑکا پیڑ پر سے چھلانگ لگاتا اور وہ لکڑی دائرے سے اٹھا کر پھر دور پھینک دیتا۔ چور لڑکے کی جان اس وقت تک نہ چھوٹتی جب تک وہ کسی لڑکے کو اس طرح نہیں پکڑ لیتا کہ لکڑی دائرے میں رکھی ہو۔"

"اس میں خوب چوٹیں لگتی ہوں گی؟" اصغر پریشان ہو گیا۔

"ہاں۔ چوٹیں بھی لگتی تھیں۔ کھیل کا تو مزا ہی یہ ہے کہ اس میں چوٹیں بھی لگیں۔"

احمد کو اپنی خاندانی مسجد دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ پوری عمارت نئی بنی ہوئی تھی۔ کہاں تو اس کے دادا کے زمانے کی چھوٹی سی مسجد جس کی چھت کی کڑیوں میں ابابیلوں کی بیٹوں سے بھرے ان کے گھونسلے اور کہاں یہ بلند اور کشادہ عمارت۔

"پھول بھائی نے بنوائی ہے یہ۔" اصغر نے بڑے فخر سے بتایا۔ جیسے وہ

پھول بھائی کہہ رہا تھا وہ چچا صاحب کا چھوٹا کا بیٹا تھا جو پاکستانی شہری تھا اور اب لبنان میں ایک امریکی بینک کا وائس پریزیڈنٹ تھا۔

"پھول بھائی کسی نہ کسی طرح یہاں سے اپنا رشتہ رکھتے ہیں۔" اصغر جیسے احمد کو شرمندہ کر رہا تھا۔

"آپ کو یاد ہوگا۔" اصغر پھر بولا۔ "یہ جو مسجد کے سامنے والی زمین ہے اسے پھپھو بی نے مسجد کے نام وقف کر دیا تھا۔ اس پر شمن خاں نے پچاس ساٹھ سال سے قبضہ کر رکھا تھا۔ اب انھوں نے اسے خالی کر دیا ہے۔"

"اچھا؟" احمد کو حیرت ہوئی کہ یہاں ایسے آدمی بھی ہیں جو ناجائز قبضے میں لی ہوئی زمین واپس کر دیتے ہیں۔

"اب وہ بہت بڈھے ہو گئے ہیں نا۔ اب ان سے دکان پر بیٹھا نہیں جاتا۔ پھر ان کے بیٹوں کا اپنا کاروبار بہت اچھا ہے۔ اب انھیں دکان کی کیا ضرورت ہے۔" اصغر نے بتایا۔

"تو اس لیے شمن خاں کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا۔" احمد کو واقعی خوشی ہوئی تھی کہ مسجد کو آخر زمین مل گئی۔ احمد جب وہیں تھا تو پھپھو بی رویا کرتی تھیں کہ۔ ارے شمن کے بچے نے مسجد کی زمین ہتھیالی ہے۔ کوئی اس سے خالی کرائے نا۔ مگر ان کی کون سنتا۔ شمن خاں بہت طاقت والے اور پیسے والے تھے۔

"ہم چاہتے ہیں اس زمین کے چاروں طرف دیوار بنا دی جائے ورنہ پھر کوئی قبضہ کر لے گا۔" اصغر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا خیال ہے۔" احمد نے یونہی کہہ دیا۔

"اس کے لیے کم سے کم ستر اسی ہزار کی ضرورت ہوگی۔" اصغر نے اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ "پھول بھائی نے کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"دیکھیے ہم سے جو ہو سکے گا ہم بھی ضرور کر دیں گے۔" احمد نے جلدی سے جواب دیا اور مسجد کی بائیں طرف قدم بڑھا دیے۔ وہاں قبرستان میں اس کا خاندانی احاطہ تھا۔

"ارے یہ پکی قبر یہاں کس کی ہے؟" وہاں وہ ایک پکی قبر دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اس نے اپنی اماں، اپنے پردادا، دادا، پر بڑے چچا، چچی صاحب اور چچی جان کی قبر کو دیکھا۔ وہ سب کچی تھیں۔ اس کے خاندان میں قبر پکی کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ تو پھر یہ پکی قبر کہاں سے آ گئی؟

"یہ مرتضیٰ بھائی کی ہے۔" اصغر نے بتایا۔

"مگر یہ ہمارے قبرستان میں کیسے؟" احمد کو غصہ آ گیا۔

"ہم کیا کر سکتے تھے۔ ان کے بیٹوں نے انھیں زبردستی یہاں دفن کر دیا۔" اصغر ایسے شرمندہ تھا جیسے یہ سب اس کا ہی قصور ہو۔

"مگر چچا صاحب، چچا میاں اور پھر تم سب۔" احمد کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "یعنی کمال ہے، تم اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے قبرستان کی حفاظت ہی کر لیتے۔ آخر یہ ہمارے خاندان کا قبرستان ہے۔" احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کس کو مارے۔

"مرتضیٰ بھائی کے بیٹوں سے کون جھگڑا کر سکتا ہے۔ ان کے پاس دولت ہے، طاقت ہے۔ انھیں کون روک سکتا ہے۔" اصغر نے سر جھکا لیا۔

"زندگی میں تو وہ ہمارے خاندان میں داخل نہیں ہو سکے تھے، مر کے ہو گئے۔" احمد کھول رہا تھا غصے میں۔ "بہت کوشش کی تھی انھوں نے کہ ان کے کسی بچے کی شادی ہمارے خاندان میں ہو جائے۔ اس میں تو کامیاب نہیں ہوئے۔ اب کامیاب ہو گئے۔" اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اصغر سر جھکائے کھڑا تھا۔

احمد جلدی سے قبرستان سے نکل آیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ اصغر اسے بتا رہا تھا کہ مسجد کے ساتھ جو نالہ بہتا تھا اب وہ چھوٹی سی گندی نالی بن گیا ہے۔ اس کے کنارے کنارے جو نرکل اگتے تھے جسے یہاں سب نل کہتے ہیں اور جس سے بچے سیٹیاں بنایا کرتے تھے وہ بھی اگنا ختم ہو گئے ہیں۔ اور مسجد کے پیچھے اچھن خاں کے جو کھیت تھے وہاں بھی گھر بن گئے ہیں۔ مگر احمد اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

"ہوں، تو تمھیں اس بات پر غصہ آ گیا کہ تمھارے خاندانی قبرستان میں کسی غیر کی قبر کیوں بن گئی؟" وہ مولوی عبدالسلام خاں کے بستر کے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہو گئی تھی کہ اس نے ان کے سامنے بھی اپنے خاندانی قبرستان کا ذکر کر دیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ عبدالسلام خاں نے ساری عمر فلسفہ پڑھایا تھا۔ مسلم فلسفے پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ابھی دنوں یو پی حکومت کی طرف سے ان کی علمی خدمات پر بہت بڑا انعام دیا گیا تھا۔ اصل میں تو وہ انھیں اس انعام پر مبارک باد دینے ہی آیا تھا مگر ان کے مزاج سے ڈرتا بھی تھا۔ کہہ دیں گے۔ میں کسی انعام ونعام کے لیے نہیں لکھتا۔ اور کسی سے مبارک باد بھی نہیں لیتا۔ اس لیے آتے ہی اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ سوچا تھا کہ موقع ملا تو خوشی کا اظہار کر دوں گا۔ مولوی صاحب بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ بستر سے اٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ مگر آواز میں وہی کرارا پن تھا جو ان کی جوانی اور احمد کے لڑکپن میں تھا۔ احمد اور اس کے دوست مولوی صاحب کی ایک بات سے بہت پریشان ہوتے تھے۔ راستے میں کہیں مل جاتے تو ہمیشہ سلام کے لیے پہلے ہاتھ اٹھا دیتے۔ لڑکوں نے کئی بار تہیہ کیا کہ اب کے انھیں پہلے ہاتھ اٹھانے کا موقع نہیں دیں گے لیکن وہ ہمیشہ ہار جاتے۔ منظر کچھ یوں ہوتا۔ دور سے عبدالسلام خاں آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہلکے بادامی رنگ کی اچکن، سفید بھک پاجامہ، کالی گرگابی، سر پر اچکن کے کپڑے کی ٹوپی اور سیدھے ہاتھ میں چھڑی۔ تیز تیز قدم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں۔ لڑکے تیار ہو جاتے کہ جیسے ہی وہ قریب آئیں گے انھیں سلام کریں گے۔ مگر قریب آنے سے پہلے ہی عبدالسلام خاں کا چھڑی والا ہاتھ اٹھ جاتا اور لڑکے شرمندہ ہو جاتے۔ یہ تو بہت بعد میں احمد کو خیال آیا کہ چوں کہ مولوی صاحب کو دیکھتے ہی لڑکے نظریں نیچی کر لیتے تھے اس لیے وہ مار کھا جاتے تھے۔ ظاہر ہے وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں تو نہیں ڈال سکتے تھے۔

"تمھارے باپ کی قبر کہاں ہے؟" وہ گاؤ تکیے کا سہارا لے کر آدھے بیٹھ گئے۔ احمد خاموش رہا۔ اس سوال کا جواب مولوی صاحب کے پاس بھی تھا، وہ کیا جواب دیتا۔ "تمھاری قبر کہاں بنے گی؟" یہ سوال بہت چبھتا ہوا تھا۔ احمد پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ "کبھی تو مروگے نہ۔" یہ کہہ کر وہ ہنسے۔ احمد کھسیانا ہو گیا۔

"تمھارے بیٹے کہاں ہیں؟ دو بیٹے ہیں نہ تمھارے؟"

"جی۔"

"کہاں ہیں وہ؟" مولوی صاحب اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

"ایک انگلستان میں ہے اور دوسرا کینیڈا میں۔" احمد نے ایسے کہا کہ اپنی آواز وہ خود بھی نہیں پہچان سکا۔

"اور تم اپنے قبرستان کے لیے رو رہے ہو؟"

"مگر وہ ہمارا خاندانی قبرستان ہے۔" احمد کو مولوی صاحب کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔

"دیکھو یہ ہماری نئی کتابیں چھپ کر آئی ہیں۔" مولوی صاحب نے ایک دم موضوع بدل دیا۔ انھوں نے سرہانے رکھی تپائی پر سے دو کتابیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔ احمد نے جلدی جلدی انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک کتاب ابن رشد پر تھی اور دوسری رازی پر۔

"یہ فخرالدین رازی نہیں ہے، ابوبکر رازی ہے۔" انھوں نے احمد کو رازی والی کتاب کے ورق الٹتے دیکھ کر بتایا۔ "اور یہ کتاب ہے مسلم فلسفے پر ایرانی اور ہندوستانی اثرات سے متعلق۔" انھوں نے ایک اور کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔

"پیارے لال جوہری صاحب کہاں ہیں؟" احمد نے جلدی سے سوال کر دیا کہ کہیں مولوی صاحب اس کا امتحان نہ لینا شروع کر دیں۔

"ان کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔" مولوی صاحب نے یونہی سرسری طور پہ اسے اطلاع دی۔

"ان کا بیٹا تھا سشیل اقبال۔ وہ کہاں ہے؟" احمد کو سشیل یاد آ گیا تھا۔ گورا گورا پیارا سا لڑکا۔

"وہ دلّی میں ہے، ماشاءاللہ بڑا افسر ہے۔ آتا رہتا ہے، بالکل خیریت سے ہے۔" مولوی صاحب ایسے خوش تھے جیسے اپنے بیٹے کی بات کر رہے ہوں۔

پیارے لال جوہری مولوی عبدالسلام خاں کے لنگوٹیا یار تھے۔ مولوی صاحب کی طرح وہ بھی ویدک فلسفے اور اسلامی فلسفے میں پیرے ہوئے تھے۔ شاید اسی حوالے سے وہ اقبال کے بھی شیدائی تھے۔ یہ اقبال سے ان کی محبت ہی تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام سشیل اقبال رکھا تھا۔ یہ سنہ چھیالیس سینتالیس کی بات تھی۔ سشیل ہوگا کوئی بارہ تیرہ برس کا۔ احمد اور اس کے دوستوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس زمانے میں جب ہر طرف ہندو مسلم جھگڑے بڑھ رہے تھے ایک مولوی صاحب سشیل کو عربی پڑھانے جوہری صاحب کے گھر جایا کرتے ہیں۔

"یہاں جبہ شریف کی زیارت اب بھی ہوتی ہے؟" احمد نے یہ سوال کر تو لیا مگر پھر خیال آیا کہ مولوی صاحب تو ان بدعتوں کو مانتے ہی نہیں ہیں۔

"ہاں۔ اب بھی ہوتی ہے، کیوں؟" مولوی صاحب اس کے سوال پر حیران ہوئے۔

"بس یونہی پوچھ رہا تھا۔" احمد کچھ گڑبڑا سا گیا، لیکن اس نے پھر ایک سوال اور کر لیا۔ "اس کا جلوس صرافہ بازار سے گذرتا ہے تو کیا اب بھی ہندو صراف اپنی اونچی دکانوں سے اتر کر سڑک پر احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں؟"

"بالکل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔" مولوی صاحب کی آواز کا کرارا پن اور بھی بڑھ گیا تھا۔ "ہاں، یہ جو شرنارتھی آ کر یہاں بس گئے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے۔ اور پھر نئی نسل کے لڑکے بھی ایسے ہی ہیں۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔

جبہ شریف کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ آنحضرت کے جبہ کا ٹکڑا ہے۔ نواب صاحب کے کوئی دادا پردادا عرب سے لے کر آئے تھے۔ یہ جبہ ایک بڑے سے سنہری صندوق میں رکھا تھا۔ اس کے لیے بہت بڑا محل بنایا گیا تھا جہاں ایک کمرے میں وہ رکھا رہتا تھا۔ باقی کمروں میں اس کی دیکھ بھال کرنے والے رہتے تھے۔ لوگ برکت کے لیے اسے اپنے گھر منگایا کرتے تھے۔ اس صندوق کو جلوس کی شکل میں لے جایا جاتا تھا۔ آگے آگے ڈولے میں صندوق ہوتا پیچھے پیچھے خادمین، جو راستے بھر نعتیں پڑھتے رہتے۔ دائیں بائیں دو آدمی صندوق پر چوبری جھلتے چلتے۔ احمد کو یاد آیا کہ کسی نے اس کے بڑے چچا سے پوچھا تھا کہ کیا یہ واقعی آنحضرت کا جبہ ہے؟ تو انھوں نے کہا تھا۔ اگر ان کا نہیں بھی ہے تو کیا ہوا، ان سے منسوب تو ہے۔ اس لیے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ جلوس جس طرف سے بھی گذرتا کیا ہندو کیا مسلمان سب سڑک کے کنارے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے۔

"تم نے تو اپنے یہاں سے سارے ہی ہندو سکھ نکال دیے۔" مولوی صاحب نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔

"جی، ابھی ہیں وہاں ہندو۔" احمد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔ "سکھ بھی ہیں۔ اور وہ آپ کے پٹھانوں کے علاقے میں زیادہ ہیں۔" اس نے اپنی طرف سے مذاق کیا۔

"آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔" وہ بولے جا رہے تھے۔ "ہم یہاں بہت ہیں۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا۔"

"جی۔" احمد نے پھر بھی نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"اور مسلمانوں کی یادگاریں بھی یہاں زیادہ ہیں۔"

"جی۔" احمد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

"نقصان کس کا ہوگا؟" وہ پہیلیاں بجھوا رہے تھے۔

"جی؟"

"لڑائی میں..."

اب احمد کی سمجھ میں آیا وہ اس سے کیا کہلوانا چاہ رہے تھے۔ یہ مولوی

صاحب کے اندر کا کانگریسی بول رہا ہے۔ احمد نے سوچا۔ ان کے بڑے بھائی مولوی عبدالوہاب خاں جمعیت العلماء ہند کے صدر تھے اس شہر میں۔ یہ خود بھی کانگریسی تھے۔ ضلع کانگریس کے صدر اچھے میاں وکیل کے بہت ہی گہرے دوستوں میں سے تھے۔ احمد کو ان کی بات اچھی نہیں لگی۔

"مگر آپ جانتے ہیں جھگڑے کی بنیاد کیا ہے۔" احمد نے ان پر حملہ کر دیا۔

"کچھ بھی ہو۔ مگر ہمیں ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔" مولوی صاحب لیکچر دے رہے تھے۔

"آپ کے یہاں جو ہو رہا ہے اسے بھی دیکھا آپ نے؟" وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ "مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔"

"اسے فلسفے میں الزامی جواب کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسے اور پیٹھ کے پیچھے سے گاؤ تکیہ ہٹا کر سیدھے لیٹ گئے۔

احمد نے سوچا اسے اب یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ مگر وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ ان کی آواز نے اسے پھر بٹھا دیا۔

"ہم بھی بہت عقل مند لوگ ہیں۔" وہ آنکھیں بند کئے کئے بول رہے تھے۔ "لٹھ لے پھرتے ہیں عقل کے پیچھے۔" وہ خاموش ہوئے پھر بولے۔ "سینتالیس میں تم لوگوں نے کیا کیا تھا؟"

احمد کی سمجھ میں پھر نہیں آیا وہ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں۔ اگر وہ پاکستان بننے کی بات کر رہے ہیں تو یہ کون سا موقع ہے یہ بحث چھیڑنے کا۔ ابھی تو بحث شروع ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ وہ اچھی طرح احمد کے خیالات جانتے ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ احمد بھی ان کی سیاست سے خوب واقف ہے۔

"تم ریاست کو پاکستان میں شامل کرانا چاہتے تھے نہ؟" انھوں نے اپنی آواز میں کڑواہٹ بھر لی تھی۔

"مگر آپ تو جانتے ہیں اس کے پیچھے کون تھا۔" اب احمد کی سمجھ میں آیا وہ کس واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔

"مگر بھائی۔ تم سب نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ لی تھیں؟" اب انھوں نے آنکھیں کھول لی تھیں اور احمد کو گھور رہے تھے۔ "آگ لگ گئی تھی سارے شہر میں۔ کتنے بے گناہ مارے گئے تھے اور کتنے گھر برباد ہوئے تھے۔ ہم اب تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔"

"ہم سب بچے تھے اس وقت۔" احمد نے یہ بات اس بے دلی سے کہی جیسے اسے خود بھی اپنی بات کا یقین نہ ہو۔

"بچے تھے؟" مولوی صاحب کی آواز میں کڑواہٹ اور بڑھ گئی تھی۔ "کالجوں میں پڑھ رہے تھے تم سب۔"

مولوی صاحب جن ہنگاموں کا ذکر کر رہے تھے وہ آزادی کے ساتھ ہی اس شہر میں شروع ہوئے تھے۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں تھے جو ملک کے دوسرے حصوں میں ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی ریاست کو انڈین یونین میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ پہلی ریاست تھی جس نے اس قسم کا اعلان کیا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جلسے جلوس شروع ہو گئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ یہ مسلمان ریاست ہے اس لیے اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہئے۔

"آزادی کے اعلان میں ریاستوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے جس میں چاہیں شامل ہو جائیں۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ نواب صاحب نے ہندوستان میں شامل ہو کر مسلمانوں سے غداری کی ہے۔"

"یہ ریاست اس سرحد سے چار ساڑھے چار سو میل دور ہے جہاں پاکستان بن رہا تھا۔" مولوی صاحب ہنسے۔

"اس وقت ہمیں بتایا جا رہا تھا کہ لاہور سے ڈھاکہ تک ایک کاریڈور بنائی جائے گی جو پاکستان کا حصہ ہوگی۔ اور رام پور مین لائن پر ہے۔" احمد نے کھسیانا ہو کر اپنی صفائی پیش کی۔ "سب کے دماغوں میں یہ بات ڈال دی گئی تھی۔"

"کس نے ڈالی تھی یہ بات تمہارے دماغوں میں؟" مولوی صاحب کی جرح جاری تھی۔

احمد نے اس کا جواب نہیں دیا کیوں کہ اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جس دن پہلی گولی چلی تھی اور اس کا سب سے پیارا دوست یوسف جو سب لڑکوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا، اس کا نشانہ بنا تھا۔ احمد کو جھرجھری آ گئی۔ اس دن یوسف سفید بھک کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر سنہری بال تھے۔ گھنے اور لمبے۔ آنکھیں شربتی تھیں جو ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ اس کے ماں باپ پہلے حیدرآباد دکن میں رہتے تھے اور ایک برس پہلے ہی اس شہر میں آئے تھے۔

"میں تو آج بھی وہ دن یاد کرتا ہوں تو ٹھنڈے پسینے آ جاتے ہیں۔" احمد کو ٹھنڈ لگنے لگی۔ "آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ منظر یاد کر کے۔ پتہ نہیں کیسے ہم دونوں جلوس میں سب سے آگے آ گئے تھے۔ ہم لیڈر نہیں تھے۔ لیڈر تو اور تھے۔ مگر ہم سب سے آگے تھے۔ بہت بڑا جلوس تھا۔ کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے ہی زیادہ تھے۔ یہ جلوس جب تحصیل کے سامنے پہنچا تو وہاں پولیس نے راستہ روک لیا۔ ہم نے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ نواب صاحب کے خلاف اور وزیر اعلیٰ کے خلاف۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ صرف نعرے لگا رہے تھے۔ مگر پھر اچانک ایک گولی چلی اور میرے ساتھ کھڑا ہوا یوسف نیچے گر گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ میں نے گھبرا کر نیچے دیکھا۔ یوسف گرا ہوا تھا اور اس کے سر میں سے سفید سفید کوئی چیز نکل رہی تھی جو آہستہ آہستہ خون میں لال ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد پھر مجھے کچھ نظر نہیں آیا اور میں چکرا کر گر گیا۔" وہ چپ ہو گیا۔ اب اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ "شہر میں آگ اس کے بعد لگی۔" اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا ہوا تم گر گئے تھے، کھڑے ہوتے تو تم بھی آج یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔" مولوی صاحب بھی سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"مگر میں تو ہسپتال تک گیا تھا۔" احمد نے جلدی سے وضاحت کی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ "شاید بھاگتے ہوئے لڑکوں کے پاؤں میرے اوپر پڑے تھے تو مجھے ہوش آ گیا تھا۔ میں کسی طرح

سرکتا سرکتا در بے تک چلا گیا تھا۔ پان والوں کی تمام دکانیں بند تھیں۔ میں ان گلیوں پر لیٹ گیا جہاں پانوں کی ڈھولیاں رکھی جاتی ہیں۔ وہاں سے اٹھا تو سیدھا ہسپتال پہنچا۔ یوسف کی لاش کا تو پتہ نہیں کہاں گئی تھی مگر زخمی لڑکے سب وہاں پہنچ گئے تھے، بہت زخمی ہوئے تھے۔ پھر جانے کہاں سے بھوندا چچا آ گئے۔ وہ مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ڈانٹا کہ فوراً گھر جاؤ۔ تمھاری اماں بہت پریشان ہیں۔"

"بھوندا چچا کون؟"

"وہ نالے پار رہتے تھے۔ ہماری مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے۔"

"بھلے آدمی تھے۔ یہی طریقہ تھا تمھیں گھر بھیجنے کا۔" اب احمد بھی ہنسا۔

"مگر اس دن کی ایک اور بات مجھے اکثر یاد آتی ہے۔" احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمارا جلوس جب سٹیشن گنج کی طرف سے بازار نصراللہ خاں کے قریب پہنچا تھا تو ہندو دکان داروں نے اپنی دکانیں بند کرنا شروع کر دی تھیں۔ میں نے ایک دکان دار کو دکان بند کرتے دیکھا تو بڑھ کر اس کی ترازو پکڑ لی تھی۔ لالہ ہم تم سے تو کچھ نہیں کہہ رہے ہیں، ہماری لڑائی تو نواب سے ہے۔"

"مگر ان کی ایک لڑکی بھی ماری گئی تھی؟" مولوی صاحب نے اسے ایک اور بات یاد دلائی۔ ان کی آواز میں کڑواہٹ پھر آ گئی تھی۔

"جی وہ اوپر کھڑکی میں کھڑی تھی، اس کے بھی گولی لگ گئی۔" احمد اور کیا کہتا۔

"تو شہیدوں میں ایک ہندو لڑکی بھی شامل تھی۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب چپ ہو گئے۔ احمد کو لگا کہ وہ غصے میں ہیں اور اس بات کو اور آگے نہیں بڑھانا چاہتے لیکن احمد اپنی بات یہاں ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ اس واقعہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ اس کے پیچھے ریاست کے بھڑے لوگوں کا ہاتھ تھا؟" احمد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ نہ بولے۔

"ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ جو لڑکا اس ایجی ٹیشن کا لیڈر تھا وہ انھیں کا آدمی تھا۔ کہتے ہیں اسے پیسہ کھلایا گیا تھا کہ وہ ریاست کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے ہنگامے کرائے۔" احمد چپ ہوا کہ شاید اب وہ کچھ بولیں لیکن وہ پھر بھی خاموش رہے تو احمد نے کہنا شروع کیا۔

"مقصد یہ تھا کہ اس طرح ہندوستانی حکمرانوں کو بلیک میل کیا جائے کہ دیکھو یہاں کے لوگ تو پاکستان میں شامل ہونے کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ہم آپ کے ساتھ آ رہے ہیں۔ کہتے ہیں ادھر شہر میں آگ لگ رہی تھی ادھر اس لڑکے کو پاکستان بھگا دیا گیا؟"

احمد پھر خاموش ہوا کہ شاید اب تو وہ اس کی تائید یا تردید کریں۔ اس نے تھوڑی دیر انتظار بھی کیا مگر وہ پھر بھی کچھ نہ بولے تو اس نے پھر ہمت کی۔

"مگر احمق کون بنا؟ ہم تو تم سب کو سمجھاتے تھے مگر ہماری کون سنتا تھا اس وقت۔ اب تم جو چاہو کہتے رہو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" اب مولوی صاحب بولے۔ "پہلے شورش کرنے والوں نے آگیں لگائیں، پورے سات آٹھ دن سارا شہر ان لوگوں کے قبضے میں رہا، پھر جاٹ رجمنٹ آ گئی اور جو کسر رہ گئی تھی اس نے نکال لی۔ نقصان کس کا ہوا؟"

"جی، چن چن کر مارا تھا انھوں نے یہاں کے لوگوں کو۔" احمد بولا۔ "لگتا تھا وہ بدلہ لے رہے ہیں پاکستانی علاقوں میں مارے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کا۔ ہمارے محلے میں ایک نیم پاگل عورت رہتی تھی۔ وہ چیختی چلاتی کرفیو میں باہر نکل آئی تھی۔ اس غریب کو بھی مار دیا تھا۔"

"ہاں، پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔" مولوی صاحب کی ٹھنڈی سانس احمد نے اپنے ماتھے تک محسوس کی۔

پھر احمد کو ایک اور بات یاد آ گئی اور وہ ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟" مولوی صاحب کو شاید اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

"مجھے قطب دین خاں یاد آ گئے۔" احمد نے کہا۔ "اچھے خاصے شریف آدمی تھے۔ ہنگامے شروع ہوئے تو وہ بھی لیڈر بن گئے۔ ایک جلوس لے کر جیل خانے پہنچ گئے، تمام قیدیوں کو آزاد کرانے۔ جیلر بھی مسلمان تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بپھرا ہوا یہ ہجوم جیل کا پھاٹک توڑ دے گا تو اس نے آگے بڑھ کر جیل کی ساری کنجیاں قطب دین خاں کے قدموں میں ڈال دیں کہ یہ لیجیے، آپ قیدیوں کو آزاد کرا لیجیے۔ لیکن یہ دیکھ لیجیے کہ اس کے بعد مجھے سولی پر چڑھا دیا جائے گا، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور قطب دین خاں کو رحم آ گیا۔"

"اب دیکھ لو، یہ ہو تم۔ گودن اور ڈیوٹ۔" مولوی صاحب نے وہ زبان بولی جو وہ اپنے شاگردوں سے بولا کرتے تھے۔ اب وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ "ہماری تاریخ ایسی ہی سادگیوں اور حماقتوں سے بھری ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسے۔

رات کو کھانے پر پورا خاندان اکٹھا ہو گیا۔ نسیم نے سارے ہی ددھیالی اور ننھیالی رشتے داروں کو بلا لیا تھا۔ چچا صاحب بھی علی گڑھ سے آ گئے تھے۔ ان کی بڑی بہو اور سب سے چھوٹا پوتا بھی ساتھ آیا تھا۔ چھوٹے میاں بھی تھانو لے سے آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا تھا۔ وہ احمد کے لئے صابونیاں اور گجیاں لائے تھے۔ گجیاں انھوں نے خاص اس کے لیے بنوائی تھیں۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا احمد کو ان سب سے مل کر، ان سے باتیں کر کے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک احمد کو خیال آیا کہ اس کے ددھیال میں بھی اور ننھیال میں بھی دو چار مرد تو اس سے بڑے ہیں لیکن عورت ایک بھی نہیں ہے جو اس سے بڑی ہو۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے بڑے ہونے کا۔ چچا میاں سے مل کر وہ بچہ ہو گیا تھا مگر اس خیال کے آتے ہی ایک دم وہ بوڑھا ہو گیا۔

"آپ کے ملک کی وجہ شہرت تو سیاسی لیڈروں کی لوٹ مار اور کرپشن ہے۔" ایک نوجوان نے اسے خواب سے جگا دیا۔ یہ نوجوان اس کی ننھیال کا تھا۔ جب سے آیا تھا سیاست پر ہی باتیں کیے جا رہا تھا۔

"تم لوگ بھی ہم سے پیچھے نہیں ہو۔" احمد نے ترنت جواب دیا۔ "ابھی پچھلے دنوں آپ کے ایک بڑے اخبار کی رپورٹر ہمارے ہاں آئی تھی۔ کرپشن کی

بات چلی تو میں نے تمھارے صوبے بہار کا ذکر کر دیا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" اسی نوجوان نے گردن اکڑا کے پوچھا۔

"اس نے کہا۔ ہمارے یہاں تو کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کو تباہ کرنا ہے تو اسے بہار دے دو۔" اس پر زوردار قہقہہ پڑا اور وہ نوجوان چپ ہو گیا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کھانا لگ گیا۔ آواز آئی۔ آجایئے کھانا لگ گیا۔ احمد کو مولوی عبدالسلام خاں یاد آ گئے۔ اس نے کہیں کہہ دیا تھا کہ اس سے کھانا بنانا نہیں آتا۔ اس پر انھوں نے فوراً ٹوکا تھا۔ کھانا بنایا نہیں جاتا پکایا جاتا ہے۔ تم رہے گاؤدی کے گاؤدی۔ اس نے سوچا کیا کھانا لگنا صحیح ہے؟ مولوی صاحب یہاں ہوتے تو کیا کہتے۔

"اوہو نسیم، تم نے یہ کیا کر دیا؟" احمد نے کھانا دیکھ کر زور سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" نسیم گھبرا کے باورچی خانے سے بھاگی بھاگی آئی۔

"تمھیں بھی یہ مرغ مسلم اور کوفتے کباب ہی پکانا رہ گئے تھے۔ میں تو یہاں کڑوے تیل میں پکائی ہوئی آلو میتھی کی بھجیا، کھٹی ہری مرچیں، ہینگ کا بگھار لگے کالے ارد، لچ کچ اور ارد کی دال کی کھچڑی کھانے آیا تھا۔"

"آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ میں بھی کوئی سالن خراب ہو گیا۔" نسیم ہاتھ میں پلاؤ کی قاب لیے کھڑی تھی۔

"دو دن کے لیے تو آئے ہو، یہ سب کھانے کیسے کھا لو گے۔" یہ چچا صاحب تھے جو خود کھانے کے بہت شوقین تھے۔ برسات میں جب اسی گھر کے آنگن میں جھولے پڑتے اور چٹ پٹے پکوان پکانے کے لئے اسی گھر کے بڑے سے باورچی خانے میں کڑھائی چڑھائی جاتی تو یہی چچا صاحب ہاتھ میں کفگیر لے کر چولہے کے پاس بیٹھ جاتے۔ اماں گول گول پوریاں کڑھائی میں ڈالتی جاتیں اور یہ تلی ہوئی پوریاں کفگیر سے نکالتے رہتے۔ رمضان آتے تو دونوں گھروں کے لیے دال سیو اور افطاری کی دوسری چیزیں بھی اسی باورچی خانے میں پکتی تھیں۔ یہ چیزیں چونکہ پورے مہینے کے لیے ہوتی تھیں اور پھر دونوں گھروں کے لیے بھی، اس لیے احمد کے گھر کی پرانی نوکرانی حشمتیا بوا کا ہاتھ اس میں زیادہ ہوتا تھا۔ نگرانی پھر بھی اماں کی اور چچا صاحب کی ہی ہوتی تھی۔ یہ ان دونوں کی سالانہ ڈیوٹی تھی۔ چچی صاحب کو کھانا پکانے کا شوق نہیں تھا۔ اور چچا میاں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد احمد چھوٹے میاں کو اپنے گھر لے آیا۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ ان دونوں گھروں کے درمیان والی کھڑکی اب دروازہ بن گئی ہے۔ آج چھوٹے میاں اور وہ اس کمرے میں سوئیں گے جہاں وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ احمد نے اصغر سے کہا تھا اور اس نے اس کے کمرے میں ایک اور پلنگ ڈال دیا تھا۔ چھوٹے میاں کا بیٹا اصغر کے ساتھ تھا۔

"اب بتاؤ، کیا حال ہے؟" احمد نے اپنا تکیہ اونچا کر لیا تا کہ وہ انھیں دیکھ سکے۔

"کیا بتاؤں؟" چھوٹے میاں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں سے بات شروع کریں۔

"اپنے بچوں کی بتاؤ۔ خطوں سے تو ساری بات معلوم نہیں ہوتی۔" احمد سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔

"دونوں بڑے بیٹوں نے ایم اے کر لیا ہے۔ ایک اپنے ماموں کے ساتھ لکھنؤ میں کمپیوٹر کا کاروبار کرتا ہے۔ دوسرے کو ابھی اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا ہے باغ اور زمین کی دیکھ بھال کے لئے۔" چھوٹے میاں بتا رہے تھے۔ "مگر یہاں اس کا دل نہیں لگتا۔ سوچتا ہوں کچھ زمین بیچ کر اسے بھی کاروبار کرا دوں۔ وہ بھی لکھنؤ چلا جائے۔ سب سے چھوٹا بیٹا علی گڑھ میں پڑھ رہا ہے۔ دو بیٹیوں کا بیاہ کر دیا ہے۔ ان دونوں نے بھی ایم اے کیا ہے۔ ایک بیٹی ابھی بیاہنے والی ہے۔ اس نے بی اے کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کا بیاہ جلدی کر دوں۔ میرا کچھ پتہ نہیں میں کب تک ہوں۔ بیاہ میرے سامنے ہو جائے تو اچھا ہے۔" وہ پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ تم تو مجھ سے چھوٹے ہو۔" احمد نے جلدی سے انھیں ٹوکا۔ "انشاءاللہ سب کی شادیاں تم خود ہی کرو گے۔"

"مجھے سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ میرے بعد میرے ننھیال سے میرے بچوں کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ میری وجہ سے ہی وہ ان سب سے ملتے ہیں۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ "میرے بعد ان کا رشتہ صرف اپنی ننھیال سے ہی رہے گا۔ ادھر کون آئے گا۔"

تو یہ مسئلہ صرف ان رشتے داروں کا ہی نہیں ہے جو پاکستان چلے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ یہاں کا بھی ہے جہاں سب اکٹھے ہیں۔ اکٹھے ہیں اگرچہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ احمد کا سر چکرا گیا۔ چھوٹے میاں کی پریشانی وہ خوب سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ ددھیال میں بھی قریبی رشتے دار کوئی نہیں تھا۔ ننھیال میں بھی صرف ایک چھوٹی خالہ تھیں جو احمد کی ماں تھیں۔ کوئی ماموں بھی نہیں تھا۔ ان کا بھائی اور دوست اگر کوئی تھا تو احمد تھا جو ان سے صرف دو سال بڑا تھا۔ اور وہ انھیں چھوڑ کر پاکستان چلا گیا تھا۔

"آپ کے جانے کے بعد میں اکیلا رہ گیا تھا۔" چھوٹے میاں بول رہے تھے اور احمد کا دل بیٹھ رہا تھا۔

"چلو اب تو ماشاءاللہ تمھارے جوان بیٹے ہیں۔" احمد نے انھیں تسلی دی۔

"اپنی ننھیال سے تعلق برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بچوں کی شادی یہاں کر دی جائے۔" چھوٹے میاں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

احمد ان کی بات سمجھا نہیں تو انھوں نے بتایا کہ احمد کے دلی والے بھائی کے بیٹے بھی ہیں اور بیٹی بھی۔ اور ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ "میں نے ان سے کہا ہے کہ چاہو تو بیٹا لے لو یا بیٹی۔ دونوں طرح ہمارے خاندانوں کا رشتہ سلامت رہے گا۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" احمد کو واقعی خوشی ہوئی تھی اس تجویز سے۔ "تو وہ کیا کہتا ہے؟

"وہ تو مانتے ہیں مگر ہماری بھابی نہیں مانتیں۔ وہ دوسرے خاندان کی ہیں نا۔" چھوٹے میاں نے سر جھکا لیا۔

"میں دلی ہوتا ہوا ہی جاؤں گا۔ میں اسے ضرور سمجھاؤں گا۔" احمد نے کہا اور پھر سوچا۔ مجھے یہ کام ضرور کرنا چاہئے۔ میں ان دونوں کا بڑا ہوں۔ خاندانوں میں رشتہ برقرار رہنا چاہئے۔

ماسٹر ممتاز ویسے ہی تھے جیسا وہ انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔ ذرا سے بھی تو نہیں بدلے تھے۔ وہی گول گول چکنا چکنا چہرہ جس پر اگر جھریاں پڑی بھی تھیں تو ایسی کہ ایک دم دیکھنے سے نظر نہیں آتی تھیں۔ قد چھوٹا اور جسم دبلا پتلا تھا اس لئے جھک جانے کا سوال بھی نہیں تھا۔ وہی فاختئی رنگ کی اچکن اور وہی علی گڑھ کاٹ پاجامہ۔ ہاں، اب سر پر ٹوپی آگئی تھی۔ شاید بال سارے ہی گر گئے تھے۔ پہلے بھی کون سے زیادہ بال تھے ان کے سر پر۔ اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر تھے۔ آرٹسٹ بھی تھے۔ کلنداراکے نام سے پینٹنگ کرتے تھے۔ مشہور آرٹسٹ اوپاما کے دوست تھے۔ احمد کو یہ تو کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ماسٹر ممتاز کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے یا نہیں۔ لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ شہر میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن انھوں نے ہی بنائی تھی۔ اور لکھنؤ میں جب امن کانفرنس ہوئی تھی تو احمد اور مسرور کو ضلع کا ڈیلیگیٹ بنا کر انھوں نے ہی بھیجا تھا۔ ٹیکسٹائل مل میں ہڑتال بھی انہوں نے ہی کرائی تھی۔ اور پھر جب شہر میں صفائی کرنے والوں نے اپنی تنخواہیں بڑھانے کے لئے شور مچایا تھا تو انھوں نے ہی احمد کو ان کا لیڈر بنوا دیا تھا۔ احمد نے بھنگیوں کی ہڑتال کرادی تھی تو ماسٹر ممتاز نے ہی اسے انڈر گراؤنڈ بھی کرادیا تھا۔ اسے ایک گھر میں چھپا دیا تھا۔ کہا تھا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے بعد احمد کا خاندان ماسٹر ممتاز سے اور بھی ناراض ہو گیا تھا۔ ایک تو ان کا لڑکا خراب کیا دوسرے سارے شہر میں گندگی پھیلا دی۔ ان دنوں بھنگیوں نے گھروں میں بھی صفائی کرنا بند کردی تھی۔ یہ سب آزادی کے دو تین سال بعد کی باتیں تھیں۔

"تمھارے جانے کے بعد میرے ساتھ بہت برا ہوا۔" وہ بھی اس سے شکایت کر رہے تھے۔ "پہلے میرا تبادلہ شہری گڑھ وال کر دیا گیا۔ پھر پیلی بھیت بھیج دیا۔ ریٹائر ہوا تو اب تک پنشن کا جھگڑا چل رہا ہے۔ ہر وقت سی آئی ڈی والے میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔" وہ اسے غور غور سے دیکھ رہے تھے۔

"مگر اب تو آپ کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں۔" احمد نے انھیں کریدا۔

"اب میں مسلمان بچوں اور بچیوں کو پڑھانے کے لئے تھوڑا بہت کام کرتا رہتا ہوں۔" وہ کرسی پر کسمسائے۔

"صرف مسلمانوں کو؟" احمد نے تعجب سے ان کے منہ کو دیکھا۔

"ہاں، صرف مسلمانوں کو۔" انھوں نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کبھی ہندو مسلمان میں فرق نہیں کرتے تھے؟" احمد کو یاد تھا کہ آزادی کے بعد اس شہر میں جب ایک دم بہت سے شرنارتھی آگئے تھے تو ماسٹر ممتاز نے ان کے بچوں کے پڑھنے کے لئے کتابیں اکٹھی کرنا شروع کردی تھیں۔ وہ گھر گھر دکان دکان جا کر پیسے اکٹھے کرتے اور لکھنؤ جا کر کورس کی اکٹھی کتابیں خرید لاتے اور ان میں تقسیم کرتے۔ احمد بھی کئی بار ان کے ساتھ لکھنؤ گیا تھا۔ بلکہ پہلی مرتبہ جب احمد ان کے ساتھ لکھنؤ گیا تھا تو اس کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یہ آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ وہ ایک دکان پر کتابیں لینے پہنچے تو دکان دار نے اتنی بہت سی کتابوں کا آرڈر دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے آئے ہو؟ احمد نے اپنا شہر بتایا۔ احمد ہی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ کتابوں کی دکان ہے تمھاری؟ جب اس نے بتایا کہ ہم غریب شرنارتھی بچوں کے لئے یہ کتابیں لے رہے ہیں تو اس دکان دار نے فوراً سوال کیا۔ "تم کون جات ہو؟"

یہ سوال احمد کے لئے بالکل نیا تھا اور پریشان کرنے والا بھی۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا، پلا بڑھا اور پڑھ رہا تھا وہاں کبھی کسی نے کسی سے ایسا سوال نہیں کیا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا تھا۔ مگر ماسٹر ممتاز نے فوراً معاملے کو سنبھال لیا تھا۔ "گپتا ہیں یہ۔"

بعد میں احمد نے جب ماسٹر ممتاز سے احتجاج کیا تھا کہ انھوں نے خواہ مخواہ جھوٹ کیوں بولا تو انھوں نے اسے سمجھایا تھا۔ حالات بہت خراب ہیں۔ اگر دکان دار کو معلوم ہو جاتا کہ ہم مسلمان ہیں تو وہ کہتا۔ تمھیں شرنارتھیوں سے کیا ہمدردی ہے۔ یاد نہیں، ہم ایک کانگریسی لیڈر کے پاس پیسے مانگنے گئے تھے تو اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا۔ شرنارتھیوں کو بھیک مانگنا کیوں سکھا رہے ہو۔

"ہندو مسلمان میں فرق تو میں اب بھی نہیں کرتا مگر حالات نے مسلمانوں کو آج کا سب سے مظلوم طبقہ بنا دیا ہے۔" ماسٹر ممتاز بولے۔ "اس شہر کے قریب قریب ہر گھر میں عورتیں اور بچے بیڑیاں بنا رہے ہیں، کارچوبی کر رہے ہیں یا چکن بنا رہے ہیں۔ اور مرد سائیکل رکشہ چلا رہے ہیں۔ پڑھنے لئے ان کے پاس وقت ہے نہ پیسہ۔"

"آپ کو یاد ہے ایک دفعہ ایک ہندو باغبان نے، جنھیں ہم بنوان کہتے تھے، ہم سے فاتحہ دلوائی تھی؟" احمد کو اچانک ایک اور بات یاد آگئی تھی۔ لیکن ماسٹر ممتاز کو وہ واقعہ یاد نہیں تھا۔ وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "محرم کی ساتویں یا نویں تھی۔" احمد نے انھیں یاد دلایا۔ "میں آپ کے ساتھ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ ہم نواب دروازے سے نکلے تو کھیتوں میں سے ایک آواز آئی۔ میاں جی، میاں جی۔ اماموں کی نیاز دلائی ہے، ذرا فاتحہ تو دیدو۔ سامنے کھیتوں میں اس کا گھاس پھونس کا جھونپڑا تھا۔ میں نے فاتحہ پڑھی تھی اس کی نیاز پر۔ آپ تو ایسی باتیں مانتے ہی نہیں تھے۔"

"ہاں۔ ترکاری اگانے اور بیچنے والے اب بھی یہاں بنوان ہی کہلاتے ہیں اور وہ سب ہندو ہیں۔" ماسٹر ممتاز نے یونہی کہہ دیا جیسے وہ دوسری باتیں کر رہے تھے۔

احمد نے ماسٹر ممتاز کو اب پھر غور سے دیکھا۔ یہ وہی پرانے ماسٹر ممتاز تھے۔ بالکل بھی تو نہیں بدلے تھے۔

"میں نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی جو پہلا بورڈ دیکھا تھا اس پر دیوناگری رسم الخط میں لکھا تھا، انجمن اہل سنت والجماعت۔ میرے لئے یہ پہلا صدمہ تھا۔" احمد نے جیسے ماسٹر ممتاز کو یاد دلایا۔ "اس کے اوپر نیچے یا آس پاس کہیں بھی اردو میں کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"بھئی جب آپ الگ ہو گئے تو پھر یہ ہونا ہی تھا۔" انھوں نے ہنس کر کہا مگر پھر جلدی سے بولے۔ "یہ آزادی کے فوراً بعد کے اثرات ہیں۔ اب ایسا نہیں ہے، اب تو بچے اردو پڑھ رہے ہیں۔" انھوں نے احمد کو یہ سوال کرنے کی مہلت نہیں دی کہ اگر ہم الگ نہ ہوتے تو کیا ایسا نہ ہوتا؟

مگر یہ "واتانوکول شاین یان کیا ہے؟" احمد نے ایک اور چوٹ کر دی۔

کیا، کیا؟ کیا کہا؟ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ احمد کیا کہہ رہا ہے۔

"میں دلّی سے ٹرین کے جس ڈبے میں بیٹھ کر آیا ہوں اس پر یہی لکھا ہوا تھا۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ سلیپر تھا۔" احمد نے وضاحت کی۔ "میں ہندی پڑھ لیتا ہوں۔"

"اچھا...؟" وہ اب بھی حیران تھے۔ "بھئی تم نے یہ پڑھ لیا، ہم نے تو کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا۔ ہمارے لیے تو ایئر کنڈیشنڈ ایئر کنڈیشنڈ ہی ہے۔ انگریزی میں بھی تو لکھا ہوتا ہے۔ مگر ہم بچوں کو ہندی، انگریزی، اردو سب ہی پڑھاتے ہیں۔ ہم انھیں مفت کتابیں بھی دیتے ہیں۔"

"یہ تو بہت نیک کام کر رہے ہیں آپ۔" احمد نے کہا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ تو آپ کا پرانا کام ہے۔

"کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے۔ انھوں نے ہمارے پیچھے سی آئی ڈی لگا دی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں ہم کوئی خطرناک کام کر رہے ہیں۔"

"آپ تو ہمیشہ ہی خطرناک کام کرتے رہے ہیں۔" اب احمد نے انھیں خوش کرنے کے لیے کہا۔

"اگر تم یہاں ہوتے تو تمھیں بھی اپنے ساتھ لگا لیتے۔" اب ماسٹر ممتاز نے اس پر ایک اور حملہ کیا۔ "یہاں تمھاری بڑی ضرورت ہے۔"

"اپنے ساتھ لگا لیتے اور پھر مجھے انڈر گراؤنڈ کرا دیتے۔" احمد نے ان سے تو مذاق کیا، مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے دل میں بھی کچھ چبھن سی ہوئی ہے۔

"تم اتنے کٹھور ہو گئے ہو؟" انھوں نے اس کی بات کا برا مانا۔

"اصل میں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں میں..."

"یہ تمھارا شہر ہے۔ یہاں گھر ہے تمھارا۔" ماسٹر ممتاز نے اس کی بات نہیں سنی اپنی ہی کہے گئے۔ پھر ایک دم اٹھے اور چلے گئے۔

وہ اس کی آخری رات تھی۔ اسے وہاں آئے تین دن ہو چکے تھے۔ صبح اسے واپس جانا تھا۔ سب کہہ رہے تھے۔ اگر اس طرح دھیا دیے ہی آنا تھا تو آنے کی ضرورت کیا تھی حالاں کہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ ایک کانفرنس میں شرکت کرنے ہندوستان آیا تھا۔ جتنے دن کا اسے ویزا ملا تھا ان میں زیادہ دن تو کانفرنس کی ہی نذر ہو گئے۔ یہاں کے لیے صرف تین دن ہی ملے ہیں۔ مگر اس کی بات کوئی بھی نہیں مان رہا تھا۔

اس نے ان سب کی لعن طعن سے بچنے کے لیے تمام بچوں کو اصغر کے گھر میں اکٹھا کر لیا۔ یہ بچے جو اس کی بہنوں، بھانجیوں اور بھتیجے بھتیجیوں کے تھے اور جب سے وہ یہاں آیا تھا اس سے شرما کر چھپتے پھرتے تھے۔ آج کی شام بچوں کی ہے۔ اس نے کہا اور بچوں کو اصغر کے گھر لے گیا۔ اصل میں وہ ان بچوں سے نہیں اپنے آپ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اور جب سے وہ یہاں آیا تھا اپنے آپ سے ہی تو باتیں کر رہا تھا۔

"وہ سامنے چھت پر جو سیدھے ہاتھ پر کمرہ ہے نا، ہم اس میں رہتے تھے۔" اس نے بچوں سے باتیں شروع کیں۔

"اس کی تو چھت بھی گری ہوئی ہے۔" ایک بچے کو یقین نہیں آیا کہ گری ہوئی چھت والے کمرے میں وہ کیسے رہتا تھا۔

"نہیں بیٹے اس وقت یہ چھت نہیں گری تھی۔" احمد نے اسے یقین دلایا۔ "ہم وہاں رہتے تھے اور جیانی نانی راتوں کو ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔"

جیانی نانی کون؟ اسی بچے نے سوال کیا۔ "وہ آپ کی نانی تھیں؟"

"نہیں بھئی، وہ ہماری نانی نہیں تھیں۔ وہ تو شاید ہماری رشتے دار بھی نہیں تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم وہ کون تھیں۔ بس، وہ سال چھ مہینے بعد آ جایا کرتی تھیں اور ہفتوں چچا صاحب کے گھر رہتی تھیں۔"

"کہاں سے آتی تھیں؟" وہی بچہ پھر بولا۔ اس بچے کی جرح سن کر احمد کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جیانی نانی کہانی سناتی تھیں تو وہ بھی سوال کر کر کے ان کا ناک میں دم کر دیا کرتا تھا۔ شہزادے نے ایسا کیوں کیا؟ شہزادی کو معلوم تھا تو وہاں کیوں گئی؟ پھر جیانی نانی دھمکی دیتیں۔ اگر تم ٹوکنا بند نہیں کرو گے تو میں کہانی نہیں سناؤں گی۔ باقی سننے والے بھی اسے ڈانٹتے تو اپنے اوپر جبر کر کے وہ چپ ہو جاتا۔ لیکن کہانی کے بیچ میں وہ بیچ سے پھر بول پڑتا اور پھر اسے ڈانٹ پڑتی۔

"جیانی نانی ہیر رانجھا کی کہانی بھی سناتی تھیں ہمیں۔" یہ بات احمد نے اصغر سے کہی۔ "وہ کہانی سناتے ہوئے کچھ ایسے لفظ بھی بول جاتی تھیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ پنجابی کے لفظ ہوں گے۔ انھوں نے ہیر رانجھا کی کہانی کہاں سنی ہو گی، اور وہ بھی پنجابی میں؟ وہ بالکل پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کی کہانیاں تو انھوں نے یہاں سنی ہوں گی مگر ہیر رانجھا انھوں نے کہاں سنی ہو گی؟ پنجاب تو یہاں سے بہت دور ہے۔ کیا وہ پنجاب گئی تھیں؟" احمد پھر اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے گئی ہوں۔" اصغر نے بھی تُکّہ لڑانے کی کوشش کی۔ "دلّی تو ضرور گئی ہوں گی۔ وہاں یہ قصہ مشہور ہو گا۔"

"ہاں ہم نے ان کی ٹھیٹ اردو میں یہ قصہ سنا تھا۔ ہم بچوں کو وہ واقعہ بہت دلچسپ لگتا تھا جب رانجھا تھک کر کھیت میں پڑی ہیر کی چارپائی پر سو گیا تھا اور ہیر کی سکھیوں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ جیانی نانی کہتیں، اے بے اس نگوڑ مارے کو کیا معلوم تھا کہ یہ ہیر کا پلنگ ہے۔ وہ تھک گیا تھا۔ اس نے ذرا سی پیٹھ لگالی تھی۔ وہ مٹی لونڈیاں بھی ایک ہی آفت کی پرکالا تھیں۔ انھوں نے اس کمبختی مارے کو اتنا مارا اتنا مارا کہ اس کی پیٹھ پر یہ موٹی موٹی بدیاں پڑ گئیں۔" یہ بات احمد نے اصغر سے کہی۔ پھر بچوں سے پوچھا۔ "تمھیں ہیر رانجھا کی کہانی کوئی سناتا ہے؟"

"ہمیں تو کوئی نہیں سناتا۔" بچوں نے جواب دیا۔

"رات ہوئی اور ہم ان کے پیچھے پڑ گئے۔ جیانی نانی کہہ دو کہانی۔ جیانی نانی کہہ دو کہانی۔" اب احمد بچوں سے باتیں کر رہا تھا۔ "وہ کہتیں کون سی کہانی سنو گے؟ اور پھر ہم بچوں میں لڑائی ہو جاتی۔ ایک کہتا وہ کہانی اور دوسرا کہتا وہ کہانی۔ آخر چچی صاحب یا ہماری اماں اس کا فیصلہ کرتیں۔ پھر جیانی نانی شروع کرتیں۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ نہ کہنے والے کے گلے عذاب نہ سننے والے کے گلے عذاب۔ جس نے کہانی بنائی ہے اس کے گلے عذاب۔"

"بے چارہ کہانی بنانے والا۔" اصغر ہنس پڑا۔

"یہ عذاب عذاب کیا کرتی تھیں وہ؟" وہی بچہ پھر بولا۔ اور احمد کو پھر یاد آیا کہ کلو ہما نے احمد کی اسی طرح کی باتیں سن کر اس کا نام بزرجمہر رکھ دیا تھا۔ کلو ہما اس کے گھر کام کرتے تھے۔ بچے ان پڑھ تھے مگر امیر حمزہ اور کلیلہ دمنہ سارا یاد تھا انہیں۔

"اور ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں تھانو لے جایا کرتے تھے۔" احمد نے بچوں کو بتایا۔ "ریل گاڑی سے نہیں، بیل گاڑیوں اور رتھوں سے۔ ریل گاڑی سے تو بعد میں جانا شروع کیا تھا۔ ہماری اماں، ہمارے ابا میاں، ہماری چچی صاحب، ہماری پھوپی کی بیٹیاں اور بیٹے۔ پورا قافلہ گاڑیوں میں بھر کر روانہ ہوتا۔ صبح فجر کے وقت چلتے۔ دوپہر کو رام گنگا کے کنارے پڑاؤ کیا جاتا۔ رام گنگا کے کنارے دور دور تک جھاؤ کے جھنڈ کھڑے ہوتے تھے۔ وہی جھاؤ جسے ہم سرو یا مور پنکھ کہتے ہیں۔ شہروں میں کتنی قدر ہے ان کی اور وہاں جنگل کے جنگل کھڑے ہوتے تھے۔"

"وہ سرو نہیں ہوتے۔ ہاں، اسی کی قسم ہے وہ۔" اصغر نے اس کی غلطی پکڑی۔ "مگر اب وہ سب ختم ہو گئے۔ اوپر باندھ بن جانے کے بعد رام گنگا چھوٹا سا نالہ بن گئی ہے۔" اصغر نے اس کے دل پر ایک اور چوٹ ماری۔ "اور کوسی تو ذرا سی نالی ہی رہ گئی ہے۔"

"اچھا؟ کوسی ندی بھی ختم ہو گئی؟ اب وہ بچوں کو کہانی سنانا بھول گیا تھا۔" کیسا صاف شفاف اور ٹھنڈا پانی ہوتا تھا اس کا۔ دونوں ہاتھوں سے چلتا پانی ذرا سا صاف کیا اور پی لیا۔"

"اب تو آپ ایک چلو بھریں گے تو کوسی کا پانی ختم ہو جائے گا۔" اصغر ہنس رہا تھا۔ "سب ندیوں پر باندھ بن گئے ہیں۔"

"باندھ؟" پہلے تو احمد چکرایا پھر سمجھ گیا۔ "ہاں۔ یہاں بندھ باندھ ہو گیا ہے۔ جیسے بھنگ بھانگ ہو گئی ہے۔"

"پھر؟" یہ سوال پھر اسی بچے نے کیا جو جلد سے جلد پوری کہانی سننا چاہتا تھا۔

"پھر یہ کہ گنگا کے کنارے سفید سفید ریت پر چادریں بچھ جاتیں۔ ان پر پراٹھے، کباب، آملیٹ، تلی ہوئی مچھلیاں اور جانے کیا کیا چن دیا جاتا۔ سب کھاتے شور مچاتے، کھیلتے کودتے اور ایک دوسرے سے لڑتے۔ پھر ابا میاں کی ڈانٹ پڑتی۔ جلدی کرو پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی اور پھر سورج ڈوبنے سے پہلے تھانو لے پہنچ جاتے۔ یہ ہماری پکنک تھی۔"

احمد خاموش ہو گیا۔ بچے بھی چپ ہو گئے تھے۔ جیسے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ سب تھانو لے میں کیا کرتے تھے۔ احمد کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا بات کرے۔

"آپ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں"، وہی بچہ پھر بولا جو بہت سوال کر رہا تھا۔ "آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"یہی تو ہے ہمارا گھر۔" احمد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تو پھر آپ یہاں رہتے کیوں نہیں؟"

"رہتے تو ہیں۔" احمد ہنسا اور اس بچے کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ "دیکھو ہم یہیں تو ہیں۔"

چچا میاں اس سے پھر لپٹ گئے۔ وہ پھر رو رہے تھے۔ احمد نے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔ اصغر سائیکل رکشا لینے گیا ہوا تھا۔

"معلوم نہیں اب تمہاری صورت دیکھنا نصیب بھی ہو یا نہیں۔" چچا میاں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں نہیں۔ اب تو پاؤں کھل گیا ہے۔ اب تو آتا ہی رہوں گا۔" احمد نے جلدی سے اپنی بات پھر دہرا دی۔

"ہاں، اگر ہم زندہ رہے۔" وہ اپنی گدلی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

"ایسی بات کیوں کرتے ہیں آپ"، احمد نے انہیں تسلی دی۔ "آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور حسنہ سے ملنے پاکستان آئیں گے۔ ہم آپ کو وہاں بلائیں گے۔"

"پہلے حالات تو ٹھیک کر لو۔" اب وہ سیدھے ہو گئے تھے۔ چچا صاحب اور چھوٹے میاں خاموش کھڑے تھے۔

سائیکل رکشا آ گیا، احمد کا سامان رکھا گیا۔ وہ ایک دفعہ پھر چچا میاں، چچا صاحب اور چھوٹے میاں سے گلے ملا۔ اصغر کو خوب زور سے اپنے ساتھ چمٹایا۔ سب بچوں کو پیار کیا اور اپنی پیٹھ اور ٹانگیں سنبھالتا ہوا رکشا پر بیٹھ گیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہی بچہ جو اس سے سوال پر سوال کر رہا تھا اس کی آستین پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

"اپنے گھر۔" احمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ تو کہہ رہے تھے یہ آپ کا گھر ہے؟" وہ احمد کی آستین نہیں چھوڑ رہا تھا۔

احمد نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ چچا میاں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور چچا صاحب، چھوٹے میاں اور اصغر کے ہونٹوں پر کمزور سی ہنسی تھی۔

پھر اصغر نے پلاسٹک کا ایک بڑا سا تھیلا احمد کے ساتھ رکھا۔ "اس میں صابونیاں، گجیاں، گڑ کی گزک اور چاول کا سوہن اور جوزی حلوہ ہے۔ اور ہاں، بدایوں کے پیڑے بھی ہیں۔"

اور جب تک رکشا احمد کے دادا کے نام والے گھیر کا موڑ نہیں مڑ گیا وہ سب اسی طرح کھڑے اسے دیکھتے رہے ☆☆☆

بیاہنی لڑکی

یوژین آئنسکو، ترجمہ: مسیح الزماں

شمارہ ۳۲،
جنوری ۱۹۶۹

کردار:

مرد

خاتون

لڑکی

خاتون لمبی اسکرٹ پر قرمزی رنگ کا چست جیکٹ پہنے ہیں۔ سر پر پھول دار ہیٹ ہے جسے ہیٹ پن سے سر پر لگایا گیا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بیگ ہے۔

مرد کے سفید ڈاڑھی ہے۔ اونچا سخت کالر، سخت کف، فراک کوٹ پہنے ہوئے۔

دونوں ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے ہیں۔

خاتون:

میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میری لڑکی پڑھنے میں کافی تیز ہے۔

مرد:

مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس پر مجھے کوئی حیرت بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں کافی جرأت و حوصلہ ہے۔

خاتون:

بہت سے دوسرے والدین کی طرح مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اس کا رویہ ہمیشہ اطمینان بخش رہا ہے۔

مرد:

یہ آپ ہی کا فیض تربیت ہے۔ مثالی اولاد خصوصاً آج کل مشکل ہی سے دیکھنے میں آتی ہے۔

خاتون:

بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔

مرد:

میرے بچپن اور جوانی کے زمانے میں بچے اب سے کہیں زیادہ مطیع اور والدین سے قریب ہوتے تھے۔ انھیں احساس ہوتا تھا کہ ان کے والدین ان کے لئے کیا قربانیاں دیتے ہیں، ان کے مالی وسائل اور دشواریاں کیا ہیں۔ اگرچہ بعض پہلوؤں سے یہ بھی اچھا ہوتا ہے کہ انھیں اس کا احساس نہ ہو۔

خاتون:

مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ وہ اب سے کہیں زیادہ...

مرد:

ہاں۔ ان کی تعداد اب سے بہت سے زیادہ ہوتی تھی۔

خاتون:

بالکل۔ اب تو فرانس میں پیدائش کی رفتار بہت گرتی جا رہی ہے۔

مرد:

ہاں، نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔ حال میں یہ رفتار پھر بڑھنے لگی ہے لیکن پچھلے برسوں کی کمی شاید ہی پوری ہو سکے۔

خاتون:

بالکل نہیں۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔

مرد:

آپ کیا امید کر سکتی ہیں۔ ان دنوں بچوں کی پرورش آسان نہیں رہی۔

خاتون:

یقیناً۔ آدمی کو زندہ رکھنے کے لئے روز بروز زیادہ خرچ کی ضرورت ہوتی جا رہی

ہے۔ پھر سوچئے کہ ان کی خواہشوں اور ضرورتوں کی فہرست کتنی لمبی ہوتی ہے۔ کیا ہے جس کی وہ فرمائش نہیں کرتے؟

مرد:

آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ آج صرف انسانی زندگی سستی ہے۔

خاتون:

بالکل ٹھیک! میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں۔ آپ درست کہتے ہیں۔

مرد:

زلزلے، حادثے، موٹر اور بیسویں قسم کی گاڑیاں جیسے ہوائی جہاز، سماجی بیماری، خود کشی، ایٹم بم...

خاتون:

اوہ، ہاں، ایٹم بم! اس نے جیسے موسموں کو بدل دیا ہے، نہ جاڑے کا ٹھیک ہے نہ برسات کا۔ سب ہی الٹ پلٹ گیا ہے۔ اور اسی پر خاتمہ نہیں۔ سنئے، کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو کیا کہتے سنا ہے!

مرد:

ارے لوگ تو جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ ان کی باتوں کا یقین کرنے لگیں تو...

خاتون:

درست ہے۔ ان باتوں کا تو کہیں خاتمہ ہی نہیں۔ اور اخبار بھی تو سب جھوٹ کا پلندہ ہوتے ہیں۔

مرد:

میری بات مانئے محترمہ... کسی پر بھروسا نہ کیجئے، کسی کا یقین نہ کیجئے، کسی کی خرافات دماغ میں جانے نہ دیجئے۔

خاتون:

ٹھیک تو ہے۔ ان خرافات کے بغیر ہی سکون رہتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کا دماغ اپنی جگہ پر بہت متوازن ہے!

مرد:

جی، بات اتنی ہے کہ میں اسے استعمال کرتا رہتا ہوں۔

خاتون:

بالکل صحیح ہے۔ لیکن ہر ایک کے لئے آپ یہی بات تو نہیں کہہ سکتے۔

مرد:

آج کل کے زمانے میں ان تمام تفریحوں، مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں... سینما، اکم ٹیکس، گراموفون، ریکارڈ کی لائبریریاں، ٹیلیفون، ریڈیو، ہوائی جہاز کا سفر، بڑی بڑی دکانیں...

خاتون:

ہاں، یہ آپ نے کہا!

مرد:

جیل خانے، شاہراہیں، بیمہ اور...

خاتون:

بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک!

مرد:

یہ تمام چیزیں جو نئی زندگی کا حسن ہیں، اس کی دل کشی ہیں انھوں نے مردوں اور عورتوں کو بدل دیا ہے... ایسا بدل دیا ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے!

خاتون:

اور یہ تبدیلی بہتری کی طرف نہیں، آپ کا یہی مطلب ہے نا؟

مرد:

جی۔ لیکن پھر بھی ہم ترقی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ہم برابر اسے کسی نہ کسی سمت میں بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں...

خاتون:

بالکل ٹھیک۔

مرد:

انجینئرنگ میں، سائنس میں، مشین سازی میں، ادب میں اور آرٹ میں۔

خاتون:

بالکل۔ بالکل۔ ہمیں ہر حال میں انصاف پسند ہونا چاہئے۔ کسی کے ساتھ زیادتی کرنا ٹھیک نہیں۔

مرد:

آپ یہاں تک کہہ سکتی ہیں کہ تہذیب کا کارواں برابر آگے بڑھ رہا ہے اور تمام اقوام کی متحدہ کوششوں سے صحیح سمت میں قدم...

خاتون:

بالکل درست ہے۔ آپ نے میرے منھ کی بات چھین لی۔

مرد:

اپنے آباواجداد کے وقت سے ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔ جب وہ غاروں میں رہتے، ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے، جانوروں کی کھالوں پر گزارا کیا کرتے تھے۔ کتنا لمبا سفر ہم نے طے کرلیا ہے!

خاتون:

اور کیا... اور سنٹرل ہیٹنگ (مشینوں کی مدد سے عمارتوں کو گرم رکھنا) جناب سنٹرل ہیٹنگ! کی ان کے غاروں میں اس کا انتظام تھا؟

مرد:

اب آپ دیکھیے محترم خاتون کہ جب میں بچہ تھا...

خاتون:

عمر کا کیسا سہانا زمانہ ہوتا ہے بچپن۔

مرد:

تو میں دیہات میں رہتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ جاڑا ہو یا گرمی دھوپ ہی ہمارا سہارا ہوتی تھی۔ ہمارے گھر میں تیل سے روشنی کی جاتی تھی... اس وقت یہ اتنا گراں نہیں تھا... اور کبھی کبھی شمعیں بھی...

خاتون:

وہ تو اب بھی جلائی جاتی ہیں، جب بجلی فیل ہو جائے۔

مرد:

مشینوں کی بھی خامیاں ہوتی ہیں، آخر آدمی ہی نے انھیں بنایا ہے۔

خاتون:

اے مردوں کی خامیوں کی بات مجھ سے نہ کیجئے۔ مجھ سے زیادہ کون انھیں جانے گا۔ اس سلسلے میں وہ عورتوں سے بالکل بہتر نہیں۔ دونوں ہی یکساں ہیں۔

مرد:

یقیناً۔ تو آپ مردوں سے کیوں امید رکھتی ہیں کہ وہ فرائض کے انجام دینے میں مشینوں سے بھی بڑھ جائیں۔

خاتون:

ہاں مجھے اس کا خیال پہلے نہیں آیا... لیکن اب جو اس پہلو سے سوچتی ہوں تو نظر آتا ہے کہ یہ ممکن تو ضرور ہے۔

مرد:

آپ دیکھیے، محترمہ، کہ انسانیت کا مستقبل، مستقبل ہی میں ہے۔ جانوروں اور پودوں کے لیے اس کے بالکل برخلاف ہے... لیکن ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ مشین حاکم علی الاطلاق ہے جو ہمارے ہاتھ ہلائے بغیر خدا اور ترقی کی جگہ لے لے گی۔ اس کے برخلاف...

خاتون:

میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔

مرد:

میں کہہ رہا تھا محترمہ کہ اس کے برخلاف آدمی اب بھی بہترین انسانی مشین ہے۔ آدمی ہی اس مشین کا آگے پیچھے کرنے والا ہے کیوں کہ وہی اس کا دماغ ہے۔

خاتون:

یہ بات کہی آپ نے!

مرد:

اور مشین آخر مشین ہے۔ البتہ حساب لگانے والی مشین جو خود ہی سے جوڑ گھٹا لیتی ہے۔

خاتون:

بالکل صحیح ہے۔ حساب کرنے والی مشین خود ہی جوڑتی گھٹاتی ہے۔ بالکل ٹھیک...

مرد:

مستثنیات ہی سے اصول ثابت ہوتے ہیں۔ اب آپ دیکھیے کہ ابھی ابھی ہم چراغ اور شمعوں کی باتیں کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک انڈے کی قیمت ایک پائی سے زیادہ نہیں تھی۔

خاتون:

ناممکن!

مرد:

آپ کو یقین نہ آئے تو مجبوری ہے۔

خاتون:

ایسا نہیں کہ میں آپ کو جھوٹا سمجھتی ہوں۔

مرد:

دس پیسوں میں تو آپ پورا کھانا کھا سکتی تھیں۔ اناج کی اس وقت قیمت ہی کیا تھی!

خاتون:

لیکن اب تو حالات دوسرے ہیں بالکل۔

مرد:

پونے چار روپے میں اچھے چمڑے کے بوٹ ملتے تھے۔ آج کل کے لڑکے ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

خاتون:

انھیں احساس ہی نہیں کہ کس طرح ان کے لیے سب چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔ یہ نوجوان کتنے ناشکرے ہیں۔

مرد:

آج کل ہر چیز ہزار گنا مہنگی ہے۔ تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مشینوں کا ایجاد خوش گوار ہے اور ترقی بہتری کا دوسرا نام ہے؟

خاتون:

ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

مرد:

آپ شاید یہ کہیں کہ ترقی بھی اچھی یا بری ہو سکتی ہے جیسے یہودی یا جرمن یا فلمیں۔

خاتون:

نہیں، نہیں۔ میں ایسی بات نہیں کہوں گی۔

مرد:

کیوں نہیں۔ آپ چاہیں تو ضرور کہہ سکتی ہیں۔ آپ کو اس کا حق حاصل ہے۔ ہے نا؟

خاتون:

بالکل۔

مرد:

ہر آدمی کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ میں دقیانوسی نہیں ہوں۔ آخر انقلاب فرانس، صلیبی جنگیں، قیصر ولیم، پوپ، نشاۃ الثانیہ، لوئی چہاردہم ہو چکے ہیں... ذرا سی بات کے لئے اتنے ہنگامے! آزادی رائے اور اظہار خیال کے لئے ہم نے بہت بڑی قیمتیں دی ہیں تاکہ دوسروں کے تمسخر کے بغیر ہمارے جی میں جو بھی آئے کہہ سکیں۔

خاتون:

یقیناً ہم نے اس کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ یہ ہمارا گھر ہمارا وطن ہے ہم کسی کو آ کر اسے الٹ پلٹ نہیں کرنے دیں گے۔

مرد:

اور ژاں آف آرک؟ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ وہ آج یہ سب دیکھے تو کیا کہے گی؟

خاتون:

یہ سوال تو میں نے اپنے آپ سے کئی بار کیا ہے۔

مرد:

ریڈیو! . اور وہ ایک پرانے خستہ جھونپڑے میں رہا کرتی تھی! ساری موجودہ تبدیلیوں کے بعد تو وہ اس ملک کو پہچانے گی بھی نہیں۔

خاتون:

نہیں۔ وہ اب دیکھے تو بالکل نہیں پہچان سکتی۔

مرد:

پھر بھی، شاید، جان لے، آخر!

خاتون:

ہاں، شاید جان جائے، آخر!

مرد:

زرا سوچئے تو کہ ان انگریزوں نے اسے آگ میں زندہ جلا ڈالا۔ اور پھر اب ہمارے دوست بن گئے ہیں۔

خاتون:

کسی نے کاہے کو یہ سوچا ہوگا؟

مرد:

مگر، انگریزوں میں کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں۔

خاتون:

لیکن زیادہ تر خراب۔

مرد:

کارسیکا کے باشندے بھی ان سے بہتر نہیں ہوتے!

خاتون:

میرا یہ مطلب نہیں...

مرد:

کم سے کم وہ ایک مصرف کے تو ہیں۔ سارے فرانس میں ڈاکیے کارسیکی ہیں۔ یہ ڈاکیے نہ ہوتے تو ہماری ڈاک کون لاتا؟

خاتون:

وہ ایک لازمی برائی ہے

مرد:

برائی کبھی لازمی نہیں ہوتی۔

خاتون:

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے۔

مرد:

آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں ڈاکیے کے پیشے کو حقیر سمجھتا ہوں۔

خاتون:

ہر پیشہ کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے۔

مرد:

(اٹھتے ہوئے) محترمہ، یہ بڑے پتے کی بات ہے! ان الفاظ کو حرز جان بنا کر یاد رکھنا چاہئے۔ میری مبارک باد لیجئے (خاتون کے ہاتھ کا بوسہ لیتا ہے) یہ آپ کا اعزاز ہے (خاتون کے سینے پر پن سے ایک تمغہ لگا دیتا ہے)

خاتون:

(کچھ گھبرا کر) ارے جناب... میں تو ایک معمولی عورت ہوں... لیکن اگر واقعی آپ کا مطلب یہ ہے...

مرد:

میں پوری سنجیدگی سے کہتا ہوں محترمہ۔ حقیقت کسی بھی دماغ سے نکل سکتی ہے۔ اس پر کسی کا اجارہ...

خاتون:

خوشامدی کہیں کے!

مرد:

(پھر بیٹھتے ہوئے) محترمہ، آپ نے ہمارے سماج کی بنیادی کمزوری پکڑ لی ہے میں اس سے نفرت کرتا ہوں اس کی تحقیر کرتا ہوں۔ اگرچہ خود کو اس سے الگ نہیں کر پاتا۔

خاتون:

آپ کو یہ کرنا بھی نہیں چاہئے۔

مرد:

ہمارا سماج اب کسی پیشہ کو محترم نہیں مانتا۔ دیکھیے نا کہ کیسے کیسے گنوار ہمارے وسیع شہروں میں بھیڑ یا دھسان گھستے چلے آتے ہیں۔

خاتون:

ہاں، جناب، میں برابر دیکھتی ہوں۔

مرد:

جب پیشہ کا احترام ختم ہو گیا تو بچوں کا احترام کہاں سے رہے گا اور بچہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ آدمی کا باپ ہوتا ہے!

خاتون:

بالکل درست!

مرد:

شاید بچہ بھی احترام حاصل کرنا بھول چکا ہے!

خاتون:

غالباً!

مرد:

پھر بھی ہمیں بچوں کا احترام کرنا چاہئے کیوں کہ اگر بچے نہ ہوں گے تو انسانی نسل فنا ہو جائے گی۔

خاتون:

میں بھی یہی سوچ رہی تھی!

مرد:

احترام کا خاتمہ ایک کے بعد دوسرے کا نمبر لاتا ہے اور آخر میں کسی چیز کا احترام، کوئی

لحاظ باقی نہیں رہ جاتا۔ آدمی کو اپنی زبان کا پاس بھی نہیں رہتا۔

خاتون:

یہ انجام بہت خطرناک ہے!

مرد:

یہ اور بھی افسوس ناک ہے جب سوچئے کہ وعدہ مقدس چیز ہے وعدۂ الٰہی کی طرح مضبوط، مستحکم۔ ہمیں اسے مذاق میں نہیں ٹالنا چاہئے۔

خاتون:

مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ بالکل اسی وجہ سے میں نے پیش نظر رکھا ہے کہ میری لڑکی کی تعلیم معقول ہو اور وہ ایک باعزت پیشہ اختیار کرے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے، عزت کی کمائی کھائے اور دوسروں کا احترام کرنا سیکھے۔

مرد:

آپ بڑی ہوش مند ہیں۔ اب اس کے کیا مشاغل ہیں؟

خاتون:

اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ وہ ٹائپسٹ بنے۔ حال ہی میں اس نے ییڈپلوما حاصل کیا ہے اور اب اسے ایسی فرم میں ملازمت مل گئی ہے جو جعل سازی کے دھندے کرتی ہے...

مرد:

وہ تو بڑی مسرور اور شادماں ہوگی۔

خاتون:

مارے خوشی کے صبح سے شام تک ناچتی رہتی ہے۔ سوچئے اس منزل تک پہنچنے کے لئے بیچاری نے کتنے پاپڑ بیلے ہیں۔

مرد:

اب تو اسے ان محنتوں کا ثمرہ مل گیا۔

خاتون:

ہاں، اب میری ذمے داری یہی ہے کہ اس کے لئے ایک اچھا سا شوہر تلاش کر دوں۔

مرد:

وہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔

خاتون:

(پہلو کی طرف دیکھ کر) لیجئے وہ آ بھی گئی۔ میں ابھی آپ سے ملاتی ہوں۔

(خاتون کی لڑکی داخل ہوتی ہے۔ وہ تقریباً بتیس سال کا صحت مند مرد ہے جس کے بڑی بڑی سیاہ مونچھیں ہیں۔ فاختئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے ہے۔)

لڑکی:

آداب، پیاری ممی!

(اس کی آواز تیز مردانی ہے۔ وہ خاتون کو جھک کر پیار کرتی ہے۔)

مرد:

محترمہ۔ یہ ہو بہو آپ کی تصویر ہے۔

خاتون:

(لڑکی سے) آداب کرو آپ کو

لڑکی:

(سر جھکا کر تعظیم کرتے ہوئے) آداب، جناب والا۔

مرد:

آداب (خاتون سے مخاطب ہو کر) بہت اچھی تربیت کی ہے آپ نے۔ کیا عمر ہوگی اس کی؟

خاتون:

ترانوے سال!

مرد:

تو بالغ ہو چکی ہے نا؟

خاتون:

نہیں تو۔ اس میں اسی سال تو ہمارے ہیں۔ اس لئے یہ تو تیرہ سال کی ہوئی۔

مرد:

خیر یہ دن بھی دوسرے دنوں کی طرح جلد گزر جائیں گے! (لڑکی سے) اچھا تو تم ابھی نابالغ ہو؟

لڑکی:

(بھاری زوردار آواز میں) جی ہاں، لیکن بھولے نہیں، بہت سے نابالغ بالغوں کے ہم بستر ہوتے ہیں۔!

(مرد اور خاتون حیرت و دہشت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب ایک دوسرے کو تحیر اور خوف کے ملے جلے انداز میں دیکھتے ہیں۔ خاتون کے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔)

پردہ گرتا ہے

☆☆☆

شفیع جاوید

کے افسانے

رات، شہر اور میں

حساس دل، تیز مشاہدہ اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کا بیان جب ایسی نثر میں ہو جو قدم قدم پر ارتکاز اور استعارے سے مزین ہو تو شفیع جاوید کا افسانہ ظہور میں آتا ہے۔ یہ افسانے جدید افسانہ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

مجلد، صفحات ۲۰۰ قیمت : ۱۶۰ روپئے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مصحف اقبال توصیفی

شمارہ ۲۰،
جنوری ۱۹۶۸

میں اپنے جسم کے باہر کھڑا ہوں

ان آنکھوں کے دریچے سے تو اب
بسیں، سڑکیں
ملوں کی چمنیاں
میونسپلٹی کا نل، کوڑھی بھکاری
دھنی مل کا بہت اونچا مکاں
کچھ بھی نظر آتا نہیں
اب ان آنکھوں میں میری
ہزاروں انجنوں کا شور ہے، کالا دھواں ہے
مگر دل کو لبھاتا ہے ابھی تک
نیلگوں دوری کا منظر
چاند، تارے، آسماں،
دیکھنے کی خواہشیں
جاگتی ہیں

مشینی ہاتھ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں
میں اپنے جسم کے باہر کھڑا ہوں

شمارہ ۲۴،
مئی ۱۹۶۸

کبھی سادہ کاغذ پہ کچھ آڑی ترچھی لکیریں سی کھینچی ہیں
اور سوچتا رہ گیا ہوں

مری طرح
میرے خدا نے بھی شاید
کچھ آڑی ترچھی لکیریں سی کھینچیں
پھر ان سے الجھ کر.....
الٹ دی دوات
ایک محور بنے سارے نقطے، لکیریں، مدار
جابجا، نور کی روشنائی کے، چھوٹے بڑے، دور و نزدیک دھبے
چاند، سورج، ستارے، زمیں
کائنات

اور ہم جانتے تھے
ابھی خشک ہو جائے گی روشنائی
آتے لمحے کی بس دیر ہے
اسی واسطے ہم نے موجود لمحے کو صدیوں میں بانٹا.....
...لاکھوں کروڑوں برس میں.....
مگر اس طرح
آتے لمحے سے موجود لمحے کا یہ فاصلہ
بڑھ سکا...؟
(میں مسکرانے لگا)

مصحف اقبال توصیفی

شمارہ ۲۰۱،
دسمبر ۱۹۹۶

ہمیں اتنا نہ آیا اپنے دل کی بات ہی کہہ لیں
کوئی پیرایۂ اظہار مل جاتا
ہمارے روز و شب کو
اگر تیری ضرورت ہی نہ ہوتی تب بھی کیا ہوتا
اگر تجھ سے محبت ہی نہ ہوتی تب بھی کیا ہوتا
کسے فرصت کہ ان اندھے کنوؤں میں جھانک کر دیکھے
اوروں کے دل کے بھید ڈھونڈے
مگر اک پھول پر رک کر، کوئی اڑتی ہوئی تتلی
نہ جانے جھک کے کیا کہتی ہے کلیاں
کھلکھلا کر زور سے ہنستی ہیں
شاخیں جھوم جاتی ہیں

تمنا کیا اگر آسائش عرض تمنا ہی نہ ہو حاصل
ہماری آنکھ میں آنسو ہے، دل میں اک سمندر سا
اب ان لہروں پہ بہتے ہیں نہیں جن کا کوئی ساحل
ہمیں اتنا نہ آیا اپنے دل کی بات ہی کہہ لیں
اپنے دل کی بات ہی کہہ لیں

مصحف اقبال توصیفی

شمارہ ۲۰۲،
جنوری ۱۹۹۷

جانے کس لئے روٹھی ایسے زندگی ہم سے
نام تک نہیں پوچھا، بات بھی نہ کی ہم سے

دیکھو وقت کی آہٹ تیز ہوتی جاتی ہے
جو سوال باقی ہیں پوچھ لو ابھی ہم سے

کوئی غم ادھر آئے اس کو گھورتی کیوں ہے
اور چاہتی کیا ہے اب تری خوشی ہم سے

جانے ایک بھولی یاد آج یاد کیوں آئی
پھر کسی کے ملنے کی آرزو ملی ہم سے

اس کی ایک انگلی پر گھومتی رہی دنیا
چاند کی طرح ہر شے دور ہو گئی ہم سے

شمارہ ۲۷۸،
مارچ ۲۰۰۴

نیم دائرے

ہزار لاکھ کروڑوں برس میں بکھرا وقت
زمین کے گذرے ہوئے کل کا ایک حصہ ہے
زمیں کے گذرے ہوئے کل میں میرا کل بھی ہے
مرے لہو کے بھی سکے ہیں ان خزانوں میں
زمیں نے جن کو لٹایا ہے آسمانوں میں
وہ ننھے ننھے ستاروں کے ٹمٹماتے چراغ
جو میرے اشکوں سے تابندہ ہیں۔ وہ گول سا چاند
وہ چرخا کاتتی بڑھیا جو اس میں بیٹھی ہے
وہ میری ماں کی طرح ہے، وہ میری بیٹی ہے۔

مصطفیٰ ارباب

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

سیب

وہ ایک سیب اٹھا کر
اپنے نازک اور خوبصورت ہاتھوں
قاشیں بنا کے
کھانے لگتی ہے
میٹھا اور رسیلا سیب
جسے وہ سفید دانتوں سے
آہستہ آہستہ چباتی ہے
مزہ اس کے منہ میں گھلتا ہے
قریب ہی بیٹھا ہوا فرد
اپنے کھردرے ہاتھ سے
پلیٹ میں سے
اسی سیب کی
ایک قاش اٹھاتا ہے
اور بے مزہ پھیکے سیب کو
تھوک دیتا ہے
دونوں حیرت سے
ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں
وہ نہیں جان سکتے
سیب کو صرف لڑکی پسند آئی تھی

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

میرا دل

میرے پاس ایک دل ہے
ایک دھڑکتا ہوا دل
میں اسے
کسی بھی حسینہ کو
پیش نہیں کروں گا
میرے آس پاس
کئی خوبصورت لڑکیاں رہتی ہیں
مجھے یقین ہے
کوئی بھی لڑکی
میرا دل
لے سکتی ہے
لیکن
میں ایسا نہیں ہونے دوں گا
میرے دل میں
میرے بہت سے دشمن رہتے ہیں
میں اپنا دل
کسی کتے کے آگے ڈالنا چاہتا ہوں

شمارہ ۲۹۰،
مارچ ۲۰۰۵

دیوتا

وہ ایک گھوڑے پر
کسی دیوتا کی مانند نمودار ہوتا ہے
بستی کے لوگ
اس کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں
ان کی گردنوں میں
احترام خم کی صورت اختیار کر لیتا ہے
دیوتا انہیں
نئے سورج کی نوید دیتا ہے
اس کے پاس جتنے بھی خواب تھے
سارے لوگوں میں بانٹ دیتا ہے
لوگ اپنے دکھوں کو بھول جاتے ہیں
ان کے سامنے
صرف ایک دیوتا رہ جاتا ہے
ان کی پلکیں
پرستش کے بوجھ تلے
جھکی رہتی ہیں
وہ سب خود کو
ایک نئی دنیا میں سانس لیتے
محسوس کرتے ہیں
ایک ننھا بچہ
کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے
غور سے دیوتا کو دیکھ رہا ہے
جو ایک سفید گھوڑے پر
باوقار انداز میں بیٹھا ہوا ہے
بچہ حیرت سے
سفید گھوڑے کی
چاروں ٹانگوں کو دیکھتا ہے

مصور سبزواری

شمارہ ۸۱،
فروری ۱۹۷۳

گھر سے چلتے ہی وہی خوف پرانے دے گا
ایک آسیب کہیں مجھ کو نہ جانے دے گا

شام ڈھلتے ہی سلگنے لگی دہلیز افق
چاند نکلا تو اداسی کے خزانے دے گا

تو دۂ ریگ ہوں میں تجھ سے تعلق کیا ہے
تو ہوا ہے تو مجھے خاک اڑانے دے گا

دشت درماں طلبی میں یوں ہی مر جائے گا
اپنے نزدیک کسی کو بھی نہ آنے دے گا

زیست کے روپ میں دیتا تھا لہو رنگ سراب
موت بھی وہ مجھے سانسوں کے بہانے دے گا

اب کسی سنگ تبسم کو وہ روکے گا نہیں
جو ہنسی میری اڑائے گا اڑانے دے گا

انتظار ثمر ہجر مصور بے سود
فصل کون آگ کے دریا میں اگانے دے گا

شمارہ ۸۷،
نومبر، دسمبر ۱۹۷۳

تمام چہرے تھے فق رات ہونے والی تھی
نہ جانے شہر میں کیا بات ہونے والی تھی

چلے تھے شام زمستاں منانے دو سائے
سڑک پہ برف کی برسات ہونے والی تھی

میں پیچھے ایک سیہ پھول کے پڑا ورنہ
مجھے اندھیروں سے کب مات ہونے والی تھی

ہوا نے چپکے سے موجوں کے کان میں کہا کچھ
کہ زیر آب کوئی گھات ہونے والی تھی

وہی مقام ملاقات کا چنا اس نے
جہاں ہجوم کی بہتات ہونے والی تھی

رہا نہ راستہ جب کوئی بچ نکلنے کا
وہ لڑ پڑا کہ اسے مات ہونے والی تھی

مصور سبزواری

شمارہ ۱۴۴،
دسمبر ۱۹۸۶

یوں گم ہوا وہ شخص کہ اکثر ہوا طلوع
نظروں سے تھا غروب تو جاں پر ہوا طلوع

فرماں روائے شہر سنبھال اپنی بخششیں
دو انگلیوں کے بیچ سمندر ہوا طلوع

وہ آخری غنیم تھا نصرت قریب تھی
اک نقش پا سے کیسا یہ لشکر ہوا طلوع

کب نرم روشنی کے جزیرے سمٹ گئے
کس سانحے سے آنکھ میں پتھر ہوا طلوع

خواب گریز پا کا تھا کردار وہ کوئی
وہ میں جو الف لیلہ کے اندر ہوا طلوع

کسب نجوم کیا کریں ہم پستیوں کے چاند
بے دسترس فلک پہ سوئمبر ہوا طلوع

شمارہ ۲۰۳،
فروری ۱۹۹۷

کف بہ کف نفرتوں کے سفر تجھ کو کچھ بھی نہ حاصل ہوا
تو نے کشتی ڈبو دی مری میں تری ضد میں ساحل ہوا

ہم تو صد رنگ آفاق آباد کرنے چلے تھے مگر
جشن تخریب میں تو بھی شامل ہوا میں بھی شامل ہوا

بجھتے بجھتے مری آگ شاداب رکھنے کی خاطر ابھی
شمع بر کف کوئی چپکے چپکے رگ و پے میں داخل ہوا

اور اک صبح خورشید کے آئینوں میں دمکنے لگی
اپنی خواہش کا چہرہ نہ اب تک نمائش کے قابل ہوا

کالے رتھ آندھیوں کے چلے رعد کے تازیانے بڑھے
پیش خیمہ ہے یہ اس کی آمد کا امکان کامل ہوا

مضطر حیدری

شمارہ ۴۳،
دسمبر ۱۹۶۹

وہی اداس سا چہرہ قیاس جیسا ہے
یہ آدمی تو کوئی روشناس جیسا ہے

کوئی بھی شکل مکمل کتاب بن نہ سکی
ہر ایک چہرہ یہاں اقتباس جیسا ہے

یہ خوف ناک جزیرہ یہ موت کا جنگل
یہ کل کے خواب کا کچھ انعکاس جیسا ہے

لو وہ بھی آج نہ جانے سیاہ پوش ہے کیوں
یہ پیرہن تو ہمارے لباس جیسا ہے

نہ جانے کیوں وہ مخاطب ہے آج یوں ہم سے
یہ اس کا لہجہ تو کچھ التماس جیسا ہے

یہ چودھویں کی چمک بھی نہ راس آئی اسے
یہ چاند آج کی شب بھی اداس جیسا ہے

مظفر حنفی

شمارہ ۸۵،
جون، جولائی ۱۹۷۳

خون میں جب اژدہے پھنکارتے ہیں
تتلیوں کو پھول آنکھیں مارتے ہیں

رات بھر لگتے ہیں خود کو اجنبی سے
ہم کچھ اتنے روپ دن میں دھارتے ہیں

حادثوں سے ہے روانی زندگی میں
جیسے اڑیل بیل کو ٹکارتے ہیں

سر لگا کر داؤں پر اب بے دماغی
لے ترے حق میں یہ بازی ہارتے ہیں

کیسے کیسے کھیل کرتی ہے ہوا بھی
بلبلے طوفان کو للکارتے ہیں

خود ہمارا جسم چھن چھن بولتا ہے
پھر بھی آئینوں پہ پتھر مارتے ہیں

ہوشیاری ہو کہ نادانی مظفر
کھردرے پن پر تغزل وارتے ہیں

بس ایک رات مرے گھر قیام کرتی جا
نہیں تو موج بلا تجھ سے میری کٹی جا

میں انتظار میں لیٹا ہوں کب سے ساحل پر
ترانا بس میں نہیں ہے تو پھر ڈبو ہی جا

چڑھا ہے زہر خودی شیو کی پیروی کر کے
اب آنسوؤں کو بھی ایوب کی طرح پی جا

وہ سوکھتی ہوئی شبنم پکارتی ہے اٹھ
ہوا نے تیرے لئے گرد بھی اڑا دی جا

کمان داروں سے سازش کہ تیر ترچھے ہوں
نگاہ کو یہ ہدایت ملی کہ سیدھی جا

کہاں ہے روٹھی ہوئی نیند، آخری شب ہے
میں سر سے پاؤں تلک آنکھ ہوں اب آ بھی جا

مٹا کے ہستی بے کار مجھ کو آگے بڑھ
ترے لحاظ سے تہمت بہت اٹھالی جا

مظفر حنفی

شمارہ ۱۰۰،
اگست، ستمبر ۱۹۷۶

خودی اچھی مگر اس کا نتیجہ
وہی نیزے پہ سر اس کا نتیجہ
صداقت برسر منبر حماقت
فراز دار پر اس کا نتیجہ
اسی سے عشق کرنے جا رہا ہوں
اسی سے پوچھ کر اس کا نتیجہ
مرادیں پھول پر آنے لگی ہیں
تمنائے ثمر اس کا نتیجہ
نکل آئے مری شہرت کے شہپر
گھمائے در بہ در اس کا نتیجہ
کسی کے واسطے رونا برا ہے
نہ بھول اے چشم تر اس کا نتیجہ
سڑک پر بے خبر سوئے ہوئے تھے
پھر اک تازہ خبر اس کا نتیجہ
چلا پھر آئینے سے ایک پتھر
ادھر وہ ہے ادھر اس کا نتیجہ
جہاں بائیس پنسیری کا ہر دھان
وہاں میں باہنر اس کا نتیجہ
مظفر اوڑھ کر تازہ زمینیں
بھٹکیے رات بھر اس کا نتیجہ

شمارہ ۱۲۴،
مارچ تا مئی ۱۹۸۲

میں گنہ گار اور ان گنت پارسا چار جانب سے یلغار کرتے ہوئے
جیسے شب خون میں بوکھلا کر اٹھیں لوگ تلوار تلوار کرتے ہوئے

اڑ رہی تھی وہاں گرد تشکیک کی، آندھیاں تیز تھیں طنز و تضحیک کی
راستے میں پڑا نیک نامی کا پل خوف آیا جسے پار کرتے ہوئے

وہ خراشیں دکھاتے رہے ہاتھ کی سنگ باری کے دوران آئی تھیں جو
ہم ادھر زخم سر کو چھپاتے رہے اور تزئین دستار کرتے ہوئے

بے رخی کی ہوائیں معافق نہ تھیں کیسے اخلاص کی کونپلیں پھوٹتیں
چار آنسو زمینوں کو نم کر گئے سرد لفظوں کو بے کار کرتے ہوئے

پھر چھٹی حس نے پرچے لگائے بہت، آئینے عاقبت نے دکھائے بہت
بھائی نے آج کیوں مجھ کو دیکھا نہیں تاج پوشی کا دربار کرتے ہوئے

یہ زمانہ لگا ہے کہ اب جسم میں خار کے واسطے قطرۂ خوں نہیں
ایک وہ وقت بھی تھا کہ چلتے تھے ہم راستے بھر کو گلنار کرتے ہوئے

طرز تعمیر کے کچھ نئے زاویے عصر نو کو مظفر نے بخشے تو ہیں
اپنی ہی ذات پر وار کرتے ہوئے اپنی ہستی کو مسمار کرتے ہوئے

مظفر حنفی

شمارہ ۱۹۹،
اکتوبر ۱۹۹۶

گرداب سے نکال مجھے بادبان باد
وحشت میں ہوں سنبھال مجھے بادبان باد

آوارگی کے شوق میں پر بھی اگ آئے ہیں
اک راہ پر نہ ڈال مجھے بادبان باد

محدود ہوگیا ہوں کبھی سوچتا تھا میں
کردے گا بے مثال مجھے بادبان باد

ایسا نہ ہو پلٹ کے زمیں پر نہ آسکوں
اتنا بھی مت اچھال مجھے بادبان باد

وہ جوش میری فکر کے دریا میں ہے کہ بس
لیکن ترا خیال مجھے بادبان باد

دم گھٹ رہا ہے سمٹی ہوئی شش جہات میں
ان سے بڑا وبال مجھے بادبان باد

ہمراہ تیرے طبع مظفر بھی ہے رواں
مقطع ہوا محال مجھے بادبان باد

شمارہ ۲۱۷،
جون ۱۹۹۸

غم اگر دل سے نکل آیا تو
سانپ یہ بل سے نکل آیا تو

اتنی وحشت بھی نہ کر صحرا میں
کوئی محمل سے نکل آیا تو

سامنے ہے وہی ظلمت کا دیار
شہر باطل سے نکل آیا تو

تیری دنیا سے بھی اٹھ جاؤں گیا
اس کی محفل سے نکل آیا تو

اور پھر ایک سفر کرنا ہے
گرد منزل سے نکل آیا تو

شور گرداب ہے دریا دریا
اور ساحل سے نکل آیا تو

مظہرالزماں خاں

شمارہ ۲۰۵،
اپریل ۱۹۹۷

وہ نجس سیاہ کتا اپنی لٹکتی اور مسلسل لعاب گراتی ہوئی بے زبان زبان سے پتہ نہیں کب اور کس بلاخیز موسم میں ہمارے قدیم گھر میں داخل ہوکر ہمارے مسائل زدہ گھر کا ایک عزیز فرد بن گیا تھا۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے بس ایک دھند میں لپٹا ہوا دھواں دھواں سا خیال میرے ذہن کے فانوس میں ہنوز مدھم چراغ سا ہے کہ شاید وہ سیاہ کتا میری عمر کے تیرہویں موسم میں یا شاید اس کے بعد یا شاید اس سے پہلے ہمارے آنگن والے گھر میں داخل ہوا تھا اور غیر ارادی طور پر میرے اندر اس کے لیے خواہ مخواہ ایک خلوص پیدا ہو گیا تھا کہ شعور میرے اندر ابھی جگنو نہیں بنا تھا اس لیے میں غیر شعور اور غیر ارادی طور پر اس سیاہ نجس کتے کے قریب آپ ہی آپ چلا گیا تھا کیوں کہ وہ میرے پیروں کے لمس سے اپنی قربت کا ہر وقت اظہار کیا کرتا تھا اور اپنی لٹکتی ہوئی چپ چپ، لعاب گراتی ہوئی چکٹ زبان سے مسلسل مجھے چاٹا کرتا تھا جس طرح دنیا آدمی کو چاٹتی رہتی ہے اور پھر پاؤں کو چاٹنے والے سے آدمی فطری طور پر خوش ہوتا ہے اسی طرح میرے اندر بھی اس سے بڑی محبت پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کے ساتھ لگے رہتے تھے اور سارے دھول موسم ہم دونوں پر سے ایک ساتھ گذرتے رہتے تھے کیونکہ کسی بھی موسم یا منظر کا احساس اس وقت مجھے نہیں ہوا تھا یا شاید میں موسم یا مناظر، دونوں سے واقف نہیں ہوا تھا اس لیے چپ تھا اور چاہتا تھا کہ میں اور وہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں اور وہ اپنی تمام خصوصیات وخساست آہستہ آہستہ میرے اندر منتقل کرتا جا رہا تھا اور میں بھی بے ارادہ اس کی عادتیں اور اس کا مزاج قبول کرتا چلا جا رہا تھا کیونکہ مجھے اس کی ہر حرکت دنیا کی طرح اچھی لگتی تھی بلکہ بعض وقت تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اور میں دونوں آہستہ آہستہ ایک سے ہوتے جا رہے ہیں کہ اس کی دنیا کا وہ ہمزاد اب پوری طرح میرا بھی ہمزاد بن گیا تھا کہ دفعتاً ایک بیدار رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کا کہیں پتہ نہیں ہے اور میں اسے مسلسل تلاش کر رہا ہوں۔ اپنے سارے گھر میں، سارے شہر میں، سارے محلے میں لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے جب کہ اس جیسے کھلنے سیاہ، زرد ہزارہا کتے ہر شہر اور ہر گھر میں موجود ومحفوظ ہیں تاہم وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا چنانچہ میں اسے تلاشتے تلاشتے تھک کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں تو اچانک مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ میرا اندر چھپا بیٹھا مسلسل بھونک رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میرے اندر چکٹ لعاب بھی گرتا جا رہا ہے اور میں اسے اپنے اندر کے جنگل سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن وہ میرے اندر سے باہر آنے کے بجائے میرے پیٹ سے میرے دل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور میرا دل میرے اندر سے باہر نکل کر دوڑ رہا ہے اور دوڑتے دوڑتے ایک ٹھوکر کھا کر شیشے کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے اور تبھی اچانک میری گہری پیدائشی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور میں اپنے میلے بستر سے اٹھ کر حیران نظروں سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتا ہوں کہ آیا وہ اپنی جگہ موجود ہے یا سبھوں کے دلوں کی طرح نکل گیا ہے۔ لیکن چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے مگر آئینہ بن گیا ہے البتہ وہ سیاہ کتا میرے پیٹ میں ہنوز بھونک رہا ہے اور معاً تبھی میری آنکھیں میرے دل میں جگنو بن جاتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ٹیڑھی دم والا سیاہ کتا میرے اندر سے نکل کر مجھے گھورنے لگا ہے اور پھر پہلی مرتبہ مجھے اس کی آنکھوں اور اس تھرتھر جھولتی ہوئی زبان اور اس سے گرتے ہوئے چپ چپ چکٹ لعاب سے نفرت ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ گذرے ہوئے تمام رات اور میلے دن ہوا، ہوا ہو جاتے ہیں تو مجھے پہلی بار اپنے اجلے آدمی ہو جانے کا احساس ہوتا ہے اور پھر میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ میں پیدا کیوں کیا گیا ہوں۔ میری پیدائش کا مقصود کیا ہے؟ اور اسی وقت میرے ذہن سے ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ اگر اپنے آپ کو سمجھنا چاہتے ہو اور اپنی ذات کو پہچاننا چاہتے ہو تو اس سیاہ کتے سے چھٹکارا حاصل کرلو ورنہ ان گنت کتوں کے کتا خانے میں ایک اور کتے کا اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ صبح اٹھ کر میں سب سے پہلے اپنے اندر اور باہر کے دونوں جسموں کو دھو ڈالتا ہوں تو پہلی مرتبہ مجھے اپنے وجود کے ساتھ علم کا احساس ہوتا ہے اور پھر اسی وقت میں آنگن میں بیٹھے ہوئے اس سیاہ کتے کے قریب جاتا ہوں اور اس کے گلے میں زنجیر ڈالتا ہوں اور پھر اسے گلی کوچوں اور بازاروں سے گذارتے ہوئے جنگل میں پہنچتا ہوں تو سورج اپنا سارے دن کا سفر ختم کیے تکان سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں اس سیاہ کتے کے گلے سے زنجیر کھولتا ہوں اور اسے جنگل میں چھوڑ کر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگتا ہوں تو وہ سیاہ کتا پھر میرے پیچھے آنے لگتا ہے۔ میں اسے دھتکارتا ہوں پھر بھی وہ میرے پیچھے آنے لگتا ہے۔ چنانچہ میں درخت سے ایک کچی لکڑی توڑتا ہوں اور اسے مارنے لگتا ہوں تو وہ بھونکتے ہوئے تیزی سے بھاگنے لگتا ہے اور میں لکڑی لیے مارتا ہوا اس کے پیچھے دوڑنے لگتا ہوں۔ آخر بھاگتے بھاگتے جب وہ سیاہ کتا میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اختتام ایک

تب میں اپنے گھر لوٹنے کے لیے گھنے جنگل سے پلٹتا ہوں تو اپنے گھر کا راستہ ہی بھول جاتا ہوں کہ جدھر جاتا ہوں مجھے درکت ہی درخت دکھائی دیتے ہیں۔

اختتام دو

اور جب میں اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں تو مجھے چاروں طرف غراتے ہوئے درخت دکھائی دیتے ہیں اور ان کی شاخوں سے ٹپکتے ہوئے چپ چپ چکٹ لعاب میں میں پوری طرح بھیگ جاتا ہوں ☆☆☆

مظہر امام

شمارہ ۱۳۴،
جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴

نہ مجھ میں ہی شعلۂ طلب تھا نہ تم میں جوش سپردگی تھا
مجھے بھی احساس کمتری تھا تمھیں بھی احساس کمتری تھا

تمھارے رخسار کی چمک تھی کہ میرے احساس کی دمک تھی
سجا سجا شب کا پیرہن تھا دھلا دھلا رنگ روشنی تھا

کہا تھا یہ دوستوں نے مجھ سے کہ اس کی رنگت کا کیا بھروسا
اگرچہ موسم بدل چکا تھا مگر جو دیکھا تو وہ وہی تھا

تھا کوئی کمزور سادہ لمحہ کہ تم مری سمت آگئے تھے
ہمارے دل ہی کی طرح کاسہ تمھارے دل کا بھی جب تہی تھا

تمھاری قربت کا معجزہ ہے مجھے نئے بال و پر ملے ہیں
یہ مجھ کو محسوس ہو رہا ہے کہ میں وہی ہوں جو میں کبھی تھا

شمارہ ۲۱۹
اگست، ستمبر ۱۹۹۸

نئی کونپل نئے پھولوں کے زمانے آئے
لوگ بھولے ہوئے دن یاد دلانے آئے

قصہ دہر کو دلچسپ بنانے آئے
ہم ترے سچ میں ذرا جھوٹ ملانے آئے

میری پہچان کی خاطر سر حجرہ قاتل
دوستوں کو مری تصویر دکھانے آئے

آگیا موسم ہجراں تو کُھل درد کھلا
وقت بدلا تو ترے غم بھی سہانے آئے

تجھ پہ الزام نہیں ہے کوئی معاملہ گل
ہم بھی آئے تو یہاں رنگ چرانے آئے

اپنے شعروں سے ملاقات ہوئی تو یہ کھلا
تازہ دم ہو کے کئی لفظ پرانے آئے

مظہرامام

شمارہ ۲۳۵
مارچ ۲۰۰۰

ذوق جمال ہو بھی تو چہرہ کہاں سے لاؤں
موجیں تو لا چکا ہوں پہ دریا کہاں سے لاؤں

آبادیاں بہت ہیں خرابے بھی کم نہیں
آشفتگی دل کا شناسا کہاں سے لاؤں

کیسے دکھاؤں لذت تقریر کا کمال
منبر ہے سر بلند سہارا کہاں سے لاؤں

اپنے مقابلے ہی کا ملتا نہیں کوئی
اب تیرے مرتبے کا میں اپنا کہاں سے لاؤں

میں بھی ستم گری کے ہنر سے ہوں آشنا
تیرا کمال، تیرا سلیقہ کہاں سے لاؤں

کوئی نیا مکان بنانے سے میں رہا
باہر ہوا ہے تازہ، دریچہ کہاں سے لاؤں

ملنا ترا ہوا ہے اب آساں بھی سہل بھی
پہلا سا لطف وعدۂ فردا کہاں سے لاؤں

طعنے ہی اب سنوں گا کہ میں بے کتاب ہوں
پیغام لاؤں بھی تو صحیفہ کہاں سے لاؤں

خوش گمانی چاہتی ہے رائیگاں کوئی نہ ہو
ہو نتیجہ ہی نتیجہ، امتحاں کوئی نہ ہو

شہر دل کے اس بھرے بازار میں چلئے جہاں
بیچنے والے بہت ہوں اور دکاں کوئی نہ ہو

وہ بھی دن آئے زمیں سیراب کرنے کے لیے
خیر کی بارش ہو لیکن آسما ں کوئی نہ ہو

ہم بھی اب گوشے میں بیٹھے مانگتے ہیں یہ دعا
جنگ سب لڑتے رہیں اور کامراں کوئی نہ ہو

یہ بھی کیا قرب قیامت کی نشانی ہے امام
رہنما ہی رہنما ہوں کارواں کوئی نہ ہو

مظہر امام

شمارہ ۲۴۲
دسمبر ۲۰۰۰

اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے سماں کیا دیکھیں
موج خوں دیکھیں کہ جمتا ہوا دریا دیکھیں

کیا پتہ کل ہمیں سیلاب کہاں لے جائے
آج کچھ دیر تو بارش کا تماشا دیکھیں

چاہنے والے بہت، ان کے تقاضے بھی بہت
کیا یہی کام ہے اپنا ترا رستہ دیکھیں

چند لمحے جو میسر ہیں غنیمت ہیں یہی
تجھ کو دیکھیں کہ ترا وعدۂ فردا دیکھیں

کھیل دکھلانے کو بیٹھے ہیں مداری کب سے
ہم جہاں خود ہی تماشا ہوں وہاں کیا دیکھیں

اپنے رستے میں بچھاتی رہے دنیا کانٹے
اور ہم دور سے بیٹھے ہوئے دنیا دیکھیں

ہم سے اب اور ہزیمت نہیں اٹھنے والی
کار جاں ختم ہوا، کار جہاں کیا دیکھیں

کل سحر ہوگی تو دشمن کا پتہ پوچھیں گے
کم سے کم آج تو ہم تیر کو آتا دیکھیں

اب تو آنکھیں ہیں کہ پتھرائی چلی جاتی ہیں
رخصت بزم ہے، شمعوں کا دھواں کیا دیکھیں

اک زمانے سے شب و روز کی گردش ہے امام
ہم کو ملتا ہی نہیں وقت کہ لمحہ دیکھیں

شمارہ ۲۴۵
مارچ تا جون ۲۰۰۱

شاعری سحر نظر کیا ہوتی
مرہم زخم جگر کیا ہوتی

اپنا ہی غم تھا زمانے سے سوا
آپ کے غم کی خبر کیا ہوتی

رات اٹھنے کو رضامند نہ تھی
مسند افروز سحر کیا ہوتی

تیری دہلیز پہ تھک کر بیٹھی
منزل گرد سفر کیا ہوتی

تاج و اورنگ کی اس دنیا میں
قدر ارباب ہنر کیا ہوتی

جمع ہم نے کئے تنکے ورنہ
قیمت برق و شرر کیا ہوتی

قافیہ

مغنی تبسم

شمارہ ۲۸، ستمبر ۱۹۶۸

مشرق اور مغرب کی شاعری میں زمانۂ قدیم ہی سے وزن کے ساتھ قافیہ کو شعر کا لازمی اور اہم جز سمجھا جاتا رہا ہے۔ قافیہ اصوات کی تکرار سے بنتا ہے۔ "باطل" اور "مشکل" قافیے ہیں اس لئے کہ ان کلموں کے آخر میں اصوات =رِ/ اور /ل/ کی تکرار ہوئی ہے۔ "سبو" اور "کدو" بھی قافیے ہیں۔ ان میں مصوتہ /وٗ/=ū/ مکرر آیا ہے۔ اسی طرح "کب" اور "جب"، "کام" اور "تام"، "غم" اور "الم" پر قافیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے قافیہ کی اکائی ایک لانبا مصوتہ[1] یا ایک مصوتہ + مصمتہ ہے۔ قافیہ میں اس صوتی اکائی کا پایا جانا ضروری بھی ہے اور کافی بھی۔ کلموں کے آخر میں لانبے مصوتوں کی تکرار سے بننے والے قافیوں کی چند مثالیں یہ ہیں:

گیا، اٹھا۔ سنے، کہے۔ کہیں، کہیں

ایک مصوتہ اور ایک مصمتہ سے مل کر تشکیل پانے والے قافیے یہ ہیں:

مل، دل۔ سال، جال۔ نظر، خبر۔ ستم، کرم

اگر دو کلموں کے آخر میں اصوات کی اس طرح تکرار نہ ہو تو انھیں قافیہ نہیں کہا جائے گا۔ "کہا" کا قافیہ "چلو" اور "بسمل" کا قافیہ "بادل" نہیں ہو سکتا۔ قافیوں میں صوتی اکائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مزید مصوتوں اور مصمتوں کی تکرار کا لزوم رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح مکرر لائے جانے والے مصوتوں اور مصمتوں کی تعداد میں تبدیلی اور ان کی ترتیب کے فرق سے مختلف آہنگ کے قافیے تشکیل پائیں گے۔ مثلاً:

مص[2] : جفا۔ خدا نمو۔ رفو روشنی۔ زندگی

مص مصم : بدن۔ وطن ساحل۔ دل گل۔ بُل

کمال۔ خیال نظیر۔ منیر روپ۔ دھوپ

مص مصم مص : کہاں۔ جہاں سفینہ۔ مہینہ تارے۔ نظارے

مص مصم مص مصم : حالات۔ خیالات چمن۔ دمن

نقیب۔ رقیب

مص مصم مصم : غرق۔ فرق ہست۔ مست تاخت۔ ساخت

مص مصم مصم مص : نکھارتے۔ سنوارتے سوختہ۔ دوختہ

لڑکا۔ تڑکا

مص مص : گئی۔ گئی آئے۔ لائے جاؤ۔ ستاؤ

مصوتوں اور مصمتوں کی تعداد اور ترتیب کے فرق سے قافیوں کے اور بھی نمونے بن سکتے ہیں۔ ان تمام نمونوں میں قافیہ کی اکائی لازماً موجود ہوگی۔

قافیہ ایک سادہ صوتی تنظیم ہے لیکن قدما نے غیر ضروری موشگافیوں سے اسے پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے اور ایک مستقل علم کی بنیاد رکھ دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علم قافیہ کی خشت اول ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ یہ علم چند غلط مفروضات پر قائم ہے۔ ان مفروضات کی غلطی واضح کر دی جائے تو سارا علم پادر ہوا ہو جاتا ہے۔ قدما نے قافیہ کی جو تعریف کی ہے اس کی رو سے قافیہ کا اطلاق چند معین حروف پر ہوتا ہے۔ جو قصیدہ اور غزل کے مطلعوں، مثنوی کی ابیات کے ہر مصرع کے آخر میں اور قطعہ، غزل اور قصیدہ کے اشعار کے مصرع ثانی کے آخر میں الفاظ مختلفہ کے اندر مکرر آتے ہیں اور مستقل نہیں ہوتے۔

بات یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ حروف سے مراد اگر زبان کی اصوات لی جائیں تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ماہرین علم قافیہ حروف کو اصوات کی علامت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن میں مصوتوں (Vowels) اور مصمتوں (Consonant) کا تصور زیادہ واضح نہیں تھا۔ قواعد کی کتابوں میں گرچہ حروف صحیح (مصمتوں) اور حروف علت (مصوتوں) کی تقسیم ملتی ہے لیکن قدما کا تصور یہ تھا کہ یہ سب حروف یا تو ساکن ہوتے ہیں یا متحرک۔ ان کے نقطۂ نظر سے مصوتہ یا (vowel) کا فعل، حرکات انجام دیتی ہیں۔ حرکات (فتح، ضمہ، کسرہ یا زبر، زیر، پیش) کو جو دراصل عربی، فارسی اور اردو زبان کے مصوتے ہیں انھوں نے نظام ہجا سے خارج کر دیا ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے کلموں کی صوتی تنظیم کے بارے میں جو مغالطہ ہوا اس کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکتا ہے:

لفظ "پانی" کو لیجیے۔ قدما کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ چار حروف، پ، الف، ن اور ی اور دو حرکات سے بنا ہے۔ ان کی ترتیب یہ ہے: پ + َ + ا + ن + ِ + ی گویا اس لفظ میں دو مصمتے (حروف صحیح) پ اور ن اور چار مصوتے (حرکات اور حروف علت) َ، ِ، ا اور ی شامل ہیں۔ جب کہ صوتی نقطۂ نظر سے صرف دو مصمتوں =/پ/ اور /ن/ اور دو مصوتوں /آ/ = ā/ اور /ی/ = ī/ پر مشتمل ہے۔ ماہرین علم قافیہ نے مزید ستم ظریفی یہ کی کہ غنہ کو ایک الگ اور مستقل صورت قرار دیا (جب کہ عروضی بھی غنہ کو حرف میں داخل نہیں سمجھتے اور تقطیع میں نہیں لاتے)۔ چنانچہ لفظ = "جہاں" ان کے بموجب ان حروف پر مشتمل ہے = ج + َ + ہ + َ + ا + ں حالانکہ یہ لفظ صرف دو مصمتوں =/ج/ اور /ہ/ اور دو مصوتوں /زبر/ = a/ اور /آں/ = ā̃/ سے مل کر بنتا ہے۔ /آں/ = ā̃/ واحد صوت ہے۔ مصوتہ /آ/ = ā/ کو جب ناک سے

---

[1] اردو زبان کے بنیادی مصوتے دس ہیں۔ ان میں تین چھوٹے مصوتے ہیں اور باقی لانبے۔

چھوٹے مصوتے : َ = a ِ = i ُ = u

لانبے مصوتے : ا/آ = ā ی = ī و = ū ُو = o ِے = e َے = ai َو = au

[2] مص = مصوتہ مصم = مصمتہ

ادا کیا جاتا ہے تو /آں=ã/ بن جاتا ہے۔

یہی وہ بنیادی لغزش اور غلطی تھی جس نے قافیہ کے ماہرین کو غلط راہ پر ڈال دیا اور اس غلطی کو نبھانے کے لئے انھوں نے غیر علمی اصولوں اور مستثنیات کا چکر چلا دیا۔

اب ہم کسی قدر تفصیل سے قدیم علم قافیہ کے مباحث کا جائزہ لیں گے۔
علم قافیہ کی رو سے قافیہ کا اطلاق نو حروف پر ہوتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

ردف، قید، تاسیس، دخیل، روی، وصل، مزید، خروج اور نائرہ

اصل قافیہ حرف روی ہے۔ اس کے بغیر قافیہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ "قسم" اور "قلم" میں حرف روی "م" ہے۔ "فضا" اور "صبا" میں حرف روی "ا" ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے اول الذکر قافیہ ایک مصوتہ /ءَ = a/ اور ایک مصمتہ /م/ سے بنا ہے۔ موخر الذکر قافیہ صرف ایک لانبے مصوتہ /آ=a/ سے تشکیل پایا ہے۔ ماہرین علم قافیہ کہتے ہیں کہ ان قوافی میں "م" اور "ا" ساکن ہیں۔ ایسے قافیہ کو وہ روی مقید کہتے ہیں۔ اگر حرف روی متحرک ہو اور اس کے بعد حرف زائد آئے تو اسے روی مطلق کہتے ہیں۔ "ذاتی" اور "نباتی" میں "ت" متحرک ہے اور اس کے بعد حرف زائد "ی" آیا ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ "مص مصم مص" نمونہ کا قافیہ ہے۔

ردف اس ساکن حرف مدہ کو کہتے ہیں جو حرف روی سے قبل بلا فصل آئے۔ "کھیر" اور "پیر" میں حرف روی "ر" سے پہلے قدما کے مطابق ایسے معروف ساکن ہیں۔ وہ اسے ردف کہتے ہیں۔ صوتی اعتبار سے یہ "مص مصم" نمونے کا قافیہ ہے۔ حرف مدہ اور روی کے درمیان کوئی اور ساکن حرف آئے تو اسے ردف زائد کہتے ہیں "دوست" اور "پوست" میں "س" ردف زائد ہے۔ قدما چونکہ غنہ کو بھی مستقل حرف تصور کرتے تھے اس لئے ان کے نقطۂ نظر سے "کانپ" اور "ڈھانپ" میں غنہ ردف زائد ہے حالانکہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ قافیہ بھی ایک مصوتہ = /آں = ã/ اور ایک مصوتہ = /پ/ سے مل کر بنتا ہے اس میں /آں/ ردف اصلی ہے۔ نہ کہ ردف زائد۔

قید اس حرف ساکن کو کہتے ہیں جو مدہ نہ ہو اور روی کے قبل بلا فصل آئے۔ "نخل" اور "دخل" میں حروف روی "ل" سے قبل "خ" حرف قید ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ "مص مصم مصم" نمونہ کا قافیہ ہے۔

تاسیس اس ساکن الف کو کہتے ہیں جو روی سے پہلے آئے لیکن الف اور روی کے درمیان ایک متحرک حرف فاصل آئے جیسے "جاہل" اور "قابل"۔ ماہرین علم قافیہ کہتے ہیں کہ تاسیس کی پابندی تمام اشعار میں ضروری نہیں ہے۔ "جاہل" اور "قابل" کا قافیہ "دل" بھی آ سکتا ہے۔

صوتی نقطۂ نظر سے قافیہ کو قائم کرنے والی تمام اصوات کی تکرار ہونی چاہئے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اصوات مسلسل واقع ہوں۔ "جاہل" اور "قابل" میں /ہ ـِ ل/ اور /ب ـِ ل/ ہی اصوات قافیہ ہیں۔ تاسیس کا شمار بعض اساتذہ نے صنعت میں کیا ہے جسے اعنات کہتے ہیں۔ تاسیس اور روی کے درمیان جو حروف مختلف آتے ہیں انھیں دخیل کہتے ہیں۔

وصل وہ حرف ہے جو روی کے بعد آتا ہے۔ "بیماری" اور "گرفتاری" میں "ر" روی ہے اور "ی" وصل۔ سوال یہ ہے کہ "ی" کو روی کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ ماہرین علم قافیہ کہتے ہیں کہ روی اور وصل میں یہ فرق و امتیاز ہے کہ وصل کو خارج کر دیا جائے تو لفظ با معنی رہتا ہے اور روی کو خارج کر دیا جاتا ہے تو مہمل ہو جاتا ہے۔ متذکرہ کلموں میں "ی" کو خارج کر دیں تو "بیمار" اور "گرفتار" باقی رہ جائیں گے جو با معنی کلمے ہیں۔ اس کے برخلاف حرف روی "ر" کو نکال دیں تو "بیما" اور "گرفتا" باقی رہ جاتے ہیں جو بے معنی ہیں۔

اس نوبت پر قافیہ کے تعین کے تعلق سے قدما کی دوسری غلطی سامنے آتی ہے۔ قافیہ میں کلمہ کی اصوات کو پیش نظر رکھنا چاہئے نہ کہ مفہوم کو۔ ہم ان غیر ضروری اصطلاحوں کے پھیر سے نکل کر سادہ طریقہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "بیماری" اور "گرفتاری" "مص مصم مص" نمونے کے قافیے ہیں۔

قافیے کے ضمن میں ایک مضحکہ خیز بحث زائد اور حرف اصلی کی آتی ہے۔ "خشک سالی" اور "خالی" میں پہلے لفظ کی "ی" کو یائے زائد کہتے ہیں کیوں کہ اصل لفظ سال پر اس کا اضافہ کیا گیا ہے جب کہ "خالی" کی "ی" اصلی ہے۔ علم قافیہ کی رو سے "خشک سالی" میں حرف روی "ل" ہے اور "خالی" میں حرف روی "ی" ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے حرف اصلی اور حرف زائد کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔

خروج وہ حرف ہے جو حرف وصل کے بعد بلا فصل آئے۔ "بجتے" اور "گرجتے" میں "ے" خروج ہے۔ علم قافیہ کی رو سے "راتیں" اور "باتیں" کا غنہ بھی خروج ہے۔ یہاں بھی غنہ کو مستقل حرف سمجھنے کا مغالطہ ہوا ہے، حالانکہ ان کلموں میں "ت" حرف روی ہے اور مصوتہ /ایں = ẽ/ حرف وصل ہے۔ صوتی اعتبار سے "راتیں" اور "باتیں" "مص مصم مص" نمونہ پر ہے اور "بجتے" اور "گرجتے" "مص مصم مصم مص" نمونہ کے قافیے ہیں۔

مزید وہ حرف ہے جو خروج کے بعد بلا فصل آتا ہے "مانو گے" اور "جانو گے" میں "ن" حرف روی ہے "و" حرف وصل "گ" حرف خروج اور "ے" حرف مزید ہے۔ اسی قیاس پر "گلابیاں" اور "شرابیاں" میں غنہ کو حرف مزید کہا جاتا ہے جو صوتی اعتبار سے درست نہیں ہے "مانو گے" "جانو گے" اور "گلابیاں" "شرابیاں" "مص مصم مص مصم مص" نمونہ کے قافیے ہیں۔

مزید کے بعد بلا فاصلہ جو حرف آتا ہے وہ نائرہ کہلاتا ہے۔ "آوے گا" اور "جاوے گا" میں "الف" روی ہے "و" وصل "ے" خروج، "گ" مزید اور حرف آخر "الف" نائرہ ہے۔ غنہ کو حسب معمول حرف سمجھ کر "چھوڑیں گے" اور "توڑیں گے" میں حرف آخر "ے" کو نائرہ کہا جاتا ہے جب کہ یہ مزید ہے "جاوے گا" "آوے گا" اور "چھوڑیں گے" "توڑیں گے" بھی "مص مصم مص مصم مص" نمونہ کے قافیہ ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ماہرین علم قافیہ نے لفظ کے با معنی جزو کے حرف آخر کو روی ٹھیرا کر اس کے قبل اور بعد آنے والے حروف کے مختلف نام دیئے ہیں۔ صوتی نقطۂ نظر سے قافیہ میں معنی کی رعایت رکھنا ہی غلط ہے۔ اس اعتبار سے حروف روی خود غیر معتبر ٹھیرتا ہے اور سارے علم قافیہ کی بنیاد اکھڑ جاتی ہے۔

اب ماہرین علم کی یہ کج روی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو وہ قافیہ کے لئے الفاظ مختلفہ کی شرط لگاتے ہیں دوسری طرف اگر ایک لفظ کئی بار مختلف معنوں میں

آئے تو اسے قافیہ مانتے ہیں مثلاً۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

اس شعر میں "دال" صوتی اعتبار سے قافیہ نہیں ہو سکتا لیکن ماہرین علم قافیہ اس پر معترض نہیں ہوتے۔

قافیہ کے باب میں حروف قافیہ کی حرکتوں کا بیان بھی آتا ہے۔ قافیہ کی حرکتوں کی چھ قسمیں بتائی جاتی ہیں:

توجیہ، مجرے، رس، اشباع، حذو اور نفاذ

ہم یہاں صرف مثالوں سے واضح کریں گے کہ یہ نام کن کن حرکات کے ہیں۔

توجیہ: "ذقن" اور "دہن" میں "ق" اور "ہ" کے بعد کی حرکت فتح۔

مجرے: "فریادی" اور "آزادی" میں "د" کی حرکت کسرہ حالاں کہ یہاں کسرہ کا وجود ہی نہیں ہے۔ ر د ر کے بعد صرف مصوتہ ر ی = ī ر ہے۔

رس: "کامل" اور "مقابل" میں "ترک" اور "ق" کی حرکت فتح۔ یہاں بھی دراصل کوئی حرکت نہیں ہے۔ ر ک ر اور ر ق کے بعد مصوتہ ر آ = ā ر آیا ہے۔ ویسے ان الفاظ میں یہ مصوتہ قافیہ میں شامل نہیں ہے۔

اشباع: "کرامت" اور "نظامت" میں "م" کی حرکت فتح۔

حذو: "شام" اور "نام" میں "الف" سے قبل کی حرکت فتح۔ یہ بھی محض مفروضہ ہے۔ الف سے قبل کوئی حرکت ہے ہی نہیں اگر حرکت ہو تو یہ الفاظ یوں پڑھے جائیں گے "ش آم" "ک آم"۔

نفاذ: "سمجھایئے" اور "لے جایئے" میں یائے تحتانی کی حرکت کسرہ۔ یہاں بھی دراصل کوئی حرکت نہیں ہے۔

ماہرین علم قافیہ نے عیوب قافیہ کے بیان میں سب سے زیادہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ صوتی اعتبار سے کوئی لفظ یا تو قافیہ ہوگا یا نہیں ہوگا۔ عیب دار قافیہ کوئی چیز نہیں ہے۔ عیوب قافیہ کے سلسلے میں سب سے پہلے اقوا کا ذکر آتا ہے۔ حرف روی سے قبل حرکت میں اختلاف ہو تو اسے اقوا کہتے ہیں جیسے "صاحب" کا قافیہ "طالب" لایا جائے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، صوتی اعتبار سے قافیہ کی اکائی ایک لانبا مصوتہ یا ایک مصوتہ + ایک مصمتہ ہے۔ "صاحب" اور "طالب" میں صرف مصمتہ ر ب ر کی تکرار ہوئی ہے۔ اس لئے ان کلموں پر قافیہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ دوسرا عیب اکفا ہے۔ یعنی حرف روی مختلف ہو، مثلاً "قزاق" کا قافیہ "فتراک" لایا جائے۔ اسے قافیہ میں شمار ہی نہیں کرنا چاہئے۔ قافیہ مان کر عیب ٹھہرانا کیا معنی رکھتا ہے؟ ہم مخرج حروف اگر بطور روی آئیں تو قافیہ داں اسے بھی اکفا سے تعبیر کرتے ہیں جیسے "تخصیص" اور "مقناطیس"۔ صوتی اعتبار سے یہ قافیہ درست اور بے عیب ہے، اس لئے کہ اردو میں ر ص ر اور ر س ر دو الگ آوازیں نہیں ہیں۔ اہل عرب کی طرح ہم ان کا تلفظ جداگانہ طریقہ سے نہیں کرتے۔ محض تحریری شکل کے اختلاف پر انھیں مختلف اصوات قرار دینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح "راز" کا قافیہ "اغماض" اور "عبث" کا قافیہ "ہوس" لایا جا سکتا ہے۔ تیسرا عیب تحریف روی بتایا جاتا ہے۔ قافیہ کے لئے کسی لفظ کا املا بدل دیا جائے تو اسے تحریف روی کہتے ہیں۔ مثلاً "میت" کے قافیہ کے لئے "پلید" کو "پلیت" کر دینا۔ صوتی نقطۂ نظر سے "میت" اور "پلیت" کے قافیوں پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "پلیت" کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ چوتھا عیب سناد ہے۔ یعنی اشباع اور حذو کی حرکات یا حرف ردف اور حروف قید میں اختلاف ہو۔ "سالم" کا قافیہ "عالم" لایا جائے، "زور" کا قافیہ "غور" "امر" کا قافیہ "مہر" اور ان کے علاوہ "غیر" کا قافیہ "خیر" اور "گرم" کا قافیہ "رزم" لانا سناد ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے ان تمام کلموں پر قافیہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

پانچواں عیب ایطا بیان کیا جاتا ہے۔ ایطا کی بنیاد حروف اصلی اور حروف زوائد کے تصور پر ہے، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ قافیوں میں سے حرف زائد حذف کر دینے پر روی مختلف ہو جائے تو ایطا کہلاتا ہے۔ حرف زائد کی تکرار نمایاں نہ ہو تو ایطائے خفی کہلائے گا۔ "پکے" اور "رلے" میں بامعنی اجزا "پک" اور "رل" کو ملحوظ رکھا جائے تو حروف روی "ک" اور "ل" قرار پاتے ہیں جو مختلف ہیں۔ لیکن صوتی اعتبار سے "پکے" اور "رلے" میں قافیہ کی اکائی لانبا مصوتہ ر ے = e ر مشترک ہے اس لئے یہ ہم قافیہ ہیں۔ لیکن ایطائے جلی کی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں قافیہ کی اکائی برقرار نہیں رہتی۔ مثلاً "جانے والا" اور "رونے والا" کے "جا" اور "رو" میں مصوتوں کا اختلاف واضح ہے، انھیں قافیہ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ معمول کو بھی قافیہ کا عیب قرار دیا جاتا ہے۔ معمول سے مراد یہ ہے کہ قافیہ ایک جگہ لفظ واحد ہو اور دوسری جگہ لفظ مرکب، جیسے "خاکساری" اور "خاک ساری" یا "شررے" اور "برے"۔ صوتی نقطۂ نظر سے اول الذکر کلمے قافئے نہیں ہیں۔ موخر الذکر میں اگر ردیف "ے" ہو بھی تو "شرر" کا قافیہ "بر" (جو "برے" کا جزو ہے، جائز اور درست ہے۔ قافیے کا ایک عیب تضمین بھی ہے۔ یعنی ایک مصرعے میں ایسا قافیہ لانا جس کے مفہوم کی وضاحت دوسرے مصرع سے ہو۔ مثلاً

کئی دن بعد ایک شب تنہا
اتفاقاً ملی وہ مہ سیما

اس شعر میں "تنہا" کا تعلق "مہ سیما" سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اعتراض شعر میں کلموں کی ترتیب سے متعلق ہے ورنہ قافیے کی صورت اور ساخت بے عیب ہے۔ بعض اساتذہ تضمین کو عیب نہیں مانتے اور یہی رائے ٹھیک بھی ہے۔

شعرا کبھی قافیہ میں ہائے آخر کو الف سے بدل دیتے ہیں اور اسے جائز سمجھا گیا ہے۔ "پینا" کا قافیہ "سکینہ" لایا جا سکتا ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ اس لئے درست ہے کہ دونوں کلموں کے آخر میں حروف اگرچہ مختلف ہیں لیکن ہائے آخر کا تلفظ الف ہی کا ادا ہوتا ہے۔ اسی طرح صوتی اعتبار سے "رات" کا قافیہ "ہاتھ" کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ادائگی میں مصمتہ ر تھ ر، ر ت ر سے بدل جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم قافیہ کی تدوین میں قدما سے چند بنیادی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ وہ قافیہ کی صوتی ماہیت کو پوری طرح دریافت نہ کر سکے۔ ان کا تصور حرف غیر علمی ہے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے لفظ کی معنوی اکائی پر غیر ضروری طور پر زور دیا، جب کہ صوتی اکائی کو اہمیت دینا چاہئے

تھا۔ قدیم علم قافیہ اس قدر ناقص ہے کہ اسے ایک سرے سے مسترد کر دینا چاہئے۔

قافیہ ایک سادہ صوتی تنظیم ہے، جس کا تجزیہ ہم مضمون کے آغاز میں کر آئے ہیں۔ ہماری شاعری میں غزل کو چھوڑ کر دیگر اصناف میں قافیہ کا استعمال بہت کم ہوتا جارہا ہے۔ لیکن دوسری شکلوں میں قافیہ کے استعمال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شکل وہ ہے جسے اندرونی قافیہ کہا جاسکتا ہے۔ یعنی قافیہ اپنے مقررہ مقام سے ہٹ کر نظم کے مصرعوں یا سطور میں کسی اور مقام پر لایا جائے۔ دوسری شکل غیر منظم قافیہ کی ہے جو مصرعوں یا سطور کے آخر میں کسی مقررہ ترتیب اور التزام کے بغیر لایا جاتا ہے۔

غیر منظم اور اندرونی قوافی نظم کے صوتی ڈھانچے اور مجموعی صوتی آہنگ کی تشکیل میں خاص حصہ ادا کرتے ہیں۔ ان قوافی کے مطالعے اور تجزیے میں قدیم علم قافیہ ہماری مدد کرنے سے قاصر ہے، اس کے لئے علم صوتیات سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ ایسے قوافی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کن اصوات سے مرکب ہیں اور وہ اصوات مخرج اور ادائیگی کے اعتبار سے کیا تاثر پیدا کرتی ہیں؟ قافیوں کی وجہ سے بعض اصوات کی تکرار ہوتی ہے اور اس کا اثر صوتی آہنگ پر پڑتا ہے نظم میں قوافی کے مقامات اندراج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بحر کے دیئے ہوئے آہنگ میں شاعر کا اپنا لہجہ ابھرتا ہے۔ غیر منظم اور اندرونی قافیوں کے استعمال کی ایک مثال فیض کی نظم "سوچنے دو" ہے:

۱ اک ذرا سوچنے دو
۲ اس خیاباں میں جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
۳ کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
۴ کون بے رنگ ہوئی درد و تعب سے پہلے
۵ اور اب سے پہلے
۶ کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
۷ خون کا قحط پڑا
۸ گل کی شہ رگ پہ کڑا
۹ وقت پڑا
۱۰ سوچنے دو
۱۱ اک ذرا سوچنے دو
۱۲ یہ بھرا شہر جو اب وادی ویراں بھی نہیں
۱۳ اس میں کس وقت کہاں
۱۴ آگ لگی تھی پہلے
۱۵ اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اول
۱۶ زہ ہوئی سرخ شعاعوں کی کماں
۱۷ کس جگہ جوت جگی تھی پہلے
۱۸ سوچنے دو
۱۹ ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
۲۰ جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
۲۱ اور یاد آئے تو محبوب گذشتہ کی طرح
۲۲ روبرو آنے سے جی گھبرائے
۲۳ ہاں مگر جیسے کوئی
۲۴ ایسے محبوب کا دل رکھنے کو
۲۵ آنکلتا ہے کبھی رات بتانے کے لئے
۲۶ ہم اب اس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یوں ہی
۲۷ دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے
۲۸ دل کی کیا پوچھتے ہو
۲۹ سوچنے دو

اس نظم میں جو غیر منظم اور اندرونی قوافی لائے گئے ہیں ان کی سرسری فہرست یہ ہے:-

ذرا = بھرا
سطور = ۱، ۱۲

(سوچنے) دو = (پوچھتے) ہو = (رکھنے) کو = جو
سطور = ۱، ۲، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۲۹

اس = کس = جس
سطور = ۲، ۱۳، ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۰

خیاباں = بیاباں (بھی نہیں) = ویراں (بھی نہیں) = یہاں = کہاں = کماں = ہاں
سطور = ۲، ۶، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۹، ۲۳

کون سی = ہوئی = گھڑی = لگی (تھی) جگی (تھی) جی = کبھی = یوں ہی = کوئی
سطور = ۳، ۴، ۶، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶

آئے = گھبرائے
سطور = ۳، ۲۰، ۲۱، ۲۲

سب (سے پہلے) = تعب (سے پہلے) = اب (سے پہلے) = جب
سطور = ۳، ۴، ۵، ۱۴، ۲۰، ۲۶

سے = پہلے = لئے
سطور = ۳، ۴، ۵، ۱۴، ۱۷، ۲۵، ۲۷

پڑا = کڑا
سطور = ۷، ۸، ۹

دریچوں = شعاعوں
سطور = ۱۵، ۱۶

دل = مل
سطور = ۲۴، ۲۷، ۲۸

بتانے (کے لئے) = نبھانے (کے لئے)

سطور = ۲۵، ۲۷

بعض الفاظ بظاہر قوافی معلوم ہوتے ہیں لیکن اندراج بحر میں ایسے مقام پر ہوا ہے جہاں لانبا مصوتہ دب کر ادا ہوتا ہے اور قافیے کی اکائی برقرار نہیں رہتی جیسے سوچنے (سطر ۱، ۱۰، ۱۱، ۱۸، ۲۹) = تھے (سطر ۳) = کون سے (سطر ۶) = کے (سطور ۱۵، ۲۵، ۲۷) وغیرہ۔

قوافی کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ زیادہ تر لانبے مصوتے کی اکائی والے قافیے ہیں۔ یوں بھی اس نظم کے مخصوص آہنگ کی تشکیل میں مصوتوں کی کثرت کو بڑا دخل ہے۔ فیض نے بحر میں لانبے مصوتوں کی فراہم کردہ گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے لانبے مصوتہ والے کئی لفظوں کو، بحر میں ایسے مقامات پر مندرج کیا ہے جہاں وہ دب کر چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوچنے (سطر ۱، ۱۰، ۱۱، ۱۸، ۲۹) لحظہ (سطر ۲) میں (سطر ۳، ۶، ۱۳، ۱۵) کی (سطر ۸، ۱۶، ۲۰، ۲۱، ۲۸) کے (سطور ۱۵، ۲۵، ۲۷) جیسے (سطر ۲۳) ایسے (سطر ۲۴) جغرافیہ (سطر ۲۰) آنے (سطر ۲۲) بھی (سطور ۲، ۱۲) تھے۔ (سطر ۳) جو (سطر ۱۲) صف بستہ (سطر ۱۵) کا (سطر ۲۴) ہے (سطر ۲۵) کو (سطر ۲۶) آتے (سطر ۲۷) مصوتوں کا اس طرح کہیں مکمل کر ادا ہونا اور کہیں دب جانا۔ سوچنے کے عمل اور کیفیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان مصوتوں کے ساتھ کہیں بندشی (Stops) مسموع مصمتے (رب ر، ربھ ر، د ر، رج ر، رگ ر، رگھ ر) کہیں صفیری مصمتے (Fricatives) (رس ر، رش ر، رز ر، رخ ر) اور کہیں غیر مسموع مصمتے (رک ر، رپ ر، رت ر، رچ ر وغیرہ) لائے گئے ہیں جن سے کہیں بلند آواز میں سوچنے اور کہیں دھیمے لہجے میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

نظم کی پہلی سطر کا ایک ایک لفظ اپنی اصوات اور بحر میں مخصوص مقام اندراج کے سبب خاص صوتی رمزیت کا حامل ہو گیا ہے۔ شاعر کچھ کہنے اور جواب دینے سے پہلے سوچنے کی مہلت چاہتا ہے۔ "اک" کی بندشی صوت رک ر سانس روک دیتی ہے وہ رک کر آگے بڑھتا ہے۔ "سوچ" کی "چ" پر پہنچ کر پھر رک جاتا ہے اور تیزی سے باقی فقرہ ادا کرتا ہے۔ نظم میں ٹھہر ٹھہر کر "سوچنے دو" کی تکرار اس کیفیت کو آخر تک کھینچ لے جاتی ہے۔ "سوچنے دو" کا ہم وزن کا فقرہ "پوچھتے ہو" ہے۔ ان میں "ہو" "دو" کا قافیہ بھی ہے۔ اس فقرے کی صوتی کیفیت پہلے فقرے سے مختلف ہے رپ راور رچھ ر غیر مسموع اصوات ہیں۔ ان سے کانا پھوسی کی کیفیت اور تاسفی لہجہ پیدا ہوتا ہے۔ رچھ ر کی ہکاریت اور رہ ر کی کیفیت آہ اس تاسفی لہجہ کو گہرا کر رہی ہے "پو" کا لانبا مصوتہ برابر سؤ = u ر اپنی ادائیگی کے لئے ایک لمبی سانس کا تقاضا کرتا ہے۔

قوافی = خیاباں، بیاباں، ویراں، کہاں، ہاں، نام و نشاں، اور دریچوں، شعاعوں کے اندراج سے نظم میں رنغی آوازوں رآں = ã ر اور راوں = õ ر کی تکرار واقع ہوئی ہے اور حزن کے تاثر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سب، تعب، اب، اور جب میں رب ر کی بندشیت سے ضبط غم کی کیفیت نمایاں ہے۔ نظم کے کئی کلموں (صف بستہ، سرخ، دلیس، بس، رسم، ایسے، جیسے وغیرہ) اور قافیوں (اس، جس، کس، کونسی، سب، سے وغیرہ) میں صفیری مصمتے رس ر کا اندراج ہوا ہے۔ یہ صورت زیر لب گفتگو اور تاسف کا لہجہ پیدا کر رہی ہے۔ رس ر کی ادائیگی میں سانس منہ سے رگڑ کے ساتھ نکلتی ہے۔ اس میں ضبط کی کوشش کے ساتھ ضبط کا دامن چھوٹنے کی کیفیت پنہاں ہے۔ ضبط جذبات، دھیمے لہجے میں بات کرنے اور سوچ کی کیفیت کو اگلے مصوتہ رے = e ر کے متواتر اندراج نے گہرا کر دیا ہے۔ یہ صوت نظم میں دوسرے تمام مصوتوں پر حاوی ہے اور کئی قافیوں میں بھی مندرج ہوئی ہے، مثلاً سے، پہلے، لئے، بتانے، بھانے وغیرہ۔ رے = e ر کے بعد مصوتہ ری = i ر کا اندراج زیادہ ہوا ہے۔ اس مصوتے سے بننے والے قافیے اکثر ایسے مقام پر مندرج ہوئے ہیں جہاں رکن ختم ہوتا ہے اس کی وجہ سے یہ مصوتہ زیادہ لمبا ہو کر جھٹکے اور زور کے ساتھ ادا ہوا ہے اور ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کو اجاگر کر رہا ہے:

کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے؟

...

کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا؟
اس میں کس وقت، کہاں
آگ لگی تھی پہلے؟
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے؟

نظم کے اسلوب اظہار کی یہ خصوصیت بھی قابل توجہ ہے کہ شاعر پہلے خود کو کچھ کہنے اور جواب دینے سے قاصر پاتا ہے۔ وہ سوچنے کے لئے مہلت چاہتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے اس کے ذہن میں مٹے ہوئے نقوش ابھرتے چلے آتے ہیں۔

کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے؟
کون بے رنگ ہوئی درد و تعب سے پہلے؟
اور اب سے پہلے
کس گھڑی؟ کون سے موسم میں؟ یہاں
خون کا قحط پڑا
گل کی شہرگ پہ کڑا
وقت پڑا؟

آخری تین سطروں میں آواز اونچی ہو گئی ہے۔ ان میں مصوتہ را = ā ر کی تکرار زیادہ ہوئی اور مصمتہ رڑ ر درد و تعب کا صوتی رمز بن گیا ہے۔ اس کے آگے شاعر پھر سوچ میں گم ہو جاتا ہے پھر کچھ یاد کرنے اور زیر لب اپنے آپ سے سوال کرنے لگتا ہے۔

فیض کی اس نظم میں قوافی کی وجہ سے جو تکرار اصوات واقع ہوئی ہے اس میں نغمگی سے زیادہ گونج کی کیفیت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدائیں ذہن کے گنبد سے ٹکرا کر لوٹ رہی ہیں۔

اس تجزیے سے یہ جتانا مقصد ہے کہ جدید نظم قوافی سے بے نیاز نہیں ہے صرف ان کا محل استعمال بدل گیا ہے اور نظم کو سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے مختلف زاویوں سے ان قوافی کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ☆☆☆

حق وفاداری

م۔ق۔خان

شمارہ ۱۴۰،
دسمبر ۱۹۸۵، جنوری، فروری ۱۹۸۶

کہا جاتا ہے کہ ایک جنگل شمال میں اپنے گھنے درختوں اور سرسبز لہلہاتی گھاس کے لئے مشہور تھا۔ اس کا شمار دنیا کے خوبصورت جنگلوں میں کیا جاتا تھا۔ دیس اور بدیس کے کونے کونے سے جانور یہاں آتے اور اس جنگل کی خوب صورتی پر دنگ رہ جاتے۔ اس جنگل کا راجہ پنگلک تھا۔ جو اپنی فہم وفراست اور حکمت عملی کے لئے مشہور ومعروف تھا۔ راجہ عوام کی رائے سے ہی چنا جاتا تھا۔ لیکن وہ حکومت کچھ خاص مشیروں اور خیر خواہوں کی مدد سے کرتا تھا۔ اسے بھی اختیار تھا یا یوں سمجھا جائے کہ اس نے یہ اختیار حاصل کر لیا تھا کہ وہ جسے چاہے اپنا وارث وجانشین چن لے۔ کہا یہی جاتا رہا تھا کہ عوام کو راجہ پر پورا یقین اور اعتماد تھا کہ راجہ جو کچھ کرے گا عوام کی فلاح وبہبود کے لئے ہی کرے گا۔ راجہ بھی بار بار اس بات کی یقین دہانی کرتا رہا تھا۔

اور سنا یہ جاتا ہے کہ ارض دکن میں بھی ایک جنگل تھا جو اپنی دولت خوب صورتی اور کشش میں یکتائے روزگار تھا۔ اس جنگل کا راجہ ایک بیل تھا جو شمال کے راجہ کا باج گذار تھا۔ وہ وفاداری کی حلف بار بار اٹھا چکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دونوں کے بیچ غلط فہمی اور تفریق کی خلیج حائل ہونے لگی۔ ان کے بیچ رابطہ کا کام دمنک سیار کر رہا تھا۔ دمنک کو آج کا کوئی اہم وزیر یا سربراہ ملک کا مشیر خاص یا ایلچی تصور کر لیا جائے جو مختلف صدر مقام پر جا کر ہائی کمانڈ کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اور تمام لوگوں کو حلف وفاداری اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ دمنک بظاہر دونوں کا خیر خواہ تھا لیکن اندر اندر رشک وحسد کی بھٹی سلگ رہی تھی اور وہ اپنی تمام تر کوششیں اس بات پر صرف کر رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے خائف رہیں۔ دونوں کے درمیان شک وشبہ کی دیوار اونچی اٹھتی جائے۔

جی ہاں قصہ یوں ہے کہ دمنک، شمال کے پنگلک کو بھڑکانے یا دوسرے لفظوں میں مشورہ دینے کے بعد سنجیوک کے پاس آیا جو ارض دکن میں تھا۔ دمنک نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"مہاراج! میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ راجہ کے وفادار نمک خوار کو راجہ کے اسرار ورموز کا پردہ فاش نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے حکومت کے نظم ونسق میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، پھر بھی آپ کی محبت اور برتاؤ میں میں اس قدر بندھا ہوں کہ میں مجبور ہوں کہ پنگلک کے سارے ناپاک ارادوں کو آپ تک پہنچا دوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے میری باتوں پر یقین کر کے ہی اس جنگل میں آنا منظور کیا تھا۔ پنگلک کا کہنا ہے کہ آپ تو گھاس کھانے والے ہیں اس لئے آپ اس کی غذا ہیں۔"

دمنک سیار کی یہ باتیں سن کر سنجیوک پر غشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر تو وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لیکن پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ راجہ کتنا ہی اچھا ہو، اگر بدشعار اور بد خصال لوگوں کے درمیان گھر جاتا ہے تو اس کی اپنی ساری فہم وفراست بیکار ہو جاتی ہے۔ یہ بدشعار کچھ نہ کچھ سازش کرتے ہی رہتے ہیں۔ جیسا کہ کوے سیار وغیرہ نے اس اونٹ کے ساتھ کیا تھا۔

دمنک متحیر سن رہا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ کون سا واقعہ ہے؟

سنجیوک ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھا لیکن وہ بولنے لگا:

کسی جنگل میں ایک شیر ببر رہتا تھا۔ باگھ، سیار اور کوا اس کے مشیر خاص اور رفیق کار تھے۔ چاروں جنگل میں گھوم رہے تھے کہ دور پر ایک اونٹ نظر آیا۔ وہ سوداگروں کے ایک قافلے سے بھٹک کر اس جنگل میں آ گیا تھا۔ شیر نے اسے دیکھا تو بڑا متعجب ہوا۔ اس نے اپنے مشیروں سے دریافت کیا کہ یہ عجیب وغریب مخلوق کیا ہے؟ جا کر پتہ چلاؤ کہ یہ وحشی درندہ صفت ہے یا پالتو ہے؟

فوراً کوا بول اٹھا، "یہ اونٹ نام کا جانور ہے۔ یہ تو آپ کی غذا بن کر آیا ہے۔ دیر کس بات کی ہے، جائیے اور اسے مار ڈالئے۔"

شیر نے کہا "گھر آئے مہمان کو مارنا گناہ ہے۔ اس طرح بلا خوف وخطر دشمن بھی پناہ میں آ جائے تو اس کو مارنے سے سو برہمنوں کے مارنے کا گناہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ اس کے پاس جا کر اسے جان بخشی کا مژدہ سنا دیں۔ اور باعزت واحترام یہاں آنے کی دعوت دیں کہ میں اس سے یہاں آنے کا سبب دریافت کروں۔"

شیر کا حکم پا کر تینوں اونٹ کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے آقا کا پیغام پہنچایا اور ساتھ ہی اپنی جانب سے یقین دلایا کہ اسے کسی قسم کی جانی یا مالی خطرے کا سوال نہیں۔ وہ خوشی خوشی شیر کے پاس آ گیا۔ شیر کو مودبانہ سلام کر کے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ شیر کے دریافت کرنے پر اس نے اپنی رام کہانی سنائی شیر اس کے ساتھ پیش آئے ہوئے سانحات سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے اونٹ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تشفی دی۔

"دوست! اب پھر یہاں سے انسانوں کی آبادی میں جا کر بوجھ ڈھونے کی زحمت اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس ہرے بھرے جنگل کو جیسے چاہو استعمال کرو۔ اب سے تم میرے خاص مشیروں میں ہو۔"

اونٹ کو بھلا اور کیا چاہئے تھا۔ وہ جنگل میں رہ کر عیش وعشرت کے دن گذارنے لگا۔ وہ کم از کم دوسرے مشیروں سے الگ تھا۔ کیوں کہ اسے شیر کے شکار پر منحصر کرنا نہیں پڑتا تھا۔ کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک بدمست ہاتھی اس جنگل میں آ ٹپکا۔ اس ہاتی اور شیر میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شیر کو ہاتھی کے موسل جیسے دانتوں سے کافی چوٹ آئی تھی، خیریت گذری کہ جان بچ گئی۔ اب وہ اس قدر مجبور ہو گیا تھا

کہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیر کا شکار کرنا بند ہو گیا۔ اور اس کے ساتھیوں کو فاقے پر فاقہ کرنا پڑا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر شیر نے ایک دن ان سے کہا کہ جاؤ جنگل میں کسی ایسے جانور کو تلاش کرو جسے شیر مار سکے۔ چاروں جنگل میں نکل پڑے۔ اونٹ تو چلتے چلتے اپنا پیٹ بھرتا جا رہا تھا لیکن ان تینوں کا بھوک سے برا حال تھا۔ اور وہ تھک کر نڈھال بھی ہو گئے تھے۔ آخر جب کوئی ایسا جانور انھیں نہیں ملا کہ جسے بہ زور یا بہ فریب شیر کے پاس لا سکیں تو انھوں نے واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

واپسی میں کوے نے چونچ مار کر سیار کو اشارہ کیا اور دونوں الگ ہو گئے۔ اسی وقت سیار کو ایک بات سوجھی اس نے کہا، "بھائی! اس طرح جنگل جنگل مارے پھرنے سے کچھ ہاتھ آنے کو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کیوں نہ اس اونٹ سے فی الحال اپنا کام چلائیں؟"

کوے نے رک کر کہا، "دوست کہتے تو آپ ٹھیک ہیں لیکن ہمارے راجہ نے اس کو امان بخشی ہے۔ یہ تو راجہ کے اصول کے خلاف ہے۔"

کوے کی بات سن کر سیار نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "تم دیکھو تو سہی کہ میں آقا کو کس طرح تیار کر لیتا ہوں کہ وہ اسے مار کر ہماری دعوت کر دیں گے۔"

وہ سیار اکیلا شیر کے پاس آیا اور اس نے نہایت مغموم چہرہ بنا کر کہنا شروع کیا۔ "جہاں پناہ! شکار کی تلاش بے سود ہے۔ اس کوشش میں ہم سب تھک ہار گئے۔ ہمیں اپنی تو فکر نہیں لیکن آپ کی حالت زار اب ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کو اس وقت مقوی غذا کی ضرورت ہے..." سیار اتنا کہہ کر رک گیا۔ وہ شیر کے چہرے پر نظر گاڑے ہوئے اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا، "آپ اجازت دیں تو میں اپنی ایک حقیر تجویز پیش کروں۔" شیر نے آنکھوں سے سیار کو اجازت دی۔ سیار نے کہا "اونٹ آپ کے حضور میں بطور غذا پیش کیا جائے۔"

شیر غصے سے کانپنے لگا۔ "کمینے، ذلیل، تم پر لعنت ہے! تم نے پھر کبھی ایسا کلمہ زبان پر لائے تو میں تمھیں فوراً مار ڈالوں گا۔ جسے ایک بار امان دی گئی ہو اس کا خون کرنا گناہ عظیم ہے۔ نہیں جانتا کہ امان بخشنا سب سے اعلیٰ و ارفع کار ثواب مانا گیا ہے؟"

سیار نے کہا۔ "میں اس بات کا حرف بہ حرف اعتراف کرتا ہوں لیکن میں جو کہنے والا ہوں اس پر حالات حاضرہ کو تناظر میں رکھ کر غور فرمائیے۔ وہ اونٹ خود اپنی زندگی آپ کی بقا کے لئے پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو آپ کیا کہیں گے؟ اونٹ نہ سہی ہم میں سے کسی ایک کو مار کر آپ کو اپنی جان بچانا ہے۔ ہمارے رہتے خدانخواستہ کہیں آپ کو کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی بے معنی ہو گی۔ پہیے کی دھری ہی ٹوٹ جائے تو کیا پھر ڈنڈوں کے سہارے پہیے گھوم سکتے ہیں؟"

سیار کی مدلل اور خوشامد بھری گفتگو سے شیر کا غصہ سرد ہو گیا۔ اس نے سیار سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم جیسا بہتر سمجھو کرو۔"

یہ سن کر سیار دوڑا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "بھائیو! بھوک کے مارے ہمارے آقا کی حالت بہت نازک ہے۔ اب کسی جانور کی تلاش کرنے یا زیادہ بحث و مباحثہ کرنے کا وقت نہیں رہ گیا ہے۔ ہمارے آقا کو کچھ ہو گیا تو ہم کس کے پاس جائیں گے، ہمارا کون ملجا و ماویٰ ہو گا؟ اس لئے ہم چاروں چل کر ان کی زندگی کی حفاظت کے لئے خود اپنی جانیں ان پر قربان کرنے کی پیش کش کریں۔

اس طرح ہم ان کے احسانوں کا بدلہ چکانے میں شاید کامیاب ہو جائیں۔"

گو وہ خود بھوکے اور مضمحل تھے وہ سیار کی بات مان کر شیر کے پاس آئے۔

کوے نے صورت حال گوش گزار کی اور کہا۔ "اس سنگین حالت کے پیش نظر میں خود کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آج مجھے مار کر کھا لیں۔ بہر حال آپ کی زندگی زیادہ اہم ہے۔ ہمارے جیسے ادنیٰ جانور کی یہ بڑی عزت افزائی ہو گی۔"

ابھی کوا کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سیار اس کے سامنے آ گیا اور اس نے کوے کو مخاطب کیا: "کوے بھائی۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ معاف کرنا آپ بہت چھوٹے ہیں۔ آپ کے کھانے سے بھی آقا کی کیا سیری ہو گی؟ صحیفوں میں آیا ہے کہ کوے کا گوشت کھانا اور وہ بھی کہ کھانے والے کی سیری بھی نہ ہو بدترین گناہ ہے۔ تمھاری وفاداری میں حرف برابر آنچ نہیں آتی۔ اب تم پرے ہٹو، میں آقا سے التجا کرتا ہوں۔"

سیار کی باتیں سن کر کوا ہٹ گیا اور سیار شیر کے سامنے پیش ہوا۔

"آقا! اس کوے کی جگہ آج آپ میرے خون سے اپنی بھوک کی آگ بجھائیے۔ آپ کا بخشا ہوا کھانا میں نے بہت کھایا ہے۔ مجھے بھی خدمت کا ایک موقع فراہم کیا جائے..."

ابھی سیار اپنی باتیں کر ہی رہا تھا کہ باگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"ارے او سیار و بھائی! تم نے ٹھیک ہی کہا ہے لیکن تم بھی تو کوے کی طرح چھوٹے ہی ہو۔ دوسرے، تمھارے پنجوں میں ایسے ناخن ہیں جنھیں تم اوزار کی طرح استعمال کرتے ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آقا کے ہم ذات ہو۔ اس لئے تم ان کی غذا نہیں بن سکتے۔ کتابوں میں آیا ہے کہ اگر جان حلق میں بھی آ جائے تو علم و بصیرت رکھنے والا حرام نہیں کھاتا۔ اس لئے آقا آج مجھے مار کر کھا لیں کہ میں دونوں جہاں میں سرخ رو ہو جاؤں۔"

باگھ کی یہ جاں نثاری دیکھ کر اونٹ کی غیرت کا جذبہ بھی جوش مارنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جس طرح دوسروں نے شیر کو خوش کیا ہے اسی طرح وہ بھی خود کو پیش کر کے واہ واہ لوٹنے میں کیوں کسی سے پیچھے رہ جائے۔ اسے بظاہر جان کا کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آگے آ کر شیر کی طرف منہ کیا اور کہنے لگا۔ "باگھ نے بجا فرمایا لیکن ان کے پنجے بھی تو ناخنوں سے لیس ہیں۔ اس لئے یہ بھی حضور والا کے ہم ذات ہوئے۔ بڑے لوگوں نے بار بار کہا ہے کہ جو اپنی ذات کا بدخواہ ہوتا ہے وہ دونوں جہاں میں زرد رو ہوتا ہے۔ اس لئے میری آرزو ہے کہ آقا مجھے مار کر اپنی زندگی کی حفاظت کریں۔ اس سے مجھے اس دار فانی میں بقائے دوام اور دوسرے جہاں میں خلد بریں ملے گی۔"

اونٹ کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ شیر نے اپنے پرانے رفقا کی جانب دیکھا۔ باگھ کی حریص نگاہیں اونٹ پر تھیں۔ سیار کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور کوا اپنی چونچ کنکنا رہا تھا۔ خود شیر کی آنتوں میں بھوک سے اینٹھن تھی۔ شیر نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور چشم زدن میں سیار اور باگھ نے دو جانب سے اونٹ پر حملہ کر دیا کوے نے اڑ کر اونٹ کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔

اسی وقت سنجیوک بیل نے محسوس کیا کہ کئی طرف سے خوں خوار درندے اس پر جھپٹ رہے ہیں۔ وہ شور مچانے لگا لیکن وقت کا قاضی اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔ دوستی اور امان کے سارے الفاظ حرف غلط ہو چکے تھے اور سنگلک کھڑا مسکرا رہا تھا ☆☆☆

بیتال کتھا

منشا یاد

شمارہ ۱۴۷،
ستمبر تا نومبر ۱۹۸۷

بیتال بولا: "تم کون ہو اور مجھے کہاں لئے جاتے ہو؟"

راجا کہنے لگا "میرا نام راجا ہے اور میں تجھے اپنی ماں پرجارانی کے پاس لئے چلتا ہوں۔"

اتنی بات راجا کے منھ سے سن بیتال کھلا کھلا کر ہنسا اور واپس جا کر اسی درخت پر لٹک گیا جہاں سے راجا اسے جان پر کھیل کر اتنی مشکلوں سے لایا تھا۔

راجا نے دیکھا تو بیتال نہیں ہے۔ بہت پریشان ہوا۔

ساری محنت اکارت جاتی معلوم ہوئی۔ دوبارہ آسیب زدہ باغ میں جانے کا سوچ کر ہول آنے لگا۔ جہاں قدم قدم پر خوفناک آنکھیں اور پر اسرار آوازیں راستہ روکتیں اور چھلاوے طرح طرح کی ڈراؤنی شکلیں بنا ڈراتے دھمکاتے تھے۔ اسے وہ آندھی یاد آئی جس کے ساتھ پتھروں کی بارش ہوتی تھی اور جس کی دہشت سے پتہ پانی ہوتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر پھر راجا کو اپنی بوڑھی اور نابینا ماں کی بات یاد آئی جس نے عمر کا اتنا حصہ اپنے باغ اور محل میں واپس جا کر آباد ہونے کی آس میں گزارا اور گھڑیاں گن گن کر اس دن کا انتظار کیا تھا اور راجا ارادہ باندھ، تلوار سونت دوبارہ اس مردار کے پیچھے روانہ ہوا۔

پچھلی بار جب راجا باغ میں داخل ہوا تھا ہر چیز کالے رنگ کی آندھی اور گرد و غبار میں چھپ گئی تھی مگر اب آندھی سرخ تھی اور ہر چیز لہولہان نظر آتی تھی۔ راجا ایک لمحے کو ٹھٹکا مگر پھر سنبھل کر چلنے لگا۔ تب چاروں اور سے طرح طرح کی عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں ان کو وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ مگر اس وقت یہ اتنی بلند، خوفناک اور ڈراؤنی نہ تھیں۔ شاید ان کم ذاتوں کو تب راجا کے پختہ ارادے کا پورا اندازہ نہیں تھا مگر اب وہ تمام حربے آزما رہے تھے۔ قدم قدم پر کتے غراتے، بلیاں لڑتیں، مصیبتیں ڈکراتیں اور ہاتھی چنگھاڑتے، چوہے اور نیولے دوڑتے۔ بچھو ڈنک لہراتے۔ سانپ پھنکارتے اور سرسراتے۔ مگر راجا نے ہمت نہ ہاری اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر پرجا محل اور باغ کو جیسے اس کے باپ دادا نے کمال خوبی سے تعمیر کیا تھا اور جس پر چنڈالوں نے قبضہ کر کے اسے اور اس کی ماں پرجارانی کو بے دخل کر دیا تھا آزاد کرا کر دم لے گا تب اسی بچے کی جو پچھلی بار ہنس ہنس کر بے حال ہوتا تھا جیسے اسے گدگدایا جا رہا ہو رونے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ چیخنے اور چلانے لگا جیسے کوئی خوفناک بھیڑیا اسے بھنبھوڑنے لگا ہو۔

ایک بار تو راجا کا دل دہل گیا مگر اس نے اوسان خطا نہیں ہونے دیئے۔ تب بہت سے لوگوں کے سسکنے، کراہنے، چیخنے اور تڑپ تڑپ کر جان دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مانو کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو، کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو، کسی کو چابکوں سے پیٹا اور ان کے اعضا کاٹے جا رہے ہوں۔ راجا نے سب سنا پر دل نہ چھوڑا۔ تلوار سے راستہ بناتا، پاؤں کو لپٹ لپٹ جاتے سانپوں سے چھڑاتا اور قدم قدم پر بھیڑیوں کی صورت دانت نکوستے چنڈالوں کو پھلانگتا آگے بڑھتا گیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ محل کے سامنے والے اسی درخت پر وہ خبیث پہلے کی طرح رسی سے بندھا الٹا لٹکا ہے۔ تب چاروں طرف شور مچ گیا۔ لینا پکڑنا جانے نہ پائے۔ پھر سبھی اونچی آواز میں رونے لگے۔ خوفناک اور مکروہ صورت ڈائنیں، اور چھل پریاں سینہ کوبی کرنے لگیں۔ مگر راجا نے اپنا دھیان نہ بٹنے دیا۔ اور آگے بڑھ کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ رسی کٹ گئی اور مردہ نیچے گر پڑا اور اسی پہلے کی طرح اٹھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ راجا نے جلدی سے چادر بچھا اس میں اسے لپیٹ کندھے پر رکھا اور لے چلا۔

تب بیتال بولا۔

"راجا تم بار بار کیوں کھیل کرتے ہو؟ اس محنت کا کچھ فائدہ نہیں۔ میرا جب اور جس وقت جی چاہے گا واپس آ جاؤں گا اور اس درخت پر لٹک جاؤں گا۔"

راجا نے جواب دیا۔ "میں اس محل اور باغ کا وارث، پرجارانی کا بیٹا ہوں۔ تم اب تک یہاں اس لئے عیش کرتے رہے کہ پرجارانی بوڑھی، نابینا اور کمزور تھی اور میں کمسن۔ مگر اب میں جوان ہو چکا ہوں اور میرے بازو میں قوت ہی نہیں اور دل میں حوصلہ اور جرأت بھی ہے اور ایسا کہا ہے کہ جو آدمی اپنی جان کی پرواہ نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔"

راجا کی بات سن کر بیتال زور سے ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔

"اے راجا... یہ محل اور باغ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہم دو ایک بار اسے چھوڑ کر چلے بھی گئے تھے، مگر اس کے ہرے بھرے درخت، خوش نما پھول پودے اور ہریالی۔ خوبصورت حوض، عالی شان بارہ دریاں اور منقش بام و در ہمیں بہت یاد

آئے اور ہمارا کھنڈروں، غاروں اور قبرستانوں میں جی اوبنے لگتا اور ہم واپس آگئے۔ اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیشہ ادھر ہی پڑے رہیں گے۔"

راجا نے کہا۔ "بے شک یہ محل اور باغ عالی شان اور خوبصورت تھا مگر تم بدبختوں نے اس کی کیا حالت بنا دی ہے۔ در و دیوار اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نہروں اور حوضوں کے پانی پر کائی جمی ہے۔ جھاڑ جھنکار نے خوبصورت روشوں کو چھپا دیا ہے۔ جیتے جاگتے اور زندگی سے بھرپور باغ اور محل کو تم بدذوقوں نے قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے مگر اب تمھیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

بیتال بولا۔ "راجا... تم بہت نادان ہو۔ تمھیں ہماری طاقت اور حربوں کا اندازہ نہیں ہے۔ جو ہم خود نہ جانا چاہیں گے تو پرجا کے تم جیسے لاکھوں کروڑوں بیٹے بھی ہمیں یہاں سے نہیں بھگا سکتے۔"

یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا اور جا کر اسی درخت پر لٹک گیا۔

راجا بہت پریشان ہوا۔ دل میں سوچتا تھا شاید اس سے نادانی ہوگئی۔ جو اسے مضبوطی سے باندھتا تو ضرور اس کے حصار سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہ اپنے من میں سوچ، راجا پھر خالی چادر اپنے کندھے پر ڈال الٹا پھرا اور اسے درخت سے اتار، اچھی طرح چادر میں لپیٹ گانٹھ لگا کاندھے پر رکھ پھر لے چلا۔

بیتال بولا۔ "اے راجا! تم ناحق میری اور اپنی نیند خراب کرتے ہو۔ اس بیگار سے کیا حاصل۔"

راجا نے کہا۔ "تم جتنی بار چاہے واپس چلے جاؤ مگر میں تمھیں وہاں نہیں ٹکنے دوں گا کیونکہ میرا ایمان ہے دل سے کوشش جاری رکھی جائے تو کامیابی ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ماں سے عہد کیا ہے کہ اسے پھر سے اس کے محل میں لا بساؤں گا اور کوئی باطل قوت مجھے میرا عہد پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی کیونکہ پرجا ماں کی بھی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔"

بیتال بولا۔ "میں تمھاری بات اور تمھارے دھن کا پکا ہونے سے خوش ہوا۔ مگر میں ایک شرط سے چلتا ہوں۔"

راجا نے پوچھا۔ "کون سی شرط؟"

بیتال بولا۔ "میں تمھیں کتھا سناتا ہوں۔ پر جو تم بیچ میں بول پڑے تو میں واپس چلا جاؤں گا اور جو تم نے میری بات سن کر سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اس کا حل ڈھونڈھ لیا تو میں پرجا محل اور باغ سے اٹھ جاؤں گا۔"

راجا نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

تب بیتال بولا۔ "اے راجا! چھناوس نام کی ایک ندی۔ اس کے کنارے ایک چھوٹا سا نگر جس میں حسو نام ایک تیلی رہتا تھا۔ حسو بڑا غصیلا، خودغرض اور بدمزاج آدمی تھا۔ بات بات پر اپنی بیوی اور بیل کو پیٹتا، گالیاں دیتا اور ہر کسی سے الجھ پڑتا۔ غصے، بھوک اور شہوت کا غلام۔ جب ان میں سے کسی حالت یا کیفیت میں مبتلا ہوتا جو چیز قریب یا سامنے ہوتی اسے توڑ مروڑ دیتا۔ اس کی اس عادت سے سبھی لوگ واقف تھے اس لئے اس سے کتراتے، خوف کھاتے اور دور دور رہتے تھے۔ ہر کمزور اور شریف آدمی اس کی گالی یا برائی کا جواب دینے کی بجائے کنی کتراتا جس سے حسو کا حوصلہ اور بڑھ گیا اور اس کے مزاج میں شیخی بھی شامل ہوگئی وہ جس کی چاہتا پگڑی اتار دیتا۔

"ایک دن کا ذکر ہے حسو گھر سے کچھ فاصلے پر کولھو پر تھا اور اسے سخت بھوک لگی تھی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ کسی وجہ سے اس کی بیوی کو کھانا پکانے اور لانے میں دیر ہوگئی تھی۔ بھوک کی وجہ سے حسو کو بہت غصہ آرہا تھا اور وہ بار بار بیل کو ڈنڈے مارتا اور دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا۔ جب تیلن ڈری سہی کھانا لے کر آئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چھڑی لے کر اسے پیٹنے لگا۔ وہ مار کی عادی تو ہوگئی تھی مگر اس روز حسو نے اسے اس بری طرح پیٹا کہ وہ نیم بے ہوش اور زخمی ہو کر زمین پر گر گئی اور کراہنے لگی۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ سفید گلابی پنڈا اور نیل نظر آنے لگے تھے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر حسو کے پیٹ کی بھوک جاتی رہی اور ایک دوسری طرح کی بھوک نے غلبہ کیا۔ اور اس کا سارا غصہ اور برہمی شہوت میں تبدیل ہوگئی۔ عین اس وقت وہ کالی کتیا جو ہر روز اپنے پلے کے ساتھ کھانے کے وقت وہاں آجاتی تھی دروازے میں آکر اکڑوں بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ جب حسو کھانا کھائے اور کوئی ہڈی یا لقمہ اس کی طرف پھینکے۔ اس دوران ڈب کھڑبا اس کا پلا کھانے کی خوشبو سونگھتا کھانے تک پہنچ گیا اور کندوری میں منہ ڈال کر روٹی کھینچ کر مزے سے کھانے لگا۔ حسو کی نظر پڑی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو گردن سے پکڑا اور چلتے کولھو میں پھینک کر پیل دیا۔ کتیا اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور وہاں سے ہٹ گئی۔

"اس روز کتیا وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ مگر جب پورے دنوں بعد حسو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اکثر اس کے گھر کے گرد منڈلانے لگی۔ اور تاک میں رہتی کہ کب موقع ملے اور وہ اس کے بیٹے کو چبا کر اس سے انتقام لے۔

"ایک دن کا ذکر ہے، تیلی تیل بیچنے کہیں گیا ہوا تھا۔ تیلن گھر میں گوبر کا لیپ کر رہی تھی اور بچہ پالنے میں لیٹا رو رہا تھا کہ کتیا کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ موقع پا کر دبے پاؤں اندر آئی اور بچے کو منہ میں اٹھا کر باہر لے گئی۔ پھر وہ ایک ویران گوشے میں پہنچی اور چاہا کہ اسے چبائے کہ بچہ قلقاری مار کر ہنس پڑا۔ پھر اس کے تھنوں کانوں اور جبڑوں پر ہاتھ مار مار کر کھیلنے لگا۔ کتیا کو عجیب سا لمس محسوس ہوا۔ پھر اس سے وہی مانوس سی باس آئی جو ڈب کھڑبے سے آئی تھی۔ تب اس کے اندر ماما جاگ اٹھی اور اس کے سوکھے لٹکے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ اس کے بعد اسے جب بھی موقع ملتا وہ اسے دودھ پلا جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ بظاہر وہ حسو تیلی کا بیٹا مگر اندر سے اس کا پلا تھا۔ پھر وہ بڑا ہو گیا مگر وہ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے حسو کے گھر کے چکر لگاتی رہتی۔ پھر لڑتا جھگڑتا بات بات پر گالیاں دیتا اور بیل اور بیوی کو پیٹتا حسو ایک روز بیمار پڑ کر مر گیا۔ اور ایسا کہا جاتا ہے کہ جنونی اور جذباتی کی عمر تھوڑی ہوتی ہے اور حاسد اپنے غصے کی آگ میں جل کر جلد راکھ ہو جاتا ہے۔ سو حسو اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو گیا اور تیلن بچے کو لے کر کسی دوسرے نگر چلی گئی۔ کتیا کچھ عرصے تک انتظار کرتی رہی کہ شاید تیلن بچے کو لے کر واپس آجائے، پھر مایوس ہو کر ڈھونڈنے نکلی اور نگر نگر گھومتی، طرح طرح کے کتوں سے لڑتی مار کھاتی در بدر پھرتی رہی۔ اسی تلاش کے دوران وہ زخمی ہوگئی اور پرجا محل کے باغ میں پہنچ کر مر گئی۔"

یہ سنا کر بیتال بولا۔ "راجا اگر تم اس کے پلے اور تیلی کے بچے کا اتا پتا معلوم کر سکو تو میں تمھیں یہ مردہ لے جانے دوں گا اور پرجا باغ سے چلا جاؤں گا، تب تک مجھے تنگ کرنے کا کچھ فائدہ تم کو حاصل نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا

اور جا کر اسی درخت سے لٹک گیا۔

راجا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ واپس جا کر اسے پھر باندھ لائے یا تیلی کے اس بیٹے کی تلاش کو نکلے جو کتا تھا مگر آدمی کے شریر میں رہتا تھا۔ تب راجا کو بہت سے آدمی یاد آئے جن سے مل کر یقین نہ آتا تھا کہ وہ آدمی ہیں۔ آدمیوں میں کتے کو تلاش کرنا آسان جان راجا نے فیصلہ کیا کہ وہ بیتال کی شرط جیت کر واپس آئے گا اور پرجاگل اور باغ کو بھوت پلید اور چنڈالوں کے قبضے سے آزاد کرائے گا۔

یہ اپنے من میں سوچ، راجا اپنے گھر آیا۔ اور ہر اس آدمی سے ملا جس پر اسے یا لوگوں کو ذرا سا بھی شک ہوتا کہ ان میں آدمیت نہیں ہے۔ لیکن بات چیت اور میل ملاپ کے بعد ہر کسی میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو نکل آتا کہ راجا کو اپنا خیال بدلنا پڑ جاتا۔ تب راجا کو احساس ہوا کہ وہ جس کام کو آسان جانتا تھا وہ بہت کٹھن ہے۔ ایک آدمی جو کتا تھا مگر آدمیوں میں آدمی کی طرح رہتا، انھی کی طرح اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا اور سارے کام کرتا تھا اسے ان سے الگ کر کے پہچاننا اور ڈھونڈ نکالنا پاتال کی خبر لانے سے کم کٹھن کام نہ تھا، مگر راجا نے ہمت نہ ہاری۔ دن رات اسی فکر اور مقصد میں پھرنے لگا تب اسے اس حال میں دیکھ کر ایک روز پرجا رانی نے پوچھا۔

"راجا بیٹے... ماں واری، کہو کیا چنتا تمھارے من کو لگی ہے؟"

راجا نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس پر رانی کہنے لگی۔

"یہ تو بڑا کٹھن کام ہے بیٹے۔ بدذاتوں نے محل اور باغ پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لئے تجھے ایسا کام سونپ دیا ہے، جس کا ہونا بڑا مشکل ہے۔ ایک کتا جو آدمیوں میں رل مل گیا ہے اسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟ پر بیٹے تو ہمت نہ ہار، بس تو ایسا کر کہ کتے اور آدمی کی خصلتوں پر نظر رکھ اور یہ دیکھ کر کہ کس آدمی میں ایسی کوئی خصلت ہے جو دوسروں میں نہیں صرف کتوں میں ملتی ہے۔"

راجا بولا۔ "یہی تو مشکل ہے ماں۔ وہ کتا جو شروع دن سے آدمیوں میں رہتا ہو، انھی میں پلا بڑھا ہو، ان کے جیسے برتنوں میں کھاتا، انھی جیسے کپڑے پہنتا اور انھی کی زبان بولتا ہو اس میں تو آدمیوں کی بھی بہت سی باتیں شامل ہو گئی ہوں گی، ایسے میں اسے اتنے لوگوں میں الگ کر کے کیسے پہچانوں؟"

پرجا بولی۔ "میں صدقے جاؤں۔ جو میری آنکھیں دیکھ سکتیں تو میں تیری مدد کرتی۔ پر اب تو تو ہی میری آنکھیں ہے راجا بیٹے۔ تو دل چھوٹا نہ کر جو تو سدھ بدھ سے کام لے گا تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالے گا۔"

پھر پرجا رانی نے اس کی سات موٹی موٹی نشانیاں بتائیں۔ اس نے کہا۔

"پہلی نشانی اس کی یہ ہے کہ بات بات پر گلے پڑ جانے اور ذرا سے اختلاف پر بھڑک جانے والا آدمی ہو گا کیونکہ ایک تو وہ کتا ہے دوسرے غصیلے اور شیخی خورے سوتیلی کا بیٹا اس لئے بہت ہی کم ظرف، بدمزاج اور ٹیڑھا آدمی ہو گا۔

"دوسری نشانی یہ کہ غیروں کا وفادار ہو گا مگر اپنوں کا بیری ہو گا۔

"تیسرے یہ کہ حرص و ہوس کا پجاری ہو گا۔ اس کا پیٹ اور نیت کبھی نہیں بھرتے ہوں گے۔ کھانے اور خطرے کی بو دور سے سونگھ لیتا ہو گا۔

"چوتھی نشانی یہ کہ اس کے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہو گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا اور اپنی برائیوں پر اتراتا ہو گا۔

"پانچویں یہ کہ شریف اور نہتے آدمیوں پر بلاوجہ غراتا مگر جہاں کہیں سے ذرا فائدے کی توقع ہو گی وہاں حسب اپنی اصل کے پاؤں چاٹتا اور دُم ہلاتا ہو گا۔

"چھٹی یہ کہ اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ان لوگوں کو موقع ملتے ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہو گا جنھوں نے اس سے کبھی کوئی نیکی کی ہو گی یا جو اس سے رتبے یا گنوں میں آگے ہوں گے۔

"اور ساتویں نشانی اس کی یہ ہے کہ اس کی وفاداری مشروط اور مشکوک ہو گی کیونکہ کتے کی وفاداری دراصل ایک کھلی خوشامد ہوتی ہے۔ جو اسے راتب ڈالتا ہے اسی کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ دوسرے کو کاٹنے دوڑتا ہے۔"

راجا یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ بولا۔

"ماں، یہ سب باتیں تو بہت سے آدمیوں میں ہیں۔ شاید بعض کتوں میں نہ ہوں۔ میں اسے اس طرح کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں؟"

پرجا بولی۔ "تو ایسے تمام لوگوں کی فہرست بنا لا۔ بیٹے یہ تیری عقل کا امتحان ہے۔ تو بدوں کی جو فہرست بنا کر لائے گا اس میں وہ ضرور شامل ہو گا اور ایسا کیا ہے کہ جو آدمی نیکوں کو بدوں سے اور بدوں کو نیکوں سے الگ کر کے پہچان سکتا ہے وہ بدی اور شر کو مٹانے کا اہل ہوتا ہے۔ سو جب بیتالوں، بدذاتوں کو پتہ چل گیا کہ پرجا کے سوجھوان بیٹے کو سارے بدوں کا علم ہے تو وہ نیکی اور سچائی کے خوف اور دہشت سے پرجاگل سے اٹھ جائیں گے، کیوں کہ نیکی اور سچائی کا پلہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔"

یہ سن راجا بہت خوش ہوا۔ ماں کی بات پلے سے باندھ گھر گھر اور گلی گلی گھومنے لگا۔ جہاں جہاں سنتا کوئی اندر یا باہر سے غیر آدمی لگتا ہے اس کا نام پتہ لکھتا جاتا۔ اس طرح سینکڑوں ہزاروں ناموں کی ایک لمبی فہرست بن گئی۔ راجا دل میں فکر کرتا کیا پتہ وہ بدذات اس میں شامل ہوا تھا یا نہیں۔ مگر اسے یہ سوچ کر تسلی ہوئی تھی کہ اسے نیکی اور بدی کو پہچان لینا آ گیا تھا اور ماں نے بتایا تھا کہ برائی کو بدی سے تمیز کرنا اور جان لینا بھی نیکی ہے۔

پھر کتنے دنوں بعد ایک دن راجا نے دل میں ٹھانی کہ پرجاگل جائے۔ سو اس نے کاغذ جیب میں ڈالا، تلوار اٹھائی اور جنگل کی راہ لی۔ راستہ کٹھن اور اونچا نیچا تھا۔ گھاٹیاں، پربت، دریا اور ندی نالے، خاردار جھاڑیاں اور سرکنڈے دامن پکڑتے، بھوت پلید راستہ روکتے اور کنکر پتھر پاؤں سے ٹکراتے تھے، مگر راجا دھن کا پکا، دم لئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر، وہ پرجا باغ میں جا داخل ہوا۔

دیکھتا کیا ہے کہ محل میں چار سو روشنی ہو رہی ہے۔ قندیلیں جلتی اور اگر بتیاں سلگتی ہیں۔ نہر میں پانی بہتا ہے۔ جابجا فوارے اچھل رہے ہیں۔ حوضوں میں چاندی کی کرنیں ناچتی ہیں اور ٹھنڈی خنک ہوا پھولوں سے کھیلتی ہے۔ راجا خوشی سے اچھل پڑا۔ بولا... پرجا ماں تیرا محل آباد ہو گیا، تیرا باغ آج سے آزاد ہو گیا۔

تب کہیں سے کالے رنگ کی ایک کتیا جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی تھیں ایک دب کھڑبے پلے کے ساتھ نمودار ہوئی۔ دم ہلا کر اور سر جھکا کر اس نے راجا کی اور دیکھا اور پلے کو ساتھ لئے باغ سے باہر چلی گئی ☆☆☆

منشا یاد

شمارہ ۲۷۷
جنوری ۲۰۰۴

ساتویں جماعت کا نوماہی امتحان ہو رہا تھا۔

میں نے ابھی آدھا پرچہ حل کیا ہوگا کہ ماسٹر فاروقی اپنی کرسی اٹھوا کر میرے قریب لے آئے۔ مجھے لگا میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے ہیں۔ مجھے اس سے الجھن ہونے لگی۔ کوئی لقمے گن رہا ہو تو آپ کھانا کیسے کھا سکتے ہیں۔ پرچہ حل کرنے کی میری رفتار سست پڑ گئی۔ مگر ماسٹر صاحب آخر وقت تک میری گردن پر سوار رہے۔ خدا خدا کر کے پرچہ مکمل ہوا۔ انھوں نے چھیننے کے انداز میں پرچہ میرے ہاتھ سے لیا اور بولے: ''گاؤں کا کوئی آدمی باہر تمھارا انتظار کر رہا ہے۔''

میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ لڑکے جمع ہو گئے۔

''کیا ہوا؟''

''میری ماں مر گئی۔''

ماسٹر صاحب نے شفقت سے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولے ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ''گاؤں سے نواب مجھے لینے آیا ہے۔''

انھوں نے گاؤں سے آنے والے آدمی کو بلوا کر اس کا نام پوچھا۔ وہ سچ مچ نواب ہی تھا۔ مجھ سے پہلے وہ گاؤں کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا شخص اور ہر فن مولا قسم کا آدمی تھا جس نے پوری چار جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔ ہمارا اس سے بھائی چارہ تھا۔ اس نے ماسٹر صاحب کے سامنے قسم کھائی اور مجھے یقین دلایا: ''تمھاری ماں جی زندہ اور سلامت ہیں۔ انھوں نے خود مجھے بھیجا ہے کہ تمھیں ساتھ لیتا آؤں۔''

ایسا پہلے بھی ہوتا تھا۔ گاؤں میں اس کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ جب بھی سودا سلف لینے آتا، ماں جی کی ہدایت کے مطابق مجھ سے مل کر اور خیریت معلوم کر کے جاتا اور اگر اگلے روز چھٹی ہوتی تو مجھے ساتھ لے جاتا۔ لیکن آج اس کی خورجین خالی تھی اور وہ صرف مجھے لینے آیا تھا۔ تاہم اس کے بار بار قسمیں کھانے کے بعد مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا۔ اور ہم گاؤں کے لئے روانہ ہو گئے۔

میں پچھلے دو تین برسوں سے پڑھائی کی خاطر خالہ کے پاس رہتا تھا۔ ان کا گاؤں شہر کے مضافات میں تھا۔ شروع میں میرے پاس بائیسکل نہیں تھی اور نہ ہی میں سائیکل چلا سکتا تھا۔ مہینوں بعد ریل گاڑی کے ذریعے اپنے گاؤں جا پاتا۔ چھٹی جماعت میں بائیسکل مل گئی مگر میری ٹانگیں پیڈلوں تک نہیں پہنچتی تھیں۔ پھر اس کا حل بھی نکل آیا۔ خالہ کے گاؤں سے اور بھی لڑکے پیدل اسکول جاتے تھے۔ ان میں ایک کو بائیسکل چلانا آتی تھی مگر اس کے پاس بائیسکل نہیں تھی۔ اس طرح مجھے ایک ڈرائیور مل گیا۔ ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں نے خود چلانا شروع کر دی اور اب میں ہر اتوار اپنے گاؤں چلا جاتا اور پیر کی صبح کو بیس اکیس میل کا سفر طے کر کے اسکول پہنچ جاتا تھا۔ بیمار ہونے اور بستر پر پڑ جانے سے پہلے ماں جی ہفتہ کے دن میرے لئے اچھی اچھی چیزیں پکا کر رکھ دیتیں، اور اگر وقت بچ جاتا تو چرخہ اٹھا کر چھت پر لے جاتیں اور شہر سے آنے والے راستے کی طرف رخ کر کے انتظار کی پونیاں کاتنے لگتیں۔ میری بائیسکل کے پہیے اور ان کا چرخہ ایک ساتھ گھومتے۔ ہوا مخالف ہوتی تب بھی لگتا میں کچی ڈور سے بندھا کھنچا چلا جا رہا ہوں۔

میرے راستے میں پندرہ میل لمبی نہر پڑتی تھی۔ جب یہ کناروں تک بھری بہ رہی ہوتی تو اس سے ایک عجیب طرح کی دہشت محسوس ہوتی۔ ماں جی کو گھر بیٹھے اس سے ہول آتا رہتا۔ خود مجھے بھی پندرہ میل لمبائی میں بہتے پانی کو دیکھ دیکھ کر اکثر اپنے یا دوسروں کے ڈوبنے کے خواب دکھائی دیتے رہتے بعض اوقات میں دیکھتا۔ میں سوکھی پڑی نہر میں پانی کے آگے آگے بھاگ رہا ہوں اور کئی گز اونچا پانی میرے پیچھے شوکتا پھنکتا چلا آتا ہے۔ گذشتہ رات بھی میں نے ایسا ہی ہولناک خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گہرے پانی میں ڈوب رہی ہیں۔ ہاتھ پاؤں مارتے مارتے ان کا سانس پھول گیا ہے مگر ہر لحظہ وہ پانی میں نیچے جا رہی ہیں۔ میں کنارے پر کھڑا روتا اور مدد کے لئے پکارتا ہوں مگر کوئی میری مدد کو نہیں آتا نہ ہی دور تک کوئی بھی ذی نفس دکھائی دیتا ہے۔ پھر وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غرق آب ہو جاتی ہیں۔ یہ خواب اصل صورت حال کے عین مطابق تھا۔

وہ کئی مہینوں سے بیمار تھیں مگر ان کا تسلی بخش علاج نہیں ہو رہا تھا۔ ابا جی خود حکیم تھے مگر ان کے علاج سے انھیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان کے علاج سے کسی کو فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا، مگر مریضوں کے انجام کے بارے میں ان کی پیش گوئی ہمیشہ درست ثابت ہوتی۔ ماں جی کے بارے میں بھی انھوں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ان کا بچنا محال ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے علاج پر بھی پوری توجہ نہیں دیتے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنے علاج پر اکتفا نہ کیا اور ایک مشہور حکیم کا علاج شروع کرا دیا جو چند میل کے فاصلے پر رہتے تھے، مگر ماں جی کو ان کے علاج سے بھی کوئی خاص افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ انھیں تپ دق تشخیص ہوئی تھی جسے اس زمانے میں لا علاج مرض

سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹری علاج میسر نہیں تھا اور پاکستان اور امریکہ کے بہترین ہسپتالوں میں ڈاکٹر اور پروفیسر آف میڈیسن کے فرائض سرانجام دینے والے ان کے پوتوں کو ابھی بہت بعد میں پیدا ہونا تھا۔

خالہ ان دنوں پہلے ہی ماں جی کے پاس تھیں۔ ہم شہر سے نکلے تو ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ نومبر کی آخری تاریخ تھی۔ خزاں کا موسم اپنے جوبن پر تھا۔ ہر طرف درختوں کے خشک ہوئے پتے، اداسی، گرد و غبار۔ تنگ کچی سڑک کا راستہ صرف تین میل لمبا تھا مگر نہایت تکلیف دہ۔ ایک تو ہوا مخالف دوسرے کوئی بس یا ٹرک گذرتا تو اتنا گرد و غبار اٹھتا کہ دیر تک کچھ سجھائی نہ دیتا۔ جب ہم نہر کی پٹڑی پر آئے تو ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا اور پیڈل مارنے میں نسبتاً آسانی محسوس ہونے لگی۔

عام طور پر میں ایک ہفتہ بعد گاؤں جاتا تھا مگر جب سے ماں جی علیل ہوئی تھیں ان کی تیمارداری اور چھوٹے بھائی بہن کی دلداری کے لئے ہر دوسرے تیسرے دن چلا جاتا۔ رات کو ماں جی کے پاؤں دباتا، انھیں دوا کھلاتا پلاتا اور ان کی طبیعت بہتر ہوتی تو کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ کر سناتا۔ انھیں کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ انھیں خود بھی بہت یاد تھیں اور وہ اپنی پڑھی سنی ہوئی ساری کہانیاں مجھے میرے بچپن ہی میں منتقل کر چکی تھیں۔ کہانی سے میری دلچسپی انھی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان کی بے وقت موت کے بعد میں نے کتابوں اور قصے کہانیوں میں پناہ لی اور جس سال وہ فوت ہوئیں اسی سال بچوں کے رسالے میں میری پہلی کہانی کے روپ میں طلوع ہوئیں۔

مجھے بعض اوقات اتوار کو ان کی دوا لینے اور کیفیت بتانے حکیم صاحب کے پاس جانا پڑتا۔ سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تھے، گھر پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی۔ ماں جی میری اس بھاگ دوڑ سے دکھی ہوتیں۔ مگر مجبوری تھی کیوں کہ ابا کو بائیسکل چلانا آتی نہ تھی۔ میں رات کو دیر سے سوتا مگر پھر منہ اندھیرے اسکول کے لئے روانہ ہو جاتا۔ گھر کے کام کاج اور ماں جی کی دیکھ بھال کے لئے میری ایک پھوپھی زاد بہن موجود تھی۔ وہ ناشتہ پکا دیتی تھی۔ میں خوب تیز بائیسکل چلاتا مگر اسکول پہنچنے میں اکثر دیر ہو جاتی۔ کلاس ٹیچر ماسٹر فاروقی ابھی میرے گھر کے حالات سے آگاہ نہ تھے۔ انھوں نے مجھے کئی بار تنبیہ کی مگر ہر بار مجھے اسکول پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ تنگ آ کر ایک روز انھوں نے میری پٹائی کر دی۔

اس روز ہوا مخالف اور سخت سردی تھی۔ گھاس پر کہرا جما ہوا تھا اور اس قدر دھند چھائی ہوئی تھی کہ نہر کا دوسرا کنارہ تک نظر نہ آتا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے۔ میں نے دو تین بار سرکنڈوں کو آگ لگا کر ہاتھ تاپے اور بڑی مشکل سے اسکول پہنچا۔ ماسٹر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، تابڑ توڑ میرے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے۔ مجھے ڈنڈوں کی تکلیف سے زیادہ ندامت کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ میں کلاس مانیٹر تھا اور کبھی سزا کی نوبت نہیں آئی تھی۔

گھنٹہ ختم ہوتے تک ان کا غصہ اتر چکا تھا۔ وہ مجھے دفتر میں آنے کا اشارہ کر گئے۔ میں ان کے دفتر پہنچا۔ انھوں نے بار بار دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے والدہ کی بیماری اور بیس میل سفر طے کر کے اسکول پہنچنے کا ذکر کیا تو ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" پھر وہ مجھ سے خاص شفقت اور رعایت کرنے لگے۔ میرے گھر کے حالات اور ماں جی کی بیماری سے باخبر رہتے۔

اس سے پہلے جب کبھی میں نواب کے ہمراہ گاؤں جاتا تھا تو اس کے ساتھ دوڑ لگاتا۔ ایک تو واپسی کے سفر میں وہ تھکا ہوا ہوتا دوسرے اس کی بائیسکل پر بوجھ لدا ہوتا۔ اور میں تازہ دم اور طفلانہ جوش سے لت پت۔ گھنٹیاں بجاتا اور قلقاریاں مارتا آگے نکل نکل جاتا۔ مگر آج ایسا لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان نہ ہو یا بائیسکل کے پہیوں کو تیل کی سخت ضرورت ہو۔ نواب کی باتوں پر مجھے یقین تو آ گیا تھا لیکن رات کا خواب میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ جیسے میرے اندر کوئی چیز گم ہو گئی یا ٹوٹ گئی تھی۔

میں ایک عرصے سے دیکھ رہا تھا کہ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ مر رہی تھیں مگر میرے بس میں کچھ نہ تھا۔ کبھی کبھی انھیں دوا سے عارضی طور پر افاقہ معلوم ہوتا مگر پھر مرض دوبارہ غلبہ کر لیتا۔ ہم کئی بار ان کے مرنے کا منظر دیکھ چکے تھے۔ اچانک ان کا سانس اکھڑ جاتا اور وہ ہانپنے لگتیں۔ آنکھیں ابل پڑتیں اور تیماردار عورتیں ان کے سرہانے بلند آواز میں سورۂ یاسین کی تلاوت کرنے لگتیں۔ مگر ان میں زندہ رہنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ دوبارہ سنبھل جاتیں۔ یا شاید قدرت کو رحم آ جاتا اور انھیں کچھ اور مہلت مل جاتی۔ میں تین روز پہلے ہی تو آیا تھا۔ ان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میں انھیں اس حالت میں چھوڑ کر اسکول آنا نہیں چاہتا تھا، مگر انھوں نے مجھے زبردستی بھیجا۔ کہنے لگیں، "اگر تم امتحان دینے نہیں جاؤ گے تو میرا خواب کیسے پورا ہوگا؟" میں نے کہا، میں اسکول چلا جاؤں گا تو تم میرے پیچھے مر جاؤ گی۔

"نہیں مروں گی۔" وہ مسکرائیں، "تمھیں دیکھے بغیر کیسے مر سکتی ہوں؟"

"ایسی بات ہے تو میں کبھی آؤں گا ہی نہیں! تا کہ تم ہمیشہ زندہ رہو۔"

"نہ اڑیا۔" وہ بولیں "ایسی زندگی کا کیا فائدہ؟"

دراصل یہ ساری خرابی ابا کی وجہ ہی سے تھی جنھوں نے ان کے مرنے کی پیش گوئی کر رکھی تھی۔

لیکن ماں جی ابھی زندہ تھیں۔ ان کے مرنے میں ابھی بہت دن باقی تھے مگر میں انھیں خوابوں میں ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا۔ خوابوں اور خیالوں کے کوہ قاف میں آبِ حیات کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔ کاش غیب سے کوئی حکیم یا فرشتہ آ جائے اور انھیں پہلے کی طرح بھلا چنگا کر دے۔ کوئی معجزہ، کوئی کرامت، میں چاہتا تھا ان کی تصویر بن جائے۔ چھوٹا اس وقت چار سال کا تھا۔ وہ بڑا ہو کر پوچھے گا ماں کیسی تھی تو اسے کیا بتائیں گے۔ کیا پتہ خود مجھے ماں جی کی صورت بھول جائے۔ مگر تصویر تو شہر ہی جا کر بنوائی جا سکتی تھی اور وہ سہارے کے بغیر بستر سے نہ اٹھ سکتی تھیں اور میرے ہاتھ میں کیمرہ، مووی کیمرہ اور ویب کیم آنے میں ابھی چالیس سال پڑے تھے۔

ابا مجھے شہر کے ہائی اسکول میں داخل کرانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ مجھے قریبی قصبے کے مڈل اسکول میں داخل کرانے کا تھا مگر ماں جی مجھے ہائی اسکول میں انگریزی پڑھانا چاہتی تھیں۔ عام طور پر دیہات میں شوہروں کے فیصلوں کے سامنے بیویوں کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن ماں جی ڈٹ گئیں۔ انھوں نے میری خالہ کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ان کے پاس پڑھنے کے لئے

بھیجیں گی۔ میں نے پرائمری کا امتحان پاس کرلیا تو ابا مجھے منڈی مویشیاں کا میلہ دکھانے شہر لے گئے۔ خوب رونق تھی۔ سینما، تھیٹر، سرکس اور موت کا کنواں۔ میں خالہ کے پاس رہ پڑا۔ ابا کا خیال تھا میں کچھ دنوں میں اداس ہو جاؤں گا اور خالہ انھیں خط لکھیں گی کہ آ کر لڑکے کو لے جائیں۔ مگر خالہ نے ماں جی کی خواہش کے مطابق مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ خوش قسمتی سے ان کے سسرالی رشتہ داروں میں بہت سے اسکول ٹیچر تھے۔ انھوں نے میرا ٹسٹ دلوا کر مجھے پانچویں میں داخل کرا دیا۔

خالہ ماں جی کی طرح ہی مہربان اور محبت کرنے والی تھیں۔ انھوں نے ایثار اور محبت کی شاندار مثال قائم کی۔ کھانے پینے کی چیز کم ہوتی تو اپنے بچوں سے چھپا کر مجھے دے دیتیں۔ مگر ان دنوں ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ خالو بہت اچھے اور شفیق آدمی تھے مگر وہ دور پار کے رشتے داروں کے پاس سندھ چلے گئے تھے۔ ان کا خط تک نہ آتا تھا۔ ابا مجھے بہت تھوڑے پیسے دے کر گئے تھے۔ اسکول کی فیس، کپڑے اور دوسرے اخراجات خالہ جان ادا کرتیں۔ میں جانتا تھا ان کا ہاتھ تنگ ہے اس لئے کسی طرح کی غیر ضروری فرمائش نہ کرتا۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ چار میل پیدل چل کر اسکول جاتے تھے۔ موسم سخت، گرم، اور راستہ پتھریلا تھا۔ جلد ہی میرے جوتے پھٹ گئے۔ کچھ روز میں ان کی مرمت کرا کر کام چلاتا رہا پھر وہ تکلیف دینے لگے۔ تلا بالکل بیکار ہو گیا تھا۔ میں جوتا کیوں نہ پہنا، سموسا کیوں نہ کھایا، تلا نہ تھا، کے مصداق سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپا کر ننگے پاؤں اسکول چلا جاتا، واپسی پر جوتے پہن لیتا۔ ہم رات کو باہر کی حویلی میں جا کر سوتے تھے اس لئے خالہ کو پتہ ہی نہ چلا کہ میرے جوتے پھٹ چکے ہیں۔ مجھے والد صاحب کا انتظار رہتا مگر وہ تو جیسے مجھے سزا دے رہے تھے۔ میرے خط کا جواب بھی نہ دیا۔

ان دنوں گرمی کی چھٹیاں جولائی میں ہوتی تھیں۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ ہر چیز جھلس رہی تھی۔ لوگ بارش کے لئے دعائیں مانگتے اور ہر روز انتظار میں رہتے کہ کب ہوائیں کالی بدلیوں کو گھیر لاتی ہیں۔ بارش تو نہ آئی لیکن میرے فلک پر ایک روز تتر کمبھی بدلی گھر آئی۔ میری زندگی میں جو چند خوبصورت ترین اور یادگار لمحے ہیں ان میں اس ایک لمحے کا بھی شمار ہوتا ہے۔ میں اسکول کے برآمدے میں خوش خطی کی مشق کر رہا تھا کہ غلام محمد گھڑی ساز کی دکان سے ان کا ایک شاگرد اور خالہ کے سسرالی عزیزوں کا لڑکا رشید بائیسکل پر اطلاع دینے آیا کہ تمہاری امی آئی ہیں۔ مجھے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور ساون کی پھوار برسنے لگی۔ میں بھاگم بھاگ دکان پر پہنچا۔ وہ اس کے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے دعا دی، میرا ماتھا چوما اور دیر تک میرا ہاتھ تھامے رکھا جیسے مجھے محسوس کر رہی ہوں یا جیسے میری موجودگی کا یقین کر رہی ہوں۔

"ابا کیسے ہیں؟" میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"ان کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں ورنہ وہ آتے۔"

میں نے چھوٹے بھائی اور بہن کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگیں "وہ سب تمہارے لئے بہت اداس ہیں۔"

"آپ کس کے ساتھ اور کیسے آئی ہیں؟"

"گاؤں کا حافظ تاجا اور اس کی گھر والی آ رہے تھے میں بھی ساتھ آ گئی۔ خیال تھا کوٹ حسن خاں سے بس مل جائے گی مگر ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ نکل گئی تھی۔ ہمیں پیدل ہی آنا پڑا۔"

گاؤں کا پیدل سفر بارہ کوس یا اٹھارہ میل تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ "آپ اتنی دور پیدل چل کر آئی ہیں؟"

"تو کیا ہوا؟" وہ بولیں، "آ تو گئی۔"

"آپ تھک گئی ہوں گی۔"

"تمھیں دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔"

ہم نے تین ماہ بعد اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ منہ اندھیرے ناشتہ کر کے گھر سے نکلی تھیں اور اپنے اور میرے لئے گھی ملے آٹے کے پراٹھے اور آم کا اچار ساتھ لائی تھیں۔ یہ جگہ بازار کے عین درمیان میں تھی۔ ایک طرف پھلوں کی دکانیں تھیں۔ آم، آڑو، آلوچے، آلو بخارا، اور خوبانیاں۔ دوسری طرف حلوائیوں کی دکانیں، دودھ سوڈے کی دکان تو اتنی قریب تھی کہ بوتلیں بھرنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ میرا جی چاہتا میں شہر کی ساری نعمتیں لا کر ان کے سامنے ڈھیر کر دوں۔ مگر مجھے تو آنے کی شکل دیکھے بھی کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ میں گلاس لے کر گھڑے سے ان کے لئے پانی لینے کو اٹھا تو ان کی نظر میرے ننگے پیروں پر پڑ گئی۔

"تمہارے جوتے کہاں ہیں؟"

میں چپ رہا تو انھوں نے پھر پوچھا۔ میں پھر بھی خاموش رہا تو وہ رونے لگیں۔ "تم اساڑھ کی گرمی میں پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں اسکول جاتے ہو؟"

وہ اتنا روئیں کہ اگر میں خالی گلاس ان کے سامنے رکھ دیتا تو وہ ان کے آنسوؤں سے بھر جاتا۔ لیکن اچانک ایک خوشگوار خیال سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ بولیں: "آج مجھے یقین ہو گیا۔ میرا خواب ضرور پورا ہو گا۔ تم پہلی آزمائش میں پورا اترے ہو۔"

پھر وہ مجھے جوتوں کی دکان پر لے گئیں اور مجھے نئے جوتے دلوائے۔ اب مجھے اپنے پھٹے پرانے جوتوں کی جو میں نے رستے میں چھپائے ہوئے تھے ضرورت نہ تھی مگر خالہ کے گاؤں جاتے ہوئے انھوں نے اصرار کر کے وہ جوتے منگائے اور بعد میں اپنے ساتھ گاؤں لے گئیں۔ یہاں بیچاری خالہ کو رلایا وہاں ابا کو۔ ان کا خیال تھا وہ یہ جوتے کسی سند یا تمغے کی طرح سنبھال کر رکھیں گی مگر جب وہ خود ہی نہ رہیں تو ان کی محفوظ کی ہوئی چیزیں کہاں باقی رہتیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد رشتے داروں کے تقاضے پر ابا نے میری شادی یا منگنی کرنا چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ ابا کا مجھ پر زیادہ زور نہ چلتا تھا۔ وہ مجھ پر سختی کرتے تو میں گھر آنا چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے خالہ کی حمایت حاصل تھی۔ میرا بھائی اور بہن دونوں بہت چھوٹے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ابا نے میرے اور خالہ کے اصرار پر دوسری شادی کر لی۔ لیکن وہ ماں جی کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک عام عورت نہ تھیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جن کو ہر قسم کا کالا اور سفید جادو ورثے میں ملتا ہے اور جنھیں دوسروں کو بس میں

اور مطیع کرنے والے سارے منتر یاد ہوتے ہیں۔ ماں جی کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے تھے اور ہر قسم کی گفتگو بے تکلفی سے کر لیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھے ماں جی سے اپنی پہلی ملاقات کا قصہ سنایا۔

ایک روز وہ اپنے مویشی چرانے پاڑ میں لے گئے۔ پاڑ بمعنی تقسیم، یعنی وہ علاقہ جہاں ایک گاؤں کی حد ختم اور دوسرے کی شروع ہوتی ہو۔ وہاں ساتھ والے گاؤں کی دو جوان لڑکیاں اپنے کھیت سے ساگ توڑ رہی تھیں۔ ابا کا کوئی مویشی ان کے کھیت میں چلا گیا۔ وہ لٹھ لے کر دوڑے اور اپنے مویشی کو واپس لے آئے مگر ان میں ایک جو قدرے بڑی تھی بہت خفا ہوئی اور دیر تک انھیں برا بھلا کہتی رہی۔ مگر دوسری خاموش رہی۔ صرف اتنا کہا۔ "جانے دو آپا۔ اس بے چارے کا کیا قصور۔"

ابا کہتے ہیں انھوں نے اپنے گھر میں تو کیا پورے گاؤں میں اتنی حلیمی اور حلاوت سے بات کرنے والی عورت نہ دیکھی تھی۔ ایک اجنبی لڑکی کا ہمدردی اور اپنائیت سے لبریز یہ سیدھا سادا جملہ ان کے دل میں اتر گیا اور کئی دن تک کانوں میں گونجتا رہا۔ آخر کار انھوں نے والدہ سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ اسی گاؤں اور برادری کی تھیں۔ اگلے ہی روز جا کر اسے بیٹے کے لئے مانگ آئیں۔

وہ اپنے سسرال آئیں تو ان کا پالا میری چاچیوں اور پھوپھیوں سے پڑا اور بقول ابا کے ایک معصوم ہرنی بھگیاڑیوں میں گھر گئی۔ مگر انھوں نے اپنی وضع نہ بدلی۔ میری ایک پھوپھی نے جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں اور دنیا کی ہر سہاگن کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتی تھیں، زبان کی قینچی چلاتے چلاتے ایک روز سچ مچ کی چھری سے انھیں زخمی کر دیا۔ مگر انھوں نے ابا سے کہا سبزی کاٹتے ہوئے میرا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اور مجھے بھی منع کر دیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروں۔ پھوپھی جان پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ وہ ان کی اس کشادہ دلی اور درگذر سے خوفزدہ سی ہو گئیں۔ کہتیں یہ کسی عام انسان کے بس کا کام نہیں۔

میرا خیال ہے ابا ٹھیک ہی کہتے تھے ان کے رویے میں بردباری اور لہجے میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔ وہ سراپا شفقت اور محبت تھیں۔ اور اس سے بڑا جادو ایجاد نہیں ہوا۔ اپنے شوہر اور بچوں سے ہی نہیں وہ اپنے والدین، بھائی بہنوں اور دیگر رشتے داروں سے بھی بے حد محبت کرتی تھیں۔ اپنے اکلوتے بھائی سے تو انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار ماموں سے ملاقات کو کئی مہینے ہو گئے۔ وہ ان کے لئے بہت اداس رہتیں۔ ایک روز میکے گاؤں کا کوئی آدمی ملنے آیا اور اس نے پوچھا، "بہن جی کوئی سکھ سنیہا؟"

انھوں نے مجھ سے کہا ماموں کے نام خط لکھ دو۔ میں قلم دوات لے آیا اور کہا، "لکھوائیں۔" انھوں نے صرف ایک مصرع لکھوایا: "اگلے منہ لا سیاہی متاادب تھساکے۔" اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھا انھیں دوسرا مصرع بھول گیا ہے میں نے کہا۔ "آگے بھی تو بولیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ "مجھ سے نہیں لکھوایا جاتا۔ تم خود ہی کچھ لکھ دو۔"

میں نے لکھ دیا۔ "ماموں جان اس کے بعد آپ کی بہن کی آواز بھرا گئی۔"

میں نے خط لفافے میں بند کر کے ننھیال کے آدمی کو دے دیا اور وہ چلا گیا۔

اگلے روز ہم ابھی ناشتہ کر رہے تھے جب ماموں جان کی گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ اندر آ رہے تھے۔ ماں جی ننگے پاؤں دروازے کی طرف دوڑیں۔ "بسم اللہ میرا ویر!"

ماموں جان ان سے کچھ ہی بڑے تھے مگر وہ ان کا والد کی طرح احترام کرتی تھیں۔ علیک سلیک اور چائے ناشتے کے بعد ماموں جان نے میرا لکھا ہوا رقعہ جیب سے نکالا اور خفگی سے بولے: "تم نے رقعے میں مجھے لکھا ہے اس کے بعد آپ کی بہن کی آواز بھرا گئی۔ گرامر کے لحاظ سے تو جملہ ٹھیک ہے مگر میں پوچھتا ہوں میری، بہن تمہاری کچھ نہیں لگتی؟"

میں نے کہا۔ "ماموں جان آپ برا نہ مانیں، میرا کوئی قصور نہیں۔ انھوں نے مجھے منع کیا ہے کہ آپ کے اور نانا جی کے سامنے ان کو ماں جی کہہ کر نہ بلاؤں۔"

"کیوں؟"

"یہ تو آپ ان سے پوچھیں۔ کہتی ہیں مجھے شرم آتی ہے۔"

اس پر ابا اور ماموں دیر تک ہنستے رہے اور وہ محجوب ہوتی رہیں۔

نہر کے پندرہ میلوں میں چھ پل اور تین گردوں پلیاں آتی تھیں۔ جب ہم تیسرے پل پر تھے اور تقریباً نصف فاصلہ طے کر چکے تو اچانک میری بائیسکل کے پہیے جام ہو گئے یا شاید ٹانگوں کی رہی سہی سکت بھی جاتی رہی۔ میں نیچے اترا اور بائیسکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے اس کے پہیے گھمانے لگا۔ نواب آگے چلا گیا تھا وہ پلٹ کر آیا۔ اس نے پہیے اور فرائی ویل چیک کیا اور ناراض ہو کر بولا، "تمھیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میں انھیں زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "نواب ایسا لگتا ہے کچھ ہو گیا ہے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوا۔ تم یوں ہی دل چھوڑ بیٹھے ہو۔" اس نے کہا۔ پھر قریبی ٹیوب ویل سے پانی لا کر مجھے پلایا اور تسلی دی اور مجھے اپنا کندھا تھام کر چلنے کو کہا۔

میں کچھ دیر اس کا کندھا تھام کر بائیسکل چلاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ نارمل ہو گیا۔ جب ہم گاؤں پہنچے۔ لوگ جمع تھے۔ انھیں نہلایا جا چکا تھا اور ان کا جنازہ ہمارے انتظار میں رکھا ہوا تھا۔

بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ صبح سے ان کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ بار بار طبیعت خراب ہوتی اور سانس اکھڑ جاتا مگر وہ خود کو سنبھال لیتیں۔ آخر کار تھک ہار کر ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اور یہ عین وہی لمحہ تھا جب ہم آدھا راستہ طے کر چکے تھے اور جب میری بائیسکل کے پہیے جام ہو گئے اور دل بیٹھ گیا تھا۔ لیکن میں آج تک اس کی کوئی عقلی اور سائنسی توجیہہ نہیں کر پایا کہ ایسا کیسے ہو گیا تھا۔ کیا یہ بھی کوئی طلسم تھا؟ ☆☆☆

ایک نظم

منصور اعجاز

شمارہ ۲۸۶
نومبر ۲۰۰۴

چاند کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا
سنجیدگی سے چاندنی بکھیرتا رہتا ہے
خوشنما پھول، چمکیلے ٹیلے، ہرے بھرے شجر
تالاب، جھیل، ندیاں، جھرنے
خوشی سے پھولے نہیں سماتے
ہرن قلانچیں بھرتے ہیں
مور ناچتے، بھنورے گنگناتے ہیں
چاند رتھ یاترا سے خوفزدہ ہوتا ہے
نہ گورو یاترا سے

غزل

منصورہ احمد

شمارہ ۲۱۵
مارچ، اپریل ۱۹۹۸

یہ میرا بھولا مورکھ دل، اک ساتھ ہی چاہے دو باتیں
اک ساتھ ہی چاہے کچے گھر، اور جل تھل کرتی برساتیں

رگ رگ سے بولے نام ترا، اور ہونٹوں سے انکار کرے
جیتی بازی کے قصے میں لکھ بیٹھے درد کی شہ ماتیں

جب آنگن میں چاند اترے تو کس چاؤ سے مہندی گھولے
پھر کورے ہاتھوں میں بھر لے اک لمبے ہجر کی سوغاتیں

یہ اپنی ہر ہر دھڑکن میں، اس کی آہٹ کا گیت بنے
اک آہن گھر کی بستی میں ڈھونڈے خوشبو کی باراتیں

سورج جیسے معیار چنے، پھر ان کی آگ میں جل جائے
کرنوں کو پرو لے سانسوں میں، تو آ پہنچیں کالی راتیں

منظر سلیم

شمارہ ۱۹۱،
فروری ۱۹۹۶

نہ وہ اپنے بارے میں
اپنے عزیزوں کے بارے میں
کچھ جانتے ہیں
نہ یاروں رفیقوں کو پہچانتے ہیں
کوئی فرد ان کے لئے کچھ نہیں اب
معما ہے ماحول سب، زندگی سب

☆

کشادہ مکاں کی فضا میں
شرافت، نفاست، دیانت
خلوص اور ایثار کی نکہتیں تیرتی ہیں
انھیں نکہتوں میں سب اچھے برے موسموں کی
ہزاروں ہی یادیں کشادہ سے کمروں میں
آنگن میں اور لان میں جی رہی ہیں
صدائیں جو بچوں کی تتلاہٹوں سے
کھنکتے گرجتے ہوئے قہقہوں تک
سب ادوار کی ہیں
مگر یہ مکاں بھی جو تعمیر انھی کا کرایا ہوا ہے
یہ کنبہ بھی جو سب انھی کا
بنایا سنوارا ہوا ہے
اب ان کے لئے کچھ نہیں ہیں
وہ دو ہاتھ ہر لمس کو جن کے اکثر
یہ لگتا ہے کچھ وہ پہچانتے ہیں
جو اسی گلا گھونٹتی بے بسی میں
سہارا شب و روز دیتے رہے ہیں
وہ دو ہاتھ ہیں جس بدن کے
اسی سے ہیں پھوٹی
یہ سب نکہتیں ساری یادیں صدائیں
پر اب اس بدن کی محبت کو بھی وہ
نہیں جانتے ہیں

☆

نہ جذبات سے اپنے واقف
نہ واقف ہیں وہ خواہشوں سے
غذا یا دوا ہو، گلے سے اترتا ہے جو کچھ
ضرورت کو اس کی سمجھنے سے رہتے ہیں قاصر
تن ناتواں پر گذرتا ہے جو کچھ
اسے خود سمجھنے کسی کو بتانے پہ قادر
نہیں ہیں

☆

بتانے کے، کہنے کے الفاظ سارے
مرض دھیرے دھیرے بھلاتا رہا ہے
اسی طرح ہر شعبۂ زندگانی کے جن سے
تعلق انھیں رہ چکا ہے
چھنے ان گنت حرف و معنی
ہوا حافظہ ان کتابوں کا جیسا
ورق جن کے ہو جائیں سادے

☆

علالت نے گویائی بھی چھین لی ہے
ادھر کچھ مہینوں سے آواز کمزور پڑتی
سمٹتی سکڑتی رہی ہے
مگر اب وہ مہر خموشی لبوں پر لگی ہے
جو دن رات میں چند لمحات ہی کے لئے ٹوٹتی ہے
کچھ اس طرح گویا مخاطب ہوں خود سے
نہ جانے وہ کہتے ہیں کیا کیا
جسے سن نہیں سکتے خود ہونٹ ان کے

☆

علالت نے سب دولت آگہی چھین لی ہے
سب افراد و اشیا سے توڑے ہیں رشتے
کیا ہے انھیں یوں اکیلا
کہ ان کا بدن بھی ہے ان کے لئے اجنبی کا
وہ اب نیم جاں ہو چکے ہیں
مگر پاک و معصوم سی مسکراہٹ
چراغ سحر کی بھڑکتی ہوئی لو
کشش دیتی رہتی ہے چہرے کو ان کے
کشش یہ سکوں سے ہے معمور لیکن
کوئی جو انھیں اور ان کی علالت
کو اچھی طرح جانتا ہو
ذرا دیر تک ان کے چہرے کو دیکھے
تو وہ رو پڑے اور نظریں ہٹا لے

منظر کاظمی

شمارہ ۲۳۷،
مئی ۲۰۰۰

جھما جھم روشنی میں نہایا ہوا شہر غیاث احمد گدی کو بہت بھلا لگتا تھا۔ فولادی صنعت کا اتنا بڑا مرکز ہوتے ہوئے اور دو بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کو اپنے سینے پر جھیلنے کے بعد بھی اس شہر میں جو ایک خاص قسم کا گہرا سکون، لذت آگیں دھیما پن، اور گاڑھی محنت کی کمائی سے پیدا ہونے والی ایک نیک نفسی یہاں کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، وہ گدی کو اتنا حیران رکھتی تھی کہ گرد و پیش کے مناظر کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھنے پر بھی وہ مطمئن نہ ہوتے تھے۔

غیاث احمد گدی جب بھی جمشید پور آتے، کوئی نہ کوئی صورت مجھ سے ملاقات کی ضرور نکالتے۔ معمولاً وہ اپنے گدی رشتہ داروں کے یہاں قیام کرتے تھے، لیکن ایک بار وہ میرے مہمان ہوئے۔ سارا دن بستر پر پڑے رہے۔ الم غلم، جو رسالے میرے کمرے میں تھے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ شام ہوئی تو ایک انگڑائی لی اور کہا: "چلو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔" اور ہم چل پڑے۔ اس سفر میں بھی انھوں نے کہا:

"یار منظر، تمھارے اللہ میاں کا کیا بگڑ جاتا اگر دو آنکھیں اور دے دیتے؟"

میں نے کہا۔ "آپ ہی کا بگڑتا۔ اس لئے کہ پھر آپ اپنے آپ میں نہ رہ پاتے۔"

وہ مسکرا کر رہ گئے۔ ہم دونوں نے ہوٹل Boulevard کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک کونے کی میز پکڑلی۔ اردو ایڈیٹروں کی بدحالی اور بد معاشی، پاکستانی رسالوں کی خوبصورتی اور ضخامت، اور ہمارے ناقدین کی باہمی گروہ بندی اور ان کی اپنی اپنی پسند کی ادبی فہرست سازی کے موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے جب افسانے پر بات آکر ٹھہری تو اچانک انھوں نے اپنی عینک میز پر اتار کر رکھ دی۔ پھر اپنی ہتھیلی کو اپنی پیشانی پر رگڑتے ہوئے ہلکا سے ہلکی ہلکی ٹھوکر دیتے ہوئے کہا:

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی... آپ کے کاندھے پر رکھا ہوا ایک سر ہے۔" میں نے ذرا الھک کر یہ بات کہی۔

"میں پوچھتا ہوں اس کے اندر کیا ہے؟" غیاث کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ میں قدرے سنجیدہ ہو گیا، لیکن اپنے لہجے کی شگفتگی کو بنائے رکھتے ہوئے میں نے کہا:

"میرا خیال ہے کہ اس کے اندر مغز ہے۔"

ابلیس نے بھی سجدۂ آدم سے انکار کرتے ہوئے وہ شدت اختیار نہ کی ہوگی جو اس وقت غیاث احمد گدی کے انکار میں تھی۔

"بالکل نہیں۔ کوئی مغز وغز نہیں۔" مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا وہ کہنا کیا چاہتے تھے، لیکن میں بھی تنا رہا۔

"چلئے۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہی ایک بڑی سچائی کا اعتراف کرلیا۔"

وہ مسکرانے لگے، لیکن سنجیدگی وہی رہی، تیور وہی رہا۔ بولے:

"دیکھو، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ جو میرا سر ہے نہ، اس میں مغز نہیں، ریشم کے دھاگے ہیں۔ تہ بہ تہ گتھے ہوئے۔ بس ایک سرا پکڑ لو کھینچتے جاؤ، کھینچتے جاؤ۔ کہیں کوئی الجھنے والا نہیں۔ ٹوٹنے والا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "غیاث بھائی۔ یہ جو بات آپ نے کہی تو جی خوش ہوا کہ آج کی شام جو پیسے خرچ ہوئے ہیں وہ برباد نہیں ہوئے۔ حق ادا ہو گیا۔"

اور تب میرے اس جواب پر یہ ہوا کہ ہم دونوں کے مشترکہ قہقہے سے وہاں موجود تمام لوگوں کے کان کی لویں گرم ہو گئیں۔ اور شام اس لیے یاد رہ گئی کہ گدی کا افسانہ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" جب جب پڑھتا ہوں میرے کان کی لویں گرم ہو جاتی ہیں۔ یہ دو لویں انسان کے جسم کا سب سے ٹھنڈا اور بے حس عضو ہیں۔ جب ہاتھ لگایئے برف جیسی کوئی شے انگلیوں میں اتر جاتی ہے۔ صرف جذبات کا غلبہ ہی انھیں گرم کرتا ہے، جذبے پیار کے ہوں یا نفرت کے، بات ایک ہی ہے۔ لیکن اب جب کہ ہمارے یہاں احتجاج کی آواز نے دم توڑ دیا ہے، کان کی لویں ایک جان لیوا فکر کی وجہ سے بھی گرم رہتی ہیں۔

> ...دیوار پر، چھتوں کی منڈیروں پر ٹیلیفون کے کھمبوں، پیڑوں یا فرش پر، دانہ دنکا چنتے ہوئے پرندے جہاں نظر آتے وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور عین پرندوں کے پروں پر لیس دار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوڑ دیتا۔ پہلے تو پرندہ پھڑپھڑاتا، اڑنے کی کوشش کرتا، پھر تھک ہار کر لیس دار رطوبت سے چیں چیں کرتے ہوئے پروں کی قوت پرواز کے الجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھوں سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا،

دھیرے سے گاڑی کے دروازے کو کھولتا، اس میں پرندے کو
ڈھکیل دیتا۔ دروازہ بند کرتا۔ پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا
جہاں پرندہ پھڑ پھڑا کر تھک جاتا، اس وقت اس آدمی کے
چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلی
کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھتیں۔

("پرندہ پکڑنے والی گاڑی")

افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا وہ کسی میر شکار کی کہانی بیان کر رہا ہے؟ بچپن میں ہم سب نے دیکھا تھا کہ بالکل اسی ہنرمندی کے ساتھ پرندہ پھنسانے والوں کی ٹولی گاؤں گاؤں گھومتی تھی اور خوراک میں کام آنے والے پرندوں کو پکڑ لے جاتی تھی۔ یہ لوگ بازار میں ان کی قیمت وصول لیتے تھے۔ اس طرح سے خود ان کی خوراک کا انتظام ہوتا تھا۔ یہ ان کا ذریعہ معاش تھا۔ یہ لوگ "میر شکار" کہلاتے تھے۔ لیکن ایسا کچھ اس کہانی میں نہیں ہے۔ ہم نے اپنے بچپن کے جن شکاریوں کا ذکر کیا، وہ چیل کوے جیسے پرندوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ غیاث کی کہانی کا میر شکار کسی پرندے کو نہیں بخشتا۔ وہ شہر کو پرندوں سے خالی کر دینا چاہتا ہے، بلکہ کر دیتا ہے۔ اور شہر کے لوگ؟

...یہ روز مرہ کا دستور ہوتا۔ دوکاندار دوکانوں میں ہوتے، راہ گیر چلتے رہے۔ موٹر کاریں تیزی سے یوں پاں کرتی گذرتی ہوتیں۔ جوتا گانٹھنے والا جوتے گانٹھتا رہتا۔ خرید و فروخت جاری رہتی۔ شور غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ لیکن دین کا بازار اتنا جوان ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر نہ اٹھتی تھی، لیکن کسی کی نظر اٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آدمی چونکتا اور حوصلے سے اٹھتا۔ گاڑی والے اس کو قریب آتے دیکھ کر جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکے نکال کر اس کی جانب اچھال دیتے۔ پھر وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھوں اور چہرے سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ یہ عمل کچھ زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ فقط چند منٹ۔ دس یا بیس منٹ تک، پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا، اور ہوتے ہوتے محض چند سکنڈ رہ گیا۔ تو اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے اور پرندہ پکڑتی چلی جا رہی ہے، اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں...

("پرندہ پکڑنے والی گاڑی")

اور انجام کے طور پر...

"بھائی جان اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نہ؟"
"..."
"جب تتلیاں چلی گئیں تو کیا بچے گا اس شہر میں؟"
جواب میں، میں خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تا حال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا چونکا اور اب اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔
"بھائی جان، بھائی جان، وہ دیکھئے!"
عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔ میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں پرندے پر لگی رہیں۔

("پرندہ پکڑنے والی گاڑی")

تو ایسا ہوا کہ اوپر کی سطریں لکھتے ہوئے مجھے انتظار حسین کی یہ تحریر یاد آ گئی۔

شہر میں درخت اندھا دھند کٹتے چلے گئے اور ایک روز مجھے ایک عجیب فون آیا۔ بیگم حجاب امتیاز علی بول رہی تھیں۔
"انتظار صاحب۔ کیا آپ کو اس کا پتہ ہے؟ اب کے برس کوئل اس شہر میں خاموش ہے۔ جون شروع ہو چکا ہے اور ابھی تک کسی طرف سے کوئل کی کوک سنائی نہیں دیتی۔"
میں نے جناح باغ میں اپنی صبح کی سیروں کو یاد کیا اور حیران ہوا کہ کوئل کے کوکنے کا موسم تو شروع ہے، ابھی تک قریب یا دور سے اس کی کوک سنائی نہیں دی، مگر مجھے اس کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔
"آپ بجا فرماتی ہیں۔ میں نے ابھی تک کوئل کی کوک نہیں سنی۔"
"پھر آپ نے اس پر کالم کیوں نہیں لکھا؟ لوگوں کو اس واقعے کا علم ہونا چاہیئے۔ انتظار صاحب لکھئے۔ لوگوں کو بتائیے کہ یہ بہت تشویش کی بات ہے۔ تو آپ لکھیں گے؟"
"جی لکھوں گا۔"
یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس پر لکھنا چاہیئے تھا۔ اور یہ واقعہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر درختوں کے قتل عام پر فطرت کے کسی گوشے سے تو احتجاج ہونا تھا۔ ہماری طرف سے احتجاج کوئلوں کی طرف سے ہوا۔ اور اس طرح ہوا کہ انھوں نے چپ سادھ لی۔

("اچھی دعا کہ اب کچھ لکھنے نہیں دے گا")

لیکن غیاث احمد گدی کے یہاں افسانہ ختم ہوتے ہوتے جو ایک عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ دکھائی دیتا ہے، وہ کیا ہے؟ یہ کس کی جانب اشارہ ہے؟ یہ سنگی پرندہ کون سی دنیا کا استعارہ ہے؟ دراصل یہ صرف احتجاج نہیں ہے۔ احتجاج کی موت پر ایک صدمے کا بھی اظہار ہے۔ صدمہ جس نے چہکتی اور چہچہاتی زندگی کو پتھر میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن افسانہ محض اتنا نہیں کہ یہ

فطرت کے تئیں ہمارے سفاکانہ رویے کا بیان ہے۔ اس افسانے میں ریشم کے دھاگے ایک دوسرے سے الجھے بغیر ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ گدی نے نازک فنکارانہ طریقے سے فطرت سے ہمارے بے جا سلوک کو موجودہ سماجی استحصال کے خلاف ایک دانشورانہ احتجاج میں بدل دیا ہے۔ یہ افسانہ Consumerisation کی لعنتوں کا ایک اشاریہ ہے جس میں انسان کی نیک قدروں کے سکتے رہنے یا انھیں بحال رکھنے کی کوششوں میں ناکامی کا نوحہ بھی ہے۔ انسان پانی ہر نئی سانس کے ساتھ اپنی نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر نئی سانس اسے نئی زندگی کے تجربوں سے گذارتی ہے۔

دکھ اور سکھ دونوں گذری ہوئی زندگی کا ماحصل بکھر بکھر کر ریزوں میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں اور نئی سانس کے ساتھ نئی زندگی جیتے ہوئے آدمی اپنی میعاد بستہ مسرتوں کے حصول کی جو تھم اٹھاتا رہتا ہے اور اپنا ہی زیاں کر لیتا ہے۔ یہ افسانہ انسان کے فطری طور پر صاف ستھرے اور سیدھے سادے وسیلۂ زندگی کی توڑ مروڑ پر بھی احتجاج ہے۔ کسی سیاسی لیڈر اور اس کے کیڈر کی نہیں، ایک تخلیقی فنکار کی۔ تخلیقی سطح پر بیدار ہونے والی احتجاج کی آواز اپنے اولین مرحلے میں دوسروں کی سماعت کو Disturb نہیں کرتی۔ سارا شور خود فنکار کے دل و دماغ کو جھنجھنائے رہتا ہے۔ ذرا یاد کیجیے؟ اس افسانے میں منی بائی کے کوٹھے پر کیا ہوا؟

> افسانہ نگار نے اپنے کہانیوں کے معاوضے کی پوری رقم جو چودہ روپئے ہوتی تھی منی بائی کے حوالے کر دی اور ایک مرحلے پر جب منی بائی نے کہا:
>
> "...واہ بہت اچھا بولتے ہو جی۔ کہاں رہتے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟"
>
> "کہانیاں لکھتا ہوں منی بائی۔ رہنا وہنا کیا، جہاں پایا رہ لیا۔ جہاں چاہا سو لیا۔"
>
> "اے۔ کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا۔ لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گذرے ہو، تمھارا دھندا تو ہمارے دھندے سے بھی گیا گذرا لگتا ہے جی۔"
>
> ("پرندہ پکڑنے والی گاڑی")

بند کمرے میں اپنے دھندے کو گیا گذرا سمجھنے والی منی بائی ہزار اپنے طوطے کو پیسوں کے عوض دے دینے کو تیار ہو لیکن وہ بہر حال ان منی بائیوں سے زیادہ ٹھوس بنیاد پر کھڑی ہے جو ہمارے رگ و پے میں گھس گئی ہیں۔ کوٹھے والی منی بائی طوائف ہے، لیکن بدچلن اور آوارہ نہیں۔ بدچلنی اور آوارگی تو صارفین کلچر کی منی بائی میں پائی جاتی ہے۔ یہی وہ منی بائی ہے جو اپنے کوٹھے بلند کرتی ہے۔ تو ہمارا کردار منہدم ہو جاتا ہے۔ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" اسی انہدام کا ماتم ہے۔ Consumerisation کے راون نے ہماری زندگی کی سیتا کا ہرن کر لیا ہے اور اس افسانے کا دکھ یہ بھی ہے کہ ایک اکیلا رام آسمان پر اڑنے والے پرندے "جٹایو" کی امدادی نشاندہی سے بھی محروم ہے۔

"ہاں منی بائی، اس لیے کبھی کبھی جی چاہتا ہے، کاغذ قلم پھینک تمھارا والا دھندا ہی شروع کر دوں۔"

گدی نے یہاں لوگوں کی بے حسی کے خلاف بڑا Caudel رویہ اختیار کیا ہے۔ لیکن اس احتجاج میں جو دردمندانہ سفاکی ہے وہ تخلیقی فنکاروں، نیک نیتی سے سوچنے والوں، شریف قدروں کو سینے سے لگائے رکھنے والوں، اور غیر صارف مزاج کے نرم لوگوں کو یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ منی بائی تو ذرا سے میں اکٹھے چودہ روپئے رکھوا لیتی ہے مگر وہ کیا کریں؟ ان کا تو لگتا کیوتر بھی قید میں ہے۔ یہ ایک بڑا سوال ہے جو اس طرز فکر کے لوگوں کے دماغ پر سوار ہوتا ہے تو برف کی لہریں ان کی جسم کی تمام ہڈیوں میں اتر جاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ برفیلی ہڈیاں کچھ لوگوں کو صرف ماسکو میں دکھائی دیتی ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کے صدر دروازے پر تیکھی نگاہوں سے دیکھنے والوں کی ہڈیاں بھی برف کی پتلی پتلی قاشیں بن گئی ہیں۔ احتجاج کے لیے اپنے تلووں کے نیچے اپنی زمین چاہیئے۔ اور اپنی زمین کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ پرندے آزاد زندگی اور بے خوف و خطر Mobility کا استعارہ ہیں۔ وہ جو پرندہ پکڑنے والی گاڑی کے ساتھ لمبے بانس والا آدمی آگے بڑھتا ہے اور چپکے سے منی بائی کے طوطے کے بائیں بازو پر لیس دار رطوبت والے تپچے کو چھوا دیتا ہے، طوطا پھڑپھڑاتا ہے تھرتھراتا ہے۔ اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور برسوں کے اڈے (منی بائی) کو غیر محفوظ جان کر بالکنی کی ریلنگ کا سہارا لینا چاہتا ہے۔

وہ کیا ہے؟

یہ احتجاج کی آخری آواز ہے۔

طوطا یوں نہیں مانتا۔ چیں کی آواز سے زور سے چیختا ہے۔ پھڑپھڑاتا ہے۔ پھر پتہ نہیں اس کی چھوٹی ہوئی قوت پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے۔ وہ ذرا اوپر اٹھتا ہے۔ لیکن پھر گر پڑتا ہے۔ وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی کی رسی بندھی ہوئی ہے (یہ اپنے Assignment کا غلام ہے) اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور مسکرا دیتا ہے۔ وہ دراصل قید کی زندگی گذار رہا ہے۔ غنیمت ہے کہ وہ آزادی کی قدر و قیمت سے ابھی تک واقف ہے۔ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں لمبے بانس لئے ہوئے چلتا، پرندہ پکڑنے والا آدمی اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے (نفرت، غصے اور حیرت سے) پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر طوطے کو اٹھانے کے لیے جھپٹتا ہے۔ لیکن طوطا اس کی گرفت میں آنے کے بجائے دفعتاً تڑپ کر اچھلتا ہے اور اس کی کن پٹیوں پر جھپٹتا ہے، اس کی گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔ پرندے کو پکڑنے کی کوشش اور پرندے کی اپنی آزاد رہنے کی جدوجہد کوئی مرحلہ نہیں طے کر پاتی کہ منی بائی لپک کر جاتی ہے اور اپنی چادر اس پر ڈال دیتی ہے۔ پھر منی بائی کہتی ہے:

> "جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی؟"

غیاث نے اس کہانی کے بے حد اہم مقام پر بات کو تھوڑا الجھانے کی خاطر ہلکا سا الجھا دیا ہے، منی بائی کا طوطے پر اپنی چادر ڈال دینا ہی کافی تھا۔ وضاحتی مکالمے کی ضرورت نہیں تھی۔ صارفی رویہ بالکل واضح ہے۔ لیکن ریشم کے

دھاگے تو بہر حال تہ بہ تہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے الجھے بغیر ایک دوسرے میں پیوست۔ گدی نے سارا ابھار پہلے ہی اتار لیا تھا۔

"ہاں منی بائی تمھارا دھندا بہت اچھا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی جی
چاہتا ہے کہ کاغذ قلم پھینک تمھارا والا دھندا ہی شروع کردوں۔"

دھندا...؟ جسم فروشی کے اس دھندے میں افسانہ نگار اپنے گاہکوں کو چودہ روپئے کے عوض کیا دے گا؟ افسانہ نگار کی اس تجویز پر منی بائی کا بے ساختہ ہنسنا اور جلدی سے چہرے کو ڈھک لینا معاملہ صاف کر دیتا ہے۔ جملہ سخت ہے لیکن گدی نے یہ بات محض کہنے کے لیے نہیں کہی۔ یہ کہہ کر اس نے دراصل آج کے کریہہ سیرت، خوبصورت چہروں کے اسی مقام پر جس کے دھندے کی بات کہانی لکھنے سے زیادہ سودمند بھی جا رہی ہے، ایسی لات ماری ہے کہ اسے لہولہان کر دیا ہے۔ یوں تو پرندہ بھی لہولہان ہے، مگر اپنی آزادی کے لیے۔

لیکن اس افسانے کا اصل دکھ کیا ہے؟ دکھ جھیلے بغیر افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ "بابا لوگ" اور "انجی" کا افسانہ نگار یہاں ذرا پھیل گیا ہے۔ اس کے ریشم کے دھاگے کچھ زیادہ کھلے ہیں اور اسی لئے کہیں کہیں پر تھوڑا الجھتے نظر آتے ہیں۔ گاڑی کا ہمیشہ مغرب سے آنا ہمارے طرز فکر اور ہماری تہذیبی وراثت کو اغوا کرنے اور یرغمال بنائے رکھنے کی جانب اشارہ ہے۔ اور گاڑی کا ٹھیک دوپہر میں آنا ان حالات کی نشاندہی ہے کہ یہ وقت پریشانیوں، الجھنوں، مصروفیتوں اور ان کی بنا پر ایک دوسرے کے درد سے ناآشنائی، بے نیازی اور تناؤ بھری بے حسی کی فضا تیار کرتا ہے۔ آدمی ایسے اوقات میں ہکا بکا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے بے خبر بلکہ ایک دوسرے کو بغلی مارتا ہوا۔ تیز رفتار اور بھاگم بھاگ میں لگا ہوا Consumer Culture اور اس کے فروغ کے لیے استحصال کے تمام ہتھکنڈے بڑی آسانی سے انھیں حالات میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ گاڑی اپنے واپسی سفر میں ترکی جانب کسی ڈھلان میں کیوں اتر جاتی ہے؟ ریشم کا ایک دھاگا یہاں پورے کا پورا الجھ گیا ہے۔ کسی محدود Landscape پر کھڑے ہو کر اپنے صدور جہ ذاتی مشاہدے کے اظہار میں جو لفظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ عام طور پر معنویت کے آفاقی مرتبوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ اتر کی سمت کہاں ہے؟ یورپی اور مغربی ممالک کی ہے؟ کسی ایشیائی خطۂ ارض کی، ہندوستان کی، یا محض گدی کے اپنے شہر جھریا کی؟ ایک ڈور بہر حال الجھی ہوئی ہے۔

لیکن افسانہ ہر حال میں اپنی بلند قامتی کے ساتھ ہم سے آنکھ ملا کر بات کر رہا ہے۔ صارفی رویے کی اس دنیا میں جہاں کمینہ پن، بے ایمانی اور بے حسی ایک جان لیوا صورت حال پیدا کر رہی ہے افسانہ نگار آدمی کی اصل کو بچائے رکھنے کی تمنا میں آرزو مندانہ التجا کی سطح پر جینے کی اذیت برداشت کر رہا ہے۔ افسانے کا دکھ یہی ہے۔ Nature اپنی معصومیت سے پہچانی جاتی ہے۔

بالارادہ فطرت نے کبھی کسی کا زیاں نہیں کیا۔ یہ صلاحیت تو ہم انسانوں میں ہے۔ افسانہ نگار یہ سارا کچھ اپنے دکھوں کی شکل میں دیکھتا ہے اور تنہا دیکھتا ہے کہ فطرت کا ایک اور نمونہ چھوٹے سے دس سالہ بچے کے کردار میں ابھرتا ہے۔ اس بچے کی بہن لقوے کی مریضہ ہے اور اس کے علاج کے لیے ایک لقا کبوتر کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن وہ بھی قید کر لیا گیا ہے۔ شعوری مصلحت کوشی اور منفعت بخش دور اندیشی، انقلاب، تغیر، تبدیلی اور آزادی کی راہیں ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے اور ساتھ ساتھ سیاسی، معاشی اور سماجی غلاموں کی تعداد بڑھاتی رہتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر احتجاج کی آواز دور دور تک نہیں سنائی دیتی لیکن یہ دس سالہ چھوٹا سا بچہ مصلحت کوشی اور دور اندیشی کے تجربوں سے نہیں گذرا ہے۔ اس لیے وہ معصوم ہے اور اسی لیے نیچر کا حصہ ہے۔ لیکن وہ ہمارے رویے پر حیران ضرور ہے۔ اس نے ماچس کی ڈبیا میں ایک خوش رنگ تتلی چھپا رکھی ہے۔ اس مقام پر فطرت کا حسن گدی کے لیے محض بصری لذتوں کا سامان نہیں رہتا۔ وہ اس کے رگ و پے میں اتر گیا ہے۔

ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش
رنگ تتلی نیم جاں سی پڑی ہوئی تھی، جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے
ہی پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کے ننھے ننھے پروں کے اردگرد زعفرانی
رنگ نکھرا ہوا تھا اور پروں کے عین درمیان زیرے کے برابر سرخی
تھی۔ اور اس سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھٹکا ہوا تھا۔
اور پروں کے کناروں پر افشاں چمک رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی
روشنی میں وہ بہت حسین دکھ رہی تھی۔ اور تب یہ مرحلہ آتا ہے۔

"بھائی جان، اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نہ؟

"..."

"جب تتلیاں چلی جائیں گی تو کیا بچے گا اس شہر میں؟"

گدی جواب میں خاموش ہے۔ اس کا دکھ یہاں آ کر زمین آسمان کا سفر کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ ڈھونڈتی ہیں۔ تلاش کرتی ہیں۔ اسے تتلی کے پروں کے عین درمیان زیرے کے برابر سرخی دکھائی دے رہی ہے۔ یہاں گدی نے ارادتاً ریشم کے ایک دھاگے پر گرہ لگا دی ہے اور بقیہ تاروں کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ریشم کے دھاگے جو تہ بہ تہ ایک دوسرے سے الجھے بغیر ایک دوسرے میں پیوست ہیں، کھلتے جاتے ہیں۔ بس تھوڑے سے، محض ایک دو دھاگے گدی نے اپنی گرفت میں لے رکھے ہیں۔ عمارت کے اوپر بنے ہوئے پتھر کے پرندے کو دیکھنے کے بعد جو صورت پیدا ہو جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ گدی کے ہاتھ میں محفوظ یہی دھاگے ہم اپنی گردنوں پر لپٹے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ پہلے تو ان کی سرسراہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہی دھاگے اور بھی لپٹتے ہیں۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں، ہم چیخنے لگتے ہیں زخمی ہرن کی طرح۔ شاید احتجاج کی کوئی صورت یوں بھی نکل آئے۔

مجھے Bulevard کی شام یاد آ گئی ہے۔ گدی نے اپنی عینک میز پر رکھ دی تھی اور ہتھیلی سے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے بلکہ اس پر ہلکی ہلکی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا تھا۔

"منظر، یہ جو ایک سر دیکھ رہے ہو نا اس میں کوئی مغز وغز نہیں ہے، ریشم کے دھاگے ہیں تہ بہ تہ۔ بس ایک سرا پکڑ لو اور کھینچتے جاؤ، کھینچتے جاؤ۔ کہیں کوئی ڈورا الجھنے والی نہیں ٹوٹنے والی نہیں..."

لیکن غیاث احمد گدی، ریشم کے دھاگے ہماری گردنوں پر اتنے سخت کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ ☆☆☆☆

من موہن تلخ

شمارہ ۲۱۱،
نومبر ۱۹۹۷

ایسا کہیں غضب نہ ہو، عمر حساب مانگ لے
میں کہ ہوں خود ہی اک سوال، مجھ سے جواب مانگ لے
چوک نہ اے ادائے نو! اب بھی تو عہد رفتہ سے
مانگ لحاظ آنکھ کا حسن حجاب مانگ لے
دل سے پسند کی ترنگ، آنکھ سے ربط کی چمک
تجھ کو جو آئے مانگنا، ہیرے سے تاب مانگ لے
مانگنا ہے جو تو خوشی، دل کو تو چاہئے تڑپ
کوئی وبال پال لے، کوئی عذاب مانگ لے
جو بھی ہوا ہے آج تک میں نے تو کچھ لکھا نہیں
ڈر ہے نہ مجھ سے زندگی کوری کتاب مانگ لے
دل کے جو ہاتھوں جی ترا جینے سے ہے اچاٹ تو
دل کے یہاں کمی نہیں، کوئی سا خواب مانگ لے
ریت کے ذروں کی چمک دھوکا نہ دے گی پھر تجھے
تو اگر آسمان سے عکس سراب مانگ لے
مانگنا ہے تو مانگ وہ، جس سے بجھے نہ تشنگی
وسعت ریگ زار سے قطرۂ آب مانگ لے
پہرے یہ کیا بٹھا دیئے، گھر ہیں کہ قید خانے تلخ
ایسے گھروں سے کیا کوئی خانہ خراب مانگ لے

شمارہ ۲۳۰،
اکتوبر ۱۹۹۹

آگے تری مرضی ہے کہ اے عمر ہمیں کیا
باتوں ہی میں سب کٹ گئی، اب بول، چلیں کیا؟
ممکن ہے کہ ہلکا بھی ہو جی کہہ کے کسی سے
مشکل تو مگر یہ ہے کہیں کیا نہ کہیں کیا
مانا کہ ہے اپنا ہی بھلا سب کے کہے میں
لگتی نہیں آواز ہی اچھی تو سنیں کیا
منظور نہیں جو بھی ہوا سب اسے جانیں
جلتے ہیں بس اندر سے دھواں بن کے اٹھیں کیا
شاید کہ نہیں کوئی صدا آئے تو کیا آئے
جب تک نہ صدا آئے تو اسرار کھلیں کیا
آواز کے ہر ایک بھنور سے تو ابھر آئے
اب چپ کے ہیں گرداب تو سکتے میں رہیں کیا
کہنا بہت آساں ہے کہ یہ کیا ہوا جینا
پودوں کی طرح سانس بھی چپکے سے نہ لیں کیا
کاٹ آئے ہیں جیسی بھی شکنجے سی یہ اب تک
کچھ اور ہے جینا تو اسے اور کسیں کیا
حیران ہیں سب کیوں کہ بلاتے ہیں کسے ہم
گم ہو گئے ہیں خود کو بھی آواز نہ دیں کیا
تم دخل نہ دو تلخ جو ہوتا ہے کہیں کچھ
کاہے کو یہ سننا ہے کسی سے کہ تمھیں کیا

من موہن تلخ

شمارہ۲۳۴،
فروری۲۰۰۰

اب ہے شکوہ بھی ہم کو تو کس سے
زندگی بھر کے ایک مونس سے

ذہن میں یہ تناؤ ہر لحہ
باز آئے ہم اس چھٹی حس سے

دل کو فرصت ملے تو اوروں سے
ہم کو بھی ایک کام ہے اس سے

اس نے اتنا کہا تھا، کیسے ہوا
ہم یہ کہتے پھرے ہیں کس کس سے

اب وہ آتے ہیں اپنی کہنے کو
اپنی ہم نے کہی ہے جس جس سے

ہاں انھی کے ہے اختیار میں سب
ہم اٹھ آئے ہیں جن کی مجلس سے

اپنے پیچھے پڑے ہیں ہم خود ہی
اور لڑتے ہیں جانے کس کس سے

خود نہیں جانتے پتہ اپنا
پوچھتے پھر رہے ہیں جس تس سے

آئے ہیں کچھ رکیں گے چل دیں گے
کیا پتہ پوچھنا ہے اور کس سے

دیدنی تھا وہ خود سے ملنا تلخ
جیسے بے حس ملا ہو بے حس سے

شمارہ۲۳۶،
اپریل۲۰۰۰

عجیب دکھ ہے یہ دل اپنے اندر اندر ہی
کہ جیسے کوئی صدف پی گیا سمندر ہی

یہ کون موج میں آیا کہ گھر ہی پھونک دیا
کہ ایسی بات کرے گا کوئی قلندر ہی

ہمارے چہرے سے وہ دکھ نہ کوئی جان سکا
کہ گھلتے جا رہے ہیں جس سے اندر اندر ہی

مجھے نہ روک سکے تیرے کوہ و صحرا تو
بچے ہیں پاس ترے اب یہ کچھ سمندر ہی

وہ کھائی منھ کی، نہیں منھ بھی تم دکھانے کے
مرے بھی آ کے کہاں، میری حد کے اندر ہی

تو کیا کوئی بھی نہیں جو ہرا سکے مجھ کو
تو جاؤ اور کہو آئے پھر سکندر ہی

کئے تو وقت نے سانچے میں ڈھالنے کے جتن
مگر یہ تلخ رہا جوں کا توں دھرندر ہی

منیب الرحمٰن

شمارہ ۳۸،
جولائی ۱۹۶۹

بلبلوں کے محل

قید ہیں جن میں شام وسحر
جس نے رکھا قدم
بن گیا سنگ در
کون گذرا ہے اس راہ سے بے خطر

اور ان سے پرے
بادلوں میں گھرے
کہساروں کے پھیلے ہوئے سلسلے
فاصلے فاصلے
ایک طائر کی پرواز بے جستجو
ایک آواز بھٹکی ہوئی کو بہ کو

شمارہ ۱۴۳،
اگست تا نومبر ۱۹۸۶

الفاظ

ایک دن وہ آئے گا
جب یہ الفاظ پیرہن اپنا
جسم سے اپنے نوچ پھینکیں
گے
اور گھر سے نکلیں گے
اپنی رعنائی برہنہ میں
جیسے صبح کا سورج
ابر سے نکل آئے

پھر یہ الفاظ، بھیس بدلے
ہوئے،
مصلحت کی سڑکوں پر
در بہ درنہ بھٹکیں گے
اور وہ درد اجنبی پن کا
ان کے سینے میں جو مچلتا ہے
ناگہاں شعلہ بن کے لپکے گا
خون بن کے مہکے گا

منیب الرحمٰن

شمارہ ۲۱۳،
جنوری ۱۹۹۸

رہِ زندگی ہے رواں دواں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں
لیے جا رہی ہے کشاں کشاں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

تگ و دو میں وقت بسر ہوا
جو بچا وہ نذرِ سفر ہوا
کہاں لطفِ صحبتِ دوستاں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

مرے روز و شب کا یہ حال ہے
نہ فراق ہے نہ وصال ہے
مرا تن یہاں، مرا دل وہاں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

یہ مرا تمھارا جو ساتھ ہے
فقط اک دکھاوے کی بات ہے
یہ ہے آج رسمِ ورہِ جہاں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

زن و مرد اکائی میں بٹ گئے
چلو سب حساب نمٹ گئے
نہیں کوئی ہمدم و ہم زباں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

ہم اگرچہ ایک ہی جا رہے
مگر اصلیت میں جدا رہے
ہوئی عمر صرفِ جہاں تہاں
کبھی میں نہیں، کبھی تم نہیں

منیب الرحمٰن

شمارہ ۲۱۳،
جنوری ۱۹۹۸

سال کا پہلا گلاب

گلاب محبت دلدار کی نشانی ہیں
گلاب شام ملاقات کی کہانی ہیں
گلاب نرمی عارض ہیں، گرمی لب ہیں
گلاب خرمن مہتاب، چراغ محفل ہیں
گلاب گوشۂ خلوت میں آتش دل ہیں
گلاب بیتے ہوئے موسموں کی خوشبو ہیں
گلاب اڑتی ہوئی ساعتوں کے جگنو ہیں

گلاب لائیں گے اس پیرہن کی بوے وصال
اٹھے گی چشم تمنا میں جستجوے وصال
رہے گی چاند ستاروں سے گفتگوے وصال

چمن چمن میں کسی کا شباب مہکے گا
وہ ابتداے محبت کا خواب مہکے گا
کہ آج شاخ پہ پہلا گلاب مہکے گا

شمارہ ۲۵۰،
نومبر ۲۰۰۱

شجر تلخ

تناور اور پر ہیبت
ثبات وقت کی مانند پائندہ
جڑیں پیوست ہیں پاتال تک اس کی
جہاں لاکھوں برس کی ہڈیاں ہیں اور ڈھانچے ہیں
یہ کس طاقت کا مظہر ہے
کہ اس کی فطرت عادی مبرا ہے تغیر سے
کسی نے تخم اس کا جب لگایا تھا
تو کیا معلوم اس کا مدعا کیا تھا
وہ بے شک جانتا ہوگا
کہ پھل اس کے ہمیشہ بدمزہ ہوں گے
مگر اب یہ کھڑا ہے سر اٹھائے عرش کی جانب
ستارے اس کو دیکھتے ہیں بلندی سے
سفید و سرمگیں بادل
اسے چھو کر گذرتے ہیں

منیب الرحمٰن

شمارہ ۲۸۳،
اگست ۲۰۰۴

ناشتے کی میز پر

ابر آلودہ فضا، بھیگا ہوا دن
منھ اندھیرے
بے صدا سنسان کمرہ
کوئی بھی چہرہ نہ آہٹ
صرف اپنی ذات کا احساس سنگیں
گھر کے اندر پھیلتی کافی کی خوشبو
میں اکیلا ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا ہوں
اور باہر بوندا باندی ہو رہی ہے

چابیوں کا گچھا

یہ چابیوں کا گچھا
جو میز پر دھرا ہے
ہے یادگار اس کی
جو آج لاپتہ ہے
دروازہ بند کر کے
وہ شخص جا چکا ہے
لوٹے گا وہ نہ ہرگز
دروازہ کہہ رہا ہے
یہ چابیوں کا گچھا
کس کام آ سکا ہے
اس سے نہ کھل سکے گا
جو قفل اب لگا ہے

منیر نیازی

شمارہ ۲۸،
ستمبر ۱۹۶۸

موسم سیر تنہائی میں آئندہ کا خیال

شام ہے تنہا ہوا باغوں میں ہے
کال کوئل کی صداؤں سے شجر زاروں میں ہے
رفتوں پر جستجو اور ہجر کے نغموں کے دن
آنے والے موسموں کے اولیں خوابوں کے دن
اک عجب آئندہ کی تصویر کاخ و کو میں ہے
قریۂ ظلمت نشاں خواب جمال ہو میں ہے

ایک احتمال

شاید وہ ملے انھیں راہوں پہ جن راہوں پر چھوڑا تھا اسے
کرنوں کی کلیاں چنتے ہوئے
مری جانب دوڑتے آتے ہوئے
پھر رک کر واپس جاتے ہوئے
شاید وہ موسم اب تک ہو جس موسم میں دیکھا تھا اسے

شمارہ ۲۹،
اکتوبر ۱۹۶۸

اگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ
ہوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ

گھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ

بہت ہی سست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا
نشاں آخر ہوا یہ سرخ تر آہستہ آہستہ

مرے باہر فصیلیں تھیں غبار خاک و باراں کی
ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ

چمک زر کی اسے آخر مکان خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

منیر نیازی

شمارہ ۳۳،
فروری ۱۹۶۹

ایک دوزخی شہر پر بادلوں کے لئے دعا

گرم رنگ پھولوں کا
گرم تھی مہک ان کی
گرم خون آنکھوں میں
تیز تھی چمک ان کی
سوچتا میں کیا اس کو
اس حسیں کی باتوں کو
دیکھتا میں کیا اس کو
خاک رنگ ہاتھوں کو

خوف تھا تمازت میں
عیش شب کی شدت کا
در کھلا تھا دوزخ کا
لمس لب کی حدت کا

میں جواب کیا دیتا
اس کی ان اداؤں کا
ایک شہر مردہ میں
دور کی نداؤں کا

سحر زرد باطن میں
پانچ بند اسموں کا
بن گیا تھا جسموں میں
زہر پانچ قسموں کا

سیر سحر آب زار بنگال

رخصت سرما کی صبح، سرد، نم، سنگین سی
خواب خاموشی کی تہ میں اک جھلک رنگین سی
بانس کا جنگل، ہوا، پانی پرانی جھیل کا
سبز ڈر پر رنگ جیسے آسماں کے نیل کا
گرتے جاتے شہر دونوں سمت اک انبار میں
کھینچتی جاتی خاک میداں ایک ہی رفتار میں
ہلتے جاتے نقش سے کچھ پھیلتی دیوار پر
بجھ کے گرتے حرف سے حد سفر آثار پر
ہر طرف خوشبو ہوا میں، بن میں، قرب آب کی
ایک پر اسرار خواہش دل میں مرگ آب کی

منیر نیازی

شمارہ ۳۹،
جون ۱۹۷۰

چمن میں رنگ بہار اترا تو میں نے دیکھا
نظر سے دل کا غبار اترا تو میں نے دیکھا

میں نیم شب آسماں کی وسعت کو دیکھتا تھا
زمیں پہ وہ حسن زار اترا تو میں نے دیکھا

گلی سے باہر تمام منظر بدل گئے تھے
جو سایۂ کوے یار اترا تو میں نے دیکھا

خمار مے میں وہ چہرہ کچھ اور لگ رہا تھا
دم سحر جب خمار اترا تو میں نے دیکھا

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

شمارہ ۶۵،
اکتوبر ۱۹۷۱

امتحاں ہم نے دیئے اس دار فانی میں بہت
رنج کھینچے ہم نے اپنی لامکانی میں بہت

وہ نہیں اس سا تو ہے خواب بہار جاوداں
اصل کی خوشبو اڑی ہے اس کے ثانی میں بہت

رات دن کے آنے جانے میں یہ سونا جاگنا
فکر والوں کو پتے ہیں اس نشانی میں بہت

کوئلیں کوکیں بہت دیوار گلشن کی طرف
چاند دمکا حوض کے شفاف پانی میں بہت

اس کو کیا یادیں تھیں کیا اور کس جگہ پر رہ گئیں
تیز ہے دریاے دل اپنی روانی میں بہت

آج اس محفل میں تجھ کو بولتے دیکھا منیر
تو کہ جو مشہور تھا یوں بے زبانی میں بہت

منیر نیازی

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

کیسی کیسی بے ثمر یادوں کے ہالوں میں رہے
ہم بھی اتنی زندگی کیسے وبالوں میں رہے

اک نظر بندی کا عالم تھی نگر کی زندگی
قید میں رہتے تھے جب تک شہر والوں میں رہے

ہم اگر ہوتے تو ملتے تجھ سے بھی جان جہاں
خواب تھے ناپید دنیا کے ملالوں میں رہے

وہ چمکنا برق کا دشت و در و دیوار پر
سارے منظر ایک پل اس کے اجالوں میں رہے

کیا تھیں وہ باتیں جو کہنا چاہتے تھے وقت مرگ
آخری دم یار اپنے کن خیالوں میں رہے

دور تک مسکن تھے بن ان کی صداؤں کے منیر
دیر تک ان دیویوں کے غم شوالوں میں رہے

کوئی حد نہیں ہے کمال کی
کوئی حد نہیں ہے جمال کی

وہی قرب و دور کی منزلیں
وہی شام خواب و خیال کی

نہ مجھے ہی اس کا پتہ کوئی
نہ اسے خبر مرے حال کی

یہ جواب میری صدا کا ہے
کہ صدا ہے اس کے سوال کی

وہ قیامتیں جو گذر گئیں
تھیں امانتیں کئی سال کی

یہ نماز عصر کا وقت ہے
یہ گھڑی ہے دن کے زوال کی

ہے منیر صبح سفر نئی
گئی بات شب کے ملال کی

دو نظمیں

منیر نیازی

شمارہ ۸۴،
مئی ۱۹۷۳

آغاز زمستاں میں دوبارہ

غروب مہر کا منظر گھڑی ہوئی گذرا
بس ایک پل کو نیستاں اسی طرح لرزا

گیاہ سبز کی خوشبو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی

وہی جمال در و سقف و بام ہے میں ہوں
کنار رود سیہ فام شام ہے میں ہوں

شمارہ ۲۱۰
ستمبر ۱۹۹۷

کل رات میرے خواب میں دو مکان تھے

ایک بہت بڑا گھر تھا
جس کا نام وقت تھا
ایک اور گھر تھا جو بڑے گھر سے چھوٹا تھا
نام اس کا بھی وقت تھا
ہم دونوں ان دونوں گھروں کی طرف جارہے تھے
ہنستے کھیلتے
میرے ساتھ، ایک دبلی سی شوخ و شنگ لڑکی تھی
جو عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی
مگر جب وہ میری طرف دیکھتی تھی تو وہ مجھے
میری عمر سے بڑی لگتی تھی
پھر بھی ہم دونوں نوخیز ہم عمروں کی طرح
ہنستے کھیلتے جارہے تھے
بڑے گھر کی طرف یا چھوٹے گھر کی طرف

میں بوند بوند زہر پیتا ہوں

موہن لال

شمارہ ۱۰۰
اگست، ستمبر ۱۹۷۶

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
(غالب)

باب ایک

میرے ساتھ سانحہ ہو گیا۔ زندگی میں جب کسی کے ساتھ کوئی چھوٹا موٹا حادثہ ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی اس کا درد بانٹنے اور غم میں شریک ہونے کے لئے آ جاتا ہے۔ گو میری عادت اپنے زخم دکھانے اور درد کہنے کی نہیں ہے، گوشت پوست کا ہوں۔ عام آدمیوں میں رہتا ہوں۔ عام آدمی ہوں۔ اس لئے یہ خواہش سر ابھارنے لگتی ہے کہ میرے درد اور غم میں کوئی شریک ہو... آج بھی ایسی خواہش ہو رہی ہے کہ سانحہ سے ہوئے گھاؤ درد اور غم میں میرا کوئی ساجھی دار بنے۔ مجھے یہ اچھی طرح احساس ہے کہ یہ خواہش بے معنی اور بے کار ہے کیوں کہ کہانی واپس آنے پر ہوئے سانحہ کا گھاؤ، درد اور زخم مجھے اکیلے برداشت کرنا پڑے گا۔

کہانی یا کسی تخلیق کا واپس آنا ادیب کے لئے سانحہ ہوتا ہے۔ اس درد کو تو وہ ہی محسوس کر سکتا ہے جس نے شعور کی کوکھ میں کہانی کی مہینوں پرورش کی ہوتی ہے۔ (چند لمحوں کا کوئی احساس مہینوں کی اذیت سے زیادہ ہوتا ہے اور کئی بار کوئی ایک کہانی شعور کی تہوں سے مہینوں خوراک حاصل کرتی ہے تب جا کر کہیں اس کی شکل و صورت بنتی ہے۔) اور تحریر کرتے ہوئے دردزہ کی پیڑا سہن کرنی ہوتی ہے۔ ایسا اس لئے کہہ رہا ہوں کیوں کہ کہیں سے پڑھا ہوا یہ قول میرے شعور میں تیر رہا تھا۔ وگرنہ میں تو سمجھتا ہوں لکھنا (تخیل زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کو قلم بند کرنا) اپنے شعور میں اٹکی ہوئی پھانس کو باہر نکالنا ہے۔ اس پھانس کو باہر نکالتے ہوئے بسا اوقات تو دردزہ سے بھی زیادہ اذیت اور کوفت ہوتی ہے تو کئی بار گلیوں کی زرم راہ مستقیم پر چلنے جیسا راحت بخش محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کہانی کا واپس آنا تو ایک سانحہ عظیم ہوتا ہے۔

دیو اور میں جلدی جلدی کھانا کھا رہے ہیں۔ ہمیں بہت جلد سنیما پہنچنا ہے۔ شو شروع ہونے میں صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ گھر سے سنیما تک راستہ بھی دس بارہ منٹ کا ہے۔ ٹکٹوں اور اچھی سیٹوں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ پہلے بھی پہنچنا ضروری ہے۔ غیر ارادی طور پر ہماری نگاہیں کلائیوں میں بندھی گھڑیوں کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ تیزی سے نوالے نگلتے ہوئے ہم سوچتے ہیں اب انیس منٹ رہ گئے ہیں، اب اٹھارہ۔

چٹھی رساں کی آواز سن کر توڑے ہوئے نوالے کو منہ میں ڈالتے ہوئے اٹھتا ہوں، صحن کی طرف سے ہوتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف آتا ہوں۔ چٹھی رساں جا چکا ہوتا ہے۔ چھوٹی بہن گیتا نے دہلیز کے پاس پڑے دو خطوط اٹھائے ہیں۔ ایک تو ان لینڈ ہے جو کہ دہلی سے موہی نے ارسال کیا ہے۔ دوسرا بھاری بھرکم لفافہ گیتا میری طرف بڑھاتی ہے۔ لفافے پر اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہوا اپنا پتہ دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ کسی نے مجھے بلاوجہ گھپ اندھیرے غار میں ڈھکیل دیا ہے۔

میری کہانیاں اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی تھیں۔ اخبار والوں کی طرف سے نہ تو کہانی کی کوئی رسید ملتی ہے نہ ہی چھپنے کی کوئی اطلاع۔ ٹکٹ لگا اور اپنا پتہ لکھا لفافہ ساتھ ارسال کرنے کے باوجود یہ لوگ مطلع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کیوں کہ ان کی دلچسپی کہانیوں (ادب) سے نہیں ہوتی بلکہ اشتہار فراہم کرنے، خبروں کو اکٹھا کرنے اور ان کی کاٹ چھانٹ کرنے میں ہوتی ہے۔ دفتر میں آئی ہوئی کہانی کو تو یہ لوگ لاوارث لاش سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں اگر یہ لاش زیادہ دن پڑی رہی تو اس کی سڑاند سارے دفتر میں پھیل جائے گی۔ اس لاش کو ٹھکانے لگاتے ہوئے، کالموں کو مد نظر رکھتے ہوئے، کسی لاش (کہانی) کے ہاتھ پاؤں کاٹ لیتے ہیں تو کبھی دھڑ غائب کر دیتے ہیں تو کبھی سر اڑا دیتے ہیں۔

ماہناموں کی طرف کہانیاں بھیجنے کا رخ کیا۔ ماہنامہ میں پہلی کہانی منتخب ہونے پر تسلی ہوئی تھی کہ کہانی ڈھنگ سے چھپے گی۔ پرچہ آیا تو کتابت اور طباعت دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ بلا قصور کسی جرم میں دھر کر منہ کالا کر کے شہر کے بازاروں کا چکر لگوایا گیا ہو۔ کئی بار سوچا کہ لکھنے میں کیا رکھا ہے نہ لکھنے کا کئی بار قصد کیا ہے لیکن لکھنے کی یہ کافر عادت چھٹتی نہیں۔

نئی کہانیاں لکھنے اور مقبول اور معتدر جریدوں میں چھپنے کے شوق نے اس ماہنامہ کو پہلی بار بھجوا دی۔ کہانی کے ہمراہ ٹکٹ لگا اور اپنا پتہ تحریر کیا ہوا لفافہ بھی ارسال کیا تھا۔ اب وہی لفافہ میرے ہاتھ میں ہے۔

لفافہ چاک کرتے ہوئے جام تسلی سے اپنا دل بہلانے لگتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ مدیر صاحب نے کہانی کی رسید ارسال کرتے ہوئے اپنے ادارے کے کتب کی فہرست ارسال کر دی ہو... اپنی ارسال کردہ کہانی کے ساتھ منسلک معذرت نامہ دیکھ کر جام تسلی ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر چور چور ہو جاتا ہے۔ اس کی کرچیاں میرے شعور میں بکھر جاتی ہیں جس سے درد و کرب کے سائے ابھرتے ہیں۔

حادثوں سے دوچار ہونا زندگی کے ہر دن کا معمول بن گیا ہے۔ اگر ان

حادثات کے نشانات چہرے پر لئے پھرتا تو گھاوؤں سے چہرہ اتنا مکروہ ہو جاتا کہ ڈر کے مارے لوگ مجھ سے دور بھاگتے پھرتے۔ زندہ رہنے کے لئے نئے اور پرانے گھاوؤں پر طرح طرح کی مرہم اور پٹیاں لگانی پڑتی ہیں۔

کاغذوں کو لفافے میں سرکا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں... مسکراہٹ ہی ایک ایسی واحد دوا ہے، جس سے نہ صرف اپنے زخموں کو چھپایا جاسکتا ہے بلکہ یہ مکر و فریب کو چھپانے کے لئے بھی اتنی ہی کارگر ثابت ہوتی ہے۔

لفافہ کو الماری میں رکھ کر مسکراتے ہوئے دیو کے سامنے آبیٹھتا ہوں۔ دیو مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا۔ پتہ نہیں یہ مسکراہٹ (واحد دوا) کا اثر تھا یا اس کی عنایت، ورنہ ایسے دوستوں کی کمی نہیں جو اپنے ہمدردی کے ناخنوں سے کرید کرید کر اچھے بھلے کو بھی لہولہان کر دیتے ہیں۔

چند ماہ پہلے پکچر دیکھنے کا جو شوق تھا، اب مجھ میں نہیں ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش سر ابھارنے لگتی ہے کہ کسی طرح پکچر دیکھنے کا پروگرام ملتوی ہو جائے اور سوچنے لگتا ہوں کہ کون سا بہانہ بنایا جائے جس میں دیو کو صداقت اور سچائی معلوم ہو، اور میں فلم دیکھنے نہ جاؤں بلکہ یہی وقت کہانی کے واپس آنے کی وجوہ تلاش کرنے میں صرف کروں ... لیکن میں ایسا کمزور آدمی ہوں کہ چاہنے کے باوجود بھی بہت کم جھوٹ بول پاتا ہوں۔

دیو کے ساتھ کمرے سے باہر نکلنے لگتا ہوں تو میری نظر شیو کی اس تصویر پر پڑتی ہے، جس میں شیو کے گلے میں لٹکا سانپ زہریلے پھنکاریں مار رہا ہوتا ہے۔ تمام راستہ یہ تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر دیو میرے ساتھ نہ ہوتا، اس سے سنیما ہال میں پہنچنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا ہرگز نہ جاتا۔

دیو امرتسر کا رہنے والا ہے۔ وہاں دفتر میں جھگڑا کر لیا تھا۔ جس سے تبدیل ہو کر یہاں آگیا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں۔ وقت گذارنے کے لئے تاش، کیرم اور پکچر ذرائع ہیں۔

سنیچر وار کو دفتر بعد دوپہر بند رہتا ہے۔ اس دوپہر کو میٹنی شو دیکھنا اس کا معمول ہے، اکیلا نہیں جاتا۔ ایک یا دو کا ساتھ پسند کرتا ہے۔ دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس نے آکر مجھے ساتھ دینے کو کہا۔ پہلے تو میں نے انکار کر دیا۔ "تم تو جانتے ہو فلموں کا مجھے شوق نہیں ہے۔" لیکن جب اس نے کہا کہ غزل جو تم اکثر گنگناتے رہتے ہو، اسی فلم میں ہے، تو میں تیار ہو گیا۔

اتفاق سے جیب میں پیسے تھے۔ اس لئے ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔ پیسے نہ ہوتے تو کسی فرسودہ بہانے کا سہارا لینا پڑتا۔ ہفتہ پندرہ دن دفتر کے بابو لوگ بیئر کاک ٹیل کا پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ زبردست خواہش رکھنے کے باوجود جیب خالی ہونے کی وجہ سے اکثر مجھے پیٹ خراب ہونے کا بہانہ لگانا پڑتا ہے۔ کئی بار تو پکڑا جاتا ہوں۔ کوئی میرا حصہ ڈالنے کو تیار ہو جاتا ہے کہ تنخواہ پر یا اگلی بار تم میرا حصہ ڈال دینا... دیو نے غزل کے دو تین شعر بھی گا کر سنائے تھے۔ اب مجھے اس کا مصرع تک یاد نہیں آرہا ہے۔ شاید کوئی کہانی واپس آنے کے غم میں میری قوت یادداشت سلب ہوتی جارہی ہے۔

دفتر بند ہونے سے پندرہ منٹ قبل دیو نے میرے پاس آکر کہا تھا۔ "میں ہوٹل میں کھانا کھانے جارہا ہوں۔ تم گھر سے کھانا کھا کر سیدھے سنیما ہال پہنچ جانا۔"

"ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے تو وقت پر نہیں پہنچ سکو گے۔" میں نے کہا۔ "گھر چلتے ہیں۔ کھانا تیار پڑا ہوگا۔ وہاں سے سیدھے فلم دیکھنے چلے چلیں گے۔"

فلم دیکھتے ہوئے بھی میں فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ بار بار میں اپنے کو الماری کے سامنے کھڑا محسوس کرتا یا شیو کے گلے کا سانپ میرے گلے میں لٹک کر پھنکارہ مارنے لگتا۔

وقفہ ہوا تو میرا سر درد کر رہا تھا۔ گھر جانے کے لئے دیو سے اجازت چاہی تو بولا۔ "تمھاری پسندیدہ غزل تو ابھی آئی ہے۔" اور وہ میرے لئے چائے کے ساتھ اسپرین لے آیا۔

مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ میری پسندیدہ غزل جس کے لئے میں فلم دیکھنے کے لئے آمادہ ہوا تھا، کب گذر گئی ہے۔ میری ذہنی کیفیت پہلے جیسی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واپس آئی ہوئی کہانی کا جائزہ لینے کے لئے میری بے تابی ہر لمحہ بڑھ رہی ہے۔

شو ختم ہونے کے بعد دیو کا ارادہ تو ریستوران میں چل کر اسپریسو کافی پینے کا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں۔ "مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔"

وہ بھانپ جاتا ہے۔ "تم تو تین گھنٹوں سے اپنے ساتھ زبردستی کر رہے ہو۔ کوئی کام تھا تو صاف بتلا دیتے۔"

مجھے یہ لاعلاج بیماری ہے کہ ارادہ یا خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی خواہشات کا پاس کرنے لگتا ہوں۔ جب اپنی ضروریات کا احساس ہوتا ہے تو سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو جاتا ہوں۔ سچ یا جھوٹ کو پکڑنے کے لئے باولا سا ہو جاتا ہوں، سچ یا جھوٹ میں سے کوئی میرے ہاتھ نہیں لگتا۔ حادثے کا شکار ہو کر ایسا گرتا ہوں کہ چوٹوں اور زخموں کی پیڑا اور لہو چھپانے کے لئے مرہم اور پٹیوں کی فکر ہونے لگتی ہے۔

باب دو

گلی میں گولیاں کھیلتے ہوئے بچوں کے پاس آشو کو مٹی میں سنا کھڑا دیکھ کر دل میں آتا ہے کہ اس کے بدن اور کپڑوں سے مٹی جھاڑوں، بال سہلاؤں، گود میں اٹھا کر پیار لاڈ سے سمجھاؤں اپنے بچے اس طرح گندے نہیں رہا کرتے اور معمول کی طرح پوچھوں۔ آج میڈم (استانی) نے اسکول میں کیا پڑھایا؟ کیا لکھایا ہے؟ کتنے گڈ لئے ہیں؟ اسے بازار لے جاؤں اس کی حسب منشا کوئی کھلونا، مٹھائی یا پھل دلا دوں۔

ایسے خیالات، جذباتی ہونے کی وجہ سے پھوٹ رہے ہیں۔ روزانہ بچے کو کھلونے دلوانا میری توفیق سے باہر ہے۔ میں نے آشو کو داخل تو ماڈل اسکول میں کروا دیا ہے لیکن اخراجات کا بار مجھ سے نہیں اٹھایا جاتا۔ پھر بھی اس ضد پر قائم رہنا

چاہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ لیکن ماڈل سکول میں پڑھنے والے بچوں کی طرح اس کی بھی فرمائشیں کچھ زیادہ ہوتی ہیں۔ آدھی چھٹی کے لئے اس کو ڈبے میں پراٹھا اور ساتھ کوئی سبزی یا اچار کی کوئی ایک آدھ پھانک ڈال دیتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی اس کو کوئی پھل دے پاتے ہیں۔ ہر روز یہ آکر سناتا ہے کہ فلاں فلاں بچے نے کیا چیزیں کھائیں... اور بچوں کے نوکر آدھی چھٹی میں ان کے لئے فروٹ، دودھ اور دوسری چیزیں لاتے ہیں۔ کئی بار کہتا ہے۔ "ڈیڈی! کار نہیں تو اسکوٹر ہی لے لو۔ اسکوٹر پر مجھے سکول چھوڑ جایا کرنا اور چھٹی کے بعد آیا ہی کرنا۔"

میں اس کو کیسے سمجھاؤں کہ تمہارے ڈیڈی کی توفیق تو سائیکل خریدنے کی بھی نہیں ہے۔ تقریباً چار مہینے ہوئے دفتر کے اسٹینڈ سے سائیکل چوری ہو گیا تھا۔ اس کے بعد نیا یا پرانا سائیکل نہیں خرید سکا ہوں۔ گھر سے دفتر جاتے ہوئے کوئی سائیکل سوار کولیگ مل جاتا ہے۔ موڈ ہونے پر لفٹ دے دے تو غنیمت نہیں تو ڈیڑھ میل صبح اور ڈیڑھ میل شام جوتوں کے تلوے گھسنے پڑتے ہیں۔ کئی دن تو یہ سلسلہ رہا کہ دیو اپنا سائیکل لے آتا۔ مجھے اس کے عوض میں گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک اس کے بوجھ کو کھینچنا پڑتا۔ اس بوجھ کو ڈھونے کی نسبت مجھے پیدل چلنا زیادہ اچھا لگا۔ کئی بار مجھے لگا کہ آشو احساس کمتری کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ برابر کی حیثیت والوں کے بچوں کے ساتھ اس کو سرکاری پرائمری اسکول میں داخل کروا دوں۔ کرسیوں کی بجائے ٹاٹوں پر بیٹھے گا اور اپنے ارد گرد میلے کچیلے بچوں کو دیکھے گا تو اس کے نازک دل پر کوئی صدمہ اپنے نقوش چھوڑ سکتا ہے۔ ایسے خیالات آنے پر ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ پتہ نہیں مستقبل میں اس کی تعلیم ماڈل یا دوسرے اسکول میں جاری رکھ بھی سکوں گا یا نہیں؟

کچھ وقت برباد ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر آشو کی نظر سے بچ کر میں گھر میں داخل ہونے لگتا ہوں۔ پیچھے سے دوڑتا ہوا آشو آکر میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔

"ڈیڈی! ڈیڈی!"

"کیا بات ہے بیٹے!" میں اپنا لہجہ نرم بنائے رکھتا ہوں۔

"مجھے پیسے دو!"

جلدی سے پچیس پیسے کا سکہ جیب سے نکال کر کہتا ہوں۔

"جاؤ۔ ٹافیاں لے لو۔"

"ٹافیاں نہیں۔ میں بنٹے (کنچے) لوں گا۔" کہتا ہوا، آشو گلی کی نکڑ میں مقیم دکان کی طرف دوڑ جاتا ہے۔

جلدی اور سستے میں چھٹکارا ہو گیا ہے۔ بازار جانے کے لئے مچلنے لگتا ہے تو...؟ کہیں واپس نہ آ جائے؟ اس وہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

الماری سے لفافہ نکالتے ہوئے، افسردہ اور مضمحل ہو جاتا ہوں اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کو سوفے پر لڑھکا دیتا ہوں۔ لفافہ سے کاغذات نکالتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ کوئی چیز میرے دل سے اڑی اڑی جا رہی ہے۔ کچھ دیر احساس کی یہ اذیت برداشت کرتے رہنے کے بعد اپنے من کو سمجھانے لگتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، کہانی میں کوئی کمزوری نہ ہو، کسی اور وجہ سے شائع نہ کی ہو۔ چھپے ہوئے معذرت نامے کو الٹ پلٹ کر تین چار دفعہ دیکھتا ہوں، چھپے ہوئے تین الفاظ 'معذرت کے ساتھ' کے علاوہ، ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ اس معذرت نامے کی بجائے ایک دو جملوں میں کہانی نہ چھپنے کی وجہ بتلائی ہوتی تو کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا... اب تو کہانی نہ چھپنے کی وجہ تلاش کرنا صحرا کا منتھن کرنا ہے، جس میں نہ تو امرت نکل سکتا ہے نہ پانی۔

ریت کا منتھن کرنے سے ریت کے ذرے ہاتھوں میں آئیں گے جو ایک ایک گرتے گرتے پھر ریت میں شامل ہو جائیں گے پھر بھی میں دوبارہ کہانی کو پڑھتا ہوں۔ نہ چھپنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی واپس آئی ہوئی کہانی کو دیکھتا ہوں، کبھی ساتھ آئے معذرت نامے کو... مجھے لگتا ہے...

پرومیتھیوس کو آگ چرانے کے جرم میں دیوتاؤں نے سزا دی تھی۔ اب کے دیوتا مجھے کہانی لکھنے کے جرم میں وہی سزا دے رہے ہیں۔

دو سگریٹ اور ایک کپ چائے پینے کے بعد بھی مضمحل اور بوجھل رہتا ہوں۔ لفافے کو الماری میں رکھ کر گھومنے کے لئے باہر نکل آتا ہوں۔

کوآپریٹو سٹور کے سامنے بناسپتی لینے والوں کی لمبی قطار سڑک بلاک کئے ہوئے ہے۔ گھروں میں شام کا کھانا پکانے کے لئے چولہے گرم کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ ان میں سے کتنوں کے گھر بناسپتی کا انتظام رہا ہوگا... اس پار جانے لگتا ہوں تو دو آدمی تھیلے اور راشن کارڈ ہوا میں لہراتے ہیں۔

"پیچھے لائن میں لگو!"

"پیچھے! پیچھے!!" کی آوازوں کے ساتھ لاتعداد راشن کارڈ، تھیلے اور ہاتھ ہوا میں لہرانے لگتے ہیں۔

"مجھے ادھر جانا ہے۔" دونوں ہاتھوں سے راستہ بنا کر بھیڑ بھری قطار پار کر جاتا ہوں۔ کچھ قدم ہی بڑھتا ہوں کہ پیچھے سے شور اٹھتا سنائی دیتا ہے۔

مڑ کر دیکھتا ہوں.. کیو ٹوٹ گئی ہوتی ہے۔

"ہمیں بناسپتی چاہئے!"

"اپنی جان پہچان والوں کو دے دیا۔"

"ہمیں کیوں نہیں دیتے؟"

"بناسپتی ختم نہیں ہوا۔ بلیک کرنے کے لئے اندر چھپا لیا ہے۔"

سگریٹ سلگا کر میں آگے کی طرف بڑھتا ہوں۔

شور اور بھیڑ کم ہوتی جا رہی ہے۔

آج کتنے گوتم اور کبیر داس اور دیوداسیاں بناسپتی کے بغیر لوٹی ہوں گی۔ صبح جلدی کیو میں لگنے کی فکر میں رات دیر تک نہیں سو سکے گی... سیما چار پانچ دن سے کہہ رہی ہے۔ بناسپتی آج شام کو ختم ہو جائے گا۔ انتظام کر لو۔ نہیں تو سوکھی روٹیاں کھانا پڑیں گی۔ کیو میں لگنے کا وقت نہیں۔ بلیک میں خریدنا نہیں چاہتا۔ کسی کو کہنا بس کی بات نہیں۔

پارک کے سامنے چائے کی دکان کے پاس سے گذرنے لگتا ہوں۔

ڈاکٹر کمار کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ مجھے بلا رہا ہوتا ہے۔ میں 'ڈش' کر کے نکل جانا چاہتا ہوں لیکن وہ اٹھ کر میری طرف بڑھتا ہے، شانے اور بازو پکڑ کر مجھے اندر لے جانے لگتا ہے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر میں اتنا نحیف اور ناتواں ہو گیا ہوں کہ مزاحمت کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں چابی کا کھلونا ہوں۔ ڈاکٹر کمار جدھر چابی گھماتا ہے ادھر میں گھومتا جاتا ہوں... مجھے کرسی پر بٹھانے اور سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہتا ہے۔

"مجھ سے دور دور کیوں رہتے ہو؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات تو ضرور ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! سچ بات تو یہ ہے کہ تم سراپا سیاست کی دلدل میں لت پت ہو چکے ہو۔"

"تم سیاست کو دلدل کیوں کہتے ہو؟"

"تم سیاست کو گنگا سے بھی پوتر سمجھ سکتے ہو۔ تمہارے اپنے خیالات ہیں لیکن میں اس کے چھینٹوں سے بچا رہنا چاہتا ہوں۔"

"سیاست کے علاوہ اور بھی تو بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔"

"ہو سکتی ہیں۔ لیکن تم ہر بات میں سیاست کو گھسیٹنے کی اپنی عادت سے مجبور ہو۔" جیب سے پیکٹ نکال ایک سگریٹ ڈاکٹر کمار کو پیش کرتا ہوں۔ دوسرا میں منہ میں لگا لیتا ہوں۔

باری باری دونوں سگریٹ سلگانے کے بعد، دیا سلائی کو ہاتھ کے جھٹکے سے بجھاتے ہوئے کہتا ہوں۔ "آج بہت اکھڑے اکھڑے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"ہمارے پاؤں جمے ہی کب تھے؟"

چھوکرا دو گلاس چائے رکھ کر چلا جاتا ہے۔ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے میں جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگتا ہوں۔ میری طرف ڈاکٹر دیکھتے ہوئے چائے کی چسکیاں لینے لگتا ہے۔ "خودکشی کی کہانیاں اب بھی لکھتے ہو؟"

"کرپٹ ذہنیت کے سیاست داں خود کو اس دھرتی کے دیوتا خیال کریں تو ہر ایماندار آدمی خودکشی کی سوچے گا یا ان دیوتاؤں پر پستول اٹھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔"

کمار کا بلند قہقہہ اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی کی طرح یہ قہقہہ بھی مصنوعی اور کھوکھلا ہوتا ہے۔

میں چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی گلاس میز پر رکھ دیتا ہوں۔

دوکاندار پاس آ کر کہتا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب! ان صاحب کو ہنستے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے!"

"میں اندر سے کھوکھلا نہیں ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج میں بہت اکھڑا اکھڑا ہوں اور اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر پھر ویسا ہی قہقہہ لگاتا ہے۔

صبر اور تحمل نے میرا دامن شاید چھوڑ دیا ہے۔" اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کے لئے قہقہوں کے علاوہ آدمی کے پاس ہے ہی کیا۔"

"نکسلائیٹ کب سے ہو گئے ہو؟"

"آ گئے نا اپنی اصلیت پر!" میں سگریٹ کو میز کے کونے پر مسلتے ہوئے کہتا ہوں۔ "ڈاکٹر! مجھے افسوس ہے کہ تم سیاست داں نہیں، لچوں میں شامل ہوتے جا رہے ہو۔ جب تم جیسے اپنے کو سیاست داں، مدبر، دانشور سمجھنے والے، سچی بات برداشت نہیں کر سکتے تو دبانے کے لئے نکسلائیٹ، سی۔ آئی۔ اے۔ یا کے۔ جی۔ بی۔ کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔"

"میرا... میرا مطلب..." وہ سگریٹ کو چائے کے گلاس میں پھینک دیتا ہے۔ گلاس کے تلے میں بچی ہوئی چائے کا لمس پا کر سگریٹ کا ٹکڑا سوں سوں کر کے بجھنے لگتا ہے۔

"تمہارا مطلب چاہے کچھ بھی ہو، تم لفظوں کے معانی اپنی مرضی سے ڈھالتے ہو، تمہاری وجہ سے کوئی شریف آدمی جیل کی ہوا کھا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر کچھ کہنے کے لئے لب کھولتا ہے۔ لیکن میرا لہجہ تیز ہو جاتا ہے۔ "اب تم دو اور دو پانچ کہو گے۔ ڈاکٹر اتنا بتلا دوں، پستول اور بندوق کا ذکر کرنے سے کوئی نکسلائیٹ نہیں بن جاتا، نہ ہی میں نکسلائیٹ ہوں۔ کسی پر پستول اٹھانے کی نسبت اپنی کنپٹی میں گولی داغنا پسند کروں گا۔"

"تم ہمیشہ خودکشی کی باتیں کرتے ہو۔ یاسیت کا تم پر غلبہ ہے۔ تم آرم میٹکم[1] لیا کرو۔"

"میں تو آرم میٹکم لے لیا کروں گا۔ تم خود اور اپنے دھرتی کے دیوتاؤں کو کیوپرم[2] دیا کرو۔"

"مجھے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں جانا ہے۔ جلدی ہے۔ اس پر کل بحث کریں گے۔"

"بحث کے علاوہ اور بھی کام ہے۔"

"لاؤ ایک سگریٹ تو سلگاؤ۔"

دونوں ایک ایک سگریٹ سلگاتے ہیں۔

"کبھی کبھی ملتے رہا کرو۔"

ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔

ٹی اسٹال سے نکل کر ہم الگ ہونے سے پہلے مصافحہ کرتے ہیں۔ میں بالکل سرد اور بیزار رہتا ہوں۔ جاتے ہوئے۔ "ایک سگریٹ تو دیتے جاؤ۔"

سگریٹ لے کر وہ مغرب کی جانب جانے لگتا ہے۔ میں خالی پیکٹ پھینک دیتا ہوں۔ میں نیا سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لئے رک جاتا ہوں۔ ڈاکٹر کمار

---

[1] ہومیو پیتھک دوا۔ اس کے مریض پر اداسی یاسیت اور خودکشی کرنے کے خیالات کا غلبہ رہتا ہے۔

[2] ہومیو پیتھک دوا۔ اس کے مریض میں دماغی علامات ملتی ہیں۔ مریض بے سر پاؤں کی باتیں کرتا ہے۔ حافظہ بالکل نہیں رہتا۔

اور میری مختلف راہیں ہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی موڑ پر ہماری ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ سگریٹ کا پیکٹ لے کر میں دیکھتا ہوں، کار تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اپنے چور چور جسم کو لئے مشرق کی طرف رینگنے لگتا ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر کمار مشرق کی جانب بڑھ رہا ہے، میں مغرب کی جانب جا رہا ہوں۔

خودکشی کا خیال آج میری زبان پر آیا تھا، کہانی واپس آنے کی وجہ سے۔ اس سے پہلے بارہا یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا ہے۔ مہینوں خودکشی کرنے کے طریقوں پر غور کیا ہے۔ اور کئی دفعہ تو ایسا وجدان ہونے لگتا ہے کہ میرا حشر خودکشی ہی ہوگا۔ اور میرے خشک ہونٹوں پر بے ترتیب لفظوں کی پپڑیاں جمنے لگتی ہیں۔

میں...ایسا پھول ہوں۔
جو
مرجھا کر بھی
ڈال سے الگ نہ ہو سکا
اور نہ جانے کس ضد میں
میں کانٹوں کی چبھن سے
اپنا ہی سینہ
چھلنی چھلنی کرتا رہا۔

باب تین

پارک اسکول، ویران سڑک سے گھومتا ہوا مرگھٹ میں پہنچ جاتا ہوں۔ یہاں بہت آیا ہوں۔ مرگھٹ کا نام سنتے ہی اداسی مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ گو یہاں خاموشی کا بسیرا ہے لیکن کسی کے آخر فنا کے وقت رشتہ داروں، عزیزوں کے رونے کی آوازیں خاموشی کے حصاروں کو توڑ کر مسلط ہو جاتی ہیں۔ مجھ سے اس وقت نہیں رویا جاتا... مجھ سے نہیں رویا گیا تھا۔ ماں جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ اس کی سرد پیلی نعش کو ہم بھائیوں اور قریبی حلقے کے احباب نے لکڑیوں پر چن کر نذر آتش کیا تھا۔ بزرگوں نے جلتی ہوئی نعش کی کھوپڑی میں لکڑی مارنے کی ہدایت دی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے ایک نیم جلا چہرہ یاد آیا تھا۔ آنسو میری گالوں پر لڑھک آئے تھے.... رشتہ داروں اور دوسروں نے سمجھا مجھے ماں کی موت کا غم نہیں۔ اپنا غم کسے اور کس طرح دکھاتا؟... ماں مارتی تھی تو دلارتی بھی تھی۔ ماتم پرسی کرنے آئی ہوئی عورتوں میں سرگوشیاں بھی ہوئی تھیں.... اس وقت بھاگ جانا چاہتا تھا۔ گوتم بن کر نروان کی تلاش کے لئے... نروان گیان سے نہیں دوا سے ہوگا۔ کوئی دوا ایجاد کرنی ہوگی، جس کی ایک چٹکی دو ایک نروان کے لئے کافی ہو۔ نروان۔ ناچتی کہانی کی تلاش کی آرزو موجزن ہونے لگتی ہے... نیلو کی نیم جلی جھلسی نعش... میں تمام عمر جھلستا اور جلتا رہوں گا...

میں چاہتا ہوں کہ موت کے بعد جلایا نہ جاؤں بلکہ میری لاش کو کوؤں چیلوں کے حوالے کیا جائے۔ میرے گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کو وہ نوچ نوچ کر کھائیں۔ وہ بات جو تا عمر کسی سے نہیں کہہ سکوں گا، میری نعش کہے گی۔ زندہ لاش کو آدمیوں نے نوچ نوچ کر کھایا اور مردہ کو کوؤں اور چیلوں نے۔

نروان، ناچتی اور کہانی کی تلاش میں بھاگتے بھاگتے کسی دن کسی چوراہے پر میرا دم ٹوٹ جائے گا۔ میں ڈھیر ہو جاؤں گا... کہانی لکھنے کی آرزو میں مدوجزر ہونے لگا ہے۔ آشو رو رہا ہوگا۔ سیما انتظار کر رہی ہوگی؟ (سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے) اپنے آپ میں کھویا ہوا ویران سڑک، سکول اور پارک کے پاس سے ہوتا ہوا، اپنے چور چور جسم کو لئے گھر پہنچتا ہوں۔

"اتنی دیر کہاں کر دی؟" سیما ایسا پوچھنے کا اپنا حق سمجھتی ہے۔

"آشو روتے روتے سو گیا ہے۔" دوسرے کمرے سے پتا جی کی آواز آتی ہے۔

"مرگھٹ میں۔" میں سیما کو جواب دیتا ہوں۔

"کیوں؟ کسی کی میت کے ساتھ گئے تھے؟"

"نہیں، خاموشی ناپنے۔"

"ہاتھ منہ دھولو۔ میں کھانا لاتی ہوں۔"

بھوک صرف پیٹ کی ہی نہیں ہوتی۔ ذہن اور شعور کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیما ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔ ہماری سوچ میں بلندیوں اور پستیوں کا فاصلہ ہے۔ یہ پتہ نہیں کون بلندی پر ہے کون پستی میں۔ پھر بھی ہم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں... ہمیں اپنی اپنی جگہ سے پیار ہے۔

"کھانا نہیں کھانا۔ ہو سکے تو ایک کپ چائے بنا دو۔"

"کچھ پڑھنا لکھنا ہے کیا؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کرو۔"

"کیوں؟ کیا ہوا ہے میری صحت کو، چائے نہیں بنانی تو نہ بناؤ، بازار سے پی آؤں گا۔"

"چائے بھی بنا دوں گی۔ پہلے کھانا تو کھا لو..."

"ایک بار کہہ دیا نا کہ کھانا نہیں کھانا۔" میرا لہجہ درشت ہو جاتا ہے۔

"اپنی کرو گے۔ میری کبھی کوئی مانی ہے جو آج مانو گے!" وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔

اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہے۔ میں نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا ہے؟ گرداب میں ڈوبتا اور ابھرتا ہوں۔ اب نہیں، کئی بار ایسے خیالات آئے ہیں۔ میں اس کا عام آدمیوں کی نسبت زیادہ خیال رکھتا ہوں اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے، اس کی جوان امنگوں کا بہت کم پاس کیا ہے۔ ایک ہی کمرے کی چھت کے نیچے، ایک ہی پلنگ پر ہونے کے باوجود بسا اوقات کہانی کی تلاش میں میں صحراؤں کا منتھن کرتا رہتا ہوں۔ وہ اداس مسکراہٹ لئے نیند میں کسمساتی رہتی ہے۔

"آشو کو لے جاؤ!" پتا جی اپنے کمرے (کھولے) میں بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔

میں آشو کو لینے کے لئے پتا جی کے کمرے کی طرف جاتا ہوں۔ رسوئی

سے اسٹوو جلنے کی آواز آرہی ہے۔ نروان اور بناپتی سے زیادہ اہم میرے لئے کہانی لکھنا ہے۔ میں آشو کو اپنی گود میں اٹھاتا ہوں۔

"کمبل میں لپیٹ کرلے جاؤ۔" میں آشو کو کمبل میں لپیٹ لیتا ہوں۔

سورگ سے بھی سندر سپنے دکھانے والے نیتاؤں کی کہانی لکھوں گا۔

اب سیما نے ابلتے پانی میں چائے اور چینی ڈال دی ہوگی؟ آشو کو لٹا کر، اس پر لحاف ڈال دیتا ہوں، کمبل دینے کے لئے پتاجی کے کمرے میں جاتا ہوں۔ نئی اور پرانی نسل کے امتیاز کی کہانی... اب دودھ ڈال دیا ہوگا... اس کے بعد نروان اور بناپتی کے تلاش کی کہانی... اسٹوو کی آواز بند ہو چکی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آتا ہوں۔ تخیل کی آنکھوں سے سیما کو مگ میں چائے چھانتے دیکھ رہا ہوں۔

میں سیما سے چائے کا مگ لے کر ڈرائنگ روم میں آجاتا ہوں۔ الماری میں کتابوں کے علاوہ کاغذات اور ادھورے مسودوں اور خاکوں کی فائل ہے۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے الماری سے ادھورے مسودے اور خاکوں کی فائل نکالتا ہوں۔ اس فائل میں واپس آئی ہوئی کہانی والا لفافہ پڑا ہے۔ لفافہ الگ کرکے، چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ ایک بوسیدہ کاغذ پر پرانی تحریر پر نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔

شادی سے پہلے۔
لیلیٰ
ٹی ایٹ کارتھی
اب ایمبیسڈر ہوگئی ہے۔

یہ سطریں اس وقت کی ہیں جب کہ چہرے پر پوری مسیں بھیگی نہیں تھیں۔ اب ٹھوڑی میں آدھے کے قریب سفید بال اگ آئے ہیں۔ ان دس برسوں میں جسمانی اور ذہنی طور پر پچیس سال گذار چکا ہوں یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ اکثر اہم باتیں بھول جاتا ہوں۔ فضول باتیں ابھر ابھر کر ذہن کو چیرتی رہتی ہیں۔ ایک بار تو میری (یادداشت) وجہ سے ایک دوست کو دلی ٹھیس پہنچی تھی۔ اس کا سخت اور شکایت بھرا خط آیا تھا۔ دل و دماغ کے غبار کو ہلکا کرنے کے لئے ایک نظم پر طبع آزمائی کی تھی۔

ہاں دوست
تم ٹھیک کہتے ہو
میری یادداشت کمزور ہے
اکثر کچھ باتیں بھول جاتا ہوں
اس سے بھی زیادہ بھول جانا چاہتا ہوں
بیوی کو
بچوں کو
اور...

اگلی سطریں یاد نہیں آرہی ہیں۔ اوراق الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ نظم اسی فائل میں ہے یا کہیں اور رکھ کر بھول گیا۔ کاغذ نکل آتا ہے، نظم (دوبارہ) پڑھنے لگتا ہوں اور یہ سطریں گنگناتے ہوئے پڑھتا ہوں۔

اس سے بھی زیادہ
بھول جانا چاہتا ہوں
بیوی کو
بچوں کو
اور جانے پہچانے چہروں کو
تاکہ کچھ تمیز نہ کرسکوں
کون کیا ہے؟
کیا کیا ہے؟

کون؟ کیا؟ کب؟... انسان خود ہیں، خدا ہیں اور جہاں ہیں ہوجائے تو دھرتی سندر سپنوں سے بھی سندر ہوجائے۔ آدمی خود ہیں، خدا ہیں، جہاں میں کیوں کر ہوسکتا ہے؟

سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے سوچتا ہوں۔ یہ کہانی بن سکتی ہے۔ پر بنتی نظر نہیں آتی۔ اوراق الٹتے الٹتے انگلیاں ایک علامتی کہانی کے خاکے پر رک جاتی ہیں۔

اس گھر میں کوئی شہد کی مکھی چھتہ نہیں بناتی، کوئی مکڑی جال بننے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو چھپکلی نگل جاتی ہے۔ چھوٹے رینگتے کیڑے بھوک سے کلبلاتے ہوئے دم توڑ دیتے ہیں۔

یہ کہانی مکمل ہوسکتی ہے۔

بھٹکتے ہوئے لمحے ستانے کے لئے پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ کمرے میں چمگادڑ بھٹکنے لگتی ہے۔ روشنی ہونے کی وجہ سے بار بار دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ روشنی کی وجہ سے ہی اندھیرے میں جانے کے لئے راستہ نہیں ملتا۔ بجلی بجھا کر اندھیرا کرتا ہوں۔ اندھیرے میں چمگادڑ کو راستہ مل جاتا ہے۔ روشنی کرتا ہوں۔ کمرے میں چمگادڑ کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نہیں ہوتی۔

کاغذ پر الفاظ ایک ایک کر کے پکنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ بہاؤ جلد رک جاتا ہے۔ مناسب لفظ کی تلاش کرتے کرتے، ہندی کی کویتا کی کچھ سطریں میرے لبوں پر رینگنے لگتی ہیں:

شبد کا روگ جیسے لاش گوری کی اٹھائے
موک شنکر پربتوں پر
پاگلوں سا گھومتا ہے
درد کہنا چاہتا ہے
شبد اس کو مل نہ پائیں
اس طرح، کچھ اس طرح
نج بھاونا کی لاش
سینے سے لگائے
شبد کی تلاش میں ہم
پاگلوں سے گھومتے ہیں۔

(چندر کرما کے مجموعہ کلام "پاشان یگ" سے)

کمرے میں چمگادڑ پھر بھٹکتی ہوئی لگتی ہیں لیکن یہ میرا کورا احساس ہوتا ہے۔ لفافہ اٹھا کر واپس آئی ہوئی کہانی کا مطالعہ کرتا ہوں... سوچ کی تہیں کریدتا ہوں۔ کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ اس کو چھوڑ کر تازہ لکھی سطریں پڑھنے لگتا ہوں۔ ایک ایک لفظ سے لفظوں کا کارواں بن کر اپنے سفر میں کوچ کرتا رہتا ہے۔

پریشان ذہن سے نکلے ہوئے لفظوں کا قافلہ جلد تھک جاتا ہے۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ان کی باتیں قلم کے متعلق ہوتی ہیں۔ تیسرا اشو ختم ہو چکا ہے۔ کاغذ سمیٹ کر میں سونے کے کمرے میں آجاتا ہوں۔ بلب کی بیمار روشنی میں دیکھتا ہوں۔ سیما کے پیلے چہرے پر افسردگی ہے...

آدھی شب کے قریب گذر چکی ہے۔ دن چھوٹے راتیں بڑی ہیں۔ سیما دن گھر کے کاموں اور فکروں میں گذارتی ہے۔ رات ٹوٹے سپنے دیکھ کر۔ میں سیما کی چھاتی سے ہاتھ ہٹا کر لحاف ٹھیک کر کے، بلب آف کرتا ہوں اور آشو کے پاس آلیٹتا ہوں... اکثر میری راتیں سوچوں، خیالوں اور فکر میں الجھ جاتی ہیں۔

باب چار

خلاف معمول علی الصبح آنکھ کھل جاتی ہے۔ خیالوں کی مکڑی اپنا جال بننے لگتی ہے۔ تار بنتے ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ مکڑی تار ہلاتی، چاٹتی اور بناتی رہتی ہے۔

اٹھتا ہوں، ڈرائنگ روم میں آکر ٹیبل لیمپ کو جلا کر ادھورے مسودے کو اٹھاتا ہوں، سوئے ہوئے لفظوں کو بیدار کرتا ہوں، کارواں بڑھنے لگتا ہے۔ اسی نشست میں کہانی مکمل ہونے کی امید بندھ جاتی ہے۔ الفاظ سطر بہ سطر بڑھتے جاتے ہیں، بڑھتے جاتے...

دروازہ پر دستک سن کر کارواں رک جاتا ہے۔ ذہن سے ابھرے ہوئے الفاظ قلم کی نوک پر آنے کے لئے کسمسانے لگتے ہیں، کڑھتا ہوا دروازہ کھولتا ہوں۔

چار اصحاب جن سے معمولی جان پہچان ہے، ووٹروں کی فہرست لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ اپنی جھلاہٹ اور مسکراہٹ کا معطر غازہ چڑھا کر باری باری ان سے مصافحہ کرنے کے بعد ان کو کمرے میں آنے کے لئے کہتا ہوں۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ووٹوں کی پڑتال کرنے کے بعد ان میں ایک مودبانہ لہجہ میں اپنی پارٹی کے امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے اس انداز سے کہتا ہے کہ جیسے میں ان کا خاص آدمی ہوں۔ ان کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکوں گا۔

دل میں تو آتا ہے، صاف صاف کہہ دوں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ووٹ کس کے حق میں ڈالنا ہے... صاف گوئی سے کام لیا تو ان جونکوں سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اپنی پارٹی کے امیدوار معتبر، معقول، مقبول، ایماندار، عوام کا خدمت گار، نہ معلوم کیا کیا ثابت کرنے کے لئے چیخ مارنے لگیں گے۔

ان سے پنڈ چھڑانے کے لئے کہتا ہوں۔ "یہ بات بھی کوئی کہنے کی ہے!"

الفاظ باغی ہو جاتے ہیں۔

اٹھتا ہوں... پیسٹ کرنے کے بعد ناشتہ لے کر کمرے میں آتا ہوں۔ کاغذ اور قلم اٹھاتا ہوں، کچھ الفاظ نوک قلم پر آنے کے لئے بے قرار ہونے لگتے ہیں۔ لفظوں کا کارواں اپنا لنگر اٹھاتا ہے۔ آہستہ آہستہ رینگنے لگتا ہے۔ رینگتے لفظوں کا کارواں پھر رک جاتا ہے۔ اپنے پر خفگی ہونے لگتی ہے۔ کہانی آج مجھ سے نہیں لکھی جا رہی ہے بلکہ میں کہانی کے ساتھ زبردستی کر رہا ہوں۔

آشو مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ بند مٹھی کھول کر بڑے چاؤ اور لاڈ سے کہتا ہے۔ "ڈیڈی! بنٹے کھیلیں!"

میرا ہاتھ اٹھتا ہے اور زناٹے کا تھپڑ معصوم کے گالوں پر پڑ جاتا ہے۔

"جوا کھیلتا ہے؟"

کنچے بکھر جاتے ہیں۔ اشو کو روتا ہوا دیکھ کر برافروختہ ہو اٹھتا ہوں۔

"چل، بھاگ!"

روتا ہوا آشو متحیر اور دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ کوئی قدم اس سے نہیں اٹھتا۔ میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ آشو کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے چلاتا ہوں۔

"چل بھاگ! نہیں تو چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

صحن میں آکر چیختا ہوں۔ "اتنا بھی تو نہیں ہوتا کہ بچے کا ذرا خیال کر لیں۔"

آشو کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔

سیما اور گیتا دوڑی چلی آتی ہیں۔

"اس کو میری آنکھوں سے دور لے جاؤ۔"

"آپ جو ہیں سب کا خیال رکھنے والے!" سیما آشو کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ "پھول سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" پتا جی دوسرے کمرے میں سے اونچی آواز سے ڈانٹتے ہیں۔

"کس بے رحمی سے مارا ہے!" گیتا آشو کا گال سہلاتی ہے۔

آشو کے پھول سے بھی نازک گال پر انگلیوں کے نشان دیکھ کر میرا دل پسیج جاتا ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے یا آشو کو سینہ سے لگا کر رونے کے بجائے غصہ سے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کو صوفے پر لڑھکا دیتا ہوں۔

میں نے آشو پر کیوں ہاتھ اٹھایا؟ شکست خوردہ تھا، اس لئے؟ آدمی شکست خوردہ ہو تو اس کا غصہ، غبار اپنے سے کمزور اور معصوموں پر نکلتا ہے۔ کہانی واپس آنے کا سانحہ، میرے ساتھ نہیں آشو کے ساتھ ہوا ہے۔ میرا کہانیاں لکھنے کا شغل گھر والوں کے ساتھ سانحہ ہے۔

روتا ہوا، متحیر، دہشت زدہ آشو جس کا نازک گال تھپڑ سے لال سرخ ہو گیا ہے۔ میری آنکھوں... میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے ہیں۔ اس طرح آنسو تو ماں کی موت پر بھی نہیں نکلے تھے۔ میں اندر ہی اندر سسکنے لگتا ہوں۔ "ماں! تم نے مجھے وردان نہیں شراپ دیا تھا۔ شراپ..."

ماں کی حالت دن بہ دن تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی۔ دوا وغیرہ کا مجھے انتظام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ پٹیالہ اور چنڈی گڑھ سے

مایوس لوٹ آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے خون میں کینسر بتلایا تھا، کسی وقت بھی المناک لمحہ ہم پر گذر سکتا تھا۔

ان کی موت سے سات آٹھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں کیمسٹ سے دوائیاں لے کر گھر میں داخل ہوتا ہوں۔

سیما اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا کر کہتی ہے۔ "ماتاجی سے آشیرواد لے لو۔"

"ماں کی حالت...؟" میرا لہجہ تشویش ناک ہو جاتا ہے۔

"نہیں! انھوں نے بھائی صاحب کو لکھ پتی ہونے کا آشیرواد دیا ہے۔"

آشیرواد؟... ماں کیا سوچے گی کہ...

"ماتاجی نے بھائی صاحب کو بلا کر آشیرواد دیا ہے۔ آپ کا بھی پوچھ رہی تھیں۔"

برآمدے میں بستر پر لیٹی ماں کو کہتا ہوں۔ "مجھے بھی بلایا تھا؟"

"ہاں۔ دوائی لے آیا؟"

میرے نفس میں خود غرضی کی جونک چمٹ جاتی ہے۔ چاہتا ہوں کہ ماں مجھے بھی کوئی آشیرواد دے۔ آشیرواد دینے کے بجائے ماں دواماں مانگتی ہے۔

پانی کے ساتھ کیپسول کھلا کر لٹانے کے بعد چادر کی سلوٹیں ٹھیک کرتے ہوئے سوچ سوچ کر نگاہیں نیچے کئے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہتا ہوں۔

"ماں، میرے پاس کتنے روپے ہوں گے؟"

"تیرے پاس؟" زرد چہرے کی دھنسی آنکھیں موند کر نحیف آواز میں کہتی ہے۔ "تجھے روپوں کی کیا ضرورت؟ تو کہانیاں لکھا کر۔"

میں مسکراتے ہوئے کہتا ہوں۔ "روپوں کی ضرورت تو مجھے بھی ہے!"

"تو کہانیاں ہی لکھا کرے گا۔"

یہ سن کر بیک وقت اداس بھی ہوتا ہوں اور مسرور بھی۔

زندگی میں کئی بار ایسے ڈرامائی لمحوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو لگتا ہے، یہ لمحے ہماری زندگی کے نہیں بلکہ کسی ناول یا ڈراما کا کوئی حصہ ہیں۔

اس کے بعد میری کہانیاں، اخباروں سے ماہناموں اور معتبر جریدوں میں چھپنے لگتی ہیں، نئی کہانیاں لکھنے اور نئے اور معتبر جریدوں میں شوق بڑھتا رہتا ہے۔ بھائی صاحب الگ ہو جاتے ہیں، ان کے بیوپار میں دن بہ دن ترقی ہونے لگتی ہے۔ مجھے تنگ دستی اپنے حلقے میں پھنساتی چلی جاتی ہے۔ قرض کے بوجھ سے جسم اور روح گلتے رہتے ہیں۔ مہینے کے آخری دنوں میں سگریٹ چھٹ جاتی ہے۔ ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کو ہر بار تین چار روز توڑ مروڑ کر پیسٹ نکالنی پڑتی ہے۔ ہر شیونگ کریم ٹیوب کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرنا پڑتا ہے۔ اسنو پاؤڈر کو اس گھر کی دہلیز میں داخل ہوئے مہینے گذر جاتے ہیں۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے دوست کو الوداع کرنے کے لئے اسٹیشن پر نہیں جا سکا ہوں۔ اکلوتی قمیص پھٹ جانے پر پینٹ کے ساتھ کرتا پہن کر دفتر جاتا ہوں۔

"بہت فیشن ایبل ہو گئے ہو؟" ایسے جملے سنے ہیں۔

اس مہینے ایسا اتفاق ہوتا ہے، ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم اور بلیڈ ختم ہو جاتے ہیں۔ خریدنے کے لئے جیب میں پیسے نہیں، دانت صاف کئے ہوئے چار دن اور شیو کئے تقریباً دس دن ہو جاتے ہیں۔ بازار سے گذرتے ہوئے حجام جس سے میں حجامت بنوایا کرتا ہوں، روک کر کہتا ہے۔

"بابو جی! آپ جیسے شریف آدمی داڑھی بڑھانے لگے تو ہمارا دھندا ٹھپ ہو جائے گا۔"

میری نگاہیں بھیگی بغلوں پر چلی جاتی ہیں۔ بغلوں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ جن سے بدبو پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بڑھی ہوئی داڑھی میں پسینے کے قطرے اور ریت کے ذرے اٹکے ہیں۔ منھ سے بدبو اور سانس اٹھنے کا احساس ہونے سا لگتا ہے ...میں بدبو پیدا کرنے والا گندگی کا ایک ڈھیر ہوں... دو دن تک جب تک کہ میں نے ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم اور بلیڈ خریدنے کے لئے پیسوں کا بندوبست نہیں کر لیا۔ مجھے گندگی کے ڈھیر ہونے کا احساس کچوکے مارتا رہتا ہے۔ تیسرے پہر گھر آتے ہی سب سے پہلے میں پیسٹ کرتا ہوں۔ اس... کے بعد... شیو...

اکثر دوست کہتے ہیں۔ "تم ٹھیک ڈھنگ سے خرچ نہیں کرتے۔"

بیوی کی شکایت ہے۔ "ان کو گھر کی نہیں، کتابیں رسالے خریدنے، کہانیاں لکھنے کی فکر رہتی ہے۔"

پتا جی اکثر کہتے ہیں۔ "تمہارے جتنی تنخواہ پانے والے خوش رہتے ہیں۔ گھر کے اخراجات چلانے کے بعد کچھ نہ کچھ بچا لیتے ہیں۔ تم نہ خوش رہتے ہو، نہ خرچ چلاتے ہو۔"

"میں اپنے اصول نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ہی مجھ سے دو دو چار چار روپوں کے لئے گرا جاتا ہے۔"

"گھر کی گاڑی تو کسی نہ کسی طرح چلانی ہوگی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق چلنا چاہئے۔"

"لوگ رفتار سے نہیں چل رہے، سیلاب میں بہہ رہے ہیں۔ کسی دن..."

پتا جی ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ سیما، گیتا... کوئی بھی نہیں سمجھتا... ان کی بھوک صرف شکم کی بھوک ہے۔ مجھے ذہنی تقویت چاہئے۔ اب میں نے ان کو سمجھانا چھوڑ دیا ہے۔ قرض لے لے کر، اپنی روح اور جسم کو گلا رہا ہوں۔ قرض کی بیساکھیوں کے سہارے کب تک... کسی دن یہ بیساکھیاں ٹوٹ جائیں گی...

باب پانچ

دستک کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کمار کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ میرا نام پکار رہا ہوتا ہے۔ میں لیٹا رہتا ہوں، نہیں اٹھتا۔ اخلاقی تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔ دروازے پر دستک بند ہو جاتی ہے۔ سمجھتا ہوں واپس چلا گیا ہوگا۔ چند ثانیوں بعد گیتا اور سیما سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

میری بابت پوچھ رہا ہوگا؟ پوچھ کر واپس چلا جائے گا۔ میرا قیاس، قیاس ہی رہتا ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع کر دیتا ہے۔

"ادیب صاحب! زندگی سے اتنے بیزار کیوں ہو رہے ہیں؟"

وہ سگریٹ سلگا کر بولنا جاری رکھتا ہے۔ "خودکشی کے طریقے پر غور کر رہے ہو یا خودکشی کی کہانی لکھ رہے ہو؟"

سیما کمرے میں چلی آتی ہے۔ "آج تو بھائی صاحب نے بڑی مہربانی کی ہے۔ بناسپتی کی چپی لادی ہے۔"

"سیما جو ڈاکٹر کمار کو دیکھ کر ناک چڑھالیتی تھی، آج اس کی عزت اور تعظیم کر رہی ہے۔

"کچھ چائے وغیرہ پلاؤ۔" پھر ڈاکٹر کی طرف مخاطب ہوتا ہوں۔

"ڈاکٹر! چائے پیو گے یا کافی؟"

"جو آسانی سے تیار ہو سکتی ہے۔"

"دو پیالے کافی بنا لاؤ۔"

سیما چلی جاتی ہے۔

کسی حد تک میں بھی ڈاکٹر کا احسان محسوس کرنے لگتا ہوں۔ آج کل بناسپتی حاصل کرنا کسی معرکہ آرائی سے کم نہیں ہے۔ ڈپو سے کوئی بناسپتی کی چپی لئے نکلتا ہے تو فخر سے چوڑا ہو جاتا ہے۔ کیو میں کھڑے ہونے کی اذیت، دھکم پیل کی تکلیف سب بھول جاتا ہے۔ ہتھیلی پر چپی رکھ کر اس شان سے جاتا ہے کہ سنجیونی بوٹی کا پہاڑ اٹھائے جا رہا ہو۔

"کل سے تمھارا موڈ آف ہے؟"

"نہیں تو!" میں بھی سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔

"کوئی بات تو ضرور ہے۔"

"موڈ کا اچھا یا خراب ہونا عارضی فعل ہے۔ کئی بار آدمی بڑی بڑی باتوں کی پروا نہیں کرتا اور کئی بار سوئی کی نوک کی چبھن سے تلملا اٹھتا ہے۔"

"یہ سوئی کی نوک کس نے چبھوئی ہے؟ کل مجھ کو میٹنگ میں جانا تھا نہیں تو ضرور کچھ بات کرتا۔ جس طرح تم کپڑوں سے باہر ہو رہے تھے مجھے لگ رہا تھا تم ہائیوسس [1] کے مریض ہو اور دل کر رہا تھا ایک ڈوز زبردستی تمھارے منہ میں ڈال دوں۔" سگریٹ کو میز کے کونے پر رگڑتے ہوئے کہتا ہے۔

"دو کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو بڑا ہومیو پیتھ سمجھنے لگے ہو۔" اتنا کچھ کہنے کے لئے سوچنے میں کتنا وقت صرف کیا تھا؟"

میری بات کو ان سنی کر کے اپنی تقریر نما بات کو جاری رکھتا ہے۔ "میں کوئیک (quack) نہیں ہول ٹائم ہومیو پیتھ ہوں۔"

"تم ہول ٹائم سیاست داں اور پارٹ ٹائم ہومیو پیتھ ہو۔"

سیما طشتری لئے کمرے میں داخل ہوتی ہے جس میں چائے کے مگ ہیں اور نمکین ہے۔ نمکین اس نے نکڑ والی دکان سے منگائی ہوگی۔ کافی کی بجائے چائے کیوں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں تو یاد آتا ہے کافی ختم ہوئے تو ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔

"بھائی صاحب آپ بھی کہانیاں لکھتے ہیں؟" سیما نمکین کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے کہتی ہے۔

"یہ تقریریں کیا کرتے ہیں۔ یہ بھاشن دیا کرتے ہیں۔"

چمچ سے نمکین منہ میں ڈال کر کمار کہنے لگتا ہے۔ "بھاشن دیتا ہوں اس لئے بناسپتی لے آیا ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوتا تو کوئی مجھے کیو میں بھی نہ لگنے دیتا۔ دھکے دے کر باہر نکال دیتے۔ کل بھابی جی بناسپتی کے بغیر لوٹ رہے تھے۔ میں مل گیا ان سے روپئے لے لئے..."

میں چائے کے گھونٹ بھرنے لگتا ہوں۔

ڈاکٹر کی آواز مجھے سنائی دیتی رہتی ہے۔ "اس سے تو اچھا تھا شاعری کرتے۔ اسٹیج پر آنے کا بھی موقع ملتا۔ کچھ روپئے ملتے۔ دوستوں میں قدر ہوتی، حلقۂ احباب میں اضافہ ہوتا۔"

چائے کا ہلکا سا گھونٹ لے کر وہ مگ میز پر رکھ دیتا ہے۔

"افلاطون کہنے میں غلطی کر گیا۔ اسے کہنا چاہئے تھا افسانہ نگاروں کی جمہوری سلطنت میں ضرورت نہیں ہے۔"

نمکین کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتا ہوں۔ "یہ لو۔"

"رشوت دے کر مجھے چپ کروانا چاہتے ہو۔" کہہ کر خود ہی ہنس پڑتا ہے۔

"رشوت اور بے ایمانی تمھاری نس نس میں رچی ہوئی ہے۔" چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی مگ میز پر رکھتا ہوں۔ سیما باہر چلی جاتی ہے۔

"دو چار کا حلقہ بنا کر کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے کو گالیوں سے نوازنا آپ اپنی قدر و منزلت سمجھتے ہیں۔ یہ سب آپ کو مبارک ہو۔"

نئی سگریٹ سلگا کر اپنی صفائی پیش کرتا ہے۔ "تم اور کانت نے کہا تھا کہ تم تو جوانوں کی رہنمائی کر سکتے ہو۔"

"ڈاکٹر نہ تم ان کی رہنمائی کر رہے ہو نہ اپنی! خود گمراہ ہو رہے ہو۔ گمراہ کر رہے ہو۔ شراب پی کر بات بات پر گالی دینا... زردہ پھلا پھلا کر ہوا میں چھوڑتے ہوئے نعرے لگانا رہنمائی ہے تو آپ اپنے بنائے ہوئے حلقہ کے نہیں ساری قوم کے رہبر ہو..."

ایک شام میں ان کے حلقہ میں پھنس گیا۔ بار میں پیگ لیتے ہوئے، بحث کرتے ہوئے، بھاری بھر کم گالیوں سے ایک دوسرے کی عزت افزائی کرنے لگے۔ بار سے باہر آ کر ایک نے زردہ کا پیکٹ نکال کر ایک ایک سب کو تقسیم کر دیا۔ وہ منہ سے پھلا کر نعرے لگاتے ہوئے توڑنے لگے یا ہوا میں چھوڑنے لگے۔ میں نے تو طبیعت کا بہانہ لگا کر رکشا پر بیٹھ کر ان سے پنڈ چھڑوا لیا۔ انھوں نے کافی دیر تک اپنا یہ شغل رکھا تھا۔

ایک بار تو ان میں بحث چلی کہ جو برہنہ ہو کر دوسرے پول کو ہاتھ لگا کر واپس آ جائے گا اس کو پانچ روپئے دیئے جائیں گے۔ بات پانچ روپئے سے شروع ہوئی۔ بولی بیس پر پہنچی تو ان میں ایک تیار ہو گیا تھا اور بیس روپئے بھی اس شرط کی جیت کے لئے تھے۔

میں سگریٹ سلگانے کے لئے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ڈاکٹر کمار ٹوک دیتا ہے۔ "خالی ہے۔ یہ لو!" اپنی سلگی ہوئی سگریٹ میری طرف بڑھاتا ہے۔

میں اس سے سگریٹ لے لیتا ہوں۔ "ڈاکٹر تم سستی شہرت کے پیچھے رنگ روپ بدل بدل کر دوڑتے پھرتے ہو۔"

---

[1] ہائیوسس ہومیو پیتھک دوا ہے۔ اس کے مریض میں پاگلوں کی طرح ہنسنے اور چیخنے کی نا واجب خواہش ہوتی ہے اور وہ کپڑے اتار کر اپنے آپ کو ننگا کرنے کا خیال کرتا ہے۔

"تم کچھ نہیں چاہتے؟" میرے ہاتھ سے سلگتی سگریٹ لے لیتا ہے۔
"تم کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟ اپنی زندگی سے کیوں بیزار رہتے ہو؟ اپنے کو دھوکا کیوں دے رہے ہو؟"

"اپنے کو دھوکا دے رہے ہو۔ یہ الفاظ میں تمہارے تئیں کہہ سکتا ہوں۔ ہر انسان کی خواہش قدر و منزلت حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے وہ اس کے لئے کیا عمل کرتا ہے؟ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی تپسیا سے اس کو پانا چاہتا ہے تو کوئی سستی شہرت کے لئے گلا پھاڑ پھاڑ جامے سے باہر ہو کر..."

"جامے سے باہر تو تم ہو رہے ہو۔ ہائیکوس لیا کرو۔"

کہہ کر کر کار قہقہہ لگاتا ہے۔ پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لیکن فوراً پیچھے سرکا لیتا ہے۔ "یہ تو خالی ہے!"

"ابھی منگواتا ہوں۔"

"نہیں۔ بس چلتا ہوں۔"

دروازے کی دراز سے اخبار سرک آتا ہے۔ میں اسے اٹھا کر میز پر رکھ دیتا ہوں۔ وہ اٹھتے اٹھتے اخبار اٹھا کر سرخیاں دیکھنے لگتا ہے۔

"بیٹھو ایک ایک کپ چائے اور لیتے ہیں۔"

"سگریٹ بھی منگواؤ۔"

"ابھی لایا۔" اٹھتا ہوں، دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے چولھے کے پاس بیٹھی گیتا کو، دو کپ چائے بنانے کے لئے کہتا ہوں۔ وہ فوراً چائے کے لئے پانی رکھ دیتی ہے۔

مجھ کو کوٹ اور پینٹ کی جیبیں ٹٹولتا دیکھ کر کہتی ہے۔

"چائے کی پتی کے لئے چار روپے نکالے تھے۔"

جیبوں سے ریزگاری نکلتی ہے۔ پیکٹ کے پورے دام بھی نہیں ہوتے۔ ماچس کے بعد چائے کی پتی، پھر چینی، نمک، دالوں کا دور شروع ہوتا ہوگا۔ نکڑ والی دکان سے کھلی سگریٹیں لیتا ہوں۔ ابھی تک دکانداروں سے ادھار لینے کی لعنت سے بچا ہوا ہوں، دوستوں سے پکڑ پکڑ کر بیساکھیوں کے سہارے مہینے کے دن پورے کر لیتا ہوں۔

دونوں ہاتھوں میں چائے کے مگ لئے داخل ہوتا ہوں۔ مگ میز پر رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر اخبار پڑھتا رہتا ہے۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال رہا ہوتا ہوں تو وہ ماچس اٹھا کر دیا سلائی جلاتا ہے۔ ایک سگریٹ اس کو پیش کرتا ہوں۔ دوسری میں منہ میں لگا لیتا ہوں۔ میری اور اپنی سگریٹ سلگانے کے بعد، اپنی نظریں اخبار میں مرکوز کر دیتا ہے۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے میں سگریٹ کے کش لگاتا رہتا ہوں۔ اداسی مجھے اپنی گرفت میں لے چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کوئی ریمارک نہیں کستا۔ چائے سگریٹ کے ساتھ وہ خبروں کے ذائقہ کا سواد لیتا رہتا ہے۔ میں خالی مگ میز پر رکھ دیتا ہوں۔ اخبار سے نظر ہٹا کر کہتا ہے۔

"بہت گرم گرم چائے پیتے ہو۔"

میں سگریٹ کے کش لگاتا رہتا ہوں۔ دھواں بڑھتا رہتا ہے۔ ایسے بہت کم لمحے آئے ہیں جب کہ ڈاکٹر اس طرح خاموش رہے اور میں نے اس کے سامنے مسکراہٹ کا غازہ چڑھا کر اپنے زخموں کو چھپانے کی کوشش نہ کی ہو۔ دھوئیں کی مقدار بڑھتی رہتی ہے۔ وہ ایک دم اٹھتا ہے جیسے اسے کوئی اہم کام یاد آ گیا ہو۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال لیتا ہے۔

"اچھا شام کو ملیں گے۔"

مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔ بیٹھے بیٹھے ہی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہوں۔ مجھے اپنی بیساکھیاں ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

باب چھ

کمرے میں تیرتے سگریٹ کے دھوئیں کے کالے ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں لیکن مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ نڈھال ہو جاتا ہوں۔ میری ٹانگیں میز پر پھیل جاتی ہیں۔ گردن سوفے کی پشت پر لڑھک جاتی ہے آنکھیں مند جاتی ہیں... میں ایک بوجھ ہوں... میں نے گھر کا کیا بنایا ہے، یہ سوفہ، کرسیاں شادی کی۔ اپنی گرہ سے ایک چٹائی بھی نہیں بنائی... سوفے کی ریگزین پھٹ گئی تھی۔ پتا جی نے بدلوائی نہیں تو سوفہ گھر کے کباڑ خانے میں ہوتا...

جب سے ہوش سنبھالا ہے محرومیوں کا عقابی پنجہ میرے بدن، دل، دماغ پر گہری گہری نچیں ڈال ڈال کر مجھے زخمی کر رہا ہے۔ کبھی من پسند کا کھانا نہیں ملا۔ ایک ایک چیز کے لئے کئی کئی دن ضد کرنی پڑتی ہے... امتحان کے دنوں میں اسکول جاتے ہوئے روٹی کے ساتھ دہی کی مانگ کیا کرتا تھا۔ ماں اڑوس پڑوس سے چھاچھ (لسی) مانگ کر لے آتی۔ اس میں نمک اور لال مرچ ڈال کر ہمیں بہلانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس دن حساب کا پرچہ تھا۔ میں ضد کرنے لگا۔ "مجھے لسی نہیں دہی چاہئے۔"

ماں نے سمجھانا چاہا۔ میں زمین پر لیٹ کر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دہی کے لئے اپنی ضد دہرانے لگا۔ ماں کی کوئی پیش نہ چلی تو تنگ آ کر مجھ پر بیلن دے مارا۔ میں روتا ہوا بھوکا اسکول چلا گیا۔ حساب میں، میں ہمیشہ اول رہا کرتا تھا۔ لیکن اس دن کے پرچہ میں فیل تھا۔

دسویں کے امتحان میں حلقہ کے سب دوست اچھے نمبروں سے پاس ہوئے تھے۔ چار نمبر کم رہنے کی وجہ سے میری فرسٹ ڈویژن نہیں آ سکی تھی۔

بچپن سے گلی کی ایک لڑکی میں دلچسپی تھی۔ کبھی کبھار اکٹھے کھیلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ دسہرہ کے دنوں میں چارپائیاں کھڑی کر کے ہم نے ایک بار رام لیلا کھیلی تھی۔ دوپٹوں کی ساڑھیاں اور بستر کی چادروں وغیرہ کے ہم نے پردے بنائے تھے۔ وہ لڑکی نیلو، سیتا اور میں رام بنا تھا...

ایک بار کھیلتے ہوئے نیلو نے کہا تھا۔ "تم میرا فراک پہن لو، میں تمہاری قمیص پہن لوں گی۔"

میں نے اپنی قمیص اتار دی تھی۔ نیلو نے اپنا فراک اتارنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی ماں آ گئی۔ اس نے نیلو کو ڈانٹا اور میرے گال پر تھپڑ مارا۔ میری ماں نے مجھے اس بات پر پیٹا تھا۔ مڈل تک ساتھ تھی، کبھی کبھی مجھ سے حساب کے سوال

کروانے آجاتی تھی۔منہ سے میں اس کو کچھ نہ کہتا۔اس کے سوال حل کرتے ہوئے مجھے لگتا، نیلو چھوٹی ہوگئی ہے۔میں بھی...میں اپنی قمیص اتار کر ہاتھ میں لئے کھڑا ہوں۔نیلو اپنا فراک اتار رہی ہے۔

دسواں کرنے کے بعد فکر معاش نے مجھے دفتر میں کلرک بنا دیا۔ایک سال بعد نیلو کالج میں جانے لگی۔پیدل یا سائیکل پر سوار مجھے دکھائی دیتی تو مجھے لگتا جمپر اتار رہی ہے۔

ابھی وہ سیکنڈ ایر میں تھی۔ایک روز اس کو بخار کے ساتھ سر درد ہونے لگا، تیسرے دن چہرے پر سرخ دانے نکل آئے۔یہ سرخ دانے آبلوں میں متبدل ہونے لگے، آبلوں میں مواد تھا...میں ایک بار بھی اس کے گھر نہیں جاسکا۔جو کچھ مجھے پتہ چلتا، ماں کی باتوں سے ہی پتہ چلتا۔محلے میں ٹیکہ لگانے کے لئے ویکسی نیٹر آئے...مجھے بچپن کا وہ دن یاد آگیا...

ہم بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔کمیٹی کا ویکسی نیٹر ٹیکہ لگانے کے لئے آیا۔کچھ بچے تو ڈر کے مارے بھاگنے لگے۔کچھ تماشا دیکھنے کے لئے رک گئے۔میں نے اور دو تین بچوں نے خوشی سے ٹیکہ لگوالیا...بچوں کا غول ویکسی نیٹر کے پیچھے ہولیا۔جس گھر وہ جاتا، بچوں کا غول اس کے ساتھ یا پیچھے ہوتا۔نیلو کے گھر پہنچے تو وہ بستروں میں چھپی ہوئی تھی۔اسے ڈھونڈا گیا تو وہ زار زار رونے لگی۔تب میں نے ویکسی نیٹر کے آگے اپنا دوسرا بازو کرتے ہوئے کہا۔"ڈاکٹر جی! اس کی جگہ مجھے ٹیکہ لگا دو۔"

ویکسی نیٹر مسکرانے لگا تھا۔نیلو کی ماں نے میرے بازو کو پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے کہا۔"جا اپنے گھر مر۔"

بعد میں نیلو کی ماں نے ایک دو عورتوں کو کہا۔"میں تو ڈاکٹر (ویکسی نیٹر) کو ایک روپیہ دے کر ٹرخا دیا۔اپنی نیلو کو ٹیکہ لگوانے سے بچالیا!"

میں ایک بار بھی نیلو کی مزاج پرسی کے لئے نہیں جاسکا (اس کی حالت کے بارے میں جو تھوڑا بہت پتہ چلتا، اپنی ماں سے) ایک دن یہ بھی سنا کہ نیلو کے اندھی ہوجانے کا اندیشہ ہے۔اس دن پہلی بار وسکی کا ذائقہ چکھا تھا۔آدھی رات کے بعد آنکھ کھل گئی تھی۔بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا تھا۔نیلو تندرست ہوگئی۔اس کی آنکھیں صحیح سلامت تھیں۔لیکن چہرے پر چیچک اپنے دائمی داغ چھوڑ گئی تھی۔

جس دن مجھے یہ پتہ چلا، وہ اتفاق سے منگوار تھا۔میری نظر میں کسی دن کی، کسی دوسرے دن سے زیادہ اہمیت نہیں ہے۔حلوائی کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے میرے قدم مجھے تازہ بوندی کے تھال کے پاس لے گئے۔ہاتھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر حلوائی کی طرف بڑھا دیا۔پتہ نہیں وہ نوٹ دو کا تھا یا پانچ کا، حلوائی نے بوندی سے بھرا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔اور قدم مندر کی طرف اٹھنے لگے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے کوئی منت نہیں مانی تھی۔

نیلو پھر کالج جانے لگی۔اس کے چہرے پر چیچک کے داغوں کا تسلط تھا، اس سے کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔لیڈی سائیکل پر آتے جاتے دیکھتا تو مجھے لگتا وہ اپنا جمپر اتار رہی ہے، لیکن جلد ہی میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔

امتحان میں وہ فیل ہوگئی۔کالج جانا اس نے چھوڑ دیا۔والدین اس کی شادی کی فکر کرنے لگے۔ایک لڑکے نے اسے دیکھ کر شادی سے انکار کردیا۔دوسرے کے والدین نے جہیز کے علاوہ نقد روپوں کی زیادہ مانگ رکھی۔ان باتوں کا عجیب طور پر مجھ پر کوئی نہ کوئی رد عمل ہوا۔پہلے لڑکے نے انکار کیا تھا تو اس بات پر بھی بیئر پی تھی۔دوسری بار انکار ہوا تو گھر پر لیٹا رہا تھا۔میں موقعے کی تلاش میں رہنے لگا کہ کب نیلو سے ملاقات ہو۔

گھر کے نلکوں میں پانی چڑھ نہیں رہا تھا۔گلی کے نل سے پانی بھرنے کے لئے بالٹی اٹھا کر چلا گیا۔وہاں کوئی دوسرا نہیں تھا۔نل کے نیچے بالٹی لگائی ہی تھی۔نیلو بالٹی اٹھائے آتی ہوئی نظر آئی۔اس نے سوتی ساڑھی اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

نزدیک آنے پر اس نے پوچھا۔"کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔"

نزدیک سے نیلو کو برسوں بعد دیکھا تھا۔

"سب ٹھیک چل رہا ہے؟"

مجھے لگتا ہے نیلو نے اپنے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے ہیں اور...اور میرے حلق میں تھوک بھر آیا، تھوک کو نگلتے ہوئے میں نے کہا۔"سنا ہے لڑکے والوں نے بہت ڈیمانڈ..."

اس نے نل کی طرف بالٹی بڑھا دی۔مجھے لگا، وہ کھلے بلاؤز کے بٹن بند کرنے لگی ہے...میری بالٹی میں پانی چھلک رہا تھا۔میں نے اپنی بالٹی اٹھائی اور اس نے اپنی بالٹی نل کے نیچے لگائی۔میں نے لب کھولنے چاہے، میرے ہاتھوں میں بالٹی کانپنے لگی...میں سراپا کانپ رہا تھا۔

"میں...میں...!" تمام قوت کو یکجا کرکے آنکھیں بند کرکے کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دی۔

"جہ...جہیز...کے بغیر ش...ش...شادی...!"

"اپنی حیثیت دیکھی ہے!" کہہ کر اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

میری آنکھوں کے آگے کالے دھبے تیرنے لگے، لڑکھڑاتے پیروں سے پانی کی بالٹی اٹھائے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔دھبے، دھندلکا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔اینٹ سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔بالٹی الٹ گئی۔پیر کے انگوٹھے کے ناخن سے خون بہنے لگا۔انگوٹھے کو ایک بار دبایا۔خالی بالٹی اٹھا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا، انگوٹھے سے خون بہتا رہا۔پیڑا اور درد لئے گھر پہنچا۔

پٹی باندھنے پر خون کا بہاؤ تو کم ہوگیا لیکن پیڑا بدستور بڑھتی رہی۔

ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے ناخن کو گوشت سے الگ کردیا۔

میں اپنے گھاؤ پر روزانہ ڈریسنگ کرواتا۔

نیلو کی سگائی دوسرے شہر میں ہوگئی۔شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ہمارے گھر بھی پانچ سات بھاجی کے لڈو آئے، پتا جی نے ایک شریف پڑوسی کی طرح شامیانے وغیرہ لگوانے میں ہاتھ بٹایا۔ماں ان کے گھر نیوتے کے پانچ روپے دے آئی۔

"کیوں؟ کیا ضرورت تھی؟" میں نے غصہ سے ماں کو کہا۔

"ان کی طرف سے بھاجی کے لڈو آئے تھے۔ شام کو برات آنے والی ہے۔ تمھیں بھی کام میں کچھ ہاتھ بٹانا چاہئے۔"

"کیوں؟" کہہ کر میں باہر چلا آیا۔ دیر تک دفتر کے کلب میں رمی کھیلتا رہا۔ باہر ہی کھانا کھایا۔ تیسرا شو دیکھ کر گھر واپس آیا تو ماں نے کہا۔ "کھانا کھالو۔"

ماں نے سمجھا تھا کہ میں اب تک براتیوں کی خدمت میں لگا رہا تھا۔

میں کمرے میں داخل تو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ہوا لیکن چادر اور تکیہ اٹھا کر باہر چلا آیا۔

"تجھے لڑکی والوں کے یہاں کھانا نہیں کھانا چاہئے تھا!"

کوئی جواب دیئے بغیر میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد پنڈت کے پھیرے پڑنے کی آواز سنائی دینے لگی... صبح جب آنکھ کھلی تو دھوپ کی وجہ سے پسینے کی وجہ سے بھیگ چکا تھا اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ نہانے اور چائے پینے کے بعد بھی سر درد ہوتا رہا۔ میں کوئی دوا لئے بغیر لیٹا رہا۔ نیلو کی ڈولی جانے کا وقت آیا تو میرے قدم مجھے ڈیوڑھی تک لے گئے لیکن باہر گلی میں نہ بڑھ سکے۔ مجھے واپس لے آئے۔ میں چھت کی کالی کڑیوں کو تاکتے ہوئے لیٹا رہا۔

انگوٹھے کے گھاؤ میں دو تین دن ڈریسنگ کروانے کے لئے نہ جا سکا۔ زخم میں مواد پڑ گیا۔ پٹی کروانے کا سلسلہ کئی دن تک چلا۔

یہ بھی سننے میں آیا کہ نیلو کے والدین نے سسرال والوں کو جہیز کے علاوہ پندرہ ہزار نقد دینے کا اقرار کیا تھا لیکن دے سکے صرف پانچ ہزار۔ نیلو کے سسرال والے اسے تنگ کرتے۔ اس کی ساس نیلو کو بقایا دس ہزار لانے کے لئے میکے بھیجتی۔ نیلو یہاں آ کر کوئی بات نہ کرتی۔ ایک دو دن رہ کر واپس چلی جاتی اور خاموشی اختیار کر لیتی۔ نیلو کے والد مکان گروی رکھ کر بقایا دس ہزار دینے کو تیار ہو گئے لیکن نیلو نے آ کر کہا۔ "مکان گروی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میرے پاؤں کے انگوٹھے کا زخم تو ٹھیک ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے ہدایت دی تھی، جب تک نیا ناخن نہیں آ جاتا خالی پٹی باندھے رہا کرو۔

انگوٹھے کو ڈیٹول سے صاف کر کے پٹی لپیٹ رہا تھا کہ نیلو کمرے میں آئی۔ میں بوٹ اور موزے اٹھا کر باہر جانے لگا تو وہ بولی۔

"میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔"

میں پٹی کی گرہ لگانے لگا۔

بغیر کسی تمہید کے وہ کہنے لگی۔ "ہماری کٹی سے شادی کر لو۔"

کٹی نیلو کی چھوٹی بہن اسی سال سے کالج جانے لگی تھی۔ مجھے اس کے پورے نام کا بھی پتہ نہیں تھا نہ اب ہے۔

"بھینگی ہے؟ کالی ہے؟ اپاہج ہے؟ یا..." کہتے کہتے میں رک گیا۔ موزے اور بوٹ اٹھا کر باہر نکل آیا۔

ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈیوڑھی میں موزے اور بوٹ پہنتے ہوئے ماں کی آواز سنی۔ "بیٹی بیٹھو۔ چائے پی کر جانا۔"

میں نے نکڑ والی دکان سے بسکٹ کا پیکٹ لے کر گلی میں کھیلتے بچے کے ہاتھ گھر پہنچوا دیا اور خود لائبریری کی طرف چل دیا۔

ماں نے بتلایا کہ نیلو پہلی بار کافی دیر تک ہمارے گھر بیٹھی رہی تھی۔ کٹی سے شادی کی بات کرنے لگی تو میں چادر اور تکیہ اٹھا کر اوپر چلا گیا۔

کسی تہوار پر چھٹی تھی۔ میں گھر پر بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ رونے اور پیٹنے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز نیلو کے گھر سے آ رہی تھی۔ ہر لمحہ رونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ باہر آ کر پتہ چلا کہ نیلو کے سسرال سے تار آیا ہے کہ "اسٹوو پھٹ جانے سے نیلو جل کر مرگئی۔"

گلی میں ہر کسی کے چہرے پر خوف اور یاسیت تھی۔

اسٹوو کبھی پھٹتا نہیں، بہانہ بتایا جاتا ہے۔ نیلو کی موت قدرتی نہیں... اس کے لالچی سسرال نے مجبور کیا ہوگا۔ میں کسی کو کچھ نہیں کہہ سکا۔ بیگ میں کپڑے، دو تین کتابیں اور ادھوری کہانی کے مسودے ڈال کر ہفتہ کے لئے چھٹی کی عرضی دفتر کے ایک بابو کو پکڑا کر دوست کے پاس گاؤں میں چلا آیا۔

دوست رات کو مجھے ٹھرا پلاتا۔ دن کو لوک گیت اور فحش لطیفے سنا سنا کر میری مہمان نوازی کرتا۔ کھیت میں درختوں کے نیچے چارپائی ڈال کر پڑھنے لکھنے کا ارادہ کرتا تو نیند غالب آ جاتی۔ دوست کے آنے پر اس کے لطیفوں اور ٹھرے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

دو دن بعد نیلو کے جل کر مرنے کی خبر گاؤں میں پہنچ گئی۔

اس بار دوست نے پوچھا تو میں نے کہا۔ "پتہ نہیں۔"

اسی دن گاؤں کے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں نیلو کی گلی میں رہتا ہوں تو دو چار کی ٹولی میں اکیلے دکیلے ہر دس پندرہ منٹ بعد کوئی نہ کوئی چلا آتا۔ لوگ عجیب عجیب سوال کرتے۔ تیسرے دن صبح شہر چلا آیا۔ گھر کی بجائے سیدھا دفتر گیا۔

دفتر کے بابوؤں نے مجھے گھیر لیا اور نیلو کی موت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ جب میں نے کہا کہ میں تو باہر گیا ہوا تھا تو وہ ہی بتلانے لگے۔ کئی باتیں۔ ہری بابو نیلو کا کوئی رشتہ دار رقت آمیز آواز میں داستان سنانے لگا۔

"ٹیکسی لے کر ہم نیلم کے سسرال پہنچے۔ وہ پہلے ہی نیلم کو مرگھٹ لے جا چکے تھے۔ ہمیں کچھ شبہ ہوا کہ مار دیا اور انتظار تک نہیں کیا۔ وہاں سے ہم نیلم کی بوا کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے گھر میں کام کر رہی تھی۔ انھیں نیلم کی موت کی خبر تک نہیں تھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوں اور اس کی بوا کو بھتیجی کی موت کی اطلاع تک نہ ہو۔ نیلم کے پھوپھا تو پولیس سٹیشن کی طرف چلے، ہم مرگھٹ کی طرف۔ انھوں نے نیلم کو داغ دے دیا تھا۔ ہم نے آگ بجھانے کے لئے کہا۔ ہماری کوئی سنوائی نہ کی۔ پولیس کے آنے پر آگ بجھائی گئی۔ نیلم کی نیم جلی نعش پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے۔ رپورٹ میں کہا گیا، موت زہر سے ہوئی ہے۔ نیلم کا ادھ جلا بدن۔ سر کی چربی پگھل کر چہرے پر آ گئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں کے ڈھیلے نہیں تھے۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔"

وہ کہتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے، نیلو کی نیم جلی نعش بجز آنکھوں کے دو سوراخوں والا نیلو کا چہرہ۔ جس کے سر کی چربی پگھل کر... اب وہی نیلو کا چہرہ.. ایسے میں کہاں جاؤں۔ کھلے میں بھی دم گھٹتا ہے۔ سونے کی پشت پر میری گردن لڑھک جاتی ہے۔

باب سات

دروازے کا ایک پٹ کھلتا ہے لیکن فوراً آدھا بند ہو جاتا ہے۔ میں دروازہ کھول کر صحن میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا ہوں۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا آشو کھڑا ہوتا ہے۔ مجھ سے میرا اپنا اتنا ڈرے اور سہمے...

اس کے پاس جا کر کہتا ہوں۔ "آؤ بیٹے کچھ کھیلیں۔"

اپنے گالوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار میں دھنستے ہوئے وہ کہتا ہے۔ "اب کبھی نہیں کھیلوں گا بنٹوں سے۔ جوا نہیں..."

اس کے گرد باہنوں کا حلقہ بناتا ہوں۔ اس کی سسکی چھوٹ جاتی ہے۔

"بیٹے کچوں سے کھیلنا جوا نہیں ہوتا۔"

سیما تیزی سے ادھر آتی ہوئی چلاتی ہے۔ "اب پھر مارنے لگے۔ کیوں بچے کے دشمن بنے ہو۔"

"اب کون مار رہا ہے؟" کپڑے دھوتی ہوئی گیتا میری طرف داری کرتی ہے۔

"بیٹے کانچوں سے کھیلنا جوا نہیں ہوتا۔" میں پھر دہراتا ہوں۔ "آؤ کھیلیں!"

"مار کر بہلاتے ہیں!" سیما بڑبڑاتی ہے۔

پتا جی گھر میں نہیں ہیں، نہیں تو وہ بھی کچھ کہتے سنتے۔ سیما کو ڈانٹتا ہوں۔ "نہانے کے لئے پانی گرم کر دے۔"

آشو کو دلارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ "بیٹے، لاؤ کھیلیں۔" میں اس کی جیبیں ٹٹولتا ہوں۔ "کہاں گئے؟"

"ممی نے ادھر پھینک دیئے۔" کیاری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اتنی گفتگو میں آشو نے ایک بار بھی مجھے ڈیڈی نہیں کہا۔ ورنہ وہ تو ہر بات میں دو تین بار ڈیڈی ضرور کہتا ہے۔ ایسا خیال آنے پر ذہن میں غبار سا چھانے لگتا ہے۔ بچے کو مارنے سے اس کی صلاحیت مر جاتی ہے۔ مارنے والے کے خلاف دل میں آکروش بھر جاتا ہے۔

بچپن میں مجھے ناناجی نے ایک بار بری طرح پیٹا تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ مجھے ان سے ڈر لگتا رہا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر آتے تھے تو غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ گھر میں کوئی نہ کوئی چیز توڑ دیتا تھا، برتنوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگتا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ماں کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس کا ڈوپٹہ سر سے اتار دیتا، بال کھینچنے لگتا جس سے میرے دو چار لگ جاتی تھیں۔

آشو کے دل و دماغ میں میرے تئیں ایسے نقوش بن گئے تو... نہیں میں...

کیاری کے پاس ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا ہوں۔ گلاب، گیندے اور موہے کے سوکھے پودوں کی جڑوں کے پاس کچے بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اکٹھے کر کے کرتے اور پاجامے سے ان کو صاف کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں میں لے کر کھنکھناتے ہوئے آشو کے پاس آتا ہوں۔

"پہلے تو باری لے گا۔ یا میں لوں؟"

وہ کچھ نہیں بولتا۔

"لے۔ پہلے تو باری لے۔"

وہ ہاتھوں کو سمیٹتے ہوئے پیچھے سرکتا ہے۔

میں کچے بکھیر دیتا ہوں۔ نیچے پنجوں کے بل بیٹھ، ایک کچا اٹھا کر دوسرے کچے پر نشانہ لگاتا ہوں۔ "یہ مارا!" دوسرے پر نشانہ لگاتا ہوں۔ "یہ بھی مارا!"

تیسرے پر جان بوجھ کر نشانہ نہیں لگاتا ہوں۔

"اب تیری باری ہے۔"

وہ سہما رہتا ہے۔

گیتا آتی ہے۔ "آؤ کھیلیں۔ ہم دونوں تیرے ڈیڈی کو ہرائیں گے۔"

سیما بھی شامل ہو جاتی ہے۔ "ہم تینوں ان کو ہرائیں گے۔"

آشو نشانہ لگانے کے لئے بیٹھتا ہے۔ لیکن فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔

میرے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ "نہیں بیٹے! یہ جوا نہیں۔" ایک کچا اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتا ہوں۔ "یہ لو۔ نشانہ لگاؤ!"

"ردی، خالی بوتلیں..." آواز گلی میں سے سنائی دیتی ہے۔

میں فوراً باہر آ کر ردی خریدنے والے سے بھاؤ طے کر لیتا ہوں، اخباروں کو اکٹھا کر کے لے جانے لگتا ہوں، سیما ٹوکتی ہے۔ "یہ لوگ ردی سستی خریدتے ہیں۔ کسی دکاندار کو دے آتا۔"

"گٹھری اٹھا کر کون لے جائے گا۔" یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

کل ساڑھے چودہ روپے ملتے ہیں۔ تین چار دن کی جیب خرچی بن گئی۔ آگے پھر سوچیں گے، کسی دن ماہنامہ، جریدوں اور کتابوں کو ردی میں تو نہیں... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔

تینوں کچے کھیل رہے ہوتے ہیں... مجھے دیکھتے ہی آشو دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور سہم کر دیوار کے ساتھ جا لگتا ہے۔ مجھے اس سے دور رہنا چاہئے۔ چولہے پر گرم ہوتے ہوئے پانی کے پتیلے کو اٹھا کر غسل خانے میں لے جا کر بالٹی میں الٹا دیتا ہوں اور خالی پتیلے چولہے کے پاس رکھ کر غسل خانے میں آ کر کپڑے اتارنے لگتا ہوں۔

نل کھولنے کے بعد فوراً غیر ارادی طور پر گرم گرم پانی کا مگ اپنے بدن پر انڈیل لیتا ہوں، چونک اٹھتا ہوں... نیم بیہوش نیلو کو آگ لگائی ہوگی تو اسے بھی ایسا، اس سے بھی زیادہ احساس... تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کی وہ جلی نعش، آنکھوں کی جگہ دو سوراخ، کھوپڑی سے پگھل کر چہرے پر ڈھلکی ہوئی چربی... چھل چھلاتی ہوئی بالٹی میں سے ٹھنڈے پانی کے مگ بھر بھر کر اپنے اوپر انڈیلنے لگتا ہوں۔

غسل خانے سے نکلتا ہوں۔ آشو بکھرے کچوں کو اکٹھا کر رہا ہوتا ہے، مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھ سست پڑ جاتے ہیں۔

"اکٹھے کرو۔ ابھی ہم دونوں کھیلیں گے!" کہتا ہوا میں آگے بڑھتا ہوں۔

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ناک سے بہتی ہوئی ریزش سڑک لیتا ہے۔ تولیہ الگنی پر پھیلا کر کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ آشو آہستہ آہستہ اپنے کچے اکٹھا کرتا رہتا ہے۔

پانچ سات منٹ بعد تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلتا ہوں تو صحن میں آشو کہیں نظر نہیں آتا۔ کمروں میں اس کو ڈھونڈنے لگتا ہوں۔

باب آٹھ

کندھے پر جلن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دواؤں کے بکس سے کینتھرس[1] کی شیشی نکال کر صاف کاغذ کے ٹکڑوں پر دس بارہ گولیاں الٹا لیتا ہوں اور شیشی بکس میں رکھ دیتا ہوں۔ دوا لیتے ہوئے میری نظر باہر گلی میں چلی جاتی ہے۔ آشو بچوں کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ وہ سب سے چھوٹا اور کمزور نظر آتا ہے۔ عمر سے پہلے اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔ شاید اس لئے اس کی نشو ونما پوری طرح نہیں ہو رہی ہے۔

دواؤں کے بکس اور الماری کو بند کر کے میں گلی میں آشو کے پاس جانے لگتا ہوں، مجھے اپنے کندھے پر جلن کم محسوس ہوتی ہے (شاید نفسیاتی اثر ہی ہو) سنگرہنی کی موذی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ علاج مہینوں چلتا رہا۔ انگریزی اور دیسی دواؤں سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ہومیو پیتھی کی طرف رخ کیا۔ اسی پیتھی سے مجھے سنگرہنی جیسی موذی بیماری سے نجات ملی تھی۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اس کی دوائیں گھر میں استعمال کرنے لگا تھا۔ ٹاؤن ہال میں ڈاکٹر ہنیمین کے جنم دن پر ہومیو پیتھی ایسوسی ایشن کی طرف سے تقریب کی گئی جس میں ہومیو پیتھی میں اعتقاد رکھنے والوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ہومیو پیتھی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی۔ دوسری پیتھیوں سے موازنہ کیا گیا۔ ایک ڈاکٹر نے اپنی تقریر کے دوران کہا۔ "اس پیتھی میں ایسی دوائیاں ہیں جن سے چیچک کے داغ تک غائب ہو سکتے ہیں۔"

میرا رجحان ہومیو پیتھی کی طرف زیادہ مائل ہونے لگا۔

آشو کے پاس جا کر کہتا ہوں۔ "آؤ بیٹے! کھیلیں۔"

غصے سے وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

میں اسے گود میں اٹھا کر کہتا ہوں۔ "آؤ۔ بازار چلیں۔"

گود سے نکلنے کے لئے وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔

"کیا کھاؤ گے؟ سیب، کیلا؟

"نہیں، مجھے چھوڑ دو!" اس کا ہاتھ پاؤں مارنا بدستور رہتا ہے۔

"اچھا گلاب جامن کھاؤ گے؟"

"مجھے کیوں مارا تھا؟" وہ میری چھاتی اور کندھے پر مکے مارنے لگتا ہے۔ "کیوں مارا تھا؟"

ناناجی جب گھر آتے تھے تو ان کے جانے کے بعد ماں سے اسی طرح لڑائی کیا کرتا تھا۔ مجھے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھتا۔

"اب نہیں ماروں گا۔"

"کیوں مارا تھا؟" اس کی سسکی نکل جاتی ہے۔

اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے یقین دلانا چاہتا ہوں۔ "میرے بیٹے اب کبھی نہیں ماروں گا۔ آؤ بازار چلیں، جو کہے گا وہ چیز دلا دوں گا۔"

گلاب جامن کھاؤں گا۔"

پہلے میرے ساتھ بازار یا پارک میں گھومنے جاتا تھا تو کچھ نہ کچھ سوال و جواب کرتا تھا یا بچوں کے میگزین سے پڑھے ہوئے لطیفے سناتا رہتا تھا۔ اب وہ چپ چاپ چل رہا ہے... اس کا چپ چاپ رہنا مجھے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

بچوں کے ماہنامے سے پڑھا ہوا لطیفہ سنانے لگتا ہوں۔

سبق پڑھانے کے بعد ماسٹر نے بچوں سے کہا، کل سبق اچھی طرح یاد کر کے آنا، جو پوچھوں اس کا جواب فٹافٹ دینا۔

دوسرے دن ماسٹر نے ایک لڑکے سے جماعت میں پوچھا۔

اکبر کے باپ کا کیا نام تھا؟

لڑکے نے جواب دیا۔ فٹافٹ۔

ہنستے رہنے کے کچھ ثانیوں بعد آشو بولا۔ "ڈیڈی! ایک لطیفہ میں سناؤں؟"

"ضرور ضرور!"

ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔

آج کون سی تاریخ ہے؟ آشو لطیفہ سنانے لگتا ہے۔

منگل وار۔ دوسرے نے جواب دیا۔

پہلا بولا۔ یار میں نے مہینہ تو نہیں پوچھا تھا۔

ہنسنے میں میں آشو کا ساتھ دیتا ہوں۔

"ڈیڈی! ڈاکٹر انکل جا رہے ہیں۔" دور سے آشو کو ڈاکٹر کمار جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

"ہاں۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں، کسی کام سے کہیں جا رہے ہوں گے!"

"ڈیڈی انکل کی دکان کہاں ہے؟"

"اب دکان نہیں ہے، اٹھالی ہے۔"

"جلوس نکالتے ہیں نہ، اس لئے۔ میں نے ایک دن دیکھا تھا، رکشا میں بیٹھے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر نعرے لگا رہے تھے۔"

"ہاں ان کو نعرے لگانے سے فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے دکان اٹھالی۔"

ڈاکٹر کمار ایک میدان میں نہیں ٹک سکا ہے، سیاسی پارٹیوں کے علاوہ تین چار ذرائع معاش بدل چکا ہے، ہومیو پیتھی اس کا چوتھا پیشہ ہے۔ ہر کام بڑے جوش و خروش سے شروع کرتا ہے لیکن جلد ہی تھک جاتا ہے اور ادھورے کام چھوڑنے کی اپنی روایت پر قائم رہنے کے علاوہ کسی قول یا کام پر قائم نہیں رہتا۔ اب سرکردہ پارٹی کا سرکردہ رکن اور ہومیو پیتھ ہے تو کچھ دن بعد یہ مہابیروں[1] کا دالعیر اور پرانی سرکاری عمارتوں کا چونا پلستر کرنے والا ٹھیکیدار بن سکتا ہے۔

حلوائی کی دکان میں داخل ہوتے ہوئے میں آشو سے پوچھتا ہوں۔

---

[1] کینتھرس ہومیو پیتھک دوا ہے جو کہ جلنے کے کام بھی آتی ہے۔

"ایک گلاب جامن کھاؤ گے یا دو؟"

"نہیں ڈیڈی! میں گنے کا رس پیوں گا۔ ادھر چلو۔" حلوائی کی دکان کے سامنے والے کھوکھے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"چلو۔" ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کروا کر پوچھتا ہوں۔ "بڑا گلاس پیو گے یا چھوٹا؟"

"بڑا۔"

میں دکاندار کو کہتا ہوں۔ "رس کا ایک بڑا گلاس تیار کردو۔ برف بالکل نہ ڈالنا۔ پیسے چاہے زیادہ لے لینا۔"

دکاندار دو منٹ انتظار کرنے کے لئے کہتا ہے۔

"میں برف ڈال کر پیوں گا۔"

"برف سے سردیوں میں زکام ہو جاتا ہے۔"

آشو میری طرف دیکھتا ہے لیکن جلد ہی دوسری طرف منھ کر لیتا ہے۔

"اچھا۔"

گنے کا رس بڑا گلاس لے کر آشو کے منھ میں لگاتا ہوں، وہ بمشکل آدھا پیتا ہے۔ "اور لو" کہہ کر میں اسے دو تین گھونٹ اور پلوا لیتا ہوں۔

"نہیں ڈیڈی۔ اور نہیں پیا جاتا۔"

میرا موڈ چائے پینے کا تھا لیکن بچا ہوا رس پیتا ہوں۔ پانچ کا نوٹ دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک پیکٹ سگریٹ دینے کو کہتا ہوں۔ دکاندار مجھے پیکٹ کے ساتھ بقایا دو روپے اور کچھ پیسوں کی ریزگاری دیتا ہے۔ نوٹ پینٹ کی پچھلی جیب میں ڈال کر ریزگاری بغیر گنے سائڈ پیکٹ میں ڈالتے ہوئے آشو سے پوچھتا ہوں۔

"اور کیا چیز لو گے؟"

وہ بچوں کے ماہنامے کی فرمائش کرتا ہے۔

"وہ بھی لے دوں گا اور کوئی چیز کھانی ہے تو بتلا دو۔"

وہ ماہنامہ کا نام دہراتا ہے۔

کتابوں کی دکان پر پہنچ کر ایک کی بجائے اس کی دو جریدوں کی فرمائش ہو جاتی ہے۔ اس کی فرمائش بھی پوری کرتا ہوں اور اپنے لئے بھی دو میگزین لے لیتا ہوں۔

آشو راستہ میں ہی چلتے ہوئے ماہناموں کی تصویریں دیکھنے لگتا ہے، اور کوئی کوئی جملہ پڑھنے لگتا ہے۔

"بیٹے چلتے ہوئے نہیں پڑھنا چاہئے۔ کسی سائیکل یا رکشا سے ٹکرانے کا ڈر رہتا ہے۔"

وہ جریدوں کو گول کر کے لپیٹ لیتا ہے لیکن توجہ ادھر ہی لگی رہتی ہے۔ بار بار اوراق الٹ پلٹ کر کے کچھ نہ کچھ پڑھ لیتا ہے۔

میں اس کے ہاتھ سے میگزین پکڑ لیتا ہوں۔

کچھ دیر چلنے کے بعد آشو پوچھتا ہے۔ "ڈیڈی! آپ کو گگی کیوں نہیں ملا ہے؟"

"بیٹے! اسٹور والوں سے میری واقفیت نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر انکل کو سب جانتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"میں بتلاؤں کیوں؟ وہ جلوس نکالتے ہیں نہ۔"

"ہاں۔"

"میں جلوس نکالا کروں گا۔"

"بیٹے! جلوس تو وہ نکالتے ہیں جن کو کوئی کام نہیں ہوتا۔ تم کو پڑھ لکھ کر بہت لائق بننا ہے۔"

میرے ہاتھ سے میگزین لیتے ہوئے کہتا ہے۔ "ایک تصویر دیکھنی ہے۔"

کھڑا ہو کر جریدوں میں سے کچھ تصویریں دکھانے کے بعد میں پرچوں کو لپیٹ کر چلنے لگتا ہوں۔

"ڈیڈی! یہ مجھے پکڑا دو۔ راستے میں نہیں پڑھوں گا۔"

اور مجھ سے میگزین پکڑ لیتا ہے۔

کچھ لمبے خاموش چلنے کے بعد آشو کہتا ہے۔ "ڈیڈی! میں بھی آپ کی طرح کہانیاں لکھا کروں گا۔"

"میری طرح زہر بھی پیا کرو گے۔"

ناگ پھنکار مار کر میرا خون چوسنے لگتا ہے۔

سماج کو کہانی کار کی نہیں سستے لیڈر کی ضرورت ہے (جو رعب اور واقفیت سے) ہتا یتی دلوا سکے۔ بگڑے کاموں کو سنوار سکتا ہو۔ ایک کہانی کار، افسانہ نگار کیا حیثیت رکھتا ہے، کیا وقعت ہے اس کی؟

کہانی کار یا افسانہ نگار کی بہ نسبت شاعر ہونا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ شاعر اپنے شعر، نظم، غزل یا گیت سنا کر لوگوں کو محظوظ کر سکتا ہے۔ شاعر مشاعروں سے نام اور روپے حاصل کر سکتا ہے۔ حلقۂ احباب میں ہر دل عزیز اور مقبول ہو سکتا ہے۔ ایک افسانہ نگار...

دیو کے مجبور کرنے پر میں اس کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے چلا گیا۔ شادی سے ایک روز قبل کاک ٹیل پارٹی کا انھوں نے اہتمام کیا۔ اسی کاک ٹیل پارٹی میں اپنے دوستوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے دیو نے کہا تھا۔ "یہ افسانہ نگار بھی ہیں۔"

"شاعر ہوتے تو محفل میں کچھ رنگ جمتا۔" جام کھنکناتے ہوئے ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے نے دہرایا تھا۔

نہیں بیٹے! میرے بچے، کہانیاں لکھنے کا یہ زہر نہ پینا۔ میری یہ آواز لبوں کے باہر نہیں آ سکتی، اندر ہی اندر باز گشت کرتی رہتی ہے۔

باب نو

"اس کو بھی اپنے جیسا بناؤ گے۔" گھر کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی سیما

---

[1] پتہ چلا ہے کتاب کار بی۔ ایل۔ ڈی (بھارتیہ لوک دل) میں شامل ہو گیا ہے۔

کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔

صحن تک پہنچتے پہنچتے گیتا جو کہ ٹیوشن پڑھا کر اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہے، اس کی آواز کانوں میں گرم پارہ انڈیلتی جاتی ہے۔

"ان کتابوں اور رسالوں پر مغزپچی کرنے کی بجائے دفتر کا کوئی امتحان پاس کیا ہوتا تو یہاں ساٹھ کی ترقی تو ہوتی۔"

میں کچھ نہ کہہ کر زخموں سے چور جسم کو گھسیٹ کر صوفے پر گرا دیتا ہوں۔ آنکھیں موند کر سوچنے لگتا ہوں۔ میں یہ زہر کب تک پیتا رہوں گا...

"میں یہ زہر نہیں پی سکتا۔"

ماں نے گیتی سے شادی کرنے کو کہا تھا تو میں چیخ اٹھا تھا۔ اس پر ماں نے جواب میں ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

"زندگی میں بہت سے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔"

"پہلے کم پی رہے ہیں کیا؟" کہہ کر میں تیزی سے پیر پٹکتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ سڑک پر اپنی لاش کے بوجھ کو گھسیٹ رہا تھا۔

ایک دم چونک اٹھتا ہوں۔ سلگتی سگریٹ انگلیوں تک پہنچ چکی ہوتی ہے ...جلن ...آگ ...آگ سے نیلو کی ادھ جلی نعش۔ کھوپڑی سے پگھل کر چہرے پر ڈھلکی ہوئی چربی اور آنکھوں کی بجائے دو سوراخ۔ سگریٹ کا آخری ٹکڑا فرش پر گرتا ہے۔

"ڈیڈی!" دروازہ کھلتا ہے۔ "کھانا کھا لو" کہتا ہوا آشو میز کے نزدیک آ جاتا ہے۔

"یہاں لا دو۔"

سلگ سلگ کر دم توڑتے سگریٹ کے ٹکڑے کو آشو بوٹ کے تلے سے مل کر باہر چلا جاتا ہے۔ صحن میں اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"آنٹی ڈیڈی کے لئے کھانا نکال دو۔"

نہ معلوم کتنے ثانیوں یا منٹوں کے بعد بھابی جی کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تھالی اور گلاس ہوتا ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ بھابی جی ہاتھ دھلواتے ہوئے کہتے ہیں۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم نہ گھر کا خرچ چلاتے ہو نہ کسی سے اچھی طرح بات کرتے ہو۔"

وہ گلاس کو میز پر رکھ دیتے ہیں۔ میں میز پوش کے لٹکے ہوئے کنارے سے ہاتھ پونچھنے لگتا ہوں۔

"کوئی روگ ہے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

میں خاموش رہ کر روٹی کا نوالہ توڑنے لگتا ہوں۔ وہ چلے جاتے ہیں۔ میں نے کتنے روگ پال رکھے ہیں۔ والدین کی ضد پر ہی میں شادی کا روگ پالنے کے لئے تیار ہوا تھا۔ میں اس کے لئے کوئی تقریب یا رسم نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت ماں باپ بھائی بہن سب نے کہا تھا کہ شادی سادہ طریقے سے اور بغیر کچھ لئے دیئے کے ہوگی۔

شادی سے پہلے میں نے سیما سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میرے خطوط میں اشعار یا رومانس سے لبریز جملے نہیں ہوتے تھے۔ دنیاوی حقیقتوں اور مسائل کا ذکر ہوتا تھا اور سادہ ڈھنگ سے شادی کی رسم پورا کرنے کی تلقین ہوتی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد سیما کی طرف سے خطوط کا سلسلہ بند ہو گیا۔

سیما کے باؤجی کو دفتر میں دیکھ کر مجھے حیرانگی ہوئی تھی۔ چپراسی کو دو کوکا کولا کہہ کر میں ریٹائرنگ روم میں ان کو لے آیا۔

"تم سیما کو خط لکھتے ہو؟" انھوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"آپ کے بڑے لڑکے رگھو سے پوچھ کر یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب کئی دن سے بند ہے۔"

"خط لکھنا بری بات نہیں ہے بیٹا! سیما نے بڑے چاؤ سے جہیز کا سامان تیار کیا ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہر کوئی چاہتا ہے کہ شادی میں دھوم دھام ہو۔ سیما بھی..."

میں اٹھ کر چلا آیا تھا اور کوکا کولا چپراسیوں نے پیا تھا۔

شادی سے کچھ دن پہلے بھائی صاحب نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"شادی دھوم دھام سے ہونی چاہئے۔"

"خرچ کون کرے گا۔ میرے پاس تو اپنے کپڑے سلوانے کے لئے بھی پیسہ نہیں ہے۔"

"میں کروں گا۔ رشتہ داروں میں ناک کٹوانی ہے کیا؟ گیتا کی بھی تو شادی کرنی ہے۔"

گیتا اس وقت بمشکل دس گیارہ سال کی ہوگی۔ اس کی تعلیم کی بہ نسبت بھائی صاحب کو اس کی شادی کی فکر تھی۔

ایک بار پھر سیما کے باؤجی دفتر میں آئے تھے۔ ہم دونوں ریٹائرنگ روم میں جانے کی بجائے باہر آ گئے۔ انھوں نے کہا۔

"آپ کے بھائی صاحب نے براتیوں کی خدمت کے لئے ہدایات بھیجی ہیں۔ تم تو سادہ ڈھنگ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ تمھارے بھائی صاحب جس طرح کی شادی چاہتے ہیں ہماری حیثیت سے باہر ہے۔"

"بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دے سکتا۔" کہہ کر میں دفتر میں چلا آیا۔

ڈولی آئے ابھی دو گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ بھائی صاحب اور بھائی صاحب سے بڑے بھائی صاحب (جو کہ لکھنؤ میں نوکری کرتے ہیں) اور دوسرے رشتہ داروں کو کہتے ہوئے سنے گئے۔ "لاٹ صاحب تو اپنے کپڑے تک نہیں سلوا سکے۔ اس کی پینٹوں اور قمیصوں کے لئے ادھار میں ہمیں کپڑا دلوانا پڑا ہے۔"

"ڈیڈی اور کیا لاؤں؟" پاس کھڑا آشو پوچھ رہا ہوتا ہے۔

"کچھ نہیں بیٹے۔" کہہ کر تھالی میں کٹوری رکھنے لگتا ہوں۔

جلدی سے کلا کر کے خالی گلاس تھالی میں رکھ دیتا ہوں۔ "یہ برتن لے جاؤ اور کمبل لا دو۔"

"اچھا۔" کہہ کر آشو جانے لگتا ہے۔

میں صوفے کی پشت کھول کر لیٹ جاتا ہوں۔ کمبل دینے کے بعد آشو کہتا ہے۔

"ڈیڈی! ایک لطیفہ سناؤں؟"

"نہیں بیٹے اب مجھے سونے دو۔" میں کمبل تان لیتا ہوں۔

(اس وقت) میرے دل و دماغ میں یہ جملہ بازگشت کرنے لگتا ہے۔

"یہ لاٹ صاحب تو اپنے کپڑے تک نہیں سلوا سکے۔"

عورتیں مجھے سہاگ کمرے میں ڈھکیل دیتی ہیں۔

سیما کہتی ہے۔ "آپ کہانیاں بھی لکھا کرتے ہیں۔"

"زندگی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔"

میں ادھار کی پتلون اور قمیص اتار دیتا ہوں۔

نیلو۔ فراک... جمپر اتارنے لگتی ہے۔

"سادہ شادی کہہ کر آپ نے باؤجی کو چار ہزار کا مقروض بنا دیا۔"

سیما کی آواز سن کر مجھے لگتا ہے کہ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اس احساس کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نیلو... سیما کو بھینچنے لگتا ہوں۔

"اپنی کہانیاں ہمیں بھی سنایا کرو۔" ایک دن سیما فرمائش کرتی ہے۔

چھپی ہوئی کہانیوں کی فائل اسے دے دیتا ہوں۔

عورتوں سے فرصت پا کر وہ کہانیاں پڑھتی اور رات کو مجھے کہتی۔

"آج کل۔ آپ کی آر کہاں ہے؟"

"میری۔ آر؟"

"انو پا کے پیچھے تو آپ دیوانے ہو رہے ہیں۔"

"..."

"درشا بھی کم حسین نہیں۔ کبھی چائے پر بلا دینا۔ ان میں کوئی شادی میں آئی تھی یا نہیں۔"

یہ سب اخبار میں چھپی کہانیوں کی ہیروئنوں کے نام تھے۔

ماہناموں میں چھپی ہوئی کہانیاں اسے سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہتی ہے۔

"یہ بھی کوئی کہانی ہے، اس سے تو اخباروں میں چھپی ہوئی کہانیاں اچھی ہیں۔"

اب تو ہماری نوک جھونک ہونے لگی ہے۔ کتابوں اور کہانیوں کو وہ اپنی سوت سمجھنے لگی ہے۔

قرض لے کر حیثیت سے زیادہ دھوم رچا کر بھائی صاحب نے اپنی ناک تو رکھ لی لیکن میری جان قرض کے شکنجے میں پھنسا کر الگ ہو گئے۔ کوئی قرض خواہ ان سے تقاضا کرتا تو میرے پاس آ کر کہتے۔ "فلاں آیا تھا۔ اس کے پیسے دو۔"

"پیسے کہاں سے دوں؟ پیسے میرے پاس کہاں ہیں؟ کیسے ادا کروں؟"

"تمھاری شادی کے لئے قرض لیا تھا۔ یہ قرضہ تو تجھے اتارنا پڑے گا۔"

سیما کے زیور گروی ہونے لگے اور پھر سنار کے پاس بکنے لگے۔

"مصالحے دار کراری چاٹ۔" کی صدا سن کر ہری اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اور الگ الگ کاغذوں میں دو جگہ چاٹ بنوا لایا تھا۔ چاٹ کا ایک کاغذ مجھے دے کر دوسرا لئے اپنی سیٹ پر چلا گیا تھا۔ ککڑی، آلو، کچالو کا ایک ایک ٹکڑا کھاتے ہوئے میں کام بھی کرتا رہا۔

چاٹ ختم کرنے کے بعد کاغذ پر لگے مصالحے کو چاٹنے لگا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر نیلو کی ادھ جلی لاش کی تصویر تھی۔ نیلو کی نعش کی تصویر اخباروں کے علاوہ ہفت روزہ اور دو تین ماہناموں میں بھی چھپی تھی۔ تصویر کی سرخی میں نہیں پڑھ سکا تھا۔ کاغذ کا ٹکڑا میرے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ اور میں یکے بعد دیگرے سگریٹیں سلگاتا رہا تھا۔

میں شور سن کر چونکا تھا۔ میری سیٹ کے پاس ہی آگ کی لپٹ نکل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں بت بنا بیٹھا رہا تھا۔ دفتر کے دو تین بابوؤں نے مجھے پکڑ کر اٹھایا تھا۔

کچھ فائلیں جل گئی تھیں۔

مجھے چارج شیٹ ملی تھی۔

یونین والوں نے کہا تھا۔ "منکر ہو جاؤ۔ معاملہ ہم سنبھال لیں گے۔"

"کیسے منکر ہو جاؤں؟ کاغذ کو آگ میرے سگریٹ کے ٹکڑے سے لگی ہے اور..."

کمرے کے پٹ کھلتے ہیں، قدموں کی آہٹ، ایک کی نہیں، دو کی ہے۔ یہ دونوں، آشو اور سیما ہیں۔ میرے سرہانے کی طرف بیٹھتی ہے اور آشو پاؤں کی طرف... میں جانتا کہ یہ دونوں شرط لگا کر آئے ہوں گے کہ میں کس کی بات مانتا ہوں۔ آشو میرے پاؤں کی طرف بیٹھا ہے۔ میں اس کی مانگ پوری کر دوں گا۔ آشو میرے سرہانے بھی آ کر بیٹھ جاتا تو بھی کوئی بات بنا کر اس کی ہی مانتا۔ کمرے میں کوئی نہیں ہوتا۔ ہوا کے جھونکے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

ادھر کے زیور تو سیما... روتے کڑھتے ہوئے دے دیتی تھی۔ میکے سے لائے ہوئے زیوروں کا نمبر آیا تو گھر میں فساد کھڑا ہو گیا۔

فائلوں کے جلنے کی سزا میں میری تبدیلی گھر سے پینتیس میل دور ہو گئی۔

میں نے وہاں رہنا چاہا تو سیما نے آشو سے کہلوایا۔

"ڈیڈی ہمیں وہاں لے چلو۔"

"ہم یہاں کس لئے رہیں۔" سیما نے ضد کی۔

مجبوراً مجھے آنے جانے کا سلسلہ اختیار کرنا پڑا۔ ستر میل کے سفر خرچ کے علاوہ جسمانی اور ذہنی طور پر تھک جاتا۔ افسروں نے مجھے پریشان کرنے کے لئے پختہ ارادے کر لئے۔ چار مہینے تک تنخواہ نہ دی۔ بسوں کے کرائے کے لئے کبھی سیما کی منتیں کرتا تو کبھی آشو کی گولک توڑتا...

بتاجی اور بھائی صاحب یقین نہیں کرتے تھے کہ سرکاری نوکری میں چار مہینے تک تنخواہ نہیں ملتی۔

ہر دوست اور واقف کار کا میں قرض دار ہو گیا۔ بعض کنی کترانے لگے۔

ایک دوست سے دو تین بار پہلے معمولی معمولی رقم ادھار لے چکا تھا۔ ڈیوٹی پر جانے کے لئے، بس کے کرایہ کے لئے، جیب میں پیسے نہ تھے۔ اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ مجھے باہر ٹھہرنے کو کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گیا، خود باہر نہیں آیا، بیوی کے ہاتھ دس روپے کا نوٹ بھیج دیا۔ وہ دس کا نوٹ پکڑتے ہوئے میں اپنی نظروں میں آدھا چوتھائی ہو گیا تھا۔ اب بھی اس کے گھر جاتے ہوئے میں اپنی نظروں میں آدھا چوتھائی ہو جاتا ہوں۔

حلق خشک ہو رہا ہے۔ پانی... کون اٹھ کر جائے۔ سگریٹ سلگاتا ہوں۔ کمرے کے دروازے، کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے کچھ ہی دیر میں دھوئیں کے بادل تیرتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔

بپا جی کو بخار آنے لگا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے انفلوئنزا کی دوا دی، دو تین دن بعد میعادی بخار ہونے کا شبہہ ظاہر کیا۔ اس کے چار پانچ دن بعد ایک اور ڈاکٹر کو گھر بلا کر معائنہ کروایا تو اس نے پھیپھڑوں میں کچھ خرابی ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا اور ایکس رے کروانے کا مشورہ دیا۔

ایکس رے کے لئے سولہ روپیوں کی فکر ہونے لگی۔

بھائی صاحب نے میرے لئے قرض کی پتلون اور قمیص سلوانے کے بعد مجھ سے تقریباً قطع تعلق کر لیا تھا۔ گھر آتے، بپا جی کی مزاج پرسی کرتے اور کوئی پھل فروٹ دے کر چلے جاتے۔ گیتا کو ٹیوشن کی فیس دو ہفتے میں ملتی تھی اور اس کو خود کالج میں اپنی فیس جمع کروانی تھی۔ اس کا دوپٹہ بھی تار تار ہوتا جا رہا تھا۔

سیما کو ہاتھ کی چوڑیاں دینے کو کہا تو بپھر گئی۔

"یہ تمھارے باپ نے نہیں، میرے باپ نے بنوا کر دی تھیں۔"

"میرا باپ تمھارے باپ کی طرح ہے، یہ تجھے دینی پڑے گی۔" ہاتھ بڑھا کر میں نے چوڑیاں اتارنا چاہی تھیں۔

"مر جاؤں گی پر..."

"آج میں تجھے مار بھی دوں گا۔"

"کیا شور مچا رکھا ہے؟ کسی کو دو منٹ کے لئے مرنے بھی دو گے یا نہیں؟"

دوسرے کمرے سے بپا جی چلائے۔

سوتا ہوا آشو جاگ کر سہما ہوا پڑا رہا۔

غصہ سے بھری گیتا نے کمرے میں آ کر کہا۔ "کیوں مراثی بن رہے ہو۔ لڑ لینے دو اسے اپنے کفن کے لئے، ماں مر گئی ہے۔ باپ بھی..." روتی ہوئی گیتا باہر چلی گئی۔

میں نے سیما کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اپنی منحوس شکل اپنے باپ کے پاس لے جا۔ کبھی یہاں پاؤں نہ رکھنا۔" غصہ سے بھرا ہوا میں گھر سے باہر نکل گیا۔

ایک دوست کے پاس جا کر سود کے کچھ روپے دلوانے کے لئے کہا تو اس نے کہہ کر ٹرخا دیا کہ سود پر روپے دینے والے آج کل کوئی چیز گروی رکھے بغیر نہیں دیتے پھر بھی کوشش کروں گا۔

ایک اور واقف کار کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ٹوٹا ہوا سا گھر لوٹنے لگا۔ سیما کا خیال آنے پر پھر رگوں میں تناؤ آ گیا۔ اس کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹنے گھسیٹنے...

"مجھے معاف کر دو۔" کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ سیما میرے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

ٹی بی کلینک میں بپا جی کا ایکس رے کروایا گیا۔

ڈاکٹر انچارج نے کہا۔ "پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا ہے۔ چھ مہینے لگاتار علاج کروانا پڑے گا۔ ہفتہ میں ایک دن آ کر سات دن کی دوا لے جایا کرنا۔"

گولیاں، ٹیکے اور ٹانک تجویز کیا۔ گولیاں اور ٹیکے ہسپتال سے مل جاتے، ٹانک بازار سے خریدنا پڑتا۔ ہسپتال میں ٹیکہ لگوانے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے گھر پر ٹیکہ لگوانے کا انتظام کرنا مناسب لگا۔ ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر ٹیکہ لگانے کے لئے آتا اور ٹیکہ لگا کر ایک روپیہ لے جاتا۔ ہسپتال سے مفت ملے ٹیکے لگوانے کی فیس روپیہ دینا بہت کھلتا۔ خود ٹیکہ لگانے کا ڈھنگ سیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرنج، سوئیاں اور روئی لے آیا اور اسی کمپاؤنڈر کی مدد سے ٹیکہ لگانے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں ٹیکہ لگا لینے کا مجھے اپنے پر اعتماد ہو گیا۔

اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ہومیو پیتھی بھی کوئی پیتھی ہوتی ہے...

حلق اور لب خشک ہونے لگتے ہیں۔ پانی پینے کے لئے اٹھتا ہوں۔ بپا جی گردن جھکائے باہر جا رہے ہیں۔

ماں زندہ تھی تو بپا جی خود کو اس گھر کا مالک سمجھتے تھے۔ تھالی میں کھانا ڈالنے میں ذرا دیر ہو جاتی تھی تو دنیا کو سر پر اٹھا لیتے تھے۔ ان کا گھر میں ہونا اڑوس پڑوس والوں کو فوراً پتہ چل جاتا تھا (کیوں کہ اونچا بولتے تھے اور بات بات پر ڈانٹتے رہتے تھے)۔ صبح ہنومان چالیسہ کا پاٹھ کرتے ہوئے بھی ٹوکا ٹوکی کرتے رہتے تھے۔ اب وہ اپنے کو گھر کا مالک نہیں، مجبور دوسروں کے سہارے جینے والا فرد خیال کرتے ہیں۔ ماں کی موت کے بعد انھوں نے کئی دن تک پاٹھ نہیں کیا تھا۔ اور دیوی دیوتاؤں کے تصویروں کے آگے دھوپ نہیں جلائی تھی۔ ان کے گھر میں ہونے نہ ہونے کا اڑوس پڑوس والوں کو کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کبھی کبھی ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اس گھر کا مالک ہوں۔

مٹکے سے پانی کا بھرنے کی بجائے نل کھول کر دو چار گھونٹ پانی پیتا ہوں۔

"چائے تو نہیں پئیں گے؟"

"نہیں۔ ابھی تو مجھے سونا ہے۔" سیما کو جواب دے کر کمرے میں آ کر لیٹ جاتا ہوں۔

بپا جی ایک بیوپاری کے پاس ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن بیماری کے دوران پچاس ساٹھ روپے مہینے کے ملتے رہے۔ یہ تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ تنکے کے سہارے اکھڑی سانسوں اور زائل ہوتی ہوئی قوت کو یکجا کرنے کے لئے کچھ پل تو مل جاتے ہیں لیکن بغیر کسی اور دوسرے سہارے کے کوئی ورطہ سے بچ کر ساحل تک نہیں پہنچ سکتا۔

ضلع افسر کے پاس جا کر بپا جی کے پلوریسی میں مبتلا ہونے اور گھر کے ناگفتہ بہ حالات بیان کرتے ہوئے میں تبدیلی اور تنخواہ کے لئے گڑگڑایا۔ وہ مجھ پر برس پڑے۔

"پہلے فائلوں کو آگ لگائی تھی۔ اب دفتر کو آگ لگانے کا ارادہ ہے کیا؟"

میں ذلت کا بوجھ اٹھائے اپنے کو دفتر سے گھسیٹ لایا۔ ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔

بپا جی کہتے۔ "چھٹی کی کیا ضرورت ہے۔ ٹیکہ لگا کر اپنے کام پر چلے جایا کرو۔"

"آپ کو یہ شک ہے کہ آپ کی غیر حاضری میں بپا جی کی تیمارداری اچھی

طرح نہیں کروں گی۔" سیما کہتی۔

گیتا بھی نصیحت کرتی۔ "چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے ہو۔ افسر ناراض نہ ہوں گے تو کیا خوش ہوں گے۔"

سب کچھ سنتا پر کسی کو یہ نہ کہتا۔ "بجز تنخواہ کے ہر روز بسوں کا کرایہ ادا کرنے کے لئے ساڑھے تین روپے کہاں سے لاؤں؟"

کئی بار مجھے لگتا ہے کہ ڈرامائی لمحوں سے ہم اپنا دامن نہیں بچا سکتے (یہ لمحے کسی ناول، کہانی یا ناٹک کا حصہ معلوم ہوتے ہیں) کئی بار یہ ڈرامائی لمحے اپنے تیز نوکیلے نیزوں سے اچھے بھلے کو لہولہان کر دیتے ہیں تو کئی بار انھیں تیز نوکیلے نیزوں سے کسی لہولہانی کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

گرور کھی چوڑیوں سے حاصل ہوئے دام ختم ہوا چاہتے تھے۔ فکر کی جونک چمٹ گئی... ٹیکہ لگانے کے بعد سرنج صاف کرنے لگا تو گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ نئی سرنج خریدنے کے لئے کیمسٹ کی دکان پر گیا۔ اتفاق ہے وہاں ایک واقف کار پروفیسر دوا لینے کے لئے آ گئے۔ رسمی گفت و شنید کے بعد انھوں نے میری دکھتی رگ پکڑ لی... بہت دنوں بعد کسی سے ہمدردی بھرے الفاظ سنے تھے۔

انھیں پری میڈیکل کے امتحان کا پریکٹیکل لینے کے لئے ضلع ہیڈکوارٹر کے کالج میں جانا تھا۔ ہمارے ضلع افسر نے نائب تحصیلدار کو ٹیلی فون کر کے اپنے لڑکے کا نام اور رول نمبر لکھوایا تھا۔ نائب تحصیلدار اور پروفیسر کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ پروفیسر نے مجھے اور تو کچھ نہیں بتلایا (یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا) تبدیلی اور تنخواہ کے لئے عرضیاں لکھ کر لانے کو کہا۔

امتحان کے پہلے دن انھوں نے ہمارے افسر کے لڑکے کو کالج میں بلوا کر کہا۔ "بچو! پریکٹیکل میں پاس ہونا ہے تو یہ تبدیلی کے آرڈر اپنے ڈیڈی سے کروا لاؤ۔ اور نمبر زیادہ لینے ہیں تو چار مہینے کی تنخواہ چار دن کے اندر اندر بھجوا دو۔"

پروفیسر صاحب نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "دونوں درخواستیں لے کر لڑکا اپنے ڈیڈی کے پاس چلا گیا۔ اس کا امتحان تیسرے دن تھا۔ شام کو ہی لڑکے کے باپ یعنی تمھارے آفیسر نے کھانے پر مدعو کر لیا۔ تمھاری تبدیلی کے حکم کی ایک نقل دینے کے بعد کہا۔ "تنخواہ کا بل خزانے بھجوا دیا ہے۔" اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا۔

میں اپنے شہر میں تبدیل ہو کر آیا تو میری جیب میں چار مہینوں کی تنخواہ تھی۔ سیما کی گرور کھی چوڑیاں چھڑوانے اور پروفیسر صاحب کے اعزاز میں تین چار دوستوں کو مدعو کر کے کاک ٹیل پارٹی کرنے کے بعد بھی میری جیب میں کچھ روپے بچ رہے تھے (اسی کاک ٹیل پارٹی میں پروفیسر نے سب کچھ بتلایا تھا اور افسر کہہ کہہ کر طنزیہ جملے اچھالتے ہوئے بلند بے باک قہقہہ لگا رہے تھے) جس سے سیما اور گیتا کے لئے میں نے ایک ایک سوٹ سلوا دیا تھا۔

جھلتے رہنے کے بعد سستانے کے لئے ایک پڑاؤ تھا۔

ایام کی گردش بدستور رہی۔ میں پڑھنے لکھنے کی لت سے مجبور تھا۔ دوبارہ سیما نے اس امید سے چوڑیاں گرور کھنے کو دے دیں کہ واپس آ جائیں گی۔ ان چوڑیوں کے بعد گلے کے ہار اور انگوٹھیوں کا نمبر لگ گیا۔ جس دن کان کے آویزوں کے علاوہ سیما کے پاس کوئی زیور نہ رہ گیا تو میرے لبوں پر تلخ مسکراہٹ تھی اور میری فرمائش پر وہ اپنا عروسی لباس پہن کر رات کو میرے ساتھ لیٹی تھی۔

باب دس

"میں زہر پیوں گا۔ مجھے زہر چاہئے!"

"چائے بناتی ہوں۔ چلا کیوں رہے ہو؟" سیما دوسرے کمرے یا صحن میں سے اونچی آواز میں کہتی ہے۔

میں آنکھیں جھپکاتا ہوں۔ کمرے میں ایک چوہا پھدک رہا ہوتا ہے... نیند میں خواب دیکھا تھا۔ خواب میں شاید بڑبڑایا یا چیخا تھا۔ سیما نے سمجھا شاید میں چائے مانگ رہا ہوں۔

خوابوں کو اکثر میں بھول جاتا ہوں۔ بس کچھ دیر کے لئے دھندلا سا عکس ذہن میں رہتا ہے۔

میں صحراؤں کا متھن کرتے کرتے جھلس جاتا ہوں، ہاتھوں، پیروں، بدن اور چہرے پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں چیچک کا شکار ہو گیا ہوں۔ چہرے، بدن، ہاتھوں اور پیروں میں آبلے ہونے کے باوجود میں صحراؤں کا متھن کرتا رہتا ہوں۔ آبلوں سے پھوٹ کر مواد بہتا رہتا ہے۔ مجھے ایک سنہری بکس اور دوسرا آب خورہ جس پر 'زہر' لکھا ہوتا ہے دکھائی دیتا ہے۔ میری نظریں کبھی سنہری بکس کی طرف لپکتی ہیں۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا ریت کے سمندر میں ڈوبتا چلا جاتا ہوں۔ میری ٹانگیں، بدن اور گردن ریت کے سمندر میں ڈوب جاتی ہیں... دونوں ہاتھ پھیلا کر میں زہر کے آبخورے کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں لیکن جدوجہد کرنے کے باوجود قدم نہیں سرکتے تو چلا اٹھتا ہوں۔ "میں زہر پیوں گا۔ مجھے زہر چاہئے!"

جس سے سیما نے سمجھا میں چائے کے لئے چلا رہا ہوں۔ چائے کا مگ میز پر رکھنے کے بعد سیما میری پیشانی کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پیشانی پر پسینے کے قطروں کو دیکھ کر اسے تشویش ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" جھٹکے سے کمبل پرے کر کے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

"اب لیٹنا تو نہیں؟" سیما پوچھتی ہے۔

"نہیں۔" باہر کی طرف جاتے ہوئے جواب دیتا ہوں۔

سیما صوفے کی پشت کھڑی کرنے لگتی ہے۔

پیشاب کرنے اور منہ پر پانی چھینٹے مارنے کے بعد تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔

سیما وہاں نہیں ہوتی۔ کھڑکیاں کھولنے لگتا ہوں۔ باہر گلی میں کھیل رہے بچوں کا شور سنائی دیتا ہے اور ان کی شکلیں بھی۔

"کھیسو سیٹھ؟"

"مردہ باد!"

بچوں کا نعرہ گونجتا ہے۔

"اس نے بلیک کی ہے۔ اس کا منہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کر جلوس

نکالا جائے!" آگے بڑھ کر آشو کہتا ہے۔

ایک بچہ اپنے گھر کی طرف لپکتا ہے۔

میں چائے کا مگ اٹھا کر کھڑکی کے پاس آ جاتا ہوں۔

"اس کھیسو نے ملاوٹ کی ہے۔ کھیسو سیٹھ!"

"مردہ باد!"

وہ لڑکا جو اپنے گھر گیا تھا۔ پیچھے ہاتھ کئے ہوئے آتا ہے۔ اپنے ہاتھوں لگائی ہوئی توے کی کالک کھیسو سیٹھ کے منہ پر ملنے لگتا ہے۔ کھیسو کا منہ کالا ہو جاتا ہے۔

"اب اس موٹے کھیسو کو گدھے پر بٹھاؤ!" آشو تجویز کرتا ہے۔

"موٹا کھیسو!" ایک اونچی آواز میں کہتا ہے۔

"ہائے ہائے!" بچوں کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔

ایک لڑکے کو گدھا بنایا جاتا ہے۔ دوسرے لڑکے اس کی پیٹھ پر کھیسو کو بٹھانے لگتے ہیں۔

آشو اور میری نظریں ٹکراتی ہیں۔ وہ دوڑتا ہوا نعرہ لگاتا ہے۔

"کھیسو سیٹھ!"

"مردہ باد!"

"بلیک کرنے والا کھیسو!"

"ہائے! ہائے!" دوسرے بچے نعرہ لگاتے ہیں۔

آشو میرے پاس آ کر کہتا ہے۔ "ڈیڈی! میں نے رسالے میں ناٹک پڑھا تھا۔ اب بچوں کو کھلا رہا ہوں۔"

"شاباش! جاؤ کھیلو۔"

آشو دوڑ جاتا ہے۔ میں خالی مگ ہاتھ میں لئے بچوں کا یہ جلوس دیکھتا رہتا ہوں۔ نعرے لگاتے بچوں کا جلوس گلی کا موڑ مڑ جاتا ہے۔

میں میز پر آ کر کل کی کہانی کے ادھورے مسودے کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔ کچھ حروف اور جملے کاٹتا جاتا ہوں، کچھ حروف اور جملے کاغذ کے کونوں یا سطروں کے درمیان لکھتا جاتا ہوں۔ اب تک لکھے ہوئے کو دوبارہ پڑھنے لگتا ہوں۔

کانت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

لپک کر دروازہ کھولتا ہوں۔

میز پر بکھرے کاغذ اور قلم کو دیکھ کر وہ کہتا ہے۔ "غلط وقت پر آ گیا ہوں۔"

"بہت ٹھیک وقت پر آئے ہو؟"

"چائے گھر پر نہیں باہر چلے گی۔"

کاغذ سمیٹ کر الماری میں رکھتا ہوں۔ گلی میں کھلنے والے دروازہ کی چٹخنی لگا کر، صحن کی طرف سے ہو کر ڈیوڑھی سے گذرتے ہوئے دیوار پر مچلتی ہوئی دھوپ دیکھ کر کانت ٹھٹھک جاتا ہے۔ ڈیوڑھی کی چھت کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہے۔

"رومانی منظر نگاری کب سے شروع کر دی؟"

"موسم برسات سے۔"

چھت کی ایک کڑی کئی دنوں سے تڑخی ہوئی تھی۔ کسی وقت بھی گرنے کا اندیشہ تھا۔ آتے جاتے ہوئے میں اس کڑی کو دیکھا کرتا تھا۔ اور ہر بار دل میں یہ خیال آتا تھا کہ یہ کڑی زیادہ دن نہیں ٹک سکے گی۔ اس کو بدلوانے کے لئے پیسوں کا مجھ سے انتظام نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن کانت ہی نے کہا تھا۔ "بدلوا نہیں سکتے تو اسے اتروا ہی دو۔"

میں ایسا کرنے کے لئے ٹال مٹول کرتا رہا۔

آنے جانے والوں، دوستوں نے کہنا شروع کر دیا۔

"اس کے گھر جانا ہو تو پہلے بیمہ کروا لینا!"

برسات کی ایک بارش ہونے کے بعد دوسری ہو رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا گھر آتا ہوں۔ ایسا وجدان ہوتا ہے کہ یہ تڑخی ہوئی کڑی کسی لمحہ بھی گر سکتی ہے۔ نہاتے ہوئے آشو کو پڑوس سے سبل لانے کے لئے بھیجتا ہوں۔ خود اس چھت پر جانے لگتا ہوں تو سیما اور گیتا روک دیتی ہیں۔

"گر پڑو گے کوئی چوٹ لگ جائے گی۔"

"چوٹوں کے لئے مرہم اور پٹیوں کی تلاش کا مجھے شوق ہے۔"

کچھ نہ کہہ کر دوسری چھتوں سے ٹپکتی جگہوں کو بند کرنے کے لئے چکنی مٹی بالٹی میں ڈال کر اوپر چلا جاتا ہوں۔

آشو آ کر صحن میں سبل رکھتا ہی ہے کہ تڑخی ہوئی کڑی کا ملبہ کڑک سے نیچے گرنے لگتا ہے۔ کچھ اینٹیں گلی میں گر جاتی ہیں۔

بارش بند ہونے کے بعد میں نے اس کڑی کے باقی ماندہ ملبے کو صاف کرنے کے بعد دوسری کڑی جو کہ معمولی تڑخ گئی تھی گرانا چاہا تو سیما اور گیتا چلا پڑیں۔

"ساری چھت گر جائے گی!"

آتے جاتے ہوئے اس نئی تڑخی ہوئی کڑی کو دیکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تڑخن کا طول و عرض بڑھتا گیا۔ اینٹیں بھی نیچے کو ڈھلک آئیں۔ پڑوسی کے گھر سے دوبارہ سبل منگوائی۔ دروازہ بند کر کے اس کڑی سے ملبہ نیچے گرا دیا۔ یہ لکڑی دو دن جلانے کے کام آئی۔

معاً مجھے گھر میں ڈرائنگ روم کے علاوہ باقی کمروں کے کچے فرش کا خیال آتا ہے۔ چوہوں نے کئی جگہ سوراخ بنائے ہیں۔ پرانی رکھی ہوئی زنک فاسفائڈ یاد نہیں کہ کہاں رکھی ہے۔ سیما کئی بار چوہے مارنے کی دوا لانے کو کہہ چکی ہے۔

دوست مشورہ دیتے ہیں۔ آدھا مکان فروخت کر کے باقی ماندہ حصے کو اسی رقم سے پختہ کروا لو۔ ایک دو دوستوں کے علاوہ کسی کو نہیں کہہ پایا کہ مجھ سے بڑے دو بھائی بھی ہیں۔

گلی کی نالی میں پڑے چیتھڑے میں گائے منہ مار رہی ہوتی ہے۔

"ہم گائے بھگت ہیں۔"

شاعر اور تنقید نگار، کانت نے کالج میں لیکچرار بننا چاہا تھا لیکن باپ کی طرح ہومیو پیتھ بننا پڑا۔ ہومیو پیتھی کے مطالعہ کی تلقین مجھے کانت سے ملی تھی۔ کانت ہی نے بے کار کمار کو ہومیو پیتھی کی دکان کھلوا دی تھی۔ کمار جس نے کانت سے دوا کی پڑیا باندھنا، مرض کی تشخیص کرنا اور دوا کا انتخاب کرنا سیکھا تھا اس کو اپنا رقیب سمجھنے لگا

تھا۔ کچھ دن تک یہ کمار کی کوشش رہی تھی کہ کانت کے گاہک مریض توڑ لئے جائیں لیکن ہر میدان کی طرح اسے یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کچھ دیر خاموش چلتے ہوئے ہم سگریٹ کے کش لگاتے رہتے ہیں۔

میں اپنی واپس شدہ کہانی کا ذکر کرتا ہوں تو کانت ہنس کر کہتا ہے۔

"کہانی بھیجنے سے پہلے مدیر صاحب کی خدمت میں کوئی سفارش یا رشوت پہنچادی ہوتی۔"

تمہارے گیت میری کہانیاں رسالوں میں سفارش اور رشوت سے چھپتی ہیں۔"

"کہانی یا تخلیق کے واپس آنے سے یہ فیصلہ قطعی نہیں ہو جاتا کہ تخلیق کمزور یا غیر معیاری ہے۔" کانت سنجیدگی سے کہنے لگتا ہے۔ "ادب میں رشوت یا سفارش کا شاید کوئی مقام نہ ہو لیکن گروپ ازم ضرور حاوی ہوتا جارہا ہے۔ کسی تخلیق کا پسند یا ناپسند ہونا جریدہ کی پالیسی اور معیار پر منحصر ہوتا ہے۔ مدیر کی ذاتی پسند یا ناپسند کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ مدیر کا موڈ آف ہو تو اچھی سے اچھی تخلیق واپس کر سکتا ہے۔ موڈ خراب ہونے کی وجہ بیوی بچوں کی طرف سے کوئی پریشانی، دوستوں کی بے وفائی یا پیٹ کی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔ کسی ایک ادارے سے تخلیق بے اعتنائی کا شکار ہو کر واپس لوٹی ہے تو دوسرے ادارے نے شکریہ کے ساتھ قبول کر کے مناسب جگہ پر شائع کیا ہے۔ میرے ویسے کئی گیت پڑے ہیں، جو کہیں نہیں چھپے ہیں۔ اسٹیج پر سناتا ہوں تو خوب داد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ اس میدان کے خلیفہ بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ذرا ماچس دینا!"

سگریٹ سلگانے کے بعد اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ "ہم قلم کار زہر پینے کے عادی نہیں تو تخلیق کے واپس آنے کا زہر پینے کے لئے بھی ہمیں ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔"

ہم پارک میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک گوشے کی طرف بڑھتے ہوئے کانت اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

"جو زہر ہم پیتے ہیں اس کا ہمارے شعور اور تحت شعور میں متھمن ہوتا رہتا ہے۔ جس سے یہ زہر potencised ہو کر نکلتا ہے جس میں زہر کو مارنے کی قوت ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم کسی چوراہے میں ڈھیر ہو جائیں اور ہماری لاشیں کوے، چیلیں اور گدھ نوچنے لگیں۔"

"گرودیو! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ تم کو کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" کمار آتے ہی ایک سانس میں کہنے لگتا ہے۔ "تمہارے افسانہ نگار تو خودکشی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں دو منٹ لیٹ ہو جاتا تو اس کی لاش چھت پر لٹکتی ملتی۔"

کانت مسکراتا ہے۔ "کچھ لوگوں کی عادت بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے لئے دس بیس ضرب دینے کی ہوتی ہے۔ تم کتنے سے ضرب دیا کرتے ہو؟"

"اسے صفر کو سو اور ہزار سے ضرب دینے کا شوق ہے۔"

"گرو! اب تم دو ہو؟"

"تم سے طاقتور ہوتا تو تم کو ضرور پیٹتا۔" کانت اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہم نے چائے منگوائی ہے، تمہارے لئے بھی منگوائی جائے؟"

سگریٹ سلگا کر، "نہیں گرو۔ میں قائم ہوں!"

چھوٹو دو گلاس چائے رکھ کر چلا جاتا ہے۔

"گرودیو! کل سے افسانہ نگار صاحب کا تو موڈ خراب ہے۔ تم ہی مسائل پر تبادلۂ خیالات کر لو۔ آج رات کو گاندھی میدان میں تقریر کرنی ہے۔"

"اس لئے ابھی سے لنگوٹے کسنے شروع کر دیئے۔ اس حالت میں قائم رہ سکو گے؟" کانت شبہ ظاہر کرتا ہے۔

"گرو۔ اس کی تم فکر نہ کرو خود آ کر دیکھ لینا۔"

مجھے چائے کے گھونٹ بھرتا دیکھ کر وہ کہتا ہے۔

"ادیب صاحب اب دو گھونٹ میں جلتی جلتی چائے پی جائیں گے۔ کہانیوں کے مقابلہ میں تو شاید یہ کوئی انعام حاصل کر سکیں۔ اگر گرم گرم چائے پینے کا بین الاقوامی مقابلہ ہو جائے تو یہ پہلا انعام حاصل کر لیں۔"

"آج تقریر کی بجائے شادی کے بعد والے عشق کی داستان سناؤں۔"

کانت کی اس بات پر وہ اس طرح اچھلتا ہے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"میں کوئی شاعر یا افسانہ نگار ہوں؟"

"بقول پریم چند اپنے کو دھوکا دینے کے لئے ہمارے پاس بہت سے بہانے ہوتے ہیں۔ اپنے کو کب تک دھوکا دیتے رہو گے؟"

"جب تک سانس کا کھیل جاری رہے گا۔" کہہ کر میں خود ہی اداس ہو جاتا ہوں۔

"تقریر کرنے کی بجائے سوشل سروس کرو۔" کانت کے الفاظ مجھے سنائی دیتے ہیں۔ "آوارہ گائے چھوڑنے والوں کے خلاف مہم کرو۔ تمہارے شہر میں گائیں چیتھڑے چباتی پھرتی ہیں۔"

"بس۔ گرودیو۔ آج جلسے میں کہنے کے لئے مجھے بہت کچھ مل گیا۔ اس موضوع پر مخالف گروپ والوں کی دھجیاں اڑا دوں گا۔"

وہ حسب عادت پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے اٹھتا ہے۔

"رات کو گاندھی میدان میں جلسہ سننے آنا۔ آ رہے ہو نا؟ تم لوگوں کی بدولت۔"

"مجھے پینے کو مل جاتی ہے۔" کانت ڈاکٹر کمار کی بات کاٹ کر جملہ اچھالتا ہے۔

"ہی ہی ہی۔ آ رہے ہو نا۔ جلسہ سننے ضرور آنا۔"

چھوٹو چائے کے خالی گلاس اٹھا کر چلا جاتا ہے۔ سگریٹ اور چائے کے دام کانت پہلے دے آیا تھا۔

ہم ادبی گفتگو شروع ہی کرتے ہیں کہ دفتر کے بابو لوگ آ جاتے ہیں، ان کی باتیں اپنے دائرہ سے باہر نہیں ہوتیں۔ وہی یونین کی باتیں۔ منیجر کا رویہ، آپس کی چغلیاں، جملے بازی، قہقہے...

ان سے اجازت لے کر اٹھتے ہیں تو پارک کے گیٹ پر ایک واقف کار اپنی بیوی بچوں سمیت مل جاتا ہے۔ سلسلۂ گفتگو 'نمستے جی' سے شروع ہو کر 'کبھی بھابی کو لے کر ہمارے ہاں آؤ' پر ختم ہو جاتا ہے۔

باب گیارہ

اندھیرے کو برقی قمقموں اور ٹیوبوں نے چاٹ لیا ہوتا ہے۔ کانت سے اجازت لے کر گھر کی راہ لیتا ہوں۔ گھر جس میں پریشانیوں کی مکڑی میرے لئے جال بنتی رہتی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوتا ہوں کہ فوراً کاغذ لے کر بیٹھ جاؤں گا اور اسی نشست میں کہانی مکمل کر کے اٹھوں گا۔

کھانا رکھتے ہوئے سیما پارک تک لے جانے کی فرمائش کرتی ہے۔

"گیتا اور تم چلی جاؤ۔"

"میرے لئے آپ کے پاس ایک منٹ بھی نہیں ہوتا۔" اس کا منہ سوکھ جاتا ہے۔

بے دلی سے کہتا ہوں۔ "اچھا تیار ہو جاؤ۔"

کپڑے تبدیل کرنے کے لئے وہ دوسرے کمرے میں جانے لگتی ہے تو کہتا ہوں۔ "گیتا سے پوچھ لو۔"

ہم چاروں گھر سے نکلتے ہیں۔ سیما کے چہرے سے گھٹن عیاں ہے۔ وہ اور گیتا پیچھے رہ کر باتیں کرتی ہوئیں آہستہ آہستہ چلتی رہتی ہیں۔ میں نگہبان بن کر آگے آگے رہتا ہوں۔ آشو کبھی میرے پاس جاتا ہے تو کبھی ان کے پاس جا کر باتیں کرنے لگتا ہے۔ پارک تک پہنچ کر سیما کہتی ہے۔

"سردی بڑھ رہی ہے، واپس چلیں۔"

ہم واپس ہو لیتے ہیں۔ گلی کے موڑ تک ان کو چھوڑ کر مڑ پڑتا ہوں۔

کیوں واپس آیا ہوں؟ چائے کا کپ پینے؟ سگریٹ پینے؟ یا اکیلے گھومنے کے لئے؟ میرے قدم مجھ کو گاندھی میدان کی طرف لے جانے لگتے ہیں۔ اسٹیج پر ڈاکٹر کمار تقریر کر رہا ہوتا ہے۔ شاید کانت بھی آیا ہو۔ میری نگاہیں بھیڑ کو چیرتی ہوئی کانت کو ڈھونڈ لیتی ہیں۔ میں اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ وہ بتلاتا ہے۔

"کمار نے ضرور پی ہوگی۔ اسٹیج پر آیا تھا تو بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ بولنا شروع کیا تھا تو لگتا تھا کہ گر جائے گا لیکن اب جمتا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر کی آواز اونچی اور تیز ہو رہی ہے۔ ایک جملے کو وہ تین بار دوہرا رہا ہے۔ لوگ متاثر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی کسی بات پر ہمارے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

اب وہ پوری طاقت سے سینہ پھلا کر کہہ رہا ہے۔ ہمیں لگتا ہے، شراب کی بدبو کا بھبکا لاؤڈ اسپیکر سے نکل کر سارے ماحول پر چھاتا جا رہا ہے۔

"ہم اپنے کو بڑا دیش بھگت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ گئو بھگت ہونے کا سوانگ رچتے ہیں۔ بھائیو! آج تمہارے شہر میں... یہ شہر میرا بھی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ہم اپنے کو بڑا دیش بھگت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، گئو بھگت ہونے کا سوانگ رچتے ہیں۔ تمہارے شہر میں گئوئیں آوارہ بھٹکتی ہوئیں، کوڑا کرکٹ کھا کر پیٹ بھرتی ہیں۔ یہ گئوئیں، یہ گائیں۔ آسمان سے نہیں آئی ہیں۔ یا دھرتی کا سینہ چیر کر باہر نہیں آئی ہیں۔ ہم نے چھوڑی ہیں۔ میرا مطلب کچھ خود غرض لوگوں نے چھوڑی ہیں جو دودھ دوہنے کے بعد گایوں کو بازاروں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ گلیوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم گائے کو ماتا کہتے ہیں، ماتا کو، تم لوگ، ہم لوگ، میں مانتا ہوں، میں کہتا ہوں، ماتا لفظ میں کتنی عقیدت، کتنی تعظیم ہوتی ہے ماتھا خود بہ خود جھک جاتا ہے، گئو کو گائے کو، ماتا گئو کو وہ عقیدت، اور تعظیم دیتے ہیں؟ جس کا ہم دعویٰ کرتے ہیں نہیں تو ہم پیٹ کے لئے دیوانے اور باولے ہوئے ہیں۔"

وہ قمیص اٹھا کر ہاتھ سے پیٹ بجاتا ہے۔ اور پیٹ بجانے کی آواز لاؤڈ اسپیکر سے آنے لگتی ہے۔

"گئو ماتا کا دودھ پی کر، گئو ماتا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گائیں کوڑا کرکٹ ہی نہیں کھاتیں۔ آج ان آنکھوں نے، میں نے ایک گئو کو، ایک گئو ماتا کو خون کے چیتھڑے پر منہ مارتے دیکھا ہے۔ وہ کپڑا کیا تھا، مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، بھلے ہی مجھے بے شرم کمینہ کہہ لیں۔ کچھ لوگ مجھے کمینہ کہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرح کمینہ نہیں ہوں جو گائے کا دودھ نکال کر گائے کو، گئو ماتا کو کوڑے کرکٹ اور چیتھڑوں سے بھوک مٹانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ پتہ ہے وہ چیتھڑا کا کیا تھا کسی عورت نے، کسی میری ماں نے یا کسی میری بہن نے..."

ہجوم میں ہنسی کے فوارے پھوٹتے ہیں۔

کمار کی تقریر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ "چیتھڑوں پر ہماری گئو ماتا منہ مارتی ہے۔"

"گئو ماتا کی!" اسٹیج سے نعرہ گونجتا ہے۔

"جے!" جلسہ میں پرجوش نعرہ بلند ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کمار تقریر کرتا رہتا ہے۔ "آپ ہمارے امیدوار چودھری صاحب کو ووٹ دیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ چودھری صاحب دوسری باتیں پوری کریں گے یا نہیں۔ آج آپ کی طرف سے، علاقے کے عوام کی طرف سے چودھری صاحب کی خدمت میں مانگ رکھتا ہوں کہ ہمارے شہر میں ایک گئو شالا بنوا دیں تاکہ شہر میں کوئی گائے آوارہ پھرتی نظر نہ آئے۔ کوئی بھوکی پیاسی گائے کوڑے کرکٹ اور چیتھڑے کا ذکر کرتے ہوئے تو مجھے شرم آتی ہے۔ بس ہمارے شہر میں ایک گئو شالا بن جائے تاکہ کوئی گائے آوارہ پھرتی نظر نہ آئے اور کوڑے کرکٹ پر منہ نہ مارے ساتھ ہی چودھری صاحب کی خدمت میں عرض کر دوں اگر کامیاب ہونے کے بعد آپ نے ہمارے شہر میں گئو شالا نہ بنوائی اور شہر میں کوئی گائے آوارہ پھرتی نظر آ گئی یا کوئی بھوکی پیاسی گائے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور کسی چیتھڑے پر مجھے کہتے ہوئے مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہئے۔ کوئی بھوکی پیاسی گائے کوڑے کرکٹ اور چیتھڑے پر منہ مارتی نظر آ گئی تو ہم لوگ جتنی طاقت سے آپ کو ووٹ دیں گے اس سے دوگنی طاقت سے آپ کے خلاف اندولن شروع کر دیں گے اور آپ نے یہ وعدہ پورا نہ کیا تو سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جو آپ کے خلاف جھنڈا بلند کرے گا۔"

"ڈاکٹر کمار!"

"زندہ باد!!"

نعروں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان ڈاکٹر کمار ہاتھ جوڑتا ہے

اور ڈائس پر بیٹھ جاتا ہے۔

کانت اور میں چائے پینے کے ارادے سے چلے آتے ہیں۔ چائے کی کھلی دکان کی تلاش کرتے ہوئے اسٹیشن کے نزدیک والی دکان پر جانا پڑتا ہے۔

واپسی پر بار کے سامنے سے گذرنے لگتے ہیں تو کوئی پیچھے سے آکر ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے۔

"آؤ!" یہ ڈاکٹر کمار ہوتا ہے۔

میں تو یہ سمجھا تھا کہ کسی نے کہا ہے۔ "ہینڈز اپ!" کانت ہنستے ہوئے کہتا ہے۔ "آج تو دو دو نشے ہو رہے ہیں؟"

"میں ڈائس پر بیٹھا ہی تھا کہ چودھری صاحب نے خوش ہو کر سو کا نوٹ دے دیا۔"

"ہم نے یہ تو نہیں پوچھا کہ چودھری صاحب نے تمھیں کتنے روپے دیے ہیں؟"

"میں نے نوٹ جیب میں ڈالا ہی تھا کہ منڈلی نے یلغار بول دیا۔ اغوا کر کے مجھے یہاں لے ئے۔ چودھری صاحب وہاں لوگوں کو گوشالا بنوا کر دے رہے ہیں اور ہم پیگ بنا رہے ہیں۔"

قہقہہ لگانے کے بعد ڈاکٹر دونوں کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے۔

"آؤنا!"

"شراب پینے کے بعد پتہ ہے یہ کیا کریں گے؟ ایک ایک بات پر دس دس گالیاں دیں گے۔" میں کہتا ہوں۔

"گالیاں تو اب بھی دے رہے ہیں۔ نہیں یقین تو چل کر دیکھ لو۔"

"تمھاری بات پر ہمیں یقین ہے۔" کانت سگریٹ سلگاتا ہے۔

"اور زردہ پھلا پھلا کر..."

"قسم سے زردہ ان کے پاس نہیں ہے۔" ہمارے ہاتھ کھینچتا ہے۔

"اب میں نے ان کو کہہ دیا ہے۔ عام لوگوں میں بیٹھ کر پینا چھوڑ دوں گا۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ شاید آخری بار ہے۔ آپ جیسے دانشوروں کے ساتھ بیٹھنے میں مجھے روحانی سکون ملے گا۔"

"روحانی سکون اور شراب؟" ایک ثانیہ کے بعد کانت کہتا ہے۔ "پھر کسی دن سہی آج کی کامیابی کی دعوت ہم چھوڑیں گے نہیں۔"

"وعدہ؟"

"وعدہ!"

"اچھا سگریٹ تو پلاتے جاؤ۔"

ہم دونوں اپنی اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر پیش کرتے ہیں۔ دونوں پیکٹوں سے وہ ایک ایک سگریٹ نکالتا ہے۔ ایک تو سلگا لیتا ہے۔ دوسری کان پر ٹکا لیتا ہے۔ بائی بائی! کرنے کے بعد قدموں کو سیدھا رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے بار میں داخل ہو جاتا ہے۔

"یہ کمار اپنے کو اس قدر دھوکا کیوں دے رہا ہے؟"

میں پوچھتا ہوں۔

"اس پر بحث نہیں، غور کرنا ہے۔"

"مجھے تو کئی بار کسی کہانی کا عجیب و غریب کردار معلوم ہوتا ہے۔"

"اسے کسی کہانی میں اتارنے کا ارادہ ہے کیا؟"

میں کوئی جواب نہیں دیتا۔

ہم خاموش چلتے رہتے ہیں۔ بجلی کے ایک پول سے دوسرے پول تک جاتے ہوئے ہمارے سائے بڑے چھوٹے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔

اگلے موڑ کانت اور میں ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر الگ الگ راستوں پر ہو لیتے ہیں۔

دھند اترنی شروع ہو گئی ہے۔ دھند کو چیرتے ہوئے میں گھر کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ رکی ہوئی کہانی کا کارواں (اپنی جگہ سے) سرکنے لگتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر قلم اور کاغذ اٹھاتا ہوں، پی ہوئی زہر کی ایک ایک بوند potencised ہو کر لفظ بن کر کاغذ پر بکھرنے لگتی ہے۔ بوند بوند زہر بکھرتی جاتی ہے۔

دروازے کا پٹ کھلتا ہے۔ پتا جی کمرے میں وارد ہوتے ہیں۔ کچھ ثانیے کھڑے رہتے ہیں۔ میں ان کو بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہہ پاتا۔ وہ صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہیں لیکن فوراً اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ میں بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ کہہ نہ سکنے کا یہ سلسلہ نہ معلوم کب ہمارے درمیان شروع ہوا ہے...

سردی کی ایک لہر میرے بدن میں سرایت کر جاتی ہے۔ قلم سے سیاہی اور دماغ سے دوسرے خیالات جھٹکنے کے بعد اپنی کہانی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ شعور کہانی کا متھن کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اعصاب کا تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن بیزاری بڑھتی رہتی ہے۔

تیسرا شو دیکھ کر جاتے ہوئے آدمیوں کے غول کی آواز گلی میں سے سنائی دیتی ہے۔ وقت اور عمر گذارنے کا احساس گھیر لیتا ہے۔ قرطاس کے تالاب میں لفظوں کی بوندیں گرنی بند ہو جاتی ہیں۔ زہر کا متھن بند ہو جاتا ہے۔ اس زہر کا متھن اب نہیں ہو سکتا... ادھورے وجود کی طرح یہ متھن بھی ادھورا رہے گا۔ کہانی آدھی ادھوری رہ جائے گی...

میرے اعصاب پر تناؤ بڑھنے لگتا ہے۔

یہ زہر مجھے مار ڈالے گا... نہیں یہ زہر مجھے ہی زندہ نہیں رکھتا بلکہ کسی دوسرے کے زہر کو بھی مار سکے گا۔ اسی زہر کا متھن ہوگا۔ آئندہ پیے زہر کا متھن کرنے میں بھی معاون ہوگا۔ اور کسی زہر کو مار سکے گا۔ زہر ہی زہر کو مارتا ہے۔

Similia similibus curtanur.

"تم کو کوئی روگ ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

پتا جی کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے، مجھے نہیں معلوم وہ کب دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے اور کب سے کھڑے ہیں۔

جواب نہ دے کر میں چھت میں لٹکے مکڑی کے آدھے ادھورے ٹوٹے

جالوں کی طرف دیکھنے لگتا ہوں (بند کمرے میں میری نگاہیں اس سے پار نہیں جاسکتیں ورنہ میں افق یا کسی سیارہ کی طرف دیکھتا۔)

"تجھے شرم آتی ہے تو میرے ساتھ چلنا۔" پتاجی اپنی بات جاری رکھتے ہیں۔ "میں ایک وید سے بات کر آیا ہوں۔"

میرا ارادہ ہوتا ہے کہ میں چیخ پڑوں۔ مجھے روگ نہیں ہے۔ مجھے روگ ہے تو پڑھنے لکھنے کا افسانہ نگاری کا۔ اس روگ کا علاج کوئی لقمان نہیں کرسکتا۔

کچھ نہ کہہ کر کاغذ سمیٹنے لگتا ہوں۔

پتاجی کا غصہ ابھر آتا ہے۔ "میری بات سنائی دیتی ہے کہ نہیں؟"

"سن لی ہے!" میں کھڑا ہوکر کہتا ہوں۔ "مجھے کوئی روگ نہیں ہے!"

کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آتا ہوں۔

سوئچ آف کرنے کی آواز آتی ہے۔ پھر میرے پیچھے پیچھے پتاجی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے لیکن وہ آہٹ دوسرے کمرے کی طرف مڑ جاتی ہے۔

میں سونے والے کمرے (اپنے) میں داخل ہوتا ہوں۔ اندھیرے میں ہی کپڑے تبدیل کرتا ہوں (بلب اس لئے روشن نہیں کرتا کہ سیما یا آشو کی نیند میں خلل نہ ہو) سوئی ہوئی سیما کے رخسار پر بوسہ ثبت کرنے کا دل ہوتا ہے لیکن کچھ ثانیے سیما کے افسردہ چہرے پر نگاہیں جمائے رہنے کے بعد مضمحل قدموں سے بڑھتا ہوا، آشو کے پاس آکر لیٹ جاتا ہوں۔

نیند، تناؤ کچھ بھی نہیں، روشن دان کو پار کرکے میری نگاہیں دھند میں الجھ جاتی ہیں۔ وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جنھیں (جن کو) مسرتیں اور زندگی کی نعمتیں میسر آتی ہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ محرومیوں کے صحراؤں میں جھلستا رہا ہوں۔

ٹرنک کے پیچھے کھڑکھڑاہٹ ہونے لگتی ہے۔

کبھی کچھ پلوں کے لئے بھی مطمئن نہیں ہوسکا ہوں۔ مطمئن ہوگیا تو شاید موت آجائے... موت... اب کون سی زندگی جی رہا ہوں۔ موت سے بھی بدتر۔ رینگتے کلبلاتے کیڑوں کی طرح۔

اس گھر میں کوئی شہد کی مکھی چھتہ نہیں بناتی۔ کوئی مکڑی جال نہیں بناتی۔ کوئی مکڑی جال بنانے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو چھپکلی نگل جاتی ہے۔

ٹرنک کے پیچھے کھڑکھڑاہٹ بڑھ رہی ہے۔

اٹھتا ہوں۔ سوئچ آن کرکے روشنی میں پیروں کو فرش پر زور سے پٹکتے ہوئے ٹرنک کی طرف بڑھنے لگتا ہوں۔ ٹرنک کے پیچھے کھڑکھڑاہٹ بند ہوجاتی ہے۔ سوئچ آف کرتا ہوں۔ بستر پر لیٹ کر سوچتا ہوں۔ واپس آئی ہوئی کہانی کو کسی دوسرے ماہنامے کو ارسال کردینی چاہئے۔ کل ہی۔ چوہے مارنے کے زنک فاسفائڈ (zinc phosphide) لے آؤں گا۔ کتنی بار سیما کو چوہوں کے بل بند کرنے کے لئے کہہ چکا ہوں لیکن... میں زنک فاسفائڈ لایا تھا لیکن رکھ کر بھول گیا ہوں۔ کل پھر لاؤں گا۔ ماں نے مجھے شراب نہیں وردان دیا تھا۔ میں کہانیاں لکھنے کا زہر پیتا رہوں گا۔ میری آدھی ادھوری کہانیاں رہ جائیں گی... میں... زہر... ماں تم نے شراب نہیں وردان دیا تھا۔ اگر مجھے یہ وردان نہ دیا ہوتا تو کب کا مر گیا ہوتا۔ کہانی کے ذریعہ پیا ہوا زہر اگلتا ہوں۔ چوہوں کو مارنے کے لئے...

ماں شراب... ورد... دا... ان...

باب بارہ

شاید میں پہلے سے جاگ رہا ہوں یا شاید ملی جلی ہنسی کی آوازیں سن کر جاگ گیا ہوں۔

"ادیب صاحب آپ کی کہانی۔" لحاف اٹھا کر سیما مجھے جھنجھوڑتی ہے۔

"کیا ہے؟" اس کی طرف منہ کرکے سنجیدگی سے سخت لہجہ میں پوچھتا ہوں۔

"کہانی کو چوہے... کہتے کہتے سیما کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوجاتی ہے اور وہ جھاڑو والے ہاتھ کو پیچھے سرکا لیتی ہے۔

اٹھتا ہوں۔ ننگے پیر کمرے کی طرف بڑھتا ہوں، گیتا کمرے کی چوکھٹ کے پاس کھڑی ہوئی ہے۔ "تمھاری کہانی کو چوہے...؟"

مجھے چوہوں کی کاغذ کترنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

میں غصے سے بھر کر کمرے میں چھلانگ لگاتا ہوں۔

چوہے سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ لیکن فوراً کہانی کو کترنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

میں غصے سے بھر جاتا ہوں پیر پٹکتا ہوا ان کی طرف بڑھتا ہوں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو ایک چوہے کی دم پکڑ کر پھینکنا چاہتا ہوں لیکن وہ اپنی دم سے میری کلائی پر سانپ کی طرح کنڈلی مار لیتا ہے اور دانتوں سے کاٹنے لگتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے چوہے، کہانی کو کترنا چھوڑ کر میری طرف لپکتے ہیں اور کاٹنے لگتے ہیں، میں غصہ، درد اور پیڑا سے چلاتا ہوں لیکن ان کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ چوہے میرے جسم کے ایک ایک اعضا، رگوں اور شریانوں کو کاٹتے رہتے ہیں۔ خون بہتا رہتا ہے۔ درد پیڑا جب برداشت سے باہر ہوجاتی ہے تو گر پڑتا ہوں... میری لاش کو کوؤں چیلوں نے نہیں نوچا... چوہوں... مجھ زندہ کو ...شاید میں... میرا حشر ایسا ہونا ہی لکھا تھا۔

دونوں آنکھوں سے چوہوں نے (دونوں) ڈھیلے نکال لئے ہیں۔ اور چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو سوراخ رہ گئے ہیں۔ اور اب دماغ کو کترنا شروع کردیا ہے۔ چربی چہرے پر... رونے کی آوازیں... میں رو رہا ہوں نہیں شاید گیتا اور سیما مجھے مرتا دیکھ کر۔

"اٹھو... جلدی... پتاجی نے..." سیما مجھے جھنجھوڑ رہی ہوتی ہے۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟ میری کہانی کو..." میں ہڑبڑا کر اٹھتا ہوں۔

سیما کے چہرے پر آنسو ہوتے ہیں۔

"پتاجی نے چوہے مارنے والا زہر..."

اتنا سنتے ہی میں ان کے کمرے کی طرف دوڑتا ہوں۔

گیتا پتاجی کی چارپائی کے پاس بیٹھی رو رہی ہوتی ہے۔

وہ مجھے کاغذ کا پرزہ دکھاتی ہے، جو زیادہ تر سیاہ ہوتا ہے۔

پتاجی کا چہرہ نیلا ہو رہا ہے اور ان کی سانس تیز چل رہی ہے۔

"بھائی صاحب کو بلا لاؤ!" روتی ہوئی گیتا کہتی ہے۔ "پتا جی کو ڈاکٹر کے پاس ہسپتال لے چلو!"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ آنکھوں کے آگے دھندلکا چھا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گر پڑوں گا۔ دیوار کا سہارا لے کر اپنے کو سنبھالتا ہوں۔ تیزی سے باہر آکر مٹکے میں سے یخ پانی کا گلاس بھر کر پیتا ہوں۔

"آپ کے ارادے بھی بڑے ہو گئے ہیں کیا؟" سیما کہتی ہوئی نزدیک آتی ہے۔ "اس سردی میں..."

"میں ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہوں۔ تم پتا جی کے پاس رہو!" کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہوں۔

میں چپلیں پہن کر باہر نکلنے لگتا ہوں۔ سیما پیچھے سے آکر کندھوں پر کمبل ڈال دیتی ہے۔ لیکن اس کو جھٹک کر باہر نکل جاتا ہوں۔

چوراہے میں پہنچ کر خیال آتا ہے، ڈاکٹر کی فیس کے لئے روپے اس وقت... بھائی صاحب دے دیں گے۔ بھائی صاحب کے گھر آج تک نہیں گیا ہوں... اب کیسے جاؤں... کانت کے گھر کی طرف جانے لگتا ہوں۔ کانت کے گھر کے سامنے پہنچ کر کچھ تاپے کھڑا رہتا ہوں۔ دروازہ کے پاس جا کر آواز لگانا چاہتا ہوں۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی۔ کال بیل ہونے کا خیال آنے پر بٹن پر انگلی رکھ دیتا ہوں۔ آواز ندارد ہوتی ہے۔ بجلی چلی گئی ہوگی۔ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہوں۔ اندر سے آواز آتی ہے۔ لیکن میں کنڈی چھوڑ کر دروازہ تھپتھپانے لگتا ہوں۔

کانت دروازہ کھولتا ہے، مجھے دیکھ کر تشویش بھرے لہجہ میں پوچھتا ہے۔ "خیر تو ہے؟"

"پتا جی نے زنک فاسفائڈ..."

"زہر! کیوں؟ آؤ۔ ابھی چلتے ہیں ہسپتال!"

میں اس کے ڈرائنگ روم سے آگے نہیں بڑھ پاتا اپنے کو ایک کرسی پر لڑھکا دیتا ہوں۔ دو منٹ میں وہ گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے آتا ہے دواؤں کے بکس سے اگنیشیا[1] کی ایک ڈوز نکال کر مجھے دیتا ہے۔ میں انکار کرنا چاہتا ہوں لیکن کانت ڈوز میرے منہ کی طرف بڑھاتا ہے۔ میرا منہ کھل جاتا ہے۔ آستین سے شوگر آف ملک کو ہونٹوں کے آس پاس سے پونچھتا ہوا اٹھتا ہوں۔

ہماری سانسیں اور قدموں کی آہٹ خاموش دھند کو چیرتی رہتی ہے۔

کانت پیکٹ سے دو سگریٹ نکالتا ہے۔ دونوں کو اپنے لبوں میں لگا کر سلگاتا ہے۔ ایک میری طرف بڑھاتا ہے۔ لیکن پھینک دیتا ہے۔ "تم نے ابھی دوا لی ہے۔ کم سے کم پندرہ منٹ کچھ اور نہیں کھانا پینا چاہئے!"

"ہومیوپیتھی میں اس کی کوئی دوا نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔ آرسینکم البم[2] ایسے موقعوں پر بہت مفید رہتی ہے لیکن ہمیں تو پتا جی کو ہسپتال لے جانا ہے۔"

"اپنی دوا سے علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"ہومیوپیتھی لوگوں میں نہیں ہے، نہ ہی لوگوں کا اعتماد جما ہے کہ ہومیوپیتھک دوائیں ایسی حالت میں دی جا سکتی ہیں۔ تمہارے بھائی صاحب اور رشتہ دار پسند نہیں کریں گے۔"

ہم گلی میں داخل ہوتے ہیں۔ گھر میں محلہ کے لوگ جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صحن میں بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ بھیڑ میں سے گذرتے ہوئے پتا جی کی چارپائی کے پاس پہنچ جاتے ہیں، بیہوش پتا جی کے پاس بزرگ اور نزدیک کے احباب کھڑے ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک دو کی یہ رائے ہوتی ہے کہ گھر میں ہی دیسی ٹوٹکوں سے قے کروا کر علاج کیا جائے کیوں کہ ہسپتال میں پولیس کی رپورٹ کے بغیر علاج نہیں ہو سکے گا۔ پولیس میں رپورٹ ہونے کا مطلب پریشانیوں کو مدعو کرنا ہے۔

کوئی ایک کہتا ہے۔ "یہاں کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ہسپتال میں چلنا چاہئے۔"

میں پتا جی کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر، چارپائی کی پٹی پر دونوں ہاتھ ٹکا لیتا ہوں اور رونے کی کوشش کرتا ہوں لیکن نہ تو رو سکتا ہوں اور نہ ہی کوئی آنسو بہا سکتا ہوں۔

آشو پیچھے سے آکر میری گردن کے گرد، بانہوں کا حلقہ بنا لیتا ہے۔

"ڈیڈی! بابا جی کو کیا ہو گیا ہے؟"

کچھ نہ کہہ کر اس کے آنسو پونچھنے لگتا ہوں۔

"بابا جی نے چوہے مارنے والا زہر کھایا ہے... میں سب چوہوں کو..."

مجھے خواب کی یاد آجاتی ہے۔ کل دوپہر کو بھی خواب دیکھا تھا۔ یہ کوئی علامات تھی یا تنبیہ...

آشو کے رونے کی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

پتا جی آنکھیں کھولتے ہیں۔ "کیوں رو رہے ہو بچو؟ تو تو اپنے باپ کے ہوتے ہوئے یتیم ہے اور تیری ماں خاوند کے ہوتے ہوئے بے... و... ہ!"

کہتے کہتے پتا جی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور چند ثانیوں کے بعد انہیں زور سے قے آتی ہے۔ بیہوش ہونے کی وجہ سے پورا مادہ باہر نہیں نکل رہا ہے۔ یہ پھیپھڑوں میں چلا گیا تو... میں یکبارگی سوکھے پتے کی طرح کانپ کر رہ جاتا ہوں۔

بھائی صاحب پتا جی کے سرہانے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تب تک ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی ہوتی۔ پتا جی کو قے ہونے لگتی ہے تو بھائی صاحب ان کی پیٹھ سہلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "کوئی برتن لے آؤ۔"

گیتا تسلا لا کر رکھ دیتی ہے جس میں کچھ راکھ بھی ہوتی ہے۔ سیما گھونگھٹ نکالے ہوئے تولیہ بڑھاتی ہے۔ سیما سے تولیہ لے کر پتا جی کا منہ اور کپڑے صاف کرنے لگتا ہوں۔

پتا جی کی آنکھیں کھلتی ہیں لیکن مند جاتی ہیں۔ اسی حالت میں وہ

---

[1] اگنیشیا۔ کسی صدمے سے ہوئی بے چینی، گھبراہٹ کو روکنے کے لئے ہومیوپیتھی دوا۔

[2] آرسینکم البم۔ سفید سنکھیا کو potencised کر کے تیار کی ہوئی ہومیوپیتھک دوا جو کئی قسم کے زہروں کا اثر زائل کرنے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔

بڑبڑاتے ہیں۔ "ت...م...بھو...کو...ں...م...ر...و...ں...گ...ے...ے!"

ایک آواز سنائی دیتی ہے، "فوراً ہسپتال لے چلو!"

ہم دونوں بھائی اور دو اصحاب چارپائی اٹھانا چاہتے ہیں تو پتاجی انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہیں۔

اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

پتاجی سر ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کوئی ایک تجویز کرتا ہے۔ "ہسپتال لے جانا چاہو تو ہومیو پیتھک دوا دلوا دو۔"

کانت باہر جانے لگتا ہے۔

بھائی صاحب پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"چارپائی اٹھاؤ۔ ہسپتال چلتے ہیں۔"

ہم چارپائی اٹھائے ہوئے صحن میں سے گذرنے لگتے ہیں تو ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ "ان کی گردن لڑھک گئی ہے ذرا دیکھو!"

چارپائی نیچے رکھ کر ہم دیکھتے ہیں۔ پتاجی کی آنکھیں پتھرا گئی ہوتی ہیں۔ جسم سرد ہو چکا ہوتا ہے۔ پتھرائی آنکھوں پر پتلیاں گرائی جاتی ہیں۔ ایک طرف لڑھکی گردن اور لٹکے ہاتھوں کو سیدھا کر دیا جاتا ہے۔

رونے کی آوازیں بلند سے بلندتر ہونے لگتی ہیں۔

ایک دو بوڑھی عورتیں نعش کو نیچے اتارنے کو کہتی ہیں۔

ہم دونوں بھائی پتاجی کی لاش کو چارپائی سے اتارنے لگتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے بھائی صاحب دہاڑ مار کر روتے ہیں لیکن میرے منھ سے ایک سسکی بھی نہیں نکلتی اور نہ ہی آنکھوں سے کوئی آنسو بہتا ہے۔ بس گردن لڑھکائے ہوئے پتاجی کے خاموش ہوئے چہرے کو دیکھتا رہتا ہوں۔

"آدمی کمرے میں بیٹھ جائیں۔" بھابھی کی آواز آتی ہے۔ اب تک میں نے بھابھی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

دو آدمی سہارا دے کر مجھے اٹھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہوں۔

کمرے سے سوفہ وغیرہ نکال کر ہمارے سونے والے کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کمرے میں بستروں کی دو تین چھوٹی دریاں بچھی ہوتی ہیں۔ میں گھٹنوں کو اکٹھا کر کے اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا دیتا ہوں۔ میری نظر وش پان کرتے ہوئے شیو کے کلنڈر پر پڑتی ہے۔ شیو تو ایک بار وش پان کرنے کے بعد کیلاش پربت پر چلا گیا تھا۔ یہاں ہر لمحہ حادثات کا زہر پینا پڑتا ہے اور...اور...

کانت اپنا دواؤں کا بکس کونے میں رکھ کر میرے پاس آبیٹھتا ہے۔

"اتنی جلدی یہ سب..." اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پاتا۔

ہم خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔

درد، کرب، یاسیت سے لبریز اشعار، جملے دماغ میں تیرنے لگتے ہیں... ماں کی موت...اور پتاجی کے آخری الفاظ۔ "تمھارے زندہ ہوتے ہوئے تمھارا بیٹا یتیم اور بیوی بیوہ...تم بھوکوں مروگے۔"

میں اب تک کیوں زندہ ہوں...زندہ بھی ہوں یا...ڈال سے کٹ کر بھی نہ جانے کس ضد میں۔ اپنا درد کانت کو کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا...کل دوپہر اور رات کے خواب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری زبان گنگ رہتی ہے۔

کل دوپہر اور رات کو لگاتار خواب کیوں آئے؟ خواب اکثر میں بھول جاتا ہوں۔ رات والا خواب تو مجھے اچھی طرح یاد ہے مووی کی طرح میرے شعور کی آنکھوں کے آگے گھوم رہا ہے...

گیتا اور سیما عورتوں میں ہوں گی۔ آشو؟ آشو کے ننھے دماغ پر یہ اثر... اس کی ننھی سوچ پر... پتاجی تمام عمر مصیبتوں کا بوجھ ڈھوتے رہے ہیں۔

رشتہ داروں اور اصحاب کی گنتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آنے والوں کو ہاتھ جوڑ کر میں پھر گردن لٹکا لیتا ہوں۔

"بڑے بھائی صاحب بلا رہے ہیں۔" گیتا کی آواز سن کر اس کی قیادت میں صحن میں سے ہو کر گذرنے لگتا ہوں تو صحن اور ڈیوڑھی کونے میں کوڑے کرکٹ کی ڈھیری میں مجھے کچھ کاغذ دکھائی دیتے ہیں۔ پیر کے انگوٹھے سے کاغذوں پر سے کچرے ہٹاتا ہوں، جھک کر دیکھ کر کاغذ اٹھا لیتا ہوں۔ یہ میری ادھوری کہانی والے کاغذ ہیں۔ بھابھی نے کمرے کی صفائی کی ہوگی تو ان کو کوڑے کے ساتھ...

میں کاغذوں کو جھاڑنے لگتا ہوں۔

گیتا مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ ان کاغذوں کو لیتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھتا ہوں۔ یہاں بھابھی اور بھائی صاحب میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

"اس کو بتلا دیا؟" بھائی صاحب گیتا سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"آپ ہی بتلا دو!" گیتا سسکنے لگتی ہے۔

بھائی صاحب کہنے لگتے ہیں۔ "پتاجی کی میت اور دوسری رسوم پر خرچ ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اکیلے پر یہ سب بار پڑے..."

"میرے پاس تو...میں بالکل...یہ سب آپ...!"

"مجھے سب اخراجات کرنے ہوں گے تو پتاجی کی ارتھی میرے دروازے سے اٹھنی چاہئے۔ اور سارے رسومات ہمارے گھر..."

مجھے لگتا ہے کہ مجھ کو زندہ آگ میں پھینک دیا ہے۔ اذیت سے پھڑپھڑا رہا ہوں... نیلو بھی اس طرح پھڑپھڑائی ہوگی۔

بولنے اور اٹھنے کی سب قوتیں زائل ہونے لگتی ہیں۔ ادھوری کہانی کے لپٹے ہوئے کاغذ میرے ہاتھ سے گر پڑتے ہیں۔

بھائی صاحب اور بھابھی کے کچھ الفاظ میرے کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتے ...نہ ہی ان کی شکلیں نظر آرہی ہیں۔ میں لاش ہوں جس کے سر کی چربی پگھل کر چہرے پر آگئی ہے اور آنکھوں میں ڈھیلے نہیں ہیں۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ ہیں ☆☆☆

مہتاب حیدر نقوی

شمارہ ۲۳۲،
دسمبر ۲۰۰۰

سطح زمین پر کھڑا شہر ملال میں ہوں گم
اپنے خدا پہ میں نثار اس کے جلال میں ہوں گم

وہ جو پرانے خواب تھے وہ جو مرے سراب تھے
طاق میں سب سجا دیئے کسب کمال میں ہوں گم

میری ہے عمر سب تمام میرے ہیں کام ناتمام
واہمے پالتا ہوں میں رنج و ملال میں ہوں گم

یوں تو کسی کے ساتھ میں رہنے کی خو مری نہیں
رنج مگر یہی ہے بس ہجر و وصال میں ہوں گم

دل میں ہمیشہ اک خلش رہتی ہے رات دن مرے
آگے کی کچھ خبر نہیں ماضی و حال میں ہوں گم

میرا جنون شوق کیا میرا کمال ذوق کیا
اپنے جمال میں ہوں گم اپنے خیال میں ہوں گم

کیسے لکھوں میں شاعری کیسے کروں یہ ساحری
ایک زمانہ ہو گیا لفظوں کے جال میں ہوں گم

شمارہ ۲۵۹
اگست ۲۰۰۲

اک سراسیمگی سامان بنی ہے کوئی چیز
ایسا لگتا ہے کہیں چھوٹ گئی ہے کوئی چیز
سب کو اک ساتھ بہائے لئے جاتا ہے یہ سیل
وہ تلاطم ہے کہ اچھی نہ بری ہے کوئی چیز
عشق نے چہرۂ گلنار کو بخشا ہے فروغ
ورنہ کب اپنے بنائے سے بنی ہے کوئی چیز
ایک میں کیا کہ مہ و سال اڑے جاتے ہیں
اے ہوا، تجھ سے زمانے میں بچی ہے کوئی چیز
یعنی زخموں کے گلستاں پہ بہار آگئی پھر
یعنی اب بھی مری آشفتہ سری ہے کوئی چیز
شاعری کیا ہے مجھے بھی نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ یہ دل کی لگی ہے کوئی چیز

شمارہ ۲۶۰
ستمبر ۲۰۰۲

الفت سے، ہوس سے نہ کسی چاہ میں آئے
ہم تو یوں ہی بے صرفہ تری راہ میں آئے
اس گھر کی صفت ہے کہ کہیں ہے نہ مکاں ہے
آئے جو یہاں کوئی تو کس چاہ میں آئے
معلوم تو کچھ ہو سر و دستار کی قیمت
یہ سوچ کے دربار شہنشاہ میں آئے
سنتے تھے کہ اب سر ہی قلم ہونا ہے اپنا
سو بے سر و سامان ہی جنگاہ میں آئے
شبنم میں نہائیں کبھی مہتاب کی کرنیں
وہ گھر مرے آئے تو شب ماہ میں آئے

انور سجاد کی امیجری اور میری ہوا خوری

مہدی جعفر

شمارہ ۲۳۱،
نومبر ۱۹۹۹

(۱)

انور سجاد کے افسانوں پر ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ جو کچھ لکھا تھا، سوچا چلو بیوی کو سنا ڈالوں۔ وہ اپنے گھریلو کاموں میں مصروف اور شاید خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے اسے راضی کیا۔ مضمون سن کر اس کی آنکھیں کچھ اس طرح پھیلیں کہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ بہتر یہی جانا کہ باہر ہوا خوری کر آؤں۔ ممکن ہے سیر دنیا سے دل بہل جائے۔ گھوم پھر کر واپس آیا تو جلے ہوئے کاغذ کی راکھ ملی۔ میں نے کہا "یہ کیا کیا؟" بولیں، "یہ لوگ اتنے مصیبت زدہ ہیں، آخر زندہ کیسے ہیں؟ اللہ خیر کرے۔ اسی لیے آپ رات دن ہلکان ہو رہے ہیں، ہوش کھوئے بیٹھے ہیں۔ اب قصہ سمجھ میں آیا۔ جلا ڈالنا ہی ٹھیک تھا۔"

مجھے بیوی کا یہ طرز عمل اچھا نہیں لگا۔ کئی روز کی جاں سوز کاوش آناً فاناً نذر آتش ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً انور سجاد کا مجموعہ "استعارے" ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ چند کتابوں کے درمیان گوشۂ عافیت میں تھا۔ خیر نشانے پر میں تھا انور سجاد نہیں۔

غصہ تو آیا ہی تھا۔ مگر بیوی میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ حیلے سے اپنی ضدی بیوی کو اس کے میکے یعنی الہ آباد پہنچا آیا۔ جون جولائی کا موسم الہ آباد کو جہنم زار بنائے ہوئے تھا۔ مجھے انتقامی مسرت ہوئی، جس طرح "چھٹی کا دن" انجوائے کرنے اور گھومنے پھرنے کی خاطر نکلے آفس زدہ کلرک نے بیوی کو ہشاش بشاش دیکھ کر اسے اجاڑ غار میں داخل ہونے کے لیے راضی کیا تھا، گویا اپنے جبر کا چھر بیوی کے تجربے میں منتقل کر دیا تھا۔ چند دنوں میں جب الہ آباد کی تپش نا قابل برداشت ہو گئی تو جھلسا ہوا اور تنہا واپس آیا۔ اس وقت بھوپال کی کھلی فضا بارانی رحمت سے سر شار ہو رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ چلو یہاں وہاں کچھ نوٹ اور یادداشتوں کے پرزے پڑے ہیں، ملا جلا کر از سر نو لکھ ڈالا جائے۔ اتنے میں ڈاکیے نے احمد ہمیش کا جہنم بھرا خط لا پکڑایا۔ خیر یہ تو بھائی ہمیش کی اپنی آگ تھی جس کی آنچ سرحد پار سے مجھ تک پہونچی تھی۔ اچھا ہوا بیوی یہاں نہیں تھی ورنہ یہ خط بھی شعلوں کی زد میں ہوتا۔

کم سے کم انور سجاد نے بالکل ہی انجان قاری کے دل و دماغ کو اتنا حیران کر دیا کہ وہ چیخ پڑے: یہ شخص زندہ کیسے ہے؟ غریب بیوی کو کیا معلوم کہ استحصال و استبداد کا دیو ہر جگہ اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ باہر ایک گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مضمون کو انگارہ دکھانا اور "انگارے" کی طرح جلا دینا بیوی کی سہل انگاری ہی تو تھی۔

مجھے احمد ہمیش کا ایک جملہ یاد آیا۔ آپ کو بھوپال کی زمین کے اوپر جو آسمان نظر آتا تھا، اس سے ذرا آگے بھی دیکھنے کی کوشش کریں۔ اقبال مجید کے مزاج سے آپ کی تنقیدی تحریر مختلف نہیں۔ دل نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ نہ میں نے نہ اقبال مجید نے بھوپال کی خوبصورت سر زمین میں آنکھیں کھولیں اور کیا قرۃ العین حیدر، بیدی، مرزا حامد بیگ، رشید امجد، دیویندر اسر، نیر مسعود، رام لعل، اور بہت سے فنکار اسد محمد خاں اور اختر جمال کی طرح بھوپال سے تعلق رکھتے ہیں؟ پھر زمین آسمان کا اشارہ چہ معنی دارد؟ اور مزاج؟ یہ بھی خوب رہی۔

انور سجاد کہتے ہیں:

> احمد ہمیش کو اور مجھے اور تمام ادیبوں اور دانشوروں کو چاہیے کہ وہ نا انصافی پر مبنی استحصالی نظام، 'جائز' ظالم اور کرپٹ حاکم طبقوں اور جعلی منافق معاشرے کے درباری Pen Coolies اور بونے ادیبوں کی جعل سازیوں، منافقت اور دوغلے پن کو برابر Expose کرتے رہیں اور تخلیقی اور مدبرانہ سطح پر معاشرے کی تبدیلی کی جدو جہد شروع کریں۔

گویا ادیب کو معاشرتی تبدیلی کے میدان عمل میں آ جانا چاہیے۔ انتظار حسین اس بات سے بدکتے ہیں۔ ان کا موقف صرف ادب ہے۔ خیال تو مستحسن ہے مگر عملی طور پر تبدیلی لانا شاید ادیب کے دائرہ کار سے باہر کی چیز ہے۔ جن لوگوں پر تخلیق کا اثر ہوتا ہے، یہ ان کا سروکار ہے۔

جہاں تک احمد ہمیش کا تعلق ہے، انھوں نے انور سجاد کی طرح مگر اپنے طریقے سے، افسانوی شکست و ریخت کا مظاہرہ کیا۔ کم لکھا اور اچھا لکھا۔ مجھے ان

کے فن پر لکھنے کا نہ موقع ملا اور نہ میں نے کوشش ہی کی۔ ان کے مشہور افسانے ''مکھی'' میں جو روداد کی تکنیک استعمال ہوئی ہے بڑی منفرد ہے۔ اس افسانے کو زندہ کرنے کے لیے ایسا بیانیہ برتاؤ کیا گیا ہے جو قاری کے ذہن میں شدید ردعمل پیدا کرے۔ غلاظت اور گھن والی Images، مثلاً بلغم، خون، اور تھوک، وغیرہ قاری میں استفراغی (Nauseating) کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ افسانہ اس تنفر آمیز اور تعفن زدہ صورت حال کے استعاروں سے زندہ ہوا ہے کہ ناک بند کر کے اور کن آنکھوں سے اپنے آپ کو پڑھواتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گھر کی نالیاں سڑی چیزیں ٹھس کر بند ہو جائیں اور انتظامیہ صفائی کی پروانہ کرے۔ قمر احسن کے افسانے جن میں گو، غلاظت، وغیرہ کی تصویر بہت ہے وہ احمد ہمیش کا تاثر معلوم ہوتا ہے۔ ''مکھی'' میں پیکر جتنے تیز اور شاک انگیز ہیں، ''کہانی مجھے لکھتی ہے'' میں وہ اس طرح نہیں آسکے۔ یہاں کہانی کو Animate کر کے اسے اصل یا Active راوی اور مصنف کو Passive راوی بنایا گیا ہے۔ مگر روداد مصنف کی ہی بیان ہوئی ہے۔ تکنیک یہ ہے کہ یہ روداد کبھی کہانی بیان کرتی ہے اور کبھی مصنف۔ کہانی خود مصنف ہی کا وجود ہے، مگر احمد ہمیش نے اس تکنیک سے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ کہانی کی شخصیت کو مصنف کی شخصیت سے بلند کر دیا اور اس سے Black Humour کا کام لینے کی سعی کی ہے۔ کہانی مصنف پر وار اور طنز کرتی ہے۔ واقعات کی کثرت اور نجی منظریت بیان کرنے کے لیے کھلا ماحول خلق ہوتا ہے۔ اس طرح ''مکھی'' کی راست روداد کے برخلاف ''کہانی مجھے لکھتی ہے'' کی واقعاتی بنت اور منظریت کے نیچے تاریخ کے بہاؤ، آزاد تلازمۂ خیال کی روش اور طنزیہ سلوک کے باوصف یہ کہانی کچھ alluring ہو گئی ہے اور ''مکھی'' کے اچھوتے پن اور کچکچاہٹ سے متجاوز نہ ہو سکی۔ احمد ہمیش نے روداد کی ایک اچھی تکنیک منکشف کرنے کے بعد اپنی تخلیقی اپج کی راہ کو خاطر خواہ مسخر کرنے کی بھرپور کوشش نہیں کی۔

قمر احسن کے ''ڈھورے'' اور ''نیا منظر نامہ''، احمد ہمیش کے ''کبروا'' اور ''مکھی'' سے متاثر ہیں۔ بس اسی قدر کہ دو ایک استعارے تقریباً وہی ہیں۔ مگر قمر احسن دوسری قماش کا فنکار ہے۔ میں اسے نقالی نہیں کہوں گا۔ دراصل احمد ہمیش اور قمر احسن کا بچپن ایک ہی طرح کے منظری علاقوں میں گذرا ہے۔ دونوں نے تقریباً اسی آسمان اور زمین کے درمیاں آنکھیں کھولیں۔ ہمیش کے نام ایسے استعاروں کی ایجاد ہے۔ استعمال پر کون سی روک ٹوک ہے؟ مثلاً قلب و جگر، یا نغمہ و گل، جیسے استعاروں کا ایجاد کنندہ کوئی بھی ہو، آنے والوں سے انھیں ہر طرح سے برتا۔ ایک استعارے کے بہ یک وقت دو موجد بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ارتکازِ نظر کی بات ہے۔

اسی طرح انور سجاد نے نئی نسل کے فنکاروں پر اپنا گہرا اثر ڈالا، مگر بیانیہ کے اخراج، جملوں کے تناؤ اور جامعیت (Compactness) کے تجربوں کی وجہ سے ان کے دردانگیز اسلوب کو گرفت میں لانا آسان نہ تھا، چہ جائے کہ اس سے اپنی الگ راہ نکالنا۔ کئی لوگوں نے کوششیں کیں اور منہ کے بل زمین پر آرہے۔ یہ انور سجاد اور ادب کا ایک طرح سے نقصان ہوا کہ ایسے اسلوب کا چلن تخلیقی کی راہیں نکالنے کے بجائے تجربوں کی بھینٹ چڑھ کر رہ گیا۔

(۲)

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اقبال مجید صاحب کا فون تھا۔ میں نے کہا آج کل اکیلا ہوں۔ انور سجاد پر لکھنا چاہ رہا ہوں۔ بولے، یہیں آجایئے (وغیرہ)۔ سوچا، ٹھیک ہے۔ کھانا پکانے سے بچوں گا، اور اقبال صاحب کو یہ معلوم ہے کہ گیہوں اور دودھ سے بنی چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں۔ سنجیدہ مزاج، خوش قامت، لحیم شحیم، گوری رنگت اور ناک نقشے کی مناسبت سے ان کی ظاہری شخصیت بنی ہے۔ ایک کشادہ اور جدید وضع سے آراستہ نئے مکان میں رہتے ہیں۔ جگہ کا نام ''کوہ فضا'' ہے۔ میں نے کہا چلئے انور سجاد پر کچھ باتیں کی جائیں۔ اقبال مجید صاحب فوراً جا کر ٹیپ رکارڈر اٹھالائے۔ میں نے ڈر کر کہا:

''آج زیادہ آپ بولئے اور میں سنوں۔'' کہا، ''یہی سہی۔''

میں: ظاہر ہے آپ نے انور سجاد کو پڑھا ہے۔ ان کے فن کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

اقبال مجید: دراصل معاملہ کچھ اس طرح سے ہے۔ یہ کاروبار ایک طرح سے باورچی گیری جیسا ہے۔

میں: (ہنستے ہوئے) خوب کہی۔ ہاں ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہے۔

اقبال مجید: اب قصہ یہ ہے کہ ہم باورچی لوگ دوسرے باورچیوں کی تیار کی ہوئی ہانڈیوں سے پتہ نہیں کیوں جلدی مطمئن نہیں ہوتے۔ خاص طور پر جب ہم بھی اسی بازار میں خوانچہ لیے بیٹھے ہوں۔ (کچھ دیر خاموشی۔ اقبال مجید سگریٹ ٹٹول رہے ہیں پھر جلا رہے ہیں)۔ اب انور سجاد صاحب کی Recipes کا معاملہ یوں ہے کہ کچھ ہی دنوں پہلے میں ''شعور'' کے پرانے شمارے الٹ پلٹ رہا تھا...

میں: ہاں، ان کی شناخت کے سلسلے میں بلراج مینرا نے کئی کئی افسانے ایک ساتھ چھاپے ہیں۔

اقبال مجید: جی ہاں۔ تو ایک تو Recipe وہ ہے جس میں مرغی اور کارڈینک دمہ کے قبیل کی ہانڈیاں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں تجربہ، مشاہدہ، علم اور بقول بلراج مین را، بصیرت اور تحریک کے اجزا تو موجود ہیں۔ مگر ان سب کا وہ جو کہتے ہیں ''کل''، تو میرے خیال میں وہ ''کل'' غائب ہے۔ یعنی ایسا ہے کہ آپ یہ ڈش کھا تو جاتے ہیں مگر لگتا ہے پیٹ نہیں بھرا۔ یعنی سرکس کے گھوڑے کو اپنی پرفارمنس دینے کے بعد گڑ کی بھیلی نہیں ملی۔

میں: تو گویا آپ Recipes کے نقطۂ نظر سے فنکاری کو دیکھ رہے ہیں۔

اقبال مجید: جی ہاں، کیوں کہ میں بھی پکانے کے عمل میں ہی لگا ہوا ہوں۔ خیر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔

میں: قطعی نہیں۔ دیکھنے کا یہ اپنا انوکھا طریقہ ہے۔

اقبال مجید: تو اب اس طرح سے دیکھا جائے تو دوسری Recipe اس قبیل کی ہے جس میں فکشن کا جو بیانیہ ہوتا ہے اس کے اندر آڈیو اور ویڈیو کو

غلط ملط کر کے افسانہ بنایا گیا ہوتا ہے۔

میں: آڈیو اور ویڈیو؟

اقبال مجید: ہاں، اگر آپ ٹی وی وغیرہ کی اسکرپٹیں دیکھیں تو کچھ... بہر حال اس کام میں ایک گھپلا یہ ہوا ہے کہ ان افسانوں میں Performing Art کے دیگر لوازمات ناپید ہیں جو اس آرٹ میں اظہار کی زبان کو زیادہ طاقتور بناتے ہیں۔ تو مجھے ایسا لگتا ہے (کچھ لمحہ سوچتے ہوئے) ...لگتا ہے اس کی قوت کے وسیع امکانات صرف لکھے ہوئے لفظوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

اب آپ دیکھیں کہ اس طرح کی تحریریں بیس سال پہلے کسی قدر متوجہ تو کرلے گئیں، اب انھیں پڑھیے تو لگتا ہے کاش یہ کسی طرح Performing Art کی مدد لے کر سامنے آتیں تو وہ جو کہتے ہیں ان کے ضمیر کی روشنی کی چکا چوندھ کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔

اب دیکھیے صاحب ایک Recipe اور ہے۔

میں: جی۔

اقبال مجید: آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں؟ آنکھیں آپ کی بند ہو رہی ہیں۔

میں: جی نہیں جو باتیں نکل رہی ہیں ان پر توجہ کر رہا ہوں۔

اقبال مجید: بس اب جو recipe ہے وہ ''کونپل''، ''ماں اور بیٹا'' وغیرہ کے قبیل کے بیانیے میں ہے۔ یہ اپنے مسالوں کے ساتھ افسانوی استعارے تخلیق کرتی ہے اور جو کہتے ہیں کہ انسان سے چھنی ہوئی انسانیت کو پھر سے پانے کی جدوجہد میں تیار ہوئی ہے... (رک کر) کیا آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟

میں: نہیں، آپ بولے جائیے، جم کر۔

اقبال مجید: تو یہ معاملہ مجھے لگتا ہے کچھ اس طرح سے ہے کہ کبھی کبھی فیملی کے ساتھ کسی باہر کے ہوٹل وغیرہ میں بیٹھ کر کچھ غیر مانوس سی ڈشیں یا ہانڈیاں کہہ لیجیے، آپ چکھنے کے لیے قصداً نکلتے ہیں اور گھر سے الگ ایک نئی فضا میں نیا ذائقہ لینا آپ کا مقصد ہوتا ہے۔ اس کے بعد گھر آکر پھر دوسرے دن اپنے دسترخوان کی چیزیں کھاتے وقت جن کھانوں کو کھاتے کھاتے ہم کبھی تھکتے نہیں ان غیر مانوس ذائقوں کو بھول جاتے ہیں۔ بس میرے نزدیک انور سجاد کی پہلی اور دوسری recipe کی، بس اتنی ہی جگہ ہے، جو کبھی کبھی باہر نکل کر غیر مانوس ذائقے لینے کی خواہش تک محدود ہوتی ہے۔ ہاں تیسری recipe والی کہانیوں میں مجھے اپنے گھریلو دسترخوان کی زبان پر ذائقے کے ساتھ جعفر صاحب ایسا لگتا ہے کہ پیٹ میں کچھ پہنچا ہے۔ دراصل ہم باورچی لوگ ایسی ہانڈی تیار کر لے جانے میں خال خال ہی کامیاب ہو پاتے ہیں جس میں ''کل'' ہی ''کل'' دکھائی دے اور اجزا ڈھونڈے نہ ملیں۔ آپ کو ہمارے یہاں کے سیکڑوں افسانے یا تو نیچے سے جلے ہوئے اور اوپر سے کچے ملیں گے اس لیے کہ کبھی تو انھیں تیز آنچ میں پکایا گیا یا کبھی ٹھیک سے دم کھانے سے پہلے ہی اتار لیا گیا یا غلط مسالے ڈال کر پکایا گیا۔ دوسروں کو کیا کہوں خود میرے یہاں بھی یہ سارے امکانات موجود ہیں (ہنسی)۔ ممکن ہے جعفر صاحب آپ کو میری ان باتوں سے یہ شک ہو رہا ہو کہ کہیں میں باورچیوں کے خاندان سے تو نہیں (دونوں کا قہقہہ)۔

(ٹیپ تو اور باتیں بھی ہوئی تھیں مگر غیر ضروری حصوں کو میں نے حذف کر دیا ہے۔)

میز پر کھانا سجا دیا گیا ہے، معمول کی طرح لذیذ اور ذائقے سے بھرپور تھا۔ افسانہ نگاروں کے اپنے اپنے تعصبات سے دور تھا۔ پکوان والی باتوں نے اشتہا بڑھا دی تھی۔ سیر ہو کر کھایا۔ ذائقے کی گفتگو سے مجھے شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال آیا جنھوں نے کہا ہے کہ بس ذائقے پر انور سجاد کی غیر معمولی قدرت ان کے افسانوں کو غیر واقعی یا خیالی اور غیر قطعی ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔

(۳)

میں الٰہ آباد گیا تو فاروقی صاحب سے بھی ملنے گیا۔ میرے ساتھ اسرار گاندھی تھے۔ فاروقی صاحب بے حد خوش گفتار اور دلنواز شخص ہیں۔ باتوں سے شگفتگی اور روشنی طبع پھوٹتی ہے۔ ان کے ساتھ من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ اس بار خاموشی سے ان کی اور اسرار گاندھی کی گفتگو سنتا رہا۔ دل میں آئی تھی کہ پوچھوں آپ نے انور سجاد کو اپنے مضمون میں جدید افسانے کا معمار اعظم قرار دیا مگر مین را کو کیوں چھوڑ دیا؟ مین را نے تو پہلے ہی چند نئی تعمیریں کھڑی کر دی تھیں اور انور عظیم بھی تو کچھ اسی طرح کا کام کرنے لگے تھے۔ مگر دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ میرا ذہن شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون ''انور سجاد، انہدام یا تعمیر نو'' کی طرف گیا۔ میرا خیال ہے کہ انور سجاد یا اردو کے کسی افسانہ نگار نے افسانے کے قدیم ڈھانچے کو ڈھانے کا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ انہدام کیسے ہوتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو جیمس جوائس کی ''یولیسس'' پڑھ لیجیے۔ کیا کیا اور کیسے کیسے مسمار کیا ہے، نظارہ کیجیے۔ کتنے تکنیکی اوزار اور طریق کار ایجاد کیے گئے ہیں، انھیں پرکھ لیجیے۔ ہمارے یہاں بغیر ڈھائے ہوئے نیا تعمیری کام شروع ہو گیا۔ ہم نے یہ پتہ چلانے کی کوشش نہیں کی کہ جیمس جوائس نے اپنے انہدام کے منصوبے میں کون سی ہماری قیمتی چیزیں بھی شامل کر لیں ہیں جہاں سے ہماری نئی راہیں نکل سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم اور فرسودہ طرز نگارش میں رد و بدل، یہاں وہاں کچھ اضافے، کچھ کوٹھریاں اور کچھ غسل خانے بڑھائے گئے، کچھ پیچھے، دو چار کھمبے گرائے گئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اگر بھرپور انہدام کر دیا گیا ہوتا تو تعمیر نو کی دلچسپ شکل ہی دوسری ہوتی۔ یہ کام انور سجاد، مین را، انور عظیم، سریندر پرکاش، احمد ہمیش یا نئے افسانہ نگاروں میں سے کوئی بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد تعمیر نو کی جاتی تو ہمیں بیرونی ادب کی تکنیکی نقل کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہم ایر کنڈیشننگ کی لعنت سے نکل کر ایسی تعمیرات بناتے جو ہماری شناخت بن جاتیں، جو قدرتی ہوا کے بہاؤ پر قابو پا کر ٹھنڈی رہتیں۔ چونکہ نہ ہم نے ڈھایا، نہ ملبہ ہٹایا، نہ زمین صاف کی، نہ اپنا نقشہ

تشکیل کیا (جو انہدام سے شاید پہلے یا شاید بعد کا عمل ہے) تو لامحالہ تعمیر نو کی گنجائش محدود ہوگئی۔ اب گھس گھس کر بنائے جاؤ اور ایک دوسرے کی تعمیر میں پیوست ہوتے جاؤ۔ بہر کیف انور سجاد کو بغیر انہدام کیے ہوئے کچھ میدان میسر آ گیا تھا جس پر انھوں نے چند تعمیری بلکہ تشکیلی تجربے کیے۔ ''استعارے'' اس کا ثبوت ہے۔ مکمل انہدام کی صورت میں انور سجاد کو اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ وہ تخلیقی غور و فکر کے لیے سیاست کی طرف تاکیں۔ مجھے شمس الرحمٰن فاروقی سے قدرے اختلاف ہے جب وہ کہتے ہیں کہ انور سجاد کے افسانوں میں بیانیہ کا انہدام ہے۔ بیانیہ کے اخراج کی صورت سے انھوں نے انحراف کی صورت پیدا کرنے کی سعی کی ہے، اسٹرکچر کا انہدام نہیں کیا ہے۔ یہاں حسرت تعمیر تو ضرور ہے۔

(۴)

اتنے میں ڈاکیے کی آواز آئی، ''پوسٹ مین!'' دیکھا تو معلوم ہوا کہ نیا ''شب خون'' آیا تھا۔ فوراً ورق گردانی شروع کی۔ حیرت انگیز اتفاق سے انور سجاد اور انتظار حسین کے دلچسپ طویل مراسلے شائع ہوئے تھے جس کے محرک شمس الرحمٰن فاروقی کے خط تھے۔ انھوں نے انور سجاد کو لکھا تھا۔ ''میں تمھاری فکشن نگاری کو جدید اردو فکشن کا اعلیٰ نقطہ مانتا رہا۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ انور سجاد کے افسانوں کی امیجری بہت پرقوت ہے۔ انھوں نے جس طرح کا فکشن لکھا اس سے پہلے شاید کبھی نہیں لکھا گیا تھا۔ ان کے یہاں فکشن کا فیشن بدل ڈالنے کی والہانہ کوشش کے باوجود کوالٹی قربان نہیں کی گئی۔ ان کا سائنسی ارتباط (جو میڈیکل اصطلاحوں کے استعمال سے نمایاں ہے) افسانوی فن کو عصریت کے رنگ میں ڈھالنے کا کام کرتا ہے، مگر وہ انھیں بہت سے گہرے پانیوں سے دور بھی رکھتا ہے جن کی طرف انتظار حسین بڑھ جاتے ہیں۔ انور سجاد اپنے خیال میں درست ہیں کہ دنیا کے دکھ درد کا علاج عملی ضابطوں میں ہے، مگر انتظار حسین بھی اپنے مقام پر صحیح ہیں کہ ادب کا کام عملی طور پر مداوا کرنا نہیں ہے بلکہ ادب روح کی تسکین کا سامان ہے۔ مگر ایک طرح سے اپنے اپنے تعصبات کے زعم میں دونوں صحیح نہیں رہتے۔ اس لیے کہ نہ تو مکمل طور پر روایاتی/ اساطیری/ مذہبی وضع اور نہ سائنسی/ مذہبی/ عملی وضع روح ادب کی تسکین کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ادب ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔ ادب نہ اسطور ہے نہ مذہب، یہ ادب کے آلۂ کار تو ہو سکتے ہیں، بہ ذات خود ادب نہیں بنتے۔ دونوں میں تعصبات کا سمنٹنگ میٹریل cementing material آتا ہے۔ ان دونوں بنیادوں پر الگ الگ جمے ہوئے برصغیر کے مختلف تناؤ، تنازعے اور تصادمات اس کے گواہ ہیں۔ دونوں مسائل کے حل نظر آتے ہیں، مگر نہیں ہیں۔ جبر و استحصال کی بات تو ٹھیک ہے۔ احتجاج کی شکل بھی ٹھیک ہے۔ مگر عدل اور انصاف کے معاملے ادب کے علاقے کے نہیں، بلکہ دوسرے ضابطوں کے پیمانے ہیں۔ ادبی حیثیت سے دیکھیے تو اگر ہم سب کو ٹھیک کرنے کے بجائے انسان رہ جائیں اور اپنے آپ کو ٹھیک کرتے رہیں تو بڑی بات ہے۔ ادب غموں، وسوسوں، اندیشوں اور خطروں کے دائرے میں پروان چڑھتا ہے احتجاج کرتا اور فروغ پاتا ہے۔ ادب نفس انسانی کی صورت حال ہے۔ نغمۂ جاں ہے، طرز فغاں ہے۔

نغمۂ جاں؟ طرز فغاں؟

ادب کی تشکیل میں غمناک لہریں اپنا کام کرتی ہیں۔ یہ باطن میں مواج ہوتی ہیں۔ ان لہروں کا ایک وضعیاتی (pattern) بنتا ہے یا ایک آہنگ ہوتا ہے جس کا جوہر نغماتی ہوتا ہے۔ یوں بھی ''نغمہ'' کی جڑ میں غم کا لفظ موجود ہے۔ طرز فغاں شکست نغمہ کی صدا ہے اور یہی تو رونا ہے۔ یہ تکنیک تدبیر اور سلوک کی چیز ہے۔ ان میں جان کھپانا ہوتا ہے۔ صابر لکھنوی مرحوم کا ایک شعر بلکہ اشارہ ہے

بلبل عوض نغمہ کرے مشق فغاں کی
قید اس کو بہار آنے پہ صیاد کریں گے

انور سجاد نے اپنے ناولٹ ''خوشیوں کا باغ'' کے سرورق پر جو تصویر بنائی ہے وہاں بلبل کے پیروں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ اندر جو بیان ہے وہ ایک خاص دور کی سیاست کی ذیل میں آ گیا ہے۔ براہ راست تصویر کشی کے بجائے تمام تر داخلی اثرات کی مصوری ہوتی تو یہ ناول اپنے دور کی ''شخصیت'' کے حصار میں نہ آ جاتا۔ خود انور سجاد نے شمس الرحمٰن فاروقی کو لکھا ہے: ''محض جمالیت پسندی (جمال پرستی) محض ترقی پسندی، محض مذہبیت، محض ادبیت (یعنی محض شخصیت) یک طرفہ اور یک جہت ہوتی ہے۔ انسان محض نہیں ہے بلکہ کثیر الجہت وجود ہے، قوت ہے''۔ انور سجاد کا یہ بیان جذباتی یا عملی زندگی کی جہتوں میں جاتا ہے۔ فن و ادب کی دنیا فنیت اور ادبیت سے واسطہ رکھتی ہے اور انداز فغاں کے دائرے میں آتی ہے۔ باقی چیزیں وہ سروکار ہیں جو اگر چاہیں تو فن و ادب سے قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ تہذیب ادب کے بغیر آدمیت گھٹ گھٹ کر تمام ہو جائے گی۔ خواہشیں تو ہزاروں ہیں اور بڑی بڑی ہیں۔ ہر شخص چیف منسٹر یا پرائم منسٹر نہیں بن سکتا۔ جو بن گیا وہ مساوات اور انصاف سے کترائے گا۔ یہ ہے سیاست کی اوقات۔

ایک طرف انور سجاد کی لذت تحریر تھی اور ایک طرف میری سوچ۔ کس طرح کا مستقبل میرے دل میں ہے؟ کس کے حسب خواہش زمانہ منقلب ہو سکتا ہے؟ خواہش اوہام کے گھیرے میں ہے، مشکوک و مشتبہ ہے، خود ایک مسئلہ ہے۔

(۵)

انور سجاد پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ انھوں نے امراض کے زاویے سے انسانی کرب کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا اصل کارنامہ انسانی ابتلا کا افقی منظر نامہ مصور کرتا ہے جہاں سیاست اور جبر و استحصال میں جکڑے، دبے ہوئے اور زخم خوردہ ایشیائی انسان کی پسپائی ہے۔ گویا ماحول کا محیط اپنے اصل مرکز پر بار ہے اسے خون آلودہ کیے ہوئے ہے۔ ہم اکثر چیخ پڑتے ہیں کہ ماحول میں بڑی گھٹن ہے۔ گھٹن بڑھتے بڑھتے بیماری بن جاتی ہے۔ کساؤ اور جکڑن میں سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہم اس گھٹن کو اپنا ہی عارضہ سمجھ لیتے ہیں، گویا یہ داخلی اور موضوعی ہو، گویا ہمارا بدن اس کا ذمہ دار ہے۔ ہمیں عرفان نہیں ہوتا کہ عام طور سے بیماریاں جسمی نہیں ہوتیں بلکہ ان کا کاروبار روح سے ہے۔ انور سجاد گھٹن کی موضوعی نہیں بلکہ معروضی سطح پر ہمیں ملیں گے۔ یہ صورت طاری کی گئی ہے۔ بیماریاں باہر سے لادی

گئی ہیں۔ جتلا نہیں تھے، کیے گئے ہیں۔ یہ اسکیزوفرینیا (Schizophrenia) جیسی حالت، یہ النا کی، جبر سے اور استحصال کے لیے ہے۔ بیماریوں کی معروضی سطح افسانوں کی داخلیت بن کر درد وغم کی شدید حالت نقش کرتی ہے۔ اس طرح انور سجاد کا استعاراتی اور علامتی نظام قائم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب فنکار گھٹن کا کساؤ خلق کرتا ہے تو جانے انجانے نثر کا رویہ بھی دباؤ میں آجاتا ہے۔ بیماریوں سے متعلق افسانوں میں فنکار کا اختلا نامہ اور تخلیقی ٹریٹمنٹ اسے راغب کرتا ہے کہ وہ اپنے فنی طریق کار میں بیانیہ تسکین (Relaxation) شامل نہ کرے۔ اب افسانے کس قدر روایتی بیانیہ کی حدود میں رہ جاتے ہیں اور کتنے شعری سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں، فن کار کو اس سے زیادہ واسطہ اظہار سے ہے۔ بیمار معاشرے کو پیدا کرنے والی سیاست کو آئینہ دکھاتی ہے۔ انور سجاد کی غمناک ضیق آمیز خلجان اور ہیجان سے لبریز اظہاریت جہاں جماؤ دار اور پیچیدہ بیان کا گھنا احساس ہے۔

اسلوبیاتی کساؤ کی مرکزیت پر اصرار کے بعد انور سجاد نے اپنا قدم بیانیہ ترسیل کی جانب بڑھایا مگر بیانیہ علامت سازی کے امکانات روشن کرنے کی جگہ وہ سبک سیر بیانیہ اور اظہر (Obvious) حقیقی مزاج کے مطابق منکشف کردہ اسلوب سے دور ہو گئے۔ ''خوشبوؤں کا باغ'' اس کی مثال ہے۔ انور سجاد کے افسانوں ''چھٹی کا دن'' اور ''گائے'' جیسے افسانوی اسلوب کے دوسرے بیانیہ امکانات پیدا کرنے کی کوشش قاری کو پیچیدہ صورت حال تک پہونچانے کا عمل انجام دیتی، نہ کہ سامنے کی سیاسی صورت کو منظر نامہ پیش کر دیا جاتا۔ وحشتناک حقیقت (Dire Reality) کے پس منظر میں اپنی بات نمایاں کرنے کا یہ فنی طریق کار ہوتا۔

(۶)

چنانچہ وقت کے ساتھ انور سجاد بدلے ہیں۔ موضوعی جہات تو وہی ہیں لیکن ان کے فنی طریق کار اور تجرباتی صورت میں تبدیلی آئی۔ ''استعارے'' میں شامل بیشتر افسانوں میں جدید مصوری جیسا ٹریٹمنٹ ہے۔ کچھ واضح ہیں، کچھ مبہم۔ ظاہر ہے یہ افسانے ہیں۔ ان میں آواز ہے، حرکت ہے، جو بیان کی بنا پر ہے۔ ''شعور'' میں چھپے ہوئے افسانے یا تو نظم و رقص سے قریب ہیں (''آج'') یا مختلف عارضوں پر قائم رقص بسمل کی طرح نظر آتے ہیں۔ نمونے کے لیے چند اقتباسات:

مصوری

(۱) تاریک رات

وہ شخص جس کی لوئی میں رات کا عکس ہے، جس کی زبان پر کانٹے اور پاؤں میں آبلے ہیں، جس کے جسم سے بہتا مٹر کا پیاسی زمین پر ٹپکتا ہے، چاروں اور سے سمٹ کر آیا ہے اور اس کھنڈر کی طرف گامزن ہے جہاں ایک سیاہ پتھر پڑا ہے (''پتھر لہو کتا'')۔

(۲) میز پر چند کاغذ بغیر پتلیوں کی آنکھیں، اس کی آنکھوں میں، اس کے ہاتھ میں، قلم کی انی پر پتلیاں۔

میں کیا لکھوں؟

وہ شفاف کاغذوں سے نظر ہٹاتا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نظریں دیوار پر جا پڑتی ہیں۔ ایک بوسیدہ فریم میں جیبوسائز کی تصویر کمرے میں گی واحد تصویر، جو کسی کلاسیک کاری پرنٹ ہے، قوی ہیکل، جوان دیوتاؤں کی قبیل کا آہنی زنجیروں میں جکڑا چٹان سے بندھا ہے، عقاب اس کا جگر نوش کر رہا ہے، اس کی نظریں فوراً بغیر پتلیوں کی آنکھوں میں پلٹ آتی ہیں۔ (''پرومیتھیس'')۔

نظم اور رقص

(۱) یہ ایک امر یقینی ہے کہ جب اس نے مرا ہے دروازے کو کھولے اور سیڑھیوں کو بالکل سپاٹ غیر جذباتی سکون میں دیکھے، ایسی سیڑھیاں جن پر چڑھنے اترنے کا کوئی نشان نہیں، یاد کا کوئی نقش تک نہیں، جب کوئی تنگ و تاریک غلام گردش طے کر کے اس کمرے میں پہنچے، کھڑکی پر چڑھے، چھیدوں والے ٹاٹ کے پردے کے کسی بھی چھید سے باہر جھانک کر دیکھے، آوارہ کتوں اور بلیوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بے پروا (''آج''، ایک)۔

(۲) ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر

پھر ان میں سب سے زیادہ طاقتور اسے کلائیوں سے پکڑ کر اٹھالیتا ہے اور فضا میں اسے یوں گھمانے لگتا ہے جیسے زمین میں پنگھوڑے کے ستون سے لٹکتے زور سے گھومتے کاٹھ کے گھوڑے، خچر، اونٹ اور ان پر سوار بچے۔ وہ باری باری اسی طرح اس ستون سے بندھی گھومتی لڑکی پر سواری کرتے ہیں۔ (''آج''، دو)۔

رقص بسمل

(۱) اس ہری کین ٹائفون، سائیکلون یا خاص حالات میں تورناڈو کی ایک آنکھ بھی ہوتی ہے، اس کے مرکز میں بہت پرسکون کہ دن کے وقت سورج اور رات کے وقت تارے صاف نظر آتے ہیں۔ اس آنکھ تک پہونچنے کے لیے اس کے گرد بے پناہ قوت سے گھومتے، سکڑتے، پھیلتے، ابھرتے، ڈوبتے بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں کو پار کرنا پڑتا ہے (''کینگرین'')۔

(۲) یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے سہتے، اڑتے، ٹھٹھرتے سیاہ بادلوں کے پیچھے لرزتی پیازی نارنجی کرنیں، نیلاہٹ مائل سرمئی چٹان کی دراز میں الٹے پاؤں اترتے سردی میں کانپتے کیکڑے کی تھرتھراتی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔ چند لمحوں میں سب کچھ تاریک بادلوں میں ٹھٹھرتا تاریک ہو جاتا ہے (''کینسر'')۔

(۳) وہ روہانسا بھاگتا ہوا معالج کے کلینک جاتا ہے۔

کلینک بند ہے۔

معالج اپنے گھر پر نہیں ہے۔

وہ دیوانہ وار بھٹکتا ہوا اپنے گھر واپس آتا ہے۔ بڑے دروازے کو بند پاتا ہے۔ گھر سے آتی عجیب و غریب چیخ و پکار سن کر پریشان ہو جاتا ہے اور سامنے دیکھتے ہی گھر کے ستون کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ سامنے اس کے کتے کے کاٹے گئی اور کتے پلے زبانیں لٹکائے آنکھوں میں خصومتوں کے جال لیے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اپنی لٹکتی زبانوں سے ٹپکی گاڑھی رال کو ایک دوسرے کے جسموں میں اتارتے ہیں۔

اس سے پیشتر معالج اپنے گرد دیوانگی کے رقص میں طواف کرنے والوں کا رخ کھڑکیوں دروازوں اور ستون کی طرف موڑ دے وہ پاس پڑی کیتلی اٹھا کر دیوانہ وار کتوں، بلیوں کے کاٹے کتوں بلیوں پر پل پڑتا ہے ("ریبیز")۔

بیانیہ کا اخراج قاری تک پہنچانے کے شعوری عمل کی نثری فنکاری کو حد سے زیادہ گھٹا دینے یا منہا کر دینے سے جو فن پارے وجود میں آئے ہیں ان میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے گویا مصنف کو اپنی نجی کیفیت کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے کا شغف ہے۔ اظہار کے لیے وہ راوی کا سہارا لیتا ہے اور راوی گھٹا گھٹا سا ہے۔ کہیں کہیں راوی دامن چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے یا بر خلاف اس کے، راوی مصنف یا کسی کردار میں ضم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ انور سجاد کا راوی انتہائی معتبر اور سچا ہے اور عام لوگوں کے تناظر میں اس کی حیثیت نمایاں ہے۔ راوی کو موقع دینا چاہیے کہ جو کچھ دیکھ اور جھیل رہا ہے اسے پیش کرتے ہوئے سانس لیتا رہے، کچھ اپنے بیانیہ طور طریقے آزمانے کا موقع پائے۔ دسیوں افسانوں کو مختصر کر کے بیک وقت نقش کرنے کے عمل میں اکثر راوی کی سانس پھول جائے گی اور وہ معدوم سا ہو جائے گا۔ ایسے افسانوں کی تخلیقی ناکامی (ترسیل نہیں) کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

دوسری طرف رقص میں محور سے باہر نکلتی ہوئی اور محور کی طرف جاتی ہوئی طاقتیں کام کرتی ہیں۔ ٹھہراؤ، تندی اور تیزی ہوتی ہے۔ انور سجاد رقص کی صورت، اظہار کو اسلوبیاتی تجربوں میں پیش کرتے ہوئے اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیتے کہ افسانے کی صنف اسے کس حد تک سہار سکتی ہے۔ افسانے کی مناؤگی میں وہ ناکام ہوں تو ہوں، البتہ برصغیر کی حیاتی کشمکش کی علامت سازی میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔

(۷)

بہرکیف انور سجاد کی کوششوں کو ان خلاق کیمیاشناسوں کے مماثل کہا جا سکتا ہے، جنھوں نے سونا خلق کرنے کی دھن میں نئے وسیلے اور سامان ایجاد کیے۔ اپنی کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے "اکوار یجیا" جیسا محلول منکشف کیا جو تحلیل زر میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ انور سجاد کے افسانوں کی امکانی تازگی متوجہ کرتی ہے۔ گویا ایک طویل بہلاوے کے بعد سچائی کا اصل چہرہ نظر آ جائے جہاں کارزار حیات کے آئینے میں مبتذل سیاسی معاشرت کا زوال آمادہ روپ ہو جہاں زندگی زخمی ہو، انسان بے بس ہو، مصائب اور آلام کے دھاردار اور خوں چکاں گھرے منظر ہوں۔ آدمی کا لہو مختلف جھلکیں دکھا رہا ہو۔ کچلے ہوئے نفس کی کراہ ہو۔ کھینچا ہوا جبر کا حصار ہو، نغمے کی گھٹی گھٹی لے ہو۔ عذاب ہو۔ ضیق النفس، سانس کی نالیوں میں ذرات کی لوری... سو جا راج دلارے... کیا مصیبت ہے۔ طوفان ختم ہوتا ہے نہ غبار چھٹتا ہے۔ سانس آتا ہے نہ موت آتی ہے ("کارڈیئک دمہ")۔

برتاؤ؟

دراصل یہ لفظ کا برتاؤ ہی تو ہے۔ بالکل نئے اور اچھوتے لفظوں کے انتخاب سے نئے منظر نامے ترتیب پاتے ہیں۔ افسانے کے ایک لمبے میدانی سفر کے بعد اچانک ایسے منظر نامے لطف دیتے ہیں۔

> وہاں پہاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی وادی میں نصب، اس بڑے پنڈال میں لوگ اس کے منتظر ہیں۔ یہ سب اس کے کہنے سے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ اسے ان لوگوں سے چند باتیں کرنا ہیں۔ چند پیغام دینا ہیں۔ راستے میں اڑتی ہوئی دھول، ایگزاسٹ پائپوں سے نکلتے پٹرول کاروں کے بخارات ڈیزل بسوں کا نکلتا دھواں ("کارڈیئک دمہ")۔

اسلوب؟

انور سجاد کا منفرد طرز بیان ہے۔ دکھوں کا زاویہ نظر اسلوب کی تشکیل کرتا ہے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں، کہیں لفظ دہرا دہرا کر Stress پیدا کرتے ہیں۔ کبھی یہ لفظ یا مختصر جملے اچانک بڑے جملوں کی نئی سطح پر جست لگا دیتے ہیں۔ اس طرح ایک لفظ یا جملے کا ماحول دوسرے لفظ یا جملے کے ماحول میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جملوں کو مختصر کر کے جمانے کے لیے ان کے یہاں واوین (Commas) کا استعمال زیادہ ہے۔ تخلیقی آنچ کے باعث بیانیہ کی ساخت پیچیدہ اور ٹھوس ہو جاتی ہے۔ جملے آہنگ کا نشیب و فراز پیدا کرتے ہیں مثلاً "شہر کے عین وسط صحرا تھا" میں انور سجاد کا Emotive اسلوب خاصا نمایاں ہے۔ یہ افسانہ شطرنج کی بساط کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ درمیان میں وقفے وقفے سے سنجیدہ اور المناک باتیں بہ آسانی کہہ دی گئی ہیں۔ انور سجاد حال کے صیغے کا استعمال بہت کرتے ہیں۔ گویا سب کچھ لمحۂ موجود میں رکا ہے۔

کردار؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انور سجاد کے کردار شکستہ اور زخمی ہیں یا حبس کی حالت میں جی رہے ہیں۔ کرداروں میں کلاسیکی ہیروازم سے انحراف اور برأت ہے۔ انور سجاد کی المیہ نگاری میں اینٹی ہیرو یا پسپا ہیرو کا کردار ہوتا ہے۔

تھیم اور پلاٹ؟

انور سجاد کے سارے افسانے، جیسا کہ وہ خود بھی کہتے ہیں، ایک وسیع تھیم یعنی جبر و استحصال کو لے کر چلتے ہیں۔ مگر اس سے نکلتی ہوئی ہر افسانے کی اپنی تھیم ہوتی ہے۔ مثلاً "چھٹی کا دن" کی تھیم سیر و تماشا ہے۔ "دوب ہوا اور لیجا" کی تھیم کچھ اس طرح ہے: انتہائی ناگفتہ بہ اور بگڑے ہوئے ماحول میں تخلیقی آگہی کی جستجو اور نئی کرن کی امید۔ پلاٹ یا تو نہیں ہوتا یا ٹوٹا پھوٹا نظر آتا ہے۔ بس تخلیق کار کی ذہنی رو کشاں کشاں چلتی ہے، جہاں جہاں لے جائے ساتھ چلیے۔

ہیئت؟

ہیئت کی تخلیق انور سجاد کی اہم خصوصیت ہے۔ ہیئتی تجربے کی مہارت ان سے نئی طرح کے افسانے لکھواتی ہے۔ "دوب ہوا اور لیجا" ایک پر پیچ افسانہ ہے جس کی ہیئت بنیادی طور پر تصویریت ہے مگر اس میں آواز کی شمولیت، موسیقی کا برتاؤ اور جملوں کی حرکت اسے افسانوی حدود میں لے آتی ہیں۔ ہر ہیئت موبائل (mobile) ہے۔ کوئی استعارہ ایسا نہیں جو شروع سے آخر تک قائم ہو۔ ایک شکستہ

معظم کا کردار افسانے کو جگہ جگہ باندھنے کا کام کرتا ہے۔ بیشتر حصہ رات کا منظر نامہ ہے۔ استعارے اور کردار اس میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ بے نام کرداروں میں بس ایک ہی نام دیا گیا ہے۔ کشمی، کشمی افسانے کا غائب حصہ ہے۔ یہ تمام کرداروں کے ضمیر میں ہے اور تخلیق کا ذریعہ ہے۔ اس نازک شے کو برتنے کے لیے صنف نازک یعنی عورت کی شکل دی گئی ہے جو استحصال کی زد پر ہے۔ (''دوب ہوا اور لتھا'' کی کشمی، یا ''سازشی'' کی رقاصہ، یا ''کیکر'' کی لونگ والی، یا ''کونپل'' کی ماں اور بیوی، یا ''شہر کے عین وسط صحرا تھا'' کی ماں یا سرویئر، یا ''چھٹی کا دن'' کی بیوی، سب ضمیر کی تخلیقی تازگی کے باوجود ضمیر پر دباؤ یا بربریت کی یلغار کی علامت ہیں۔)

''دوب ہوا اور لتھا'' سوچ کی استعاراتی، فکری، مکالماتی، تفاعلی، داخلی، حسی اور الم خیز منظریت پر قائم ایک ہیئت ہے۔ اس سوچ کو لیے معظم ڈھولچی اور دوسرے ساتھ کے باہمی تفاعل کی راہ سے نقش کیا گیا ہے۔ یہ کردار الگ الگ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ یہ کردار معظم کی قائم مقامی کرتے ہیں، Resonate کرتے ہیں یا اس کے تعلق سے برآمد ہوتے ہیں۔ مبہم مخالف ماحول کے درمیان کتوں کی مخالفت درج ہوتی ہے۔ گویا افسانہ جس کا مخالف ہے اس کی سطح ذلیل خونخوار جانور کی سی ہے۔ یہ جدید مصوری کی ہیئت ہے۔ تمام استعارے اس مصوری کو شکل دیتے ہیں۔

- ☆ موم بتی راتوں میں جوانی کے تختوں کو گرماتی ہے۔
- ☆ معظم نے پیار سے اپنے ہاتھوں پر سلگتے چاندوں کو دیکھا۔
- ☆ میں لائبریری میں جا کر دیکھتا ہوں وہاں اب بھی شاید کھانے کو ہو۔
- ☆ ہم دوب ہیں ہم ہوا ہیں پھر بھی زنجیروں میں بند ہیں۔
- ☆ وہ روشنی اور ڈھول کی آواز کے شیشے میں اتر گیا۔
- ☆ انھوں نے مجھے سپر مارکیٹ کے Dog Food والے شوکیس میں سجا رکھا تھا۔
- ☆ دور دھوئیں کے غبارانے آسمان میں پرندے منڈلا رہے تھے۔

(''دوب ہوا اور لتھا'')

یہ بے جہت یا چاروں سمت پھیلا ہوا افسانہ اپنے اختتام پر بدلتا ہے۔ ہیئتی اعتبار سے بیانیہ میں روے دار (Crystalline) خاصیت کا احساس ہوتا ہے۔ کئی سطحیں ہر سطح کا آئینے کی طرح اپنی سمت میں انعکاس: تختوں کا ستاروں میں کھلنا شوکیش میں سجانا، ہاتھوں کا چاند، پھوڑوں سے کھرنڈ اترنا، ون ٹو تھری ناٹ فائر وغیرہ۔ یہ علامتی احساس کی تصویری جہت ہے۔ ساری ہیئت میں علامتی احساس بنا گیا ہے۔ طاقتور امیجز کا گھنا برتاؤ کبھی زیر زمین چشمے اور کبھی ابلتے ہوئے لاوے کا احساس دلاتا ہے۔ ''دوب ہوا اور لتھا''، ''بچھو غار نقش'' اور ''پتھر لہو کتا'' ایسے افسانے ہیں جنھیں جدید مصوری میں بھی شمار کرنا چاہیے۔

علامت؟

علامتی اعتبار سے انور سجاد کی زبان میں داخلی نشانیات کا سربستہ نظام ہے جس کا تعلق باہری حقیقت سے قائم ہوتا ہے۔ گویا ان کی علامتیں اصل حقیقت کی مرکزی ماہیت پر استوار ہیں جو علامت کی صحیح بنیاد ہے۔ چنانچہ علامت بات پیش کرنے کا اپنا طاقتور طریقہ ہے۔

قضیاتی بیان اور علامتوں کو ایک دوسرے میں پیوست دیکھ کر افتخار جالب نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انور سجاد کے فن میں افسانے اور شاعری کی حد ود مل گئی ہیں۔ اس سے کنفیوژن پیدا ہوا۔ ان کا یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں، اس لیے کہ قضیاتی بیان اور علامتیں افسانہ نگاری کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔ قضیاتی بیان (جو انور سجاد کی خصوصیت ہے) تو افسانے کی چیز ہے ہی۔ افتخار جالب نے اپنے موقف کو مزید تقویت پہونچانے کے لیے ''استعاراتی فلک الافلاک'' کی ایک شعری اصطلاح تشکیل کی۔ فلک الافلاک سے کون سی قضیاتی یا علاماتی خاصیت مراد ہے؟ یہاں اس لفظ کو علامت کے ساتھ جوڑنے سے کیا تصویر زیادہ صاف ہو جاتی ہے؟ علامت علامت ہوتی ہے، فلکی ہو یا ارضی، بہت پھیلی ہوئی ہو، محدود ہو یا استعارے کی سطح پر ہو۔ پھر بھی، ایسی استعارہ سازی اور ارتفاعی علامتوں کا برتاؤ جو ٹھوس ارضی نہ ہو، اسے فلک الافلاک کہا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ حقیقت سے دوری، علیحدگی یا ابہام کی نمائندگی کر سکتا ہے اور ایسے عصری افسانوں کی شناخت میں معاون ہو سکتا ہے جن میں شاعری برتی گئی ہو، یا موہوم، مبہم یا غیر مرئی خیال کی نمائندگی کی گئی ہو، جو خود حقیقت نہ ہوں، حقیقت کا پرتو ہوں۔

انور سجاد کی علامتیں آسمانی نہیں بلکہ زمینی ہیں، سخت زمین پر قائم ہیں۔ مثلاً ''کارڈئیک دمہ'' میں کالی مٹی کے ذروں کی علامت برتی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ علامت کا فلک الافلاک نہیں ہے۔ ''چھٹی کا دن''، ''لاکٹ'' کی علامت ہے، یا ''پتھر لہو کتا'' میں عنوان کے تینوں لفظ علامتیں ہیں۔ پرندے، لوگ، ہوا، صحرا یا افسانوں کی بنت میں شامل دوسرے استعارے ذیلی اور نسبتاً کم علامتی جزویت کے ہیں۔ انھیں فلک الافلاک سے تعبیر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ انور سجاد کے یہاں زمین پر چلنے والے کردار ہوتے ہیں جنھیں وہ علامت بنا دیتے ہیں، جبکہ رشید امجد ماحول اور فضا کو علامت بناتے ہیں۔ انور سجاد کے یہاں قدرتی فضا یا فطری مناظر (آسمان، ہوا، دوب وغیرہ) جوں کے توں رہتے ہیں علامت نہیں بنتے۔ جو مصنوعیت اور ترچھا پن (Obliqueness) ہے وہ انسانوں (اور حیوانوں) کی ساخت میں ہے۔

کارڈئیک دمہ

''کارڈئیک دمہ'' میں کالی مٹی کے ذرے مداخلت کرتے ہیں۔ یہ بنیادی علامت کردار کے پھیپھڑوں پر جم جاتے ہیں، خون میں داخل ہو جاتے ہیں بولنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ''لفظ ہیں کہ ہر پل حلق میں آ کر پھول جاتے ہیں... پھیپھڑے لہو کو آکسیجن مہیا کرنے کے بجائے اس میں مٹی کے ذرات گھول دیتے ہیں۔ صدائے احتجاج خون اور مٹی کے دلدل میں پھنس جاتی ہے۔''

گویا یہ ذرے سازش کا حصہ ہیں اور گھٹن یا کارڈئیک دمہ باہر سے مسلط ہے۔ پرندوں کا استعارہ سازشی ماحول کی نقاب کشائی کرتے ہوئے آزادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ پھر پرندہ، اور غائب علامتی کردار کھلی اور صاف فضا میں

سانس لینے (یا صدائے احتجاج بلند کرنے) کی آزادی کھو چکا ہے۔ چنانچہ سیاہ گردوغبار اور کالی مٹی کے ذروں کے انسلاکات ایسے ماحول کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں جس میں نہ بول پانے، گھٹتے رہنے یا گھونٹ دیئے جانے کی بربری اذیت کارڈیئک دمہ کی تاثراتی شدت بن گئی ہے۔ علامتی بیان کے درمیان طنز موجود ہے: "ڈاکٹروں نے اس سے کہہ دیا ہے اسے کسی قسم کی گرد سے الرجی نہیں بلکہ اس کا دل پھیل رہا ہے جس سے وہ چھتنار ہتا ہے۔" افسانے میں گرد کا علامتی سلوک رفتہ رفتہ بڑھتا ہے۔ وہ پیغام دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں موجود "سرخ سرخ دھبوں کو زبان چاہیے، زبان کے لیے آواز چاہیے اور آواز کے لیے سانس پر گرد اور دھوئیں کا پہرا ہے۔" گویا گرد، جبر کی علامت ہے۔ آخر میں گرد کے جبر کو نقطۂ عروج تک پہونچانے کے لیے اسے زنا بالجبر کی امیجری سے مستحکم کیا گیا ہے۔ اس دلدوز واقعے کو دیکھنے کے بعد غائب کردار کی "سانس بجے تو اٹھے۔ روشنی ہو تو دروزہ کھولے۔ وہ اسی تشنج میں گرفتار کالی مٹی کے ذروں کی سازش کو سانس کی نالیوں سے لوری کی صورت سنتا ہے۔ سوجا راج دلارے سوجا" اعصاب شکن ماحول میں یہ لوری بڑی بھیانک صورت حال نقش کرتی ہے۔ انور سجاد کے یہاں یہ علامتی بجلیاں ایک ہوش مند کردار کی سوچ اور دردمند آہنگ پر متواتر گرتی ہیں۔

چھٹی کا دن

انور سجاد کا اگر ایک ہی افسانہ منتخب کرنا ہو تو "چھٹی کا دن" ان کا نمائندہ افسانہ ہے جو الگ سے ہی اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ یہ ایک کلرک کی کہانی ہے جو دفتری استحصال کا شکار ہے۔ بیوی کے ساتھ سیر پر نکلا ہے مگر ذہنی طور پر دفتری زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کھویا کھویا (Pre-occupied) ہے۔ اس کے جذبات سرد ہو چکے ہیں۔ دفتر کیا ہے؟ (کلرک) کی آزاد اور تازہ فطرت کو قید کرنے، بدل ڈالنے اور اپنے قدرتی ماحول سے بے آہنگ کر دینے کی نفع پرور انتظامیہ سازش ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو آفس مشرقی خطہ پر مغربی تدبیر کاری اور مغائر طور طریقوں کے تسلط کی علامت بن گیا ہے۔ انسان کو ترقی کی لالچ میں گرفتار کر کے اس بیکراں انبساط سے محروم کر دیا گیا ہے، جو اس کا حق تھا اور جس کا ایک ادنیٰ جزو چھٹی کا دن ہو سکتا ہے۔ مگر کلرک کی داخلی کیفیت اتنی المناک بنادی گئی ہے کہ فطری سیر کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ برخلاف اس کے وہ ایذا پسند ہو جاتا ہے۔ اسے دفتری حالات میں Exist کرنے کے لیے اپنی استعداد سے زیادہ انرجی چاہیے۔ چنانچہ کلرک اپنے باپ اور ماں سے ان کی جان کی قربانی مانگتا ہے اور آخر میں بیوی کو قربانی کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ جبر کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ماں باپ تو بوڑھے ہیں، مگر بیوی قربانی دینے کو راضی ہو جاتی ہے۔ وفادار بیوی، جو کلرک کی اسکیزو فرینیا (Schizophrenia) جیسی حالت کے برعکس مسرتوں، ولولوں، اور ترنگوں سے علاقہ رکھتی ہے، قربانی کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور وہ اسے انجان غار میں جانے پر مجبور کر کے ایک عنوان سے دفتری ایذا پسندی اور انتقامی جبلت کو بیوی کے ساتھ برت کر راحت حاصل کرتا ہے۔ دفتری استحصال کا پنجہ پوری فیملی (یا مشرقی خطے) کو اپنے شکنجے میں کس چکا ہے۔

اس افسانے کا بیانیہ جو ڈائلاگ، مانولاگ، سوچ، مناظر اور ماحول کی کرافٹ سے مرتب ہوتا ہے، علامتی بیانیہ کی اچھی مثال ہے۔ عورت آزادی کی لطیف حسیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ گویا وہ زمین اور آسمان ہوا اور سبزہ زار اور تمام عطائے قدرت یعنی خدا کے نظام رحمانیت کا طمانیت بخش تخلیقی وجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مور کے رقص اور پرندوں کا پس منظر دیا گیا ہے۔ اصل میں سارا گھنا لاوہاں ہے جس جگہ انسان کی بدبختی کے ہاتھوں میں انتظام ہے۔ وہی سیاہ بختی خلق کرتا ہے۔ عورت کی طرح مرد بھی گرفتار بلا ہے مگر یہ مرد سلاخوں کے پار جنگل کے قیدی بادشاہ کی طرح ہے۔ "مرد کی آنکھیں شہر کے پوائنٹ آف ویو سے پنجرے کی سلاخوں کے پار اپنے آپ کو دیکھتی ہیں۔" یہ جملہ بلکہ پورا پیراگراف Julio Cortazar کے افسانے Axoloti کی یاد دلاتا ہے جہاں واحد متکلم ایکویریم میں ایکواٹل (سلامانڈر کے کیچوے والے بچے) کو اسقدر شدت سے دیکھتا ہے کہ آخر کار وہ اپنے آپ کو ایکویریم کے شیشے کے پیچھے پانی کے اندر موجود ایکواٹل سمجھنے لگتا ہے بلکہ دھیرے دھیرے ایکواٹل بن جاتا ہے اور شیشے کے باہر خود کو بیرونی شخص کی طرح دیکھتا ہے جو اس کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ انور سجاد کے کلرک کی حالت کم و بیش یہی ہے۔

> کاہے کی چھٹی، کاہے کی چھٹی۔ میں ہر دن اس سے پہلے دن کی طرح گذار گذار کر اکتا گیا تھا۔ سورج نکلتے ہی فائلیں لیس سر، نو سر، ویری ول سر، تھینک یو سر، پھر گھر، بک بک، جھک جھک، دفتر سے بچی فائلیں، دوات قلم، قلم دوات کاغذ، کاغذ کاغذ لفظ بے معنی لفظ آج تمہیں ترقی دی جاتی ہے اسی طرح محنت کرتے رہے تو کل کل کل کل کل لفظ بے معنی لفظ۔

افسانہ جدید کلچر کا Dis-orientation ہے۔ یورپین کلچر سے شدید ردعمل ہے جس نے مشرقی لطافت اور طمانیت چھین لی ہے۔ "چھٹی کا دن" میں میجک ریلزم (Magic Realism) کی کارفرمائی اس کی علامتی ساخت کو اور بامعنی بنادیتی ہے۔ کہیں کہیں سریت کا خفیف سا برتاؤ علامتی بنت کا حصہ ہے۔ (جگہ جگہ بلا کا ذکر ہے۔ یا پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے سے پہلے اچانک ایک لڑکا نمودار ہوتا ہے، کھلکھلا کر ہنستا ہے اور درختوں کی سرنگ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔)

تکنیکی طور پر افسانے کا دھرا امکاناتی ہے جس کے درمیان یعنی دو کلاموں کے بیچ سوچ یا منظر کی کرافٹ ہے۔ ذیلی علامتوں اور استعاروں کی لڑی ہے۔ اصل علامت لاکٹ ہے جسے سیر کے دوران پہلے عورت اپنے سینے پر سیٹ کرتی ہے، آگے چل کر غار میں بھیجنے سے پہلے مرد عورت کے سینے پر سیٹ کرتا ہے اور جب لاکٹ غار میں گم ہو جاتا ہے تو خاتمہ یوں ہے۔ "اس کا ہاتھ چھاتیوں کے عین درمیان قمیص کو اس جگہ نوچتا ہے جہاں لاکٹ نہیں ہے۔" گویا لاکٹ شوق کی علامت ہے یا دھڑکتا ہوا دل ہے جو سرنگ کی نذر ہو گیا ہے۔

پرندے کی کہانی

"پرندے کی کہانی" میں سریت کا برتاؤ بالکل نہیں ہے، مگر علامتی

ابہام کا وفور ہے۔ خاص کر ٹنڈ منڈ پرندہ جو کہانی کا سب سے نمایاں اور سب سے طاقتور پیکر ہے، اپنے ابہام میں بھی شدید ہے۔ پرندہ ساری کہانی پر پوری طرح سے محیط ہے۔ پرندے کی علامت میں ایک تو مشرق کے تحفظ کا سوال ہے اس لیے کہ یہ خاص پرندہ دانوں کی پرکھ میں معروف ہے، دوسرے خود اس کی حیثیت کی قبولیت کا سوال ہے کہ پرندہ مشرق نژاد ہے اور سفید فام سیاح (س ف س) اس کی خلقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ''اس کی گول گول آنکھیں رتھ کے پہیے تھے۔ چونچ اوپر تلے رکھی دو کرکیوں سے بنی تھی۔ وہ اپنے سوکھے ہوئے پنجے ناپ تول کے زمین میں گاڑ کے چلتا تھا۔'' یہ پرندہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے۔ س ف س اسے ایک قیمتی خزانے یا ایک تحفے کی حیثیت سے حاصل کرنے کے لیے اسے لالچ دیتا ہے جبکہ پرندہ مشرقی لڑکے سے گہرے تعلق اور اپنائیت کی نمائندگی کرتا ہے اور اس سے ہم آہنگ ہے۔ وہ س ف س کی بدنیتی سمجھتا ہے اور اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ ایک نسلی جہد ہے، ایک تصادم ہے۔ مشرق کی انسیت بے زبانی اور مغرب کی عیاری فریب اور غیر ہم آہنگی یا غیریت کو پرندہ پہچانتا ہے۔ س ف س کہتا ہے کہ اس کی ''ماں اپنے کانوں کے ذائقے پر زبان کے ذائقے کو ترجیح دے تو میں بھی اس ضیافت میں شریک ہو سکوں گا۔'' گویا پرندے کی ہم نوائی چارہ سازی اور ہم نفسگی تو کجا اس کی ضیافت کا چٹخارہ لوں گا۔ مشرق کے نصف کرۂ ارض اور مغرب کے مابین یہ تضاد دونوں کے درمیان پیدا تصادم کا منظر نامہ بن جاتا ہے۔

> سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ پرندہ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا
> اچک کر کھلے دروازے سے کار پر چڑھ گیا۔ س ف س کی
> آنکھوں میں تاریک خنک سرخ پھولوں سے لدے دہاڑتے
> جنگل اور پسینے دھان اور بارود کی بو میں رچے رنگ ناچنے
> لگے۔ س ف س نے اپنے ہاتھوں سے وار کو روکنا چاہا لیکن
> پرندے نے اپنی گردن جھکا کر ہاتھوں کے نیچے سے اس کے
> سینے کو نوچ لیا۔

یہ ساری امیجری احتجاج کی علامتی تصویر ہے۔ اس کے برعکس اپنائیت کی لمسیاتی امیجری دیکھیے۔

> اس معصوم لڑکے نے جس کی مسیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں، جس
> کا چہرہ وہاں کی زمین تھا: سوندھی باس، گندمی مٹی، نصف کرۂ ا
> رض پر محیط شوفر سے پرندے کو چھین کر اپنے سینے سے لگا لیا اور
> اس کے سر کو چومتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لڑکا جہاں کہیں بھی آیا ہے، قدرتی معصومیت کھلنڈرے پن اور بے خوفی کی علامت ہے خواہ وہ ''پرندے کی کہانی'' کا لڑکا ہو یا ''چھٹی کا دن'' یا ''کونپل'' کا لڑکا یا ''گائے'' کا۔ کچھ آگے بڑھ جاؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ لڑکے کی علامت میں تخلیق کار کی روح اور طمانت مضمر ہے جسے مستقبل کی امید کی حیثیت حاصل ہے اور تخلیقی قبولیت کا تحرک اسی سے ملتا ہے۔ انور سجاد نے پرندے کی علامت کو دونوں نصف کرۂ ارض پر محیط کر دیا ہے جبکہ ساری کائنات ٹنڈ منڈ پرندے (جو پرندوں سے نکل کر آیا ہے) کے وجود میں داخل ہے۔ وہ جمیل رہا ہے اسے لمسیاتی احساس کی محیط الارضیت درکار ہے۔ س ف س کی کائنات (س ف س بھی ایک پرندہ ہے اور پرندوں سے نکل کر آیا ہے) پرندے کے باہر ہے وہ جمیل نہیں رہا ہے، اسے ٹنڈ منڈ پرندے کا احساس و عرفان نہیں ہے اسی لیے وہ اسے دانے دنکے (Foreign Aid) کی محیط الارضیت سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔

(۹)

نتیجہ؟

علامت کے ساتھ استعاروں کے جماؤ دار طریق کار سے پیچیدہ افسانوی ساخت تو بن جاتی ہے مگر قاری کی حدود میں ترسیل کے لیے یہ مجموعی شکل دقت طلب ہوتی ہے۔ اس طرح یہ تکنیک بھی ایک جبر بن جاتی ہے۔ طنز تو قائم ہوتا ہے مگر قاری کے تئیں افسانے میں Release of tension کا اہتمام نہیں ہوتا۔ انور سجاد کے یہاں ایسے ہیومر کا برتاؤ مشکل سے ملے گا جو طنز کی آغوش میں ہمکتا ہے۔ ہمارے یہاں ہیومر کے لیے ایک لفظ مزاح ہے۔ مگر مزاح جن معنوں میں لیا جاتا ہے، میں افسانے کے تعلق سے اس کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ طنز ہی ہو، لیکن اس کی گود میں مزاح کھیلے۔ مزاح طنز کے بطن سے خلق ہوتا ہے اور طنز ہی کی طرح کام کر سکتا ہے۔ انور سجاد کی سنجیدہ مظہریت مزاح کی لطیف فنکاری کا تقاضہ کرتی ہے تا کہ ترسیل کی راہ استوار ہو اور ''پتھر لہو کتا'' یا ''بچھو غار نقش'' جیسی پیچیدہ صورت نہ پیدا ہو۔ البتہ ''پرندے کی کہانی'' میں انھوں نے ایک جگہ مزاح (بلکہ لطیفہ) کو الگ سے کرافٹ کیا ہے۔ یہ مزاح بھرپور طنز بھی ہے۔ پھر بھی یہ چسپاں کیا گیا ہے اور فکشن کی رواں بیانیہ سے نہیں پھوٹتا۔ ''چھٹی کا دن'' میں کہیں کہیں مزاح کی جھلک بیانیہ کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور افسانے کی قرأت پذیری (Readibility) بڑھا دیتی ہے۔ مگر شافی نہیں۔ شاید مزاح مصنف کے مزاج کے منافی ہے۔

لفظوں کے حد درجہ مناسب استعمال اور استعاراتی تناؤ کے خلقی سلوک کے باوجود انور سجاد کے یہاں افسانوی منصوبہ بندی کی کمی کھٹکتی ہے۔ ان کے یہاں نہ تناؤ کی تدبیر کاری ہے اور نہ پلان کے تحت تناؤ کا زائل ہونا۔ ایسا تناؤ جو قاری کو وہ دکھائے جسے دیکھنے سے وہ انکار کرتا ہو، دیکھنا نہ چاہتا ہو یا دیکھنے سے فرار حاصل کرتا ہو۔ ایسے تناؤ کا تاثر اسے اپنی رائے بدل ڈالنے پر مجبور کرے اسے خود بدل ڈالے۔

افسانوی فارم کی حدود میں رہتے ہوئے انور سجاد کو منضبط طریقے سے چیخ پکار، رونا دھونا، واویلا اور توڑ پھوڑ کرنا چاہیے تھا کیوں کہ ان کے فکشن کا رویہ اشتعال انگیزی کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نامساعد حالات میں فرش ہو جاؤ، غم کو محفوظ رکھو، حوصلۂ نغاں کو فراوانی دو اور سازگار وقت کا انتظار کرو۔ یہ بصورت دیگر قدیم اساطیری انداز ہے۔ انور سجاد کے فن میں اگر کوئی کمی ہے تو بس یہ کہ سب کچھ بنا افسانوی پلان کے ہے۔ ''کونپل'' میں نوزائیدہ بچے کی امیجری لڑکے کی مظہریت، حسرت تعمیر کو اشارہ تو کرتی ہے مگر مطمئن نہیں کرتی۔ ایک False Relief کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۱) مشرقی طرزِ احساس کا عرفان، معرفت اور اس کی مغربی توسیع کس طرح ممکن ہے؟

(۲) علم کی کون سی راہ انسان کے بنیادی (لاشعوری) طبعی رویے کی تسکین کر سکتی ہے، اس کی آزاد فطری روش کو سہار سکتی ہے؟ دینی اساطیری سائنسی اقتصادی یا کوئی اور؟

(۳) محیط الارض معاشرتی رویہ کیا ہونا چاہیے؟

انور سجاد بلاشبہ ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ اگر سنجیدگی سے بے حد سنجیدہ (Serious) ادب پڑھنا ہے تو ان جیسا مشکل سے ملے گا۔ انور سجاد سنگین حالات کا اندوہ نامہ رقم کرتے ہیں جو کھلا ہوا سچ ہے جس طرح انتظار حسین کا بیشتر تمثیلی اور اساطیری ادب در پردہ سچ ہے اور تصادم اکثر سچ اور سچ کے درمیان زیادہ شدید ہوتا ہے۔

فون آیا تو معلوم ہوا کہ بیوی ملیریا کے تیز بخار میں مبتلا ہے۔ بہت ہو گیا، اب پہلی گاڑی سے الہ آباد کے لیے رختِ سفر باندھ رہا ہوں ☆☆☆

زبان کی صحت کا سائنسی تصور، آج کی اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی کثرت کا تنقیدی جائزہ اور غیر معیاری استعمالات کی فہرست و تنقید، جدید لغت نگاری کے اصولوں پر، غیر زبانوں کے الفاظ کا استعمال کہاں ضروری ہے، کہاں معیوب ہے اور کیوں؟ تذکیر و تانیث کے معاملات، عملی قواعد کے بعض مسائل،

مندرجہ بالا مباحث پر مبنی کوئی تین ہزار اندراجات کے لئے پڑھیں:

لغاتِ روزمرہ

از: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات ۳۰۰، مجلد، قیمت: دو سو روپۓ

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند)

اردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شب خون کتاب گھر سے بھی دستیاب ہے

THE COLOUR OF BLACK FLOWERS

Selected Poetry of **Shamsur Rahman Faruqi**

Choosen by
Baidar Bakht

Translated by
Baidar Bakht, Leslie Lavigne and Shamsur Rahman Faruqi

Published by
Ajmal Kamal from the City Press, Karachi

Rs. 250.00

*

Available from
Shabkhoon Kitab Ghar, Allahabad

تمباکو کی ضرر رسانیاں

آنتون چیخوف، ترجمہ: مہر افشاں فاروقی

شمارہ ۸۹،
مارچ اپریل ۱۹۷۴

کردار:

آئیون نیوخن، ایک زن مرید شوہر جس کی بیوی ایک میوزک اسکول اور ایک لڑکیوں کا بورڈنگ چلاتی ہے۔

منظر:

ایک مقامی کلب کا اسٹیج۔

آئیون نیوخن:

(مونچھیں ندارد لیکن لمبے گل مچھے، ایک پرانا، مسلسل پہننے سے گھسا ہوا، فراک نما کوٹ پہنے ہوئے بڑے وقار سے اندر آتا ہے، جھک کر تسلیم کرتا ہے اور واسکٹ درست کرتے ہوئے) خواتین و حضرات، یعنی کہ (گل مچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری بیوی سے درخواست کی گئی ہے کہ میں یہاں خیراتی مقصد کے واسطے ایک عام فہم لکچر پڑھوں۔ خیر مجھے اگر لکچر دینا ہے تو دینا ہی ہوگا، اس سلسلہ میں میری کوئی رائے نہیں ہے۔ ہاں یہ تو ہے کہ میں کوئی پروفیسر نہیں ہوں اور نہ ہی میرے پاس عالمانہ ڈگریاں ہیں، مگر پھر بھی پچھلے تیس برسوں سے مسلسل، میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس کام کے میری صحت کے لئے نقصان دہ ثابت ہونے کے باوجود، وغیرہ وغیرہ، میں خالص سائنسی نوعیت کے مسائل پر کام کرتا رہا ہوں۔ میں مفکرانہ قسم کا آدمی ہوں اور ذرا تصور کیجئے، کبھی کبھی وقت تو میں سائنسی مضامین تک لکھ ڈالتا ہوں۔ میرا مطلب ہے قطعی طور پر سائنسی تو نہیں، بلکہ اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ وہ تقریباً سائنسی طرز کے ہوتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ، کچھ دن پہلے میں نے ایک لمبا مضمون ''کچھ کیڑوں کی ضرر رسانی'' لکھا تھا۔ میری لڑکیوں کو وہ بے انتہا پسند ہے۔ خاص طور سے کھٹملوں کے ذکر والے حصوں کو تو وہ بہت پسند کرتی ہیں۔ لیکن پڑھنے کے بعد ہی میں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یقیناً، چاہے آپ جتنا بھی عمدہ کیوں نہ لکھیں، کھٹمل مار دوا سے آپ کو چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ کھٹمل تو ہم لوگوں کے پیانو میں بھی ہیں۔ جو موضوع میں نے اپنے آج کے لکچر کے لئے چنا ہے، وہ، گویا، انسانوں کو تمباکو کے استعمال کے نقصانات کے بارے میں ہے۔ میں خود سگریٹ پیتا ہوں لیکن آج میری بیوی نے مجھ کو تمباکو کی ضرر رسانی پر لکچر دینے کا حکم دیا ہے اور اس لئے مجھے لکچر دیتے ہی بنے گی۔ تمباکو پر... خیر تمباکو پر ہی رہنے دیجئے... میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن آپ حضرات سے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ میرے اس لکچر پر سنجیدگی سے غور کریں، اس ڈر سے کہ کوئی غیر متوقع واقعہ نہ ہو جائے۔ مگر وہ لوگ جو خشک سائنسی لکچروں سے گھبراتے ہیں، جنھیں ایسی چیزوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے اگر چاہیں تو اسے نہ بھی سنیں اور جا بھی سکتے ہیں۔ (واسکٹ درست کرتے ہوئے) میں خصوصاً یہاں پر آئے ہوئے طبی پیشہ سے تعلق رکھنے والے ممبران کی توجہ کا متمنی ہوں، جو کہ میرے اس لکچر سے بہت ساری کارآمد معلومات حاصل کر سکیں گے۔ کیوں کہ تمباکو، نقصان دہ اثرات کے علاوہ، دواؤں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مثال کے طور پر اگر آپ ایک مکھی کو نسوار کے ڈبے میں بند کریں تو وہ غالباً اعصاب کی ابتری سے مر جائے گی۔ تمباکو اصلاً ایک پودا ہے.. عموماً میں لکچر دیتے وقت اپنی داہنی آنکھ جھپکاتا ہوں لیکن آپ اس کا کوئی خیال نہ کریں۔ یہ تو محض گھبراہٹ کا اثر ہے۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو میں بہت ہی نروس قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے ۱۸۸۹ سے ہی اپنی داہنی آنکھ جھپکانا شروع کر دی تھی۔ قطعی تاریخ بیان کروں تو وہ ۱۳ ستمبر تھی۔ اسی دن جس دن میری بیوی نے ہماری، گویا، چوتھی بیٹی بار برا کو جنم دیا تھا۔ میری سب لڑکیاں ۱۳ تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں۔ حالاں کہ (اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارے پاس وقت کم ہے، مجھے اپنے لکچر کے موضوع سے بھٹکنا نہیں چاہئے۔ برسبیل تذکرہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میری بیوی ایک میوزک اور ایک پرائیویٹ بورڈنگ اسکول چلاتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے قطعی طور پر بورڈنگ اسکول تو نہیں لیکن تھوڑا بہت اسی کی طرح کا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میری بیوی کو حالات کی تنگی کی شکایت کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس نے کچھ نہیں تو چالیس پچاس ہزار روبل کی رقم جوڑ جوڑ کر چھپا رکھی ہے۔ مگر میرے پاس، میرے پاس تو اپنے کو بخشنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ایک کوڑی تک نہیں۔ لیکن، خیر، ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ۔ بورڈنگ اسکول میں میری ڈیوٹی گرہستی سنبھالنا ہے۔ میں گھر کا سامان خریدتا ہوں، نوکروں پر نگاہ رکھتا ہوں، اخراجات کو ایک رجسٹر میں نوٹ کرتا ہوں، کاپیاں سلتا ہوں، پسو اور کھٹمل مارتا ہوں، اپنی بیوی کی کتیا کو ٹہلاتا ہوں، چوہے پکڑتا ہوں.. پچھلی رات مجھے باورچی کو آٹا اور مکھن دینا پڑا کیوں کہ آج کیک پکنے والے تھے۔ خیر مختصراً جب کیک تیار ہو گئے تو میری بیوی باورچی خانے میں یہ کہنے آئی کہ اس کی تین شاگردوں کو گلے کی گلٹیاں پھولنے کی وجہ سے کیک نہیں ملے گا۔ تو اس طرح ایسا ہوا کہ ہمارے پاس کچھ کیک زیادہ بچ رہے۔ پھر ان کا کیا ہوتا؟ میری بیوی نے پہلے تو حکم دیا کہ انھیں نعمت خانے میں رکھ دیا جائے، پھر کچھ دیر سوچا اور سوچ سمجھ کر کہا، ''یہ کیک تمھیں لو۔ لولو کہیں کے!'' جب اس کا موڈ خراب رہتا ہے تو وہ ہمیشہ مجھے یہی سب کہتی ہے: ''لولو''، یا ''سنپولا''، یا ''شیطان۔'' آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کیسا شیطان میں ہوں۔ اس کا موڈ ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ لیکن میں نے ان کیکوں کو ٹھیک سے چبایا نہیں۔ یوں ہی

نکل گیا، کیوں کہ مجھے ہمیشہ بھوک لگی رہتی ہے۔ کل، مثال کے طور پر، اس نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ کہنے لگی، تم کو کھلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ "لولو جیسے تو تم ہو..." بہر حال (گھڑی دیکھتے ہوئے)، میں اپنے موضوع سے بھٹک گیا ہوں اور اپنے نفس موضوع سے بھی تھوڑا ہٹ گیا ہوں۔ چلئے آگے بڑھیں۔ حالاں کہ اس وقت آپ کوئی رومانی کہانی یا سمفنی یا موسیقی سننا پسند کریں گے۔ (گاتا ہے) "میدان سے ہٹیں گے نہ ہمارے کبھی پاؤں" یاد نہیں آتا کس گانے میں ہے... برسبیل تذکرہ میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اپنی بیوی کے میوزک اسکول میں گرہستی سنبھالنے کے علاوہ میرا کام میتھمیٹکس، فزکس، کیمسٹری، جغرافیہ، تاریخ، سرگم، لٹریچر وغیرہ پڑھانا بھی ہے۔ ناچ گانا اور آرٹ سکھانے کے لئے میری بیوی الگ سے فیس لیتی ہے حالاں کہ میں ہی ناچ کا بھی ماسٹر ہوں اور گانے کا بھی۔ ہمارا میوزک اسکول ۱۳ نمبر پانچ کتا گلی میں ہے۔ شاید اسی لئے میں اتنا بدنصیب رہا ہوں۔ ۱۳ نمبر کے مکان میں رہنے کی وجہ سے۔ پھر میری سب لڑکیاں ۱۳ کو پیدا ہوئیں اور ہمارے مکان میں بھی ۱۳ کھڑکیاں ہیں۔ لیکن خیر، اس کو دہرانے سے کیا فائدہ۔ میری بیوی کاروباری انٹرویو کے لئے ہر وقت گھر میں رہتی ہے، اور اسکول کا پراسپکٹس یہاں کے چپراسی سے مل سکتا ہے۔ ایک نسخہ چھ پیسوں میں۔ (کچھ نسخے اپنی جیب سے نکالتے ہوئے) اور اگر آپ چاہیں تو میں خود آپ کو دے سکتا ہوں۔ بس چھ چھ پیسے میں۔ کسی کو چاہئے؟ (وقفہ) کوئی نہیں۔ چلئے چار پیسے کر دیتا ہوں۔ (وقفہ) یہ تو بری بری بات ہے... ہاں مکان نمبر ۱۳ ہے۔ میں ہر کام میں ناکام رہتا ہوں۔ میں بوڑھا اور احمق ہو گیا ہوں۔ اس وقت میں لکچر دے رہا ہوں اور دیکھنے میں خاصا خوش مزاج نظر آتا ہوں۔ لیکن میرا اس وقت بے تحاشا چیخنے کو یا دنیا کے آخری کرنے میں بھاگ جانے کا دل چاہ رہا ہے... کوئی بھی نہیں ہے جس سے میں اپنا دکھڑا کہوں۔ میں رونا چاہتا ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں، تمہارے بیٹیاں تو ہیں... لیکن لڑکیاں کیا ہوتی ہیں؟ جب میں ان سے بات کرتا ہوں تو وہ صرف ہنستی ہیں... میری بیوی کی سات لڑکیاں ہیں۔ نہیں معاف کیجئے گا، میرا خیال ہے صرف چھ (جھجک کر) یقیناً سات ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی اینیا ستائیس سال کی ہے اور سب سے چھوٹی سترہ سال کی۔ حضرات! (چاروں طرف دیکھتا ہے) میں شکستہ حال ہوں، میں محض ایک بے وقوف اور بے حقیقت شے بن گیا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے سامنے دنیا کے سب سے زیادہ خوش باپ کو دیکھ رہے ہیں۔ آخر ایسا ہی تو ہونا چاہئے، لیکن میری ہمت نہیں ہے کہ میں کہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن کاش آپ جانتے! میں نے اپنی بیوی کے ساتھ تینتیس سال گذارے ہیں۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ میرا مطلب ہے قطعی بہترین نہیں۔ لیکن عمومی طور پر۔ مختصراً یوں کہئے کہ وہ خوشی کے ایک لمحے کی طرح گذر گئے۔ لیکن سچ پوچھئے تو لعنت ہے سب پر (چاروں طرف دیکھتا ہے) مگر میرا خیال ہے وہ ابھی تک آئی نہیں۔ وہ یہاں نہیں ہے اس لئے جو بھی میرے دل میں آئے میں وہ سب کہہ سکتا ہوں... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے... جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ خیر جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا۔ میری لڑکیوں کی شادی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ وہ بہت شرمیلی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ مردوں کو انہیں دیکھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ میری بیوی پارٹیاں دینا نہیں چاہتی۔ وہ کبھی کسی کو کھانے پر نہیں بلاتی۔ وہ بہت ہی زیادہ کنجوس، غصہ ور اور لڑاکا عورت ہے۔ اس لئے کوئی ہمارے گھر نہیں آتا... لیکن میں آپ کو رازدارانہ طور پر بتاتا ہوں (فٹ لائٹ کے قریب آتے ہوئے)... میری بیوی کی لڑکیاں بڑے بڑے تیوہاروں کے دن اپنی خالہ نتالی کے گھر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ وہی نتالی جو گٹھیا کی مریض ہے اور ہمیشہ ایک پیلے رنگ کا کالی چتی دار لباس پہنے رہتی ہے، جیسے کہ وہ پوری پوری کالے بھونروں سے ڈھکی ہو۔ وہاں پر اصلی کھانا ملتا ہے۔ اور اگر اتفاقاً میری بیوی وہاں نہ ہو تب آپ اور... (کہنی اٹھاتے ہوئے) میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے ایک ہی گلاس میں نشہ آجاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے میں بہ یک وقت اتنا خوش اور رنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ پھر مجھے اپنی جوانی کے دن یاد آتے ہیں۔ اور کسی ان جانی وجہ سے میرا کہیں بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ اسی وقت بھاگ جانے کا... آہ کاش آپ جانتے کہ مجھے ایسا کر ڈالنے کی کتنی شدید تمنا ہے۔ (پرمسرت جوش کے ساتھ) کہیں بھاگ جانا، سب کچھ پیچھے چھوڑ کر، کبھی پیچھے دیکھے بغیر بھاگ جانا!... کہاں؟ کوئی فرق نہیں، کہیں جائیں... شرط صرف یہ ہے کہ میں اس نیچ، کمینی، ذلیل زندگی سے بھاگ جاؤں جس نے مجھ کو ایک شکستہ حال بوڑھا، بیوقوف بنا دیا ہے، نرا احمق بنا دیا ہے۔ اپنی اس جاہل، حقیر، غصہ ور، کینہ پرور، خبیث، کنجوس بیوی سے بھاگ جاؤں جو مجھے تینتیس سال سے ستاتی رہی ہے۔ یہ میوزک اسکول، یہ باورچی خانہ، اپنی بیوی کے مالی معاملات و مشغولیات، یہ سب چھوٹی چھوٹی دنیاداری کی باتیں، ان سب کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ بھاگ جاؤں اور پھر کہیں رک جاؤں، دور، بہت دور کسی میدان میں اور کسی پیڑ کی طرح ساکت کھڑا ہو جاؤں کسی لٹھے کی طرح، باغ کے لولو کی طرح، پھیلے ہوئے آسمان کے نیچے اور رات بھر ٹھہرے ہوئے چاند کو اپنے سر پر چمکتا یاد نہ کروں... میرا کس قدر دل چاہتا ہے کہ میں اس پرانے بوسیدہ کوٹ کو کھینچ کر اتار دوں، جس کو تینتیس سال پہلے میں نے اپنی شادی کے دن پہنا تھا... (فراک نما کوٹ کھینچ کر اتارتے ہوئے) اور جس کو پہن کر میں خیراتی مقصد کے لئے لکچر دیتا ہوں... یہ لے! (کوٹ کو پاؤں سے کچلتے ہوئے) یہ لے! میں بھی بوڑھا، بے چارہ اور حقیر ہوں، اس واسکٹ کی طرح جس کی پشت پیوند آلودہ، بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہے... (اپنی پیٹھ دکھاتے ہوئے) مجھے کچھ نہیں چاہئے! میں بھی کبھی جوان تھا، یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، میں نے بھی خواب دیکھے تھے، اپنے کو مرد سمجھتا تھا... اب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ کچھ نہیں فقط سکون... سکون! (پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور جلدی سے اپنا فراک نما کوٹ پہن لیتا ہے) اسٹیج کے پیچھے میری بیوی ہے... وہ آگئی ہے اور اس کونے میں میرا انتظار کر رہی ہے... (گھڑی دیکھتے ہوئے) وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ اگر وہ آپ سے پوچھے تو میں آپ سے التجا کرتا ہوں، کہہ دیجئے گا کہ وہ لکچرر... وہ لولو، میرا مطلب اپنے آپ سے ہے، تمیز و وقار سے پیش آیا تھا۔ (ایک طرف دیکھ کر کھانستے ہوئے) وہ میری طرف دیکھ رہی ہے... (آواز اونچی کرتے ہوئے) اس مفروضے سے شروع کرتے ہوئے کہ تمباکو میں ایک خطرناک زہر ہوتا ہے، جس کے بارے میں میں نے ابھی بتایا ہے، سگریٹ پینا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں یہ امید کرنے کی جرأت کرتا ہوں، گویا کہ میرا لکچر "تمباکو کی ضرر رسانی" آپ کے لئے فائدے کا باعث ہوگا۔ لکچر ختم ہوتا ہے۔ (جھک کر تسلیم کرتا ہے اور بڑے وقار سے چلا جاتا ہے) ☆☆☆

بہ یاد جوزف براڈسکی (۱۹۴۰ تا ۱۹۹۲)

تاتیانا ٹالسٹایا، ترجمہ: مہر افشاں فاروقی

شمارہ ۱۹۷،
اگست ۱۹۹۶

گھر سے جب آخری سامان نکالا جاتا ہے تو بازگشت کی عجیب سی گونج سماجاتی ہے۔ ہماری آواز دیواروں سے ٹکرا کر ہمارے پاس واپس آجاتی ہے۔ اکیلے پن کا ایک شور، سونے پن کا جھونکا۔ تعین کی سمت کا کھوجانا اور اک جی متلانے والی آزادی کا احساس۔ ایسا لگتا ہے کہ سبھی کچھ جائز ہے۔ اور کسی بھی بات کے کوئی معنی نہیں۔ ہمارے قدموں کی کمزور تال کے علاوہ کوئی ردعمل نہیں۔ روسی ادب کی دنیا میں اس وقت ایسا ہی لگ رہا ہے۔ اس صدی کے ختم ہونے کے چار سال قبل ہی بیسویں صدی کے نصف دوم کے سب سے بڑے شاعر کو اس نے کھودیا ہے اور اس جیسے کسی کی اب توقع بھی نہیں کرسکتا۔ جوزف براڈسکی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور ہمارا گھر خالی ہوگیا ہے۔ روس اس نے کوئی بیس اکیس برس پہلے چھوڑ دیا تھا اور امریکہ کی شہریت لے لی تھی۔ اسے امریکہ سے محبت بھی تھی۔ وہ انگریزی میں نظم اور نثر لکھتا تھا۔ لیکن روس آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا ملک نہیں۔ آپ رہائی کی کوشش کرتے رہیئے۔ اور آخری دم تک آپ کو تھامے رہے گا۔

روس میں جب کوئی موت ہوتی ہے رواج ہے کہ سارے آئینے کالی ململ سے ڈھانک دیئے جاتے ہیں۔ یہ بہت پرانا رواج ہے جس کے اصل معنی اب بھلادیئے گئے ہیں یا غلط بیانی کا شکار ہوگئے ہیں۔ بچپن میں میں نے سنا تھا کہ یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ عقیدہ تھا کہ مرنے والا مرنے کے بعد بھی اپنے گھر میں نو دن تک گھومتا پھرتا ہے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے رخصت لیتا ہے۔ ایسے میں آئینے میں اپنی صورت نہ دیکھ کر وہ ڈر نہ جائے۔ لہٰذا آئینے ڈھانک دیئے جاتے ہیں۔ اپنی نامنصفانہ حد تک مختصر لیکن غیر مختتم حد تک تو انگر زندگی میں جوزف کی شخصیت اتنے لوگوں، تقدیروں، کتابوں، شہروں میں منعکس تھی کہ اب ان افسردہ دنوں میں جب وہ ہمارے درمیان موجود ہے لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، دل چاہتا ہے کہ ان سارے آئینوں کو جن سے اسے محبت تھی، ہم ماتمی غلاف چڑھادیں: مین ہیٹن (Manhatten)(۱) کے ساحلوں کو تر بہ تر کرنے والے عظیم الشان دریا۔ ترکی کی آبنائے باسفورس(۲)، ایمسٹرڈیم (Amsterdam) کی نہریں، وینس (Venice) کی آبی شاہراہیں، جن سب کے گیت وہ گاتا تھا۔ پیٹرس برگ (Petersburg) (یعنی وہ شہر جہاں وہ پیدا ہوا) میں پھیلا ہوا رگوں جیسا سڑکوں دریاؤں کا جال... سو جزیرے اور نہ جانے کتنے دریا؟ جیتا اور بے رحم۔ اس کے لئے مستقبل کے سارے شہروں کا نمونہ۔

یہ وہ شہر تھا جہاں نوعمری کے دنوں میں اس پر شاعر ہونے یعنی قانوناً آوارہ گرد ہونے کا حکم لگایا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روس کا واحد شاعر تھا جس پر اس تازہ ایجاد کردہ وحشیانہ قانون کا اطلاق کیا گیا تھا۔ جس کی رو سے دولت کمانے کی خواہش نہ ہونا ایک جرم تھا... ظاہر ہے اصل نکتہ یہ نہیں تھا۔ اپنی حیوانی جبلت کے ذریعہ حاکموں کو پورا احساس تھا کہ وہ کس سے مخاطب تھے۔ انھوں نے سارے کاغذات جن میں جوزف کو شاعری کا ترجمہ کرنے کے عوض میں ملی ہوئی چھوٹی موٹی رقمیں درج تھیں رد کردیے۔

"تمھیں شاعر مقرر کیا کس نے؟" وہ اس پر دہاڑے۔

"میں سمجھتا تھا... میں نے سمجھا کہ یہ تو خدا نے مجھے مقرر کیا ہے۔"

"اچھا ایسا ہے...تو پھر جیل، جلاوطنی۔"

نوجوانی کی ایک نظم میں اس نے وعدہ کیا تھا:
نہ ملک نہ گرجا کا قبرستان میں چنوں گا
میں واپس واسلویسکی (۳) کے جزیرے پر آؤں گا
مرنے کے لئے
لیکن اندھیرے میں مجھے تمہارا گہرا نیلا ہیولا نہیں ملے گا
میں کھینچی نشان بنی ہوئی تارکول اور کنکر کی سڑک پر
گر پڑوں گا۔

میں سوچتی ہوں کہ اس کے دل میں ایک دن کے لئے بھی روس واپس نہ جانے کی خواہش اس لئے تھی کہ کہیں اس کی یہ غیر محتاط سی پیشین گوئی پوری نہ ہوگی۔ اخماتووا (۴)، سویتائی وا (۵) اور ان جیسے اور شاعروں کی نظمیں وہ پڑھتا رہا تھا، اور شاعرانہ اوہام پرستی کو سمجھتا تھا۔ ان کی پہلی اور واحد ملاقات کی بات چیت بھی اسے یاد تھی۔

"تم نے یہ کیسے لکھ دیا...؟ کیا تم نہیں جانتے کہ شاعر کے کہے ہوئے الفاظ ہمیشہ سچ ثابت ہوتے ہیں؟" ان میں سے ایک نے شکایت آمیز لہجے میں کہا... "اور تم نے ایسا لکھا کیسے؟" دوسری شاعرہ متحیر رہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا وہ واقعی پیش آیا۔

میری اس سے ملاقات ۱۹۸۸ میں امریکہ کے ایک مختصر دورے کے درمیان ہوئی۔ اور جب میں روس واپس پہنچی تو مجھے فوراً براڈسکی کے نام منعقد ایک شام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ ایک پرانے دوست نے اس کا کلام پڑھا۔ پھر موسیقی کا پروگرام تھا جو اس کے نام نظر تھی۔ جس ہال میں جلسہ منعقد تھا اس کے قریب پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ راہ چلنے والوں کو لوگ پکڑ پکڑ کر بس ایک ٹکٹ ان کے ہاتھ بیچ دینے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ہال کے باہر سوار پولیس کا پہرہ تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ 'راک میوزک' کا کوئی کانسرٹ ہونے والا ہو۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، جب مجھے یہ خیال آیا کہ انتظامیہ کمیٹی غالباً مجھ سے امید رکھتی ہے کہ میں براڈسکی کے بارے میں کچھ کہوں گی۔ کیونکہ ان کے علم و اطلاع کے مطابق میں پہلی شخص تھی جس نے ان کے محبوب شاعر کو برسوں کی جلاوطنی کے بعد روبرو دیکھا تھا۔ لیکن بھلا میں کہہ کیا سکتی تھی؟ اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہہ سکتے ہیں جس کے ساتھ آپ نے محض دو گھنٹے گزارے ہوں؟ میں نے بہت انکار کیا لیکن انھوں نے مجھے اسٹیج پر گھسیٹ ہی لیا۔ میں نے اپنے کو بالکل احمق سا محسوس کیا۔ ہاں . میں نے براڈسکی کو دیکھا ہے۔ ہاں میں نے اس کو جیتا جاگتا دیکھا ہے، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سگریٹ بہت پیتا ہے۔ ہم لوگوں نے کافی پی۔ گھر میں شکر نہیں تھی۔ (سامعین بے چین ہوگئے۔ کیا امریکی ہمارے شاعر کی دیکھ بھال نہیں کر رہے ہیں؟ اس کے پاس شکر کیوں نہیں تھی؟) اچھا اور کیا؟ اچھا پھر [مشہور بیلے رقاص] بیرش نیکوف (Baryshnikov) اپنے ساتھ لکڑیاں وغیرہ لے کر آ گیا۔ اور دونوں نے مل کر آگ جلائی۔ (ہال میں بے چینی بڑھ گئی۔ کیا ہمارا شاعر وہاں ٹھنڈ سے مرا جا رہا ہے؟) اس کا گھر کس منزل پر ہے؟ کیا کھاتا ہے وہ؟ کیا لکھ رہا ہے؟ ہاتھ سے لکھتا ہے یا ٹائپ رائٹر پر؟ کس کی کتابیں اس کے پاس ہیں؟ کیا اسے معلوم ہے کہ ہم اسے بہت چاہتے ہیں؟ کیا وہ یہاں آئے گا؟ کیا وہ آئے گا؟ کیا وہ آئے گا؟

"جوزف کیا تم روس چلو گے؟"

"ممکن ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ شاید اس سال نہیں۔ مجھے جانا چاہئے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ میری وہاں کسی کو ضرورت نہیں۔"

"اتنے بھولے نہ بنو، وہ تمھیں ایک منٹ کے لئے نہ چھوڑیں گے۔ تمھیں گود میں اٹھا کر سڑکوں کا چکر لگائیں گے...ہوائی جہاز سمیت۔ اتنی بھیڑ ہوگی شیرمیٹے وو (Sheremetevo) ہوائی اڈے پر کسٹم کی حد بھی پار کر جائیں گے۔ اور تمھیں اپنی آغوش میں اٹھا کر ماسکو لے جائیں گے یا پیٹرس برگ۔ سفید گھوڑے پر، اگر وہ تمھیں اچھا لگتا ہو تو۔"

"یہی تو اصل وجہ ہے میرے نہ جانے کی۔ اور مجھے وہاں کسی کی ضرورت نہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے روشن خیال، تعلیم یافتہ طبقے کی وہ معصوم بوڑھی عورتیں، تمھارے قاری، سارے لائبریرین، عجائب گھروں کے ملازم، پنشن یافتہ بزرگ، مشترک فلیٹوں پر مشتمل بلڈنگوں میں رہنے والے جو اپنی چائے کی کیتلی لے کر مشترک باورچی خانے میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ ان سب کا کیا؟ جو فل ہارمونک کانسرٹ (Philharmonic Concert) میں سب سے پیچھے والی قطاروں میں کھمبے کے پاس جہاں ٹکٹ سستے ہوتے ہیں کھڑے رہتے ہیں، ان کا کیا؟ کیا تم انھیں دور سے بھی اپنے کو دیکھنے کا موقع نہیں دو گے؟ آخر وہ تمھارے حقیقی قاری ہیں۔ تم ان کو کیوں سزا دے رہے ہو؟"

میرا یہ وار بے جا تھا۔ بے تکا اور بے جا۔ وہ جواب میں یا تو مذاق کی باتیں کہتا:

"میں اپنے پسندیدہ ڈچ لوگوں سے نہ مل آؤں؟ مجھے اٹلی کے لوگوں سے بہت پیار ہے۔ میں اٹلی جاؤں گا۔ پولینڈ کے لوگ بہت عمدہ ہیں انھوں نے مجھے بلایا ہے۔"

یا وہ ناراض ہو جاتا:

"انھوں نے مجھے میرے بابا کے جنازے میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ میری ماں میرے بغیر مر گئی... میں نے اجازت مانگی اور انھوں نے انکار کر دیا۔"

کیا وہ گھر جانا چاہتا تھا؟ میرے خیال میں شروع میں تو کم از کم بہت زیادہ۔ لیکن وہ جا نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے ماضی سے ڈرتا تھا۔ یادوں سے یاد ہانیوں سے، بازیافتہ قبروں سے، اپنی کمزوریوں سے اسے ڈر تھا۔ اپنی شاعری میں اپنی ماضی کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کو بگاڑنے کا ڈر تھا۔ گذرے کل کو پلٹ کر دیکھنے کا ڈر... جیسے آرفیوس نے یوری ڈائس (۶) کو پلٹ کر دیکھا اور ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ اسے یہ سمجھنے میں قطعی مشکل نہ ہوئی تھی کہ اس کے سچے قاری وہیں ہیں۔

روس ہی میں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ روسی شاعر ہے... حالاں کہ اس نے اپنے کو سمجھا دیا تھا۔ اور صرف اپنے آپ کو... کہ وہ انگریزی کا شاعر ہے۔ شکرے کے بارے میں اس کی ایک نظم ہے ("خزاں میں ایک شکرے کی پکار") جو میساچوسٹس (Massachussets) کی پہاڑیوں میں اتنا اوپر اڑتا ہے کہ اوپر اٹھتی ہوئی ہوا کا دباؤ اس کو زمین پر نیچے اترنے نہیں دیتا۔ اور شکرا وہیں مر جاتا ہے، اس بلندی پر جہاں پر نہ پرند ہیں نہ انسان، نہ سانس لینے کے لئے ہوا۔

تو کیا وہ واپس جاسکتا تھا؟ میں اور دوسرے لوگ کیوں اس کے واپس جانے کے بارے میں یہ سارے سوال پوچھ کر اس کو پریشان کرتے تھے؟ ہم چاہتے تھے کہ وہ محسوس کرلے اور جان لے کہ اس کو کتنا چاہا جاتا تھا... ہم اسے کتنا چاہتے تھے اور مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ اسے اس طرح بار بار یقین دلانے کی ضرورت تھی بھی یا نہیں، یا اس سے اس کے دکھے ہوئے دل کو اور ٹھیس پہنچتی تھی۔

"جوزف تمھیں ہمارے کالج میں تقریر کرنے آنا ہے۔ آؤ گے...؟ فروری یا ستمبر؟"

"ظاہر ہے فروری۔ ستمبر؟ میں اتنے دن زندہ بھی رہوں گا؟" اور پھر وہ ایک اور سگریٹ پیکٹ سے نکال کر اس کا فلٹر توڑ کر پھینکتے ہوئے ایک اور لطیفہ سناتا۔

"شوہر اپنی بیوی سے کہتا ہے: ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ اب آخری وقت آگیا ہے میں صبح تک زندہ نہ رہوں گا۔ چلو شیمپین پئیں اور بس آخری بار ایک دوسرے کی آغوش میں سوجائیں۔ بیوی جواب دیتی ہے: یہ سب تمھارے لئے تو ٹھیک ہے۔ تمھیں صبح اٹھنا تھوڑی ہے۔"

کیا ہمیں اس کے ساتھ "بیمار آدمی" والا برتاؤ کرنا چاہئے تھا... موسم کے بارے میں گفتگو کرنا اور چپکے پنجوں کے بل چلنا؟ جب وہ اسکڈ مور (۷) میں تقریر کرنے آیا تو تین گھنٹے کے کار کے سفر سے بالکل تھک کے چور تھا، کاغذ کی طرح سفید... ایسی حالت تھی کہ دیکھ کر ایمرجنسی (Emergency) کو فون کرنے کو دل چاہے۔ لیکن اس نے ایک گلاس وائن پی اور آدھا پیکٹ سگریٹ کا ختم کرڈالا، بہترین گفتگو کی، اپنی نظمیں پڑھیں۔ اور پھر اور نظمیں پڑھیں، اور پڑھیں، اور پڑھیں... سگریٹ پیتے ہوئے، زبانی، اپنی اور دوسروں کی نظمیں سنائیں۔ تب تک اس کے سامعین اس کے غیر امریکی دھوئیں سے پہلے پڑ چکے تھے لیکن وہ بالکل ٹاپ فارم میں تھا... اس کے گال سرخ تھے۔ آنکھیں چمکتی ہوئی۔ وہ دیر تک پڑھتا رہا، پڑھتا رہا اور جب اسے ہر حال میں سوجانا چاہئے تھا۔ وہ اپنی زبان کے نیچے دل کی بیماری کی گولی دبا کر اور باتیں کرنا چاہتا تھا اور پھر وہ اپنے مہمان نواز میزبان سالمہ گنڈی (۸) کے ناشر باب اور پیگی بوایرز (Bob اور Peggy Boyars) کے ہاں چلا گیا۔ اور وہاں خوب باتیں کیں، شراب پی، سگریٹ پی، خوب ہنسا اور آدھی رات کو جب اس کے میزبان بھی تھک گئے تو میں اور میرے شوہر اسے گیسٹ ہاؤس واپس لے گئے۔ اس کی توانائی لہریں لے رہی تھی اور ہماری گھٹتی جارہی تھی۔

"کتنے پیارے لوگ ہیں۔ لیکن شاید ہم نے انھیں تھکا مارا۔ اچھا تو اب ہم سچ سچ باتیں کرسکتے ہیں۔"

"سچ سچ" یعنی روسی انداز میں۔ اور ہم صبح کے تین بجے تک گیسٹ ہاؤس میں باتیں کرتے رہے... کیونکہ جوزف کو ہر ممکن چیز میں دلچسپی تھی۔ ہم نے درازوں کو کاگ پیچ کی تلاش میں اسک ڈالا تاکہ سرخ وائن کی ایک اور بوتل کھولیں، اس خاموش امریکی عمارت کو ممنوعہ دھوئیں سے بھرڈالا۔ باورچی خانے کا کونا کونا دعوت استقبال سے بچے کچھے کھانے کی تلاش میں چھان مارا۔ (ہمیں لومین چھپا کر رکھ دینا تھا... اور بڑا لذیذ مرغ بچا ہوا تھا... ہمیں چرالینا چاہئے تھا۔")
آخر کار جب ہم نے رخصت لی تو میں اور میرے شوہر تو بمشکل کھڑے ہو پا رہے تھے اور جوزف ابھی بھی تر و تازہ تھا۔

پیٹرس برگ کے سارے دوستوں کے لئے اس کے دل میں غیر معمولی محبت تھی۔ اور ان دوستوں کی خوبیاں جن میں سے کچھ تو محض خیالی تھیں، وہ بہت فراخ دلی سے بیان کرتا تھا۔ اور جہاں تک انسانی وفاداری کی بات ہے اس میں وہ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ دوستوں کے بارے میں اس کی تعیین قدر بالکل معتبر نہ تھی۔ وہ سب کے سب نابغۂ روزگار تھے بالکل موتسارت (۹) کی طرح غیر معمولی، بیسویں صدی کے بہترین شعرا میں سے ایک۔ روسی روایت کے مطابق اس کے لئے انسانی رشتہ انصاف سے اونچا اور محبت سچائی سے برتر تھی۔ روس کے نوجوان شاعر اور مصنف اسے اپنی بیاضوں اور تحریروں کے سیلاب میں غرق کردیتے۔ میں جب بھی ماسکو سے امریکہ جانے کی تیاری کرتی میری جان پہچان کے بھی شاعر اپنی اپنی کتابیں لاکر میرے سوٹ کیس میں ٹھونس دیتے۔

"زیادہ بھاری نہیں ہے۔ خاص بات بس اتنی ہے کہ براڈسکی کو دکھا دینا۔ اور کہہ دینا کہ بس اس کو پڑھ لے اور ہمیں کچھ نہ چاہیئے۔ بس وہ پڑھ بھر لے۔"

اور وہ پڑھتا تھا اور یاد رکھتا تھا، اور لوگوں کو بتاتا تھا کہ وہ نظمیں اچھی ہیں، اور وہ انٹرویو دیتے وقت ان خوش قسمت لوگوں کی تعریف کرتا تھا۔ اور وہ اسے اپنی مطبوعات بھیجتے ہی رہتے۔ اور ان کے دماغ پھر جاتے اور ان میں سے بعض تو ایسی باتیں کہنے لگ جاتے مثلاً: "سچ بات تو یہ ہے کہ روس میں صرف دو اصلی شاعر ہیں۔ ایک براڈسکی اور ایک میں۔" اس نے اپنے بارے میں ایک نرم دل پرانے قسم کے کنبہ پرور بوڑھے باپ ہونے کا تاثر قائم کردیا تھا۔ لیکن کاش اگر وہ نوجوان مصنف (جس کا نام میں نہیں لینا چاہتی) سن سکتا کہ فرماں بردار براڈسکی اس کا افسانہ پڑھ کر کس قدر شکوہ شکایت کرتا اور رنج کا اظہار کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا افسانہ اخلاقی پستی سے لطف اندوزی کے بارے میں تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بھی لکھتے رہنا ممکن ہے لیکن اس کے بعد وہ جی کیسے سکتا ہے؟"

وہ روس نہیں گیا۔ لیکن روس اس کے پاس آگیا۔ سب نے خود کو یقین دلالیا کہ وہ واقعی سچ مچ ایک جیتی جاگتی ہستی تھا، زندہ تھا اور لکھ رہا تھا... یہ عجیب و غریب روسی شاعر جو روس کی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ روسی اخباروں،

رسالوں، یک جلدی یا کثیر الجلد مجموعوں میں چھپتا تھا۔ اس کی تحریروں سے اقتباسات نکالے جاتے۔ اس کے بارے میں گہرے مطالعے جیسا وہ چاہتا تھا چھاپے جاتے۔ اور جیسا وہ نہیں چاہتا تھا، وہ بھی چھاپے جاتے۔ لوگ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے دیکھتے۔ اسے استعمال کرتے اور پھر اسے افسانے یا اسطور (Myth) میں بدل دیتے۔

ایک دفعہ ماسکو کی کسی سڑک پر رائے شماری کی گئی: "آنے والے پارلیمنٹری انتخاب سے آپ کو مستقبل کے بارے میں کیا امیدیں ہیں؟" ایک بڑھئی نے جواب دیا۔ "مجھے پارلیمنٹ اور سیاست کی کوئی پروا نہیں، میں تو بس براڈسکی کی طرح پرائیویٹ زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔"

وہ جینا چاہتا تھا، مرنا نہیں... نہ جزیرۂ واسی لیوسکی پر، نہ جزیرۂ مین ہیٹن پر۔ وہ خوش تھا۔ اس کے بیوی بچے تھے جنھیں وہ چاہتا تھا۔ اور شاعری تھی۔ دوست تھے، پڑھنے والے تھے، طالب علم تھے۔ وہ اپنے ڈاکٹروں سے بھاگ کر ماؤنٹ ہولیوک (۱۰) چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا ڈاکٹر لوگ اسے وہاں پکڑ نہ پائیں گے۔ وہ اپنی پیشین گوئی سے بچ نکلنا چاہتا تھا:

میں قینچی قینچی نشان بنی ہوئی تارکول اور کنکر
کی سڑک پر گر پڑوں گا۔

وہ ایک اور جزیرے میں اپنی لائبریری کے فرش پر لڑکھڑا کر گرا۔

امریکی، روسی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی لکیروں کے نیچے جو کہ ایک تارک وطن کی دوہری تقدیر تھے:

اور دو لڑکیاں... نہ بتائے ہوئے برسوں کی بہنیں
جزیرے پر دوڑتی ہوئی
لڑکے کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہیں

وہ اپنی موت پر بے شک دو لڑکیاں چھوڑ گیا... اپنی بیوی اور اپنی بیٹی۔

"جوزف جانتے ہو، اگر تم شور شرابے کے ساتھ، سفید گھوڑے پر سوار، اُمڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان واپس نہیں جانا چاہتے تو تم بھیس بدل کر پیٹرس برگ کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"بھیس بدل کر؟"

اچانک نہ تو وہ برہم تھا اور نہ ہی مذاق میں بات کو ٹال رہا تھا۔ بلکہ بہت غور سے وہ میری بات سن رہا تھا۔

"ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ تم نقلی مونچھیں وغیرہ لگا لینا... یا ایسا ہی کچھ اور کر لینا۔ بس کسی کو بتانا مت۔ کسی کو بھی نہیں۔ تم روس چلے جاؤ۔ ٹریم پر بیٹھ کر مینوسکی پراسپکٹ کی سیر کرو۔ سڑکوں پر چہل قدمی کرو، آزاد اور گم نام۔ وہاں پر بھیڑ رہتی ہے۔ سب لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ڈھکیلتے رہتے ہیں۔ آئس کریم خریدنا۔ کون پہچانے گا! اگر تمھارا دل چاہے تو فون بوتھ سے اپنے دوستوں کو فون کر لینا۔ کہہ دینا تم امریکہ سے فون کر رہے ہو۔ یا اگر جی چاہے تو کسی دوست کے دروازے پر یوں ہی دستک دینا۔ میں حاضر ہوں۔ یوں ہی چلا آیا۔ تمھاری یاد آئی تھی۔"

میں تو یہ سب باتیں کر رہی تھی۔ چہلیں کر رہی تھی کہ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ ہنس نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کے چہرے پر ایک معصومیت، بے بسی جھلک رہی تھی ایک عجیب قسم کی خوابیدگی۔ اس کی آنکھیں چیزوں کے آر پار دیکھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چیزوں کے کناروں کے بیچ سے گذر کر۔ وقت کے دوسرے سرے پر وہ چپ بیٹھا تھا۔ اور میں عجیب سا محسوس کر رہی تھی جیسے کسی جگہ بن بلائے گھس گئی ہوں۔ اس احساس کو دور کرنے کے لئے میں نے قابل رحم سی خوش طبع آواز میں کہا:

"بڑا اچھا آئیڈیا ہے، ہے نہ؟"

اس نے مجھے جیسے آر پار دیکھا اور زیر لب کہا۔

"شاندار... بہت شاندار" ☆☆☆

حواشی

از مہر افشاں فاروقی

(۱) نیویارک شہر کا سب سے اہم حصہ جو چاروں طرف دریا سے گھرا ہوا ہے لہٰذا اسے جزیرۂ مین ہیٹن بھی کہتے ہیں۔

(۲) وہ تنگ آبنائے جو بحر اسود کو بحر مارمورہ سے الگ کرتی ہے۔(Bosporous)۔

(۳) سینٹ پیٹرس برگ (کمیونسٹ زمانے میں اس شہر کا نام لینن گراڈ تھا) کے کئی جزیروں سے ایک جزیرہ(Vasilevsky)۔

(۴)Anna Akhmatva(۱۸۸۹تا۱۹۶۶) اس زمانے کی سب سے بڑی روسی شاعرہ جو کمیونسٹ عہد میں بے حد معتوب و مظلوم رہی۔

(۵)Olga Tsvetaeva اسٹالن کے زمانے کی غیر معمولی شاعرہ جس کا کلام اب دنیا میں پھیل رہا ہے۔

(۶) یونانی دیومالا کا موسیقار آرفیوس اپنی معشوقہ یوری ڈائس (Urndyce) کی تلاش میں تحت الثریٰ تک جاتا ہے لیکن پھر اسے کھو دیتا ہے۔

(۷)Skidmore کالج نیویارک اسٹیٹ میں ایک چھوٹا سا کالج جہاں ٹالسٹایا تخلیقی ادب پڑھاتی ہے۔

(۸)Salmagarrdi کوئی بھی ملی جلی ہانڈی۔ یہ ایک رسالے کا نام ہے۔

(۹)Wolfgang Mozart (۱۷۵۶تا ۱۷۹۱) آسٹریائی موسیقار جس نے نوعمری ہی میں ایسی موسیقی لکھی جو بڑے بڑے ماہروں کو تا عمر نصیب نہیں ہوتی۔

(۱۰)Mount Holyoke نیویارک میں ایک کالج جہاں براڈسکی پڑھاتا تھا۔

راج بدل گیا

اینڈرو موشن، ترجمہ، مہرافشاں فاروقی

شمارہ ۲۶۷
اپریل ۲۰۰۳

نینوا کی سڑک پر،
آگے بڑھتے ہوئے موت نے ذرا دم لیا اور کہا:
"غور سے سنو!
دیکھتے ہو، آس پاس کی ان جگہوں کے نام؟
یہ اب میرے ہیں۔ میں نے انھیں پلٹ دیا ہے۔
اور وہ باغ عدن... جو یہاں سے جنوب کو ہے،
آج پو پھٹتے ہی میں نے اپنے سپاہیوں کو فرمان بھیجا:
اکھاڑ پھینکو... اس کی دیواریں، اس کے پھاٹک، تاکہ سب دیکھ سکیں
ان پرتکلف رسیلے فواکہ کو جو اس کے درختوں پر آویزاں ہیں۔
تمھارا دل اس پر للچاتا ہے نہ؟ تو جاؤ، کھالو،
اپنے ہونٹ چاٹو، پھلوں کو توڑو، پھر توڑو

دجلہ و فرات کی کیا بات؟ جاؤ انھیں تسخیر کرلو: وہ زمانہ بھی تھا
جب وہ بچپن کے رنگوں والی ریتی اور دھوپ کی چلمن
سے ہو کر بہتی تھیں۔
لیکن اب؟ اب نہیں۔

اب تو میں نے انھیں انواع و اقسام کے انسانی فضلے سے پاٹ دیا ہے۔

بابل کو ذرا دیکھو، جاؤ، اسے بھی لے لو۔
وہ محل جس میں بے تحاشا پھول اگتے تھے جن کی
خوشبوئیں
سلطنتوں کے لئے امن کے دنوں کو شیریں تر بناتی تھیں...
ابھی اب میں نے فضا کو معطر کرنے کا اور ہی طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے۔
اور ابھی سے لوگ اسے بے بسی اور نومیدی کا ہی ایک نام دینے لگے ہیں۔

اور اب رہا بغداد... اس کے میناروں پر تاروں کے شمسے،
سنگ مرمر کے ایوان اور دالان، اور سراب حدت
یہ مقامات، اور وہ ساری قدیم اشیا جنھیں تم جانتے ہو،
بس بہت جلد تم انھیں نہ جانو گے...
اس وقت
یہی تو میری مصروفیت ہے، کام چل رہا ہے۔"

مہیش اشک

شمارہ ۶۷،
دسمبر ۱۹۷۱

میرا کی طرح اس کی محبت میں دم کہاں
لیتے ہیں روز کرشن جہاں میں جنم کہاں

اب خواب بھی بھٹکنے لگے میرے دشت دشت
رکتے ہیں دیکھنا ہے یہ وحشی قدم کہاں

جنگل یہ خواہشات یہ موہوم راستے
اے تشنگی کی رات بتا، جائیں ہم کہاں

وہ خامشی ہے اب کہ بھٹکتی ہے روح بھی
جسموں کے وہ سراب کہاں جام جم کہاں

نفرت نہ کر کہ ہم کوئی سقراط تو نہیں
راس آتا ہے ہر ایک کو آخر یہ سم کہاں

آوارہ گھومتے ہیں خیالات کے بدن
قصے مری حیات کے ہوں گے رقم کہاں

شمارہ ۲۵۱
دسمبر ۲۰۰۱

پورا پورا چپ، پوری پوری گویائی بھی
وہ دو آنکھیں محفل بھی تنہائی بھی

تم کھاری پن لے آئے حالانکہ
ساگر میں دستار بھی ہے گہرائی بھی

میں ہی جلوہ میں ہی پردہ میں ہی طور
میں ہی اپنی متحیر بینائی بھی

نہیں ہے تو اک ہرا بھرا میدان ہی بس
ورنہ ہم میں پربت بھی ہے، کھائی بھی

کیسے کیسے لوگ تھے کھینے والوں میں
لیکن کوئی ناؤ کنارے آئی بھی

لمحہ لمحہ آنکھ جنموں نے نم رکھی
مشکل ہے ان قطروں کی یکجائی بھی

دنیا قرض ہے گر دنیا کے ہونے کا
دنیا ہی ہے دنیا کی بھرپائی بھی

میراجی

شمارہ ۲۷،
اگست ۱۹۶۸

یہ ساغر تو نہیں ہے، اک خذف ریزہ اٹھاتا ہوں...
اٹھا کر پھینکتا ہوں جھیل کے شفاف پانی پر
تو لہروں کے کئی چکر بناتا ہوں؛

یہ کس کے ہاتھ نے دن رات کا پردہ اٹھایا ہے
کہ رقاصہ نے جلدی سے گھما کر ساق سیمیں کو
نشانِ راہ کا منظر دکھایا ہے، لبھایا ہے
نگاہِ غیر کو، اپنا بنایا ہے؛

ادھر لاتا۔ بطے تیرتی جائے۔ ادھر لاتا
بس اب دردِ خیال تشنہ بھی باقی نہ رہ جائے،
فراموشی مرے دامن سے کیوں لپٹے؟ وہ قحبہ تو نہیں ہے جس کے آنچل میں
ہزاروں سانس الجھ کر رینگتے رہتے ہیں، نادانی میں لہریں بن کے مٹتے ہیں؛

تھکن سے چور، پژمردہ کلائی نیم جاں، پھیلی فضا کو تھام لیتی ہے
مری رگ رگ میں ایسے خون کی بوندیں لرزتی ہیں
جو رقاصہ کے ماتھے کا پسینہ ہے،

یہ کس کی نرم انگشت حنائی نے کنول کو یوں ٹٹولا ہے کہ ہر پتی لرز اٹھی؟
کہیں اب تیری یہ آشفتہ تنہائی نہ مٹ جائے۔
اٹھو، میرے قریب آؤ.... قریب آؤ... جھجکتے ہو؟
تو پھر کس بات پہ ساغر اٹھایا تھا،
وہ دھمکی تھی: مجھے خونِ حیات رفتہ پینا ہے؟
چلو جاؤ، اسی سوئی ہوئی رقاصہ کو لاؤ جو اپنی سرد آنکھوں سے
اچھلتے کودتے دل کو تھپکتے ہی سلادے گرم آہوں میں،
مجھے جینا ہے۔ اس لمحے کو چٹکی میں مسل کر، میں زمانِ بے کراں کا شاہد و
دم ساز کردوں گا

ادھر لاتا بطے تیرتی جائے۔
وہ منظر پھر چھلک اٹھے جو میرے سامنے آ کر بجھاتا تھا۔ ترا ہر
سانس فانی ہے،
ترے روئے شگفتہ نے کھلایا میرے گلشن کو
مجھے ایسا جھنجھوڑا جس طرح جھونکا
کسی آزردہ پتی کو تھپیڑوں سے بہاتا ہی چلا جاتا ہے، رکتا ہی نہیں،
بہتا ہے، بہتا ہے، بہاتا ہے؛

کبھی دیکھی ہیں آتش دان کی چنگاریاں تم نے؟
ہنسی میں گل زدہ رخسار کو سہلا کے ہر انگشت رستی ہے
کسی نازک رسیلے پھل کی پتلی قاش سے میری زباں چھونے لگی،
دیکھو...
سفیدی صاف، سادہ پیرہن کی سوکھے پتوں کو مسلتی ہے
یونہی لیٹی ہوئی رہیو، ذرا میں سوچ لوں اک گھونٹ تیرے گرم بازو سے
مرے دل کو سبک سر کر سکے گا، یا میں پھر گہرے اندھیرے کے خلا میں
جھولتے ہی جھولتے نم ناک آنکھیں بند کرلوں گا؟

یہ صبح پیرہن غماز ہے اس بات کی: مت سوچ خاموشی ہی بہتر ہے،
مگر موجِ کفِ آلودہ تصور میں در آتی ہے
ادھر لاتا۔ بطے کے گلوئے گرم کی ہر جنبش پیچاں
اسی رقاصہ کے دامن میں گھوم کر کو
جھلاتی ہے جواب تک میرے پہلو میں چھپی بیٹھی رہی، لیکن

مجھے تم طفلِ ناداں کی طرح کیوں دیکھتے ہو؟ طفلِ ناداں تو نہیں
ہوں میں، نہ تم ہی طفلِ ناداں ہو...

میراجی

شمارہ ۴۰،
اکتوبر ۱۹۶۹

زمانے میں کوئی برائی نہیں ہے
فقط اک تسلسل کا جھولا رواں ہے

یہ میں کہہ رہا ہوں
میں کوئی برائی نہیں ہوں، زمانہ نہیں ہوں، تسلسل کا جھولا نہیں ہوں۔
مجھے کیا خبر کیا برائی میں ہے، کیا زمانے میں اور پھر تو یہ بھی کہوں گا
کہ جو شے اکیلی رہے، اس کی منزل فنا ہے
برائی بھلائی زمانہ تسلسل... یہ باتیں بقا کے گھرانے سے آئی ہوئی ہیں
مجھے تو کسی بھی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے
میں ہوں ایک اور میں اکیلا ہوں، اک اجنبی ہوں

یہ بستی، یہ جنگل، یہ بہتے ہوئے راستے اور دریا
یہ پربت، اچانک نگاہوں میں آتی ہوئی کوئی اونچی عمارت
یہ اجڑے ہوئے مقبرے اور مرگِ مسلسل کی صورت مجاور
یہ ہنستے ہوئے ننھے بچے، یہ گاڑی سے ٹکرا کے مرتا ہوا ایک اندھا مسافر
ہوائیں، نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ کیا ہیں؟
یہی تو زمانہ ہے، یہ اک تسلسل کا جھولا رواں ہے

یہ میں کہہ رہا ہوں
یہ بستی، یہ جنگل، یہ رستے، یہ دریا، یہ پربت، عمارت، مجاور، مسافر
ہوائیں، نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ سب کچھ، یہ ہر شے مرے ہی گھرانے سے آئی ہوئی ہے
زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے ان مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے، یہ کیسے کہوں میں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملے ہیں

میراجی

شمارہ ۱۴،
اکتوبر ۱۹۶۹

فضا میں سکوں ہے
الم ناک گہرا، گھنا، ایک اک شے کو گھیرے ہوئے، ایک اک شے کو
افسردگی سے مسل کر مٹاتا ہوا، بے اماں۔ بے محل، نور سے دور...
پھیلی فضا میں سکوں ہے
اجالے کی ہر اک کرن جیسے تھکی ہوئی ہے
اندھیرے سے بڑھ کر اندھیرا ہے

لچکتی ہوئی ٹہنیوں کی گھنی پتیوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے
ہوا سرسرانے لگی ہے
ہوا کس لیے سرسرانے لگی ہے
کہیں دور... غول بیاباں کی دل کو مسلتی ہوئی چیخ جاگی
کہیں دور غول بیاباں
کہیں دور
کہیں دور کیا ہے... سکوں ہے
کہیں دور کچھ بھی نہیں ہے، سکوں ہے
کہیں دور کچھ بھی نہیں ہے؟
کہیں دور کچھ بھی نہیں ہے تو پھر کیسے غول بیاباں کی دل کو مسلتی ہوئی
چیخ جاگی؟

فسردہ سی کچھ ہڈیاں ہیں، فسردہ سی خاکستر بے زباں ہے؟
فسردہ سے کنکر، فسردہ فضا میں سکوں ہے
یہاں کوئی غول بیاباں نہیں ہے
لچکتی ہوئی ٹہنیوں کی گھنی پتیوں میں گھنا اور گہرا سکوں ہے

کہیں دور...
کہیں دور غول بیاباں...
کہیں دور غول بیاباں کی دل کو مسلتی ہوئی چیخ جاگی
"یہ کیسا فسوں ہے؟"
"سکوں ہے!" "سکوں ہے؟"
سکوں دور ہو جائے، ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شور مجسم بنے سامنے
آئے
پل میں سکوں دور ہو جائے... لیکن
مرے دل کے گہرے سکوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے

میرا جی

شمارہ ۵۴،
نومبر ۱۹۷۰

ایک اکہرا، دوسرا دہرا، تیسرا ہے سو تہرا ہے،
ایک اکہرے پر پل پل کو دھیان کا خونیں پہرہ ہے
دوسرے دہرے کے رستے میں تیسرا کھیل کا مہرہ ہے
تیسرا چہرہ جو ہے اس کا سب سے اجاگر چہرہ ہے
گویا اکہرا پہرا، دہرا مہرہ، تہرا چہرہ ہے
ایک اکہرا کاغذ، دہرا تہرا ہو کر ناؤ بنی
ناؤ سے پل بھر بچے بہلے کھیل کھیل میں گھاؤ بنی،
گھاؤ بنی تو دل میں دھیان یہ آیا کہہ دیں... آؤ بنی!

بن بن کے جو کھیل بگڑ جاتے ہیں ان کی بات نہیں،
کوئی جنازہ بھی یہ نہیں ہے اور کوئی بارات نہیں
یہ اک ایسا دن ہے جس کے آگے رات نہیں

چہرے کی ہر تہ میں یوں تو اک نیا ہی چہرہ ہے،
لیکن ہر اک چہرہ اس بن کھیلے کھیل کا مہرہ،
جس کا رنگ اکہرا ہے۔

آگے بات بڑھائیں کیسے، بات بنے تو بات بڑھے
اب تک رنگ اکہرا تھا گر کوئی بڑھا تو ہاتھ بڑھے
ہونی کی تو ریت یہی ہے چھوٹے دن کی رات بڑھے،
اب تو جو بھی بڑھنا چاہے اپنے ساتھ ہی ساتھ بڑھے
آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر اک آگے اک پیچھے ہے
پیچھے والا کیسے بڑھے جب آگے والا بھی دوڑے؟
دونوں چوٹ برابر کی ہیں یہ دونوں سے کون کہے
ہار اور جیت اسی میں ہے اب کون رکے اور کون بڑھے۔

میراجی

شمارہ ۵۴،
نومبر ۱۹۷۰

ایک کتبہ

یہاں ہے خدا بخش بندہ ترا
خدایا مرے حال پر رحم کر
کہ جیسے میں کرتا جو ہوتا خدا
کہیں تو خدا بخش ہوتا اگر

حادثہ

اک فرشتہ پھول سا برساتا ہوا
صحن گلشن میں ہوئی اس کی نمود
لا ابالی لحجۂ جوش شباب،
اس حقیقت کو کبھی تو جان سکتی ہی نہ تھی،
اس فرشتے کے حسیں ملبوس میں شیطان تھا
ایک لمحے کے لئے بس ایک لمحے کے لئے
دل پہ تیرے چھائی وحشت، مست مست
اور پھر دل سے مرے رخصت ہوا جوش جنوں
خشک پتوں پر تھا افتادہ ترا
نرم و نازک، سرد، جسم سیم گوں

سحر حیات

کشاں کشاں
بلندیوں پہ لے گئی امنگ مری روح کو
خیال دل میں آ گیا، میں چل پڑا
نکل کے گھر سے کوہ و دشت اور ریگ زار میں
افق کے پاس دور دیکھیں دھندلی بستیاں
جنونِ جستجو نے ہیچ کر دیا
مری نگاہ میں
نظام کائنات کو
میری حیات ست رو کو بھر دیا
جوان خوں کے جوش سے؛
بھلا کے دل سے ضبط کو، شعور کو
فضا میں عزم آہنی کے آتشیں زبور کو
بکھیر کر میں چل پڑا۔
نکل کر گھر سے کوہ دشت اور ریگ زار میں
مگر بھلا دیا تھا دل سے ضبط کو، شعور کو
جنون جستجو نے روک بن کے میری راہ میں
لبوں سے نغمہ زن زبور کو بدل کے رکھ دیا ملول، سرد آہ میں؛
کشاں کشاں حیات مختصر کا دور ہو چکا
امنگ کے طلسم نے بدل کے اور ہو چکا
وہ نغمہ میرے خواب کا، خیال کا۔

میراجی

شمارہ۸۸،
جنوری،فروری ۱۹۷۴

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

کیا بھولا، کیسے بھولا، کیوں پوچھتے ہو، بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی بھولا بھالا بھول گیا

کیسے دن تھے کسی راتیں کیسی باتیں گھاتیں تھیں!
من بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بھول گیا

اندھیارے سے ایک کرن نے جھانک کے دیکھا،شرمائی
دھندلی چھب تو یاد رہی، کیسا تھا چہرہ بھول گیا

یاد کے پھیر میں آکر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
دکھ میں سکھ ہے سکھ میں دکھ ہے بھید یہ نیارا بھول گیا

ایک نظر کی، ایک ہی پل کی بات ہے ڈوری سانسوں کی
ایک نظر کا نور مٹا جب اک پل بیتا بھول گیا

سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر پٹکا ساگر گہرا بھول گیا

ہنسی ہنسی میں،کھیل کھیل میں،بات کی بات میں رنگ مٹا
دل بھی ہوتے ہوتے آخر گھاؤ کا رستا بھول گیا

اپنی بیتی جگ بیتی ہے جب سے دل نے جان لیا
ہنستے ہنستے جیون بیتا، رونا دھونا بھول گیا

جس کو دیکھو اس کے دل میں شکوہ ہے تو اتنا ہے
ہمیں تو سب کچھ یاد رہا پر ہم کو زمانہ بھول گیا

کوئی کہے یہ کس نے کہا تھا کہہ دو جو کچھ جی میں آئے
میرا جی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بھول گیا

یاحی یاقیوم استغیث برحمتک (روغن) عمل: اسلم کمال عطیہ: محمد سہیل عمر

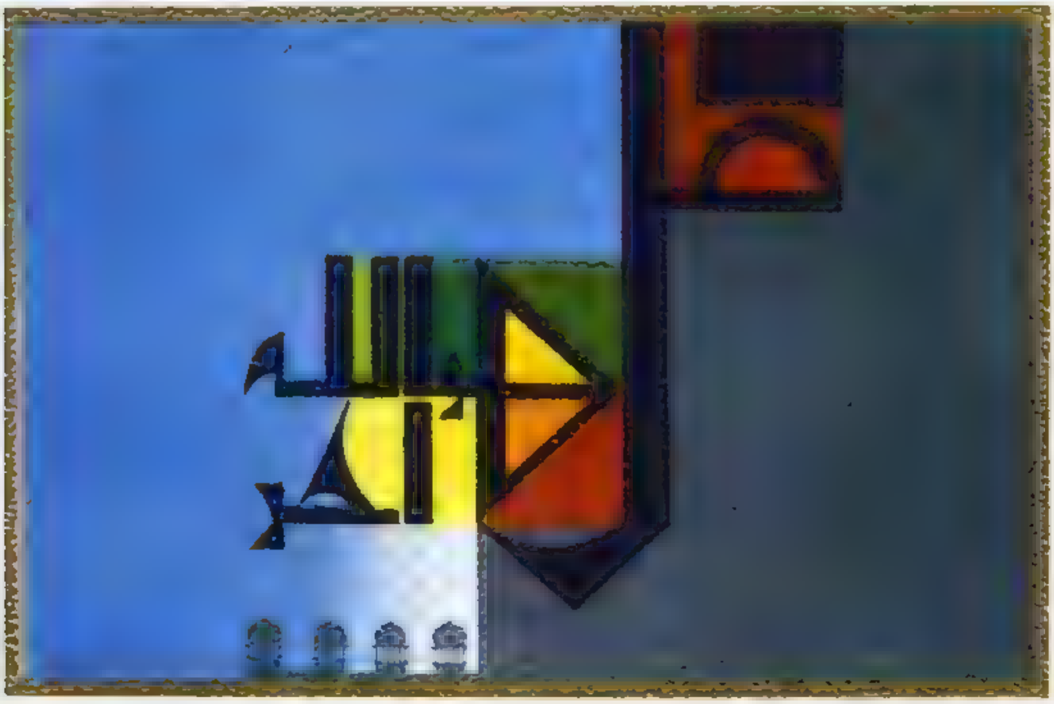

قل ہواللہ احد (روغن) عمل: اسلم کمال عطیہ: محمد سہیل عمر

قل ہو اللہ احد (روغن) عمل اسلم کمال عطیہ از محمد سہیل عمر

اقرا باسم الذی خلق (روغن) عمل: اسلم کمال عطیہ از محمد سہیل عمر

میراجی

شمارہ ۱۹۶،
جولائی ۱۹۹۶

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند۔
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے رہ گزاروں سے لپٹتے، سوگوار،
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا۔
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی!
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو!
بوئے مے میں بوئے خوں الجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری،
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو!
شام تک ہر روز ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

پہلے اردو شاعری میں کردار نگاری مثنوی، مرثیے اور ہجو تک محدود تھی۔ غزل کے کردار مثلاً عاشقِ زار، محبوبِ جفا کار، رقیبِ ناہنجار، واعظِ ریاکار، یا زاہدِ شب زندہ دار، اپنے آپ میں زندگی کا چلتا پھرتا عکس نہیں رکھتے تھے۔ یہ سب کردار محض محدود مخصوص رجحانات کے مجبور تھے، جن سے ایک معین موقع پر معین چلن ہی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ گویا یہ مشینیں نہیں، بلکہ ریل کے انجن تھے، جو شاعرانہ محکمے کی ساختہ پٹریوں پر ہی چل سکتے تھے۔ اپنے آپ میں مگر کسی نئی ڈگر پر چلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن نئی شاعری میں جب شاعروں کو غزل کی یک رنگ ہیئت سے چھٹکارا نصیب ہوا اور وہ اس تنگنائے سے ہٹ کر بہنے لگے تو جہاں ان کی اپنی انفرادیت نے نت نئے رنگ نمایاں کرنے شروع کئے، وہاں شعر میں شخصیت اور کردار کے نئے امکانات بھی پیدا ہو گئے۔ آج اردو کے نوجوان شعرا کے کلام میں جہاں ان کی اپنی انفرادیت کے مختلف رنگ موجود ہیں، وہاں ان کے اپنے کئے ہوئے مطالعے بھی کردار کے تنوع میں اضافہ کر رہے ہیں۔ راشد کی اس نظم کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔

راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھجکتے ہوئے تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتا ہے، جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی الجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہوا ہو، جو کسی بات سے جی بھر کر پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو: ایک نقطے سے ہٹ کر دوسرے نقطے تک، اور پھر دوسرے سے تیسرے تک۔ اس نظم کا انسان بھی کچھ اسی وقت کا انسان ہے۔ اس میں ایک ایسے آدمی کے خیالات کا عکس ہے جو یکساں بہاؤ اور بیزار کن کیفیات میں شب و روز گرفتار ہے۔ ہر روز اپنے زعم میں یہ سمجھ کر وہ دفتر یا دکان سے اٹھتا ہے یا اپنے ہل کو خیرباد کہتا ہے کہ شاید کل اس کی زندگی کی ہم آہنگی میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ لیکن دوسرے دن وہی دفتر کی فائلیں، وہی مسودے اور گاہک اور ناپ تول، وہی ہل اور وہی کھیتی باڑی۔ آخر وہ زندگی کی عشوہ کار محبوبہ کے قدموں میں تازہ اور چمکتا ہوا لہو دیکھ پاتا ہے۔ مسرتوں میں غم کی آمیزش کا دفعتہً احساس کر لیتا ہے، چنانچہ عزم کرتا ہے، آخری عزم کہ مسرتوں اور امیدوں کی انتہائی بلندیوں سے کود جائے، تاکہ زندگی کے حجابِ اکبر سے ہمیشہ کے لئے نجات پائے۔

یہ اس نظم کے ہیرو کا عمومی کردار ہے۔ لیکن تخصیص کے نقطۂ نظر سے ہم

پوچھتے ہیں کہ یہ ہیرو کون ہے؟ کسان، بنیا یا صرف ایک کلرک؟ نظم کا صرف ایک مصرع جواب دیتا ہے: وہ ہیرو ایک کلرک ہے۔ "شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں/ چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں" اور "صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند۔" دفتر میں میز پر بیٹھے ہوئے کلرک کے سامنے فائلوں کا انبار لگا رہتا ہے۔ انگشت کو تر کر کے ان کے صفحے پلٹتے، اور ان صفحوں کے سیاہ وسفید میں تبدیلی کرتے ہی اس کا دن تمام ہوتا ہے۔ شام تک وہ میز کے انبار کو گھٹانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ہر چیز سے بیگانہ، ایک مشین۔ شام کو گھر لوٹتے ہوئے اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے، وہ بھی بالواسطہ، کیونکہ جس سرنگوں اور سوگوار تیرگی کو وہ منہ بسورے، رہ گذاروں سے لپٹے، دیکھتا ہے وہ اس کی اپنی ہی ذات کا ایک عکس ہے، جسے دوسرے روز دفتر میں پہنچ کر پھر دیکھتا ہے کہ میز پر فائلوں کی دیوار بلند دکھائی دے رہی ہے۔

لیکن یہ گذرے ہوئے دنوں کی بات ہے۔ آج اس کلرک نے ایک ارادہ باندھا ہے۔ آج اس نے محسوس کیا ہے کہ جس عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ (زندگی، کلرکی کی زندگی) کے پاس وہ اتنی مدت سے آتا جاتا ہے، اس کے تخت خواب کے نیچے تو تازہ و درخشاں لہو دکھائی دے رہا ہے، اس لئے اب وقت آن پہنچا ہے کہ وہ اس سے رہائی حاصل کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عزم آخری کر چکا ہے۔

اس نظم کے استعاروں پر بھی ذرا غور کیجئے۔ دیوار تو، ظاہر ہو چکا ہے کہ فائلوں کا انبار ہے۔ "کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی"؛ "ساتویں منزل" سے کیا مراد ہے؟ ایک شک گذرتا ہے کہ یہ منزلیں عمارت کی نہیں ہیں۔ اس کلرک کے دوران ملازمت کی منزلیں ہیں۔ "میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں/کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی" یہاں لفظ "بھی" سے اس شک کا سراغ ملتا ہے۔ یعنی یہاں پہنچ کر شاعر یا کلرک یہ دیکھتے ہوئے بھی عزم آخری کر لیتا ہے کہ سات سال کی محنت اور دنیوی ترقی کو چھوڑ دے۔ اس صورت میں خودکشی محض ملازمت سے استعفے بن جاتی ہے۔ لیکن پھر "خودکشی" عنوان کیوں؟ ملازمت سے استعفیٰ بھی تو ایک طرح کی خودکشی ہی ہے، اقتصادی خودکشی۔

ایک اور بات، "تازہ و درخشاں لہو..." یہ لہو کس کا ہے؟ زندگی کی محبوبہ کا، یا اس کلرک کا؟ اصل میں یہ خون ہر نو گرفتار کلرک کا ہے، اسی لئے تازہ و درخشاں ہے۔ آخر میں شاعر سمجھتا ہے کہ اگر ساتویں منزل سے وہ اس محبوبہ کے تعلق کو توڑ دے، تو فائلوں کی دیوار ہم آغوش زمیں ہو جائے گی، یعنی کلرکی ختم ہو جائے گی۔ کس کی کلرکی کی؟ اس نظم کے ہیرو کی نہیں بلکہ کلرکی بنفسہ، کیوں وہ جس انداز سے بوسے کا دھوکا دے کر اس میں ہر نو گرفتار کے تازہ و درخشاں لہو کی بو ملا دیتی ہے، آسودگی اور خوشحالی کے خواب دکھا کر ایک اچھے بھلے انسان کو بے جان مشین بنا دیتی ہے، اس کا احساس نہ صرف اس نظم کے کلرک کو ہو چکا ہے، بلکہ دنیا بھر کے کلرکوں کو ہو چکا ہے۔ گویا یہ نظم کلرکی سسٹم کی مخالفت کرتی ہے اور اس میں شاعر کی فنکارانہ ذہانت نے خارجی بیان کو داخلی انداز میں سمویا ہے(۱) ☆☆☆

(۱) اس تجزیے کا تجزیہ حامدی کے کاشمیری کے مضمون "راشد کی نظم اور میراجی کا تجزیہ" میں ملاحظہ کریں (ادارہ)۔

گیت

سیفو، ترجمہ: میراجی

شمارہ ۲۲۷،
جولائی ۱۹۹۹

دیوتاؤں کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے
سامنے بیٹھ کے جو دیکھتا ہی جاتا ہے

تری صورت کو تری میٹھی صدا سنتا ہے
قہقہے کی ترے مستانہ ادا سنتا ہے

میرے سینے میں مرا دل بھی لرز اٹھتا ہے،
آہ! اک جذبۂ بسمل بھی لرز اٹھتا ہے

گھٹ کے رہ جاتی ہے سینے ہی میں آواز مری
دیکھ لیتی ہوں جو اک لحہ بھی صورت تیری

گویا منہ ہی میں نہ تھی ایسے زباں ہوتی ہے
آگ سی جسم میں اک میرے تپاں ہوتی ہے

میری آنکھوں کو نظر آتی نہیں کوئی شئے
اور کانوں میں بھی اک شور چلا آتا ہے

لیکن افسوس کہ قسمت میں "نہیں" لکھا ہے
دکھ ہی سہتی رہوں میں بیٹھی یہیں لکھا ہے

زندگی دکھ سے رہائی نہیں دیتی مجھ کو
موت بھی دور دکھائی نہیں دیتی مجھ کو

نظم

میراجی

شمارہ ۲۴۱،
اکتوبر نومبر ۲۰۰۰

ہاتھ پھولوں سے الجھتے ہوئے کہتے تھے کہ آج آئے ہو؟
بالوں کی زینت یک شب میں انھیں پیرہن سادہ کو
یوں فریب غم دل دینا تھا؟
سمٹے پیراہن خم خوردہ میں جب دھاریاں مل جاتی ہیں
یوں نظر آتا ہے لب سے۔ میں کہوں؟ تم ہی کہو،
تم ہی اگر کہہ دو مزہ آجائے
لب سے لب ملتے ہیں، مل کر وہ جدا ہوتے ہیں
آؤ اب ہم بھی جدا ہو جائیں
صرف ملنے میں ہی مجبوری ہوا کرتی ہے
یا جدا ہونے میں، دوری میں بھی مجبوری ہے؟
صرف اک لذت یک شب ہی کی مجبوری ہے
یہی کاشانہ نکلنے پایا
تم کتابیں نہ پڑھو گے تو تمھیں فائدہ ہو،
کتابیں نہ پڑھیں آج، اس وقت، یہاں
عہد کریں، تم بھی مگر ہم سے کہو
زندگی کا یہی اک فائدہ ہے، لذت یک شب، یک شب
انھیں پھولوں کو ذرا دیکھو کہ ترتیب کے پابند ہوئے بیٹھے ہیں
گیسوؤں میں بھی اگر ہوتے تو یونہی رہتے
ان کو کچھ فکر نہیں لذت یک شب کیا ہے
ان کو کچھ فکر نہیں کہ فریب غم دل کیا ہے
ان کو کچھ فکر نہیں کہ یہ کیا وہ کیا ہے
دائیں جانب جو جھکا ہے وہ جھکا رہتا ہے
بائیں جانب جو ستادہ ہے ستادہ ہی رہے گا، دیکھو
ان ہی پھولوں سے کہو
یوں فریب غم دل دینے میں کیا فائدہ ہے
استخواں پھولوں کے دامن میں چھپے رہتے ہیں
زندگی کا یہی اک قاعدہ ہے
آؤ اب گیسوؤں میں زینت یک شب بن جاؤ

کمپوزیشن چار(۱)،(۲)

مین را

شمارہ ۳۷،

جون ۱۹۶۹

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے سے تیز چمکیلے رنگ کی کار داخل ہو رہی ہے... ادھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، کالی چکنی ہموار اور کشادہ سڑک کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے سے تیز چمکیلے رنگ کی کار داخل ہو رہی ہے... ادھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، کالی چکنی ہموار اور کشادہ سڑک کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے پر تیز چمکیلے رنگ کی کار رفتار میں ہے... ادھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، کالی چکنی ہموار اور کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی سڑک کے بائیں کونے پر تیز چمکیلے رنگ کی کار رفتار میں ہے... ادھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، کالی چکنی ہموار اور کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی سڑک کے بائیں کونے پر گہری زرد تیز رفتار کار ہے... ادھر مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں تو رگہری زرد تیز رفتار کار ہے... ادھر ویران مشرق کی جانب سے، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، دو اجنبی چکنی، ہموار اور کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک کے بائیں اور گہری زرد برق رفتار کار ہے... مشرق کی جانب سے، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، دو اجنبی چکنی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور گہری زرد برق رفتار کار ہے... مشرق کی جانب سے، ایک دوسرے سے بے خبر، کچھ فاصلے سے آگے پیچھے، دو اجنبی چکنی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور زرد برق رفتار کار ہے... مشرق کی جانب سے، ایک دوسرے سے بے خبر، کچھ فاصلے سے آگے پیچھے، دو اجنبی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچ سڑک پر بائیں اور برق رفتار کار ہے... مشرق کی جانب سے، ایک دوسرے سے بے خبر، کچھ فاصلے سے آگے پیچھے، دو اجنبی سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر ہوں۔ میرے سامنے سڑک پر بائیں اور برق رفتار کار ہے... ادھر ایک دوسرے سے بے خبر آگے پیچھے دو اجنبی سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر ہوں۔ میرے سامنے سڑک پر بائیں اور برق رفتار کار ہے... ادھر دو اجنبی آگے پیچھے بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں ان کے پیچھے لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں ادھر۔ میرے سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار... ادھر دو اجنبی آگے پیچھے بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم ان کے پیچھے لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تیز تر

میں ادھر میرے سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار ادھر دو اجنبی آگے پیچھے بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم ان کے پیچھے تیز تر بڑھتا ہوا لڑکا ایوننگ نیوز

میں ادھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار ادھر دو اجنبی برابر برابر بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم پیچھے تیز تر لڑکا ایوننگ نیوز

میں ادھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار ادھر دو اجنبی برابر برابر بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم پیچھے ایوننگ نیوز تیز تر لڑکا

میں ادھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار ادھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک پیچھے ایوننگ نیوز لڑکا

میں ادھر سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار ادھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک پیچھے ایوننگ نیوز لڑکا

میں ادھر سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار ادھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک پیچھے ایوننگ نیوز لڑکا

سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک ایوننگ نیوز لڑکا

برق رفتار کار دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر ایوننگ نیوز لڑکا

کار دو اجنبی ایوننگ نیوز لڑکا

کار دو اجنبی "ایوننگ نیوز"

ایک اجنبی کار "ایوننگ نیوز" دوسرا اجنبی چت

سامنے سڑک ذرا بائیں ایک اجنبی ذرا دائیں دوسرا اجنبی چت کار

میں ادھر سامنے سڑک ذرا بائیں ایک اجنبی بے خبر ذرا دائیں دوسرا اجنبی چت ایوننگ نیوز لڑکا گھسٹتی رکتی کار

میں ادھر سامنے سڑک ذرا بائیں ایک اجنبی بے خبر ذرا دائیں دوسرا اجنبی چت لڑکا ایوننگ نیوز تھامے سڑک گھسٹتی رکتی کار

میں ادھر ہوں سامنے سڑک ہے ذرا بائیں ایک اجنبی سڑک کے بیچ ہے ذرا دائیں دوسرا اجنبی سڑک کے ادھر چت ہے لڑکا ایوننگ نیوز تھامے سر جھکائے گھسٹتی رکتی کار

میں ادھر ہوں۔ میرے سامنے بائیں اور بیچ سڑک ایک اجنبی ہے، ادھر ذرا دائیں سڑک کے ادھر دوسرا اجنبی چت ہے۔ لڑکا ایوننگ نیوز تھامے کھڑا ہے۔ کار گھسٹنے کے بعد رک گئی ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچ سڑک پر بائیں اور ایک اجنبی ہے۔ مشرق کی جانب دائیں اور سڑک کے ادھر دوسرا اجنبی چت ہے۔ لڑکا ایوننگ نیوز تھامے کھڑا ہے۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچ سڑک پر دائیں اور کار رکی ہوئی ہے

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور ایک اجنبی قدم اٹھا رہا ہے... ادھر مشرق کی جانب دائیں اور سڑک کے ادھر دوسرا اجنبی چت ہے۔ ننگے پاؤں لڑکا ایوننگ نیوز تھامے کھڑا ہے۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر دائیں اور کار رکی ہوئی ہے

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور ایک اجنبی قدم اٹھا رہا ہے۔ اس کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے ☆☆☆

۳ جنوری ۱۹۶۹

حاشیہ از مصنف:

(۱) "کمپوزیشن ایک" اور "کمپوزیشن دو" "سویرا" لاہور میں شائع ہوئے تھے اور "کمپوزیشن تین"، "شب خون" میں۔ اس کے علاوہ کمپوزیشن سیریز کے دو اور افسانے "کمپوزیشن دسمبر ۱۹۶۴" "سیپ" کراچی میں اور "کمپوزیشن موسم سرما ۱۹۶۴"، "سویرا" لاہور میں شائع ہوئے تھے۔

(۲) براہ کرم افسانہ کسی خاموش جگہ قدرے اونچی آواز میں پڑھیے۔

غزلیں

ناصر شہزاد

شمارہ ۱۶۳،
اگست تا اکتوبر ۱۹۹۱

رنجش بے حساب رہنے دے
دل کو زیر عتاب رہنے دے

سطوت ماہ و سال کی خاطر
شاخچوں پہ گلاب رہنے دے

مجھ کو رسوا نہ کر سر بازار
خود کو عزت مآب رہنے دے

جب تلک جیتے ہیں کچے گھڑے
راستوں میں چناب رہنے دے

یا خدا میری سادھنا کا صلہ
حرف کو ہم رکاب رہنے دے

ممٹیوں میں جگا بجھے منظر
بام پر آفتاب رہنے دے

مجھ سے فوقیت بشر مت چھین
مجھ کو جزو کتاب رہنے دے

اس کے ہونٹوں سے مت چرا سرخی
پنکھڑی پر عناب رہنے دے

یار جانی کوئی کہانی سونپ
دل کو مت بے نصاب رہنے دے

ابھی ہاتھوں پہ پھولتی ہے حنا
ابھی رخ پر نقاب رہنے دے

بانسری ہاتھ میں ہوا کے تھما
موج میں جوئے آب رہنے دے

شمارہ ۲۱۰
ستمبر ۱۹۹۷

نین نشے کی چڑھتی نمو پر
باقی بدن سب جام و سبو پر

پیار میں تیری میری باتیں
کچھ میں میں پر، کچھ تو تو پر

چڑیاں، مور، ممولے، وادی
ہم تم ایک کنار جو پر

شاخ انار نے چہرہ چوما
پھول گرے اس کے گیسو پر

لکھی گئی تاریخ ہماری
کوفہ تیرے کاخ و کو پر

چاہت میں رسوائی اول
کان نہ رکھنا ہاؤ ہو پر

دھوپ پھسل کر بام سے اتری
روپ گیا اس آئنہ رو پر

ہم نے اپنی کویتا گوندھی
مٹی کی سوندھی خوشبو پر

سنگ سہیلی رنگ چنبیلی
زرد لباس کھلے گیسو پر

منوا سو کے بدرا ہو کے
کوئل کی کوہو کوہو پر

کربل حرب ہراول حملہ
کربل آخری ضرب عدو پر

تن من مہمان ہے پیاس کی پونجی
من میزان ہے آب وضو پر

ناصر کاظمی

شمارہ ۱۴،
اکتوبر ۱۹۶۹

چہرہ افروز ہوئی پہلی گھڑی ،ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ،ہم نفسو شکر کرو

آؤ پھر یادِ عزیزاں ہی سے مے خانۂ جاں گرم کریں
دیر کے بعد یہ محفل تو جمی، ہم نفسو شکر کرو

آج پھر دیر کی بکھری ہوئی یادوں نے پکارا دل کو
دیر کے بعد کوئی بات چلی، ہم نفسو شکر کرو

رات بھر شہر میں بجلی سی چمکتی رہی ہم سوئے رہے
وہ تو کہیے کہ بلا سر سے ٹلی ہم نفسو شکر کرو

درد کی شاخ تہی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی شام نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو

آسماں لالۂ خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصرِ بیداد کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

ناہید اختر

شمارہ ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

میں تو نرم و نازک لفظوں کے موتی ہی بکھیروں گی
مجھ کو کیا کہ کس نے بھیجے طنز کے نشتر
تحفے میں ملی دشنام تو کیا
الزاموں کے دفتر آئے، بہتانوں کی برساتیں
کس کے ہاتھ میں پتھر ہیں
گھات میں ہیں جلاد تو کیا
یہی نہ ہوگا ٹکڑے کر کے میرے بدن کے
رقم کریں گے ہر ٹکڑے پر
قصۂ استبداد و جفا
یہی نہ ہوگا، حرف غلط کی طرح مٹے گا
نام اخوت، لفظ وفا
یہی نہ ہوگا، فصل بہاراں
پھول ببول کھلائے گی
یہی نہ ہوگا، باد صبا بھی زہر فشاں ہو جائے گی
یہی نہ ہوگا، بلبل اپنے راگ رسیلے بھولے گی
یہی نہ ہوگا، اب محلوں میں سدا ہی الو بولیں گے
اور خزاں اترا اترا کر قدم قدم اٹھلائے گی
کوئل کی مدھریلی تان
نہ اب قلب اور جگر برمائے گی
نہ کونپل کوئی پھوٹے گی، نہ فصل کوئی لہرائے گی
نہ پیار کی رت آئے گی کبھی
بس ہجر کا موسم ٹھہرے گا
مایوسی کے آنگن میں دلدار صبح نہ اترے گی
خوں گشتہ دل میں اشکوں کے صف در صف لشکر اتریں گے
بہتے لہولہو پیراہن خوابوں کے پیکر اتریں گے
گھائل کرنے جسم و جاں کو، اعدا کے عسا کر اتریں گے
یہی نہ ہوگا، دست طلب
رہ جائے گا مجروح عطا
لیکن اپنی وضع نہ بدلوں گی میں خو نہ اپنی چھوڑوں گی
میں تو نرم و نازک لفظوں کے موتی ہی بکھیروں گی، میری زباں
تم چاہے دامن میں بھر لو چاہے چاک کرو
پتھر برسا کر جب جی چاہے، مجھ کو سنگسار کرو
میں تو فقط مٹی کا بدن ہوں
لیکن خاک بھلا کر پاؤ تم مجھ کو؟

ولیم سین سم، ترجمہ: نجم فاروقی

شمارہ ۷
دسمبر ۱۹۶۶

میرے چچا ایک سرسبز و شاداب وادی میں سیاہ و سفید رنگ کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ مکان کی بلیاں سیاہ چیز کی تھیں جیسے بارش میں لکڑیاں بدرنگ ہو جاتی ہیں اور پلستر خشک کھریا کی طرح سفید تھا۔ مکان کے باہر دونوں جانب لمبی لمبی گھنی ہری گھاس تھی۔ گھاس میں پھول نہیں تھے، صرف سبز گھاس کے پس منظر میں سیاہ و سفید مکان۔

میرے چچا نے ایک سیاہ و سفید رنگ کی گائے پال رکھی تھی جو ہری گھاس کے باڑے میں رہا کرتی تھی اور دن بھر میدان میں کھڑی ہری گھاس کے پس منظر میں اپنے سیاہ و سفید وجود کو نمایاں رکھتی تھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ میرے چچا جو ایک پادری تھے، اگرچہ بہت غریب اور بوڑھے ہو چلے تھے، لیکن پھر بھی اپنی قمیص کا کالر سفید چمکتا ہوا اور سیاہ کوٹ ستھرا رکھنے کے عادی تھے۔ وہ اس قدر بوڑھے تھے، یا شاید کثرت عبادت سے، ان کا چہرہ اور ان کا گنجا سر یک سر سفید رنگ کے ہو گئے تھے۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ میں نے ان حالات میں جون کے طویل اور اکتا دینے والے مہینہ کو اپنے چچا کے ساتھ کیوں کر گذارا۔ اکثر میں گھنٹوں باغ میں اپنی کرسی میں دھنسا ہوا کبھی سفید آسمان کو تکا کرتا، کبھی تا حد نظر پھیلے ہوئے ہرے میدان کو، اور کبھی کبھی اس سیاہ و سفید مکان کو۔ میری ہر نظر میں کتنا تضاد تھا۔ نیچے کی جانب جھکے ہوئے سفید و تابناک آسمانوں تلے ہرے میدان کیسے چمک اٹھتے ہیں! سیاہ و سفید مکان اور مکان کے پہلو میں کھڑی ہوئی گائے کے انداز میں کیسا سکوت تھا! کیسی خاموشی سے مکان کے ہرے لان میں میرے چچا اپنے بوڑھے کالے پاؤں سے چہل قدمی کیا کرتے تھے!

اس کرسی پر بیٹھا میں یہ سوچا کرتا کہ پھول کس طرح کھلتے ہیں یا نیلا آسمان کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ میں رنگین تصویری کتابوں سے دل بہلایا کرتا، اپنے سرخی مائل ہاتھوں کو بڑی دیر تک دیکھا کرتا۔ لیکن سبز و سیاہ و سفید رنگ مجھ پر غالب آجاتے، ان کی حکومت ہر طرف تھی۔ چمک دار سورج کسی بڑی طاقت والے لیمپ کی روشنی کی طرح سفید بادلوں کی چلمن سے جھانکا کرتا، جس کے جلو میں رنگ اور بھی نکھر اٹھتے تھے۔

میں آپ کو بتلاؤں گا کہ اس دن دوپہر کو میرے اور چچا جان کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔

اس وقت میرے اندر فلسفیانہ عنصر پیدا ہو چلا تھا۔ کبھی میں یہ سوچتا کہ سیاہ و سفید کوئی رنگ ہی نہیں تھے، اور میرے چاروں طرف یہ ہریالی جو سورج کی روشنی کی وجہ سے لحظہ بہ لحظہ تابناک نظر آتی تھی، اس کا بھی کوئی رنگ نہیں تھا۔ یہ ایک قسم کی شادابی تھی جو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی... لیکن ضرورت کس بات کی تھی... میں نے بہت غور کیا... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آخر کار میں نے چچا جان کے چہرے کا بغور مطالعہ کرنے کی ٹھانی۔

وہ مجھ سے کچھ گز دور کھڑے تھے۔ میں نے انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ اپنا سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے جو کہیں کہیں سے تنگ اور کہیں کہیں ڈھیلا تھا۔ قمیص کا کالر حسب دستور سفید تھا اور کالر کے بیچ پھنسی ہوئی سفید جھریوں دار گردن، خیالوں میں گم بوڑھا چہرہ، ستی ہوئی کھال، سیاہ ضعیف ویران آنکھیں، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں...

اور اوپر نو مولود نرم دل آسمان!

یک لخت مجھے خیال آیا کہ یہ شخص سرخی سے بھرا ہوا ہے، اندر سے یہ بالکل سرخ ہے۔ میں نے اس بات کو بھلا دینا چاہا۔ میں نے کئی کھیل ایجاد کیے، کاغذ اور پنسل کے کھیل، حاصل ضرب کے کھیل، تاکہ میں اپنے خیالات کا رخ موڑ سکوں۔ میں ضرورت سے زیادہ کسرت کرنے لگا۔ میں نے اپنے پاؤں کو زیادہ سے زیادہ تھکایا تاکہ پاؤں کی تکلیف میری دماغی تکلیف کو کم کر دے۔ میں مکان کے اندھیرے حصوں میں بھٹکا کرتا جہاں سے چچا جان مجھے یہ کہہ کر نکال لایا کرتے کہ ڈاکٹر نے نہ صرف مجھے آرام کی تاکید ہے بلکہ تازہ ہوا کی بھی۔ جب بھی چچا جان مجھے اندھیرے سے گھسیٹ کر اجالے میں لے آتے، ان کے متعلق میرا خیال مستحکم ہو جاتا۔ راتوں کی تاریکی میں، سبز و سیاہ و سفید ماحول سے دور، بستر پر لیٹا ہوا میں سرخ رنگ کے بارے میں سوچا کرتا۔

دماغ سے ان خیالات کے نکلنے کے لئے کوئی وسیلہ بھی ہونا چاہیے تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت انھیں خیالات نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے طے کر لیا کہ اس سیاہ و سفید قسم کے انسان کے اندر

سے سرخی کو نکال پھینکوں گا۔ روٹی کاٹنے کا چاقو لے کر میں اس کی تلاش میں نکل پڑا۔

اتفاق کی بات یہ واقعہ مکان کے اندر کھانے کے کمرے میں پیش آیا، مکان کے باہر پھیلی ہوئی ہریالی سے دور۔ اس سے کم از کم یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تخیل اپنے محرک سے زیادہ جاندار ہو چلا تھا۔ جس کمرے میں یہ بات میرے ذہن میں آئی، میں چاہتا ہوں ایک نظر آپ بھی اس کا جائزہ لے لیں۔ کمرے میں ایک طرف دیوار میں الماری لگی ہوئی تھیں جس پر ایک کٹورے میں ایک سیب رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی فضا تاریک اور بوجھل تھی۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی۔ میزوں پر بوسیدہ میز پوش پڑے ہوئے تھے اور دیواروں پر بہت پرانی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں جن کا رنگ دھندلا پڑ چکا تھا۔ غرض کہ زندگی کا احساس یکسر ہنگامہ اور ولولہ سے عاری تھا، بلکہ اس کی جگہ بے جان جمود اور تھکا دینے والی یکسانیت نے لے لی تھی۔

میں چچا جان کے پیچھے کھانے کی میز کے قریب کھڑا تھا۔ وہ سر ہلا ہلا کر کھانا کھا رہے تھے جیسے گوشت کے پارچوں سے گفتگو کر رہے ہوں، کیوں کہ ان کی عادت تھی کہ پہلے وہ چاقو سے لقمے کاٹ لیا کرتے تھے پھر کانٹوں سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے ان کے داہنے ہاتھ میں کانٹا تھا اور وہ بائیں ہاتھ سے میل کلاتھ پر پڑی ہوئی روٹی توڑ رہے تھے۔ بوڑھے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ بہت اطمینان سے وقت کا احساس کئے بغیر دیر تک کھانا کھایا کرتے ہیں۔

ان کا عکس دوسری جانب لگے ہوئے آئینے میں پڑ رہا تھا۔ چونکہ وہ سر جھکا کر کھانے میں مشغول تھے اس لئے آئینے میں ان کا چہرہ نہیں نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے دفعتاً میز پر پڑے ہوئے چاقو کو اٹھایا جو روٹی کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کے بیچ پڑا ہوا تھا، اور دوسرے لمحے میں خنجر کی طرح سنبھالا لے کر ان پر حملہ کیا۔ چاقو کی دھار آری کی طرح دندانہ دار تھی۔ فرط مسرت سے بے تاب ہو کر میں نے پوری قوت سے چاقو ان کی بالوں سے بے نیاز سفید کھوپڑی پر مارا، اور اسے کاٹنے لگا۔

پہلے ہی حملے پر چچا جان کچھ گڑبڑائے جیسے انھیں نیند آ گئی ہو، یا شاید جیسے انھوں نے محسوس کیا ہو کہ ان کی سفید پلیٹ کے نیچے کوئی سیاہ مکھی گھس آئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اسی وقت وہ مر گئے۔ ان کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہوگی۔

میں چھری سے ان کا سر کاٹتا رہا۔ چونکہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اس لئے احتیاطاً میں شروع ہی سے بائیں ہاتھ سے ان کے سر کو سیدھا پکڑے رہا۔ کھوپڑی چیرتے وقت میں نے بہت بے چینی سے اندر جھانکا اور مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ پہلے تو سرخی ضرور نظر آئی لیکن بعد میں سب رنگ گڈمڈ ہو گئے، کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کھوپڑی میں کون سا رنگ چھپا ہوا تھا۔ اس بوسیدہ کمرے کی دھندلی روشنی میں مجھے جو کچھ بھی نظر آیا وہ کسی بھی حالت میں سرخ رنگ نہیں تھا جس کی مجھے ذہنی طور پر تلاش تھی۔

میں نے مایوسی سے چچا جان کی طرف دیکھا۔ اسی اثنا میں میری نگاہ مقابل سمت میں لگے ہوئے بڑے آئینے پر گئی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا، مجھے کچھ امید نظر آئی۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو چلا۔ کرسیوں کو پھلانگتا ہوا میں دوڑ پڑا۔ کرسیوں کے گرنے کا شور مجھے سنائی دیتا رہا۔ لیکن میں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اپنے حلق کو چاقو سے چیر دیا۔

میری ممنون نگاہوں نے سرخیوں کا ہجوم دیکھا... جو بآسانی میرے حلق سے جاری ہوا تھا۔ رواں دواں... چمک دار... سرخ، سرخ... میں اس قدر مسرور ہوا کہ میں نے اپنی حلق کو آدھا ہی چیر کر چھوڑ دیا۔ اب ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی... سسکتا، مسکراتا میں گھٹنوں کے بل جھک گیا، میرے دونوں ہاتھ عبادت کے انداز میں ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ میں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ لیکن وہاں آئینہ نہیں تھا!

صرف نعمت خانے کا سیاہ چوبی تختہ۔ میں فرش پر گر پڑا۔ بات بڑی حیرت کی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے دھوکا نہیں ہوا ہے بلکہ آئینہ میرے سامنے آویزاں تھا اور میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ میں کوشش کر کے کھڑا ہو گیا۔ آئینہ پھر مجھے آنکھیں دکھلا رہا تھا، میں نے آئینے پر آخری نظر ڈالی اور گرتا پڑتا کمرے کے باہر میدان میں نکل آیا... اور باغ کے پھاٹک سے نکلتے ہوئے گلی میں ٹہلتے ہوئے... گرد و پیش کی ہریالی کے برعکس میرے ہاتھ بے تحاشا سرخ رنگے ہوئے تھے اور مجھے اپنے بے حد خوبصورت سرخ حلق کی یاد آتی رہی... میں آپ سے بتاؤں یہ خیال میرے لئے انتہائی مسرور کن تھا کہ وہ خوب صورت سرخ حلق میرا ہی تھا۔

میرا خیال ہے میرے ہاتھوں اور چہرے کی اس چمک دار سرخی کو دیکھ کر ہی وہ جنگلی لوگ جو پہاڑی سے اتر کر میری جانب آ رہے تھے، رفو چکر ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اتنے خوف زدہ ہوئے، کیوں کہ یقیناً وہ اپنی زندگی ہریالی میں گذارنے کے عادی تھے۔ میرے جسم کی سرخی دیکھ کر چونکے ہو گئے ہوں گے۔

اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے نئے بھورے رنگ کے مکان میں رہتے ہوئے یہ سوچتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں درگذر بھی کی جا سکتی ہیں۔ کیوں کہ ہر چیز کی انتہا بے معنی ہے۔ مجھے اب ہر رنگ بہت دیدہ زیب لگتے ہیں... بادی النظر میں سیاہ معلوم پڑنے والی میرے دوستوں کی چمک دار نیلی وردیاں اور کسی پادری کی طرح نیلی ٹوپیاں ☆☆☆

۱۹۷۷ سے پابندی وقت اور اعلیٰ معیار کے ساتھ احمد آباد سے نکلنے کے بعد

دوماہی گلبن

اب لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے

مینجنگ ایڈیٹر: سید ظفر ہاشمی

قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپئے زر سالانہ: ساٹھ روپئے

رابطہ: ۳۰۔۳۱، حسن گارڈن کالونی۔ کنتا، لکھنؤ ۲۲۷۱۰۵

مجھے چاھو، مجھے چاھو، مجھے چاھو...

ایم۔ایس واڈل، ترجمہ: نجم فاروقی

شمارہ ۹،
فروری ۱۹۶۷

میں تنہا نہیں تھا۔

میں نے رک کر چاروں طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے قریب کوئی موجود ہے۔ میرا تعاقب کر رہا ہے۔کوئی شخص جو خود کو مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے میرا واہمہ رہا ہو۔

سڑک پر لگے ہوئے لیمپ کی روشنی میں رک کر میں نے سگریٹ سلگائی۔ ممکن ہے لاشعوری طور پر مجھے کسی شخص کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ ممکن ہے یہ میرے احساس کی غلطی ہو۔ میں پتھر کا بنا ہوا انسان نہیں ہوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے قدموں کو گن کر سڑک پار کی ہے جس کے دونوں جانب درختوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔

غالباً ناصر اسے ایک ہی جست میں پار کرسکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ لمبی کود میں مہارت رکھتا ہے۔ لیکن میرے اس طرح سڑک پر آوارہ پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں گھر پر رک کر انتظار بھی کرسکتا تھا، اس طرح کوئی بھی واقعہ ہوتا، کم از کم میرے سامنے ہوتا۔

کوئی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اونہہ، کوئی نہیں یقیناً کوئی شخص ہے۔

میں لوٹ پڑا۔

میرے چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔

سڑک خاموشی سے میرا منہ تک رہی تھی، پیڑ ساکت، جھاڑیاں خوابیدہ۔ کوئی مدھم روشنی کسی اونچی جھاڑی کی سطح پر جھلملا رہی تھی۔ چونکہ رات بہت بیت چلی تھی اس لئے اکا دکا ہی روشنیاں چمک رہی تھیں یا شاید ابھی بہت رات باقی تھی۔ جیسی آپ کی مرضی۔ رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے، سرد، ناخوش گوار صبح۔ میں بستر پر دراز ہو کر آرام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ صبح اٹھ کر ٹہلنے میں مجھے راحت ملتی ہے۔ زیادہ دور تک نہیں۔ بس تھوڑی دور، پھر واپسی۔ اس سے مجھے خیالات میں تسلسل اور یکسوئی پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میں اور خبروں کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ آدمیوں کی بھیڑ سے بھرا ہوا شور شرابے والا دن۔ اور رات... تنہا، پرسکون ٹھنڈی میٹھی...

میں نے تیزی سے قدم بڑھائے، میں گھر پہنچ کر سو جانا چاہتا ہوں۔ لیکن... اونہہ، کوئی نہیں۔ میں چلتا رہنا چاہتا ہوں۔ عموماً لوگ چلتے وقت صرف چلتے ہیں۔ کوئی بات نہیں سوچتے۔ اور میں... غالباً میرے پیچھے پیچھے کوئی آ رہا ہے؟

کیا میں پھر مڑ کر دیکھوں؟ مڑ مڑ کے نہ دیکھو، کوئی مجھ سے کہتا ہے۔

ٹھیک ہے، میں مڑ کر نہیں دیکھوں گا... ہوگا کوئی، غالباً کوئی کتا۔

شکر ہے، میرا گھر قریب آ گیا۔ میں پھاٹک کھولتا ہوں اور بجری پر چلتا ہوں۔ تیس گز لمبا بجری کا راستہ۔ میں جیب میں چابیاں تلاش کرتا ہوں۔ اندھیرے میں میرے ہاتھ قفل کو ٹٹولتے ہیں۔

کوئی شخص پھاٹک پر کھڑا ہے۔ یقیناً، کوئی ہے۔ مجھے اس کا ہیولیٰ نظر آ رہا ہے۔ بے رنگ۔ ارے وہ کہاں غائب ہو گیا؟ غالباً میرا تخیل تھا۔ یا کوئی حقیقت؟ میں پھاٹک کے قریب لوٹا۔ کوئی نہیں۔ نہیں، کوئی نہیں۔

ممکن ہے کوئی شخص رہا ہو۔ کوئی غیر مرئی ہستی۔ کوئی تھا ضرور... خلا میں کسی کا وجود۔ خلا میں کسی کے وجود کے لئے میرا تخیل۔ اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں، اندھیری رات کا بے کراں سناٹا اور میرے تخیل کا تجسس۔

خیر، کوئی نہ سہی۔ صرف سیاہ رات۔ خواب سے بے نیاز میری رات۔ سب کی رات۔ مجھے اندر جا کر کچھ پی کر سو رہنا چاہئے۔ صبح ناصر سے ملاقات کروں گا اور آرام کروں گا۔

گھر میں داخل ہو کر میں ایک جام چڑھاتا ہوں تاکہ خیالات مجتمع ہو سکیں۔ میں کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھتا ہوں۔ پھاٹک کے قریب کوئی نہیں ہے۔

پھاٹک کے قریب کوئی نہیں ہے۔

پھاٹک کے قریب کوئی ہے ضرور کوئی شخص ہے۔ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔ پچھلی شب۔ مجھے پچھلی شب کی کوئی بات یاد نہیں ہے۔ ممکن ہے پچھلی شب کا وجود ہی نہ ہو۔ لیکن آج رات۔ ضرور پھاٹک پر کوئی شخص ہے، یا کوئی شے۔ کیا ہے،

میں نہیں کہہ سکتا۔لیکن ہے ضرور۔میں اس کے لئے پریشان نہیں ہوں۔اشتیاقی ضرور ہوں۔

پھاٹک پر جو شے ہے، جب میں بہ غور دیکھتا ہوں مجھے نہیں نظر آتی۔ کبھی دکھائی پڑتی ہے، کبھی معدوم ہو جاتی ہے۔ پردوں کے پیچھے سے یہی معلوم ہوتا ہے پھاٹک کے قریب کوئی موجود ہے۔ سڑک کی مدھم روشنی میں دھندلی سی...

ناصر بھی آ رہا ہوگا۔ ممکن ہے اس طرح کچھ معلوم ہو سکے۔ میں اب اس شے کو بہ خوبی دیکھ رہا ہوں۔ پھاٹک کے اندر۔ پھاٹک سے ذرا ہٹ کر۔ پھاٹک کے اندرونی جانب... باغیچے کے قریب اندھیرے میں...

وہ شے اب بہت صاف نظر آ رہی ہے۔ میں اسے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ میں قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ ممکن ہے یہ میرا واہمہ ہو۔ ممکن ہے حقیقت ہو۔ اگر صرف واہمہ ہے تب مجھے خوف زدہ ہونا چاہئے۔ لیکن میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ بلکہ خوش ہوں۔ ممکن ہے میں خوف زدہ ہوں۔ ممکن ہے میرا دل اندر سے کانپ رہا ہو... ضرور ایسا ہی ہے۔

ناصر اس شے کو نہیں دیکھ سکا۔ اگرچہ اندھیرے میں وہ اس کے قریب سے گذرا لیکن اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں نے اس سے کوئی استفسار نہیں کیا کیوں کہ وہ سوچتا رہا... لیکن کیا سوچتا؟ ممکن ہے وہاں اندھیرے میں کوئی نہ رہا ہو۔ صرف میرے تخیل کی اپج۔

ناصر توہم پرست انسان نہیں ہے، اس لئے اس سے میں اس قسم کی باتیں نہیں پوچھ سکتا۔ کیا آپ محض تخیل کو شخصیت کا روپ دے سکتے ہیں؟ ناصر مضبوط قوت ارادی کا آدمی ہے، حقائق پرست... آپ اس سے آمدنی اور اخراجات کی مدوں پر آزادانہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ خیالات کی دنیا سے دور بھاگتا ہے۔

کھڑکی کے قریب بیٹھ کر میں ناصر سے گفتگو کرتا رہا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کیا ناصر بھی میری طرح اس شے کو دیکھ سکتا ہے؟ میں نہیں چاہتا تھا کہ ناصر شعوری طور پر اس شے کو دیکھے۔ ہرگز نہیں۔ اگر وہ اس شے کو دیکھ سکا تب وہ کوئی تخیلی شے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ایک ایسی شے جس کے خدوخال، رنگ و روپ کو واضح طور پر اس کا رسا ذہن قبول کر سکتا۔ اگر وہ نہیں دیکھ سکا تب یقیناً وہ شے میرے تخیل کی اپج ہے۔ تھکے ہوئے بیمار ذہن کی اپج۔

ٹھیک ہے... وہ اسے نہیں دیکھ سکا۔

اس شے نے ناصر کو دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا ہوتا، اگر وہ کوئی دکھائی دینے والی چیز ہوتی۔ تاریکی کے برعکس وہ شے ایک دم اجالے میں آ گئی۔ باغ کے اندھیرے سے کھڑکی کے اجالے تک۔

میں اس شے کو بہ خوبی دیکھ رہا ہوں یہ ایک عورت کا ہیولیٰ ہے۔ ایک لڑکی، عورت نہیں۔ اس کی قامت بہت مختصر ہے۔ اس کی چال بہت نرم نرم ہے۔ درحقیقت وہ چلتی ہوئی نہیں نظر آتی۔ کسی لمحہ وہ ایک جگہ ہے، دوسرے لمحہ دوسری جگہ۔ وہ مکان کی سمت آ رہی ہے۔ سفید۔ شاید بالکل سفید نہیں۔ بلکہ بے رنگ کہئے۔ جیسے آبِ رواں نے کوئی روپ دھار لیا ہو جیسے مینہ جم کر شیشے کے سانچے میں ڈھل گیا ہو۔

"کیا با آسانی گھر واپس جا سکتے ہو؟" میں نے ناصر سے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

میں نے دروازے کے دونوں پاٹ کھول دیئے۔

"شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

وہ بجری کی سڑک پر چلنے لگا۔

میں دروازے میں کھڑا رہا۔ وہ سوچ رہا ہوگا میں اسے رخصت کرنے کی غرض سے کھڑا ہوں۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے الوداعی نگاہوں سے دیکھا۔

وہ شے اب گھاس کی روش تک آ گئی تھی۔ وہ ایک انتہائی متین اور مسکین چہرہ تھا۔ اس کا قد میرے کاندھوں تک تھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ بلکہ ساکت کہئے۔ منجمد۔ اس کی انگلیاں اس کے لانبے کوٹ کو چھو رہی تھیں اس نے رخ موڑ لیا تھا اس لئے اب میں اسے اچھی طرح نہیں دیکھ رہا تھا اس کے پیروں میں پرانے فیشن کے جوتے تھے، اس کا لباس لانبا اور عام وضع کا تھا۔ اس کے کاندھوں پر لانبا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔

میں دروازے کے قریب اس کا انتظار کرتا رہا مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"اندر آ جاؤ!" میں نے پکار کر کہا "تم اندر آ سکتی ہو۔"

میں ایک قدم آگے بڑھا۔ وہ جا چکی تھی۔

باغ کے اندھیرے میں کھڑے ہو کر میں نے کہا: "تم مجھ سے ڈرو نہیں، ننھی بی بی... بالکل مت ڈرو۔" لیکن میری آواز میں لرزش اور کھوکھلا پن تھا۔ میں واقعی اسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ سردی میں راستہ بھٹک گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی؟

میں نے ایک منٹ اس کا انتظار کیا۔ پھر دو، تین۔ اس وقت تک جب تک کہ میں اکتا کر لوٹ نہیں آیا۔ دروازے کے قریب پہونچ کر میں ہلکے سے بڑبڑایا۔ "تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا...؟"

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں کھڑکی کے قریب اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور باہر کی جانب دیکھنے لگا، شاید وہ لڑکی پھر نظر آ جائے... میں انتظار کرتا رہا اور نہ معلوم کب مجھے نیند آ گئی۔

صبح کو سورج کی شعاعیں کھڑکی کے شیشوں کے اس پار مسکرا رہی تھیں۔ میں کاہلی سے بھیگی بلی کی طرح اٹھا اور لاپرواسا معمولات میں مشغول ہو گیا۔ جیسے ساری دنیا کا وقت میرے حصے میں آ گیا ہو۔

لیکن اس لڑکی کو بالکل فرصت نہیں تھی۔ اسے جس چیز کی تلاش تھی شاید اسے وہ نہیں مل سکی۔ بے شبہ وہ اس کی تلاش میں ہے۔

اوس سے بھیگے ہوئے کھڑکی کے شیشوں پر وہ اپنی انگلیوں سے لکھ گئی تھی۔ "مجھے چاہو، مجھے چاہو، مجھے چاہو..."

رات ناصر اس کے بہت قریب سے گذرا۔ جب میں نے ناصر کو اندر آنے کو کہا تو وہ بھی اس کے پیچھے دروازے کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ ناصر کے خوب صورت سوٹ میں جذب ہو کر رہ گیا، لیکن دوسرے لمحے میں نے اس کے شانوں کی جانب نگاہ دوڑائی، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

جب میں دروازہ بند کر کے واپس ہوا، ناصر نے مجھ سے کہا۔ "تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے، تم نے آرام کرنے کا بہت مناسب فیصلہ کیا ہے۔"

"معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا" میں اکثر سوچتا ہوں مجھے آرام کرنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔"

"اوہ..."

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس قسم کی شاعرانہ باتوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"یہاں بہت تنہائی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہی ہو۔"

"پھر کہیں اور چلے جاؤ۔" وہ میز کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی میں دھنس گیا اور بریف کیس سے کاغذات نکال کر اپنے سامنے پھیلانے لگا۔

"شاید تمہاری دلچسپی کا یہاں کوئی سامان نہیں ہے۔"

"ایسی بات تو نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔ ایسی باتیں جو ناصر کی دلچسپی کی تھیں۔ مگر مجھے باہر کا خیال پریشان کئے رہا۔ ناصر کا خیال غلط تھا۔ مجھے یہاں رو کے رہنے کا خاصا مواد تھا، مثلاً باہر کھڑی ہوئی وہ لڑکی...

آخر کب تک وہ باغیچے میں کھڑی رہے گی؟

زیادہ دیر تک نہیں۔ جب میں نے ناصر کو اندر آنے کے لئے راستہ دیا تب وہ ڈیوڑھی میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہی سرد نگاہیں۔ کوٹ کے کناروں کو چھوتے ہوئے نرم و نازک ہاتھ۔

ناصر کے واپس جانے پر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ابھی تک سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

"آخر تم اندر آ ہی گئیں۔" میں نے کہا" لیکن تم چاہتی کیا ہو؟"

اس نے میری بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ صرف اس کی آنکھیں۔ خوبصورت اور اداس آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ کیسی نازک اور ننھی منی سی لڑکی۔

"میں نہیں جانتا کہ تم سے کس طرح بولوں۔" میں نے کہا، "مجھے افسوس ہے، پتہ نہیں تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

وہ مسکرائی، پہلی بار اس کے ساکت وجود میں میں نے حرکت محسوس کی۔ ایک دل فریب مسکراہٹ۔ کشش و بیچ میں مبتلا۔ مگر دل رہا، پھر وہ معدوم ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لئے وہ سیڑھیوں کے قریب ستون کے پاس نظر آئی، پھر غائب ہو چکی تھی۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنا نہیں چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

اب اس کا مزید انتظار فضول تھا، ممکن ہے کسی ایک جگہ وہ دیر تک نہ ٹھہر سکتی ہو۔ بہر حال اب وہ جا چکی تھی۔

رات بھر میں نے اس کا انتظار کیا۔ شاید وہ آ جائے، لیکن وہ نہیں آئی۔ ایک آدھ بار مجھے کسی سائے کا احساس ہوا۔ روشنی میں کسی کا عکس جھلکا، لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔

اس طرح دو ایک دن گذرے۔ وہ مکان کے کسی بھی حصے میں نظر آ جاتی۔ کھڑی مسکراتی رہتی۔ ایک بار وہ میری طرف بڑھی، اپنی خوبصورت انگلیوں سے میری جانب اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اس کی جانب لپکا... لیکن وہ جا چکی تھی۔ وہ میرے قریب آنا چاہتی تھی لیکن پھر بھی مجھ سے خوف زدہ تھی۔

ایک رات جب ناصر جا چکا تھا، میں نے سوچا۔ "آخر یہ ڈراما کب تک چلے گا؟" وہ بازو دار کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی، میں نے کہا، "آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

میں دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا مبادا وہ ڈر جائے۔ میں کرسی سے دو تین فیٹ کے فاصلے پر رک گیا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ "گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہے..." میں نے اس سے کہا۔

وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گئی اور کرسی کے پیچھے نظر آئی۔ اب اس کا خوف غائب جاتا رہا تھا، وہ کرسی کے پیچھے کھڑی تھی۔

"تم گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے پھر اطمینان دلایا۔

تب اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے داہنے کندھے کو چھوا۔ سردی کی ایک تیز لہر میرے بازوؤں سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں دوڑ گئی۔

ایک کپکپا دینے والا احساس۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ غائب ہو چکی تھی، صرف میں اپنے بائیں ہاتھ سے داہنے سرد بازو کو پوری قوت سے دبائے ہوئے تھا۔

یہ میری اور اس کی محبت کی ابتدا تھی، اس لڑکی کے جسم کا پہلا پہلا لمس۔ اور شاید پہلی ہی بار میں خوف زدہ بھی تھا۔

میں اسے چھونا چاہتا تھا، اس کے عارض کی ملاحت محسوس کرنا چاہتا تھا، اس کے ننھے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا... میرا خیال ہے وہ بھی اس بات کو جانتی تھی۔ میرا خیال ہے وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس کی دل نشیں مسکراہٹ، اس کے ناز و انداز۔ درحقیقت کتاب محبت کے ابتدائیے تھے۔ شاید اسی لئے اس نے شبنم کے آنسوؤں کا سہارا لے کر کھڑکی پر کہہ دیا تھا۔ "مجھے چاہو، مجھے چاہو، مجھے چاہو..."

ہم دونوں کی محبت میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔ ناصر عموماً رات کو آتا اور تھوڑی دیر رک کر واپس چلا جاتا۔ پھر وہ آتی، کرسی پر بیٹھی مسکرایا کرتی، میں دھیرے دھیرے اس کے قریب جا کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ لیتا اور اس کے سرد لمس کا دباؤ اپنے جسم پر محسوس کرتا، اور سردی کی تیز لہر میرے اندر دوڑ جاتی۔

ناصر نے اپنے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم پڑتی۔" اس کا لہجہ بہت ہمدردانہ تھا۔

"اچھا خاصا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمہاری چوٹ..." وہ کہتے کہتے رک گیا، وہ میرے بازوؤں کی طرف دیکھ رہا تھا جو سفید پٹیوں سے ڈھکے ہوئے تھے جنھیں میں نے آستین سے چھپا رکھا تھا۔

"یہ آگ سے جلنے کے زخم ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں سمجھتا تھا کہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا، لیکن زخم شدت اختیار کر گئے۔"

"تم نے ڈاکٹر کو دکھلایا؟"

"ہاں، ہاں۔ بالکل۔"

ناصر مطمئن ہو گیا، وہ میری باتوں پر ہمیشہ یقین کر لیا کرتا تھا، جرح کرنے کا عادی نہیں تھا۔

ناصر چلا گیا۔ میں کمرے میں واپس آیا، وہ کھڑکی کے قریب کھڑی ہوئی ناصر کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف مڑی اور جوں ہی اس نے اپنی بدوضع انگلیوں کو میری جانب بڑھایا، مجھے اپنے چہرے پر سردی کی تیز لہر دوڑنے کا احساس ہوا۔

اب وہ اکثر مجھے چھو لیتی ہے، تھپکیاں دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جس جگہ وہ مجھے تھپکتی ہے جسم کے اتنے حصے کی کھال خشک ہو جاتی ہے، گوشت گل کر سڑ جاتا ہے اور خون کی روانی بند ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں خود کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا کیوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جلد ہی یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔

دوسری شب ناصر پھر آیا۔ میں نے اسے ایک چابی دے رکھی ہے۔ وہ آسانی اندر آ جاتا ہے۔ بہت دیر تک اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے قصداً کمرے میں اندھیرا رکھا تا کہ وہ دیکھ نہ سکے۔ لیکن کیا نہ دیکھ سکے؟ میں نے بہانہ کر دیا کہ میری آنکھوں کو روشنی بھلی نہیں معلوم ہوتی... آخر اس بہانے بازی سے کب تک کام چلے گا؟

وہ پلنگ کی پائینتی کے قریب کھڑی ناصر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک آدھ بار ناصر نے چونک کر اپنی پلکیں جھپکائیں، اسے کسی تیسرے وجود کا احساس ہوا۔ لیکن نہیں، وہ ایک ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے، اس نے محض نظر کا فریب سمجھا۔

"خدا حافظ"، کہہ کر ناصر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے حرکت کی۔ وہ دروازے کو پار کر کے باہر نکل آیا، وہ بدستور پائینتی کے قریب کھڑی رہی، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، پھر ایک دم پلٹ کر کمرے سے پھسلتی ہوئی نکلتی چلی گئی۔

میں نے کھڑکی سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا... وہ باہر سڑک پر جا رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے لپک رہی تھی۔ وہ دفعتاً مڑا، جیسے اسے تعاقب کا احساس ہو گیا ہو۔ لیکن نہیں۔ اس نے رک کر سگریٹ سلگائی اور سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جوں ہی میں مڑتا ہوں خشک گوشت کا ایک پارچہ میرے رخسار سے کٹ کر نیچے قالین پر گر پڑتا ہے، میں بستر پر پہنچنے سے قبل ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہوں۔

وہ میری تھی... یقیناً وہ میری تھی ☆☆☆

امیر خسرو دہلوی

دیباچہ غرۃ الکمال

امیر خسرو نے شعر کے دفاع میں ایسے نکات پیش کئے ہیں جن کا جواب آج تک ممکن نہ ہو سکا۔ انھوں نے ایک انوکھے استدلال کے ذریعہ شعر کو تقدیس کا حامل قرار دیا یعنی یہ کہ جو شعر کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ لفظ اور معنی کے اعتبار سے حقیقت شعر اور حقیقت علم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خسرو نے دو دنیاؤں کا ادغام تجویز کیا اور اس کی موافقت میں وہ ایک نیا استدلال لائے۔ یہ استدلال عرب و عجم میں بے عدیل ہے لیکن ممکن ہے خسرو کے یہاں اس کا خیال سنسکرت سے آیا ہو۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اس نہایت مشکل اور کم یاب متن کا بہت درست ترجمہ کراچی کے پروفیسر لطیف اللہ نے سلیس اور شگفتہ اردو میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے۔

قیمت : ۲۲۵ روپے

ناشر : شہرزاد، کراچی

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

سے طلب کریں

نجم فضلی

شمارہ ۱۷۸،
نومبر دسمبر ۱۹۹۴

دھوئیں کی لکیریں
فضاؤں میں یوں جال بنتی ہیں جیسے
کرن روشنی کی کوئی بچ کے جانے نہ پائے گی ان سے
روشنی، علم، نیکی، مسرت
ہمارے لبوں کا یہ سہما ہوا سا تبسم
دلوں میں امیدوں کے یادوں کے کھلتے کنول
جن سے ہم اتنی تنہائیوں کو سجاتے رہے ہیں
یہ سب کچھ اندھیرے کے اس دودھیا جال کی زد میں ہیں
ذہن کو مت تھکاؤ
اندھیرے میں چھت کو نہ گھورو
لہو مت جلاؤ
کہ اب خوں فقط
جلتے بجھتے چمکتے ہوئے اشتہاروں کی خوراک ہے
اشتہارات، اس عہد کا معجزہ
جو بشارت ہیں اس دور میں
ہر ضرورت کی تکمیل کی
ساری آسائشیں، ہر خوشی، سارے جذبے، شرافت محبت
یہاں تک کہ جنت جہنم سبھی

فلسفے یا سیاست کی یا پھر مذاہب کی اونچی دکانوں کے شوکیس میں
بند ڈبوں میں کیپسول میں بک رہے ہیں
اگر جیب میں کچھ نہیں ہے
تو پھر اشتہاروں کو دوبارہ دیکھو
کہ منٹوں میں قارون بننا بھی مشکل نہیں
زندگی سہل ہے باقی باتیں غلط
اندھیروں کے کوہ گراں
اتنی باریک کرنوں کے تیشے سے کب کٹ سکے ہیں
انھیں بھول جاؤ
مگر

درد بیدرد ہے باقی احساس خوابیدہ ہیں
خالی الفاظ کا ایک جنگل ہے جس میں
بھٹکتا ہوں میں
مردہ الفاظ دکھ کا مداوا نہیں
مجھے مر کے دوبارہ اٹھنے کی حسرت نہیں ہے
میں پہلے کئی مرتبہ مر چکا ہوں

خمیازہ

مجم فضلی

شمارہ ۲۳۸،
جون ۲۰۰۰

اس نے اپنی دونوں آنکھیں الگ کر کے رکھ دیں۔ پھر اپنے کان نکال کے آنکھوں کے پاس ہی رکھ دئے۔ پھر اپنی ٹانگیں اور ہاتھ ایک طرف ڈھیر کئے اور اطمینان سے اس ڈھیر پر سر ٹکا کر جاگنے کے منظر سے منہ پھیر لیا۔

آج پھر اس نے خواب دیکھا۔

مگر یہ خواب روزانہ کے خواب سے مختلف تھا۔

خواب میں وہ اپنے پیروں پر اپنے پورے قد سے کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔ جس دروازے سے گذرتے وقت اس کے بال اوپر چوکھٹ کو چھوتے تھے۔ آج وہ اتنا اونچا ہو گیا تھا جس کے نیچے سے وہ اس طرح گذر گیا جیسے بڑے پل کے نیچے سے نوکا۔ باہر کا منظر بھی اسے دھندلا دھندلا نظر آیا۔ ہمیشہ کی طرح خوشبو بکھیرتے ہوا کے دوش پر لہراتے خوش رنگ پھول بھی نظر نہ آئے۔ پھول نظر نہیں آئے۔ تتلیاں بھی نہیں تھیں تو ان کے پیچھے ہنستے مسکراتے توانائی سے دمکتے بھاگتے ہوئے بچے بھی غائب تھے۔ گویا اس کی بصارت بھی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی بصارت پر پورا زور ڈال کر اس دھندلے منظر کو اپنی آنکھوں کی بچی کھچی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی تو اس کا دماغ گھومنے لگا۔

اس وقت اسے اپنے گرد کچھ چاندتاروں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جابر دھوپ میں کچھ بچے ملدوش وتجسس انداز سے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ قریب آنے پر پتہ چلا کہ وہ بچوں کے قد کے پورے آدمی ہیں جو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ مگر ان کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ تب اسے پتہ چلا کہ اس کی سماعت بھی بری طرح متاثر ہے۔ اس لمحے وہ اضطراری طور پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے پورے قد سے اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

سنو بھائیو!

بس اسی لمحے، اس کے پورے قد سے کھڑے ہوتے ہی، اس کے ہونٹوں سے آواز کے پہلے ارتعاش کے آزاد ہوتے ہی وہ سب کے سب جیسے ''یہ تو کوئی اور ہے'' کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور فوراً ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا جیسے چند قدم بھاگنے کے بعد وہ سب ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں یا تال میں اتر گئے ہوں۔ پھر اسے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ جیسے بومرنگ واپس ہو گیا ہو۔

مگر یہ سب کچھ اس کا واہمہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے سامنے ہی اس کی سماعت، اس کی بصارت اور اس کا ناطقہ الگ صلیبوں پر جبر کی کیلوں سے ٹھکے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور ان کے نڈھال جسم سے قطرہ قطرہ ٹپکتی بے چارگی زمین کو مٹ میلا بنا رہی تھی۔ پھر وہ مکروہ مٹ میلا پن سڑے ہوئے خون کی طرح اس کے گرد پھیل گیا۔

اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے اضطراری طور پر کروٹ لی۔

قریب پڑی ہوئی آنکھ اس کے جسم کے بوجھ سے نڈھال چیخ رہی تھی۔ گھبرا کر وہ اٹھا تو اسے دوسری آنکھ کا خیال آیا۔ جسے اس نے اپنے چاروں طرف ڈھونڈا، پھر اسے نہ پا کر بے نیاز ہو گیا۔ مگر فوراً ہی اسے محسوس ہوا کہ دوسری آنکھ اس کے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔ شدید تاسف کے عالم میں اس نے دوسری

آنکھ بھی چہرے پر ٹانگ لی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے لیٹنے سے پہلے حسب معمول اپنی دونوں آنکھیں اپنے چہرے سے اتار کر ایک طرف رکھ دی تھیں۔ یہ آنکھیں اور یہ کان دوسروں کے طے کیے ہوئے منصوبے کے تحت دیکھنے اور سننے کے عادی ہو چلے تھے۔ خواب میں ان کی ضرورت نہ تھی۔ خواب میں ان کے بغیر صحیح سمت میں دور تک دیکھ سکتا تھا۔ صحیح آوازیں سن سکتا تھا۔ تو یہ کوئی سازش تھی کہ سوتے میں اس کی ایک آنکھ اس کے چہرے پر ٹانگ دی اور سب کچھ خلط ملط ہو گیا۔ یہ اس کے خوابوں کے خلاف سازش تھی۔

پہلے تو ایسا نہ تھا۔ یکا یک نمودار ہونے والے آسیب کے منہ سے زہریلا دھواں پھیلنے سے پہلے تو وہ بھی دوسروں جیسا تھا۔ اور خیالات میں بھی یکسانیت تھی۔ سب کے خواب بھی ان کے لئے اتنے ہی اہم تھے جتنے ان کے اپنے خواب۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اس کا سر درد کی تیز و تند لہروں کے بیچ ہچکولے کھانے لگا۔ اس کا سر تو بے ہتھیلی کی کلائیوں پر ٹکا ہوا تھا اور کلائیاں خنجر کی نوک بن کر اس کے دماغ میں چبھ رہی تھیں۔

اس نے چاروں طرف اپنی ہتھیلیاں ڈھونڈھیں۔ وہ آس پاس کہیں نظر نہ آئیں۔ بہت تگ و دو کے بعد ایک ویران نیم تاریک گوشے میں وہ ہتھیلیاں ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے اپنی ہتھیلیاں اپنی کلائیوں سے جوڑیں اور ان کے بیچ اپنا سر رکھا تب اسے سکون ہوا۔

یکا یک ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے خود کو خود سے الگ کر لیا۔

"بھائی نمبر دو! تم ہی ہو یا کوئی اور؟"

اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص سے پوچھا جس کے تمام اعضا اپنی اپنی جگہ مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے۔

"بھائی نمبر ایک! میں ہوں تو تم ہی مگر اس وقت تک تم سے مختلف نظر آ رہا ہوں جب تک تم سے الگ ہوں۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم دونوں زیادہ دیر الگ نہیں رہ سکتے۔ کوئی خود سے کیسے الگ رہ سکتا ہے۔"

نمبر ایک حسرت سے اس کو دیکھتا رہا۔

کیا خوبصورت جوان ہے۔ اس کی تمام صلاحیتیں پوری طرح اس کے اختیار میں ہیں۔ وہ پیروں پر کھڑا ہو کتنا وجیہہ کتنا شاندار لگ رہا ہے۔ اس کے خیالات اس کے اپنے ہیں۔ ان پر کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہے۔ وہ آزادی سے اپنی مرضی کی سوچ سکتا ہے۔

نمبر ایک، ایک عجیب سی سرشاری میں ڈوب گیا۔ آخر وہ کوئی دوسرا نہیں میں ہی ہوں۔ میں اس کے پیروں پر جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔ اس کی آنکھوں سے تمام مناظر کی اصلی شکل دیکھ سکتا ہوں اس کے کانوں سے صحیح آوازیں سن سکتا ہوں۔ اور اس کی زبان سے سچ بات... کیا سچ بات کہہ سکتا ہوں؟

نمبر دو کا جسم جیسے شیشے کا ہو جس میں نمبر ایک کی سوچ اس کے احساسات منور الفاظ کی شکل میں منتقل ہوئے نمبر ایک کو صاف نظر آ رہے تھے۔

"غلطی کرنے والے کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے غلطی دانستہ ہو یا نادانستہ یا اپنے سے پہلے والے کی ہو خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔"

"درد کا خمیازہ کون بھگتے گا؟" نمبر ایک کی سوچ۔

"درد اور خمیازہ دونوں انسان کا ہی مقدر ہیں۔ انسان کسی اکائی کا نام نہیں تسلسل کا نام ہے۔ ہمارے دکھ درد اس تسلسل کا نتیجہ ہیں۔ جب کہ خوشی اگر مل جائے تو ذاتی، لمحاتی ہوتی ہے۔ ہم سے پہلوں کی غلطی کا خمیازہ ہمارا مقدر ہیں۔ ہماری غلطیوں کا خمیازہ ہمارے بعد والے بھگتیں گے۔"

"تو ہماری حالت..."

"یہ تم جانو۔ میں تو تم ہی ہوں۔"

نمبر دو غائب ہو گیا۔ تنہائی کی شدت سے گھبرا کر وہ آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

بونوں کی بھیڑ اس کے گرد جمع ہو گئی۔ جتنی دیر وہ چپ رہا بونے اپنے چہروں پر اس کی آواز سننے کا اشتیاق سجائے خاموش کھڑے رہے۔ پھر اس کے لب ہلے۔

"ماضی انسان کا سب سے قیمتی ورثہ ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنے حال کی عمارت اور مستقبل کا خاکہ تیار کرتا ہے..."

اس نے دیکھا کہ سامعین کے چہرے جذبات سے عاری اور آنکھیں مفہوم سے خالی ہیں۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"وہ جو سامنے بہت بڑا سا دروازہ..." یکا یک اس پر منکشف ہوا کہ اس کے سامعین کی آنکھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ بڑی چیزیں ان کے دائرۂ نگاہ میں نہیں سما پاتیں۔

"اچھا! یہ جو قریب ہی بہت چھوٹی سی کھڑکی ہے..."

"ہاں ہاں وہ دور بڑا دروازہ صاف نظر آ رہا ہے۔" سامعین نے خوش ہو کر کہا۔

اس نے تاسف سے سوچا۔ جنھیں صرف چھوٹی اور سامنے کی چیزیں نظر آتی ہوں ان سے کیا بات ہو۔ اس نے سلیمانی ٹوپی پہن لی۔

بونوں میں چند نے جو دوسروں پر اثر انداز نظر آ رہے تھے۔ اس کے ناک، کان، آنکھ، ہونٹوں کے انداز چال ڈھال کے ڈھنگ۔ اس کے خیالات اور اس کی ذات سے متعلق تمام چیزوں کی شبیہیں حاصل کر کے، ان پر مخصوص رنگ چڑھا کر اپنی دکانوں میں سجانے لگے۔

کچھ بونے اس کی کرسی کے پائے کاٹ کر چھوٹے کرنے میں مصروف تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" چند بونوں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اگر اسے ہم میں رہنا ہے تو ہمارے جیسا بن کر رہنا پڑے گا۔" دانشورانہ لہجے میں جواب ملا۔

"مگر کوئی کسی اور جیسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پھر تو..."

"پھر کیا؟"

"پھر یہ کہ یہ نہیں رہے گا۔"

"یعنی...؟" اس نے اپنی گردن پر انگلی پھیر دی۔

"ہاں... لیکن ابھی ہمیں اس سے بہت کچھ حاصل کرنا باقی ہے۔"

"تو گویا ہم اسے اپنا ئیں گے؟"

"ہم اس سے اس کی تمام چیزیں حاصل کریں گے پھر انھیں اپنا رنگ چڑھا کر پیش کریں گے اس کا اپنا کچھ نہیں رہ جائے گا... جب کسی کے پاس اپنا کچھ نہ رہ جائے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔"

"نقل اور اصل کا فرق تو..."

"کوئی فرق نہیں۔ جو چیز زیادہ لوگ اختیار کرلیں وہ اصلی ہو جاتی ہے۔ کل جو چیز اصلی تھی آج نقلی ہے جو آج اصلی ہے کل وہ نقلی ہو جائے گی۔"

"سچ اور جھوٹ؟"

"جو بات زیادہ لوگ کہتے ہیں وہ سچ ہے..."

کسی خیالی آہٹ پر دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ اور وہ بھاگ نکلے۔

اس کے دن اسی طرح بے یقینی کی صورت میں گذرتے رہے۔ دن کیا گذرتے رہے۔ دن اسے گذرتے رہے۔ اس طرح کی اس کی یادداشت، اس کے احساسات اس کے نظریات سب خلط ملط ہو گئے۔ اب اسے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اس نے دوسرے قبیلوں کی زبانیں سیکھیں تو انھوں نے کہا کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کی زبان نہیں ہے۔ اس کا رہن سہن چغلی کھاتے ہیں کہ یہ کہیں اور کا ہے۔

کبھی کبھی دوسرے قبیلوں کے لوگ اس سے دوستی کا دم بھرنے لگتے مگر مطلب برآری کے بعد اس سے اس طرح منہ پھیرتے جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ اس کے اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں نے نہ جانے کتنے جتنوں کے بعد دوسرے قبیلے میں خود کو قابل قبول بنانے کی خوش فہمی حاصل کرلی تھی۔

اس طرح وہ اور تنہا ہو گیا۔

اس کا اپنا کچھ نہیں رہ گیا۔ نہ دوسرے قبیلے کی کوئی چیز اس کے پاس تھی۔ فقط اس کا دماغ اس کی سوچ اپنی تھی جو تاریخ کے جبر سے واقف تھی۔ یکا یک ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے بڑے گداز کے لہجے میں نمبر دو کو پکارا۔

"بھائی نمبر دو! میں اور تم تو ایک ہی ہیں۔ پھر بھی تم مجھ سے بالکل مختلف ہو۔ مکمل۔ جب کہ میرے ساتھ جڑ کر تم بھی نامکمل ہو جاتے ہو۔ اس لئے میں مرجاتا ہوں تاکہ تم اپنی اصل حیثیت سے زندہ رہو۔"

اور نمبر ایک مرگیا ☆☆☆

غزل

ندا فاضلی

کچھ بھی بچا نہ کہنے کو ہر بات ہوگئی
آؤ کہیں شراب پئیں رات ہوگئی

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

رستے میں وہ ملا تھا، میں بچ کر گذر گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہوگئی

وہ آدمی تھا کتنا بھلا کتنا پرخلوص
اس سے بھی آج لیجے ملاقات ہوگئی

مدت سے تھی تلاش ملیں، اور مل لئے
دو پل رکے، سلام ہوا، بات ہوگئی

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

شمارہ ۱۳،
جون ۱۹۶۷

ندا فاضلی

شمارہ ۱۷،
اکتوبر ۱۹۶۷

ایک روپے کے سولہ آنے
دو آنے کا مول
بھائی بہن۔ پورب اور پچھم
ماتا پتا بے زار
گھونگھٹ میں سمٹی خاموشی
دو دھاری تلوار
گھر کی لاج کھڑی دروازے
کب سے سانکل کھول
جانے پہچانے... ان جانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی جوالا
سڑک سڑک
پتھراؤ
شبدوں کے سب چہرے زخمی
ننگے سارے بول
ایک روپے کے سولہ آنے...

شمارہ ۱۹،
دسمبر ۱۹۶۷

پہلے وہ
رنگ تھی...
پھر روپ بنی
روپ سے جسم میں تبدیل ہوئی
اور پھر....
جسم سے بستر بن کر
گھر کے کونے میں لگی رہتی ہے
جس کو...
کمرے میں گھٹا اندھیارا
وقت بے وقت اٹھالیتا ہے
کھول لیتا ہے، بچھالیتا ہے

ندا فاضلی

غزل

شمارہ ۱۸۰،
فروری ۱۹۹۵

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں

پہلے ہر چیز تھی اپنی مگر اب لگتا ہے
اپنے ہی گھر میں کسی دوسرے گھر کے ہم ہیں

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں، کدھر کے ہم ہیں

چلتے رہتے ہیں کہ چلنا ہے مسافر کا نصیب
سوچتے رہتے ہیں کس راہ گذر کے ہم ہیں

گنتیوں میں ہی لکھے جاتے ہیں ہر دور میں ہم
ہر قلم کار کی بے نام خبر کے ہم ہیں

تھوڑی سی کمی

شمارہ ۲۵۲،
جون ۲۰۰۲

ہر نظم مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ قلم سے کاغذ پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر پریت مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ گگن سے دھرتی پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر جیت مکمل ہوتی ہے
سرحد سے وہ لیکن آنگن میں
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

پھر نظم نئی
پھر پریت نئی
پھر جیت نئی بہلاتی ہے
ہر بار مگر لگتا ہے یونہی
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ندا فاضلی

شمارہ ۲۵۲

جنوری ۲۰۰۲

میرا شہر

یہی شہر جواب
سمندر کنارے
ہرا چھاؤں کے ناریل کے سہارے
جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے
اکیلا سا
چپ چپ سا
سہما ہوا ہے
کبھی یہ بھی چاروں طرف بھاگتا تھا
بڑا زندہ دل تھا
یہ شب میں بھی دن کی طرح جاگتا تھا
کہیں چلتی لوکل میں گانوں کے جیسا
کہیں جینس پہنے جوانوں کے جیسا
کبھی آرتی اور اذانوں کے جیسا
کبھی دور کے آسمانوں کے جیسا
صدا اس کی چاروں طرف گونجتی تھی
کھنکتا ہوا ایسا کلدار تھا یہ
شرابی
نمازی
جواری
پجاری
خود اپنی ہی مستی میں سرشار تھا یہ
نظر لگ گئی اس کو شاید کسی کی
کبھی اس کی جیبوں میں ڈھیروں ہنسی تھی
یہ بادل سا چھم چھم برستا بہت تھا
یہ ہنستا بہت تھا۔

شمارہ ۲۷۲

ستمبر ۲۰۰۳

میرا شہر

شہر میرے ساتھ چل تو
چیختے بڑھتے، جھگڑتے
کرفیو، نعروں کے اس بازار سے
باہر نکل تو
تیری آنکھوں میں بھری ہے دہشت
لگتا ہے
کئی برسوں سے تو سویا نہیں ہے

ہڈیوں میں تیری
تیرے سوچنے محسوس کرنے کا تھا جتنا فاسفورس
مر چکا ہے
کوکا کولا، پیپسی کا رنگ ان میں بھر چکا ہے
اب کسی بھی حادثے پر
واقعے پر
مسئلے پر
چونکتا ہے تو نہ روتا ہے کبھی تو

فرقہ بندی کا جان لیوا روگ
تیرے تن بدن کو کھا رہا ہے
شہر تو چاروں طرف سے
پھیلتا ہی پھیلتا ہی جا رہا ہے
اس سے پہلے، پھولتے غبارے جیسا
تو اچانک پھوٹ جائے

شہر سن۔ ایسا کریں ہم
دور جنگل کے کسی سنسان سے گوشے میں چھپ کر
پیاز کی گانٹھوں کو چاقو سے تراشیں
اور دونوں
روتے روتے شانت ہو کر
خوب گہری نیند سوئیں۔

نشتر خانقاہی

شمارہ ۳۹،
اگست ۱۹۶۹

دھڑکا تھا دل، کہ پیار کا موسم گذر گیا
ہم ڈوبنے چلے تھے کہ دریا اتر گیا

خوابوں کی وہ متاع گراں کس نے چھین لی
کیا جانئے وہ نیند کا عالم کدھر گیا

تم سے بھی جب نشاط کا اک پل نہ مل سکا
میں کاسۂ سوال لئے در بدر گیا

بھولے سے کل جو آئینہ دیکھا تو ذہن میں
اک منہدم مکان کا نقشہ اتر گیا

تیز آندھیوں میں پاؤں زمین پر نہ ٹک سکے
آخر کو میں غبار کی صورت بکھر گیا

گہرا سکوت، رات کی تنہائیاں، کھنڈر
ایسے میں اپنے آپ کو دیکھا تو ڈر گیا

کہتا کسی سے کیا کہ کہاں گھومتا پھرا
سب لوگ سو گئے تو میں چپکے سے گھر گیا

شمارہ ۲۴۱،
اکتوبر نومبر ۲۰۰۰

آپ اپنی ذات میں سمٹا ہوا عالم تمام
تم کو یوں جانا کہ تھا جانا ہوا عالم تمام

کل تو بیگانہ تھا لیکن آج ہے بیگانہ تر
اک سر انگشت پر رکھا ہوا عالم تمام

دسترس کا ذکر کیا ہے، آگہی کی بات کیا
روبرو ہے گرد میں اڑتا ہوا عالم تمام

گر بدل جاتے تو تھی دنیا کی ہر شے حسب حال
ہم نہیں بدلے تو ہے بدلا ہوا عالم تمام

جانتا ہوں میں اگر جاگا تو یہ سو جائے گا
اب ہوں خوابیدہ تو ہے جاگا ہوا عالم تمام

انگلیوں کے بیچ یہ پیچیدہ گر ہیں تہ بہ تہ
ناخنوں کے درمیاں الجھا ہوا عالم تمام

اک مری خاطر جو تھے سب کے دعا گو کیا ہوئے
اف یہ محرومی کہ ہے سہما ہوا عالم تمام

نصیر احمد ناصر

شمارہ ۲۱۲،

دسمبر ۱۹۹۷

مہمان پرندوں کو الوداع

الوداع مہماں پرندو، الوداع!
اگلے برس تک
الوداع
اگلے برس جب تم اڑانوں کے صحیفے لے کے آؤ گے
تو جھیلوں کے کنارے
ہم تمھارے منتظر ہوں گے
تمھارے خوبصورت نرم زریلے پروں کا
لمس پاتے ہی
زمیں پر پھر محبت لوٹ آئے گی
مگر اگلے برس تک

پانیوں میں
کائی کی موٹی تہوں کا بھی اضافہ ہو چکا ہوگا
ہوائیں دھول سے،
کالی کثافت کے دھوئیں سے
گرد سے لبریز ہوں گی
کھیت، بیلے، گھاس کے میداں، گھنے جنگل
نئی سڑکوں کی آری سے
کئی ٹکڑوں کی صورت کٹ چکے ہوں گے
شکاری موسموں کی سازشیں بھی تیز ہوں گی
الوداع مہماں پرندو الوداع!
اگلے برس تک
ہم تمھارے لوٹ آنے کی خوشی کا دکھ منائیں گے

شمارہ ۲۱۵،

مارچ اپریل ۱۹۹۸

دکھ

دکھ کسی بچے کی بنائی ہوئی تصویر ہے
زندگی کے ٹریسنگ پیپر پر
دکھ کبھی سیدھی، کبھی آڑی ترچھی لکیریں بناتا ہے
کبھی مخروطی، کبھی چوکور
کبھی اسپائرل
کبھی دائروں میں پھیلتا ہوا
اپنے ہی بے انت میں گم ہو جاتا ہے
کچھ لوگ سمجھتے ہیں
کہ محبت دکھ کو جنم دیتی ہے
لیکن محبت تو وہاں سے شروع ہوتی ہے
جہاں دکھ کی انتہا،
پتہ نہیں دکھ چھوٹا ہے یا محبت بڑی
میں تو اتنا جانتا ہوں
کتنا بے مایہ ہے وہ شخص
جس کے پاس ایک عورت کی محبت بھی نہ ہو
حالانکہ دکھ عورت ہے نہ محبت
دکھ تو ان دونوں کو
بیک سے ملاتا اور جدا کرتا ہے
جس طرح وقت ازل اور ابد کو
تو کیا دکھ ایک مثلث ہے
یا دو سطروں کے بیچ
بے راس دوری کی ہیئتگی؟

شمارہ ۲۳۸،

جون ۲۰۰۰

اے مرے خواب کہاں جائیگا

کون سی آنکھ ٹھکانا ہے ترا
کون سی نیند بہانہ ہے ترا

کون سے دل میں اترنا ہے تجھے
کون سا زخم نشانہ ہے ترا

کون سا جسم ترا مرقد ہے
کون سا لمس خزانہ ہے ترا

خواہش مرگ کے سناٹے میں
کون سا اسم ترانہ ہے ترا

کس مداوے کی ہے ارداس تجھے
کون سا روگ پرانا ہے ترا

کون سی سطر کہانی ہے تری
کون سا باب فسانہ ہے ترا

کون سی صبح تری منطق ہے
کون سا علم شبانہ ہے ترا

کون سی نسل تجھے دیکھے گی
کون سا عہد زمانہ ہے ترا

نقی حسین جعفری

شمارہ ۲۹۲،
مئی ۲۰۰۵

پھر بھی، کبھی کبھی

پختہ سن کی، رنگ روپ والی
جذبات پر حاوی نہ جذبات سے عاری
سیاہ یا سرخ،
سرخی مائل سیاہی یا سیاہی مائل سرخی
رنگ چاہے جیسا ہو، مگر گہرا ہو
عالی نسب ہونا شرط نہیں ہے
میرے والدین کی عالی نسبی ہی میرے لئے بہت ہے
حافظہ اچھا ہو کہ میں بھولنے لگا ہوں
میری تحریریں، کبھی کبھی پڑھ لے
جیسے... پڑھتی تھیں
یہ بتانے کے لئے کہ عبارت کے کون سے حصے
کمزور ہیں۔
کمپیوٹر لٹریٹ (۱) ہو تو اچھا ہے
ای میل کے جواب اور گوگل (۲) تلاش
کبھی کبھی طول طلب ہوتے ہیں

دیر سے سونا اور باتیں کرنا مجھے پسند ہے۔
دیر سے سونے کا عمل تو جاری ہے
لیکن باتیں کئی سال سے نہیں کیں۔
میری پچاسویں سالگرہ کو کئی سال ہو گئے
پھر بھی،
کبھی کبھی، خیال آتا ہے

(۱) Computer Literate
(۲) Google

کوئی کہتا تھا

جس دن کچھ وقت تمھارے ساتھ گذرتا ہے،
وہ دن اچھا ہے
جس شب تمھارا خیال دیر تک رہتا ہے،
وہ رات اچھی ہے

اچھی کتابیں پڑھنے سے خوش مزاجی باقی رہتی ہے
اچھے ڈٹرجنٹ (۱) سے کپڑے خراب نہیں ہوتے
چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے سے نئی معرفت ملتی ہے
کپڑے الٹ کر سکھانے سے جلد فیڈ (۲) نہیں ہوتے

(۱) Detergent
(۲) Fade

ل۔م۔دانش

شمارہ ۲۰۱،
دسمبر ۱۹۹۶

نشاط و رنج و غم کی ہر کہانی یاد رکھتا ہوں
میں دل کی داستاں صدیوں پرانی یاد رکھتا ہوں
ہر اک خاموش شے دنیا کی مجھ سے بات کرتی ہے
میں چیزوں کی یہ گہری بے زبانی یاد رکھتا ہوں
وہ خالی آسماں ہو خالی کمرہ ہو کہ خالی دل
میں ہر اک رنج کو اس کی زبانی یاد رکھتا ہوں
میرے رستے میں دیواریں ہیں آوازیں ہیں چہرے ہیں
میں سب کچھ بھول جاتا ہوں نشانی یاد رکھتا ہوں
کوئی منظر کسی مٹھی میں رکتا ہی نہیں لیکن
میں ہر منظر میں اک رنج روانی یاد رکھتا ہوں
غلط کر دیتا ہوں اکثر میں سب کچھ ٹھیک کرنے میں
بھلا دینے کی کوشش میں کہانی یاد رکھتا ہوں
گذرتے بادلوں کا شور ہو کہ گھر کا سناٹا
زمیں کا غم، بلائے آسمانی یاد رکھتا ہوں
ہنسی کی گود میں پوشیدہ آنسو دیکھ لیتا ہوں
میں جینے میں بھی مرگ ناگہانی یاد رکھتا ہوں
بھلا دیتا ہوں اکثر دوستوں کو اپنی نفرت میں
مگر میں دشمنوں کی مہربانی یاد رکھتا ہوں
کوئی سرگوشیاں کرتا ہے آدھی رات کو دانش
میں دن کے شور میں شب کی کہانی یاد رکھتا ہوں

میرے چہرے پہ تھوکو
تمہیں حق ہے میرے چہرے پہ تھوکو
کہ اس چہرے پہ رعنائی
نہ ایسی آنکھیں
جن کو دیکھ کر آہوئے وحشی کا گماں ہو

ستاروں کی چمک ان میں
نہ خوابوں کی وہ سرمستی
جو کہتے ہیں
خدا نے مشترک بانٹے ہیں انساں میں

دہکتے سیب ہیں یہ گال
نہ جاں میں توانائی
کہ جس کو دیکھ کر صدیوں پرانے دیوتاؤں کی
عظمت کا خیال آئے

دھنسی آنکھیں ہیں
جن میں ان گنت صدیوں کا اک آسودہ حالی
اور مسرت کا
فقط اک انتظار روح فرسا رقص کرتا ہے

سیاہ رنگت
کہ جس کی ہر سطر پر
ہر بن مو پر لکھا ہے
آدمیت کے ستم کی داستاں

اس کی شرافت اور نجابت کی کہانی
تمدن کی نشانی

یہ پچکی ہڈیاں گالوں کی
جن کا خون
گورے دیوتاؤں کا وہ غازہ ہے
کہ جس کی سرخ رنگت سے
جلال ان کا ہے تابندہ
خمار بے کراں زندہ
کہ پوری آدمیت جس کے دم سے
ان کے آگے سرنگوں ہے
سراسیمہ، پریشاں، گو مگو ہے

سیاہ رنگت
یہ پچکی ہڈیاں
اور یہ دھنسی آنکھیں
معیار حسن دنیا کا
مقرر جو بھی ہے اس کے مطابق
کوئی بھی تو شے نہیں ہے
یہ فقط بدصورتی ہے
تھوک دو اس پر
مگر یہ جان لو
اس رنگ پر، اس کالے چہرے پر
کہیں انسانیت کے خون کا دھبہ نہیں

ن ۔م ۔راشد

شمارہ ۴۰،
ستمبر ۱۹۶۹

اے سمندر! پیکر شب، جسم، آوازیں
رگوں میں دوڑتا پھرتا لہو
پتھروں پر سے گذرتے، رقص کی خاطر
اذاں دیتے گئے
اور میں مرتے درختوں میں نہاں سنتا رہا۔
ان درختوں میں مرا اک ہاتھ
عہد رفتہ کے سینے پہ ہے
...جس پہ جل جاتے ہیں ہاتھ...
دوسرا، اک شہر آئندہ میں ہے جویاے راہ
شہر... جس میں آرزو کی مے انڈیلی جائے گی،
زندگی سے رنگ کھیلا جائے گا۔

اے سمندر!
چاند کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے
شب کی طغیانی کی باہوں پر رواں
اے سمندر! آنے والے دن کو یہ تشویش ہے
رات کا کابوس جو دن کے نکلتے ہی ہوا ہو جائے گا
کون دے گا اس کے ژولیدہ سوالوں کا جواب؟
کس کرن کی نوک
کن پھولوں کا خواب؟

اے سمندر!
میں گنوں گا دانہ دانہ تیرے آنسو
جن میں اک زخار بے ہستی کا شور۔

اے سمندر! رات اس ساحل پہ غراتے رہے
غم زدہ لمحات کے ترسے ہوئے کتوں کی نظریں
چاند پر پڑتی رہیں
ان کی عوعو چاند تک لپکی رہی
اے سمندر! میں گنوں گا دانہ دانہ تیرے آنسو
جن میں آنے والا جشن وصل نا آسودہ ہے
جن میں فرداے عروسی کے لئے کرنوں کا ہار
شہر آئندہ کی روح بے زماں چنتی رہی
میں ہی دوں گا، اے سمندر! جشن میں دعوت تجھے
استراحت تیری لہروں کے سوا کس شے میں ہے؟

اے سمندر! ابر کے اوراق کہنہ
بازوے دیرینۂ امید پر اڑتے ہوئے
دور سے لائے ہیں کیسی داستاں!
شہر آئندہ کے دست و پا کے رنگ
...جیسے جاں دینے پہ سب آمادہ ہوں...
دست و پا میں جاگ اٹھے
راگ کے مانند، میں بھی دست و پا میں جاگ اٹھا

اے سمندر!
کل کے جشن نو کی موج
شہر آئندہ کی بیانی کی حد تک آ گئی

اب گھروں سے۔
جن میں راندہ روز و شب کی چار دیواری نہیں...
مرد و زن نکلیں گے ہاتھوں میں اٹھائے برگ و بار
جن کو چھو لینے سے لوٹ آئے گی روگرداں بہار

اے سمندر!

ن۔م۔راشد

شمارہ ۳۶،
مارچ ۱۹۷۰

یہ مزار، سجدہ گذار جس پہ رہے ہیں ہم
یہ مزار تار، خبر نہیں
کسی صبح نو کا جلال ہے
کہ ہے رات کوئی دبی ہوئی؟
کسی آئینے کو سزا ملی
جو ازل سے عقدۂ نا کشا کا شکار تھا؟
کسی قہقہے کا مآل ہے
(جو دوام ذات کی آرزو میں اسیر تھا؟)
کبھی گرد رہ، کبھی مہر و مہ پہ سوار تھے
وہ کہانیوں کے جواب کیسے گذر گئے
وہ گذر گئے تجھے خاک بے کسی جان کر؛
نہ تری صدا کی طرف بڑھے
...وہ صدا کہ جس کی ہر ایک لے
کبھی شعلہ ہے، کبھی رنگ ہے
کبھی دل بنے، کبھی رنگ ہے
کبھی دل بنے کبھی جاں بنے...
نہ نظر ہی تجھ سے ملا سکے
کہ مرور وقت سے ان کی ایک نگاہ
ان کا نشاں بنے،
وہ غم و نشاط کی نارسی کا غبار تھے
یہ مزار، تیرہ و تار ہے

یہ مزار مہر بلب سہی،
جو نسیم خندہ چلے کبھی
تو وہ در کھلیں
جو ہزار سال سے بند ہیں
کئی آرزوئیں اسیر ہیں کہ نجات پا کے ابل پڑیں
جو نسیم خندہ چلے کبھی

انھیں کیا کہیں
کہ جو اپنی آنکھ کے سیم و زر
کسی روگ میں، کسی حادثے میں گنوا چکے
انھیں کیا کہیں کہ جو اپنے ساتھ کوئی کرن
سحر عدم سے نہ لا سکے؟
مگر ایک وہ کہ ہزار شمعوں کے سیل میں
کبھی ایک بار جو گم ہوئے
خبر اپنی آپ نہ پا سکے!

وہ نمی، وہ خلوت ترش بو
جو اجالا ہوتے ہی قحبہ گاہوں میں آپ پائیں
وہی خامشی، وہ رازمو، وہی سائیں سائیں
کہ جو بنک خانوں کے آس پاس تمام رات ہے رینگتی
وہی اس مزار کی خامشی

جو ہماری ہستی پہ حکم راں
جو ہماری بود پہ خندہ زن....
(جو تبسیم خندہ چلے کبھی!)

مگر آرزوئیں، وہ سائے عہد گذشتہ کے
کبھی واردات کے بال و پر
کبھی آنے والے دنوں کا پرتو زندہ تر
وہ ہوائیں ہیں کہ ہمیشہ آگ کے
رقص وحشی و بے زمام میں ہانپتی
کبھی گھر کے سارے شگاف و درز میں چیختی
کبھی چیختی ہیں پلک لگے
کبھی چیختی ہیں سحر گئے۔

ابھی سامنے ہے وہ ثانیہ
جسے میرے خوابوں نے شب کے ناخن تیز تر سے بچا لیا
ابھی سامنے ہے وہ ثانیہ، کسی ثانیے کی کسر سے کم
کوئی مبتدا جو خبر سے کم...
جو ان ہی ہواؤں کے زور سے
کرے اور ٹوٹ کے ماہ و سال کے رہ گذر میں بکھر گئے
اسی ثانیے میں وہ شیشے پیکر و جاں کے پھر سے سمیٹ لوں۔
کہ نہیں ہیں اپنی بہا میں دیدۂ تر سے کم!

میں ہوں آرزو کا...
امید بن کے جو دشت و در میں بھٹک گئی
میں ہوں تشنگی کا...
کنار آب کا خواب بن کر چھلک گئی
میں کشادگی کا....
جو تنگنائے نگاہ و دل میں اتر گئی
میں ہوں یک دلی کا...
جو بستیوں کی چھتوں پہ دود سیاہ بن کے بکھر گئی
میں ہوں لحن آب کا،
رسم بار کا
نغمہ خواں
یہ بجا کہ ہست ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر اک حقیقت آخریں
یہی آستانۂ مرگ ہے!
یہ بجا سہی، کبھی مرگ اپنی نفی بھی ہے
وہی مرگ سال بسال آپ نے جی بھی ہے
وہی ہول جاں کی کمی بھی ہے
یہی وہ نفی تھی کہ جس کے سائے میں آپ
(میرے مراقبے کی طرح) برہنہ گذر گئے
یہ اسی کمی کی تھی ریل پیل کہ آپ اپنی گرسنگی
کی ندی کے پار اتر گئے
کبھی آسمان و زمین پہ دور خزاں میں بوے عبیر و گل
کی سخاوتوں کی مثال آپ بکھر گئے
ابھی تک (مرا یہ مشاہدہ ہے) کہ اس کے مزار کے آس پاس عبیر و
گل کی لپٹ سے زائروں، رہروؤں کے نصیب جیسے دمک اٹھے، تو
ہزار نام بس ایک نام کی گونج بن کے جھلک اٹھے،
تو ہزار چہروں سے ایک آنکھ...
ہزار آنکھوں سے اک اشارہ...

ہزار سالوں سے ایک لمحہ
برس پڑا
تو پھر آنے والے ہزار قرنوں کی شاہ راہیں
(جو راہ دیکھتے تھک گئی تھیں)
ستارہ بن کے مہک اٹھیں!
یہ بجا کہ مرگ ہے اک حقیقت آخریں،
مگر ایک ایسی نگاہ بھی ہے
جو کسی کنوئیں میں دبی ہوئی
کسی پیرہ زن... کہ ہے مامتا میں رچی ہوئی...
کی طرح ہمیں
ہے ابد کی ساعت ناگزیر سے جھانکتی
تو اے زائرو، کبھی ناوجود کی چوٹیوں سے اتر کے ہم
اسی اک نگاہ میں کود جائیں،
نئی زندگی کا شباب پائیں،
نئے ابر و ماہ کے خواب پائیں!

نہیں مرگ کو، کہ وہ پاک دامن و نیک ہے
کسی زمزمے کو فسردہ کرنے سے کیا غرض؟
وہ تو زندہ لوگوں کے ہم قدم...
وہ تو ان کے ساتھ شراب و نان کی جستجو میں شریک ہے
وہ نسیم بن کے، گلوں کے بیم و رجا میں
ان کی ہر آرزو میں شریک ہے
وہ ہماری لذت عشق میں،
وہ ہمارے شوق وصال میں،
وہ ہماری ہو میں شریک ہے
کسی کھیل کود میں ہوں جو ہم
تو ہمارے ساتھ حریف بن کے ہے کھیلتی
کبھی ہارتی کبھی جیتتی!
کسی چوک میں کھڑے سوچتے ہوں کدھر کو جائیں
تو وہ اپنی آنکھیں بچھا کے راہ دکھائے گی
جو کتاب خانے میں جا کے کوئی کتاب اٹھائیں
تو وہ پردہ ہائے حروف ہم سے ہٹائے گی
...وہ ہماری روز کی گفتگو میں شریک ہے!
تو مرے وجود کے شہر،
مجھ کو جگا بھی دو
مری آرزو کے درخت، مجھ کو دکھا بھی دو
کہ گلی گلی جو گرا رہے ہیں دورویہ
کتنے ہزار سال سے برگ و گل،
مجھے دیکھنے دو وہی سحر، وہی دن کا چہرۂ لازوال،
وہ دھوپ، جس سے ہماری جلد سیاہ تاب ازل سے ہے!
مجھے اس جنون کی رہ خرام پہ لے چلو
نہیں جس کے ہاتھ میں موقلم
نہیں واسطہ جسے رنگ سے
فقط ایک پارۂ سنگ سے ہے کمال نقش گر جنوں!
اے مرے وجود کے شہر، مجھ کو جگا بھی دو،
مرے ساتھ ایک ہجوم ہے،
میں جہاں ہوں زائروں کے ہجوم بھی ساتھ ہیں
کہ ہم آج معنی و حرف کی شب وصل نو کی برات ہیں

ن۔م۔راشد

شمارہ ۴۷،
اپریل ۱۹۷۰

وقت کے پابند ہاتھ
راہوں کا غمگیں جواب
سنتے رہے
سبزے کے تشنہ سراب
رات کا دیوانہ خواب
تکتے رہے
جیسے وہ جاسوس ہوں
جن کا ہدف
آنکھ سے اوجھل کوئی
آفتاب!
وعدے کی سردی کی رات
(وعدے کی بے مہر رات)
کیسی ہوائیں چلیں

دیدۂ و دل نے مرے
کیسے طمانچے سہے،
کیسے ہر اک چاپ سے،
خون پہ ضربیں پڑیں،
کیسے رگیں درد کے
راگ سے بوجھل رہیں
آہ وہ زیبا کلام کھل اٹھیں
جس کے لئے بارہا
روح کی شب ہائے تار
اور پگھلتے رہے، جس کے لئے ہجر کی برفوں کے خواب
آہ وہ زیبا کلام دور کا سایہ رہا
اور میں سوچا کیا جینے کی خاطر مگر رینگتے سایوں سے وابستہ رہوں؟
بات کے پل پر کھڑا پیاس سے خستہ رہوں؟

ن۔م۔راشد

شمارہ ۷۴،
اپریل ۱۹۷۰

شب تم اس قلعے کے نا جشن میں موجود نہ تھیں
(شاد رہو!)
کیسے طوفان کی شوریدہ سر...
پردے کئے چاک، گرائے فانوس...
اور ہر روز میں در آتی رہی؟
ڈگمگاتے ہوئے مہمان ضیافت کی صفوں سے گذرے
پاؤں رکھتے بھی نہ تھے
دل کے قالینوں کے رنگ و خط و محراب کو تکتے بھی نہ تھے
آ کے ٹھہری ہے لب کاسۂ جاں
یاد کے چنگل افسردہ سے بچتی ہوئی
اک تازہ کرن
پر جھجکتی بھی نہیں
اور اس آنکھ کو جو کاسۂ جاں میں
وا ہے،
ابھی تکتی بھی نہیں۔
(یہی وہ کاسۂ جاں جس میں جلائی ہیں
گلوں کی شمعیں، جس میں سو رنگ سے کل رات کے مانند...
منائی ہیں خدائی راتیں!
اے کرن، شکر کہ ہم
ہجر کے زینوں پہ، یا وصل کے آئینوں پہ
جم جاتے نہیں؛
اور بے کار ہیولاؤں کے ساتھ
بہتی مالاؤں پہ تھم جاتے نہیں؛
جن میں نادیدہ ملاقات کی سرگوشی ہو
ایسے گوشوں میں بھی ہم جاتے نہیں!
کل تم اس قلعے کے نا جشن میں موجود نہ تھیں
اور نہ تم سن ہی سکیں...
کتنی دوشیزہ تھیں جن کی دستک
جن کے مژگاں کی لب و چشم کی پیہم دستک
...ایسی دوشیزہ کہ تھیں
سایوں کے ناشہروں کی رہنے والی
(کبھی اتریں تو اترتی ہی گئیں
زینوں سے،
دیواروں سے،
تا رنگ و غبار!)
ان کے مژگاں کی لب و چشم کی پیہم دستک
تم مگر سن نہ سکیں۔
آج وہ قلعۂ عرفاں کے دریچوں کے تلے
دیتی رہتی ہیں دبی پیاس کی دستک شب و روز
اے کرن، ان کے لئے قطرۂ اشک!
اپنے نادیدہ اجالوں کی پھواروں سے کوئی قطرۂ اشک!
جس میں دھندلائے بدن
پھر سے نکھر کر نکلیں
خندۂ نور سے بھر کر نکلیں

ن۔م۔راشد

شمارہ ۴۷،
اپریل ۱۹۷۰

وہ صحن جن سے پلٹ گئی تھی دھنک کی خوشبو
وہاں ابھی تک درخت اپنی برہنگی میں پکارتے ہیں...
پکارتے ہیں:
...''دھنک کی خوشبو،
وہ خواب لادے
کہ جن سے بھر جائیں رات بھر میں سبو ہمارے...''
وہ چاند،
کل شب جسے ہم اپنے دلوں کے پیالوں میں قطرہ قطرہ
انڈیلتے رہ گئے تھے، اس کو
ہنسی ہنسی میں ابھی کوئی شخص، لحہ پہلے
چڑھا کے، پیالہ پٹک گیا ہے۔
یہ دیکھتے ہی گلی کا ملا بہت ہی رویا
''خلا سے کچھ عرش کی خبر بھی؟''
(نفی میں کیسا نفی کا جویا!)
''....وہ چاند کے آر پار، گویا کہیں نہیں تھا؟
عجیب! گویا کہیں نہیں تھا...''

وہ صحن جن سے پلٹ گئی ہے دھنک کی خوشبو
وہ ان میں فردا کی نارسائی کے اشک
چپ چاپ بو رہا ہے،
وہ ہنس رہا ہے: ''اگر زمین گھومتی ہے، کیوں کر
یہ لوگ صحنوں کو لوٹ آئے
سحر سے پہلے؟
کوئی پرندہ نہ راہ بھولا سفر سے پہلے؟''
وہ صحن جن سے پلٹ گئی تھی دھنک کی خوشبو
خلا سے آتی ہوئی صدائیں
بے ان کے دیوار و بام کو تھپ تھپا رہی ہے،
ہمارے بوڑھے نزار چہروں پر لطمہ زن ہیں
کہ رات کے دل فریب رؤیا
ہمارے سینوں میں
بے سرا سا الاپ بن کر
اٹک گئے ہیں

ن۔م۔راشد

شمارہ ۴۷،
اپریل ۱۹۷۰

جہاں ابھی رات ہے، ہوا کے سوا
کوئی زندہ تر نہیں ہے۔
ابھی ہوا ساحلوں کی بے تاب ہمہموں سے
گذر کے، اپنی طلب کے سونے چہار راہوں
میں رک گئی ہے،
اگر وہ چاہے تو دور ماضی کے بام و دیوار پھاند جائے
(وہ دست و پا کے پرانے زخموں کی ریزش خون سے ڈر رہی ہے)
ہوا کشوں کی نگہ سے بچ کر، اگر وہ چاہے،
غموں کی بے صرفہ کھڑکیوں کے
سیاہ شیشوں کو توڑ ڈالے
دلوں کی افسردہ جلوتوں کا سراغ پالے
(وہ ناتوانوں کے زور بازو کے راز پنہاں سے کانپتی ہے)
اگر وہ چاہے شگاف در سے، جورات بھر سے
ہماری بے التفاتیوں سے کھلا رہا ہے،
ہمارے صحنوں کو روند ڈالے
ہمارے صحنوں کے چار گوشوں میں پھیل جائے
(مگر وہ ہر صحن کی اداسی کو بھانپتی ہے)
جہاں ابھی رات ہے، وہاں ہم....
وہاں ابھی لوگ بہتے پانی کو بوڑھے دانتوں سے کاٹتے ہیں
اور ایسے روتے ہیں کو اب میں جیسے ایک بے جان جسد سے لگ کر
وہ سو رہے ہوں
ہوا کو اس کی خبر نہیں ہے
ہوا کا ان ہول کے پلوں پر گذر نہیں ہے
جہاں ابھی رات ہے، وہاں ہم....
وہاں ابھی لوگ... آرزوؤں کے نردبانوں پہ چل رہے ہیں۔
قدم قدم پر پھسل رہے ہیں،
کہ جیسے صحرا سمندروں میں پھسل رہا ہو۔
جہاں ابھی رات ہے، ہوا کے سوا کوئی پردہ در نہیں ہے،
مگر ہوا جب طلب کی راہوں کو چھوڑ کر پھر
ہمارے دیوار و در پہ جھپٹی
ہمیں پھر اپنی برہنگی کا یقین ہوگا
اور اپنے جسموں کے چاک ہم رات کی سیاہی
میں دیکھتے ہی بہت ہنسیں گے!

البتہ+لیکن

ن۔م۔راشد

شمارہ۵۱،
اگست ۱۹۷۰

آپ، تم جس کے ثنا خواں ہو، وہ
البتہ ولیکن کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ، دو چہروں کی ناگن کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک البتہ مرے ساتھ سحر گاہ
تمناؤں کے بستر سے اٹھا
(ہر سحر گاہ یوں ہی اٹھتا ہے)
دن کو اک پیر جہاں گرد کے مانند لڑھکتا رہا، لنگڑاتا رہا
شام ہوتے ہی وہ لیکن کی سیہ لاش کے ساتھ،
موج آشفتہ کنارے پہ جسے ڈال گئی
پھر مرے ساتھ ہی بستر سے ہم آغوش ہوا
آپ، البتہ ولیکن کے سوا کچھ بھی نہیں

جشن آدم پہ خدا نے جو ملے عطر و گلاب
سرمۂ و غازۂ و گلگونہ ملا
اب وہی چہلم انساں پہ لگا کر نکلے
آپ، البتہ ولیکن کے سوا کچھ بھی نہیں

کبھی وہ چہرہ، وہ البتہ، جسے جانتے ہو
اس تگ و تاز میں بھی، شور کے ہنگام میں بھی
نوحہ گر ہوتا ہے لیکن یہ کہ اب زندہ نہیں
کبھی وہ چہرہ، وہ لیکن جسے تم جانتے ہو
اپنے سنسان میں، تنہائی میں

آپ ہی ہنستا ہے البتہ کی حالت پہ کہ اب وہ زندہ نہیں!
کیا ہوا آپ کے اک چہرے کی خاکستر سے
گر نیا چہرہ جھلک اٹھتا ہے
آپ، البتہ ولیکن کے سوا کچھ بھی نہیں
...ایسا البتہ ولیکن جو تگ و تاز کے، یا شور کے ہنگام کے
اس بار گراں کے نیچے
جیسے دب جاتا ہے پھر اس کی خبر تک گویا
کبھی آتی نہیں، آتی نہیں، آتی ہی نہیں...

ن۔م۔راشد

شمارہ ۶۶،
نومبر ۱۹۷۱

آگہی ہے ریت، دیواروں کے ساتھ
سارے دروازوں کے ساتھ
سرخ اینٹوں کی چھتوں پر رینگتی ہے،
نیلی نیلی کھڑکیوں سے جھانکتی ہے،
ریت!
ریت، رک جا
کھیل نہ کرلیں
سنہرے تاش کے پتوں سے درزوں، روزنوں کو
بند کرلیں، ریت،
رک جا!
ست برساتیں کہ جن پر دوڑ پڑنا
جن کو دانتوں میں چبالینا
کوئی مشکل نہ تھا
تو نے وہ ساری نگل ڈالی ہیں، رات!
رات، ہم ہنستے رہے، اے ریت!
تو دیوانی بلی تھی، جو اپنی دم کے پیچھے
گھومتی جاتی تھی،
اس کو چاٹتی جاتی تھی، رات!
ریت کی اک عمر ہے، اک وقت ہے
لیکن ہمیں
خود سے جدا کرتی چلی جاتی ہے، ریت
ناگہاں ہم سب پہ چھا جانے کی خاطر
یہ ہماری موت بن کر تازہ کر دیتی ہے
یادیں دور کی (یا دیر کی!)
ریت کو مٹھی میں لے کر دیکھتے ہیں
اپنے پوروں سے اسے چھنتے ہوئے
ہم دیکھتے ہیں،
اپنے پاؤں میں پھسلتے دیکھتے ہیں،
ریت پر چلتے ہوئے!
اپنے گیسو اس سے اٹ جاتے ہیں
بھر جاتے ہیں پیراہن،
ہمارے باطنوں کو چیرتی جاتی ہے ریت
پھیلتی جاتی جسم و جاں کے ہر سو،
ہم پہ گھیرا ڈالتی جاتی ہے
ریت!
ریت اک مثبت نفی تھی،
ریت سرحد تھی کبھی
ریت عارف کی اذیت کا بدل تھی،
آنسوؤں کی، غم کی پہنائی تھی ریت
اپنی جویائی تھی ریت!
ریت میں "ہر کس" تھے ہم
دوسرا کوئی نہ تھا،
ریت وہ دنیا تھی، جس پر دشمنوں کی مہر لگ سکتی نہ تھی
اس کو اپنا تک کوئی سکتا نہ تھا
ریت پر ہم سن رہے ہیں آج
پیرانہ سری کی، اپنی تنہائی کی چاپ!

دن کے ساحل پر اتر کر
آنے والی رات کو تودے لگاتی جا رہی ہے
ناگہاں کی بے نہایت کو اڑا لائی ہے ریت
دل کے سونے پن میں در آئی ہے ریت
ریت!

اک زمزمے کا ہاتھ

ن۔م۔راشد

شمارہ ٦٧،
دسمبر ١٩٧١

ابھرا ہے جو آواز کے نابود سے
اک زمزمے کا ہاتھ
اس ہاتھ کی جھنکار
نئے شہروں کا، تہذیبوں کا
الہام بنے گی
یہ ہاتھ نہیں دھات کے اک معبد کہنہ
سے چرایا ہوا، تاریخ میں لتھڑا ہوا
اک ہاتھ!
یہ ہاتھ خداوند ستم گر کا نہیں ہے
یہ ہاتھ گدا پیشہ پیامبر کا نہیں ہے
اس ہاتھ میں تم دیکھتے ہو،
شمع کی لرزش ہے، جو کہتی ہے
کہ "آؤ!
شاہ راہ پہ بکھرے ہوئے اوراق اٹھاؤ
اس ہاتھ سے لکھو!"
کہتی ہے کہ "آؤ!
ہم تم کو نئے زینوں کے، باغوں کے،
محلوں کے، ستونوں کے، نئے خواب دکھائیں
وہ پھول جو صحراؤں میں شبنم سے جدا [خود سے جدا]
ہانپتے ہیں،
ان کے، نئے صحنوں میں انبار لگائیں۔
الجھے ہوئے لمحات جو افکار کی دیواروں سے
آویختہ ہیں، ان سے نئے ہار بنائیں
سینوں میں اتر جائیں، پھر افسردہ تمنائیں
جلائیں!"
کہتی ہے کہ "دو وقت کی روٹی کا سہارا
ہے یہی ہاتھ
جینے کا اشارہ ہے یہی ہاتھ
اس ہاتھ سے پھر جام اٹھائیں
پھر کھولیں کسی صبح کی کرنوں کے دریچے
اس ہاتھ سے، آتی ہوئی خوش بوؤں کو
آداب بجالائیں
افسوس کہ دہلیز پہ اک عشق کہن سال
پڑا ہے،
اس بوڑھے کے چہرے پہ ڈھلکتے ہوئے آنسو
اس ہاتھ سے پونچھیں؛
یہ ہاتھ جو پھیلے ہوئے سورج سر گرا ہے
ہم سامنے اس کے
جھک جائیں دعا میں، کہ یہی
زندگی و مرگ کی اس دھوپ میں،
اس چھاؤں میں،
پھر حرف و معانی کے نئے وصل کا
پیغام بنے گا،
ہر بوسے کا الہام بنے گا

نیر عاقل

شمارہ ۲۸۸،
جنوری ۲۰۰۵

نہ تھا خیال کہ نزد رگ گلو کوئی تھا
نظر نہ دیکھ سکی تھی چہار سو کوئی تھا

رہا ہے گرم نظر آنکھ موند کر کوئی
لبوں کو بند کیے محو گفتگو کوئی تھا

کچھ ایسا جذب کیا ذوق خود کلامی نے
یہ دھیان ہی نہ رہا میرے روبرو کوئی تھا

ملا ہوا تھا کفن نیستی کو ہستی کا
وگرنہ میں ہی کوئی چیز تھا نہ تو کوئی تھا

خرابے میں یہاں کے ذوق معماری تو رکھتے ہم
شکست افتاد کچھ ہو جنگ کو جاری تو رکھتے ہم

یہ مانا دار کے تختے پہ بھی نیند آہی جاتی ہے
الم کی سیج پر کچھ سعی بیداری تو رکھتے ہم

سبک سر ہو کے بہ جاتے نہ یاد خاکساری سے
رقیبوں میں حریفوں سی گراں باری تو رکھتے ہم

نہ اتنی جلد ہم کو زیر کرتی بیعت فاسق
لبوں پر اپنے عزم حرف انکاری تو رکھتے ہم

منظر تو رہا برف پگھلنے کی طرح کا
لیکن پس منظر وہی جلنے کی طرح کا

سب جس کو سمجھتے ہیں مری قوم کی تحریک
انداز ہے وہ نیند میں چلنے کی طرح کا

کل قلب سے اشکوں کی روانی کا تھا سب ڈھنگ
چشمہ کسی پربت سے ابلنے کی طرح کا

اس عمر میں بھی ہے روش وقت کا انداز
بچوں کی طرح گر کے سنبھلنے کی طرح کا

مارگیر

نیر مسعود

شمارہ ۱۰۹
اکتوبر ۱۹۷۸

لنگ ولوک وخفتہ شکل و بے ادب
سوے او می غیژ و او را می طلب

Turn away no more
Why wilt thou turn away

(۱)

"مارگیر! مارگیر!

رات کے سناٹے میں یہ آواز گونجتی۔ پکارنے والا کبھی بوڑھا ہوتا، کبھی جوان، کبھی کوئی عورت ہوتی اور کبھی کوئی بچہ، اس لئے ان آوازوں میں بڑا فرق ہوتا ہوگا، مگر مجھ کو ہمیشہ ایک ہی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"مارگیر! مارگیر!!"

رات کے سناٹے میں جب یہ آواز گونجتی تو میری سمجھ میں کبھی نہ آتا تھا کہ پکارنے والا کون ہے۔ اس آواز میں موت کے خوف کی وہ لرزش ہوتی تھی جو پکارنے والے کی عمر اور جنس پر چھائی رہتی تھی۔ میری گہری نیند اس آواز سے ٹوٹ جاتی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ مجھے ہلکی سی جھرجھری آتی اور میرا جی چاہتا کہ اسے خواب کی آواز سمجھ کر پھر سو جاؤں۔ لیکن ٹھیک اسی وقت مجھ کو اپنی گردن پر دو ٹھنڈی انگلیوں کا لمس محسوس ہوتا اور کان کے پاس مدھم سی آواز سنائی پڑتی۔

"آواز لگ رہی ہے۔"

اور مجھے اٹھنا پڑتا۔ اتنی دیر میں آواز قریب آجاتی اور اب اس کے ساتھ کئی آوازیں مل جاتیں۔

"مارگیر! مارگیر!!"

اس آواز کے ساتھ بہت سے قدموں کی آہٹیں شامل ہوتیں۔ میں بڑھ کر دروازہ کھول دیتا اور ایک چھوٹا سا مجمع گھر کے اندر داخل ہو جاتا۔ کچھ لوگ ایک مرتے ہوئے آدمی کو تھامے ہوتے۔ کبھی کبھی اس مجمع میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہوتی جس پر ایک مردہ سانپ جھول رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پھر جھرجھری آتی۔ اس وقت میں تنہا اس مجمع کا سامنا کرتا۔ میں زمین پر جگہ صاف کرتا جس پر مرتے ہوئے آدمی کو لٹایا جاتا۔ میں اس کے پہلو میں ایک پتلی اور دو قد آدم لمبی چٹائی بچھاتا جس پر مردہ سانپ کو پھیلا دیا جاتا۔ میں مرتے ہوئے آدمی کا بدن ٹٹولتا اور زخم کی جگہ دریافت کر کے اسے اس طرح لٹا دیتا کہ زخم اوپر ہو جائے۔ میں کبھی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اسے سانپ نے کس طرح ڈسا، مگر کئی لوگ پوری تفصیل سے واقعہ بیان کرتے۔ ان کی آوازیں ملی جلی ہوتیں اور کبھی میں اصل واقعے کو پوری طرح نہ سن پاتا۔ اور اصل واقعہ بیان کرنے والے ہوتے بھی کم تھے۔ اس لئے کہ جس پر یہ واقعہ گذرا ہوتا تھا وہ یا تو زمین پر بے ہوش پڑا ہوتا یا اتنا ہیبت زدہ ہوتا کہ کچھ بول نہ سکتا تھا، اس لئے واقعہ بیان کرنے والے زیادہ تفصیل اور انہماک کے ساتھ یہ بتاتے تھے کہ واقعے کی خبر انھیں کیوں کر ہوئی اور اس وقت وہ کیا کر رہے تھے۔ وہ بیان کرتے جاتے، میری کارروائیوں کو دیکھتے جاتے، مگر ان کی نظریں کسی اور کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی رہتیں۔

کچھ دیر بعد مارگیر ان کے سامنے ہوتا۔ مارگیر کو دیکھتے ہی سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور ایک سرگوشی مجمع میں ادھر سے ادھر دوڑ جاتی۔

"مارگیر! مارگیر!!"

مارگیر کچھ دیر تک بالکل خاموش رہتا اور اس کی توجہ کسی بھی طرف نہ ہوتی تھی۔ لوگ بھی خاموش رہتے تھے اور ان کی نگاہیں مارگیر پر جم جاتیں۔ پھر وہ ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھتا:

"کیا ہوا؟"

مگر اس جواب میں سب لوگ ایک ساتھ نہیں بولتے تھے، جیسے ان میں کوئی خاموش معاہدہ ہو گیا ہے، اور کوئی ایک شخص بہت ٹھہر ٹھہر کر کم سے کم لفظوں میں مارگیر کو بتاتا کہ کیا ہوا تھا۔ لیکن مارگیر کو شاید اس کا ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی نظریں چٹائی پر پھیلے ہوئے مردہ سانپ پر ہوتی تھیں جس کا پھن اکثر بری طرح کچلا ہوا ہوتا تھا۔ وہ سانپ کو ہمیشہ بڑی افسردگی کے ساتھ دیکھتا اور کبھی

کبھی تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ وہ اپنا اصل مریض سانپ ہی کو سمجھ رہا ہے۔ یہ وقفہ بہت طویل محسوس ہوتا۔ اس کے بعد مار گیر شکار کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ میں بھی پہلی مرتبہ غور سے شکار کا چہرہ دیکھتا۔

اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ہوتیں۔ کبھی وہ بالکل بے ہوش ہوتا۔ لیکن اس کے چہرے کی جلد کے نیچے نیچے کچھ رنگ سے دوڑتے معلوم ہوتے۔ کبھی وہ ہوش میں ہوتا اور بے انتہا خوفزدہ نظر آتا۔ کسی پر خوف اور نیند کا ایک ساتھ حملہ ہوتا تھا اور مار گزیدہ کے سوا میں نے کبھی کسی کے چہرے پر خوف اور خوابیدگی کو یکجا نہیں دیکھا۔ شکار ہر عمر اور ہر جنس کے ہوتے تھے لیکن ہر شکار کے چہرے پر اپنی اہمیت کا ایک عجیب سا احساس ضرور نظر آتا جیسے سانپ سے ڈسا جانا اس کا اپنا کارنامہ ہے جو ہر ایک انجام نہیں دے سکتا۔ میں نے مایوسی کسی شکار کے چہرے پر نہیں دیکھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مار گیر تک زندہ پہنچ جانے کے بعد کوئی شکار مرتا نہیں اور عموماً اپنے پیروں پر چلتا ہوا واپس جاتا تھا۔

البتہ کبھی کبھی مار گیر کے پاس سے شکار لاش کی صورت میں بھی واپس جاتا تھا لیکن یہ صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ مار گیر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر چکا ہوتا تھا۔ سانپ کا شکار ہونے کے بعد بہت بری طرح مرا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس کی موت کی تصدیق کے لئے اس کا چہرہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی لیکن وہ مردہ شکار لانے والوں کو اس کی موت کا یقین مار گیر تک پہنچنے کے بعد ہی آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ زیادہ تر باتیں ماگیر کے آنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا تھا کہ شکار مر چکا ہے۔ بعض بعض شکاروں کی تو کھال تک پھٹ چلی ہوتی تھی، ایسے شکاروں کے ساتھ آنے والے مار گیر کے آنے سے پہلے واقعہ بیان کرنے میں زیادہ جوش نہیں دکھاتے تھے، وہ غور سے میرا چہرہ دیکھتے رہتے اور مریض کی حالت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر میں اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیتا۔ مار گیر آتا۔ پہلے چٹائی کی طرف دیکھتا جس کی جگہ خالی ہوتی، اس لئے کہ میرے سامنے مردہ شکار کے ساتھ اسے ڈسنے والا سانپ کبھی نہیں آیا۔ اس کے بعد مار گیر شکار کو غور سے دکھتا، پھر مجھے دیکھتا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ جاتا اور کونے میں لپٹی کھڑی ہوئی ایک اور چٹائی کھول کر شکار کے اوپر ڈال دیتا۔ کچھ دیر سناٹا رہتا۔ پھر مار گیر وہاں سے ہٹ جاتا۔ لوگ لاش کو اٹھاتے، میں چٹائی لپیٹ کر کونے میں کھڑی کر دیتا اور لوگ لاش کو لے جاتے۔ وہ بالکل خاموشی کے ساتھ روانہ ہوتے لیکن دروازے سے باہر نکلنے کے بعد ان میں سے کسی نہ کسی کے رونے کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔

لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا تھا۔ زیادہ تر شکار مرنے سے پہلے ہی مار گیر تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ پھر مار گیر اس کو مرنے نہیں دیتا تھا خواہ اسے کسی بھی سانپ نے کاٹا ہو اور شکار کے ساتھ اسے کاٹنے والا سانپ آتا یا نہ آتا، مار گیر ایک ہی نظر میں سمجھ لیتا تھا کہ اسے کس قسم کے سانپ نے کاٹا ہے۔

ان شکاروں میں بہت ایسے ہوتے تھے جنھیں کاٹنے والا سانپ زہریلا ہوتا ہی نہیں تھا اور وہم انھیں مارے ڈالتا تھا۔ سادہ پانی میں گھلا ہوا کوئی بھی رنگ ان کے علاج کو کافی ہوتا لیکن مار گیر انھیں بڑی تکلیف پہنچاتا تھا۔ کبھی وہ ان کے زخم کی جگہ کو جلا دیتا، کبھی زخم کو تیز نوکوں والے اوزاروں سے چیر کر ان میں ایسی دوائیں بھر دیتا کہ وہ تڑپنے اور چیخنے لگتے لیکن مار گیر کے اشارے پر انھیں کئی لوگ مل کر جکڑ لیتے اور ان کا منھ دبا دیتے۔ کچھ دیر ہنگامہ سا رہتا جس کے دوران مار گیر پھر مردہ سانپ کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ آخر شکار پر غشی طاری ہو جاتی اور لوگ اسے اٹھا کر واپس لے جاتے۔

جنھیں واقعی زہریلا سانپ ڈستا ان کے علاج مار گیر کے پاس بہت تھے جو ڈسنے والے سانپوں کی قسموں کے لحاظ سے بدلتے رہتے تھے۔ کسی شکار کے زخم پر وہ ایک طرح کی مٹی کا لیپ کرتا اور وہی مٹی پانی میں گھول کر اسے پلاتا بھی تھا، کسی کے زخم پر وہ کسی درخت کی کچلی ہوئی ہری چھال کا پھین دار رس لگاتا اور کسی کے زخم سے بہت سا خون نکالنے کے بعد وہ زخم پر کسی دوا کے دو ایک قطرے ٹپکاتا اور مجھے یقین ہے کہ اس دوا میں کسی دوسری قسم کے سانپ کا زہر بھی شامل ہوتا تھا۔

لیکن کوئی شکار ایسے سانپ کا کاٹا ہوا ہوتا یا زہر اس کے خون میں اتنا پھیل چکا ہوتا کہ اس پر کوئی دوا کارگر نہ ہوتی۔ ایسے شکاروں پر مار گیر دوائیں آزماتا بھی نہیں تھا۔ ان کیلئے وہ زہر مہرہ نکالتا۔ زہر مہرہ کا عمل ہمیشہ ایک سا ہوتا اور کبھی خطا نہ کرتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے زہر مہرے کا عمل اپنے ہی اوپر دیکھا تھا، یا اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے دیکھا تھا۔

(۲)

میں ایک مری ہوئی لڑکی سے بھاگ رہا تھا۔ مجھے یقین کے ساتھ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی مر چکی ہے لیکن میں اس سے بھاگ رہا تھا۔ میرا مکان بہت پیچھے رہ گیا تھا، پھر میرا شہر بھی پیچھے رہ گیا۔ پھر نئی بستیاں آئیں۔ وہ بھی پیچھے رہ گئیں، اور اب میں جنگلوں کے روبرو تھا۔

کچھ دن سے میں سوچنا چھوڑ چکا تھا لیکن یہاں پر ٹھہر کر میں نے بڑا وقت سوچنے میں گذارا۔ میرے سامنے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جو آگے بڑھ کر تاریک ہوتا چلا گیا تھا اور مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں قدرے بلندی پر تھا اور جنگل کا یہ سلسلہ نشیب کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اس سلسلے کے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کرنا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے مری ہوئی لڑکی کا فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ واقعی مری ہوئی تھی یا مجھے مری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے واقعات کی رو سے نہیں بلکہ محض اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کرنا تھا اور میں سخت تذبذب میں گرفتار تھا۔ دراصل میں یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں نے ایک پوری رات سوچنے میں گذاری اور صبح ہوتے ہی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کو زندہ سمجھ کر بھاگ رہا ہوں یا مردہ۔ میں نے خواہش کی کہ جو کچھ ہوا وہ نہ ہوا ہوتا۔ اسی خواہش میں مجھے نیند آ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا کہ واقعی جو کچھ ہوا وہ نہیں ہوا تھا، اور اس لئے خواب ہی میں مجھے نیند آنے لگی اور میری آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلتے ہی جنگل میں اتر گیا۔

یہ جنگل سے میرا پہلا سابقہ تھا۔ مجھے وہاں کی فضا مرطوب محسوس ہوئی جو آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مرطوب ہوتی جا رہی تھی۔ میں پرانے درختوں اور مرجھائی ہوئی بیلوں کے درمیان بڑھ رہا تھا۔ کہیں کہیں درختوں کی ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے بیچ میں گلیارے بن گئے تھے۔ ان گلیاروں میں مٹی کے اندر سے ابھری ہوئی موٹی پتلی بے شمار جڑوں کے جال سے بچھے ہوئے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان جڑوں کے درخت کہاں ہیں۔ البتہ کہیں کہیں کوئی سوکھا درخت آجاتا اور میرے پیروں کے نیچے بچھے ہوئے جال میں سے کوئی جڑ چٹ کر ٹوٹ جاتی، اور میں سمجھ لیتا کہ یہ جڑ اسی درخت کی تھی۔

مجھے جنگل میں ڈر نہیں لگا۔ جانور مجھے کم ملے۔ چھوٹے جانور میری آہٹ پا کر بھاگتے اور قریب کی جھاڑی میں رک کر اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھتے تو مجھ کو شرمیلے بچوں کا خیال آجاتا۔ جنگلوں کے سب جانور کی آنکھوں میں مجھے معصومیت اور حیرانی نظر آئی۔ درندے مجھ کو نہیں ملے۔

کچھ دور تک میں نے جنگل کو دلچسپی سے دیکھا۔ پھر مجھے اپنے مکان کے بیرونی کمرے میں سجے ہوئے نوادر کا خیال آنے لگا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ بیرونی کمرے میں کون کون سے نوادر تھے اور اب میں ذہن پر زور ڈال ڈال کر ان میں سے ایک ایک کو یاد کر رہا تھا۔

ان میں ایک کسی دھات کا شیر تھا جو اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا دہاڑنے کے انداز میں منھ کھولے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں کسی قیمتی پتھر کی تھیں اور مجھ سے کئی پشت پہلے غائب ہو چکی تھیں۔ اب اس شیر کی اہمیت انھیں آنکھوں کی وجہ سے تھی جو اب نہیں تھیں۔ اس شیر کے قریب ہی اور اس سے بڑا کسی سرخی مائل سیاہ مسالے کا بنا ہوا گھوڑا تھا جس پر اسی مسالے کا بنا ہوا سوار بھی تھا۔ سوار کا ایک ہاتھ تلوار چلانے کے انداز میں اٹھا ہوا تھا لیکن اس ہاتھ میں کچھ تھا نہیں۔ اس اٹھے ہوئے ہاتھ میں تلوار کی بڑی کمی محسوس ہوتی تھی، لیکن ایک بہت بوڑھے بزرگ کا کہنا تھا کہ دراصل سوار کے ہاتھ میں تلوار نہیں بلکہ ترازو تھی۔ میرے سامنے بلکہ میری ہی بے احتیاطی سے سوار کا اوپر کا دھڑ بھی ٹوٹ گیا تھا جسے ایک ہوشیار کاریگر سے جڑوایا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دھڑ ٹوٹنے کے بعد اندر کا جو مسالہ نظر آیا اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا اور اس میں سے ایک عجیب سی خوشبو نکلتی تھی جسے سونگھنے سے پرانی باتوں کا خیال آنے لگتا تھا۔ شیر اور سوار کے سامنے والی دیوار پر ایک کیکڑا تھا۔ یہ کیکڑا اسینگ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ یہ ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑے گئے تھے کہ ذرا سا چھوتے ہی پورا کیکڑا ہلنے لگتا اور دیوار پر رینگتا ہوا معلوم ہوتا۔ مجھے یہ کیکڑا برا لگتا تھا اور کبھی کبھی مجھ کو اس سے خوف بھی آتا تھا۔ یہ کسی گم گشتہ قبیلے کی صنعت کا نمونہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہ ہو سکا۔

بیرونی کمرے کے نوادر میں ایک چھوٹا سا محل بھی تھا جو مختلف رنگ کے پتھروں کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ یہ محل محرابوں ستونوں، برجوں وغیرہ سب کے لحاظ سے مکمل تھا۔ اس کے برج خصوصاً بہت خوبصورت تھے اور ان کے کنگروں کی باریک مناعی دیکھ کر اکثر مہمان حیرت کرتے تھے۔ اس محل کے سلسلے میں بتایا جاتا تھا کہ کبھی واقعی بالکل اسی ساخت کا ایک بہت بڑا محل موجود تھا جس کے آثار کھنڈر کی صورت میں اب بھی ملتے تھے۔ اسی بڑے محل سے پہلے یہ چھوٹا محل نمونے کے طور پر بنایا گیا تھا لیکن بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ جب بڑا محل ٹوٹا تو اس کے معمار نے یادگار کے طور پر یہ چھوٹا محل بنایا۔ کبھی کبھی بزرگوں میں اس موضوع پر بحث بھی چھڑ جاتی۔ اس بحث میں عجیب عجیب طریقوں سے محل کے ٹوٹنے کے امکانی اسباب پر غور کیا جاتا۔ اور معمار کی عمر کے تخمینے لگائے جاتے۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کبھی نہ ہو سکا کہ چھوٹا محل بڑے محل کا نمونہ ہے یا یادگار۔ اتنا ضرور یقین تھا کہ اس چھوٹے محل کے عین مطابق ایک بڑا محل بھی تھا جو منہدم ہو چکا تھا اور اس لحاظ سے اب اسے یادگار ہی سمجھا جاتا تھا۔ میں اکثر اس چھوٹے سے محل کے سامنے کھڑا اتنی دیر تک اسے دیکھتا رہتا کہ وہ اصل بڑا محل معلوم ہونے لگتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس کے اندر سے زندگی کی آوازیں بھی آتی سنائی دیتیں۔ تب میں اچانک پیچھے ہٹ جاتا اور محل ایک جھٹکے کے ساتھ چھوٹا ہو جاتا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو اس محل میں رہنے کی ضد کیا کرتا۔ اس کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنے لئے اسی نمونے کا اصلی بڑا محل بنواؤں گا۔ میں بزرگوں اور بیرونی کمرے میں آنے والے مہمانوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ بھی کیا کرتا تھا اور محل میں جو تبدیلیاں میں نے تجویز کی تھیں ان کے بارے میں ان سب سے مشورہ کرتا تھا۔

لیکن بیرونی کمرے کے نوادر میں سب سے زیادہ نمایاں ایک مَحمل تھا۔ یہ محمل بیرونی کمرے کے بیچوں بیچ میں ایک ہشت میز پر رکھا جاتا تھا۔ یہ میز خاص اسی محمل کے لئے بنوائی گئی تھی۔ محمل مختلف قسم کی دھاتوں اور لکڑیوں کا بنا ہوا تھا اور اس کے دروں پر نہایت باریک رنگین کپڑوں کے تہہ بہ تہہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے پھندنوں والی ڈوریوں کی مدد سے ان پردوں کو سرکایا جاتا تھا اور محمل کے اندر گول اور چوکور گدے بے ترتیبی سے پڑے نظر آتے تھے۔ گدوں کے آس پاس سنہرے روپہلے چھوٹے چھوٹے ظروف بھی تھے جن میں سے کسی کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ محمل کی چھت میں کسی بہت نازک دھات کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جو اکثر آہستہ آہستہ بجا کرتی تھیں، مگر ان کے بجنے کا احساس عام طور پر اسی وقت ہوتا تھا جب بیرونی کمرے میں باتیں ہوتے ہوتے اچانک خاموشی چھا جاتی۔ ایسے موقعوں پر گھنٹیوں کی آواز سارے کمرے میں گشت کرتی معلوم ہوتی۔ اس آواز کا دھیما پن بھی عجیب تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹیاں قریب ہی دھیمی آواز میں نہیں بلکہ بہت دور تیز آواز میں گونج رہی ہیں۔

بیرونی کمرے کے نوادر میں محمل کا اضافہ آخری تھا اور تنہا یہی اضافہ تھا جو میرے ہوش سنبھالنے کے بعد ہوا تھا۔ اس طرح میرے لئے یہ اضافہ پہلا بھی تھا۔ ایک وحشی سا شخص اس محمل کو لایا تھا اور محمل کو بیرونی کمرے میں رکھنے کے لئے مناسب جگہ مقرر کرنے اور ہشت پہل میز کی تیاری کے سلسلے میں وہ کچھ عرصے تک ہمارے یہاں رہا بھی تھا۔ اس نے محمل کی قدامت کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بعض مہمانوں کا خیال تھا کہ محمل کئی سو سال پرانا ہے، لیکن کچھ تاجروں نے یقین کے ساتھ بتایا کہ یہ دراصل اسی وحشی کی کاریگری کا نمونہ ہے اور محض دیکھنے میں اس قدر

پرانا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ اگر کسی ایک شخص نے اس مخمل کو بنایا ہے تو اس کی قریب قریب پوری عمر اس کی تیاری میں صرف ہو گئی ہو گی۔ مخمل لانے والے شخص کی شروع میں خوب خاطر تواضع ہوتی تھی لیکن بعد میں اس کو بڑی بے عزتی کے ساتھ ہمارے یہاں سے نکال دیا گیا جس کا سبب مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ مخمل بہرحال بیرونی کمرے کے بیچ میں ہشت پہل میز پر رکھا رہا، اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی تھی، جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، کہ وہ تمام نوادر کو اپنی طرف کھینچے ہوئے تھا ورنہ پہلے یہ سب نوادر ادھر ادھر بھاگتے معلوم ہوتے تھے۔ شروع شروع میں ہمارے یہاں جب مخمل کا ذکر آتا تو اس وحشی شخص کا بھی ذکر ضرور آتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذکر سنائی دینا بند ہو گیا۔ میں نے اپنے گھر میں آخری بار اس کا ذکر اس وقت سنا جب ہمارے یہاں یہ خبر آئی کہ اس کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔

یہاں پہنچ کر پہلی بار مجھ کو جنگل میں سانپوں کا خیال آیا۔

میں جنگل کے اس حصے میں تھا جہاں درختوں کے تنوں پر اور زمین پر ہری بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان بیلوں کے پتے گہرے سبز رنگ کے بڑے بڑے تھے اور ان پر ہلکے سبز رنگ کے ڈورے سے ابھرے ہوئے تھے۔ یہ پتے خوب شاداب تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان کو موڑا جائے تو وہ بیچ سے ٹوٹ جائیں گے اور ٹوٹتے ہی ان میں سے پھینٹیں اڑیں گی، بلکہ واقعی وہاں کی فضا میں پانی کی بہت مہین مہین پھواریں اڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ غرض جنگل کی وہ جگہ ان ٹھکانوں سے بہت مختلف تھی جہاں سانپوں کے ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی جگہ پہنچ کر مجھے سانپوں کا خیال آیا اور ہلتے ہوئے پتوں کے آس پاس کسی سانپ کی موجودگی کا شبہ ہونے لگا، یہاں تک کہ مجھے قدم بڑھانا دشوار ہو گیا۔ میں ہری بیلوں کے ایک سمندر میں کھڑا ہوا تھا۔ پتے یوں ہل رہے تھے جیسے موجیں آہستہ آہستہ اٹھتی اور گرتی ہوں اور ان موجوں کے نیچے نیچے رینگتی ہوئی چیزیں مجھے اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، یہاں تک کہ مجھے اپنی جگہ پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ میں نے کسی صاف جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا، لیکن میرے چاروں طرف ہری بیلیں تھیں جن کے بڑے بڑے شاداب پتوں سے ڈھکی ہوئی زمین کے نشیب و فراز کا اندازہ ممکن نہ تھا۔ اور اس زمین میں نشیب و فراز تھے ضرور۔ مجھے یاد آیا کہ آگے بڑھتے ہوئے میں کئی مرتبہ کمر تک پتوں میں ڈوب گیا تھا۔ اور ان کو ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا ڈھلان سے چڑھائی تک آیا تھا بلکہ پتوں کو ہٹانے کا لمس میرے ہاتھوں پر ابھی تک تازہ تھا۔ مگر اب میں اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا تھا اور مجھ کو وہاں سے ہٹنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اسی وقت میرے پیروں کے قریب کوئی چیز ہلی اور میں اس چیز کی سمت کا تعین کیے بغیر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میرا پیر کسی جاندار چیز پر پڑا اور وہ چیز اور زیادہ جاندار ہو گئی۔ مجھے اپنے پیر میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ کچھ پتے ہٹے اور ان کے نیچے سے ایک چوڑا پھن ابھرا۔ پل بھر کے لئے چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھورتی نظر آئیں اور پاس ہی کسی کے ٹھنڈی سانس بھرنے کی سی آواز سنائی دی۔ پھر وہ پھن پتوں کے نیچے ڈوب گیا۔ پتے اپنی جگہ پر جھومے اور چکنا لمبا بدن مجھے پلٹتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک بار پتے زور سے ہلے اور پھر دور تک ہٹتے چلے گئے۔

مجھے ایسا معلوم ہوا میرے کانوں میں کوئی گرم گرم چیز بھری ہوئی ہے۔ میں اس چیز پر غور کرنے لگا۔ آخر میں نے سر کو جھٹکا اور اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ دیر تک یہ بات طرح طرح سے میرے ذہن میں بیٹھتی رہی۔ مجھے ایک طرح کی جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھ کو پہلے ہی سے اس جگہ پر سانپوں کی موجودگی کا خیال ہو رہا تھا اور میں خود کو ان کی زد میں محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مجھے کچھ عجیب سا یقین بھی تھا کہ میں سانپوں سے محفوظ ہوں۔ اسی وجہ سے میں جھنجھلایا ہوا تھا کہ میرا یقین غلط ہو گیا۔ یہ کیوں ہوا جہاں مجھے سانپ کا وہم تھا وہاں حقیقت میں سانپ موجود تھا۔ لیکن اب میرے کانوں میں بھری ہوئی گرم چیز پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی اور ایک بار پھر مجھ پر اس خیال کا غلبہ ہوا کہ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اس وقت مجھے اپنے گھر میں ہونے کی شدید خواہش ہوئی اور میں نے بھاگنا شروع کیا۔

میں ابھی تک جس رخ پر چل رہا تھا اب اسی رخ پر بھاگ رہا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ اس طرح میں اپنے گھر سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ جس قدر تیز بھاگوں گا اسی قدر جلد گھر پہنچوں گا، بلکہ کئی بار تو مجھے اس جنگل کے پیچ و خم پر اپنے گھر کے آس پاس کے پہچانے ہوئے راستوں کا گمان ہوا مگر میں جلد ہی تھک گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی چیز آہستہ آہستہ میرے بدن کو جکڑ رہی ہے۔ میں رک گیا۔ مجھے نیند آ رہی تھی، مگر میں سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس جنگل میں کسی انسان کے نہ ہونے کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اب نیند سے میرا بدن جھونکے کھا رہا تھا۔ ایک بار مجھے سامنے ایک سیاہ دیوار سی اٹھتی نظر آئی میں نے اسے غور سے دیکھنا چاہا تو وہ غائب ہو گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے اپنے داہنے بائیں سیاہ دیواریں اٹھتی معلوم ہوئیں۔ ذرا دیر میں سامنے والی دیوار بھی نمودار ہو گئی پھر یہ سب دیواریں آپس میں مل گئیں۔ میں ہر طرف سے سیاہ دیواروں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ دیواریں دھیرے دھیرے تنگ بھی ہو رہی تھیں اور بلند بھی، اور ان میں سے ایک طرح کی خاموشی اور تاریکی نکل کر پھیلتی جا رہی تھی۔

اس پھیلتی ہوئی خاموشی میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

"وہ کدھر گیا ہے؟"

معلوم نہیں کس طرح میں نے سمجھ لیا کہ یہ سوال کے بارے میں ہے۔ اور مجھی سے کیا گیا ہے۔ آواز پھر آئی۔

"کیا تھا؟"

مگر مجھے جواب دینے کی خواہش نہیں تھی بلکہ سیاہ دیواروں کے بیچ میں یہ تبدیلی مجھے کوئی خاص بات بھی نہیں محسوس ہوئی۔ اب کوئی میرے پورے بدن کو ٹٹول رہا تھا۔ ایک سوال مجھے اور سنائی دیا۔

"کہاں پر کاٹا ہے؟"

میں بے حرکت پڑا ہوا تھا اور کوئی میرے پاس موجود تھا۔ کسی نے میری

آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر آہستہ سے کھولا اور بند کر دیا۔ کوئی مجھے اٹھا کر اور کہیں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے نیند کا آخری جھونکا آیا مگر تاریکی میں ڈوبنے سے پہلے میں نے اپنے کان کے پاس ایک تیز چیخ سنی۔

"مارگیر! مارگیر!!"

وہ پہلا اور آخری موقع تھا جب بستی والوں نے مارگیر کو خود اپنا نام پکارتے سنا۔ اس کے بعد کا قصہ مجھے اتنی دفعہ بتایا گیا کہ میں اس کو اپنے چشم دید واقعے کی طرح بیان کر سکتا ہوں، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے خیال ہونے لگتا ہے کہ واقعہ وہ سب باتیں میری آنکھوں دیکھی تھیں۔

مارگیر کی آواز جنگل سے نکل کر بستی تک پہنچی اور بستی والے جنگل کی طرف دوڑ پڑے۔ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آواز کس نے لگائی ہے مگر اتنا سب جانتے تھے کہ کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہے، اور انھیں اس کو مارگیر کے پاس لے جانا تھا۔ لیکن جب وہ جنگل کے دہانے میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ مارگیر مجھ کو اپنی کمر پر لاد کر چلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا بدن جابجا سے چھلا ہوا ہے۔ بستی والوں نے لپک کر مجھے اٹھایا اور جس طرح دوڑتے ہوئے آئے تھے اسی طرح واپس چلے۔ آدھے راستے تک مارگیر سب کے ساتھ رہا پھر وہ زمین پر گر گیا اور لوگ میری طرح اسے بھی اٹھا کر لے چلے۔ اب وہ سب خوف زدہ تھے۔ اور جب یہ جلوس بستی میں داخل ہوا تو پوری بستی میں کھلبلی پڑ گئی اور کسی کے کہے سنے بغیر یہ خبر پھیل گئی کہ مارگیر کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ غالباً مر بھی چکا ہے۔ لیکن اپنے گھر کے قریب پہنچ کر مارگیر اپنے پیروں پر چلنے لگا۔ اسی نے گھر کا دروازہ کھولا اور جب تک مجھے زمین پر لٹائیں وہ گھر کے اندرونی حصوں سے زہر مہرہ اور دودھ کا برتن لئے میرے سرہانے آ چکا تھا۔ اس نے ایک بار سر سے پیر تک میرے بدن پر زخم کا نشان تلاش کیا اور بائیں پیر کی ایڑی سے کچھ اوپر دو چھوٹے چھوٹے سوراخوں کو چٹکی میں پکڑ لیا پھر اس نے زہر مہرہ نکالا جو دیکھنے میں ایک سیاہی مائل پتھر کا ٹکڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ زہر مہرہ اس نے زخم سے چھوا دیا اور زخم نے زہر مہرہ کو مقناطیس کی طرح چپکا لیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ سانپ کا شکار ابھی علاج کے قابل ہے۔ مارگیر نے فوراً ایک چھوٹے برتن میں دودھ کو قطرہ قطرہ زخم پر ٹپکانا شروع کیا اور مجمع جو ابھی تک دم بخود تھا، اب اس میں بہت مدھم سرگوشی کی لہر دوڑی:

"زہر مہرہ زہر چوس رہا تھا۔"

کچھ دیر تک زہر مہرہ زخم سے چپکا رہا پھر چھوٹ کر نیچے گرا۔ کسی نے کسی کو آہستہ سے بتایا۔

"زہر مہرے پر زہر چڑھ گیا ہے۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

مارگیر نے زہر مہرہ دودھ کے بڑے برتن میں ڈال دیا۔ مدھم سرگوشی پھر پھیلی۔

"اب یہ دودھ میں اپنا زہر چھوڑ کر پھر تازہ ہو جائے گا۔"

مارگیر نے دودھ میں سے زہر مہرہ نکالا اور پھر زخم سے چھو دیا۔ اور وہ پھر زخم سے چپک گیا۔ ذرا دیر میں بیہوش ہو کر گرا۔ پھر دودھ میں ڈالا گیا، پھر زخم سے لگایا گیا، پھر زخم سے چپک گیا۔ یہ بار بار ہوا اور ہر بار سرگوشی پھیلتی۔

"جب تک رگ رگ سے زہر نہ کھینچ لے گا اسی طرح چپکتا رہے گا۔"

آخر ایک بار جب اسے دودھ میں سے نکال کر زخم سے چھوایا گیا تو وہ چپکنے کے بجائے نیچے گر پڑا۔ اور اسی وقت میرے بدن میں حرکت پیدا ہوئی۔

اب لوگوں کو فکر ہوئی کہ میں کون ہوں اور میرا کیا کیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں گفتگو شروع کر دیں، مارگیر نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا:

"اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

(۳)

کئی دن تک میں خواب اور بیداری کے درمیان رہا۔ دن میں دو تین دفعہ مارگیر میرے سرہانے آتا اور دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہتا۔ کئی مرتبہ اس نے مجھے ایک عرق بھی پلایا۔ آخر ایک دن اس نے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چلنے میں دشواری ہو گی لیکن ایک بار قدم بڑھانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں بالکل ویسا ہی ہوں جیسا تھا۔ البتہ میں نے مارگیر سے بات نہیں کی۔

اس نے مجھے پوری بستی کا ایک چکر لگوایا۔ یہ چھوٹی سی بستی تھی جو اس وقت مجھے قریب قریب ویران نظر آئی۔ بستی سے باہر کی طرف جانے والے گلیارے پر آ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اتنے لمبے قدم بڑھانے لگا کہ مجھے اس کا ساتھ دینے کیلئے تقریباً دوڑنا پڑا۔ جلد ہی میری سانس ناہموار ہو گئی اور سارے بدن سے پسینا چھوٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ رکا اور بہت دیر تک غور سے میرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر ہم آگے بڑھے جلد ہی ہم جنگل کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہاں مارگیر نے ایک بار اور دیر تک غور سے مجھے دیکھا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

ہری بیلوں کا وہی سمندر میرے سامنے تھا، اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس سمندر کے بیچوں بیچ کس طرح پہنچ گیا تھا۔ اور اگر پہنچ گیا تھا تو اس میں سے نکلا کیوں کر تھا۔ اس وقت ان بیلوں میں اترنا غیر ممکن نظر آتا تھا۔ یہاں پر جنگل چھدرا تھا لیکن کچھ آگے بڑھنے پر اس کے بعض قطعے بہت گنجان ہو گئے تھے۔ اور ہم جس طرف بھی گئے ادھر مجھے کوئی نہ کوئی آدمی ضرور دکھائی دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس جنگل میں جانوروں کے بجائے انسان رہتے ہیں۔

وہ سب کسی نہ کسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھے کو میں نے دیکھا کہ بھربھری زمین سے سفیدی مائل جڑیں کھود کر نکال رہا ہے۔ ایک بہت اونچے درخت کے نیچے دو آدمی کپڑا تانے کھڑے ہوئے تھے اور کسی شخص کو جو درخت کے اوپر تھا، کچھ ہدایتیں دے رہے تھے، ایک طرف کچھ لوگ مختلف قسم کی پتیوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگا رہے تھے۔ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا کہ طرح طرح کے گوند اور درختوں کے تنوں سے نکلنے والا دودھ جمع کر رہے ہیں۔ کچھ کچھ دیر بعد جنگل کے دور افتادہ حصوں کی طرف سے کوئی شخص آتا دکھائی دیتا جس کے ساتھ پنجروں میں چھوٹے جنگلی جانور اور پرندے ہوتے۔ اس وقت وہ جنگل مجھے بڑا

انوکھا معلوم ہو رہا تھا جہاں لوگ بلاخوف وخطر اپنے اپنے کام میں منہمک تھے۔ اور ان کا انہماک بھی ایسا تھا کہ بظاہر انھیں اپنے کام کے سوا ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ لیکن جب مار گیر ان کے پاس سے گزرتا تو وہ کام روک دیتے اور جب تک وہ آگے نہ نکل جاتا اس وقت شروع نہ کرتے۔ وہ مار گیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے لیکن جب میں ان کے قریب سے گزرتا تو وہ آہستہ سے مسکراتے اور اس طرح سر کو جنبش دیتے جیسے میرا حال دریافت کر رہے ہوں۔ وہ اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے کو میرے بارے میں بتاتے اور پھر مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ مجھے بھی ان کے جواب میں مسکرانا چاہئے۔ لیکن میں اسی طرح مردوں کا سا چہرہ اور آنکھیں لئے ان کے درمیاں سے گذرتا رہا۔ مجھے یہی مناسب معلوم ہوا اور معلوم نہیں کیوں اس کا سبب میں نے یہ قرار دے لیا کہ میں مار گیر کے ساتھ ہوں۔ کچھ دیر میں ہم ان دونوں سے آگے نکل گئے۔

اب ہم جنگل کے نیم تاریک حصوں میں تھے۔ یہاں پہنچ کر مار گیر ایک درخت کی موٹی ابھری ہوئی جڑ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا:

"کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے بتا دیا۔ وہ جس درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا تھا اس کی چھال اپنے انگوٹھے کے ناخن سے کھرچتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دونوں انگوٹھوں کے ناخن بہت لمبے لمبے اور نیلگوں ہیں۔ درخت کی چھال پر گہری سبز لکیریں پڑ رہی تھیں اور وہ انھیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ناخن اپنے لباس پر گھس کر صاف کیا اور بہت دھیمی آواز میں پوچھا:

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

میں نے پھر بتا دیا۔ چھال کی مٹیالی کھرچن درخت کی ابھری ہوئی جڑ پر جمع ہوگئی تھی۔ اس نے کھرچن سمیٹ کر دونوں ہی ہتھیلیوں سے اس کا ڈھیلا ڈھیلا گولا بنایا اور اپنے لباس میں رکھ لیا۔ پھر اس نے وہ سوال کیا جس کی اب میں توقع کر رہا تھا:

"کہاں جا رہے تھے؟"

میں کاموش رہا۔ وہ بولا:

"اگر تم یہ سوچ کر نہیں نکلے تھے کہ تمھیں کہاں جانا ہے تو یہ بستی بھی بری نہیں۔ البتہ یہاں سانپ زیادہ ہیں۔"

"جنگل میں۔" میں نے کہا۔

"بستی میں بھی۔" وہ بولا "کیوں کہ دونوں پاس پاس ہیں بلکہ لوگوں نے دونوں کو ایک کر رکھا ہے۔"

میں نے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا:

"کوئی تم کو روکتا نہیں۔ اگر تم آگے ہی جانا چاہتے ہو..."

"میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ پھر اس کا لہجہ بدلا اور اس میں ہلکی سی آزردگی کی کیفیت پیدا ہوئی: "تمھارے پیر پر اب زخم کا نشان باقی نہیں ہے اور کچھ دن میں تم کو یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی تمھیں سانپ نے کاٹا تھا۔"

"مجھے یاد رہے گا۔" میں نے کہا اور ایک بار اسی جملے کو دل ہی دل میں دہرایا۔

"پرانے الفاظ ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا، "میں انھیں پہلے بھی سن چکا ہوں۔"

اس کے بعد وہ دیر تک خاموش رہا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ میرے بولنے کا انتظار کر رہا ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ اتنے میں وہ خود ہی بولا:

"پہلے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمھیں کس سانپ نے کاٹا ہے۔ میں تھک بہت گیا تھا اور وقت بھی کم تھا، اس لئے میں نے زہر مہرہ نکالا۔ پھر اس کی تلاش میں مجھے جنگل آنا پڑا۔"

مجھے اپنے قریب ہی کہیں ایک مانوس خوشبو کا احساس ہوا۔ یقیناً بہت پہلے بھی میں اس خوشبو سے آشنا تھا۔ میرے سر کے اندر دھند سی پھیلنے لگی جس کو مار گیر کی آواز نے صاف کیا۔ وہ اپنے لباس کی تہوں میں سے ایک تھیلا باہر نکال رہا تھا۔

"تمھیں اسی نے کاٹا تھا۔" اور تھیلے میں ہاتھ ڈالکر ایک تڑپتا ہوا سانپ باہر نکالا۔ سانپ نے اس کے ہاتھ میں لپٹنا شروع کیا تھا کہ کہیں دور سے آواز آئی:

"مار گیر! مار گیر!!"

ار قریب کی کئی وازوں نے بازگشت کی طرح اس صدا کو دہرایا۔

"مار گیر! مار گیر!!"

مار گیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آواز لگ رہی ہے۔" اس نے کہا اور ہاتھ کو گھما کر سانپ کو دور پھینک دیا۔ اس نے ہوا میں کئی بل کھائے، ایک جھاڑی میں اس کے گرنے کی ہلکی سی آواز آئی اور دو تین چڑیاں جھاڑی سے نکل کر اڑ گئیں۔ مار گیر بہت تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ جلد ہی وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مانوس خوشبو کی لپٹ پھر آئی اور اچانک مجھے پتہ چلا کہ یہ خوشبو درخت کے کھرچے ہوئے تنے کی سبز لکیروں میں سے نکل رہی ہے۔ میں ان لکیروں کی طرف کھنچ رہا تھا کہ ایک آہٹ سنائی دی۔ ماگیر میرے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جیسا میں نے کہا تھا، یہاں سانپ زیادہ ہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہاں میں بھی ہوں۔" اور پہلے سے بھی زیادہ تیز قدموں سے واپس ہو گیا۔

اس کے ہاتھ کا دباؤ مجھے اپنے کندھے پر اب تک محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مانوس خوشبو اس کی ہتھیلیوں میں بھی موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہی خوشبو اس سوار کے ٹوٹے ہوئے دھڑ میں سے نکلتی تھی جس کے بارے

میں فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ترازو تھی یا تلوار۔

اب مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس طرح میں نے مارگیر کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ میں کبھی کبھی بستی میں گھومنے نکلتا تو لوگ میری پذیرائی کرتے تھے، لیکن ان کی گفتگو زیادہ تر مارگیر کے بارے میں ہوتی تھی۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ مارگیر خالی وقت میں کیا کرتا ہے، انھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ اور یہ معلوم کرنے کی انھیں زیادہ فکر تھی کہ مارگیر مجھ سے کیا باتیں کرتا ہے، اس لئے کہ وہ بستی والوں سے، کبھی کبھی مارگزیدوں کا حال، وہ بھی دو تین لفظوں میں، پوچھ لینے کے سوا کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا اگر بستی والے میرے سامنے اس کے متعلق تجسس ظاہر کرتے تھے تو مجھے تعجب نہیں ہوتا تھا لیکن مارگیر کی بابت وہ مجھ سے پوچھتے کم تھے، مجھے بتاتے زیادہ تھے۔ اور اس گفتگو کا موضوع ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ مارگیر نے کب کب اور کس کس طرح اور کس کس کو سانپ کے زہر سے بچایا۔ وہ لوگ مجھے خاص طور پر دکھائے جاتے جن کا علاج مارگیر نے کیا تھا، اور ان میں خود مجھ کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ غرض بستی والوں نے میرے بارے میں مجھ کو بتایا بہت لیکن مجھ سے پوچھا کچھ نہیں، حتیٰ کہ انھوں نے مجھ سے میرا نام بھی نہیں معلوم کیا اور اپنی مقامی بولی میں خود ہی میرا ایک نام رکھ دیا جس کے معنی مددگار تھے۔ کئی موقعوں پر یہ نام سننے کے بعد بالآخر مجھے خیال آیا کہ واقعی میں مارگیر کا ہاتھ بٹاتا ہوں اور یہ کہ مجھے بستی میں رہتے ہوئے شاید اس سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

میں اس کے ساتھ جنگل جاتا تھا اور اس کی دواؤں کے لئے سامان اکٹھا کرتا تھا۔ اس سامان میں جمادات، نباتات، حیوانات سب شامل تھے۔ کبھی ہم مختلف قسم کی مٹی اور پتھر جمع کرتے، کبھی طرح طرح کے پھل پھول، چھالیں، جڑیں، ریشے اور گوند، کبھی جانوروں اور پرندوں کی باری آتی جو تنہا میرے قابو میں کبھی نہ آتے لیکن مارگیر انھیں آسانی سے گھیر لیتا اور میں بڑھ کر ان کو پکڑ لیتا تھا۔ ان سب موقعوں پر وہ ان میں سے ہر چیز کی تاثیر بہت تفصیل سے بتاتا۔ اس تاثیر کا تعلق ہمیشہ اور صرف زخموں کے اندمال سے ہوتا تھا اور مارگزیدگی کے علاج سے کبھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان چیزوں میں سے چند ہی ایسی نہیں جنھیں وہ سانپ کے شکاروں پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کا اندازہ مجھے کبھی نہ ہو سکا کہ وہ کون سی چیزیں ہیں۔ اس نے اس بارے میں مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ دراصل وہ سانپوں کے موضوعات پر بات ہی نہیں کرتا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک اس کی زبان کھل گئی۔

وہ بستی کے بازار کا دن تھا۔ دور دور سے خریدار بستی میں آئے ہوئے تھے، اور بستی والے جنگل سے جو کچھ جمع کرتے تھے اس کا سودا ہو رہا تھا۔ میں بازار کا ایک چکر لگا کر واپس آیا تھا۔ میں جدھر بھی گیا ادھر میں نے مارگیر کا ذکر سنا تھا۔ اس ذکر میں باہر سے آنے والے خریداروں کو بڑی دلچسپی تھی۔ لیکن خود مارگیر ہمیشہ بازار سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا اور خریداروں کی یہ خواہش کہ وہ بھی اس بستی کے مشہور مارگیر کو ایک نظر دیکھیں، اس بازار کے دن تک پوری نہیں ہوئی تھی۔ میں واپس آیا ہی تھا کہ بازار کی طرف سے آواز آئی:

"مارگیر! مارگیر!!"

اچانک مارگیر میرے سامنے تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں تھا اور اس کے چہرے سے ایسا جوش اور تجسس ظاہر ہو رہا تھا جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آواز لگتے ہی اس کا نمودار ہو جانا بھی میرے لئے نئی بات تھی۔ میں نے زمین پر جگہ صاف کرنا شروع کی لیکن اس نے مجھے روک دیا:

"نہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا:

"مجھے جانا ہے۔ کہیں سانپ نکلا ہے۔"

اس وقت مجھے بھی خیال آیا کہ اس بار جو آواز لگی تھی اس میں موت کی دہشت کی وہ لرزش نہیں تھی جسے سن کر مجھے جھرجھری آ جاتی تھی۔ یہ صورت میرے لئے نئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے ساتھ چلنے کو کہے گا یا نہیں، اتنے میں آواز پھر اتنے ہی فاصلے پر مگر اس مرتبہ بہت بڑے شور کی صورت میں سنائی دی:

"مارگیر، مارگیر، مارگیر!"

اور مارگیر مجھے آواز کی سمت لپکتا نظر آیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا لیکن جلد ہی وہ مجھ سے بہت آگے نکل کر غائب ہو گیا۔ شور ہو رہا تھا لیکن جب تک میں بازار کے قریب پہنچوں وہ بھی مدھم پڑتے پڑتے ختم ہو گیا۔ میں اور آگے بڑھا تو بازار کی اڑتی ہوئی گرد نظر آئی جو اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہاں کی کوئی شے دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے شور سننے کی کوشش کی لیکن اب ہر طرف ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جس کا بازار کے دن کے ساتھ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میرے قدم رک گئے اور کچھ دیر تک میں گرد کے مرغولوں کو پیچ کھاتے دیکھتا رہا۔ میں واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر رہا تھا کہ بازار کی طرف سے ایک بہت بلند تنہا آواز سنائی دی:

"کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں صرف سانپ پکڑتا ہوں۔"

یہ وہی آواز تھی جو میں نے سانپ سے ڈسے جانے والے دن اپنے سرہانے سے اٹھتی سنی تھی۔ لیکن اس دن اس میں پگھلتے ہوئے پتھروں کی سی یہ کیفیت نہیں تھی۔ اور اب یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوئی:

"کسی کو نہیں معلوم تھا؟"

جواب میں شاید کچھ کہا گیا اور مارگیر کی تنہا آواز پھر سنائی دی:

"اژدہا ہے، اژدہا ہے، سانپ ہے، سانپ ہے۔"

اور گرد کے مرغولوں کے آگے مجھے اس کا ہیولیٰ ہلتا دکھائی دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے اور اس نے کسی بھی لہجے سے عاری انداز میں کہا:

"یہ اژدہوں کی زمین نہیں۔ اس زمین کو میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔"

اس کا ہیولا دم بھر کے لئے جامد ہو کر پھر ہلا اور یکبارگی وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس کے چہرے کی کھال تنی ہوئی تھی اور آنکھیں بہت بڑی ہو گئی تھیں۔ مگر اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ شاید میں اسے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں اس کے راستے سے ہٹ گیا اور جب وہ میرے پاس سے گذرا تو

مجھے اس کے بدن سے ٹھنڈک کی لہریں نکلتی محسوس ہوئیں۔ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد بھی میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ گرد میں لپٹے ہوئے بازار میں داخل ہو جاؤں۔

بازار میں افراتفری تھی۔ خریدار نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو خاصے فاصلے پر وہ اپنی گاڑیوں کے پاس اکٹھا اور خاموش نظر آئی۔ بستی والے الگ الگ جتھے بنائے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری طرف جھپٹے۔ انھوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا اور میرے لئے اول اول ان کی باتوں کا ماحصل صرف یہ تھا کہ مارگیر ناراض ہے اور کیا میں اسے راضی کر سکتا ہوں۔ اژدہے یا سانپ کا ان کی باتوں میں نام تک نہیں آرہا تھا، البتہ کسی شخص کی بیوقوفی کا بار بار ذکر کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب میرے جواب کے انتظار میں خاموش ہو گئے۔ مجھے بھی خاموش دیکھ کر شاید ان کو احساس اور مجھے پورا واقعہ سننے کی دعوت دی گئی۔ اس کام کے لئے ایک شخص کا انتخاب کیا گیا جس کی خوش مزاجی بستی میں مشہور تھی۔ اس نے نہایت سنجیدگی اور بالکل غیر ضروری تفصیلات کے ساتھ بازار کے لگنے اور یکے بعد دیگرے خریداروں کے آنے کا بیان شروع کیا۔ اس بیان کے بیچ میں کسی نے تجویز پیش کی کہ یہ واقعہ خریداروں کی موجودگی میں بیان ہونا چاہیے۔ دو تین آدمی لپک کر خریداروں کے پاس پہنچے، کچھ دیر ان سے گفتگو کرتے رہے اور یہ تجویز لئے ہوئے واپس آئے کہ جہاں پر خریدار اور ان کی گاڑیاں ہیں وہیں سب جمع ہو جائیں۔ لہٰذا ہم لوگ سامان کے انباروں سے کتراتے ہوئے گاڑیوں کے پاس پہنچے۔ اب میں نے قریب سے خریداروں کو دیکھا۔

ان کے چہروں سے وہ اکتاہٹ ظاہر ہو رہی تھی جو کسی انتظار کے خالی اور غیر دلچسپ وقفے میں پیدا ہوتی ہے۔ مختلف حلیوں والے یہ خریدار مختلف مزاجوں لیکن یکساں حقیقت کے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔ اور بے تعلقی کا انداز انھوں نے شاید کسی باہمی معاہدے کے تحت اختیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے مجھ کو بھی بے تعلقی سے دیکھا اور واقعہ بیان کرنے والے کی طرف بھی بالکل توجہ نہیں کی۔ مگر اس سے بیان کرنے والے کے انہماک میں فرق نہیں آیا اور اس نے وہاں پہنچتے ہی بیان جاری کر دیا کہ کس طرح دور کے ایک خریدار کو اثنائے سفر میں ایک اژدہا نظر آیا، جس کا شکار ابھی پوری طرح اس کے حلق سے نہیں اترا تھا۔ وہ اپنے شکار کو نگلنے کی کوشش میں سست ہو رہا تھا اور بہت سے لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے۔ خریدار نے ان لوگوں کو راضی کر کے کسی طرح اژدہے کو اپنی گاڑی میں رکھوا لیا اور اس کی پیش بندی کر لی کہ وہ گاڑی سے نکلنے نہ پائے۔ جب وہ خریدار بستی کے بازار میں پہنچا اور وہاں مارگیر کا ذکر آیا تو اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے لوگوں کو اژدہے کا حال بتایا جسے سنتے ہی اس کی گاڑی کے گرد مجمع لگ گیا۔ سب اژدہے کو دیکھنے کے مشتاق تھے اور خریدار جو اچانک سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا گاڑی کا وہ حصہ ذرا سا کھولا جس میں اژدہا بند تھا۔ اب سب نے دیکھا کہ اژدہا گاڑی میں سے باہر نکلا چلا آرہا ہے، اور خوب چاق ہو رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ بازار میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا بلکہ بعض لوگوں کے خیال میں اس نے ان پر حملہ بھی کیا۔ بازار میں ابتری پھیل گئی۔ بستی والے اسے مارنے کے درپے تھے لیکن خریدار اسے زندہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس میں کچھ بدمزگی پیدا ہوئی۔ اسی بدمزگی کے بیچ میں کسی نے مارگیر کا نام لے دیا اور اس کا نام آتے ہی آواز لگنا شروع ہو گئی۔ اتنی دیر میں اژدہا ادھر پہنچ گیا جدھر چھوٹے جانور اور پرندے فروخت ہوتے تھے۔ مارگیر کے پہنچتے پہنچتے وہ ایک جانور کو منہ میں دبا چکا تھا اور لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک کسی کو مارگیر کے آجانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ آخر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن وہ انھیں بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ اسے اتنے غصے کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس نے اژدہے کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور اسی غصے کی حلات میں واپس چلا گیا۔

یہ بیان خاصا طویل تھا اور اس میں اجناس اور افراد کے ناموں کی بڑی فراوانی تھی۔ واقعہ بیان کرنے والا اگر کسی جنس کا نام لیتا تو اس کے انبار کی طرف اشارہ ضرور کرتا اور بتاتا کہ یہ کس کا مال ہے اور اس کا خریدار کون کون ہے۔ بستی میں سے اگر کسی فرد کا نام لیتا تو اس کو نہ صرف میرے سامنے بلاتا بلکہ اس کا مختصر تعارف بھی پیش کرتا۔ ان افراد میں سے کسی کسی کو میں سانپ کے شکار کی حیثیت سے پہچانتا بھی تھا۔ بہر حال بیان ختم ہوا اور اب پھر کئی کئی لوگوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ خدشہ تھا کہ مارگیر بستی چھوڑ کر چلا جائے گا اور ہر ایک کو یہ امید تھی کہ میں اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکتا ہوں۔ ہر ایک کو یہ اندیشہ تھا کہ مارگیر خاص طور پر اسی سے ناراض ہے اور ہر ایک یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ مارگیر کو بلانے کی تجویز اس کی نہیں تھی، بلکہ بعضوں نے تو اس تجویز کی مخالفت کرنے کا بھی دعویٰ کیا۔ خریدار البتہ خاموش تھے لیکن جب میں واپس چلا تو ایک بھاری ہاتھ نے میرا شانہ پکڑ لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ غالباً وہ خریداروں میں سب سے بوڑھا تھا اور اسے کم دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے قریب کیا اور بولا

"ہمیں معلوم ہوا کہ اژدہا اژدہا ہے، مگر اس سے یہ ضرور پوچھنا کہ جنھیں سانپ زندہ نگل جاتا ہے کیا ان کے حق میں سانپ بھی اژدہا نہیں ہے؟"

اس کے بعد وہ دیر تک اپنی آنکھوں پر زور ڈال کر مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے خود مجھ سے اس سوال کے جواب کا طالب ہو۔

"اور اسے یہ بتانا مت بھولنا کہ اگر وہ بستی کے لئے ضروری ہے تو ہم بھی ضروری ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اور اگر کبھی اس فیصلے کی نوبت آگئی کہ کون زیادہ ضروری ہے." وہ رکا اور میں سوچنے لگا کہ اس کی آواز اس کے حلئے سے میل نہیں کھاتی۔

"اگر وہ چاہے تو تم اسے میرا نام بھی بتا سکتے ہو۔" اس نے کہا اور میرا شانہ چھوڑ دیا لیکن اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔

واپسی میں بستی والے کچھ دور تک میرے ساتھ چلے لیکن اب وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور کسی ایسے اندیشے میں گرفتار تھے جو مجھ پر واضح نہ ہو سکا۔

ان کی گفتگو سے اس بات کا مبہم سا اظہار ضرور ہوا کہ مارگیر کو خریداروں کا بستی میں آنا اور خریداروں کو بستی میں مارگیر کا ہونا پسند نہیں۔ لیکن وہ سب یقین کے ساتھ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اس ناپسندیدگی کا اظہار نہ خریداروں کی طرف سے ہوا ہے نہ مارگیر کی طرف سے۔

مارگیر مجھے اس چٹائی پر بیٹھا ہوا ملا جو سانپ کے مردہ شکاروں پر ڈالی جاتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا سا سرک گیا اور ہلکی سی جھجک کے بعد میں بھی اس چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے انگوٹھوں کے لمبے نیلگوں ناخنوں کو اپنے لباس پر رگڑ رہا تھا اور خاموش تھا۔ کپڑے پر ناخنوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ آواز کہیں بہت دور سے آ رہی ہے۔ پھر یہ آواز قریب ہونے لگی اور اچانک بہت تیز ہو گئی، لیکن اب یہ باہر سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پل بھر کو اندھیرا سا چھا گیا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آواز پھر ہلکی پڑتے پڑتے بہت دور ہو گئی۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا۔ زمین بھیگی ہوئی تھی اور درختوں کے پتوں سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ لیکن آسمان بالکل صاف تھا۔

"بیٹھو۔" مارگیر کہہ رہا تھا۔ "یہاں کبھی کبھی ایسی بھی بارش ہوتی ہے۔"

میں بیٹھ گیا۔

"تم کہاں تھے؟"

میں نے اسے بازار کی مختصر روداد بتا دی لیکن بوڑھے خریدار کی گفتگو اور اس کے بعد بستی والوں کی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔

"وہ اژدہے اور سانپ کو ایک سمجھتے ہیں۔" مارگیر شکایت کے انداز میں بڑبڑایا۔ "انھوں نے دونوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا ہے۔ ان کے لئے دونوں رینگتے ہوئے جاندار ہیں؛ ایک بڑا، ایک اس سے چھوٹا۔ زہر کا فرق ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے میری طرف دیکھا اور چپ ہو گیا۔ اس کے لہجے کے جواب میں اپنی خاموشی مجھے مناسب نہیں معلوم ہوئی اور میں نے پوچھا:

"زہر کا فرق خود سانپوں میں نہیں ہوتا؟"

"سانپ صرف وہ ہے جس کے پاس زہر ہوتا ہے۔ باقی سارے رنگ برنگے کیڑے ہیں اور سانپ بھی صرف اسی وقت تک سانپ ہے جب تک وہ اپنے زہر سے کام لے سکتا ہے۔ اسی لئے مرا ہوا سانپ بھی سانپ نہیں رہ جاتا۔"

"لیکن زہریلے سانپ کی قسمیں..."

"قسمیں زہر کی ہوتی ہیں، سانپ کی نہیں۔"

"اور جن سانپوں... رنگ برنگے کیڑوں کا کاٹا ہوا آدمی وہم سے مر جاتا ہے...؟"

"وہ اس وہمی کے لئے سانپ ہیں لیکن حقیقت میں... وہ رکا، پھر بولا۔ تم باتیں اچھی کر سکتے ہو۔ معلوم نہیں کیوں۔ لیکن یہ قسم... یہ وہم سے مر جانے والی قسم آدمیوں کی ہے، ان رینگنے والوں کی نہیں اور ان رینگنے والوں کے لئے آدمی کی یہی قسم سب سے زہریلی ہے۔ اس لئے تم دیکھتے ہو کہ میں اس قسم والوں کا علاج کیا کرتا ہوں۔"

مجھے مارگیر کے یہاں لائے جانے والے بعض شکاروں کی چیخ پکار یاد آئی، اور میں نے پوچھا:

"ان رنگ برنگے کیڑوں کی خاطر؟"

"دونوں کی خاطر... مگر..." اس نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تمھیں رنگ برنگے کیڑوں والی بات کیوں اچھی نہیں لگی؟ اچھا تمھاری خاطر میں سانپ کی دو قسمیں مان لوں گا، ایک وہ جس کے کاٹنے سے آدمی صحیح مرتا ہے، ایک وہ جس کے کاٹنے سے آدمی غلط مرتا ہے۔"

مگر یہ پھر آدمیوں ہی کی قسمیں ہوئیں، میں نے سوچا اور شاید وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن نہ میں نے کچھ کہا نہ اس نے

اس کے بعد وہ دیر تک خاموش رہا۔ ایک بار اس نے اپنے ناخنوں کو غور سے دیکھا۔ کچھ دیر تک چٹائی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر بولا:

"اس سے پہلے میں جس جگہ تھا وہاں اژدہے بہت تھے۔ ہلاک کرنے والی چیزوں سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے میں اژدہوں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ میں ہمیشہ اس تاک میں رہتا تھا کہ اژدہے کو شکار کرتے دیکھوں، اور میں نے یہ منظر بہت دیکھا، یہاں تک کہ اژدہے اور اس کے شکار کا رشتہ میری سمجھ میں آنے لگا۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہر شکاری کا اپنے شکار سے ایک رشتہ ہوتا ہے۔"

میں نہیں جانتا لیکن میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہر شکاری کی طرح... ہر شکاری جانور کی طرح، اژدہے کو شکار کی تلاش اس وقت ہوتی ہے جب وہ بھوکا ہوتا ہے۔ وہ کسی درخت سے لپٹ کر انتظار کرتا رہتا ہے، کبھی بلندی پر انتظار کرتا ہے، کبھی زمین کے قریب آ کر، کبھی ایک جگہ سے مایوس ہو کر دوسری جگہ جاتا ہے اور انتظار کرتا رہتا ہے۔ آخر شکار اس کے نزدیک سے گذرتا ہے اور دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اژدہے کو نزدیک آتے ہوئے شکار کی خبر نہیں ہے۔ لیکن اچانک وہ تڑپتا ہے اور شکار کے بدن سے لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ شکار بھی تڑپتا ہے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ موت سے دوچار ہے، اس لئے وہ پوری قوت سے تڑپتا ہے اور اژدہے کے بلوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بل اس کے گرد بڑھتے اور کستے جاتے ہیں۔ یہ جنگ بہت سخت مگر بالکل خاموش ہوتی ہے اور کبھی کبھی دیر تک جاری رہتی ہے۔ آخر اس کی شدت میں کمی ہونے لگتی ہے۔ وہی موت سے دوچار ہونے کا خیال جو شروع میں شکار کی قوت بڑھاتا ہے۔ اب اس کی قوت کو گھٹاتا ہے اور یہاں پہنچ کر اژدہا اسے نگلنا شروع کرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جیت جانے کی چمک نہیں ہوتی۔" مارگیر نے آہستہ سے مٹھیاں بند کر لیں۔ "میں نے ہمیشہ دونوں کی آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا ہے، اور ہمیشہ مجھے دونوں کی آنکھوں میں ایک سناٹا دکھائی دیا ہے جیسے وہ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے ہوں۔ اور اس سناٹے کے پیچھے ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں کبھی افسردگی ہوتی ہے، کبھی ایک طرح کی جھینپ اور کبھی صرف اکتاہٹ، جیسے وہ خواہش کے بغیر اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہوں۔ اس لئے کبھی کبھی، شاید یہ میرا

وہم، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے..." وہ رک گیا اور پھر بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس نے اپنی بات پوری نہیں کی۔

"تم نے اژدہوں کی زمین کیوں چھوڑی؟" آخر میں نے پوچھا لیکن اس نے شاید سنا نہیں۔

"دم نکلنے تک شکار اژدہے کے بلوں سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا، اگرچہ آخر میں یہ کوشش محض زندہ رہنے کی رسم ادا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ بڑا مکروہ منظر ہوتا ہے۔ لیکن ایک بار اژدہے کی پکڑ میں آجانے کے بعد شروع سے آخر تک شکار کو یہ معلوم رہتا ہے کہ وہ موت سے دوچار ہے اور کیوں دوچار ہے۔ آخری سانس تک وہ اژدہے کے وجود کو اور اژدہا تو اس کے بھی بعد تک اپنے شکار کے وجود کو محسوس کر سکتا ہے۔ دونوں کے لئے یہ پورا کھیل سامنے کا ہوتا ہے۔ اور سامنے کا کھیل..." وہ پھر رک گیا اور پھر اس نے اپنی بات پوری کی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اچانک اسے میرے وجود کا احساس ہوا۔ اس نے پوچھا:

"جس وقت تم پر سانپ کا زہر چڑھ رہا تھا اور تم مرنے کے قریب ہو رہے تھے، اس وقت خود وہ سانپ کہاں تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اس وقت وہ تم سے کہیں بہت دور ہوگا اور ممکن ہے کہ اس بیچ میں اسے کچھ ایسی باتیں پیش آگئی ہوں کہ اس نے تمھیں بالکل فراموش کر دیا ہو۔ شاید تم نے اس کو دیکھ لیا تھا، اس لئے تم بھاگ رہے تھے، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہ ہوتا۔ تم سمجھتے کہ تمھارے پیر میں کوئی چھوٹا سا کانٹا چبھ گیا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ جھک کر پیر کو سہلا لیتے۔ اس کے بعد بھول جاتے کہ تمھارے پیر میں کانٹا چبھا تھا۔ اس کے بعد تم کتنا فاصلہ طے کر لیتے۔ اس کے بعد زہر چڑھنا شروع ہوتا اور تمھاری سمجھ میں نہ آتا کہ تمھیں کیا ہو رہا ہے۔ تمھیں خیال بھی نہ آتا کہ کسی جگہ کسی وقت تمھارے پیر میں جو چبھن ہوئی تھی وہی تم کو مارے ڈال رہی ہے۔ تمھاری سمجھ ہی میں نہ آتا کہ تم کس کا شکار ہوئے ہو۔ اور تمھارا شکاری بھی تمھاری ہی طرح لاعلم ہوتا۔ بلکہ اس کا ہونا بھی کیا ضروری ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تمھارا شکاری اس سے پہلے ہی معدوم ہو چکا ہوتا۔ لیکن اب تمھارے لئے اس کے زندہ یا مردہ، قریب یا دور ہونے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس لئے کہ سانپ کا کھیل سامنے کا نہیں ہوتا۔ سامنے کا کھیل اژدہے کا ہوتا ہے۔"

میں نے اسے خریدار کی بات بتائی کہ چھوٹے جانوروں کے حق میں سانپ بھی اژدہا ہے۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "خریداروں کے دماغ میں ایسے سوال زیادہ آتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانپ انسان کے حق میں اژدہا نہیں ہے، اور اژدہا کسی کے حق میں بھی سانپ نہیں ہے۔ لیکن یہ کتنا بڑا فرق ہے وہ نہیں سمجھ سکتے۔"

میں اسی فرق پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مار گیر نے پوچھا:

"تم نے آج سے پہلے بھی اژدہا دیکھا تھا؟"

جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے آج سے پہلے بھی اور آج بھی اژدہا نہیں دیکھا تھا تو اس نے پہلو بدلا اور مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ ہماری گفتگو پھر ایک سوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح گفتگو کا موضوع بدل جائے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اس سے اس اچانک برس کر نکل جانے والے بادل کے بارے میں دریافت کروں لیکن اسی وقت اس نے پوچھ لیا:

"اژدہے کے متعلق انھوں نے تم کو کیا بتایا؟"

مجھ کو بتانا پڑا کہ میں نے ان سے اژدہے کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی ہیں۔ بہت دیر تک خاموشی رہی۔ آخر وہ بولا:

"خیر اگر تم نہیں چاہتے تو میں تمھارے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک سانپ کے مختلف زہروں اور ان کے اثرات کے بارے میں بولتا رہا لیکن یوں جیسے خود اپنی یادداشت تازہ کر رہا ہو۔ اچانک ایک آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑا۔

سامنے تین اجنبی کھڑے ہوئے تھے۔

"تم وہاں نہیں ملے، یہاں چلے آئے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

مار گیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اتنی رات ہو گئی!" اس نے حیرت سے کہا۔

وہ تینوں بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا:

"کیا اس کے سامنے؟"

"نہیں۔" مار گیر بولا۔ "آؤ۔" اور وہ ان کو اپنے آگے بڑھاتا گھر کے اندرونی حصوں میں لے گیا۔

وہ بستی کے آدمی نہیں تھے۔ بازار میں جن خریداروں کو میں نے دیکھا تھا ان سے وہ یقیناً بہت مختلف تھے، لیکن ان میں کوئی بات تھی جس کی وجہ سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ تینوں بھی خریدار ہیں۔

(۴)

اسی رات صبح صادق سے کچھ پہلے آواز لگی اور بے ہوش آدمی لایا گیا۔ اس کے ساتھ ایک مرا ہوا سانپ بھی تھا۔ ساتھ والوں نے بتایا کہ انھیں اس کی چیخ سنائی دی تھی اور جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہ بے ہوش تھا۔ سانپ انھیں اس کے قریب ہی مل گیا تھا۔ انھیں لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس شخص کو پہلے بھی ایک سانپ نے کاٹا تھا۔ وہ لوگ اس پہلے واقعے کی تفصیل بتا رہے تھے کہ مار گیر سامنے آ گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا اور بے ہوش شخص پر جھک گیا۔ پھر اس نے سانپ کو غور سے دیکھا۔ پھر بے ہوش شخص پر جھک گیا۔ اسی طرح دیر تک باری باری وہ دونوں کو دیکھتا رہا۔ آخر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور بالکل کھوکھلی آواز میں بولا:

"اسے لے جاؤ۔"

شاید یہ ان لوگوں کیلئے نئی بات تھی۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں ایک

دوسرے سے کچھ مشورہ کر رہے تھے کہ مارگیر کی قدرے بلند آواز سنائی دی۔

"اس نے بتایا تھا؟"

میں نے بتایا کہ وہ لوگوں کو بے ہوش ملا تھا اور انھیں اس کی صرف چیخ سنائی دی تھی۔

"اسے سانپ نے نہیں کاٹا ہے۔" مارگیر نے کہا اور واپس چلا گیا۔ بے ہوش شخص کے ساتھ والوں نے کچھ بولنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی حالت بگڑتی نظر آئی اور وہ اس کی طرف لپکے۔

اسی وقت دور پر پھر آواز لگی۔

"مارگیر! مارگیر!!"

بے ہوش شخص کے ساتھ والوں نے اسے اٹھایا اور سب باہر نکل گئے۔

ذرا دیر بعد ایک اور مجمع گھر میں داخل ہوا جس میں کچھ لوگ اس سے پہلے والے مجمع کے بھی تھے۔ اس مجمع کے ساتھ بھی ایک بے ہوش شخص تھا اور بظاہر اس کی بھی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس بار مجھے کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی بلکہ جب مارگیر آیا تو اس کے سوال کے جواب میں بھی سب خاموش رہے۔ شاید وہ لوگ یہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ ان میں سے کس کو بولنا ہے۔ لیکن اتنی دیر میں مارگیر بے ہوش شخص پر جھکا تھا۔ مجمع میں سے ایک شخص جو بہت بے چین معلوم ہو رہا تھا آگے بڑھ کر مارگیر کے قریب آ گیا:

"سانپ ہی نے کاٹا ہے؟" اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا، اور مارگیر نے چٹائی پر پھیلے ہوئے مردہ سانپ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پہلی بار میں نے دیکھا کہ علاج شروع ہونے سے پہلے ہی مارگزیدہ کے ساتھ آئے ہوئے مجمع میں اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"دودھ۔" مارگیر نے کہا اور کچھ لوگ دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ سب سمجھ گئے تھے کہ علاج زہر مہرہ سے ہوگا لیکن ان کی یہ امید کہ انھیں زہر مہرے کا عمل دیکھنے کو ملے گا پوری نہیں ہوئی اس لئے کہ مارگیر نے دودھ آ جانے کے بعد ان سب کو باہر بھیج دیا۔

زخم کا پتہ نہیں لگ رہا تھا۔ مارگیر نے شکار کے بدن پر خود ایک زخم لگایا۔ زہر مہرہ اس زخم سے بھی چپک گیا۔ جب میں اس پر قطرہ قطرہ دودھ ٹپکا رہا تھا تو مجھے مارگیر کی آواز سنائی دی:

"مجھے نہیں معلوم اور شاید کسی کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ہے۔ اسے پرانے لوگوں نے بتایا تھا یہ قدرتی چیز ہے، کوئی پتھر یا نباتات، یا کسی قسم کا جاندار۔"

"جاندار؟" میں نے پوچھا۔ اسی وقت زہر مہرہ بے ہوش ہو کر گرا۔

"یہ بے ہوشی۔" مارگیر بولا۔ "یا شاید کچھ دیر کی موت، کیا اس کے جاندار ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟ اور اس کے جاندار ہونے کا کیا ثبوت ہے؟"

اس نے زہر مہرہ کو دودھ کے برتن میں سے نکال کر زخم سے چپکا دیا۔

"تمھیں تعجب ہوگا۔" وہ کہنے لگا۔ "کہ میں سب سے زیادہ سانپ سے ڈرتا ہوں۔" مجھے واقعی تعجب ہے اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

"لیکن کبھی کبھی سانپ سے بھی زیادہ ڈر مجھے زہر مہرے سے لگتا ہے۔"

اسی وقت شکار کے بدن کو حرکت ہوئی اور مارگیر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جس وقت شکار اپنے پیروں پر چلتا ہوا باہر گیا ہے، دھوپ پھیل چکی تھی۔ مارگیر نے زہر مہرے کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں کر کے آہستہ سے رگڑتے ہوئے کہا:

"اس کا کھیل سامنے کا ہوتا ہے لیکن کوئی اسے سمجھ نہیں پاتا۔ یہ ڈرنے کی بات ہے یا نہیں؟"

"شاید،" میں نے کہا، "لیکن اگر..."

"اور یہ زہر قاتل ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں یہ خود بھی نہایت مہلک ہے۔ مگر کس طرح؟ میرے پاس ایک ہلاک کرنے والی چیز ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیوں کر ہلاک کرتی ہے۔ اسی لئے مجھے اس سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اور جب اس ڈر میں یہ خیال بھی شامل ہو جاتا ہے کہ یہ چیز شاید جاندار ہے..."

مجھے نیند آ رہی تھی مگر یہ کسی اور طرح کی نیند تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کھوکھلا ہوتا جا رہا ہوں اور اگر میں سو گیا تو میرا بدن باقی نہ رہے گا۔ میں چاہ رہا تھا کہ مارگیر بولتا رہے تاکہ مجھے نیند نہ آئے۔ لیکن میں اس کا ایک ہی جملہ سن سکا:

"اسی طرح کبھی کبھی مجھے اپنے آپ سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔"

اس کے بعد وہ مجھے اپنی طرف جھپٹتا دکھائی دیا۔

(۵)

مجھے آج تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں نے ان دھندلے سایوں کے درمیان کتنا وقت گذارا۔ شروع شروع میں مجھے ہلکی آہٹوں کے سوا کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد آہٹوں کے ساتھ کچھ ہاتھوں نے مجھے چھونا شروع کیا۔ یہ ہاتھ کبھی کبھی مجھے کوئی چیز بھی پلاتے تھے جس کے ساتھ میری ناک میں تلخ دھوئیں کی سی بو آتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے مجھے ہر وقت ایک سیاہ پردہ تنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخر ایک بار اس پردے میں ہلکی ہلکی لہریں پڑنے لگیں جو رفتہ رفتہ دھندلے سایوں میں بدل گئیں۔ ابتدا میں یہ سایے میرے لئے قابل فہم تھے، لیکن پھر ایسا ہونے لگا کہ جو شکل میں چاہتا تھا سائے وہی شکل اختیار کر لیتے تھے، اور یہ میرا ایک کھیل ہو گیا۔ ان بدلتی ہوئی شکلوں کے سوا جو میری مرضی کی پابند تھیں مجھے کسی چیز کے بارے میں کوئی تجسس نہیں تھا اور اپنے حواس سے ٹکرانے والی ہر بات مجھے بالکل فطری اور ہمیشہ سے ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ آوازیں مجھ سے سوال کرتی تھیں جن کا جواب دینے کے لئے مجھے ان سوالوں کو سمجھنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، بلکہ کبھی کبھی تو میں کسی سوال کے بغیر بھی جواب دینے لگتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح میں کوئی بہت بڑا فرض ادا کر رہا ہوں۔ میں ہر طرح اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔

لیکن ایک بار اچانک مجھے اپنا بولنا برا معلوم ہونے لگا اور میں جملے کے بیچ

ہی میں خاموش ہو گیا۔ کسی نے مجھ سے کوئی سوال کیا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد میں زیادہ تر سوتا اور خواب دیکھتا رہا۔ ایک خواب میں نے یہ دیکھا کہ جنگل میں ہری بیلوں کے درمیان مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ میں مار گیر کے یہاں پہنچایا گیا ہوں اور وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے سانپ نے نہیں کاٹا ہے۔ لوگ اس کی منت سماجت کر رہے ہیں۔ وہ اس سے صرف یہ کہلوانا چاہ رہے ہیں کہ مجھے سانپ ہی نے کاٹا ہے۔ وہ بار بار اس کی طرف بڑھتے ہیں اور پیچھے ہٹتے ہیں۔ اس میں میرا بدن جھکولے کھا رہا ہے، اور اسی میں میری آنکھ کھل گئی۔

مار گیر جھکا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر وہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور ایک طرف سرک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑھ کر میرے قریب آ گیا۔

"مجھے دیکھنا برا تو نہیں لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں بہت سے گدوں کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ میرے آس پاس کچھ برتن رکھے تھے جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔ چاروں طرف کشادہ در تھے جن میں سے ہر ایک پر کسی باریک کپڑے کے کئی کئی پردے لٹک رہے تھے۔ مار گیر نے ایک در کے پردے سرکا دیے۔ کھلے ہوئے در سے آتی ہوئی تیز روشنی مجھے بہت عجیب اور بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ مگر میں نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ میں کسی چیز کو دیکھنے کی توقع کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے، اور باہر جو کچھ تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ مار گیر نے پردے برابر کر دیے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے مار گیر کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا:

"آج میں اسے لے جاؤں گا۔"

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مار گیر سامنے روشنی لیے کھڑا تھا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

کئی ہاتھوں نے مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور انھیں ہاتھوں کے سہارے میں باہر آیا۔ روشنی سیدھی میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی اس لیے میں کسی کو دیکھ نہ سکا۔ مجھے ایک گاڑی میں بٹھایا گیا اور جب گاڑی چلی تو میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ روشنی بھی نہیں تھی۔ راستے بھر میں سوتا جاگتا رہا۔ آخر گاڑی رکی اور مار گیر مجھے روشنی لیے ہوئے دکھائی دیا۔ اس نے مجھے نیچے اتارا۔ سامنے اس کا مکان نظر آ رہا تھا۔

"خود سے چل کر دیکھو۔" اس نے کہا اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت مار گیر نے کچھ کہا اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بستی کے مکانوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مار گیر میرے قریب آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب روشنی نہیں تھی اور تین دھندلے سائے گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔

"اندر آ جاؤ۔" مار گیر کی آواز سنائی دی۔

کئی دن تک میں باہر نہیں نکلا۔ شاید میرا جی نہیں چاہا یا شاید میں نے فرض کر لیا تھا کہ مار گیر مجھے باہر نہیں جانے دینا چاہتا۔ میں نے اس کی اس خواہش کی کچھ نہایت مبہم تاویلیں بھی کی تھیں جو اب مجھے یاد نہیں۔ لیکن درحقیقت اس دوران میں نے مار گیر کو دیکھا ہی بہت کم۔ اس عرصے میں میرا حافظہ بہت تیز ہو رہا تھا۔ مجھے ہر بات تمام تفصیلات کے ساتھ یاد آتی تھی، لیکن مختلف باتوں کو ترتیب وار یاد کرنے میں مجھ کو کامیابی نہ ہوتی تھی۔ مثلاً اپنا سانپ سے ڈسا جانا مجھے اس کے بعد کا واقعہ معلوم ہوتا تھا۔ جب جنگل میں مار گیر نے سانپ نکال کر پھینکا تھا۔ ناچار میں دواؤں کے اس سامان کی طرف متوجہ ہو گیا جو مار گیر جنگل سے فراہم کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مار گیر آخری بار جو سامان میرے ساتھ لایا تھا اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ میں نے اس میں کی ہر ہر چیز اٹھا کر دیکھی اور اس کے متعلق مار گیر نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب مجھے یاد آنے لگا۔ مجھے درخت کی وہ کھرچی ہوئی چھال بھی ملی جس میں سے مانوس خوشبو نکلتی تھی۔ مار گیر نے اس کی بہت سی تاثیریں بتائی تھیں لیکن یہاں میرا حافظہ جواب دے گیا اور بہت کوشش کے باوجود مجھے کوئی ایک تاثیر بھی یاد نہ آئی، بلکہ جب میں نے دماغ پر زیادہ زور دیا تو یہ بھی بھول گیا کہ یہ درخت کی کھرچی ہوئی چھال ہے۔ بار بار ایسا ہی ہوا، پھر یہ ہونے لگا کہ اس چھال کو دیکھتے ہی بلکہ اس کا خیال آتے ہی میری ناک میں اس کی خوشبو آنے لگتی اور مجھے گھر میں ٹھہرنا دوبھر ہو جاتا۔

ایسے ہی ایک موقع پر مجھے دور کہیں بچوں کے شور کرنے اور بارش کی سی آواز سنائی دی۔ میں باہر نکل آیا اور آواز کی سمت چلا۔ مجھے دور پر سبزی مائل ڈھیر ادھر ادھر سرکتے نظر آئے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ بڑے بڑے پتوں والی بیلوں کو چھوٹے چھوٹے بچے گھسیٹے پھر رہے تھے اور اس کھیل سے بہت خوش تھے۔ بعض بچے بیلوں کے بیچ میں کود پڑتے اور کچھ دور تک ان کے ساتھ گھسٹتے چلے جاتے تھے۔ وہ اس طرح پاؤں چلاتے تھے جیسے پانی میں کھیل رہے ہوں۔ ان کے پیچھے پتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی پگڈنڈیاں سی بنتی جاتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بچوں کا جوش بڑھ گیا اور انھوں نے چلانا شروع کیا:

"مار گیر! مار گیر!!"

کچھ دیر تک مجھ کو ان کی آوازیں سنائی نہیں دیں۔ مجھے جنگل کی طرف سے واپس آتے ہوئے لوگ گلیارے میں لپکتے نظر آئے۔ ذرا دیر میں بچوں کے پاس مجمع لگ گیا۔ اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی اور مجھے اپنی پشت پر مار گیر کی آواز سنائی دی:

"تمھیں دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے۔"

اس کے جانے کے بعد بچوں نے پھر بیلوں سے کھیلنا چاہا، لیکن بڑوں نے انھیں روک دیا۔ وہ بچوں کو کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔

اس وقت میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ جنگل کی طرف سے خالی ہاتھ لوٹے ہیں۔

(۶)

دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ میری آنکھ پیروں کی ہلکی چاپ سے

کھلی۔ بستی کے دو آدمی میرے سرہانے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جس کی خوش مزاجی مشہور تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے میری طبیعت کا حال پوچھا پھر کہنے لگا:

"اتنے دن میں تم بہت بدل گئے ہو، مددگار۔ ہم سب تمھیں دیکھنا چاہتے تھے، کل موقع تھا لیکن آواز..." وہ اچانک افسردہ ہو گیا... "لیکن شاید تم آواز ہی پر باہر نکلے تھے۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں بچوں کا شور سن کر باہر آیا تھا اور آواز انھوں نے مجھے دیکھ کر لگائی تھی۔

"اگر یہ بات تم اسے بھی بتا دو۔۔۔" اور وہ پھر افسردہ ہو گیا۔ "یہ کیوں کر ہو سکتا ہے مددگار کہ بچے وہ نہ کریں جو ان کے بڑے کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھی نے اسے کچھ یاد دلایا اور اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ میں نے کہا:

"کل جب میں نے تم لوگوں کو خالی ہاتھ جنگل سے واپس آتے دیکھا..."

"ہم جانتے تھے کہ تمھیں رنج ہوگا۔" اس نے کہا اور اس کی خوش مزاجی لوٹ آئی، "مددگار، ہم سب تمھیں صرف تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا، سب اکٹھا ہیں۔ ہمیں معلوم ہے تمھیں زیادہ دیر تک باہر نہیں رہنا چاہئے۔"

"اور تم ابھی ابھی جاگے ہو۔" اس کا ساتھی بولا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بستی والوں کے جنگل جانے کا وقت تھا۔ وہ سب مجھے گلیارے میں ملے۔

"دیر تک وہ مجھے خاموشی اور افسردگی کے ساتھ دیکھتے رہے، یہاں تک کہ مجھ سے نہ رہا گیا۔

"مجھے ٹھیک سے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے کہا، پھر بھی اگر تمھیں کچھ پوچھنا ہے..."

وہ سب میرے قریب آ گئے اور اب انھوں نے مجھ سے سوال کرنا شروع کئے، لیکن ان کے کسی بھی سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے اس کا جواب بھی طلب کر رہے ہیں، بلکہ ان کے سارے سوالوں کا رخ بظاہر میری طرف تھا بھی نہیں۔ ایک سوال ہوتا اور کئی لوگ اسے مسترد کر دیتے اور خود نئے سوال کرتے جنھیں دوسرے مسترد کر دیتے، اس لئے بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کے سارے سوال آپس ہی میں ہیں دراصل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کون سے سوال ہیں جن کے جواب مجھ سے مل سکتے ہیں۔ ان سب کے چہروں پر ایسی تھکن اور لہجے میں ایسی ناامیدی تھی کہ مجھے اپنا ان میں سے نہ ہونا برا لگنے لگا لیکن جلد ہی میں ان سوالوں کی لپیٹ میں آ گیا جو مجھے صاف صاف سنائی دے گئے تھے۔ کیا پہلی بار سانپ نے مجھے کاٹا تھا؟ مجھے دو بار سانپ نے کاٹا تھا یا صرف دوسری بار؟ میں نے بستی میں آنے کے لئے جنگل کا راستہ کیوں اختیار کیا؟ کیا مجھے واقعی ان لوگوں کو خالی ہاتھ واپس آتے دیکھ کر رنج ہوا تھا؟ پھر جنگل کیوں کٹ رہا ہے؟

"جنگل کیوں کٹ رہا ہے؟" میں نے اس آخری سوال کو دہرایا۔

"ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" ایک بوڑھا بولا۔ "ہم اس پر پلتے رہے اور اب ہم ہی اس کو کاٹ رہے ہیں۔" اس نے مایوسی کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

"تم لوگ جنگل کاٹ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"ہمیں تو کچھ کرنا ہی ہے، مددگار، اپنا کام نہ سہی دوسروں کا کام سہی۔ اور سچ پوچھو تو اب بھی ہم جنگل پر پل رہے ہیں، مگر کب تک؟"

"یہ بستی بہت اچھی ہے، مددگار۔" ایک اس سے بھی زیادہ بوڑھا آدمی بولا۔ "یہاں سانپ ضرور زیادہ ہیں، لیکن یہاں مار گیر بھی ہے۔"

اس کے بعد وہ سب جنگل کی طرف مڑ گئے۔ صرف وہ بوڑھا سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولا:

"یہ بستی بہت اچھی تھی، مددگار۔"

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم سے بہت سے سوال کئے گئے ہیں۔" مار گیر بولا۔ "لیکن وہ خود بھی نہیں جانتے کہ تم ان سوالوں کا جواب دے سکو گے یا نہیں۔ ایسا ہے کہ تم اجنبی ہو اس لئے انھیں خیال ہوتا ہے کہ جو انھیں نہیں معلوم شاید تمھیں معلوم ہے۔ اجنبی ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے، مددگار۔" اس نے پہلی مرتبہ میرا نام لیا۔ "شاید ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔"

"میں نہیں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے پھر کہا۔

"ان کے سوالوں سے تمھاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟"

میں نے بستی والوں کے وہ سوال دہرا دیے جو میں نے صاف صاف سنے تھے۔ مار گیر سر جھکائے سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا:

"تمھیں اچھی طرح یاد ہے کہ یہ سوال اسی طرح ایک کے بعد ایک پوچھے گئے تھے؟"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ واقعی مجھے آخری سوال کے سوا کہ جنگل کیوں کٹ رہا ہے، ان سوالوں کی صحیح ترتیب یاد نہیں تھی۔ مار گیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ کئی بار اس کی نظریں جھکیں اور اٹھیں پھر اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بہت نرم اور نیچی آواز میں بولا:

"نہیں! اب اسے یاد نہ کرو ورنہ تمھارا دم گھٹ جائے گا۔ کیا پہلے ہے اور کیا بعد میں، اس کے بھولنے سے بڑا فرق ہو جاتا ہے، مددگار۔ اور جتنی طرح سے بھولو گے، فرق بھی اتنی ہی طرح کا ہوگا۔"

"مجھے سوالوں کی ترتیب یاد نہیں آ رہی ہے۔"

"اب اسے بھول جاؤ اور غنیمت سمجھو کہ تمھارا سامنا صرف سوالوں سے تھا۔" وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ "اگر ان کے ساتھ جواب بھی ہوتے، جن میں سے بعض

خودسوال کی صورت میں ہو سکتے تھے اور تمھیں یہ معلوم نہ ہو پاتا کہ ان میں کوئی جواب کس سوال کا ہے، یا کون سوال کس جواب یا سوال کے بعد کا ہے، اور اس کے بعد کا سوال کون سا ہے، اور ہر بار..." اس کی آواز تھمتی گئی۔

کیا یہ رو رہا ہے؟ میں نے سوچا اور اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں اور آواز صاف ہو چکی تھی۔

"...اور ہر بار جب تم اسے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہو اور اس میں شک پڑتا تو جتنا تم جانتے ہو اس پر بھی تمھیں افسوس ہوتا۔" اس نے کہا، اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ یاد کرنا چاہتا ہے اور اس میں شک پڑ رہا ہے۔

"جب میں نے کہا تھا کہ میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو میرا مطلب..."

"اور مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا تھا کہ تم جاننا چاہتے ہو۔ اتنے دن میں تم بہت بدل گئے ہو، مددگار۔"

"مجھے بستی والوں کا خیال تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔" مارگیر بولا۔ پھر اس کی آنکھیں بھی دھندلا گئیں۔ اور اس نے بھی وہی بات کہی۔ "یہ بستی بہت اچھی تھی مددگار۔"

وہ اٹھ کر جانے لگا۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔

"جنگل کیوں کٹ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"واقعی تم بہت بدل گئے ہو۔" اس نے قدرے مایوسی سے کہا۔ "پھر بھی تم اجنبی ہو، اور یہاں، اس معاملے میں، اجنبی ہونا بری بات نہیں۔ خیر، مددگار، میں خود بھی تمھیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ کوئی اطلاع نہیں، اطلاع دینا میرا کام نہیں۔" وہ آہستہ سے غرایا۔ اور اس وقت اسے دیکھ کر مجھے جال میں پھنسے ہوئے درندوں کا خیال آیا۔

"جب میں نے کہا تھا میں جاننا چاہتا ہوں..."

"دیکھو، مددگار،" اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بیٹھتے ہوئے کہا، "تم جانتے ہو، ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اور جو کوئی کچھ کرتا ہے اس کا سامنا خریدار سے ہونا ضروری ہے۔ خواہ اس کے پاس بیچنے کو کچھ نہ ہو، اس کا سامنا خریدار سے ضرور ہوتا ہے۔ اور خریدار اپنا فائدہ دیکھتا ہے اور اپنے نفع کا خیال رکھتا ہے۔ یہ برا ہے نا؟ اس سے بھی برا یہ ہے کہ اگر خریدار صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کو نفع ہوا ہے اور دوسرے کا نقصان اسے نظر نہیں آتا تو اسے اپنے نفع میں بھی شک پڑ جاتا ہے۔ اور کتنے خریدار تو ایسے ہیں جو اپنے نفع کو فقط دوسرے کے نقصان سے ناپتے ہیں۔ نہیں..." اس نے میرے بولنے سے پہلے ہی مجھے روک دیا۔ "یہ مت کہنا کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہے تمھیں شاید اس لئے شک ہے، کبھی کبھی میں تمھارے بارے میں سوچتا ہوں کہ تمھارا نہ تو خریداروں سے سامنا ہوتا ہے نہ تم خود خریدار ہو۔ مگر کبھی تم نے سوچا کہ تم ایسے کیوں ہو؟"

"اب سوچوں گا۔" میں نے کہا۔

اس لئے کہ تم اجنبی ہو۔ جب میں نے تمھیں اجنبی کہا تھا تو تم کو برا لگا تھا لیکن یہ بھی کہ تم خالص اجنبی ہو۔ اور جیسا کہ میں نے کہا، یہ بری بات نہیں ہے۔ مددگار، یہ برا لگنے کی بات نہیں ہے۔"

"مجھے برا نہیں لگا۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"اجنبی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اسی لئے تمھیں جاننے کی ضرورت پڑی۔ حالانکہ تمھیں بتا دیا گیا تھا کہ ہم خریداروں کے بیچ میں آ گئے ہیں۔"

"خریداروں سے واسطہ پہلے نہیں تھا؟"

تھا۔ مگر اس وقت خریدار ہمارے بیچ میں آتے تھے۔ اب جب کہ ہم خریداروں کے بیچ میں آ گئے ہیں۔" اس کے الفاظ غراہٹ میں ڈوب گئے اور ایک بار پھر مجھے جال میں پھنسے ہوئے درندوں کا خیال آیا۔

اچانک ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ سن رہا ہے، اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ اس نے اس طرح ادھر ادھر دیکھا جیسے سمت کا تعین کر رہا ہو۔ میں نے اپنے کانوں پر زور دیا۔ اسی وقت دور پر ایک تھرتھراتی ہوئی حیوانی آواز سنائی دی۔ مارگیر میرا ہاتھ پکڑے پکڑے آواز کی سمت چلا۔ چند قدم کے بعد وہ رکا۔ اس کی نگاہیں اس طرف جمی ہوئی تھیں جدھر سے آواز آئی تھی۔ بظاہر وہ مجھے فراموش کر چکا تھا، لیکن اس نے کہا:

"میں تمھیں بتانا یہ چاہتا تھا، مددگار، کہ ہر خریدار اس کا بڑا خیال رکھتا ہے کہ اس کے کام دوسروں کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اسے وہ اپنے نفع کے لئے، اور دوسرے کے نقصان کے لئے بھی، ضروری سمجھتا ہے۔ تو اب نہ کہنا کہ تم جاننا چاہتے ہو، اس لئے کہ میں بھی نہیں جانتا۔" اس کے بعد وہ تیزی سے آواز کی سمت بڑھنے لگا۔

ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ مارگیر مٹی کے ایک تودے کے پاس رک گیا۔ میرا ہاتھ چھوڑ کر اس نے تودے کا آدھا چکر لگایا۔ اب وہ میرے سامنے تھا اور ہمارے درمیان مٹی کا تودہ تھا۔ اس نے مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں ہٹا ہی تھا کہ تودے کے پیچھے سے ایک سانپ تیزی سے رینگتا ہوا نکلا۔ میری نظر اس پر جمنے نہیں پائی تھی کہ میرے اور اس کے بیچ میں مارگیر حائل ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ تودے میں سے گزر کر آ گیا ہے۔ سانپ واپس مڑا مگر مارگیر پھر اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ سانپ ایک طرف گھوما۔ مارگیر اس کے سامنے تھا۔ نرم و خشک مٹی پر سانپ کے رینگنے کی لکیریں اور مارگیر کے قدموں کے نشان دونوں بے آواز پڑ رہے تھے۔ سانپ ایک بار پھر پلٹا۔ مارگیر اب بھی اس کے سامنے تھا۔ ایک چھوٹا سا وقفہ ہے اور اب سانپ نے سر اٹھا کر پھن پھیلا لیا۔ مارگیر ایک طرف مڑتا ہوا آگے بڑھا۔ سانپ کا پھن اس کی جانب گھوم گیا۔ مارگیر ہلکا سا چکر کاٹ کر اس کی طرف چلا۔ سانپ کا پھن پھر اس کے سامنے تھا۔ لیکن اب مارگیر سیدھا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سانپ کا پھن داہنے بائیں جھوم رہا تھا اور اس کی دم آہستہ آہستہ زمین پر پڑ رہی تھی۔ مارگیر اس کے قریب آ چکا تھا۔ اچانک اس کا ایک گھٹنا زمین سے لگا، ہاتھ آگے بڑھا، ذرا سی گرد اڑی اور سانپ اس کے شانے تک لپٹا نظر آیا۔ اس کا سمٹا ہوا پھن مارگیر کی مٹھی میں دبا تھا۔

وہ اسی طرح سانپ کو لئے ہوئے میرے قریب آ گیا۔

"کیسا ہے؟" اس نے پوچھا۔

مجھے ان دونوں میں ایک بھیانک حسن نظر آ رہا تھا، البتہ مارگیر کے مقابلے میں سانپ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی بنایا گیا ہے۔

"کاٹا تو نہیں؟" میں نے پوچھا اور مجھے خود ہی اپنا سوال مہمل معلوم ہوا۔ مارگیر نے سانپ کا پھن انگوٹھے سے دبایا اور اس کا منہ کھل گیا۔ مارگیر نے اسے تھوڑا اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس سے زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا جو میں ٹھیک سے سن نہیں سکا لیکن اس سے مجھے سانپ کے بارے میں یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ مادہ ہے۔

"زہری زہر۔" مارگیر نے سانپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔ "ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے، مددگار، میں زہر کا کام کرتا ہوں۔"

کچھ دن سے بستی میں سانپ زیادہ نکلنے لگے تھے۔ روزانہ کم سے کم ایک بار آواز ضرور لگتی۔ اب میں بھی اس آواز کا فرق سمجھنے لگا تھا اس لئے مجھے آواز سن کر کوئی انتظام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مارگیر کے گھر کے اندرونی حصوں سے نکل کر آتا اور باہر چلا جاتا۔ وہ جلد ہی واپس لوٹتا اور میں کوشش کرتا کہ اسے آتے ہوئے نہ دیکھوں اور وہ خود بھی میری طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آواز لگنے کے وقت مارگیر گھر میں موجود نہ ہوتا اور جنگل کی سمت سے یا کسی اور طرف سے لپکتا نظر آتا۔ لیکن سانپ کو پکڑ لینے کے بعد وہ سیدھا گھر کا رخ کرتا۔ وہ زیادہ تر گھر کے اندر ہی رہتا تھا، یا شاید اس کے مکان میں باہر نکلنے کا کوئی اور بھی راستہ تھا۔ بہرحال اس دن کے بعد سے جب اس نے میرے سامنے سانپ پکڑا تھا، کبھی کبھی اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے سوا میری اس سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

لیکن ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ بار بار میرے سامنے آتا ہے، کچھ دیر تک مجھے دکھتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ اس عرصے میں ایک بار آواز بھی لگی، اور جب وہ باہر سے واپس آیا تو دیر تک میرے قریب کھڑا رہا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھ سے ایسی آواز آتی جیسے کوئی بار بار مٹھی کھولتا اور بند کرتا ہے۔ ایک بار تو مجھے شبہہ ہوا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے لیکن وہ خاموش تھا۔ آخر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لپٹا ہوا سانپ اپنے بل کبھی تنگ کر رہا تھا کبھی ڈھیلے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن رک گیا۔ مارگیر اب گردن جھکائے ہوئے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح گردن جھکائے جھکائے وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔ اس میں اسے ہلکی ٹھوکر بھی لگی۔

شام ہوتے ہوتے ایک آواز اور لگی۔ مجھے نیند آ گئی تھی اور میری آنکھ اسی آواز سے کھلی۔ اب خاموشی تھی۔ میں کچھ دیر تک جاگتا رہا۔ پھر اسے خواب کی آواز سمجھ کر دوبارہ سونے ہی کو تھا کہ باہر آہٹ سنائی دی۔ کچھ دیر بعد ایک چھوٹا سا مجمع گھر کے اندر داخل ہوا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجمع کے آگے والے آدمی کے ہاتھ میں لکڑی پر جھولتا ہوا ایک مردہ سانپ تھا۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی مجھے یاد نہ آیا کہ اس بار جو آواز لگی تھی اس میں موت کے خوف کی لرزش بھی تھی یا نہیں۔ میں نے زمین پر جگہ صاف کی اور تیلی والی چٹائی بچھا دی۔ مجمع خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر آگے والا آدمی بڑھا۔ اس نے سانپ کو لکڑی سمیت چٹائی پر ڈال دیا اور میری طرف مڑ کر بولا:

"ہمیں اس کو مار دینا پڑا۔"

اس کے بعد وہ بالکل خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ سانپ بے ترتیبی سے چٹائی پر پڑا تھا۔

مجھے اس میں ہلکی سی حرکت محسوس ہوئی، لیکن اس کا پھن بری طرح کچلا ہوا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسا مارگیر نے میرے سامنے پکڑا تھا۔

دیر تک جاگتے رہنے کے بعد میں پھر سو گیا۔

آدھی رات کے قریب میری آنکھ کھلی۔ مجھے اپنی گردن پر دو ٹھنڈی انگلیوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ مارگیر میرے سامنے کھڑا تھا۔ پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ خاموشی اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔

"میں آواز نہیں سن سکا۔"

"آواز نہیں لگی۔" وہ بولا۔

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ مردہ سانپ چٹائی پر اسی طرح بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ اس کے پھن کا رخ البتہ ذرا سا بدل گیا تھا۔ میں نے مارگیر کی طرف دیکھا۔

"اب میں تمھیں اطلاع دے رہا ہوں، مددگار، اس کے سرد ہاتھ نے میرے ہاتھ کو جکڑ لیا۔ زہر مہرہ غائب ہو گیا۔"

(۷)

میں کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

"کب؟" آخر میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ بولا۔ اس کے بعد وہ دیر تک بالکل چپ رہا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اسے تلاش کروں گا۔"

اس نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے بولا:

"ایسی چیز واپس ملنے کے لئے نہیں ہوتی۔"

"پھر بھی شاید..."

"پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔" اس نے کہا۔ "نقصان ہوا ہے، لیکن

پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔"

اس کا انداز ایسا تھا جیسے نقصان اس کا نہیں میرا ہوا ہو اور مجھے تسلی دے رہا ہو۔ اور اس انداز میں ایسی صداقت تھی کہ کچھ دیر کے لئے میں واقعی خود کو اس کی ہمدردی کا مستحق سمجھنے لگا۔ لیکن جلد ہی میں حقیقت پر غور کرنے کے قابل ہو گیا۔

"زہر مہرے کی نوبت کبھی کبھی آتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کبھی کبھی، ہاں،" اس نے کہا۔ "وہ آخری علاج تھا اور کبھی خطا نہ کرتا تھا۔"

"لیکن تمہارے پاس علاج بہت ہیں زہر مہرے کی نوبت کبھی کبھی آتی تھی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں مددگار،" اس نے کہا، "لیکن تم نہیں سمجھے۔ وہ آخری علاج تھا اور کبھی خطا نہ کرتا تھا، اس لئے کہ وہ ہر زہر کا علاج تھا۔ علاج بہت سے ہیں لیکن بہت سے زہروں کا علاج اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے ان زہروں سے ڈرنا چاہئے۔ لیکن مجھے زہر مہرے سے ڈرنا چاہئے، اس لئے کہ وہ ہر زہر کا آخری علاج تھا۔

لیکن وہ خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ اس وقت خود اس کا پرسکون چہرہ مجھے ان چیزوں میں سے معلوم ہو رہا تھا جن سے ڈرنا چاہئے۔

"میں ڈر نہیں رہا ہوں، مددگار،" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن جب سے وہ نہیں ہے، مجھے کیا کیا دکھائی دے رہا ہے۔"

اس کے بعد اس پر مدہوشی سی طاری ہوئی۔ یقیناً اس وقت وہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا ہاتھ اپنی جگہ پر رک گیا اور اس کی آنکھوں میں مجھے بھی وہی نظر آنے لگا جو شاید اس کو دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مارگیر آواز سن کر وہاں پہنچا ہے جہاں سانپ نکلا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ مارگیر کو دیکھتے ہیں وہ اسے راستہ دیتے ہیں۔ مگر سانپ اسے دیکھ کر بھاگنے کے بجائے کنڈلی مار کر پھن کاڑھ لیتا ہے۔ مارگیر رک رک کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اچانک سانپ چیختا ہے اور اسے ڈس کر بھاگنے لگتا ہے۔ لوگ سانپ کو مار ڈالتے ہیں اور مارگیر کے گرد مجمع لگ جاتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ایک مجمع آواز لگاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جو بے ہوش آدمی ہے اس کی حالت بہت خراب ہے۔ سب نہایت پریشان ہیں۔ مارگیر سامنے آتا ہے۔ وہ شکار کو دیکھتا ہے اور چپ کھڑا رہتا ہے۔ شکار کی حالت بگڑتی جاتی ہے، لوگ مارگیر کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ اس کی منت سماجت شروع کرتے ہیں اور اس سے صرف یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ شکار کو سانپ ہی نے کاٹا ہے۔ لیکن مارگیر چپ کھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شکار دم توڑ دیتا ہے۔ لوگ اسے اٹھا کر باہر لے جاتے ہیں اور باہر سے رونے کی آواز آتی ہے۔ اسی وقت ایک اور مجمع گھر میں داخل ہوتا ہے، لیکن یہ مجمع مارگیر کو دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، پھر پیچھے ہٹتا ہے۔ سب کی نگاہیں مارگیر پر جمی ہوئی ہیں۔ مارگیر کی ادھ کھلی آنکھوں میں سناٹا ہے اور وہ سامنے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ آگے کی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔

میں نے اسے سنبھالنا چاہا لیکن وہ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"بستی یوں بھی ختم ہو رہی تھی، مددگار۔" وہ بولا، "اور یہ اس کی ختم ہونے کی ایک اور صورت ہے۔ میں یہاں اژدہوں کی زمین سے آیا تھا اور میں نے زہر کا کام شروع کیا تھا۔ پھر وہ دیر تک چپ رہا۔ اس کی نظریں مردہ سانپ پر جمی ہوئی تھیں۔

صبح صادق سے کچھ پہلے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سہارا دینا چاہا۔ لیکن وہ تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دو دفعہ میرے شہر کا نام لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ میرے قریب آ گیا اور بولا:

"واپس جانے کو جی چاہتا ہے؟"

میں کچھ نہیں بولا۔ وہ واپس جانے کیلئے مڑا، لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد پھر لوٹ آیا۔ اس نے چٹائی پر پڑی ہوئی وہ لکڑی اٹھائی جو سانپ کے ساتھ آئی تھی۔ دیر تک وہ خاموشی سے لکڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"کسی کو بتانا مت، مددگار، مگر مجھے یقین ہے کہ اس سانپ کے زہر کے سارے علاج بھول چکا ہوں۔"

میں نے دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

میں جاگتا رہا۔ سورج میرے سامنے نکلا اور اس کی روشنی تیز ہو گئی۔ میں نے بستی کے جاگنے اور لوگوں کے جنگل کی طرف جانے کی آوازیں سنیں، لیکن اس تمام عرصے میں میرے کان مکان کے اندرونی حصوں کی طرف سے آتی ہوئی آوازوں پر لگے رہے۔ یہ ہلکی ہلکی آوازیں طرح طرح کی تھیں۔ کچھ اٹھانے اور رکھنے کی آواز، تھپتھپاہٹ کی آواز، مٹی پر مٹی پڑنے کی سی آواز، چیزیں احتیاط کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ سرکانے کی آواز، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مسلسل آتی رہنے والی ایک آواز، جو بہت آہستہ سے آتی تھی لیکن اس کے پیچھے ایک وحشیانہ قوت چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں اس آواز کو بالکل نہیں سمجھ سکا، لیکن اب میں اسے سننا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آواز اسی طرح آتی رہی تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔ لیکن اسی وقت یہ آواز رک گئی۔ مارگیر کی آواز میں نے اب تک نہیں سنی تھی اور اب میں اس کا منتظر تھا۔ لیکن اندر بالکل خاموشی تھی۔ میں بہت دیر تک انتظار کرتا رہا لیکن خاموشی نہیں ٹوٹی۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ مارگیر کی آواز کوئی زبردست نشہ ہے جس کی مجھے شدید طلب ہے۔ اور میں اس احساس کے زائل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔

میں نے ابھی تک مکان کا یہ حصہ نہیں دیکھا تھا۔ یہاں مجھے دیواروں پر

اور لکڑی کے مچانوں پر طرح طرح کے تھیلے، ٹوکریاں اور پنجرے سے ملتی جلتی چیزیں نظر آئیں۔ مختلف شکلوں کے چھوٹے چھوٹے برتن بھی بہت تھے جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ان سے الگ دودھ کے چھوٹے اور بڑے برتن رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں خاص وضع سے خم کھائی کئی لکڑیاں کھڑی تھیں۔ انہیں کے قریب ایک بستر تھا جو خالی تھا۔ ایک مچان کے نیچے دواؤں کا تھوڑا سا سادہ سامان بے ترتیب پڑا ہوا تھا جس کا زیادہ حصہ مکان کے اس درجے میں تھا جہاں میں رہتا تھا۔ اس سامان کو دیکھتے ہی میں باہر کی طرف واپس ہوا۔ میں نے وہاں کے سامان میں رکھا ہوا درخت کی چھال کا وہ گولا اٹھا لیا جس میں سے مانوس خوشبو نکلتی تھی۔ میں اس گولے کو سونگھ رہا تھا کہ میری نظر فرش پر بچھی ہوئی تیلی چٹائی کی طرف اٹھ گئی جس پر مردہ سانپ ابھی تک پڑا تھا اور اب خراب ہو چلا تھا۔ میں نے تیلی چٹائی اور سانپ کو نہیں چھیڑا، البتہ کونے میں لپٹی کھڑی ہوئی چٹائی اٹھالی۔ اس تمام وقت میں مجھ پر اس احساس کا غلبہ رہا کہ میں مارگیر کی بڑی مدد کر رہا ہوں۔

اب میں دوبارہ اندر گیا اور جن چیزوں کو دیکھ کر گیا تھا ان پر ایک بار پھر نظر دوڑائی۔ کوئی شے میری آنکھ سے بچی نہیں تھی تب میں نے ان چیزوں کو دیکھا جن پر میری نگاہ ابھی تک دیکھی ہوئی چیزوں سے پہلے گئی تھی۔

فرش پر ہر طرف سانپ بکھرے پڑے تھے۔ یہ سب کے سب بے حرکت تھے۔ البتہ ان کے درمیان اکا دکا چھوٹے چھوٹے جانور بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ان جانوروں کے چھو جانے سے کسی کسی سانپ کو ہلکی سی جنبش ہوتی تھی۔ ان سانپوں کے قد و قامت مختلف تھے اور ان میں سے بعض یقیناً نہایت خوبصورت تھے۔ کوئی کوئی سانپ الٹا ہو گیا تھا اور اس کے سفید یا زردی مائل پیٹ خوش ترتیبی سے پڑی ہوئی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ ان میں سے کسی کے بھی مردہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سب کے پھن بری طرح کچلے ہوئے تھے۔ کسی کی بھی آنکھیں باقی نہیں تھیں۔ ان کے باقی بدن بالکل سالم تھے لیکن بعض بعض سانپوں کی دمیں بھی چپٹی ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی آنکھیں باقی ہوتیں تو ان میں سے کس طرح کا تاثر ہوتا، لیکن فوراً ہی مجھ کو اپنا یہ سوچنا بہت برا لگا۔ اور اب میں اس طرف متوجہ ہوا جدھر میں نے مکان کے اس اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔ سانپوں کے درمیان چھوٹی ہوئی جگہوں پر پیر رکھتا ہوا میں اس طرف بڑھا۔

خالی بستر کے قریب فرش پر مارگیر پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کو بڑھا ہوا تھا، دوسرا ہاتھ بستر کو اس طرح دبوچے ہوئے تھا کہ آدھا بستر نیچے کی طرف ڈھلک آیا تھا۔ میں نے بستر کو آہستہ سے سرکا کر ٹھیک کیا اور مارگیر کا ہاتھ زمین سے لگ گیا۔

اس کا چہرہ اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کے نیچے تھا اس لئے میں اسے نہیں دیکھ سکا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ لپٹی ہوئی چٹائی ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی۔ اب میں نے اسے کھولا اور مارگیر کے بدن پر ڈال دیا۔ اس کے بعد میں باہر کی طرف کے حصے میں چلا آیا۔

تیلی چٹائی پر تنہا پڑے ہوئے سانپ کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ معمول کے خلاف اس دن کوئی آواز نہیں گئی۔ اس وقت مجھے یہ بھی یاد نہ آسکا کہ آخری آواز میں نے کب سنی تھی، البتہ اس سے پہلے کی ساری آوازیں اپنے ساتھ کی تمام تفصیلوں سمیت مجھے یاد آتی رہیں، یہاں تک کہ ہر طرف گہرا اندھیرا اچھل گیا اور میں اسی اندھیرے میں باہر نکل آیا۔

کچھ دور تک مجھے بستی کے نشان ملتے رہے۔ آخر وہ بستی بہت پیچھے رہ گئی۔ ☆☆☆

اسرار گاندھی کے افسانوں میں معاصر حقائق نئے تخیلاتی روپ میں نظر آتے ہیں

اسرار گاندھی کے افسانوں کا نیا مجموعہ

رہائی

قیمت : سو روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

باطل کے اندھیروں میں حق کی روشنی

پندرہ روزہ

حق و باطل

ناگپور

ایڈیٹر : حکیم محمد مسیح الدین صدیقی

(نمونے کی کاپی دس روپئے کے ڈاک ٹکٹ ارسال فرما کر طلب فرمائیں)

پتہ

ایڈیٹر "حق و باطل"

587 گودھنی، ناگپور۔ 441111

شیشہ گھاٹ

نیر مسعود

شمارہ ۲۱۹،
اگست ستمبر ۱۹۹۸

(۱)

آٹھ برس تک بڑی محبت کے ساتھ مجھے اپنے یہاں رکھنے کے بعد آخر میرا منھ بولا باپ مجبور ہوا کہ میرے لیے کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈھے۔ زیادتی اس کی نہیں تھی میری بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا، اور مجھے بھی، کہ کچھ دن اس کے ساتھ آرام سے رہنے کے بعد میرا ہکلانا ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کو امید نہیں تھی، نہ مجھے، کہ گھر کے باہر لوگ میرا تماشا بنا لیں گے، جس طرح کسی پاگل کا تماشا بنا لیا جاتا ہے۔ بازاروں میں میری بات سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے سنی جاتی تھی، اور وہ بات ہنسی کی ہو یا نہ ہو، لوگ اس پر ہنستے ضرور تھے۔ کچھ دن میں میری یہ حالت ہو گئی کہ بازار تو بازار، گھر کے اندر بھی اگر کبھی کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو بول میرے ہونٹوں سے اور میرے دانتوں سے اور میرے تالو سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلے جاتے، جیسے پانی کی لہریں کنارے کو چھو کر پلٹتی ہیں۔ آخر میری زبان میں گرہیں سی پڑ جاتیں، گردن کی رگیں پھولنے لگتیں۔ گلے اور سینے پر اتنا زور پڑتا کہ دم گھٹنے لگتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ سانس اکھڑ جائے گی۔ ناچار بات ادھوری چھوڑ کر ہانپنے لگتا اور سانس ٹھہرنے کے بعد نئے سرے سے بات شروع کرتا۔ اس پر منھ بولا باپ مجھے ڈانٹتا:

"جہاں تک کہہ چکے ہو، میں نے سن لیا۔ اب آگے بڑھو۔"

وہ اگر کبھی مجھے ڈانٹتا تو اسی بات پر ڈانٹتا تھا۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں بیچ سے بات شروع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی تو صبر سے میری بات سنتا اور کبھی ہاتھ اٹھا کر کہتا:

"اچھا، بس کرو۔"

لیکن میری مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بڑی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ آخر مجھے ہکلاتا چھوڑ کر چلا جاتا اور میں اکیلا بولتا رہ جاتا۔ اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو ظاہر ہے پاگل سمجھتا۔

مجھے بازاروں میں گھومنے پھرنے اور لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا بھی شوق تھا۔ میں خود اپنی بات تو ٹھیک سے نہیں کہہ پاتا تھا لیکن یہ کہ دوسروں کی باتیں غور سے سن کر اور دل ہی دل میں انھیں دہرا کر پوری کرتا تھا۔ کبھی کبھی میری طبیعت الجھنے ضرور لگتی تھی لیکن میں وہاں خوش بھی تھا اس لیے کہ وہاں کے لوگ مجھے ناپسند نہیں کرتے تھے، اور سب سے بڑھ کر اس لیے کہ میرا منھ بولا باپ مجھے بہت چاہتا اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن کچھ دن سے وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ایک نئی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے سوال کرتا تھا جن کے جواب میں مجھے دیر لگتی تب بھی وہ میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا اور جب میں نئے سرے سے بولنا شروع کرتا تب بھی وہ اتنی ہی توجہ سے سنتا رہتا۔ میں سوچتا تھا کہ اب وہ مجھے ڈانٹنے ہی والا ہے اور میری زبان میں گرہ پڑنے لگتی، لیکن وہ کچھ بولے بغیر میری طرف دیکھے جاتا تھا۔

تین ہی دن میں مجھ کو اپنی زبان کچھ کچھ کھلتی معلوم ہونے لگی۔ سینے پر زور پڑنا بھی کم ہو گیا اور میں اس دن کا خواب دیکھنے لگا جب میں بھی دوسروں کی طرح آسانی اور صفائی سے بولنے لگوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں وہ باتیں بھی جمع کرنا شروع کر دیں جو دوسروں سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چوتھے دن باپ نے مجھے پاس بلا کر بٹھایا۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر چپ ہو گیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ اب وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا، لیکن اچانک اس نے کہا:

"پرسوں تمھاری نئی ماں آ رہی ہے۔"

اس نے مجھے خوش ہوتے دیکھا، کچھ پریشان ہوا، پھر آہستہ سے بولا:

"تمھیں بولتے دیکھے گی تو پاگل ہو کے مر جائے گی۔"

دوسرے دن صبح میرا سامان بندھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، باپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"چلو۔"

☆☆

سفر میں وہ مجھ سے کچھ نہیں بولا۔ لیکن راستے میں ملنے والے ایک آدمی کے پوچھنے پر اس نے بتایا:

"اسے جہاز نے مانگ لیا ہے۔"

پھر وہ دونوں جہاز کی باتیں کرنے لگے۔ مجھے بھی جہاز یاد تھا۔ جب میں شروع شروع میں باپ کے پاس آیا تھا تو جہاز میلوں اور بازاروں میں مسخرے پن کی نقلیں کر کے روزی پیدا کرتا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر چھوٹا سا گلابی رنگ کا بادبان باندھے رہتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا نام جہاز پڑ گیا تھا۔ یا شاید جہاز نام ہونے کی وجہ سے وہ پیٹھ پر بادبان باندھنے لگا ہو۔ ہوا تیز چلتی تو گلابی بادبان پھول جاتا اور جہاز کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ اسی بادبان کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ طوفان

میں گھرے ہوئے جہاز کی نقل بہت اچھی اتارتا تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصیلی ہوائیں، بپھری ہوئی موجیں اور تیز گھومتے ہوئے بھنور کسی جہاز کو ڈبونے پر تل گئے ہیں۔ نقال کے منہ سے ہوا کی غراہٹ، موجوں کے تھپیڑوں، بھنور کے سناٹے، بلکہ بادبانوں کے پھڑپھڑانے تک کی آوازیں صاف نکلتیں اور آخر وہ ڈوب ہی جاتا۔ یہ نقل بچوں اور لڑکوں کو بہت پسند تھی لیکن یہ صرف اس وقت دکھائی جاتی تھی جب ہوا تیز چل رہی ہو۔ اگر ہوا رک جاتی تو یہ چھوٹے تماشائی اور بھی خوش ہوتے اور شور مچانے لگتے:

"تمباکو، تمباکو!"

جہاز کا سا تمباکو پینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تمباکو کی جتنی قسمیں اور تمباکو کو پینے کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے شاید وہ سب اس کے استعمال میں تھے اور رکی ہوئی ہوا میں وہ منہ سے دھویں کے بادل چھوڑ چھوڑ کر ان سے ایسے ایسے کھیل دکھاتا تھا کہ تماشائیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی دھویں کے بہت سے مرغولے نکال کر کئی قدم پیچھے ہٹ جاتا، پھر ہاتھوں اور کلائیوں کو اس طرح گھماتا اور موڑتا تھا جیسے نرم گندھی ہوئی مٹی سے کوئی مورت بنا رہا ہو۔ اور واقعی مرغولے کسی مورت کی صورت بن کر کچھ دیر تک ہوا میں ٹکے رہتے۔ کچھ نقلیں وہ ایسی بھی کرتا تھا جن کو دیکھنا سننا لڑکوں کو سخت منع تھا۔ ان موقعوں پہ وہ بازاریوں کے تنگ ہوتے ہوئے دہرے تہرے دائروں میں چھپ جاتا اور دور والوں کو صرف جھونکے کھاتے ہوئے بادبان اور تماشائیوں کے قہقہوں سے پتہ چلتا کہ جہاز نقلیں کر رہا ہے۔

منہ بولے باپ کے پاس میرے آنے کے پہلے ہی سال جہاز کی آواز خراب ہو گئی تھی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا تھا۔ نقلیں دکھانے میں وہ بہت طرح سے بولا کرتا تھا لیکن اب کچھ بولنا شروع کرتا تو کھانسی بار بار اس کا گلا بند کر دیتی اور بعض وقت اسے بھی اپنی بات پوری کرنے میں قریب قریب اتنی ہی دیر لگتی جتنی مجھے لگتی تھی۔ اس نے نقلیں کرنا بلکہ ہماری طرف آنا بھی چھوڑ دیا اور پہلے سال کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

ہمارے راستے میں بڑی جھیل کے کناروں کی کئی بستیاں اور گھاٹ آئے۔ ہر جگہ میرے باپ کے جاننے والے موجود تھے اور سب کو وہ یہی بتاتا تھا کہ جہاز نے مجھے مانگ لیا ہے۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر میں نے باپ سے کچھ پوچھا نہیں۔ میں دل ہی دل میں اس سے ناراض بھی تھا اس لیے کہ اس کے پاس نہ رہنے کے خیال سے میں بالکل خوش نہیں تھا۔ لیکن خوش میرا باپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کم سے کم ایسا آدمی تو وہ بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا جو دوسرے دن نئی بیوی لانے والا ہو۔

آخر ہم ایک میلی کچیلی بستی میں پہنچے۔ یہاں کے لوگ شیشے کا کام کرتے تھے۔ تھوڑے سے گھر تھے لیکن ہر گھر میں شیشہ پگھلانے کی بھٹیاں تھیں جن کی بھدی چمنیاں چھتوں اور چھپروں سے کچھ اوپر نکلی ہوئی دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ دیواروں پر، گلیاروں میں۔ بلکہ وہاں کے درختوں پر بھی کلونس کی تہیں تھیں۔ آدمیوں کے کپڑے اور آوارہ کتوں بلیوں کے بدن بھی دھویں سے کالے ہو رہے تھے۔ میرے باپ کے جاننے والے یہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے ہم کو کچھ کھانے پینے کے لیے بٹھا لیا۔ مجھے وہاں کی ہر چیز سے وحشت ہو رہی تھی۔ میرے باپ نے کچھ دیر تک غور سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سفر میں پہلی بار مجھ سے بات کی۔

"یہاں لوگ بوڑھے نہیں ہوتے۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی، میں نے وہاں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ واقعی ان میں کوئی بوڑھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے باپ کی آواز سنائی دی:

"دھواں انھیں کھا جاتا ہے۔"

"پھر وہ یہاں کیوں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن یہ سوال مجھے بے فائدہ سا محسوس ہوا اور میں باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"جہاز بھی شیشے کا کام جانتا ہے،" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا، "اس کا گھر یہیں ہے۔"

میں ایک جھٹکا کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری زبان میں ایک ساتھ بہت سی گرہیں پڑ گئیں، لیکن اب میں چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا اس بستی میں، جہاں کی ہر چیز پر سیاہ وحشت برستی معلوم ہوتی ہے، مجھ کو جہاز کے سے دھواں اگلتے ہوئے بازاری مسخرے کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ یہ بات پوچھے بغیر میں نہیں رہ سکتا تھا چاہے اس میں جتنی بھی دیر لگتی۔ لیکن باپ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا:

"لیکن وہ یہاں کا رہنا کب کا چھوڑ چکا ہے۔"

مجھے واقعی کچھ اطمینان ہوا۔ اگر جہاز یہاں، اس بستی میں نہیں رہتا ہے، میں نے خود سے کہا، تو میں اس کے ساتھ کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔ اسی وقت میرے باپ نے کہا:

"اب وہ گھاٹ پر رہتا ہے" اس نے ایک طرف اشارہ کیا، "شیشہ گھاٹ پر۔"

اس نام پر ایک بار پھر مجھے وحشت ہونے لگی۔ یقیناً میرے باپ کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسی کے گھر میں کچھ لوگوں سے شیشہ گھاٹ کا ذکر سن چکا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بڑی جھیل کا سب سے مشہور اور سب سے اجاڑ گھاٹ ہے اور بی بی نام کی ایک ڈراونی عورت اس کی تنہا مالک ہے۔ وہ ایک مشہور ڈاکو، یا شاید باغی، کی محبوبہ تھی، پھر اس کی بیوی ہو گئی۔ وہ بی بی ہی سے ملنے آیا تھا کہ مخبری ہو گئی اور اسی گھاٹ پر وہ سرکاری آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی الٹ پلٹ ہوئی کہ پورا شیشہ گھاٹ بی بی کے حوالے کر دیا گیا جہاں اس کی بہت بڑی ناؤ جھیل میں پڑی رہتی ہے، اور بی بی نے اسی ناؤ میں اپنے رہنے کا ٹھکانا بنا لیا ہے۔ وہ کچھ کاروبار بھی کرتی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی آدمی گھاٹ پر آنے دیا جاتا ہے۔ باقی کسی کو ادھر کا رخ کرنے کی اجازت نہیں۔ کسی کی ہمت بھی نہیں۔ بی بی سے سب ڈرتے ہیں۔

جہاز شیشہ گھاٹ پر کیسے رہنے لگا؟ کیا مجھے بی بی سے ملنا ہوا کرے گا؟ وہ مجھ سے باتیں تو نہیں کرے گی؟ مجھے اس کی باتوں کا جواب ضرور دینا پڑے گا؟ وہ میرے بولنے پر غصے سے پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ میں ان سوالوں اور ان کے خیالی جوابوں میں ایسا کھو گیا تھا کہ مجھے شیشے والوں کی بستی سے اٹھ کر چلنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا جب میرے کان میں باپ کی آواز آئی۔

"پہنچ گئے۔"

(۲)

بڑی جھیل کا شاید یہی سب سے اجاڑ حصہ تھا۔ ایک بنجر میدان کے خاتمے

پر مٹیالے پانی کا پھیلاؤ شروع ہوا تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر تھوڑا پانی چھوڑ کر ایک بہت بڑی ناؤ جھیل کے کچھ حصے کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس پر شاید کبھی لکڑی کے لٹھے لادے جاتے ہوں گے۔ اب اس میں لٹھوں ہی سے کئی چھوٹی بڑی کوٹھریاں سی بنالی گئی تھیں۔ ناؤ کے سارے تختے ڈھیلے ہو گئے تھے اور ان سے ہلکی چرچراہٹ کی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑی چیز دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہو۔ جھیل کے کنارے ایک لمبی سی منڈیر زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔ آس پاس چار پانچ چبوترے تھے جن میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے تھے۔ ان کے قریب ایک لمبا گلا ہوا بانس تھا جس کو مٹی نے قریب قریب چھپا لیا تھا۔ اتنی کم چیزیں تھیں پھر بھی مجھے یقین ہو رہا تھا کہ جب یہ سب کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوا نہیں ہوگا تو اس جگہ چہل پہل رہتی ہوگی۔ اب گھاٹ کے نام پر ایک لمبا سائبان رہ گیا تھا جس کا اگلا حصہ داہنی طرف کے نشیب میں جھیل کے تھوڑے سے پانی کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ سائبان کے پیچھے ذرا بلندی پر ایک بے ڈول عمارت تھی جس میں لٹھوں اور چکنی مٹی کا استعمال کچھ اس طرح ہوا تھا جیسے بنانے والا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے لکڑی سے بنائے یا مٹی سے، اور اسی ادھیڑبن میں عمارت بن کر تیار بھی ہو گئی ہو۔ چھت البتہ پوری لکڑی کی تھی اس کے بیچوں بیچ والے ابھار پر لگا ہوا گلابی رنگ کا ایک چھوٹا سا بادبان ہوا سے بار بار پھول رہا تھا۔

میرا منہ بولا باپ ضرور پہلے بھی یہاں آیا ہوگا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی کے ساتھ سیدھا نشیب میں اترا اور سائبان کے نیچے سے شروع ہونے والے مٹی کے پانچ زینے چڑھ کر عمارت کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

جہاز سامنے ہی زمین پر بیٹھا تمباکو پی رہا تھا۔ ہم دونوں بھی اندر جا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

''آ گیا؟'' اس نے باپ سے پوچھا اور کھانسنے لگا۔

آٹھ برس میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی زردی اور ہونٹوں کی سیاہی اتنی بڑھ گئی تھی کہ شبہ ہوتا تھا انھیں الگ سے رنگا گیا ہے۔ کچھ کچھ دیر بعد اس کی گردن اس طرح ہل جاتی تھی جیسے کسی بات کا اقرار کر رہا ہو۔ اور اسی طرح گردن ہلاتے ہوئے اس نے زرد آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر بولا:

''بڑا ہو گیا۔''

''آٹھ برس بعد دیکھ رہے ہو،'' میرے باپ نے اسے بتایا۔

ہم بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ دونوں اشاروں میں باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ اچانک میرا باپ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھا۔ جہاز نے منہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پوچھا:

''کچھ رکوگے نہیں؟''

''کام بہت ہے،'' میرا باپ بولا، ''ابھی کچھ بھی نہیں کیا ہے۔''

جہاز نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور میرا باپ دروازے سے باہر نکل گیا۔ مٹی کے زینے اترتے اترتے وہ رک کر مڑا، واپس آیا اور مجھے چمٹا کر دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا، پھر بولا:

''دل نہ لگے تو جہاز کو بتا دینا، میں آ کر لے جاؤں گا۔''

جہاز کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور میں اس کی طرف مڑ گیا۔ اس نے جلدی جلدی تمباکو کے بہت سے کش کھینچے، دیر تک اپنی گھرگھراتی ہوئی سانس کو ہموار کرتا رہا، پھر اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ جھیل پر نظریں دوڑاتا رہا۔ پھر مٹی کے زینوں کی طرف واپس ہوا، لیکن پہلے زینے پر پیر رکھتے رکھتے رک گیا۔

''نہیں،'' اس نے کہا، ''سب سے پہلے بی بی۔''

جھیل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہم بڑی ناؤ کے قریب پہنچے۔ دو لمبے لٹھوں کو ملا کر کنارے سے ناؤ تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ لٹھوں پر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے ہم دوسرے سرے کی چھوٹی سیڑھی تک اور سیڑھی چڑھ کر ناؤ پر پہنچے۔ سامنے کی ایک کوٹھری کے دروازے پر ترپال کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے آگے ایک دورنگی بلی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے ہم کو دیکھا۔ جہاز پردے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں اس سے کئی قدم پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ جہاز نے پھر کھانسنا شروع کیا تھا کہ پردہ ہٹا کر بی بی سامنے آ گئی۔

اسے دیکھ کر مجھے ڈر لگا، لیکن اس سے بھی زیادہ یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ یہ بے ہنگم عورت کبھی کسی کی محبوبہ تھی۔ اس نے جہاز کو دیکھا، پھر مجھ کو۔

''بیٹا آ گیا؟'' اس نے جہاز سے پوچھا۔

''ابھی پہنچا ہے،'' جہاز نے بتایا۔

بی بی نے مجھے سر سے پیر تک کئی بار دیکھا، پھر بولی:

''دکھیا معلوم ہوتا ہے۔''

جہاز کچھ نہیں بولا۔ میں بھی کچھ نہیں بولا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا اور اسی وقت اس نے پوچھا:

''پیرا کی جانتے ہو؟''

''نہیں'' میں نے گردن کے اشارے سے اسے بتایا۔

''پانی سے ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا ہوں۔'' میں نے پھر اشارے سے اسے بتایا۔

''بہت؟''

''ہاں بہت،'' میں نے بتا دیا۔

''ڈرنا چاہیے،'' اس نے یوں کہا جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

میں نے جھیل کے پھیلاؤ کو دیکھا۔ رکی ہوئی ہوا میں مٹیالا پانی بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور جھیل پر کسی بنجر میدان کا شبہ ہوتا تھا۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جہاز کی طرف مڑ گئی جو اس کی طرف تمباکو کو پینے کا سامان بڑھا رہا تھا۔ دیر تک وہ دونوں تمباکو پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ حساب کتاب قسم کی کاروباری باتیں تھیں۔ اس بیچ میں بھورے رنگ کا ایک کتا کسی طرف سے نکل کر آیا اور مجھے سونگھ کر چلا گیا۔ اونگھتی ہوئی بلی نے کتے کو دیکھ کر دم پھلائی اور پیٹھ اونچی کر لی، پھر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بی بی کو دیکھ لیتا تھا۔ مضبوط بنی ہوئی عورت اور اپنی بڑی ناؤ کی طرح دھیرے

دھیرے ٹوٹ رہی ہے۔ کم سے کم اس کے چہرے سے ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا، اور اس کی باتوں سے بھی جو مجھے صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے رک کر ایک بار اس نے گردن اٹھائی اور زور سے آواز دی:

"پریا!"

دور کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز پانی پر تیرتی ہوئی ہماری طرف آئی اور جہاز میرا ہاتھ پکڑ کر کشتیوں والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر میں نے اپنی پشت پر بی بی کی آواز سنی۔

"اسے اچھی طرح رکھنا، جہاز۔" اور پھر وہی، "دکھیا معلوم ہوتا ہے۔"

یہاں سے کچھ اس طرح کہا کہ میں خود کو واقعی دکھیا سمجھنے لگا۔

(۳)

لیکن کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں خود کو دکھیا سمجھتا۔ بی بی کے یہاں سے آ کر جہاز نے مجھ کو میرے رہنے کا ٹھکانا دکھایا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ ایک اجاڑ گھاٹ پر بنے ہوئے اسی بے ڈول مکان کا حصہ ہے، جس کے سامنے مٹیالے پانی کی جھیل اور پشت پر بنجر میدان ہے۔ وہاں میرے آرام کا اچھے سے اچھا سامان موجود تھا۔ سجاوٹ بھی تھی جس میں شیشے کی چیزوں سے زیادہ کام لیا گیا تھا دروازوں اور روشن دانوں میں بھی شیشے استعمال ہوئے تھے۔ مجھ کو تعجب ہوا کہ جہاز کسی جگہ کو اتنے سلیقے سے سجا سکتا ہے۔ پھر خیال ہوا کہ اس نے اس میں کسی اور کی مدد لی ہے، یا پھر سجاوٹ کا کام باقاعدہ سیکھا ہے۔ وہاں کئی چیزیں آج ہی کی لائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہاں سے کئی چیزیں ہٹائی بھی گئی ہیں، اور یہ شبہ بھی ہوا کہ اس جگہ مجھ سے پہلے، شاید بہت پہلے کوئی اور بھی رہتا تھا۔

اپنے ٹھکانے کو دیکھ لینے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ پہلے ہی دن میں نے شیشہ گھاٹ کا سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ لیکن پریا کو میں نے دوسرے دن دیکھا۔

مجھے آج تک حیرت ہے کہ میرے منھ بولے باپ کے یہاں جو لوگ شیشہ گھاٹ کی باتیں کر رہے تھے ان میں سے کسی نے بی بی کی بیٹی کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کا نام شیشہ گھاٹ پہنچنے کے پہلے دن سنا تھا جب بی بی نے ناؤ پر سے اسے پکارا تھا۔ اس دن کی گھبراہٹ میں مجھے یہ سوچنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ پریا کون ہے۔ لیکن دوسرے دن صبح میں نے گھاٹ کے سامنے جھیل پر سے ہنسی کی آواز سنی پھر کسی نے کہا:

"جہاز، تمھارے بیٹے کو دیکھیں گے۔"

جہاز نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بی بی کی بیٹی۔" اس نے بتایا اور مجھے سائبان کے نیچے لا کھڑا کیا۔

کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر جھیل میں دھیرے دھیرے بہتی ہوئی تنکی سی کشتی کے پچھلے سرے پر میں نے دیکھا کہ پریا بالکل سیدھی کھڑی ہوئی ہے۔ پھر اس نے اپنے بدن کو ہلکا سا جھکولا دیا اور کشتی سائبان کی طرف بڑھی۔ پریا کے بدن نے ایک اور جھکولا کھایا۔ کشتی اور آگے بڑھی۔ اس طرح رکتی بڑھتی ہوئی وہ سائبان کے بہت قریب آ گئی۔

"یہی ہے؟" اس نے جہاز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لڑکی بی بی کی بیٹی ہے، جس طرح اس پر حیرت ہوئی تھی کہ بی بی کسی کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ میں نے اسے ذرا غور سے دیکھنا چاہا لیکن اب وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھ رہی تھی۔

"دکھیا تو نہیں معلوم ہوتا۔" اس نے جہاز سے کہا، پھر مجھ سے بولی، "دکھیا تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ میں دکھیا معلوم ہوتا ہوں،" میں نے ذرا جھنجھلا کر کہنا چاہا لیکن صرف ہکلا کر رہ گیا۔ پریا ہنس پڑی اور بولی:

"جہاز، یہ سچ مچ..."

پھر اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ناؤ پر سے بی بی کی پاٹ دار آواز آئی:

"پریا، اسے نہ ستاؤ۔"

"کیوں؟" پریا نے پکار کر پوچھا، "دکھیا جو ہے؟"

"پریا،" جہاز نے اسے سمجھایا، "اس سے تمھارا جی بہلے گا۔"

"ہمارا جی گھبراتا ہی نہیں ہے، اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

میں خود کو کسی مصیبت میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا، لیکن اسی وقت اس نے مجھ سے پوچھا:

"تم نے اپنی نئی اماں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا،" میں نے سر کے اشارے سے اسے بتایا۔

"دیکھنے کو جی نہیں چاہتا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں چاہتا؟" اس نے پھر پوچھا۔

جواب میں میرا سر اس طرح ہلا کہ اس کا مطلب ہاں بھی ہو سکتا تھا، نہیں بھی۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ آج نئی ماں میرے پہلے گھر میں آنے والی ہے، شاید آ چکی ہو۔

باپ نے کہا تھا وہ مجھے بولتے دیکھ کر پاگل ہو جائے گی۔ میں خیال ہی خیال میں خود کو بولتے اور اس کو دھیرے دھیرے پاگل ہوتے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ ایسی عورت کے ساتھ جو میری وجہ سے پاگل ہو گئی ہو، میرا اس گھر میں رہنا کیسا ہوتا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کل اس وقت تک میں اس گھر میں تھا، اور وہ مجھے بہت پرانے زمانے کی بات معلوم ہوئی۔ مجھے وہاں گزارے ہوئے آٹھ سال آٹھ لمحوں کی طرح یاد آئے۔ پھر مجھے اپنا منھ بولا باپ یاد آنے لگا جو کل مجھے چمٹا کر جہاز کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ پہلے بھی مجھ کو یقین تھا، اب اور زیادہ یقین ہو گیا، کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

"جہاز بھی تم سے بہت محبت کرے گا،" پریا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں اسے بھول گیا تھا لیکن وہ اتنی دیر سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر آئی۔ اس کا بدن آہستہ سے گھوما اور سائبان کی طرف اس کی پیٹھ ہو گئی۔ بدن کے ایک جھکولے کے ساتھ اس نے کشتی کو آگے بڑھایا اور دھیرے دھیرے ہم سے دور ہوتی گئی۔ مجھے

ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کوئی عجوبہ دیکھا ہے۔

"اگر بی بی نے اس کا نام لے کر نہ پکارا ہوتا،" میں نے خود کو بتایا، "تو میں اسے جھیل کی روح سمجھتا۔"

وہ جھیل کی روح نہیں تو عجوبہ ضرور تھی، اس لیے کہ وہ پانی کے نیچے پیدا ہوئی تھی اور اس کے پیروں نے آج تک زمین نہیں چھوئی تھی۔

☆☆

بڑی ناؤ بی بی کو باپ دادا سے ملی تھی اور معلوم نہیں کب سے جھیل میں پڑی تھی، پریا کے جانے کے بعد جہاز نے بتایا، لیکن خود بی بی جھیل سے دور کہیں اور رہتی تھی جہاں اس کا میاں وہی ڈاکو، یا کوئی بھی ہو تھا، چھپ کر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ جب پریا پیدا ہونے کو ہوئی تو میاں نے ایک دائی کے ساتھ بی بی کو ناؤ پر پہنچا دیا۔ ولادت کے وقت جہاز بی بی کے دور سے چیخنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ پھر یہ آوازیں کچھ بدل گئیں سرکاری آدمی پہنچ گئے تھے اور بی بی سے اس کے میاں کا پتہ پوچھ رہے تھے بی بی نے کچھ نہیں بتایا تو انھوں نے اس کو جھیل میں غوطوں پر غوطے دینا شروع کیے اور ایسے ہی کسی لمبے غوطے میں پریا پیدا ہوئی۔

"میں نے صاف دیکھا،" جہاز نے بتایا، "کہ پانی کے نیچے سے بی بی کی سانسوں کے بلبلے اٹھ رہے ہیں، اور انھیں بلبلوں کے بیچ میں ایک بار پریا کا چھوٹا سا سر ابھرا اور اس کے رونے کی آواز آئی۔"

تب ان لوگوں نے سمجھا کہ بی بی بن نہیں رہی تھی۔ وہ چلے گئے، لیکن گھات میں رہے۔ اور، جیسا کہ انھیں یقین تھا، ایک دن پریا کا باپ گھاٹ پر آیا۔ ہی ناؤ پر اس کو گھیرا گیا۔ اس نے بچ کر نکل جانا چاہا لیکن زخمی ہو کر جھیل میں گرا اور جھیل ہی میں ڈوب گیا۔

اس دن سے بی بی نے بڑی ناؤ کو اپنا اور پریا کا ٹھکانا بنا لیا ہے۔ خود بی بی کبھی کبھی دوسری بستیوں کی طرف نکل جاتی ہے لیکن پریا کو اس نے آج تک زمین پر نہیں آنے دیا ہے۔ وہ اپنی کشتی پر جھیل میں گھومتی رہتی ہے، یا پھر بڑی ناؤ پر ماں کے پاس آ جاتی ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ بی بی نے کوئی قسم کھائی ہے؟ کوئی منت مانی ہے؟ کسی کو نہیں معلوم، اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ پریا کب تک جھیل میں چکر لگاتی رہے گی اور اس کے پیر کبھی مٹی کو چھوئیں گے یا نہیں۔

(۴)

شیشہ گھاٹ پر میں نے ایک سال گذارا، اور اس ایک سال میں جھیل پر سے سب موسموں کو گذرتے اور ہر موسم میں پریا کی کشتی کو پانی پر گھومتے دیکھا۔ اس کے سوا وہاں میرے لیے دل بہلانے کا زیادہ سامان نہیں تھا۔ میرے ٹھکانے کا باہری دروازہ بنجر میدان میں کھلتا تھا جس کے نزدیکی کناروں پر شیشے والوں کی دھواں دیتی ہوئی بستی کو چھوڑ کر صرف مچھیروں کی آبادیاں تھیں۔ سوکھتی ہوئی مچھلیوں کی وجہ سے میں ان آبادیوں سے دور دور رہتا تھا۔ مچھیرے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں بھی لگے رہتے تھے، اور میرے کسی کام کے نہیں تھے، جس طرح میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ میدان کے دوسرے کناروں پر بہت گھاٹ تھے، ملاحوں کی بڑی بڑی آبادیاں بھی تھیں۔ کسی کسی گھاٹ پر بہت چہل پہل رہتی تھی، لیکن ایک دو بار جب میں کسی گھاٹ پر پہنچا تو پتہ چلا کہ وہاں جہاز کے منھ بولے بیٹے کی خبر پہنچ چکی ہے اور لوگ مجھے پہچاننے ہی والے ہیں، اس لیے خالی میدان میں گھومنے اور وہاں کی کچھ چیزوں کو خواہ مخواہ اپنی دلچسپی کا سامان بنا لینے کے سوا زیادہ تر میں سائبان کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ بوڑھا جہاز بھی اپنے کاموں اور ادھر ادھر کی گشتوں سے فرصت پا کر تمباکو پینے کے سامان کے ساتھ وہیں آ بیٹھتا اور طرح طرح کے قصے سناتا تھا جو یاد رکھنے کے قابل تھے مگر میں انھیں بھول گیا ہوں۔ البتہ یہ مجھ کو اب تک یاد ہے کہ جب اس کا کوئی قصہ میرا دھیان اپنی طرف نہ کھینچ پاتا تو وہ جوش میں آ کر، بلکہ دہشت زدہ ہو کر، اسے اپنے پرانے نقالوں والے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس میں اس پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور اس کے قصے کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو جاتی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ شیشہ گھاٹ دنیا سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہے اور جھیل کا یہ حصہ ہمیشہ ویران پڑا رہتا ہوگا۔ ایسا نہیں تھا، البتہ وہاں بی بی کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ یہی میں نے باپ کے گھر پر ان لوگوں سے سنا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ بی بی کسی کو ادھر نہیں آنے دیتی۔ لیکن جہاز کے یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کچھ خاص خاص دنوں میں مچھیرے اپنی کشتیاں اور جال لے کر یہاں آتے ہیں۔ کسی کسی دن تو ان کی تعداد اتنی بڑھ جاتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا پانی پر کوئی چھوٹا سا میلا لگا ہوا ہے۔ میں اپنے ٹھکانے پر، کبھی سائبان کے نیچے، بیٹھا ہوا مچھیروں کی آوازیں سنتا تھا کہ ایک دوسرے کو پکار رہے ہیں اور کچھ ہدایتیں دے رہے ہیں۔ ان کی آوازوں کے بیچ میں کہیں پریا کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ کبھی ان کی آوازوں سے معلوم ہوتا کہ وہ پریا کو کسی بات سے روک رہے ہیں۔ کبھی کسی بوڑھے مچھیرے کی آواز سنائی دیتی کہ پریا کو ڈانٹ رہا ہے اور زور زور سے ہنستا بھی جا رہا ہے۔ اس وقت ناؤ پر سے بی بی کی آواز آتی:

"پریا، انھیں کام کرنے دو۔"

جواب میں پریا کی ہنسی سنائی دیتی اور بوڑھا مچھیرا بی بی کو منع کرتا کہ پریا کو کچھ نہ کہے۔

ان دنوں میں بھی اور دوسرے دنوں میں پریا بھی سویرے سویرے گھاٹ پر ضرور آتی تھی۔ سائبان کے سامنے اپنی کشتی پر کھڑے کھڑے وہ کچھ دیر تک جہاز سے باتیں کرتی، کبھی مجھ کو بھی سائبان کے نیچے بلوا لیتی، اور اگر جہاز اٹھ کر چلا جاتا تو مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ کچھ بچکانی سی باتیں کرتی تھی۔ اپنے کتے بلی کے قصے زیادہ سناتی، یا یہ بتاتی تھی کہ کل بی بی نے اسے کس کس بات پر ڈانٹا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے کوئی بات اس طرح اچانک پوچھ بیٹھتی کہ مجھ کو گردن کے اشارے کی جگہ زبان سے جواب دینے کی کوشش کرنا پڑتی۔ اس پر وہ خوب ہنستی اور بی بی کی ڈانٹ کھاتی، پھر جھیل کے دور افتادہ حصوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ دوپہر کو بی بی اسے زور سے پکارتی اور اس کی کشتی ناؤ کی طرف بڑھتی نظر آتی۔ اس کے بعد سے ناؤ پر سے بار بار اس کے ہنسنے اور بی بی کے بگڑنے کی آوازیں آتیں۔ تیسرے پہر کو وہ پھر نکلتی اور گھاٹ کے سامنے ٹھہرتی۔ اگر اس وقت جہاز موجود نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس کی باتیں کرتی تھی۔ اسے جہاز کی ہر بات میں ہنسی کا سامان نظر آتا تھا چاہے وہ اس کا تمباکو پینا ہو، یا اس کا بے ڈھنگا لباس ہو، یا اس کے مکان پر لگا ہوا بادبان۔

ایک دن جب وہ مجھے جہاز کا کوئی قصہ سنا رہی تھی، مجھے شبہ ہوا، پھر یقین ہو گیا، کہ اسے بالکل نہیں معلوم کہ آٹھ برس پہلے تک جہاز بازاروں میں مسکرا

بن کیا کرتا تھا۔ اور اس دن پہلی بار میں نے ذرا اطمینان کے ساتھ بولنے اور اسے جہاز کی نقالیوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ پھر بھی وہ ہنسے بغیر بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی، جس طرح آخر میں میرا باپ میری بات سننے لگا تھا۔ اسی وقت جہاز تمبا کو پیتا ہوا سائبان کے نیچے آ گیا۔ اس نے میری مشکل آسان کی اور پریا کو بتا دیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ پھر اس نے دو تین چھوٹی چھوٹی نقلیں کر کے دکھا بھی دیں۔ مجھ کو وہ اس کی پرانی نقلوں کی بھونڈی نقلیں معلوم ہوئیں لیکن پریا کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ کچھ اور نقلیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن جہاز اتنی ہی دیر میں کھانسی سے ہلکان ہو گیا تھا۔ پریا اس کی کھانسی کے رکنے کا انتظار کر رہی تھی، لیکن جہاز نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا کہ وہاں سے چلی جائے۔ پریا نے ہنستے ہوئے اپنی کشتی موڑی اور جاتے جاتے بولی:

”جہاز، جہاز، تم تو بی بی کو بھی ہنسا دو گے۔“

دوسری صبح وہ روز سے کچھ پہلے سائبان کے سامنے آ گئی، لیکن اس دن جہاز کہیں نکل گیا تھا۔ اس نے مجھ سے جہاز کی باتیں شروع کر دیں اور کل کی نقلوں کا حال اس طرح بتایا جیسے میں نے کل، بلکہ اس سے پہلے بھی کبھی، جہاز کو نقلیں کرتے نہ دیکھا ہو، بلکہ مجھے یہی پتہ نہ ہو کہ جہاز کبھی نقلیں بھی کرتا تھا۔ میں سنتا رہا، پھر اسے بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ جہاز پیٹھ پر بادبان باندھ کر بازاروں میں گھومتا تھا اور جہازوں کے ڈوبنے کی بھی نقلیں کرتا تھا۔ مگر نہیں بتا سکا، نہ زبان سے، نہ اشاروں سے۔ آخر چپ ہو گیا۔

”کل۔“ میں نے دل میں کہا، ”جیسے بھی ہو، میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔“

میں نے اسے واپس جاتے دیکھا۔

”کل،“ میں نے پھر دل میں کہا، ”جیسے بھی ہو۔“

اسی شام میرا منھ بولا باپ شیشہ گھاٹ پر آیا۔

اس ایک سال میں وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا جتنا آٹھ سال میں جہاز نہیں ہوا تھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی اور جہاز اس کو سہارا دے کر لایا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ کو چمٹا لیا۔ آخر جہاز نے اس کو مجھ سے الگ کیا، ٹھیک سے بٹھایا، پھر میری طرف مڑا۔

”تمھاری نئی ماں مر گئی،“ اس نے مجھے بتایا اور کھانسنے لگا۔

(۵)

منھ بولے باپ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جہاز اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد اسے لے کر کہیں چلا گیا تھا اور رات گئے اکیلا واپس آیا تھا۔ اس وقت میں سونے کے لیے لیٹ تھا۔ جہاز بھی کچھ دیر تک تمبا کو پینے کے بعد شاید سو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ میرا منھ بولا باپ اتنی جلدی بوڑھا کس طرح ہو گیا۔ پھر مجھے اپنی نئی ماں کا خیال آیا جو مجھے بولتے دیکھے بغیر مر گئی تھی اور شاید پاگل بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر مجھے شیشہ گھاٹ پر گذارا ہوا اپنا ایک سال یاد آنے لگا۔ میں وہاں پھیلی ہوئی اور بہت کم ٹوٹنے والی خاموشی سے کبھی کبھی اکتا جاتا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا وہ جگہ ہمیشہ آوازوں سے بھری رہتی تھی۔ شیشے والوں اور مچھیروں اور دوسرے گھاٹوں کی سمت سے مدھم پکاریں آتی تھیں اور جھیل پر آبی پرندے بولتے تھے۔ لیکن میں دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ذرا سا کانوں پر زور دیا تو سائبان کی طرف سے کنارے کو چھو کر پلٹتی ہوئی لہروں کی رکی رکی آوازیں آئیں اور بی بی کی ناؤ کے تختوں کی ہلکی چرچراہٹ سنائی دی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ شیشہ گھاٹ کو میرے ہی رہنے کے لیے اور مجھ کو شیشہ گھاٹ پر رہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

”کل صبح میں جہاز کو بتا دوں گا،“ میں نے خود سے کہا اور سو گیا۔

صبح کو میری آنکھ روز کی طرح جہاز کے کھانسنے کی آواز سے کھلی۔ پھر مجھے پریا کی آواز بھی سنائی دی۔ دونوں روز کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ لیکن جہاز جہاں بیٹھا تھا وہاں سے پریا کی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی، اس لیے جہاز کو زور زور سے بولنا اور بار بار کھانسنا پڑ رہا تھا۔

میں اٹھ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ پریا سامنے ہی اپنی کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس نے جہاز سے ایک دو باتیں اور کیں۔ بی بی کا کچھ ذکر تھا۔ پھر وہ الٹے قدموں چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ اس کے پیروں کی ہلکی سی جنبش سے کشتی نے دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا۔ اب پریا کی پیٹھ سائبان کی طرف تھی۔ میں نے پہلی بار بی بی کی اس بیٹی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور یہ سوچ کر پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا کہ بی بی کی سی عورت اس کی ماں ہے۔ اسی وقت اس کے بدن نے جھکولا کھایا اور کشتی سائبان سے دور ہونے لگی۔ پھر آہستہ سے ڈگمگائی اور رک گئی۔ پریا نے اپنے داہنے بائیں اور سامنے پھیلی ہوئی جھیل کو دیکھا۔ کشتی پھر آہستہ سے ڈگمگائی لیکن پریا نے اپنے بدن کو سادھ کر اس کا توازن درست کر دیا۔ اس کے پیروں کو پھر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ کشتی نے ایک بار پھر بہت دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا اور میں نے سامنے سے بھی پریا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ مجھے اندیشہ سا ہوا کہ اس کو میرا اس طرح دیکھنا برا نہ لگے، لیکن اس کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔ وہ گھاٹ کے ٹھہرے ہوئے پانی کو بہت غور سے، جیسے زندگی میں پہلی بار، دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ رک رک کر چلتی ہوئی کشتی کے سائبان والے سرے پر آ گئی۔ تھوڑا جھک کر اس نے ایک بار پھر پانی کو غور سے دیکھا، سیدھی کھڑی ہوئی، اپنے پورے بدن کو سادھا اور بہت اطمینان سے جھیل کی سطح پر پیر رکھ دیا جیسے کوئی سوکھی زمین پر قدم رکھتا ہے۔ پھر اس کے دوسرے پیر نے کشتی کو چھوڑا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا قدم۔

”پانی پر چل رہی ہے!“ میں نے کچھ حیرت اور کچھ خوف کے ساتھ خود کو بتایا، ذرا دور پر تمبا کو پیتے ہوئے جہاز کی طرف گردن موڑی، پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ پریا کی خالی کشتی اور سائبان کے درمیان صرف پانی تھا جس پر موٹی لہروں کے بیچ سے پریا کا سر ابھرا۔ اس نے پانی پر کئی بار ہتھیلیاں ماریں جیسے جھیل کی سطح کو پکڑنا چاہ رہی ہو۔ پانی کی آواز کے ساتھ بہت سے چھینٹے اڑے اور مجھے جہاز کی آواز سنائی دی:

”پریا، پانی کا کھیل نہ کرو۔“

پھر اس کے گلے میں دھوئیں کا پھندا پڑا اور وہ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ دم بھر کے لیے میری نگاہ اس کی طرف مڑی۔ اس پر دورہ سا پڑا ہوا تھا اور وہ کسی کی مدد کا محتاج معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ مجھے سپاٹ

پانی پر لہروں کے نئے دائرے پھیلتے دکھائی دیے۔

وہ پھر ابھری اور پھر نیچے بیٹھنے لگی۔ میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جہاز!" میں نے زور سے پکارا، پھر میری زبان میں گرہیں پڑ گئیں۔

میں جہاز کی طرف لپکا۔ اس کی کھانسی رک گئی تھی لیکن سانس گھر گھرا رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا سینہ اور دوسرے سے آنکھیں مل رہا تھا۔ میں نے زینے پر چڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے زور سے ہلایا۔

"...پریا..." میرے منھ سے نکلا۔

اپنی زرد آنکھوں سے کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ سے کوئی شکاری پرندہ چھوٹ گیا ہے۔ سائبان میں اترنے والے کچے زینوں پر دھول اڑ رہی تھی اور جہاز پانی کے کنارے تھا۔

پریا کی کشتی اب پورا چکر کاٹ چکی تھی۔ جہاز نے کشتی کو دیکھا، پھر پانی کو۔ پھر اس نے کسی اجنبی سی بولی میں پوری طاقت سے ایک آواز لگائی۔ میں نے سنا کہ ناؤ سے بی بی نے بھی اتنی ہی طاقت سے اس آواز کو دہرایا۔ پھر دور دور تک کئی طرف سے یہی آواز آئی۔ مجھے پھر بی بی کی آواز سنائی دی:

"دکھیا؟"

"پریا!" جہاز نے اتنے زور سے کہا کہ اس کے سامنے جھیل کا پانی ہل گیا۔

دور اور قریب کی آوازوں نے جہاز کی آواز کو بار بار دہرایا اور مجھے جال سمیٹتے ہوئے اور خالی ہاتھ مچھیرے کئی طرف سے گھاٹ کی جانب دوڑتے دکھائی دیے۔ سائبان تک پہنچنے سے پہلے پہلے ان میں سے کئی پانی میں اتر گئے۔ جہاز انھیں اشارے سے کچھ بتا رہا تھا کہ بائیں طرف سے پانی کے اچھلنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ بڑی ناؤ پر کتا بھونکتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑ رہا ہے اور دورنگی بلی پیٹھ اونچی کیے ایک کوٹھری کی چھت پر سے اسے دیکھ رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ بی بی، قریب قریب ننگی، کسی خارش زدہ آدم خور مچھلی کی طرح پانی کو کوٹتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا بدن پریا کی کشتی سے ٹکرایا اور کشتی اپنی جگہ پر پھرکی کی طرح گھوم گئی۔ بی بی غوطہ لگا کر کشتی کے دوسری طرف ابھری۔ اس نے جلدی جلدی مچھیروں کو کئی اشارے کیے اور پھر غوطہ لگایا۔

دوسرے گھاٹوں سے ملاحوں کی کشتیاں شیشہ گھاٹ کی طرف دوڑتی دکھائی دیں۔ کئی ملاح راستے ہی میں کود کر اپنی کشتیوں کے آگے آگے پیر رہے تھے۔

اب پریا کی کشتی سے سائبان تک اور سائبان سے کشتی تک پانی میں سر ہی سر تھے۔ جھیل کے کنارے کنارے بھی مجمع بڑھ رہا تھا۔ ہر چیز ہل رہی تھی اور ہر طرف ایک شور تھا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ پانی کی اچھالوں کا شور سب سے زیادہ تھا جس میں وقت کے گذرنے کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ آخر کرخت آواز نے بہت زور سے کچھ کہا۔ شور تیز ہو کر اچانک ختم ہو گیا اور پانی میں اترے ہوئے سارے بدن بے آواز پیرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ سب بالکل خاموش تھے، صرف ناؤ پر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک ہاتھ کسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جہاز میرے پاس کھڑا تھا۔

"چلو" اس نے میرا ہاتھ ہلا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کدھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ مگر اب وہ مجھ کو مکان کے اندر لیے جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے گھوم کر جھیل کی طرف دیکھنا چاہا لیکن جہاز نے میرے ہاتھ کو ذرا سا جھٹکا دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"چلو،" اس نے پھر کہا۔

ہم مکان کی پشت والے دروازے پر آئے۔ جہاز نے دروازہ کھولا۔ سامنے بنجر میدان تھا۔

"وہ مل گئی ہے،" اس نے مجھے بتایا، پھر میدان کے بائیں کنارے کی طرف اشارہ کیا اور جلدی جلدی کہنے لگا، "تھوڑی دیر میں شیشے والوں کے یہاں پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے سواری مل جائے گی۔ نہ ملے تو کسی کو بھی میرا نام بتا دینا۔"

اس نے رومال میں بندھی ہوئی کچھ رقم میری جیب میں ڈال دی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے کہا:

"اسے صرف تم نے ڈوبتے دیکھا ہے۔ سب تم ہی سے ایک ایک بات پوچھیں گے۔ بی بی سب سے زیادہ، بتا پاؤ گے؟"

میری آنکھوں میں وہ منظر آ گیا: سارے لوگ، کانوں میں بالے پہنے ہوئے مچھیرے، اور ہاتھوں میں کڑے ڈالے ہوئے ملاح، اور گھاٹ گھاٹ کے سیلانی، میرے گرد دوہرے تہرے دائرے بنائے ہوئے ہیں، اور ہر طرف سے سوال ہو رہے ہیں، اور بی بی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ پھر سب چپ ہو جاتے ہیں اور بی بی آگے بڑھ کر میرے قریب آ جاتی ہے۔

جہاز نے میرے کپکپاتے ہوئے بدن کو دیکھا اور بولا:

"مجھے کچھ بتا دو... کچھ بھی... وہ پانی میں گر گئی تھی؟"

"نہیں..." میں نے کسی طرح کہا۔

"پھر؟" جہاز نے پوچھا، "خود جھیل میں کود گئی تھی؟"

"نہیں،" میں نے کہا اور سر سے اشارہ بھی کیا۔

جہاز نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا:

"کچھ بتاؤ، جلدی۔"

مجھے معلوم تھا میں زبان سے کچھ نہ بتا پاؤں گا، اس لیے میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے بتانے کی کوشش کی کہ وہ پانی پر چلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن میرے ہاتھ بار بار رک جاتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اشارے بھی ہکلانے لگے ہیں اور ان کا کوئی مطلب نہیں نکل رہا ہے۔ لیکن جہاز نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا:

"پانی پر چل رہی تھی؟"

"ہاں،" میں نے پھر ذرا مشکل سے کہا۔

"جہاز!" گھاٹ کی طرف سے بی بی کی دہاڑ سنائی دی۔

بوڑھے مسخرے کی زرد آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا۔ اس کی گردن اقرار کے انداز میں ہلی اور میں مڑ کر آگے بڑھ گیا ☆☆☆

جدیدیت کے بڑے بھائی لوگ

وارث علوی

شمارہ ۲۷، مئی ۱۹۷۲

زیر نظر مضمون نہ تو عصری تنقید کا جائزہ ہے نہ ان نقادوں کا تجزیہ جنھوں نے جدید ادب، جدید تنقید اور جدیدیت پر خیال آرائی فرمائی ہے۔ ایسے پروفیسرانہ مضامین لکھنے کا نہ مجھ میں حوصلہ ہے نہ خواہش۔ پھر جدیدیت اتنی نئی چیز ہے اور اس پر لکھنے والوں نے اتنا کم لکھا ہے کہ اسے موضوع سخن بنا کر نہ تو تنقیدی تصورات کی نشان دہی ممکن ہے نہ نقادوں کے مقام کا تعین۔ جدیدیت کے متعلق خود جدیدیت کے حامیوں میں اتنا زبردست فکری انتشار ہے کہ ان کی تنقید کی روشنی میں یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ جدیدیت کیا ہے اور جدیدیت کے متعلق ان میں سے ہر ایک کے تصورات کیا ہیں اور ان تصورات میں کون سی قدریں مشترک ہیں اور کن باتوں پر اختلافات ہیں؟

لہٰذا جدیدیت کی تنقید پر نہ تو میں طائرانہ نظر ڈالنا چاہتا ہوں نہ شیر کی طرح مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف اس تماشا سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں جو اس وقت دکھائی دیتا ہے جب نقاد رستم کی طرح تنقید کی آنگن میں کودتا ہے اور گو اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی سینہ تانے چلتا ہے کہ جو کام ہم نے کیا وہ بھلا دوسرا کیا کر سکے گا۔ جدیدیت فی نفسہٖ نہ کسی کو شاعر بناتی ہے نہ نقاد۔ جدید نقاد یا جدیدیت کا علم بردار نقاد کوئی قیمت نہیں رکھتا تاوقتیکہ وہ بنیادی طور پر اچھا نقاد نہ ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی رجحان کی حمایت، علم برداری یا مخالفت انھیں نقاد بنا سکتی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ نقاد بننے کی کوشش کریں اور اس مقصد کے لئے وہ ادب اور تنقید کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، وہ محض حامی، مخالف یا علم بردار بننے کی کوشش کرتے ہیں اور بغیر کسی ادبی اور تنقیدی شعور کے رجحان کی حمایت اور مخالفت اسی طرح کرتے ہیں گویا ان کا یہی کام انھیں نقاد بنانے کے لئے کافی ہے۔

جب آدمی کی فکر منظم نہ ہو، تنقیدی نظر صاف نہ ہو اور ادب اور آرٹ کی جمالیات اور تنقید کے اصولوں کا بنیادی علم تک بھی اس کے پاس نہ ہو تو یہ توقع رکھنا بھی عبث ہے کہ وہ کسی رجحان کی حمایت یا مخالفت کا کام بھی سلیقہ سے کر سکے گا۔ چنانچہ میں تو سب سے پہلے یہی دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ آدمی بنیادی طور پر نقاد ہے یا نہیں؟ اگر وہ نقاد نہیں ہے اور محض ایک Fake اور Phony آدمی ہے تو اس کے متعلق بات چیت سرے سے بے کار ہے۔ اسی لئے مجھے پروفیسروں اور اکاڈمک نقادوں کی طرح ایسی باتیں کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ جدیدیت پر فلاں فلاں صاحب نے بھی خیال آرائی کی ہے اور فلاں سال میں فلاں رسالے میں فلاں مضمون لکھا ہے۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فلاں صاحب کا فلاں مضمون محض فلانی ہے یا کوئی تنقیدی قدر و قیمت بھی رکھتا ہے۔ کسی کا کسی عنوان پر مضمون لکھنا تو اس کے نقاد ہونے کی دلیل نہیں۔ اور کوئی شخص نقاد کیوں نہیں ہے یہ جاننے کے لئے اس کی تنقیدوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف اتنا ہی دیکھنا کافی ہے کہ تنقیدوں میں نقاد کا جو کردار ابھرتا ہے وہ کیسے آدمی کا کردار ہے؟ آدمی کی وضع قطع، بات چیت، لب و لہجہ، طرز بیان اور طرز فکر سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ آدمی genuine ہے یا محض fake، phony اور impostor ہے۔ تنقید میں بھی اسلوب کا رچاؤ، فکر کا نظم و ضبط، مسئلے پر دھیان مرکوز کرنے کی اہلیت، بکھرے ہوئے مواد کو سمیٹنے کا سلیقہ، صحیح اور مناسب سندیں، متعلق رائیں، خیال افروز مثالیں اور دوسرے علمی شعبوں سے بے حد ضروری اور موضوع سے متعلق نکات کی فیض یابی کی استعداد، غرض یہ اور ایسی دوسری بہت سی صفات ہیں جو ملحوظ نظر رہیں تو نقاد کے کردار کے متعلق آپ آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہیں کہ نقاد پروفیسر ہے، Dabbler ہے، Dillettante ہے، پروپیگنڈسٹ ہے، اسناب ہے، کالم نویس ہے۔ Pedant ہے Preacher یا Pedagogue ہے۔

نقاد کے متعلق آپ نے اتنی سی بات جان لی تو پھر اس کے یک ایک جملہ کا تجزیہ اور تحلیل اس کے تضادات کی نشان دہی اور اس کی رایوں اور فیصلوں کی حرف گیری کر کے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ نقاد کہاں کہاں بہکا اور کہاں کہاں اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ یہ طریقۂ کار اس لئے بھی پسندیدہ نہیں کہ فونی نقاد اتنی غفلت روی اتنی زبردست کج فکری ایسے تضادات، تنقیدی مساحات اور بے سر و پا بیانات سے کام لیتا ہے کہ جب تک اس کے پورے مضمون کی ایک ایک سطر کی پرسش نہ کی جائے اور اس کی ایک ایک بے معنی بات کو بے

نقاب نہ کیا جائے تب تک اس کے صحیح خد وخال عام پڑھنے والوں کے سامنے نمایاں نہیں کئے جاسکتے، کیوں کہ تنقید میں غلط معلومات، غیر ضروری علمی نمائش، فکر کے فریب، کلی شیز (cliches) کے طلسم، شاعرانہ طرز بیان، لفاظی، لب ولہجہ کی مصنوعی تمکنت، بلند جبینی، ناصحانہ اور پیغمبرانہ وقار، سماجی تحریمات اور اخلاقی Priggishness سے علمی اور تنقیدی فضا کے وہ طلسمات کھڑے کئے جاسکتے ہیں کہ ادب کا ایک قاری اصل اور نقل میں فرق ہی نہیں کرسکتا۔ وہ یہ جان ہی نہیں سکتا کہ اتنی ہیبت ناک زبان لکھنے والا اور ایسے مہتم بالشان مسائل پر عالمانہ جلال و جبروت کے ساتھ غور کرنے والا آدمی پنچ تنتر کے اس بیل کی مانند جس کی آواز سے خود شیر ڈر گیا تھا باوجود اپنے ڈیل ڈول اور موٹی آواز کے محض ادب کی جگالی کرنے والا بیل کیوں کر ہوسکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے یعنی نونی نقاد کو نونی ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا پورا وقت کمزور لکھنے والوں کی کمزوریوں کو اجاگر کرنے میں صرف کردے۔ صاف بات یہ ہے کہ اہل نظر ایسے کاموں کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وقت اتنا ارزاں بھی نہیں کہ پیش پا افتادہ اور فرسودہ چیزوں پر غارت کیا جائے۔

تنقید ہمارے یہاں عموماً ان لوگوں کا ذہنی مشغلہ رہا ہے جو ادبی اسنابری کے شکار رہے ہیں۔ اسناب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان امور سے اپنا علم اور واقفیت ظاہر کرتا ہے جن پر اسے کوئی مہارت اور دسترس حاصل نہیں ہوتا۔ سماجیات، سیاست، فلسفہ، سائنس، نفسیات وغیرہ سے جس قسم کی چھیڑ چھاڑ ہمارے نقادوں نے اپنی تنقیدوں میں روا رکھی ہے اس سے اسنابری کی ہی بو آتی ہے۔ ہماری تنقیدوں سے یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان علوم پر نقادوں نے استادانہ مہارت حاصل کی ہو۔ بس لقمہ چینی اور پیوند دوزی کیا کرتے ہیں۔ ہماری تنقیدوں سے جو عموماً تشنگی کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جس موضوع پر ہمارے نقاد قلم دانی کرتے ہیں اس پر کما حقہ دسترس حاصل کرنے کی کوشش تک ان میں عنقا نظر آتی ہے۔ نقاد اپنے موضوع سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ موضوع سے بھٹک کر ادھر ادھر ہرزہ گردی کرتا اور مار مشکلوں سے تھکا ہارا جب پھر موضوع کی طرف پلٹتا ہے تو ابھی پٹھے پر ہاتھ دھرنے بھی نہیں پاتا کہ پھر کمان کی طرح چھنک جاتا ہے۔ ہرزہ گردی کی نفسیاتی وجہ ایک ہی ہے، موضوع سے عدم واقفیت۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایسے موضوع پر قلم رانی کی ضرورت کیا ہے جس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی ضروری صلاحیتوں سے نقاد آراستہ نہیں؟ ضرورت کوئی نہیں۔ صرف اسنابری کی مجبوریاں ہیں۔

جدیدیت پر علی گڑھ یونیورسٹی میں جو سیمینار ہوا تھا اس میں پڑھے گئے مقالے "جدیدیت اور ادب" نام کی کتاب میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مقالوں میں آپ کو اچھی اور بری دونوں قسم کی تنقیدوں کے نمونے نظر آئیں گے۔ ان میں سے اکثر مقالے اسنابری کے شکار ہیں۔ مثلاً رام لعل کا مضمون "افسانہ اور قاری"۔ اس مضمون کے فکری انتشار کا یہ عالم ہے کہ اس میں افسانہ اور قاری کے رشتہ پر دو جملے بھی ایسے نظر نہیں آئے جو بصیرت افروز ہوں۔ یہی حال وارث کرمانی کے مضمون "جدید شعری تنقید" کا ہے۔ ان مضامین کا تعلق ان کے عنوانات سے اتنا ہی ہے جتنا مثلاً کیمسٹری کی کسی کتاب کا غذا سے ہوتا ہے۔ ان مضامین کے عنوانات اگر "میری ڈائری کا ایک ورق" یا "بکھرے موتی" وغیرہ ہوتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ نقاد کے پاس اگر فکری نظم وضبط ہی نہیں تو اس سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ کسی موضوع پر ڈھنگ سے ایک دو صفحے بھی لکھ سکے گا۔ ذہنی جودت یا طراری آدمی کو خیر نقاد تو کیا بناتی، لیکن تنقیدی نظر اور ڈسپلن کی عدم موجودگی میں ایسی جودت اور طراری اس خودنمائی اور بڑبولے پن کو جنم دیتی ہے جو سلیم الطبع لوگوں کے لئے صریحاً ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ رام لعل کا مضمون ایسی ہی خودنمائی اور بڑبولے پن کا نمونہ ہے۔ رام لعل، وارث کرمانی، ڈاکٹر محمد حسن، ان عنوانات پر لکھ ہی نہیں رہے جو انھوں نے مضامین کے لئے منتخب کئے ہیں۔ مثلاً افسانہ اور قاری کے رشتے پر Q.D. Leavis کی ایک پوری کتاب ہے جس کا نام ہے Fiction and the Reading Public۔ اس پوری کتاب میں مصنف جس طرح اپنے موضوع سے چپکا ہوا ہے، رام لعل اپنے دس صفحے کے مضمون میں ایسی وابستگی کا ثبوت نہیں دے سکے۔ پھر جس قسم کے افسانے رام لعل نے لکھے ہیں ان کی بساط پر اتنی اچھل کود انھیں زیب بھی نہیں دیتی۔ اپنے افسانوں کا تعریفی ذکر طبیعت کو اور منغض کرتا ہے۔ ان کے نام لکھے گئے خطوط کے جن اقتباسات کو انھوں نے پیش کیا ہے وہ لگ بھگ ایسے ہی ہیں جن میں ان کی تعریف کے پہلو جھلکتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت تھا، لیکن مشکل وہاں آن پڑی ہے جب خطوط سے ایسے جملے بھی انتخاب کئے جاتے ہیں جو دوسرے افسانہ نگاروں کے منھ پر کالک ملتے ہیں۔ مثلاً یہ اقتباسات دیکھئے:

> "تم افسانے سے کوئی بڑی چیز یعنی ناول کب لکھ رہے ہو۔"
>
> "میرا تصور کہ میں آپ سے چند برس پہلے پیدا ہوگیا یا میری ادبی زندگی آپ سے پہلے شروع ہوئی یا لوگوں کی نگاہ ہم پر نسبتاً پہلے پڑگئی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ بے حد خوبصورت لکھتے ہیں اور ہم لوگوں سے بہتر لکھتے ہیں۔"
>
> "سریندر پرکاش، بلراج مین را اور انور سجاد کے افسانے بے حد ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔"

افسانے اور قاری کے عنوان کے تحت خودستائی کے پہلو تلاش کرنا بہت ہی نازیبا حرکت ہے۔ رام لعل اپنے پیش رو افسانہ نگاروں سے خود کو مختلف سمجھتے ہیں۔ ابھی فن کی بات تو جانے دیجئے کہ بیدی اور منٹو کے مقام کو پہنچتے پہنچتے انھیں سات جنم لینے ہوں گے، لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے پیش رووں سے وہ ادب اور آرٹ کے سبق تو کیا سیکھتے، وہ چند آداب بھی نہ سیکھ سکے جو آدمی کو دنیا میں ایک جامع اور پختہ آدمی کی طرح behave کرنے کا اہل بناتے ہیں۔ کم از کم انھوں نے منٹو یا بیدی کی شخصیت پر غور کیا ہوتا تو انھیں پتہ چلتا کہ آدمی جب فن کار بنتا ہے تو ادب اور آرٹ کے مسائل پر کس طرح لب کشائی کرتا ہے۔ رام لعل چاہے اچھے افسانہ نگار یا اچھے نقاد بنیں نہ بنیں، انھیں تو اس بات پر خود اطمینانی ہے

کہ بہرحال وہ جدید ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں:

> کرشن اور بیدی کو لکھتے ہوئے تیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ جو لوگ اپنے زمانے میں جدید سمجھے جاتے تھے وہ اب اپنی نظروں میں بھی خود جدید نہیں رہے۔

گویا جدید ہونا یا نہ ہونا بذات خود ایک ادبی قدر بن گیا ہے۔ جو جدید نہیں وہ اس قابل نہیں کہ اس پر وقت غارت کیا جائے۔ اور جو رام لعل کی طرح جدید ہیں وہ تو لامحالہ قابل توجہ بنیں ہی گے۔ جدیدیوں میں بھی سریندر پرکاش، بلراج مین را اور انور سجاد تو ایسے ہی رام لعل کے مداحوں کی نظر میں خوار ہیں، لہٰذا اب کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق، کی للکار کے لئے میدان صاف ہے۔

ہر فن کار اپنے لئے میدان صاف کرتا ہے۔ لیکن فن کار جتنا بڑا ہوگا اس کی تنقیدی نظر بھی اتنی ہی گہری ہوگی۔ وہ اپنے پیش رو فن کاروں کی تعریف یا تنقیص کرے گا بھی تو صحیح تنقیدی اصولوں پر کرے گا۔ رام لعل چونکہ بہت ہی معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں اس لئے ان کی تعریف و تنقیص دونوں میں اناڑی پن نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کرشن چندر نے ادھر ایک ہی سیریز میں سات کہانیاں "لندن کی راتیں" کے عنوان سے لکھی ہیں۔ خود کو جدید ثابت کرنے کے لئے انھوں نے مناسب سمجھا کہ اب اپنے افسانوں میں ہوائی جہازوں، نئی نئی شرابوں اور دیس دیس کی عورتوں کا ذکر کیا جائے۔ ان کے منہ سے انگریزی کی بے ربط نظمیں بھی سنوا دی جائیں اور اس طرح ان کے بوہیمین یا ٹیڈی رویے کو پیش کیا جائے۔

کرشن چندر پر میں بہت سخت اعتراض کرتا رہا ہوں، بلکہ اب تو میں بلراج مین را کے اس خیال سے اتفاق کرنے لگا ہوں کہ کرشن چندر دراصل Non-Writer ہے۔ یعنی ایک ادیب اور فن کار کے طور پر اب کرشن چندر پر بات چیت ممکن ہی نہیں رہی۔ لیکن رام لعل کا کرشن چندر پر اعتراض غلط ہے۔ اس اعتراض کی کوئی تنقیدی بنیاد نہیں۔ وہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ ہوائی جہازوں اور نئی شرابوں وغیرہ کے نام کرشن چندر اس لئے لیتے ہیں کہ وہ خود کو جدید ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کرشن چندر بنیادی طور پر ایک مقبول عام اور کمرشیل رائٹر ہیں یا بن گئے ہیں۔ Exotic فضا اور Topographical تفصیلات مقبول عام ادیب کے Assets ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جزئیات نگاری ان کے مشاہدہ کی وسعت اور تیزی کی دلیل مانی جاتی ہے اور کمرشیل رائٹر کے پاس سوائے اس کے مشاہدہ کے اور رہتا بھی کیا ہے؟ تخیل سے وہ محض ایجاد بندہ کا کام لیتا ہے اور زبان سے محض بیان کا۔ ایک مشاہدہ ہی ایسی چیز ہے جس پر وہ تھوڑا بہت فخر کر سکتا ہے، یعنی قسم قسم کی شرابوں کو وہ جانتا ہے اور دیس دیس کی عورتوں کو وہ پہچانتا ہے۔ کرشن چندر جیسے لکھنے والوں کے یہاں یہ بھی غنیمت ہے اور مجھے کہنے دیجئے کہ رام لعل کے افسانے اس "غنیمت" سے بھی محروم ہیں۔ ان کا تخیل معمولی، زبان بے رنگ اور بیان یک آہنگ ہے۔ کاش ان کے افسانوں میں نئی نئی شرابوں اور دیس دیس کی عورتوں کا ذکر ہوتا۔ فن کار کو تخیل کی تیسری آنکھ تو قدرت کی طرف سے ملتی ہے۔ تیسری آنکھ کھلے جب کی بات تب۔ اس وقت تک وہ کچھ نہیں تو کم از کم اپنی دو آنکھیں تو کھلی رکھتے۔ کرشن چندر نے جدید بننے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن وہ وہ دوسری نوعیت کی حامل ہے۔ انھوں نے بیکٹ کے گوڈو کا ترجمہ اردو میں کیا۔ یہ ان کی اسنابری ہے۔

رام لعل لکھتے ہیں:

> منٹو نے سیکس اور طوائفوں کی زندگی کو اردو میں پہلی بار انسانی ہمدردی کے ساتھ پیش کیا۔ یہ خصوصیت اسے موپاساں، چیخوف اور دیگر مغربی افسانہ نگاروں سے ملی۔ منٹو کے کردار عام طور پر ابنارمل ہی ہوتے تھے اس لئے اپنے اندر ایک ڈرامائی اپیل بھی رکھتے تھے۔ لیکن ان کے یہاں کہانی کا ٹریٹمنٹ (Treatment) سب سے نمایاں خوبی تھی۔ چھوٹے چھوٹے تیز و ترش جملے، نادر الوجود تشبیہات اور غیر متوقع انجام، ان ہی خوبیوں کی بنا پر جوان کے زمانے میں جدید بھی جاتی تھیں منٹو جدید افسانے کا ہر دل عزیز شہزادہ ثابت ہوا۔

پہلی بات تو یہ کہ اس پورے پیراگراف کا ایک ایک جملہ گھسا پٹا، سطحی، اور ادب کے تمام ہرزہ گردوں کا ورد رہا ہے۔ منٹو پر ہر بھی اور پروفیسر نقاد ایسی ہی باتیں کہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں منٹو کی جو خوبیاں گنوائی گئی ہیں وہ کسی اعتبار سے ایسی خوبیاں نہیں جو کسی بھی فن کار کو ہماری نظر میں قابل احترام بنائیں۔ تیز و ترش جملے اور غیر متوقع انجام وغیرہ قسم کی چیزیں تو رام لعل بھی کوشش کریں تو حاصل کر سکتے ہیں۔ جو چیز منٹو کو عظیم بناتی ہے وہ سیکس یا طوائف وغیرہ کی طرف نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی کی طرف اس کا رویہ ہے۔ یہ رویہ ایک فن کار کا نہیں بلکہ ایک صوفی کا ہے۔ اس آدمی کا ہے جو زندگی کا تماشا ایک ایسی ماورائی نظر سے کرتا ہے جو ادب میں بہت ہی بڑے فن کار کو ... بودلیئر اور الیٹ جیسے فن کار کو ملتی ہے۔ منٹو نے سیکس اور طوائف پر نہیں لکھا۔ کوئی بھی فن کار سیکس اور طوائف پر نہیں لکھتا۔ سیکس اور طوائف تو محض بہانے ہوتے ہیں، اس تجربہ اور اس وژن کے اظہار کا جو فن کار کا زندگی اور انسان کا تجربہ اور وژن ہوتا ہے۔ رام لعل لکھتے ہیں، یہ خصوصیت اسے موپاساں، چیخوف اور دیگر مغربی افسانہ نگاروں سے ملی۔ یہ سمجھنا کہ رام لعل دیگر مغربی افسانہ نگاروں کو جانتے ہوں گے ہماری سادہ لوحی ہے۔ کیوں کہ جو دو نام انھوں نے گنوائے ہیں اس میں سے بھی ایک نام غلط ہے۔ بھلا چیخوف کو سیکس اور طوائفوں سے کیا لینا دینا۔

رام لعل کا پورا مضمون اسی قسم کی خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آدمی میں تنقید کا سلیقہ نہ ہو تو چاہے وہ جدید ہو یا قدیم، محض گھاس ہی کاٹتا ہے۔ ادب اور تنقید میں انتشار ایسے ہی لوگ پھیلاتے ہیں جو فکر و نظر کی تہذیب و تربیت کے بغیر بس جس موضوع

پر جو جی چاہا ہانکتے رہتے ہیں۔

یہی حال اس کتاب میں وارث کرمانی، محمد حسن، قمر رئیس اور قاضی عبدالستار کے مضامین کا ہے۔ محمد حسن سمجھتے ہیں کہ وہ قلم برداشتہ جو کچھ بھی دو چار صفحے لکھ لیں گے وہ گویا سند ہوں گے۔ تحقیق، تدقیق، سوچ بچار کی اب گویا انھیں ضرورت نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تنقید میں جو مقام انھوں نے حاصل کیا ہے وہ لیڈروں کا سا ہے جو ہر موضوع پر اور ہر مسئلہ پر بلا سوچے سمجھے تقریر جھاڑتے ہیں۔ لگ بھگ ایسا ہی درجہ ترقی پسندوں میں ڈاکٹر علیم کو حاصل تھا۔ مطالعہ سطحی، ادبی شعور ناقص، تنقیدی نظر عنقا، لیکن ادبی مسائل پر بات اس ٹھسے سے کی جاتی تھی گویا کوئی جرمن اسکالر یا آکسفورڈ ڈان (Oxford Don) خیال آرائی کر رہا ہے۔ تنقید میں ڈاکٹر علیم ہی کی طرح ڈاکٹر محمد حسن کا انجام بھی عبرت ناک ہے۔ محمد حسن کو فن کار کے طریقۂ کار اور ادب اور آرٹ کی جمالیات کا علم سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ محض کلی شیز میں باتیں کرتے ہیں اور انھیں اچھالتے رہتے ہیں۔ اپنے اس مضمون ("جدیدیت اور اردو افسانہ") میں انھوں نے وژن، پرائیویٹ وژن collective vision وغیرہ کی کلی شیز پسند کی ہیں۔ ذرا مغربی تنقید میں دیکھئے کہ وژن کا لفظ کتنا کم استعمال ہوتا ہے اور کتنے محدود اور مخصوص معنی میں، اور نقاد اس لفظ کے استعمال میں کیسی احتیاط برتتے ہیں۔ شاعر کا Visionary تصور راں بو (Rimbaud) نے پیش کیا تھا۔ یہ تصور کیسا خطرناک تھا اور اس سے شاعری میں کیسے نتائج پیدا ہوئے اس کا مطالعہ اگر آپ کرنا چاہیں تو آرچیبالڈ میکلیش (Archibald Macleash) کا راں بو پر مضمون دیکھئے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کون سا لفظ کس معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جیسے نقادوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مختلف اوقات میں ان کے ذہن پر مختلف تصورات اس شدت سے غلبہ پاتے ہیں کہ وہ ایک ہی حقیقت کو کل حقیقت سمجھنے لگتے ہیں اور ایک ہی ادبی تصور کو واحد حقیقی تصور خیال کرتے ہیں۔ پھر تو ان کی نظر میں باقی تمام حقائق اور تصورات ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی ان پر تکنیک کا بھوت سوار ہوتا ہے، کبھی عصری آگہی کا، کبھی قومی شعور کا تو کبھی فن کار کے وژن کا۔ چنانچہ اب وژن کا بھوت سوار ہوا ہے تو وہ ارشاد فرماتے ہیں:

> پلاٹ ہو یا کردار نگاری یا انداز بیان یا تکنیک۔ ان میں سے کوئی بھی فی نفسہٖ اہم نہیں، ان میں سے کوئی بھی فن کار کا مقصد نہیں بلکہ محض ذریعہ ہیں۔ حتیٰ کہ نفس مضمون یا موضوع بھی فی نفسہٖ اہم نہیں۔ ان کی اہمیت بھی صرف اس بنا پر ہے کہ ان کے ذریعہ فن کار کی نجی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کون بتائے کہ ادب میں فی نفسہٖ تو نجی بصیرت بھی اہم نہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ فن کار کی نجی بصیرت معمولی ہو یا ہو ہی نہیں اور وہ بڑا فن کار ہو۔ ٹالسٹائی کی وہ کون سی نجی بصیرت ہے جو "جنگ اور امن" اور "اینا کارے نینا" (Anna Karenina) میں ظاہر ہوئی ہے؟ فلابیئر نے "مادام بواری" میں، اور بالزاک نے اپنی ناولوں میں کون سی نجی بصیرت کا اظہار کیا ہے؟ شیکسپیئر کی نجی بصیرت کیا ہے؟ کیا رومانی شاعروں کی نجی بصیرت اچھی ہے یا بری؟ اقبال کی نجی بصیرت کیا ہے؟ اس بصیرت کی وجہ سے ان کی شاعری اچھی بنی ہے یا اس کے باوجود؟

میں صرف معلومات کی خاطر یہ سوال پوچھ رہا ہوں کہ کیا وہ دو چار ایسی کتابوں کے نام بتا سکتے ہیں جس میں فن کار کی نجی بصیرت پر روشنی ڈالی گئی ہو اور اس روشنی میں اس کے فن کا جائزہ لے کر اس کی فنکارانہ عظمت کو اس کی نجی بصیرت کا نتیجہ بتایا گیا ہو؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ فن کار کی نجی بصیرت ناقص ہو جیسی کہ لارنس (D H Lawrence) کی تھی اس کے باوجود اس کا فن عظیم ہو؟ کیا خود ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ ممکن ہے کہ نجی بصیرت کو تنقید کی واحد کسوٹی بنا کر وہ اردو کے فن کاروں کی عظمت کا تعین ان کی نجی بصیرت کی بنیاد پر کریں۔ اگر وہ ایسا کر سکتے ہیں تو کر دکھائیں کہ اردو تنقید میں ایسا کام ایک عہد آفریں کارنامہ ہوگا۔

دراصل نجی بصیرت وغیرہ قسم کے الفاظ وہ لحیم و شحیم تجریدات ہیں جن کا سہارا عموماً وہی نقاد لیتے ہیں جن کی اپنی کوئی بصیرت نہیں ہوتی۔ حسن، صداقت، آفاقیت ہی کی طرح نجی بصیرت وغیرہ قسم کی تجریدات کا استعمال غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر اب اس طرح روا رکھا جاتا ہے گویا نجی بصیرت بھی ایسا تصور ہے جسے نقاد نے تخلیق فن کی نفسیات اور جمالیات پر فلسفیانہ غور و فکر کے بعد حاصل کیا ہے اور اب گویا وہ اس تصور کی تمام پہنائیوں اور نزاکتوں سے آگاہ ہے۔ فی الحقیقت ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نقاد کی پوری تنقید چغلی کھاتی ہے کہ اس کے یہاں ایسے تصورات کسی فلسفیانہ غور و فکر یا ناقدانہ چھان بین کا نتیجہ نہیں محض دبیز تجریدات ہیں جن کے معنی سے وہ خود واقف نہیں۔ تخلیقی عمل کی نفسیات کا ڈاکٹر صاحب کا علم کچھ اسی قسم کا ہے:

> ادب احساس کا نتیجہ ہے۔ احساس جذبہ بنتا ہے، شعور کی آمیزش اور تخیل کی رہبری سے اس میں رنگ و آہنگ آتا ہے اور وہ شعور اور جذبے کی راہ میں نئے چراغ روشن کرتا ہے۔ دوسری منزل وہ ہے جہاں نفس مضمون کی ترسیل ہی سے نہیں بلکہ انداز بیان کی ساحری تکنیک اور طرز ادا کی حسن کاری سے قاری کے جمالیاتی انبساط کو بیدار کرتا ہے اور حسن جمال کو آسودہ کرتا ہے۔

اس پورے بیان کو آپ بار بار پڑھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب تخلیقی عمل کی نفسیات اور ادبی جمالیات کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ وہ محض چند الفاظ: احساس، جذبہ، شعور، تخیل، انداز بیان، تکنیک، طرز ادا کو جانتے ہیں اور محض ان کے پرفریب استعمال سے تنقید کا طلسم کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کسی لفظ پر انھوں نے ادبی نقاد کی حیثیت سے غور نہیں کیا۔ شعور کی آمیزش سے "اس میں" رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے رنگ و آہنگ کے پیدا ہونے سے کیا مراد ہے؟ اگر شعور کی آمیزش سے "اس میں" رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے تو پھر شعور، شعور کی راہ میں نئے چراغ کیسے روشن کرتا ہے؟ انداز بیان کی سحری اور طرز ادا کی

حسن کاری میں کیا فرق ہے اور کیا یہ دونوں چیزیں تکنیک سے الگ ہیں؟ کیا جمالیاتی انبساط انھی چیزوں سے پیدا ہوتا ہے، یا پھر احساس، جذبہ، تخیل وغیرہ کا بھی اس میں کچھ عمل دخل ہے؟

میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ان الفاظ کے معنی اور مفہوم سے واقف نہیں جنھیں باشعور نقاد ادبی مسائل پر بات چیت کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔ انھوں نے ایک کتاب بلکہ ایک مضمون بھی طرز ادا، طرز بیان، تخیل، جذبہ وغیرہ کے متعلق پڑھا نہیں۔ ان امور پر ان کی فکر کی بات تو دور رہی، سمجھ بھی مبتدیانہ حد سے آگے نہیں بڑھی اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ وژن کی بات کرتے ہیں۔ وہ سلسلۂ ترجیحات (Scale of Priorities) کا ذکر کرتے ہیں جسے بعض علما نے نظام اقدار کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں کہ نظام اقدار بعض علما کے کہنے سے نہیں بنتا۔ بعض علما کی بخ تو انھوں نے محض اس لئے لگائی ہے کہ انھیں خود اپنے اس خیال پر اعتماد نہیں ہے کہ سلسلۂ ترجیحات کو نظام اقدار کہا جائے یا نہیں۔ وہ اقدار کے معنی سے واقف نہیں۔ وہ محض سلسلۂ ترجیحات کا استعمال کر کے دھونس جمانا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ سلسلۂ ترجیحات اور اقدار میں کیا فرق ہے، اسی لئے بعض علما کی بخ لگا دی۔ انگریزی کے ایک phrase کا استعمال بھی ہو گیا اور اقدار کی تعریف کی حوصلہ شکن منزل بھی سر ہو گئی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب ایسی باتیں لکھ کر کسے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کی تنقیدیں اردو ادب میں اسنابری کی عبرت ناک ترین مثالیں ہیں۔ انھیں پتہ نہیں کہ اپنی تمام قومی، تہذیبی اور ادبی خیر اندیشیوں کے باوجود انھوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعہ جس فکری انتشار اور بربریت کو اردو تنقید میں رواج دیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے زیر سایہ پرورش پائے ہوئے لوگ کسی بھی ادبی اور تہذیبی مسئلہ پر ایک دانشور کی طرح سوچنے کی اہلیت تک کھو بیٹھے ہیں۔ سوچنے کی بات جانے دیجئے، یہاں تو سوال ایسے دو چار جملے لکھنے کا ہے جو محض الفاظ کا گورکھ دھندا اور اصطلاحوں کی شعبدہ بازی نہ ہو۔

ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون "جدید اردو ناول" کا مقابلہ آپ ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون سے کریں گے تو آپ کو بہت سی خصوصیات مشترک نظر آئیں گی۔ دونوں میں تجزیاتی مطالعے کی کمی ہے۔ ناقدانہ بصیرت کا دونوں میں شدید فقدان ہے۔ دونوں تاریخی جائزوں کے آدمی ہیں اور دونوں پروفیسرانہ قسم کی تنقید لکھتے ہیں۔ لیکن قمر رئیس اور محمد حسن میں ایک فرق ہے۔ محمد حسن اسناب ہیں جب کہ قمر رئیس اسناب نہیں۔ محمد حسن بڑے بھائی کی طرح بات کرتے ہیں اور فن کاروں میں احساس جرم اور احساس گناہ پیدا کرتے ہیں جب کہ قمر رئیس اس معاملہ میں بے ضرر سے آدمی ہیں۔ وہ تنقید کے معاشرتی تصورات میں محصور ہیں اور ان کی تنقید گو کوئی بصیرت عطا نہیں کرتی لیکن وہ خود ساختہ غلط ادبی مفروضات اور تصورات پر فن کاروں کی پرکھ کر کے ان سے ناانصافی بھی نہیں کرتی۔ قمر رئیس کی تنقید خالص اکاڈمک ہے۔ اسے پڑھنے سے بوریت ہوتی ہے، لیکن کوفت اور جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی۔ اکاڈمک تنقید نہایت بھولی بھالی ہوتی ہے۔ وہ ہر فن پارہ میں خوبیوں کی متلاشی رہتی ہے اور ہر فن پارہ کی ایسے الفاظ اسلوب میں تعریف کرتی ہے جو فن پارہ کی جسامت کے اعتبار سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ وہ فن پارہ کی تاریخی اہمیت اور فنی اہمیت میں امتیاز نہیں کرتی اور اسی لئے وہ کسی فن پارہ کے متعلق ایسی بات بتانے سے قاصر رہتی ہے جو ہمیں اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرا سکے۔ مثلاً قمر رئیس "گوشۂ عافیت" کے متعلق لکھتے ہیں:

> اس میں ہندوستانی معاشرہ کی بڑھتی ہوئی طبقاتی آویزش اور اس کے بنیادی مسائل کا احساس و شعور ناول کے فن کو ایک نیا روپ دیتا ہے اور ناول کو عام انسانی زندگی کا رزمیہ بنا دیتا ہے۔

یاد رکھئے کہ طبقاتی آویزش وغیرہ کا احساس و شعور ناول کے فن کو نیا روپ نہیں دیتا۔ ناول کے فن کو نیا روپ ناول کے فن کا شعور ہی دے سکتا ہے۔ "گوشۂ عافیت" عام انسانی زندگی کا رزمیہ نہیں ہے۔ پریم چند کے دوسرے ناولوں کی طرح وہ بھی ایک معمولی ناول ہے۔ نقاد کو یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ باوجود ہمارے سب سے قابل احترام فن کار ہونے کے پریم چند کوئی غیر معمولی ناول نگار نہیں تھے۔ وہ ایک جاندار افسانہ نگار تھے لیکن ناول نگار کی حیثیت سے وہ ایک معمولی لکھنے والے تھے۔ ترقی پسندوں نے اپنی غیر ادبی مصلحتوں کی بنا پر ان کے ناولوں اور خاص طور پر ان کے گئو دان کی جو مبالغہ آمیز تعریف کی ہے اسی کی بازگشت قمر رئیس کے اس جملے میں بھی سنائی دیتی ہے۔

> "گئو دان" کی فنی ساخت میں ایک کوہستانی عوامی گیت کا زیر و بم، سوز و درد اور دل میں ڈوب جانے والی دل کشی اور سادگی ہے اور یہ ناول ان کی فنی بصیرت کا نقطۂ عروج ہے۔

یہ ناول بھلے پریم چند کی فنی بصیرت کا نقطۂ عروج ہو لیکن ناول نگاری کے معاملہ میں پریم چند کی فنی بصیرت ایسی نہیں تھی کہ اس کا نقطۂ عروج ناول کے فن کا بھی نقطۂ عروج تسلیم کیا جائے۔ ایسی شاعرانہ مدح سرائی "گئو دان" کے متعلق ہمیں کچھ بھی تو نہیں بتاتی۔ اس ناول پر علی عباس حسینی کی تنقید کو نظر انداز کر کے کوئی بھی نقاد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ پریم چند کے متعلق ہمارے اکثر و بیشتر تصورات سکہ بند ہیں۔ محمد حسن جیسے لوگ تو سمجھتے ہیں کہ ہم پریم چند کے قد کا کوئی بھی فن کار پیدا نہیں کر سکے۔ اس قسم کی بے جا پرستش کے دائروں سے ہمیں نکلنا ہے کیوں کہ اسی پرستش کی بنیاد میں ہمارے قومی اور سماجی تعصبات کام کر رہے ہیں فنی اور ادبی اصول نہیں۔ ہمارے معاشرتی نقاد پریم چند پر اگر نکتہ چینی کرتے بھی ہیں تو غلط ادبی اصولوں کی بنا پر۔ چنانچہ ایسی نکتہ چینی کا نچوڑ قمر رئیس کے ان جملوں میں نظر آتا ہے۔

> وہ سائنسی اشتراکیت پر نہیں بلکہ انسان دوستی پر ایمان لائے تھے۔ ان کے سماجی اور سیاسی شعور میں متوسط طبقہ کی مفاہمت پرستی کا گہرا رنگ تھا۔ وہ زندگی کے تضادات

اور سماجی مسائل کا حل سائنسی بصیرت سے نہیں اخلاقی زاویوں سے تلاش کرتے تھے۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری اور فنی تکمیل کا احساس ناتمام اور ناقص نظر آتا ہے۔

کمال یہ ہے کہ جو فن کار کی خوبیاں گردانی جاسکتی ہیں مثلاً انسان دوستی، اور اخلاقی زاویے، وہی یہاں اس کے معائب بتائے گئے ہیں۔ یہ Apriori فیصلہ نقاد نے کیسے کرلیا کہ سائنسی اشتراکیت انسان دوستی سے بہتر قدر رکھتی ہے؟ پھر نقاد کے پاس ایسے کیا شواہد ہیں جو یہ ثابت کریں کہ سائنسی اشتراکیت اچھا ادب تخلیق کرسکتی ہے؟ قمر رئیس بھلا یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ آج دنیا جس بحران اور انتشار سے گذر رہی ہے اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ لوگوں نے سماجی اور سیاسی مسائل کو اخلاقی قدروں سے ہٹ کر سائنسی طریقہ پر حل کرنا شروع کیا۔ سائنس کی، اور اس معنی میں اشتراکیت کی بھی کوئی اخلاقیات نہیں ہیں۔ ذریعے آپ کچھ بھی اپنایئے، قتل، خواہ جنگ وغارت گری، آپ کے مقاصد آپ کے ذریعوں کو حق بجانب ثابت کردیں گے۔ ذرا دیکھئے تو سہی سارتر اور کامیو نے، جسے آڈن نے Necessary Murder کہا ہے، اس کی اخلاقی اور انسانی زاویہ سے کیسی تفتیش کی ہے۔ تشدد تشدد کو جنم دیتا ہے۔ آپ قتل کے ذریعہ اپنے راستے کے کانٹے کو ہٹاتے ہیں، ممکن ہے آپ بھی کسی کے راستہ کا کانٹا ہوں اور آپ کو بھی قتل کے ذریعہ ہٹادیا جائے۔ انقلابی ادب کتنا غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہوسکتا ہے اس کی چھان بین کی ضرورت ہمارے نقادوں نے ابھی تک محسوس کی ہی نہیں۔ ہر بڑا فن کار اپنی آخری صورت میں انسان دوست اور اخلاقی ہوتا ہے۔ اشتراکی فن کار کبھی بھی بڑا بن ہی نہیں سکتا کیوں کہ اشتراکی فلسفے میں اخلاق اور انسان دوستی کے تصورات محض اضافی ہیں۔ اندرونی کشمکش سے گذر کر آدمی اپنے لئے جو اخلاقی فیصلہ کرتا ہے وہی فیصلہ اسے انسانی کردار عطا کرتا ہے۔ تمام مذاہب اور تمام روحانی اور اخلاقی نظاموں کا یہی سبق ہے۔ تمام دنیا کا ادب خیر وشر کی اسی کشمکش میں گرفتار انسان کے الم ونشاط کا ترجمان ہے۔ پریم چند نے یہ سبق گاندھی جی سے سیکھا اور یہی اخلاقی اور انسانی عنصر ان کے فن کو اتنا شاندار بناتا ہے۔ کرشن چندر اور احمد عباس اور دوسرے سائنسی اشتراکیت کے پجاری پریم چند کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے یہاں کشمکش انسان کے اندر نہیں بلکہ انسان کے باہر سماج میں ہے۔ ان کا کوئی کردار اندرونی کشمکش سے گذر کر اپنے لئے کوئی اخلاقی فیصلہ نہیں کرتا۔ اس کے تمام فیصلے سیاسی لیڈر کرتے ہیں جو اخلاقیات سے پرے سائنسی نقطۂ نظر کے حامل ہوتے ہیں۔ سائنسی نقطۂ نظر نے آشوتز (Auschwitz) کے گیس چیمبر بھی بنائے اور سائبیریا کے کیمپ بھی، ایٹم بھی اور ہائیڈروجن بم بھی۔ انسان دوست اور اخلاقی آدمی، گاندھی جی جیسا آدمی، ہر فیصلہ اپنی اندرونی آواز کے ذریعہ کرتا ہے۔ یہ وہ آواز ہوتی ہے جو ایک زبردست اخلاقی کشمکش سے گذرنے کے بعد آدمی کو سنائی دیتی ہے۔ یہ مصلحت اندیشی اور ڈپلومیسی کی آواز نہیں ہوتی جو کمیشاروں (Commissars) کی رہنمائی کرتی ہے۔

فن کار کی تو دلچسپی ہی اس آدمی میں ہوتی ہے جو اندرونی طور پر نشیب وفراز سے گذرتا ہے۔ غزل کی تو پوری شاعری ہی عاشق کی اندرونی کشمکش کی آئینہ دار ہے۔ اگر غزل کا محبوب کوٹھے کی رنڈی ہے تو اس کے ساتھ ہم بستری کرنے کے لئے اتنے سارے جذباتی داؤ پیچ اور معاملات سے گذرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر کشمکش شاعر کے اندر نہیں بلکہ چوراہے پر دربان کے ساتھ ہے تو پھر ناکامیوں سے کام لیا، اور عشق بن یہ ادب نہیں آتا، اور پاس ناموس عشق تھا ورنہ، اور اندیشہ ہائے دور دراز۔۔ وغیرہ کی لن ترانیوں کی ضرورت کیا تھی، سیدھے کوٹھے پر جاتے اور فراغت حاصل کرلیتے۔ پھر تو غزل بھی اتنی ہی بے کیف ہوجاتی جتنی فحش ناول نگاری۔ فحش ادب اگر بے کیف ہوتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس میں کشمکش کردار کے اندر نہیں بلکہ کردار کے باہر ہوتی ہے۔ دربان کی طرح سرمایہ دار اگر بیچ میں سے اٹھ جائے تو پھر فارغ البالی کے کوٹھے پر بس عیش کے جھولے جھولا کریں۔ دستفسکی (Dostoevsky)، سارتر اور کامیو تو یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک انقلابی کے لئے اپنے دشمن پر گولی چلانے کے اخلاقی نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ یعنی ان کا سروکار بھی فرد کے اندرون سے ہے۔ ہمارے معاشرتی نقاد پریم چند سے اس لئے برہم ہیں کہ وہ سماجی مسائل کا اخلاقی حل کیوں تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ باتیں اس زبان کے ادیب کہہ رہے ہیں جو ان لوگوں کے ستم کا نشانہ ہے جو رسم الخط سے لے کر ہر تہذیبی مسئلہ کا حل اخلاقی اور انسانی بنیاد پر نہیں بلکہ سائنسی طریقہ سے تلاش کرتی ہے۔ اگر پریم چند کی حقیقت نگاری ناقص ہے تو اس کی وجہ ان کی انسان دوستی اور اخلاقیات نہیں بلکہ ان کا ناقص فنی شعور ہے۔ اگر وہ اپنے آرٹ کو سماجی خدمت کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے انکشاف ذات اور انکشاف حقیقت کا ذریعہ سمجھتے تو وہ اپنے تخیل سے زیادہ بھرپور کام لے سکتے۔ انھوں نے فن کو تعلیم اور تلقین اور سماجی اصلاح کا ذریعہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فن کے ذریعہ حقیقت کا آزادانہ اور معروضی طور پر انکشاف کر ہی نہ سکے۔ فن حقیقت کا انکشاف اپنے طور پر کرتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب فن کار فن کو قائم بالذات سمجھے اور اس سے سماجی اصلاح اور تعلیم وتلقین کے کام لینے کی کوشش نہ کرے۔ اسی Didactic عنصر کی وجہ سے تو کیٹس، ورڈز ورتھ جیسے شاعر کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ غرض یہ کہ فن کار کا اپنے فن کی طرف رویہ ٹھیک نہ ہو تو اس کے غارت ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور پریم چند کا فن کا تصور ناقص تھا۔ یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ پریم چند کے ناقص ادبی تصورات اور ان تصورات کے زیر اثر انھوں نے جو نقائص اپنے فن میں پیدا کیے وہ ہمارے مارکسی اور معاشرتی نقادوں کی نظر میں ان کے مستحسنات ٹھہرے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مارکسی اور معاشرتی نقادوں کے ساتھ کسی بھی سطح پر تبادلۂ خیالات ممکن ہی نہیں۔ آدمی ادبی تصورات سے بحث کرسکتا ہے تعصبات کی چٹانوں سے سر نہیں پھوڑ سکتا۔

معاشرتی نقادوں کے لئے بس اتنا کافی ہوتا ہے کہ کوئی ناول یا افسانہ اپنے عہد کی زندگی کا ترجمان ہو، ان کا سماج کا تصور خام اور فن کا تصور ناقص ہوتا ہے بلکہ اکثر وبیشتر تو سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ فن کا ذکر ان کے یہاں محض تکنک،

شعور کی رو، داخلی تصویر کشی، اور طرز ادا کی سحر طرازی جیسے کل شیز کے غیر ذمہ دارانہ استعمال تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو بس اتنا کافی ہے کہ ایک مخصوص دور کے سماجی حالات اور طبقاتی آویزش کی ناول میں عکاسی ہوئی ہے اور یہ چیز گویا بذات خود ناول کو ایک نیا رنگ اور آہنگ اور روپ بخشنے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے ان کی تعریف اور تنقیص دونوں غلط بنیادوں پر ہوتی ہے۔ "لندن کی ایک رات" کے متعلق قمر رئیس فرماتے ہیں:

> یہ صرف چند نوجوانوں کی حکایت شب نہیں بلکہ ہندوستان کی ذہنی تاریخ کا ایک جز اور زندہ سماجی حقیقتوں کا مرقع بن گیا ہے۔

ایک سو صفحے کے پمفلیٹ نما ناول کے کھانستے کھنکارتے جسم پر تعریف کی یہ قبا بہت بہت ڈھیلی ہے۔ ایسے جملے صرف شہ پاروں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اگر زندہ سماجی حقیقتوں کا مرقع ہونا ہی اصل ادب ہے تو پھر مغرب کے ادب کی بات جانے دیجئے، بنگالی اور گجراتی ناولوں کی سماجی حقیقت نگاری کے سامنے بھی اردو ناول محض طفل مکتب نظر آتا ہے۔ ایسے جملے لکھنا ہی اگر تنقید ہے تو میں اردو میں گجراتی ناول کی تاریخ پانچ ہزار صفحوں میں لکھنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

"اداس نسلیں"، "آنگن"، "خدا کی بستی"، "شب گزیدہ" کی بھی ایسی ہی بے جا تعریف کی گئی ہے۔ یہ پہلا ناول ہے...، یہ پہلا ناول ہے...، یہ پہلا ناول ہے...، یہ پہلا ناول ہے...، ارے بھئی پہلا ناول بھاڑ میں جائے، اگر وہ اچھا ناول ہی نہیں تو کس کام کا۔ جب کرشن چندر کے نہایت ہی بے کار ناول "جب کھیت جاگے" کے متعلق قمر رئیس یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول تکنیک کے اعتبار سے بے شک اچھوتا ہے اور اس میں مواد کو حسن وسلیقہ سے پیش کرنے میں ان کی تخیلی قوت نے کسی حد تک توازن سے بھی کام لیا ہے تو قمر رئیس سے یہ توقع کہ وہ "اداس نسلیں" اور "خدا کی بستی" جیسے اوسط درجے کے ناولوں پر ڈھنگ کی تنقید کریں، بے معنی ہے۔ ان سے یہ توقع بھی بے کار ہے کہ "ایک چادر میلی سی" جیسے ناول کی اصل روح کو وہ سمجھ سکیں۔ ان کا معاشرتی ذہن اور مہاجنوں کے جیسا مادہ پرست اور اقتصادی نقطۂ نظر اس ناول کی تعریف میں بھی ان سے صرف ایسے جملے لکھوا سکتا ہے۔

> رانو کے بے کراں دکھوں کی یہ کہانی نچلے طبقہ کی ہر ہندوستانی عورت کی کہانی ہے۔ لیکن اس میں رانو، تلوکا اور منگل کی کہانی سے چودھری مہربان داس گھنشیام اور بابو ہری داس کے بہانہ جرائم کی کہانی مربوط کر کے بیدی ہمیشہ کی طرح یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ مہاجنی نظام کی تاجرانہ قدروں کے تسلط نے انسان کو کتنا خوار وزار کر دیا ہے۔ یہاں ہر شے، ہر جذبہ ہر آدرش یہاں تک کہ انسانی وجود بھی سکوں میں خریدا جاتا ہے۔

ایسی تنقید کا مقابلہ پھر آپ 'ایک چادر میلی سی' پر اس تنقید سے کیجئے جو شام لعل ادیب نے "سوغات" میں اور افتخار جالب نے "دستاویز" میں لکھی ہے۔ آپ کو معاشرتی نقادوں کے ذہنی دیوالیہ پن کا اندازہ ہو جائے گا۔ جدید افسانہ پر اچھی تنقید کے نمونے آپ کو بلراج کومل اور گوپی چند نارنگ کے مضامین میں نظر آئیں گے۔ ان مضامین میں آپ کو ایک سوچتے ہوئے ذہن کی کارفرمائیاں ملیں گی۔ نقاد اگر ہمارے تعصبات کو توڑ دیتا ہے اور ان فن کاروں کے لئے ہمارے دل میں جگہ پیدا کرتا ہے، جس سے ہم ہماری کم نظری یا ہمارے ادبی مذاق کی مجبوریوں کی بنا پر بھنائے بیٹھے تھے تو یہ اس کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ سریندر پرکاش اور بلراج مین را کے خلاف میرے دل میں سخت تعصبات تھے۔ گوپی چند نارنگ کے ایک مضمون نے ان تعصبات کی دیواروں کو ڈھا دیا اور گو ابھی تک میں مین را سے کلی طور پر صلح نہیں کر سکا لیکن سریندر پرکاش کو تو میں جدید افسانہ نگار کا ستون سمجھنے لگا ہوں۔ نقاد علم و انکسار سے ایسے چھوٹے چھوٹے کام بھی کرتا رہے تو وہ معاشرتی نقادوں کی سماجی دستاویزوں اور قوم وملک کی ذہنی تاریخوں سے زیادہ گراں قدر اور قابل احترام ہیں۔ نقاد کا کام سوائے اس کے ہے کیا کہ وہ ہمارے تعصبات کو توڑے، جن فن کاروں یا فن پاروں کے متعلق ہمارا علم ناقص یا غلط ہے ان کا صحیح علم عطا کرے۔ جو ہم نہیں جانتے وہ ہمیں بتائے۔ ہماری سماجی اور کاروباری مصروفیتوں کی بنا پر جن مسائل پر ہم سوچنے کی اہلیت اور فرصت پیدا نہیں کر سکتے ان مسائل پر وہ سوچ بچار کر کے ہمیں بصیرت بخشے، ہمیں ادب سے لطف اندوز ہونے کا اہل بنائے، فن کاروں اور فن پاروں سے انصاف کرے اور اپنی نگارشات سے ایسی حوصلہ انگیز فضا پیدا کرے جہاں فن کار احساس گناہ، احساس جرم اور احساس کم تری کا شکار ہوئے بغیر اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے۔ یہ ہیں وہ چند کام جو ادبی نقاد نیازمندی سے کر سکتا ہے۔ رہی سماجی تاریخوں کی مسل بندی تو اس کام کے لئے تو ہر یونیورسٹی اور ہر تعلیمی ادارہ میں سماجی علوم کے شعبے اور ہر بڑے شہر میں Institute of Sociology قائم ہو چکے ہیں۔ نہ جانے ہم Duplicate کام کرنے کی ہماری عادت کب ترک کریں گے۔

جدید افسانہ کا ذکر چل رہا ہے تو سر راہ محمود ہاشمی کے ایک مضمون "ایک خطرناک میلان" مطبوعہ "شب خون" شمارہ ۶ کا بھی ذکر کر دوں۔ محمود ہاشمی اس مضمون میں پورے بڑے بھائی کے وقار کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ جس خطرناک میلان کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ مغرب کی اندھی تقلید کا ہے۔ وہ ان نئے لکھنے والوں کو جو اپنے افسانوں میں مشت زنی کا ذکر کرتے ہیں ژاں ژینے (Jean Genet) کی اندھی تقلید سے دور رہنے کا نیک مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے حالات مغرب سے مختلف ہیں۔ یہاں کی جنسی زندگی اور اخلاقیات بھی مغرب سے مختلف ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ جو بات غلط ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو بات مغرب کے لئے جائز ہے اسے ہمارے لئے ناجائز بتایا جاتا ہے۔ یعنی فحش ادب انگریزی میں ہے اور دوسرے لوگ اسے پڑھ نہیں سکتے تو ٹھیک ہے، ہم اس سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ اپنی زبان میں اگر فحاشی عام ہوئی تو پھر ادب اور اخلاقیات کا خدا حافظ۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جب مغرب کے طرز حکومت، طرز سماج، طرز زندگی کی یلغار کا یہ عالم ہے کہ ہم ہماری تہذیبی اور اخلاقی

پونجی کو بچا تک نہیں سکتے تو پھر ایسی اخلاقی باتیں اگر Prudery نہیں تو اور کیا ہیں۔
ہمارے مارکسی نقاد مغرب کی انقلابی آئیڈیولوجی کو بغیر کسی اخلاقی کشمکش کے اپناتے ہیں اور ہمارے جاگیردارانہ نظام، جاگیردارانہ اخلاقیات، دیسی نظام اور مذہبی میلانات سے برگشتہ خاطر نظر آتے ہیں، ملک کو صنعتیانے کی باتیں کرتے ہیں۔ ٹیکنولوجیکل عہد کے خواب دیکھتے ہیں، ملک کو ترقی پسند، لبرل اور جدید بنانے کی باتیں کرتے ہیں اور ان کی ترقی پسندی اور لبرلزم کے تمام تصورات مغرب کے جدید صنعتی تمدن کی پیدا کردہ فکر سے مستعار ہیں۔ اور پھر بھی ہم لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری تہذیبی اور اخلاقی روایت پر آنچ نہ آنے پائے۔ یعنی میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کر کے ہم ہلا گلا کرتے رہیں۔ خون میں جراثیم نافذ کر کے تجربات مغرب کرے اور ہمارے پاس تو صرف صاف ستھری دواؤں کی شیشیاں ہی آتی رہیں۔
نہیں جناب! تہذیبی اور تمدنی زندگی میں ایسا بنیا پن چلتا نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ بڑے صنعتی شہر قائم کرتے رہیں اور بے چہرہ بھیڑ کے جتھوں کو ان شہروں میں بساتے رہیں اور پھر اپنی مرکزی تہذیبی روایت سے کٹی ہوئی یہ بھیڑ آپ کی جاگیردارانہ اخلاقیات کی پاس داری بھی کرتی رہے۔ موٹر آئے گی تو موٹر میں لڑکیوں کو گھمانے والا اسلوب زندگی بھی آئے گا۔ گھر میں ریڈیو آئے گا تو ریڈیو پر زردہ کا اشتہار بھی آئے گا۔ گھر میں اخبار اور رسالے آئیں گے تو رسالوں میں نیم برہنہ لڑکیوں کی تصویریں اور انڈر ویر اور بریزیر کے اشتہارات بھی آئیں گے۔ جدید برہنہ تہذیب کی یلغار سے آپ کہاں کہاں بچتے پھریں گے؟ نئے انسان، نئی دنیا، نئے تمدن کے ہم نے جو خواب دیکھے تھے وہ اس قدر مادی تھے اور اخلاقی اور انسانی قدروں سے اس قدر بے نیاز تھے کہ آج ان کی تعبیر پر ہماری بوکھلاہٹ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ سماجی ناانصافی کو دور کرنے کی ہماری قدریں بھی کسی اخلاقی نظام سے مستعار نہیں تھیں۔ اقتصادی مساوات اور اشتراکی نظام لانے کے جن طریقوں کی ہم نے تبلیغ کی تھی ان کی بھی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ برسر اقتدار طبقہ استبداد کے ذریعہ ہی اپنا اقتدار قائم رکھتا ہے اور مظلوم طبقہ اس اقتدار کو چھین لینے کے لئے جو بھی تشدد روا رکھے وہ جائز ہے۔ مجھے اس منطق سے کوئی پرخاش نہیں۔ لیکن جیسا کہ ایلیٹ نے بتایا ہے کہ لبرلزم جن قوتوں کو آزاد چھوڑتا ہے پھر انھیں کنٹرول کرنے کا اس کے پاس سوائے جابرانہ تشدد کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا۔ ایلیٹ کی طرح میں بھی لبرلزم کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن لبرلزم کے پرجوش حامی خود اپنے ہی پیدا کردہ نتائج سے پھر جس طرح سراسیمہ ہوتے ہیں اس سے بچنے کے لئے ایک مرکزی تہذیبی روایت پر قائم صحت مند معاشرہ کی قدروں کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ ایک ایسا معاشرہ جو انتہا پسندی کی دارو گیر کا شکار ہوئے بغیر اپنے مسائل کو حل کرنے اور سماجی ناانصافیوں کو دور کرنے کے جمہوری طریقوں کو دانش مندی سے استعمال کر سکے آج کی بے چین دنیا میں ہر شخص کا آئیڈیل ہے۔ جو چیز اس آئیڈیل کو محض افسانہ و افسوں بنائے ہوئے ہے وہ آج کے صنعتی نظام کا اندرونی تضاد اور انتشار ہے۔ اس انتشار کو پیدا کرنے، پھیلانے اور قائم رکھنے میں ان سیاسی رہبروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو ہر قسم کی اخلاقیات سے ماورا اقتدار پسندی کے لئے شہروں کی بھیڑ کو خطابت اور ماس میڈیا کے ذریعہ ایک ہزار پاؤں والے بے دماغ جانور کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ انھیں غلط آدرشوں سے بہلاتے ہیں۔ قومی، مذہبی یا نسلی برتری کا جنون پیدا کرتے ہیں۔ جنگ، خانہ جنگی اور انقلاب کے لئے انھیں اشتعال دلاتے ہیں اور پھر پورے ملک اور قوم کو تباہی کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔
ہمارے فن کاروں اور نقادوں نے بھی تو سیاسی لیڈروں کا یہی طریقہ کار اپنایا تھا۔ اب آرٹ، تہذیب اور سماج کے اخلاقی، معاشرتی اور انسانی مسائل پر سوچ بچار کرنے کی بجائے ہیجان انگیز خطابت اور نظریاتی تبلیغ کے وہی طریقے تو اپنائے تھے جو سیاسی لیڈر اور کمیشاروں کے طریقے تھے۔ ادب کو پروپیگنڈہ، فن کار کو پارٹی کا کاسہ لیس اور نقاد کو نیم سیاسی، نیم ادبی نظریات کا ڈھنڈورچی بنایا۔ اس وقت کسی کو قومی روایت اور انسانی اور اخلاقی قدروں کا خیال نہیں آیا۔ مارکس، لینن اور اسٹالن، گورکی اور ماؤزے تنگ جیسے غیر ادبی سیاسی آدمیوں کے خیالات اور ادب کے متعلق ان کی رایوں کی تختیاں لگا کر ہمارے دانشور ادب اور تنقید کے میدانوں میں گھومتے رہے تو مغرب کی نقالی کی بات کسی نے نہیں کی۔ اب بودلیئر اور ایلیٹ کا نام کوئی لیتا ہے تو اسے مغرب کا نقال کہا جاتا ہے اور یہ بات بھی وہی لوگ کہتے ہیں جن کی پوری زندگی دساور سے آیات کئے ہوئے سیاسی پمفلٹ پڑھتے گذری ہے۔ ایلیٹ کچھ نہیں تب بھی بیسویں صدی کی سب سے بڑی ادبی آواز ہے۔ آدھی دنیا پر اس کی شاعری اور تنقیدوں کا اثر ہے۔ کیا یہی بات ہم ان سیاسی لیڈروں کے متعلق کہہ سکتے ہیں جن کے اقوال، ہماری ترقی پسند تنقیدوں میں جگمگا رہے ہیں؟
ہندوستان کو عہد وسطیٰ کے اندھیروں اور جاگیردارانہ نظام معاشرت سے باہر نکالنے کی پوری جد وجہد مغرب کے زیر اثر عمل میں آئی۔ ہندوستان Modernize کرنے میں ہمارے لبرل اور مارکسی نقاد پیش پیش رہے۔ مجھے لبرل لوگوں پر اعتراض نہیں۔ لیکن مجھے اعتراض اس ذہنیت پر ہے جو اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنے پر تیار نہیں ہوتی۔ بھئی جس قسم کی مغرب کی نقالی ہندوستان میں جدید دور کے آغاز کے ساتھ ہوئی ہے اس کے تو ہم سب شکار ہیں۔ نئے لکھنے والے اپنی آئیڈینٹی (Identity) کی تلاش میں سرگرداں تو اسی لئے ہیں کہ اس نقل میں اپنی اصل کو تلاش کریں۔
مجھے کہنے دیجئے کہ "آگ کا دریا" سے لے کر "تیز ہوا میں تنہا پھول" تک نئے لکھنے والوں نے جس جس طرح اپنی جڑوں کو پانے کی کوشش کی ہے وہ بذات خود ایک مثبت رویہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک آدرشی انسان اور دوسرے ملکوں کی نقل پر قائم ایک آدرشی سماجی نظام کی لگن میں ہم تو یہ بھی فراموش کر چکے ہیں کہ ہمارا سماج اور اس سماج کا انسان کیا ہے اور کیسا ہے۔ نئے لکھنے والوں نے کچھ نہیں تو اپنے سامنے کی حقیقت پر نظریں تو جمائیں۔ لینن اور گورکی سے تو انھوں نے یہی سیکھا کہ نیا انسان اور نیا سماج کیسا ہوگا اور کون سے طریقوں سے پیدا ہوگا۔ یہ تو ایلیٹ تھا جس نے بتایا کہ شاعری کس قدر شدید طور پر بلکہ حاسدانہ طور پر قومی ہوتی

ہے۔ یہ تو نئے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اپنے کھیت کھلیانوں، گلی کوچوں، جنگلوں اور دریاؤں، علم الاصنام اور مذہبی روایتوں کو از سر نو کھنگالا ورنہ ہماری انقلابی شاعری کا تو پورا رویہ خیالی، آدرشی اور تجریدی تھا۔ وہ کسان کو نہیں بلکہ کسان کے آدرشی تصور کو، مزدور کو نہیں بلکہ مزدور کے انقلابی کردار کو، انسان کو نہیں بلکہ انسان کی تجرید کو پیش کرتی رہی۔ جو عورت میراجی، منیر نیازی اور مختار صدیقی کی شاعری میں جاگتی ہے وہ انقلابی شاعری میں محض ایک پرچھائیں بن کر سامنے آتی ہے۔ اپنے ملک، اپنی نسل اور اپنے گرد و پیش کی ٹھوس حقیقت کے ساتھ جتنا نئے لکھنے والوں کو سروکار رہا ہے اتنا ان لوگوں کو نہیں رہا جو مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے کہانیاں اور نظمیں گڑھا کرتے تھے۔

آپ فن کی طرف اپنا رویہ درست کیجئے۔ ملک، قوم، سماج کی طرف آپ کا رویہ خود بہ خود ٹھکانے پر آجائے گا۔ فن کو آپ انکشاف حقیقت کا ذریعہ بنایئے تو حقیقت بھی آپ کے ہاتھ آئے گی۔ فن کو آپ نے تبلیغ و تلقین کا ذریعہ بنایا تو پھر آپ کے لئے حقیقت کے انکشاف کا مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ دوسرے لوگ آپ کے لئے حقیقت تلاش کرتے ہیں، اس کی تفسیر کرتے ہیں، اسے آئیڈیولوجی اور نظریہ کے فریم میں جڑتے ہیں اور آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں کہ اب آپ زبان کی چاشنی میں اسے ڈبو کر چاروں اور پھیلاتے رہیں۔ آپ کا رشتہ حقیقت سے کٹ جاتا ہے اور آپ آدرش اور نظریہ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ آدرش واد پھر تجرید ہے۔ نئے لکھنے والوں نے آدرشی تجرید سے دامن چھڑایا تو اپنے وقت کی زندہ حقیقت بھی ان کی گرفت میں آئی۔ اس لئے نئے لکھنے والوں پر مغرب کی نقالی کا بہتان سب سے زیادہ مضحکہ خیز بہتان ہے۔

ذرا منیر نیازی کے مجموعۂ کلام پر اشفاق احمد کا مقدمہ اور "پرانے موسموں کی آواز" پر لکھا گیا دیباچہ پڑھئے اور دیکھئے کہ شاعری کی بات تو الگ رہی نئے لکھنے والوں کی نثر کا ایک ایک لفظ کیسی اپنی دھرتی کی سگندھ میں بسا ہوا ہے۔ اگر ادب نقالی ہے پھر وہ چاہے مشرق کی ہو یا مغرب کی تو اس قابل نہیں ہے کہ اس پر وقت غارت کیا جائے۔ ادب تو طبع زاد ہوتا ہے۔ تخلیق کا تو مطلب ہی ہے کہ فن پارہ فن کار کی کوکھ سے پیدا ہو، مستعار فلسفہ یا نظریہ کی ٹیسٹ ٹیوب میں تیار کیا ہوا نہ ہو۔ اگر نظم یا افسانہ نقالی ہے تو وہ Fake ہے۔ اسے نظر انداز کیجئے اور اصل کی طرف رجوع کیجئے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جدید شاعر کا تنہائی کا احساس، ذات کا کرب، غیر محفوظیت کا خوف، تردد اور بے چینی جو کچھ ہے اس پر فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ مغرب کی نقل ہے۔ مغرب کی نقالی کا تماشا آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ فن کاروں میں نہیں بلکہ نقادوں کی کتابوں میں دیکھئے کہ کیسے ہمارے نقاد اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے لکھنے والے مغربی نقادوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے لنگڑاتے ہوئے چلتے ہیں۔ فن کار اگر Original نہیں تو دو کوڑی کا ہے۔ اس کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ طبع زاد خلاق نہ ہو اور زندہ رہے۔ ارے مغرب کی نقالی کی بات جانے دیجئے۔ اس کا سب سے بڑا مرحلہ تو یہ ہوتا ہے وہ اپنی ہی زبان کے پیش رو فن کاروں کی نقل سے خود کس طرح بچائے۔ لیکن تنقید تو چونکہ ایک انتخابی فن ہے اس لئے اس میں تو کسب فیض کے بہانوں تلے سب کچھ چل جاتا ہے۔ آپ: ادب تنقید حیات ہے اور ادب روح عصر کا ترجمان ہے۔ یا: ادب فن کار کے وژن کا اظہار ہے یا: اسلوب، شخصیت کا آئینہ دار ہے قسم کے پیش پا افتادہ سکہ بند تصورات ادھر ادھر سے ہتھیا لیجئے اور کس کی مجال ہے جو آپ سے کہے کہ آپ مغربی نقادوں کو سمجھے بغیر ان کی نقل کر رہے ہیں۔ جن کی پوری زندگی مغرب کے ہڈسن (W. H. Hudson) اور اسکاٹ جیمس (R. A. Scott-James) جیسے اکاڈمک نقادوں کی کاسہ لیسی کرتے گذری ہے وہ ہمارے فن کاروں کے متعلق جب بھی لب کشائی کرتے ہیں تو چھوٹتے ہی مغرب کی نقالی کی گالی دیتے ہیں۔

بہرحال میں جس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مشرق کو مغرب سے "فیض یاب" کرنے کے گنہ گار ہم سب ہیں۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ دلی اور اصفہان، لندن، ماسکو اور نیویارک کی طرح عظیم ترقی یافتہ اور جدید شہر بنے۔ لاکھوں کی آبادیاں ہوں، ہزاروں کارخانے ہوں، دیو ہیکل ادارے ہوں، بھیڑ بھاڑ، چمک دمک، تیز رفتاری اور رونق ہو۔ چاق چوبند بیوروکریسی ہو اور زور دار سیاسی پارٹیاں۔ جلسے جلوس، ہنگامے، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اشتہارات ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں وہ سماجی اور نفسیاتی مسائل پیدا نہ کریں جن کا سامنا آج مغرب کے انسان کو ہے۔ کارخانے ہوں لیکن دھواں نہ پیدا ہو، رسل و رسائل کے تیز رفتار ذرائع ہوں لیکن اعصاب لکھنؤ کے نوابوں کی طرح پر سکون رہیں۔ عورتوں کو آزادی ملے لیکن ہمارے جاگیردارانہ نظام اخلاق پر آنچ نہ آئے۔ شہروں میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو لیکن فرد فرد بھی رہے۔ ادب اور آرٹ کا بیوپاری کرن ہو لیکن ہم اعلیٰ ادب ہی پیدا کرتے رہیں۔ اشتہارات کی گرم بازاری ہو لیکن ہمارا ذہنی سکون اور قلبی طمانیت درہم برہم ہونے نہ پائے۔ گویا کہ ہم کیک کھانا بھی چاہتے ہیں اور اسے رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ سماجی تبدیلیاں ایسے صاف ستھرے طریقوں سے آیا کرتیں تو پھر انسان کو چاہئے ہی کیا تھا۔ آپ صنعتی نظام میں ضرور داخل ہویئے لیکن مدنی زندگی میں اس نظام سے جو اخلاقی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں انھیں بھگتنے کے لئے بھی تیار رہئے۔ فن کار صنعتی نظام کی مخالفت یا موافقت نہیں کرتا۔ وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ اس نظام میں بسنے والا انسان کیسے نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کا شکار ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ آپ مشت زنی کیجئے۔ وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ آدمی کیوں مشت زنی کرتا ہے۔ ہم جنگ کے لئے ہتھیار دوسرے ملکوں سے خریدتے ہیں۔ ہمارے جنگ کے طور طریقے مغرب کے سکھائے ہوتے ہیں۔ بم، ایٹم بم بنانے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کے طریقے مغرب سے حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت مغرب کی نقالی کی بات کسی کو یاد نہیں آتی۔ لیکن جب کوئی نوجوان افسانہ نگار افسانے میں مشت زنی کا ذکر کرتا ہے تو ہم فوراً اچھل پڑتے ہیں۔ چلانے لگتے ہیں کہ مشت زنی کا سبق سیکھنے کے لئے ڈاں ژنے کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کوئی کارخانہ نہیں جو مغرب کے انجینئر آکر ہماری زمین پر نصب کر جائیں۔ یہ تو ہر قوم اور ہر ملک کا سب سے بڑا گرہ ادیوگ رہا

ہے۔فن کار نوجوانوں کو مشت زنی کا سبق نہیں پڑھاتا۔ وہ ان کے اخلاق خراب نہیں کرتا۔ اس پھسپھوندگی تہذیب کے نوجوانوں کے اخلاق رہے ہی کہاں ہیں جو انھیں خراب کرنے کا سوال پیدا ہو؟ جب نسل، مذہب، قومیت، جمہوریت اور انقلاب کے نام پر انسان آبادیوں کو پھونک سکتا ہے اور بھری پری بستیوں کو اجاڑ سکتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کوئی غیر انسانی، غیر اخلاقی حرکت کر رہا ہے بلکہ اپنی حرکت کو وہ آدرش واد، انقلاب، انسان دوستی اور شوونزم (Chauvinism) کی نقاب اڑھا کر نہایت ٹھنڈے کلیجے سے ہر قسم کی بہیمیت کو روا رکھ سکتا ہے تو ادب میں مشت زنی کا ذکر ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے، کا سوال ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

اخلاقی قدروں کی بحث اس معاشرہ میں ہوتی ہے جسے اخلاقی قدروں میں دلچسپی ہو۔ جس معاشرہ کی نظر محض مادی خوش حالی اور آسائشوں پر مرکوز ہو اس میں اخلاقیات ایک ضمنی اور اضافی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ مشت زنی تو ویسے بھی ایک بے ضرر سرگرمی ہے۔ لوگ قتل وخون وغارت گری تک پر انسانی انداز میں سوچنے کی اہلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اہلیت ہی نہیں بلکہ میلان تک گنوا بیٹھتے ہیں۔ دور جدید کی اس بے چہرہ غیر انسانی بھیڑ میں مشت زنی پھر بھی ایک انسانی سرگرمی ہے۔ فسادات پر افسانے پڑھنے کے بجائے حسن عسکری ننگی تصویریں دیکھنا پسند کرتے تھے کیوں کہ فسادات کی حیوانی بہیمیت کے مقابلے میں ننگی تصویریں پھر بھی ایک انسانی اور حیاتیاتی عمل پیش کرتی تھیں۔ جب بھی بم باری کی سائرن بجتی ہے تو میں "لب جوے بارے" پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

مظہر امام نے اپنے ایک مضمون "آتی جاتی لہریں" مطبوعہ "شب خون" شمارہ ۱۶ میں محمود ہاشمی کے اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مظہر امام اپنے مضمون پر خود ایک قسم کی ادبی اسنابری کے شکار ہو گئے ہیں۔ یہ اسنابری ہے ادب میں اپ ٹو ڈیٹ رہنے کی۔ جہاں Dated ادب پڑھنا ایک قسم کا روایتی انجماد ہے وہاں اپ ٹو ڈیٹ رہنا بھی ایک قسم کی فیشن پرستی ہے۔ خصوصاً جب کہ علم و ادب کے ہر شعبہ میں تصنیفات کے وفور کا یہ عالم ہو کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہوں، اس وقت ایسے قاری کے لئے جو دو چار زبانوں پر قدرت رکھتا ہو کسی بھی صورت سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مطالعہ کے تمام مواد سے سربرآور ہو سکے۔ پھر جدید زندگی میں مختلف قسم کی مصروفیات اور تفریحات اس قدر ہیں۔ تھیٹر، فلم، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلیویژن کے ذریعہ مختلف فنون خصوصاً موسیقی کا تصرف ہماری زندگی میں اس قدر شدید ہے کہ آج کا آدمی مطالعہ کے لئے جو تھوڑا بہت وقت نکال لیتا ہے وہ بھی ایک معجزہ ہے۔ ایسے حالات میں مطالعہ کے آداب پر از سر نو غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ زبردست قوت انتخاب اور ذہنی تہذیب کے بغیر آج کے آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنے مطالعے میں ایسی سلیقہ مندانہ تنظیم اور رکھ رکھاؤ پیدا کر سکے کہ وہ ناپائدار اور ہنگامی تجربات، خام اور ناقص تصنیفات سطحی، پیش پا افتادہ، فرسودہ اور بھرتی کی تحریروں کی بجائے پائدار، جاندار اور اعلیٰ تحریروں اور تخلیقات سے کسب فیض کر سکے۔ مہذب قاری وہ ہوتا ہے جو کلاسکی اور عصری ادب کے مطالعہ میں ایک توازن قائم رکھتا ہے اور اعلیٰ ادبی فن پاروں کو... شیکسپئر، خیام اور غالب کو... اس طرح پڑھتا ہے کہ گویا وہ زمان ومکان کی حدود سے ماورا ہیں اور جب تک وہ ان کے ساتھ رہتا ہے وہ خود بھی زمان و مکان کی حدود سے ماورا ایک ایسے ابدی لمحہ میں جیتا ہے جس میں اس کی ذات اور اس کا شعور فن پارہ کی دنیا میں تحلیل ہو کر جذب ہو جاتا ہے۔ ہیملٹ اور میکبتھ کی دنیا میں پڑھنے والا ایسا کھو جاتا ہے کہ وہ اپنا آپ، اپنا زمانہ اور اپنا جغرافیائی مقام سب کچھ اس وقت تک کے لئے فراموش کر دیتا ہے جب تک وہ اس دنیا میں رہتا ہے۔ اسی لئے جب وہ ہیملٹ اور میکبتھ کی بات کرتا ہے تو ہم عصریت Contemporaniety کے احساس کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ڈرامے چار سو سال پہلے لکھے گئے ہیں۔

بڑے فن پارے ستاروں کی مانند آسمان ادب پر چمکتے رہتے ہیں اور ہر دور اور ہر مقام کا ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ صرف اسی کے لئے چمک رہے ہیں۔ اسی لئے وہ جب اس کے متعلق بات کرتا ہے تو اس اپنائیت سے بات کرتا ہے گویا وہ اس کی زندگی کا سب سے گراں مایہ تجربہ ہیں۔ انسان کی زندگی کے گراں مایہ تجربے Dated نہیں ہوتے، خوش گوار یادوں کی صورت میں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ شیکسپیئر اور غالب کو ہم سے پہلے بے شمار لوگوں نے پڑھا۔ ہمارے بعد آنے والی بے شمار نسلیں بھی پڑھتی رہیں گی اور اس طرح پڑھتی رہیں گی گویا شیکسپیئر اور غالب نے جو کچھ لکھا خاص ان ہی کے لئے لکھا ہے۔ ہماری ہی طرح وہ شیکسپیئر اور غالب پر اس طرح بات کریں گی گویا یہ دونوں ان کے لئے زندہ حقیقت ہیں۔ ہر بڑا فن کار اور فن پارہ قاری کے لئے شہ رگ کی قربت رکھتا ہے۔ یہی Immediacy فن پارے کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کا ذکر قاری ہر موقع اور ہر محل پر کر سکتا ہے۔ اسے مشعل راہ اور منبع فیض بنا کر زندگی اور ادب دونوں کی سیرابی کر سکتا ہے۔

کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ قاری یا نقاد کو یہ کہہ کر ٹوکے کہ جس نظم یا ڈرامے کا آپ ذکر کر رہے ہیں یا اسے اب پڑھ رہے ہیں وہ تو آج سے پچاس یا سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ وہ چاہے آج سے دو ہزار سال پہلے لکھی گئی ہو، میں تو اس کا ذکر ایک زندہ اور نئے تجربے کے طور پر ہی کروں گا کیوں کہ میرے لئے وہ اسی وقت زندہ حقیقت بنتی ہے جب میں اسے پڑھنا شروع کرتا ہوں۔ اور جیسے ہی میں نے اسے پڑھنا شروع کیا کہ میرا شعور، میری آگہی، میری حسیت فن پارہ کے عظیم اور شدید تاثر کے زیر اثر بدلنا شروع ہوتی ہے۔ شیکسپیئر اور غالب کو پڑھ کر آپ وہ نہیں رہتے جو انھیں پڑھنے سے پہلے تھے۔ آپ ان کے آئینہ میں اپنے بہت سے تجربات اور جذباتی اور روحانی الجھنوں کا عکس دیکھتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ کے دل کی باتیں بیان کر رہے ہیں یا ان انسانی حقیقتوں کو بے نقاب کر رہے ہیں جو آپ کی زندگی کی بھی زندہ حقیقتیں ہیں۔ آپ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جن مسائل نے آپ کو الجھایا یا پریشان کیا ہے، ان مسائل سے یہ فن کار بے خبر نہیں تھے۔ چونکہ وہ بڑے فن کار تھے اس لئے ان مسائل سے سربرآ ہونے کے ان کے

طریقۂ کار آپ کو پسند آتے ہیں اور اگر آپ بھی لکھتے لکھاتے ہیں تو ان کے طریقۂ کار سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کا انفرادی تجربہ روایت کے سلسلہ کی کڑی بنتا ہے۔ اور اس طرح آپ کا انفرادی وجدان روایت سے کسب نور کرتا ہے۔ اس لئے مظہر امام کی یہ بات طفلانہ ہی نہیں احمقانہ ہے کہ "نہ جانے ہمارے یہاں علم کی روشنی اتنی تاخیر سے کیوں پہنچتی ہے۔" وہ کہتے ہیں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کو ہمارے یہاں بائبل کی طرح پیش کیا جاتا ہے جو آج سے پورے پینتالیس سال پہلے ۱۹۲۲ کی تصنیف ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ علامت پسندی کے ضمن میں جن ملارمے اور ورلین صاحبان کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے وہ آج سے سو سال پرانے ہیں۔ میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ ایلیٹ، ملارمے اور ورلین اگر بڑے شاعر ہیں تو آج سے دو سو سال بعد بھی ان کے حوالے دیے جائیں گے۔ افلاطون کے ادبی تصورات کا ذکر تو آج ہم پورے ڈھائی ہزار سال بعد بھی اسی طرح کرتے ہیں گویا وہ آکسفورڈ کا کوئی پروفیسر ہو۔ ادب میں بڑے فن کار، بڑے رجحانات، بڑے تصورات آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ان سے ہر وقت فیض اٹھایا جاسکتا ہے۔ کوئی فن کار کسی دوسری زبان، دوسرے ملک، یا دوسرے عہد میں یکا یک مقبولیت کیوں حاصل کرتا ہے، اس کی مختلف تاریخی اور ادبی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ آرنلڈ (Matthew Arnold) آج ہمارے دلوں کے قریب اس لئے ہے کہ تشکیک کے جس کرب سے آج ہم گذر رہے ہیں اسی کرب سے آج سے سو سال پہلے آرنلڈ گذرا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آرنلڈ کا اور ہمارا زمانہ ایک ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زمانہ کے اختلاف کے باوجود آرنلڈ کا اور ہمارا تجربہ ایک ہے۔ مختلف حالات ہی میں سہی لیکن جو اس پر سو سال پہلے بیتی تھی وہ ہم پر آج بیت رہی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جدید شاعر وجود کے جس کرب میں مبتلا ہے وہ کرب ایلیٹ، آرنلڈ یا بودلیئر نے بھی محسوس کیا تھا تو اس کا مطلب یہ کیسے لیا جاسکتا ہے کہ جدید شاعر آرنلڈ، ایلیٹ یا بودلیئر کے عہد میں جی رہا ہے؟ تشکیک کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس نے ہماری حسیت کو خیام کی حسیت سے قریب تر کر دیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہے کہ ہم خیام کے زمانہ کی شاعری کر رہے ہیں تو اس کی بات بے معنی ہوگی۔ شاعری تو ہم ہمارے زمانہ ہی کی کر رہے ہیں لیکن چونکہ ہم شاعری ہوائی آدرشوں کی خلائی دنیاؤں میں نہیں کرتے بلکہ ہمارے تجربات کی حقیقی دنیا میں کرتے ہیں اور چونکہ ہمارے تجربات انسانی تجربات ہیں اس لئے ہمارے تجربات کے ہم رنگ تجربات دوسرے زمانوں اور زبانوں کے شاعروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسے شاعر سے اگر ہم براہ راست واقف ہیں تو ان کے اثرات بھی ہم فطری طور پر قبول کرتے ہیں کیوں کہ شاعر اپنی تمام جدت پسندی اور اجتہاد کے باوجود روایت سے بے بہرہ ہو کر قلم نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری غزل پر کبھی رنگ میر چھاتا ہے کبھی رنگ غالب اور ہمارے افسانوں پر کبھی موپاساں کی پرچھائیاں پڑتی ہیں تو کبھی چیخوف کی۔ ہمارے شاعر کبھی ایلیٹ سے متاثر ہوتے ہیں تو کبھی بودلیئر سے۔

انسانوں کے تجربات میں یہ اشتراک اگر ممکن نہ ہو تو انسانی سماج قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے احتشام حسین کی یہ بات نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ ان کی بصیرت کے معاشرتی نقاد کو زیب بھی نہیں دیتی کہ "بدقسمتی سے نئی شاعری کے بعض مبلغ اردو کے نئے شاعروں کے لئے اس پس منظر کو زیادہ شاعرانہ اور حقیقی قرار دیتے ہیں جو تقریباً سو سال پہلے کے فرانس میں، پچاس سال پہلے کے یورپ میں تھا یا آج کے امریکہ میں ہے۔ وہ ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ کی دنیا کو اب تک حقیقی دنیا، کافکا اور کامیو کے کردار کو حقیقی کردار سمجھتے ہیں[1]۔"

ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کی دنیا آج بھی اتنی ہی حقیقی دنیا ہے جتنی خیام کی رباعیات، شیکسپیئر کے ڈراموں اور چیخوف کی کہانیوں کی دنیا حقیقی ہے۔ اگر انسانی تجربات کی وہ دنیا جسے انھوں نے اپنے فن کے فارم میں قید کیا ہے ہمارے لئے حقیقی نہیں رہی تو کیا یہ لوگ Dated ہوگئے؟ پھر تو فن کار کی حیثیت سے ان کا ذکر ہی بے کار ہے۔ ان کا ذکر ادب اور تنقید میں نہیں بلکہ مخطوطات کی فہرستوں میں ہونا چاہئے۔ ان پر تنقید نہیں بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا تھیسس لکھنا چاہئے۔ کامیو کے کردار حقیقی کردار ہیں اور اتنے حقیقی کردار ہیں کہ اگر ہم ان کا مطالعہ سنجیدگی اور ہمدردی سے کرتے تو خونریزی کے اس ہولناک تجربے سے شاید ہمیں گذرنا نہ پڑتا جس سے ہم آج گذر رہے ہیں۔

فن صحافت نہیں ہے۔ بڑا فن کار اپنے گرد و پیش کی صحافتی دستاویز تیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے فن میں اپنے عہد کی تاریخ بیان نہیں کرتا۔ وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ جس دنیا میں اور تاریخ کے جس دور میں وہ جی رہا ہے اس دنیا میں جینے کا کیا مطلب ہے۔ اسی لئے فن کار کے فن سے اس کے عہد کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی نہ ہی اس کے فن کو کچا مواد سمجھ کر اس کے دور کی فکری تاریخ کی تدوین ممکن ہے۔ ایسی حرکتیں نقادوں کی ذہنی عیاشیاں ہیں۔ وہ اپنے "کام" اور اپنے مقصد کے لئے فن کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ادب کی بنیاد بنا کر "روح عصر" کی تاریخ یا فکر کے ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے والے جرمن عالموں کی حوصلہ شکن لیکن بالآخر بے نتیجہ اور فضول کوششوں سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ یہ کوششیں بے نتیجہ اور فضول اس لئے ہیں کہ ان میں یہ بنیادی نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ ادب سماجی عمل کی تاریخ نہیں ہوتا۔ ادب میں یہ ممکن نہیں کہ سماج اپنی تمام تاریخی تفصیلات کے ساتھ جھلکے۔ یہی نہیں بلکہ ادب میں جو سماجی حقیقت جھلکتی ہے وہ بھی فن کار کے تصورات، خوابوں، آرزومندیوں، محرومیوں اور تمناؤں میں رنگ کر تاریخی حقیقت سے اس قدر مختلف ہو جاتی ہے کہ یہ بتانا بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ فن کار کا فن سماجی حقیقت کا آئینہ ہے، تاویل ہے، تفسیر ہے، تنقید ہے، تجربہ ہے یا Caricature ہے۔

فن کار سماجی حقیقت کے وہی پہلو انتخاب کرتا ہے جو اس کے "فن" کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اسی لئے معاشرتی نقادوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ فن کار کے "فن" کی حدود میں رہ کر تاریخی حقیقت کا پتہ لگائیں۔ اسی لئے انھیں

---

[1] "نئی شاعری کا پس منظر" از احتشام حسین، آہنگ، گیا، شمارہ ۷،۱۔

تاریخی حقیقت کے تعین کے لئے فن کے علاوہ دوسرے ایسے بہت سے ماخذات کھنگالنے پڑتے ہیں جن میں سماجی حقیقت زیادہ ٹھوس اور معروضی طور پر قید ہوتی ہے۔یہی معاشرتی نقادوں کا حسن حسین ہے۔محض ادب اور محض آرٹ کی دنیا میں ان کی سانس رندھتی ہے اور انھیں ایسی دانشورانہ جولان گاہوں کی تلاش ہوتی ہے جہاں وہ تاریخ، معاشرت، فلسفہ اور سماجیات کی فضاؤں میں لمبے لمبے سانس لے سکیں۔ایسے لوگ دراصل سماجی مفکر، مورخ یا صحافتی آدمی ہوتے ہیں جو ادبی تنقید کو اپنے علم وفضل اور سماجی خیالات کے اظہار کا غلط طریقہ پر ذریعہ بناتے ہیں۔ادب کے خودکفیل، آزاد یا قائم بالذات ہونے کا تصور سیدھا اس بنیاد ہی پر وار کرتا ہے جس پر انھوں نے اپنی پوری دانشورانہ زندگی کی تعمیر کی ہے۔اگر ادب خودکفیل اور قائم بالذات ہی ٹھیرا تو معاشرتی نقاد محض Irrelevant اور غیر ضروری ہیں کیوں کہ کسی فن کار یا فن پارہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے اگر قاری کو فن کے باہر کسی چیز کے کھنگالنے کی ضرورت نہیں ہے تو پھر نقاد کی اس پوری فوج کے کیا معنی رہ جاتے ہیں جو ایک نازک اور لطیف سے فن پارہ کو معنی خیز بنانے کے لئے تاریخ، سماجی علوم، فلسفہ اور سیاست کی مملکتیں فتح کرنے کے لئے نکل پڑتی ہے؟ اسی لئے معاشرتی نقاد کا تصور بھی یہی ہوتا ہے کہ نقاد، قاری اور فن کار کے بیچ رابطہ ہے۔یعنی فن نہ اپنے طور پر اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ وہ قاری پر اپنے اسرار و رموز کی دنیائیں منکشف کرے نہ قاری میں اتنی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ فن سے براہ راست طور پر لطف اندوز ہو سکے۔لہٰذا بیچ میں ایک ایسے مفسر اور شارح کی ضرورت ہوتی ہے جو قاری کو وہ مواد فراہم کر دیتا ہے جس کے بغیر اس کی دانست میں فن پارہ سے کماحقہ طور پر لطف اندوز اور فیض یاب نہیں ہوا جا سکتا۔

مجھے نقاد کے اس تصور پر کچھ اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ وہ یہ کام نیازمندی اور انکساری سے کرتا رہے، حالانکہ میں ذاتی طور پر نقاد کا وہ تصور زیادہ پسند کرتا ہوں جو نقاد کا کام یہ بتاتا ہے کہ نقاد کو فن پارہ سے جو تجربہ حاصل ہوا ہے وہ اس کا بیان کرے۔ہمیں لوگوں کے تجربات سے دلچسپی ہوتی ہے خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں۔ فن کا مطالعہ بھی ایک جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے۔نقاد تو یہی بتاتا ہے کہ رباعیات خیام، دیوان غالب، شیکسپیئر کے کسی ڈرامے یا ٹالسٹائی کی ناول کی دنیا میں داخل ہونے اور اس دنیا کی سیر کا اس کا تجربہ کیا رہا ہے؟ نقاد اس تجربے کے بیان میں اپنی تمام ذہنی، فکری اور علمی صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے۔اپنے اس تجربے کو از سر نو وہ تنقید میں تخلیق کرتا ہے۔فن کار زندگی کے تجربہ کو فن میں تخلیق کرتا ہے، نقاد فن کار کے تجربے کو تنقید میں۔تنقید میں اسی حد تک تخلیقی سرگرمی ہے۔میں تاثراتی تنقید کی بات نہیں کہہ رہا نہ ہی میرا مطلب یہ ہے کہ فن کار اور نقاد دونوں کے تخلیقی عمل کی نوعیت ایک سی ہے۔نقاد تنقید میں تاثراتی طریقہ کار کو بھی اپنائے گا لیکن اس کا رویہ بنیادی طور پر دانشورانہ اور عقلی ہوگا۔

بہر حال تنقید وہی بڑی ہوتی ہے جو فن پاروں کی دنیا میں نقاد کے ذہنی سفر کی داستان ہوتی ہے۔یہاں پر نقاد محض ایک رابطہ نہیں ہوتا بلکہ خود ایک آزاد شخصیت اختیار کر لیتا ہے اور اس میں ہماری دلچسپی کی وجہ یہ ہوتی ہے اس کی شخصیت بذات خود دلچسپ اور پہلودار ہوتی ہے۔وہ دنیائے ادب کا ایک سیاح ہوتا ہے جو ان دنیاؤں کے بارے میں جن سے ہم واقف ہوتے ہیں دلچسپ اور بصیرت افروز باتیں بتاتا ہے اور ان دنیاؤں کے بارے میں جن سے ہم واقف نہیں ہوتے دلچسپ باتیں کر کے ہمیں ان کی سیر کی ترغیب دلاتا ہے۔"رابطہ" کے تصور میں پیران کلیسا کے پندار اور مجاوروں کی بو آتی ہے۔معاشرتی نقاد کی شخصیت چونکہ تمام سماجی علوم کی ایک کیم وشحیم اکاڈمی کا حجم رکھتی ہے اس لئے اکثر و بیشتر رابطہ سد راہ بن جاتا ہے اور قاری تاریخی عہد اور سماجی ادوار اور طبقاتی نظاموں اور سیاسی انقلابوں کے ہفت خوان طے کرنے کے بعد فن کار یا فن پارہ تک پہنچتا بھی ہے تو اس کا ذہن مختلف تصورات، نظریات اور تاثرات سے اس قدر مسخ ہو چکا ہوتا ہے کہ فن پارہ کو صحیح فنی قدروں اور اس کی جمالیاتی خصوصیات کی بنا پر سمجھنے، برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اس میں استعداد ہی نہیں رہتی۔

آرٹ کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہم سے براہ راست گفتگو کرتا ہے۔ یعنی اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں کسی قسم کی پیشگی تیاری کی ضرورت نہیں رہتی۔اپنے ریک پر سے آپ شیکسپیئر کے ڈرامے، چیخوف کی کہانی اور دیوان غالب کو کسی بھی وقت اٹھا کر پڑھ سکتے ہیں۔اگر شیکسپیئر کے ڈرامے سے لطف اندوز ہونے کے لئے مجھے الزبتھ کے عہد کی سماجی، سیاسی اور مذہبی تاریخ کا علم بھی حاصل کرنا ضروری ہوتا تو آپ ہی بتائیے کہ سوائے چند عالموں کے شیکسپیئر سے کون فیض یاب ہو سکتا؟ فن کے قائم بالذات ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے وقت کی پیداوار ہونے کے باوجود اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس "وقت" کے عالمانہ مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔فن جتنا اپنے وقت میں اسیر ہوگا، اتنا ہی وہ وقتی اور صحافی ہوگا اور اتنا ہی وہ کم خودکفیل ہوگا۔جتنا وہ کم خودکفیل ہوگا اتنا ہی اسے سمجھنے کے لئے فن سے باہر اس وقت کی تاریخ اور سماجی واقعات سے واقفیت ناگزیر ہو جائے گی۔فن کار اپنے وقت کی ہی پیداوار ہوتا ہے لیکن اس کا سروکار انسان کی جذباتی اور حسی زندگی کے ان پہلوؤں اور مسائل سے ہوتا ہے جو ابدی اور آفاقی دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں۔اسی لئے فن کار سماجی حالات کو اپنا موضوع نہیں بناتا بلکہ ایک مخصوص دور کے مخصوص حالات کے پیدا کردہ انسان کی اخلاقی اور جذباتی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔اسی لئے اس کے فن کو سمجھنے کے لئے اس کے دور کے سماجی حالات کا مطالعہ ناگزیر نہیں ہوتا۔ایسا مطالعہ ہم ہمارے شوق کی خاطر یا کسی اور مقصد سے کر سکتے ہیں۔لیکن ہم کوئی ایسا کلیہ یا نظریہ نہیں بنا سکتے جیسا کہ معاشرتی نقاد بناتے ہیں کہ فن کار کے سماجی پس منظر کو سمجھے بغیر فن کار کو سمجھا نہیں جا سکتا۔چنانچہ احتشام حسین کے اس سوال کے جواب میں کہ:

> کیا اقبال اور ٹیگور کی شاعری عالمی فکر، ہندوستانی بیداری،
> انقلاب روس، روایتی سرمایہ فکر و ادب اور عصری تقاضوں پر
> غور کئے بغیر بھی جانچی جا سکتی ہے؟[1]

---

[1] "نئی شاعری کا سماجی پس منظر" آہنگ، ۷۱۔

ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ جی ہاں کبھی جا سکتی ہے اور اگر نہیں بھی جا سکتی تو اقبال اور ٹیگور جس مناسبت سے اپنے وقت اور عصری حالات میں قید ہیں اسی مناسبت سے ان کا شاعرانہ قدر کم ہوتا ہے، بڑھتا نہیں۔ اگر اقبال اور ٹیگور کی شاعری کو ادب کی زندہ روایت بننا ہے تو آج سے سو سال بعد آنے والی نسلوں کے لئے اسے اتنا ہی Self Contained ہونا پڑے گا جتنی مثلاً شیکسپیئر، غالب یا بودلیئر یا ایلیٹ کی شاعری ہے۔ اگر اقبال اور ٹیگور کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے آنے والی نسلوں کو ہندوستانی بیداری اور انقلاب روس کی تاریخیں اٹھلانے کی نوبت پیش آئے تو شاعر، شاعر کم اور صحافی اور پروپیگنڈسٹ زیادہ ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شاعر اپنے وقت کے حالات سے سروکار نہیں رکھتا یا اپنے وقت کی پیداوار نہیں ہوتا۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنے فن کو محض صحافت اور پروپیگنڈہ یا کسی سماجی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک آزاد اور قائم بالذات سرگرمی سمجھتا ہے تو اس کی کوشش یہی ہوگی کہ وہ اپنے فن کو حالات کا حلقہ بگوش بنانے کی بجائے فن کا سروکار ان امور سے رکھے جو انسانوں کے بنیادی Concerns سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی فن سے وہ وہی کام لے جس کام کے کرنے کا وہ اس کے زمانے میں اہل ہے۔ فن کار اپنے وقت کے حالات کا انکار نہیں کرتا۔ ان سے چشم پوشی بھی نہیں کرتا۔ ان سے گریز اور فرار بھی اختیار نہیں کرتا۔ وہ انھیں اپنی گرفت میں لیتا ہے پھر انھیں Transcend کر جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس نے جنگ یا انقلاب کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جن چیزوں کا وہ ذکر کر رہا ہے ان کے سامنے جنگ اور انقلاب ہیچ ہیں۔ جنگ اور انقلاب تو محض علامات ہیں کسی اندرونی روگ کے۔ یہ روگ انسان میں کہاں ہے۔ کیسے پیدا ہوا فن کار اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ فن کار جب انسانی روح کے Malaise کا ذکر کرتا ہے تو وہ جنگ اور انقلاب، فسادات اور تشدد سے آنکھیں چراتا نہیں بلکہ ان سے گذر کر انھیں سمیٹ کر وہ بیماری کی اصل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جنگ اور انقلاب کا ذکر نہ پا کر آپ فن کار پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ اپنے وقت کے حالات سے سروکار نہیں رکھتا۔ وہ سروکار رکھتا ہے لیکن ایک فن کار کی طرح اور فن کار کا کام تخلیق فن ہے، سماجی Document تیار کرنا نہیں۔ اور تخلیق فن کا مطلب ہے فن کو خود کفیل قائم بالذات سرگرمی سمجھا جائے، پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں۔ ایسا سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فن کار عصری تقاضوں کی بجائے فنی تقاضوں کا خیال رکھے گا اور اس کے فنی تقاضے اسے بتائیں گے کہ اس کا کام تاریخ کی مسل بندی اور ہنگامی، سماجی اور سیاسی واقعات میں صحافیوں کی سی دلچسپی اور مبلغوں کی سی ترجمانی نہیں ہے بلکہ انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی کی فن کارانہ تفسیر و تعبیر ہے۔ یہی آگہی فن کار کو اس کے زمانہ اور اس کے ملک اور اس کی قوم کا ہوتے ہوئے بھی ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے قابل قبول بناتی ہے۔

فن کار کی ہر تخلیق قاری کو ایک ذاتی Compliment پیش کرتی ہے۔ وہ قاری سے روبرو براہ راست گفتگو کرتی ہے۔ فن کار دوسرے ماہرین علوم کی طرح قاری سے تقاضا نہیں کرتا کہ اس کی تصنیف سے فیض یاب ہونے کے لئے وہ اپنے ذہن کو خصوصی علوم سے آراستہ کرے۔ فلسفہ اور نفسیات کو سمجھنے کے لئے ان علوم میں عالمانہ دسترس اور استادانہ مہارت بہم پہنچانی پڑتی ہے۔ فن اس قسم کے اسی ذہنی یا دانشورانہ specialization کا تقاضا نہیں کرتا۔ فن کار اپنی تمام بلندیوں کے باوجود چوراہے کا آدمی ہوتا ہے اور کوئی بھی آدمی دو روپے پھینک کر مجرے میں غالب اور داغ کی غزلیں سن سکتا ہے اور تھیٹر میں شیکسپیئر کا ڈراما دیکھ سکتا ہے۔ وہ ان سے کتنا لطف اندوز ہوگا اس کا دار و مدار اس کی ذہنی سطح پر ہے، علمی بلندی پر نہیں۔ فن کے اس عوامی کردار کو نظر انداز کر دیجئے اور شعر چوراہے سے نکل کر داخل مدرسہ ہو جائے گا۔ مدرس چاہتے بھی یہی ہیں کہ ان کے رابطے کے بغیر شعر سے کوئی ربط قائم ہی نہ کر پائے۔ ان کی تان اسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ جب تک وہ فن کار کے عہد کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا بھرپور تجزیہ نہیں کرتے تب تک آپ شاعر اور شاعری کو کما حقہ طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے ان لوگوں کے پسندیدہ لکھنے والے بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے وقت کے حالات میں اس قدر قید ہوں کہ ان کی کتابوں کو سماجی تاریخ کی کتاب کے حاشیہ کے طور پر ہی پڑھا جا سکے۔ سماج سدھار، مصلح قوم، راشٹر کوی اور انقلابی صحافت کے خطیب ایسے لوگوں کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ ایسا ادب کیسا ادب ہوتا ہے، اس سے مجھے سر دست بحث نہیں۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ ادب کی یہی قسم کل ادب ہے۔ دنیا کے ادب کا بہت بڑا اور بہت ہی عظیم حصہ ایسے ادب پر مشتمل ہے جو نہ سماجی مسائل سے بحث کرتا ہے نہ ان کی اصلاح اور حل سے متعلق ہے۔ اس کے بنیادی Concerns انسانی زندگی کے جذباتی اور روحانی پہلو ہیں۔ یہ ادب انسان کو اس کے تاریخی پس منظر میں نہیں بلکہ اس کے انسانی اور وجودی پس منظر میں دیکھتا ہے۔ ایسے ادب کا تعلق ملک اور قوم بنانے، اور ملک اور قوم تباہ کرنے، نئے سماج کی داغ بیل ڈالنے اور نئے انسان کے آدرش پیش کرنے سے نہیں ہوتا، اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان کو انسان کے طور پر سمجھا جائے۔ انسان کی قوتوں اور کمزوریوں اس کی الم ناکیوں اور نشاط آفرینیوں اس کی اخلاقی، روحانی اور جذباتی کشمکشوں، اس کی اچھائیوں اور برائیوں، بلندیوں اور پستیوں کی وہ آگہی حاصل کی جائے جو صرف فن کے ذریعہ ممکن ہے۔ جن فن کاروں کا تعلق ایسے مسائل سے ہوتا ہے ان کا سماجی پس منظر بھی ہمیں بتا کر کیا بتا سکتا ہے؟

جو لوگ اپنی عصری تاریخ کے جوہڑ ہی کو پھلانگ گئے ہوں اس جوہڑ میں نقاد کا گلے تک دھنسے رہنا پیشہ ورانہ مجبوری ہو تو ہو، ادبی اور تنقیدی تقاضا تو نہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے معاشرتی نقاد جب بھی کسی فن کار کے عہد کے سماجی حالات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ان حالات کو فن کار کے فن کے ساتھ کسی معنی خیز یا بصیرت انگیز طور پر Link نہیں کر سکتے۔ ان کی تنقیدوں میں تاریخ کا حصہ الگ رہتا ہے۔ اور فن کار کے فن کا حصہ الگ ہے۔ دونوں ''ناگزیریت'' کے بندھن سے کبھی بندھے نظر نہیں آتے۔ ان کے ادبی تصورات (اگر کوئی ہوئے) ان کے سماجی تصورات سے الگ رہتے ہیں یا ٹکراتے رہتے ہیں لیکن کبھی باہم مل کر ایک جامع

نظریہ کی تشکیل نہیں کرتے۔ سیکڑوں شاعر ایسے ہوتے ہیں جو ان کے نظریے کی تنگ دنیا میں سما نہیں سکتے۔ اس وقت ان کی برہمی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ غصہ تو انھیں اسی بات پر ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے وقت کی تاریخ پر ایسے نظر کیوں نہ کی جیسی کہ انھوں نے اس کے وقت کی تاریخ پر ڈالی ہے۔ جو بات یہ بھولے بھالے نقاد نہیں جانتے وہ یہ ہے کہ شاعر کا عہد ان کے لئے تاریخ ہے لیکن شاعر کے لئے تو ایک زندہ حقیقت تھا۔ وہ تاریخی عمل سے الگ نہیں تھا بلکہ اس عمل کا ایک حصہ تھا۔ وہ خود تاریخ کی گردشوں میں گھوم رہا تھا اور اپنے وقت کا مطالعہ وہ اس طرح نہیں کرسکتا تھا جس طرح ایک زمانی فاصلہ کے بعد اکاڈمی میں بیٹھے مورخ اور نقاد کر سکتے ہیں۔

یہ لوگ کسی تاریخی عہد کے اہم واقعات کے متعلق سوچتے ہیں اور ان کے متعلق کسی دوٹوک رائے یا نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا کرسکتے ہیں، لیکن وہ اس عہد کے شاعر سے ایسے مطالبات نہیں کرتے کہ وہ بھی ان ہی کے جیسی رائے قائم کیوں نہیں کرسکا؟ اس لئے نہیں کرسکا کہ اسے وہ زمانی فاصلہ کے فوائد حاصل نہیں تھے جو انھیں ہیں۔ اگر شاعر، بادشاہ اور نواب کے متعلق جاگیرداری اور ساختی کال کے زوال کے متعلق نئے عہد کی آمد کے متعلق اپنا رویہ متعین نہیں کرسکا تو یہ اس کی مجبوری تھی۔ لیکن معاشرتی نقاد ایسی مجبوریوں کا خیال نہیں کرتے۔ وہ فوراً فیصلہ صادر کردیں گے کہ شاعر کے یہاں تضاد ہے اور یہ تضاد اس کے زمانے کا تضاد ہے۔ شاعر اپنے عہد کے طبقاتی نظام کے اندرونی تضاد کو سمجھ نہیں سکا۔ شاعر اپنے حالات کا مناسب اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ سماجی مسائل کا کوئی سماجی حل تلاش نہیں کرسکا کیوں کہ ایسے حل کی تلاش اس نے سماجی حقائق کی دنیا میں نہیں کی بلکہ اپنی ذات کے اندر کی۔ اس طرح وہ عینیت اور سریت کا شکار ہوگیا۔ اس کی شکست خوردگی اور پسپائی اور قنوطیت اور تصوف زندگی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے عقل وشعور سے اپنے وقت کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اس قسم کی تنقیدوں کے آپ نمونے دیکھنا چاہیں تو آپ احتشام حسین، ممتاز حسین، ظ انصاری، سردار جعفری، سجاد ظہیر، محمد حسن اور دوسرے بے شمار مارکسی اور معاشرتی نقادوں کے وہ مضامین پڑھیے جو انھوں نے ہمارے کلاسیکی شاعروں پر لکھے ہیں۔ ایسی تنقیدوں کو میں سرے سے تنقید ماننے کے لئے ہی تیار نہیں ہوں۔ ان تنقیدوں کا ادبی حقائق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تنقیدیں نقاد کی ترنگی فکر اور نظریاتی اڑانوں کا ملغوبہ ہیں۔ یہ جدید یا قدیم ادب کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں بتاتی جو اس ادب کو سمجھنے میں اور اس سے بہتر طور پر لطف اندوز ہونے میں ہماری مدد کریں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہماری توجہ کو اصل حقائق سے ہٹا کر ان حقائق میں الجھاتی ہیں جو بنیادی طور پر ادبی حقائق ہیں ہی نہیں۔ اس تنقید نے ہمارے جدید اور قدیم دونوں قسم کے شاعروں کے ساتھ ناانصافیاں کی ہیں۔ ہمارے ذہنوں کو غیر ادبی عقائد اور وابستگیوں اور آئیڈیولوجیکل تعصبات سے بھر کر ہمیں اس بات کا اہل ہی نہیں چھوڑا کہ ہم شعر کو شعر کے طور پر پڑھ سکیں اور شاعر کو شاعر کے طور پر چاہ سکیں۔ بات ذرا سخت ہے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ "ہماری" مارکسی اور معاشرتی تنقید نے سوائے فکری انتشار، ذہنی تعصب اور تہذیبی بربریت کے کوئی اثرات ہمارے ادب پر نہیں چھوڑے۔

یہی حال فلسفی نقادوں کا ہے۔ انھوں نے اپنی نام نہاد فلسفیانہ تنقید سے فن کار کی رہنمائی نہیں کی بلکہ اسے محض الجھایا ہے۔

ذرا کرامت علی کرامت صاحب کے ان جستہ جستہ جملوں پر نظر کیجئے:

"لیکن جہاں تک وجودیت پسندی سے ہمارے جدید شعرا کی ذہنی وابستگی کا سوال ہے، ان لوگوں نے عموماً ناقص ردعمل کا ثبوت دیا۔"

"اپنے ترقی پسند پیش رووں کے برعکس ہماری نئی نسل کے شعرا نے وجودیت پسندوں کی طرح فرد کی ذات کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اپنی شاعری میں کرب واضطراب، تردد وتشویش، غیر محفوظیت و درشتی، نیز مایوسی و بے یقینی کے احساس کو بکثرت استعمال کرتے رہے۔ اس انتشار کو نئی شاعری کے بعض فلسفہ طرازوں نے عالمی سطح پر پھیلے ہوئے انتشار کا جائز ردعمل قرار دیا۔ اردو کی نئی نسل میں اس رجحان کو مقبول عام بنانے میں "شب خون" الٰہ آباد کا سب سے نمایاں حصہ ہے۔ نئی نسل میں اس رجحان کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نئی شاعری "فرد کی ذات"، "ذات کا کرب" اور "کرب کا احساس"، اسی مثلث میں محبوس ہو کے رہ گئی۔ وجودیت پسندوں کا اصل فلسفہ کہ انسان اپنی قوت ارادی کے ذریعہ غیر محفوظیت، خوف، تردد اور انتشار کے عالم سے خود کو باہر نکال لانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اردو کے نئے شاعروں میں تقریباً مفقود ہو کے رہ گیا ہے۔ یہ بات یقیناً اردو ادب کے لئے اچھی علامت نہیں تھی۔"

"انسان اپنے وجودی حدود کو پار کرنے کی کاوش میں اس عدمیت یا نفی پن کا احساس کرے گا جسے گوتم بدھ نے शून्य سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ عدمیت برائے عدمیت نہ ہوگی بلکہ संसार کے ماورا ارتفاع حاصل کرنے کی غرض سے ہوگی۔ لیکن اردو کے نئے شاعروں میں اس ارتفاع کا جذبہ مجموعی طور پر مفقود نظر آنے لگا۔ حالانکہ اقبال کی شاعری کی عمدہ مثالیں ان کے سامنے تھیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا تھا اور اس طرح ایک طرف اپنشد اور گوتم بدھ کے فلسفہ سے تو دوسری طرف مولانا روم کے اسلامی فلسفہ سے رشتہ جوڑا جاسکتا تھا جس سے ہم بین الاقوامی ادب کے سامنے فخر کے ساتھ ایک نئی چیز پیش کرسکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے لئے نئی شاعری کے وہ فلسفہ طراز ذمہ دار تھے جو جدید انسان کے مثبت کردار کو جدید شاعری میں ابھارنا نہیں

چاہتے تھے۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے جدید انسان کی جس تنہائی پر زور دیا ہے بین الاقوامی ادب کے لئے کوئی نیا فلسفہ نہ تھا..."

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وجودیت پسندی کے فلسفہ میں کوئی خامی نہیں ہے یا یہ کہ شاعر کے لئے وجودیت پسندی سے اثر قبول کرنا لازم اور لابدی ہے بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وجودیت پسندوں کی طرح اگر غیر محفوظیت، خوف، تردد، تشویش اور انتشار کو اپنایا گیا تھا تو وجودیت پسندی کے مثبت پہلو کو کیوں نہیں اپنایا گیا جس کی رو سے جدید انسان اپنی قوت ارادی کے ذریعہ اپنے تاریک ماحول سے خود کو نکال لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔"

("سطور"، شمارہ ۴)

ان تمام بیانات کے پیچھے جو ذہنیت کام کر رہی ہے وہ کتے کو برا نام دے کر اسے پھانسی پر چڑھانے والی ذہنیت ہے۔ وجودیت کے تخت پر جدید شاعروں اور جدید شاعری کے "فلسفہ طرازوں" دونوں کو سولی دی گئی ہے۔ جس غلط مفروضے پر یہ بیانات قائم ہیں وہ یہ ہے کہ جدید شاعری وجودی فلسفہ کی ترجمان ہے۔ جس غلط ادبی نظریہ پر یہ مفروضہ مبنی ہے وہ یہ ہے کہ شاعری کسی بھی فلسفہ کی ترجمان یا عکاس ہو سکتی ہے۔ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان دینے سے پیشتر نقاد کو چاہئے کہ وہ ادب اور فلسفہ کے رشتہ پر غور کر کے چند بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرے، کیوں کہ ایسا کئے بغیر وہ فن اور فلسفہ کے رشتے کو سمجھ نہیں سکے گا اور اس میں نقصان فن کا ہی ہوگا۔ یہ سوالات ہیں: کیا فن فلسفہ کا حلقہ بگوش ہوتا ہے یا خوشہ چیں؟ خوشہ چینی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ فن کار کسی بھی فلسفیانہ تصور کا استعمال کیسے کرتا ہے؟ فن کار کے یہاں فلسفیانہ خیال کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا فن کاری کی اعلیٰ قدروں کو بھینٹ چڑھائے بغیر فلسفہ کی پیروی ممکن ہے؟ کیا فلسفیانہ شاعری کی مسرت بخشی جمالیاتی ہوتی ہے یا فکری؟ کسی خیال کا انکشاف یا اس کا فلسفیانہ استقصاء بذات خود ایک مسرت انگیز اور Exciting کام ہے۔ اس لئے شاعری میں فلسفیانہ تفکر بھی مسرت انگیز ہو سکتا ہے جیسا کہ مثلاً پوپ (Alexander Pope) کی شاعری میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مسرت شاعری کی ہے یعنی جمالیاتی ہے، یا فلسفیانہ غور و فکر کی یعنی دانشورانہ ہے؟ پوپ اور شیکسپیئر میں، غالب اور اقبال میں فلسفہ کا استعمال کون سا فرق لئے ہوئے ہے اور اگر ایک کی فن کاری دوسرے سے اعلیٰ درجہ کی ہے تو دونوں میں فن کارانہ رویہ... ادب میں فلسفہ کو برتنے کا... وہ کون سا طریقہ کار ہے جو ایک کو دوسرے سے بہتر فن کار بناتا ہے؟

غرض کہ ادب اور فلسفہ کے مسائل ایسے نہیں ہیں کہ کچھ فرض کر لیا جائے جو ادب کے فنکشن اور منصب سے ناانصافی کے مرتکب ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ نقاد کو کسی ایک فلسفہ میں دلچسپی ہو اور اسے اس پر دسترس بھی حاصل ہو لیکن اس سے اس بات کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسی ہی دلچسپی اور دسترس کا مطالبہ فن کار سے کرے۔ فن کار کی فلسفہ میں دلچسپی فلسفہ کے طالب علم سے مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ وہ ہر فلسفے سے اپنے کام کی چیزیں لے لیتا ہے اور کسی بھی نظام فلسفہ کی مکمل حلقہ بگوشی نہیں کرتا۔ اس لئے فن کار پر اس اعتراض کی کوئی بنیاد نہیں رہتی کہ اس کا فلسفہ کا علم ناقص ہے۔ کرامت علی صاحب جانتے ہیں کیوں کہ انھوں نے جدید شاعری کا مطالعہ مجھ سے زیادہ کیا ہے کہ جدید شاعروں کی احساس کی سمتیں مختلف ہیں بلکہ ہر شاعر بہ یک وقت احساس کی مختلف سمتوں میں سفر کرتا ہے۔ ایسے مختلف شاعروں کو بھیڑوں کا ایک ریوڑ سمجھ کر یہ قیاس کر لینا کہ یہ سب کے سب وجودی فلسفہ کی چراگاہ میں گھاس چرتے پھرتے ہیں، ہوش مندی کی دلیل نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جدید شاعری وجودی فلسفہ سے متاثر نہیں ہے، یا جدید شاعری ان مسائل سے بے نیاز ہے جو وجودی فکر کے بھی مسائل رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر جدید شاعری وجودی فکر سے متاثر ہے تو پھر نقاد کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان اثرات کا جائزہ لے کر بتائے کہ ان کا ادب پر کیا اچھا برا اثر پڑا ہے؟ ایسا جائزہ اور تجزیہ اور چیز ہے اور ادعائی بیانات اور تعمیمات دوسری چیز۔

کرامت صاحب کو شکایت ہے کہ ہمارے جدید شاعروں نے وجودیت پسندی کے فلسفہ سے ناقص ردعمل کا ثبوت دیا یعنی اس کے چند منفی پہلوؤں کو اپنایا لیکن مثبت پہلوؤں کو یعنی قوت ارادی کے ذریعہ تاریک ماحول سے نکلنے والے پہلوؤں کو نہیں اپنایا۔ کرامت صاحب کے اسلوب فکر کو اگر ہم تنقید میں روا رکھیں تو پھر دیکھئے کیسے دلچسپ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا کبیر نے اسلام کی طرف مثبت ردعمل کا ثبوت دیا؟ اس نے اسلام سے چند تصورات کیوں لئے اسلام کا پورا فلسفہ کیوں نہ ہضم کیا؟ اقبال نے ہیگل، کانٹ اور نطشے اور برگساں کے چند تصورات کو کیوں اپنایا؟ کیا اقبال نے مارکس کی طرف ناقص ردعمل کا ثبوت دیا ہے؟ (مارکسی تو خیر ہاں ہی کہیں گے) کیا ترقی پسندوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کمیونزم کے صرف مثبت پہلوؤں کی طرف دیکھا اور منفی پہلوؤں کی طرف نہیں دیکھا؟ سوال پھر وہی بنیادی آن کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ فن کار کون سی ضرورتوں کے تحت کون سے تصورات اپناتا ہے اور ان سے اپنی شاعری میں کیا کام لیتا ہے؟ وہ تصورات اس کی شاعری کو کمزور بناتے ہیں یا طاقت بخشتے ہیں، فلسفہ فن کار کی حسیت کو محدود کرتا ہے یا اسے وسعت بخشتا ہے؟

مثلاً ذات کے کرب کا مسئلہ لے لیجئے۔ نقاد کا پہلا کام تو یہ ہے کہ کسی بھی شاعر کے یہاں کرب کی نوعیت کا اندازہ لگائے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ "کرب" کا شدید ترین اظہار تو فیض کی نظم "ہم لوگ" میں ہوا ہے، جس میں فیض نے جدید آدمی کی موہوم الجھنوں کی جذباتی سطحوں کو نہایت احساس مندی سے چھوا ہے۔ پہلا سوال تو یہی کہ جدید شاعروں کا کرب اس کرب سے کون سی باتوں میں مختلف ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود فیض کا کرب رومانی Agony سے کون سی باتوں میں مختلف ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ جدید شاعروں کے کرب کی اگر کچھ فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی سمتیں ہیں تو وہ کون سی ہیں اور اس معاملہ میں ان پر کون سی وجودی اور غیر وجودی مفکروں کے اثرات پڑے ہیں؟ کرب کی جو مختلف شکلیں مثلاً ذات کا

کرب، فرد کی آزادی کا کرب، آزادانہ انتخاب کا کرب، موت کا کرب وغیرہ جو وجودی مفکروں میں نظر آتی ہیں ان میں سے کون سے کرب نے ہمارے شاعروں کو زیادہ متاثر کیا ہے اور کیوں؟ کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ جسے ہم وجودی کرب کہتے ہیں وہ فن کار کے وجودی مسائل ہی کا پیدا کردہ ہو اور وجودیت پسند فلسفہ کی دین نہ ہو؟ ہیگل نے جسے دکھی شعور کہا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے ضروری تو نہیں کہ وجودیت پسند فلسفہ کی خوشہ چینی کی جائے۔

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا اور یہ کام ادبی نقاد کا بنیادی کام ہے کہ اس کرب سے شاعر نے کام کیا لئے ہیں؟ محض کرب کی موجودگی یا اس کا بیان تو شاعر کو شاعر نہیں بناتا۔ مثلاً ہمیں یہ سوال پوچھنا ہوگا کہ اس کرب پر شاعر Ruminate کرتا ہے یا اس پر Contemplate کرتا ہے۔ الیٹ نے بتایا ہے کہ جو چیز آرنلڈ کو بڑا شاعر بننے سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسائل پر Ruminate بہت کرتا ہے۔ خود آرنلڈ نے اپنی نظم کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ داخلی Brooding جو کسی عمل میں منتج نہیں ہوتی بالآخر اکتاہٹ اور بے کیفی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ نقاد کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جدید شاعر کرب پر Ruminate کرتا ہے تو اس کے نتائج کیا آتے ہیں؟ اس پر Contemplate کرتا ہے تو فکر و احساس کے کون سے دیے روشن ہوتے ہیں؟ احساس کی سطح پر محض کرب کا اظہار کرتا ہے تو شاعری کی فضا کیسی صورت اختیار کرتی ہے؟ کیا اس فضا پر وہ بادل چھائے رہتے ہیں جو کھلتے ہیں نہ برستے ہیں یا پھر ابر شفق آلودہ کی آگ سے فضاؤں کی سمتیں دہک اٹھتی ہیں؟ کیا کرب داخلی حزن پیدا کرتا ہے یا اندرونی گھٹن؟ دونوں صورتوں میں اس کی امیجری اور ڈکشن کیسے متاثر ہوتی ہے؟ کیا شاعر تصویری پیکروں اور علامتوں کے ذریعہ سوچتا ہے یا تجریدی فکر کی سطح پر؟ الفاظ اس کے یہاں جیتے جاگتے ہیں یا کتابی ہیں؟ پھر ایک دوسرا اہم سوال آتا ہے۔ کرب جدید شاعری میں شاعر کا حسی تجربہ ہے یا محض فیشن پرستی؟ نقاد کے پاس اس کے وجدان کے علاوہ دوسرے کون سے Empirical تنقیدی سانچے ہیں جن کے ذریعہ وہ کسی احساس کی اصلیت اور بناوٹ کا فرق سمجھتا ہے؟

یہ اور ایسے دوسرے بہت سے کام ہیں جو کسی بھی رجحان، تحریک یا شعر کے متعلق فیصلہ دینے سے پیشتر نقاد کو کرنے پڑتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام مشکل ہیں۔ لیکن نقاد سے یہ کس نے کہا کہ اس کا کام آسان ہوتا ہے؟ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قسم کا کام کرنے کے لئے ہر شاعر کے لئے وقت نکالنا پڑتا ہے اور ہم سب عدیم الفرصتی کے مارے ہوئے ہیں۔ میں خود جدید اور قدیم سبھی شاعروں پر اپنے طور پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں، لیکن وقت کہاں ہے؟ لیکن نقاد اگر نقاد کے طور پر کام نہیں کرسکتا تو اسے خاموش رہنا چاہئے۔ رائے زنی اور مشورہ پاشی سے خوش ہو لینا اس کے کردار کو زیب نہیں دیتا۔ Pat generalization کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک بھی شاعر سے ناانصافی کرتا ہے تو نقاد نا قابل معافی غلطی کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ قانون کا طریقہ کار بھی تو یہی ہے کہ چاہے دس مجرم چھوٹ جائیں لیکن ایک بے گناہ نہ مارا جائے۔

اب کرامت صاحب کے طریقہ کار پر غور کیجئے۔ وہ پہلے وجودیت کے فلسفہ کی تمہید باندھتے ہیں اور پھر اس تمہید کو درہ بنا کر جدید شاعروں کو پھٹکارتے ہیں۔ یہ طریقہ کار اتنا ہی Indecent ہے جتنا ترقی پسند نقادوں کا طریقہ کار جو انسان دوستی اور زندگی سے پیار وغیرہ قسم کی چیزوں کا خود کو اجارہ دار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کو جو ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں انسان دشمن اور حیات دشمن اور موت اور غلاظت کے کیڑے سمجھتے ہیں۔ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ جدید شاعر نے وجودیت پسند فلسفہ کے منفی پہلو لئے اور مثبت پہلو نہ لئے۔ اگر وجودیت پسند فلسفے کے مثبت پہلو ہیں یعنی یہ فلسفہ فن کار کے لئے ایسے امکانات رکھتا ہے کہ وہ زندگی کی طرف کوئی اطمینان بخش اثباتی رویہ تشکیل دے سکے تو کرامت صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس کی نشان دہی کرتے۔ لطف تو اس وقت آتا جب وجودی فلسفہ کے دور جدید کے سب سے بڑے مفکر اور ادیب سارتر کے ادب سے مثالیں پیش کر کے بتاتے کہ آدمی اپنی قوت ارادی سے اپنے تاریک ماحول سے کس طرح نکلتا ہے۔ سارتر کی تمام ناولیں منفی رویہ پر ختم ہو جاتی ہیں، اور گو اس کے ڈرامے اثباتی رویہ کی طرف قدم بڑھاتے محسوس ہوتے ہیں لیکن منزل پر پہنچ نہیں پاتے۔

دراصل سارتر کا پورا ادب بھی اس کے وجودی فلسفہ ہی کا exploration ہے جو فکر کی بجائے تخلیقی سطح پر کیا گیا ہے۔ سارتر بہت ہی ذہین اور بہت ہی طباع ادیب ہے۔ بیسویں صدی پر اس کی چھاپ بہت گہری ہے لیکن اس کا ادب جو ایک سوال پیش کرتا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے ادب کو اپنے فلسفہ کی تفسیر بنا کر ادب کو ادب کتنا رہنے دیا؟ سارتر کے بڑے سے بڑے مداح بھی اس سوال کا جواب دیتے وقت بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ سارتر کے ادب کی فلسفیانہ قدر و قیمت بہت بڑی سہی لیکن اس کی تخلیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ تو ایک عام سا مقولہ بن گیا ہے کہ فلسفی تو بڑا سارتر ہے لیکن فن کار بڑا کامیو ہے۔ یہ سارتر اور کافکا کا مقابلہ بھی ہمیں بتا دے گا کہ مابعد الطبیعیاتی خوف، کرب اور غیر تحفظی کا فن کارانہ احساس اور اس احساس کا ترجمان ادب کیسا ادب ہوتا ہے اور اس احساس کا فلسفیانہ تجزیہ اور تفسیر کا کیا مطلب ہے اور اس تجزیے اور تفسیر کا ترجمان ادب کیسا ہوتا ہے؟

دوسری بات یہ کہ جس قسم کے اثباتی رویہ کی بات کرامت صاحب کرتے ہیں وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک فن کار سنگ دلی اور بے دردی سے چند دوٹوک اور حتمی فیصلوں پر نہ پہنچے۔ ایسے فیصلوں کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ فن کار اپنے لئے جذبات اور تجربہ کی دنیا کیں محدود کرلے۔ ایک سمت میں چلنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ دوسری سمتوں کی طرف پیٹھ کرلی جائے۔ ایسے فیصلوں سے اقبال اور ترقی پسندوں اور وجودیت پسندوں کے ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی نشان دہی کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ خود سارتر کے ادب کو دیکھئے۔ اس میں تشدد کا عنصر کتنا زیادہ ہے۔ عورت اور جنس کی طرف اس کا رویہ کتنا غیر صحت مند، غیر جذباتی اور سرد ہے۔ اس کا آزادی کا تصور کتنا Demonic ہے۔ اس کے یہاں انسان اپنی قوت ارادی سے اپنے لئے ذمہ دارانہ انتخاب کر کے خود کو

جس قالب میں ڈھالتا ہے وہ انسانیت دوست لبرل اور انقلابی آدمی کا کردار ہے لیکن سارتر کا پورا وجودی فلسفہ جو اس بے معنی اور Absurd کائنات میں انسان کے بے معنی وجود پر مبنی ہے، آدمی کے لبرل اور انقلابی بننے کے پورے عمل کو Gratuitous بنا دیتا ہے۔ یہ دنیا بے معنی ہے۔ اس دنیا میں آدمی اجنبی ہے۔ کوئی یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ یہ دنیا آدمی کے لئے بنائی گئی ہے۔ کوئی فلسفیانہ اور مذہبی تصور ایسا نہیں جو یہ سمجھا سکے کہ آدمی کیوں ہے، کائنات کیوں ہے؟ چونکہ آدمی آزاد ہے اس لئے اب وہ اپنی قوت ارادی سے جو چاہے بن سکتا ہے۔

داستفسکی کے یہاں یہ سوال اپنی پوری بھیانکتا کے ساتھ ابھرا ہے لیکن وہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ سارتر نے یہ جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش نہایت ہی پر خلوص ہے لیکن ساتھ ہی Blatant ہے۔ اصل میں جن حالات کا اسے سامنا تھا وہ بہت ہی سفاک حالات تھے۔ انسان کی ہزاروں سالہ مذہبی روایت کے باوجود سارتر نے اپنے زمانہ میں ہٹلر کے کنسنٹریشن کیمپ (Concentration Camp)، گیس چیمبر اور غیر انسانی قتل و غارت گری کا تماشا دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود جس دوٹوک طریقے پر وہ انسان سے اپنی مذہبی روایت ترک کرنے کا تقاضا کرتا ہے وہ انسان کے لئے ممکن نہیں کیوں کہ انسان اتنی آسانی سے اپنی مانوس وابستگیوں کو ترک نہیں کرتا۔ اسی لئے سارتر کا الحاد بھی نہایت سفاک اور کچے گوشت کی طرح برہنہ ہے۔ فلسفہ میں یہ سب کچھ چل سکتا ہے لیکن ادب میں تو آدمی ہر چیز کو انسانی تجربہ کے طور پر قبول کرتا ہے۔ یعنی فلسفہ میں تو مثلاً خدا کا دوٹوک انکار ممکن ہے لیکن احساس اور تجربہ کی سطح پر یہ انکار اتنا سیدھا سادا نہیں ہوتا اسی لئے سارتر کے ادب میں نرمی اور ملائمیت نہیں ملتی۔ سختی، تندی اور شدت ملتی ہے۔ اس میں چمک ہے لیکن فولاد کی۔ جذبات ٹکراتے ہیں لیکن لوہے کی سلاخوں کی طرح۔ غرض یہ کہ ادب کے ذریعہ نیا انسان تخلیق کرنے کا جذبہ اپنی جگہ حق بجانب سہی، لیکن فن کار سے احساس اور فن کی بہت قربانیاں مانگتا ہے۔

جب فن کار فن کی بجائے انسان کا خالق بنتا ہے جس کا بحیثیت فن کار کے وہ اہل نہیں ہوتا تو اسے فلسفوں کے کنوئیں جھانکنے پڑتے ہیں اور جو بھی نیا انسان وہ تخلیق کرتا ہے چاہے وہ اقبال کا مرد مومن ہو، ترقی پسندوں کا نیا انسان ہو یا سارتر کا لبرل انسان دوست انقلابی ہو، وہ محض ایک آئیڈیل ہوتا ہے اور ادب کا سروکار پھر آئیڈیل سے نہیں Actuality سے ہوتا ہے۔ اسی لئے فن کار فلسفہ کے مسائل ادب میں نہیں سلجھاتا بلکہ انسان کے انسانی مسائل کی ادب کے ذریعہ آگہی پیش کرتا ہے جیسا کہ آڈن نے بتایا ہے کہ فن کار Dilemma کو Resolve نہیں کرتا بلکہ صرف اس کی Terms بیان کرتا ہے۔ اس نظر سے آپ دیکھیں تو فن کار کے اثباتی رویہ کی بات ہی مہمل بن جاتی ہے۔

جیسی باتیں کرامت صاحب نے کہی ہیں اگر ایسی باتیں "جدید شاعری کے فلسفہ طراز" کرتے تو ان پر فارمولا سازی اور منصوبہ بندی کا اعتراض عائد کر دیا جاتا اور بجا طور پر کیا جاتا۔ کرامت صاحب نے اپنے بیانات میں ایسی شاعری جس سے ہم بین الاقوامی ادب کے سامنے فخر کے ساتھ ایک نئی چیز پیش کرسکتے تھے، کا منصوبہ پیش نہیں کیا تو اور کیا کیا ہے؟ ایسی شاعری کا جو نسخہ انھوں نے تجویز کیا ہے وہ اقبال کی شاعری، اپنشد، اور گوتم بدھ کے فلسفے، اور مولانا روم کے اسلامی فلسفے پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک عدمیت کے احساس سے نکلنے کے لئے جدید شاعر اس نسخہ کا استعمال کرسکتے تھے۔ ایک سوال تو یہ کہ وجودی فلسفہ تو عدمیت کے احساس کے ساتھ جینے کا سبق دیتا ہے۔ یعنی آدمی کو اس دنیا میں عدمیت کے کرب کو جھیل کر ہی جینا پڑے گا۔ خاص طور پر ہائڈیگر (Heideggar) اور سارتر کی الحادی وجودیت پسندی کو کسی بھی طرح عدمیت کے کرب کے مداوا کے طور پر مذہب کی تشفی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ خود عیسائی وجودیت پسند عدمیت کے کرب کو زائل کرنے کا کوئی مداوا تلاش نہ کرسکے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ منکر تھے اور عدمیت کے متعلق مذہبی فکر کو ان کا ذہن رد کرتا تھا۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وجودیت پسندوں نے تو عدمیت کے احساس کے ساتھ ہی اس دنیا میں جینے کی بات کی ہے۔ اب کرامت صاحب جدیدیوں پر لعنت بھیجتے ہیں کہ عدمیت کے احساس کے ارتفاع کے لئے انھوں نے اپنشد، اسلام، اقبال وغیرہ کی طرف رجوع کیوں نہیں کیا؟

دوسری بات یہ کہ عدمیت وغیرہ کا جو کچھ گھپلا پیدا ہوا ہے وہ اللہ حضور کے ہمارے درمیان سے روٹھ کر چلے جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مذہب، موت اور عدمیت دونوں کو ہمارے لئے گوارا بنائے ہوئے تھا۔ عہد وسطیٰ کے آدمی کو موت اور عدمیت کا کرب نہیں تھا۔ اس کرب کا آغاز بھی نشاۃ الثانیہ سے ہوتا ہے جب عقلیت پسندی نے مذہبی روایت کو کمزور کرنا شروع کیا۔ ہندو مذہب اور اسلامی تصوف دونوں موت کو تو حقیقت ازلی سے وصال کی گھڑی سمجھتے تھے۔ عیسیٰ کو انسانی روح کی ابدیت کا تصور گوارا بنائے ہوئے تھا۔ یہ سب تصورات سائنس اور عقلی علوم کے آگے ٹک نہ سکے اور رخصت ہونے لگے۔ آدمی اپنی تمام Mortality اور Finitude کے ساتھ پھر کائنات میں حقیر اجنبی اور شرار جستہ بن کر رہ گیا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا کوئی فلسفہ عدمیت کے کرب کو کم یا گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ کام صرف مذہب ہی کرسکتا ہے لیکن مذہبی عقیدہ کے لئے آج کا آدمی روز بروز نا اہل بنتا جا رہا ہے۔ انسان نفسیاتی اور روحانی طور پر اپنے Finitude میں رہ نہیں سکتا اور اس کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں رہی جو اسے لامحدودیت کا احساس بخشے۔

جدید شاعر کی جدید دنیا سے غیر اطمینانی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ دنیا انسان سے اس کے جذباتی سہارے چھین لیتی ہے اور اسے ایک غیر مطمئن روح کی طرح دنیا کے خرابے میں بھٹکتا چھوڑ دیتی ہے۔ جدید شاعر کے یہاں کھوئی ہوئی روحانی دنیا کو پانے کی تڑپ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ شاعر خدا کا بھوکا ہے۔ اور جدید سائنسی دنیا میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے کیوں کہ وہ ان مانوس فکری وابستگیوں سے کٹ گیا ہے جو اس دنیا میں اس کے وجود کو بامعنی بناتی تھیں۔ کچھ نہیں تو آپ عمیق حنفی، کمار پاشی اور محمد علوی کی شاعری کو ذرا غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کی شاعری میں روحانی تشنگی کیسے پیاسی آتما کی طرح زبان لٹکائے

سو کے بیابان میں بھاگ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس پیاس کو کون بجھائے۔ اپنشد، اسلام، تصوف، لیکن کیا یہ چیزیں عقیدے کی بازیابی کے بغیر ممکن ہیں اور ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے کیا ہم اس بات کا مجاز رکھتے ہیں کہ فن کاروں کے روحانی مسائل بھی سلجھاتے پھریں؟ کیا یہ مسئلہ فن کار کا اپنا نہیں ہے کہ وجود کے کرب، عدمیت کے کرب، موت کے خوف کو زائل کرنے کے لئے وہ خود اپنا راستہ تلاش کرے؟ اگر وہ مذہب کو اپنا نہیں سکتا تو اس کی کچھ جذباتی مجبوریاں ہوں گی۔ بھلا ہماری تلقین سے وہ تھوڑے ہی شب زندہ دار بنے گا۔ اگر ہم جیسے چونچ لوگ اس قسم کی روحانی رہبری کے اہل ہوتے تو بکھیڑ تنقیدی مضامین لکھنے کے بجائے نورالہدیٰ بن کر دنیا کے لوگوں کو نجات کے راستے نہ بتاتے پھرتے؟

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ عدمیت کے کرب سے نجات پانے کے لئے اپنشد اور گوتم بدھ کے فلسفے سے زیادہ تسکین بخش کوئی اور فلسفہ نہیں۔ لیکن جس قسم کے سیکولرزم کو ہمارے زمانہ نے رواج دیا ہے اور خود الحادی وجودیت پسندوں کا فلسفہ جس کی حمایت پر تعمیر ہوا ہے، کیا ایسی سیکولر اور مادہ پرست فضا میں فن کار ان فلسفوں سے جو مذہبی اور روحانی اقدار پر مبنی ہیں فیض یاب ہو سکتا ہے؟ یعنی فن کار کے لئے کیا یہ ممکن اور مناسب ہے کہ بغیر کسی روحانی طلب کے محض شاعرانہ ضرورتوں کے پیش نظر یا بین الاقوامی ادب میں فخر کے ساتھ ایک نئی چیز پیش کرنے کے اصل مقصد کے تحت وہ ان فلسفوں کو کھنگالے جن کے سرچشمے انسان کے مذہبی اور روحانی تقاضے رہے ہیں؟ کیا بغیر کسی روحانی وابستگی کے کسی بھی روحانی نظام فکر کا استعمال عیاری نہیں ہوگا؟ کیا سنسار کے ماورا ارتفاع حاصل کرنے کے لئے کلام اقبال اور کلام رومی کا مطالعہ کافی ہے یا اس کے لئے کسی مذہبی لگن اور روحانی تجربہ کی بھی ضرورت ہے؟ کیا رومی اور اقبال کے سے روحانی اور مذہبی استغراق والوں کی مخصوص طرز کی شاعری کی ''عمدہ مثالوں'' کے ذریعہ جدید شاعر عدمیت کے مختلف مدارج پا کر سنسار کے ماورا ارتفاع حاصل کر سکتا ہے؟ کیا آدمی اپنے روحانی مسائل کو محض صوفیانہ شاعروں کے مطالعہ سے سجھا سکتا ہے، یا پھر اسے شاعری سے ہٹ کر خود اپنی زندگی میں مذہبی اور روحانی اقدار کو جذب کرنا پڑے گا؟

ان سوالوں کا تسلی بخش جواب مشکل ہے کیوں کہ ان تمام سوالوں کا تعلق ادب اور عقیدہ کے متنازعہ فیہ مسئلہ سے ہے۔ ادب میں عقیدے کے مسئلہ پر تو خود الیٹ بری طرح چکرایا ہے اور میرے گلے اس کی یہ بات نہیں اترتی کہ ادب میں عیسائیت کا استعمال عیسائیت کو اپنا عقیدہ بنائے بغیر بھی ممکن ہے۔ بہر حال کرامت صاحب فکر کے جس بحران سے گذر رہے ہیں وہ وہی ہے جس کا سامنا لبرل اور ہیومنسٹ فکر کو ہے۔ یعنی مذہب کے مافوق الفطرت عناصر کے بغیر محض اس کی اخلاقیات کو کیسے قائم رکھا جائے۔ یاد رکھئے ہیومنزم اپنی اخلایات تشکیل نہیں کر سکا۔ اس کی تمام اخلاقی اقدار وہی ہیں جو مذہبی روایت کی پروردہ ہیں۔ ہیومنسٹ مذہب کی اخلاقی اور روحانی وحدت کو ثنویت میں بدلتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر مذہب کو اس کی ماورائیت کی وجہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے اخلاقی نظام سے کارآمد کام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہیومنسٹ آدمی کے Finitude کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ تو اس کی ذات کی بیکرانیوں کا نغمہ سنج ہوتا ہے۔ لیکن ماورائی dimension سے محروم آدمی پھر محدود اور فانی آدمی ہوتا ہے۔ لہٰذا ہیومنسٹ کو پھر ایسی ماورائیت کی تلاش ہوتی ہے جو مذہب اور روحانی ڈسپلن سے بے نیاز فکر کی سطح پر اس کی تسکین کرتی ہے۔ یہ بھی گویا کیچڑ میں ہاتھ خراب کئے بغیر موتی چننے کا معاملہ ہے۔ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کی بنیاد پر ہی انتخابی مذہبیت کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ ایسے فلسفوں اور روحانی نظاموں کی تلاش ہوتی ہے جو اداراتی مذہب سے غیر متعلق خالص فکر کی سطح پر تسکین کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ ویدانت، بدھزم اور زین بدھزم کی طرف پورے مغرب کا رجحان اسی انسان کی کشمکش کا آئینہ دار ہے جو مذہب کو مسترد کرنا چاہتا ہے لیکن روحانی تسکین کے بغیر جی بھی نہیں سکتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ روحانی تشنگی کو بجھانے کے یہ راستے صحیح نہیں ہیں۔ اگر صحیح ہیں بھی تو وہ فرد کے لئے صحیح ہیں۔ یعنی ایک فرد کی حیثیت سے آدمی اپنی روحانی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی بھی ایسے روحانی ڈسپلن سے وابستہ ہو سکتا ہے جو اس کی ضرورت پوری کرتا ہو۔ لیکن چند برگزیدہ بندوں کی روحانی کشمکش اور نجات کے مسائل کا حل پورے انسانی معاشرہ کے روحانی اور اخلاقی مسائل کا حل نہیں بن سکتا۔ انسانی معاشرہ چند برگزیدہ بندوں یا سماج سے کٹے ہوئے چند انفرادیت پسند دانشوروں پر مشتمل نہیں ہوتا۔ یہ مختلف ذہنی اور روحانی سطح کے کروڑوں آدمیوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایسے معاشرہ کی روحانی تسکین اور اخلاقی ضرورتوں کو تھیوسوفیکل سوسائٹی، لاج، پرارتھنا سماج اور برہمو سماج اور زین بدھزم کے رسیا چند روحانیت پسند دانشور پورا نہیں کر سکتے۔ وہ معاشرہ صحت مند معاشرہ نہیں ہوتا جو سماج سے کٹے ہوئے انفرادیت پسند دانشوروں کو جنم دیتا ہے۔ ایسے دانشوروں کا وجود خود سماجی نظام کے اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی چغلی کھاتا ہے۔

صنعتی دور کے قصیدہ خوانوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ بڑے شہروں کے اجتماعی جتھے کیسی انفرادیت پسندی کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ اپنی روحانی پیاس کو بجھانے کے لئے اندرونی روشنی کا چراغ لے کر نکلا ہوا دانشور، سماج کے ان دیوہیکل مسائل کو کیسے حل کر سکتا ہے جو ایک توانا مذہبی روایت کی شکست نے پیدا کئے ہیں؟ آج لبرل مفکروں کو اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ لبرل فکر خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گئی ہے۔ انسانی تاریخ میں مذہب محض ایک روحانی طرز حیات نہیں رہا بلکہ سماجی ڈسپلن بھی رہا ہے۔ ایک سماجی ڈسپلن کے طور پر اس کی کامیابی کا راز اس کی روحانی اور ماورائی بنیادوں میں مضمر ہے۔ اسی لئے الیٹ ایک توانا سماج کے لئے ایسی مرکزی روایت کی اہمیت پر زور دیتا ہے جو سماج کی روحانی اور تہذیبی قدروں پر مشتمل ہو۔ اسی لئے وہ ایسی ترنگی اور لامرکز فکر کو مشکوک نظر سے دیکھتا ہے جو انسان کی تہذیبی تمدنی اور مذہبی زندگی کے مانوس اسالیب میں سرنگ لگاتی ہے۔ نئے انسان اور نئے سماج کی تعمیر کرنے والے پرجوش انقلابی اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ انسانی سماج کو اس کی مرکزی روایت سے محروم کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی سماج کی جگہ انسانی بھیڑ اور community کی جگہ اکھڑے ہوئے بے چہرہ انسانوں کا جتھا لے لیتا ہے۔

آدمی اپنی ذات میں بے کراں نہیں ہے۔ اس کی ذات محدود ہے اور وہ خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ ایک طاقتور اخلاقی اور روحانی ڈسپلن کے بغیر نہ تو اس کی شر کی قوتوں کو دبایا جاسکتا ہے نہ خیر کی قوتوں سے کوئی اچھا کام لیا جاسکتا ہے۔ مذہب کا سماجی اور اخلاقی کارنامہ یہی ہے کہ وہ انسان کے وحشی جذبات کی تادیب اور تہذیب کا کام کرکے اسے سماجی زندگی کا اہل بناتا رہا ہے۔ آدمی اگر اپنی معنویت پاتا ہے تو ایسے نظام میں پاتا ہے جو اس کے ارادوں اور فیصلوں سے ماورا روایت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ جدید شاعر صنعتی نظام سے نالاں ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ صنعتی نظام نے آدمی کو مرکزی بنا کر اسے سماج کی مرکزی تہذیبی روایت سے بے بہرہ کرکے روحانی اور تہذیبی طور پر بانجھ کردیا ہے۔ آدمی اپنی مانوس وابستگیوں کو کھو بیٹھا ہے اور نئی وابستگیاں پیدا نہیں کرسکا۔ کیا میں، کیا کرامت صاحب، کیا جدید شاعر، ہم سب درد کی ایک ہی کمند میں گرفتار ہیں۔ ہم سب اس کے بنجر میدان کے رہ نورد ہیں جو تہذیب کے دھندلکے میں لپٹا ہوا ہے۔ جب خود ہماری فکر بحران کا شکار ہو ہمارے نجات کے راستے محض طفل تسلیاں ہوں، ہماری روشنی کی کرن تھوڑی ہی دور جاکر اندھیرے میں ڈوب جاتی ہو تو جدید شاعر کی اس وجہ سے سرزنش کہ وہ ہماری رہنمائی کیوں قبول نہیں کرتا بہت ہی نازیبا حرکت ہے۔

ہمارے بڑے بھائی لوگ چاہتے یہ ہیں کہ سائنس، ٹیکنولوجی اور صنعتی نظام کی آسائشوں سے بھی فیض یاب ہوتے رہیں اور روحانی نجات کے راستے بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائیں۔ اس لئے پھر خالص بڑے بھائی کا طریقۂ فکر وجود میں آتا ہے۔ بھئی مذہب اور سماج کی مرکزی روایت تو ہاتھ سے گئی۔ عدمیت کے کرب سے نجات کے لئے اپنشد اور گوتم بدھ کا فلسفہ پڑھ لو، افاقہ ہوگا۔ جدید شاعر کچھ نہیں تو اپنے کرب کے احساس اور بیان میں تو پرخلوص ہے۔ وہ طفل تسلیوں اور جھوٹے دلاسوں کا شاعر نہیں۔ وہ درد کی لہر کو برداشت کرسکتا ہے لیکن درد کے اس علاج پر رضامند نہیں ہوتا اوپر سے چٹنی کے ذریعہ آنت کو اندر دبائے رکھتا ہے۔ وہ اگر Organic طور پر اپنے عقیدہ کو بچا نہیں سکتا تو میکانکی طور پر اسے تھامنے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ الحادی اور مذہبی وجودی فکر ایک موڑ پر ہاتھ ملا کر الگ الگ راستوں پر گامزن ہوتی ہے اور ابھی تک یہ راستے کسی ایک منزل پر مل نہیں پاتے۔ کرامت صاحب جس راستہ پر گامزن ہوئے ہیں وہ قوت ارادی کے ذریعہ اپنی نجات کا راستہ آپ تلاش کرنے کا ہے۔ اس راستے پر اب انھیں اپنشد اور گوتم بدھ کے فلسفی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ سارتر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہمیں ہمارے کام کا آغاز اس مفروضہ سے کرتا ہے کہ خدا نہیں ہے اور اگر خدا ہو تب بھی انسان کی صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوغلاپن وہیں سے پیدا ہوتا ہے جب آدمی میں اپنے عقائد کے نتائج بھگتنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ دوغلاپن فکر کی سطح پر ہوتا ہے۔ فلسفی کا دوغلاپن فن کار کے یہاں احساس کی کشمکش میں بدل جاتا ہے۔ فلسفی کلی اور حتمی انتخاب کا متلاشی ہوتا ہے جب کہ فن کار دونوں دنیاؤں پر بیک وقت چھاپا مارتا ہے۔ وہ کیک کھانا بھی چاہتا ہے اور کیک کو سالم بھی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ مسرت حاصل کرنا بھی چاہتا ہے اور مسرت کو پائدار بنانا بھی چاہتا ہے۔ وہ تماشائے گلشن کا بھی شکار ہوتا ہے اور تمنائے چیدن کا بھی۔

غرض یہ کہ فن کار احساس کی سطح پر متضاد رویوں کو باہم Fuse کرتا ہے۔ اس کے یہاں تضاد ہم آہنگی میں بدل جاتا ہے۔ تنقید اپنی آخری شکل میں فلسفہ ہی کا ایک جزو ہے کیوں کہ نقاد کا سروکار بھی حقیقت کی آگہی اور قدروں کی تلاش سے ہوتا ہے۔ لیکن نقاد فکر کو فلسفہ کی سطح پر نہیں بلکہ ادب کی سطح پر جانچتا ہے۔ جو احساس کی سطح ہے۔ اسی لئے نقاد کی انگلیاں فن کار کی حسیت کے بہت نازک مقامات کو چھوتی ہیں۔ اور اس نقاد کے لئے جس کی فکر فلسفیانہ ہو ادب کی پرکھ نہایت آزمائش کا مقام ہوتا ہے۔ اس کے لئے مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مضبوط عقائد کو سالم رکھتے ہوئے ادبی تنقید میں عقیدہ کی تنگ نظری کی پرچھائیاں نہ پڑنے دے۔ ایک طرف تو ایلیٹ کے عیسائی عقائد کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ وہ انگلینڈ کے چرچ کو ڈانٹ پلاتا ہے کہ کلیسا زمانہ کے جدید تقاضوں سے مفاہمت کے نام پر مذہب کو بہت سہل بنا رہی ہے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ لوگوں کو محسوس ہونا چاہئے کہ مذہب کوئی تن آسانوں کا مشغلہ نہیں۔ یہ ایک سخت گیر نظام ہے اور اس کی سخت گیری کو قبول کرکے ہی آدمی اپنے کردار کی تہذیب و تربیت کرسکتا ہے۔ لیکن یہی ایلیٹ جب تنقید لکھتا ہے تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے کہ اس کے عقائد فن کی کسوٹی نہ بننے پائیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تنقید لکھتے وقت وہ اپنے عقائد کو بالائے طاق رکھ دیتا۔ مذہبی روایت کے علاوہ ادبی اور تہذیبی روایت کی پروان چڑھائی ہوتی ہیں۔ محض عقیدہ یا Doctrine کی بنیاد پر فن پارے کی پرکھ ممکن نہیں۔ فن کار اور فن پارے کی پرکھ اپنے عقیدہ یا ڈاکٹرائن کی سنگین کسوٹی پر نہیں بلکہ فن کار کی حسیت کی نازک اور لطیف فضاؤں کو ہمدردی سے سمجھ کر ہی کی جاسکتی ہے۔ اس حسیت کو سمجھنے کے آداب آپ کو ایلیٹ بتائے گا۔ تنقید کے میدان میں مجاہدانہ شمشیر زنی اور عقائد کے Crusades کا دور اب ختم ہوا۔ نقاد اگر فن کار کی حسیت کے نازک مقامات کو چھونے کا سلیقہ نہیں رکھتا تو مجھے کہنے دیجئے کہ وہ تنقید لکھنے کا حق بھی نہیں رکھتا

☆☆☆

دوہے

از جمیل الدین عالی

چار سو ستر دوہے

ڈیلکس ایڈیشن، کئی دلچسپ مضامین، ایک انٹرویو

پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی، کراچی، لاہور

ہندوستان میں قیمت : پانچ سو روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

غزل

(سعدی کی نذر جن کی ایک غزل کی بحر نے اسی بحر میں غزل کی تحریک کی)

وحید اختر

شمارہ ۱۴۹،
مارچ تا مئی ۱۹۸۸

فینٹیسیا اور اس کی شکست

(تہران کی برف باری کے تجربے کے بعد)

صبح گل گشت کو نکلی تو یہ تھا حال صبا کا
ہنسی اس پر اسے چھیڑا، اسے گھورا، اسے تاکا

شاخ و سبزہ کو جھنجھوڑا در ہر خواب کو توڑا
سالم اک پردہ نہ چھوڑا کسی آرام سرا کا

ہے ہر اک رنگ پریدہ ہے نظر سب سے کشیدہ
جیب و دامن ہے دریدہ گل رنگین قبا کا

مہر غنچہ ہے شکستہ ہے ہر اک برگ گسستہ
کوئی تکمہ نہیں بستہ کسی زر تار عبا کا

کھل گئے کلبۂ احزاں ہوئے وا حجلۂ خوباں
بے حجاب آئے نگاراں نہ رہا عذر حیا کا

کرم حسن ہے ارزاں نگہ ناز ہے رقصاں
کرو نذر اپنے دل و جاں یہی سکہ ہے وفا کا

تن نازک پہ گرانی کرے پوشاک شہانی
جو بھی آگے ہے کہانی ہے وہ حق حسن ادا کا

ہے عجب عالم رویا نہیں اک نقش بھی دھندلا
ہے تخیل کا کرشمہ کہ یہ جادو ہے فضا کا

سر منظر ہے زمستاں یخ و پائیز بداماں
پس منظر ہے بہاراں یہ ہے اعجاز خدا کا

اتری کب گل کی سواری چلی کیا باد بہاری
تھی لگی آنکھ تمہاری وہ تو جھونکا تھا ہوا کا

ہے برہنہ ابھی منظر دو اسے برف کی چادر
نہ صبا ہے نہ گل تر نہ چھناکا نہ دھماکا

جسے کہتے ہو گلستاں گل کاغذ کی ہے دوکاں
جسے سمجھے تھے بہاراں وہ تبسم تھا فنا کا

چادریں خواب کی تانے ہیں گم اپنے میں دوانے
دیکھ لیں خواب سہانے ہے یہی توڑ فضا کا

آنکھ سوجا

وحید اختر

شمارہ ۱۷۹،
جنوری ۱۹۹۵

خواب باف وخواب زاد وخواب پرور آنکھ، سوجا
دوپہر میں ڈھونڈتا ہے چرخ پر مہتاب کوئی
مانگتا ہے تشنۂ خوں خنجروں سے آب کوئی
جنبش مژگاں سے وا ہوتا نہیں ہے باب کوئی
حرف چیں ماشین سے بنتا نہیں ہے خواب کوئی
کیوں اگلتی ہے تو اپنے لعل وگوہر، آنکھ سوجا
خواب باف وخواب زاد وخواب پرور آنکھ، سوجا

اجنبیت کے خیابانوں میں دست وپانہ سوئیں
بھاگتے وحشت زدہ، مجنوں سوار وراہوار
ناشناسا نام، بے اسما ہجوم بے کنار
شیر ونان وگوشت کی دوکان پر لمبی قطار
ہر نفس کارآمد و باطل شماروں کا شمار
احتیاجات اس جہاں میں اک گھڑی اصلا نہ سوئیں
ہاں، خیالوں کے دھندلکوں سے منور آنکھ سوجا

اے نویسندہ مشین دوڑ، اے قلم خاموش ہو جا
منتشر افکار کے کج مج زباں میں ترجمے
بے زبانوں کی زباں کے کرتبوں پر تبصرے
لفظ ہیں زیر وزبر کی گرد میں گم مقبرے
مقبروں میں لفظ کے مدفون تازہ فلسفے
فکر معنی آفریں، قبروں سے ہم آغوش ہو جا
خشک ہیزم پر کھلیں گے کیا گل تر، آنکھ سوجا

کاسۂ سر میں خلا بھر لے، خیالوں سے نکل
ہے کتب میں ہر خلا کا اک حوالہ، مانگ لے
علم سے بے معنی لفظوں کا رسالہ، مانگ لے
جہل کے دفتر سے جنت کا قبالہ، مانگ لے
شک اسیری کا بھی کچھ ہو گا ازالہ مانگ لے
ڈھونڈ راہ راست، پیچیدہ سوالوں سے نکل
شاخ جرم شاعری کی زہر آور آنکھ، سوجا

ایک خارستان سے نکلے تو ملا اک ریگ زار
گلستان سعدی وگل گشت حافظ ہیں گماں
بزم رومی، رزم فردوسی ہیں گم گشتۂ جہاں
ذہن بستہ طے کرے گا کیا سخن کے ہفت خواں
ہر طرف ہیں حرف زن آموختہ خواں طوطیاں
واں مقدر چیخ تھی یاں ہے خموشی کا مزار
واں تھے خوابیدہ، یہاں غائب ہیں منظر، آنکھ سوجا

جدید اردو شاعری،ایک مثبت تحریک

وزیر آغا

شمارہ ۴۵،
فروری ۱۹۷۰

جدید اردو شاعری پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے ایک یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ یہ ایک منفی تحریک ہے جس نے فرد کی تنہائی اور مجہولیت کا پرچار کیا ہے۔ زندگی سے دور بھاگنے کی تلقین کی ہے اور یاسیت اور بے عملی کو ایک ادبی موقف کے طور پر اختیار کر کے ایک مبہم علامتی انداز رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اعتراض عام طور سے ان بزرگوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ جو شاعری کو ''حاصل'' کے بجائے ایک ''ذریعہ'' سمجھتے ہیں۔ نیز جنھوں نے جدید شاعری کی وسعت اور گہرائی کو جانچنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ تعصب، تنقیدی بصیرت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ ہمدردانہ اندازِ نظر ہی مفقود ہو جاتا ہے جو کشادہ دلی کے لئے پہلی اہم شرط ہے۔ زیرِ نظر مضمون کا مقصد جدید شاعری کے مثبت پہلوؤں کی نشان دہی کرنا ہے تاکہ اس تعصب آمیز اندازِ نظر کا استیصال ہو سکے۔

جدید اردو شاعری اس اعتبار سے ایک مثبت تحریک ہے کہ اس نے زمانے کی جملہ کروٹوں سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں اور خیال کو عادت، تکرار اور محاورے کی گہری گھائیوں (Grooves) سے باہر نکلا کر اسے روحِ عصر سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تو فرد کی روحانی طلب کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ فرد کو ایک ''اکائی'' کے طور پر پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے نیز فرد کو اس کے ماضی اور مستقبل سے مربوط کر کے اسے ''ثقافتی اکائی'' کی علامت بنا کر بھی پیش کیا ہے۔ یہ کام روایتی قسم کی شاعری کے بس کا روگ نہیں تھا۔

اقبال سے جدید اردو شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری مواد اور ہیئت ہر دو اعتبار سے جدید کہلانے کی مستحق ہے۔ اس نے نہ صرف جدید موضوعات، مسائل اور اشیا سے اپنے احساسی قرب کو شعر میں سمویا ہے بلکہ شعری زبان کے سلسلے میں بھی اجتہادی عمل کا ثبوت دیا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش، نئی علامتوں کی تخلیق اور پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم عطا کر کے اقبال نے گویا زبان کو از سرِ نو خلق کیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے کلام میں تازگی کا احساس ہوتا ہے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے یہ لہجہ اردو شاعری میں موجود نہیں تھا۔

مگر اقبال ان بڑے شعرا میں سے ہے جو ہمیشہ تعمیر اور تخریب کے سنگم پر نمودار ہوتے ہیں، جن کے ہاں ایک طرف تو نئے زمانے کی شکست و ریخت کا عرفان اور دوسری طرف ماضی کے نظم و ضبط کا احترام موجود ہوتا ہے اور جو آنے والے زمانے کی چاپ کو سننے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے شعرا کو نئے اور پرانے سبھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ان کی قدامت یا جدیدیت کے بارے میں گرمیٔ گفتار کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اقبال کے بارے میں مزید کچھ کہنے کے بجائے جدید شاعری کی اس تحریک کا ذکر کرتا ہوں جو اقبال کی اجتہادی روش سے پھوٹی اور پھر پھیلتی پھولتی چلی گئی۔

جدید اردو شاعری کا پہلا دور جو ۱۹۳۵ سے ۱۹۴۷ تک پھیلا ہوا ہے دراصل ''حصولِ آزادی'' کا دور ہے۔ یہ آزادی سماجی سطح ہی کی نہیں نفسیاتی اور لسانی سطح کی بھی ہے اور اس کا نہایت گہرا تعلق اس تحریکِ آزادی سے بھی ہے جو انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے لئے وجود میں آئی تھی اور جو اس زمانے میں بڑی شدت اختیار کر گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کا تعلق انگریزی شاعری کی اس

متوازی تحریک سے بھی ہے جو ۱۹۲۰ کے لگ بھگ انگلستان میں نمودار ہوئی اور جو بنیادی طور پر سیاسی مسائل سے متعلق تھی اس تحریک پر اوون Owen، ایلیٹ Eliot اور ہاپکنز Hopkins کے گہرے اثرات مرتسم تھے اور اس کے علم برداروں میں آڈن Auden، اسپنڈر Spender، میک نیس Mac Niece، ڈے لیوس Day Lewis اور دوسرے شعرا کا نام ابھرتا تھا۔ چوں کہ برصغیر کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی زبان سے گہرا تعلق رکھتا تھا اس لئے کچھ عجب نہیں کہ انگریزی شاعری کی اس متوازی تحریک نے بھی جدید اردو شاعری کے پہلے دور کے مزاج کو ایک خاص رنگ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ بہر حال اثرات کی داستان طویل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ چنانچہ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے میں محض یہ عرض کروں گا کہ جدید اردو شاعری کے اس پہلے دور میں آزادی کی تحریک سیاسی، سماجی، نفسیاتی، لسانی تمام سطحوں پر نمودار ہوئی۔

سیاسی سطح کو اجاگر کرنے میں جوش، راشد اور فیض کی عطا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان میں سے جوش نے زیادہ تر اپنے زمانے کے اس سیاسی لیڈر کا موقف اور لہجہ اختیار کیا جو پلیٹ فارم سے انبوہ کو مخاطب کرتا تھا اور جس کا اولین مقصد انبوہ کے ہاں انگریز کی غلامی سے نجات پانے کا جذبہ پیدا کرتا تھا۔ ۱۹۶۰ کے بعد حبیب جالب اور بعض دوسرے شعرا نے جوش کی اس خاص روش کا تتبع کیا اور بڑی بے باکی اور جرأت سے ہنگامی حالات پر جوشیلی نظمیں لکھیں۔ مگر جوش کی نظموں میں شعری اخفا کم اور جنگی ترانے کا زور زیادہ تھا۔ اس لئے ان کا کلام ہنگامی طور پر تو کامیاب ہوا اور دیرپا اثرات کا منبع ثابت نہ ہوسکا۔ دوسری آواز راشد کی تھی۔ جوش نے تو سیاسی لیڈر کے لہجے میں بات کی اور اسی لئے یہ بات براہ راست اور اس کا مقصد بہت نمایاں تھا۔ مگر راشد نے اپنے زمانے کے اس برہم نوجوان کے احساسات کو پیش کیا جو تحریک آزادی کا ایک فعال سپاہی تھا لیکن جس کا ردعمل خاصا پیچیدہ اور تہ دار تھا۔ یہ نوجوان خارج کی دنیا میں بھی موجود تھا اور خود راشد کے لاشعور میں بھی چھپا ہوا تھا۔

بعض لوگوں نے راشد کی حمایت میں یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ راشد تو محض ایک تماشائی تھا جس نے اس برہم نوجوان کو قریب سے دیکھا اور پھر اس کے احساسات کو نظم کردیا۔

اس قسم کا موقف تخلیق کا موقف تخلیقی شعر کے سارے نظام کی نفی کرتا ہے کیوں کہ کوئی بھی شاعر جب تک خود کیفیت یا تجربے سے نہ گذرے یا کم از کم اسے اپنے اوپر وارد نہ کرے، اس کے پرخلوص اظہار میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ خود راشد کے اندر یہ برہم نوجوان موجود تھا اور اسی لئے راشد کی اس زمانے کی نظموں میں برہمی اور انتقام کا وہ جذبہ بہت نمایاں ہے جو اس دور کے نوجوان کو بہت عزیز تھا۔ یہ نوجوان محض انگریز کی غلامی کے بوجھ کو اتار پھینکنا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ انگریز سے ایک سو برس کی غلامی کا انتقام لینے کے بھی درپے تھا۔ جوش کی نظمیں سیاسی پلیٹ فارم کی حد تک تھیں لیکن راشد کی نظموں میں گہرائی اور تہ داری تھی اور ان کے ذریعہ راشد نے نہ صرف انگریزی سیاست بلکہ انگریزی تہذیب پر بھی حملہ کیا اور وہ کام جسے اکبر نے ظرافت کی سطح پر اور اقبال نے ذہن کی سطح پر سرانجام دینے کی کوشش کی تھی، اسے جذبے اور احساس کی سطح پر انجام دیا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو راشد کی وطن دوستی جذباتیت پر نہیں بلکہ مجروح جذبات کی اساس پر قائم تھی اور اسی لئے اس کا تاثر بھی نسبتاً دیرپا ثابت ہوا۔

تیسری آواز فیض کی تھی۔ مگر ایک تو فیض نے انگریز کی غلامی سے نجات پانے سے کہیں زیادہ جاگیردارانہ نظام سے نجات پانے اور ایک خاص وضع کے سیاسی نظام کو رواج دینے کا خواب دیکھا تھا اور اس لئے اس کی نظموں کا سیاسی پس منظر "باہر" کے عنصر سے جنگ کے بجائے اندر کے عناصر سے برسرپیکار ہونے کا عکاس ثابت ہوا۔ دوسرے، فیض نے شعری اخفا سے کام لیتے ہوئے رومانی جذبات اور سیاسی مسلک میں سنجوگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کہیں ناکام اور کہیں کامیاب ہوئی مگر اس کے باعث اردو شاعری میں ایک ایسا نیا رنگ پیدا ہوا جس کا تتبع فیض کے بعد آنے والے شعرا کی ایک پوری کھیپ نے کیا اور جس کی صدائے بازگشت آج بھی کہیں نہ کہیں سنائی دے جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ ان تینوں شعرا نے اردو شاعری کو ایک سیاسی پس منظر عطا کیا جو ان سے قبل کے "اصلاحی پس منظر" سے قطعاً الگ اور جدا تھا۔

حصول آزادی کی دوسری صورت مزاجاً سماجی نوعیت کی تھی۔ ۱۹۳۵ کے لگ بھگ "انگارے" وجود میں آئی جو بجائے خود کوئی اہم کتاب تو نہیں تھی لیکن جو ذہن کی ایک خالص جہت اور سماج کی ایک نئی کروٹ کے لئے علامت کا درجہ ضرور رکھتی تھی۔ حصول آزادی کی یہ رو دراصل فرد کی آزادی کے لئے نہیں بلکہ سماج کی آزادی کے لئے کوشاں تھی۔ فرد اور سماج ہمیشہ آپس میں متصادم رہے ہیں اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ ہر چند جاگیردارانہ نظام کا فرد ذہنی اور علمی سطح پر معاشرے کی پامال راہوں سے باہر نہ آسکا تھا۔ تاہم خالصتاً معاشی سطح پر وہ زیادہ مطلق العنان تھا اور اس کی "قوت" نے جبر اور ظلم کی روایت کو جنم دے دیا تھا۔

نئی ذہنی کروٹ کا مدعا فرد کے اس جابرانہ رویے کا قلع قمع کرنا تھا تا کہ معاشرہ اس کے پنجوں سے نکل کر آزادی کا سانس لے سکے چنانچہ سماجی ہمہ اوست کا تصور دراصل فرد کی غیر معمولی معاشی قوت کے خلاف ایک ردعمل کی حیثیت رکھتا تھا اور اس اعتبار سے یہ آزادی کی تحریک ہی سے منسلک تھا۔ یہ بات زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں کہ جس طرح فرد اپنے وقت میں مطلق العنان اور جابر بن جاتا ہے بالکل اسی طرح سماج بھی طاقت کے حصول کے بعد ایک مشینی نظام میں مبدل ہوکر فرد کی آزادی اور انفرادیت کو ختم کردیتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے اقبال نے فرد کو صنوبر کی طرح آزاد بھی دیکھا اور پابہ گل بھی۔ ایک مثالی معاشرے کی شاید اس سے بہتر تفسیر مشکل ہی سے ملے گی۔ بہر حال جدید اردو شاعری نے معاشرہ کی آزادی کا پرچم اٹھایا تو یہ حصول آزادی کی بڑی تحریک ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس سلسلے میں بھی جوش اور فیض کے نام خاصے اہم ہیں گو ان کے تتبع میں شعرا کی ایک پوری کھیپ بھی سامنے آئی جو برصغیر کی تقسیم سے پہلے ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت میں ایک الگ وجود کی حامل نہیں تھی لیکن جو تقسیم کے بعد ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم ہوئی اور اپنے نیم ادبی نیم سیاسی مسلک پر سختی سے کاربند رہنے کے باعث

آخر آخر میں اپنی توانائی اور نکھار سے محروم بھی ہوگئی۔ مگر یہ ایک الگ داستان ہے یہاں صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس ضمن میں جوش اور فیض کے دکھائے ہوئے راستے پر سفر کرنے والوں میں سردار جعفری، مخدوم، مجاز، ساحر، کیفی اعظمی، ندیم، ظہیر کاشمیری وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

جدید اردو شاعری میں حصول آزادی کی تیسری صورت فرد کے احساس سے متعلق تھی میری مراد فرد کے اس جذبے سے نہیں جس کے تحت وہ ایک اجنبی حکومت سے متصادم تھا بلکہ اس کاوش سے ہے جس کے تحت اس نے بہت سے سماجی اور نفسیاتی تعصبات اور رسم و رواج کی بندشوں سے نجات پانے کی کوشش کی۔ اسی کاوش میں مغربی علوم سے آشنائی نے بطور خاص ایک اہم کردار ادا کیا اور فرد کے ذہنی افق کو کشادہ کر کے اسے خود احتسابی پر مائل کیا۔

دراصل جدید دور سے قبل تقریباً نصف صدی کا عرصہ اردو شاعری میں اخلاقیات اور اصلاحی تحریکات کا دور تھا جس نے فرد کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ جبلی تقاضوں کو دبائے اور ان کے بجائے ملی تقاضوں کو تمام تر اہمیت تفویض کر دے یہ مسلک بہت توانا اور یہ آدرش بہت نیک تھا۔ لیکن کوئی بھی تحریک انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جائے تو یک طرفہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنان چہ اردو شاعری میں خیال کو جذبے پر ترجیح ملی تو جسم کی ناپاکی کا تصور ابھر آیا۔ مگر شاعری تو فکر اور جذبے کے امتزاج سے عبارت ہے۔ اس لئے محض کسی آدرش کے پرچار کے سہارے مشکل ہی سے اپنے تاثر کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

جدید اردو شاعری میں اپنے "اندر" کی دنیا کی سیاحت کا رجحان میرا جی سے شروع ہوا۔ میرا جی نے اپنی شاعری میں بہت سے ان احتسابات کو نظر انداز کر دیا جو ایک طویل اصلاحی تحریک کی دین تھے۔ بیشک بعض اوقات میرا جی بھی انتہا پسندی کا مرتکب ہوا۔ لیکن اپنی عمدہ نظموں میں میرا جی نے جسم اور اس کے تقاضوں سے شرمانے کے بجائے انھیں اپنے شعری اظہار سے منسلک کیا اور یوں اردو شاعری کو ایک غیر فطری رویہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔ جسم کی جڑیں زمین سے اور زمین کی جڑیں اس کے ماضی سے پیوست ہوتی ہیں چنانچہ جب میرا جی "اندر" کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی شاعری میں زمین کی باس ابھر آئی اور اردو شاعری کو ایک مضبوط بنیاد مہیا ہوگئی۔

حصول آزادی کی یہ رو جو برصغیر کی تقسیم سے پہلے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی سطحوں پر نمودار ہوئی، اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے کسی بھی بڑی سے بڑی ادبی تحریک سے کم تر درجہ کی نہیں تھی۔ چنانچہ اس دور کے آخر آخر میں بہت سے ایسے اردو شعراء سامنے آئے جنھیں کسی خاص "خانے" کے سپرد کرنا تو بے حد مشکل ہے مگر جن کے ہاں "آزادی" کا احساس ایک قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔

یہ آزادی بہ یک وقت سیاسی، سماجی اور انفرادی سطحوں پر نمایاں ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ سطحیں آپس میں اس طور پر مربوط ہوگئیں کہ ان شعرا کو کسی خاص مسلک کا علم بردار کہنا بے حد مشکل ہے۔ مجید امجد، یوسف ظفر، قیوم نظر، اختر الایمان، مختار صدیقی، مخمور جالندھری، سلام مچھلی شہری، منیب الرحمٰن، تخت سنگھ، ضیا جالندھری، صفدر میر اور متعدد دوسرے شعرا جو اس دور میں منظر عام پر آئے، جدید اردو شاعری کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں فرد اپنے جملہ سیاسی، سماجی اور نفسیاتی تعصبات کو تج کر اپنے واقعی روپ میں سامنے آیا۔ چنانچہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے جدید اردو شاعری کو ایک باقاعدہ جہت عطا کی۔

جدید اردو شاعری کا دوسرا دور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوا اور چوں کہ نئی مملکت کے تقاضوں نے اس کی تعمیر میں جو حصہ لیا اس لئے میں اس دور کی اردو شاعری کے احوال میں صرف پاکستانی شعرا کی تخلیقات ہی کا ذکر کروں گا۔ تقسیم سے پہلے کا دور "تحریک آزادی" کا دور تھا اور گو شاعری میں یہ تحریک تعصب، ظلم، جبر و استبداد، معاشی ناہمواری اور رسم رواج کی بندشوں کے خلاف لڑی گئی۔ تاہم یہ اس بڑی تحریک ہی کا ایک حصہ تھی جس کے تحت اہل ہند نے اجنبی حکومت سے نجات پانے کی کوشش کی تھی۔ آزادی کے بعد پاکستان کی تعمیر کا منصوبہ ایک مقدس عمل کی حیثیت اختیار کر گیا اور گو شاعری کا کردار، عام زندگی کے مخصوص اقتصادی اور سماجی تعمیر کے منصوبوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تاہم اس نے قومی شخصیت کی تعمیر میں ضرور حصہ لیا اور اس کے لئے وہ فضا مہیا کی جو انتشار کے بجائے نظم و ضبط کی داعی تھی۔ چنان چہ جدید اردو شاعری نے کئی سطحوں پر ایک تعمیری کارنامہ سرانجام دینے کی کوشش کی۔

پہلی سطح اپنی ثقافتی جڑوں کی تلاش کا وہ میلان تھا جس کے تحت شعرا نے زمین سے رشتہ جوڑا اور اس کی باس اور رنگ کو اپنی تخلیقات میں سمو لیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے سطح مرتفع ایران کی وہ علامتیں جو اردو شاعری میں صدیوں سے رائج تھیں، غائب ہونے لگیں اور ان کی جگہ ارض پاکستان سے اخذ کردہ علامتیں اور مظاہر نظر آنے لگے۔ چنانچہ غزل میں ایرانی بلبل کے نغمے کی جگہ پاکستانی پرندوں کی چہکار نے لے لی جیسے ناصر کاظمی کے ہاں، اور ایرانی چمن کی جگہ معبدوں، جنگلوں اور کھیتوں نے لے لی۔ ناصر شہزاد، جمیل الدین عالی اور ابن انشا نے شاعری کو زمین سے اور بھی قریب کر دیا۔ وہ رجحان بھی منظر عام پر آیا جس نے ارض پاکستان کی ثقافتی تاریخ اور اس تاریخ کی علامتوں کو شاعری کا جزو بدن بنا لیا۔ اس سلسلے میں مختار صدیقی، جعفر طاہر اور بعض دوسرے شعرا کے نام خاصے اہم ہیں۔ پھر اسی غواصی کے تحت بعض شعرا نے پاکستانی تاریخ کے پس منظر میں اتر کر انسان کی ثقافتی بنیادوں سے وہ علامتیں اخذ کیں جو دیو مالاؤں سے متعلق تھیں یا جو ان عناصر پر مشتمل تھیں جن سے یہ دیو مالائیں مرتب ہوئی تھیں۔ مجید امجد، شاد امرتسری، فارغ بخاری، اعجاز فاروقی، نثار ناسک اور بعض دوسرے شعرا کو اس ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں ثقافتی گہرائی پیدا کی۔

ثقافتی پس منظر میں رنگارنگی اور تنوع پیدا کرنے کے سلسلے میں منیر نیازی کی عطا بھی قابل تعریف ہے کہ اس نے مذہب الارواح کی بیش تر علامتوں اور جنگلوں کے طویل دور کی ہیبت اور تشدد کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں سمو کر اسے ایک نیا ذائقہ تفویض کیا ہے۔

ماضی کی تلاش اور ثقافتی جڑوں کی دریافت کا عمل اس اعتبار سے بہت

مفید تھا کہ اس نے ہوا میں معلق ہونے کے احساس کو ختم کیا اور ماضی کو "اب" کی فضا اور "آئندہ" کے خوابوں سے منسلک کر کے گویا ایک ثقافتی "کل" (Gestalt) کو وجود میں لانے کی کوشش کی۔ اس سے اگلا قدم یہ تھا کہ شاعری میں "مکمل شخصیت" کے نقوش کو اجاگر کیا جاتا۔ دراصل یہ نظریہ کہ شاعری نہ صرف "پورے آدمی" کی تخلیق ہے بلکہ یہ لکھی بھی "پورے آدمی" کے لئے جاتی ہے، بہت پرانا ہے۔ انگلستان میں ۱۹۵۰ کے لگ بھگ اس نظریے کی تجدید ہوئی جب شعرا کا وہ گروہ سامنے آیا جس میں فلپ لارکن Philip Larkin اور ٹام گن Thom Gunn شامل تھے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ نیو لائنز New Lines کے نام سے رابرٹ کانکوئسٹ Robert Conquest نے مرتب کیا اور دیباچے میں لکھا کہ یہ شاعری "پورے آدمی" کی شاعری ہے اور حقیقت کے ادراک کے لئے ذہنی صلاحیتوں جذبات، حسیات...غرض ان تمام حربوں سے کام لیتی ہے جو انسانی شخصیت کی تحویل میں ہیں۔ بنیادی طور پر یہ شاعری شخصی جذبات اور مشاہدات کی اساس پر قائم تھی اور اس کا ملجا اس "پورے آدمی" کو پیش کرنا تھا جو روح اور جسم خیال اور جذبے کے اتصال سے ایک "اکائی" کے روپ میں ابھرتا ہے۔

اردو میں "پورا آدمی" کے اس نظریے کی صدا بازگشت سلیم احمد کی تحریروں اور سلیم احمد اور ظفر اقبال کی غزلوں میں نمایاں ہوئی۔ جدید دور سے قبل لکھنؤ اسکول کے زمانے میں شاعری کا پلڑا جسم کی طرف جھکا رہا تھا اور اس لئے یہ شاعری ابتذال کی حد تک جسم سے متعلق ہو گئی تھی، گویا یہ "مکمل شخصیت" کی عکاس نہیں تھی۔ اس کے بعد حالی اور اس کے رفقا کے دور میں جسم کی نفی کا رجحان ابھرا اور اس لئے یہ شاعری بھی ادھورے آدمی کی عکاس ثابت ہوئی۔ سلیم احمد اور ظفر اقبال کا موقف یہ تھا کہ اردو شاعری سے جسم کی باس چھن چکی ہے اس لئے اگر اسے یہ باس لوٹا دی جائے تو پورے آدمی کا تصور تکمیل پا سکتا ہے۔ لیکن اصولی سطح پر نظریے کا اظہار اور عملی طور پر اسے شعر کی بنت میں شامل کرنا دو بالکل الگ باتیں ہیں۔ چنانچہ ان دونوں شعرا کے ہاں شعر کا رخ واضح طور پر شجر ممنوعہ کی طرف جھکا اور کئی موقعوں پر ابتذال کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جو لکھنؤ اسکول کی دین تھی۔ ان کے برعکس جب عارف عبدالمتین نے "گھر" کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور پھر گھر یا جسم کے مادی تقاضوں اور ارضی میلانات کو ایک روحانی پرتو تفویض کیا تو ایک ایسی مکمل شخصیت کے نقوش ابھر آئے جو "پورا آدمی" کے اس موقف کے عین مطابق تھے جس کا اظہار رابرٹ کانکوئسٹ نے کیا تھا۔ جدید اردو شاعری میں عارف نے پہلی بار "گھر" کو اس انداز سے شعر میں سمویا کہ روح اور بدن کے سنجوگ کی صورت پیدا ہو گئی اور ایک ایسی مثبت اور تعمیری روش وجود میں آ گئی جس نے اردو شاعری میں ایک نئے بعد کا اضافہ کر دیا۔

جدید اردو شاعری کی تیسری سطح، بیسویں صدی کی میکانکی زندگی اور مشین کی معیت میں رہتے ہوئے فرد کی تنہائی اور بے بسی کو اجاگر کرنے کی ایک کاوش تھی اردو شاعری کے دو پہلو اب تک بہت نمایاں تھے۔ ایک تو دیہاتی زندگی کا وہ پہلو جس نے گیت میں بالخصوص اپنا اظہار کیا تھا۔ اور دوسرا "بیٹھک" سے متعلق وہ پہلو جس نے تماشائی کے منصب کو اجاگر کیا تھا۔ یہ بیٹھک "قدیم شہری زندگی کا ایک حصہ تھی گو اس کی حیثیت سمندر میں گھرے ہوئے جزیرے سے مختلف نہیں تھی۔ پھر یہ "بیٹھک" روایات اقدار اور سوچ کے مخصوص پیکروں کا گہوارہ بھی تھی۔ اسی لئے شہر اور اس کے معاملات کی طرح اس کا ردعمل عام طور سے استہزا آمیز ہوتا تھا۔ بیسویں صدی میں ابھرنے والے شہروں نے "بیٹھک" کے اس تصور کو پاش پاش کر دیا اور شاعر کو سر بازار مشینوں کے شور میں لا کھڑا کیا، چنانچہ اسے مشینیں عفریتوں کی طرح نظر آئیں اور مشینی نظام میں اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ گویا جو اب تک تماشائی تھا وہ خود تماشہ بن گیا۔ اس سے جدید اردو شاعری میں وہ جدید لمس Modern Sensibility پیدا ہوا جو بیٹھک میں بیٹھنے والوں کو حاصل نہیں تھا۔ مگر محض "جدید لمس" کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک اس میں آفاقیت کا عنصر بھی شامل نہ ہو۔ اچھی شاعری پہچان محض یہی نہیں کہ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کس زمانے کی پیداوار ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کے مطالعہ سے احساس جاگ اٹھے کہ یہ زمانے سے ماورا بھی ہے۔ جدید اردو شاعری میں مشین سے قرب کا احساس اول عزیز حامد مدنی کی نظموں میں ایک باقاعدہ رجحان کی صورت میں ابھرا اور گو شعریت کی کمی نے مدنی کی شاعری کو اونچے درجے کی شاعری نہ بننے دیا تاہم جدید لمس کے اعتبار سے ان کی عطا یقیناً قابل تعریف ہے۔ مجید امجد نے شہری عفریت کو اپنی بہت سی نظموں میں بڑی فن کاری سے پیش کیا اور اعجاز فاروقی کی بعض نظموں میں بھی مشینی شہر کے باسی کا کرب بڑی عمدگی سے ظاہر ہوا۔ نثار ناسک، فاروق حسن، آفتاب اقبال شمیم، حامد جیلانی، اور بعض دوسرے شعرا نے بھی نئی شہری فضا کی عمدہ عکاسی کی۔ لاہور کے بعض نوجوان شعرا نے مشینی شہر کی عکاسی کے مسلک کو ایک منی فسٹو کے طور پر قبول کیا اور اس لئے اکثر ان کی نظموں میں ایک سی فضا، ایک سی اشیا کی کیٹلاگ اور ایک سا ردعمل بھی ملتا ہے۔ لیکن ان سب نے بہرحال جدید لمس سے اپنی شاعری کو آشنا ضرور کیا اور یہ ایک بات قابل قدر تھی۔ مگر یہ لوگ نظم کو رقیق حالت Fluid State سے اوپر اٹھا کر فنی تکمیل کی سطح پر نہ لا سکے اور یوں ان کی بیشتر کاوشیں "ادھوری تخلیقات" کی صورت میں سامنے آئیں مگر یہ سب نوجوان ہیں اور ابھی ان کے سامنے بہت وقت پڑا ہے۔ اس لئے کچھ عجب نہیں کہ جذبات کی دم روکنے والی کیفیت سے نجات پاتے ہی وہ عمدہ چیزیں لکھنے لگیں۔

چوتھی سطح شعری زبان میں توسیع اور لغوی زبان کو شعری سطح پر از سر نو خلق کرنے کا وہ میلان ہے جو ساری جدید شاعری میں خوش بو کی طرح بسا ہوا ملتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف قدیم تلمیحات، شعری تراکیب، پامال تشبیہوں اور استعاروں کو ترک کر دیا گیا ہے۔ بلکہ نئے الفاظ، علامتوں اور شعری روابط کو رواج دینے کی کوشش بھی عام طور سے ملتی ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی عطا کا ذکر ہو چکا ہے۔ جدید دور میں نئے الفاظ اور تراکیب کو شعری زبان میں داخل کرنے کے سلسلے میں عبدالعزیز خالد، جعفر طاہر، شیر افضل جعفری اور بعض دوسرے شعرا کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مگر محض نئے الفاظ کی آمیزش کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک کہ یہ نئے شعری روابط نئی علامتوں کو ابھارنے میں ممد ثابت نہ ہو۔ اس سلسلے میں تقریباً تمام اچھے جدید شعرا کے ہاں زبان کی تازگی کا احساس ملتا ہے۔ ان لوگوں نے اس بات

سے کوئی سروکار نہیں رکھا کہ فلاں لفظ غیر شاعرانہ ہے، کیوں کہ فی الحقیقت کوئی لفظ بھی غیر شاعرانہ نہیں ہوتا۔ یہ تو شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک کرخت سے کرخت اور نامانوس سے نامانوس لفظ کو بھی شعری لباس پہنانے یا انگریزی محاورے کے مطابق اسے Prettify کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جدید اردو شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس نے لفظوں کے سلسلے میں تعصبات سے کنارہ کشی اختیار کی اور بڑی کشادہ دلی سے زبان کو نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئے حسی تلازمات سے آشنا کیا۔ مگر ہر تحریک میں کوئی نہ کوئی فارورڈ بلاک بھی نمودار ہوتا ہے۔ جدید اردو شاعری میں اس بلاک نے خود کو محض زبان کی وسعت تک محدود نہ رکھا بلکہ زبان کے تار و پود میں ایک ایسی انقلابی تبدیلی لانے کا موقف اختیار کیا جو اپنے مزاج اور جہت کے اعتبار سے ڈلن ٹامس Dylan Thomas کی اس آواز سے ہم آہنگ تھا جو ۱۹۳۰ کے لگ بھگ انگلستان میں نمودار ہوئی تھی۔ ڈلن ٹامس نے گرامر اور Syntax میں انقلابی تبدیلی لانے کا پرچار کیا تھا اور اس ضمن میں اس کا موقف جیمس جوائس کے تجربات سے بہت قریب تھا۔ مگر یہ تحریک کچھ ہی عرصہ کے بعد "چونکانے" کے عمل سے فارغ ہو کر اپنی موت آپ مرگئی۔ یہی حال اردو کے اس فارورڈ بلاک کا ہوا کہ چند تجربات کے بعد اس کا زور بھی از خود ٹوٹ گیا اور اس کے علم بردار نے جب پچھلے دنوں اپنا موقف ہی تبدیل کرلیا تو گویا اس تحریک کے خاتمے کا رسمی اعلان بھی ہوگیا۔

پانچویں سطح کو میں ایک "روحانی تعمیر نو" کا نام دوں گا۔ یہ اس لئے کہ اس کے تحت شعرا نے ایک بڑی حد تک صوفیانہ مسلک اختیار کیا اور زندگی کی بوقلمونی اور تنوع کے پیچھے حقیقت کی ایک ناقابل تقسیم صورت کو روح کی سطح پر محسوس کیا۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ روحانی تعمیر نو کی یہ رو صوفیانہ مسلک کے اس پیش پا افتادہ اظہار کے طور پر نمودار نہیں ہوئی جو اردو شاعری کو ہمیشہ سے عزیز رہا ہے اور جس میں جزو اور کل، عین الیقین اور حق الیقین، مایا اور سراب، ہمہ اوست اور تت توام آسی کی مخصوص روش نے ایک ایسی شاعری تخلیق کی جس کا ایک مانوس پیکر تھا، اور جو کم تر درجے کے شعرا کے ہاں تکلفاتی اور تقلیدی ہو کر رہ گئی تھی۔ جدید شعرا نے تصوف کا کوئی بنا بنایا سانچہ بہت کم استعمال کیا۔ انھوں نے تو اپنی روح کے لامتناہی پھیلاؤ کو عام شعری زبان میں بیان کیا اور یہ بڑی بات تھی تصوف کی یہ نئی رو تجربے کے لمس سے مالا مال تھی اور چوں کہ اس نے محسوسات سے جنم لیا تھا اس لئے قدرتی طور پر اس کا ذریعہ اظہار بھی تصنع اور تکلف سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والے بیش تر سینیئر شعرا تھے۔ وجہ یہ کہ جوانی تو جذبات سے کھیلتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جذبات جوانی سے کھیلتے ہیں اور چوں کہ خدمات کی گرفت بہت کڑی ہوتی ہے اس لئے جوانی ان سے آزاد ہونے کا خیال بھی نہیں کرسکتی۔ البتہ چالیس کے مقدس سن کے بعد جب جذبات کی جوالا مدھم پڑتی ہے تو "آزاد" ہونے کی خواہش بیدار ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جدید اردو شاعری میں یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری اور جیلانی کامران کی وہ شاعری جو چالیس کے بعد وجود میں آئی جذبات کی جوالا مکھی سے اوپر اٹھ کر "روح کل" تک رسائی پانے کی ایک کاوش ہے۔ خوبی اس میں یہ ہے کہ اس نے شاعر کے محسوسات سے جنم لیا ہے، محض آمد پیری کے احترام میں نازل نہیں ہوئی چنانچہ اسی لئے یہ پراثر بھی ہے۔

جدید اردو شاعری کی آخری سطح "نئے انسان" کے ظہور کی بشارت ہے۔ یہ نیا انسان تا حال محض ایک ہیولی ہے۔ جس کے خدو خال پوری طرح واضح نہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو یہ محض اپنے پاؤں کی چاپ یا ہاتھ کی دستک سے پہچانا گیا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بالائی سطح کے انتشار اور شکست و ریخت کے نیچے سے انسان کا یہ نیا پیکر برآمد ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ جدید اردو شاعری میں اقبال وہ پہلا شاعر تھا جس نے اس نئے انسان کی جانب اشارہ کیا۔ مگر اقبال کے نزدیک یہ نیا انسان محض سماجی اوصاف کا مرقع نہیں تھا۔ اس میں وہ بہت سی روحانی صفات بھی موجود تھیں جو ایک مثالی ہستی کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر اقبال کے بعد "انسان" کے تصور کو سیاسی مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا۔ جوش سے اس کی ابتدا ہوئی اور پھر تقریباً تمام ترقی پسند شعرا نے "عظیم انسان" کے گن گائے، حتیٰ کہ یہ لفظ محض ایک Cliche بن کر رہ گیا۔ اقبال کے بعد آنے والے جدید شعرا نے انسان کو کسی مسلک کی تشہیر کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ شعر تخلیق کرتے ہوئے قطعاً غیر شعوری طور پر اسے دریافت کیا ہے۔ اس ضمن میں راشد کی نئی کتاب "لا=انسان" بطور خاص ایک نہایت اہم تصنیف ہے کہ اس میں راشد نے اس نئے انسان کی قیمت دریافت کی ہے اور اسے ایک مخصوص سیاسی چھاپ سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے بعض مضامین میں اس نئے انسان کو دوسری ہستی The other کا نام دیا ہے جو سینے کے زنداں سے باہر آنے کے لئے بے تاب ہے۔ یہ سوال کہ اس نئی ہستی کا حلیہ کیا ہے، خارج از بحث ہے کیوں کہ تا حال اس کی بھرپور جھلک حاصل نہیں ہوسکی۔ لیکن اس کی داخلی قوت کا احساس ان فنی تخلیقات کے مطالعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے، جن پر اس کے قرب نے اپنے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ جدید اردو شاعری نے اس نئے انسان کی نشان دہی کر کے ایک مثبت قدم اٹھایا ہے اور یوں خود کو دنیا کی ترقی یافتہ شاعری سے ہم آہنگ کردیا ہے اس نئے انسان کے وجود کا احساس دلانے میں شہزاد احمد، غلام جیلانی اصغر، ساقی فاروقی، ماجد الباقری، اور پچھلے چند برس میں ابھرنے والوں میں رشید قیصرانی، کیف انصاری، راحت نسیم ملک، افتخار نسیم، سیف زلفی، ارشاد حسین کاظمی، جاوید شاہین، انور شعور، صہبا اختر، جون ایلیا، ریاض مجید اور سلیم شاہد کے نام بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ☆☆☆

سہ ماہی "انتساب"

کا

محمد ایوب واقف نمبر

مدیر: ڈاکٹر سیفی سرونجی

قیمت: ۵۰ روپئے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

کھلونے

وزیر آغا

شمارہ ۲۰۲
جنوری ۱۹۹۷

کھلونے ہی کھلونے ہیں
کبھی بچوں کے ہاتھوں میں
کبھی بچوں کی صورت میں

کبھی جب ڈور مالا کی
معاد و لخت ہوتی ہے
تو لمحے، دانہ دانہ ڈور تک
ہر سو بکھرتے ہیں
زماں کو دائرے کی قید سے آزاد کرتے ہیں
منور کہکشاں کے طشت میں
گھی کے دیے بن کر نکلتے ہیں
معطر روشنی تقسیم کرتے ہیں

کھلونے ہی کھلونے ہیں
دیے، لمحے، پتنگے، سرخ تارے
ابر کی قاشیں
تری آنکھوں کے اندر پتلیوں کا رقص
میرے دل میں پاگل دھڑکنوں کا شور
کیسا کھیل ہے نٹ کھٹ کھلونوں کا

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
زمیں اور آسماں میں فاصلہ باقی نہیں رہتا
تو یوں لگتا ہے جیسے
ہست... اک ٹوٹا کھلونا ہے
سجا کر میں جسے، اپنی ہتھیلی پر
دکھاتا پھر رہا ہوں
نیستی کی بند آنکھوں کو

غزل

وقار واثقی

شمارہ ۱۷،
اکتوبر ۱۹۶۷

کام ہے اک وقار، اگر کر لو
اپنی ہی ذات کا سفر کر لو

دیکھنی ہے ہمیں یہ دنیا بھی
اپنا چہرہ ذرا ادھر کر لو

چشم عالم تو دیکھتی ہے گناہ
بندگی چاہے جس قدر کر لو

اب تو ممکن نہیں رہا تم سے
کہ کسی ایک دل میں گھر کر لو

خوش ہو پگڈنڈیوں سے تم بچ کر
شاہراہوں پہ بھی نظر کر لو

جس نے دیکھا تمھیں، ہوا حیراں
کم سے کم تم بھی اک نظر کر لو

دویک وشال

شمارہ ۱۴۶،
مئی تا اگست ۱۹۸۷

تم ہی بتاؤ
میں زندگی کی تصویر بناؤں بھی تو کیسے
کہ میرے سارے رنگ اب خشک ہو چکے ہیں
ہواؤں نے ان کی نمی چرا لی ہے
دھوپ نے ان کی خوشبو کے ساتھ ریپ کیا ہے
تم میری آنکھوں میں اس طرح کیا جھانکتے ہو؟
شاید یہ بھول گئے کہ ان میں اب
دور تک کوئی بھی منظر دکھائی نہیں دیتا
میری مسکراہٹوں پر تم بدگمانی مت لاؤ
ایسا تو نہیں کہ مجھ کو
رونا آتا ہی نہ ہو
میرے سینے میں جو ناگ پھنی کے کانٹے اگ آئے ہیں
انھیں دیکھو تو ذرا
کتنے خوبصورت ہیں یہ
کیا تم ان مسکراتے ہوئے زخموں پر
کوئی نظم لکھو گے
میرا قلم
اب بہت دور تک میرا ساتھ نہیں دے پاتا
ذہن میں بے ترتیبی سے ابھرنے والے
یہ مفلس الفاظ
اب کاغذ پر آتے ہی پتھرا جاتے ہیں
تم کہیں سے ان کے معنی ڈھونڈ لاؤ نا
جانتے ہو
کل کسی مردہ تخلیق کو
کچھ سمجھدار لوگوں نے
اس قبرستان میں گاڑ دیا
جہاں صرف مقدس زندگی دفنائی جاتی ہے
میری خواہشیں تو ہمیشہ سے گونگی تھیں
میری سوچوں کو بھی شاید
اب فالج مار گیا ہے
تم بے جھجک مجھ پر الزام رکھ سکتے ہو
کہ میرے کندھے اب ایسے بوجھ کے عادی ہو چکے ہیں
میں اپنے ان بھی گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں
جو درحقیقت کبھی رونما نہیں ہوئے
صدیوں نے میری جھولی میں
ان گناہوں کے احساس سے گھائل
چند یتیم لمحوں کے سوا
اور دیا ہی کیا ہے
بولو تو
میں اپنی زندگی کی تصویر بناؤں بھی تو کیسے
کہ میرے سارے رنگ
اب خشک ہو چکے ہیں

افسانے کا منصب

وہاب اشرفی

شمارہ ۶۴
ستمبر ۱۹۷۱

تقریباً ایک صدی پہلے فریڈرک بی۔ پرکسن نے افسانے کے منصب پر اپنے خیالات قلم بند کئے تھے جو اس کی کتاب Devi-puzzlers and Other Studies میں پیش لفظ کے طور پر شریک ہیں۔ فرکسن انیسویں صدی کے اواخر میں معیاری رسالوں کے مدیر کی حیثیت سے کافی مشہور تھا اور اس کی رائیں اپنے وقت میں مستند تصور کی جاتی تھیں۔ افسانے کی فنی حیثیت، ناول کے مقابلے میں اس کے وقار، نیز اس کے متعدد دوسرے اوصاف سے متعلق اس کے خیالات آج بھی قابل غور ہو سکتے ہیں، اس کے جملے ہیں:

> ... میں افسانے کے فن کے بارے میں بہت اونچے خیالات رکھتا ہوں۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں ہیں جو اچھے افسانے لکھ سکتے ہوں، مختصر افسانے کی حیثیت طویل (یعنی ناول) کے مقابلے میں وہی ہے جو پہاڑ کے مقابلے میں ہیرے کی ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ نہ تو ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کے مجموعے زیادہ فروخت ہوئے اور نہ ہی تھینل ہاتھورن کے۔ لیکن اس کے بعد بھی انگریزی ادب کی اس صنف کے یہ دو لکھنے والے سب سے اچھے ہیں...
>
> ... افسانے کا فن جس عظمت کا مستحق ہے اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسی بات نہیں کہ افسانہ نثر کی عظیم ترین صنف ہے، جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لیرک، شاعری کی بہترین صنف ہے، لیکن لیرک ہی کی طرح افسانے کا مقام بلند ہے، لیرک کی جو حیثیت رزمیہ یا بیانیہ یا ڈرامائی نظموں کے مقابلے میں ہو سکتی ہے، افسانے کی وہی حیثیت نثر کی دوسری صنفوں کے مقابلے میں ہے۔ لیرک ہی کی طرح ایک اچھا افسانہ عظیم، غیر معمولی اور کمیاب ذہن کی پیداوار ہوتا ہے...

ممکن ہے مغربی ادب کے بعض واقف کار پرکسن کے انسائیکلوپیڈیائی ذہن کے قائل ہوتے ہوئے بھی اسے پرکاش پنڈت کی صف میں کھڑا کر دیں اور افسانے کے بارے میں اس کے خیالات کو قابل اعتنا تصور نہ کریں۔ لیکن میرے خیال میں ایڈگر ایلن پو کی رائیں اتنی آسانی سے رد نہیں کی جا سکتیں، اس لئے بھی کہ جدیدیت کے بہت سے رجحانات کا منبع عالمی شہرت کے مالک کئی دوسرے فن کاروں کے علاوہ پو کی نگارشات بھی ہیں۔ خصوصاً علامت نگاری کے ضمن میں اس کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اس کی عظمت کے قائل تو ملارمے اور بودلیئر بھی تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی The Philosophy of Composition شعری محاسن کی تعیین میں اس حد تک معاون ہوئی ہے کہ اب ہم کسی شعر کے مفہوم کی تلاش میں اس کی صوتی کیفیت اور حواس خمسہ پر اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بہر حال افسانے یا کہانی کے بارے میں پو نے اپنے اپنے تاثرات ہاتھورن کی کہانیوں کے جائزے میں بیان کئے تھے اور اب یہ اس کے "کمپلیٹ ورکس" میں چھپ گئے ہیں، وہ لکھتا ہے:

> ... ہماری رائے میں اس امر سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اعلیٰ ترین ذہن کی بہترین جائے ورزش نثری حصے میں کہانی ہی ہے... شاعری کی تمام صورتوں میں تاثر یا اثر کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ وحدت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم کسی تخلیق کو ایک ہی بیٹھک میں نہ پڑھ لیں... تمام اعلیٰ جذبے لازمی طور پر گذراں ہوتے ہیں لہٰذا طویل نظم فریب محض ہے ... رزمیہ آرٹ ناپختہ ذہن کی پیداوار ہے اور اس کا عہد ختم ہو چکا ہے، اسی طرح کوئی نظم جو ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہوتی ہے وہ واضح اثر تو قائم کر سکتی ہے لیکن شدید اور بسیط نہیں، اس لئے غایت اختصار عیب ہے لیکن غایت طوالت ناقابل معافی گناہ ... ناول اپنی طوالت کے باعث قابل اعتراض صنف ہے اور چونکہ یہ ایک ہی نشست میں نہیں

پڑھا جاسکتا اس لئے اثر کی طاقت کھو دیتا ہے... مطالعے کے وقفوں کی وجہ سے دوسری دنیاوی دلچسپیاں مخل ہو جاتی ہیں اور کتاب کے مجموعی تاثر کو یا تو تبدیل کر دیتی ہیں یا مسخ کر دیتی ہیں...

فکشن کے ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو پرکسن اور پو کی طرح افسانے کو ناول پر ترجیح دیتے ہوں۔ ایسے نقادوں میں برینڈر میتھیوز کا نام خاصا مشہور ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ڈرامانگار، نقاد اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی کتاب The Philosophy of the Short Story کافی مشہور ہوئی تھی اور اس کے چھپتے ہی ناول اور افسانے کے تقابلی منصب کے بارے میں اچھی خاصی بحث چھڑ گئی تھی۔ افسانے کے بارے میں اس کی رائے آج بھی قابل اعتنا ہے، اس نے لکھا ہے:

...لیکن کئی چیزیں جو افسانہ نگار کے لئے ضروری ہیں، ناول نگار کے لئے ضروری نہیں۔ ناول نگار بہت وقت لے سکتا ہے، اسے چکر کاٹنے کی کافی گنجائش ہے، لیکن افسانہ نگار کو تو لازمی طور پر اختصار، جامعیت اور غایت جامعیت سے کام لینا ہے... پھر ناول نگار کے یہاں قوتیت ہو سکتی ہے، وہ اپنی بہترین قوتوں کو حقائق کی تصویرکشی کی طرف راغب کر سکتا ہے اگر وہ حقیقی زندگی کی جھلک دکھا دیتا ہے تو ہماری تسکین ہو جاتی ہے۔ پر افسانہ نگار کے یہاں اپج اور کاری گری ہونی ہی چاہئے... سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا شخص جس کے یہاں اختراع کی صلاحیت، جامعیت اور کاری گری نہیں ہے، کبھی افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوا...

ظاہر ہے کہ برینڈر میتھیوز کے سامنے جوائس، پروست، کامیو، کافکا، یا سارتر جیسے نال نگاروں کی مثالیں نہیں تھیں ورنہ وہ ناول کے ضمن میں عمومیت، بہتر اپج اور صناعی کے فقدان کی باتیں نہیں کرتا۔ لیکن ناول نگاروں کے چکر کاٹنے والی بات تو آج بھی سچی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کتنے ہی معیاری ناول محض اپنی طوالت کے باعث پڑھے نہیں جاتے، اس لئے مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ اور ناولوں کو مختصر کر کے فروخت کرنا ناشروں کی ایک مخصوص پالیسی بن گئی ہے، ایسی abridged صورت سے کسی ناول پر کیا کچھ صدمہ پہنچتا ہے یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن مختصر کیئے ہوئے ناول خوب مقبول ہیں۔ پر افسانے کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا جاتا۔ اگر افسانے کو جہاں تہاں سے کاٹ دیا جائے تو اس کا وجود ہی معدوم ہو جائے گا، اس لئے کہ افسانے کا مختصر سانچہ افسانہ نگار کو "چکر کاٹنے" کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ افسانہ نگار کو بہر صورت اختصار اور جامعیت سے کام لینا ہی ہے اور یہ کام کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ ہنری جیمز جیسے عظیم فن کار کو بھی ہوا ہے۔

افسانے کے بارے میں ہنری جیمز کے خیالات اس کے مضمون On the Genesis of the Real Thing میں ملتے ہیں۔ یہ مضمون اس کی کتاب "نوٹ بکس" میں شریک ہے۔ جیمز اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ افسانے کا فن ایک مشکل فن ہے، مختصر سانچے میں باتوں کا بیان سخت ریاض چاہتا ہے۔ اس نے اپنی مشکل کا اظہار کیا ہے کہ سات ہزار سے دس ہزار الفاظ کی حدود میں افسانے لکھنا اس کے لئے ایک طرح کی آزمائش تھی۔ جیمز افسانے کو "خوب صورت، چمک دار، تیز اور نمایاں ہیرا" تصور کرتا ہے اور موپساں کے افسانوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ افسانے کا مختصر سانچہ کتنا ریاض چاہتا ہے، اس کا اندازہ چیخوف کی بھی نگارشات سے ہوتا ہے۔ چیخوف نے غالباً افسانے پر تفصیلی اور مدلل کوئی مضمون نہیں لکھا۔ لیکن اس نے اپنے بعض خطوط میں افسانے کی فنی عظمت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے تمام خطوط کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ افسانہ چھوٹی چیزوں کو زندہ بنا دینے کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار دوسرے اوصاف کے علاوہ فن کے اسرار اور موز سے آگاہ ہو، چنانچہ وہ ایک افسانہ نگار کی کہانیوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے:

تمہارے افسانوں میں وہ جامعیت نہیں ہے جو چھوٹی چیزوں کو زندہ بنا ڈالے، تمہارے افسانوں میں ہنر مندی بھی پائی جاتی ہے، ذہانت اور ادبی احساس بھی لیکن ان میں آرٹ بہت کم ہوتا ہے... ایک پتھر سے چہرہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں سے وہ تمام حصے کاٹ کر پھینک دیئے جائیں جو چہرہ نہیں ہیں...

چیخوف کے آخری جملے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ افسانے کا فن سخت قسم کے فن کارانہ رد و انتخاب کا فن ہے اور افسانہ نگار کو ادھر ادھر بھاگنے کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عظیم نقاد اور ناول نگار ناول کو فنی عظمت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے اور سرے سے اسے آرٹ کی دنیا سے خارج کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نمایاں نام ایچ۔ جی۔ ویلز کا ہے۔ یوں تو اسے اس بات کا احساس ہے کہ آج کی الجھی ہوئی اور پیچیدہ زندگی کی تصویرکشی کسی ذریعہ سے ہو سکتی ہے تو وہ ذریعہ ناول کا ہے لیکن ویلز کو تامل ہے کہ ناول کو آرٹ کا نام دیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح ورجینیا وولف جیسی عظیم ناول نگار کو بھی ناول کو فن تسلیم کرنے میں عار ہے۔ وہ لکھتی ہے:

... یوں تو ناول نے اپنے ارتقا میں انسان کے ہزاروں معمولی احساسات جگائے ہیں لیکن ایسے سلسلہ کو

آرٹ سے وابستہ کرنا فعل عبث ہے...آج کا کوئی نقاد یہ نہیں
کہہ سکتا کہ ناول فن کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کا فنی
جائزہ لینا چاہئے...

ویلز یا ورجینیا وولف کے خیالات پر تنقید کی جاسکتی ہے اور ان کی رائے سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے لیکن اتنی بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ اصول اور ضابطے جو دوسرے فنون لطیفہ کا معیار و مقام متعین کرتے ہیں وہ ناول پر بہت کم منطبق ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقی وجہ اس کی طوالت ہی ہے جو اسے جامع بنانے میں ہر قدم پر مخل ہوتی ہے جب کہ افسانے کی جامعیت اور اس کا اختصار فنی نوک پلک کی آراستگی کا کافی موقع فراہم کرتا ہے، جس کی بنیاد پر ایڈگر ایلن پو افسانے کو ناول پر فوقیت دینے میں تذبذب محسوس کرتا۔ لہٰذا یہ امر محتاج ثبوت نہیں رہتا کہ افسانے کی فنی حیثیت ناول کے مقابلے میں کم تر نہیں ہے۔

افسانے کی فنی حیثیت کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ محض ایک صنف کے بل بوتے پر بین الاقوامی مقبولیت اور شہرت کا حصول محال ہے۔ اس غلط فہمی سے یہ مفروضہ بھی جنم لیتا ہے کہ کسی فن کار کی عظمت کے تعین میں یہ عنصر بھی بہت اہم ہے کہ جس صنف سے وہ خود کو وابستہ کئے ہوئے ہے اس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ یعنی غیر اہم صنف کا سہارا لینے والا فن کار عالمی شہرت کے حصول میں ناکام رہے گا۔ لیکن ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہے کہ غیر اہم صنفوں سے وابستگی کے باوجود کچھ ادبا و شعرا ساری دنیا میں مشہور ہوگئے ہیں اور ان کی حیثیت عالمی ادب میں محفوظ ہوگئی ہے۔ غزل کلیم الدین احمد کے قول کے مطابق ایک نیم وحشی صنف سخن ہے، لیکن غالب کی شہرت کا تنہا راز اسی نیم وحشی صنف میں غیر معمولی اور انفرادی کارگزاریاں ہیں۔ فرانسیسی شعرا بودلیئر، رانبو اور ورلین، لافورگ، کلودیل، پال والیری، رونسار، یا جرمنی شعرا ہولڈرلن، اسٹیفان جارج، رلکے، یا اطالوی شعرا لیوپاردی، کواسیمادو، یا انگریزی شعرا اوڈن، بلیک، ییٹس، یا فارسی شعرا حافظ، بیدل، رومی، عمر خیام وغیرہ نے کسی زمانے کی اس عظیم ترین صنف میں شاعری نہیں کی جسے ایپک کہتے ہیں۔ لیکن کیا آج کا نقاد ملٹن کو ملارمے پر صرف اس لئے فوقیت دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ ملارمے نے کوئی ایپک نہیں لکھی؟ دراصل کوئی مخصوص صنف اہم یا غیر اہم نہیں بناتی بلکہ متعلقہ صنف میں اس کی اپنی کارگزاری اسے اہم یا غیر اہم بناتی ہے۔ لہٰذا بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ افسانے کی صنف ناول کے مقابلے میں کم تر ہے تو بھی یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ صرف افسانے کے سہارے کسی افسانہ نگار کا عالمی ادب میں مقام حاصل کرنا محال ہے، ذیل کی چند مثالیں اس حقیقت کو مزید واضح کریں گی۔

چیخوف کی شہرت کا باعث اس کے افسانے بھی ہیں اور ڈرامے بھی۔
لیکن وہ ڈرامے کی طرف اس وقت راغب ہوا جب وہ بیشتر افسانے لکھ چکا تھا اور اس کی شہرت اور عظمت عالمی سطح پر محفوظ ہوگئی تھی۔ اس کے چھ ڈرامے
Ivanov, The Seagull, Uncle Vanya, The Three Sisters
اور The Cherry Orchard ڈرامے کی نئی جہتوں کی طرف اہم قدم ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چیخوف ان ڈراموں کے بغیر بھی عالمی ادب میں اتنا ہی عظیم رہتا ہے جتنا آج ہے۔ اس کی شہرت ۱۸۸۶ تک مسلم ہو چکی تھی جب اس کے افسانوں کا مجموعہ Particolored Stones کے نام سے شائع ہوا تھا۔ چیخوف نے ڈرامے اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں لکھے۔ ایک دوسرا روسی افسانہ نگار بونن محض اپنے افسانوں کی وجہ سے ہی زندہ ہے۔ میرے خیال میں تاثراتی، قنوطی اور گہری داخلیت کے انداز کے افسانے لکھنے والوں میں بونن کا مقام پہلی صف کے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔ اس کے افسانے دی گرامر آف لو، دی جنٹلمین فرام فرانسسکو اور سن اسٹروک دنیا کے مشہور افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بونن نے کسی اور فن کا سہارا نہیں لیا لیکن آج وہ دنیا کا جانا پہچانا فن کار ہے۔ گورکی نے ڈرامے بھی لکھے اور ناول بھی۔ لیکن اس کی شہرت کی بنیاد اس کا افسانہ Twenty-six Men and a Girl ثابت ہوا۔ وہ چوروں، لٹیروں اور پسماندہ افراد پر مسلسل افسانے لکھتا رہا۔ یہ افسانے ۱۸۹۵ سے ۱۹۰۰ کے درمیان شائع ہوئے اور اس کی دائمی شہرت کا باعث بنے۔ گورکی نے ناول اور ڈرامے بہت بعد میں لکھے۔ موپساں کا قائل تو ہنری جیمز بھی تھا اور اس نے متعدد بار اس کا اظہار کیا ہے کہ موپساں کے انداز کے افسانے لکھنا سخت فنی ریاض چاہتا ہے۔ موپساں، فلابیئر اور زولا کی صحبتوں کے بعد بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی رہا۔ اس کے چھ ناول، متعدد سفری خاکے اور دوسری نگارشات اس کے افسانوں کے منصب تک نہیں پہنچتیں اور ان کی حیثیت اس کے افسانوں کے مقابلے میں ضمنی ہے۔ ترگنیف کے افسانے ۱۸۴۷ اور ۱۸۵۱ کے درمیان شائع ہوئے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''اسپورٹسمن اسکیچز'' ۱۸۵۲ میں چھپا اور اس کی شہرت کی سبیل بن گیا۔ اس سے پہلے اس نے شاعری بھی کی لیکن اسے بحیثیت شاعر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہو جانے کے بعد ترگنیف ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ پشکن کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کا افسانہ The Captain's Daughter اس کی ادبی عظمت میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ امریکی افسانہ نگار او ہنری (ولیم ہنری پورٹر) کی ساری شہرت اس کے افسانوں کی مرہون منت ہے۔ کیتھرین این پورٹر مسلسل افسانے لکھ رہی ہے اور جدید افسانہ نگاروں میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ دو سال پہلے اسے فورڈ فاؤنڈیشن انعام مل چکا ہے۔ نئے ذہن کے معماروں میں مارسل پروست کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ تیرہ جلدوں پر مشتمل اس کا طویل ناول In Search of Lost Times اپنی تہ داری کے باعث اس صدی کا عظیم شاہکار ہے لیکن خود پروست کو اپنے افسانے Fihal S...ments of a Patacnde پر بڑا ناز تھا۔ تیرہ صفحات کا یہ افسانہ پروست نیز نئے ذہن کو سمجھنے کا ایک اہم زاویہ ہے۔ اس افسانے کے آخری جملوں میں پروست کا ذہن و دماغ چھپا ہوا ہے:

...کیسی خوشی، جئے جانے کی کون سی وجہ، کیسی
زندگی ایسی خود آگاہی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ کون سچ ہے خود
آگاہی یا زندگی کی خوشی؟ دونوں میں سچ کون ہے؟

کیتھرین مینسفلڈ نے ۳۵ برس کی مختصر عمر پائی لیکن ادبی لحاظ سے ہمیشہ زندہ ہے۔ اس کی عظمت اور شہرت کی وجہ صنف افسانہ ہی ہے، کوئی دوسری صنف نہیں۔ اطالوی ادیب پیرانڈیلو نے افسانے بھی لکھے، ڈرامے اور ناول بھی۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں کے مقابلے میں اس کے ناول کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے کہ اس کا فکری نظام اس کے ڈراموں ہی سے تشکیل پایا لیکن ابتدا میں اس کی شہرت اس کے افسانوں ہی کے باعث ہوئی۔ کامیو جب کافکا کے فکری محور کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے ناول The Trial اور The Castle کے ساتھ ساتھ اس کے افسانے Metamorphosis کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اردو کے کئی نئے افسانوں میں اس افسانے کے اثرات نمایاں ہیں۔ رابرٹ ٹامبین اس افسانے کو "بیسویں صدی کا عظیم تخیلی شاہکار" کہتا ہے اور The Trial اور The Castle کو اس کے مقابلے میں کم تر سمجھتا ہے۔

جرمن ناول نگار اور افسانہ نگار ٹامس مان نے جرمنی تہذیب کے کھوکھلے پن کے اظہار کے لئے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی، لیکن اس کی شہرت میں دونوں ہی صنفیں یکساں معاون ہوئی ہیں۔ کامیو کے ناول The Plague، The Outsider اور The Fall عظیم ادبی شاہکار ہیں لیکن اس کا افسانوی مجموعے Exile and the The Kingdom کے چھ افسانے اپنی فنی عظمت کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ فلپ تھوڈی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح اس کے افسانے اس کے ناول کے مقابلے میں "دوسرے درجہ کی چیز نہیں ہیں۔" ہنری جیمز کی عظمت Dubliners کے پندرہ افسانوں کے بغیر نامکمل ہوتی۔ "ڈبلنرز" کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ ازرا پاؤنڈ نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ ایلیٹ نے پاؤنڈ کے مضامین یک جا کر کے شائع کردیئے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں "ڈبلنرز" پر پاؤنڈ کا وہ مضمون شریک ہے۔ اس کے علاوہ خود ہنری جیمز کی نظر میں اس کے افسانے انتہائی اہم تھے۔ کیا کوئی ایسی دھاندلی کرسکتا ہے کہ لارنس کے نظریے کی تشکیل میں صرف اس کے ناولوں کو زیر بحث لائے اور اس کی انفرادیت کے حامل افسانوی مجموعے Prussian Officers کو نظر انداز کردے؟

اردو کے افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اگر دنیا کی اہم زبانوں میں مسلسل ترجمہ ہوتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں عالمی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ ہو۔ اسی طرح افسانے کی نئی تکنیک میں لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش اور مین را کے افسانے دنیا کی عظیم زبانوں میں منتقل کئے جاتے رہیں تو عالمی سطح پر بھی یہ نام جانے پہچانے نظر آئیں گے۔ ممکن ہے میری اس رائے کو مبالغہ سمجھا جائے لیکن سنجیدگی سے عالمی ادب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کیتھرین این پورٹر اور غیاث احمد گدی کے افسانوں کی فنی جہتیں ایک سی ہیں لیکن اردو افسانے کے ارتقائی جائزے میں بھی غیاث احمد گدی کو نظر انداز کرنے سے لوگ نہیں چوکتے جب کہ پورٹر کی بین الاقوامی حیثیت مسلم ہو چکی ہے۔

افسانے پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں تجربے کی گنجائش بہت کم ہے۔ اس کو زمان و مکان کے حدود میں بہر حال رہنا ہے اور اس کا بیانیہ انداز اتنا اٹل ہے کہ اس سے انحراف کی کوششیں بے معنی ہیں۔ ممکن ہے صرف اردو افسانوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہی گئی ہو لیکن یہ اعتراض بھی وزنی نہیں ہے اس لئے کہ اس صنف میں برابر تجربے ہو رہے ہیں اور تکنیک کی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں۔ تکنیک کے بہت سے نئے تجربے پڑھنے والوں کو اکثر ناگوار اس لئے ہیں کہ ہم رسمی اور روایتی افسانے پڑھنے کے عادی ہیں پھر مغرب میں لکھے جانے والے نئے افسانوں سے بے خبر رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمیں Initiation (بداتی) افسانوں سے واقفیت نہیں ہے۔ انتھرا پالوجی کی یہ اصطلاح ایک خاص قسم کے نئے افسانے کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ کسی کم عمر کے ارتقائے شعور کے مرحلے میں کوئی واقعہ اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ اس کے ردعمل میں زندگی کا کوئی بالغ تصور اس کے سامنے آجائے اور اس کے مستقبل کی زندگی پر اس کا گہرا اثر قائم رہے۔ ہیمنگوے کا افسانہ "دی کیلرس"، کترائن مینسفلڈ کا "دی گارڈن پارٹی" فاکنر کا "دی بیر" بداتی افسانے ہیں۔ اردو میں ایسے افسانوں کا کال ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ "بھولا"، منٹو کے "جی آیا صاحب" اور کلام حیدری کے افسانے "غلطی" میں انی سیئشن کے کچھ عناصر ملتے ہیں۔ لیکن افسانے کی اس نئی قماش کے بارے میں اردو فکشن کے نقاد بالکل خاموش ہیں۔ حالانکہ مغرب میں انی سیئشن افسانے قریب قریب تیس برس پرانے ہو چکے ہیں۔

البتہ اردو کے نئے افسانے کی بحث میں "شعور کی رو" پر اچھی خاصی روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ اردو میں نصف درجن افسانے بھی شاید ہی اس تکنیک پر پورے اتریں گے۔ اس لئے کہ ہمارے افسانہ نگار زیادہ دیر تک صبر نہیں کرسکتے اور ذہن کی ترنگ پر زور لگا کر اچھی خاصی عبارت آرائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ "شب خون" مارچ ۱۹۷۱ میں غیاث احمد گدی کا افسانہ "نارو منی" غالباً "شعور کی رو" کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ لیکن غیاث زیادہ دیر تک خاموش نہ بیٹھ سکے اور جہاں تہاں ذہن کے بہاؤ پر روک لگانے میں منہمک ہو گئے۔ ہاں سریندر پرکاش کا افسانہ "تلقارمس" "شعور کی رو" کی تکنیک پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ افسانہ نگار کو خواب میں کسی نے اسی نام سے پکارا تھا۔ یہ بیان Surrealism کی تحریک کی اسی بنیاد کی یاد دلاتا ہے کہ کس طرح آندرے بریتوں (Andre Breton) کے ذہن میں یکا یک یہ جملہ عود کر آیا: A man is cut in half by the window۔ شعور کی رو کے افسانے کوئی سرریلسٹ ہی لکھ سکتا ہے اس لئے کہ سرریلزم کے منشور میں اس کی تعریف جس طرح کی گئی ہے وہ "شعور کی رو" پر منطبق ہوتی ہے:

> A pure psychic automatism by
> which it is intended to express, verbally,
> in writing or by other means, the real

process of thought. Thought's dictation, in the absence of all control exercised by the reason and outside all aesthetic or moral preo- ccupations.

اسی طرح، علامتی افسانے کے بارے میں کچھ نئے افسانہ نگار سخت غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ ہمارے یہاں علامت کا مفہوم یہ مان لیا گیا ہے کہ کسی ایک چیز کے لئے کوئی دوسری چیز مخصوص کرلیں۔ مثال کے طور پر طوائف کی کہانی لکھنی ہو تو اس کے لئے سڑک کا لفظ منتخب کرلیں اور پھر جہاں جہاں طوائف لکھا ہو وہاں وہاں سڑک لکھتے جائیں اور بس علامتی افسانہ تیار ہوگیا۔ حالانکہ علامت نگاری ایک طرح سے رومانی نظریہ کے تخلیقی تصور پر مبنی ہے، جس میں فطرت اپنی تسلیم شدہ خدو خال عادات و اطوار میں نہیں دیکھی جاتی بلکہ تخیل کے آئینہ میں کچھ اور ہی شے بن جاتی ہے، لہٰذا اردو کے بہت کم افسانے علامتی افسانے بن پاتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ افسانے میں تبدیلی کے امکانات کم ہیں صحیح نہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو افسانے ابھی تک اپنی قدیم ڈگر سے ہٹے نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ A Portrait in Black and Blood جیسا نیا افسانہ ہمارے لئے ناقابل فہم بن جاتا ہے اور ہم بڑی بے تکلفی سے اسے ناقابل اشاعت کہہ دیتے ہیں۔

افسانے میں تبدیلی کی اتنی ہی گنجائش ہے جو کسی دوسری اہم صنف میں ہوسکتی ہے، لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ اس کے روایتی خدو خال کو اٹل نہ سمجھا جائے Sherwood Anderson نے تقریباً ساٹھ سال پہلے اپنے ایک مضمون Form, Not Plot میں اس کا اظہار کیا تھا کہ پو، موپساں اور او ہنری نے افسانہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی ذہین نسل کو ماجرا نگاری کا مصنوعی تصور دے کر زندگی سے دور کردیا ہے۔ اینڈرسن نے ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ہماری بے تکلف روزانہ زندگی میں کوئی ہموار پلاٹ نہیں ہوتا۔ ایسے پلاٹ پر مبنی افسانے صرف مصنوعی ہوسکتے ہیں۔ اینڈرسن کی رائے کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ماجرا نگاری افسانے کے لئے ہمیشہ غیر ضروری رہی ہے، لیکن اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ پلاٹ کو جتنی خدمت انجام دینی تھی دے چکا۔ حقیقت نگاری کے نئے تصور کا تقاضا ہے کہ اب اسے پلاٹ سے آزاد کیا جائے اور نئے رنگ و آہنگ سے ہمکنار کیا جائے۔ پلاٹ پر مبنی افسانے کا تصور سال خوردہ تصور ہے۔ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سلسلہ میں Barnard Overstreet نے اپنے مضمون Little Story - What Now? میں چند قابل غور نکتوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> ہماری حالیہ صدی کا ڈراما وہ ڈراما ہے جو ہمارے ذہنوں میں ہوتا رہتا ہے۔ خارجی عمل (چاہے وہ ہاتھ کی کوئی معمولی جنبش ہو یا ایک قوم کا دوسری قوم پر سفاکانہ حملہ) اسی حد تک اہم ہے کہ کہاں تک اس کا ردعمل ہماری ذہنی اور جذباتی کیفیات پر ہو رہا ہے...
>
> ...اس صدی میں افسانے کا کیا ہوگا؟ اس کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی اتنی ہی مشکل ہے جتنی مشکل تمام اداروں کے مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کرنا۔ لیکن اتنی بات تو کہی جاسکتی ہے کہ گذشتہ چند دہائیوں سے افسانہ انسانی ذہن کی گتھیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کی عکاسی کا معیاری آلۂ کار افسانہ ہی ہے...

ظاہر ہے کہ اینڈرسن کی طرح اوور اسٹریٹ بھی اسی امر پر زور دے رہا ہے کہ انسان کے نفسیاتی عوامل ایک سیدھی لکیر میں ترتیب نہیں دیئے جاسکتے اس لئے حقیقی افسانے Plotless ہی ہوسکتے ہیں۔ افسانے کے نقادوں میں آج اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ افسانے کے ڈھانچے میں جو تبدیلی آئی ہے وہ فنی اعتبار سے اس کی عظمت بڑھانے میں معاون ہے۔ مغرب میں افسانے بقول اوور اسٹریٹ Poison-Plot سے نجات پاچکے ہیں اور اپنی سال خوردہ مصنوعی آرائش و زیبائش کو ترک کرکے انتہائی فطری بن گئے ہیں۔ ایسے افسانے جن میں پلاٹ سازی کی جھلک بھی ہے تو وہ رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ ذہنی عوامل کی عکاسی ہے۔ چنانچہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے افسانے The Blue Bird، سرویاں کے The Daring Young Man on the Flying Trapeze، فلینری اوکانر کے A Good Man is Hard to Find، ٹرومین کپوٹے کے A Tree of Night اور کیتھرین این پورٹر کے The Theft کو ایک ساتھ پڑھئے تو ان کے متنوع مزاج کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ایسے میں نیاز فتح پوری، پریم چند، ممتاز مفتی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، محمد حسن، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، رام لعل اور کلام حیدری کے افسانے اپنے اپنے عہد کے نمایاں فرق کے باوجود پلاٹ سازی کی حد تک روایتی ہی نظر آئیں گے۔ افسانے کے فارم کے بارے میں ان کا تصور بہت حد تک جامد ہی رہا ہے۔

یہاں اس امر پر اصرار کیا جاسکتا ہے کہ نیاز فتح پوری کے مقابلے میں پریم چند کے افسانے نئے ہیں (اور ایک الگ اسکول کے ہیں)۔ اسی طرح پریم چند، اعظم کریوی، سدرشن یا سہیل عظیم آبادی کے مقابلے میں ممتاز مفتی کے اور ممتاز مفتی یا محمد حسن کے مقابلے میں منٹو یا انتظار حسین کے.. مجھے ان باتوں سے انکار نہیں ہے لیکن ان افسانہ نگاروں میں بنیادی فرق موضوعات کا فرق ہے۔ مختلف موضوعات کی بنا پر فارم کی تھوڑی سی لچک کو ہیئتی تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ غالباً اردو افسانے کے روایتی سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض حضرات اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ افسانے میں تبدیلی ممکن نہیں ہے لیکن اردو کے افسانے کی ایسی رفتار اس صنف کی کمزوری ثابت نہیں کرتی بلکہ اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ افسانے کے اجزائے ترکیبی کے سلسلے میں ہمارا موقف ناگوار حد تک روایتی ہے۔ ویسے یہ صنف کتنی لچک دار ہے۔ اس کا اندازہ ایڈگر ایلن پو اور ولیم بروز کے افسانوں کی ہیئت

کے تقابلی جائزے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کی نئی پود نے شاید اس کا اندازہ لگالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انور سجاد، مین را اور سریندر پرکاش اردو افسانے کا مزاج بدلنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا افسانہ کوئی جامد صنف نہیں بلکہ انتہائی لچک دار اور تغیر پسند صنف ہے۔

صنف افسانہ کو دوسرے نثری اصناف کے مقابلے میں ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ شاعری سے بہت قریب ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر یا اچھے شعر کی بحث میں جدلیاتی الفاظ کے استعمال نیز ابہام اور اجمال کے اوصاف کو ناگزیر بتایا ہے۔ ہربرٹ ریڈ بھی قریب قریب ان ہی امور پر زور دیتا ہے۔ اب اگر نئے افسانوں کے مزاج کو غور کیجئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ خصوصیتیں ان میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ افسانہ شاعری سے بہت قریب ہے یا ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں Brickell کا مضمون What Happened to the Short Story قابل مطالعہ ہے۔ بریکل نے نئے افسانے کی زبان کی بحث میں اس کی شاعرانہ خوبیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صرف افسانہ ہی نثر کی وہ صنف ہے جو شاعری کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے عہد سے لے کر آج تک کسی نہ کسی طرح افسانے کی صنفی حیثیت کے اظہار میں شاعری سے اس کی قربت ثابت کی جاتی رہی ہے اور چونکہ فنون لطیفہ میں شاعری کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے اس لئے افسانے کی اہمیت کو "ماڈسٹ آرٹ" کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ عالمی شہرت کے حامل نئے افسانوں کو الگ بھی کردیجئے تو اردو کے کچھ نئے افسانے مثلاً ماچس (مین را)، برف پر ایک مکالمہ (سریندر پرکاش)، (کلام حیدری)، ساتویں کہانی (احمد ہمیش)، تج دو تج دو (غیاث احمد گدی)، ربط کا اعتقاد (جوگندر پال)، کابوس (اکرام باگ)، غم زدوں کی برات (احمد یوسف)، کٹھ پتلیاں (شفیع جاوید)، نئی سڑک (ظفر اوگانوی)، آدمی (الیاس احمد گدی)، دستک (تسکین انصاری)، ایک آنکھ کا آدمی (محسن شمسی)، سیاہ ڈائل اور سیاہ ہاتھ (اختر یوسف)، سانپوں کی پٹاری (اقبال متین) وغیرہ اپنی شعریت کی وجہ سے بھی "ماڈسٹ آرٹ" کی صف میں نہیں رکھے جاسکتے۔

لہٰذا افسانے کی صنفی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس صنف نے انسان کے خارجی و داخلی احوال کی عکاسی میں اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس کے بدلتے ہوئے تیور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں نجی و ذاتی کوائف کے اظہار کا موثر ادبی ذریعہ یہی صنف ثابت ہوگی ☆☆☆

عکس ایک

وہاب دانش

شمارہ ۴۸،
مئی ۱۹۷۰

مرے سامنے برج بابل
بنانے کی سازش ہوئی ہے
بلندی نے پتھر کے زینوں پہ
قدموں کو رکھ کر
خلاؤں کی جانب ادھورے سفر کے پسینہ میں غوطے کی محنت چکھی ہے
تو آواز
ناقہ قطاروں کی فوجوں میں تلوار بن کر
فلک در فلک
برج، گنبد، فصیلوں میں تحلیل سی ہوگئی ہے
خیالوں، زبانوں کے کالے متن
سامری لب تکلم میں رخنہ پڑا ہے
کہ بلقیس تنہا
ہواؤں میں لٹکے ہوئے باغ کے رستوراں میں
گھنے شہر کے کاہنوں میں گھری
سوچ میں غرق
اکثر مجھے بے خیالی میں اقرار کے ہونٹ سے چومتی ہے
کہ آواز
میرے تعاقب میں ملبوس کی ساری بے نام گرہوں سے کھل کر
الف ہوگئی ہے
کہ میں اس کے اندر
ازل سے ابد تک
تلفظ کی لذت پر روتا رہا ہوں

ابابیل کو سمت دو

وہاب دانش

شمارہ ۷۰،
مارچ ۱۹۷۲

سنو
رات کہتی ہے کیا
اس کے لب تیرگی میں کھلے
اور صدیوں کی دہشت، سیاہی
بھیانک اندھیروں کے ملبے کو
آنے لگی جھرجھری
چیختی اک ابابیل
خالی دریچوں، شکستہ سی محراب اور کرب آلود سہمے
ہوئے طاق کی
کشمکش جھیلتی
دائرے، خط، مثلث کے غم کھینچتی پھڑپھڑانے لگی
درد کس
بے زباں، غم زدہ، سر بریدہ مجسم کا ہے
خون اپنا سنبھالو ذرا
حادثے کے سمندر میں اس سانس کو
اب اچھالو ذرا
ساحلی، پر سکوں پانیوں سے ابھرتی ہوئی

رسمساہٹ کے پیچھے
چھپا کون ہے؟
لازمیں، لامکاں اور لاجسم
یہ قطرہ قطرہ لہو
چاند سے اک جزیرے کے عرفان میں
رو بہ سیلاب ہے
آبشاروں سے گرتی ہوئی
ان گنت، برق سی بے تماشائی انگلیوں کی ہنسی
ان نگاہوں میں جب
گدگدی پھیرنے اور سرگوشیوں میں ہر اک ان کہی
رونے کے لئے
تم سے ملنے کو بے تاب ہے
تو اس رات کے کسمساتے ہوئے ہونٹ کا
دل سنو

اور ابابیل کو سمت دو

وہاب دانش

شمارہ ۱۳۲،
مارچ تا مئی ۱۹۸۴

ترا نام شہد سے لکھ کے میں
کبھی مور
مور و مگس بنوں
کبھی پر
شفالی سی بوند سے
کبھی لب
خوشی سے میں رنگ لوں
کبھی رقص
بن کے ادا ادا
کبھی سر
سرور ہوا بنوں
ترا نام شہد سے لکھ کے میں
کبھی آب دیکھوں
لہولہو
کبھی خواب دیکھوں کہ رنگ و بو
کبھی ریت
ریت صراط پر
کبھی دجلہ دجلہ فرات پر
کبھی شمر شاہی سراب پر
کبھی تیر پہرا تھا آب پر
ترے ہونٹ دیکھوں کہ آئینہ
ترا رخ مبین انا انا
مگر اے شہید شمائلی
تری آبرو تھی
علی علی
تو ہی نیزہ نیزہ بلند تھا
ترا سر تو خنجر اپسند تھا
جو جھکا تو خاک تھی مرمریں
جو کٹا تو ریت تھی احمریں
توئی مصطفیٰ توئی مصطفیٰ
ترا نام شہد سے لکھ کے
میں
کبھی آب دیکھوں
لہولہو
یا سراب دیکھوں
عدو عدو

وہاب دانش

شمارہ ۲۳۰،
اکتوبر ۱۹۹۹

شمارہ ۲۵۱،
دسمبر ۲۰۰۱

غرض نشاط

بندے!
بیانیہ...مکر بندو کا ہو
سیاہ حاشیے
یا گھور دائرے کا
تمھاری عافیت اور
خیر قاری اس میں ہے
کہ انجام عیاں ہو
آئینے کی طرح نہیں
منھ پھٹ
عکس دراز
بلکہ ناریل کی طرح
سفیدی بند
مہر بہ لب
تر و تازہ گنگا جلی سے
لبالب
کہ ذرا سا کھلے
تو سرور آجائے
وفور آجائے

تیرا نام

نارس
لیتا ہوں میں کیا؟
تیرا نام
صبح صبح یا شام
تیرے آگے جوڑے
ہاتھ
موڑے پاؤں
بستہ لب
تو سنتا ہے
میں جپتا ہوں جو
دانے
آٹھوں پہر
ساتوں دن
تیرے آگے
بے وجود
نارس لیتا ہوں میں کیا؟
تیرا نام

امن آئے تو

شب تیرہ و تار کو
اجالنے کی آرزو
صد چراغ ہے میرے روبرو
مہر و ماہتاب ہے
لب آب جو
امن آئے تو
صبح ترین
ہو جائے کاخ و کو
دو پہر شین ہو جائے
شوشۂ شر رنمو
دھوپ دراز
صحن، بام و در، روشن دان
تھتھائیں اک بارگی
تذکیر ہو جائے روشنی
امن آئے تو
امن آئے تو
امن آئے تو
امنائے تو

ہربنس کھیا

شمارہ ۲۱۱،

اکتوبر نومبر ۱۹۹۷

سکون

ایک طویل عمر
تم اور میں
اپنے اپنے گھروں میں بند تھے
جہاں زندگی نے کڑے پہرے لگا رکھے تھے
اصولوں کے، رشتوں کے اور فرائض کے

اس تمام مدت میں
جو شاید سترہ برس تھی یا ستر
ایک دوسرے کی سانس کی آواز نے
ہمیں تپش دی
آواز جو بہت ہلکی، بہت مدھم تھی
تپش جو دور تھرتھراتی لو سے بھی ملائم

اور ایک دن
سانسوں کی تپش
اور تھرتھراتی لو کی آگ میں
زندگی کے سارے پہرے موم کی طرح پگھل گئے

ویران گھر میں گلاب کے رنگ
اور موتیا کی خوشبو کا اضطراب بکھر گیا
جس نے ہماری پر سکون خاموشی
کو ریزہ ریزہ کر دیا

آؤ آج پھر ہم
تم اور میں
اپنے پیروں کے ارد گرد
ہلکی ہلکی لکیروں کے دائرے کھینچ لیں
یہ لکیریں شاید کبھی دیوار بن جائیں
اور ہم پھر اپنے اپنے گھروں میں
سکون کی نیند سو سکیں

شمارہ ۲۳۴،

فروری ۲۰۰۰

میری دوست

میری ایک دوست
ہم دم اور ہم راز
اس کی گہری اداس آنکھیں
سرو کے سروں جیسی
برگد کی چھالوں جیسے بال
ہونٹوں پر ان کہا پیار
لمس میں جاں گداز نرمی
اس کی خاموشی میں
آخری دم تک
میری ہم سفری کا وعدہ ہے
یاس نام ہے اس کا

ہمدم کاشمیری

شمارہ ۲۵۳،
فروری ۲۰۰۲

جہاں انساں تھا مشت استخواں رکھا ہوا ہے
خدا کا شکر ہے کچھ تو نشاں رکھا ہوا ہے

یہ کس نے شہر کے سب بام و در روشن کیے ہیں
یہ کس نے بند کمروں میں دھواں رکھا ہوا ہے

خدا جانے کہ کیا انجام ہو اپنے سفر کا
ہوا سے دور ہم نے بادباں رکھا ہوا ہے

اسی پر ہم قناعت کر رہے ہیں جی رہے ہیں
ہمارے پاس ذکر رفتگاں رکھا ہوا ہے

اسی کی کھوج میں طے ہو چکی ہے دھوپ ساری
وہ اک سایہ جو زیر سائباں رکھا ہوا ہے

ابھی دل میں ہے اس پچھلے سفر کی یاد باقی
نگاہوں میں غبار کارواں رکھا ہوا ہے

میری پہچان کیوں اس سے الگ ہوتی نہیں ہے
میرے شعلے میں یہ کس نے دھواں رکھا ہوا ہے

شمارہ ۲۷۰
جولائی ۲۰۰۳

(ظفر اقبال اور کاوش بدری کی نذر)

آئینے میں دیکھا ہے چہرہ تو نہیں سب کچھ
دیکھا ہے مگر ہم نے دیکھا تو نہیں سب کچھ

تم نے بھی چھپایا ہے ہم سے کئی باتوں کو
ہم نے بھی تمھیں خط میں لکھا تو نہیں سب کچھ

تھوڑا سا بچایا ہے بارش میں جو کام آئے
قربان فقط تجھ پر کرنا تو نہیں سب کچھ

اک یاد تمھاری ہی دیکھی ہے مگر کم کم
گھنگھور اندھیرے میں چمکا تو نہیں سب کچھ

خود آ کے ملا آخر ذخار سمندر میں
پانی نے بھی سوچا ہے دریا تو نہیں سب کچھ

اوروں کے بھی قصے ہیں اوروں کی بھی باتیں ہیں
اس اپنی کہانی میں اپنا تو نہیں سب کچھ

یاسمین حمید

شمارہ۲۶۸،
مئی ۲۰۰۳

بانجھ عورت اور بانجھ رشتے کے دکھ کی طرح
لوگ خاموش ہو گئے
اپنی اپنی قسمتوں سے صلح کرنے والے
جبر کو تسلیم کر کے
نمک کی کانوں میں گم ہوئے
اور خود کو دیواریں چاٹنے کے کام پر معمور کر لیا

اے تنکوں سے بھری ہوئی ہوا!
تیرے رستے میں آج کوئی آنکھیں نہیں
جنھیں تو زخمی کر سکے
اے کیچڑ سے بھرے ہوئے پانی!
آج کسی کو پیاس نہیں
اکڑی ہوئی زبان پہ جمے ہوئے لفظ
حلقوم کی دلدل میں معدوم ہو چکے
اے دھوپ کی شدت سے جلے ہوئے موسم!
برف روح تک اتر چکی

ہم سے کسی نے کہا کہ ہم خوشیوں بھرے گیت لکھیں
ان پیروں کے لیے
جنھیں ابھی رقص کرنا ہے۔

زندگی کا جبر
ٹھہر ٹھہر کر نازل ہو گا
ساری دنیا کو یک مشت نہیں اداس ہونا چاہیے
تاریخ کی رنگارنگی کو برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے

ہمارے عہد کی تاریخ
ہمارے دل کی تاریخ سے مختلف ہے
ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے
ہمارے بچوں کی حقارت ہمیں بتائے گی
کہ ہمارا نام کس زمانے میں درج ہوا۔

یوگ راج

شمارہ ۱۵،
اگست ۱۹۷۰

پچھلے دنوں "ذہن جدید" کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی کے چھوٹے سے مگر خوبصورت ہال میں ایک یادگار مباحثہ ہوا۔ اس مباحثے کی ہندوستان گیر اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مباحثے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے بیس پچیس ادیب اور بہت سے مقامی ادیب حضرات نے شرکت کی اور یہ سب حضرات مختلف خیالات اور نظریات کو ماننے والے تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ اکثر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ جس بات نے اس سیمینار کو ہندوستان گیر حیثیت اور شہرت دی وہ تھی ان سب مختلف الرائے ادیبوں کا یک جا اکٹھا ہونا اور کھلے دل سے بلا کسی طرح کی جھجک کے اپنے خیالات کا اظہار کرنا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی مثال میں نہیں ملتی کہ اتنے زیادہ لوگ الگ الگ عقائد رکھتے ہوئے ایک جگہ پر یا ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے ہوں اور انھوں نے اس طرح تفصیل سے اپنی اپنی بات کہی ہو۔ جو بھی بولا وہ اپنے دل کی بولا اور پورے بھروسے سے بولا۔ اسی لئے اس مباحثے کو کسی ایک گروپ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سیمینار ہر ادبی حلقے میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہر شخص لمذا کرے کا جائزہ اپنے عقائد کی روشنی میں لیتا ہے اور اسے اپنے ہی ڈھنگ سے پیش کرتا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میری کوشش یہی ہے کہ اس بحث کو غیر جانب داری کے ساتھ مختصر اور جامع شکل میں شائقین ادب کو پیش کروں۔ خود نتیجے اخذ کرنے کی بجائے لوگوں پر چھوڑ دوں، وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نتیجے نکالیں۔

وہ اٹھائیس مارچ کی شام تھی۔ موسم خوشگوار تھا، بستی نظام الدین میں نئی طرز کی خوب صورت عمارت غالب اکیڈمی کے ہال میں خوب چہل پہل تھی۔ پلیٹ فارم پر بھی ادیب حضرات تھے اور سامعین بھی ادیب ہی لوگ تھے۔ ہال قریب قریب بھرا ہوا تھا۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دلی کی گرمی اور لمبے لمبے فاصلوں پر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جناب زبیر رضوی نے اس سیمینار کے لئے جناب خلیل الرحمن اعظمی کے نام کا بطور صدر اعلان کیا جس کی تائید میں بہت سی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔ اعظمی صاحب نے تالیوں کے شور میں مسند صدارت سنبھال لی اور مختصر سی تقریر کے بعد سیمینار کی کاروائی شروع ہو گئی۔ زبیر صاحب نے "ذہن جدید" کا تعارف مختصر الفاظ میں کرانے کے بعد بلراج کومل صاحب کو مقالہ پڑھنے کے لئے کہا۔

بلراج کومل صاحب نے اپنا مضمون پڑھنے سے پہلے اس بات کی معافی مانگی لی کہ یہ کوئی لمبا چوڑا مضمون نہیں ہے، جدید ادب کے بارے میں کچھ خیالات ہیں جو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے سامنے آتے ہیں اور جن کے بارے میں تمام نقادوں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

بلراج کومل صاحب کے مضمون کا عنوان "کیا ہم محفوظ ہیں؟" تھا، اور ان کے اس مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ جدید کا وہ مفہوم جو ادب کے واسطے سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے Thomas Mann کے الفاظ میں درمیانہ طبقہ کے مہذب مفروضوں سے آزاد ہونے کا ہے، ہر راز کو فاش کرنے کا ہے، معزز شہری کے دعووں کو باطل ثابت کرنے کا ہے، اشتہاری سیاست اور اشتہاری پروگراموں کی نقاب کشائی کا ہے، مردہ الفاظ، بے کار اسالیب، فرسودہ عقائد اور کرم خوردہ روایات کو دریا برد کرنے کا ہے۔

انسان کی ذاتی اور سماجی زندگی ان گنت زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس غلامی سے آزادی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کے ذہن کی سیکڑوں تہیں ہیں اور ان میں لاتعداد عمل اور رد عمل پرورش پا رہے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ وجود کیا ہے؟ ان سب سوالات کا صرف ایک طے شدہ جواب نہیں۔ ان گنت جواب ہیں۔ جدید وہ ہے جو آسان جواب کی بجائے مشکل لیکن اپنا جواب تلاش کرنا چاہتا ہے۔

بلراج کومل صاحب اپنا مضمون پڑھ چکے تو خلیل صاحب نے اس مقالے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس مقالے پر بحث ہو جائے، اس کے بعد دوسرا مقالہ پڑھا جائے گا۔ اس مقالے میں جن مسائل کو اٹھایا گیا ہے ان کی جزئیات کے سلسلے میں جن کو اختلاف ہو یا ان مسائل کے بارے میں جنھوں نے الگ سے سوچا ہو، ہم ان کا استقبال کرتے ہیں۔"

زاہدہ زیدی: میں چاہتی نہیں تھی کہ اس بحث کا آغاز میں ہی کروں۔ مجھے اس سلسلے میں زیادہ عرض بھی نہیں کرنا، لیکن اس مقالے سے جو باتیں پیدا ہوئی ہیں ان پر روشنی ڈالنا یا کچھ سوال اٹھانا چاہتی ہوں۔ میرے خیال میں بلراج کومل صاحب نے کافی پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو بڑے سلجھے ہوئے انداز سے پیش تو ضرور کیا لیکن اس سلسلے میں چند ایک مثالوں کی بنا پر پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر، آپ کہتے ہیں کہ انسان خدا کی ذات میں گم ہونا نہیں چاہتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صرف آپ کی رائے ہو۔ اسے ایک عام رائے کی طرح سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انسان خدا بننا چاہتا ہے، وہ خدا کی ذات میں گم نہیں ہونا چاہتا۔ اگر چہ مجھے کچھ شوق نہیں، مگر میں کامیو (Camus) کے ایک بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں جس میں وہ کہتا ہے کہ خدا کی وحدت کو تسلیم کر لینے سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو ہر گناہ کی سزا ملتی ہے۔ اور اگر وہ خدا کو نہیں مانتا تو سزا کا خوف بھی نہیں رہتا۔ لیکن خدا کی ذات تحفظ کا احساس بھی پیدا کرتی ہے۔ اب اگر انسان کے سامنے ان دونوں حالتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی آزادی ہو تو وہ سزا کی اذیت کے باوجود خدا کی وحدت اور اس کی ذات کا انتخاب کرے گا۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر سکیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص کامیو کے خیالات سے اتفاق کرے۔ دراصل آج کا انسان بھی شاید خدا کی ذات میں گم ہونا چاہتا ہے۔ خدا میں یقین رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف راستوں کی تلاش میں ہے۔ دوسرے، آپ نے کہا کہ انسان خدا بننا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں جب یہ منزل آتی ہے کہ انسان خدا بننے کا جذبہ یا صلاحیت رکھتا ہو تو پھر اسے غیر محفوظ ہونے کا خوف یا کسی کی راہبری کی ضرورت نہیں رہتی۔ دراصل یہ مسئلہ ان لوگوں کے لئے پیدا ہوتا ہے جو خدا کی موجودگی کا احساس کرتے ہیں لیکن خدا بننے کا جذبہ یا صلاحیت نہیں رکھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی ایک ذاتی خیال ہے اور اس قسم کے مسئلوں پر مختلف خیالات ہو سکتے ہیں۔ آپ اگر مغربی ادب یا اپنے جدید ادب کا مطالعہ کریں تو اس کے اندر جو ضد یا غیر محفوظ ہونے کا احساس ملتا ہے تو اس کے پیچھے بھی جو مسئلہ ہے وہ بھی یہ ہے کہ انسان اگر چہ خود کو کسی چیز میں گم کرنا چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا۔ اپنی آزادی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرے گا تو اسے خود خدا بننا پڑے گا۔ چاہے وہ بہت ہی معمولی چیزوں کا خدا ہو جائے۔ اسے اپنی دنیا خود ہی تخلیق کرنا پڑے گی۔ یہ بھی ایک رائے ہے۔ ہوسکتا ہے آپ لوگوں کی رائے اس سے زیادہ گہری صاف اور جامع ہو۔

ایک بات آپ نے جدیدیت کی پہچان کی اٹھائی ہے۔ آج کا انسان آسان حل تلاش نہیں کرتا بلکہ مشکل جواب ڈھونڈتا ہے لیکن جوابات اس کے اپنے ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس پہ بھی بہت سی رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس پہ یوں بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے کہ مسئلہ صرف جواب ڈھونڈنے کا نہیں بلکہ سوالات اٹھانے کا ہے۔ پھر آپ نے جدید ادب کی بات کہی۔ میرے خیال میں آپ اردو کے جدید ادب کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ بہت سی باتیں جو آپ نے کہیں وہ آپ کی ذاتی رائے ہو سکتی ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہ دعووں کا طمع چاک کرتا ہے۔ درمیانہ طبقے اور بورژوا طبقے کا اخلاق، اور بہت سی چیزیں آپ نے کہیں۔ یہ بھی کہا کہ آج کا جدید ادب حقیقت پسند ہے۔ میرے خیال میں بلراج صاحب کا سارا بیان وضاحت طلب ہے۔ کیوں کہ میرے دماغ میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں۔ کیا واقعی ہی آج کا جدید ادب یا جدید شاعری، جس شاعری پہ جدیدیت کا لیبل لگا دیا گیا ہے وہ پوری شاعری حقیقت پسندانہ ہے؟ کیا یہ شاعری ان تمام مسائل کو چھیڑتی ہے؟ کیا واقعی میں جدید ادب یا جدید شاعری زندگی کا بالکل نیا تصور پیش کرتی ہے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری سمجھ قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن جب میں کافکا (Kafka) یا بیکیٹ (Becket) کو پڑھتی ہوں، سارتر (Sartre) یا بہت سے دوسرے مغربی ادیبوں کو پڑھتی ہوں تو میں فوراً سمجھ جاتی ہوں۔ لیکن جب شمس الرحمن فاروقی صاحب کے ''نئے نام'' پڑھتی ہوں تو اس میں جتنے نام الف سے شروع ہوتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتے، مثلاً افتخار جالب وغیرہ۔ ہوسکتا ہے یہ ادیب حضرات کافکا، کامیو اور بیکیٹ وغیرہ سے زیادہ گہرائی میں گئے ہوں۔

محمد علوی: شاعری تو آپ اردو میں کرتی ہیں نہ۔

زاہدہ زیدی: ہاں اتفاق سے۔ اردو زبان ہی میری مادری زبان ہے، اردو اور ہندوستان کی زندگی سے میرا بہت گہرا تعلق ہے۔ لیکن پھر بھی ایسا اتفاق ہے جب میں اس شاعری کو پڑھتی ہوں تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

رفعت سروش: آپ بیچ میں مت بولئے۔

خلیل صاحب: میری آپ سب لوگوں سے گذارش ہے کہ آپ ذرا اختصار سے کام لیں کیوں کہ ابھی ایک مقالہ اور پڑھا جانا ہے۔

عابد رضا بیدار: دوستو ابھی زاہدہ زیدی نے جو کچھ کہا اس کے پہلے حصے میں تو انھوں نے بہت سے سوالات اٹھائے جس پہ ہمارے بہت سے دوست ناراض بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن بہت سی باتیں تشنہ رہ گئیں۔ مقالے اور تقریر کے بعد جو تین باتیں سامنے آتی ہیں وہ ہیں، غیر محفوظیت، خلا، اور تنہائی۔ یہ تین باتیں تو بالکل صاف ہیں۔ اس وقت جدیدیت کے سلسلے میں جو تمام موضوعات ہیں ان کو بڑی حد تک ان تین موضوعات میں گھیرا جا سکتا ہے۔ یا دو ایک قریب کے اور موضوعات بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ بلراج کومل صاحب نے ایک اور بات بڑی دلچسپ کہی لیکن اس کو وہ آگے نہیں بڑھا پائے یعنی حقیقت کا ایک نام ویت نام بھی ہوتا ہے۔ چیکوسلوا کیہ بھی ہوتا ہے۔ اور احمد آباد بھی ہوتا ہے۔ بلراج کومل صاحب جدیدیت کے منکر ہیں، انھوں نے اپنے مقالے میں ایک اور بات اہم کہی۔ انسان کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اور یہ سب کچھ کیا ہے؟ اس کا کوئی طے شدہ جواب نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں حقیقت کا نام ویت نام ہے، چیکوسلوا کیہ ہے، احمد آباد ہے، اس میں ایک اضافہ کر لیں اور وہ ہے اردو زبان کی Recognition کا مسئلہ۔ ہم اردو کے ادیب ہیں۔ اردو کا مسئلہ ہر ایک کے ذہن میں ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اردو کو Recognition کیوں نہیں ملتا۔ اگر اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تو پھر جدیدیت یا ترقی پسندی کتنے دن چلنے والی ہے؟

محمد علوی: جہاں تک میں جدید ادب کو سمجھتا ہوں، جدید ادب سوالوں کا جواب نہیں بلکہ سوالوں کا مجموعہ ہے۔ اس لئے کہ سوال کی جو اہمیت ہے وہ جوابوں کی نہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے مجھ سے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ روپئے میں پیسے کتنے ہوتے ہیں تو میں چونسٹھ پیسے کہتا تھا۔ لیکن آج مجھ سے جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو میں ایک روپئے کے سو پیسے بتاتا ہوں۔ جواب ہمیشہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے لیکن سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ دوسری بات جو کول صاحب نے کہی کہ انسان خدا ہونا چاہتا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو خدا میں گم ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں آگے چل کر یہ دونوں فعل ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انھوں نے کوئی مثال نہیں دی کہ جدید ادب میں کہیں بھی کسی بھی شاعر نے اس بات کا ذکر کیا ہو کہ انسان خدا میں جذب ہونا چاہتا ہے۔ میں تو جہاں تک جدید ادب کو سمجھا ہوں، انسان اپنی کھوج میں نکلا ہے اور یہ بہت اچھا قدم ہے۔ ادب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود کو کیا پاتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی: میرا ارادہ ہے کہ بحث کو صحیح مرکز پر لاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اب تک جو مسائل کول صاحب نے اپنے مقالے میں اٹھائے ہیں ان پر باقاعدہ گفتگو نہیں ہو سکی۔ اس مباحثے کا موضوع جدید شاعری ہے یا جدید شاعری کا ابہام؟ جدید شاعری کیا ہے؟ یہ ابہام کیوں ہے؟ کیوں نہیں ہے؟ ان پر میں کچھ نہ کہوں گا حالانکہ ظاہر ہے کہنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن میں چاہتا یہ ہوں کہ کول صاحب کی آخری اور سب سے اہم بات جو ان کے اس مقالے کا حاصل ہے، اس کے بارے میں کچھ کہوں۔ کول صاحب نے یہ کہا تھا کہ جدید رویہ یہ ہے کہ سوالوں کے آسان حل نہ ڈھونڈنے چاہئیں بلکہ مشکل حل تلاش کئے جائیں اور وہ حل اپنے ہوں۔ اس کو ذرا پھیلایئے تو بات یہ نکلتی ہے کہ شاعر یا ادیب کا اس کے معاشرے سے کیا رشتہ ہے؟ یہ سوال اصل میں تمام سوالوں کا سوال ہے۔ جس کی طرف انھوں نے غالباً اشارہ کیا کہ ادیب کا، کسی بھی Creative Artist کا، اس کے معاشرے سے کیا رشتہ ہے؟ مثلاً معاشرہ یہ کہتا ہے کہ خدا ہے تو ادیب بھی کہے کہ خدا ہے... معاشرہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، تو ادیب بھی کہے کہ خدا ایک ہے یا انکار کرے تو... اس طرح جتنے بھی انسان کے وجود سے منسلک سوالات ہیں ان سب کے بارے میں ایک ادیب کیا سوچے اور کیا کہے؟ کیا وہ معاشرے کے لائے ہوئے اصولوں، مسلط کئے ہوئے قوانین کو مان لے، یا نہ مانے؟ ہمارے عہد میں اس مسئلے کی ایک اور نوعیت بھی پیدا ہو گئی ہے، وہ یہ کہ ادیب کا رشتہ مستقل بنیادوں پر قائم پورے سماج سے کیا ہو؟ اسے اسٹیبلشمنٹ بھی کہتے ہیں۔ ہمارے عہد کے عملے (یعنی اسٹیبلشمنٹ) کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سمٹ کر بہت ہی مختصر اور قطعی طور پر محدود ہو گیا ہے۔ اس لئے اس مسئلے کی نوعیت بدل گئی ہے۔ پہلے یہ اسٹیبلشمنٹ بہت ہی بے شکل سا ہوتا تھا جس میں کافی گنجائش ہوتی تھی۔ ادیب بحیثیت ادیب اسٹیبلشمنٹ میں تصور کر لئے جاتے تھے۔ پھر بھی، اسٹیبلشمنٹ میں گھسنے کی خواہش، اس کا ایک حصہ بن جانے کی آرزو، یہ انسان کی فطری خواہش ہے۔ اس سے نہ تو میں بچ سکتا ہوں اور نہ ہی آپ۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو غالباً آپ انکسار سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے عہد میں ادیب کے سامنے یہ مسئلہ ہے: کیا وہ اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو جائے، اس کی جی حضوری کرے، یا اس سے بغاوت کرے؟ اگر بغاوت کرے تو کس حد تک؟ لمبے بال رکھے، الٹے سیدھے کپڑے پہنے، L.S.D. کے ٹرپ پر جائے، لکھنا پڑھنا چھوڑ دے، شادی کرے، یا نہ کرے، یا بہت سی شادیاں کر لے؟ وہ مکمل طور پر خود کو کس طرح ظاہر کرے؟ وہ اگر اسٹیبلشمنٹ سے بغاوت کر رہا ہے تو کس حد تک؟ اگر نہیں کرتا تو کیوں نہیں کرتا، کہاں تک نہیں کرتا؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو سوال آپ نے اٹھائے ہیں کہ ادیب کا جدید رویہ یہ ہے کہ وہ آسان جواب نہیں ڈھونڈتا۔ آسان جواب یہ ہے کہ میں عملے کا حصہ بن جاؤں۔ جو کہا جائے اس کو مان لوں۔ اس کی تبلیغ بھی کروں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر یہ آسان جواب ہے، ممکن ہے کہ نہ ہو، لیکن فرض کر لیجئے آسان جواب یہی ہے تو کول صاحب کے مقالے کے مطابق نئے ادیب کا فرض یا اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ آسان جوابات کو مسترد کر دے۔ اس سلسلے میں ذرا تاریخ کے اوراق پلٹئے تو عرفی کا نام یاد آتا ہے۔ جس دربار سے عرفی منسلک ہونے کی کوشش کرتا تھا، جہانگیر کے دربار سے، اس میں کس قدر پیچیدگیاں، عداوتیں، ایک طرح سے سخت قسم کے مقابلے تھے۔ اکبر کے ہاں بڑے بڑے شاعر و دانشور ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ جمع تھے۔ ان سے عرفی کی عداوت، ان سے جھگڑے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جھگڑوں سے عرفی بھی پوری طرح رنگا ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسے صرف اس لئے زہر دے دیا گیا تھا کہ وہ جہانگیر پر عاشق تھا۔ گویا وہ اس حد تک دربار کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ تو کیا عرفی کی شاعری اس بنا پر ہمارے لئے مشکوک ہے؟ اسٹیبلشمنٹ میں داخل ہونے یا کود پڑنے کی پوری کوشش کے باوجود کیا ہم عرفی کو شاعر نہیں مانیں گے؟

ہوتا کیا ہے کہ ادیب جب شروعات کرتا ہے تو باہری سا آدمی ہوتا ہے۔ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے اپنے ڈھنگ سے، جو غالباً اور لوگ نہیں کہہ رہے ہوتے، تو وہ تنہا محسوس کرتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا کا آدمی ہے۔ شروع شروع میں یا کچھ دنوں تک جب لوگ اسے پہچانتے نہیں ہیں تو اس کا فرسٹریشن بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کو شہرت اور وقعت مل جاتی ہے تو چاہے وہ کامیو ہو یا ہم آپ ہوں، جب اس کو پیسے ملنے لگتے ہیں، کتابوں کا معاوضہ ملنے لگتا ہے، انعام ملنے لگتے ہیں تو وہ اسٹیبلشمنٹ کا فرد بن جاتا ہے۔ بنیادی کشمکش یہ ہوتی ہے کہ جو ادیب اخلاقاً Nonconformist ہوتا ہے وہ اپنے پیشے، حرکتوں اور افعال کے اعتبار سے اسٹیبلشمنٹ کی جانب کشاں کشاں چلتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی جانب چلنا لامحالہ ہو گیا ہے۔ بیکیٹ بھی چل رہا ہے نوبل پرائز سے بڑھ کے اور کیا انعام ہوگا؟ تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ جتنے بھی ادیب نوبل پرائز یافتہ ہیں وہ سب پرل بک (Pearl Buck) کے درجے کے ادیب ہیں، سب [illegible] ہیں یا ہم یہ سمجھیں کہ اگر کوئی ادیب لمبے بال نہیں رکھتا، وہ L.S.D. کے ٹرپ پر بھی نہیں جاتا، تو کیا وہ اسٹیبلشمنٹ کا فرد ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا تعلق اس سے کوئی بہت زیادہ گہرا نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا لباس پہنتا ہے، کس قسم کا کھانا کھاتا ہے، کس قسم کے مکان میں رہتا ہے۔ اور

وہ جوان افعال میں گرفتار ہے جن کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے... ہماری کچھ روایت ایسی ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے شاعری کر دے تو اس سے ہماری سب توقعات اٹھ جاتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس پر غور کریں کہ اسٹیبلشمنٹ کا رکن بننے کے کیا معنی ہیں، کیا آسان سوال مسترد کر دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کے خلاف سڑکوں پہ ہم جھنڈے لے کر کھڑے ہو جائیں، یا یہ کہ ہم بہت ہی گھٹیا درجے کی زندگی گذاریں تب ہی ہم خود کو اسٹیبلشمنٹ کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔

عملے کے خلاف ہونا تو آپ کا انٹلکچوئل نظریہ ہے جس کا ادیب کے ظاہری حالات سے رشتہ گہرا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کوئی ادیب بہت ہی گھٹیا درجے کی زندگی گذارتا ہو اور اپنے ادب میں بہت گھٹیا ہو۔ اور کوئی ادیب بہتر زندگی گذارتے ہوئے اعلیٰ ادب تخلیق کرے۔ تو میرا خیال ہے کہ بلراج کومل صاحب نے اپنے مقالے میں عدم تحفظ، تنہائی، اور خلا کی باتیں شروع میں کہی ہیں ان میں زیادہ جانے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر انھوں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ آسان جواب ڈھونڈنا غلط ہے۔ اب مجھے پوچھنا یہ ہے کہ آسان جواب ڈھونڈنے سے کیا مراد ہے؟

حسن نعیم: جناب صدر اور حاضرین، جو باتیں بلراج کومل صاحب نے کہی ہیں وہ اس قدر پیچیدہ نہیں تھیں کہ اس قدر لمبی تقریر کی جائے۔ آسان سوال اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی سیاسی جماعت، کسی ادبی جماعت، یا کسی بھی طور کے اسٹیبلشمنٹ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں تو جو فیصلے اجتماعی طور پر ہوتے ہیں، وہ آپ کو تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔ اگر تسلیم نہ کریں تو آپ بغاوت کرتے ہیں اور یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلنے کے بعد کسی دباؤ کی بنیاد پر اپنے سوچنے سمجھنے کی مشین یعنی دماغ کو بند کر دیتے ہیں۔ یہی ان کا بنیادی جواب ہے۔ اس کو ذرا تفصیل سے بتاؤں گا کیوں کہ فاروقی صاحب نے کچھ صحیح سوال اٹھائے ہیں۔ وہ یہ کہ پہلے تو شاعر ادیب یا دانشور کی سماج میں جو حیثیت تھی وہ قصیدہ نگاری یا ذاتی تعلقات کی بنا پر ہوتی تھی۔ اس طرح وہ درباروں میں پہنچتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کتابیں چھپتی ہیں۔ پریس ہے۔ دانشور فکر کی سماج میں ایک حیثیت ہوگئی ہے۔ وہ چاہے ہندوستان کا ادیب ہو چاہے روس یا امریکہ کا۔ میں یہاں مثال دوں گا Viva Zapata کی جس کی فلم بھی بنی تھی۔ وہ آدمی جو اپنی زندگی ایک انقلابی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے، حاکم وقت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، بہت سے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، لمبی جدوجہد کے بعد جب وہ خود طاقت حاصل کر لیتا ہے تو اس کا رویہ انھیں سوالوں کے بارے میں بدل جاتا ہے جو اس نے خود اٹھائے تھے جن کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان میں بھی جدیدیت کی تحریک چلائی گئی۔ اس کا رجحان پیدا ہوا تو کچھ سوالات اٹھائے گئے جو صحیح تھے لیکن جن لوگوں نے یہ سوالات اٹھائے آج وہ خود اس اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن چکے ہیں جو انھوں نے خود تخلیق کیا ہے۔

زاہدہ زیدی: فاروقی صاحب نے مسئلے کو ایسا انٹلکچوئل رنگ دے دیا ہے کہ اس میں زبردست الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کیا ہے؟ اگر حکومت، آل انڈیا ریڈیو، اسٹیبلشمنٹ ہے، اگر ساہتیہ اکادمی اسٹیبلشمنٹ ہے، نوبل پرائز اسٹیبلشمنٹ ہے، تو ایک چھوٹا سا اسٹیبلشمنٹ شمس الرحمن فاروقی بھی ہیں۔ ذہنی طور پر اسٹیبلشمنٹ کو برا کہہ لینا ہی کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ تخلیق کیا کر رہے ہیں؟ جو شخص بڑی تخلیق کرتا ہے وہ خود آخر میں اسٹیبلشمنٹ بن جاتا ہے۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ میں نے جیسا پہلے بھی کہا تھا کہ جو انسان خدا بننے کا جذبہ یا صلاحیت رکھتا ہے وہ خود اپنی دنیا تلاش کر لیتا ہے۔ اپنی قدریں بنا لیتا ہے۔

قاضی سلیم: اس مباحثے کا عنوان تھا "جدید اردو ادب یا جدید شاعری"۔ اس لحاظ سے جو بنیادی سوال جدید شاعری اور زندگی سے تعلق رکھنے والے تھے وہ صرف اتنے ہیں کہ شاعری کا عمل کیا ہے؟ ہم سماج میں رہتے ہیں، ادیب بھی سماج میں رہتا ہے، شاعر بھی سماج میں رہتا ہے تو اس کی تخلیقات کس طرح سماج کو متاثر کریں گی، ادیب کا کیا Contribuiton ہوگا؟ وہ سماج میں کس طرح رہتا ہے، کیا پہنتا ہے، کیسے بال رکھتا ہے، کیا کھاتا ہے، یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم نے اپنے اوپر ذمہ داری لے لی تو سب سے پہلے یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس پر آپ نے سوالیہ نشان بنا دیا۔ ہم اپنے طور پر سوچیں گے کہ اس کائنات سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟ اس سماج میں رہنے سے ہماری کیا اچھائی برائی ہے؟ ہم اپنے عہد کے لحاظ سے ان سوالوں کا جواب دیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم حقیقت پسند ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ترقی پسند بھی کہتے تھے لیکن ان کی حقیقت پسندی در اصل یک رخی تھی۔ آج زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ آپ دیکھیں نیوٹن کے کلیات اور آئن سٹائن کے نظریات میں کس قدر پیچیدگی آگئی ہے۔ فرائڈ اور یونگ کی فلاسفی میں نفسیات میں کتنی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، وہ سچائی جو یک رخی سچائی تھی آج ان گنت رخوں والی سچائی ہوگئی ہے۔ یہ تہ در تہ سچائی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جدید شاعر زیادہ حقیقت پسند ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام تہوں کے ساتھ وہ اپنے عہد کے مزاج کو سمجھ کر اس کا جواب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی بات ایک شاعری کو دوسری شاعری سے بلند کرتی ہے، ایک کو پرانی اور دوسری کو نئی شاعری قرار دیتی ہے۔

بلراج مین را: جدیدیت اور اسٹیبلشمنٹ کے سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہوں گا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس زبان سے کسی ادیب کو روٹی نہ مل سکے، اس زبان کے ادیب ظاہر ہے اسٹیبلشمنٹ سے روٹی حاصل کریں گے۔ صرف لکھ کر نہیں، دوسرے کام حاصل کر کے دوسری ملازمتیں، جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بحیثیت ادیب جو سوالات ان کے ذہن میں اٹھتے ہیں اور ان کے جوابات جو موجود ہوتے ہیں کہیں ہم اس روٹی کھانے کے چکر میں ایسے جوابات کو یا اس عمل کو جو ہمارے اپنے عمل ہیں ان کو چھپاتے تو نہیں؟ مثلاً ہمارے اس سماج میں جغرافیائی حدود میں جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں وہاں ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ یعنی آپ ملازمت کرتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں جو کامگاروں کی سرگرمیاں ہیں اور جو عملے کے خلاف ہیں اور سوشل

تبدیلی کا ایک بہت بڑا آرگن ہوتی ہیں۔ آپ کہیں اس عملے کا حصہ بننے کے ساتھ ساتھ ٹریڈ یونین کو سبوتاژ تو نہیں کرتے، ایک آدمی کی حیثیت سے ایک ادیب کی حیثیت سے؟

دیوندر اسر: ایک زمانہ ہوا ایک مضمون کا بڑا تذکرہ تھا۔ میں نے بدقسمتی سے وہ مضمون نہیں پڑھا، لیکن اس کا عنوان تھا ''نئی شاعری سامراج کی سازش''۔ میں نہیں کہہ سکتا اس مضمون میں نئی شاعری کے حق میں تھا یا خلاف۔ میں خود کو کسی زمانے میں ضرور جدید سمجھتا تھا لیکن اب جو باتیں سننے میں آئیں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی ایک بہت بڑی سازش ہے آدمی کو اس پورے سماج سے الگ کرنے کی۔ ان الفاظ میں جو بار بار دہرائے گئے ہیں، علیحدگی، دہشت، خوف، تنہائی، ہے۔ اجنبی پن ہے۔ آخر یہ سب کس لئے؟ کہا جاتا ہے کہ صاحب ہم تو اپنی ذات سے بھی الگ ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جتنا بڑا سماجی عمل اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ جو سوالات پیش کر رہا ہے اس کا ہم سامنا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ حقیقت کی بات کہی گئی ہے۔ ایک بات ہے، جس کا تعلق ایک خاص دور سے ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک خاص بنیادی عمل ہوتا ہے۔ جہاں تک بنیادی عمل کا تعلق ہے جو سوالات بلراج کومل صاحب نے اٹھائے ہیں ان میں سے کوئی سوال ایسا نہیں جو جدید یا نیا ہو۔ پہلی بات آزادی کا سوال۔ میرا خیال ہے یہ سوال تو باغ عدن میں بھی آدمی نے اٹھایا تھا۔ پر ومیتھیوس (Prometheus) نے جو کئی سال پہلے تحریر لکھی تھی اس کے سامنے بھی آزادی کا سوال تھا۔ وہ جو علیحدہ ہو گیا ہے اپنے دیوتاؤں کی دنیا سے اور ایک اجنبی چٹان سے اس کو باندھ دیا گیا ہے وہ ایک عمل تھا۔ وہی عمل آج ہمارے پاس کیوں نہیں ہے جبکہ وہ سارے الفاظ ہم آج بھی استعمال کر رہے ہیں؟ کسی نے نئے پن کے بارے میں سوال اٹھایا تھا۔ یہ نیا پن کیا ہے؟ آدمی خدا کے بارے میں سوچتا ہے۔ خدا کے بارے میں کب آدمی نے نہیں سوچا۔ انسان یا کائنات کے رشتے کے بارے میں کب آدمی نے نہیں سوچا؟ جو یہ کہتے ہیں کہ خدا مر گیا ہے تو یہ بہت پرانی بات ہے۔ آج تو چرچ میں بھی کچھ پادری ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا مر گیا ہے اور وہ چرچ بھی ابھی تک یہاں موجود ہے۔ دراصل یہ لوگ اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن گئے ہیں اور انھوں نے باغیانہ خیالات کے تیز دھارے کو کند کرنے کا ایک راستہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ انھیں باغیانہ الفاظ کو اپنا لو اور پھر ان الفاظ کو اس فلسفے کے سپرد کر دو۔ جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب اب کوئی راستہ نہیں... کیوں کوئی راستہ نہیں ہے؟ ٹھیک ہے، راستہ شاید نہ ہو لیکن راستے کی تلاش پہ آپ کو کیا اعتراض ہے۔ نہیں ملتا راستہ آپ کو تو آپ شہید ہو جائیے۔ خودکشی کر لیجئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ادیب کوئی دنیا سے دوسرے انسانوں سے الگ چیز نہیں ہے وہ بحیثیت انسان زندہ ہے۔ بحیثیت انسان وہ تمام فعل کرتا ہے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ کوئی جواب آخری نہیں ہوتا لیکن ایک جواب ضرور ہوتا ہے جو اپنے دور سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے پہلوؤں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جب ایک مکمل تحریک مکمل سماجی تبدیلی کا حصہ بن جائے تو ہم ضرور ان سوالوں کی حد سے ذرا آگے جاتے ہیں۔

بلراج کومل صاحب کے مقالے پر جن اصحاب نے جو جو کچھ کہنا تھا پوری تفصیل سے اپنی بات کو واضح کر کے کہا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ اسی طرح پوری بحث کا بھرپور تاثر سامعین پر پڑا۔ بہت سے اختلاف کے باوجود گرما گرمی تو تھی لیکن تلخی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے بعد کومل صاحب نے مختصراً الفاظ میں اسی پوری بحث کا جواب دیا۔ انھوں نے کہا۔

کومل: میرا مقالہ کوئی مکمل قسم کی تحریر نہیں ہے، جو تفصیلات آپ لوگوں نے پیش کی ہیں اگر میں پوری تفصیل کے ساتھ لکھتا تو بہت سی باتوں کو سمیٹ لیتا۔ محترمہ زاہدہ زیدی صاحبہ نے کہا کہ میرے مقالے میں ایک مخصوص رائے پیش کی گئی ہے۔ لیکن میں نے تو اس انسپریشن کا ذکر کیا ہے جو By and Large انسان کے اندر موجود ہے۔ میں نے کوئی مخصوص رائے نہیں پیش کی ہے صرف Pin point کر دیا ہے کہ جدید کیا ہے؟ اور یہ کوئی لعنت یا گالی نہیں ہے۔ پھر چند لوگوں نے کہا کہ جدید ادیبوں کی اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہ محض مفروضہ ہے اور بالکل غلط مفروضہ ہے۔ اس قسم کا اسٹیبلشمنٹ اردو جیسی محدود زبان میں نہ تو قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی موجود ہے۔ در اصل ہم سب لوگ اپنی اپنی ڈفلی بجاتے ہیں۔ ورنہ میرے مقالے میں وہ سب باتیں موجود ہیں جن کا مطالبہ کچھ معترضوں نے کیا ہے۔ میری تمام تر ہمدردیاں واضح طور پر اس مضمون میں تلاش اور جستجو کے عمل کے ساتھ ہیں۔

جناب محمود ہاشمی صاحب کے مضمون سے پہلے دن پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ اس وقفے میں اس سیمینار میں شریک سب حضرات کی چائے اور کھانے پینے کی چیزوں سے خاطر تواضع کی گئی۔ اس چائے نے لوگوں کو پھر سے تازہ دم کر دیا اور ہر شخص پھر سے آ کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور پھر محمود صاحب نے اپنا مضمون ''شاعری میں Commitment کا مسئلہ'' پڑھا جسے لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ محمود ہاشمی صاحب نے اپنے اس مضمون میں بڑی خوبی سے لفظ Commitment کی تاریخ بیان کی۔ یہ لفظ ادب میں کیسے آیا، کن لوگوں نے اسے سب سے پہلے استعمال کیا اور ان کا اس لفظ Commitment سے کیا مقصد تھا؟ چونکہ سارتر نے اس لفظ کو سب سے پہلے ادب کے لئے استعمال کیا تھا اس لئے محمود ہاشمی صاحب نے ان کی تحریروں سے حوالے دے کر اپنی بات کو واضح طریقے سے کہنے کی کوشش کی۔ اور حاضرین کے ذہنوں میں بہت سے سوالوں کو جگایا جن سے بحث کا آغاز ہوا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔

جگن ناتھ آزاد: صاحب صدر اور حضرات! جناب ہاشمی صاحب کے مقالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اچھی شاعری Commitment کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ شاعری میں Commitment کا ہونا شاعری کے اچھے یا معمولی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اگر آپ Commitment والی شاعری کی مثالیں ہی اعلیٰ پایہ کی نہ دیں تو اس سے ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ Commitment کی شاعری اعلیٰ پایہ کی شاعری نہیں ہوگی۔ ہمارے یہاں دو

بڑے شاعر ہیں۔ غالب اور اقبال۔ غالب کی شاعری Non-committed شاعری ہے اس کے ساتھ ہی اقبال کی جتنی بھی شاعری ہے وہ تمام Committed ہے۔ اقبال ہمارے دو بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ اچھی شاعری کا تعلق Commitment کے ساتھ ایسا نہیں ہے جتنا کہ شاعر کی ذات کے ساتھ ہے اور اس معجزے کے ساتھ ہے جس کو انکشاف ذات کا معجزہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ فکر کو جذبہ بنانے کا جو معجزہ ہے اس سے ہماری شاعری بڑی شاعری بنتی ہے۔ جن شاعروں نے اس عمل سے کام لیا ہے یا جنھوں نے دوسرے لفظوں میں فکر کو کامیابی کے ساتھ جذبہ بنالیا ہے ان ہی کی شاعری بڑی شاعری ہے۔

شمس الرحمن فاروقی: جناب عالی! مسئلہ صرف یہی تھا کہ شاعری Commitment کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس میں آزاد صاحب نے اتنا اور بڑھا دیا ہے کہ بڑی شاعری۔ میرا خیال ہے کہ مضمون نگار نے کہیں بڑی چھوٹی کی تشخیص نہیں کی بلکہ ایک بنیادی اصولی بات کہی ہے کہ ہر وہ چیز جسے آپ شاعری کے نام سے یاد کرسکتے ہیں، اس میں اگر Commitment داخل کریں گے تو شاعری ختم ہو جائے گی Genuine شاعری۔ لہٰذا بڑی چھوٹی نہ کہہ کر اصل شاعری کہا جائے۔ میں اسے یوں کہوں گا کہ Commitment شاعری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ Commitment میں سب سے بڑی خرابی یہ ہو جاتی ہے کہ اگر میں Committed ہو کر شعر پڑھتا ہوں تو اس میں دو صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔ ایک تو یہ کہ میں شعر میں خود کو ڈھونڈوں جو کچھ شعر میں لکھا ہوا ہے، کہاں تک میں اس میں پہنچتا ہوں۔ بلکہ وہ نہ ہو کر میں اس میں دیکھنے لگتا ہوں کہ جس چیز سے جن سیاسی، سوشل، یا حکیمانہ خیالات سے میں بندھا ہوا ہوں، وہ اس میں کہاں تک ہیں۔ چنانچہ بنیادی حیثیت سے جو پہلی ناکامی ہوئی وہ یہ ہے کہ شاعری سے سارے تقاضے ہی بدل جاتے ہیں، بحیثیت شاعر کے اور بحیثیت قاری کے بھی۔ کیوں کہ کوئی شاعر نہیں کہہ سکتا کہ میں صرف شاعر ہوں۔ شاعر ہی اپنے شعر کا پہلا قاری ہوتا ہے شاعر اور قاری دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ تو بحیثیت قاری کے میں اپنا شعر پڑھتا ہوں تو مجھ پر یہ کابوس طاری ہو جاتا ہے کہ جن فلسفوں یا سماجی بندھنوں سے میں بندھا ہوا ہوں وہ اس شاعری میں کہاں تک منعکس ہو رہے ہیں؟ اگر نہیں ہو رہے ہیں تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ شعر شعر نہیں ہے۔ دراصل اس طرح شاعری گڑ بڑا جاتی ہے۔ یعنی شاعری ایک عبوری تحریک کی طرح کی چیز ہوئی۔ اگر میں ذہن میں بیٹھے ہوئے عقیدوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو گویا میں ایک طرح سے ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہوں جو مجھ پر ظاہر ہو چکی ہیں۔ حالانکہ اصل شاعری نام ہوتی ہے ان چیزوں کے اظہار کا جو مجھ پر ظاہر نہیں ہیں۔ اس لئے کسی عقیدے سے بندھ جانے سے یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب میں شاعری کو پڑھتا ہوں یا جب شعر کہتا ہوں تو مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ کیا میں نے وہ چیزیں لکھ دی ہیں جو مجھ پر ظاہر نہیں تھیں؟ اور وہیں پر فوراً پیچھے ہٹنا شروع کر دیتا ہوں۔ محمود ہاشمی صاحب کے مضمون میں سب باتیں آگئیں لیکن ایک بات انھوں نے صاف نہیں کی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ Commitment کی تعریف کیوں کر کریں گے۔ یہ ہے کیا؟ فرض کیجئے مجھے اپنے بیوی بچوں سے محبت ہے، اپنے خاندان سے لگاؤ ہے۔ میں کسی ایک نام نسب کا قائل ہوں۔ اس محبت کی بنا پر خود کو بھی بہت بڑا آدمی سمجھتا ہوں تو کیا یہ بھی Commitment ہے یا کہ اس کے معنی صرف سوشل، حکیمانہ، یا اخلاقی بندھن ہوگا؟ یا یہ کہ Commitment کے معنی ہیں کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی ادارے سے بندھ جانا؟

مظہر امام: یہ کہنا کہ کسی طرح کے بندھن یا Commitment سے ہم لوگ بالکل آزاد ہیں یا اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے یا ہماری شاعری Commitment کی متحمل نہیں ہوسکتی، میرے خیال میں غلط ہے۔ شاعری اس طرح کے Commitment کی متحمل ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی، دونوں صورتوں میں اچھی شاعری ممکن ہے۔

انور عظیم: جناب صدر اور دوستو، میں ہر ایسی محفل میں جب شریک ہوتا ہوں جہاں جدید شاعری، جدید ادب، افسانہ نگاری، یا نثر سے متعلق مضامین پڑھے جاتے ہیں تو میں یہ توقع لے کر آتا ہوں کہ مقالہ نگار ہمیں Applied تنقید سے روشناس کرائے گا یعنی وہ اپنے یہاں کے ادب کو موضوع بنا کر اس کے تجزیے سے ہمیں بعض نقطے سمجھائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ترقی پسند تحریک سے جو روایت چلی تھی اور اب بھی جاری ہے یعنی غیر ملکی سند کا حوالہ دینے کی، اور ان حوالوں کی بنیاد پر مفتی کا رول ادا کرنے کی، وہی روایت بالکل اسی شکل میں جدید تنقید نگاروں کے ہاں بھی موجود ہے۔ جس کی بہت نمایاں اور تکلیف دہ مثال یہ مضمون ہے جو ابھی یہاں پڑھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ جدید نسل کے لکھنے والوں کو ان سے پہلے کی نسل جو ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے پروان چڑھی تھی وہ گم راہ تھی۔ اس لئے اس نے اچھا ادب نہیں پیدا کیا۔ تو جدید نسل نے بغاوت کا پرچم اٹھالیا۔ اب ان کو بھی پندرہ بیس سال ہو چکے ہیں۔ جب ان پندرہ بیس سال کی جد وجہد کے بعد ہم احتساب کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہی پرانی لکیر اب بھی پیٹی جارہی ہے۔ یہ کہنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس سے پہلے کے جو شاعر اور ادیب ترقی پسند تھے وہ Committed تھے، وہ مرچکے ہیں۔ یہ ہم پچھلے پندرہ سالوں سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن جو زندہ شاعر ہیں، ان کی مثالیں نمونے کی طور پر نہیں پیش کی گئیں۔ اس مضمون میں بھی اس کی بڑی حد تک کمی محسوس ہوتی ہے۔

عزیز قیسی: دوستو، میں اس لئے بے چین ہوں کہ جو باتیں میں کہنے جا رہا ہوں وہ کوئی دوسرا ساتھی نہ کہہ دے۔ میرے حساب سے Commitment یہ ایک ضروری برائی ہے انسانی سماج میں رہنے کی، اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ شاعر بھی اس میں آجاتا ہے وہ آدمی بھی ہے جو پاگل ہو گیا ہے راستے میں بیٹھا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ میں کوئی بات نہیں مانتا آپ کی، وہ بھی Commitment کی بدی سے آزاد نہیں۔ اس لئے کہ انسان کوئی مطلق ہستی نہیں ہے۔ کوئی مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ اور یہ اس کی فحش مجبوری ہے۔ ازلی اور ابدی محرومی ہو سکتی ہے۔ ازلی اور ابدی کامیابی بھی ہو سکتی ہے۔ تو یہ ہے Commitment۔ ہم جب کسی ادب یا

آرٹ کے تخلیق کرنے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں، ایک خاص وجدانی مجبوری کے تحت یا اپنی شعوری urges کے تحت... میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی یک رخی سچائی ہے کیوں کہ کسی فن کو تخلیق کرنے کا تاثر بھی نہ صرف باہر سے آتا ہے اور نہ صرف اندر سے...ہم رو رہے ہیں پورے انسانی سماج کو محسوس کرتے ہوئے اور خود کو محسوس کروانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے وجود کا اعتراف کروانا چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری سوچ سب تک پہنچے۔ لیکن ہماری مصیبت کیا ہے کہ ہم اکیلے کچھ نہیں ہیں۔ ہمارا تو ذریعہ ہی الفاظ ہیں۔ الفاظ ہم کہہ سکتے ہیں لیکن تاثر سننے والے کا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بلراج کومل صاحب کے مضمون پر ہوئی بحث پر کوئی صاحب کہہ رہے تھے کہ صاحب تنہائی، غیر محفوظ، اور خلا۔ اب یہ ہے کہ آپ ان کی درجہ بندی کیجئے۔ اصل میں کہاں کہاں ٹکراؤ ہے۔ کیا ٹکراؤ ہے؟ اب سے پہلے تو بنیادی ٹکراؤ ہے اس پوری دنیا سے، کائنات سے۔ اس کا ایک مسئلہ ہے، وجود کا عدم کا۔ کہاں سے آیا، کیوں آیا، کب جائے گا، کیوں جائے گا؟ کوئی حساب کتاب ہے کہ نہیں اس کے عمل کا؟

عمیق حنفی: حضرات، محمود ہاشمی کا مضمون Commitment کی ایک Theoretical بحث پیش کرتا ہے۔ یہ لفظ کب سے ادب میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کب اسے ایک اصولی حیثیت دی گئی تنقید میں اور یہ مانگ کی جانے لگی کہ Commitment ضروری ہے شاعری کے لئے یا غیر ضروری ہے۔ اس کی ایک نظریاتی بحث اس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بار سارتر نے لفظ Commitment استعمال کیا تھا تو اس کا اس سے کیا مقصد تھا، سارتر Commitment اور شاعری کے تعلقات کو کیا سمجھتا تھا؟ لہٰذا اس میں کوئی جرم نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون میں سارتر کے حوالے پیش کیے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ سارتر کا مقصد کیا تھا۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھی اپنی تقریر میں کہا تھا کہ محض کوئی لیبل لگا دینے سے شاعری اچھی یا بری نہیں ہو جاتی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ فیض اس لئے اچھے شاعر نہیں کہ وہ ترقی پسند ہیں۔ فیض اچھے شاعر ہیں۔ اب وہ اچھے ترقی پسند ہوں یا نہ، یہ ایک دوسری بات ہے اور یہ غیر شاعرانہ اور غیر ادبی بحث ہے۔ انور عظیم اچھے افسانے لکھتے ہیں تو اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ وہ صرف افسانے اچھے لکھتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جس کو لکھنے کی، الفاظ کو صحیح طور پہ استعمال کرنے کی، یا اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے شعور کو ظاہر کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو، وہ چاہے جدید شاعر ہو چاہے ترقی پسند یا قدیم شاعر ہو جائے، وہ کبھی اچھا شاعر، افسانہ نگار یا نقاد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جدیدیت بھی یہ بحث نہیں ہے کہ کسی نے نہیں کہا کہ محض جدیدیت کی وجہ سے کوئی شاعر، کوئی افسانہ نگار اچھا ہو جاتا ہے۔ پہلے تو یہی پتہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ شاعر یا ادیب ہے کہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ وہ جدید یا روایتی ہے یا رجعت پسند۔ ابھی تک جتنے بھی مباحث یہاں پہ ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر شاعری اور ادب کی بجائے شاعری کی سماجی حیثیت اور اس کے سیاسی عمل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اعلان یہ کیا گیا تھا کہ یہ مذاکرہ اردو کی جدید شاعری کے مسائل سے متعلق بحث کرے گا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کا موضوعاتی پہلو انسانی زندگی سے الگ نہیں ہوتا لیکن شاعری کا ایک فنی اور جمالیاتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ شاعری محض شعور نہیں جذبہ اور احساس بھی ہوتی ہے اس لئے وابستگی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ایک علم کی اصطلاحات کے دوسرے ادب یا فن میں استعمال کر دینے سے بات نہیں بنتی۔ وسیع معنی ہر اصطلاح کے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں Committment سے مراد سیاسی اور سماجی نظام فکر یا پارٹی پروگرام کے ساتھ Committed ہے۔ جب سارتر یہ کہتا ہے کہ شاعری میں Commitment غیر ضروری ہے تو اس پہ غور کیا جانا چاہئے کہ واقعی ہی غیر ضروری ہے یا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں انسانی احساسات انسانی جذبات کا دخل کم ہوتا ہے اور وہ کسی بھی سیاسی Commitment کے غلام ہوتے نہیں ہیں۔

حسین نعیم: جناب صدر اور دوستو! میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ محمود ہاشمی صاحب نے مقالہ لکھا ہے لیکن اندازہ یہ ہوا کہ انھوں نے بطور مترجم زیادہ چیزیں سارتر سے لی ہیں۔ کارل مارکس یا سارتر سے کوئی بھی Commitment نہیں ہے اس لئے ان حوالوں سے میں ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مقالہ غیر ضروری ہے۔ یہ تو خیریت ہے کہ کچھ نکتے اٹھائے گئے جن پر لوگ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اگر Commitment کا وہی بھدا تصور مان لیا جائے جو ہاشمی صاحب نے پیش کیا ہے تو یہ مقالہ نہایت Committed ہے۔ اور اس کا Commitment سیاسی ہے اور وہ ظاہر ہے۔ میرے خیال میں شاعر کی وابستگی صرف شاعری کی اعلیٰ اقدار سے ہوتی ہے اور اپنے ذاتی Ideal سے۔ یہ خود ایک تشنہ بیان ہے۔ اگر اس کی تفصیل میں جاؤں تو شاید میں ہی تقریر کرتا رہ جاؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاعری ہے کیا؟ یہ بھی انھوں نے نہیں بتایا۔ ورنہ کچھ آسانیاں ہو جاتیں۔ میرے خیال میں شاعری ان الفاظ کے پلندے کا نام نہیں ہے جو شاعر نے لکھا ہے بلکہ شاعری وہ چیز ہے، ان کیفیات کا نام ہے جو ان الفاظ کو سن کر ان موضوع الفاظ کو سن کر دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تشریح ایسی ہے جو بہت سے خیالات کو سمیٹ سکتی ہے۔

اس سمینار میں جہاں اردو کے مشہور و معروف ادیبوں نے شرکت کی وہاں ہندی ادب کے مشہور نقاد بھی آئے ہوئے تھے۔ سردیشور دیال صاحب کی ہندی کے جدید ادب پر بڑی گہری نظر ہے۔ جب ان سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے فرمایا۔

سردیشور دیال سکسینہ: مجھے یہاں آکر بہت خوشی ہوئی ہے میری تمنا تھی کہ میں اردو کی نئی کویتا جسے ہم لوگ آدھونک (جدید) کویتا کہتے ہیں، کیا ہے؟ اس کے لکھنے والوں سے ملوں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ جن سوالوں پہ ہندی کے کوی دوچار کر رہے ہیں لگ بھگ ان ہی سوالوں پہ اردو کے کوی بھی سوچ رہے ہیں۔ جس آدھونکتا (جدیدیت) کے سوال پر یہاں دوچار ہوا اسی کے اوپر ہندی میں بڑے لمبے عرصے سے بات چل رہی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے الٰہ آباد میں ایک گھوشٹی (مذاکرہ) ہوئی تھی۔ جس میں 'ساہتیہ کیوں؟' کے سوال پر دوچار کیا گیا تھا۔ اس کو

یہاں تک پھیلا دیا گیا تھا کہ بیسویں صدی کا اگر یہی رویہ رہا تو اس صدی کا لکھا ہوا ادب آگے کی صدیوں کے لئے کس کام کا ہوگا؟ یہ سب ایسے سوال ہیں جن پر وچار کرنے سے بڑا لابھ ہوتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ جس پرتشٹھان (اسٹیبلشمنٹ) کا سوال فاروقی صاحب نے اٹھایا اور جس ڈھنگ سے اسے اٹھایا لگ بھگ اسی سوال پہ ہندی کے لوگ بھی وچار کر رہے ہیں۔ جب کوئی کوی اسٹیبلشمنٹ سے الگ رہنے کا سوال اٹھاتا ہے تو لوگ یہ مان لیتے ہیں کہ اس کا مقصد سیاسی اور سماجی علحدگی ہے۔ ایسا نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کی مخالفت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ سماجی اور سیاسی مسئلوں سے ٹکرانے سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان سے وہ کس طرح اپنا تال میل بٹھاتا ہے؟ ہم اس بحث میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سماجک اور راجنیتک معاملات میں ایک لیکھک کو بیدار اور باشعور ہونا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر غلطی یہ ہوتی ہے کہ جب کوی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سماجی اور سیاسی روپ سے بیدار ہو تو ایک بہت بڑا گروپ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو اس کو بھی ایک نعرے کے روپ میں لے لیتا ہے۔ اور ان جماعتوں سے خود کو وابستہ کر لیتا ہے۔

محمود ہاشمی صاحب کے مضمون پر جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے اور بہت سے سوالیہ نشان لگا چکے تو محمود ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون پر اس پر مغز بحث کا جواب دینے کے لئے اٹھے۔

محمود ہاشمی: دوستو! مضمون پر بہت تفصیل سے بات چیت ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جزئیات سے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گفتگو میں ہم استقرائی انداز سے کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ ہماری زندگی میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل چیز ہے لفظ۔ لفظ کے مختلف مفاہیم ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں مختلف اوقات میں مختلف نئے معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ ہے آزادی۔ اس کے مختلف مفاہیم، مختلف تعریفیں ہیں۔ اس کی ایک تعریف وہ ہے جو سارتر نے کی ہے۔ اس کا ایک مفہوم وہ ہے جو سیاست کاروں کی یا سیاسی پلیٹ فارم سے کی جانے والی تقریروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ مفاہیم مختلف ہیں اور مفہوم کا یہی اختلاف کمٹمنٹ کے مسئلے سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اس جلسے میں، بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو شاعری میں کمٹمنٹ کو بہت ضروری سمجھتے ہیں اور جدید شاعری کے سلسلے میں کمٹمنٹ کو Critical Placement کا درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ کمٹمنٹ کا لفظ فلسفہ ادب میں کب سے استعمال ہونا شروع ہوا۔ نیز اس لفظ کا فلسفیانہ تناظر کیا ہے اور اس کے اطلاق کی حدود کیا ہیں؟ اس مقصد کے لئے میں نے سارتر کا سہارا لیا کہ سارتر مجھ سے، میرے عہد کے ادیبوں سے، اور اس سے زیادہ یہ کہ میرے ملک کے انٹلیکچولز سے زیادہ ذہین اور زیادہ مستند ہے۔ سارتر نے کمٹمنٹ کا جو مفہوم لیا ہے میں نے اسی کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، اپنا نظریہ لادنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ صرف ایک بات میں نے نہیں کی اور اس پر بحث میں حصہ لینے والوں نے بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ سارتر نے یہ تو کہا ہے کہ شاعری کمیٹیڈ ہو سکتی ہے اس سلسلے میں سارتر نے خاص نکات کی بھی وضاحت کی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایسی نثر جو کمیٹیڈ ہو اس میں ترسیل ہونی چاہئے۔ ایسی نثر استعاروں سے Images سے مبرا ہو، پیچیدہ oblique نہ ہو۔ اس میں سیاسی سماجی اور تاریخی شعور موجود ہو۔ شاعری کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ شاعری کی تفہیم کی مختلف سطحیں ہیں، نفسیاتی، لسانی، جمالیاتی یا عوامی نوعیت کی روایتی۔

ایسے شعر ہیں جن کو سن کر یا پڑھ کر سامع یا قاری کچھ اور مفہوم بھی اخذ کر سکتا ہے اور فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ اس شعر میں ذم کا پہلو ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا پڑھنے والا اپنے ذہن میں موجود مفہوم کو شعر میں منتقل کر دیتا ہے۔ ذم کا مفہوم شعر میں نہیں، سامع یا قاری کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعری کے سلسلے میں مفہوم متعین یا طے شدہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے آپ ظالم کے خلاف کمیٹیڈ ہوں اور آپ کا قاری مظلوم کے خلاف کمیٹیڈ ہو۔ ایسی صورت میں کمٹمنٹ کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہے گی۔

اس مذاکرے کے بعد اس نشست میں موجود تمام شعرا حضرات نے اپنا اپنا کلام پیش کیا جس سے تمام حاضرین لطف اندوز ہوئے۔ اس اچھے خاصے مشاعرے کی صدارت جناب قاضی سلیم صاحب نے کی اور اس کو کنڈکٹ جناب زبیر رضوی کر رہے تھے۔ جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں:

زیب غوری، مہدی حیدر زیدی، اظہر عباس زیدی، اسلم پرویز، کمار پاشی، مخمور سعیدی، بانی، بلراج کومل، عمیق حنفی، زبیر رضوی، انوار انجم، محمد علوی، عادل منصوری، سلیمان اریب، عزیز قیسی، انور معظم، شمس الرحمن فاروقی، سلام مچھلی شہری، خلیل الرحمن اعظمی، حسن نعیم، کے کے نیر، این ایس بیدی، سرویشور دیال سکسینہ، مظہر امام، قاضی سلیم، رفعت سروش۔

ان کے علاوہ جن دوسرے ادیبوں نے اس مشاعرے اور مذاکرے میں شرکت کی ان کے نام یہ ہیں:

اقبال ملک، وی۔ این۔ کیمکر، سریندر پرکاش، پریم ناتھ در، انور معظم، کرشن موہن، اسد جعفری، وڈیرا، انور عظیم، یوگ راج، سید ہاشمی، جمیلہ فاروقی، یوسف ناظم، شمس الحق عثمانی ☆☆☆

جدید غزل کے صاحب اسلوب شاعر
مہتاب حیدر نقوی کا نیا شعری مجموعہ
ماورائے سخن
شائع ہو گیا ہے۔
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کے پتے:
۱۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
۲۔ مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
۳۔ شب خون کتاب گھر، ۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد

کے۔ کے۔ برلا فاؤنڈیشن

مندرجہ ذیل انعامات/منصوبے کے لئے نامزدگیاں/درخواستیں درکار ہیں :-

۱۔ سرسوتی سمان (مالیت پانچ لاکھ روپئے): کسی بھی ہندوستانی زبان میں بلند پایہ ادبی تصنیف کے لئے۔

۲۔ ویاس سمان (مالیت ڈھائی لاکھ روپئے) : ہندی میں کسی بلند پایہ تصنیف کے لئے۔

۳۔ بہاری پرسکار (مالیت ایک لاکھ روپئے) : صرف راجستھان کے ہندی اور راجستھانی ادیبوں کی کسی بلند پایہ تصنیف کے لئے۔

۴۔ شنکر پرسکار (مالیت ڈیڑھ لاکھ روپئے) : ہندی زبان میں ہندوستانی فلسفے، ثقافت اور فن پر کسی بلند پایہ تصنیف کے لئے۔

۵۔ واچسپتی پرسکار (مالیت ایک لاکھ روپئے) : سنسکرت کی کسی بلند پایہ تصنیف کے لئے۔

۶۔ جی۔ ڈی۔ برلا انعام برائے سائنسی تحقیق (مالیت ڈیڑھ لاکھ روپئے)۔

۷۔ تقابلی ہندوستانی ادبیات کے کسی موضوع پر فیلوشپ۔

نامزدگی/درخواست بھیجنے کی آخری تاریخ: ۱۵ اپریل ۲۰۰۶

مکمل تفصیلات اور نامزدگی/فیلوشپ کی درخواست کا فارم حسب ذیل پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے:

کے۔ کے۔ برلا فاؤنڈیشن

ہندوستان ٹائمس ہاؤس، ساتویں منزل،

۱۸۔۲۰ کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

فون 23718282,23317735

"شب خون"

کے گذشتہ شمارے

"شب خون" کے حسب ذیل شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔ شائقین فی پرچہ پچیس روپے (Rs. 25/-) کے حساب سے "شب خون" کے نام ڈرافٹ بھیج کر حاصل کریں۔ ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔ وی۔ پی۔ نہیں کی جائے گی۔ منی آرڈر صرف خاص حالات میں قبول کیا جاسکے گا۔

۱۶ تا ۱۷	۱۲۵ تا ۱۲۶	۲۰۱ تا ۲۰۵
۳۰ تا ۳۱	۱۲۸ تا ۱۳۰	۲۰۷ تا ۲۰۸
۳۴، ۳۸	۱۳۲ تا ۱۳۴	۲۱۰ تا ۲۱۹
۴۰ تا ۴۵، ۵۰	۱۳۸، ۱۴۱	۲۲۲ تا ۲۲۴
۵۲ تا ۶۰	۱۴۳ تا ۱۴۵	۲۲۶، ۲۲۸
۶۱ تا ۷۰	۱۴۷ تا ۱۵۷	۲۳۰ تا ۲۳۲
۷۷ تا ۸۰	۱۶۰ تا ۱۶۱	۲۳۷، ۲۳۸
۸۷ تا ۹۰	۱۶۸ تا ۱۷۲،	۲۴۴ تا ۲۵۰
۹۱ تا ۹۹	۱۷۴	۲۵۲ تا ۲۵۶
۱۰۶ تا ۱۱۰	۱۷۶ تا ۱۸۲	۲۵۸ تا ۲۶۴
۱۱۳ تا ۱۱۵	۱۸۵ تا ۱۹۹	۲۶۶ تا ۲۹۲
۱۲۲ تا ۱۲۳	ضخیم آخری شمارہ ۷۵۰ روپے	

شب خون کتاب گھر

الہ آباد

آل انڈیا تعلیمی وملّی فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

نئی دہلی

مقاصد

☆ تعلیمی فروغ، ملی اتحاد، قومی یکجہتی اور انسانی خدمات
☆ دینی، عصری اور تکنیکی تعلیم کو فروغ
☆ دیہی غریب بستیوں میں دینی عصری علوم کی درسگاہوں کا قیام
☆ مریضوں کی اعانت
☆ بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کی مالی امداد
☆ بہار کے سیلاب زدگان کے لئے ریلیف کا انتظام
☆ مدرسے اور متعدد مکاتب جو یو۔ پی۔ بہار، جھارکھنڈ اور مغربی بنگال میں چل رہے ہیں۔
☆ ملی کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹکنالوجی
☆ مدرسۃ البنات
☆ ملی گرلز اسکول (انگلش میڈیم سی بی ایس سی کورس)
☆ اس کے علاوہ مزید اداروں کا قیام منصوبہ میں شامل ہے۔
☆ فاؤنڈیشن کو محکمہ انکم ٹیکس کی جانب سے G-80 اور A-12 کی سرٹیفکیٹ حاصل ہے، جس کے تحت امداد دینے والے کو 50% کی سرکاری رعایت انکم ٹیکس میں ملے گی۔ بینک ڈرافٹ یا چیک پر صرف

"ALL INDIA TALIMI WA MILLI FOUNDATION"
A/c No. 16049 S.B.I. New Delhi

تحریر فرمائیں

MAULANA ASRARUL HAQUE QASMI
President: All India Talimi wa Milli Foundation
Post Box 9724, New Delhi 110025
Tel.: 011-26984730-55675966

سید عبدالقادر میموریل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

الہ آباد

پس ماندہ اور اقلیتی طبقوں کی

بچیوں کی تعلیمی اور سماجی فلاح

کے لئے

خالصۃً لوجہ اللہ سرگرم عمل ہے۔

آپ بھی اس کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔

تفصیلات کے لئے لکھیں :

سید عبدالقادر میموریل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۹ سی ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۱

Shamsur Rahman Faruqi

THE FLOWER-LIT ROAD

Sixteen Essays in Urdu Literary Theory and Criticism

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہ خیال
(غالب)

The road of thought, lit
With wave upon wave
Of flowers.

(Ghalib)

Price : Rs. 640.00
Laburnum Press, Allahabad - 211001
Shabkhoon Kitab Ghar, Allahabad - 211003

Regd. with the Registrar of Newspapers No. 12476/66

June - December 2005

Annual Subscription Rs. 240/-

Urdu Monthly
Shabkhoon

P.O. Box No. 13
313, Rani Mandi
Allahabad - 211003

Postal Regd. No. PMG-AD/117
Validity 2005-2008

Licensed to Post without Pre-Payment
Lic. No. WP-1 Dtd. 15-6-2001

Price Per Set Rs. 750/-

دنیا کی سیادتوں میں پہلے علم حاصل کرو۔
بعد میں حاصل اعزاز واقتدار
تحصیل کمالات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔
(امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ)

Al-Barkaat
Institute of Management Studies
Aligarh

Approved by AICTE & Affiliated to U.P. Technical University

مشہور و مقبول خلائق، صوفی، شاعر، دانشور
حضرت سید شاہ برکت اللہ پیمی مارہروی کی یادگار میں
ان کے اخلاف کا قائم کردہ جدید ترین علم و دانش کا مرکز

Al-Barkaat Institute of Management Studies
Anoopshahr Road, Aligarh - 202002
Phone : 0571-3091308, 3091309, 3099871, 09837081001
Website : www.albarkaat.com, www.albarkaat.edu.in
email of advisor to students : goutam_saha007@rediffmail.com